تفسیر نعیمی

حکیم الامت مفتی احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر: نعیمی کتب خانہ گجرات
مفتی احمد یار خان روڈ، گجرات۔ پاکستان۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پنجتن پاک

قرآنی پنجتن پاک

محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم

- حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- حضرت عثمانِ غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- حضرت مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ

آسمانی پنجتن پاک

محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم

- حضرت جبرائیل علیہ السلام
- حضرت میکائیل علیہ السلام
- حضرت اسرافیل علیہ السلام
- حضرت عزرائیل علیہ السلام

حدیثی پنجتن پاک

محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم

- حضرت مولیٰ علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا
- حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ
- حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ

منجانب: صاحبزادہ مفتی اقتدار احمد خان

اَشرفُ التَّفَاسِیر

تَفسِیرِ نعیمی

جلد ۱

مُفَسِّر

شیخ التفسیر حکیم الاُمت مُفتی احمد یار خان نعیمی رحمۃ اللہ علیہ

ناشر
نعیمی کُتب خانہ
مُفتی احمد یار خان روڈ
چوک پاکستان، گجرات،

فہرست مضامین تفسیر نعیمی پارہ اول

پیش لفظ

خلاق العلیم نے اپنے حبیب ﷺ کو منور القلوب بنایا اور اس صاحب خلق عظیم نے اپنے غلاموں کے دلوں کو نور ہدایت سے چمکایا اور مینارہ نور بنایا تا کہ مخلوق خدا راہ ھدیٰ کی معرفت پائے اور گمراہ کن اندھیروں میں بھٹکنے سے بچ جائے۔ اللہ کی شان۔ ہدایت مخلوق کے یہ سامان۔ سارا عالم نور محمد یہ کی ضیاء پاشیوں سے جگمگانے لگا ہر کوئی فوز العظیم کی طرف راہ پانے لگا کبھی یہ نور اصحاب النبی ﷺ کے ذریعے نجوم ہدایت بن کر چمکا اور کبھی تابعین تبع تابعین کے زہد و تقویٰ سے جھلکا کبھی اس نے امام اعظم کی قندیل سے منور ہو کر لوگوں کو شریعت کا راستہ دکھایا اور کبھی غوث اعظم کی شمع سے چمک کر طریقت کے رموز سے روشناس کرایا اور معرفت الٰہی کا جام پلایا۔

الغرض۔ کبھی یہ نور فقہاء امت محمد یہ کی درسگاہوں سے پھیلا اور کبھی اولیاء امت محمد یہ کی خانقاہوں سے۔ ہدایت امت کے راستے خوب مضبوط و معین ہو گئے اور لوگوں کے قلوب زیور ہدایت سے منور و مزین ہو گئے۔ جب بھی کوئی شخص شیاطین ضلال یا شامت اعمال کی وجہ سے گم گشتہ راہ ہو جاتا تو انہی مینار ہائے نور کی وجہ سے راہ فلاح پاتا۔ مخلوق عالم نے راہ فلاح پائی مگر شیطان کو یہ بات پسند نہ آئی دل ہی دل میں جلتا تھا اور اپنی ناکامی پر ہاتھ ملتا تھا کہ اس نے کیا سوچا تھا اور کیا ہو گیا۔ اس کے دل میں بڑا فتور تھا مگر کیا کرتا مجبور تھا، کہ شمع نور محمدی کو بجھا دینا اس کی طاقت سے بہت دور تھا آخر کار اسے ایک راہ سجھائی دی اب وہ بجائے دشمن دین مصلح دین بن کر ظاہر ہوا برائی کی طرف بلانے کو چھوڑ کر نیکی کی راہ سمجھانے لگا اور اسرار و رموز شریعت و طریقت لوگوں کو بتانے لگا۔

مگر کس طرح۔ کہ کبھی عظمت قرآن کو اس طرح سمجھایا کہ حدیث رسول اللہ ﷺ کا انکار کروا دیا اور منکرین حدیث پیدا کر دیئے اور کبھی حدیث کے اتباع کے وہ معانی کئے کہ لوگ ائمہ فقہاء سے برگشتہ ہو گئے اور ہر شخص بزعم خود مجتہد بن بیٹھا شیطانی غرور کے اس جال نے اُن کے ذہن میں یہ خیال پیدا کر دیا کہ دین کی جو سمجھ انہیں ہے کسی اور کو نہیں اور خطاء سے ماوراء انہی کی ہستی باصفا ہے اور وہ آیات و احادیث سے بذات خود مسائل کا استنباط کرنے لگے حالانکہ انہیں خیال بھی نہ گزرا کہ جہالت کس حد تک ان پر چھائی ہوئی ہے نہ تو ان کی قرآن مجید کی تمام آیات پر نظر ہے اور نہ تمام احادیث پر بلکہ تمام احادیث تو کجا صحاح ستہ کی سب حدیثوں کے متن بھی اس کی نظر میں نہ ہیں چہ جائے کہ ان کے اسرار و رموز کو سمجھیں اور ان سے مسائل نکالیں اسی وجہ سے انہیں یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ اُن کے کسی ایک آیت یا حدیث سے نکالے ہوئے مسئلے سے کتنی آیات و احادیث کی تکذیب لازم آئی یا ان میں کتنی جگہ تعارض پیدا ہوا اور دین اسلام میں کون کون سے رخنے پڑ گئے کبھی لوگوں کو شریعت سے دور اور کبھی طریقت سے نفور کیا۔ نتیجتاً دین اسلام میں نئے فرقوں کی اس قدر بہتات ہوئی کہ خدا کی پناہ ہر شخص قرآن و حدیث کا داعی بن کر میدان میں آ گیا اور قرآن سنا سنا کر لوگوں کو صاحب قرآن سے برگشتہ کرنے لگا غالباً اسی

صورتحال کا حدیث شریف میں اشارہ ہے۔

وَسَتَرَوْنَ مِنْ بَعْدِیْ اِخْتِلَافًا شَدِیْدًا فَعَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَهْدِیِّیْنَ عَضُّوْا عَلَیْهَا بِالنَّوَاجِذِ وَاِیَّاکُمْ وَالْاُمُوْرَ الْمُحْدَثَاتِ فَاِنَّ کُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ (ابن ماجه، کتاب اتباع سنت)

اور دیکھو گے تم میرے بعد شدید اختلاف پس واجب ہے تم پر میری سنت اور ہدایت دیئے ہوئے خلفاء راشدین کی سنت مضبوطی سے پکڑو اس پر اپنے دانتوں سے اور بچاؤ تم اپنے آپ کو نئی چیزوں سے کیونکہ دین میں ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

چونکہ ان متبعین فتطین کی اپنی شخصیت کچھ ایسی نہ تھی کہ بلندی کردار کی وجہ سے عوام پر اثر انداز ہو سکتے یا اخلاق نبوی کا آئینہ دار ہو کر اہل ایمان کو اپنی طرف مائل کر سکتے لہٰذا انہوں نے صحبت و تقریر سے زیادہ تحریر کو اپنے نظریات کا ذریعہ تشہیر بنایا اور اس کی اشاعت میں اتنی سرگرمی دکھائی کہ عوام کے دلوں میں ان کے لئے نرمی پیدا ہوگئی اور وہ تحریف القرآن کو تفہیم القرآن اور تفویۃ الایمان کو تقویۃ الایمان سمجھنے لگے اور سراب کو چشمہ آب سمجھ کر اس کی طرف دوڑ لگادی بے خبر اس بات سے کہ جس چھلاوے کو یہ راہنما و رفیق سمجھ رہے ہیں انجام کار وہ انہیں ایسے قعر عمیق میں گرادے گا کہ جہاں سے ان کی نجات ناممکنات میں سے ہوگی۔

مختصر یہ کہ ظهر الشیطان بشروره مگر والله متم نوره ایسے دور پریشانی میں علماء حقانی نے بتوفیق رحمانی دین اسلام کی نگہبانی کے لئے اس محاذ پر کام سنبھالا اور رہبران دین کے روپ میں چھپے ہوئے ان بندگان دیولعین کو تقریراً و تحریراً بے نقاب کیا تاکہ ہدایت کے غلاف میں گمراہی بیچنے کے اس سلسلے کا سدباب کیا جاسکے اور دینی رنگ میں رنگی ہوئی اس بے دینی کو پھیلنے سے روکا جاسکے۔ انہی چند میں سے جو نابغہ روزگار تھے ایک حضرت حکیم الامت مفتی احمد یار تھے جن کی تحریر دست مومن میں برہنہ شمشیر اور قلب باطل میں بمثل تیر تھی انہوں نے مختلف طریقوں سے قلوب و اذہان کی تطہیر کی کبھی حدیث کی شرح لکھی اور کبھی قرآن کی تفسیر کی ان کی یہ کاوش بارگاہ اللہ جل مجدہ میں شرف قبولیت سے ایسی باریاب ہوئی کہ بے شمار مخلوق اس چشمے سے فیض یاب ہوئی اور اپنا قبلہ ایمان درست کیا اور آج عرصہ دراز گزر جانے کے بعد بھی اہل ایمان فیض پا رہے ہیں جبکہ حزب الشیطان نظریں چرا رہے ہیں کہ اس ضرب مومن کے مقابل نہ کوئی ان کا سہارا ہے اور نہ ہی انہیں اس کے جواب کا یارا۔ عشق رسول ﷺ میں ڈوبی ہوئی قلم کی اس زبان سے تفسیر القرآن کے وہ محمد عرفان نمونے ظاہر ہوئے کہ جس سے قلوب اہل ایمان حب حبیب الرحمٰن سے سرشار ہو کر رشک اہل جہان ہوگئے۔

اے ضیاء الحق بحذق رائے تو   حلق بخشد سنگ را حلوائے تو

یہ تفسیر القرآن عرف عام میں تفسیر نعیمی کے نام سے جانی جاتی ہے اور اہلسنت و جماعت میں ایک حوالے کی حیثیت سے مانی جاتی ہے ہمیں انتہائی مسرت ہے کہ ہم اس کو نئی تصحیح و کتابت کے ساتھ طباعت و اشاعت کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ تاکہ اس خزانہ بہائے بیش کو بہتر انداز میں پیش کیا جاسکے چونکہ یہ کتاب مخالفین پر پیش کی جاتی ہے اس لئے ہم نے

کوشش کی ہے کہ دوران تفسیر جو آیات بطور حوالہ پیش ہوئی ہیں ان تمام کی سورتوں اور نمبر کی نشاندہی کر دی جائے تا کہ قاری کو قرآن مجید میں وہ آیت ڈھونڈنے میں دشواری نہ ہو اور مخالف کو جرأت منہ ماری نہ ہو۔اس کی تصحیح میں جناب زاہد لطیف نعیمی قادری صاحب نے میری بہت مدد کی سارا سارا دن اس محنت طلب کام میں میرا ساتھ دیا اور بعض جگہ بہت مفید مشورے دیئے اللہ تعالیٰ ان کی اس محنت کو قبول فرمائے اور جزائے خیر سے نوازے اس کے ساتھ میں مناظر اسلام محمود احمد قادری نعیمی صاحب کا بھی بہت ممنون ہوں جنہوں نے تفسیر کا ایک پرانا نسخہ برائے تصحیح ہم کو دیا اور گاہے بگاہے تصحیح میں ہماری مدد کے ساتھ مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔ ہر چند کہ ہم نے اس کتاب کی تصحیح کتابت میں بہت محنت کی ہے لیکن بحیثیت انسان سہو و نسیان کا بہت امکان ہے لہٰذا قارئین سے التماس ہے کہ اگر غلطی نظر سے گزرے تو باحوالہ اطلاع کی جائے تا کہ اصلاح کی جاسکے۔شکریہ

محمد عبدالقادر خان نعیمی قادری

ابن مفتی اقتدار احمد خان نعیمی

ابن مفتی احمد یار خان نعیمی

علم تفسیر

''سے متعلق گذارشات''

نصف صدی پیشتر عام مسلمان قرآنی علوم سے تھوڑے بہت آشنا ہونے کے باوجود بھی قرآن کو بذات خود صرف تلاوت کی حد تک پڑھتے تھے قرآن کریم سے خود کچھ بھی اخذ کرتے ہوئے انہیں ہچکچاہٹ محسوس ہوتی تھی یہ کام انہوں نے مستند علماء کرام کے لئے چھوڑ رکھا تھا کہ قرآن پاک کو سمجھیں اور اس کے مطالب و مسائل عام فہم زبان میں عوام تک پہنچائیں اکثر جید علماء کرام بھی قرآن پاک کے ترجمہ اور تفسیر کرنے سے عام طور پر اجتناب فرماتے تھے اور قرآن کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے تقریباً اکیس علوم صرف نحو، معانی، بیان، بدیع، ادب، لغت، فلسفہ، حساب، جیومیٹری، فقہ، تفسیر، حدیث، علم کلام جغرافیہ، تاریخ، تصوف، اصول، وغیرہ پر مکمل دسترس حاصل کرنا ضروری خیال کرتے تھے ان تمام علوم کو حاصل کرنے کے بعد بھی وہ تقریباً تمام گزشتہ مفسرین اور مترجمین کو پڑھنا ضروری خیال کرتے تھے تاکہ کوئی ایسی بات تحریر میں نہ آجائے جس سے بجائے فائدے کے ان کی تحریر و تفسیر اسلام میں نئے فرقہ کا باعث بن جائے۔

اس طرح عام مسلمان بد مذہبی و لا دینی کا شکار نہ ہوتے تھے اور فرقہ سازی میں اتنی تیزی نہیں پیدا ہوتی تھی جتنی آج کل ہے۔

جمہوریت کے اس دور میں ہر شعبہ میں برابری کے دعوے کئے جا رہے ہیں لوگوں میں علماء کے ساتھ بھی برابری کرنے کا خیال پیدا ہوا ہے ہر شخص نے قرآن پاک سے بہ ہمت خود علم حاصل کرنے کی کوشش کی عربی سے معمولی شد بد رکھنے والے مترجم قرآن بن گئے اور ہر آیت کا تفسیر کرنا اپنے لئے ضروری خیال کرنے لگے ایسے لوگ بھی مترجم اور مفسر بن گئے جن کے بارے میں تصدیق ہے کہ انہوں نے باضابطہ طور پر کسی بھی مدرسہ عربی میں علم حاصل نہیں کیا (مودودی) حساب میں ڈاکٹریٹ کرنے والے مفسر قرآن بنے (عنایت اللہ المشرقی) یہاں تک کہ ایسے ایسے دعویدار پیدا ہوئے کہ قرآن کو دیگر علوم کی مدد سے سمجھنے کے اصول کو بالائے طاق رکھ کر قرآن کو قرآن سے سمجھنے کے اصول بتانے لگے احادیث تک سے روگردانی کی اور پھر ستم یہ کہ اپنا نام اہل قرآن رکھا (غلام احمد پرویز) نتیجہ اب یہاں تک پہنچا ہے کہ خواندہ ناخواندہ صرف انگریزی تعلیم یافتہ لغت کا معمولی طالب علم مفسر قرآن بن بیٹھا ہے اور اپنی پیش کردہ تاویلات کو بھی وحی الٰہی جانتے ہوئے اس سے اختلاف کرنے والوں کو بلا تامل کافر کہہ دیتا ہے اسی دور کے متعلق ہی حضور ﷺ نے خبر دی کہ دین اسلام میں بہت سے فرقے بنیں گے رب تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّ عُمْيَانًا (فرقان: ۷۳)

مسلمان اللہ تعالیٰ کی آیتوں پر گونگے اندھے ہو کر نہیں گر پڑتے یعنی مسلمانوں کو چاہئے کہ قرآن پاک کو سمجھنے کے لئے بہت

محنت کریں نیز ہر ترجمہ اور تفسیر قرآن کو قرآن کی طرح نہ جانیں کہ مترجم یا مفسر غلطیوں سے مبرا نہیں مرزا غلام احمد قادیانی نے دعویٰ نبوت کیا اور ثبوت میں قرآن کی اس آیت کو پیش کیا۔

اَللّٰہُ یَصْطَفِیْ مِنَ الْمَلٰٓئِکَۃِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ط (حج:۷۵)

یعنی اللہ تعالٰی فرشتوں اور انسانوں میں سے رسول چنتا رہے گا وغیرہ وغیرہ غرضیکہ اندھا دھند ترجمے بے ایمانی کی جڑ ہیں آنکھوں پر پٹی باندھ لو جو دل میں آئے کہہ دو اور قرآن سے ثابت کر دو۔

میں ان تمام گزارشات کے بعد قارئین سے خصوصی طور پر درخواست کروں گا کہ تفسیر یا ترجمہ کا انتخاب کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا ضروری سمجھئے کہ مترجم اور مفسر کس حیثیت کا عالم ہے اور قرآن پاک کا ترجمہ یا تفسیر لکھنے کا حق بھی رکھتا ہے یا نہیں۔

فقیر مفتی محمد مختار احمد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

حمد ہے اللہ جل شانہٗ کو جس نے حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو پیدا فرمایا۔ درود ہو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ پر جنہوں نے اللہ کو ظاہر فرمایا۔ حمد اس اللہ تعالیٰ کو جس نے ہمیں انسان کیا درود ہو اس مصطفیٰ علیہ السلام پر جنہوں نے ہمیں مسلمان کیا۔ حمد ہے اس رب کریم کی جس نے ہمیں بولنا سکھایا، درود ہو اس نبی رؤف ورحیم پر جس نے ہمیں کلمہ پڑھایا حمد ہے اس رب بے نیاز کو جس نے ہمیں ایمان دیا۔ درود ہو اس صاحب تخت وتاج پر جس نے ہمیں قرآن دیا۔ حمد ہے اس مالک یوم الدین پر جس نے زمین پر انسان بکھیرے، درود ہو اس شاہ عرش پر جس نے یہ بکھیرے ہوئے جمع فرمائے حمد ہے اس رب کو جس نے رنگ برنگا انسان بنایا درود ہو اس نبی علیہ السلام پر جس نے ان کو اک رنگ بنایا۔

صبغۃ اللہ ہست رنگ خم او | ہمشتھا یک رنگ گردد اندر او

حمد ہے اس رب کو جس نے ہمیں عقل وہوش دیا درود ہو اس نبی پر جس نے جام عرفان سے متوالا ومدہوش کیا حمد ہے اس رب کو جس نے آسمان نبوت پر مختلف تارے کھلائے درود اس آفتاب رسالت پر جس نے اپنے دامن نور میں سارے تارے چھپائے حمد اس جبار وقہار کو جس نے جہنم کو بھڑکایا۔ درود اس شفیع روز شمار پر جس نے اس بھڑکتے کو بجھایا حمد ہے اس ستار وغفار پر جس نے دار خلد بنایا درود ہو اس مدنی سرکار پر جس نے اسے بسایا حمد ہے اس خالق کو جس سے سب کو ابتداء ہے درود ہو اس خاتم پر جس پر سب کی انتہا ہے درود ہو اس نبی پر جس نے فرمایا لا الٰہ الا اللہ حمد ہو اس اللہ کو جس نے فرمایا محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ واصحابہ وبارک وسلم۔

اَمَّا بعدُ جاننا چاہئے کہ نظر انسانی آفتاب آسمانی کے مقابل خیرہ شبنم شمسی نور سے کافور اور کمزور روئے روشن آگ سے فیض لینے سے معذور، غرض کہ ہر ادنیٰ اعلیٰ کے مقابل محض مجبور، یہ تو مخلوق کا آپس میں معاملہ ہے ذات خالق تو کہیں اعلیٰ وبالا ہے کس آنکھ میں طاقت ہے کہ اس کی تجلی جھیل سکے کس گوش وہوش میں قوت ہے کہ اس کے مخاطبہ کی قوت لا سکے، کس مخلوق میں قدرت ہے کہ اس کے مقابل ٹھہر سکے یہ ظلمت وہ نور، وہ قادر یہ مجبور، وہ قاہر یہ مقہور، ان مجبوریوں میں مخلوق کا خالق سے تعلق کیونکر قائم ہوتا اور افاضہ اور استفاضہ کی کیا صورت ہوتی مخلوق کی یہ بے کسی ایسی برزخ کبریٰ کی تلاش میں تھی جو رب و مربوب عابد ومعبود خالق ومخلوق میں فیض دینے اور لینے کا سلسلہ قائم کرے۔ خلقت کی کمزور نگاہ کسی ایسے گہرے رنگ والے شیشے کی جستجو میں تھی جو نور لم یزل کی جلالی شعاعوں کو شان جمالی میں اس تک پہنچادے خلقت کی ہستی کسی ایسے مضبوط واسطے کی جویاں تھی جو اس کمزور ادنیٰ کی اس قوی واعلیٰ تک رسائی کرادے دائرہ کائنات کسی ایسے مرکز کا متلاشی تھا جس کی طرف سب کا رجوع ہو اس مجبوری ومعذوری پر رب قدیر نے رحم فرمایا کہ مخلوق کو خالق سے ملانے، گرتوں کے اٹھانے، بگڑوں کو بنانے کے لئے اس ذات کو پیدا فرمایا جو ہستی کا پہلا نقش، دفتر مخلوقات کا حرف اولین، گلزار خلائق کا نفیس پھول، آسمان وجود کا نیر اعظم

ہے جسے جہاں والے تو مکی مدنی کہتے ہیں اور جناں والے سرو چمنی بلبل انہیں گل کہے قمری سرو جانفزا بتائے۔ عرش والے انہیں احمد مجتبیٰ کہتے ہیں اور فرش والے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ والہ واصحابہ وسلم الی یوم الجزاء

ادھر اللہ سے واصل ادھر مخلوق میں شامل خواص اس برزخ کبریٰ میں ہے حرف مشدد کا

ان کی ذات، حبل اللہ المتین، اور واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا حکم رب العالمین ان کا نام پاک ہی ان کے کام کا پتہ دیتا ہے۔ "اللہ" بولنے سے دونوں لب جدا ہو جاتے ہیں اور لفظ "محمد" کہتے ہی مل جاتے ہیں کہ وہ نیچوں کو اعلیٰ سے ملانے ہی تو آئے ہیں ان کا نام حرز جان طفلان تیغ نوجوانان اور عصائے پیرو ناتواں ہے پھر وہ خالی نہ آئے، ایک نسخہ کیمیا ساتھ لائے جس کا نام ہے قرآن کریم

اتر کر حرا سے سوئے قوم آیا اور ایک نسخہ کیمیا ساتھ لایا

سبحان اللہ! نسخہ کیا ہے، کیمیا ہے۔ بیماروں کی شفا، تندرستوں کا ذریعہ بقاء، گمراہوں کا راہنما، مسجدوں میں اس کی تلاوت ہے میدانوں میں اس سے جہاد، عدالتوں میں اس سے فیصلے، بیماروں کے گلوں میں تعویذ بن کر پڑے، جان کنی میں مشکل حل کرے، بعد موت قبر اور حشر میں میں کام آئے۔ غرض کہ انسان کی دینی اور دنیوی زندگی کا دستور العمل ہے۔ ہر مسلمان کے دل میں جذبہ ہے کہ اسے سمجھے، ہر مومن کے قلب میں تڑپ ہے کہ اس فرمان تک اس کی رسائی ہو۔ علماء تو محنت کر کے اس کے مضامین تک پہنچتے ہیں مگر عوام چاہتے ہیں کہ اس کے مضامین ہماری زبان میں ہم تک پہنچیں، اس لئے تقریباً ہر زبان میں اس کی بے شمار تفسیریں لکھی گئیں۔ زبان اردو بھی کسی سے پیچھے نہ رہی۔ مگر اہل ہند نے مسلمانوں کے اس جذبے سے غلط فائدہ اٹھایا کہ اپنے خیالات فاسدہ کو تفسیری رنگ میں ظاہر کیا مرزائی نبوت مرزا کا مقصد لے کر مفسر بنے چکڑالوی اپنے مذہب نامہذب کی اشاعت تفسیر کی آڑ میں کرنے لگے۔ بعض نے ولایتی عینک سے قرآن پاک کو دیکھا بعض لوگوں نے شیطانی دل و دماغ سے اسے سمجھا کہ خود قرآن کریم سے صاحب قرآن ﷺ کی توہین نکالنے لگے۔ شیطانی توحید کو ایمانی توحید بنا کر خلق کے سامنے پیش کرنے لگے۔ آج کل ہر بد مذہب نے ترجمہ قرآن کو اپنے لئے آڑ بنایا ہے۔ جگہ جگہ مسجدوں میں قرآنی ترجمے کے درس کے بہانے مسلمانوں کو بہکایا جا رہا ہے جاہل اردو خواں جسے استنجاء کرنے کی تمیز نہیں مفسر بنا ہوا ہے اس لئے عرصہ سے میرا ارادہ تھا کہ کوئی ایسی تفسیر لکھوں جو کہ عربی معتمد تفاسیر کا خلاصہ ہو اور جس میں موجودہ فرقوں کے نئے نئے اعتراضات کے جوابات دیئے جائیں کیونکہ اردو تفاسیر عام طور پر بد مذہبوں کی ہیں لیکن بہت وجوہ سے اس کا موقعہ نہ ملتا تھا کہ رب تعالیٰ نے مجھے شہر گجرات علاقہ پنجاب میں بھیجا یہاں مجھے روزانہ تفسیر قرآن سنانے کی خدمت میسر ہوئی اس وقت یہ خیال بھی نہ تھا کہ یہ تفسیر کبھی کتابی شکل میں چھپے گی ہوا یہ کہ بعض احباب نے روزانہ تقریریں لکھنی شروع کر دی جب چند پارے ختم ہوئے تو عام مسلمانوں کا خیال ہوا کہ اس کو چھپوا دیا جائے یہ تو ممکن نہ تھا کہ وہی تفاسیر چھپائی جاتیں بلکہ ان پر نظر ثانی کر کے انہیں زوایدہ و مکررات سے خالی کرنا، نئے فوائد بڑھانا ضروری تھا کیونکہ تحریر و تقریر میں فرق ہوتا ہے ادھر میں نے حسب ذیل کتب لکھیں۔

جاء الحق، شان حبیب الرحمٰن، سلطنت مصطفیٰ (ﷺ) اسلامی زندگی، دیوان سالک وغیرہ۔ امید سے زیادہ ان کی مقبولیت نے اور بھی میرا حوصلہ بڑھا دیا۔ لہٰذا اس طرف توجہ کی۔ توجہ تو کر دی۔ مگر اتنے بڑے کام کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ بھلا کہاں مجھ جیسا بے ہنر انسان اور کہاں تفسیر قرآن۔ لیکن درحقیقت نہ تو وہ کتابیں میری قوت سے لکھی گئیں اور نہ یہ کام میری قوت سے ہوگا۔ بلکہ رب تعالیٰ اور اس کے محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام جس سے چاہیں اپنا کام لے لیں۔ حق تعالیٰ کے بھروسہ پر یہ کام شروع کر دیا رب تعالیٰ میری زبان وقلم وکلام کو غلطی سے بچائے۔ حق باتیں ظاہر فرمائے اور خیر وخوبی سے اس کام کو انجام پر پہنچائے اور اسے قبول فرمائے اور مجھ فقیر بے نوا کے لئے صدقہ جاریہ اور توشہ آخرت بنائے۔ نیز اس مدرسہ غوثیہ گجرات کو دائم قائم رکھے۔ اور جن جن حضرات نے اس میں دامے، درمے قدمے، سخنے، قلمے کوشش کی انہیں جزائے خیر دے۔

آمین!

خصوصیات

اس تفسیر میں حسب ذیل خصوصیات ہیں۔

۱۔ یہ تفسیر، تفسیر روح البیان، تفسیر کبیر، تفسیر عزیزی، تفسیر مدارک، تفسیر محی الدین ابن عربی کا گویا خلاصہ ہے۔

۲۔ اردو تفاسیر میں سب سے بہتر تفسیر خزائن العرفان مصنفہ حضرت مرشدی استاذی صدر الافاضل مولانا الحاج سید محمد نعیم الدین صاحب قبلہ مراد آبادی دام ظلہم ہے۔ اس کو مشعل راہ بنایا گیا گویا یہ تفسیر اس کی تفصیل ہے۔

۳۔ اردو ترجموں میں نہایت اعلیٰ اور بہتر اعلیٰ حضرت قدس سرہ کا ترجمہ کنز الایمان ہے۔ اسی پر تفسیر کی گئی۔

۴۔ ہر آیت کا پہلی آیت سے نہایت عمدہ تعلق اور ربط بیان کیا گیا۔

۵۔ آیات کا شان نزول نہایت وضاحت سے بتایا گیا اور اگر شان نزول چند مروی ہیں تو ان کی مطابقت کی گئی۔

۶۔ ہر آیت کی اولاً تفسیر اور پھر خلاصہ تفسیر اور پھر تفسیر صوفیانہ دلکش اور ایمان افروز طریقہ سے کی گئی۔

۷۔ ہر آیت کے ساتھ علمی فوائد اور فقہی مسائل بیان کئے گئے۔

۸۔ تقریباً ہر آیت کے ماتحت آریہ، عیسائی وغیرہ دیگر ادیان اور دیوبندی، قادیانی، نیچری، چکڑالوی، وغیرہم کے اعتراضات، معہ جوابات بیان کئے گئے۔ ستیارتھ پرکاش چودھویں باب کے جوابات بھی دیئے گئے۔ لیکن یہ کتاب مجھے کچھ بعد میں ملی۔ اس لئے اس کی باقاعدہ تردید کچھ دور جا کر شروع ہوئی۔ اس تفسیر کے مطالعہ کے وقت قرآن پاک سامنے رکھا جائے اور جب آیت کی تفسیر دیکھنا ہو اس پر نظر رہے تو انشاء اللہ بہت لطف آئے گا۔

۹۔ بہت کوشش کی گئی ہے کہ زبان آسان ہو اور مشکل مسائل بھی آسانی سے سمجھا دیئے جائیں مگر پھر بھی مسائل علمی ہیں جیسے مسئلہ امکان کذب یا امکان نظیر یا مسئلہ عصمت انبیاء یا حضور علیہ السلام کے والدین کے ایمان کی بحث یا آیات واحادیث کی

مطابقت اگران میں سے کوئی بات سمجھ میں نہ آئے تو چند بار مطالعہ کریں یا کسی سنی عالم سے حل کرلیں۔

۱۰۔تفسیر کی تعریف اور تفسیر وتاویل وتحریف کا فرق اور مولوی اور صوفی کی تعریفیں اور ان میں عمدہ فرق اور ان دونوں جماعتوں کی ضرورت پارہ اول کے اخیر میں بیان کی گئیں وہاں ملاحظہ فرمائیں اور جوکوئی اس سے فائدہ اٹھائے وہ مجھ فقیر بے نوا کو دعائے خیر سے یاد کرے۔اس کا تاریخی نام ''اشرف التفاسیر'' المعروف ''تفسیر نعیمی'' رکھتا ہوں۔حق تعالیٰ اسے قبول فرمائے اور میرے لئے صدقہ جاریہ اور کفارہ سیئات بنائے۔

وَمَا تَوْفِيْقِىْ اِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ وَ صَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى خَيْرِ خَلْقِهٖ وَ نُوْرِ عَرْشِهٖ سَيِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحَابِهٖ اَجْمَعِيْنَ

احمد یار خان نعیمی اشرفی او جھانوی بدایونی

۸ ماہ فاخر ربیع الآخر ۱۳۶۳ھ روز ایمان افروز طغیان سوز --- دوشنبہ مبارکہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے انیس سال میں پہلی بار درس قرآن ختم ہوا۔پھر دوبارہ شروع کیا گیا۔دوران درس میں بہت سے تفسیری نکات فوائد، نئے اعتراضات و جوابات وغیرہ بیان ہوئے وہ تمام اس میں زیادہ کردیئے گئے اب بفضلہٖ تعالیٰ یہ تفسیر کچھ اور ہی چیز ہوگئی۔وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ عَلٰى ذٰلِكَ

احمد یار خان مہتمم مدرسہ غوثیہ نعیمیہ گجرات پاکستان
ومالک نعیمی کتب خانہ گجرات
۲۵ شوال المکرم ۱۳۷۸ھ یوم دوشنبہ

مقدمہ

اس میں چند فصلیں ہیں

پہلی فصل، لفظ قرآن کے معنی اور اس کی وجہ تسمیہ

لفظ قرآن یا تو قرء سے بنا ہے یا قراءۃ سے یا قرن سے (تفسیر کبیر پارہ ٢) قرء کے معنی جمع ہونے کے ہیں۔ اب قرآن کو قرآن اس لئے کہتے ہیں کہ یہ بھی سارے اولین وآخرین کے علموں کا مجموعہ ہے (تفسیر کبیر، روح البیان پارہ ٢) دین دنیا کا کوئی ایسا علم نہیں جو قرآن میں نہ ہو اسی لئے حق تعالیٰ نے خود فرمایا کہ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (نحل: ٨٩) نیز یہ سورتوں اور آیتوں کا مجموعہ ہے۔ نیز یہ تمام بکھروں کو جمع کرنے والا ہے دیکھو ہندی، سندھی، عربی، عجمی لوگ ان کے لباس، طعام، زبان طریق زندگی سب الگ الگ کوئی صورت نہ تھی کہ یہ اللہ تعالیٰ کے بکھرے ہوئے بندے جمع ہوتے۔ لیکن قرآن کریم نے ان سب کو جمع فرمایا اور ان کا نام رکھا مسلمان خود فرمایا سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ (حج: ٧٨) جیسے کہ شہد مختلف باغوں کے رنگ برنگ پھولوں کا رس ہے مگر اب ان سب رسوں کے مجموعہ کا نام شہد ہے۔ اسی طرح ''مختلف ملکوں، مختلف زبانوں کے لوگ ہیں۔ مگر اب ان کا نام ہے مسلمان تو گویا یہ کتاب اللہ کے بندوں کو جمع فرمانے والی ہے اسی طرح زندوں اور مردوں میں بظاہر کوئی علاقہ باقی نہ رہا تھا لیکن اس قرآن عظیم نے ان کو بھی خوب جمع فرمایا کہ مردے مسلمان زندوں سے فیض لینے لگے کہ اسی قرآن سے ان پر ایصال ثواب وغیرہ کیا جاتا ہے اور زندے وفات شدہ لوگوں سے کہ وہ حضرات اسی قرآن کی برکت سے ولی قطب، غوث بنے اور ان کا فیض بعد وفات جاری ہوا انشاء اللہ اس کی بحث وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ میں آئے گی۔

اور اگر یہ قراءۃ سے بنا ہے تو اس کے معنی ہیں پڑھی ہوئی چیز۔ تو اب اس کو قرآن اس لئے کہتے ہیں کہ اور انبیاء کرام کو کتابیں یا صحیفے حق تعالیٰ کی طرف سے لکھے ہوئے عطا فرمائے گئے لیکن قرآن کریم پڑھا ہوا اترا۔ اس طرح کہ جبریل امین حاضر ہوتے اور پڑھ کر سناجاتے اور یقیناً پڑھا ہوا نازل ہونا لکھے ہوئے نازل ہونے سے افضل ہے۔ جس کی بحث دوسری فصل میں آتی ہے نیز جس قدر قرآن کریم پڑھا گیا اور پڑھا جاتا ہے اس قدر کوئی دینی دنیوی کتاب دنیا میں نہ پڑھی گئی۔ کیونکہ جو آدمی کوئی کتاب بناتا ہے۔ وہ تھوڑے سے لوگوں کے پاس پہنچتی ہے اور وہ بھی ایک آدھ دفعہ پڑھتے ہیں۔ اور پھر کچھ زمانہ بعد ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح پہلی آسمانی کتابیں بھی خاص خاص جماعتوں کے پاس آئیں اور کچھ دنوں رہ کر پہلے تو بگڑیں پھر ختم ہو گئیں جس کا ذکر تیسری فصل میں انشاء اللہ آئے گا لیکن قرآن کریم کی شان ہے کہ سارے عالم کی طرف آیا اور ساری خدائی میں پہنچا سب نے پڑھا بار بار پڑھا اور دل نہ بھرا۔ اکیلے پڑھا، جماعتوں کے ساتھ پڑھا۔ اگر کبھی تراویح کی جماعت

یا شبینہ دیکھنے کا اتفاق ہو تو معلوم ہو گا کہ اس عظمت کے ساتھ کوئی کتاب پڑھی ہی نہیں گئی۔ پر لطف بات یہ ہے کہ اس کو مسلمان نے بھی پڑھا اور کفار نے بھی پڑھا۔ لطیفہ۔ ایک بار رام چندر آریہ نے حضرت صدر الافاضل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے عرض کیا کہ مجھے قرآن کریم کے چودہ پارے یاد ہیں بتایئے آپ کو میرا وید کتنا یاد ہے حضرت موصوف نے فرمایا۔ یہ تو میرے قرآن کا کمال ہے کہ دوست تو دوست دشمنوں کے سینوں میں بھی پہنچ گیا اور تیرے وید کی یہ کمزوری ہے کہ دوستوں کے دل میں بھی گھر نہ کر سکا۔ اور بقول تمہارے دنیا میں وید کو آئے ہوئے کروڑوں برس ہو چکے ہیں لیکن ہندوستان سے آگے نہ نکل سکا۔ مگر قرآن کریم چند صدیوں میں تمام عالم میں پہنچ گیا۔

اور اگر یہ قرن سے بنا ہے تو قرن کے معنی ہیں ملنا اور ساتھ رہنا۔ اب اس کو قرآن اس لئے کہتے ہیں کہ حق اور ہدایت اس کے ساتھ ہیں نیز اس کی سورتیں اور آیتیں ہر ایک بعض بعض کے ساتھ ہیں کوئی کسی کے مخالف نہیں نیز اس میں عقائد اور اعمال اور اعمال میں اخلاق، سیاسیات، عبادات، معاملات تمام ایک ساتھ جمع ہیں نیز یہ مسلمان کے ہر وقت ساتھ رہتا ہے دل کے ساتھ، خیال کے ساتھ، ظاہری اعضاء کے ساتھ اور باطنی عضووں کے ساتھ دل میں پہنچا۔ اس کو مسلمان بنایا ہاتھ پاؤں ناک کان وغیرہ کو حرام کاموں سے روک کر حلال میں مشغول کر دیا۔ غرضیکہ سر سے لے کر پاؤں تک کے ہر عضو پر اپنا رنگ جما دیا۔ پھر زندگی میں ہر حالت میں ساتھ، بچپن میں ساتھ، جوانی میں ساتھ، بڑھاپے میں ساتھ۔ پھر ہر جگہ ساتھ رہا تخت پر ساتھ، تختے پر ساتھ، گھر میں ساتھ، مسجد میں ساتھ، آبادی میں ساتھ، غرضیکہ ہر حال میں ساتھ پھر مرتے وقت ساتھ کہ پڑھتے اور سنتے ہوئے مرے قبر میں ساتھ کہ بعض صحابہ کرام کو ان کی وفات کے بعد قبر میں قرآن پاک پڑھتے ہوئے سنا گیا اور حشر میں ساتھ کہ گناہ گار کو خدا سے بخشوائے پل صراط پر نور بن کر مسلمان کے آگے آگے چلے اور راستہ دکھائے اور بتائے اور جب مسلمان جنت میں پہنچے گا تو فرمایا جائے گا کہ پڑھتا جا اور چڑھتا جا غرضیکہ یہ مبارک چیز کبھی بھی ساتھ نہیں چھوڑتی اس کا دوسرا نام فرقان بھی ہے۔ یہ لفظ فرق سے بنا ہے اس کے معنی ہیں فرق کرنے والی چیز قرآن کو فرقان اس لئے کہتے ہیں کہ حق و باطل، جھوٹ اور سچ مومن اور کافر میں فرق فرمانے والا ہے قرآن بارش کی مثال ہے دیکھو کسان زمین کے مختلف حصوں میں مختلف بیج بو کر چھپا دیتا ہے کسی کو پتہ نہیں لگتا کہ کہاں کون سا بیج بویا ہوا ہے۔ مگر بارش ہوتے ہی جہاں جو بیج دفن تھا، وہاں وہی پودا نکل آتا ہے تو بارش زمین کے اندرونی تخم کو ظاہر کرتی ہے۔ اسی طرح رب تعالیٰ نے اپنے بندوں کے سینوں میں ہدایت، گمراہی، سعادت، شقاوت، کفر و ایمان کے مختلف تخم امانت رکھے نزول قرآن سے پہلے سب یکساں معلوم ہوتے تھے صدیق و ابو جہل، فاروق و ابولہب میں فرق نظر نہیں آتا تھا قرآن نے نازل ہو کر کھرا اور کھوٹا علیحدہ کر دیا صدیق کا ایمان زندیق کا کفر ظاہر فرما دیا لہٰذا اس کا نام فرقان ہوا یعنی ان میں فرق ظاہر فرمانے والا قرآن کریم کے کل ۳۲ نام ہیں جن کی تفصیل ان شاء اللہ شروع سورۂ بقرہ ذالک الکتاب میں بیان کی جائیگی۔

دوسری فصل، نزول قرآن کریم میں

نزول کے معنی ہیں اوپر سے نیچے اترنا اور کلام میں نقل و حرکت نہیں ہو سکتی لہٰذا اس کے اترنے اور نقل و حرکت کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو کسی چیز پر لکھا جائے اور اس چیز کو منتقل کیا جائے جیسے کہ ہم کوئی بات خط میں لکھ کر بھیج دیں تو وہ بذریعہ اس کاغذ کے منتقل ہوئی اس طرح پہلی کتابوں کا نزول ہوا تھا یا کسی آدمی سے کوئی بات کہلا کے بھیج دی جائے اس صورت میں حرکت کرنے والا وہ آدمی ہوگا اور وہ کلام اس کے ذریعے سے حرکت کرے گا اور یا بغیر کسی واسطے کے سننے والے سے گفتگو کر لی جائے قرآن کریم کا نزول ان پچھلے دو طریقوں سے ہوا یعنی جبریل امین آتے تھے اور آ کر سناتے تھے۔ یہ نزول بذریعہ قاصد ہوا اور قرآن کریم کی بعض آیتیں معراج میں بھی بغیر واسطہ جبریل امین عطا فرمائی گئیں جیسا کہ مشکوۃ شریف باب المعراج میں ہے کہ سورۃ بقرہ کی آخری آیتیں حضور علیہ السلام کو معراج میں عطا فرمائی گئی لہٰذا قرآن پاک کا نزول دوسری آسمانی کتابوں کے نزول سے زیادہ شاندار ہے کہ وہ لکھی ہوئی آئیں۔ یہ بولا ہوا آیا اور لکھنے اور بولنے میں بڑا فرق ہے۔ کیونکہ بولنے کی صورت میں بولنے کے طریقے سے اتنے معنی بن جاتے ہیں کہ جو لکھنے سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ مثلاً ایک شخص نے ہم کو لکھ کر دیا کہ تم دہلی جاؤ گے ہم لکھی ہوئی عبارت سے ایک ہی مطلب حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن اس جملے کو اگر وہ بولے تو پانچ چھ طریقے سے بول کر اس میں وہ پانچ چھ معنی پیدا کر سکتا ہے ایسے لہجوں سے بول سکتا ہے کہ جس سے سوال، حکم، تعجب، تمسخر وغیرہ کے معنی پیدا ہو جائیں۔ مجھ سے ایک شخص نے کہا تھا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تاروں کے بارے میں فرمایا **ھذا ربی** یہ میرا رب ہے اور یہ شرک ہے۔ انبیائے کرام شرک سے معصوم ہوتے ہیں پھر آپ نے یہ کیوں فرمایا۔ میں نے ان سے کہا کہ ہم کو یہ جملہ لکھا ہوا ملا۔ اس سے ہم ان کی مراد کے سمجھنے میں غلطی کر سکتے ہیں ممکن ہے کہ انہوں نے اس کو اس طرح بولا ہو کہ جس سے انکار یا سوال کے معنی پیدا ہو گئے ہوں تو حقیقت میں یہ کلام ان چیزوں کی ربوبیت کے انکار کیلئے ہوا غرضیکہ بولنے اور لکھنے میں بڑا فرق ہے۔ **(فائدہ)** کوئی انسان قرآن کریم کو صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرح نہیں جان سکتا اس کی چند وجہیں ہیں۔ ان میں سے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم نے قرآن کریم جبریل امین کی زبان سے نہ سنا۔ لہٰذا ادا کرنے میں جو اسرار و نکات حاصل ہوئے (ہوں گے) ان تک ہمارا دماغ کیسے پہنچ سکتا ہے۔

قرآن پاک کا نزول کتنی بار ہوا

قرآن کریم کا نزول چند طریقے سے اور چند بار ہوا ہے۔ اولاً لوح محفوظ سے پہلے آسمان کی طرف نزول ہوا کہ یکبارگی ماہ رمضان کی شب قدر میں ہوا۔ اس کے متعلق قرآن کریم فرماتا ہے۔ **شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ** (البقرہ:۱۸۵) اور **اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ** (القدر:۱) پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تقریباً تیئس سال کے عرصہ میں تھوڑا تھوڑا بقدر ضرورت آتا رہا اور احادیث سے ثابت ہے کہ رمضان میں حضرت جبریل امین حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر سارا قرآن سنایا کرتے تھے اور بعض بعض آیتیں دو دو بار بھی نازل ہوئی ہیں جیسے سورۃ فاتحہ وغیرہ خلاصہ یہ ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن کا نزول کئی طریقے سے ہوا لیکن احکام اس نزول سے جاری فرمائے جاتے تھے جو بذریعہ جبریل امین تھوڑا تھوڑا آتا تھا ہماری اس تقریر سے ایک بڑا اعتراض بھی اٹھ گیا وہ یہ کہ حق تعالیٰ نے قرآن کریم کے بارے میں کہیں نَزَّلْنَا فرمایا اور کہیں اَنْزَلْنَا اور نَزَّلْنَا کا معنی ہے آہستہ آہستہ ہم نے اتارا اَنْزَلْنَا کا معنی ہے یکبارگی اتار دیا ان دونوں آیتوں کی مطابقت کیسے کی جائے **جواب** معلوم ہو گیا کہ چند بار نزول ہوا ہے۔ اور ان آیتوں نے الگ الگ نزولوں کو بیان فرمایا ہے نزول قرآن اور دیگر آسمانی کتب کے نزول میں تین طرح فرق ہے ایک یہ کہ وہ کتب لکھی ہوئی آئیں قرآن پڑھا ہوا یعنی وہ سب تحریری، قرآن تقریری۔ دوسرے یہ کہ وہ سب ان پیغمبروں کو خاص جگہ بلا کر دی گئیں مگر قرآنی آیات عرب کے گلی کوچوں بلکہ حضور کے بستر شریف میں آئیں تاکہ حجاز کا ہر ذرہ عظمت والا ہو جائے کہ وہ قرآن کا جائے نزول ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ کتب یکبارگی اتریں قرآن کریم ۲۳ سال میں تاکہ حضور سے ہمیشہ اللہ تعالیٰ کی ہمکلامی رہے اور مسلمانوں کو عمل آسان ہو کیونکہ یکدم سارے احکام پر عمل مشکل ہوتا ہے۔ دیکھو بنی اسرائیل ایک دم تورات ملنے سے گھبرا گئے اور بولے۔ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا (بقرہ: ۹۳)۔

قرآن کا نزول حضور علیہ السلام پر کیوں ہوا

بندوں کیلئے ضروری ہے کہ حق تعالیٰ کے احکام کو مانیں لیکن یہ ماننا جب ہی ضروری ہو گا جب کہ وہ احکام نبی کی پاک زبان سے ادا ہوں حق تعالیٰ تو بلا واسطہ کسی غیر نبی سے کلام نہیں فرماتا۔ اگر جبریل انسانی شکل میں آ کر لوگوں کو احکام سنا جاتے تو بھی ان پر عمل کرنا ضروری نہ ہوتا اسی طرح کوئی غیر نبی خواب یا الہام یا غیبی آواز سے کسی حکم پر مطلع ہو جائے تو اس کا ماننا شرعاً لازم نہ ہو گا مشکوٰۃ شریف کے شروع میں ہے کہ ایک بار حضرت جبریل امین شکل انسانی میں سائل بن کر حضور پاک کی خدمت میں حاضر ہوئے اور حضور سے دریافت کیا کہ ایمان کیا ہے، اسلام کیا ہے احسان کیا ہے۔ حضور نے جواب دیئے جب وہ دریافت کر کے چلے گئے تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا یہ جبریل امین تھے اور تم کو تمہاری دینی باتیں سکھانے آئے تھے۔ دیکھو اس موقع پر حضرت جبریل امین نے خود ہی نہ کہہ دیا کہ اے صاحبو! میں جبریل ہوں اور تم کو فلاں فلاں بات کا حکم کرتا ہوں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ میری اطاعت ان حضرات پر واجب نہ ہو گی۔ اس لئے حضور علیہ السلام کی زبان پاک سے وہ کلمات لوگوں کو سنوائے۔ اماموں کا قیاس بھی حق تعالیٰ کے فرمان یا حضور کے ارشاد پر مبنی ہوتا ہے۔ ہمارے اس کلام سے نتیجہ یہ نکلا کہ ع

اصل الاصول بندگی اس تاجور کی ہے!

کہ نبی کی ہی اطاعت درحقیقت حق تعالیٰ کی اطاعت ہے **(فائدہ)** پیغمبر کا خواب اور ان کا الہام وغیرہ بھی وحی کی طرح قابل اطاعت ہوتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب میں دیکھا تھا کہ اپنے فرزند کو ذبح کر دو حالانکہ بے قصور آدمی کو

قتل کرنا شریعت کے خلاف تھا لیکن آپ کے اس خواب نے اس حکم شرعی کو آپ کے حق سے منسوخ کر دیا آج اگر کوئی مسلمان یہ خواب دیکھے تو وہ محض اپنے خواب پر ایسے کام کی جرأت نہیں کر سکتا کیونکہ یہ خلاف شریعت ہے **نکتہ** یہ بھی یاد رہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نہ تو نبی ہیں نہ نبیوں کے استاذ بلکہ رب تعالیٰ اور پیغمبروں کے درمیان پیغام پہنچانے والے قاصد ہیں اور انبیاء کرام کے خادم۔ نبی، حکومت الٰہیہ کے اختیارات والے حکام ہیں حضرت جبریل امین ایسے نہیں۔ بلاشبہ یوں سمجھو کہ ایک ضلع کا افسر ہے اور ایک محکمہ ڈاک کا قاصد۔ بادشاہ کے یہاں سے احکام ڈاک کے ذریعے سے حاکم کے پاس آتے ہیں تو ڈاک کا لانے والا حاکم نہیں حاکم وہی ہے جس کے پاس یہ احکام آئے اور جوان پر رعایا سے عمل کرائے گا۔

قرآن اور حدیث کا فرق

قرآن اور حدیث دونوں ہی وحی الٰہی ہیں۔ دونوں کی اطاعت ضروری ہے۔ فرق اتنا ہے کہ قرآن کریم کی عبارت خدا کی طرف سے ہے اور مضمون بھی۔ گویا جس طرح حضرت جبریل امین نے آکر سنایا اسی طرح بلا کسی فرق کے حضور علیہ السلام نے بیان فرمادیا حدیث میں یہ ہے کہ مضمون رب کی طرف سے ہوتا ہے اور الفاظ حضور علیہ السلام کے اپنے ہوتے ہیں اب اس مضمون کا رب کی طرف سے آنا یا بطور الہام ہوتا ہے یا فرشتہ ہی عرض کرتا ہے لیکن اس کی ادا حضور علیہ السلام کے اپنے الفاظ سے ہوتی ہے اسی لئے اس کا ماننا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہے لیکن اس کی تلاوت نماز میں بجائے قرآن شریف کے نہیں ہو سکتی کیونکہ عمل مضمون پر ہوتا ہے اور تلاوت الفاظ کی ہوتی ہے اور اسی وجہ سے قرآن پاک کے احکام حدیث سے منسوخ ہو سکتے ہیں ہم اس کی پوری بحث انشاء اللہ تعالیٰ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا (البقرہ:۱۰۶) میں کریں گے دیکھو غیر اللہ کو سجدہ تعظیمی کرنا قرآن شریف سے ثابت ہے مگر حدیث نے اس کو منسوخ کیا وغیرہ وغیرہ اسی لئے قرآن پاک فرماتا ہے وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ یعنی ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کو قرآن شریف اور حکمت سکھاتے ہیں۔ اگر حدیث شریف ماننے کی ضرورت نہ ہوتی تو حکمت کا ذکر نہ فرمایا جاتا فقط کتاب کا ذکر ہی کافی تھا حدیث ماننے کا یہ مطلب نہیں کہ قرآن ناقص ہے قرآن پاک بالکل مکمل کتاب ہے لیکن اس مکمل میں سے مضامین حاصل کرنے کیلئے مکمل ہی انسان کی ضرورت تھی۔ اور وہ نبی ہیں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمندر میں موتی ضرور ہیں لیکن ان کے حاصل کرنے کیلئے کسی غواص (غوطہ خور) کی ضرورت ہے اگر قرآن پاک سے مسائل ہر شخص نکال لیا کرتا تو اس کے سکھانے کیلئے پیغمبر کیوں بھیجے جاتے۔ اس کی پوری بحث انشاء اللہ آئندہ ہوگی اور جس طرح کہ قرآن شریف ہوتے ہوئے حدیث پاک کے ماننے کی ضرورت ہے اور حدیث کے ماننے سے قرآن کا ناقص ہونا لازم نہیں آتا اسی طرح حدیث وقرآن کے ہوتے ہوئے ہم جیسوں کو فقہ کے ماننے کی بھی ضرورت ہے اور فقہ ماننے سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن وحدیث ناقص ہوں۔ اسی لئے قرآن کریم نے عام حکم فرمادیا کہ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ (النساء:۵۹) یعنی اطاعت کرو اللہ کی اور اللہ کے رسول علیہ السلام کی اور اپنے میں امر والوں (علماء مجتہدین) کی یہ بھی خیال رہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر قول و فعل جو منقول ہو جائے

وہ حدیث ہے خواہ ہمارے لئے لائق عمل ہو یا نہیں مگر سنت صرف ان اقوال و اعمال کو کہا جاتا ہے جو ہمارے لئے لائق عمل ہوں۔ اسی لئے حضور نے فرمایا عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ تم پر میری سنت لازم ہے یہ نہ فرمایا عَلَيْكُمْ بِحَدِيْثِيْ لہٰذا دنیا میں کوئی شخص اہل حدیث نہیں ہوسکتا کیونکہ تمام حدیثوں پر عمل ناممکن ہاں اہلسنت ہوسکتا ہے یعنی تمام سنتوں پر عمل۔

تیسری فصل، قرآن پاک کی ترتیب اور اس کا جمع ہونا

پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ قرآن پاک لوح محفوظ میں لکھا ہوا تھا قرآن کریم فرماتا ہے، قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ ﴿۲۱﴾ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ ﴿۲۲﴾ (البروج: ۲۲)، پھر وہاں سے پہلے آسمان پر لایا گیا پھر وہاں سے تیئس سال میں آہستہ آہستہ حضور علیہ السلام پر نازل ہوتا رہا مگر یہ نازل ہونا اس لکھے ہوئے کی ترتیب کے موافق نہ تھا کیونکہ یہ نزول بندوں کی ضرورت کے مطابق ہوتا تھا جس آیت کی ضرورت ہوئی وہی آگئی مثلاً اگر اول ہی سے شراب کے حرام ہونے کی آیتیں اتر آتیں تو یقیناً عرب کے نئے مسلمانوں کو دشواری واقع ہوتی کیونکہ وہاں عام طور پر شراب پی جاتی تھی اسی طرح سارے احکام کو سمجھ لو لیکن چونکہ حضور علیہ السلام کی نگاہ پاک لوح محفوظ وغیرہ پر تھی اس لئے آپ ہر آیت کے نزول کے وقت اس کو ترتیب سے جمع کرا دیتے تھے اس طرح کہ جو حضرات کاتب وحی مقرر تھے ان کو فرما دیتے تھے کہ یہ آیت فلاں سورت میں فلاں آیت کے بعد رکھو اور یہ ترتیب لوح محفوظ کی ترتیب کے موافق تھی اور طریقہ اس وقت یہ تھا کہ حضرت زید بن ثابت و دیگر بعض صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اس خدمت کو انجام دینے کیلئے مقرر تھے۔

جس وقت جو آیت اترتی حضور علیہ السلام کے حکم کے مطابق اونٹ کی ہڈیوں پر کھجور کے پٹھوں پر اور مختلف کاغذوں پر لکھ لیتے تھے اور یہ چیزیں متفرق طور پر لوگوں کے پاس رہیں لیکن ان حضرات کو زیادہ اعتماد حفظ پر تھا یعنی عام صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پورے قرآن کے حافظ تھے جیسا کہ آج حافظ ہیں بلکہ اس سے زیادہ تو یوں سمجھو کہ قرآن پاک کی ترتیب خود حضور علیہ السلام نے دی تھی لیکن ایک جگہ کتابی شکل میں جمع نہ فرمایا تھا۔ اس کی تین وجہیں تھی۔ ایک تو یہ کہ چونکہ صدہا حافظ اس کو اسی ترتیب سے یاد کر چکے تھے جو آج تک چلی آرہی ہے اور نماز میں پڑھنا فرض تھا۔ اور نماز کے علاوہ بھی صحابہ کرام برکت کیلئے اس کو اکثر اوقات پڑھتے ہی رہتے تھے اس لئے اس کے ضائع ہونے کا کچھ اندیشہ نہ تھا اور دوسرے یہ کہ جہاد اور دیگر ضروریات کی وجہ سے اتنا موقعہ نہ مل سکا کہ اس کو ایک جگہ جمع کیا جاتا اور تیسرے یہ کہ جب تک کہ پورا قرآن پاک نہ آجاتا اس کو جمع کرنا غیر ممکن تھا کیونکہ ہر سورت کی کچھ آیات اتر چکی تھیں کچھ اترنے والی ہوتی تھیں حضور کی وفات سے کچھ روز پہلے نزول قرآن کی تکمیل ہوئی غرضیکہ حضور علیہ السلام کی زندگی پاک میں قرآن کریم کتابی شکل میں ایک جگہ جمع نہ ہوسکا البتہ مرتب ہو گیا اللہ کی شان کہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے زمانے میں یعنی حضور علیہ السلام کی وفات ہی کے سال ملک یمامہ کے جھوٹے مدعی نبوت مسیلمہ کذاب اور اس کے ساتھیوں سے صحابہ کرام کو سخت جنگ کرنی پڑی اور اس جنگ میں تقریباً سات سو حافظ قرآن بھی شہید ہو گئے تب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بارگاہ صدیقی میں حاضر ہوئے اور عرض

کیا کہ اگر اس طرح حافظ اور قراء شہید ہوتے رہے تو بہت جلد قرآن پاک ضائع ہو جائے گا حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جمع فرمایا جنہوں نے حضور علیہ السلام کے زمانہ پاک میں وحی لکھنے کی خدمت انجام دی تھی اور اس کا مہتمم حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو قرار دیا کہ تم تمام جگہ سے قرآن پاک کی آیات جمع کر کے کتابی شکل میں تیار کرو زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یہ کام اچھا ہے

نوٹ: اس سے بدعت حسنہ کا ثبوت ہوا حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نہایت محنت اور جانفشانی سے ان تمام آیتوں کو یکجا جمع کیا جو کہ لوگوں کے سینوں اور کھجور کے پٹھوں اور ہڈیوں میں لکھی ہوئی تھیں اور ترتیب وہی رہی جو حضور علیہ السلام نے فرمائی تھی۔ یہ قرآن کا نسخہ صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حیات میں ان کے پاس رہا پھر حضرت فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس رہا پھر ان کے بعد فاروق اعظم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بیٹی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پاک بیوی حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس محفوظ رہا۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خلافت کے زمانہ میں حذیفہ بن یمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو کہ آرمینیہ اور آذربائیجان کے کفار سے جنگ فرما رہے تھے وہاں کی مہم سے فارغ ہو کر حاضر دربار ہوئے اور عرض کیا کہ "اے امیر المومنین لوگوں میں قرآن پاک کے متعلق اختلاف شروع ہو گئے ہیں اگر یہ اختلاف بڑھتے رہے تو مسلمانوں کا حال یہود و نصاریٰ کی طرح ہو جائے گا لہٰذا اس کا جلد کوئی انتظام کیجئے وجہ اختلاف یہ تھی کہ بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے نسخوں میں حضور علیہ السلام کے وہ الفاظ بھی لکھے تھے جو آپ نے بطور تفسیر ارشاد فرمائے تھے اور وہ حضرات اس کو قرآن ہی کا جز و سمجھ گئے تھے حالانکہ وہ الفاظ قرآن نہ تھے جیسے کہ مصحف ابن مسعود رضی اللہ عنہ وغیرہ نیز ایک نسخہ تمام ملک کے مسلمانوں کیلئے اب کافی نہ تھا نیز حافظ صحابہ کرام کو جو لقمہ قرآن مجید میں لگتا تھا اس کے نکالنے میں بہت دشواری ہوتی تھی۔ ان وجوہ کی بناء پر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پھر زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم فرمایا اور ان کی مدد کیلئے عبد اللہ ابن زبیر اور سعید ابن عاص اور عبد اللہ ابن حارث ابن ہشام کو مقرر کیا۔ ان حضرات نے حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس سے پہلے جمع کئے ہوئے قرآن کو منگایا اور پھر اس کا مقابلہ حفاظ کے حفظ قرآن سے نہایت تحقیق سے کر کے چھ یا سات نسخے نقل کئے اور یہ نسخے عراق، شام، مصر وغیرہ اسلامی ممالک میں بھیج دیئے اور اصل نسخہ حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو واپس کر دیا اور جن صحابہ کرام کے تفسیر سے ملے ہوئے قرآن کے نسخے تھے اور وہ اس کو قرآن پاک ہی سمجھ بیٹھے تھے ان کو منگوا کر جلوا دیا گیا کیونکہ ان نسخوں کا باقی رہنا آئندہ بڑے فتنوں کا دروازہ کھول دیتا کہ آئندہ لوگ اس کو قرآن پاک ہی سمجھ بیٹھتے۔ الحمد للہ اب تک قرآن پاک اسی طرح بلاکم و کاست مسلمانوں میں چلا آ رہا ہے ناظرین ہماری اس تقریر سے سمجھ گئے ہوں گے کہ قرآن پاک کی ترتیب نزول قرآن کے مطابق ہو سکتی ہی نہیں تھی کیونکہ موجودہ ترتیب لوح محفوظ کی ترتیب کے مطابق ہے اور قرآن پاک کا نزول ضرورت کے مطابق ہوا اور یہ بھی سمجھ گئے ہوں گے کہ قرآن پاک کو ترتیب دینے والے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں لیکن اس کو کتابی شکل میں ترتیب دینے والے اولاً صدیق اکبر اور دوسرے عثمان غنی ہیں رضی اللہ عنہم اجمعین اس لئے آپ کا لقب ہے عثمان جامع قرآن۔ **نکتہ:** صلح حدیبیہ کے موقع پر جب کہ صحابہ کرام نے حضور علیہ السلام کے ہاتھ

پر بیعت کی جس بیعت کا نام بیعت الرضوان ہے اس میں حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ موجود نہ تھے کیونکہ ان کو حضور کی طرف سے مکہ معظمہ بھیجا گیا تھا تو حضور علیہ السلام نے اپنے بائیں ہاتھ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ یہ عثمان کا ہاتھ ہے اور خود ان کی طرف سے بیعت فرمائی۔ ع

خود کوزہ وخود کوزہ گر وخود گل کوزہ!

تو حضور علیہ السلام کا ہاتھ گویا عثمان غنی کا ہاتھ ہوا اور حق تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کے ہاتھ کو اپنا ہاتھ فرمایا یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (الفتح:۱۰) تو گویا اس واسطے سے عثمان غنی کا ہاتھ اللہ کا ہاتھ ہے اور قرآن کریم اللہ کا کلام۔ تو یوں کلام اللہ، ید اللہ نے جمع فرمایا۔ اس لئے عثمان غنی کو جمع قرآن کیلئے منتخب فرمایا گیا۔ (نوٹ ضروری) قرآن پاک کی تقسیم اس زمانہ پاک میں دو طریقے سے ہو چکی تھی۔ ایک سورتوں سے، دوسری منزلوں سے یعنی قرآن پاک کی سات منزلیں کی گئی تھیں کہ تلاوت کرنے والا ایک منزل روزانہ کے حساب سے ختم کر سکے سات دن میں، ان منزلوں کو فمی بشوق میں جمع کیا گیا ہے یعنی پہلی منزل سورۃ فاتحہ سے شروع ہوتی ہے دوسری مائدہ سے تیسری سورۃ یونس سے چوتھی سورۃ بنی اسرائیل سے، پانچویں سورۃ شعراء سے چھٹی سورۃ والصفت سے اور ساتویں سورۃ ق سے پھر اس کے بعد قرآن پاک کے تیس حصے برابر کئے گئے جس کا نام رکھا گیا تیس سیپارے تا کہ تلاوت کرنے والا ایک سیپارہ روز کے حساب سے ایک مہینہ میں قرآن پاک ختم کر سکے پھر قرآن میں زیر وزبر نہ ہونے کی وجہ سے اس کی تلاوت کرنے میں سخت دشواری محسوس ہوتی تھی کیونکہ غیر عربی لوگ تو پڑھ ہی نہ سکتے تھے اور عربی حضرات بھی بعض بعض موقعوں پر دشواری محسوس کرتے تھے لہٰذا اس میں زیر وزبر لگائے گئے اور نون قطنی وغیرہ ظاہر کئے گئے مشہور یہ ہے کہ یہ کام حجاج بن یوسف نے کیا۔ اسی حجاج بن یوسف نے سورتوں کے نام قرآن میں لکھے۔ اس سے پہلے یہ نام قرآن میں نہ لکھے تھے (تفسیر خزائن العرفان) پھر اس ضمن میں تفسیر روح البیان آخر سورۃ حجرات میں ہے کہ مصحف عثمانی میں نہ نقطے تھے نہ اعراب نہ رکوع نہ سیپارے نقطے لگانے والے اعراب لگانے والے ابو اسود دُئلی تابعی ہیں جنہوں نے حجاج بن یوسف کے حکم سے یہ کام کیا۔ پھر خلیل ابن احمد فراعیدی نے مد اور وقف وغیرہ کی علامات قرآن میں لگائیں اور یعرب ابن قحطان نے قرآن کو عربی خط یعنی نسخ میں لکھا بعض لوگوں نے کہا ہے کہ قرآن کے تیس پارے ہیں اور اس میں نصف، ربع، ثلث کے نشانات مامون عباسی کے زمانے میں لگائے گئے رکوع بنائے گئے یعنی حضرت عثمان غنی رمضان شریف کی تراویح کی نماز میں جس قدر قرآن پاک پڑھ کر رکوع فرماتے تھے۔ اتنے حصے کو رکوع قرار دیا گیا اس لئے اس کے نشان پر قرآن مجید کے حاشئے پر ع لگا دیتے ہیں بعض کہتے ہیں یہ عمرو کے نام کا عین ہے بعض کہتے ہیں کہ عثمان کے نام کا عین لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ لفظ رکوع کا عین ہے تو حقیقت میں یہ تمام کام تلاوت کرنے والے کی آسانی کیلئے کئے گئے۔ **لطیفہ:** اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تراویح بیس رکعت ہونی چاہئے نہ کہ آٹھ رکعت اس لئے کہ حضرت عثمان روزانہ بیس رکعت تراویح پڑھتے تھے اور ہر رکعت میں قرآن پاک کا ایک رکوع پڑھتے اور ستائیسویں رمضان المبارک ختم قرآن پاک فرماتے اس حساب سے کل پانچ سو چالیس رکوع بنتے ہیں اور کل رکوع قرآن پاک کے پانچ سو چھپن ہیں چونکہ بعض سورتیں بہت چھوٹی ہیں اس لئے بعض

رکعتوں میں دو سورتیں پڑھ لی جاتی ہیں اگر تراویح آٹھ رکعت ہوتی جیسے وہابی کہتے ہیں تو قرآن پاک کے رکوع دو سو سولہ ہونے چاہئے تھے اس کی مزید تحقیق کیلئے ہماری کتاب لمعات المصابیح علی رکعات التراویح دیکھو۔ سورتوں کی ترتیب کے بارے میں اختلاف ہے بعض فرماتے ہیں کہ ان کو بھی آیتوں کی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہی ترتیب دیا تھا اور بعض فرماتے ہیں کہ نہیں بلکہ صحابہ کرام کے اجتہاد سے یہ ترتیب ہوئی لیکن تفسیر عزیزی نے یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت سی سورتوں کی ترتیب اشارۃً خود ہی فرمادی تھی جیسے کہ سات طویل سورتیں اور حم والی اور مفصل کی سورتیں ان کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نمازوں یا اپنے وظیفوں میں ترتیب وار پڑھ کر بتلا دیا تھا اور بعض سورتوں کی ترتیب حضور کے بعد صحابہ کرام اجتہاد سے مضامین کی مناسبت سے واقع ہوئی جیسے کہ کسی بڑے شاعر کے کلام کو ہم ترتیب دیں تو اس کو ردیف کے حرفوں کے مطابق اس طرح ترتیب دیتے ہیں کہ بڑی بڑی غزلیں اور قصیدے پہلے اور مثنوی اس کے بعد اور قطعے اور رباعیاں اس کے بعد تو ترتیب میں کلام کی موزونیت کا لحاظ رکھا جاتا ہے نہ کہ اس نے یہ کلام کب کہا اسی لئے مدنی بڑی بڑی سورتیں قرآن پاک میں اول ہیں اور مکی سورتیں بعد میں۔

چوتھی فصل، قرآن پاک کی حفاظت

قرآن پاک سے پہلی کتابیں مثلاً توارات، انجیل وزبور وغیرہ ایک خاص وقت تک کیلئے اور خاص خاص قوموں کیلئے دنیا میں بھیجی گئیں اس لئے حق تعالیٰ نے ان کی حفاظت کا ذمہ خود نہ لیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پیغمبران عظام کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد وہ کتابیں بھی قریب قریب ختم ہو گئیں لیکن یہ قرآن کریم سارے جہاں کیلئے آیا اور ہمیشہ کیلئے آیا اس لئے رب تعالیٰ نے خود اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا تھا چنانچہ ارشاد فرمایا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر:۹) ہم نے ذکر (قرآن) اتارا ہے اور ہم اس کے محافظ ہیں اور سبحان اللہ! ایسی اس کی حفاظت ہوئی کہ کوئی شخص اس میں زیر اور زبر کا فرق نہ کرسکا۔ اس کی حفاظت کا ذریعہ یہ ہوا کہ قرآن کریم فقط کاغذ پر ہی نہ رہا بلکہ مسلمانوں کے سینوں میں محفوظ کیا گیا صحابہ کرام کے زمانہ کی حالت تو ہم سنی سنائی بیان کرسکتے ہیں لیکن اس زمانے میں تو مشاہدہ ہو رہا ہے کہ اگر کسی چھوٹے سے گاؤں میں بھی کسی مجمع کے سامنے کوئی تلاوت کرنے والا ایک زبر زیر کی غلطی کردے تو ہر چہار طرف سے آوازیں آتی ہیں آپ نے غلط پڑھا اس طرح پڑھو۔ اور ہر زمانے ہر جگہ ایک دو نہیں بلکہ صدہا حافظ پیدا ہوتے رہے اس کی مثال یوں سمجھو کہ جب بچہ سکول میں قدم رکھتا ہے تو چونکہ اسے ابھی کتاب سنبھالنے کی لیاقت نہیں ہوتی لہٰذا اس کے استاد چھوٹے چھوٹے قاعدے اور کتابیں اس کو خرید کر دیتے ہیں وہ بچہ کتابیں پڑھتا بھی جاتا ہے اور ضائع بھی کرتا جاتا ہے جب کسی قدر ہوش سنبھالتا ہے تو اب کتابیں پھاڑتا تو نہیں لیکن ان پر لکھ لکھ کر خراب کرتا رہتا ہے پھر جب خوب سمجھدار ہو جاتا ہے اور کتاب کی قدر و قیمت پہچانتا ہے تو اب کتاب کو جان سے بھی زیادہ عزیز سمجھتا ہے اسی طرح دنیا سب سے پہلے خدائی کتابوں اور صحیفوں کو سنبھال نہ سکی تو ان کو برباد کر ڈالا پھر توارات وانجیل کو بالکل تو نہ مٹایا مگر اپنی طرف سے بہت کچھ اس میں غلط ملط کردیا دنیا کے اخیر دور میں قرآن

کریم تشریف لایا اور قدرت نے اس کو سنبھالنے کا طریقہ سکھایا تورات وانجیل کسی زمانے میں بگڑی بگڑائی پائی جاتی ہوں گی لیکن اب تو صفحہ ہستی سے تقریباً بالکل ناپید ہوگئیں یہ جو پیسے پیسے کی یوحنا اور متی رسول کی انجیلیں فروخت ہورہی ہیں یہ وہ انجیل نہیں جو آسمان سے آئی تھی بلکہ اس کے ترجمے ہوں گے کیونکہ وہ عبرانی زبان میں تھیں اور یہ ترجمے مختلف زبانوں میں ہیں جب وہ اصل کتاب ہمارے سامنے ہے ہی نہیں تو ہم کیسے معلوم کریں کہ یہ ترجمے اس کے صحیح ہیں یا نہیں بخلاف قرآن کریم کے کہ وہی قرآن اسی زبان میں بعینہ موجود ہے۔ جو صاحب قرآن علیہ السلام پر اترا تھا وہ کتابیں تو کیا باقی رہتیں، زبان عبرانی جس میں وہ کتابیں آئیں تھیں وہ ہی دنیا سے غائب ہوگئیں۔ بلکہ مصر اور شام وغیرہ ممالک جہاں عبرانی زبان بولی جاتی تھیں وہاں عربی زبان نے اپنا سکہ جمالیا اور اس قرآن پاک کی بدولت ہر ملک میں عربی زبان کا دور دورہ ہوگیا چنانچہ الحمد للہ، ہندوستان میں بھی لاکھوں کی تعداد میں عربی دان موجود ہیں لیکن عبرانی جاننے والا ایک بھی نہیں ہے حتی کہ مشن اسکولوں میں انجیل تو پڑھائی جاتی ہے مگر افسوس کہ عبرانی اور سریانی زبانیں وہاں بھی غائب ہیں یہ سب قرآن پاک اور صاحب لولاک کی برکت ہے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حیرت یہ ہے کہ قرآن پاک کے الفاظ محفوظ، اس کے پڑھنے کے طریقے، یعنی قرات (تجوید) محفوظ کہ س، ص، ت، ط، ک، ق، د، ذ، ض، ظ، مد، شد وغیرہ کس طرح ادا کئے جائیں طریقہ تحریر بھی محفوظ ہے یعنی جس طرح کہ صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تحریر منقول ہے اس کے خلاف قرآن پاک نہیں لکھ سکتے بسم اللہ کا سین لمبا اور میم گول لکھا جاتا ہے کہ کسی قرآن پاک میں سین چھوٹا کر کے نہ لکھا جائے بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ (حجرات:۱۱) لکھنے میں الاسم آتا ہے جیسا کلمات نحوی میں الاسم آتا ہے علماء فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کو عربی خط میں لکھا جائے، اردو خط یا نستعلیق میں نہ لکھا جائے، بعض بعض کلمات نحوی قاعدے کے خلاف معلوم ہوتے ہیں لیکن وہ پڑھے ویسے ہی جاتے ہیں جیسے کہ ثابت ہو چکے۔ مثلاً عَلَيْهُ اللّٰهَ (فتح:۱۰)، وَمَآ اَنْسٰنِيْهُ (کہف:۶۳)، لَنَسْفَعًا (علق:۱۵) وغیرہ ان چیزوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ سبحان اللہ! قرآن پاک ایسا محفوظ ہے کہ اس کے صفحات تک محفوظ اگر کوئی منصف ان باتوں کو بنظر انصاف دیکھے تو قرآن پاک کے قبول کرنے میں تامل نہ کرے ان خوبیوں کو دیکھ کر بعض پادریوں کے منہ میں پانی بھر آیا اولاً تو اس کوشش میں رہے کہ انجیل شریف کو محفوظ کتاب ثابت کرسکیں مگر نہ کر سکے بلکہ بہت سے محققین عیسائیوں نے مان لیا کہ انجیل شریف میں لفظی اور معنوی بیشمار تحریفیں ہوئیں اور مان لیا کہ انجیل کی بہت سی آیتیں اور بہت سے باب الحاقی ہیں دیکھو مسٹر ہارن اور ہنری اور اسکاٹ صاحب کی تفاسیر اور دیکھو مباحثہ دینی مطبوعہ اکبر آباد مصنفہ پادری فنڈر وغیرہ بعض عیسائی پادریوں نے یہ کوشش کی کہ قرآن پاک کو محرف ثابت کریں۔ چنانچہ عبدالمسیح اور ماسٹر رام چند اور پادری عمادالدین نے اس بارے میں رسالے لکھ ڈالے یہ لوگ جس قدر اعتراض کر سکتے ہیں ہم ان کو علیحدہ علیحدہ سوال جواب کی شکل میں بیان کرتے ہیں تا کہ مسلمان ان سے واقف ہوں۔

(۱) **سوال:** حضرت عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جب قرآن کا نسخہ تیار کیا تو پچھلے نسخوں کو جلوا دیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرآن وہ نہیں ہے جو آسمان سے آیا تھا بلکہ وہ جلایا جا چکا۔ **جواب:** اس کا جواب دوسری فصل میں نہایت تفصیل

سے گزر چکا کہ ان نسخوں کو جلوانا اختلاف کو مٹانے کیلئے تھا کیونکہ ان میں قرآن اور تفسیری عبارات مخلوط تھیں۔ آیات کو لے لیا گیا اگر وہ نسخے باقی رہتے تو آئندہ بڑا اختلاف پیدا ہو جاتا اس تفصیل کو پڑھنے کے بعد معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ اعتراض محض لغو اور دھوکہ دینے کیلئے ہے۔

(۲) سوال: تفسیر اتقان اور بخاری شریف جلد دوم باب جمع قرآن میں ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ (التوبہ:۱۲۸) والی آیت تمام جگہ تلاش کی مگر کہیں نہ ملی بجز ابوخزیمہ انصاری کے کہ ان کے پاس یہ لکھی ہوئی موجود تھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اور آیتیں بھی اس طرح گم ہو گئی ہوں گی نیز حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے مروی ہے کہ ایک آیت لکھی ہوئی ہمارے پاس موجود تھی جسے بکری کھا گئی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اور آیتیں بھی اس طرح برباد ہو گئی ہوں گی۔ **جواب:** اگر ایسی ایسی دو چار سو روایتیں بھی جمع کر لی جائیں اور وہ روایتیں قابل قبول بھی ہوں اور کوئی بکری پورا قرآن بھی کھا گئی ہو تب بھی اصل قرآن کا ایک لفظ بھی ضائع نہیں ہو سکتا یہ تو جب ہوتا جب قرآن پاک کا دارومدار توراۃ وانجیل کی طرح فقط دو چار نسخوں پر ہوتا یہ تو مسلمانوں کے سینوں میں موجود تھا کاغذ کو بکری اور گائے بھینس کھا سکتی ہے حافظ کے سینے کو تو قبر کی مٹی بھی نہیں کھاتی اسے کون کھائے گا جناب وہ صحابہ کرام کا زمانہ تھا اگر آج بھی دنیا سے قرآن پاک کے سارے نسخے ناپید کر دیئے جائیں تو ہندوستان کے کسی معمولی گاؤں کا ایک چھوٹا حافظ بچہ بھی قرآن پاک بعینہ لکھوا سکتا ہے۔

(۳) سوال: مسلمان خود مانتے ہیں کہ قرآن پاک کی بہت سی آیتیں منسوخ ہیں کہ سورۃ یاسین سورۃ بقرہ کے برابر تھی لیکن نسخ وغیرہ ہو کر کٹ کٹا کر اتنی باقی رہی معلوم ہوا کہ یہ قرآن بعینہ وہ نہیں ہے جو کہ آسمان سے آیا تھا بلکہ اس میں بہت سی تبدیلی ہو چکی ہے۔ **جواب:** تحریف کے معنی یہ ہیں کہ کتاب والے کی غیر موجودگی میں اس کے بغیر مرضی اس کی کتاب میں کمی یا زیادتی کر دی جائے لیکن اگر صاحب کتاب ہی اپنی مرضی سے اپنی کتاب میں کچھ کمی بیشی کرے تو اس کو کوئی بیوقوف بھی تحریف نہ کہے گا ایک طبیب نسخہ لکھتا ہے بیمار اپنی طرف سے اس میں دوائیں گھٹا تا بڑھاتا ہے تو وہ مریض یقیناً مجرم ہے لیکن اگر طبیب ہی مریض کے حالت میں تبدیلی کی بناء پر اپنے نسخے میں کچھ تبدیلی کرتا ہے تو یہ طبیب کی قابلیت اور نسخے کے مکمل ہونے کی دلیل ہے نہ کہ نسخے کی تحریف یہی قرآن پاک میں ہوا کہ بعض سورتوں میں حالات کے موافق خود قرآن بھیجنے والے خدا کی طرف سے ہی احکام بدلے گئے نسخ کی پوری تحقیق ہم انشاء اللہ اس آیت کے ماتحت لکھیں گے کہ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ (البقرہ:۱۰۶) انتظار کریں۔

(۴) سوال: مسلمانوں کی بعض جماعتیں (جیسے کہ شیعہ) کہتی ہیں کہ قرآن میں سے دس پارے کم کر دیئے گئے اور اس قرآن میں سورہ حسنین سورۂ علی اور سورۂ فاطمہ بھی تھیں پتہ نہیں لگتا کہ وہ کہاں گئیں پھر آپ کس منہ سے کہتے ہیں کہ قرآن پاک محفوظ ہے۔ **جواب:** کسی بے وقوف شیعہ نے گپ ہانکی ہو گی محققین شیعہ تو بڑے شدومد کے ساتھ اس سے اپنی برات ثابت کرتے ہیں مثلاً ملا صادق، شرح کلینی میں، محمد ابن حسن آملی، شیخ صدوق ابوجعفر محمد بن علی بابویہ وغیرہ اور کیوں

ثابت نہ کریں اس لئے کہ اس عقیدے سے تو اہل بیت عظام کے اسلام کی ہی خیر نہ رہے گی کیونکہ پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ اہل بیت اطہار رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین نے اس محرف قرآن کو اپنی نمازوں میں کیوں پڑھا اور اس سے احکام کیوں جاری فرمائے اور قرآن پاک کو تحریف ہوتا ہوا دیکھ کر خاموشی کیوں اختیار کی کیوں نہ سربکف ہو کر میدان میں نکلے اور قرآن پاک کی حفاظت فرمائی اگر وہ اس کام کو کرتے تو تمام مسلمان ان کی امداد کرتے اگر نہ بھی کرتے تو خدا تو امداد کرتا اور خدا بھی امداد نہ کرتا اور جان جاتی تو شہید ہوتے جب مسئلہ خلافت کیلئے امیر معاویہ اور عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے جنگ ہو سکتی تھی تو حفاظت قرآن کے لئے خلفائے ثلاثہ سے بھی جنگ ہو سکتی تھی رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین اور اگر کچھ بھی نہ ہوتا تو حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا زمانہ خلافت سب کے بعد تھا اس زمانہ میں خلفائے ثلاثہ پردہ فرما چکے تھے کسی کا خوف نہ تھا تو اصلاح فرمانی ضروری تھی شہید کربلا، سید الشہداء امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ جہاں یزید کی بیعت کا مقابلہ میں جان دے سکتے تھے، وہی شہباز اسلام پروانہ شمع رسالت رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس مسئلہ، حفاظت قرآن پر بھی اپنی جان دے سکتے تھے ان تمام حضرات کا بلا اعتراض قرآن پاک کو قبول فرمالینا اس کی صحت کی کھلی ہوئی دلیل ہے کون ایسا بے وقوف شیعہ ہوگا کہ جو کہ اپنے ائمہ دین پر اس قدر اعتراض گوارا کر کے قرآن پاک کی تحریف کا قائل ہوگا اس کی زیادہ تحقیق منظور ہو تو تفسیر فتح المنان کا مطالعہ کریں باقی اور واہیات اعتراض جو کئے جاتے ہیں مثلاً اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ پر یا قرآن پاک میں انبیاء کرام کے قصوں کے بار بار آنے پر چونکہ ان کا تعلق حفاظت قرآن سے نہیں اس لئے ہم ان کو یہاں بیان نہیں کرتے بلکہ اس آیت کے ماتحت بیان کریں گے وَاِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا (البقرہ: ۲۳) قارئین اس کا انتظار کریں۔

تتمہ بحث: قرآن پاک کا طریقہ تحریر بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منقول ہے چنانچہ خرپوتی شریف نے قصیدہ بردہ میں کتب معتبرہ سے نقل کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو جو کاتب وحی تھے قلم کا ہاتھ میں لینا دوات کا موقعہ پر رکھنا ب کو سیدھا کرنا سین کو متفرق کر کے لکھنا م کو ٹیڑھا نہ کرنا وغیرہ سکھاتے تھے اس لئے قرآن پاک کی تحریر اور اس کی تلاوت ہر ایک میں سنت کا اتباع لازم ہے۔

پانچویں فصل، قرآن پاک کے فضائل وفوائد

انسان میں کیا طاقت ہے جو رب کے کلام کے فضائل اور اس کے فوائد کو پورے طور پر بیان کر سکے مسلمانوں کی واقفیت کیلئے چند باتیں اس کے فضائل کے متعلق اور چند فائدے بیان کئے جاتے ہیں کلام کی عظمت کلام کرنے والے کی عظمت سے ہوتی ہے ایک بات فقیر بے نوا کے منہ سے نکلتی ہے اس کی طرف کوئی دھیان بھی نہیں دیتا اور ایک بات کسی بادشاہ یا حکیم کے منہ سے نکلتی ہے تو اس کو دنیا میں شائع کیا جاتا ہے اخباروں اور رسالوں میں اس کی اشاعت ہوتی ہے غرض یہ ہے کہ کلام کی عظمت کا پتہ کلام والے کی عظمت سے لگتا ہے۔ اسی قاعدے کی بناء پر اندازہ لگالو کہ قرآن پاک ایسا معظم کلام ہے کہ اس کے مثل کسی کا کلام نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ خالق کا کلام ہے مثل مشہور ہے کہ کَلَامُ الْمَلِکِ مَلِکُ الْکَلَامِ یعنی بادشاہ کا کلام کلاموں کا

بادشاہ ہے اس کلام ربانی میں سارے علوم اور ساری حکمتیں موجود ہیں جس میں سے ہر شخص اپنی لیاقت کے موافق حاصل کرتا ہے اس کا پتہ عقل سے لگتا ہے اور تفسیریں دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس مفسر میں جیسی قابلیت ہے اسی قسم کے وہ بیش بہا موتی اس قرآن سے نکالتا ہے منطقی مفسر کی تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں از اول تا آخر منطق ہی منطق ہے نحوی اور صرفی مفسر کی تفسیر سے پتا چلتا ہے کہ اس میں صرف اور نحو ہی ہے۔ فصیح اور بلیغ مفسر کی تفسیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کریم میں فصاحت و بلاغت کا دریا موجیں مار رہا ہے صوفیاء کرام کی تفسیروں سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں سب کچھ ہے لیکن جیسا کہ اس کا شناور، ویسی اس کی تحصیل پھر جہاں تک سمجھنے والے کی سمجھ کی پہنچ وہاں تک اس کی تحقیق اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک جہاز سواریوں سے بھرا ہوا سمندر کے سفر سے آ کر کنارے لگا اس جہاز میں کپتان سے لے کر مسافروں تک ہر قسم کے لوگوں نے سفر کیا لیکن اگر کسی مسافر سے سمندر کے کچھ حالات دریافت کیے جائیں تو وہ کچھ نہ بتا سکے گا کیونکہ اس کی نظر فقط پانی کی ظاہری سطح پر تھی اور اگر خلاصی سے کچھ تحقیق کی جائے وہ وہاں کے حالات کا کچھ پتہ دے گا اور اگر کپتان سے معلومات حاصل کی جائیں تو وہ اول سے آخر تک کے سمندر کے تقریباً سارے اندرونی حالات بیان کر سکے گا کہ فلاں جگہ اس کی گہرائی اتنے میل تھی اور فلاں مقام پر پانی میں اس قسم کا پہاڑ تھا میں اپنے جہاز کو اس طرح سے بچا کے لایا وغیرہ وغیرہ اسی طرح قرآن کریم ہم بھی پڑھتے ہیں اور امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ بھی پڑھتے تھے اور صحابہ کرام بھی اسی قرآن کی تلاوت کرتے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اسی قرآن پاک کو پڑھا کتاب تو ایک ہی ہے لیکن پڑھنے والوں کے ذہن کی رسائی کی انتہائیں الگ الگ ہماری نگاہ فقط ظاہری الفاظ تک ہی بمشکل پہنچتی ہے یہ حضرات بقدر وسعت علمی اس کی تہہ تک پہنچ کر مسائل اور فوائد کو نکال لیتے ہیں بیہقی شریف میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور علیہ السلام سے بارہ سال میں سورۃ بقرہ پڑھی اب بتاؤ پڑھنے والے فاروق اعظم جیسے صاحب کمال پڑھانے والے خود صاحب قرآن صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور بارہ سال کی مدت بتاؤ کہ آقا نے کیا کیا نہ دیا ہوگا اور ان کے نیاز مند خادم عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا کیا نہ لیا ہوگا پھر ذرا اس پر بھی غور کرتے چلو کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے الرحمٰن علم القرآن۔ اپنے محبوب علیہ السلام کو رحمان نے قرآن سکھایا۔ حضرت جبریل تو فقط پہنچانے والے ہیں سوچو تو سکھانے والا الرحمان، سیکھنے والا سید الانس والجان اور کیا سکھایا ''قرآن'' نہ معلوم رب نے کیا دیا اور محبوب علیہ السلام نے کیا کیا لیا اسی لئے تفسیر روح البیان شریف نے فرمایا کہ ایک مرتبہ حضرت جبریل قرآن کی آیت الم لے کر آئے عرض کیا الف حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ ''میں نے جان لیا''۔ عرض کیا لام فرمایا۔ ''یقین کرلیا''۔ عرض کیا میم تو فرمایا ''اس کا کرم ہے'' جبریل امین کہنے لگے کہ حضور آپ نے کیا سمجھا اور کیا جانا میں تو کچھ بھی نہ سمجھا فرمایا یہ میرے اور رب کے درمیان راز ہیں۔

میان خالق و محبوب رمزے است
کراماً کاتبیں راهم خبر نیست

ہمارے اس عرض کرنے کا مدعا یہ ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا عالم اور بڑے سے بڑا زبان دان قرآن پاک کے متعلق یہ خیال نہ

کرے کہ میں نے اس کی حقیقت کو پالیا قرآن پاک ایک سمندر ناپیدا کنار ہے جتنا جس کا برتن، اتنا وہاں سے وہ پانی لے سکتا ہے۔ لیکن کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میرے کوزے میں سارا سمندر آ گیا غرض کہ قرآن کریم حق تعالیٰ کی عظمت کا مظہر ہے جیسے اس کی عظمت کی انتہا نہیں ویسے ہی اس کی عظمت بے انتہا ہے۔ شعر

کلام اللہ بھی نام خدا کیا راحت جان ہے　　عصائے پیر ہے تیغ جواں ہے حرز طفلاں ہے

خیال رہے کہ تمام انبیاء کرام کے معجزے قصے بن کر رہ گئے کوئی معجزہ نہیں جو آج دیکھا جائے مگر حضور کے بہت سے معجزات تا قیامت رہیں گے جنہیں دنیا آنکھوں سے دیکھے گی قرآن کریم میں چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ آیات ہیں ہر آیت حضور کا معجزہ ہے جن کی مثل بن نہ سکا ان کے پڑھنے سے دل نہیں اکتا تا ایسے ہی حضور کی محبوبیت جو قریباً ہر دل میں آج بھی موجود ہے ہم نے حضور کے نام پر سکھوں، ہندوؤں کو روتے دیکھا۔ ایسے آپ کا بلند ذکر ہر مجلس ہر زبان پر آپ کا چرچا ہے یہ بھی زندہ جاوید معجزات ہیں جنہیں دنیا دیکھتی ہے اور دیکھتی رہے گی۔ فوائد۔ قرآن کریم کے فوائد کا احاطہ کسی کی زبان، کسی کا قلم، کسی کا دل و دماغ نہیں کر سکتا بس یوں سمجھو کہ یہ عالم کی تمام روحانی، جسمانی، ظاہری، باطنی ضرورتوں کا پورا فرمانے والا ہے اگر ہم حدیث وفقہ کی روشنی میں قرآن کریم کے صحیح معنوں میں عامل بن جائیں تو ہم کو کبھی بھی کسی حاجت میں کسی قسم کا امداد نہ لینی پڑے ہم اس کے متعلق دو طرح گفتگو کرتے ہیں ایک عقلی اور ایک نقلی اگرچہ مسلمان کیلئے نقلی دلائل کے ہوتے ہوئے عقلی دلائل کی کوئی ضرورت نہیں لیکن زمانہ موجودہ میں نئی روشنی کے دلدادوں کا اعتماد اپنی لولی لنگڑی عقل پر زیادہ ہے یعنی گلاب کی خوشبو کے مقابلہ میں گیندے کی بدبو سے زیادہ مانوس ہو چکے ہیں اس لئے اولاً ہم ان کی تواضع کیلئے عقلی فوائد بیان کرتے ہیں۔

۱۔ سخی دو قسم کے ہیں ایک وہ جو فقیر کو بلا کر دیں دوسرے جو فقیر کے گھر آ کر دیں کنواں بلا کر دیتا ہے دریا آ کر دیتا ہے اور سمندر بادل بنا کر عالم پر پانی برسا دیتا ہے کعبہ معظمہ بھی سخی اور قرآن کریم بھی مگر فرق یہ ہے کہ کعبہ معظمہ کے پاس بھکاری جائیں اور جا کر فیض لے آئیں قرآن کریم کی یہ شان ہے کہ مشرق و مغرب میں گھر گھر پہنچا اور اپنا فیض جا کر دیا اور جو لوگ کہ بالکل ان پڑھ تھے ان کیلئے علماء مثل بادل کے بنا بنا کر اپنی رحمتوں کی بارش ان پر بھی برسا دی۔ ع

رہے اس سے محروم آبی نہ خاکی　　ہری ہو گئی دم میں کھیتی خدا کی

۲۔ آفتاب، وہ نور ہے جو ایک وقت میں آدھی زمین کو چمکاتا ہے اور پھر ظاہر کو چمکاتا ہے اور اپنے سامنے والے کو چمکاتا ہے اور پھر بادل کی وجہ سے اسی کی روشنی پھیکی پڑ جاتی ہے کبھی اس کو گرہن بھی لگتا ہے دن بھر میں تین پلٹے کھاتا ہے صبح اور شام کو ہلکا اور دوپہر کو تیز لیکن قرآن کریم آسمان ہدایت کا وہ چمکتا دمکتا سورج ہے جو بیک وقت سارے عالم کو چمکا رہا ہے فقط ظاہر کو نہیں بلکہ دل و دماغ کو بھی منور کر رہا ہے نیز اس کی روشنی جیسے میدانوں پر پڑ رہی ہے اسی طرح پہاڑوں اور غاروں میں اور تہہ خانوں میں غرض کہ ہر جگہ پہنچ رہی ہے نہ کبھی اس کو گرہن لگے نہ کوئی بادل اسی کی روشنی کو ڈھک سکے۔ اس کی شعاعیں بڑی تاریک گھٹاؤں کو بھی چیر کر اپنا کام کرتی ہیں اس لئے رب تعالیٰ نے قرآن پاک کے بارے میں فرمایا وَاَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا (النساء: ۱۷۴)

۳۔ آج ہم لوگوں نے اپنی بے علمی کی وجہ سے قرآن کریم کے فیوض و برکات کو محدود سمجھ رکھا ہے بعض لوگوں نے تو اپنے عمل سے ثابت کر دیا ہے کہ قرآن کریم فقط اس لئے آیا ہے کہ بیماری اور اسے پڑھ کر دم کر لو اور گھر میں برکت کے واسطے رکھ لو جب کوئی مرنے لگے تو اس پر یاسین پڑھ دو اور بعد موت اس کو پڑھوا کر ایصال ثواب کر دو اور باقی رہا عمل اس کے لئے قرآن کی کوئی ضرورت نہیں اس کیلئے فقط انگریزوں کے بنائے ہوئے قوانین ہیں چنانچہ بعض جگہ کے مسلمانوں نے اپنی خوشی سے اسلامی قوانین کے مقابلہ میں ہندوؤں یا عیسائیوں کے قانونوں کو اپنے پر لازم کر لیا ہے جیسے کہ پنجاب کے زمیندار کاٹھیاواڑ کے عام مسلمان کہ انہوں نے میراث سے اپنی لڑکیوں کو قانونی طور پر محروم کر دیا اور اپنی صورت سیرت طریق زندگانی، لباس وغیرہ میں یکدم غیروں سے مل گئے اور بعض نے یہ کہنا شروع کیا کہ قرآن فقط عمل کیلئے آیا ہے اس کی تلاوت کرنا، اس سے دم کرنا تعویذ کرنا یا اس سے ایصال ثواب کرنا اس کے نزول کی حکمت کے خلاف ہے قرآن عمل کیلئے اترا ہے نہ کہ طبابت اور چھومنتر کیلئے وہ کہتے ہیں کہ قرآن پاک ایک نسخہ ہے نسخے کے فقط پڑھتے رہنے سے شفا نہیں ملتی بلکہ اس کو استعمال کرنا چاہئے۔ یہ وہ خیال فاسد ہے کہ جو پڑھے لکھوں کے دماغ میں بھی گھوم رہا ہے۔ مسٹر عنایت اللہ مشرقی اور ابو الاعلیٰ مودودی اور عوام دیوبندی اسی چکر میں ہیں مگر خیر سے عمل وہاں بھی غائب ہے عمل کا فقط نام ہی نام ہے یا اگر عمل ہے تو ایسا اندھا جیسا کہ مشرقی نے اپنے خاکساروں سے کرا کر صدہا کو موت کے گھاٹ اتروا دیا اور خود معافی مانگ کر خیریت سے گھر آ بیٹھے لیکن دوستو! ان لوگوں میں افراط ہے اور پہلے لوگوں میں تفریط تھی جس طرح سے کہ ہم اپنے مال اور بدن کے اعضاء سے بہت سے کام لیتے ہیں کہ آنکھ سے دیکھتے بھی ہیں روتے بھی ہیں اور اس میں سرمہ لگا کر زینت بھی حاصل کرتے ہیں ہاتھ سے پکڑتے بھی اور مار کو روکتے بھی ہیں زبان سے کھاتے بھی ہیں، بولتے بھی ہیں۔ کھانے کی لذت اور اس کی سردی گرمی بھی محسوس کرتے ہیں اور ایک ہی پھونک سے گرم چائے بھی ٹھنڈی کرتے ہیں سردیوں میں انگلیاں بھی گرم کرتے ہیں آگ جلاتے بھی ہیں اور چراغ بجھاتے بھی ہیں اسی طرح عبادت میں صدہا ایسی مصلحتیں ہیں روزہ عبادت بھی ہے قسم وغیرہ کا کفارہ بھی جو غریب نکاح نہ کر سکے اس کیلئے شہوت توڑنے کا ذریعہ بھی اسی طرح قرآن کریم صدہا دینی اور دنیوی فوائد لے کر اترا نماز قرآن کے ذریعے سے ادا ہو، کھانا وغیرہ قرآن پڑھ کر شروع کرو شاہی قوانین قرآن سے حاصل کرو بیمار پر قرآن پڑھ کر دم کرو یا تعویذ لکھ کر گلے میں ڈالو ثواب کیلئے اس کو پڑھو، عمل اس پر کرو غرض کہ یہ قرآن بادشاہ کیلئے قانون، غازی کیلئے تلوار، بیمار کیلئے شفاء، غریب کا سہارا، کمزور کا عصا، بچوں کا تعویذ، بے ایمان کیلئے ہدایت، قلب مردہ کی زندگی، قلب غافل کیلئے تنبیہ، گمراہوں کیلئے مشعل راہ، زنگ آلود قلب کی صیقل ہے۔ اگر قرآن کریم صرف احکام کیلئے ہوتا اور دیگر مقاصد اس سے حاصل نہ ہوتے تو اس میں فقط احکام کی آیتیں ہوتیں ذات وصفات کی آیتیں متشابہات انبیائے کرام کے قصے، آیات منسوختہ الاحکام ہرگز نہ ہونی چاہئیں تھیں کیونکہ ان سے احکام حاصل نہیں کئے جاتے اسی طرح سے ان احکام کی آیتیں بھی نہ ہوتیں جن پر عمل ناممکن ہے جیسے کہ نبی کی آواز پر آواز بلند کرنے کی آیتیں یا بارگاہ نبوی میں دعوت کھانے کے آداب یا نبیوں کی بیبیوں سے حرمت نکاح کی آیتیں اور قرآن پاک یہ نہ فرماتا کہ نُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّ رَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ

(الاسراء:۸۲) اسی طرح اگر قرآن فقط برکت لینے اور دم درود کیلئے ہوتا تو اس میں احکام کی آیتیں نہ ہونی چاہئیں تھیں۔

نکتہ: یہ جو کہا گیا ہے کہ قرآن ایک نسخہ ہے اور نسخہ کا پڑھنا مفید نہیں ہوتا۔ یہ مثال غلط ہے بعض چیزوں کے نام میں اور پڑھنے میں تاثیر ہوتی ہے پردیسی آدمی کے پاس گھر سے خط آئے تو فقط پڑھ کر ہی اس کا دل خوش ہو جاتا ہے بیماری ہلکی پڑ جاتی ہے کسی شخص کو مصیبت کی خبر سناؤ سن کر دل کا حال بدل جاتا ہے کسی کو الو گدھا کہہ دو تو آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ کسی کے سامنے کسی کھٹی چیز کا نام لے دو تو منہ میں پانی بھر آتا ہے اگر روزہ کی حالت میں کسی کا منہ خشک ہو جائے تو اس کو دکھا کر لیموں کاٹو تو اس کی خشکی دور ہو جاتی ہے ہر دوا پلائی ہی نہیں جاتی بلکہ کبھی دکھائی اور سونگھائی بھی جاتی ہے تو جب مخلوق کے نام و پیام میں اور ناموں میں اتنا اثر ہے تو خالق کے پیام میں کس قدر اثر ہونا چاہئے خود غور کرلو۔

اب ہم قرآن پاک کے وہ فوائد بیان کرتے ہیں جو احادیث سے ثابت ہیں۔ ۱۔ حدیث شریف میں ہے جس گھر میں روزانہ سورۂ بقرہ پڑھی جائے وہ گھر شیطان سے محفوظ رہتا ہے لہٰذا جنات کی بیماریوں سے بھی محفوظ رہے گا۔ ۲۔ قیامت کے دن سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران لوگوں پر سایہ کریں گی اور ان کی شفاعت کریں گی جو دنیا میں قرآن پاک کی تلاوت کے عادی تھے۔ ۳۔ جو شخص آیۃ الکرسی صبح و شام اور سوتے وقت پڑھ لیا کرے تو اس کا گھر انشاء اللہ آگ کے لگنے اور چوری ہونے سے محفوظ رہے گا۔ ۴۔ سورۂ اخلاص کا ثواب تہائی قرآن کے برابر ہے اسی لئے ختم و فاتحہ میں اس کو تین بار پڑھتے ہیں۔ ۵۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے ہیں کہ جو شخص قرآن پاک کا ایک حرف پڑھے اس کو دس نیکیوں کے برابر نیکی ملتی ہے خیال رہے کہ الم ایک حرف نہیں بلکہ الف، لام، میم، تین حروف ہیں لہٰذا فقط اتنا پڑھنے سے تیس نیکیاں ملیں گی۔ خیال رہے کہ الم متشابہات میں سے ہے جس کے معنی ہم تو کیا جبریل بھی نہیں جانتے مگر اس کے پڑھنے پر ثواب ہے معلوم ہوا کہ تلاوت قرآن کا ثواب اس کے سمجھنے پر موقوف نہیں بغیر سمجھے تلاوت پر ثواب ہے ولایتی مرکب دوائیں مریض کو شفا دیتی ہیں ان کے اجزاء معلوم ہوں یا نہ ہوں یوں ہی قرآن کریم شفا اور ثواب ہے معنے معلوم ہوں یا نہ ہوں دیکھو بھینس دودھ کیلئے، بیل کھیتی باڑی کیلئے، گھوڑے، اونٹ، سواری اور بوجھ اٹھانے کیلئے پالے جاتے ہیں مگر طوطی مینا صرف اس لئے پالے جاتے ہیں کہ وہ ہماری سی بولی بولتے ہیں اگرچہ بغیر سمجھے سہی۔ مینا طوطی ہماری بولی بولیں تو تمہیں پیاری لگے اگر تم جناب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بولی بولو تو رب کو پیارے اس سے وہ لوگ عبرت پکڑیں جو کہتے ہیں کہ بغیر معنی سمجھے قرآن بیکار ہے اس کا کوئی ثواب نہیں۔ ۶۔ جو شخص قرآن پڑھے اور اس پر عمل کرے تو قیامت کے دن اس کے ماں باپ کو ایسا تاج پہنایا جائے گا جس کی چمک آفتاب سے کہیں بڑھ کر ہوگی۔ ۷۔ قرآن پاک دیکھ کر پڑھنے میں دوہرا ثواب ملتا ہے اور بغیر دیکھ کر پڑھنے میں ایک ثواب۔ **نوٹ:** چند چیزوں کا دیکھنا عبادت ہے۔ قرآن پاک، کعبہ معظمہ، ماں باپ کا چہرہ محبت سے اور عالم دین کی شکل دیکھنا عقیدت سے وغیرہ وغیرہ۔ ۸۔ قرآن پاک کی تلاوت اور موت کی یاد دل کو اس طرح صاف کر دیتی ہے جیسے کہ زنگ آلود لوہے کو صیقل۔ ۹۔ جو شخص کہ قرآن پاک کی تلاوت میں اتنا مشغول ہو کہ کوئی دعا نہ مانگ سکے تو خداوند تعالیٰ اس کو مانگنے والوں سے زیادہ دیتا ہے۔ ۱۰۔ جو شخص ہر رات سورۂ واقعہ پڑھا کرے، انشاء اللہ اسے کبھی فاقہ نہ ہوگا۔

۱۱۔ سورۂ الم تنزیل پڑھنے والا جب قبر میں پہنچتا ہے تو یہ سورۃ اس طرح اس کی شفاعت کرتی ہے کہ اے اللہ اگر میں تیرا کلام ہوں تو اس کو بخش دے ورنہ تو مجھے اپنی کتاب سے نکال دے اور میت کو اس طرح ڈھک لیتی ہے جیسے چڑیا اپنے پروں سے اپنے بچوں کو اور اسے عذاب سے بچاتی ہے۔ ۱۲۔ جو شخص کہ سورۂ یاسین اول دن میں دوپہر سے پہلے پڑھنے کا عادی ہو تو اس کی حاجتیں پوری ہوتی ہیں۔ ۱۳۔ سورۃ یاسین شریف پڑھنے سے تمام گناہ معاف ہوتے ہیں اور مشکلیں آسان ہوتی ہیں لہٰذا اس کو بیماروں پر پڑھو۔ ۱۴۔ سوتے وقت قُلْ یٰٓاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ پڑھنے والا انشاء اللہ تعالیٰ کفر سے محفوظ رہے گا یعنی اس کا خاتمہ بالخیر ہوگا۔ ۱۵۔ سورۂ فلق اور سورۃ الناس پڑھنے سے آندھی اور اندھیری دور ہوتی ہے اور اس کو پابندی سے پڑھنے والا انشاء اللہ جادو سے محفوظ رہے گا۔ ۱۶۔ سورۃ فاتحہ جسمانی اور روحانی بیماریوں کی دوا ہے (ہر سورت کے فوائد ہم انشاء اللہ تعالیٰ اس سورۃ کے ساتھ بھی لکھیں گے واضح رہے کہ قرآن کریم کے فائدے فقط پڑھنے والے پر ہی ختم نہیں ہو جاتے بلکہ دوسروں تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔ مثلاً جہاں تک اس کی آواز پہنچے وہاں تک ملائکہ رحمت کا اجتماع ہوتا ہے چنانچہ حدیث شریف میں کہ حضرت اسید ابن حضیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک شب تلاوت قرآن کر رہے تھے اور ان کے پاس ایک گھوڑا بندھا تھا وہ اچانک اچھلنے کودنے لگا آپ باہر تشریف لائے اور نگاہ اٹھا کر دیکھا ایک سائبان تھا جس میں قندیلیں روشن تھیں اس سے گھوڑا ڈر کر کودتا تھا۔ صبح کو آ کر بارگاہ نبوت میں یہ واقعہ عرض کیا۔ ارشاد ہوا کہ رحمت کے فرشتے تھے جو تمہارا قرآن پاک سننے آئے تھے اسی طرح جہاں تک اس کی آواز پہنچے وہاں تک کی ہر ایک چیز درخت، گھاس، بیل، بوٹے، حتیٰ کہ در و دیوار اس کے ایمان کی قیامت میں انشاء اللہ تعالیٰ گواہی دیں گے اسی طرح اگر تلاوت کرنے والا کچھ آیتیں پڑھ کر بیمار پر دم کرے تو انشاء اللہ تعالیٰ صحت ہوگی دیکھو اگر تم کسی باغ کے پاس سے گزرو تو وہاں کے پھولوں کی مہم دور تک محسوس ہوتی ہے جس سے دماغ معطر اور دل خوش ہو جاتا ہے آخر یہ کیوں؟ صرف اس لئے کہ ہوا پھولوں سے لگ کر ہر چہار طرف پھیلتی ہے اس ہوا کی تاثیر یہ ہوتی ہے کہ گزرنے والوں کو خوش کر دیتی ہے تو جس زبان سے قرآن پاک پڑھا جائے اس سے لگ کر جو پھونک نکلے وہ کیوں نہ دافع ہر بلا ہو۔ صحابہ کرام نے سانپ کے کاٹے ہوؤں کا سورۃ فاتحہ دم کر کے علاج کیا ہے اسی طرح قرآن کریم کی آیتوں کو لکھ کر تعویذی شکل میں بیمار کے ساتھ رکھا جائے تو اس کو شفا ہوتی ہے جس کی آنکھ دکھتی ہو، اس کی آنکھ کے سامنے ایک سبز کپڑا باندھ دیتے ہیں اور اس سے اس کو شفا ہوتی ہے آنکھ میں سرمہ لگانے سے نظر قائم رہتی ہے۔ جب یہ معمولی دوائیں کچھ دیر ہمارے ساتھ رہ کر اپنا اثر دکھا دیں تو قرآن حکیم کی آیتیں اس سے کہیں زیادہ شفا بخش کیوں نہ ثابت ہوں گی؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن کریم سے، قرآن شریف کی آیتوں سے بیماروں کا علاج کیا ہے۔ جس تعویذ گنڈے اور دم سے حدیث پاک میں منع فرمایا گیا وہ زمانہ جاہلیت کے شرکیہ منتر تھے جن میں بتوں سے مدد مانگنے کے الفاظ تھے، قرآن پاک کی آیتوں سے ان کو کیا نسبت؟ اسی طرح اگر قرآن پاک کی تلاوت کر کے کسی کو ثواب بخش دیا جائے تو وہ ضرور اس کو پہنچے گا۔ اگر میں اپنا کمایا ہوا روپیہ کسی کو دوں تو دے سکتا ہوں اسی طرح اپنے کمائے ہوئے ثواب کو دینے کا اختیار بھی رکھتا ہوں۔ ہاں فرق یہ ہے کہ اگر مال چند اشخاص پر تقسیم کیا جائے تو وہ بٹ کر تھوڑا تھوڑا ملے گا اور دینے والے کے پاس

نہ رہے گا اگر ثواب صدہا آدمیوں کو بخش دیا جائے تو سب کو پورا پورا ملے گا اور بخشنے والے کو ان سب کے برابر جیسے کوئی عالم یا حافظ صدہا آدمیوں کو عالم یا حافظ بنائے وہ علم تقسیم ہو کر نہ ملے گا۔ بلکہ سب کو برابر ملے گا اور پڑھانے والے کے علم میں اور ترقی ہوگی ایصال ثواب کی ضروری بحث اور اس کے متعلق تمام اعتراضات اور جوابات انشاء اللہ تعالیٰ ہم اس آیت کے ماتحت لکھیں گے۔ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ (البقرہ:۲۸۶)

چھٹی فصل، تلاوت قرآن

بزرگان دین کی عادتیں تلاوت قران پاک کے متعلق جداگانہ تھیں بعض حضرات تو ایک دن رات میں آٹھ ختم کر لیتے تھے چار دن میں اور چار رات میں بعض حضرات چار، بعض دو، اور بعض ایک اور بعض لوگ دو دن میں ایک ختم اور بعض تین دن میں، بعض پانچ دن میں بعض سات دن میں اور سات دن میں ختم کرنا اکثر صحابہ کرام کا معمول تھا اس میں لوگوں کے حالات مختلف ہیں بعض تو نہایت تیز پڑھنے کی صورت میں بھی حروف کو ان کے مخرجوں سے ادا کرنے اور صحیح پڑھنے پر قادر ہوتے ہیں اور بعض لوگ اکثر تیز پڑھیں تو صحیح نہیں پڑھ سکتے لہٰذا تلاوت کرنے والوں کو چاہئے کہ صحیح پڑھنے کی کوشش کریں کیونکہ ثواب صحیح پڑھنے میں ہے نہ کہ محض جلدی پڑھنے میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی تھیں کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس طرح تلاوت فرماتے تھے کہ ایک ایک حرف صاف صاف معلوم ہوتا تھا سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ ارشاد فرماتے تھے کہ قرآن کریم جب دل میں اترتا ہے تب اس میں جمتا ہے اور نفع دیتا ہے تلاوت کرنے والا جس اطمینان اور سکون کے ساتھ دنیا میں تلاوت کرتا تھا اسی اطمینان کے ساتھ تلاوت کرتا ہوا جنت میں بڑھتا جائے گا اور جہاں تک اس کی تلاوت ختم ہوگی وہاں تک کا سب ملک اس کو دیا جائے گا بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ اگر عربی سمجھنے پر قدرت رکھتا ہو تو اس کے معانی اور مضامین پر غور کرتا جائے اور رحمت کی آیت آئے تو خوش ہو اور خدا سے رحمت مانگ لے اور جب عذاب کی آیت آئے تو ڈرے اور اس سے پناہ مانگے۔ نیز کوشش کرے کہ تلاوت کے وقت دل حاضر ہو اور خشوع اور خضوع کے ساتھ پڑھے یہاں تک کہ رقت آجائے اور آنکھوں سے آنسو جاری ہو جائیں اور اگر معنی نہ سمجھتا ہو تو یہ سمجھ کر تلاوت کرے کہ یہ وہی الفاظ ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی پڑھتے تھے اور حضور کے صحابہ بھی اولیاء اللہ بھی علماء دین بھی جیسے ہلال عید میں تمام انسانوں کی نگاہیں جمع ہو جاتی ہیں۔ ایسے ہی الفاظ قرآن مجید میں سب کی تلاوتیں اور ادائیں جمع ہو جاتی ہیں اگر یہ سمجھ کر تلاوت کی تو انشاء اللہ بہت لذت آئے گی اگرچہ بے وضو بھی قرآن پڑھنا جائز ہے لیکن مستحب یہ ہے کہ وضو کر کے تلاوت کرے۔ اس میں زیادہ ثواب ہے اور سنت یہ ہے کہ تلاوت پاک جگہ میں ہو مسجد میں ہو تو اور زیادہ بہتر ہے یہ بھی مستحب ہے کہ قبلہ کی طرف منہ کر کے سر جھکا کر اطمینان سے پڑھے اور اگر تلاوت کرتے وقت مسواک وغیرہ سے منہ کو صاف کرے اور خوشبو بھی لگائے تو بہت ہی اچھا ہے کیونکہ جتنا ادب زیادہ اتنا ہی فیض زیادہ تلاوت سے پہلے اعوذ باللہ اور بسم اللہ بھی پڑھے اور تلاوت کی حالت میں کسی سے بلاضرورت بات کرنا مکروہ ہے سیدنا عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تلاوت کے دوران کسی سے کلام نہ فرماتے تھے اور اگر کلام کرنا پڑ جائے تو کلام

کے دوران قرآن شریف بند رکھے اور پھر بسم اللہ پڑھ کر شروع کرے۔ **مسئلہ:** جنبی حیض ونفاس والی عورتوں کا قرآن کو چھونا بھی جائز نہیں اگر چھونا پڑ جائے تو کسی علیحدہ کپڑے سے چھوئیں ادب یہ ہے کہ بے وضو آدمی بھی بغیر کپڑے کے قرآن پاک کو ہاتھ نہ لگائے فرق یہ ہے کہ بے وضو اپنے کرتہ کے دامن سے بھی پکڑ سکتا ہے اور وہ لوگ علیحدہ کپڑے سے پکڑیں۔ بہتر یہ ہے کہ جس دن قرآن پاک ختم کرے اس دن اپنے گھر والوں دوستوں کو جمع کرے، سیدنا حضرت انس رضی اللہ عنہ قرآن کے ختم کے وقت اپنے اہل قرابت کو جمع فرماتے اور دعا کرتے تھے حضرت مجاہد فرماتے ہیں کہ اس وقت رحمت الٰہی نازل ہوتی ہے حدیث شریف میں آیا ہے کہ اس وقت دعا قبول ہوتی ہے بعض روایتوں میں ہے کہ جو قرآن پاک پڑھ کر حق تعالیٰ کی حمد کرے اور درود پڑھے اور اپنے گناہوں کی معافی مانگے تو رحمت الٰہی اس کو تلاش کرتی ہے۔ تلاوت کرنے والے کو چاہئے کہ قرآن پاک ختم کرتے ہی دوسری بار اس کو شروع کردے یعنی سورۃ فاتحہ پڑھ کر سورۂ بقرہ مفلحون تک پڑھ لے پھر دعا مانگے۔

مسئلہ: حافظ تراویح میں جب قرآن پاک پڑھے تو ایک بار کسی نہ کسی جگہ بسم اللہ شریف بلند آواز سے ضرور پڑھے کیونکہ یہ بھی قرآن پاک کی آیت ہے اور مستحب یہ ہے کہ ہر نمازی نماز میں جب کوئی سورۃ شروع کرے تو آہستہ سے بسم اللہ پڑھ لیا کرے سوائے سورۃ توبہ کے۔ اس کی پوری بحث تفسیر خزائن العرفان کے مقدمہ میں دیکھو۔

تتمہ: قرآن پاک کا چھوٹی تقطیع پر یا تعویذی طرح چھاپنا مکروہ ہے چاہئے یہ کہ بڑی تقطیع پر چھاپا جائے حروف خوب کھلے ہوں اور اس کے رکوع اور آیتوں اور منزلوں کو دیدہ زیب بنانا مستحب ہے کیونکہ اس میں قرآن پاک کی عظمت کا اظہار ہے۔ قرآن پاک اتنی جلدی پڑھنا کہ جس سے بجز تَعْلَمُوْنَ اور يَعْلَمُوْنَ کچھ سمجھ میں نہ آئے، یعنی حروف کی ادائیگی پوری طرح نہ ہو، سخت برا ہے حافظوں کو اس کا بہت لحاظ رکھنا چاہئے۔ **مسئلہ:** جس جگہ سب لوگ اپنے کاروبار میں مشغول ہوں وہاں قرآن پاک بلند آواز سے پڑھنا منع ہے یا تو تنہائی میں بلند پڑھو یا وہاں جہاں کم سے کم ایک آدمی سننے والا ہو کیونکہ اس کا سننا فرض کفایہ ہے۔ **مسئلہ:** چند شخصوں کا بیک وقت بلند آواز سے تلاوت کرنا منع ہے یا تو ایک پڑھے باقی سب سنیں یا سب آہستہ پڑھیں (تیجے اور ختم والوں کو اس کا خاص خیال رکھنا چاہئے) مکتبوں اور مدرسوں میں جو بچے مل کر پڑھتے ہیں، یہ مجبوری کی وجہ سے ہے۔ **مسئلہ:** قرآن پاک کو خلاف ترتیب الٹا پڑھنا ممنوع ہے ہاں اگر خارج نماز درمیان میں ٹھہرتا جائے جس سے الگ الگ قرآئتیں معلوم ہوتو کوئی مضائقہ نہیں (شامی) اور ترتیب کے مطابق جگہ جگہ سے آیتوں کا پڑھنا جائز ہے جیسا کہ فاتحہ اور ختم کے وقت کیا جاتا ہے۔

ساتویں فصل، تفسیر کے معنی اور اس کی تحقیق

لفظ تفسیر فسر سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کھولنا محاورہ میں تفسیر یہ ہے کہ کلام کرنے والے کا مقصد اس طرح بیان کرنا جس میں کوئی شک وشبہ باقی نہ رہے اور مفسرین کی اصطلاح میں تفسیر یہ ہے کہ قرآن پاک کے وہ احوال بیان کرنا جس میں عقل کو دخل نہیں بلکہ نقل کی ضرورت ہو جیسے آیات کا شان نزول یا ان کا ناسخ اور منسوخ ہونا وغیرہ تفسیر بالرائے حرام ہے کیونکہ حدیث

شریف میں آیا ہے کہ جو شخص قرآن میں اپنی رائے سے کچھ کہے اور ٹھیک بھی کہہ جائے تب بھی خطا کار ہے۔ تفسیر قرآن کے چند مرتبے ہیں۔

ا۔ تفسیر قرآن بالقرآن یہ سب سے مقدم ہے۔

۲۔ تفسیر قرآن بالحدیث کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صاحب قرآن ہیں ان کی تفسیر نہایت صحیح اور اعلیٰ۔

۳۔ قرآن کی تفسیر صحابہ کرام خصوصاً فقہائے صحابہ اور خلفائے راشدین کے اقوال سے ہو۔

۴۔ تفسیر قرآن تابعین یا تبع تابعین کے قول سے۔ اگر روایت سے ہے تو معتبر۔ اس کی زائد تحقیق کیلئے ہماری کتاب ''جاء الحق'' یا ''اعلائے کلمۃ اللہ'' مصنف قطب الوقت حضرت قبلہ مہر علی شاہ صاحب کا مطالعہ کرو لفظ تاویل اول سے مشتق ہے اس کے معنی ہیں رجوع کرنا اصطلاح میں تاویل یہ ہے کہ کسی کلام میں چند احتمال ہوں ان میں سے کسی احتمال کو قرینوں سے اور علمی دلائل سے ترجیح دینا یا کلام میں علمی نکات وغیرہ بیان کرنا اس کیلئے نقل کی ضرورت نہیں بلکہ ہر عالم اپنی قوت علمی سے قرآن پاک میں نکات وغیرہ نکال سکتا ہے مگر شرط یہ ہے خلاف شریعت ہرگز نہ ہو اس لئے مفسرین بڑے بڑے نکات بیان فرماتے ہیں اور ہر ایک کیلئے نقل پیش نہیں فرماتے امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے احیاء العلوم شریف باب ہشتم میں فرمایا کہ قرآن پاک کے ایک ظاہری معنی ہیں اور ایک باطنی، ظاہری معنی کی تحقیق علماء شریعت فرماتے ہیں اور باطنی کی صوفیائے کرام حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ اگر میں چاہوں تو سورۂ فاتحہ کی تفسیر سے ستر اونٹ بھر دوں مگر یہ باطنی تفسیر ظاہری معنی کے خلاف ہرگز نہ ہوگی تحریف مشتق ہے حرف سے حرف کے معنی ہیں علیحدگی یا کنارہ اصطلاح میں تحریف یہ ہے کہ کلام کا مطلب ایسا بیان کیا جائے جو کلام کرنے والے کے مقصد کے خلاف ہو مفسرین کی اصطلاح میں تحریف دو طرح کی ہے تحریف لفظی اور تحریف معنوی تحریف لفظی یہ ہے کہ قرآن پاک کی عبارت کو دیدہ دانستہ بدل دیا جائے جیسا کہ یہود و نصاریٰ نے اپنی اپنی کتابوں میں کیا۔ تحریف معنوی یہ ہے کہ قرآن پاک کے ایسے معنی اور مطلب بیان کئے جائیں جو کہ اجماع امت یا عقیدہ اسلامیہ یا اجماع مفسرین یا تفسیر قرآن کے خلاف ہوں اور وہ یہ کہے کہ آیت کے وہ معنی نہیں بلکہ یہ ہیں جو میں بیان کر رہا ہوں جیسا کہ اس زمانہ میں چکڑالوی، قادیانی، اور دیوبندی وغیرہ کر رہے ہیں دونوں قسم کی تحریفیں کفر ہیں۔ مفسر وہ شخص ہو سکتا ہے۔

ا۔ جو کہ قرآن کے مقصد کو پہچان سکے۔

۲۔ ناسخ و منسوخ کی پوری خبر رکھتا ہو۔

۳۔ آیات و احادیث میں مطابقت کرنے پر قادر ہو۔ یعنی جن آیتوں کا آپس میں مقابلہ معلوم ہوتا ہو یا جو آیت کہ احادیث کے خلاف معلوم ہوتی ہوں ان کی ایسی توجیہہ کر سکے کہ جس سے مخالفت اٹھ جائے۔

۴۔ آیتوں کے شان نزول سے باخبر ہو۔

۵۔ آیتوں کی توجیہہ کر سکے یعنی جو قرآن پاک کی آیتیں عقل کی رو سے محال معلوم ہوتی ہوں ان کو حل کر سکے۔ مثلاً قرآن پاک میں آتا ہے کہ حضرت مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے لوگوں نے کہا یا اخت ھرون حالانکہ ہارون علیہ السلام (موسیٰ علیہ

السلام کے بھائی) اور حضرت مریم میں سینکڑوں برس کا فاصلہ ہے تو پھر حضرت مریم ان کی بہن کیسے ہو سکتی ہیں اسی طرح قرآن فرماتا ہے کہ سکندر ذوالقرنین نے آفتاب کو کیچڑ میں ڈوبتا ہوا پایا حالانکہ آفتاب ڈوبتے وقت زمین پر نہیں آتا اور نہ کیچڑ اونچی ہو کر آفتاب تک پہنچتی ہے ان جیسی آیات کی توجیہیں کر سکے۔

۶۔ آیات میں محذوفات نکالنے پر قدرت رکھتا ہو۔ یعنی بعض جگہ آیات میں پوری کی پوری عبارتیں محذوف ہیں۔ ان کے بغیر نکالے ہوئے آیت کا ترجمہ درست نہیں ہوتا۔

۷۔ عرب کے محاورے سے پوری طور پر واقف ہو قرآن پاک نے بہت جگہ وہاں کے خاص محاورے استعمال فرمائے ہیں جیسے تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ (لہب:۱) ابولہب کے دونوں ہاتھ ٹوٹ جائیں یا کہ فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَ الْاَرْضُ (الدخان:۲۹) کہ کفار کے مرنے پر زمین اور آسمان نہ روئے یا ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ (الدخان:۴۹) یعنی کفار سے جہنم میں کہا جائے گا تو یہ عذاب چکھ تو بڑا عزت اور کرم والا ہے وغیرہ وغیرہ ان جیسی آیات کے مقصود کو پہچان سکے اور معلوم کر سکے کہ اس جگہ کس قسم کا محاورہ استعمال ہوا ہے۔

۸۔ محکم اور متشابہ آیت کو پہچانتا ہو۔

۹۔ قرأتوں کے اختلاف سے واقف ہو۔

۱۰۔ مکی اور مدنی آیتوں کو جانتا ہو وغیرہ وغیرہ جب اتنی صفتیں موجود ہوں تو تفسیر کرنے کی ہمت کرے اس کی زیادہ تحقیق مقصود ہو تو دیکھو تفسیر فتح البیان کا مقدمہ مگر افسوس ہے کہ اس زمانہ پرفتن میں تفسیر قرآن کو جتنا آسان سمجھا گیا ہے اتنا آسان اور کوئی کام نہیں سمجھا گیا۔ حق تعالیٰ اس زمانے کے فتنوں سے بچائے فقیر حقیر پر تقصیر احمد یار اپنے قصور علم کا اقرار کرتا ہوا محض اللہ تعالیٰ و رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھروسے پر اس کام کو شروع کرتا ہے اور اس دریا ناپیدا کنار میں غوطہ لگاتا ہے اور بارگاہ الٰہی میں دعا کرتا ہے کہ حق بات قلم سے نکلوائے اور اسے قبول فرما کر میرے لئے صدقہ جاریہ اور توشہ آخرت بنائے اور جن حضرات نے اس کام میں دامے درمے قدمے قلمے سخنے مدد کی انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْۤ اِلَّا بِاللّٰهِ

احمد یار خان نعیمی اشرفی
مہتمم مدرسہ غوثیہ گجرات
۱۵ ربیع الآخر ۱۳۶۳ھ یوم دوشنبہ مبارکہ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ط
پناہ پکڑتا ہوں اللہ کی سے شیطان نکالا ہوا
میں نکالے ہوئے شیطان سے اللہ کی پناہ چاہتا ہوں

اعوذ باللہ کے متعلق چند باتیں غور طلب ہیں۔ ا۔ تلاوت سے پیشتر اس کو کیوں پڑھتے ہیں۔ ۲۔ اس کی تفسیر کیا ہے۔ ۳۔ اس کے فوائد کیا ہیں۔ ۴۔ اس کے متعلق مسائل کیا ہیں۔

پہلی بحث

پڑھنے کی وجہ رب تعالیٰ کا حکم ہے فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ (النحل:۹۸) جب تم قرآن پڑھنے لگو تو نکالے ہوئے شیطان سے اللہ کی پناہ لو۔ معلوم ہوا کہ قرآن پڑھتے وقت اعوذ باللہ پڑھنا حکم الٰہی ہے۔ ۲۔ نیز حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وصحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور ساری امت ہمیشہ اس پر عمل کرتی رہی معلوم ہوا کہ یہ پڑھنا سنت ہے۔ ۳۔ نیز جس طرح کہ نماز سے پہلے وضو ضروری۔ ہے کیونکہ وہ جسمانی پلیدی دور کرتا ہے اور انسان کو قابل نماز بناتا ہے اسی طرح تلاوت سے پہلے اعوذ پڑھنا چاہئے کہ یہ اندرونی پلیدی کو دور کرتا ہے اور زبان کو قرآن پاک کی تلاوت کے قابل بناتا ہے۔ ۴۔ نیز جو شخص بادشاہ کے دروازے پر حاضر ہو وہ بغیر اجازت اندر نہیں آسکتا۔ یونہی جو بارگاہ الٰہی میں حاضر ہو وہ بغیر اعوذ پڑھے کچھ عرض نہ کرے۔ گویا اعوذ پڑھنا رب تعالیٰ سے تلاوت کی اجازت لینا ہے۔ ۵۔ نیز حاضری بارگاہ کے وقت درباری لباس جسم پر ہوتا ہے یہ بارگاہ الٰہی میں حاضری کے وقت گویا قلب وزبان کا لباس ہے۔

اعوذ باللہ کی تفسیر

لفظ اعوذ، عوذ سے مشتق ہے۔ اور عوذ کے دو معنی ہیں۔ ا۔ التجا کرنا، پناہ پکڑنا۔ ۲۔ ملنا پہلے معنی کے لحاظ سے اس کا مطلب یہ ہوگا کہ میں پناہ پکڑتا ہوں التجا کرتا ہوں اللہ سے اور دوسرے معنی کی بناء پر مطلب یہ ہوگا کہ میں اپنے نفس کو فضل الٰہی اور رحمت الٰہی سے ملاتا ہوں لفظ اللہ کی تفسیر انشاء اللہ بسم اللہ میں بیان کی جائے گی لفظ شیطان میں دو قول ہیں۔ ا۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ شطن سے مشتق ہے اور ۲۔ بعض کے قول کی بناء پر شیط سے۔ شطن کے معنی ہیں دور ہونا اور چونکہ ابلیس بھی مقرب بارگاہ الٰہی ہو کر وہاں سے دور ہوا اس لئے اس کو شیطان کہا جاتا ہے اور شیط کے معنی ہیں ہلاک ہونا یا باطل ہونا اور چونکہ ابلیس بھی سرکشی کی وجہ سے ہلاک ہوا اور اس کا سارا اچھلا کیا دھرا باطل ہو گیا اس لئے اس کو شیطان کہتے ہیں لفظ رجیم مرجوم کے معنی میں ہے اور مرجوم رجم سے بنا ہے اور رجم کے معنی نکالنے کے بھی ہیں اور پھینک کر مارنے کے بھی اور یہ لعنت (دور کرنا) کے معنی میں بھی آتا ہے اگر پہلے معنی کئے جائیں تو چونکہ پہلے شیطان ملائکہ کے ساتھ رہتا تھا اور وہاں سے اس کو نکالا گیا اور فرمایا فَاخْرُجْ مِنْھَا اس لئے اسے رجیم کہا جاتا ہے دوسرے معنی کی بناء پر یہ توجیہہ ہوگی کہ اب بھی جب کبھی یہ آسمان پر جانے کی

کوشش کرتا ہے تو اس کو شہاب (ٹوٹا ہوا تارہ) پھینک کر مارا جاتا ہے لہٰذا یہ مرجوم ہوا تیسرے معنی کی بناء پر توجیہہ یہ ہوگی کہ اس پر ہمیشہ حق تعالیٰ اور فرشتوں اور انسانوں کی طرف سے لعنت پڑتی ہی رہتی ہے رب تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ (ص:۷۸) اور تجھ پر قیامت تک لعنت ہے۔

عالمانہ تفسیر

عالمانہ تفسیر اس کی یہ ہوگی کہ دنیوی اور دینی آفتیں بے انتہا ہیں اور ہماری طاقت اور قدرت ان کو دور نہیں کرسکتی کیونکہ ہم کمزور ہیں اور جب کمزور شخص کسی بڑی مصیبت میں پھنس جائے تو اس کو ضروری ہوتا ہے کہ وہ کسی قوت والے کی پناہ لے اور اس کی امان میں آئے اور جتنی بڑی آفت ہو اتنی ہی بڑی قوی ذات کے ساتھ پناہ لینا ضروری ہوتا ہے معمولی دشمنوں کو دفع کرنے کیلئے تھانے دار یا پولیس کی پناہ کافی ہوتی ہے اور بڑی مصیبت دفع کرنے کیلئے کپتان پولیس، ڈپٹی کمشنر، گورنر بلکہ بعض صورتوں میں بادشاہ کی پناہ لینا ضروری ہوتا ہے چونکہ شیطان نہایت قوی دشمن ہے اور اس کے مکر وفریب غیر متناہی ہیں، اتنے بڑے دشمن اور اتنی مصیبتوں سے بچنے کیلئے اس ذات کی پناہ لینا ضروری ہے جو قادر مطلق اور حي و قيوم ہے اس لئے انسان سے کہلوایا گیا کہ اے بندے! یہ کہہ کر تو میری پناہ میں آ اور کہہ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ پھر پر لطف بات یہ ہے کہ یہاں یہ نہ کہا گیا کہ شیطان کے کس دھوکا سے پناہ مانگتا ہوں جس میں اشارہ اس جانب ہے کہ اسکے سارے وسوسوں اور خباثتوں سے پناہ مانگتا ہوں تو گویا برے عقائد سے اللہ کی پناہ، برے اعمال سے اللہ کی پناہ، اچھے کام سے باز رہنے سے اللہ کی پناہ، اندرونی اور بیرونی رکاوٹوں سے اللہ کی پناہ، غرض جو چیز اللہ سے روکے اسی سے اللہ کی پناہ۔

صوفیانہ تفسیر

اس کی صوفیانہ تفسیر یہ ہوگی کہ جو چیز بھی سرکش ہو اور ہم کو ذکر الٰہی سے روکے وہ شیطان ہے خواہ جن ہو یا انسان ہو، کوئی چوپایہ یا موذی جانور ہو خواہ ہمارا نفس ہو یا جسمانی اور نفسانی عوارض یا کوئی دنیوی کام اسی لئے قرآن کریم فرماتا ہے کہ شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ (انعام:۱۱۲) اور ایک جگہ فرماتا ہے مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں ایک خچر حاضر کیا گیا جب آپ اس پر سوار ہوئے تو وہ اچھلنے کودنے لگا اس کو بہت مارا مگر وہ اسی طرح کودتا اچھلتا رہا۔ حضرت فاروق رضی اللہ عنہ اس پر یہ کہہ کر اتر آئے کہ یہ شیطان ہے۔ مثنوی شریف میں ہے کہ

نفس ماہم کمتر از فرعون نیست لیک او را عون و ما را عون نیست

اس صورت میں الشیطان میں الف لام جنسی ہے اور مقصود اس کا یہ ہے کہ میں مطلقاً ہر شیطان کے ہر فریب سے اللہ کی پناہ لیتا ہوں اس میں اشارہ اس جانب ہے کہ ہم نہایت کمزور ہیں اور بڑے بڑے قوی دشمنوں میں گھرے ہوئے ہیں۔ نفس، شہوت، غصہ، حرص، حسد، ہوس، طمع وغیرہ اندرونی دشمن ہیں جو ہر وقت ہمارے ساتھ رہتے ہیں اور برے ساتھی دنیوی ضروریات اور عضو کی غلط خواہش، مثلاً آنکھ سے حرام چیز دیکھنے کی خواہش، کان سے حرام چیز سننے کی خواہش، ہاتھ سے حرام کام کرنے کی خواہش، پیر سے حرام کی طرف جانے کی خواہش، یہ تمام خارجی دشمن ہیں تو ایک ضعیف البنیان انسان اور اس

کے پیچھے اتنے خطرناک شیطان، اس اپنی بے کسی اور بے بسی کو دیکھ کر انسان عرض کرتا ہے کہ اے اللہ! تیری پناہ۔ کامل اعوذ یہ ہے کہ بندہ عمل وقول دونوں سے ادا کرے یعنی زبان سے اعوذ باللہ پڑھے اور عملی طور پر برے یاروں اور شیطانی کاموں سے بچے جو شخص زبان سے اعوذ باللہ پڑھا کرے مگر برے کاموں سے نہ بچے اس کا اعوذ باللہ پڑھنا ناقص ہے۔ **فکتہ:** کسی مصیبت میں دینی و دنیوی نبی یا ولی یا مرشد یا دنیوی حاکم کی پناہ پکڑنا اعوذ باللہ کے خلاف نہیں۔ کیونکہ ان کی پناہ حقیقت میں رب کی پناہ ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ان کی بارگاہوں میں جانے والا رب سے پھر گیا دیکھو رازق اور مددگار رب ہے لیکن پھر بھی رزق تلاش کرنے کیلئے مالداروں اور بادشاہوں کی نوکری کرتے ہیں پھر وہاں سے روپیہ حاصل کر کے بہت سی دکانوں پر جاتے ہیں کہیں سے خوراک کہیں سے پوشاک وغیرہ حاصل کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ ہم نے خدا کو چھوڑ کر ان کو رازق سمجھ لیا بلکہ خدا ہی کا رزق تلاش کرنے اسی کے حکم سے ان جگہوں پر جاتے ہیں یہ اس کے رزق کے دروازے ہیں اسی طرح شیطان سے بچنے کیلئے پیر کے پاس جانا، بزرگوں کی خدمت میں حاضر ہونا، نبی کے دامن میں چھپنا یہ سب اس اعوذ باللہ پر ہی عمل ہے۔ مثنوی شریف میں ہے کہ ؎

پیر را بگزیں کہ بے پیر ایں سفر ہست بس پر آفت و خوف خطر

دوسری بات یہ بھی ہے کہ اللہ کی پناہ میں انسان جب آسکتا ہے کہ جب کوئی اس پناہ میں لانیوالا ہو جج کی پناہ میں وہ شخص آئے گا جس کو وکیل یا مختار اس کی پناہ تک پہنچائے تو انبیائے کرام اور اولیائے عظام کے پاس آنا حقیقت میں اللہ کی پناہ میں آنے کا ذریعہ ہے۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس کی پوری بحث اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ اور جاء وک کے تحت آئیگی۔

اعوذ باللہ کے الفاظ

امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما کے نزدیک اعوذ باللہ کے یہ الفاظ ہونے چاہئے۔ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ کیونکہ قرآن پاک میں انہی الفاظ کے ساتھ حکم دیا گیا ہے لیکن امام احمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اس طرح پڑھنا بہتر ہے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ امام ثوری اور امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ اس طرح پڑھے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ اللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ اور بعض روایتوں میں آتا ہے کہ حضرت جبریل نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا کہ آپ اس طرح پڑھئے اَسْتَعِيْذُ بِاللّٰهِ السَّمِيْعِ الْعَلِيْمِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ لیکن حنفیوں کو چاہئے کہ پہلی اعوذ پڑھا کریں۔

اعوذ باللہ کے نکتے

اعوذ باللہ پڑھنے میں چند نکتے ہیں۔ **پہلا نکتہ:** اعوذ باللہ پڑھنا گویا خلق سے خالق کی طرف رجوع کرنا ہے اور یہ تصوف کی پہلی سیڑھی ہے۔ **دوسرا نکتہ:** اعوذ پڑھنے میں اپنی مجبوری اور بے بسی اور رب تعالیٰ کی قدرت کا اقرار ہے اور یہ نفس کے پہچاننے کی پہلی منزل ہے مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ۔ **تیسرا نکتہ:** شیطان انسان کا دشمن ہے اور

رب تعالیٰ انسان کا مولیٰ ہے مولیٰ کے پاس حاضری دینے میں دشمن راستہ قطع کرتا ہے تو انسان پکار کر عرض کرتا ہے کہ اے مولیٰ تو ہی مجھے شیطان سے بچالے اور اپنی بارگاہ میں حاضر فرمالے اور انسان تصوف کی منزل جب ہی طے کر سکتا یہ جب ادھر سے طلب ہو۔ **چوتھا نکتہ:** قرآن کریم فرماتا ہے کہ قرآن کو نہ چھوئیں مگر پاک لوگ تو قرآن پاک کی جلد کو پاک ہاتھ چھوئے اور قرآن پاک کی عبارت کو پاک زبان چھوئے اور قرآن پاک کے مضامین کو پاک دل چھوئے اور اعوذ زبان و دل کی طہارت ہے شرک کرنیوالا گویا قلبی جنبی ہے اور گنہگار گویا قلبی بے وضو ہے اور اعوذ آب رحمت کا دریا ہے کوئی بھی آ کر اس میں غوطہ لگائے پاک ہو جائے گا۔ **پانچواں نکتہ:** مومن کا دل حق تعالیٰ کا تجلی گاہ ہے اور حق تعالیٰ کا باغ اور اس کا تخت ہے جیسا کہ حدیث قدسی میں آیا ہے اور جنت ہمارا باغ ہے حق تعالیٰ نے جنت سے ہماری وجہ سے شیطان کو نکالا اور فرمایا فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيمٌ (الحجر: ۳۴) لہٰذا لازم ہے کہ ہم حق تعالیٰ کے باغ یعنی اپنے دل سے اس کے لئے شیطان کو نکالیں کیونکہ میزبان کیلئے ضروری ہے کہ مہمان کی خاطر گھر صاف کرے مگر چونکہ ہم اس کے نکالنے پر مستقل قادر نہ تھے تو اس میں اس کی امداد لی اور پڑھا اعوذ باللہ۔ **چھٹا نکتہ:** رب تعالیٰ فرماتا ہے إِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ (فاطر: ۱۰) بارگاہ الٰہی میں پاک کلمے قبول ہوتے ہیں قرآن پاک کی ساری عبارت فی نفسہ پاک ہے لیکن اگر پڑھنے والا پاک نہ ہو تو اس کی گندگی کی وجہ سے یہ پڑھنا بارگاہ الٰہی میں قبول نہ ہوگا تو اعوذ سے اپنے آپ کو پاک کر کے اس کی تلاوت کو قابل قبول بناتا ہے اگر زیادہ تفصیل دیکھنی ہو تو "بستان التفاسیر" اور "تفسیر کبیر" اور "روح البیان" وغیرہ کا مطالعہ کرو۔

اعوذ باللہ کے فضائل و فوائد: پہلی فضیلت

تقریباً تمام انبیاء اور اولیاء نے مختلف عبارتوں سے اعوذ باللہ پڑھی ہے چنانچہ حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کیا إِنِّي أَعُوذُ بِكَ أَنْ أَسْأَلَكَ مَا لَيْسَ لِي بِهِ عِلْمٌ (ہود: ۴۷) حضرت یوسف علیہ السلام نے زلیخا سے ارشاد فرمایا مَعَاذَ اللَّهِ إِنَّهُ رَبِّي (یوسف: ۲۳) اور اپنے بھائیوں سے فرمایا مَعَاذَ اللَّهِ أَنْ نَأْخُذَ إِلَّا مَنْ وَجَدْنَا (یوسف: ۷۹) الآیۃ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا أَعُوذُ بِاللَّهِ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْجَاهِلِينَ (البقرہ: ۶۷) اور فرمایا إِنِّي عُذْتُ بِرَبِّي وَرَبِّكُمْ أَنْ تَرْجُمُونِ (الدخان: ۲۰) اور حضرت مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی والدہ نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا إِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ (آل عمران: ۳۶) اور حضرت مریم رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے حضرت جبریل امین کو مرد کی شکل میں دیکھ کر فرمایا إِنِّي أَعُوذُ بِالرَّحْمَٰنِ مِنْكَ (مریم: ۱۸) الآیۃ ہمارے حضور علیہ السلام کو رب تعالیٰ نے بار بار اعوذ پڑھنے کا حکم دیا۔ کہیں فرمایا قُلْ رَبِّ أَعُوذُ بِكَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ (مومنون: ۹۷) الخ کہیں فرمایا فَاسْتَعِذْ بِاللَّهِ (اعراف: ۲۰۰) کہیں فرمایا قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور کہیں قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ وغیرہ وغیرہ ان آیات سے معلوم ہوا کہ انبیاء کرام نے ہر مصیبت کے موقع پر اعوذ باللہ پڑھی ہے۔ **دوسری فضیلت:** احادیث شریفہ بھی اس بارے میں بہت وارد ہیں۔ چنانچہ ایک شخص پر غصہ بہت وارد تھا اور منہ سے جھاگ نکل رہے تھے حضور علیہ السلام نے فرمایا اگر یہ شخص

اعوذ باللہ پڑھ لے تو اس کی یہ حالت دور ہو جائے معلوم ہوا کہ اعوذ پڑھنے سے غصہ دور ہوتا ہے جو ہزار گناہوں کی جڑ ہے۔ ''بستان التفاسیر'' میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص روزانہ دس بار اعوذ باللہ پڑھ لیا کرے حق تعالیٰ اس پر ایک فرشتہ مقرر فرما دیتا ہے جو کہ اس کو شیطان سے بچاتا ہے۔ ''تفسیر روح البیان شریف'' نے اسی اعوذ باللہ کی تفسیر میں فرمایا کہ حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں جو حضور قلب کے ساتھ اعوذ باللہ پڑھے تو رب اس کے اور شیطان کے درمیان تین سو پردے حائل کر دیتا ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اعوذ کو مختلف عبارتوں کے ساتھ بہت سے فائدوں کے ساتھ دعاؤں میں ورد فرمایا ہے چنانچہ مشکوۃ شریف میں استعاذہ (اعوذ پڑھنا) کا ایک باب باندھا ہے۔ چنانچہ جو شخص صبح و شام یہ پڑھے اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ تو زہریلی چیزوں سے انشاء اللہ محفوظ رہے گا نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امام حسن اور امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کیلئے یہ دعا پڑھتے تھے اُعِيْذُ كُمَا بِكَلِمٰتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ شَرِّ كُلِّ شَيْطَانٍ وَّ هَامَّةٍ وَ مِنْ كُلِّ عَيْنٍ لَامَّةٍ اور فرماتے ہیں کہ میرے جد امجد حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے فرزندوں اسماعیل اور اسحاق علیہما السلام کو اس دعا سے تعویذ فرماتے تھے۔ (بستان التفاسیر) اس سے معلوم ہوا کہ اگر بچوں کو اس دعا کا تعویذ پہنایا جائے یا اس دعا سے دم کیا جائے تو انشاء اللہ وہ بچے ہر بلا سے محفوظ رہیں گے مشکوۃ شریف کے اسی باب میں ہے کہ حضور علیہ السلام پڑھا کرتے تھے اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْهَمِّ وَ الْحُزْنِ وَ الْعِجْزِ وَالْكَسْلِ وَالْجُبْنِ وَالْبُخْلِ وَضِلَعِ الدَّيْنِ وَ غَلَبَةِ الرِّجَالِ اس کا پڑھنے والا انشاء اللہ دنیوی رنج و غم اور مجبوری اور بزدلی اور قرض اور دشمنوں کے غلبے سے محفوظ رہے گا نیز حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یہ پڑھا کرتے تھے اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْبَرَصِ وَ الْجَذَامِ وَالْجُنُوْنِ وَ مِنْ سَيِّءِ الْاَسْقَامِ انشاء اللہ تعالیٰ اس کا پڑھنے والا جذام اور دیوانگی اور بری مرض سے محفوظ رہے گا مشکوۃ شریف کے اسی باب میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ جو شخص سو کر اٹھے تو یہ دعا پڑھ لیا کرے اَعُوْذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّةِ مِنْ غَضَبِهٖ وَ عِقَابِهٖ وَ شَرِّ عِبَادِهٖ وَ مِنْ هَمَزَاتِ الشَّيٰطِيْنِ وَ اَنْ يَّحْضُرُوْنَ سیدنا عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنے سمجھدار بچوں کو یہ دعا حفظ کرا دیتے تھے اور نابالغ بچوں کے گلے میں اس کا تعویذ بنا کر ڈال دیتے تھے تعویذ لکھنے اور گلے میں ڈالنے کا ثبوت ہوا اس کی پابندی کرنے والا انشاء اللہ تعالیٰ جنات اور انسان کی شرارت اور رب تعالیٰ کے غضب سے محفوظ رہے گا غرض کہ اعوذ بہت سی دعاؤں میں کام آتا ہے۔ اگر اس کی زیادہ تحقیق منظور ہو تو مشکوۃ شریف باب الاستعاذہ کا مطالعہ کرو۔

اعوذ باللہ کے متعلق فقہی مسائل

تلاوت کرنے والے کیلئے تلاوت سے پہلے اعوذ باللہ پڑھنا سنت ہے اس طرح کہ اول اعوذ باللہ پڑھے پھر بسم اللہ۔ **مسئلہ**: مقتدی اعوذ نہ پڑھے گا کیونکہ وہ امام کے پیچھے قرات نہ کرے گا۔ **مسئلہ**: استاد کو قرآن سنانے والے کے لئے اعوذ پڑھنا سنت نہیں کیونکہ وہ تلاوت نہیں کر رہا بلکہ قرآن سیکھ رہا ہے۔ **مسئلہ**: عید کی نماز میں امام پہلی تکبیر کے بعد فقط

سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ پڑھے اور چوتھی تکبیر کے بعد اعوذ باللہ پڑھ کر قرات شروع کرے کیونکہ یہی وقت قرات کا ہے۔

مسئلہ: بعض لوگوں کے نزدیک تلاوت کے وقت اعوذ باللہ پڑھنا واجب ہے اور بعض کے نزدیک تلاوت کے بعد پڑھنا واجب ہے وہ لوگ اس آیت کے ظاہری معنی پر عمل کرتے ہیں فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ (النحل:۹۸) وہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں قرآن پاک پڑھنے کے بعد اعوذ پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے اور خدا کے حکم پر عمل کرنا واجب ہے۔تفسیر کبیر اعوذ کی بحث۔لیکن صحیح پہلی بات ہے یعنی اعوذ پڑھنا قرآن پاک پڑھنے سے پہلے سنت ہے جیسے قرآن پاک فرماتا ہے۔اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ (مائدہ:۶) الخ یعنی جب کھڑے ہو تم نماز کی طرف تو وضو کرلو مطلب یہ نہیں کہ نماز پڑھ کر وضو کرو بلکہ مطلب یہ ہے کہ جس وقت نماز کا ارادہ کرو اور وہی اس جگہ مراد ہے اسی طرح رب فرماتا ہے فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (النساء:۳) دیکھو نکاح کرنے کا حکم قرآن پاک میں ہے لیکن بسا اوقات یہ نکاح سنت ہوتا ہے۔

مسئلہ: بعض روایتوں میں آتا ہے کہ پہلی وحی میں حضرت جبریل امین نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا کہ آپ اس طرح فرمائیے استعیذ باللہ السمیع العلیم من الشیطن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم○ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّکَ الَّذِیْ خَلَقَ اس سے ظاہر یہ ہوتا ہے کہ اعوذ باللہ بھی قرآن پاک کی آیت ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت نہیں بلکہ جبریل علیہ السلام نے برکت کے واسطے یہ پڑھائی۔اور یہ آیت قرآن اقراء سے شروع ہوئی واللہ اعلم بالصواب۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
ساتھ نام اللہ بہت مہربان رحمت والا
بہت مہربان رحمت والے اللہ کے نام سے شروع

بسم اللہ کے متعلق چند باتیں غور کرنے کی ہیں ایک یہ کہ اس کا تعلق اعوذ باللہ سے کیا ہے۔دوسرے یہ کہ اس میں نکات کیا ہیں تیسرے اس کے فضائل وفوائد کیا ہیں چوتھے اس کے متعلق فقہی مسائل۔

تعلق: بسم اللہ کا اعوذ باللہ سے دو طرح کا تعلق ہے ایک تو یہ کہ اعوذ باللہ میں ماسوی اللہ سے علیحدگی تھی اور بسم اللہ میں اللہ کی طرف توجہ اور ماسوی اللہ سے علیحدگی۔تو جہ الی اللہ سب پر مقدم ہے اس لئے اعوذ باللہ بسم اللہ پر مقدم ہے دوسرے یہ کہ اعوذ باللہ میں برے عقائد اور برے اعمال وغیرہ سے پرہیز ہے اور بسم اللہ میں اچھے عقائد اور اچھے اعمال وغیرہ کو رب سے حاصل کرنا ہے تو گویا وہ پرہیز تھا یہ علاج ہے اور پرہیز علاج پر مقدم ہے پہلے بیماری کو دفع کرو پھر مقویات کا استعمال کرو لہٰذا اعوذ پہلے پڑھو اور بسم اللہ بعد میں۔

نکات

بسم اللہ کے نکات میں دو قسم کے نکات ہیں ایک تو خود بسم اللہ۔کہ ہر کام کے شروع میں کیوں پڑھی جاتی ہے دوسرے بسم اللہ کے الفاظ میں یعنی ب۔اسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں کیا نکات ہیں۔**پہلا نکتہ:** کفار عرب اپنے ہر کام کو بتوں کے نام سے

شروع کرتے تھے چنانچہ کہا کرتے تھے کہ بسم اللات والعزی لہٰذا ضروری ہوا کہ مومن مسلمان اپنے ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرے تاکہ کفار کی مخالفت ظاہر ہو فائدہ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان کا ہر عمل کفار کے مخالف چاہئے۔ ان سے محبت اور مشابہت بہت بری چیز ہے۔ **دوسرا نکتہ:** جس کام کی ابتداء اچھی ہو اس کی انتہا بھی اچھی ہوتی ہے بچے کے پیدا ہوتے ہی اس کے کان میں اذان کہی جاتی ہی تاکہ اس کی ابتداء اللہ کے نام پر ہو اور اس کی تمام زندگی بخیریت گزرے دکاندار دکان کی پہلی بکری ادھار نہیں کرتا بلکہ نقد پیسے مانگتا ہے تاکہ سارا دن تجارت کیلئے اچھا گزرے اسی طرح مسلمان کو ضروری ہے کہ اپنے ہر کام کی ابتداء اللہ تعالیٰ کے نام سے کرے تاکہ بخیر وخوبی انجام کو پہنچے۔ **تیسرا نکتہ:** سرکاری مال پر کوئی سرکاری علامت لگا دی جاتی ہے تاکہ چور اس کو لیتے ہوئے خوف کرے اور چرا نہ سکے کیونکہ سرکاری مال کی چوری ایک قسم کی بغاوت ہے اسی طرح مسلمان کو چاہئے کہ اپنے ہر کام کے اول بسم اللہ پڑھ دے تاکہ یہ بسم اللہ رب العالمین کی نشانی ہی بن جائے اور شیطان چور اس میں اپنا دخل نہ دے سکے اور حدیث پاک میں آتا بھی ہے کہ جس کام کے اول میں بسم اللہ نہ پڑھی جائے اس میں شیطان شریک ہو جاتا ہے اور بسم اللہ کے پڑھ لینے سے وہ کام شیطان سے محفوظ رہتا ہے اس کی پوری بحث بسم اللہ کے فوائد میں آئے گی۔ **چوتھا نکتہ:** آدمی جس کا ذکر کرتا ہے اس کو اسی کے ساتھ رکھا جاتا ہے انسان بسم اللہ زیادہ پڑھے تو انشاء اللہ دونوں جہان میں رحمت الٰہی اس کے ساتھ رہے گی تفسیر کبیر شریف نے بسم اللہ کے ماتحت ایک روایت بیان فرمائی کہ ایک مرتبہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اپنی انگوٹھی عطا فرمائی اور فرمایا کہ اس پر کسی نقاش سے **لا الہ الا اللہ** لکھوا دو صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقاش کے پاس لے گئے اور فرمایا کہ اس پر لکھ دے **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ** نقاش نے یہی لکھ دیا جب وہ انگوٹھی بارگاہ رسالت میں پیش ہوئی تو اس پر لکھا تھا **لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ابوبکر صدیق** ارشاد فرمایا اے ابوبکر یہ زیادتی کیسی؟ عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کے نام کو تو میں نے بڑھایا تھا میں نے نہ چاہا کہ رب کے اور آپ کے نام میں جدائی ہو جائے (یعنی رب کا ذکر ہو اور آپ کا ذکر نہ ہو) لیکن اپنا نام میں نے نہیں بڑھایا یہ عرض معروض ہو رہی تھی کہ جبریل امین حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ صدیق کا نام میں نے لکھا ہے کیونکہ صدیق اس سے راضی نہ ہوئے کہ آپ کا نام خدا کے نام سے علیحدہ ہو خدا تعالیٰ اس سے راضی نہ ہوا کہ صدیق کا نام آپ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نام سے علیحدہ ہو تو خدا پاک توفیق عطا فرمائے کہ ہم اس کا ذکر اس کے حبیب علیہ السلام کے ذکر کے ساتھ کیا کریں۔ **پانچواں نکتہ:** دنیا کے سارے کام حقیقت میں انسان کیلئے زہر قاتل ہیں کیونکہ یہ رب تعالیٰ سے غافل کرنے والے ہیں اور اس کا تریاق رب کا نام ہے تو جو انسان رب کے نام سے سارے کام شروع کرے گا، خدا چاہے تو اس کا کوئی کام غفلت پیدا نہ کرے گا۔ **چھٹا نکتہ:** جب کوئی فقیر کسی امیر کے دروازے پر جاتا ہے تو بھیک مانگنے کی غرض سے اس کی تعریف شروع کر دیتا ہے جس سے کہ امیر سمجھ جاتا ہے کہ یہ بھکاری ہے میری تعریفیں کر کے مجھ سے مانگنا چاہتا ہے تو گویا فقیر کا یہ کہنا کہ گھر والا بڑا سخی داتا ہے، مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ کچھ دلوا دو اسی طرح جب انسان کوئی کام شروع کرتا ہے تو چاہتا ہے کہ رب

تعالیٰ سے اس میں مدد مانگے اور اس کے پورا کرنے اور درست کرنے کی توفیق مانگے تو صاف صاف تو نہیں کہتا۔ رب کی تعریفیں کرتا ہے اور اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ میرے اس نام لینے کی لاج تیرے ہاتھ ہے۔ تو ہی اس بیڑے کو پار لگانے والا ہے۔ فقیر حقیر احمد یار خان اپنے رب قدیر کی بارگاہ میں اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واسطہ پیش کرتا ہے کہ مولا! کہاں مجھ جیسا ضعیف البیان انسان اور کہاں تفسیر قرآن تیرے ہی نام سے اور تیرے ہی بھروسے پر اس کام کو شروع کیا ہے تو ہی اس کو درست فرمانے والا ہے اور بخیر وخوبی انجام پہنچانے والا ہے۔ **ساتواں نکتہ:** انسان کو چاہئے کہ ہر وقت اپنی عاجزی اور کمزوری اور نیاز مندی اور رب تعالیٰ کی قدرت اور رحمت اور بے نیازی پر نگاہ رکھے تاکہ بڑے سے بڑا کام کرنے پر بھی اس کے دل میں یہ غرور پیدا نہ ہو کہ میں نے اتنا بڑا کام کر لیا بلکہ یہ خیال رہے کہ جو کچھ کیا رب نے کیا اس کا فضل تھا کہ مجھ سے کرالیا اور یہ بات جب ہی حاصل ہوگی جب کہ ہر وقت مولا کی طرف دھیان رہے لہٰذا جب کہ ہر کام کے شروع ہی میں بسم اللہ پڑھ لے گا تو انشاء اللہ کبھی اس میں ''میں'' نہ پیدا ہوگی بلکہ ''تو ہی تو'' میں فنا رہے گا۔ بسم اللہ کے حروف کے نکات۔ بسم اللہ کو ب سے شروع کیا گیا اور اسم کے الف کو گرا دیا حالانکہ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ میں اگرچہ الف پڑھنے میں نہیں آتا مگر لکھنے میں آتا ہے اس کی وجہ کیا ہے اس میں چند حکمتیں ہیں۔

حکمتیں

پہلی حکمت: انسان نے عالم ارواح میں پیدا ہو کر سب سے پہلے لفظ بلٰے بولا تھا یعنی رب تعالیٰ نے فرمایا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں سب نے عرض کیا بلٰے یعنی ہاں ہے تو سب سے پہلے انسان کے منہ سے ب نکلی رب تعالیٰ نے اپنے کام کو ب سے شروع کیا تاکہ قرآن پاک پڑھتے ہی وہ عہد و میثاق یاد آ جائے۔ **دوسری حکمت:** خدا پاک کا نام بر اور بار اور باری بھی ہے اور یہ ب سے شروع ہوتے ہیں تو گویا اس میں رب تعالیٰ کے بہت سارے ناموں کی طرف اشارہ بھی ہو گیا۔ **تیسری حکمت:** نحوی قاعدے سے ب ملانے کیلئے آتی ہے اور قرآن کی تلاوت کرنے والا بھی رب سے ملنا ہی چاہتا ہے اور الف بے تعلقی چاہتا ہے اس لئے وصل کی حالت میں گر جاتا ہے تو یہ چونکہ ملنے کا وقت ہے اس لئے ب سے ابتداء کی گئی۔ **چوتھی حکمت:** ب میں انکسار ہے اور الف میں بلندی ہے لکھنے میں اور بولنے میں بھی لہٰذا بندے کے اظہار عاجزی کیلئے ب ہی مناسب ہے **اسم** جہاں بسم اللہ کہا گیا باللہ نہ کہا گیا جس کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ کے نام سے شروع کر رہا ہے کیونکہ ابھی بندے کی ابتدائی حالت ہے اولاً نام تک تو پہنچ لے بعد کو ذات تک پہنچے گا۔ **دوسرا نکتہ:** یہ ہے کہ اس میں اس جانب اشارہ ہے کہ جس طرح اللہ کی ذات سے برکت اور مدد حاصل کی جاتی ہے، اسی طرح اللہ کے نام یعنی لفظ اللہ سے بھی برکت اور مدد حاصل کی جا سکتی ہے حالانکہ لفظ اللہ رب نہیں یہ تو کچھ حروف کا مجموعہ ہے جب الف و لام و الف اور ہ سے مدد اور برکت لینا جائز ہے تو اللہ کے پیاروں سے مدد لینا بھی بدرجہ اولیٰ جائز ہے کیونکہ وہ ان حرفوں سے تو کم نہیں۔ نکتہ مجھ سے بعض بزرگوں نے فرمایا کہ اسم اللہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھی نام پاک ہے جیسے کہ ذکر

اللہ بھی حضور علیہ السلام کا نام ہے۔ دیکھو دلائل الخیرات شریف اور حضور علیہ السلام کو اسم اللہ اس لئے کہتے ہیں کہ اسم وہ ہوتا ہے جو ذات کو بتائے اور ذات پر دلالت کرے اور حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے بھی اللہ کی ذات کو ظاہر کیا رب تعالیٰ حضور علیہ السلام کا خالق ہے اور حضور علیہ السلام اس کے مظہر اتم۔

؎ جب محمد ہوئے رسول اللہ تب کھلا لا الہ الا اللہ (ﷺ)

نیز بقاعدہ نحوی اسم پر سارے فعل اعتماد کرتے ہیں اور وہ کسی پر اعتماد نہیں کرتا۔ دیکھو مارا کا اعتماد زید پر ہے نہ کہ زید کا اعتماد مارا پر یعنی زید ہو تو "مار" پائی جائے نہ یہ کہ مار افعل ہو تو زید پایا جائے اسی طریقے سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سارے عالم کا اعتماد ہے اعتماد کو بھی آپ پر اعتماد ہے لیکن آپ کو بجز پروردگار کی ذات کے کسی پر اعتماد نہیں۔ نیز بقاعدہ نحوی اسم فعل کا محتاج نہیں بلکہ فعل اسم کا حاجت مند ہے یعنی فعل بغیر اسم کے ملے ہوئے جملہ (پوری بات) نہیں بن سکتا اور اسم بغیر فعل کے جملہ بن سکتا ہے۔ اسی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عالم میں کسی کے حاجت مند نہیں بلکہ سارا عالم ان کا محتاج ہے کہ وہ نہ ہوتے تو کچھ بھی نہ ہوتا۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ بقاعدہ تصوف کہاں کا اسم اور کہاں کا فعل یہ سب اعتبارات ہیں اصل حقیقت محمد یہ ہی ہے۔ یہ سب اس کے پرتو (سائے) ہیں اعلیٰ حضرت نے کیا خوب فرمایا۔

؎ وہی جلوہ شہر بہ شہر ہے وہی اصل عالم و دہر ہے وہی بحر ہے وہی لہر ہے وہی پاٹ ہے وہی دھار ہے

پانی ایک ہی ہے مگر الگ الگ اعتبارات سے الگ نام، کنارہ، دھار، پاٹ، موج، نہر، نالہ، دریا، سمندر پھر فرماتے ہیں۔

وہ نہ تھا تو باغ میں کچھ نہ تھا، وہ نہ ہو تو باغ ہو سب فنا!
وہی جان ہے جان سے ہے بقاء وہی بن ہے بن ہی سے بار ہے

فرماتے ہیں۔

؎ بادب جھکا لو سر ولا کہ میں نام لوں گل و باغ کا گل تر محمد مصطفیٰ چمن ان کا پاک دیار ہے!

یہ بہت اچھی تاویل ہے اور کسی قاعدہ شرعیہ کے خلاف نہیں۔ اب آگے جو الرحمٰن اور الرحیم آ رہا ہے وہ یا تو اللہ کی صفت ہو یا لغوی معنی میں اسم اللہ کی یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی۔ اور حضور علیہ السلام کو رحیم تو قرآن نے فرمایا ہے رہا لفظ رحمٰن اس کے متعلق گزارش یہ ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے مدارج میں فرمایا کہ حضور تمام صفات الٰہیہ سے موصوف ہیں۔

نیز قرآن نے فرمایا وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (انبیاء: ۱۰۷) "تفسیر کبیر" کے شروع میں بسم اللہ کے ماتحت ہے کہ حق تعالیٰ کے تین ہزار نام ہیں جن میں سے ایک ہزار کو **ملائکہ** جانتے ہیں۔ اور ایک ہزار صرف انبیاء کرام اور باقی ایک ہزار میں سے تین سو نام توراۃ شریف میں اور تین سو انجیل میں اور تین سو زبور میں اور ننانوے نام قرآن پاک میں ہیں اور ایک نام وہ ہے جس کو صرف حق تعالیٰ ہی جانتا ہے لیکن بسم اللہ میں حق تعالیٰ کے جو تین نام آئے ان تین میں ان تین ہزار کے معنی پائے جاتے ہیں لہٰذا جس نے ان تین ناموں سے حق تعالیٰ کو یاد کر لیا گویا اس نے تمام ناموں سے اس کو یاد کیا ان

تمام ناموں میں لفظ اللہ حق تعالیٰ کا ذاتی نام ہے اور باقی اسمائے صفاتیہ ذاتی نام اسے کہتے ہیں جو کہ صرف ذات کو بتائے اور صفاتی نام وہ کہلاتے ہیں جو کہ ذات کے ساتھ صفت کی طرف بھی اشارہ کریں جیسے ایک آدمی کا نام عبداللہ خان ہے لیکن وہ مولوی بھی ہے اس واسطے اسے عالم کہتے ہیں اور چونکہ قرآن پاک بھی اس نے حفظ کیا ہے لہٰذا اسے حافظ بھی کہتے ہیں قرأت بھی سیکھی ہے اس واسطے اس کو قاری بھی کہتے ہیں زمین کا مالک بھی ہے لہٰذا اس کو زمیندار بھی کہتے ہیں تو عبداللہ تو اس کا ذاتی نام ہوا کیونکہ اس نے فقط اس کی ذات کو بتایا علم اور قرأت اور حفظ وغیرہ کی طرف اشارہ نہ کیا اور دوسرے نام اس کے صفاتی نام ہیں اس طرح لفظ اللہ فقط اس کی ذات کو بتاتا ہے اور باقی علیم، قدیر، رحمٰن اور رحیم وغیرہ اس کی صفات کی طرف اشارہ کرتے ہیں اسم ذات کی پہچان چند ہیں ایک تو یہ کہ وہ نام نام والے کے ساتھ خاص ہو دوسرے کی اس میں شرکت نہ ہو۔ دیکھو جو بھی علم سیکھ لے اسے عالم اور جو بھی قرآن پاک حفظ کر لے اسے حافظ کہا جائے گا لیکن اس علم اور حفظ کی وجہ سے کسی کو عبداللہ خان نہ کہا جائے گا۔ اس لئے قرآن کریم میں حق تعالیٰ کے بعض صفاتی نام رؤف، رحیم وغیرہ غیر اللہ کیلئے بھی استعمال فرمائے گئے لیکن الٰہ کسی کو نہ کہا گیا۔ دوسرے یہ کہ اسم ذات کبھی کسی اسم کی صفت بن کر نہیں آتا بلکہ صفتوں کا موصوف بن کر آتا ہے یہ کہہ سکتے ہیں کہ عبداللہ خان عالم۔ فاضل۔ حاجی۔ قاری ہیں یہ نہیں کہہ سکتے کہ حاجی صاحب عبداللہ خان ہیں اسی طرح قرآن پاک میں ہر جگہ لفظ اللہ موصوف بن کر تو آیا مگر کسی اسم کی صفت نہ بنا تیسری پہچان یہ ہے کہ اسماء صفات میں زیادتی کمی کا احتمال ہوتا ہے مگر اسم ذات میں یہ احتمال نہیں مثلاً یہ کہہ سکتے ہیں کہ فلاں شخص فلاں شخص سے زیادہ عالم ہے اس سے زیادہ قاری اس سے زیادہ مالدار لیکن یہ نہیں کہہ سکتے اس سے زیادہ عبداللہ ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ کے دوسرے بعض ناموں میں تفضیل وغیرہ کے صیغے بن سکتے ہیں مثلاً اللہ تعالیٰ عالم بھی ہے اور علام بھی قادر اور قدیر بھی ہے لیکن لفظ اللہ کا تفضیل بنے نہ مبالغہ اور نہ صفت مشبہ وغیرہ اس فرق کا بہت خیال چاہئے۔ اس میں اختلاف ہے کہ اللہ کسی اور لفظ سے بنا ہے یا نہیں (مشتق ہے یا جامد) بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ یہ مشتق ہے اور بعض کہتے ہیں کہ جامد مشتق کہنے والے فیصلہ یقینی نہ کر سکے کہ کس لفظ سے مشتق ہے بعض نے فرمایا کہ الہ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں سکون اور چین اور قرار چونکہ حق تعالیٰ کے ذکر سے سب کو چین اور قرار آتا ہے اس لئے اس کا نام اللہ ہے۔ یا اس لئے کہ ہر ممکن چیز واجب پر ختم ہوتی اور قرار پکڑتی ہے تو تمام عالم کے متعلق سوال ہو سکتا ہے کہ اس کو کس نے بنایا لیکن اللہ کے متعلق یہ سوال نہیں ہو سکتا کہ اس کو کس نے بنایا۔ بعض نے فرمایا کہ لفظ ولہ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں حیرانی چونکہ تمام مخلوق اس کی ذات وصفات میں حیران ہے محرومین تو جہالت کی تاریکیوں میں پھنسے ہیں اور واصلین الی اللہ بجز تجلیات نورانی کچھ نہ پا سکے اور اس کی حقیقت کو نہ پہنچ سکے کہ آفتاب۔

؎ حیرت اندر حیرت آمد حیرت اندر حیرت است ہست یا حیرت سراپا کار در سرکار ما!

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہ لاہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں بلندی چونکہ حق تعالیٰ کی ذات تمام ممکنات سے بلند وبالاتر ہے اس لئے اس کو اللہ کہا جاتا ہے بعض کہتے ہیں لفظ اللہ لاہ سے بنا ہے جس کے معنی حجاب کے ہیں (یعنی پردہ) چونکہ حق تعالیٰ کی ذات نظر، خیال، گمان، وہم، عقل، سب سے وراء ہے اس لئے اسے اللہ کہتے ہیں شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے فرمایا۔

؎ اے برتر از قیاس و خیال و گمان و وہم و زہرچہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ ایم

لطف یہ ہے کہ اللہ کی ذات زیادتی ظہور کی وجہ سے چھپ گئی اور کمال نور کی وجہ سے نظر نہ آسکی۔

؎ بے حجابی یہ کہ ہر ذرہ میں جلوہ آشکار اس پہ گھونگٹ یہ کہ صورت آج تک نادیدہ ہے

بعض فرماتے ہیں کہ لفظ اللہ اس الہ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں عاجزی وزاری کرنا ہے چونکہ تمام بندے اس کی بارگاہ میں عاجزی اور زاری کرتے ہیں لہٰذا اسے اللہ کہتے ہیں کبھی کبھی انسان اسباب پر نظر کر لیتا ہے لیکن پھر اس کی انتہاء مسبب الاسباب پر ہی ہوتی ہے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ لفظ اللہ اس الہ سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں گھبرا کر آنا چونکہ تمام مخلوق ہر مصیبت میں آخر کار رب کی طرف پناہ پکڑتی ہے اس لئے اس کا نام اللہ ہے صاحب تفسیر کبیر نے اسی معنی کے ماتحت فرمایا کہ مقروض قرض خواہ کو دیکھ کر بھاگتا ہے۔ لیکن پروردگار ایسا کریم ہے کہ اس کے مقروض بندے اسی کی بارگاہ کی طرف بھاگتے ہیں۔ بلکہ وہ خود بلا رہا ہے فرماتا ہے فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ (الذاریات:۵۰) (بھاگ کر آؤ اللہ کی طرف) بادشاہ مالدار فقراء سے اپنے دروازے بند کرتے ہیں تا کہ فقیر ہمارے پاس نہ آئیں لیکن رب تعالیٰ وہ غنی ہے جس کا دروازہ ہر ایک کیلئے کھلا ہے اور تو بھگاتے ہیں مگر وہ اپنے دروازے کی طرف بلاتا ہے۔ فرماتا ہے اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (غافر:۶۰) (اے بندو! مجھ سے مانگو میں تمہاری بات مانوں گا)۔

حکایت: دو بھائی تھے۔ ایک متقی پرہیز گار دوسرا فاسد و بدکار جب فاسق مرنے لگا تو متقی بھائی نے کہا دیکھا تجھے میں نے بہت سمجھایا مگر تو اپنے فسق و فجور سے باز نہ آیا اب بول تیرا کیا حال ہوگا اس نے جواب دیا کہ اگر قیامت کے روز میرا رب میرا فیصلہ میری ماں کے سپرد کر دے تو بتاؤ کہ ماں مجھے کہاں بھیجے گی۔ دوزخ میں یا جنت میں پرہیز گار بھائی نے کہا کہ ماں تو واقعی جنت میں بھیجے گی گنہگار نے جواب دیا کہ میرا رب میری ماں سے زیادہ مہربان ہے کہا اور انتقال ہو گیا۔ بڑے بھائی نے خواب میں اسے نہایت خوشحال دیکھا۔ مغفرت کی وجہ پوچھی تو کہا کہ میری اسی مرتے وقت کی بات نے میرے تمام گناہ بخشوا دیئے۔

؎ ہم گنہگاروں پہ تیری مہربانی چاہئے سب گناہ دھل جائیں گے رحمت کا پانی چاہئے

اسی وجہ سے اس کو اللہ کہتے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ لفظ اللہ کسی لفظ سے مشتق نہیں جیسے اس کی ذات کسی سے نہیں بنی ایسے ہی اس کا نام کسی لفظ سے نہیں بنا سبحان اللہ! جب اس کے نام میں اتنی حیرانی ہے تو کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ میں نے رب کی حقیقت کو پالیا۔

لفظ اللہ کی خصوصیات

تفسیر کبیر شریف میں بسم اللہ کی تفسیر میں فرمایا کہ لفظ اللہ میں چند خصوصیتیں ہیں ایک یہ کہ لفظ اللہ رب کی ذات پر دلالت کرنے میں حرفوں کا محتاج نہیں الف کو گرا دو تو للہ رہتا ہے۔ وہ بھی ذات کو بتا رہا ہے حق تعالیٰ فرماتا ہے وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (الفتح: ۴) اگر اس کا پہلا لام بھی گرا دو تو لَهٗ کی شکل پر رہتا ہے یہ بھی اسی ذات کو بتا رہا ہے فرماتا ہے لہ الملک ولہ الحمد اگر دوسرا لام بھی گرا دیں تو فقط ہ باقی رہتا ہے۔ وہ بھی ذات کو بتا رہا ہے۔ لا الہ الا ھو جس طرح سے کہ اس کا نام حروف کا محتاج نہیں ایسے ہی اس کی ذات کسی کی محتاج نہیں۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ خدا کے دوسرے اسماء خاص خاص صفتوں پر دلالت کرتے ہیں لیکن لفظ اللہ ساری صفتوں پر جس نے اللہ کہہ کر پکار لیا اس نے گویا ساری صفتوں سے پکارا کیونکہ اللہ وہی ہے جس میں ساری صفتیں موجود ہوں۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ کلمہ طیبہ میں لفظ اللہ ہی داخل ہے جس کو پڑھ کر کافر مومن بنتا ہے اگر کوئی لا الہ الا الرحمٰن کہہ دے یا اس کے دیگر سارے اسموں سے کلمہ پڑھ لے مومن نہ ہوگا مگر لا الہ الا اللہ کہتے ہی دولت ایمان سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ لفظ محمد میں قریب قریب یہ ساری خصوصیتیں موجود ہیں اور اس میں بہت عجیب عجیب نکات موجود ہیں لیکن یہاں اس کے بیان کا موقع نہیں صرف ایک نکتہ عرض کرتا ہوں لفظ ''اللہ'' بولو تو ہونٹ ملتے نہیں۔ مگر لفظ ''محمد'' کے بولتے ہی نیچے کا ہونٹ اوپر والے سے دوبارہ مل جاتا ہے معلوم ہوا کہ ان کا نام نیچوں کو اوپر والے سے ملانے والا ہے اور ان کی ذات مخلوق کو خالق سے ملانے والی ہے تو ان کا نام ان کے کام کو بتا رہا ہے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی خصوصیات انشاء اللہ کسی اور جگہ بیان کی جائیں گی الرحمان الرحیم لفظ رحمان اور رحیم، رحم سے بنا ہے اور رحم کے معنی ہیں دل کا نرم ہونا اور کسی پر مہربانی کرنا عورت کی بچہ دانی کو اس لئے رحم کہتے ہیں کہ وہ اپنے پیٹ کے بچے پہ بہت مہربان ہوتی ہے اور بچہ اس سے بہت انس رکھتا ہے۔ نیز جن لوگوں کا آپس میں رحمی رشتہ ہوتا ہے۔ وہ بھی ایک دوسرے پر مہربان ہوتے ہیں۔ بھائی، بھتیجے، بھانجے یہ سب ایک دوسرے کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرتے ہیں۔ اسی لئے انہیں ذی رحم کہتے ہیں۔ مگر حق تعالیٰ چونکہ دل وغیرہ سے پاک ہے اس لئے یہاں اس کے یہ معنی ہوں گے کہ فضل و احسان فرمانے والا۔ اب رحمان و رحیم کے معنی میں چند طرح کا فرق ہے۔ ایک تو یہ کہ رحمٰن کے معنی سب پر عام رحم فرمانے والا اور رحیم کے معنی خاص خاص پر خاص رحم فرمانے والا۔ دیکھو ہوا، سورج کی روشنی وغیرہ بلا فرق سب کو عطا فرمائی۔ یہاں رحمانیت کی جلوہ گری ہے۔ لیکن حکومت، دولت، ولایت، نبوت یہ سب کو نہ دیئے بلکہ خاص خاص کو دیئے۔ ان میں رحیم کے معنی کا ظہور ہے دوسرے یہ کہ دنیا میں دوست اور دشمن مسلمان اور کافر سب کو اپنی رحمتوں سے نواز ڈالا یہاں صفت رحمٰن کا ظہور ہے مگر آخرت میں خاص خاص مسلمانوں پر رحم اور دشمنوں پر قہر ہوگا تو وہاں صفت رحیم کا ظہور ہوگا تیسرا اس طرح کہ بڑی بڑی نعمتیں سلطنت، حکومت، زمین، جنت اسی سے مانگی جاتی ہے اور وہی دیتا ہے اور چھوٹی چھوٹی نعمتیں بھی اس سے طلب کی جاتی ہیں، حتیٰ کہ اگر کسی کے جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو وہ بارگاہ الٰہی میں عرض کرے کہ خدایا میرا تسمہ ٹوٹ گیا تو عطا فرما تو بڑی نعمتوں کے لحاظ سے رحمٰن اور چھوٹی نعمتوں کے لحاظ سے رحیم اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اگر بڑے بادشاہ سے چھوٹی چیز مانگی جائے تو اس کو ناگوار ہوتی ہے کہ اس میں میری توہین ہوگی اور اگر معمولی مالدار سے بڑی چیز مانگی جائے تو وہ اس کے دینے سے عاجز ہوتا ہے یہ رب تعالیٰ کی ہی شان ہے جو چھوٹی بڑی ہر چیز عطا فرماتا ہے اور کسی چیز کے مانگنے میں ناراض نہیں ہوتا۔ چوتھا فرق یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے بعض نعمتیں بلا واسطہ اور بعض کسی واسطے سے عطا فرمائی ہیں۔ دیکھو ہم کو جان ملی بغیر ماں باپ کے وسیلے

سے مگر جسم اور جسم کی ضروریات ماں باپ اور دوسرے بندوں کے واسطے سے ملی ہیں۔ اسی طرح پانی، ہوا، دھوپ اور چاندنی وغیرہ بغیر کسی واسطے کے عطا فرمائی گئیں۔ لیکن غذا اور دوا لباس وغیرہ بندوں کے واسطے سے عطا فرمایا تو بلاواسطہ نعمتوں کے لحاظ سے اس کو رحمٰن اور بالواسطہ کے لحاظ سے رحیم کہا جاتا ہے پانچواں فرق یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے بعض نعمتیں ہمیشہ کیلئے عطا فرمائیں جیسے جان اور ایمان، عبادت اور نیکیاں اور آخرت کی نعمتیں اور بعض نعمتیں عارضی ہیں جو چند روز کیلئے عطا فرمائی گئیں بعد میں ہمارے پاس نہ رہیں گی جیسے کہ دنیوی زندگی کی ضروریات وغیرہ پہلی نعمتوں کے لحاظ سے اس کا نام رحمٰن اور دوسری نعمتوں کے لحاظ سے رحیم **نکتہ:** حق تعالیٰ نے بسم اللہ میں اپنے اسم ذات کے ساتھ رحمت کی دو صفتوں کو بیان فرمایا اس لئے کہ اللہ کے نام میں ہیبت تھی اور رحمٰن اور رحیم میں رحمت اللہ کا نام سن کر نیک بندوں کو بھی کچھ عرض معروض کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی لیکن رحمان اور رحیم سن کر ہر مجرم اور خطا کار کو بھی عرض کرنے کی ہمت پڑی اور حقیقت بھی یہی ہے کہ اس کے جلال کے مقابلے میں کون دم مار سکتا ہے اور ظہور و جمال کے وقت ہر ایک ناز کر سکتا ہے۔ تفسیر کبیر شریف میں اس کے ماتحت ایک عجیب حکایت لکھی ہے کہ ایک سائل ایک بہت بڑے مالدار کے عظیم الشان دروازے پر آیا اور کچھ سوال کیا مکان میں سے معمولی سی چیز آئی۔ فقیر نے لے لی اور چلا گیا دوسرے دن ایک بہت مضبوط پھاوڑا لے کر آیا اور دروازہ کھودنے لگا مالک نے پوچھا یہ کیا کرتا ہے فقیر نے کہا یا تو عطا کو دروازے کے لائق کر یا دروازہ عطا کے لائق کر یعنی جب دروازہ اتنا بڑا بنایا ہے تو ضروری ہے کہ بڑے دروازے سے بڑی ہی بھیک ملا کرے کیونکہ عطا دروازے اور نام کے لائق ہونی چاہئے۔ ہم فقیر گنہگار بندے بھی عرض کرتے ہیں اے مولا! ہم کو ہمارے لائق نہ دے بلکہ اپنے جود و سخا کے لائق دے۔ بیشک ہم گنہگار ہیں لیکن تیری غفاری ہماری گنہگاری سے بڑی ہے۔

؎ گناہ رضا کا حساب کیا وہ اگرچہ لاکھوں سے ہیں سوا مگر اے عفو تیرے عفو کا نہ حساب ہے نہ شمار ہے

حق تعالیٰ کے نام ہیں توفیقی یعنی شریعت میں جو نام ہے اسی نام سے اس کو یاد کیا جائے اپنی طرف سے حق تعالیٰ کا نام تجویز نہیں کیا جا سکتا لہٰذا خدا کو رام یا پرمیشور یا گاڈ وغیرہ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ یہ نام شریعت سے ثابت نہیں ہاں خدا کی صفتوں کو اپنی زبان سے جس طرح چاہیں بیان کریں۔ مثلاً اس کو پروردگار یا خدا یا اللہ پاک کہیں یہ الفاظ رب کے نام نہیں بلکہ اس کی صفات کے ترجمے ہیں لفظ خدا مالک کا ترجمہ ہے اور پروردگار رب کا۔

بسم اللہ کے فضائل اور فوائد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے فضائل و فوائد بیشمار ہیں جن میں سے کچھ عرض کئے جاتے ہیں ایک یہ کہ قرآن پاک کی کنجی ہے بلکہ ہر دنیوی اور دینی جائز کام کی بھی کنجی ہے کہ جو کام اس کے بغیر کیا جائے ناقص رہتا ہے دوسرے یہ کہ تفسیر روح البیان شریف میں بسم اللہ کے ماتحت ایک حدیث نقل فرمائی کہ جب حضور علیہ السلام معراج میں تشریف لے گئے اور جنتوں کی سیر فرمائی تو وہاں چار نہریں ملاحظہ فرمائیں ایک پانی کی، دوسری دودھ کی، تیسری شراب کی اور چوتھی شہد کی جبریل امین سے دریافت کیا کہ یہ نہریں کہاں سے آرہی ہیں حضرت جبریل امین نے عرض کیا کہ مجھے اس کی خبر نہیں دوسرے فرشتے نے عرض کیا کہ ان

چاروں کا چشمہ میں دکھاتا ہوں ایک جگہ لے گیا وہاں ایک درخت تھا جس کے نیچے ایک عمارت بنی ہوئی تھی اور دروازے پر قفل پڑا تھا اور اس کے نیچے سے یہ چاروں نہریں نکل رہی تھیں ارشاد فرمایا دروازہ کھولو، عرض کیا اس کی چابی میرے پاس نہیں بلکہ آپ کے پاس ہے یعنی بسم اللہ الرحمٰن الرحیم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بسم اللہ پڑھ کر قفل کو ہاتھ لگایا دروازہ کھل گیا اندر جا کر ملاحظہ فرمایا کہ اس عمارت میں چار ستون ہیں اور ہر ستون پر بسم اللہ لکھی ہے اور بسم اللہ کے میم سے پانی جاری ہے اللہ کی ہ سے دودھ جاری ہے، رحمان کی میم سے شراب اور رحیم کی میم سے شہد اندر سے آواز آئی۔ ''اے میرے محبوب علیہ السلام! آپ کی امت میں سے جو شخص بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھے، وہ ان چاروں کا مستحق ہوگا'' تیسرے یہ کہ تفسیر کبیر شریف میں اسی بسم اللہ کی تفسیر میں لکھا ہے کہ فرعون نے خدائی کے دعوے سے پیشتر ایک مکان بنایا تھا اور اس کے بیرونی دروازے پر بسم اللہ لکھی تھی۔ جب دعویٰ خدائی کیا اور موسیٰ علیہ السلام نے اس کو تبلیغ اسلام کی اور اس نے قبول نہ کی تو موسیٰ علیہ السلام نے اس کے حق میں بددعا کی۔ وحی آئی۔ اے موسیٰ (علیہ السلام) یہ ہے تو اسی قابل کہ اس کو ہلاک کر دیا جائے لیکن اس کے دروازے پر بسم اللہ لکھی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ عذاب سے بچا ہوا ہے'' اسی وجہ سے فرعون پر گھر میں عذاب نہ آیا بلکہ وہاں سے نکال کر دریا میں ڈبویا گیا سبحان اللہ! جب ایک کافر کا گھر بسم اللہ کی وجہ سے عذاب سے بچ گیا تو اگر کوئی مسلمان اس کو اپنے دل وزبان پر لکھ لے تو کیوں نہ عذاب الٰہی سے محفوظ رہے مگر خیال رہے کہ ان الفاظ کی بے ادبی نہ ہونے پائے۔

تفسیر عزیزی میں بسم اللہ کے فوائد میں لکھا ہے کہ ایک ولی اللہ نے مرتے وقت وصیت کی تھی کہ میرے کفن میں بسم اللہ لکھ کر رکھ دینا لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ قیامت کے دن میری دستاویز ہوگی جس کے ذریعہ سے میں رحمت الٰہی کی درخواست کروں گا تفسیر کبیر وغیرہ میں ہے کہ بسم اللہ میں انیس حروف ہیں اور دوزخ پر عذاب کے فرشتے بھی انیس ہیں پس امید ہے کہ اس کے ایک ایک حروف کی برکت سے ایک ایک فرشتے کا عذاب دور ہو جائے۔ دوسری خوبی یہ بھی ہے کہ دن رات میں چوبیس گھنٹے ہیں جن میں سے پانچ گھنٹے پانچ نمازوں نے گھیر لئے اور انیس گھنٹوں کیلئے بسم اللہ کے انیس حروف عطا فرمائے گئے جو بسم اللہ کا ورد کرتا رہے انشاء اللہ اس کا ہر گھنٹہ عبادت میں شمار ہوگا اور ہر وقت کے گناہ معاف ہوں گے۔

بسم اللہ کے فوائد

بسم اللہ کے بیشمار فائدے ہیں جن میں سے ہم کچھ تھوڑے ''تفسیر کبیر'' اور ''تفسیر عزیزی'' وغیرہ سے نقل کرتے ہیں۔ **پہلا فائدہ:** جو شخص اپنی بیوی کے پاس جاتے وقت بسم اللہ پڑھ لے تو اس میں شیطان شریک نہ ہوگا اور اگر اس صحبت سے حمل قائم ہو جائے تو اس حمل کا بچہ اپنی زندگی میں جس قدر سانس لے گا اس قدر اس کے باپ کے اعمال میں نیکیاں لکھی جائیں گی جو شخص کسی جانور پر سوار ہوتے وقت بسم اللہ اور الحمدللہ پڑھ لے تو اس جانور کے ہر قدم پر اس سوار کے حق میں ایک نیکی لکھی جائے گی جو شخص کشتی میں سوار ہوتے وقت بسم اللہ اور الحمدللہ پڑھ لے، جب تک وہ اس میں سوار رہے گا اس کے واسطے نیکیاں لکھی جائیں گی جو بیمار بسم اللہ کہہ کر دوا پئے انشاء اللہ دوا فائدہ دے گی۔

حکایت: ایک بار حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیٹ میں نہایت سخت درد ہوا حق تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کیا ارشاد ہوا کہ جنگل کی فلاں بوٹی کھاؤ چنانچہ آپ نے کھائی اور فوراً آرام ہو گیا کچھ دنوں بعد پھر وہی بیماری ہوئی موسیٰ علیہ السلام نے پھر وہی دوا استعمال کی مگر درد میں زیادتی ہو گئی جناب باری میں عرض کیا کہ الٰہی یہ کیا بھید ہے کہ دوا ایک مگر تاثیریں دو کہ پہلی بار اس نے شفا دی اور اس دفعہ بیماری بڑھائی ارشاد الٰہی ہوا کہ اے موسیٰ پہلی بار تم میری طرف سے بوٹی کے پاس گئے تھے اور اس دفعہ اپنی طرف سے۔ اے موسیٰ! شفا تو میرے نام میں ہے میرے نام کے بغیر دنیا کی ہر چیز زہر قاتل ہے اور میرا نام اس کا تریاق ہے۔

حکایت: حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک قبر پر گزرے دیکھا کہ اس میت پر عذاب ہو رہا ہے یہ دیکھ کر چند قدم آگے تشریف لے گئے اور وہاں سے استنجا کر کے واپس آئے اب جو اس قبر پر گزرے تو ملاحظہ فرمایا کہ اس قبر میں نور ہی نور ہے اور وہاں رحمت الٰہی کی بارش ہو رہی ہے۔ آپ بہت حیران ہوئے اور بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ مجھے اس کا بھید بتایا جائے ارشاد ہوا کہ روح اللہ یہ سخت گنہگار اور بدکار تھا اس وجہ سے عذاب میں گرفتار تھا لیکن اس نے اپنی بیوی حاملہ چھوڑی تھی اس کے لڑکا پیدا ہوا اور آج اس کو مکتب میں بھیجا گیا۔ استاد نے اس کو بسم اللہ پڑھائی ہمیں حیا آئی کہ میں زمین کے اندر اس شخص کو عذاب دوں کہ جس کا بچہ زمین پر میرا نام لے رہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بچوں کی نیکی سے ماں باپ کی نجات ہو جاتی ہے۔ تفسیر عزیزی میں ہے کہ جس شخص کو کوئی سخت مصیبت پیش آ جائے تو وہ بسم اللہ بارہ ہزار دفعہ اس طرح پڑھے کہ ایک ہزار بسم اللہ پڑھ کر دو رکعت نفل پڑھے پھر ہر ہزار پر دو نفل پڑھتا جائے اس کے بعد دعا مانگے انشاء اللہ اس کی دعا قبول ہو گی جس شخص کو کوئی سخت مشکل در پیش ہو تو وہ یہ عبارت ایک پرچہ میں لکھے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مِنَ الْعَبْدِ الذَّلِيْلِ اِلَى الرَّبِّ الْجَلِيْلِ رَبِّ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الضُّرُّ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ پھر یہ پرچہ کسی بہتے ہوئے پانی میں ڈال دے اور ڈال کر یہ دعا پڑھے اَللّٰهُمَّ بِمُحَمَّدٍ وَ اٰلِهِ الطَّيِّبِيْنَ الطَّاهِرِيْنَ وَ اَصْحَابِهِ الْمُرْشِدِيْنَ اَقْضِ حَاجَتِىْ يَا اَكْرَمَ الْاَكْرَمِيْنَ جو شخص پاخانہ جاتے وقت بسم اللہ پڑھ لے اس کا جنات ستر نہ دیکھ سکیں گے حضرت نوح علیہ السلام نے کشتی میں سوار ہوتے وقت پڑھا تھا۔ بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّىْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (ہود: ۴۱) اس وجہ سے بیڑا پار ہوا تو جو شخص کشتی میں سوار ہوتے وقت یہ دعا پڑھ لے تو خدا چاہے تو وہ ڈوبنے سے بچے گا جب آدمی بسم اللہ سے بیڑے پار لگتے ہیں تو پوری بسم اللہ میں کیا کیا برکتیں ہوں گی حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب بلقیس کو پہلا خط لکھا تو اس میں لکھا کہ اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ (النمل: ۳۰) اس کی برکت سے بلقیس ان کے نکاح میں آئی اور اس کا پورا ملک یمن حضرت سلیمان علیہ السلام کے قبضے میں آیا غور تو کرو کہ سورۃ توبہ میں بسم اللہ نہیں لکھی گئی۔ اس طرح ذبح کے وقت پوری بسم اللہ نہیں پڑھتے بلکہ یوں کہتے ہیں بسم اللہ اللہ اکبر اس میں کیا حکمت ہے حکمت یہ ہے کہ سورۃ توبہ میں اول سے آخر تک جہاد اور قتال کا ذکر ہے اور یہ کافروں پر قہر ہے۔ اسی طرح ذبح میں جانور کی جان لی جاتی ہے یہ بھی جبر و قہر کا وقت ہوتا ہے۔ اس وقت رحمت کا ذکر نہ کرو۔ سبحان اللہ تو جو شخص پوری بسم اللہ کا ورد کرے تو انشاء اللہ خدا کے غضب سے محفوظ رہے گا۔

حضرت خالد ابن ولید رضی اللہ عنہ کے پاس کوئی شخص زہر لایا اور کہا کہ اگر آپ اس زہر کو پی کر صحیح سلامت رہیں تو ہم جان لیں کہ اسلام سچا ہے آپ نے بسم اللہ کہہ کر وہ زہر پی لیا اور خدا کے فضل سے کچھ اثر نہ ہوا وہ شخص یہ دیکھ کر اسلام لے آیا۔ بادشاہ روم ہرقل نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں خط لکھا کہ مجھے دردسر کی بہت شکایت ہے کچھ علاج کیجئے۔ آپ نے اس کے پاس ایک ٹوپی بھیج دی۔ جب بادشاہ وہ ٹوپی اوڑھتا تھا درد جاتا رہتا تھا اور جب اتار دیتا تھا درد شروع ہو جاتا تھا۔ اس کو سخت تعجب ہوا۔ اس نے ٹوپی کو کھلوایا۔ دیکھا تو اس میں ایک پرچہ لکھا تھا جس میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا تھا۔ غرض یہ کہ بسم اللہ میں بیشمار فائدے ہیں۔

اعتراض: بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم تو بسم اللہ ہزاروں بار پڑھتے ہیں مگر کچھ فائدہ نہیں ہوتا۔ حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بسم اللہ پڑھ کر زہر پی لیا لیکن اگر ہم بسم اللہ پڑھ کر کوئی بھاری غذا بھی کھالیں تو نقصان پہنچا دیتی ہے۔ **جواب:** تمام دعائیں اور وظیفے مثل کارتوس کے ہیں اور پڑھنے والے کی زبان بندوق کارتوس یقیناً شیر کو مارتا ہے مگر کب، جب کہ اچھی رائفل سے استعمال کیا جائے۔ دعائیں تو وہی ہیں لیکن ہماری زبانیں صحابہ کرام کی سی نہیں ہم اس زبان سے روزانہ جھوٹ، غیبت وغیرہ بکتے رہتے ہیں پھر وہ تاثیر کہاں سے آئے۔ اگر قرآن پاک کی تاثیر دیکھنی ہے تو اچھی زبان پیدا کرو۔

بسم اللہ کے مسائل

بسم اللہ قرآن پاک کی پوری آیت ہے۔ مگر کسی سورت کا جز نہیں بلکہ سورتوں میں فاصلہ کرنے کیلئے اتاری گئی ہے۔ اسی لئے نماز میں اس کو آہستہ ہی پڑھتے ہیں ہاں جو حافظ تراویح میں پورا قرآن پاک ختم کرے وہ ضرور کسی نہ کسی سورت کے ساتھ ایک بار بسم اللہ زور سے پڑھے۔ **مسئلہ:** سوا سورۂ توبہ کے باقی ہر سورت بسم اللہ سے شروع کرے۔ لیکن اگر کوئی شخص سورۂ توبہ سے ہی تلاوت شروع کرے تو وہ تلاوت کیلئے بسم اللہ پڑھ لے۔ **مسئلہ:** ہر جائز کام کا بسم اللہ سے شروع کرنا مستحب ہے ناجائز کام پر بسم اللہ پڑھنا منع ہے اگر کوئی شخص بسم اللہ کہہ کر شراب پئے، چوری کرے، غیبت کرے، جھوٹ بولے تو کفر کا اندیشہ ہے۔ شامی میں ہے کہ حقہ پیتے وقت اور بدبودار چیزیں (جیسے پیاز، لہسن وغیرہ) کھاتے وقت بسم اللہ نہ پڑھنا بہتر ہے۔ **مسئلہ:** ننگے ہوکر، پاخانہ میں پہنچ کر بسم اللہ پڑھنا منع ہے۔ **مسئلہ:** نمازی نماز میں جب کوئی سورت پڑھے، آہستہ سے بسم اللہ پڑھنا مستحب ہے۔ **مسئلہ:** جو جائز کام بھی بغیر بسم اللہ کے شروع کیا جائے گا اس میں برکت نہ ہوگی۔ **مسئلہ:** جب مردہ کو قبر میں اتارا جائے تو اتارنے والے یہ پڑھتے جائیں بِسْمِ اللّٰهِ وَعَلٰى مِلَّتِ رَسُوْلِ اللّٰهِ **مسئلہ:** جمعہ عیدین نکاح وعظ وغیرہ کا خطبہ الحمد للہ سے شروع کیا جائے یعنی بسم اللہ آہستہ پڑھی جائے پھر جب قرآن پاک کی آیت آئے تب بلند آواز سے بسم اللہ پڑھی جائے۔ **مسئلہ:** جانور کو ذبح کرتے وقت بسم اللہ پڑھنا واجب ہے کہ اگر جان بوجھ کر چھوڑ دیا تو جانور مردار ہوگا اگر بھولے سے چھوٹ گئی تو جانور حلال ہے۔ **مسئلہ:** اگر شکاری تیر یا بھالا وغیرہ دھاردار چیز سے شکار کرے اور یہ چیزیں پھینکتے وقت بسم اللہ پڑھ لے تو

اگر جانور اس کے پاس پہنچتے پہنچتے مر بھی گیا تب بھی حلال ہوگا۔ یونہی اگر پالتو جانور قبضے سے نکل گیا۔ مثلاً گائے کنوئیں میں گر گئی یا اونٹ بھاگ گیا تو بسم اللہ کہہ کر تیر یا بھالا یا تلوار ماردی گئی تو جانور حلال ہے۔ **مسئلہ:** اگر شکار پر شکاری کتا چھوڑتے وقت بسم اللہ پڑھی جائے اور کتے کی پکڑ سے جانور مر جائے تو وہ حلال ہے۔ شکار کے پورے مسائل انشاء اللہ شکار کی آیتوں کی تفسیر میں بیان کئے جائینگے۔

سُوْرَةُ الْفَاتِحَةِ مَكِّيَّةٌ وَهِيَ سَبْعُ آيَاتٍ

سورۃ فاتحہ مکہ والی اور وہ سات آیتیں

سورۃ فاتحہ مکیہ ہے اور وہ سات آیتیں ہیں۔

سورۂ فاتحہ کے متعلق چند باتیں عرض کرنی ہیں ایک یہ کہ اس کے نام کتنے ہیں دوسرے یہ کہ شان نزول اس کا کیا ہے تیسرے یہ کہ اس کے فضائل کیا کیا ہیں چوتھے یہ کہ اس میں مسائل کیا کیا ہیں۔

سورۃ فاتحہ کے نام

(اس کے کل بیس نام ہیں) ۱۔فاتحہ، ۲۔ فاتحۃ الکتاب، ۳۔ام القرآن، ۴۔سورۃ الکنز، ۵۔سورۃ وافیہ، ۶۔سورۃ کافیہ، ۷۔سورۃ شافیہ، ۸۔سورۃ شفاء، ۹۔سبع مثانی، ۱۰۔سورۂ نور، ۱۱۔سورۂ رقیہ، ۱۲۔سورۃ الحمد، ۱۳۔سورۃ دعا، ۱۴۔سورۃ تعلیم المسئلہ، ۱۵۔سورۃ مناجات، ۱۶۔سورۃ تفویض، ۱۷۔سورۃ سوال، ۱۸۔سورۃ ام الکتاب، ۱۹۔سورۃ سوال، ۲۰۔سورۃ صلوٰۃ اس سورۃ میں سات آیتیں، ستائیس کلمے اور ایک سو چالیس حروف ہیں کوئی آیت ناسخ یا منسوخ نہیں۔اس سورۃ کی وجہ تسمیہ (فاتحۃ الکتاب) اس لئے کہتے ہیں کہ اس سورۃ سے قرآن پاک کو شروع کیا جاتا ہے اور اس لئے کہ بعض روایات کی رو سے سب سے پہلے یہی اتری۔

سورۃ الحمد اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے اول میں لفظ الحمد آتا ہے۔

ام القرآن اس لئے کہتے ہیں کہ ام کے معنی ہیں اصل کے اور یہ سورۃ سارے قرآن پاک کی اصل ہے اس لئے کہ جس قدر مضامین سارے قرآن شریف میں تفصیل وار ہیں وہ سب اجمالاً یہاں آگئے ہیں اس کو قرآن پاک سے وہی نسبت ہے جو بیج کو درخت سے ہوتی ہے کیونکہ بیج میں سارا درخت (یعنی پتے، شاخیں، پھل، پھول وغیرہ) ہوتا ہے۔

ام الکتاب اس لئے کہتے ہیں کہ ساری آسمانی کتابوں کے تقریباً سارے مضامین اس میں آگئے ہیں۔ کیونکہ عقائد و اعمال وغیرہ سب اس میں موجود ہیں نیز خدا کی ذات وصفات، اس کی معبودیت اس کی بے نیازی بندے کی عبدیت نیازمندی وغیرہ تمام اس میں موجود ہیں۔

سبع مثانی اس لئے کہتے ہیں کہ اس لفظ کے معنی ہیں سات مکرر آیتیں۔ چونکہ اس میں سات آیتیں ہیں اور دوبارہ نازل ہوئی اس لئے اس کا یہ نام ہوا۔ نیز نماز میں ہر رکعت میں اس سورۃ کی تکرار ہوتی ہے نیز آدھی سورۃ میں رب کی حمد وثنا ہے اور باقی آدھی میں بندے کی عرض ومعروض تو گویا آدھی خالق کیلئے ہے اور آدھی مخلوق کیلئے لہٰذا اس کو سبع مثانی کہا جاتا ہے۔ نیز اس طرح کی سورۃ کسی اور آسمانی کتاب میں نہ آئی۔ نیز سورۃ فاتحہ کا ثواب قرآن کے ساتویں حصہ کے برابر ہے۔ لہٰذا جو شخص اسے سات بار پڑھ لے وہ پورے قرآن کا ثواب پائے گا۔ نیز اس کی آیتیں بھی سات ہیں۔ اور دوزخ کے دروازے بھی سات جو شخص کہ ان سات آیتوں کے پڑھنے کا پابند ہوگا انشاء اللہ اس پر دوزخ کے سات دروازے بند ہو

جائیں گے۔ حدیث شریف میں ہے کہ ایک بار جبریل امین نے بارگاہ نبوت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں عرض کیا کہ میں آپ کی امت پر دوزخ کے عذاب کا خوف کرتا تھا۔ جب سورۃ فاتحہ اتری تو مجھے اطمینان ہو گیا کیونکہ یہ سات آیتیں جہنم کے سات طبقوں کا قفل ہیں۔ (تفسیر کبیر)

سورۃ وافیہ - وافیہ کے معنی پوری ہونے والی اس سورت میں یہ خصوصیت ہے کہ ہر رکعت میں پوری ہی پڑھی جاتی ہے۔ دوسری سورتیں اگر دو رکعت میں آدھی آدھی یا کم وبیش پڑھ دی جائیں تو جائز ہوتا ہے۔

سورۃ کافیہ اس کو کافیہ اس لئے کہتے ہیں کہ یہ دوسری سورتوں کے بدلہ میں کافی ہوتی ہے۔ لیکن اور کوئی سورۃ اس کا بدل نہیں ہو سکتی۔

سورۃ شافیہ اس لئے کہتے ہیں یہ زہر اور صدہا قسم کی بیماریوں کا علاج ہے۔ ایک صحابی نے دیکھا ایک آدمی مرگی کے دورہ میں گرفتار ہے تو اس کے کان میں یہ سورۃ پڑھ دی اور اس کو آرام ہو گیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں یہ واقعہ عرض کیا تو فرمایا یہ سورۃ ہر بیماری کی دوا ہے نیز یہ سورت جسمانی اور روحانی تمام بیماریوں کا علاج ہے۔ انشاء اللہ اس کی تحقیق اس کے فوائد میں بیان کی جائے گی۔

سورۃ صلوٰۃ اس کو اس لئے کہتے ہیں کہ اس کا پڑھنا ہر نماز میں ضروری ہے

سورۃ سوال اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں بندوں کو حق تعالیٰ سے دعا مانگنے کا طریقہ بتایا گیا ہے کہ جب دعا کرنی ہو تو پہلے خداوند تعالیٰ کی حمد کرے، اپنی محتاجی اور بندگی کا ذکر کرے، پھر اپنی حاجت عرض کرے اور دنیوی حاجت کے مقابلے میں آخرت کی حاجتیں زیادہ مانگے۔ سورۂ شکر اور سورۂ دعاء اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں بندوں کو رب تعالیٰ کا شکر کرنے اور دعا مانگنے کا طریقہ سکھایا گیا وغیرہ وغیرہ۔

شان نزول

اس کے نزول کے بارے میں تین قول ہیں ایک یہ کہ یہ مکہ مکرمہ میں ہجرت سے پہلے نازل ہوئی بلکہ بعض علماء فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے سورۃ فاتحہ ہی نازل ہوئی۔ چنانچہ اس کا واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے اور فرمایا کہ جب میں تنہائی میں بیٹھتا ہوں تو غیبی آواز سنتا ہوں کہ کوئی کہتا ہے پڑھو۔ اس کی خبر ورقہ بن نوفل کو دی گئی جو کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے رشتہ میں بھائی تھے۔
ورقہ نے عرض کیا کہ اب جب کبھی یہ آواز آئے تو آپ اطمینان سے سنتے رہیں۔ چنانچہ پھر یہ ہوا کہ حضرت جبریل حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا کہ پڑھئے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ - اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ اس روایت سے معلوم ہوا کہ سب سے پہلے فاتحہ نازل ہوئی مگر دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے سورۃ اقراء نازل ہوئی۔
دوسرا قول یہ ہے کہ یہ سورت ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں اتری لیکن اس پر اعتراض یہ ہے کہ نماز مکہ مکرمہ میں شب معراج میں فرض ہو چکی تھی اور نماز میں اس کا پڑھنا ضروری ہے اگر یہ سورت مدنی ہو تو مسلمانوں نے اتنے روز تک کیا پڑھا۔ تیسرا

قول یہ ہے کہ سورت ہجرت سے پہلے مکہ مکرمہ میں اور ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں دوبارہ نازل ہوئی اس لئے اس کو سبع مثانی کہتے ہیں کیونکہ یہ سات آیتیں ہیں اور دو دفعہ اتری ہیں اور دوبار اترنے میں حکمت یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کی شان کا پتہ لگ جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت بھی معلوم ہو جائے کیونکہ قرآن پاک کی آیتیں حقیقت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کیلئے ربانی تحفہ ہیں۔

نوٹ: اس سے معلوم ہوا کہ قرآن پاک کا اترنا محض حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم کیلئے نہیں تھا بلکہ اس میں اور بھی حکمتیں ہیں۔ سورت، آیت، مکی، مدنی۔ آیت قرآن پاک کی اس عبارت کو کہتے ہیں جس میں بات پوری تو ہو جائے مگر اس کا کوئی علیحدہ نام نہ رکھا گیا ہو جیسے ہم لوگ جملہ یا کلام بولتے ہیں اور اس کو آیت اس لئے کہتے ہیں کہ آیت کے معنی ہیں نشانی اور قرآن پاک کا ہر جملہ قرآن پاک کی حقانیت لانے والے کی حقانیت اور بھیجنے والے کی حقانیت کی نشانی ہے سب سے چھوٹی آیت مُدْهَآمَّتٰنِ (رحمٰن: ۶۴) ہے۔ اور سب سے بڑی آیت مداینہ جو بقرہ کے آخری رکوع میں ہے سورت، سور سے بنا ہے اس کے معنی ہوتے ہیں گھیرنے والی چیز۔ اسی لئے شہر کے آس پاس کی دیوار (شہر پناہ) کو سور البلد کہتے ہیں کیونکہ وہ شہر کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے قرآن پاک کی اصطلاح میں سورۃ قرآن پاک کی وہ عبارت کہلاتی ہے جس میں مضمون پورا ہو گیا ہو اور اس کا نام بھی کچھ رکھ دیا گیا ہو جیسے سورۃ فلق، سورۃ بقرہ وغیرہ سورت اور آیات دو قسم کی ہیں مکی و مدنی مکی وہ ہیں جو ہجرت سے پہلے اتریں خواہ کہیں اتریں۔ مدنی وہ ہیں جو ہجرت کے بعد اتریں خواہ وہ کہیں اتری ہوں۔ لہٰذا جب ہجرت کے بعد نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ مکرمہ تشریف لائے اور وہیں کوئی آیت آئی تو اگرچہ وہ اتری ہے مکہ مکرمہ میں لیکن یہ مدنی کہلائے گی کیونکہ ہجرت کے بعد آئی بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ مکی وہ جو مکہ مکرمہ میں اترے اور مدنی وہ جو مدینہ پاک میں اترے لیکن یہ صحیح نہیں کیونکہ اگر مکی مدنی کے یہ معنی ہوتے تو بعض وہ آیتیں جو طائف شریف میں اتریں ان کا نام طائفی آیتیں ہونا چاہیے تھا لہٰذا سورۃ فاتحہ مکی بھی ہے مدنی بھی قرآن پاک میں سب سے چھوٹی سورۃ کوثر ہے اور سب سے بڑی سورۃ بقرہ خیال رہے کہ پچھلے رسول طالب تھے کلام الٰہی مطلوب اس لئے وہ کتاب لینے خاص جگہ جایا کرتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام توریت لینے طور پر تشریف لے گئے۔ مگر ہمارے حضور مطلوب ہیں اور کتاب اللہ طالب کہ جہاں حضور ہیں وہیں قرآن کی آیات آ رہی ہیں حضور مکی ہیں تو آیات مکی جب حضور مدنی ہو گئے تو آیتیں بھی مدنی ہو گئیں۔ حضور آگے ہیں آیات پیچھے پیچھے علی العموم حضور قرآن پاک کے متبع ہیں مگر بعض اوصاف میں قرآن کریم حضور کا تابع چونکہ حضور عربی ہیں لہٰذا قرآن بھی عربی ساری آیات عربی ہیں مگر حضور کی مکی مدنی ہونے سے آیات مکی مدنی بن گئیں۔ بہت سی آیتیں حضور کی مرضی کے مطابق اتریں جیسے تبدیلی قبلہ وغیرہ کی آیات۔

سورتوں کے نام

قرآن پاک کی سورتوں کے نام اس کے بعض مضامین یا بعض مقاصد یا بعض الفاظ سے رکھ دیئے جاتے ہیں۔ مثلاً اس سورۃ کا نام الحمد بھی ہے اس لئے کہ اس میں لفظ الحمد آ گیا ہے سورت بقر کا نام سورۃ بقر اس لئے ہے کہ اس میں ایک جگہ گائے کا ذکر

آ گیا ہے اور قل ھواللہ کا نام سورۃ اخلاص ہے اس لئے اس کا مقصود ہے اپنے دین کو خالص اللہ کیلئے بنانا۔ سورۃ کے نام کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اس میں اول سے آخر تک وہی مضمون ہو۔ سورۃ بقر میں صدہا مضامین بیان ہوئے مگر اس کا نام سورۃ بقرہ رکھا گیا۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ طبیب اپنی مرکب دواؤں کے نام مختلف حیثیت سے رکھتے ہیں۔ ایک دوا کا نام ہے ''جوارش کمونی'' یعنی زیرے کی جوارش تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس میں صرف زیرہ ہی ہے۔ دوائیں اور بھی ہیں مگر ایک جز سے اس کا نام رکھ دیا گیا ہے ایک دوا کا نام ہے شربت شفا چونکہ اس سے شفا مقصود ہے۔ اس لئے اس کا نام شربت شفا ہوا بعض دواؤں کا نام ہے ''تریاق'' تریاق نزلہ اس کا مقصد یہ ہے کہ یہ دوا نزلہ میں استعمال کیجئے۔ یہ بیماری کے نام سے دوا کا نام ہوا جس طرح کہ طبیب اپنی دواؤں کے نام چند وجہوں سے رکھتے ہیں۔ ایسے ہی طبیب روحانی نے اپنے قرآن پاک کی سورتوں کے نام چند وجہوں سے رکھے یہ بات بہت خیال رہے۔

سورۃ فاتحہ کی آیتیں

یہ سب مانتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ میں سات آیتیں ہیں اس کا نام ہی ''سبع مثانی'' ہے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ سات آیتیں کون سی ہیں۔ حضرت امام شافعی کے نزدیک بسم اللہ پہلی آیت ہے اور صراط الذین سے ولاالضالین تک ایک آیت یعنی علیہم پر وقف نہیں بلکہ ان کے یہاں بسم اللہ ہر سورت کی پہلی آیت ہے اسی لئے ان کے مذہب میں امام بسم اللہ کو بلند آواز سے پڑھتا ہے اور حضرت امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک بسم اللہ اس سورت کا جز نہیں پہلی آیت الحمدللہ ہے اور علیہم پر وقف ہے۔

سورۃ فاتحہ کے فضائل اور فوائد

اس سورۃ کے فضائل بیشمار ہیں کچھ تفسیر کبیر وغیرہ سے نقل کئے جاتے ہیں۔ ''مسلم شریف'' میں ہے کہ ایک مرتبہ ایک فرشتے نے آسمان سے نازل ہو کر بارگاہ نبوت میں عرض کی کہ یارسول اللہ مبارک ہو آپ کو دو نور ایسے ملے کہ جو کسی نبی کو نہ ملے ایک سورۃ فاتحہ اور دوسرا سورۃ بقر کی آخری آیتیں۔ ترمذی شریف میں ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ سورۃ فاتحہ کی مثل توریت و انجیل و زبور میں کوئی سورت نہ اتری۔ تفسیر کبیر میں ہے کہ رب تعالیٰ نے آسمان سے ایک سو چار کتابیں اور صحیفے اتارے۔ مگر سو کتابوں کے علوم چار میں رکھے یعنی توریت وانجیل و زبور پھر ان تین کے علوم قرآن پاک میں رکھے۔ پھر قرآن پاک کے اصول مفصل (سورۂ حجرات سے والناس تک) میں رکھے گئے۔ پھر مفصل کے علوم سورۂ فاتحہ میں رکھے گئے۔ لہٰذا جس نے سورۃ فاتحہ سیکھ لی اس نے گویا ساری آسمانی کتابیں سیکھ لیں اور جس نے سورۃ فاتحہ پڑھ لی، اس نے تمام آسمانی کتابیں پڑھ لیں نیز یہ سورۃ بالکل رحمت کی سورت ہے اس لئے اس میں رب تعالیٰ کے قہر اور جبر اور دوزخ کے عذاب وغیرہ کا ذکر نہیں بلکہ اس میں وہ حرف بھی نہیں آئے جو جہنم وغیرہ کے اول میں آتے ہیں چنانچہ اس سورت میں سات حروف نہیں ث، ج، خ، ز، ش، ظ، ف کیونکہ ث ثبور کا پہلا حرف ہے جس کے معنی ہیں ہلاکت جیم جہنم کا پہلا حرف ہے جس کے معنی ہیں دوزخ۔ خ

خزی کا پہلا حرف ہے جس کے معنی ہیں رسوائی۔ ز، زفیر اور زقوم کا پہلا حرف ہے۔ زفیر دوزخیوں کی آواز اور زقوم تھوہر (جہنمیوں کی غذا) ش شھیق کا پہلا حرف ہے جس کے معنی ہیں جہنمیوں کی آواز ظ، ظل کا جو کہ قرآن پاک میں اس طرح مذکور ہے ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ (مرسلات: ۳۰) اور ظلم کا پہلا حرف ہے۔ "تفسیر روح البیان" میں ہے کہ جس وقت یہ سورت اتری اس وقت حضرت جبریل علیہ السلام کے ساتھ ستر ہزار فرشتے آئے تھے۔

فوائد

سورۂ فاتحہ کے بیشمار فائدے ہیں جن میں سے چند بیان کیے جاتے ہیں جو شخص سورۂ فاتحہ سو بار پڑھ کر دعا مانگے حق تعالیٰ اس کی دعا قبول فرمائے گا۔ جو شخص مریض لا دوا ہو وہ چینی کے سفید برتن میں آب زمزم اور زعفران سے سورۂ فاتحہ لکھ کر دھو کر اکتالیس روز تک پیتا رہے تو انشاء اللہ شفا ہوگی اگر آب زمزم نہ ملے تو عرق گلاب لے لے۔ اگر یہ بھی میسر نہ ہو تو کنویں کا پانی ہی کافی ہے۔ "تفسیر کبیر" میں ہے کہ بعض گنہگار قوموں پر عذاب الٰہی آنے والا ہوگا مگر ان میں سے کوئی بچہ مکتب میں جا کر فاتحہ پڑھے گا اس کی برکت سے چالیس سال تک عذاب دور ہو جائے گا جو شخص کسی دنیوی بلا میں پھنس گیا ہو وہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی میم کو الحمد کے لام میں ملا کر پڑھا کرے انشاء اللہ اس سے نجات ملے گی بعض صوفیاء کے یہاں یہ عمل ہوتا ہے کہ اگر کسی شہر میں طاعون یا کوئی اور وبائی بیماری پھیلے تو ایک تاشہ یا نقارہ پر دائرہ کی شکل میں سورۂ جمعہ اور بعد میں سورۂ فاتحہ کو لکھتے ہیں اور بیچ میں پندرہ کا نقش بناتے ہیں پھر ایک دنبے کے سامنے یہ تاشہ بجاتے ہیں اور تاشہ بجاتے ہوئے اس دنبے کو گلی کوچے میں گشت کراتے ہیں اس کے بعد اس دنبے کو کنارہ شہر پر ذبح کر کے اس کا خون دفن کر دیتے ہیں اور اس کا گوشت فقیروں پر خیرات کر دیتے ہیں تو بفضلہٖ تعالیٰ اس وبا سے امان ملتی ہے بعض صحابہ کرام نے سانپ کے کاٹے ہوئے پر سورۂ فاتحہ پڑھ کر دم کیا اور اسے آرام ہوا غرض یہ کہ اس کے بیشمار فائدے ہیں۔

سورۃ فاتحہ کے مسائل

مسئلہ: ہر نماز میں اس سورۃ کا پڑھنا واجب ہے فرض نماز میں تو اول دو رکعتوں میں اور فرض کے علاوہ دیگر نمازوں میں ہر رکعت میں۔

مسئلہ: امام کے پیچھے مقتدی کو سورۃ فاتحہ پڑھنا سخت منع ہے قرآن پاک فرماتا ہے کہ جب قرآن پاک پڑھا جائے تو تم خاموش رہو اور کان لگا کر سنو لہٰذا جو شخص امام کے پیچھے فاتحہ پڑھتا ہے وہ اس آیت کریمہ کے خلاف عمل کرتا ہے مسلم شریف میں ہے کہ اذا قرء فَاَنْصِتُوْا جب امام قرات قران کریم کرے تو تم خاموش رہو۔ دوسری حدیث شریف میں آتا ہے قِرَاءَۃُ الْاِمَامِ لَہٗ قِرَاءَۃٌ امام کا قرآن پاک پڑھنا مقتدی کا پڑھنا ہے نیز تقریباً اسی جلیل القدر صحابہ کرام سے منقول ہے کہ وہ حضرات امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ کو پڑھنے سے منع فرماتے تھے ان میں سے حضرت علی مرتضیٰ اور عبداللہ ابن مسعود وغیرہما رضی اللہ عنہم اجمعین بھی ہیں دیکھو "شامی" جلد اول باب القرأت اور اگر احادیث کی پوری تحقیق کرنی منظور ہو تو "طحاوی شریف"، "صحیح البخاری شریف" اور "موطا امام محمد" وغیرہا دیکھو نیز اگر مقتدی پر سورۂ فاتحہ پڑھنا ضروری ہوتی تو جو شخص رکوع میں امام سے ملتا

وہ رکعت نہ پاتا۔ کیونکہ اس کا فرض یعنی سورۃ فاتحہ پڑھنا رہ گیا۔ نیز بادشاہوں کی بارگاہ میں حاضر ہونے والے دربار کے آداب سب بجالاتے ہیں اور سلام سب عرض کرتے ہیں مگر کلام ان سب کی طرف سے ایک ہی کرتا ہے۔ نماز میں بھی بارگاہ الٰہی میں حاضری ہے لہٰذا نماز کے ارکان، رکوع، سجدہ، قیام وغیرہ سب ادا کریں۔ کیونکہ یہ اس کے دربار کے آداب ہیں اور التحیات وغیرہ سب پڑھیں کیونکہ یہ اس دربار کا سلام وغیرہ ہیں مگر قرآن پاک کی تلاوت فقط ایک امام ہی کرے کیونکہ یہ عرض معروض ہے۔ حدیث شریف میں جو ہے کہ بغیر سورۃ فاتحہ نماز نہیں ہوتی۔ یہ ہمارے خلاف نہیں۔ کیونکہ جب امام نے سورۃ فاتحہ پڑھ لی تو یہ نماز سورۂ فاتحہ سے خالی نہ رہی۔ نیز یہ حدیث تو فرماتی ہے کہ سورۂ فاتحہ نماز میں ضروری پڑھی جائے اور قرآن کریم فرماتا ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو تم سنو اور خاموش رہو۔ ان دونوں کو اس طرح جمع کرلو کہ امام اور اکیلا نمازی سورۂ فاتحہ پڑھے اور مقتدی خاموش رہے قرآن پاک پر عمل ہوگیا اور حدیث شریف پر بھی نیز حدیث فرماتی ہے کہ بغیر سورۃ فاتحہ نماز نہیں ہوتی لیکن قرآن کریم فرماتا ہے فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ (مزمل: ۲۰) کہ جس قدر قرآن پاک میسر ہو پڑھ لو لہٰذا اس حدیث شریف اور قرآن پاک کو اس طرح جمع کیا جائے گا کہ مطلقاً قرآن پاک پڑھنا تو فرض اور سورۂ فاتحہ پڑھنا واجب نیز ایک حدیث شریف میں یہ بھی آتا ہے کہ نماز بغیر سورۂ فاتحہ اور دوسری سورت کے ملائے نہیں ہوتی حالانکہ دوسری سورت کا ملانا کسی کے نزدیک بھی مقتدی کیلئے ضروری نہیں۔ بلکہ مقتدی کیلئے منع ہے غرض کہ صحیح یہی ہے کہ امام کے پیچھے سورۂ فاتحہ ہرگز نہ پڑھی جائے۔

مسئلہ: نماز جنازہ میں سورۃ فاتحہ تلاوت کی نیت سے پڑھنا منع ہے ہاں اگر دعا کی نیت سے پڑھے تو جائز ہے اس کے باقی مسائل انشاء اللہ اپنے اپنے موقع پر آئیں گے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ
سب خوبیاں اللہ کیلئے
سب خوبیاں اللہ کو

اس آیت میں چار باتیں قابل غور ہیں۔ ۱۔ قرآن کریم میں سب سے پہلے یہ آیت کیوں آئی۔ ۲۔ اس کی عالمانہ اور صوفیانہ تفسیر کیا ہے۔ ۳۔ اس سے مسلمانوں کو فائدے اور سبق کیا کیا حاصل ہوئے۔ ۴۔ اس پر سوالات کیا ہیں ان کے جوابات کیا ہیں۔

۱۔ چند وجوہ سے اس آیت کو سب سے پہلے رکھا گیا ہے۔ ایک یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا ہوتے ہی چھینک آئی۔ آپ نے فرمایا۔ الحمد للہ رب العالمین اسی لئے ہم کو بھی حکم ہے کہ چھینک کر یہ پڑھیں اور سننے والا یہ جواب دے یَرْحَمُكُمُ اللّٰهُ پھر چھینکنے والا جواب دے یَهْدِیْكُمُ اللّٰهُ وَیُصْلِحُ بالکم معلوم ہوا کہ یہ پہلا کلمہ ہے جو حضرت انسان کے منہ سے نکلا۔ رب تعالیٰ نے اپنے کلام کو بھی اسی سے شروع فرمایا۔ دوسرے یہ کہ الحمد للہ میں آٹھ حروف ہیں اور جنت کے دروازے

بھی آٹھ ہیں۔تو جو شخص صفائی قلب سے اسے پڑھے گا وہ انشاءاللہ جنت کے آٹھوں دروازوں کا مستحق ہوگا اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ قرآن پاک شروع کرتے ہی پڑھنے والا جنت کا مستحق ہو چکا اب آگے جس قدر پڑھے گا رب تعالیٰ کے فضل وکرم میں زیادتی ہوگی تیسرے یہ کہ عبادت کی جان اللہ کی تعریف ہے اسی کو قرآن کریم نے پہلے بیان کیا۔چوتھے یہ کہ اس میں مسلمانوں کو سبق ہے کہ اپنا ہر کام خدا کی حمد سے شروع کیا کریں کیونکہ رب کی کتاب بھی اسی سے شروع ہوتی ہے پانچویں یہ کہ جب کسی بادشاہ سے کچھ عرض کرنا ہوتا ہے تو پہلے اس کی تعریف کی جاتی ہے اسی طرح جب کسی کو خط لکھتے ہیں تو اولاً اس کے القاب لکھتے ہیں، بعد میں اپنا مطلب چونکہ سورۂ فاتحہ میں بھی بندوں کو دعا سکھائی گئی ہے اس لئے اسے حمد سے شروع کیا گیا ہے۔

تفسیر

اس کی عالمانہ تفسیر تو یہ ہے کہ اس میں تین کلمے ہیں الف لام، حمد، للہ ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ تحقیق کی جاتی ہے۔الف، لام میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ یہ استغراقی ہے۔دوسرے یہ کہ عہدی ہے۔(تفسیر روح البیان) اگر استغراقی ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ ہر حمد ہر زمانے میں ہر حالت میں ہر حمد کرنے والے سے خاص ہے۔اللہ کیلئے حمد کا عام ہونا، الف لام سے حاصل ہوا اور حامد کے عام ہونے سے حمد کا عموم حاصل ہو گیا اور جملے اسمیہ سے ہمیشگی معلوم ہوئی تو اب کلام کا مقصود یہ ہوا کہ کوئی بھی تعریف کرے کسی حالت میں کرے، سب تعریف اللہ ہی کی ہوئی وہ اس طرح کہ اگر رب کی تعریف کرو تو ظاہر ہے کہ وہ تعریف بلاواسطہ رب کی تعریف ہے۔اور اگر اس کی کسی مخلوق کی تعریف کرو کسی ولی، چاند، سورج، موتی وغیرہ جس کی بھی تعریف کی جائے، بالواسطہ رب کی ہی تعریف ہے۔کیونکہ چیز کی تعریف حقیقت میں بنانے والے کی تعریف ہوتی ہے۔مکان کی تعریف حقیقت میں اس کاریگر کی تعریف ہے جس نے وہ مکان بنایا۔خط کی تعریف میں اس کے لکھنے والے کی تعریف ہے جس نے اسے لکھا اسی طرح دنیا کی ہر چیز کی تعریف حقیقت میں اس کے بنانے والے کی تعریف ہے اسی لئے حضور علیہ السلام کی نعت حقیقت میں رب کی تعریف ہے۔پھر زبان سے تعریف کرو تو اللہ کی تعریف ہاتھ پیر سے اپنے عاجزی کا اظہار کرو مثلاً نماز پڑھو روزہ رکھو تو رب کی تعریف اس کی اطاعت میں مال خرچ کرو مثلاً زکوٰۃ، صدقہ، فطرہ، قربانی ادا کرو تو یہ رب کی تعریف ہے۔خانہ کعبہ کا طواف، حضور پاک کی عظمت ماہ رمضان کا ادب اور احترام۔اولیاء اللہ کے تبرکات اور ان کی قبور کی تعظیم حقیقت میں رب کی عملی تعریف ہے۔قرآن پاک فرماتا ہے۔وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ (حج:۳۲) "جو شخص رب کی نشانیوں کی تعظیم کرے تو وہ شخص متقی ہے حکومت کے دفتروں کچہریوں اور اس کے خدام کی عظمت درحقیقت حکومت کی عزت ہے۔ان میں سے ایک کی بھی توہین حکومت کی توہین اور اس سے بغاوت ہے۔الف، لام، استغراقی نے ان سب باتوں کو اپنے میں لے لیا۔اسی طرح خدا کی نعمت ملنے پر اس کا شکر کرنا اور تکالیف آنے پر صبر کرنا یہ بھی رب تعالیٰ کی تعریف ہے بندے کو چاہئے کہ ہر حال میں خدا کی حمد کرے۔نعمت میں اس لئے حمد کرے کہ خدا کے فضل کا شکریہ ہے۔اور تکلیف میں اس لئے حمد کرے کہ جو تکلیف ہم پر آئی ہے وہ کسی گناہ کی وجہ سے آئی ہے۔خدا کی حمد اس گناہ کا

کفارہ بن جائے گی۔ جب گناہ مٹ جائے گا، تکلیف اپنے آپ جاتی رہے گی۔ یہ ہوئی ہر حالت کی حمد اسی طرح ہر نعمت کا شکر یہ اور اس کی حمد علیحدہ علیحدہ ہے۔ تندرستی کی حمد یہ ہے کہ اس میں رب کی عبادت، بیماروں کی تیمارداری اور بے دست و پا کی خدمت کرے۔ مال کا شکر اور حمد یہ ہے کہ اس سے غریبوں کی امداد کرے اسی طرح ہر عضو کی حمد اور شکر الگ الگ ہے۔ آنکھ کا شکر اور حمد یہ ہے کہ کعبہ معظمہ کو، قرآن پاک کو علماء دین کے چہروں کو دیکھے۔ کان کی حمد اور شکر یہ ہے کہ اس سے قرآن پاک کی تلاوت، نعت شریف، علمی مضامین، علماء دین کا وعظ سنے۔ ہاتھ پاؤں کی حمد اور شکر یہ ہے کہ ان سے مرضی الٰہی کے کام لے۔ فقط الف لام نے ان سب باتوں کو گھیر لیا انسان کی پیدائش سے پہلے نامعلوم کون کون سے چیزیں دنیا میں کب کب آباد تھیں۔ اور اب بھی نامعلوم اس عالم میں کس قدر مخلوقات ہے ان کو ان کا پیدا کرنے والا ہی جانتا ہے اور ہر چیز خدا کی تعریف کرتی ہے اور ہمیشہ سے کرتی رہے گی۔ غرضیکہ جب سے وقت بنا اور جب تک وقت رہے گا۔ رب کی حمد ایک آن کیلئے بند نہ ہوگی۔ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (الاسراء: ۴۴) ہر چیز رب کی حمد تعریف کرتی ہے۔ یہ ہوا اس حمد کے زمانے کا عموم ان سب کو جملے اسمیے نے گھیر لیا۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ الف، لام، عہدی ہو۔ تب اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ خاص حمد اللہ کی ہے۔ یعنی رب تعالیٰ ہر حمد قبول نہیں فرماتا بلکہ کوئی خاص حمد اس کے ہاں مقبول ہوتی ہے۔ اب وہ خاص حمد کون سی ہے وہ وہ حمد ہے جو اس کے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے رب کی کی۔ یا ان کے بتانے سے کوئی اور کرے۔ اس لئے آپ کا اسم شریف ہے۔ ''احمد'' یعنی رب کی بہت حمد کرنے والے اور رب کا نام ہے ''محمود'' یعنی اپنے پیارے محبوب کا حمد کیا ہوا۔ حدیث شفاعت میں وارد ہے کہ رب تعالیٰ قیامت کے دن ہم کو اپنی خاص حمدیں الہام فرمائے گا۔ ہم سجدے میں ان سے رب کی حمد کر کے اپنی امت کی شفاعت کریں گے حقیقت بھی یہ ہے آج ہندو، عیسائی، سکھ، آریئے، وغیرہ تمام کفار اپنے اپنے خیال میں خدا کی تعریف کرتے ہیں۔ مگر ان میں سے کسی کی حمد قبول نہیں حمد مسلمانوں ہی کی قبول ہے کیوں؟ صرف اس لئے کہ مسلمان محبوب علیہ السلام کی بتائی ہوئی حمد کرتے ہیں اور وہ لوگ ان سے علیحدہ ہو کر، یا اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ حمد خدا کے ہاں مقبول ہے جو اس کے محبوب علیہ السلام کی نعت کے ساتھ ہو۔ جو حمد الٰہی نعت مصطفیٰ علیہ السلام سے خالی ہو، مردود ہے۔ شیطان کی ساری عبادتیں بیکار ہو گئیں۔ تمام کفار کی ساری حمدیں غیر مقبول کیوں؟ اس لئے کہ اس میں نعت کی چاشنی نہیں۔ اسی لئے کلمہ نماز، خطبہ، اذان، غرض کہ مسلمانوں کی کوئی عبادت حضور علیہ السلام کی نعت سے خالی نہیں۔

ذکر خدا جو ان سے جدا چاہو نجدیو! واللہ ذکر حق نہیں کنجی سقر کی ہے
ذکر سب پھیکے جب تک نہ مذکور ہو نمکین حسن والا ہمارا نبی (صلی اللہ علیہ وسلم)

حمد خدا روحانی غذا ہے اور نعت مصطفیٰ علیہ السلام اس کا نمک ہے۔ بغیر نمک ساری غذا بیکار بغیر نعت مصطفیٰ علیہ السلام ساری حمد غیر مقبول ہے۔ یعنی واقع میں تو سب حمدیں اللہ ہی کی ہیں لیکن مقبول حمد وہی ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بتائی ہوئی ہو۔ تیسرے معنی اس کے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ خاص حمد اللہ کی ہے۔ یعنی ساری مخلوق میرے محبوب علیہ السلام کی حمد و ثنا

کرے۔ مگر جیسی چاہئے ویسی نہیں کر سکتی۔ محبوب علیہ السلام کی کامل حمد وہی ہے جو رب نے کی اس لئے رب کا نام ہے حامد اور حضور علیہ السلام کا نام ہے ''محمد یعنی رب تعریف فرمانے والا کس کی؟ اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تعریف کئے ہوئے کس کے؟ اپنے رب کے۔ پہلی تمام توجیہوں کی بناء پر اس آیت میں اللہ محمود ہے اور ساری مخلوق یا نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے حامد ہوئے۔ لیکن اس آخری توجیہہ کی رو سے حضور علیہ السلام محمود ہیں اور اللہ حامد تو یہ آیت جس طرح حمد خدا ہے اس طرح نعت مصطفیٰ بھی ہے صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خیال رہے کہ ساری عبادت سنت رسول اللہ ہے۔ مگر نعت مصطفوی سنت الٰہیہ ہے نیز ساری عبادتیں نبوت کے تیرھویں سال سے آنا شروع ہوئیں سب سے پہلے نماز آئی جو معراج میں ملی مگر حضور کی نعت شریف اول ہی سے آئی نیز ہماری موت کے بعد تمام عبادات ختم ہو جائیں گی مگر نعت مصطفیٰ قبر و حشر ہر جگہ خصوصاً مقام محمود پر۔ تین چیزوں میں فرق کرنا چاہئے۔ حمد و مدح اور شکر حمد کے معنی کسی کی اختیاری۔ خوبی بیان کرنا خواہ وہ کوئی نعمت دے یا نہ دے شکر کے معنی ہیں کسی کی اختیاری خوبی ظاہر کرنا اس لئے کہ اس نے ہم کو کچھ دیا ہے اور مدح کسی کی خوبی بیان کرنا خواہ اختیاری ہو یا غیر اختیاری موتی کی صفائی کی تعریف کی جائے تو یہ اس کی مدح ہے اور جب کوئی ہم کو کچھ دے اور ہم اس کی تعریف میں کہہ دیں کہ آپ سخی ہیں یا جھک کر اسے سلام کریں تو یہ اس کا شکر ہے۔ اور ویسے ہی کسی کی تعریف کریں کہ فلاں بڑا عالم ہے۔ یہ اس کی حمد ہے لیکن اس آیت میں لفظ حمد تینوں معنی کو شامل ہے۔ اسی لئے آگے اللہ کا نام ذاتی اور اس کی کچھ صفتوں کا ذکر کیا گیا۔ لفظ اللہ نے حمد کے حقیقی معنی کو بیان کیا اور الرحمٰن اور الرحیم نے شکر کے معنی اور مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ نے مدح کے معنی کو اللہ کے لام میں تین احتمال ہیں یا خصوصیت کا لام ہو یا استحقاق کا یا ملکیت کا تو معنی اس آیت کے یہ ہوں گے کہ تمام حمدیں اللہ کے ساتھ خاص ہیں یا اللہ ان کا مستحق ہے۔ یا وہ اللہ کی ملکیت ہیں۔ اب جو شخص بھی غیر اللہ کو اپنا معبود جان کر اس کی تعریف کرے گو یا خدا کی امانت میں خیانت کرتا ہے۔ کیونکہ حمد ملک تو ہے خدا کی اور اس نے صرف کی اور جگہ۔

تفسیر صوفیانہ

صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ حمد کے معنی ہیں محمود کے کمال کا ظاہر کرنا اور جو شخص یا جو چیز اپنے میں جو بھی کمال رکھتی ہے وہ حقیقت میں رب ہی کا کمال ہے۔ لہٰذا دنیا کی چیزوں کے کمال کا ظہور خدا کی حمد ہے۔ اس کا مطلب صاف یہ ہوا کہ کوئی شخص زبان سے خدا کی حمد کرے یا نہ کرے، رب تعالیٰ کی حمد ہے۔ ایک بت پرست بت کو سجدہ کر رہا ہے اپنی حماقت سے اپنی اختیاری تعریف کو غلط جگہ صرف کر رہا ہے لیکن اس کے جسم کی بناوٹ اور اس کے ہاتھ پاؤں کی طاقت اور اس کی قوت گویائی غرض کہ اس کا ہر عضو اس کی ہر حرکت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ میرا خالق بے نیاز ہے اور بزبان حال اس پر لعنت کرتی ہے کہ اندھے تو کیا کر رہا ہے غرض یہ کہ اس کی بت پرستی کی حالت میں بھی اس کی غیر اختیاری حمد اللہ ہی کیلئے ہو رہی ہے۔

برگ درختاں سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفترے است معرفت کردگار

اگر یہ کمبخت خود اپنے کو پہچان لیتا تو بت پرستی کبھی نہ کرتا یہی معنی اس حدیث کے ہیں مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ

دوسری توجیہہ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہ صرف حق تعالیٰ ہی موجود ہے۔دنیا کی سب چیزیں اس کا سایہ اور اعتبار ہیں اور سائے کی تعریف حقیقت میں سائے والے کی تعریف لہٰذا جس کی تعریف کرو رب ہی کی تعریف ہے کیونکہ وہ اس کے وجود ہی کا ظل ہے۔حقیقت محمدیہ اس کا اعتبار اول باقی سارا عالم اس کے اعتبارات۔بلاتشبیہ یوں سمجھو کہ دھوپ میں ایک آئینہ رکھا ہے جس میں آفتاب کا عکس آرہا ہے۔اس کے مقابلے میں کسی کوٹھڑی میں بہت سے رنگ برنگ آئینے رکھے ہیں اس آئینے کی وجہ سے ان تمام آئینوں میں آفتاب کے عکس پہنچ رہے ہیں۔لیکن چونکہ ان کے رنگ الگ الگ ہیں لہٰذا مختلف رنگ سے سورج کے عکس نظر آرہے ہیں۔دیکھو اصل تو وہ آفتاب ہے جو آسمان پر چمک رہا ہے۔اس کا پہلا سایہ دھوپ والے آئینے میں ہے اور اس کے دیئے ہوئے عکس کوٹھڑی کے سارے آئینوں میں ہیں۔اب ان عکسوں میں سے جس کے حسن و جمال اور نور کی تعریف کرو وہ حقیقت میں آسمان والے اصل سورج کی تعریف ہے۔اسی طرح حقیقی نور حق تعالیٰ۔اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ حقیقت محمدیہ پہلا آئینہ باقی سارا عالم وہ کوٹھڑی والے رنگ برنگ کے آئینے ہیں۔ اب اگر بیچ میں یہ دھوپ والا آئینہ نہ ہو تو یہ کوٹھڑی کے آئینے سب بے نور رہ جائیں اس حدیث کا یہی مطلب ہے کہ اَنَا نُوْرٌ مِّنْ نُّوْرِ اللّٰہِ وَ کُلُّ الْخَلَائِقِ مِنْ نُّوْرِیْ لہٰذا ثابت ہوا کہ ساری حمد اللہ کی ہے کیونکہ وہ خود ہی حامد اور خود ہی محمود اور خود ہی حمد ہے۔لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ ہماری اس تحریر سے حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے ذرے ذرے میں موجود ہونے کا مسئلہ حل ہوگیا اس مسئلہ کو صوفیائے کرام مسئلہ وحدت الوجود کہتے ہیں حقیقت میں یہ مسئلہ کسی حال والے سے سمجھنا چاہئے قال کا دائرہ بہت تنگ ہے۔

مسائل فقیهه: جمعہ کے خطبہ میں حمد پڑھنا واجب ہے اور خطبہ نکاح اور دعاء اور ہر جائز کام کے اول اور آخر میں ہر کھانے پینے کے بعد حمد کرنا مستحب ہے۔چھینک آنے کے بعد حمد کرنا سنت مؤکدہ ہے۔

اعتراضات

اعتراض: آریوں نے اس پر چند اعتراض کئے ہیں ایک تو یہ کہ یہ کلام اللہ کا نہیں کسی بندے کا بنایا ہوا ہے۔اگر خدا کا ہوتا تو اس طرح ہوتا۔اَلْحَمْدُ لِیْ دوسرے یہ کہ آگے آرہا ہے ہم تجھی کو پوجتے ہیں۔رب کس کو پوجتا ہے۔تیسرے یہ کہ خدا اپنی تعریف اپنے آپ کرے یہ غرور ہے اور غرور کرنا اور شیخی مارنا بری بات ہے۔ **جواب:** یہ کلام اللہ کا ہے اور اپنے بندوں سے کہلوانے کیلئے اس طرح بولا گیا ہے۔جیسے استاد شاگرد کو سامنے بٹھا کر کتاب خود پڑھتا ہے تاکہ شاگرد بھی اسی طرح پڑھے۔نیز کبھی حاکم دوسرے کی زبان میں بات کرتا ہے۔ممبری کے فارم چھپوائے جاتے ہیں۔اس کی عبارت اس طرح ہوتی ہے کہ "میں اقرار کرتا ہوں کہ سارے قوانین کی پابندی کروں گا۔ہمیشہ خیر خواہ رہوں گا۔وغیرہ وغیرہ دیکھو ان فارموں کا مضمون بنانے والا کوئی اور ہے۔لیکن چونکہ ممبروں سے یہ کہلوانا مقصود ہے اس لئے اس کی زبان میں یہ الفاظ لکھے گئے۔تو اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے بندو! ہماری بارگاہ میں آکر اس طرح کہا کرو۔رب تعالیٰ اگر اپنی ذات وصفات خود ہم سے بیان نہ فرماتا تو ہمیں اس کا پتہ کیسے چلتا یہ شیخی نہیں ہے بلکہ بندوں کو اپنی پہچان کرانی ہے۔ایک بادشاہ اپنی رعایا سے کہتا ہے

کہ مجھے تم پر فلاں فلاں اختیارات ہیں اور میری یہ شان ہے۔ اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ رعایا ان باتوں سے خبر دار ہو کر اس کی اطاعت کرے۔ اسی طرح یہاں بھی ہے۔ غرض کہ یہ اعتراض محض حماقت ہے۔ **دیوبندی اعتراض:** دیوبندی کہتے ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر حال میں بندہ اللہ ہی کی حمد اور اسی کا ذکر کرے۔ اٹھتے بیٹھتے یا رسول اللہ یا غوث کہنا اور کسی کا نام جپنا شرک ہے۔ **جواب:** اللہ والوں کی تعریف اور ان کا ذکر حقیقت میں خدا کی ہی تعریف ہے اور اسی کا ذکر ہے بلکہ کامل حمد اللہ کی وہی ہے جو اس کے خاص بندوں کے ذکر کے ساتھ ہو جیسا ہم اوپر بیان کر چکے۔ اگر اٹھتے بیٹھتے غیر اللہ کی تعریف کرنا شرک ہے تو تم بھی اٹھتے بیٹھتے اپنے مولویوں کے تعریف کرتے ہو۔ تم مشرک ہوئے کہ نہیں۔

رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۲﴾
مالک یا پالنے والے سارے جہانوں کا
جو مالک سارے جہان والوں کا

تعلقات

تعلق: اس کا تعلق حمد سے چند طرح ہے۔ ایک یہ کہ اس میں سب بندوں کو رب کی حمد کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اور اس میں اس کی وجہ بتائی گئی۔ یا یہ کہ وہ دعویٰ تھا کہ سب تعریفیں اللہ ہی کی ہیں۔ اس کی دلیل بیان کی گئی۔ یعنی ساری تعریفیں اللہ کیلئے ہیں کیونکہ وہ تمام جہانوں کا پالنے والا ہے اور جو جہانوں کو پالے وہ تعریف کے لائق بھی ہے دوسرے اس طرح کہ رب کی حمد کرنے والے چار قسم کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو محض رب کو راضی کرنے کیلئے اس کی حمد کریں اور کوئی اپنا نفع ان کے مدنظر نہ ہو جیسے حضرت انبیاء کرام علیہم السلام اور خواص اولیاء اللہ دوسرے وہ جو اپنے پر اس کے بیشمار احسانات دیکھ کر اس کی حمد کریں جیسے عام شکر گزار بندے۔ تیسرے وہ جو آئندہ رحمت کی امید پر اس کی حمد کریں جیسے عام گنہگار امیدوار بندے چوتھے وہ جو اس کی ہیبت وجلالت سے ڈر کر اس کی حمد کریں۔ پہلے گروہ کیلئے فرمایا گیا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ دوسرے گروہ کیلئے فرمایا رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ یعنی چونکہ وہ تم کو برابر پال رہا ہے۔ روزی دے رہا ہے اس کی حمد کرو۔ تیسرے گروہ کیلئے فرمایا گیا۔ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ یعنی چونکہ وہ تم پر آئندہ بھی رحم فرمائے گا لہٰذا تم اس کی حمد کرو چوتھے گروہ کیلئے فرمایا مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ یعنی چونکہ وہ شہنشاہ ہے ہر طرح تم پر قدرت رکھتا ہے اس سے ڈرو اور اس کی حمد کرو۔ غرضیکہ چاروں جملوں میں نہایت اعلیٰ درجہ کا تعلق ہے اور اس ترتیب کیسی عمدہ ہے کہ حمد کرنیوالوں کے مرتبوں کے مطابق ہے۔

تفسیر

لفظ رب کے تین معنی ہیں۔ مالک، سردار، پالنے والا اور تینوں معنی اس جگہ درست ہو سکتے ہیں مالک تو اس لئے کہ سارے جہانوں کا مالک ہونا۔ ہمیشہ سے مالک ہونا، ہمیشہ تک مالک رہنا۔ ہر طرح مالک ہونا، حقیقی مالک ہونا۔ یہ خاص حق تعالیٰ ہی کی صفت ہے جس کسی کو اس نے ملکیت عطا فرمائی وہ محدود ہے کسی خاص وقت سے ہے، کسی خاص وقت تک کیلئے ہے خاص

حیثیت سے ہے اور رب کی عطا سے ہے آپ اپنے جانور کے مالک ہیں لیکن اس کی ہر چیز کے مالک نہیں۔ نہ ہمیشہ سے مالک تھے اور نہ ہمیشہ مالک رہیں گے اسی طرح اور چیزوں کو بھی قیاس کرلو۔ سردار کے معنی اس لئے درست ہیں کہ سردار وہ جو بلند مرتبہ رکھے اور بیشک حق تعالیٰ سب سے بلند مرتبے والا اور اعلیٰ ہے۔ جس کسی کو عزت اور عظمت ملی، اسی کی عطا سے ملی۔ اسی لئے اس کا نام اعلیٰ، عظیم اور اس کی صفت تعالیٰ ہے۔ تیسرے معنی ہیں پالنے والا۔ اس معنی میں نہایت ہی وسعت ہے۔ کس کو پالنے والا، کب سے پالنے والا۔ کب تک پالنے والا اور کس طرح پالنے والا۔ کس کو پالنے والا رب العالمین سے معلوم ہوا کہ سارے جہانوں کا پالنے والا۔ کب سے کب تک پالنے والا یہ بھی اسی سے معلوم ہوا۔ کہ جب سے عالم ہے اور جب تک رہے گا اس کی ربوبیت کی بارش ان پر ہوتی رہے گی کس طرح پالنے والا یہ بھی اسی سے معلوم ہوا یعنی ہر طرح اور ہر نوعیت سے پالنے والا۔ اب اس کو یوں سمجھو کہ دنیا کے ظاہری پالنے والوں کی تربیت اس وقت شروع ہوتی ہے۔ جب کہ وہ چیز پہلے بن کر آجائے۔ اور بہت جلد ختم ہو جاتی ہے اور خاص قسم کی تربیت ہوتی ہے، عام نہیں ہوتی اور خاص خاص کی تربیت ہوتی ہے ہر ایک کو کوئی نہیں پالتا۔ دیکھو دنیا میں سب سے بڑے پالنے والے ماں باپ مانے گئے ہیں۔ جن کے متعلق رب قرآن پاک میں فرماتا ہے كَمَا رَبَّيٰنِي صَغِيرًا (الاسراء: ۲۴) دوسروں کی تربیت ان سے کہیں کم ہے لیکن جب بچہ باپ کی پیٹھ میں ہے اور ماں کے پیٹ میں آئے، نطفہ بن کر رہے، خون کا قطرہ بنے، گوشت کا لوتھڑا بنے، اس میں عضو وغیرہ بنیں۔ پھر اس میں روح پیدا ہو۔ ان تمام وقتوں میں ماں باپ کو اس کی پرورش سے کوئی تعلق نہیں۔ جب خیریت سے پیدا ہو گیا تو رب ہی نے ماں کے سینے سے دودھ کی دو نہریں جاری فرمائیں۔ ماں نے صرف یہ کیا کہ رب کا دیا ہوا دودھ اسی بچہ کے منہ میں دے دیا۔ اسی دودھ کے پیٹ میں پہنچنے کے بعد ماں پھر بے تعلق ہو گئی۔ معدے میں پہنچ کر اس کا ہضم ہونا اور بچے کا پلنا بڑھنا، اس میں ماں کا کوئی تعلق نہیں۔ پھر دودھ کا بہانہ بھی دو سال تک رہا بچہ بڑا ہوا۔ ماں نے یہ بھی بند کر دیا۔ غرضیکہ بچہ جس قدر بڑھتا گیا، ماں کی پرورش گھٹتی گئی۔ پھر ایک وقت وہ آیا کہ بچہ جوان اور ماں باپ بوڑھے ہو گئے تو اب معاملہ الٹ ہو گیا۔ ماں خدمت کی محتاج اور بیٹا خدمتگار۔ اور اگر اسی دوران میں بچہ مر گیا تو پھر تو کسی طرح کا ظاہری تعلق رہا ہی نہیں۔ قربان اس ''رب العالمین'' کے جو ہم کو باپ کی پیٹھ میں پالے۔ ماں کے پیٹ میں پالے، بچپن، جوانی، بڑھاپا، تندرستی، بیماری، جیتے ہر حال میں پالے اور سب کو پالے پھر کسی سے اس کا معاوضہ طلب نہ کرے۔ اسی لئے وہی ''رب العالمین'' کہلانے کا مستحق ہے پھر ہر طرح پالتا ہے جسم کے ظاہری اعضاء کو اور طریقے سے پرورش کرتا ہے باطنی اعضا کی پرورش کا اور طریقہ مقرر فرمایا۔ جان کو اور طریقے سے پالا ایمان کو اور طرح سے پرورش کیا۔ پاک ہے وہ جس نے ہڈی (کان) سے سنایا چربی (آنکھ) سے دکھایا اور گوشت (زبان) سے بولنے کی طاقت دی پھر ان چیزوں کو قسم قسم کے پھلوں اور دانوں سے پرورش فرمایا جس وقت، جس طرح جس کی پرورش کی ضرورت تھی اسی طرح اس کو پالا۔ درختوں میں چلنے پھرنے کی طاقت نہ تھی تو ان کیلئے باغبان کو خدمتگار مقرر کیا جس نے اُن کو وہیں کھاد پہنچایا۔ بادلوں کے بہشتیوں کو حکم دیا کہ تم سمندر سے پانی لے کر ان کو پلاؤ۔ غرض کہ ان کی ہر ضرورت وہیں کھڑے کھڑے پوری کی۔ پرندوں میں حرکت کی طاقت تھی لیکن روزی کمانے کی طاقت نہ تھی۔ ان

کو حکم دیا گیا کہ تمہارے گھونسلوں میں تمہارا رزق نہ پہنچے گا تم یہاں سے جاؤ۔ کھیت میں کسان نے تمہارے لئے غلہ تیار کر رکھا ہے جاؤ اور چگ آؤ وہ صبح کو بھوکے نکلے اور شام کو پیٹ بھر کر لوٹے۔ حضرت انسان کو حرکت کرنے کی بھی طاقت تھی اور کمانے کی بھی۔ انہیں حکم دیا گیا کہ تم کو درختوں اور جانوروں کی طرح بغیر کمائے روزی نہ ملے گی۔ وہ مجبور ہیں اور تم مختار۔ گھر سے نکلو بھی اور روزی کماؤ بھی۔ بیج تم ڈال آنا۔ باقی بارش، دھوپ وغیرہ سے تمہاری امداد ہم کریں گے۔ حضرت انسان بھی جب تک بے دانت والے ناسمجھ بچے رہے تب تک ان کو بھی دودھ پلا کر بغیر محنت کرائے پالا۔ غرض کہ ہر طرح پالنے والا ہے۔ یہ اس کی لامتناہی تربیتوں کا ایک نمونہ ہے۔

خالق اور مخلوق کی پرورش میں فرق

اگرچہ بعض بندے بعض بندوں کو ظاہری طور پر اور کچھ وقت کیلئے کسی قدر پالتے ہیں اس لئے اس کو مجازاً رب کہا جاتا ہے۔ جس پر قرآن کریم شاہد ہے۔ لیکن پھر بھی خالق کی تربیت میں بڑا فرق ہے۔ پہلا فرق یہ ہے کہ بندہ کسی کو کسی غرض کیلئے پالتا ہے۔ خالق بغیر غرض کے۔ اگر ماں باپ بیٹے کو پالتے ہیں تو اس لئے کہ وہ بڑھاپے میں کام آئے۔ مالدار غریبوں کو پالتے ہیں یا تو اس لئے کہ ہمارا نام ہو یا اس لئے کہ ہم کو آخرت میں ثواب ملے۔ بادشاہ اپنے نوکروں کو تنخواہ دیتے اور پالتے ہیں اس لئے کہ وقت پر ہمارے کام آئیں غرض سب اپنی اپنی غرض کیلئے ہیں۔ حق تعالیٰ ہی ہے جو بغیر غرض کے پالے۔ دوسرا فرق بندہ کسی کو پالتا ہے تو اس کے مال میں کمی ہو جاتی ہے وہ ختم ہونے کے خوف سے بڑی احتیاط سے کام کرتا ہے۔ اگر آمدنی کم ہو جائے تو بہت سے نوکر نکال دیئے جاتے ہیں۔ حق تعالیٰ کے خزانے میں کبھی کمی نہیں ہوتی اس لئے اس کی تربیت سے کوئی نکالا نہیں جاتا۔ تیسرا یہ کہ سخی بندے جب کسی کو پالتے ہیں تو اس پر احسان جتاتے ہیں اور بغیر مانگے دیتے نہیں۔ مگر حق تعالیٰ بغیر مانگے عطا کرتا ہے۔ وہ تو ایسا کریم ہے کہ جب ہم ماں کے پیٹ میں تھے ہم کو مانگنے کا شعور بھی نہ تھا۔ تب وہ دے رہا تھا۔ چوتھا یہ کہ بندہ سب کو نہیں پال سکتا۔ گھر بار والا آدمی صرف اپنے بچوں کو پالتا ہے۔ بڑا آدمی صرف نوکر چاکروں کو پالتا ہے۔ لیکن رب سب کو پالتا ہے۔ پانچواں فرق یہ ہے کہ اور سخی لوگ زیادہ مانگنے والوں اور بہت سے سوالات سے گھبرا جاتے ہیں۔ لیکن رب وہ کریم ہے کہ اس کو بہت مانگنا پسند ہے۔ ہر گدا اس کے دروازے پر نئی ادا سے آتا ہے نئے ناز دکھاتا ہے مگر وہ سب کو اپنے فضل سے نوازتا ہے۔

اے کہ باہر دل ترا رازے دگر   ہر گدا را بر درت نازے دگر

فائدہ

عیسائی حق تعالیٰ کو اب (باپ) کہتے ہیں اور ہم اس کو رب کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کو دنیا کا باپ کہنا اس کی بہت بڑی توہین ہے۔ ہم بتاتے ہیں کہ باپ اور رب میں کیا اور کتنے فرق ہیں۔ پہلا فرق یہ ہے کہ باپ اپنے بچے کو پالنے میں اس کی ماں کا محتاج ہے کہ اس کی امداد سے پالے۔ رب بندوں کو پالنے میں کسی کا محتاج نہیں ہے۔ دوسرا فرق یہ ہے کہ باپ فقط جسم

کو پالتا ہے۔رب ہر چیز کو۔اسی لئے باپ بیٹے کو ہوشیار ہونے کے بعد استاد اور پیر کے سپرد کرتا ہے اور عرض کرتا ہے اتنا کام میں نے کر دیا۔آگے اس کی اصلاح آپ کے ذمے ہے۔تیسرا فرق باپ کا درجہ دینی استاد اور مرشد سے کم ہے۔کیونکہ باپ نے ہم کو حیوان (جاندار جسم) بنایا اور دینی استاد اور شیخ نے ہم کو ناطق یعنی سمجھ بوجھ والا بنایا۔نیز باپ نے ہم کو اوپر (عالم ارواح) سے نیچے (عالم اجسام) میں اتارا اور استاد اور شیخ نے پھر نیچے سے اوپر پہنچایا۔اگر ان کا کرم نہ ہوتا تو اسفل السافلین میں جاتے نیز باپ نے فقط جسم بنایا جو کہ مٹنے والا ہے۔مگر استاد اور شیخ نے ایمان دیا جو باقی دولت ہے اسی لئے اگرچہ مالی حقوق میں ماں باپ استاد سے بڑھ جائیں لیکن اطاعت اور ادب میں استاد اور شیخ والد سے بڑھ کر ہیں۔لیکن رب کی بارگاہ میں یہ سوال ہی نہیں۔کیونکہ وہاں تقسیم کار نہیں۔چوتھا فرق باپ اور بیٹے میں جنسیت اور نوعیت میں شرکت ہوتی ہے یعنی بیٹا باپ کا ہم جنس ہوتا ہے۔انسان کا بچہ انسان، گھوڑے کا بچہ گھوڑا، گدھے کا بچہ گدھا، ہمارے پیٹ میں سے جو کیڑے خارج ہوتے ہیں، اسی طرح بالوں اور کپڑوں میں سے جو جوئیں وغیرہ نکلتی ہیں وہ ہماری اولاد نہیں کیونکہ وہ ہماری ہم جنس نہیں۔لہٰذا جب مخلوق خالق کی ہم جنس نہیں بلکہ کسی صفت میں شریک نہیں تو اس رب کو باپ اور مخلوق کو اولاد کہنا حماقت ہی تو ہے پانچواں فرق یہ ہے کہ جس طرح بیٹا باپ کا محتاج ہے ایسے ہی باپ بیٹے کا محتاج ہے بیٹا ہو تو اسے باپ کہا جائے گا۔مگر رب تعالیٰ اپنی کسی صفت میں اپنی مخلوق کا محتاج نہیں۔

ربوبیت عامہ اور خاصہ

حق تعالیٰ کی ربوبیت کا دو طرح ظہور ہو رہا ہے۔اس کی بعض نعمتیں تو وہ ہیں جو سب کو بلا فرق مل رہی ہیں۔جیسے دھوپ، ہوا، زمین، آسمان کا سایہ وغیرہ بعض نعمتیں وہ ہیں جو خاص خاص کو بہت فرقوں کے ساتھ عطا ہو رہی ہے۔جیسے رزق، مال، اولاد، عزت، حکومت، آفتاب وغیرہ تو یہ سب حق تعالیٰ کی ربوبیت عامہ کے مظہر ہیں اور مال وغیرہ اس کی ربوبیت خاصہ کے۔لیکن پھر بھی آفتاب وغیرہ کے عموم میں کچھ کمی ہے کہ یہ چیزیں بیک وقت سب کو فیض نہیں پہنچاتیں۔فقط جسم کو فیض دیتی ہیں۔روح سے ان کو تعلق نہیں ہوتا۔حکمت الٰہی کا تقاضا تھا کہ کوئی نعمت اس کی ایسی بھی ہو جو اس کی ہر طرح کی ربوبیت کو پورے طور پر ظاہر کرے۔ہر جگہ، ہر وقت، ہر چیز کو یکساں فیض عام بھی پہنچائے اور خاص خاص کو خاص فیض بھی اس نعمت الٰہیہ کا نام اور مظہر اتم کا اسم شریف ہے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہی وہ نعمت عظمیٰ ہے جس کو رب تعالیٰ نے فرمایا وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (انبیاء:۱۰۷) ایک جگہ فرمایا لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (فرقان:۱) جس قدر رب العالمین کی ربوبیت میں وسعتیں ہیں۔اسی قدر رحمت عالم کی رحمت کی گنجائشیں۔بلکہ یوں کہو کہ حق تعالیٰ کی ربوبیت حضور علیہ السلام کی رحمت کے ذریعے سے سب کو پہنچتی ہے۔حضور علیہ السلام کی رحمت ایک تو عام ہے۔کلمہ، کعبہ، قرآن، ایمان سب کو یکساں عطا فرمایا۔لیکن ولایت، قطبیت، غوثیت اور شہادت وغیرہ خاص خاص نعمتیں ہیں جو حضور علیہ السلام کے دربار در بار سے فرق کے ساتھ بٹتی ہیں۔العالمین۔عالمین جمع عالم کی ہے۔عالم علم سے بنا ہے جس کے معنی ہیں نشان دنیا کو عالم اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی ہر چیز اپنے خالق کی نشانی ہے۔اللہ کے سوا کو عالم کہتے ہیں۔تفسیر روح البیان شریف نے اس جگہ

فرمایا کہ اٹھارہ ہزار عالم ہیں اور یہ دنیا یعنی زمین و آسمان وغیرہ جو ہم کو نظر آ رہے ہیں۔ ان میں سے ایک ہے۔ ''عالم ارواح'' عالم اجسام، عالم امکان، پھر عالم سفلی، عالم علوی، عالم ملکوت، عالم ناسوت، عالم جنات، عالم انسان، عالم ملائکہ، عالم برزخ وغیرہ وغیرہ یہ دنیا تو ان عالموں میں سب سے چھوٹا عالم ہے۔ ایک جنت ہی اتنی بڑی ہے کہ تمام زمین و آسمان اس میں رکھے جائیں تو ایسے معلوم ہوں جیسے میدان میں چند کوڑیاں۔ جہنم کی گہرائی کا یہ حال ہے کہ اگر ایک پتھر اس کے کنارے سے پھینکا جائے تو ستر سال میں اس کی تہ تک پہنچے۔ حالانکہ وہی پتھر آسمان سے پھینکا جائے تو بارہ گھنٹے سے پیشتر زمین پر آ جائے گا پھر یہ عالم جو نظر آ رہا ہے اس میں ہزاروں قسم کی وہ مخلوق ہے جس سے ہم ناواقف ہیں تفسیر روح البیان شریف میں اسی جگہ ہے کہ صرف انسانوں کی ایک سو پچیس قسمیں ہیں بعض وہ بھی ہیں کہ جن کے کان ہاتھی کے کان کی طرح ہیں۔ بعض وہ ہیں جن کے پاؤں میں چلنے کی طاقت نہیں۔ بعض وہ ہیں جن کی آنکھیں ان کے سینوں پر ہیں۔ بعض وہ ہیں جن کے سر کتوں کے سے ہیں۔ فقیر نے بھی بعض مردم خور انسان کے فوٹو دیکھے ہیں جن کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے جب ہم کو ان عالموں کی ہی خبر نہیں تو اس کی ربوبیت کو کما حقہ، کیسے جان سکیں۔

آریوں کے اعتراضات

اعتراض: اگر پروردگار واقعی عالمین (تمام جہانوں) کا پالنے والا ہے تو مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل کیوں کراتا ہے رب کا کام ہے پالنا نہ کہ مارنا۔ **جواب:** جو ناقص مخلوق اپنے وجود سے دوسری اعلیٰ مخلوق کی پرورش میں رکاوٹ پیدا کرے۔ اس کو علیحدہ کر دینا ہی پرورش ہے۔ کسان کے کھیت میں فصل کے ساتھ کچھ خوبصورت نرم گھاس بھی اگ آتی ہے۔ دیکھنے میں بھلی معلوم ہوتی ہے مگر کسان جانتا ہے کہ اس سے کھیت برباد ہو جائیگا۔ اسے جڑ سے اکھیڑ باہر پھینکتا ہے کیونکہ اسی میں کھیت کی بھلائی ہے۔ اسی طرح کفار رب تعالیٰ کی زمین پر خوبصورت گھاس ہیں اگر زور پکڑ جائیں تو خدا کے بندوں پر دنیا تنگ ہو جائے ان کو نکلوا دینا ہی ضروری ہے گویا یہ ربوبیت کیلئے آڑ ہیں جس کا ہٹانا ضروری ہے۔ **دوسرا اعتراض:** رب کا کام پرورش کرنا اور تکلیفوں سے بچانا ہے پھر وہ اپنے خاص بندوں پر تکلیفیں کیوں اتارتا ہے۔ بیماری غریبی وغیرہ۔ **جواب:** رب تعالیٰ اپنے مخلص بندوں پر جو کوئی تکلیف بھیجتا ہے اس میں ہزار ہا حکمتیں ہوتی ہیں کبھی یہ تکلیف اس کے گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہے کبھی صبر کی وجہ سے ان کا درجہ بلند کرتی ہے کبھی یہ بہت بڑی راحت کا پیش خیمہ ہوتی ہے۔ مثلاً مال کی زکوٰۃ ظاہر میں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ مال بلاوجہ خرچ کرنا ہے لیکن اس کی برکت سے غریب پل جاتے ہیں۔ دینے والے کے مال میں برکت ہوتی ہے جیسے کہ پھل دار درخت کی شاخیں کاٹ دینے سے آئندہ اس سے زیادہ پھل پیدا ہوتے ہیں۔ معمولی بیماریاں، بڑی بڑی بیماریوں سے بچا لیتی ہیں۔ بہت دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک چیز ہم کو شروع میں ناپسند ہوتی ہے۔ مگر اس کا انجام نہایت اچھا ہے۔ باپ اپنے عزیز بیٹے پر علم و ہنر سیکھنے کی محنت ڈالتا ہے بچہ مدرسہ کی پابندیاں، استاد کی سختیاں دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔ مگر جب اس کا نتیجہ نکلتا ہے تو سمجھتا ہے کہ وہ سختیاں کڑی دوا کی طرح فائدہ مند تھیں۔ **تیسرا اعتراض:** اگر حق تعالیٰ ''رب العالمین'' ہے تو بندوں کی ہر دعا قبول کیوں نہیں فرماتا۔ بہت دفعہ دعا کرتے کرتے تھک

جاتے ہیں لیکن دعا قبول نہیں ہوتی۔ **جواب:** بندہ اپنی نا سمجھی سے کبھی وہ دعائیں مانگ لیتا ہے جو انجام کار اس کیلئے نقصان دہ ہوتی ہیں۔ رب تعالیٰ چونکہ علیم وخبیر ہے وہ اپنے عین فضل وکرم سے ان کو قبول نہیں فرماتا۔ اس کا قبول نہ فرمانا اس کا کرم ہے نہ کہ ظلم۔ نا سمجھ بچہ اپنے عقلمند باپ سے شہد مانگتا ہے۔ باپ جانتا ہے کہ یہ شہد اس کو نقصان دے گا بیوقوف بیمار حکیم سے خوش رنگ اور مزیدار دوائیں مانگتا ہے لیکن وہ اس کو کڑوی دوائیں پلاتا ہے، تو یہ اس باپ اور حکیم کا اس پر عین کرم ہے۔

چوتھا اعتراض: رب کے معنی ہیں پالنے والا جب حق تعالیٰ سب کا رب ہے تو چاہئے کہ سب کو پالا ہی کرے کسی کو موت نہ دیا کرے کیا ہلاک کرنا بھی ربوبیت ہے؟ **جواب:** جو لوگ موت سے گھبراتے ہیں وہ موت کی حقیقت کو نہیں سمجھتے۔ موت تو حبیب سے ملنے کا ایک پل ہے حق تعالیٰ کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت نصیب ہوتی ہے۔ گویا زندگی ایک کھیتی ہے اور موت اس کی کٹائی کھیت کا کاٹنا حقیقت میں کھیت کی پرورش کی تکمیل ہے۔ ایسے ہی انسان کی زندگی اس کے کمائی کرنے کا وقت ہے اور موت اسی کا پھل پانے کا وقت ہے۔

دیوبندی اعتراض: جب حق تعالیٰ ''رب العالمین'' ہے تو چاہئے کہ ساری حاجتیں اسی سے مانگی جائیں جو لوگ خدا کو چھوڑ کر نبیوں ولیوں سے حاجتیں مانگتے ہیں وہ خدا تعالیٰ کو ''رب العالمین'' نہیں مانتے۔ **جواب:** اللہ کے خاص بندوں سے کوئی چیز مانگنا حقیقت میں اسی اللہ ہی سے مانگنا ہے۔ کیونکہ یہ اللہ کے بندے اس کی صفت ربوبیت کے مظہر ہیں۔ بیشک اللہ ''رب العالمین'' رازق ہے شافی الامراض ہے۔ لیکن اس نے ان تمام کاموں کیلئے دروازے مقرر کر دیے ہیں ان دروازوں پر جا کر مانگنا۔ حقیقت میں رب ہی سے مانگنا ہے۔ شفا لینے حکیم کے ہاں جاتے ہیں، انصاف لینے حاکم کے ہاں پہنچتے ہیں۔ خدا کا رزق لینے کیلئے مالدار کا دروازہ تلاش کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں۔

رزق ہر چند بیگماں برسد　　　شرط عقل است جستن از در ہا

یوں سمجھو کہ پاور ہاؤس میں بجلی بنتی ہے لیکن اس کی روشنی وہاں ملتی ہے جہاں اس کے قمقمے لگے ہوں تو جو شخص قمقموں سے روشنی حاصل کرے وہ پاور ہاؤس کا مخالف نہیں۔ اس کی بحث انشاء اللہ تعالیٰ آئندہ بھی کی جائے گی۔

الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝۲
بخشنے والا مہربان
بہت مہربان رحمت والا

تعلق

اس کا تعلق رب العالمین سے چند طریقے پر ہے۔ ایک یہ کہ اس جملے میں ارشاد تھا کہ وہ جہانوں کا پالنے والا ہے۔ احتمال تھا شاید وہ اس پالنے پر مجبور ہو۔ یعنی اس کو پالنا پڑتا ہے۔ جیسے کہ بادشاہ اپنے ملازمین کو پالتا ہے۔ مگر وہ اس پالنے پر مجبور ہے کہ اگر نہ پالے تو اس کی سلطنت قائم نہیں رہ سکتی۔ یا کوئی شخص اپنے گھر کے جانور وغیرہ کو مجبوراً پالتا ہے۔ کیونکہ جانتا ہے کہ نہ

پالوں گا تو میرے کام بند ہو جائیں گے تو اس جگہ فرمایا گیا کہ وہ عالمین کو پالنے پر مجبور نہیں ہے۔ محض رحمت سے پالتا ہے دوسرے اس طرح کہ پالنا کبھی رحمت کے ساتھ ہوتا ہے کبھی قہر کے ساتھ۔ جیسے کہ جیل خانے میں قیدیوں کو بھی حکومت پالتی ہے کھانے پینے کو دیتی ہے۔ مگر قہر کے ساتھ پالتی ہے۔ لیکن یہاں فرمایا کہ پالتا تو ہے مگر رحم کے ساتھ۔ تیسرے اس طرح کہ حمد کا رحمت کے ساتھ خاص تعلق ہے۔ جو خدا کی حمد کرتا ہے رحمت ضرور پاتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا ہوتے ہی چھینک آئی تو کہا۔ الحمد للہ فوراً ملائکہ کی طرف سے جواب ملا یرحمک اللہ وہی سنت آج بھی جاری ہے۔ رحمٰن اور رحیم کی تفسیر اور ان کا فرق ہم ''بسم اللہ'' میں پورے طور پر بیان کر چکے ہیں۔ یہاں اتنا اور بتائے دیتے ہیں کہ ''رحمان'' کے معنی یہ بھی کئے گئے ہیں کہ اس قسم کی رحمتیں فرمانے والا جو بندوں سے حاصل نہ ہو سکیں۔ اور رحیم کے معنی یہ ہیں کہ اس قسم کی رحمتیں فرمانے والے کہ جس کی مثل کچھ نہ کچھ بندوں سے بھی حاصل ہو سکے۔ اسی طرح رحمان بلا واسطہ بندوں پر رحم فرمانے والا اور رحیم بندوں کے واسطے سے رحم فرمانے والا۔ مثال یوں سمجھو کہ اکثر جاندار چیزیں اپنے ماں باپ کے ذریعے سے پرورش پاتی ہیں۔ لیکن کوے کا بچہ جب انڈے سے نکلتا ہے تو اس کی ماں اس سے بالکل بے تعلق ہو جاتی ہے۔ وہ گوشت کا لوتھڑا سا ہوتا ہے۔ اس کے کھانے کیلئے اس پر مچھر جمع ہو جاتے ہیں۔ وہ ان کو لقمہ بنالیتا ہے۔ اسطرح اس کی پرورش ہوتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ اس کے جسم پر پر آجاتے ہیں۔ تب ماں پالتی ہے۔ (روح البیان و تفسیر کبیر) حضور ذوالنون مصری رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دن میں دریائے نیل کے کنارے جا رہا تھا میں نے دیکھا کہ ایک بچھو بھاگا ہوا دریا کی طرف آ رہا ہے جب وہ دریا کے کنارے پہنچا فوراً ایک کچھوا کنارے آ لگا۔ وہ بچھو اس پر سوار ہوا اور کچھوا اس کو لے کر دوسرے کنارے کی طرف چل دیا مجھے شوق ہوا کہ دیکھوں یہ بچھو کو کہاں لے جا رہا ہے میں کشتی میں بیٹھ کر اس کے پیچھے ہولیا بچھو اس طرف پہنچ کر اترا اور دوڑتا ہوا آگے چل دیا میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولیا کچھ دور جا کر دیکھا کہ ایک نوجوان شخص ہے اور اس کے قریب ایک زہریلا سانپ ہے جو اس کو کاٹنا چاہتا ہے اس بچھو نے سانپ پر حملہ کیا اور سانپ نے بچھو پر یہ دونوں ایک دوسرے کے زہر سے مر گئے اور وہ جوان بچ گیا ہم بھی دن میں بظاہر اپنی حفاظت خود کرتے ہیں لیکن رات کو سونے کی حالت میں ہماری حفاظت خدا کے سوا کون کرتا ہے بہت سی مصیبتیں وہ ہیں کہ ہماری ظاہری کوشش سے دفع ہوتی ہیں اور بہت سی وہ آفتیں ہیں کہ جن سے ہم کو حق تعالیٰ ہی بچاتا ہے وہ اس کی رحمانیت کا ظہور ہے۔ اور یہ اس کی رحیمی کی جلوہ گری مشرکین کا عقیدہ تھا کہ بڑی بڑی نعمتیں رب دیتا ہے اور چھوٹی چھوٹی بت۔ اس عقیدے کی بھی اس میں تردید ہوگئی کہ وہ رحمان بھی ہے اور رحیم بھی یعنی چھوٹی بڑی نعمتیں وہی عطا کرتا ہے۔

اعتراضات

آریوں کے اعتراض: پہلا اعتراض: جب بسم اللہ میں یہ دو لفظ آ چکے تھے تو یہاں دوبارہ کیوں لائے گئے۔ **جواب:** بسم اللہ میں حق تعالیٰ کی ذاتی رحمتوں کا ذکر تھا اور یہاں صفاتی کا۔ 2- قرآن کریم میں جن چیزوں کا بار بار ذکر فرمایا ہے اس سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ بندے سمجھ جائیں کہ ان کو بار بار کہنا خدا کو پسند ہے۔ **دوسرا اعتراض:** خدا

پاک رحمٰن اور رحیم ہے تو دوزخ اور موذی چیزوں کو کیوں پیدا فرمایا اور شیطان کو کیوں بنایا۔ **جواب:** اس کا جواب "رب العالمین" میں گزر چکا ہے کہ بعض تکلیفیں رحمت کو ظاہر کرتی ہیں جو مصیبت کسی عوض رحمت کا ذریعہ بن جائے وہ حقیقت میں رحمت ہی ہے۔ اگر تکلیف دہ چیزیں پیدا نہ ہوتیں تو ہماری روح اور جسم کو پوری طہارت حاصل نہ ہوتی۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ بظاہر تکلیف دہ معلوم ہوتی ہیں لیکن حقیقت میں یہ روح کو پاک کرنے والی چیزیں ہیں۔ جیسے کہ میلے لوہے کو لوہار بھٹی میں رکھ کے کوٹتا پیٹتا ہے تو وہ مصیبت پا کر زنگ وغیرہ سے صاف ہو جاتا ہے۔ اور اگر صاف اور قیمتی لوہے کو بھٹی میں رکھتا ہے تو اسے کوٹ پیٹ کر پرزہ بناتا ہے جس سے اس کی قدر و قیمت بڑھ جاتی ہے گھڑیوں اور مشینوں میں تھوڑی قیمت کا لوہا ہے لیکن کاریگر کے پاس پہنچ کر پرزہ بنا اور بہت قیمتی ہو گیا۔ سونا اگرچہ نہایت قیمتی دھات ہے اگر وہ سنار کی بھٹی میں نہ رکھا جائے اور سنار کے ہاتھ سے چوٹیں نہ کھائے تو وہ زیور بن کر محبوب کے گلے میں نہ جائے تو یہ تکلیفیں بھی حقیقت میں اس کی قدر و قیمت بڑھانے والی ہیں۔ اسی طرح گنہگاروں پر جو تکلیفیں اور مصیبتیں آتی ہیں وہ انہیں زنگ آلود لوہے کی طرح گناہوں کے میل سے صاف کر جاتی ہیں اور نیک کاروں پر جو آتی ہیں ان کو عمدہ لوہے کی طرح قیمتی بنا جاتی ہیں۔ مقربین پر جو آتی ہیں ان کو سونے کی طرح اور زیادہ قرب الٰہی کے قابل بنا جاتی ہیں تو یہ مصیبتیں درحقیقت حق تعالیٰ کی رحمتیں ہیں۔ اسی طرح تکلیف دہ زہریلی چیزیں وغیرہ ہزاروں بڑی بڑی مصیبتوں کو دفع کر دیتی ہیں مثلاً مچھر اور مکھی جسم انسانی سے بہت زہریلے مادوں کو چوس لیتے ہیں۔ غلے کے کیڑے۔ گھن وغیرہ غلے کے بہت سے مضر اثرات کو مٹا دیتے ہیں۔ بے وقت بارشیں زہریلے دانوں کو تباہ کر کے اور گرم غلے کو ٹھنڈا کر کے کھانے کے قابل بنا دیتی ہیں۔ پھر یہ کیا ضروری ہے کہ پروردگار عالم صرف انسانوں پر ہی رحم فرمائے وہ بھی اس کی مخلوق اور اس کے رحم کے مستحق ہیں۔

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ؕ﴿۳﴾
مالک دن بدلے کا۔
روز جزا کا مالک

تعلق

اس سے پہلے اللہ کی ربوبیت اور رحمت کا ذکر ہوا۔ جس سے سننے والے کے قلب میں امید کا دریا موجیں مارنے لگا۔ اب ضرورت تھی، کہ اس کے دل میں رب کا خوف پیدا کیا جائے کیونکہ ایمان امید اور خوف کے درمیان ہے۔ لہٰذا اس آیت میں رب تعالیٰ کی ملکیت، غلبے وغیرہ کا ذکر فرمایا۔ عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ دنیا میں کیسے ہی گناہ کرلو، کوئی سزا نہ ملے گی۔ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کی سولی (معاذ اللہ) سب کا کفارہ بن گئی۔ انہیں رحمت پر یقین ہو گیا۔ غضب سے بے خوف ہو کر گناہ پر دلیر ہو گئے۔ آریوں کا عقیدہ ہے کہ کسی گناہ کی معافی ہو سکتی نہیں اس کی سزا ضرور بھگتنی پڑے گی۔ یہ رحمت سے مایوس ہوئے گناہ پر دلیر ہوئے کیونکہ ناامیدی بھی گناہ پر دلیر کرتی ہے جب تک کہ بلی کتے سے بچنے کا موقعہ دیکھتی ہے بھاگتی ہے مگر جب پھنس جاتی ہے تو کتے پر حملہ کر دیتی ہے۔ جس کو پھانسی کا حکم ہو جائے اس کی بہت احتیاط کی جاتی ہے کہ کسی کو قتل نہ کر دے کیونکہ وہ

اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے انسان گناہ سے اسی وقت بچ سکتا ہے جب اس کو اپنے مولیٰ کے غضب کا ڈر اور اس کی رحمت کی امید ہو۔ اس لئے رحمتوں کے ذکر کے بعد اپنی جباری کا ذکر فرمایا۔ دوسرے اس طرح کہ بعض لوگ امید پر عبادت کرتے ہیں اور بعض جوتے کے خوف سے۔ امید والوں کیلئے پہلی آیتیں تھیں اور دوسروں کیلئے یہ آیت۔

تفسیر

مالک۔ قاریوں کا اس لفظ میں اختلاف ہے بعض اسے مالک اور بعض ملک پڑھتے ہیں ملک کے معنی بادشاہ اور مالک کے معنی مالک۔ خواہ کچھ بھی ہو ہے بنا یہ ملک سے ملک کے لفظی معنی ہیں تعلق مضبوطی اور قوت بادشاہ کو ملک اور مالک اس لئے کہتے ہیں کہ اس کو اپنے مملوک اور رعیت سے تعلق بھی ہوتا ہے۔ اس پر قدرت بھی ہوتی ہے اور مضبوطی سے سب پر قابض بھی ہوتا ہے۔ جو لوگ ملک پڑھتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ بادشاہ کا درجہ عام مالکوں سے زیادہ ہوتا ہے۔ لہٰذا ملک پڑھنا بہتر ہے، جس کے معنی ہوئے قیامت کے دن کا بادشاہ لیکن مالک پڑھنے والے فرماتے ہیں کہ مالک پڑھنا چند وجہوں سے بہتر ہے۔ اولاً یہ کہ مالک میں چار حرف ہیں اور ملک میں تین اور قرآن پاک کے ایک حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں لہٰذا مالک کے پڑھنے پر چالیس اور ملک کے پڑھنے پر تیس نیکیاں ملیں گی۔ دوسرے اس لئے کہ بادشاہ رعایا کا حاکم ہوتا ہے اور مالک اپنے مال یا غلام کا لیکن بمقابلہ رعیت کے زیادہ قبضہ اپنی مملوک پر ہوتا ہے کیونکہ رعیت میں بعض وہ بھی ہوتے ہیں کہ جن کی بادشاہ کو مجبوراً رعایت کرنی پڑتی ہے بلکہ رعایا کو رعایا کہتے ہی اس لئے ہیں کہ بادشاہ کو اس کی رعایت کرنی پڑتی ہے۔ لہٰذا ملک سے مالک پڑھنا بہتر ہے۔ تیسرے اس لئے کہ رعایا اپنے آپ کو بادشاہ کی حکومت سے نکال سکتی ہے یا تو اس طرح کہ اس کے ملک سے نکل کر دوسرے کے ملک میں پہنچ جائے یا بادشاہ کو سلطنت سے معزول کر دے لیکن مملوک اپنے مالک کی ملکیت سے اپنی خوشی سے کبھی نہیں نکل سکتا۔ لہٰذا مالک کی ملکیت بادشاہ کی ملکیت سے قوی ہے۔ چوتھے اس لئے کہ بادشاہ اپنی رعایا کے مال و جان وغیرہ کا بالکل مالک نہیں بلکہ وہ خود ان کے مالک اور قابض ہوتے ہیں۔ لیکن مالک اپنے مملوک یا غلام کی ہر چیز کا مالک ہے۔ پانچواں اس لئے کہ رعایا ہر کام کرنے میں بادشاہ کی اجازت لینے کی محتاج نہیں لیکن مملوک (غلام) اپنے مالک کی بغیر اجازت کوئی کام نہیں کر سکتا۔ چھٹے اس لئے کہ رعایا بادشاہ سے ہر چیز نہیں مانگ سکتی بلکہ اپنا انتظام خود کرتی ہے بادشاہ کی اطاعت صرف اس لئے کرتی ہے کہ اس کے غضب سے بچ جائے لیکن مملوک (غلام) اپنا کھانا کپڑا ہر ضروریات اپنے مالک سے مانگتا ہے اور ہم بھی رب تعالیٰ سے ہر چیز مانگتے ہیں اور وہ ہمارا مربی ہے لہٰذا مالک کے معنی زیادہ مناسب ہیں۔ ساتویں اس لئے کہ بادشاہ رعایا کے مال کا امیدوار رہتا ہے کہ یہ ٹیکس ادا کریں تو ہماری سلطنت چلے اور یہ ہماری فوج میں بھرتی ہوں تو ہمیں مدد ملے لیکن مالک اپنے غلام سے ان باتوں میں بے نیاز ہوتا ہے وہ اس سے مال لیتا نہیں بلکہ اس کو مال دیتا ہے اور وہ غلام بھی اپنے کو خالی سمجھ کر اس کے کرم و فضل کا طالب ہوتا ہے۔ ہم بھی خدائے پاک کی بارگاہ میں اس کے فضل و کرم ہی کے طالب ہیں۔ آٹھویں یہ کہ بادشاہ تندرست اور جوان ہی کو اپنی فوج میں بھرتی کرتا ہے اور بیماروں اور کمزوروں کو نہیں لیتا لیکن مالک اپنے بیمار اور کمزور غلام کا علاج کراتا ہے اور بڑھاپے میں اس کی مدد کرتا ہے۔ اور اگر وہ کسی بلا میں پھنس جائے تو مالک

اسے چھڑاتا ہے۔نویں یہ کہ بادشاہت میں ہیبت ہے اور ملکیت میں رحمت اور حق تعالیٰ اپنے بندوں پر رحیم و کریم ہے (تفسیر کبیر) ان وجہوں سے مالک پڑھنا بہتر ہے۔ یَوْمِ الدِّیْنِ بدلے کا دن۔ یوم عربی میں دن کو کہتے ہیں اور دن ہوتا ہے آفتاب کی حرکت سے اور قیامت کے دن آفتاب کی حرکت نہ ہوگی اس لئے یہاں یوم سے مراد وقت یا زمانہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ حق تعالیٰ قیامت کے سارے وقت کا مالک ہے یا قیامت میں جو واقعات ہوں گے ان سب کا مالک ہے۔ دین کے دو معنی ہیں۔ بدلہ فیصلہ اور انصاف۔ دوسرے ملت۔ یعنی مذہبی عقیدے قیامت کے دن کو دین کا دن یا تو اس لئے کہتے ہیں کہ اس دن تمام دینوں یعنی ملتوں کے فیصلے کئے جائیں گے۔ دنیا میں دیندار اور بے دین یکساں پل رہے ہیں۔ بظاہر حق و باطل کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن اس دن سب پتہ چل جائے گا یا اس لئے دین کا دن کہتے ہیں کہ ہر دین والا دین اسی لئے اختیار کرتا ہے کہ اس دن نجات ہو جائے۔ عیسائی، یہودی، پارسی اور مسلمان وغیرہ جس قدر مذاہب ہیں سب اس دن کے قائل ہیں۔ سب اسی دن کی مصیبت سے بچنے کیلئے آج دین اختیار کر رہے ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض نے غلط دین اختیار کیا بعض نے صحیح۔ یا یوم دین اس لئے کہتے ہیں کہ اس دن کوئی دنیوی کام نہ ہوگا۔ بلکہ سب کام دینی ہوں گے دنیا میں ہم کچھ کام دینی کرتے ہیں اور کچھ دنیوی لیکن اس دن کھانا پینا لباس تعمیر مکان ان میں سے کوئی کام نہ ہوگا اگر دین کے معنی جزا کئے جائیں تو قیامت کو یوم الدین اسلئے کہتے ہیں کہ اس دن دنیا کے تمام اعمال کی جزا دی جائے گی دنیا میں اچھے برے جیسے چاہو کام کرلو یہاں بدلہ نہیں۔ لیکن وہاں بدلہ ہے کام نہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک طالب علم تعلیم کے زمانہ میں صرف پڑھتا ہے اس زمانہ میں اس کی محنت کی کوئی بھی تحقیقات نہیں کرتا۔ محنت کرے یا کھیلے۔ لیکن جب امتحان کا دن آیا اس نے محنتی اور کھلاڑی کو الگ الگ کر دیا محنتی بڑھا کے ان کو انعام دیا اور کھلاڑیوں کو سزا تو گویا امتحان کا دن سال بھر کے کام کے بدلے کا ہے یا یوں سمجھو کہ کھیت میں بھوسہ اور دانہ ایک ہی زمین میں رہتے ہیں۔ ایک ہی کھاد اور پانی سے پلتے ہیں۔ ایک ہی دھوپ سے فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ لیکن ایک دن وہ بھی آتا ہے جب کہ کھیت کا مالک اس کو گاہ کر بھوسے کو دانے سے الگ کر دیتا ہے۔ دانہ اور جگہ پہنچتا ہے اور بھوسہ اور جگہ یونہی دنیا ایک کھیتی ہے اور قیامت کے دن اس کے گاہنے کا دن ہے۔ **نکتہ** حق تعالیٰ ہمیشہ تک ہر چیز کا مالک ہے پھر اپنے کو بالخصوص قیامت کا مالک فرمانا چند وجہوں سے ہے۔ اولاً یہ کہ جب مالک کی عظمت دکھانی منظور ہوتی ہے تو اس کی ملکیت کو کسی بڑے مملوک کی طرف نسبت کی جاتی ہے۔ بادشاہ کی سلطنت بہت سے ملکوں، شہروں، قصبوں اور گاؤں پر ہوتی ہے لیکن جب اس کی عظمت ظاہر کرتے ہیں تو کہتے ہیں شاہ ہند، شاہ دہلی وغیرہ اس کا منشا یہ نہیں کہ اور چیزوں کا مالک نہیں مالک تو ہے لیکن اس طرح کہنے میں اس کی بھی عظمت ظاہر ہوتی ہے اسی لئے حق تعالیٰ کو رب کعبہ اور رب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ دوسرے اس لئے کہ دنیا میں بظاہر اور بھی عارضی مالک ہیں کہا جاتا ہے کہ ہندوستان کا مالک فلاں۔ جاپان کا بادشاہ فلاں۔ یہ گھر فلاں کا۔ لیکن قیامت کا دن وہ دن ہوگا جب کہ کوئی بھی کسی چیز کا ظاہری مالک بھی نہ ہوگا۔ خود ارشاد فرمائے گا لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ آج کس کا ملک ہے۔ اس وقت کوئی اس سوال کا جواب دینے والا بھی نہ ہوگا۔ تو خود ہی جواب میں ارشاد فرمائے گا۔ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ تیسرے اس لئے

کہ بڑے مالک کی طرف نسبت کرنے سے اس چیز کی عزت ظاہر ہوتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ کا محل ہے اس قاعدے سے اس نسبت سے قیامت کے دن کی عظمت اور ہیبت ظاہر ہوتی ہے کہ وہ خدا کا دن ہے۔ خداوند جل وعلا اسی دن کا مالک ہے اسی لئے سب کے دل میں اس دن کی ہیبت ہے۔ اسی دن کی ہیبت لوگوں سے نیک کام کراتی ہے اور برے کاموں سے بچاتی ہے۔ **نکتہ:** آریوں کے عقیدے میں یہ دنیا ہی عمل اور جزا کی جگہ ہے وہ کہتے ہیں کہ جو انسان برے کام کرتا ہے وہ مرنے کے بعد بری ''جون'' میں آتا ہے اور اچھے کام کرنے والا اچھی ''جون'' میں۔ جس قدر جانور وغیرہ ہیں یہ پہلے انسان ہی تھے۔ لیکن یہ اپنی بدعملی کی وجہ سے ان ''جونوں'' میں آئے۔ تو ان کے نزدیک دنیا عمل وجزا دونوں کی جگہ ہے۔ لیکن مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ دنیا فقط عمل کی جگہ ہے یہاں جزا نہیں اور آخرت فقط جزا کی جگہ وہاں عمل نہیں۔ اگرچہ بعض کام ایسے بھی ہیں کہ جن کا کچھ نہ کچھ نتیجہ دنیا میں بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ جیسے ماں باپ کی اطاعت کرنے والا دنیا میں خوشحال رہتا ہے۔ ان کے ساتھ بدسلوکی کرنیوالا دنیا میں ذلیل وخوار ہوتا ہے۔ لیکن یہ خوشحالی یا ذلت یا رسوائی اس کی جزا نہیں ہوگی۔ یہ تو ایسا ہے جیسے سرکاری نوکر کیلئے بھتہ یا مجرم کیلئے جیل سے پیشتر حوالات بھتہ تو تنخواہ نہیں اور یہ حوالات اس کے جرم کی سزا نہیں۔ سزا تو مقدمے کے بعد شروع ہوگی۔ آریوں کا یہ عقیدہ بالکل خلاف عقل ہے۔ اولاً تو اس لئے کہ جب دوسری ''جون'' میں پہنچ کر پہلی ''جون'' کا آرام یا تکلیف یاد ہی نہ رہا تو اس کو اپنے گزشتہ اعمال کا احساس ہی کیا ہوگا۔ اور تکلیف اور غم محسوس ہی کیا ہوگا مثلاً ایک شخص آج فقیر بے نوا ہے۔ ان کے قاعدے سے، پہلے وہ کسی اچھے حال میں زندگی گزار گیا تھا لیکن اپنی بدعملی کے باعث اب فقیر بنا کے بھیجا گیا۔ جب اسے یاد ہی نہ رہا کہ پہلے میں کیا تھا اور اس وقت میں نے کیا کیا تھا۔ کس عیش میں تھا۔ یہ کس عمل کی سزا ہے تو اب اس کو اس فقیری میں تکلیف ہی کیا ہوگی۔ وہ تو اپنی فقیری میں ہی خوش اور مست ہے۔ دوسرے اس لئے کہ اگر یہ عقیدہ صحیح ہوتا تو دنیا کے جانداروں کی تعداد میں وزن قائم رہتا۔ یعنی اگر انسان بڑھتے تو دوسرے جانور گھٹ جاتے اور دوسرے جانور بڑھتے تو انسان گھٹ جاتے۔ کیونکہ اول سے آخر تک روحوں کی تعداد ایک ہی ہے۔ وہی مختلف جسموں میں گھومتی پھر رہی ہیں۔ لیکن تجربہ یہ بتا رہا ہے کہ دن بدن ہر جاندار میں زیادتی ہوتی ہے تیسرے اس لئے کہ ایک بار حضرت صدر الافاضل مرشدی واستاذی مولانا محمد نعیم الدین صاحب قبلہ مرادآبادی علیہ الرحمۃ کا مناظرہ رام چندر دہلوی سے ہوا۔ حضرت نے دریافت فرمایا کہ مہاشہ جی! کوئی دنیا میں ایسا بھی گزرا ہے کہ جس نے کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ کہنے لگے لاکھوں سب سے بڑے تو رشی منی گزرے ہیں جن پر وید آئے حضرت نے فرمایا ایسے بے گناہ انسان کو کس ''جون'' میں جانا چاہئے ان کو تو ایسی جون میں جانا چاہئے کہ جہاں ہر طرح کی راحت اور آرام ہو تو اس نے کہا بیشک فرمایا بتاؤ کہ وہ ''جون'' کون سی ہے۔ کہا کہ ایسے لوگ بادشاہ بن کر آتے ہیں۔ فرمایا کہ بادشاہ سے بڑھ کر تو دنیا میں کوئی مصیبت میں نہیں۔ سب کو فکر نان۔ اس کو فکر جہان۔ غریب لوگ رات کو آرام سے سوئیں اور وہ فکر سے تارے گن گن کے گزارے۔ یہ تو بڑا ظلم ہے کہ خدا تعالیٰ ان کو ایسی مصیبت میں ڈالے تو مہاشہ جی فوراً بولے کہ وہ تارک الدنیا سنیاسی بن کر آتے ہیں۔ فرمایا واہ ان کی نیکیوں کا یہ بدلہ دیا کہ سر پر ٹوپی نہ پاؤں میں جوتا۔ نہ تن پہ کپڑا نہ بدن پر لنگوٹا سب تو جاڑوں میں عمدہ عمدہ لباس پہنیں۔ یہ مصیبت کا مارا آگ

تاپ کر رات کاٹے۔ مہاشہ جی گھبرا گئے بہت سے پلٹے کھائے۔ مگر کوئی جون ایسی نہ ملی جو بالکل راحت و آرام کی ہوتی حضرت نے فرمایا کہ مہاشہ جی اگر ہماری بات مانو۔ تو ہم تمہیں بتائیں کہنے لگے بتاؤ فرمایا کہ ان کو رنڈی بن کر آنا چاہئے کہ دنیا میں بھی آرام سے رہتی ہے۔ دن رات نیا لطف اٹھائے۔ دوسرے کمائیں یہ مزے سے کھائے۔ مہاشہ جی گرم ہو گئے اور کہا دیکھئے آپ گالیاں دیتے ہیں فرمایا یہ تمہارے مذہب کی کمزوری ہے قرآن کو مان لو۔ جنت ہی جزا کی جگہ بن سکتی ہے نہ کہ دنیا چوتھے اس لئے کہ دنیا میں دیکھا جاتا ہے کہ نہایت اقبال مند مالدار صاحب عزت پر کبھی ایسا وقت آ پڑتا ہے کہ اس کی زندگی پلٹ جاتی ہے۔ پہلے مالدار تھا اب فقیر ہو گیا پہلے عزت و عظمت اور اقبال مندی اس کے پاؤں چومتی تھی اب ادبار نے اس کو گھیر لیا۔ اسی طرح بہت سے آدمی دیکھے گئے ہیں کہ پہلے غریب تھے پھر مالدار بن گئے تو اگر یہ دنیوی آرام اور تکلیفیں پچھلی جون کی جزا اور سزا تھیں تو چاہئے تھا کہ ایک ہی حال پر رہتا یہ حال بدلے کیوں۔

اعتراضات

آریوں کا اعتراض. قرآن شریف کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا صرف قیامت کے دن کا مالک ہے تو کیا آج اس کے سوا کوئی اور مالک ہے۔ **جواب:** اس کا نہایت نفیس جواب اسی تفسیر میں اوپر گزر چکا ہے۔

دیوبندیوں کا اعتراض: جب قیامت کے دن کا خدا ہی مالک ہے تو خدا کے سوا نبیوں ولیوں کو اپنا شفیع جاننا اور ان کو اس دن حاجت روا ماننا اس آیت کے خلاف ہے۔ بدعتی لوگ اولیاء اللہ اور پیروں کی نذر نیاز اس لئے کرتے ہیں کہ یہ لوگ قیامت کے دن ان کے کام آئیں یہ عقیدہ بالکل مشرکانہ عقیدہ ہے۔ **جواب:** شفاعت اور بندوں کی حاجت روائی حق تعالیٰ کے مالک ہونے کے بالکل خلاف نہیں۔ انبیاء کرام اولیاء اور علماء اس لئے شفاعت نہ کریں گے کہ وہ اس دن کے حقیقی مالک ہیں بلکہ اس لئے کہ وہ مالک حقیقی کے پیارے ہیں ان کی بات وہاں سنی جاتی ہے۔ اگر وہ مالک حقیقی ہوتے تو شفاعت کے کیا معنی؟ وہ خود بخش دیتے دنیا میں بھی ہر چیز کا مالک پروردگار ہی ہے مگر یہاں بھی بڑے حاکموں کی بارگاہ میں شفاعت (سفارش) ہی سے کام چلتا ہے ان شاء اللہ شفاعت کی پوری بحث آیت الکرسی کے تحت کی جائے گی اور ہم نے اپنی کتاب ''شان حبیب الرحمان'' میں بھی اس پر کافی روشنی ڈالدی ہے۔

إِيَّاكَ نَعْبُدُ
تجھ ہی کو پوجیں ہم
ہم تجھ ہی کو پوجیں

تعلق

اس آیت کا تعلق گزشتہ آیتوں سے چند طرح ہے **اولاً** اس طرح کہ شروع سے اب تک حق تعالیٰ نے اپنے انعامات اور جباری اور ملکیت کا ذکر فرمایا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ اللہ کی مخلوق اس کی اطاعت کی طرف رغبت کرے۔ کیونکہ احسان کی وجہ

سے انسان اطاعت کی طرف رغبت کرتا ہے اور خوف، ڈر سے سربسجود ہوتا ہے۔ لہٰذا حکم ہوا کہ تم کہو اِيَّاكَ نَعْبُدُ تو گویا اب تک عبادت کی توجہ دلائی تھی۔ اب عبادت کا صریح حکم فرمایا۔ **دوسرے** اس طرح کہ حق تعالیٰ نے اس سے پہلے اپنے پانچ نام بیان فرمائے۔ اللہ، رب، رحمان، رحیم، اور مالک گویا یوں فرمایا۔ کہ ہم تمہارے اللہ ہیں۔ پھر تم کو پالا لہٰذا ہم رب ہیں تم نے گناہ کئے ہم نے چھپائے پس ہم رحمان ہیں تم نے توبہ کی ہم نے مغفرت فرمائی لہٰذا ہم رحیم ہیں۔ تم ہمارے قبضے میں ہو اور جزا اور سزا کا دن بھی آنے والا ہے۔ لہٰذا ہم مالک ہیں پس اے بندے تو ہماری عبادت کر اور عبادت کا مستحق وہی ہے جس میں یہ صفتیں ہوں۔ لہٰذا یہ کہو کہ اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ **تیسرے** اس طرح کہ انسان کے تین ہی حال ہیں۔ گزرے ہوئے، موجودہ اور آنے والے اور تینوں حالوں میں انسان رب کا محتاج ہے کیونکہ جب موجود نہ تھا تو اس نے موجود کیا۔ جب کمانے کے قابل نہ تھا۔ اس نے رزق دیا۔ اس کو لفظ اللہ اور رب نے بیان کیا پھر موجودہ حالت میں ہر ہر آن ہر طرح رب کے محتاج اس کا ذکر رحمٰن اور رحیم میں فرمایا اور پھر آئندہ قبر اور حشر میں رب ہی کے محتاج اس کو بیان کیا ''مالک یوم الدین'' نے، تو ان آیات نے بتا دیا کہ اے انسان تو ہر حالت میں رب کا محتاج ہے اب فرمایا گیا کہ جس کے کرم کی تجھ کو ہر وقت ضرورت تھی اور رہے گی تو اسی کی عبادت بھی کر۔

تفسیر

علماء کرام فرماتے ہیں کہ اس آیت میں کلام کی روش چند طرح بدل گئی۔ اولاً یہ کہ اب تک خدا کا ذکر اس کے ناموں سے تھا۔ اب اس کو خطاب کیا گیا۔ دوسرے اب تک اللہ ہی کا ذکر تھا۔ اس آیت میں بندے کا بھی ذکر کیا گیا تیسرے اب تک رب تعالیٰ کی ہی صفات کا ذکر تھا۔ اب بندے کی صفات کا ذکر فرمایا۔ لیکن اس طرح کہ ایاک پہلے اور نعبد بعد میں ایاک کو اس لئے پہلے رکھا تا کہ اس میں حصر کے معنی پیدا ہو جائیں۔ یعنی ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ نیز حق تعالیٰ قدیم ہمیشہ سے موجود۔ ہم حادث بعد میں پیدا ہونے والے جو پہلے سے ہوا اس کا ذکر پہلے۔ جو بعد میں ہوا اس کا ذکر بعد میں نیز اس میں اس بات کی تعلیم دی ہے کہ جب انسان اپنا بھی اور رب کا بھی ذکر کرے تو رب کا ذکر پہلے کرے نیز اس میں اشارہ اس جانب ہے کہ عبادت کرنے والے کی نیت خالص رب کو راضی کرنے کی ہو نہ کہ دنیا کے دکھانے کی کیونکہ جو شخص ریا سے عبادت کرتا ہے۔ وہ خدا کا عابد نہیں بلکہ اس کا عابد ہے جس کو دکھا رہا ہے میں نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ جب وہ نماز میں کھڑے ہوتے تو بہت روتے تھے۔ میں نے رونے کی وجہ دریافت کی۔ فرمانے لگے مجھے خبر نہیں کہ میں نماز پڑھنے میں سچا ہوں یا جھوٹا۔ کہ زبان سے تو کہہ رہا ہوں اِيَّاكَ نَعْبُدُ اگر میرے قلب میں ذرہ بھر ریا ہوئی تو خدا کا حکم ہوگا کہ تو جھوٹا ہے۔ ارے کمبخت مسجد میں کھڑے ہو کر نماز کی حالت میں میرے سامنے ہاتھ باندھ کر مجھ سے جھوٹ بول رہا ہے کہ زبان سے کہتا ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ (ہم تجھ ہی کو پوجتے ہیں) اور دل میں کسی اور کی پوجا کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس قول سے سچا کرے آمین۔ خطاب کا صیغہ اس لئے لایا گیا تا کہ بندہ اس وقت اپنے رب کو حاضر ناظر جانے کہ گویا میں اس کو دیکھ رہا ہوں یا وہ مجھے دیکھ رہا ہے۔ اس لئے میں عرض کر رہا ہوں کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ گویا کہ نمازی نماز شروع کرتے وقت رب سے غائب تھا۔

اور اب خدا کی صفتیں بیان کرنے کی برکت سے بارگاہ میں اس طرح حاضر ہو گیا کہ اس کو دیکھ رہا ہے اور اس سے کلام کر رہا ہے نیز اب تک خدا کی صفتوں ہی کا بیان تھا۔ اور اب عرض و معروض ہے صفتوں کا بیان غائب کے صیغے سے اچھا ہوتا ہے۔ اور عرض و معروض حاضر کے صیغے سے۔ (نوٹ ضروری) نماز میں کسی کو خطاب کر کے کلام کرنا جائز نہیں۔ اگر کوئی ایسا کرے تو نماز جاتی رہے گی۔ سوا اللہ کے اور اللہ کے محبوب علیہ السلام کے اس طرح کہ یہاں کہتا ہے اِیَّاکَ نَعۡبُدُ اور التحیات میں کہتا ہے اَلسَّلَامُ عَلَیۡکَ اَیُّهَا النَّبِیُّ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازی جس طرح اللہ کو حاضر ناظر جانے اسی طرح محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اور جس طرح رب کو راضی کرنے کی نیت کرے ایسے ہی اس کے محبوب علیہ السلام کو اسی لئے صحابہ کرام نے عین حالت نماز میں حضور علیہ السلام کا ادب کیا ہے۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم) نعبد عبد سے بنا ہے جس کے لغوی معنی ہیں ''اظہار عجز'' اسی لئے عام راستے کو عربی محاورے میں طریق معبد کہتے ہیں کیونکہ وہ ہر ایک کے پیر کے نیچے آتا ہے۔ (تفسیر کبیر) اصطلاح شریعت میں یا یہ عبادۃ سے بنا ہے یا عبودۃ سے عبادت کے معنی عابد بننا اور عبودت کے معنی عبد بننا (روح البیان) یا تو یہ معنی ہوئے کہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں یا یہ کہ تیرے ہی بندے بنتے ہیں۔ قرآن شریف میں عبد چار معنی میں استعمال ہوا مخلوق جیسے عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِیۡ بَاۡسٍ شَدِیۡدٍ (الاسراء:۵) مملوک جیسے من عبادکم مطیع جیسے اِنَّهٗ کَانَ عَبۡدًا شَکُوۡرًا (الاسراء:۳) فنافی اللہ جیسے اَسۡرٰی بِعَبۡدِهٖ مخلوق کا سب سے بڑا کمال عبدیت ہی ہے اس لئے کلمہ طیبہ میں عبدہ و رسولہ ہے اللہ کا بندہ صحیح ہونے کے دو رکن ہیں اغیار سے خالی ہو کر یار کا کاشانہ ہو۔ اس کی فرمانبرداری میں لذت محسوس کرے ایک شرط ہے کہ اللہ کے پیاروں سے دلی محبت رکھے عالموں سے علم کاتبوں سے کتابت شاعروں سے شعر ملتے ہیں بندوں کی صحبت سے بندگی ملتی ہے۔ عبادت کے اصطلاحی معنی یہ ہیں کہ کسی کو خالق یا خالق کا حصہ دار مان کر اس کی اطاعت کرنا جب تک یہ نیت نہ ہو تب تک اسے عبادت نہیں کہا جائے گا اب بت پرست بت کے سامنے سجدہ کرتا ہے اور مسلمان کعبہ کے سامنے وہاں بھی پتھر ہی ہیں لیکن وہ مشرک ہے اور ہم موحد، ہندو اپنے دیوتاؤں رام چندر وغیرہ کو مانتا ہے مسلمان نبیوں ولیوں کو پھر کیا وجہ کہ وہ مشرک ہو گیا اور یہ موحد رہا۔ فرق یہی ہے کہ وہ انہیں الوہیت میں حصہ دار مانتا ہے، ہم ان کو اللہ کا خاص بندہ مانتے ہیں بہر حال عبادت بہت سی قسم کی ہے۔ نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ بلکہ یوں سمجھو کہ جو جائز کام بھی رب کو راضی کرنے کی نیت سے کیا جائے وہ عبادت ہے۔ یہاں تک کہ آدمی رب کو راضی کرنے کیلئے اپنے بچوں کو پالے تو یہ بھی عبادت ہے اور ان میں ثواب ملتا ہے یہ کلمہ ان سب کو شامل ہے۔ اس طرح بندہ بننے کی بہت سے صفتیں ہیں۔ رب کی رضا میں راضی رہنا۔ اس کی نعمت پر شکر کرنا اس کی بلا پر صبر کرنا اپنے عقائد درست کرنا غرض کہ اپنے میں بندوں کے سے صفات پیدا کرنا یہ سب معانی بھی اسی کلمے میں آ گئے نعبد کو جمع کے صیغے سے فرمایا اس میں اشارہ اس طرف ہے کہ اے اللہ میں تیری بارگاہ میں اکیلا حاضر نہیں ہوا اور نہ صرف اپنی عبادت لایا بلکہ تیرے سب بندوں کے ساتھ ہوں جن میں انبیاء اولیاء صالحین سب ہیں اگر میری عبادت قبول نہ ہو تو ان کے طفیل قبول فرمالے کیونکہ جو موتی خریدتا ہے وہ ڈورے کو واپس نہیں کرتا فقہاء فرماتے ہیں کہ جو شخص خراب اور عمدہ مال ملا کر فروخت کرے تو بے خریدار یہ نہیں کر سکتا کہ اچھا لے لے اور برا واپس کر دے۔ بلکہ وہ کل لے

لے گا یا کل واپس کرے گا اور ہر ایک کی عبادت بارگاہ الٰہی سے واپس نہیں ہوتی۔ تو نیکوں کے طفیل امید ہے کہ ہم بدوں کی بھی وہاں رسائی ہو جائے۔ **مسئلہ:** اگر کوئی شخص رب کی عبادت اکیلا ہی کرے جب بھی یہ سمجھ کر کرے کہ مجھ سے پہلے بہت سے مقبول بندے اس کام کو کر گئے ہیں اور اب بھی کر رہے ہوں گے میں اپنے کو ان میں شامل کرتا ہوں۔ مثلاً ایک آدمی نیت خیر سے یہ سمجھ کر اپنے بچوں کو پالتا یا نوکری کرتا ہے کہ یہ رب کا حکم ہے تو اس کا یہ کام عبادت ہے۔ اس وقت یہ نیت کرے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنے اہل وعیال کی پرورش فرمائی اور دیگر انبیاء کرام اولیاء اللہ نے بھی رزق حاصل کرنے کیلئے بہت سے ذریعے اور پیشے اختیار کئے میں بھی انہیں کی اتباع میں یہ کام کر رہا ہوں اس لئے جمع کا صیغہ یہاں بھی صادق ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دنیاوی کاموں کو خود کیا تا کہ یہ کام سنت بن جائیں یونہی اگر کوئی شخص تنہا نماز پڑھ رہا ہے تو وہ بھی یہی کہے گا اِيَّاكَ نَعْبُدُ کیونکہ ہزاروں بندے اس سے پہلے یہ عبادت کر چکے ہیں اور ہزاروں اب بھی کر رہے ہوں گے۔ نیز اس کے ساتھی فرشتے بھی حق تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ دیکھنے میں اگرچہ اکیلا معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں بہت سوں کے ساتھ ہے۔ اس لئے اگر ایک آدمی کو سلام کرتے ہیں تو بھی السلام علیکم (یعنی تم سب پر سلام) ہی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کے ساتھ فرشتے بھی ہیں۔ **مسئلہ:** اس سے معلوم ہوا کہ جماعت سے نماز پڑھنی چاہئے۔ بلکہ ہر عبادت مسلمانوں کے اجتماع کا مقام ہے کہ بغیر جماعت عبادت ناقص ہوتی ہے۔

تفسیر صوفیانہ

صوفیاء کرام کے نزدیک وہی عبادت کامل ہے جس میں فقط اللہ کو راضی کرنا منظور ہو اگر جنت لینے کیلئے یا دوزخ سے بچنے کیلئے عبادت کی تو وہ عبادت کیا ہوئی ایک قسم کا بیوپار ہوا۔ اس لئے فرمایا ایاک اے اللہ تیری ہی عبادت کرتے ہیں یعنی ہماری عبادت سے مقصود صرف تیری ذات ہے۔ اسی وجہ سے نماز کی نیت میں کہا جاتا ہے کہ واسطے اللہ کے یہ نہیں کہتے کہ واسطے جنت کے یا واسطے جہنم سے بچنے کے نیز جو شخص جنت کے حاصل کرنے یا دوزخ سے بچنے کیلئے عبادت کرتا ہے وہ اپنی عبادت کا نتیجہ قیامت سے پہلے نہیں دیکھ سکتا کیونکہ جنت دوزخ کا معاملہ قیامت کے بعد ہے لیکن جو صرف رب کی رضا کیلئے کرتا ہے اس کا مقصد آج ہی سے حاصل ہو گیا۔ لہٰذا یہ نفع میں رہا۔

عبادت کی روح یہ ہے کہ انسان غرور (دھوکہ) سے سرور (خوشی) کی طرف منتقل ہو جائے اور دنیا کی تاریکی سے نکل کر حق کے نور اور مشاہدہ جمال میں پہنچ جائے کیونکہ دنیا اور دنیا کی چیزیں ایک اندھیرا ہیں اور دین نور ہے دنیا میں بے چینی ہے اور عبادت میں چین ہے قرآن کریم فرماتا ہے کہ اے محبوب ہم جانتے ہیں کہ کفار کی باتوں سے آپ کے دل کو دکھ پہنچتا ہے اس کا علاج یہ ہے فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَكُنْ مِّنَ السّٰجِدِيْنَ ۝ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتّٰى يَاْتِيَكَ الْيَقِيْنُ (الحجر: ۹۸-۹۹) معلوم ہوا کہ عبادت دنیوی تکلیفوں کا علاج ہے لہٰذا جس عبادت میں یہ بات نہ ہو وہ بالکل بے جان ہے نیز جس چیز سے اپنا پیارا راضی ہو وہ عبادت ہے اور جس سے وہ ناراض ہو وہ کام گناہ ہے حضرت علی رضی اللہ عنہ کیلئے خیبر کے دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیند پر نماز قربان کر دینا عین عبادت تھی اگر نماز چھوڑنے میں اس کی رضا ہے تو چھوڑنا عبادت

ہے اور پڑھنے میں اس کی رضا ہے تو پڑھنا عبادت آفتاب نکلتے وقت نماز پڑھنا گناہ کیوں ہے۔ اس لئے کہ اس میں اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم راضی نہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: جب اللہ تعالیٰ غنی (سب سے بے پرواہ) ہے تو اسے بندوں کی عبادت کی کیا ضرورت ہے اور انہیں عبادت کا کیوں حکم دیا ہے۔ ہم بھی بلاوجہ عبادت کی مشقت میں کیوں پڑھیں۔ **جواب:** رب کو ہرگز ہماری عبادت کی ضرورت نہیں۔ بلکہ ہم کو خود ضرورت ہے۔ قالین یا قیمتی بستروں پر بیٹھنے کے قابل وہی ہوگا جس کا جسم گندگی سے آلودہ نہ ہو۔ گندہ آدمی اس پر بیٹھنے کے قابل نہیں حق تعالیٰ کی جنت نہایت پاک صاف جگہ ہے اس کے قابل وہی ہے جو خود پاک صاف ہو دنیا کی مشغولیت ہمارے قلب کو گندہ بنا دیتی ہے۔ عبادت رحمت کا پانی ہے۔ عبادت اس کا صیقل ہے۔ جس سے اس کو صاف کر دیا جاتا ہے اگر عبادت سے صفائی نہ ہوتی رہے تو آخر کار یہ آئینہ بالکل سیاہ ہو کر کسی قیمت کے قابل نہ رہے نیز دشمنوں میں گھرا ہوا انسان جب ہی محفوظ رہ سکتا ہے جب یا تو وہ خود ہی قدرت والا ہو یا کسی قدرت والے کو پکڑے ہم کمزور ہزاروں دشمنوں میں پھنسے ہوئے ہیں۔ شیطان، نفس امارہ، دنیوی الجھنیں برے یار وغیرہ ضرورت ہے کہ قدرت والے حق تعالیٰ کے ساتھ اپنا تعلق قائم رکھیں اور یہ عبادت تعلق ہی ہے نیز پردیسی کو اپنے دیس کے ذکر سے چین ملتا ہے ہماری روح پردیسی ہے عبادت میں اس وطن کا ذکر ہے اس لئے اس کو اس سے چین ملتا ہے تفسیر عزیزی میں لکھا ہے عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ کے عضو میں ایک زخم تھا کہ جس کی وجہ سے اس عضو کو کاٹنے کی ضرورت تھی مگر سخت تکلیف کی وجہ سے ہمت نہ پڑتی تھی۔ جب وہ نماز میں کھڑے ہوئے تو کاٹ دیا گیا۔ اوران کو اس کا احساس بھی نہیں ہوا۔

آریوں کا اعتراض: مسلمان کہتے ہیں کہ ہم سب رب ہی کی عبادت کرتے ہیں۔ اور موحد ہیں حالانکہ وہ کعبہ کے طرف سر جھکاتے ہیں یہ تو ہندوؤں سے بڑھ کر مشرک ہوئے کیونکہ وہ تو ایک پتھر کو پوجتا ہے اور یہ ہزاروں پتھروں کی عمارت کو اگر مسلمان کہیں کہ ہم کعبہ کو خدا نہیں جانتے تو ہندو بھی مورتی کو خدا نہیں سمجھتا بلکہ اپنا دھیان یک سو رکھنے کیلئے ایک پتھر کو سامنے رکھ لیتا ہے۔ **جواب:** اس کا جواب نماز کی نیت ہی میں دے دیا گیا ہے کیونکہ نیت میں یہ کہا جاتا ہے کہ "نماز واسطے اللہ کے منہ طرف کعبہ شریف کے، معلوم ہوا کہ نماز کعبہ کیلئے نہیں نماز تو اللہ کیلئے ہے صرف جہت مقرر کرنے کیلئے کعبہ کی سمت تجویز کر دی گئی ہے اگر نماز کعبہ کیلئے ہوتی تو جس طرف کعبہ کا پتھر پہنچتا ادھر ہی مسلمان جھک جاتا مگر ایسا نہیں ہوتا۔ غلاف کعبہ ہمارے پاس پہنچتا ہے ہم اس کو سجدہ نہیں کرتے اگر وہاں کا کوئی پتھر بلکہ ساری عمارت پنجاب میں رکھ دی جائے تو کوئی بھی ادھر سجدہ نہ کرے۔ لیکن ہندو کا یہ حال ہے کہ جدھر اس کی مورتی ادھر ہی پجاری کا سر۔ معلوم ہوا کہ اس کا سر مورتی کیلئے جھکا۔ اور مسلمان کا سر رب کیلئے بلکہ خوف اور سفر کے نفل میں جدھر منہ کر کے نماز پڑھے گا ہو جائے گی۔ فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ (البقرہ: ۱۱۵) پھر فرق یہ ہے کہ ہندو پتھر کسی انسان کے نام پر بناتا ہے رام چندر، کالی مائی، دیو، مہادیو کے نام پر وغیرہ وغیرہ اور اس شخص کو خدا کا شریک اور خدائی میں حصہ دار مانتا ہے اور یہ سمجھ کر اس پتھر کی طرف سر جھکاتا ہے کہ جس کا یہ

پتھر ہے میں اس کی عبادت کر رہا ہوں کعبہ شریف میں ان میں سے کوئی بات موجود نہیں۔ یہ بھی یاد رہے کہ کعبہ عمارت کا نام نہیں ہے بلکہ اس جگہ کا نام ہے اگر وہاں کوئی عمارت بھی نہ ہو۔ تو بھی نماز میں اسی طرف منہ کیا جائے گا یہ عمارت تو اس جگہ کا نشان ہے جب پہاڑ اور تہ خانوں میں نماز پڑھتے ہیں۔ اس حالت میں اس عمارت کا کوئی بھی حصہ سامنے نہیں ہوتا۔

اعتراض: چاہئے کہ تم آریوں کی عبادت کو صحیح مانو کیونکہ یہ کسی مورتی کی پوجا نہیں کرتے صرف رب کا نام لیتے ہیں اور تم بھی رب کا نام لیتے ہو مقصد رب کو یاد کرنا ہے جس طرح چاہو کرلو۔ **جواب:** عبادت ہی وہی سچی ہے کہ جس کی تعلیم حق تعالٰی کی طرف سے نبیوں کے ذریعہ دی گئی ہو اپنی عقل کی تجویز کی ہوئی کوئی عبادت، عبادت نہیں۔ مسلمان جو بھی عبادت کرتا ہے وہ رب تعالٰی کی بتائی ہوئی نبیوں کی بتائی ہوئی ہے۔ لہٰذا صحیح ہے۔ آریہ وغیرہ کی عبادت عقل سے سوچی ہوئی ہے۔ اپنی طرف سے بنائی ہوئی لہٰذا وہ کچھ بھی کرے غلطی کرتا ہے شاہی قانون کی پابندی استدضروری ہوتی ہے۔

دیوبندیوں کا اعتراض: دیوبندی فرقہ کے نزدیک عبادت وہ کام ہے جو حق تعالٰی نے اپنے لئے خاص کیا ہو اور ان کو بندگی کیلئے بندوں کا نشان بنایا ہوا ہے دیکھو ''تقویت الایمان'' لہٰذا ایسے کام غیر خدا کیلئے کرنا شرک و بت پرستی ہے اس لئے ان کے مذہب کی رو سے کسی کو پکارنا کسی کی دہائی دینا کسی غیر خدا سے مدد لینا۔ کسی کے گھر یا جنگل کا ادب کرنا کسی کی یادگار منانا۔ کسی کی قبر پر جھاڑو دینا۔ کسی کی طرف اپنے کام یا اپنے نام کی نسبت کرنا یعنی علی بخش نبی بخش نام رکھنا غرضیکہ کسی کی کچھ تعظیم کرنا غیر اللہ کی عبادت ہے اور شرک ہے اور اِیَّاکَ نَعْبُدُ کے خلاف ہے وہ کہتے ہیں کہ جب ہم اللہ کے بندے ہیں اور اس سے وعدہ بھی کر چکے ہیں اِیَّاکَ نَعْبُدُ کہ ہم تیری ہی عبادت کریں گے تو اس کو چھوڑ کر کسی بندے کے ساتھ یہ معاملہ کرنا یقیناً شرک ہے۔ **جواب:** اگر عبادت کی یہ تعریف صحیح مان بھی لی جائے تو جن چیزوں کو ان وہابیوں نے شرک کہا وہ شرک نہیں بنتیں اور اس عقیدہ کی بناء پر دنیا میں کوئی بھی شرک سے نہیں بچ سکتا نہ خود دیوبندی وہابی اور نہ کوئی اور مسلمان اول تو اس لئے کہ قبر پر جھاڑو دینا کسی کو پکارنا کسی سے مدد مانگنا کسی کا دن منانا خدا تعالٰی کے ساتھ خاص نہیں اور نہ یہ چیزیں بندگی کا نشان ہیں۔ مدد کی بحث تو ہم ان شاء اللہ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ میں کریں گے۔ لیکن اور چیزوں کو لے لو رب تعالٰی نے اپنے نبیوں کو پکارا یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ مسلمانوں کو پکارا کافروں کو پکارا پہاڑوں کو پکارا اس صورت میں رب معاذ اللہ پہلا مشرک اور قرآن پڑھنا شرک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے امتیوں کو پکارا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ساریہ رضی اللہ عنہ کو جو نہاوند میں جہاد کر رہے تھے۔ مدینہ پاک سے پکارا ہم ایک دوسرے کو دن رات پکارتے ہیں خود وہابی مولوی قاسم صاحب نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پکارا۔

مدد کر اے کرم احمدی کہ تیرے سوا نہیں ہے قاسم بیکس کا کوئی حامی کار

غرض کہ پکارنے کو شرک کہنا عجب حماقت ہے کسی کی یادگار منانا بھی خدا کے ساتھ خاص نہیں۔ نہ خدا کسی کی یادگار مناتا ہے اور نہ کوئی شخص خدا کی یادگار منائے حج حضرت ہاجرہ کی یادگار ہے ورنہ دوڑنا کودنا پتھر پھینکنا بذاتہ ثواب کا کام نہ تھا پانچ وقت کی نمازیں بھی مختلف نبیوں کی یادگار ہیں جس پیغمبر نے کسی خاص موقع پر جتنی رکعتیں پڑھ لی ہیں انہیں کو اسلام نے قائم رکھا ہے

اسی لئے نمازوں کی رکعتیں مختلف ہیں کہ فجر میں دو ظہر عصر میں چار چار وغیرہ دوشنبہ کے دن کا روزہ اسی لئے سنت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت پاک کی یادگار ہے اگر یادگار منانا شرک ہو تو بولو شرک سے کون بچا۔

قبر پر جھاڑو دینا: یہ کام بھی خدا تعالیٰ کے ساتھ خاص نہیں نہ تو خدا تعالیٰ کسی کی قبر پر جھاڑو دیتا ہے اور نہ خدا تعالیٰ کی قبر ہے کہ جس پر جھاڑو دی جاتی ہو اور نہ جھاڑو دینا بندگی کا نشان ہے اگر جھاڑو دینا بندگی کا نشان ہوتا تو چاہئے کہ ہر دیوبندی وہابی کی بغل میں ہر وقت ایک جھاڑو رہتی۔ کیونکہ نشان بندگی بندہ کے ساتھ چاہئے۔

دن مقرر کرنا: بھی شرک نہیں کیونکہ حج کیلئے دن مقرر، نماز کیلئے وقت مقرر، روزوں کے لئے مہینہ مقرر، شادی بیاہ کیلئے تاریخیں مقرر، مدرسہ دیوبند کے امتحان اور تعطیل اور چھٹی کے وقت نصاب تعلیم غرض کہ ہر چیز مقرر تو بتاؤ شرک سے کون بچا۔

عبدالنبی نام رکھنا: بھی شرک نہیں کیونکہ یہاں عبد کے معنی عابد کے نہیں غلام کے ہیں۔ قرآن کریم فرماتا ہے (تمہارے بندے) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا قل یا عبادی فرمادو اے میرے بندو مصنف درمختار کے شیخ کا نام عبدالنبی تھا۔ اگر عبدالنبی نام رکھنا شرک ہو تو بتاؤ شرک سے کون بچا غرض یہ عبادت کے نہایت بیہودہ معنی ہیں۔ عبادت کے معنی ہیں اپنے انتہائی عجز کا اظہار اور انتہائی عجز جب ہی ہوگا جب کہ عاجز اپنے کو ان کا بندہ اور ان کا اپنا خالق یا خالق کا حصہ دار مانے گا۔ **پانچواں اعتراض:** مشرکین عرب اپنے معبودوں کو خدا نہیں مانتے تھے بلکہ ان کو خدا کا بندہ اور خدا تک پہنچنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ چنانچہ کہتے تھے کہ ہم ان کو پوجتے ہیں کہ لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (زمر: ۳) تاکہ یہ ہم کو خدا سے قریب کردیں جس سے معلوم ہوا کہ کسی کو اپنا وسیلہ جاننا، اس کو پکارنا وغیرہ ہی عبادت ہے اسی وجہ سے وہ لوگ مشرک قرار دیئے گئے **جواب:** اس اعتراض کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ ان مشرکین مکہ کا ان چیزیں کو محض وسیلہ جاننا شرک نہ تھا بلکہ ان کو وسیلہ جان کر پوجنا شرک تھا۔ قرآن پاک کی یہ آیت ہے کہ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (زمر: ۳) یعنی ہم ان چیزوں کو نہیں پوجا کرتے مگر اس لئے کہ ہم کو اللہ کے قریب کردیں ان کا عقیدہ یہ تھا کہ بت ان کے چھوٹے معبود ہیں تو اللہ کے بندے مگر ان کے ذریعے سے رب کی خدائی چل رہی ہے اور رب کو ان کی بات ان سے دب کر ماننی پڑتی ہے۔ اور ان کو رب سے ایسی نسبت ہے کہ جیسے وزراء کو بادشاہ سے کہ ان کی ناراضگی سے رب کی ربوبیت میں خلل پڑ جائے گا اور ان میں الوہیت ایسے سمائی ہوئی ہے۔ جیسے کہ گلاب کے پھول میں اس کی خوشبو وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ دنیا کے بڑے بڑے کام رب کرتا ہے اور چھوٹے چھوٹے کام یہ کرتے ہیں یہ سمجھ کر ان کی اطاعت و بندگی کرتے تھے۔ (اسی لئے ان کو آلِهَه یا شُرَكَاءَ کہتے ہیں اور یہ سمجھ کر ان کی پوجا کرتے تھے جیسے کہ آج کل ہندوستان کے ہندوؤں کا گنگا اور کالی اور مہادیو اور بھوانی وغیرہ کے متعلق یہی عقیدہ ہے الحمدللہ مسلمان کسی نبی ولی کے متعلق یہ عقیدہ نہیں رکھتا اس کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ جو تیرے سوا ہے وہ تیرا بندہ ہے اس کی پوری تحقیق ہماری کتاب جاء الحق میں دیکھو دوسرے یہ کہ اگر مان بھی لیا جائے کہ مشرکین کا ان کو بتوں کو وسیلہ جاننا ہی شرک تھا۔ تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیشک بتوں کو وسیلہ جاننا کفر ہے۔ لیکن پیغمبروں، اللہ کے مقبول بندوں کو وسیلہ جاننا اور

اپنا شفیع ماننا ہر گز شرک نہیں اور یہ سمجھ کر ان کی اطاعت کرنا اسلام کے خلاف نہیں کیونکہ ان معبودوں کو حق تعالیٰ نے اپنے تک پہنچنے کا وسیلہ نہ بنایا تھا کفار فقط اپنی تجویز سے ان کو وسیلہ مانتے تھے لہٰذا یہ کفر تھا اور انبیاء اور نیک بندوں کو حق تعالیٰ نے وسیلہ بنا کر بھیجا ہے یہ انتخاب الٰہی سے منتخب ہیں۔ لہٰذا ان کو وسیلہ جاننا عین ایمان ہے جیسے کہ بادشاہ کی رعایا بادشاہ کے مقرر کئے ہوئے حکام کو اپنا وسیلہ یا مددگار جانے یہ بغاوت نہیں بلکہ بادشاہ کی مرضی کے مطابق ہے لیکن اگر رعایا کسی کو خود اپنی طرف سے حاکم مقرر کر کے اس کو اپنا مددگار جانے اب باغی ہوگئی کیونکہ شاہی انتخاب والوں کو چھوڑ کر اپنے انتخاب پر عمل کیا دیکھو کعبہ معظمہ کی طرف ہر مسلمان سجدہ کرتا ہے لیکن اگر کوئی خود اپنی طرف سے کعبہ بنالے جیسے کہ سندھ کے ایک بے دین نے کیا اور ادھر سجدہ کرنا شروع کردے تو یقیناً وہ کافر ہے فرق کیا ہوا دونوں سجدے تو رب ہی کو کر رہے ہیں لیکن خود ساختہ کعبہ کی طرف سجدہ کرنا کفر کیوں ہوا۔ اسی لئے کہ کعبہ معظمہ کا رب نے انتخاب کیا تھا اور یہاں اس نے اپنے آپ۔ اس کی بہت سے مثالیں دی جاسکتی ہیں بہر حال عبادت کیلئے یہ ضروری ہے کہ معبود میں خدائی شان مان کر اس کی اطاعت کی جائے اسلام سے پہلے قریب قریب سارے دینوں میں بزرگوں کو تعظیمی سجدہ کیا جاتا تھا فرشتوں نے حضرت آدم علیہ السلام کو برادران یوسف علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو سجدے کئے اور رب کو بھی سجدہ ہوتا تھا بتاؤ کیا فرق تھا کہ رب کو سجدہ عبادت تھا اور یہ محض تعظیم فرق صرف نیت کا تھا یعنی رب کو سجدہ کرتے تھے اسے خالق مان کر اور بزرگوں کو سجدہ کرتے تھے۔ محض بزرگ جان کر۔

لطیفہ: ایک بزرگ ابن سعود نجدی کے زمانہ میں مدینہ پاک حاضر ہوئے۔ روضہ مطہرہ کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہوئے تھے کہ نجدی پولیس نے کہا کہ کیا تو نماز پڑھ رہا ہے تو مشرک ہوگیا۔ انہوں نے پوچھا کہ کیوں سپاہی کہنے لگا کہ کسی کے سامنے نماز کی طرح کھڑا ہونا یعنی ہاتھ باندھ کر یہ اس کی عبادت ہے بزرگ فرمانے لگے کہ کیسے کھڑا ہوں وہ بولا کہ ہاتھ چھوڑ کر انہوں نے کہا کہ اس طرح کھڑا ہونا بھی مالکی نماز کا قیام ہے۔ پھر بھی نماز سے مشابہت تو رہی۔ اگر ناف کے نیچے ہاتھ باندھوں تو حنفی نماز ہے اور ناف کے اوپر باندھوں تو شافعی نماز ہاتھ چھوڑ کر کھڑا ہوں تو مالکی نماز ہے اب بتا کیا کروں وہ خاموش ہوگیا بزرگ فرمانے لگے کہ کسی کام کا عبادت بننا یا نہ بننا نیت پر موقوف ہے۔

وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ ۝
اور تجھ ہی سے ہم مدد چاہیں
اور تجھ سے مدد چاہیں

تعلق

اس کا تعلق گزشتہ آیت سے چند طریقے سے ہے اول یہ کہ سورۃ فاتحہ میں چند مضمون ہیں پہلا خدا کی حمد دوسرا اپنی بندگی کا اظہار تیسرے اس سے دعا مانگنا اس سے پہلے دو مضمون بیان ہو چکے ہیں اب تیسرا شروع ہوتا ہے مگر چونکہ دعا کیلئے ضروری ہے کہ کسی وسیلہ سے کی جائے اس لئے اس سے پہلے عبادت کا ذکر ہوا اور بعد میں دعا کا یعنی اے اللہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور عبادت کے وسیلہ سے تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔ (تفسیر عزیزی یہی مقام) اس لئے مصیبتوں کے وقت نمازیں پڑھ کر

صدقات وغیرہ ذکر کے نیک اعمال کر کے دعائیں کی جاتی ہیں تا کہ وہ عبادات قبولیت دعا کا وسیلہ بنیں ضروری نوٹ اس سے معلوم ہوا کہ ہر دعا میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وسیلہ پکڑنا ضروری ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضری بھی رب کی عبادت ہے اور ہر عبادت دعا کا وسیلہ ہے رب نے فرمایا وَ ابْتَغُوْا اِلَیْهِ الْوَسِیْلَةَ (مائدہ:۳۵) دوسرے اس طرح کہ اس سے پہلے فرمایا گیا تھا کہ اے اللہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں۔ اب عرض کیا جا رہا ہے خدایا اس عبادت کو مکمل کرنے میں تجھ سے مدد مانگتے ہیں یعنی شروع کرنا ہمارا کام ہے اور اس کو انجام پر پہنچانا تیرا کام تیسرے اس طرح کہ عبادت کی کچھ ظاہری شرطیں ہیں جن کے بغیر عبادت ادا نہیں ہوتی جیسے نماز کیلئے وضو وغیرہ۔ انہیں شرائط ادا کہتے ہیں اور کچھ باطنی شرطیں ہیں کہ جن کے بغیر نماز بارگاہ الٰہی میں قبول نہیں ہوتی جیسے دل میں خشوع خضوع کا ہونا ریاء اور فخر سے پاک ہونا وغیرہ وغیرہ کہ جن کے بغیر نماز قبول نہیں ہوتی پہلی قسم کی شرطیں وضو کرنا وغیرہ بظاہر انسان کے قبضے میں ہیں لیکن دوسری قسم کی شرطوں میں انسان بالکل بے بس معلوم ہوتا ہے کیونکہ دل کا حاضر ہونا اور خیالات کا پاک وصاف ہونا انسان کے قابو سے باہر ہے۔ اس لئے پہلے عرض کیا گیا اِیَّاكَ نَعْبُدُ یعنی ہم ظاہری شرطیں ادا کر کے تیری عبادت کرتے ہیں اور دوسری قسم کی شرطوں کے لحاظ سے کہا گیا اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ خدایا ان شرطوں میں تیری مدد مانگتے ہیں چوتھے اس طرح کہ پہلے اپنی عبادت کرنے کا ذکر تھا اور اب عرض کیا گیا کہ اس عبادت کا رب کی بارگاہ تک بخیریت پہنچ جانا اور مقبول ہونا یہ رب ہی کے کرم پر موقوف ہے کیونکہ بہت سے ایسے عارضے پیش آ جاتے ہیں کہ جن سے سارا کیا دھرا برباد ہو جاتا ہے اللہ محفوظ رکھے تو عرض کیا خدایا عبادت ہم نے کر دی اور آئندہ اس کی حفاظت میں تجھ سے مدد مانگتے ہیں پانچویں اس طرح کہ عبادت سے روکنے والی چند چیزیں ہیں۔ نفس، شیطان، دنیوی الجھنیں اور برے یار، اور عبادت کرانے والی چند چیزیں ہیں۔ روح، ایمان، قرآن وغیرہ تو گویا عبادت کرتے وقت دو لشکروں کا مقابلہ ہے پہلے تو عرض کیا اے اللہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور پھر عرض کیا۔ خداوند ہمارے اس جہاد میں رحمانی لشکر کو شیطانی لشکر پر فتح دے۔ اس میں ہم تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔

تفسیر عالمانه

علماء کرام فرماتے ہیں کہ یہاں مدد سے مراد یا تو صرف عبادت میں مدد مانگنا ہے یا سارے دنیوی دینی کاموں میں۔ دوسرے معنی زیادہ مناسب ہیں تو گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ اے اللہ جس طرح ہم صرف تیری عبادت کرتے ہیں اسی طرح صرف تجھ سے ہی ہر کام میں مدد مانگتے ہیں ہم مشرک نہیں ہیں کہ بعض کاموں میں تجھ سے مدد لیں اور بعض میں تیرے سوا کسی اور سے ہر کام میں تجھ ہی پر اعتماد ہے اور تیری ہی مدد بھی مدد ہے۔ اس میں بندے کو تعلیم ہے کہ وہ حق تعالیٰ پر نظر رکھے اور اس کو اپنا حقیقی مدد گار جانے اگر مخلوق کی طرف سے کبھی کوئی مدد کر بھی دے تو یہ سمجھے کہ یہ بھی حق تعالیٰ ہی کی مدد ہے سب چیزیں اس کے خدام اور آلات ہیں بلا تشبیہ یوں سمجھو کہ بجلی صدہا کام کر رہی ہے۔ روشنی دیتی ہے پنکھے چلاتی ہے گاڑیاں کھینچتی ہے لیکن یہ کام محض بجلی کے تار کا نہیں بلکہ یہ سارے کام پاور ہاؤس سے ہو رہے ہیں جس کسی نے ہماری مدد کی اس میں مدد کی طاقت نہ ہوتی یا اس کے دل میں رحم نہ آتا ہو تو وہ کبھی ہماری مدد نہ کرتا۔ اور یہ طاقت اور رحم دلی رب کی طرف سے ہے۔ تو حقیقی مددگار وہی ہوا۔

لہٰذا رب کو چھوڑ کر کسی اور پر اعتماد کرنا محض نادانی ہے۔

تفسیر صوفیانہ

صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ ایک درجہ ہمارے یہاں وہ بھی ہے کہ وہاں پہنچ کر انسان ظاہری اسباب پر بھی نظر نہیں رکھتا بلکہ بعض موقعوں پر حق تعالیٰ سے بھی اپنی زبان سے عرض حال نہیں کرتا تا کہ یہ دعائیہ الفاظ بھی آڑ نہ ہو جائیں حضرت ابراہیم علیہ السلام جب نمرودی آگ کی طرف چلے تو حضرت جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ کچھ آپ کو حاجت ہے فرمایا تم سے کچھ نہیں حضرت جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا رب ہی سے عرض کیجئے۔ فرمایا حَسْبِی مِنْ سَوَالِی عِلْمُہٗ بِحَالِی یعنی وہ خود جانتا ہے اس کا جاننا کافی ہے پھر میری عرض کی کیا ضرورت ہے سبحان اللہ یہ وہ حالت ہے کہ جس میں دعا مانگنے سے بھی گریز ہے اس طرف اشارہ کیا جا رہا ہے وَاِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ خیال رہے کہ اولیاء کرام کی یہ حالت ہر وقت نہیں ہوتی۔

اگر درویش بر حالے بماندے   سر دست از دو عالم برفشاندے

جب وقت امتحان ہو تو دعا نہ مانگنا اور راضی برضا رہنا عبادت ہے۔ اس لئے امام حسین رضی اللہ عنہ کیلئے کسی نے دعا نہ کی کہ خدایا کربلا کی مصیبت ان سے ٹال دے اور جب بندگی کے اظہار کا وقت ہو تو ہر چیز رب سے مانگو یہاں تک کہ جوتے کا تسمہ بھی اسی سے مانگو کیونکہ بندے کا کام مانگنا ہی ہے۔ "تفسیر کبیر" اور "روح البیان" شریف نے اسی مقام پر فرمایا کہ حضرت خلیل علیہ السلام نے جب اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ پر عمل کیا۔ تو ان پر نمرودی آگ گلزار بنادی گئی۔ تو جو مسلمان یہ عرض کرے تو انشاء اللہ جہنم کی آگ اسے نقصان نہ پہنچا سکے گی بلکہ جب مومن صراط سے گزرے گا تو نار پکارے گی کہ تیرا نور ایمانی مجھے بجھا دیتا ہے ایک وقت جنتی مسلمان گنہگار مسلمانوں کو نکالنے کیلئے جہنم میں جائیں گے ان پر آگ اثر نہ کر سکے گی۔

اعتراضات

دیوبندیوں کا اعتراض: جب تم نے تلاوت قرآن پاک میں رب سے یہ وعدہ کر لیا کہ ہم تجھ سے ہی مدد مانگتے ہیں تو نبیوں اور ولیوں سے کیوں مدد مانگتے ہو یہ شرک ہے۔ **جواب:** انبیاء اولیاء سے امداد لینا حقیقت میں رب ہی سے امداد ہے کیونکہ اس کی امداد دو طرح کی ہے بالواسطہ یا بلاواسطہ اللہ کے بندوں کی مدد رب کے فیضان کا واسطہ ہے۔ قرآن کریم نے غیر خدا سے امداد لینے کا خود حکم فرمایا چنانچہ ارشاد فرماتا ہے اِسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوۃِ (البقرہ: ۴۵) مسلمانوں مدد لو صبر و نماز سے صبر و نماز بھی غیر خدا ہیں نیز فرماتا ہے اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ (محمد: ۷) اگر تم اللہ کے دین کی مدد کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد کرے گا رب تعالیٰ غنی ہو کر بندوں سے مدد طلب کرتا ہے تو اگر ہم محتاج بندے کسی بندے سے مدد مانگیں تو کیا برائی ہے۔ نیز حضرت ذوالقرنین کا قول نقل فرماتا ہے فَاَعِیْنُوْنِیْ بِقُوَّۃٍ (کہف: ۹۵) تم لوگ میری مدد کرو اپنی قوت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ (الصف: ۱۴) میرا مددگار کون ہے اللہ کی طرف نیز قرآن کریم نے فرمایا وَتَعَاوَنُوْا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی (مائدہ: ۲) یعنی ایک دوسرے کی مدد کرو بھلائی اور پرہیزگاری پر غرض

کہ قرآن کریم نے جگہ جگہ غیر خدا سے مدد لینے کا حکم فرمایا۔ صحابہ کرام کی ایک جماعت کا نام ہے انصار جس کے معنی ہیں مددگار۔ اگر غیر خدا سے مدد لینا شرک ہو تو یہ نام ہی مشرکانہ ہوا۔ حالانکہ انہیں یہ لقب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عطا فرمایا۔ اور قرآن کریم نے بھی ان کو اسی لقب سے یاد فرمایا۔ عیسائیوں کو قرآن کریم نے نصاریٰ کے نام سے یاد فرمایا اس کے معنی بھی مددگار ہیں اگر وہ احادیث اور فقہی عبارتیں جمع کی جائیں کہ جن میں غیر خدا سے مدد لینے کا حکم ہے تو اس کیلئے دفتر درکار ہیں۔ اگر اس کی زیادہ تحقیق منظور ہو تو ہماری کتاب ''جاء الحق'' کا مطالعہ کریں نیز خود دیوبندی اپنی ہزار ہا مصیبتوں میں پولیس کچہری، حکومت ڈاک خانہ وغیرہ سے مدد لیتے ہیں۔ تو ان میں سے کوئی مسلمان نہ رہا۔ شعر

تیری اٹکے تو وکیلوں سے کرے استمداد — یا محمد سے بگڑتی ہے طبیعت تیری

مدرسہ دیوبند مسلمانوں ہی کی مدد سے چل رہا ہے۔ نیز انسان پیدائش سے قبر تک بندوں کا محتاج ہے دائی کی مدد سے پیدا ہوا۔ ماں باپ کی مدد سے پرورش پائی۔ طبیب کی مدد سے شفا پائی۔ مالداروں کی مدد سے زندگی گزاری استاد پیر کی مدد سے ایمان ملا قرابت داروں کی مدد سے نزع کے وقت کلمہ نصیب ہوا مسلمان بھائیوں کی مدد سے غسل وکفن دفن نصیب ہوا۔ پھر مسلمانوں کی مدد سے قبر میں ثواب پہنچتا رہا۔ اب کوئی کس منہ سے کہہ سکتا ہے کہ غیر خدا سے مدد لینا شرک ہے۔ جہاں مدد کو خدا کے ساتھ خاص کیا گیا ہے۔ وہ حقیقی مدد ہے اور جہاں غیر خدا سے مدد لینے کا حکم ہے وہاں بالواسطہ ہے۔ لہٰذا تمام آیتیں اور احادیث مطابق ہوگئیں۔ قرآن شریف سمجھنے کیلئے ایمان کا نور اور حجازی کارخانے کی عینک چاہئے۔ نجدی عینک رہی سہی بھی پھوڑ دیگی۔

دوسرا اعتراض: زندوں سے مدد مانگنا تو جائز ہے۔ مگر مرے ہوؤں سے مدد لینا شرک ہے۔ **جواب:** اس آیت میں زندہ اور مردہ کا کوئی فرق نہیں کیا گیا جیسے کہ اِیَّاکَ نَعۡبُدُ میں عبادت کو اللہ کے ساتھ خاص کیا گیا کہ خدا کے سوا نہ زندہ کی عبادت جائز نہ مردہ کی۔ اس طرح اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ میں بھی ہونا چاہئے۔ **جواب ۲:** مدد لینا دو طرح پر ہے جسم سے اور روح سے۔ کسی سے کہنا پانی پلا دو۔ روٹی پکا دو وغیرہ یہ جسم کی مدد ہے اور کسی اللہ والے سے عرض کرنا کہ ہماری بگڑی بنا دو۔ بارگاہ الٰہی میں عرض کر کے بچہ دلا دو ہمیں جنت دے دو (جیسے کہ صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کرتے تھے) دوزخ سے بچا لو۔ حق سے ملا دو یہ سب روحانی مددیں ہیں۔ مرنے سے صرف بعض لوگوں کا جسم بیکار ہو جاتا ہے۔ روح کی طاقتیں تو بڑھ جاتی ہیں۔ میت قبر میں سے اوپر کے سارے حالات دیکھتی ہے اور ہلکی سی آوازیں بھی سنتی ہے۔ تو جو روح اپنی زندگی میں روحانی امداد کر سکتی ہے۔ بعد وفات بدرجہ اولیٰ مدد کر سکے گی۔ نیز دیکھو شب معراج میں حضرت موسیٰ نے مسلمانوں کی مدد کی کہ پچاس نمازوں کی پانچ کرا دیں۔ یہ مدد موسیٰ علیہ السلام نے اپنی وفات سے قریباً تین ہزار سال بعد کی اب بھی حضور کے نام کی مدد سے کافر مومن بنتے ہیں۔ موسیٰ وہارون کے تبرکات کی مدد سے بنی اسرائیل نے جالوت پر فتح پائی۔ رب فرماتا ہے، بَقِیَّۃٌ مِّمَّا تَرَکَ اٰلُ مُوۡسٰی وَ اٰلُ ہٰرُوۡنَ (بقرہ: ۲۴۸) حضور کی وفات کے بعد صحابہ حضور کے لباس وبال دھو کر شفا کیلئے پیتے تھے۔ اور حضور کی مدد سے شفا پاتے تھے۔ دیوبندیوں کے بزرگوں اور عام اولیاء اللہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہمیشہ مددیں مانگی ہیں۔ اور مدد مانگنے کو جائز رکھا ہے۔ چنانچہ مولوی محمود حسن صاحب دیوبندیوں کے شیخ الہند اپنے ترجمہ قرآن میں جس کے

چار پاروں کا ترجمہ انہوں نے کیا ہے۔ باقی مولوی شبیر احمد صاحب نے ایاک نستعین کے تحت فرماتے ہیں ہاں اگر کسی مقبول بندے کو واسطہ رحمت الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر استعانت ظاہری اس سے کرے تو یہ جائز ہے کہ یہ استعانت درحقیقت حق تعالیٰ ہی سے استعانت ہے اس کی پوری تحقیق ''جاء الحق'' میں دیکھو بہرحال اس اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ کے وہی معنی کرنے پڑیں گے۔ جو ہم نے عرض کردیئے۔

آریوں کا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کسی بندے کی کتاب ہے۔ کیونکہ اگر یہ رب کی کتاب ہوتی تو بتاؤ رب تعالیٰ کس کی عبادت کرتا ہے اور کس سے مدد مانگتا ہے۔ جواب: اس کا جواب بہت تفصیل سے گزر چکا ہے۔ ایک بار بابا خلیل داس بنارسی سے ایک آریہ نے یہی اعتراض کیا تھا۔ تو انہوں نے وہی جواب دیا جو ہم پہلے عرض کر چکے ہیں اور پھر فرمایا کہ اگر کہیں وید سے ثابت کردو کہ یہ وید اللہ کا کلام ہے تو تم کو ایک ہزار روپیہ انعام دیا جائے گا۔ بلکہ وید میں تو اللہ کا کوئی ذاتی نام بھی نہیں آیا۔ اوم، بھگوان، پرماتما، سروشکتی، مان وغیرہ اس کے صفتی نام رکھ لئے گئے ہیں۔ بلکہ اوم تو گانے کا سر ہے۔ جس کو آریوں نے خدا کا نام سمجھ رکھا ہے۔ قرآن کریم نے تو صاف فرمایا تَنْزِیْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِیْنَ (واقعہ: ۸۰) وغیرہ وغیرہ یعنی قرآن خدا کی طرف سے اترا۔ آؤ میں تم کو دکھاؤں کہ وید بنانے والا کون ہے۔ چنانچہ انہوں نے یجروید کا ایک منتر پڑھا۔ جس کا ترجمہ یہ بتایا کہ اے بھگوان میں اس منتر کا بنانے والا ہوں۔ میرا نام گوتم ہے اور تو مجھے توفیق دے کہ میں اس کام کو پورا کروں۔ دیکھو وید یہ صاف کہہ رہا ہے کہ یہ بندوں کا بنایا ہوا ہے اس پر وہ آریہ خاموش ہوگیا۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ ﴿۶﴾
ہدایت دے، ہم کو راستہ سیدھا
ہم کو سیدھا راستہ چلا

تعلق

پہلا تعلق: اس آیت کا پہلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ اول یہ کہ پہلے ذکر ہوا تھا۔ کہ ہم تجھ سے مدد مانگتے ہیں۔ یہ نہ معلوم ہوا تھا کہ کس کام میں اب اس استمداد کی کچھ تفصیل فرمائی گئی کہ اس میں مدد مانگتے ہیں کہ تو ہم کو سیدھے راستے پر چلا۔ اس سے نتیجہ یہ نکلا کہ دنیوی اور دینی کاموں میں اللہ ہی سے مدد مانگی جائے۔ مگر استقامت میں خاص طور پر کہ یہ تمام نیکیوں کی جڑ ہے۔ **دوسرا تعلق:** اس طرح کہ اس سے پہلے ذکر تھا عبادت کا اور اب ذکر ہو رہا ہے دعا کا جس میں اشارہ اس جانب ہو رہا ہے کہ عبادت کے بعد دعا مانگنی چاہئے۔ اسی لئے سنت ہے کہ نماز کے بعد دعا مانگے تیسرے اس طرح کہ اب تک عرض کیا تھا کہ خدایا ہم تیری عبادت کرتے ہیں اور تجھ سے مدد مانگتے ہیں اب عرض کیا کہ تو ہمیں سیدھے رستے پر قائم رکھ۔ یعنی عبادت پر قائم رکھ ایسا نہ ہو کہ کچھ روز عبادت کر کے ہم چھوڑ دیں۔ بلکہ ہمیشہ تیری عبادت میں مشغول رہیں کہ یہی صراط مستقیم ہے چوتھے اس طرح کہ اب تک عبادت کا ذکر ہوا۔ اب عرض کیا کہ اے اللہ ہم کو اس عبادت میں سیدھے

راستے پر قائم رکھ یعنی اس طریقہ سے عبادت کرا کہ تیری بارگاہ میں قبول ہو اور افراط و تفریط کے درمیان ہو اور جس طرح تیرے مقبول بندوں نے عبادت کی ہو۔ ایسا نہ ہو کہ دنیوی راحت کے موقعوں پر تیری عبادت سے غافل ہو جائیں اگر کبھی عبادت میں مشقتیں ہوں تو عبادت سے منہ نہ موڑ لیں۔ پانچویں اس طرح کہ عبادت وغیرہ کے بعد ہدایت کی دعا مانگنا اس لئے ہے کہ بغیر ہدایت کے عبادت مقصود تک نہیں پہنچاتی۔ بڑے بڑے عابد آخر کار زندیق بن گئے کہ ابلیس اور برصیصا اور بلعم ابن باعورہ وغیرہ کہ پہلے یہ لوگ اول درجہ کے عابد تھے اور بعد میں گمراہ ہوئے تو عرض یہ کیا جا رہا ہے کہ خدایا ہم اپنی اس عبادت پر نازاں نہیں ہیں تجھ سے ہدایت اور ہدایت پر استقامت مانگتے ہیں۔

تفسیر عالمانہ

علمائے کرام کے طریقے پر چاروں میں گفتگو کرنا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ- اهد ہدایت سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں رہبری کرنا یا منزل مقصود کا پتہ، نشان دینا۔ ہدایت دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک فقط راستہ دکھا دینا۔ دوسرے مقصود پر پہنچا دینا۔ اگر راستہ دکھا دینا مراد ہوتا تو ہدایت کے بعد الی یا لام لایا جاتا ہے اور یہاں ان دونوں میں سے کوئی نہیں جس سے معلوم ہوا کہ بندہ عرض کر رہا ہے "اے مولا صرف ہمیں سیدھا راستہ دکھا نہ دے بلکہ وہاں تک پہنچا دے اور اس پر چلا بھی دے کیونکہ راستے میں راہ مار بہت ہیں بغیر تیری مدد اس پر چلنا ناممکن ہے **نا** سے معلوم ہوا کہ دعا کرنے والا سب کیلئے دعا کر رہا ہے یہ نہیں کہتا کہ فقط مجھے ہدایت دے، بلکہ ہم سب کو اس جمع میں چند فائدے ہیں ایک یہ کہ جس طرح وہ عبادت زیادہ قبول ہوتی ہے جو مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ کی جائے اسی طرح وہ دعا زیادہ مقبول ہوتی ہے۔ جو سب کیلئے کی جائے کیونکہ اگر ایک کیلئے بھی قبول ہوئی تو امید ہے کہ سب کیلئے قبول ہو جائے گی۔ اسی لئے دعا کے اول اور آخر درود شریف پڑھا جاتا ہے۔ کیونکہ درود شریف کی برکت سے دعا بھی قبول ہوتی ہے تو رحمت الٰہی سے امید قوی ہے کہ وہ درمیان کی دعا کو نہ چھوڑے گا بلکہ آس پاس کے درود شریف کی برکت سے اسے بھی قبول فرمالے گا (تفسیر کبیر یہی مقام) دوسرے اس لئے کہ اگر ایک شخص ہدایت پر آ گیا اور باقی سب لوگ گمراہ رہیں تو گمراہوں میں اس ایک کی زندگی دشوار ہو جائے گی کیونکہ اگر ایک شخص ان سب کی موافقت کرے تو خود بھی گمراہ ہوتا ہے اور مخالفت کرے تو دشمنی پیدا ہوتی ہے اور زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ پس یہی ضروری ہے کہ سب کو ہدایت ملے تاکہ ان سب کی دونوں زندگیاں درست ہو جائیں (تفسیر عزیزی) تیسرے اس لئے کہ حدیث پاک میں ہے کہ تم بے گناہ زبان سے دعا مانگو صحابہ کرام نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے گناہ زبان کہاں سے لائیں۔ فرمایا کہ ہر ایک دوسرے کے حق میں دعا کرے کہ اپنی زبان اپنے لئے گناہ گار ہے نہ کہ غیر کیلئے ہے۔ (تفسیر کبیر) اس سے معلوم ہوا کہ دعا کی مقبولیت کا راز یہ ہے کہ سب کیلئے کی جائے جو چاہے کہ میری دعا بارگاہ الٰہی میں مقبول ہو۔ اپنے ساتھ سب کیلئے دعا کرے اور کہے اے اللہ ہم سب کو یہ عطا فرما۔ خیال رہے کہ کافروں کیلئے ایمان ہدایت ہے مومن کیلئے تقویٰ، متقی کیلئے کمال تقوی اور مقبولوں کیلئے قرب الٰہی، مقربین کیلئے کمال قرب ہدایت ہے لہٰذا اگر کافر یہ آیت پڑھے تو ایمان کی دعا ہے گناہ گار کیلئے تقویٰ کی متقی کیلئے قرب کی دعا ہے۔ لہٰذا اس آیت سے یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ معاذ اللہ حضور صلی

اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی گنہگار تھے۔ ورنہ وہ یہ آیت کیوں پڑھتے تھے۔ دیکھو بھٹی گندے لوہے کیلئے صفائی کا ذریعہ ہے۔ صاف لوہے کیلئے پرزہ بنا کر قیمتی کر دینے کا ذریعہ سونے کیلئے زیور بنا کر محبوب کے قرب کا ذریعہ۔ الصراط۔ صرط سے بنا ہے جس کے معنی ہیں نگل لینا۔ چونکہ راستہ مسافر کو اس طرح اپنے اندر لے لیتا ہے جیسے کھانے والا لقمے کو اس لئے راستے کو صراط کہتے ہیں۔ اصطلاح میں صراط اس شارع عام یعنی اس عام اور وسیع راستے کو کہتے ہیں جس میں چند آدمی مل کر چل سکیں وہ تنگ گلی کوچے جن میں چند آدمیوں کے مل جل کر چلنے کی گنجائش نہ ہو انہیں صراط نہیں کہا جاتا چونکہ دعا سب کیلئے مانگی گئی ہے اس لئے بولا گیا اس لئے صراط فرمانا ہی بہتر تھا صراط سبیل اور طریق کے معنی قریب قریب ایک ہی ہیں لیکن اس جگہ صراط اس لئے بولا گیا کہ پل صراط یاد آجائے اور منشاء یہ ہو جائے کہ اے اللہ ہمیں اس راستہ پر چلا جس پر چل کر پل صراط کو آسانی سے طے کر لیں۔ اَلْمُسْتَقِیْمَ مشتق ہے استقامت سے اس کے معنی ہے سیدھا ہونا سیدھا راستہ وہ ہے جو بہت جلد مقصود تک پہنچا دے اور چلنے والے کو کسی طرف مڑنا نہ پڑے ٹیڑھا راستہ یا تو مقصود تک پہنچائے گا ہی نہیں یا بہت دیر اور بہت دشواری سے پہنچائے گا جو کہ اس مثال میں ظاہر ہو رہے ہیں۔

نقشہ ۱: سیدھا راستہ

نقشہ ۲: سیدھا راستہ — ٹیڑھا راستہ

منزل نقشہ نمبر ۱ میں ٹیڑھے راستے مسافر کو منزل تک پہنچا سکتے ہی نہیں اور نقشہ نمبر ۲ میں آس پاس کے راستے اگرچہ منزل تک پہنچا تو دیں گے لیکن بہت دشواری سے اور ان میں بھٹکنے کا بہت اندیشہ ہے کفر تو وہ ٹیڑھا راستہ ہے جو کبھی منزل تک پہنچا سکتا ہی نہیں اور گمراہی یعنی اہل سنت والجماعت کے علاوہ دوسرے وہ گمراہ فرقے جو حد کفر تک نہ پہنچے ہوں جیسے تفضیلی رافضی اور وہ وہابی جنہوں نے گستاخی نہ کی ہو۔ اگرچہ آخر کار مغفرت پا کر منزل (جنت) تک پہنچ تو جائیں گے لیکن بہت دشواریوں اور مصیبتوں کے بعد۔ یہاں ان دونوں قسموں کے راستوں سے پناہ مانگی گئی ہے دعا مانگی گئی ہے اور اے پروردگار ہم کو سیدھے راستے پر چلا۔

صراط مستقیم کون سا راستہ ہے

صراط مستقیم میں بہت گنجائش ہے یہ دینی اور مذہبی عقیدے معاملات اور عبادات اور اخلاق سب کو شامل ہے تو مطلب اس کا یہ ہوا کہ اے اللہ ہم کو عقیدے اور اعمال سب میں سیدھے راستے پر قائم رکھ اس کی تفصیل یہ ہے کہ ہر چیز میں تین حیثیتیں ہیں۔ ۱۔ افراط زیادتی، ۲۔ تفریط کمی، ۳۔ میانہ روی نہ زیادتی نہ کمی تمام دینوں کے لحاظ سے دین اسلام مستقیم ہے اس لئے کہ دین موسوی میں بہت سختیاں تھیں چوتھائی حصہ زکوٰۃ واجب تھی ناپاک کپڑے اور ناپاک کھال کو کاٹنا جلانا پڑتا تھا۔ عبادت

خانوں کے سوا کہیں عبادت نہ ہو سکتی تھی۔ سخت سزا کے بعد توبہ قبول ہوتی تھی۔ دین عیسوی میں بہت نرمی تھی کہ شراب اور سور بھی حلال تھے۔ دین اسلام میں نہ پہلی سی سختیاں ہیں نہ دوسری نرمیاں۔ زکوٰۃ میں چالیسواں حصہ واجب اور وہ بھی صدہا آسانیوں کے ساتھ ہر جگہ مسجد یا غیر مسجد میں نماز جائز بڑے سے بڑا گناہ توبہ سے معاف ناپاک کو پاک کرنے کیلئے تیس بتیس طریقے نہایت آسان آسان کپڑے وغیرہ کو صاف پانی بہا کر پاک کرلو تانبے اور شیشے کے برتنوں کو صرف رگڑ کر پاک کرلو۔ ناپاک دودھ اور تیل وغیرہ کو پاک جنس کے ساتھ بہا کر پاک کرلو اگر پانی میسر نہ ہو تیمم کر کے نماز ادا کرلو وغیرہ وغیرہ شراب اور خنزیر جو کہ عقل اور صحت کو خراب کرنے والے ہیں۔ اور قوم میں بے غیرتی اور شر پیدا کرنے والے ہیں ان کو حرام کر دیا گیا۔

مذہبی عقائد

مذہب اہل سنت و جماعت صراط مستقیم ہے۔ کیونکہ فرقہ جبریہ انسان کو پتھر کی طرح بالکل مجبور مانتے ہیں اور فرقہ قدریہ انسان کو بالکل مختار اہل سنت کہتے ہیں کہ انسان خلق میں مجبور اور کسب میں مختار ہے اس کی تحقیق ان شاء اللہ مسئلہ تقدیر میں آئے گی۔ رافضی صحابہ کرام کے دشمن خارجی اہل بیت کے دشمن۔ لیکن اہل سنت ان دونوں جماعتوں کے بندۂ بے زر کیونکہ اہل بیت کرام امت کیلئے جہاز اور صحابہ کرام امت کیلئے تارے قطب نما خارجیوں نے کشتی کو چھوڑا رافضیوں نے رہنما تاروں سے منہ موڑا دونوں کی کشتی ڈوب گئی۔ اہل سنت کا بیڑا پار ہے چکڑالویوں نے حدیث اور فقہ کو چھوڑا غیر مقلدوں نے فقہ سے منہ موڑا۔ دیوبندیوں نے نبیوں اور ولیوں سے رشتہ توڑا بلکہ اللہ اور رسول علیہ السلام سے مقابلہ کی ٹھانی معاذ اللہ رب کو جھوٹا ٹھہرایا اس کے محبوب علیہ السلام کو بے علم اور اپنا جیسا بتایا۔ ہر کار خیر کو حرام قرار دیا۔ اور جہنم کا راستہ لیا اہل سنت نے بحمدہ تعالیٰ سب کو ان کے درجے کے موافق مانا یہی صراط مستقیم قرار پایا اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس پر قائم رکھے اعمال میں وہ اعمال صراط مستقیم ہیں۔ جو اسلام اور قرآن نے سکھائے عبادت اخلاق گھر کے اخراجات سب میں درمیانی چال چلن صراط مستقیم ایک شخص نوافل میں مشغول ہو کر تمام اہل قرابت کے حقوق سے بے پرواہ ہو جاتا ہے۔ دوسرا آدمی دنیوی جھگڑوں میں مصروفیت کی وجہ سے یاد خدا سے غافل۔ دونوں صراط مستقیم پر نہیں ہیں۔ تیسرا رب کو یاد بھی کرتا ہے سب کے حق بھی ادا کرتا ہے۔ بیشک وہی صراط مستقیم پر قائم ہے۔ اسی کو حدیث پاک میں اس طرح بیان فرمایا کہ سوؤ بھی اور رات کو عبادت بھی کرو۔ روزے بھی رکھو اور افطار بھی کرو۔ تمہاری آنکھ کا تم پر حق ہے۔ تمہاری بیوی کا تم پر حق ہے۔ تمہارے مہمان کا تم پر حق ہے۔ وغیرہ وغیرہ یہاں تک کہ محدثین ایک باب باندھتے ہیں۔ "باب القصد فی العمل" یعنی اعمال میں میانہ روی کا باب قرآن پاک نے فرمایا کہ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا (البقرہ: ۱۴۳) اے مسلمانوں ہم نے تم کو درمیانی امت بنایا۔ اخلاق میں وہ خلق صراط مستقیم ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا۔ کبھی کسی حال میں کسی پر غصہ نہ کرنا بے غیرتی ہے۔ اور خودداری کے خلاف ہے اور ہر وقت غصے میں رہنا بد خلقی ہے۔ اللہ کیلئے غصہ کرنا۔ دشمنان دین سے بیزاری اور دنیوی معاملات میں بردباری خلق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے غرض کہ اگر صراط مستقیم کی پوری تفسیر جائے تو اس کیلئے دفتر درکار ہیں۔ بطور نمونہ یہ چند باتیں درج

کردی گئی ہیں۔ رب تعالیٰ اس پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

تفسیر صوفیانہ

ہدایت چند طرح کی ہے ایک ہدایت الہامی جو بغیر کسی کو بتائے خود بخود حاصل ہو جیسے بچہ کا پستان چوسنا اور رو رو کر ماں کو اپنی طرف مائل کرنا خود بخود جانتا ہے۔ دوسری ہدایت احساسی جو کہ حواس درست ہونے کے بعد حاصل ہو جیسے کہ بچہ ہوش سنبھالنے کے بعد اچھی بری چیزوں میں فرق کرتا ہے۔ تیسری ہدایت عقلی جو عقل کی مدد سے حاصل ہوا سے ہدایت نظری بھی کہتے ہیں۔ یہ دلائل سے حاصل ہوتی ہے۔ یعنی انسان اپنی عقل کی مدد سے دلائل قائم کرے اور پھر اس سے نتیجہ نکالے چوتھی ہدایت الٰہیہ جو کہ پیغمبروں کی مدد اور حق تعالیٰ کے خاص کرم سے حاصل ہو یعنی جن چیزوں کو ہم عقل اور دلائل سے معلوم نہیں کر سکتے۔ اس کی رہبری کیلئے حق تعالیٰ نے انبیاء کرام کو بھیجا پھر یہ دو قسم کی ہے ایک ہدایت عامہ اور دوسری ہدایت خاصہ ہدایت عامہ شرعی احکام کی ہدایت ہے۔ جو نبی کی طرف سے عام مخلوق کو ہوتی ہے۔ جیسے عقائد اسلامیہ اور ظاہری اعمال اسلامیہ کی ہدایتیں اس ہدایت کو بنیانی یا توفیقی بھی کہتے ہیں۔ ہدایت خاصہ وہ جو نور نبوت یا نور ولایت سے خاص خاص لوگوں کو حاصل ہو (تفسیر عزیزی) خیال رہے کہ ہدایت الٰہیہ ہم لوگوں کیلئے آخری ہدایت ہے مگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیلئے یہ پہلی ہدایت ہے یعنی الہامیہ خاص بندے پیدائشی عارف باللہ ہوتے ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام نے پیدا ہوتے ہی فرمایا اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ (مریم: ۳۰) یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں قرآن فرماتا ہے وَاٰتَیْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِیًّا (مریم: ۱۲) ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پیدا ہوتے ہی سجدہ کیا۔ قرآن کی پہلی آیت کے نزول کے وقت آپ اعتکاف اور ذکر الٰہی میں مشغول تھے۔ حضور غوث پاک نے رمضان کے دن ماں کا دودھ نہیں پیا دنیا میں ہر چیز مرکز سے حاصل کی جاتی ہے مگر مرکز براہ راست رب سے لیتا ہے تمام دنیا سمندر سے پانی لیتی ہے۔ مگر سمندر رب سے تمام تارے سورج سے نور لیتے ہیں مگر سورج رب سے منور ہے سمندر پانی کا مرکز سورج نور کا مرکز جناب مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہدایت کے مرکز مولانا روم فرماتے ہیں۔

گر بہ استدلال کار دیں بدے　　فخر رازی رازدارے دیں بدے
پائے استدلالیاں چوبیں بود　　پائے چوبیں سخت بے تمکین بود

مولانا روم نے فرمایا کہ اس قسم کی ہدایت حاصل کرنے کیلئے فخر الدین جیسی ہستی کی عقل بھی کافی نہیں۔ کیونکہ یہ ہدایت عقل سے وراء ہے اسی لئے صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ ظاہری عالم کی پہنچ دلیل تک ہے اور صوفی کی رسائی کشف و مکاشفہ تک ہے۔ یعنی ظاہری عالم بتا کر اور شیخ طریقت دکھا کر سمجھاتا ہے ظاہری عالم صاحب قال اور یہ صاحب حال ہے مولانا اس کو یوں ادا فرماتے ہیں۔

قال را بگذار مرد حال شو　　زیر پائے کاملے پامال شو

پھر فرماتے ہیں۔

سرمہ کن در چشم خاک اولیاء　　تا ببینی زابتداء تا انتہا

اس آیت کریمہ میں اس آخری قسم کی ہدایت رب سے مانگی گئی ہے یعنی اے پروردگار ہم کو وہ ہدایت فرما جو حواس اور عقل وغیرہ سے وراء ہے اور صرف تیرے کرم سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی لئے کہا گیا۔ "اِهْدِ" تو ہمیں ہدایت دے اب اس کا تعلق گزشتہ آیتوں سے اس طرح ہو گیا کہ پہلے کہا گیا تھا۔ نَعْبُدُ اور نَسْتَعِيْنُ جس میں کہ فاعل بندہ تھا یعنی جہاں تک رسائی ہماری عقل وغیرہ کی ہے وہاں تک تیری مدد سے ہم نے کام کر لیا لیکن جو چیزیں ہماری عقل وغیرہ سے بالاتر ہیں۔ اے مولا اس کی ہدایت تو فرما یہاں رب کو فاعل قرار دیا گیا اب نا سے مراد ان حضرات کی وہ جماعت ہے جو ان کی یار طریقت اور واقف حقیقت ہو تو گویا کہا یہ جا رہا ہے کہ اے اللہ اس جنگل میں ہم نے قدم تو رکھ دیا لیکن اپنے تک پہنچنے کا راستہ یعنی وہ راستہ جس کی تو انتہا ہو اس کی رہبری تو ہی فرما دے۔

رہرو راہ محبت تھک نہ جانا راہ میں　　لذت صحرا نوردی دوری منزل میں ہے

الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صوفیاء کرام کے نزدیک صراط مستقیم کی چند تفسیریں ہیں ایک یہ کہ صراط مستقیم وہ راستہ ہے جو محبت اور عقل دونوں کو جامع ہو جس کا نام ہے سلوک کیونکہ محض عقل جو عشق الٰہی سے خالی ہو بے دین ہے اور محض عشق جس میں عقل قائم نہ رہے، جذب ہے۔ ان دونوں راستوں میں افراط و تفریط ہے اور رب تعالیٰ کی محبت بھی کامل ہو۔ عقل بھی باقی ہو یہ سلوک ہے وہی اس جگہ مطلوب ہے۔ سالک مجذوب سے اعلیٰ ہے موسیٰ علیہ السلام تجلی صفات دیکھ کر بیہوش ہو گئے یہ جذب ہوا حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معراج میں عین ذات کو دیکھ کر تبسم ہی فرماتے رہے یہ سلوک ہوا۔

موسیٰ زہوش رفت بیک پرتو صفات　　تو عین ذات مے نگری و در تبسمی

دوسرے یہ کہ جو راستہ ذات الٰہی تک پہنچا دے وہ صراط مستقیم ہے۔ اس کے علاوہ اور راستے افراط و تفریط سے خالی نہیں یہ حضرات فقط جنت پر قناعت نہیں کرتے حور و قصور پر صبر نہیں کرتے یہ تو اس راستے کو ڈھونڈتے ہیں جس کی یہ منزلیں ہیں گویا یہ کہا جا رہا ہے اے اللہ راستے بہت سے ہیں اور ادھر بلانے والے مختلف ذوق کے لوگ ہیں شیطان اور راستے کی طرف دعوت دے رہا ہے نفس اور طرف کھینچ رہا ہے۔ دشمن کہیں اور لے جانا چاہتا ہے۔ دوست کہیں اور پہنچانے کی تمنا رکھتے ہیں۔ لیکن اے مولا ہم تو اس راستے کے طالب ہیں جو تجھ تک پہنچا دے وہ راستہ وہ ہی ہے۔ جس میں انسان راضی برضا رہے علماء کرام کے نزدیک اچھے عقیدے قلب کا سیدھا راستہ ہے اور نیک اعمال قالب کا صراط مستقیم جو مومن کو جنت تک پہنچاتے ہیں۔ صوفیاء کرام کے نزدیک سلسلہ مشائخ وہ سیدھا راستہ ہے جو مومن کو اللہ تک پہنچاتا ہے اس دعا سے چند مسئلے معلوم ہوئے ایک یہ کہ ہر شخص مرتے وقت تک راستے میں ہے منزل پر بعد موت پہنچے گا۔ جیسے مسافر راستہ میں مال و متاع کی نگرانی کرتا ہے۔ ایسے ہی ہر شخص اپنے اعمال کا نگران ہے دوسرے یہ کہ اللہ کی بڑی نعمت یہ ہے کہ انسان کو سیدھا راستہ چلنے کی توفیق مل جائے اسی لئے سورۃ فاتحہ میں صرف اس کی دعا کرائی گئی ہے۔ تیسرے یہ کہ اللہ تک بغیر وسیلہ نہیں پہنچ سکتے ورنہ پھر راستہ کی کیا ضرورت ہوتی رب ہم سے قریب ہے مگر ہم اس سے دور اس لئے ہم راہ طے کرنے کے محتاج ہیں تفسیر کبیر میں اس جگہ ایک حکایت نقل کی گئی ہے۔

حکایت: حضرت ابراہیم بن ادہم پا پیادہ حج کو جارہے تھے ایک ناقہ سوار بدوی نے پوچھا آپ کہاں جاتے ہیں فرمایا بیت اللہ شریف اس نے کہا آپ دیوانے معلوم ہوتے ہیں۔ اتنا لمبا سفر نہ آپ کے پاس سواری نہ توشہ شاید آپ کو موت لائی ہے۔ حضرت ابراہیم رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ تیرے پاس ایک سواری ہے۔ میں بہت سی سواریاں رکھتا ہوں۔ لیکن وہ تجھ کو نظر نہیں آتیں عرض کیا وہ کون سی سواریاں ہیں فرمانے لگے جب مجھ پر کوئی بلا آتی ہے تو صبر کے گھوڑے پر سواری کرتا ہوں جب نعمت پاتا ہوں تو شکر کی سواری پر سوار ہو جاتا ہوں۔ جب کوئی رب کی قضاء آتی ہے تو رضا پر سوار ہوتا ہوں۔ جب نفس کسی طرف بلاتا ہے تو اپنی عمر پر بے اعتمادی کے گھوڑے پر سواری کرتا ہوں۔ بدوی بولا۔ بیشک آپ سوار اور میں پیادہ ہوں۔ جس طرح کہ دنیوی سفروں میں مختلف سواریاں چاہئیں کہیں تانگے پر جاتے ہیں کہیں ریل پر کہیں موٹر پر جہاز سے سمندر کو طے کرتے ہیں ہوائی جہاز پر سوار ہو کر فضا کی سیر کرتے ہیں اسی طرح اس سفر میں بہت سی سواریاں درکار ہیں اور ان سواریوں کی لگام کسی اور کے قبضے میں ہے۔ تیسری یہ کہ صوفیاء کرام کے نزدیک دین پر استقامت سیدھا راستہ ہے فرماتے ہیں کہ ایک استقامت ہزار کراموں سے بہتر ہے استقامت کے معنی یہ ہیں کہ اگر مولا کا اشارہ ہو کہ اپنے آپ کو دریا میں ڈال دو۔ تو اس کی تعمیل میں ذرا تامل نہ کرے۔ جیسے کہ حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ ہوا اگر حکم ملے کہ اپنے بچے کو ذبح کر دو تو اس پر راضی ہو جائے جیسے سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کر کے دکھا دیا۔ اگر یاد حق میں آگ سامنے آجائے تو اس کی پرواہ نہ کرے جیسے خلیل اللہ علیہ السلام نے نار نمرود کی پرواہ نہ فرمائی اگر کسی بڑے مرتبہ پر پہنچ کر کسی کی شاگردی کرنے کا حکم مل جائے تو اس پر عار نہ ہو جیسے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کر کے دکھا دیا کہ اس قدر عظمت وجلالت کے باوجود حضرت خضر علیہ السلام کے پاس حاضری میں کچھ شرم نہ فرمائی اگر آرے سے چرنے کی مصیبت سامنے آجائے تو اس کو صبر وشکر کے ساتھ برداشت کرے جیسے حضرت زکریا علیہ السلام پر گزرا وغیرہ وغیرہ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ جب اپنی جان و مال اور اولاد ایک پردہ بن جائے تو اس کو پھاڑ دو۔ اس وقت ان کا پھاڑنا فضول خرچی نہیں بلکہ یہ محبوب سے ملنے کا ذریعہ ہے حضرت سلیمان علیہ السلام نے نماز عصر قضاء ہو جانے پر ایک ہزار گھوڑے ذبح کر دیئے تو یہ فضول خرچی نہ ہوئی بلکہ آڑ کو پھاڑ ڈالا گیا اور یہ درجہ مشکل سے حاصل ہوتا ہے اس لئے عرض کیا اے اللہ تو ہدایت دے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: آریہ اس آیت پر اعتراض کرتے ہیں کہ دعا بے موقع ہے کیونکہ انسان جو اسلام لا چکا ہے اور نماز کیلئے حاضر ہو گیا قرآن پاک کی تلاوت شروع کر دی تو ہدایت تو اسے مل گئی اور مانگی وہ چیز جاتی ہے جو حاصل نہ ہو پس یہ ہدایت مانگنا بالکل بیکار ہے۔ **جواب:** اس کا جواب اس آیت کی تفسیر سے بخوبی ظاہر ہو گیا کہ یا مراد ہے ہدایت پر قائم رکھنا یا اس میں ترقی دینا قلب کو درست رکھنا یا مصیبتوں میں ثابت قدم رکھنا وغیرہ وغیرہ جیسا انسان ہو اس کیلئے ویسی ہدایت کافر کیلئے ہدایت یہ کہ وہ ایمان لے آئے مومن کیلئے ہدایت یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرے متقی کی ہدایت یہ ہے کہ اس پر قائم رہے جس قسم کا تلاوت کرنے والا ہو گا اس قسم کی ہدایت مراد ہو گی خیال رہے کہ ہم بھی سیدھے راستہ پر ہیں یعنی اس پر چل رہے

ہیں حضور بھی سیدھے راستے پر ہیں رب تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ۙ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (یٰس: ٣۔٤)
رب تعالیٰ بھی سیدھا راستہ پر ہے یعنی سیدھے راستے پر چلنے سے ملتا ہے جیسے لاہور سیدھی سڑک پر ہے۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے
اِنَّ رَبِّيْ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (ہود:٥٦) **دوسرا اعتراض:** ہم بھی نماز میں یہ دعا کرتے ہیں کہ ہمیں سیدھے
راستے پر چلا۔ انبیاء، اولیاء بھی یہی دعاء کرتے ہیں تو ہم میں فرق ہی کیا ہے (وہابی)۔ **جواب:** راستہ سب کا ایک ہے مگر
منزل مقصود سب کی جداگانہ ہمارے راستہ کی انتہا آگ سے نجات ہے مقبولوں کی انتہا جنت کا گلزار محبوبوں کے راستے کی انتہا
دیدار و وصال یار جیسے برات میں براتی دولہا اور اس کے ماں باپ سب ہی جاتے ہیں ایک ہی راستہ سب طے کرتے ہیں مگر
براتیوں کی انتہا کھانا یا شرکت ہے۔ اہل قرابت کی انتہا جوڑے گھوڑے مگر دولہا کی انتہا دلہن کا حصول ہے۔ راستہ ایک ہے مگر
منزل مقصود جداگانہ اس آیت سے دھوکہ نہ کھاؤ۔

صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۙ
راستہ ان لوگوں کا انعام (احسان) کیا تو نے پر ان لوگوں
راستہ ان کا جن پر تو نے احسان کیا

تعلق

اس آیت کا تعلق پچھلی گزشتہ آیت سے چند طرح ہے۔ اولاً اس طرح کہ پہلے سیدھے راستہ کی ہدایت مانگی گئی تھی جس میں
بہت گنجائش تھی۔ اس کو بیان کرنے کیلئے عرض کیا کہ اے اللہ ہم ان کا راستہ مانگتے ہیں۔ جن پر تو نے احسان فرمایا جس سے
معلوم ہوا کہ سیدھے راستے کی پہچان یہ ہے کہ اس کو اللہ کے نیک بندے اختیار کرلیں۔ دوسرے اس طرح کہ پہلی آیت میں
رب سے راستہ مانگا اور اب اس راستے کے راہبر مانگے کیونکہ کوئی راستہ بغیر راہبر کے ملے طے نہیں ہوسکتا تو گویا عرض کیا کہ
پروردگار ہم وہ راستہ مانگتے ہیں جس میں تیرے بندوں کے خاص نقش قدم موجود ہوں اور ان کی رہبری سے ہم منزل مقصود تک
پہنچ جائیں تیسرے اس طرح کہ صراط مستقیم وہ راستہ ہے جو افراط و تفریط کے درمیان ہو۔ اس کو واضح کرنے کیلئے تین
جماعتوں کا ذکر کیا درمیانی راستہ تیرے خاص بندوں کا راستہ ہے۔ افراط والا **الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ** کا راستہ اور تفریط کا راستہ
ضالین کا راستہ تو گویا اس میں اس راستے کی حد بندی کی گئی۔

تفسیر عالمانہ

علماء کرام فرماتے ہیں کہ راستے دو ہیں ایک راستہ مخلوق سے خالق کی طرف اور دوسرا خالق سے مخلوق کی طرف جو راستہ مخلوق
سے خالق کی طرف ہے خطرناک ہے اس میں بہت سے قافلے لٹ چکے ہیں اور اس پر جگہ جگہ ڈکیتی ہوتی ہے ڈاکوؤں کا سردار
ابلیس ہے اعلان کرچکا ہے کہ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ (اعراف:١٦) تو ضرورت تھی کہ اس قافلے کے ساتھ
جائے جس قافلے میں محافظین اور سرکاری افسران موجود ہوں۔ اور جس راستے میں جگہ جگہ سرکاری حفاظتی چوکیاں ہوں جس

کی وجہ سے ڈاکو کی ہمت نہ پڑے کہ ہم کو لوٹے اور محافظین وہی حضرات ہیں جن کا اس میں ذکر کیا گیا۔ اَنْعَمْتَ انعام سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں نعمت دینا نعمت لغت میں نرمی کو کہتے ہیں۔ اس لئے عرب والے نرم کپڑے کو ثوب ناعم اور نرم کھال کو جلد ناعم بولتے ہیں۔ اصطلاح میں سرور اور لذت کو نعمت کہتے ہیں نعمت تین طرح کی ہوتی ہے ایک وہ جو بلا اسباب رب کی طرف سے ایجاد ہوتی ہے جیسے زندگی اور بچپن کا رزق اور ہدایت وغیرہ اور دوسری وہ نعمت جو ہم تک بظاہر کسی بندے کے ذریعے سے پہنچی جیسے دنیوی مال وغیرہ تیسری وہ جو ہمارے اعمال کے ذریعے ہم کو ملے جیسے بعض اعمال سے رزق بڑھ جاتا ہے اور جنت وغیرہ (تفسیر کبیر) ان تینوں کی واضح مثال یہ ہے کہ ایک شخص نے ایمان اور عمل کے ذریعے سے جنت حاصل کی جیسے کہ مطیع بندہ دوسرے نے بغیر عمل کسی کے طفیل جنت لے لی۔ جیسے کہ مسلمانوں کے نابالغ فوت شدہ بچے تیسرے نے بغیر کسی سبب کے جنت حاصل کی جیسے حور وغلمان اور رب کی وہ مخلوق جو جنت کو پر کرنے کیلئے پیدا کی جائے گی پہلی قسم کی نعمت دو طرح کی ہے ایک دنیاوی جیسے کہ ہمارے اعضاء اور ان کی قوتیں وغیرہ دوسرے دینی جیسے کہ ایمان اور ہدایت وغیرہ اس آیت کریمہ میں نعمت سے یہ آخری قسم کی نعمت مراد ہے یعنی دینی نعمتیں۔ تو آیت کا مقصد یہ ہوا۔ ''اے اللہ ہم کو ان لوگوں کے راستے پر چلا جن کو تو نے دینی نعمتوں سے نوازا ہے۔ وہ کون حضرات ہیں اس کو خود قرآن کریم نے دوسری جگہ بیان فرمایا فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِیْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَ الصِّدِّیْقِیْنَ وَ الشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِیْنَ (النساء:۶۹) معلوم ہوا۔ وہ حضرات چار گروہ ہیں پیغمبر صدیقین شہید لوگ اور اللہ کے نیک بندے ہم نے نعمت کی یہ تقسیم اس لئے کی کہ اگر ہر نعمت مراد ہوتی تو اس میں کفار منافقین فاسقین بھی آجاتے ہیں کہ ان کو بھی خدا نے عمر، مال، اولاد، حکومت وغیرہ کی نعمتیں عطا فرمائی ہیں۔ رب تعالیٰ کی نعمت سے کوئی خالی نہیں۔ لیکن چونکہ دنیوی نعمتیں دینی نعمتوں کے مقابلے میں حقیر ہیں کہ وہ فانی ہیں اور یہ باقی لہٰذا اس جگہ کامل نعمت مراد لی گئی۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ**: یہ کہ اس سے معلوم ہوا کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت حق ہے۔ کیونکہ اس آیت میں فرمایا گیا۔ کہ ان کا راستہ اللہ سے مانگو جن پر اللہ کا انعام ہوا۔ اور دوسری آیت میں فرمایا گیا کہ وہ لوگ نبی اور صدیقین ہیں اور اسلام میں صدیقین کے سردار ابوبکر رضی اللہ عنہ ہیں کیونکہ صدیق کے معنی یا تو یہ ہیں کہ ہر کام میں سچا، قول میں، عمل میں ایمان میں اور ابوبکر صدیق میں یہ بات بطریق کامل موجود تھی۔ کیونکہ رب نے ان کو صحابی فرمایا اور متقی کے خطاب سے نوازا کہ ارشاد فرمایا اِذْ یَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ (توبہ:۴۰) اور دوسری جگہ فرمایا وَ سَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى ۙ الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَكّٰى (اللیل:۱۸) یہ دونوں نیز اور بہت سی آیتیں ان کے حق میں آئیں۔ جن کی تفسیر ان شاء اللہ تعالیٰ اپنے موقع پر کی جائے گی۔ یا صدیق کے یہ معنی ہیں کہ نبی کی بہت تصدیق کرنے والا یعنی بعض تو نبی کو اس کے معجزے سے جانتے ہیں۔ بعض کچھ دلائل دیکھ کر لیکن صدیق اپنے نور قلبی سے پہنچانتے ہیں جیسے کہ طبیعت انسانی لذتوں کی خوبی اپنے ذوق سے محسوس کر لیتی ہے کہ اچھی چیزیں ہضم کر لیتی ہے اور بری چیز کو پھینکتی ہے ایسے ہی صدیق کا نفس ایمان اور

ایمانیات کو بخوشی قبول کرتا ہے اور گندی چیزوں سے خود بخود نفرت کرتا ہے یہ بات بھی ابوبکر صدیق میں اعلیٰ درجے پر موجود ہے کہ انہوں نے اسلام سے پیشتر بھی نہ کبھی بت پرستی کی اور نہ زنا وغیرہ قبیح چیزیں۔ اور حضور علیہ السلام کو بغیر معجزات طلب کئے نبی مان لیا۔ اور معراج جسمانی کی بلا دلیل تصدیق کر دی۔ تو اب دونوں آیتوں سے یہ فائدہ حاصل ہوا کہ رب نے ہم کو حکم دیا کہ ہم سے اس راستے کی ہدایت مانگو جس پر ابوبکر صدیق اور تمام صدیق تھے۔ اگر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ معاذ اللہ ظالم ہوتے تو ان کی پیروی جائز نہ ہوتی۔ **دوسرا فائدہ:** یہ حاصل ہوا کہ کسی امام کی تقلید کرنا سخت ضروری ہے کیونکہ اس آیت میں فقط صراط مستقیم پر کفایت نہ کی گئی بلکہ اس کے ساتھ اس راستے کے پیشواؤں کی اتباع طلب کرنے کا بھی حکم دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہمارے لئے راستہ بھی ضروری ہے اور راستے کا رہبر بھی نیز اس میں بتایا کہ سیدھا راستہ وہ ہوتا ہے کہ جس پر اللہ کے نیک بندے چلے ہوں تبع تابعین سے لے کر اب تک اللہ کے سارے نیک بندے مفسرین، محدثین، فقہاء اولیاء عامتہ المسلمین کسی نہ کسی امام کے مقلد ہی رہے ان میں سے کوئی بھی غیر مقلد نہ گزرا۔ معلوم ہوا کہ تقلید اللہ کے بندوں کا راستہ ہے اگر اس کی پوری تشریح دیکھنا ہو تو ہماری کتاب ''جاء الحق'' کا مطالعہ کرو۔ اگر تقلید کرنا شرک یا حرام ہو تو دنیا سے حدیث کا علم مٹ جائے گا۔ کیونکہ سارے محدثین مقلدین اور مقلدوں کے شاگرد ہیں اور جس حدیث کی اسناد میں ایک فاسق آجائے وہ حدیث قابل قبول نہیں ہوتی تو اس قاعدے سے چاہئے کہ جس حدیث کی اسناد میں ایک مقلد آجائے وہ بھی قابل قبول نہ رہے تو بخاری مسلم ترمذی سب ختم کیونکہ ان کی کوئی اسناد مقلد سے خالی نہیں۔ **تیسرا فائدہ:** اس سے یہ حاصل ہوا کہ اچھے لوگوں کی پیروی کرنا اچھا اور بروں کی پیروی کرنا برا کیونکہ قرآن کریم نے کفار کا ایک عیب یہ بھی بیان فرمایا کہ وہ انبیاء کی تعلیم کے مقابلہ میں اپنے جاہل باپ دادوں کی پیروی کرتے ہیں اور یہاں مسلمانوں کو یہ تعلیم دی کہ تم ہم سے یہ دعا مانگو کہ خدایا ہم کو ہمارے مومنین باپ دادوں کے راستے پر چلا وہ آیتیں کفار کی تقلید کی برائی میں ہیں اور یہ آیت مومنین کی تقلید کی خوبی بیان فرما رہی ہے۔ **چوتھا فائدہ:** یہ حاصل ہوا کہ جس راستے پر اللہ کے نیک بندے جائیں وہی سیدھا راستہ ہے اور جس کو اللہ کے نیک بندے مستحب جانیں وہ مستحب ہے اس کی تفسیر اس حدیث سے ہوتی ہے کہ مَا رَاٰہُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَسَنًا فَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ حَسَنٌ جس کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے دوسری حدیث میں ارشاد ہوا اَنْتُمْ شُهَدَاءُ اللّٰهِ فِی الْاَرْضِ اے مسلمانوں تم زمین پر اللہ کے گواہ ہو جس چیز یا آدمی کو تم اچھا کہہ دو وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے کیونکہ تمہاری زبان رب کا قلم ہے لہٰذا محفل میلاد شریف، فاتحہ، عرس بزرگان اور وہ تمام چیزیں جن کو عرب و عجم کے علماء زاہدین صالحین مشائخ صوفیاء اچھا جانتے اور عمل کرتے ہیں وہ سب جائز ہیں اور مستحب ہیں اور ان کو جائز اور مستحب جاننا ہی صراط مستقیم ہے۔ کیونکہ یہ اللہ کے نیک بندوں کا راستہ ہے۔ ثابت ہوا کہ مذہب اہل سنت و جماعت حق ہے ایک دیوبندی کی بکواس کی وجہ سے تمام جہان کے علماء اور صالحین کو مشرک نہیں کہا جا سکتا ہاں اس دیوبندی کو بے دین کہنا آسان ہے جو تمام کی مخالفت کر کے اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتا ہے۔ **پانچواں فائدہ:** یہ ہے کہ جس دین و مذہب میں اولیاء اللہ ہوں وہ ہی سچا ہے۔ جو دین ولایت سے خالی وہ جھوٹا ہے۔ جس شاخ میں پھل پھول سبزہ ہو وہ ہی جڑ

سے وابستہ ہے اس کی خدمت کی جاتی ہے جو سوکھ گئی اس کا تعلق جڑ سے ٹوٹ گیا وہ جلانے کے لائق ہے دیکھو بنی اسرائیل کا دین جب تک منسوخ نہ ہوا تھا۔ تب تک ان میں اولیاء اللہ ہوتے رہے اصحاب کہف آصف بن برخیا حضرت مریم انہی کے دین کے اولیاء ہیں جب سے وہ دین ختم ہوا ولایت ان سے جاتی رہی۔ غرضیکہ اولیاء اللہ حقانیت دین کی جیتی جاگتی دلیلیں ہیں اولیاء اللہ اول سے آخر تک صرف مذہب اہل سنت و جماعت میں ہیں کسی وہابی، شیعہ، مرزائی فرقہ میں اولیاء نہیں۔ ولی کی تین علامتیں ہیں۔ ایمان تقوی عام مخلوق کا انہیں ولی کہنا۔ رب فرماتا ہے۔ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا یَتَّقُوْنَ (النمل: ۵۳)۔

تفسیر صوفیانه

صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ سے وہ حضرات مراد ہو سکتے ہیں جن پر رب کی باطنی نعمتیں نازل ہوئیں اور جن پر نور کا چھینٹا پڑا۔ کیونکہ مشکوۃ شریف باب الایمان بالقدر میں ہے کہ حق تعالیٰ نے سیدنا آدم علیہ السلام کی پشت سے تمام روحوں کو نکالا پھر ان پر نور کا چھینٹا دیا۔ بعض لوگوں پر وہ نور پڑا اور بعض اس سے محروم رہے۔ جن پر نور پہنچا وہ ہدایت پر آجائیں گے اور جو اس سے محروم رہے وہ گمراہ ہی رہیں گے۔ کاملین حق بات کو اسی نور سے معلوم کر لیتے ہیں اور عامۃ المسلمین ان کی پیروی کر کے ہدایت پا جاتے ہیں لیکن جو ان سے الگ رہا وہ تاریکی میں رہا لہٰذا اَنْعَمْتَ سے مراد اولیاء اور سالکین راہ ہیں صوفیاء کرام کے نزدیک کفار اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ میں داخل ہی نہیں۔ ہیں کیونکہ انہیں کسی قسم کی نعمت دی ہی نہ گئی۔ یہ دنیاوی نعمتیں مال و اولاد وغیرہ مسلمانوں کیلئے نعمت ہے اور کفار کے واسطے زحمت کیونکہ اس سے مسلمان کے نیک اعمال میں ترقی ہوتی ہے اور کفار کی سرکشی بڑھتی ہے قرآن پاک خود فرماتا ہے کہ وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ خَیْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ؕ اِنَّمَا نُمْلِیْ لَهُمْ لِیَزْدَادُوْٓا اِثْمًا (آل عمران: ۱۷۸) اس کی یوں مثال سمجھو کہ ایک شخص نے اپنے دوست کو خاص حلوا کھلایا اور دشمن کو زہر آلود کھلوایا دونوں کو حلوا ہی دیا ہے دوست کے واسطے وہ رحمت اور دشمن کے واسطے زحمت ہے یا یوں سمجھو کہ ایک ہی حلوے میں سے تندرست اور بیمار نے کھایا لیکن اس سے بیمار کی بیماری بڑھ گئی تندرست کو طاقت پہنچی۔ اس طرح ایک ہی نعمت مسلمان اور کافر کو ملتی ہے۔ لیکن کافر کو کفر کی بیماری ہے جس کی وجہ سے اس کیلئے یہ زہر ہے۔ صوفیاء کرام اس آیت کی بناء پر فرماتے ہیں کہ ہر مسافر طریقت کو پیر کی ضرورت ہے۔

مولانا فرماتے ہیں:

پیر را بگزیں کہ بے پیر ایں سفر　　ہست بس پر آفت و خوف خطر

چوں گرفتی پیر ہیں تسلیم شو　　ہمچو موسیٰ زیر حکم خضر رو!

ان شاء اللہ پیر کی ضرورت ہم بیعت کی آیتوں میں بیان کریں گے۔ **مسئلہ**: اس آیت سے ان شاء اللہ یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمانوں کا اجماع یعنی کسی مسئلہ پر اتفاق کرنا شرعی دلیل ہے جو شخص کہ امت کے اجماع سے علیحدہ ہوا وہ اس بکری کی طرح خطرے میں ہے جو اپنے گلہ سے الگ ہو جائے جس طرح بھیڑیا اس بکری کو کھا جاتا ہے اسی طرح شیطان ایسے مسلمان کو جلد گمراہ کر دیتا ہے لہٰذا چاہئے کہ مسلمانوں کی جماعت کے ساتھ رہیں۔

اعتراضات

اعتراض: صراط مستقیم ایک راستہ ہے اور انبیاء اولیاء علماء الگ الگ راستے رکھتے ہیں تو ایک راستہ ان سب کا راستہ کیوں کر ہوسکتا ہے۔ کیونکہ ہر نبی کی شریعت علیحدہ تھی۔ ہر ولی کے سلسلے طریقت جدا جدا ہیں۔ قادری، چشتی، نقشبندی وغیرہ علماء کے مذہب علیحدہ علیحدہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی وغیرہ غرض کہ ایسا کوئی راستہ نہیں مل سکتا جو ان سب کا راستہ ہو۔ **جواب:** تفسیر عزیزی میں نہایت نفیس مثال سے اس کا جواب دیا گیا ہے وہ یہ کہ ایک قافلہ ایک راستے کو طے کر رہا ہے لیکن اس قافلے کے آدمی مختلف کام کر رہے ہیں کوئی بڑھئی ہے، کوئی لوہار، کوئی بوجھ اٹھانے والا، کوئی کرایہ دار، کوئی محافظ چوکیدار۔ ان میں سے ہر شخص ایک ہی راستہ طے کر رہا ہے ایک ہی جگہ جا رہا ہے لیکن اپنے درجے کے لائق علیحدہ علیحدہ کام کرتے ہوئے یہ سب ایک دن منزل مقصود پر پہنچ جائیں گے۔ یا یونانی طبیبوں کا ایک طریقہ علاج ہے۔ ڈاکٹروں کا دوسرا طریقہ ان یونانی طبیبوں میں سے ہر طبیب کا طریقہ علاج جداگانہ ہے کوئی مفرد دواؤں سے علاج کرتا ہے کوئی معجونوں وغیرہ سے کوئی عرقیات اور شربتوں سے لیکن سارے یونانی حکیم ایک ہی قسم کے معالج مانے جاتے ہیں اسی طرح انبیاء کرام، علماء عظام، صوفیائے صافیہ اگرچہ اعمال میں کسی قدر اختلاف رکھتے ہیں۔ لیکن اصل مقصود سب کا ایک ہی ہے یہ عملوں کا اختلاف زمانے اور مزاجوں کے اختلاف کی وجہ سے ہے زمانہ موسوی میں دین موسوی ہی ان لوگوں کے مزاج اور زمانے کے موافق تھا۔ اور زمانہ عیسوی میں دین عیسوی ہی موافق ہوا۔ حدیث پاک میں فرمایا گیا کہ انبیاء کرام علاتی (باپ شریکے) بھائی ہیں۔ اصل توحید میں سب کا اتفاق ہے اعمال میں اختلاف۔

غیر مقلدوں کا اعتراض: صحابہ کرام اللہ کے مقبول بندے تھے۔ ان کے راستہ پر چلنا ہدایت ہے اور ان کا راستہ سیدھا راستہ ہے انہوں نے کسی کی تقلید نہ کی اور نہ ان کے زمانہ میں یہ چار مذہب حنفی شافعی وغیرہ بنے، لہٰذا تقلید نہ ہی کرنا سیدھا راستہ ہے۔ **جواب:** اس اعتراض کے دو جواب ہیں ایک الزامی دوسرا تحقیقی الزامی جواب تو یہ ہے کہ نبیوں کا راستہ صراط مستقیم ہے اور کوئی نبی کسی دوسرے نبی کا امتی نہیں ہوا لہٰذا امتی نہ بننا سنت انبیاء ہے وہابیوں کو چاہئے کہ کسی کے امتی بھی نہ بنیں۔ جواب تحقیقی یہ ہے کہ صحابہ کرام میں اصلی تقلید موجود تھی غیر فقیہ صحابہ فقیہ صحابہ کرام کی اطاعت کرتے تھے اور صحابہ کرام قرآن وحدیث سے قیاس فرما کے مسائل نکالتے تھے رہا یہ کہ اس زمانہ میں چند مذہب نہ بنے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سینے صحبت نبی سے منور تھے۔ ان میں اختلاف بہت کم تھے۔ گمراہ کرنے والے فرقے نہ تھے۔ لہٰذا ان کو قانونوں کی ترتیب کی ضرورت نہ پڑی۔ بعد میں جھگڑے پڑنا شروع ہوئے مسلمانوں میں کمزوریاں آنے لگیں ضرورت تھی کہ ان کو صحیح راستے پر لگایا جائے اس کی مثال یوں سمجھو کہ ان کے زمانے میں نہ قرآن پاک پر زیر زبر لگائے گئے نہ رکوع بنائے گئے نہ اس کے تیس سیپارے کئے گئے نہ حدیث کا فن بنا نہ اسماء الرجال کی ترتیب دی گئی۔ نہ حدیثوں کی اسناد پر جرح ہوئی نہ حدیثوں کو کتاب کی شکل میں جمع کیا گیا کیونکہ اس وقت ان چیزوں کی ضرورت ہی نہ تھی۔ جس قدر ضرورت بڑھتی گئی کام بھی بڑھتے گئے تو اب جو بیوقوف کہے کہ علم حدیث پڑھنا حدیثوں پر جرح کرنا صحابہ کے طریقے کے خلاف ہے وہ محض احمق ہے جس

طرح کہ علم حدیث کا جمع کرنا جائز بلکہ ضروری ہے۔ ایسے ہی فقہ وغیرہ بھی ضروری ہے نیز اگر فقہ کا انکار کر دیا جائے تو جو مسائل کہ حدیث وقرآن میں صراحۃ نہیں ملتے۔ ان میں یہ لوگ کیا کریں گے مثلاً ایک سوال قائم ہوتا ہے کہ اڑتے ہوئے ہوائی جہاز میں نماز پڑھنا کیسی ہے؟ لاؤڈ سپیکر سے نماز پڑھنا جائز ہے یا ناجائز، ریڈیو یا مونوگراف کے ذریعے سے اگر سجدہ کی آیت سنی جائے تو سننے والے پر سجدہ تلاوت واجب ہوگا یا نہیں؟ اگر جمعہ کی پہلی رکعت میں جماعت ہو اور دوسری رکعت میں امام کے پیچھے جماعت نہ رہے تو جمعہ پڑھے کہ ظہر؟ وغیرہ وغیرہ اس قسم کے صدہا مسائل ایسے ہیں جن کا حکم ہم کو قرآن اور حدیث سے نہیں ملتا۔ اگر فقہ کا انکار کیا جائے تو ان کا کیا حکم ہوگا۔

اس کی پوری بحث ان شاء اللہ تعالیٰ اس آیت کے ماتحت کی جائے گی اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ (النساء:۵۹)

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝
نہ غضب کئے ہوئے پر ان اور نہ بہکے ہوئے
نہ ان کا جن پر غضب ہوا اور نہ بہکے ہوؤں کا

تعلق

اس کا تعلق گزری ہوئی آیتوں سے چند طرح ہے **ایک** یہ کہ پہلی آیت میں صراط مستقیم کا پتہ بتایا گیا تھا اور پوری چیز کا پورا پتہ تب لگتا ہے جب کہ اس کے کچھ نشان بھی معلوم ہوں اور اس کی ضد کے بھی۔ کیونکہ چیز کی پہچان اس کی ضد کی پہچان سے ہوتی ہے تو پہلی آیت میں صراط مستقیم کی علامت بتائی گئی اور اس میں ٹیڑھے راستہ کا پتہ دیا گیا ہے تاکہ ان میں تمیز ہو جائے **دوسرے** یہ کہ پہلے خدا کے انعام کا ذکر تھا جس کو سن کر بندے کے دل میں امید پیدا ہوئی تھی اب غضب کا ذکر ہوا جس سے خوف پیدا ہوا اور ایمان، خوف وامید کے درمیان ہے یا یوں کہو کہ ایمان کے دو بازو ہیں ایک خوف اور ایک امید جس طرح پرندہ دو بازوؤں کے بغیر نہیں اڑ سکتا اسی طرح مومن بغیر امید اور خوف کے راستے کو طے نہیں کر سکتا ان دونوں میں برابری چاہئے **تیسرے** یہ کہ پہلی آیت میں ان لوگوں کا ذکر تھا جن پر اللہ نے انعام کیا اس آیت میں انہی لوگوں کی پہچان بتائی گئی یعنی انعام والے وہ لوگ ہیں جو خدا کے غضب یعنی بدعملی اور ضلالت یعنی گمراہ اور بداعتقادی سے بچے ہوئے ہوں تو مطلب یہ ہوا کہ انعام والے کی پہچان یہ ہے کہ اس کے عقائد بھی درست ہوں اور اعمال بھی یعنی کافر بھی نہ ہو اور فاسق بھی نہ ہو۔

تفسیر عالمانہ

غیر کے تین معنی ہیں نہ، سوا اور مگر یہاں تینوں معنی بن سکتے ہیں غضب کے لفظی معنی ہیں جوش اور بدلنا اور اصطلاح میں غضب اس حالت کا نام ہے جو دل میں بدلہ لینے کے خیال پر جوش پیدا ہوتا ہے اور جس میں کہ اس کا حال پلٹ جاتا ہے۔ رب تعالیٰ چونکہ دل سے اور دل کی حالت پلٹنے سے پاک ہے اس لئے یہاں اس کے معنی ہیں ارادہ عذاب۔ ضال ضلال سے مشتق ہے

جس کے معنی ہیں حیرت جو شخص حیران ہوا سے کہتے ہیں ضال عام عرف میں ضال کے معنی ہوتے ہیں گمراہ یعنی بدعقیدہ قرآن کریم میں جہاں کہیں انبیاء کرام کے متعلق ضلال فرمایا ہے وہاں لغوی معنی مراد ہیں یعنی حیرت وارفتگی جو شخص کسی نبی کو گمراہ جانے وہ کافر ہے اس میں اختلاف ہے کہ یہاں اَلْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ سے کون لوگ مراد ہیں اور ضالین سے کون؟ ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ اَلْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ سے مراد یہود اور ضالین سے نصاریٰ ہیں۔ تفسیر کبیر نے اس کے علاوہ چند معنی اور بیان فرمائے ہیں ایک یہ کہ اَلْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ سے مراد بدعمل فاسق اور فاجر ہیں اور ضالین سے مراد کفار ہیں دوسرے یہ کہ اَلْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ سے مراد کھلے کافر اور ضالین سے مراد منافق یعنی چھپے ہوئے کافر اس کی وجہ یہ ہے کہ سورۂ بقرہ شریف میں اولاً مسلمانوں کا ذکر ہوا ہے۔ پھر کھلے کافروں کا۔ پھر منافقوں کا۔ اگر یہاں بھی ان لفظوں کے یہ معنی ہوں تو سورۂ فاتحہ کی ترتیب سورۂ بقرہ کی ترتیب کے مطابق ہو جائے گی بعض نے فرمایا کہ جو لوگ خدا کے منکر ہیں وہ مغضوب علیھم ہیں اور جو خدا کو مان کر دوسری ایمانی چیزوں کے منکر ہیں وہ ضالین ہیں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اَلْمَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ وہ لوگ ہیں جن کی بدعقیدگی حد کفر تک پہنچ گئی ہو۔ جیسے ہمارے زمانے میں چکڑالوی، تبرائی شیعہ، قادیانی اور نبی علیہ السلام کی توہین کرنے والے دیوبندی اور ضالین وہ جن کی بدعقیدگی حد کفر تک نہ پہنچی ہو۔ جیسے تفضیلی شیعہ اور فقط نیاز اور فاتحہ کے منکر دیوبندی کچھ بھی مراد ہو مقصود یہ ہے کہ اے خدا ہم کو ان کے راستے سے بچا جو تیرے غضب میں آ گئے اور جو گمراہ ہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** فرشتے اور نبی ایک منٹ کیلئے بھی گمراہ نہیں ہو سکتے اور نہ کبھی گناہ کریں جس سے خدا کے غضب کے مستحق ہو جائیں اس لئے کہ انبیاء کی پیروی کرنے کا حکم ہے اور گمراہوں اور بدعملوں سے بچنے کا اگر وہ کسی ساعت میں بدعقیدہ یا بدعمل ہوئے ہوتے تو اس وقت ان سے بچنا لازم ہوتا اور یہ ان کے منصب کے خلاف ہے لہٰذا اسی سے عصمت انبیاء کا ثبوت ملا اور اس کی پوری بحث ہمارے رسالے قہر کبریا بر منکرین عصمت انبیاء میں دیکھو۔ **دوسرا فائدہ:** اس سے معلوم ہوا کہ گمراہوں اور بدمذہبوں سے دور رہنا چاہئے اور اللہ کے نیک بندوں کی صحبت میں بیٹھنا سخت ضروری ہے بدمذہبوں کے طریقوں ان کی صورتوں اور ان کی سیرتوں ان کی صحبتوں سے بچو جس کے پاس دولت ہو چاہئے کہ ڈاکوؤں اور چوروں سے علیحدہ رہے ورنہ ان کی دولت خطرے میں ہے اسی طرح جس کے پاس دولت ایمان ہو وہ ایمان کے چوروں سے علیحدہ رہے زہریلا سانپ جان لے گا اور برا یار ایمان برباد کرے گا مگر افسوس کہ ہمارے زمانے میں قوم کی تنظیم اور اتفاق کے یہ معنی کئے گئے ہیں کہ اللہ والوں (علماء، مشائخ، صوفیاء) سے نفرت کرو اور ہر بدمذہب کو اپنا بھائی سمجھو۔ **تیسرا فائدہ:** اس سورت کے شروع میں رب کی حمد وثناء ذکر ہوا اور آخیر میں اس کے غضب سے پناہ کا جس سے معلوم ہوا جس طرح رب تعالیٰ کی حمد وثناء نیک بختیوں کی اصل ہے اسی طرح بداعتقادی اور بدعملی بدنصیبیوں کی جڑ ہے۔ **چوتھا فائدہ:** اللہ کے مقبول بندے جہاں بھی ہوں اور جب بھی گزرے ہوں اور جیسے بھی ہوں سب ایک ہی جماعت ہیں کیونکہ ان سب کی اصل ایک ہی ہے لہٰذا آدم علیہ السلام کے زمانے سے قیامت تک کے

سارے مقبول انشاء اللہ تعالیٰ ایک ہی زمرے میں ہیں لیکن مردودین بارگاہ قسم قسم کے لوگ ہیں۔ بعض وہ جن کی صورتیں بگڑی ہیں بعض وہ جن کی سیرتیں بگڑی ہیں اور یہ اگرچہ دنیا میں متفق ہو کر رہیں لیکن آخرت میں کبھی ان کا اتفاق نہ ہوگا۔
پانچواں فائدہ: دنیوی تکلیفیں اور مصیبتیں رب کا غضب نہیں جس طرح سے کہ یہاں کا محض آرام اس کی نعمت نہیں بلکہ یہ تکالیف اس بھٹی کی آگ کی طرح ہیں جو سونے کے میل کو دور کر دیتی ہے۔ یا کھوٹے کھرے سونے کو الگ کر کے دکھا دیتی ہے جو دولت حق تعالیٰ سے غافل کر دے وہ رب کا غضب ہے اور جو تکلیف اس کی یاد دلائے وہ اس کی نعمت ہے۔

تفسیر صوفیانہ

صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ مغضوب اور ضال وہ ہیں جو اس ازلی نور کے چھینٹے سے محروم رہ گئے یا مغضوب وہ جو مقبول ہو کے مردود بنے یا وہاں حاضر ہو کر غائب ہو گئے یا مغفورین کے زمرے میں رہ کر مقہور بنے دار السرور سے نکل کر دار الغرور میں آگئے جیسے ابلیس اور بلعم ابن باعورہ اور ضالین وہ لوگ ہیں جو وہاں تک پہنچتے ہی نہیں یا تو یہاں سے چلے ہی نہیں یا چلے مگر راستے میں رہ گئے تو آیت کا مقصود یہ ہوگا کہ خداوندا ہم کو نہ تو ان لوگوں میں سے بنانا جو تجھ تک پہنچتے ہی نہیں اور نہ ان سے جو پہنچ کر لوٹے یہ مقام بہت نازک ہے انسان کو چاہئے کہ اپنے ظاہری علم اور تقویٰ پر اعتماد نہ کرے بہت سی کھیتیاں پک کر برباد ہو جاتی ہیں اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنَا حُسْنَ الْخَاتِمَةِ ماوشما تو کیا انبیائے کرام نے بھی استقامت کی دعائیں مانگی ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے عرض کیا تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ (یوسف:۱۰۱) شرح فقہ اکبر میں ہے کہ کسی تیلن نے سلطان العارفین بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ آپ کی داڑھی اچھی ہے یا میرے بیل کی دم فرمایا کہ اگر میں دنیا سے ایمان سلامت لے گیا تو میری داڑھی بدرجہا بہتر ہے اور اگر یہ دولت مجھ سے چھن گئی تو تیرے بیل کی دم میری داڑھی سے کہیں اچھی ہے۔ کیونکہ پھر جہنم میرے لئے ہوگا نہ کہ جانور کیلئے۔ اے مغرور انسان ابھی تو کس بات پر فخر کرتا ہے ابھی تیرے سامنے نزع کی سختی قبر کی تنگی، قیامت کی وحشت میزان کا معاملہ پل صراط سے گزرنا باقی ہے جس وقت ان شاء اللہ تعالیٰ پل سے بخیریت گزر جائیں گے تب یہ کہیں گے۔

للہ الحمد نہ مردیم و رسیدیم بدوست　　آفرین باد بریں ہمت مردانہ ما

مگر سب کی اصل یہ ہے۔

گر محمد ﷺ کا ساتھ ہو جائے　　پھر تو سمجھو نجات ہو جائے

اعتراضات

اعتراض: حق تعالیٰ نے غضب اور گمراہی کے راستے پیدا ہی کیوں کئے؟ شیطان کو بنایا ہی کیوں نفس امارہ کو کیوں پیدا فرمایا؟ کیا اچھا ہوتا کہ نہ یہ موذی چیزیں ہوتی نہ دنیا میں خدا کی نافرمانی ہوتی۔ اگر رب تعالیٰ نافرمانیوں سے راضی تھا تو نافرمانیوں پر عذاب کیسا؟ اور اگر ناراض تھا تو انہیں پیدا کیوں فرمایا۔ **جواب:** اس کا تفصیلی جواب ہم ان شاء اللہ تعالیٰ سورۃ بقرۃ کے شروع میں دیں گے جہاں شیطان کی تحقیق اور اس کے پیدا کرنے کے اسرار بیان کئے جائیں گے۔

اٰمِیْنَ
قبول فرما
قبول فرمالے

آمین اسم فعل ہے اس کے معنی یا تو ہیں ایسا ہی کر یا قبول فرما یہ قرآن پاک کی آیت نہیں ہے اس لئے نہ تو اس کو قرآن پاک میں لکھا گیا اور نہ آج تک کسی نے اس کے قرآن ہونے کا دعویٰ کیا ہاں سنت یہ ہے کہ سورۂ فاتحہ کے بعد تلاوت کرنے والا اور سننے والا آمین کہہ لیا کرے اسی طرح ہر دعا کے بعد آمین کہنا سنت ہے۔

آمین کے فضائل

تفسیر روح البیان شریف نے اسی جگہ پر ایک حدیث نقل فرمائی کہ حضرت جبریل امین نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ فاتحہ کیلئے آمین ایسی ہے جیسے کتاب کیلئے مہر یعنی جس طرح بغیر مہر کے کتاب مکمل نہیں ہوتی اسی طرح بغیر آمین سورۂ فاتحہ مکمل نہیں ہوتی سیدنا علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ آمین، رب العالمین کی مہر ہے۔ جس سے اپنے بندے کی دعا پر مہر لگاتا ہے یعنی جس طرح کہ مہر والا لفافہ سوائے مکتوب الیہ کے کوئی نہیں کھول سکتا اسی طرح آمین والی دعا ان شاء اللہ ضائع نہیں ہو سکتی یعنی یا تو قبول ہو جائے اور اگر وہ دعاء ارادۂ الٰہی کے خلاف ہے تو دعا مانگنے والے کو ثواب مل جائے گا حضرت وہب فرماتے ہیں کہ آمین میں چار حرف ہیں اور آمین کہنے والے کیلئے چار فرشتے دعا مغفرت کرتے ہیں حدیث پاک میں ہے کہ جب امام وَلَا الضَّآلِّیْنَ کہے تو تم آمین کہو کیونکہ اس وقت ملائکہ بھی آمین کہتے ہیں۔ جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہوگئی اس کے تمام گناہ بخش دیئے جائیں گے حضرت امام رازی تفسیر سورۂ فاتحہ میں فرماتے ہیں کہ شیطان اس دعا سے مایوس ہو جاتا ہے جس کے آخیر میں آمین کہہ دی جائے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس پر مہر لگ چکی ہے میں توڑ نہیں سکتا۔ (روح البیان) دعا کرنے والا اور آمین کہنے والا دونوں دعا میں شریک ہوتے ہیں اس لئے حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام سے فرمایا قَدْ اُجِیْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا (یونس: ۸۹) یعنی تم دونوں کی دعا قبول کر لی گئی حالانکہ فقط موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی تھی اور حضرت ہارون علیہ السلام نے صرف آمین فرمائی تھی مگر رب نے اس دعا کو ان دونوں صاحبان کی طرف نسبت کیا بزرگان دین فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کے مجمع میں دعا کرنا بہتر ہے کیونکہ اس صورت میں ایک شخص دعا کرے گا اور باقی سب لوگ آمین کہیں گے۔ اگر ان میں سے ایک کی بھی آمین قبول ہوگئی تو ان شاء اللہ سب کی دعا قبول ہو جائے گی۔

آمین کے مسائل

ا۔ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ آمین قرآن پاک کا کلمہ نہیں بلکہ یہ فقط دعا ہے۔ اس کا دعا ہونا قرآن پاک اور حدیث شریف اور سارے مسلمانوں کے اتفاق سے معلوم ہو چکا ہے رب تعالیٰ نے حضرت ہارون علیہ السلام کی آمین کو دعا فرمایا۔ حضور صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم نے اس کے قرآن ہونے کی خبر نہ دی کسی صحابی اور تابعی نے اسے قرآن نہ کہا اور اسے قرآن میں لکھا بھی نہ گیا۔ ان تمام باتوں سے ثابت ہوا کہ یہ قرآن نہیں بلکہ دعا ہے۔ **مسئلہ**: امام کے پیچھے آمین آہستہ کہنی چاہئے اور نماز کے علاوہ بھی آہستہ کہنا بہتر ہے۔ اس کا آہستہ کہنا قرآن پاک، احادیث شریفہ اور عمل صحابہ کرام اور عقلی دلائل سے ثابت ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّ خُفْيَةً (اعراف:۵۵) یعنی اپنے رب سے عاجزی کے ساتھ اور چپکے سے دعا کرو جس سے معلوم ہوا دعا دل میں کرنی چاہئے اور آمین بھی ایک دعا ہے لہٰذا یہ بھی دل میں ہی چاہئے۔ قرآن کریم فرماتا ہے وَ اِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (البقرہ:۱۸۶) اور اے محبوب علیہ السلام جب میرے بندے آپ سے میرے بارے میں دریافت کریں تو فرمادو میں بہت قریب ہوں قبول کرتا ہوں دعا کرنے والے کی دعا کو۔ اس آیت سے بھی مقصود یہی ہے کہ دعا کرنے والے چیخنے کی زحمت گوارا نہ کریں پکار کر اس سے کوئی چیز مانگی جاتی ہے۔ جو دور ہو وہ تو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے لہٰذا اس سے آہستہ ہی دعا کرو۔ ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ آمین آہستہ ہی چاہئے۔

احادیث

حدیث ۱: مشکوٰۃ باب القراءۃ فی الصلوٰۃ میں ہے کہ جب امام وَلَا الضَّآلِّيْنَ کہے تو تم آمین کہو کیونکہ اس وقت ملائکہ بھی آمین کہتے ہیں۔ جس کی آمین ملائکہ کی آمین کے موافق ہوگئی اس کے سارے گزرے ہوئے گناہ معاف ہو جائیں گے (رواہ البخاری والمسلم) اس حدیث سے معلوم ہوا کہ گناہ جب معاف ہوں گے جب کہ آمین ملائکہ کی طرح کہے گا اور ملائکہ تو آہستہ کہتے ہیں جو کہ ہمارے سننے میں نہیں آتی تو چاہئے کہ ہم بھی آہستہ ہی کہیں اگر ہم نے بلند آواز سے آمین کہی تو ملائکہ کی آمین کے مخالف ہوئی پھر مغفرت کیسی؟ یہ جو فرمایا گیا کہ جس کی آمین فرشتوں کے موافق ہو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کیفیت میں موافق ہو نہ کہ وقت میں کیونکہ وقت تو آمین کہنے کا وہی ہے جو بھی اس وقت آمین کہے گا موافق ہو جائے گا پھر اس میں یہ قید لگانا کیسی؟ کہ جن کی آمین فرشتوں کی آمین کے موافق ہو اس کی مغفرت ہو۔ مراد وہی ہے۔ جو ہم نے عرض کیا۔ **حدیث ۲**۔ حضرت وائل ابن حجر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی جب حضور علیہ السلام یہاں پہنچے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ تو فرمایا امین واخفی بھا صوتہ یعنی اپنی آواز پست کی۔ آمین آہستہ پڑھی اس کو امام احمد اور ابوداؤد طیالسی اور طبرانی اور دار قطنی نے اپنی سنن میں اور حاکم نے مستدرک میں روایت کیا اور فرمایا کہ یہ حدیث صحیح الاسناد ہے۔ **حدیث ۳**۔ امام محمد رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے آثار میں اور عبدالرزاق نے اپنی مصنف میں امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا کہ حضرت ابراہیم نخعی فرماتے ہیں کہ چار چیزوں کو امام آہستہ کہے۔ ۱۔ اعوذ باللہ، ۲۔ بسم اللہ، ۳۔ سبحٰنک اللّٰھم ۴۔ آمین **حدیث ۴**۔ طبرانی نے تہذیب میں اور طحاوی نے اور ابن جریر نے اور ابوحفص ابن شاہدین نے حضرت ابووائل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ حضرت علی

اور عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نہ تو بسم اللہ بلند آواز سے پڑھتے تھے اور نہ آمین **حدیث ۵**۔ اسی طبرانی نے کبیر میں انہی ابی وائل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کہ حضرت علی اور عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہما نماز میں اعوذ باللہ اور بسم اللہ اور آمین کو بلند آواز سے نہ پڑھتے تھے۔ **حدیث ۶**۔ عینی شرح ہدایہ نے حضرت ابو معمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی کہ سیدنا عمر ابن الخطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں امام چار چیزیں آہستہ کہے اعوذ باللہ بسم اللہ آمین ربنا لک الحمد **حدیث ۷**۔ یہی روایت منتخب کنز العمال میں ابراہیم نخعی سے ہے۔ **حدیث ۸**۔ ابوداؤد ترمذی اور ابن ابی شیبہ نے وائل ابن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت کی فرماتے ہیں کہ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سنا کہ آپ نے پڑھا غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ اور آمین کہا وخفض بها صوته اپنی آواز کو اس میں پست کیا۔ **حدیث ۹**۔ بیہقی نے انہی ابی وائل رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا کہ سیدنا عبداللہ فرماتے ہیں کہ امام چار چیزوں کو آہستہ کہے۔ بسم اللہ آمین ربنا لک الحمد اور اعوذ باللہ۔ **حدیث ۱۰**۔ دارمی اور بیہقی نے سیدنا ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ جب قاری کہتا ہے ولا الضالین تو آسمان کے فرشتے بھی آمین فرماتے ہیں جس کی آمین ان کی آمین کے موافق ہوگی اس کی مغفرت ہو جائے گی اس کی پوری تحقیق صحیح البہاری میں دیکھو۔

عقلی دلیل: آمین کے علاوہ جس قدر نماز میں دعائیں ہیں یعنی دعاء قنوت، دعاء ماثورہ وغیرہ تمام آہستہ ہی پڑھی جاتی ہیں۔ چونکہ آمین بھی ایک دعا ہے چاہئے کہ یہ بھی آہستہ پڑھی جائے۔ نیز نماز میں سوا تکبیروں اور تلاوت قرآن کے کوئی ذکر بلند آواز سے نہیں کیا جاتا اور آمین بھی تلاوت اور تکبیروں کے علاوہ ہی ہے لہٰذا وہ بھی آہستہ ہونی چاہئے۔

غیر مقلدوں کا اعتراض: غیر مقلد کہتے ہیں کہ بہت سی احادیث میں آیا ہے کہ بلند آواز سے آمین کہی جائے چنانچہ ترمذی، ابوداؤد اور ابن ماجہ نے وائل ابن حجر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سنا کہ آپ نے نماز میں وَلَا الضَّآلِّيْنَ پڑھا اور آمین فرمایا مَدَّ بِهَا صَوْتَهٗ بلند کیا اس سے اپنی آواز کو اسی طرح ابن ماجہ کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتنی آواز سے آمین فرماتے تھے جو صف اول والے سن لیتے تھے پھر یہ سب لوگ اتنی بلند آواز سے آمین کہتے تھے جس سے مسجد گونج جاتی تھی لہٰذا آمین بلند آواز سے کہنی چاہئے۔ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں اول یہ کہ قرآن پاک نے آہستہ دعا مانگنے کا حکم دیا اور آمین بھی ایک دعا ہے اور ان احادیث سے آمین بالجہر ثابت ہوئی یقیناً آیت قرآنی کو ترجیح دی جائے گی نیز حضور کی آواز پر اپنی آوازیں اونچی کرنا حرام ہے رب فرماتا ہے لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ (حجرات: ۲) اگر ختم سورۂ فاتحہ پر حضور کے ساتھ تمام صحابہ اونچی آواز سے حضور کے ساتھ آمین کہتے تو ان کی آوازیں حضور کی آواز سے اونچی ہو جاتیں یہ حکم قرآنی کے خلاف ہے۔ آمین بالخفی کی پوری بحث ہماری کتاب جاء الحق حصہ دوم میں ملاحظہ کرو۔ جس میں اس جیسے ۲۶ مسائل پر محققانہ گفتگو کی گئی ہے۔ دوسرے یہ کہ جب احادیث کی تحقیق کی جاتی ہے تو بلند آواز کی حدیثوں میں صرف سیدنا وائل رضی اللہ عنہ کی روایت صحیح ہے جس میں مَدَّ بِهَا صَوْتَهٗ ہے اور اس کا ترجمہ یہ نہیں کہ بلند آواز سے آمین فرمائی بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ آواز کھینچ کر آمین کہا یعنی آمین کے

الف اور میم کو مد کے ساتھ کھینچ کر پڑھا۔اب لفظ صوت کے معنی فقط آواز کے ہیں خواہ چیخ کر ہو خواہ آہستہ پھر جب کہ انہی حضرت وائل رضی اللہ عنہ کی روایت میں صراحتہً آچکا کہ حضور علیہ السلام نے آمین آہستہ فرمائی تو یقیناً اس روایت میں بھی صوت سے مراد آہستہ آواز ہو گی تا کہ دونوں روایتیں مطابق ہو جائیں تیسرے یہ کہ جن روایتوں میں جہر کے الفاظ موجود ہیں۔ اولاً تو اسناد کے لحاظ سے وہ صحیح نہیں۔ علاوہ ازیں ان روایات کرنے والوں نے مَدَّبِهَا صَوْتَهٗ کا ترجمہ جہر فرما کر روایت بے معنی کر دی ہے ابن ماجہ کی روایت اس لئے بھی قرین قیاس نہیں کہ اس میں ہے کہ آمین کی آواز سے مسجد گونج جاتی تھی اور ظاہر ہے کہ کچی اور چھپر والی مسجد میں گونج پیدا نہیں ہو سکتی گونج تو ڈاٹ والی پختہ عمارت میں پیدا ہوتی ہے اور مسجد نبوی شریف اس وقت کچی تھی چھت میں چھپر تھا اس کی تحقیق ہمارے حاشیہ بخاری نعیم الباری میں دیکھو چوتھے یہ کہ جب حدیثوں میں تعارض ہو تو قیاس کے ذریعے سے بعض حدیثوں کو ترجیح دے دی جاتی ہے تو آہستہ آمین کہنے کی حدیثیں قیاس کے مطابق ہیں اور بلند آواز سے آمین کہنے کی حدیثیں قیاس کے خلاف جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں لہٰذا آمین آہستہ ہی کہنا چاہئے پانچویں یہ کہ آہستہ آمین والی حدیثوں کی قرآن پاک تائید فرما رہا ہے لہٰذا وہی زیادہ قابل عمل ہے چھٹے یہ کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ بلند آواز سے آمین کہنے کی روایتیں منسوخ ہیں اور آہستہ والی ناسخ۔ لہٰذا آہستہ آمین کہنا ہی قابل عمل ہے۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلٰى حَبِيْبِهٖ وَ نُوْرِ عَرْشِهٖ سَيِّدِنَا وَ مَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ وَاَصْحٰبِهٖ اَجْمَعِيْنَ بِرَحْمَتِكَ يَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِيْنَ٥

سورة البقره مدنية وهي مائتان وست وثمانون آية واربعون ركوعا

سورہ بقرہ مدنی ہے اور وہ دوسو چھیاسی آئتیں اور چالیس رکوع ہیں

تعلق

اس سورۃ کا سورۃ الحمد کے ساتھ چند طرح تعلق ہے اولاً یہ کہ سورۃ الحمد میں ایسے عمدہ مضامین بیان ہوئے جن سے بیمار دل اور بیمار روح کو شفا ابدی حاصل ہوئی اسی لئے اس کا نام سورۂ شافیہ تھا۔ شفا کے بعد زندگی ضروری ہوتی ہے یا یوں سمجھو کہ دوا کے بعد غذا ضروری ہے۔ کیونکہ دوا سے بیماری دور ہوتی ہے اور غذا سے زندگی باقی رہتی ہے سورۂ بقرہ کے اندر ایسے مضامین بہت زیادہ ہیں جو انسان کو روحانی زندگی عطا فرماتے ہیں کیونکہ اس میں چالیس رکوع ہیں مگر کوئی بھی رکوع ایسا نہیں جس میں زندگی کا ذکر نہ ہو کسی رکوع میں ایمان کا ذکر ہے کسی میں اعمال کا کسی میں غذائیں پیدا فرمانے کا کسی میں بنی اسرائیل پر من وسلویٰ اتارنے کا کسی میں دین ابراہیم کی پیروی کرنے کا کسی میں کعبے کے بدلنے کا کسی میں مرے ہوئے کو گائے کا گوشت مار کر زندہ کرنے کا کسی میں شراب وجوئے کی ممانعت کسی میں خانگی زندگی کے طریقے کسی رکوع میں طلاق اور عدت وغیرہ کسی میں بچوں کی پرورش۔ کسی میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا چار جانوروں کا مار کر زندہ دکھانا وغیرہ وغیرہ اور یہ تمام مضامین جسمانی یا روحانی حیات بخشنے والے ہیں تو یوں سمجھو کہ سورۂ فاتحہ شفا تھی اور سورۂ بقرہ حیات یعنی زندگی کی سورت دوسرے یہ کہ سورۂ بقرہ الحمد شریف کی تفصیل ہے یعنی جو مضامین کہ وہاں اجمالی طور پر بیان کئے گئے تھے وہ اس سورت میں مفصل طور پر بیان ہوئے مثلاً سورۂ فاتحہ میں حق تعالیٰ کی ربوبیت اور رحمت کا ذکر فرمایا گیا اس سورت میں ذکر ہوا کہ رب تعالیٰ نے آسمان سے پانی برسا کر قسم قسم کے پھل پیدا فرمائے۔ فلاں قوم کو من وسلویٰ عطا فرمایا گیا۔ فلاں شخص کو بعد مرنے کے زندہ کر دیا وغیرہ وغیرہ اسی طرح سورۂ فاتحہ میں حق تعالیٰ کی شہنشاہی کا ذکر تھا کہ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ اس سورۃ میں ذکر آئے گا کہ بنی اسرائیل نے فلاں خطا کی ان پر یہ عذاب بھیجا گیا یہ اس کی شہنشاہی کا ثبوت ہے۔ اسی طرح سورۃ فاتحہ میں عبادت کا ذکر تھا۔ تو اس سورۃ میں روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ وغیرہ سب کا ذکر آئے گا۔ اسی طرح سورۃ فاتحہ میں سیدھے راستے کی دعا مانگی گئی تھی۔ انعام والوں کے راستوں پر چلنے کی توفیق اور سورۂ بقرہ میں حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب اور دیگر انبیاء کرام علیہم السلام اور ان کی پیروی کرنے والوں کا ذکر ہے۔ اسی طرح سورۃ فاتحہ میں غضب والوں اور گمراہوں سے پناہ مانگی گئی تھی اور سورۂ بقرہ میں فرعون اور نمرود وغیرہ کے حالات اور ان کی تباہی کا ذکر فرمایا گیا غرض کہ سورۃ بقرہ سورۂ فاتحہ کی تفصیل یا تفسیر ہے اس لئے اس کو سورۂ فاتحہ کے بعد بیان فرمانا نہایت بہتر ہے۔

سورۂ بقرۃ کا نام

ہم سورۂ فاتحہ کے اول میں یہ عرض کر چکے ہیں کہ سورۃ کا نام اس کے بعض مضامین وغیرہ سے ہوتا ہے لہٰذا سورۂ بقرہ کا نام بھی اس کے ایک مضمون سے رکھا گیا۔ بقر کے معنی ہیں گائے یا بیل چونکہ اس میں گائے کے ذبح کرنے اور اس کے ذریعے سے

ایک مقتول کو زندہ کرنے کا ذکر کیا گیا ہے۔اس لئے اس کا نام سورۂ بقرۃ رکھا گیا۔اگرچہ اس میں اور بھی اعلیٰ مضامین موجود تھے لیکن گائے کا یہ عجیب وغریب قصہ صرف اسی سورۃ میں ہے اور کسی میں نہیں اور اس واقعہ میں ہزار ہا فائدے ہیں جن کی کچھ تفصیل ہم اس موقع پر کریں گے لہٰذا اس کا نام سورت بقرہ ہی ہوا۔

شان نزول

اس کا ایک تو اجمالی شان نزول ہے ایک تفصیلی۔تفصیلی شان نزول تو مختلف آیتوں کے ساتھ بیان کیا جائے گا شان نزول اجمالی یہ ہے کہ جب بانی اسلام علیہ السلام مکہ مکرمہ میں تشریف فرما تھے تو وہاں صرف بت پرستوں اور مشرکین کا مقابلہ تھا لیکن جب مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو یہاں عیسائیوں اور یہودیوں کی آبادی پائی۔مدینہ پاک میں یہودیوں کا بہت زور تھا۔ اور عبداللہ ابن ابی یہاں کا گویا سردار مانا جاتا تھا۔جب اسلام کا آفتاب مدینہ پر چمکا اور سب سے پہلے ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر کو چمکایا اور قرآن کی آوازیں ان کے کانوں میں پہنچیں تو سب کے دلوں نے قبول کیا لیکن سوا چند دیندار لوگوں کو باقی سب حسد اور تعصب کی وجہ سے مقابلے پر آمادہ ہو گئے۔چونکہ یہ لوگ پہلے سے علم میں مشہور تھے اور اطراف مدینہ کے لوگ ان کی عزت بھی کرتے تھے اور اس لئے اکثر عرب کے جہلاء ان کے ساتھ ہو گئے پھر یہود ونصاریٰ جو آپس میں لڑتے رہتے تھے اسلام کے مقابلے کیلئے ایک ہو گئے عبداللہ ابن ابی اور اس کے ساتھی جن کو عزت اور مال کی محبت نے اندھا کر رکھا تھا بظاہر تو مسلمان ہو گئے لیکن دل سے کافروں کے ساتھ رہے اور انہوں نے در پردہ ان دشمنوں کی امداد کرنا شروع کر دی تو یوں سمجھو کہ مدینہ پاک میں آکر مسلمانوں کو چار قوموں سے مقابلہ کرنا پڑا۔علمائے یہود،علمائے نصاریٰ، جہلاء مشرکین اور منافقین یہ لوگ خفیہ ایذاء پہنچانے کے علاوہ کج بحثیاں کرتے تھے اور مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔پس حکمت الٰہی کا تقاضا ہوا کہ ایک ایسی سورت اتاری جائے جس سے ان چار فرقوں کی سرکوبی ہو جائے اور ان کے شبہات دور کئے جائیں اس لئے مدینہ پاک پہنچتے ہی یہ سورۂ اترنا شروع ہوئی یہ تو اس پوری سورت کے نازل ہونے کی وجہ بیان کی گئی۔آیتوں کا شان نزول ان شاءاللہ تعالیٰ ان کے ساتھ بیان کیا جائے گا۔

سورۃ بقرۃ کے فضائل

سورۂ بقرۃ کے بے شمار فضائل ہیں ان میں سے کچھ عرض کئے جاتے ہیں۔ ا۔ مسلم شریف میں سیدنا انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے جو شخص سورۂ بقرۃ اور آل عمران جانتا تھا اس کی بڑی عزت ہوتی تھی۔ ۲۔ مسند امام احمد وغیرہ میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سورۂ بقرۃ قرآن پاک میں ایسی ہے۔جیسے کہ اونٹ کے جسم میں کوہان یعنی اس کے پیٹھ کی ہڈی۔یعنی جیسے کہ اونٹ کی خوبصورتی اس کے کوہان سے ہوتی ہے۔اسی طرح قرآن پاک کی زینت سورۂ بقر سے ہے۔اسی مسلم شریف میں ابو امامہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ زہراوین (چمکدار نورانی) سورتوں کو پڑھا کرو۔یعنی سورۂ بقرہ وآل عمران۔کیونکہ قیامت کے دن یہ دونوں سورتیں اپنے پڑھنے والوں پر بادلوں کی

طرح سایہ کریں گی اور ان کی شفاعت فرمائیں گی۔ ۳۔ تفسیر عزیزی میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص ہر جمعہ کی شب میں سورۂ بقرہ وآل عمران پڑھا کرے تو اس کو اتنا ثواب ملتا ہے جس سے کہ بعیدا سے عروبا تک بھر جائے (بعیداز مین کے آخری ساتویں طبقہ کا نام ہے اور عروبا ساتویں آسمان کا) ۴۔ ام الدرداء سے روایت ہے کہ ایک شخص نے جو قرآن پاک کی تلاوت کرنے والا تھا ایک روز اپنے پڑوسی کو مار ڈالا صبح کو اسے گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔ جب اسے دفن کیا گیا تو تمام سورتیں اس کی قبر سے نکل کر جاتے ہوئے دیکھی گئیں مگر سورۂ بقرہ وسورۂ آل عمران اس وقت تک نہ گئیں جب تک کہ جمعہ نہ آ گیا۔ اور وہ شخص عذاب سے محفوظ ہو گیا۔ ۵۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سورۂ بقرہ بارہ سال میں تمام حقائق واسرار کے ساتھ پڑھی اور جس دن ختم کی اس دن خوشی میں ایک اونٹ ذبح کر کے صحابہ کرام کی خوشی میں دعوت کی۔

ضروری نوٹ: اس سے معلوم ہوا کہ دینی کتابیں شروع یا ختم کرتے وقت شیرینی تقسیم کرنا اور خوشی منانا سنت صحابہ کرام ہے۔ ۶۔ قرآن پاک میں سب میں بڑی یہی سورت ہے اس سورۃ میں دو سو چھیاسی (۲۸۶) آیتیں ہیں چالیس (۴۰) رکوع اور چھ ہزار ایک سو اکیس (۶۱۲۱) کلمے اور پچیس ہزار پانچ سو (۲۵۵۰۰) حرف ہیں ۷۔ قرآن پاک کی سب سے بڑی آیت یعنی آیت مداینہ اسی سورہ بقرہ میں ہے۔ ۸۔ ابن عربی کہتے ہیں کہ سورۂ بقر میں ایک ہزار حکم اور ایک ہزار نہی اور ایک ہزار خبریں ہیں یعنی جس قدر احکام کہ اس سورۃ میں ہیں اتنے اور سورتوں میں نہیں۔ **فائدہ:** یہ بھی قرآن پاک کا ایک معجزہ ہے کہ اس کی سورتیں اور آیتیں چھوٹی بڑی ہیں جس سے رب تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا ظہور ہوتا ہے کہ وہ جس طرح بڑی سورۃ میں بے شمار خوبیاں بھر سکتا ہے۔ اسی طرح چھوٹی سے چھوٹی سورۃ میں بھی۔ سورۃ چھوٹی ہو یا بڑی ہر ایک معجزہ ہے۔ غور کرو کہ ہاتھی اونٹ کے جسم بہت بڑے ہیں اور چیونٹی کا جسم نہایت معمولی لیکن جتنے عضو کہ ہاتھی اور اونٹ میں ہیں قریب قریب وہ سب عضو چیونٹی میں بھی ہیں۔ اس سے حق تعالیٰ کی قدرت کا ظہور ہوتا ہے۔

سورۃ بقرۃ کے فائدے

سورۂ بقرہ کے بے شمار فائدے ہیں جن میں سے کچھ فائدے ہم تفسیر عزیزی اور تفسیر خزائن العرفان سے نقل کرتے ہیں۔ ۱۔ جس گھر میں سورۂ بقرۃ پڑھی جائے اس گھر میں تین روز تک سرکش شیطان داخل نہیں ہوتا۔ ۲۔ جو شخص ہمیشہ سوتے وقت سورۂ بقرہ کی دس آیتیں پڑھ لیا کرے وہ ان شاء اللہ قرآن پاک کبھی نہ بھولے گا وہ دس آیتیں یہ ہیں۔ چار آیتیں اول کی یعنی مفلحون تک اور آیۃ الکرسی اور دو آیتیں آیۃ الکرسی کے بعد کی اور تین آیتیں آخیر سورت کی ۳۔ جس کسی کے بچے کو چیچک نکل آئے اور وہ ڈھائی پاؤ چاول پکائے اور اس میں بقدر ضرورت دہی اور کھانڈ ڈالے اور کسی فقیر کو بلا کر اس سے کہے کہ تو ان چاولوں کو اس طرح آہستہ آہستہ کھا کہ میرا پڑھنا اور تیرا کھانا ایک ساتھ ختم ہوں وہ فقیر اس بچے کے سامنے کھانا شروع کرے اور وہ شخص اس بچے کے سامنے سورۂ بقرہ شروع کرے آہستگی سے عمدہ طریقے سے سورۂ بقرہ پڑھے ادھر تو یہ سورت ختم کرے

ادھر وہ چاول ختم کرے ان شاء اللہ چیچک کو آرام ہوگا اور اس سال میں اس گھر میں چیچک سے امن رہے گا مگر شرط یہ ہے کہ یہ عمل صبح کے وقت کیا جائے اور عمل کرنے والا اور بیمار بچہ دونوں نہار منہ ہوں۔ ۴۔ طبرانی اور بیہقی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میت کو دفن کرکے اس کی قبر کے سرہانے سورۃ بقرہ کی اول آیتیں مفلحون تک اور قبر کی پائنتی سورۂ بقرہ کا آخری رکوع پڑھنا چاہئے۔ ان شاء اللہ اس کے بقیہ اور فائدے اس سورۃ کے آخیر میں بیان کئے جائیں گے۔

الٓمّٓ ﴿۱﴾ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ ﴿۲﴾
یہ کتاب نہیں شک میں ہدایت لئے پرہیزگاروں
وہ بلند رتبہ کتاب کوئی شک کی جگہ نہیں اس میں ہدایت ہے ڈر والوں کو

تعلق

سورۂ فاتحہ کو الحمد سے شروع فرمایا جس کے معنی اس قدر ظاہر ہیں کہ بچے بھی جانتے ہیں اور ہر شخص سنتے ہی اس کے سمجھنے اور جاننے میں کچھ تامل نہیں کرتا لیکن سورۂ بقرۃ کو الم سے شروع فرمایا جس کے معنی میں عام تو کیا بڑے بڑے علماء اور اولیاء بھی حیران ہیں اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ قرآن پاک بعض لحاظ سے بہت آسان ہے اور بعض اعتبار سے سخت مشکل۔ اس کے بعض ظاہری معنی تو اس قدر آسان ہیں کہ سن کر ہی سمجھ میں آجاتے ہیں اور بعض اسرار و رموز اس قدر دشوار ہیں کہ جس کیلئے عقل انسانی کافی نہیں ہوتی نقل حدیث ہی کی ضرورت پڑتی ہے۔ دیکھو دنیا کی بعض چیزیں ایسی عام ہیں کہ ہر شخص کو بلا تکلف مل جاتی ہیں جیسے ہوا، پانی وغیرہ اور بعض وہ چیزیں ہیں کہ بہت دشواریوں سے خاص خاص ہی کو ملتی ہیں جیسے ہیرا اور موتی وغیرہ اگر قرآن کریم بالکل آسان ہوتا تو کوئی شخص شیخی سے کہہ سکتا تھا کہ میرا دماغ اس کے سمجھنے کیلئے کافی ہے۔ ضرورت تھی کہ کچھ راز کی باتیں اس میں ایسی بھی ہوں کہ جن کو سنتے ہی بڑے سے بڑا عالم اپنے عجز کا اقرار کرتے ہوئے پکار کر یہ کہنے لگے کہ سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ (البقرہ: ۳۲) کہ اے پروردگار ہمیں خبر نہیں اپنے راز تو ہی جانتا ہے۔ سورۂ بقرہ کا اول کلمہ وہ مقرر کیا کہ جس کو سن کر انسان اپنی عاجزی کا اقرار کرے۔

تفسیر

الٓمّٓ حق تو یہ ہے کہ اس کے معنی اللہ اور اس کے رسول اور محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سوا کوئی نہیں جانتا ہم کو چاہئے کہ اس کے حق ہونے پر ایمان لے آئیں اور یہ کہہ دیں کہ اس کے معنی وہ ہیں جو رب تعالیٰ نے بتائے اور محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے جانے تفسیر روح البیان شریف میں اس جگہ فرمایا کہ یہ الم ان کلاموں میں سے ہے جن کے معنی کی خبر حضرت جبریل علیہ السلام کو بھی نہیں ہوتی تھی۔ ڈاک خانے کے ذریعے حکام کے پاس کچھ شاہی تاروں میں ایسے حروف آتے ہیں کہ جن کو خود تار کا لینے والا پوسٹ ماسٹر اور لانے والا تار بابو بھی نہیں سمجھتا لیکن جس حاکم کے پاس وہ تار آتا ہے وہ اسے خوب سمجھتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ رب نے سب کچھ بتا کر حضور کو بھیجا ورنہ حضور ان متشابہات کے معنی ہرگز نہ سمجھتے اور ان کا نزول بیکار ہوتا نیز رب

نے صلوٰۃ وزکوٰۃ وغیرہ ساری عبادات کا حکم دیا مگر کسی عبادت کی تفصیل نہ بیان کی نہ حضور نے پوچھا کہ زکوٰۃ کتنے مال سے کتنی دیں کب دیں کیسے دیں بلکہ بلا تامل صحابہ کو ہر حکم قرآنی کی تفصیل سمجھا دی کلمہ الم نے ہی حضور کا علم اور عالم پیدا ہونا بتا دیا چنانچہ روایات سے ثابت ہے کہ جب کھیعص نازل ہوئی تو حضرت جبریل علیہ السلام نے جب عرض کی کاف تو حضور نے فرمایا میں نے جان لیا پھر عرض کیا ھا فرمایا میں نے جان لیا پھر عرض کیا یا فرمایا میں نے جان لیا پھر عرض کیا عین فرمایا میں نے جان لیا اور پھر عرض کیا صاد فرمایا میں نے جان لیا حضرت جبریل علیہ السلام نے عرض کیا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے کیا جان لیا؟ مجھے تو کچھ خبر نہ ہوئی۔

میان طالب و محبوب رمزیست   کراماً کاتبین راہم خبر نیست

لیکن بعض علمائے کرام نے بطریق تاویل ان کے کچھ معنی بیان کیے ہیں۔لیکن وہ بھی فرماتے ہیں کہ حقیقی معنی وہی ہیں جو رب جانے۔وہ تاویلیں یہ ہیں۔۱۔الم قرآن پاک کا نام ہے۔۲۔الم سورۂ بقرہ کا نام ہے بلکہ جو بھی سورتیں اس قسم کے حروف سے شروع ہوتی ہیں وہ اس سورت کا نام ہی ہوتی ہے جیسے حم یا الر وغیرہ ۳۔اس کا ہر حرف حق تعالیٰ کے بعض ناموں کا پہلا حرف ہے یعنی الف سے مراد ہے اللہ اور لام سے مراد لطیف میم سے مراد معین یا مجید یا منان ۴۔الف سے مراد انا یعنی میں لام سے مراد اللہ میم سے مراد اعلم یعنی میں جانتا ہوں ۵۔یہ اللہ اور دوسری ذاتوں کے ناموں کے مخفف حرف ہیں یعنی الف سے مراد اللہ لام سے جبریل اور میم سے مراد محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تو مقصود یہ ہوا کہ اس میں قرآن پاک کے بھیجنے والے اور پہنچانے والے اور وصول کرنے والے کا نام ہے یعنی یہ قرآن کریم اللہ نے بھیجا جبریل لائے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پایا ۶۔یہ حرفوں ہی کے نام ہیں یعنی اس سے مراد الف لام میم ہی ہیں تو منشاء یہ ہے کہ قرآن پاک بھی انہی حرفوں سے بنا۔جن سے اے انسان تیرے کلام بنتے ہیں۔لیکن پھر اس قدر اعلیٰ کلام ہونے سے معلوم ہوتا ہے کہ کلام الٰہی ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: ۱۔قرآن پاک تو عمل کرنے کیلئے آیا ہے۔اگر اس کی مراد اس قدر چھپی ہوئی تھی تو اسے قرآن پاک میں رکھا ہی کیوں گیا؟ اگر یہ راز کی بات تھی تو صیغہ راز میں رکھی جاتی۔ **جواب:** یہ خیال محض غلط ہے کہ قرآن کریم صرف عمل کیلئے آیا ہم اس کی تحقیق مقدمہ میں کر چکے ہیں حق یہ ہے کہ بعض آیتیں جاننے کیلئے جیسے اللہ کی ذات وصفات کی آیتیں اور بعض آیتیں فقط ماننے کیلئے یعنی انہیں جانو مت صرف مان لو کہ یہ کلام اللہ کا ہے۔بعض آیتیں ڈرنے کیلئے جیسے عذاب کی آیتیں۔اور بعض آیتیں خوش ہونے اور امید کیلئے جیسے رحمت کی آیتیں تو یہ متشابہات صرف ماننے کیلئے ہیں۔اب رہا یہ سوال کہ انہیں قرآن پاک میں کیوں رکھا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ چند حکمتوں سے ۱۔ان پر ایمان لانا۔۲۔ان کی تلاوت کرنا کیونکہ تلاوت میں ایک حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں تو اگرچہ الم کے معنی سمجھ میں نہ آئیں مگر اس کے پڑھنے سے تیس نیکیاں مل جائیں گی۔۳۔اس سے حضور علیہ السلام کی شان معلوم ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ کے ایسے راز دار ہیں کہ ان کے رازوں تک فرشتوں کی بھی رسائی نہیں۔۴۔عالموں کی آنکھیں نیچی ہوں گی اور دل سے غرور جاتا رہے گا اور انہیں اپنی عاجزی، نیاز

مندی کا اقرار کرنا پڑے گا کیونکہ ہر عالم ہر چیز کے جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے جب ان کلمات کو نہ سمجھ سکے گا تو یہی کہتے بنے گی کہ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ ۵۔ ان کے معنی کا نہ سمجھنا، قرآن کے خدائی کتاب ہونے کی دلیل ہوگی کیونکہ جہاں تک دماغ کی رسائی نہ ہو اسے یہی کہتے بنتا ہے کہ یہ خدا کی چیز ہے۔ **دوسرا اعتراض:** رب تعالیٰ فرماتا ہے وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ یعنی ہم نے قرآن کریم کو آسان کیا اور تم کہتے ہو کہ قرآن کریم کی بعض آیتیں بے حد مشکل ہیں تو تمہاری یہ بات کلام الٰہی کے خلاف ہوئی؟ **جواب:** یہ آیت آپ نے پوری نہ پڑھی۔ پوری آیت یہ ہے وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ (قمر: ۱۷) یعنی ہم نے اس قرآن کو یاد کرنے یا نصیحت حاصل کرنے کیلئے آسان کیا ہے یعنی کوئی بھی آسمانی کتاب کسی امتی نے حفظ نہ کی قرآن پاک کی یہ خصوصیت ہے کہ بچوں کو بھی حفظ ہے تو یہ حفظ کیلئے آسان ہے نہ کہ سمجھنے کیلئے اسی طرح اس قرآن پاک کے ذریعے سے رب کو پہنچاننا آسان ہے نہ یہ کہ اسرار سمجھنا کیا قرآن پاک کی وہ آیت نہ دیکھی وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ (آل عمران: ۷) یعنی ان متشابہ آیتوں کے معنی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ **نوٹ:** ہمارے اس جواب سے وہابیوں اور چکڑالویوں کے صدہا اعتراضات اٹھ جائیں گے کیونکہ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم نور ہے قرآن کریم دلیل ہے قرآن کریم ہدایت دینے والا قرآن کریم تبلیغ کا ذریعہ ہے قرآن کریم کتاب مبین یعنی کھلی ہوئی کتاب ہے اگر اس کی بعض آیتیں بالکل چھپی ہوئی اور مشکل ہوتیں تو وہ نور ہوتیں نہ ہدایت نہ دلیل۔ ان سب کا جواب ہمارے مذکورہ جواب سے معلوم ہو گیا کہ قرآن کریم کی ساری آیتیں حق تعالیٰ کو پہچاننے کی دلیل دینے والیں اور اپنے لانے والے کی صداقت کیلئے نور وغیرہ ہیں نہ یہ کہ ہر ایک کا راز سمجھنا بھی آسان ہے۔ **تیسرا اعتراض:** متشابہات قرآنیہ کا علم حضور کو بھی نہیں دیا گیا صرف رب کو ہے۔ قرآن کہتا ہے وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ (آل عمران: ۷) **جواب:** یہ غلط ہے اگر حضور کو ان کا علم نہ دیا جاتا تو ان کا نزول بیکار ہوتا رب فرماتا ہے اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ (الرحمٰن: ۱) رب نے حضور کو سارا قرآن سکھا دیا قرآن میں متشابہات بھی ہیں اگر ان کی تعلیم نہ دی جاتی تو سارے قرآن کی تعلیم نہ ہوتی یہ اس آیت کے خلاف۔ تمہاری پیش کردہ آیت کا مقصد یہ ہے کہ بغیر تعلیم الٰہی ان کی تاویل کوئی نہیں جانتا یہاں صرف نحوی قاعدے کافی نہیں ذٰلِكَ الْكِتٰبُ اس کا تعلق پہلے سے یہ ہے کہ اگر الم قرآن پاک کی سورۃ کا نام ہو تو وہ مبتداء ہوگا اور یہ اس کی خبر تو معنی یہ ہوں گے کہ الم یہ کتاب ہے اور اگر وہ متشابہات میں سے ہے تو یہ الگ جملہ بنے گا اس طرح کہ ذالک مبتدا اور الکتاب خبر یعنی یہ قرآن کتاب کامل ہے۔

تفسیر

ذالک اسم اشارہ ہے جیسے کہ اردو میں لفظ یہ یا وہ اب اس میں گفتگو یہ ہے کہ ذلک سے اشارہ کس طرف ہو رہا ہے اگر اہل کتاب کو سنانا مقصود ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ چیز جس کا وعدہ توریت وانجیل وغیرہ میں کیا گیا تھا آخر زمانہ میں ایک کتاب آنے والی ہے اے عیسائیوں اور یہودیو! یہ وہی کتاب ہے اس کتاب نے آ کر تمہارے نبیوں اور تمہاری کتابوں کو سچا کر دیا اگر یہ کتاب نہ آتی تو تمہارے نبیوں اور کتابوں کی یہ پیشگوئی جھوٹ ہو جاتی تمہارا اس کتاب کا انکار حقیقت میں اپنے

نبیوں اور کتابوں کو جھٹلاتا ہے اور اگر مسلمانوں کو سناتا ہے تو ذالک سے اشارہ یا تو ان سورتوں کی طرف ہو رہا ہے جو سورۂ بقرۃ سے پہلے اتر چکی ہیں اور یا ان کی طرف جو آئندہ اترنے والی ہیں یا اس کی طرف جو لوح محفوظ میں لکھا ہوا ہے چونکہ پہلے خبر دی جا چکی ہے وَ اِنَّهٗ فِیْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَیْنَا (زخرف:۴) اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی امت کو اس کی خبر دی تھی تو اب معنی یہ ہوئے کہ وہ سورتیں جو اس سے پہلے آ چکیں یا جو لوح محفوظ میں لکھی ہوئی ہیں وہ یہ کتاب ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ مبتداء اور لَا رَیْبَ فِیْهِ اس کی خبر تو اس صورت میں اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ کتاب وہ ہے جس میں کوئی شک نہیں الکتاب کَتَبَ سے بنا ہے اور اس کے چند معنی ہیں جمع ہونا اسی لئے لشکر کو کتیبہ کہتے ہیں کیونکہ اس میں بہت سے انسان جمع ہوتے ہیں۔ ۴۔ معیاد یا مدت وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ (حجر:۴) ۵۔ غلام کو مکاتب کرنا یعنی اس سے کہنا کہ اتنا مال دے تو آزاد ہے وَالَّذِیْنَ یَبْتَغُوْنَ الْكِتٰبَ (النور:۳۳) ۶۔ لکھنا اور لکھی ہوئی چیز اس جگہ یا تو پہلے معنی مراد ہیں یا آخری۔ اگر پہلے مراد ہوں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ جمع کی ہوئی چیز ہے کیونکہ قرآن کریم میں سارے علوم جمع ہیں تو گویا کامل کتاب یہی ہے۔ خیال رہے کہ سارے علوم قرآن شریف میں ہیں رب فرماتا ہے کہ تَفْصِیْلَ الْكِتٰبِ (یونس:۳۷) اور فرماتا ہے وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ (انعام:۵۹) اور سارا قرآن حضور کے علم میں رب فرماتا ہے اَلرَّحْمٰنُ ۙ عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ اب جو کوئی حضور کے علم کا انکار کرے وہ یا تو قرآن میں سارے علوم نہیں مانتا یا حضور کو سارے قرآن کا عالم نہیں مانتا پہلی صورت بھی آیت کے خلاف ہے دوسری بات بھی اگر آخری معنی مراد ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ یہ لکھی ہوئی چیز ہے یعنی لکھنے میں کامل یہی کتاب ہے اس کے سوا سب ناقص اس لئے کہ سب سے پہلے یہ لوح محفوظ میں لکھی گئی پھر پہلے آسمان پر پھر مسلمانوں کے سینوں میں اور ہڈیوں پتھروں وغیرہ پر پھر کاغذ اور کاغذ پر اس قدر لکھی گئی کہ اس کی مثال کوئی دوسری کتاب ہو سکتی ہی نہیں کیونکہ انسان جو بھی کتاب لکھتا ہے وہ دو چار یا دس بیس دفعہ چھپ کر ختم ہوتی ہے توریت و انجیل وغیرہ بھی چند بار لکھی گئیں اور اب ختم ہو چکی لیکن قرآن پاک نے اس زمانہ میں بھی دنیا بھر کے پریسوں پر قبضہ کر لیا چنانچہ اس وقت صرف لاہور سے پچاس لاکھ سالانہ اس کی اشاعت ہے نہ معلوم ہندوستان پاکستان کے دیگر پریسوں میں ہر سال کتنا چھپتا ہوگا اب اندازہ لگاؤ کہ ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک، مصر، استنبول، بیروت، عراق، حجاز وغیرہ سے کس قدر اس کی اشاعت ہوگی ماننا پڑے گا کہ لکھنے اور چھپنے کے لحاظ سے بھی یہی کتاب مکمل ہے ''روح البیان'' شریف نے اس جگہ بیان فرمایا کہ توریت شریف کی ایک ہزار سورتیں تھیں۔ اور ہر سورت میں ایک ہزار آیتیں تو موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اس کتاب کو کون پڑھ سکے گا اور کون حفظ کر سکے گا تو ارشاد باری ہوا کہ میں اس سے اعلیٰ شان والی کتاب نبی آخر الزمان پر اتاروں گا لیکن ان کی امت کے بچوں تک کو یاد کرا دوں گا نیز اسی روح البیان شریف میں ہے کہ اس سے پہلے کل آسمانی کتابیں ایک سو تین اتریں پچاس صحیفے شیث علیہ السلام پر اور تیس ادریس علیہ السلام پر اور بیس ابراہیم علیہ السلام پر توریت موسیٰ علیہ السلام اور زبور داؤد علیہ السلام اور انجیل عیسیٰ علیہ السلام پر۔ لیکن ان تمام کتابوں کے مضامین ان قرآن پاک میں جمع ہیں۔ لہٰذا یہ کتاب ان تمام کتابوں کی جامع ہے اس لئے کہا گیا۔ ذالک الکتاب۔

قرآن پاک کے نام

تفسیر کبیر اور تفسیر عزیزی وغیرہ میں ہے کہ قرآن پاک کے ۳۲ نام ہیں۔ جو کہ قرآن پاک میں مذکور ہیں۔ ۱۔ کتاب، ۲۔ قرآن، ۳۔ فرقان، ۴۔ ذکر و تذکرہ ۵۔ تنزیل، ۶۔ الحدیث، ۷۔ موعظۃ، ۸۔ حکم، حکمت، حکیم، محکم، ۹۔ شفاء، ۱۰۔ ہدی، ۱۱۔ صراط مستقیم، ۱۲۔ حبل، ۱۳۔ رحمت، ۱۴۔ روح، ۱۵۔ قصص، ۱۶۔ بیان، تبیان، ۱۷۔ بصائر، ۱۸۔ فصل، ۱۹۔ نجوم، ۲۰۔ مثانی، ۲۱۔ نعمت، ۲۲۔ برہان، ۲۳۔ بشیر، نذیر، ۲۴۔ قیم، ۲۵۔ مہیمن، ۲۶۔ ہادی، ۲۷۔ نور، ۲۸۔ حق، ۲۹۔ عزیز، ۳۰۔ کریم، ۳۱۔ عظیم، ۳۲۔ مبارک یہ تمام نام قرآن کی مختلف آیتوں میں مذکور ہیں۔ وہ آیتیں یا تو کسی حافظ سے معلوم کر لی جائیں یا تفسیر کبیر و عزیزی میں اس مقام پر دیکھ لی جائیں۔

ان ناموں کی وجہ

قرآن اور فرقان کے معنی اور اس کی وجہ تسمیہ تو ہم مقدمہ میں بیان کر چکے ہیں۔ کتاب کے معنی بھی ابھی بیان کر دیئے باقی ناموں کی وجہ تسمیہ حسب ذیل ہے۔ ۴۔ ذکر و تذکرہ کے معنی ہیں یاد دلانا چونکہ یہ قرآن کریم اللہ اور اس کی نعمتوں کی اور میثاق کے عہد کو یاد دلاتا ہے اس لئے اسے ذکر و تذکرہ کہتے ہیں۔ ۵۔ تنزیل کے معنی ہیں اتاری ہوئی کتاب چونکہ یہ بھی رب کی طرف سے اتاری گئی ہے اس لئے تنزیل کہتے ہیں۔ ۶۔ حدیث اس کے معنی ہیں نئی چیز یا کلام اور بات چونکہ بمقابلہ توریت و انجیل کے یہ دنیا میں زمین پر بعد میں آیا اس لئے یہ نیا ہے نیز یہ پڑھا ہوا اترا نہ کہ لکھا ہوا۔ اس لئے یہ بات ہے۔ ۷۔ موعظۃ کے معنی نصیحت کے ہیں اور یہ کتاب سب کو نصیحت کرنے والی ہے اس لئے اس کا نام موعظۃ ہے۔ ۸۔ حکمت حکم محکمہ یہ حکم سے بنے ہیں اس کے معنی مضبوط کرنا لازم کرنا اور روکنا چونکہ یہ قرآن پاک مضبوط بھی ہے کوئی اس میں تحریف نہ کر سکا اور لازم بھی ہے کہ کسی کتاب نے اس کو منسوخ نہ کیا اور بری باتوں سے روکنے والا بھی ہے اس لئے اس کے یہ نام ہوئے۔ ۹۔ شفاء اس لئے کہتے ہیں کہ یہ ظاہری اور باطنی بیماریوں سے سب کو شفاء دینے والی کتاب ہے۔ ۱۰۔ ہدی ہادی اس لئے کہتے ہیں کہ یہ لوگوں کو ہدایت کرتی ہے۔ ۱۱۔ صراط مستقیم اس لئے کہتے ہیں کہ اس پر عمل کرنے والا اپنی منزل پر آسانی سے پہنچ سکتا ہے۔ ۱۲۔ حبل اس لئے کہتے ہیں کہ حبل کے معنی ہیں رسی اور رسی سے تین کام لئے جاتے ہیں۔ اس سے چند بکھری ہوئی چیزوں کو باندھ لیتے ہیں رسی کو پکڑ کر نیچے سے اوپر پہنچ جاتے ہیں رسی ہی کے ذریعے کشتی پار لگ جاتی ہے چونکہ قرآن کے ذریعے مختلف لوگ ایک ہو گئے اسی طرح اس کی برکت سے کفر کے دریا میں ڈوبنے سے بچ جاتے ہیں اس کے ذریعے سے حق تعالیٰ تک پہنچتے ہیں اس لئے اس کو حبل کہتے ہیں۔ ۱۳۔ رحمت اس لئے کہتے ہیں کہ یہ علم ہے اور جہالتوں اور گمراہیوں سے نکالنے والا ہے اور علم حق تعالیٰ کی رحمت ہے۔ ۱۴۔ روح حضرت جبریل علیہ السلام کی معرفت آئی اور یہ جانوں کی زندگی ہے اس لئے اس کو روح کہتے ہیں نیز روح کے چند کام ہیں جسم کو باقی رکھنا بے جان جسم جلد سڑ گل جاتا ہے جسم کی حفاظت کرنا کہ بے جان جسم کو جانور کھا جاتے ہیں جسم پر روح کرنا کہ جسم کی ہر جنبش روح کے ارادے سے

ہوتی ہے قرآن شریف بھی مسلم قوم کی بقاء کا ذریعہ ہے مسلمانوں کو شیاطین اور کفار سے بچاتا ہے قوم مسلم پر روح کرتا ہے کہ مسلمان کی ہر حرکت قرآن کے ماتحت ہے لہٰذا یہ روح ہے۔ ۱۵۔ قصص قصے کے دو معنی ہیں حکایت اور کسی کے پیچھے چلنا۔ چونکہ قرآن پاک نے انبیاء کرام اور دوسری قوموں کے سچے قصے بیان کئے اور لوگوں کا یہ امام ہے کہ سب لوگ اس کے پیچھے چلتے ہیں اس لئے اس کا نام قصص ہے۔ ۱۶۔ بیان تبیان مبین ان سب کے معنی ہیں ظاہر کرنے والا چونکہ یہ قرآن سارے شرعی احکام کو اور سارے علوم غیبیہ کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ظاہر فرمانے والا ہے اس لئے اس کے یہ نام ہیں۔ ۱۷۔ بصائر جمع بصیرت کی ہے بصیرت کہتے ہیں دل کی روشنی کو جیسے کہ بصارت آنکھ کے نور کو کہا جاتا ہے چونکہ اس کتاب سے دلوں میں صدہا نور پیدا ہوتے ہیں اس لئے اسے بصائر بھی کہا جاتا ہے۔ ۱۸۔ فصل کے معنی ہیں فیصلہ کرنے والی یا جدا کرنے والی چونکہ یہ آپس کے جھگڑوں کی فیصلہ کرنے والی بھی اور مسلمانوں اور کفار میں فاصلہ فرمانے والی اس لئے اس کا نام فصل ہے۔ ۱۹۔ نجوم نجم سے بنا ہے اس کے معنی تارے کے بھی ہیں اور حصہ کے بھی چونکہ قرآن پاک کی آیتیں تاروں کی طرح لوگوں کو ہدایت کرتی ہیں اور علیحدہ علیحدہ آئیں۔ اس لئے ان کا نام نجوم ہوا۔ ۲۰۔ مثانی جمع ہے مثنیٰ کی مثنیٰ کے معنی ہیں بار بار کیونکہ اس میں احکام اور قصے بار بار آئے ہیں اور یہ کتاب خود بھی بار بار اتری ہے جیسا کہ ہم مقدمہ میں بیان کر چکے ہیں اس لئے اس کو مثانی کہتے ہیں۔ ۲۱۔ نعمت کے معنی ظاہر ہیں۔ ۲۲۔ برہان کے معنی ہیں دلیل اور یہ بھی رب کی اور نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اور تمام سابقہ انبیاء کے صدق کی دلیل ہے اس لئے اسے برہان کہتے ہیں۔ ۲۳۔ بشیر ونذیر ہونا ظاہر ہے کیونکہ یہ کتاب خوشخبری بھی دیتی ہے اور ڈراتی بھی ہے۔ ۲۴۔ قیم کے معنی ہیں قائم رہنے والی یا قائم رکھنے والی اس لئے اللہ کو قیوم کہتے ہیں قرآن پاک کو اس لئے قیم کہا جاتا ہے کہ وہ خود بھی قیامت تک قائم رہے گا اور اس کے ذریعہ سے دین بھی قائم رہے گا۔ ۲۵۔ مہیمن کے معنی ہیں امانت دار یا محافظ چونکہ یہ کتاب مسلمانوں کی دنیا وآخرت میں محافظ ہے اور رب تعالیٰ کے احکام کی امانت دار اور نبی امین پر اتری۔ اور ان صحابہ کرام کے ہاتھوں میں رہی جو کہ اللہ کے امین تھے۔ اس لئے اس کو مہیمن کہا گیا۔ ۲۶۔ ہادی کے معنی بالکل ظاہر ہیں۔ ۲۷۔ نور اسے کہتے ہیں جو خود بھی ظاہر ہو اور دوسروں کو ظاہر کرے جس کا ترجمہ ہے چمک یا روشنی چونکہ یہ قرآن پاک خود بھی ظاہر ہے اور اللہ کے احکام کو انبیاء کرام کو توریت وانجیل وغیرہ سب کو ظاہر فرمانے والا ہے۔ اس لئے اس کو نور کہا جن پیغمبروں کے نام قرآن نے بتا دیئے وہ سب میں ظاہر اور مشہور ہو گئے اور جن کا قرآن کریم نے ذکر نہ فرمایا وہ بالکل چھپ گئے نیز یہ قرآن کریم پل صراط پر نور بن کر مسلمانوں کے آگے آگے چلے گا۔ ۲۸۔ حق اس کے معنی ہیں سچی بات۔ بمقابل باطل یعنی جھوٹی بات قرآن پاک سچی بات بتاتا ہے سچے کی طرف سے آیا ہے سچا اس کو لایا ہے سچے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اترا اس لئے اسے حق کہتے ہیں۔ ۲۹۔ عزیز کے معنی ہیں غالب اور بے مثل قرآن پاک بھی سب پر غالب رہا اور اب بھی سب پر غالب ہے اور بے مثل بھی ہے اس لئے اس کو عزیز کہا جاتا ہے۔ ۳۰۔ کریم اس کے معنی ہیں سخی۔ چونکہ قرآن کریم علم خدا کی رحمت اور ایمان اور بے حساب ثواب دیتا ہے۔ اس لئے اس سے بڑھ کر سخی کون ہو سکتا ہے۔ ۳۱۔ عظیم کے معنی ہیں بڑا۔ چونکہ سب سے بڑی کتاب بھی ہے اس لئے اس کو عظیم

فرمایا گیا۔

ضروری نوٹ: رب تعالیٰ نے چند چیزوں کو عظیم فرمایا ہے۔ اپنی ذات کو عرش کو قرآن کو قیامت کے دن کو قیامت کے زلزلہ کو حضور علیہ السلام کے اخلاق کریمہ کو اللہ کے اس فضل کو جو حضور علیہ السلام پر ہوا۔ عورتوں کے فریب کو۔ فرعونی جادوگروں کے جادو کو اور مسلمانوں کے ثواب کو منافقوں کے عذاب کو۔ ۳۲۔ مبارک کے معنی ہیں برکت والا چونکہ اس کے پڑھنے اور عمل کرنے سے ایمان میں برکت نیک عملوں میں عزت چہرے کے نور میں برکت ہے اس لئے اس کو مبارک کہتے ہیں۔

فائدہ

قرآن کریم نے چند چیزوں کو مبارک فرمایا۔ طور سینا کو جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام رب سے ہمکلام ہوئے زیتون کے درخت کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بارش کے پانی کو اور شب قدر کو اور قرآن کو چونکہ یہ قرآن مبارک رات میں مبارک فرشتے کے ذریعے سے مبارک ذات پر آیا اس لئے یہ صد ہا برکتوں کا سرچشمہ ہے **تتمہ**۔ رب تعالیٰ نے سات چیزوں کو کریم فرمایا۔ اپنی ذات کو۔ ۲۔ قرآن شریف کو، ۳۔ موسیٰ علیہ السلام کو، ۴۔ نیک اعمال کے ثواب کو، ۵۔ عرش کو، ۶۔ حضرت جبریل علیہ السلام کو، ۷۔ حضرت سلیمان کے اس خط کو جو بلقیس کے پاس گیا تھا۔

اعتراضات

اعتراض: ذالک اسم اشارہ ہے اور اس کا استعمال دور کی چیزوں میں ہوتا ہے اور اشارہ کیلئے ضروری ہے کہ جس طرف اشارہ ہو وہ نظر آتی ہو۔ جب یہ فرمایا گیا تب سارا قرآن کریم نظر نہیں آ رہا تھا نیز دور بھی نہ تھا تو یہاں ذالک کا استعمال کیونکر ہوا۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر کبیر شریف نے یہ دیا ہے کہ اشارہ کرنے کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ چیز نظر آ رہی ہو اگر کسی موقع پر سننے والے کے خیال میں وہ بات ہو تو بھی اس خیالی چیز کی طرف اشارہ کر دیتے ہیں۔ جیسے کہ قرآن کریم نے قیامت کے بارے میں فرمایا ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ (ق:۲۰) یا نزع کی سختی کے متعلق ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ (ق:۱۹) لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ چیز ذہن میں محسوس ہو جائے تب اس کی طرف اشارہ کیا جائے گا نیز یہ ضروری نہیں کہ ذٰلِكَ دور ہی کیلئے آئے اور ھذا قریب ہی کیلئے بلکہ ذالک بھی قریب کے لئے استعمال ہو سکتا ہے کیونکہ ذٰلِكَ اور ھذا دونوں لفظ ذا سے بنے ہیں فرق اتنا ہے کہ ھذا میں ذا پر ھا بڑھا دیا گیا ہے ذٰلِكَ میں لک لہٰذا یہاں ذالک قریب کیلئے استعمال ہوا ہے اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ ذٰلِكَ اس کتاب کی طرف اشارہ ہو رہا ہے جو کہ لوح محفوظ یا توریت وانجیل میں مذکور ہے اور یہ چیزیں تو سننے والوں سے دور ہیں اس لئے بعید کا کلمہ بول دیا گیا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ عظیم الشان چیز کی طرف بعید سے اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ گویا اس کے مرتبے کی بلندی زیادتی فاصلہ کے قائم مقام ہے اس لئے بھی یہاں ذٰلِكَ بول دیا گیا لَا رَيْبَ فِيْهِ کا تعلق ذٰلِكَ الْكِتٰبُ سے ہے یا تو اس کا تعلق یہ ہے کہ وہ مبتداء تھا اور یہ خبر ہے تو آیت کے یہ معنی ہوئے کہ یہ کتاب وہ ہے۔ جس میں کوئی شک نہیں۔ یا ذٰلِكَ الْكِتٰبُ علیحدہ جملہ تھا اور یہ دوسرا جملہ ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہی کامل کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں۔ یا اب لَا رَيْبَ فِيْهِ میں بھی دو احتمال ہیں ایک یہ کہ لَا رَيْبَ پر آیت پوری ہو جائے

اور فِيۡهِ کا تعلق هُدًى ہی سے ہو تو آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ یہی کامل کتاب ہے بیشک اس میں پرہیزگاروں کو ہدایت ہے دوسرے یہ کہ فِيۡهِ پر آیت پوری ہو اور هُدًى لِّلۡمُتَّقِيۡنَ دوسری آیت ہو تو اب معنی یہ ہوں گے کہ یہی کامل کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے متقیوں کو ہدایت دینے والی ہے۔

تفسیر

لانفی جنس ہے۔ ''نفی جنس'' اسے کہتے ہیں جو اصل چیز کا انکار کردے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس میں اصل سے ہی شک نہیں ہے یعنی کسی قسم کی گنجائش نہیں ریب رَيۡبَةٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں قلق اور پریشانی اور نئی بلا اس لئے کہا جاتا ہے رَيۡبُ الزَّمَانِ یعنی زمانے کی مصیبتیں اصطلاح میں اس شک کو ذیب کہتے ہیں جس میں بدگمانی پائی جائے چونکہ ریب میں بھی دل کو پریشانی اور بے اطمینانی ہوتی ہے اس لئے اس کو ریب کہا جاتا ہے تو اب کلام کا مقصود ہے کہ قرآن کریم اپنے کلام الٰہی ہونے میں اس قدر ظاہر ہے کہ اس میں شک کی گنجائش نہیں یا اس کے کلام اللہ ہونے پر اس قدر دلائل قائم ہیں کہ جن کے ہوتے ہوئے شک کی گنجائش نہیں۔

ایک یہ کہ قرآن پاک اس ملک میں آیا جہاں کے باشندوں کو اپنی زبان دانی، فصاحت و بلاغت پر ناز تھا جو کہ اپنے کو عربی اور دوسروں کو عجمی کہتے ہیں عربی کے معنی ہیں بولنے والے ظاہر ہے کہ عجمی کے معنی ہیں گونگا۔ اس لئے بے زبان جانور کو عجماء کہتے ہیں اور قرآن نے سب کو اپنے مقابلے کی دعوت دی مگر کوئی مقابلہ نہ کرسکا اور جس کا مقابلہ نہ ہوسکے وہ کتاب الٰہی ہے دوسرے اس لئے کہ جس ذات پر قرآن کریم آیا ان کے پاس اس قرآن کریم کی اشاعت کا کوئی ظاہری سامان نہ تھا۔ نہ مال تھا یار و مددگار نہ کوئی زیادہ قرابت دار نہ والد کا سایہ نہ ماں کی گود نہ دادا کی میٹھی میٹھی نگاہیں جو قرابت دار تھے وہ بھی جانی دشمن۔ پھر اس وقت میں آیا جب کہ اشاعت کا دنیوی انتظام نہ تھا نہ ریڈیو نہ بجلی نہ پریس۔ بلکہ نہ باقاعدہ کاغذ اور نہ دوات و قلم پھر اس قدر بے سروسامانی کے باوجود اتنی تھوڑی مدت میں اس کا اس قدر پھیلنا کلام الٰہی ہونے کی قوی دلیل ہے تیسرے یہ کہ جن لوگوں میں قرآن مجید آیا وہ دنیوی تہذیب سے بالکل نا آشنا تھے گویا یوں کہو کہ علم و تہذیب ان تک پہنچے ہی نہ تھے ڈکیتی، چوری، زنا، خونریزی، جنگ و جدل ان کی پیدائشی عادتیں تھیں۔ ایسی قوم میں قرآن پاک آیا۔ اور صرف تئیس سال بلکہ حق یہ ہے کہ دس سال کے عرصہ میں انہی کی نہیں بلکہ سارے عالم کی کایا پلٹ دی چوروں کو پاسبان ڈاکوؤں کو عادل و منصف اور بے تہذیبوں کی دنیا کی تہذیب کا استاد، بے علموں کو علم لدنی کا ماہر بنادیا بلکہ یوں کہو کے بے پڑھوں میں سے کسی کو صدیق، کسی کو فاروق، کسی کو ذوالنورین اور کسی کو حیدر بنادیا۔ ایک بچے کو صرف بی اے پاس کرانے میں کئی سال لگ جاتے ہیں اور بہت سا مال خرچ ہوجاتا ہے یہ کون سا مکتب تھا کیسا معلم تھا اور کون سی کتاب پڑھائی کہ جس نے آنا فانا انہیں ہر بات میں کامل کردیا چوتھے یہ کہ اس کی چھوٹی چھوٹی آیتیں بھی فصاحت و بلاغت اور مسائل اور حکمتوں کا سرچشمہ ہیں۔ حضرت امام فخرالدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے صرف اعوذ سے دس ہزار مسائل نکالے ایک بزرگ نے بسم اللہ کی تقریباً چار لاکھ ترکیبیں کی ہیں ایک بزرگ نے اَلۡهٰكُمُ التَّكَاثُرُ سے بہت سے مسئلے نکالے اور یہ جامعیت اس بات کی کھلی دلیل ہے۔ کہ قرآن پاک کلام الٰہی

ہے پانچویں اس لئے کہ اس کی آیتوں میں ایسی کشش ہے کہ نا سمجھنے والے لوگ بھی اس کو سن کر رونے لگتے ہیں اور ان کے جسم کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جب صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قرآن پاک کی تلاوت فرمایا کرتے تھے تو مشرکین کے بچے اور عورتیں ان کے پاس جمع ہو کر گریہ وزاری کرتے تھے اب بھی دیکھا گیا ہے کہ اگر کوئی شخص عمدہ طریقہ سے اس کی تلاوت کرے تو غیر مسلموں کو بھی وجد آجاتا ہے چھٹے اس لئے کہ بڑے بڑے عرب کے نامور فصیح و بلیغ عالم جب اس کا مقابلہ کرنے کیلئے آتے تو اس کو سن کر سجدہ کر دیتے تھے۔ اگر انسان میں تھوڑی عقل ہو تو ان اوصاف کو دیکھ کر اس کے کلام الٰہی ہونے میں ہرگز شک نہ کرے تعصب اور عناد کا کوئی علاج نہیں **نکتہ:** لَا رَیْبَ فِیْهِ سے اس جانب اشارہ ہے کہ چونکہ یہ کلام اللہ کا ہے اور حق تعالیٰ جھوٹ سے پاک ہے۔ یعنی اس کا جھوٹ بولنا محال بالذات ہے۔ لہٰذا اس کلام کے سچے ہونے میں کوئی شک وشبہ نہیں بڑے سے بڑا سچا آدمی بعض دفعہ غلط بیانی یا مبالغہ سے کام لے لیتا ہے یہ کلام ان چیزوں سے پاک ہے اس سے دیوبندی مذہب کی تردید ہوگئی کیونکہ ان کے مذہب میں خدا کا جھوٹ بولنا ممکن ہے جب خدا کا جھوٹ ممکن ہو تو اس کا سچا ہونا ضروری نہ رہا۔ اس کے کلام میں جھوٹ کا امکان واحتمال پیدا ہو گیا اور یہ لاریب فیہ کے خلاف ہے ان عقلمندوں کے مذہب میں خدا کی سچائی کی تعریف جب ہی ہو سکتی ہے جب کہ خدا جھوٹ بول سکے مگر بولے نہیں وہ کہتے ہیں کہ دیکھو گونگے کے جھوٹ نہ بولنے کی تعریف نہیں۔ کیونکہ وہ بول سکتا ہی نہیں شاید لوگ اس قاعدے سے سارے عیبوں کو خداوند تعالیٰ کیلئے ممکن مان لیں۔ موت جہالت وغیرہ کہ جب خدا ان پر قادر ہو اور ان کو استعمال نہ کرے تو اس کی تعریف ہو حق تعالیٰ جب دین لیتا ہے تو عقل بھی چھین لیتا ہے اس مسئلے کی تحقیق عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (بقرہ: ۲۰) میں ان شاء اللہ کی جائے گی۔ فیہ کے مقدم ہونے سے حصر کا فائدہ حاصل ہوا یعنی صرف قرآن ہی میں ہدایت ہے نہ تو عقل سے حاصل ہو سکتی ہے نہ اب توریت وانجیل سے کیونکہ عقل صرف دنیاوی ہدایت میں کام آتی ہے اور توریت وانجیل منسوخ ہو چکیں۔ خیال رہے کہ حدیث کی ہدایت دراصل قرآن ہی کی ہدایت ہے کہ حدیث تو قرآن کی شرح ہے توریت وانجیل پہلے ہدایت تھیں اب نہیں جیسے بچپن میں ماں کا دودھ اور گھٹی غذا یہ جوانی میں نہیں خیال رہے کہ حواس بھی رہبری کرتے ہیں عقل بھی اور وحی الٰہی بھی مگر حواس عقل کی مدد سے راہبر ہیں بے عقل آدمی نجاست کھالیتا ہے کنویں میں ڈوب مرتا ہے ایسے ہی عقل وحی کی مدد سے رہبر عقل بغیر وحی الٹا کام کرتی ہے۔ شعر

عقل زیر حکم دل یزدانی است   چوں ز دل آزاد شد شیطانی است

اعتراضات

آریوں کا اعتراض: اس جگہ آریہ اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن کریم تو فرما رہا ہے کہ قرآن میں شک نہیں لیکن کفار کو اس میں شک مسلمانوں کے بہت فرقوں کو اس کے معنی میں شک چنانچہ بعض فرقوں نے متشابہات کے ظاہری معنی ہی مراد لئے ہیں علماء اسلام کو بھی بہت موقعوں پر شک ہو جاتا ہے۔ اس لئے مفسرین میں بھی اور فقہاء میں بھی آپس میں اختلاف رہتا ہے۔ قاری بھی قراتوں میں اختلاف رکھتے ہیں اور کفار کو تو اس کے کلام الٰہی ہونے میں شک اتنے شکوک کے ہوتے ہوئے

پھر شک کی نفی کیوں کی گئی اور لطف یہ ہے کہ قرآن کریم نے بھی ایک جگہ فرمایا کہ: وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا (البقرہ: ۲۳) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں لوگوں کو شک ہوا اور اس کو دفع کرنے کی کوشش کی گئی اب یہ دونوں آیتیں مطابق کیونکر ہوں۔ **نوٹ**: جس عمدہ طریقہ سے ہم نے اس اعتراض کو بیان کیا یہ ان شاء اللہ معترضین بھی اس طرح بیان کرنہ کر سکیں گے۔ **جواب**: جواب اس کا سب سے بہتر وہ ہے جو اس مقام پر تفسیر روح البیان میں دیا گیا وہ یہ کہ اس آیت میں شک کی نفی کتاب سے کی گئی یہ نہ کہ لوگوں سے یعنی کتاب یہ شک کی جگہ نہیں اگر لوگوں کے دلوں میں شک ہو تو اس کا یہاں انکار نہیں اس جواب کی تفصیل یہ ہے کہ شک کی دو صورتیں ہوتی ہیں ایک یہ کہ خود وہ کلام ہی مشکوک ہو دوسرے یہ کہ کلام تو سچا تھا مگر لوگ اپنی بے علمی یا ضد کی وجہ سے اس میں شک کرنے لگے جیسے کہ قرآن فی نفسہ سچا ہے لیکن کفار نے تعصب کی وجہ سے اس میں شک کیا علماء ربانی کا اختلاف ان کی کمی علم کی بناء پر ہے یعنی ان کو تحقیق نہ ہو سکی کہ فلاں آیت کے کون سے معنی یقینی ہیں وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ میں انسان کا شک بیان ہوا ہے نہ کتاب کا تو نفی کتاب کے شک کی ہے اور ثبوت انسانوں کے شک کا اسی لئے اس آیت میں ہے لَا رَيْبَ فِيْهِ یعنی اس کتاب میں شک نہیں اور وہاں فرمایا گیا وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ یعنی اے کفار اگر تم شک میں ہو۔

تعلق

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ یا ھدی مبتدا ہے اور اس کی خبر فیہ تو یہ مصدری معنی میں اب اس کے معنی یہ ہوں گے کہ اس قرآن پاک میں پرہیز گاروں کو ہدایت ہے یا یہ علیحدہ جملہ ہے۔ اور اس لا ریب فیہ میں شیعہ کا بھی رد ہو گیا کیونکہ قرآن کریم شک سے اس وقت محفوظ رہ سکتا ہے جب اس کے لانے والے جبریل لینے والے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور پھیلانے والے صحابہ کرام سب خیانت وغیرہ سے محفوظ ہوں تو جیسے قرآن کی حقانیت ماننے کیلئے حضرت جبریل اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سچا ماننا ضروری ہے ایسا ہی صحابہ کا سچا ماننا بھی ضروری ہے۔ اگر وہ سچے نہ ہوں تو قرآن میں یہ تردد ہو گا کہ شاید صحابہ نے غلط جمع کیا ہو کیونکہ وہ سچے نہ تھے۔ (معاذ اللہ) اب یہ ھدیٰ یا مصدری معنی میں ہے یا اسم فاعل کے معنی میں اس کے معنی یا تو یہ ہیں کہ یہ قرآن پاک از اول تا آخر پرہیز گاروں کیلئے ہدایت ہے یا ہدایت دینے والا ہے۔

تفسیر

ہدایت کے معنی اور اس کے اقسام ہم سورۂ فاتحہ میں بیان کر چکے متقی وقیٌ اور وقایۃ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں حفاظت اور پردہ شریعت میں تقویٰ اسے کہتے ہیں کہ انسان ان کاموں سے بچے جو اس کیلئے آخرت میں نقصان دہ ہوں تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ قرآن کریم ان لوگوں کو ہدایت دینے والا ہے جو پرہیز گار ہیں۔ تقویٰ کے تین درجے ہیں ایک دائمی عذاب سے بچنا۔ اس لحاظ سے ہر مسلمان متقی ہے دوسرے عام گناہوں سے بچنا اور عام طور پر تقویٰ کے یہی معنی مراد ہوتے ہیں اس لحاظ سے پرہیز گار لوگ متقی ہیں تیسرے اس چیز سے بچنا جو حق تعالیٰ سے روکے اس لحاظ سے اولیاء اللہ اور انبیاء کرام متقی ہیں۔ اس آخری درجہ کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ دنیاوی چیزوں سے بے تعلقی رکھی جائے جیسا کہ تارک الدنیا، فقیر اور سیدنا عیسیٰ علیہ

السلام نے کر کے دکھایا دوسرے یہ کہ تعلق سب سے ہو مگر دل کا تعلق رب سے گویا یہ چیزیں ان کے لئے آڑ نہ رہیں دل بیار اور دست بکار کی جلوہ گری ہو۔ جیسے کہ حضور غوث پاک اور ان اولیاء کرام کا طریقہ مبارک رہا جو دنیوی کاروبار سے تعلق رکھتے تھے اور جیسے کہ حضرت سلیمان و یوسف علیہما السلام نے عمل فرما کر ظاہر فرمایا یہ قرآن مجید ہر درجہ کے متقی کیلئے اسی کے لائق ہدایت ہے لہٰذا عام لوگوں کو تو اسلام اور ایمان کی ہدایت ہے اور خاص لوگوں کیلئے ایقان اور احسان کی ہدایت اور خاص الخاص حضرات کیلئے حجاب کے دور کرنے اور جمال یار کی مشاہدے کی ہدایت قرآن کریم میں تقویٰ چند معنی میں مذکور ہوا۔ ایمان، توبہ، فرمانبرداری، گناہ چھوڑنا، اخلاص خوف خدا بھی تقویٰ ہے مگر خیال رہے کہ خوف دو طرح کا ہوتا ہے ایذاء کا خوف جو موذی سے ہوتا ہے جیسے سانپ اور چور سے خوف دوسرا طاقت اور قدرت کا خوف جو سلطان سے ہوتا ہے۔ ایذا کے خوف میں نفرت اور بھاگنا ہوتا ہے اس لئے انسان سانپ سے بھاگتا ہے اور قدرت کے خوف میں اطاعت ہوتی ہے رب سے خوف دوسری قسم کا ہونا چاہئے پھر قدرت کا خوف دو طرح کا ہے ناامیدی کا خوف اور امید کا خوف ناامیدی کا خوف گناہ پر دلیر کرتا ہے جیسے مغلوب بلی کتے پر حملہ کر دیتی ہے مگر امید کے ساتھ جو خوف ہوتا ہے وہ گناہ سے بچاتا ہے رب تعالیٰ سے یہ دوسرا خوف چاہئے اس لئے کہ رب نے قرآن میں ڈرایا بھی اور امید بھی دلائی ہے۔

تقویٰ کے فوائد

حقیقت یہ ہے کہ تقویٰ نہایت ضروری چیز ہے۔ قرآن کریم میں فرمایا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (حجرات: ۱۳) تم میں سے اللہ کے نزدیک زیادہ عزت والا وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہے ایک جگہ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا (النحل: ۱۲۸) یعنی اللہ پرہیزگاروں کے ساتھ ہے۔ ایک جگہ ارشاد فرماتا ہے وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۝ وَّ يَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ (الطلاق: ۳) یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے ڈرے گا خدا تعالیٰ اسے ہر مصیبت سے چھٹکارا عطا فرمائے گا اور اس طرح اس کو رزق دیگا کہ جو اس کے خیال میں بھی نہ آئے اس سے معلوم ہوا کہ تقویٰ اور پرہیزگاری دین دنیا میں کام آنے والی چیز ہے۔ تفسیر کبیر نے سیدنا عبداللہ ابن عباس سے روایت کی کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ جو شخص چاہتا ہے کہ لوگوں میں اس کی عزت ہو وہ اللہ سے ڈرے اور پرہیزگاری اختیار کرے حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے بوستان میں فرمایا۔

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ　　　که گردن نه پیچد زحکم تو هیچ

یعنی تو حق تعالیٰ کے حکم سے منہ نہ موڑ تو تیرے حکم سے کوئی چیز بھی سر نہ پھیرے گی بعض اولیاء اللہ کو دیکھا گیا کہ جانور اور کنکر وغیرہ بھی ان کی اطاعت کرتے ہیں۔ کیوں؟ اس لئے کہ وہ اللہ کے سچے فرمانبردار ہیں۔

تقویٰ کی علامتیں

تقویٰ کی مختلف علامتیں مختلف حضرات سے منقول ہیں۔ جو تفسیر کبیر عزیزی وغیرہ میں بیان کی گئی ہیں سیدنا حضرت علی رضی

اللہ عنہ سے روایت ہے کہ متقی کی پہچان یہ ہے کہ وہ گناہ پر قائم نہ رہے اور اپنی عبادت پر غرور نہ کرے حسن بصری فرماتے ہیں کہ متقی وہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مقابلے میں غیر اللہ کو اختیار نہ کرے اور ساری چیزیں اللہ کے قبضے میں جانے ابراہیم بن ادہم فرماتے ہیں تقویٰ یہ ہے کہ خلق تیری زبان میں اور ملائکہ تیرے کاموں میں اور پروردگار تیرے دل میں عیب نہ پائے حضرت واقدی فرماتے ہیں کہ تقویٰ اس طرح ہے کہ جس طرح تو اپنے بدن کو خلقت کیلئے لباس وغیرہ سے آراستہ کرتا ہے ایسے ہی اپنے دل کو حق تعالیٰ کیلئے آراستہ کر حدیث شریف میں یہ آتا ہے کہ متقی وہ ہے جو شبہ کی چیزوں سے بچے جیسے ابن سیرین رضی اللہ عنہ کے پاس چالیس گھڑے گھی تھا غلام نے خبر دی کہ ایک گھڑے سے مرا ہوا چوہا نکلا ہے پوچھا کون سے گھڑے سے عرض کیا کہ یہ مجھے یاد نہ رہا فرمایا سب گھڑوں کا گھی پھینک دو چونکہ سب میں شبہ پیدا ہو گیا امام ابو حنیفہ علیہ الرحمۃ اپنے کسی مقروض کے مکان پر قرض کے تقاضے کیلئے گئے سخت دھوپ تھی اور تیز گرمی لیکن اس کی دیوار کے سائے میں نہ کھڑے ہوئے بلکہ دھوپ میں کھڑے رہے کسی نے عرض کیا کہ اے امام دھوپ تیز ہے سائے میں آ جائیے فرمایا میں خوف کرتا ہوں کہ یہ سایہ لینا سود نہ بن جائے (روح البیان) صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ متقی وہ ہے کہ جو اپنے یوم میثاق کے وعدہ کو پورا کرے جس کے متعلق قرآن پاک فرماتا ہے اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ (البقرہ: ۴۰) تم میرا وعدہ پورا کرو، میں تمہارا وعدہ پورا کروں گا اور اس کی علامت یہ ہے کہ ہر بلا پر صابر اور نعمتوں پر شاکر قضا سے راضی، قرآن پاک کے سامنے جھکا ہوا رہے۔

اعتراضات

اس جگہ چند اعتراضات ہیں۔ **آریوں کا اعتراض:** یہ ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم ان کو ہدایت دیگا جو پہلے سے پرہیزگار بن چکے ہوں حالانکہ چاہئے کہ قرآن کریم گمراہوں کو ہدایت دے کیونکہ جو پرہیزگار بن چکا اسے ہدایت کی کیا ضرورت رہی۔ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں سب سے بہتر جواب تو وہ ہے جو تفسیر عزیزی نے دیا وہ یہ کہ اس کے معنی یہ نہیں کہ جو متقی بن چکے ہیں انہیں قرآن پاک ہدایت دیگا یا دے رہا ہے بلکہ یہ معنی ہیں کہ جو متقی نظر آ رہے ہیں انہیں قرآن کریم نے ہدایت دی ہے۔ یہ اس کی ہدایت سے متقی بنے گویا یہ گزرے ہوئے زمانہ میں متقیوں کو ہدایت دے چکا فرمایا یہ جا رہا ہے کہ مسلمانو کیا جانتے ہو قرآن کریم کی کیا شان ہے یہ جو تم صدیق و فاروق اور مہاجرین و انصار، متقی و ابرار نظر آ رہے ہو۔ یہ سب اس قرآن کریم کی ہدایت کا ہی کرشمہ ہے انہیں جو کچھ ملا ہے قرآن کریم سے ہی ملا ہے گویا قرآن کریم نے ان حضرات کے زہد و تقویٰ و پرہیزگاری کو اپنے ہادی ہونے کا مظہر قرار دیا اور یہ فرمایا کہ اگر میری ہدایت دیکھنی ہے تو میرے لانے والے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یاروں کو دیکھو۔ اس کی مثال یوں سمجھو کہ کوئی شخص کسی عورت کی طرف اشارہ کر کے کہے کہ یہ دودھ پلانے والی عورت اس جوان کی ماں ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ جوان اب اس کا دودھ پی رہا ہے یا آئندہ پیئے گا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ شخص اس ماں کا دودھ پی کر جوان ہوا ہے۔ یہی یہاں مراد ہے۔

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص صحابہ کرام یا اہل بیت کے ایمان کا انکار کرتا ہے وہ حقیقت میں قرآن کریم کے ہادی ہونے کا منکر ہے بعض حضرات نے کہا کہ انہیں متقی آئندہ کے لحاظ سے کہا گیا ہے۔ یعنی ان کو ہدایت دینے والا ہے جو متقی

بننے والے ہیں اور جن کے نصیب میں تقویٰ لکھا ہوا ہے جیسے کہ ہم طالب علم کو مولوی صاحب کہہ دیتے ہیں تیسرا جواب یہ دیا گیا ہے کہ یہاں متقی سے مراد ہے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے والا یعنی جن کے دل میں خوف الٰہی ہے وہ اس پر ایمان لے آتے ہیں اور جن کے دل میں محض ہٹ دھرمی ہے وہ خواہ مخواہ اس کا انکار ہی کرتے ہیں چوتھا یہ کہ ہدایت سے مراد ہے منزل مقصود تک پہنچانا معنی یہ ہوئے کہ جو پرہیزگار ہیں انہیں قرآن پاک قیامت کے دن جنت تک پہنچائے گا جیسا روایت میں آتا ہے کہ قرآن کریم نور بن کر مومنوں کے آگے آگے چلے گا۔ پانچواں جواب یہ ہے کہ متقین سے مراد ہیں ''مومنین'' اور ہدایت سے مراد ہے نیک اعمال کی رہبری تو معنی یہ ہوئے کہ جو لوگ ایمان لے آئیں ان کو قرآن پاک نیک اعمال کی ہدایت کرتا ہے۔

نوٹ: ایمان نبی سے ملتا ہے اور ایمان کے بعد قرآن دل میں تشریف لاتا ہے اس لئے کافر کو کلمہ پڑھا کر مسلمان کرتے ہیں اور بعد میں اسے قرآن پڑھاتے ہیں ہم نے عرض کیا ہے۔

قرآن بھی جب ہی ہاتھ آیا جب دل نے وہ نور ہدی پایا ۔۔۔ وہ جس کو ملے ایمان ملا ایمان تو کیا رحمان ملا

ہم نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرآن کو پہچانا نہ کہ قرآن سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بلکہ حضور علیہ السلام کی پہچان ان کے معجزات سے ہوئی تو اب یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کریم معجزہ ہونے کی حیثیت سے نبی کی پہچان کراتا ہے اور نبی علیہ السلام کے ذریعہ سے قرآن کی پہچان ہوتی ہے۔ اب آیت کے معنی خوب چسپاں ہو گئے کہ جو لوگ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکت سے ایمان لے آئے انہیں قرآن کریم تقویٰ وطہارت کی رہبری فرماتا ہے خیال رہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہدایت قرآن پر موقوف نہیں وہ تو رب کے پاس سے ہدایت یافتہ دنیا میں تشریف لائے عیسیٰ علیہ السلام نے پیدا ہوتے ہی قوم سے فرمایا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں مجھے اس نے کتاب دی مجھے نبی بنایا مجھے برکت والا کیا مجھے نماز روزہ کا حکم دیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اول سے عادل۔ امین عابد خلیق تھے جو احکام قرآن کریم نے سنائے ان پر سرکار پہلے ہی سے عامل تھے۔ اس لئے فرمایا گیا ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ یہ نہ فرمایا ھدیً لَک یعنی قرآن ان پرہیزگاروں کا ہادی ہے یہ نہ کہا کہ آپ کا ہادی ہے۔

دوسرا اعتراض: اس جگہ فرمایا گیا کہ قرآن کریم پرہیزگاروں کیلئے ہدایت ہے دوسری جگہ ارشاد ہوا هُدًى لِّلنَّاسِ یعنی یہ قرآن سب لوگوں کیلئے ہدایت ہے۔ ان دونوں آیتوں میں مطابقت کس طرح کی جائے؟ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں سب سے بہتر جواب وہ ہے جو تفسیر کبیر نے دیا کہ ان دونوں آیتوں کے ملانے سے معلوم ہوا کہ صرف پرہیزگار ہی انسان ہیں اور جس کے دل میں خدا کا خوف نہ ہو وہ انسان ہی نہیں وہ انسانی لباس میں جانور ہے بلکہ جانوروں سے بدتر کیونکہ جانور تو اپنے مالک کو پہچانتا ہے اور یہ نہیں پہچانتا دوسرا جواب یہ ہے کہ قرآن کریم کا ایک کام ہے راستہ دکھانا وہ سب انسانوں کیلئے ہے کافر منافق مسلمان سب کو راستہ دکھاتا ہے اور ایک کام ہے راستہ پر لگا دینا۔ وہ صرف مومنین کیلئے ہو۔ نہ کہ کفار کیلئے یعنی اس کے ذریعہ سے مسلمان تو راستہ پر لگ گئے اور کفار علیحدہ رہے۔ **تیسرا اعتراض:** یہ ہے کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ سارا قرآن ہدایت ہے حالانکہ قرآن کی بعض آیتیں متشابہ ہیں جو کسی انسان کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ جب سمجھ میں نہ آئیں تو ہدایت کیا دیں گی اور بعض وہ آیتیں ہیں جن کے معنی میں بہت سے احتمالات ہیں جن کی وجہ

سے مسلمانوں میں بہت سے فرقے بن گئے تفسیر کبیر نے اس جگہ فرمایا حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جب عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کو خارجیوں سے مناظرہ کرنے کیلئے بھیجا تو ان سے فرمایا کہ ان کے مقابلہ میں قرآن شریف سے دلیل نہ پکڑنا کیونکہ قرآن شریف سے ہر شخص اپنا مطلب نکال سکتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم ہدایت نہیں ہدایت ہوتا تو گمراہ لوگ اس سے دلیل نہ پکڑ سکتے۔ **جواب**: بعض آیتوں کے معانی کا سمجھ میں نہ آنا بھی اس کے کلام الٰہی ہونے کی دلیل ہے کیونکہ اگر یہ کلام انسانی ہوتا تو کسی نہ کسی عقلمند کی عقل ان کی تہہ تک ضرور پہنچ جاتی سبحان اللہ کیا لطف ہے کہ قرآن پاک سمجھ میں آئے تو بھی رہبری کرے اور سمجھ میں نہ آئے تو بھی راہ دکھائے بہرحال یہ ہدایت ہے نیز بدمذہبوں کے قرآنی آیات سے دلیل پکڑ لینے کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس کی تہہ تک نہیں پہنچتے اور قرآن پاک کا نور ان کی دل کی آنکھوں کو خیرہ کر دیتا ہے جیسے کہ اگر کوئی شخص آفتاب میں نظر جمائے تو اس کو آفتاب کالا معلوم ہوتا ہے آفتاب تو سیاہ نہیں لیکن اس کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں بارش بہت فائدہ مند چیز ہے لیکن بعض جگہ گھاسیں اس سے جل جاتی ہیں تو یہ بارش کا قصور نہیں بلکہ ان گھاسوں کا اپنا قصور ہے عمدہ غذائیں بیشک مقوی ہیں لیکن کمزور معدے والے کو ان سے نقصان ہوتا ہے مگر یہ غذا کا قصور نہیں بلکہ کھانے والے کے معدہ کا فتور ہے بہرحال قرآن کریم کا ایک ایک حرف ہدایت ہے کسی کو اس سے ہدایت نہ ملنا قرآن پاک کے ہدایت ہونے میں مضر نہیں۔

الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ
وہ ایمان لاتے ہیں ساتھ چھپے ہوئے
وہ جو بے دیکھے ایمان لائیں

تعلق

پہلے فرمایا گیا تھا کہ قرآن پاک پرہیزگاروں کیلئے ہدایت ہے۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ متقی کون لوگ ہیں تو گویا یہ آیت اس اجمال کی تفصیل ہے اگر تقویٰ کے معنی یہ کئے جائیں کہ ناجائز باتوں سے بچنا تو مطلب یہ ہوا کہ متقی وہ ہے جو ناجائز باتوں سے بچے۔ اور اچھی اختیار کرے تو ان اچھی باتوں کا ذکر اس آیت میں ہوا چونکہ بیماری کا دفع کرنا مقویات پر مقدم ہوتا ہے اس لئے تقویٰ کا ذکر ان چیزوں سے پہلے کیا گیا بہرحال یہ آیت یا پہلی آیت پر مترتب ہے یا اس کی تفسیر چونکہ ایمان تمام نیکیوں کی اصل اور جڑ ہے کہ اگر ایمان قائم ہے تو نیک اعمال فائدہ دیں گے ورنہ نہیں اس لئے ایمان کو پہلے بیان کیا اور اس کے بعد نماز وغیرہ کو دل ایک تختی ہے اور نیک اعمال اس کے اچھے نقش اور تختی پر نقش و نگار تبھی کئے جاتے ہیں جب پہلے اسے دھو کر صاف کر لیا جائے تو ایمان رحمت کا وہ پانی ہے جس سے قلب صاف ہوتا ہے جب ایمان سے دل صاف ہو گیا تو اب نیک اعمال کے ذریعہ سے اس پر عمدہ عمدہ نقش و نگار کئے جا سکتے ہیں۔

تفسیر

يُؤْمِنُوْنَ ایمان سے مشتق ہے ایمان کے لغوی معنی ہیں امن دینا چونکہ مومن اچھے عقیدے اختیار کر کے اپنے کو ہمیشہ کے عذاب سے امن دے لیتا ہے۔ اس لئے اچھے عقیدوں کے اختیار کرنے کا نام ایمان ہے یہ بھی خیال رہے کہ قرآن کریم میں

مسلمانوں کو مومن کہا گیا ہے اور رب تعالیٰ کو بھی لیکن مسلمانوں کے مومن ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ اپنے آپ کو عذاب سے امن دیتے ہیں اور رب تعالیٰ کے مومن ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہ اپنے کرم سے ایمان والے بندوں کو عذاب سے امن دیتا ہے ایمان کے دوسرے معنی مضبوط کرنے اور بھروسہ کرنے کے بھی ہیں چونکہ مومن کو اپنے عقیدوں پر مضبوطی اور پورا بھروسہ حاصل ہوتا ہے اس لئے اسے مومن کہا جاتا ہے اور کافروں کو ہمیشہ تردد ہی رہتا ہے اس لئے وہ مومن کہلانے کے مستحق نہیں شریعت میں ایمان کے معنی یہ ہیں کہ جن باتوں کے متعلق یقین سے معلوم ہو جائے کہ دین محمدی میں سے ہیں ان سب کو دل سے یقیناً ماننا اور زبان سے اقرار کرنا لیکن دلی تصدیق اصل ایمان ہے اور اقرار احکام اسلامی جاری کرنے کی شرط اعمال دین میں داخل نہیں یعنی اگر کوئی شخص عقیدہ درست رکھتا ہو لیکن اعمال نہ کرتا ہو یا برے اعمال کرتا ہو وہ مومن ہے اس لئے آیت کریمہ میں ایمان کے بعد نماز وغیرہ کا ذکر ہوا اگر اعمال ایمان کا جزء ہوتے تو ایمان کے بعد اعمال کے بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ لہٰذا شرابی، چور، زانی اور دیگر بدکار لوگ اگر عقیدے درست رکھتے ہوں تو وہ یقیناً مومن ہیں اور اگر نمازی پرہیزگار شخص کے عقیدے بگڑے ہوئے ہوں تو وہ کافر ہے قرآن کریم نے ارشاد فرمایا ہے وَاِنۡ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اقۡتَتَلُوۡا (حجرات:۹) یعنی اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں جنگ کر بیٹھیں دیکھو آپس میں لڑنا حرام ہے لیکن ان لڑنے والوں کو مومنین کہا گیا اگر کوئی شخص عمر بھر نیک اعمال کرے لیکن آخر میں مرتے وقت اس کے عقیدے بگڑ جائیں تو وہ بے ایمان ہے جیسے شیطان اور بلعم بن باعورہ کا واقعہ ہوا ہماری اس تحقیق سے اتنا معلوم ہوا کہ اس زمانے کے نئے نئے فرقے جیسے خاکسار وغیرہ جو کہتے ہیں کہ ایمان صرف خدمت خلق کا نام ہے عقیدوں کی ضرورت نہیں وہ سخت غلطی پر ہیں دوستو ایمان یعنی عقیدے مثل جڑ کے ہیں اور اعمال اس کے پھل پھل جبھی لگ سکتے ہیں جب جڑ قائم ہو اسی طرح حالی پانی پتی جو کہہ گئے

یہی ہے عقیدہ یہی دین و ایمان   کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

یہ ایک خبط ہے قرآن کریم فرماتا ہے کہ اگر تم نے ہمارے نبی کی آواز پر اپنی آوازیں اونچی کر دیں تو تمہارے اعمال برباد ہو جائیں گے۔ اگر ایمان صرف اعمال کا نام تھا تو نبی پاک کی ادنیٰ بے ادبی سے اعمال برباد کیوں ہو گئے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مومن کو اعمال کی ضرورت نہیں۔ نیک اعمال بھی سخت ضروری چیز ہیں۔ جو شخص عقائد درست کر کے اپنے اعمال نہ سنبھالے وہ ایسا ہے جیسا درخت لگا کر اس کے پھل نہ کھائے۔

اسلام اور ایمان میں فرق

اسلام کے معنی ہیں سر سجدے میں رکھنا یعنی اطاعت کرنا اسلام میں ظاہر کرنا معتبر ہے اور ایمان چھپی ہوئی چیز ہے اگر کسی کے عقائد درست نہ ہوں لیکن وہ اپنے آپ کو مومن ظاہر کرتا ہے جیسے منافقین تو وہ مسلم ہوگا مومن نہ ہوگا ایسے ہی اگر کوئی شخص ایمان لے آیا مگر اس کو اپنے ایمان ظاہر کرنے کا موقع نہ ملا تو وہ مومن ہوگا مسلم نہ ہوگا جس شخص کے عقائد بھی درست اقرار بھی کرتا ہے لیکن اعمال خراب وہ فاسق ہے جس کے اعمال بھی درست وہ متقی خیال رہے کہ جاننا اور پہچاننا اور ماننا کچھ اور

حضور کو جاننے پہچاننے کا نام ایمان نہیں ماننے کا نام ایمان ہے قرآن کریم فرماتا ہے يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (البقرہ:۱۴۶) کفار مکہ حضور کو پہچانتے تھے۔ مگر کافر ہے کیونکہ مانتے نہ تھے ماننا بھی تین قسم کا ہے محض ڈر سے ماننا محض لالچ سے ماننا۔ دلی محبت سے ماننا۔ پہلے دو ماننے والے ایمان والے نہیں کہ منافق بھی ڈر، لالچ سے مانتے تھے محبت سے ماننا ایمان ہے وہ ہی یہاں مراد ہے۔ غیب کے معنی غائب یعنی چھپی ہوئی چیز اصطلاح میں غیب وہ چیز کہلاتی ہے جو کہ ظاہری باطنی حواس اور عقل سے چھپی ہو یعنی نہ تو آنکھ ناک کان وغیرہ سے معلوم ہو سکے اور نہ غور وفکر سے عقل میں آسکے غیب دو طرح کا ہے۔ ایک وہ جس پر کوئی دلیل بھی قائم نہ ہو جیسے کسی کی موت کا وقت قیامت کے آنے کی تاریخ پیٹ کے بچے کی تحقیق یہ چیزیں دلائل سے بھی نہیں معلوم ہو سکتیں اسی کا نام ہے مَفَاتِحُ الْغَيْبِ اسی کے متعلق قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے عِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ (انعام:۵۹) یعنی غیب کی کنجیاں اللہ ہی کے پاس ہیں اسے کوئی بھی اپنے آپ معلوم نہیں کر سکتا مگر جس کو رب بتائے۔ جیسے انبیاء کرام اور خاص اولیاء اللہ اس تک پہنچ سکتے ہیں دوسرا وہ غیب جس پر دلیل قائم ہو۔ یعنی دلائل سے اس کا پتہ لگ جائے جیسے حق تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات انبیاء کی نبوت اور ان کے متعلق احکام وغیرہ۔ یہ غیب وہ ہے کہ غور وفکر سے معلوم ہو جاتا ہے۔ رب کو ہم نے نہ دیکھا لیکن دنیا کا ذرہ ذرہ اس کے ہونے کا پتہ دے رہا ہے یہاں غیب سے یہی مراد ہے اب اس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ متقی وہ ہیں جو ان غیبوں پر ایمان رکھتے ہوں جو دلائل سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ اللہ کی ذات اس کی صفات انبیاء کرام کی نبوت قیامت، حساب، سزا و جزا، جنت و دوزخ، یہ سب اسی غیب میں داخل ہیں جو شخص ان میں سے کسی چیز کا انکار کرے وہ کافر ہے۔ تفسیر روح البیان میں فرمایا کہ غیب دو قسم کے ہیں ایک تو وہ جو تجھ سے غائب جیسے کہ عالم ارواح کہ پہلے تو وہاں موجود تھا اور جب تو یہاں آ گیا تو وہ تجھ سے غائب ہو گیا دوسرا وہ جس سے تو غائب یعنی وہ تیرے پاس اور تو اس سے دور جیسے حق تعالیٰ کہ وہ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ لیکن ہم اس سے دور ہیں۔

یار نزدیک تر از من بمن است　　　　وین عجب تر کہ من از وے دورم

اس آیت کے تین معنی ہیں ایک یہ کہ وہ غیب پر ایمان لاتے ہیں یعنی حق تعالیٰ کو اور جنت دوزخ وغیرہ کو بغیر دیکھے مانتے ہیں دوسرے یہ کہ وہ غیب یعنی دل سے ایمان لاتے ہیں زبان ظاہر ہے اور دل چھپا ہوا زبان سے تو منافقین بھی ایمان لے آئے تھے۔ مگر وہ قبول نہیں۔ کیونکہ وہ غیب یعنی دل سے ایمان نہ تھا۔ تیسرے یہ کہ غیب میں یعنی مسلمانوں کے پیچھے بھی ایمان لاتے ہیں منافقین مسلمانوں کے سامنے تو کہہ دیتے تھے کہ ہم ایمان لے آئے مگر آپس میں کافروں سے ملتے تھے تو کہتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ تو اس میں یہ فرمایا گیا کہ مومن وہ ہے جو ہر حال میں یعنی مسلمانوں کے سامنے بھی اور مسلمانوں کے پیچھے بھی ایماندار ہے۔

فائدہ: اس سے معلوم ہوا کہ غائب چیز پر ایمان لانا معتبر ہے نہ کہ ظاہر پر قرآن پاک کے ظاہری حروف کو مان لینا کہ یہ ایک کتاب ہے عربی زبان کی ہے لاہور میں چھپی ہے فلاں کاغذ پر لکھی گئی ہے یہ ایمان نہیں کیونکہ یہ بالکل ظاہر ہیں بلکہ قرآن پاک کے چھپے ہوئے وصف پر ایمان لانا ضروری ہے وہ یہ کہ یہ اللہ کی طرف سے آیا ہے حضرت جبریل علیہ السلام لائے ہیں

حضور علیہ السلام پر آیا ہے کیونکہ اوصاف ظاہراً محسوس نہیں ہوتے اسی طرح حضور علیہ السلام کے ظاہری صفات کو مان لینا ایمان نہیں کہ وہ بشر تھے، مکہ مکرمہ میں پیدا ہوئے مدینہ منورہ میں قیام فرمایا کھاتے پیتے تھے۔ سیدنا عبداللہ کے فرزند تھے۔ آمنہ خاتون کے لخت جگر نور نظر تھے۔ کیونکہ یہ تو ان کے ظاہری اوصاف ہیں اس کے کفار بھی قائل تھے بلکہ حضور پاک علیہ السلام کے چھپے ہوئے اوصاف کو ماننے کا نام ایمان ہے یعنی کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اس کے پیارے ہیں تخت وتاج والے ہیں۔ شفیع المذنبین رحمۃ للعلمین ہیں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ اوصاف ظاہر میں محسوس نہیں اس لئے ان کو ماننا ہی ایمان بالغیب ہوگا وہابیہ اور دیوبندیہ کا حضور علیہ السلام کی بشریت کے پیچھے پڑ جانا محض بے دینی ہے ان کو بشر ماننا ایمان نہیں۔ بلکہ ان کو مصطفیٰ ماننا رحمۃ للعالمین ماننا ایمان ہے اسی لئے کلمہ میں پڑھا جاتا ہے۔ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ نہ کہ محمد بشر بلکہ حق تو یہ ہے کہ اللہ کو صرف خالق عالم ماننے کا نام بھی ایمان نہیں کیونکہ اس کا خالق ورازق وغیرہ ہونا مثل ظاہر کے ہے بلکہ اس کو رب مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ماننا ایمان ہے اسی لئے حق تعالیٰ نے فرمایا قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ جس سے معلوم ہوا مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ لائی ہوئی توحید ایمان اور فرمایا وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ (اعراف: ۱۷۲) جس سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ نے میثاق کے دن ساری اولاد آدم کو اپنی پہچان اس طرح کرائی کہ ہم رب محمد ہیں یہ سب باتیں ایمان بالغیب میں داخل ہیں رب نے اپنی مخلوقات میں غیب وشہادت رکھے ہیں۔ ہمارا بدن شہادت ہے۔ قلب وروح غیب درخت اور اس کی سبزی شہادت ہے جڑ اور درخت کا وہ رس جس کے سوکھ جانے سے درخت خشک ہو جاتا ہے یہ غیب ہے ایسے ہی ایمانیات کیلئے غیب وشہادت ہے۔ ابلیس نے آدم علیہ السلام کا ظاہر، شہادت کی چیز دیکھی یعنی ان کا جسم اور جسم کی ساخت مگر ان کا اندرونی وصف خلافت الہیہ نہ دیکھی جو غیب تھی اسی لئے مارا گیا۔ اب بھی جن کی نظر حضور کی بشریت پر ہے وہ ابلیس کی طرح بدنصیب ہیں اس لئے یہاں ارشاد ہوا یومنون بالغیب قرآن کے ظاہری الفاظ شہادت ہیں۔ اس کا کلام الٰہی ہونا غیب اب جو حضور کو صرف بشر یا ابن عبداللہ یا عربی ہاشمی ہونا مان لیں وہ مومن نہیں یہ اوصاف تو ابوجہل بھی مانتا تھا۔ حضور کو نبی رسول، شفیع، خاتم الانبیاء وغیرہ ماننا ایمان ہے یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غیبی اوصاف ہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: غیب چیزوں پر ایمان لانا کیوں ضروری ہے۔ **جواب:** اس لئے کہ ایمان کی حقیقت ہے اللہ و رسول پر اعتماد ہونا۔ چیز کو دیکھ کر یا سن کر تو ہر شخص مان لیتا ہے۔ مگر وہ چیز جو اس سے غیب ہو اور عقل میں نہ آئے اس کو صرف اس لئے ماننا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے دل میں اطاعت ہے مرتے وقت ملائکہ موت کو دیکھ کر اسی طرح قیامت کے قریب آفتاب کو مغرب سے نکلتا ہوا دیکھ کر ایمان لانا ہرگز قبول نہیں۔ کیونکہ اسے نبیوں کی خبروں پر اعتماد نہ ہوا بلکہ اپنی آنکھ پر اعتماد ہوا کہ ان سے سن کر نہ مانا آنکھ سے دیکھ کر مانا۔ سچ پوچھو تو ایمان کی جان تو یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خبر پر اپنے حواس سے زیادہ اعتماد ہو اگر ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت دن ہے اور نبی کریم فرماتے ہیں کہ اس وقت رات ہے تو ہماری آنکھ جھوٹی ہے اور نبی کریم سچے کیوں کہ ہماری آنکھ

ہزار دفعہ غلطی کر جاتی ہے مگر ان کا فرمان کبھی غلط نہیں ہوتا۔ اس پر یہ شعر چسپاں ہوتا ہے۔

اگر شاہ روز را گوید شب است ایں — بباید گفت اینک ماہ و پروین

دوسرا اعتراض: اس آیت سے لازم آتا ہے کہ صحابہ کرام کا ایمان درست نہ ہو کیونکہ نبی کریم کو دیکھ کر ایمان لائے حالانکہ ایمان بالغیب چاہئے۔ **جواب:** صحابہ کرام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ظاہری جسم پاک کی زیارت کی اور اس پر ایمان نہیں ایمان تو ان کی نبوت اور چھپے ہوئے اوصاف پر ہے اور یہ چیزیں ان کی نگاہوں سے بھی غیب تھیں معجزات کو دیکھنے سے نبوت نہیں محسوس ہوتی جیسے کے مخلوق کو دیکھنے سے خالق محسوس نہیں ہوتا۔ **تیسرا اعتراض:** پھر چاہئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مومن نہ کہا جائے اس لئے کہ ان کیلئے ایمان کی کوئی چیز غیب نہیں کیونکہ اللہ پاک کو انہوں نے دیکھا فرشتوں کو انہوں نے ملاحظہ فرمایا قرآن کریم کو انہوں نے اترتے دیکھا جنت و دوزخ کی انہوں نے سیر فرمائی نبوت تو خود ان کا اپنا وصف ہے جس کا انہیں علم حضوری ہے جب ان کیلئے ان میں سے کوئی چیز غیب نہ رہی تو ان کے ایمان کی کیا سبیل ہے۔ **جواب:** یہ سب گفتگو مومنوں کے متعلق تھیں وہ تو عین ایمان ہیں ان کے جاننے پہچاننے کا نام ہی ایمان ہے۔ سب مومن وہ ایمان، سب عارف وہ عرفان، سب صادق وہ سراپا صدق سب عالم وہ عین علم سب قاصد وہ منزل مقصود سب طالب وہ مطلوب وہ سب کی انتہا انہیں اپنے پر کیوں قیاس کرتے ہیں ان کو مومن اس طرح کہہ دیتے ہیں جس طرح اللہ کو بھی مومن کہتے ہیں کہ لفظ مومن ایک ہے مگر معنی میں بہت فرق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وآلہ واصحابہ بارک وسلم

نکتہ: تفسیر کبیر اور تفسیر عزیزی نے مسند امام احمد بن حنبل سے روایت نقل کی حارث ابن قیس نے سیدنا عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عرض کیا کہ ہمیں حسرت وافسوس ہے کہ ایک نعمت تم کو ملی اور ہم کو نہ ملی وہ یہ کہ تم دیدار یار سے مشرف ہوئے اور ہم اس سے محروم رہے سیدنا ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ نبوت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سب پر ظاہر ہے لیکن اے حارث تمہارا ایمان بڑا کامل ہے کیونکہ ہم انہیں دیکھ کر ایمان لائے اور تم بغیر دیکھے اور یہی آیت پڑھی تفسیر عزیزی میں ابوداؤد طیالسی سے روایت ہے کہ ایک شخص سیدنا عبداللہ ابن عمر کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ کیا تم نے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی ان آنکھوں سے دیکھا ہے آپ نے فرمایا کہ ہاں پھر اس شخص نے کہا کہ کیا تم نے اپنی اس زبان سے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کلام بھی کیا ہے آپ نے فرمایا کہ ہاں۔ پھر اس شخص نے کہا کہ تم نے اپنے ان ہاتھوں سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت بھی کی ہے، فرمایا کہ ہاں۔ پھر اس شخص پر وجد کی حالت طاری ہوگئی اور غشی کی حالت میں کہنے لگا تم لوگ کیا ہی خوش نصیب ہو سیدنا عبداللہ ابن عمر نے اس کا حال دیکھ کر فرمایا کہ میں تجھے ایک حدیث پاک سناتا ہوں وہ یہ کہ میں نے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا کہ مبارک وہ شخص جو مجھے دیکھ کر ایمان لائے اور بڑا مبارک ہے وہ شخص جو بغیر دیکھے مجھ پر ایمان لائے ان حدیثوں سے ہمارے اس کلام کی پوری تائید ہوتی ہے۔ **چوتھا اعتراض:** روایات سے ثابت ہے کہ بعض اولیاء اللہ اور صحابہ کرام پر سارے غیب ظاہر ہو جاتے ہیں جیسے حضرت زید رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ جنت و دوزخ کے سارے طبقے میرے سامنے ہیں یا کہ حضور غوث پاک رضی اللہ عنہ فرماتے

ہیں کہ میں نے اللہ کے سارے شہروں کو اس طرح دیکھا ہے جیسے کہ چند رائی کے دانے تو ان حضرات کو غیب پر ایمان حاصل نہ ہوا کیونکہ جب کوئی چیز ان کیلئے غیب رہی ہی نہیں تو غیب پر ایمان کیسا۔ **جواب:** ایک تو یہ ہے کہ دیکھ کر ایمان لانا اور ایک ہے ایمان لا کر دیکھنا دیکھ کر ایمان لانا معتبر نہیں۔ یہ حضرات غائب چیزوں پر ایمان لائے تھے بعد میں نور ایمانی کی زیادتی کی وجہ سے وہ غائب چیزیں ان پر ظاہر ہو گئیں لہٰذا ان کو ایمان بالغیب اعلیٰ درجہ کا حاصل ہوا اس کی تائید حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ انہوں نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ مجھے دکھا دے تو مردوں کو کس طرح زندہ کرے گا ارشاد ہوا کہ اَوَلَمۡ تُؤۡمِنۡ (البقرہ: ۲۶۰) کیا تم اس پر ایمان نہیں لائے ہو۔ عرض کیا کہ ہاں لیکن دل کو اطمینان (حق الیقین) چاہتا ہوں۔ تو دیکھو کہ ان کو ایمان پہلے حاصل ہو چکا ہے بعد میں انکشاف ہوا۔

تتمہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ علم غیب کے بغیر ایمان حاصل نہیں ہوتا کیونکہ ایمان یقین کا نام ہے اور یقین علم کا انتہائی درجہ ہے جب کسی کو غیب کا علم نہ ہو تو یقین کیسے ہوگا ہم قیامت دوزخ جنت رب کی ذات وصفات کو جانتے ہیں تب ہی اس پر ایمان لاتے ہیں۔ اور یہ سب چیزیں غیب ہیں اور ان کا جاننا علم غیب ''تفسیر کبیر'' نے اسی جگہ لکھا کہ ہر مسلمان کہہ سکتا ہے کہ میں غیب جانتا ہوں لیکن علم غیب کی دو صورتیں ہیں ایک سن کر جاننا دوسرے دیکھ کر سن کر جاننے کو علم بالغیب کہتے ہیں جیسے ہم کو قیامت وغیرہ چھپی چیزوں کا علم نبی پاک کے فرمانے سے ہے اور دیکھ کر جاننے کو علم الغیب کہتے ہیں۔ جیسے کہ انبیاء کرام اور اولیاء اللہ کا علم اسی لئے صوفیاء کرام اس آیت کریمہ کے معنی یہ فرماتے ہیں کہ متقی وہ ہیں جو ایمان لاتے ہیں اس نور غیبی سے جو رب تعالیٰ کی طرف سے ان کو ملا اور اس کی تائید یہ حدیث پاک کرتی ہے کہ مومن نور الٰہی سے دیکھتا ہے۔

(روح البیان یہی مقام)

وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ
اور قائم رکھیں نماز کو
اور نماز قائم رکھیں

تعلقات

اس جگہ متقین کا ذکر ہو رہا ہے متقی وہ ہیں جن کے ایمان واعمال درست ہوں ایمان کا ذکر پہلے کر دیا گیا ہے اور اب اعمال کا ذکر شروع ہوا چونکہ اعمال میں نماز سب سے بہتر عمل ہے اس لئے پہلے اس کا ذکر کیا گیا۔ چند وجوہ سے ایمان اعمال پر مقدم ہے **پہلی** وجہ یہ ہے کہ ایمان اعمال کی اصل ہے جیسے کہ پہلے ذکر کیا گیا **دوسری** یہ کہ ایمان قلب (دل) کا کام ہے۔ اور اعمال قالب (جسم) کا کام دل بادشاہ ہے جسم اس کی رعایا لہٰذا دل کا کام جسم کے کام سے افضل ہے **تیسری** یہ کہ ایمان سارے پیغمبروں کے دین میں یکساں رہا اور اعمال میں فرق ہوتا رہا اور ہمیشہ کی چیز بدلنے والی چیز سے افضل ہے **چوتھی** یہ کہ ایمان لانا اسلام میں اول ہی سے فرض ہوا نماز زکوٰۃ وغیرہ بعد میں کہ نماز معراج میں فرض ہوئی اور باقی اعمال اس کے بھی بعد **پانچویں** یہ کہ اعمال موت پر ختم ہو جاتے ہیں مگر ایمان موت اور قبر حشر وغیرہ میں ہر جگہ ساتھ رہتا

ہے **چھٹی** یہ کہ ایمان لانا سب پر فرض ہے مگر اعمال سب پر فرض نہیں چنانچہ کافر پر ایمان لانا فرض بچے اور دیوانے اپنے ماں باپ کے تابع ہوئے مسلمان پر ہر حالت میں ایمان لانا فرض نہیں لیکن نماز زکوٰۃ وغیرہ کوئی عبادت کافروں، بچوں، دیوانوں پر فرض نہیں اس طرح نماز روزہ حیض ونفاس والی عورت پر فرض نہیں زکوٰۃ اور حج غریب پر فرض نہیں ان وجوں سے ایمان کو پہلے بیان کیا گیا اور نماز کو زکوٰۃ وغیرہ سے پہلے اس لئے بیان کیا گیا کہ نماز بدنی عبادت ہے اور زکوٰۃ مالی اور بدن مال سے افضل ہے لہٰذا نماز زکوٰۃ سے افضل دوسرے اس لئے کہ اسلام میں سب سے پہلے نماز ہی فرض ہوئی اور اس کے بعد زکوٰۃ وغیرہ تیسرے اس لئے کہ رب تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو عرش پر بلا کر نماز عطا فرمائی اور زکوٰۃ وغیرہ باقی اعمال زمین پر ہی بھیج دیئے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سارے اعمال میں نماز افضل ہے۔ چوتھے اس لئے کہ نماز دن بھر میں پانچ دفعہ پڑھی جاتی ہے اور زکوٰۃ اور روزہ سال کے بعد، حج عمر میں ایک مرتبہ۔ پانچویں اس لئے کہ نماز ہر غریب وامیر مسافر ومقیم مسلمان پر فرض ہے مگر زکوٰۃ غریب پر فرض نہیں اور روزہ رکھنا مسافر پر فرض نہیں کیونکہ مسافر روزہ قضا کر سکتا ہے چھٹے اس لئے کہ نماز آدم علیہ السلام سے ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک قریباً ہر پیغمبر نے کس قدر فرق کے ساتھ پڑھی ہے۔ لیکن زکوٰۃ روزے وغیرہ کا یہ حال نہیں چنانچہ حضرت آدم علیہ السلام نے فجر پڑھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ظہر پڑھی۔ حضرت یونس علیہ السلام نے عصر پڑھی۔ عیسیٰ علیہ السلام نے مغرب موسیٰ علیہ السلام نے عشاء (تفسیر روح البیان) یہی مقام اس بارے میں اور بھی روایتیں ہیں۔

تفسیر

یُقِیْمُوْنَ۔ اقامت سے بنا ہے اس کے لغوی معنی ہیں سیدھا کرنا اور یہاں مراد ہے نماز کو ہمیشہ پڑھنا اس کے ظاہری اور باطنی آداب کے ساتھ پڑھنا ظاہری آداب اس کی شرطیں فرائض سنتیں مستحبات ہیں اور باطنی شرائط یہ ہیں کہ دل میں عاجزی ہو ریا نہ ہو حضور قلبی ہو دل ہمہ تن بارگاہ الٰہی کی طرف متوجہ ہو اسی لئے قرآن کریم نے جہاں بھی نماز کا ذکر فرمایا وہاں قائم کرنے کے ساتھ فرمایا جو شخص نماز تو پڑھے مگر پابندی سے نہ پڑھے وہ اس آیت پر عامل نہیں اسی طرح جو شخص مستحب وقت پر نہ پڑھے نماز کی پاکی پلیدی کا پورا خیال نہ رکھے اس کی سنتیں وغیرہ ادا نہ کرے ریاکاری کیلئے پڑھے وہ سب اس آیت سے خارج ہیں **یُقِیْمُوْنَ** میں بہت گنجائش ہے شریعت وطریقت کے سارے مسائل اس میں آ گئے حق تعالیٰ نماز قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائے صوفیاء کے نزدیک نماز قائم کرنا اور ہے اور نماز قائم رکھنا کچھ اور جیسے بغیر بنیاد کے دیوار قائم نہیں رہتی بغیر جڑ کے درخت قائم نہیں رہتا بغیر شہد یا قوام ڈالے ہوئے بعض پھل قائم نہیں رہتے ایسے ہی دیوار نماز پر اسلام کی ساری عمارت قائم ہے اس نماز کو مضبوط بنیاد پر قائم کر دو۔ وہ بنیاد ہے عشق جناب مصطفیٰ کہ منہ ہو کعبہ کی طرف اور دل ہو مدینہ کی طرف ورنہ رکوع وسجود حجاب ہیں۔

گر باداء نماز تو نہ شوی بے نقاب ہست رکوعم حجاب ہست سجودم حجاب

اللہ نماز قائم رکھنے کی توفیق دے بغیر عشق کی نماز ہمیشہ قائم نہ رہے گی یہاں کی ہی رہ جائے گی۔ **نکتہ: یقیمون** جمع کے صیغہ

سے ارشاد فرمایا وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ (البقرہ: ۴۳) یعنی نمازیوں کے ساتھ نمازیں پڑھو اس سے معلوم ہوا کہ جماعت سے نماز پڑھنا سخت ضروری ہے۔ امام احمد ابن حنبل رضی اللہ عنہ کے نزدیک مردوں پر جماعت فرض ہے۔ یہاں واجب اور بعض نے کہا سنت موکدہ۔ مگر ہمارے یہاں بھی بعض نمازوں میں جماعت فرض ہے جیسا کہ نماز جمعہ اور عیدین وغیرہ (صلوٰۃ) صلی یا صلو سے بنا صلی کے معنی ہیں آگ سے گرمی حاصل کرنا جس کا ترجمہ تاپنا قرآن پاک فرماتا ہے لَعَلَّكُمْ تَصْطَلُوْنَ (نمل: ۷) چونکہ ٹیڑھے بانس کو آگ سے گرم کر کے سیدھا کرتے ہیں۔ اسی طرح ٹیڑھے آدمی کو نماز کی برکت سے سیدھا کیا جاتا ہے اس لئے اس کو صلوۃ کہتے ہیں صلی کے دوسرے معنی ہیں لازم پکڑنا قرآن کریم فرماتا ہے تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً (الغاشیہ: ۴) چونکہ نماز بھی مسلمان کے واسطے لازم رہتی ہے۔ اس لئے اس کو صلوۃ کہتے ہیں صلو کے معنی ہیں سرین چونکہ نماز پڑھنے کی حالت میں سرین کو حرکت ہوتی ہے۔ اس لئے اس کو صلوٰۃ کہتے ہیں۔ قرآن پاک میں لفظ صلوۃ پانچ معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ ۱۔ دعا کیلئے وَصَلِّ عَلَيْهِمْ (التوبہ: ۱۰۳) ۲۔ تعریف جیسے يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِيِّ (احزاب: ۵۶) ۳۔ قرآن پاک کی تلاوت وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ (الاسراء: ۱۱۰) ۴۔ رحمت صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ (البقرہ: ۱۵۷) ۵۔ نماز جیسے اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (البقرہ: ۴۳) اور حق تو یہ ہے کہ نماز میں پہلی چار چیزیں بھی شامل ہیں اس میں رب سے دعا بھی ہے۔ اس کی تعریف بھی تلاوت قرآن بھی اور اس پڑھنے والے پر رحمت بھی یہاں اس آیت میں صلوۃ کے معنی نماز ہی ہیں۔ نماز بہت قسم کی ہے، فرض، جیسے نماز پنج وقتہ اور جمعہ واجب جیسے نماز عید، اور وتر سنت موکدہ جیسے ظہر مغرب کی سنتیں اور سنت غیر موکدہ جیسے کہ عصر و عشاء کی سنتیں نوافل جیسے نماز اوابین نماز چاشت و اشراق وغیرہ یہاں نماز سے فرض نماز مراد ہے تو معنی یہ ہوئے کہ متقی وہ لوگ ہیں جو فرض نمازوں کو پابندی سے ادا کرتے ہیں۔

نماز کے فضائل

کچھ فضائل تو ہم نے تعلق میں بیان کر دیئے اور کچھ یہ ہیں ۱۔ نماز تمام ملائکہ کی عبادتوں کا مجموعہ ہے۔ کیونکہ ملائکہ مقربین میں سے بعض وہ ہیں جو صرف رکوع ہی کر رہے ہیں بعض صرف سجدہ بعض قیام بعض صرف تسبیح و تہلیل رب تعالیٰ نے ہماری نماز میں یہ سب چیزیں جمع فرمائیں جو اس کی پابندی کرے گا وہ درجہ میں تمام ملائکہ کے برابر یا ان سے افضل ہوگا۔ ۲۔ نماز میں ساری مخلوقات کی عبادت جمع ہے وہ اس طرح کہ درخت ہر وقت قیام میں ہیں اور چوپائے رکوع میں سانپ بچھو وغیرہ ہر وقت سجدے میں مینڈک وغیرہ ہر وقت قعدے میں انسان چونکہ ان سب سے افضل ہے اس لئے چاہئے کہ اس کی عبادت ان سب کی عبادتوں کو شامل ہو۔ ۳۔ نماز انسان کی ہر حالت درست کرتی ہے برے کاموں سے بچاتی ہے یہ تو آزمائی ہوئی بات ہے کہ بڑے بڑے فاسق و بدکار لوگوں نے جب صدق دل نے نماز پڑھنی شروع کر دی تو رب کے فضل سے سارے گناہوں سے بچ گئے۔ ۴۔ نماز صدہا بیماریوں کا علاج ہے اس وقت کے اطباء بھی کہتے ہیں کہ وضو کرنے والا آدمی دماغی بیماریوں میں بہت کم مبتلا ہوتا ہے۔ نمازی آدمی اکثر تلی کی بیماریوں اور جنون وغیرہ سے محفوظ رہتا ہے نیز پنج وقتہ نمازی کے

اعضاء دھلتے رہتے ہیں۔ کپڑے پاک رہتے ہیں۔ گھر بھی اس کا پاک رہتا ہے۔ اس لئے وہ گندگی سے بچا رہتا ہے اور گندگی بہت سی بیماریوں کی جڑ ہے۔ ۵۔ نماز ہر مصیبت کا علاج ہے اسی لئے اسلام نے ہر مصیبت کے وقت نماز پڑھنے کا حکم دیا بارش نہ ہو تو نماز استسقاء پڑھو سورج یا چاند کو گرہن لگے تو نماز کسوف پڑھو۔ کوئی حاجت درپیش ہو تو نماز حاجت پڑھو۔ غرضیکہ نماز ہر مصیبت میں کام آنے والی چیز ہے۔

نماز کیسی پڑھی جائے

اس کے متعلق روح البیان شریف نے اسی جگہ فرمایا کہ کسی شخص نے حاتم زاہد سے پوچھا کہ آپ نماز کس طرح پڑھتے ہیں۔ فرمایا کہ جب نماز کا وقت قریب آتا ہے تو اچھی طرح وضو کرتا ہوں۔ پھر مصلے پر سیدھا کھڑا ہوتا ہوں۔ اور دل میں محسوس کرتا ہوں کہ کعبہ معظمہ میرے چہرے کے سامنے ہے اور مقام ابراہیم میرے سینے کے آگے۔ اللہ میرے پاس ہے۔ جو میرے ہر حال کو دیکھ رہا ہے گویا کہ میرے قدم پل صراط پر ہیں۔ اور جنت میرے داہنی طرف اور دوزخ میرے بائیں طرف ہے اور ملک الموت میرے پیچھے کھڑے ہوئے ہیں اور ہر نماز کے متعلق میں یہ خیال کرتا ہوں کہ یہ میری آخری نماز ہے۔ پھر تکبیر تحریمہ کہتا ہوں۔ پھر قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہوں کہ ایک ایک لفظ کے معنی پر غور کرتا ہوں عاجزی کے ساتھ رکوع کرتا ہوں اور گریہ وزاری کے ساتھ سجدہ اور امید قبول پر التحیات پڑھتا ہوں اور سنت کے طریقہ پر سلام پھیرتا ہوں۔ پھر جب فارغ ہوتا ہوں تو نماز کے قبول ہونے کی امید اور مردود ہونے کے خوف میں مشغول ہوتا ہوں۔ اور فرمایا کہ میں اس طرح سے تیس سال سے نماز پڑھ رہا ہوں صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ اے اللہ کے بندو! نماز کیلئے یا تو تارے بن جاؤ۔ کہ تمام رات رب کی عبادت کرو اور یہ نہ ہو سکے تو چاند بن جاؤ یعنی رات کے بعض حصہ میں عبادت کرو اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو سورج سے تم کم نہ ہو کہ دن کو غفلت میں نہ گزارو۔

نماز کے اسرار اور حکمتیں

پانچ وقت کی نماز اس لئے فرض ہے کہ معراج میں اولاً پچاس وقت کی فرض ہوئی پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عرض کرنے پر پانچ وقت کی رہ گئی حق تعالیٰ کے یہاں ہر نیکی کا ثواب دس گنا ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ نمازیں پڑھنے میں تو پانچ ہیں اور ثواب میں پچاس دوسری حکمت یہ ہے اور امتوں نے یہ نمازیں متفرق طور پر پڑھی تھیں کسی نے فقط ظہر کسی نے فقط عصر وغیرہ حق تعالیٰ نے ان ساری نمازوں کو ہمارے لئے جمع فرمایا چونکہ وہ سب مل کر پانچ ہی نمازیں ہوتی تھیں اس لئے ہمارے واسطے پانچ رہیں تیسرے یہ کہ نمازوں سے مقصود یہ ہے کہ انسان کی ہر حالت اللہ کے ذکر سے شروع ہو اور دن اور رات میں پانچ ہی حالتیں ہوتی ہیں۔ اس لئے نماز بھی پانچ ہی رکھی گئیں۔ مثلاً صبح کو اٹھا تو اب بیداری کی حالت شروع ہوئی سب سے پہلے اللہ کا ذکر کرے دوپہر تک دنیوی کاروبار سے فارغ ہوا کھانا وغیرہ کھا کر دوپہر میں آرام کیا اب جو اٹھا تو دن کا دوسرا حصہ اور ہماری دوسری حالت شروع ہوئی لہٰذا پہلے نماز پڑھ لو عصر کے وقت تقریباً سارے لوگ اپنے کاروبار سے فارغ ہو گئے سیرو

تفریح کا وقت آیا بازاروں میں تجارتوں کے چمکنے کا وقت آیا گویا ہماری تیسری حالت شروع ہوئی اب بھی پہلے نماز پڑھ لو مغرب کے وقت دن جا رہا ہے رات آرہی ہے دنیا کی حالت نے کروٹ بدلی اب بھی پہلے نماز پڑھ لو جب سونے کیلئے چلوتو بہت ممکن ہے کہ یہ نیند تمہاری آخری ہو اس کے بعد قیامت ہی کو اٹھنا۔ اور نیند بھی ایک قسم کی موت ہے لہٰذا اللہ پاک کا ذکر کرو اور نماز پڑھ کر سوؤ۔ جس کام کی ابتداء اچھی ہوتی ہے۔ ان شاء اللہ وہ کام آخیر تک اچھا رہتا ہے دوکاندار لوگ کہتے ہیں کہ ہمارا پہلا گاہک کوئی مبارک ہو جس کی برکت سے تمام دن خوب تجارت ہو۔ مسلمان کے بھی ہر کام کی ابتداء اللہ کے ذکر سے ہو۔ لہٰذا پانچ نمازیں رکھی گئیں۔

نماز کی رکعتیں

مختلف اس لئے ہیں کہ یہ نمازیں گزشتہ پیغمبروں کی ایک لحاظ سے یادگار ہیں چونکہ آدم علیہ السلام نے فجر کے وقت دو ہی رکعتیں پڑھی تھیں اور حضرت خلیل اللہ نے ظہر کے وقت چار وغیرہ وغیرہ اس لئے ہم بھی اتنی ہی رکعتیں پڑھتے ہیں۔ نیز طبیب کے نسخہ میں دوائیں مختلف وزن کی ہوتی ہیں کوئی دو ماشہ تو کوئی تین تولہ اور دواؤں کے یہ وزن اس کی حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔ اسی طرح نماز کی رکعتیں گویا روحانی نسخہ کے اوزان ہیں نیز اس جگہ روح البیان شریف نے لکھا ہے کہ ملائکہ کے بازو مختلف ہیں کسی کے دو کسی کے تین کسی کے چار۔ رب تعالیٰ نے نمازوں کی رکعتیں بھی مختلف رکھیں کیونکہ یہ بھی روح کے بازو ہیں قبلہ کو منہ کرنے میں یہ حکمت ہے کہ کعبہ معظمہ تمام زمین کی اصل ہے۔ کیونکہ زمین وہاں ہی سے پھیلی تو چاہئے کہ نمازی کا جسم اپنے اصل کی طرف رہے۔ اس میں اس جانب اشارہ ہے کہ نمازی کا دل عالم کی اصل یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف رہے کیونکہ حضور علیہ السلام روحوں کی اصل ہیں۔ اس لئے آپ کو ہر نمازی نماز میں سلام کرتا ہے اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّهَا النَّبِیُّ اور اسی لئے اگر کسی نمازی کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پکاریں تو اس پر واجب ہے کہ اپنی نماز چھوڑ کر حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو جائے اس کی تحقیق کیلئے ہماری کتاب ''شان حبیب الرحمان'' کا مطالعہ کرو اور ان شاء اللہ اس کے متعلق جو قرآن پاک کی آیتیں ہیں ان کے ماتحت مسئلہ کی پوری تحقیق کی جائے گی۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: قرآن پاک کی اس آیت سے معلوم ہوا کہ متقی وہ جو نماز قائم کرے۔ تو جو صحابہ کرام کہ نماز فرض ہونے سے پہلے وفات پا گئے یا اب جو شخص اسلام لاتے ہی وفات پا جائے۔ وہ متقی نہ ہونا چاہئے کیونکہ اس نے نماز قائم ہی نہ کی۔

جواب: تمام اعمال میں قدرت کی شرط ہے۔ یعنی مطابق طاقت کے واجب ہوتا ہے جو شخص کہ نماز پڑھنے کا موقع ہی نہ پائے اس پر نماز فرض ہی نہ ہوئی۔ دیکھو مالدار آدمی اسلام کے پانچوں ارکان ادا کرتا ہے۔ یعنی زکوٰۃ وحج بھی غریب آدمی صرف تین یعنی کلمہ، نماز، روزہ، حائضہ عورت نماز بھی نہیں پڑھتی۔ مگر یہ سب ایک درجہ کے متقی ہیں کیونکہ ان میں ہر شخص بقدر طاقت اطاعت کر رہا ہے اسی طرح ایک شخص کی عمر سو برس کی ہوئی دوسرے کی پچیس برس کی۔ سو برس والے کی عبادتیں زیادہ

ہیں لیکن دونوں ایک درجہ کے متقی ہیں دوسرا جواب یہ ہے کہ ایک تو ہے اعمال کا کرنا اور ایک ہے ماننا وہ متقی ہے کہ اگر اس کو عمل کا موقع ملے تو کرے اور اگر نہ ملے تو کم از کم اس کو مانے جو صحابہ کرام نماز فرض ہونے سے پہلے وفات پا چکے ان کا بھی یہ عقیدہ تھا کہ جتنے احکام آئیں گے وہ سب حق ہوں گے خواہ ہمیں کرنے کا موقع ملے یا نہ ملے۔ آج بھی غریب آدمی یہ عقیدہ رکھتا ہے کہ زکوٰۃ اسلامی فرض ہے اگر میرے پاس مال ہو تو مجھ پر زکوٰۃ دینا فرض ہو جائے۔ یہ ماننا ہی اس کے متقی ہونے کیلئے کافی ہے۔ بعض صحابہ کرام نے سارا قرآن پاک اترا ہوا نہ دیکھا کیونکہ وہ بعض سورتوں کے اترنے سے پہلے ہی وفات پا گئے۔ پہلی امتوں نے سارے انبیاء کرام کو نہ جانا۔ کیونکہ وہ بعض انبیاء ان کے بعد آنے والے تھے تو اب یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ان کا ایمان ناقص تھا۔ اور ہمارا کامل۔ کیونکہ ہم نے سارے قرآن اور سارے پیغمبروں کو پا لیا۔ اس لئے کہ سب کو وہ بھی مانتے تھے۔ اور ہم بھی مانتے ہیں وہ اس طرح مانتے تھے کہ بعض انبیاء اور بعض قرآن کی آیتیں آنے والی ہیں اور وہ سب حق ہیں ہم اس طرح مانتے ہیں کہ سب آ چکے ہیں اور سب حق ہیں۔ **دوسرا اعتراض:** چاہئے کہ نماز فرض ہی پڑھی جائے سنتوں کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ متقی بننے کیلئے فرض نماز کی پابندی کافی ہے جیسا کہ اس تفسیر سے معلوم ہوا۔

جواب: سنتوں کے بغیر فرض ناقص ہیں بلکہ بغیر سنت فرض ادا ہو سکتے ہی نہیں۔ سنت کو فرض سے وہ تعلق ہے جو پانی کو کھانے سے ہے۔ کہ بغیر پانی نہ تو کھانا تیار ہوتا ہے اور نہ کھایا جا سکتا ہے اسی طرح بغیر سنت نہ تو فرض ادا ہو سکتا ہے اور نہ پڑھا جا سکتا ہے۔ دیکھو مثلاً روٹی ہے یہ بغیر پانی بنتی بھی نہیں اور کھائی بھی نہیں جاتی۔ کھیت میں گیہوں پانی سے تیار ہوا۔ پھر آٹا پانی سے گوندھا گیا جب کھانے کیلئے بیٹھے تو ساتھ پانی بھی پیا گیا۔ جس ترکاری سے روٹی کھائی وہ بھی کھیت میں پانی سے تیار ہوئی پھر پانی ہی سے دھلی اور پانی ہی سے پکی اسی طرح فرض سنت سے حاصل ہوتا ہے۔ نماز پڑھنے لگو تو کانوں تک ہاتھ اٹھاؤ قیام، تلاوت، سجدہ التحیات وغیرہ کی سنتیں ادا کرو تو فرض ادا ہو پھر کوئی فرض نماز ایسی نہیں جس کے ساتھ سنتیں نہ پڑھی جائیں۔ اسی طرح روزہ رکھنے کیلئے سحری کھانا اور کھجور سے افطار کرنا وغیرہ سب سنت ہے زکوٰۃ کے پیسے سے اپنے اہل قرابت کی خدمت کرنا سنت۔ بلکہ فرض تو ہم پر بالغ ہونے کے بعد عائد ہوتے ہیں اور مرنے سے پہلے ہی ہمیں چھوڑ دیتے ہیں۔ لیکن سنت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہوتے ہی ہمیں اپنے دامن میں لیتی ہے۔ اور مرنے پر بھی بلکہ مرنے کے بعد بھی ہمارا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ پیدا ہوتے ہی بچے کو غسل دینا کپڑا پہنانا ختنہ اور عقیقہ کرنا وغیرہ سب سنتیں ہی تو ہیں پھر زندگی گزارنا پیٹ بھر کر کھانا کھانا جوتا پگڑی کرتہ اچکن وغیرہ پہننا یہ سب سنتیں ہیں اکثر صورتوں میں نکاح کرنا اور بیوی بچوں کی پرورش کرنا، مکان بنانا وغیرہ یہ سب سنتیں ہیں، اس طرح مرتے وقت کلمہ پڑھانا کفن کی ترتیب دینا قبر کی نوعیت وغیرہ یہ سب سنتیں ہیں۔ بعد موت ایصال ثواب کرنا وغیرہ سنتیں ہیں اسی لئے ہمارا نام اہل فرض نہیں بلکہ اہل سنت و جماعت ہے جو لوگ کہ سنت نمازوں کے منکر ہیں ان کو چاہئے نہ تو مکان بنائیں نہ دو وقتہ پیٹ بھر کر روٹی کھائیں نہ عمدہ لباس پہنیں بلکہ مرنے لگیں تو جان بچانے کیلئے تھوڑے چنے کھا لیا کریں اور صرف ناف سے گھٹنوں تک کپڑا باندھا کریں اور سخت ضرورت کے بغیر نکاح ہرگز نہ کریں اپنا نام کچھ نہ رکھیں کیونکہ فرض صرف اس قدر ہیں جو ہم نے عرض کر دیئے۔ یہ کیا کہ نماز کی سنتوں سے انکار اور باقی

تمام سنتوں سے عمل جناب سنت نے ہم کو انسان بنایا رب تعالیٰ ہم کو سنت پر قائم رکھے سنت چھوڑنے والا شفاعت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محروم ہے خیال رہے کہ سنت اور حدیث میں دو طرح کا فرق ہے اور ایک یہ کہ حدیث حکایت ہے اور سنت جس کی حکایت کی جاوے۔ وہ الفاظ جن میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افعال کریمہ نقل کئے گئے وہ الفاظ حدیث ہیں اور خود حضور نے جو کام کیا تھا جس کی حکایت کی گئی وہ سنت دوسرے اس طرح کہ حدیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام وہ طریقے جو نقل میں آجاویں۔ خود ہمارے لئے وہ قابل عمل طریقے جن میں اتباع کی جا سکے لہٰذا حدیث عام ہے سنت خاص خیال رہے کہ حضور کے خصائص جیسے نو بیویاں ایک ساتھ نکاح میں رکھنا روزہ وصال۔ منبر پر کھڑے ہو کر نماز پڑھنا۔ اونٹ پر طواف کرنا۔ حدیث میں تو آ گیا مگر یہ سنت نہیں کیونکہ ہم ان کی پیروی نہیں کر سکتے اس لئے حدیث شریف میں ارشاد ہے عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي تم پر میری سنت لازم ہے یہاں بحدیثی نہ فرمایا لہٰذا انسان اہل سنت تو ہو سکتا ہے یعنی ہر سنت پر عمل کرنے والا مگر اہل حدیث نہیں ہو سکتا۔ اپنے کو اہل حدیث کہنا کھلا جھوٹ ہے۔ ورنہ پھر تو نو بیویاں نکاح میں رکھنا ہوں گی وغیرہ وغیرہ۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ۝۳
اور سے اس دیا ہم نے ان کو خرچ کرتے ہیں
اور ہماری دی ہوئی روزی میں سے ہماری راہ اٹھائیں

تعلق

یہاں متقین کی صفات کا ترتیب وار ذکر ہو رہا ہے پہلے ایمان کا ذکر ہوا جو سب کی اصل تھا پھر نماز کا جو تمام اعمال سے افضل تھی اور جس کا تعلق مومن کے بدن سے تھا۔ اب اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا ذکر ہوا جس کا قوی تعلق مال سے ہے چونکہ جب انسان پیدا ہوتا ہے تو اس کے پاس صرف جسم ہوتا ہے اور مال بعد میں حاصل ہوتا ہے اس لئے نماز کا ذکر پہلے اور خرچ کرنے کا بعد میں دوسرے یہ کہ زکوٰۃ نماز کے بعد فرض ہوئی اس لئے زکوٰۃ کا ذکر نماز کے بعد تیسرے یہ کہ ایمان میں نجات ہے اور نماز میں مناجات اور خرچ میں درجات نجات مناجات سے پیچھے ہیں اس لئے اس کو بعد میں بیان کیا گیا۔ یہ کہ ایمان بشارت ہے نماز میں کفارہ ہے اور خرچ میں طہارت یعنی پاکی ہے اور یہ ان دونوں سے پیچھے یہ کہ ایمان میں عزت اور نماز میں قربت اور خرچ میں زیادتی ہے اور زیادتی ان دونوں کے بعد میں ہے اس لئے اس کا ذکر بعد میں ہوا یہ کہ اس آیت میں چار چیزوں کا ذکر ہوا، تقویٰ، ایمان بالغیب اور نماز قائم کرنا اور خرچ کرنا اور یہ چار صفتیں چاروں خلفاء (یعنی ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی، مولیٰ علی کی صفتیں ہیں چنانچہ صدیق اکبر متقین کے سردار عمر فاروق مومنین کے پیشوا عثمان غنی نمازیوں کے شہنشاہ مولا علی راہ خدا میں خرچ کرنے والوں کے امام رضی اللہ عنہم اجمعین (تفسیر روح البیان)

تفسیر

اس جملے میں تین الفاظ ہیں اور تینوں بہت گنجائش رکھتے ہیں جس کی وجہ سے یہ جملہ مسائل کا ایک دریا ہے بلکہ یوں سمجھو کہ فقط یہ ایک جملہ ہی انسان کی ساری زندگی کیلئے کافی ہے ایک مما دوسرے رَزَقْنٰهُمْ تیسرے یُنْفِقُوْنَ۔ مما میں من بعضیت کیلئے ہے یعنی اپنی روزی میں سے کچھ حصہ خرچ کرے اس سے دو فائدے حاصل ہوئے ایک تو یہ کہ سارا مال راہ خدا میں خرچ کر کے خود فقیر نہ بن جانا چاہئے اگر آپ نے اپنا سارا مال فقیروں کو دے دیا اور اپنے کو اور اپنی اولاد کو بھوکا رکھا تو بہت سے حقوق مار کر ایک نفلی کام کیا جو یقیناً منع ہے اور اگر بعد میں بھیک مانگتے پھرے تو نفل ادا کر کے حرام میں پھنسے کیونکہ بلا سخت ضرورت بھیک مانگنا حرام ہے اسی لئے اس جگہ مِمَّا فرمایا گیا ہاں اگر کوئی اللہ کا بندہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی طرح متوکل ہو اور اس کے سارے گھر والے بھی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے گھر والوں کی طرح متوکل ہوں اور پھر وہ اپنا سارا گھر بار مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدم پاک پر نثار کر دے اور گھر میں اللہ و رسول کے نام رکھے تو یہ دوسری بات ہے۔

موسیا آداب دانا دیگراند   سوختہ جان و روانا دیگراند

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تو پروانہ شمع مصطفائی تھے۔ ان سوختہ جانوں کے احکام ہی دوسرے ہیں۔ لہٰذا جو شخص اس آیت کو پیش کر کے ان پر اعتراض کرتا ہے وہ عاشقوں کے رمز سے ناواقف ہے۔ دوسرے اس طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ ہمارے پاس عام طور پر دو قسم کے مال ہوتے ہیں کچھ حرام اور کچھ حلال۔ راہ خدا میں وہ مال خرچ کرو جو نہایت طیب اور حلال ہو۔ کیونکہ حرام مال اس کی بارگاہ میں قبول نہیں تیسرے یہ کہ ہمارے مالوں میں سے بعض مال ردی ہوتے ہیں۔ اور بعض کھرے اللہ کی راہ میں کھرا مال خرچ کرو جس کی دوسری آیتوں میں تصریح فرمائی گئی ہے۔ اس لئے یہاں من ارشاد فرمایا گیا (رَزَقْنٰهُمْ) یہ رزق سے بنا ہے رزق کی لغت میں دو معنی ہیں عطاء یعنی دی ہوئی چیز، حصہ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ (الواقعہ: ۸۲) اس آیت میں رزق حصہ کے معنی میں استعمال ہوا اصطلاح میں رزق وہ ہے۔ جس سے کوئی جاندار چیز نفع حاصل کرے لہٰذا ہوا، پانی، لباس، غذائیں، زمین، اولاد وغیرہ غرضیکہ دنیا کی ہر نعمت رزق ہے تو اب اس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ ہر نعمت میں سے ہماری راہ میں خرچ کریں لیکن ہر چیز کا خرچ کرنا اس کے موافق ہوگا مثلاً ہوا سے سانس لیتے ہیں تو کچھ سانسیں اللہ کے ذکر میں خرچ کرو۔ یہ سانسوں کی زکوٰۃ ہوئی اگر اولاد آپ کو ملی ہے تو جس طرح چند بچوں کو دنیوی کاروبار میں ماہر بناتے ہو ان میں کم از کم ایک کو حافظ قرآن یا عالم دین بھی بناؤ اور جس طرح کہ اپنی اولاد کو دنیوی کام سکھاتے ہو کوئی دینی کام بھی سکھاؤ اور ان کو یہ بھی سمجھا دو کہ تم کس درخت کی شاخ اور کس شاخ کے پھل ہو اسی طرح اگر تمہارے پاس مال ہے تو مال کو بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ لفظ رَزَقْنٰهُمْ ان سب کو شامل ہے۔ شریعت میں سات طرح مال خرچ کرنا عبادت ہے۔

۱۔ زکوٰۃ اس کی بہت سے قسمیں ہیں اور ہر قسم کے ہزار ہا مسائل چاندی سونے کی زکوٰۃ جانوروں کی زکوٰۃ زمینی پیداوار کی زکوٰۃ وغیرہ وغیرہ ۲۔ صدقہ فطر۔ ۳۔ نفلی صدقے اس کی بہت قسمیں ہیں مہمانوں کی دعوت کمزوروں کی مدد یتیموں کی

پرورش اور قرض دار کے قرض کی ادائگی گیارہویں شریف محفل میلاد پاک سب اس میں شامل ہیں۔ ۴۔ وقف اس کی بھی بہت سی صورتیں ہیں مسجدیں دینی مدرسے پل کنویں سرائے وغیرہ بنانا۔ ۵۔ حج کے خرچ۔ ۶۔ جہاد۔ ۷۔ اپنے اپنے ذمہ اہل قرابت کے جو خرچ لازم ہیں ان کا ادا کرنا اس کی بھی بہت سی قسمیں ہیں بیوی کے مصارف چھوٹی اولاد کی پرورش والدین کا خرچ غریب اہل قرابت کی امداد وغیرہ سب اس میں داخل ہیں (يُنْفِقُوْنَ) انفاق۔ نفق سے بنا ہے اس کے لغوی معنی ہیں بکھیرنا الگ الگ ہونا اسی لئے جس کا دل اور زبان ایک نہ ہوا اسے منافق کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کا دل زبان سے علیحدہ ہے۔ لومڑی کے سوراخ کو نافقہ کہتے ہیں کیونکہ اس کے علیحدہ علیحدہ دروازے ہوتے ہیں ایک ظاہر اور ایک چھپا ہوا اور رائج سکے کو نافقہ کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ ایک جگہ مشکل سے جمع ہوتا ہے خرچ کو بھی نفقہ اسی لئے کہتے ہیں کہ اس میں مال بکھیر دیا جاتا ہے آپ کی جیب میں پچاس روپے ہیں بازار جا کر آپ نے پانچ روپے کپڑے والے کو دیئے۔ دس غلے والے کو کچھ مٹھائی وغیرہ میں صرف کئے تو وہ پیسہ جو آپ کی جیب میں جمع تھا متفرق ہو گیا۔ خرچ چند طرح کا ہے حرام خرچ جیسے شراب نوشی وغیرہ جائز خرچ جیسے دنیوی ضروریات میں پیسہ خرچ کرنا مستحب سنت اور فرض اس جگہ وہ خرچ مراد ہے۔ جو رضاء الٰہی کیلئے ہو خواہ فرض ہو یا نفل جن مفسرین نے اس کی تفسیر زکوٰۃ سے کی ہے انہوں نے ایک خاص قسم کی تفسیر کر دی بہر حال قرآن پاک کا یہ جملہ ہزار ہا مسائل کو شامل ہے۔

تفسیر صوفیانہ

صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ جس طرح ظاہری نعمتوں کے خرچ کو شامل ہے اسی طرح باطنی نعمتوں کا خرچ بھی اس میں داخل ہے۔ لہٰذا غنی اپنے مال سے خرچ کرے علماء اپنے علم سے خرچ کریں کہ لوگوں کو سکھائیں بتائیں۔ مجاہدین اپنی جان خرچ کریں کہ حق تعالیٰ کی اطاعت میں کوتاہی نہ کریں اور عابدین اپنے دل کو خرچ کریں کہ اس دل کو دنیا کی گندگیوں کا گھورا (روڑی) نہ بنائیں بلکہ دنیوی فکروں کو قلب میں نہ آنے دیں اور گھر کو یار کے لئے صاف رکھیں گندے گھر بادشاہ نہیں آتا اور دنیوی مصیبتوں کو دل سے اس طرح باہر رکھیں جیسے کشتی سے دریا کا پانی کسی شاعر نے خوب کہا ہے۔

آب در کشتی ہلاک کشتی است   آب اندر زیر کشتی پشتی است

کشتی کے لئے پانی ضروری ہے لیکن اگر پانی کشتی کے اندر آ جائے تو ڈوب جائے گی اسی طرح کہ دل کے لئے بھی تفکرات ضروری اگر تفکرات نہ ہوں تو دل کسی چیز پر تیرے گا لیکن اگر یہ تفکرات دل میں آ گئے تو دل ہلاک ہو جائے گا۔ نیز وہ فرماتے ہیں کہ غنی مال سے جیب خالی کرے اور فقیر غیر سے اپنے قلب کو صاف کرے۔ مثنوی شریف میں ہے۔

آں درم دادن سخی را لائق است   جان سپردن خود سخائے عاشق است

زکوٰۃ کے اسرار اور فائدے

یہ قدرتی بات ہے کہ خرچ کرنے سے چیز بڑھتی ہے۔ اگر عالم اپنا علم خرچ نہ کرے تو اس سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے اگر کنویں سے

پانی خرچ نہ کیا جائے تو پانی گندہ ہو جائے گا۔ اگر درختوں کی کچھ شاخیں نہ کاٹی جائیں تو ان میں آئندہ پھل کم آئیں گے۔ اسی طرح اگر مال کی زکوٰۃ ادا نہ کی جائے تو اس مال کی ترقی رک جائے گی۔ ۲۔ قدرت نے ہر چیز سے زکوٰۃ لی ہے۔ بیماری تندرستی کی زکوٰۃ ہے نیند بیداری کی زکوٰۃ تکلیفیں راحتوں کی زکوٰۃ کھیتوں میں کچھ غلے کا برباد ہو جانا اور پرندوں کا کھا جانا یہ پیداوار کی قدرتی زکوٰۃ ہے۔ اگر ہم اپنے مال سے زکوٰۃ نہیں نکالتے تو قانون قدرت کے خلاف کرتے ہیں۔ ۳۔ اگر کسی کی کوئی چیز ضرورت سے زائد بچ جائے تو وہ اور جگہ بھی خرچ ہونی چاہئے کتے وغیرہ کے پستان میں اتنا ہی دودھ ہے جتنا اس کے بچے پی سکیں لیکن بھینس گائے کو اس کے بچے کی ضرورت سے زیادہ دودھ دیا گیا ہے اس سے معلوم ہوا کہ اس میں اوروں کا بھی حق ہے اگر قدرت نے آپ کو آپ کی ضرورت سے زیادہ مال دیا ہے۔ تو یقیناً اس میں فقرا اور مساکین کا بھی حصہ ہے زائد چیز کو علیحدہ کرنا ہی ضروری ہے آپ کے بڑے ہوئے ناخن اور بال لمبیں وغیرہ علیحدہ ہونی چاہئیں۔ اسی طرح پیٹ کا فضلہ بھی خارج ہونا چاہئے اس کا رہنا بیماری ہے اسی طرح زکوٰۃ کا پیسہ بھی علیحدہ ہونا چاہئے کیونکہ اس کا رہنا بیماری ہے۔ ۴۔ جس طرح آپ کے مال سے حکومت ٹیکس لیتی ہے کہ اس کے بغیر ادا کئے آپ حکومت کے باغی قرار پاتے ہیں اور وہ یہ کہتی ہے کہ جب ہم تمہاری ہر طرح خدمت کرتے ہیں اور تمہارے آرام کے لئے ہر قسم کے محکمے بنا دیئے ہیں تو کیا ہمارا اتنا بھی حق نہیں کہ تمہارے مال سے ہم کچھ لیں۔ اسی طرح جب رب تعالیٰ نے ہماری ہر قسم کی پرورش فرمائی۔ ہمارے آرام کے لئے ہزاروں ملائکہ وغیرہ کے محکمے مقرر فرمائے تو کیا اس کا اتنا بھی حق نہیں کہ ہمارے مال میں سے کچھ طلب فرمائے بلکہ حق تو یہ ہے کہ یہ مال بھی اسی کا ہے اور ہم بھی اسی کے یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے ہم کو مال دیا اور خود ہم سے لے کر ہم کو ثواب عطا فرما دیا انسان کی فطرت میں محبت ہے مگر بعض محبتیں مفید ہیں بعض بیکار بعض نقصان دہ اللہ رسول کی محبت مفید ہے۔ دنیا کی ہر چیزوں کی محبت بیکار ہے۔ شیطانی چیزوں سے محبت نقصان دہ اسلام نے پہلی محبت بڑھانے کے لئے عبادات رکھیں کہ جس کا چرچا جس کی اطاعت زیادہ ہو اس سے محبت پیدا ہوتی ہے آخری دو محبتوں کے گھٹانے کے لئے بہت ذریعے قائم کئے زیارت قبور کرو تا کہ محبت کی دنیا کم ہو وغیرہ انہی اسباب میں سے ایک سبب زکوٰۃ و خیرات ہے کہ انسان اپنی کمائی اپنے ہاتھ سے اللہ کے نام پر دے تا کہ محبت مال دل میں نہ آ جائے۔ زکوٰۃ کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے مال بربادی وغیرہ سے محفوظ رہتا ہے اور اس میں ہمیشہ برکت رہتی ہے۔ زکوٰۃ دینے سے بظاہر جیب خالی ہوتی ہے لیکن حقیقت میں بھرتی ہے مثنوی شریف میں فرمایا گیا ؎

ہر کہ کارد گردد انبارش تہی　　لیکش اندر مزرعہ باشد بہی

و آنکہ در انبار ماندہ و صرفہ کرد　　اسپش و موش و حوادث ماش خورد

یعنی ایک کسان نے غلہ بویا دوسرے نے نہ بویا بظاہر بونے والے کی بوری خالی ہو گئی اور نہ بونے والے کے بورے بھرے رہے لیکن حقیقت میں نہ بونے والا خالی ہو گیا کیونکہ اس کے غلہ کو چند روز میں جانور چوہے مہمان اور بال بچے وغیرہ خرچ کر ڈالیں گے لیکن جس نے بویا اس کے بورے پہلے سے زیادہ بھر جائیں گے تفسیر روح البیان میں اسی جگہ ہے کہ کسی نبی پر وحی

آئی کہ فلاں شخص کی آدھی عمر غنا میں اور آدھی فقیری میں گزرنے والی ہے اس سے پوچھو کہ پہلے کون سی چیز چاہئے اس نے عرض کیا کہ میں پہلے غنا چاہتا ہوں لہٰذا اس کو غنی کر دیا گیا لیکن اس نے تدبیر یہ کی جتنا پیسا اپنے نفس پر خرچ کرتا اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ فقراء اور مساکین پر۔ جب اس کی آدھی عمر گزر گئی تو ان پیغمبر پر دوبارہ وحی آئی کہ چونکہ اس نے ہماری نعمتوں کا شکر ادا کیا اور شکر سے نعمتیں بڑھتی ہیں لہٰذا اس کی ساری عمر غنا میں کٹے گی۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: زکوٰۃ قوم کو ترقی سے روکتی ہے زکوٰۃ دینے سے غربت آتی ہے اس لئے مسلمان دوسری قوموں سے زیادہ غریب ہیں۔ **جواب:** زکوٰۃ قوم کی ترقی کا اصل راز ہے اگر صحیح معنی میں زکوٰۃ دی اور لی جائے تو قوم میں کوئی غریب نہیں رہ سکتا مسلمان جب تک زکوٰۃ دیتے رہے بہت مالدار رہے جب سے زکوٰۃ دینے میں کمی کی غریبی آئی۔ اس وقت مسلمانوں کی غربت کی وجہ یہ ہے کہ یہ بیکاری پسند کرنے میں مقدمہ بازیوں اور شادی بیاہ کی ناجائز رسموں اور عیاشیوں میں خود کو تباہ کرتے ہیں۔ ایسی مثال کہیں نہیں مل سکتی کہ کوئی شخص زکوٰۃ دینے سے غریب ہو گیا ہو۔ **دوسرا اعتراض:** آریوں کا۔ زکوٰۃ کے قانون سے مسلم قوم میں بیکاری اور بھیک مانگنے کی عادت پڑ گئی کیونکہ جب انہیں معلوم ہے کہ زکوٰۃ کا پیسہ مالداروں سے مل جائے گا تو پھر وہ محنت کیوں کریں۔ **جواب:** یہ زکوٰۃ کی خرابی نہیں۔ بلکہ زکوٰۃ کے غلط استعمال کی خرابی ہے۔ اسلام نے جس طرح کہ مالداروں کی زکوٰۃ دینے کی ترغیب دی ہے اسی طرح فقراء مساکین کو کما کر کھانے کا اور بھیک سے بچنے کا سخت حکم دیا جس کے متعلق قرآن پاک کی آیتیں اور احادیث بکثرت موجود ہیں۔ زکوٰۃ لینا تو سخت مجبوری کے وقت ہے اگر کوئی شخص کسی اچھی چیز کو غلط استعمال کرے تو یہ اس کے استعمال کی خرابی ہے نہ کہ اس چیز کی کوئی شخص ریل سے خودکشی کرے تو اس سے ریل بری نہیں ہوگی بلکہ اس کی یہ حرکت بری ہوئی۔ اگر زکوٰۃ سے بیکاری بڑھتی ہے تو ہندوؤں میں سادھو اور بھکاریوں کی جماعتیں کیوں موجود ہیں۔ **تیسرا اعتراض:** رب کو راضی کرنے کے لئے صرف ایک نیک عمل کی ضرورت ہے۔ صدہا قسم کے اعمال شریعت نے کیوں بتائے۔ **نوٹ:** یہ اعتراض خاکساریت کی جڑ ہے کہ ان کے نزدیک صرف جھوٹی خدمت خلق اور نام کا غلط جہاد نجات کا مدار ہے نماز روزے کو مولویوں کی شکم پروری بتایا۔ **جواب:** جس طرح کہ زندہ رہنے کے لئے ہزارہا چیزوں کی ضرورت ہے۔ غذا، پانی، لباس، مکان، دوا وغیرہ کہ ان کے بغیر زندگی ناممکن ہے۔ اگر کوئی شخص کہے کہ زندگی کے لئے صرف ہوا کافی ہے۔ غذا وغیرہ کی کیا ضرورت ہے وہ دیوانہ ہی تو ہے تو جس طرح جسمانی زندگی کے لئے بہت سے اعمال ضروری۔ دوسرا جواب یہ ہے کہ دنیا میں انسان کا تعلق بہت سی چیزوں سے ہے اور ہر تعلق میں انسان صدہا گناہ کر لیتا ہے تو ضرورت تھی کہ ہر تعلق میں کوئی نہ کوئی عبادت بھی رکھی جائے تاکہ اس سے یہ چیزیں پاک ہوتی رہیں۔ چونکہ انسان کو تعلق مال سے بھی ہے اور اس مال میں بہت سی بے احتیاطیاں ہوتی رہتی ہے۔ اس لئے ضرورت تھی کہ اس میں ایک مالی عبادت رکھی جائے۔ اسی کا نام زکوٰۃ ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ج
اور وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں ساتھ اس اتارا گیا طرف آپ اور وہ اتارا گیا
اور وہ کہ ایمان لائیں اسپر جو اے محبوب تمہاری طرف اترا اور جو تم
وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۝
سے پہلے آپ کے اور ساتھ آخرت وہ یقین کرتے ہیں
سے پہلے اترا اور آخرت پر یقین رکھیں

تعلق

اس آیت کو پہلی آیت سے چند طرح سے تعلق ہے۔ بعض تعلقات عبارت کے لحاظ سے ہیں اور بعض مضمون کے لحاظ سے۔ عبارت کے لحاظ سے یہ ہے کہ یا تو یہ علیحدہ جملہ ہے اور یہ مبتداء اور اولئک سے آخیر تک اس کی خبر ہے تو اس صورت میں آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ جن لوگوں میں یہ تین صفتیں ہوں وہ ہدایت پر ہیں اور کامیاب ہیں اور یہ الَّذِيْنَ پہلے الَّذِيْنَ پر معطوف ہے۔ تو اس صورت میں یہ معنی ہوں گے کہ یہ قرآن پاک ان پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے جن میں وہ پہلی تین صفتیں بھی ہوں۔ اور یہ تینوں صفتیں بھی ہوں جو کہ اب بیان ہو رہی ہیں تو گویا یہ آیت بھی متقین کی تفسیر ہے اور یا یہ الَّذِيْنَ متقین پر معطوف ہے تو آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ قرآن کریم پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے اور ان لوگوں کے لئے بھی جن میں یہ تین صفتیں ہوں۔ ان صورتوں میں اُولٰٓئِکَ سے علیحدہ جملہ شروع ہوگا۔ مضمون کے لحاظ سے بھی چند طرح تعلق ہے ایک یہ کہ پہلی آیت میں متقین کی صفت یہ بیان کی گئی کہ جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور بظاہر غیب سے مراد اللہ کی ذات وصفات تھیں اور فقط اللہ کی ذات وصفات کو ماننا متقی ہونے کے لئے کافی نہیں جب تک انبیاء کرام اور آسمانی کتابوں اور قیامت پر بھی یقین نہ ہو ان چیزوں کو اس آیت میں بیان کیا گیا (تفسیر فتح المنان) دوسرے اس طرح کہ پہلی آیت میں ان پرہیزگاروں کا ذکر ہوا تھا کہ جو بے پڑھوں اور مشرکین عرب میں سے ایمان لا کر پرہیزگار بنے کیونکہ ان کے لئے نبوت اور آسمانی کتابیں اور قیامت وغیرہ سب ہی چیزیں بالکل غیب تھیں۔ کیونکہ وہ ان سب سے ناواقف وبے خبر تھے اور اب اُن اہل کتاب کا ذکر ہو رہا ہے کہ جو پہلے سے نبوت اور آسمانی کتابوں اور قیامت کو جانتے اور مانتے تھے اور جن کے لئے یہ چیزیں کسی قدر ظاہر تھی تو یوں سمجھو کہ پہلے ان مسلمانوں کا ذکر ہوا جو شرک سے نکل کر اسلام میں داخل ہوں اور اب ان مسلمانوں کا ذکر ہو رہا ہے کہ جو یہودیت اور عیسائیت سے توبہ کر کے مسلمان ہوں جس سے معلوم ہوا کہ یہ کتاب دونوں قسم کے لوگوں کے لئے پوری ہدایت ہے تیسرے اس طرح کہ یہ آیت پہلی آیت کی تفصیل ہے۔ وہ اس طرح کہ پہلے فرمایا گیا تھا کہ پرہیزگار وہ ہیں۔ جو غیب پر ایمان لائیں اور اب اس کی تفصیل اس طرح فرمائی گئی کہ اس سے وہ مراد ہیں جو ساری آسمانی کتابوں پر ایمان لائیں۔ مگر ان دونوں تعلقات میں غیب سے مراد ساری چھپی ہوئی چیزیں ہیں۔

تفسیر

ایمان کے معنی اور اس کی اقسام اس سے پہلے بیان کئے جاچکے مَاۤ اُنۡزِلَ میں دو کلمے بہت غور کے قابل ہیں اولاً مَا اور دوسرے اُنۡزِلَ، مَا کے معنی ہیں ہر وہ چیز اور اُنۡزِلَ کے معنی جو اتاری گئی آپ کی طرف جس سے یہ بات معلوم ہوئی کہ صرف قرآن پاک کو ماننا مومن و متقی بننے کے لئے کافی نہیں بلکہ حضور ﷺ کی ساری احادیث پاک کو ماننا از بس ضروری ہے۔ ورنہ یہاں بالقرآن فرمایا جاتا تو آیت کا مقصود یہ ہوا کہ اے محبوب ﷺ متقی وہ ہیں جو ان ساری چیزوں پر ایمان لائیں جو آپ پر اتریں۔ خواہ بذریعہ ظاہر وحی کے جیسے قرآن کریم یا بذریعہ چھپی ہوئی وحی کے یعنی الہام وغیرہ جیسے احادیث۔ لہٰذا حضور ﷺ جو کچھ خواب میں دیکھ کر بیان فرمائیں اس کا ماننا اور جو کچھ کہ آپ کے قلب پاک پر الہام ہو اس کا ماننا اور جو کچھ ظاہر وحی سے آئے اس کا ماننا غرضیکہ جو لب پاک مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہوا ان سب کا ماننا ایمان کے لئے ضروری ہے کیونکہ یہ سب رب کی طرف سے ہوتا ہے قرآن کریم فرماتا ہے وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡہَوٰی ؕ اِنۡ ہُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی (نجم: ۳) ہمارے محبوب ﷺ تو اپنی خواہش سے بولتے ہی نہیں بلکہ وہ سب وحی ہوتی ہے جو ان کی طرف کی جاتی ہے۔ لہٰذا جو شخص ان میں سے کسی چیز کا منکر ہو وہ کافر ہے۔ ہم قرآن و حدیث کا فرق مقدمہ میں بیان کر چکے ہیں جن احادیث شریف کو قرآن پاک کی آیتوں نے منسوخ فرمادیا جیسے کہ بدر کے قیدیوں سے فدیہ لینا وغیرہ جس کو بے ادب کہہ دیتے ہیں وہ معاذ اللہ نبی کی غلطی تھی ان کا ماننا بھی اس وقت فرض تھا۔ جب وہ کلام ارشاد ہوا تھا اور اس منسوخ ہونے میں بھی عجیب راز ہیں۔ جن کو ہم نے اپنی کتاب سلطنت مصطفیٰ میں بیان کیا ہے البتہ بطور مشورہ جو باتیں حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمائیں ان کا یہ درجہ نہیں اسی لئے یہاں ارشاد ہوا بِمَاۤ اُنۡزِلَ اور یہ نہ فرمایا گیا کہ بِمَا قُلۡتَ یعنی جو کچھ آپ کہیں۔ انزال کے معنی ایک دم اتارنے کے ہیں۔ چونکہ ہر آیت ایک دم ہی اترتی تھی اس لئے یہاں انزل فرمایا گیا یعنی ہر اس آیت اور حدیث پر ایمان لائیں جو ایک دم آپ پر اتری اتارنے کے معنی اور اس کی پوری تحقیق مقدمہ میں کر چکے ہیں اِلَیۡکَ میں بہت گنجائش ہے۔ جو چیزیں حضور علیہ السلام کے قلب پاک پر بطور الہام اتریں وہ بھی اس میں شامل ہیں اور جو کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے آکر عرض کیں۔ اور حضور علیہ السلام نے کان مبارک سے سنیں وہ بھی اس میں داخل اور جن چیزوں کو آنکھوں سے ملاحظہ فرما لیا خواہ فرش پر رہ کر یا عرش پر جاکر وہ سب اس میں شامل ہیں۔ لہٰذا نماز روزہ، زکوۃ اور نماز کی رکعتیں اور زکوۃ کے نصاب وغیرہ سب اس میں شامل ہیں۔ اگرچہ ان میں سے بعض چیزیں وہ ہیں جو حضور علیہ الصلوۃ والسلام نے قلب پاک سے معلوم فرمائیں اور بعض وہ جو سن کر یا دیکھ کر معلوم کیں۔

وَمَاۤ اُنۡزِلَ مِنۡ قَبۡلِکَ سے معلوم ہوا کہ جس طرح قرآن پاک کا ماننا ایمان کے لئے ضروری ہے۔ اسی طرح ساری آسمانی کتابوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ لیکن ان دونوں کتابوں کے ایمان لانے میں دو طرح فرق ہے۔ ایک یہ کہ سارے قرآن پاک کا ماننا بھی ضروری۔ اور اس کی محکم آیتوں پر عمل کرنا بھی ضروری۔ لیکن پچھلی کتابوں کا فقط اس طرح ماننا ہی ضروری ہے کہ وہ آسمانی کتابیں تھیں۔ جو ان پیغمبروں پر آئی تھیں۔ وہ سب حق تھیں۔ لیکن ان پر عمل کرنا ہمارے ذمہ لازم نہیں

اور قرآن کریم نے پہلے آسمانی کتابوں کے جو احکام نقل فرما دیئے (جیسے کہ قصاص۔ اور سزاؤں کے احکام) ان پر عمل کرنا ہمارے لئے بھی ضروری ہے۔ لیکن اس لئے نہیں کہ وہ ان کتابوں کے حکم تھے بلکہ اس وجہ سے کہ ان کا ذکر بغیر تردید کے ہمارے قرآن پاک میں آ گیا۔ دوسرے اس طرح کہ ان کتابوں کا تفصیل سے جاننا ضروری نہیں صرف اتنا ماننا کافی ہے کہ کچھ کتابیں آئیں تھیں اور وہ حق تھیں لیکن قرآن پاک کے بقدر ضرورت احکام کی تفصیل جاننا ہر مسلمان پر فرض عین ہے اور پورے قرآن کی تفصیل جاننا فرض کفایہ۔ جس فریضہ کو علماء کرام ادا کرتے ہیں۔ ان فرقوں کی وجہ سے مَآ اُنْزِلَ کو دوبارہ فرمایا گیا قرآن پاک کے لئے علیحدہ اور باقی ساری آسمانی کتابوں کے لئے علیحدہ۔ **نکتہ:** منسوخ احکام کا ماننا ضروری ہوتا ہے اور ان پر عمل کرنا اکثر منع۔ دیکھو یہ ماننا ضروری ہے کہ پہلے بیت المقدس قبلہ تھا۔ لیکن اس کی طرف نماز پڑھنا منع۔ اس لئے قرآن کریم نے یہاں ایمان کا ذکر فرمایا نہ کہ عمل کا وَ بِالْاٰخِرَةِ میں تین جگہ رہنا ہے کچھ روز تو دنیا میں کچھ روز قبر میں یعنی عالم برزخ میں اور ہمیشہ آخرت میں دنیا کی ابتداء ہماری پیدائش سے ہے اور اس کی انتہا ہماری موت اور برزخی زندگی کی ابتداء مرنے سے اور اس کی انتہا قیامت پر اخروی زندگی کی ابتداء قیامت سے اور انتہا کبھی نہیں بلکہ اس کی بقاء ہمیشہ دنیا کو دنیا اس لئے کہتے ہیں کہ یا تو یہ دُنُوٌّ سے بنا ہے یا دَنَائَۃٌ سے اگر دُنُوٌّ سے بنا ہے تو اس کے معنی ہوئے قریب کی چیز کیونکہ اس کی فنا قریب ہے اور اگر دَنَائَۃٌ سے بنا ہے تو اس کے معنی ہیں ادنی یا حقیر چیز برزخ کے معنی ہیں پردے کے چونکہ برزخی زندگی دنیوی اور اخروی زندگی کے درمیان ایک پردہ ہے کہ نہ وہاں عمل ہیں اور نہ کئے ہوئے اعمال کی جزاء لہٰذا اسے برزخ کہتے ہیں۔ آخرت کے معنی دوسری چیز چونکہ وہ دوسری زندگی ہے اس لئے اس کو آخرت کہا جاتا ہے۔ یہاں آخرت سے مراد یا لغوی آخرت ہے یا اصطلاحی لغوی آخرت میں برزخ بھی داخل ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ دنیا کے علاوہ دوسری ہر حالت پر وہ یقین رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو۔ ان سب کا ماننا ایمان کے لئے ضروری ہے چونکہ دنیا کی زندگی اور اس کے سارے حالات محسوس ہیں۔ اور وہ دونوں حالتیں غیب ہیں۔ لہٰذا دنیا پر ایمان لانا ضروری نہیں بلکہ ان دونوں پر ایمان ضروری ہے۔ هُمْ يُوْقِنُوْنَ کا مقدم کرنا حصر کے لئے ہے یعنی ان ہی لوگوں کو آخرت پر یقین ہے آریئے یا سناتنی ہندو وغیرہ چونکہ نہ قیامت کو مانیں اور نہ قیامت کے بعد کے حالات کو اس لئے یہ حصر صحیح ہوا۔ اسی طرح عیسائی اور یہودی اگرچہ قیامت وغیرہ کو مانتے ہیں لیکن غلط طریقہ سے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ جنت میں صرف یہودی یا عیسائی ہی جائیں گے اور نیز یہ کہ یہودیوں کو صرف چند دن ہی آگ کا عذاب ہوگا اور یہ کہ جنت کی نعمتیں دنیا کی نعمتوں کی طرح نہیں ہیں۔ یعنی وہاں غذائیں اور بیویاں نہیں کیونکہ یہ چیزیں جسم کی پرورش اور نسل کے بڑھانے کے لئے ہوتی ہیں اور ان کی وہاں ضرورت نہیں بلکہ وہاں صرف روحانی خوشی اور سرور ہوگا اور ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ یہ سب چیزیں تو ہوں گی لیکن ہمیشہ نہ رہیں گی بلکہ دنیا کی طرح وہ بھی مٹ جائیں گی اس لئے ان لوگوں نے حقیقتاً صحیح معنی میں آخرت کو نہ مانا۔ (تفسیر روح البیان) ثابت ہوا کہ مسلمانوں کے علاوہ کسی نے بھی آخرت کو صحیح طور پر نہ مانا بعض نے بالکل نہ مانا جیسے آریہ اور بعض نے غلط طریقہ سے مانا لہٰذا یہ انحصار بالکل صحیح ہوا۔ **تنبیہ:** جو شخص مسلمانی کا دعویٰ کر کے جنت دوزخ وغیرہ کا انکار کرے یا وہاں کی نعمتوں میں عیسائیوں کی طرح تاویل

کرے جیسے کہ سر سید علی گڑھی اور اسکے ہوا خواہ وہ کافر و مرتد ہے اور اس آیت سے خارج از اسلام ہے یُوْقِنُوْنَ یقین سے بنا ہے اور یقین کے دو معنی ہیں ایک کسی چیز کو بلاشبہ جاننا یعنی پہلے شبہ ہو اور بعد میں نہ رہے (تفسیر کبیر یہی مقام) یا دلائل سے بلاشبہ جاننا اسی لئے حق تعالیٰ کے علم کو یقینی نہیں کہتے۔ "روح البیان یہی مقام" کیونکہ خداوند کریم کا علم نہ تو دلائل سے ہے اور نہ شک وشبہ کے بعد اسی طرح حضور علیہ السلام کو جو اپنی نبوت کا علم ہے اس کو یقین نہ کہا جائے گا کیونکہ ان کو نہ تو اس سے پہلے شک تھا اور نہ ان کو یہ علم دلائل سے حاصل ہوا۔ ابو اللیث رحمتہ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یقین تین طرح کا ہے۔ یقین عیاں، یقین خبر، یقین دلالت، یقین عیاں تو یہ ہے کہ خود چیز کو دیکھ کر اسکا یقین حاصل ہو۔ یقین خبر وہ ہے کہ جو کسی سے خبر پا کر اس چیز کا یقین حاصل ہو۔ جیسے کہ دھوئیں کو دیکھ کر آگ کا اور دھوپ کو دیکھ کر آفتاب کا یقین یہاں یقین سے آخری دو قسمیں مراد ہیں۔ بلکہ شریعت میں یقین خبر ہی معتبر ہے۔ کیونکہ جو شخص نبی کا انکار کرے اور ان ساری چیزوں کو اپنی عقل سے معلوم کرے وہ شریعت میں مومن نہیں اسی لئے اس آیت میں آخرت کے یقین کو کتابوں کے ایمان کے بعد بیان کیا۔

تفسیر صوفیانہ

صوفیاء کرام فرماتے ہیں یقین کے بھی تین درجے ہیں اور ایمان کے بھی علم الیقین، عین الیقین، حق الیقین، علم الیقین سن کر جاننا، عین الیقین دیکھ کر جاننا اور حق الیقین اس میں فنا ہو کر جاننا اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک شخص سن کر جانتا ہے کہ آگ گرم ہے دوسرا آگ کے پاس بیٹھا ہوا اس کی گرمی محسوس کر کے جان رہا ہے کہ آگ گرم تیسرے نے اپنے آپ کو آگ میں ڈال دیا اور آگ نے اس کی رگ رگ میں سرایت کی اور وہ زبان حال سے کہنے لگے۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی تاکس نہ گوید بعد ازاں من دیگرم تو دیگری

اس فنا کے بعد اس کو جاننا تو پہلا علم الیقین ہوا۔ دوسرا عین الیقین اور تیسرا حق الیقین حق الیقین والا جس پر نظر فرمادے۔ اس کو بھی رنگ دے کوئلہ جب آگ بن جاتا ہے تو جسم تو کوئلہ سا رہتا ہے لیکن وہ کام آگ کا سا کرتا ہے نیز صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ جو شخص ان درجات میں ترقی چاہتا ہے وہ حسب ذیل کام کرے، باوضو رہنا، کم کھانا، اکثر خاموش رہنا، اکثر خدا کا ذکر کرنا، عالم کی چیزوں میں غور کرنا، فرائض اور سنتوں کی پابندی کرنا، دنیا والوں سے بے غرض رہنا، کم سونا، حلال کھانا، سچ بولنا، یہ چیزیں **قفلوں** کی چابیاں ہیں۔ یقین کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ انسان دنیا میں آخرت کی تیاری کرے تفسیر روح البیان شریف میں اس جگہ ہے کہ چند لوگ بہت دھوکے میں ہیں ایک وہ جو اللہ کو خالق جان کر اس کی عبادت نہیں کرتا۔ ۲۔ وہ جو اللہ کو رازق جان کر اس پر بھروسہ نہیں رکھتا۔ ۳۔ وہ جو دنیا کو فانی جان کر بھروسہ کرتا ہے۔ ۴۔ وہ جو کہ اپنے وارثوں کو اپنا دشمن سمجھ کر دین کھو کر ان کے لئے مال جمع کرتا ہے۔ ۵۔ وہ جو کہ موت کو مان کر اس کی تیاری نہیں کرتا۔ ۶۔ وہ جو کہ جانتا ہے کہ قبر میری جگہ ہے اور پھر اس کو آباد نہیں کرتا۔ ۷۔ وہ جو کہ جانتا ہے کہ اللہ پاک حساب لے گا۔ اور پھر اپنا حساب صاف نہیں رکھتا۔ ۸۔ وہ جو کہ جانتا ہے کہ پل صراط پر چلنا پڑے گا۔ اور اپنا بوجھ ہلکا نہیں کرتا۔ ۹۔ وہ جو کہ جانتا ہے کہ جہنم بدکاروں کی جگہ ہے۔ مگر اس سے نہیں بھاگتا۔ ۱۰۔ اور وہ جو کہ جانتا ہے کہ جنت ابرار کی جگہ ہے مگر اس کی طرف نہیں آتا۔ حق تعالیٰ ہم

سب کو عمل کی توفیق دے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ سارے قرآن پاک پر ایمان لانے سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے تو جو صحابہ کرام سارے قرآن شریف کے اترنے سے پہلے وفات پا گئے تھے۔ وہ متقی نہ ہوئے۔ **جواب:** اس کا جواب پہلے دیا جا چکا ہے کہ ان سب کا ایمان سارے قرآن پاک پر تھا۔ جو آ گیا تھا اس پر اور جو آنے والا تھا اس پر بھی ایمان لانے کے لئے اس چیز کا آ جانا ضروری نہیں۔ دیکھو ہمارا قیامت پر ایمان ہے۔ مگر وہ ابھی آئی نہیں۔ **دوسرا اعتراض:** اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں انجیل و توریت وغیرہ ساری کتابیں صحیح موجود تھیں۔ کیونکہ اگر صحیح نہ ہوتیں تو ان پر ایمان کیسے لایا جاتا۔ اور ان پر بغیر ایمان لائے تقویٰ حاصل نہیں ہو سکتا۔ اگر مسلمان موجودہ **انجیلوں** وغیرہ کو غلط مانتے ہیں تو وہ اپنے ایمان کی بھی خیر منائیں۔ **جواب: انجیلیں** حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ سے پہلے ہی غلط ملط ہو چکیں تھیں چنانچہ پولوس مقدس نے جو خط **گلیتوں** کو لکھا ہے اس کے پہلے باب میں ہے کہ لوگوں نے انجیل کو الٹ پلٹ کر دیا اور اے لوگوں تم جعلی **انجیلوں** کی طرف کیوں مائل ہو گئے۔ اصل انجیل بلا توسط کسی انسان کے حضرت مسیح سے مجھ کو ملی ہے اس کے سوا جو کوئی اور انجیل تم کو سنائے اس پر لعنت (تفسیر حقانی یہی آیت) بلکہ موجودہ انجیلوں کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کچھ تاریخی کتابیں ہیں جن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیدائش سے لے کر نقلی موت تک کے حالات جمع کر دئے گئے ہیں اس میں یہی ملتا ہے کہ حضرت عیسیٰ نے فلاں موقع پر یہ کہا اور فلاں سے یہ کہا وغیرہ اب آپ کا یہ کہنا کہ اگر اصلی انجیل نہ تھی تو مسلمان ایمان کس پر لائے اور اس آیت کے مضمون کو کس طرح بجا لائے اس کا جواب بالکل آسان ہے کہ مسلمان اس پر ایمان لائے تھے کہ جو کتابیں ان پیغمبروں پر آئی تھیں وہ حق تھیں نہ اس پر کہ وہ اب **بجنسہ** موجود ہیں کسی چیز پر ایمان لانے کے لئے اس کا موجود ہونا ضروری نہیں۔ مسلمان تو عیسیٰ علیہ السلام پر بھی ایمان لائے حالانکہ وہ اس وقت موجود نہ تھے۔ **تیسرا اعتراض:** قرآن پاک کی اس آیت میں بے ترتیبی ہے کیونکہ قرآن کریم ان کتابوں سے بعد میں آیا اور وہ کتابیں اس سے پہلے مگر یہاں قرآن کریم کا ذکر پہلے ہے اور ان کتابوں کا ذکر بعد میں۔ چاہئے تھا کہ ان کا ذکر پہلے کیا جاتا **جواب:** اگرچہ قرآن کریم دنیا میں آنے کے اعتبار سے ان کتابوں سے پیچھے ہے مگر اب ایمان لانے اور جاننے میں ان پر مقدم کیونکہ ہمیں ان کتابوں کا علم قرآن کریم کے ذریعہ سے ہوا۔ مسلمان ان کتابوں کو اس لئے مانتے ہیں کہ قرآن کریم نے ان کو منوایا لہٰذا قرآن کریم کا ذکر پہلے ہی ہونا چاہئے۔ کیونکہ حق اس کا مقدم ہے بلا تشبیہ یوں سمجھو کہ باپ کا حق اولاد پر دادا سے زیادہ ہے۔ اگرچہ دادا دنیا میں آنے میں باپ سے پہلے ہے لیکن اولاد کا رشتہ دادا سے باپ کے ذریعہ سے ہی قائم ہوا۔

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ

یہ لوگ اوپر ہدایت سے پالنے والا اپنے اور یہ لوگ وہ

وہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں

الْمُفْلِحُوْنَ ۝

کامیاب

اور وہی مراد کو پہنچنے والے

تعلق

اس آیت کو پہلے سے چند طرح تعلق ہے عبارت کے لحاظ سے تو اس طرح کہ یا تو یہ الذین کی خبر ہے اور یا یہ علیحدہ جملہ کہ اُولٰٓئِكَ ابتداء عَلٰی هُدًی اخیر تک اس کی خبر مضمون کے لحاظ سے چند طرح تعلق ہے۔ **اولاً:** یہ کہ یہ آیت گزشتہ آیتوں کا نتیجہ ہے۔ اس طرح کہ پہلے اعمال کا ذکر ہوا۔ اب اس کے انجام کا۔ یعنی جن لوگوں میں پہلی بیان کی ہوئی صفتیں ہوں۔ ان کا انجام یہ ہے کہ وہ ہدایت پر بھی ہیں اور کامیاب **دوسرے** یہ کہ یہ پہلی آیتوں کی علت ہے یعنی قرآن کریم ان لوگوں کے لئے ہدایت ہے جن میں وہ پہلی بیان کی ہوئی صفتیں ہوں ان کے لئے ہدایت کیوں ہے۔ اس لئے کہ وہ رب تعالیٰ کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور کامیاب ہیں۔ خیال رہے کہ اس ہدایت میں اور هُدًی لِّلْمُتَّقِيْنَ کی ہدایت میں فرق کرنا ضروری ہوگا تا کہ علت اور معلول میں یا عمل اور اس کے انجام میں فرق ہو جائے اس کو ہم هُدًی لِّلْمُتَّقِيْنَ کے ماتحت تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اور اس جگہ بھی تفسیر میں کچھ عرض کر دیں گے۔

تفسیر

اُولٰٓئِكَ اسم اشارہ ہے اشارہ کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ سننے والے کو محسوس ہو یا تو اس طرح کہ وہ اس کو دیکھ رہا ہو یا اس طرح کہ اس کے اوصاف ایسے بیان کر دیئے جائیں کہ وہ مثل محسوس کے بن جائے لہٰذا اگر الْمُتَّقِيْنَ سے جماعت صحابہ مراد تھی تو یہ اُولٰٓئِكَ پہلی قسم کا اشارہ ہوگا یعنی یہ صدیق و فاروق اور مہاجرین و انصار وغیرہم ہدایت پر ہیں۔ اور اگر عام جماعت متقین مراد تھے تو یہ اشارہ ذہنی ہوگا یعنی قیامت تک کے وہ لوگ جن کی یہ صفتیں ہیں وہ ہدایت پر ہیں۔ لیکن چونکہ ہماری نگاہوں سے جماعت صحابہ کرام بھی غائب ہے۔ اس لئے ہمارے لئے ذہنی ہی ہوگا۔ اس اشارہ میں سارے گزرے ہوئے اور موجودہ اور آئندہ پرہیزگار شامل ہیں۔ عَلٰی هُدًی میں عَلٰی اس لئے بڑھایا گیا کہ عَلٰی غلبہ کے لئے آتا ہے جیسے کہتے ہیں کہ زید سواری پر ہے۔ یعنی زید سواری پر ہے اور وہ سواری زید کے قبضے میں ہے اسی طرح اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ لوگ ہدایت پر غالب ہیں اور یہ ہدایت ان کے قبضے میں آ چکی ہے کہ ان شاء اللہ وہ ان سے چھوٹ نہیں سکتی۔ کیونکہ وہ ان کے رب کا عطیہ ہے اور وہ ہمیشہ اس کو مضبوطی سے پکڑے رہے ہیں نفس اور شیطان اور دنیوی تفکرات اور دیگر راحتیں مصیبتیں ان کو اس ہدایت سے ہٹا نہیں سکتیں۔ اور وہ ان تمام سے اس طرح گزر جاتے ہیں جیسے کہ کشتی دریا سے هُدًی کے نکرہ ہونے سے معلوم ہوا کہ وہ تمامی قسم کی ہدایتوں پر ہیں وہ اس راستہ پر چل رہے ہیں کہ جو جہنم سے بچتا ہوا جنت میں ہوتا ہوا اللہ کے محبوبوں اور مقربین سے ملاتا ہوا رب تک پہنچا دیتا ہے مِّنْ رَّبِّهِمْ میں نہایت نفیس اشارہ ہوا کہ جو کچھ ان کو ملا ہے یہ ان کے

رب کے کرم سے کیونکہ سارے اعمال اسباب ہیں۔ حق تعالیٰ مسبب الاسباب ان کو یہ اعمال ملے وہ بھی اس کے کرم سے ان اعمال پر قائم رہے وہ بھی اس کے کرم سے اور اعمال کے باطل کرنے والی چیزوں سے محفوظ رہے یہ بھی اس کے کرم سے اور انہیں جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ بھی اس کے کرم سے (وَاُولٰٓئِكَ) دوبارہ اس لئے لایا گیا کہ پہلے متقیوں کی دو قسم کی صفتیں بیان ہوئی تھیں۔ ایک تو ایمان بالغیب نماز کا قائم کرنا راہ الٰہی میں خرچ کرنا دوسرے تمام آسمانی کتابوں پر ایمان لانا اور آخرت کا یقین کرنا پہلی صفتوں کے لحاظ سے وہ ہدایت پر ہوئے اور دوسری صفتوں کے لحاظ سے کامیاب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پہلی صفتیں عام مسلمانوں کی تھیں اور دوسری صفتیں علماء کرام وغیرہم کی تو اب یہ کہا گیا کہ عام مسلمان ہدایت پر ہیں۔ اور خاص علماء کرام وغیرہم کامیاب جیسے قرآن کریم نے اس طرح اشارہ فرمایا کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (الاعلیٰ: ۱۴) کامیاب وہ ہوا جس نے تزکیہ نفس (قلب کی صفائی) کیا دوسری جگہ ارشاد فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ يَهْدِيْهِمْ رَبُّهُمْ (یونس: ۹) ان آیتوں میں ایمان و عمل کے ساتھ ہدایت کا ذکر ہوا۔ اور صفائی قلب کے ساتھ فلاح یعنی کامیابی کا (هم) سے معلوم ہوتا ہے کہ کامیابی انہی لوگوں کے ساتھ خاص ہے۔ یہود و نصاریٰ جو اپنی کامیابی کے خواب دیکھ رہے ہیں اس خواب کی تعبیر کبھی ظہور میں نہ آئے گی۔ ان کی حالت اس پیاسے کی طرح ہے جو دوپہری میں ریت کو دریا سمجھ کر اس طرف محبت اور محنت سے جائے لیکن وہاں پہنچ کر سخت مایوس ہو۔ کفار اور مشرکین کے سارے اچھے اعمال کا یہی حال ہے (الْمُفْلِحُوْنَ) یہ فلاح سے بنا ہے۔ فلاح کے لغوی معنی ہیں چیرنا اور کھلنا اور قطع کرنا اسی لئے کسان کو فلاح کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین کو چیرتا ہے اصطلاح میں فلاح کے معنی ہیں کامیابی کیونکہ وہ بھی آڑوں اور پردوں کو چیر کر مشکلات کو دفع کر کے حاصل کی جاتی ہے تو معنی یہ ہوئے کہ اس قسم کے لوگ دنیا اور برزخ اور آخرت ہر جگہ کامیاب ہیں۔ خیال رہے کہ ہدایت و کامیابی سے مراد دنیا کی ہدایت و کامیابی ہے تو معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ دنیا میں اچھے عقیدوں پر ہیں اور اچھے اعمال کی توفیق والے ہیں، امیری، فقیری سلطنت وغیرہ ہر حال میں کامیاب ہیں۔ اگر برزخ کی ہدایت و فلاح مراد ہے تو معنی یہ ہیں کہ مرتے وقت حسن خاتمہ اور قبر میں سوالات کے جوابات کی ہدایت پر ہیں پھر برزخی نعمتوں سے کامیاب ہیں۔ اگر قیامت کی ہدایت و فلاح مراد ہے تو مطلب یہ ہے کہ قیامت میں سوالات ملائکہ کے جوابات کی ہدایت پالیں گے۔ پھر رب کی مغفرت سے کامیاب ہوں گے۔

تفسیر صوفیانہ

صوفیا کرام فرماتے ہیں کہ متقی کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو ایک میدان میں جارہا ہے جس میں جگہ جگہ کانٹے اور انگارے غار پھسلنیں ہیں۔ وہ عقلمند بہت احتیاط سے اپنے کو کانٹوں اور غاروں وغیرہ سے بچاتا ہوا اور صاف جگہ پر قدم رکھتا ہوا۔ لالٹین سے کام لیتا ہوا چلا جارہا ہے یہ شخص ان شاء اللہ ہدایت پر بھی رہے گا اور منزل مقصود کو بھی جلد پالے گا۔ دوسرا وہ شخص ہے کہ جس کے پاس کوئی روشنی نہیں جس سے وہ ان مصیبتوں کو دیکھ سکے اور اس کٹھن راستہ کو طے کر سکے۔ یہ شخص کبھی منزل مقصود کو نہیں پاسکتا یا تو کسی غار میں گر کر ہلاک ہوگا۔ اگر آگ میں پڑ گیا تو جل گیا۔ تیسرا وہ شخص ہے جس کے پاس روشنی تو ہے لیکن وہ چلنے میں بے احتیاطی کرتا ہے اس طرح کہ آگ اور غار سے تو بچتا ہے لیکن کانٹوں کا خیال نہیں رکھتا۔ یہ شخص اگرچہ

منزل مقصود تک پہنچ جائے گا لیکن زخمی ہو کر اور بہت دیر کے بعد یہ دنیا ایک خار، غار اور آگ والا میدان ہے۔ سینما اور شراب خانے وغیرہ کانٹے ہیں جو اس جگہ بکھرے ہوئے ہیں۔ کفر پھیلے ہوئے انگارے ہیں اور شرک یہاں کے غار تمام لوگ اس میدان کو طے کر رہے ہیں لیکن متقی مسلمان کے پاس قرآن پاک کا گیس ہے اور اپنے تقویٰ کی وجہ سے نہایت احتیاط سے اس کو طے کر رہا ہے۔ نیکی کی جگہ قدم رکھتا ہے۔ برے مقامات سے بچتا ہے گناہگار مسلمان کے پاس بھی یہ روشنی تو ہے اور وہ کفر شرک کی باتوں سے بچتا ہے۔ لیکن بے احتیاطی کی وجہ سے خود کو گناہوں کے کانٹوں میں پھنسا دیتا ہے اور کافر چونکہ قرآن پاک کی روشنی سے علیحدہ ہے اس لئے وہ یا تو شرک کے غار میں گر کر ہلاک ہوتا ہے یا کفر کی آگ سے جل کر تو متقی ہدایت پر بھی ہے اور اعلیٰ درجہ کا کامیاب بھی۔ اور گنہگار مسلمان ہدایت پر تو ہے لیکن اول نمبر کا کامیاب نہیں۔ اور کافر نہ ہدایت پر نہ کامیاب۔ صوفیاء کرام یہ بھی فرماتے ہیں کہ کامیابی کے تین انجام ہیں۔ اولاً نفس اور دنیا اور شیطان اور برے ساتھیوں پر غالب رہنا دوسرے کفر و گمراہی اور جہالت اور نفس کے دھوکے اور شیطان کے وسوسوں اور قبر کی وحشتوں، قیامت کی دہشتوں اور پل صراط کی پھسلنوں اور جنت کی محرومی اور عذاب کی سختیوں سے نجات پا جانا۔ تیسرے ابدی ملک اور سرمدی نعمتوں اور لازوال رحمتوں اور دائمی سرور اور بے گرد و غبار کی تندرستی اور بے حجاب محبوب کو پالینا حق تعالیٰ ہم کو نصیب فرمائے۔ نیز صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ ایک ہی راستہ کو کوئی شخص پیدل طے کرتا ہے۔ دوسرا گھوڑے پر تیسرا برق رفتار موٹر کار پر جتنی تیز سواری ہوگی اسی قدر جلد راستہ طے ہوگا طریقت نہایت تیز سواری ہے۔ اور شریعت نہایت مضبوط اور احتیاط کی سواری شریعت میں پھسلن کم مگر رفتار آہستہ اور طریقت میں رفتار تیز خطرات بہت زیادہ اس کو مثنوی شریف میں یوں بیان فرمایا۔

یک زمانہ صحبت با اولیاء بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

یعنی اللہ والوں کی ایک آن صحبت سو برس کی خالص عبادت سے بہت زیادہ نافع ہے نیز شریعت میں اپنے آپ جانا ہوتا ہے اور طریقت میں کسی اور کی طرف سے کشش ہوتی ہے۔ تو ھُدًی سے مراد شریعت پر چلنا ہے اور فلاح سے مراد رب کا اپنی طرف کھینچنا ہے۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ جو شخص نیک اعمال کی نار (آگ) سے اپنے وجود کے حجاب کو جلا دیتا ہے اور دنیا سے نگاہ پھیر کر آخرت کا مشاہدہ کرتا ہے تو اس کو رحمت ربانی اپنی طرف اس طرح جذب کر لیتی ہے کہ وہ رحمت جاذب اور یہ مجذوب بلکہ یوں کہو کہ وہ طالب اور یہ مطلوب ہوتا ہے۔ اس کلام کی کوئی انتہا نہیں یہ حال ہے اس کو قال سے بیان نہیں کیا جا سکتا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں میں پرہیزگاروں کی سی چھ صفتیں ہوں وہ ہدایت بھی پائیں اور کامیاب بھی ہوں۔ لہٰذا گنہگار مسلمان چونکہ نماز اور زکوٰۃ کے پابند نہیں ہوتے اور وہ ان دو صفتوں سے محروم ہیں چاہئے کہ وہ ہدایت اور کامیابی دونوں سے محروم ہوں **جواب:** متقیوں کی جو چھ صفتیں بیان کی گئیں ہیں ان میں سے بعض اصل ہیں کہ جن کے نہ ہونے سے انسان ہدایت اور کامیابی سے بالکل محروم رہے گا اور بعض صفتیں فرعی ہیں کہ جن کے نہ ہونے سے انسان کامل ہدایت اور کامل کامیابی نہیں حاصل کر سکتا عقائد یعنی غیب پر ایمان وغیرہ یہ اصل صفتیں تھیں۔ اور اعمال و نماز و

زکوٰۃ کا ادا کرنا کامل کامیابی کے حاصل کرنے کے لئے ہے ان آیتوں کا مطلب یہ ہے کہ جن میں یہ عقائد اور یہ اعمال پائے جائیں وہ کامل ہدایت پر ہیں اور کامل کامیاب اور جن میں یہ اوصاف نہ ہوں وہ کامل کامیاب نہ ہوں گے اگر عقائد درست نہ ہیں۔تو کامیابی سے یکسر محروم اور اگر صرف اعمال بگڑے ہوئے ہیں تو ناقص کامیاب۔

آریوں کا اعتراض: خدا تعالیٰ کی یہ بے جا طرفداری ہے۔کہ مسلمانوں کے اعمال تو قبول کرے اور غیر مسلموں کے اعمال رد کردے جب دونوں ایک ہی سے اعمال کررہے ہیں تو یہ فرق کیوں ایک ہندو کنواں کھدواتا ہے پل بنواتا ہے اور صدقہ خیرات کرتا ہے وہ تو بالکل قبول نہ ہوں۔اور ایک مسلمان ان میں سے دسواں حصہ بھی کرے تو خدا کا پیارا بن جائے۔

جواب: ایک شخص نہایت عمدہ حلوا بناتا ہے۔جس میں کہ سوجی، بادام، گھی، شکر وغیرہ خوب اچھی طرح ڈالتا ہے۔لیکن اس میں چھٹانک بھر سنکھیا بھی حل کرکے ملا دیتا ہے دوسرے آدمی نے حلوا تو معمولی بنایا لیکن اسے زہر سے محفوظ رکھا۔یقیناً اس بے وقوف مالدار کا قیمتی حلوا ہلاک کردے گا اور اس عقلمند غریب کا معمولی حلوہ فائدمند ہوگا یہ نیک اعمال حلوے کے اجزاء ہیں اور کفر زہر کافر جو نیک کام بھی کرتا ہے۔اس میں کفر کا زہر موجود ہوتا ہے لہٰذا اس کے اعمال بے کار ہیں اور مسلمان اگرچہ معمولی نیک کام کرے لیکن اس کے اعمال کفر کے زہر سے محفوظ ہیں۔لہٰذا کارآمد۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ
تحقیق وہ لوگ کافر ہوئے برابر ہے پر اُن خواہ ڈرائیں آپ انہیں یا نہ
بے شک وہ جن کی قسمت میں کفر ہے انہیں برابر ہے چاہے تم انہیں ڈراؤ یا نہ
لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۶﴾
ڈرائیں وہ نہیں ایمان لائیں گے
وہ ایمان لانے کے نہیں

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح کا تعلق ہے۔**اولاً** یہ کہ ان آیتوں میں حق تعالیٰ کے مقبول بندوں کا ذکر تھا۔اب ان کے مقابلے میں مردودوں کا ذکر فرمایا گیا کیونکہ ہر چیز اپنے مقابل کے ذریعہ پورے طور پر پہچانی جاتی ہے۔دن رات کے ذریعے سے اور نور ظلمت کے ذریعہ سے خوب ظاہر ہوتا ہے **دوسرا** یہ کہ مقبولوں کی ان صفتوں کا ذکر تھا۔جن سے انہوں نے ہدایت اور کامیابی پائی۔اور مردودوں کی ان صفتوں کا ذکر فرمایا گیا جن کی وجہ سے وہ ہدایت و کامیابی سے محروم رہے اور ہدایت کی حکمت یہ ہے کہ دونوں قسم کی صفتوں کا ذکر کردیا جائے تاکہ سننے والے بہتری کے اسباب کو حاصل کریں اور برائیوں کے اسباب سے بچیں۔**تیسرا** یہ کہ پہلے فرمایا گیا تھا کہ قرآن کریم ان پرہیزگاروں کے لئے ہدایت ہے جن میں پہلی ذکر کی ہوئی چھ صفتیں ہوں۔اب ارشاد ہوا کہ قرآن کریم ان کے لئے ہدایت نہیں۔جن میں یہ آنے والی صفات ہوں جس سے

معلوم ہو جائے کہ وہ چیزیں ہدایت کی علتیں تھیں اور یہ محرومی کی۔ایک قابل طبیب مریض کو علاج کی تدبیریں بھی بتاتا ہے اور پرہیز کی چیزیں بھی کہ فلاں فلاں چیزیں مضر ہیں۔تاکہ مریض وہ تدبیر کرے اور ان نقصان دہ چیزوں سے بچے۔

شان نزول

یہ آیت کریمہ ابوجہل وابولہب وغیرہ ان کفار کے حق میں نازل ہوئی جو علم الٰہی میں ایمان سے محروم تھے حضور ﷺ ان کے ایمان نہ لانے سے غمگین ہوتے تھے۔تب یہ آیت اتری اور حق تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کو تسلی دی کہ نہ تو آپ کی تبلیغ میں کوتاہی ہے اور نہ ہمارے کلام میں کچھ نقصان۔ان کا ایمان نہ لانا خود ان کی بدنصیبی ہے اور محرومی کی وجہ سے ہے آپ اس پر غمگین نہ ہوں۔

تفسیر

اِنَّ اس کے معنی ہیں تحقیق یا بے شک یہ اس مقام پر بولا جاتا ہے۔جہاں کوئی شخص کلام کا انکار کر رہا ہو یا خود کلام ایسا اہم ہو کہ جس کے انکار کا اندیشہ ہو۔چونکہ یہ مضمون بہت اہم تھا۔اور ناسمجھ لوگ یقیناً اس کا انکار کرنے والے تھے اس لئے کلام کی اہمیت سمجھانے کیلئے اس جگہ اِنَّ فرمایا گیا اَلَّذِیْنَ سے یا تو خاص لوگ مراد ہیں جیسے ابوجہل، ابولہب اور ولید ابن مغیرہ وغیرہم اور یا عام وہ کفار مراد ہیں جن کی ضد اور ہٹ دھرمی ان کی طرح ہو۔خیال رہے کہ قرآن پاک کی عبارت کے عموم کا لحاظ ہوتا ہے۔نہ کہ واقعہ نزول کے خصوص کا یعنی اگرچہ یہ آیت خاص چند لوگوں کے حق میں اتری۔لیکن چونکہ اس کے الفاظ عام ہیں اس لئے اس آیت سے وہ سب مراد ہو سکتے ہیں جو ازلی کافر ہوں کفروا کفر سے بنا ہے۔کفر کے لغوی معنی ہیں چھپانا اور ڈھکنا اس لئے چھلکے کو کفور کہتے ہیں کیونکہ وہ مغز کو ڈھانپے ہوتا ہے کافور کو بھی کافور اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی بو تمام بوؤں کو ڈھک لیتی ہے شریعت میں کفر کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کے وجود یا اس کی توحید یا کسی نبی کی نبوت یا دینی ضروریات میں سے کسی چیز کا انکار کر دینا دینی ضروریات وہ چیزیں ہیں جن کو عام مسلمان جانتے ہوں کہ وہ دینی چیزیں ہیں۔یا وہ کہ جن کا جاننا دین میں داخل ہونے کیلئے ضروری ہو تو سمجھو کہ جس چیز کو مان کر انسان مسلمان ہوتا ہے۔اس کا انکار کر کے کافر بن جاتا ہے۔

تمتہ: بعض کام وہ ہیں جن کو شریعت نے دین کے انکار کا نشان قرار دیا۔جیسے زنار باندھنا اور سر پر ہندوانی چوٹی رکھنا وغیرہ یہ کام بھی کفر ہیں کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا کرنے والا بے دین ہو چکا ہے یوں سمجھو کہ جو کام کفار کے دینی نشان بن چکے ہوں یعنی جن کو دیکھ کر لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ یہ کوئی کافر ہے ان کا کرنا مسلمانوں کے لئے کفر ہے۔جیسے قشقہ لگانا۔چوٹی رکھنا۔اور جو کام کفار کے نشان ہوں وہ مسلمان کے لئے حرام جیسے کہ ہیٹ لگانا اور ہندوانی دھوتی باندھنا، قرآن کریم میں کفر چار معنی میں استعمال ہوا ہے۔ایک ایمان کا مقابل دوسرے انکار کرنا تیسرے شکر کا مقابل یعنی ناشکری جیسے وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ (البقرہ:۱۵۲) چوتھے بیزاری جیسے یَكْفُرُ بَعْضُكُمْ بِبَعْضٍ (عنکبوت:۲۵) یہاں پہلے معنی مراد ہیں۔کیونکہ اس سے پہلے ایمان کا ذکر ہو چکا ہے کفر چار طرح کا ہے۔کفر انکار وہ یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کو جانے ہی نہیں۔جیسے کہ رب سے بے خبر کفار دوسرے کفر جحود وہ یہ کہ رب کو دل سے جانے مگر زبان سے اقرار واعتراف نہ کرے جیسے کہ ابلیس اور ضدی کافروں کا

کفر، تیسرے کفر عناد، وہ یہ کہ دل سے جانے بھی زبان سے بول دے۔ لیکن کسی وجہ سے اس کی اطاعت نہ کرے۔ جیسے ابو طالب کا کفر کہ وہ فرماتے ہیں۔ شعر

وَلَقَدْ عَلِمْتُ بِاَنَّ دِيْنَ مُحَمَّدٍ مِنْ خَيْرِ اَدْيَانِ الْبَرِيَّةِ دِيْنًا

لَوْلَا الْمَلَامَةُ اَوْ حِذَارُ اَوْ مُسَبَّةٌ لَوَجَدْتَنِيْ سَمْحًا بِذَاكَ مُبِيْنًا

اور جیسے کہ آج کل کے وہ ہندو وغیرہ جو کہ حضور ﷺ کی نعتیں لکھتے ہیں اور ان میں حضور ﷺ کی حقانیت کا اقرار کرجاتے ہیں لیکن مسلمان نہیں ہوتے۔ چوتھے کفر نفاق وہ یہ ہے کہ زبان سے اقرار کرے اور دل میں اعتقاد نہ ہو۔ (تفسیر روح البیان) یہاں دوسری قسم کا کفر مراد ہے ابو طالب کے ایمان اور کفر کی بحث انشاء اللہ کسی اور جگہ کی جائے گی اس میں بہت گفتگو کی گئی ہے کہ یہاں کون سا کفر اور کون سے کفار کی طرف اشارہ ہے کیونکہ تمام کافر تو ایسے نہ تھے جن کے ایمان سے ناامیدی ہو۔ صدہا کافر مسلمان ہوئے اور یہاں مایوسی کا اظہار فرمایا جارہا ہے اس لئے بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ کافر ہیں جو ضد کی وجہ سے کافر ہوئے بعض تو بے علمی کی وجہ سے کافر رہے اور بعض شبہات کی وجہ سے ان دونوں کے ایمان کی امید ہوتی ہے کہ اگر ان کو اسلام کا صحیح علم ہو جائے یا ان کے شبہات دور ہو جائیں تو وہ ایمان لے آئیں لیکن بعض ایسے ہوتے ہیں کہ ہر بات کو جان کر سمجھ کر محض ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اسلام قبول نہیں کرتے ان کے ایمان کی کوئی امید نہیں کیونکہ ضد کا علاج کسی عالم کے پاس اور وہم کی دوا کسی طبیب کے پاس نہیں ضد کی چند وجہیں ہوتی ہیں ایک یہ کہ رہبر کی ذات سے عناد ہو تو وہ اس کی ہر بات کا انکار ہی کرتا ہے۔ دیکھو ابلیس حضرت آدم علیہ السلام کے حسد و عناد کی وجہ سے کافر ہوا تو رب کا حکم سجدہ سن کر فرشتوں کو سجدے کرتے دیکھ کر بھی ایمان نہ لایا کیونکہ کلام کا اثر متکلم کی عظمت سے ہوتا ہے عشق مصطفیٰ دل میں کفر آنے نہیں دیتا۔ عداوت مصطفیٰ دل میں ایمان آنے نہیں دیتی۔ دوسرے اپنے کافر باپ دادوں کی بے جا حمایت کہ ان کی ہر بات مانیں گے خواہ وہ غلط ہو یا صحیح تیسرے خود اس فرمان سے ضد جو رہبر فرمارہا ہے یہ تینوں قسم کے ضدی لوگ ایمان سے یکسر محروم ہیں بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس عالم کے علاوہ ایک اور عالم بھی ہے جسے امثال یا عالم غیب کہتے ہیں جو کچھ یہاں ہو رہا ہے یا ہونے والا ہے وہ سب کچھ پہلے ہو چکا ہے گویا کہ عالم ظہور یا عالم شہادت اس عالم غیب کا سایہ ہے تو ان سے مراد وہ لوگ ہیں جو عالم امثال میں کافر ہو چکے ہیں یعنی ازلی کافر اسی کی طرف وہ حدیث شریف اشارہ کرتی ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ تمام روحیں مثل چیونٹیوں کے حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے نکالی گئیں جن میں سے بعض سفید اور بعض کالی تھیں نیز حدیث معراج میں آتا ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اس حال میں دیکھا کہ ان کے دائیں بائیں روحیں تھیں داہنی طرف دیکھ کر خوش اور بائیں طرف دیکھ کر غمگین ہوتے تھے۔ حضرت جبریل نے عرض کیا کہ یہ ان کی اولاد کی روحیں ہیں داہنی طرف مومنین اور بائیں طرف کفار ہیں غرضیکہ دوسرے عالم میں دو قسم کے لوگ تھے بعض کافر اور بعض مومن یہاں وہ ہی کفار مراد ہیں بعض علماء کرام فرماتے ہیں اس سے وہ کفار مراد ہیں جن کے متعلق علم الٰہی میں آچکا ہے کہ کافر مریں گے اسکے متعلق بھی مختلف احادیث وارد ہیں بہت سے وہ لوگ جو اس وقت مومن ہیں مگر حق تعالیٰ کے علم میں وہ کافر ہیں اور

بہت سے وہ لوگ ہیں کہ جو بظاہر یہاں کافر ہیں اور حق تعالیٰ کے علم میں مومن ہیں ان کا اخیر حق تعالیٰ کے علم کے مطابق ہی ہوگا وہی لوگ یہاں مراد ہیں تو آیت کا مقصود یہ ہوا کہ اے نبی ﷺ قرآن اور آپ کا کام ہدایت دینا اور راہ بتانا ہے نہ کہ کسی چیز کی حقیقت کو بدل دینا جس طرح کہ ہادی کی تعلیم سے جانور انسان نہیں بن سکتا اسی طرح ازلی بدبخت نیک بخت نہیں ہو سکتا جو وہاں نور سے محروم رہا ہے انہیں یہاں کون منور کرے؟ سَوَآءٌ اور اِسۡتِوَاءٌ ایک ہی معنی میں آتے ہیں یعنی برابر ہونا مگر یہاں یہ مصدر اسم فاعل کے معنی میں ہے یعنی برابر عَلَیۡھِمۡ سے اس جانب اشارہ ہے کہ آپ کا ان کو ڈرانا اور نہ ڈرانا ان کے لئے برابر ہے کہ وہ بہر حال ایمان نہ لائیں گے مگر اے محبوب آپ کے لئے برابر نہیں کیونکہ آپ تبلیغ کا ثواب پائیں گے یہ تبلیغ آپ کے لئے بہت مفید اور ان کے لئے بیکار اسی لئے حضور نے آخر تک ان کفار کو بھی تبلیغ فرمائی جن کا کفر پر مرنا یقینی تھا۔ عبداللہ بن ابی منافق کا جنازہ پڑھا دینا بھی تبلیغ کے لئے تھا جس سے بہت سے منافق مخلص بن گئے اور نماز اس میت کے لئے بیکار تھی مگر حضور کے لئے ثواب کا باعث کہ تبلیغ عملی تھی۔ ڈاکٹر مایوس مریض کو آخر دم تک دوا دیتا ہے جس پر فیس اور دوا کی قیمت ملتی ہے اگرچہ بیمار نہ بچے بادل ہر زمین پر برستا ہے جس کے لئے دنیا میں وعظ بیکار ہے اس کے لئے آخرت میں جہنم کی آگ پر صبر اور بے صبری برابر ہوگی اور جس کے لئے جوانی اور بڑھاپا تندرستی اور بیماری آرام اور تکلیف ظاہر اور چھپا ہوا گناہ برابر ہو یعنی ہر حال میں گناہ کرے۔ اس کے لئے خوف ہے کہ موت کے وقت توبہ کرنا اور نہ کرنا برابر ہو ایسے ہی اللہ والوں سے ملنا اور نہ ملنا برابر ہو۔ شفاعت ہونا نہ ہونا برابر ہو (تفسیر تیسیر) ءَاَنۡذَرۡتَھُمۡ انذار سے بنا ہے جس کے لغوی معنی ہیں خطرناک چیز کی اطلاع دینا یعنی ڈرانا۔ اور شریعت میں عذاب الٰہی سے ڈرانے کو انذار کہتے ہیں جو شخص دنیوی مصیبتوں سے کسی کو ڈرائے اسکو شرعاً منذر کہا جاتا ہے۔ **نکتہ:** نبی ڈراتے بھی ہیں اور خوشخبریاں بھی دیتے ہیں اس لئے ان کو نذیر اور بشیر کہا جاتا ہے اس آیت میں فقط ڈرانے کا ذکر فرمایا گیا مگر بشارت کا ذکر نہ ہوا اس لئے کہ انسان ڈر سے زیادہ اطاعت کرتا ہے بڑے سے بڑا مجرم جیل خانہ کے خوف سے جرم سے باز آتا ہے مثل مشہور ہے کہ حجت وہاں کام آتی ہے جہاں بات کام نہیں آتی۔ جب ان بے دینوں کے لئے ڈرانا ہی مفید نہ ہوا تو بشارت کیا فائدہ دے گی اس لئے ڈرانے کے ساتھ بشارت کا ذکر نہ فرمایا گیا نیز ڈرانا مقدم اور بشارت بعد میں جب وہ اس درجہ سے نکلے ہی نہیں۔ اور بشارت کی حد میں ہی نہ آئے تو نہیں بشارت کس طرح دی جا سکتی تھی۔ لَا یُؤۡمِنُوۡنَ میں غیب کی خبر ہے۔ اور یہ خبر بالکل سچی ثابت ہوئی کہ آخر کار وہ لوگ ایمان نہیں لائے۔ اس جگہ یہ فرمایا گیا کہ وہ ایمان نہ لائیں گے اور یہ نہ کہا گیا کہ وہ ایمان لانے پر قدرت نہیں رکھتے تاکہ یہ معلوم ہو کہ ان کا یہ کفر اختیاری ہے وہ اس میں مجبور نہیں ہیں۔ کیونکہ علم الٰہی میں یہ آیا ہے کہ وہ اپنی خوشی اور اپنے اختیار سے کافر رہیں گے تو جس طرح ان کا کافر رہنا یقینی ہے۔ اسی طرح ان کا مختار بننا بھی یقینی ہے۔ مجبور و معذور کو حق تعالیٰ عذاب نہیں دیتا۔ ہماری اس مختصر تقریر سے تقدیر کا بڑا مسئلہ بھی حل ہو گیا اس کی پوری بحث ان شاء اللہ کسی اور مقام پر کی جائے گی۔

تفسیر صوفیانہ

اس آیت میں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ جنہوں نے میثاق کے دن بلٰی کہہ کر ہماری ربوبیت کا اقرار کیا اور بعد میں اپنے دل کے

صاف آئینے کو اعمال بد سے اس قدر خراب کرلیا کہ وہ صیقل کے قابل نہ رہا اور جنہوں نے کہ اپنی نفیس ارواح کے پرندوں کو قالب کے پنجرے میں ہونے کے بعد پانچوں حواس کے روزنوں کے ذریعہ اس دنیا کو اس طرح دکھایا کہ وہ اپنے اصلی وطن کو بھول گئے۔ اور نفس اور شیطان کی صحبت میں روح کو ایسا مانوس کیا۔ کہ وہ اپنے اس پرانے وطن کے دوستوں سے منہ موڑ بیٹھی وہ لوگ اب اس قابل نہ رہے کہ وطن کو یاد کریں صوفیاء کرام یہ بھی فرماتے ہیں کہ لفظ انسان انس سے بنا ہے جس کے معنی ہیں محبت چونکہ انسان ہر انیس یعنی ساتھی کا اثر بہت جلد لیتا ہے اس لئے اسے انسان کہتے ہیں۔ لہٰذا اگر انسان کے ساتھی اچھے ہوں گے تو انسان بھی اچھا رہے گا اور برے ساتھیوں سے خود برا ہو جائے گا انسانوں کو ناس بھی کہتے ہیں ناس کے معنی ہیں بھولنے والا یہ بھی شیطان کی صحبت اور دنیا کے میدان میں آ کر اللہ کو بھول جاتے ہیں اس لئے ان کو ناس کہا جاتا ہے نیز صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ روح دو چیزوں کو دیکھتی ہے ایک تو دنیا کو دوسرے آخرت کو دنیا کو دیکھنا، آنکھ، ناک، کان وغیرہ روزنوں کے ذریعے سے اور آخرت کا دیکھنا خفیہ روزنوں سے ہے جو انسان ہر وقت دنیا میں مشغول رہے گا۔ آخر کار آخرت کے روزن سب بند ہو جائیں گے جس کو قرآن کریم فرما رہا ہے۔ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (محمد: ۲۴)

اعتراضات

پہلا اعتراض: جب حق تعالیٰ کے علم میں یہ بات آچکی کہ وہ ایمان نہ لائیں گے۔ تو ان کی تبلیغ سے کیا۔ فائدہ: چاہئے تھا کہ ان کو تبلیغ بھی نہ کی جاتی۔ **جواب:** تبلیغ سے دو فائدے ہوئے ایک تبلیغ کرنے والے کو دوسرے اس کو جس کو تبلیغ کی جائے۔ یہاں ایک فائدہ فوت ہو چکا۔ مگر دوسرا فائدہ یعنی مبلغ کا ثواب باقی ہے۔ اس لئے تبلیغ بے کار نہ ہوئی نیز اس تبلیغ کی وجہ سے قیامت کے دن اس کفار کا منہ بند ہو جائے گا اور وہ اپنی بے علمی کا عذر نہ کرسکیں گے۔ **دوسرا اعتراض:** جب رب کو خبر تھی کہ وہ ایمان نہ لائیں گے تو ان کو ہلاک کیوں نہ کر دیا جیسے کہ قوم نوح علیہ السلام کو ان کے ایمان نہ لانے کی خبر دے کر ہلاک کر دیا گیا۔ **جواب:** اس لئے کہ ہمارے نبی ﷺ رحمۃ للعالمین ہیں آپ کے ہوتے ہوئے عام عذاب الٰہی نہیں آتا پہلے حق تعالیٰ کے جلال کا ظہور تھا۔ اور اب دنیا میں امن و امان کا دور دورہ ہے جس پر قرآن کریم شاہد ہے وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ (انفال: ۳۳) **تیسرا اعتراض:** جب کہ ان کی تقدیر میں یہ آچکا کہ وہ ایمان نہ لائیں گے۔ تو اب چاہئے کہ انہیں کفر کی سزا نہ ملے۔ کیونکہ وہ اپنے اس کفر میں مجبور ہیں۔ **جواب:** اس سوال سے معلوم ہوتا ہے کہ معترض تقدیر کی حقیقت نہیں سمجھا۔ تقدیر علم الٰہی کا نام ہے۔ اس علم میں جس طرح مجرم کا جرم داخل ہے ایسے ہی اس کا اختیار بھی یعنی حق تعالیٰ کو اس کے متعلق یہ علم ہوا کہ اس شخص کو ایمان لانے یا نہ لانے کا اختیار تو ہوگا۔ مگر یہ اپنی خوشی سے ایمان نہ لائے گا جب یہ کفر اختیاری ہوا۔ تو اس کی سزا ضرور ملنی چاہئے۔ **چوتھا اعتراض:** جب حق تعالیٰ نے ان کے کافر رہنے کی خبر دے دی۔ تو ان کا مسلمان ہونا ناممکن ہو گیا کیونکہ خدا کی خبر جھوٹی نہیں ہو سکتی تو ضروری ہوا کہ وہ اس کفر پر عذاب نہ پائیں گے۔ **جواب:** جس طرح کہ خداوند کریم کے جان لینے سے وہ کفر میں مجبور نہ ہوئے اسی طرح حق تعالیٰ کی خبر دینے سے بھی وہ کفر پر مجبور نہ ہوں گے کیونکہ خبر یہ دی گئی کہ وہ بخوشی کافر رہیں گے۔ اس خبر سے ان کا ارادہ سے کافر رہنا

ضروری ہوا۔ اور اس ارادہ کی وجہ سے وہ مختار رہے نیز یہ خبر ایسی ہے جیسے ایک طبیب کسی غافل مریض سے کہہ دے کہ تمہاری بیماری چوتھے درجے تک پہنچ چکی ہے جس کا علاج ناممکن ہے اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ تو نے اپنی بیماری سے بے پرواہی کر کے اور بد پرہیزی کر کے اسے اتنا بڑھا لیا کہ وہ علاج کے قابل نہ رہی۔ اس میں قصور بیمار کا ہی ہوگا۔ نہ کہ طبیب کا اسی طرح یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ ان کفار نے اپنے کفر کو اس حد تک پہنچا دیا ہے اور وہ ان کے دل میں اس قدر مضبوط ہو چکا کہ اس کا نکلنا ناممکن تو کفر کا اتنا قوی ہونا بھی ان کی اپنی ہی بے احتیاطیوں سے ہے۔ لہٰذا وہ ہی مجرم ہیں اور یہ دیکھا بھی گیا ہے کہ کسی کی مخالفت معمولی درجہ کی ہوتی ہے لیکن بڑھتے بڑھتے عناد ذاتی بن جاتی ہے۔ **پانچواں اعتراض:** جن کے متعلق قرآن کریم میں یہ خبر دی جا چکی ہے کہ وہ ایمان نہ لائیں گے۔ اب ان کا ایمان لانا کس طرح بھی ممکن نہ رہا کیونکہ اب اگر وہ ایمان لائیں بھی تو اس آیت کو مانیں گے یا نہیں۔ اگر انکار کریں تو کافر کیونکہ آیت کا انکار کفر ہے اور اگر نہیں تو کافر کیونکہ اس میں اپنے کو بے ایمان ماننا ہے اس لئے کہ اس آیت کا مضمون یہی ہے اور اپنے کو بے ایمان ماننا بھی کفر ہے اب بتاؤ ان کے لئے ذریعہ ایمان کیا رہا اوروں کیلئے قرآن کریم کو ماننا ایمان ہے اور ان کے لئے کفر **جواب:** اس قسم کے لوگ اگر ایمان لائیں تو اس آیت کو اس طرح مانیں گے کہ بعض لوگ ازلی کافر ہیں نہ یہ کہ ہم کیونکہ اس آیت کریمہ میں کسی کا نام لے کر یہ حکم نہیں لگایا گیا اور اس آیت کے مضمون کو اس طرح مان لینا یقیناً کفر نہیں۔ لہٰذا ان کے لئے اس آیت کا ماننا کفر نہ ہوا۔ اس کی پوری بحث انشاء اللہ مسئلہ تقدیر میں کی جائے گی۔

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰٓى
مہر کر دی خدا او پر دلوں ان کے اور او پر کانوں ان کے اور او پر آنکھوں ان کے
اللہ نے ان کے دلوں پر اور کانوں پر مہر کر دی اور ان کی آنکھوں پر
اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۫ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۷ ع
پردہ اور لیے ان کے سزا بڑی
گھٹا ٹوپ اور ان کے لئے بڑا عذاب

تعلق

اس آیت کا پہلی آیت سے یہ تعلق ہے کہ پہلے ان کفار کی صفات و حالات کا ذکر ہوا تھا اور اب اس کی وجہ بیان ہوئی کہ ان میں یہ صفات کیوں پیدا ہوئیں۔ یا پہلی آیت میں ان کفار کی صفات کا ذکر تھا۔ اور اس میں ان کے انجام کا یا پہلی آیت میں ان کی بیماری کا ذکر ہوا۔ اور اس میں اس بیماری کا وجہ کا تذکرہ اور یا پہلے بیماری کا ذکر تھا۔ اور اب اس کے نتیجے کا۔ لہٰذا یہ آیت پہلی آیت کی یا توجیہ ہے یا اس کا انجام۔

تفسیر

خَتَمَ اللّٰهُ ختم کے معنی ہی چھپانا۔ اور مضبوط کرنا اور انتہا کو پہنچنا مہر لگانے کو ختم اس واسطے کہتے ہیں کہ اس کی وجہ سے اندر کی چیز لوگوں کی نگاہوں سے چھپادی جاتی ہے۔ مثلاً کسی شخص نے کسی چیز کا پارسل کیا۔ تو اس کو تھیلے میں بھر کر اس پر لاکھ وغیرہ کی مہر لگادی جس سے کہ کوئی اس کو راستہ میں کھول نہ سکے۔ یہاں ختم سے مراد مہر لگانا ہے اور دل پر مہر لگانے سے یہ مطلب ہے کہ ان کی سرکشی اس حد تک پہنچ گئی کہ وہ کفر اور گناہوں کو اچھا سمجھنے لگے ایمان واطاعت کو برا اور کافر سرداروں کی طرف رغبت اور انبیاء اور اولیاء سے بے رغبتی کرنے لگے اب ان کے دلوں کا حال ایسا ہو گیا کہ نہ ان سے کفر نکل سکتا ہے اور نہ ان تک حق جا سکتا ہے۔ جیسے کہ مہر والا پارسل کہ نہ تو اس میں سے کوئی چیز نکل سکے اور نہ کوئی چیز باہر سے جا سکے۔ قرآن کریم نے اس حالت کو یہاں ختم سے بیان فرمایا۔ اسی حالت کو دوسری جگہ طبع سے بیان فرمایا۔ فَطُبِعَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (منافقون:۳) جس کے معنی ہیں چھاپنا تیسری جگہ اس حالت کو اغفال فرمایا اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ (کہف:۲۸)۔ جس کے معنی ہیں غافل کرنا چوتھی جگہ اقساء فرمایا قٰسِيَةً (مائدہ:۱۳) جس کے معنی ہیں سخت کرنا پانچویں جگہ اسے رین فرمایا رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ (المطففین:۱۴) ان سب الفاظ کے معنی قریب قریب ایک ہی ہیں دل پر کفر کی مہر لگ جانا حقیقت میں عذاب الٰہی ہے عَلٰى قُلُوْبِهِمْ قلوب جمع قلب کی ہے قلب کی معنی ہیں الٹا ہونا اور بدلنا کھوٹے روپے کو اسی لئے قلب کہتے ہیں کہ ہر شخص اسے الٹا واپس کرتا ہے اور بدلتا ہے، دل کو بھی قلب اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ بائیں پہلو میں اوندھا لٹکا ہوا ہے اور اس کا حال ہر وقت بدلتا رہتا ہے۔ ذرا میں متقی بنتا ہے ذرا میں بدکار کبھی خوش تو کبھی غمگین (وغیرہ وغیرہ) ہماری زبان میں تو قلب اس گوشت کے لوتھڑے کا نام ہے۔ جو غنچہ (یعنی کلی) کی شکل ہے اور سینے کے بائیں طرف لٹکا ہوا ہے روح اسی گوشت میں پیدا ہوتی ہے۔ اسی سے شریانیں رگوں کے ذریعہ ہر عضو میں پہنچ جاتی ہے۔ یہی ہر جاندار کی زندگی کی اصل ہے لیکن شریعت میں اس ربانی لطیفہ کا نام ہے۔ جس کا تعلق اس گوشت سے ہے اسی لطیفہ پر انسانیت موقوف ہے اور اسی سے رب کی فرمان برداری اور شریعت کی پابندی ہوتی ہے۔ قرآن کریم میں قلب کے اکثر یہی معنی مراد ہوتے ہیں جس طرح کہ اس گوشت کے ساتھ جان قائم ہے اسی طرح اس لطیفہ کے ساتھ ایمان قائم، اس پر الہام الٰہی ہوتا ہے اور یہی لطیفہ دلیلوں سے نتیجہ معلوم کرتا ہے۔ اس کو قرآن کریم نے کہیں قلب کہا ہے۔ جیسے لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ (ق:۳۷) اور کہیں نفس فرمایا ہے جیسے وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰىهَا (الشمس:۷) اور کہیں روح جیسے قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ (الاسراء:۸۵) (تفسیر عزیزی) اس کو مولانا جامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

نیست ایں پیکر مخروطیء دل — بلکہ ہست ایں قفس طوطی دل
گر تو طوطی ز قفس نہ شناسی — بخدا ناس نہ ای نہ شناسی

یعنی یہ غنچہ کی شکل والا دل نہیں ہے بلکہ یہ طوطی دل کا پنجرہ ہے۔ اگر تو اس پنجرہ اور طوطی میں فرق نہ کر سکے تو قسم خدا کی انسان نہیں۔ اردو میں بھی کبھی بولا کرتے ہیں۔ فلاں بڑا دل والا آدمی ہے۔ وہاں دل سے یہی مراد ہے اور یہی معنی اس آیت میں مراد ہیں تو آیت کا مطلب یہ ہوا کہ وہ دل اللہ کا فضل تھا اور جو کہ ہر انسان کو ہدایت پر رہنے اور رب کو پہچاننے کے لئے عطا

فرما گیا تھا اور جو ذوق شوق اور کشف کا سرچشمہ تھا۔ اور جو کہ ایمان کے رہنے کی جگہ اور اس کا برتن تھا جب اس پر ہی کفر کی مہر لگ گئی۔ اور کفر سے وہ اس قدر بھر گیا کہ اس میں ایمان کی جگہ ہی نہ رہی تو اب ان کے ایمان کی کیا امید وَعَلٰی سَمْعِهِمْ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اس کا تعلق قلب سے ہے۔ تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ان کے دلوں پر بھی مہر ہے اور ان کے کانوں پر بھی اور ان کی آنکھوں پر پردہ ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس کا تعلق آگے یعنی ابصار سے ہے تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ ان کے دلوں پر تو اللہ نے مہر لگا دی اور ان کے کانوں پر اور آنکھوں پر پردے ہیں۔ لیکن پہلا قول صحیح ہے اس لئے کہ دوسری آیت میں اسے صاف طریقہ سے بیان فرمایا گیا وَّ خَتَمَ عَلٰی سَمْعِهٖ وَ قَلْبِهٖ وَ جَعَلَ عَلٰی بَصَرِهٖ غِشٰوَةً (جاثیہ: ۲۳) اس آیت میں صاف صاف فرمادیا کہ دو چیزوں پر مہر ہے۔ دل اور کان اور پردہ فقط آنکھوں پر وہی معنی اسی جگہ مناسب ہیں نیز کان کے واسطے مہر ہی مناسب ہے اور آنکھ کے لئے پردہ کیونکہ کان ہر طرف کی آواز سنتا ہے اور آنکھ فقط سامنے کی چیز دیکھتی ہے اور مہر ہر راستہ کو بند کرتی ہے اور پردہ سامنے کے راستے کو۔ اس لئے کان اور دل پر مہر لائق اور آنکھ پر پردہ مناسب نیز مہر سے اصل مقصود یہ ہوتا ہے کہ بیرونی چیز اندر نہ آسکے اور پردہ سے اصل مقصود یہ ہوتا ہے کہ اندرونی باہر نہ جاسکے۔ اس لئے عورت پردہ کرتی ہے نہ کہ مرد اور چونکہ دل میں باہر سے خیالات آتے ہیں۔ اور کان میں باہر کی آوازیں۔ لہٰذا ان کو روکنے کے لئے مہر ہی مناسب ہے اور آنکھ میں کوئی بیرونی چیز نہیں آتی بلکہ خود آنکھ سے نوری شعاعیں نکل کر باہر والی چیزوں پر پڑتی ہیں تو ان کا احساس ہوتا ہے اس لئے اس کے لئے پردہ مناسب ہے اس جگہ علیٰ کو دوبارہ اس لئے لایا گیا تاکہ معلوم ہو کہ کانوں پر دل کے علاوہ علیحدہ مستقل مہر لگی ہے یہ نہیں ہوا کہ فقط دل پر تو مہر ہو اور اس کے سبب کان بیکار ہوں سمع کے معنی سننے کے ہیں لیکن اس جگہ اس عضو کو کہا گیا ہے۔ کہ جس میں یہ طاقت محفوظ ہے اور وہ عضو دونوں کانوں کے درمیان میں ایک پٹھا ہے۔ جب آواز کانوں کے راستے سے پٹھے تک پہنچتی ہے تب اس کا احساس ہو جاتا ہے اور چونکہ وہ پٹھہ ایک ہی ہے اس لئے اس کو یہاں صیغہ مفرد سے بولا گیا سبحان اللہ کیا نفیس ترتیب ہے کہ دل ایمان وکفر کا ظرف تھا۔ اس کا ذکر پہلے ہوا اور کان اور آنکھیں ایمان کا راستہ کیونکہ کان کے ذریعے قرآن کریم کی آیتیں نصیحتیں اور ہدایتیں دل تک پہنچتی ہیں اور دل انہیں قبول کر کے ایمان لاتا ہے۔ اسی طرح آنکھوں سے قرآن کریم نبی ﷺ کا چہرہ پاک اور معجزات حق تعالیٰ کی قدرت کے نمونے دیکھے جاتے ہیں۔ دل ان کو مان کر ایمان لاتا ہے۔ تو گویا دل بادشاہ ہوا اور یہ اعضا اس کے خادم بادشاہ کا ذکر پہلے ہوا۔ اور خادموں کا بعد میں پھر کان آنکھوں سے چند وجوہ سے افضل ہے۔ ایک یہ کہ کوئی پیغمبر سننے کی قوت سے محروم نہ ہوا لیکن بعض پیغمبر آنکھوں کی مرض میں مبتلا ہوئے جیسے حضرت یعقوب اور شعیب علیہما السلام تو سننا نبوت کی شرط ہے دوسرے یہ کہ ہر بہرہ گونگا ضروری ہوتا ہے لیکن ہر نابینا گونگا نہیں۔ بہرے سے ہماری مراد وہ ہے جو بالکل نہ سن سکے نہ کہ جو اونچا سنتا ہو تیسرے یہ کہ سننے سے عقل کامل ہوتی ہے۔ چوتھے یہ کہ آنکھ اپنے دیکھنے میں درمیانی روشنی کی محتاج ہے کہ نہ تو یہ تاریکی میں کام کر سکے اور نہ بہت تیز روشنی کو برداشت کر سکے مگر کان کے سننے میں یہ کوئی شرط نہیں چھٹے یہ کہ تبلیغ اکثر و بیشتر کان اور زبان کے ذریعے ہوتی ہے کہ نبی ﷺ سے فرمان سنے اور لوگوں سے بیان کئے جاتے ہیں اس لئے کان کو آنکھ سے پہلے بیان کیا گیا۔ (تفسیر

عزیزی وکبیر روح البیان وغیرہ) وَعَلٰٓى اَبۡصَارِهِمۡ یہ جملہ علیحدہ ہے اور اسکے معنی یہ ہیں کہ ان کی آنکھوں پر پردے ہیں ابصار جمع بصر کی ہے جس کے معنی ہیں دیکھنا۔ لیکن یہاں مراد ہیں، آنکھیں جن میں کہ دیکھنے کی طاقت ہے۔ غِشَاوَةٌ سے مراد وہ پردہ ہے کہ جو لوگوں کو نظر نہ آئے مگر خود دیکھنے والے کے لئے آڑ بن جائے جس کی وجہ سے کہ وہ آیات الٰہیہ کو صحیح طور پر نہ دیکھ سکے۔ وَّلَهُمۡ عَذَابٌ عَظِيۡمٌ عذاب عذب سے بنا ہے عذب کے معنی ہیں روکنا۔ میٹھے پانی کو اسی لئے عذب کہتے ہیں کہ وہ پیاس کو روکتا ہے۔ سزا کو اس لئے کہتے ہیں کہ وہ جرم سے روکتی ہے۔ قرآن کریم میں عذاب سزا کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ عَظِيۡمٌ عظیم حقیر کے مقابل میں ہے اور کبیر صغیر کی ضد۔ حقیر کے معنی ہیں ہر طرح چھوٹا تو عظیم کے معنی ہوئے ہر طرح بڑا۔ صغیر کے معنی ہیں ایک لحاظ سے چھوٹا تو کبیر کے معنی ہوں گے ایک لحاظ سے بڑا لہٰذا عظیم کبیر سے بڑھ کر ہے۔ اب اس آیت کے یہ معنی ہوئے کہ ان کے لئے وہ عذاب ہے جو ہر طرح بڑا ہے۔ وہ اس طرح دنیا میں مسلمانوں کے ہاتھوں قتل کئے جائیں۔ یا قیدی بنائے جائیں۔ آخرت میں تیز آگ۔ گرم پانی اور زہریلے جانوروں میں مبتلا کئے جائیں اور اس پر سب سے بڑی مصیبت یہ کہ وہ دائمی ہو۔ جس کی انتہا نہ ہو۔

خلاصہ مضمون

اس آیت کریمہ کا مضمون یہ ہے کہ اے نبی ﷺ آپ ان کفار کی ہٹ دھرمی سے رنجیدہ نہ ہوں۔ اور نہ ان کے ایمان لانے کی امید رکھیں۔ کیونکہ ایمان لانے کی دو ہی صورتیں ہوتی ہیں ایک یہ کہ اس کا دل صحیح ہو اور وہ خود بخود حق تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں اور نبی کے معجزات کو دیکھ کر ایمان لے آئے۔ دوسرے یہ کہ اس کو خود تو عقل نہ ہو۔ لیکن دوسرے کے سمجھانے اور بتانے سے ایمان قبول کرے۔ یہ کفار ان دونوں چیزوں سے محروم ہیں۔ کیونکہ ان کی ضد اور ہٹ دھرمی نے ان کے دل کو اس قابل نہ رکھا کہ اس سے کوئی صحیح بات سوچ سمجھ سکیں اور کان اور آنکھوں کو ایسا معطل کر دیا کہ جن سے وہ حق کی آواز سنتے نہیں اور حق کی آیات دیکھتے نہیں چونکہ ایمان لانے کے سارے اسباب ان کے لئے ختم ہو چکے اس لئے آپ ان کے ایمان کی امید نہ فرمائیں اور یہ بھی ہے کہ دل ایمان کا مکان اور آنکھ کان ایمان کے راستے جب راستے بھی بند ہو چکے اور مکان بھی ایمان کے آنے کے لائق نہ رہا تو اب انہیں ایمان کیونکہ میسر ہو۔ علماء کرام فرماتے ہیں کہ گناہوں کی اصل تین چیزیں ہیں۔ حرص، حسد اور تکبر، غفلت پیدا کرنے والی چند چیزیں ہیں۔ زیادہ کھانا، زیادہ سونا، ہر طرح آرام سے رہنے کی خواہش کرنا۔ مال کی محبت۔ عزت کی رغبت، حکومت کی خواہش، بسا اوقات مال وحکومت کی طلب میں انسان کافر بن جاتا ہے اور وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ گناہ دل میں سیاہی پیدا کرتا ہے۔ اور قرآن پاک کی تلاوت، درود شریف، اللہ پاک کا ذکر، موت کا یاد کرنا، یہ سب چیزیں دل کی صیقل ہیں۔ جن سے کہ وہ سیاہی دور ہوتی ہے۔ اسی طرح زیادہ ہنسنا دل کو بیمار کر دیتا ہے اور خوف الٰہی سے رونا اس کا علاج ہے جو شخص گناہوں کے ساتھ نیکیاں بھی کرتا رہے تو اس کا قلب میلا ہو کر دھلتا رہے گا۔ لیکن جو گناہوں میں مشغول رہے نیکی کی طرف متوجہ نہ ہو اس کے قلب کی سیاہی بڑھتے بڑھتے ایک دن سارے قلب کو سیاہ کر دیگی۔ جس کے متعلق حدیث شریف میں آتا ہے کہ ان دلوں پر لوہے کی طرح زنگ آتا رہتا ہے۔ اور اس کی صفائی تلاوت قرآن ہے۔ اس

سیاہ قلب کو صاف کرنے کیلئے ایک عرصہ اور کافی محنت چاہئے ہاں اگر کسی اللہ والے کی اس پر نگاہ کرم پڑ جائے تو وہ آناً فاناً اس قلب کو صاف کر دیتی ہے۔اس کے متعلق اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں۔

تو جو چاہے تو ابھی میل مرے دل کی دھلے کہ خدا دل نہیں کرتا کبھی میلا تیرا

مگر جس دل کی سیاہی اللہ والے کی نگاہ سے بھی دور نہ ہو۔تو یقیناً اس پر مہر لگ چکی۔اس طرف اس شعر میں اشارہ ہے۔شعر

بخدا خدا کا یہی ہے در نہیں اور کوئی مفر مقر جو وہاں سے ہو یہیں آ کے ہو جو یہاں نہیں تو وہاں نہیں

خیال رہے کہ گناہوں سے آہستگی سے دل میلا ہوتا ہے اور میلا دل عبادات کے ذریعہ آہستہ آہستہ صاف ہوتا ہے مگر نبی کی عداوت سے کبھی ایک دم مہر لگ جاتی ہے شیطان کے دل پر حضرت آدم کے بغض سے اچانک مہر لگ گئی اور موسیٰ علیہ السلام کے جادوگروں کا میلا دل نگاہ کلیمی سے اچانک اجلا ہو گیا۔معلوم ہوا کہ عداوت نبی بدترین کفر ہے اور نگاہ ولی بہترین نعمت ہے۔

تفسیر صوفیانہ

صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ نے میثاق کے دن انسانوں کو ذروں کی شکل میں ظاہر فرما کر ان سے اپنی ربوبیت کا عہد لیا پھر ان ذروں کو دلوں میں دلوں کو جسموں میں جسموں کو دنیا میں امانت کے طور پر رکھا۔یہ ذرے تا وقت ولادت دلوں کے روزن ہیں۔جن کے ذریعے دل کو عالم غیب نظر آتا رہا۔اور وہاں کی آوازیں محسوس ہوتی رہیں۔اسی لئے روایت میں آتا ہے کہ ہر بچہ اسلام پر پیدا ہوتا ہے۔اس کی ماں باپ اسکو یہودی عیسائی یا مجوسی بنا دیتے ہیں جب ہوش سنبھال کر انسان بری صحبتوں میں بیٹھا آہستہ آہستہ روزن بند ہوتے گئے۔یہاں تک کہ اب کھلنے کے قابل نہ رہے اسی حالت کا اس آیت میں بیان ہے۔اب اس شخص کے پاس بصارت رہ گئی۔بصیرت نہ رہی ایک بزرگ نے فرمایا کہ جو مجھے دیکھ لے وہ جنتی ہو جائے۔معترض نے اعتراض کیا کہ ابوجہل تو رسول اللہ کو دیکھ کر جنتی نہ بنا۔لوگ آپ کو دیکھ کر جنتی بن جائیں۔انہوں نے جواب دیا قسم رب کی ابوجہل نے محمد رسول اللہ کو نہ دیکھا۔بلکہ محمد ابن عبداللہ کو دیکھا اگر محمد رسول اللہ کو دیکھ لیتا تو ممکن نہ تھا کہ جہنم میں جاتا۔کیونکہ رسول اللہ کو دیکھنے والی آنکھ جہنم میں جا سکتی ہی نہیں حقیقت یہ ہے کہ حسن لیلیٰ کے لئے دیدۂ مجنوں چاہئے اور جمال مصطفیٰ ﷺ کے لئے صدیقی نگاہ درکار ہے۔قرآن پاک فرماتا ہے۔وَتَرٰىهُمْ يَنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ (اعراف:۱۹۸) اے محبوب وہ آپ کو دیکھتے تو ہیں۔مگر دیکھتے نہیں نیز فرماتے ہیں۔بیج زمین میں چھپایا جاتا ہے پھر وہ درخت کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔اور درخت سے شاخ پھر شاخ سے پھل غرض کہ پھل اس کے بیج کے سارے ظاہری و باطنی اوصاف کو بیان کر دیتا ہے اور پکار کر زبان حال سے کہتا ہے کہ اے دیکھنے والو۔اگر تم میرے بیج کا اندرونی اور بیرونی حال معلوم کرنا چاہتے ہو تو مجھ کو دیکھ لو۔تو گویا یہ پھل بیج کے ظہور کا خاتمہ ہے۔اسی طرح تقدیر الٰہی کا راز نیک بختی اور بدبختی کا تخم ہے کہ جو اللہ کے علم میں محفوظ ہے۔پھر انسان کا وجود وہ درخت جس میں یہ نیک بختی اور بدبختی محفوظ۔اس سے اخلاق کی شاخیں نکلیں۔اور ان شاخوں میں نیک و بد اعمال اور اقرار و انکار کے پھل لگے۔ان پھلوں نے ان اسرار الٰہیہ کو جواب تک چھپے ہوئے تھے۔ظاہر فرمایا تو یہ دل اور کانوں کی مہر اور آنکھوں کے پردے ان بھیدوں کا مظہر ہیں۔

فائدہ: بزرگان دین فرماتے ہیں کہ اللہ والوں کی عداوت سے دل میں سختی پیدا ہوتی ہے۔ اور ان سے دشمنی رکھنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ دل میں مہر لگ جاتی ہے کہ پھر اس کو ایمان میسر نہیں ہوتا۔ اسی لئے حدیث قدسی میں ارشاد ہے کہ جو کوئی میرے ولی سے عداوت رکھے۔ میں اس کو اعلان جنگ دیتا ہوں۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ محبت کے کفر سے عداوت کا کفر سخت ہے۔ یعنی ایک شخص کسی نبی کی محبت میں حد سے بڑھ کر کافر ہو گیا۔ جیسے کہ عیسائی اور دوسرا نبی کی عداوت کی وجہ سے کافر ہوا جیسے یہودی اگر چہ یہ دونوں فرقے اسلام سے خارج ہیں۔ لیکن یہودی بمقابلہ عیسائیوں کے سخت کافر ہیں۔ اسی لئے یہودی حق تعالیٰ کی نعمتوں سے یکسر محروم ہیں کہ ان کے لئے فرمایا گیا ضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ (البقرہ:۶۱) اور آج دنیا میں کہیں بھی یہودی کی سلطنت نہیں۔ اسی طرح روافض سیدنا علی رضی اللہ عنہ کی محبت میں حد سے بڑھ کر ایمان سے نکل گئے اور انبیاء کرام کی گستاخی کرنے والے دیوبندی اسلام سے خارج ہو گئے۔ مگر ان روافض سے یہ دیوبندی سخت کافر ہیں۔ کیونکہ دشمنی انبیاء کی وجہ سے کافر ہوئے۔

اعتراضات

اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان کافروں کے لئے ایمان کے سارے راستے بند ہو چکے لہٰذا یہ لوگ کافر رہنے میں بے قصور ہوئے۔ اور بے قصور کو سزا کیسی (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** یہ لوگ اس لئے مجرم ہیں کہ انہوں نے اپنے ایمان کے راستے خود بند کرائے۔ کیونکہ اس کے اسباب انہوں نے جمع کئے اور حق تعالیٰ نے راستے بند کر دیئے۔ جیسے کہ کوئی شخص کسی کو ظلماً قتل کر دے۔ تو اگر چہ مقتول کی جان حق تعالیٰ نے ہی نکالی لیکن جان نکلنے کے سارے اسباب (یعنی قتل وغیرہ) اس نے جمع کئے۔ لہٰذا قاتل یقیناً مجرم ہے۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ
اور سے لوگوں وہ کہتے ہیں کہ ایمان لائے ہم ساتھ اللہ اور ساتھ دن پچھلے
اور کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے
وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۝۸
اور نہیں ہیں وہ ایمان دار
وہ ایمان والے نہیں

تعلقات

پہلا تعلق: اس سے پہلے کی آیتوں میں خالص مومنوں اور خالص کافروں کا ذکر ہوا۔ اب ان منافقوں کا ذکر فرمایا جا رہا ہے جو دل سے کافر تھے اور زبان سے مومن بنتے تھے چونکہ ان کی حالت مومنین اور کافرین کے درمیان تھی لہٰذا ان کا ذکر ان دونوں کے بعد میں کیا گیا۔ اس لئے درمیانی چیز جب ہی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ جب اس کے دونوں کنارے معلوم ہوں۔

دوسرا تعلق: اس طرح ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے کھلے ہوئے کافروں کا ذکر تھا اور اب چھپے ہوؤں کا چھپا ہوا کافر ظاہر کافر کے مقابلہ میں زیادہ خطرناک ہے۔ لہٰذا اسکا ذکر بعد میں کیا۔

شان نزول

مدینہ منورہ میں ایک شخص عبداللہ بن ابی تھا۔ جس کو وہاں اچھی نگاہ سے دکھا جاتا تھا۔ اور قریب تھا کہ اس کو وہاں کا سردار بنادیا جائے لیکن جب آفتاب اسلام ﷺ نے وہاں جلوہ گری فرمائی۔ اور مدینہ والوں کے دل نور ایمان سے جگمگائے تو اس کی عزت و آبرو میں فرق آگیا اس کی طرف مدینہ والوں کا وہ رجحان نہ رہا جو پہلے تھا اس لئے اس کے دل میں بغض و عناد کی آگ بھڑک اٹھی۔ مگر یہ بہت چالاک تھا۔ اس نے خیال کیا کہ اگر میں ظاہر طور پر مسلمانوں کا مخالف رہوں تو میری خیر نہیں۔ اس لئے بظاہر تو یہ مسلمان ہو گیا مگر دل سے سخت دشمن رہا اور اس نے یہ روش اختیار کی کہ مسلمانوں کے سامنے حضور ﷺ کے اوصاف بیان کرتا اور کہتا کہ یہ وہی نبی آخر الزمان ہیں جن کی خبر توریت میں دی گئی اور جب کفار سے ملتا تو مسلمانوں کے خلاف باتیں کرتا اور دل میں خوش ہوتا تھا کہ ہم دونوں جماعتوں کے پیارے ہیں۔ اس کے ساتھ بہت سے لوگ مل گئے جس سے اس کی پوری جماعت ہو گئی۔ جن کا نام منافقین ہے۔ ان لوگوں کے بارے میں یہ آیات کریمہ اتریں۔

تفسیر

رب تعالیٰ نے مسلمانوں کی صفات میں اس جگہ چار آیتیں نازل فرمائیں۔ اور کھلے کافروں کے متعلق دو آیتیں لیکن منافقوں کے عیوب تیرہ آیتوں میں بیان فرمائے یا تو اس لئے کہ یہ زیادہ خطرناک تھے اور یا اس لئے کہ مسلمان ان کو پہچان نہ سکتے۔ ان کی بہت سی نشانیاں بتادینے سے ان کا پہچاننا آسان ہو گیا۔ اور یا اس لئے کہ یہ مسلمانوں سے تعلق رکھتے تھے ان کی صحبت میں آکر بیٹھتے تھے۔ نمازوں میں شریک ہوتے تھے۔ لہٰذا ان کے ایمان کی کسی قدر امید تھی۔ اس لئے ان کے عیوب زیادہ بیان کئے تا کہ وہ شرمندہ ہو کر خالص مومن بن جائیں اَلنَّاسُ یہ انسان کا اسم جمع ہے۔ اور اس کو ناس اس واسطے کہتے ہیں کہ یہ نَسْیٌ سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں بھولنا چونکہ یہ بھی اپنے پہلے عہد میثاق کو بھول گیا۔ اسی لئے اس کو انسان اور ناس کہا گیا۔ نیز یہ حق تعالیٰ کی نعمتوں کو جلد بھول جاتا ہے اور مصیبتوں کو یاد رکھتا ہے اس لئے اس کو ناس کہا گیا۔ یا یہ اُنسٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں دیکھنا اور ظاہر ہونا۔ چونکہ یہ بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ اور ظاہری زمین پر رہتا ہے۔ اس لئے اس کو انسان کہتے ہیں۔ اور جن چونکہ زمین کے چھپے ہوئے حصے میں آباد ہیں۔ اس لئے انہیں جن کہتے ہیں۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ انسان اور ناس اُنسٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں محبت چونکہ انسان بھی اپنے ہم جنس سے بہت زیادہ محبت رکھتا ہے۔ اس لئے اسے انسان کہتے ہیں من واحد تثنیہ جمع سب کے لئے بولا جاتا ہے کیونکہ یہ لفظاً واحد ہے اور معناً جمع اسی لئے اس کی طرف واحد اور جمع دونوں قسم کی ضمیریں لوٹ سکتی ہیں۔ اس آیت میں یَقُوْلُ بصیغہ واحد فرمایا گیا اور اٰمَنَّا اور هُمْ اور بِمُؤْمِنِیْنَ یہ سب جمع کے طریقے پر کیونکہ لفظ مَنْ میں دونوں کی گنجائش ہے اس آیت میں دو چیزوں پر ایمان لانے کا ذکر ہوا ایک اللہ اور دوسرے یوم آخر اس لئے کہ دونوں ایمانیات کے گویا کنارے ہیں منافقین سارے ایمانیات کے ماننے کا دعویٰ کر رہے ہیں

اور یہ کہتے ہیں کہ ہم رب تعالیٰ سے یوم آخر تک کی تمام چیزوں پر ایمان لے آئے۔ کتاب۔ نبی سب اس میں آگئے اور یا اس لئے کہ ان کے کلام میں فریب تھا۔ کیونکہ یہ لوگ یہودی تھے وہ اللہ اور قیامت کو تو پہلے ہی سے مانتے تھے۔ انہوں نے یہاں ایسا لفظ بولا کہ جس سے دو پہلو نکلیں۔ مسلمان تو سمجھ لیں کہ یہ ایمان لے آئے اور اپنے ہم جنس کفار سے یہ کہہ سکیں کہ ہم مسلمان نہیں ہوئے۔ ہم نے تو اپنے اصلی عقیدے کو بیان کیا (تفسیر روح البیان) وَمَاهُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ میں اس کی نہایت عمدہ طریقہ سے تردید فرمادی گئی۔ کیونکہ یہاں یہ فرمایا گیا کہ وہ مومنین کی جماعت ہی سے نہیں۔ یا یہ کہ وہ اصل سے مومن ہی نہیں۔

خلاصہ تفسیر

اس آیت کریمہ میں منافقین کا کلام نقل فرمایا گیا ہے کہ وہ بظاہر کہتے تھے کہ ہم ایمان لے آئے اور مسلمان ہو گئے تا کہ مسلمانوں میں مل کر دنیاوی فائدہ حاصل کریں اور اپنے ظاہری اسلام کو آڑ بنا کر ہر قسم کی سختی سے بچے رہیں مگر چونکہ یہ ایمان حقیقی نہ تھا اور خلوص دل سے انہیں میسر نہ تھا فقط زبان سے دعویٰ اسلام کرنا حق تعالیٰ کے نزدیک کچھ وقعت نہیں رکھتا۔ لہٰذا مسلمانوں کی تنبیہ کے لئے فرمایا گیا کہ یہ لوگ فریبی ہیں۔ مسلمان نہیں۔ ان کے عیوب قرآن کریم نے مختلف جگہ بیان فرمائے ہیں۔ اور جو کچھ انہوں نے غزوات میں فتور برپا کئے وہ بھی قرآن پاک میں مذکور ہیں۔ ان آیات سے حق تعالیٰ نے نفاق کی جڑ کاٹ دی۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **اول:** یہ کہ انسانوں میں چند گروہ ہوئے ایک وہ جو دل وزبان سے مومن ہوں۔ ان کو مخلصین کہا جاتا ہے۔ دوسرے وہ کہ جو ظاہر باطن کافر ان کو مجاہر کہتے ہیں تیسرے وہ کہ جو دل میں کافر اور زبان سے مومن ان کو منافق کہا جاتا ہے۔ جو شخص دل سے مومن اور بظاہر کافر ہو اس کی دو صورتیں ہیں۔ اگر کسی سخت مجبوری کی وجہ سے ایسا کر رہا ہے تو مخلصین میں داخل ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے اِلَّا مَنْ اُكْرِهَ وَقَلْبُهٗ مُطْمَئِنٌّ بِالْاِيْمَانِ (النحل:١٠٦) مگر اس صورت میں ضروری ہے کہ مجبوری کے دور ہوتے ہی اپنے ایمان کو ظاہر کردے اور اگر بلا سخت مجبوری کے کفر ظاہر کرتا ہے تو وہ شرعاً مسلمان نہیں۔ اور نہ اس پر اسلامی احکام (جیسے کہ تجہیز وتکفین ونماز جنازہ وغیرہ وغیرہ) جاری ہوں۔ بہت ممکن ہے کہ کبھی نہ کبھی ان کی نجات ہو جائے حدیث شفاعت میں ہے کہ جنتیوں کو حکم ہوگا کہ جہنم میں سے ان لوگوں کو بھی نکال لاؤ جن کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان ہو چنانچہ جنتی اس حکم پر عمل کریں گے حق تعالیٰ ارشاد فرمائے گا کہ شُفَعَاءُ اپنی شفاعت سے بخشوا لئے گئے۔ اب رب کی باری ہے حق تعالیٰ اپنا ایک لپ بھر کر جہنمیوں کو جہنم سے نکالے گا۔ ''تفسیر روح البیان شریف'' نے لکھا ہے کہ یہ لوگ وہ ہوں گے جو شرعاً کافر تھے دل میں مومن بہت ممکن ہے کہ ابو طالب بھی ان میں سے ہوں۔ کیونکہ شرعی ایمان والے تو شُفَعَآء کے ذریعہ نکل گئے اس لپ میں وہی آئے جن کا ایمان شرعی نہ تھا۔

منافق

یہ لفظ نفاق سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں علیحدہ ہونا چونکہ ان کا دل وزبان علیحدہ علیحدہ ہیں اس لئے انہیں منافق کہا جاتا ہے

نفاق کی چند قسمیں ہیں۔ ۱۔ یہ کہ زبان سے ایمان ظاہر کرے مگر دل میں صاف منکر ہوں ۲۔ یہ کہ زبان سے ایمان ظاہر کرے مگر دل صاف منکر نہ ہو بلکہ مذبذب ہو ۳۔ یہ کہ زبان سے اسلام کا اقرار کرے اور دل میں تصدیق بھی ہو مگر دنیا کی محبت اس پر ایسی غالب ہو کہ دنیوی نفع کو ایمان پر مقدم سمجھتا ہو۔ دنیا کے لئے لشکر اسلام کا مقابلہ اور اہل اسلام کی بربادی اور دین کی مذمت اس کے نزدیک کچھ مشکل نہ ہو جو کافر چاہے چند پیسے دے کر اس سے ہر برا بھلا کام کرائے۔ یہ تینوں قسم کے لوگ سخت قسم کے کافر ہیں اور جہنم کے سب سے نیچے کے طبقے میں رہیں گے ۴۔ یہ کہ جو ایسا بے حیا تو نہ ہو۔ مگر اس کا قال حال کے مطابق نہ ہو زبان سے کچھ کہے اور دل میں کچھ رکھے اور اس کو تقیہ کہتے جو کہ شیعہ مذہب کا بڑا اصولی مسئلہ ہے۔ اس قسم کا نفاق بھی منافقین کا طریقہ تھا جو صداقت ایمان سے بالکل خالی ہے کیونکہ کوئی معمولی سمجھدار بھی اس کو اچھا نہیں جانتا۔ حدیث پاک میں بعض گناہوں کو بھی نفاق کہا گیا ہے جیسے کہ روایات میں آتا ہے کہ منافق کی علامتیں چند ہیں جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔ کسی سے لڑے تو گالیاں بکے۔ وعدہ کرے تو پورا نہ کرے۔ کسی کی امانت رکھے تو خیانت کرے یہ عملی نفاق ہے نہ کہ اعتقادی۔ یہ منافقوں کے کام ہیں۔ **دوسرا فائدہ:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ جتنے فرقے ایمان کا دعویٰ کریں اور کفر کا اعتقاد رکھیں وہ سب اسلام سے خارج ہیں۔ کیونکہ محض دعویٰ کرنے سے ایمان حاصل نہیں ہوتا۔ **تیسرا فائدہ:** منافقوں کو مِنَ النَّاس کہا گیا۔ جس میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ لوگ فقط صورت میں مسلمان ہیں انسانی کمالات اور صفات سے ایسے خالی ہیں کہ ان کا ذکر کسی خوبی سے نہیں کیا جاتا ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بھی آدمی ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ کسی کو صرف بشر کہنے میں اس کے فضائل و کمالات کے انکار کا پہلو نکلتا ہے۔ اسی لئے قرآن پاک میں جا بجا انبیاء کرام کے بشر کہنے والوں کو کافر فرمایا گیا۔ کیونکہ دراصل یہ لفظ انبیاء کرام کی شان میں ادب سے دور اور کفار کا دستور ہے۔ (تفسیر خزائن العرفان) **چوتھا فائدہ:** ان آیات سے معلوم ہوا کہ کھلے کافر سے منافق کافر بدتر ہے۔ اس کی چند وجوہ۔ ۱۔ یہ کافر تو فقط کافر ہے۔ مگر منافق کافر بھی ہے اور دھوکے باز بھی۔ ۲۔ یہ کہ کافر گویا مرد ہے مگر منافق خنثیٰ۔ ۳۔ یہ کہ کافر تو فقط کافر ہے مگر منافق کافر بھی ہے اور جھوٹا بھی۔ ۴۔ یہ کہ کافر تو محض کافر ہے۔ مگر منافق کافر بھی ہے اور اسلام کا مذاق اڑانے والا بھی۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: منافقین اللہ اور قیامت کو دل سے مانتے تھے۔ پھر قرآن کریم نے ان کے اس ماننے کا کیوں انکار کیا
جواب: اس لئے کہ وہ غلط طریقہ سے مانتے تھے۔ خدا تعالیٰ کو اولاد والا اور قیامت کو اپنی نجات کا دن مانتے تھے۔ اور یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ نیز نبی کریم ﷺ کو بغیر مانے ہوئے کسی چیز کا ماننا معتبر نہیں وہ ہی توحید اللہ کے نزدیک معتبر ہے جو نبوت کے اقرار کے ساتھ ہو۔ چونکہ وہ حضور ﷺ کا انکار کرتے ہوئے رب کا اقرار کرتے تھے۔ اس لئے فرمایا گیا کہ وہ رب کو بھی نہیں مانتے۔ **دوسرا اعتراض:** قیامت کو یوم یعنی دن کیوں کہتے ہیں دن تو سورج سے بنتا ہے اور اس دن تو سورج ہی فنا ہو چکا ہوگا۔ **جواب:** عربی میں وقت کو بھی یوم کہتے ہیں یہاں یہی معنی مراد ہیں **تیسرا اعتراض:** قیامت کو یوم آخر کیوں کہتے ہیں اور اس کی حد کیا ہے **جواب:** قیامت سے پہلے محدود دن تھے اور وہ قیامت کے آنے

سے ختم ہو گئے اب غیر محدود وقت ہے اس لئے اس کو یوم آخر کہتے ہیں قیامت کی حد کے متعلق دو قول ہے بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ وہ مردوں سے اٹھنے سے شروع ہو کر فیصلہ الٰہی پر ختم ہو گا یعنی جب سارے جنتی جنت میں پہنچ جائیں گے اور محض کفار دوزخ میں رہ جائیں تب اس دن کی انتہاء ہو گی بعض فرماتے ہیں اس کی انتہا نہیں۔ (تفسیر کبیر)

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ

وہ فریب دیتے ہیں اللہ اور ان کو جو ایمان لائے اور نہیں فریب دیتے

فریب دینا چاہتے ہیں وہ اللہ اور ایمان والوں کو اور حقیقت میں فریب نہیں دیتے

اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝٩

مگر جانوں اپنی کو اور نہیں سمجھتے

مگر اپنی جانوں کو اور نہیں شعور انہیں

تعلق

اس آیت کا پہلی آیت سے دو طرح کا تعلق ہے ایک یہ کہ پہلی آیت میں منافقین کی بے ایمانی کا ذکر تھا۔ اور اب ان کے برے اعمال کا۔ چونکہ کفر دیگر اعمال سے مقدم ہے۔ اس لئے اس کا ذکر پہلے ہوا اور اعمال کا بعد میں دوسرے یہ کہ پہلی آیت میں یہ فرمایا گیا تھا کہ اگر چہ وہ ایمان ظاہر کرتے ہیں لیکن وہ مومن نہیں اور اس آیت میں اس کے مقبول نہ ہونے کی وجہ بیان ہو رہی ہے یعنی چونکہ ان کا اظہار ایمان خلوص سے نہیں بلکہ فریب دینے کے لئے ہے اس لئے قبول نہیں۔ لطف یہ ہے کہ مخلص یہی کلمہ بول کر مومن بنتا ہے اور وہ لوگ انہی کلموں سے زیادہ بے دین ہو گئے کیونکہ لفظوں میں نیت کا بڑا دخل ہے۔ مکھن نکلا ہوا دودھ اگر چہ شکل وشبہات میں دودھ ہی کی طرح ہے لیکن بازار میں اس کی کوئی قیمت نہیں خلوص نیت مانند مکھن کے ہے اور محض اچھے اچھے الفاظ جو اس سے خالی ہوں رب کی بارگاہ میں ان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔

تفسیر

يُخٰدِعُوْنَ خَدَعَ سے بنا ہے۔ اس کے لغوی معنی ہیں چھپانا۔ اسی لئے خزانہ کو مَخْدَع کہتے ہیں کیونکہ اس میں روپیہ چھپا رہتا ہے اور گردن کی چھپی ہوئی رگوں کو اَخْدَعَيْن کہتے ہیں۔ اصطلاح میں خَدَع کے معنی دھوکہ ہیں یعنی برائی کو دل میں چھپا کر اچھائی ظاہر کرنا اللہ اس سے مراد تو اللہ کی ذات ہے تو يُخٰدِعُوْنَ کے معنی ہوں گے دھوکہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ رب تعالیٰ کو کوئی دھوکہ نہیں دے سکتا۔ یا اللہ سے مراد رسول اللہ ﷺ ہیں کیونکہ بہت سی جگہ اللہ سے رسول اللہ ﷺ مراد ہوتے ہیں تا کہ لوگوں کو آپ کی عظمت کا پتہ چل جائے کہ حضور علیہ السلام کا بارگاہ الٰہی میں وہ درجہ ہے کہ ان کی اطاعت رب کی اطاعت انکی مخالفت رب تعالیٰ کی مخالفت ہے ان کو دھوکہ دینا رب تعالیٰ کو دھوکہ دینا قرآن کریم ایک جگہ ارشاد فرماتا ہے کہ اے محبوب جو آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ ایک جگہ

ارشاد فرمایا کہ کنکر آپ نے نہیں پھینکے۔ اسی قاعدہ سے یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ منافقین اللہ کو یعنی رسول اللہ کو دھوکہ دے رہے ہیں۔ (تفسیر روح البیان۔ تفسیر عزیزی وغیرہ) اَنْفُسَهُمْ اَنْفُسٌ نفس کی جمع ہے نفس کے چند معنی ہیں ذات، روح، دل، دل کے متعلقات خون، پانی یہاں پہلے مراد معنی مراد ہیں۔ یعنی یہ منافقین درحقیقت اپنے کو دھوکہ دے رہے ہیں کیونکہ جو شخص اعلیٰ چیز کو چھوڑ کر ادنیٰ اختیار کرے اور پھر اپنے کو کامیاب جانے وہ بڑا بے وقوف ہے اور سخت دھوکے میں ہے۔ منافقین نے دین چھوڑ کر دنیا اختیار کی اور اس پر خوش ہوئے۔ لیکن دنیا بھی ہاتھ نہ آئی۔ بلکہ رسوائی، ذلت نصیب ہوئی۔ تو اپنے کو دھوکہ ہی دیا۔ صحابہ کرام نے فانی دنیا اور اس کی نعمتوں پر لات ماری اور اللہ و رسول ﷺ کو اختیار کیا تو دنیا بھی لونڈی بن کر ان کے قدموں میں آ گری۔ درحقیقت یہی لوگ بہت کامیاب رہے۔ وَمَا يَشْعُرُوْنَ يَشْعُرُوْنَ شعور سے بنا ہے، شعور کہتے ہیں حواس سے جاننے کو اس لئے حواس کو مشاعرہ کہتے ہیں اور شعر بال کو کہتے ہیں اور جو لباس جسم سے مس کئے ہوئے ہو اسے شعار کہتے ہیں منظوم کلام کو بھی اسی لئے شعر کہتے ہیں کہ اس کی برائی یا بھلائی وزن کا درست اور نادرست ہونا حواس سے معلوم ہوتا ہے۔ اسکا مقصود یہ ہے کہ ان کم بختوں کو حواس بھی ایسے بگڑ گئے کہ یہ اس قدر ظاہر چیز کو بھی محسوس نہیں کر سکتے۔ اس لئے کہ یہ دن رات دیکھ رہے ہیں کہ ہماری خفیہ مخالفتوں سے اسلام کی اشاعت میں کچھ فرق نہیں آیا۔ بلکہ دن بدن ترقی ہو رہی ہے۔ اور مسلمانوں کو ہم سے بالکل اعتماد نہیں مگر اس پر بھی اپنی بری روش کو نہیں چھوڑتے۔ تو گویا یہ جانوروں سے بدتر ہیں اور جمادات (اینٹ پتھر وغیرہ) کی طرح ہیں۔ کیونکہ محسوسات کو جانور بھی معلوم کر لیتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اس آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ منافقین جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائے۔ اپنے گمان میں وہ خدا تعالیٰ یا رسول اللہ ﷺ اور مسلمانوں کو فریب دے رہے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت وہ خود کو فریب دے رہے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ علام الغیوب ہے۔ اس پر کوئی بات چھپی ہوئی نہیں۔ اور فریب اسی کو دیا جا سکتا ہے کہ جو حقیقت سے ناواقف ہو اور رسول اللہ ﷺ اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اعظم ہیں کہ اس نے اپنے حبیب کو سارے علوم غیبیہ عطا فرمائے ہیں وہ تو ابتداء ہی سے ہر ایک کی حقیقت اور انجام سے خبردار ہیں کیونکہ معراج میں سب کفار اور مومنین کو دیکھ کر آئے ہیں۔ صحابہ کرام کو بھی مومنین اور کفار کے ناموں کے رجسٹر دکھا دئے ہیں جیسا کہ احادیث میں آتا ہے انہوں نے بڑے بڑے بدکاروں کے ایمان کی خبر دے دی تو وہ آخرکار مومن ہی ہو گئے اور بڑے بڑے ظاہر متقیوں کے جہنمی ہونے کی خبر دے دی تو وہ آخرکار جہنمی ہو کر ہی مرے۔ انہوں نے تو یہ بھی بتا دیا کہ حسین و حسن جوانان جنت کے سردار ہیں۔ میری لخت جگر فاطمہ جنتی بیبیوں کی سردار ہیں۔ انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ ابو طالب دوزخ میں نہیں بلکہ اس کے جھیرے میں رہیں گے۔ اور ان کے تلوے میں آگ کی محض ایک چنگاری ہوگی وغیرہ وغیرہ جس سے معلوم ہوا کہ وہ جنتیوں اور جہنمیوں کو پہچانتے ہیں اور ان کے درجات اور درکات سے بھی واقف ہیں لہٰذا یہ منافق ان کو دھوکہ نہیں دے سکتے اسی طرح مسلمان بھی اپنے نور ایمان سے مومن اور کافر کو پہچان لیتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ مسلمان کی ذہانت سے ڈرو۔ وہ اللہ کے نور سے دیکھتا ہے بلکہ اللہ والوں کے پاس

بیٹھنے والے جانور بھی کافر و مومن کی تمیز کر لیتے ہیں۔ حضرت سفینہ رضی اللہ عنہ کے سامنے ایک شیر آ گیا آپ نے فرمایا کہ اے شیر میں رسول اللہ کا غلام ہوں وہ یہ سن کر کتے کی طرح دم ہلانے لگا۔ (دیکھو مشکوٰۃ شریف باب الکرامات) ابولہب کے بیٹے عتبہ کو جس نے حضور علیہ السلام کی شان میں گستاخی کی تھی شیر نے اس کا منہ سونگھ کر پھاڑ دیا لہٰذا وہ مسلمانوں کو بھی دھوکا نہیں دے سکتے لیکن چونکہ نبی کریم علیہ السلام اور مسلمانوں نے ان کے عیب نفاق کو ظاہر نہ فرمایا اس لئے منافق سمجھے کہ ہم دھوکا دہی میں کامیاب ہو گئے حقیقتاً نہ تو خدا تعالیٰ کو دھوکا ہوا اور نہ رسول علیہ السلام کو اور نہ ہی مسلمانوں کو بلکہ خود منافقوں کو ہوا لیکن وہ اس راز کو نہ سمجھ سکے کہ ان کی بکواس پر مسلمانوں کا خاموش ہو جانا در حقیقت عیب پوشی ہے جس میں ہزار ہا راز ہیں لہٰذا اس فریب کا اثر الٹا انہیں پر پڑا کہ آخر کار دنیا میں ان کی رسوائی ہوئی۔ اور آخرت میں سخت عذاب کے مستحق ہوئے مگر چونکہ ان کے حواس میں فرق آ گیا ہے اس لئے وہ اس کو سمجھ نہ سکے۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ انسان کے پاس بھی یہ تینوں جماعتیں موجود ہیں۔ روح انسانی خالص مومن اور شیطان کھلا ہوا کافر۔ لیکن نفس امارہ منافق کہ دل سے مل کر اپنے کو اس کا دوست ظاہر کرتا ہے۔ ادھر شیطان سے ملتا ہے تو اس کا دوست بنتا ہے لیکن جس دل پر اللہ کا کرم ہو جائے اس پر نفس امارہ غالب نہیں آتا۔ بلکہ آخر کار خود ہی مجبور ہو کر تابع ہو جاتا ہے۔

اعتراض

پہلا اعتراض: یُخٰدِعُوْنَ۔ مُخَادَعَۃ سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں۔ ایک دوسرے سے دھوکے بازی کرنا۔ لہٰذا آیت کے معنی یہ ہوئے کہ یہ منافقین رب تعالیٰ کو اور مسلمانوں کو دھوکہ دیتے ہیں اور حق تعالیٰ اور مسلمان ان کو دھوکہ دیتے ہیں۔ اور کسی کو دھوکہ دینا حق تعالیٰ کی شان کے بھی خلاف ہے اور مسلمانوں کے بھی **جواب:** اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کئی جگہ باب مُفَاعِلَۃ شرکت سے خالی بھی ہو جاتا ہے جیسے سَافَرْتُ میں نے سفر کیا عَاقَبْتُ اللِّصَّ یعنی میں نے چور کو سزا دی۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ چور نے بھی مجھ کو سزا دی یہاں بھی یہی معنی مراد ہے **دوسرا جواب:** یہ ہے کہ یہاں شرکت ہی کے لئے ہے اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ منافقین تو اپنا ایمان ظاہر کر کے مسلمانوں کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں اور مسلمان بھی ان کے ایمان کو معلوم کر کے ان سے بے تعلق ہو جاتے ہیں کہ نہ ان سے جہاد کرتے ہیں اور نہ ان پر جزیہ لگاتے ہیں جس سے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارا داؤ چل گیا لیکن مرنے کے بعد پتہ چلے گا۔ کہ ہم تو بڑے دھوکے میں رہے۔ نیز تفسیر روح البیان میں اس جگہ بیان فرمایا گیا کہ جب منافقین جہنم میں ایک زمانے تک رہ لیں گے تو اچانک جہنم کے دروازے کھل جائیں گے۔ جس سے وہ یہ سمجھیں گے کہ گنہگار مسلمانوں کی طرح ہمارے بھی نکلنے کی باری آ گئی۔ اور دروازہ کی طرف بھاگیں گے لیکن جب وہاں پہنچیں گے تو دروازے بند کر دیئے جائیں گے اور انہیں دھکیل کر ان کی جگہ پہنچا دیا جائے گا جس کے متعلق قرآن پاک فرماتا ہے یُخٰدِعُوْنَ اللّٰہَ وَھُوَ خَادِعُھُمْ (النساء: ۱۴۲) یہ ان کے فریب کی سزا ہوگی اور جرم کی سزا دینا عیب نہیں۔ **دوسرا اعتراض:** اس جگہ فرمایا گیا کہ منافقین جانتے نہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا تَکْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (آل عمران: ۷۱) یعنی تم جان بوجھ کر حق چھپاتے ہو۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ جانتے ہیں اب ان

دونوں آیتوں میں مطابقت کس طرح کی جائے۔ **جواب**: منافقین سب کچھ جانتے تو تھے۔ لیکن اس پر عمل نہ کرتے تھے۔ اس لحاظ سے گویا جاہل تھے۔ ان کے عمل نہ کرنے کی وجہ سے انہیں یہاں جاہل کہا گیا۔ جیسے کہ کفار کو اندھا۔ بہرا، گونگا کہا گیا ہے۔ بے عمل عالم مثل جاہل کے ہے اور کنجوس مالدار مثل فقیر کے۔ لہٰذا انہیں جاہل کہنا عمل کے لحاظ سے ہے اور انہیں عالم کہنا حقیقت علم کے لحاظ سے۔

فِىۡ قُلُوۡبِهِمۡ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمۡ عَذَابٌ
میں دلوں ان کے بیماری پس بڑھائی ان کی اللہ نے بیماری اور لئے ان کے عذاب
ان کے دلوں میں بیماری ہے تو اللہ نے ان کی بیماری اور بڑھادی اور ان کے لئے دردناک
اَلِيۡمٌ ۙ بِمَا كَانُوۡا يَكۡذِبُوۡنَ ﴿۱۰﴾
ہے دردناک بوجہ اس کے تھے وہ جھوٹ بولتے
عذاب ہے بدلہ ان کے جھوٹ کا

تعلق

گزشتہ آیتوں میں منافقین کی بدعملی کا ذکر ہوا۔ اب اس بدعملی کی وجہ بیان ہو رہی ہے۔ یعنی دھوکے بازیاں وغیرہ اس لئے کرتے ہیں کہ ان کے دل میں نفاق کی بیماری ہے اور برابر بڑھ رہی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پہلی آیت میں ان کی بدعملی کا ذکر ہوا اور اس آیت میں اس کے نتیجہ کا۔ یعنی چونکہ وہ اس قسم کی حرکتیں کر رہے ہیں اس لئے بجائے شفاء ہونے کے مرض بڑھ رہا ہے جیسے کوئی طبیب کہے کہ فلاں مریض بدپرہیزی کر رہا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کا مرض ترقی پر ہے کہ یا تو پہلی آیت سبب ہوئی اور یہ اس کا نتیجہ یا اس کا برعکس نیز اس سے پہلے ان کے اقوال واعمال کا ذکر ہوا۔ اور اب ان کی دلی حالت کا تذکرہ یعنی منافقین کہتے یہ ہیں۔ اور کرتے یہ ہیں۔ اور ان کے دل کی یہ حالت ہے۔ کبھی تو دل کا اثر ظاہر پر پڑتا ہے اور کبھی ظاہر کا دل پر۔ چونکہ یہاں ان کے قول وفعل کا اثر ان کے دلوں پر پڑ رہا ہے کہ مرض بڑھ رہا ہے۔ اس لئے قلبی حالت کو ان دونوں کے بعد بیان کیا۔

تفسیر

مَّرَضٌ لغت میں بدن کی اس عارضی حالت کو کہتے ہیں جس کی وجہ سے اس کے طبعی کاموں میں خلل پڑ جائے جیسے کہ بخار جسم انسانی کو طبعی کاموں سے روک دیتا ہے۔ لیکن مجازاً ان نفسانی عوارضات کو بھی کہہ دیتے ہیں کہ جو نفس کے کمالات کو ختم کر دیں جیسے جہالت، بدعقیدگی، حسد، بغض، دنیا کی محبت جھوٹ اور ظلم وغیرہ کہ ان کی وجہ سے نفس کے کمالات زائل ہو جاتے ہیں۔ اور کبھی یہ عیوب کفر تک بھی پہنچا دیتے ہیں جو کہ روحانی موت ہے۔ دل کی بیماریاں چند قسم کی ہیں ایک وہ کہ جن کا تعلق اخلاق سے ہے۔ جیسے کہ حسد کینہ وغیرہ دوسرے وہ کہ جن کا تعلق افعال سے ہے۔ جیسے کہ برے ارادے یہاں پہلی قسم کی بیماری مراد

ہے۔ یعنی ان کے دلوں میں بدعقیدگی اور کفر تو پہلے ہی سے موجود ہے۔ اب دن بدن اس میں زیادتی ہو رہی ہے۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس سے تینوں قسم کی بیماریاں مراد ہوں۔ یعنی منافقین کے دلوں میں بدعقیدگی۔ بدخلقی، بدعملی موجود ہے۔ اور اس میں زیادتی ہو رہی ہے۔ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ زَادَ لازم بھی آتا ہے اور متعدی بھی یعنی زیادہ ہوا، اور زیادہ کیا۔ یہاں متعدی معنی میں استعمال ہوا۔ یعنی اللہ نے ان کی بیماری بڑھا دی۔ اس کے بڑھانے کی چند صورتیں۔ ایک یہ کہ انہیں اسلام کو دیکھ کر غم ہوتا تھا۔ اور اللہ نے اسکی اشاعت فرما کر ان کے غم کو بڑھا دیا۔ اور اس طرح ان کے دل میں بدعقیدگی اور نبی ﷺ کی دشمنی تھی۔ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر اس طرح لگا دی کہ ان میں وعظ و نصیحت اثر نہ کرے کفر کو بڑھا دیا۔ یا اس طرح کہ جس قدر شرعی احکام بڑھے۔ ان کا انکار بھی بڑھا مثلاً جب تک دس احکام آئے تو وہ دس کے منکر رہے اب پانچ اور آجانے پر پندرہ کے منکر ہو گئے۔ یا اس طرح کہ پہلے فقط عبادات آئی تھیں۔ وہی ان پر بھاری تھیں۔ جب سزائیں اور جہاد آ گئے تو ان پر اور مصیبت ٹوٹ پڑی۔ اللہ کی شان ہے کہ شرعی احکام اور قرآنی آیتیں مسلمانوں کے ایمان کو قوی کریں لیکن ان سے کفار کا کفر بڑھے جیسے کہ بارش کا پانی گندگی پر پڑ کر اس کو زیادہ پھیلا دیتا ہے۔ مگر پاک چیزوں پر پڑ کر ان کو اور بھی صاف پاک کر دیتا ہے۔ یہی بات یہاں پر ہے کہ یا اس طرح کہ جب وہ کھلے کافر تھے۔ تو ان میں بہادری تھی۔ مگر اسلام کے دبدبے اور شوکت کو دیکھ کر ان میں بزدلی پیدا ہو گئی۔ جس کی وجہ سے منافق بننے پر مجبور ہو گئے۔ جس طرح کی دنیا میں ان کی بیماریاں بڑھتی جا رہی ہیں اسی طرح آخرت میں ان کا عذاب اور مسلمانوں کا ثواب بڑھتا رہے گا۔ عَذَابٌ اَلِيْمٌ۔ الیم اَلَمٌ سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں درد اور تکلیف۔ الیم کے معنی ہوئے دردناک اور تکلیف دہ کفار کے عذاب کو عظیم فرما دیا گیا تھا اور منافقوں کے عذاب کو الیم کہا گیا ہے۔ اس لئے کہ بمقابلہ کفار کے ان کو عذاب کی زیادہ تکلیف ہو گی کیونکہ کافروں نے ایمان کی لذت بالکل نہ چکھی تھی اور نور ایمانی ان کے ظاہری حواس تک بھی نہ پہنچا تھا انہیں خبر ہی نہ تھی کہ نماز میں کیا لطف ہے اور ایمان میں کیا بہار لیکن منافقین ایمان کے دروازے تک پہنچ چکے تھے اور اس کی شیرینی ان کے تالو اور زبان میں لگ چکی تھی۔ پھر اس کے پھل نہ کھا سکیں گے تو ان کو اپنی محرومی پر بہت صدمہ ہو گا جیسے کہ ایک شخص نے عمدہ میووں کا مزہ چکھا ہی نہیں۔ دوسرے نے چکھا تھا مگر اب اس کو میسر نہیں تو یقیناً نہ ملنے کی حسرت زیادہ انہی کو ہو گی جو چکھ کر محروم ہو گئے (تفسیری عزیزی) نیز کھلے کافروں کو تو صرف دوزخ کا عذاب ہی ہو گا اور منافقوں کو عذاب بھی اور طعنے بھی اس لئے ان کو تکلیف زیادہ ہو گی نیز چونکہ انہوں نے جھوٹ بھی بولا تھا اس لئے ان کو جہنم کے سب سے نیچے طبقے میں رکھا جائے گا جہاں کہ اور طبقات سے دوزخیوں کی پیپ وغیرہ بہہ کر آئے گی اور وہ ہی ان کو پلائی جائے گی تو کفر کی وجہ سے ان کو یہ عذاب ہوا اور فریب کی وجہ سے یہ درد پہنچا يَكْذِبُوْنَ میں اس طرف اشارہ ہے کہ ان پر مصیبتیں جھوٹ کی وجہ سے آئیں يُكَذِّبُوْنَ کذب سے بنا ہے۔ اس کے معنی ہیں جھوٹ، جھوٹ کئی قسم کا ہوتا ہے۔ ا۔ قول میں جھوٹ وہ اس طرح کہ خلاف واقع خبر دے۔ ۲۔ فعل میں جھوٹ۔ وہ اس طرح کہ عمل قول کے خلاف ہوں یعنی کہے کچھ اور کرے کچھ۔ ۳۔ عقیدے میں جھوٹ وہ اس طرح کہ غلط عقائد اختیار کرے۔ مثلاً خالق تو ایک ہے لیکن کسی کا عقیدہ یہ ہو کہ خالق چند ہیں تو یہ عقیدے کا جھوٹ ہوا۔ ہر جھوٹ برا ہے لیکن

عقیدے کا جھوٹ سخت برا اور یہ منافق ہر طرح جھوٹے تھے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ جھوٹ بدترین گناہ اور فحش عیب ہے۔ بلکہ ہزار ہا گناہوں کی جڑ ہے اگر کوئی شخص جھوٹ نہ بولنے کا عہد کرے تو ان شاء اللہ بہت سے گناہوں سے بچ جائے گا۔ انبیاء کرام سارے گناہوں سے اور خصوصاً جھوٹ سے بالکل محفوظ و معصوم ہوتے ہیں جو شخص انہیں جھوٹا مانے وہ بے دین حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق جو آیا ہے کہ انہوں نے معاذ اللہ تین جھوٹ بولے یہاں جھوٹ سے مراد تعریض ہے۔ یعنی ذومعنی کلام بولنا۔ اور اس سے خلاف ظاہر معنی مراد لینا اور یہ تعریض ضرورتاً جائز ہوتی ہے۔ جیسے کہ آپ کی بیوی حضرت سارہ کے متعلق ایک ظالم بادشاہ نے پوچھا کہ یہ آپ کی کون ہے آپ نے خیال فرمایا اگر میں نے کہہ دیا کہ میری بیوی ہے تو یہ ظالم مجھ سے جبراً چھین لے گا۔ اس لئے آپ نے کہہ دیا کہ یہ میری بہن ہے۔ وہ نسبتی بہن سمجھا اور آپ نے دینی بہن مراد لی اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہجرت میں حضور ﷺ کے ساتھ جا رہے ہیں۔ کسی کافر نے پوچھا کہ اے ابوبکر تمہارے ساتھ یہ کون ہیں۔ آپ نے راز چھپانے کے لئے فرمایا مجھے راستہ بتانے والے ہیں۔ وہ یہ سمجھا کہ اس سے دنیوی راستہ مراد ہے اور آپ کی مراد تھی راہ الٰہی یہ تعریض ہے۔ اور ضرورتاً جائز

تتمہ: جھوٹ بہرحال منع ہے سواء چند موقعوں کے سخت مجبوری کی حالت میں دو مسلمانوں میں صلح کرانے کے لئے اپنی بیوی کو راضی کرنے کے لئے جہاد کے موقع پر ضرورتاً (تفسیر روح البیان وشامی وغیرہ) جھوٹ سے جس طرح اخروی عذاب آتا ہے۔ ایسے ہی دنیا میں بھی مصیبتیں نازل ہوتی ہیں۔ مثنوی شریف میں ہے۔

صبح کاذب کارواں ہا را زدہ است　　که ببوئے روز بیرون آمدہ است

صبح کاذب خلق را رہبر مباد　　که دہد بس کارواں ہارا بباد

صبح کاذب بھی صدہا قافلوں کو برباد کر چکی ہے خدا کرے جھوٹا کسی کا رہبر نہ بنے۔

خلاصہ تفسیر

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کی فطرت میں ہی تندرستی نہیں اور ان کے دلوں پر جھوٹ کی بیماری سوار ہے جوں جوں صحت بخش باتیں نبی ﷺ پر نازل ہوتی گئیں ان کی مخالفت سے ان کا مرض بڑھتا گیا اور جس طرح کہ جسمانی مرض کا انجام موت ہے۔ اسی طرح روحانی بیماریوں کا نتیجہ دردناک عذاب ہے بارش ہر درخت کو بڑھاتی ہے مگر جس درخت کا تخم خراب ہو اس میں کانٹے اور کڑوے پھل آتے ہیں۔ اور جس کا تخم اچھا ہو اس میں عمدہ پھل پھول لگتے ہیں اسی طرح قرآن کریم کی آیتیں رحمت کی بارش ہیں۔ جس سے مومنوں کو شفاء ہوتی ہے اور جن کی اصل میں کجی ہے ان کی بیماری بڑھتی ہے اس میں ان کا اپنا قصور ہے نہ کہ قرآن کریم کا۔

تفسیر صوفیانہ

عام طور پر دل میں اچھے خیالات بھی آتے ہیں اور برے بھی اچھے خیالات رحمانی الہام ہوتے ہیں۔ جس کے لئے ایک فرشتہ مقرر ہے۔ اور برے خیالات شیطانی وسوسے۔ جن دلوں پر اللہ کا کرم ہے۔ ان کو الہام زیادہ اور وسوسے کم ہوتے ہیں۔ بلکہ

بعض مقبولات خدا ایسے بھی ہیں کہ جو ان وسوسوں سے بالکل محفوظ ہو جاتے ہیں اور جن کے دلوں میں بیماری ہے انہیں الہام کم اور وسوسے زیادہ ہوتے ہیں۔ اگر اس مرض کا علاج کسی قابل طبیب روحانی سے کرالیا جائے تو صحت ہو جاتی ہے ورنہ یہ مرض بڑھتا بڑھتا اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ دل میں اچھے خیالات کا آنا ہی بند ہو جاتا ہے اور کبھی یہاں تک ترقی ہو جاتی ہے برے کاموں کو اچھا اور اچھے کاموں کو برا سمجھنے لگتا ہے اور بدکاروں کو عزیز رکھنے اور نیکوکاروں سے نفرت کرنے لگ جاتا ہے۔ یہی دل کی موت ہے اسی طرح بعض اوقات دل سے غیبی آواز آتی ہے جو انسان کو برائی سے روکتی ہے اور برے کام کرنے پر ملامت کرتی ہے اللہ کے مقبول بندوں کی یہ آواز نہایت قوی ہوتی ہے کہ وہ برے راستہ پر آتے ہی نہیں اور گناہوں کی زیادتی کی وجہ سے یہ آواز کمزور پڑ جاتی ہے یہاں تک کہ رفتہ رفتہ بند ہو جاتی ہے۔ پھر غلط آوازیں آنی شروع ہو جاتی ہیں کہ گناہ کرنے پر خوشی کی آواز نکلتی ہے۔ یہ قلب کی موت ہے اور اس آیت میں انہی بیماریوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ جس طرح سے کہ بعض دوائیں اور بعض جگہ کی آب و ہوا تندرستی بخشتی ہے۔ اسی طرح بعض اعمال اور کسی جگہ کی آب و ہوا روحانی تندرستی دیتی ہے۔ اولیاء اللہ کی زیارت ان کی قبور پر حاضری دینے کا اس لئے حکم ہے کہ وہاں کی آب و ہوا ایمان کے لئے زیادہ مفید ہے۔ جس طرح کہ بیمار سفر کر کے طبیبوں کے پاس جاتے ہیں۔ اسی طرح گناہوں کا بیمار اگر سفر کر کے روحانی اطباء کے پاس حاضری دے تو کیا حرج ہے سفر عرس اور سفر زیارت قبور میں یہی حکمتیں ہیں ان کی زیادہ تحقیق کے لئے شامی جلد اول بحث زیارت قبور اور اشعتہ اللمعات اور کتب تصوف اور ہماری کتاب جاء الحق کا مطالعہ کرو۔ اور جس طرح بعض بیماریاں اڑ کر لگتی ہیں اسی طرح روحانی بیماری بھی اڑ کر لگنے والی ہیں۔ اسی لئے بدمذہبوں اور بے دینوں کی صحبت سے دور رہنا ضروری ہے۔

حکایت: ایک شخص کسی حکیم کے پاس جا کر کہنے لگا کہ حکیم صاحب مجھے گناہوں کی دوا درکار ہے حکیم صاحب حیران ہو گئے ان کا کمپوڈر کوئی مرد خدا تھا کہنے لگا کہ توبہ کے پتے۔ شکر کے پھول، عبادت کے بیج، ریاضت کی جڑیں ہم وزن لے کر مجاہدے کے ہاون دستے میں کوٹ لے۔ اپنے آنسوؤں میں تر کر کے صبر کی آگ پر پکالے اخلاص کی کھانڈ سے میٹھا کر کے دل کی آہوں سے ٹھنڈا کر کے پی جا۔ ان شاء اللہ شفا ہو گی کہنے لگا اس کا پرہیز کیا جواب دیا کہ اپنے دل کو اغیار کے کوڑے سے صاف رکھ تا کہ یار وہاں تجلی فرمائے۔ اور اس کی گزرگاہ اور دروازے کو عبادات کی جھنڈیوں سے آراستہ رکھ۔ گناہوں کے گرد و غبار سے صاف کر دے تا کہ یہ راستہ یار کے آنے جانے کے قابل بن جائے نیز اپنے نفس امارہ کے گلے میں کسی شیخ کی غلامی کا پٹہ ڈال۔ تا کہ وہ مارا نہ جائے۔ اللہ پاک ہمیں یہی علاج نصیب فرمائے۔

اعتراض: اس جگہ فِیْ قُلُوْبِهِمْ کیوں بولا گیا مختصر عبارت یہ تھی کہ قُلُوْبُهُمْ مَرْضٰی یعنی ان کے دل بیمار ہیں **جواب:** اس میں اس جانب اشارہ ہے کہ ان کی یہ بیماری عارضی ہے اصلی نہیں۔ نیز یہ مرض ابھی راسخ نہیں ہوا بلکہ قابل علاج ہے اسی لئے ان کو ایمان کی طرف بلایا جا رہا ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ ۙ قَالُوْٓا اِنَّمَا
اور جب کہا جائے لئے ان کے نہ فساد کرو میں زمین کہتے ہیں اس کے

اور جو ان سے کہا جائے زمین میں فساد نہ کرو تو کہتے ہیں
نَحۡنُ مُصۡلِحُوۡنَ ﴿۱۱﴾
سوا نہیں ہم اصلاح کرنے والے ہیں
ہم تو سنوارنے والے ہیں

تعلق

اس سے پہلے بتایا گیا ان منافقوں کی دلی بیماری انتہا کو پہنچ چکی ہے اب اس کی نشانی بتائی گئی ہے وہ نیک و بد میں تمیز نہیں کر سکتے۔ بلکہ ہر ایک کو غلط سمجھتے ہیں جیسے کہ بیماریوں کے ساتھ ان کی علامات بھی بتاتے ہیں اسی طرح اس مرض کی یہاں یہ پہچان بتائی گئی تو گویا یہ آیت کا نتیجہ ہے اس کا عکس بھی ہو سکتا ہے یعنی چونکہ ان کے حواس ایسے بگڑ گئے کہ نیک کو بد اور بد کو نیک سمجھنے لگے تو لامحالہ ان کے لئے دردناک عذاب ہے یہ بھی تعلق ہے کہ اس سے پہلے منافقین کی بدعقیدگیوں اور بکواس اور برے اعمال کا ذکر تھا۔ اب ان کی بدمعاملگی کا ذکر ہو رہا ہے۔ یعنی دل ان کے بیمار۔ زبانیں ان کی جھوٹی۔ عبادتیں ان کی غلط اور ان کے معاملات بھی خراب ہیں چونکہ عبادات معاملات سے پہلے ہوتی ہیں اس لئے ان کا ذکر پہلے ہوا اور معاملات کا بعد میں۔

تتمہ: جن اعمال کا تعلق رب سے ہو۔ ان کو عبادات کہتے ہیں۔ جیسے، نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ اور جن کا تعلق بندوں سے ہو انہیں معاملات کہتے ہیں۔ جیسے تجارت آپس کے لین دین و دیگر برتاوے منافقین کے دونوں قسم کے اعمال خراب تھے۔ ان میں سے آخری قسم کا ذکر یہاں ہو رہا ہے۔

تفسیر

وَاِذَا قِیۡلَ۔ قِیۡلَ قول سے بنا ہے۔ جس کے چند معنی ہیں۔ ۱۔ بات۔ ۲۔ بولنا یا کہنا۔ ۳۔ دل کے خیالات۔ ۴۔ رائے۔ ۵۔ مذہب یہاں یا تو کہنا مراد یا رائے دینا کہنے والا کون ہے اس میں چند احتمال ہیں۔ رب تعالیٰ کہ اس نے نبی کریم ﷺ کے ذریعہ ان سے یہ فرمایا دوسرے خود نبی کریم ﷺ تیسرے عام مومنین چوتھے وہ مسلمان جن سے وہ فتنے کی باتیں کرتے تھے لَا تُفۡسِدُوۡا فساد سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں بگڑنا یعنی کسی چیز کا اعتدال سے نکل جانا اور نفع کے قابل نہ رہنا اس کا مقابل ہے صلاح جس کے معنی ہیں سنورنا اور نفع کے قابل ہونا اس فساد و صلاح میں بہت گنجائش ہے نفس کا فساد دو شخصوں کا فساد ہر شہر کا فساد کسی خاص ملک کا فساد اور زمین کا فساد فِی الۡاَرۡضِ نے یہ بتایا کہ یہاں آخری فساد مراد ہے تو منافقین سے کہا جا رہا ہے۔ کہ اگر تم خود بگڑے ہوئے ہو تو اوروں پر تو مہربانی کرو اور اللہ کی زمین میں فساد نہ پھیلاؤ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین کی بیماری متعدی یعنی پھیلنے والی تھی۔ اب یہاں فساد سے کیا مراد ہے؟ اس میں چند قول ہیں سیدنا عبداللہ بن عباس، حسن، قتادہ، سدی رضی اللہ عنہم کا یہ **قول** ہے کہ یہاں فساد سے مراد ہے علانیہ گناہ کرنا کیونکہ علانیہ گناہ سے خدا کی رحمتیں

بند ہو جاتی ہیں۔ عذاب نازل ہوتے ہیں۔ قتل دخون وغارت گری وغیرہ شروع ہو جاتی ہے چونکہ وہ لوگ موقع پا کر علانیہ گناہ بھی کرتے تھے اور اس سے ان کو روکا گیا۔ خیال رہے کہ صحابہ حضور کی فیض صحبت سے ایسے منجھ گئے تھے کہ اولاً تو وہ گناہ کرتے نہ تھے اگر کبھی کوئی گناہ سرزد ہو جاتا تو چھپانے کی کوشش نہ کرتے بلکہ بارگاہ نبوی میں آ کر اقرار کر کے سزا لیتے تھے منافق وہ مردود ازلی ٹولہ تھا جو اس آستانہ میں آ کر بھی درست نہ ہوئے فرمایا جا رہا ہے تم اپنے کام سے حضور کے نام کو بٹہ نہ لگاؤ۔ فساد نہ کرو **دوسرا قول**: یہ ہے کہ فساد سے مراد کفار سے ملنا ان کی تواضع وخاطر اور خوشامد کرنا ہے۔ تو گویا یہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ تم ایک طرف کے ہو کے رہو۔ تمہاری یہ منافقانہ حرکتیں فساد پھیلا دیں گی۔ **تیسرا قول**: یہ ہے کہ فساد سے مراد ہے مسلمانوں کے راز کفار تک پہنچانا چونکہ منافقین مسلمانوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے۔ اس لئے ان کو کچھ مسلمانوں کی جنگی تدبیریں معلوم ہو جاتی تھیں اور وہ کفار کو ان کی خبر کر دیتے تھے اس حرکت سے انہیں روکا گیا۔ چوتھا قول یہ ہے کہ منافقین نو مسلموں سے خفیہ مل کر ان کے دلوں میں اسلام کے خلاف شکوک وشبہات ڈالتے تھے وہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ جب پرانے مسلمان اسلام پر مطمئن نہیں تو ضرور اسلام میں کچھ خرابی ہو گی۔ یہاں فساد سے ان کی یہی حرکت مراد ہے اور اسی سے ان کو روکا جا رہا ہے۔ قَالُوْٓا ظاہر یہ ہے کہ یہ انہیں منافقین کا قول ہے جن کو فساد سے روکا گیا اس قول کا خلاصہ یہ ہے کہ ہم فساد نہیں پھیلاتے بلکہ اصلاح کرتے ہیں یعنی اے مسلمانو! جس چیز کو تم فساد کہتے ہو اس کو ہم اصلاح سمجھتے ہیں کیونکہ تمہارا اسلام فساد ہے اور اسی کو ہم مٹانا چاہتے ہیں یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ مُصْلِحُوْنَ سے مراد ہو صلح کرانا یعنی منافقین کہتے تھے کہ ہم کافروں سے اس لئے ملتے اور ان کی خاطر ومدارت کرتے ہیں۔ تاکہ تم میں اور ان میں صلح قائم رہے اور مدینہ پاک کی زمین خون سے رنگین نہ ہو۔ اور اے مسلمانو تمہاری کوشش یہ ہے کہ یہاں کشت وخون ہو جائے لہٰذا ہم ہی مصلح ہیں۔ نہ کہ تم اسی لئے انہوں نے اِنَّمَا بولا جو کہ حصر کیلئے آتا ہے قرآن کریم نے دوسرے مقام پر ان منافقین کا قول اس طرح نقل فرمایا قَالُوْٓا اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّآ اِحْسَانًا وَّتَوْفِیْقًا (النساء: ۶۲)

خلاصہ تفسیر

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان منافقین پر دلی بیماری اس قدر غالب آگئی کہ برے بھلے کی تمیز نہ رہی کیونکہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ چغل خوری، غمازی اور گناہوں سے ملک میں فساد برپا نہ کرو تو وہ جواب دیتے ہیں کہ ہم تو بھلائی کرتے ہیں وہ ان گناہوں کو بھلائی سمجھ بیٹھے، جیسے کہ بعض بیمار میٹھی چیز کو کڑوی اور کڑوی کو میٹھی محسوس کرتے ہیں یہی ان کا حال ہے۔ جب انسان اپنے عیب کو ہنر سمجھنے لگے۔ تو اس کی ہدایت بہت مشکل ہے۔ کیونکہ وہ جاہل مرکب ہے۔ **نوٹ**: یہ سمجھنا کہ اس قسم کے لوگ پہلے ہی تھے اب نہیں ہیں۔ سخت غلطی ہے۔ اب بھی بکثرت موجود ہیں۔ بت پرستی گنگا اشنان کرنا وغیرہ سب اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہیں مبارک وہ شخص ہے، جس کو دنیا میں حقیقت حال کی خبر ہو جائے۔ اور برے بھلے کی تمیز کرے ورنہ مرنے کے بعد تو ہو ہی جائے گی۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے ایک یہ کہ کفر درحقیقت فساد ہے کیونکہ یہ حق تعالیٰ کی بغاوت ہے اور بغاوت سے بڑھ

کر کوئی فساد نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ اسلام اور شریعت مطہرہ کی اطاعت زمین کی اصلاح ہے کیونکہ یہ وفاداری ہے اگر کوئی شخص کفر کر کے کشت و خون بند کر دے۔ تو وہ بھی مفسد ہے دوسرا شخص اسلام پھیلانے اور ہدایت دینے کیلئے جہاد و قتال بھی کرے تو وہ مصلح ہے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کسی مریض کا کوئی عضو گل گیا۔ اگر اسے نہ کاٹا جائے تو دوسرے اعضا کے گلنے کا بھی اندیشہ ہے۔ طبیب حاذق اس کو کاٹنا چاہے اور وہ بے وقوف اس سے بچے اور کہے کہ عضو کا کاٹنا جسم کو فاسد کرتا ہے میں تو اصلاح چاہتا ہوں ہر عضو کو اپنے حال پر ہی رہنے دوں گا۔ اگر چہ بظاہر طبیب جسم کو بگاڑ رہا ہے۔ اور وہ بیمار اس فساد سے بچنا چاہتا ہے لیکن در حقیقت طبیب مصلح ہے اور مریض مفسد۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ بیمار کی رائے بھی بیمار ہوتی ہے منافقین جسم کی اصلاح چاہتے تھے۔ وہ دونوں جہاں میں خرابی کا باعث تھی۔ ضرورت کے وقت جہاد نہ کرنا فساد ہے اور کرنا اصلاح۔ تیسرے یہ کہ کفار سے میل جول رکھنا۔ اور ان کے دینی معاملات میں خاطر تواضع کرنا ان کے ساتھ چاپلوسی اور خوشامدیں کرنا۔ ان کی خوشی کے لئے صلح کل بن جانا۔ اور حق گوئی سے باز رہنا منافقوں کی شان ہے۔ منافق دو قسم کا ہے۔ منافق عملی اور منافق اعتقادی نفاق عملی حرام ہے۔ نفاق اعتقادی کفر اور حرام۔ جیسا کہ اس زمانہ میں بہت لوگوں نے طریقہ اختیار کر لیا ہے سمجھ لو کہ مسلمانوں کی ترقی محض تعداد بڑھانے سے نہ ہوگی بلکہ حق کے ذریعہ ہوگی۔ آپ تولہ بھر عطر بڑھانے کے لئے ایک مٹکا پیشاب میں ملا دیں تو اس سے عطر بڑھا نہیں فنا ہو گیا۔ وہ تولہ بھر تھا تو عطر اور اب مٹکا بھر گیا مگر عطر نہ رہا۔ اتفاق بے شک اچھی چیز ہے مگر کس سے! مسلمانوں سے اور تنظیم بڑی ضروری چیز ہے مگر کس کی؟ مسلمانوں کی۔ غلط تنظیم کو مٹانا اسلام کا اولین فرض ہے۔ نبی کریم ﷺ نے جلوہ گری فرما کر غلط تنظیم کو ہی مٹایا اور سید الشہداء شہید کربلا امام حسین رضی اللہ عنہ نے یزیدی تنظیم کی دھجیاں اڑا دیں اپنی قلت اور مخالفین کی کثرت کی بالکل پرواہ نہ کی اس وقت تنظیم کی رٹ لگانے والے اور اتفاق اتفاق کا گیت گانے والے اسلامی تنظیم سے منہ موڑ کر غلط سیاسی تنظیم کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اور دیوبندی، وہابی، قادیانی، بلکہ ہندو اور عیسائی وغیرہ سب مل کر ایک ہو جائیں۔ نہ ایسا ہو سکا ہے اور نہ ہو سکے گا۔ روشنی اور تاریکی کفر و ایمان میں کبھی اتفاق ہوا ہی نہیں۔ اگر چہ خود ساختہ تنظیم کی بجائے مسلم قوم کی صحیح معنی میں تنظیم کرتے تو یقیناً بہت کامیاب ہوتے اور چھوٹی چھوٹی جماعتیں دیوبندی، قادیانی وغیرہ کبھی کی فنا ہو کر اسلام میں داخل ہو چکی ہوتیں ان تمام جماعتوں کا پھیلانا اس بے ہودہ تنظیم کے شور کا نتیجہ ہے۔ میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ مسلمان ہر ایک سے لڑتے پھریں بلکہ یہ ہے کہ ان سب سے علیحدہ رہیں اور ان میں سے کسی کو دوست نہ بنائیں قرآن کریم فرماتا ہے۔ لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ (آل عمران: ۲۸) مسلمان کفار کو دوست نہ بنائیں۔ حق تعالیٰ عمل کی توفیق عطا فرمائے۔

تفسیر صوفیانہ

جس طرح سے عمدہ زمین میں جس قسم کا بیج ڈالا جائے گا۔ اسی قسم کا درخت اگے گا جو شخص بار آور درختوں کی بجائے خاردار (کانٹے والے) درخت بوئے وہ اس زمین کو بگاڑتا ہے اور اپنے کو ان فوائد سے محروم کرتا ہے۔ اسی طرح انسانی دل میں ہر قسم کی استعداد ہے۔ اگر اس میں ایمان کا بیج بویا تو اس سے عمدہ پھل حاصل ہوں گے اور کفر کے بیج سے کانٹے ہاتھ لگیں گے۔

یہاں یہ کہا جارہا ہے کہ اے منافقو! اپنے اس قلب کی کھیتی میں کفرونفاق کا بیج ڈال کر اس کو فاسد نہ کرو۔ بلکہ ایمان بو کر اور عبادات کا پانی دے کر نیک صحبتوں کی ہوا لگا کر پھل دار درخت پیدا کرو۔ لیکن وہ اپنی بے وقوفی کے کانٹے بو کر پھل کے امیدوار ہیں۔

اعتراضات

اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ منافقین اپنی بے ایمانیاں ظاہر کرتے ہیں اور مسلمانوں کے سمجھانے پر ایسے بے ہودہ جواب بھی دیتے تھے۔ تو اس صورت میں وہ منافق کہاں رہے بلکہ کھلے کافر ہو گئے **جواب:** یہ لوگ خفیہ طور پر ایسی بدکاریاں کرتے تھے۔ اور جب کبھی کسی مسلمان کو پتہ لگ جاتا تھا تو ان کو سمجھاتا تھا تو وہ خاموش ہو جاتے تھے مگر اپنے دل میں یہ سوچتے تھے کہ ہماری یہ روش ٹھیک ہے حق تعالیٰ نے اس آیت میں ان کے دلی راز کو ظاہر فرمایا خیال رہے کہ عہد نبوی میں منافقین پر تلوار کا جہاد نہ تھا۔ اگرچہ ان سے علامات کفر ظاہر ہوتی تھیں حضور کے بعد ایمان ہے یا کفر نفاق کوئی چیز نہیں۔ اب جس کلمہ گو سے علامات کفر میں سے کوئی علامت ظاہر ہو گی مرتد واجب القتل ہو گا جیسا کہ مشکوٰۃ آخر باب علامات النفاق میں حضرت عائشہ کا ارشاد ہے اور اس کی شرح لمعات میں یہ ہی توجیہ مذکور ہے جو اپنے نفاق کو اصلاح کہے وہ مرتد ہے۔

اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۲﴾
خبردار تحقیق وہ ہی فسادی ہیں اور لیکن نہیں شعور رکھتے
سنا ہے وہ ہی فسادی ہیں مگر انہیں شعور نہیں

تعلق

اس سے پہلے منافقین کی بکواس کا ذکر ہوا۔ اب اس کی تردید ہو رہی ہے۔ مگر جس شدومد سے انہوں نے اپنی تعریف کی تھی اس سے بڑھ کر ان کی برائی بیان ہوئی۔

تفسیر

اَلَا حرف تنبیہ ہے۔ کبھی تو یہ لفظ غافل کو آگاہ کرنے کے لئے بولا جاتا ہے اور کبھی مضمون کی اہمیت بتانے کے لئے جس کا ترجمہ ہے۔ خبردار اگر کلام کی توجہ منافقین کی طرف ہے تب تو یہ غافلوں کو بیدار کرنے کے لئے ہے۔ اور اگر مسلمانوں سے خطاب ہے تو چونکہ وہ تو پہلے ہی سے خبردار ہیں اس لئے محض مضمون کی اہمیت کے لئے ہے اِنَّهُمْ۔ اِنَّ اس جگہ استعمال کیا جاتا ہے۔ جہاں کہ اس کلام کا کوئی منکر ہو یا اس کے انکار کا احتمال ہو۔ چونکہ اس مضمون کے منافقین و کفار منکر تھے اور ضعیف الاعتقاد مسلمانوں کے انکار کا اندیشہ تھا۔ کیونکہ بظاہر معلوم ہوتا تھا کہ منافقین امن پسند اور صلح کل ہیں۔ اور مسلمان جنگ جو اور شورش پسند ہیں۔ اس لئے اس جگہ اِنَّ لایا گیا فرمایا گیا کہ یقیناً یہ صلح پسندی عین فساد ہے هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ دوبارہ۔ هُمْ لانے سے حصر کے معنی پیدا ہو گئے یعنی منافقین ہی مفسد ہیں نہ کہ مسلمان۔ منافقین نے اپنے کلام میں اِنَّمَا بول کر بتایا تھا کہ

اصلاح کرنا ہمارا ہی کام ہے نہ کہ مسلمانوں کا۔حق تعالیٰ نے ھم فرما کر بتا دیا کہ فساد پھیلانا منافقوں ہی کا کام ہے نہ کہ مسلمانوں کا اَلْمُفْسِدُوْنَ میں بہت گنجائش ہے۔کیونکہ اس کے معنی ہیں بگاڑنے والے تو یہ منافقین اپنی زبان، خیال اور سارے اعضاء کو کفر سے بگاڑنے والے ہیں اور لوگوں کو بھی ایمان سے روک کر بگاڑتے ہیں۔کافروں کو کفر میں مضبوط کر کے بگاڑتے ہیں۔زمین کو اللہ کا ذکر روک کر بگاڑتے ہیں اس لئے ہر طرح مفسد ہی ہوئے وَلٰکِنْ لَّا یَشْعُرُوْنَ شعور حواس کے جاننے کو کہتے ہیں تو اس میں اس جانب اشارہ سے ظاہر ہو رہا ہے کہ منافقوں کا مفسد ہونا ایسا ظاہر ہے کہ گویا آنکھوں سے نظر آ رہا ہے۔مگر ان کی آنکھیں بھی پھوٹی ہوئی ہیں جس کی وجہ سے ایسی کھلی ہوئی چیز بھی محسوس نہیں کر سکتے۔ کیونکہ تقیہ کا برا ہونا تمام دینوں میں مسلم ہے۔دو غلے آدمی کو سب ہی برا کہتے ہیں۔یہ ایسے اندھے ہیں کہ اچھا سمجھتے ہیں مجبوری کے وقت منہ سے کفر نکالنا ایسا درست ہے جیسے جان کے خطرے پر سور شراب کھانا نیز صحابہ کو رب نے حضور کی صحبت، جمع قرآن، اشاعت اسلام کے لئے منتخب کیا۔مہربان باپ اپنے بیٹے کو بروں کی صحبت سے بچاتا ہے۔مہربان رب نے اپنے محبوب کو صحبت اصحاب کیلئے منتخب کیا کہ فرمایا اِصْبِرْ نَفْسَکَ مَعَ الَّذِیْنَ الخ (کہف:۲۸) اور فرمایا وَلَا تَعْدُ عَیْنٰکَ عَنْھُمْ (کہف:۲۸) اور فرمایا وَلَا تَطْرُدِالَّذِیْنَ (انعام:۵۲)

خلاصہ تفسیر

یہاں یہ فرمایا جا رہا ہے کہ دیکھو یہی لوگ اول درجہ کے مفسد ہیں۔مگر ساتھ ہی ساتھ اول درجہ کے بے شعور بھی ہیں کہ ان کو فساد و اصلاح کی تمیز نہ رہی۔دل کے اندھے ہونے سے ظاہری اعضاء بھی بیکار ہو جاتے ہیں۔

تفسیر صوفیانہ

انسان کا تعلق دنیا سے بھی ہے اور دین سے بھی۔لیکن دنیا اور دین آپس میں ضد ہیں۔دنیا کا سنبھالنا دین کو بگاڑنا ہے اور دین کی اصلاح دنیا کو فاسد کرتی ہے۔حقیقت پر نظر رکھنے والے دین کی زیادہ فکر رکھتے ہیں۔اور بہت دفعہ دین کے مقابلے میں دنیا کو بگاڑ لیتے ہیں۔لیکن ظاہر بین لوگ دنیا کو دین پر مقدم سمجھتے ہیں کہ دنیا کے لئے دین کو برباد کر ڈالتے ہیں۔منافقین ان ہی لوگوں میں سے تھے کہ جن کی نگاہ میں فقط دنیا کا حاصل کر لینا انتہائی کمال تھا۔اس لئے وہ اپنے اس کام کو اصلاح کہتے تھے۔اور رب تعالیٰ نے اس کو فساد قرار دیا کیونکہ یہ اپنی دنیا سنبھال کر دین بگاڑ رہے تھے۔باقی کو چھوڑ کر فانی چیز اختیار کرنا یقیناً فساد ہی ہے۔

تتمہ: خیال رہے کہ صوفیائے کرام کے نزدیک دنیا وہ ہے جو حق سے غافل کر دے۔خوراک و پوشاک زن و فرزند اور دیگر جائز کاروبار اگر رسول اللہ ﷺ کی اتباع کے لئے ہوں تو وہ سب عین دین ہیں۔

چیست دنیا از خدا غافل بودن ‏ نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

فائدے

پہلا فائدہ: اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو کوئی اللہ والوں کا مقابلہ کرتا ہے وہ حق تعالیٰ کا مقابل قرار پاتا ہے۔اور مقبول

بندوں پر اعتراض کرنا در پردہ حق تعالیٰ پر اعتراض ہے۔ کیونکہ منافقین نے مسلمانوں پر اعتراض کیا تھا نہ کہ رب پر۔ مگر جواب رب نے دیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ نے اس اعتراض کو اپنی طرف منسوب فرمایا۔ جیسے کہ بارہا نبی ﷺ پر اعتراضات ہوئے اور رب تعالیٰ نے ان کے جواب دیئے۔ **دوسرا فائدہ:** اس سے معلوم ہوا کہ جو کوئی اللہ کا ہو جاتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے یعنی جو دنیا میں اللہ کا وکیل بن جائے کہ اس کے احکام اپنی کوشش سے پھیلائے تو رب تعالیٰ بھی اس کا وکیل ہو جاتا ہے۔ کہ جو اس پر مصیبت پڑے اس خود دفع فرمائے۔ اسی لئے فرمایا گیا فَاتَّخِذْهُ وَكِيلًا (المزمل:۹) حقیقت یہ ہے کہ جو شخص اطاعت رب کی فکر میں رہتا ہے۔ رب تعالیٰ اس کو ذنیوی فکروں سے بچا لیتا ہے۔ **تیسرا فائدہ:** یہ کہ صحابہ کرام کو فسادی کہنا منافقوں کا کام ہے۔ منافقوں نے کہا تھا کہ ہم ہی مصلح ہیں۔ یعنی فسادی تم ہو تو رب نے فرمایا کہ منافق ہی فسادی ہیں کوئی صحابی فسادی نہیں۔ ان حضرات کی آپس کی جنگیں بھی فساد نہ تھیں وہ نفسانی نہ تھیں۔ منافقوں کی نمازیں بھی فساد ہیں کہ یہ نمازیں نفسانی ہیں رحمانی نہیں۔ دیکھو رب نے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو کافر یا فسادی نہ قرار دیا بلکہ انہیں ہدایت کے تارے بتایا اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا الخ (یوسف:۴)

اعتراضات

اعتراض: اس آیت کے حصر سے معلوم ہوا کہ صرف منافقین ہی مفسد ہیں تو کیا دوسرے کفار اور بے دین مفسد نہیں۔
جواب: اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہ حصر مسلمانوں کے مقابلہ میں ہے۔ یعنی مسلمان مفسد نہیں وہ ہی مفسد ہیں لہٰذا یہ حصر اضافی ہوا نہ کہ حصر مطلق۔ دوسرے یہ کہ جس فساد کا یہاں ذکر ہو رہا ہے وہ صرف منافقین ہی پھیلاتے ہیں۔ اس قسم کا فساد اور کوئی نہیں پھیلاتا تو یہ حصر خاص اس فساد کے لحاظ سے ہے۔

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ قَالُوْٓا
اور جب کہا جاوے لئے ان کے ایمان لاؤ جس طرح ایمان لائے لوگ کہتے ہیں کیا ایمان لائیں جس طرح
اور جب ان سے کہا جاوے ایمان لاؤ جیسے اور لوگ ایمان لائے تو کہیں
اَنُؤْمِنُ كَمَآ اٰمَنَ السُّفَهَآءُ ۭ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ
ایمان لائے بے وقوف لوگ خبردار تحقیق وہ ہی بے وقوف ہیں
کیا ہم احمقوں کی طرح ایمان لائیں سنا ہے وہی احمق ہیں
وَلٰكِنْ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳﴾
اور لیکن نہیں جانتے
مگر جانتے نہیں

تعلق

اس آیت کا گزشتہ آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ **ایک** یہ کہ اس سے پہلے منافقین کی دو قسم کی برائیاں بیان کی گئیں اب تیسری قسم کی برائی بیان ہو رہی ہے۔ **دوسرے** اس طرح کہ پہلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ مسلمان منافقین کو فساد سے منع کرتے ہیں اور وہ نہیں مانتے۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ مسلمان ان کو حقیقی ایمان کی طرف بلاتے ہیں وہ یہ بھی نہیں مانتے چوں کہ مکمل تبلیغ یہی ہے کہ گمراہ کو برائی سے روکا جائے اور بھلائی کی طرف بلایا جائے تو گویا کہ مسلمانوں کی تبلیغ کا ایک حصہ یعنی برائی سے روکنا پہلے ذکر ہوا اور دوسرا حصہ یعنی حقیقی ایمان کی دعوت دینا اب مذکور ہوا۔ اس میں مسلمانوں کو تبلیغ کا طریقہ بھی سکھایا جا رہا ہے اور یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ برائی سے بچانا بھلائی کرانے پر مقدم ہے۔ چونکہ فساد سے باز رہنا حقیقی ایمان کی شرط ہے اس لئے پہلے اس اسے بیان کیا گیا اور بعد میں ایمان کو۔

تفسیر

قِیْلَ میں یہاں بھی وہی احتمالات ہیں جو پہلے بیان ہوئے۔ کہ یا تو یہ قول رب کا ہے یا نبی ﷺ کا۔ یا محض مسلمانوں کا اٰمِنُوْا میں ایمان کا حکم ہے۔ حالانکہ وہ تو پہلے ہی سے بظاہر مومن تھے جس سے معلوم ہوا کہ محض زبانی ایمان بالکل معتبر نہیں یہاں ایمان کا تو حکم ہے لیکن اس کا ذکر نہیں کہ کس پر ایمان لاؤ۔ کیونکہ آئندہ عبارت اس کو ظاہر کر رہی ہے کہ جس پر سب لوگ ایمان لائے اس پر تم بھی لاؤ۔ اَلنَّاسُ سے مراد یا تو جنس انسان ہیں تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ تم آدمیوں کی طرح ایمان لاؤ۔ جس سے معلوم ہوا کہ جو صحیح مومن نہ ہو۔ وہ حقیقت میں آدمی ہی نہیں۔ بلکہ جانور سے بھی بدتر ہے کہ وہ تو اپنے مالک کو پہچانے اور یہ نہ پہچانے یا اس سے خاص لوگ مراد ہیں۔ ان خاص میں چند احتمال ہیں یا حضور ﷺ اور ان کے سارے جان نثار صحابہ یا ان منافقین کے دوسرے اہل وطن مُخْلِصِیْن یا ان کے اہل قرابت مومنین جیسے عبداللہ ابن سلام رضی اللہ عنہم تفسیر عزیزی نے سیدنا عبداللہ ابن عباس سے روایت کیا کہ یہاں الناس سے مراد ابوبکر، عمر، عثمان، وعلی ہیں رضی اللہ عنہم اجمعین چونکہ اس زمانہ میں یہ حضرات خلوص ایمان میں بہت مشہور ہو چکے تھے اس لئے ان کا ایمان اوروں کے ایمان کے لئے ایک معیار بن چکا تھا کہ جس کا ایمان ان حضرات کی طرح ہو وہ تو مومن ہے ورنہ نہیں گویا یہ کہا جا رہا ہے کہ اے منافقو! تم ظاہری ایمان تو لے آئے مگر یہ بیکار ہے۔ اگر اپنی بھلائی چاہتے ہو تو صدیق وفاروق والا ایمان لاؤ۔ بازار میں اس چیز کی قدر و منزلت ہوتی ہے جس پر کارخانے کی مہر ہو۔ ایسے ہی بازار محبت میں اسی ایمان کی قیمت ہے جس پر مصطفیٰ ﷺ کی مہر ہو اور وہ صدیقی اور فاروقی ایمان ہے۔ اَلسُّفَهَآءُ سَفَهٌ سے بنا ہے اسکے لغوی معنی ہیں ہلکا پن اہل عرب بولتے ہیں سَفِهَتُہُ الرِّیْحُ یعنی اس کو ہوا اڑا لے گئی۔ اصطلاح میں اس کے معنی ہیں بے وقوفی اور حماقت۔ کیونکہ اس میں بھی عقل کا ہلکا پن ہوتا ہے اس کا مقابل علم اور اَنَاۃٌ جس کے معنی میں بردباری اور دور اندیشی منافقین نے مخلص مسلمانوں کو چند وجوہ سے بے وقوف کہا۔ **ایک** یہ کہ اس وقت اکثر مسلمان فقراء و مساکین تھے اور منافقین مالدار۔ ان کی حقارت بیان کرتے ہوئے ان کے لئے یہ لفظ بولا **دوسرے** اس لئے کہ منافقین اسلام کو باطل دین اور کفر کو سچا دین سمجھتے تھے اور جو باطل دین اختیار کرے وہ بے

وقوف ہوتا ہے اس لئے ان مسلمانوں کو اس لفظ سے یاد کیا **تیسرے** اس لئے کہ مسلمانوں نے دین کے مقابلہ میں دنیا پر لات ماردی تھی منافقین سمجھے کہ دنیوی نفع نقد ہیں اور دینی نفع ادھار۔ اور ادھار بھی ایسے کہ موت یا قیامت سے پہلے وصول نہ ہو سکیں تو نقد کو چھوڑ کر ادھار لینے والا ان کے نزدیک بے وقوف تھا **چوتھے** اس لئے کہ منافقین کے خیال میں دنیوی راحتیں یقینی تھیں اور دینی فائدے (جنت اور وہاں کی نعمتیں وغیرہ) محض خیال اور وہمی کہ اولاً تو یہی نہیں معلوم کہ ان کی کچھ حقیقت بھی ہے یا نہیں اور اگر کچھ ہے تو ہمیں ملیں یا نہ ملیں اور اگر ملیں تو نہ معلوم کب اور کس طرح۔ تو محض وہمی اور خیالی چیزوں کی امید پر ان یقینی نفعوں کو چھوڑنا بے وقوفی ہے **پانچویں** اس لئے کہ کفار مدینہ سے ہمیشہ تعلقات رہے ہیں اور رہیں گے اسلام ایک پردیسی مذہب ہے اور مسلمان مسافر لوگ نہ معلوم کہ یہ دین باقی رہے یا نہ رہے۔ ان پردیسی لوگوں اور عارضی دین کی محبت میں اپنے اصلی اور حقیقی دوستوں سے بگاڑ لینا بے وقوفی ہے۔ ہم نے ایسی عقل مندی کی ہے کہ اس پر شیطان بھی قربان ہو جائے۔ وہ یہ کہ دونوں کو راضی رکھا اگر مسلمان غالب رہے تو ہم ان سے نفع حاصل کریں گے۔ اور اگر کفار غالب آ گئے تو ہماری پانچوں گھی میں ہیں۔ دوطرفہ رہنا نہایت عقل مندی ہے۔ رب تعالیٰ نے ان کے اس جھوٹے خیال کی نہایت نفیس تردید فرمائی کہا اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَآءُ اَلَا۔ اِنَّ اور هُمْ کے فوائد ہم پہلے بیان کر چکے ہیں حق تعالیٰ نے ان منافقین کو چند وجہوں سے بے وقوف فرمایا۔ اولاً اس لئے کہ انہوں نے مٹنے والے نفع کی خاطر باقی رہنے والی نعمتوں کو چھوڑ دیا اور جو باقی کے مقابل فانی اختیار کرے وہ نہایت بے وقوف ہے۔ دوسرے اس لئے کہ انہوں نے قوی دلائل کے مقابلہ میں اپنے فاسد خیالات پر اعتماد کیا۔ اور ایسا شخص بڑا احمق ہے۔ تیسرے اس لئے کہ یہ دو گھر کے مہمان بنے اور دو گھر کا مہمان ہمیشہ بھوکا رہتا ہے۔ یعنی ان کی ان حرکتوں سے نہ تو مسلمانوں میں ان کا اعتبار رہے گا اور نہ ہی کفار میں۔ چوتھے اس لئے کہ ان کا یہ مکر اس وقت چل سکتا تھا جب مسلمان ان کی حقیقت سے بے خبر رہتے۔ حالانکہ رب نے ان کی قلعی کھول دی۔ اور مسلمانوں کو ان کے دلی ارادوں سے خبردار کر دیا۔ پانچویں اس لئے کہ انہوں نے نبی کریم ﷺ کی مخالفت کی جو کہ درحقیقت رب کی مخالفت ہے اور رب کی مخالفت کر کے کوئی بھی عزت نہیں پا سکتا۔ ان کی مثال تو بالکل ایسی ہے کہ کوئی شفا حاصل کرنے کے لئے سانپ سے کٹوالے لَا يَعْلَمُوْنَ پہلی آیت میں لَا يَشْعُرُوْنَ فرما کر احساس کی نفی فرمائی گئی تھی اور یہاں لَا يَعْلَمُوْنَ فرما کر علم اور سمجھ کی نفی فرمائی گئی۔ اس میں چند حکمتیں ہیں ایک یہ کہ وہاں فساد کا ذکر تھا جو حواس سے محسوس ہوتا ہے۔ اور یہاں بے وقوفی کا ذکر ہوا جو عقل سے معلوم ہوتی ہے دوسرے یہ کہ منافقین نے مسلمانوں کو بے وقوف کہا تو رب تعالیٰ نے ان کو جاہل فرمایا۔ تیسرے یہ کہ رب تعالیٰ نے انہیں یہاں بے وقوف فرمایا۔ اور پھر فرمایا کہ انہیں اپنی بے وقوفی کی بھی خبر نہیں۔ کیونکہ علم تو عقل سے حاصل ہوتا ہے۔ جب یہ عقل ہی سے محروم ہیں تو علم کیسے پا سکتے ہیں۔ روح البیان شریف نے اس جگہ بیان فرمایا کہ جب آدم علیہ السلام پیدا ہوئے تو ان کی خدمت میں جبریل امین تین تحفے لے کر حاضر ہوئے۔ علم، حیا اور عقل اور عرض کیا کہ آپ ان میں سے ایک کو اختیار فرمالیں حضرت آدم علیہ السلام نے عقل اختیار فرمائی۔ جبریل امین نے علم اور حیا سے کہا کہ تم واپس جاؤ۔ ان دونوں عرض کیا کہ ہم عالم ارواح میں بھی عقل کے ساتھ ہی رہے اور اب بھی ساتھ ہی رہیں

گے۔ عقل دماغ اور علم دل اور حیاء آنکھوں میں قائم ہوگئی۔ مثنوی شریف میں فرمایا۔

جملہ حیواں را پئے انساں بکش — جملہ انسان را بکش از بہرہش
لطف اُو عاقل کند مرتل را — قہر او ابلہ کند قابیل را

خلاصہ تفسیر

اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ جب کوئی خیر خواہ ان سے کہتا ہے کہ تم اللہ والوں کی طرح حقیقی ایمان لے آؤ جس سے فتنہ وفساد بند ہو جائے اور دنیا سے نفرت اور آخرت سے الفت حاصل ہو اور تمہارا شمار بھی آخرت کے ان لوگوں میں ہو جائے جو حقیقتاً انسان ہیں تو منافقین جواب دیتے ہیں کہ کیا ہم بھی ان بے وقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں جنہوں نے خیالی جنت کے لئے دنیوی راحت کو ٹھکرا دیا۔ بھائی دنیا دین سے مقدم ہے۔ آخرت کس نے دیکھی ہے اور وہاں کی نعمتیں کیا خبر کیسی ہیں۔ اس جگہ آرام کر لینے دو۔ اس ادھار کی امید پر یہ نقد کیوں چھوڑیں۔ اور کیا ہم ان کی طرح ہو جائیں کہ جو دنیا کے عیش وآرام کو چھوڑ کر دن کو روزے اور رات کو عبادت الٰہی میں مشغول رہتے ہیں۔ انہیں دنیا سازی آتی ہی نہیں۔ بھائی یہ مسلمان ناعاقبت اندیش ہیں۔ اندھا دھند ایک طرف چل پڑے۔ ہم عقل مند اور نہایت پولیٹیکل آدمی ہیں۔ دنیا سازی کوئی ہم سے سیکھے۔ ہم نے وہ تدبیر کی ہے اور ایسی چال چلی ہے کہ جس سے ہمارا کبھی نقصان ہو سکتا ہی نہیں۔ اگر مسلمانوں کا دور دورہ رہا تو ہم ان کے یار بنے رہیں گے اور در پردہ کفار سے بھی ساز باز رکھیں گے۔ تا کہ اگر ان کا غلبہ ہو جائے تو بھی ہمارا مدعا ہاتھ سے نہ جائے۔ چند غریبوں کی وجہ سے سب بڑے بڑے آدمیوں کو ناراض کر لینا عقل مندوں کا کام نہیں۔ حق تعالیٰ نے جواب دیا کہ یہ بڑے ہی احمق اور بے وقوف ہیں کیونکہ ان کی یہ دورنگی چال ہر طرح خطرناک ہے۔ کبھی ایسا وقت آجائے گا کہ دنیا میں انہیں کوئی نہ پوچھے گا۔ اور قیامت تک ان پر لعن طعن ہوتی رہے گی۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ ایک یہ کہ دینی باتوں میں اللہ کے مقبول بندوں کی پیروی کرنی ضروری ہے۔ کیونکہ یہاں حکم دیا گیا ہے کہ مقبولوں کی طرح ایمان لاؤ۔ **دوسرے** یہ کہ اس سے معلوم ہوا کہ مذہب اہل سنت وجماعت حق ہے۔ اس لئے کہ اس میں سنت رسول اللہ اور صالحین کی پیروی ہے۔ **تیسرے** یہ کہ وہابی، دیوبندی وغیرہ تمام باطل فرقے گمراہ ہیں کیونکہ غیر مقلدوں کے نزدیک تقلید کرنا یعنی اللہ والوں کے راستے پر چلنا برا ہے۔ اور دیوبندی ان سارے امور خیر کو شرک کہتے ہیں۔ جن پر عرب وعجم کے مسلمانوں کا عمل ہے۔ چوتھے یہ کہ صالحین کو برا کہنا منافقوں کا طریقہ ہے۔ آج کل بھی رافضی خلفاء راشدین کو اور خارجی علی مرتضی کو برا کہتے ہیں بلکہ تبرا رافض کا رکن ایمان ہے۔ حالانکہ یہ منافقوں کا کام ہے کہ صحابہ کو سفہاء کہہ کر تبرا کرتے تھے غیر مقلد اماموں خاص کر امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کو گالیاں دیتے ہیں۔ دیوبندی تمام زمانے کے اولیاء اللہ مقبولین بارگاہ علماء کرام کو مشرک اور کافر جانتے ہیں کیونکہ میلاد شریف کرنا حضور ﷺ کی تعریفیں کرنا ہی شرک ٹھہرا۔ تو اس صورت میں کوئی عالم اور ولی شرک سے نہ بچا۔ اگر تقویۃ الایمان کے شرکیات پر غور کیا جائے تو خود

اسلام کا ماننا شرک ہے مرزائی گزشتہ انبیاء کو چکڑالوی صحابہ کرام اور محدثین کو نیچری تمام اکابرین کو برا کہتے ہیں۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ سب گمراہ ہیں۔ (تفسیر خزائن العرفان) پانچویں یہ کہ اس میں دین دار عالموں کو تسلی ہے کہ وہ بے دینوں کی بدزبانی سے رنجیدہ نہ ہوں بلکہ یہ سمجھ لیں کہ اہل باطل کا ہمیشہ یہ دستور رہا ہے (تفسیر مدارک) حق یہ ہے کہ علماء کرام دین مصطفیٰ ﷺ کے محافظ اور چوکیدار ہیں۔ چور پہلے چوکیدار ہی پر حملہ کرتا ہے کیونکہ اس کے ہوتے ہوئے وہ چوری نہیں کر سکتا اس لئے آج جو بھی بے دین اٹھتا ہے وہ علماء پر لعن طعن کرتا ہی اٹھتا ہے کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ ان کی موجودگی میں ہم دین مصطفیٰ ﷺ میں چوری نہیں کر سکتے۔ مگر یاد رہے کہ چوکیدار پر شہنشاہ کا ہاتھ اور اس کی پشت پر سارا سلطانی عملہ ہوتا ہے۔ اسی طرح علماء دین پر مصطفیٰ ﷺ کا دست کرم ہے اور ملائکہ ان کی حمایت پر ہیں۔ اسی لئے بڑی بڑی طاقتیں جیسے خاکساری، نیچری، وغیرہ علماء سے ٹکرائیں مگر پاش پاش ہوگئیں۔ علماء کے اقبال و وقار میں بفضلہ تعالیٰ کوئی فرق نہ آیا۔ علماء کو بھی لازم ہے کہ دین حق کی خدمت کو اپنا مقصد قرار دیں اگر یہ خادم دین بن کر رہیں گے تو انشاءاللہ دنیا خود ان کے پیر چومے گی۔ چھٹے یہ کہ مقبولان خدا کا دشمن درحقیقت حق تعالیٰ کا دشمن ہے۔ دیکھو ان منافقین نے مسلمانوں کو بے وقوف کہا تھا۔ حق تعالیٰ نے خود ان کا بدلہ دیا۔ اور ان کو بیوقوف فرمایا۔ ساتویں یہ کہ صحابہ پر تبرا کرنا منافقوں کا کام ہے۔ وہ ان حضرات کو سُفَهَاء کہہ کر تبرا کرتے تھے۔

تفسیر صوفیانہ

صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ انسان دنیا میں مسافر کی حیثیت سے ہے۔ اپنے وطن یعنی عالم ارواح سے اپنے مالک سے کچھ عہد و پیمان کر کے کمائی کرنے یہاں پردیس میں آیا ہے۔ لیکن یہاں کے باغ و بہار میں پھنس کر اپنے اصلی وطن اور حقیقی مقصد کو بھول گیا۔ وطن سے برابر چٹھیاں تار اور قاصد آ رہے ہیں کہ اے پردیسیو! پردیس سے کما کر اپنے دیس کو بھیجتے رہو۔ تمہیں یہ موقعہ پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ عقل مند تو ان پیغاموں کو سن کر فوراً ہوش میں آجاتے ہیں۔ اور اپنے وطن کی تیاری میں مشغول ہو جاتے ہیں۔ مگر غافل لوگ اس جھوٹی زیب و زینت میں کچھ ایسے مست ہیں کہ ان پیغاموں سے بھی ان کی آنکھ نہیں کھلتی۔ جب کوئی خیر خواہ ان سے کہتا ہے کہ دیکھو فلاں شخص کی طرح تم بھی سفر کی تیاری کرلو تو بجائے اس کے کہ اس کا احسان مانتے الٹے اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اور دل والوں کو مجنوں اور دیوانہ کہتے ہیں۔ پردیس کے ساز و سامان پر ایسے قناعت کر چکے ہیں کہ انہیں اپنے دیس کا کچھ ہوش ہی نہ رہا۔ وہ ان اللہ والوں کے پھٹے پرانے کپڑوں اور زرد چہروں کو دیکھتے ہیں۔ ان کے دل کی نورانیت اور سینوں کے خزینوں سے بے خبر ہیں۔ یہ اللہ والے اس چاند سورج کی طرح ہیں جو گرد و غبار کی آڑ میں اغیار کی نگاہوں سے چھپے ہوں۔ مثنوی شریف میں فرمایا۔

گر تو سنگ صخرہ ای مرمر شوی — چوں بصاحب دل رسی جوہر شوی

انہم تحت قبائی کامنوں — جز کہ بر دانش نداند ز آزموں

صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ علم دو قسم کا ہے۔ ایک علم ظاہری اور دوسرا علم لدنی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ قلب کے دو

دروازے ہیں۔ ایک بیرونی اور ایک اندرونی، بیرونی دروازہ تو ظاہری حواس ہیں۔ کہ ان کے ذریعہ سے قلب علم ظاہری حاصل کرتا ہے۔ اور اندرونی دروازہ الہام ہے کہ جس سے علم باطنی حاصل ہوتا ہے۔ جو شخص کہ فقط ظاہری علم پر اعتماد کرکے باطنی دروازہ بند کرے۔ وہ اگرچہ کتنا ہی پڑھا لکھا ہو مگر جاہل ہے۔ یہ منافقین بڑے چالاک اور دنیوی سمجھ رکھنے والے تھے مگر چونکہ علم لدنی سے بے بہرہ تھے۔ اس لئے انہیں فرمایا گیا۔ لَا یَعْلَمُوْنَ جو شخص کہ ظاہری علم کی اصطلاحیں یاد کرے اور اس کا دروازہ قلب نہ کھلے وہ علم کے انوار سے محروم رہتا ہے۔ بلکہ اکثر یہ علم اسکے لئے حجاب بن جاتا ہے۔ اَلْعِلْمُ حِجَابُ اَکْبَر۔

چند خوانی حکمت یونانیاں حکمت ایمانیاں راہم بخواں

اعتراضات

اعتراض: اس زمانہ پاک میں منافقین کو اتنی جرات کیسی ہوتی تھی کہ وہ صحابہ کرام کی بدگوئی کر لیتے۔ اس پر مسلمان خاموش رہتے تھے۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی کسی بے دین کی یہ جرات نہیں کہ علی الاعلان صحابہ کرام کی شان میں گستاخی کر سکے۔ **جواب:** ان کی یہ بدزبانی مسلمانوں کے سامنے نہ تھی۔ یہ تبرا بازیاں خاص مجلسوں میں کرتے تھے رب تعالیٰ نے ان کا پردہ فاش کر دیا آج کل کے گمراہ فرقے بھی اپنے برے عقیدے مسلمانوں سے چھپاتے پھرتے ہیں۔ مگر حق تعالیٰ ان کی تحریروں اور کتابوں سے ان کے راز فاش فرما دیتا ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کو ہوشیار کیا گیا ہے کہ وہ گمراہوں کے اچھے الفاظ سے دھوکہ نہ کھائیں۔ (تفسیر خزائن العرفان) **دوسرا اعتراض:** عقائد میں تقلید کرنا منع ہے۔ اور تقلیدی ایمان کا اعتبار نہیں لیکن اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ دین میں تقلید چاہئے کیونکہ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ مسلمانوں کی طرح تم بھی ایمان لے آؤ۔ **جواب:** یہ تقلیدی ایمان نہیں۔ اس آیت کا منشا ہی کچھ اور ہے۔ تقلیدی ایمان اسے کہتے ہیں کہ انسان خود تو ایمان سے بے خبر رہے۔ اور محض یہ کہہ کر ایمان لے آئے کہ جو فلاں کا ایمان ہے وہ میرا یا یہ کہ خود اسلام کی خوبیوں سے بالکل ناواقف رہے اور کہے کہ مجھے نہیں خبر کہ اسلام حق ہے یا باطل میں تو محض فلاں کی دیکھا دیکھی مسلمان ہو گیا یہ دونوں قسم کے ایمان مقبول نہیں اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ ایمان تو سوچ سمجھ کر اختیار کیا جائے مگر اللہ والوں کی راہبری میں۔ **تیسرا اعتراض:** جب رب نے منافقوں کا کفر ظاہر کر دیا تو ان پر مرتدین کے احکام جاری کیوں نہ ہوئے۔ بہت دفعہ ان کے منہ سے کفریات نکل جاتے تھے جیسے اِعْدِل یَا مُحَمَّد وغیرہ۔ آج ان باتوں پر قائل قتل ہو جاتا ہے۔ **جواب:** اس زمانہ میں مسلمان بہت تھوڑے تھے۔ لہٰذا نرم احکام رہے۔ تاکہ شاید یہ منافقین کچھ دن بعد مخلصین بن جائیں۔ اس لئے مؤلفۃ القلوب بھی زکوٰۃ کا مصرف ہے۔ جب اسلام قوی ہو گیا مسلمان بہت ہو گئے تو مؤلفۃ القلوب زکوٰۃ کا مصرف نہ رہا۔ اور اسلام سے نفاق ختم ہو گیا۔ اب یا مومن ہے یا کافر۔ اگر ایک کلمہ گستاخی کا کسی کے منہ سے سنا جائے گا قتل کیا جائے گا۔ جیسا کہ حضرت خدیجہ کی حدیث میں ہے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی

اور جب ملیں ان سے جو ایمان لائے بولے ایمان لائے ہم اور جب تنہا ہوں

اور جب ایمان والوں سے ملیں تو کہیں ہم ایمان لائے اور جب اپنے شیطانوں کے پاس اکیلے

شَیٰطِیْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۱۴﴾

طرف شیطانوں اپنے کے کہیں تحقیق ہم ساتھ تمہارے ہیں اس کے سوا نہیں کہ ہم ہنسی کرنیوالے ہیں

ہوں تو کہیں ہم تمہارے ساتھ ہیں ہم تو یوں ہی ہنسی کرتے ہیں

تعلق

اس آیت کا پہلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **ایک** یہ کہ اس سے پہلے منافقوں کے تین عیب بیان ہو چکے۔ اب یہ چوتھا عیب بتایا جا رہا ہے۔ **دوسرے** یہ کہ پہلے منافقین کی دینی حالت اور صرف مسلمانوں کے ساتھ برتاوے وغیرہ کا بیان ہوا اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ ان کا معاملہ مومنین اور کفار دونوں سے کیسا ہے۔ **تیسرے** یہ کہ یہ پہلی آیت کی تفصیل ہے۔ کیونکہ وہاں فرمایا گیا تھا کہ منافقین اپنے کو عقل مند اور مسلمانوں کو بے وقوف کہتے ہیں۔ اب ان کے اس فریب کا ذکر کیا گیا جس کو وہ عقل مندی سمجھتے تھے۔

ھدایت: بعض لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت مکرر ہے۔ کیونکہ منافقین کے ایمان ظاہر کرنے کا پہلے ہی ذکر ہو چکا۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّقُوْلُ اٰمَنَّا اور اب بھی اسی کا ذکر ہوا تھا۔ لیکن یہ خیال محض غلط ہے تکرار وہ ہے کہ جو فائدے سے خالی ہو۔ اس جگہ پہلے ان کی دینی حالت کا ذکر ہوا تھا۔ اور اب ان کے معاملہ کا یعنی پہلے ان کا عقیدہ بتانا مقصود تھا اور اب ان کا فریب

شان نزول

یہ آیت عبد اللہ بن ابی منافق وغیرہ منافقین کے حق میں نازل ہوئی ایک بار انہوں نے صحابہ کرام کی ایک جماعت کو آتے دیکھا۔ تو عبد اللہ بن ابی منافق اپنے یاروں سے کہنے لگا کہ دیکھو میں انہیں کیسے بناتا ہوں جب یہ حضرات قریب پہنچے تو عبد اللہ نے پہلے حضرت صدیق اکبر کا دست مبارک پکڑا اور بولا کہ مبارک ہیں آپ کہ جناب صدیق ہیں بنی تیم کے سردار شیخ الاسلام رسول اللہ ﷺ کے غار کے ساتھی اپنی جان و مال کو حضور علیہ السلام پر قربان فرمانے والے۔ پھر حضرت فاروق رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر بولا کہ سبحان اللہ! آپ بنی عدی کے سردار ہیں۔ فاروق آپ کا لقب ہے۔ اپنی جان و مال حضور علیہ السلام پر قربان فرمانے والے۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا کہ اے عبد اللہ! رب سے ڈر نفاق چھوڑ منافقین سب سے بدتر ہیں وہ بولا کہ اے علی آپ یہ کیوں فرماتے ہیں ہمارا ایمان بھی آپ حضرات کی طرح ہے۔ پھر یہ حضرات وہاں سے روانہ ہو گئے عبد اللہ اپنی جماعت والوں سے کہنے لگا کہ دیکھا میں نے کیا چال چلی۔ ان لوگوں نے اسکی تعریف کی تب یہ آیت کریمہ اتری۔ (تفسیر روح البیان و تفسیر خزائن العرفان)

تفسیر

لَقُوا یہ لفظ لقوٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ملاقات کرنا اور سامنے آنا یہاں دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا میں مخلص مسلمان مراد ہیں۔ زبانی مسلمان تو منافقین بھی تھے مگر ان کو ایسی چالیں مخلصین کے سامنے چلنی پڑتی تھیں اٰمَنَّا میں حقیقی ایمان مراد ہے ان کے زبانی ایمان میں کسی کو شک نہ تھا۔ حقیقی ایمان مشکوک تھا۔ یہ لوگ بار بار قسمیں کھا کھا کر اپنے اخلاص کا لوگوں کو یقین دلایا کرتے تھے۔ ولایتی گھی کا نام ہے اصلی گھی۔ آج بھی بے دین لوگوں کا یہی طریقہ ہے کہ قسمیں کھا کھا کر اپنے ایمان ظاہر کرتے پھرتے ہیں۔ مگر لوگوں کو ان کا اعتبار نہیں ہوتا۔ خالص مشک تعریف کا محتاج نہیں۔ اسی طرح مخلص مسلمان کو قسموں کی ضرورت نہیں پڑتی۔ ان کا نور ایمانی خود بخود اپنی جلوہ گری کرتا ہے۔ خَلَوْا۔ خَلْوٌ سے بنا ہے اس کے معنی ہیں اکیلا ہونا اور گزرنا قَدْ خَلَتْ اور تمسخر کرنا۔ اس جگہ پہلے ہی معنی مراد ہیں۔ یعنی جب منافقین اپنے شیطانوں کے پاس تنہائی میں جاتے ہیں کہ جہاں کوئی مسلمان نہیں ہوتا تو یہ گفتگو کرتے ہیں۔ شَیٰطِیْنِہِمْ شیاطین شیطان کی جمع ہے۔ لفظ شیطان کی تحقیق اَعُوْذُ بِاللہِ میں ہو چکی اور اس کی حقیقت انشاء اللہ آگے بیان کی جائیگی لیکن یہاں تو ان کے دوست مراد ہیں یا منافقین کے سردار جو کہ شیطان کی طرح سرکش اور گمراہ کن ہیں۔ اہل عرب ہر سرکش کو شیطان کہہ دیتے ہیں۔ ضحاک نے فرمایا کہ اس جگہ شیاطین سے کفار کے کاہن (نجومی، پنڈت) مراد ہیں کیونکہ ان کے پاس شیطان آیا کرتے تھے اور یہ چند لوگ تھے بنی قریظہ میں کعب ابن اشرف اور بنی اسلم میں ابو بردہ اور جہینہ میں عبدالدار اور بنی اسد میں عوف ابن عامر اور ملک شام میں عبداللہ ابن اسود جن کے متعلق اہل عرب کا یہ خیال تھا کہ یہ لوگ غیب کی خبر رکھتے ہیں اور اسرار الٰہی جانتے ہیں اور بیماروں کا علاج کرتے ہیں۔ اِنَّا مَعَکُمْ سے مراد یہ ہے کہ ہم تمہارے ساتھی ہیں۔ یعنی منافقین ان سرداروں کے پاس آ کر کہتے تھے کہ ہم دینی عقائد میں ہر طرح تمہارے ہی ساتھی ہیں۔ خیال رہے کہ منافقین نے مسلمانوں سے صرف اٰمَنَّا کہا۔ یعنی ہم ایمان لے آئے۔ جملہ فعلیہ استعمال کیا اور اس کے ساتھ کسی قسم کی تاکید کا ذکر نہ کیا۔ کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ مسلمان سیدھے سادھے ہیں۔ صرف ہمارے کہنے سے ہی مان جائیں گے۔ اور ہماری بات میں کچھ شک نہ کریں گے اس لئے بغیر تاکید کلام کیا اور یہ بھی کہتے تھے کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں۔ یعنی پہلے کافر تھے اب مومن بن گئے۔ مگر کفار کے متعلق ان کا خیال تھا کہ یہ لوگ بہت چالاک ہیں ہماری ہر بات بلا تحقیق ہرگز نہ مانیں گے اس لئے اِنَّا وغیرہ سے کلام کی تاکید کرتے تھے۔ اور جملہ اسمیہ بول کر یہ بتاتے تھے کہ ہم پہلے بھی تمہارے ساتھی تھے اور اب بھی ہیں۔ لیکن پھر بھی چوں کہ ان کو شک و شبہ ہوتا تھا کہ یہ تو مسلمانوں کے ساتھ نمازیں پڑھتے ہیں۔ ان کے وعظوں میں جاتے ہیں ان کے ساتھ جہادوں میں شریک ہوتے ہیں پھر یہ ہمارے ساتھی کیوں کر ہوئے۔ اس شبہ کو مٹانے کے لئے کہتے تھے اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ یعنی اے دوستو! ہمارے ظاہری برتاوے سے تم دھوکا نہ کھانا، ہم تو مسلمانوں کو بے وقوف بنانے کے لئے یہ حرکتیں کرتے ہیں۔ ہمارے دل تمہارے ساتھ ہیں۔ یہ ظاہری برتاوے محض اس لئے ہیں کہ ان کے ساتھ رہ کر اپنے جان مال و اولاد کی حفاظت کرلیں اور ان کے ساتھ غنیمتیں حاصل کریں۔ ان کے خفیہ راز معلوم کر کے تم تک پہنچا دیں۔ مُسْتَهْزِءُوْنَ هَزْوٌ سے بنا

ہے کہ جس کے لفظی معنی ہیں ہلکا پن۔ جو شخص اچانک مرجائے اسے حازی کہتے ہیں اسی طرح تیز رفتار جانور پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اِستِھزَاء کے معنی ہیں کسی کو جاہل بنانا یا اس سے ہنسی ٹھٹھا کرنا اور خفیف و ذلیل کرنا یہاں تینوں معنی بن سکتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

جب وہ منافقین مسلمانوں سے ملتے تھے تو ان کو خوش کرنے کے لئے کہہ دیتے تھے۔ کہ میاں ہم تو مسلمان ہو چکے ہیں۔ اور جب اپنے سرداروں اور دوستوں کے پاس جاتے تو نہایت تاکید سے قسمیں کھا کھا کر کہتے تھے کہ ہم تو ہر طرح تمہارے ساتھ ہیں۔ ہم مسلمانوں سے دل لگی کرنے کے لئے ان کے سامنے کلمہ پڑھ دیتے ہیں۔ اور وہ نرے بے وقوف ہیں۔ ہماری باتوں کو سچا سمجھ کر اپنی خاص مجلسوں میں ہم کو شریک کر لیتے ہیں۔ جس سے کہ ہم ان کے دلی ارادوں اور خاص مشوروں سے خبردار ہو کر تمہیں بھی آگاہ کر دیتے ہیں۔ اے کافرو! ہمارا یہ طریقہ تمہارے لئے بھی مفید ہے تمہیں ہمارا احسان ماننا چاہئے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک** یہ کہ دل لگی اور مذاق کیلئے کلمہ پڑھنا کفر ہے۔ کیونکہ قرآن پاک نے ان کے اس اظہار ایمان کو کفر قرار دیا۔ **دوسرے**: یہ کہ انبیاء علیہم السلام اور دین کے ساتھ تمسخر کرنا کفر ہے۔ **تیسرے**: یہ کہ صحابہ کرام اور دینی پیشواؤں کا مذاق اڑانا بھی کفر ہے۔ (خزائن العرفان) بلکہ ہر دینی چیز قرآن شریف، مسجد، علمائے کرام رمضان شریف اور اولیاء اللہ کے مزارات وغیرہ کی توہین بھی کفر ہے۔ اور ان کی تعظیم ایمان و تقویٰ کی علامت قرآن کریم نے فرمایا کہ جو کوئی شعائر اللہ (اللہ کی نشانیوں) کی تعظیم کرے وہ دلی پرہیز گار ہے۔ **چوتھے**: یہ کہ ہر ایک کی مجلس میں بیٹھنا اور بدمذہبوں کو اپنا دوست بنانا منافقوں کا طریقہ ہے۔ آج کل یہ مرض عام مسلمانوں میں ہے۔ **پانچویں**: یہ کہ لوگوں کا مذاق اڑانا سخت برا ہے۔ قرآن کریم نے فرمایا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ (حجرات:۱۱) کوئی قوم دوسری قوم سے مذاق نہ کرے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل نے عرض کیا تھا کہ آپ ہم سے دل لگی کرتے ہیں تو فرمایا کہ خدا مجھے اس سے بچائے کہ میں جہلاء میں سے ہو جاؤں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی کا مذاق اڑانا جہالت ہے۔ خیال رہے کہ مذاق اڑانا اور بات ہے اور خوش طبعی کرنا اور چیز خوش طبعی کو مزاح کہتے ہیں۔ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ مذاق اڑانے میں کسی کو ذلیل کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اور خوش طبعی میں صرف دل خوش کرنا اور غم دور کرنے والی باتیں ہوتی ہیں۔ کبھی کبھی خوش طبعی کرنا جائز بلکہ سنت سے ثابت ہے۔ مگر شرط یہ ہے کہ اس میں جھوٹ نہ ہو یہ بھی واضح رہے کہ مذاق کی ابتداء منع ہے۔ اگر کوئی شخص ہمارا مذاق اڑائے اور ہم جواب میں اس کا مذاق اڑا دیں تو ہم کو جائز ہے۔ ہاں مسلمان سے درگزر کرنا اور کافر کو رعایت نہ کرنا سنت صحابہ ہے۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ جو کہ حضور ﷺ کے نعت گو اور نعت خواں ہیں وہ جواباً کفار کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ اور نبی ﷺ ان کو دعائیں دیتے تھے۔

اعتراضات

اعتراض: اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں منافقوں کی چغلی مسلمانوں کے سامنے کی اور ان کی غیبت بھی یہ دونوں چیزیں عیب ہیں رب کی شان کے خلاف۔ **جواب**: اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ یہ چیزیں بندوں کو ممنوع ہیں رب پر یہ

احکام جاری نہیں وہ بندوں کا مالک ہے جیسے چاہے اپنے بندوں کو یاد کرے۔ برائی سے یا بھلائی سے۔ ہم کسی کو ماردیں تو مجرم ہیں رب رات دن موت دیتا ہے۔ دوسرے یہ کہ مسلمان کی غیبت بھی بری ہے چغلی بھی بری۔ کفار کی غیبت وغیرہ بری نہیں۔ دیکھو آج کل ابوجہل ابولہب ابلیس کو برا کہا جارہا ہے تیسرے یہ کہ عداوت یا فساد کی بنا پر غیبت و چغلی بری چیز ہے کسی کو شر سے بچانے یا اصلاح کے لئے پس پشت برا کہنا غیبت یا چغلی نہیں بلکہ اصلاح ہے۔ یہاں مسلمانوں کو منافقوں کے شر سے بچانا مقصود ہے اور منافقوں کی اصلاح مطلوب ہے۔ آج بھی حدیث کے راویوں کے عیوب بیان ہوتے ہیں۔ فسادیوں سے شریفوں کو بچانے کیلئے ان کے عیوب بیان کئے جاتے ہیں کہ اس سے معاملہ نہ کرنا۔ شاگرد کی شکایت استاد سے کی جاتی ہے۔

تفسیر صوفیانہ

دنیا اور آخرت ان دو سوکنوں کی طرح ہیں جن کا اجتماع ناممکن ہے منافقین نے چاہا تھا کہ ہم زبان سے دیندار اور دل سے کافر رہ کر دونوں کو جمع کرلیں انجام یہ ہوا کہ کہیں کے نہ رہے۔ اسی طرح جو شخص چاہے کہ میں اپنے دل میں دین و دنیا دونوں کو جمع کرلوں وہ غلطی کرتا ہے۔ دنیا کے معنی ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ صوفیاء کرام کا عمل یہ ہے۔

دنیا میں تو ایسا ہو رہ جوں مرغابی ساگر میں   نام خدا کا ایسے جپنا جوں چت ناری گاگر میں

مرغابی دریا میں پہنچ کر مچھلی کی طرح تیرتی ہے۔ مگر ہوا میں پرندہ بن کر اڑتی ہے۔ پانی بھرنے والی عورتیں تین چار گھڑے لے کر راستہ طے کرتی ہیں۔ مگر ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ نگاہ راستہ پر ہے دھیان گھڑوں کی طرف اور کان اور زبان اپنی سہیلیوں کی طرف متوجہ اپنی کہہ رہی ہیں دوسری کی سن رہی ہیں۔ اسی طرح مرد میدان وہ ہے کہ گھر میں دنیا دار معلوم ہو۔ مسجد میں دینداروں کا سردار دنیا کا ہر کام کرے۔ مگر دین کا ہر وقت دھیان رکھے۔ تارک دنیا کمزور ہے اور تارک دین بے ایمان۔

اَللّٰهُ یَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَ یَمُدُّهُمْ فِیْ طُغْیَانِهِمْ یَعْمَهُوْنَ ﴿۱۵﴾
اللہ استہزاء فرماتا ہے ساتھ ان کے اور ڈھیل دیتا ہے ان کو میں سرکشی اپنی کہ بھٹکتے ہیں
اللہ ان سے استہزاء فرماتا ہے اور انہیں ڈھیل دیتا ہے کہ اپنی سرکشی میں بھٹکتے ہیں

تعلق

اس سے پہلے منافقین کا چوتھا فریب بیان ہوا تھا۔ اب اس کی سزا کا ذکر ہو رہا ہے تاکہ سننے والا اس سے عبرت پکڑے اور اس حرکت سے باز آئے۔

تفسیر

اللہ اس آیت کو اللہ کے نام سے شروع کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ مسلمانوں کو ان کے مذاق کا جواب دینے کی کوئی ضرورت نہیں۔ بلکہ ان کی طرف سے خود رب تعالیٰ ان کو جواب دے رہا ہے۔ نیز اس سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ کے استہزاء کے مقابل میں منافقین کا مذاق بالکل بیکار ہے۔ جیسے کوئی قوی کسی کمزور سے کہے کہ تو کیا بدلہ لے گا بدلہ تو میں لوں گا یَسْتَهْزِئُ

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ استہزاء کے تین معنی ہیں۔ جاہل بنانا، ذلیل کرنا، دل لگی کرنا یہاں پہلے دو معنی بن سکتے ہیں نہ کہ تیسرے کیوں کہ حق تعالیٰ دل لگی کرنے سے پاک ہے۔ تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ خداوند تعالیٰ انہیں جاہل قرار دیتا ہے یا ذلیل کرتا ہے۔ اس جگہ یَسْتَهْزِئُ میں تین احتمال ہیں ایک یہ کہ بمعنی حال ہو۔ یعنی انہیں دنیا میں ذلیل کرتا ہے کہ کسی جگہ ان کی عزت نہیں ہوتی۔ دوسرے یہ کہ بمعنی استقبال ہو یعنی انہیں قیامت یا دوزخ میں ذلیل فرمائے گا۔ وہ اس طرح کہ یہ منافقین مسلمانوں کے ساتھ رہیں گے کفار جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے حق تعالیٰ ان سب پر تجلی فرمائے گا۔ مومنین تو سجدے میں گر جائیں گے۔ مگر منافقین کی پشت ایسی سخت ہو جائے گی کہ بجائے سجدہ کرنے کے اوندھے گر پڑیں گے تب انہیں کتوں کی طرح جہنم میں پھینکا جائے گا اور یا یہ دوام تجددی کے معنی میں ہے۔ یعنی منافقین تو ایک بار ہی مسلمانوں سے مذاق کر چکے مگر رب تعالیٰ ان کے ساتھ ہمیشہ اور ہر جگہ طرح طرح سے استہزاء فرماتا رہے گا۔ دنیا میں موت کے وقت قبر قیامت غرض ہر جگہ ان کے ساتھ استہزاء ہوتا رہے گا وَ یَمُدُّهُمْ۔ یَمُدُّ یا تو مَدٌّ سے بنا ہے یا مدد سے مد کے معنی ہیں مہلت دینا اور مدد کے معنی ہیں بڑھانا قوت دینا اور اصلاح کرنا اگر یہ مد سے بنا ہوا تو آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ ان منافقوں کو ڈھیل دیئے ہوئے ہے کہ وہ جرم کرتے ہیں اور ان کی پکڑ نہیں ہوتی اور مَدَدٌ سے بنا ہو تو معنی یہ ہوں گے کہ حق تعالیٰ ان کی سرکشی گمراہی کو زیادہ فرماتا ہے اور اس کو قوی؛ اور مضبوط کرتا ہے۔ کیونکہ انہیں مال دیتا ہے اور اولاد وغیرہ بھی بڑھاتا ہے جس کی وجہ سے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر رب تعالیٰ ہم سے ناراض ہوتا تو ہمیں یہ انعامات کیوں دیتا لیکن صحیح یہی ہے کہ یہ مدد سے بنا ہے۔ کیونکہ اگر یہ مد سے بنتا تو اس کے بعد لام ہوتا یعنی یَمُدُّلَهُمْ ہوتا۔ تفسیر کبیر میں ہے کہ قرآن کریم میں مد شر کے لئے اور امداد خیر کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک جگہ ارشاد ہے۔ وَنَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا (مریم:۷۹) دوسری جگہ ارشاد وَ اَمْدَدْنٰكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّ بَنِیْنَ (الاسراء:۶) چونکہ یہاں سرکشی اور گمراہی کا ذکر ہے اس لئے مدُّ فرمایا گیا فِیْ طُغْیَانِهِمْ۔ طغیان کے لغوی معنی ہیں حد سے بڑھ جانا۔ اس لئے پانی کے سیلاب کو طغیانی بولتے ہیں۔ کیونکہ وہ بھی اپنی حد سے بڑھ جاتا ہے۔ لیکن اب اس کا استعمال کفر و سرکشی سے حد سے بڑھ جانے پر ہوتا ہے اور یہاں بھی یہی معنی ہیں کہ منافقین اپنی سرکشی میں حد سے آگے بڑھ چکے ہیں یَعْمَهُوْنَ عَمَهٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں دل کا اندھا ہو جانا۔ جسے ہندی میں کہتے ہیں ہٹے کی پھوٹ جانا عَمیٰ آنکھ کے اندھے ہونے کو کہتے ہیں اور عَمَهٌ دل کے اندھے ہونے کو۔ یہاں اس سے مراد ہے حیران و پریشان ہونا۔ کیونکہ اگر اندھے کو میدان میں اکیلا چھوڑ دیا جائے تو وہ بھی حیران ہو کر ادھر ادھر بھٹکتا پھرے گا۔ منزل مقصود کو نہ پہنچے گا اسی طرح دنیا کے میدان میں ان منافقین نے قرآن پاک اور صاحب لولاک ﷺ کو صحیح معنی میں نہ پکڑا اس لئے انہیں کچھ نہیں سوجھتا کہ کدھر جائیں کبھی کافروں کی طرف اور کبھی مسلمانوں کی طرف بھٹکتے پھرتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

منافقین خود کو عقل مند اور مسلمانوں کو بے وقوف سمجھتے ہوئے کہا کرتے تھے کہ ہم تو ان سے دل لگی کیا کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے ان کی بکواس کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ وہ بے چارے تو مسلمانوں سے کیا دل لگی کریں گے خود مسلمانوں کا رب ان

کو ذلیل وخوار کر رہا ہے اور کرتا رہے گا وہ اس طرح کہ جیسے ان کا ظاہر کچھ ہے اور باطن کچھ۔ اسی طرح ان کے ساتھ رب کا معاملہ بھی دنیا میں کچھ اور ہے اور آخرت میں کچھ اور۔ دنیا میں تو ان پر سارے اسلامی احکام بظاہر جاری کر دیئے گئے کہ نہ ان سے جہاد پر نہ ان پر جزیہ نہ ان کو مسجدوں میں آنے سے کوئی روک ٹوک اور نہ اسلامی کاموں میں شرکت کرنے سے ممانعت مرنے کے بعد کفن دفن وغیرہ سارے احکام ان پر جاری جس سے کہ وہ سمجھے کہ مسلمانوں پر ہمارا داؤ خوب چلا۔ مگر جب قبر میں پہنچیں گے تو پتہ چلے گا کہ خود غلط بود آں چہ ماپنداشتیم تب رو رو کر کہیں گے کہ ہمیں بڑا دھوکا ہوا ہم کچھ سمجھتے تھے اور ظاہر کچھ ہوا۔ پھر ان کی حالت یہ ہے کہ جب اسلام کے دلائل سنتے ہیں تو سمجھتے ہیں شاید اسلام سچا دین ہو۔ مگر جب کفار کی مالداری ان کا عیش اور مسلمانوں کی غربت وافلاس پر نظر کرتے ہیں تو سوچتے ہیں کہ اگر رب تعالیٰ کفار سے ناراض تھا تو ان کو اتنا مال کیوں دیا۔ اور اگر مسلمانوں سے راضی تھا تو ان کو اس حال میں کیوں رکھا لہٰذا کفر سچا ہے اور معاذ اللہ اسلام جھوٹا۔ غرضیکہ وہ ایسے حیران و پریشان ہیں کہ اس کے متعلق کچھ فیصلہ ہی نہ کر سکے۔ بخلاف مسلمانوں کے کہ وہ جب مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں تو صابر بن کر درجات حاصل کر لیتے ہیں اور جب نعمتیں پاتے ہیں تو شاکر بن کر خدا کے پیارے اور مقبول بن جاتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ دنیاوی مصیبتیں اور راحتیں مسلمانوں کے لئے حق تعالیٰ کی نعمتیں ہی ہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک:** یہ کہ ایمان سے دل کا اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اور کفر میں بے اطمینانی رہتی ہے۔ مومن اس مضبوط درخت کی طرح ہے جو کہ تیز آندھیوں کا مقابلہ نہایت اطمینان سے کر لیتا ہے۔ نہ تو مصیبت میں گھبراتا ہے اور نہ راحتوں پر اتراتا ہے۔ کافر اس کچی کھیتی کی طرح ہے جو ہر ہوا کا اثر لے لیتی ہے مصیبت آئے تو گھبرا جائے اور راحتیں پا کر غرور کرے **دوسرے:** یہ کہ بندے کو چاہئے کہ درازی عمر اور زیادتی مال و اولاد پر فخر نہ کرے اور اس سے دھوکا نہ کھائے۔ بہت دفعہ یہ چیزیں حق تعالیٰ کی طرف سے عذاب ہوتی ہیں۔ کفار کے لئے ان چیزوں کی زیادتی عذاب کی زیادتی کا باعث بن جاتی ہے کہ ان کو دنیا میں مال محدود اور آخرت میں وبال محدود ملتا ہے۔ اور مخلصین کیلئے یہ چیزیں زیادتی ثواب کا باعث ہیں۔ یعنی اس کے لئے دنیا میں مال محدود اور آخرت میں ظل ممدود ہیں (دراز سایہ) بعض بزرگان دین زیادہ دنیاوی راحتوں سے گھبراتے تھے کہ ایسا نہ ہو کہ یہ راحتیں ہمارے نیک اعمال کا بدلہ ہوگئی ہوں **تیسرے:** یہ کہ دنیوی ترقیاں قابل اعتماد نہیں۔ اس کی مثال پتنگ کی سی ہے کہ وہ اس قدر اونچی اڑتی ہے کہ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے۔ مگر اس کی ڈور پتنگ والے کے ہاتھ میں ہے کہ ایک جھٹکے میں اس کو زمین پر لے آتا ہے انسان دنیوی ترقی کرتے کرتے بادشاہ بن جائے۔ مگر ایک جھٹکے میں قصر (محل) سے نکل کر قبر میں پہنچ جاتا ہے۔ **چوتھے:** یہ کہ حق تعالیٰ مسلمانوں کا ایسا والی ہے کہ جو انہیں تکلیف پہنچائے خود رب تعالیٰ اس سے بدلہ لیتا ہے۔ **پانچویں:** یہ کہ جو کوئی اپنے ذاتی معاملے میں کسی سے بدلہ نہ لے تو حق تعالیٰ اس کی طرف سے بدلہ لیتا ہے اور جو خود بدلہ لینے کے درپے ہو جائے وہ یہ درجہ نہیں پاتا۔ لہٰذا مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے ذاتی معاملات میں درگزر کیا کریں اور دینی معاملات میں ہرگز کسی کی رعایت نہ کیا کریں۔ مگر افسوس کہ آج ہمارا

طریقہ اس کے برعکس ہو گیا کہ جس شخص سے ہمیں کوئی ذاتی نقصان پہنچ جائے۔ ہم اس کے پکے دشمن ہیں لیکن جن بد مذہبوں سے کہ دین کو نقصان پہنچ رہا ہو ان کو اپنا بھائی بنانے کے لئے تیار۔

تفسیر صوفیانہ

تصوف کا آخری درجہ ہے فنافی اللہ جس میں پہنچ کر بندہ اپنے کو رب کی بارگاہ میں ایسا فنا کر دیتا ہے کہ صرف قالب تو بندہ کا رہ جاتا ہے۔ مگر اسکے سارے کام رب کی طرف سے ہوتے ہیں۔ اس سے دوستی رب سے دوستی۔ اس سے جنگ رب سے جنگ۔ اس کا کہنا رب کا کہنا اس کی بات رب کی بات۔ جیسے کہ کوئلہ آگ میں پہنچ کر ایسا فنا ہوا کہ قالب تو کوئلے کا رہا۔ مگر شکل اور نام اور کام آگ کا سا ہو گیا۔ چونکہ صحابہ کرام فنافی اللہ کے درجہ پر فائز تھے۔ اس لئے ان کو دھوکا دینا اور ان کا مذاق اڑانا درحقیقت رب کو دھوکا دینا اور اس سے مذاق کرنا ہے۔ اس لئے رب نے گویا منافقین سے اپنا بدلہ لیا اور فرمایا اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ نیز جس قدر رسی لمبی ہوتی ہے۔ اس قدر جھٹکا سخت لگتا ہے۔ اور جس قدر چکی دیر میں پیستی ہے اس قدر باریک پیستی ہے۔ لہٰذا ان لوگوں کے لئے یہ مہلتیں خطرناک ہیں۔

تو مشو مغرور بر حلم خدا ٭ دیر گیرد سخت گیرد مر ترا

نیز: زیادہ چالاک حق تعالیٰ کے یہاں بڑا بے وقوف ہوتا ہے۔ اور سیدھا سادا مسلمان بڑا عقل مند ان سیدھے سادوں کی مخالفت بڑی خطرناک ہے۔ شعر

خاکساران جہاں را بحقارت منگر ٭ تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

ہر سری کو پاگل نہ سمجھو۔ کیونکہ ان میں سے بعض بڑے بھیدی ہیں۔

اعتراضات

اعتراض: ستیارتھ پرکاش میں دیانند نے اعتراض کیا۔ کہ قرآن کریم نے خدا تعالیٰ کو عیب لگائے۔ کیونکہ قرآن سے ثابت ہے کہ اللہ منافقوں سے دل لگی اور مذاق کرتا ہے۔ اور قرآن سے یہ بھی ثابت ہے کہ مذاق کرنا جہالت ہے نتیجہ جو نکلا وہ خود سمجھ لو۔ اسی طرح رب تعالیٰ کے لئے قرآن کریم نے بڑے بڑے عیب ثابت کئے ہیں۔ **جواب:** ایسے اعتراضات کے چند جوابات ہیں **ایک:** یہ کہ فعل کے معنی فاعل کے لحاظ سے ہوتے ہیں۔ جیسا فاعل ویسے فعل کے معنی دیکھو اردو میں بولتے ہیں۔ "میں بیٹھ گیا" یعنی کھڑے سے بیٹھ گیا۔ فلاں سیٹھ بیٹھ گیا یعنی اس کا دیوالیہ ہو گیا فلاں دیوار بیٹھ گئی۔ یعنی زمین میں دھنس گئی۔ فلاں کا دل بیٹھ گیا۔ یعنی اس کی حرکت بند ہو گئی۔ فلاں کی دکان بیٹھ گئی یعنی اب چلتی نہیں۔ فلاں کی آنکھ بیٹھ گئی یعنی دماغ میں گھس گئی۔ فلاں مشین کا پرزہ ٹھیک بیٹھ گیا یعنی اپنی جگہ میں فٹ یعنی ٹھیک آ گیا۔ تمہاری بات میرے دل میں بیٹھ گئی۔ یعنی دل نے اسے قبول کر لیا۔ شکر نیچے بیٹھ گئی۔ یعنی تہ میں جم گئی۔ نشانہ صحیح بیٹھ گیا یعنی تیر نشانہ پر لگا وغیرہ وغیرہ۔ خیال تو کرو کہ ان باتوں میں بیٹھنا ایک ہی لفظ ہے۔ مگر فاعلوں کے لحاظ سے کتنے معنی بن گئے۔ اسی طرح قرآن پاک میں ایک لفظ جب بندوں کے لئے آئے گا تو اس کے معنی کچھ اور ہوں گے۔ اور جب رب کے لئے بولا جائے تو کچھ اور بندوں

کے لئے استہزاء کے معنی ہیں۔ مذاق کرنا۔ مگر رب تعالیٰ کے لئے اس کے معنی ہوں گے ذلیل کرنا۔ یعنی اللہ ان کو ذلیل کرتا ہے۔ **دوسرے:** یہ کہ بہت دفعہ جرم اور اس کی سزا کو ایک ہی لفظ سے بیان کر دیتے ہیں جیسے کہ کہتے ہیں کہ جتنا کوئی تم پر ظلم کرے اتنا ہی تم بھی اس پر ظلم کرو۔ عربی زبان میں بولتے ہیں جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ (شوریٰ: ۴۰) یعنی برائی کا بدلہ برائی ہے۔ دیکھو ظلم کی سزا دینا ظلم نہیں بلکہ عین انصاف ہے لیکن اس کو بھی ظلم کہہ دیا گیا۔ اسی طرح اس آیت میں مذاق کی سزا کو بھی استہزاء یعنی مذاق کہہ دیا گیا۔ **تیسرے:** یہ کہ کسی سے ابتداء مذاق کرنا جہالت ہے۔ لیکن مذاق کے بدلہ میں مذاق کرنا عین حکمت اور کمال انصاف ہے۔ خاص کر جب کوئی اپنے محبوبوں سے دل لگی کرے تو محب کو بدلہ میں استہزاء فرمانا دنیائے محبت میں ضروری ہے۔ (تفسیر عزیزی) چونکہ اللہ کے پیاروں کا منافقین نے ابتداء مذاق اڑایا یہ عین جہالت تھی۔ اور رب تعالیٰ کا ان سے بدلہ لینا عین حکمت کسی کو مار ڈالنا ظلم ہے۔ مگر قاتل کو پھانسی دینا عین انصاف **چوتھے:** یہ کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ حق تعالیٰ ان کے ساتھ استہزاء کرنے والوں کی طرح دنیا و آخرت میں معاملہ فرمائے گا۔ جس کو یہاں استہزاء فرمایا گیا ان معاملات کی پوری تفصیل ہم پہلے کر چکے ہیں۔ **نکتہ:** چونکہ منافقین اور رب تعالیٰ کے استہزاء میں چند طرح فرق تھا۔ اس لئے ان دونوں استہزاؤں کو نہ تو ایک جملہ میں بیان کیا گیا اور نہ اس جملہ کا پہلے جملہ پر عطف کیا گیا۔ بلکہ دونوں جملوں کو بالکل مستقل طور پر علیحدہ علیحدہ بیان کیا گیا۔ جس سے معلوم ہو جائے کہ یہ دونوں استہزاء علیحدہ علیحدہ نوعیت اور حقیقت رکھتے ہیں۔ **تتمہ:** آریوں نے لفظ استہزاء سے ایسے ہی دھوکا دیا جیسے دیوبندی وغیرہ لفظ بشر سے دھوکا دیتے ہیں۔ فافہم۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى۪ فَمَا رَبِحَتْ
یہ لوگ وہ ہیں کہ خریدا گمراہی کو بعوض ہدایت پس نہ نفع دیا
یہ لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خریدی تو ان کا
تِّجَارَتُهُمْ وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ ﴿۱۶﴾
بیوپار نے ان کے اور نہ تھے وہ ہدایت پانے والے
سودا نفع نہ لایا اور سودے کی راہ نہ جانتے تھے

تعلق

اس سے پہلے منافقین کی کچھ حرکتیں بیان فرما کر یہ بتایا گیا تھا کہ یہ نادان اپنی ان حماقتوں کو دانائی سمجھتے ہیں۔ اب اس کو ایک نہایت بہترین تمثیل سے سمجھایا جا رہا ہے جس سے کہ ان کی حالت اچھی طرح سب کے ذہن نشین ہو جائے۔ یا یوں کہو کہ اس سے پہلے کی آیتوں میں منافقین کے چند عیوب بیان کئے گئے اور یہاں ان عیبوں کا نتیجہ بیان ہو رہا ہے جیسے کہ کوئی شخص کسی بیوپاری کی تجارتی غلطیوں کو بیان کر کے آخر میں کہے کہ انجام کار اس کا دیوالیہ ہو گیا اور وہ اپنی اصل پونجی بھی کھو بیٹھا۔

شان نزول

یہ آیت یا تو ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئی جو کہ مخلص مومن بننے کے بعد کافر ہو گئے یا ان یہود کے حق میں آئی۔ جو پہلے سے نبی آخر الزمان علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے۔ مگر جب حضور کی تشریف آوری ہوئی تو منکر ہو کر بعض تو مجاہر کافر اور بعض منافق بن گئے یا ان تمام کفار کے حق میں آئی جنہیں اللہ نے عقل سلیم عطا فرمائی تھی۔ اور جن کے سامنے دلائل قائم فرما کر ہدایت کا راستہ ظاہر فرما دیا۔ مگر انہوں نے عقل و انصاف سے کام نہ لیا۔ ضد سے گمراہ ہو گئے۔ (تفسیر خزائن العرفان)

تفسیر

اُولٰٓئِکَ اسم اشارہ ہے۔ چونکہ منافقین کی صفتیں اس طرح بیان کر دی گئیں کہ وہ دوسروں سے بالکل چھٹ گئے۔ اور ہر شخص کو ان کی پہچان ہو گئی۔ اور جو چیز کہ خیال میں موجود ہو اس کی طرف بھی اشارہ کر دیا جاتا ہے۔ لہٰذا یہاں ان کی طرف اشارہ کیا گیا۔ لیکن چونکہ مسلمانوں سے درجہ میں بہت دور تھے۔ اس لئے اشارہ بعید استعمال ہوا۔ اِشْتَرَوُا۔ اِشْتِرَاءٌ سے بنا ہے کہ جس کے معنی ہیں خریدنا۔ یعنی قیمت خرچ کر کے مال مقصود حاصل کرنا لیکن یہاں اس معنی میں استعمال ہوا کہ اپنی چیز کے بدلے میں غیر کی چیز لینا اور اشتراء ایک چیز سے بے رغبتی اور دوسری چیز کے لالچ کرنے کو بھی کہہ دیتے ہیں چونکہ راہ راست پر چلنا اور ایمان اختیار کرنا یہ ہر مسلمان کا اصلی فرض ہے۔ پھر جب کہ کفار اور منافقین شیطان سے گمراہی سیکھ کر اس فرض کو کھو بیٹھے۔ اس لئے ان لوگوں کے ہدایت چھوڑنے اور گمراہی اختیار کرنے کو خرید و فروخت سے بیان کیا گیا الضَّلٰلَۃَ اس کے چند معنی ہیں ظلم کرنا، درمیانی حالت سے ہٹ کر افراط و تفریط میں پڑ جانا۔ ہدایت کا گم ہو جانا۔ یہاں دین سے بہک کر بے دینی اختیار کرنا مراد ہے جس کے معنی ہیں گمراہی۔ لیکن یہی لفظ ضلالت جہاں کہیں انبیاء کرام کے لئے بولا گیا ہے۔ وہ وارفتگی یا جذب وغیرہ کے معنی میں ہے۔ جو انبیاء کرام کو گمراہ جانے وہ سخت بے دین ہے۔ اس مسئلہ میں ہم نے ایک مستقل کتاب لکھی جس کا نام ہے قہر کبریا بر منکر عصمت انبیاء اس کی پوری تحقیق کے لئے اس کا مطالعہ کرو۔ بِالْھُدٰی عربی زبان میں لین دین کے معاملات میں ب اس پر آتی ہے جس کو چھوڑنا مقصود ہو (یعنی قیمت) تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ انہوں نے ہدایت کو چھوڑ کر گمراہی اختیار کر لی ہدایت کے معنی اور اس کی اقسام ہم سورۃ فاتحہ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔ فَمَا رَبِحَتْ۔ رَبْحٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں نفع اپنی اصل پونجی کے علاوہ جو کچھ حاصل ہو وہ منافع یا ربح کہلاتا ہے تِّجَارَتُھُمْ۔ تجارت خرید و فروخت کے کاروبار کو کہتے ہیں اسی طرح جو شخص یہ کاروبار کرتا ہو اسے تاجر یعنی بیوپاری کہا جاتا ہے۔ جو شخص کہ کبھی کوئی چیز فروخت کرے اسے بائع کہتے ہیں نہ کہ تاجر وَمَا کَانُوْا مُھْتَدِیْنَ کے دو معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ وہ پہلے ہی سے اس تجارت سے ناواقف تھے۔ اس لئے وہ نفع تو کیا کماتے اصل پونجی بھی ہاتھ سے کھو بیٹھے **دوسرے:** یہ کہ وہ اس تجارت میں ہدایت پانے والے نہ ہوئے یعنی اور تجارتوں میں تو خوب ہوشیاری سے کام کرتے ہیں۔ مگر اس تجارت میں ایسے بے وقوف بنے کہ بجائے کمال حاصل ہونے کے اصلی مال کو بھی زوال آ گیا۔

خلاصہ تفسیر

حق تعالیٰ کی طرف سے انسان کو عقل ملتی ہے۔ اور پھر نیک و بد راستے اس کے سامنے ہوتے ہیں۔ تاکہ وہ اپنی عقل سے کام لے کر اچھے راستے کو اختیار کرے اور برے سے بچے۔ ان منافقوں نے اپنے اندر برے اخلاق پیدا کر کے اس نور حق کو بجھا دیا اور ہمیشہ کی مصیبتوں کو مول لے لیا۔ انہوں نے کلمہ توحید کی صرف یہ قیمت جانی کہ اسکے ذریعہ دنیاوی نفع حاصل کر لئے۔ حالانکہ آخرت کی نعمتوں کے مقابل میں ان نفعوں کی کوئی حقیقت نہیں تو ان لوگوں نے عقل اور کلمہ توحید کو دنیا کے لئے خرچ کیا اور پھر اس پر خوش بھی ہوئے۔ ان کی مثال بالکل ایسی ہوئی کہ کوئی احمق قیمتی موتی دیکر مٹی کا کھلونا خریدے۔ یا اصلی سونا دے کر ولایتی نقلی سونا لے لے۔ تجارت کے اصول سے یہ لوگ بہت گھاٹے میں رہے۔ عقل مند لوگ اپنی عقل، مال و جان، اولاد صرف کر کے سچا ایمان لیتے ہیں اور وہ واقعی عقل مند بیوپاری ہیں۔ کیونکہ فانی کے عوض باقی حاصل کرتے ہیں۔

فائدے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ بیع تعاطی جائز ہے۔ یعنی بغیر منہ سے بولے محض لین دین سے کوئی چیز خرید لینا کیونکہ منافقین نے اپنے منہ سے خرید و فروخت کے الفاظ نہ کہے تھے۔ محض ہدایت چھوڑ کر گمراہی اختیار کی تھی اس کو قرآن کریم نے خریدنا فرمایا تو معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص قیمت دیکر چیز لے لے اور بیچنے والا بھی اس پر راضی ہو جائے تو بیع ہو جائے گی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص بڑے سے بڑے دنیوی نفع کو چھوڑ کر دینی معمولی نفع حاصل کرے وہ کامیاب تاجر ہے اور اس کا برعکس کرنے والا محض بے وقوف ہے کیونکہ دنیا بھر کے نفع آخرت کے معمولی نفع کے مقابل ہیچ ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص دینی کام ریا کاری کے لئے کرتا ہو وہ نہایت ہی بے وقوف ہے۔ کیونکہ وہ بھی انہیں منافقین کی طرح ہے جنہوں نے محض مسلمانوں کو راضی کرنے کے لئے کلمہ پڑھا تھا۔ دینی کاموں کی قیمت اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی رضامندی ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص نوافل ادا کرے اور واجبات و فرائض میں غفلت کرے وہ بے وقوف ہے۔ بعض لوگ کثرت سے وظیفے پڑھتے ہیں لیکن فرض نماز، زکوۃ اور روزوں وغیرہ کی پرواہ نہیں کرتے وہ سخت غلطی پر ہیں۔ فرض نماز اصل پونجی ہے اور نوافل اس کا نفع اصل پونجی کھو کر نفع کے چند پیسے حاصل کرنا کون سی عقلمندی ہے۔ (تفسیر روح البیان یہی مقام) یہ بھی معلوم ہوا کہ بجبوری نیکی کرنے کا کوئی ثواب نہیں۔ ثواب اسی نیک عمل کا ملے گا جو انسان دلی رغبت اور خوشی سے کرے۔ کیونکہ منافقین کلمہ اور نماز وغیرہ مجبوراً پڑھتے تھے اس لئے انہیں کچھ فائدہ حاصل نہ ہوا مثنوی شریف میں ہے۔

اختیار آمد عبادت را نمک ورنہ میگردد بنا خواہ ایں فلک
اِئْتِیَا کرھاً مہار عاقلاں اِئْتِیَا طوعاً مہار بے دلاں

یعنی رغبت عبادت کا نمک ہے۔ مجبوراً تو چاند سورج وغیرہ سب حرکت کر رہے ہیں۔ مگر انہیں اس پر کوئی ثواب نہیں۔

تفسیر صوفیانہ

انسان کے لئے دو ہدایتیں ضروری ہیں۔ ایک فطری ہدایت جو کہ عالم ارواح میں مل چکی ہے اور جس پر ہر بچہ پیدا ہوتا ہے۔

دوسری کسبی جو دنیا میں اللہ والوں کی صحبت سے حاصل ہوتی ہے جو شخص ان دونوں ہدایتوں کو پالے وہ نور علی نور ہے۔ جو اس دوسری ہدایت سے محروم رہا اس کی پہلی ہدایت بیکار ہے جیسے کہ آفتاب اور آنکھ کا نور مل کر فائدہ مند ہوتے ہیں۔ اگر آفتاب نور دے رہا ہے۔ کسی کی آنکھ میں نور نہ ہو تو وہ کچھ نہیں دیکھ سکتا۔ یا آنکھ میں نور موجود ہے اور دوسرا نور اسے حاصل نہیں یعنی وہ اندھیرے میں ہے وہ بھی دیکھنے سے محروم۔ ان منافقوں کو پہلا نور یعنی ہدایت فطری حاصل تھی۔ لیکن نور مصطفائی سے علیحدہ رہے۔ اس کسبی کو چھوڑ کر گمراہی حاصل کی لہٰذا اس تجارت میں کامیاب نہ ہوئے۔

حکایت: مثنوی شریف میں اسی کے مطابق ایک نہایت بہتر حکایت بیان فرمائی۔ وہ یہ کہ ایک شکاری ترکش میں تیر بھر کر باز کے شکار کے لئے نکلا۔ باز ہوا میں اڑتا ہوا ملا جس کا سایہ زمین پر پڑ رہا تھا۔ اس نے تاک تاک کر اس سایہ پر تیر چلائے۔ یہاں تک کہ سارا ترکش خالی ہو گیا۔ مگر باز ہاتھ نہ آیا۔ محروم واپس ہوا۔ اپنے کسی دوست سے کہنے لگا کہ میں نے ٹھیک نشانے پر تیر لگائے۔ مگر باز نہ مرا کیا وجہ ہوئی۔ اس نے کہا۔ اے بیوقوف! جس کو تو نے نشانہ بنایا وہ باز نہ تھا۔ اصل باز اوپر تھا جہاں تیری نگاہ نہ پہنچ سکی۔ ان منافقین نے بھی اسی طرح اپنے ترکش کے سارے تیر دنیا کے لئے استعمال کئے۔ لہٰذا دین الٰہی کے ہاتھ نہ آیا۔ قیمتی تیر بھی برباد ہو گئے۔

اعتراضات

اعتراض: جب ان منافقین کے پاس ہدایت تھی ہی نہیں۔ تو اس کے بدلے میں گمراہی کیوں کر خریدی۔ **جواب** اس کا جواب عالمانہ اور صوفیانہ تفسیروں سے معلوم ہو چکا وہ یہ کہ انہوں نے فطری ہدایت کے بدلے میں گمراہی خریدی یا کسبی ہدایت حاصل کرنے کا ان کو موقع تو ملا لیکن اس کو چھوڑ کر گمراہی حاصل کی یا انہوں نے کلمہ طیبہ زبان سے پڑھا۔ نماز روزے ادا کئے۔ اگر وہ چاہتے تو اپنے ان اعمال سے جنت حاصل کر لیتے۔ لیکن انہوں نے دنیا حاصل کی۔ لہٰذا خرید و فروخت کے معنی ان پر بخوبی چسپاں ہو گئے۔

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِى اسْتَوْقَدَ نَارًا ۚ فَلَمَّآ اَضَآءَتْ
کہاوت ان کی مثل اس کے لئے ہے کہ روشن کی آگ پس جبکہ روشن ہوگئی وہ جگہ ارد گرد اس
ان کی کہاوت اس طرح کی ہے جس نے آگ روشن کی تو جب اس سے آس پاس جگمگا
مَا حَوْلَهٗ ذَهَبَ اللّٰهُ بِنُوْرِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِىْ ظُلُمٰتٍ لَّا
کے لے گیا اللہ نور ان کا اور چھوڑ دیا ان کو میں اندھیروں
اٹھا اللہ ان کا نور لے گیا اور انہیں اندھیروں میں
يُبْصِرُوْنَ ﴿۱۷﴾

نہیں دیکھتے
چھوڑ دیا کہ کچھ نہیں سوجھتا

تعلق

اس سے پہلے منافقین کے عیوب بیان کئے۔اب ان کو اور زیادہ ظاہر کرنے کے لئے ایک مثال دیکر سمجھایا۔مثال سے مشکل بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔مثال دو طرح کی ہوتی ہے۔ایک مفرد کی مفرد سے جیسے کہ زید کو شیر سے تشبیہ دینا اور ایک قصے کی قصے سے پہلی قسم کو تشبیہ اور دوسری کو مثال کہا جاتا ہے۔

تفسیر

مَثَلُهُمْ مثل کے لغوی معنی ہیں مثل اور مانند۔لیکن اصطلاح میں اس مشہور کہاوت کو کہتے ہیں جو عجیب چیز کے لئے بیان کی جائے۔جیسے اردو میں بے درد آدمی کے لئے بولتے ہیں کہ جس کے نہ نکلی ہو بوائی وہ کیا جانے پیڑ پرائی۔یعنی جو کبھی مصیبت میں گرفتار نہ ہوا وہ مصیبت زدوں کے درد کو کیا جانے۔یہاں یہی معنی مراد ہیں چونکہ دلائل سے فقط عقل مند بات سمجھتے ہیں مگر مثالوں سے بے وقوف بھی سمجھ جاتے ہیں۔اس لئے قرآن کریم اور احادیث شریفہ میں بیشمار مثالیں بیان فرمائیں گئیں توریت وانجیل میں تو مثالوں کی پوری سورتیں تھیں جن کا نام سورۃ الامثال تھا۔ **کَمَثَلِ** اس میں کاف زیادہ ہے کیونکہ کاف کے معنی بھی مثل ہی ہیں جب مثل پر داخل ہو تو اس نے کچھ معنی نہ دیئے جیسے **لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ** میں۔یا اس جگہ مثل بمعنی حالت کے ہے تو کاف اپنے معنی میں ہے آیت کریمہ کے یہ معنی ہوئے کہ منافقین کی عجیب حالت ان لوگوں کی حالت کی طرح ہے **الخ الَّذِی** یہ لفظاً صورۃً واحد ہے اور معناً جمع کیونکہ اس سے پہلے **مَثَلُهُمْ** آ چکا اور اس کے بعد بھی **بِنُوْرِهِمْ** آ رہا ہے یعنی اس جماعت کی طرح ہے جیسے قرآن پاک میں آتا ہے **وَخُضْتُمْ کَالَّذِیْ خَاضُوْا** (التوبہ:69) **اسْتَوْقَدَ۔وَقُوْدٌ** سے بنا ہے۔جس کے معنی ہیں آگ کا بھڑکنا اور اس سے شعلے نکلنا ایندھن کو بھی اس لئے وقود کہتے ہیں کہ اس سے آگ بھڑکتی ہے تو مطلب یہ ہوا کہ ان لوگوں نے خوب تیز آگ جلائی اور اسے خوب بھڑکایا **نَارًا**۔نور سے بنا ہے جس کے معنی ہیں تڑپنا اور حرکت کرنا چونکہ آگ میں بھی تڑپ اور حرکت ہے اس لئے اسے نار کہتے ہیں پھر چونکہ آگ میں روشنی بھی ہے اس لئے روشنی کو نور کہہ دیا گیا ہے اور مینارے کو بھی اس لئے مینارہ کہتے ہیں کہ اس پر اذان دی جاتی ہے اس کو دور سے دیکھ کر لوگ منزل کا پتہ لگا لیتے ہیں۔چونے کو نورہ کہتے ہیں۔اس لئے وہ بال اڑا کر بدن کو چمکا دیتا ہے۔غرضیکہ نور کا استعمال دو معنی میں ہو گیا ایک حرکت اور تڑپ دوسرے روشنی چمک یا ظہور **فَلَمَّا اَضَاءَتْ۔ اَضَاءَتْ۔ ضَوْءٌ** سے بنا ہے جس کے معنی ہیں تیز روشنی،نور اور ضوء میں یہ فرق ہے کہ نور ہلکی روشنی کو بھی کہہ دیتے ہیں۔مگر ضوء تیزی پر بولا جاتا ہے۔اس لئے قرآن کریم نے آفتاب کو ضیاء اور چاند کو نور فرمایا۔

فیض: نبی کریم ﷺ اور قرآن کریم کو بھی اسی لئے نور فرمایا گیا ان سے ہر ایک فیض حاصل کر سکتا ہے وہ مثل سورج کے جلالی نہیں جو کہ آنکھوں کو خیرہ کر دے۔یہاں **اَضَاءَتْ** لازم بھی ہو سکتا ہے اور متعدی بھی۔اگر لازم ہو تو یہ معنی ہوں گے کہ پس جب کہ چمک گئی آس پاس کی جگہ اگر متعدی ہو تو یہ معنی ہوں گے کہ پس جب خوب چمکا دیا اس آگ نے آس پاس کی جگہ کو ماحولہ

لفظ حول کے معنی ہیں گھومنا اس لئے برس کو بھی حول کہتے ہیں کہ وہ گردش کرتا رہتا ہے اصطلاح میں حول ملی ہوئی چیز کو کہتے ہیں۔
نیز: اسکے معنی بدلنے کے بھی ہیں اسی لئے قرض منتقل کرنے کو حوالہ کہتے ہیں۔ اور کسی چیز کی جستجو کرنے کو محاولہ کہتے ہیں۔ یہاں دوسرے معنی مراد ہیں۔ یعنی قریب کی جگہ ذَهَبَ اللهُ عربی زبان میں ذَهَبَ بِهٖ اور اَذْهَبَهٗ کے ایک ہی معنی ہیں یعنی اس کو لے گیا۔ لیکن ذَهَبَ بِهٖ وہاں بولا جاتا ہے کہ جہاں بالکل لے گیا ہو اور واپسی کی امید نہ ہو اور اذھب میں یہ دونوں باتیں نہیں۔ کہتے ہیں ذَهَبَ السُّلْطَانُ بِمَالِهٖ بادشاہ نے اس کا سارا مال بالکل ضبط کر لیا یعنی کچھ نہ چھوڑا اور اس کی واپسی کی بھی امید نہیں۔ قرآن کریم نے یہی لفظ یہاں اس لئے استعمال فرمایا تاکہ معلوم ہو کہ رب نے ان کا نور بالکل بجھا دیا۔ اب ان کے منور ہونے کی کوئی امید نہیں۔ اس ذَهَبَ کو اللہ کی طرف اس لئے نسبت کیا گیا تھا کہ معلوم ہو کہ منافقین کی آگ کسی عارضے سے نہیں بجھی۔ کہ وہ دوبارہ جلا سکیں۔ بلکہ خود اللہ نے بجھائی ہے۔ جسے اللہ بجھا دے اسے کون روشن کرے۔ بِنُوْرِهِمْ نور کے معنی ہیں روشنی یعنی جو خود ظاہر ہو اور دوسرے کو ظاہر کرے۔ اس کا مقابل ہے۔ ظلمت جس کے معنی ہیں تاریکی نور کی نسبت منافقوں کی طرف اس لئے کی گئی کہ وہ اس سے فائدہ حاصل کر رہے تھے۔ وَتَرَكَهُمْ اس لئے فرمایا گیا تاکہ معلوم ہو کہ ان کی آگ بالکل ہی بجھا دی گئی جس سے کہ وہ پورے طور پر اندھیرے میں رہ گئے۔ فِيْ ظُلُمٰتٍ۔ ظلمت کی جمع ہے اس کے لغوی معنی ہیں کم ہونا برف کو اس لئے ظلم کہتے ہیں کہ وہ بہت کم ہو جاتا ہے۔ ستانے کو بھی ظلم اس لئے کہتے ہیں کہ اس کی وجہ سے ظالم کے نیک اعمال برباد ہو کر کم ہو جاتے ہیں نیز ظلم دانت کے پانی اور اس کی تری اور اس کی سفیدی کو بھی کہتے ہیں۔ (تفسیر کبیر) مگر یہاں اس سے مراد ہے تاریکی۔ ظلمات جمع اس لئے بولا گیا کہ منافقین صرف ایک تاریکی میں نہ تھے بہت سی تاریکیوں سے گھرے ہوئے تھے۔ ایک تو کفر کی تاریکی۔ دوسرے مکر و فریب کی تیسرے جھوٹ بولنے کی چوتھے مسلمانوں پر طعنہ زنی کی۔ پانچویں جہل مرکب کی۔ چھٹے گناہوں اور شہوتوں کی وغیرہ وغیرہ لَا يُبْصِرُوْنَ میں تاریکیوں ہی کا بیان ہے۔ یعنی انہیں اندھیرے میں اس طرح چھوڑ دیا کہ کچھ سوجھتا ہی نہیں۔

خلاصہ تفسیر

مدینہ منورہ کے لوگ اول تو حضور ﷺ کی تشریف آوری پر خوش ہوئے اور بہت سے لوگوں نے کلمہ پڑھ لیا۔ لیکن ان میں سے بعض نے دنیاوی اغراض و مقاصد کی بنا پر بعد میں منافقت شروع کر دی تو ان کی اس حالت کو اس جماعت کے ساتھ تشبیہ دی گئی۔ کہ جو اندھیرے جنگل میں گھر گئی ہو پھر انہوں نے روشنی اور گرمی حاصل کرنے اور درندوں سے بچنے کے لئے خوب آگ بھڑکائی جب آگ بھڑکنے لگی اور انہوں نے گرمی اور نور بھی حاصل کر لیا تو اب وہ اس پر مطمئن ہو گئے کہ اب یہ آگ نہ بجھے گی اور ہم اسکے فوائد سے محروم نہ ہوں گے وہ اسی خیال میں تھے کہ اچانک آگ بالکل بجھ گئی اور ایسی بجھی کہ اس کا کوئی شعلہ اور چنگاری بھی باقی نہ رہی کہ جس سے دوبارہ آگ جلا لیں اور نہ ہی ایندھن آگ قبول کرنے کے قابل رہا اب یہ حیران پریشان ہیں کہ کیا کریں اور کدھر جائیں۔ اسی طرح ان منافقین نے مسلمانوں کے خوف اور ان کے نفع کی امید سے بظاہر اسلام قبول کر لیا جو مثل آگ جلانے کے ہوا۔ حق تعالیٰ کی طرف سے بھی ان پر ظاہری اسلامی احکام جاری کر دیئے گئے۔ یہ

اس آگ کی روشنی ہوئی۔ منافقین مطمئن ہو گئے کہ جس طرح ہم نے اس زبانی کلمے اور ظاہری اسلام سے دنیا میں کام نکال لیا آخرت میں بھی کام نکال لیں گے۔ یہ ان کا اس ظاہری روشنی پر اعتماد ہوا۔ وہ اسی خیال میں تھے کہ اچانک ان کو موت نے آدبایا یہ اس آگ کا گل ہونا ہوا۔ مرتے ہی آنکھ کھل گئی اور بزبان حال یوں کہنے لگے۔ خواب تھا وہ کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا خیال رہے کہ ہر انسان تاجر ہے زندگی دوکان، سانسیں اور زندگی کی گھڑیاں اصل رقم جن کو خرچ کر کے وہ اعمال کے سودے خریدتا ہے نیک اعمال کرنے والا نفع میں، گناہ کرنے والا نقصان میں، کفر کرنے والا پورے خسارہ میں ہے جیسے بعض دوکانیں دن رات کھلی رہتی ہیں۔ ایسے ہی بعض لوگ سوتے جاگتے پھرتے نیکیاں کرتے ہیں بلکہ بعد وفات بھی ان کی دوکان بند نہیں ہوتی بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (البقرہ: ۱۵۴) جب قبر میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ان کا ظاہری اسلام کا چراغ یہاں کچھ کام نہ آیا۔ اب ان کو نہ تو نیک اعمال کرنے کا موقع رہا اور نہ وہاں سے لوٹنے کی کوئی صورت رہی کہ دنیا میں آکر نیکیاں کر جائیں یہ اس کی مثال ہوئی کہ دوبارہ آگ جلنے کے قابل نہ رہی۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے ایک یہ کہ جو چیز کہ نام ونمود کے لئے ہو وہ دنیا ہے اور اس کا فائدہ عارضی اور جو حق تعالیٰ کے لئے ہو وہ عین دین ہے اور اس کا فائدہ لازوال جو نماز روزہ دکھلاوے کے لئے ہو وہ بالکل دنیا ہے اور جو دنیوی کاروبار بھی سنت پر عمل کی نیت سے کئے جائیں وہ دین دیکھو منافقین کے سارے اعمال دنیا بن کر رہ گئے۔ **دوسرے:** یہ کہ کوئی شخص اپنے ان اعمال پر بھروسہ نہ کر بیٹھے جب تک کہ اس کو خاتمہ بالخیر میسر نہ ہو جائے اس جگہ اعمال کی بہت ڈکیتیاں ہوتی ہیں۔ ہندی میں ایک مثال ہے ہری ہری کھیتی اور گابھن گائے جب جانو جب منہ تک جائے۔ **تیسرے:** یہ کہ ظاہری اعمال قالب ہیں اور نیت اخلاص مثل قلب کے۔ قالب بغیر قلب کے بیکار ہے۔ اور اعمال بغیر صحیح نیت کے بے فائدہ۔

تفسیر صوفیانہ

خالص آگ پائدار، اس کی گرمی قابل اعتبار اور اس کا نور برقرار۔ جیسے کہ کرۂ نار۔ اور انسانی مزاج کے خلط کی آگ کہ نہ تو اسکے لئے ایندھن کی ضرورت اور نہ اس کے بجھنے کا بفضلہٖ تعالیٰ اندیشہ۔ لیکن غیر خالص آگ نہ تو خود پائدار نہ اس کی گرمی کا اعتبار اور نہ ہی اس کے نور کو قرار جیسے دنیا کی عام آگ کہ یہ ایندھن کی محتاج اور ہوا پانی مٹی سے اس کے بجھنے کا ہر وقت اندیشہ کیونکہ یہ خالص نہیں۔ اس میں مٹی کے اجزاء ہیں اس طرح خالص ایمان انشاء اللہ پائدار ہے۔ جس کی حرارت رہنے والی جیسا کہ قرآن کریم فرما رہا ہے۔ يُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَ فِي الْاٰخِرَةِ (ابراہیم: ۲۷) اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس کلمہ طیبہ پر زندگی موت، قبر و حشر میں ثابت رکھے گا۔ اسی طرح اس کا نور زندگی و قبر اور حشر میں برقرار۔ قرآن شریف فرماتا ہے۔ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ (حدید: ۱۲) یعنی قیامت میں مسلمانوں کا نور ان کے آگے آگے چلے گا۔ انشاء اللہ حقیقی و خالص ایمان کی آگ کے بجھنے کا اندیشہ نہیں۔ منافقین کا ایمان چونکہ خالص نہ تھا بلکہ ریاکاری اور دنیوی اغراض سے مخلوط تھا۔ لہٰذا بجھ گیا۔ نیز یہ مخلفین ایمان پر تو کیا ثابت رہتے کم بخت اپنے کفر پر بھی

پورے طور پر قائم نہ رہے۔

نکتہ: صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ آفتاب کی شعاعوں سے کپڑا نہیں جل سکتا۔ لیکن آتشی شیشے کے ذریعہ سے جل جاتا ہے۔ اسی طرح توحید کی شعاعیں کفر و فسق کے خرمن کو نہیں جلاتیں جب تک کہ نبوت کے آتشی شیشے میں سے چھن کر نہ آئیں پھر نبوت کی شعاعیں بھی دل کی خواہشوں اور سامان گناہ کو نہیں جلاتیں جب تک کہ کسی ولی کے شیشے میں سے چھن کر نہ آئیں۔ توحید کی تاثیر کیلئے نبوت کی آڑ ضروری ہے۔ اور نبوت کی تاثیر کے لئے ولی کا دامن درکار یہ منافقین توحید کے قائل تھے۔ مگر نبوت اور ولایت سے علیحدہ لہٰذا ان کا نور بجھ گیا۔ اس آیت سے شیطانی توحید کے حامی دیوبندیوں اور وہابیوں کو عبرت پکڑنی چاہئے۔

اَلرُّوْحُ فِدَاکَ فَزِدْ حرقًا یک شعلہ دگر برزن عشقاً
میرا تن من دھن سب پھونک دیا یہ جان بھی پیارے جلا جانا

عشق کی آگ وہ آگ ہے جو محبوب کے سوا کو جلا ڈالتی ہے اللہ وہ آگ نصیب کرے۔ آمین

اعتراضات

اعتراض: یہ مثال اس جگہ بظاہر چسپاں نہیں ہوتی۔ کیونکہ منافقین کا دھوکے کے لئے کلمہ پڑھنا عین بے ایمانی تھا۔ ان کو اول ہی سے ایمان کا عارضی نور حاصل نہ ہوا پھر بجھانے کے کیا معنی اور مثال میں ان لوگوں کا ذکر ہے کہ جنہوں نے آگ جلا تو لی مگر بعد میں بجھ گئی۔ **جواب:** چونکہ منافقین نے اس ظاہری کلمے سے مسلمانوں کی تلوار اور جزیہ سے امن پایا۔ اور ان کے ساتھ غنیمتوں، جہادوں اور نمازوں میں شریک ہوگئے یہ اس کلمے کا عارضی نور تھا جو ان کو حاصل ہو گیا لیکن چونکہ مرنے کے بعد ان کی یہ کلمہ گوئی کام نہ آئی۔ اس لئے نور کا بجھنا ان پر خوب چسپاں ہوگیا۔ اس مثال میں چند جماعتیں شامل ہیں۔ ایک تو منافق جنہوں نے دل میں کفر رکھ کر اظہار ایمان کیا دوسرے وہ جو مخلص مومن ہونے کے بعد مرتد ہوگئے تیسرے وہ جنہیں قدرت نے صحیح فطرت عطا فرمائی اور دلائل نے ان پر حق واضح کر دیا۔ مگر انہوں نے اس سے فائدہ نہ اٹھایا۔ (تفسیر خزائن العرفان)

صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾
بہرے گونگے اندھے پس وہ نہیں لوٹیں گے
بہرے گونگے اندھے تو وہ پھر آنے والے نہیں

تعلق

اس میں اعلیٰ کی طرف ترقی ہے۔ یعنی پہلی آیت میں فرمایا گیا کہ منافقین ان کی طرح ہیں۔ کہ جو آگ جلائیں اور ان کی آگ بجھ جائے۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ دنیوی آگ بجھنے پر فقط آنکھ بیکار ہو جاتی ہے۔ کان زبان پر اس کا کچھ اثر نہیں ہوتا لیکن منافقین کی آگ تو ایسی بجھی کہ جس سے ان کے کان، زبان، آنکھ، دل سب ہی بیکار ہوگئے۔

تفسیر

صُمٌّ۔ صَمَمٌ سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں کان کا بوجھ اور یہ دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک تو وہ کہ جس سے سننے کی طاقت ہی جاتی رہے دوسرے وہ کہ جس سے اونچا سنائی دینے لگے۔ بُکْمٌ زبان کی اس بیماری کا نام ہے جس سے حروف ادا نہ کئے جا سکیں اس کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس سے حروف بگڑ کر ادا ہوں جس کو اردو میں تو تلا پن کہتے ہیں اور عربی میں عقدۃ اللسان دوسرے وہ جس سے بولنا ہی ناممکن ہو جس کو اردو میں گونگا پن کہتے ہیں اور عربی میں خرس اور یہ دوسرے معنی ہی یہاں مراد ہیں عُمْیٌ آنکھ کی وہ بیماری ہے جس میں بینائی بالکل جاتی رہتی ہے جسے اردو میں اندھا پن کہتے ہیں۔ پھر اس کی دو قسمیں ہیں ایک پیدائشی اندھا پن جس کو عربی میں عُمْیٌ کہتے ہیں کَمَہٌ اور اس عارضے والے کو اَکْمَہُ۔ دوسرے یہ کہ پہلے انکھیارا ہو۔ بعد میں اندھا ہوا ہو۔ یہ آخری معنی یہاں مراد ہیں پھر اس کی بھی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ سرے سے آنکھ ہی نہ ہو۔ جسے عربی میں طَمَسٌ کہتے ہیں دوسرے یہ کہ آنکھ تو قائم ہو مگر اس میں روشنی نہ ہو۔ آخری معنی اس جگہ مراد ہیں۔ خیال رہے کہ اس بیماری کی کل چار قسمیں ہیں۔ عَمْیٌ، طَمَسٌ، کَمَہٌ، عَمَہٌ، عَمَہٌ جس کے معنی ہیں دل کا اندھا ہونا یَعْمَهُوْنَ اسی سے بنا ہے۔ اس جگہ عُمْیٌ سے مراد آنکھ اور دل دونوں کا اندھا پن ہے فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْنَ یعنی انسان کے راہ راست پر آنے کی تین ہی صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ اس کی بینائی قائم ہو جس سے وہ راستہ دیکھ لے۔ **دوسرے**: یہ کہ اس میں بولنے کی طاقت ہو کسی کو پکار کر اس کی مدد سے راہ راست پر آ جائے **تیسرے**: یہ کہ اس کے کان درست ہوں کہ کسی ہادی کی آواز سن کر درست ہو جائے جب ان منافقین کی یہ تینوں قوتیں ختم ہو چکیں تو اب ان کے کفر سے لوٹنے کی کوئی امید نہیں۔

خلاصہ تفسیر

مسلمانوں کو یہ امید ہوگی کہ شاید منافقین کبھی تو ہدایت پر آ جائیں گے اس لئے وہ ان کو ہدایت پر لانے کی کوشش بھی کرتے ہوں گے اور پھر اپنی ناکامی پر رنجیدہ ہوں گے۔ حق تعالیٰ نے مسلمانوں کے اس رنج و غم کے دور فرمانے کے لئے ان کے ایمان سے مایوس فرما دیا اور فرمایا دیا کہ اے مسلمانو! یہ تو بہرے، گونگے، اندھے ہو چکے ہیں اب تم ان کے ایمان لانے کی بالکل امید نہ رکھو وہ اپنی ان حرکتوں سے باز نہ آئیں گے۔ چونکہ ناامیدی بھی ایک راحت ہوتی ہے اس لئے مسلمان ان کے ایمان سے ناامید ہو کر انتظار کی تکلیف سے بچ گئے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **ایک**: یہ کہ اللہ کے نزدیک وہ ہی عضو کام کا ہے۔ جو اپنے مقصود کو پورا کرے اور جس میں یہ صفت نہیں وہ محض بیکار ہے۔ چونکہ زبان حق بولنے، کان حق سننے اور آنکھیں حق دیکھنے کے لئے عطا فرمائی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ جو بھی دنیاوی کام اس سے لئے جاتے ہیں وہ سب تابع ہیں جب ان اعضاء نے اپنا اصلی کام نہ کیا تو ان کو بیکار کہا گیا۔ اولیاء اور شہداء اگرچہ بظاہر وفات پا جاتے ہیں لیکن قرآن کریم فرماتا ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اپنی زندگی کے مقصود کو پورا کر دیا ہے جیسے کہ سرکاری ملازم سرکاری کام کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں۔ اور ان کے آرام و

آرائش کے لئے بڑی تنخواہ، عمدہ مکان، سواریاں وغیرہ کا انتظام حکومت کی طرف سے ہوتا ہے اصل مقصود تو خدمت سرکار ہے۔ یہ موٹر اور کوٹھی وغیرہ اس کے لئے ہے۔ جو نوکر آرام کرے اور کام نہ کرے وہ شاہی نوکر ہی نہیں ہے۔ اور نہ تنخواہ پانے کا مستحق لیکن جس نے اپنی خدمت کے زمانہ میں بخوبی خدمت کی بعد میں اس کی پنشن ہوگئی اگرچہ وہ اب کوئی خدمت نہیں کر رہا ہے مگر ملازم سرکار ہے یہ کفار اور منافقین کام چور نوکر ہیں اور یہ وفات شدہ اولیاء اللہ پنشن یافتہ سرکاری عہدہ دار **دوسرے:** یہ کہ جو حق تعالیٰ کی طرف بخوشی رجوع کرتا ہے وہ اس کی بارگاہ میں عزت وکرامت سے بلایا جاتا ہے کہ مرتے وقت اس کو کہا جاتا ہے۔ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً (الفجر:۲۸) یعنی اے مبارک روح اپنے رب کی طرف چل کہ تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی۔ اور جو کہ بخوشی اس طرف رجوع نہیں کرتے۔ انجام کاران کو بھی وہیں جانا پڑے گا۔ ہتھکڑی اور بیڑی کے ساتھ اور ان کے لئے فرمایا گیا۔ وَ نَحْشُرُهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ عُمْیًا وَّ بُكْمًا وَّ صُمًّا (الاسراء:۹۷) یعنی ہم ان کو قیامت کے دن ان کے چہروں کے بل اندھا، گونگا، بہرا اٹھائیں گے۔ صوفیاء اکرام فرماتے ہیں۔ کہ تین چیزیں دل کی آنکھ کو اندھا کر دیتی ہیں۔ ۱۔ اعضاء کو گناہوں میں مشغول رکھنا۔ ۲۔ ریا سے عبادت کرنا۔ خالق کو چھوڑ کر خلق سے امید رکھنا۔ یہ بیماری تپ دق کی طرح اولاً تو ہلکی معلوم ہوتی ہے۔ لیکن آخر میں مہلک ثابت ہوتی ہے۔

آباد وہی دل ہے کہ جس میں تمہاری یاد ہے
جو یاد سے غافل ہوا ویران ہے برباد ہے

اَوْ كَصَیِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِیْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ رَعْدٌ وَّ بَرْقٌ ج
یا مثل تیز بارش سے آسمان میں اس اندھیریاں اور گرج اور چمک ہے
یا جیسے آسمان سے اترتا پانی کہ اس میں اندھیریاں ہیں اور گرج اور
یَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ حَذَرَ
کرتے ہیں انگلیاں اپنی میں کانوں اپنے سے کڑک خوف موت
چمک ہے اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس رہے ہیں کڑک کے سبب موت
الْمَوْتِ ط وَ اللّٰهُ مُحِیْطٌۢ بِالْكٰفِرِیْنَ ﴿۱۹﴾
کے اور اللہ گھیرنے والا ہے کو کافروں
کے ڈر سے اور اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے

تعلق

پہلی آیت میں منافقوں کی ایک کہاوت بیان کی گئی تھی یہ انہی کی دوسری کہاوت ہے اس میں اور اس میں یہ فرق ہے کہ وہاں تو آگ جلا کر روشنی حاصل کرنے کا ذکر تھا اور یہاں بجلی سے ملنے کا تذکرہ وہاں تو معمولی وحشت اور خوف کا ذکر ہوا تھا اور یہاں

سخت گھبراہٹ پریشانی کا بیان ہوا۔لہٰذا یہ کہاوت پہلی سے اعلیٰ ہے۔ چند کہاوتوں سے فائدہ یہ ہوتا ہے کہ اصلی چیز ہر ایک کی سمجھ میں بخوبی آجاتی ہے۔

شان نزول

منافقوں میں سے دو شخص حضور ﷺ کے پاس سے مشرکین کی طرف بھاگے۔راستے میں یہی بارش آگئی جس کا اس آیت میں ذکر ہو رہا ہے اس میں سخت گرج اور چمک تھی ان کا یہ حال ہوا کہ جب گرج ہوتی تو کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے کہ کہیں اس سے ہمارے کان نہ پھٹ جائیں۔اور جب چمک ہوتی تو چلنے لگتے۔جب اندھیری ہو جاتی تو ٹھہر جاتے۔آپس میں کہنے لگے کہ شاید اس گناہ سے ہم پر مصیبت آئی ہے۔خدا خیر سے سویرا کردے تو ہم حضور کی خدمت میں واپس جا کر ان کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیں گے۔رب نے ان پر فضل فرمایا اس مصیبت سے نجات کی انہوں نے ایسا ہی کیا کہ سچے مسلمان بن گئے۔اور پھر اسلام پر صحیح معنی میں قائم رہے اس موقعہ پر یہ آیت کریمہ اتری حق تعالیٰ نے ان کے اس واقعہ کو باقی منافقین کے لئے کہاوت بنایا۔اور اس قصے کو ان کی روش پر منطبق فرمایا۔(تفسیر خزائن العرفان)

بعض منافق نفاق میں پختہ تھے جن کے ایمان میں آنے کی کوئی امید نہ تھی ان کے لئے پہلی مثال تھی۔اس لئے وہاں فرمایا گیا کہ بہرے گونگے اندھے ہیں اب نہ لوٹیں گے۔بعض منافق نفاق میں کمزور تھے۔جن کے ایمان کی امید تھی ان کے لئے یہ دوسری مثال ہے اس لئے اس آیت میں ارشاد ہوا کہ قریب ہے کہ بجلی ان کی آنکھیں اچک لے یعنی اچکی نہیں۔

تفسیر

اَوْ عربی زبان میں شک کی جگہ استعمال کرتے ہیں جیسے اردو میں "یا" مثلاً کہا جائے کہ زید آیا تھا یا عمر۔لیکن حق تعالیٰ شک سے پاک ہے اس لئے اس اَوْ میں چند احتمال ہیں۔ایک یہ کہ اختیار کے لئے ہو جیسے کہا جاتا ہے کہ لاری میں یا ریل میں یعنی تمہیں اختیار ہے جس میں چاہو آؤ۔ایسے ہی یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ اے مسلمان تجھے اختیار ہے کہ خواہ تو منافقوں کیلئے پہلی کہاوت بیان کرے یا دوسری۔دوسرے یہ کہ منافق دو قسم کے تھے۔بعض ان آگ والوں کی طرح اور بعض ان بارش والوں کی طرح۔تیسرے یہ کہ یہ او بلکہ کے معنی میں ہے یعنی منافقین ان آگ والوں کی طرح بلکہ ان بارش والوں کی طرح ہیں چوتھے یہ کہ یہ اَوْ واؤ کے معنی میں ہے۔یعنی منافقین ان کی طرح ہیں۔قرآن پاک میں اَوْ ان سب معنی میں استعمال ہوا۔(تفسیر کبیر) كَصَيِّبٍ، صَيِّبٌ، صَوْبٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں اترنا جھکنا اور ارادہ کرنا۔سر جھکانے کو تصویب الراس کہتے ہیں لیکن یہاں پہلے معنی کا لحاظ ہے۔اور یہاں صیب سے مراد یا تو تیز بارش ہے۔کیونکہ یہ اوپر سے گرتی ہے۔اور یا بادل کیونکہ یہ بھی نیچے جھک کر برستا ہے مِّنَ السَّمَآءِ۔سَمَاءٌ۔ سُمُوٌّ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں اونچائی بلندی آسمان کو سماء اسی واسطے کہتے ہیں کہ وہ اونچا ہے اور بادل کو بھی سماء کہتے ہیں۔یہاں یا تو آسمان مراد ہے یا بادل اگرچہ بارش اوپر ہی سے برستی ہے۔لیکن پھر بھی مِنَ السَّمَاءِ فرمادینے میں چند فائدے ہیں۔

فائدے

ایک: یہ کہ فلاسفہ کہتے ہیں بارش دریاؤں کا پانی ہے۔ جو گرم ہو کر بھاپ بن کر اوپر گیا۔ وہاں ٹھنڈا ہو کر بادل بنا اور پھر برس گیا اس میں اس کی تردید کر دی گئی کہ بارش زمین سے نہیں آتی ہے۔ کیونکہ بہت دفعہ گرمی ہوتی ہے مگر بارش نہیں ہوتی۔ اور بارہا سخت سردی میں تیز بارش ہو جاتی ہے۔ اور اگر یہ مان بھی لیا جائے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ کبھی چھوٹے قطرے گرتے ہیں اور کبھی بڑے کبھی برف اور کبھی اولہ اور اگر سب باتوں سے چشم پوشی کر کے مان بھی لیا جائے کہ بارش سمندر سے ہوتی ہے تو بتاؤ سمندر میں پانی کہاں سے آیا یقیناً آسمان ہی سے آیا ہم کو خزانے سے روپیہ ملتا ہے لیکن خزانہ میں ٹکسال سے روپیہ آتا ہے۔ تو آیت میں بارش کی ٹکسال کا ذکر فرمایا گیا تفسیر روح البیان میں سیدنا عبداللہ ابن عباس سے روایت کیا کہ عرش کے نیچے ایک دریا ہے جس سے تمام حیوانات پر رزق اترتے ہیں۔ رب تعالیٰ کی مرضی کے مطابق تمام رزق آسمانوں سے گزرتے ہوئے دنیاوی آسمان کی طرف پہنچتے ہیں بادل مثل چھلنی کے ہے کہ پانی آسمان سے آتا ہے۔ اور اس سے چھن کر زمین پر گرتا ہے۔ ہر قطرہ ایک فرشتہ لے کر آتا ہے جو زمین پر آہستہ سے رکھ جاتا ہے۔ **دوسرا فائدہ:** مِنَ السَّمَآءِ فرمانے میں یہ ہے کہ اس میں اس جانب اشارہ ہو رہا ہے کہ یہ بارش عالمگیر بارش تھی۔ یہ نہ تھا کہ بعض جگہ نہ ہو۔ **تیسرا فائدہ:** یہ کہ فلاسفہ کے قول کے مطابق اگرچہ بارش زمین کے پانی سے ہوتی ہے مگر اس کے اسباب آسمان سے بنتے ہیں۔ کیونکہ آفتاب کی گرمی سے پانی بھاپ بن کر اوپر چڑھتا ہے۔ اور وہاں کی ٹھنڈک سے جم کر بادل بن جاتا ہے۔ لہٰذا بارش آسمان ہی کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔

تتمہ: فلاسفہ کہتے ہیں کہ گرمی سے پانی بھاپ بن جاتا ہے۔ اور زمین کے اجزاء دھواں۔ جیسے لکڑی سے دھواں اور دیگچی سے گرم پانی بھاپ بن کر اڑتا ہے۔ یہ زمین کا دھواں جب ہوا کی حرکت سے آگے بڑھ کر کرۂ آگ تک پہنچ جاتا ہے اور وہاں جا کر روشن ہو جاتا ہے تو کبھی تو چند روز تک روشن رہتا ہے اور دم دار ستارے اور نیزے کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور کبھی روشن ہو کر بجھ جاتا ہے جس کو شہاب کہتے ہیں (تارا ٹوٹنا) اور کبھی روشن نہیں ہوتا بلکہ جل جاتا ہے اور آسمان کی سرخی اور سیاہی بن کر نظر آنے لگتا ہے۔ اسی طرح بخار زمین سے اٹھ کر چند صورتیں اختیار کر لیتا ہے۔ ایک یہ کہ زیادہ اونچا ہو کر جم جاتا ہے۔ اور قطرہ قطرہ ہو کر زمین پر گر پڑتا ہے۔ اس جمے ہوئے بخار کو بادل اور ان قطروں کو بارش کہتے ہیں۔ اور کبھی یہ بخار زیادہ اونچا نہیں جاتا۔ بلکہ زمین کے قریب ہی سردی سے جم کر گر جاتا ہے اس کو شبنم یا اوس کہتے ہیں۔ اور کبھی سخت سردی کی وجہ سے یہ بخار راستہ ہی سے جم کر زمین پر گر پڑتا ہے اس کو اولہ کہتے ہیں۔ تو یہ بخار اور دھوئیں کے علیحدہ علیحدہ حالات تھے۔ لیکن کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آفتاب کی گرمی پا کر بخار دھواں اور غبار مخلوط ہو کر زمین سے اوپر اٹھتے ہیں اور وہاں پہنچ کر علیحدہ علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ غبار الٹا واپس ہوتا ہے اسی کا نام آندھی ہے اور بخار اور دھواں ٹھنڈک کی حد کو پہنچتے ہیں۔ جہاں بخار ٹھنڈا ہو کر بادل بن جاتا ہے۔ اور دھواں اس کو چیر کر اوپر جانا چاہتا ہے کہ جس سے سخت آواز پیدا ہوتی ہے۔ اسی آواز کا نام اردو میں گرج اور عربی میں رعد ہے اور کبھی یہ دھواں تیز حرکت کی وجہ سے بھڑک کر روشن ہو جاتا ہے۔ اسی کو اردو میں بجلی اور عربی میں برق کہتے

ہیں۔اور کبھی بہت سردی کی وجہ سے یہ دھواں بھی جم کر زمین کی طرف لوٹتا ہے۔یہ جما ہوا دھواں جب بادل کو چیرتا ہے تو اس سے سخت آواز پیدا ہوتی ہے۔اور زمین پر گر کر بہت سی چیزوں کو فنا کر دیتا ہے۔اسی کو عربی میں صاعقہ اور اردو میں بجلی گرنا کہتے ہیں۔اس کی قوت اس قدر ہے کہ دریا میں گر کر مچھلیوں کو بھی جلا ڈالتا ہے۔بعض جگہ یہ بجھی ہوئی بجلی لوہے کی شکل میں ملی ہے۔یہ وہی پکا اور جما ہوا دھواں ہے۔مگر

دل کے بہلانے کو لیکن یہ خیال اچھا ہے

یہ سب عقلی ڈھکوسلے ہیں۔مگر حقیقت میں یہ تمام قدرت کے کرشمے ہیں۔چونکہ فلاسفہ کے قول پر بھی ان سب چیزوں میں آفتاب کی گرمی کو پورا دخل ہے اور وہ آسمان پر ہے۔لہٰذا ان سب میں آسمانی اسباب کو دخل ہوا۔اس لئے مِنَ السَّمَآءِ ان کے قول پر بھی خوب چسپاں ہو گیا فِيهِ ظُلُمٰتٌ۔ فِيهِ کی ضمیر صَيِّبٍ کی طرف لوٹتی ہے۔اگر اسکے معنی بادل کے ہوں تو آیت کا ترجمہ یہ ہوگا کہ اس بادل میں بہت تاریکیاں ہیں اور اگر اس کے معنی بارش ہوں تو یہ مطلب ہوگا کہ اس بارش میں بہت تاریکیاں ہیں اور دونوں صحیح ہیں وہ چند تاریکیاں یہ ہیں۔بادل کی تاریکی، تیز بارش کی تاریکی، رات کی تاریکی، چاندنی نہ ہونے کی تاریکی وَّرَعْدٌ وَّبَرْقٌ رعد بادل کی آواز اور برق اس کی چمک کو کہتے ہیں۔اگر کہا جائے کہ یہ چیزیں بارش میں ہیں تو بھی صحیح ہے۔کیونکہ ان دونوں کا اور بارش کا تعلق بادل سے ہے۔اور اگر کہا جائے کہ یہ دونوں بادل میں ہیں تو بالکل ظاہر ہے۔ترمذی شریف میں ہے کہ ایک دفعہ یہودیوں نے حضور ﷺ سے دریافت کیا کہ رعد اور برق کیا چیز ہے حضور ﷺ نے فرمایا کہ رعد اس فرشتے کا نام ہے جو بادلوں پر مقرر ہے اور یہ آواز اسی فرشتے کی ہے جس سے وہ بادلوں کو چلاتا ہے اور برق اس کا آتشی کوڑا ہے جس سے بادلوں کو ہانکتا ہے تفسیر روح البیان نے لکھا ہے کہ وہ فرشتہ شہد کی مکھی کے مشابہ ہے۔مگر اس کی قوت کا یہ حال ہے بعض روایات میں آتا ہے کہ یہ آواز اس فرشتے کی تسبیح کی ہے اسی لئے اس آواز کو سن کر تسبیح پڑھنی چاہئے سیدنا عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ جو شخص بادل کی کڑک اور گرج سن کر یہ پڑھے سُبْحَانَ الَّذِیْ يُسَبِّحُ الرَّعْدُ بِحَمْدِهٖ وَالْمَلٰٓئِكَةُ مِنْ خِيْفَتِهٖ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ تو وہ شخص بجلی گرنے سے انشاء اللہ محفوظ رہے گا اور فرماتے ہیں کہ اگر اس پر بجلی گر جائے تو اس کی دیت (خون بہا) دینے کو تیار ہوں اور یہ عمل نہایت مجرب ہے اَصَابِعَهُمْ انسان کڑک سن کر اپنے پورے کانوں میں لگاتا ہے نہ کہ پوری انگلیاں۔لیکن یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ وہ اپنی پوری انگلیاں کانوں میں ڈالتے ہیں یا یہ کہ انگلیوں سے پورے ہی مراد ہیں اور یا یہ مطلب ہے کہ وہ خوف کے مارے ساری انگلیاں کانوں میں ٹھونسنے کی کوشش کرتے ہیں مِنَ الصَّوَاعِقِ۔صواعق صاعقہ کی جمع صاعقہ اس گرنے والی بجلی کو کہتے ہیں جو کسی چیز پر گر کر اس کو جلا ڈالتی ہے یعنی وہ لوگ بجلی گرنے کے اندیشہ سے اپنے کان بند کرتے ہیں حَذَرَ الْمَوْتِ حذر کے معنی ہیں ڈر اور پرہیز یعنی بچنا۔یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں یعنی موت کے ڈر کی وجہ سے یا موت سے بچنے کے لئے وَاللّٰهُ مُحِيْطٌ اس کے لفظی معنی یہ ہیں کہ اللہ کافروں کو گھیرے ہوئے ہے کیونکہ محیط احاطہ سے بنا ہے۔جس کے معنی ہیں کہ کسی چیز کے آس پاس اس طرح گھیرا ڈال لینا کہ وہ بالکل درمیان میں آئے اور یہ بات حق تعالیٰ کے لئے ناممکن ہے کیونکہ وہ جگہ

وغیرہ میں ہونے سے پاک ہے اس لئے محیط وغیرہ کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ حق تعالیٰ کا علم اور قدرت ان کو گھیرے ہوئے ہے یعنی کوئی چیز اس کے علم اور قدرت سے باہر نہیں۔ دیوبندیوں نے اس قسم کی آیات سے ثابت کیا کہ حق تعالیٰ کی ذات ہر جگہ میں موجود ہے۔ لہٰذا نبی علیہ السلام کو ہر جگہ میں حاضر ماننا شرک ہے یہ عقل مند اتنا نہ سمجھے کہ ہر جگہ میں تو وہ ہو جس کا جسم ہو اور جگہ میں آسکے۔ حق تعالیٰ ان دونوں چیزوں سے پاک ہے۔ ہر جگہ بعض مخلوق ہی ہو سکتی ہے خالق نہیں ہو سکتا ہے جیسے کہ ملک الموت۔ منکر نکیر۔ فرشتہ کاتب تقدیر۔ چاند سورج اور سب کا نور نگاہ کہ یہ چیزیں بیک وقت ہر جگہ موجود ہیں۔ اس مسئلہ حاضر ناظر کی تحقیق کے لئے ہماری کتاب جاء الحق کا مطالعہ کرو۔ بِالْكٰفِرِيْنَ سے یہ مقصود نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا علم صرف کافروں کو گھیرے ہوئے ہے نہ کہ مسلمانوں کو وہ تو سب کو محیط ہے۔ لیکن چونکہ یہاں کافروں کا ہی تذکرہ ہو رہا ہے۔ اس لئے انہی کا ذکر فرمایا۔

خلاصہ تفسیر

منافقین کی حالت کو دوسری نہایت نفیس کہاوت سے سمجھایا جا رہا ہے کہ ان کی حالت ان لوگوں کی طرح ہے جو اندھیری رات میں سنسان جنگل طے کر رہے ہوں۔ کہ اچانک ان کو نہایت کالا بادل آگھیرے۔ یہ لوگ سخت اندھیرے میں پھنس جائیں۔ پھر اس سے بارش تیز۔ بجلیاں اور گرج ظاہر ہو۔ گرج کو سن کر تو ان لوگوں کو اپنی موت کا اندیشہ ہو جائے۔ جس سے وہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونسنے لگیں کہ کہیں اس آواز سے ہمارے کان کے پردے نہ پھٹ جائیں اور بجلی کی روشنی پا کر چلنے لگیں۔ اور اندھیرا ہو جانے پر کھڑے رہ جائیں غرض کہ عجب کش مکش میں پھنس جائیں اور وہ اس حالت میں نہایت حیران و پریشان ہوں کچھ سمجھ میں نہ آتا ہو کہ کیا کریں اور کدھر جائیں یہی حال ان منافقین کا ہے کہ یہ اپنی زندگی کی اندھیری رات میں دنیا کا جنگل طے کر رہے تھے کہ اچانک ان کے شہر میں حضور ﷺ تشریف لے آئے جو کہ رحمت الٰہی کا گہرا بادل ہیں اور آپ پر قرآن کریم اترنے لگا جو مثل تیز بارش کے ہے جس طرح بارش تمام زمین کو سرسبز و شاداب بنا دیتی۔ اور اس میں باغ کھیت اور ان میں پھل پھول لگا دیتی ہے۔ اسی طرح قرآن کریم کی بارش نے دلوں کی زمین میں ایمان کے باغ لگا دیئے۔ اور ان باغوں میں تقویٰ اور پرہیزگاری کے پھول کھلا دیئے۔ مگر اس قرآن میں شرعی احکام اور جرموں کی سخت سزائیں۔ اور دنیا سے بے رغبتی کرنے کا حکم بھی ہے۔ جو کہ مثل گرج اور کڑک کے ہے یہ منافقین کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتے ہیں کہ کہیں یہ کلام ہمارے دلوں پر اثر نہ کر جائے جس سے کہیں ہمارے دنیاوی عیش و آرام میں فرق آجائے مال کی زکوٰۃ دینی پڑ جائے جہاد میں اسلام پر جان نثاری کرنی پڑے کیونکہ یہ چیزیں ان کے نزدیک موت ہیں مگر جب کبھی ان کے مال یا اولاد میں برکت ہوتی یا غنیمت اور زکوٰۃ کا مال ان کے ہاتھ آتا۔ تو بجلی کی چمک والوں کی طرح کچھ چل پڑتے اور کہتے کہ اسلام سچا دین ہے جب سے ہم نے ظاہری کلمہ پڑھا ہے ہمارے گھر میں اللہ کا فضل ہے۔ اور اگر کوئی مصیبت آپڑے۔ مثلاً اولاد یا مال میں کمی ہو جائے وغیرہ وغیرہ تو بارش اور اندھیریوں میں ٹھٹک رہنے والوں کی طرح کہنے لگتے ہیں۔ کہ جب سے ہم نے ظاہری کلمہ پڑھا ہے تب ہی سے ان مصیبتوں میں گرفتار ہوئے ہیں یہ دین سچا دین نہیں یہ کہہ کر اسلام سے پلٹ جاتے ہیں مگر حق تعالیٰ فرماتا ہے

کہ وہ کفر کرکے ہمارے قبضے سے باہر نہیں ہو سکتے کیونکہ سب مخلوق اور خاص کر کفار پر ہماری قدرت کا پورا احاطہ ہے کوئی بھاگ کر کہاں جاسکتا ہے اور کسی کی کیا مجال کہ اپنے تدبیری قلعے کے ذریعہ ہم سے بچ جائے۔ طبیب کی تلخ دوا سے بچ کر یعنی شریعت کی پابندی چھوڑ کر اپنی غلط تدبیروں سے شفا چاہنا حماقت ہے۔ (نوٹ) اس آیت کے فوائد وغیرہ دوسری آیت کے بعد بیان کئے جائیں گے۔ کیونکہ ابھی اس کہاوت کا مضمون پورا نہیں ہوا۔

يَكَادُ الْبَرْقُ يَخْطَفُ اَبْصَارَهُمْ ؕ كُلَّمَآ اَضَآءَ لَهُمْ
قریب ہے بجلی اچک لے آنکھیں ان کی جب کبھی چمکتی ہے لئے
بجلی یوں معلوم ہوتی ہے کہ ان کی نگاہیں اچک لے جائے گی جب چمک ہوئی
مَّشَوْا فِيْهِ ۙ وَاِذَآ اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ؕ وَلَوْ شَآءَ
ان کے چلتے ہیں میں اس اور جب تاریک ہو جاتی ہے اوپر ان کے کھڑے ہو گئے اور
اس میں چلنے لگے اور جب اندھیرا ہوا کھڑے ہو گئے اور اللہ
اللّٰهُ لَذَهَبَ بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ
اگر چاہتا اللہ البتہ لے جاتا کان ان کے اور آنکھیں ان کی
چاہتا تو ان کے کان اور آنکھیں لے جاتا
شَىْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۰﴾ ع
تحقیق اللہ اوپر ہر چیز کے قادر ہے
بے شک اللہ سب کچھ کر سکتا ہے

تعلق

اس آیت کا مضمون پہلے مضمون کا بقیہ ہے کیونکہ اس میں بارش میں پھنسنے والوں کے حال کا ذکر ہوا یعنی کانوں میں انگلیاں دینا ان کے باقی حالات کا ذکر اب ہو رہا ہے۔ لیکن چونکہ ہیبت کے وقت وہ حرکتیں انسان پہلے کرتا ہے۔ اور چلنا پھرنا اس کے بعد اس لئے پہلے کان بند کرنے کا ذکر ہوا اب ان کے چلنے پھرنے کا۔

تفسیر

یَکَادُ۔ کَوْدٌ سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں قریب ہونا۔ اور یہ وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں کام ہوا تو نہ ہو، مگر اس کے ہونے کا قوی اندیشہ یا امید ہو۔ یہاں بھی یہی فرمایا جا رہا ہے کہ بجلی نے ان کو اندھا تو نہیں بنایا مگر ان کو اس کا سخت خطرہ پیدا ہو چکا **یَخْطَفُ۔** خُطْفٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں اچانک چھین لینا۔ (یعنی اچک لینا)۔ اَبْصَارَهُمْ۔ اَبْصَارٌ بصر کی جمع ہے۔

جس کے معنی میں آنکھ کی روشنی وہ اگرچہ ایک ہی ہوتی ہے مگر چونکہ یہاں بہت سے آدمیوں کا ذکر ہے اس لئے ان کی آنکھوں میں روشنیاں بھی بہت سی ہیں۔ قاعدہ یہ ہے کہ تیز روشنی پر نگاہ جمانے سے آنکھ بیکار ہو جاتی ہے سورج اور تیز گیس پر اس کا تجربہ کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ بجلی کی روشنی بھی بہت تیز ہوتی ہے۔ اس لئے ان کو اپنے اندھے ہونے کا اندیشہ ہے كُلَّمَآ اور اِذَا دونوں وقت کے لئے آتے ہیں۔ مگر كُلَّمَآ میں زیادہ گنجائش ہے کیونکہ اس کے معنی ہیں جب کبھی، اور اذا کے معنی ہیں جب اگرچہ اس بجلی کا چمکنا اور بجھنا بار بار ہو رہے ہیں مگر چونکہ وہ لوگ چمکنے سے راضی ہیں اور بجھنے سے ناخوش۔ اس لئے چمکنے کو كُلَّمَآ سے اور بجھنے کو اِذَا سے ارشاد فرمایا گیا۔ اَضَاءَ یہ لازم بھی ہو سکتا ہے اور متعدی بھی یعنی یا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جب کبھی ان کے سامنے بجلی چمکتی ہے اور یا یہ کہ جب کبھی راستے کو چمکاتی ہے مَّشَوْا فِيْهِ، مَشَوْا مَشْیٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں آہستہ آہستہ چلنا۔ لپک کر چلنے کو عربی میں خبت کہتے ہیں اور دوڑنے کو هَرْوَلَه مطلب یہ ہوا کہ وہ لوگ روشنی میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہیں۔ اور پھونک پھونک کر رکھتے ہیں۔ کیونکہ دہشت نے ان میں بھاگنے کی طاقت ہی نہ چھوڑی فِيْهِ کی ضمیر یا تو اَضَآءَ کی طرف لوٹتی ہے یا راستہ کی طرف یعنی وہ اس روشنی میں چلتے ہیں یا راستہ میں اَظْلَمَ میں بھی لازم متعدی ہونے کا احتمال ہے۔ یعنی جب بجلی تاریک ہو جاتی ہے یا راستے کو تاریک کر دیتی ہے۔ قَامُوْا قیام سے بنا ہے جس کے معنی ہیں کھڑا ہو جانا اور کھڑا رہ جانا۔ بیٹھے سے اٹھنے کو کھڑا ہونا بولتے ہیں۔ اور چلتے چلتے رک جانے کو کھڑا رہ جانا اور یہاں یہ دوسرے معنی ہی مراد ہیں یعنی ان بے وقوفوں میں اتنی عقل نہیں ہے۔ اندھیرے میں پہلے چمکے ہوئے راستے پر کچھ قدم چل لیں بلکہ بجلی کے بجھتے ہی ٹھٹک رہتے ہیں وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ سے یہ فرمایا جا رہا ہے کہ ان کی یہ تدبیریں بالکل بے سود ہیں حق تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ جو ان کی آنکھیں اور کان محفوظ رہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ کڑک اور چمک سے ان کی آنکھ کان کو بہر حال بیکار کر دے خواہ وہ اپنے کانوں میں انگلیوں کی بجائے کھیاں ہی ٹھونس دیں بِسَمْعِهِمْ وَاَبْصَارِهِمْ، سَمْعٌ سننے کی قوت کو بھی کہہ سکتے ہیں اور کان کے اس پردے کو بھی جس میں یہ قوت محفوظ ہے۔ یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں۔ اسی طرح ابصار بصر کی جمع ہے۔ اس میں بھی یہی دونوں احتمال ہیں کہ یا تو ان کے دیکھنے کی قوت مراد ہو یا آنکھوں کے وہ تل جن میں یہ قوت ہے۔ چونکہ دونوں کانوں کے درمیان پٹھا ایک ہی ہے۔ اور دونوں آنکھوں کے تل جدا جدا اس لئے سمع کو واحد اور ابصار کو جمع لایا گیا۔ تو آیت کے معنی یہ ہوئے۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کے دیکھنے اور سننے کی طاقت زائل فرما دیتا ان کے کان کے پردے ہی پھاڑ دیتا اور آنکھوں کے تل ہی ضائع فرما دیتا اِنَّ اللّٰهَ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اِنَّ یا تو وہاں بولتے ہیں جہاں کلام کا منکر موجود ہو یا وہاں جہاں انکار کا احتمال ہو چونکہ عرب کے مشرکین اور کفار حق تعالیٰ کی قدرت کاملہ کے منکر تھے۔ اور آئندہ اسلام میں بھی اس کے منکرین پیدا ہونے والے تھے۔ اس لئے یہاں اِنَّ ارشاد فرمایا گیا چونکہ مشرکین چند معبود مانتے تھے اس لئے انہوں نے خدا کو ہر شے پر قادر نہ مانا۔ کیونکہ مجبور ہی اپنے کاموں میں کسی مددگار کو اپنا شریک بناتا ہے اور جو خود ہر چیز پر قادر ہو اسے مددگار کی کیا ضرورت۔ اسی طرح عیسائیوں اور یہودیوں نے حق تعالیٰ کے لئے اولاد ثابت کی اور مجبور ہی اولاد کا محتاج ہوتا ہے۔ نہ کہ ہر شے پر قادر اسی طرح آریوں نے حق تعالیٰ کو روح مادے کا محتاج مانا

معتزلہ نے خود بندوں کو اپنے کا خالق مانا غرضیکہ بہت سے فرقے قدرت الٰہیہ کے منکر ہوئے اس لئے یہاں اِنَّ فرمایا گیا عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ۔ شَیْءٌ کے لغوی معنی ہیں چاہنا اور اصطلاح میں سے اسے بولتے ہیں جس کا تعلق چاہنے سے ہو جس کا اردو ترجمہ ہے چیز آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ قرآن شریف میں شئی چار معنی میں استعمال ہوا بمعنی ممکن موجود جیسے خَالِقُ کُلِّ شَیْءٍ کیونکہ مخلوق موجود ہی ہے نہ کہ غیر موجود ہے ممکن خواہ موجود ہو یا نہ ہو جیسے کہ اس آیت میں کیونکہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے جو اس کے چاہنے اور ارادے میں آسکے اور وہ ممکنات ہی ہیں اس لئے کہ واجب اور محال خدا کے ارادے میں آسکتے ہی نہیں۔ لہٰذا وہ قدرت میں داخل بھی نہیں پروردگار نہ تو اپنا شریک بنا سکتا ہے کیونکہ وہ محال ہے اور نہ خود عیوب سے موصوف ہوسکتا ہے کیونکہ یہ بھی محال ہے اور نہ خود اپنی ذات وصفات پر قادر ہے کیونکہ وہ واجب ہے لہٰذا اس شیء سے محال اور واجب دونوں خارج ہیں بمعنی معلوم جیسے کہ وَکَانَ اللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا (احزاب: ۴۰) یہاں شیء میں واجب محال ممکن سب داخل ہیں کیونکہ خدا ان سب ہی کو جانتا ہے۔ بمعنی موجود خواہ واجب ہو یا ممکن جیسے قُلْ اَیُّ شَیْءٍ اَکْبَرُ شَهَادَةً قُلِ اللّٰہُ (انعام: ۱۹) اسی طرح رب کا فرمانا کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (قصص: ۸۸) ان دونوں آیتوں میں شیء بمعنی موجود ہے۔ حق تعالیٰ بھی اس میں داخل ہے۔ اگر شیء کے ان معنی میں فرق نہ کیا جائے تو بہت دشواری ہوگی۔

دیوبندیوں نے اس آیت سے سمجھا کہ اللہ جھوٹ بھی بول سکتا ہے۔ کیونکہ جھوٹ بھی شے ہے۔ اور ہر شے پر خدا قادر اس کی بحث انشاءاللہ ہم اسی آیت کے اخیر میں عرض کریں گے قَدِیْرٌ، قَدْرٌ سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں اندازہ لگانا اور قادر ہونا یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں۔ اس لئے کہ حق تعالیٰ ہر چیز کو اندازے سے پیدا فرماتا ہے۔ نہ اس سے کم نہ زیادہ۔ لہٰذا اندازہ فرمانے والا ہے اور کسی چیز سے وہ مجبور نہیں۔ لہٰذا وہ ہر شے پر قدرت رکھنے والا بھی ہے۔ دوسرے معنی یہاں زیادہ چسپاں ہیں۔ اگرچہ روح البیان نے پہلے معنی بھی کئے ہیں قدیر اور قادر کا فرق قادر اسم فاعل ہے۔ اور قدیر صفت مشبہ ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ صیغہ اسم فاعل اس پر بولتے ہیں جس سے فعل صادر ہو رہا ہے اور صفت مشبہ اس کے لئے بولا جاتا ہے جس میں فعل کرنے کی صفت موجود ہو خواہ فی الحال کر رہا ہو یا نہ جیسے کہ سامع اسے کہا جائے گا جو فی الحال کچھ سن رہا ہو مگر سمیع وہ ہے جس میں سننے کی قوت موجود ہے خواہ فی الحال سنے یا نہ سنے۔ سمیع کا مقابل ہے بہرا۔ ایسے ہی متکلم وہ جو فی الحال بول رہا ہے اس کا مقابل ساکت یعنی خاموش مگر کلیم وہ ہے جس میں بولنے کی طاقت ہو جس کا مقابل ہے گونگا۔ لہٰذا حق تعالیٰ ہمیشہ سے قدیر ہے۔ خواہ مقدورات یعنی عالم موجود ہوں یا نہ ہوں۔

خلاصہ تفسیر

اس آیت میں منافقین کے حال کو اور زیادہ واضح فرمایا گیا کہ جس طرح بارش میں بجلی کی چمک سے آنکھیں چندھیاتی اور بند ہو جاتی ہیں اور اس کی روشنی سے مسافر کچھ چلنے لگتا ہے اور اندھیرا ہونے پر ٹھہر جاتا ہے اس حال میں وہ حیران ہوتا ہے نہ منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے اور نہ لوٹ سکے۔ اسی طرح یہ منافقین جب حضور ﷺ کے کھلے ہوئے معجزے اور قرآن پاک کی آیات دیکھتے ہیں جو مثل چمکتی ہوئی بجلی کے ہیں تو مجبوراً دل سے تصدیق کر لیتے ہیں جیسے کہ مسافر اس روشنی میں کچھ چل

لیتے تھے اور پھر شکوک اور شبہات کی تاریکی میں آکر رک جاتے تھے جیسے کہ وہ مسافر اندھیرا ہو جانے پر ٹھہر جاتے ہیں لہٰذا ان کے دل کو سکون وقرار نہیں بلکہ حیران ہیں کہ اسلام کو مانیں یا نہ مانیں۔ نیز برق قرآن کی روشنی سے آنکھ بند کرنا اور اس کا انکار کئے جانا بیکار ہے کیونکہ اول تو اس سے بصیرت دور نہیں ہوتی اور پھر بھی رب تعالیٰ ان کو اندھا بہرا کر سکتا ہے۔ اب بھی بہت لوگ دیکھے جاتے ہیں جو دل سے اسلام کی حقانیت کا اقرار کرتے ہیں پھر ان کے دلوں میں ایسے شبہات آجاتے ہیں کہ جس سے وہ حیران رہ جاتے ہیں اس کی دوسری تفسیر وہ بھی ہوسکتی ہے جو پہلے عرض کی گئی یعنی عیش وآرام پاکر اسلام کی حقانیت کے قائل ہو جاتے ہیں۔ اور اگر کوئی مصیبت پڑ جائے تو منکر خیال رہے کہ بادل سے جنگل کا مسافر گھبراتا ہے اور گھر والے خوش ہوتے ہیں یعنی سایہ والوں کے لئے بادل رحمت وخوشی کا سبب ہے بے سایہ لوگوں کے لئے عذاب۔ زمین مدینہ میں صحابہ دامن محبوب کے ساتھ تھے منافق بے سایہ والے حضور نبوت کے آسمان۔ قرآن اس آسمان کا بادل احکام قرآن بارش، عذاب کی آیتیں گرج سزاد نیاوی کی آیات گویا برق جن سے صحابہ خوش تھے۔ منافق گھبرائے ہوئے یہ اختلاف حال تاقیامت رہے گا انسان کو جسمانی وروحانی سایہ کی ہر وقت حاجت ہے گرمی سردی بارش سے بچنے کیلئے سایہ کا محتاج ہے۔ بچہ ماں باپ کے رعایا بادشاہ کے شاگرد استاد کے سایہ کے حاجت مند ایسے ہی امتی حضور کے سایہ کے قبر وحشر میں محتاج ہیں

اس آیت کے فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **ایک**: یہ کہ اسباب کی تاثیر اللہ کے ارادے پر موقوف ہے اگر وہ نہ چاہے تو کسی سبب سے کچھ اثر نہیں ہوسکتا **دوسرے**: یہ کہ حق تعالیٰ کسی سبب کا محتاج نہیں وہ جو چاہے بغیر سبب بھی کر سکتا ہے کیونکہ یہاں فرمایا جارہا ہے کہ بجلی اور گرج نہایت تیز تھیں مگر ان کی آنکھیں اور کان سلامت رہے کیونکہ حق تعالیٰ نے ان کو اندھا اور بہرہ کرنا نہ چاہا اور اگر وہ چاہتا تو بغیر ان اسباب کے بھی کر سکتا تھا۔ **تیسرے**: یہ کہ آج بھی جو لوگ اللہ کی عبادت دنیوی آرام کیلئے کرتے ہیں وہ سخت غلطی پر ہیں ہم نے بعض ایسے لوگ دیکھے کہ اگر ان کا کوئی نقصان ہو گیا تو نماز چھوڑ دی اور کہنے لگے کہ نماز تو پھلتی نہیں۔ اگر ہم کو پھلتی ہوتی تو ہمارا یہ نقصان نہ ہوتا۔ یہ لوگ اس آیت سے عبرت حاصل کریں اگرچہ نیک کاموں سے بلائیں ٹل جاتی ہیں لیکن اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ نیکوکار پر کبھی کوئی دنیاوی مصیبت آئے ہی نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو صحابہ کرام خصوصاً حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ پر کوئی تکلیف نہ آتی بلکہ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ اپنے ذاتی فائدے کو مدنظر رکھ کر عبادت کرنا ٹھیک نہیں۔ لہٰذا محض جنت کے لئے نماز نہ پڑھو وہ تو اللہ کے فضل سے ملے گی نماز وغیرہ تو رب کو راضی کرنے کے لئے ہیں بارگاہ الٰہی میں تاجر بن کر نہ آؤ یعنی یہ نہ کہو کہ خدایا ہمارے اعمال کے بدلے جنت دے بلکہ یہ کہو کہ اپنے فضل سے ہمارے گناہ معاف کردے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمتہ نے خوب فرمایا ہے۔

من نہ گویم کہ طاعتم بپذیر قلم عفو بر گنا ہم کش

ع ما گدائیم نہ بازرگانیم۔ **چوتھے**: یہ کہ ایمان اطمینان سے حاصل ہوتا ہے۔ **فیز**: ایمان حضور ﷺ کو ماننے کا نام ہے نہ کہ محض جاننے کا مشرکین بھی جانتے تھے کہ قرآن کریم فرماتا ہے یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (البقرہ:۱۴۶)

انشاء اللہ ہم جاننے اور ماننے کا فرق اسی آیت کے ماتحت بیان کریں گے۔

تفسیر صوفیانہ

صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ طریقت کے مسافر کو بھی یہ مصیبتیں پیش آتی ہیں جو کہ یہاں بیان ہوئیں کیونکہ جو شخص اس راستہ میں قدم رکھتا ہے۔ اور کچھ محنت کے بعد اس میں کچھ تجلی انوار ہوتی ہے تو وہ خوش ہو کر خوب آگے بڑھنے کی کوشش کرتا ہے۔ مگر پھر اچانک وہ تجلیات کچھ دنوں کے لئے بند ہو جاتی ہیں تو یہ گھبرا جاتا ہے اور اس کی ہمت ٹوٹنے لگتی ہے اگر مستقل مزاج ہے تو ان حالتوں کی پرواہ نہ کرتا ہوا کوشش کئے جاتا ہے ورنہ تھک کر بیٹھ رہتا ہے اور تھک کر بیٹھنا ہی بڑی محرومی ہے۔ طالب مولیٰ کو لازم ہے کہ ان حالات کی پروانہ کرتے ہوئے اپنا کام کئے جائے اور یہ بھی خیال رکھے کہ یہ دشوار گزار راستہ ہے اور سخت کٹھن منزل اس بھنور میں ہزاروں کشتیاں ڈوب چکی ہیں اور ہزاروں مسافر اس جنگل میں شیطانی ڈاکوؤں کے ہاتھ لٹ چکے ہیں۔ **دنیوی** زیب و زینت شیطانی خیالات اور غرور وغیرہ اس سفر کی مصیبتیں ہیں۔ یہ بھی خیال رہے کہ صوفی اور ولی ہمیشہ ایک حال پر نہیں رہتا۔ کبھی دنیا کی خبر رکھتا ہے اور کبھی اپنے سے بھی غافل ہو جاتا ہے۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں۔

گہے بر طارم اعلیٰ نشینم گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

ولی پر فیض کبھی زیادہ کبھی کم کچھ روز کے لئے بند بھی ہو جاتا ہے نبی کریم ﷺ پر بھی وحی یکساں نہ آتی تھی کبھی کبھی چند روز کے لئے بند بھی ہو جاتی تھی۔ لہٰذا اس راستے کی ان مصیبتوں کی پرواہ نہ کرے۔

مسئلہ امکان کذب

چونکہ اس آیت سے موجودہ زمانہ کے دیوبندیوں نے حق تعالیٰ میں جھوٹ جیسے عیب کا امکان مانا ہے۔ اس لئے کچھ اس کے متعلق بھی روشنی ڈالنی ضروری ہے۔ ہم اس کے متعلق ایک مقدمہ اور دو فصلیں پیش کرتے ہیں ناظرین سے توقع انصاف اور اپنے رب سے امید قبول رکھتے ہیں۔ **مقدمہ:** جھوٹ تمام عیبوں سے بدتر عیب ہے چند وجہ سے ایک یہ کہ انسان بغیر جھوٹ کی مدد کے کوئی گناہ کر سکتا ہی نہیں اگر کوئی سچ بولنے کا عہد کرے تو انشاء اللہ تمام گناہوں سے خود بخود توبہ کرے گا دیکھو چور، شرابی زانی یہ حرکتیں جب ہی کر سکتے ہیں جب کہ وہ پہلے سے جھوٹ بولنے کے لئے آمادہ ہو جائیں اور یہ خیال کر لیں کہ اگر ہم پکڑے گئے تو صاف انکار کر جائیں گے۔ اگر پہلے سے سچ بولنے کا ان لوگوں نے عہد کر لیا ہو تو وہ یہ حرکتیں کر سکتے ہی نہیں۔ **دوسرے:** یہ کہ کوئی بھی گناہ کفر نہیں مگر جھوٹ کفر اور شرک کی حد تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ مشرک کہتا ہے کہ رب دو ہیں۔ یہ جھوٹ ہے اور کفر ہے۔ عیسائی کہتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام رب کے بیٹے ہیں۔ جھوٹا اور کافر ہے۔ ایک شرابی جواری ان جرموں کو حرام کہتے ہوئے کرتا ہے تو وہ گناہگار ہے مگر کافر نہیں کیونکہ جھوٹ نہیں بول رہا ہے۔ لیکن جب اس نے کہہ دیا کہ یہ چیزیں حلال ہیں اب جھوٹ بولا کافر ہو گیا۔ ماننا پڑے گا کہ بڑے سے بڑا گناہ بھی کفر نہیں اور جھوٹ اکثر کفر ہے۔ شریعت نے جن اعمال کو کفر قرار دیا جیسے کہ زنار باندھنا۔ چوٹی رکھنا وہ بھی اسی لئے کہ یہ تکذیب دین کی علامات ہیں وہاں بھی جھوٹ

ہی کفر ہوا **تیسرے:** یہ کہ قرآن کریم میں کسی گناہ گار پر لعنت نہیں فرمائی گئی سوائے جھوٹے کے کہ فرمایا گیا لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ (آل عمران:۶۱) خیال رہے کہ ظالم اور کافر پر جو لعنتیں آتی ہیں وہ جھوٹ کی ہی وجہ سے ہیں کیونکہ کفر و شرک میں جھوٹ ضرور ہوگا اور ظالمین سے بھی کفار ہی مراد ہیں۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ جھوٹے کے سوا کوئی لعنت کا مستحق نہیں چوتھے یہ کہ جھوٹا آدمی چھچھورا ہوتا ہے اور چھچھورا حکومت کے قابل نہیں۔ بہر حال جھوٹ تمام عیبوں سے بدتر عیب ہے یہ بات اپنے ذہن میں رکھو انشاء اللہ آئندہ کام آئے گی۔

پہلی فصل

خدائے تعالیٰ کے جھوٹ سے پاک ہونے کے دلائل۔ **پہلی دلیل:** چونکہ جھوٹ عیب ہے بلکہ تمام عیبوں سے بدتر عیب اور رب تعالیٰ تمام عیبوں سے پاک لہٰذا جھوٹ سے بھی پاک خیال رہے کہ جس طرح دوسرے عیبوں کا حق تعالیٰ کے لئے امکان نہیں یعنی چوری اور زنا وغیرہ اس کے لئے محال بالذات ہیں اسی طرح اس کا جھوٹ بولنا بھی محال بالذات **دوسری دلیل:** جب کسی کلی کی دو ہی فرد یں ہوں تو ہر ایک کا حکم دوسری فرد کے لحاظ سے ہوگا خبر کی دو ہی قسمیں ہیں سچی یا جھوٹی۔ لہٰذا اگر خدا کی خبروں میں جھوٹ کی گنجائش ہو تو ان کا سچا ہونا واجب نہ رہا جھوٹ کے امکان سے سچ کی ضرورت جاتی رہی۔ **تیسری دلیل:** خدا کی تمام صفتیں واجب ہیں اگر جھوٹ کا احتمال ہو تو سوال یہ پیدا ہوگا کہ وہ جھوٹ خدا کی صفت بنے گا یا نہیں اگر صفت ہے تو اس کو واجب ہونا چاہئے تھا۔ اور اگر صفت نہیں ہے تو اس کے امکان کے کیا معنی۔ **چوتھی دلیل:** کلام صادق خدا کی صفت ہے۔ جب خدا کا جھوٹ ممکن ہوا تو سچ بھی واجب نہیں رہا جس سے لازم یہ آیا کہ خدا کی صفت ممکن ہوئی۔ **پانچویں دلیل:** جھوٹ بولنے کی صرف تین وجہیں ہوتی ہیں۔ بے علمی، عاجزی اور خباثت اگر کسی شخص کو خبر ملی اس نے وہی لوگوں سے بیان کردی تو یہ شخص اپنی بے خبری کی وجہ سے جھوٹ بات کہہ گیا زید نے وعدہ کیا کہ میں ایک ماہ کے بعد قرض ادا کردوں گا مگر اس مدت میں روپیہ اس کے ہاتھ نہ آیا اور اس وعدہ میں جھوٹا ہو گیا یہ جھوٹ اس کی مجبوری کی وجہ سے ہوا۔ اسی طرح کسی شخص کو جھوٹ بولنے کی عادت ہو گئی کہ بلا وجہ جھوٹ بولا کرتا ہے۔ یہ جھوٹ خباثت نفس کی وجہ سے ہوا لیکن خدائے تعالیٰ ان تینوں عیوب سے پاک لہٰذا جھوٹ سے پاک **چھٹی دلیل:** کوئی چیز خدا کی مثل نہیں ہوسکتی خدا کی شان سب سے ارفع واعلیٰ ہے۔ انبیاء کرام کا جھوٹ بولنا ممکن بالذات اور محال بالغیر ہے۔ اگر رب تعالیٰ کا جھوٹ بھی ایسا ہی ہو تو معاذ اللہ اس وصف میں انبیاء اس کی مثل ہو گئے۔ **ساتویں دلیل:** جس کلام میں جھوٹ کا احتمال ہو۔ سننے والے کو اعتبار نہیں ہوتا۔ اگر خدا کی خبروں میں جھوٹ کا امکان ہو تو اس کی کوئی خبر یقینی نہ رہی۔ اور بغیر یقین ایمان حاصل نہیں ہوتا۔ لہٰذا کوئی دیوبندی امکان کذب کا مسئلہ مان کر مومن نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اسے خدا کی ہر خبر میں جھوٹ کا امکان نظر آئے گا۔ اور وہ یقین جو ایمان کے لئے ضروری ہے اس کو حاصل نہ ہوگا۔ **آٹھویں دلیل:** جس طرح کہ دوسرے عیوب الوہیت کے خلاف ہیں۔ اسی طرح جھوٹ بھی اس کے خلاف ہے۔ دیکھو تفسیر کبیر و

تفسیر روح البیان اور دیگر کتب علم کلام **نویں دلیل:** بعض چیزیں بندوں کے لئے کمال ہیں اور رب کے لئے عیب جیسے کھانا پینا اور عبادت کرنا۔ یہ بھی حق تعالیٰ کے لئے محال بالذات ہیں تو جھوٹ کہ بندوں کے لئے بھی اول نمبر کا عیب ہو وہ رب کے لئے ممکن کیوں کر ہوگا۔ **دسویں دلیل:** دیوبندیوں میں بھی منطق دان لوگ ہیں وہ اس مسئلہ کے قائل نہ ہوئے اور تمام علماء منطق نے اس مسئلہ کی تردید ہی کی۔ چنانچہ مولانا عبداللہ ٹونکی اور شاہ فضل الحق خیر آبادی نے اس کی تردید میں رسالے لکھے۔ دیوبندیوں کے مایہ ناز منطقی مولانا عبدالوحید صاحب سنبھلی یہی کہا کرتے تھے کہ ہمارے بڑوں سے اس مسئلہ میں سخت غلطی ہوگئی ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسئلہ نہایت بے ہودہ ہے۔

دوسری فصل اعتراض و جواب

پہلا اعتراض: اگر خدائے تعالیٰ جھوٹ پر قادر نہ ہو تو مجبور ہوگا۔ اور مجبوری اس کی الوہیت کے خلاف ہے **جواب:** مجبوری اسے کہتے ہیں کہ جہاں مفعول میں اثر قبول کرنے کی قابلیت ہو۔ مگر فاعل میں اثر کی طاقت نہ ہو۔ اور اگر خود مفعول ہی اثر نہیں لے سکتا تو یہ قصور مفعول کا ہے نہ کہ فاعل کا۔ اگر کوئی روشنی میں قریب کی چیز نہ دیکھے تو اندھا ہے۔ لیکن اگر اندھیرے میں یا بہت دور کی چیز نہ دیکھ سکے تو اندھا نہیں۔ کیونکہ یہاں اس کی آنکھ کا قصور نہیں۔ بلکہ اس چیز کا قصور ہے کہ جو اس کے دیکھنے کے قابل نہ رہی۔ اسی طرح خود عیوب اس قابل نہیں کہ خدا کی قدرت میں داخل ہوں۔ لہٰذا یہ قصور ان عیوب کا ہے نہ کہ قدرت کا۔ اگر اسی کا نام مجبوری ہوتا تو تمہارے نزدیک بھی خدائے تعالیٰ بہت سے عیوب پر قادر نہیں جیسے موت وغیرہ **دوسرا اعتراض:** جھوٹ بھی ایک شے ہے اور ہر شے خدا کی قدرت میں داخل **جواب:** خدا کا جھوٹ شے نہیں کیونکہ وہ محال ہے اور بندوں کا جھوٹ بولنا بے شک شے ہے۔ خدائے تعالیٰ اس کے پیدا کرنے پر واقعی قادر ہے نہ کہ خود اس سے موصوف ہونے پر۔ کیونکہ سارے عیب بھی خدا کی مخلوق ہیں مگر خدا ان سب سے پاک ہے عیب کو پیدا کرنا اور جاننا عیب نہیں ہاں عیب کرنا عیب ہے **تیسرا اعتراض:** خدا کی خبریں بھی خبر ہی ہیں اور خبر اسی کو کہتے ہیں جس میں جھوٹ سچ کا احتمال ہو۔ اگر جھوٹ کا احتمال نہ ہوگا تو سچ کا بھی امکان نہ رہے گا لہٰذا اس کی خبروں کو خبر ماننے کے لئے ان میں جھوٹ کا امکان مانو مگر چونکہ وہ خدا کی خبریں ہیں اس لئے جھوٹی ہوں گی نہیں۔ لہٰذا ان خبروں کا جھوٹا ہونا ممکن بالذات اور محال بالغیر ہے۔ **جواب:** مطلق خبر جنس ہے اور حق تعالیٰ کی خبر اس کی نوع۔ اس نوع میں حق تعالیٰ کی نسبت مثل فصل کے ہے۔ فصل کے ذریعہ سے نوع پر جو احکام جاری ہوتے ہیں وہ سب ذاتی ہوتے ہیں ہاں جنس کے لئے عارضی جیسے کہ ناطق کے احکام انسان کے لئے ذاتی ہیں اور حیوان کیلئے عارضی۔ لہٰذا جب نسبت الٰہی نے جھوٹ ہونے کو محال کیا تو محال ہونا رب کی خبر کے لئے بالذات اور مطلق خبر کے لئے بالعرض ہوا۔ ہماری اس تقریر سے بفضلہٖ دونوں اعتراض کافور ہوگئے۔ **چوتھا اعتراض:** حق تعالیٰ کے سچے ہونے کی تعریف جب ہی کی جاسکتی ہے جب کہ وہ جھوٹ پر قادر ہو۔ مگر نہ بولے۔ اگر اس کو جھوٹ پر قدرت ہی نہ ہو تو پھر سچے ہونے میں کیا کمال جیسے کہ دیوار کے جھوٹ نہ بولنے کی تعریف

نہیں کی جا سکتی کیونکہ اس میں بولنے کی طاقت ہی کہاں ہے۔ (یہ اعتراض اسمٰعیل دہلوی کی ذہانت کا نتیجہ ہے) **جواب:** ماشاء اللہ کیا اچھا قاعدہ ایجاد کیا۔ خدا تعالیٰ کے فنا نہ ہونے کی تعریف چوری نہ کرنے کی تعریف سارے عیبوں سے پاک ہونے کی تعریف کی جاتی ہے۔ اس قاعدے سے لازم آتا ہے کہ یہ سارے عیب خدا کے لئے ممکن ہوں۔ کیونکہ بغیر امکان خدا کی تعریف کرنا ناممکن ہے۔ جناب حق تعالیٰ کی تعریف اس طرح کی جائے گی کہ اس بارگاہ تک کسی عیب کی رسائی ہی نہیں یاد رہے کہ دیوار کا جھوٹ محال بالغیر نہیں۔ بلکہ محال عادی ہے۔ انبیاء کرام اولیاء عظام سے پتھروں نے کلام کیا اور آئندہ بھی کریں گے۔ تو مولوی اسمٰعیل صاحب کے اس قاعدے سے لازم آتا ہے کہ حق تعالیٰ کا جھوٹ محال بالغیر تو کیا محال عادی بھی نہ ہوتا کہ اس کی تعریف کی جا سکے۔ **پانچواں اعتراض:** یہ سب مانتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ کی وعیدوں کا خلاف ہو سکتا ہے۔ مثلاً اس نے خبر دی کہ مسلمان کو ظلماً قتل کرنے والے کی سزا جہنم ہے۔ لیکن سب مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وہ اگر چاہے تو قاتل کو جہنم نہ بھیجے اور یہی جھوٹ ہے **جواب:** معاذ اللہ اس کو جھوٹ سے کیا تعلق اولاً تو خدا کی ساری وعیدیں اس کے ارادے پر موقوف ہیں کہ وہ اگر چاہے تو سزا دے اور چاہے تو معاف فرما دے۔ قرآن کریم نے فرمایا وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ (النساء: ۴۸) اس آیت نے شرک کے سوا ساری وعیدوں کو رب کے چاہنے پر موقوف کر دیا لہٰذا جس گنہگار کی بخشش [illegible] گی [illegible] اسی مضمون کا ظہور ہوگا **دوسرے:** یہ کہ قصور معاف کرنا کرم نہ کہ جھوٹ لہٰذا جھوٹ عیب ہے **تیسرے:** یہ کہ یہ اعتراض تو تم پر بھی پڑتا ہے۔ کیونکہ رب کے جھوٹ کو تم محال بالغیر مانتے ہو۔ اور وعید کی مخالفت واقع ہے۔ اگر یہ کذب ہے تو تم خدا کے کذب کو واقع مانو نہ کہ محال بالغیر۔ **چھٹا اعتراض:** رب تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ (انفال: ۳۳) یعنی اے نبی ﷺ آپ کے ہوتے ہوئے کفار مکہ پر عذاب نہ بھیجیں گے اور پھر خود ہی فرمایا قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰٓى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ (انعام: ۶۵) یعنی اے کفار مکہ اللہ قادر ہے کہ تم پر اوپر یا نیچے سے عذاب بھیجے۔ دیکھو ان کفار مکہ سے عذاب نہ بھیجنے کا وعدہ فرمایا گیا لیکن دوسری آیت میں عذاب بھیجنے پر قدرت ثابت فرما دی گئی جس سے معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ اپنا وعدہ توڑنے پر بھی قادر ہے اور یہی جھوٹ یہ اعتراض دیوبندی مذہب کا انتہائی ہے۔ جس کو مولوی خلیل احمد اور رشید احمد ہر جگہ بیان کرتے ہیں۔ **جواب:** عالم کی ہر چیز کا ہونا حق تعالیٰ کے ارادے پر موقوف ہے فرماتا ہے فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (ہود: ۱۰۷) اور فرماتا ہے کہ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ (شوریٰ: ۲۹) کفار مکہ پر عذاب آنا چونکہ یہ بھی عالم کی ایک چیز ہے لہٰذا ممکن اور رب اس پر قادر اسی امکان و قدرت کا ذکر تمہاری پیش کردہ دوسری آیت میں ہوا لیکن جب عالم کی کسی چیز سے حق تعالیٰ کے ارادے کا تعلق ہو جائے تو اب اس کے خلاف ہونا محال بالذات اس کا ذکر پہلی آیت میں ہوا تو خلاصہ یہ ہوا کہ کفار مکہ پر عذاب کا آنا اور نہ آنا خود اپنے لحاظ سے دونوں ممکن ہیں۔ مگر اس لحاظ سے کہ عذاب نہ آنے کا حق تعالیٰ نے وعدہ فرمایا۔ اور اس کے ارادے کے خلاف ہونا محال بالذات لہٰذا اس حال میں عذاب کا آنا محال بالذات۔ مثال سمجھو۔ زید کھڑے ہونے اور بیٹھنے دونوں پر قادر ہے مگر جب کھڑا ہو گیا تو کھڑے ہونے کی حالت میں بیٹھنا محال بالذات ہے۔ کیونکہ وہ اجتماع ضدین کی مثال ہے۔ اسی طرح حق تعالیٰ ہر

چیز کے پیدا کرنے اور فنا کرنے پر قادر۔ لیکن جب کسی کو پیدا فرما دیا تو پیدا ہو چکنے کی حالت میں فنا ہونا محال بالذات ہے اس طرح کہ ہستی اور نیستی دونوں جمع ہو جائیں۔ ہاں جب نیستی کی جائے گی تو ہستی فنا ہو جائے گی۔ ہر دو نقیضوں کا یہی حال ہے کہ ان میں سے ہر ایک ممکن لیکن ایک کے ہوتے ہوئے دوسرے کا ہونا محال بالذات اور موٹی مثال سمجھو کنواری لڑکی جس مسلمان سے چاہے نکاح کرے یعنی بطریق بدلیت ہر مسلمان کے نکاح میں آ سکتی ہے۔ مگر جب ایک سے نکاح کر لیا تو دوسرے سے نکاح کرنا اسی حال میں شرعاً محال بالذات ہو گیا اور سمجھو کہ زید کے پیدا ہونے سے پیشتر ہر شخص بطریق بدلیت اس کا باپ بن سکتا تھا لیکن جب وہ بکر کے نطفے سے پیدا ہو چکا اور بکر اس کا باپ بن چکا تو اس حالت میں کسی اور کا باپ بننا محال بالذات ہے۔ حق تعالیٰ قادر نہیں کہ کسی اور کو بھی زید کا باپ بنا دے کذب جب ہوتا ہے جب کہ تعلق ارادے کے باوجود حق تعالیٰ ان کے عذاب پر قادر ہونا جناب تعدد امکان اور چیز ہے اور امکان تعدد دوسری چیز اس عذاب بھیجنے میں امکان کا تعدد ہے نہ کہ تعدد کا امکان قرآن پاک سمجھنے کے لئے عقل و علم بھی ضروری ہے۔ اور دین بھی مگر دیو بندیوں کے ہاں ان تینوں کا دیوالہ ہے۔ یہ دیو بندیوں کا انتہائی اعتراض تھا جو بفضلہٖ تعالیٰ پاش پاش ہو گیا اور ہم تو اس سے یہ بھی سمجھے کہ وہ ابھی تک امکان کذب کے معنی سمجھے ہی نہیں۔ یہ کون کہتا ہے کہ عالم کی بعض چیزیں ممکن ہیں اور بعض ناممکن۔ نقیضین ضدیں ہر ایک ممکن لیکن ان کا جمع ہونا محال بالذات اسی طرح خبر الٰہی کے ساتھ خلف کا ہونا محال بالذات اسی کا نام امکان کذب ہے۔ اس سوال کا آسان جواب یہ ہے کہ آیت مَا كَانَ لِيُعَذِّبَهُمْ میں عام عذاب ظاہری مراد ہے مسخ اور پتھر برسنا وغیرہ اور دوسری آیت یعنی قُلْ هُوَ الْقَادِرُ (انعام: ۶۵) میں عذاب باطنی مراد ہے۔ یعنی جنگوں میں شکست قحط سالی، سخت بیماریاں وغیرہ یا عذاب ظاہری خاص جیسے حدیث شریف میں فرمایا گیا کہ قرب قیامت بعض قوموں کی صورتیں مسخ ہوں گی زمین دھنسنے لگے گی۔ حضور کی تشریف آوری سے عام عذاب ظاہری آنا منع ہو گیا دوسرا عذاب منع نہیں آیت وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ (انفال: ۳۳) سے پہلے کفار مکہ کی یہ دعا مذکور ہے کہ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ أَوِ ائْتِنَا علیہ (انفال: ۳۲) جس سے پتہ لگا کہ وہاں یہ ہی عذاب مراد ہے خیال رہے کہ کذب صدق خبر کی صفت ہے نہ کہ مخبر عنہ کی لہٰذا یہ محال بالذات ہے کہ رب تعالیٰ خلاف واقع کی خبر دے یہ ہی امتناع کذب کے معنی ہیں جن کے جنتی ہونے کی خبر دے دی گئی اگر وہ دوزخ میں جا سکتے ہیں تو یہ خبر محال بالذات ہوتی۔ **ساتواں اعتراض:** عام متکلمین فرماتے ہیں **مقدور العبد مقدور اللہ** یعنی جس پر بندہ قادر ہے اس پر خدا بھی قادر ہے اور جھوٹ پر تو بندہ قادر تو چاہئے کہ خدا بھی قادر ہو **جواب:** اس قول کا مطلب یہ ہے کہ جس کے کسب یعنی کرنے پر بندہ قادر ہے۔ اسکے خلق، پیدا کرنے پر خدا بھی قادر کیونکہ وہ ممکن ہی ہو گا نہ یہ کہ خدا بھی اس کے کرنے پر قادر ہو جائے۔ اگر یہ مطلب ہوتا تو بندہ زنا چوری وغیرہ سب پر قادر ہے کیا رب کو ان پر قادر مانو گے **آٹھواں اعتراض:** خدا پاک قادر ہے کہ ہزاروں محمد بنا دے۔ اہل سنت جو کہتے ہیں کہ اب نئے نبی کا آنا محال بالذات ہے غلط ہے۔ اسی طرح یہ کہتے ہیں کہ حضور کا مثل ناممکن ہے غلط ہے جس نے ایک محمد کا پیدا کیا کیا وہ لاکھوں محمد نہیں بنا سکتا۔ (ماخوذ از تقویت الایمان)
جواب: دیو بندی فوج میں تمنا کہاں۔ گنگا کی موج میں جمنا کہاں۔ یہ مسئلہ امکان نظیر ہے کہ جو امکان کذب کی شاخ

ہے۔ اس میں دو گفتگوئیں ہیں۔ ایک حضور علیہ السلام کے بعد نئے پیغمبر کا آسکنا ہے دوسرے آپ کا مثل ہو سکنا پہلے مسئلہ کی تحقیق تو بفضلہ تعالیٰ سوال نمبر ۶ کے جواب میں پوری پوری ہو چکی یعنی حق تعالیٰ اس پر قادر تھا کہ لاکھوں میں جس کو چاہتا خاتم النبیین بنا کر بھیج دیتا یعنی بطریق بدلیت لاکھوں خاتم النبیین بنانا ممکن تھا مگر جب نبی کریم علیہ السلام کا انتخاب ہو گیا اور آپ خاتم النبیین بن گئے تو اب کسی کا نبی بننا محال بالذات ہے۔ جس کی نہایت نفیس مثالیں ہم پہلے دے چکے ہیں کہ ہر شخص ہندہ کا شوہر اور زید کا باپ بن سکتا ہے مگر جب ایک بن گیا تو دوسرے کا بننا محال جب زید کا دوسرا باپ نہیں بن سکتا تو دوسرا خاتم النبیین کیسے ہو سکتا ہے۔

رہا دوسرا مسئلہ اس کی تفصیل کے لئے رسالہ مبارکہ امتناع النظیر مصنفہ حضرت شاہ فضل حق صاحب کا مطالعہ کرو میں مختصراً عرض کرتا ہوں یہ سب کو معلوم ہے کہ دو نقیضوں اور دو ضدوں کا جمع ہونا محال بالذات ہے۔ اور حضور علیہ السلام کی مثال ماننے میں یہ دونوں باتیں لازم وہ اس طرح کہ حضور علیہ السلام آخری نبی ہیں۔ آپ کا دین آخری دین ہے۔ آپ کی کتاب آخری کتاب ہے۔ اب اگر کوئی شخص حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مثل فرض کیا جائے تو اگر ان باتوں میں وہ آخری ہو تو حضور آخر نہ رہے اور اگر حضور علیہ السلام آخری ہوں تو وہ دوسرا آخر نہیں۔ اسی طرح حضور علیہ السلام سب سے پہلے شفاعت فرمانے والے سب سے پہلے رب سے کلام فرمانے والے سب سے پہلے صراط سے گزرنے والے سب سے پہلے جنت میں جانے والے سب سے پہلے آپ کی قبر انور کھلے گی۔ سب سے پہلے آپ ہی کا نور پیدا ہوا۔ میثاق کے دن سب سے پہلے آپ ہی نے بلیٰ (ہاں) فرمایا اتنی باتوں میں حضور سب سے پہلے ہیں۔ اگر کوئی آپ کی مثل ہو تو اس میں یہ اولیتیں جمع ہوں گی یا نہیں اگر ہوں تو حضور علیہ السلام میں نہ رہیں گی ورنہ دو نقیضیں جمع ہوں اور اگر نہ ہوں تو وہ آپ کا مثل کیسے۔ تیسرے یہ کہ حضور علیہ السلام ساری اولاد آدم کے سردار ہیں سارے انسان قیامت میں آپ کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے سارے انسانوں کے آپ خطیب ہوں گے۔ سارے روتوں کو آپ ہنسائیں گے۔ سارے گرتوں کو آسنبھالیں گے سارے جلتوں کو آپ بجھائیں گے سارے بگڑوں کو آپ بنائیں گے ساری آنکھیں آپ کا منہ تکیں گی سارے ہاتھ آپ کے دامن کی طرف بڑھیں گے سارے لوگوں میں سے آپ کو مقام محمود ملے گا۔ سارے لوگوں میں آپ کو وسیلہ (جنت کا اعلیٰ مقام) ملے گا۔ سارے لوگوں کے آپ نبی ہیں رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا (اعراف: ۱۵۸) اگر کوئی آپ کا مثل ہو تو بتاؤ اس میں یہ صفتیں ہوں گی یا نہیں۔ اگر ہوں گی تو اجتماع نقیضین ہے۔ اور اگر نہ ہوں تو وہ مثل کیسا۔ حق یہ ہے کہ حق تعالیٰ خالقیت میں وحدہ لا شریک ہے۔ اور حضور نبی کریم علیہ السلام ان اوصاف میں وحدہ لا شریک۔ جس طرح دو خدا کا ہونا محال۔ ایسے ہی دو مصطفیٰ ہونا محال۔ ہمارا ایک شعر یاد کرلو۔

کوئی مثل ان کا ہو کس طرح وہ ہیں سب کے مبدا و منتہا
نہیں دوسرے کی یہاں جگہ کہ یہ وصف دو کو ملا نہیں

ڈاکٹر اقبال نے کیا خوب فرمایا ہے۔

رخ مصطفیٰ ہے وہ آئینہ کہ اب ایسا دوسرا آئینہ
نہ کسی کے وہم و گمان میں نہ دکان آئینہ ساز میں

نواں اعتراض: خدا تعالیٰ قادر ہے کہ اس جیسا دوسرا عالم بنا دے اور اس عالم میں اس عالم کی سی تمام چیزیں ہونا

ضروری ہیں ورنہ وہ اس عالم کی طرح نہ ہوگا۔ لہٰذا اس عالم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جیسی ہستی بھی ضرور ہوگی ورنہ وہ عالم اس عالم جیسا نہ ہوگا۔ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ **ایک** یہ کہ رب تعالیٰ اس عالم جیسا دوسرا عالم پیدا فرمانے پر قادر ہے اور عالم ماسویٰ اللہ ہر ممکن کو کہتے ہیں چونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نظیر ناممکن ہے اس لئے وہ عالم سے خارج ہے۔ **دوسرے** یہ کہ عالم جمیع ماسویٰ اللہ کو کہتے ہیں جب سارے ماسویٰ اللہ عالم میں داخل ہو چکے تو دوسرا عالم ناممکن ہوا۔ کیونکہ اس فرضی عالم میں جو شے مانی جائے گی وہ اس سے پہلے فرضی عالم کا جز ہوگی۔

يَاۤ اَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ وَالَّذِیْنَ
اے لوگو عبادت کرو رب اپنے کی وہ رب جس نے پیدا کیا تم کو اور ان کو
اے لوگو اپنے رب کو پوجو جس نے تمہیں اور تم سے اگلوں کو پیدا کیا
مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۲۱﴾ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ
سے پہلے تمہارے شاید کہ تم متقی بن جاؤ وہ بنایا واسطے تمہارے
یہ امید کرتے ہوئے کہ تمہیں پرہیزگاری ملے وہ جس نے تمہارے
الْاَرْضَ فِرَاشًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً ۪ وَّاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ
زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت اور اتارا سے آسمان
لئے زمین کو بچھونا اور آسمان کو عمارت بنایا اور آسمان سے پانی اتارا
مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۚ فَلَا تَجْعَلُوْا
پانی پس نکالا سے اس بعض پھلوں کو کھانے کے لئے تمہارے پس نہ
تو اس سے کچھ پھل نکالے تمہارے کھانے کو تو
لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾
بناؤ واسطے اللہ کے برابر والے حالانکہ تم جانتے ہو
اللہ کے لئے جان بوجھ کر برابر والے نہ ٹھیراؤ

تعلق

نبی کے لئے ضروری ہے کہ سب سے اپنی کتاب کا کتاب الٰہی ہونا بیان کرے۔ اس کے بعد اس مقصد کو دنیا کے سامنے پیش کرے جس کے لئے وہ دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی پہلے قرآن کریم کا کتاب الٰہی ہونا بیان فرمایا۔ اور اس کی یہ

صفت بیان فرمائی کہ وہ ازلی نیک بختوں یعنی متقیوں کے لئے ہدایت ہے اور متقیوں کی پہچان کے لئے کھلے اور چھپے دونوں قسم کے کافروں کا ذکر فرمایا۔ اسی سبب سے قرآن پاک کی پہچان کرانا مقصود تھا۔ جب یہ مرحلہ طے ہو چکا اور بندوں کو ہدایت حاصل کرنے اور بدبختی سے بچنے کا مشتاق بنا دیا تو اب اس مقصود کو بیان فرمایا جس کے لئے حضور علیہ السلام کو دنیا میں بھیجا گیا تھا۔ یعنی باغیوں کو وفادار بنانا اور سب کو حق تعالیٰ کا عبادت گذار بنانا۔ لہٰذا ان سب آیتوں کے بعد عبادت کا ذکر فرمایا **دوسرے:** اس طرح بھی تعلق ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے ایمان اور کفر و نفاق کا ذکر فرمایا گیا۔ تاکہ سننے والا ایمان اختیار کرے اور کفر و نفاق سے بچے۔ اب اس کے بعد عبادت کا ذکر ہو رہا ہے۔ کیونکہ ایمان لانا اور کفر سے بچنا عبادت سے پہلے ہے **تیسرے:** اس طرح کہ اس سے پہلے قرآن کی صفت بیان ہوئی۔ اب خدا کی ذات و صفات کا ذکر ہے۔ چونکہ قرآن سے خدائے پاک کو صحیح طرح پہچانا جاتا ہے۔ اس لئے کتاب کا ذکر پہلے فرمایا گیا۔

تفسیر

یا پکارنے کا حرف ہے۔ پکارنے سے چند مقصود ہوتے ہیں۔ ۱۔ غافل کو اپنی طرف متوجہ کرنا یَاۤ اَیُّهَا النَّاسُ ۲۔ غائب کو حاضر کرنا۔ عتاب ظاہر کرنا۔ جیسے یَا خَبِیْثُ۔ یَا اِبْلِیْسُ اظہار کرامت جیسے یَاۤ اَیُّهَا النَّبِیُّ اظہار محبت جیسے یَاۤ اَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ اظہار عجز یَا اَللّٰهُ تکوین، تاثیر جیسے یٰجِبَالُ اَوِّبِیْ (سبا:۱۰) وغیرہ وغیرہ رب تعالیٰ ہم کو پکارتا ہے۔ ہماری غفلت دور کرنے کے لئے، اپنے نبی کو پکارتا ہے کرامت محبت ظاہر فرمانے کے لئے۔ کیونکہ نبی کریم علیہ السلام کبھی خدا سے غافل نہیں رہتے۔ آسمان و زمین کو پکارا اطاعت کرانے کے لئے وغیرہ وغیرہ ایسے ہی ہم رب کو پکارتے ہیں اپنی عاجزی کے اظہار کے لئے کیونکہ رب تعالیٰ ہم سے کبھی بھی غافل نہیں غرض کہ ایک ہی ندا سے بہت سے معنی حاصل ہوتے ہیں۔ یہاں یہ ندا غافلوں کو تنبیہ کے لئے بھی ہو سکتی ہے اور غائبوں کو حاضر کرنے کیلئے بھی۔ اور عتاب کے لئے بھی۔ کیونکہ ناس کے لغوی معنی ہیں بھولنے والے تو مطلب یہ ہوا کہ اے ہم کو بھول جانے والو ہماری طرف آجاؤ اَیُّهَا جب معرف باللام پر یَا لگاتے ہیں تو ان میں فاصلہ کرنے کے لئے اَیُّهَا داخل کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ اس ایھا میں تنبیہ کی بو ہے اس لئے اللہ پر نہیں آتا یعنی یَاۤ اَیُّهَا اللہ اور یَاۤ اَیُّهَا الرَّحْمٰن نہیں کہا جاتا۔ اَلنَّاسُ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اکثر اَلنَّاسُ سے مکے والوں کو اور اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے مدینے والوں کو پکارا جاتا ہے مگر یہاں اَلنَّاسُ میں تمام انسانوں سے خطاب ہے۔ یعنی کافر مومن، منافق وغیرہ۔ (تفسیر خزائن العرفان وروح البیان) اور حق یہ ہے کہ قیامت تک آنے والے انسان اس خطاب میں داخل ہیں اُعْبُدُوْا۔ اُعْبُدُوْا عبادت سے بنا ہے۔ اور عبادت کے معنی ہم سورہ فاتحہ کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں کیونکہ یہاں اَلنَّاسُ میں سارے کفار، مومنین، منافقین داخل ہیں اسی لئے ضروری ہے کہ اُعْبُدُوْا کے معنی بھی ایسے وسیع کئے جائیں جو ان سب کے لئے مناسب ہوں لہٰذا اس کے معنی یہ ہوں گے۔ کہ اے کافرو عبادت کرو یعنی ایمان لے آؤ اور اے منافقو عبادت کرو یعنی مخلص بن جاؤ اے گنہگارو عبادت کرو یعنی نمازی بن جاؤ۔ اے بخیلو عبادت کرو یعنی زکوۃ دو۔ اے بے روزہ عبادت کرو یعنی روزے رکھو وغیرہ وغیرہ رَبَّکُمُ۔ حق تعالیٰ کے تمام ناموں میں سے رب اس لئے فرمایا گیا کہ سننے والوں کو عبادت کا شوق پیدا ہو اور حکم مع وجہ کے ہو جائے۔ یعنی تم خدا کی

عبادت کرو۔ کیونکہ وہ تمہارا پالنے والا ہے اور پالنے والے کا حق ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ میں حق تعالیٰ کی ربوبیت ہی کا ذکر ہے۔ چونکہ پالنا پیدا کرنے کے بعد ہوتا ہے۔ اس لئے پیدا کرنے کا ذکر پہلے فرمایا گیا اور رزق کا بعد میں خَلَقَ، خَلْقٌ سے بنا ہے۔ خَلْقٌ کے معنی ہیں نیستی سے ہستی میں لانا۔ جو صرف خدا ہی کا کام ہے اور اسباب جمع کرنے کو کسب کہتے ہیں بندہ کاسب ہے خالق نہیں۔ کسب کے معنی ہیں اسباب جمع کرنا، عورت مرد کا ملنا بچے کی پیدائش کا سبب ہے۔ لیکن اس کا پیدا ہونا حق تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے وَالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ سے یہ بتایا گیا کہ وہ تمہارا بھی پیدا کرنے والا ہے اور تم سے پہلی امتوں کا بھی یا تمہارے باپ داداؤں کا بھی جس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تمہارا قدیمی محسن اور تم اس کے قدیمی غلام ہو۔ لہٰذا تم پر دوطرح حق ہے۔ کہ تم اس کی عبادت کرو۔ لَعَلَّکُمْ عربی زبان میں لَعَلَّ شک کے لئے آتا ہے رب تعالیٰ شک سے پاک ہے۔ اس لئے یہاں اس کے تین معنی کئے جاتے ہیں ایک یہ کہ اس کا استعمال عربی زبان کے محاورے کے مطابق ہے۔ یعنی چونکہ عربی میں لَعَلَّ بولا جاتا ہے اور یہ قرآن بھی عربی ہے محض اس لئے لَعَلَّ فرمایا گیا۔ دوسرے یہ کہ بندوں کے حق میں لَعَلَّ شک کے لئے ہے۔ لیکن حق تعالیٰ کی طرف سے یقین کے لئے کیونکہ اسی کی امید دلاتا ہے جو کہ یقینی ہونے والی ہو۔ اب اس کے معنی ہوں گے تا کہ تم متقی بن جاؤ۔ تیسرے یہ کہ یہ لَعَلَّ بندوں کے لحاظ سے ہے نہ کہ رب کے لحاظ سے تو مطلب یہ ہوا کہ اے لوگو تم رب کی عبادت اس امید پر کرو کہ شاید تمہیں تقویٰ حاصل ہو جائے یعنی نہ تو دنیاوی لالچ سے کرو۔ نہ خدا سے ناامید ہو کر اور نہ اس سے بے خوف ہو کر کیونکہ مرنے سے پہلے اپنی کامیابی کا یقین نہیں ہو سکتا۔ بڑے بڑے پرہیز گار مرتے وقت بے ایمان ہو گئے۔ لہٰذا تم عبادت کرے جاؤ اور رب سے ڈرے جاؤ تَتَّقُوْنَ یہ لفظ تقویٰ سے بنا ہے اور یہاں تقویٰ کے تین معنی ہو سکتے ہیں۔ عذاب الٰہی سے بچ جانا پرہیز گار ہو جانا دل میں پرہیز گاری کا نور پیدا ہو جانا تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اے لوگو اپنے رب کی عبادت کرو۔ شاید کہ تم اس کے عذاب سے بچ جاؤ یا شاید کہ تم پرہیز گار بن جاؤ یا شاید کہ تمہارے قلب میں پرہیز گاری کا نور جلوہ گر ہو جائے۔ عبادت تقویٰ کی ابتداء ہے۔ اور تقویٰ اصل مقصود یا عبادت ایک راستہ اور پرہیز گاری منزل مطلوب اس راستے کو طے کئے جاؤ۔ شاید تم منزل مقصود پر پہنچ جاؤ یا اپنے ظاہر جسم کو عبادت کے زیور سے آراستہ کئے جاؤ شاید تمہیں نور قلبی میسر ہو جائے یا اپنی گندگی کو درست کئے رہو تا کہ تمہاری روح کو قوت حاصل ہو اَلَّذِیْ جَعَلَ رب تعالیٰ نے اپنی پہچان یوں کروائی تھی کہ اللہ وہ ہے جس نے تم کو پیدا کیا اور یہ ایک چھپی ہوئی بات تھی۔ اس لئے کہ جب انسان کو اپنا ہونا اور ابتدائی پرورش ہی یاد نہیں تو یہ کیسے جانے کہ میرا خالق کون ہے اس لئے رب تعالیٰ کی اور کھلی ہوئی نشانیاں بتائی گئیں کہ میاں تمہارا خالق وہی تو ہے۔ جس نے تمہارے لئے زمین کا بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا ہے۔ اور زمین پر قسم قسم کے رزق پیدا فرما کر تمہاری دعوت کا سامان کر دیا لَکُمُ الْاَرْضَ۔ لَکُمْ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کا سارا انتظام صرف انسانوں کے لئے کیا گیا ہے جانور وغیرہ انسان کے تابع ہیں اسی لئے حضرت آدم علیہ السلام کو ملائکہ کا مسجود بنایا۔ کیونکہ فرشتے تابع تھے۔ اور حضرت آدم اصل مقصود تو فرمایا جا رہا ہے کہ تم پر اتنا بڑا کرم ہے کہ تمہارے لئے ساری چیزیں بنائیں اور پھر ہر چیز خدا کی عبادت کرے اور تم بت پرستی کتنے افسوس کی بات ہے۔ ارض کے

معنی یا تو ہیں کھا جانا اور کچل دینا۔ چونکہ زمین بھی ہر چیز کو کھا جاتی ہے۔ یعنی گلا ڈالتی ہے اور قدموں سے کچلی جاتی ہے۔ اس لئے اسے ارض کہتے ہیں فِرَاشًا اس کے معنی ہیں بستر زمین کو بستر بنانے کا یہ مطلب ہے کہ اس کی اصل جگہ سمندر کے نیچے ہے۔ لیکن انسانوں کی خاطر کچھ حصہ پانی کے اوپر کر دیا گیا پھر زمین گول بھی ہے لیکن اس کی گولائی ایسی نہیں کہ جس پر سے آدمی لڑھک جائیں بلکہ اس کا ایسا پھیلاوا ہے جس کی وجہ سے وہ بستر کا کام دیتی ہے پھر نہ تو گارے کی طرح اس کو نرم کیا گیا اور نہ پتھروں لوہے اور روڑوں کی طرح سخت کہ اس پر چلنا پھرنا دشوار ہو جائے۔ بلکہ درمیانی حالت میں رکھا گیا کہ جس پر چلنا پھرنا عمارتیں بنانا آسان ہوں وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً۔ سَمَاء کے معنی ہم پہلے بیان کر چکے ہیں۔ بناء سے مراد یا تو چھت ہے یا عمارت یعنی یہاں تو فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے تمہاری خاطر زمین پر آسمان کو قبے کی طرح بنایا۔ جس میں رنگ برنگی تیز و ہلکی قندیلیں یعنی چاند سورج تارے وغیرہ جڑ دیئے وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً اس میں بتایا جا رہا ہے کہ تمہارے مکانات کی چھتیں صرف سایہ دینے اور بارش سے بچنے کا کام دیتی ہیں۔ لیکن آسمان ایسی انوکھی چھت ہے کہ جس سے تمہارا رزق بھی آتا ہے۔ فَاَخْرَجَ بِهٖ میں یہ بتایا گیا کہ پھلوں کے پیدا کرنے والے ہم ہی ہیں بارش تو صرف اس کا ظاہری سبب ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ تم اپنی حقیقت کو معلوم کر لو کیونکہ زمین مثل ماں کے ہے اور آسمان مثل والد کے اور پانی کے قطرے نطفے کی طرح اور پھل وغیرہ اولاد کی طرح گویا تمہارے اور ان چیزوں کے پیدا کرنے کا طریقہ ایک ہی ہے۔ (تفسیر روح البیان) مِنَ الثَّمَرٰتِ یہ من یا تو بیانیہ ہے تو معنی یہ ہوئے کہ نکالا اس بارش کے ذریعے پھلوں کو اور یا تبعیضیہ ہے۔ جس کے معنی یہ ہوئے کہ نکالا اس بارش سے بعض پھلوں کو بعض فرمانے کی تین وجہ ہیں۔ ایک یہ کہ ہر پھل بارش سے نہیں پیدا ہوتا بلکہ بعضے بغیر بارش بھی پیدا ہو جاتے ہیں جیسے کھجوریں وغیرہ بلکہ بعض پھل بارش سے خراب بھی ہو جاتے ہیں دوسرا یہ کہ ہر جگہ سارے پھل نہیں پیدا ہوتے کشمیر میں اور قسم کے پھل پیدا ہوتے ہیں اور بنگال میں دوسری قسم کے عرب میں اور طرح کے تو مطلب یہ ہوا کہ اس پانی میں سے ہر جگہ بعضے پھل پیدا فرمائے۔ تیسرا یہ کہ اس کا تعلق آئندہ عبارت سے ہے تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ بارش سے بعض پھل تمہارے کھانے کے لئے پیدا فرمائے۔ اور بعض جانوروں کے لئے کیونکہ انسان ہر پھل نہیں کھاتا کسی درخت کا پھل کھاتا ہے۔ کسی کے پتے کسی کی صرف جڑیں رِزْقًا لَّكُمْ میں یہ فرمایا گیا کہ ہر چیز تمہارے لئے بنی۔ اگر کوئی چیز جانور بھی کھا لیں وہ بھی تمہاری برکت سے جنات کیڑے مکوڑے وغیرہ سب تمہارے طفیل پل رہے ہیں۔ بادشاہ اپنے کسی حاکم کی دعوت کرے اور اس حاکم کے نوکروں چاکروں کو بھی شریک فرمائے۔ بلکہ اس کے گھوڑوں وغیرہ کے لئے چارے کا انتظام فرمائے تو یہ سب اس حاکم پر احسان ہے فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا یہ اس پوری آیت کا مقصود ہے یعنی جب تم ان ساری باتوں کو جان چکے تو تم رب کی بغاوت نہ کرو اور کوئی اس کا ہمسر نہ مانو اَنْدَادًا جمع ہے ند کی جس کے معنی ہیں مثل۔ لوگ چند طرح شرک کرتے تھے۔ بعض تو خالق ہی چند مانتے تھے۔ یعنی یہ کہتے تھے کہ بڑی چیزوں کا بنانے والا ایک رب ہے اور چھوٹی چیزوں کا دوسرا اور بعض کہتے تھے کہ عالم کا بنانے والا تو ایک ہے۔ مگر اس کا انتظام کرنے والے چند اکیلا رب اتنے بڑے عالم کا انتظام نہیں کر سکتا۔ بعض کہتے تھے کہ رب تو ایک ہی ہے مگر صاحب اولاد ہے اور بعض کہتے تھے کہ رب ایک ہی ہے۔ مگر یہ ہمارے

بت اس کی بارگاہ میں دھونس کے ساتھ ہماری شفاعت کر سکتے ہیں۔ بعض کہتے تھے کہ رب تو ایک ہی ہے اور سب اس کے بندے ہیں۔ مگر بعض بندے اس کی طرح قدیم ہیں۔ اور اس سے بے پرواہ وغیرہ وغیرہ۔ اس مختصر سے جملے میں ان سب کی تردید فرمادی گئی اور فرمادیا گیا کہ تم کسی کو کسی طرح بھی رب کا ہمسر نہ جانو نہ ذات میں نہ الوہیت کے دخیل ہونے میں اور نہ وجود میں وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ میں یہ بتایا گیا کہ عقلاً و نقلاً ہر طرح تم جان چکے کہ خالق ایک ہی ہے اور اب اگر تم شرک کرو گے تو تمہارا کوئی عذر قابل قبول نہیں ہوگا۔

خلاصہ تفسیر

اس آیت کا اصل مضمون یہ ہے کہ اے لوگو تم اپنے اسی رب کی عبادت کرو جو عبادت کے لائق ہو۔ اور عبادت کے لائق وہی ذات ہو سکتی جو بڑی عظمت اور قدرت والی ہو نہ کہ تمہارے وہمی اور خیالی معبود۔ وہ عظمت والی ذات وہ ہے جس نے تم کو اور تمہارے باپ داداؤں کو پیدا فرمایا۔ عبادت بھی اس امید پر کرو کہ تم کو حق تعالیٰ کی طرف سے تقویٰ کا انعام مل جائے کیونکہ جب آئینہ آفتاب کے سامنے آجاتا ہے یا کوئلہ اور لوہا کچھ دیر آگ میں رہ لیتا ہے تو ضرور اس میں آفتاب اور آگ کا اثر آجاتا ہے۔ جس سے کہ وہ آفتاب اور آگ کا کام کرتا ہے۔ اسی طرح اگر تم بھی عبادت کے ذریعے سے اپنے رب سے تعلق قائم کرلو گے تو ضرور رب کی رحمت تمہاری دست گیری کرے گی اور تم کو تقویٰ حاصل ہو جائے گا جس سے تم سے خلاف عادت کام یعنی (کرامتیں) صادر ہونے لگیں گی۔ اس خالق حقیقی کی پہچان یہ ہے کہ اس نے تمہارے آرام کے لئے زمین کے ایک ٹکڑے کو پانی سے باہر نکالا اور پھر اس کو گارے کی طرح نرم اور لوہے کی طرح سخت نہ کیا اور نہ اس کی گولائی ایسی رکھی جس سے تم اس پر ٹھہر نہ سکو غرضیکہ ہر طرح اس کو تمہارے لئے بستر کی طرح آرام دہ بنایا پھر یہ کرم فرمایا کہ زمین پر آسمان کا خیمہ لگایا۔ جس سے کہ یہ جہان ایک گھر کی طرح ہو گیا۔ اور تم کو اس میں رکھ کر تمہاری روزانہ تین وقت دعوت کا انتظام فرمایا اور پانی برسا کر رنگ برنگ پھول پھل پیدا فرمائے اب تم خود ہی غور کرلو کہ اگر کوئی دولت مند تم کو معمولی تنخواہ پر نوکر رکھے تو تم ہر طرح اس کی خدمت، اطاعت کرتے رہو۔ جو رب کہ تم پر اتنے احسانات فرمائے اس کو چھوڑ کر اوروں کی عبادت کرنا یا اوروں کو اس کا شریک جاننا بالکل خلاف انسانیت ہے یا کہ نہیں

آیت کے فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے ایک یہ کہ جو شخص رب کی عبادت نہ کرے وہ انسان نہیں۔ کیونکہ یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ فرمایا گیا **دوسرے** یہ کہ کافروں پر بھی عبادت کرنا فرض ہے جس کے نہ کرنے پر ان کو عذاب ہوگا کیونکہ یہاں سارے انسانوں سے فرمایا گیا۔ کہ عبادت کرو جیسے کہ بے وضو پر فرض ہے کہ وضو کرے اور نماز پڑھے۔ ایسے ہی کافر پر فرض ہے کہ ایمان لائے اور نماز پڑھے۔ (تفسیر خزائن العرفان) لیکن فرق اس قدر ہے کہ کافر پر نماز وغیرہ کی فرضیت شرعی نہیں۔ اسی لئے جو کافر مسلمان ہو اس کو زمانہ کفر کی نمازیں قضا کرنی لازم نہیں بلکہ فرض ہونے کے یہ معنی ہیں کہ دوزخ میں ان کو کفر کرنے اور عبادت نہ کرنے کا عذاب ہوگا۔ چنانچہ جب دوزخیوں سے مسلمان پوچھیں گے کہ تم دوزخ میں کیوں آئے۔ تو وہ جواب میں

اپنے کفر کے ساتھ بدعملیوں کا ذکر بھی کریں گے اور کہیں گے کہ لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۝ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِيْنَ (المدثر: ۴۳) کہ ہم نمازی نہ تھے اور نہ مسکینوں کو صدقات دیتے تھے وغیرہ وغیرہ **تیسرا:** یہ کہ عبادت کا فائدہ عابد ہی کو ملتا ہے خدا تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ کسی کی عبادت سے فائدہ خود حاصل کرے۔ اس لئے ارشاد ہوا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ **چوتھا:** یہ کہ باپ داداؤں پر احسان اولاد پر احسان ہے اسی لئے فرمایا گیا وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ۔

تفسیر صوفیانہ

چونکہ عبادت میں تکلیف بھی ہوتی ہے۔ اس لئے حق تعالیٰ نے بندوں کو براہ راست پکارا۔ تاکہ اس پکارنے کی لذت سے عبادت کی مشقت بھول جائیں اور سمجھیں کہ عبادت ایسی پیاری چیز ہے کہ جس کی برکت سے ہمارے پیارے نے ہم کو پکار لیا۔ اگر ہم جان بھی قربان کر دیں تو اس پکارنے کی نعمت کا شکر یہ ادا نہیں ہو سکتا۔ اور کیسے پکارا کہ اے بھولنے والو انسانو! تم دنیا میں آ کر ہمیں بھول گئے مگر ہم تمہیں نہ بھولے۔ آؤ اب بھی وقت ہے اپنے اس رب کو پوج لو۔ جس نے ہر وقت تمہارا خیال رکھا۔ اپنی بندگی کو یہاں تک ظاہر کرو کہ فنا فی اللہ ہو کر ماسوی اللہ سے علیحدہ ہو جاؤ۔ جس سے تم کو متقی کا خطاب مل جائے وہ اللہ وہ ہے جس نے تمہارے قلب کو زمین بنایا۔ اور اس کی طرف اپنے محبوب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمان کی طرح سایہ دینے والا مقرر کیا اس آسمان نبوت سے تمہارے قلب کی زمین پر قرآن کا پانی برسایا۔ جس سے ہدایت اور تقویٰ اور نور اور رحمت اور شفا اور برکت، نیک بختی، نجات، قرب الٰہی، صلاح اور کامیابی اور حکمت اور علم اور آداب اور اخلاق اور عزت اور غناء کے پھل پیدا ہوئے لہٰذا تم ان دلوں سے ماسویٰ اللہ کی محبت نکال ڈالو۔ اپنے دلوں کو صرف رب کی تجلی گاہ بناؤ۔ جب ہم تمہارے ہیں تو تم بھی ہمارے ہو جاؤ۔ خیال رہے کہ آسمان ساری زمین کو گھیرے ہوئے ہے۔ حضور کی نبوت اور رحمت عالمین کو محیط ہے۔ آسمان دینے کے لئے ہے زمین لینے کے لئے حضور دینے والے داتا ہیں۔ ہم لینے والے بھکاری بغیر آسمانی مدد کے زمین سے تخم نہیں اگتا۔ حضور کی نگاہ کرم کے بغیر کوئی نیکی قبول نہیں ہوتی آسمان تک نہیں پہنچ سکتی کوئی مخلوق حضور کی شان تک نہیں پہنچ سکتی۔ آسمان دور رہ کر زمین کو ہر طرح کا فیض دے رہا ہے۔ حضور مدینہ میں جلوہ گر رہ کر کونین کو فیض دے رہے ہیں۔

حکایات: حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دن حساب و کتاب کا وعظ فرمایا جس سے کہ لوگ چیخیں مار کر رونے لگے۔ اسی حال میں حضرت ابوالحسن نوری وہاں سے گزرے اور فرمایا کہ اے شبلی اللہ کے بندوں کو اتنا پریشان کرتا ہے۔ قیامت کا حساب بہت دراز ہوگا۔ اس کا لب لباب صرف یہ دو باتیں ہیں کہ فرمایا جائے گا کہ من ترا بودم تو کرا بودی۔ یعنی اے بندوں ہم تو تمہارے تھے تم کس کے تھے۔ خداوندا تو اپنے فضل سے ہمیں اپنا بنالے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: دیوبندیوں کا۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ خالق کے سوا دوسرے سے مدد لینا اور مصیبت کے وقت پکارنا شرک ہے۔ اس ہی کی یہاں تردید کی جاتی ہے۔ مشرکین عرب یہ ہی سمجھتے تھے کہ دنیا کے انتظام میں ہمارے معبودوں کو

دخل ہے۔ اسی لئے وہ ان سے مرادیں مانگتے تھے اس زمانے کے مسلمان بھی سمجھتے ہیں کہ نبیوں اور ولیوں کو عالم کے کاروبار میں دخل ہے اور ان سے وہ بھی مرادیں مانگتے ہیں لہٰذا یہ بھی مشرک **جواب**: بزرگان دین سے مدد مانگنے کی پوری بحث ہم نے اپنی کتاب جاء الحق میں کی ہے اور بقدر ضرورت وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔ اس جگہ صرف اتنا بتاتے ہیں کہ شاہ عبدالعزیز صاحب نے تفسیر عزیزی میں اسی آیت کے ماتحت اطاعت اور عبادت میں بڑا اچھا فرق بیان فرمادیا ہے۔ وہ یہ کہ حاکم کا حکم بجالانے کو اطاعت کہتے ہیں اور اپنی بندگی کے اظہار کرنے کو عبادت کہتے ہیں۔ اور غیر اللہ کی اطاعت تمام دینوں میں جائز ہے پیغمبر اور مرشد عالم دین اور حاکم وقت کی اطاعت ہر شخص کرتا ہے لیکن ان میں سے کسی کی عبادت کوئی مسلمان نہیں کرتا۔ کیونکہ معبود ہونے کے لئے ذاتی عظمت ضروری ہے اور اطاعت میں یہ لازم نہیں اس کا خلاصہ یہ ہوا کہ کسی کو اپنا مستقل اور ذاتی حاکم مان کر اور اپنے کو اس کا بندہ سمجھ کر اس کی فرماں برداری کرنا عبادت ہے۔ اور کسی کو غیر مستقل اور مجازی عطائی حاکم مان کر اور اپنے کو اس کا ماتحت اور غلام سمجھ کر اس کی فرماں برداری کرنا عبادت نہیں اس سے مشرکین اور مسلمانوں میں بڑا فرق ہو گیا **دوسرے سوال کا جواب**: یہ ہے کہ بے شک حق تعالیٰ نے فرشتوں انبیاء کرام اور اولیاء کو اپنی خلقت کا انتظام سپرد فرمادیا ہے جس کا ثبوت قرآن کریم اور حدیث پاک سے ہے بچہ بنانے جان نکالنے وغیرہ وغیرہ کاموں کے لئے فرشتے مقرر ہیں۔ لیکن اس بارے میں مشرکین اور مسلمین کے عقیدے میں یہ فرق ہے کہ مشرکین یہ سمجھتے تھے کہ حق تعالیٰ یہ سارے کام خود بخود نہیں کر سکتا مجبوراً ہمارے بتوں کو مقرر کیا گیا۔ جیسے کہ دنیوی بادشاہ مجبوراً افسروں کو مقرر کرتے ہیں مسلمانوں کا یہ عقیدہ ہرگز نہیں بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ سب حق تعالیٰ کے بندے اور خدام بارگاہ ہیں خدائی میں دخیل نہیں حق تعالیٰ نے محض اپنے کرم سے ان کو یہ مرتبہ عطا فرمایا۔ **دوسرا اعتراض**: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تقویٰ عبادت کا نتیجہ ہے۔ حالانکہ عبادت خود تقویٰ ہے **جواب**: اس کا جواب اسی آیت کی تفسیر میں گزر گیا کہ تقویٰ قلب کی ایک صفت ہے اور اکثر عبادت ظاہری بدن سے ہوتی ہے۔ اور چونکہ ظاہری جسم کا اثر دل پر پڑتا ہے۔ اس لئے ظاہری عبادت سے دل پرہیزگار بنے گا جیسے قرآن کریم نے فرمایا اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ (عنکبوت: ۴۵) صلوٰۃ عبادت ہے اور برائیوں سے بچنا تقویٰ۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا
اور اگر ہو تم بیچ شک کے سے اس جو اتارا ہم نے اوپر بندے ہمارے کے
اور اگر تمہیں کوئی شک ہو اس میں جو ہم نے اپنے خاص بندے پر اتارا تو اس
بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ
پس لاؤ ایک سورت کو سے مثل اس کے اور بلالو مددگاروں اپنے کو سے
جیسی ایک سورت تو لے آؤ اور اللہ کے سوا اپنے سب

اِنۡ کُنۡتُمۡ صٰدِقِیۡنَ ﴿۲۳﴾
سو اللہ کے اگر ہو تم سچے۔
حمائتیوں کو بلالو اگر تم سچے ہو۔

تعلق

اس آیت کو پہلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **ایک** یہ کہ پہلے حق تعالیٰ کی ذات وصفات کا ذکر فرمایا گیا جس سے ان لوگوں کی تردید ہوگئی جو حق تعالیٰ کی ذات اور اس کی صفات کے منکر تھے۔ اب نبوت کا ذکر فرمایا جارہا ہے تاکہ نبوت کے منکرین کی تردید ہوجائے لیکن جس طرح کہ حق تعالیٰ نے اپنی پہچان اپنی مخلوق کے ذریعے سے کرائی۔ اسی طرح نبی کی پہچان بذریعہ کتاب۔ **دوسرے** یہ کہ اس سے پہلے بندوں کو عبادت کا حکم دیا گیا۔ اور عقل انسانی مقبول اور غیر مقبول عبادت میں فرق نہیں کرسکتی بہت سے عقل مند لوگ بت پرستی کو مقبول عبادت سمجھے ہوئے کرتے ہیں۔ اس لئے بندوں کو ضرورت تھی کہ حق تعالیٰ خود اپنی مقبول عبادت کا طریقہ بتائے۔ اور یہ تعلیم صرف اسی طرح ہوسکتی ہے کہ اس کی طرف سے کوئی قانونی کتاب بندوں کو ملے جس کا کتاب اللہ ہونا کھلی ہوئی دلیل سے ثابت ہو۔ **تیسرا:** یہ کہ پہلے بندوں کو خدا تک پہنچنے کا حکم دیا گیا اب یہ بتایا جارہا ہے کہ اے بندو تم ادنیٰ ہم اعلیٰ۔ تمہاری پہنچ ہم تک کیسے ہوسکتی ہے۔ اس لئے درمیان میں ایک واسطہ رکھا جاتا ہے جس کا نام نبی ہے تم اس تک پہنچو اور اس تک پہنچنا گویا ہم تک پہنچنا ہوگا۔ اس ذات کی نبوت ثابت کرنے کے لئے عربوں کے مذاق کے مطابق دلیل قائم فرمائی گئی بہر حال یہ آیت، کتاب اور نبوت دونوں کے متعلق ہے **چوتھے:** یہ کہ پچھلی آیت میں بارش آسمانی کا ذکر تھا جس سے رزق جسمانی پیدا ہو کر ربوبیت جسمانی ظاہر ہوتی ہے۔ اب بارش رحمانی یعنی قرآن کا ذکر ہے جس سے رزق ایمانی، تقویٰ، طہارت پیدا ہوتے ہیں جس سے اللہ کی ربوبیت باطنی عیاں ہے۔

تفسیر

وَ اِنۡ کُنۡتُمۡ۔ اِنْ شک کے موقع پر بولا جاتا ہے اور کفار کا شک کرنا یقین تھا لہٰذا اس جگہ اِنْ لانا حکیمانہ طریقۂ تعلیم کی بنا پر ہے۔ عقل مند واعظ اپنے مخالفین کی جماعت میں کھڑے ہو کر یہ نہیں کہتا کہ تم میرے مخالف ہو۔ بلکہ یہ کہتا ہے کہ اگر تم کو میری بات میں شک ہو تو فلاں فلاں دلائل پر غور کرو۔ تمہیں میری بات کا یقین ہوجائے گا جس سے سننے والے ہٹ دھرمی سے باز آجاتے ہیں فِیۡ رَیۡبٍ ریب کے معنی ہم بیان کرچکے ہیں یہاں یہ نہ فرمایا گیا کہ اگر تمہارے دل میں شک ہو بلکہ فرمایا گیا کہ اگر تم شک میں ہو جس سے معلوم ہوا یہ شک ایک عارضی چیز ہے جس میں تم بتلا کردیئے گئے ہو۔ اس عارضی بیماری کا علاج وہ ہے جو ہم بتارہے ہیں مِّمَّا نَزَّلۡنَا تنزیل سے بنا ہے جس کے معنی ہیں آہستہ آہستہ اترنا چونکہ کفار عرب یہ بھی اعتراض کرتے تھے کہ خدائی کتاب کو ایک دم آجانا چاہئے۔ شعراء کا یہ کام ہے کہ دو دو چار چار شعر بنا کر دیوان تیار کرلیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضور علیہ السلام بھی دو دو چار چار آیتیں سوچ سوچ کر بناتے ہیں اور جمع کرتے جاتے ہیں ان کے اسی شبہ کا ذکر کرکے

فرمایا گیا کہ تم کو اس قرآن کے آہستہ آہستہ اترنے پر شک ہو تو آئندہ دلیل پر غور کرو ہم آہستہ اترنے کے فوائد مقدمہ میں بیان کر چکے ہیں۔ عَلٰی عَبْدِنَا اس میں بھی کفار عرب کے دوسرے شبہ کا ذکر ہے وہ کہتے تھے کہ کلام الٰہی کسی بندے خاص کر انسان اور خاص کر رسول اللہ ﷺ جیسی ذات پر نہ آنا چاہئے جن کے پاس نہ مال نہ دولت نہ کسی سے علم حاصل کیا نہ علماء کی صحبت میں رہے تو فرمایا گیا اگر تمہیں اس ذات کریم پر قرآن کے اترنے میں شبہ ہے تو مذکورہ علاج کرو گویا یہ آیت صدہا بیماریوں کی دوا اور بہت سے شبہات کا دفعیہ ہے۔ خیال رہے کہ یہاں رب کی عطا اور حضور کا ذکر ہے لہٰذا یہاں حضور کو عبد فرمایا کہ بندے کا کام مولیٰ سے لینا ہے۔ جہاں حضور کی عطا کا ذکر ہے وہاں حضور کو رسول فرمایا۔ اٰتٰىكُمُ الرَّسُوْلُ (حشر: ۷) یا اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ (توبہ: ۷۴) خیال رہے کہ حضور خالص اللہ کے بندے ہیں جن سے اللہ کی شان ظاہر ہے، ہم کبھی نفس کے بندے (مطیع) ہوتے ہیں کبھی شیطان کے کبھی درہم و دینار کے نیز حضور کی ہر ادا اللہ کی ربوبیت کا پتہ ہے۔ لہٰذا عبد اللہ ہونا حضور کی بڑی صفت ہے۔ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ سورۃ یا تو سُوْر سے بنا ہے یا سور سے یعنی یا تو اس کا واؤ اصلی ہے یا ہمزہ سے بدلا ہوا اگر واؤ اصلی ہو تو اس کے معنی ہیں شہر پناہ اور منزل درجہ اور قوت عرب والے بولتے ہیں سورۃ الاسد یعنی شیر کی قوت چونکہ قرآن کی سورۃ بھی ایک مضمون کو گھیرے ہوتی ہے یا پڑھنے والا اس کو اس طرح طے کرتا ہے کہ جیسے مسافر منزلوں کو یا بمقابلے آیت کے سورۃ زیادہ قوی۔ ان وجوں سے اس کو سورۃ کہتے ہیں۔ اور اگر یہ ہمزہ والے سور سے بنا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں ٹکڑا اور بچی ہوئی چیز۔ چونکہ سورۃ بھی قرآن پاک کا ایک جز ہے اور ہر ایک دوسرے سے علیحدہ ہیں اس لئے اس کو سورت کہتے ہیں اصطلاح میں سورت قرآن کے اس حصے کو کہتے ہیں جس میں پورا مضمون بیان ہو اور اس کا نام بھی ہو۔ اور اس میں کم از کم تین آیتیں ہونی چاہئیں مِّنْ مِّثْلِهٖ۔ من یا بیانیہ ہے تو اس کے معنی ہوں گے کہ ایسی سورت لاؤ جو قرآن کے مثل ہو یا تبعیضیہ ہے۔ چونکہ کفار کہتے تھے وَلَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَا یعنی اگر چاہیں تو ایسا قرآن ہم بھی کہہ لیں یا یہ فرمایا جا رہا ہے اے لوگو! اگر تم ایسا قرآن کہو تو اس میں سے ایک سورت بارگاہ نبوی میں بھی پیش کرنا کہ تم کو اس کی حقیقت معلوم ہو جائے۔ یا یہ من ابتدائیہ ہے تب بھی اس کا مطلب وہی ہو گا یعنی ایسی سورت لے آؤ جو تمہارے بنائے ہوئے قرآن میں سے نکل کر آئے۔ مثل سے مراد لفظاً اور معنیً قرآن کی طرح ہونا ہے۔ یعنی وہ سورت لاؤ جس کی عبارت اور مضمون فصاحت و بلاغت اور غیبی خبریں دینے وغیرہ میں قرآن کی مثل ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم ہر طرح بے مثل مثلہ کی ضمیر میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ ملکی طرف لوٹے تو آیت کے معنی یہ بنیں گے کہ قرآن کی طرح ایک سورت لاؤ۔ اور اس سے قرآن پاک کا بے مثل ہونا ثابت ہو گا دوسرا یہ کہ عبد کی جانب لوٹے تب معنی یہ ہوں گے کہ ایک سورت ایسی لاؤ۔ جو محمد ﷺ جیسی ہستی کی طرف سے ہو۔ (تفسیر کبیر، خازن، مدارک) یعنی پہلے تو آسمان کے نیچے ایسی ہستی تلاش کرو جو میرے محبوب ﷺ کی طرح ہو پھر اس سے ایک سورۃ بنوا کر لاؤ نہ ان جیسا آج تک پیدا ہوا نہ ہو لہٰذا تمہیں نہ کوئی ایسا ملے گا نہ ایسا قرآن سنائے گا۔ اس آیت سے حضور ﷺ کا بے مثل اور بینظیر ہونا معلوم ہوا حضور کی بے مثلی کی تحقیق ہماری کتاب شان حبیب الرحمان میں دیکھو۔ اور کچھ ہم اس تفسیر میں امکان کذب کے مسئلے میں بیان کر چکے ہیں اور زائد تحقیق انشاء اللہ قُلْ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ

(حم السجدہ:٦) کے ماتحت کی جائے گی یہاں اتنا سمجھ لو کہ حضور ﷺ ایمان اعمال دنیوی دینی احکام ظاہر و باطن غرض کسی وصف میں ہماری مثل نہیں وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ شہداء جمع شہید کی ہے جس کے معنی ہیں حاضر۔ مگر گواہ اور مددگار اور حاکم کو اس لئے شہید کہتے ہیں کہ گواہ اور مددگار تو موقعہ پر حاضر ہوتا ہے اور حاکم مقدمہ کے فیصلہ کے وقت، جو راہ الٰہی میں مارا جائے اس کو بھی شہید اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ مرتے ہی حق تعالیٰ کی بارگاہ یا جنت میں حاضر ہو جاتا ہے۔ یعنی دوسرے مسلمان تو قیامت کے بعد جنت میں پہنچیں گے مگر یہ مرتے ہی وہاں پہنچ گیا یہاں سب معنی بن سکتے ہیں۔ یعنی اے کافرو تم اپنی مدد کے لئے اپنے فرضی حاکم بتوں کو بلا لو یا اپنے ان عالموں کو بلاؤ جو تمہاری ہر بات کی گواہی دیتے ہیں یا عرب کے ان فصیح اور بلیغ لوگوں کو بلاؤ جو کہ تمہارے دل میں حاضر رہتے ہیں مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔ دون کے معنی ہیں پاس اور قریب کتاب لکھنے کو تدوین اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں مضامین ایک دوسرے کے پاس رکھے جاتے ہیں دنیا کو دنیا اس لئے کہتے ہیں کہ وہ آخرت کے قریب ہے۔ پھر بطور مجاز کم رتبہ کے معنی میں بھی یہ لفظ استعمال ہونے لگا۔ پھر اس کے بعد حد سے بڑھنے کو بھی دون کہنے لگے۔ تو معنی یہ ہوئے کہ اے کافرو تم خدا کو چھوڑ کر جس کسی کو اپنا معبود یا مددگار سمجھ بیٹھے ہو ان سب کو جمع کر لو تا کہ وہ تمہاری اس کام میں مدد کریں اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کفار کے سچے ہونے کا احتمال ہے۔ بلکہ چیلنج کے موقعہ پر اسی قسم کے الفاظ بولے جاتے ہیں کہ اگر تجھ میں کچھ بل کس ہے تو مقابلہ میں آجا۔

خلاصہ تفسیر

کفار عرب قرآن پاک کے متعلق چند قسم کی بدگمانیاں کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ یہ کلام رسول اللہ ﷺ نے خود بنا کر رب کی طرف منسوب کر دیا ہے۔ اس آیت کریمہ میں آسمانی اور انسانی کتاب کی ایسی اچھی پہچان بتائی گئی ہے کہ سبحان اللہ وہ یہ کہ دنیا میں ہر شخص قدرتی اور مصنوعی چیزوں کو پہچان لیتا ہے۔ دیکھو جگنو اور چیونٹی کو ہر شخص جانتا ہے کہ یہ کسی انسان کی بنائی ہوئی نہیں۔ اور ریل کے انجن اور گیس کے متعلق ہر ایک کو یقین ہے کہ یہ انسان کی بنائی ہوئی چیزیں ہیں۔ حالانکہ انجن کی رفتار زیادہ چیونٹی کی کم۔ گیس کی روشنی بہت تیز اور جگنو کی بالکل ہلکی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ آپ نے ان کو پہچانا۔ پہچان صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ انسانی چیز وہ جس کا مثل انسان سے بن سکے اور قدرتی چیز وہ جو انسان کی طاقت سے بالا ہو انجن اور گیس اگر چہ بہت طاقت ور چیزیں ہیں مگر دن رات کارخانوں سے بن کر نکلتے رہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ یہ انسانی چیزیں ہیں۔ چیونٹی اور جگنو اگرچہ کمزور ہیں لیکن آج تک کسی کارخانے سے نہ بنے معلوم ہوا کہ قدرتی ہیں اسی قاعدے سے یہاں ارشاد ہو رہا ہے کہ کافرو اگر تم کو ہمارے قرآن کے کتاب الٰہی ہونے میں اور نبی کے پیغمبر ہونے میں کچھ شک ہے تو اور معجزات تو کیا صرف اس کلام ہی کا مقابلہ کر لو کیونکہ وہ نبی ﷺ بھی انسان ہی ہیں۔ تمہارے ملک میں پیدا ہوئے۔ تم بظاہر بڑے زبان دان علم والے شاعر فصیح و بلیغ ہو تم نے ہر قسم کے مجمع اور میلے دیکھے ہیں۔ علماء اور شعراء کے کلام سنے ہیں۔ اہل علم اور تاریخ والوں کی صحبتیں اٹھائی ہیں۔ وہ نبی ﷺ نہ تو علماء کی صحبت میں رہے اور نہ انہوں نے مورخین کی کتابیں دیکھیں۔ بلکہ ان کی ابتدائی پرورش تو ایک معمولی سے گاؤں میں حلیمہ دائی کے گھر میں ہوئی۔ جہاں کہ علم کی روشنی بالکل نہ پہنچی تھی۔ پھر شروع عمر سے ہی

وہ عبادت ریاضت گوشہ نشینی میں مشغول رہے۔ تم میں اور ان میں اس قدر فرق ہوتے ہوئے تم کو اعلان عام دیا جاتا ہے کہ وہ تو اکیلے سارا قرآن پڑھ کر سناتے ہیں۔ تم سارے ملک، عرب کے علماء فضلاء شعراء فصحاء بلغاء جمع ہو کر اس کے مقابلے کی صرف چھوٹی سی ایک سورت ہی بنالاؤ۔ اگر تم سب کی کوشش سے ایک سورت بھی اس جیسی بن سکے تو سمجھنا قرآن خدائی کتاب نہیں۔ اور اگر تم سب مجبور ہو جاؤ تو اس چیونٹی اور انجن والے قاعدے سے یہاں بھی سمجھ لینا کہ قرآن بشر کا نہیں بلکہ خالق بشر کا ہے۔

قرآن پاک کی خوبیاں

قرآن پاک میں لاکھوں وہ خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے عرب کے لوگ مقابلے سے عاجز رہے۔ ہم ان میں کچھ بطور نمونہ پیش کرتے ہیں **ایک:** یہ کہ اس شاعر کا کلام اعلیٰ ہوتا ہے۔ جو کہ جھوٹ اور مبالغہ سے کام لے۔ سچی سچی اور سیدھی سادھی باتیں معمولی معلوم ہوتی ہیں مگر قرآن پاک کی یہ خوبی ہے کہ جھوٹ اور مبالغہ سے بالکل پاک لیکن پھر بھی اس میں وہ کشش ہے کہ سننے والے تڑپ جاتے ہیں۔ اس قرآن نے صحابہ کرام میں وہ جوش پیدا کر دیا کہ وہ گھر بار مال و دولت عیش و آرام حتیٰ کہ وطن تک چھوڑ کر حضور کے ساتھ ہو لئے سچی اور سیدھی بات کہتا ہے۔ مگر تڑپا دیتا ہے۔ **دوسرا:** یہ کہ دیکھی ہوئی چیز کی خوبیاں بیان کی جاسکتی ہیں شعراء معشوق اور شراب گھوڑا بادشاہ وغیرہ دیکھی ہوئی چیز کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔ مگر بے دیکھی چیز کی تعریف کر کے اس کے اوصاف دلوں میں اتار دینا قرآن شریف کی خصوصیت ہے۔ دیکھو رب تعالیٰ قیامت جنت دوزخ یہ تمام چیزیں بے دیکھی ہوئی ہیں۔ قرآن نے انہیں بے دیکھی چیزوں کو ایسا منوایا کہ عرب کے بڑے بڑے فاسق متقی پرہیزگار بن گئے **تیسرا:** یہ کہ بڑے بڑے شعراء کے کلام میں ایک یا دو شعر اعلیٰ درجے کے ہوتے ہیں اور باقی معمولی۔ لیکن قرآن پاک اول سے آخر تک ایسا فصیح ہے کہ اس کے مقابلے سے خلقت عاجز ہے۔ اسی لئے اس آیت میں بسورۃ فرمایا گیا **چوتھے:** یہ کہ اگر عمدہ سے عمدہ کلام چند بار بولا جائے تو اس میں پہلی سی لذت نہیں رہتی۔ قرآن پاک کی یہ خصوصیت ہے کہ ایک مضمون کو مکرر بیان فرماتا ہے لیکن ہر جگہ نیا ہی لطف آتا ہے۔ **پانچویں:** یہ کہ بڑے بڑے خطیب و شعراء کہتے ہیں کہ عشقیہ مضامین پر لطف ہوتے ہیں۔ لیکن حرام حلال کے مسئلے خشک جن کے بیان سے مجمع کو وجد نہیں آتا۔ قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ خشک مضامین بھی اس طریقے سے بیان فرماتا ہے کہ سننے والوں کو وجد آجاتا ہے **چھٹے:** یہ کہ اچھے سے اچھا کلام ہر موقعہ پر لطف نہیں دیتا خوشی کے موقعہ پر مرثیہ اور غم کے موقعہ پر دل خوش کن قصیدے نہیں پڑھے جاتے۔ قرآن پاک کی یہ خصوصیت ہے کہ ہر وقت اس کا پڑھنا لطف دیتا ہے خوشی و غم راحت و مصیبت جس وقت بھی پڑھا جائے دل کو تسکین اور سرور حاصل ہوتا ہے۔ **ساتویں:** یہ کہ قرآن کریم سارے علموں کی اصل ہے۔ علم کلام، علم فقہ، علم اصول، علم نحو، علم لغت، علم زہد، غیب کی خبریں، علم اخلاق غرضیکہ ہر علم پورا پورا اس میں موجود ہے اور کتابیں ایک ہی فن بیان کرتی ہیں۔ **آٹھویں:** یہ کہ اعلیٰ کلام چند بار پڑھنے سے پرانا ہو جاتا ہے قرآن کریم کی یہ خصوصیت ہے کہ اس کو پڑھے جاؤ لطف

بڑھتا جائے گا۔ **نویں**: یہ کہ بہتر سے بہتر دوا اپنے میں ایک یا دو وصف رکھتی ہے۔ قرآن پاک کی یہ خصوصیت ہے کہ یہ ہر جسمانی روحانی بیماری کا مکمل علاج ہے۔ اس کی عبارت تعویذ بنے۔ اس کا پڑھ کر دم کرنا مصیبتوں کو ٹالے اس پر عمل کرنے سے دونوں جہان کی بھلائیاں حاصل ہوں۔ **دسویں**: یہ کہ سارے علوم اس کے خادم اور یہ سب کا اصلی مقصود ہے صرف نحو، منطق، فلسفہ وغیرہ اسی کے لئے پڑھا جاتا ہے۔ پھر چند استاد اس کو سکھاتے ہیں تب یہ آتا ہے۔ ابتدائی استاد اس کے حروف کی پہچان کراتا ہے۔ قاری اس کے پڑھنے کا طریقہ بتاتا ہے۔ عالم اس کے مضامین ذہن نشین کراتا ہے۔ صوفی اس کے اسرار بیان فرماتا ہے۔ اتنے استادوں سے پڑھ کر پھر بھی کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ میں نے قرآن پورے طور پر جان لیا یہ وہ وجوہ تھیں جن کی بناء پر تمام عرب کے فصحاء، بلغاء مقابلے سے عاجز رہ گئے۔

تفسیر صوفیانہ

معترضین کے اعتراضات دل کے پردے ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ کمال قرآن اور جمال صاحب قرآن نہ دیکھ سکے معترضین اغیار جمال یار اور اسرار کے قابل نہیں ہوتے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے۔

انداز حسینوں کو سکھائے نہیں جاتے ۔۔۔ امی لقبی ہوں وہ پڑھائے نہیں جاتے
ہر ایک کا حصہ نہیں دیدار کسی کا ۔۔۔ بوجہل کو محبوب دکھائے نہیں جاتے

اس آیت میں یہ فرمایا جارہا ہے کہ اے بوجہلی آنکھ والو تم اگر مگر کے چکر میں ہو۔ اس بھنور سے نکلو۔ قرآن اور قرآن لانے والے حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو صرف بصارت سے نہیں۔ بلکہ بصیرت سے دیکھو تو تم پر ان کے اسرار ظاہر ہو جائیں گے۔ مثنوی میں ہے۔

توز قرآن اے پسر ظاہر مبیں ۔۔۔ دیو آدم را نہ بیند جز کہ طیں
ظاہرے قراں چو شخصے آدمیست ۔۔۔ کہ نقوشش ظاہر و جانش خفی است

یہ قرآنی دلائل اور علماء وصوفیاء کی صحبتیں ان پردوں کی پھاڑنے والی قینچیاں ہیں کہ عالم اصل حقیقت بتا کر اور صوفی دکھا کر ان پردوں کو چاک کر دیتے ہیں۔ چونکہ اس آیت کا مضمون ابھی مکمل نہیں ہوا۔ اس لئے اس کے فوائد اور اعتراض وجواب آئندہ آیت کے ساتھ بیان کئے جائیں گے۔

فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیْ وَقُوْدُهَا

پس اگر نہ کر سکو تم اور ہرگز نہ کر سکو گے پس ڈرو آگ سے وہ جو

پھر اگر نہ لا سکو اور ہم فرمائے دیتے ہیں کہ ہرگز نہ لا سکو گے تو ڈرو اس آگ سے

النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۚ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِیْنَ ﴿۲۴﴾

کہ ایندھن اس کا آدمی اور پتھر ہیں تیار کی گئی ہے واسطے کافروں کے

جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں تیار کی گئی ہے کافروں کے لئے

تعلق

یہ آیت پہلی آیت کا مقصود بیان کر رہی ہے۔ پہلے کفار کو مقابلے کا چیلنج دیا گیا تھا۔ اب یہ فرمایا جا رہا ہے کہ اس چیلنج سے مقصود صرف یہ ہے کہ تم اپنی مجبوری معلوم کر کے قرآن پر ایمان لے آؤ۔ نیز اس طرح بھی تعلق ہو سکتا ہے کہ یہ آیت پہلی آیت کی دلیل ہو۔ کیونکہ کہ اس میں غیب کی خبر دی گئی ہے کہ تم سے قیامت تک کبھی مقابلہ ہو سکے گا ہی نہیں۔ لہٰذا یہ قرآن اس لئے بھی بے مثل ہے کہ اس میں غیب کی خبریں ہیں۔

تفسیر

فَاِنْ شک کے لئے آتا ہے۔ یہاں مخاطبین کے لحاظ سے فرمایا گیا کہ اے کافرو اگر تم یہ کام نہ کر سکو۔ لَمْ تَفْعَلُوْا ماضی کے معنی دیتا ہے۔ مگر یہاں ان کی وجہ سے مستقبل کے معنی میں ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کی کوشش مقابلہ سے پہلے یہ فرمایا جا رہا ہے۔ یعنی تم کوشش کر دیکھو۔ پھر اگر ناکام رہو تو ایمان لے آنا وَلَنْ تَفْعَلُوْا یہ غیب کی خبر ہے۔ جس میں بلا تردد فرمایا گیا کہ سن لو تم یہ ہرگز نہ کر سکو گے۔ اور الحمدللہ یہ خبر سچی ہوئی کہ اس چیلنج سے کفار کے دلوں میں آگ سی بھڑک گئی۔ بہت کچھ مقابلے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ اگر ایک سورت بھی ان سے بن جاتی۔ تو آج تک کفار اس کی اشاعت کرتے۔ مگر اللہ کے فضل سے اب تک سب سرنگوں رہے۔

تیرے آگے یوں ہیں لچے دبے فصحاء عرب کے بڑے بڑے
کہے کوئی منہ میں زبان نہیں نہیں بلکہ جسم میں جان نہیں

فَاتَّقُوْا یہ وَقْیٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ڈرنا اور بچنا۔ یہاں یہ دونوں معنی بن سکتے ہیں۔ مقصود یہ ہے کہ ان اعمال سے بچو جو جہنم کا ذریعہ ہیں۔ النَّارَ الَّتِیْ جہنم میں ٹھنڈے طبقے بھی ہوں گے اور آگ کے ساتھ دوسری تکلیفیں بھی ہوں گی۔ لیکن صرف آگ کا اس لئے ذکر فرمایا گیا کہ وہاں اکثر طبقوں میں آگ ہی ہے اور آگ اصل ہے اور باقی تکلیفیں اس کے تابع۔ اَلَّتِیْ سے معلوم ہوتا ہے کہ جہنم کی ہر آگ کا ایندھن آدمی اور پتھر نہیں ہیں۔ بلکہ اس آگ کا جو انسان کفار کے لئے بنی ہے۔ کیونکہ جس طبقے میں کفار جنات رہیں گے اس کا ایندھن جن ہیں اور جس طبقے میں کچھ روز کے لئے گنہگار مسلمان رہیں گے اس کا ایندھن بد اعمال ہوں گے نہ کہ وہ خود (تفسیر روح البیان وتفسیر کبیر) وَقُوْدُ اس کے لفظی معنی ہیں۔ روشن کرنا اور بھڑکانا یہاں مراد روشن کرنے کا آلہ یعنی ایندھن۔ النَّاسُ سے مراد کافر انسان ہیں۔ وَالْحِجَارَۃُ اس میں تین قول ہیں۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے گندھک مراد ہے۔ کیونکہ اس کی آگ بہت تیز ہوتی ہے اور دیر میں بجھتی ہے۔ اور اس میں گرمی کے ساتھ سخت بدبو بھی پیدا ہوتی ہے۔ بعض نے فرمایا کہ اس سے مراد بت ہیں۔ کیونکہ کفار ان بتوں کو خدا مانتے تھے۔ وہاں ان کی ذلت کے لئے یہ پتھر بھی آگ میں ڈال دیئے جائیں گے۔ بعض نے فرمایا کہ اس سے مراد عام پتھر ہیں تو آیت کا مقصود یہ ہوا کہ دینوی آگ پتھر سے بجھ جاتی ہے لیکن اس آگ کی تیزی کا یہ عالم ہے کہ وہ پتھروں سے اور بھڑکے گی۔ لیکن اس سے سنگ

اسود، مقام ابراہیم، صفاو مروہ کے پتھر۔ منبر و روضہ مطہرہ کی درمیانی جگہ علیحدہ ہیں کہ یہ چیزیں جنتی ہیں۔ جیسا کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ جیسے حضور کا استن حنانہ اور ناقہ شریف حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی وغیرہ کہ جنتی ہیں۔ اُعِدَّتْ اس سے معلوم ہوا کہ وہ آگ کافروں کے لئے بنی ہے۔ پتھروں وغیرہ کا اس میں جانا۔ ان کافروں کے طفیل ہے۔ اسی طرح گنہگار مسلمان بھی اگرچہ دوزخ میں جائیں گے، لیکن کافروں کے تابع ہو کر جیسے لوہار کی بھٹی ٹیڑھے لوہے کو سیدھے کرنے کے لئے بنی ہے۔ مگر اس میں کوئلے بھی جلتے ہیں اور کبھی میلے لوہے کو اس کے ذریعے صاف بھی کر دیا جاتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

جب کفار کو قرآن کریم کے مقابلے کا اعلان دیا جا چکا تو ان کو بتایا گیا کہ اگر تم ان کے مقابلے میں کامیاب نہ ہو سکو تو ہم تم سے کہہ دیتے ہیں کہ کبھی بھی نہ ہو سکو گے تو سمجھ لینا کہ اس کا انکار حقیقت میں خدائے قادر کا مقابلہ ہے۔ اور اس کا مقابلہ کرنا جہنم میں ٹھکانا بنانا ہے۔ جہنم کی آگ کی تیزی کا یہ حال ہے اور دوسری آگ تو نرم اور پتلی لکڑیوں سے سلگتی ہے۔ لیکن وہ پتھروں اور آدمیوں سے سلگتی ہے یا دوسری آگ میں لکڑیاں جلتی ہیں لیکن اس میں انسان اور پتھر جلتے ہیں۔ لہٰذا تم کو لازم ہے کہ آگ سے بچنے کا سامان کرو۔ یعنی اس قرآن پر ایمان لے آؤ اور اس کو اپنا دستور العمل بناؤ۔

فائدے

ان آیتوں سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ ایک یہ کہ قرآن کریم معجزہ ہے۔ اگلے انبیاء کرام کے معجزے قصے بن کر رہ گئے ہیں۔ لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ یعنی قرآن شریف قیامت تک لوگوں کے سامنے رہے گا۔ **نوٹ ضروری:** جو عجیب بات مدعی نبوت کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا کہ اس سے اس نبی کی سچائی معلوم ہو اسے معجزہ کہتے ہیں۔ اور پیغمبروں کو ایک ایک یا دو دو معجزے ملتے تھے۔ سب سے زیادہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئے یعنی نو۔ لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چھ ہزار معجزے تو روایتوں میں آتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا معجزہ قرآن کریم ہے اور حق یہ ہے کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم از سر مبارک تا قدم پاک معجزہ ہیں۔ یعنی آپ کا ہر عضو شریف معجزہ بلکہ ہر وصف ہر حال معجزہ ہے۔ اس کی پوری تحقیق ہماری کتاب شان حبیب الرحمٰن میں دیکھو۔ اور انشاء اللہ اس آیت کے ماتحت بھی عرض کی جائے گی قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (النساء: ۱۷۴) جو عجیب باتیں انبیاء کرام سے بچپن شریف میں ظاہر ہوتی ہیں ان کو اِرْھاص کہتے ہیں۔ جیسے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا پیدا ہوتے ہی کلام فرمانا یا ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کے بچپن شریف میں پتھر کا کلام کرنا و سلام کرنا اور جو عجیب باتیں اولیاء اللہ کے ہاتھ پر ہوتی ہیں انہیں کرامت کہتے ہیں۔ بت پرست جوگیوں اور دیگر کفار سے جو عجیب باتیں ظاہر ہوتی ہیں ان کو استدراج کہتے ہیں۔ جیسے دجال کے ہاتھ سے عجائبات کا ظاہر ہونا۔ معجزے تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو ہر وقت نبی کے ساتھ رہتے ہیں۔ جیسے کہ حضور کے جسم اطہر کا بے سایہ ہونا یا دندان مبارک سے نورانی شعاع کا نکلنا۔ دوسرے وہ جو ہر وقت ان کے قبضے میں رہتے ہیں کہ جب چاہیں تب ظاہر فرما دیں۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام کا ید بیضا اور لاٹھی کا سانپ بن جانا۔ تیسرے وہ جن کا ظاہر ہونا صرف رب کے کرم پر موقوف

ہوتا ہے۔ پیغمبر کا اس پر قبضہ نہیں ہوتا جیسے قرآن پاک کی آیتوں کا اترنا۔ **دوسرا فائدہ:** ہر زمانے کے پیغمبر کو اسی قسم کا معجزہ عطا ہوا جس کا اس زمانے میں بہت زور تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں جادو کا زور تھا تو آپ کی لاٹھی کو سانپ بنانے کا معجزہ دیا گیا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں علم طب کا بہت شور تھا تو آپ کو مردہ زندہ کرنے اور اندھوں کو اچھا کرنے کا معجزہ دیا گیا جس کا تعلق طب سے ہے۔ ہمارے حضور کے زمانہ میں فصاحت و بلاغت بہت زوروں پر تھی اس لئے آپ کو قرآن کا معجزہ عطا فرمایا گیا۔ لہٰذا اگر مرزا جی بھی نبی ہوتے تو ان کو سائنسی ایجادات کا معجزہ ملتا۔ کیونکہ آج کل اسی کا زور ہے۔ مگر انہوں نے خطبہ الہامیہ بطور معجزہ پیش کیا۔ جس سے دو سو غلطیاں حضرت پیر مہر علی شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے نکالیں۔ سچ ہے کہ غلط نبی کے لئے غلط معجزے چاہئیں۔ **تیسرا فائدہ:** اس سے معلوم ہوا کہ ہر امر وجوب کے لئے نہیں ہوتا۔ قرآن کریم اس امر پر سولہ معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یہ امر فَاتُوْا اظہار عجز کے لئے ہے۔ **چوتھا فائدہ:** اس سے معلوم ہوا کہ جہنم پیدا ہو چکا کیونکہ اُعِدَّتْ فرمایا گیا جو کہ ماضی ہے۔ **پانچواں فائدہ:** اس سے اشارۃً معلوم ہوا کہ مسلمان جہنم میں ہمیشہ نہ رہیں گے کیونکہ جہنم صرف کفار کے لئے بنی ہے۔ مسلمان عارضی طور پر وہاں رہیں گے۔ **چھٹا فائدہ:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ فقط حرفوں کے یکساں ہونے سے کوئی کلام قرآن کے مثل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ کفار نہ کہہ سکے کہ ہمارا عربی کلام بھی انہی ۳۲ حرفوں سے بنا ہے جس سے قرآن کی عبارت بنی ہے۔ لہٰذا ہمارے قصیدے قرآن کی مثل ہیں۔ اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ظاہری اعضاء اور ظاہری حالات کی بناء پر ہماری مثل نہیں۔ جو شخص ان ظاہری اوصاف کو دیکھ کر اپنے کو ان کی مثل سمجھے وہ حماقت میں کفار مکہ سے بڑھ کر ہے۔ انشاء اللہ اس کی پوری تحقیق اور موقع پر کی جائے گی۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: پہلا اعتراض آریوں کا۔ جس طرح قرآن کریم کا مثل کسی سے نہ بن سکا۔ اسی طرح ہمارے وید کا مثل بھی آج تک کوئی نہ بنا سکا۔ چاہئے کہ اس کو بھی کلام الٰہی مان لو۔ **جواب:** وید نے کبھی کسی کو اپنے مقابلے کا چیلنج دیا ہی نہیں تو اس کا مقابلہ کون کرتا۔ رستم پہلوان تو کہہ سکتا ہے کہ میں نے اخباروں میں اپنے مقابلے کے لئے چیلنج دیئے مگر کوئی سامنے نہ آیا۔ مگر بدھوا چھدوا کمزور لوگ یہ نہیں کہہ سکتے کہ میرے مقابلے میں بھی آج تک کوئی نہیں آیا۔ کیونکہ انہوں نے اپنے مقابلے کے لئے کسی کو بلایا ہی کب تھا۔ **دوسرا جواب:** یہ ہے کہ وید سنسکرت زبان میں آیا اور یہ زبان کسی کی مادری زبان نہیں۔ نہ اس کا کوئی ماہر۔ مقابلے کا چیلنج اس فن کے ماہروں کو دیا جاتا ہے۔ کوئی عربی خواں انگریزی خواں کی جماعت کو چیلنج دے تو غلط ہے۔ اس کو چاہئے کہ عربی علماء کے مجمع میں اعلان کرے۔ قرآن کریم عربی زبان میں آیا۔ اور ملک عرب میں آیا۔ اس زمانے میں آیا جبکہ فصاحت و بلاغت پر ناز کرنے والے لوگ وہاں موجود تھے۔ پھر اس نے سب کو للکارا اگر کچھ بل بوتا ہے تو آؤ ہمارا مقابلہ بھی کر لو۔ بیچارہ وید کس کو پکارتا۔ وہ تو بقول تمہارے ایسی بے ڈھنگی زبان میں آیا جس کا ماہر دنیا میں موجود نہیں۔ **دوسرا اعتراض:** عیسائیوں کا۔ اگر یہ بات صحیح ہے کہ خدائی کتاب کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا

تو چاہئے توریت انجیل کو صحیح مانا جائے۔ مگر تم کہتے ہو کہ لوگوں نے ان میں اپنی طرف سے آیتیں بڑھا بھی دیں اور گھٹا بھی دیں بلکہ بدل بھی دیں۔ انسانی بنائی ہوئی آیتیں خدا کی بھیجی ہوئی آیتوں کے ساتھ کیسے مل گئیں ان میں فرق کیوں نہ ہو سکا۔

جواب: ان کتابوں کی عبارتیں معجزہ بنا کر نہ بھیجی گئیں تھیں۔ کیونکہ اس زمانہ میں عبرانی زبان دان اپنی فصاحت پر نازاں نہ تھے۔ اور پھر بھی جو بناوٹی آیتیں ان میں بڑھائی گئیں وہ بھی کسی طرح اصل آیتوں سے حقیقتاً مل جل نہ سکیں۔ زمین و آسمان کا ان میں فرق رہا۔ لیکن لوگ اپنی بے علمی سے اس فرق کو محسوس نہ کر سکے۔ کلام کا فرق اس کا جاننے والا کر سکتا ہے۔ آج اگر کوئی شخص جاہل دیہاتیوں کو کوئی عربی سنا کر کہہ دے کہ یہ قرآن شریف ہے وہ یقیناً محض عبارت سے نہ پہچان سکیں گے یہی معاملہ وہاں ہو گیا۔ لطیفہ پنڈت دیانند سرستی نے کتاب اللہ کی تین پہچانیں بتائیں ہیں۔ ایک یہ کہ وہ دنیا میں ہمیشہ سے ہو وید چونکہ ہمیشہ سے ہے۔ اور قرآن کچھ دنوں سے آیا ہے۔ لہٰذا وید ہی خدائی کتاب ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں (نسخ) یعنی تبدیلی نہ ہو، تیسرے یہ کہ وہ کسی قوم کی زبان میں نہ ہو۔ بلکہ ایسی زبان میں ہو جو سب کے لئے اجنبی ہو۔ ورنہ خدا طرف دار ٹھہرے گا۔ کہ اپنا کلام ایک قوم کے لئے آسان کر دیا۔ دوسری کے لئے مشکل یہ دونوں وصف بھی وید میں ہیں۔ لہٰذا وید ہی خدائی کتاب ہے۔ چوتھے یہ کہ اس میں ایک مضمون کو بار بار بیان نہ کیا گیا ہو۔ یہ خوبی وید میں ہی ہے۔ قرآن تو ایک ہی مضمون بار بار بیان کرتا ہے۔ لہٰذا یہ خدائی کتاب نہیں ہو سکتی مگر یہ چاروں اصول بالکل غلط اور عقل کے خلاف ہیں۔ خدائی چیز کی پہچان ایسی ہونی چاہئے جو ہر جگہ کام دے۔ اگر پہلی پہچان صحیح ہو تو چاہئے کہ دنیا کی کوئی چیز بھی خدا کی بنائی ہوئی نہ ہو۔ کیونکہ ان میں سے کوئی بھی ہمیشہ سے نہیں۔ دن رات، آسمان، زمین، چاند، سورج سب ہی کچھ عرصہ سے بنے ہیں۔ بولو پنڈت جی تم بھی خدا کے بنائے ہوئے ہو کہ نہیں۔ تم بھی کچھ عرصہ پہلے ہی بنے ہو۔ اگر دوسری پہچان صحیح ہو تو بھی دنیا کی کوئی چیز خدا کی نہ ہوگی۔ کیونکہ ہر چیز میں تبدیلی ہے۔ دن جاتا ہے رات آتی ہے۔ اسی طرح ہمارا بچپن، جوانی، بڑھاپا، تندرستی بیماری سب بدلتے رہتے ہیں۔ چاہئے کہ ان میں سے کوئی بھی خدا کی نہ ہو۔ اسی طرح اگر تیسری پہچان صحیح ہو تو بھی دنیا کی کوئی چیز خدائی نہ رہے۔ کیونکہ حق تعالیٰ کی ساری نعمتیں خاص مخلوق کے ذریعے عام کو ملتی ہیں۔ آفتاب کے ذریعے سے روشنی بادل کے ذریعے سے بارش تالاب اور دریا کے ذریعے سے پانی، عالموں کے ذریعے سے علم، مالداروں کے ذریعے سے مال۔ بادشاہ کے ذریعے سے انصاف عام مخلوق کو ملتا ہے۔ تو اگر اہل عرب کے ذریعے قرآن ساری دنیا کو ملے تو کون سی بڑی بات ہے۔ چوتھی پہچان بھی غلط ہے۔ اگر یہ صحیح ہو تو بھی دنیا کی کوئی چیز خدا کی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ دن رات بار بار آتے ہیں۔ موسم، فصلیں اور پھل وغیرہ سب بار بار ہی آتے رہتے ہیں۔ اگر قرآن پاک میں ایک مضمون بار بار آئے تو کیا خرابی ہے۔ جس مضمون کو خوب یاد کرانا منظور ہوتا ہے وہ بار بار بیان کیا جاتا ہے۔ نیز قرآن کریم جس مضمون کو چند جگہ بیان فرماتا ہے۔ اس میں ہر جگہ نیا لطف اور نئی حکمتیں ہوتی ہیں۔ قرآن کی حقانیت کی دلیل ہے کہ ایک چیز کئی جگہ بیان ہو۔ مگر نئے انداز سے اور نرالے طریقے سے بہر حال یہ پہچانیں سب غلط ہیں۔ صحیح پہچان وہی ہے جو قرآن پاک نے فرمائی۔

وَبَشِّرِ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ
اور خوشخبری دو تم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور کام کیے انہوں نے اچھے تحقیق
اور خوشخبری دیں انہیں جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے ان کے لئے باغات ہیں
تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ
واسطے ان کے باغات ہیں بہتی ہیں سے نیچے ان کے نہریں جب کبھی دیئے جائیں
جن کے نیچے نہریں رواں جب ان کو باغوں سے کوئی پھل کھانے کو دیا جائے گا
رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ
گے وہ اس سے پھل کھانے کے لئے تو کہیں گے وہ یہ وہی ہے جو دیئے گئے ہم پہلے اس سے
صورت دیکھ کر کہیں گے یہ تو وہی رزق انہیں پہلے سے ملا تھا اور
مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِیْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙۗ وَّهُمْ فِیْهَا
اور دیئے جاویں گے ملتے جلتے ہم شکل اور واسطے ان کے اس میں بیویاں پاک وصاف
وہ صورت میں ملتا جلتا انہیں دیا جاوے گا اور ان کے لئے ان باغوں میں
خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾
اور وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔
ستھری بیبیاں ہیں اور وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔

تعلق

اس آیت کا گزری آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **ایک** یہ کہ اس سے پہلے جہنم کا ذکر تھا۔ اب جنت اور اس کے مستحقین کا ذکر فرمایا گیا۔ کیونکہ ہر چیز اپنے مقابل سے خوب پہچانی جاتی ہے۔ **دوسرے** یہ کہ ہر حکم کو تین طرح قبول کرایا جاتا ہے۔ دلیلوں سے۔ ڈرا کر۔ لالچ دے کر۔ اس سے پہلے قرآن پاک کی حقانیت دلائل سے بیان فرمائی گئی۔ پھر اس کے نہ ماننے پر عذاب سے ڈرایا دھمکایا گیا۔ اب اس کے ماننے پر ثواب کی امید دلائی گئی۔ کیونکہ دنیا میں تین قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ بعض تو دلائل سے بات مان لیتے ہیں اور بعض خوف سے۔ بعضے لالچ سے۔ یا یوں کہو کہ انسان کی عقل دلیل سے بات مانتی ہے اور دل ڈر سے اور نفس لالچ سے۔ انہی تین چیزوں کا یہاں ذکر ہوا۔ خیال رہے کہ یہ تینوں ذریعے عاقلوں کے لئے ہیں۔ عشق ان تمام اسباب وذرائع سے بے نیاز ہے۔ اپنا بدصورت بچہ، اپنا معمولی دیسی جھونپڑا پیارا ہے دلیل سے نہیں۔ بلکہ عشق سے۔ عقل کہتی ہے، کشمیر و پیرس اچھا۔ عشق کہتا ہے۔ مدینہ اعلیٰ۔ **تیسرا** یہ کہ انسان کو ضروری ہے کہ تین

چیزیں معلوم کرے ایک اپنی ابتدا کہ میں کہاں سے آیا، دوسرے اپنی غذا کہ میں کہاں سے کھاتا پیتا ہوں۔ تیسرے اپنی انتہا کہ مجھے کہاں جانا ہے۔ اس سے پہلے دو چیزوں کا ذکر ہو گیا تھا کہ اَلَّذِیْ خَلَقَکُمْ میں انسان کی ابتداء اور اَلَّذِیْ جَعَلَ لَکُمْ میں اس کی غذا کا ذکر فرمایا رہی انتہا وہ کفار کی کچھ اور تھی، مسلمانوں کی اور لہٰذا پہلے کفار کی انتہا بیان فرما کر اب مسلمانوں کی انتہا کا ذکر ہو رہا ہے۔

تفسیر

وَبَشِّرِ یہ لفظ بشارت سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں خوشخبری۔ اور خوشخبری کو بشارت اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بشرہ سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں ظاہری کھال۔ چونکہ اچھی خبر کا اثر چہرے وغیرہ پر ظاہر ہوتا ہے کہ سن کر ہنسی آجاتی ہے۔ چہرے کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس کو بشارت کہا جاتا ہے۔ یہاں تو صرف حضور سے خطاب ہے۔ یعنی اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کو آپ خوش خبری دیجئے۔ خیال رہے کہ ایک بشارت ہے آئندہ نبیوں کی آمد کی اس کے ساتھ تصدیق ہوتی ہے۔ گذشتہ نبیوں کی طرح حضور اس بشارت سے پاک ہیں۔ کیونکہ آپ کے بعد کوئی نبی نہیں۔ اس لئے حضور کو صرف مصدق فرمایا جاتا ہے۔ آدم علیہ السلام صرف بشیر ہیں کسی نبی کے مصدق نہیں۔ کیونکہ آپ سے پہلے کوئی نبی نہ ہوا تھا۔ دوسری بشارت ہے اللہ کی رحمتوں کی جس کے ساتھ نذارت ہے۔ اسی معنی سے حضور بشیر ہیں۔ آپ کا لقب بشیر ونذیر ہے۔ یہاں دوسری بشارت مراد ہے۔ یا عام علماء اور واعظین سے۔ یعنی اے علماؤ اور واعظو! تم مسلمانوں کو خوشخبری دیتے رہو۔ بشیر کو باب تفعیل سے لایا گیا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ ہمیشہ تھوڑی تھوڑی خوشخبریاں دیتے رہنا چاہئے کہ واعظ کا کوئی وعظ خوشخبری سے خالی نہ ہو۔ مگر خیال رہے کہ خوشخبری کے ساتھ ڈرانا بھی ضروری ہے۔ تاکہ مسلمانوں کو امید اور خوف رہے۔ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اس سے یا تو قرآن پر ایمان لانا مراد ہے کیونکہ پہلے اسی کا ذکر ہوا ہے یا ساری ایمانی باتوں پر۔ اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ اس ایک کلمے سے ساری ایمانیات کا ذکر ہو گیا۔ یہاں تا قیامت ہر جگہ کے مومن مراد ہیں۔ حضور ﷺ ان سب کے بشیر ہیں بلا واسطہ یا بالواسطہ اگرچہ فرشتے جنات انسان سب مومن ہیں مگر یہاں صرف انسان مومن مراد ہیں کیونکہ جنت صرف انسان مومنوں کے لئے جیسا کہ سورۂ احقاف میں مذکور ہے۔ تمام ایمانیات توحید، فرشتوں وغیرہ کا ماننا ایمان کا قالب یا ڈھانچہ حضور کو ماننا ایمان کا قلب وروح ہے۔ شیطان توحید وتمام غیب کی چیزوں کو مانتا تھا۔ صرف نبی کا منکر تھا مومن نہ ہوا فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ (النساء:۶۵) ایمان کو عمل سے اسی لئے مقدم کیا گیا کہ ایمان سارے نیک اعمال کی اصل ہے۔ کافر کا کوئی نیک عمل قابل ثواب نہیں۔ نیز جنت میں داخل ہونے کے لیے ایمان شرط ہے۔ رہے نیک اعمال وہ بسا اوقات ضروری نہیں رہتے۔ جو شخص ایمان لاتے ہی مر جائے وہ یقیناً جنتی ہے۔ حالانکہ اس نے نیک کام کوئی بھی نہ کیا۔ بدکار مسلمان بھی آخر کار جنت میں ضرور پہنچیں گے۔ مگر بے ایمان جنت سے بالکل محروم ہیں۔ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ایمان کے بعد نیک عمل کا اسی لئے ذکر فرمایا گیا کہ کوئی شخص ایمان پر بھروسہ نہ کر بیٹھے۔ کیونکہ ایمان بنیاد ہے۔ اور اعمال عمارت فقط بنیاد سے مکان نہیں بن جاتا۔ بغیر عمل جنت کی طلب حماقت ہے۔ نیز ایمان نور ہے اور عمل اس کی زیادتی۔ جس کی برکت سے

مسلمان کا ظاہر و باطن چمک جاتا ہے۔ نیز جنت کے راستے میں صدہا خندقیں ہیں۔ یہ اعمال وہ سواری ہیں جس سے یہ خندقیں آسانی سے طے ہو جاتی ہیں۔ بلکہ یوں کہو کہ خود ایمان کے جاتے رہنے کا ہر وقت اندیشہ ہے۔ یہ اعمال ایمان کی روک تھام ہیں۔ اَلصّٰلِحٰتِ جمع صالحة کی ہے۔ جس کے معنی ہیں نیک کام اور جو جائز کام بھی رضائے الٰہی کے لئے کیا جائے وہ صالح ہے۔ اس میں عبادات معاملات وغیرہ سب ہی داخل ہو گئے، چونکہ ہر شخص سارے نیک کام نہیں کر سکتا۔ فقیر سے زکوٰۃ اور کمزور سے حج ناممکن ہے۔ اس لئے یہاں طاقت کے مطابق اعمال مراد ہیں اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ۔ لَهُمْ کے مقدم کرنے سے معلوم ہوا کہ جنت صرف مومن کے لئے ہے۔ جَنّٰتٍ جمع جنت کی ہے۔ جس کے معنی ہیں گھنا باغ۔ چونکہ گھنے باغ کی زمین درختوں سے چھپ جاتی ہے اس لئے اس کو جنت کہا جاتا ہے۔ جنت میں اگرچہ اور بھی صدہا نعمتیں ہوں گی لیکن جنت ان سب میں اصل ہے۔ اس لئے اس کا ذکر ہر جگہ فرمایا جاتا ہے۔ جنت کے آٹھ طبقے ہیں۔ جنت الفردوس، جنت عدن، جنت ماویٰ، دار الخلد، دار السلام، دار المقامہ، علیین، جنت نعیم (تفسیر عزیزی) ان کے ناموں میں کچھ اختلاف بھی ہے۔ مسلمانوں کو ان کے اعمال کے مطابق ان طبقوں میں رکھا جاوے گا۔ چونکہ سارے مسلمانوں کے لئے یہ ساری جنتیں ہیں اس لئے آیت کا مطلب یہ ہوا کہ جنتیں مسلمانوں میں تقسیم ہو جائیں گی۔ جیسے کہ ریل میں تھرڈ سیکنڈ وغیرہ کئی درجے ہوتے ہیں۔ اور وہ سب مسافروں کے لئے ہی ہیں۔ لیکن جتنا روپیہ خرچ کیا جائے گا اتنا ہی درجہ ملے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اعلیٰ درجے والے ادنیٰ درجہ کے بھی مالک ہوں لیکن وہ اعلیٰ میں ہی رہیں گے۔ جیسے کہ فسٹ کلاس کا مسافر تھرڈ میں سفر کر سکتا ہے۔ مگر کرتا نہیں۔ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ یہ ان باغوں کی صفت ہے۔ چونکہ باغوں کی سرسبزی پانی سے ہی ہوتی ہے اور جس باغ میں نہریں جاری ہوں وہ بڑا خوبصورت معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے وہاں نہریں جاری ہوں گی۔ اَنْهٰرُ نہر کی جمع ہے جس کے معنی ہیں چیرنا۔ چونکہ زمین چیر کر دریا میں سے پانی لایا جاتا ہے اس لئے اسے نہر کہتے ہیں۔ جنت میں بھی حوض کوثر وغیرہ سے پانی آئے گا۔ اور ان باغوں میں ہوتا ہوا نکل جائے گا۔ اور یہ نہ تو بالکل نالی کی طرح تنگ ہوں گی اور نہ دریا کی طرح فراخ اور ٹیڑھی بل کھائی ہوئی۔ بلکہ نہایت سیدھی اور درمیانی فراخ۔ اس لئے ان کو نہر کہا گیا۔ بعضوں نے کہا ہے کہ یہاں انہار سے صرف پانی ہی کی نہریں مراد ہیں۔ کیونکہ باغ کی سرسبزی صرف پانی سے ہوتی ہے۔ اور چونکہ یہ نہریں ہر طبقے میں ہوں گی۔ اس لئے ان کو جمع لایا گیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ وہ چار قسم کی نہریں ہوں گی۔ پانی کی، شہد کی، دودھ کی اور شرابا طہورا کی۔ کیونکہ یہ مومنین کے پینے کے لئے ہوں گی۔ اور وہاں کی سرسبزی قدرتی ہوگی۔ اگر جنت کے باغوں کی سبزی اس پانی سے ہوتی تو وہاں ہر وقت پانی نہ رہتا۔ کیونکہ اس سے درخت گل جاتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ نہ اس پانی سے وہ درخت گلیں گے نہ اس کے بغیر سوکھیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان پھلوں میں دودھ اور شہد وغیرہ کا مزہ ہو۔ کیونکہ دنیا میں بھی اگر کسی درخت کی دودھ اور شہد سے پرورش کی جائے تو اس کے پھلوں میں لذت اور شیرینی بڑھ جاتی ہے۔ (تفسیر عزیزی)

كُلَّمَا رُزِقُوْا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جنتیوں کے پاس رزق ہر وقت نہ ہوگا اور کبھی کبھی دیا جائے گا۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ وہاں کا پھل ہر وقت موجود ہوگا۔ لیکن اس کا کھانا وقتاً فوقتاً خواہش کے مطابق ہوگا۔ خیال رہے کہ جنت میں پھل ہوں گے

غلہ نہ ہوگا۔ اس لئے وہاں باغات ہیں کھیت نہیں۔ کیونکہ غذا بقائے زندگی کے لئے ہوتی ہے اور پھل صرف لذت کے لئے۔ وہاں بھوک پیاس نہیں۔ وہاں کی زندگی غذا کی محتاج نہیں۔ صرف لذت کے لئے پھل کھائے جائیں گے۔ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ اس میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ قبل سے مراد دنیوی پھل ہوں یعنی جب جنتی کوئی پھل پایا کریں گے تو کہا کریں گے کہ یہ ویسا ہی پھل ہے جیسے ہم کو دنیا میں ملتے تھے۔ کیونکہ یہ ان کے ہم شکل اور ہم رنگ ہوں گے۔ مگر جب کھائیں گے تو مزا نرالا پائیں گے اور یا اس سے خود جنت کے پہلے پھل مراد ہیں۔ یعنی جنت کا ہر پھل شکل وصورت میں پہلے پھلوں کی طرح ہوگا۔ مگر ہر بار وہ لذت اور ہی قسم کی ہوگی۔ مثلاً جب بھی سیب کھائیں گے علیحدہ مزا پائیں گے وَاُتُوْا بِہٖ مُتَشَابِھًا اس کا مقصود یہ ہے کہ جنت کے پھل یا تو دنیاوی پھلوں کے ہم شکل ہوں گے یا وہاں کے ہی پھلوں کے۔ اس لئے کہ اجنبی چیز کی طرف دل راغب نہیں ہوتا۔ ان کے دلوں کو راغب کرنے کیلئے پھلوں کی شکل تو دنیاوی پھلوں کی طرح ہوگی۔ مگر لذت جدا تا کہ ان کو ہر بار نیا لطف آئے۔ تفسیر روح البیان میں فرمایا گیا کہ ہر جنتی کو کھانے پینے اور جماع میں سو آدمی کی قوت دی جائے گی۔ اور وہاں پیشاب اور پاخانہ کی بالکل ضرورت نہ ہوگی۔ بلکہ ان کی غذا خوشبودار پسینہ بن کر جسم سے نکل جائے گی۔ ازواج جمع زوج کی ہے۔ جس کے معنی ہیں جوڑا۔ یہ لفظ شوہر اور بیوی دونوں پر بولا جا سکتا ہے۔ مگر یہاں بیویاں ہی مراد ہیں۔ کیونکہ لَھُمْ کی ضمیر مذکر تھی اور آگے مُطَھَّرَۃٌ جو کہ ازواج کی صفت ہے وہ مونث ہے۔ چونکہ شوہر بیوی کا گویا مالک ہوتا ہے اور بیوی شوہر کے لئے نعمت الٰہی ہے اس لئے جنت کی عورتوں کی خواہ وہ حوریں ہوں یا دنیاوی بیویاں وہاں کی نعمتوں میں سے شمار کیا گیا۔ خیال رہے کہ جو عورت جس مسلمان کے نکاح میں مرے گی وہ جنت میں اسی کے ساتھ رہے گی۔ اسی لئے نبی کریم ﷺ کی بیویوں کا نکاح نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ وہ جنت میں حضور کے لئے خاص ہیں۔ اور جس عورت کا شوہر کافر ہو کر مرا یا جو کہ کنواری ہی مرگئی ان کا نکاح ان جنتیوں میں سے کسی سے کرا دیا جائے گا جو جنت کے بھرنے کے لئے پیدا کئے جائیں گے۔ اور جس کی بیوی کافر ہو کر مری یا کنوارا ہی مرگیا اس کے نکاح میں صرف حوریں ہوں گی۔ اور جس کی بیوی بھی مسلمان مرے وہ جنت میں اپنی اس بیوی کو بھی پائے گا اور حوروں کو بھی۔ لیکن وہاں یہ دنیاوی بیویاں حسن وجمال میں حوروں سے کسی طرح کم نہ ہوں گی۔ روایات میں آیا ہے کہ حضرت مریم عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ اور حضرت آسیہ فرعون کی بیوی جنت میں حضور ﷺ کے نکاح میں آئیں گی۔ اس کی پوری تحقیق انشاء اللہ سورت مریم میں کی جائے گی۔ جنت میں ایک مرد کو چند بیویاں دی جائیں گی مگر ایک عورت کو چند مرد نہیں کہ یہ بے حیائی ہے۔ ایک مخدوم کے چند خادم ٹھیک ہیں مگر ایک خادم کے چند مخدوم ٹھیک نہیں۔ ہاتھ میں انگوٹھا جو نر ہے ایک ہے۔ انگلیاں جو مادہ ہیں وہ چند اسی لئے لَھُمْ اَزْوَاجٌ ارشاد ہوا۔ نیز حور جو انسان نہیں ان کا نکاح انسانوں سے ہو سکے گا۔ دنیا میں نکاح کے لئے ہم جنس ہونا شرط ہے کہ انسان کا نکاح غیر انسان سے نہیں۔ خیال رہے کہ وہاں کی بیویاں قیامت کے بعد جنت میں پہنچ کر ہی ملیں گی۔ حضرت آدم وادریس علیہما السلام اگرچہ جنت میں رہے۔ وہاں سب کچھ کھایا پیا۔ مگر حوروں سے بے تعلق رہے۔ شہداء کی روحیں جنت کے میوے کھاتی ہیں مگر حوروں سے بے تعلق۔ حضرت مریم نے دنیا میں جنتی میوے کھائے۔ اس لئے ازواج کے لئے فِیْھَآ فرمایا اور ثَمَرَۃٍ کے لئے فِیْھَآ

ارشاد نہ ہوا مُطَهَّرَةٌ اس سے معلوم ہوا کہ عورتیں خواہ حور ہوں خواہ دنیا کی عورتیں تمام ظاہری اور باطنی عیبوں اور گندگیوں سے بالکل پاک ہوں گی۔ یعنی حیض نفاس، پیشاب، پاخانہ، منی، تھوک، میل ہر قسم کی بیماری وغیرہ سے بھی پاک ہوں گی۔ اور بد خلقی، سخت زبانی، نافرمانی وغیرہ سے بھی ایک دم دور۔ ان کے چہرے کا نور آفتاب کی روشنی کو شرما دے گا هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ اس سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ وہ ہمیشہ زندہ رہیں گے اور کبھی نہ مریں گے۔ کیونکہ ان کے جسم پر روحانیت غالب ہوگی نہ کہ عنصریت۔ اور فنا عنصریت کے لئے ہے نہ کہ روح کے لئے۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں کہ جنتی مرد عورتیں ہمیشہ پینتیس سال کے جوان رہیں گے ان کا قد حضرت آدم علیہ السلام کی طرح ساٹھ ساٹھ ہاتھ کا ہوگا۔ بے داڑھی ہوں گے۔ سب کی آنکھیں قدرتی سرگیں ہوں گی۔ ہر ایک کے جسم پر ستر جوڑے ہوں گے۔ ہر جوڑے کا علیحدہ رنگ ہوگا۔ اور وہ جوڑے ایسے شفاف ہوں گے کہ ان سب کا رنگ اوپر سے نظر آئے گا۔ روزانہ ان کا حسن و جمال بڑھے گا، نہ کبھی بوڑھے ہوں گے، نہ دبلے، نہ کمزور اور نہ ان کے کپڑے کبھی میلے ہوں گے۔ (تفسیر روح البیان)

خلاصہ تفسیر

قرآن پاک کے نہ ماننے پر سزا کا ذکر ہو چکا ہے۔ اب اس کے ماننے کی جزا کا ذکر ہو رہا ہے کہ اے نبی ﷺ جو صحیح مسلمان ہوئے اور ایمان پر ان کا خاتمہ ہوا۔ اور انہوں نے عبادت، سخاوت، خوش اخلاقی وغیرہ نیک اعمال کئے۔ انہیں یہ خوشخبری سنا دو کہ ان کے مرنے کے بعد اس عالم میں ایسے عمدہ اور گھنے خوبصورت باغ دیئے جائیں گے کہ جن میں دودھ شہد وغیرہ کی نہریں بہتی ہوں گی اور ان باغوں کے میووں میں عجیب لطف یہ ہوگا کہ سب کی شکل وصورت رنگت و خوشبو تو یکساں مگر ذائقے الگ الگ۔ اس مشابہت کی وجہ سے جنتی کھاتے وقت سمجھیں گے کہ یہ وہی میوہ ہے مگر جب کھائیں گے تو ہر بار نیا ہی لطف پائیں گے۔ اور ان کو صرف کھانا اور مکان ہی نہ ملے گا بلکہ ان کے دل لگنے کے لئے اور گھروں کی آبادی کے لئے نہایت پاکیزہ بیویاں بھی دی جائیں گی جو کہ ساری نفرت کی چیزوں سے پاک ہوں گی۔ صورت نہایت زیبا اور سیرت نہایت اعلیٰ ہوگی۔ ان نعمتوں پر طرہ یہ کہ ان کو بڑھاپا بیماری وغیرہ کی تکلیفیں نہیں اور موت کا کھٹکا نہیں۔ دنیا کے سارے عیش موت کی وجہ سے تلخ ہیں۔ وہاں یہ تلخی بھی نہ ہوگی۔ بلکہ وہ اپنی عیش و آرام کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ وہاں رہیں گے۔

فائدے

اس آیت سے اتنے فائدے حاصل ہوئے، **ایک** یہ کہ جنت پیدا ہو چکی ہے۔ کیونکہ آدم علیہ السلام وہاں رہ چکے ہیں۔ حضور معراج میں وہاں کی سیر فرما چکے ہیں۔ اور اس آیت سے معلوم ہوا کہ جنت جنتیوں کے لیے نامزد ہو چکی ہے۔ نیز حضور ﷺ کو کوثر دیا جا چکا ہے۔ اور دی وہی چیز جاتی ہے جو موجود ہو۔ **دوسرے** یہ کہ جنت اور جنت والوں کے لئے فنا نہیں وہ ہمیشہ باقی رہیں گے۔ **تیسرے** یہ کہ اعمال ایمان میں داخل نہیں بلکہ ایمان کے علاوہ ہیں۔ کیونکہ یہاں اعمال کا ایمان پر عطف کیا گیا اور عطف غیریت چاہتا ہے۔ نیز بہت سے مومنین کو عمل کا موقع نہیں ملتا اگر اعمال ایمان کے جز ہوتے تو یہ لوگ مومن کیونکر ہوتے۔ **چوتھے** یہ کہ دنیا میں حائضہ عورت سے جماع کرنا منع ہے۔ اس لئے کہ وہ گندی ہے اور مرد پاک،

جنتی عورتیں ہر طرح پاک ہیں۔ لہٰذا جو مرد گناہوں کی ناپاکی میں لتھڑا ہوگا وہ ان کے پاس نہ جاسکے گا۔ **پانچواں** یہ کہ دنیا میں جو شخص حلال جماع سے جنبی ہو اس کو مسجد میں آنا حرام ہے۔ تو جو حرام شہوتیں پوری کرے اس کو جنت میں جانا بھی حرام ہوگا۔ کیونکہ وہ جگہ پاکوں کی ہے۔ **چھٹے** یہ کہ نیک پاک بیوی اللہ کی بڑی رحمت ہے۔ کیونکہ اس سے صحبت زیادہ رہتی ہے۔ اچھوں کی صحبت تمام نعمتوں سے بڑھ کر ہے۔ حضور کے صحابہ صرف صحبت نبوی کی وجہ سے تمام مسلمانوں سے افضل ہیں۔

تفسیر صوفیانہ

جن لوگوں نے اپنے دلوں میں ایمان حقیقی (ایمان مقبول) کا بیج بویا۔ اور اس کو نیک اعمال کا پانی دیا تو ان کو ایسے باغات ملیں گے جن میں توکل، یقین، زہد، تقویٰ، صدق، اخلاق، ہدایت، قناعت، پاک دامنی، مجاہدہ، شوق ذوق، رغبت، خوف امید، صفائی قلب، وفا طلب، محبت، حیا، کرم، سخاوت، شجاعت، علم، حلم، معرفت، عزت رفعت، رحمت، ہمت کے گھنے درخت ہوں گے، جن کے نیچے اللہ کی رحمت اس کے کرم، اس کی عنایت، اس کے فضل اور توفیق کی نہریں ہوں گی۔ جب کبھی وہ ان درختوں سے مشاہدہ، کشف تجلی انوار کے پھل پائیں گے تو کہیں گے کہ یہ تو ہم اس سے پہلے بھی پا چکے ہیں۔ مگر ہر کشف میں علیحدہ لذت اور ہر تجلی میں نیا نور ہوگا۔ اس لئے کہ اس راہ میں نئے آنے والے لوگ مشکل سے فرق کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام طور کے نور کو نار یعنی آگ سمجھا اور فرمایا کہ اِنِّیۡۤ اٰنَسۡتُ نَارًا (طٰہٰ:۱۰) مگر جب سالک واصل ہو جاتا ہے تو ہر نار میں علیحدہ ذوق پاتا ہے۔ ان حضرات کے لئے اس قلبی باغ میں ان پھلوں کے علاوہ عالم غیب سے اور بھی رحمتوں کے جوڑے ملیں گے جو کہ اغیار کی نظر سے پاک ہوں گے اور وہ ان سے واپس نہ لئے جائیں گے۔ بلکہ ہمیشہ ان کے پاس ہی رہیں گے۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ جیسے جنت کے پھل دنیا کے پھلوں کی طرح ہوں گے نام اور شکل میں مگر لذت میں دنیاوی پھلوں سے کوئی نسبت نہیں ایسے ہی انبیاء اولیاء کی عبادات اگرچہ نام وشکل میں ہماری عبادات کی طرح معلوم ہوتی ہیں کہ ہم بھی نماز پڑھتے ہیں وہ بھی۔ ارکان نماز دونوں جگہ یکساں معلوم ہوتے ہیں مگر لذت وقبولیت میں کوئی نسبت نہیں۔ اسی لئے ہمارا پہاڑ بھر سونا خیرات کرنا صحابہ کے ایک سیر جو کو نہیں پہنچ سکتا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ جنتی لوگ ہر پھل کو دیکھ کر یہی کہیں گے کہ یہ وہی پھل ہے جو کہ ہم کو پہلے مل چکا ہے۔ اس پہلے سے کیا مراد ہے۔ آیا دنیا میں پہلے مل چکا ہے یا جنت ہی میں؟ اگر کہا جائے کہ دنیا میں پہلے مل چکا ہے تو لازم آتا ہے کہ جنت میں دینوی نعمتوں کے علاوہ کوئی نعمت نہ ہوتا کہ وہ ہر نعمت پر یہ کہہ سکیں کہ یہ تو ہم دنیا میں ہی پا چکے۔ حالانکہ قرآن کریم فرما رہا ہے کہ فَلَا تَعۡلَمُ نَفۡسٌ مَّاۤ اُخۡفِیَ لَہُمۡ مِّنۡ قُرَّۃِ اَعۡیُنٍ (سجدہ:۱۷) اور حدیث پاک میں آیا ہے کہ رب تعالیٰ نے جنت میں نیک بندوں کے لئے وہ نعمتیں مہیا فرمائی ہیں جو نہ کسی آنکھ نے دیکھی نہ کان نے سنی نہ کسی کے خیال میں آئیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنتی نعمتیں گمان ووہم سے بھی بالاتر ہیں۔ اور یہاں فرمایا ہے کہ وَ اُتُوۡا بِہٖ

مُتَشَابِهًا ان آیات میں مطابقت کیونکر ہو سکتی ہے۔ نیز بعض جنتی فقراء اور مساکین ہوں گے۔ جن کو دیناوی نعمتیں دنیا میں بہت کم میسر آتی تھیں۔ نیز دنیا میں ہر ملک میں علیحدہ قسم کے پھل پائے جاتے ہیں پھر بھی جنتی وہاں ہر پھل کو دیکھ کر یہ کیونکر کہہ سکیں گے کہ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ۔ اور اگر اس قبل سے مراد خود جنت ہی کی پہلی نعمتیں ہیں تو بھی درست نہیں ہوتا کیونکہ اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ جنتی ہر پھل کو دیکھ کر یہی کہیں گے تو جب بالکل پہلی بار وہ پھل کھائیں گے تو کیا کہیں گے۔ **جواب:** یہ اعتراض نہایت قوی ہے۔ علماء نے اس کے دو جواب دیئے ہیں۔ ایک یہ کہ مِنْ قَبْلُ دونوں قسم کے پھلوں کو شامل ہے۔۔ یعنی جنتی پھلوں کو دیکھ کر تو دنیا کے پھل یاد کریں گے اور بعض کو دیکھ کر جنت کے اگلے پھل دوسرے یہ کہ هٰذَا الَّذِیْ میں لفظ جزا پوشیدہ ہے۔ یعنی جنتی ہر پھل کو دیکھ کر یہ کہیں گے کہ ان اعمال کا بدلہ ہے جن کی ہم کو دنیا میں توفیق ملی تھی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جنت کی نعمتیں درحقیقت نیک اعمال ہوں جو کہ نعمتوں کی شکل میں ظاہر ہوئے (تفسیر عزیزی) اس کی تائید ان احادیث صحیحہ سے بھی ہوتی ہے۔ جن میں فرمایا گیا کہ دنیوی نیک و بداعمال آخرت میں اچھی بری شکلوں میں ظاہر ہوں گے۔

دوسرا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بغیر اعمال جنت نہیں مل سکتی۔ کیونکہ یہاں جنت کی خوشخبری کو ایمان اور عمل دونوں سے متعلق کیا گیا۔ حالانکہ مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ جنت بغیر اعمال بھی مل سکتی ہے۔ **جواب:** یہ خوشخبری صالحین کے لئے بلا قید ہے اور گنہگار مسلمانوں کے لئے ارادہ الٰہی کی قید سے کہ اگر وہ چاہے تو ان کے گناہ معاف فرمادے اور چاہے تو سزا دے کر جنت دے۔ (تفسیر خزائن العرفان) **تیسرا اعتراض آریوں کا۔** جنتی مرد اور عورت پینتیس سال کے نوجوان ہوں گے۔ خوبصورت اور قوی ہوں گے۔ حالانکہ یہ لوگ دنیا میں کمزور، بوڑھے وغیرہ تھے۔ اسی کا نام ''آواگون'' ہے۔ آریہ مانتے ہیں کہ دنیا ہی میں ایک روح مختلف جسموں میں آتی ہے اور مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ یہ معاملہ آخرت میں ہوگا۔ نیز قرآن پاک سے ثابت ہے کہ بعض امتیں سور بندر وغیرہ بنادی گئیں۔ موسیٰ علیہ السلام کا عصا کبھی سانپ بن جاتا تھا، کبھی لاٹھی، یہی ہمارا عقیدہ ہے۔ **جواب:** اس مسئلہ کی تحقیق انشاء اللہ عصا موسوی کے ذکر کے موقع پر کی جائے گی۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لو کہ جسم کا بدلنا ممکن بلکہ واقع ہے۔ لیکن روح کی تبدیلی ناممکن ہے۔ دن رات جسموں میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ آگ ہوا بن جاتی ہے اور ہوا آگ۔ جسم انسانی مرنے کے بعد مٹی ہو جاتا ہے۔ زندگی میں بھی بچپن، جوانی، بڑھاپا، بیماری، تندرستی کی حالت میں جسم کی حالتیں بدلتی رہتی ہیں۔ یہ ہرگز آواگون نہیں۔ آواگون یہ ہے کہ روح انسانی اس جسم انسانی سے نکل کر گدھے کے جسم میں پہنچے اور روح ہماری بن جائے۔ یہ ناممکن ہے۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو بھی ایمان دار ہو کر نیک اعمال کرے وہ جنت کا مستحق ہے۔ شیطان نے بھی مومن رہ کر بہت نیک کام کئے تھے۔ چاہئے کہ وہ جنتی ہو۔ کیونکہ اس آیت میں بقاء ایمان کی قید نہیں۔ **جواب:** یہاں ایمان سے مراد حقیقی ایمان ہے۔ اور وہی اللہ کے نزدیک مقبول ہے۔ اور ایمان حقیقی وہی ایمان ہے۔ جو دنیا سے مومن کے ساتھ جائے۔ شیطان کے متعلق فرمایا گیا کہ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِیْنَ یعنی وہ ایمان کی حالت میں ہی اللہ کے علم میں کافر تھا۔ جو ایمان ساتھ نہ جائے وہ حقیقت میں ایمان ہی نہیں۔ **پانچواں اعتراض:** نیچریوں کا۔ شعر۔

ایسی جنت کیا کرے کوئی جس میں لاکھوں برس کی حوریں ہوں

جب جنت قیامت کے بعد دی جائے گی تو اتنے پہلے اس کو پیدا کرنے کی کیا ضرورت۔ زیادہ عمر سے چیزیں خراب ہو جاتی ہیں۔ **جواب:** حقیقت میں یہ دو اعتراض ہیں۔ ایک یہ کہ جنت قیامت سے پہلے کیوں پیدا ہوئی۔ دوسرے یہ کہ پرانی چیز کمزور اور خراب ہو جاتی ہے۔ پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ قیامت سے پہلے بھی جنت میں صدہا کام ہو رہے ہیں۔ جنت میں آدم علیہ السلام کو اولاً رکھا گیا۔ اب بھی وہاں ادریس علیہ السلام موجود ہیں۔ اب بھی وہاں بعض صالحین کی روحیں پرندوں کی شکل میں رہتی ہیں۔ اب بھی وہاں حور و غلمان وغیرہ رب کی تسبیح وتہلیل کر رہے ہیں۔ وہاں کی سیر حضور علیہ السلام کو کرائی گئی۔ مسلمان اس پر ایمان لاتے ہیں کہ جنت حق ہے۔ اور وہاں کا پانی حضور نے صحابہ کرام کو پلایا۔ یعنی اپنی پاک انگلیوں سے پانی جاری فرما دیا۔ یہ وہی پانی تھا۔ (روح البیان وغیرہ) حضور علیہ السلام نے وہاں کی بعض نعمتیں صحابہ کرام کو کھلا دیں۔ کہ حضرت جابر کے گھر تھوڑے گوشت و آٹے سے صدہا آدمیوں کی دعوت فرما دی۔ یہ آٹا وغیرہ وہاں سے آ رہا تھا۔ اب بھی وہاں کا پتھر سنگ اسود خانہ کعبہ میں نصب ہے۔ اب بھی وہاں کا لباس یعنی ناخن ہر انسان کے پاس موجود ہے۔ اور اگر یہ نفع فی الحال حاصل نہ بھی ہوتے تب بھی اس کا ہونا بیکار نہ ہوتا۔ ہر حکومت اپنے سارے محکمے پہلے ہی قائم کر لیتی ہے۔ کچہری، جیل خانہ، شفاخانہ پہلے ہی سے بنا لئے جاتے ہیں۔ اس کا انتظار نہیں ہوتا کہ کوئی جرم کرے تب جیل بنے۔ کوئی بیمار ہو تب شفاخانہ بنے۔ نہیں پہلے ان سب چیزوں کا ہونا سلطنت کی شان اور سلطان کا رعب ہے۔ دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ پرانا ہونا خراب یا کمزور ہونا ان عنصری جسموں کی خصوصیت ہے۔ غیر عنصری جسم نہ پرانے ہوتے ہیں نہ خراب۔ بتاؤ تو چاند، سورج، ستارے، زمین و آسمان وغیرہ کب کے بنے ہوئے ہیں؟ کیا یہ پرانے ہو کر خراب ہو گئے؟ آپ کی روح کتنی پرانی ہے؟ کیا کمزور ہو گئی یا خراب ہو گئی؟ ہرگز نہیں۔ تو جنت کی نعمتیں کیوں خراب ہوں گی۔ **چھٹا اعتراض:** جنت میں انہار کیوں ہیں؟ دریا کیوں نہیں؟ پانی دریا میں زیادہ ہوتا ہے۔ **جواب:** چند وجہ سے ایک یہ کہ باغوں میں نہر ہی کی ضرورت ہے۔ دریا کی ضرورت نہیں دوسرے یہ کہ نہر مکانوں کے اندر بھی جا سکتی ہے۔ جیسے دہلی کے لال قلعہ میں مگر دریا نہیں جا سکتا۔ تیسرے یہ کہ نہر سیدھی اور خوبصورت ہے۔ دریا ٹیڑھا اور بدنما ہوتا ہے۔ بلکہ ہیبت ناک ہوتا ہے۔ چوتھے یہ کہ نہر ہمیشہ فائدہ مند ہوتی ہے۔ مگر دریا کبھی طغیانی سے تباہی مچا دیتا ہے۔ پانچواں یہ کہ نہر کا پانی قبضہ میں ہوتا ہے جب چاہو جتنا چاہو چھوڑ دو مگر دریا کا پانی قبضہ سے باہر ہوتا ہے۔ چھٹے یہ کہ دریا اکثر چشموں سے نکلتا ہے۔ اور نہر دریا سے۔ جنت کی نہریں بھی حوض کوثر وغیرہ سے نکلیں گی۔ ساتویں یہ کہ دریا سے براہ راست کھیتوں باغوں کو پانی نہیں دیا جا سکتا۔ نہر سے بلا واسطہ دیا جاتا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِۦٓ أَن يَضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوضَةً فَمَا

تحقیق اللہ نہیں حیا فرماتا یہ کہ بیان فرماوے کہاوت کوئی سی مچھر پس وہ جو اوپر ہے

بے شک اللہ اس سے حیا نہیں فرماتا کہ مثال سمجھانے کو کیسی ہی چیز کا ذکر فرماوے مچھر ہو یا اس سے

فَوۡقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا فَيَعۡلَمُوۡنَ اَنَّهُ الۡحَـقُّ مِنۡ
اس کے پس لیکن وہ جو ایمان لائے پس جانتے ہیں تحقیق وہ سچی ہے طرف سے
بڑھ کر تو وہ جو ایمان لائے وہ تو جانتے ہیں کہ یہ ان کے رب کی طرف سے حق ہے اور کافر
رَّبِّهِمۡ‌ۚ وَاَمَّا الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا فَيَقُوۡلُوۡنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ
رب ان کے اور لیکن وہ جو کہ کافر ہوئے پس کہتے کیا وہ جو ارادہ کیا
کہتے ہیں ایسی کہاوت میں خدا کا کیا مقصود ہے اللہ بہتیروں کو اس سے گمراہ
بِهٰذَا مَثَلًا ‌ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيۡرًا ۙ وَّيَهۡدِىۡ بِهٖ كَثِيۡرًا ؕ
اللہ نے ساتھ اس کہاوت کے گمراہ فرماتا ہے ساتھ اس کے بہت کو اور ہدایت دیتا ہے ساتھ اس کے بہت کو
کرتا ہے اور بہتیروں کو ہدایت دیتا ہے۔

تعلق

پہلا تعلق: اس سے پہلے قرآن پاک کی حقانیت دلائل سے ثابت فرمائی گئی اور اس کے ماننے کی جزا اور نہ ماننے کی سزا کا ذکر فرما کر اس پر ایمان لانے کی رغبت دی گئی۔ اب ان شبہات کو دور فرمایا جا رہا ہے۔ جو کہ کفار قرآن پاک پر کرتے تھے جن کی وجہ سے وہ قرآن کو کتاب اللہ نہ مانتے تھے۔ کیونکہ کسی شے کے ثبوت کے لئے جس طرح دلائل کی ضرورت ہے اسی طرح مخالفین کے شبہات کے جوابات کی بھی۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ جنت نیک مومنوں کے لئے ہے۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ مومن وہ ہے جو قرآن کریم کی ہر بات کو بلا چون وچرا تسلیم کرلے

شان نزول

سیدنا عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جب قرآن کریم میں بتوں کو مکڑی کے جالے سے تشبیہ دی گئی تو یہود نے کہا کہ اگر قرآن کریم آسمانی کتاب ہوتا تو اس میں ان حقیر چیزوں کا ذکر نہ ہوتا۔ کیونکہ ایسی چیزوں کا ذکر خدا کی شان کے خلاف ہے۔ ان کی تردید میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ جب منافقین کی حالت کو آگ اور تاریکیوں اور گرج اور بجلی سے تشبیہ دی گئی تو منافقین نے طعنہ دیا کہ اتنی بڑی عظمت والے رب تعالیٰ کو ان مثالوں کی کیا ضرورت پڑی تھی۔ یہ خدائی کتاب نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ طعنہ مشرکین دیا کرتے تھے۔ اس موقعہ پر یہ آیت آئی۔ شان نزول کی یہ سب صورتیں اس طرح جمع ہوسکتی ہیں کہ یہ تینوں جماعتیں جب ایسے واہیات شبہات کر چکیں تب ان سب کی تردید میں یہ آیت کریمہ اتری۔ کیونکہ یہ تینوں جماعتیں بلکہ سارے کفار حضور ﷺ کو ایذا دینے میں متفق تھے۔ اور سورت بقرۃ کے شروع سے اب تک ان تینوں جماعتوں کا ذکر بھی ہو چکا ہے۔ (تفسیر کبیر)

تفسیر

اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖ۔ لَا یستحی۔ حیا سے بنا ہے، جس کے معنی ہیں شرم و غیرت۔ جب بدنامی اور برائی کے خوف سے دل میں کسی کام سے رکاوٹ پیدا ہو جاتی ہے۔ اس رکاوٹ کا نام حیا ہے۔ یہ ایک درمیانی حالت ہے۔ اس کے نیچے ہے، خجالت یعنی شرمندگی اور اس کے اوپر ہے وقاحت۔ جس کے معنی بے غیرتی، بے شرمی۔ ان تینوں میں فرق یہ ہے کہ حیاء کی وجہ سے انسان وہ کام کرتا ہی نہیں۔ خجالت میں کام کر کے شرمندہ ہوتا ہے۔ وقاحت میں بے غیرتی کے کام پر دلیری اور جرات کرتا ہے۔ حیاء اور غضب اور رحمت وغیرہ کے حقیقی معنی سے رب تعالیٰ پاک ہے۔ کیونکہ یہ دل کی صفتیں ہیں اور دل جسموں میں ہوتا ہے۔ لہٰذا حق تعالیٰ پر جہاں کہیں یہ الفاظ استعمال کئے جائیں گے وہاں ان کا نتیجہ مراد ہوگا مثلاً حیا کا نتیجہ ہے کام چھوڑ دینا، غضب کا نتیجہ ہے بدلہ لینا، رحمت کا نتیجہ ہے نفع پہنچانا۔ حق تعالیٰ کے لئے ان الفاظ کے یہی معنی مراد ہیں۔ حیا نہ فرمانے کے معنی ہیں ان مثالوں کو نہ چھوڑنا اَنْ یَّضْرِبَ۔ ضَرْبٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں مارنا، چلنا، مثال بیان کرنا۔ یہاں تیسرے معنی مراد ہیں مثلاً اس کی تحقیق ہم پہلے کر چکے ہیں کہ مثل اس کہاوت کو کہتے ہیں جو عجیب و غریب موقع پر بولی جائے۔ ما یہ لفظ تنکیر یہ ہے جس کی وجہ سے مثلاً کا ابہام اور بھی زیادہ ہوگیا۔ مثلاً کے معنی کہاوت اور مثلاً ما کے معنی ہیں کوئی سی کہاوت۔ تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالیٰ کسی بھی کہاوت سے حیا نہیں فرماتا بَعُوْضَۃً بعض سے بنا جس کے معنی ہیں ٹکڑا۔ چیز کے حصے کو اسی لئے بعض کہتے ہیں کہ وہ کل کا ایک ٹکڑا ہے۔ چونکہ ٹکڑا کل سے چھوٹا اور حقیر ہوتا ہے۔ اس حقارت کے لحاظ سے مچھر کو بعوضہ کہا گیا چونکہ یہ بہت چھوٹا جانور ہے۔ یا اس لئے کہ مچھر گویا مکھی کا ٹکڑا ہے۔ **فَمَا فَوْقَھَا** اس کے معنی ہیں کہ مچھر سے اوپر کی چیزیں۔ اس اوپر میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ اس لفظ سے مچھر سے بڑی چیزیں مراد ہوں جیسے مکھی مکڑی وغیرہ تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ حق تعالیٰ مچھر اور اس سے بڑی چیزوں (جیسے مکھی و مکڑی) وغیرہ کی کہاوت سے شرم نہیں فرماتا۔ دوسرے یہ کہ مچھر سے بھی بڑھ کر حقیر چیزیں مراد ہوں یعنی جو چیزیں کہ مچھر سے بھی زیادہ چھوٹی اور حقیر ہوں تب آیت کے معنی یہ ہوئے کہ حق تعالیٰ مچھر اور اس سے بھی کم تر چیزوں کی کہاوت سے حیا نہیں فرماتا۔ **نکتہ:** مچھر وغیرہ میں چند عجیب خصوصیتیں ہیں ایک یہ کہ بھوکا رہ کر زندہ رہتا ہے۔ پیٹ بھر کر مر جاتا ہے۔ اسی طرح دنیادار مصیبت میں رب کی یاد کرتا ہے۔ عیش میں رب کو بھول جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ چھوٹی چیزیں حق تعالیٰ کی قدرت کو بڑی چیزوں سے زیادہ ظاہر کرتی ہیں۔ کیونکہ چھوٹی چیزوں میں بھی وہی سارے اعضاء موجود ہوتے ہیں جو بڑی میں ہیں۔ چنانچہ مچھر میں ہاتھی کے سارے عضو موجود ہیں۔ حتیٰ کہ اس کی سونڈ بھی ہے۔ بلکہ دو پر اور زیادہ ہیں۔ نیز انسان بڑی چیز کا اچھی طرح فوٹو کھینچ سکتا ہے۔ مگر مچھر وغیرہ کا صحیح فوٹو جس میں کہ اس کے سارے اعضاء موجود ہو جائیں۔ ناممکن ہے **تیسرے:** یہ کہ مچھر ہاتھی کو مار ڈالتا ہے۔ لیکن ہاتھی مچھر کو نہیں مار سکتا۔ **چوتھے:** یہ کہ مچھر بہادر اور دلیر ہے کہ شیر، ہاتھی اور سانپ وغیرہ قوی جانور انسان سے ڈر کر جنگل میں رہتے ہیں۔ لیکن یہ بہادر انسان کے گھروں میں رہے اور آواز دے کر انسان کو کاٹے۔ جس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ چاہے تو چھوٹے سے بڑا کام لے لے۔ اگر مچھر کی سی بہادری شیر اور سانپ میں ہوتی تو کوئی بھی

انسان زندہ نہ رہتا۔ **پانچویں:** یہ کہ بڑے بڑے بادشاہ مچھر سے عاجز ہوئے کہ اس کے دفع کرنے کی صدہا تدبیریں کرتے ہیں۔ مگر اس سے امن نہیں ملتی۔ نمرود جیسے جابر بادشاہ کو ایک مچھر نے اتنے جوتے لگوائے کہ اس کا خدائی کا نشہ دور ہو گیا اور آخر کار مچھر ہی نے اس کو ہلاک کیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ جب بڑے سے بڑا انسان ایک مچھر کو برداشت نہیں کر سکتا تو جہنم کے سانپ بچھو کیسے برداشت کرے گا۔

حکایت: سلطان مامون الرشید خطبہ پڑھ رہا تھا کہ ایک مچھر اس کی آنکھ پر آ بیٹھا۔ بار بار اڑایا مگر وہ دفع نہ ہوا۔ آخر کار سلطان کو خطبہ چھوڑنا پڑا اور کہنے لگا کہ خدا نے مچھر کو کیوں پیدا کیا ہے۔ حضرت مولانا ابو ہذیل بصری نے فرمایا کہ مچھر اس لئے پیدا ہوا تاکہ اس سے بڑے بڑے جابر بادشاہ مجبور ہو کر رب کی قہاری معلوم کریں۔ **چھٹے:** یہ کہ بڑی چیزوں کے راز و اسرار معلوم کرنا آسان لیکن چھوٹی چیزوں کے مشکل فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا۔ اَمَّا میں شرط کے معنی ہیں۔ اسی لئے اس کے جواب میں ''ف'' آتی ہے اور اس سے کلام کی تاکید ہو جاتی ہے۔ زید۔ ذاھب اور اما زید فذاھب میں دوسرا جملہ زائد تاکید والا ہے۔ امنوا سے یا وہ لوگ مراد ہیں جو اس وقت ایمان لا چکے ہیں یا وہ جو علم الٰہی میں مومن ہیں اگرچہ بظاہر ابھی کافر ہوں تو آیت کے معنی یہ ہوئے جو ایمان لا چکے ہیں وہ ان مثالوں کو جانتے ہیں یہیں اور یا یہ کہ جو علم الٰہی میں مومن ہیں وہ عنقریب جان لیں گے کہ یہ حق ہے۔ فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ حق کے چند معنی ہیں۔ صحیح۔ ثابت۔ واجب۔ یہاں پہلے دونوں معنی مراد ہو سکتے ہیں۔ یعنی یہ مثالیں بالکل صحیح ہیں یا یہ مثالیں ایسی مضبوط ہیں کہ جن کے انکار کی گنجائش نہیں۔ حق اور صدق میں یہ فرق ہے کہ صدق یعنی (سچ) وہ ہے جو واقع کے مطابق ہو اور حق (صحیح) وہ ہے کہ واقعہ اس کے مطابق ہو۔ مِنْ رَّبِّهِمْ اس سے معلوم ہوا کہ مومنین ان جیسی مثالوں کی وجہ سے قرآن کے کلام الٰہی ہونے کا انکار نہیں کرتے۔ وہ جانتے ہیں کہ جب مچھر وغیرہ کو پیدا کرنا عیب نہیں تو ان کی مثال دینا کیوں عیب ہوگا۔ بلکہ یہ تو عین حکمت ہے۔ کیونکہ چھوٹی چیز کی مثال چھوٹی سے اور بڑی کی بڑی سے ہی دی جا سکتی ہے۔ چونکہ مومن افضل ہیں کافر ادنیٰ و ارذل۔ لہٰذا یہاں مومنوں کی صفات کا ذکر پہلے ہوا کفار کے عیب کا ذکر بعد میں۔ آگے چونکہ صرف گمراہوں کی تفصیل مذکور ہے۔ وَمَا یُضِلُّ بِهٖۤ الخ مومنوں کو ان کے تقابل سے جانا گیا۔ اس لئے وہاں گمراہوں کا ذکر پہلے ہے ہدایت والوں کا بعد میں کہ فرمایا یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا ۙ وَّ یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا ترتیب کی تبدیلی میں یہ حکمت ہے۔ گمراہی ہماری اصلی حالت ہے۔ ہدایت محض عارضی یہ عطاء رب۔ لہٰذا گمراہی کا ذکر پہلے جیسے تاریکی اصل ہے نور عارضی موت اصل ہے زندگی عارضی۔ اسی لئے رب نے ظلمت کو نور سے پہلے موت کو حیات سے پہلے ذکر کیا کہ فرمایا الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ (انعام: ۱) اور فرمایا خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوةَ (ملک: ۲) نیز دنیا میں گمراہ زیادہ ہیں ہدایت پر کم۔ لہٰذا گمراہی کا ذکر پہلے ہوا۔ وَ اَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا صحیح یہ ہے کہ کفروا سے یہود، مشرکین منافقین سب مراد ہیں۔ کیونکہ سب ہی کا یہ اعتراض تھا فَیَقُوْلُوْنَ یہ لفظ یا تو حال کے معنی میں ہے یا استقبال کے یا دونوں کے بطریق عموم مشترک تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ کفار یہ اعتراض کرتے بھی ہیں اور کریں گے بھی لہٰذا یہ غیب کی خبر ہے۔ اس کی سچائی اب بھی ظاہر ہو رہی ہے کہ عیسائی وغیرہ اب بھی یہ اعتراض کر رہے ہیں۔ مَاذَا یہ مَاذَا استفہامیہ اور ذَا الَّذِیْ کے معنی میں ہے یعنی وہ کون

ہی حکمت ہے۔ اَرَادَ اللّٰہُ بِھٰذَا مَثَلًا یہ ھٰذَا حقارت کے لئے ہے۔ یعنی ان جیسی حقیر مثالوں سے خدا نے کیا ارادہ کیا۔ یُضِلُّ بِہٖ یہ کفار کے سوال کا جواب ہے۔ کیونکہ وہ کہتے تھے کہ اللہ ان حقیر مثالوں سے کیا چاہتا ہے تو جواب دیا گیا کہ یہ مثال کفر و ایمان کی کسوٹی ہے۔ جس سے مومن اور کافر کی پہچان ہوگئی۔ کافروں کو اس کے ذریعے سے گمراہ کر دیا گیا اس طرح کہ ان کی گمراہی کو اور زیادہ کر دیا۔ ورنہ وہ گمراہ تو پہلے ہی تھے۔ جیسے بارش گندے نالے پر پڑے تو اس کی گندگی اور زیادہ پھیل جاتی ہے۔ کیونکہ ان مثالوں پر بفضلہ تعالیٰ کسی مسلمان نے اعتراض نہیں کیا اور نہ کوئی ان کی بناء پر مرتد ہوا۔ یا ان مثالوں کے ذریعہ منافق و مخلص، ضعیف الاعتقاد، پختہ مومنوں میں فرق ہو گیا کہ منافقوں نے ان پر اعتراض کئے۔ ضعفاء ان اعتراض کی وجہ سے تذبذب میں پڑ گئے۔ مگر مخلصوں نے نہ اعتراض کئے نہ اعتراضات سنے اور مومنوں کو ہدایت دی۔ گمراہ کرنے کے معنی وہی ہیں جو ہم ختم اللہ کی آیت میں بیان کر چکے۔ کثیراً یہاں کثیر (بہت) تھوڑوں کے مقابلے میں نہیں ہے۔ بلکہ یہ معنی ہیں کہ اس کے ذریعے بہتیرے گمراہ ہو جاتے ہیں اور بہتیرے ہدایت پا جاتے ہیں۔ وَّیَھْدِیْ بِہٖ کَثِیْرًا۔ یَھْدِیْ سے مراد یا تو ہدایت دینا ہے یا ہدایت پر قائم رکھنا اور یا ہدایت کو کامل بنانا یعنی ان مثالوں سے بہتوں کو ہدایت مل جاتی ہے اور بہت ہدایت پر قائم رہتے ہیں اور بہتوں کی ہدایت کامل ہو جاتی ہے۔

خلاصہ تفسیر

جب قرآن کریم نے اہل عرب کو اپنے مقابلے میں دعوت دی۔ اور کفار نے مقابلے کے لئے ایڑی چوٹی کے زور لگا دیئے پھر بھی ان سے مقابلہ نہ ہو سکا۔ بڑے بڑے علماء و فضلاء کی کمیٹیاں ہوئیں مگر کوئی بھی ایک آیت قرآن جیسی نہ بنا سکا۔ ہاں **مسیلمہ کذاب** نے کچھ سورتیں بنائیں۔ مگر جب وہ خود کفار کے سامنے پیش کی گئیں تو انہوں نے ہی ان کا قہقہہ اڑایا اور حضور علیہ السلام کے سامنے پیش ہونے کا موقع ہی نہ آیا۔ جیسے کہ اس زمانے میں بعض شیعہ علماء نے سورۂ حسنین اور سورۂ فاطمہ بنائیں۔ مگر مارے غیرت کے ان کے ظاہر کرنے کی ہمت نہ کی اور سنا گیا ہے کہ سید احمد خان علی گڑھی نے قرآن پاک میں اپنی طرف سے کچھ ترمیم کی۔ مگر یہ سب چیزیں دنیا کے سامنے آنے سے پہلے ہی گم ہوگئیں۔ تو کفار کو تو اور کچھ بن نہ پڑا۔ یہ کہنے لگے کہ اگر یہ قرآن شریف خدائی کلام ہوتا تو اس میں ایسی چھوٹی اور حقیر چیزوں سے مثل کیوں دی جاتی اتنی بڑی ذات اور ایسی چھوٹی چیزوں کا ذکر کرے۔ خدا تعالیٰ ان کا جواب دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ حق تعالیٰ چھوٹی چیزوں کی مثال سے کچھ شرم نہیں فرماتا۔ کیونکہ مثال سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ معقول چیز محسوس بن کر ہر ایک کی سمجھ میں آجائے اور اس کے ذریعے مضمون کو دل قبول کرے۔ کسی چیز کا جیسا حال ہوگا اسی قسم کی چیز سے اس کی مثال دی جائے گی۔ بڑی چیز کی مثال بڑی اور حقیر چیز کی مثال حقیر اس پر اعتراض کرنا محض غلط اور بیجا ہے بلکہ یہ تو کمال حکمت ہے کہ مثال اصل کے مطابق ہو حقیر چیزوں کی مثال چھوڑ دینی اور ان کو بغیر مثال لانا ان کے سمجھانے کے لئے کافی نہ ہوگا۔ مثل مشہور ہے کہ مثال اقوال کا چراغ ہے۔ چراغ خواہ سونے کا ہو خواہ مٹی کا روشنی میں فرق نہیں رکھتا۔ ہاں فحش و گندی باتیں جھوٹی خبریں اللہ تعالیٰ کی شان کے خلاف ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم ان دونوں سے پاک ہے۔ اے کافرو اتم جو کہتے ہو کہ ان معمولی مثالوں سے مقصد کیا ہے تو

اصلی مقصد جو تھا وہ بتا دیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان سے یہ فائدہ بھی حاصل ہوا بے ایمانوں کی بے ایمانی اور ایمان داروں کے ایمان ان مثالوں کو سن کر اور بڑھ گئے۔ یہ مثالیں اس پانی کی طرح ہیں جو کھاری زمین میں پہنچ کر کانٹے وغیرہ عمدہ زمین میں گلاب وچنبیلی وغیرہ لگاتا ہے۔ بارش تو ایک ہی ہے مگر مختلف زمینوں میں مختلف اثر کرتی ہے۔ اسی طرح مثالیں ایک ہیں مگر مسلمانوں کے دلوں میں پہنچ کر اور اثر کرتی ہیں اور کفار کے قلوب میں اور۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک** یہ کہ جب ضدی انسان دلائل سے عاجز ہوتا ہے تو وہم اور بے جا شکوک کی دلدل میں پھنس جاتا ہے۔ اسی لئے بزرگان دین فرماتے ہیں کہ ہدایت دلیلوں سے نہیں ملتی بلکہ حق تعالیٰ کے فضل سے **دوسرے** یہ کہ بری چیز کا جاننا اور اس کا ذکر کرنا برا نہیں ہاں فحش طریقے سے بیان کرنا برا ہے۔ اس سے دیوبندیوں کا یہ اعتراض بھی اٹھ گیا کہ حضور ﷺ کے علم سے شیطان کا علم زیادہ ہے۔ کیونکہ شیطان بری چیزوں کو بھی جانتا ہے اور حضور کے لئے ان کا جاننا عیب ہے۔ **تیسرے** یہ کہ بدکاروں کے لئے اچھا وعظ بجائے فائدے کے نقصان پہنچاتا ہے۔ یہ وعظ کی خرابی نہیں بلکہ اس کے دل کی خرابی ہے۔ **چوتھے** یہ کہ قرآن ایک ہے۔ مگر اس کے دیکھنے والی نظریں دو قسم کی۔ قبول کی نظر۔ اعتراض کی نظر۔ پہلوں کو ہدایت اور دوسروں کو اس سے گمراہی ملتی ہے۔ یہ قرآن کا قصور نہیں بلکہ نظر کا فتور ہے۔ یہی حال صاحب قرآن علیہ السلام کے جمال پاک میں ہے۔ صدیقی نگاہ سے دیکھنے والے صحابی بن گئے اور ابوجہلی نظر سے مشاہدہ کرنے والے طاغی وعذابی ہو گئے۔ ماں اپنے بچے کو اور نظر سے دیکھتی ہے۔ ڈائن دوسری نظر سے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: قرآن کریم میں کہیں بھی مچھر سے تشبیہ نہیں دی گئی۔ ہاں مکڑی اور مکھی کا ذکر ضرور آیا ہے۔ تو یہاں یہ فرمانا کہ رب تعالیٰ مچھر کی مثال سے شرم نہیں فرماتا کیونکر صحیح ہوگا۔ **جواب:** یہ کفار کے اعتراض کا کامل طور پر جواب ہے یعنی اے کافرو تم تو مکھی اور مکڑی کے ذکر سے مرے جا رہے ہو حق تعالیٰ تو مچھر بلکہ اس سے بھی حقیر چیز کے ذکر سے نہیں شرماتا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کہیں مچھر کا ذکر آیا ہے۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ مومنین بہت ہیں۔ کیونکہ ارشاد ہوا وَّیَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا مگر دوسری جگہ فرمایا گیا وَ قَلِیْلٌ مِّنْ عِبَادِیَ الشَّكُوْرُ (سبا: ۱۳) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شکر گزار بندے تھوڑے ہیں۔ **جواب:** مومنین تعداد میں لاکھوں کروڑوں ہیں۔ لہٰذا بہت ہیں۔ لیکن کفار کے مقابلے میں کم۔ اس آیت میں ان کی تعداد کی زیادتی مراد ہے۔ اور وہاں کفار کے مقابلے میں کمی۔ نیز مومن اگرچہ کافروں سے بظاہر کم ہیں لیکن حقیقت میں ان سے زیادہ کیونکہ یہ سچے ہیں اور وہ جھوٹے اور تھوڑے سچے بہت جھوٹوں سے زیادہ ہیں۔ اسی لئے حدیث پاک میں ارشاد ہوا کہ بڑے گروہ کے ساتھ رہو اگر ایک آدمی بھی حق پر ہے تو وہ ہی بڑا گروہ ہے کیونکہ حق اعظم (بڑا) ہے۔ (تفسیر روح البیان شرح فقہ اکبر ملا علی قاری) اس لئے کہ اس ایک کے ساتھ پچھلا سارا بڑا گروہ ہے۔ لہٰذا اس آیت میں مسلمانوں کی حقیقی زیادتی بیان ہوئی اور کفار کی تعداد کی زیادتی اور وہاں مسلمانوں کی تعداد کی کمی۔

تیسرا اعتراض: اس آیت میں یہ تو بتایا گیا ہے کہ اللہ چھوٹی چیزوں کے ذکر سے حیا نہیں فرماتا۔ مگر اس کی وجہ نہیں بتائی گئی کہ کیوں حیا نہیں کرتا۔ لہٰذا کفار کا اعتراض ویسا ہی باقی رہا۔ کیونکہ وہ کہہ سکتے ہیں کہ جو اس سے حیا نہ کرے وہ خدا نہیں۔ **جواب:** یہ مسئلہ بالکل ظاہر تھا۔ اس لئے اس کی وجہ بتانے کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ قرآن کریم عربی زبان میں آیا اور اہل عرب عام چھوٹی بڑی مثالیں دیا کرتے ہیں۔ قرآن نے بھی مثالیں دیں تو کیا خرابی ہوئی۔ مشرکین تو اس سے خاموش ہو گئے۔ رہے یہودی وغیرہ ان سے کہا جا سکتا ہے کہ توریت و انجیل میں صدہا اس قسم کی مثالیں موجود ہیں۔ بتاؤ تم انہیں خدائی کتاب مانتے ہو یا نہیں۔ چنانچہ انجیل میں مثال دی گئی کہ کسی نے اپنے کھیت میں گیہوں بوئے۔ جب یہ سو گیا تو اس کے دشمن نے اس میں منمنے (گیہوں کی طرح زہریلے دانے) بکھیر دیئے۔ اس کے غلاموں نے عرض کیا کہ مولیٰ تیرے کھیت میں گیہوں کے ساتھ منمنے بھی پیدا ہو گئے۔ اس نے جواب دیا کہ ابھی (ان کو نہ اکھیڑو ورنہ گیہوں بھی اکھڑ جائیں گے) غرضیکہ یہ دونوں قسم کے درخت پرورش پاتے رہے۔ جب کھیت کاٹا گیا تب گیہوں کو علیحدہ اور منمنوں کو علیحدہ کر دیا گیا۔ منمنے جلا دیئے گئے اور گیہوں مکان میں بھیج دیئے گئے۔ اسی طرح حضرت آدم علیہ السلام نے زمین پر اپنی نیک اولاد پیدا کی۔ شیطان نے اس میں برائیوں کے بیج بھی ڈال دیئے۔ یہ دونوں قسم کے لوگ دنیا میں رہتے سہتے رہے۔ مگر پھر بوقت موت مالک نے ان دونوں قسم کے لوگوں کو علیحدہ کر دیا۔ دیکھو اس میں گیہوں اور منمنوں کی مثال بیان فرمائی (روح البیان تفسیر کبیر و عزیزی) اسی طرح انجیل میں ارشاد ہوا کہ ''اے لوگو! تم چھلنی نہ بنو جس میں آٹا نکل جاتا ہے اور بھوسی رہ جاتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے منہ سے حکمت کی باتیں نکل جائیں اور سینوں میں حسد رہے۔ غرضیکہ اس قسم کی مثالیں بہت ہیں۔ اب بتاؤ کہ انجیل خدائی کتاب ہے یا نہیں اگر ہے اور ضرور ہے تو اس میں بھی تو ایسی مثالیں موجود ہیں۔ لہٰذا اگر قرآن کریم میں بھی ایسی مثالیں ہوں تو کیا حرج ہے۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ گمراہ کرتا ہے۔ مگر دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان یا سرداران کفار لوگوں کو گمراہ کرتے چنانچہ فرمایا گیا وَاَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهٗ (طٰہٰ:۷۹) اور ارشاد ہوا کہ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِیُّ (طٰہٰ:۸۵) نیز فرمایا گیا کہ شیطان نے عرض کیا تھا وَّلَاُضِلَّنَّهُمْ (النساء:۱۱۹) تو ان آیات میں مطابقت کس طرح ہوگی۔ نیز جو گمراہ کرے اس سے بچنا چاہئے۔ تو کیا حق تعالیٰ سے بچنا چاہئے۔ **جواب:** اس کا تفصیلی جواب تو آیت ختم اللہ کی تفسیر میں گزر گیا۔ اس جگہ تفسیر کبیر میں اس کے بہت سے جواب دیئے گئے ہیں۔ سب میں بہتر یہ ہے کہ یہاں تین صورتیں ہیں۔ گمراہی پیدا فرمانا۔ یا گمراہی کے اسباب جمع کر دینا یا گمراہی کی رغبت دینا۔ گمراہی اختیار کرنا۔ شیطان انسان کو گمراہی کی رغبت دیتا ہے اور اس کے اسباب جمع کرتا ہے۔ انسان ان اسباب کو اختیار کرتا ہے۔ اس کے بعد حق تعالیٰ اس میں گمراہی پیدا فرماتا ہے۔ لہٰذا ایک ہی گمراہی کی نسبت شیطان کی طرف تو اور معنی سے ہے۔ اور اس گمراہ کرنے کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف دوسرے معنی سے دیکھو کسی نے چھری سے بکری ذبح کی تو یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فلاں شخص نے بکری کی جان لے لی اور یہ بھی کہ چھری نے جان لے لی۔ اور یہ بھی کہ حق تعالیٰ نے جان لے لی یہ تین نسبتیں تین معنی سے ہیں۔ انسان اور چھری جان نکلنے کا سبب بعید یا سبب قریب ہیں اور حق تعالیٰ حقیقۃً اس کی موت کا خالق۔ لہٰذا یہ تمام

آیات مطابق ہیں۔ پھر گمراہی کی رغبت دینے والے سے بچنا ضروری ہے نہ کہ خالق سے بلکہ شیطان سے بھاگ کر خالق کی امن میں آنا چاہئے۔ **پانچواں اعتراض:** اللہ تعالیٰ نے انسان کو گمراہ ہونے کا اختیار بھی کیوں دیا گمراہی کا اختیار دینا بھی برا ہے۔ **جواب:** بندے میں اختیار پیدا کرنا برا نہیں بلکہ اس کا غلط استعمال کرنا برا ہے۔ سپاہی کو حکومت ہتھیار دیتی ہے۔ دشمن کو مارنے کے لئے۔ جو سپاہی اپنے ہی آدمی کو اس ہتھیار سے مارے تو سپاہی مجرم ہے۔ نہ کہ حکومت۔ رب نے ہم کو تمام قوتیں، اختیارات نیکیاں کرنے کو دیئے فرمایا۔ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات: ۵۶) ہم اگر ان قوتوں کو حرام میں خرچ کریں تو ہم مجرم ہیں۔ چونکہ ابھی آیت کا مضمون مکمل نہیں ہوا۔ لہٰذا اس کی تفسیر صوفیانہ آئندہ بیان ہوگی۔

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ
اور نہیں گمراہ کرتا ساتھ اس کے مگر ان بدکاروں کو جو کہ توڑتے ہیں
اور اس سے انہیں گمراہ کرتا ہے جو بے حکم ہیں اور جو اللہ کے عہد کو توڑ دیتے ہیں
عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ
وعدہ اللہ کا پیچھے مضبوطی اس کی کے اور کاٹتے ہیں اس کو کہ حکم دیا اللہ نے
پکا ہونے کے بعد اور کاٹتے ہیں اس چیز کو جس کے
بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ
جس کا یہ کہ جوڑا جائے اور فساد پھیلاتے ہیں بیچ زمین کے یہ لوگ ہی
جوڑنے کا خدا نے حکم دیا اور زمین میں فساد پھیلاتے ہیں
الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾
نقصان والے ہیں
وہ ہی نقصان میں ہیں

تعلق

اس آیت سے پہلے فرمایا گیا تھا کہ رب ان مثالوں سے بہت سے لوگوں کو گمراہ فرماتا ہے۔ مگر ان لوگوں کی تفصیل نہ فرمائی تھی کہ کن کو اب گمراہ ہونے والوں کی تفصیل فرمائی جارہی ہے۔ مگر چونکہ گمراہوں کی تفصیل سے ہدایت والوں کی تفصیل خود بخود حاصل ہو جائے گی اس لئے ان کی تفصیل نہ فرمائی گئی۔ یعنی جن لوگوں میں یہ مذکورہ عیب ہیں وہ تو اس سے گمراہ ہوتے ہیں جس سے معلوم ہوا کہ جن میں یہ عیوب نہ ہوں وہ ہدایت پاتے ہیں۔

تفسیر

وَمَا يُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ۔ فَاسِقِيْنَ فسق سے بنا ہے۔جس کے لغوی معنی ہیں نکلنا۔اہل عرب کہتے ہیں فَسَقَتِ الرُّطَبَةُ عَنْ قِشْرِهَا یعنی چھوہارا اپنے پوست سے باہر آ گیا۔شریعت میں اس کے معنی ہیں۔حق تعالیٰ کی اطاعت سے نکلنا۔فاسق وہ نافرمان بندہ ہے جو گناہ کبیرہ کرے۔فسق کے تین درجے ہیں۔تغابی، انہماک، جحود،تغابی یہ کہ آدمی اتفاقی طور پر کسی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو جائے مگر اس کو برا ہی جانتا رہے۔انہماک یہ کہ گناہ کبیرہ کا عادی ہو گیا اس سے بچنے کی پرواہ نہ کرے مگر اس کو گناہ جانے۔جحود یہ کہ حرام کو اچھا جاننے لگا یعنی اس کی حرمت کا انکار کر دیا یہ درجہ کفر ہے۔پہلے دو درجے کفر نہیں۔اس انکار کی بہت سی صورتیں ہیں۔رب کا انکار، نبی کا انکار وغیرہ۔ان سب کی اصل نبوت کا انکار ہے۔جس سے سارے انکار پیدا ہو جاتے ہیں۔ابلیس نے اولاً نبوت کا انکار کیا اب رب کے سارے احکام کا انکاری ہے۔اسی لئے حضور ﷺ نے پہلی تبلیغ میں اپنا اقرار کرایا۔پھر توحید وغیرہ کا جو شخص کفر و شرک کے علاوہ کیسے ہی گناہ کرے مگر عقیدہ نہ بگڑا ہو تو اگرچہ گنہگار ہوگا کافر نہ ہوگا۔حق تعالیٰ فرماتا ہے۔وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا (حجرات:۹) اگر مسلمانوں کے دو گروہ آپس میں قتال کریں۔مسلمان کا قتل سخت جرم ہے۔مگر قاتل کو قرآن نے مومن فرمایا۔یہاں فاسقین سے یہ تیسرے درجے والا فاسق ہی مراد ہے۔قرآن کریم فرماتا ہے اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (التوبہ:۶۷) یہاں منافق کو جو کافر ہے فاسق فرمایا الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ یہ لفظ نقض سے بنا ہے۔جس کے معنی ہیں کھولنا۔چونکہ وعدہ اور عہد اس رسی سے مشابہ ہے۔جس سے کسی کو مضبوط باندھا جاتا ہے۔اس لئے وعدہ خلافی کرنے اور عہد توڑنے کو نقض فرمایا گیا عَهْدَ اللّٰهِ عہد کے معنی ہیں حفاظت۔جس کا خیال رکھا جاوے۔اسے بھی عہد کہتے ہیں۔گھر اور زمانے کو بھی اس لئے عہد کہا جاتا ہے کہ اس کا بھی خیال رکھا جاتا ہے۔اب عہد اس وعدے کو کہنے لگے جس کے پورا کرنے کا بہت خیال رکھا جاوے تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ قرآن کریم سے وہ فاسق گمراہ ہوتے ہیں جو اللہ سے وعدہ خلافی کرتے ہیں۔اس میں اختلاف ہے کہ اس عہد سے کون سا عہد مراد ہے۔بعض حضرات فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے پہلی کتابوں میں لیا تھا کہ جو کوئی زمانہ خاتم النبیین کا پائے وہ ان پر ایمان لائے۔اس سے وہ ہی بنی اسرائیل مراد ہوں گے۔جنہوں نے حضور ﷺ کا زمانہ پا کر ایمان قبول نہ کیا۔دوسرا قول یہ ہے کہ اس سے وہ عہد مراد ہے جو منافقین اسلام لاتے وقت کرتے تھے۔اس صورت میں منافقین ان میں داخل ہوں گے۔بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس عہد سے مراد میثاق کا عہد ہے۔اس دن تین عہد لئے گئے تھے۔ایک سارے انسانوں سے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى (اعراف:۱۷۲) یعنی یہ کہ حق تعالیٰ کی ربوبیت کا اقرار کریں۔دوسرے انبیاء سے کہ رسالت کی تبلیغ کریں اور دین کو قائم رکھیں جس کا ذکر اس آیت میں ہے وَاِذْ اَخَذْنَا مِنَ النَّبِيّٖنَ مِيْثَاقَهُمْ (احزاب:۷) تیسرا علماء سے کہ حق کو نہ چھپائیں۔اس کا بیان اس آیت میں ہے کہ وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ (آل عمران:۱۸۷) اس صورت میں اس آیت سے سارے ہی کفار مراد ہیں ــــ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ میثاق وثق سے بنا ہے۔جس کے معنی ہیں مضبوطی۔بعضوں نے فرمایا کہ انبیاء کرام کا تشریف لانا آسمانی کتابوں کا اترنا علماء کرام کے وعظ یہ اس کی پختگی

ہے۔ یہ مصدر ہے جیسے میلاد اور میعاد۔ اس کے معنی ہیں مضبوط کرنا آیت کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کافر گمراہ ہوتے ہیں۔ جو اپنے عہد کو مضبوط کر کے توڑ دیتے ہیں۔ اس میں بہت گفتگو ہے کہ اس جگہ عہد کی مضبوطی سے کیا مراد ہے۔ بعضوں نے فرمایا کہ دنیا میں توحید و رسالت کے جو دلائل قائم فرمائے گئے ہیں وہ اس وعدے کی مضبوطی ہے۔ بعضوں نے فرمایا کہ انبیاء کرام کا تشریف لانا آسمانی کتابوں کا اترنا علماء کرام کے وعظ یہ اس کی پختگی ہے بعض نے فرمایا کہ بنی اسرائیل حضور کی تشریف آوری سے پیشتر قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ ہم نبی آخر الزمان پر ایمان لائیں گے۔ یہ اس عہد کی مضبوطی تھی۔ پھر آپ کا زمانہ پا کر کفر کرنا اس کا توڑنا ہوا۔ بعض نے فرمایا کہ کفار جب مصیبت میں پھنستے ہیں تو عہد کر لیتے ہیں۔ کہ اگر خدا ہم کو اس سے نجات دے تو ہم نیک بن جائیں گے۔ مگر نجات پا کر پھر اسی گمراہی پر قائم رہتے ہیں۔ وَيَقْطَعُونَ۔ قَطْعٌ سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں کاٹنا توڑنا نقض و قطع میں یہ فرق ہے کہ نقض رسی کے کھولنے کو کہتے ہیں۔ جس سے اس کی بناوٹ بگڑ جائے اور قطع کاٹنے کو کہ جس سے بناوٹ تو قائم رہے لیکن بیچ سے ٹوٹ جائے۔ جو شخص رشتہ داروں کے حقوق ادا نہیں کرتا تو اس کا رشتہ تو قائم رہتا ہے مگر محبت ٹوٹ جاتی ہے۔ مگر جو وعدے پر قائم نہیں رہتا اس کا وعدہ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہاں نقض فرمایا گیا تھا کہ اور یہاں قطع مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ یہ کفار کا دوسرا عیب ہے۔ یعنی وہ ان رشتوں کو توڑ دیتے ہیں جن کے جوڑنے کا حکم دیا تھا۔ اس آیت میں بہت گنجائش ہے۔ اس میں دنیا و دین کے سارے تعلق آ گئے۔ اس کی تفصیل کے لئے دفتر چاہئیں۔ ہم ایسا مختصر سا قاعدہ عرض کرتے ہیں جس سے تمام رشتوں کا حال معلوم ہو جائے، انسان کے رشتے اور تعلق کل دو قسم کے ہیں۔ ایک روحانی دوسرا جسمانی۔ روحانی پانچ ہیں۔ ایک حق تعالیٰ سے دوسرا انبیاء کرام سے تیسرا آسمانی کتابوں سے، چوتھا علماء اور مشائخ سے۔ پانچواں عام مسلمانوں سے۔ اسی طرح جسمانی رشتے بھی چند ہیں۔ ماں باپ سے، اولاد سے، بھائی بہن سے، بیوی سے۔ عام قرابت داروں سے۔ اپنے گھر کے پالے ہوئے جانوروں سے جس جگہ رہتے ہیں اس جگہ سے۔ کامل وہ شخص ہے جو ان تمام حقوق کو پورا کر کے دنیا سے جائے۔ اللہ کی عبادت کرے۔ انبیاء پر ایمان لائے۔ حضور ﷺ کی اطاعت کرے۔ ساری آسمانی کتابوں کی عزت کرے۔ علماء و مشائخ کی خدمت کرے۔ مسلمانوں پر مہربان رہے۔ ماں باپ کو راضی رکھے۔ بیوی بچوں کو کمائی کر کے کھلائے۔ اہل قرابت کی مصیبت میں کام آئے وغیرہ وغیرہ۔ پھر جس کا احسان زیادہ اس کا حق مقدم۔ اسی لئے سارے حقوق سے اللہ و رسول کے حق زیادہ قوی ہیں کہ رب سے جان ملی۔ ان سے ایمان۔ پھر جسمانی حقوق والوں کے مقابلے میں روحانی حقوق اعلیٰ ہیں۔ اسی لئے عالم اور شیخ کا حکم ماں باپ کے حکم پر مقدم۔ کیونکہ ماں باپ ہم کو اوپر یعنی عالم ارواح سے نیچے لائے۔ اور علماء و مشائخ نے ہم کو نیچے سے اوپر پہنچایا۔ پھر جسمانی رشتہ داروں میں بھی یہ ترتیب ہے کہ حق بقدر احسان سب سے مقدم۔ ماں کا حق پھر باپ کا پھر دیگر اہل قرابت کا۔ حقوق کی پوری تحقیق انشاء اللہ تیرہویں سیپارہ میں کی جائے گی۔ خیال رہے کہ جس نے اپنا رشتہ غلامی حضور سے مضبوط کر لیا اس نے سارے رشتے جوڑے اور جس نے حضور سے رشتہ غلامی توڑ لیا اس نے سارے رشتے توڑ دیئے۔ حضور کے رشتے میں سارے رشتے آ جاتے ہیں۔ اس لئے کافر اگر عمر بھر اللہ کی عبادت اور والدین کی اطاعت کرے۔ تمام حق داروں کے حقوق ادا کرتا رہے، اس آیت میں داخل رہے گا۔ سچا مومن کبھی ان رشتوں کو توڑ سکتا ہی نہیں۔

دیکھو اہل عرب اسلام سے پہلے رشتے توڑ چکے تھے۔ بت پرستی، بچیوں کو زندہ دفن کرنا، زندہ جانوروں کے اعضاء کھا جانا ان کا عام طریقہ تھا۔ مسلمان ہو کر ان کے سارے رشتے جڑ گئے۔ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ یہ کفار کا تیسرا عیب ہے۔ کہ زمین میں فساد پھیلاتے ہیں یا اس طرح کہ ایمان قبول نہیں کرتے یا اس طرح کہ لوگوں کو ایمان سے روکتے ہیں یا اس طرح کہ مال اور عزت کے طمع میں بری رسمیں پھیلاتے ہیں یا اس طرح کہ شہوت اور غصے میں پھنس کر قتل اور خون اور مار پیٹ گالی گلوچ کرتے ہیں۔ چونکہ ان کو زمین میں رب تعالیٰ کی اطاعت کے لئے بھیجا گیا تھا اور وہ کافر رہے۔ لہٰذا کافر رہ کر جو کام بھی کریں وہ فساد ہی ہے۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ یہ کفار کے عیوب کا انجام ہے۔ یعنی جنہوں نے وہ ذکر کیے ہوئے عیب اختیار کیے وہ سخت نقصان میں رہے۔ تاجر کو نقصان تین قسم کا ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ اصل رقم لوٹ آئے نفع حاصل نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ اصل رقم بھی پوری وصول نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ اصل رقم کے علاوہ بھی نقصان ہو۔ یہ کفار تیسری قسم کا خسارہ پانے والے ہیں۔ کیونکہ ان کو ہاتھ پاؤں آنکھ ناک، زبان عقل و ہوش کی رقم عطا فرمائی گئی تھی کہ اس سے تجارت کر کے نیک اعمال کا نفع حاصل کریں۔ انہوں نے کفر کر کے اعمال تو کیا۔ اصل پونجی بھی برباد کر دی۔

خلاصه تفسیر

اس سے پہلے معلوم ہوا تھا کہ قرآن کریم سے بعض لوگ گمراہ بھی ہو جاتے ہیں۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ وہ گمراہ ہونے والے کون ہیں۔ اس آیت کو دیکھ کر ہر شخص اپنے گریبان میں منہ ڈالے اور سوچے کہ میں کس زمرے میں ہوں۔ فرمایا گیا کہ جس میں یہ چار عیب ہیں وہ کبھی بھی قرآن پاک سے ہدایت حاصل نہیں کر سکتے ایک یہ کہ اللہ کی اطاعت سے باہر رہے اور اس کی ذات وصفات کا انکار کرے۔ دوسرے یہ کہ اللہ سے جو عہد کیا تھا اس کو مضبوط کر کے توڑ دے۔ خواہ میثاق والا عہد توڑے یا اسلام لاتے وقت جو عہد کیا تھا اس کو توڑے یا مرشد کے ہاتھ پر بیعت ہوتے وقت جو استقامت کا عہد کیا تھا اس کو توڑے۔ تیسرے یہ کہ جن حقوق کی ادائیگی کا حکم تھا اور جن رشتوں کے جوڑنے کا فرمان تھا ان کے پورا کرنے میں کوتاہی کرے۔ یعنی رب کی توحید انبیاء کی نبوت آسمانی کتابوں کی حقانیت کا قائل نہ ہو علماء مشائخ کی بات نہ مانے۔ قرابت داروں کے حقوق ادا نہ کرے۔ ان کی مصیبت میں کام نہ آئے۔ چوتھے یہ کہ حرام کام کر کے زمین میں فساد پھیلائے۔ ایسا شخص قرآن کریم سے ہرگز نفع حاصل نہیں کر سکتا بلکہ وہ پورا نقصان و خسارے میں ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک** یہ کہ اصل ایمان محض قرآن کے پڑھنے سے نہیں ملتا۔ کیونکہ ایمان تخم ہے اور قرآن پاک بارش کا پانی۔ بارش کا پانی ہر جگہ پہنچتا ہے۔ لیکن جہاں جیسا بیج ہوگا ویسا ہی درخت اگے گا۔ یہ تخم در حقیقت محبت خدا و رسول ہے۔ جو کہ محض فضل الٰہی سے حاصل ہوتی ہے۔ **دوسرا فائدہ:** یہ کہ وعدہ عہد اور میثاق میں کچھ تھوڑا فرق ہے۔ وعدہ تو یہ ہے کہ کسی کو بھلائی کا امیدوار بنایا جائے۔ اس کی حفاظت کی ذمہ داری ہو یا نہ ہو۔ میں نے آپ سے زبانی کہہ دیا کہ تم کو فلاں چیز دوں گا۔ کوئی ایسا ظاہری انتظام نہ کیا جس سے کہ مجھے پورا کرنا پڑ جائے۔ عہد وہ وعدہ ہے جس

کے پورا کرنے کی ذمہ داری بھی ہو اور اس کے علاوہ کوئی اور پختگی بھی جیسے میں آپ سے کوئی وعدہ کروں اس پر گواہ بھی بنا لوں۔ تحریر بھی کر دوں اور اس تحریر کی رجسٹری بھی کرا دوں۔ جیسا وعدہ ویسی ہی اس کی ذمہ داری۔ عام وعدہ کے خلاف کرنا بھی جرم عہد کی مخالفت کرنا اس سے زیادہ جرم میثاق توڑنا سب سے بڑھ کر جرم حق تعالیٰ نے بندوں سے نہایت مضبوط عہد و پیمان لئے تھے۔ اب جو اس کو توڑنے وہ یقیناً حکومت الہیہ کا مجرم ہے۔ **تیسرا فائدہ:** یہ کہ بادشاہ کی فرماں برداری کے لئے جو بھی کشت و خون وغیرہ کیا جائے وہ فساد نہیں۔ بلکہ عین اصلاح ہے۔ مگر اس کی مخالفت کرنا بغاوت اور فساد، ڈاکوؤں اور پولیس میں گولی چلی بہت کشت و خون ہوا۔ ان دونوں نے ایک ہی سا کام کیا مگر ڈاکو فسادی ہیں اور پولیس مصلح ہیں۔ اسی طرح کفار اور مسلمانوں میں فی سبیل اللہ جنگ ہو تو کفار مفسد ہیں اور مسلمان مصلح۔ اسی طرح عالم دین کوئی ضروری مسلہ بیان کرے اور بدمذہب اس پر شور مچائیں۔ فتنہ برپا کریں۔ اگرچہ لوگ تو اس کو فساد کہتے ہیں لیکن اللہ کے نزدیک وہ عالم دین مصلح ہے۔ یزیدی اور حسینی لشکروں میں جنگ ہوئی۔ یقیناً حضرت حسین رضی اللہ عنہ مصلح تھے اور یزید مفسد۔ **چوتھے:** یہ کہ اگر انسان اپنے جسم کو دنیوی کاموں میں مشغول رکھے اور آخرت کو بھول جائے وہ چاہے امیر کبیر بن جائے نقصان میں ہے۔ اور جو شخص رب کو راضی رکھے خواہ وہ غریب ہی رہے فائدے میں ہے کیونکہ زندگانی کا مقصود رضائے الٰہی ہے۔ **پانچویں:** یہ کہ قرآن شریف سے ہدایت وہی حاصل کر سکتا ہے جس کا رشتہ غلامی حضور سے قائم ہوا گر ان سے کٹا تو قرآن سے گمراہی ملے گی جیسا کہ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ سے معلوم ہوا۔ اس لئے کافر کو پہلے قرآن نہیں پڑھاتے۔ کلمہ پڑھا کر حضور سے رشتہ غلامی قائم کرتے ہیں پھر قرآن پڑھاتے ہیں۔ حضور نے پہلی تبلیغ میں پہلے اپنی پہچان کرائی پھر اور کچھ فرمایا غرضیکہ قرآن کتاب اللہ ہے۔ حضور نور اللہ ہیں۔ نور کے بغیر کتاب نہیں فائدہ دیتی۔

تفسیر صوفیانہ

الفاظ لباس ہیں اور حقیقت معنے اس کی اصل بصارت (آنکھوں) سے تو لباس اور بصیرت (دل کی روشنی) سے حقیقت معلوم ہوتی ہے۔ کفار چونکہ دل کے اندھے تھے اس لئے ان کے کانوں میں ان مثالوں کے فقط الفاظ پہنچے۔ جیسے جانور کے کان میں مالک کی فقط آواز پہنچتی ہے۔ اس لئے وہ کہنے لگے کہ یہ الفاظ بے معنی ہیں۔ لیکن مومنین نور ایمان سے حقیقت کو دیکھ کر کہتے تھے کہ نہیں، یہ رب کا کلام ہے چونکہ نور ایمان سے نور قرآن اور نور قرآنی سے رضائے رحمان اور حور و قصور جناں (جنت کی حوریں اور محل) حاصل ہوتے ہیں جو اس نور سے محروم وہ ہر نعمت سے محروم وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى (الاسراء: ۷۲) جو یہاں اندھا وہ وہاں بھی اندھا۔ چونکہ رحمان غفار بھی ہے اور قہار بھی اس لئے اس کا قرآن شفا بھی ہے اور شقاء (بدنصیبی) بھی۔ شقاء ان لوگوں کے لئے ہے جو پیدائش کے دن نور کے چھینٹے سے بچ کر فاسق ہو گئے۔ اور توحید، عبادت اور اخلاص کے وعدے کو توڑ بیٹھے۔ اور جنہوں نے اس راستے کو کاٹ دیا جو حق سے ملانے والا تھا اور جس پر چلنے کا حکم تھا۔ یعنی خالق کو چھوڑ کر مخلوق سے ملے اور دل کی زمین کو بگاڑ دیا وہ اس طرح کہ نہ تو اس میں توحید کا بیج بویا اور نہ اس کو انبیاء کرام کی اطاعت کے پانی سے سیراب کیا۔ بلکہ شرک کا تخم بو کر اغیار کی صحبت سے اس کو خراب پانی دیا۔ لہٰذا وہ اس میں

سخت نقصان میں رہے۔ کیونکہ ان کے فطری ایمان کی کھیتی اس پانی کے نہ ملنے کی وجہ سے خشک ہو گئی۔ اب جبکہ مومنین اپنا کھیت کاٹیں گے تو یہ حسرت سے ہاتھ کاٹیں گے اور جب مومنین پھل کھائیں گے تو یہ غم کھائیں گے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کافروں کو گمراہ کرتا ہے۔ کافر تو پہلے ہی گمراہ ہیں انہیں گمراہ کرنے کے کیا معنی۔ **جواب:** گمراہی کے بہت درجے ہیں۔ کفار نے ایمان قبول نہ کر کے اس کا پہلا درجہ حاصل کیا۔ پھر جس قدر قرآن پاک کا انکار کرتے گئے۔ گمراہی میں ترقی کرتے گئے یا یہ کہ قرآن سے پہلے بھی ان میں گمراہی موجود تھی مگر ظاہر نہ تھی۔ قرآن پاک سے اس کا ظہور ہوا۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو کافر رشتوں کو توڑے وہ گمراہ ہے اور صدہا کافر اپنے ماں باپ کی خدمت کرتے ہیں۔ خیرات صدقات کرتے ہیں۔ اللہ کے بندوں کو اپنے پیسے سے نفع پہنچاتے ہیں چاہئے کہ وہ گمراہ نہ ہوں۔ **جواب:** رشتہ جوڑنا اور حقوق کا ادا کرنا جب ہی معتبر ہے۔ جبکہ اللہ و رسول کی رضا مندی کے لئے ہو۔ جو شخص ماں باپ کی خدمت. بہن بھائی کے حقوق کی ادائگی۔ بلکہ نماز و روزہ اس لئے کرتا ہے کہ دنیا میں اس کا نام ہو اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ چونکہ کفار یہ سارے کام اپنے نام کے لئے یا بتوں کے راضی کرنے کے لئے یا رب کو راضی کرنے کے لئے ہی، مگر بغیر واسطہ مصطفیٰ کرتے ہیں اس لئے ان کے کسی کام کا اعتبار نہیں۔ جیسے کہ ہمارے جاہل مسلمان شادی بیاہ کے موقع پر بہت کچھ خرچ کرتے ہیں مگر رب کے لئے نہیں۔ رسموں کی پابندی اور دنیا کے دکھاوے کے لئے لہٰذا یہ سب برباد نہ دنیا میں نام ہو نہ آخرت میں کام۔ **تیسرا اعتراض:** میثاق کے دن کا وعدہ جب کسی کو یاد ہی نہ رہا تو بیکار ہے۔ **جواب:** بیکار جب ہوتا جب یاد دلایا بھی نہ جاتا۔ حق تعالیٰ نے نبیوں، کتابوں اور علماء مشائخ کے ذریعے یاد دلایا پھر بیکار کیوں رہا۔ گورنمنٹ کے یہاں آپ نے بیع نامہ تحریر کر کے رجسٹری کرا دیا۔ اب آپ کو وہ بیع (بیچنا) یاد رہے یا نہ رہے۔ آپ کو بہرحال پابندی کرنا پڑے گی۔ اگرچہ یہاں کفار سے خطاب ہے۔ مگر مسلمانوں کو بھی عبرت پکڑنی چاہئے۔ جب کتا اپنے مالک کی نافرمانی نہیں کرتا تو مومن اللہ و رسول کی نافرمانی کیوں کرے۔ اگر یہ خیال رہے تو انسان گناہ نہیں کر سکتا۔

كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ
کیسے انکار کرتے ہو تم خدا کا حالانکہ تھے تم مردے پس زندہ کیا تم کو پھر
بھلا تم کیونکر خدا کے منکر ہو گئے۔ حالانکہ تم مردے تھے اس نے تم کو جلایا
ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾
موت دے گا تم کو پھر زندہ کرے گا تم کو پھر طرف اس کے لوٹائے جاؤ گے
پھر تمہیں مارے گا پھر تمہیں جلائے گا پھر اس طرف لوٹ کر جاؤ گے

تعلق

اس آیت کا پہلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ایک یہ کہ اس سے پہلے توحید اور رسالت اور کتاب اللہ کی حقانیت کو دلائل سے ثابت فرمایا گیا۔اب حق تعالیٰ کی خاص نعمتوں اور عجیب عجیب قدرتوں کا ذکر فرما کر سب کو ایمان کی رغبت دی جا رہی ہے۔کیونکہ محسن کا احسان ماننا شرافت انسانی کا تقاضا ہے۔دوسرے اس طرح کہ اب تک توحید و رسالت اور قرآن کی حقانیت کے قوی دلائل ارشاد ہوئے تھے۔اور چونکہ قیامت پر ایمان لانا بھی مسلمان بننے کے لئے ضروری ہے۔اس لئے نہایت نفیس طریقے سے اب قیامت کو عقلی دلائل سے بیان فرمایا جا رہا ہے۔مگر سبحان اللہ طریقہ بیان ایسا نرالا اور دل کش ہے کہ اس کو سن کر ہر طبقے کا انسان ماننے پر مجبور ہوگا اور اس کے ضمن میں خالق کی ہستی کا ثبوت بھی اچھی طرح فرما دیا گیا۔

تفسیر

كَيْفَ تعجب دلانے کا سوال ہے۔یعنی ان دلائل کے ہوتے ہوئے اے مشرکو! تمہارا کفر کرنا بہت ہی عجیب بات ہے۔کیونکہ جب کم درجے کے محسن کی ناشکری سخت عیب ہے۔ماں باپ کی نافرمانی ہر دین میں بری ہے تو وہ رب تعالیٰ جس کا احسان ان تمام احسانوں سے اعلیٰ ہے۔اس کی نافرمانی یقیناً خلاف عقل ہے تَكْفُرُوْنَ کفر سے بنا ہے جس کے معنی ہیں چھپانا اور انکار کرنا۔مگر یہاں انکار مراد ہے۔بِاللّٰهِ کفار چند قسم کے تھے۔بعض دہریئے یعنی حق تعالیٰ کے منکر۔بعض خدا کی صفات اور قیامت وغیرہ کے منکر۔بعض نبوت انبیاء کے منکر ان تمام سے یہ خطاب ہے کیونکہ ان میں سے کسی چیز کا انکار حقیقت میں اللہ تعالیٰ کا انکار ہے۔حکومت کے مقرر کئے ہوئے کسی حاکم کی بغاوت حکومت کی بغاوت ہے۔اور اس کے ایک فرمان کا انکار بھی سلطنت کا انکار ہے۔وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا اموات یا تو میت کی جمع ہے یا میت کی۔جیسے قول یا قیل کی جمع اقوال ہے یہ دونوں لفظ موت سے بنے ہیں۔جس کے معنی یا تو بے جان ہونا یا زندہ ہو کر مردہ ہو جانا فرمایا جا رہا ہے کہ اے لوگو! تم پہلے بے جان تھے۔پھر رب نے تم کو جان بخشی۔اگر موت کے معنی زندہ ہو کر فنا ہونا ہے تو اس حالت کو موت فرمانا مجازاً ہے۔اور اگر اس سے مراد بے جان ہونا ہے تو یہ حقیقت ہے۔اردو اور عربی دونوں زبانوں میں بے جان جسم کو مردہ بول دیتے ہیں۔خشک زمین کو کہہ دیتے ہیں کہ زمین مردہ ہوگئی۔قرآن پاک میں ارشاد ہوا يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا (روم:۵۰) دوسری جگہ ارشاد ہوا بَلْدَةً مَّيْتًا (زخرف:۱۱) اس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ تم بہت سے بے جان جسموں سے گھومتے ہوئے آئے ہو۔وہ اس طرح کہ اول تم مٹی تھے پھر دانہ بنے، پھر آٹا، پھر خون، پھر نطفہ، پھر گوشت کا لوتھڑا اتنے بے جان جسموں میں چکر لگا کر اس موجودہ شکل میں نمودار ہوئے۔کسی نے کیا خوب شعر کہا ہے۔

هفت صد هفتاد قالب دیده ام هم چو سبزه بار ها روئیده ام

اس شعر سے یہی مراد ہے۔خلاصہ یہ ہے کہ اب تک تم کو ہر اگلا جسم پہلے سے اعلیٰ ملا، دانہ مٹی سے اعلیٰ، آٹا دانہ سے بہتر وغیرہ اب تم کو جسم عمل کے مطابق ملے گا تو ایسے پاکیزہ عمل کرو کہ آئندہ اچھی شکل و صورت پاؤ۔جنتی لوگ خوبصورت انسانی شکل میں ہوں گے، دوزخی لوگ کتے گدھے کی صورت میں دل کا حال چیزوں پر نمودار ہوگا۔فَاَحْيَاكُمْ احیاء حیات سے بنا ہے جس

کے معنی ہیں زندگی اور اس زندگی سے مراد وہ زندگی ہے جو ماں کے پیٹ میں بچے کو مل جاتی ہے۔ چونکہ یہ زندگی پہلی موت سے ملی ہوئی ہے۔ اس لئے یہاں ''ف'' ارشاد فرمایا گیا ثُمَّ يُمِيتُكُمْ اس موت سے مراد وہ موت ہے جو عمر ختم ہونے پر آئے گی۔ چونکہ یہ موت دنیاوی مصیبتوں سے نجات دیتی ہے اور دوسری ابدی زندگی کا وسیلہ ہے۔ حق تعالیٰ کی ساری اخروی نعمتوں کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اس لئے اس کو نعمتوں میں شمار فرمایا۔ نیز جاندار کو بے جان کرنا حق تعالیٰ کی قدرت کی بڑی دلیل ہے۔ اس لئے ان دلائل میں موت کو بھی شمار فرمایا۔ چونکہ زندگی کے ملنے اور موت کے آنے میں بڑا فاصلہ ہوتا ہے۔ اس لئے یہاں ثُمَّ ارشاد ہوا ثُمَّ يُحْيِيكُمْ یہ اس دوسری زندگی کا ذکر ہے جو موت کے بعد ملنے والی ہے جس کے کفار منکر ہیں۔ پہلی تین حالتوں پر (یعنی پہلے بے جان پھر زندہ ہونا پھر مرجانا) تمام لوگ متفق تھے۔ لیکن اس زندگی کے منکر۔ اس لئے پہلے ان باتوں کو بیان کر کے اب اس کا ذکر ہوا تاکہ معلوم ہو کہ جو ذات اولاً زندہ کرنے اور موت دینے پر قادر ہے۔ وہ دوبارہ زندگی دینے پر قادر ہے اس زندگی سے یا قبر کی زندگی مراد ہے جو سوال و جواب کیلئے ہر شخص کو دی جائے گی یا حشر کی جو حساب کتاب کے لئے عطا ہوگی۔ مگر ظاہر یہی ہے کہ اس سے زندگی قبر مراد ہے۔ جیسا کہ احادیث میں وارد ہوا کہ مردہ دفن ہونے کے بعد لوگوں کے پیروں کی آہٹ کو سنتا ہے۔ اس سے تین سوال ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ رب تیرا کون، دوسرا یہ کہ دین تیرا کیا۔ تیسرے یہ کہ تو اس سبز گنبد والے نبی ﷺ کو جو تیرے سامنے جلوہ گر ہیں کیا کہتا تھا چونکہ یہ دوسری زندگی موت کے کچھ دیر کے بعد ہوتی ہے۔ کفن دفن وغیرہ میں دیر لگتی ہے اس لئے یہاں بھی ثُمَّ ہی فرمایا گیا ہے اگر اس سے مراد حشر کی زندگی ہوتی تو اس کے بعد ثُمَّ نہ فرمایا جاتا کیونکہ وہ زندگی رب کی طرف لوٹنے سے ملی ہوئی ہے اور اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ پھر تم زندہ ہوگے اور پھر کچھ عرصہ بعد رب کی طرف لوٹو گے۔ چونکہ زندگی اور حشر کے درمیان میں برزخ کا زمانہ ہے اس لئے آگے ثُمَّ لانا صحیح ہوا۔ لہٰذا یہ آیت برزخی زندگی اور وہاں کی راحت و تکلیف کو بتا رہی ہے۔ اس لئے کہ جس طرح دنیوی زندگی میں بعض آرام سے ہیں بعض تکلیف میں اسی طرح برزخی زندگی میں ہوگا۔ خیال رہے کہ ہم کو زندگیاں تین ملی ہیں۔ دنیاوی، برزخی، اخروی مگر موت صرف ایک ہے۔ اسی لئے برزخی زندگی کے بعد موت کا ذکر نہ فرمایا پہلے نفخہ صور پر زندوں کی موت ہوگی جو پہلے مر چکے ہیں ان کو غشی طاری ہوگی ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ یہ انسان کی پانچویں حالت ہے اور اس میں بتایا جا رہا ہے کہ اے لوگو! تم ایک حالت گزار کر اب دوسری حالت میں آئے ہو۔ تمہارے سامنے تین میدان اور ہیں جن کو طے کرنا ہے۔ ایک موت پھر قبر کی زندگی، پھر حشر میں رب کی طرف لوٹنا اس کے بعد تم کو قرار ہوگا۔ لہٰذا تم کو چاہئے کہ تم ان منزلوں میں نہ پھنس جاؤ بلکہ اپنے اصلی مقصود کا خیال رکھو اور وہاں کا انتظام رکھو۔

خلاصہ تفسیر

جب توحید و رسالت اور قرآن کی حقانیت کے مسائل سلسلہ وار ثابت ہو چکے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ کفار کے شبہات کے جواب بھی دے دیئے گئے جس سے منصفین ماننے پر مجبور ہو گئے تو اب ان ہٹ دھرم کافروں کے سمجھانے کے لئے جو ضد کی وجہ سے دلائل پر نظر نہیں کرتے تھے ایک نئی دلیل بیان فرمائی گئی۔ کیونکہ جیسی بیماری ویسا اس کا علاج ایک ہی بخار مختلف سببوں

سے ہوتا ہے۔ دانا طبیب سبب کا خیال فرما کر علاج فرماتا ہے۔ لہٰذا پہلے دلائل سے سمجھایا گیا اور اب دوسرے طریقے سے۔ اس دلیل میں رب تعالیٰ کی نعمتوں کا بھی ذکر ہے اور اس کی رحمتوں کا بھی اور پھر انسان کی بے کسی و بے بسی کا بھی تذکرہ ہے اور اسکے ایک حالت میں نہ ٹھہرنے کا بھی۔ تاکہ یہ چاروں باتیں انسان کو ایمان لانے پر مجبور کر دیں۔ کیونکہ کفار کی نظر محسوسات تک تھی اور وہ نہ دیکھی ہوئی چیز کو قبول نہ کرتے تھے۔ اسی لئے وہ حشر اور جنت دوزخ وغیرہ کے منکر تھے۔ بلکہ ان میں بعض رب کے بھی قائل نہ تھے۔ اس لئے پہلے ترتیب وار ان محسوس حالتوں کا ذکر فرمایا گیا۔ جن کا کوئی انکار نہ کر سکتا تھا۔ اور پھر ان کے ذریعہ ان چیزوں کو ثابت فرمایا گیا جن کے وہ منکر تھے۔ فرمایا گیا یہ تو تم جانتے ہی ہو کہ تم پہلے بے جان تھے اور تمہیں یہ معلوم ہی ہے کہ تم اس حالت میں کہاں کہاں کی سیر کر چکے، کبھی سبزہ بن کر اگے کبھی دانہ بن کر پسے۔ کبھی روٹی بن کر اپنے باپ کے معدے میں پہنچے اور پھر وہاں سے چل کر خون بن کر نطفہ بنے، پھر رحم مادر میں آ کر بہت سے انقلاب دیکھے، پھر زندہ ہو کر نہ معلوم کتنی حالتیں تم پر گزریں۔ بچپن، جوانی، بڑھاپا، نادانی، دانائی، کمزوری، قوت، بیماری، تندرستی، علم، جہالت، ہوش مندی، بیہوشی۔ غرضیکہ صدہا حالتوں میں تم بدلتے رہے۔ پھر جب تمہیں موت آئی تو تم سب کچھ ہو کر کچھ نہ رہے۔ اتنی باتوں کو دیکھ کر تم کس طرح اللہ کا انکار کر سکتے ہو۔ اگر تم خود اپنی حالت ہی پر غور کر لو تو رب کا انکار نہیں کر سکتے۔ کیونکہ معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری حالتوں کا بدلنے والا کوئی اور ہی ہے۔ پھر جب تم پر موت و زندگی گزر چکی تو آئندہ بھی زندگی اور موت آئے تو کون سی تعجب کی بات ہے۔ ایجاد کرنا مشکل ہوتا ہے۔ دوبارہ بنانا آسان۔ جب خالق عالم تم کو ایجاد فرما چکا تو دوبارہ بنانا کون سا مشکل ہے۔ نیز تم کو یہ معلوم ہوا کہ تم اپنے ان حالات میں بالکل مجبور ہو نہ تم لڑکپن اور جوانی کو جانے سے روک سکتے ہو نہ بڑھاپے کو آنے سے۔ بڑے بڑے قدرت والے شہنشاہ جن کے نام کے دنیا میں ڈنکے بجتے تھے وہ نہایت بے بسی کی حالت میں یہاں سے ایسے گئے کہ ان کا نام بھی باقی نہ رہا۔ تو ایسے مجبور مسافر کو چاہئے کہ اپنے قدرت والے رب کو راضی رکھے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک** یہ کہ عالم کی ہر چیز بلکہ خود ہم اپنے خالق کی ذات و صفات کی کھلی ہوئی دلیل ہیں۔ اسی لئے فرمایا گیا ہے کہ جو اپنے کو پہچان لے گا وہ رب کو پہچان لے گا۔ **دوسرے** یہ کہ دنیا عمل کی جگہ ہے۔ نہ کہ سزا و جزا کی۔ اسی لئے اس کو قرار نہیں۔ **تیسرے** یہ کہ حیات برزخ اور قبر کے سوال و جواب حق اور قرآن سے ثابت ہیں۔ چکڑالوی وغیرہ اس کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ قرآن سے ثابت نہیں ان کا یہ قول محض جہالت پر مبنی ہے۔ ایک تو یہی آیت قبر کی زندگی بتا رہی ہے۔ جیسا کہ ہم تفسیر میں عرض کر چکے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا کہ قیامت میں کفار عرض کریں گے۔ رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَ اَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ (المومن:۱۱) اے پروردگار تو نے ہم کو دو موتیں دیں اور تو نے ہم کو دو زندگیاں بخشیں۔ دو موتیں بالکل ظاہر ہیں۔ ایک زندگی کے بعد بتاؤ دو زندگیاں کون سی ہیں؟ خیال رہے کہ یہ دونوں زندگیاں حشر کی زندگی سے پہلے ہو چکی ہیں۔ کیونکہ انہیں ماضی سے بیان فرمایا جا رہا ہے۔ ماننا پڑھے گا کہ یہ دونوں زندگیاں ایک دنیا کی ہے

اور ایک قبر کی۔ نیز قرآن پاک میں ارشاد ہوا کہ یُثَبِّتُ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِالْقَوْلِ الثَّابِتِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ فِی الْاٰخِرَةِ (ابراہیم: ۲۷) یعنی اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو دنیوی زندگی اور آخرت میں کلمہ طیبہ پر ثابت قدم رکھتا ہے۔ یہاں آخرت سے مراد قبر کی زندگی ہے۔ یعنی مسلمان دنیا میں مصیبت اور آرام ہر حالت میں اور قبر میں نکیرین کے سوال کے وقت کلمہ طیبہ پر ثابت قدم رہتے ہیں۔ یہاں آخرت سے حشر مراد نہیں کیونکہ وہاں ایمان وکفر کا سوال نہیں ہے بلکہ اعمال کا حساب۔ نیز رب فرماتا ہے۔ اَلنَّارُ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْهَا غُدُوًّا وَّ عَشِیًّا ۚ وَ یَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ ۫ اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ (المؤمن: ۴۶) یہاں یُعْرَضُوْنَ میں فرعونیوں کے عذاب قبر کا ذکر ہے اور اَدْخِلُوْا الخ میں قیامت کے بعد دوزخ کے عذاب کا۔ چونکہ برزخ میں کافر دوزخ میں نہیں پہنچے گا بلکہ دوزخ کی گرمی قبر میں آوے گی۔ اس لئے یہاں یعرضون اور یہاں ادخلوا فرمایا گیا۔ اس کے علاوہ زندگی قبر کے متعلق بے شمار احادیث صحیحہ اور امت رسول اللہ کا اجماع ہے۔ اس کی زائد تحقیق ہمارے فتاویٰ میں دیکھو اور انشاء اللہ اس تفسیر میں بھی مختلف آیتوں کے ضمن میں کچھ عرض کیا جا تا رہے گا۔

تفسیر صوفیانہ

اس جگہ مسلمانوں سے خطاب ہو رہا ہے کہ اے مسلمانو! تم آئندہ کیسے کافر بن سکتے ہو۔ حالانکہ تم آدم علیہ السلام کی پشت میں بے جان ذرے تھے پھر تم کو رب نے اس طرح زندہ فرمایا کہ ان کی پشت سے تم کو نکالا اور اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ (اعراف: ۱۷۲) کا پر لطف کلام سنایا اور تمہیں اپنے خطاب کی عزت بخشی اور تم کو جواب باصواب کی توفیق بخشی کہ تم نے خوشی سے بلٰی کہا کفار کی طرح بے مروتی اور خوف سے نہ کہا۔ پھر تم کو اس طرح موت دیتا ہے۔ کہ عالم ارواح سے عالم اجسام کی طرف منتقل فرماتا ہے۔ پھر تم کو انبیاء کرام اور آسمانی کتابیں بھیج کر دوبارہ زندگی بخشتا ہے۔ اور پھر تم اسی کی طرف بے اختیار لوٹ کر جاؤ گے یا یہ خطاب انبیاء کرام سے ہے کہ اے پیغمبرو! تم معصوم ہونے کی وجہ سے کبھی خدا کی نعمتوں کا انکار نہیں کر سکتے ہو۔ اس لئے کہ تم پہلے عدم کے پردے میں تھے۔ پھر رب نے تم کو نور عنایت کے پانی اور دست محبت سے خمیر فرمایا۔ پھر اس کو نور سے منور فرما کر زندگی بخشی۔ پھر جمال کے مشاہدے سے جدا کر کے تم کو موت عطا فرمائی۔ پھر وحی کے نور سے منور فرما کر زندگی بخشی۔ پھر جذبات حق کی کشش سے تم رب کی طرف ہی لوٹو گے یا اے انسان تم پہلے بے علمی کی بناء پر مردہ تھے پھر تمہیں عقل و ہوش و علم دے کر زندہ کیا۔ پھر بڑھاپے میں بے عقل ہو کر علم بھول کر گویا مردہ ہو جاؤ گے۔ پھر قبر میں تم کو علم و عقل دے کر زندہ فرمادے گا۔ پھر تم رب کی بارگاہ میں حاضر ہو گے۔ علم روح کی زندگی ہے جہالت روح کی موت، مرنے کے بعد روح کا علم بلکہ ہر قوت بڑھ جاتی ہے۔ اس لئے بزرگوں کی ارواح بعد موت مدد کرتی ہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: نحوی قاعدے سے فعل اور حال کا زمانہ ایک چاہئے مگر یہاں ایسا نہیں کیونکہ یہاں تَکْفُرُوْنَ فعل ہے۔ اور کفار کی موت اور حیات رب کی طرف لوٹنا حال اور ان سب کا زمانہ علیحدہ علیحدہ۔ کیونکہ کفر تو آج ہو رہا ہے اور یہ حالات یا تو پہلے ہو چکے ہیں یا آئندہ ہوں گے لہٰذا یہ ترکیب کیونکر صحیح ہوگی۔ **جواب:** چونکہ یہ سارے گذشتہ اور آئندہ

واقعات حق تعالیٰ کے نزدیک بہت قریب قریب ہوئے ہیں۔ اس لئے گویا ان کا زمانہ ایک ہی ہے قیامت اگرچہ ہم کو دور معلوم ہوتی ہے۔ مگر اللہ اور رسول کے نزدیک بہت قریب قرآن کریم فرماتا ہے کہ اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ (القمر:۱) اور حضور فرماتے ہیں کہ ہم اور قیامت دو ملی ہوئی انگلیوں کی طرح ہیں۔ **دوسرا اعتراض**: اس آیت سے معلوم ہوا کہ ہر شخص کے لئے دو موتیں ہیں۔ ایک دنیا کی زندگی سے پہلے دوسری اس کے بعد مگر قرآن سے ہی ثابت ہو رہا ہے کہ بعض لوگوں کو تین موتیں آئیں۔ چنانچہ حضرت عزیر علیہ السلام کو سو برس تک مردہ رکھ کر زندہ فرمایا گیا۔ حضرت حزقیل علیہ السلام کی دعا سے وہ بنی اسرائیل دوبارہ زندہ کئے گئے جو کہ وبا کے خوف سے شہر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ اور جنگل میں ان کو مار دیا گیا تھا، موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جو بنی اسرائیل ان کے ساتھ کوہ طور پر گئے تھے اور بجلی سے مر گئے تھے انہیں زندہ کیا گیا۔ عیسیٰ علیہ السلام نے بہت سے مردوں کو زندہ فرمایا۔ ہمارے حضور ﷺ نے اپنے والدین کریمین کو زندہ کر کے ایمان دیا اور حضرت جابر کے مرے ہوئے بچوں کو زندہ فرمایا جیسا کہ حدیث میں آتا ہے ان سب کو یقیناً تین موتیں آئیں پھر ان آیتوں کو کس طرح جمع کیا جائے۔ **جواب**: اس جگہ انسان کی عام حالت کا ذکر ہو رہا ہے۔ کیونکہ عام طور پر دو ہی موتیں آتیں ہیں۔ یعنی یہ قانون ہے اور وہ خصوصی واقعات قدرت کے قانون کے پابند ہم ہیں نہ کہ رب۔ ہمارا قانون پر بھی اعتماد ہے۔ اور قدرت پر بھی خیال رہے کہ دوبارہ زندگی پانے والوں کو دوبارہ موت و سکرات نہ ہوئی۔ پھر ان کی روح ایسے قبض کی گئی جیسے نیند یا غشی کا طاری ہونا بغیر تکلیف کے یہ واقعات اتفاقیہ ہیں نیز اس آیت میں کفار و مشرکین سے خطاب ہے۔ اور ان میں بہت سے لوگ ان واقعات کے قائل نہ تھے۔ **تیسرا اعتراض**: آریوں کا۔ اگر انسان نے اس زندگی سے پہلے اتنے جسموں کی سیر کی ہے چاہئے کہ آواگون درست ہو۔ **جواب**: اس کا پہلے گزر چکا کہ یہ جسموں کی تبدیلی ہے نہ روحوں کی اور آواگون روح کی تبدیلی کا نام ہے یہ بھی خیال رہے کہ جسم کے اصلی اجزاء اور وہ نہایت چھوٹے چھوٹے ذرے ہیں جو کہ خوردبین سے بھی نہیں نظر آسکتے جن کو عربی میں عجب الذنب کہتے ہیں، یہ ریڑھ کی ہڈی میں محفوظ ہیں کسی حال میں نہیں بدلتے۔ اگر کسی انسان کو شیر نے کھالیا اور وہ پائخانہ بن کر نکل گیا۔ پھر اس کے اصلی اجزاء پاخانے میں باقی رہے۔ یہی اجزاء گیہوں، روٹی، خون اور منی میں برابر محفوظ رہتے ہیں۔ جب انسان مرنے کے بعد مٹی بن جاتا ہے تو مٹی میں بھی وہ اجزاء سلامت رہتے ہیں۔ انہی اجزاء پر قیامت کے دن اجسام بنائے جائیں گے۔ اس ہی وجہ سے ہر حال میں کہا جاتا ہے کہ یہ وہی انسان ہے جو کہ پہلے منی یا گوشت کا لوتھڑا یا بچہ وغیرہ تھا۔ وہی کہنا اس لئے ہے کہ اس کے اصلی اجزاء محفوظ ہیں آواگون والوں کے نزدیک دوسرا جسم پہلے جسم کا بالکل غیر ہوتا ہے اور اسلام میں وہ پہلا ہی جسم ہوتا ہے صرف صورت بدل جاتی ہے۔ لہٰذا اس مسئلے کو آواگون سے کوئی تعلق نہیں۔ **چوتھا اعتراض چکڑالویوں کا**: جو لوگ قبر میں دفن نہیں ہوتے۔ مثلاً جلا دیئے جاتے ہیں یا ان کو شیر وغیرہ کھا جاتا ہے اس سے حساب قبر کیونکر ہوگا۔ **جواب**: قبر خاص اس گڑھے کا نام نہیں جس میں مردے دفن کئے جاتے ہیں بلکہ اس برزخی حالت کا نام ہے جو مرنے اور قیامت میں اٹھنے کے درمیان ہے۔ اس حالت میں انسان کہیں بھی ہو اس کی روح کو جسم کے اصلی اجزاء سے متعلق کر کے اس سے سوال جواب ہو جاتے

ہیں۔ لہٰذا اگر جسم انسانی شیر یا مچھلیوں کے پیٹ میں ہے یا جل کر اور راکھ ہو کر میدان میں اڑ رہا ہے یا دریا میں بہہ رہا ہے۔ کہیں بھی ہو اس کی روح کو اس سے متعلق کر کے وہاں ہی سوال جواب کر لئے جاتے ہیں۔ جب ماں کے پیٹ میں بچہ بنتا ہے تو فرشتہ وہیں آ کر تمام نقش و نگار بھی کر جاتا ہے اور اس کی تقدیر بھی لکھ جاتا ہے۔ مگر ماں کو خبر نہیں ہوتی۔ اسی طرح شیر وغیرہ کے پیٹ میں ہی حساب ہوتا ہے اور اس کو خبر نہیں ہوتی۔

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۗ ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی
وہ وہ ہے کہ پیدا فرمایا اس نے واسطے تمہارے جو بیچ زمین کے ہے سارا پھر قصد
وہ وہی ہے جس نے تمہارے لئے بنایا جو کچھ زمین میں ہے پھر آسمان کی طرف
السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۹﴾
کیا طرف آسمان کے پس برابر کیا ان کو سات آسمان اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔
استوا (قصد) فرمایا تو ٹھیک سات آسمان بنائے اور وہ سب کچھ جانتا ہے۔

تعلق

اس آیت کا پہلے سے چند طرح تعلق ہے۔ **ایک** یہ کہ حق تعالیٰ نے پہلی آیت میں انسان کی داخلی نعمتوں کا ذکر فرمایا تھا اب خارجی نعمتوں کا ذکر فرمایا۔ جو کہ زمین وغیرہ سے ہم کو حاصل ہوتی ہیں۔ **دوسرے** یہ کہ پہلے ہم کو زندگی بخشنے کا ذکر فرمایا گیا تھا اور اب زندہ رہنے کے اسباب کا کیونکہ زمین کی نعمتوں کے بغیر ہماری زندگی ناممکن ہے مگر چونکہ زندگی اصل ہے اور نعمتوں سے نفع حاصل کرنا اس کی فرع اس لئے زندگی کا ذکر پہلے فرمایا ان کا بعد میں۔ **تیسرے** یہ کہ کفار کہہ سکتے تھے ہمیں رب نے پیدا نہیں فرمایا بلکہ اتفاقیہ اسباب جمع ہو گئے اور ہم پیدا ہو گئے۔ لہٰذا ہم پر رب کا کوئی احسان نہیں سورج سے دانہ پکا اس سے آٹا بنا جو ہمارے والد کے پیٹ میں جا کر خون بنا اور نطفہ بن کر ماں کے رحم میں آ گیا اور ہم پیدا ہو گئے اس میں رب کا کون سا احسان ہے اس وہم کی تردید کے لئے اب فرمایا گیا کہ یہ تو سوچو کہ یہ اسباب کس نے پیدا فرمائے اور ان میں یہ تاثیریں کس نے بخشیں؟ کہنا پڑے گا کہ رب نے، لہٰذا احسان رب ہی کا ثابت ہوا۔

تفسیر

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ قرآن کریم میں هُوَ الَّذِیْ کبھی تو اللہ کی رحمت ظاہر کرنے کے لئے ہوتا ہے کبھی اظہار قدرت کے لئے یہاں دونوں مقصد ہو سکتے ہیں۔ یعنی اللہ تعالیٰ وہ قدرت والا ہے یا رحمت والا ہے کبھی کسی خاص بندے کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے بھی هُوَ الَّذِیْ آتا ہے۔ هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ اللہ وہ شان والا ہے جس نے ایسے شان والے محمد رسول اللہ ﷺ کو پیدا فرمایا۔ یہاں حضور کی شان کا اظہار مقصود ہے کہ اگر میری شان دیکھنا ہے تو میرے اس محبوب کی شان دیکھو بے دیکھی چیز کو ان کے مظاہر سے جانا جاتا ہے، جان کو اعضاء کی حرکات سے معلوم کرتے ہیں ایسے ہی رب کو عالم کے حالات سے معلوم

کرو۔ مفسرین فرماتے ہیں کہ یہاں خلق قدر کے معنی میں ہے۔ یعنی اس رب نے تمہارے لئے زمین کی ساری نعمتوں کو مقرر فرمایا کیونکہ اس آیت کے نازل ہونے کے وقت نہ تو ساری چیزیں پیدا ہوئی تھیں۔ نہ سارے انسان، اب آیت کا مقصد یہ ہوا کہ جو کچھ پیدا فرما چکا وہ تمہارے لئے تھا اور جو کچھ پیدا کیا ہے اور جو کرے گا وہ سب تمہاری ہی خاطر لَكُمْ اس میں لام نفع کا ہے یعنی تمہارے نفع کے لئے چیزیں پیدا ہوئیں کہ جس سے تم دینی یا دنیوی نفع حاصل کرو یعنی چیزوں کو کھانا، بعض کو پہننا، بعض کو پینا وغیرہ۔ یہ دنیوی نفع ہیں، بعض چیزوں سے بچ کر ثواب حاصل کرنا، ان سب چیزوں کو دیکھ کر خالق کو پہچاننا وغیرہ دینی نفع ہیں مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا اس سے معلوم ہوا کہ زمین کی ساری چیزیں خواہ وہ زمین پر ہوں یا زمین میں ہوں۔ سب ہمارے نفع کے لئے پیدا کی گئیں کہ بلا وسیلہ یا وسیلے سے یہ سب ہمارے کام میں آتے ہیں۔ عمدہ غذائیں پاکیزہ خوشبوئیں، دل پسند آوازیں، حسین صورتیں، وہ لذیذ چیزیں بلا واسطہ ہمارے لئے ہیں اور لکڑی، لوہا، تیر کمان، رسی وغیرہ اسی لئے بنی کہ ان کے ذریعے ہم غذائیں حاصل کریں اور بیماری اور مشقت ہماری عبرت کے لئے پیدا فرمائی گئیں، موت اس لئے بنی تاکہ دنیاوی نعمتوں سے سارے اگلے اور پچھلے لوگ نفع حاصل کریں اگر سب پیدا ہوتے اور کوئی نہ مرتا تو زمین بھی تنگ ہو جاتی اور روزی بھی اور بے شمار لڑائی جھگڑے واقع ہوتے اور پہلے لوگ حکومت پر قائم رہتے اور پچھلے اس سے محروم اور مشقتیں اور مصیبتیں بھی ہمارے ہی فائدے کے لئے ہی بنی اگر یہ نہ ہوتیں، تو دنیا میں کوئی کارخانہ ہی نہ ہوتا اگر چور نہ ہوتا تو پولیس کا محکمہ نہ بنتا اور لاکھوں آدمی بیکار رہتے، اگر جرم نہ ہوتے، کچہریاں ویران ہوتیں، اگر دشمن نہ ہوتا تو فوج کا محکمہ بیکار تھا۔ اگر سردی گرمی کی مصیبت نہ ہوتی تو اونی کپڑے کے کارخانے اور حسخانے، پنکھے وغیرہ کچھ نہ ہوتے، اگر بھوک نہ ہوتی تو سارے باورچی بیکار تھے، اگر بیماری نہ ہوتی تو دوا اور شفا خانے بیکار اور حکیم عطار، اور جراح سب رائیگاں جاتے۔ غرضیکہ ان مصیبتوں نے ہی دنیا کو آباد کیا۔ حتیٰ کہ زہر قاتل اور سانپ وغیرہ بھی بہت دواؤں میں کام آتے ہیں، بہر حال سب چیزیں ہمارے ہی نفع کے لئے ہیں۔ (تفسیر عزیزی) ثُمَّ اسْتَوٰى إِلَى السَّمَآءِ اِسْتَوٰی سویٰ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں برابری اور مساوات، اس لئے سیدھی چیز کو مستوی کہتے ہیں۔ کیونکہ اس کے اجزاء آپس میں برابر ہوتے ہیں، نہ تو اونچے، نہ نیچے اور نہ ٹیڑھے، پھر اس کا استعمال قصد اور ارادے کے لئے ہونے لگا۔ عرب والے بولتے ہیں اِسْتَوٰی کَالسَّهْمِ الْمُرْسِلِ یعنی اس کا چھوٹے ہوئے تیر کی طرح قصد کیا، چونکہ پہلے معنی یعنی برابری سے رب تعالیٰ پاک ہے۔ اس لئے دوسرے ہی معنی مراد ہیں چونکہ زمین کی ساری نعمتیں ہمارے لئے ہی پیدا فرمائی گئی تھیں اور زمین کی ساری چیزیں آسمانی مدد (بارش اور چاند سورج ستارے وغیرہ) کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتیں، اس لئے آسمان کو بھی پیدا فرمایا گیا، اس سے معلوم ہوا کہ اصل مقصود زمین ہے کیونکہ ہم اسی پر ہی رہتے ہیں اور زمین کے لئے آسمان بنایا گیا۔ اس لئے یہاں ثم ارشاد فرمایا گیا۔ خواہ آسمان زمین سے پہلے بنا ہو یا بعد میں لیکن ہے زمین کے تابع، اس لئے درجے اور رتبے میں زمین سے پیچھے ہی ہے اس لئے ثم صحیح ہے، ہماری اس تقریر سے بہت بڑا اعتراض اٹھ گیا جس کو ہم اعتراض وجواب کے موقع پر عرض کریں گے۔ سماء اونچی چیز کو بھی سماء کہتے ہیں اور آسمان کو بھی، مگر یہاں آسمان مراد ہے، جیسا کہ آئندہ عبارت سے معلوم ہو رہا ہے۔ اس سے معلوم

ہوا کہ آسمان بھی ہمارے لئے ہی بنا ہے کیونکہ ہمارے لئے زمین بنی اور زمین کے لئے آسمان تو ہمارے لئے آسمان فَسَوّٰىهُنَّ یہاں سوئی برابر کرنے اور ٹھیک کرنے کے معنے میں ہے۔ یعنی آسمانوں کو ایسا ٹھیک بنایا کہ اس میں کہیں بھی سوراخ یا شگاف یا ٹیڑھا پن نہ رہا۔ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ اس سے معلوم ہوا کہ آسمان سات ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ مع عرش کرسی کے سات ہیں اور بعض فرماتے ہیں کہ ان کے علاوہ لہٰذا مع عرش کرسی کے نو ہوئے، پرانے فلاسفہ نو مانتے ہیں اور اس آیت کے یہی معنی کرتے ہیں آسمانوں کے سات ہونے میں عجیب حکمت ہے کیونکہ ہر آسمان پر ایک سیارہ ہے اگر آسمان ایک ہی ہوتا اور سب سیارے تارے ایک پر ہوتے تو زمین کا انتظام درہم برہم ہو جاتا۔ وہ اس طرح کہ پہلے آسمان پر چاند ہے اور چوتھے پر سورج، سورج سے غلہ وغیرہ پکتا ہے اور چاند اور دیگر سیاروں سے اس میں رنگت ولذت پیدا ہوتی ہے، پھر سورج کبھی قریب آ جاتا ہے اور کبھی دور جس کی وجہ سے موسم بدلتے رہتے ہیں اور ہر موسم کے پھل پیدا ہوتے ہیں، اگر سورج پہلے آسمان پر ہوتا تو سخت گرمی کی وجہ سے جاندار فنا ہو جاتے اور کھیت باغ جل جاتے اور اگر چاند چوتھے آسمان پر ہوتا۔ تو اتنی ہلکی شعائیں زمین تک پہنچتیں جو کہ پھلوں میں رنگت ولذت پیدا کرنے کے لئے کافی نہ ہوتیں۔ لہٰذا جس کے تارے کا زمین سے جس قدر دور رہنا مناسب تھا اس کو اسی قدر دور رکھا گیا۔ انہی فاصلوں کے فرق کے لئے سات آسمان بنائے گئے اور ان میں صدہا حکمتیں ہیں جن کے بیان کی یہاں گنجائش نہیں۔ جس کو دیکھ کر بے اختیار یہ کہنا پڑتا ہے کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (آل عمران:۱۹۱)، وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ اس میں یہ بتایا گیا کہ رب نے جو کچھ بھی فرمایا بہت علم کے ساتھ پیدا فرمایا یوں ہی بے فائدہ نہ بنایا جس چیز کو جہاں رکھا اور جس کو جیسا بنایا اس کو ویسا ہی ہونا چاہئے تھا اور اس میں یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ جس طرح عالم کا ذرہ ذرہ ہمارے علم میں ہے ایسے ہی تمہارے جسم کے سارے اجزاء ہمارے علم میں ہیں خواہ وہ اجزاء تمہارے مرنے کے بعد ہوا میں اڑ جائیں یا پانی میں بہہ جائیں یا ذروں سے مل جائیں اور پھر ان پراگندہ اجزاء کو جمع کر کے ان میں دوبارہ روح ڈال دینا ہمارے واسطے کوئی مشکل نہیں۔ مشکل تو اسے ہو جس کے علم میں کچھ کمی ہو یا قدرت میں، لہٰذا تم قیامت کا انکار نہ کرو، غرضیکہ سارا عالم اجسام انسان کے لئے بنا، اس لئے آدم علیہ السلام تمام مخلوق سے پیچھے ہوئے، اور جب انسان فنا ہوں گے تو قیامت آ جائے گی اور جن بستیوں پر انسانوں کے گناہ کی وجہ سے عذاب آئے اور وہاں ساری مخلوق فنا کر دی گئی کو جب اصل مقصود نہ رہا تو تابع چیزوں کا رہنا بیکار۔

خلاصہ تفسیر

حق تعالیٰ نے جب اپنی پہلی نعمت یعنی انسان کو زندہ کرنا یاد دلایا۔ تو اب ان نعمتوں کا ذکر فرمایا جا رہا ہے جس پر زندہ رہنا موقوف ہے۔ یعنی تم اس رب سے کیوں منہ موڑتے ہو جس نے تم کو نیست سے ہست کیا اور پھر موجود کر کے تم کو یونہی بے سروسامان نہ چھوڑا بلکہ اس نے محض تمہاری خاطر زمین اور اس کی ساری نعمتیں پیدا فرمائیں اور چونکہ زمین کی نعمتیں آسمانی اثرات کے بغیر نہیں حاصل ہو سکتیں، اس لئے آسمان کو بھی تمہاری ہی خاطر بنایا اور چونکہ ایک یا دو آسمانوں سے زمین کا انتظام مکمل نہیں ہوتا اس لئے تمہاری ہی خاطر آسمان سات بنائے اور چونکہ زمین و آسمان میں تعلق کے بغیر بھی زمین کی نعمتیں نہیں

بن سکتیں، اس لئے تمہاری خاطر ان دونوں میں ایسا تعلق پیدا فرمایا کہ کہا جاسکتا ہے کہ تمہارا رزق آسمان سے آتا ہے اور زمین سے ملتا ہے اور یہ اس لئے ہے کہ خدا تعالیٰ ہر چیز کا علم رکھتا ہے اور ہر چیز کے اسرار، اور مصلحتیں اس کو معلوم ہیں، غرض کہ اے انسانو! یہ ساری کائنات تمہاری خاطر بنی ہے۔ پھر بھی اگر تم ہمارا احسان نہ مانو تو بہت تعجب ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے، **ایک** یہ کہ زمین اور آسمان کی ساری چیزیں انسان کے نفع کے لئے بنائی گئیں۔ اس لئے انسان کو ساری مخلوق سے پیچھے پیدا فرمایا کیونکہ سامان پہلے جمع کیا جاتا ہے اور جس کی خاطر یہ سامان ہو وہ بعد میں آتا ہے، اگر کہیں جلسہ وعظ ہو تو فرش وتخت، روشنی صفائی وغیرہ کا انتظام پہلے ہو جائے گا، سننے والوں کا اجتماع بھی پہلے ہو جائے گا اور مولوی صاحب کی تشریف آوری بعد میں ہوگی۔ وہ جو حدیث قدسی میں آتا ہے اے محبوب **لَوْ لَاکَ لَمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاکَ** اس کی پوری تائید ہوتی ہے۔ اگر حدیث ضعیف کی تائید قرآن سے ہو جاوے تو قوی ہو جاتی ہے۔ لہٰذا یہ حدیث اگر ضعیف بھی ہو تو اب قوی ہے برات کا کھانا دانہ باراتیوں کے لئے اور براتی دولہا کے طفیل، عالم کا بناؤ انسان کے لئے اور انسان حضور کے لئے اس لئے حضور تمام نبیوں سے پیچھے آئے کہ اصلی مقصود پیچھے ہوتا ہے۔ حضور کی تشریف آوری سارے پیغمبروں کے بعد اسی لئے ہوئی کہ مقصود ذات اوست دیگر جملگی طفیل نیز انسان تمام چیزوں کے بغیر زندگی نہیں گزار سکتا لیکن وہ تمام چیزیں انسان کے بغیر رہ سکتی ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ انسان بادشاہ ہے۔ باقی سب خدام، کیونکہ خادم بغیر آقا کے اکثر گزر کر لیتا ہے، لیکن آقا بغیر خدام نہیں رہ سکتا۔ سبحان اللہ آناں کہ غنی تراند محتاج تراند۔ نیز انسان ہر چیز سے نفع حاصل کرتا ہے دیگر چیزوں میں یہ وصف نہیں، فرشتے کھانے پینے سے دور، جنات مکانات وغیرہ سے بے پرواہ جانور لباس وغیرہ کے غیر محتاج اور غذائیں بھی ان کے لئے معمولی اور خاص خاص، مگر حضرت انسان کو ان سب چیزوں کی حاجت، پھر ان میں سے ہر ایک کی ہزار ہا قسمیں چاول ہزار ہا ترکیب سے استعمال کئے جائیں، کپڑوں میں سینکڑوں وضع قطع مکان کی صد ہا قسمیں پتہ لگا کہ سب چیزیں انہی حضرات کے لئے بنی ہیں۔ **دوسرے** یہ کہ جو چیزیں ہمارے لئے بنی ہیں تو ان کا حلال ہونا بھی ہمارے لئے ضروری ہے، وہابیوں اور دیوبندیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ جو چیز حضور پاک کے زمانہ اقدس میں نہ ہو وہ سب بدعت اور حرام ہے جس سے لازم آیا کہ اعراب والا قرآن شریف اور بخاری شریف وغیرہ پڑھنا، پلاؤ، بریانی کھانا، ریل کی سواری وغیرہ سب حرام، کیا کوئی دیوبندی ہے جو اپنے اس اصول پر عمل کر کے دکھاوے۔ **تیسرے** یہ کہ آسمان کا وجود بھی ہے۔ اور وہ مجسم ہیں اور سات ہیں۔ قرآن مجید نے یہ بھی بتایا اور توریت اول کے پہلے باب میں ارشاد ہوا کہ ابتداء میں خدا نے زمین وآسمان کو پیدا کیا۔ اسی توریت شریف کے ساتویں باب میں طوفان نوحی کے بیان میں ذکر ہوا کہ آسمان کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ آٹھویں باب میں فرمایا گیا کہ آسمان کی کھڑکیاں بند ہو گئیں وغیرہ وغیرہ انجیل متی کے تیسرے باب میں ہے کہ جب عیسیٰ علیہ السلام یحییٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے دریا میں غوطہ لگا کر باہر آئے تو ان کے لئے آسمان کھل گیا۔ انجیل لوقا کے اٹھارویں باب میں ہے کہ اتنا بھی نہ چاہا کہ آسمان کی طرف آنکھ اٹھاوے، اسی طرح مکاشفات یوحنا کے آٹھویں باب

سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں پر تارے ہیں۔ ہندوؤں کے وید اور پارسیوں کے وساطیر سے بھی آسمانوں کے متعلق اس قسم کے مضامین ثابت ہیں۔ غرضیکہ ہر مذہب کی الہامی اور غیر الہامی کتابوں سے آسمانوں کا ثبوت ملتا ہے، پرانے فلاسفہ بھی اس کے قائل رہے۔ مگر ایک دیوانہ فلسفی جس کا نام فیثا غورث ہے اس نے آسمانوں کا انکار کیا اس کی اس بات پر کسی عقل مند نے دھیان نہ دیا۔ اس زمانہ کے فلاسفہ نے اس قول کو دیوانوں کی بڑ سے زیادہ وقعت نہ دی۔ مگر اب کچھ عرصہ سے یورپ میں یہ عقیدہ بہت پھیلا اور ان کی تقلید میں بعض ہندوستان کے فیشنی مسلمان بھی آسمان کا انکار کرنے لگے۔ اور سر سید احمد خان علی گڑھی کے مقلدین نے جہاں جنت دوزخ کی آیتوں میں تاویلیں کیں، ویسے ہی یہ بھی کہا کہ آسمان سے مراد انتہائے نظر ہے اور یہ تارے وغیرہ بغیر آسمان کے موجود ہیں اور آسمان کی کوئی حقیقت نہیں، ان کا کلام محض لغو اور باطل ہے کہ اس میں ساری آسمانی کتابوں کا انکار ہے۔ اور محسوسات کی مخالفت ان کے پاس آسمان کے نہ ہونے کی کوئی دلیل نہیں۔ **چوتھے** یہ کہ آسمان دور رہ کر بھی زمین کو فیض برابر دے رہا ہے تو اگر حضور ﷺ مدینہ میں جلوہ گر ہو کر تمام عالم کو فیض دیں تو ہوسکتا ہے، زمین آسمان سے کبھی بے پرواہ نہیں۔ امتی حضور سے کبھی بے نیاز نہیں ہوسکتا، آسمان دیتا ہے زمین لیتی ہے ایسے ہی حضور دینے آئے ہم لینے کے لئے۔

تفسیر صوفیانہ

وہ اللہ ایسی قدرت والا ہے جس نے تمام روحانی اور جسمانی چیزوں کو تمہارے لئے پیدا فرمایا کہ وہ سب تمہارے کام آئیں اور تم کو ان کے لئے نہ بنایا کہ تم ان میں پھنس کر رب کو بھول جاؤ بلکہ تم کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (الذاریات:۵۶) بلکہ خاص اپنے لئے جیسے خود فرمایا کہ وَاصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ (طٰہٰ:۴۱) اے بندے میں نے کوئی کام تیرے غیر کی خاطر نہ کیا۔ تو بھی اپنا کوئی کام میرے غیر کے لئے نہ کر، جس قدر تو میرے لئے ہوگا اسی قدر میں تیرا ہوں گا جیسا کہ روایت میں ہے کہ اللہ کا جو ہو رہتا ہے اللہ اس کا ہو جاتا ہے اور سوا انسان کے کسی میں استعداد نہیں کہ وہ اللہ کا ہو رہے اور اللہ اس کا ہو جائے۔

حکایت: تفسیر روح البیان سورت رعد شریف میں فرمایا گیا کہ ایک بزرگ سے رب نے ارشاد فرمایا کہ میں نے عالم کی ساری چیزیں تیرے لئے بنائیں تو نے میرے لئے کیا کیا۔ انہوں نے اپنی عبادات پیش کیں۔ ارشاد الٰہی ہوا کہ یہ عبادتیں بھی تو نے اپنے لئے ہی کی تھیں تاکہ دوزخ سے بچ جائے اور جنت حاصل کرے بتا میرے لئے کیا کیا عرض کیا مولا پھر تیرے لئے کون سا کام ہوتا ہے، فرمایا کہ میرے پیاروں سے محبت اور میرے دشمنوں سے عداوت۔ لہٰذا نماز، حج وغیرہ ادا کرنا عبادت ہے اور ان عبادات سے محبت کرنا رب کی محبت ہے، عبادت اپنے لئے ہے، عبادت سے محبت رب کے لئے۔ عبادت کرنا شریعت ہے، عبادت سے محبت کرنا طریقت۔ رب فرماتا ہے فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ (الماعون:۵) جو عبادت تو کرے مگر بوجھ جان کر رب اس سے ناراض ہے۔ اسی لئے صوفیاء کرام کے نزدیک جنت کے لئے عبادت کرنا کمال نہیں محض رضائے الٰہی کے لئے چاہیے اور جس طرح آسمان و زمین کو تیری خاطر بنایا اسی

طرح تو بھی اپنے دنیوی کاروبار بھی میری ہی رضا کے لئے کر خود اس لئے کھا پی کہ تو اس سے عبادت کرے۔ بچوں کی اس لئے پرورش کر کہ یہ میرا حکم ہے اور وہ رب تعالیٰ اپنی ہر مخلوق کے ہر حال کو بخوبی جانتا ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: جب رب تعالیٰ نے سب چیزیں ہمارے لئے ہی پیدا کیں ہیں تو پھر ہم کو بعض چیزیں کیوں دیں اور بعض انسان غریب وفقیر کیوں رہے۔ ملکوں اور انسانوں کے حالات مختلف کیوں ہوئے۔ **جواب:** رب نے ساری چیزیں سارے انسانوں کے لئے پیدا کیں نہ فقط تمہارے ایک کے لئے دنیا کی تمام چیزیں تمام انسانوں کو تقسیم ہو کر بقدر حصہ مل گئیں، انگلستان والوں کو ایک قسم کے پھل اور غذائیں وغیرہ۔ ہندوستانیوں کو دوسری طرح کے بعض کو کم بعض کو زیادہ تا کہ دنیا کا نظام قائم رہے۔ **دوسرا اعتراض:** جب ہر چیز ہمارے لئے ہی بنی تو شریعت میں بعض چیزیں حرام کیوں فرمائیں۔ چاہئے تھا کہ ہم ہر چیز کو ہر طرح استعمال کر سکتے۔ **جواب:** ہر چیز تمہارے ہی نفع کے لئے بنی نہ کہ تمہارے کھانے کے لئے، ہر چیز کا نفع علیحدہ علیحدہ ہے کسی کو کھاؤ، کسی کو پہنو، کسی کو سونگھو، کسی سے بچو۔ تمہارے گھر میں تمہاری بیوی، ماں، بہن، بیٹی یہ سب تمہارے نفع کے لئے ہی ہیں۔ لیکن ان سب کا نفع یکساں نہیں۔ بیوی سے وطی کی جاتی ہے اور ماں بہن سے امداد اور شفقت حاصل کی جاتی ہے، پانی اور آگ سب تمہارے نفع کے لئے، مگر پانی پیا جاتا ہے اور آگ کھائی پی نہیں جاتی، اور جس طرح ہر چیز کا طریقہ استعمال سکھانے والے کی مدد کے بغیر حاصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح انبیاء کرام کی تعلیم کے بغیر کسی چیز کو استعمال کرنا فائدہ مند نہ ہوگا۔ انبیاء کرام نے فرمایا کہ بکری کو استعمال کرو اور نفع لو۔ اور خنزیر سے بچ کر۔

تیسرا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ زمین پہلے پیدا ہوئی اور آسمان بعد میں، مگر دوسری آیتوں سے ثابت ہوا کہ آسمان پہلے بنا اور زمین بعد میں، اب ان آیتوں میں مطابقت کس طرح کی جائے۔ **جواب:** اس کے چند جوابات ہیں ایک یہ کہ زمین کی پیدائش آسمانوں سے پہلے مگر اس کا پھیلاؤ آسمانوں کے بعد، اور اس طرح سب سے پہلے پانی پیدا ہوا۔ اس پانی میں کچھ جھاگ نمودار ہوئے وہ جھاگ اس جگہ محفوظ رکھے گئے جہاں اب خانہ کعبہ ہے۔ یہ جھاگ ہی اصل زمین ہیں، پھر پانی سے بخار اٹھا وہ بخار آسمان بنا پھر جھاگوں کو پھیلا دیا گیا، چنانچہ دوسری آیت میں ارشاد ہوا کہ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا (النازعات: ۳۰) یعنی اس کے بعد زمین کو پھیلایا۔ مگر یہ جواب ضعیف ہے کیونکہ یہاں کی آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ زمین کی ساری چیزیں پیدا کر کے آسمان پیدا کیا اور زمین کی ساری چیزیں زمین کے پھیلنے کے بعد ہی ہو سکتی ہیں۔ بعض لوگوں نے فرمایا کہ اصلی آسمان زمین سے پہلے بنا لیکن اس کا ہموار ہونا اور ان کا سات بننا زمین کے بعد ہوا۔ لہٰذا اصلی آسمان پیدائش میں زمین سے پہلے ہے اور تسویت (ہموار اور یکساں ہونا بعد میں) مگر یہ جواب یہ بھی کمزور ہے کیونکہ دوسری آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کی تکمیل کے بعد زمین بنی ہے۔ چنانچہ قرآن فرماتا ہے۔ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴿۲۹﴾ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا (نازعات: ۳۰) لہٰذا صحیح جواب یہی ہے کہ آسمان پہلے بنا بعد میں زمین، لیکن جہاں کہیں آسمان کو زمین کے بعد بیان فرمایا گیا ہے وہ اس لئے ہے کہ زمین کی پیدائش

اصل مقصود ہے اور آسمان اس کے تابع۔ لہٰذا یہاں لفظ ثم فقط ذکر اور درجے کی ترتیب کے لئے ہے۔ (تفسیر کبیر) **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ آسمانوں زمین کی پیدائش میں بہت وقت صرف ہوا بلکہ بعض جگہ فرمایا گیا کہ ان کی پیدائش چھ دن میں ہوئی، مگر دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کی پیدائش فقط کن فرما دینے سے ہوئی۔ نیز جب اس وقت سورج بنا ہی نہیں تھا۔ تو چھ دن کیسے معلوم ہوئے، دن رات تو سورج سے ہوتے ہیں۔ **جواب:** اس کا مکمل جواب انشاء اللہ آیت فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ میں دیا جائے گا۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لو کہ ایک تو ہے بنانے کا طریقہ، دوسرے اس کی مدت کُنْ والی آیت میں طریقہ پیدائش بیان فرمایا گیا کہ رب تعالیٰ نے ان سب چیزوں کو کن فرما کر بنا دیا۔ آریوں کے پر میشور کی طرح روح اور مادے کا محتاج نہ تھا۔ اور ستۃ ایام والی آیت میں مدت پیدائش ذکر ہوئی کہ چھ دن میں چھ بار کن فرما کر یہ تمام چیزیں پیدا فرمائیں۔ نیز چھ دن سے اتنا وقت مراد ہے کہ اگر اس وقت سورج ہوتا تو اس کے چھ دن بن جاتے یا دن سے مراد دفعہ ہے۔ یعنی چھ دفعہ کن کی توجہ ہوئی، اور یہ تمام چیزیں بن گئیں۔ اب رہی یہ بات کہ کن فرمانے سے کیا مراد ہے۔ اور جبکہ اس وقت کوئی چیز موجود تھی ہی نہیں تو کن کس سے کہا گیا اور کس نے سنا اور چھ دن میں کیوں پیدا فرمایا یہ تمام باتیں انشاء اللہ انہی آیتوں کی تفسیر میں بیان ہوں گی اس قسم کے اعتراضات پنڈت دیانند کے اوہام ہیں۔ نیز آسمانوں کی حقیقت اور ان کی پیدائش کا پورا واقعہ اور ترتیب انشاء اللہ اسی جگہ بیان ہو گی۔ یہاں اس کا موقع نہیں۔ **پانچواں اعتراض:** آج سائنس کہتی ہے کہ آسمان کچھ نہیں کیونکہ دوربینوں اور تمام آلات رسد میں نظر نہیں آتا۔ اور روسی سیارہ چاند وغیرہ سے گزرتا ہوا سورج کے مدار میں پہنچ گیا۔ اگر آسمان تھا تو یہ راکٹ کیسے گزر گیا۔ **جواب:** آسمان ہیں اور ضرور ہیں۔ آلات سے نظر اپنی شفافی کی وجہ سے نہیں آتے جیسے ہوا آج تک کسی آلہ سے نہ دیکھی گئی، ہمیں کیا خبر کہ روسی راکٹ سورج تک پہنچا یا نہیں۔ اگر پہنچ بھی گیا ہو تو اس کی وجہ یہ ہے آسمان کا قوام پانی یا ہوا کی طرح رقیق ہے رب فرماتا ہے فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ (لیس: ۴۰) ہر تارا اپنے آسمان میں تیر رہا ہے، تیرنا رقیق چیز میں ہی ہو سکتا ہے بلکہ اس راکٹ سے تو حضور کی معراج کا مسئلہ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر جانے کے عقیدے کی تائید ہوتی ہے جو فلاسفہ آسمان کا چیرنا غیر ممکن مانتے ہیں ان کے مقابل واقعہ معراج وغیرہ کا ثبوت ہے۔

وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَةً ؕ
اور جبکہ فرمایا رب نے آپ کے واسطے فرشتوں کے تحقیق میں بنانے والا ہوں بیچ زمین کے
اور یاد کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے فرمایا میں زمین میں اپنا نائب بنانے والا ہوں
قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِیْهَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْهَا وَیَسْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ
نائب کہا انہوں نے کیا بنائے گا تو بیچ اس کے اس کو جو فساد پھیلائے گا بیچ اس کے اور
بولے کیا ایسے کو نائب کرے گا جو اس میں فساد پھیلائے گا اور خون ریزیاں کرے گا

وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لَا

بہائے گا خون اور ہم تسبیح کرتے ہیں ساتھ تیری تعریف کے اور پاکی بولتے ہیں واسطے تیرے

اور ہم تجھے سراہتے ہوئے تیری تسبیح کرتے ہیں اور تیری پاکی بولتے ہیں۔ فرمایا مجھے

تَعْلَمُونَ ﴿٣٠﴾

فرمایا رب نے تحقیق میں جانتا ہوں وہ جو تم نہیں جانتے

معلوم ہے تم نہیں جانتے۔

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **ایک:** یہ کہ پچھلی آیتوں میں ان نعمتوں کا ذکر فرمایا گیا جو بلا واسطہ ہر انسان کو ملتی ہیں زندگی اور موت اور زمین و آسمان کی نعمتیں، اب اس خاص نعمت کا ذکر ہے جو انسانوں کے والد حضرت آدم علیہ السلام کے ذریعہ سے ان کو ملی، یعنی حضرت آدم علیہ السلام کی عزت افزائی اور ان پر خاص کرم خداوندی، کیونکہ باپ کی عزت سے اولاد کی عزت ہے۔ **دوسرے:** یہ کہ پچھلی آیتوں میں قیامت تک ملنے والی دائمی نعمتوں کا ذکر فرمایا گیا۔ یعنی زندگی اور موت اور زمین و آسمان کی ظاہری نعمتیں، اور اب اس نعمت کا ذکر ہو رہا ہے جو شروع پیدائش کے وقت صرف ایک بار دی جا چکی اور جس کی وجہ سے نسل انسانی قیامت تک فخر کرے گی مگر چونکہ وہ پچھلی نعمتیں ہر شخص کو محسوس ہوتی تھیں اور کوئی بھی اس کا انکار نہ کر سکتا تھا اور یہ نعمت انبیاء کرام سے سن کر ہی معلوم ہوئی اس لئے ان کا ذکر پہلے ہوا۔ اور اس کا ذکر بعد میں۔ **تیسرے:** یہ کہ پہلی آیت سے معلوم ہوا تھا کہ عالم کی ساری چیزیں انسان کے لئے پیدا ہوئیں۔ اس پر سوال پڑ سکتا ہے کہ انسان تو ہزار ہا مخلوق سے کمزور ہے، فرشتے، جنات، ہاتھی اور شیر وغیرہ سب اس سے بڑھ کر طاقتور ہیں، پھر سب کا یہ حاکم کیونکر ہو سکتا ہے، اس آیت میں اس کا جواب دیا جا رہا ہے کہ اے معترض انسان کی محض جسمانی کمزوری کو مت دیکھ، بلکہ اس کی لیاقت اور قابلیت پر بھی نظر کر جو قدرت نے اس کو عطا فرمائی ہے، ہم تجھ کو تیری ابتداء پیدائش کا قصہ سناتے ہیں۔ جس سے تجھ کو معلوم ہو گا کہ بہترین مخلوقات یعنی ملائکہ نے تیرے پدر بزرگوار آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا اور ان کو اپنا خلیفہ مانا، حالانکہ فرشتے تمام مخلوق سے زیادہ طاقتور ہیں۔ جسمانی طاقت اور چیز ہے اور روحانی کمالات دوسری چیز۔ **چوتھے:** یہ کہ پچھلی آیت میں فرمایا گیا کہ انسان عالم کا مقصود ہے۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ انسان عالم کا مسجود، کیونکہ فرشتوں کا مسجود ہوا تو ان کے ماتحتوں کا بھی۔

تفسیر

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لفظ اذ ظرف ہے جو فعل کو چاہتا ہے۔ عام مفسرین اس جگہ اذکر نکالتے ہیں، یعنی اے محبوب ذکر کرو قرآن کریم نے بھی بعض جگہ اذ کے ساتھ اذکر ارشاد فرمایا ہے۔ وَاذْكُرْ أَخَا عَادٍ ۖ إِذْ أَنذَرَ قَوْمَهُ (احقاف: ۲۱) اور فرمایا وَ

اُذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ (ص: ۴۱) یہ اس آیت کی تفسیر ہیں۔ پچھلی آیتوں میں محسوس نعمتوں کا ذکر تھا اس لئے وہاں ضرورت نہ تھی۔ مگر یہاں اذکر ضروری ہے۔ اس اذکر کے دو معنی ہو سکتے ہیں یاد کرو۔ ان لوگوں سے ذکر کرو۔ خیال رہے کہ وہ چیز یاد دلائی جاتی ہے جو پہلے سے علم میں ہو، یا تو بتا دی دی گئی ہو یا دکھا دی گئی ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ سارے واقعات حضور ﷺ کے علم میں ہیں اور ظاہر ہے کہ اس سے پہلے بتائے نہیں گئے تھے کیونکہ قرآن کریم تو اب اتر رہا ہے۔ اور حضور نے تاریخ بھی نہ پڑھی تھی ثابت ہوا کہ وہ سب حضور کو دکھا دیئے گئے تھے، اس لئے فرمایا جاتا ہے کہ اے محبوب ذرا اس واقعہ کو تو یاد کرو۔ بعض جگہ ارشاد ہوا ہے۔ اَلَمْ تَرَ یعنی اے محبوب کیا تم نے وہ واقعہ نہ دیکھا یعنی دیکھا ہے، اس سے حضور کا علم غیب بھی ثابت ہوا۔ اور حاضر و ناظر ہونا بھی قَالَ رَبُّكَ یہ خبر سیدنا آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے فرشتوں کو دے دی گئی تھی۔ اس میں چند حکمتیں تھیں، ایک یہ کہ بندوں کو مشورہ کرنے کی ہدایت ہے اور اس سے معلوم ہوا کہ مشورہ سنت الٰہیہ ہے دوسرے یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کی عظمت ظاہر کہ ان کی تشریف آوری سے پہلے ہی ان کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ سلطنت کے معمولی حکام دن رات آتے جاتے رہتے ہیں لیکن جب بادشاہ دار السلطنت سے چلتا ہے تو سارے ملک میں اس کا اشتہار ہو جاتا ہے کہ فلاں بادشاہ آنے والا ہے کیونکہ وہ سلطنت کا بڑا رکن ہے، آدم علیہ السلام بھی عالم کے اصل مقصود تھے۔ اس لئے ان کی آمد کا اس طرح اعلان فرمایا گیا۔ تیسرے یہ کہ ان کی تشریف آوری سے پہلے ہی ملائکہ کے سارے شبہات دور کر دیئے جائیں، تا کہ ان کی آمد کے بعد سوال و جواب کا موقع نہ رہے۔ ربک اس میں حضور ﷺ کی شان کا اظہار ہے اس لئے کہ یہاں یہ نہ فرمایا گیا کہ میں نے کہا یا اللہ نے فرمایا! بلکہ یوں فرمایا کہ اے محبوب تمہارے رب نے فرمایا یعنی رب نے اپنا ذکر حضور ﷺ کے ذکر کے ساتھ کیا اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ سب کچھ حضور ﷺ کے لئے ہو رہا تھا۔ چونکہ آپ کو پیدا کرنا منظور تھا اس لئے یہ سارے انتظامات ہوئے جیسے کہ پھول کے لئے سارا باغ لگایا جاتا ہے بلاشبہ جیسے باپ اپنے بیٹے سے کہے کہ تیرے باپ نے مکان بنایا۔ باغ لگایا، کوٹھیاں تعمیر کرائیں، یعنی تیرے لئے مَلٰٓئِكَةِ۔ ملائکہ ملک کی جمع ہے اس کے معنی ہیں فرشتہ یہ لفظ ملوکہ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں پیغام، اہل عرب کہتے ہیں مَلَكَنِيْ اِلَيْهِ یعنی مجھ کو اس کی طرف بھیجا۔ اس سے مالک بنا اس کو بدل کر مَلِئَكٌ ہوا۔ پھر ہمزہ گر کر ملک رہا۔ اس کی جمع ملائک ہوئی جیسے شمائل، پھر جمع کو مونث کرنے کیلئے تا لگا دی گئی۔ اب اس کے معنی ہوئے قاصد، چونکہ فرشتے حق تعالیٰ اور اس کے پیغمبروں کے درمیان وحی لانے والے قاصد ہوتے ہیں۔ نیز اس دنیا میں رحمتیں اور عذاب لے کر آتے ہیں اس لئے انہیں ملک کہتے ہیں۔

فرشتے کی حقیقت

یہ نوری جسم ہیں۔ مختلف شکل بدل سکتے ہیں بہت طاقتور ہیں، عالم ملکوت میں سے ہیں۔ ان کی کثرت کا یہ حال ہے کہ تفسیر روح البیان وغیرہ نے فرمایا کہ انسان جنات کا دسواں حصہ اور جن وانس خشکی کے جانوروں کے دسواں حصہ اور یہ سب مل کر پرندوں کا دسواں حصہ اور یہ سب مل کر دریائی جانوروں کا دسواں حصہ اور یہ سب مل کر زمین کے فرشتوں کا دسواں حصہ اور یہ

سب مل کر پہلے آسمان کے فرشتوں کا دسواں حصہ اور وہ سب مل کر دوسرے آسمان کے فرشتوں کا دسواں حصہ، ساتویں آسمان تک یہ ترتیب ہے۔ پھر یہ تمام مخلوقات کرسی کے فرشتوں کے مقابلے میں بہت کم ہیں، وہ سب مل کر عرش اعظم کے ایک پردے کے فرشتوں کے مقابلے میں، خیال رہے کہ عرش اعظم کے چھ لاکھ پردے ہیں اور ہر پردے پر اسی قدر ملائکہ ہیں، پھر یہ تمام مخلوق ان فرشتوں کے مقابلے میں جو عرش اعظم کے آس پاس گھومتے رہتے ہیں ایسے ہیں جیسے دریا کے مقابلے میں قطرہ، ان کی تعداد رب ہی جانتا ہے، یہ تمام فرشتے رب کے مطیع بندے اور ہر دم اس کی عبادت میں مشغول رہنے والے ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ سب سے بڑی مخلوق فرشتے ہی ہیں۔ قرآن کریم بھی فرما رہا ہے۔ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ إِلَّا هُوَ (المدثر:۳۱) یعنی رب کے لشکروں کو وہی جانتا ہے، اس جگہ تفسیر کبیر اور روح البیان نے فرمایا کہ حضور ﷺ نے معراج میں ایک جگہ فرشتوں کی قطاریں جاتی ہوئی دیکھیں۔ جبرئیل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کہاں جا رہے ہیں، جبرائیل نے عرض کیا کہ میں تو جب سے پیدا ہوا ہوں اس قطار کو ایسے ہی دیکھا مجھ کو خبر نہیں کہ کہاں سے آ رہے ہیں؟ کہاں جا رہے ہیں، ہاں جو فرشتہ ایک بار گزر جاتا ہے دوبارہ لوٹ کر نہیں آتا۔ فرمایا تا چلو ان سے پوچھیں چنانچہ ان میں سے ایک سوال کیا گیا کہ تیری عمر کتنی ہے اس نے جواب دیا مجھے خبر نہیں ہاں اتنا جانتا ہوں کہ رب تعالیٰ ہر چار لاکھ سال کے بعد ایک تارا پیدا فرماتا ہے اور میں نے چار لاکھ تارے پیدا ہوتے ہوئے دیکھے۔

ملائکہ کی قسمیں

فرشتے چند قسم پر ہیں۔ جن کا ذکر قرآن میں آ رہا ہے، ایک عرش کے اٹھانے والے، دوسرے عرش اعظم کے گرد گھومنے والے، تیسرے جلیل القدر ملائکہ جیسے جبرائیل و میکائیل، چوتھے جنت کے فرشتے، پانچویں جہنم کے جن کے سردار کا نام مالک ہے دیگر فرشتوں کا نام زبانیہ ہے، چھٹے وہ فرشتے جو انسانوں کی حفاظت کے لئے مقرر کئے گئے۔ ساتویں اعمالنامہ لکھنے والے فرشتے جنہیں کراماً کاتبین کہتے ہیں۔ آٹھویں وہ فرشتے جن کے سپرد دنیا کے انتظامات ہیں، پھر ان کی بہت سی قسمیں ہیں بعض پانی برسانے والے، بعض رحم میں بچہ بنانے والے بعض مصیبت کے وقت انسانوں کی مدد کرنے والے وغیرہ وغیرہ، اسی جگہ تفسیر کبیر نے سیدنا عبداللہ ابن عباس سے روایت کی ہے کہ جو شخص کسی جنگل میں پھنس جائے تو اس طرح آواز دے أَعِينُونِي عِبَادَ اللَّهِ يَرْحَمُكُمُ اللَّهُ یعنی اے اللہ کے بندو میری مدد کرو۔ اسی طرح حصن حصین میں بھی ہے اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے بندوں کو مصیبت کے وقت پکارنا سنت صحابہ کرام ہے۔

فرشتوں کی صفات

۱۔ فرشتے اللہ اور رسول کے درمیان واسطہ ہیں۔ ۲۔ وہ ہمیشہ عبادت گزار اور ساجد ہیں۔ ۳۔ حق تعالیٰ سے ان کو بہت قرب حاصل ہے۔ ۴۔ وہ معصوم ہیں کہ کبھی حق تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کر سکتے۔ ۵۔ وہ حق تعالیٰ سے نہایت ڈرنے والے ہیں۔ ۶۔ وہ خدا تعالیٰ کے دوستوں کی مدد کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے ساتھ ہو کر کفار سے لڑتے ہیں، جیسا کہ جنگ بدر میں ہوا۔

۷۔ان کے بازو اور پر ہیں۔یہ ساری قسمیں اور ان کی ساری صفات قرآن پاک میں صراحۃً آئی ہیں۔اگر ان تمام آیتوں کو جمع کرنا ہے تو تفسیر کبیر یہی مقام اور تفسیر حقانی کا مقدمہ دیکھو۔خیال رہے کہ اولاً حق تعالیٰ نے فرشتوں کو آسمان میں اور جنات کو زمین میں بسایا تھا۔یہ واقعہ آدم علیہ السلام کی پیدائش سے ساٹھ ہزار سال پہلے ہوا۔یہ جنات زمین میں سات ہزار سال تک آباد رہے، پھر ان کا آپس میں بغض وحسد شروع ہوا۔چنانچہ انہوں نے آپس میں خوب جنگ وخون ریزی کی اس وقت تک ابلیس جس کا نام عزازیل تھا بہت مقبول بارگاہ الٰہی تھا اور تمام ملائکہ میں بڑا عالم اور عابد،اس کو حکم ہوا کہ اپنے ساتھ فرشتوں کی ایک جماعت لے جا اور جنات کو زمین سے نکال کر ان کو جزیروں اور پہاڑوں میں آباد کردے۔چنانچہ ابلیس نے ایسا ہی کیا جو فرشتے کہ ابلیس کے ساتھ آئے تھے وہ اس زمین پر آباد کردیئے گئے۔لہٰذا اب فرشتوں کے دو حصے ہوگئے۔ایک زمین والے اور ایک آسمان والے،حق تعالیٰ نے اس خدمت کے انعام میں ابلیس کو زمین اور پہلے آسمان کی بادشاہت اور جنت کے خزانے عطا فرمائے لہٰذا یہ کبھی زمین میں عبادت کرتا کبھی آسمان میں کبھی جنت میں،اس کے عروج وترقی نے اس کے دل میں فخر پیدا کیا اور سوچنے لگا کہ میں تمام ملائکہ سے افضل ہوں۔اتنا واقعہ خیال رہے یہ آئندہ تفسیر میں کام آئے گا۔

اس میں اختلاف ہے کہ حضرت آدم کی آمد کی خبر کن فرشتوں کو دی گئی تھی آیا سب کو یا بعض کو،بعض فرماتے ہیں کہ صرف زمین کے رہنے والوں کو ہی خبر دی گئی تھی۔

مگر صحیح یہ ہے کہ سارے فرشتوں کو ہی بتایا گیا تھا کیونکہ آیت میں کوئی قید نہیں۔**نکتہ:** صرف فرشتوں کو ہی خبر دی گئی نہ کہ دیگر مخلوقات کو۔اس لئے کہ فرشتے دنیا کے انتظام کرنے والے ہیں اور باقی مخلوقات ان کے تابع۔چونکہ اب فرشتوں کو سیدنا آدم کا ماتحت ہونا ہوگا،اس لئے ان کو بتانا سخت ضروری تھا۔وائسرائے کی آمد کی خبر سلطنت کے نوکروں کو خاص طور پر دی جاتی ہے، نیز اس وقت فرشتے ہی ساری مخلوقات سے افضل اور طاقتور تھے جب یہی مطیع بنا دیئے گئے تو دوسرے خود بخود مطیع ہو جائیں گے اسی لئے فرشتوں ہی سے سجدہ بھی کرایا گیا۔نیز جب فرشتوں کو اطلاع دیدی گئی تو باقی مخلوقات کو خود بخود ہوگئی۔ کیونکہ ان کا سب میں دور دورہ تھا حکومت کی خبریں پہلے خاص محکمے کی طرف آتی ہیں۔نیز فرشتوں کو ہی اپنے خلیفہ ہونے کی امید ہوسکتی تھی۔کیونکہ وہ طاقتور،عبادت گزار اور معصوم بندے تھے۔انہی کو خبر دی گئی تا کہ اپنے سارے سوال وجواب کر لیں۔اِنِّیْ جَاعِلٌ اس جگہ جَاعِلٌ فرمایا گیا نہ کہ خَالِقٌ اس لئے کہ خلق کے معنی ہیں پیدا کرنا اور جعل کے معنی ہیں بنانا۔ محسوس چیزوں کے پیدا کرنے کو خلق کہتے ہیں۔اور اس کے باطنی صفات کے پیدا کرنے کو جعل،اسی لئے قرآن کریم نے فرمایا۔ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَ جَعَلَ الظُّلُمٰتِ وَ النُّوْرَ (انعام:۱) آسمان زمین محسوس جسم تھے ان کے لئے خلق فرمایا گیا۔اور تاریکی اور روشنی ملکوتی چیزیں ہیں اس لئے جعل فرمایا گیا۔چونکہ اس جگہ صرف حضرت آدم علیہ السلام کے جسم شریف کے بنانے کی خبر دینا منظور نہیں۔جسم تو بہت سی مخلوقات کے پیدا ہو چکے تھے،بلکہ ان کی خلافت کی خبر دینا منظور تھی۔ اس لئے جَاعِلٌ فرمایا گیا۔ایک جگہ فرمایا گیا ہے اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ (ص:۷۱) اس میں صرف ان کی پیدائش کا ذکر ہوا۔فِی الْاَرْضِ سیدنا آدم علیہ السلام کی خلافت زمین میں اس لئے مقرر فرمائی گئی کہ آسمان میں تو جھگڑے فساد، جنگ و

جدال، خونریزیاں کبھی ہوں گی ہی نہیں۔ اس لئے وہاں کسی منتظم خلیفہ کی ضرورت بھی نہیں۔ یہ ساری بیماریاں زمین میں ہی ہونے والی تھیں۔ اس لئے یہاں ہی خلیفہ کی ضرورت تھی، رہی یہ بات کہ ساری زمین کا خلیفہ بنایا گیا یا بعض کا، ظاہر یہی ہے کہ ساری کا کیونکہ یہاں کوئی قید نہیں۔ **خلیفة خلف** سے بنا ہے جس کے معنی ہیں پیچھے۔ خلیفہ بروزن فعیلۃ صفت مشبہ کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں پیچھے آنے والا یا نائب جو کسی کے پیچھے یا غیر موجودگی میں اس کا کام کرے۔ ظاہر ہے کہ یہاں اللہ کا خلیفہ مراد ہے۔ اگرچہ خدا تعالیٰ ہر وقت موجود ہے اس کو خلیفہ بنانے کی ضرورت نہیں مگر بندوں کو ضرورت ہے کیونکہ حق تعالیٰ تک ان کی رسائی نہیں۔ درمیان میں ایسے واسطے کی ضرورت پڑی جو رب سے فیض لے اور بندوں تک پہنچائے وہی رب کا خلیفہ ہے، خلیفہ تین قسم کا ہوتا ہے۔ پس وفات سلطان اس کا کام چلانے والا جیسے حضور کے خلفاء راشدین، پس پشت سلطان کارفرما۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام کی غیر موجودگی میں حضرت ہارون یا حضور کی غیوبت میں حضرت ابن ام مکتوم۔ پس پردہ نیابت کرنے والا۔ یہاں تیسری خلافت مراد ہے کیونکہ رب نہ میت ہے نہ غائب بلکہ محجوب ہے۔ اسی لئے قیامت میں کوئی اس کا خلیفہ نہ ہوگا کہ رب ظاہر و عیاں ہوگا۔ اس لحاظ سے سارے پیغمبر اور حضور ﷺ کے بعد قیامت تک ہر زمانے کے قطب خلیفۃ اللہ ہیں، چنانچہ قرآن کریم نے فرمایا یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ (ص:۲۶) پہلے خلیفہ حضرت آدم علیہ السلام ہوئے اور آخری خلیفہ عیسیٰ علیہ السلام ہوں گے کیونکہ وہ امت مصطفیٰ ﷺ کے خاتم الاولیاء یعنی آخری ولی ہیں۔ مگر اس آیت میں خلیفہ سے آدم علیہ السلام ہی مراد ہیں۔ کیونکہ یہاں سارے واقعات انہی کے بیان ہو رہے ہیں۔

حضرات انبیاء کرام چند وجوہ سے خلیفۃ اللہ ہوئے، **ایک** یہ کہ یہ آسمانی اور زمینی چیز کے مجموعہ ہیں کہ ان کا جسم فرشی اور روح عرشی ہے، **دوسرے** یہ کہ یہ حق تعالیٰ کی ساری صفات کے مظہر ہیں، **تیسرے** یہ کہ ان کو رب نے اپنا علم عطا فرمایا جس سے انہوں نے قوانین اور قاعدے بنا ڈالے۔ **چوتھے** یہ کہ ان کو اپنا کلام دیا کہ رب کے کلام کو اپنی زبان سے مخلوق تک پہنچایا۔ **پانچویں** یہ کہ ان کو ایسی قدرت کاملہ عطا فرمائی جو رب کی قدرت کا نمونہ ہے اگرچہ بظاہر فرشتے بڑے قوی ہیں لیکن نبی کی قوت و قدرت ان سے کہیں بڑھ کر ہے۔ حضرت ملک الموت موسیٰ علیہ السلام کے ایک تھپڑ کی تاب نہ لا سکے جیسا کہ احادیث میں آیا ہے۔ **چھٹے** یہ کہ دنیا کی ہر چیز کو ان کے قبضے میں دیا گیا کہ حیوانات جمادات بلکہ آسمان و زمین پر ان کی حکومت قائم ہوئی، خیال رہے کہ سلطان کی نیابت و خلافت دو جزوں پر موقوف ہے۔ سلطان کا سا علم اور سلطان کی سی قدرت اسے عطا ہو۔ ورنہ وہ سلطان کا کام نہیں سنبھال سکتا۔ اس لئے رب نے حضرت آدم کی خلافت ثابت کرنے کے لئے انہیں علم اسماء دیا۔ اس علم کی عطا ظاہر فرمائی۔ اور مسجود ملائکہ بنایا اس میں قدرت خلیفہ ظاہر کی۔ بڑی قدرت والے فرشتوں کے مسجود ہیں۔ **ساتویں** یہ کہ جسمانیات کے علاوہ روحانیات میں بھی ان کا بہت دور دورہ ہے کہ جنات فرشتے ان کے قبضہ میں، خیال تو کرو کہ عرب کا ایک ناقہ نشین شہنشاہ ﷺ آن کی آن میں زمین و آسمان کو طے فرماتا ہوا وہاں تشریف فرما ہو کر آ گیا، جہاں فرشتے کا خیال بھی نہیں پہنچ سکتا۔ یہ تو قوت انبیاء کا کچھ ذکر ہوا شاید اس کا کفار انکار کر جائیں، لیکن اب سائنس کے کرشمے اور مسمریزم کی طاقتیں تو سب پر ظاہر ہو گئیں کہ جس نے انسان کی طاقت و قوت کو بالکل ظاہر کر دیا۔ بھلا خیال کرو

کہ انسان نے زمین پر بیٹھے بیٹھے آسمانوں کی پیمائش کر ڈالی۔ چاند تاروں کی حرکتیں معلوم کر کے ان کی تقسیم کر ڈالی۔ جس سے گھنٹے منٹ اور سیکنڈ بنالئے۔ آوازوں کو فوٹو گراف میں قید کر لیا۔ ٹیلی فون اور تار برقی کے ذریعہ تین سیکنڈ میں آواز کو ساری زمین میں گھمادیا۔ غرضیکہ اس نے وہ کام کر کے دکھائے۔ جن کی مثال نہیں۔ معلوم ہوا کہ یہی حق تعالیٰ کی صفات کا مظہر ہے اور یہی خلافت کے لائق، بعض نے فرمایا کہ یہاں خلیفہ سے مراد جنات اور فرشتوں کا خلیفہ ہے۔ کیونکہ یہ انسان ان دونوں کے بعد زمین میں آباد ہوئے۔ اس معنی سے سارے انسان خلیفہ ہیں۔ قرآن کریم نے فرمایا یَجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ (نمل: ۶۲) شیخ ابن عربی فتوحات مکیہ کے دسویں باب میں فرماتے ہیں کہ آدم علیہ السلام حضور ﷺ کے پہلے خلیفہ اور نائب ہوئے امام بوصیری قصیدہ بردہ شریف میں فرماتے ہیں:

فَإِنَّکَ شَمْسُ فَضْلٍ هُمْ كَوَاكِبُهَا يظهرن انوارها لِلنَّاسِ فِي الظُّلَمِ

"یعنی اے نبی ﷺ آپ بزرگی کے سورج ہیں اور سارے پیغمبر آپ کے تارے۔" اسی قسم کا مضمون مولوی صاحب بانی مدرسہ دیوبند نے بھی تحذیر الناس میں لکھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام بلکہ سارے پیغمبر نبی ﷺ کے خلیفہ ہیں، قَالُوٓا أَتَجْعَلُ فِيهَا یہ وہ عرض ہے جو فرشتوں نے خلیفہ کی خبر سن کر بارگاہ الٰہی میں پیش کی، یا تو یہ کلام سارے فرشتوں کا ہے یا زمین والوں کا، بعض علماء فرماتے ہیں کہ صرف ہاروت و ماروت کا۔ علماء فرماتے ہیں کہ جن فرشتوں نے یہ عرض کر کے خون ریزی اور فساد کو انسان کی طرف نسبت دی ان کو حق تعالیٰ نے اس لئے مقرر کیا ہے کہ جہاد میں شرکت کر کے مسلمانوں کی امداد کیا کریں۔ (تفسیر روح البیان)۔ مَنْ يُّفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ فرشتوں نے سمجھا کہ انسان کی خلافت سے زمین میں دوز بردست خرابیاں پیدا ہوں گی، ایک فساد دوسرے خونریزی یا تو اس لئے سمجھا کہ وہ لوح محفوظ میں دیکھ چکے تھے رب نے انہیں علم غیب بخشا کہ سعادت وشقاوت سے خبردار تھے، خیال رہے کہ یہاں حضرت آدم کی اولاد کا فساد پھیلانا اور خونریزی کرنا مراد ہے نہ کہ خود حضرت آدم علیہ السلام کا، تو آپ تو معصوم ہیں یا اس لئے کہ جنات نے بھی خرابیاں کی تھیں اور جو شہوت اور غصہ ان میں تھا وہ انسان میں بھی ہے۔ لہٰذا ان دونوں کے کام بھی یکساں ہی ہوں گے۔ خیال رہے کہ ان کی مراد فساد سے گناہ، اور بدکاریاں ہیں، چونکہ انسان میں شہوت ہے اس لئے وہ اپنے سارے اعضاء کو گناہوں میں صرف کرے گا اپنے کان اور آنکھوں کو غیبت، چغلی سننے اور نامحرم عورتوں اور لڑکوں کو دیکھنے میں صرف کرے گا اور زبان کفریات بکنے جھوٹ بولنے بروں کو بھلا کہنے اور بھلوں کو گالیاں دینے میں استعمال کرے گا اور چونکہ اس کو بھوک وغصہ بھی ہے۔ اس لئے گوشت کھانے اور پوست لینے کے واسطے خشکی اور دریائی جانوروں کو قتل کرے گا۔ بلکہ ملک اور مال، حکومت، عزت حاصل کرنے کے لئے خود انسانوں کو قتل کر کے زمین کو خون سے رنگین کرے گا۔ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ۔ نُسَبِّحُ تسبیح سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں عیوب سے پاک کرنا اور پاک جاننا، یہاں دوسرے معنی مراد ہیں۔ یعنی ہم سب فرشتوں کا یہی کام ہے کہ ہمیشہ تیری پاکی بولا کریں اور تیری تعریف کیا کریں، یا تیرا شکر بجالایا کریں۔ وَنُقَدِّسُ لَكَ۔ نقدس تقدیس سے بنا ہے، جس کے معنی ہیں کسی کی صفات کمالیہ بیان کرنا تسبیح میں عیبوں کی نفی اور تقدیس میں صفات کا اثبات ہے تو ان کا مطلب یہ ہوا کہ مولیٰ

ہم فرشتوں میں گناہ کرنے کا مادہ ہی نہیں کیونکہ ہم میں نہ غضب ہے، نہ غصہ ہے، نہ شہوت، نہ غرور، نہ حسد وغیرہ ہمارے کام صرف تین ہی ہیں۔ تیری پاکی بولنا، تیرا شکر کرنا اور تیری عظمت بیان کرنا۔ لہٰذا اگر ہم کو ہی اس خلافت سے سرفراز فرمایا جائے تو تیرا عین کرم ہے۔ کیونکہ ہماری وجہ سے تیری زمین گندی نہ ہو گی۔ جواب ملا قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ یعنی اے فرشتو ہم کو تمہاری عبادت اور انسان کی نافرمانی کا پورا پورا علم ہے۔ مگر پھر بھی اس کو خلیفہ بنانے میں جو راز ہیں۔ وہ تم نہیں جانتے تم میں اور اس میں چند فرق ہیں، اسی وجہ سے وہ خلافت کا زیادہ حقدار ہے۔ **ایک** یہ کہ تم کامل عابد اور وہ کامل عالم ہو گا اور عابد کے لئے مسجد کا محراب اور عالم کے لئے خلافت کا تخت و تاج ہے۔ **دوسرے** یہ کہ تمہارا تعلق فقط عالم ارواح سے ہے اس کا تعلق اجسام و ارواح دونوں سے ہو گا کیونکہ اسے جسم اور روح دونوں ملیں گے۔ **تیسرے** یہ کہ تمہاری عبادت جبری ہے وہ تمہاری غذاء ہے ان کی عبادت اختیاری ہو گی، **چوتھے** یہ کہ تمہیں عبادت سے کوئی چیز روکنے والی نہیں۔ اس کے لئے ہزاروں چیزیں درپیش ہوں گی پھر وہ ان سب پر لات مار کر ہماری اطاعت کرے گا۔ اس لئے اس کا ایک سچا سجدہ تمہاری ہزارہا عبادتوں سے افضل ہو گا۔ **پانچویں** یہ کہ تم میں کوئی گنہگار نہیں، اس لئے تم سے ہماری شان ستاری غفاری ظاہر نہیں ہو سکتی ان میں گنہگار بھی ہوں گے جن کے گناہوں کو میں چھپاؤں گا۔ اور جب وہ روتے ہوئے توبہ کریں گے تو میں مغفرت کروں گا۔ بے شک ان میں شہوت اور غصہ ہو گا۔ مگر جب وہ میرے لئے صرف ہو گا تو اس سے بڑے بڑے عمدہ نتیجے نکلیں گے اس کے دل میں میرے عشق اور محبت کا جوش اور اس کے خیال میں میرا جذبہ ہو گا۔ اور جب وہ اپنا غصہ میری رضا کے لئے استعمال کرے گا۔ تو میدان جہاد میں جانباز غازی بن کر آئے گا اور شہید یا فتح مند ہو کر مٹے گا اور چونکہ ان میں برائیاں قباحتیں ہوں گی اس لئے ان میں رسول کتابیں اور احکام بھیجے جائیں گے اور ان سے وعدے وعید کئے جائیں گے۔ اے ملائکہ اور اے فرشتو! جس طرح ان میں فاسق و فاجر و بدکار ہوں گے ایسے ہی ان میں عابد و زاہد متقی و پرہیزگار بھی ہوں گے میرے وفادار راز دار بھی ہوں گے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان میں احمد مختار ہوں گے اور ان کے صحابہ کبار اور اہل بیت اطہار **چھٹے** یہ کہ تم صرف رکوع وسجدہ کی عبادتیں کر سکتے ہو۔ انسان ہزار ہا ایسی عبادتیں کرے گا جو تم نہیں کر سکتے۔ وہ بھوکا رہ کر روزہ دار، مسافر بن کر حاجی، میری راہ میں لڑ کر غازی، میرا قرآن پڑھ کر قاری، دشمنوں میں فیصلہ کر کے قاضی، چہرہ پاک مصطفیٰ کو دیکھ کر صحابی بنے گا۔ غرضیکہ ہر عضو سے صدہا عبادتیں انجام دے گا۔ **ساتویں** یہ کہ اے فرشتو اس انسان کے طفیل تم کو ہزار ہا عبادتیں نصیب ہو جائیں گی جو اب تم نہیں کر سکتے پھر تم میں کوئی حامل وحی بن کر فرشتوں کا سردار بنے گا۔ کوئی بدر کے میدان میں صحابہ کے ساتھ شرکت کر کے ہم سے تمغہ پائے گا۔ کوئی کاتب اعمال بنے گا۔ **آٹھویں** یہ کہ اسے درد دل اور عشق ملے گا۔

خلاصہ تفسیر

انسانوں کو دو نعمتیں بتا کر تیسری نعمت یاد دلائی جا رہی ہے اور فرمایا جا رہا ہے کہ رب تعالیٰ نے تم پر اتنا بڑا افضل فرمایا جو کسی مخلوق پر نہ فرمایا تھا۔ کہ تمہارے دادا حضرت آدم علیہ السلام کو وہ عزت بخشی کہ فرشتوں کو ان کی پیدائش کی خبر دی کہ ہم زمین پر اپنا

نائب پیدا فرمانا چاہتے ہیں اس کے اور اس کی اولاد انبیاء کرام کی معرفت اپنے احکام جاری کریں گے جب ملائکہ نے سنا تو وہ سمجھے کہ آدم علیہ السلام خدا کے برگزیدہ بندے ہوں گے کیونکہ ان کی پیدائش سے پہلے ان کی خلافت اور حکومت کی منادی ہو رہی ہے مگر جب انہیں یہ معلوم ہوا کہ ان کے خمیر میں آگ، پانی، ہوا اور مٹی موجود ہیں جس سے کہ ان میں شہوت اور غصہ یقیناً ہوگا جو کہ فساد کی جڑ ہے تو نہایت تعجب سے کہنے لگے کہ اے مولا! ایسے کو خلیفہ بنانے میں کیا حکمت ہے۔ جس میں ایسے فسادات کا اندیشہ ہو، رہی تیری تسبیح وحمد، اس کے لئے ہم فرشتے موجود ہیں۔ جن میں نہ غصہ ہے، نہ شہوت، رب تعالیٰ نے مجملاً یہ جواب ہی دے دیا کہ اس میں جو حکمت ہے وہ تم کو نہیں معلوم۔ تم میں شہوت وغصہ کا نہ ہونا ہی اس بات کا باعث ہے کہ تمہارے سوا ان کو خلیفہ بنایا جائے۔

آدم علیہ السلام کی پیدائش

تفسیر عزیزی وغیرہ میں آدم علیہ السلام کی پیدائش کا واقعہ اس طرح نقل فرمایا کہ حق تعالیٰ نے حضرت جبرائیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ تمام روئے زمین سے ہر قسم کی سیاہ، سفید، سرخ، کھاری، میٹھی، نرم خشک ایک مٹھی خاک اٹھالاؤ۔ حضرت جبرائیل نے زمین پر تشریف لاکر خاک اٹھانی چاہی، زمین نے سبب پوچھا، حضرت جبرائیل نے سارا واقعہ بیان کیا۔ زمین نے عرض کیا کہ میں اس سے خدا کی پناہ پکڑتی ہوں کہ تو مجھ سے خاک اٹھا کر انسان بنائے جس کی وجہ سے میرا کچھ حصہ جہنم میں پہنچے۔ حضرت جبرئیل خالی واپس گئے اور عرض کیا کہ خدایا زمین نے تیری عزت کی پناہ پکڑی میں تیرے نام اور عزت کے ادب سے اس سے خاک نہ اٹھا سکا۔ حق تعالیٰ نے پھر حضرت اسرافیل ومیکائیل کو باری باری بھیجا مگر وہ بھی اسی طرح واپس آگئے۔ آخر میں حضرت ملک الموت بھیجے گئے انہوں نے زمین کی ایک نہ سنی بلکہ فرمایا کہ میں تو اللہ کے حکم کا تابعدار ہوں۔ تیری عاجزی اور زاری کی وجہ سے رب کی اطاعت نہیں چھوڑ سکتا۔ اسی لئے ان کو جان نکالنے کا کام سپرد کر دیا گیا کہ تم نے ہی اس خاک کو زمین سے الگ کیا ہے، تم ہی اس کو ملانا۔ اب انہیں حکم ہوا کہ اس خاک کو وہاں رکھو جہاں آج خانہ کعبہ ہے۔ فرشتوں کو حکم ہوا کہ اس خاک کا مختلف پانیوں سے گارا بنائیں۔ چنانچہ اس پر چالیس روز بارش ہوئی۔ انتالیس دن تو غم ورنج کا پانی برسا، اور ایک دن خوشی کا۔ اسی لئے انسان کو رنج وغم زیادہ رہتے ہیں اور خوشی کم ہوتی ہے۔ پھر اس گارے کو مختلف ہواؤں سے اتنا خشک کیا کہ کھنکھنانے لگا۔ جیسے قرآن کریم ارشاد فرما رہا ہے صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ (الرحمٰن: ۱۴) پھر فرشتوں کو حکم ہوا کہ اس گارے کو مکے اور طائف کے درمیان وادیٔ نعمان میں عرفات پہاڑ کے نزدیک رکھیں، پھر حق تعالیٰ نے خاص اپنے دست قدرت سے اس گارے کو حضرت آدم کا قالب بنایا اور ان کی صورت تیار کی فرشتوں نے کبھی ایسی صورت نہ دیکھی تھی۔ تعجب سے اس کے آس پاس پھرتے تھے۔ اس کی خوبصورتی سے حیران تھے۔ ابلیس کو بھی اس سارے اعلان وغیرہ کی خبر ہو چکی تھی وہ بھی اس قالب کو دیکھنے آیا اور اس کے گرد پھر کر بولا کہ اے فرشتو! تم اسی کا تعجب کرتے ہو۔ یہ تو ایک اندر سے خالی جسم ہے جس میں جگہ جگہ سوراخ ہیں اور اس کی کمزوری کا یہ حال ہے کہ اگر بھوکا ہو تو گر پڑے اور اگر خوب سیر ہو جائے تو چل پھر نہ سکے۔ اس قالب خالی سے کچھ نہ ہو سکے گا، پھر بولا ہاں اس کے سینے کی بائیں طرف ایک بند کوٹھڑی ہے (دل) یہ خبر نہیں کہ

اس میں کیا ہے۔ شاید کہ یہی لطیفہ ربانی کی جگہ ہو جس کی وجہ سے یہ خلافت کا حقدار ہوا۔ پھر روح کو حکم ہوا کہ اس قالب میں اور اس کے گڑھوں میں بھر جائے۔ جب روح قالب کے پاس پہنچی تو جسم کو تنگ و تاریک پایا اندر جانے سے ٹھہر گئی۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ تب نور مصطفیٰ ﷺ سے وہ قالب جگمگا دیا گیا۔ یعنی وہ نور پیشانی آدم علیہ السلام میں امانت رکھا گیا۔ اب روح آہستہ آہستہ داخل ہونے لگی ابھی سر میں تھی کہ آدم علیہ السلام کو چھینک آئی اور زبان سے نکلا الحمد للہ حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا یَرْحَمُکَ اللّٰہ ہی اب بھی سنت ہے۔ جب روح کمر تک پہنچی، حضرت آدم نے اٹھنا چاہا مگر گر پڑے کیونکہ نیچے کے دھڑ میں روح پہنچی ہی نہیں تھی۔ حق تعالیٰ نے فرمایا خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ (الانبیاء: ۳۷) فرمایا تمام بدن میں روح پھیل گئی تو حکم ہوا کہ فرشتوں کے پاس جا کر ان کو سلام کرو۔ اور سنو وہ تمہیں کیا جواب دیتے ہیں تب آدم علیہ السلام ادھر تشریف لے گئے اور فرمایا السلام علیکم انہوں نے جواب دیا وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ ارشاد الٰہی ہوا کہ یہی الفاظ تمہارے اور تمہاری اولاد کے لئے مقرر کیے گئے۔ حضرت آدم نے عرض کیا کہ مولیٰ میری اولاد کون تب ان کی پشت پر دست قدرت پھیر کر اس سے ساری انسانی روحیں نکالی گئیں اور آدم علیہ السلام کو سب دکھائی گئیں اور انہیں کافر و مومن، منافق، اولیاء، قطب، انبیاء دکھائے گئے جس کا ذکر آگے کی آیتوں میں آتا ہے۔

آیت کے فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک:** یہ کہ کوئی اہم کام بغیر مشورہ نہ کیا جائے کیونکہ مشورہ کرنا سنت الٰہی بھی ہے اور ہم کو اس کا حکم بھی ہے۔ **دوسرے:** یہ کہ کام میں جلد بازی ہرگز نہ کرنی چاہئے۔ حق تعالیٰ نے جو کہ قادر مطلق ہے سیدنا آدم کا خمیر چالیس دن میں تیار فرمایا۔ **تیسرے:** یہ کہ چالیس کا عدد بڑا مبارک ہے کہ خمیر حضرت آدم چالیس دن میں ہوا۔ اب بھی ماں کے پیٹ میں نطفہ کا حال چالیس دن میں بدلتا ہے، پھر عورت کو چالیس ہی دن تک نفاس کا خون آسکتا ہے، چالیس سال میں ہی انسان کی عقل کامل ہوتی ہے اسی لئے اکثر انبیاء کرام کو نبوت اسی عمر میں ملی **چوتھے:** یہ کہ آدم علیہ السلام کا دبدبہ زمین و آسمان ہر جگہ ہے، ہاں ان کا پایہ تخت زمین ہے کیونکہ اس آیت میں خلیفہ کو بغیر قید کے رکھا۔ زمین ان کی قیام گاہ بنائی۔ **پانچویں:** یہ کہ خلیفہ کے لئے معصوم ہونا ضروری نہیں جیسا کہ شیعہ کہتے ہیں ہاں نبوت کے لئے عصمت ضروری اگر خلیفہ کا معصوم ہونا ضروری ہوتا تو فرشتے ہی بنائے جاتے، یہی وہ عرض بھی کر رہے تھے، حق تعالیٰ نے انسان کے گنہگار ہونے کا انکار نہ فرمایا بلکہ صرف یہ فرمایا کہ گنہگاروں کو ہی خلافت دینی مصلحت ہے۔ **چھٹا:** یہ کہ خلیفہ کا ظاہر ہونا ضروری ہے غائب خلافت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ لوگوں کی نگاہ سے حق تعالیٰ کی ذات بھی غائب ہے۔ اسی وجہ سے تو اس نے اپنا خلیفہ بنایا تا کہ لوگ ظاہر خلیفہ سے فیض لے سکیں اور اور اگر خلیفہ بھی غائب ہو جائے تو خلافت کا مقصد ہی پورا نہ ہو، نیز اگر غائب کی خلافت صحیح ہو تو نبی کریم ﷺ ہی قیامت تک خلیفہ رہنے چاہئیں۔ حضرت علی اور امام مہدی کی خلافت کی کوئی ضرورت نہیں۔ **ساتویں:** یہ کہ چھوٹوں کو یہ حق حاصل ہے کہ بڑوں کے کام کی حکمت پوچھ لیں، جیسے کہ فرشتوں نے حق تعالیٰ سے دریافت کی۔ **آٹھویں:** یہ کہ بڑوں کو یہ حق ہے کہ راز کی بات چھوٹوں پر ظاہر نہ کریں۔ بلکہ ان کو خاموش

رہنے کا حکم دیں جیسے کہ اس واقعہ میں ہوا۔ **نویں:** یہ کہ علم عبادت سے افضل ہے کیونکہ فرشتے عابد تھے اور آدم علیہ السلام عالم، مگر آدم علیہ السلام افضل ہوئے۔ **دسویں:** یہ کہ اللہ کا کرم اعمال پر موقوف نہیں، دیکھو لاکھوں سال کے عابدوں کو ان آدم علیہ السلام کے سامنے جھکایا گیا۔ جنہوں نے ابھی تک ایک سجدہ بھی نہ کیا تھا چونکہ ابھی مضمون پورا نہیں ہوا۔ اس لئے تفسیر صوفیانہ آئندہ کی جائے گی۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: تم فرشتوں کو گناہوں سے معصوم مانتے ہو مگر اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں نے بہت سے گناہ کئے۔ **ایک:** یہ کہ انہوں نے حق تعالیٰ پر اعتراض کیا اور یہ بڑا گناہ ہے۔ **جواب:** یہ اعتراض نہ تھا بلکہ حکمت دریافت کرنا تھی اور یہ بالکل جائز **دوسرے:** یہ کہ فرشتوں نے آدم علیہ السلام کی غیبت کی کہ ان کی غیر موجودگی میں ان کو برا کہا۔ **جواب:** اگر مسئلہ پوچھنے میں کسی کی برائی کا ذکر آ جائے تو غیبت نہیں بلکہ جائز ہے ابوسفیان کی بیوی ہندہ نے حضور کی خدمت میں عرض کیا کہ یا حبیب اللہ میرے شوہر بخیل آدمی ہیں مجھ کو بقدر ضرورت مال نہیں دیتے، کیا میں ان کے پوچھے بغیر کچھ ان کا مال لے لیا کروں؟ حضور نے فرمایا کہ ہاں بقدر ضرورت لے سکتی ہو اور یہ نہ فرمایا کہ تم نے ان کی غیبت کی۔ ایسے ہی یہاں ہے **تیسرے:** یہ کہ فرشتوں نے اپنی بڑائی ظاہر کی اور یہ غرور ہے کہ جو حرام ہے **جواب:** یہ بڑائی نہ تھی بلکہ حق تعالیٰ کی نعمت کا اقرار کہ خدایا تو نے ہم کو اپنی تسبیح اور تقدیس کی توفیق عطا فرمائی ہے رب تعالیٰ کی نعمت کا ظاہر کرنا عبادت ہے۔ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (الضحیٰ:۱۱) **چوتھے:** یہ کہ فرشتوں نے رب کا جواب سن کر بارگاہ الٰہی میں معذرت کی کہ عرض کیا لَا عِلْمَ لَنَا تو اگر یہ باتیں گناہ نہیں ہوتیں تو معذرت کی کیا ضرورت تھی۔ **جواب:** زاہد لوگ گناہ سے توبہ کرتے ہیں اور عارفین عبادت کر کے بھی ان کا یہ توبہ کرنا ترک اولیٰ کی بناء پر تھا۔ شعر۔

زاہداں از گناہ توبہ کنند   عارفاں از عبادت استغفار

پانچویں: یہ کہ ملائکہ سے رب نے فرمایا! اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ معلوم ہوا کہ وہ جھوٹے تھے اور جھوٹ بولنا گناہ ہے۔ **جواب:** فرشتوں نے اپنے کو عبادت کی وجہ سے خلافت کے لائق سمجھا تھا جو ایک غلط فہمی تھی۔ حق تعالیٰ کی طرف سے اس کو دور کر دیا گیا اور غلط فہمی گناہ نہیں اگر کوئی شخص غلط فہمی کی بناء پر قسم بھی کھائے تو گنہگار نہیں ہوگا اگر یہ امور گناہ ہوتے تو رب تعالیٰ ان پر عتاب فرماتا جیسے کہ حضرت آدم پر ہوا۔ **چھٹے:** یہ کہ ہاروت و ماروت فرشتے تھے اور ان سے گناہ کبیرہ سرزد ہوئے۔ جیسے کہ آگے آنے والا ہے **ساتویں:** یہ کہ شیطان کو بھی بعض علماء نے فرشتہ مانا ہے حالانکہ وہ تمام گنہگاروں کا سردار ہے۔ پھر ملائکہ کی عصمت کے کیا معنی۔ **جواب:** ان دونوں سوالوں کے جواب انشاء اللہ وہاں ہی دیئے جائیں گے، جہاں ان کا ذکر آئے گا۔ **دوسرا اعتراض:** شیعوں کا۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ کا انتخاب رب تعالیٰ کی طرف سے ہونا ضروری ہے نہ کہ لوگوں کی رائے سے دیکھو ملائکہ بظاہر خلافت آدم علیہ السلام کے مخالف ہوتے ہیں مگر حق تعالیٰ کے فیصلے کے مقابل باطل ہیں۔ **جواب:** اس سوال کے دو جواب ہیں، ایک تحقیقی، دوسرا الزامی۔ **جواب:**

تحقیق تو یہ ہے کہ خلافت دو قسم کی ہے، ایک نبوت کے ساتھ، ایک نبوت کے بغیر، پہلی قسم کی خلافت محض حق تعالیٰ کے انتخاب سے ہی ہوگی۔ کسی کی رائے کا اس میں کچھ دخل نہ ہوگا۔ کیونکہ نبوت انتخاب الٰہی ہے نہ تو اس میں عمل کو دخل ہے نہ کسی رائے کو اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَیْثُ یَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ (انعام: ۱۲۴) ہاں یہ ثابت ہے کہ بعض انبیاء کرام کی دعا سے کسی کو نبوت عطا ہوئی۔ جیسے حضرت ہارون کی نبوت موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے کہ انہوں نے عرض کیا تھا کہ وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ (طٰہٰ: ۲۹) مگر یہ نبوت ملی رب ہی کی طرف سے۔ آدم علیہ السلام کی خلافت اسی قسم کی تھی، اس لئے انتخاب رب تعالیٰ کی طرف سے ہوا۔ رہی دوسری قسم کی خلافت یعنی بغیر نبوت والی، اس کے لئے قاعدہ تو حق تعالیٰ کی طرف سے بنایا جائے گا۔ مگر اس قاعدے کے مطابق مقرر کرنا مسلمانوں کی طرف سے ہوگا۔ قرآن کریم فرماتا ہے کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَیَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِی الْاَرْضِ (النور: ۵۵) یعنی اللہ نے پرہیزگار مسلمانوں سے وعدہ کرلیا کہ انہیں زمین پر خلافت دے گا۔ جس سے معلوم ہوا کہ اس خلافت کے لئے ایمان اور پرہیزگاری درکار ہے نہ کہ انتخاب ربانی بھی۔ موسیٰ علیہ السلام نے سفر میں جاتے وقت حضرت ہارون سے فرمایا اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ (اعراف: ۱۴۲) کہ تم میری قوم میں میرے خلیفہ بن جاؤ۔ حضور ﷺ نے بعض سفر کے موقعہ پر عبداللہ بن ام مکتوم کو اپنا خلیفہ بنایا وغیرہ وغیرہ۔ مسلمانوں کے انتخاب کی چند صورتیں ہیں، ایک یہ کہ خود بادشاہ اپنی زندگی میں کسی کو اپنا خلیفہ اور ولی عہد مقرر کردے۔ جیسے کہ حضرت عمر کی خلافت۔ **دوسرے:** یہ کہ عام مسلمان اس کو اپنا خلیفہ مان لیں۔ جیسے حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت۔ **تیسرے:** یہ کہ خاص رائے والے لوگ جن پر عام مسلمانوں کو اعتماد ہو، وہ کسی کو اپنا خلیفہ مان کر مقرر کرلیں۔ جیسے کہ حضرت عثمان غنی اور حضرت مولیٰ علی کی خلافتیں

جواب الزامی: یہ ہے کہ اگر خلافت کے لئے انتخاب الٰہی ضروری ہے تو نبوت و خلافت میں کیا فرق رہا۔ وائسرائے بادشاہ کی طرف سے مقرر ہوتا ہے، لیکن چیئرمین اور اسمبلی کا ممبر رعایا کے انتخاب سے، نیز بارہ اماموں کی خلافت کی شیعہ کون سی آیت یا نص پیش کریں گے۔ شاید ستر (۷۰) گز والے چھپے ہوئے قرآن میں ہو تو ہو۔ اس قرآن میں تو نہیں ہے۔ لہٰذا اگر ہماری تین خلافتیں ختم تو تمہاری پوری بارہ ہی ختم، نیز جس طرح نبی اپنی نبوت کو نہیں چھپا سکتا اور جھوٹے نبی کو نبی نہیں مان سکتا ورنہ خود کافر ہو جائے گا، اسی طرح مولیٰ علی پر لازم تھا کہ صدیق اور فاروق کے زمانے میں اپنی خلافت کا اعلان کرتے اور ان کو خلیفہ نہ مانتے، کیا شیعہ حضرات صدیق و فاروق کی خلافت کا انکار کرکے اہل بیت اطہار کا ایمان بھی ثابت کرسکیں گے۔ (خدا کی پناہ) **تیسرا اعتراض:** فرشتوں نے حضرت آدم کے متعلق فرمایا تھا کہ وہ فساد و خونریزی کریں گے، انہوں نے کچھ نہ کیا بلکہ وہ تو معصوم نبی تھے۔ **جواب:** فرشتوں کو یہ علم تھا کہ خلافت سارے انسانوں میں رہے گی اور ان میں فساد و خونریزی بھی ہوگی یہ تو عرض و معروض نوع انسان کے متعلق ہے۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ
اور سکھایا آدم کو نام سب کے سب پھر پیش کیا ان کو اوپر فرشتوں کے
اور اللہ تعالیٰ نے آدم کو تمام اشیاء کے نام سکھائے پھر سب اشیاء ملائکہ پر پیش کرکے

اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۱﴾
پس فرمایا خبر دو تم سب مجھ کو ناموں کی ان کے اگر ہو تم سچے
فرمایا تم سچے ہو تو ان کے نام بتاؤ

تعلق

اس آیت کا پہلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **ایک:** یہ کہ پہلے فرمایا گیا تھا کہ ہم آدم علیہ السلام کو خلیفہ بنانے والے ہیں مگر خلافت پورے علم کے بغیر نہیں ہوسکتی، کیونکہ بادشاہ کو اپنی رعایا کے سارے حالات کا جاننا ضروری ہے، اس لئے اب ان کو علم عطا فرمانے کا ذکر فرمایا گیا۔ **دوسرے:** یہ کہ فرشتوں نے حضرت آدم کو خلیفہ بنانے کی حکمت پوچھی تھی۔ اس کا اجمالی جواب رب تعالیٰ کی طرف سے یہ دیا گیا کہ اس کو ہم جانتے ہیں تم نہیں جانتے، اس سے فرشتے خاموش تو ہو گئے مگر ان کو تسکین نہ ہوئی تھی، اب عملی طور پر اس کا تفصیلی جواب دیا جا رہا ہے۔ جس سے فرشتوں کو پوری تسکین حاصل ہو۔

تفسیر

وَعَلَّمَ۔ عَلَّمَ تعلیم سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں آہستہ آہستہ علم دینا اور سکھانا، چونکہ آدم علیہ السلام کو حق تعالیٰ کی ذات وصفات اور سارے ایمانیات کا علم ان کی پیدائش سے پہلے ہی دے دیا گیا تھا۔ اسی لئے انہوں نے چھینک آتے ہی اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کہا جس میں خدا کی ذات وصفات کا ذکر ہے اور پھر جیسا کہ روایات میں آتا ہے کہ پیدا ہوتے ہی ساق عرش پر لکھا ہوا پڑھ لیا کہ لا الٰہ الا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ جس سے معلوم ہوا کہ نبی آخر الزماں ﷺ کو بھی جانتے ہیں اور ان کی نبوت رسالت کو بھی پہچانتے ہیں، اور لکھے ہوئے حروف پڑھ لیتے ہیں مگر ساری چیزوں کا علم پیدائش کے بعد عطا ہوا۔ اس لئے علم باب تفعیل سے فرمایا گیا۔ خیال رہے کہ آدم علیہ السلام کو نہ تو کسی مدرسے میں جانا پڑا تھا اور نہ کسی استاد کی شاگردی کرنی پڑی، بلکہ بطور الہام خود بخود سب علوم ان کو آگئے۔ جیسے بعد مرنے کے ہر شخص کو زبان عربی خود بخود آجاتی ہے کہ قبر کے سوال وجواب اور محشر کا حساب کتاب اور جنت والوں کی بول چال سب عربی زبان میں ہیں۔ آدم یا تو ادومۃ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں گندمی رنگ ہونا اور یا تو اَدِیْمٌ سے جس کے معنی ہیں ظاہری زمین چونکہ آپ کا رنگ شریف گندمی تھا، آپ کا جسم مبارک ظاہری زمین کی مختلف مٹیوں سے تھا۔ اس لئے آپ کا نام آدم ہوا۔ اور آپ کی اولاد کو آدمی یعنی آدم والا کہا جاتا ہے اگرچہ اس جسم میں پانی ہوا کا بھی دخل تھا، مگر وہ سب مٹی کو خمیر کرنے کے لئے تھا جیسے کہ آٹے کو گوندھنے کے لئے اس میں پانی ملا دیا جاتا ہے اسی لئے انسان زمین پر رہتا ہے نہ ہوا اور نہ پانی میں۔ نیز زمین میں عجز وانکساری ہے جس کی وجہ سے کھیت وباغ اسی میں لگتے ہیں۔ حضرت آدم میں عجز وانکساری کو رکھا اور ایمانی کھیت عرفانی باغ آپ میں اور آپ کی اولاد کے سینے میں لگائے گئے۔ اسی عجز کا ظہور خطا پر، ندامت وتوبہ سے ہوا۔ ابلیس نادم نہ ہوا کہ ناری تھا۔ آپ نہایت خوبصورت تھے اور جسم شریف آپ کا ساٹھ (۶۰) ہاتھ تھا۔ جنتی لوگوں کا بھی اتنا ہی قد ہوگا۔ رہے جہنمی ان میں سے بعض اتنے بڑے

ہوں گے کہ ان کی ایک داڑھ بقدر پہاڑ ہوگی جیسا کہ روایت میں آیا ہے۔ اَلْاَسْمَآءَ اسماء۔ وسمٌ یا سموٌ سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں علامت یا پہچان یا بلندی اور اب نام کو بھی کہتے ہیں۔ تفسیر کبیر وغیرہ نے فرمایا کہ یہاں پہلے ہی معنی مراد ہیں کیونکہ آدم علیہ السلام کو فقط چیزوں کے نام ہی نہ بتائے گئے بلکہ ان کی حقیقتیں خاصیتیں اور نفع ونقصان اور ان کا طریقہ استعمال اور ان کے بنانے کے طریقے۔ غرضکہ ہر چیز کے سارے حالات بتائے گئے تھے اور ہر حال اس چیز کی علامت تھی۔ اس لئے وہ سب اسماء میں ہی داخل ہیں کیونکہ فقط نام بتانے سے علم کامل نہیں ہوتا اور اس سے خلافت کا مقصود بھی حاصل نہیں۔ بعض حضرات فرماتے ہیں کہ یہاں اسم کے معنی نام ہی ہیں مگر چونکہ ہر چیز کے حالات بھی چیز ہیں اور ان کے بھی کچھ نام ہیں، ان سب کی تعلیم بھی فرمائی گئی تھی۔ غرضکہ یہ تو سب مانتے ہیں کہ حضرت آدم کا علم ہر چیز کو شامل تھا۔ لیکن اس وسعت علمی کو بعض تو اَلْاَسْمَآءَ سے ثابت کرتے ہیں بعض کُلَّهَا سے۔ دعویٰ سب کا ایک دلیلیں علیحدہ۔ کُلَّهَا۔ اس میں بہت گنجائش ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی نام بھی آدم علیہ السلام کے علم سے باقی نہ بچا۔ جیسے خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا ہر چیز کا خالق ہے، ایسے ہی یہاں کُلَّهَا سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام ہر نام والی چیز کے عالم ہیں۔ خیال رہے کہ آدم علیہ السلام کا علم اس قدر وسعت کے باوجود ہمارے نبی ﷺ کے دریا کا قطرہ ہے کیونکہ ان کا علم ہر اس چیز کو بھی گھیرے ہوئے ہے کہ جہاں تک الفاظ ونام بلکہ کسی کا خیال بھی نہیں پہنچتا۔ اسی لئے حضور ﷺ کے متعلق فرمایا گیا وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ (النساء: ۱۱۳) یہاں نہ اسم کی قید ہے نہ الفاظ وحروف کی پابندی۔ اب ہم کُلَّهَا کی کسی قدر گنجائش دکھاتے ہیں۔

یہ سب جانتے ہیں کہ دنیا میں اول سے آخر تک لاکھوں زبانیں بولی گئیں اور ہر زبان کے حروف نقش اور ان کے الفاظ علیحدہ علیحدہ پھر ہر زبان میں کروڑوں لغات جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا میں کروڑوں چیزیں اور ہر چیز کی لاکھوں صفات اور ہر صفت کے لاکھوں نام اور نام کے لکھنے اور بولنے کے لاکھوں طریقے مثلاً الف لکھنے کا انگریزی میں اور طریقہ ہے اور اردو میں اور، عربی میں اور، پھر مثلاً پانی کو اردو میں پانی۔ فارسی میں آب۔ عربی میں ماء۔ ہندی میں جل انگریزی میں واٹر اور نہ معلوم کس کس زبان میں کیا کیا کہتے ہوں گے۔ پھر اگر لفظ پانی لکھا جائے تو ہر زبان کی عبارت میں علیحدہ طریقے سے مثلاً انگریزی (pani) اور ہندی میں (पानी) اور گجراتی میں (પાણી) اور اردو میں (پانی) عربی میں (ماء) وغیرہ وغیرہ طریقوں سے پھر اس پانی کے ہزاروں حالات اور ہزاروں قسمیں ہیں۔ ٹھنڈا، گرم، صاف، میلا، کھاری، میٹھا، بھاری، ہلکا، گاڑھا، پتلا، سفید، کالا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب علوم سیدنا آدم علیہ السلام کو دیئے گئے۔ بھلا خیال تو کرو اس علم کی کوئی حد ہے۔ تفسیر روح البیان میں اس جگہ فرمایا گیا کہ آدم علیہ السلام کو سات لاکھ زبانوں کا علم تھا اور ایک ہزار پیشوں میں خوب ماہر تھے، مگر آپ نے کھیتی باڑی کا کام کیا۔

لطیفہ: آدم علیہ السلام کا پیشہ کھیتی باڑی، نوح علیہ السلام کا نجاری، (لکڑی بنانا یعنی بڑھئی کا پیشہ) ادریس علیہ السلام کا درزی گری، صالح علیہ السلام تجارت، داؤد علیہ السلام کا زرہ سازی (زرہ بنانا یعنی لوہار کا کام) سلیمان علیہ السلام کا زنبیل سازی اور موسیٰ علیہ السلام، شعیب علیہ السلام اور حضور انور ﷺ کا عمل مبارک بکری چرانا تھا۔ (روح البیان)۔ نیز کُلَّهَا

سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ نے اپنی ذات وصفات کے سارے نام بھی ان کو تعلیم فرمائے تھے۔ اب تو آدم علیہ السلام کے علم کی کوئی انتہا نہ رہی روح البیان وغیرہ نے اس جگہ لکھا کہ آدم علیہ السلام کو تمام فرشتوں اور اپنی اولاد کے سارے نام اور حیوانات جمادات، پرندوں چرندوں اور ہر وہ جاندار جو قیامت تک پیدا ہونے والے ہیں تمام شہروں اور گاؤں ہر کھاتی پیتی چیز اور جنت کی ہر نعمت بلکہ یوں کہو کہ ہر چھوٹی بڑی چیز کے نام بتا دیئے گئے۔ یہاں تک کہ پیالہ اور ڈھال اور دودھ نکالنے کا برتن بلکہ آہستہ اور زور سے گوز مارنے کے نام بھی بتا دیئے گئے۔ ثُمَّ عَرَضَهُمْ اس سے معلوم ہوا کہ فقط غائبانہ نام ہی نہ بتا دیئے گئے تھے بلکہ دیکھنے والی چیزیں دکھائی گئی تھیں۔ یعنی جو چیزیں قیامت تک کبھی بھی پیدا ہونے والی تھیں مثلاً ریلوے، موٹر کار، ٹیلی فون، ریڈیو، ہوائی جہاز، ٹی وی وغیرہ یہ سب چیزیں ان کو دکھا کر ان کے نام اور بنانے کی ترکیبیں اور ان کے سارے حالات بتائے گئے اور پھر ان سب چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ تمام فرشتوں پر ہی یہ ساری چیزیں پیش کی گئی تھیں کیونکہ اس جگہ ملائکہ میں کوئی قید نہیں ہے۔ نیز حکمت پوچھنے والے سارے ہی فرشتے تھے اور چونکہ ان چیزوں میں بعض عقل والی اور بعض بے عقل تھیں اس لئے بطریق تغلیب عَرَضَهُمْ فرمایا گیا۔ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ۔ یہ امر ملائکہ کی عاجزی کے اظہار کے لئے ہے کیونکہ جب انہیں ناموں کی خود ہی خبر نہ تھی تو حق تعالیٰ سے کیا عرض کرتے۔ خیال رہے کہ یہاں اَنْۢبِـُٔوْنِیْ فرمایا گیا یعنی صرف خبر ہی دے دو جو کہ علم سے ادنیٰ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں ان چیزوں کا پورا علم تو کیا ہوتا معمولی خبر بھی نہیں ہے۔ بِاَسْمَآءِ هٰۤؤُلَآءِ لفظ اسماء پہلے آچکا تھا اور اب یہاں دوبارہ اس لئے کہا گیا کہ وہاں اس سے سب چیزوں کی حقیقت اور اس کے سارے حالات اور نام مراد ہیں۔ اس لئے وہاں عَلَّمَ وَ كُلَّهَا فرمایا گیا تھا لیکن یہاں صرف نام ہی مراد ہیں کہ اے فرشتو تم دوسرے حالات تو کیا بیان کرو گے، فقط ان کے نام ہی بتا دو، ورنہ یہاں ضمیر ہی کافی تھی۔ یعنی بِهَا۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ فرشتوں نے جو کچھ عرض کیا تھا وہ بظاہر بالکل سچ تھا۔ کیونکہ واقعی انسانوں میں فساد بھی ہوگا، اور واقعی فرشتے رب کی تسبیح وتصدیق بھی کرتے تھے لیکن ان دو باتوں سے جو انہوں نے نتیجہ نکالا تھا جس کو صاف بیان نہ کیا، اس میں غلطی کی تھی، اس آیت میں ان کی اس غلط فہمی کو دور کرنا منظور ہے وہ یہ سمجھتے تھے کہ خلافت عابد اور معصوم کا حق ہونا چاہئے نہ کہ اس جماعت کا کہ جس میں گناہ وجرم بھی ہوتے ہوں، یہاں ان کو فرمایا گیا کہ انتظام سلطنت صرف عبادت سے نہیں ہوسکتا، اس لئے کہ رعایا کے سارے حالات کی خبر ہونا ضروری ہے تم کو نام بھی نہیں معلوم اور حالات کیا معلوم ہوں گے۔ تفسیر عزیزی میں اس کے دوسرے نہایت نفیس معنے کیے گئے وہ یہ کہ ملائکہ سمجھے تھے کہ ہم حق تعالیٰ کی کامل حمد وتسبیح کرتے ہیں۔ لہٰذا ہم بھی کامل عابد ہیں۔ اس آیت میں فرمایا گیا کہ کامل حمد وہ کر سکتا ہے جو حق تعالیٰ کے سارے نام اور صفات سے واقف ہو۔ اور پورا شکر وہ ہی بجالا سکتا ہے جو اس کی ساری نعمتوں کی خبر رکھتا ہو، اے فرشتو! جب تم کو ساری نعمتوں کا نام تک معلوم نہیں اور رب کی صفات اور سارے ناموں کا پورا پتہ نہیں تو تم اس کی پوری حمد اور شکر کیسے کر سکتے ہو۔ اے فرشتو! پوری حمد بھی وہی کرے گا جس کا علم کامل ہوگا۔ غرضکہ اس میں فرشتوں کو جھوٹا کہنا منظور نہیں، بلکہ ان کی غلط فہمی کو دور کرنا۔

خلاصہ تفسیر

جب آدم علیہ السلام پیدا ہوئے اور فرشتوں نے ان کے چھینک آنے پر **الحمدللہ** کہنے۔ اور فرشتوں کو **السلام علیکم** کہنے سے ہی معلوم کرلیا تھا کہ یہ ہونہار ہستی ہے لیکن ابھی تک ان کی خلافت کے حقدار ہونے کی کوئی خاص وجہ معلوم نہ ہوئی تھی۔ اس لئے حق تعالیٰ نے تمام چیزوں کے نام ان کی صفات ان کا طریقہ استعمال بلکہ سب کی حقیقتیں آدم علیہ السلام کے دل میں القاء کردیں۔ اس کے بعد ان تمام چیزوں کو فرشتوں کے سامنے کر کے دربار عام میں سوال کیا کہ تم مجھ کو ان چیزوں کے نام تو بتادو اگر تم اپنے اس خیال میں سچے ہو کہ ہم کامل عابد ہیں اور عابد خلافت کا کام انجام دے سکتا ہے۔ جب وہ چیزوں کے نام ہی نہ بتا سکے تو ان پر اپنی عاجزی اور آدم علیہ السلام کی افضلیت اور حق تعالیٰ کی حکمت ظاہر ہوگئی۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **ایک** یہ کہ علم خلوتوں اور تنہائیوں کی عبادت اور چلہ کشی سے افضل ہے۔ کیونکہ رب نے آدم علیہ السلام کی افضلیت علم ہی سے ظاہر فرمائی۔ **دوسرے:** یہ کہ انبیاء علیہ السلام فرشتوں سے افضل ہیں۔ **تیسرے:** یہ کہ بری چیزوں کا جاننا برا نہیں کیونکہ آدم علیہ السلام کو ہر بری بھلی چیز کا علم دیا گیا اور اس سے ان کی افضلیت ظاہر فرمائی گئی۔ نیز سب سے بری چیز کفر ہے لیکن اس کا نبچنے کے لئے سیکھنا فرض ہے۔ نیز حق تعالیٰ کو بھی بری بھلی باتوں کا علم ہے۔ اگر بری بات جاننا برا ہوتا تو حق تعالیٰ اس سے پاک ہوتا لہٰذا وہابیوں، دیوبندیوں کا یہ کہنا کہ بری چیز کا علم حضور ﷺ کی شان کے خلاف ہے محض غلط ہے۔ رہی یہ آیت وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ (یس: ۶۹) اس کی تحقیق ہم انشاء اللہ اسی آیت میں کریں گے۔ نیز اس کے لئے ہماری کتاب جاء الحق کا مطالعہ کرو۔ **چوتھے:** یہ کہ اللہ تعالیٰ نبیوں کو علم لدنی بخشا ہے جیسا کہ عَلَّمَ سے معلوم ہوا کہیں ثابت نہیں کہ کوئی نبی کسی کا شاگرد ہوا ہو، سوائے موسیٰ علیہ السلام کے کہ آپ علم شریعت بلکہ علم اسرار و طریقت حاصل کرنے خضر علیہ السلام کے پاس گئے۔

خاتمہ: علم کے فضائل

اس کے بے شمار عقلی اور نقلی فضائل ہیں۔ ہم تفسیر کبیر اور تفسیر عزیزی سے کچھ پرلطف چیزیں بیان کرتے ہیں۔ فقیہ ابولیث سمر قندی نے فرمایا کہ عالم کی صحبت میں حاضر ہونے میں سات فائدے ہیں خواہ اس سے علم حاصل کرے یا نہ کرے **ایک** یہ کہ وہ شخص طالب علموں کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے اور ان کا سا ثواب پاتا ہے، **دوسرے** یہ کہ جب تک اس مجلس میں بیٹھا رہے گا گناہوں سے بچا رہے گا۔ **تیسرے** یہ کہ جس وقت یہ اپنے گھر سے طلب علم کی نیت سے نکلتا ہے، ہر قدم پر نیکی پاتا ہے۔ **چوتھے** یہ کہ علم کے حلقہ میں رحمت الٰہی نازل ہوتی ہے جس میں یہ بھی شریک ہو جاتا ہے۔ **پانچویں** یہ کہ یہ علم کا ذکر سنتا ہے جو کہ عبادت ہے۔ **چھٹے** یہ کہ وہاں جب کوئی مشکل مسئلہ سنتا ہے جو اس کی سمجھ میں نہیں آتا اور اس کا دل تنگ ہوتا ہے تو حق تعالیٰ کے نزدیک منکسر القلوب میں شمار کیا جاتا ہے۔ **ساتویں** یہ کہ اس کے دل میں علم کی عزت اور

جہالت سے نفرت پیدا ہوتی ہے۔ **دوسری فضیلت:** حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ علم دین مال پر سات وجہ سے افضل ہے۔ **اول:** یہ کہ علم پیغمبروں کی میراث ہے اور مال فرعون، ہامان، شداد اور نمرود کی۔ **دوسرے:** یہ کہ مال خرچ کرنے سے گھٹتا ہے مگر علم بڑھتا ہے۔ **تیسرے:** یہ کہ مال کی انسان حفاظت کرتا ہے مگر علم انسان کی حفاظت کرتا ہے۔ **چوتھے:** یہ کہ مرنے کے بعد مال تو دنیا میں رہ جاتا ہے اور علم قبر میں ساتھ جاتا ہے۔ **پانچویں:** یہ کہ مال مومن وکافر سب کو مل جاتا ہے مگر علم دین کا نفع ایماندار ہی کو حاصل ہوتا ہے۔ **چھٹے:** یہ کہ کوئی بھی عالم سے بے پرواہ نہیں۔ لیکن بہت سے لوگوں کو مالداروں کی ضرورت نہیں۔ **ساتویں:** یہ کہ علم سے پل صراط پر گزرنے کی قوت حاصل ہوگی اور مال سے کمزوری۔
تیسری فضیلت: قرآن مجید میں سات چیزوں کے بارے میں فرمایا گیا کہ وہ آپس میں برابر نہیں۔ ا۔ عالم جاہل کے برابر نہیں۔ ۲۔ خبیث اور طیب برابر نہیں۔ ۳۔ دوزخی اور جنتی برابر نہیں۔ ۴۔ اندھا اور آنکھ والا ۵۔ اسی طرح اندھیرا اور روشنی۔ ۶۔ سردی اور گرمی ۷۔ زندے اور مردے آپس میں برابر نہیں۔ **چوتھی فضیلت:** سات پیغمبروں کو علم کی وجہ سے بڑے بڑے فائدے حاصل ہوئے۔ ا۔ آدم علیہ السلام کو ان کے علم نے فرشتوں سے سجدہ کرادیا۔ ۲۔ خضر علیہ السلام کو علم نے، موسیٰ علیہ السلام کی ملاقات عطا کی۔ ۳۔ یوسف علیہ السلام کو علم نے قید سے نکال کر تخت وتاج شاہی عطا کیا۔ ۴۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کو علم نے بلقیس جیسی صاحب جمال اور صاحب تخت وتاج والی بیوی عطا کی۔ ۵۔ داؤد علیہ السلام کو علم نے بادشاہی دی۔ ۶۔ عیسیٰ علیہ السلام کے علم نے ان کی ماں سے تہمت دور کرائی۔ ۷۔ حضرت محمد ﷺ کے سر مبارک پر خلافت الٰہیہ اور شفاعت کبریٰ کا سہرا بندھا۔ **پانچویں فضیلت:** تعلیم یافتہ کتے کا شکار بھی حلال ہے یہ علم کی برکت ہی ہے۔ **چھٹی فضیلت:** حضرت سلیمان علیہ السلام کی چیونٹی کو علم کی بدولت یہ مرتبہ عطا فرمایا کہ اس کا ذکر قرآن کریم میں فرمایا بلکہ اس کے نام کی ایک سورت قرآنی مقرر فرمائی یعنی (سورہ نمل) اور رب نے اس کا کلام پسند فرماتے ہوئے قرآن کریم میں نقل فرمایا کہ اس نے اور چیونٹیوں سے کہا تھا کہ تم اپنے سوراخوں میں گھس جاؤ کہیں تم کو حضرت سلیمان علیہ السلام اور ان کا لشکر بے خبری میں کچل نہ ڈالے۔ جس سے معلوم ہوا کہ وہ نبی کو معصوم اور نبی کے ساتھیوں کو ظلم وغیرہ سے محفوظ سمجھتی تھی کیونکہ اس نے کہا کہ بے خبری میں۔ جس سے معلوم ہوا کہ پیغمبر اور ان کے ساتھی جان بوجھ کر چیونٹی پر ظلم نہیں کرتے۔ مگر افسوس چیونٹی کا تو یہ عقیدہ مگر شیعوں کا یہ عقیدہ کہ صدیق اکبر اور فاروق اعظم نے اہل بیت پر ظلم کیا اور وہ ظالم تھے۔ یہ تو عقل میں چیونٹی سے بھی کم ہیں۔ **ساتویں فضیلت:** حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ سارے بندوں میں رب سے علماء ڈرتے ہیں اور دوسری جگہ ارشاد فرمایا کہ جنت ڈرنے والوں کے لئے ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جنت علماء ہی کے لئے ہے اور دوسروں کو بھی ان ہی کے طفیل ملے گی۔ اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کیونکہ رب کو بغیر جانے پہچانے اس سے خوف کیونکر ہوگا۔ علماء ربانی ہی اس کو خوب جانتے ہیں اور وہی اس سے خوف بھی کرتے ہیں۔ **آٹھویں فضیلت:** حدیث پاک میں ارشاد ہوا کہ عالم کی بزرگی عابد پر ایسی ہے جیسے چودہویں رات کے چاند کی تاروں پر **نویں فضیلت:** تمام پر بادشاہ حکومت کرتا ہے مگر بادشاہ پر علم والا۔ دیکھو طبیب بادشاہ کو صدہا کھانوں سے روک سکتا

ہے اور کڑوی دوائیں پلا سکتا ہے۔ **دسویں فضیلت:** حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دنیا چار شخصیتوں سے قائم ہے۔ عالم باعمل سے علماء سے محبت رکھنے والے جاہلوں سے۔ سخی مالداروں سے اور صابر فقیروں سے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام کو ساری چیزوں کا علم عطا ہوا۔ پھر انہوں نے گندم کیوں کھالیا اگر جان بوجھ کر کھایا تو یہ سخت گناہ ہوا۔ جس سے انبیاء معصوم ہیں اگر بے علمی سے کھایا تو ان کا علم مکمل نہ ہوا۔ **جواب:** ان کو ہر چیز کا علم تھا، مگر کھاتے وقت اس کو بھول گئے، بھولنا اور خطا انبیاء سے سرزد ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ فَنَسِیَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (طٰہٰ:۱۱۵) یعنی وہ بھول گئے ہم نے ان کا ارادہ نہ پایا۔ بڑے سے بڑا حافظ بعض اوقات قرآن پاک میں ایسا لقمہ کھاتا ہے کہ بغیر بتائے ہوئے اس کو حل نہیں کر سکتا۔ **دوسرا اعتراض:** جب اس وقت ساری چیزیں پیدا ہی نہیں ہوئی تھیں تو دکھائی کیسے گئیں۔ **جواب:** ہماری کمزور آنکھیں دیکھنے کے لئے بہت سی چیزوں کی محتاج ہیں، کہ وہ چیز موجود ہو نہ بہت دور ہو نہ بہت قریب روشنی میں ہو۔ تیز روشنی بھی نہ ہو، جیسے کہ آفتاب۔ زیادہ شفاف بھی نہ ہو جیسے کہ ہوا وغیرہ لیکن مقبول بندوں کی نگاہ ہر موجود و غیر موجود، دور اور قریب شفاف اور غیر شفاف چیز کو دیکھ لیتی ہے، ہماری عقل اور خیال بھی ان چیزوں کو محسوس کر لیتے ہیں۔ چنانچہ مرے ہوئے لوگ گذشتہ چیزیں خیال میں ایسی آجاتی ہیں جیسے ابھی سامنے ہیں، اور وہ لوگ باتیں کر رہے ہیں مکان بنانے سے پہلے اس کا خیالی نقشہ ایسا قائم کر لیا جاتا ہے جیسے سامنے مکان بنا کھڑا ہے پھر بالکل ویسا ہی مکان بنتا ہے۔ خواب میں آنے والی اور گزری ہوئی چیزیں دیکھ لی جاتی ہیں، دور کی چیزیں اور بالکل نہ دیکھی ہوئی چیزیں جیسے کہ جنت و دوزخ وغیرہ معلوم ہو جاتی ہیں۔ ان حضرات کی آنکھیں ہمارے عقل و خیال سے زیادہ قوی ہیں۔ قیامت میں سب لوگ اپنے گزرے ہوئے اعمال مختلف شکلوں میں دیکھیں گے۔ حضور نبی کریم ﷺ نے صدہا برس بعد آنے والے واقعات کے متعلق فرمایا کہ میں ان کو دیکھ رہا ہوں۔ **تیسرا اعتراض:** حق تعالیٰ نے فرشتوں کو بھی اتنا وسیع علم کیوں نہ عطا فرمایا۔ **جواب:** اس لئے کہ ان کی طبیعت اتنے علم کے لئے موزوں نہ تھی اور نہ ان میں اس کی قابلیت تھی۔ **چوتھا اعتراض:** ان میں قابلیت کیوں نہ پیدا فرمائی۔ **جواب:** وہ استعداد و قابلیت انسان کی خصوصیت ہے۔ اگر ان میں پیدا کر دی جاتی تو وہ فرشتے نہ رہتے بلکہ انسان بن جاتے، اس سوال کا مطلب تو یہ ہوا کہ فرشتوں کو انسان کیوں نہ کر دیا گیا۔ **پانچواں اعتراض:** جب فرشتے انسان کی اصلاح نہیں کر سکتے تو وحی کا لانا ان کے ذمے کیوں کیا گیا۔ وحی سے ہی اصلاح ہوتی ہے، **جواب:** فرشتے فقط حق تعالیٰ کے سفیر ہیں انسانوں کے مصلح نہیں اتنا وسیع علم مصلح کے لئے ضروری ہے۔ نہ کہ فقط قاصد کے لئے، کلکٹر کے یہاں سارے احکام ڈاک خانہ کے ذریعے آتے ہیں، مگر ان کے مرتبوں میں فرق ہے اسی لئے فرشتے نبیوں کے استاد نہیں بلکہ ان کے خدمتگار اور پیغام رساں ہیں اسی لئے بارہا حضرت جبرئیل نے شکل انسانی میں آکر حضور سے سوالات کئے۔ **چھٹا اعتراض:** اگلی آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ آدم علیہ السلام نے اپنے سارے علوم فرشتوں کو سکھا دیئے اگر فرشتوں میں اس کی قابلیت نہ تھی تو پھر انہیں اتنا علم کیسے آ گیا۔

جواب: اس کا جواب انشاء اللہ اگلی آیت میں آئے گا۔ **ساتواں اعتراض:** جب فرشتے انسانوں پر خلافت نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ان کے ہم جنس نہیں تو چاہئے کہ انسان بھی جنوں فرشتوں وغیرہ پر خلافت نہ کرے حالانکہ ہمارے حضور علیہ السلام ساری مخلوق کے نبی ہیں۔ **جواب:** ان کو خلافت نہ ملنے کی وجہ ان کے علم کی کمی ہے، نہ کہ محض جنسی اختلاف، چونکہ انسان ساری مخلوقات میں افضل اور اکمل ہے اور بڑا اپنے چھوٹے پر حکومت کر سکتا ہے۔

قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنْتَ
انہوں نے کہا پاکی ہے تجھے نہیں ہے علم واسطے ہمارے مگر وہ جو سکھایا تو نے ہم کو۔
بولے پاکی ہے تجھے ہمیں کچھ علم نہیں مگر جتنا تو نے ہمیں سکھایا بے شک
الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ ﴿۳۲﴾
تحقیق تو ہی جاننے والا حکمت والا ہے۔
تو ہی علم و حکمت والا ہے۔

تعلق

اس سے پہلے رب تعالیٰ کے جواب کا ذکر ہوا سننے والے کو انتظار تھا کہ پھر فرشتوں نے کیا عرض کیا اس آیت میں ذکر ہے یا یوں کہو کہ پہلے معلوم ہوا تھا کہ حق تعالیٰ نے فرشتوں سے ان چیزوں کے نام دریافت فرمائے اب فرشتوں کے جواب کا ذکر فرمایا گیا۔

تفسیر

قَالُوْا ظاہر یہ ہے کہ تمام ملائکہ نے یک زبان ہو کر عرض کیا یا ہر ایک نے براہ راست یا بعض مقربین نے سب کی طرف سے سُبْحٰنَكَ یہ لفظ سَبْحٌ سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں تیرنا۔ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ (انبیاء: ۳۳) چونکہ تیرنے والا کنارے سے دور نکل جاتا ہے۔ اس لئے دور ہونے کے معنی میں استعمال ہونے لگا اور چونکہ جو ذات عیوب سے پاک ہو وہ تمام برائیوں سے دور ہوتی ہے۔ اس لئے پاکی کے معنی میں اس کا استعمال ہوا۔ اصل میں عبارت یوں تھی نُسَبِّحُكَ سُبْحَانًا یعنی ہم تجھ کو پاک جانتے ہیں پاک جاننا۔ پھر سبحان کو کاف کی طرف مضاف کیا گیا اور فعل گرا دیا گیا۔ فرشتوں نے یہ الفاظ یا تو اس لئے بولے کہ بارگاہ الٰہی کا ادب یہ ہے کہ اگر کچھ عرض کرنی ہو تو پہلے رب کی حمد کی جائے۔ اسی لئے نمازی سب سے پہلے سبحان پڑھتا ہے اور بعد میں کچھ عرض کرتا ہے یا اس لئے کہ تعجب کے موقع پر بھی سبحان بولا جاتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا تھا۔ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَیْكَ (اعراف: ۱۴۳) یونس علیہ السلام نے عرض کیا تھا۔ سُبْحٰنَكَ ۖ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (انبیاء: ۸۷) چونکہ فرشتے بھی اپنے گذشتہ سوال سے معذرت کر رہے ہیں۔ اس لئے انہوں نے بھی کہا یا اس لئے کہ وہ اس لفظ سے اپنا مقصود عرض کر رہے ہیں کہ خداوند ہم تجھ کو ہر عیب سے پاک جانتے ہیں کہ تو نے آدم علیہ السلام کو بلا وجہ

زیادہ علم دے دیا اور ہم کو کم۔ بلکہ ہم سمجھتے ہیں کہ تو نے ہر ایک کو بقدر قابلیت عطا فرمایا، بے شک ہم میں اس قدر علم کی استعداد ہی نہیں ہے، کمی ہمارے لینے میں ہے نہ کہ تیری عطا میں لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اس میں فرشتوں نے اپنی عاجزی کا نہایت عمدہ طریقے سے اقرار کیا کہ مولیٰ ہم بذات خود تو تمام کمالات سے خالی ہیں اور علم بھی ایک کمال ہے۔ ہم میں جو کچھ کمال ہے وہ تیرا دیا ہوا ہے چونکہ اس علم کی طرف سے عطا نہیں ہوئی اس لئے ہماری کیا مجال کہ ہم تیرے حضور محض اپنی اٹکل اور قیاس سے کچھ کہہ دیں۔ مولیٰ ہم کو اپنی کم علمی کا اقرار ہے۔ علم صدہا قسم کے ہیں جن میں سے بعض عقلی ہیں۔ بعض نقلی مگر یہ سارے علوم ملتے ہیں رب کی عطا سے اس لئے لَا عِلْمَ میں جنس علم کی نفی ہے جیسے لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ میں اور لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ میں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدایا کوئی چیز سکھا کر امتحان لیا جاتا ہے جب تو نے ہمیں ان کے نام سکھائے ہی نہیں تو ہمارا امتحان کیوں لے رہا ہے اس لئے کہ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ تو ہر چیز کا جاننے والا ہے اور کامل حکمت والا۔ تو ہر ایک کی قابلیت اور لیاقت بھی جانتا ہے اور یہ بھی کہ کون کس نعمت کے لائق ہے۔ جس قدر علم کے لائق ہم تھے وہ ہم کو دیا اور جس کے لائق آدم علیہ السلام تھے وہ ان کو چیونٹی کو کن اور ہاتھی کو من دیتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

جب فرشتوں کو حکم ہوا کہ تم ان چیزوں کے نام بتاؤ تو وہ سمجھ گئے کہ اس سے ہمارا امتحان مقصود نہیں ہے کیونکہ امتحان تو بتائی ہوئی چیز کا لیا جاتا ہے انہوں نے بے دغدغہ اور بلا تامل اپنی عاجزی کا اقرار کر لیا۔ مگر اس نفیس طریقے سے کہ سبحان اللہ بظاہر تو رب کی حمد کی، لیکن اس حمد میں حق تعالیٰ کی صفات کمالیہ اور اپنے قصور کا اقرار کیا اور یہی توبہ کی حقیقت ہے اور ساتھ ہی ساتھ اپنی عاجزی کو خود اپنی طرف نسبت دی نہ کہ رب کی طرف، یعنی یہ نہ کہا کہ مولیٰ تو نے ہمیں بہت کم علم دیا۔ آدم علیہ السلام کو زیادہ، بلکہ یہ عرض کیا کہ ہم میں اتنے ہی علم کی طاقت تھی جتنا تو نے عطا فرمایا۔ تیرا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ شیطان نے یہ کہا کہ بِمَآ اَغْوَيْتَنِیْ (حجر: ۳۹) مولیٰ تو نے مجھے گمراہ کر دیا۔ اس لئے وہ تو مردود ہوا اور یہ سب محبوب رہے۔ خیال رہے کہ یہ عاجزانہ کلام صرف فرشتوں کا ہے، شیطان اس میں شامل نہیں وہ تو اس وقت حاسد ہو چکا تھا۔ سجدہ نہ کر کے اس کا حسد ظاہر ہوا۔ یہ بھی خیال رہے کہ شیطان بھی اشیاء کے نام نہ بتا سکا، اس لئے سجدہ نہ کرنے کی وجہ اپنا نار سے پیدا ہونا بیان کیا، نام بتانے کی جرات نہ کی، اب جو شخص کہے کہ شیطان کا علم حضور سے زیادہ وہ اس آیت کا منکر ہے۔ اس کا علم تو حضرت آدم کے علم کا کروڑواں حصہ بھی نہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے ایک یہ کہ دعا سے پہلے رب کی حمد ضروری ہے کیونکہ ملائکہ نے پہلے سُبْحٰنَكَ کہا۔ بعد میں کچھ عرض کیا۔ **دوسرے:** یہ کہ جس قسم کی دعا ہو اسی قسم کی حمد کریں۔ مثلاً اگر دعائے مغفرت کرنا ہے تو عرض کرے کہ مولیٰ ہم سب گنہگار ہیں اور تو غفار۔ اگر رزق مانگنا ہے تو عرض کرے مولا ہم سب فقراء ہیں اور تو غنی رزاق۔ **تیسرے:** یہ کہ بندے کو چاہئے کہ اپنے قصور کے ماننے میں حجت اور مولیٰ کے فضل و کرم کا انکار نہ کرے۔ **چوتھے:** یہ کہ بڑے سے

بڑا عالم اگر کسی مسئلے سے ناواقف ہو تو اپنی عزت رکھنے کے لئے غلط جواب نہ دے۔ بلکہ اپنی کم علمی کا اقرار کرے کیونکہ اسی میں عزت ہے۔ **حکایت:** ایک عالم سے برسر منبر کوئی مسئلہ پوچھا گیا۔ انہوں نے فرمایا کہ مجھے اس کی خبر نہیں۔ سائل نے کہا۔ جب آپ جاہل ہیں تو منبر پر کیوں بیٹھ گئے۔ انہوں نے فرمایا کہ اس قدر علم سے منبر پر بیٹھا۔ اگر میں جہالت سے کام لیتا تو آسمان پر پہنچ جاتا۔ **پانچویں:** یہ کہ کسی شخص کو بغیر فضل مولیٰ علم غیب نہیں مل سکتا۔ جو شخص کہ علم نجوم یا کہانت وغیرہ سے علم غیب حاصل کرنا چاہے وہ جاہل ہے۔ کیونکہ ملائکہ نے عرض اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا (تفسیر کبیر) لہٰذا جو شخص کسی مخلوق کو بغیر عطائے الٰہی ایک چیز کا بھی علم غیب مانے وہ بے دین ہے۔ بلکہ حق یہ ہے کہ کوئی علم بھی حق تعالیٰ کے فضل کے بغیر نہیں مل سکتا۔ کتابیں پڑھنا، وعظ سننا، علماء کے پاس حاضر رہنا۔ یہ سب محض اسباب ہیں۔ اصل چیز مسبب اسباب کے قبضے میں ہے۔ **چھٹے:** یہ کہ حکمت کو کبھی علم کے معنی میں بولا جاتا ہے اور کبھی دوسرے معنی میں بھی، یہاں دوسرے ہی معنی میں استعمال ہوا۔ ورنہ علیم کے بعد حکیم فرمانے سے کچھ فائدہ نہ ہوتا۔

قَالَ يَآدَمُ اَنْۢبِئْهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۚ فَلَمَّآ اَنْۢبَاَهُمْ بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۙ
کہا رب نے اے آدم خبر دو ان کو ناموں کی ان کے پس جبکہ خبر دی ان سب کو ناموں
فرمایا اے آدم بتادے انہیں سب اشیاء کے نام جب آدم نے انہیں سب نام بتادیئے
قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۙ
کی ان چیزوں کے فرمایا رب نے کیا نہ کہا میں نے واسطے تمہارے تحقیق میں جانتا ہوں چھپی
فرمایا میں نہ کہتا تھا کہ میں جانتا ہوں آسمانوں اور زمین کی چھپی چیزیں
وَاَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ ﴿۳۳﴾
چیز آسمانوں کی اور زمین کی اور جانتا ہوں میں وہ جو ظاہر کرتے ہو اور جو تھے تم چھپاتے
اور میں جانتا ہوں جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو اور جو کچھ تم چھپاتے ہو

تعلق

اس آیت کو پہلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **ایک:** یہ کہ پہلے واقعہ سے فرشتوں کو اپنا عجز تو معلوم ہو گیا لیکن آدم علیہ السلام کے کمال کا پتہ نہ لگا اور ان کی خلافت ان کے کمال ہی کی وجہ سے تو تھی اس لئے حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کا علم فرشتوں پر اس طرح ظاہر فرمایا تو گویا کہ آدم علیہ السلام کے خلافت کے مستحق ہونے کی دو وجہیں تھیں۔ فرشتوں کا عاجز ہونا اور ان کا کامل ہونا جن میں ایک کا ذکر پہلے کر دیا گیا اور دوسری کا اب **دوسرے:** یہ کہ پچھلی آیت میں فرشتوں کے معذرت کرنے کا ذکر تھا۔ اور اب اس کی قبولیت کا تذکرہ۔ یعنی جب انہوں نے اپنے قصور کا اقرار کر لیا تو ہم نے ان کو یہ انعام عطا

فرمایا۔ **تیسرے**: یہ کہ پہلی آیت میں فرشتوں کی کمی علم کا ذکر تھا۔ اور اب ان کی تکمیل کا۔

تفسیر

قَالَ يٰٓاٰدَمُ۔ اب رب نے آدم علیہ السلام سے خطاب فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا کہ اے آدم خیال رہے کہ قرآن کریم میں سارے پیغمبروں کو نام لے کر پکارا ہے مگر ہمارے نبی ﷺ کو ہر جگہ ان کے پیارے صفات کے ساتھ۔ یَا اَیُّھَا النَّبِیُّ، یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ، یٰٓاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ وغیرہ۔ خیال رہے کہ پکارنے سے چند مقصود ہوتے ہیں۔ (۱) غافل کو بیدار کرنا۔ (۲) کسی کو اپنی طرف متوجہ کرنا۔ (۳) محبت کا ظاہر کرنا جیسے کہ اے میرے پیارے۔ (۴) غضب اور قہر کا ظاہر فرمانا جیسے کہ اے خبیث، انبیاء کرام کو اکثر محبت کے اظہار کے لئے پکارا جاتا ہے کیونکہ وہ حضرات رب سے غافل نہیں ہوتے۔ ہم جو دعا میں رب کو پکارتے ہیں اس کو غافل سمجھ کر نہیں پکارتے بلکہ یا تو محبت کی وجہ سے یا اس کا کرم حاصل کرنے کے لئے۔ ظاہر یہ ہے کہ آدم علیہ السلام سے رب کا یہ کلام بلا واسطہ ہے بطور الہام یا خواب بھی نہیں بلکہ صراحۃً ہے اس کے باوجود آپ کا لقب کلیم اللہ نہیں، کلیم اللہ وہ جو زمین پر رہتے ہوئے بلا واسطہ رب سے ہم کلام ہو کہ رب کہے وہ سنے وہ عرض کریں رب سنے۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی خصوصیت ہے۔ آدم علیہ السلام سے یہ کلام جنت میں ہوا۔ اور اگر زمین پر ہے تو بھی دو طرفہ ہم کلامی نہیں۔ معراج میں ہمارے حضور سے ہم کلامی ہوئی، مگر زمین پر نہیں عرش سے دور۔ اَنْۢبِئْھُمْ اس جگہ انبا فرمایا گیا جس کے معنی ہیں خبر دے دو اور آدم علیہ السلام کے لئے علم ارشاد ہوا تھا۔ جس کے معنی ہیں سکھا دیا۔ اس لئے کہ آدم علیہ السلام کو ہر چیز کا پورا پورا علم دیا گیا اور انہوں نے حاصل کر لیا۔ جس سے کہ وہ عالم کل کہلانے کے مستحق ہوئے۔ مگر آدم علیہ السلام نے ان چیزوں کی فقط خبر دے دی۔ خواہ فرشتوں کو اس سے علم حاصل ہوا ہو یا نہ ہو۔ ایک مدرس اپنے شاگرد کو باقاعدہ پڑھاتا ہے۔ جس سے وہ شاگرد بھی عالم بن جاتا ہے پھر کبھی منبر پر بیٹھ کر بطریق وعظ کچھ مسائل بیان کر دیتا ہے۔ جس سے سننے والے پورے عالم نہیں بن جاتے بلکہ ان کے کانوں میں علم کی آواز پہنچ جاتی ہے۔ بِاَسْمَآئِھِمْ اس سے پہلے اسماء کا ذکر ہو چکا ہے۔ چاہئے تھا کہ یہاں ضمیر لائی جاتی۔ مگر وہاں چونکہ اسماء سے مراد سارے صفات و حالات تھے اور یہاں فقط چیزوں کے نام اس لئے اسماء ہی فرمایا گیا جس سے معلوم ہوا کہ آدم علیہ السلام کے برابر عالم نہ ہوئے۔ (ماخوذ از تفسیر عزیزی) فَلَمَّآ اَنْۢبَاَھُمْ بِاَسْمَآئِھِمْ۔ آدم علیہ السلام نے فوراً حکم کی تعمیل کی۔ روح البیان نے اس جگہ فرمایا کہ آدم علیہ السلام کے لئے منبر بچھایا گیا اور تمام ملائکہ ان کے سامنے بیٹھے آپ نے اس پر کھڑے ہو کر تمام چیزوں کے نام بیان فرمائے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مجلس وعظ تھی نہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کا مدرسہ، اس سے ہماری پہلی تقریر کی تائید ہوتی ہے، اس آیت سے یہی معلوم ہو رہا ہے کہ آپ نے یہ سارے نام آن کی آن میں بتا دیئے کچھ دیر نہ لگی کیونکہ انباء باب افعال سے ہے، یہ بھی ایک معجزہ ہے کہ تھوڑے وقت میں بڑے سے بڑا کام کر لیا جائے، ورنہ بیشمار چیزوں کا نام بتانے کے لئے بڑا وقت درکار تھا۔ آج سب فرشتوں کی عبادت حضرت آدم علیہ السلام کا وعظ سننا تھا۔ سب کی تمام ڈیوٹیاں ختم کر کے یہاں حاضری کا حکم دیا گیا۔ محبت نبی ساری عبادات سے افضل ہے۔ آج نمازی، حاجی، غازی، قاری بن سکتے ہیں مگر صحابی کوئی نہیں بن سکتا۔ سبحان اللہ

آدم علیہ السلام نے تو اپنے زمانہ میں فرشتوں کو یہ سب کچھ بتا دیا۔ لیکن ہمارے حضور ﷺ نے بھی ایک مرتبہ منبر پر قیام فرما کر ابتدائے پیدائش سے قیامت تک کے سارے حالات پورے بیان کر دیئے جیسا کہ بخاری شریف میں ہے بلکہ مسند امام احمد میں ہے کہ قیامت تک اگر کوئی پرندہ پر بھی ہلائے گا اس کی بھی خبر دے دی۔ وہ پہلے نبی کی مجلس تھی اور یہ خاتم النبیین کی آخری مجلس وہاں سننے والے فرشتے تھے اور یہاں صحابہ کرام۔ یہاں بھی اسماء اسی لئے فرمایا گیا صرف نام ہی بتایا گیا۔ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ۔ جب آدم علیہ السلام کا کمال علمی فرشتوں کو معلوم ہو چکا تب رب نے فرمایا کہ کیا میں نے تم سے نہ کہا تھا یہ استفہام انکاری ہے یعنی کہا تھا کہ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ کہ میں آسمان اور زمین کی چھپی ہوئی چیزیں جانتا ہوں بہت پر لطف بات یہ ہے کہ اس واقعہ سے فرشتوں کو آدم علیہ السلام کا علم غیب معلوم ہوا تھا۔ مگر رب نے فرمایا کہ اس سے تم کو میرا علم معلوم ہو گیا جس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کا کمال رب کے کمال کا آئینہ ہے۔ انہی کی عظمت سے رب کی عظمت ظاہر ہوتی ہے کیونکہ شاگرد کی قابلیت سے استاد کے علم کا پتہ چلتا ہے۔ دیوبندیوں کے یہاں خدا کی تعظیم نبیوں کی توہین سے ہوتی ہے ان کی شیطانی توحید کے معنی ہیں پیغمبروں کو گالی دینا ”معاذ اللہ“ لیکن مسلمانوں کے نزدیک نبیوں کی عزت میں رب کی اور اسلام کی عزت ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ فرشتے بھی بغیر انبیاء کے وسیلہ سے خدا تعالیٰ کی ذات و صفات کو نہیں جان سکتے تو ہم تم کس شمار میں ہیں۔ کیونکہ اس آیت میں رب نے آدم علیہ السلام کے علم کو اپنے علم کی دلیل بنایا اور فرمایا کہ اے فرشتو! اب تک تم نے ہم کو بغیر دلیل جانا تھا تو آج دلیل سے پہچان لو کہ آدم کے علم کو دیکھ کر ہمارے علم کا پتہ لگا لو کہ اگرچہ تمہاری پیدائش ان سے بہت پہلے ہے۔ تمام جہان کی تم نے سیر کر ڈالی اور تم عالم بالا کے رہنے والے اور یہ ذات عالم سفلی کی مخلوقات میں سے ایک ہے اور ابھی ابھی پیدا ہوئے۔ انہوں نے کہیں کی بھی سیر نہ فرمائی لیکن ان کو زمین و آسمان کے ایسے راز معلوم ہیں جو تم کو نہیں معلوم اور جو چیزیں کہ ان سے ہزاروں برس پہلے پیدا ہو چکیں یہ ان تمام کے پورے واقف ہیں۔ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ تمام مفسرین فرماتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ اے فرشتو میں تمہاری ہر ظاہری بات اور چھپے ہوئے خیال کو جانتا ہوں یعنی بظاہر تم نے یہ کہا تھا کہ انسان فساد و خون ریزی کرے گا اور ہم تیری تسبیح و تہلیل کرتے ہیں۔ مگر تمہارے دل میں یہ تھا کہ ہم ہی خلافت کے مستحق ہیں۔ بھلا اس سے افضل اور زیادہ علم والی کون سی مخلوق پیدا ہو سکتی ہے۔ اس میں رب کی قدرت کا انکار نہیں تھا۔ بلکہ یہ ان کی سمجھ میں نہ آ سکتا تھا کہ ہم سے بڑھ کر بھی کوئی پیدا ہو گا۔ کیونکہ ہم نوری ہیں اور نور سب سے اعلیٰ ہم بہت پہلے پیدا ہو چکے ہیں اور ساری دنیا کا تجربہ کر چکے ہیں اب جو کوئی نیا پیدا ہو گا وہ یقیناً ہم سے علم میں کم ہو گا۔ رب نے فرمایا کہ اے فرشتو ہم تمہاری کہی ہوئی بات اور چھپا ہوا خیال جانتے ہیں۔ مگر تفسیر کبیر نے اس جگہ ایک نئی بات فرمائی وہ یہ کہ عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ فرشتوں کی ظاہری بات سے ان کا یہ قول مراد ہے جو انہوں نے بارگاہ الٰہی میں پیش کیا اور چھپی ہوئی بات سے ابلیس کا دلی ارادہ مراد ہے کہ اس نے آدم علیہ السلام کی خبر پاتے ہی دل میں سوچ لیا تھا کہ میں ان سے بڑا ہوں اور کبھی بھی ان کی اطاعت نہ کروں گا۔ چونکہ ابلیس بھی فرشتوں کے ساتھ رہتا تھا۔ اور انہی میں اس کا بھی شمار تھا۔ لہٰذا اس کے اس خیال کو سب کی طرف نسبت کر دیا گیا قوم میں سے بعض کا کام

سب کی طرف نسبت پاجاتا ہے تو مطلب یہ ہوا کہ اے فرشتو جو بات تم نے ظاہر طور پر کی وہ بھی ہم جانتے ہیں اور جو کچھ تم میں سے بعض نے ارادہ کرلیا ہے اس کی بھی ہمیں خبر ہے۔ تفسیر عزیزی نے اس کا مطلب یہ بیان فرمایا کہ فرشتوں کی بعض صفتیں بالکل ظاہر تھیں جیسے رب کی عبادت کرنا اور ان کا گناہوں سے معصوم ہونا وغیرہ وغیرہ اور بعض صفتیں ایسی چھپی ہوئی تھیں جن کی خود ان کو بھی خبر نہ تھی کہ ہم کو رب نے یہ قوتیں بھی عطا فرمائی ہیں جیسے کہ عورت کے رحم میں بچہ بنانا، مسجدوں کی خدمت کرنا، لوگوں کی جانیں نکالنا۔ قبر کے سوالات اللہ والوں سے محبت رکھنا غازیوں، حاجیوں کی مدد کرنا، زندوں کی نذر و نیاز مردوں تک پہنچانا۔ مسلمانوں کے درود سبز گنبد کے اندر لے جا کر شہنشاہ کونین کی خدمت میں حاضر کرنا وحی اتارنا، انبیاء کرام تک کتابوں کا پہنچانا وغیرہ وغیرہ کہ خود ان کو ان صفتوں کا پتہ نہ تھا۔ اگر آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد پیدا نہ ہوتی تو ہرگز فرشتوں کی یہ صفتیں ظاہر نہ ہوتیں۔ اس لئے رب نے فرمایا کہ اے فرشتو ہم تمہاری ظاہری صفتوں کو بھی جانتے ہیں اور تمہارے باطنی کمالات کو بھی اسی لئے ہم نے اس خلیفہ کو پیدا کیا لہٰذا تم پر اس خلیفہ کا بڑا حق ہے اس کی بدولت تم اپنی حقیقت سے آگاہ ہو گئے۔ انہی کے سبب سے تمہارا درجہ بارگاہ الٰہی میں بڑھا زمین کی قوت اور اس میں بویا ہوا تخم لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتا۔ بارش ان سب چیزوں کو ظاہر کرتی ہے۔ فرشتوں کے قلوب مختلف استعداد کی زمین تھے۔ ان کی چھپی ہوئی قوتیں تو بویا ہوا تخم تھا خلیفۃ اللہ آدم علیہ السلام رحمت الٰہی کی بارش تھے جن کی تشریف آوری سے سب کے مختلف کمالات ظاہر ہو گئے۔ جیسے ہمارے حضور کے وسیلہ سے صدیق و زندیق علیحدہ علیحدہ ہو کر لکھے گئے۔

خلاصہ تفسیر

جب فرشتوں نے اپنی معذوری اور کم علمی کا اقرار کرلیا اور بارگاہ الٰہی میں اپنی عرض معروض کی معذرت کی تب خدا تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو حکم دیا کہ آپ ان کو سب چیزوں کے نام بتا دیں، آدم علیہ السلام نے حکم پاتے ہی آنا فانا بلا تامل سب کچھ ان کو بتا دیا جب اس واقعہ سے فرشتوں کو اپنی عاجزی اور آدم علیہ السلام کے کمال علمی کا ثبوت ہو گیا۔ تب رب تعالیٰ نے ان کو متنبہ کرنے کو فرمایا کہ تم اپنے دل میں کیا سمجھتے تھے اور ظاہر کیا ہوا میں ہی ہر چیز کی حکمت اور مصلحت زمین و آسمان کی پوشیدہ باتیں تمہارے ظاہری اور باطنی حالات جانتا ہوں لہٰذا اس آیت میں اِنِّیٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ کی شرح ہو گئی یہ تمہارا تعجب کرنا بے جا تھا ہم جو کچھ کرتے ہیں اس میں ہزار ہا حکمتیں ہوتی ہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوتے ہیں **ایک:** یہ کہ علم عبادات سے افضل ہے اور عالم عابد سے بہتر، **دوسرے:** یہ کہ تعلیم کو حق کی طرف نسبت کر سکتے ہیں کہ رب نے ہی سکھایا مگر اس کو معلم کہنا جائز نہیں کیونکہ معلم پیشہ ور تعلیم دینے والے کو کہتے ہیں۔ **تیسرے:** یہ کہ نعمتیں اور ساری زبانیں حق تعالیٰ کی طرف سے ہیں کیونکہ انسانوں کی پیدائش سے پہلے وہ سب آدم علیہ السلام کو سکھائی گئیں (تفسیر خزائن العرفان)۔ **چوتھے:** یہ کہ فرشتوں کے کمالات اور علم میں زیادتی ہوتی ہے کیونکہ آدم علیہ السلام کے ذریعے فرشتوں کا علم بھی بڑھا اور ان کے کمالات بھی ظاہر ہوئے۔ اگر وہ پیدا نہ ہوتے تو فرشتوں

کے وہ درجات کیونکر ہوتے جواب حاصل ہوئے۔ **پانچویں:** یہ کہ عارف کامل وہ ہے جو حق تعالیٰ کی صفات انبیاء کرام کے ذریعے جانے کیونکہ فرشتے اس سے پہلے عارف باللہ تو تھے۔ مگر بواسطہ رسول اللہ نہ تھے آج حق کے صفات آئینہ نبوت سے دیکھے جس سے ان کا عرفان اور کامل ہوگیا، اسی لئے رب نے فرمایا هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ (فتح ۲۸:) یعنی رب کو اس طرح پہچانو کہ اس نے اپنے رسول کو بھیجا۔ **چھٹے:** یہ کہ بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کے ذریعے انبیاء کو علم ملتا ہے کیونکہ وحی اور کتاب فرشتے ہی لے کر آتے ہیں مگر حقیقت میں نبی کے ذریعے فرشتوں کو علم ملا جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوا، اب نبی کے پاس جو وحی آئے گی وہ ان کے علم میں پہلے سے ہوگی اس وحی سے یا تو ان کا علم ظاہر ہوگا یا ان کا ذہول اور زیان دور ہوگا۔ ہمارا یہ دعویٰ حضرت آدم علیہ السلام اور نبی کریم ﷺ کے متعلق ہے۔ ہم نے اس کی پوری تحقیق اپنی کتاب ''جاء الحق'' میں کردی ہے۔ **ساتویں:** یہ کہ حضرات انبیاء کرام رب کی طرف سے مالک ومختار ہوتے ہیں کہ خدا تعالیٰ جو بھی جس کو دیتا ہے وہ ان کے ذریعہ سے دیکھو رب نے آدم علیہ السلام کو علم بلاواسطہ عطا فرمایا۔ لیکن فرشتوں کو آدم علیہ السلام کے ذریعے حالانکہ وہ اس پر بھی قادر تھا کہ فرشتوں کو سب کچھ خود ہی بتا دے مگر نہ بتایا۔ اس کی بہت نفیس بحث ہماری کتاب ''شان حبیب الرحمٰن'' میں دیکھو۔ **آٹھویں:** یہ کہ جو بغیر وسیلہ انبیاء خدا تک پہنچتا ہے وہ محض بے وقوف ہے۔ فرشتوں کو جو کہ نوری ہیں رب کا قرب خاص آدم علیہ السلام کے ذریعے عطا ہوا، شیطان نے براہ راست خدا تک پہنچنا چاہا، مردود کر کے نکال دیا گیا آج بھی شیاطین جب آسمان پر جانا چاہتے ہیں تو ان کو شہاب (ٹوٹا ہوا تارا) سے مار دیا جاتا ہے کیونکہ وہ مدینے والے راستے کو چھوڑ کر براہ راست جانا چاہتے ہیں اور بعض صحابہ کرام کی نعشیں آسمان پر اٹھائی گئیں کیونکہ وہ نبی کے ذریعے سے گئے تھے۔ **نویں:** یہ کہ حق تعالیٰ نبیوں کو پیدا فرمانے والا ہے اور یہ حضرات اس کی ذات وصفات کے ظاہر کرنے والے لہٰذا رب خالق انبیاء اور پیغمبر مظہر کبریا کیونکہ رب تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کے علوم دکھا کر اپنی شان علمی کا خطبہ ارشاد فرمایا۔ شعر

جب وہ ہوئے رسول اللہ　　　تب کھلا لا الٰہ الا اللہ

اعتراضات

پہلا اعتراض: پہلی آیت سے معلوم ہوا تھا کہ فرشتوں میں اس قدر وسیع علم کی استعداد ہی نہ تھی اس لئے خلافت آدم علیہ السلام کو دی گئی تو آدم علیہ السلام کے ذریعہ ان کو یہ سارے علوم کیوں حاصل ہو گئے **جواب:** ان کو صرف ناموں کی خبر لگی نہ کہ سارے حالات کا پورا علم اس لئے اس کو اَنْۢبِئْهُمْ سے بیان کیا لطیفہ۔ مولوی اشرف علی صاحب نے اس جگہ کمال ہی کر دیا وہ تفسیر بیان القرآن میں لکھتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کے اس نام بتانے سے فرشتے چیزوں کے نام بھی نہ سمجھ سکے۔ بلکہ اس تمام تقریر سے ان کو صرف آدم علیہ السلام کے علم کا پتہ لگا یعنی انہوں نے صرف اتنا سمجھا کہ آدم علیہ السلام واقعی بڑے عالم ہیں۔ پھر مثال دے کر سمجھاتے ہیں کہ جیسے ناسمجھ کے سامنے کوئی سمجھدار آدمی کسی باریک مسئلے کی تقریر کرے تو وہ ناسمجھ اس تقریر سے وہ مسئلہ نہ سمجھے گا مگر اس عالم کے زور علمی کا قائل ہو جائے گا۔ **سبحان اللہ** یہاں تو آدم علیہ السلام کے ایسے

خیر خواہ بنے کہ فرشتوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر انہیں عالم مان لیا۔ لیکن یہی صاحب سید الانبیاء ﷺ کا علم جانوروں اور پاگلوں کی طرح بتارہے ہیں۔ اور انہی کے قوت باز و مولوی خلیل احمد صاحب شیطان اور ملک الموت کا علم حضور سے زیادہ مان رہے ہیں اور ان کے پیشوا مولوی قاسم حضور کا علم آدم علیہ السلام سے زیادہ مانتے ہیں ان صاحبوں کے کلام سے ثابت ہوا کہ آدم علیہ السلام کا علم سارے فرشتوں اور شیطانوں سے زیادہ کیونکہ اس موقع پر شیطان بھی چیزوں کا نام نہ بتا سکا اور حضور علیہ السلام کا علم آدم علیہ السلام سے زیادہ تو نتیجہ یہ نکلنا چاہئے تھا کہ حضور کا علم سارے فرشتوں اور شیطان سے کہیں زیادہ مگر ان صاحبوں نے نتیجہ نکالا کہ حضور کا علم ملک الموت اور شیطان سے کم۔ واللہ یہ الٹی منطق ہماری سمجھ میں نہیں آئی کیا کوئی دیوبندی یا وہابی اس معمہ کو سمجھا سکتا ہے جو ضدین کے اجتماع کو ہمیں سمجھادیں گے۔ ہم ان کے نہایت مشکور ہوں گے۔ **دوسرا اعتراض:** حق تعالیٰ نے یہ سارے نام فرشتوں کو خود ہی کیوں نہ بتادیئے۔ **جواب:** اس کا جواب پہلے گزر چکا کہ اس میں آدم کی فضیلت کا اظہار منظور تھا اور سارے انسانوں کو بتانا مقصود تھا۔ کہ خدا تعالیٰ کی ہر نعمت انبیاء کرام سے حاصل کریں۔ **تیسرا اعتراض:** جب آدم علیہ السلام کو سارے علم پہلے ہی حاصل ہو گئے تو ان پر وحی کیوں آئی تھی۔ **جواب:** اس کا جواب بھی پہلے گزر چکا کہ یا تو وحی لوگوں پر اظہار کرنے کے لئے ہوتی ہے یعنی وحی سے پہلے اس مسئلے کا اظہار نہیں ہوتا اور بعد وحی ہوتا ہے یا اس لئے کہ بعض مسائل کا خود ان کو خیال نہیں رہتا وحی سے وہ ظاہر ہو جاتے ہیں۔

تفسیر صوفیانہ

حق تعالیٰ کے سارے ملک علیحدہ علیحدہ تھے۔ عالم اجسام عالم ارواح سے بے تعلق اور عالم امر عالم خلق سے علیحدہ نور ظلمت سے دور اور ظلمت نور سے کافور ایسی کوئی ہستی موجود نہ تھی جو ان سارے عالموں میں تعلق پیدا کردے کیونکہ فرشتے اس دنیا سے بے نیاز تھے اور یہاں کے جانور جنات وغیرہ اس طرف سے بے خبر نیز حق تعالیٰ کے بہت سے صفات اب تک ظاہر نہ ہوئے تھے۔ کیونکہ کوئی ایسا کامل مظہر نہ آیا تھا جو ان سب کو ظاہر کرے اس لئے منشاء الٰہی یہ ہوا کہ اپنا خلیفہ ایسا بناؤں جو ملک کو ملکوت سے خلق کو امر سے ظلمت کو نور سے غم کو سرور سے ملادے۔ نیچوں کو اوپر پہنچادے اور اوپر کی رحمتیں نیچے والوں تک لادے اور جو اپنے ظاہری و باطنی صفات سے میرے تمام اوصاف ظاہر کردے اس میں روح و روحانیت جسم و جسمانیت سما اور سماویات ارض اور ارضیات دنیا اور دین جمادات اور نباتات اور حیوانات ملکوت اور ملکوتیات سب جمع ہوں جو اپنے وجود سے رب کا وجود اپنی وحدانیت سے رب کی وحدانیت اپنی زندگی سے رب کی حیات اپنی قدرت اور ارادہ سمع، بصر، اور کلام اور علم سے رب کی قدرت اور ارادے اور سمع بصر علم وغیرہ کو ظاہر کردے اور اپنے روح کی لامکانیت اور جہتیت سے رب کی ان صفات کو ظاہر فرمائے اور اس لئے وہ خلیفۃ اللہ الاعظم کا لقب پائے لہٰذا رب نے ایسے خلیفہ کی پیدائش کا نوری فرشتوں میں اعلان فرمایا فرشتے اس کی تہہ تک نہ پہنچ سکے، انہوں نے اس کے ظاہر سے دھوکا کھایا، انہیں کیا خبر تھی کہ مٹی کے چراغ میں روحانیت کا روغن ہوگا۔ اور وہ چراغ قلب کے فانوس میں رکھا جائے گا اور وہ فانوس اس کے جسم کے طاق میں محفوظ ہوگا جس میں اسرار الٰہی کی بتی ہوگی اور نور الٰہی کے تار سے روشن ہوگا پھر اس کو عقل کا نور دے کر نور علیٰ نور بنایا جائے گا جس سے حق

تعالیٰ کے سارے صفات عدل اور احسان محبت اور رحمت عزت اور غلبہ اور غضب اور انتقام عالم میں ظاہر ہوں گے اس لئے انہوں سوال کر دیا کہ مولیٰ اس میں وہ کمال کیا ہوگا جو ہم میں نہیں ہے اس وقت تو ان فرشتوں کو یہ فرما کر خاموش کر دیا گیا کہ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ لیکن پھر اس خلیفہ کو پیدا فرما کر اس کے علم کی کچھ تجلی فرشتوں پر ڈالی۔ وہ اس طرح کہ اس خلیفہ کو تین قسم کے علم دیئے۔ روحانیات اور ملکوتیات کا جس کی کسی قدر فرشتوں کو بھی خبر تھی۔ دوسرے جسمانیات کا جس سے فرشتے ناواقف تھے۔ تیسرے الہیات کا جو کہ فرشتوں کے وہم سے بھی بالاتر تھا۔ کیونکہ فرشتے ملکوت میں سے تھے اور یہ باتیں عالم غیب عالم جبروت کی سیدنا آدم کا علم وہاں تک پہنچایا کہ جہاں فرشتے بھی کہنے لگے کہ سُبۡحٰنَکَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ لیکن باغ خلیل کے گل زیبا اور چمن آدم کے تخم مقصود حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو معراج میں وہاں پہنچایا کہ فرشتے تو کیا حضرت جبرائیل کو یہ عرض کرنی پڑی۔ شعر

اگر یک سر موئے برتر پرم فروغ تجلی بسوزد پرم

غرضکہ حضرت آدم کے سامنے فرشتوں کو اپنی کم علمی کا اقرار اور حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کے سامنے اپنی کم قدرتی کا اقرار کرنا پڑا۔ چونکہ آدم علیہ السلام درخت عالم کے پھل تھے۔ پھل سارے درخت کے اوپر رہتا ہے اور تمام درخت کا خلاصہ ہوتا ہے اس لئے آدم علیہ السلام بھی خلاصہ موجودات تھے۔ فرشتوں نے حضرت آدم کے علم کی جھلک دیکھی ان پر ایک حالت وجد طاری ہوئی ان سے کہا گیا کہ اگر جاؤ آدم کے سامنے۔

وَاِذۡ قُلۡنَا لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اسۡجُدُوۡا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوۡۤا اِلَّاۤ اِبۡلِیۡسَ ؕ
اور جبکہ کہا ہم نے واسطے فرشتوں کے سجدہ کرو تم واسطے آدم کے پس سجدہ کیا سب نے
اور یاد کرو جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو تو سب نے سجدہ کیا سوا ابلیس کے
اَبٰی وَاسۡتَکۡبَرَ ٭۫ وَکَانَ مِنَ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۳۴﴾
سوا شیطان کے انکار کیا اور غرور کیا اور ہو گیا سے کافروں میں
منکر ہوا اور غرور کیا اور کافر ہو گیا۔

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **ایک:** یہ کہ اس سے پہلے حق تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کا ذکر فرمایا اولاً ہمارے جد امجد آدم علیہ السلام کا خلیفۃ اللہ ہونا دوسرے ان کو بہت سا علم ہونا۔ تیسرے فرشتوں کا عاجز ہو کر ان کی شاگردی کرنا اب چوتھی نعمت کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ یعنی فرشتوں کا ان کو سجدہ کرنا جس ترتیب سے واقعات ہوئے اسی ترتیب سے ان کا ذکر بھی ہوا۔ **دوسرے:** یہ کہ اس سے پہلے آدم علیہ السلام کی خلافت کا ذکر ہوا تھا اور خلافت کے لئے دو وصف ضروری ہیں ایک خلیفہ کا عالم ہونا دوسرے اس کا قدرت والا ہونا کہ سب رعایا اس کے سامنے جھک جائے پہلے ان کے علم کا ذکر ہو چکا

اب ان کی قدرت کا ذکر ہو رہا ہے۔ **تیسرے:** یہ کہ اس سے پہلے آدم علیہ السلام کی استاذی کا ذکر تھا اب اس کے نتیجہ کا کہ جب وہ فرشتوں کے استاذ ہوئے تو فرشتوں نے ان کی اس طرح تعظیم کی۔

تفسیر

وَاِذْ قُلْنَا ظاہر یہ ہے کہ سجدے کا حکم آدم علیہ السلام کے کمال علمی کے ظاہر کرنے کے بعد ہوا کہ جب فرشتے ان کی قابلیت اور لیاقت دیکھ چکے تب ان سے فرمایا گیا کہ آدم کو سجدہ کرو لیکن بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ حکم آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ہی ہو چکا تھا کیونکہ دوسری جگہ قرآن کریم فرما رہا ہے فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَ نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ (ص:۷۲) لیکن ان دونوں باتوں کو اس طرح جمع کیا جاسکتا ہے کہ فرشتوں کو آدم علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے ہی سجدے کا حکم دے کر ان کو اس کے لئے تیار کر دیا گیا تھا۔ اب اس علم کے ظہور کے بعد سجدہ کرایا گیا۔ یعنی سجدہ کرانا بعد میں جیسے کہ مال آتے ہی زکوٰۃ واجب ہو جاتی ہے لیکن سال گزرنے پر ادا کرائی جاتی ہے، خیال رہے کہ قُلْنَا جمع کا صیغہ ہے رب تعالیٰ نے اپنے لئے واحد کا صیغہ بھی فرمایا ہے بیان توحید کے لئے۔ جمع کا بھی اظہار عظمت کے لئے مگر بندہ ہمیشہ رب کے لئے واحد کا صیغہ استعمال کرے جمع کبھی نہ بولے کہ اس میں شرک کی بو ہے اس لئے کسی نبی کسی ولی نے کسی دعا یا عرض معروض میں رب کے لئے جمع کا صیغہ کبھی نہ بولا یہ جمع بدعت سیئہ سنت کے خلاف شرک کی موہم ہے یہ نہ کہو کہ رب فرماتے ہیں کہو فرماتا ہے **لِلْمَلٰٓئِكَةِ** بعض لوگوں نے یہاں زمین کے فرشتے مراد لئے ہیں یعنی یہ سجدہ اور تعظیم وغیرہ صرف زمین کے فرشتوں نے ادا کیا لیکن صحیح یہی ہے کہ یہاں سارے فرشتے مراد ہیں کیونکہ آدم علیہ السلام کی فضیلت سارے ہی فرشتوں پر ظاہر ہوئی اور سب ہی نے ان کی شاگردی کی تو چاہئے کہ سجدہ اور تعظیم بھی سب ہی کریں نیز اس جگہ ملائکہ میں کوئی قید نہیں ہے تو بلا وجہ قید لگانا معتبر نہیں ہوگی۔ نیز آئندہ ارشاد ہو رہا ہے كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ یعنی سب نے مل کر سجدہ کیا پھر اتنی تاکیدوں کے ہوتے ہوئے خاص کرنے کا اعتبار نہیں **اسْجُدُوْا** یہ لفظ سجدہ سے بنا ہے جس کے لغوی معنی ہیں عاجزی اور فرمانبرداری کرنا قرآن کریم فرماتا ہے۔ وَّالنَّجْمُ وَ الشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ (الرحمٰن:٦) اور عربی شعراء نے بھی اس معنی میں اس کو استعمال کیا ہے مگر شریعت میں زمین پر پیشانی رکھنے کو سجدہ کہا جاتا ہے بشرطیکہ اس میں سجدہ کی نیت بھی ہو بلکہ سجدہ میں سات عضو زمین پر لگنے چاہئیں، پاؤں کے دونوں انگوٹھے، دونوں گھٹنے، دونوں ہتھیلیاں اور ایک ناک پیشانی، سجدہ دو قسم کا ہے۔ سجدہ تعبدی اور سجدہ تعظیمی۔ سجدہ تعبدی یہ ہے کہ کسی کو اپنا خالق مان کر اس کے لئے جھکے سجدہ تعظیمی یا سجدہ تحیت یہ کہ کسی کو فقط بزرگ جان کر اس کے سامنے سر زمین پر رکھے، سجدہ تعبدی خدا کے سوا کسی دوسرے کو کرنا شرک ہے، کسی بھی دین میں جائز نہ ہوا سجدہ تعظیمی پہلی امتوں میں جائز تھا، چنانچہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے ان کو سجدہ کیا اس جگہ سجدے میں چار قول ہیں **ایک** یہ کہ یہاں فقط تعظیم مراد ہے یعنی لغوی سجدہ لیکن یہ قول نہایت ہی ضعیف ہے بلکہ قرآنی آیتوں کے خلاف اس لئے کہ قرآن کریم نے کہیں تو فرمایا ہے فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ (ص:۷۲) اور کہیں فرمایا خَرُّوْا دونوں کے معنی ہیں گر جانا فقط تعظیم میں گرنا نہیں ہوتا۔ **دوسرا قول** یہ ہے کہ اس سے فقط جھکنا مراد ہے۔ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ یہی فرماتے ہیں لیکن یہ قول بھی

قابل قبول نہیں کیونکہ اس میں بھی گرنا نہیں ہوتا اور قرآن کریم سے گرنا ثابت ہے نیز قرآن کریم کی عبارتوں میں شرعی معنی چھوڑ کر لغوی معنی مراد لینا بڑے فتنے کا دروازہ کھولنا ہے۔ کیونکہ اگر آپ سجدے سے جھکنا یا تعظیم کرنا مراد لیتے ہیں تو بعض لوگ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ میں صلوٰۃ کے لغوی معنی یعنی فقط دعا بھی مراد لے سکیں گے۔ **تیسرا قول** یہ ہے کہ یہاں سجدے سے مراد زمین پر پیشانی لگانا ہی ہے اور فرشتوں کو اسی کا حکم ہوا تھا لیکن اس میں پھر دو قول ہیں۔ بعض فرماتے ہیں کہ سجدہ عبادت تھا۔ یعنی سجدہ اللہ کو تھا اور آدم علیہ السلام مثل قبلہ کے جیسے کہ ہم کعبہ کے سامنے جھک کر اللہ کو کرتے ہیں ایسے ہی فرشتوں نے آدم علیہ السلام کے سامنے جھک کر اللہ کو سجدہ کیا۔ یہی قول شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا بھی ہے لیکن یہ بھی ضعیف ہے تفسیر کبیر نے اس کی بہت تردید فرمائی ہے اس لئے کہ آدم علیہ السلام محض قبلہ ہوتے تو اِلٰی اٰدَمَ فرمایا جاتا نہ کہ لِاٰدَمَ جس کے معنی ہوتے کہ آدم کی طرف سجدہ کرو مگر فرمایا گیا لِاٰدَمَ جس کے معنی ہیں کہ صرف آدم کے لئے سجدہ کرو اور یہاں لام کو اِلٰی کے معنی میں لینا بلا وجہ حقیقی معنی کو چھوڑنا ہے۔ نیز آدم علیہ السلام فقط قبلہ ہوتے تو اس سے ان کی فضیلت اور عزت ثابت نہ ہوتی۔ حضور ﷺ کعبے کی طرف سجدہ کرتے تھے حالانکہ آپ کعبہ سے افضل تھے (تفسیر کبیر)۔ نیز اگر آدم علیہ السلام فقط قبلہ ہوتے تو ابلیس انکار نہ کرتا کیونکہ اس نے اب تک بیت المعمور کے سامنے رب کے لئے لاکھوں سجدے کئے تھے وہ یہ سمجھتا تھا کہ میرے پہلے سجدے بھی رب کے لئے تھے اور یہ بھی۔ پہلے بیت المعمور (آسمان والوں کا کعبہ) کی طرف تھے اور اب آدم علیہ السلام کی طرف اس کے انکار سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ سجدہ آدم علیہ السلام کو ہی تھا۔ **چوتھا قول** یہ ہے یہ سجدہ تعظیمی تھا اور آدم علیہ السلام کے لئے ہی تھا۔ پہلی شریعتوں میں جائز تھا ہمارے اسلام میں منسوخ ہو گیا اب رب کے سوا کسی کو کسی قسم کا سجدہ کرنا جائز نہیں یہی قول صحیح ہے اور اسی کی قرآنی آیت اور احادیث صحیحہ سے تائید ہوتی ہے۔

تتمہ: اسلام میں جس طرح سجدہ حرام کیا گیا اسی طرح جھک کر تعظیم کرنا بھی لہٰذا بقدر رکوع جھک کر سلام کرنا یا کسی بڑے آدمی کے سامنے کی زمین چومنا سب منع ہے۔ ہاں اگر کسی اور کام کے لئے جھکا اور وہ کام تعظیم کے لئے ہے تو جائز ہے جیسے کہ کسی بزرگ کے پاؤں چومنے اور جوتے سیدھے کرنے کے لئے جھکنا اس کی پوری تحقیق کے لئے ہماری کتاب جاء الحق کا مطالعہ کرو۔ نیز اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی قدس سرہ نے اس بارے میں ایک مستقل رسالہ لکھا۔ اَبُوْ الْمِقَالِ۔ لِاٰدَمَ لام سے وہ فائدے حاصل ہوئے جو اوپر بیان کئے گئے۔ اس سجدہ کرانے میں چند مصلحتیں تھیں ایک یہ کہ جب دنیوی بادشاہ کسی کو وزیر اعظم بناتا ہے تو دوسرے امیروں اور وزیروں کو حکم دیتا ہے کہ اس کو سلامی کرو اور اس کو نذرانے اور ہدیے پیش کرو اسی طرح یہاں ملائکہ سے سجدہ کا نذرانہ پیش کروایا گیا جو حقیقت میں وفاداری کا حلف ہے۔ دوسرے یہ کہ کسی علاقہ کے حاکم کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں ایک اس علاقہ کا پورا پورا علم دوسرے سب پر حکومت اور قدرت جب آدم علیہ السلام تمام جہان کے حاکم بنائے گئے تو ان کو سارے جہاں کا علم بھی دیا اور سب پر قدرت بھی علم تو پہلے ظاہر فرما دیا گیا اور قدرت اور تصرف کا اب اظہار ہوا کیونکہ جب فرشتے ہی ان کے سامنے جھک گئے اور ان کے زیر فرمان ہو گئے تو باقی چیزیں خود بخود قبضے میں آ گئیں۔ فَسَجَدُوْا یہ حکم سنتے ہی سارے فرشتے بلا تامل آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ میں گر گئے مفسرین کرام فرماتے

ہیں کہ سب سے پہلے حضرت جبرئیل سجدے میں جھکے پھر میکائیل، پھر اسرافیل پھر عزرائیل، پھر سارے فرشتے۔ اسی لئے حضرت جبرئیل کو سب سے بڑا درجہ عطا فرمایا گیا۔ یعنی خدمت انبیاء (تفسیر خزائن العرفان) بعض حضرات فرماتے ہیں کہ سب سے پہلے حضرت اسرافیل نے سجدہ کیا اسی لئے ان کی پیشانی پر سارا قرآن لکھ دیا گیا (تفسیر روح البیان)۔ خیال رہے کہ آدم علیہ السلام کی پیدائش بھی جمعہ کے دن ہوئی تھی اور یہ سجدہ بھی اور ان کا جنت سے باہر تشریف لانا بھی جمعہ کے دن ہوا اور توبہ کی قبولیت بھی اور بڑے بڑے اہم کام بھی جمعہ ہی کے دن ہوئے قیامت بھی جمعے ہی کے دن قائم ہوگی انشاء اللہ پورے فضائل سورۃ جمعہ کی تفسیر میں اور کچھ اس سے پہلے بھی بیان کئے جائیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ سجدہ ظہر کے وقت سے عصر تک رہا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ ملائکہ سو برس سجدہ کرتے رہے اور تیسرا قول یہ ہے کہ پانچ سو سال تک سجدہ میں رہے (تفسیر خزائن العرفان اور روح البیان) ان باتوں کو اس طرح جمع کیا جاسکتا ہے۔ کہ اولاً فرشتوں نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کیا جس کا شیطان نے انکار کیا یہ سجدہ تھوڑی دیر تک رہا۔ پھر انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا کہ شیطان آدم علیہ السلام کی طرف پیٹھ پھیرے کھڑا ہے تب انہوں نے دوسرا سجدہ اس سجدے کی توفیق کے شکریے میں ادا کیا۔ یہ سجدہ رب کے لئے تھا اور سجدہ شکر تھا پھر جب سر اٹھایا تو انہوں نے دیکھا کہ شیطان پہلے بہت خوبصورت تھا لیکن اب اس کی شکل مسخ ہو کر جسم خنزیر کا سا اور چہرہ بندر کا سا ہوگیا۔ تب انہوں نے ہیبت الٰہی سے ایک اور سجدہ کیا یہ تینوں سجدے آدم علیہ السلام ہی کی طرف تھے مگر تین قسم کے اور ان کی مدتیں علیحدہ علیحدہ (ماخوذ از تفسیر روح البیان) خیال رہے کہ اس عالم کی ابتدا بھی تعظیم نبی سے ہوئی کہ پہلے حضرت آدم کو سجدہ کرایا اور اس عالم آخرت کی ابتدا بھی تعظیم نبی سے ہوگی کہ محشر میں اولاً تلاش شفیع کے لئے حضور کے دروازے پر حاضری ہوگی پھر کوئی اور کام تمام عبادات سے بڑی عبادت تعظیم پیغمبر ہے۔ اِلَّآ اِبۡلِیۡسَ۔ تمام فرشتوں نے سجدہ کرلیا لیکن ابلیس اپنی عبادت اور شیطانی توحید کے نشہ میں مست رہ کر اس سجدہ کا انکاری ہوگیا۔ خیال رہے کہ مردود ہونے سے پہلے اس کا نام عزازیل تھا مگر پھر اس کا نام ابلیس وشیطان منکر ہوگیا لفظ ابلیس بلس سے بنا ہے جس کے معنی ناامید یا مکار چونکہ شیطان بھی رحمت الٰہی سے ناامید ہوچکا اور اس نے مکر وفریب کو اپنا پیشہ بنالیا اسے ابلیس کہا جانے لگا۔ لفظ شیطان شطن سے بنا ہے شطن کے معنی ہیں دور ہونا چونکہ یہ بھی ہر رحمت سے دور ہے اس لئے اس کو شیطان کہا جاتا ہے۔ لہٰذا یہ بروزن فیعال ہے اور اس کا نون اصلی ہے اور یاشیطٗ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں باطل اور جھوٹا ہونا۔ اس صورت میں اس کے الف اور نون زیادہ ہوں گے اب ہر مکار یا فریبی کو بھی شیطان یا ابلیس کہا جانے لگا قرآن کریم فرماتا ہے وَ اِذَا خَلَوۡا اِلٰی شَیٰطِیۡنِہِمۡ (البقرہ: ۱۴) تحقیق شیطان۔ اس زمانے کے مغربی آفت کے مارے ہوئے علی گڑھی اور نیچری عقیدے میں ڈوبے ہوئے لوگ جس طرح جنت دوزخ قیامت وغیرہ کے منکر ہوئے اسی طرح وہ شیطان کا بھی انکار کر بیٹھے اور قرآن پاک کو اپنی رائے کے موافق کرنے کے لئے اس میں طرح طرح کی تحریفیں شروع کردیں اور کہہ دیا کہ اس سے مراد انسان کے برے صفات ہیں ان کا یہ قول اہل اسلام عیسائیوں، یہودیوں، مجوسیوں وغیرہ سب کے ہی خلاف ہے کیونکہ شیطان کا ثبوت توریت وانجیل اور وساطیر وغیرہ سب ہی سے ہے اگر شیطان انسانی صفت کا نام ہوتا تو اس کو آگ سے پیدا ہونے اور

آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کرنے اور فرشتوں کی جماعت سے نکالے جانے، قیامت تک اس کو مہلت ملنے اور اس کی اولاد ہونے کے کیا معنی ان کا یہ کلام توجہ کے قابل نہیں ہے ہاں اس میں محققین کا اختلاف ہے کہ شیطان کی حقیقت کیا ہے بعض فرماتے ہیں کہ وہ فرشتہ نہ تھا تو سجدے کے حکم میں کیونکر داخل ہوتا رہا قرآن کریم میں اس کو جن فرمانا کہ كَانَ مِنَ الْجِنِّ اس کے معنی ہیں چھپا ہوا یا تو وہ انسانوں کی نگاہ سے چھپا رہتا ہے اور فرشتے بھی اس کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ اس لئے اسے جن فرمایا گیا بعض حضرات فرماتے ہیں کہ جن بھی فرشتے ہی ہیں۔ یعنی اطاعت کرنے والوں کو ملک کہا گیا۔ نافرمانوں کو جن لیکن یہ دونوں قول ضعیف ہیں۔ حق یہی ہے کہ شیطان جنات میں سے ہی ہے اور جنات کی حقیقت اور ہے فرشتوں کی اور اس لئے کہ جنات کی پیدائش نار سے ہے وہ خود کہتا ہے خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ (اعراف: ۱۲) اور دوسری جگہ فرمایا گیا ہے وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ السَّمُوْمِ (حجر: ۲۷) نیز فرمایا گیا وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ (الرحمٰن: ۱۵) اور فرشتے نوری ہیں جیسا کہ احادیث صحیحہ میں وارد ہے نیز شیطان کی ذریت اور اولاد ہے فرشتے اس سے پاک ہیں کیونکہ ان میں کوئی نر و مادہ ہے ہی نہیں ہے یہ دونوں باتیں قرآن کریم سے ثابت ہیں۔ نیز فرشتے معصوم ہیں اور شیطان نابکار بدکاروں کا سردار۔ قرآن کریم فرشتوں کے بارے میں فرماتا ہے لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ (التحریم: ۶) نیز فرشتے اللہ کے رسول ہیں اور شیطان اور جنات میں یہ بات نہیں ان تمام باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جن اور فرشتوں کی علیحدہ علیحدہ حقیقتیں ہیں اور شیطان جنات میں سے ہیں مگر اپنی عبادت اور تقویٰ کی وجہ سے چونکہ فرشتوں میں رہتا تھا اس لئے سجدے کے حکم میں وہ بھی شامل ہو گیا جیسے بادشاہ اپنے سپاہیوں کو کچھ حکم کرے تو ان کے ساتھ رہنے والے سائیس دربان اور فراش بھی اس حکم میں داخل ہو جاتے ہیں مفسرین فرماتے ہیں کہ جب فرشتے سجدے میں گرے تو شیطان آدم علیہ السلام کی طرف پیٹھ کر کے کھڑا ہو گیا اسی وقت سے اس کی صورت مسخ کر دی اور نکال دیا گیا۔ تفسیر عزیزی میں اس جگہ ہے کہ ایک بار شیطان نے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ آپ تو اللہ کی بارگاہ میں بڑے مقبول ہیں میری شفاعت فرما دیجئے کہ حق تعالیٰ میری توبہ قبول فرمائے موسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی حکم الٰہی ہوا کہ آپ کی شفاعت قبول اور شیطان کی توبہ قبول ہے مگر شرط وہی پہلی ہے کہ آدم علیہ السلام کی قبر کو سجدہ کرے موسیٰ علیہ السلام نے شیطان کو خبر دی اس نے جواب دیا کہ جب میں نے زندہ آدم کو سجدہ نہ کیا تو مردے کو کیا سجدہ کروں۔ مگر اے موسیٰ تمہاری شفاعت کا مجھ پر احسان ہے اس لئے میں آپ کو ایک فائدے کی بات بتاتا ہوں کہ میں تین وقتوں میں آدمی کو بہت خراب کرتا ہوں ایک غصے کی حالت میں کہ اس وقت میں بجائے خون کے اس کے جسم میں دوڑتا ہوں اور جو چاہتا ہوں اس سے کرا لیتا ہوں دوسرا جہاد کی حالت میں کہ غازی کو گھر بار یاد دلا کر جہاد سے روکتا ہوں تیسرے غیر عورت کے ساتھ خلوت کی حالت میں کہ زنا کرا دیتا ہوں۔ روح البیان میں اس جگہ فرمایا کہ حق تعالیٰ شیطان کو ایک لاکھ برس جہنم میں رکھ کر وہاں سے نکالے گا اور فرمائے گا کہ تو اب بھی حضرت آدم کو سجدہ کر لے وہ انکار کرے گا اور وہ دوزخ میں وہ واپس کر دیا جائے گا۔ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ۔ اَبٰى اِبَاءٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں دیدہ دانستہ بلاوجہ انکار کر دینا یعنی شیطان نے بلا عذر جان بوجھ کر سجدے سے انکار کر دیا انکار کیوں کیا تکبر کی وجہ سے اِسْتَكْبَرَ۔ اِسْتِكْبَارٌ سے بنا ہے

جس کے معنی ہیں اپنے کو بڑا سمجھنا شیطان نے تین وجہوں سے اپنے کو آدم علیہ السلام سے بڑا سمجھا **ایک** یہ کہ میں آگ سے پیدا ہوا وہ خاک سے آگ خاک سے افضل ہے اور جو افضل سے پیدا ہو وہ بھی افضل لہٰذا میں آدم علیہ السلام سے افضل **دوسرے** یہ کہ میں ہزاروں سال عبادت میں مشغول رہا آدم علیہ السلام نے ابھی کوئی عبادت نہیں کی لہٰذا میں ان سے افضل **تیسرے** یہ کہ میں نے دنیا میں بڑے بڑے کام انجام دیئے جیسے زمین کو جنات سے خالی کرانا وغیرہ انہوں نے اب تک کوئی مشقت نہ اٹھائی لہٰذا میں ان سے افضل حق تعالیٰ نے میری ناقدری کی اور سالہا سال کا حق خدمت برباد کر دیا۔ اس لئے سجدے سے انکاری ہو گیا۔ انکار کی وجہ دوسری آیت میں مذکور ہے۔ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ (حجر: ۳۳) حضرت آدم کو حقیر اور اپنے کو عزت والا جاننا معلوم ہوا کہ تمام کفروں کی جڑ توہین نبی ہے جو شیطان سے سرزد ہوا خیال رہے کہ کفار کے مقابل تکبر عبادت ہے اور نبی کے مقابل تکبر کفر ہے۔ شیطان کا تکبر آخری قسم کا تھا۔ اس لئے کافر ہوا وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ مفسرین نے اس کے دو معنی کئے ہیں ایک یہ کہ كَانَ۔ صَارَ کے معنی میں ہے یعنی شیطان انکار کر کے کافروں میں سے ہو گیا۔ یعنی اب تک مومن تھا آج سے اس انکار سے کافر ہوا دوسرے یہ کہ كَانَ اپنے ہی معنی میں ہے یعنی وہ پہلے ہی سے کافروں میں سے تھا یا تو اسے مایوسی ہوئی سجدے کا انکار کر گیا اس لئے کہ وہ اللہ کے علم میں پہلے ہی کافر تھا۔ اس کی عبادت وغیرہ اللہ کے ہاں قبول نہ تھی کافرین سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کافروں کی اور بھی جماعت موجود تھی جن میں آج شیطان بھی داخل ہو گیا سب سرکش جن کافر ہی تو تھے۔

خلاصہ تفسیر

جب آدم علیہ السلام کا علم تمام پر ظاہر ہو گیا تو تمام فرشتوں کو جن میں شیطان بھی رہتا تھا حکم ہوا کہ تم سب کے سب آدم علیہ السلام کو تعظیمی سجدہ کرو وہ سب سجدے میں گر گئے لیکن ابلیس سجدے سے انکاری ہوا اپنے کو بڑا جان کر دل میں سوچنے لگا کہ حق تعالیٰ کا یہ حکم غلط ہے میں بہت بڑا آدم علیہ السلام بہت چھوٹے چھوٹا بڑے کے سامنے جھک سکتا ہے۔ نہ کہ بڑا چھوٹے کے سامنے رب نے میری ہزارہا برس کی عبادت کی کوئی قدر نہ فرمائی اور میرا حق نہ پہچانا۔ اس لئے وہ کافروں سے ہو گیا، کفر و گناہ کرنے والا نفس امارہ ہے شیطان اس کا مشیر و وزیر ہے۔ جیسے خود شیطان کو اس کے نفس نے کافر بنایا۔ ایسے ہی ان جنات کو ان کے نفوس نے کافر کیا۔ لہٰذا آیت پر یہ اعتراض نہیں کہ جب شیطان نے گمراہ کرنے کا کام اب تک شروع ہی نہ کیا تھا تو جنات کافر کیونکر ہوئے آخر ان جنات نے جنگ و خون ریزی بھی کی تھی نفس کے اغواء سے آج رمضان میں شیطان قید ہوتا ہے مگر جب بھی ہم لوگ گناہ کرتے ہیں صرف نفس کے اغواء سے

حضرت حوا کی پیدائش

اس واقعہ کے بعد آدم علیہ السلام تنہا زمین پر پھرتے تھے اور ہر جانور کو اپنا غیر جنس دیکھ کر گھبراتے تھے اور تمنا کرتے تھے کہ کاش کوئی میرا ہم جنس ہوتا جس سے مجھے انس حاصل ہوتا دوسرے جمعہ کو آدم علیہ السلام سو رہے تھے کہ فرشتوں نے ان کی بائیں

پسلی چاک کی جس سے انہیں کچھ تکلیف نہ ہوئی اور اس سے آناً فاناً ایک نہایت خوبصورت عورت بنائی آدم علیہ السلام کی چاک کی ہوئی پسلی کو ملا دیا گیا جب وہ جاگے تو اپنا ہم جنس اپنے پاس بیٹھا ہوا دیکھا پوچھا تم کون ہو ندا آئی یہ ہماری بندی ہے، تمہاری وحشت دور کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ آدم علیہ السلام نے چاہا کہ ان کو ہاتھ لگائیں حکم ہوا کہ اے آدم پہلے ان کا مہر ادا کرو پھر ہاتھ لگانا عرض کیا کہ مولیٰ مہر کیا ہے فرمایا کہ میرے نبی محمد مصطفیٰ ﷺ پر دس بار درود شریف پڑھو اور فرشتوں کی گواہی سے ان کا نکاح ہوا (تفسیر عزیزی)۔ ان کا نام حوا اس لئے ہے کہ یہ لفظ حی سے بنا ہے جس کے معنی ہیں زندہ چونکہ یہ زندہ انسان آدم علیہ السلام سے پیدا ہوئیں یا ہر زندہ انسان کی والدہ ہیں۔ اس لئے انہیں حوا کہا گیا یا یہ لفظ حوت سے بنا ہے جس کے معنی ہیں سرخی مائل بہ سیاہی چونکہ ان کے ہونٹ کا رنگ ایسا ہی تھا۔ اس لئے انہیں حوا کہا گیا عربی میں عورت کو امرء ۃ کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ امرء (یعنی مرد) سے بنی ہیں۔ اس کو عورت اس لئے کہتے ہیں کہ اس کے لئے بے پردہ ہونے میں عار یعنی شرم ہوتی ہے۔ اس لئے شرمگاہ کو بھی عورت کہا جاتا ہے۔ حضرت حوا کا قد بھی ساٹھ ہاتھ کا تھا ان کی عمر شریف نو سو ستانوے (۹۹۷) سال ہوئی۔ آدم علیہ السلام کے بعد ساڑھے ساٹھ سال زندہ رہیں۔ (تفسیر روح البیان) ان کی پیدائش کہاں ہوئی انشاءاللہ اگلی آیت میں بیان کیا جائے گا۔

فائدے

ایک: یہ کہ حضرت آدم علیہ السلام فرشتوں سے افضل ہیں کیونکہ انہیں سجدہ کرایا گیا۔ **دوسرے:** یہ کہ استاد کا ادب شاگرد پر بہت ضروری ہے کیونکہ فرشتوں نے آدم علیہ السلام کا ادب کیا۔ **تیسرے:** یہ کہ تکبر اور غرور نہایت بری چیز ہے کیونکہ سب سے پہلے شیطان تکبر ہی سے گمراہ ہوا۔ **چوتھے:** یہ کہ خدا کا حکم وجوب کے لئے ہوتا ہے اسی لئے تو شیطان اس مخالفت سے گمراہ ہوا۔ **پانچویں:** یہ کہ کسی شخص کو اپنی عبادت پر ناز نہ کرنا چاہئے کیونکہ شیطان جب عابد تھا تو اگرچہ خدا کے علم میں وہ کافر تھا مگر اس وقت کی حالت کے لحاظ سے اس کو فرشتوں میں عزت دی گئی اور جب اس کا کفر ظاہر ہوا تب نکالا گیا۔ اسی طرح حضور ﷺ کا منافقوں کی رعایت فرمانا بے علمی کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ اسی طرح تھا۔ **چھٹے:** یہ کہ بغیر عظمت انبیاء توحید لعنت کا سبب ہے۔ شیطان نے توحید الٰہی کا انکار نہ کیا بلکہ حضرت آدم علیہ السلام کی تعظیم کا اس واقعہ سے دیوبندیوں اور وہابیوں کو سخت عبرت پکڑنی چاہئے خیال رہے کہ کفر کی صدہا قسمیں ہیں رب کا انکار کفر اس کی صفات کا انکار کفر فرشتوں یا قیامت یا جنت دوزخ کا انکار کفر وغیرہ پھر ان کفروں کی بہت سی قسمیں کوئی ہلکی ہے کوئی بھاری۔ مگر ان سب میں سب سے بدتر کفر اہانت پیغمبر ہے کہ شیطان کا کفر اسی قسم کا تھا۔ وہ رب کی ذات وصفات وغیرہ کسی چیز کا انکاری نہ تھا۔ **ساتویں:** یہ کہ گناہ کرنا کفر نہیں ہاں گناہ کو اچھا سمجھنا کفر ہے۔ کیونکہ شیطان ایک سجدے کے چھوڑنے سے مردود ہوا اور ہم گنہگار صدہا سجدے چھوڑ کر بھی مسلمان رہتے ہیں۔ کیونکہ وہ انکار سے تھا اور یہ شرمساری کے ساتھ۔ **آٹھویں:** یہ کہ اللہ والوں کو حقیر جاننا اتنا بڑا جرم ہے کہ پھر توبہ کی توفیق بھی نہیں ہوتی فقہا فرماتے ہیں کہ سنت غیر موکدہ کا مذاق اڑانا بھی کفر ہے۔ **نویں:** یہ کہ توہین پیغمبر کے ہوتے ہوئے علم اور عبادت سب بیکار ہیں۔ **دسویں:** یہ کہ حکم الٰہی کے مقابلہ

میں قیاس کرنا کفر ہے کیونکہ شیطان نے یہی تو کیا تھا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: سب کو شیطان گمراہ کرتا ہے۔ مگر بتاؤ شیطان کو کس نے گمراہ کیا اسی طرح شیطان کے گمراہ ہونے سے پیشتر جو جنات نے فتنہ فساد کیا وہ کس کے بہکانے سے **جواب:** ان سب کے نفس نے گمراہ کیا اصل گمراہ کرنے والی چیز نفس ہی ہے شیطان تو اس کی رہبری کرتا ہے قرآن کریم فرماتا ہے۔ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ (یوسف: ۵۳) دیکھو ماہ رمضان میں شیطان قید ہو جاتا ہے مگر پھر بھی لوگ گناہ کرتے ہیں نفس کی وجہ سے **دوسرا اعتراض:** حق تعالیٰ نے شیطان کو پیدا ہی کیوں کیا جو تمام گناہوں کی اصل ہے۔ **جواب:** اگر شیطان نہ ہوتا تو دنیا اور دین میں کچھ بھی نہ ہوتا کیونکہ پھر نہ بادشاہ کی ضرورت ہوتی اور نہ پولیس اور کچہری اور نہ فوج وغیرہ کے محکمے کی اسی طرح نہ پیغمبروں کی، نہ ولیوں اور پیروں کی دوزخ اور عذاب کے فرشتے بیکار رہتے۔ نیز خدا کی صفتیں غفاری، ستاری، قہاری، جباری، وغیرہ کا ظہور نہ ہوتا۔ کیونکہ یہ صفات بندوں کے گناہوں سے ظاہر ہوتے ہیں بلکہ یوں کہو کہ پھر نہ تو آدم علیہ السلام دانہ کھاتے نہ زمین پر آتے نہ دنیا آباد ہوتی بلکہ غور سے معلوم ہوتا ہے کہ گرم وسرد پاک وناپاک اچھی بری چیزوں سے ہی دنیا کا نظام قائم ہے ان میں سے اگر ایک بھی نہ ہو تو دنیا کا خاتمہ ہو جائے دیکھو پانی اور گندے کھاد سے دانہ اگتا ہے۔ سریلی اور بھدی آوازیں مل کر باجا بجتا ہے۔ گرم اور ٹھنڈی طاقت سے بجلی بنتی ہے وغیرہ وغیرہ اسی لئے جب دنیا میں اہل ایمان نہ رہیں گے تو قیامت آجائے گی۔ **تیسرا اعتراض:** جب شیطان مردود ہونے والا تھا تو پہلے اس کو اتنی عزت کیوں دی گئی؟ **جواب:** تاکہ قیامت تک لوگوں کو اس سے عبرت حاصل ہو جائے کوئی شخص اپنے علم تقویٰ اور پرہیزگاری کے نشہ میں کسی پیغمبر کی توہین نہ کرے سمجھ لے کہ وہ نازک بارگاہ ہے کہ اس کی بے ادبی کرنے پر سارے علم وعمل برباد ہو جاتے ہیں۔ شیطان کو مولوی بنا کے مارا، عابد وزاہد بنا کے مردود کیا تاکہ سب مولویوں اور صوفیوں اور پیروں کو عبرت حاصل ہو جائے بہت سے لوگوں کو یہ کہتے سنا گیا کہ دیوبندی علماء نے واقعی حضور کی توہین تو کی ہے مگر وہ ہیں۔ بڑے عالم وعامل وہ اس واقعہ سے عبرت پکڑیں۔ دیوبندی مولوی شیطان سے بڑھ کر عالم وعابد نہیں۔ **چوتھا اعتراض:** انبیاء کرام کی نعلین پاک کی توہین کرنا کفر کیوں ہے اور پیروں کی توہین کفر کیوں نہیں؟ (نئے دیوبندی) **جواب:** اس لئے ان کی ہر چیز رب کی تجویز سے ہے اور ان کی ہر ادا رب کی رضا سے جب کفار نے حضور ﷺ کے حضرت زینب سے نکاح کرنے پر اعتراض کیا تو رب نے فرمایا زَوَّجۡنٰکَهَا (احزاب: ۳۷) یعنی اے کافرو محبوب کا نکاح میں نے کرایا ہے تم ان پر کیوں اعتراض کرتے ہو سبحان اللہ رب نے نکاح کرانے کو اپنی طرف نسبت دی لہٰذا ان کی کسی چیز پر اعتراض در پردہ رب پر اعتراض ہے اگر کوئی شخص فوج کی وردی یا غذاء پر اعتراض کرے تو حقیقتاً بادشاہ پر اعتراض کر رہا ہے کیونکہ یہ سب شاہی تجویز ہے۔ **پانچواں اعتراض:** سجدے تعظیمی کا جواز تو قرآن سے ثابت ہے۔ کیونکہ پچھلی شریعتیں جب قرآن اور حدیث میں بیان ہو جاویں وہ ہم پر لازم ہوتی ہیں اور سجدہ تعظیمی کا حرام ہونا صرف بعض حدیثوں سے ثابت ہے۔ اور غیر متواتر سے قرآنی حکم کو نہیں چھوڑا جا سکتا لہٰذا اب

بھی سجدہ تعظیمی جائز ہے۔ (بعض نئے پیر پرست) **جواب:** فرشتوں کا یہ سجدہ حضرت آدم کی شریعت کا حکم نہ تھا کیونکہ شرعی حکم نبی کے ذریعے انسان یا جنات پر جاری ہوتا ہے فرشتوں پر حکم شرعی جاری نہیں ہوتا یہاں یہ حکم خصوصی طور پر صرف فرشتوں کو دیا گیا لہٰذا یہ شریعت آدم علیہ السلام کا حکم نہ تھا نیز یہ سجدہ صرف ایک ہی بار حضرت آدم علیہ السلام کو ہوا ہمیشہ سجدہ کرنے کا حکم نہ تھا۔ یعقوب علیہ السلام کا یوسف علیہ السلام کو سجدہ کرنا نہ تعظیمی تھا نہ حکم شرعی اگر تعظیمی ہوتا تو حضرت یوسف والد کو سجدہ کرتے بلکہ یہ صرف خواب کی تعبیر پوری کرنے کے لئے تھا جیسے ابراہیم علیہ السلام کا فرزند کے ذبح کے لئے تیار ہو جانا خواب کی تعبیر کے لئے تھا ان کا اپنے فرزند کو بیابان جنگل میں چھوڑ آنا یہ تمام چیزیں دین ابراہیمی کے شرعی احکام نہ تھے ایسے ہی یہ سجدہ یعقوبی ہوا۔ اسی لئے یوسف علیہ السلام نے فرمایا یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ (یوسف:۱۰۰) جیسے رب تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے فرمایا یٰۤاِبْرٰهِیْمُ ﴿۱۰۴﴾ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا (الصافات:۱۰۵) غرضیکہ تعظیمی سجدے کا گزشتہ شریعتوں میں جائز ہونا اور ہمارے ہاں حرام ہونا دونوں حدیث سے ثابت ہیں۔

تفسیر صوفیانہ

فرشتے اب تک رب کے لئے سجدے کرتے رہے جو ان کی ملکی اور روحانی طبیعتوں کا تقاضا تھا ان سجدوں میں براہ راست رب ہی کی تعظیم تھی۔ ماسوا اللہ کی تعظیم کو دخل نہ تھا۔ آج اس سجدہ کا حکم دیا جا رہا ہے جس میں بواسطہ حضرت آدم رب کی تعظیم ہوگی۔ کیونکہ آج حضرت آدم نور الٰہی کی تجلی گاہ ہیں جو ان کے سامنے جھکے گا وہ حقیقت میں رب ہی کو سجدہ کرے گا جیسے اپنے حبیب سے فرمایا کہ جو آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں لہٰذا سچا سلوک وہ ہے جو پیغمبر کے ذریعے سے حاصل ہو۔ نیز فرشتوں کی عبادت سے نہ تو ان کو ثواب ملتا ہے اور نہ ان کو ترقی درجات حاصل ہوتی ہے آج فرمایا گیا کہ اے فرشتو آج تم وہ سجدہ کرو جو فائدہ مند ہو تم کو پورا فائدہ اس سے نہ ہو گا ہاں آدم علیہ السلام کو اس سے فائدہ ضرور پہنچے گا کیونکہ ان کی اولاد تمہارے سجدے کو دیکھ کر اور سن کر بزرگوں کے ادب کا طریقہ سیکھے گی۔ جس سے وہ میری بارگاہ تک پہنچنے کے قابل ہوگی اور آج کا یہ سجدہ تمہارے صدہا سال کے سجدوں کا خلاصہ ہے کیونکہ یہ حق و باطل کو علیحدہ کرنے والا ہے اب تک کے سارے سجدے اس شان کے نہ تھے فرشتے چونکہ نوری تھے اور نور کی شان ہے اطاعت کرنا۔ شیطان ناری تھا۔ نار کی طبیعت ہے اوپر کو چڑھنا، اس لئے آج اس نار نے بغیر وسیلہ پیغمبر اوپر چڑھنا چاہا نیچے گرا دیا گیا یہ ایک وہ سجدہ تھا جس نے لاکھوں کے سجدے مقبول بنا دیئے اور ابلیس کے لاکھوں سجدے مردود کر دیئے کسی نے کیا خوب کہا ہے۔ شعر

گر وقت اجل سر تیری چوکھٹ پہ جھکا ہو ۔۔۔ جتنی ہو قضا ایک ہی سجدے میں ادا ہو

ریاضت نام ہے تیری گلی میں آنے جانے کا ۔۔۔ تصور میں تیرے رہنا عبادت اس کو کہتے ہیں

بعض حضرات فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیشانی میں نور مصطفیٰ ﷺ جلوہ گر تھا۔ یہ سب برکتیں اور عظمتیں اسی کی وجہ سے تھی اور در حقیقت یہ سجدہ اس نور ہی کو تھا۔ اس نور سے ہر جگہ رحمت کا ظہور ہوا سب سے پہلے اس نور مصطفیٰ ﷺ نے اپنے والد ماجد کو فرشتوں کا مسجود بنایا۔ شعر

زبان حال سے کہتے تھے آدم جسے سجدہ ہوا ہے وہ میں نہیں ہوں

پھر اسی نور نے اپنے انہی پدر والا کی توبہ کرائی اسی کی برکت سے حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کنارے لگی اسی نے خلیل رب جلیل پر نار کو نور بنایا اسی نے اسمٰعیل ذبیح اللہ کو ذبح سے بچایا، اسی نے اپنے باپ عبداللہ کو عبدالمطلب کی چھری سے ذبح ہونے کو بچایا، خود فرماتے ہیں اَنَا ابْنُ ذَبِیْحَیْنِ میں دو ذبیحوں کا فرزند ہوں مولانا جامی فرماتے ہیں۔ شعر

اگر نام محمد را نیاور دے شفیع آدم نہ آدم یافتے توبہ نہ نوح از غرق نجینا

وَقُلْنَا یٰۤاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا
اور ہم نے فرمایا اے آدم رہئے آپ اور بی بی آپ کی اسی جنت میں اور تم دونو کھاؤ اس سے
اور ہم نے فرمایا اے آدم تو اور تیری بی بی اس جنت میں رہو اور کھاؤ اس میں سے
رَغَدًا حَیْثُ شِئْتُمَا ۪ وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا
سیر ہو کر جہاں چاہو تم دونوں اور نہ قریب جانا اس درخت کے پس ہو جاؤ گے
بے روک ٹوک جہاں تمہارا جی چاہے مگر اس پیڑ کے پاس نہ جانا
مِنَ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۳۵﴾
سے ظالموں
کہ حد سے بڑھنے والوں سے ہو جاؤ گے

تعلق

اس آیت کو پہلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **ایک**: یہ کہ اس سے پہلے حق تعالیٰ کے چند احسانات کا ذکر کیا گیا تھا کہ ہم نے تمہارے والد کو فلاں فلاں درجے عطا فرمائے اس سلسلے میں اب ایک اور احسان کا ذکر ہو رہا ہے کہ ہم نے تمہارے والد حضرت آدم کو جنت جیسی آرام دہ اور پاکیزہ جگہ میں رکھا۔ **دوسرے**: یہ کہ اس سے پہلے خلافت کے متعلق آدم علیہ السلام کی دو صفتوں کا ذکر فرمایا گیا ایک ان کا بہت بڑا علم دوسرے ان کی قدرت اور عزت اس آیت میں ان کی تیسری صفت کا ذکر ہے جو خلافت کے لئے ضروری ہے یعنی حکومت کرنے اور زمین آباد کرنے کا طریقہ اور اس کا تجربہ چونکہ ان کو اور ان کی اولاد کو زمین میں رہنے کے لئے مکان بنانا اور باغات کھیتیاں لگانا اور اللہ کی اطاعت کرنا دوسروں پر حکومت کرنا وغیرہ ضروری تھے۔ اس لئے ان کو گویا سکھانے کے لئے جنت میں رکھا تا کہ وہ ان تمام چیزوں کا تجربہ فرما کر پھر زمین میں تشریف لائیں پہلے انہیں علم دیا گیا تھا اور اب تجربہ کے لئے عارضی طور پر جنت میں رکھا گیا۔

تفسیر

وَقُلْنَا جب شیطان مردود ہو چکا تو اس کو فرشتوں کی جماعت سے بھی نکال دیا گیا اور جنت وغیرہ اعلیٰ مقامات سے بھی اور اس کے بعد آدم علیہ السلام کو حکم دیا گیا کہ یٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ اگرچہ جنت میں حضرت آدم اور حوا دونوں ہی کو رکھا گیا تھا لیکن اصل مقصود آدم علیہ السلام کا رکھنا تھا اور حضرت حوا ان کی دل بستگی کے لئے تھیں کیونکہ جنت میں رکھ کر خلافت کا طریقہ صرف آدم علیہ السلام کو سکھانا منظور تھا۔ اس لئے اس جگہ خطاب صرف آدم علیہ السلام کو فرمایا گیا اور ان کی بیوی کا ذکر بطریق عطف ہوا زَوْجُكَ عربی میں زوج کے معنی ہیں جوڑا شوہر اور بیوی دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ یہاں بیوی کے معنی میں استعمال ہوا کبھی فرق کے لئے بیوی کو زوجہ کہہ دیتے ہیں مگر یہاں اس فرق کی ضرورت نہ تھی کیونکہ جب ان کی نسبت آدم علیہ السلام کی طرف سے ہو رہی ہے تو خود بخود سمجھ میں آجائے گا کہ یہاں بیوی مراد ہے۔ حضرت حوا کو جنت میں رکھنے کی تین حکمتیں تھیں ایک یہ کہ ان کے ذریعے آدم علیہ السلام کو اطمینان رہے دوسرے یہ کہ وہ جنتی مکانوں کی زیب و زینت اور صفائی دیکھ کر دنیاوی گھروں کو سجانا اور صاف رکھنا سیکھ لیں۔ **تیسرے:** یہ کہ جنتی زیور اور پوشاکیں استعمال کر کے دنیا میں بھی عمل کریں گویا بیرونی زندگی تو آدم علیہ السلام سیکھیں اور خانگی زندگی حضرت حوا اسی لئے اس وقت آپ کی زوجہ صرف حوا تھیں وہاں کی حوریں نہ تھیں کیونکہ دنیا میں آکر گھر بار انہی کو سنبھالنا تھا نہ کہ حوروں کو لہٰذا حوروں کو تربیت کی ضرورت ہی نہ تھی۔

حضرت حوا کی پیدائش

ہم بیان کر چکے ہیں۔ اب یہ خیال رہے کہ یہ تو سب مانتے ہیں کہ آدم علیہ السلام وہاں پیدا ہوئے جہاں آج مکہ معظمہ آباد ہے لیکن حضرت حوا کی پیدائش میں اختلاف ہے کہ کہاں ہوئی عبداللہ ابن عباس اور ابن مسعود فرماتے ہیں کہ جنت میں ہوئی۔ سیدنا آدم علیہ السلام ایک دن سو رہے تھے ان کی پسلی سے ان کو پیدا فرمایا گیا۔ تو آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ اے آدم علیہ السلام آپ اور آپ کی بیوی جنت میں ٹھہرے رہو لیکن حضرت عمر اور دیگر صحابہ کرام نے روایت فرمائی کہ فرشتوں نے آدم اور حوا علیہم السلام کو نوری لباس پہنایا، ان کے سر پر تاج رکھے، سونے کے تخت پر بٹھایا۔ حضرت حوا کو مختلف قسم کے زیوروں سے آراستہ کیا اور پھر ان دونوں کو جنت میں پہنچا دیا گیا۔ (تفسیر کبیر روح البیان)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حوا کی پیدائش بھی زمین میں ہوئی۔ اب آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ آپ اور آپ کی بیوی جنت میں جا کر رہو اَلْجَنَّةَ تمام مفسرین کا اتفاق ہے کہ اس سے وہی جنت مراد ہے جس میں نیکو کار ثواب کے لئے جائیں گے یعنی بہشت ہاں بعض بے دینوں نے کہا ہے کہ یہ فلسطین یا فارس کرمان میں کوئی باغ تھا جس میں آدم علیہ السلام کو کچھ دن کے لئے رکھا گیا پھر ایک خطا کی وجہ سے ہندستان کی طرف بھیج دیا گیا لیکن یہ بات محض غلط ہے اس لئے کہ آدم علیہ السلام سے فرمایا گیا اِهْبِطُوْا مِنْهَا یعنی جنت سے اتر جاؤ، اترنا اونچی جگہ سے ہوتا ہے۔ اگر یہ کوئی زمین کا باغ ہوتا تو فرمایا جاتا کہ اُخْرِجُوْا نیز دوسری جگہ قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ (البقرہ: ۳۶) یعنی تمہارا ٹھکانہ زمین میں ہے اگر وہ باغ بھی زمین میں ہی ہوتا تو یہ

کیوں کہا جاتا کہ تم جنت سے اتر کر زمین میں جا کر رہو کیونکہ پھر وہ زمین میں پہلے ہی سے تھے۔ اِھْبِطُوْا کو اُخْرِجُوْا کے معنی میں لینا بلاوجہ حقیقی معنی کو چھوڑنا ہے نیز روایات میں بھی صراحتاً یہی آیا ہے کہ آدم علیہ السلام بہشت میں رہے اپنے وہم کی وجہ سے احادیث کو نہیں چھوڑا جا سکتا ہے دوسرے فریق کے دلائل بھی انشاء اللہ اسی آیت کے اعتراضات کے جوابات میں بیان کئے جائیں گے وَكُلَا مِنْهَا چونکہ فقط جنت کی چیزیں دیکھنے سے پورا تجربہ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے ان کو عام نعمتیں کھانے کی عام اجازت دی گئی تاکہ یہاں کھا کر دنیوی نعمتوں کا کھانا سیکھ جائیں اور چونکہ اس کھانے کی ان دونوں حضرات آدم وحوا کو یکساں اجازت تھی۔ اس میں کوئی کسی کے تابع نہیں۔ اس لئے یہاں تثنیہ کا صیغہ ارشاد ہوا آپ کو وہاں مشروبات پینے کی بھی کھلی اجازت تھی مگر کیونکہ پانی کھانے میں خود ہی آجاتا تھا اس وجہ سے اس کا ذکر علیحدہ نہ فرمایا آج کہا جاتا ہے کہ کھانے کی دعوت ہے لیکن وہاں پانی، شربت، سوڈا وغیرہ سب کچھ ہوتا ہے۔ رَغَدًا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو جنتی نعمتوں کے کھانے میں کوئی روک ٹوک نہ تھی جب چاہیں اور جو کچھ چاہیں اور جتنا چاہیں کھائیں نہ تو وہاں نعمتوں کے ختم ہونے کا خطرہ ہے اور نہ بدہضمی ہونے کا دغدغہ نیز کسی چیز کے فقط چکھ لینے سے اس کی خاصیتیں اور نفع نقصان پورے پورے معلوم نہیں ہوتے یہاں سیری بھوک کے مقابل نہیں یعنی جب بھوکے ہو تو پیٹ بھر کر کھالو آپ کو وہاں بھوک اور پیاس نہ تھی بلکہ وسعت کے معنی ہیں حَيْثُ شِئْتُمَا یہ فرما کر ان کو جنت میں ہر جگہ جانے کی اجازت دی گئی چونکہ بہشت کے ہر طبقے کی آب وہوا مختلف تھی اور ہر جگہ کے مکانات اور حویلیاں اور محل رنگ برنگے اس لئے ان کو ہر جگہ کی چیزیں دیکھنے کا موقع دیا گیا تاکہ اس کی مثل وہ اور ان کی اولاد دنیا کو آباد کریں اور وہ وہاں کا نمونہ ان کے خیال میں بیٹھا ہوا ہو وہ دنیا میں ظاہر کریں تاکہ دنیا آخرت کا نمونہ بن جائے۔ وَلَا تَقْرَبَا چونکہ دنیا میں آدم علیہ السلام اور ان کی اولاد پر احکام خداوندی جاری ہونے والے تھے اور دنیا کی بعض چیزوں سے ان کو روکا جانے والا تھا لہٰذا ان کے نفس کو اس پابندی کا عادی بنانے کے لئے یہاں بھی انہیں بعض چیزوں سے روک دیا گیا اور فرما دیا گیا کہ اے آدم وحوا تم جنت میں جو چاہو کھاؤ لیکن اس درخت کے قریب نہ جانا یعنی نہ اسے کھانا، نہ ادھر جانا خیال رہے کہ اس قرب میں مکانی یعنی فقط پاس جانے کی ممانعت نہیں ہے ورنہ لَا تَقْرَ بَار کے پیش سے ہوتا ہے کیونکہ جو قرب کے پاس جانے کے معنی میں ہے وہ مطرد کے پانچویں باب سے ہے۔ (تفسیر روح البیان)۔ بلکہ اس سے قرب استعمال مراد ہے۔ (یعنی اس درخت کو کھانا تو کیا کھانے کے قریب بھی نہ ہونا یعنی کھانے کے خیال اور اس کے اسباب سے بچنا) جیسے قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ (البقرہ: ۲۲۲) یعنی حائضہ عورتوں کے پاس نہ جاؤ فرماتا ہے۔ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ (الانعام: ۱۵۲) یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ یہاں بھی تقربوا کی ر کو زبر ہی ہے نہ کہ پیش جس سے معلوم ہوا کہ حائضہ عورت اور یتیم کے مال کے پاس جانے سے ممانعت نہیں ہے بلکہ ان کے غلط استعمال سے روکا گیا ہے۔ هٰذِهِ الشَّجَرَةَ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی خاص درخت دکھا کر ان سے یہ فرمایا گیا تھا اس میں چار روایتیں ملتی ہیں ایک یہ کہ گیہوں تھا۔ اور جنت کا گیہوں بیل کے گردے کے برابر تھا اور شہد سے زیادہ میٹھا اور مکھن سے زیادہ نرم اور لذیذ تھا۔ (تفسیر روح البیان، تفسیر عزیزی)۔ چونکہ اس گیہوں کی وجہ سے آدم علیہ السلام جنت سے باہر تشریف لائے

اسی لئے ان کی اکثر اولاد کا رزق گیہوں قرار دیا گیا اور یہ گیہوں ہی تمام مصیبتوں کی جڑ ہے چونکہ حضرت آدم کی آزمائش مقصود تھی اسی لئے جنت میں اسی وقت یہ درخت تھا آئندہ وہاں صرف پھل فروٹ کے درخت ملیں گے۔ گندم وغیرہ دانہ کے پودے نہ ہوں گے کیونکہ یہ غذا ہی ہے وہاں غذا کی ضرورت نہیں لذت کے لئے میوے ہوں گے دوسری روایت یہ ہے کہ وہ درخت انگور تھا۔ اسی لئے دنیا میں انگور کی شراب وغیرہ حرام کی گئی۔ تیسری روایت میں ہے کہ وہ درخت انجیر تھا اسی لئے آدم علیہ السلام اپنے جسم پاک پر انجیر کے پتے لپیٹ کر جنت سے باہر تشریف لائے چوتھی روایت یہ ہے کہ وہ کوئی ایسا درخت تھا کہ جس کے کھانے سے پائخانہ کی حاجت ہوتی تھی۔ اور جنت ان گندگیوں سے پاک ہے وہاں تو سارے کھانے ڈکار سے ہضم ہوتے ہیں۔ تو فرمایا گیا کہ اب تم وہاں جاؤ جہاں تمہاری ضرورت (رفع حاجت) پوری ہو سکے مگر ان سب میں ترجیح پہلی روایت یعنی گیہوں والی کی ہے یہی سیدنا عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں۔ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِیْنَ یہ بھی فرمادیا گیا کہ اگر تم نے اس حکم کے خلاف کیا تو تم ظالموں یعنی خطا کاروں میں سے ہو جاؤ گے۔ کیونکہ مالک کی بغیر اجازت اس کی چیز استعمال کرنا ظلم ہی تو ہے۔ اس طرح کرنا اپنی ذات پر ظلم کرنا ہے۔

خلاصہ تفسیر

یہ تو پہلے معلوم ہو چکا کہ آدم علیہ السلام کو زمین میں رہنے اور وہاں حکومت کرنے کے لئے پیدا کیا گیا تھا۔ یہ جو کچھ اب تک ہوا تھا ان کی خلافت ہی کا پیش خیمہ تھا۔ لہٰذا جبکہ آدم علیہ السلام کے سر پر دستار خلافت بندھ چکی اور سارے فرشتوں نے نذرانہ سجود پیش کر کے وفاداری کا حلف دے دیا تب رب نے ان سے فرمایا کہ اے آدم تم اور تمہاری بیوی بہشت میں رہو وہاں تمہیں کوئی روک ٹوک نہیں جو جی چاہو خوب کھاؤ اور جہاں چاہو سیر و تفریح کرو۔ تمہیں ہر چیز کی اجازت تو ہے مگر اس درخت (گیہوں، انجیر، یا انگور، یا کوئی اور خاص درخت) کے پاس تک نہ جانا، یعنی کھانا تو کیا اس کا خیال تک نہ کرنا اور جو ایسا کرو گے تو یاد رکھنا کہ خرابی میں پڑ جاؤ گے۔ اور اس سے تمہارے اوپر آفت آجائے گی خیال رہے کہ آدم علیہ السلام کو کچھ روز کے لئے جنت میں رکھنے کی چند حکمتیں ہیں۔ ایک تو وہی جو ہم تفسیر میں عرض کر چکے کہ بادشاہ جس کو بڑا عہدہ دینا چاہتے ہیں اس کو بی اے وغیرہ یا اعلیٰ قابلیت کی ڈگری دینے کے بعد بھی ٹریننگ دیتے ہیں۔ جس سے اس کو حکومت کرنے کا تجربہ ہو جائے علم اور چیز ہے اور تجربہ دوسری چیز آدم علیہ السلام نے جنت میں رہ کر وہاں کے فرشتوں پر بھی حکومت کی۔ وہاں کے مکانات اور باغات کی بناوٹ بھی دیکھی وہاں کی نعمتوں کو استعمال بھی کیا پھر بعض چیزوں کی ممانعت بھی سن لی، پھر خطا ہو جانے پر عتاب الٰہی کا لطف بھی حاصل کر لیا۔ ایک محبوب اور پیاری چیز پا کر اس کے چھوٹ جانے کا غم بھی محسوس کر لیا۔ دنیا میں ان کو اور ان کی اولاد کو انہی تمام باتوں سے واسطہ پڑنا تھا۔ اس لئے اب جب دنیا میں تشریف لائے تو بالکل تجربہ کار اور پختہ ہو آئے دوسرے یہ کہ رب تعالیٰ نے ان کے اور ان کی اولاد کے لئے جنت بنائی جو کہ ان کی اصل قیام گاہ ہے۔ دنیا تو ایک عارضی جگہ اور اس کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا ان کو جنت پہلے دکھادی گئی۔ تاکہ وہ اور ان کی اولاد ان نعمتوں کو دیکھ کر یا سن کر ان کے حاصل کرنے کی کوشش اور ان کی طلب سے ایک دم بھی غافل نہ رہیں۔ تیسرے یہ کہ دنیا میں ان پر احکام ربانی بھیجے جانے

والے تھے۔ جن کی مخالفت کی وجہ سے تکلیفیں آنے والی تھیں اس لئے یہاں ہی یہ کام کر کے ان کو دکھا دیا گیا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **ایک:** یہ کہ نکاح حق تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے کہ اس میں صدہا دینی اور دنیاوی فائدے ہیں۔ ایسی کوئی عبادت نہیں جو آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک ہر دین و ملت میں جاری رہی ہو۔ سوائے ایمان اور نکاح کے رب تعالیٰ نے قرآن کریم میں انہی پیغمبروں کا ذکر فرمایا جو نکاح والے ہیں عیسیٰ علیہ السلام بھی دوبارہ دنیا میں تشریف لا کر نکاح کریں گے اور یحییٰ علیہ السلام نے بھی نکاح کیا تھا۔ لیکن اس کی لذتوں میں زیادہ مشغول نہ ہوئے۔ اسی لئے رب نے ان کو حصور فرمایا **دوسرے:** یہ کہ جنت کی نعمتوں میں سے بیویاں اعلیٰ نعمت ہیں کیونکہ رب نے آدم علیہ السلام کی دلبستگی کے لئے ان کی بیوی کو بھی وہاں رکھا لہٰذا جن لوگوں نے جنت کی حوروں کا انکار کیا ہے انہوں نے سخت غلطی کی **تیسرے:** یہ کہ جنت پیدا ہو چکی ہے **چوتھے:** یہ کہ وہاں کی ساری نعمتیں بھی پیدا ہو چکیں ورنہ آدم علیہ السلام کے وہاں رہنے اور وہاں کی نعمتیں استعمال کرنے کے کیا معنی **پانچویں:** یہ کہ انسان کی پیدائش چار طریقوں سے ہوئی ماں باپ سے جیسے کہ عام انسان بغیر ماں باپ کے جیسے کہ حضرت آدم علیہ السلام بغیر ماں کے جیسے حضرت حوا بغیر باپ کے جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام **چھٹے:** یہ کہ حضرت آدم کو جنتی پھل فروٹ کھانے کی اجازت دی گئی مگر وہاں کی حوروں کے قرب کی اجازت نہ تھی کہ حوریں اس وقت ہی ملیں گی جب وہاں ثواب کے لئے جانا ہوگا ہمارے حضور بھی معراج میں تشریف لے گئے شہداء کی روحیں وہاں رہتی ہیں وہاں کے میوے کھاتی ہیں مگر حوروں سے قرب نہیں ہوتا حوروں کے متعلق رب فرماتا ہے لَمۡ یَطۡمِثۡهُنَّ اِنۡسٌ قَبۡلَهُمۡ (الرحمٰن: ۷۴) کیونکہ حوروں سے انسان کا نکاح بعد قیامت ہو سکے گا اب کسی دین میں جائز نہ ہوا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: حضرت حوا حضرت آدم علیہ السلام کی بیٹی تھیں کیونکہ ان کے جسم پاک سے پیدا ہوئیں تو ان کے ساتھ زوجیت کا برتاؤ کیسے جائز ہوا **جواب:** اولاد وہ کہلاتی ہے جو کہ اپنے نطفے سے پیدا ہو یہاں ایسا نہ ہوا لہٰذا وہ ان کی بیٹی نہ ہوئیں۔ ہمارے جسم سے بہت سی جاندار چیزیں بن جاتی ہیں سر میں پیٹ میں بہت سے جانور پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ ہماری اولاد نہیں کہلاتے۔ کیونکہ ہمارے نطفے سے نہیں ہیں اسی لئے بعض علماء فرماتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کو ابن مریم کہنا مجاز ہے اس لئے کہ سیدنا عیسیٰ علیہ السلام حضرت جبریل کی پھونک سے پیدا ہوئے اور حضرت مریم کا شکم شریف ان کی امانت کی جگہ تھی وہاں مریم کا بھی نطفہ نہ تھا اس کی پوری بحث انشاء اللہ سورت مریم میں کی جائے گی اور اگر مان بھی لیا جائے کہ حضرت حوا آدم علیہ السلام کی بیٹی ہی تھی تو بھی جس طرح ان کی شریعت میں بہن سے نکاح جائز تھا اس طرح مجبوراً اس بیٹی سے نکاح کرنا جائز قرار دیا گیا کیونکہ دوسری عورت کا ملنا ناممکن تھا اگر آدم علیہ السلام کی طرح حضرت حوا کو بھی بنا دیا جاتا تو یقیناً عورت مرد میں اتنی محبت نہ ہوتی جواب ہے کیونکہ اب تو اس سے محبت ہے کہ عورت مرد کا جزو ہے اور نہ عورت کا مرد کے تابع ہونا معلوم ہوتا ہے۔ نہ عورت مرد کے ہم جنس ہوتی جیسے دوسری جاندار چیزیں انسان کی غیر جنس تھیں ویسے یہ بھی ہوتیں اس زمانے کے

بعض واعظ اور بے دین عالم کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کا نکاح کسی جناتنی سے ہوا اور حضرت حوا کے اس نکاح سے انکار کرتے ہیں اس اعتراض کی بنا پر مگر یہ نقلاً بھی غلط ہے اور عقلاً بھی نقلاً تو اس لئے کہ رب فرماتا ہے وَجَعَلَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا (اعراف:۱۸۹) معلوم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی زوجہ انہیں کے جسم سے بنیں انسان تھیں غیر انسان نہ تھیں عقلاً اس لئے کہ انسان کا نکاح غیر جنس سے نہیں ہو سکتا صرف انسان سے ہو سکتا ہے گائے بکری بھینس جن سب ہی انسان کے غیر جنس ہیں کسی سے نکاح جائز نہیں نیز دو جنسوں کے اختلاط سے جو اولاد ہو گی وہ انسان نہ ہو گی بلکہ کوئی اور چیز ہو گی گھوڑی گدھے سے خچر ہوتا ہے بکرے ہرنی سے ایسا بچہ ہوتا ہے جو نہ بکری ہی ہو نہ ہرن ہوا گر حضرت آدم کی بیوی جناتنی ہوتی تو ان کی اولاد نہ انسان ہوتی نہ جن کوئی تیسری چیز ہوتی **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس جنت میں آدم علیہ السلام کو رکھا گیا تھا وہ بہشت بریں نہ تھا بلکہ کوئی اور باغ تھا چند وجہ سے ایک یہ کہ اگر یہ بہشت بریں ہوتا تو آدم علیہ السلام وہاں سے باہر نہ آتے کیونکہ وہاں ہمیشگی ہے خٰلِدِيْنَ فِيْهَا **جواب:** جب ثواب کے لئے بہشت میں داخلہ ہوگا تو وہاں ہمیشگی ہوگی اس وقت آدم علیہ السلام کا وہاں رہنا ثواب کے لئے نہ تھا فرشتے بھی وہاں آتے جاتے رہتے تھے ادریس علیہ السلام بھی وہاں گئے ہوئے ہیں ہمارے نبی ﷺ معراج کی رات وہاں تشریف لے گئے شہیدوں کی ارواح بھی وہاں جنت میں رہتی ہیں مگر اس رہنے میں ہمیشگی نہیں ہے اسی لئے حضور علیہ السلام جنت سے واپس تشریف لائے ادریس علیہ السلام اور شہیدوں کی روحیں بھی قیامت میں وہاں سے باہر آئیں گی پھر فیصلہ ہونے کے بعد ثواب کے لئے جائیں گی **دوسری وجہ:** یہ کہ شیطان کو سجدے سے انکار کرتے ہی جنت سے نکال دیا گیا تھا پھر وہ آدم علیہ السلام کو دھوکہ دینے وہاں کس طرح پہنچ سکا نیز جنت شیطان کی جگہ ہی نہیں ہے وہ تو نیک کاروں کی جگہ ہے **جواب:** اس کا تفصیلی جواب تو انشاء اللہ اگلی آیت میں آئے گا۔ یہاں اتنا سمجھ لو کہ اگر شیطان جنت میں گیا بھی ہو تو وہاں ثواب کے لئے نہ گیا بلکہ اور مقصد کے لئے بیشک مسجد نمازیوں کی جگہ ہے مگر بعض لوگ جوتے چرانے کے لئے وہاں آجاتے ہیں وہاں شیطان چوری کرنے کے لئے گیا نیز جنت وغیرہ اعلیٰ مقامات سے شیطان چند بار نکالا گیا ہے ایک تو سجدے کا انکار کرتے ہی۔ اس نکالنے کا مقصد یہ تھا کو وہاں اس کا مقام نہ رہا چھپ چھپا کر آنا جانا باقی رہا جیسے نکالا ہوا مجسٹریٹ بھی کچہری میں عام لوگوں کی طرح جا سکتا ہے۔ لیکن دوسری نوعیت سے پھر جب آدم علیہ السلام وہاں سے اتارے گئے تو شیطان کا داخلہ جنت میں تو بند ہو گیا لیکن پھر بھی آسمانوں پر جاتا آتا رہا اور فرشتوں کی گفتگو سنتا رہا اور کاہنوں کو جھوٹ سچ ملا کر اس کی خبر دیتا رہا۔ پھر ہمارے نبی ﷺ کی تشریف آوری سے وہاں سے بھی روک دیا گیا اب جانے کی کوشش کرتا ہے مگر پلٹ کر واپس آتا ہے اس کی پوری تحقیق انشاء اللہ سورت جن میں کی جائے گی **تیسری وجہ:** یہ کہ بہشت میں شرعی احکام جاری نہیں اور نہ وہاں کسی چیز کی روک ٹوک ہے اور آدم علیہ السلام کو ایک درخت سے روکا گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کوئی اور باغ تھا نہ کہ بہشت بریں **جواب:** جنت کی یہ صفت بھی جب ہی ہو گی جب لوگ ثواب کے لئے وہاں داخل ہوں گے **چوتھی وجہ:** یہ کہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں آدم علیہ السلام سوئے تب ان کی پسلی سے حضرت حوا پیدا ہوئیں اور بہشت

بریں میں کسی کو نیند نہیں کیونکہ نیند ایک قسم کی موت ہے اور وہ جگہ موت سے پاک **جواب:** جنت کا یہ وصف بھی تب ہی ہو گا جب ثواب کے لئے وہاں داخلہ ہوگا۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ ممنوعہ درخت سے کھانا ظلم تھا آدم علیہ السلام نے بھی اپنے ظلم کا اقرار کیا کہ عرض کیا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا (اعراف: ۲۳) دوسری جگہ قرآن کریم ارشاد فرماتا ہے لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ (البقرہ: ۱۲۴) یعنی میری نبوت ظالموں کو نہ پہنچے گی ان دونوں آیتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ آدم علیہ السلام نبی نہ تھے کیونکہ ان سے ظلم سرزد ہوا اور ظالم نبی نہیں ہوسکتا **جواب:** اس کے نہایت مفصل مکمل جواب ہماری کتاب "قہر کبریا بر منکرین عصمت انبیاء" میں دیکھو جس میں اس جیسے بہت سے سوالوں کا جواب دیا گیا ہے اور کچھ تفصیل اگلی آیت میں بھی کی جائے گی یہاں اس قدر سمجھ لو کہ قرآن کریم میں ظلم چند معنی میں استعمال ہوا بمعنی کفر وشرک بمعنی ستانا بمعنی فسق وفجور بمعنی حد سے آگے بڑھنا وغیرہ وغیرہ اس آیت میں ظلم کے معنی حد سے نکلنا یا کسی چیز کو بے موقع استعمال کرنا ہے آیت رَبَّنَا ظَلَمْنَآ میں ظلم سے مراد خطاء لغزش ہو جانا لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ میں ظلم سے مراد بدکاری فسق وفجور ہے یعنی بدکاروں فاسقوں کو نبوت نہیں ملے گی قرآن کریم نے سیدنا آدم علیہ السلام کی پاک دامنی کا ہر جگہ اعلان فرمایا کہ وہ بھول گئے کہیں فرمایا کہ ان کو شیطان نے بہکا دیا وغیرہ وغیرہ یہ اعتراض تو ایسا ہوا جیسے کوئی کہہ دے کہ اللہ مومن ہے قرآن سے ثابت ہے اور ہر مومن ہمارا بھائی ہے یہ بھی قرآن سے ثابت ہے لہٰذا اللہ ہمارا بھائی ہے جیسے یہاں مومن کے چند معنی میں فرق نہ کیا گیا ایسے ہی یہاں بھی۔

تفسیر صوفیانہ

اس خطاب سے اشارۃً معلوم ہو رہا تھا کہ آدم علیہ السلام کا یہ قیام دائمی نہ ہوگا کیونکہ جس کو ہمیشہ رکھنا ہو اس کو کسی چیز سے روکا نہیں جاتا یہ بھی سمجھ میں آ رہا تھا کہ ان سے یہ خطا ضرور ہوگی یہ بھی معلوم ہو رہا تھا کہ ان کو زمین میں جانا ہوگا کیونکہ وہ زمین ہی کی خلافت کے لئے پیدا فرمائے گئے تھے اس لئے رب نے ان کو امتحان کا خطاب فرمایا اور ان کی عزت افزائی کے لئے اس درخت سے روکا کیونکہ فرمایا کہ اے آدم تمہارے لئے ساری جنت اور وہاں کی نعمتیں مباح ہیں مگر اس درخت کے پاس نہ جانا کیونکہ یہ درخت محبت اور معرفت کا ہے جس کے لئے محنت لازم ہے اور یہ منع کرنا ہی ان کے کھانے کا سبب بنا کیونکہ انسان ممنوع چیز کی طرف زیادہ رغبت کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا آدم علیہ السلام نے وہ درخت کھالیا جس کے کھاتے ہی خلافت اور محبت اور محنت کے اسرار کھل گئے اور جمال وجلال کا اظہار شروع ہو گیا خدا کی صفات تو ابی ستاری' غفاری' قہاری' وغیرہ جو کہ اب تک دُرِ مکنون کی طرح راز میں تھیں۔ ظاہر ہونے لگیں کیونکہ اس درخت کے کھانے سے وہ خطا کار قرار دیئے گئے جس سے کہ انہیں توبہ کرنی پڑی اور اس توبہ سے ان کو حق تعالیٰ کی طرف سے محبت اور طہارت قلبی کے انعام عطا فرمائے گئے اس پر قرآن گواہ ہے اور فرماتا ہے اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِیْنَ (البقرہ: ۲۲۲) اس ممانعت سے یہ سبب نسیان عصیان ہوا۔ عصیان سے توبہ، توبہ سے محبت الٰہی اور محبت سے طہارت غرضیکہ اس ممانعت میں ہزار ہا راز اور اس ربانی عتاب اور سیدنا آدم علیہ السلام کی ندامت وتوبہ میں ہزاروں ناز وانداز (تفسیر روح البیان) اور سچ تو یہ ہے کہ سارے عالم کا

ظہور ان کی برکت ہے ان حضرات کی خطائیں ہماری عبادتوں سے افضل ہیں کیونکہ ان کی خطا سے رب کی عطا ہوتی ہے حضرت فاروق اعظم کی خطا سے قیامت تک کے مسلمانوں کو رمضان کی راتوں میں اپنی بیویوں سے جماع کرنے کی اجازت ملی حضرت ابوامیہ ضمری کے منہ سے مجبوراً کلمہ کفر نکال دینے کی برکت سے ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کو ایسی مجبوری میں اس کی اجازت ملی اس لئے مولینا فرماتے ہیں۔

ہر چہ گیرد علتی علت شود کفر گیرد کاملے ملت شود

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۠
پس پھسلا دیا ان دونوں کو ابلیس نے اس سے پس علیحدہ کر دیا ان کو اس سے کہ تھے وہ بیچ
تو شیطان نے جنت سے انہیں لغزش دی اور جہاں رہتے تھے وہاں سے انہیں الگ کر دیا
وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ
اس کے اور کہا ہم نے اتر جاؤ بعض تمہارے واسطے بعض کے دشمن ہیں اور واسطے تمہارے
اور ہم نے فرمایا نیچے اترو آپس میں ایک تمہارا دوسرے کا دشمن اور تمہیں ایک وقت تک
مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝
بیچ زمین کے ٹھہرنا اور نفع پانا ہے طرف ایک وقت کے
زمین میں ٹھہرنا اور برتنا ہے

تعلق

اس آیت کا پہلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **ایک**: یہ کہ اس میں بھی حق تعالیٰ کی ایک خاص اس نعمت کا ذکر ہے جو ہم کو حضرت آدم علیہ السلام کے ذریعہ عطا ہوئی یعنی ان کا جنت سے باہر تشریف لانا کیونکہ یہ تشریف آوری ہزاروں نعمتوں کا اصل ہے البتہ اتنا فرق ہے کہ پچھلی آیتوں میں ان نعمتوں کا ذکر ہے جو ظاہر و باطن ہر طرح نعمت تھیں یعنی ان کا خلیفہ ہونا اور مسجود ملائکہ بننا وغیرہ وغیرہ اس آیت میں اس نعمت کا ذکر ہے جو بظاہر زحمت ہے اور حقیقۃً رحمت **دوسرے**: یہ کہ پہلی آیتوں میں دائمی نعمتوں کا ذکر تھا یعنی خلافت وغیرہ اور جنت کا داخلہ عارضی اور منقطع ہونے والی نعمت تھی جس کا اس سے پہلے ذکر ہوا اب آیت میں اس عارضی نعمت کے ختم ہونے کے اسباب کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔

تفسیر

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ۔ اَزَلَّ۔ زَلَّۃٌ سے بنا ہے اس چند کے معنی ہیں۔ دور جانا، لے جانا، پھسل جانا، اسی لئے مَزَلّ پھسلتی زمین کو کہتے ہیں کہ جس پر قدم نہ ٹھہرے یہاں تینوں معنی بن سکتے ہیں یعنی شیطان نے آدم و حوا کو لغزش دے دی یا جنت سے دور

کردیا یا وہ ان کو جنت سے لے گیا بہر حال یہ لفظ بتا رہا ہے کہ حضرت آدم وحوا کو جو کچھ ہوا وہ خطا ہوا نہ کہ جان بوجھ کر اگر چہ فاعل حقیقی رب تعالیٰ ہے لیکن چونکہ ان باتوں کا شیطان سبب بنا۔ اس لئے اس کی طرف نسبت کردی گئی اس

بھکانے کا واقعہ یہ ھوا: کہ شیطان کے دل میں آدم علیہ السلام کی طرف سے سخت حسد پیدا ہو چکا تھا۔ اس لئے وہ ان کی فکر میں رہتا تھا ایک دفعہ موقع پا کر یا تو جنت میں خود پہنچا یا اس لئے کہ اگر چہ وہ جنت سے نکالا جا چکا تھا مگر اب تک اس کا وہاں آنا جانا بند نہ ہوا تھا۔ اور یا اس طرح گیا کہ جنت میں مور اور سانپ نہایت خوبصورت جانور تھے اور یہ دونوں آدم علیہ السلام کی خدمت کیا کرتے تھے شیطان جنت کے دروازے کے باہر پہنچا ادھر مور بھی دروازۂ جنت پر آیا تھا شیطان اور مور نے آپس میں مشورہ کیا کہ کسی صورت سے آدم وحوا علیہما السلام کو دروازۂ جنت تک لے آنا چاہیے۔ ادھر شیطان نے سانپ سے مشورہ کیا کہ تو مجھ کو منہ میں لے کر جنت کی دیوار پر اس وقت پہنچا دینا۔ جب کہ آدم علیہ السلام دروازے پر آئے ہوئے ہوں یہ تجویز طے ہونے کے بعد مور نے حضرت آدم وحوا کے سامنے ناچنا شروع کیا یہ دونوں حضرات رقص کے دیکھنے میں مشغول ہوئے مور ناچتے ناچتے پیچھے ہٹنے لگا یہ دونوں صاحب اس کی طرف آگے بڑھنے لگے یہاں تک کہ مور ناچتا ہوا دروازہ جنت پر آ گیا جس کے ساتھ ہی ساتھ یہ دونوں صاحب بھی وہاں پہنچ گئے ادھر سانپ بھی تیار کھڑا تھا شیطان کو فوراً اپنے منہ میں لے کر جنت کی دیوار تک پہنچ گیا۔ اس ترکیب سے شیطان آدم علیہ السلام کے سامنے آ گیا اور اس کو کچھ ان سے گفتگو کرنے کا موقع مل گیا لہٰذا شیطان تو جنت سے باہر رہا آدم علیہ السلام اندر اور پھر ان کی گفتگو ہوگئی تفسیر کبیر نے اس قصے پر کچھ جرح فرمائی ہے۔ مگر تفسیر عزیزی نے بلا جرح اسے نقل فرمایا کچھ بھی ہوا بہر حال شیطان ان کے روبرو پہنچ گیا اور جا کر عرض کیا کہ مجھ سے آپ کے حضور میں بڑی بے ادبی ہوئی میں نے آپ کو سجدہ نہ کیا جس کے سبب میں ملعون ہو گیا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ اس گناہ کا کفارہ ادا کروں اور آپ کو ایسے مرتبے پر پہنچا دوں جس سے آپ مجھ سے راضی ہو جائیں اور آپ کو مجھ پر جو غصہ ہے۔ وہ جاتا رہے یہ کہہ کر بولا کہ آپ اپنی اس تعظیم وتکریم پر فریفتہ نہ ہو جائیں کیونکہ آپ کو آخر کار موت آنے والی ہے۔ جس سے کہ تمام عیش وآرام ختم ہو جائیں گے حضرت آدم نے پوچھا کہ موت کیا چیز ہے شیطان مردہ جانور کی طرح ان کے سامنے پڑ گیا اور جان کنی کے وقت جو حالت ہوتی ہے۔ ہاتھ پاؤں پٹکنا، روح کا نکلنا، تڑپنا وغیرہ ان کو دکھلایا یہ دونوں حضرات اس حالت کو دیکھ کر ڈر گئے اور اس سے پوچھنے لگے کہ کیا اس موت سے بچنے کی کوئی تدبیر ہے۔ اس نے کہا کہ ہاں قرآن کریم نے خود اس کا کلام نقل فرمایا کہ ﴿هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰى شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا یَبْلٰى﴾ (طٰہٰ: ۱۲۰) یعنی میں تم کو ایسے درخت کا پتا بتاتا ہوں کہ جو اسے کھالے ہرگز نہ مرے اور اس کی بادشاہت بھی فنا نہ ہو انہوں نے پوچھا وہ کون سا درخت ہے اس نے وہی درخت بتایا جس سے ان صاحبوں کو منع فرمایا گیا تھا فرمایا کہ یہ درخت تو سلطنت جانے کا سبب ہے ہم کو حق تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا اگر ہم یہ درخت کھالیں تو اس کے عتاب میں آ جائیں گے اگر یہ فائدے مند ہوتا تو ہم کو اس کے پاس سے کیوں منع فرمایا جاتا شیطان نے کہا ﴿مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّاۤ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَیْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِیْنَ﴾ (اعراف: ۲۰) یعنی رب تعالیٰ نے تم کو اس درخت سے اس لئے منع نہیں کیا ہے کہ اس سے تمہیں کچھ نقصان پہنچے

گا بلکہ اس لئے کہ تمہیں خلافت کے لئے پیدا کیا گیا اور خلافت وہی کر سکتا ہے جو حق تعالیٰ کے ذکر کے علاوہ دوسری فکروں میں بھی مشغول رہے اور حق تعالیٰ سے کچھ دور بھی رہے فرشتوں کی طرح صرف عابد اور رب سے بالکل قریب نہ ہو۔ اس درخت میں یہ تاثیر ہے کہ جو کوئی کھالیتا ہے وہ فرشتہ بن جاتا ہے پھر اس سے خلافت کا بوجھ نہیں اٹھ سکتا۔ دیکھو بادشاہ بھی اس شخص کو کہیں کا حاکم بنا کے بھیجتا ہے۔ جو بادشاہ کی دوری گوارہ کرے۔ نیز اس درخت کا کھانے والا کبھی بہشت سے نہیں نکل سکتا۔ اور یہاں موت نہیں چونکہ تمہیں خلیفہ کرنا منظور ہے اور خلیفہ وہی ہو سکتا ہے جس کو موت بھی آسکے تاکہ خلافت اس کی نسل میں جاری ہو غرضیکہ حق تعالیٰ کی یہ ممانعت نہی تنزیہی ہے نہ کہ تحریمی اور نہی تنزیہی کی پہچان ہی یہی ہے کہ جو انسان کے دنیوی فائدے کی خاطر کی جائے جیسے قرآن شریف میں ہے وَلَا تَسْـَٔمُوٓا۟ أَن تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا (البقرہ: ۲۸۲) قرض کم ہو یا زیادہ اس کے لکھنے میں کوتاہی نہ کرنا نیز تمہیں رب نے اس کے کھانے سے منع نہیں کیا بلکہ درخت کے پاس جانے سے روکا ہے۔ آپ پاس نہ جائیں۔ لائے میں دیتا ہوں کھا آپ لیں اور اگر رب نے کھانے سے ہی منع فرمایا ہو تو یہ ممانعت آپ کی شروع پیدائش کے وقت تھی۔ اس وقت اس کو ہضم کرنے کی آپ میں طاقت نہ تھی اب بفضلہ تعالیٰ آپ قوی ہو چکے ہیں اب اس کا کھانا پینا مضر نہیں غرضیکہ ہر پہلو پر گفتگو کر گیا یہ کہہ کر قسمیں کھا گیا کہ میں تمہارا بڑا ہی خیر خواہ ہوں وَقَاسَمَهُمَآ إِنِّى لَكُمَا لَمِنَ ٱلنَّٰصِحِينَ (اعراف: ۲۱) حضرت آدم علیہ السلام کو اس کی قسموں پر اعتبار آ گیا وہ یہ سمجھے کہ کسی میں یہ ہمت ہی نہیں کہ رب تعالیٰ کی جھوٹی قسم کھائے آدم علیہ السلام کو یہ خیال نہ رہا کہ رب سے پوچھ لیں۔ پوچھنا بھول گئے کیونکر نہ بھولتے دنیا میں آ کر رنگ لگانا تھا۔ دیکھو یعقوب علیہ السلام یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کے ساتھ بھیجتے وقت اللہ کو سونپنا بھول گئے چالیس یا اسی سال کی جدائی ہوئی۔ اس جدائی کی برکت سے آپ کو سلطنت ملی اور بنی اسرائیل مصر میں آباد ہوئے۔ ہمارے حضور بدر کے قیدیوں کے متعلق انتظار وحی فرمانا بھولے اس بھول کی برکت سے ان تمام قیدیوں کو بعد میں ایمان نصیب ہوا اگر اس وقت قتل ہو جاتے تو ایمان کیسے ملتا۔ غرضیکہ ہماری بھول شیطانی، نفسانی ہوتی ہے۔ پیغمبر کی بھول رحمانی جس کے شاندار نتیجے نکلتے ہیں خیال رہے کہ شیطان نے حضرت آدم و حوا کو ایک دم نہیں بہکایا بلکہ حضرت حوا کو پہلے اور بعد میں آدم علیہ السلام کو اسی طرح پہلے وہ درخت حضرت حوا نے کھایا پھر آدم علیہ السلام نے (تفسیر عزیزی)۔ عَنْهَا اس ضمیر کا مرجع یا جنت ہے یا درخت یعنی شیطان نے ان آدم و حوا کو جنت سے لغزش دے دی۔ یا اس درخت کے متعلق فَأَخْرَجَهُمَا اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ شیطان اپنی کوشش میں ناکام رہا۔ کیونکہ اس کا مقصود یہ نہ تھا کہ آدم علیہ السلام صرف جنت سے باہر ہو جائیں بلکہ وہ چاہتا تھا کہ وہ اپنے درجے سے گر جائیں۔ اس میں کامیاب نہ ہوا کیونکہ آدم علیہ السلام جنت سے باہر تو آ گئے مگر ان کا درجہ اور زیادہ ہو گیا۔ پھر قرآن کریم نے فرمایا فَتَابَ عَلَيْهِ۔ مِمَّا كَانَا فِيهِ اس میں بھی بہت پر لطف نکتہ ہے۔ وہ یہ کہ یہاں مِنَ الْجَنَّةِ نہ فرمایا گیا بلکہ اتنی بڑی عبارت ارشاد ہوئی تاکہ معلوم ہو جائے کہ آدم علیہ السلام جنت سے بالکل محروم نہ ہوئے بلکہ ان کا وہ عارضی قیام جاتا رہا اور وہاں بھیجا گیا جہاں کی خلافت کے لئے انہیں پیدا کیا گیا تھا۔ لہٰذا یہ شر ان کے لئے سب خیر بنی وَقُلْنَا اهْبِطُوا۔ اِهْبِطُوا صیغہ جمع ہے جس کے معنی ہیں تم سب نیچے اتر جاؤ۔ یا تو اس میں خطاب

آدم علیہ السلام کو اور ان کی اولاد کو ہے جو اس وقت ان کی پیٹھ میں تھے یعنی اے سارے انسانو تم سب نیچے اتر جاؤ۔ یا پانچ چیزوں سے حضرت آدم، حضرت حوا اور شیطان اور مور اور سانپ خیال رہے کہ ان سب کو اترنے کا یکساں حکم دیا گیا ہے لیکن ان کی نوعیتوں میں بڑا فرق ہے آدم علیہ السلام اتر کر اپنے دارالسلطنت یعنی زمین پر تشریف لائے۔ یا اپنے جسمانی وطن میں آئے کیونکہ ان کا جسم پاک زمین سے ہی بنا تھا۔ شیطان وغیرہ فساد برپا کرنے کے لئے پردیس میں آیا یوں سمجھو کہ مسلمان کمانے کے لئے زمین میں بھیجے گئے اور کفار اپنی کمائی فنا کرنے کے لئے یہ بھی خیال رہے کہ شیطان کا یہ نکلنا دوبارہ ہے کہ جس کے بعد جنت میں داخلہ ہی بند ہو گیا۔ بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ۔ اس میں یا انسانوں سے خطاب ہے کہ بعض انسان بعض کے دشمن ہیں۔ کافر مومنوں کے بدبخت نیک بختوں کے، جاہل عالموں کے فاسق، فاجر لوگ دین داروں کے ہمیشہ دشمن رہیں گے اور یا ان پانچوں سے خطاب ہے جو جنت سے باہر آئے یعنی شیطان انسان کا دشمن اور انسان شیطان کا، اسی طرح سانپ انسان کا اور مور کا دشمن، انسان اور مور سانپ کا بَعْضُكُمْ اس لئے فرمایا کہ ان میں سے سب ایک دوسرے کے دشمن نہ ہوں گے چنانچہ مرد اور عورت آپس میں دشمن نہیں۔ اسی طرح مور اور سانپ اور شیطان آپس میں دشمن نہیں نیز بعضے انسان اپنی بیوقوفی سے سانپ یا شیطان سے محبت کر لیتے ہیں۔ نیز مومنین آپس میں دوست ہیں اور کفار آپس میں۔ لہٰذا نہ تو تمام افراد ایک دوسرے کے دشمن نہ تمام نوعیں۔ وَلَكُمْ فِي الْأَرْضِ مُسْتَقَرٌّ اس سے معلوم ہوا کہ سب کا ٹھہرنا زمین ہی میں ہے بعض زمین کے اوپر جیسے زندہ انسان اور بعض زمین کے اندر جیسے جنات اور سانپ اور اگر کچھ دیر کے لئے انسان یا مور، درخت، یا ہوا میں بھی رہے، تب بھی وہ زمین پر ہی ہے کیونکہ یہ چیزیں زمین پر ہیں۔ غور کیا جائے تو سب چیزیں زمین پر چند طریقے سے رہتی ہیں۔ کبھی باپ کی پیٹھ میں، کبھی ماں کے رحم میں، زندگی میں زمین کے اوپر اور بعد موت زمین کے اندر وَّ مَتَاعٌ إِلَىٰ حِينٍ اس میں یہ بتایا گیا کہ ہمارے سارے زندگی کے سامان غذا لباس وغیرہ زمین ہی سے پیدا ہوں گے اور تم ان سے نفع حاصل کرو مگر ہمیشہ نہیں بلکہ خاص وقت تک، یا موت تک، یا قیامت تک۔ اس سے معلوم ہوا کہ زمین میں ہمیشہ کوئی نہ رہے گا۔ سب یہاں سے منتقل کر کے مختلف مقامات میں بھیج دیئے جائیں گے اس میں آدم علیہ السلام کو خوشخبری دی گئی کہ جس طرح آپ کا جنت میں یہ قیام عارضی تھا۔ اسی طرح زمین میں رہنا بھی عارضی ہوگا۔ پھر آپ کو یہاں ہی بلایا جائے گا۔ آپ مستقل یہاں رہیں گے۔

خلاصہ تفسیر

اس سے پہلے آدم علیہ السلام کے جنت میں جانے اور شیطان کے وہاں سے نکل جانے کا واقعہ بیان کیا جا چکا اب فرمایا کہ اس جانی دشمن یعنی شیطان نے کسی صورت سے حضرت آدم و حوا کے پاس جا کر ان کو سبز باغ دکھائے اور بہت دلیلوں سے سمجھایا کہ یہ درخت تمہارے لئے فائدہ مند ہے اور قسمیں کھا کر انہیں اطمینان دلایا کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آدم علیہ السلام اس کے دھوکے میں آ گئے۔ ممانعات الٰہی کے اصل مقصد کو بھول گئے اس درخت کو کھا لیا۔ آخر شیطان نے ان کو علیحدہ ہی کر دیا۔ ہم نے بھی انہیں حکم دیا کہ اب تم سب کے سب زمین پر اتر جاؤ۔ اور وہاں آپس کی عداوت کی تکلیف

اٹھاؤ اور موت تک وہیں رہو اور وہاں ہی کما کر کھاؤ۔

آدم علیہ السلام کا جنت سے باہر تشریف لانا

آدم علیہ السلام کے جنت سے تشریف لانے کا واقعہ جو قرآن کریم اور احادیث شریفہ اور محدثین و مورخین سے ثابت ہے وہ یہ ہے کہ حضرت حوا نے پہلے خود وہ دانہ کھایا پھر آدم علیہ السلام کو کھلا دیا اس کھانے کا یہ اثر ہوا کہ ان کے جسموں سے جنتی لباس جاتا رہا اور وہ حضرات برہنہ رہ گئے۔ مارے شرم کے انجیر کے درخت کے پتوں سے اپنے جسموں کو چھپانے لگے اسی حالت میں رب کی طرف سے نداء آئی کہ آدم وحوا کیا ہم نے تم کو اس درخت سے منع نہ کیا تھا اور کیا تم سے نہ کہا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے اس کے فریب میں نہ آنا یہ حضرات عذر کے سوا اور کیا عرض کر سکتے تھے پھر فرشتوں کو حکم ہوا کہ ان سب کو زمین پر اتار دو چنانچہ آدم علیہ السلام کو ہندوستان میں شہر سراندیپ کے اس پہاڑ پر اتارا گیا جس کو نود کہتے ہیں اور حضرت حوا کو ساحل عرب پر جدے میں اور مور کو مرج الہند میں اور شیطان کو جنگل میسان میں جو کہ بصرے سے کچھ فاصلے پر ہے یا جہاں آج یاجوج ماجوج کی دیوار قائم ہے، سانپ کو بجستان یا اصفہان میں اسی لئے وہاں اب بھی سانپ زیادہ ہوتے ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کو کھیتی باڑی کرنے اور معاش حاصل کرنے کی تکلیف دی گئی۔ حضرت حوا کو حیض وحمل اور کمی عقل اور نقصان میراث ملی۔ سانپ کے پاؤں غائب کر دیئے گئے اور اس کو پیٹ کے بل چلایا گیا اس کی غذا مٹی قرار دی گئی۔ مور کے پاؤں بدشکل کر دیئے گئے۔ ابلیس کی صورت مسخ کر دی گئی اور نہایت رسوا کر کے دنیا میں رکھا گیا سیدنا مولیٰ علی فرماتے ہیں کہ ہندوستان کی زمین اس لئے ہری بھری ہے اور عود اور قرنفل وغیرہ خوشبوئیں اس لئے وہاں پر پیدا ہوتی ہیں کہ آدم علیہ السلام جب اس زمین پر آئے تو ان کے جسم میں جنتی درخت کے پتے تھے اور پتے ہوا سے اڑ کر جس درخت پر پہنچے وہ ہمیشہ کے لئے خوشبودار ہو گیا آدم علیہ السلام جنت سے مختلف قسم کے بیج اور تین قسم کے پھل اور حجر اسود، سیاہ پتھر جو اب خانہ کعبہ میں لگا ہوا ہے اور وہ عصا جو بعد میں موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ آیا جس کی لمبائی دس گز تھی اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔ اور کچھ سونا چاندی، اور کچھ کھیتی باڑی وغیرہ کے اوزار بھی ساتھ لائے، آدم علیہ السلام اس قدر گریہ وزاری میں مشغول ہوئے کہ ان تخموں سے بے خبر ہو گئے۔ شیطان نے موقع پا کر ان کو اپنا ہاتھ لگایا۔ جس جس تخم پر اس کا ہاتھ لگا وہ زہریلا ہو گیا۔ اور جو اس کے ہاتھ سے محفوظ رہا اس کا نفع برقرار رہا۔ سیدنا آدم علیہ السلام کے ساتھ تین قسم کے جنتی میوے آئے۔ ایک وہ جو پورے کھالئے جاتے ہیں دوسرے وہ جن کا اوپری حصہ کھالیا جاتا ہے اور گٹھلی پھینک دی جاتی ہے جیسے خرما وغیرہ، تیسرے وہ جن کا اوپری چھلکا پھینک دیا جاتا ہے اور اندرونی حصہ کھالیا جاتا ہے صحیح روایت میں ہے کہ ان کے ساتھ لوہے کے اوزار بھی تھے۔ ایک سنڈاسی جس سے لوہا پکڑتے ہیں، دوسرے ہتھوڑا، تیسرے ارین نیز حجر اسود جب جنت سے آیا تو اس کی روشنی کئی میل تک جاتی تھی۔ جہاں اس کی شعائیں پہنچتی تھیں اسی حد تک حرم کی حدیں قائم ہوئیں۔ نیز آدم علیہ السلام کو دنیا میں آکر بہت وحشت اور گھبراہٹ ہوئی۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام بحکم الٰہی زمین پر آئے اور بلند آواز سے اذان کہی جب آدم علیہ

السلام نے اذان میں حضور علیہ السلام کا نام سنا تب ان کی وہ وحشت دور ہوئی یہ تمام واقعات صحیح احادیث سے ثابت ہیں جن کو شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی نے تفسیر عزیزی میں اسی مقام پر جمع فرمایا۔

ذریعہ معاش

اسی تفسیر عزیزی میں ہے کہ سب سے اول کپڑا بننے کا کام آدم علیہ السلام نے کیا اور بعد میں کھیتی باڑی کے کام میں مشغول رہے۔ نوح علیہ السلام کا ذریعہ معاش لکڑی کا تھا۔ (بڑھئی پیشہ)، ادریس علیہ السلام درزی گری۔ حضرت ہود اور صالح تجارت حضرت ابراہیم علیہ السلام کھیتی باڑی کرتے تھے موسیٰ علیہ السلام نے کچھ مدت بکریاں چرائیں، داؤد علیہ السلام زرہ بناتے تھے۔ سلیمان علیہ السلام اتنے بڑے بادشاہ ہو کر درختوں کے پتوں سے پنکھے اور زنبیلیں وغیرہ بنا کر گزر کرتے تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے کوئی پیشہ اختیار نہ فرمایا بلکہ ہمیشہ سیر فرماتے تھے اور فرماتے تھے کہ جس نے مجھے ناشتہ دیا ہے وہی شام کا کھانا بھی دے گا۔ اسی تفسیر عزیزی میں ہے کہ آدم علیہ السلام نے ہمیشہ بارش کا پانی پیا کنوئیں کا پانی کبھی نہ پیا سب سے پہلے آدم علیہ السلام نے ہی چاندی سے روپیہ اور سونے سے اشرفیاں بنائیں۔

آدم علیہ السلام کی وفات

جب آدم علیہ السلام کا وقت آخر آیا، آپ کو جنتی میوے کھانے کی خواہش ہوئی اپنے فرزندوں سے کہا کہ کعبہ معظمہ میں جاؤ اور وہاں دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ میری یہ تمنا پوری کرے۔ فرزندان آدم حکم پا کر وہاں پہنچے انہیں حضرت جبریئل و دیگر فرشتے ملے جن سے انہوں نے آدم علیہ السلام کی فرمائش کا حال بیان کیا۔ فرشتوں نے کہا ہمارے ساتھ آؤ ہم جنت کے میوے اپنے ساتھ لائے ہیں۔ چنانچہ یہ سب آدم علیہ السلام کے پاس پہنچے حضرت حوا ان فرشتوں کو دیکھ کر ڈرنے لگیں اور چاہا کہ آدم علیہ السلام کے دامن میں چھپ جائیں انہوں نے فرمایا کہ حوا اب تم مجھ سے الگ رہو، میرے اور رب کے قاصدوں کے درمیان آڑ نہ بنو فرشتوں نے آدم علیہ السلام کی روح قبض کی اور ان کے بیٹوں سے کہا کہ جس طرح ہم آپ کے والد کا کفن دفن کریں ویسے ہی تم بھی کیا کرنا جبریئل علیہ السلام جنت کی مرکب خوشبو اور جنتی حلے کا کفن اور بہشتی بیری کے کچھ پتے اپنے ساتھ لائے تھے۔ ان کو خود غسل دیا اور کفن پہنایا اور خوشبو ملی اور ملائکہ ان کا لاشہ مبارک کعبہ میں لائے اور ان پر سارے فرشتوں نے نماز جنازہ ادا کی جس میں حضرت جبرائیل امام تھے اور باقی فرشتے مقتدی اور اس نماز میں چار تکبیریں کہیں۔ جیسے کہ آج ہوتی ہیں پھر مکہ معظمہ سے تین میل فاصلہ پر مقام منیٰ میں لے گئے جہاں کہ حاجی قربانی کرتے ہیں اور اسی جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے سیدنا اسمٰعیل کی قربانی کی وہاں مسجد خیف کے قریب بغلی قبر کھودی گئی اور ان کو دفن کر کے ان کی قبر کو اونٹ کی پیٹھ کی طرح ڈھلوان بنایا بعض روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ ان کے لاشہ مبارک کو ان کی اولاد میں سے ڈیڑھ سو آدمی خانہ کعبہ میں لائے لہٰذا آدم علیہ السلام کی قبر منیٰ میں مسجد خیف کے پاس ہے اور حضرت حوا کی قبر جدے شریف میں اسی طرح تفسیر عزیزی میں حضرت مجاہد سے روایت ہے ان کے کچھ اور واقعات انشاءاللہ اگلی آیت میں بھی آئیں گے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **ایک** یہ کہ کوئی شخص اپنے سے شیطان کو دور نہ جانے اور نہ اپنے تقویٰ اور پرہیز گاری کا بھروسہ کرے دیکھو اس نے ایک پیغمبر کو جنت میں پہنچ کر فریب دیا حالانکہ جگہ محفوظ تھی اور آدم علیہ السلام معصوم ہر طرح حفاظت تھی ہم معصوم بھی نہیں دنیا جگہ محفوظ بھی نہیں پھر شیطان سے امن میں کیسے رہ سکتے ہیں اس سے ہمیشہ کھٹکتے رہنا چاہے۔ **دوسرے** یہ کہ بڑے بڑوں کو عورتوں کے ذریعہ پھانستا ہے۔ روایت میں ہے کہ عورتیں شیطان کی رسیاں ہیں۔ دیکھو سیدنا آدم کو حضرت حوا کے ذریعہ درخت کھلایا۔ **تیسرے** یہ کہ خطا کی وجہ سے اللہ کی نعمتیں چھین لی جاتی ہیں۔ سیدنا آدم کی ایک خطا سے جنت کی ساری نعمتیں دور ہوگئیں۔ **چوتھے** یہ کہ اگرچہ ساری چیزیں رب ہی کی طرف سے ہیں لیکن ادب یہ ہے کہ برائیوں کو اپنی یا شیطان کی طرف نسبت کرے اور بھلائیوں کو رب کی طرف دیکھو آدم علیہ السلام کے جنت سے علیحدہ ہونے کو شیطان کی طرف نسبت دی گئی اور خود آدم علیہ السلام نے اپنی خطا کو اپنی طرف نسبت دی کہ عرض کیا رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا ہاں شیطان نے کہا اَغْوَيْتَنِيْ یعنی خدایا تو نے مجھے گمراہ کر دیا۔ اس لئے وہ تو مردود ہوا۔ اور آدم علیہ السلام محبوب رہے۔ **پانچویں** یہ کہ دشمن سے غافل نہیں رہنا چاہئے وہ ہمیشہ تاک میں رہتا ہے۔ جیسے شیطان آدم علیہ السلام کے پیچھے پڑا رہا۔ **چھٹے** یہ کہ ہر ایک کی عمدہ باتیں سن کر دھوکہ نہ کھانا چاہئے۔ کیونکہ بہت دفعہ زبان دل کے خلاف ہوتی ہے شیطان نے کتنی اچھی باتیں کیں۔ مگر دل میں حسد تھا۔ **ساتویں** یہ کہ سب سے پہلے تقیہ شیطان نے کہا۔ تقیہ شیطانی کام ہے کہ دل میں عداوت چھپا کر زبانی دوست بن کر حضرت آدم کے پاس پہنچا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: حضرت آدم نے ہم کو جنت سے نکالا، خطا انہوں نے کی اور اسے بھگت ہم رہے ہیں (عام بے دین) حافظ شیرازی کہتے ہیں ۔

من ملک بودم و فردوس بریں جائم بود   آدم آورد دریں دیر خراب آبادم

جواب: یہ بالکل غلط ہے بلکہ تم جیسے بے دینوں نے آدم علیہ السلام کو جنت سے باہر نکالا کیونکہ تم ان کی پشت میں تھے اور جنت بے دینوں کی جگہ نہیں ہے۔ اس لئے مرضی الٰہی یہ ہوئی کہ آدم ان بے دینوں کو زمین پر پھینک آئیں پھر ہمیشہ کے لئے جنت میں تشریف لائیں انسان کو پلیدی پاخانہ میں لے جاتی ہے نہ کہ پلیدی کو انسان یعنی جب حاجت ہوتی ہے تب اس کے نکالنے کے لئے پاخانہ جانا پڑتا ہے۔ حافظ شیرازی کا مطلب غلط سمجھا وہ یہ فرما رہے ہیں کہ میں اس سے پہلے عالم ارواح میں نہایت بے فکری میں تھا، میرے ماں و باپ مجھ کو دنیا میں لے آئے آدم سے مراد انسان ہے جس کا مطلب یہ ہوا۔ شعر ۔

میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں   نہ اس کا بھید سمجھایا گیا ہوں

یا یہ کہ حافظ صاحب یہ مضمون آدم علیہ السلام کی طرف سے فرما رہے ہیں یعنی آدم علیہ السلام کہتے ہیں کہ میں بہشت بریں میں رہتا تھا لیکن میری بعض اولاد مجھ کو اتار لائی۔ آدم بمعنی انسان کیونکہ ظاہر ہے کہ جنت میں آدم علیہ السلام رہتے تھے نہ کہ حافظ

صاحب۔ **دوسرا اعتراض:** پہلی آیت سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو ساری چیزوں کے نام ان کے خواص اور سارے حالات کی تعلیم فرمادی تھی۔ تعجب یہ ہے کہ شیطان نے اس درخت کے متعلق غلط خبر دے دی اور آدم علیہ السلام نے قبول کر لی آدم علیہ السلام کو خبر ہونی چاہئے تھی کہ اس درخت کے وہ خواص نہیں جو شیطان بیان کر رہا ہے۔ پھر تعجب ہے کہ شیطان کو اپنا دوست کیسے سمجھ گئے انہیں اوروں کے کفر وایمان کا بھی پتہ ہونا چاہئے تھا کیونکہ وہ سب کے سارے حالات سے واقف تھے۔ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ شعر ہے۔

ہونے والا ہوتا ہے جب کوئی کار غیب سے ہوتے ہیں اسباب آشکار

یہ سب باتیں آدم علیہ السلام کے علم میں تھیں مگر ہونے والی ہو کے رہتی ہے جب یہ موقع آیا سب کچھ بھول گئے جیسے قرآن کریم فرما رہا فَنَسِیَ آدم علیہ السلام بھول گئے۔ جاننا اور چیز ہے اور علم حضور دوسری چیز انہیں اس وقت علم تھا۔ حضور نہ رہا جیسے کہ دنیا میں سب جانتے ہیں کہ حضور علیہ السلام شفیع المذنبین ہیں مگر قیامت کے دن عیسیٰ علیہ السلام کے سوا کسی ولی نبی قطب غوث کو یہ خیال نہ رہے گا اور ادھر ادھر کسی شفاعت کرنے والے کو ڈھونڈتے پھریں گے اور سوا عیسیٰ علیہ السلام کے کوئی پیغمبر شفیع المذنبین کا صحیح پتہ نہ دیں گے۔ **دوسرا جواب:** یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کو جس طرح اور سب باتیں معلوم تھیں ایسے ہی اپنا یہ سارا واقعہ بھی معلوم تھا کہ ایسا ہو کر رہے گا اس لئے شیطان سے بہت جرح نہ کی حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ جب کربلا کی طرف روانہ ہوئے تو لوگوں نے ڈر کر روکنا چاہا تو فرمایا کہ میں خود نہیں جا رہا ہوں مجھے کوئی لئے جا رہا ہے۔ صاحب اسرار حضرات مرضی الٰہی پا کر دانستہ بنا دیتے ہیں۔ اس کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں۔ **تیسرا اعتراض:** آدم علیہ السلام سے یہ گناہ سرزد ہوا پھر انہیں معصوم کیونکر کہا جا سکتا ہے حق تعالیٰ نے بھی فرمایا ہے۔ عَصٰۤى اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰى (طٰہٰ:۱۲۱) عنی آدم علیہ السلام نے اپنے رب کی نافرمانی کی خود انہوں نے بھی عرض کیا کہ رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا (اعراف:۲۳) جس سے معلوم ہوا کہ انبیاء کو معصوم ماننا غلط ہے۔ **جواب:** اس کا تفصیلی جواب ہماری کتاب "قہر کبریا" میں دیکھو یہاں اتنا عرض کئے دیتے ہیں کہ اہلسنت وجماعت کے نزدیک انبیاء کرام کفر وشرک اور عمداً گناہ کبیرہ اور ایسے ہی گناہ صغیرہ سے ہمیشہ معصوم رہتے ہیں جو نبوت کی شان کے خلاف ہیں۔ ہاں خطایا بھول کر ایسا صغیرہ گناہ سرزد ہو سکتا ہے جس سے کہ شان نبوت میں فرق نہ آئے حضرت آدم علیہ السلام سے جو کچھ ہوا یا خطائے اجتہادی کی وجہ سے تھا مگر چونکہ نیکوں کی بھلائیاں بھی مقربین کے درجے کے لحاظ سے برائیاں ہوتی ہیں اس لئے ان خطاؤں کو بھی وہ حضرات گناہ فرما دیتے ہیں اور ہم جیسے گنہگاروں سے ان جیسی خطاؤں کی پرسش نہیں ہوتی لیکن ان کے بلند درجے کے لحاظ سے ان لغزشوں پر بھی عتاب آ جاتا ہے یہاں بھی ایسا ہی ہوا عصمت انبیاء کی بے شمار دلیلیں ہیں جن سے صرف چند دلیلیں یہاں عرض کرتا ہوں۔ **پہلی دلیل:** گنہگار فاسق ہوتا ہے اور فاسق کی مخالفت کرنا ضروری اور نبی کی اطاعت کرنا فرض اگر نبی گنہگار یا فاسق ہوں تو ان کی اطاعت بھی ضروری ہو جائے اور مخالفت بھی یہ اجتماع ضدین ہے۔ **دوسری دلیل:** فاسق کی بات بلا تحقیق نہ ماننی چاہئے قرآنی حکم ہے اور پیغمبر کی بات بلا تحقیق ہی ماننا ضروری ہے اگر نبی بھی فاسق ہوں تو ان کی بات کا

ماننا اور نہ ماننا دونوں ضروری ہوں گے۔ اور یہ ایک اجتماع نقیضین ہے۔ **تیسری دلیل:** گنہگار سے شیطان راضی ہوتا ہے۔ اس لئے وہ حزب الشیطان میں داخل ہے اور نیک کار سے رحمان راضی اور حزب اللہ میں داخل اگر پیغمبر ایک آن کے لئے بھی گنہگار ہوں تو معاذ اللہ وہ حزب الشیطان (شیطانی گروہ) میں داخل ہوں گے۔ نیز پیغمبر کے گناہ کرتے وقت اگر کوئی امتی نیکی کر رہا ہو تو اس وقت اور اس آن میں وہ امتی نبی سے افضل ہوگا۔ اور یہ بات بالکل باطل ہے۔ **چوتھی دلیل:** رسول فرشتوں سے افضل ہیں، قرآن فرمارہا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰۤى اٰدَمَ وَ نُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰهِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ (آل عمران: ۳۳) جس سے معلوم ہوا کہ سارے پیغمبر تمام جہان سے افضل اور جہان میں فرشتے بھی داخل ہیں۔ لہٰذا نبی فرشتوں سے افضل اور فرشتے یقیناً گناہوں سے معصوم ان کی شان میں رب فرمارہا ہے۔ لَا یَعْصُوْنَ اللّٰهَ (التحریم: ۶) یعنی فرشتے کبھی گناہ نہیں کرتے۔ اب اگر نبی گناہ کریں تو درجے میں فرشتوں سے کم ہو جائیں گے کیونکہ قرآن فرمارہا ہے۔ اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِیْنَ كَالْفُجَّارِ (ص: ۲۸) جس سے معلوم ہوا کہ متقی گنہگار کے برابر نہیں ملائکہ تو متقی ہیں۔ اگر نبی ایک آن کے لئے فاسق بن جائیں تو ملائکہ کے برابر نہ رہیں گے۔ **پانچویں دلیل:** قرآن کریم سے ثابت ہے کہ رب نے شیطان سے فرمایا تھا کہ میرے خاص بندوں پر تیرا داؤ نہ چلے گا۔ شیطان نے بھی کہا تھا کہ خداوند میں تیرے سارے بندوں کو گمراہ کردوں گا۔ سوائے تیرے خاص بندوں کے۔ صالح علیہ السلام نے بھی فرمایا کہ اے لوگو! جس بات سے میں تم کو روکوں اس کو خود کرنے کا کبھی خیال بھی نہ کرنا فرماتے ہیں وَ مَاۤ اُرِیْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَاۤ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ (ہود: ۸۸) جب رب کہے کہ میرے نبیوں پر شیطان غالب نہیں آسکتا۔ انبیاء بھی فرمائیں کہ ہم گناہ کا ارادہ بھی نہیں فرماتے، شیطان بھی کہے کہ پیغمبروں پر میرا داؤ نہیں چلتا۔ اب جو شخص ان کو گنہگار مانے وہ شیطان سے بھی بدتر ہے۔ لہٰذا جو حدیثیں ایسی ملیں جن سے پیغمبروں کے گناہ ثابت ہوں وہ قابل قبول نہیں۔ اور جن آیات سے ان کے گناہ کرنے کا دھوکہ پڑتا ہے ان کی توجیہ یا تاویل ضروری ہے تاکہ قرآنی آیتوں میں تعارض نہ ہو مجھ سے ایک شخص نے یہی اعتراض کیا تھا اور کہنے لگا کہ نبیوں کا کفر و شرک اور گنہگار ہونا قرآن سے ثابت ہے، میں نے اس کو یہی جواب دیا وہ نہ مانا، میں نے کہا کہ پھر تم رب کو بھی گنہگار مانو۔ کیونکہ قرآن کریم میں آتا ہے۔ وَ مَكَرَ اللّٰهُ نیز فرمایا گیا۔ وَ هُوَ خَادِعُهُمْ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ دھوکہ اور مکر فرماتا ہے اور یہ باتیں گناہ ہیں۔ تب وہ کہنے لگا کہ ان آیتوں کا یہ مطلب نہیں، بلکہ یہ ہے۔ ہم نے کہا کہ جیسے یہاں اور مطلب نکالتے ہو ایسے ہی وہاں انبیاء کے لئے بھی اور مطلب نکالو تب وہ لاجواب ہوا۔

تفسیر صوفیانہ

فرشتے محض عابد تھے اور انسان عبادت مع محبت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ محبت کے لئے امتحان ضروری ہے۔ جنت محبت سے پاک ہے، اس لئے ضروری تھا کہ آدم علیہ السلام امتحان محبت کے لئے زمین کی امتحان گاہ (یونیورسٹی) میں آئیں۔ نیز یہ زمین حضور ﷺ کی جائے پیدائش تھی اور جنت وغیرہ ان کے معراج کا مقام اس لئے ضروری تھا کہ آدم علیہ السلام وہ جگہ خالی کر کے زمین میں تشریف لائیں۔ لہٰذا ان کی تشریف آوری کی یہ صورت ہوئی کہ دست قدرت نے اچھی تدبیر سے شیطان

کی آڑ میں آدم علیہ السلام کو وہاں سے اتارا جیسے کہ یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں کی آڑ میں کنعان سے مصر پہنچایا تاکہ وہاں عنا کے بعد غنا عطاء فرمائی جائے۔آدم علیہ السلام کو بھی سلامت سے ملامت کی طرف فرح سے طرح کی طرف نعمت سے قسمت کی طرف محبت سے محنت کی طرف قربت سے غربت کی طرف الفت سے کلفت کی طرف وصلت سے فرقت کی طرف منتقل کیا گیا۔ان کو جنت میں ہر چیز سے انس تھا۔محبوب یہ کب چاہتا ہے کہ میرا حبیب کسی اور کو بھی چاہے محبت میں شرکت اسرار والوں کے مذہب میں شرک ہے۔لہٰذا ان سب سے علیحدہ کر کے اور سب کو حضرت آدم کا دشمن بنا کر پیاروں سے چھڑا کر چلہ کشی کے لئے گوشہ زمین میں بھیجا گیا اور فرمایا گیا کہ اپنے اس چلے کو پورا کر کے پھر ہمارے پاس تشریف لاؤ۔آدم علیہ السلام کا زمین میں آنا ایسا تھا جیسا کہ دانے کا زمین میں جانا کہ دانہ مالک کے گھر سے نکل کر غربت کے جنگل میں جاتا ہے وہاں بارش دھوپ کی سختیاں برداشت کر کے ہرا بھرا کھیت بنتا ہے۔پھر پھل بن کر اور بھوسہ پتے دور کر کے مالک کے گھر لوٹ آتا ہے۔آدم علیہ السلام کو زمین کی کھیتی میں بھیجا گیا۔اطاعت کے پانی سے سیراب کیا گیا۔جس سے کہ عبادت کی شاخیں نکلیں اور اسی میں شریعت، حقیقت، طریقت، معرفت کے پھل لگے کفار جو بھوسہ کے مثل تھے۔علیحدہ چھانٹ دیئے گئے اور وہ دانے اپنے ساتھ بہت سے دانوں کو لے کر جہاں سے آیا تھا وہیں گیا۔

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ
پس پالیے آدم نے سے رب اپنے کچھ کلمے پس توبہ قبول کی اوپر ان کے
پھر سیکھ لیے آدم نے اپنے رب سے کچھ کلمے تو اللہ نے اس کی توبہ قبول کی بے شک وہی
هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۳۷﴾
تحقیق وہ ہے توبہ قبول کرنے والا مہربان
بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے

تعلق

اس آیت کا گزری ہوئی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔**ایک** یہ کہ اس میں بھی خدا کی اس ایک نعمت کا ذکر ہے جو آدم علیہ السلام کے ذریعہ سب انسانوں پر کی گئی یعنی توبہ کی قبولیت خیال رہے کہ عیسائیوں و آریوں وغیرہ کفار کے ہاں توبہ کا مسئلہ نہیں۔عیسائی تو کہتے ہیں کہ ہم کو کوئی گناہ مضر نہیں ہمارا کفارہ مسیح کو سولی ہو چکی۔آریہ وغیرہ کہتے ہیں کہ کسی گناہ کی معافی نہیں سزا ضرور بھگتنی پڑے گی۔ان دونوں مسئلوں میں انسان گناہ پر دلیر ہوتا ہے۔معافی کا یقین اور معافی سے مایوسی جرم کراتی ہے۔خوف و امید گناہ سے روکتی ہے یہ توبہ میں ہے اگر قبول ہو جائے تو چھٹکارا ہے قبول نہ ہو تو جوتا خواری ہے۔غرضیکہ مسئلہ توبہ تقویٰ کی اصل ہے۔**دوسرے** یہ کہ اس سے پہلی آیت میں خطا کا ذکر تھا۔اور اب عطا کا یا پہلے عتاب کا ذکر ہوا تھا۔اور اب اس کی انتہا کا۔

تفسیر

فَتَلَقّٰۤى اٰدَمُ عربی زبان میں ''ف'' فوراً کے معنی میں آتی ہے جس سے بلا تاخیر بعد میں ہونا سمجھا جاتا ہے۔ یعنی پہلے آدم علیہ السلام سے وہ خطا ہوئی اور پھر فوراً ان کو کچھ کلمات کی عطا ہوئی ظاہر تو یہی ہے کہ آدم علیہ السلام کے زمین پر تشریف لانے اور بہت عرصے تک معافی کے لئے برقرار رہنے اور بہت گریہ وزاری کرنے کے بعد یہ توبہ کی قبولیت کا واقعہ ہوا۔ روایتوں سے بھی یہی ثابت ہے چنانچہ روایت میں آتا ہے کہ آدم علیہ السلام نے زمین پر آ کر تین سو برس تک شرم کی وجہ سے آسمان کی طرف سر نہ اٹھایا۔ اور اس قدر روئے کہ آپ کے آنسو تمام زمین والوں کے آنسوؤں سے زیادہ ہیں تب کچھ دعائیہ کلمے انہیں یاد آئے اس صورت میں یا تو یہ ''ف'' ثم کے معنی میں ہے تو معنی آیت کے یہ ہوں گے کہ پھر بہت عرصہ بعد توبہ قبول ہونے کا واقعہ ہوا۔ اور یا اس آیت سے پہلے ایک پورا مضمون محذوف ماننا پڑے گا۔ یعنی آدم علیہ السلام کو نیچے آنے کا حکم ملا۔ پس وہ نیچے آئے اور کئی سو سال تک پریشان رہے جب یہ سب گریہ زاری کر چکے تب فوراً ان کی توبہ قبول ہوئی بعض نے فرمایا کہ فوراً رب تعالیٰ کے نزدیک تھا نہ کہ دنیا کے لحاظ سے یہاں تین سو سال گزر چکے تھے۔ مگر رب کے نزدیک ایک آن تھی۔ یہاں کے ہزار سال وہاں کا ایک دن ہے بلکہ دنیا میں بھی ہر ایک کا فوراً مختلف ہوتا ہے۔ آرام سے سونے والا رات کو آن محسوس کرتا ہے۔ بے چینی میں گزارنے والا اسی رات کو ایک سال سمجھتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ قبول توبہ کا واقعہ جنت ہی میں ہو چکا تھا اور آدم علیہ السلام قبول توبہ کے بعد زمین پر تشریف لائے۔ (تفسیر روح البیان)۔ اور دنیا میں آ کر ان کا گریہ وزاری فرمانا جنت اور حضرت حوا کے فراق میں ہوا مگر یہ قول ضعیف ہے جب توبہ قبول ہو چکنے کے بعد زمین پر تشریف لائے تو پھر بیوی سے علیحدگی کیسی اور پریشانیاں کہاں۔ یعنی رب تعالیٰ معافی دے کر کسی کو بلا وجہ پریشانی میں نہیں ڈالتا۔ صوفیائے کرام اس رونے کے کچھ اور اسرار بیان کرتے ہیں جس کو ہم تفسیر صوفیانہ میں بیان کریں گے۔ تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ جب انہیں جنت سے نیچے آنے کا حکم ہوا تب ان کی توبہ قبول ہونے کا واقعہ بھی ہو گیا۔ پھر اس کے بعد زمین پر تشریف لائے اس صورت میں ''ف'' اپنے معنی میں رہی اور آئندہ جو دوسرا اِهْبِطُوْا آ رہا ہے اس نے علیحدہ معنی دیئے اور اس صورت میں آدم علیہ السلام کا زمین پر آنا خطا کی بناء پر نہ رہا بلکہ عطائے خلافت کے لئے فَتَلَقّٰۤى۔ تلقی سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں ملنا۔ کسی چیز کا پانا، حاصل کرنا۔ یہاں تینوں معنی بن سکتے ہیں اٰدَمَ۔ دعائیہ کلمے حضرت آدم اور حضرت حوا دونوں کو عطا ہوئے تھے لیکن صرف آدم علیہ السلام کا ذکر ہوا۔ کیونکہ عورتیں مردوں کی تابع ہوتی ہیں۔ اسی لئے قرآن کریم کے اکثر احکام مردوں کے خطاب سے ہیں۔ عورتیں اس میں تبعاً داخل ہیں۔ مِنْ رَّبِّهٖ۔ اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ باتیں رب کی طرف سے سکھائی گئی تھیں۔ یا تو بطور الہام یا بطریق وحی۔ اگر الہام تھا تو حضرت آدم و حوا دونوں کو ہوا اور اگر بطریق وحی تھا۔ تو آدم علیہ السلام پر وحی آئی اور انہوں نے وہ وحی حضرت حوا کو سنائی اس صورت میں آدم علیہ السلام نے پہلے توبہ کی حضرت حوا نے بعد میں كَلِمٰتٍ۔ اس میں دو قرائتیں ہیں۔ کلمات ''ت'' کو پیش اور زیر یعنی آدم علیہ السلام نے کلمے پالئے یا ان کلموں نے آدم علیہ السلام کو پالیا وہ کلمے کیا تھے۔ اسے قرآن کریم نے دوسری جگہ خود بیان فرمایا ہے۔ رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا الخ مگر تفسیر عزیزی اور تفسیر خزائن العرفان

اور تفسیر روح البیان نے طبرانی حاکم ابو نعیم اور بیہقی کی روایت نقل کی کہ سیدنا عمر فاروق اور علی مرتضی رضی اللہ عنہما نے ارشاد فرمایا کہ حضور علیہ السلام ارشاد فرماتے ہیں کہ جب آدم علیہ السلام کی پریشانی انتہا کو پہنچ چکی تو ان کو ایک دن یاد آیا کہ میں نے اپنی پیدائش کے وقت عرش اعظم پر لکھا دیکھا تھا کہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ جس سے معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہ کا وہ درجہ ہے کہ ان کا نام عرش اعظم پر رب کے نام کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ تدبیر یہی ہے کہ انہیں کے وسیلہ سے دعائے مغفرت کروں۔ چنانچہ اس دعا کے ساتھ یہ بھی عرض کیا۔ اَسْئَلُکَ بِحَقِّ مُحَمَّدٍ اَنْ تَغْفِرَلِیْ ابن منذر کی روایت میں یہ کلمات ہیں۔ اَللّٰهُمَّ اِنِّی اَسْئَلُکَ بِجَاهِ مُحَمَّدٍ عَبْدِکَ وَ کَرَامَتِهٖ عَلَیْکَ اَنْ تَغْفِرَلِیْ خَطِیْئَتِیْ یعنی یارب میں تجھ سے تیرے بندۂ خاص محمد مصطفیٰ علیہ السلام کی عزت اور مرتبے کے طفیل اور اس بزرگی کے صدقے میں جو انہیں تیرے دربار میں حاصل ہے۔ مغفرت چاہتا ہوں تب فوراً جواب الٰہی آیا کہ اے آدم تم نے اس شہنشاہ کو کہاں سے جانا۔ حضرت آدم نے سارا ماجرا عرض کیا۔ حکم الٰہی آیا کہ اے آدم وہ محبوب سب پیغمبروں سے پچھلے پیغمبر ہیں تمہاری اولاد سے ہیں۔ اگر وہ نہ ہوتے تو تم کو بھی پیدا نہ کیا جاتا۔ فَتَابَ عَلَیْهِ تَابَ تَوْبٌ سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں لوٹنا اور رجوع کرنا۔ بندے کی توبہ ہے گناہ سے اطاعت کی طرف رجوع کرنا اور حق تعالیٰ کی توبہ ہے سزا سے مغفرت کی طرف رجوع فرمانا لہٰذا توبہ رب کی بھی صفت ہے۔ اور بندے کی بھی مگر علیحدہ علیحدہ معنی سے بندے کی مکمل توبہ یہ ہے کہ گذشتہ گناہوں سے شرمندہ ہوا اور فی الحال وہ گناہ چھوڑے اور آئندہ اس گناہ سے بچنے کا عہد کرے اگر حقوق سے توبہ کرتا ہے تو ان کو ادا بھی کرے۔ مثلاً نمازیں رہ گئیں ہیں تو ان کی قضا کر ڈالے۔ اگر کسی کا قرض ہے تو ادا کر دے خیال رہے کہ توبہ کے کچھ ارکان ہیں۔ کچھ شرطیں، کچھ مستحبات۔ اور نماز روزے کی طرح، توبہ کا بھی ایک وقت ہے اس کی تفصیل انشاء اللہ کسی اور مقام پر بیان کریں گے۔ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ اس میں اللہ کی دو صفتوں کا ذکر ہے۔ ایک تواب، دوسری رحیم۔ تواب کے معنی ہیں بہت توبہ قبول فرمانے والا کہ اگر انسان ہزاروں بار توبہ کرے اور پھر غلطی سے گناہ صادر ہوتا رہے تب بھی اس کی توبہ قبول ہوتی رہتی ہے۔ نیز وہ خود ہی توبہ کی توفیق دیتا ہے اور اس کے اسباب جمع فرماتا ہے۔ رحیم کے معنی بسم اللہ کی تفسیر میں بیان ہو چکے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

جب آدم علیہ السلام جنت سے باہر زمین پر تشریف لائے تو ایک دم بہت سی مصیبتوں میں گرفتار ہو گئے۔ جنت سے چھوٹنے کا غم اپنی بیوی حوا کی جدائی، اپنی وحشت اور تنہائی۔ پھر رب تعالیٰ کا عتاب۔ اس عتاب کی وجہ سے سخت پریشانی تھی۔ اس پریشانی میں تین سو سال تک اس قدر روئے کہ ان کی مثال دنیا میں نہیں ملتی۔ پانچ آدمی بہت روئے ہیں۔ (۱) حضرت آدم علیہ السلام اپنی خطا پر۔ (۲) یعقوب علیہ السلام فراق فرزند میں۔ (۳) یحیٰی علیہ السلام خوف الٰہی سے۔ (۴) حضرت فاطمہ زہرا حضور علیہ السلام کی وفات کے بعد۔ (۵) امام زین العابدین واقعہ کربلا کے بعد۔ مگر ان تمام حضرات میں آدم علیہ السلام کی گریہ وزاری سب سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ تین سو سال تک متواتر روئے ہیں۔ تفسیر عزیزی میں ہے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو بھی ان کی گریہ وزاری پر رونا آ گیا۔ انہوں نے بھی بارگاہ الٰہی میں آدم علیہ السلام کی سفارش اور شفاعت کی تب

رحمت الٰہی نے ان کی دستگیری فرمائی اور ان کو رحمت للعالمین علیہ السلام کا نام یاد دلایا اور اس کے ذریعہ توبہ قبول ہوئی۔

آدم علیہ السلام کی توبہ

یہ تو معلوم ہو چکا کہ آدم علیہ السلام کئی سو برس تک اپنی خطاء پر نادم رہے جب توبہ کا وقت آیا اور آدم علیہ السلام کے دل میں ان دعاؤں کا القاء ہوا۔ وہ عاشورہ یعنی دسویں محرم اور غالباً جمعہ کا دن تھا۔ عاشورہ جمعہ کو بڑے اہم واقعات ہوئے، آدم علیہ السلام کی توبہ، نوح علیہ السلام کی کشتی کا زمین پر آنا۔ یونس علیہ السلام کا مچھلی کے پیٹ سے باہر آنا۔ ایوب علیہ السلام کی شفاء۔ موسیٰ علیہ السلام کا فرعون سے نجات پانا اور فرعون کا غرق ہونا۔ یعقوب علیہ السلام کا یوسف علیہ السلام سے ملنا۔ امام حسین کا کربلا میں شہید ہونا، سب دسویں محرم کو ہوا۔ ان بزرگوں نے گیارہویں شب راحت کی گزاری اس لئے اہلسنت گیارہویں شریف کرتے ہیں۔ بظاہر حضور غوث پاک کی فاتحہ ہوتی ہے درحقیقت ان تمام بزرگوں پر انعام الٰہی ملنے کی خوشی آپ کو ان کلمات کے ملنے سے بہت خوشی ہوئی آپ نے وضو فرمایا اور خانہ کعبہ کے سامنے کھڑے ہوئے۔ دو رکعت نماز ادا کی اور پھر ان کلمات سے دعا مانگی۔ جب آدم علیہ السلام جنت سے تشریف لائے تھے تب ان کے چہرے مبارک کا رنگ سیاہ ہو گیا تھا اور توبہ قبول ہونے کے بعد ان کو حکم ہوا کہ چاند کی تیرہویں اور چودھویں اور پندرہویں کا روزہ رکھو چنانچہ آپ نے یہ روزے رکھے اور ہر دن میں جسم کا تہائی حصہ اصلی رنگ پر آتا رہا۔ پندرہیوں تاریخ کو تمام جسم پاک اصلی رنگ پر آ گیا۔ یہ تینوں روزے نوح علیہ السلام کے زمانہ تک فرض رہے۔ اسلام میں بھی کچھ زمانے ہر مہینے کے یہ تین روزے فرض رہے اب فرض تو نہیں۔ مگر سنت ہیں توبہ قبول ہونے کے بعد عرفات کے مقام میں حضرت حوا سے ملاقات ہوئی اور ایک نے دوسرے کو پہچانا۔ اسی لئے اس میدان کو عرفات کہتے ہیں۔ یعنی پہچاننے کی جگہ جب آدم علیہ السلام جنت سے آئے تھے۔ تو ان سے عربی زبان بھی سلب کر لی تھی یعنی بھلا دی گئی تھی۔ اتنے روز تک سریانی زبان میں کلام فرمایا۔ توبہ قبول ہونے کے بعد عربی زبان پھر عطا ہوئی۔ پھر حضرت جبرئیل نے تمام عالم کے جانوروں کو آواز دی کہ اے جانورو حق تعالیٰ نے تم پر اپنا خلیفہ بھیجا ہے۔ اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کرو۔ دریائی جانوروں نے اپنا سر اٹھا کر اطاعت ظاہر کی۔ اور خشکی کے جانور آپ کے آس پاس جمع ہو گئے آدم علیہ السلام ان پر ہاتھ پھیرنے لگے جن پر ان کا ہاتھ پہنچ گیا وہ اہلی اور خانگی رہا۔ جیسے گھوڑا، اونٹ، بکری، کتا، بلی وغیرہ اور جس پر آپ کا ہاتھ نہ پہنچا وہ جنگلی وحشی رہا۔ جیسے ہرن وغیرہ اس واقعہ کے بعد آدم علیہ السلام نے عرض کیا مولیٰ اولاد بہت کمزور ہے اور ابلیس کا فریب بہت سخت اگر تو ان کی امداد نہ کرے تو وہ ابلیس سے کیونکر بچ سکیں گے۔ حکم الٰہی آیا کہ اے آدم تمہارے اور احکام تھے ان کے لئے دوسرے احکام ہوں گے۔ ہم ہر انسان کے ساتھ ایک فرشتہ رکھیں گے جو اس کو شیطان کے وسوسے سے بچائے گا اور ہر ایک کے لئے اس کے مرنے کے وقت تک توبہ کا دروازہ کھلا رکھیں گے۔ تب آپ نے خوش ہو کر شکر کیا۔ اسی تفسیر عزیزی میں ہے کہ آپ کی اولاد بیٹے پوتے وغیرہ آپ کی موجودگی میں چالیس ہزار تک پہنچ چکے تھے۔ اور آپ نے آخر عمر میں خاموشی اختیار فرمائی تھی کہ بجز ذکر الٰہی دیگر کلام بہت کم فرماتے تھے۔ آپ کی وفات کا پورا واقعہ ہم اس

سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** یہ کہ مقبولان بارگاہ کے وسیلے سے دعا مانگنی جائز اور سنت آدم علیہ السلام ہے۔ **دوسرے:** یہ کہ کوئی عبادت بغیر وسیلہ نبی قبول نہیں۔ دیکھو آدم علیہ السلام کئی سو برس تک گریہ وزاری میں مشغول رہے۔ مگر بغیر حضور کے نام کے مقصود پورا نہ ہوا۔ **تیسرے:** یہ کہ دعا میں بحق فلاں کہنا جائز ہے۔ **چوتھے:** یہ کہ توبہ کے لئے گریہ وزاری کرنا بہت فائدہ مند ہے۔ (مثنوی شریف میں ہے)

طفل یک روزہ ہمیں داند طریق | کہ بگریم تا شود دایہ شفیق
تو نمی دانی کہ دایہ دایگاں | چوں دہد بے گریہ شیر اندر دہاں
چوں خدا خواہد کہ ما یاری کند | میل مارا جانب زاری کند
باش چوں ولاب نالاں چشم تر | تاز صحن جان بر روید خضر
آخرے ہر گریہ آخر خندہ ایست | مرد آخر بیں مبارک بندہ ایست

پانچویں: یہ کہ انسان نے زمین پر آکر سب سے پہلی عبادت توبہ کی ہے اس لئے انسان کو چاہئے کہ ہر وقت توبہ کرتا رہے۔ **چھٹے:** یہ کہ دنیاوی بادشاہوں کا یہ حال ہے کہ ان کے قریب رہنے والوں کو ان کا خوف کم ہوتا ہے۔ مگر بارگاہ الٰہی میں جس قدر زیادہ قرب اسی قدر زیادہ خوف **ساتویں:** یہ کہ دعا وظیفے وہ زیادہ مقبول ہیں جو کسی مقبول کے ذریعے ہیں۔ آدم علیہ السلام اس عرصہ میں ہر طرح کی دعائیں کرتے رہے مگر قبولیت اس دعا کو ہوئی جو رب کی طرف سے ملی کلمات کے فیض کے ساتھ زبان کا بھی فیض چاہئے۔ کلام ربانی کے لئے زبان بھی فریدانی چاہئے۔ کارتوس کے لئے رائفل بھی ضروری ہے مریدین اپنے پیر سے دعاؤں وظیفوں کی اجازت لیتے ہیں ان کی دلیل یہ آیت ہے۔ **آٹھویں:** یہ کہ خطا ہم کرلیتے ہیں بخشش کے لئے رب کرم فرماتا ہے دیکھو خطاء کی نسبت حضرت آدم علیہ السلام کی طرف کی گئی اور بخشش کی نسبت رب تعالیٰ کی طرف۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: جب آدم کی توبہ قبول ہی کرنی تھی تو ان کو اتنے روز تک پریشان کیوں رکھا گیا۔ **جواب:** جو چیز مشکل سے حاصل ہوتی ہے اس کی قدر بھی ہوتی ہے۔ دوسروں کو اس سے عبرت حاصل ہوتی ہے۔ نیز حضرات انبیاء کرام کی یہ پریشانیاں ان کے درجے بڑھانے کا ذریعہ بنتی ہیں۔ **دوسرا اعتراض:** فقہاء فرماتے ہیں کہ دعا میں بحق فلاں کہنا منع ہے اور اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جائز ہے۔ **جواب:** یہ دونوں کلام صحیح ہیں حق تعالیٰ پر کسی کا اپنا ذاتی حق نہیں اس معنی سے حق فلاں کہنا منع ہے۔ لیکن اس نے اپنے مقبول بندوں کو اپنے فضل و کرم سے کچھ حقوق عطا فرمائے جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے اس معنی سے کہنا جائز ہے۔

تفسیر صوفیانہ

فرشتے ہمیشہ عبادت کرتے تھے لیکن اب تک انہوں نے توبہ وگریہ وزاری کی عبادت نہ کی تھی۔ سیدنا آدم علیہ السلام نے زمین پر آتے ہی یہی عبادت کی جنت کا فراق حضرت حوا کی جدائی تو رونے کا بہانہ تھا۔ درحقیقت اپنی محبت میں ان کو رلانا تھا۔ مجاز حقیقت کا پل ہے۔

حکایت: مثنوی شریف میں فرمایا کہ ایک بار مجنوں نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا مولا تو نے مجھے عشق لیلیٰ دے کر اس مصیبت میں کیوں ڈال دیا کہ تمام دنیا میں رسوا ہو گیا اور یہاں کی لذتیں اور عیش سب بھول گیا۔ جواب ملا۔

عشق لیلیٰ نیست ایں کار من است ۔۔۔ حسن لیلیٰ عکس رخسارے من است

خوش بیاید نالہ ء شب ہائے تو ۔۔۔ ذوق ہا دارم بیارب ہائے تو

اے دیوانے یہ لیلیٰ کا عشق نہیں ہے۔ وہ تو فقط ایک پردہ ہے۔ لیلیٰ کا رخسار آئینہ جمال یار ہے۔ جس کے ذریعہ تجھ کو اس کا دیدار حاصل ہوتا ہے۔ روح البیان شریف نے ایک مقام پر فرمایا کہ بظاہر یعقوب علیہ السلام فراق یوسف میں رو رہے تھے مگر درحقیقت خالق یوسف کی محبت ان کو رلا رہی تھی کیونکہ وہ کنعان میں بیٹھے ہوئے یوسف علیہ السلام کا ہر حال دیکھ رہے تھے۔ پھر ان کے لئے فراق کیسا اس پر لطف مضمون کو انشاء اللہ ہم سورہ یوسف کی تفسیر میں بیان کریں گے اور اپنی کتاب "جاء الحق" میں بھی بیان کر چکے ہیں۔ روایات میں ملتا ہے کہ ایک بار لیلیٰ مجنوں کے پاس گئی اور کہا کہ میں ہی وہ لیلیٰ ہوں جس کے فراق میں تو تڑپ رہا ہے۔ اس نے جواب دیا تو میری لیلیٰ کہاں سے آئی تو ایک انسان ہے۔ غرضیکہ نام لیلیٰ کا رہ گیا اور کام کسی اور کا غرضیکہ قلب آدم علیہ السلام کو جب توبہ کے صابن سے صاف کر دیا گیا اور آنکھوں کے پانی سے اس کو خوب دھویا تب رحمت الٰہی کی بارش ان پر ہوئی اور ان کو اپنا قرب عطا فرمایا۔ تفسیر روح البیان نے اس جگہ فرمایا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے قلب میں محبت الٰہی کا تخم بویا گیا۔ اور چشمہء چشم کے پانی (آنسوؤں) سے اس کو سیراب کیا گیا۔ تو اس تخم کی پہلی شاخ رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا ظاہر ہوئی اور اس شاخ پر توبہ کی کلیاں نمودار ہوئیں۔ جس سے ہدایت کا پھول کھلا۔ اجتباء معرفت کا پھل حاصل ہوا۔ جسے قرآن کریم نے فرمایا ثُمَّ اجْتَبٰهُ رَبُّهٗ فَتَابَ عَلَيْهِ وَهَدٰى (طٰہٰ:۱۲۲)

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى

کہا ہم نے اترو تم اس سے سب کے سب پس اگر آئے تمہارے پاس طرف سے میری ہدایت

ہم نے فرمایا تم سب جنت سے اتر جاؤ پھر اگر تمہارے پاس میری طرف سے کوئی ہدایت آئے

فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۳۸﴾

پس جس نے پیروی میری ہدایت کی کی پس نہیں کوئی ڈر اوپر ان کے اور نہ وہ غمگین ہوں گے

تو جو میری ہدایت کا پیرو ہوا اسے نہ کوئی اندیشہ اور نہ کوئی غم

تعلق

اس آیت کا پہلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **ایک:** یہ کہ اس میں بھی اس ایک نعمت کا ذکر ہے جو آدم علیہ السلام کے ذریعے انسانوں کو ملی۔ یعنی ان کا زمین پر تشریف لانا۔ پھر زمین میں احکام الٰہی کا آنا۔ ان کی وجہ سے مومن و کافر میں فرق ہونا۔ **دوسرے:** یہ کہ اس سے پہلے کی آیت میں اس خطا کا ذکر ہوا۔ جو آدم علیہ السلام کو بہشت سے زمین پر لائی۔ اب ان نیک عملوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ جو کہ پھر ان کو اور ان کی اولاد کو زمین سے جنت میں پہنچائیں گے۔ **تیسرے:** یہ کہ اس سے پہلے آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہونے کا تذکرہ ہوا۔ اب یہ بتایا جارہا ہے کہ فقط اس سے ہی جنت میں واپسی نہ ہوگی بلکہ اس کے لئے نیک اعمال کرنا ہوں گے۔

تفسیر

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا یہ بھلا اس سے پہلے بھی آچکا ہے لیکن اس میں چند طرح فرق ہے ایک یہ کہ وہ قبول توبہ سے پہلے فرمایا گیا تھا اور یہ اس کے بعد اگر جنت ہی میں توبہ ہوئی تھی جیسا کہ بعض علماء فرماتے ہیں تو جنت ہی میں دوبارہ اتر جانے کا حکم دیا گیا۔ بعد میں توبہ قبول ہوئی پھر فرمایا گیا کہ اگرچہ توبہ تو قبول ہوئی مگر اترنا ضرور پڑے گا۔ لہٰذا اِهْبِطُوْا آدم علیہ السلام کے علم کے لئے تھا۔ اور دوسرا عمل کے لئے اور اگر زمین پر توبہ قبول ہوئی جیسا کہ روایت سے ثابت ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم زمین میں ہی رہو جہاں تم کو اتارا گیا۔ کیونکہ اب تمہاری بعض اولاد جنت میں آئے گی۔ اور بعض نہ آئے گی کیونکہ اگر بغیر عمل ہی جنتیوں کو جنت میں بلایا جائے تو دوزخیوں کو اعتراض کرنے کا موقع ملے گا۔ لہٰذا عمل کر کے آؤ۔ **دوسرا فرق:** یہ ہے کہ پہلے اهبطوا میں سارے اترنے والوں کو خطاب تھا۔ لیکن یہاں صرف اولاد آدم علیہ السلام کو کیونکہ آگے احکام کا ذکر ہے۔ جس سے سانپ اور مور وغیرہ علیحدہ ہیں۔ **تیسرا فرق:** یہ ہے کہ اس اِهْبِطُوْا کے ساتھ عداوت کی تکلیف وغیرہ کا ذکر تھا۔ جس سے معلوم ہوا تھا کہ زمین تکلیف کی جگہ ہے اس اهبطوا کے ساتھ رب کے احکام کا ذکر ہے اور یہ بتایا جارہا ہے کہ جو کوئی دنیا میں رہ کر ہماری فرمانبرداری کرے گا۔ وہ وہاں کے خوف و غم سے محفوظ رہے گا۔ **چوتھا فرق:** یہ ہے کہ اس اِهْبِطُوْا میں حق تعالیٰ سے دور ہونے کا ذکر تھا اور یہاں اس سے قرب کا یعنی دنیا میں رہو۔ لیکن اگر ہماری اطاعت کرو گے تو وہاں یعنی ہم سے قریب ہی رہو گے۔ بہر حال دوبارہ اس کا ذکر بیکار نہیں ہے۔ جمیعاً اس سے معلوم ہوتا ہے حضرت آدم و حوا سانپ مور وغیرہ سب ہی کو جنت سے نکلنے کا حکم ہوا۔ کوئی وہاں باقی نہ رکھا گیا۔ لیکن اس سے یہ لازم نہیں کہ سب ایک دم ہی نکلے ہوں۔ ممکن ہے کہ ساتھ ہی نکلے ہوں یا آگے پیچھے۔ نیز اگر یہ خطاب صرف آدم و اولاد آدم کو ہو اور مطلب یہ ہو کہ تم سب نیچے رہو تو لازم یہ نہیں کہ سب کا نیچے رہنا یکساں اور ایک ہی مدت تک ہوگا۔ بلکہ بعض اللہ کے بندے قیامت سے پہلے جنت پہنچ جائیں گے جیسے شہداء کی روحیں حضرت ادریس علیہ السلام بعض قیامت کے بعد جیسے تمام مسلمان **فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ** لفظ اِمَّا اِنْ شرطیہ اور ما زائدہ سے بنا ہے۔ اس کا استعمال ایک کے موقع پر ہوتا ہے۔ اور يَاْتِيَنَّ میں نون سے تاکید پیدا ہوئی تو آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اگر ضرور آئے تمہارے پاس چونکہ رب کی طرف سے انبیائے کرام اور کتابوں کا آنا یقینی تھا۔ اس

لئے نون استعمال فرمایا گیا لیکن بندوں کو اس ہدایت کے پانے میں شک تھا۔ کیونکہ بعض ماں کے پیٹ میں بعض بچپن ہی میں مرجاتے ہیں اور بعض دیوانگی میں عمر گزارتے ہیں اور بعضے وہ ہیں جن تک نبوت کی روشنی نہیں پہنچتی جیسے زمانہ جاہلیت کے لوگ ان کے لحاظ سے بطریق شک اِمَّا ارشاد ہوا۔ یعنی رب کی طرف سے ہدایت تو ضرور آئے گی لیکن اگر تم اس کو پاؤ تو تم اطاعت کرنا۔ یہاں کُمْ سے خطاب صرف انسانوں کو ہے کیونکہ شیطان اور سانپ اور مور کے پاس نہ کوئی کتاب آئی نہ رسول۔ اور بہت ممکن ہے کہ اس خطاب سے حضرت آدم و حوا بھی خارج ہوں کیونکہ آدم علیہ السلام لوگوں کے لئے خود ہدایت تھے اور حضرت حوا اس ہدایت کو پا چکی تھیں۔ اب ان کے پاس ہدایت آنے کے کیا معنی۔ لیکن اس کی ایک تفسیر ایسی بھی ہوسکتی ہے جس میں انسان و جن جانور وغیرہ سب داخل ہو جائیں وہ انشاء اللہ تفسیر صوفیانہ میں عرض کی جائے گی۔ مِنِّیْ سے معلوم ہوا کہ ہدایت رب کی طرف سے ہی آتی ہے۔ خواہ کسی ذریعہ سے ملے۔ فرشتے بلا واسطہ پاتے ہیں انبیاء کرام کبھی فرشتوں کے ذریعہ سے کبھی بلا واسطہ صحابہ کرام انبیاء کے ذریعے سے اور ان کے بعد کے لوگ علماء و مشائخ کے ذریعہ غرضیکہ ابتداء ایک مگر انتہا میں فرق اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو باتیں شیطان کی طرف سے آئیں وہ نہ ہدایت ہیں اور نہ ان کی اطاعت فائدہ مند۔ هُدًی یہ مصدر یا تو اپنے ہی معنی میں ہے یا اسم فاعل کے معنی میں یعنی اگر تمہارے پاس ہدایت آئے یا ہدایت دینے والی چیزیں آئیں جیسے کہ انبیاء کرام آسمانی کتابیں اور پیغمبروں کی شریعتیں فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ اس جگہ بجائے ضمیر کے لفظ ہدایت ارشاد ہوا۔ یعنی تَبِعَهٗ نہ فرمایا کیونکہ پہلی ہدایت میں اور اس میں بہت فرق ہے پہلی ہدایت سے ہدایت دینے والی چیزیں مراد تھیں اور اس ہدایت سے اعمال وغیرہ مراد ہیں۔ نیز ہر ایک کی ہدایتیں علیحدہ ہیں اور اس کی اتباع میں فرق جیسے سورج ایک ہے مگر اس کا فیض زمینوں اور زمانوں میں مختلف بنگال میں اور پھل پیدا کرتا ہے۔ کشمیر میں اور سردی میں فیضان کسی قسم کا ہے گرمی میں دوسری قسم کا۔ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ خوف کے معنی ہیں ڈر یعنی آئندہ مصیبت پر خطرہ اور اندیشہ اس سے معلوم ہوا کہ جو ہدایت پر قائم رہے اسے یا تو موت کے وقت یا قیامت کے دن یا قبر میں کوئی خوف نہ ہوگا۔ اور یا دنیا اور آخرت میں ان کیلئے کوئی حقیقۃً خوف کی بات نہ ہوگی۔ خیال رہے کہ خوف دو قسم کا ہوتا ہے ایک فائدہ مند اور دوسرا نقصان دہ۔ رب کا پیغمبر کا قیامت کا جہنم کا خوف فائدہ مند ہے جس سے کہ ایمان اور تقویٰ حاصل ہوتا ہے مگر رب کے مقابلہ میں مخلوق کا خوف جس کی وجہ سے انسان رب کی اطاعت نہ کر سکے سردی کے خوف سے نماز چھوڑ دی جائے بے دینوں کے ڈر سے تبلیغ بند کر دی جائے یہ نقصان دہ خوف ہے اور یہاں اسی ہی خوف کی نفی ہے۔ کیونکہ عَلٰی نقصان کے لئے آتا ہے یعنی ان کے لئے وہ خوف نہیں جو ان پر وبال بن جائے۔ رہا خوف الٰہی جس کو خشیۃ کہتے ہیں یہ تو ان کو اعلیٰ درجے کا حاصل ہوتا ہے۔ نیز سانپ بچھو وغیرہ موذی جانوروں سے ڈرنا بھی اس میں داخل نہیں کیونکہ یہ خوف بھی مضر نہیں ہے موذی چیزوں سے خوف ایذا ہوتا ہے جس کا نتیجہ نفرت ہے رب تعالیٰ اور اس کے رسول سے خوف ہیبت ہے جس کا نتیجہ اطاعت ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کی قوم سے ڈر ہوا جب پہلی بار عصا سانپ بنا تو ڈر ہوا یہ خوف ایذا تھا۔ جس کی بناء پر آپ کو ان سے نفرت ہوگئی۔ وہ خوف اس آیت کے خلاف نہیں۔ یا مطلب اس کا یہ ہے کہ ان کے لئے حقیقتاً کوئی خوف کی چیز نہیں ہے۔ یعنی اگرچہ وہ دل میں ڈریں لیکن ڈر کی کوئی چیز نہیں ہے۔ جیسے کہ وکیل مدعی سے کہتا ہے کہ تمہیں اس مقدمے

میں کوئی خوف نہیں۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ تم پر کوئی ایسی آفت آنے والی ہی نہیں جس کا کوئی اندیشہ ہو۔ نہ یہ کہ تمہارے دل میں خوف نہیں۔ اسی لئے لَا خَوْفٌ فرمایا نہ کہ لَا یَخَافُوْنَ۔ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ یَحْزَنُوْنَ۔ حَزَنٌ سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں غم اور افسوس یعنی یہ اللہ والے یا موت کے وقت یا قبر وحشر میں غم نہ کریں گے۔ کیونکہ دنیا سے کامیاب آئے ہیں۔ کما کر لائے ہیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ وہ دنیا و آخرت میں دنیاوی نفعوں کے حاصل نہ ہونے پر غم نہیں کرتے کیونکہ ان کی نگاہ میں دین ہوتا ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ ان کو وہ غم نہ ہوگا جو کفار اور فاسقوں کو ہوگا۔

خلاصہ تفسیر

آدم وحوا علیہما السلام جب جنت سے چلے تو اب انہیں یہ خبر نہ تھی کہ آیا ہم ہمیشہ کے لئے جارہے ہیں یا پھر کبھی یہاں آنا میسر ہوگا اور اس جگہ رہ کر بھی تعلق رب سے رہے گا یا نہیں۔ ان کے اطمینان کے لئے فرمایا کہ اب تو تم سب جنت سے اتر کر زمین پر جاؤ لیکن وہاں تم پر ہماری نظر عنایت رہے گی۔ اور ہم تمہارے پاس اپنی ہدایت یعنی عقل سلیم عجائبات قدرت انبیاء کتابیں اور پھر انبیاء کے نائب علماء ومشائخ بھیجیں گے۔ دیکھو اس بار تم چوک گئے آئندہ ایسا نہ کرنا اسی غلطی سے سبق حاصل کرنا جو ہماری ہدایت کے موافق عمل کرے گا۔ تو اس کو نہ آئندہ کا خوف ہوگا اور نہ کبھی گزری عمر سے غم۔ بلکہ دونوں عالم میں شاد وخرم رہے گا۔ اسی لئے روایت میں ہے کہ قیامت کا دن بے دینوں کو پہاڑ سا معلوم ہوگا۔ یعنی بہت سخت اور دراز لیکن نیک کاروں کو ایسا محسوس ہوگا جیسے چار رکعت پڑھنے کے بقدر وقت۔ کیونکہ یہ راحت میں ہوں گے اور وہ تکلیف میں اگرچہ روایات میں آتا ہے کہ قیامت میں ہر شخص کو افسوس ہوگا، بدکاروں کو نیکی نہ کرنے کا اور نیکو کاروں کی زیادہ نیکی نہ کرنے کا مگر بدکاروں کا غم تکلیف دہ ہوگا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **ایک:** یہ کہ دنیا میں نیک اعمال کرنے کے لئے انسان کو بھیجا گیا ہے۔ نہ کہ فقط کھانے پینے کے لئے کھانا پینا تو اعمال کے لئے ہے **دوسرے:** یہ کہ جو چیز رب کی طرف سے ملے وہ ہدایت ہے خواہ کسی ذریعے سے آئے اور جو شیطان کی طرف سے ملے وہ گمراہی۔ **تیسرے:** یہ کہ نیک اعمال سے دل مضبوط اور قوی ہو جاتا ہے کہ اس کی وجہ سے دنیوی رنج وخوشی کا اثر نہیں لیتا بلکہ ہر حالت اسے خدا کی طرف مائل کرتی ہے وہ مثل اس پہاڑ کے ہوتا ہے جو آندھیوں سے جنبش نہیں کرتا۔ **چوتھے:** یہ کہ رب کی طرف سے انسان کو ہدایت فطری ہدایت عقلی اور ہدایت شرعی ملیں۔ مگر نجات کا مدار ہدایت شرعی پر ہے جیسا کہ فَمَنْ تَبِعَ سے معلوم ہوا خیال رہے کہ جیسے سورج کا ایک فیض عام ہے۔ یعنی روشنی، ہزارہا فیوض خاص ہیں۔ باغ، کھیت، دریاؤں کانوں میں مختلف فیوض دیتا ہے۔ ایسے ہی انبیاء کرام خصوصا سید الانبیاء کی ایک ہدایت عام ہے جسے شریعت کہتے ہیں دوسری ہدایت یہی خاص ہیں جنہیں طریقت حقیقت معرفت کہا جاتا ہے۔ حضور کے جسم کے احوال کا نام شریعت دل کے احوال کا نام طریقت روح کے احوال کا نام حقیقت سر کے احوال کا نام معرفت ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: ایک اِهْبِطُوْا فرمانے کے بعد دوبارہ اِهْبِطُوْا فرمانا بیکار ہے۔ اس لئے کہ پہلے آ چکا ہے۔
جواب: اس کا جواب گزر چکا کہ اس تکرار میں چار فائدے ہیں۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ والوں کو خوف وغم نہیں ہوتا۔ اور حدیث پاک میں آتا ہے کہ جس قدر انسان کا درجہ اعلیٰ اسی قدر رنج وغم و بلا مصیبت اس کے لئے زیادہ نیز ہر مسلمان کو عبادت قبول نہ ہونے خاتمہ خراب ہونے یا اعمال برباد ہونے کا خطرہ لگا ہوا ہے۔ **جواب:** اس کا جواب بھی گزر چکا کہ یا تو اس سے قیامت کا خوف وغم مراد ہے یا جنت میں پہنچ جانے کے بعد یا دنیا میں نقصان و خوف وغم کی بھی نفی مقصود ہے۔

تفسیر صوفیانہ

جب رب نے آدم علیہ السلام کو زمین پر بھیجنے کی آزمائش میں مبتلا فرمایا تو ان کو تسلی دی کہ یہ امتحان اگر چہ بہت سخت ہے مگر اس میں ممتحن کی طرف سے چند طرح تمہاری اور تمہاری اولاد کی مدد فرمائی جائے گی۔ اور تم کو کامیاب ہونے اور اچھے نمبر لینے میں بہت مدد بھیجی جاوے گی۔ تم سے اور تمہاری اولاد سے ہمارا تعلق نہ ٹوٹے گا۔ بلکہ کسی کو بلا واسطہ کسی کو ایک واسطے سے اور کسی کو چند واسطوں سے وحی، کتاب، احکام وغیرہ پہنچائے جائیں گے جس نے اپنے قلب میں آدم علیہ السلام کی طرح ہماری محبت کا تخم بویا اور اس کو توبہ گریہ زاری اور استغفار وغیرہ کے پانی سے پرورش کیا۔ یہاں تک کہ اس میں عبادت، اطاعت، معرفت وغیرہ کا پھل لگ گیا تو ان کو کھیتی بگڑنے، اجڑنے کا خوف اور اس تخم کے خراب ہو جانے کا غم نہ ہوگا۔ یعنی نہ تو ان کا تخم فاسد ہوگا اور نہ ان کی کھیتی برباد اور دنیا کی کوئی مصیبت ان کے لئے نقصان دہ نہ ہوگی بلکہ ہر مصیبت ان کو زیادہ رَاغب الی اللہ کرے گی

آب در کشتی ہلاک کشتی است آب اندر زیر کشتی پشتی است

کیونکہ ان کا دل ہماری محبت سے بھرا ہوگا۔ اس میں کسی بھی رنج وغم کی گنجائش نہ ہوگی۔ ہر مصیبت دل سے دبی ہوئی رہے گی۔ نیز دنیا کی خوفناک چیزیں خود ان سے خوف کریں گی۔ وہ کسی سے خوف نہ کریں گے جیسا کہ ثابت ہے کہ سانپ، بچھو وغیرہ، بعض اولیاء اللہ کے تابعدار ہوئے اور بڑے بڑے سرکش جن وانسان ان کے مطیع فرمان رہے دوزخ کی آگ بھی ان سے خوف کرے دنیا کی آگ زہر وغیرہ ان کو نقصان نہ پہنچا سکیں۔ اب وہ بجز پروردگار کس سے خوف کریں۔ خیال رہے کہ ہر ایک کے لئے ہدایت علیحدہ اور اس کی اتباع جداگانہ۔ اسی طرح ان کا خوف وغم سے نجات پانا مختلف نوعیت کا ہے۔ غریب کے اور احکام۔ مالدار کے اور عورت کے علیحدہ اور اس کی اتباع جداگانہ اسی طرح ان کا خوف وغم سے نجات پانا مختلف نوعیت کا ہے اہل طریقت و حقیقت و معرفت کی دوسری نوعیت جس قسم کی ہدایت اسی قسم کی اتباع پھر اسی طرح کی جزاء جیسا تخم ویسا ہی درخت اور اس ہی طرح کا پھل جانوروں کی بھی علیحدہ علیحدہ ہدایتیں ہیں یعنی دشمن انبیاء جیسے چھپکلی اور جو باوغیرہ اور بعض جانور خدام نبی جیسے ہد ہد اور کبوتر وغیرہ ان کی ہدایت ان کی طبعی حالت ہے۔

موسیا آداب دانا دیگر اند سوختہ جاں درد آناں دیگر اند
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ
اور وہ جنہوں نے کفر کیا اور جھٹلایا آیتوں کو ہماری یہ لوگ ساتھی ہیں آگ کے
اور جو کفر کریں اور میری آئتیں جھٹلائیں تو وہ دوزخ والے
فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۳۹﴾ ع
وہ بیچ اس کے ہمیشہ رہنے والے ہیں
ہیں ان کو ہمیشہ اس میں رہنا

تعلق

اس آیت کا پہلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **ایک**: یہ کہ پہلے مومنین کا ذکر ہوا تھا۔ اب کفار کا اور ہر چیز کا پورا علم اس کی ضد سے ہوتا ہے۔ **دوسرے**: یہ کہ پہلے اس جماعت کا ذکر ہوا جو کہ جنت میں واپس آنے والی ہے۔ اب اس کا ذکر ہوا جو کہ وہاں پھر نہ جائے گی۔ **تیسرے**: یہ کہ اس سے پہلے جنت کے پہچاننے والے اعمال کا ذکر ہوا تا کہ ان کو اختیار کیا جائے اب جنت سے محروم کرنے والی چیزوں کا تذکرہ ہوا تا کہ اس سے پرہیز کیا جائے۔ یعنی وہ علاج تھا یہ اس کا پرہیز۔

تفسیر

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا، كَفَرُوْا۔ كُفْرٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں انکار کرنا یہاں دل کا انکار مراد ہے۔ کیونکہ زبانی انکار کا ذکر تو آئندہ آرہا ہے چونکہ دل کا انکار زبانی انکار سے پہلے ہوتا ہے اس لئے اس کا ذکر بھی پہلے ہوا اور تکذیب کا بعد میں۔ نیز جہنمی بن جانے کے لئے صرف دل کا انکار کافی ہے۔ خواہ زبانی انکار ہو یا نہ ہو۔ اس لئے بھی اس کو پہلے ہی فرمایا گیا۔ **وَكَذَّبُوْا** اس سے مراد ہے اللہ تعالیٰ کی آیتوں کو جھوٹا کہنا خواہ زبان سے ہو یا قلم سے یا افعال سے یا کسی اور علامت سے۔ مثلاً کسی کافر نے ساری عمر اپنے منہ سے کسی آیت کو جھوٹا نہ کہا بلکہ وہ اپنی پوجا پاٹ میں مشغول رہا وہ بھی اس میں داخل ہے کیونکہ اس کا ہندوانی کام کرنا اور کفر کی نشانیاں زنار استعمال کرنا ہی اس کی علامت ہے کہ وہ اسلامی احکام کو جھوٹا جان رہا ہے۔ خیال رہے کہ اس آیت کے معنی یہ نہیں ہیں کہ کفر اور تکذیب اور ان کاموں کے کرنے سے ہی صرف جہنمی ہو بلکہ ان دونوں میں سے کوئی بھی کام کرے۔ یقیناً جہنمی ہو جائے گا۔ لہٰذا منافقین جو دل سے کافر اور زبان سے مصدق تھے وہ جہنمی اور مشرکین و کفار جو دل سے حق جانیں مگر زبان سے تکذیب وہ بھی جہنمی جیسے ابو جہل وغیرہ لہٰذا نعت گو ہندو سب اس میں داخل ہیں۔ ہاں جو کہ دل سے اسلام کو مان چکا مگر زبان سے تصدیق کا موقعہ نہ ملا وہ انشاء اللہ جنتی ہے نیز اگرچہ خطاب کے وقت کفر اور تکذیب آئندہ ہونے والی تھی مگر چونکہ یہ یقینی چیز تھی لہٰذا ان دونوں کو بصیغہ ماضی فرمایا گیا چونکہ وہ علم الٰہی میں کافر و مکذب ہیں اس لئے ماضی ارشاد ہوا۔ یعنی جو میرے علم میں کافر و مکذب ہو چکے اور جن کا نام کافروں کی فہرست میں آچکا۔ یہ فہرست بعض انبیاء کرام کو

بھی دکھائی گئی ہے آدم علیہ السلام نے تمام روحوں کو سیاہ سفید رنگ میں ملاحظہ فرمایا سیاہ کفار کی روحیں تھی۔ سفید مومنوں کی ہمارے حضور نے دو کتابیں صحابہ کو دکھائیں۔ ایک مومنوں کی دوسری کافروں کی فہرست تھی بِاٰيٰتِنَآ۔ آیات سے اللہ کی یقینی نشانیاں مراد ہیں۔ جو بھی اللہ کی نشانیوں کو جھٹلادے یعنی یا تو آسمانی کتاب کا انکار کرے یا کسی پیغمبر کا یا قیامت کا، دوزخ وجنت کا یا کسی بھی اسلامی حکم قطعی کا وہ سب جہنمی ہیں۔ نیز اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ کم سے کم تین آیتوں کا انکار کرے وہ دوزخی ہوا اگر ایک آیت کا انکار کردیا۔ جہنمی ہوگیا کیونکہ ایک آیت کا انکار کل کا انکار ہے بادشاہ کے ایک قانون کا توڑنا تمام کا توڑنا ہے۔ دیکھو جال کا ایک پھندہ کھل جانے سے تمام پھندے کھل جاتے اُولٰٓئِكَ اگرچہ یہ کفار سننے والے کی نگاہ سے غائب تھے مگر چونکہ ان کے ایسے اوصاف بتادیئے گئے جس سے وہ مثل محسوس کے ہوگئے۔ لہٰذا ان کی طرف اُولٰٓئِكَ سے اشارہ فرما دیا گیا۔ اَصۡحٰبُ النَّارِ اصحاب جمع صاحب کی ہے جس کے معنی ہیں ساتھی یعنی کافر آگ کے ساتھی ہیں اور اس میں ہمیشہ رہنے والے یا اس کے معنی ہیں والے اور مالک جیسے کہا جاتا ہے صاحب علم۔ صاحب مال۔ آیت کا مطلب یہ ہوا کہ یہ لوگ آگ والے ہیں اور آگ انہی کی خاطر بنائی گئی ہے۔ بعض گنہگار مسلمان بھی اگرچہ عارضی طریقے پر آگ میں رہیں گے لیکن آگ ان کی خاطر نہیں بنی ہے وہ کافروں کے طفیلی ہوں گے۔ اَلنَّارِ اگرچہ دوزخ میں ٹھنڈے طبقے بھی ہیں۔ لیکن تھوڑے اور اس کے مستحقین بھی تھوڑے۔ اس لئے جہنم کو آگ ہی سے تعبیر کرتے ہیں یا یوں کہو کہ ان کی ٹھنڈک بھی آگ ہی کی وجہ سے ہے۔ دوزخ میں آگ ایک ہی جگہ جل رہی ہے۔ لیکن اس کے قریب اور دور ہونے کی وجہ سے ہر طبقے کی گرمی مختلف جیسے حمام میں آگ ایک جگہ مگر گرمی مختلف، یا آسمان پر سورج ایک جگہ مگر زمین کی ہر ولایت میں، گرمی سردی جداگانہ تو دوزخی کسی طبقے میں رہے اس کا تعلق آگ سے ہی ہے۔ کوئی آگ سے قریب رہ کر گرمی میں ہے۔ کوئی دور رہ کر سردی میں هُمۡ فِيۡهَا خٰلِدُوۡنَ، هُمۡ سے معلوم ہوتا ہے کہ آگ میں ہمیشہ رہنا صرف کافروں کے لئے ہے۔ مومن کتنا ہی گنہگار ہو کبھی نہ کبھی دوزخ سے ضرور نکل جائے گا۔ گنہگار مومن اور کافر کے عذاب میں چند طرح فرق ہوگا۔ **ایک:** یہ کافر کے لئے دوزخ میں ہمیشگی ہے۔ مومن کے لئے نہیں جیسا کہ یہاں معلوم ہوا ہے۔ **دوسرے:** یہ کہ کافر کو رسوا بھی کیا جائے گا۔ گنہگار مومن کو رب وہاں رسوا نہ کرے گا۔ رب فرماتا ہے لِّنُذِيۡقَهُمۡ عَذَابَ الۡخِزۡىِ (حم سجدہ:١٦) **تیسرے:** یہ کہ دوزخ کی آگ کافر کے قالب وقلب ظاہر وباطن کو جلادے گی رب فرماتا ہے۔ تَطَّلِعُ عَلَى الۡاَفۡـِٕدَةِ (الھمزہ:۷) مومن کا دل زبان اعضاء سجدہ کو آگ نہ جلائے گی جیسا کہ حدیث شفاعت میں وارد ہے۔ پھر کفار کے عذاب بھی مختلف ہیں ابولہب اور ابوطالب کا عذاب یکساں نہیں خیال رہے کہ مومن وکافر ہونے میں خاتمے کا اعتبار ہے یعنی جس کا خاتمہ ایمان پر ہو وہ مومن ہے اور جس کا کفر پر ہو وہ کافر ہے۔ اگرچہ زندگی میں کیسے ہی ہوں وہی اس جگہ مراد ہیں۔

خلاصہ تفسیر

جب کہ مومنوں کا انعام بیان فرمادیا گیا تو اب کافروں کے عذاب کا ذکر ہوا اور فرمایا گیا کہ جو ہماری ہدایت کو دل سے نہ مانے گا اور ہماری کسی نشانی کتاب یا پیغمبر یا دینی چیز کا زبان سے انکار کرے گا یا ان میں غور تامل نہ کرے گا بلکہ جانوروں کی طرح

کھانے پینے اور دنیا کے مزے اڑانے ہی کو اپنا مقصود اصلی سمجھے گا۔ وہ ہمیشہ دوزخ کی آگ میں جلے گا اور کبھی بھی وہاں سے نہ نکل سکے گا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا:** یہ کہ کفر و ایمان کے درمیان کوئی اور درجہ نہیں یعنی انسان مومن ہوگا یا کافر یہ ناممکن ہے کہ نہ مومن ہو نہ کافر کیونکہ اس آیت میں انسانوں کی دو ہی قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ لہٰذا منافقین تو کافر ہیں اور مسلمانوں کے بچے مومن کفار کے بچے شرعاً کافر، عند اللہ رب جانے، **دوسرے:** یہ کہ دوزخ اور جنت کے علاوہ کوئی مستقل جگہ نہیں اعراف ایک عارضی مقام ہوگا۔ جیسے راستے میں منزل اس کی تحقیق انشاء اللہ سورہ اعراف میں ہی کی جائے گی۔ کیونکہ قرآن پاک میں ہر جگہ ان دو ہی مقامات کا ذکر آتا ہے۔ **تیسرے:** یہ کہ دل کا کفر اور زبان کا انکار دونوں کا ایک ہی حکم ہے کیونکہ یہاں كَفَرُوْا اور كَذَّبُوْا کی ایک ہی سزا بیان فرمائی۔ **چوتھے:** یہ کہ دین کی کسی یقینی بات کا انکار درحقیقت اس کی ساری باتوں کا انکار ہے کیونکہ یہاں فرمایا گیا اٰيٰتِنَا **پانچویں:** یہ کہ ایمان کی طرح کفر میں بھی زیادتی کمی ہونا ممکن ہے یعنی سارے قرآن پاک کا منکر اور ایک آیت کا منکر یا صرف قیامت کا منکر پورے کافر ہیں۔ ان میں کوئی آدھا یا چوتھائی کافر نہیں کیونکہ اس آیت میں ہر کافر کی ایک ہی سزا بیان ہوئی ہاں ایمان کی طرح کفر کے بھی چند عارضی مرتبے ہیں۔ بعض سخت کافر، بعض ہلکا، کافر مگر اس لحاظ سے دوزخ کے طبقے اور ان کے عذاب علیحدہ علیحدہ ہیں۔ **چھٹے:** یہ کہ جس شخص تک اسلامی احکام نہ پہنچے ہوں اس کے لئے صرف اللہ کو ایک ماننا کافی ہے۔ اگر وہ موحد ہو جائے تو مومن ہوگا نہ کہ کافر کیونکہ کفر کے معنی ہیں انکار اور انکار بغیر خبر نہیں ہو سکتا اور نہ بے خبر کو منکر کہا جا سکے۔ لہٰذا حضور کے والدین کریمین کو کافر نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ وہ موحد تھے اور اسلام کے تشریف لانے سے پہلے انتقال فرما گئے اس آیت میں فرمایا گیا جو ہماری آیتوں کو جھٹلائے وہ جہنمی۔ بتاؤ انہوں نے کون سی آیات الٰہی کا انکار کیا تھا بلکہ حق تو یہ ہے کہ آدم علیہ السلام تا حضرت عبداللہ حضور کے نسب میں کوئی کافر نہ گزرا۔ انشاء اللہ اس کی تحقیق لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ (التوبہ:۱۲۸) اور تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ (شعراء:۲۱۹) میں کی جائے گی اور بفضلہٖ تعالیٰ حضور کے والدین کریمین کے ایمان کی مکمل و مفصل بحث اس پارے میں زیر آیت وَلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ (البقرہ:۱۱۹) میں کر دی گئی ہے ملاحظہ فرماؤ۔ ہماری کتاب ''شان حبیب الرحمٰن'' میں بھی دیکھو۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: جس کے دل میں ایمان ہو اور زبان سے ظاہر کرنے کا موقع نہ ملے وہ کس زمرے میں شمار ہے۔
جواب: وہ اللہ کے نزدیک مومن ہے مگر شرعاً اس کا اسلام ظاہر نہ ہونے کی وجہ سے اس کی نماز جنازہ وغیرہ نہیں پڑھ سکتے۔ **دوسرا اعتراض:** ایسا شخص جنت میں ہوگا یا دوزخ میں ہے۔ **جواب:** وہ آخر کار بغیر شفاعت جنت میں جائے گا حدیث شریف میں ہے کہ شفاعت کرنے والے رائی بھر ایمان والوں کو بھی جہنم سے نکال لے جائیں گے۔ تب رب

تعالیٰ اپنا دست قدرت بھر کر جہنمیوں کو جنت میں پہنچائے گا اس دست قدرت میں اسی قسم کے لوگ ہوں گے جن کا ایمان شرعی نہ تھا۔ **تیسرا اعتراض:** مشرکین کے بچے کس زمرے میں ہیں کیونکہ ان پر اس آیت کا کوئی جز صادق نہیں آتا۔ **جواب:** بہت ممکن ہے کہ وہ جنت میں مومنوں کے خادم بنا کر رکھے جائیں۔ مگر بہتر یہ ہے کہ ان کے متعلق خاموشی اختیار کی جائے۔ کیونکہ اس میں روایتیں مختلف ہیں۔ **چوتھا اعتراض:** ابو طالب اس آیت کے دونوں مضمونوں سے خارج معلوم ہوتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے نہ تو ہدایت اختیار کی اور نہ انکار کیا۔ ان کے اشعار سے حضور کی تعریف ثابت ہے۔ **جواب:** ان کا ایمان شرعاً ثابت نہیں ہوا صرف نعت گوئی یا حضور ﷺ کی اس لئے خدمت کرنا کہ وہ میرے بھائی کے فرزند ہیں۔ اس سے شرعاً ایمان ثابت نہیں ہوسکتا۔ ایمان نام تصدیق کا ہے۔ یعنی سچا ماننا نہ کہ محض جاننا۔ ہاں بہت ممکن ہے کہ یہ اللہ کے نزدیک مومن ہوں۔ انشاء اللہ اس کی تحقیق بھی کسی مقام پر کردی جائے گی۔

تفسیر صوفیانہ

ہر انسان فطرت (پیدائشی ایمان) پر پیدا ہوتا ہے۔ جو اس کے قلب میں تخم کی طرح ہے جنہوں نے اس تخم محبت کو نفسانی شہوات میں میں چھپا دیا اور انکار کی گرم ہواؤں سے اس کو جلا دیا۔ وحی اور الہام کے خوشگوار پانی اور ہوائیں اس تک نہ پہنچنے دیں اور اس میں معرفت قربت کے پھل نہ لگنے دیئے یہاں تک کہ اس کو فاسد کر دیا۔ وہ ہمیشہ نار فراق میں رہیں گے اور کبھی اس سے نجات نہ پائیں گے۔

حضرت آدم کے قصے کے فائدے

اس پورے واقعہ سے چند عجیب عجیب فائدے حاصل ہوئے **ایک** یہ کہ سب کا بہکانے والا شیطان اور شیطان کو بہکانے والا نفس لہٰذا نفس شیطان سے زیادہ خطرناک ہے۔ مولانا فرماتے ہیں

نفس ماہم کمتر از فرعون نیست ۔۔۔ لیک اورا عون مارا عون نیست

دوسرے: یہ کہ دنیا میں سب سے پہلا گناہ (شیطان کی نافرمانی) حسد سے ہوا۔ معلوم ہوا کہ حسد تمام گناہوں کی جڑ ہے۔ حسد کی وجہ سے نفس عقل کو ڈھک لیتا ہے۔ دیکھو حسد، حرص ہوس، طمع، سب نقطوں سے خالی ہیں۔ ایسے ہی حاسد وغیرہ بھی دنیا کی ہر نعمت سے محروم۔ **تیسرے:** یہ کہ جہاں تک شیطان براہ راست نہ پہنچ سکے وہاں عورت کے ذریعے سے پہنچتا ہے۔ جیسے کہ آدم علیہ السلام پر بذریعہ حضرت حوا اس نے حملہ کیا۔ **چوتھے:** یہ کہ نبوت اعمال سے نہیں حاصل ہوتی۔ بلکہ محض رب کے فضل سے ورنہ شیطان یا کسی فرشتے کو ملنی چاہئے تھی۔ **پانچویں:** یہ کہ پیغمبر کی توہین کرنے والے کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔ رب نہیں چاہتا کہ میری جنت میں کوئی میرے دوست کا دشمن آجائے۔ **چھٹے:** یہ کہ نبی کی توہین کے ساتھ خدا کی توحید شیطانی توحید ہے جو کہ مردود بنا دیتی ہے۔ **ساتویں:** یہ کہ انسان نے دنیا میں آکر سب سے پہلی عبادت گریہ وزاری کی اور استغفار کی۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَ
اے اولاد یعقوب کی یاد کرو احسان میرا وہ جو احسان کیا میں نے اوپر تمہارے
اے یعقوب کی اولاد یاد کرو میرا وہ احسان جو میں نے تم پر کیا اور
اَوْفُوْا بِعَهْدِيْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ ۚ وَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ ﴿۴۰﴾
اور پورا کرو عہد میرا پورا کروں گا میں عہد تمہارا اور مجھ سے ہی پس ڈرو تم لوگ
میرا عہد پورا کرو میں تمہارا عہد پورا کروں گا اور خاص میرا ہی ڈر رکھو تم لوگ

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **ایک**: یہ کہ پہلے عام انسانوں کو رب کی عام نعمتیں یاد دلا کر ایمان کی رغبت دی گئی اب خاص بنی اسرائیل کو ان سے خاص احسان الٰہی یاد دلا کر ایمان کی طرف راغب کیا گیا۔ کیونکہ سورہ بقرۃ مدنی ہے اور مدینہ منورہ میں بنی اسرائیلی بکثرت آباد تھے۔ یہ لوگ اہل علم بھی تھے اور اہل کتاب بھی۔ ان کی وہاں عزت بھی تھی ان کے ایمان لانے سے دوسرے بہت سے لوگ ایمان لے آتے اور یہ ہی لوگ نبی آخر الزمان کی خوشخبریاں بھی دیا کرتے تھے۔ **دوسرے**: یہ کہ اس سے پہلے عام لوگوں کو وہ عہد و پیمان یاد دلائے گئے تھے جو انہوں نے میثاق کے دن رب سے کئے تھے۔ اب بنی اسرائیل کو وہ خاص عہد و پیمان یاد دلائے جا رہے ہیں جو کہ ان سے خاص طور لئے تھے۔ **تیسرے**: یہ کہ بنی اسرائیل کا قصہ حضرت آدم کے قصے کے مطابق تھا کہ آدم علیہ السلام سے بھی ایک خطا کی وجہ سے جنت کا عیش و آرام چھوٹا۔ دنیا کی مشقتیں پڑ گئیں بنی اسرائیل سے بھی ایک خطا کی وجہ سے من و سلویٰ چھوٹا اور ان پر دنیاوی مصیبتیں نازل ہوئیں۔ **چوتھے**: یہ کہ پہلے معلوم ہو چکا کہ شیطان کو حسد نے تباہ کر دیا کہ وہ آدم علیہ السلام سے پہلے اپنے آپ کو خلافت کا حقدار سمجھتا تھا۔ آدم علیہ السلام کی قدر و منزلت اس سے دیکھی نہ گئی اور ان کا انکار کر کے ملعون ہوا۔ کفار بنی اسرائیل بھی حضور علیہ السلام کی تشریف آوری سے پہلے سمجھتے تھے کہ پہلے پیغمبروں کی طرح نبی آخر الزمان بھی بنی اسرائیل ہی میں سے ہوں گے۔ مگر جب بنی اسمٰعیل میں سے حضور تشریف فرما ہوئے تو یہ لوگ حسد سے منکر ہو گئے۔ نیز حضور سے پہلے مدینہ منورہ میں علماء بنی اسرائیل کی بہت عزت اور ان کو کافی آمدنی تھی مگر حضور علیہ السلام کی تشریف آوری سے ان کی قدر و منزلت نہ رہی جس کی وجہ سے بعض تو کھلے دشمن بن گئے اور بعض منافق لہٰذا اب ان کو خطاب ہو رہا ہے کہ اے بنی اسرائیل تم شیطان کے واقعہ سے عبرت حاصل کرو۔ وہ بھی حسد ہی کا شکار ہوا تھا کہیں تم بھی حسد سے اس کی طرح نہ ہو جاؤ۔ یہاں سے ''سَيَقُوْلُ'' تک ان سے ہی کلام جاری ہے۔ **پانچویں**: اس طرح کہ اس سے پہلے آدم علیہ السلام کے واقعات بیان فرما کر حضور علیہ السلام کی نبوت ثابت فرمائی گئی کہ اگر ہمارے محبوب علیہ السلام سچے پیغمبر نہ ہوتے تو بغیر پڑھے ہوئے گذشتہ واقعات اس طرح سچے اور صحیح کیسے بیان فرما دیتے۔ اب بنی اسرائیل کے گزرے ہوئے سارے واقعات بلا کم و کاست بیان ہو رہے ہیں۔

تا کہ یہ لوگ ان واقعات کو اپنی کتابوں کے موافق پا کر حضور علیہ السلام کی نبوت کے قائل ہوں۔اس کے سوا اور بھی وجوہ تعلق نکل سکتے ہیں مگر اتنے ہی میں کفایت ہے یہ قصے کا قصے سے تعلق تھا۔آیات کا تعلق ہر آیت کے ساتھ انشاء اللہ بیان ہوگا۔

تفسیر

یٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ ہم پہلے بتا چکے ہیں ندا چار طرح کی ہوتی ہے یہاں غافلوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی ندا ہے۔ بنی ابن کی جمع ہے بنین بھی آتی ہے اور ابناء بھی یہاں پہلی جمع ہے اگر چہ ابن لفظی بیٹے کو کہتے ہیں مگر اصطلاح میں اولاد کے معنی میں بولا جاتا ہے خواہ بیٹی ہو یا بیٹا اور خواہ قریبی ہوں یا دور کے جیسے بنی آدم اس معنی میں یہ بنی ہے۔اسرائیل حضرت یعقوب کا لقب ہے۔آپ کا نام یعقوب تھا۔یعقوب عقب سے بنا ہے۔جس کے معنی ہیں پیچھے چونکہ حضرت یعقوب اور ان کے بھائی عیص ایک ساتھ (جڑواں پیدا ہوئے تھے مگر حضرت عیص کسی قدر پہلے اور یعقوب پیچھے۔اس لئے ان کا نام یعقوب ہوا، یہ اپنے والد اسحٰق علیہ السلام کے بہت خدمت گزار فرزند تھے،ایک دفعہ حضرت اسحٰق عبادت کے لئے گوشہ نشین ہوئے اور ان کو دروازہ حجرہ پر بٹھا دیا کہ کسی کو اندر نہ آنے دینا،اچانک ایک مقرب فرشتہ انسانی شکل میں آیا اور حضرت اسحٰق کی ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا،آپ نے منع کیا مگر وہ نہ مانا،انہوں نے اس کو جبراً روکا حضرت اسحٰق علیہ السلام دروازے کا شور سن کر باہر آئے دیکھا تو حضرت یعقوب فرشتہ سے جھگڑ رہے ہیں انہوں نے فرمایا کہ برخوردار یہ فرشتہ مقرب ہے اور فرشتہ سے معذرت فرمائی کہ انہوں نے آپ کو پہچانا نہیں۔اس نے یعقوب علیہ السلام کی بہت تعریف کی اور فرمایا کہ اسی طرح حق خدمت ادا کرنا چاہئے اور فرمایا کہ ہماری طرف سے ان کا نام اسرائیل رکھو "تفسیر عزیزی" اسرائیل دو لفظوں سے بنا ہے اسرا اور ایل اسرا کے معنی یا تو بندہ ہے اور یا برگزیدہ اور ایل زبان عبرانی میں حق تعالیٰ کا نام ہے لہٰذا اسرائیل کے معنی یا تو ہیں اللہ کا بندہ یعنی عبد اللہ اور یا اللہ کا مقبول بندہ۔چونکہ یہ نام فرشتے نے تجویز کیا اس لئے فرشتوں کا سا ہی نام ہے جیسے جبرائیل، میکائیل، اسرافیل وغیرہ خیال رہے کہ ان کی اولاد کا نام بنی اسرائیل ہوا نہ کہ بنی یعقوب کیونکہ یہ نام حضرت یعقوب کو خدمت کے صلہ میں ملا تھا۔ان کی اولاد کو بنی اسرائیل فرمانے میں ان کو اطاعت الٰہی کی رغبت دینا ہے کہ تم اس کے فرزند ہو جس نے اطاعت کر کے ہماری طرف سے اعلیٰ خطاب پایا تم بھی اپنے خطاب یافتہ والد کے نقش قدم پر چل کر اچھے خطاب حاصل کرو۔بنی اسرائیل کے باقی واقعات اور یعقوب علیہ السلام کے کچھ حالات انشاء اللہ اسی آیت کے خلاصہ تفسیر میں بیان ہوں گے **اُذۡکُرُوۡا** یہ لفظ یا تو ذکر ذال کے پیش سے بنا ہے۔جس کے معنی ہیں یاد رکھنا یعنی بھول نہ جانا۔یا ذکر ذال کے زیر سے۔جس کے معنی ہیں بیان کرنا جس کا مقابل ہے خاموشی۔لہٰذا یا تو اس کے معنی ہوئے کہ اللہ کی نعمتوں کو یاد رکھو۔ان کا چرچا کرو۔(تفسیر روح البیان) ہم کو بھی حکم ہے **وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ** (الضحیٰ:۱۱) رب کی نعمت، اپنے گناہ، دوسروں کے اچھے سلوک یاد رکھنا۔یاد کرنا عبادت ہے حضور نے آخر تک ابوبکر صدیق اور انصار کے سلوک کی تعریف فرمائی۔رب کے امتحانات، اپنی نیکیاں دوسروں کی بدسلوکی بھول جانا عبادت ہے فتح مکہ کے بعد حضور نے اہل مکہ کی ایذاؤں کا تذکرہ بھی نہ کیا۔یوسف علیہ السلام نے بھائیوں کی ایذاؤں کی شکایت والد سے نہ کی۔**نِعۡمَتِیَ** نعمت اس نفع کو کہتے ہیں جو بطریق احسان کسی کو پہنچایا جائے یہاں اس

سے جنس نعمت مراد ہے نہ کہ خاص ایک نعمت یعنی اس نعمت وکرم کو یاد کرو جو کہ خاص تم پر کئے گئے جیسے فرعون کو ہلاک کرنا تمہیں مصر کا ملک دینا تمہارے لئے دریا کو خشک کرنا تم پر من وسلویٰ برسانا، تم کو توریت شریف عطا فرمانا تمہارے لئے پتھر سے پانی کے چشمے نکالنا تمہارے گروہ میں پیغمبروں کا بھیجنا وغیرہ وغیرہ یہ نعمتیں اگرچہ تمہارے باپ دادا کو ملیں مگر باپ دادوں پر احسان اولاد پر احسان ہے اس لئے تم اس احسان کو یاد رکھو اور شکر یہ ادا کرو۔ اَلَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ یعنی وہ نعمتیں جو ہم نے خاص تم کو عطا فرمائیں یعنی تم کو ایک تو عام لوگوں کے ساتھ نعمتوں سے حصہ دیا۔ اور ان کے علاوہ خاص وہ نعمتیں دیں جو تمہارے سوا دوسرے قبیلوں کو نہ ملیں چونکہ زیادہ نعمتیں زیادہ شکر کا باعث ہیں لہٰذا بمقابلہ دوسروں کے تم کو بہت جلد ایمان لانا چاہئے بلکہ خود حضور ﷺ کی تشریف آوری تمہارے واسطے خصوصاً بڑی نعمت ہے کیونکہ ان کی تشریف آوری سے تمہاری کتابوں تمہارے پیغمبروں کا دنیا بھر میں قیامت تک کے لئے پرچار ہوگا۔ خیال رہے کہ ایک لحاظ سے حضور سارے جہان کے لئے نعمت الٰہی ہیں۔ وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (الانبیاء: ۱۰۷) کہ حضور کی برکت سے دنیا کو عذاب سے امن ملا انہیں ہر قسم کی نعمتیں مل رہی ہیں۔ دوسرے لحاظ سے حضور صرف مومنوں کے لئے رحمت ہیں۔ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ (التوبہ: ۱۲۸)۔ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ (آل عمران: ۱۶۴) حضور کی طفیل انہیں ایمان قرآن رحمان وغیرہ ملے تیسرے لحاظ سے حضور گذشتہ نبیوں کے لئے نعمت کہ ان سب کی تصدیق حضور کے طفیل ہوئی ان کے نام کے ڈنکے بجائے گئے خصوصاً حضرت عیسیٰ و مریم و سلیمان علیہ السلام پر کہ ان کو یہود نے تہمتیں لگائیں حضور کے طفیل وہ دور ہوئیں چوتھے اعتبار سے حضور بنی اسرائیل کے لئے رحمت کہ یہ لوگ دنیا بھر میں حضور کی آمد کا اعلان کرتے پھرتے تھے۔ حضور کی آمد سے وہ سب سچے ہو گئے جو انتیس کے چاند کا اعلان کرے پھر چاند ہو جائے تو یہ سچا ہو جاتا ہے۔ پانچویں اعتبار سے حضور اگلی کتابوں کے لئے نعمت کہ ان کی تصدیق حضور نے کی وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْۤ۔ اَوْفُوْا، وَفَاءٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں پورا کرنا۔ عہد باہمی قرارداد اور آپس کے معاہدے کو کہتے ہیں مطلب یہ ہوا کہ اے بنی اسرائیل تم نے جو کچھ ہم سے عہد و پیمان کر لیا ہے اب وہ پورا کرو اس عہد میں چند احتمالات ہیں ایک یہ کہ حق تعالیٰ نے سارے بندوں سے اپنی ذات وصفات اور تمام پیغمبروں پر ایمان لانے کا عہد لیا تھا جس میں بنی اسرائیل بھی شامل تھے تو مطلب یہ ہوا کہ سب ہی کو عہد پورا کرنا ضروری ہے۔ مگر تم کو خاص طور پر زیادہ ضروری کیونکہ تم پر سرکاری انعام زیادہ ہوئے دوسرے یہ کہ اس سے خاص وہ عہد مراد ہے جو بنی اسرائیل سے لیا گیا جس کا ذکر اس آیت میں ہے وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِیْثَاقَ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَیْ عَشَرَ نَقِیْبًا (مائدہ: ۱۲) تیسرے یہ کہ اس سے نبی آخر الزمان پر ایمان کا عہد مراد ہے اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ (اعراف: ۱۵۷) چوتھے یہ کہ اس سے وہ عہد مراد ہے جو حضرت آدم کے جنت سے اترتے وقت لیا گیا تھا کہ جب ہماری طرف سے ہدایت پہنچے تو اس کی پیروی کریں پانچویں یہ کہ اس سے وہ عہد مراد ہے جو تمام پیغمبروں سے نبی آخر الزمان کی اطاعت کرنے کا لیا گیا تھا۔ چونکہ نبی کا عہد ساری امت کا عہد ہوتا ہے اس لئے فرمایا جا رہا ہے کہ اے بنی اسرائیلو اگر تمہارے پیغمبران عظام ہی بظاہر دنیا میں جلوہ گر ہوتے تو اس نبی پر ایمان لاتے

خوش قسمتی سے تم کو یہ موقع ملا ہے تم فوراً وہ عہد پورا کردو۔ چھٹے یہ کہ اس سے یہ عہد مراد ہے جو اہل کتاب سے لیا گیا کہ ہمارے نبی آخر الزمان کے اوصاف جو تورات وانجیل میں ہوں ان کو نہ چھپائیں اور نہ مٹائیں فرمایا جارہا ہے کہ اے بنی اسرائیل اس عہد کو پورا کرنے کا وقت اب آیا ہے۔ اٹھو ہاتھ میں تورات وانجیل لو اس محبوب کے اوصاف لوگوں کو سناؤ اور سب کو ان کی طرف بلاؤ اور رب جانتا ہے کہ اگر علماء اہل کتاب حضور کے اوصاف جو پچھلی کتابوں میں تھے نہ چھپاتے تو میرے خیال میں کوئی عیسائی اور یہودی کافر نہ رہتا سب اسلام لے آتے انشاءاللہ حضور کے اس قسم کے اوصاف ہم اس تفسیر میں آئندہ بیان کریں گے۔ اور اپنی کتاب شان حبیب الرحمن میں بھی بیان کر چکے ہیں۔ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ سبحان اللہ کیا پیارا اور امید افزا ارشاد ہے۔ رب فرمارہا ہے تم میرا عہد پورا کرو میں تمہارا عہد پورا کروں گا۔ خیال رہے کہ پہلے جملہ میں عہد کی اضافت فاعل کی طرف ہے اور دوسرے میں مفعول کی طرف تو معنی یہ ہوئے کہ تم وہ عہد پورا کرو جو میں نے تم سے لیا میں وہ عہد پورا کروں گا جو میں نے اپنے کرم سے تم سے کرلیا ہے۔ رب نے بھی ہم سے اپنے فضل سے، بہت سے وعدے فرمائے ہیں۔ (۱) تمہارے اعمال قبول فرمائے جائیں گے۔ (۲) تم کو جنت میں واپس بلایا جائے گا۔ (۳) تمہارے گناہ معاف کئے جائیں گے۔ (۴) تم کو دین و دنیا کے غم سے نجات دی جائے گی۔ (۵) تم کو عزت وعظمت بلکہ سلطنت دی جائے گی۔ (۶) تم کو اپنا دیدار کرایا جائے گا مگر یہ تمام عہد اس صورت میں ہیں کہ تم اس محبوب کے وفادار رہو۔

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

خلاصہ یہ ہوا کہ اول تو یوں بھی مرد کو اپنی زبان کا پاس چاہیے جو کہے وہ کر کے دکھائے تم بھی میرا عہد پورا کر کے دکھادو دوسرے یہ عہد تو رب کے ساتھ نفع بخش تجارت بھی ہے کہ ایک عہد پورا کرو ہزار گنا نفع لو پھر عہد توڑنا سراسر نافرمانی اور نامردی کی بات ہے۔

علماء بنی اسرائیل کو خطرہ تھا کہ اگر ہم اسلام قبول کرلیں تو ہماری وہ آمدنیاں بند ہوجائیں گی اور نذریں نیازیں اور تحفے ہدیے وغیرہ ختم ہوجائیں گے جو ہم کو اپنے جہلاء سے حاصل ہوتے ہیں نیز وہ ہماری سرداری بھی جاتی رہے گی جو ہم کو اب حاصل ہے ان کو فرمایا گیا کہ دنیا والوں اور یہاں کی مصیبتوں وغیرہ سے نہ ڈرو بلکہ ہم سے خوف کرو یعنی ایمان میں تم کو دینوی نقصان ہے اور ایمان نہ لانے میں ہماری ناراضی جو دنیا اور آخرت کا وبال ہے اور اس سے یہ زیادہ سخت ہے لہٰذا ہم سے خوف کرکے ایمان لے آؤ خیال رہے کہ ڈر دو قسم کا ہوتا ہے عذاب سے اور جلال سے۔ پہلا ڈر تو دور ہوسکتا ہے۔ دوسرا نہیں یعنی خوف جلال ہر وقت رہتا ہے اسی لئے یہاں اِیَّایَ فرمایا گیا یعنی میری کبریائی اور جلالت ذات سے ڈرو یہ نہ کہا وَعِقَابِیْ فَارْهَبُوْنَ یہ بھی خیال رہے کہ خوف اور رہب میں فرق ہے۔ خوف تو محض ڈر جانا ہے اور رہب ڈر کر برائیوں سے رک جانا کہ جب اللہ کا عذاب سنا دل کانپ گیا۔ چار آنسو بہہ گئے یہ خوف ہوا اور اللہ کی پکڑ سے ڈر کر گناہوں سے توبہ کرلی اور پھر ان کے قریب نہ گئے۔ یہ رہب ہوا۔ یہاں فرمایا گیا کہ مجھ سے ڈر کر میرے محبوب ﷺ کی مخالفت سے باز آجاؤ۔

خلاصہ تفسیر

بنی اسرائیل خوف اور حسد کی وجہ سے اسلام قبول نہ کرتے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ نبی آخر الزمان بھی ہمارے ہی خاندان سے ہوں گے۔ جب اولاد اسمٰعیل میں یہ آفتاب چمکا۔ یعنی حضور ﷺ کی جلوہ گری ہوئی تو یہ لوگ جل کر سیاہ خاک ہو گئے۔
حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ اے بے وقوفو تم اپنے انعامات کو بھی یاد کرو کہ تم میں انبیاء علیہم السلام بھیجے۔ کتابیں نازل فرمائیں۔ تمہیں غلبہ دیا حکومت اور عزت عنایت کی دولت اور سلطنت عطا فرمائی۔ جلالت وحشمت تمہارے حصہ میں آئی۔ علم وفضل تمہیں دیا گیا جاہ وجلال تمہیں بخشا گیا اب اگر آخری نبی بنی اسمٰعیل میں تشریف لے آئے تو اس میں تمہارا کیا بگڑ گیا۔ کیا رب کی ساری نعمتوں کے تم ہی ٹھیکیدار ہو۔ اس حسد سے باز آ جاؤ اور اپنی تمام نعمتوں کو یاد کر کے اپنا وہ وعدہ پورا کرو جو تم نے ہم سے کیا تھا کہ جب نبی آخر الزمان تشریف لائیں گے تو ہم ان پر ایمان لائیں گے ہم نے جو تم سے وعدہ کیا ہے پورا کر دیں گے یعنی تم کو غلبہ دیں گے اور دنیوی نعمتوں سے مالا مال کر دیں گے اور تم کو جو اپنی آمدنی وغیرہ بند ہونے کا ڈر لگا ہے اس کو دل سے نکال دو صرف ہم سے خوف کرو اگر تم ایمان لے آئے تو دیکھنا کہ تمہاری عزت وآبرو مال ودولت وغیرہ میں ترقی ہوگی۔
رب تعالیٰ نے بندوں سے دو قسم کے وعدے کئے ہیں ایک غیر مشروط جیسے رزق اور دنیاوی نعمتیں کہ فرمایا نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ (الاسراء:۳۱) دوسرا مشروط اگر تم مومن و پرہیزگار بنو گے تو تم کو جنت مغفرت دنیا میں عظمت وسلطنت معرفت وغیرہ بخشیں گے فرمایا اَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران:۱۳۹) یہاں دوسرا وعدہ مراد ہے دنیا کی نعمتیں دولھا کی نچھاور ہیں جسے دوست دشمن سب پاتے ہیں مگر آخرت کی نعمتیں برات کا کھانا یا جوڑے ہیں جو اپنوں کو دیئے جاتے ہیں غیروں کو نہیں مگر افسوس کہ ہم کو دنیا کی فکر ہر دم ہے آخرت کی فکر بالکل نہیں رب کرم فرمائے۔

بنی اسرائیل

حضرت ابراہیم بابل کے شہر کسدیون میں رہتے تھے جس کا دوسرا نام آر تھا وہاں سے آپ کے باپ تارخ اپنے بیٹے ابراہیم اور پوتے لوط اور حضرت ابراہیم کی بیوی سارہ کو لے کر وہاں سے جنوب کی طرف سے مقام حراں میں آ بسے وہاں ہی تارخ نے وفات پائی پھر وہاں سے ابراہیم اپنی بیوی سارہ اور لوط کو لے کر کنعان میں آئے اور حیتوں کے علاقے میں مقام خبرون میں قیام فرمایا آپ کی دو بیبیاں تھیں بڑی بیوی حضرت سارہ اور چھوٹی حضرت ہاجرہ اور آپ کے آٹھ بیٹے تھے حضرت سارہ سے ایک بیٹا حضرت ہاجرہ سے سات حضرت اسماعیل جو سب سے بڑے تھے زمران، یسقان، مدان، مدیان، اسباق، سوخ (تفسیر حقانی) ان میں سے اسمٰعیل عرب میں آن بسے تھے۔ ان کی اولاد کو بنی اسمٰعیل کہتے ہیں اور انہیں میں سے حضرت محمد مصطفیٰ علیہ السلام، مگر اسحاق کنعان میں ہی رہے اسحاق نے حضرت لوط کی لڑکی سے نکاح کیا جن سے دو بیٹے ایک ہی حمل سے پیدا ہوئے ایک عیص اور دوسرے یعقوب اسحاق نے اپنی آخر عمر میں ان دونوں کو اپنا سجادہ نشین بنایا اور یعقوب کو دعا دی کہ حق تعالیٰ تمہاری اولاد میں نبوت جاری رکھے اور عیص سے فرمایا کہ تمہاری نسل میں بادشاہت رہے پھر حضرت یعقوب

علیہ السلام کو اپنا جانشین بنا کر وصال فرما گئے۔ عیص بہت مالدار ہو گئے اور یعقوب علیہ السلام بہت مسکین۔ ان کی والدہ نے مشورہ دیا کہ اے یعقوب تمہارا یہاں رہنا مناسب نہیں۔ تم اپنے ماموں لایان کے پاس چلے جاؤ وہ مالدار آدمی ہیں تمہاری پرورش کریں گے اور ممکن ہے کہ اپنی بیٹی سے تمہارا نکاح بھی کر دیں۔ یعقوب علیہ السلام اپنے ماموں کے گھر آ گئے وہ ان کے آنے سے بہت خوش ہوئے اور کچھ روز کے بعد اپنی بڑی بیٹی سے نکاح بھی کر دیا۔ جس سے چار بیٹے پیدا ہوئے۔ روبیل، شمعون، لاوا، یہودا اس کے بعد یعقوب علیہ السلام کی بیوی انتقال کر گئیں، لایان نے اپنی دوسری بیٹی ان کے نکاح میں دے دی جس سے دو بیٹے پیدا ہوئے اور یہ بھی انتقال کر گئیں پھر لایان نے تیسری بیٹی ان کے نکاح میں دے دی جس سے چند بیٹے پیدا ہوئے اور یہ بھی انتقال کر گئیں پھر لایان کی چوتھی بیٹی آپ کے نکاح میں آئیں جن کا نام راحیل تھا انہی سے یوسف علیہ السلام اور بنیامین پیدا ہوئے اب یعقوب علیہ السلام کی عمر چالیس سال ہو چکی تھی ان کو نبوت ملی اور حکم ملا کہ کنعان جا کر تبلیغ کرو۔ لایان اپنے داماد کی نبوت پر بہت خوش ہوئے اور یعقوب علیہ السلام کو مع ان کی بیوی راحیل اور ان کی ساری اولاد کے رخصت کیا اور رخصت کے وقت پانچ سو بکریاں اور پانچ سو بیل اور پانچ سو اونٹ اور پانچ سو خچر جہیز دیا۔ بہت سے غلام بہت سے جوڑے اور بہت سا روپیہ ان کو دیا۔ جب آپ اس ساز و سامان سے کنعان پہنچے تو عیص نے ان کا استقبال کیا اور ان کی آمد کی بڑی خوشی منائی اور عرض کیا کہ میرے لئے بھی دعا کرو کہ میری نسل میں بھی کوئی پیغمبر ہو۔ آپ نے فرمایا کہ تمہاری اولاد میں ایوب اور سکندر ذوالقرنین ہوں گے یوسف علیہ السلام دو برس کے تھے کہ ان کے بھائی بنیامین پیدا ہوئے اور ان کی پیدائش میں ان کی والدہ راحیل کا انتقال ہو گیا۔ جب لایان نے یہ واقعہ سنا تو انہوں نے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی کا نکاح بھی یعقوب علیہ السلام سے کر دیا اور اس بیٹی نے یوسف علیہ السلام اور بنیامین کی پرورش کی (تفسیر عزیزی) یعقوب علیہ السلام کے کل بارہ بیٹے تھے۔ روبیل، شمعون، لاوی، یہودا، اسکار، زبلون، دان، تختالی، جد، اشر، یوسف، بنیامین۔ ان بارہ بیٹوں کی اولاد بہت ہوئی اور ان کے نام سے بارہ قبیلے مشہور ہوئے ہر ایک قبیلے کو سبط کہتے ہیں جس کی جمع ہے اسباط ان قبیلوں میں بڑے بڑے اولوالعزم پیغمبر پیدا ہوتے رہے جیسے حضرت موسیٰ، داؤد، سلیمان و عیسیٰ علیہم السلام انہی قبیلوں کو بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ یہ لوگ روئے زمین پر بڑے متبرک مانے جاتے ہیں حضور علیہ السلام کے زمانہ میں مدینہ منورہ اور خیبر وغیرہ میں بکثرت آباد تھے۔ اب بھی کہیں کہیں پائے جاتے ہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **ایک:** یہ کہ اللہ کی نعمتوں کا ذکر کرنا حکم قرآنی ہے کیونکہ بنی اسرائیل کو اس کا حکم دیا گیا۔ لہٰذا محفل میلاد شریف بہت مبارک ہے کیونکہ اس میں حضور علیہ السلام کی تشریف آوری کا ذکر ہوتا ہے جو کہ سب سے بڑی نعمت ہے۔ دوسری جگہ قرآن پاک فرماتا ہے قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا (یونس: ۵۸) یعنی اللہ کی رحمت پر خوب خوش رہو اسی طرح گیارہویں شریف، عرس بزرگان وغیرہ کہ یہ تمام محفلیں ان بزرگوں کی یادگاریں قائم کرنے اور ان کی سوانح حیات لوگوں کو سنا کر انہیں عبادتوں کی رغبت دینے کیلئے کی جاتی ہیں۔ حج، قربانی، روزے رمضان

وغیرہ سب میں اللہ کی نعمتوں کی یاد ہی ہے ان یادگاروں کی اصل یہ آیت اور اس جیسی دوسری آیات ہیں اگرچہ بعض لوگوں نے ان امور خیر میں بدعات ناچ گانا وغیرہ شامل کر دیا۔ مگر اس شمول سے اصل عرس حرام نہ ہوگا۔ جیسے شادیوں میں باجہ گانا بجانا شامل ہونے سے نکاح حرام نہیں یا جیسے کعبہ معظمہ میں بت رکھ دیئے گئے تھے تو کعبہ کو نہیں ڈھایا گیا بلکہ بت نکال دیئے گئے ایسے ہی خدا موقع دے تو ان برائیوں کو دور کر دیا جائے۔ یادگاریں نہ مٹاؤ مسجد میں کتا گھس جائے تو کتا نکالو مسجد نہ گراؤ **دوسرا:** یہ کہ نعمت کا شکر اور وعدہ پورا کرنا بہت ضروری ہے۔ **تیسرا:** یہ کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ اللہ کے سوا کسی سے خوف نہ کریں چوتھا یہ کہ امت محمد مصطفیٰ ﷺ بنی اسرائیل سے افضل ہیں کیونکہ ان سے تو کہا گیا ہے کہ تم میری نعمتوں کو یاد کرو اور ہم سے ارشاد ہوا فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ (البقرہ: ۱۵۲) تاکہ ان کی نظر نعمت سے منعم کی طرف جائے اور ہماری نظر منعم سے نعمت کی طرف پانچواں یہ کہ جس قدر زیادہ نعمت ہوگی اسی قدر نافرمانی کرنا زیادہ وبال۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ خدا کے سوا کسی سے خوف نہ کرنا چاہئے پھر تم نبیوں، ولیوں سے کیوں خوف کرتے ہو (دیوبندی وہابی) **جواب:** اس کا جواب لَا خَوْفٌ کی تفسیر میں گزر چکا ہے انبیاء اولیاء سے خوف حقیقت میں رب سے خوف ہے۔ خدا کے مقابلہ میں کسی سے خوف کرنا جرم ہے تم بھی بادشاہوں اور حاکموں سے خوف کرتے ہو۔

تفسیر صوفیانہ

رب تعالیٰ نے ایمان فطری اور عقل سلیم دلائل قوی سب کو عطا فرما کر بڑا احسان فرمایا پھر پیغمبروں کو بھیج کر کتابیں اتار کر علماء ومشائخ کو قائم فرما کر ہم سے ایمان اور نیک اعمال کا عہد لیا اور اپنے فضل و کرم سے اپنے دیدار کا وعدہ فرمایا۔ ہماری طرف سے پہلا وفائے عہد کلمہ شہادت پڑھنا ہے اور رب کی طرف سے ہمارے جان و مال کا محفوظ فرمانا ہے ہماری آخری وفاء عہد دریائے توحید میں اس طرح غرق ہو جانا ہے کہ اپنی بھی خبر نہ رہے لا الہ کی تلوار سے غیر اللہ کو قتل کر دینا اور الا اللہ میں فنا ہو کر باقی باللہ بن جانا رب تعالیٰ کی طرف سے دائمی دیدار کا عطا ہونا اس کے درمیان وفائے عہد کے صدہا درجات اور اس طرف سے عطا کے ہزارہا درکات ہیں۔ امام قشیری فرماتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ اے بندو تم دار الحجاب یعنی دنیا میں میرا عہد پورا کر دو میں دار قربت یعنی جنت میں تمہارا عہد پورا کروں گا۔ تم ہمیشہ ربی ربی کہہ کر میرا عہد پورا کرو۔ میں اس کے جواب میں عبدی عبدی کہہ کر اپنا عہد پورا کروں گا۔ تم دار الفراق میں میرا عہد پورا کرو کہ میرے سوا کسی کو مت ڈھونڈو۔ میں دار الوصال میں اپنا عہد پورا کروں گا کہ اپنے سوا اور کسی کی طرف نہ بھیجوں گا تم میرے ہو جاؤ میں تمہارا ہو جاؤں گا

ہر سو دود آں کس ز در خویش براند آں را کہ بخواند بدر کس نہ دواند

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ

اور ایمان لاؤ ساتھ اس کے جو اتاری میں نے سچا کرنے والی واسطے اس کے جو ساتھ تمہارے اور نہ ہو تم

اور ایمان لاؤ اس پر جو میں نے اتارا اس کی تصدیق کرتا ہوا جو تمہارے ساتھ ہے اور سب سے پہلے
كَافِرٍ بِهٖ ۖ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۫ وَّاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ ﴿۴۱﴾
پہلے منکر ساتھ اس کے اور نہ خرید و بدلے آیتوں میری کے قیمت تھوڑی اور مجھ سے ہی پس ڈرو تم
اس سے منکر نہ بنو اور میری آیتوں کے بدلے تھوڑے دام نہ لو اور مجھ سے ڈرو

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ ایک یہ کہ پہلے عہد پورا کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اب اس کی تفصیل فرمائی جا رہی ہے چونکہ عہد بہت تھے۔ اور ان سب میں ایمان مقدم اس لئے پہلے اسی کا ذکر ہوا دوسرے یہ کہ پہلے اجمالاً نعمت الٰہی کے یاد کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اب اس کی تفصیل فرمائی گئی کہ اے بنی اسرائیل قرآن کریم اور نبی آخر الزمان تمہارے حق میں خاص طور پر بڑی نعمت ہیں کیونکہ ان سے تمہاری کتابوں وغیرہ کی تصدیق ہوتی ہے۔ لہٰذا فوراً مان جاؤ۔

شان نزول

یہ آیت کعب ابن اشرف اور دوسرے رؤسا اور علماء یہود کے حق میں نازل ہوئی جو اپنی قوم کے جاہلوں سے روپیہ وصول کرتے تھے اور ان کی پیداوار میں اپنے حصے مقرر کر رکھے تھے انہیں فکر ہوئی کہ توریت میں جو حضور ﷺ کی نعت موجود ہے اگر ہم اس کو ظاہر کر دیں یا خود حضور پر ایمان لے آئیں تو ہماری قوم بھی ان پر ایمان لے آئے گی۔ اور ہماری یہ آمدنی جاتی رہے گی۔ اس لئے انہوں نے توریت کو بدل ڈالا اور جب لوگ ان سے پوچھتے کہ توریت میں نبی آخر الزمان کے کیا اوصاف مذکور ہیں تو وہ چھپا لیتے اور ہرگز نہ بتاتے (تفسیر خزائن العرفان و تفسیر خازن) روح البیان نے اس جگہ فرمایا کہ ایک بار کعب ابن اشرف نے علماء یہود سے کہا کہ تم حضور علیہ السلام کے بارے میں کیا کہتے ہو انہوں نے کہا کہ وہ سچے نبی ہیں۔ کعب بولا اگر تم کچھ اس کے خلاف جواب دیتے تو میں تم کو انعام دیتا وہ کہنے لگے کہ ہم نے بغیر سوچے سمجھے کہہ دیا کہ سوچنے کا موقع دو۔ کعب نے کہا اچھا سوچ لو۔ یہ لوگ اس مجلس سے اٹھے اور حضور کی نعت توریت سے نکال دی اور نبی آخر الزمان کی وہ نعتیں بیان کیں جو دجال کی ہیں۔ پھر کعب سے آ کر کہا تب اس نے ہر ایک عالم کو چار چار سیر جو اور چار چادریں دیں۔ اس موقع پر یہ آیت کریمہ اتری۔ مثنوی شریف میں ہے۔

بود در انجیل نام مصطفیٰ آں سر پیغمبراں بحر صفا
بود ذکر حلیہا و شکل او بود ذکر غز و صوم و اکل او

نیز علماء یہود اپنے جہلاء سے کچھ رشوت لے کر توریت کے سخت احکام بدل کر نرم کر دیتے تھے بلکہ امراء یہود کی طرف سے ان علماء کی تنخواہیں اس لئے مقرر تھیں کہ جب کبھی ہم کو ضرورت پڑے تو دین کے احکام بدل دیا کرو۔

تفسیر

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ۔ یہ خطاب ان بنی اسرائیل سے ہے جو حضور ﷺ کے زمانے میں موجود تھے۔ جیسے کہ اُذْكُرُوْا اور

اَوْفُوْا میں خطاب ان سے تھا پھر قیامت تک کے بنی اسرائیل کو یہ حکم شامل ہو گیا مَا اَنْزَلْتُ میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ اس سے صرف قرآن کریم مراد ہو دوسرے یہ کہ اس سے قرآن پاک اور صاحب قرآن علیہ السلام اور ان کے تمام فرمان مراد ہوں (تفسیر کبیر) اس لئے بالقرآن نہ فرمایا۔ بلکہ اتنی دراز عبارت ارشاد ہوئی خیال رہے کہ حدیث و قرآن سب ہی اللہ کا اتارا ہوا ہے قرآن کے الفاظ اور معنی سب، حدیث کے صرف معنی، اور الفاظ حضور کے ہیں۔ بلکہ قرآن کا قرآن ہونا بھی حدیث سے ہی معلوم ہوا حضور کی زبان پر خدا ہی بولتا ہے اور یہ فرق کہ یہ الفاظ خدا کے ہیں۔ اور یہ الفاظ حضور کے حضور ہی کے بتانے سے معلوم ہوگا۔ یہ بتانا حدیث ہے صوفیائے کے نزدیک اَنْزَلْتُ حضور ہیں قرآن کی طرح حضور بھی منزل من اللہ ہیں آپ پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی ہر ادا پر ایمان لائے خیال رہے کہ اس جگہ بالقرآن نہ فرمایا بلکہ مَا اَنْزَلْتُ فرمایا اس میں اشارہ اس جانب ہے کہ اے بنی اسرائیل تم ان تورات و زبور و انجیل وغیرہ پر اس ہی لئے تو ایمان لائے ہو کہ وہ ہماری اتاری ہوئی ہیں۔ لہٰذا قرآن بھی ہمارا اتارا ہوا ہے تمہارا فرض ہے کہ اس پر ایمان لاؤ جیسے کہ ایک آسمانی کتاب کے بعض حصے کا انکار کفر ہے۔ ایسے ہی کسی پوری کتاب آسمانی کا انکار کرنا بھی کفر ہے اور جیسے کہ تم نے موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کو اس لئے مانا کہ ہمارے پیغمبر ہیں اسی طرح نبی آخر الزمان کو بھی مان لو تم کو معلوم ہے کہ یہ قرآن میرا اتارا ہوا ہے کیونکہ یہ معجزہ ہے اور سراسر ہدایت اور پھر لطف یہ کہ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ تمہاری کتابوں کی تصدیق فرمانے والا بھی ہے خیال رہے کہ اس مع میں بھی چند احتمال ہیں یا یہ کہ اس سے پہلی آسمانی کتابیں مراد ہوں یا پچھلے پیغمبر بھی اور کتابیں بھی اور یا ان کتابوں کے سارے اصلی عقیدے اور احکام یعنی مصدقا کے تین معنی ہو سکتے ہیں سچا کرنے والا سچا کہنے والا سچا کروانے والا ان تینوں معنی سے قرآن اور حضور مصدق ہیں یعنی پچھلے پیغمبروں اور ان کی کتابوں اور ان کے سارے احکام و فرمانوں کی تصدیق کرتے ہیں ایک یہ کہ ان سب کتابوں میں آخری نبی اور آخری کتاب کے آنے کی خبر تھی۔ اس کے آنے سے وہ سب خبریں سچی ہو گئیں اگر یہ نہ آتے تو جھوٹی ہو جاتیں کسی سے کہوں کہ کل بارش ہوگی اگر ہو جائے تو میں سچا ورنہ جھوٹا دوسرے یہ کہ دنیا میں ہزارہا پیغمبر تشریف لائے اور بہت سی کتابیں اور صحیفے آئے لیکن جن کا قرآن نے ذکر فرما دیا وہ تو دنیا میں مشہور ہو گئے باقی ایسے گم ہوئے کہ دنیا ان کے نام سے بھی بے خبر ہو گئی یعنی جس کا قرآن نے ذکر کر دیا اس کا قیامت تک سارے جہاں میں چرچا ہو گیا اور جس کا ذکر نہ کیا گیا وہ گم ہو گیا۔ تیسرے یہ کہ توریت اور انجیل کو ماننے والے صرف بنی اسرائیل ہی تھے اور قرآن پاک کا ماننے والا سارا جہان اور ظاہر ہے کہ جو بھی قرآن کو مانے گا وہ ان کتابوں کو ضرور مانے گا تو گویا قرآن و حضور نے تمام دنیا سے یہ کتابیں منوالیں اور وہ کام کر کے دکھایا جو نہ تو خود ان کتابوں نے کیا اور نہ ان کے ماننے والے بنی اسرائیل سے ہو سکا۔ دیکھو بتول کنواری مریم صدیقہ کو لوگوں نے تہمت لگائی قرآن نے ان کو پاک دامن فرما کر سارے جہان میں ان کی عصمت کے خطبے پڑھا دیئے سارے بے ادب گستاخ شرمندہ ہو کر چپ ہو گئے حقیقت میں قرآن پاک کا ان ساری کتابوں پر بڑا بھاری احسان ہے بلکہ جن پچھلے احکام کو منسوخ کیا گیا اس سے بھی ان کتابوں کی تصدیق ہوئی کیونکہ ان کتابوں ہی نے خبر دی تھی کہ نبی آخر الزمان سخت احکام کو نرم فرمانے والا اور گندگیوں کو دور فرمانے والا ہوگا۔ تو اگر یہ نسخ نہ ہوتا تو وہ خبر سچی نہ

رہتی گویا حضور اور قرآن تمہارے نبیوں اور کتابوں کے گواہ ہیں مدعی گواہ کی تصدیق کرتا ہے اسے جھٹلاتا نہیں ورنہ اس کا مقدمہ ناکام ہے تم بڑے بیوقوف ہو کہ اپنے گواہوں کو جھوٹا کہہ کر اپنا مقدمہ برباد و ناکام کر رہے ہو خیال رہے کہ مدعی گواہ کے سچے ہونے کا بھی قائل ہوتا ہے اور باخبر ہونے کا بھی کہ ان دونوں کے بغیر گواہی درست نہیں آج جو لوگ حضور کو سچا تو مانتے ہیں مگر عالم کل نہیں مانتے وہ اپنا قیامت والا مقدمہ کمزور کر رہے ہیں حضور رب کے سامنے ہمارے ایمان و اعمال کے بھی گواہ ہیں وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ: ۱۴۳) غرضیکہ اہل کتاب نے حضور کو بے خبر مان کر اور ان بیوقوفوں نے حضور کو بے علم مان کر مقدمہ بگاڑ دیا۔ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۢ بِهٖ ۔ بِہٖ کی ضمیر یا تو مَآ اَنْزَلْتُ کی طرف لوٹ رہی ہے یا مَعَكُمْ کی طرف یعنی تم اس قرآن کے پہلے منکر نہ بنو قرآن کا انکار کر کے خود اپنی کتابوں کا انکار نہ کرو۔ کیونکہ قرآن کریم کا انکار ان سب کا انکار ہے۔ اَوَّلَ كَافِرٍ کے چند معنی ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ تم قرآن سنتے ہی بے سوچے سمجھے بیدھڑک شروع ہی سے انکار نہ کر دو بلکہ اپنی کتابوں کو دیکھو پھر اس قرآن کریم اور ان پیغمبر کے حالات کو ان کے مطابق کرو اور ایمان لے آؤ۔ دوسرے یہ کہ بنی اسرائیل تم جان بوجھ کر قرآن کے پہلے منکر نہ بنو کیونکہ تم سے پہلے جن مشرکین نے انکار کیا ہے۔ وہ جہالت اور نادانی کی وجہ سے تھا تمہارا انکار جان بوجھ کر ہے لہٰذا تم اس قسم کے انکار اور کفر میں سب سے پہلے ہو تیسرے یہ کہ اے مدینہ کے اسرائیلیو! اپنی جماعت میں سب سے پہلے تم ہی نے قرآن کریم سنا ہے کیونکہ صاحب قرآن مدینہ میں ہی تشریف لائے ہیں اگر تم نے اس کا انکار کیا تو تمہاری دیکھا دیکھی خیبر وغیرہ کے اسرائیلی بھی انکار کر دیں گے اور تم ان کے لحاظ سے پہلے کافر بنو گے چوتھے یہ کہ اے علماء بنی اسرائیل تمہارے معتقدین و متبعین، تمہاری پیروی کرتے ہیں اگر تم نے انکار کیا تو وہ بھی انکار کریں گے لہٰذا تم پہلے کافر نہ بنو پانچویں یہ کہ تم اپنی آئندہ نسل کے لحاظ سے پہلے کافر نہ بنو کیونکہ اولاد اکثر اپنے باپ داداؤں کے دین پر ہوتی ہے وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا یا تو یہاں آیات سے قرآنی آیت مراد ہیں یا توریت و انجیل کی آیتیں کیونکہ وہ نذر و نیاز و رشوت کے لئے قرآن کریم کو چھوڑتے تھے اس لئے فرمایا گیا کہ آیات قرآنی کے مقابلے میں دنیا کو نہ لو جو کہ تھوڑی سی قیمت ہے یا چونکہ علماء یہود دنیوی نفع کی وجہ سے توریت کی آیتیں بدل ڈالتے تھے لہٰذا فرمایا کہ میری آیتیں اس معمولی قیمت پر بیچ نہ ڈالو خیال رہے کہ دنیا اور دنیوی چیزیں کیسی بھی ہوں آخرت کے مقابلے میں تھوڑی ہیں ساری دنیا جنت کے ایک موتی کے برابر نہیں ہو سکتی۔ پھر اس کے باوجود یہ سب فانی اور آخرت باقی اس آیت میں دنیا کے دو عیب بیان کئے گئے ایک اس کا ثمن یعنی قیمت ہونا دوسرے اس کا تھوڑا ہونا قیمت وہ چیز کہلاتی ہے جو کہ بذات خود فائدہ نہ دے بلکہ اس سے فائدے مند چیزیں حاصل کی جاویں۔ روپیہ پیسہ نہ کھایا جا سکتا ہے نہ پہننے میں آ سکتا ہے ہاں اس سے غذا اور لباس خرید سکتے ہیں اسی طرح دنیا بذات خود بالکل بے فائدہ ہاں اس کے ذریعے آخرت حاصل کر سکتے ہیں تو دنیا قیمت اور آخرت اصل مقصود ہے بیوقوف اسرائیلیوں نے آیات الٰہی کے عوض دنیا کو لیا تو گویا اصل کے بدلے قیمت کو خریدا۔ ارے بیوقوفو! قیمت سے اصل چیز خریدو وَاِيَّايَ فَاتَّقُوْنِ یعنی تم مجھ سے ڈرو نہ کہ لوگوں سے پہلی آیت میں فَارْهَبُوْنِ فرمایا تھا اور یہاں فَاتَّقُوْنِ اس کی چند وجہیں ہیں ایک یہ کہ پہلے عوام بنی اسرائیل سے خطاب تھا۔ یہاں ان کے علماء سے اور رہبت

سلوک کی ابتدائی منزل ہے اور تقویٰ، انتہائی لہٰذا ابتدائی لوگوں کو ابتدائی چیز کا حکم دیا اور انتہائی علماء کو انتہائی درجہ کا (تفسیر روح البیان) دوسرے یہ کہ رہبت خطرناک چیز کے اندیشے سے ہوتی ہے اور تقویٰ اسکے یقین پر کسی کو سانپ کا شبہ پڑ گیا وہ ڈر گیا یہ رہبت ہے دوسرے نے سانپ بالیقین دیکھ لیا اور وہ اس سے بھاگا یہ تقویٰ ہے۔ جہلاء کو رب کی حقانیت کا یقین نہ تھا اس لئے ان کو عذاب الٰہی کا صرف وہم تھا۔ اور ان کے علماء کو دونوں چیزوں کا یقین لہٰذا علماء کے لئے اتقون فرمایا گیا۔ (تفسیر کبیر) تیسرے یہ کہ رہبت بنی اسرائیل کا اپنا لفظ تھا۔ اسی لئے خدا پرستوں کو راہب کہتے تھے اور تقویٰ اسلامی کلمہ جو آدمی اپنا پرانا دین چھوڑ کر مسلمان ہو اس کو چاہئے کہ اس دین کے خاص الفاظ کو چھوڑ دے (تفسیر عزیزی) لہٰذا مسلمان ہو کر رب کو بھگوان مت کہو اور اپنے شرکیہ نام بھی بدل ڈالو۔

خلاصہ تفسیر

بنی اسرائیل سے فرمایا جارہا ہے کہ تم میری نعمتوں کو اس طرح یاد کرو اور میرے وعدوں کو ایسے پورا کرو کہ اس قرآن والے محبوب ﷺ اور قرآن اور ان کے سارے معجزات پر ایمان لے آؤ ایک تو اس لئے کہ پچھلی کتابوں اور رسولوں کی طرح یہ بھی ہمارے بھیجے ہوئے ہیں تو بعض کو ماننا اور بعض کو نہ ماننا اس کے کیا معنی دوسرے اس لئے کہ یہ کتاب و رسول تمہارے محسن ہیں کہ انہوں نے آکر ان سب کتابوں اور نبیوں کو سچا کر دیا کہ ان میں فرمایا گیا تھا کہ اس شکل و شباہت والا اور ان اخلاق و صفات والا ایسی خوبیوں کا مالک مکہ میں پیدا ہو کر مدینہ میں رہنے والا اس قسم کی تعلیم دینے والا اچھے کام سکھانے والا سیدھا رستہ دکھانے والا۔ سچی بات بتانے والا۔ توحید کا سبق پڑھانے والا۔ کفر و ضلالت مٹانے والا۔ شمع ایمان جلانے والا۔ رحمٰن کی طرف سے قرآن کریم لانے والا۔ مرجھائی ہوئی کلیاں کھلانے والا۔ ڈوبتی کشتیاں ترانے والا۔ چھوٹی نبضیں چلانے والا۔ روتوں کو ہنسانے والا۔ جلتوں کو بجھانے والا رازداروں کو کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیاً کا راز سمجھانے والا بیگانوں کو اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُکُمْ سنا کر اپنی طرف بلانے والا خود غریبی میں گزار کر غریبوں کو تخت و تاج دلوانے والا فرش پر رہ کر عرش پر حکومت کرنے والا۔ صحرائے عرب میں بیٹھ کر سارے جہان کو دیکھنے والا محبوب ﷺ تشریف لانے والا ہے ان کے آنے کا سارے پیغمبروں کو انتظار تھا خلیل ان کی دعائیں مانگ کر گئے حضرت مسیح گویا یہ کہہ کر بشارت دے گئے کہ میں اس صبح کے تارے کی طرح ہوں جو آسمان پر چمک کر آفتاب کے آنے کی خبر دیتا ہے اور خبر دے کر آفتاب ہی کے دامن نور میں چھپ جاتا ہے۔ حضرت مسیح یہ بھی فرما گئے کہ میں اس آخری نبی کے تسمے کھولنے کے لائق نہیں۔ (دیکھو انجیل برناباس فصل ستانوے) اس نبی کے آنے سے سارے پیغمبر سچے ہو گئے تم بھی ان کے انکار سے حیا کرو اور اس کے پہلے منکر نہ بنو اور اپنے پچھلوں کا بیڑا غرق نہ کرو اگلوں پر پچھلوں کا بوجھ ہوتا ہے اور عالم کے بگڑنے سے عالم بگڑ جاتا ہے اور تھوڑے پیسوں اور آمدنی کے لالچ سے اپنا اصل ایمان فروخت نہ کرو سامان سے قیمت نہ خریدو بلکہ قیمت سے سامان خریدو اور ہم سے ڈرتے رہو خیال رہے کہ حضور اور قرآن نے گذشتہ نبیوں ہی کی تصدیق نہ کی بلکہ ان کتابوں ان کے عقائد ان کی ملت کے اولیاء اللہ ان کے شہروں کی عظمت کی بھی تصدیق فرمادی اس لئے یہاں ارشاد ہوا مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ یعنی وہ تمہارے سارے سچے معتقدات کی تصدیق کرتے

ہیں چنانچہ قرآن نے بیت المقدس کی حرمت میں فرمایا اُدْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا (البقرہ:۵۸) اصحاب کہف کے بارے میں جو نصرانیت کے اولیاء اللہ ہیں ان کا پورا واقعہ بلکہ ان کے کتے کو احترام کے ساتھ بیان کیا۔ آصف بن برخیا جو یہودیت کے ولی اللہ ہیں ان کی کرامات کا ذکر کیا تمام دنیا کے مسلمانوں کے دلوں میں ان کی عظمت قائم فرمادی یہ ان سب پر احسان عظیم ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **ایک:** یہ کہ عالم گمراہ جاہل گمراہ سے بدتر ہے کیونکہ جاہل اس کی پیروی کر کے گمراہ ہوتے ہیں۔ **دوسرے:** یہ کہ دین کو دنیا حاصل کرنے کا ذریعہ نہ بنائے کہ دنیا کی خاطر دین چھوڑ دے **تیسرے:** یہ کہ یہ آیت اگرچہ بنی اسرائیل کے لئے آئی ہے۔ مگر اس میں مسلمانوں کے بھی چند فرقے داخل ہیں۔ پہلا فرقہ وہ علماء جو نفسانی خواہش کیلئے حکام سے ملیں اور ان کے ناجائز افعال کو جائز ثابت کرنے کیلئے قرآن وحدیث میں تاویلیں کریں۔ دوسرا فرقہ وہ واعظین و مدرسین جو اپنے عوام کا میلان خاطر دیکھ کر مسائل بیان کریں اور ضروری احکام کو اس لئے چھپالیں کہ اس سے ہماری آمدنی میں فرق پڑے گا۔ تیسرے فرقہ وہ علماء جو غلطی کر کے اپنی آبرو کے خیال سے توبہ نہ کریں جیسے علماء دیوبند ان بدنصیبوں کو اپنے کفر کا یقین ہو چکا ہے مگر عار کے مقابلے میں نا رقبول کرتے ہیں۔ چوتھا فرقہ وہ قاضی اور مفتی جو کہ رقم لے کر حکم شرع بدل دیتے ہیں۔ جیسے آج کل پنجاب کے دیوبندی جو روپیہ لے کر کچہری کے تنسیخ نکاح پر دوسرا نکاح پڑھا دیتے ہیں۔ پانچواں فرقہ وہ حکام جو کہ ظالم سے رشوت لے کر انصاف نہیں کرتے۔ چھٹا فرقہ وہ مدرسین و مبلغین جو محض دنیا کے لئے یہ کام کریں یعنی جہاں دنیوی فائدے کی امید ہو صرف وہاں تبلیغ کریں اور جس شخص سے دنیوی نفع ہو صرف اس کو علم دین سکھائیں (تفسیر عزیزی) **چوتھا فائدہ:** تنخواہ لے کر علم دین پڑھانا اجرت پر تعویذ لکھنا اور دم کرنا قرآن پاک چھاپ کر فروخت کرنا۔ اس آیت سے خارج ہیں کیونکہ بیچنے کے یہ معنی ہیں کہ پیسہ لے کر شرعی احکام بدل دیئے جائیں پریس والا درحقیقت کاغذ اور لکھائی اور چھپائی کی قیمت لے رہا ہے اسی طرح تعویذ لکھنے والا اور دم کرنے والا ایک طرح کے علاج کی اجرت لے رہا ہے کیونکہ اس نے قرآن سے علاج کیا ہے۔ صحابہ کرام نے ایک سانپ کاٹے ہوئے پر سورۃ فاتحہ پڑھ کر دم کر دی اور اس پر تیس بکریاں اجرت لیں خود بھی کھائیں اور ان میں سے حضور نبی کریم ﷺ نے بھی ملاحظہ فرمایا اس طرح قرآن پڑھانے والا قرآن پاک کو فروخت نہیں کرتا بلکہ اپنا وقت گھرانے اور اپنا کاروبار چھوڑنے اور بچوں کی نگرانی کرنے وغیرہ کی اجرت لیتا ہے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلافت پر تنخواہ لی حالانکہ خلافت دینی کام تھا۔ **مسئلہ:** خالص عبادت اور حرام کاموں پر اجرت لینا منع ہے۔ جیسے نماز روزہ اور تلاوت قرآن کہ یہ خالص عبادتیں ہیں اور گانا بجانا وغیرہ کہ یہ حرام ہیں اسی لئے کہ اس کی حدیث میں ممانعت آئی۔ لیکن علماء متاخرین نے امامت اور اذان وغیرہ کی اجرت جائز رکھی کیونکہ اگر یہ جائز نہ ہو تو مسجدیں ویران ہو جائیں گی۔ تفسیر عزیزی میں اس جگہ نہایت عمدہ فائدہ بیان فرمایا وہ یہ کہ جائز کام پر اجرت لینی جائز ہے اسی طرح جس فرض یا واجب میں جائز کام مل جائے اس پر بھی اجرت لینی جائز ہے اور یہ اجرت اس جائز کی ہوگی نہ کہ واجب وفرض کی لہٰذا امامت میں دو چیزیں ہیں ایک ادائے نماز جو کہ فرض اور ایک خاص جگہ اور وقت کی

پابندی یعنی فلاں وقت حاضری دینا یہ جائز فعل ہے تنخواہ اس کی پابندی کی ہے نہ کہ نماز کی۔ **پانچواں فائدہ:** کسی بزرگ کے معتقدین اسے حد سے بڑھادیں خدا سے ملا دیں توان کے جواب میں اس بزرگ کی توہین نہ کرو بلکہ ان کو رد کو دیکھو عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ و مریم کو رب کا بیٹا اور بیوی کہا قرآن نے ان کی تردید کی مگر ان دونوں بزرگوں کی عزت و تکریم کی جیسا کہ مصدقاً سے معلوم ہوا اس سے وہ لوگ عبرت پکڑیں جو بد مذہبوں کی تردید کیلئے بزرگوں کو گالیاں دیتے ہیں روافض کی تردید میں حضرت حسین کی اہانت کرتے ہیں۔ **چھٹا فائدہ:** حضور آخری نبی ہیں کیونکہ حضور صرف مصدق ہیں کسی نبی کے مبشر نہیں خیال رہے کہ بشارت اگر نذیر کے ساتھ جمع ہو کر آئے تو اس کے معنی ہیں رب کی رحمت کی خوشخبری جیسے بشیراً ونذیراً اس معنی سے ہمارے رسول بشیر اور اگر تصدیق کے ساتھ جمع ہو تو معنی ہیں کسی آئندہ نبی کی خوشخبری۔ اس معنی سے حضور ہرگز بشیر نہیں اس لئے یہاں صرف مصدقا ارشاد ہوا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن بنی اسرائیل کی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے حالانکہ ان کے پاس بدلی ہوئی اور مخلوط کتابیں تھیں۔ جس کو قرآن نے جھٹلایا ہے۔ **جواب:** اس جگہ فرمایا گیا ہے کہ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ یعنی قرآن اس کی تصدیق فرمانے والا ہے جو تمہارے ساتھ ہے نہ اس کی جو تم نے بنائی ہے ساتھ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ جو رب کی طرف سے آئی اور تمہارے پاس موجود ہو یعنی انہی بدلی ہوئی کتابوں میں جو اصلی آیتیں ہیں۔ ان کی تصدیق فرماتا ہے اسی لئے یہاں بکتبکم نہ فرمایا۔ **دوسرا اعتراض:** قرآن کریم نے ان کی اصلی کتابوں کی بھی تصدیق نہ فرمائی بلکہ ان کو منسوخ فرمایا **جواب:** منسوخ فرمانا تصدیق کے خلاف نہیں قرآن کریم نے یہ کہیں نہ فرمایا کہ یہ کتابیں جھوٹی تھیں بلکہ یہ بتایا کہ وہ کتابیں سچی مگر اب ان کا حکم جاری نہیں ایک طبیب اپنا نسخہ بدلتا ہے تو اس میں پہلے نسخے کی، تکذیب (جھوٹا کرنا) نہیں بلکہ مریض کی حالت کے لحاظ سے اب اس کا استعمال بند کر دیا گیا ہے بلکہ یہ نسخ بھی ان کی تصدیق ہے کیونکہ ان کتابوں نے خبر دی تھی کہ نبی آخر الزمان سختیاں دور فرمائے گا اگر وہ سخت احکام باقی رہتے تو یہ خبر سچی کیسے ہوتی۔ **تیسرا اعتراض:** اس جگہ فرمایا گیا کہ تم قرآن کریم کے پہلے منکر نہ بنو بنی اسرائیل سے پیشتر اور بہت سی قومیں انکار کر چکیں تھیں تو یہ لوگ پہلے منکر کیونکر بن سکتے تھے۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر چکا ہے کہ اپنی جماعت یا اپنی نسل میں یا جان بوجھ کر پہلے منکر نہ ہو۔ **چوتھا اعتراض:** کیا پہلا منکر بننا منع ہے اور پچھلا منکر بننا جائز۔ **جواب:** پہلا منکر بننا زیادہ عذاب کا باعث ہے کیونکہ جو بھی اس کی دیکھا دیکھی منکر بنے گا ان سب کا عذاب بھی اس کے لئے ہوگا کیونکہ یہ برائی کا موجد ہے پچھلے منکر کو صرف اپنے انکار کا عذاب ہوگا نیز ہر منکر اپنی نسل کے لحاظ سے پہلا منکر ہے آج بھی ہر کافر اپنی اولاد کے لحاظ سے پہلا کافر ہے کہ اس کی وجہ سب اولاد وغیرہ کافر ہوئی۔ **پانچواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ آیتوں کو تھوڑی قیمت سے نہ بیچو تو کیا بہت سی قیمت سے بیچ دیں یعنی دو چار روپے میں نہ بیچیں سو پچاس میں بیچ دیں (آریہ)
جواب: آیات کے لحاظ سے تھوڑی قیمت ہے قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ (النساء: ۷۷) تو آیت کا مطلب یہ ہوا کہ دنیا کے

عوض نہ بیچو جو تھوڑی اور حقیر ہے یا یوں کہو کہ یہ اس واقعہ کی حکایت ہے، علمائے بنی اسرائیل تھوڑے ہی پیسوں میں فروخت کیا کرتے تھے جیسے کہ قرآن پاک میں آتا ہے کہ دگنا تگنا سود نہ کھاؤ اسکا مطلب یہ نہیں کہ سوایا ڈیوڑھا کھالو بلکہ اس زمانے میں جو کچھ تھا اس کا بیان ہے۔ **چھٹا اعتراض:** اس جگہ فرمایا گیا کہ میری آیتوں کے عوض تھوڑی قیمت نہ خرید و حالانکہ یوں کہنا چاہئے تھا کہ میری آیتیں قیمت کے عوض نہ بیچو یا میری آیتوں کے عوض تھوڑے سامان کو نہ خریدو کیونکہ قیمت سے چیز خریدتے ہیں، کہ چیز سے قیمت۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر ہی میں گزر چکا کہ دنیا بذات خود آخرت کی قیمت ہے جس کے ذریعے آخرت حاصل کی جائے اور آیات الٰہی اصل مقصود ان بیوقوفوں نے دنیا کو اصل مقصود سمجھ کر دین کے عوض اس کو حاصل کیا۔ لہٰذا دنیا کو ثمن (قیمت) فرمانا اصل واقعہ کے لحاظ سے ہے اور لَا تَشْتَرُوْا فرمانا ان کے عمل کے لحاظ سے۔
ساتواں اعتراض: اس سے معلوم ہوا کہ آیتیں بدل کر پیسہ لینا حرام ہے لیکن آیتیں بدلوا کر پیسہ دینا بھی حرام ہے کہ نہیں۔ **جواب:** جب لینا حرام ہوا تو دینا پہلے ہی حرام ہوا۔ کیونکہ لینا دینے سے ہوتا ہے قرآن کریم میں ہے کہ سود نہ کھاؤ جس طرح سود کھانا حرام ہوا ایسے کھلانا اور دینا بھی۔

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ
اور نہ ملاؤ حق کو ساتھ باطل کے اور نہ چھپاؤ حق کو حالانکہ تم
اور حق سے باطل کو نہ ملاؤ اور نہ دیدہ دانستہ حق
تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾
جانتے ہو
کو چھپاؤ

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے ایک یہ کہ پہلے علماء بنی اسرائیل کو خود ایمان لانے کا حکم دیا گیا اور کفر سے روکا گیا اور اب ان کو اوروں کو گمراہ کرنے سے منع فرمایا جا رہا ہے۔ یعنی پہلے کہا گیا تھا کہ تم خود کفار نہ بنو اب فرمایا ہے کہ اوروں کو کافر نہ بناؤ مگر چونکہ اپنا ایمان وکفر دوسروں کو مومن وکافر بنانے سے پہلے ہوتا ہے اسی ترتیب سے اس کا ذکر ہوا ہے دوسرے یہ کہ پہلے فرمایا گیا تھا کہ میری آیتوں کے عوض مال نہ لو۔ اس آیت میں اس کا مطلب بتایا کہ مال لے کر حق کو نہ چھپاؤ۔ تیسرے یہ کہ علمائے یہود تین حرکتیں کرتے تھے ایک تو روپیہ لے کر آیتیں بدل ڈالنا دوسرے آیات میں اپنی طرف سے کچھ زیادتی کر دینا۔ تیسرے اپنی مخالف آیات کو چھپا لینا۔ ایک فعل سے پہلے روکا گیا تھا اور دو حرکتوں سے اب منع فرمایا جا رہا ہے۔

تفسیر

وَلَا تَلْبِسُوا۔ تَلْبِسُوا۔ لَبْسٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں غلط۔ یعنی ملاوٹ کرنا جیسا کہ دودھ میں پانی اور اصلی گھی میں

ولایتی گھی کو اسی طرح ملا دینا جس سے اصل و نقل کی پہچان نہ رہے علما یہود بھی کتاب کی آیتوں یا اس کے معانی میں اپنی طرف سے ایسی زیادتی کر دیتے تھے جس سے اصل و نقل کی پہچان نہ رہتی تھی اس سے ان کو منع فرمایا جا رہا ہے **اَلْحَقَّ بِالْبَاطِلِ** حق واقعی چیز کو کہتے ہیں اور باطل غیر واقعی کو صدق، سچ، اور حق میں اسی طرح کذب (جھوٹ) اور باطل میں فرق ہے کہ سچ جھوٹ صرف کلام کی صفت ہے اور حق و باطل عام ہے غلط عقیدے اور غلط خیالات کو باطل کہا جاتا ہے۔ کاذب نہیں کہا جاتا۔ اسی طرح صحیح عقائد کو حق کہا جائے گا۔ نہ کہ صادق (سچا) نیز حق و باطل میں مطابقت واقع کی طرف سے معتبر ہے اور صادق و کاذب میں کلام کی طرف سے۔ یعنی صادق وہ کہ واقع کے مطابق ہو اور حق وہ کہ واقع اس کے مطابق ہو۔ لہٰذا حق صادق سے اعلیٰ ہے چونکہ علمائے یہود آیتوں اور ان کے معانی اور ان کے مطالب میں ہر طرح خلط ملط کرتے رہتے تھے۔ اس لئے یہاں حق فرمایا گیا۔ تاکہ سب کو شامل ہو جائے یعنی نہ آیتوں کے الفاظ میں خلط ملط کرو اور نہ اس کے معانی اور مطلب میں۔ **وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ** یہاں لا پوشیدہ ہے اس لئے نون گر گیا۔ یعنی حق نہ چھپاؤ خیال رہے کہ خلط اور چھپانے میں یہ فرق ہے کہ خلط کے معنی ہیں ملا کر ظاہر کرنا اور کتم (چھپانا) کے معنی ہیں ظاہر نہ کرنا ان کے علماء یا تو احکام ظاہر ہی نہ کرتے تھے اور یا ملاوٹ کر کے ظاہر کرتے تھے ان دونوں کاموں سے ان کو روک دیا گیا۔ **وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ** یعنی علماء بنی اسرائیل تم جان بوجھ کر یہ حرکتیں کرتے ہو نہ کہ بے علمی اور بھول سے اس میں اس جانب اشارہ ہو رہا ہے کہ جان بوجھ کر یہ دونوں کام کفر ہیں بلا ارادہ یا نادانی یا بھول کر کفر نہیں ایک حافظ قرآن پاک غلط پڑھ گیا کسی کاتب نے نادانی سے آیت غلط لکھ دی کسی شخص نے بے علمی سے آیت کا کوئی مطلب سمجھ لیا کسی مجتہد سے آیت سے مسئلہ نکالنے میں غلطی ہو گئی یہ سب اس حکم سے خارج ہیں خدا کا شکر ہے کہ قرآن مجید میں تحریفی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ نیز قرآن وہ سورج ہے جو چھپایا نہیں جا سکتا رب نے الفاظ قرآن کی حفاظت کے لئے حافظ اداء الفاظ کی حفاظت کے لئے قاری احکام قرآن کی حفاظت کے لئے محدثین و مفسرین و فقہاء پیدا کئے اسرار قرآن کی حفاظت کیلئے صوفیا، مشائخ، اولیاء پیدا فرمائے اور انہیں تا قیامت باقی رکھا قرآن کی حفاظت کے لئے حدیث شریف باقی رکھی۔

خلاصہ تفسیر

علماء یہود دو طرح لوگوں کو ایمان سے روکتے تھے بیخبروں کو تو سچی بات سناتے ہی نہ تھے اور باخبر اور ہوشیار لوگوں کو شبہ میں ڈال دیتے تھے یا تو کتاب کی آیتوں میں ہی خلط ملط کر دیتے تھے اور یا اس کے مطالب اس طرح بیان کرتے تھے جس سے وہ شبہ میں پڑ کر حق تک نہ پہنچ سکے۔ مثلاً جاہلوں سے کہتے تھے کہ ہماری کتابوں میں نبی آخر الزمان کی خبر ہی نہیں ہے اور جاننے والوں سے کہتے تھے کہ ان کی خبر تو دی گئی ہے۔ مگر وہ صفتیں حضور ﷺ میں نہیں پائی جاتیں۔ اس لئے ارشاد ہو رہا ہے کہ اے بنی اسرائیل یہ دونوں حرکتیں چھوڑ دو نہ تو حق و باطل کو ملاؤ نہ حق کو چھپاؤ اور تمہارا جان بوجھ کر یہ دو حرکتیں کرنا اور بھی زیادہ خطرناک ہے! خیال رہے کہ اس زمانے میں نہ تو کوئی ان کتابوں کا حافظ تھا اور نہ کوئی خاص کتب خانہ اور لکھنے کا زیادہ رواج نہ کتابوں کی عام اشاعت بلکہ آسمانی کتابیں خاص خاص راہبوں کاہنوں کے پاس ہی ہوتی تھیں۔ اس لئے ان کو بدلنا کچھ

مشکل نہ تھا الحمد للہ کہ قرآن کریم میں اس قسم کی تحریف کبھی نہیں ہو سکتی کیونکہ اس کی اشاعت بہت ہو چکی اور حافظوں کے سینوں میں بھی آ گیا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے ایک یہ کہ اگر چہ یہ آیت علماء بنی اسرائیل کے لئے آئی ہے لیکن اس میں وہ موجودہ علماء بھی داخل ہیں جو قرآن پاک کے معانی یا مطالب میں تبدیلی کرتے ہیں۔ جیسے خاتم النبیین کے معنی ہیں آخری نبی مگر دیوبندیوں اور قادیانیوں نے اسکے معنی کئے اصلی نبی اور حضور علیہ السلام کے بعد بھی نئے پیغمبروں کا آنا جائز مانا نیز وہ علماء بھی اس میں داخل ہیں جو قرآن کریم اور احادیث صحیحہ کو کانگریس یا دیگر کفار کے مطابق کرنے کی کوشش کرتے ہیں جیسے ابوالکلام آزاد اور دیگر کانگریسی احراری اور خاک ساری علماء ہم کو خوب یاد ہے کہ جب کانگریس نے نمک بنا کر سول نافرمانی کرنے کا اعلان کیا تو دیوبند سے وہ حدیثیں نکلیں کہ نمک لکڑی گھاس آزاد چیزیں ہیں جو ان کو پائے وہ ہی ان کا مالک اور جب کانگریس نے چرخہ کاتنے کا حکم دیا تو مدرسہ دیوبند سے چرخے کی حدیث بھی نکل آئی جب وہ تحریکیں ختم ہو گئیں تب یہ احادیث بھی چھپ گئیں دوسرے یہ کہ جان بوجھ کر قرآن کے الفاظ یا معانی یا مطالب کا بگاڑنا کفر ہے جو قرائتیں اور معنی کہ متواتر طور پر منقول ہیں اسی کی پیروی کی جائے گی۔ بغیر قصد غلطی کا یہ حکم نہیں ہے بے علم اگر نادانی سے غلطی کرتا ہے تو گنہگار ہے اس پر فرض تھا کہ علم حاصل کر کے صحیح پڑھے عالم اگر سستی کر جائے تو بھی گنہگار ہے اس کو چاہئے تھا کہ محنت سے صحیح مسائل معلوم کرے ایک مجتہد کوشش کے باوجود غلطی کر جائے تو وہ گنہگار بھی نہیں بلکہ اس کوشش کا ثواب پائے گا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس سے معلوم ہوا کہ جان بوجھ کر گناہ کرنا برا ہے نادان بن کر جو چاہو سو کر لو۔ **جواب:** اس کا جواب گزر گیا کہ دونوں چیزیں گناہ ہیں لیکن جان بوجھ کر کرنا کفر۔ **دوسرا اعتراض:** اس سے معلوم ہوا کہ علم سے جہالت بہتر ہے کیونکہ جاہل کا گناہ گناہ ہے عالم کا گناہ کبھی کفر بن جاتا ہے امام احمد نے کتاب الزہد میں فرمایا کہ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ جاہل بے عمل پر ایک وبال ہے اور عالم بے عمل پر سات۔ **جواب:** جہالت کا وبال علم کے وبال سے زیادہ ہے اس لئے کہ عالم بے عمل فقط بے عملی کا گنہگار ہے اور جاہل بے عمل ڈبل گنہگار ہے ایک تو بے علمی کی وجہ سے دوسرا بدعملی سے علم سیکھنا فرض تھا۔ جاہل اس فرض کا تارک ہے گنہگار ہے ایک شخص اپنے باپ کو نہ پہچان کر اس کو مارے پیٹے عقل کہتی ہے کہ یہ شخص بڑا بدنصیب ہے جاہل کا ایک وبال عالم کے سات وبالوں سے سخت ہوگا گنہگار مومن کو صدہا بدعملیوں کی سزا ملے گی اور کافر کو صرف کفر کی مگر ایک کفر کی سزا دیگر صدہا جرموں کی سزا سے سخت ہوگی حدیث صحیح سمجھو (تفسیر عزیزی) خیال رہے کہ کفریات وغیرہ میں بے عملی عذر نہیں اگر کوئی جاہل بھی کلمہ کفر وغیرہ منہ سے نکال دے شراب وغیرہ پی لے تو وہ ضرور مجرم ہے کوئی شخص قانون سے واقف ہو کر چوری کرے یا بے ٹکٹ ریل میں سفر کرے اور گرفتار ہونے پر کہے کہ مجھے خبر نہ تھی کہ یہ کام جرم ہے وہ بھی ضرور سزا کا مستحق ہوگا۔

تفسیر صوفیانہ

دین حق ہے دنیا باطل قلب سورج نفس امارہ بادل فرمایا جارہا ہے کہ اے بنی اسرائیل تم دین کو دنیا سے اس طرح مخلوط نہ کرو کہ ان کا آپس میں امتیاز نہ رہے بلکہ دین کو دنیا سے خالص رکھو دنیا پر دین کا لباس نہ پہناؤ۔ خالص سونے خالص دودھ کی قدر ہے ایسے ہی بارگاہ الٰہی میں خالص دین کی قدر و منزلت ہے اور تم قلب کے سورج کو نفس امارہ کے بادلوں سے نہ چھپاؤ تاکہ دونوں جہاں میں اس کا نور پاؤ۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو قلبی نور سے اپنے آپ کو منور رکھیں۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾
اور قائم رکھو نماز کو اور دو تم زکوۃ اور رکوع کرو ساتھ رکوع کرنے والوں کے
اور نماز قائم رکھو اور زکوۃ دو اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے ایک یہ کہ پہلے بنی اسرائیل کو ایمان لانے کی رغبت دی گئی اور اب نیک اعمال کرنے کا حکم دیا جارہا ہے چونکہ ایمان اعمال پر مقدم ہے اس لئے ایمان کا حکم پہلے دیا گیا اور اعمال کا بعد میں خیال رہے کہ خود کفر کرنا بھی کفر ہے اور دوسروں کو ایمان سے روکنا بھی کفر اور کسی کو کفر کی رغبت دینا بھی کفر۔ ان تینوں قسم کے کفر سے منع فرما کر اب انہیں نماز وغیرہ کا حکم دیا گیا یعنی خود کفر نہ کرو اور دل کو ایمان سے روک کر کافر نہ بنو پھر نیک اعمال بھی کرنا دوسرے یہ کہ اب تک انہیں ایمان کا حکم دیا گیا تھا اب فرمایا جارہا ہے کہ صرف ایمان ہی پر قناعت نہ کرنا بلکہ اس کے بعد نیک اعمال بھی کرنا تیسرے یہ کہ پہلے فرمایا گیا کہ تم لوگوں کو ایمان سے روک کر اپنی علیحدہ جماعت نہ بناؤ اب فرمایا جارہا ہے کہ خود ایمان لا کر مسلمانوں کی جماعت میں آجاؤ چوتھے یہ کہ علماء بنی اسرائیل تین بیماریوں میں گرفتار تھے۔ خود پسندی، مال کی حرص، حسد وغیرہ ان کیلئے تین علاج فرمائے گئے۔ نماز، زکوٰۃ، جماعت نماز میں شرکت، نماز کی وجہ سے نمازی سے خود پسندی دور ہوگی زکوۃ سے مال کی محبت میں کمی آجائے گی۔ شرکت جماعت سے حسد دور ہوگا گویا ایمان لا کر وہ شفا خانہ مصطفیٰ ﷺ میں داخل ہوں گے اور یہ تین نسخے استعمال کر کے بیماریوں سے آرام پائیں گے۔

تفسیر

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ۔ چونکہ ایمان کے بعد نماز پڑھنے اور نماز قائم کرنے کا فرق ہم سورہ بقرۃ کے شروع میں بیان کر چکے ہیں کہ نماز صحیح پڑھنا۔ ہمیشہ پڑھنا۔ صحیح وقت پر پڑھنا۔ نماز کی فکر رکھنا اور سفر و حضر، تندرستی و بیماری ہر حال میں نماز پڑھنا نماز قائم کرنا ہے نماز قائم کرنا ہی انسان کو برائیوں و فحش سے بچاتا ہے نماز قائم کرنے والا مرنے کے بعد قبر میں بھی نماز پڑھتا ہے یا نماز کی فکر میں رہتا ہے جیسا کہ احادیث سے ثابت ہے الصَّلٰوةَ میں الف لام عہد خارجی ہے یعنی وہ مسلمانوں والی نماز قائم کرو یہود اور عیسائی بھی نماز پڑھتے تھے، لیکن اب اسلامی نماز قبول ہے نہ کہ دوسری خیال رہے کہ یہ حکم ایمان لانے کے بعد دیا جارہا

ہے۔یعنی پہلے ایمان لاؤ۔ پھر نماز پڑھو یہ نہیں کہ بے ایمان رہ کر نماز پڑھو۔ جیسے بے وضو شخص سے کہا جائے کہ نماز پڑھ تو یہ مطلب نہیں کہ اسی حالت میں پڑھ لے بلکہ وضو کر کے نماز پڑھ یا یہ مطلب ہے کہ اے بنی اسرائیلیو! نماز کی فرضیت کے قائل ہو جاؤ گویا یہ آیت بِمَا اَنْزَلْتُ کی تفصیل ہے۔ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ نماز کے بعد ادائے زکوۃ کا حکم دیا گیا کیونکہ نماز بدنی عبادت تھی اور زکوۃ مالی عبادت اور بدن مال سے افضل ہے اس لئے نماز زکوۃ سے افضل خیال رہے کہ دونوں جگہ حکم بظاہر یکساں ہے یعنی نماز پڑھو اور زکوۃ دو لیکن نماز کا حکم مثل زکوۃ کے نہیں ہے کیونکہ نماز ہر غریب و امیر پر فرض ہے اور زکوۃ صرف مالداروں پر زکوۃ کے لفظی معنی ہیں بڑھنا اور پاک ہونا عرب والے کہتے ہیں کہ ذَكَا الزَّرْعُ یعنی کھیتی بڑھ گئی اور قرآن پاک فرماتا ہے غلامًا زَكِيًّا یعنی پاک لڑکا اور فرماتا ہے قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى (اعلیٰ: ۱۴) یعنی کامیاب ہو گیا وہ جو پاک ہوا چونکہ زکوۃ نکالنے سے باقی مال پاک وصاف ہو جاتا ہے جیسے ختنہ کرنے اور ناخن و بال کٹوانے سے جسم پاک وصاف ہو جاتا ہے اس لئے اس کو زکوۃ کہتے ہیں۔ نیز اگرچہ زکوۃ سے بظاہر مال گھٹتا ہے لیکن حقیقت میں اس سے مال اور عمر میں برکت ہوتی ہے بلائیں دور ہوتی ہیں مصیبتوں سے امن ملتی ہے اس لئے اس کو زکوۃ کہتے ہیں تفسیر کبیر نے اس جگہ فرمایا کہ صدقہ وخیرات میں چھ فائدے ہیں تین دنیا میں اور تین آخرت میں۔ دنیا میں تو رزق میں برکت مال میں زیادتی گھر میں آبادی ہوتی ہے اور آخرت میں صدقہ عیبوں کو چھپائے گا۔ قیامت کی دھوپ سے بچائے گا آگ سے آڑ بنے گا یہاں بھی زکوۃ میں الف لام عہد خارجی ہے یعنی اسلامی زکوۃ دیا کرو۔ بنی اسرائیل پر چوتھائی مال زکوۃ فرض تھی اور اس کے قوانین کچھ اور تھے مگر اب مصطفیٰ ﷺ کا زمانہ ہے اس لئے اب انہی کے قوانین پر عمل کرنا پڑے گا۔ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ یہ تیسرا حکم ہے یعنی اے بنی اسرائیل رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔ رکوع کے لغوی معنی ہیں جھکنا اور پست ہونا اور اصطلاح شریعت میں نماز کے ایک رکن کا نام ہے یہاں یا تو لغوی معنی مراد ہیں یعنی جس طرح مسلمان اللہ تعالیٰ اور رسول علیہ السلام کے احکام پر سر خم کر دیتے ہیں تم بھی سرکشی چھوڑ کر ان کے ساتھ اطاعت کیا کرو یا اصطلاحی معنی یعنی تم ان نمازیوں کے ساتھ رکوع والی نماز پڑھا کرو کیونکہ یہودیوں کی نماز میں رکوع نہ تھا تو گویا یہ جملہ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ کی تفسیر ہے۔ یعنی کون سی نماز قائم کرو رکوع والی یا اس کا مطلب یہ ہے کہ جماعت سے نماز پڑھا کرو کیونکہ جماعت کی نماز تنہا نماز پر ستائیس درجہ افضل ہے۔ تفسیر روح البیان نے اس جگہ عجیب نکتہ بیان کیا وہ فرماتے ہیں کہ جماعت جمع سے بنا ہے اور جمع کم از کم تین پر بولی جاتی ہے اور ایک نماز میں دس نیکیاں تو تیس آدمیوں کی تیس نیکیاں ہوئیں ہر ایک کی ایک اصل نماز اور نور رب کا عطیہ لہٰذا نماز میں تین اصل نمازیں اور ستائیس عطیے۔ نیز سلطانی بارگاہ میں وفد کی عرض و معروض بمقابلہ اکیلے کی عرض سے زیادہ سنی جاتی ہے جماعت کی نماز میں مسلمان وفد کی شکل میں اپنے رب کے حضور حاضر ہوتے ہیں امید ہے کہ بہت جلد کامیاب ہوں گے امام ان کا نمائندہ ہوتا ہے۔ نمائندہ جتنا اعلیٰ ہو گا اتنی ہی اعلیٰ نمائندگی ہو گی۔ خیال رہے کہ یہ تیسرا حکم پہلے دو حکموں سے زیادہ خاص ہے اس لئے کہ ہر نماز جماعت سے نہیں پڑھی جاتی جمعہ اور عیدین کے لئے جماعت فرض ہے اور پنجگانہ فرض نمازوں کے لئے واجب نماز کسوف (سورج کے گرہن کی نماز) نماز استسقاء نماز تراویح کے لئے جماعت سنت باقی نفلوں کے لئے اہتمام سے جماعت کرنا منع

ہے۔ پھر ہر شخص کے لئے جماعت ضروری نہیں مسافر اور سخت بیمار پر جماعت معاف ایسے ہی بارش اور آندھی میں جماعت معاف عورتوں، بچوں، بعض اندھوں اور لنگڑوں وغیرہ پر جماعت معاف اس لئے جماعت کا حکم ان نماز وزکوۃ کے حکموں کے بعد ہوا۔

خلاصہ تفسیر

جب بنی اسرائیل کو ایمان اور ایمانیات کا حکم دیا جا چکا تو اس کے بعد تقویٰ اور طہارت کا حکم دیا کہ نماز کو اچھی طرح قائم کرو تاکہ تمہارے دل نرم ہوں اور دلوں کی سیاہی دور ہو اور پھر خدا سے ڈر کر اپنے مال میں کچھ مقرر حصہ بھی فقراء وغرباء کو دیا کرو جس سے تمہارا اعمال پاک ہو اور خوب بڑھے اور نماز اپنے گھروں میں اکیلے ہی نہ پڑھ لیا کرو بلکہ پنجگانہ جماعت میں شامل ہو کر نمازیوں کے ساتھ ادا کیا کرو تاکہ تم کو دین کی برکتیں اور انوار حاصل ہوں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے ایک یہ کہ ایمان سارے اعمال سے افضل ہے اور نماز باقی اعمال سے بہتر اس لئے کہ ایمان قلب کا فعل ہے اور نماز قالب کا اور زکوۃ مال کا نیز تمام اعمال عرش سے فرش پر بھیجے گئے لیکن نماز حضور کو عرش پر بلا کر دی گئی۔ نیز نماز کا فائدہ براہ راست اپنی ذات کو حاصل ہوتا ہے اور زکوۃ کا فائدہ دوسرے کو یعنی فقیر کو اور اپنا فائدہ دوسرے کے فائدے پر مقدم ہے رَبِّ اغْفِرْلِیْ وَالِوَالِدَیَّ پہلے اپنے لئے دعا ہے پھر دوسروں کے لئے نیز نماز میں بدن سے کام کرنا پڑتا ہے اور زکوۃ میں مال سے اور بدن مال سے افضل ہے۔ نیز نماز ہر مخلوق ادا کرتی ہے فرشتے اور جنات، درخت وغیرہ لیکن زکوۃ سوائے انسان کے کوئی ادا نہیں کرتا دوسرے یہ کہ نماز کے بعد درجہ زکوۃ کا ہے کیونکہ نماز بھی ایک فعل ہے اور زکوۃ بھی۔ رہا روزہ یہ فعل نہیں بلکہ ترک فعل ہے یعنی روزہ کسی کام کرنے کا نام نہیں بلکہ کھانے پینے کے چھوڑنے کا نام ہے تیسرے یہ کہ نماز جماعت سے پڑھنا افضل ہے اس لئے کہ تنہا نماز ہوئی نہ معلوم قبول ہو کہ نہ ہو لیکن جماعت میں اگر ایک کی قبول ہو گئی تو اس کی طفیل سب کی قبول ہے۔ نیز جو دعا مل کر مانگی جائے وہی زیادہ قابل قبول ہوتی ہے چوتھے جس نے رکوع پا لیا اس نے رکعت پالی اسی لئے کہ یہاں فرمایا گیا کہ رکوع والوں کے ساتھ رکوع کرو جس سے معلوم ہوا کہ تم اگر رکوع میں مل جاؤ گے تو اس رکعت میں سب کے ساتھ مانے جاؤ گے ورنہ نہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: حنفیوں کے نزدیک کافروں کو روزے نماز کا حکم نہیں ہوتا اور یہاں کافر بنی اسرائیل کو یہ حکم دیا جا رہا ہے معلوم ہوتا ہے کہ مذہب شافعی حق ہے۔ **جواب:** ظاہر میں تو یہ آیت شافعیوں کے بھی خلاف ہے کیونکہ ان کے نزدیک بھی کفار کو اداء نماز وغیرہ کا حکم نہیں اسی لئے نومسلم سے وہ بھی گذشتہ نمازیں قضا نہیں کراتے صرف اختلاف اس میں ہے کہ آخرت میں کفار کو صرف کفر کا عذاب ہو گا یا دیگر گناہوں کا بھی شافعیوں کے نزدیک اعمال کا بھی عذاب ہو گا حنفیوں کے نزدیک صرف کفر کا اس جگہ نماز وزکوۃ کا حکم ایمان کے حکم کے ساتھ ہے جس کے معنی یہ ہوئے کہ تم ایمان لا کر نماز پڑھو

الحال ان کو نماز کا حکم نہیں دیا جا رہا لہٰذا یہ ہمارے خلاف نہ ہوا کیونکہ کفار کو بحالت کفر اعمال کا حکم نہ دیا گیا۔ **دوسرا اعتراض:** پھر بھی مذہب شافعی قوی معلوم ہوتا ہے کیونکہ دوسری جگہ قرآن کریم فرما رہا ہے کہ جب مسلمان دوزخی کفار سے پوچھیں گے کہ مَاسَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ (المدثر: ۴۲) یعنی تم کو جہنم میں کون چیز لائی تو وہ جواب دیں گے کہ لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ (المدثر: ۴۳) کہ ہم نمازی نہ تھے مسکینوں کو کھانا نہ کھلاتے تھے معلوم ہوا کہ ان کو اعمال کا بھی عذاب ہوگا۔ **جواب:** اس آیت سے یہ ہرگز معلوم نہیں ہوتا کہ ان کو نماز نہ پڑھنے کا عذاب ہوگا بلکہ ثابت یہ ہو رہا ہے کہ مسلمان نہ ہونے کا عذاب ہوگا کیونکہ وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم نمازیوں میں سے نہ تھے۔ یعنی مسلمانوں کی جماعت سے خارج تھے ورنہ کہتے مَا کُنَّا نُصَلِّیْ بہرحال ان کو اعمال کے نہ ماننے کا عذاب ہوگا نہ کہ نہ کرنے کا۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جماعت بھی مثل نماز وزکوٰۃ کے فرض ہے کیونکہ ان سب کے لئے یکساں حکم آرہا ہے اور حکم فرضیت کے لئے آتا ہے پھر تم جماعت کو واجب یا سنت موکدہ کیوں مانتے ہو۔ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ شریعت میں فرض وہ کہلاتا ہے کہ جس کی طلب ضروری ہو اور اس کا ثبوت بھی قطعی ہو اور دلالت بھی۔ اِرْکَعُوْا کا ثبوت تو یقینی ہے مگر دلالت یقینی نہیں یعنی یہ یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ اس سے مراد جماعت ہی ہے بلکہ اس کے اور معنی بھی ہو سکتے ہیں جو ہم تفسیر میں عرض کر چکے لہٰذا جب اس کا یقین نہ رہا تو فرضیت ثابت نہ ہو سکی۔ دوسرے یہ کہ اگر ایک نماز کے لئے بھی جماعت فرض ہو جاوے تب بھی آیت کا مقصود حاصل ہو گیا اور جمعہ وعیدین کے لئے جماعت فرض ہے لہٰذا آیت پر عمل ہو گیا تیسرے یہ کہ ہر حکم وجوب کے لئے نہیں یہاں پہلے دو حکم تو وجوب کے لیے تھے مگر یہ نہیں کیونکہ فرض کرنے میں طاقت سے زیادہ انسان پر بوجھ پڑے گا ہر شخص اپنے کام کا مختار ہے۔ نہ کہ دوسروں کا اور جماعت کرنا دوسروں کا فعل ہے پھر اس پر کیوں فرض ہو اس قرینہ سے معلوم ہوا کہ یہ حکم وجوب کے لئے نہیں (تفسیر عزیزی) **چوتھا اعتراض:** تو چاہئے کہ جمعہ اور عیدین کے لئے بھی جماعت فرض نہ ہو کیونکہ اس جماعت میں بھی طاقت سے زیادہ تکلیف ہے۔ **جواب:** جمعہ اور عیدین میں اگر جماعت میسر نہ ہو تو یہ نمازیں بھی معاف ہو جاتی ہیں اور پنجگانہ نمازیں بہرحال فرض ہیں لہٰذا طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں۔

تفسیر صوفیانہ

مقام عشق میں حق کو باطل سے نہ ملاؤ اور تم پر جو کچھ انوار اور تجلیات نازل ہوں جو شریعت کی تصدیق کرتی ہوں اس کو فوراً قبول کرنا اور اس کے منکر نہ بنو اور منزل عشق کی تکلیفوں کو برداشت کرو کیونکہ یہ راستہ خاردار ہے اور تھوڑے آرام اور دنیوی راحتوں کے عوض میرے ان فیوض وبرکات کو فروخت نہ کر ڈالو اور نماز عشق شروع کرنے سے پیشتر ہر حالت سے اپنی بندگی ظاہر کرو نفی اور اثبات کے شغل میں عملاً مشغول رہو اہل شریعت پڑھتے ہیں۔ لَا مَعْبُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ اہل طریقت کے ہاں لَا مَوْجُوْدَ اِلَّا اللّٰہُ یعنی ماسوا اللہ کے نفی کر کے بحر توحید میں غوطہ لگاتے ہیں جب نماز عشق شروع کرو تو سب سے پہلے اس پر عمل کرو کہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْتُمْ سُکٰرٰی (النساء: ۴۳) جب تم کو محبت دنیا کثرت رنج وغم ماسوا اللہ پر نظر کا نشہ چڑھا ہو تو نماز عشق کے قریب مت آؤ اور یہ سب نشے عشق کی ترشی سے اتار دو اور پھر نماز شروع کرو تو اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ پر عمل کرو یعنی نماز

سیدھی ہو ٹیڑھی نہ ہو قلب و قالب ایک ہی طرف متوجہ ہوں یہ نہ ہو کہ قالب اور جگہ اور قلب اور جگہ۔ قالب کے ٹیڑھا ہونے سے ہر چیز ٹیڑھی ہوگی۔ شعر ۔

خشت اول چوں نہد معمار کج تا ثریا مے رود دیوار کج

نماز کی پہلی اینٹ سیدھی رکھو وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ نفس کو حرص و ہوس برے اخلاق سے پاک کرو دل کو ماسوا اللہ کے حساب سے یاد رکھو کیونکہ ماسوا اللہ حق پر زیادتی ہے اور کمال پر زیادتی نقصان ہے لہٰذا یہ زیادتی دور کرو اور وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ پر اس طرح عمل کرو اور انکساری اور اپنی ہستی کو مٹانے میں اس جماعت اولیاء کے ساتھ ہو جنہوں نے موجود حقیقی کی طلب میں اپنے وجود کو فانی کر دیا اس راستے میں اکیلے مت جاؤ ورنہ مارے جاؤ گے مولانا فرماتے ہیں۔

پیر را بگزیں کہ بے پیر ایں سفر ہست بس پر آفت و خوف و خطر

حکایت: امام محمد غزالی کے چھوٹے بھائی حامد غزالی رحمۃ اللہ علیہ بڑے ولی کامل تھے۔ یہ امام محمد رحمۃ اللہ علیہ کے پیچھے نماز نہ پڑھتے تھے انہوں نے والدہ سے شکایت کی کہ حامد بھائی مجھ میں کیا خرابی دیکھتے ہیں کہ میرے پیچھے نماز نہیں پڑھتے امام حامد نے عرض کیا کہ ان کا قالب نماز میں رہتا ہے اور قلب کتابوں میں یعنی نماز میں قرات کے وقت فقہی الجھنوں میں الجھے رہتے ہیں والدہ نے فرمایا بیٹا یہ مرض تو تم میں بھی ہے کہ وہ تو نماز میں مسائل ڈھونڈتا ہے اور تم اس کی عیب جوئی کرتے ہو تو تم سے وہ بہتر ہے کہ ان کا قلب کتابوں میں رہتا ہے اور تمہارا قلب عیب جوئی میں نماز کامل وہ تھی کہ تم کو ماسوا اللہ کی خبر نہ رہتی اللہ پاک ایسی نماز نصیب فرمائے۔ (آمین)

دوسری تفسیر صوفیانہ

اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کے معنی ہیں نماز قائم کرو اگر پہلے معنی ہوں تو مقصد یہ ہے کہ جیسے دریا کے ایریے میں پل یا عمارات بہت مضبوط بنائی جاتی ہیں تاکہ پانی کے ریلے میں بہہ نہ جائیں مضبوط مسالہ قابل انجینئر کی رائے اور لائق مستریوں سے چنائی کرائی جاتی ہے دنیا گویا دریا کا ایریا ہے جہاں نفسانی شیطانی طغیانیاں آتی رہتی ہیں خطرہ ہے کہ عبادات بلکہ ایمانیات کو بہا لے جائیں لہٰذا اسے قائم و مضبوط رکھو کہ مرتے وقت تک کوئی ایسی حرکت نہ کرو جس سے اعمال اکارت ہو جائیں یہ تب ہی ہو گا جبکہ نماز کے ارکان اعلیٰ ہوں اور شیخ کامل کی نگاہ سے تیار ہوں اگر دوسرے معنی ہوں تو منشا یہ ہے کہ نماز کی بنیاد دل پر رکھو اسکی چنائی زبان اور دیگر ظاہری اعضاء پر کرو کہ سر کعبہ کی طرف ہو اور دل کا مدینہ کے ہرے گنبد کی طرف جھکاؤ زبان سے قرآن پڑھو دل سے قرآن لانے والے محبوب کے گن گاؤ تاکہ نماز بے بنیاد نہ رہے۔ زکوٰۃ صرف مال کی نہ دو بلکہ مال حال اعمال سب میں سے زکوٰۃ نکالو نیز رب کی بارگاہ میں اکیلے نمازی بن کر نہ جاؤ نمازیوں کے ساتھ جاؤ تاکہ راستہ کے خطرات سے محفوظ رہو رب کی بارگاہ میں مقبول ہو گلدستہ کی گھاس پھول کے ساتھ رہ کر بادشاہ کی میز پر پہنچ جاتی ہے خیال رہے کہ محبت کی ہمراہی و معیت زمان و مکان کی معیت سے بے نیاز ہے ابو جہل حضور کے ساتھ نہ ہوا۔ حضور غوث پاک حضور کے ساتھ ہیں اب پڑھو وَارْکَعُوْا مَعَ الرّٰکِعِیْنَ اچھوں کے ساتھ رہ کر رکوع و سجود کرو۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ
کیا حکم دیتے ہو تم لوگوں کو ساتھ بھلائی کے اور بھولتے ہو تم جانوں کو اپنی
کیا لوگوں کو بھلائی کا حکم دیتے ہو اور اپنی جانوں کو بھولتے ہو حالانکہ تم
الْكِتٰبَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۴۴﴾
حالانکہ تم لوگ تلاوت کرتے ہو کیا پس نہیں عقل رکھتے تم
کتاب پڑھتے ہو تو کیا تمہیں عقل نہیں

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **ایک** یہ کہ اس سے پہلے علماء بنی اسرائیل کے ان عیبوں کی اصلاح کی گئی تھی جو سراسر عیب تھے اور ان برائیوں سے روکا گیا جو ایک لحاظ سے برائیاں تھیں اور دوسرے لحاظ سے بھلائیاں یعنی دوسروں کو اچھی باتوں کا حکم کرنا اور خود اس پر عمل نہ کرنا **دوسرے** یہ کہ گذشتہ آیتوں سے ایک شبہ پیدا ہوتا تھا اس آیت میں اس کو دور کیا گیا شبہ یہ تھا کہ علمائے بنی اسرائیل بعض لوگوں کو در پردہ اسلام قبول کرنے کا مشورہ دیتے تھے اور ان سے نیک کام بھی کراتے تھے اور راستہ بتانے والے کو کرنے والے کی طرح ثواب ملتا ہے وہ کہہ سکتے تھے کہ اگرچہ ہم خود ایمان نہ لائیں مگر جن لوگوں نے ہمارے مشورے سے ایمان قبول کیا ان کا ثواب ہم کو مل گیا اب ہم کو ایمان اور اعمال کی ضرورت نہیں اس آیت میں جواب دیا گیا کہ شریعت کے احکام ایسے نہیں یہاں تو جو غذا ب کھائے گا اسی کا پیٹ بھرے گا اور جو دوا پئے گا وہی صحت پائے گا۔ اپنی بھرنی ہے اگر نجات حاصل کرنا ہے تو اپنے اعمال اپنے ساتھ لاؤ۔

شان نزول

علمائے یہود سے ان کے مسلمان رشتہ داروں نے پوچھا کہ دین اسلام سچا ہے کہ نہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ تم اس پر قائم رہو یہ دین سچا ہے اور قرآن حق ہے اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی ایک روایت یہ مشہور ہے کہ عرب کے یہودی حضور ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے مشرکین عرب کو نبی آخر الزمان کی تشریف آوری کی خبر دیتے تھے اور ان کی اطاعت کرنے کی ہدایت کرتے تھے پھر جب حضور تشریف لائے تو یہ ہدایت کرنے والے حسد سے خود کافر ہو گئے تب یہ آیت کریمہ اتری (تفسیر خزائن العرفان) تفسیر روح البیان نے اس جگہ فرمایا کہ علماء یہود ان غریب یہودیوں سے جن سے کچھ دنیاوی لالچ نہ تھا چپکے سے کہہ دیتے تھے کہ تم ان نبی آخر الزمان پر ایمان لے آؤ یہ سچے ہیں۔ اور مالدار یہودیوں سے جن سے ان کو آمدنی تھی کہتے تھے حضور ﷺ میں نبی آخر الزمان کی بعض علامتیں تو ہیں بعض نہیں لہذا ایمان لانے میں جلدی نہ کرو ذرا غور کر لینے دو کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر یہ لوگ ہاتھ سے نکل گئے تو ہماری آمدنی جاتی رہے گی ان کے متعلق یہ آیت کریمہ آئی۔

تفسیر

یہ ہمزہ استفہام سوال کا ہے اور یہ استفہام یا اظہار تعجب کے لئے ہے یا جھڑ کنے کیلئے یعنی تعجب یا سخت افسوس ہے کہ تم لوگوں کو تو اچھی باتیں بتاتے ہو اور اپنے کو بھول جاتے ہو تَاْمُرُوْنَ۔ امر سے بنا ہے جس کے معنی ہیں اپنے چھوٹے کو کسی چیز کا حکم کرنا۔ چونکہ کہنے والے علماء تھے اور سننے والے ان کے ماتحت جہلاء اس لئے تَاْمُرُوْنَ فرمایا گیا خیال رہے کہ چھوٹے سے کچھ طلب کرنا امر کہلاتا ہے برابر والے سے التماس بڑے سے طلب کرنے کو دعا یا استدعا کہتے ہیں اور کبھی امر مشورے کے معنی میں بھی استعمال ہو جاتا ہے۔ الناس اس سے مراد یا تو علماء یہود کے وہ قرابت دار ہیں جو مسلمان ہو چکے تھے یا غریب یہودی یا مشرکین عرب جیسا کہ شان نزول میں بیان کیا جا چکا ہے بالبر۔ لفظ بر کے معنی وسعت اور فراخی کے ہیں اس لئے وسیع میدان کو بر کہا جاتا ہے اصطلاح میں نیک کام اور سچائی اور سچے کو بر کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں بر الوادین اور حج مبرور یعنی مقبول حج جو اپنی قسم کو پورا کرے تو بولتے ہیں بر فی یمینہ یعنی اپنی قسم میں سچا نکلا قرآن پاک فرماتا ہے وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى (بقرہ:۱۸۹) یعنی سچا وہ ہے جو پرہیزگار رہے اس جگہ بر سے یا تو ہر اچھی بات مراد ہے یا لوگوں کو ایمان کی رغبت دینا یا ایمان پر قائم رہنے کا مشورہ دینا یا ان کو نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کا حکم دینا یا توریت کی پیروی کرنے کا حکم دینا۔ یعنی اے علماء یہود تم دوسروں کو تو ایمان لانے پر قائم رہنے توریت پر عمل کرنے اور صدقہ وخیرات کا حکم دیتے ہو لیکن خود ان سب سے ایک دم دور ہو وہ تَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ تنسون۔ نسیان سے بنا ہے جس کے معنی ہیں بھول جانا خیال رہے کہ علم کے بعد بھولنے کو نسیان کہتے ہیں اور مطلق بھولنے کو سہو۔ یہاں نسیان ترک (چھوڑنے) کے معنی میں ہے یعنی تم اپنے کو عمل سے ایسے دور رکھتے ہو جیسے کہ بھول ہی گئے یا گویا تمہارے حق میں یہ آیتیں آئی ہی نہیں وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ۔ تتلون۔ تلاوت سے بنا ہے جس کے معنی ہیں متبرک چیز کو پڑھنا تلاوت بھی "تلوٌ" سے بنا ہے جس کے معنی ہیں پیچھے ہونا اس لئے پیچھے آنے والے کو، تالی کہتے ہیں کیونکہ پڑھنے والا بھی کتاب کا مضمون پڑھ کر پیچھے چھوڑتا ہے اور خود آگے بڑھتا ہے اس لئے اس کو تلاوت کہتے ہیں الکتب سے توریت مراد ہے یعنی تم دن رات توریت شریف میں جا بجا یہ پڑھتے ہو کہ جس کا قول اس کے عمل کا مخالف ہو وہ عذاب اور وبال کا مستحق ہے اور پھر تم وہی حرکت کرتے ہو اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ یہ استفہام بھی تعجب یا رغبت دینے کیلئے ہے یا یعنی تعجب ہے کہ تم اتنی موٹی بات سمجھتے کیوں نہیں یا کیا تم میں اتنی عقل بھی نہیں جو ایسی ظاہر بات کو سمجھ لو تعقلون، عقل سے بنا ہے جس کے لغوی معنی ہیں منع کرنا باز رکھنا اسی لئے جس رسی سے جانور کو باندھا جائے اسے عقال کہتے ہیں اصطلاح میں عقل اس نور روحانی کو کہتے ہیں جس سے باریک باتیں معلوم کی جائیں عقل کا خزانہ دماغ یا دل ہے اسی لئے دماغ خراب ہو جانے پر اور دل کے سخت غمگین ہونے پر انسان بے عقل ہو جاتا ہے چونکہ یہ نور بھی انسان کو بری باتوں سے روکتا ہے اور نیکی پر قائم رکھتا ہے اس کو عقل کہا جاتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے علماء بنی اسرائیل تم دوسروں کو تو اچھے اعمال کا حکم دیتے ہو اور خود عمل نہیں کرتے حالانکہ تم توریت میں جگہ جگہ پڑھ چکے ہو

کہ جو شخص لوگوں کو وعظ و نصیحت کرے اور خود اس پر عامل نہ ہو وہ بہت برا اور مستحق عذاب شخص ہے اور یہ بات تو عقل سے بھی معلوم ہوسکتی ہے کہ دوسرے کو کچھ کہنا اور خود اس کے خلاف عمل کرنا بدتر گناہ ہے کیونکہ اس حرکت سے وعظ کا اثر جاتا رہے گا اولاً تو اس لئے کہ واعظ بے عمل کی آواز صرف لوگوں تک پہنچتی ہے اور عالم باعمل کا کلام دلوں میں اثر کرتا ہے دوسرے اس لئے کہ واعظ بے عمل کو دیکھ کر لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ سب کچھ جھوٹ ہے اگر سچ ہوتا تو واعظ صاحب کے دل میں خوف ہوتا اور وہ اس کے عامل ہوتے اس وجہ سے واعظ کا وعظ بے تاثیر رہ جاتا ہے اور اس وعظ کی ساری محنت رائیگاں جاتی ہے کیونکہ وعظ سے مقصود عمل ہے جب وہ ہی حاصل نہیں ہوا تو وعظ کا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ:** یہ کہ واعظ کو چاہئے کہ پہلے خود اپنے وعظ پر عامل ہو۔ ورنہ اس کا وعظ بے تاثیر ہوگا اور خود اس کو دنیا و آخرت میں رسوائی حاصل ہوگی روایت، حدیث معراج میں ہے کہ حضور ﷺ نے ایک جماعت کو دیکھا کہ ان کے ہونٹ آگ کی مقراض (قینچی) سے کاٹے جارہے ہیں حضرت جبریل علیہ السلام سے پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں عرض کیا واعظین بے عمل ہیں۔ مسلم اور بخاری شریف میں اسامہ ابن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ قیامت کے دن ایک شخص کو دوزخ میں ڈالا جائے گا اس کی انتڑیاں باہر نکل پڑیں گی جس کو کھینچتا ہوا وہ اس طرح چکر لگائے گا جیسے چکی کے ارد گرد گدھا دوسرے دوزخی پوچھیں گے کہ تو بڑا واعظ تھا تو اس بلا میں کیوں گرفتار ہوا وہ کہے گا کہ میں واعظ تو تھا لیکن بے عمل تھا روایت، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ عالم بے عمل چراغ کی بتی کی طرح ہے کہ خود جلتی ہے اوروں کو روشنی پہنچاتی ہے (تفسیر کبیر) روایت جنتیوں کا ایک گروہ دوزخیوں کی ایک جماعت کو آواز دے گا کہ ہم تمہاری تعلیم سے جنت میں آگئے تم خود جہنم میں کیوں پہنچے افسوس ہے کہ شاگرد جنت میں استاد دوزخ میں وہ جواب دیں گے کہ تمہارے پاس عمل تھا ہمارے پاس نہ تھا (تفسیر کبیر) **دوسرا فائدہ:** جو فقط قول سے وعظ کرتا ہے اس کا کلام برباد ہے اور جو اپنے عمل سے وعظ کرے اس کا وعظ دلوں کو شکار کر لیتا ہے دیکھو صحابہ کرام کے زمانے میں نہ بڑے بڑے جلسوں کا رواج تھا اور نہ اس زمانے کی طرح ان میں تیز طرار مقرر تھے ان کی سیدھی سادھی باتیں ہوتی تھیں اور بے تکلف تقریریں مگر ان سیدھی باتوں نے دنیا کو پلٹ دیا۔ عالم میں انقلاب برپا کر دیا کیونکہ ان کے پاس دل کی آواز تھی اور عمل والا وعظ، حق تعالیٰ انہیں کے طفیل سے ہم لوگوں کو بھی وہی آواز عطا فرمائے۔ **تیسرا فائدہ:** یہ کہ جس طرح واعظ بے عمل قابل ملامت ہے اسی طرح واعظ باعمل لائق ہزار کرامت اس کا درجہ دنیا میں بھی بڑا آخرت میں بھی

حکایت: تفسیر کبیر نے اس جگہ فرمایا کہ یزید ابن ہارون واعظ باعمل اور زاہد بے ریا تھے ان کے انتقال کے بعد کسی نے ان کو خواب میں دیکھا پوچھا کہ قبر میں کیسی گزری انہوں نے جواب دیا کہ نکیرین نے مجھ سے پوچھا کہ رب تیرا کون میں نے کہا کہ جس نے ہزاروں کو رب کی طرف بلایا وہ خود رب کو بھول جائے

حکایت: حضرت شیخ شبلی سے نزع کے وقت کہا گیا کہ کہو لا الہ الا اللہ آپ نے جواب میں یہ شعر پڑھا (فرمایا)

اِنَّ بَيْتًا اَنْتَ سَاكِنُهٗ غَيْرُ مُحْتَاجٍ اِلَى السُّرُجِ

یعنی جس گھر میں اے پیارے تو ہو وہاں چراغ کی ضرورت نہیں جس دل میں ان کا دھیان ہو اسے زبان ہلانے کی ضرورت نہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم بے عمل کو وعظ کہنا جائز نہیں لہٰذا کوئی مسئلہ معلوم ہو جس پر ہم عامل نہ ہوں تو چاہئے کہ کسی کو غلطی کرتے ہوئے دیکھ کر بھی نہ بتائیں۔ **جواب:** اس میں وعظ کی برائی معلوم نہ ہوئی بلکہ عمل نہ کرنے کی واعظ کو چاہئے کہ وعظ بند نہ کرے بلکہ عمل کرنا شروع کر دے اگر خود عامل نہ بھی ہو تب بھی دین کی تبلیغ کئے جائے کیونکہ ابھی تو ایک گناہ کر رہا ہے اور وعظ بند کر دینے پر دو گناہ ایک بدعملی اور دوسرے دین کو چھپانا ہے۔ عالم بے عمل کی مثال چراغ والے اندھے کی سی ہے کیونکہ وہ تو اس سے فائدہ حاصل نہیں کرتا مگر دوسروں کو فائدہ پہنچا دیتا ہے اور یہ بھی ایک نیکی ہے۔ **دوسرا اعتراض:** غریب مولوی کو چاہئے کہ زکوۃ اور حج کے احکام کو نہ بیان کرے کیونکہ وہ اپنی غریبی کی وجہ سے خود ان کا عامل نہیں لہٰذا وہ بے عمل ہے **جواب:** بے عمل وہ کہلاتا ہے جس پر عمل کرنا ضروری ہو اور نہ کرے جس کو شریعت نے معافی دی وہ بے عمل نہیں ایک طبیب بیمار کو دوا پلاتا ہے اگر بیمار کہے کہ حکیم صاحب پہلے دوا آپ پیو پھر مجھے پلاؤ تو وہ بیوقوف ہے کیونکہ اس کو دوا کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ حضور ﷺ پر زکوۃ فرض نہ تھی لیکن آپ نے اوروں کو اس کا حکم دیا۔

تفسیر صوفیانہ

انسان پر اپنے نفس کا بھی حق ہے اپنے عزیزوں کا بھی اور دوسرے اجنبیوں کا بھی پہلے نفس کا حق ادا کرے پھر اہل قرابت کے حقوق پھر دوسروں کے بے عمل واعظ اپنے نفس کا حق ادا نہیں کرتا دوسروں کے حقوق کی فکر میں ہے وہ یقیناً ظالم ہے حضور ﷺ اول ہی سے عارف و عابد تھے۔ پھر اپنے اہل قرابت کو تبلیغ کی پھر اپنے ملک والوں کو پھر دوسروں کو صوفیاء فرماتے ہیں کہ اپنے نفس کو بھول جانا بدترین جرم ہے نفس کی معرفت رب کی معرفت کا ذریعہ ہے نفس کی بھول رب کو بھول جانے کا ذریعہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ رب فرماتا ہے وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (حشر:۱۹) معلوم ہوا کہ رب کا بڑا عذاب یہ ہے کہ بندے کو اس کے نفس کی طرف سے غافل فرما دے خیال رہے کہ چہرہ دیکھنے کے لئے دنیاوی آئینے بنائے گئے مگر آئینہ دل نفس ایمان دیکھنے کے لئے رب نے حضور کو بھیجا کہ ہر شخص حضور کے ذریعے اپنے کو پہچان سکتا ہے کہ کتنے پانی میں ہوں۔ آئینہ کے ایک طرف مصالحہ ہوتا ہے دوسری جانب شفاف حضور کا ایک رخ بشریت دوسرا رخ نور ہے۔

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى
اور مدد حاصل کرو ساتھ صبر اور نماز کے اور تحقیق وہ البتہ بھاری ہے مگر اوپر
اور صبر سے اور نماز سے مدد چاہو اور بے شک نماز ضرور بھاری ہے مگر ان پر جو میری

الْخٰشِعِيْنَ ﴿۴۵﴾ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ
دل سے رجوع کرنیوالوں کے جو کہ یقین کرتے ہیں کہ تحقیق وہ ملنے والے ہیں رب اپنے سے
طرف جھکتے ہیں جنہیں یقین ہے کہ انہیں اپنے رب سے ملنا ہے
اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿۴۶﴾
اور تحقیق وہ طرف اس کی لوٹنے والے ہیں
اور اس کی طرف پھرنا ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **ایک** یہ کہ پہلے بنی اسرائیل کو اپنے پرانے دین چھوڑنے اور نئے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا۔ نیز نماز مع جماعت ادا کرنے اور زکوۃ دینے کی ہدایت کی گئی اور یہ کام ان پر بہت شاق اور بھاری تھے لہٰذا اب اس آیت میں وہ ترکیب بتائی گئی جس سے ان کی مشکل آسان ہو جائے جیسے طبیب بیمار کو بدمزہ دوا دیتا ہے اور ہدایت کرتا ہے کہ اس میں شکر ملا کر پینا **دوسرے** یہ کہ اس سے پہلے بنی اسرائیل کو علاج بتایا گیا تھا اور اب وہ ترکیب بتائی جس سے وہ علاج آسان ہو قابل ڈاکٹر جب کسی کمزور بیمار کا آپریشن کرتا ہے تو اسکو کلوروفارم، بیہوشی کی دوا سونگھا دیتا ہے تا کہ اسے محسوس نہ ہو رب نے بھی ان کمزوروں کو صبر و نماز کے لئے کلوروفارم تجویز فرمایا جس سے ان کو اعمال کی مشقت محسوس نہ ہو۔

تفسیر

اُسْتَعِيْنُوْا۔ استعانت کے معنی مدد مانگنا اور مدد حاصل کرنا ہے یعنی اللہ سے بذریعہ صبر و نماز کے لئے مدد مانگو یا نماز اور صبر سے مدد حاصل کرو یعنی علماء فرماتے ہیں کہ یہ مومنین کو حکم ہو رہا ہے کیونکہ علماء بنی اسرائیل اب تک ایمان لائے ہی نہ تھے ان کو یہ احکام دینا کیا معنی مگر صحیح یہی ہے کہ یہ علمائے بنی اسرائیل سے خطاب ہے ورنہ اس آیت کا تعلق گذشتہ سے نہ رہے گا اور آیت بے جوڑ ہو جائے گی۔ کفار کو شرعی احکام سنانے کی پوری بحث ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں بِالصَّبْرِ یہ ب یا استعانت کی ہے یا صلہ کی یعنی صبر و نماز کے ذریعے رب سے مدد مانگو یا اس صبر و نماز سے مدد حاصل کرو۔ صبر کے معنی ہیں روکنا اصطلاح میں کامیابی کی امید سے مصیبت پر بیقرار نہ ہونے کو صبر کہتے ہیں۔ صبر کی تین قسمیں ہیں۔ مصیبت میں صبر کرنا، عبادت اور اطاعت کی مشقتوں پر صبر کرنا اور ان پر قائم رہنا نفس کو گناہ کی طرف مائل ہونے سے روکنا اس کو یوں سمجھو کہ مصیبت میں دل چاہتا ہے کہ بیقراری اور بے چینی کا اظہار کرے اب دل کو قابو میں رکھنا اور راضی برضا رہنا پہلی قسم کا صبر ہے سردی کے موسم میں ٹھنڈے پانی سے وضو کرنے کی ہمت نہیں پڑتی اسی طرح زکوۃ نکالنے کو جی نہیں چاہتا اب دل پر جبر کر کے ان کاموں کو کر گزرنا دوسری قسم کا صبر ہے گانے بجانے کی طرف دل مائل ہے ہم دیکھتے ہیں کہ سود خوار بڑے مزے سے پیسے کما رہے ہیں

ہمارا دل بھی چاہتا ہے کہ یہ حرکت کریں اب دل کو روکنا اور ادھر نہ جانے دینا تیسری قسم کا صبر ہے اس جگہ تینوں قسم کے صبر مراد ہو سکتے ہیں۔ بعض علماء کرام فرماتے ہیں کہ یہاں صبر سے روزہ مراد ہے کیونکہ اس میں بھی نفس کو خواہشات سے روکنا ہوتا ہے اگر چہ نماز روزے پر مقدم ہے لیکن اس جگہ روزہ مقدم نماز پر بعض نے فرمایا ہے کہ صبر ہر مقام کا علیحدہ ہے جہاد میں نہ بھاگنا صبر ہے۔ نماز کو ہمیشہ پڑھنا صبر ہے گناہ سے استغفار کرنا اس کا صبر ہے غرضیکہ اس میں بہت گنجائش ہے صبر ایک قسم کی ورزش ہے جس طرح ورزش کرنے والا پہلوان بھاری بوجھ اٹھا سکتا ہے اور دشمن کا مقابلہ کر سکتا ہے اسی طرح صابر بندہ بڑی بلاؤں کا مقابلہ کر سکتا ہے اور بے صبر دل چھوڑ جاتا ہے وَالصَّلٰوۃِ چونکہ نماز بھی صبر ہے ظاہری و باطنی اعضاء کو پابند کرنا پڑتا ہے نیز بعض وقت اس کی وجہ سے کچھ تکلیف بھی برداشت کرنی پڑتی ہے اس لئے صبر کے بعد اس کا ذکر ہوا یہاں صلوٰۃ سے یا تو پنجگانہ نماز مراد یا خاص نماز یعنی پنجگانہ نمازوں کے ذریعہ مدد حاصل کرنا ہر مصیبت کے وقت خاص نمازوں سے قحط سالی میں نماز استسقاء سے اور خاص مصیبت کے وقت نماز حاجت وغیرہ سے چونکہ نماز انسان کو دنیا سے بے خبر کر کے اللہ کی طرف متوجہ کر دیتی ہے اس لئے اس کی برکت سے دنیا کی مشکلیں دل سے فراموش ہو جاتی ہیں۔ تفسیر عزیزی نے اس جگہ بیان فرمایا کہ جب نبی کریم ﷺ کے گھر میں فاقہ ہوتا تھا اور رات میں کچھ ملاحظہ نہ فرماتے تھے اور بھوک غلبہ کرتی تھی تو نبی کریم ﷺ دربار مسجد میں تشریف لا کر نماز میں مشغول ہوتے تھے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرزند کی وفات کی خبر سن کر نماز میں مشغول ہو گئے اور اس کو اتنا دراز کیا کہ جب لوگ دفن کر کے لوٹے تب آپ فارغ ہوئے لوگوں نے اس کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا کہ مجھے اس فرزند سے بہت محبت تھی میں اس کی جدائی کا صدمہ برداشت نہ کر سکتا تھا چار نماز میں مشغول ہو کر اس صدمے سے بے خبر ہو گیا اور آپ نے یہی آیت پڑھی اس کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ اولاً تو صبر سے مدد لو اور جب صبر سے کام نہ چلے تو نماز میں مشغول ہو جاؤ چونکہ نماز میں کمال مشغولیت ہوتی ہے اور روح حضور الٰہی کی لذتوں میں اس قدر مشغول ہو جاتی ہے کہ پھر اس تک کوئی خطرہ نہیں پہنچ سکتا لہٰذا دنیوی تکلیفوں سے راحت دیتی ہے۔ خیال رہے کہ تفسیر کی بنا پر معنی یہ تھے کہ صبر و نماز کے ذریعے، وسیلہ سے رب سے مدد مانگو یعنی عرض کرو کہ مولا ہماری نمازوں و صبر وغیرہ نیک اعمال کی برکت سے فلاں کام میں ہماری مدد فرما جیسا کہ غار میں پھنس جانے والے تین اسرائیلیوں کا قصہ حضور نے بیان فرمایا کہ انہوں نے اپنے اعمال کے توسل سے دعا کی اور رہائی پائی جب ہمارے مشکوک اعمال جن کی مقبولیت یقینی نہیں وہ وسیلہ قبول دعا بن سکتے ہیں تو حضور ﷺ جو یقیناً مقبول ان کی ہر ادا رب کو پیاری ان کا توسل بھی ضرور درست اس توسل کی پوری بحث ہماری کتاب جاء الحق حصہ اول میں ملاحظہ کرو۔ وَاِنَّهَا یہ ضمیر یا تو صرف نماز کی طرف لوٹتی ہے یا صبر و نماز دونوں کی طرف یا استعانت کی طرف یعنی وہ نماز یا صبر و نماز دونوں یا ان سے مدد لینا بڑا بھاری ہے۔ لَكَبِيْرَةٌ یہاں کبیرہ کے معنی شاق دشوار اور ثقیل یعنی بھاری کے ہیں جیسے کہ قرآن پاک میں ہے كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ (شوریٰ: ۱۳) مشرکین پر بھاری پڑ گیا۔ یعنی وہ نماز وغیرہ کفار منافقین وغیرہ پر بہت بھاری ہے اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ۔ خاشعین خشوع سے بنا ہے جس کے معنی ہیں عاجزی یا رب کی طرف مائل ہونا یا سکون قلب۔ قرآن کریم فرماتا ہے تَرَى الْاَرْضَ خَاشِعَةً (حم السجدہ: ۳۹) یعنی سَاكِنَتًا، لَرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا

(الحشر:۲۱) یعنی مائل یا عاجز یہاں تینوں معنی بن سکتے ہیں۔ یعنی نماز سب پر بھاری ہے۔ سوائے ان کے جن کے دل میں سکون ہے یا رب کے سامنے عاجز ہیں یا اس کی طرف میلان جس سے معلوم ہوا کہ وہ نماز کارآمد ہے جس میں قلب اور قالب دونوں اللہ کی طرف مائل ہوں۔ اگر جسم مسجد میں رہا اور دل بازار میں تو اس سے یہ فائدہ نہ ہوگا اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ یَظُنُّوْنَ۔ ظن سے بنا ہے جس کے حقیقی معنی گمان ہیں اور مجازی معنی ہیں یقین۔ قرآن کریم فرماتا ہے اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِكَ اَنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ (مطففین: ۴) یہاں ظن بمعنی یقین ہے کیونکہ قیامت وغیرہ پر یقین رکھنا ہی ایمان ہے شک کفر ہے اور ہوسکتا ہے کہ یہ ظن گمان کے معنی میں ہو تو اب مُلٰقُوْا کے دوسرے معنی ہوں گے اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ۔ مُلٰقُوْا ملاقات سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ملنا۔ یہاں یا تو قیامت میں رب سے ملنا مراد ہے۔ یا حالت نماز میں یا موت کے وقت وغیرہ یعنی نماز ان لوگوں پر بھاری نہیں جن کو قیامت میں رب سے ملنے کا یقین ہے یا ان پر جو ہر لحظہ اپنی موت کا اندیشہ رکھتے ہیں۔ یعنی ہر نماز کو اپنی آخری نماز سمجھ کر پڑھتے ہیں۔ یا ان پر جو اپنے رب سے ثواب پانے کی امید رکھتے ہیں۔ یا ان پر کہ جو نماز کے وقت یہ سمجھتے ہیں کہ ہم رب سے ملاقات کر رہے ہیں اور رب ہم کو دیکھ رہا ہے وَاَنَّهُمْ اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ راجعون رجوع سے بنا ہے جس کے معنی ہیں واپس ہونا اور لوٹنا جتنے ملاقات میں احتمال تھے اتنے ہی یہاں لوٹنے میں ہیں۔ یعنی ان پر نماز بھاری نہیں جنہیں یقین ہے کہ وہ قیامت میں رب کی طرف رجوع کریں گے یا موت اور رجوع قریب ہے اور یا ہم بحالت نماز رب کی طرف متوجہ ہیں اور اس سے کلام کر رہے ہیں۔ لہٰذا یہاں ظن سے مراد یقین بھی ہوسکتا ہے اور گمان بھی جو کفار کہ قیامت وغیرہ کے قائل ہی نہیں اسی طرح جو مسلمان دراز زندگی کا یقین رکھ رہے ہیں یا جو کہ نماز بے پرواہی سے ادا کرتے ہیں۔ ان پر نماز یقیناً بھاری ہے اور ان کو اس نماز سے پورا پورا فائدہ حاصل نہیں ہوتا (تفسیر عزیزی اور تفسیر کبیر)

خلاصہ تفسیر

بنی اسرائیل کو حضور علیہ السلام پر ایمان لانے اور مسلمانوں کی جماعت سے مل جانے کا حکم دیا گیا اور یہ ان پر بہت بھاری تھا۔ لہٰذا انہیں وہ تدبیر بتائی جس سے یہ سارے کام آسان ہو جائیں فرمایا گیا کہ اگر تم پر یہ بات گراں ہو تو صبر اور نماز سے مدد لینا پھر صبر میں تو اتنی مشقت نہ تھی البتہ نماز ضرور دشوار تھی یعنی نماز دیگر دشواریوں کا علاج ہے لیکن یہ خود بھی دشوار ہے اس کو آسان کرنے کی نہایت بہتر تدبیر بتائی گئی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ نماز میں دشواری کی وجہ یہ ہے کہ انسان کا دل میدان خیال میں آزاد پھرنے کا عادی ہے اور ظاہری اعضاء دل کے تابع نماز میں ظاہری اعضاء کو تو پورا پورا بند کر لیا گیا ہے کہ ہنسنا بولنا، کھانا پینا، چلنا سب حرام کر دیے اس ظاہری پابندی کا اثر دل پر پڑتا ہے جس سے کہ وہ گھبرانے لگتا ہے اس گھبراہٹ کی وجہ یہ ہے کہ دل ہر وقت حرکت چاہتا ہے اس کو سکون اور چین کی عادت نہیں۔ لہٰذا سب سے پہلے حکم ہوا کہ دل میں خشوع یعنی سکون اور قرار پیدا کرو یہ سکون نماز کو آسان کر دے گا۔ چونکہ نفس ایک وقت میں دو طرف توجہ نہیں کر سکتا اس کو اگر ایک خیال میں لگا دیا جائے تو دوسرے خیالات خود بخود جاتے رہتے ہیں۔ اس لئے خشوع کے بعد وہ خیال بتا دیا گیا جس میں دل کو لگا دینا چاہیے۔ یعنی اپنے رب سے ملاقات کا خیال اور اسی طرف رجوع ہونے کا دھیان۔ جب دل میں یہ خیال پیدا ہوگا تو دنیوی

خیالات خود بخود جاتے رہیں گے۔ جس سے اس کو قرار حاصل ہوگا اور قرار سے نماز آسان ہوگی۔ بلکہ اسی میں لذت حاصل ہوگی اور دل لذیذ چیز کا حریص ہوتا ہے لہٰذا وہ نماز پر حریص ہو کر اس کا پابند ہوگا اور پابندی نماز سے انشاء اللہ سب مشکلیں آسان ہو جائیں گی۔ سبحان اللہ کیسا باقاعدہ اور بہتر علاج تجویز فرمایا گیا۔ اب خواہ دل میں یہ خیال پیدا ہو کہ ہمیں قیامت میں رب کے سامنے پیش ہونا ہے اور اپنا حساب زندگی دینا ہے جس سے کہ خوف اور امید پیدا ہو اور نماز کا شوق ہو یا یہ خیال ہو کہ ممکن ہے کہ یہ نماز ہماری آخری نماز ہو اور پھر ہم کو موقعہ نہ ملے۔ یا یہ کہ ہم رب کو دیکھ رہے ہیں اور اس سے کلام کر رہے ہیں اور یا یہ کہ رب ہم کو دیکھ رہا ہے۔ ہمارا کلام سن رہا ہے حدیث پاک میں ارشاد ہوا کہ یہ سمجھ کر عبادت کرو کہ تم رب کو دیکھ رہے ہو اگر یہ نہ سمجھ سکو تو کم از کم یہ ہی سمجھ لو کہ وہ ہم کو دیکھ رہا ہے۔ حق تعالیٰ ایسی نماز اور خیالات ہم سب کو نصیب فرمائے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **ایک:** یہ کہ صبر و نماز سے بڑی بڑی مشکلیں حل ہو جاتی ہیں تفسیر عزیزی نے اس جگہ فرمایا کہ حدیث شریف میں ہے کہ علم مسلمان کا دوست ہے اور حلم یعنی بردباری اس کا وزیر اور عقل اس کی رہبر اور تواضع اور نرمی اس کا بھائی اور صبر اس کے لشکر کا جرنیل جس طرح بغیر جرنیل کوئی ملک فتح نہیں ہوسکتا اسی طرح بغیر صبر کوئی مشکل حل نہیں ہوسکتی۔ **دوسرے:** یہ کہ دنیوی کاموں میں بھی بغیر صبر کامیابی نہیں ہوسکتی۔ اگر تاجر استقلال سے تجارت نہ کرے اور تجارت کی مشکلات اور اس کے نقصانات پر صبر نہ کرے تو کبھی اس میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے یہاں استعینو اطلق فرمایا گیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ ہر دینی و دنیوی مشکلات میں صبر و نماز سے مدد لینی چاہئے۔ **تیسرے:** یہ کہ عابد گوشہ نشین سے عالم دین افضل ہے۔ کیونکہ وہ نہ لوگوں سے میل جول رکھتا ہے نہ ان سے تکلیفیں اٹھاتا ہے۔ نہ صبر کرتا ہے۔ عالم دین لوگوں میں رہ کر تبلیغ دین کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے صدہا اس کے دشمن بن جاتے ہیں۔ سب کی اذیتیں برداشت کرتا ہوا صبر سے اپنے کام کئے جاتا ہے وہ یقینی بڑے درجے والا ہے۔ حضرات صحابہ کرام نے کسی کا باپ نہیں مارا تھا۔ لیکن آج صدہا سال کے بعد بھی ان پر تبرا ہو رہا ہے تفسیر عزیزی نے اس جگہ ایک حدیث نقل فرمائی کہ کہ ایک صحابی نے حضور علیہ السلام کے زمانہ میں ایک پہاڑ کے غار میں گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ حضور علیہ السلام نے چند روز بعد صحابہ کرام سے دریافت کیا کہ وہ غیر حاضر کیوں ہیں۔ لوگوں نے یہ واقعہ عرض کیا۔ فرمایا کہ ان کو بلاؤ جب وہ حاضر ہوئے تو ان سے اس کی وجہ دریافت کی انہوں نے عرض کیا۔ کہ لوگوں کی صحبت عبادت میں خلل ڈالتی ہے۔ حضور نے فرمایا کہ مسلمانوں کی صحبت میں رہ کر مشقتیں برداشت کرنا ساٹھ سالہ تنہائی کی عبادت سے افضل ہے۔ **چوتھے:** یہ کہ رب سے بذریعہ اعمال دعا کرنا زیادہ قابل قبول ہے اس لئے کہ اس آیت کے معنی یہ بھی ہوسکتے ہیں۔ کہ بذریعہ صبر و نماز رب سے مدد مانگو۔ **پانچویں:** یہ کہ مسلمانوں کو انشاء اللہ آخرت میں دیدار الٰہی ہوگا کیونکہ یہاں فرمایا گیا ہے مُلٰقُوْا رَبِّهِمْ اور بغیر دیدار ملاقات ناقص ہے۔ **چھٹے:** یہ کہ نماز کا بھاری معلوم ہونا نفاق کی علامت ہے، حدیث پاک میں فرمایا گیا کہ عشاء و فجر کی نمازیں منافقین پر بہت دشوار ہیں۔ کیونکہ منافق نماز کو بے کار جانتا ہے اور مسلمان اس سے ہزار ہا امیدیں رکھتا ہے۔ امید کی وجہ سے بھاری کام بھی ہلکے معلوم ہوتے

ہیں۔ کسان غلے کی امید میں کڑی دھوپ میں سخت محنت کر لیتا ہے طالب علم کامیابی کی امید میں بہت کوشش کر جاتا ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ نماز مسلمانوں کے لئے آسان اور منافقین کے لئے مشکل ہے تو چاہئے کہ منافقین کو اس کا ثواب زیادہ ملے اور مسلمانوں کو کم کیونکہ جو مشکل کام کرے اس کا ثواب زیادہ ہونا چاہئے۔ **جواب:** اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کو نماز آسان معلوم ہوتی ہے اور منافقین کو بھاری۔ نماز ایک ہی فعل ہے مسلمانوں کے لئے زیادہ سخت کیونکہ وہ قلب وقالب دونوں سے ادا کرتا ہے لیکن رضائے الٰہی کی خوشی میں اس کو یہ دشواری محسوس نہیں ہوتی۔ جیسے بیمار تندرستی کے لالچ میں کڑوی دوائیں پی لیتا ہے۔ دوا تو کڑوی ہی ہے۔ لیکن شفا کی امید نے اس کا پینا آسان بنا دیا کیا تم نے نہیں سنا کہ حضور ﷺ کے قدم پاک پر نماز سے ورم آ جاتا تھا۔ لیکن پھر فرماتے ہیں۔ کہ نماز میں میری آنکھ کی ٹھنڈک ہے۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا تعالیٰ کسی خاص جگہ میں رہتا ہے جہاں کہ ہم مرنے کے بعد جائیں گے۔ کیونکہ فرمایا گیا ہے اِلَیْهِ رٰجِعُوْنَ **جواب:** اس کا تفصیلی جواب مٰلِكِ یَوْمِ الدِّیْنِ کی تفسیر میں دیا گیا ہے۔ یعنی اس جگہ جانا مراد ہے جہاں سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی کی ظاہری حکومت وغیرہ بھی نہ ہو۔ یعنی میدان محشر۔ کیونکہ دنیا میں بظاہر اوروں کی بھی حکومت ہے۔ **تیسرا اعتراض:** الیہ انتہا کے لئے آتا ہے اور انتہا کسی جسم کی طرف ہونی چاہئے۔ معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ جسم ہے۔ **جواب:** انتہا کے لئے جسم ضروری نہیں کہا جاتا ہے کہ فلاں اپنی اصلی حالت کی طرف لوٹ گیا۔ دیکھو حالت جسم نہیں مگر رجوع کی انتہا ہے۔ یہاں مطلب یہ ہے کہ بلا واسطہ رب کی حکومت کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ **چوتھا اعتراض:** رجوع کے معنی ہیں پہلی حالت کی طرف لوٹ جانا۔ جس سے معلوم ہوا کہ روحیں قدیم میں ہمیشہ سے ایک عالم میں تھیں۔ عارضی طور پر دنیا میں آ کر پھر وہیں لوٹ جائیں گی۔ **جواب:** اس کا جواب وہی دوسرے اعتراض کا جواب ہے۔ بیشک اس سے پہلے عالم ارواح میں روحیں تھیں لیکن یہ کیسے معلوم ہوا کہ ہمیشہ سے تھیں۔

تفسیر صوفیانہ

اس سے پہلے لوگوں کو راہ عشق طے کرنے کا حکم دیا گیا تھا اور محبوب حقیقی نے سب کو اپنی طرف دعوت دی تھی اب فرمایا گیا کہ چونکہ میرا راستہ خاردار ہے اور اس کا طے کرنا دشوار ہے اس لئے ہم تم کو دو سواریاں یا دو باز وعطا فرماتے ہیں جن پر سوار ہو کر یا جن سے اڑ کر ہم تک پہنچو۔ ایک صبر یعنی شہوات نفسانیہ اور خواہشات حیوانیہ سے پرہیز۔ دوسرے نماز یعنی دروازہ غیب پر معتکف رہنا اور رب کی بارگاہ میں دائم وقائم رہنا۔ مگر یہ بھی خیال رہے کہ ان سواریوں پر سوار ہونا بھی آسان نہیں ہے۔ یہ ہر ایک کے قبضے میں نہیں آتیں سوائے ان اس کے جن پر حق تعالیٰ اپنی تجلی فرمائے اور جس سے ان میں سکون پیدا ہو جائے اور یہ تجلی حق سے الفت پیدا کر دے اور خلق کی کلفت دور کرے اور پھر ان کو یقین ہو جائے کہ ہم انشاء اللہ اس راستے کو ضرور طے کریں گے اور ایک دن جمال یار کا ضرور مشاہدہ کریں گے۔ پھر یہ بھی انہیں یقین ہو کہ ہم خود اپنی کوشش سے یہ وادی طے نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ جذبات حق ہم کو اپنی طرف کھینچ رہے ہیں اور اس بحر کی لہریں ہم کو ادھر بہائے لئے جا رہی ہیں۔ پھر یہ

خیال رہے کہ جس طرح پل صراط پر گزرنے والے مختلف ہوں گے بعض تیز رو اور بعض سست رفتار اسی طرح اس راستے کو طے کرنے والے مختلف ہیں۔ بعض وہ جن کے لئے یہ نماز اور صبر تیز رفتار سواری ہیں اور بعض وہ جن کے لئے یہ دونوں چیزیں اڑنے والے بازو ہیں۔ بعض کا چلنا ہلکا بعض کا قوی۔ مولانا فرماتے ہیں

یک زمانہ صحبتے با اولیاء — بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا

صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ لوہے کو نرم کر کے اسے ڈھالتے ہیں یا اس کے کل پرزے بناتے ہیں موم کو پگھلا کر سانچوں میں ڈھالتے ہیں۔ نفس امارہ لوہا ہے اگر اس میں خشوع، عجز، نرمی پیدا ہو جائے تو اس کو ہر طرح ڈھالا جا سکتا ہے نماز و صبر سانچے ہیں۔ خشوع نفس کو نرم کرنے والی آگ ہے پہلے خشوع ہے، پھر عبادات اور خشوع و نرمی پیدا کرنے والی چیز موت کی یاد قیامت کی فکر ہے یا اللہ کی محبت یہاں انہی چیزوں کا ذکر ہوا اور اسی ترتیب سے ذکر ہوا۔ عاجز خاک میں باغ لگتے ہیں۔ نہ کہ متکبر آگ میں مشکلات حل کرنے والی چیز نماز و صبر ہے انہیں آسان کرنے والا خشوع اور خشوع موت کی یاد ہے۔

يٰبَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ اذۡکُرُوۡا نِعۡمَتِیَ الَّتِیۡۤ اَنۡعَمۡتُ عَلَیۡکُمۡ
اے اولاد یعقوب کی یاد کرو میری نعمت وہ جو انعام کیا میں نے
اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا احسان جو میں نے تم پر کیا
وَ اَنِّیۡ فَضَّلۡتُکُمۡ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۴۷﴾
اور پر تمہارے اور تحقیق میں نے بزرگی دی تم کو اوپر ان جہاں والوں کے
اور یہ کہ سارے زمانہ پر تمہیں بڑائی دی

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **ایک:** یہ کہ پہلے فرمایا گیا تھا کہ نماز لوگوں پر بہت بھاری ہے ہاں جو اپنے رب سے ملنے کا یقین رکھتے ہوں ان کے لئے ہلکی۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ اے بنی اسرائیل تم دوسری جماعت میں رہو کیونکہ تم پر ہمارے خاص انعامات ہیں اور جس پر خاص انعامات ہوں اس کو چاہیئے کہ مشقتیں برداشت کرے۔ **دوسرے:** یہ کہ اس سے پہلے بنی اسرائیل کو فرمایا گیا تھا کہ ایمان اور تقویٰ کے حاصل کرنے کا طریقہ صبر اور نماز ہے اور یہ بہت مشکل اور بھاری ہے۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ اگر تم یہ راستہ نہ چل سکو تو اس سے آسان تر دوسرا راستہ بتایا جاتا ہے اور وہ راہ شکر ہے۔ اس لئے اپنی خاص نعمتوں کا ذکر فرما کر ان کو شکر کی طرف مائل کیا جا رہا ہے یوں سمجھو کہ پہلے گرم علاج بتا کر اب نرم بتایا جا رہا ہے کہ یا تو صبر سے تقویٰ حاصل کرو اور اگر یہ نہ کر سکو تو شکر سے **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں خشوع حاصل کرنے کے لئے آئندہ پیش آنے والے واقعات کا ذکر فرمایا گیا کہ دھیان رکھو کہ تمہیں رب کے سامنے کھڑے ہونا ہے اس کی طرف رجوع کرنا ہے۔ لہٰذا خشوع و عاجزی اختیار کرو۔ اب اس خشوع کو حاصل کرنے کے لئے گزشتہ نعمتیں یاد دلائی جا رہی ہیں کہ ہم نے تم پر

یہ احسانات کئے تھے۔ لہٰذا خشوع وعاجزی کرو۔ کوئی ڈر سے مانتا ہے کوئی احسانات یاد کرکے۔ پچھلی آیت پہلے لوگوں کے لئے تھی یہ آیت دوسروں کے لئے۔

تفسیر

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اس سے پہلے بھی یہ خطاب ہو چکا ہے اور اسرائیلیوں کو رب کی نعمتیں یاد دلائی جاچکی ہیں۔ لیکن وہ خطاب اور قسم کے احکام کی تمہید تھی اور یہاں دوسرے قسم کے احکام کی وہاں ان کو وفائے عہد (وعدہ پورا کرنا) کا حکم دیا گیا تھا۔ اور یہاں تقویٰ وغیرہ کا۔ ان لوگوں کو بنی اسرائیل کہہ کر پکارنے میں اس جانب اشارہ ہے کہ تم بڑے باپ کے بیٹے ہو۔ تم کو چاہئے کہ ان کے قدم بقدم چلو تا کہ تمہاری عزت برقرار رہے۔ اذْكُرُوْا اس سے یہ مطلب نہیں کہ تم صرف زبان سے ان نعمتوں کو یاد کرلیا کرو یا اپنی بڑائی کے لئے لوگوں کو جتاتے پھرو بلکہ عملی طور پر شکریے کے ساتھ یاد کرو کیونکہ یہی حقیقی یاد ہے۔ فخریہ یاد کرنا حرام اور بلا فائدہ ذکر کرنا بیکار۔ اسی لئے تفسیر روح البیان نے اُذْكروا کے معنی اشکروا کئے ہیں نِعْمَتِیَ۔ نعمت (نون کے کسرہ کے ساتھ) کے معنی ہیں۔ احسان خواہ ظاہری ہو یا باطنی اور خواہ بالواسطہ ہو یا بلا واسطہ قرآن کریم فرماتا ہے وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ (شعراء: ۲۲) نعمت (نون کے فتح سے) کے معنی ہیں۔ عیش وآرام کا سامان قرآن کریم میں ہے۔ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ (الدخان: ۲۷)، (تفسیر کبیر) چونکہ بنی اسرائیل پر ہر قسم کے ظاہری وباطنی دنیوی اور دینی احسانات کئے گئے تھے۔ اس لئے نعمت نون کے کسرہ سے فرمایا گیا الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ بظاہر اس سے بنیادی نعمتیں مراد ہیں جیسے من وسلویٰ اتارنا لق ودق بیابانوں میں بادلوں سے ان پر سایہ کرنا۔ ان کے لئے پتھر سے پانی نکالنا بحر قلزم کو خشک کرنا وغیرہ یا اس سے بالواسطہ نعمتیں مراد ہیں۔ یعنی ان نعمتوں کو یاد کرو جو تمہارے باپ دادوں پر کی گئی تھیں جس سے تم ہمیشہ فخر کرتے رہو گے۔ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ بظاہر اس سے دینی نعمتیں مراد ہیں یہ بھی یاد کرو کہ ہم نے تم کو بڑی بزرگی دی کہ تمہارے گروہ میں چار ہزار پیغمبر پیدا فرمائے اور توریت، زبور وانجیل اور دوسرے صحیفے تمہاری زبان میں تمہاری جماعت پر اتارے اور تم میں بڑے بڑے عادل بادشاہ اور باعمل عالم اور اولیاء اللہ اور مشائخ پیدا فرمائے جس کی وجہ سے تم سارے فرقوں پر اعلیٰ ہوئے۔ تم ہی وحی الٰہی کا جائے نزول رہے۔ تم ہی آسمانی کتابوں کے خزانے، تم ہی احکام شرعیہ کے واقف کار اور عالم کے سردار رہے۔ لہٰذا تم کو چاہئے کہ اب اس نبی آخر الزماں پر ایمان لے آؤ تا کہ تمہاری عزت اور عظمت باقی رہے اور تم اس عہدے سے معزول نہ کردیئے جاؤ۔ اب تک تم اولاد انبیاء ہونے کی وجہ سے تمام پر سردار رہے۔ اور اب سید الانبیاء کی امت بن کر كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ کا اعلیٰ خطاب حاصل کرو عَلَى الْعٰلَمِيْنَ یہ عالم کی جمع ہے۔ جس کے حقیقی معنی ہیں ماسوا اللہ اور مجازاً بڑے گروہ کو بھی عالم بول دیتے ہیں۔ کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے جلسے میں ایک عالم جمع ہو گیا۔ اگر یہاں حقیقی معنی مراد ہوں تو اس آیت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم نے تمہارے باپ دادوں کو ان کے زمانہ میں سارے عالم پر بزرگی دی تھی یا بعض وجوہ سے تم کو اب بھی سارے عالم پر بزرگی حاصل ہے۔ جیسے اولاد انبیاء ہونا وغیرہ وغیرہ اور اگر عالم کے معنی مجازی مراد ہوں تو معنی یہ ہوں گے کہ تم کو ہم نے بہت سے لوگوں (مشرکین وغیرہ) پر بزرگی دی ہماری اس تقریر سے واضح ہو گیا کہ بنی اسرائیل

کا مسلمانوں سے افضل ہونا لازم نہیں۔ مسلمانوں کے لئے رب نے فرمایا كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ (آل عمران:۱۱۰) یہ آیت اس کے خلاف نہیں کیونکہ ایک زمانہ میں وہ افضل تھے اب بھی بعض افضل یا بعض جزوی حیثیتوں سے بنی اسرائیل افضل اور کلی طور پر مسلمان جیسے حضرت مریم سے فرمایا گیا وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ (آل عمران:۴۲) اے مریم تم کو تمام جہان کی عورتوں پر بزرگی دی۔ اس سے لازم یہ نہیں کہ حضرت مریم، حضرت خدیجہ، عائشہ و حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہن سے افضل ہوں۔ حضور کی ازواج کے بارے میں فرمایا گیا کہ اے نبی کی بیویو تم کسی بیوی کی طرح نہیں یعنی سب سے افضل ہو۔ ایک زمانہ میں حضرت مریم افضل تھیں اور دوسرے زمانے میں یہ بیویاں۔

خلاصہ تفسیر

اے بنی اسرائیل صبر و نماز کے ذریعے ایمان اور تقویٰ اختیار کرو اور بیشک یہ چیزیں بہت دشوار ہیں۔ مگر چونکہ تم پر ہماری نعمتیں بہت زیادہ ہیں اس لئے تم ان کو برداشت کرو یا اے بنی اسرائیل اگر تم سے صبر و صلوٰۃ کا راستہ طے نہ ہو سکے تو تم شکر کے راستے سے ہم تک آجاؤ۔ کیونکہ تم پر زیادہ نعمتیں ہیں۔ لہٰذا زیادہ شکر واجب بھلا ہماری نعمتوں کو یاد تو کرو۔ کہ ہم نے تم پر کتنی نعمتیں فرمائیں۔ ان نعمتوں کی خود قرآن کریم نے کچھ تفصیل فرمائی ہے اِذْ جَعَلَ فِيْكُمْ اَنْۢبِيَآءَ وَجَعَلَكُمْ مُّلُوْكًا ۖ وَّاٰتٰىكُمْ مَّا لَمْ يُؤْتِ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ (مائدہ:۲۰) تم میں نبی بھیجے اور تم کو بادشاہ بنایا اور تم کو وہ نعمتیں دیں کہ اس وقت دنیا میں کسی کو نہ دیں۔ اور سب سے بڑی نعمت یہ دی کہ تم کو تمام جہان سے افضل کر دیا۔ ان باتوں کو یاد کرو اور اس کا شکر یہ اس طرح ادا کرو کہ آج دین اسلام کی خدمت میں سب سے آگے آگے رہو۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **ایک**: یہ کہ نسبی بزرگی بھی اللہ کی نعمت ہے کیونکہ بنی اسرائیل کو ان کے اولاد انبیاء ہونے پر احسان جتایا گیا۔ یقیناً سید متقی یا سید عالم دوسرے متقی اور عالموں سے افضل ہوگا۔ کیونکہ وہ پیغمبر کی اولاد ہیں۔ اسی طرح گنہگار سید دوسرے گنہگاروں سے اس لحاظ سے بہتر ہوگا کہ وہ نبی کی اولاد ہے بلکہ حق تو یہ ہے کہ سید گنہگار بھی دوسرے پرہیزگاروں سے نسبی لحاظ سے افضل ہے شامی جلد اول میں صلوٰۃ جنازہ کی بحث میں ایک حدیث نقل فرمائی کہ حضور فرماتے ہیں کہ موت سے سارے نسب ٹوٹ جاتے ہیں سوائے میرے نسب کے اور فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کی یہ آیت فَلَآ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ (المومنون:۱۰۱) یعنی قیامت میں نسب کام نہ آئیں گے۔ اس سے حضور ﷺ کا نسب علیحدہ ہے اسی طرح حضور ﷺ کا یہ فرمانا کہ اے میرے اہل قرابت وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ (یوسف:۶۷) اس سے مطلب یہ ہے کہ بغیر اذن الٰہی میں تم سے عذاب دفع نہیں کر سکتا پھر علامہ شامی فرماتے ہیں کہ یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ اپنی اولاد سے عذاب دور نہ کریں حالانکہ آپ تو اجنبی گنہگاروں کی شفاعت فرما کر عذاب سے بچالیں گے۔ یا نکال لیں گے۔ شامی نے سادات کرام کے فضائل کے بارے میں ایک مستقل رسالہ لکھا اَلْعِلْمُ الظَّاهِرُ فِيْ نَفْعِ نَسَبِ الطَّاهِرِ بلکہ میرا ایمان تو کہتا ہے کہ گنہگار سید کیچڑ میں آلودہ موتی ہے کہ اگرچہ گناہوں کے کیچڑ میں ہے مگر سید ہے **دوسرے**: یہ کہ تمام

عظمتیں اور عزتیں ایمان سے قائم رہتی ہیں۔ بے ایمان کی رب کے یہاں کوئی عزت نہیں کیونکہ بنی اسرائیل کو صرف اولاد انبیاء ہونے پر نہ رہنے دیا بلکہ انہیں دعوت ایمان دی گئی کہ کنعان نبی کا بیٹا تھا۔ مگر بے ایمانی کی وجہ سے تباہ ہو گیا۔ اسی طرح شیعہ اور مرزائی دیوبندی وغیرہ مرتد، سید تو کیا مسلمان بھی نہیں۔ انہیں سید کہنا بھی غلطی ہے۔ سید ہونے کے لئے ایمان شرط ہے۔ دیکھو بے ایمان بنی اسرائیل کی کوئی عزت نہ ہوئی۔ **تیسرے:** یہ کہ علم تاریخ کا جاننا اور اس کا یاد کرنا ضروری ہے کیونکہ اس سے خدا کی نعمتیں معلوم ہوتی ہیں۔ **چوتھے:** یہ کہ اگر نعمت الٰہی ظاہر کرنے کے لئے اپنے بزرگوں کے دینی فضائل بیان کئے جائیں تو جائز ہے۔ کیونکہ یہاں بنی اسرائیل کو یہی حکم ہو رہا ہے لہٰذا حضور کے فضائل، اولیاء اللہ کے مراتب کا چرچا کرنا بہت بہتر ہے کہ یہ حق تعالیٰ کی اعلیٰ نعمت کا چرچا اس کا شکریہ ہے رب فرماتا ہے وَ اَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (الضحیٰ:۱۱) **پانچویں:** یہ کہ کسی کی یادگاریں منانا جائز بلکہ بہتر ہے کیونکہ یہ بھی نعمت الٰہی کے ذکر کا ذریعہ ہے اور یہاں اذکروا مطلق ہے۔ لہٰذا عرس بزرگان اولاد کی سالگرہ یا تخت وتاج ملنے کی خوشی میں جشن وغیرہ کرنا سب جائز ہے۔ بشرطیکہ اس نیت سے ہوں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام بنی اسرائیل سارے عالم سے افضل ہیں تو کیا قارون اور سامری اور وہ بنی اسرائیل جن کی صورتیں مسخ کی گئیں کیا وہ بھی افضل تھے۔ کیونکہ وہ بھی بنی اسرائیل تھے۔ **جواب:** قوم اسرائیل دوسری قوموں سے افضل ہے اس سے لازم نہیں آتا کہ ان کا ہر شخص افضل ہو قرآن حکیم میں آتا ہے کہ مرد عورتوں کے سردار ہیں۔ اس سے لازم یہ نہیں کہ کافر مرد مومن عورتوں سے افضل ہوں۔ **دوسرا اعتراض:** اگر اسرائیلی مسلمان ہو جائیں تو کیا سارے عالم سے افضل ہوں گے۔ اگر ان کو افضل نہ مانا جائے تو اس آیت کے خلاف ہے اور اگر مانا جائے تو عالم میں نبی کریم ﷺ بھی ہیں یا جس وقت بنی اسرائیل افضل تھے تو کیا انبیاء سے بھی افضل تھے۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر چکا ہے کہ یہاں عالمین کا استغراق حقیقی نہیں ہے۔

تفسیر صوفیانہ

اس آیت میں بظاہر بنی اسرائیل سے خطاب ہے۔ لیکن در پردہ سارے مومنین کے لئے عام ہے ارواح مومنین کو خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اے لوگو اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو جو تم پر ہوئی اور وہ یہ کہ تم کو فیضان نبوت حاصل کرنے کے قابل بنایا اور پھر فقط قابل بنا کر ہی نہ چھوڑا بلکہ نبوت کی ظاہری اور باطنی انوار کی شعاعیں تم پر ڈالیں۔ جس وجہ سے تمہارا قالب شریعت کے راستے پر اور قلب راہ طریقت کو عبور کر سکے۔ لہٰذا نبی آخر الزمان پر ایمان لاؤ کیونکہ یہ ان شعاعوں کا خاصہ ہے اور میں نے تمہاری جماعت کو جن میں انبیاء اور صدیقین اور شہدا اور صالحین سب داخل ہیں یہ نعمت دے کر باقی سارے عالم پر بزرگی دے دی۔

دوسری تفسیر

تمام بزرگوں سے تعلق ہے۔ اسرائیلی اس لئے عالمین پر افضل ہوئے کہ انہیں نسبی طور پر انبیاء اولیا سے تعلق تھا جن اسرائیلیوں نے حضور ﷺ سے رشتہ غلامی جوڑا انہیں بزرگیوں پر بزرگی ملی۔ جنہوں نے حضور سے یہ رشتہ نہ جوڑا وہ بدترین مخلوق بن گئے۔ ان کی خاندانی شرافتیں ختم ہو گئیں۔ فرسٹ کلاس کا ڈبہ اگر انجن سے کٹ جائے تو اس کی کوئی وقعت نہیں۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ اس شاخ میں پھل پھول لگتے ہیں۔ جس کا تعلق جڑ سے ہو۔ اس جماعت میں اولیا ہوتے ہیں۔ جس کا تعلق حضور ﷺ سے ہو۔ دیکھو بنی اسرائیلیوں میں صدہا اولیاء ہوئے مگر جب ان کا دین منسوخ ہوا اور انہوں نے حضور کی غلامی سے انکار کیا تو وہاں ولایت بند ہو گئی۔ ان میں حضرت آصف بن برخیا اصحاب کہف بی بی مریم جیسے لوگ نہیں پیدا ہوتے ایسے ہی اسلام کے تہتر فرقوں میں صرف جماعت اہل سنت برحق ہے اسی میں اولیاء ہیں۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ
اور ڈرو تم اس دن سے کہ نہ بدلہ دے گا کوئی نفس طرف سے کسی نفس کے کچھ بھی اور نہ
اور ڈرو اس دن سے جس دن کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہو سکے گی اور نہ کافروں کیلئے
مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۴۸﴾
قبول کی جائے گی طرف سے اس کی کوئی سفارش اور نہ لیا جائیگا طرف سے اس کی فدیہ اور نہ وہ لوگ مدد کیے جائیں گے
کوئی سفارش مانی جائے گی اور نہ کچھ لے کر اس کی جان چھوڑی جائے گی اور نہ اس کی مدد ہو گی

تعلق

اس آیت کا پہلی آیت سے کئی طرح تعلق ہے **ایک:** یہ کہ بنی اسرائیل کو اس سے پہلے ان کے فضائل سنا کر خوش کیا تھا اب قیامت کی مصیبتیں سنا کر ڈرایا جارہا ہے تاکہ وہ خوشی میں پھول کر رب کو نہ بھول جائیں اور امید وخوف کے درمیان رہیں جس پر ایمان کا دارومدار ہے اور **دوسرے:** یہ کہ شاید بنی اسرائیل اپنے اپنے گزشتہ فضائل سنکر یہ کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے رب کا شکر بخوبی ادا کر لیا ہے۔ اب وہ اس مرتبہ پر ہیں کہ جو کوئی ان کا وسیلہ پکڑے اس کو قیامت کے دن حساب کا ڈر نہیں اور خاص ہمارے لئے ان کی شفاعت کافی ہے اور ان کی بزرگیاں ہی ہم کو نجات دلا دیں گی کیونکہ ہم ان کی اولاد میں ہیں۔ لہٰذا ان سے فرمایا گیا کہ تم اس خیال میں مت رہنا اور آخرت کو دنیا پر قیاس مت کر لینا۔ وہاں کے حالات ہی کچھ اور ہیں۔

تفسیر

وَاتَّقُوْا یہ لفظ تقی سے بنا ہے جس کے معنی ہیں بچنا اور ڈرنا اور یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں۔ یعنی اس دن سے ڈر کر ایمان لے آؤ ایمان لا کر اس دن کی مصیبتوں سے بچ جاؤ۔ کیونکہ وہاں گنہگار پریشان اور نیک کار انشاء اللہ راحت میں ہوں گے

یَوۡمًا یوم لغت میں دن کو کہتے ہیں اور کبھی وقت کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں یا دن ہی کے معنی میں ہے کیونکہ قیامت میں آفتاب سامنے ہوگا۔ بلکہ سروں سے قریب ہوگا اور آفتاب کے سامنے ہونے کے وقت کا نام دن ہے اور یا اس سے مطلقاً وقت مراد ہے کیونکہ وہاں آفتاب کو طلوع غروب نہ ہوگا جس سے دن رات مقرر ہوں بلکہ ایک جگہ پر ہی قائم رہے گا اور حساب ختم ہونے پر اس کو دوزخ میں بھیج دیا جائے گا۔ یہ بھی خیال رہے کہ یا تو خود قیامت کے دن سے ڈرنا مراد ہے اور یا وہاں کے حساب و کتاب اور عذاب سے یعنی اس دن سے ڈرو یا اس دن کے حساب و کتاب سے ڈرو لَا تَجۡزِیۡ قیامت میں صدہا مصیبتیں ہوں گی۔ لیکن سب سے بڑی مصیبت یہ ہوگی کفار کا کوئی غمخوار و مددگار نہ ہوگا۔ اسی کا یہاں ذکر کیا گیا کیونکہ بنی اسرائیل کو یہی دھوکا تھا کہ اگر ہم کافر ہی رہیں تو ہمارے بزرگ ہم کو بچالیں گے۔ خیال رہے کہ مدد کی چار صورتیں ہوتی ہیں یا تو مددگار اپنے ساتھی کو اپنی قوت بازو اور زور سے بچالے اسے نصرت کہتے ہیں۔ یا بغیر زور کے کسی اور طرح بچا لے یا تو سفارش کر کے اس کو شفاعت کہتے ہیں۔ یا کچھ دے کر اب جو چیز ملزم کے ذمے تھی وہی دے کر بچایا گیا تو اسے جزا کہتے ہیں اور اگر جرمانہ وغیرہ دے کر چھڑایا گیا تو اس کا نام فدیہ ہے اس آیت میں ان چاروں باتوں کی ترتیب وار نفی فرمائی گئی۔ تجزی جزاء سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ادا کرنا یا بدلہ دینا یعنی قیامت کے دن نہ تو کسی کی طرف سے اعمال کر سکے گا اور نہ اپنے اعمال دے کر اس کو چھڑا سکے اور نہ کسی کے بدلے میں کوئی عذاب بھگت سکے گا۔ مثلاً کسی مشرک کے چار بیٹے مومن متقی ہیں اور وہ چاہیں کہ ہم اپنے باپ کو کچھ نیک اعمال دے دیں یا اس کی طرف سے کوئی نیک کام کرلیں یا اس کی سزا خود بھگت لیں تو یہ سب ناممکن ہے دنیا میں مومن دوسرے مومن کو نیک اعمال کا ثواب بخش سکتا ہے مگر کوئی کسی کو بداعمال کا عذاب نہیں بخش سکتا۔ یعنی ایصال ثواب درست ہے مگر ایصال عذاب نادرست۔ ایصال ثواب میں ثواب بخشنے والا محروم نہیں ہوتا بلکہ دوسرے کو اس میں شریک کر لیتا ہے مگر کافر کے لئے نہ تو دنیا میں ایصال ثواب ہو سکے اور نہ آخرت میں کسی کی نیکی مل سکے مردہ کافر کو دعا بیکار ہے لہٰذا اس آیت سے ایصال ثواب کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ مومن گنہگار دنیا میں مسلمانوں کے ایصال ثواب سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور آخرت میں ہم جیسے گنہگار نیکوں کے طفیل بخشے جائیں گے انشاء اللہ ع بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم۔ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ یہاں پہلے نفس سے نفس مومن اور دوسرے سے نفس کافر مراد ہے (تفسیر خزائن العرفان روح البیان و مدارک) معنی یہ کہ کوئی مومن متقی پرہیزگار نفس بھی کسی کافر کی حاجت روائی نہ کر سکے گا۔ یہ معنی ضرور خیال میں رہنے چاہئیں اسی جگہ دھوکہ ہوتا ہے شَیۡئًا یا یہ لَا تَجۡزِیۡ کا مفعول بہ ہے یعنی کسی قدر تکلیف کو دور نہ کر سکے گا۔ یا مفعول مطلق کی صفت یعنی نہیں دفع کرے گا اس کافر سے تھوڑا دفع کرنا بھی (تفسیر کبیر) یعنی عبادات معاملات عقائد اور عام اعمال غرض کسی شے میں کچھ بھی حاجت روائی نہ کر سکے گا۔ وَّلَا یُقۡبَلُ اس کے لفظی معنی ہیں کہ اس کی شفاعت قبول نہ کی جائے گی اور قبول نہ ہونے کی دو صورتیں ہیں یا شفاعت بالکل نہ ہو یا ہو مگر قبول نہ کی جائے یہاں پہلے ہی معنی مراد ہیں کفار بنی اسرائیل کا خیال تھا کہ ہمارے باپ دادے ہمیں بخشوالیں گے۔ یہاں فرمایا گیا کہ وہ تمہاری سفارش رد کر دیں گے یا یہ معنی کہ اگر شفاعت ہو بھی تو قبول نہ کی جائے گی۔ کیونکہ اس کے لئے ایمان شرط ہے اور تم بے ایمان ہو مِنۡهَا یہ ضمیر یا تو پہلے نفس کی طرف لوٹتی ہے یا

دوسرے کی طرف لہٰذا یا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ مومن کی سفارش کافر کے حق میں قبول نہ ہوگی یا یہ کہ نفس کافر کی طرف سے پیش کی ہوئی سفارش قبول نہ ہوگی یعنی اگر کافر اپنا کوئی سفارشی پیش کرے تو قبول نہ ہو اس دوسرے معنی کو بھی تفسیر کبیر وغیرہ نے اختیار کیا ہے شَفَاعَةٌ یہ لفظ شفع سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ساتھی ہونا اور ہمراہی بننا دو رکعت نماز کو شفعہ کہتے ہیں اور ہر جوڑ کو شفع اور طاق عدد کو وتر کہتے ہیں۔ قرآن کریم میں ہے وَّالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ (فجر: ۳) پڑوسی کو شفیع اور اس کے حق پڑوسیت کو شفعہ کہتے ہیں کیونکہ وہ اس کے ساتھ رہتا ہے۔ اب یہ سفارش کے معنی میں استعمال ہونے لگا کیونکہ سفارشی بھی حاجت مند کو اکیلا نہیں چھوڑتا بلکہ اس کا ساتھی بن کر اسی کی حمایت کرتا ہے شفاعت کی بحث انشاء اللہ اسی آیت کے خلاصہ تفسیر میں کی جائے گی۔ وَّلَا یُؤْخَذُ یہ تیسری قسم کی مدد کی نفی ہے یعنی نفس کافر سے کوئی معاوضہ وفدیہ بھی نہ لیا جائے گا۔ خیال رہے کہ یہاں بھی لینے کی نفی فرمائی گئی ہے اس کی بھی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ وہ فدیہ دے ہی نہ سکے دوسرے یہ کہ دینا چاہے مگر قبول نہ ہو۔ یہاں پہلے معنی ظاہر ہیں۔ یعنی کفار کے پاس کچھ دینے کو ہوگا ہی نہیں تاکہ اس سے قبول کیا جائے اور دوسرے معنی کا بھی احتمال ہے کہ اگر اس کے پاس سارے خزانے ہوں اور وہ دے کر عذاب سے چھوٹنا چاہے تو بھی منظور نہ ہو مِنْهَا ظاہر یہ ہے کہ یہ ضمیر دوسرے نفس کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعنی کافر نفس سے فدیہ نہ لیا جائے گا اور یہ بھی احتمال ہے کہ نفس اول کی طرف لوٹے یعنی اگر مومن شخص کافر کی طرف سے اعمال یا مال کا کوئی فدیہ پیش کرے تو منظور نہ ہو (تفسیر عزیزی) عَدْلٌ لفظ عدل کے معنی برابری اور مساوات کے ہیں قرآن کریم فرماتا ہے بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ (انعام: ۱۵۰) اس ہی لئے نظیر اور مثل کو عدیل کہتے ہیں کیونکہ وہ اس کے برابر ہوتا ہے۔ نیز انصاف کو عدل اور انصاف کی جگہ کو عدالت کہتے ہیں۔ اس لئے کہ وہاں ظالم سے بدلہ لے کر مظلوم کے برابر کیا جاتا ہے۔ اب اس مال کو عدل کہتے ہیں جو جان وغیرہ کے عوض میں دیا جائے یعنی خون بہا اور فدیہ آیت کے معنی یہ ہوئے کہ کافر کو رشوت یا نذرانہ یا خون بہا لے کر بھی نہیں چھوڑا جائے گا۔ خیال رہے کہ پہلے جملے میں جزا کی نفی تھی اور یہاں عدل کی ہماری تقریر سے ان دونوں میں فرق ظاہر ہوگیا وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ یہ چوتھی قسم کی مدد کی نفی ہے نصر کے معنی بالجبر مدد کے بھی ہیں اور بدلہ لینے کے بھی (تفسیر کبیر) قرآن کریم فرماتا ہے وَنَصَرْنٰهُ مِنَ الْقَوْمِ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا (انبیاء: ۷۷) یہاں نصرنا کے معنی اَنْتَقَمْنَا ہیں۔ لہٰذا اس جملہ کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ یعنی نہ تو دھونس سے ان کی مدد ہو سکے گی اور کس میں یہ طاقت ہے کہ اللہ سے یا عذاب کے فرشتوں سے بدلہ لے سکے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کفار سے کسی طرح بھی مصیبت دور نہ ہو سکے گی۔

خلاصہ تفسیر

اے بنی اسرائیل تم کو چاہئے کہ ہماری نعمتوں کو یاد کر کے شکر گزاری کرو اور سرکشی سے باز آ جاؤ ہماری اطاعت کرو نہ کہ غرور اور سرکشی۔ اگر تم اس سے باز نہ آتے تو خیال رکھو کہ تم کو ایک دن ہمارے سامنے آ کر حساب دینا ہے اس دن سے خوف کرو۔ وہاں کسی صورت سے بھی تم عذاب سے نہیں بچ سکتے۔ نہ تو یہ ممکن ہے کہ دوسرا شخص تمہارا ذمے دار بن جائے کہ تمہارے حقوق اور حساب و کتاب کو اپنے پر لے کر تمہیں چھڑا دے اس دن کی سختی ایسی ہوگی کہ ہر شخص نفسی نفسی پکارے گا۔ کوئی کسی کے کام نہ

آئے گا۔ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ أَخِيهِ ۝ وَأُمِّهِ وَأَبِيهِ (عبس: ۳۴)۔نہ یہ ممکن ہے کہ کوئی بھی کسی کافر کی سفارش کر کے چھڑا لے رب کی مرضی کے بغیر کوئی نبی یا بزرگ کسی کے حق میں سفارش نہ فرمائیں گے اور نہ یہ ممکن ہے کہ تم یا تمہاری طرف سے کوئی دوسرا جرمانہ بھگت کر معاوضہ دے کر مال وغیرہ خرچ کر کے تم کو آزادی دلا دے۔ کیونکہ رب تعالیٰ کو مال و دولت کی پرواہ نہیں نہ یہ ممکن ہے کہ تمہارے یار و مددگار اہل برادری اور قرابت دار خدا کا مقابلہ کر کے تم کو زور سے چھڑا لیں۔ کیونکہ رب سے مقابلہ کرنے کی کسی میں طاقت نہیں۔

شفاعت

قریباً ساری امت مسلمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ بِاِذْنِ پروردگار جناب احمد مختار ﷺ مسلمانوں کی شفاعت فرمائیں گے۔ اور ان کے طفیل علماء و مشائخ بھی شفاعت کریں گے لیکن اس سے پہلے معتزلہ فرقے نے اس کا انکار کیا۔ اسی لئے تفسیر کبیر وغیرہ نے ان کی بہت تردید فرمائی۔ اب وہ فرقہ مٹ بھی گیا اور اس کا نام ونشان بھی جاتا رہا اس زمانہ میں دیوبندیوں اور وہابیوں نے شفاعت کا پرزور انکار کیا چنانچہ ان کے امام الطائفہ مولوی اسمٰعیل دہلوی نے تقویۃ الایمان، میں صاف صاف لکھ دیا کہ کوئی کسی کا سفارشی اور حمایتی نہیں اسی تقویۃ الایمان میں ص ۱۶ پر شفاعت بالاذن کا اقرار تو کیا مگر اس کے معنی ایسے بگاڑے جس سے شفاعت کی کوئی حقیقت باقی نہیں رہتی یہ لکھ دیا کہ شفاعت کی صورت صرف یہ ہے کہ ایک بادشاہ کسی مجرم کو خود چھوڑنا چاہتا ہے لیکن اپنے قانون ٹوٹنے کے ڈر سے بظاہر کسی سے سفارش کرا لیتا ہے اور وہ سفارش کرنے والا بھی شاہی اشارہ پا کر (مفت کرم داشتن) کے طریقے سے کچھ ظاہری سفارش کر دیتا ہے خدا کے ہاں کسی کی عزت نہیں جو عزت سفارش کرے نہ رب کو کسی سے محبت کہ اس کی بات محبت کی وجہ سے مان لے اس میں در پردہ شفاعت کا انکار کر دیا اب وہابی اور دیوبندی خدا کے خوف سے نہیں بلکہ مسلمانوں کے ڈر سے شفاعت کا اقرار تو کر لیتے ہیں اور حضور کو شفیع المذنبین بھی مان لیتے ہیں لیکن اسی بگڑے ہوئے معنی سے جیسے قادیانی حضور کو خاتم النبیین دیگر معنی سے مان لیتے ہیں یہاں تک کہ اس موجودہ زمانہ میں مولوی ابوالاعلیٰ مودودی نے شفاعت کے معنی یہ کئے کہ محض وہ ایک التجا اور درخواست جو انبیاء ملائکہ صحابہ اہل ایمان اور سب بندے دوسرے بندوں کے حق میں کر سکتے ہیں۔ دیکھو مولوی مودودی صاحب کی کتاب قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں غور کرو کہ اگر شفاعت کے معنی صرف دعاء خیر ہے تو پھر نبی کریم ﷺ شفیع المذنبین نہ رہے بلکہ ہر مسلمان شفیع المذنبین ہے بلکہ ہم سب حضور کیلئے بڑے شفیع (معاذ اللہ) ہوئے کیونکہ ہم ہر وقت درود شریف پڑھتے ہیں درود حضور کیلئے دعاء خیر ہی تو ہے کیونکہ انکار شفاعت کی وباء لوگوں میں در پردہ پھیلائی جا رہی ہے اس لئے ہم اس کے متعلق تھوڑی بحث کرتے ہیں اس بحث کے کچھ مضامین تو تفسیر کبیر سے لئے ہیں اور کچھ مضامین وہ ہیں جو رب نے ظاہر فرمائے اس بحث کے دو باب کئے جائیں گے پہلے باب میں شفاعت کا ثبوت قرآنی آیات اور احادیث صحیحہ اور عقلی دلائل سے ہوگا اس میں یہ بھی بتایا جائے گا کہ حضور کی شفاعت فقط رب کا بہانہ نہ ہوگی بلکہ بالمحبت بھی ہوگی اور شفاعت بالعزت بھی اور یہ دونوں قسم کی شفاعتیں بِالْاِذْن میں ہی داخل ہیں اور دوسرے باب میں اس پر اعتراض و جواب۔

پہلا باب شفاعت کے ثبوت میں

حق تعالیٰ فرماتا ہے ۱۔ عَسٰٓی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا (الاسراء:۷۹) اس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کو رب نے مقام محمود عطا فرمایا اور مقام محمود ہی وہ مقام ہوگا جہاں تشریف فرما کر حضور شفاعت کا دروازہ کھولیں گے اور آپ کی شان عالی کو دیکھ کر سارے دشمن و دوست آپ کی تعریف کریں گے۔ ۲۔ وَلَسَوْفَ یُعْطِیْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰی (الضحیٰ:۵) اس سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ حضور کو راضی فرمائے گا۔ مسلم شریف میں ہے کہ ایک دن نبی ﷺ ہاتھ اٹھا کر رو رو کر امت کے حق میں دعا فرما رہے تھے کہ جبریل امین نے حاضر ہو کر رونے کا سبب پوچھا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ہم کو امت کا غم رلا رہا ہے۔ جبریل امین نے بارگاہ الٰہی میں جا کر یہی عرض کیا۔ ارشاد الٰہی ہوا کہ میرے محبوب سے کہہ دو کہ ہم آپ کو آپ کی امت کے بارے میں راضی کرلیں گے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور نے فرمایا کہ جب تک میرا ایک امتی دوزخ میں رہا میں راضی نہ ہوں گا (تفسیر خزائن العرفان سورۃ الضحیٰ) اس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام شفاعت فرمائیں گے اور وہ شفاعت بالمحبت یا بالوجاہت ہوگی کیونکہ حضور کو راضی کرنے کے لئے ہوگی۔ سبحان اللہ کیا ناز محبوبانہ ہے کہ رب فرما رہا ہے کہ ہم راضی کرلیں گے اور محبوب فرماتے ہیں کہ ہم راضی نہ ہوں گے اگر ہم یہ بات کہیں تو کافر ہو جائیں ۳۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ الآیۃ (النساء:۶۴) اس سے معلوم ہوا کہ جو مجرم بھی اپنی معافی چاہے وہ بارگاہ مصطفیٰ علیہ السلام میں حاضر ہو اور حضور علیہ السلام اس کے لئے سفارش فرمائیں تو رب معافی فرماتا ہے یہی شفاعت ہے۔ ۴۔ وَصَلِّ عَلَیْهِمْ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ (التوبہ:۱۰۳) یہاں حضور کو حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ مسلمانوں کے صدقے لے کر ان کو پاک فرما دو اور ان کے لئے دعا بھی کرو۔ آپ کی دعا سے ان کو چین حاصل ہوتا ہے اس سے دو باتیں معلوم ہوئی۔ ایک یہ کہ کوئی عمل حضور کی سفارش کے بغیر قبول نہیں ہوتا اور مسلمانوں کی طہارت پاکیزگی حضور کے کرم سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ محض اپنے اعمال سے **دوسرے**: یہ کہ صحابہ کرام کو فقط اپنے اعمال پر چین نہ آتا تھا بلکہ حضور کی سفارش اور دعا سے ان تمام آیتوں کی نہایت عمدہ تفسیر ہماری کتاب ''شان حبیب الرحمٰن'' میں دیکھو ۵۔ وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ (محمد:۱۹) اس میں حضور علیہ السلام سے فرمایا جا رہا ہے کہ اپنی خطاؤں کی اور مسلمانوں کے گناہوں کی مغفرت مانگو اس میں سارے ہی مجرم مسلمان داخل ہو گئے اور یہی شفاعت ہے۔ حق تعالیٰ ملائکہ حاملین عرش کی تعریف میں فرماتا ہے۔ ۶۔ وَیَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا (المؤمن:۷) معلوم ہوا کہ فرشتے مسلمانوں کے لئے دعا کرتے ہیں۔ ۷۔ عیسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا وَاِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَاِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ (مائدہ:۱۱۸) ۸۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا تھا کہ فَمَنْ تَبِعَنِیْ فَاِنَّهٗ مِنِّیْ وَمَنْ عَصَانِیْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (ابراہیم:۳۶) ان دو آیتوں سے معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام گنہگاروں کی شفاعت فرمائیں گے۔ اسی جگہ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام نے یہ آیتیں پڑھ کر اپنی امت کے حق میں دعا کی اور بہت گریہ وزاری فرمائی اور پھر وہ حدیث نقل کی

جو ہم نے آیت الضحیٰ میں بیان کر دی۔ ۹۔ رب تعالیٰ نے سورۂ مریم میں متقین کی صفات بیان فرماتے ہوئے فرمایا لَا يَمْلِكُونَ الشَّفَاعَةَ إِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا (مریم:۸۷) اس سے معلوم ہوا کہ متقی اس کی شفاعت کریں گے جس نے رب سے عہد کر لیا ہے اور ہر مسلمان رب سے عہد کرنے والا ہے۔ ۱۰۔ حق تعالیٰ صفات ملائکہ میں فرماتا ہے وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى (انبیاء:۲۸) اس سے معلوم ہوا کہ جس سے خدا راضی ہو اسی کے لئے فرشتے شفاعت کریں گے اور ہر مسلمان سے اسلام کی وجہ سے خدا راضی ہے۔ ۱۱۔ رب نے فرمایا إِذَا حُيِّيتُمْ بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا (النساء:۸۶) الآیۃ۔ جس سے معلوم ہوا کہ جب کوئی سلام کرے تو اس کا اچھا جواب دینا چاہئے اور سارے مسلمانوں کو حکم ہے کہ ہمارے نبی پر صلوٰۃ وسلام پڑھو صَلُّوا عَلَيْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (احزاب:۵۶) یہ سوال ہے کہ جب ہم حضور پر صلوٰۃ و سلام پڑھتے ہیں تو حضور ہم کو جواب میں دعا دیتے ہیں یا نہیں۔ اگر نہیں دیتے تو پہلی آیت کے خلاف ہے اور اگر دیتے ہیں تو یقیناً ہمارے سلام سے بہتر ہی جواب دیں گے کیونکہ یہی حکم ہے لہٰذا آپ یقیناً ہمارے جواب میں اعلیٰ درجہ کی شفاعت فرماتے ہیں (تفسیر کبیر) ۱۲۔ مشرکین کی برائی میں فرمایا گیا فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشَّافِعِينَ (المدثر:۴۸) جس سے معلوم ہوا کہ کفار پر یہ قہر الٰہی ہوگا کہ انہیں شفاعت نفع نہ دے گی اگر مسلمانوں کا بھی یہی حال ہو تو ان میں اور کفار میں کیا فرق رہا۔ ۱۳۔ يَوْمَ لَا يَنْفَعُ مَالٌ وَلَا بَنُونَ ۝ إِلَّا مَنْ أَتَى اللّٰهَ بِقَلْبٍ سَلِيمٍ (الشعراء:۸۹) جس سے معلوم ہوا کہ مشرکین کا مال اور اولاد انہیں کچھ فائدہ نہ دے گی لیکن مسلمانوں کے لئے مال بھی کارآمد اور اولاد بھی اور فرماتا ہے مَا لِلظّٰلِمِينَ مِنْ حَمِيمٍ وَلَا شَفِيعٍ يُطَاعُ (مومن:۱۸) یعنی کافروں کا نہ کوئی دوست نہ کوئی سفارشی جس کا کہا مانا جائے۔ اگر مسلمانوں کا بھی کوئی دوست و شفیع نہ ہو تو مومن و کافر میں فرق کیا ہوا۔ نیز لِلظّٰلِمِينَ کی تقدیم حصر کا فائدہ دیتی ہے۔ یعنی صرف کافروں کا دوست و شفیع کوئی نہیں جو کہے کہ میرا شفیع کوئی نہیں وہ در پردہ اپنے کفر کا اقرار کرتا ہے

احادیث

شفاعت کے متعلق بے شمار احادیث ہیں۔ یہاں کچھ بطور نمونہ عرض کی جاتی ہیں۔ ۱۔ تفسیر کبیر نے اس جگہ بحوالہ مسلم فرمایا کہ حضور فرماتے ہیں کہ ہر نبی کو حق تعالیٰ کی طرف سے ایک دعا ملتی ہے۔ سب نے اپنی دعائیں یہاں استعمال کر لیں۔ مگر میں نے اپنی دعا محفوظ رکھی ہے اس سے قیامت کے دن اپنی امت کی شفاعت کروں گا اور یہ شفاعت میرے ہر اس امتی کو پہنچے گی جو مومن ہو کر مرے ۲۔ مشکوٰۃ میں، بحوالہ مسلم، بخاری ہے کہ لوگ قیامت کی گرمی سے گھبرا کر شفیع کی تلاش میں نکلیں گے آدم علیہ السلام کے پاس پہنچ کر شفاعت چاہیں گے وہ فرمائیں گے کہ مجھ سے خود ایک خطا ہو گئی ہے۔ لب کشائی کرنے کی میری ہمت نہیں پڑتی۔ نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ شاید وہاں شفاعت ہو جائے۔ وہ بھی یہی جواب دے کر حضرت ابراہیم کے پاس بھیجیں گے وہ بھی یہی جواب دے کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس اور وہ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس بھیجیں گے عیسیٰ علیہ السلام فرمادیں گے کہ آج سوائے محمد رسول اللہ کے تمہاری شفاعت کوئی نہیں کر سکتا۔ تب سب لوگ ہمارے پاس آئیں گے ہم

کہیں گے کہ بیشک شفاعت کرنا ہمارا کام ہے پھر ہم سجدے میں سر رکھ کر شفاعت فرمائیں گے۔ حکم الٰہی ہوگا کہ اے محمد اپنا سر مبارک اٹھاؤ بات کرو سنی جائے گی۔ شفاعت کرو قبول کی جائے گی۔ جو کچھ مانگو دیا جائے گا۔ تب ہم سر اٹھائیں گے اور شفاعت فرمائیں گے۔ الخ

خلیل و نجی مسیح و صفی سبھی سے کہی کہیں نہ بنی
وہ بے خبری کہ خلق پھری کہاں سے کہاں تمہارے لئے

فقط اتنا سبب ہے انعقاد بزم محشر میں
کہ ان کی شان محبوبی دکھائی جانے والی ہے

خلاصہ: یہ ہے کہ قیامت میں پہلے وہ ہی کام ہوگا جسے وہابی شرک کہتے ہیں۔ یعنی اللہ کے بندوں سے مدد مانگنا اور ان کے دروازوں پر مدد کیلئے حاضر ہونا۔ اس مجمع میں وہابی بھی ہوں گے جو میرے اور آپ کے محبوب ﷺ کے دروازے پر ہاتھ پھیلانے جائیں گے ہم محشر میں خیر دیکھیں گے۔ نجدی آج ان سے التجا نہ کرے! جب کل ان سے مانگنا ہے تو آج ان سے کیوں اکڑتے ہو۔ **لطیفہ**: دنیا میں سب جانتے ہیں کہ حضور ہی شفیع المذنبین ہیں۔ مگر قیامت میں سب بھول جائیں گے محدثین مفسرین علماء مشائخ سب ہی اس مجمع میں موجود ہیں مگر کسی کو یہ یاد نہیں آتا۔ انبیاء کرام کو بھی خیال نہ رہا۔ صحیح پتہ نہ بتا سکے اس میں کیا راز ہے بات یہ ہے کہ اگر اول ہی سے حضور علیہ السلام تک پہنچ جاتے تو شاید کوئی بدگو کہتا کہ اس شفاعت میں حضور کی کیا تخصیص ہے ایسی شفاعت تو ہر جگہ ہو سکتی تھی اس لئے پہلے ان سب کو تمام جگہ پھرا لیا گیا تا کہ شان مصطفیٰ ﷺ کا پتہ چل جائے اور سب معلوم کرلیں کہ آج سارے انبیاء نفسی نفسی فرما رہے ہیں امتی امتی کہنے والی صرف مصطفیٰ علیہ السلام کی زبان پاک ہے۔ سب اِذْهَبُوْا اِلٰی غَیْرِیْ فرمائیں گے (کسی اور کے پاس جاؤ) لیکن آج اَنَا لَهَا فرمانے والے صرف حضور ہی ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی فرما رہے ہیں کہ میں تو باہر کا دوست ہوں۔ اندرون سرا مصطفیٰ ﷺ ہی ہیں۔ ۳۔ مشکوٰۃ شریف باب الشفاعت میں ہے کہ تین جماعتیں قیامت کے دن شفاعت فرمائیں گی اول انبیاء پھر علماء پھر شہداء ۴۔ اسی جگہ ہے کہ حضرت انس نے حضور سے عرض کیا کہ قیامت میں آپ میری شفاعت فرمائیں۔ فرمایا ضرور کریں گے عرض کیا کہ میں آپ کو وہاں کس جگہ ڈھونڈوں فرمایا صراط پر۔ عرض کیا اگر وہاں نہ پاؤں فرمایا۔ میزان پر عرض کیا اگر وہاں بھی نہ پاؤں۔ فرمایا حوض کے پاس ۵۔ اسی مشکوٰۃ باب البکاء علی المیت میں ہے کہ حضور نے فرمایا کہ جس کے دو چھوٹے بچے مر جائیں وہ اسے جنت میں لے جائیں گے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا کہ اگر ایک مر جائے۔ فرمایا ایک بھی عرض کیا کہ اگر کوئی نہ مرا ہو فرمایا اس کو میں جنت میں لے جاؤں گا۔ ۶۔ اسی میں اسی جگہ ہے کہ کچا بچہ اپنے رب سے اپنے والدین کے بارے میں جھگڑا کرے گا تو اس سے فرمایا جائے گا کہ اے اپنے رب سے جھگڑنے والے بچے جا اپنے ماں باپ کو جنت میں لے جا پس وہ ان دونوں کو اپنی نال سے کھینچ کر جنت میں لے جائے گا۔ ۷۔ اسی مشکوٰۃ باب الوصایا میں ہے کہ حضور فرماتے ہیں کہ اگر مسلمان میت کی طرف سے صدقہ کیا جائے یا غلام آزاد کئے جائیں یا حج کیا جائے تو وہ اس کو پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ اور بیشمار احادیث پیش کی جاسکتی ہیں مگر یہاں اتنی ہی کفایت ہے۔

شفاعت کے عقلی دلائل

۱۔ دنیا آخرت کا نمونہ ہے اور دنیا میں تو بادشاہوں کے ہاں حکام اور مقربین مجرم کی سفارش کر کے چھڑا لیتے ہیں ایسے ہی آخرت میں بھی مقبولان الٰہی شفاعت سے مجرموں کو عذاب سے بچالیں گے مگر باغی کی سفارش کوئی نہیں کر سکتا۔ ایسے ہی کفار کی شفاعت نہیں ہوگی ۲۔ کبھی بادشاہ اپنے پیارے کی عزت افزائی کے لئے کسی کو اس کے ذریعے کچھ دیتا ہے تاکہ لوگوں میں اس کی عزت ہو۔ اسی طرح رب تعالیٰ اپنے محبوبوں کے ذریعے لوگوں پر رحم فرماتا ہے تاکہ ان کی عزت ظاہر ہو ۳۔ حق تعالیٰ تقریباً ساری نعمتیں وسیلے اور ذریعے سے عطا فرماتا ہے وہ رزاق شافی خالق ہے لیکن مالداروں کے ذریعے رزق اور شفاء طبیبوں کے ذریعے عطا فرماتا ہے۔ اسی طرح بیشک وہ غفار ہے لیکن بذریعہ مصطفیٰ ﷺ گنہگاروں کی مغفرت کرے گا۔ چنانچہ مشکوٰۃ شریف باب ذکر الیمن میں ہے کہ شام میں چالیس ابدال رہیں گے جن کی برکت سے بارشیں ہوں گی۔ دشمنوں پر فتح حاصل ہوگی اور اہل شام سے عذاب دفع ہوگا۔ ۴۔ اگر شفاعت کوئی چیز نہ تھی تو نماز جنازہ بھی نہ ہونی چاہئے کیونکہ وہ بھی شفاعت ہی ہے۔ جو اس میت کو مسلمان سامنے رکھ کر اس کے لئے دعا کرتے ہیں اور بچے کو اپنا شفیع بناتے ہیں۔ چنانچہ بچے کے جنازے پر پڑھتے ہیں اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُ لَنَا فَرَطًا پھر آخر میں کہتے ہیں وَاجْعَلْهُ لَنَا شَافِعًا وَّمُشَفَّعًا یعنی اے اللہ اس بچے کو ہمارا شفیع بنا غرضیکہ نماز جنازہ مسئلہ شفاعت پر مبنی ہے خیال رہے کہ یہ شفاعت محض حیلے کے طور پر نہ ہوگی جیسا کہ مولوی اسمٰعیل نے تقویۃ الایمان میں لکھا بلکہ شفاعت بالوجاہت اور شفاعت بالمحبت اور شفاعت بالاذن ہر طرح کی ہوگی رب تعالیٰ فرماتا ہے وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (المنافقون: ۸) موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں فرماتا ہے وَكَانَ عِنْدَ اللّٰهِ وَجِيْهًا (احزاب: ۶۹) عیسیٰ علیہ السلام کے لئے فرماتا ہے وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ (آل عمران: ۴۵) اس سے معلوم ہوا کہ اللہ والوں کو رب نے اپنی بارگاہ میں بڑی عزت دی ہے رب فرماتا ہے يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ (مائدہ: ۵۴) نیز فرماتا ہے رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ (مائدہ: ۱۱۹) معلوم ہوا کہ یہ لوگ اللہ کے پیارے ہیں اس لئے ان کی بات وہاں مانی جاتی ہے۔ مشکوٰۃ باب فضل الفقراء میں ہے کہ حضور فرماتے ہیں کہ میری امت کے بہت سے پریشان حال اور پراگندہ بال ایسے ہوں گے کہ اگر وہ اللہ پر قسم کھا جائیں تو رب ان کی قسم پوری فرمائے۔ یعنی اگر وہ قسم کھا لیں کہ فلاں کو جنت میں لے جاؤں گا تو رب تعالیٰ ضرور اس کو جنت میں بھیجے گا ابھی آپ پڑھ چکے کہ چھوٹے بچے اپنے والدین کے لئے رب سے جھگڑا کریں گے معلوم ہوا کہ یہ حضرات بارگاہ الٰہی میں ناز کرتے ہیں اور ان کے ناز قبول فرمائے جاتے ہیں۔ نیز شفاعت بالاذن کے معنی یہ نہیں۔ کہ ہر مجرم کے لئے خاص اذن حاصل کر کے شفاعت کی جائے یا رب کو خود بخشنا منظور ہو اور بہانے کیلئے مصطفیٰ ﷺ کی جانب اشارہ کردے بلکہ معنی یہی ہیں کہ بارگاہ الٰہی میں کسی کو بغیر اجازت بولنے کی جرات نہیں۔ ان حضرات کو اجازت عام ہوگی کہ ہر مسلمان کی شفاعت کریں اور بخشالیں اور جس کو عذاب دینا منظور ہوگا اس کی طرف شفیع المذنبین کا خیال ہی نہ جائے گا۔ یہ سب باتیں خدا کی عطا سے ہیں کہ اس پر دھونس نہیں واقع

رہے کہ اس آیت میں جو فرمایا گیا کہ کوئی نفس کسی نفس کا بدلہ نہ بنے نہ کوئی شفاعت قبول کی جائے نہ اسے فدیہ لے کر چھوڑا جائے اور نہ کسی کی مدد کی جائے یہ سب کفار کے لئے ہیں مسلمانوں کو انشاء اللہ یہ چاروں نعمتیں حاصل ہوں گی۔ روایات میں آتا ہے کہ کفار مسلمانوں کا فدیہ بن کر جہنم میں جائیں گے اور مسلمان جنت میں اپنی جگہ بھی لیں گے اور کفار کی بھی۔ نیز مسلمانوں کی مالی عبادتیں یعنی صدقات وخیرات ان کے کام آئیں گی۔ ان کی برکت سے غضب الٰہی کی آگ بجھ جائے گی۔ مسلمانوں کی شفاعت بھی ہوگی جیسا کہ گزر چکا۔ مسلمانوں کے بچے، علماء، مشائخ ان کی باذن الٰہی مدد بھی کریں گے یہ آیت مسلمانوں پر چسپاں کرنا جہالت ہے۔ مشرکین تو اپنے بتوں کو شفیع مان کر ان کی پوجا کرتے تھے۔ قرآن نے ان سے فرمایا کہ وہ شفاعت کرنے کے لائق نہیں۔ انہیں شفاعت کی اجازت نہ ملی۔ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (البقرہ:۲۵۵) بغیر اجازت شفاعت کیسی۔ کفار اہل کتاب کہتے تھے کہ ہم اگرچہ کفر کریں ہمارے باپ دادے جو انبیاء اولیاء تھے۔ ہمیں بخشوا لیں گے۔ انہیں فرمایا گیا کہ وہ حضرات واقعی شفاعت کے لائق ہیں مگر تم لوگ شفاعت حاصل کرنے کے اہل نہیں کہ تم کافر ہو۔ شفاعت کے لئے ضروری ہے کہ کرنے والا کرنے کا اور حاصل کرنے والا شفاعت پانے کا اہل ہو۔ **فصل شفاعت کے متعلق** چند باتیں یاد رکھو **ایک** یہ کہ قیامت کے دو وقت ہیں پہلا عدل کا دوسرا فضل کا پہلے وقت میں دیگر انبیاء کرام میں کچھ بولنے کی ہمت نہ کریں گے اس وقت صرف حضور ہی شفاعت فرمائیں گے اور دروازہ شفاعت کا آپ ہی کھولیں گے۔ اسی لئے آپ کو شفیع المذنبین کہا جاتا ہے یعنی بے کسی کے وقت میں گنہگاروں کی شفاعت فرمائیں گے۔ اسی کا نام شفاعت کبریٰ ہے اور یہ حضور کی خصوصیت ہے۔ دروازہ کھلنے کے بعد ہر نیک کار بدکار کی شفاعت کرے گا **دوسرے:** یہ کہ شفاعت چار قسم ہوگی۔ ۱۔ میدان محشر سے نجات دلانے کے لئے۔ ۲۔ عذاب الٰہی کم کرانے کے لئے۔ ۳۔ گناہ معاف کرانے اور جہنم سے بچانے کے لئے ۴۔ درجے بڑھانے کے لئے۔ پہلی شفاعت سے سارا عالم فائدہ اٹھائے گا۔ کفار بھی اور مومنین بھی۔ دوسری قسم کی شفاعت کفار کے لئے ہے۔ احادیث میں آیا ہے کہ حضور کی برکت سے بعض کفار کا عذاب ہلکا ہوتا ہے۔ جیسے ابو طالب اور ابولہب کا۔ ابو طالب تو حضور کی خدمت کی وجہ سے اور ابولہب حضور کی ولادت پاک کی خوشی منانے سے عذاب میں ہلکے ہیں۔ روح البیان نے فرمایا ہے کہ حاتم طائی کو بھی ہلکا عذاب ہوگا۔ **تیسری** شفاعت مومن گنہگاروں کے لئے اور **چوتھی** شفاعت نیک کاروں کے لئے ہوگی۔ وہ جو حدیث میں آتا ہے کہ سنت کو چھوڑنے والا شفاعت سے محروم ہے اس سے چوتھی شفاعت مراد ہے یعنی بلندی درجات کی ورنہ دوسری روایت میں ہے کہ میری شفاعت گناہ کبیرہ والوں کے لئے بھی ہوگی نیز یہ جو عقیدہ ہے کہ کافر شفاعت سے محروم ہیں اس سے اخیر کی شفاعتیں مراد ہیں ہماری اس تقریر سے معلوم ہوا کہ ہر نیک و بد حضور کی شفاعت کا محتاج ہے۔ **چوتھے:** یہ کہ شفاعت صغریٰ اتنے حضرات کریں گے انبیاء، اولیاء، علماء، مشائخ، حجر اسود، قرآن کریم، خانہ کعبہ، اور رمضان اور چھوٹے بچے بلکہ مشکوٰۃ باب اذان میں بحوالہ بخاری واحمد وغیرہ ہے کہ جہاں تک موذن کی آواز پہنچتی ہے وہاں تک کی ہر چیز قیامت کے دن اس کے ایمان کی گواہی دے گی۔ مولوی

عبدالحی صاحب نے مقدمہ ہدایہ میں لکھا یہ حدیث میں بھی موجود ہے کہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ قیامت کے دن حجر اسود کی آنکھیں اور منہ ہوں گے اور حاجیوں کی شفاعت کرے گا۔ بعض جہنمی بغیر شفاعت بھی جنت میں جائیں گے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ رب تعالیٰ اپنا لپ (بک) بھر کر جہنمیوں کو جنت میں ڈالے گا۔ اوران لوگوں کو نام عتقاء الرحمان ہوگا۔ مشکوٰۃ باب الشفاعت بحوالہ مسلم، بخاری، تفسیر روح البیان نے آیۃ الکرسی کی تفسیر میں لکھا کہ یہ لوگ وہ ہوں گے جو عند اللہ مومن تھے۔ نہ کہ عندالشریعت۔

دوسرا باب مسئلہ شفاعت پر اعتراضات وجوابات

مسئلہ شفاعت پر آریوں، نیچریوں اور دیوبندیوں کے کچھ اعتراضات ہیں جن کو ہم مع جواب عرض کرتے ہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: بہت سی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کے ہاں کسی کی شفاعت نہیں حضور علیہ السلام نے اپنی اول تبلیغ میں حضرت فاطمہ الزہرہ سے فرمایا کہ میں تم سے خدا کا عذاب دفع نہیں کرسکتا (نیچری اور دیوبندی) **جواب:** اس قسم کی ساری آیتوں اور احادیث میں کفار مراد ہیں۔ سیدہ فاطمہ الزہرہ سے بھی یہی فرمایا جارہا ہے کہ اگر تم نے ایمان قبول نہ کیا تو تمہاری شفاعت نہ ہوگی۔ اسی لئے بہت سی آیات قرآنیہ میں اِلّا فرما کر مستثنیٰ فرمایا گیا۔ **دوسرا اعتراض:** اگر خدا پیغمبر کی سفارش سے جنت دے دے تو خدا طرفدار ہے استیارتھ پرکاش باب ۱۴، **جواب:** اس کا جواب شروع سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہر نعمت بعض کے ذریعے بعض کو پہنچی ہے۔ اور بیشک خدا تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کا طرفدار ہے۔ اچھوں کی طرفداری کرنا اچھا ہے۔ پنڈت جی کو سورج سے روشنی اور مالداروں سے بھیک ملتی ہے۔ **تیسرا اعتراض:** کفار عرب بتوں کو اپنا شفیع جانتے تھے۔ قرآن کریم نے اس عقیدہ کو کفر قرار دیا ہے۔ بہت آیتیں اس پر گواہ ہیں۔ مسلمان پیغمبروں ولیوں کو شفیع مان کر کافر ہو رہے ہیں۔ **جواب:** کفار غیر ماذون! کہ رب کے دشمنوں کو شفیع مان کر کافر ہوتے ہیں (بتوں کو) ہم ان محبوبوں کو شفیع مانتے ہیں جن کو رب نے شفیع بنایا۔ نیز کفار دھونس کی شفاعت مانتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ رب تعالیٰ کو بتوں کی شفاعت مجبوراً ماننی پڑے گی کیونکہ وہ اس کی خدائی میں دخیل ہیں۔ لہٰذا وہ کافر تھے۔ ہم مقبولان خدا کی شفاعت بالاذن اور شفاعت بالعزت اور بالوجاہت عطائی مانتے ہیں۔ **چوتھا اعتراض:** شفاعت کے عقیدے سے مسلمان بدعمل بن جائیں گے۔ کیونکہ وہ شفاعت پر اعتماد کر کے اعمال سے غافل ہوجائیں گے (دیوبندی اور وہابی) **جواب:** یہ اعتراض تو ایسا ہی ہے جیسے آریہ کہتے ہیں کہ توبہ کا مسئلہ بدعمل بناتا ہے۔ جناب شفاعت سے امید بڑھے گی اور امید سے شوق عمل زیادہ ہوگا۔ **پانچواں اعتراض:** ہم بھی حضور کے واسطے رحمت مانگتے ہیں اور ان پر درود پڑھتے ہیں۔ اور حضور بھی ہمارے لئے دعا ہی کرتے ہیں اور کریں گے تو چاہئے کہ حضور ہمارے شفیع ہوں اور ہم حضور کے۔ **جواب:** ان دونوں دعاؤں میں بڑا فرق ہے اور حضور کی دعا سے ہمارے بیڑے پار ہوں گے ان کی دعاؤں کے

بغیر ہمارا کام چل سکتا ہی نہیں۔ ہمارا دعا کرنا ان سے بھیک مانگنے کے لئے ہے۔ جیسے بھکاری سخی کو دعائیں دے کر بھیک مانگتا ہے اس لئے قرآن کریم نے جہاں درود کا حکم دیا وہاں پہلے ہی فرمادیا کہ ہم نبی پر رحمتیں بھیج رہے ہیں۔ تم بھی ان کے لئے دعا کیا کرو یعنی تمہاری دعا پر ہماری رحمت موقوف نہیں۔ پہلی قسم کی دعا شفاعت ہے اور دوسری دعا بھیک مانگنا۔ لہٰذا حضور ہمارے شفیع ہیں اور ہم ان کے بھکاری۔ **چھٹا اعتراض:** حضور نے فرمایا کہ زکوٰۃ نہ دینے والے قیامت میں ہمارے پاس اپنا مال لادے ہوئے شفاعت کے لئے آئیں گے۔ ہم فرمائیں گے کہ ہم نے تمہیں تبلیغ احکام کردی تھی اب ہم مالک نہیں۔ معلوم ہوا کہ شفاعت نہ ہوگی۔ **جواب:** اس حدیث سے تو یہ ثابت ہو رہا ہے کہ حضور شفاعت پر مجبور نہیں بلکہ مختار ہیں جس کی چاہیں اس کی شفاعت کریں۔ جس کی چاہیں نہ کریں۔ جیسے رب تعالیٰ غفور ہے مگر لاکھوں گنہگاروں کو نہ بخشے گا اور دنیا میں یہ اعلان فرمانا بھی قانون کا وقار قائم کرنے کے لئے ہے ورنہ اظہار رحمت کے لئے فرماتے ہیں، شَفَاعَتِیْ لِاَهْلِ الْكَبَائِرِ مِنْ اُمَّتِیْ یہ ہے رحمت یا خطاب منکرین زکوٰۃ سے ہوگا۔ کیونکہ وہ انکار زکوٰۃ سے کافر ہو چکے اور کافر کے لئے شفاعت نہیں۔

وَاِذْ نَجَّيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ
اور جب نجات دی ہم نے تم کو فرعون کی ذریت سے چکھاتے تھے وہ تم کو سختی عذاب کی
اور یاد کرو جب ہم نے تم کو فرعون والوں سے نجات بخشی کہ تم پر بڑا عذاب کرتے تھے
يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ ؕ وَفِىْ ذٰلِكُمْ
ذبح کرتے ہیں وہ بیٹوں کو تمہارے اور زندہ چھوڑتے تھے لڑکیوں کو تمہاری اور اس میں
تمہارے بیٹوں کو ذبح کرتے تھے اور تمہاری بیٹیوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس میں
بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿۴۹﴾
آزمائش طرف سے رب تمہارے کے بڑی
تمہارے رب کی طرف سے بڑی بلا تھی یا بڑا انعام

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے **ایک** یہ کہ پہلے اجمالاً بنی اسرائیل کی نعمتوں کا ذکر ہوا تھا۔ اب اس کی تفصیل فرمائی جارہی ہے۔ چونکہ ان پر دو قسم کے احسانات ہوئے تھے ایک تو مصیبت دور کرنا دوسرے رحمتیں عطا فرمانا اور ظاہر ہے کہ مصیبت سے نجات ملنا حصول نعمت پر مقدم ہے اس لئے پہلے اسی کا ذکر ہوا۔ **دوسرے** یہ کہ اس سے پہلے ارشاد ہوا تھا کہ قیامت میں کوئی کسی کے کام نہ آئے گا۔ اب یہ سمجھانے کے لئے فرعون کے ظلم کا واقعہ بیان ہو رہا ہے۔ جس سے معلوم

ہوا کہ جب دنیوی مصیبت میں کوئی کسی کے کام نہیں آتا تو قیامت میں کون آ سکتا ہے اور اے اسرائیلیو! دنیوی بادشاہ کے غضب سے تم سخت مصیبت میں گرفتار ہو گئے تو اگر کفر کر کے تم غضب الٰہی میں آ گئے تو تمہارا کیا حال ہوگا۔ **تیسرے** یہ کہ بنی اسرائیل دنیوی عزت کی خاطر اور اپنی حکومت باقی رکھنے کیلئے اسلام قبول نہ کرتے تھے۔ جیسا کہ پہلے معلوم ہوا۔ اب انہیں فرعون کا واقعہ یاد دلا کر بتایا جارہا ہے کہ ملک اللہ کا ہے۔ جس کو چاہے دے جیسے فرعون سے چھین کر تم کو ملک مصر دیا اسی طرح ہو سکتا ہے کہ تم سے چھین کر مسلمانوں کو دے دیا جائے۔ لہٰذا آخرت کی عزت طلب کرو نہ کہ محض دنیا کی **چوتھے** یہ کہ بنی اسرائیل مسلمانوں کو غریب اور حقیر سمجھ کر ان سے علیحدہ رہتے تھے اور کفار کی عظمت و عزت پر نظر کر کے ان سے تعلق رکھتے تھے۔ لہٰذا ان کو فرعون کا قصہ یاد دلا کر بتایا جارہا ہے کہ دیکھو پہلے تم حقیر و غریب تھے مگر حق پر تھے اور فرعونی لوگ عزت والے تھے مگر جھوٹے آخر کار تمہاری فتح ہوئی وہ ہلاک ہوئے اب تم جھوٹے ہو۔ اور غریب مسلمان سچے۔ لہٰذا یقین کرلو تم ہلاک اور وہ غالب رہیں گے مسلمانوں کی غریبی سے دھوکہ مت کھاؤ۔

تفسیر

وَ اِذْ یہ اذکروا فعل کا مفعول ہے یعنی وہ وقت یاد کرو۔ چونکہ بنی اسرائیل تاریخ سے واقف تھے اس لئے ان کو یہ واقعہ یاد دلایا جارہا ہے نَجَّیْنٰکُمْ یہ لفظ نَجْوٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں علیحدہ یا اونچی جگہ چونکہ جو کوئی فتنے سے علیحدہ بھاگ جائے وہ اس سے بچ جاتا ہے اس لئے اس بچنے کو نجات کہتے ہیں۔ اس نجو سے بہت سے لفظ بنتے ہیں۔ مگر سب میں علیحدگی کے معنی ملحوظ ہیں۔ اس سے استنجا بنا ہے۔ کیونکہ یہ علیحدگی میں کیا جاتا ہے اسی سے مناجات بنا جس کے معنی ہیں تنہائی میں دعا کرنا۔ اسی سے نجویٰ بنا جس کے معنی مشورہ کرنا، کیونکہ وہ بھی علیحدگی میں کیا جاتا ہے اس کے معنی ہوئے کہ ہم نے تم کو فرعون والوں سے علیحدہ کر لیا اور نجات دیدی اگرچہ یہ واقعہ موجودہ بنی اسرائیل کے باپ دادوں کو پیش آیا تھا۔ مگر چونکہ ان کا بچنا، ان ہی کا بچنا تھا اگر وہ نہ بچتے تو یہ کیسے پیدا ہوتے۔ اس لئے ان سے فرمایا گیا کہ تم کو نجات دی مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ۔ آل اہل سے بنا ہے مگر ان میں فرق یہ ہو گیا کہ اہل کو ہر طرف نسبت کر دیتے ہیں اہل بیت اہل علم اہل شہر مگر آل صرف بڑے آدمی کی طرف نسبت ہوتا ہے۔ خواہ دنیوی لحاظ سے بڑا ہو۔ خواہ دینی۔ کہا جاتا ہے آل عمران۔ آل نبی۔ آل فرعون وغیرہ۔ آل گھر میں رہنے والوں کو بھی کہتے ہیں۔ جیسے بیوی بچے، خدام وغیرہ اور گھر میں پیدا ہونے والوں کو بھی یعنی اولاد اور تابعداروں کو بھی یہاں تیسرے معنی مراد ہیں۔ یعنی فرعون کے نوکر چاکر پولیس والے وغیرہ کیونکہ فرعون کی کوئی اولاد نہ تھی اور اس کی بیوی سے بنی اسرائیل کو کوئی تکلیف نہ پہنچی۔ فرعون بادشاہ مصر کا لقب تھا۔ کیونکہ مصری زبان میں اس کے معنی تھے بادشاہ جیسے عربی میں سلطان فارسی میں بادشاہ ہندی میں راجہ اور انگریزی میں کنگ۔ ہر بادشاہ مصر کو فرعون کہا کرتے تھے اس فرعون کا نام ولید ابن مصعب تھا اور چونکہ یہ بہت خوبصورت تھا اس لئے لوگ اسے قابوس کہتے تھے جس کے معنی ہیں روشن چنگاری۔ بادشاہ ہونے کی وجہ سے فرعون کہا جاتا ہے۔ یہ بہت سخت مزاج اور ظالم شخص تھا۔ اس کے باقی حالات خلاصہ تفسیر میں آئیں گے۔

خیال رہے کہ بعض لوگوں نے سمجھا ہے کہ یہی یوسف علیہ السلام کا فرعون بھی تھا۔ مگر یہ غلط ہے۔ اس کا نام ریان ابن ولید تھا۔ موسیٰ علیہ السلام اور یوسف علیہ السلام میں چار سو سال کا فاصلہ ہے لہٰذا یہ وہی فرعون کیسے ہوسکتا ہے یَسُوْمُوْنَكُمْ یہ لفظ سوم سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ڈھونڈنا اور تلاش کرنا اسی لئے نرخ (بھاؤ) کو بھی سوم کہتے ہیں کہ اس سے چیز تلاش کی جاتی ہے۔ یہاں پہنچانے یا چکھانے کے معنی میں استعمال ہوا چونکہ وہ بھی بنی اسرائیل کو تلاش کر کے تکلیف دیتے تھے سُوْٓءَ الْعَذَابِ۔ سُوْٓء کے معنی برائی و سختی بھی ہیں اور برا و سخت بھی یہاں ہر دو معنی بن سکتے ہیں۔ یعنی تم کو عذاب کی سختی یا سخت عذاب پہنچاتے تھے۔ فرعون کی سختیاں بنی اسرائیل پر بے پناہ تھیں۔ ان کے بچوں کو اپنی قوم کا غلام بنا لیا تھا۔ ان کی عورتیں فرعونیوں کی خادمائیں تھیں۔ ان کے جوانوں کے ذمے سخت اور دشوار کام تھے وہ پتھر ڈھوتے تھے جس سے ان کی کمر اور گردنیں زخمی ہو گئیں تھیں۔ غریبوں پر ٹیکس مقرر تھے جو روزانہ شام سے پہلے وصول کر لئے جاتے تھے اگر کسی سے ایک دن کا ٹیکس بھی ادا نہ ہوتا تو اس کے ہاتھ گردن کے ساتھ باندھ دیے جاتے تھے اور مہینے بھر تک اس کو اس مصیبت میں رکھا جاتا تھا۔ کمزور بڈھے اسرائیلی نہایت ذلیل کام پر مقرر کئے گئے تھے۔ چنانچہ فرعونیوں کے لئے اینٹیں بنا کر پکاتے تھے ان کے مکانات تیار کرتے تھے ان کے پاخانوں اور گلیوں میں جھاڑو دیا کرتے تھے۔ ان کی بڈھی عورتیں فرعونیوں کے لئے سوت کات کر کپڑے بناتی تھیں وغیرہ وغیرہ تفسیر کبیر و روح البیان و عزیزی و خزائن العرفان، یُذَبِّحُوْنَ اَبْنَآءَكُمْ یا تو یہ اس سخت عذاب کی کچھ تفصیل ہے یا علیحدہ چیز یعنی اس کا ظلم تم پر یہاں تک بڑھ گیا تھا کہ تمہارے بچوں کو ذبح کر ڈالتا تھا اور یہ سخت مصیبت تھی کیونکہ لڑکوں کے ذبح ہونے سے اس نسل کے ختم ہونے کا اندیشہ تھا۔ نیز بغیر مردوں کے عورتوں کی زندگی دشوار ان کی عزت و عصمت خطرے میں ہوتی ہے۔ نیز چھوٹے بچوں کے ذبح کرنے میں اس کی ماں کو سخت تکلیف ہوتی ہے کیونکہ بڑی مشقت سے اس کو حاصل کرتی ہے اس سے بہت سی امیدیں رکھتی ہیں۔ نیز قدرتی طور پر بمقابلہ بیٹی کے بیٹا زیادہ پیارا ہوتا ہے۔ لہٰذا بیٹوں کا ماں باپ کے سامنے ذبح ہونا بڑی ہی مصیبت تھی۔ پھر اگر فرعونی ان کی ساری اولاد قتل کر دیتے تو غنیمت تھا۔ مگر وہ یہ نہ کرتے تھے بلکہ وہ یَسْتَحْيُوْنَ نِسَآءَكُمْ تمہاری لڑکیوں کو زندہ چھوڑتے تھے۔ خیال رہے کہ قرآن کریم نے لڑکوں کے لئے ابناء فرمایا نہ کہ رجال لڑکیوں کے لئے نساء فرمایا نہ کہ بنات چھوٹی لڑکیوں کو بنات اور جوانوں کو نساء کہا جاتا ہے اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ وہ ان بچیوں کو زندہ چھوڑتے تھے کہ جو جوان ہو کر تمہارے لئے وبال بن جاتی تھیں۔ کیونکہ لڑکی جوان ہو کر ماں باپ کے لئے بوجھ بن جاتی ہے اور خاص کر جب کہ قوم کے بچے ذبح کئے جا رہے ہوں کہ لڑکیاں جوان ہو کر کہاں جائیں گی جب ان کے نکاح کیلئے قوم میں مرد نہ ملیں تو نہ معلوم ان کا انجام کیا ہو وَفِيْ ذٰلِكُمْ یہ تمام تکلیفوں کی طرف اشارہ ہے یعنی اس ذبح کرنے سے، چھوڑنے اور سخت عذاب میں بَلَآءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ یہ بلا آفت کے معنی میں ہے یا امتحان کے یعنی یہ تم پر بڑی مصیبتیں تھیں۔ یا سخت امتحان کیونکہ امتحان نعمت سے بھی ہوتا ہے اور محنت سے بھی بلا سے مراد نعمت بھی ہوسکتی ہے تو معنی یہ ہوں گے کہ اس نجات دینے میں اور احسانات کرنے میں تمہارا امتحان بھی تھا۔ کہ اب تم خدا کا شکر کرتے ہو یا نہیں۔

خلاصہ تفسیر

بنی اسرائیل کو یہ دوسرا انعام یاد دلایا جا رہا ہے کہ اے اسرائیلیوں تم فرعون والی مصیبتوں کو یاد کرو کہ تم کو ہر روز اس کی قوم کی طرف سے ایک نئی مصیبت کا سامنا ہوتا تھا۔ اس نے تم کو طرح طرح کے عذابوں میں جکڑ رکھا تھا۔ یہاں تک کہ تمہارے لڑکوں کو قتل کراتا اور لڑکیاں باقی چھوڑتا تھا۔ اس میں تم پر سخت مصیبت تھی۔ نسل و قوم کا کم ہونا۔ لڑکیوں کا دوسروں کے استعمال میں آنے کا اندیشہ پھر زندہ اولاد کو قتل دیکھنا اور اپنی گود میں بچوں کے ذبح ہونے کا نظارہ رب نے تم کو سب مصیبتوں سے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے نجات دی۔ یہ کتنا بڑا احسان ہے اور کیسی نعمت ہے تم اس احسان کو یاد کرو اور اس نبی آخر الزمان پر ایمان لاؤ۔ خیال رہے کہ بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کی نجات اور فرعون کے غرق کی یادگار قائم کئے ہوئے تھے کہ عاشورہ کے دن روزہ رکھتے خیراتیں کرتے خوشیاں مناتے تھے، شروع اسلام میں مسلمانوں پر بھی یہ روزہ فرض تھا مگر قرآن نے ان کی یہ یادگاریں منانا کالعدم قرار دیا فرمایا یاد کرو معلوم ہوا کہ حضور سے منہ موڑ کر کوئی عبادت یا یادگار منانا معتبر نہیں۔

بنی اسرائیل، فرعون، موسیٰ علیہ السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد یعقوب علیہ السلام تک ان کی اولاد کنعان میں ہی آباد رہی پھر یوسف علیہ السلام اپنے بھائیوں کے حسد کی وجہ سے بظاہر غلام بن کر مصر میں تشریف لائے یہاں حق تعالیٰ نے ان کو بڑا عروج عطا فرمایا۔ جب کنعان میں سخت قحط پڑا تب یعقوب علیہ السلام اور ان کی ساری اولاد مصر میں آ گئے۔ ان سب کو خدا نے بڑھایا اور چند صدیوں میں مصر میں ان کے لاکھوں آدمی ہو گئے اور اس عرصہ میں وہاں اسرائیلیوں کا بہت دبدبہ رہا یوسف علیہ السلام والا فرعون اور اس کے ساتھی مرکھپ گئے اور ملک مصر میں بدنظمی پیدا ہوئی ولید بن مصعب جو سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا فرعون ہے یہ شہر اصفہان کا ایک غریب عطار تھا۔ جب اس پر بہت قرض ہو گیا تو اصفہان سے بھاگ کر شام پہنچا لیکن وہاں کوئی ذریعہ معاش ہاتھ نہ آیا تب وہ تلاش روزی کے لئے مصر میں آیا۔ یہاں اس نے دیکھا کہ گاؤں میں تربوز بہت سستے بکتے ہیں اور شہر میں مہنگے۔ دل میں سوچا کہ نفع بخش تجارت ہے۔ چنانچہ اس نے گاؤں سے بہت سارے تربوز خریدے مگر جب شہر کی طرف چلا تو راستے میں محصول لینے والوں نے کئی جگہ اس سے محصول لیا۔ بازار آتے آتے صرف اس کے پاس ایک تربوز بچا باقی سب محصول میں چلے گئے یہ سمجھ گیا کہ اس ملک میں کوئی شاہی انتظام نہیں جو چاہے حاکم بن کر مال حاصل کرے۔ اس وقت مصر میں کوئی وبائی بیماری تھی لوگ بہت مر رہے تھے۔ یہ قبرستان میں بیٹھ گیا اور کہا کہ میں شاہی افسر ہوں مردوں پر ٹیکس لگا ہے فی مردہ مجھے پانچ درہم دو اور دفن کر دو اس بہانے سے چند روز میں اس نے بہت مال جمع کر لیا اتفاقاً ایک روز کوئی بڑا آدمی دفن کے واسطے لایا گیا اس نے اس کے وارثوں سے روپے پیسے مانگے انہوں نے اسے گرفتار کر کے بادشاہ تک پہنچا دیا اور سارا واقعہ بادشاہ کو بتایا۔ بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ تجھے کس نے اس جگہ مقرر کیا ہے۔ ولید بولا کہ میں نے آپ تک پہنچنے کا یہ بہانہ بنایا تھا۔ میں آپ کو خبر کئے دیتا ہوں کہ آپ کے ملک میں بہت بدنظمی ہے۔ میں نے تین مہینے کے عرصہ میں

ظلماً اتنا مال جمع کرلیا۔آپ خیال کر سکتے ہیں کہ دوسرے حکام کیا کچھ نہ کرتے ہوں گے یہ کہہ کروہ سارا مال بادشاہ کے سامنے ڈال دیا اور کہا کہ اگر آپ انتظام میرے سپرد کردیں تو میں آپ کا ملک درست کردوں گا بادشاہ کو یہ بات پسند آئی اور اسے کوئی معمولی عہدہ دے دیا۔ ولید نے وہ طریقہ اختیار کیا جس سے بادشاہ بھی خوش رہا اور رعایا بھی۔ رفتہ رفتہ یہ تمام لشکر کا افسر بنا دیا گیا اور ملک کا انتظام اچھا ہوگیا۔ جب بادشاہ مصر مرا تو رعایا نے ولید کو تخت پر بٹھا دیا۔ (تفسیر روح البیان) اس نے تخت پر بیٹھتے ہی اعلان عام کیا کہ لوگ مجھے سجدہ کیا کریں۔ سب سے پہلے اس کے وزیر ہامان نے اس کو سجدہ کیا اور پھر دوسرے امیروں اور سرداروں کے ذریعے مصر کے لوگوں سے خود اپنے کو سجدہ کراتا تھا اور دور والوں کے لئے اس نے اپنے نام کے بت بنا کر بھیج دیے تھے کہ وہ ان بتوں کو سجدہ کیا کریں تمام اہل مصر فرعون کی پرستش میں گرفتار ہوگئے مگر بنی اسرائیل نے اس سے انکار کیا فرعون نے ان کے سرداروں کو بلا کر بہت ڈرایا دھمکایا۔ مگر انہوں نے کہا کہ ہم تیری عبادت نہیں کر سکتے صرف رب کی عبادت کریں گے تو جو چاہے سو کر۔ فرعون غصے میں آگیا اور دیگوں میں زیتون کا تیل اور گندھک کھولا کر بنی اسرائیل کو ڈالنا شروع کیا بنی اسرائیل نے یہ سب کچھ برداشت کیا۔ مگر رب کی اطاعت سے منہ نہ موڑا اور فرعون کو سجدہ نہ کیا۔ جب بہت سے بنی اسرائیل جلا دیئے گئے تب ہامان نے فرعون سے کہا کہ ان کو مہلت دے اور ان کو دنیا میں ذلیل کر کے رکھ۔ تب اس نے جلانے سے ہاتھ کھینچا اور اسرائیلیوں پر بہت سختیاں شروع کردیں (تفسیر عزیزی) اس زمانے میں فرعون نے خواب دیکھا کہ بیت المقدس کی طرف سے ایک آگ آئی جس نے تمام قبطیوں، (فرعونیوں) کو جلا ڈالا مگر اسرائیلیوں کو کوئی نقصان نہ پہنچا اور پھر دیکھا کہ بنی اسرائیل کے محلے سے ایک بڑا اژدھا نکلا۔ جس نے اس کو تخت سے نیچے ڈال دیا اس نے تعبیر دینے والوں سے اپنا خواب بیان کیا انہوں نے کہا اے فرعون بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تیری حکومت کے ٹکڑے اڑا دے گا اس نے فوراً کوتوال شہر کو بلا کر حکم دیا کہ ایک ہزار سپاہی ہتھیار بند اور ایک ہزار دائیاں بنی اسرائیل کے محلے میں مقرر کردو کہ جس گھر میں لڑکا پیدا ہوا اسے قتل کردیا جائے چند سال میں بنی اسرائیل کے بارہ ہزار بچے اور ایک روایت میں ہے کہ ستر ہزار قتل کرا دیئے اور نوے ہزار حمل گرائے گئے خدا کی شان بنی اسرائیل کے بوڑھے بھی جلد جلد مرنے لگے۔ تب قبطیوں نے فرعون سے درخواست کی کہ بنی اسرائیل میں موت کا بازار گرم ہے اور ادھر ان کے بچے قتل کئے جارہے ہیں اگر یہ حال رہا تو یہ قوم فنا ہوجائے گی پھر ہمیں خدمتگار کہاں سے ملیں گے تب فرعون نے حکم دیا کہ اچھا ایک سال بچے قتل کئے جایا کریں اور ایک سال چھوڑے جائیں۔ رب کی شان چھوڑنے کے سال میں ہارون علیہ السلام پیدا ہوئے (موسیٰ علیہ السلام کے بڑے بھائی) اور قتل کے سال موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش ہوئی (تفسیر عزیزی وخزائن العرفان)

موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش

لاوی بن یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں حضرت عمران اس وقت اپنی قوم کے سردار تھے۔ ان کی بیوی کا نام حضرت عایذ تھا۔ موسیٰ علیہ السلام انہی کے فرزند ہیں۔ جب حضرت عایذ حاملہ ہوئیں تو فرعون کی دائیاں ان کے گھر میں اور سپاہی دروازے پر

آنے لگے۔ جب زمانہ ولادت قریب آیا تو ایک دائی ان کے گھر میں رہنے لگی موسیٰ علیہ السلام رات کے وقت پیدا ہوئے فرعون کی دائی ان کو دیکھ کر بے اختیار ان پر عاشق ہوگئی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو محبوبیت عامہ بخشی تھی جو انہیں دیکھتا عاشق ہو جاتا۔ رب فرماتا ہے وَاَلْقَیْتُ عَلَیْكَ مَحَبَّةً مِّنِّیْ (طٰہٰ:۳۹) یوسف علیہ السلام کو مصری عورتوں نے دیکھ کر اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے تھے۔ ہمارے حضور کی محبوبیت کا یہ عالم ہے کہ آج بغیر دیکھے لاکھوں عاشق ہیں۔ نیز حضور تمام مخلوق کے محبوب ہیں کہ لکڑیاں پتھر تک ان کے فراق میں روتی تھیں۔ دائی نے ان کی والدہ سے کہا کہ کسی صورت سے ان کو قتل ہونے سے بچاؤ۔ یہ کہہ کر ایک بکری کا بچہ ذبح کیا ہوا ایک ہانڈی میں ڈال کر سپاہیوں سے کہا کہ اس گھر میں لڑکا پیدا ہوا تھا میں نے ذبح کر دیا ہے اور دیکھو میں اس کو دفن کرنے کے لئے جنگل میں جا رہی ہوں۔ سپاہیوں نے اس پر اعتبار کیا اور کوئی زائد تحقیقات نہ کی۔ موسیٰ علیہ السلام اپنے گھر میں پرورش پاتے رہے مگر نجومیوں نے فرعون کو خبر دی کہ بنی اسرائیل میں وہ بچہ پیدا ہو چکا ہے۔ فرعون اس خبر سے پریشان ہوگیا۔ اور کوتوال کو سخت تنبیہ کی کوتوال نے سپاہیوں پر سختی کی۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے بہت کوشش سے ان کے بچے قتل کئے مگر عمران کے لڑکے کو اپنے ہاتھ سے نہ مارا صرف دائی کے کہنے پر اعتماد کر لیا۔ کوتوال نے کہا کہ فوراً اس گھر کی تلاشی لو اور بلا تامل گھس جاؤ۔ سپاہی بے پردہ حضرت عمران کے گھر گھس آئے۔ اس وقت موسیٰ علیہ السلام اپنی بڑی بہن مریم کی گود میں تھے۔ مریم نے یہ ماجرا دیکھ کر فوراً ان کو بھڑکتے ہوئے تنور میں اس طرح ڈال دیا کہ سپاہیوں کو خبر نہ ہوئی مریم نے خیال کیا کہ اگر پولیس نے بچہ کو دیکھ لیا تو یہ فرزند اور ہم قتل کر دیئے جائیں گے پولیس نے گھر کی تلاشی لی۔ کچھ نہ پا کر واپس لوٹ گئی۔ والدہ نے مریم سے پوچھا کہ موسیٰ علیہ السلام کہاں ہیں اس نے سب ماجرا کہا۔ ماں غم سے تڑپ گئی تنور پر جا کر دیکھا کہ آگ کے شعلے نکل رہے مگر موسیٰ علیہ السلام بدستور امن و امان سے ہیں۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کا ارہاص ہوا یعنی دعویٰ نبوت سے پہلے معجزہ کا ظہور جیسے حضور ﷺ کو بچپن شریف میں پتھروں کا سلام کرنا وغیرہ۔ عیسیٰ علیہ السلام نے پیدا ہوتے ہی کلام فرمایا۔ حضرت مریم نے بچپن میں جنتی غیبی پھل کھائے یہ قرآن نے ثابت کیا آج ان کی عمر چالیس دن کی تھی۔ والدہ کے دل میں خیال آیا کہ اس فرزند کی زندگی مشکل ہے اس کو کشتی میں رکھ کر دریائے نیل میں بہا دینا بہتر ہے۔ شاید کوئی دوسرا شخص ان کو اٹھا لے اور وہاں پرورش کریں۔

موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کے گھر پہنچنا

گھر کے سب لوگوں نے مشورہ کر کے محلہ کے ایک بڑھئی سے جس کا نام سانوم تھا ایک صندوقچہ لکڑی کا بنوا کر اس سے عہد لیا کہ کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا سانوم نے صندوقچہ بنایا۔ ادھر فرعون کی طرف سے اعلان ہوا کہ جو شخص ہم کو اس لڑکے کا پتہ دے جو کہ بنی اسرائیل کے گھر پیدا ہوا ہے تو اس کو بہت انعام دیا جائے گا۔ سانوم کو طمع ہوئی خبر دینے کے لئے نکلا اور دروازے پر پہنچا کہ زمین میں ٹخنوں تک دھنس گیا اور غیبی آواز کان میں آئی کہ اگر یہ راز تو نے ظاہر کیا تو تجھ کو زمین میں دھنسا دیا جائے گا۔ سانوم گھبرا گیا اور صندوقچہ عمران کے مکان پر پہنچایا اور عرض کیا کہ مجھے اس پاکیزہ فرزند کی صورت دکھا دو والدہ نے اس کو

حضرت موسیٰ کی زیارت کرائی سانوم نے ان کے قدم پاک پر آنکھیں ملیں اور ان پر ایمان لایا چنانچہ سب سے پہلا مومن یہی ہے اور اس صندوقچہ کی اجرت بھی نہ لی۔ والدہ ماجدہ نے موسیٰ علیہ السلام کو غسل دیا عمدہ کپڑے پہنائے خوشبو لگائی اور صندوقچہ میں رکھ کر دریائے نیل پر روتی ہوئی لے گئیں۔ اور خدا کے حوالے کر کے دریا میں بہا دیا۔ دل بہت بے چین ہوا مگر قدرتی طور پر تسکین ہوئی کہ یہ بچہ پھر مجھ کو ہی ملے گا۔ دریا سے ایک نہر نکال کر فرعون کے باغ میں پہنچائی گئی تھی جس کا نام عین الشمس تھا۔ یہ صندوقچہ اس نہر میں داخل ہو کر فرعون کے باغ میں پہنچا اس وقت فرعون باغ کی سیر کر رہا تھا اور اس کی بی بی حضرت آسیہ اور دیگر خاص لوگ ساتھ تھے یہ لوگ اس صندوقچہ کو اٹھا کر فرعون کے پاس لے آئے۔ فرعون نے جو اس کو کھولا تو اس میں حسین وجمیل لڑکا پایا۔ بولا کہ یہ وہی لڑکا ہے جس کی نجومیوں نے خبر دی تھی۔ یہ میرا کمال ہے کہ وہ خود بخود میرے پاس آ گیا۔ اس کو بھی فوراً قتل کر دیا جائے۔ حضرت آسیہ فرعون کی بی بی آپ کا حسن وجمال دیکھ کر آپ پر عاشق ہو گئیں اور فرعون سے بولیں کہ تو نے محض گمان سے ہزار ہا بچے قتل کرا دیئے اس کو قتل نہ کر یہ بچہ شاید کسی اور جگہ سے آ رہا ہے بنی اسرائیل کا نہیں ہے میرا کوئی بیٹا نہیں ہے۔ میں اس کو بیٹا بناؤں گی خدا نے میری گود بھر دی فرعون نے یہ بات مان لی ادھر مریم (موسیٰ علیہ السلام کی بہن) نے ماں کو خبر دی کہ بھائی تو فرعون کے پاس پہنچ گیا۔ ماں بے قرار ہو گئی مگر رب کی طرف سے القاء ہوا کہ گھبراؤ نہیں تمہارا بچہ تم کو ہی ملے گا۔ اب حضرت آسیہ نے شہر کی دائیاں (دودھ پلانے والیاں) بلوائیں جو کہ ان کو دودھ پلائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کسی کا دودھ نہ پیا۔ مریم بھی وہاں موجود تھیں کہنے لگیں کہ ایک بہت قابل دائی ہے جس کا دودھ بہت اچھا ہے اس شہر میں رہتی ہے۔ فرماؤ تو اس کو بھی بلا لاؤں۔ فرعون بولا فوراً لاؤ۔ وہ اپنی والدہ کو لے گئیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے دودھ پیا اور ان کی گود میں سو گئے۔ فرعون نے ان کی ایک اشرفی روزانہ اجرت مقرر کر دی۔ اور کہا تم اس بچے کی پرورش کرو۔ قدرت کے قربان فرعون نے جس کے ڈر سے بارہ ہزار بچے ذبح کرائے اس کو خود پرورش کر رہا ہے آسیہ نے موسیٰ علیہ السلام کے لئے سونے کا گہوارہ تیار کرایا۔ اور بہت ناز ونعمت سے ان کی پرورش کی۔ دو برس تک موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے ان کی پرورش کی۔ اس مدت کے گزرنے پر ایک خچر بھرا ہوا سونا اور کئی اونٹ لدے ہوئے دیگر نفیس تحفے دے کر عایذ (موسیٰ علیہ السلام کی والدہ) کو رخصت کیا۔ مسئلہ ماں اپنے بچہ کی پرورش پر اجرت نہیں لے سکتی کیونکہ اس پر واجب ہے اور واجب کی اجرت لینا منع مگر موذی کافر کا مال جس طرح ہاتھ لگے لینا جائز ہے۔ اسی لئے عایذ نے فرعون سے یہ مال لیا۔ نیز اگر وہ فرما دیتیں کہ میں اس کی ماں ہوں تو قتل کر دی جاتیں۔ اس عذر کی وجہ سے بھی اجرت لینی جائز ہوئی۔

موسیٰ علیہ السلام کی پرورش

پھر حضرت آسیہ نے خود ان کی پرورش شروع کر دی اور فرعون بھی ان سے محبت کرنے لگا۔ جب آپ تین برس کے ہوئے تو ایک دن فرعون آپ کو گود میں کھلا رہا تھا کہ اچانک آپ نے اس کی داڑھی پکڑ کر ایک طمانچہ مارا۔ فرعون غصہ میں بھر کر آسیہ سے بولا کہ یہ وہی بچہ معلوم ہوتا ہے۔ دیکھو اس نے میری یہ بے حرمتی کی آسیہ فرمانے لگیں کہ بچے ناسمجھ ہوتے ہیں ان کے فعل

کا اعتبار نہ کرنا چاہئے۔ یہ تو آگ میں بھی ہاتھ ڈال دیتے ہیں۔ فرعون نے کہا کہ اچھا امتحان کرو ایک طشت میں سونا رکھ دو دوسرے میں آگ اگر یہ آگ میں ہاتھ ڈال دے تو واقعی تم ٹھیک کہتی ہو۔ ایسا ہی کیا گیا۔ قریب تھا آپ سونے کی طرف دوڑتے۔ مگر حضرت جبرئیل نے آپ کا رخ آگ کی طرف کر دیا۔ آپ نے آگ میں ہاتھ ڈال کر ایک بڑا سا انگارہ منہ میں رکھ لیا جس سے آپ کی زبان جل گئی اور آپ کو لکنت ہو گئی۔ تب فرعون کو آسیہ کی بات پر پورا یقین ہوا۔ آپ کے زمانہ پرورش میں فرعون نے آپ کے بہت سے معجزے دیکھے ایک بار آپ نے مرغ سے تسبیح پڑھوائی۔ ایک دفعہ پکے ہوئے مرغ کو زندہ فرمایا جس سے کہ فرعون کے دل میں آپ کا رعب بیٹھ گیا۔ مگر غلبہ محبت اور اپنی بیوی کی وجہ سے قتل نہ کرا سکا۔ جب موسیٰ علیہ السلام تقریباً جوان ہوئے۔ تب آپ کا میلان قلبی بنی اسرائیل کی طرف ہوا۔ آپ ان سے ہی میل جول زیادہ رکھتے تھے۔ فرعونیوں کو ناگوار گزرتا تھا مگر کچھ دم نہ مار سکتے تھے۔ جب آپ ۲۲ سال کے ہوئے تب ایک دن سرداران بنی اسرائیل کو علیحدہ کر کے ان سے پوچھا کہ تم فرعون کی مصیبت میں کب سے مبتلا ہو۔ انہوں نے جواب دیا کہ بہت عرصے سے آپ نے فرمایا کہ یہ تمہارے گناہوں کی شامت ہے۔ تم نذر مانو کہ جب رب تعالیٰ تم کو اس سے نجات دے تو تم وہ پوری کرو۔ ان سب نے کہا کہ کیا نذر مانیں۔ آپ نے فرمایا کہ رب تعالیٰ کی اطاعت فرمانبرداری۔ سب نے نذر مان لی۔

موسیٰ علیہ السلام کی مصر سے روانگی

جب آپ تیس سال کے ہوئے تو ایک دن ایک قبطی اور اسرائیلی میں جھگڑا ہو رہا تھا۔ قبطی اسرائیلی کو لکڑیوں کا بوجھ اٹھانے پر مجبور کر رہا تھا۔ وہ انکار کرتا تھا، اسرائیلی نے آپ کو پکارا کہ اے موسیٰ مجھے اس ظالم سے نجات دلواؤ آپ نے قبطی کو ظلم سے منع کیا وہ باز نہ آیا آپ نے اس کو مکا مارا جس سے قبطی مر گیا اسرائیلی اپنے گھر گیا خیال رہے کہ آپ نے قبطی کو ہلاک کرنے کے ارادے سے نہ مارا تھا صرف چھڑانے کے لئے وہ اتفاقیہ مر گیا اتفاقیہ پر یہ قصاص نہیں ہوتا نیز وہ کافر حربی تھا جس کا قتل گناہ بھی نہیں کچھ روز بعد تو سارے ہی قبطی ہلاک کئے گئے الغرض فرعون کو خبر پہنچی اس نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام نہیں کر سکتے دوسرے دن وہ بنی اسرائیلی دوسرے قبطی سے الجھا ہوا تھا۔ آپ کو دیکھ کر آپ سے فریاد کی آپ نے اسرائیلی کو جھڑکا اور چاہا کہ اس قبطی سے چھڑوا دیں اسرائیلی سمجھا کہ آج مجھے مار رہے ہیں۔ وہ چیخا کہ اے موسیٰ کل تو نے قبطی کو مارا تھا! کیا آج مجھے ہلاک کرنا ہے یہ بات لوگوں نے سنی اور فرعون کے پاس گواہی دی قبطی سرداروں نے فرعون سے مطالبہ کیا کہ ہمارے حوالے کرو تاکہ ہم قبطی کا ان سے قصاص لیں فرعون نے ایسا کرنے میں تامل کیا اس مجلس میں ایک شخص موجود تھا جس کا نام حزقیل تھا اور وہ درپردہ ایمان لا چکا تھا۔ اس نے موسیٰ کو خبر دی کہ آپ کے قتل کا مشورہ ہو رہا ہے۔ بہتر ہے کہ آپ کسی اور جگہ چلے جائیں موسیٰ بے سروسامان مدین کی طرف روانہ ہو گئے اور وہاں حضرت شعیب علیہ السلام کے گھر ٹھہر گئے اور ان کی لڑکی سے جن کا نام صفورا تھا۔ نکاح کیا دس سال وہاں رہے پھر مصر کی طرف تشریف لائے راستہ میں آپ کو نبوت عطا ہوئی اور پھر چالیس سال تک مصر میں فرعون کے مقابلے میں مشغول رہے اور تبلیغ احکام فرماتے رہے یہ واقعہ خیال میں رکھنا چاہئے آئندہ اس سے فائدہ ہوگا۔

(تفسیر عزیزی)

اعتراضات

پہلا اعتراض: بنی اسرائیل پر فرعون کی سختی ان کی سرکشیوں کا عذاب تھا۔ لیکن ان کے بچوں نے کیا گناہ کیا تھا۔ جو وہ بچے ذبح کئے گئے۔ **جواب:** دنیا میں مصیبتیں آفتیں صرف گناہوں سے ہی نہیں آتیں۔ بلکہ بہت وجوہ سے آتی ہیں انبیاء کرام اولیاء اللہ جو بالکل بے گناہ ہوتے ہیں۔ سب پر تکالیف آجاتی ہیں امام حسین اور ان کے شیر خوار بچے علی اصغر کس گناہ پر کربلا کی مصیبت میں مبتلا ہوئے جن قوموں پر آسمانی غیبی عذاب آئے ان کے بچے جانور سب ہی ہلاک ہوئے حالانکہ بچے مجرم نہ تھے۔ بنی اسرائیل کے بچوں کا ذبح بنی اسرائیل کے نیک کاروں کا امتحان تھا، بدکاروں کی سزا کہ بچوں کے ذبح سے انہیں تکلیف ہو۔ ہاں آخرت کے عذاب بغیر جرم نہ ہوں گے۔

تفسیر صوفیانہ

نفس امارہ فرعون ہے اور اس کے عیوب آل فرعون۔ روح انسانی گویا بنی اسرائیل ہے اور اس کے عمدہ صفات بنی اسرائیل کے بچے اور بعض قلبی صفات اس کی لڑکیاں۔ نفس امارہ اور اس کے عیوب صفات حمیدہ کو ذبح کر کے دور کرتے ہیں۔ اور قلبی صفات کو باقی رکھ کر ان سے اپنی خدمت لیتے ہیں تاکہ ان سے حیوانی کام لئے جاویں اس فرعون نفس سے نجات بغیر رحمت کردگار ممکن نہیں۔ اس میں انسان کا سخت امتحان ہے۔ جس کو رب ہدایت دیتا ہے اس کے نفس اور نفسانی عیوب کو بحر قہر میں فنا کر کے روح وقلب کو اس سے نجات دیتا ہے اور رہبر طریقت کے ذریعہ اس کو ترقیاں نصیب فرماتا ہے۔ یہ رہبر طریقت اس کے لئے مثل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہادی مطلق ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔ شعر

نفس ماہم کمتر از فرعون نیست لیک اورا عون مارا عون نیست

وَاِذْ فَرَقْنَا بِكُمُ الْبَحْرَ فَاَنْجَيْنٰكُمْ وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ
اور جب کہ پھاڑ دیا ہم نے بوجہ تمہاری دریا کو پس نجات دی ہم نے تم کو اور ڈبویا ہم نے
اور جب ہم نے تمہارے لئے دریا پھاڑ دیا تو تمہیں بچالیا اور فرعون
وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۰﴾
ذریت فرعون کو حالانکہ تم لوگ دیکھتے تھے
والوں کو تمہاری آنکھوں کے سامنے ڈبویا

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **ایک** یہ کہ فرعونی طاقت سے بنی اسرائیل کو نجات دینے کا اجمالاً ذکر ہوا

تھا۔ اب اس کی تفصیل ارشاد ہو رہی ہے۔ یعنی اس طرح نجات دی کہ اس کو ڈبو دیا اور تم کو دریا سے صحیح وسالم پار کر دیا۔
دوسرے یہ کہ یہ تیسرا انعام ہے جو کہ بنی اسرائیل پر ہوا تھا۔ یعنی اولاً تم کو سب پر فضیلت دی۔ دوسرے موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے تمہیں فرعونی قوم کی غلامی سے چھڑایا۔ **تیسرے** اس کو ہلاک کر کے تم کو تخت وتاج کا مالک بنایا۔

تفسیر

وَاِذْ یہاں بھی اُذْکُرُوْ فعل چھپا ہوا ہے یعنی اے اسرائیلیو وہ وقت بھی یاد کرو۔ اگر یہ آیت گذشتہ آیت ہی کی تفصیل ہے۔ تو واذ فرما کر اس کو اس لئے علیحدہ فرمایا کہ یہ ان تمام نعمتوں سے اعلیٰ ہے اور ایک ہی واقعہ میں بعض اہم باتوں کو علیحدہ طور پر بھی بیان کر دیتے ہیں اور اگر یہ تیسرا انعام ہے تو وَاِذْ فرمانا بالکل ظاہر ہے۔ فَرَقْنَا فرق سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں علیحدہ علیحدہ کرنا۔ اور چیر دینا۔ چونکہ اس وقت دریائے قلزم کا پانی پھٹ کر اس میں راستہ بن گیا تھا اور اس راستے کے بھی بارہ حصے ہوئے تھے۔ جن کے درمیان پانی کی دیواریں بنیں۔ اس لئے فَرَقْنَا فرمایا گیا۔ اگر کوئی شخص پانی میں گھس جاوے جب بھی اگرچہ پانی چر جاتا ہے مگر یہ چرنا نہ تو محسوس ہوتا ہے نہ عجیب بات ہے مگر اس موقعہ پر چرنے کی عجیب ہی نوعیت تھی اس لئے اہتمام سے اس کا ذکر ہوا بِکُمْ پر باسببیہ ہے یعنی تمہاری وجہ سے دریا چیرا گیا۔ اگرچہ اس چرے ہوئے دریا میں گھس کر فرعون بھی غرق ہوا۔ مگر یہ چرنا ہوا اسرائیلیوں کے لئے۔ یا یوں کہو کہ غرق فرعون بھی اسرائیلیوں کے لئے ہی ہوا تھا۔ لہٰذا یہ سب کچھ انہی کے لئے ہوا۔ اَلْبَحْرَ عربی میں بحر کھاری دریا کو کہتے ہیں میٹھے دریا کو بحر کہنا مجازاً ہوتا ہے یہاں بحر سے دریا قلزم مراد ہے قلزم ایک شہر کا نام ہے جہاں یہ دریا ختم ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو بھی قلزم کہا جاتا ہے۔ یہ دریا سمندر کی ایک شاخ ہے جبش اور دیگر بلاد عرب کے درمیان سے گزرتی ہے اور اسے بحر احمر بھی کہا جاتا ہے اس کا طول ۴۶۰ فرسخ جنوباً شمالاً ہے اور عرض صرف ۶۰ فرسخ ہے یہ مصر سے صرف تین دن کے فاصلہ پر واقع ہے اور دریائے نیل مصر کے مغربی جانب ہے۔ یہ جو مشہور ہے کہ دریائے نیل میں غرق ہوا محض غلط ہے۔ (تفسیر عزیزی) فَاَنْجَیْنٰکُمْ اس دریا سے تم کو نجات دے دی کہ تم کو وہاں سے بخیر وخوبی نکال دیا اور تمہارے لئے دریا کا پانی پھاڑ بھی دیا اور زمین خشک کر دی تاکہ تم کو چلنے میں آسانی ہو اور صرف اس پر کفایت نہ کی بلکہ تمہاری خاطر وَاَغْرَقْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ تمام فرعونی ذریت کو ڈبو دیا۔ یہاں آل فرعون سے خود فرعون اور اس کی ساری قوم مراد ہے یعنی قبطی مرد۔ اس میں لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ صرف فرعونی قوم ہی کو ڈبویا ان کے سارے مال زمین باغات کھیتیاں وغیرہ باقی رکھیں بلکہ ان کے جسم پر جو زیور وغیرہ تھا وہ بھی دریا نے باہر پھینک دیا۔ اگر ان پر اور قسم کا عذاب آتا تو ان کے مکان وغیرہ گر جاتے اور زمین مصر خراب ہو جاتی اور نیز تم کو مصر میں رہنا جائز نہ ہوتا۔ کیونکہ عذاب کی جگہ مسلمانوں کو نہ رہنا چاہئے۔ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ یعنی یہ سارا واقعہ تمہاری آنکھوں کے سامنے ہوا دریا کا پھٹنا پھر تمہارا اس سے گزر جانا اور سارے فرعونیوں کا اس میں ڈوب جانا۔ تم نے (تمہارے باپ دادوں نے) اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یا یہ مطلب ہے کہ بنی اسرائیل کو فرعون کے ڈوبنے میں کچھ شک تھا۔ ان کے یقین کے لئے دریا نے اس کی لاش باہر پھینک دی

جس کو دیکھ کر انہیں یقین آیا ان دونوں صورتوں میں موجودہ بنی اسرائیل کے باپ دادا مراد ہیں اور تَنْظُرُوْنَ ماضی ناتمام کے معنی میں یعنی تمہارے باپ دادے اس کو دیکھتے تھے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اے اسرائیلو اب بھی تم اس واقعہ کو دیکھ رہے ہو کیونکہ فرعون اور ہامان کی لاشیں اب تک موجود ہیں آج چودہ سو برس بعد بھی لوگوں نے دیکھی ہیں۔

خلاصہ تفسیر

یہ تیسرا انعام ہے جو مصر سے نکلنے کے بعد بنی اسرائیل پر ہوا جب موسیٰ علیہ السلام ان کو فرعون کی قید سے چھڑا کر کنعان کی طرف روانہ ہوئے تو فرعون اور اس کے لشکر نے اس کا پیچھا کیا۔ اور بحر قلزم کے پاس ان کو آلیا۔ اب پیچھے فرعون تھا اور آگے سمندر جس سے ان کے حواس باختہ ہوگئے۔ ایسی مصیبت کے وقت میں تم پر رب نے فضل کیا اور تمہارے لئے سمندر خشک کر کے اس میں بارہ راستے بنا دیے۔ جب تم سوکھے پار اتر گئے اور تمہارے پیچھے لشکر فرعونی نکلنے لگا تو ان پر پانی ہموار ہوگیا۔ جس سے وہ سب ڈوب گئے تم یہ سارا تماشا پرلے کنارے پر کھڑے دیکھ رہے تھے خون خوار دشمن سے نجات پانا ایسی خوفناک حالت سے بچ جانا اپنے ایسے سخت دشمن کو مع ساز و سامان ڈوبتا ہوا دیکھنا۔ کیسی خوشی اور کیسا انعام ہے تم کو چاہئے کہ ان انعامات کو خیال میں رکھو اور اس نبی آخر الزمان ﷺ پر ایمان لے آؤ۔

غرق فرعون

جب موسیٰ علیہ السلام مدین سے مصر تشریف لائے اور راستے میں نبوت اور رسالت سے مشرف ہوئے۔ تو چالیس سال تک یہاں قیام فرما کر فرعون اور فرعونیوں سے مقابلہ کرتے رہے اور ان کو بڑے بڑے معجزے دکھاتے رہے تا کہ وہ ایمان لے آئیں مگر وہ نہ لائے۔ تب آپ نے مایوس ہو کر بارگاہ الٰہی میں عرض کی کہ خدایا کسی صورت سے بنی اسرائیل کو قبطیوں کے ہاتھ سے چھڑا تا کہ بے خوف و خطر یہ تیری عبادت کریں حکم الٰہی آیا کہ آپ بنی اسرائیل کو جمع کر کے راتوں رات یہاں سے کوچ کر جاؤ۔ اگر فرعون تمہارے پیچھے آئے گا تو ہلاک کر دیا جائے گا۔ تب آپ نے خفیۃً سب اسرائیلیوں کو خبر کر دی سارے اسرائیلیوں نے ایک جگہ جمع ہونے کا ارادہ کیا۔ فرعون کو کچھ وہم ہوا پوچھا کہ یہ مجمع کیوں ہو رہا ہے اسرائیلیوں نے کہا کہ ہمارے عاشورہ کا دن قریب ہے آدم علیہ السلام اسی دن پیدا ہوئے تھے۔ یہی ہماری عید کا دن ہے ہم چاہتے ہیں کہ سب شہر سے باہر جمع ہو کر رب کی عبادت کریں۔ اور وہاں عید منائیں۔ فرعون خاموش ہوگیا اور عام بنی اسرائیلیوں نے قبطیوں سے بیش قیمت زیور اور عمدہ پوشاکیں عاریۃً مانگ لیں اور عید کے بہانے سے خیمے اور ڈیرے شہر سے باہر لگا دیئے یہ واقعہ نویں محرم جمعرات کے دن ہوا اس وقت موسیٰ علیہ السلام کی عمر شریف اسی برس اور ان کے بھائی ہارون کی تراسی برس تھی پچھلی رات کو یعنی محرم کی دسویں شب جمعہ میں ان سب نے معہ ساز و سامان کوچ کر دیا۔ ہارون علیہ السلام ان کے آگے تھے موسیٰ علیہ السلام پیچھے بنی اسرائیل چھ لاکھ ستر ہزار تھے آگے چل کر راستہ بھول گئے۔

یوسف علیہ السلام کی لاش مبارک کا ساتھ میں لینا

موسیٰ علیہ السلام نے بڈھے لوگوں سے کہا کہ یہ راستہ تمہارا دیکھا ہوا ہے تم کو ملتا کیوں نہیں انہوں نے عرض کیا کہ یوسف علیہ السلام نے وصیت فرمائی تھی کہ جب میری قوم بنی اسرائیل مصر سے جائے تو میرا تابوت قبر سے نکال کر ساتھ لے جائے اور میرے بزرگوں کے ساتھ مجھے دفن کریں۔ ہم نے وہ وصیت پوری نہیں کی اس لئے راستہ بھول گئے۔ آپ نے پوچھا کہ ان کی قبر مبارک کہاں ہے سب نے کہا کہ ہمیں پتہ نہیں آپ نے سارے لشکر میں منادی کرائی کہ جس کو یوسف علیہ السلام کی قبر معلوم ہو وہ مجھے بتا دے۔ ایک بڑھیا عورت نے کہا کہ مجھے معلوم ہے لیکن اگر آپ مجھ سے عہد کرلیں کہ میں جو مانگوں سو پاؤں گی۔ تب میں پتہ دوں گی آپ نے کچھ تامل کیا وحی آئی کہ اے موسیٰ ان سے عہد کرلو اور جو چاہے سو اس کو دو۔ آپ نے عہد فرمالیا۔ بڑھیا بولی کہ میں چاہتی ہوں کہ بہشت میں میں آپ کے ساتھ رہوں۔ آپ نے قبول فرمالیا۔ تب اس بڑھیا نے کہا کہ ان کی قبر شریف دریائے نیل میں غرق ہو چکی ہے۔ اگر فلاں جگہ سے پانی ہٹا کر زمین کھودی جائے تو اس سے آپ کا صندوق نکل سکتا ہے آپ نے حکم دیا بنی اسرائیل نے فوراً اس جگہ سے ان کا تابوت نکالا یہ تابوت سنگ مرمر کا ایک صندوق تھا۔ جس میں یوسف علیہ السلام کی لاش مبارک تھی آپ نے یہ تابوت سب کے آگے رکھا اور اس تابوت کی برکت سے راستہ ظاہر ہوا رب کے فضل سے رات کے تھوڑے حصے میں بہت راستہ طے کرلیا۔ اگر آپ سیدھا فلسطین کا راستہ اختیار کرتے جو مصر سے شمال مشرق میں تھا۔ تو آپ کو یہ دشواریاں پیش نہ آتیں۔ لیکن مرضی الٰہی یہی تھی لہٰذا آپ مشرقی جانب قلزم کی طرف روانہ ہو گئے اور منزل سقاعط میں ہوتے ہوئے مقام ایسام میں پہنچے اور وہاں سے کوچ کر کے فی الحیرات میں جو کہ بعل سفون کے مقابل دریائے قلزم پر واقع تھا قیام کیا اور وہاں اپنے ڈیرے ڈال دیے صبح کے وقت فرعون کو جاسوسوں نے خبر دی کہ کل جہاں بنی اسرائیل جمع ہوئے تھے وہاں سے راتوں رات کوچ کر گئے ہیں فرعون کے دل میں غصے کی آگ بھڑک گئی اس نے فوراً حکم دیا کہ تیز گھوڑے اور عمدہ سوار جمع ہوں روایت میں ہے کہ ستر ہزار گھوڑ سوار فوج اس کے لشکر کے آگے آگے تھی اور باقی فوج کے متعلق کچھ صحیح پتہ نہیں لگتا۔ تفسیر روح البیان نے فرمایا کہ ستر لاکھ گھوڑ سوار فوج تھی تفسیر عزیزی میں فرمایا کہ ایک لاکھ تیر انداز ایک لاکھ نیزے باز اور ایک لاکھ گرز مارنے والے ان میں تھے فرعون نے مع اس لشکر کے یہ راستہ بہت جلد طے کر کے دو پہر کے قریب بنی اسرائیل کو جالیا۔ بنی اسرائیل فرعونی لشکر دیکھ کر گھبرا گئے اور موسیٰ علیہ السلام سے عرض کرنے لگے کہ بتاؤ ہم کہاں جائیں! اتنا واقعہ سننے سے مسلمانوں کو دو باتیں معلوم ہونی چاہئیں ایک یہ کہ انبیاء کرام کے بعض معجزات ان کی وفات کے بعد بھی دیکھے جاتے ہیں۔ دیکھو یوسف علیہ السلام کی نعش مبارک کے کتنے کرشمے بنی اسرائیل نے دیکھے دوسرے یہ کہ نبی سے عہد و پیمان رب تعالیٰ سے عہد ہے کہ بڑھیا نے موسیٰ علیہ السلام سے اپنے جنتی مقام کا عہد لے لیا۔ جو رب نے منظور فرمایا۔

فرعون کی غرقابی

آپ نے فرمایا مایوس نہ ہو میرے ساتھ میرا رب ہے جو مجھے ہدایت کرے گا۔ وحی آئی کہ اے موسیٰ دریا پر اپنا عصا مار کر کہو تو پھٹ جا اور ہم کو راستہ دے آپ نے ایسا ہی کیا۔ حکم الٰہی سے تیز ہوا چلی جس نے پانی کو پھاڑ کر اس میں راستہ بنا دیا۔ دریا میں بارہ راستے پیدا ہو گئے جن کے درمیان پانی دیواروں کی طرح کھڑا ہو گیا۔ آناً فاناً آفتاب نے زمین کو خشک کر دیا اور آپ نے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ ان راستوں میں داخل ہو جاؤ۔ یہ لوگ ہمت نہ کرتے تھے کہ کہیں ہم ڈوب نہ جائیں سب سے پہلے یوشع علیہ السلام نے اپنا گھوڑا ڈالا ان کے پیچھے حضرت ہارون نے جب اسرائیلیوں نے ان کو گزرتے دیکھا تو مجبوراً یہ بھی دریا میں چل دیے ان کے بارہ قبیلے تھے ہر قبیلہ ایک راستے میں داخل ہوا۔ ان سب کے پیچھے موسیٰ علیہ السلام داخل ہوئے ان کے گروہ نے کہا کہ اے موسیٰ ہمیں خبر نہیں کہ ہمارے دوسرے گروہ زندہ ہیں یا ڈوب گئے موسیٰ علیہ السلام نے ان پانی کی دیواروں پر لاٹھی ماری جس سے کہ ان میں جالے کی مثل روشندان بن گئے اور ہر جماعت ان راستوں میں ایک دوسرے کو دیکھتے اور باتیں کرتے گزر گئے اتنے میں فرعونی لشکر بھی دریا کے اس کنارے آپہنچا فرعون نے دیکھا کہ دریا میں راستے بنے ہوئے ہیں جن میں جا بجا آبی دیواریں کھڑی ہیں دل میں حیران ہوا مگر لشکر والوں سے کہا میرے اقبال سے دریا خشک ہو گیا تا کہ میں اپنے بھاگے ہوئے غلاموں کو زندہ پکڑ سکوں۔ اگر یہ اسرائیلی ڈوب جاتے تو مجھے غلام کہاں سے ملتے ہامان نے چپکے سے فرعون کو کہا کہ دریا میں قدم نہ رکھنا ورنہ تجھ کو اپنی خدائی کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔ بہت جلد کشتیاں جمع کرا اور ان کے ذریعہ دریا کو پار کر فرعون نے اپنے گھوڑے کو روک لیا۔ اسی حالت میں جبرئیل علیہ السلام شکل انسانی میں گھوڑی پر سوار فرعون کے گھوڑے کے آگے نمودار ہوئے اور اپنی گھوڑی دریا میں ڈال دی۔ فرعون کا گھوڑا گھوڑی کی بو پا کر اس کے پیچھے ہولیا۔ فرعون نے لاکھ روکا مگر نہ رکا اور اس خشک راستے میں داخل ہو گیا۔ جب لشکریوں نے فرعون کو دریا میں داخل ہوتے دیکھا وہ بھی ہر طرف سے داخل ہونے لگے۔ اس جگہ اتنی بات اور یاد رکھنی چاہئے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا سامری۔ اس نے دیکھا کہ جس جگہ حضرت جبرائیل کی گھوڑی کی ٹاپ پڑتی ہے وہاں سبزہ اگ آتا ہے وہ سمجھا کہ اس ٹاپ کے نیچے والی مٹی میں تاثیر زندگی ہے اس نے تھوڑی مٹی اپنے ہاتھ لے لی غرضیکہ سارا فرعونی لشکر بیچ دریا میں آگیا۔ ادھر بنی اسرائیل نکل کر یہ تماشہ دیکھنے لگے۔ خیال رہے کہ جہاں یہ واقعہ ہوا وہاں قلزم کا عرض بہت تھوڑی یعنی صرف چار فرسخ کوس تھا۔ اس لئے دوسرے کنارے سے یہاں کے حالات بخوبی نظر آتے تھے جب سارا لشکر دریا میں داخل ہو چکا تو اس کو حکم الٰہی پہنچا کہ تو آپس میں مل جا۔ دریا آپس میں مل گیا اور سب غرق ہو گئے یہ واقعہ دسویں محرم جمعہ کے دن بوقت دوپہر ہوا موسیٰ علیہ السلام نے اس خوشی میں روزہ رکھا حضور علیہ السلام کے زمانہ پاک تک یہودی عاشورے کے دن روزہ رکھتے تھے۔ حضور علیہ السلام جب مدینہ منورہ تشریف لائے اور بنی اسرائیل کو روزہ رکھتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ ہم اس خوشی منانے کے زیادہ حقدار ہیں۔ چنانچہ اسلام میں بھی عاشورے کا روزہ فرض ہو گیا۔ اب اگرچہ اس کی فرضیت منسوخ ہو چکی لیکن اب بھی مستحب ہے بنی

اسرائیلیوں کے دل میں فرعون کی ایسی ہیبت بیٹھی ہوئی تھی کہ انہیں اس کے ڈوبنے کا یقین نہ آتا تھا۔ تب دریا نے اس کی اور چند لوگوں کی لاشیں باہر پھینک دیں تب ان کو یقین ہوا۔ خیال رہے کہ فرعون تمام کفار سے بدتر ظالم تھا جس نے ہزاروں بے گناہ اسرائیلی بچوں کو ذبح کیا عذاب ہلکا آیا کہ مصر سے نکال کر دریا میں ڈبویا گیا۔ مکانات، باغات، عورتیں بچے سب محفوظ رہے عاد و ثمود کی طرح خود بستی میں رہ کر عذاب نہ آیا مصر اب تک آباد ہے، عاد و ثمود کی بستیاں اجاڑ دی گئیں۔ دو وجہ سے ایک یہ کہ مصر میں انبیاء اولیاء کی قبور ہیں کہ یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائی وہاں مدفون ہوئے ان قبروں کی برکت سے شہر برباد نہ کیا گیا دوسرے یہ کہ اکثر اللہ کا عذاب جرم کی طرح آتا ہے فرعونیوں نے اسرائیلیوں کے مردوں کا خاتمہ کرنا چاہا عورتوں کو باقی رکھا رب نے ان کے مردوں کو ہلاک کیا عورتوں کو باقی رکھا کہ ٹھوکریں کھاتی پھریں۔ امیہ ابن خلف کو رب نے وہ عذاب دیا جو وہ حضرت بلال کو ایذا دیتا تھا یعنی برچھوں سے جسم چھلنی کرتا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **ایک** یہ کہ رب تعالیٰ اپنے بندوں کو تکلیف و آرام سے آزماتا ہے ہر حال میں راضی رہنا ابرار کا کام ہے اور کسی وقت اس کو بھول جانا اغیار کا کام **دوسرے** یہ کہ رب کے یہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں ظالم کو ضرور سزا ملتی ہے مگر مظلوم کو چاہئے کہ جلدی نہ کرے۔ **تیسرے** یہ کہ عاشورے کا روزہ سنت ہے۔ مگر بہتر یہ ہے کہ دو روزے رکھے نویں اور دسویں۔ تفسیر روح البیان نے اس جگہ فرمایا کہ شیخ عبدالقادر قدس سرہ نے عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک روایت نقل فرمائی کہ جو شخص عاشورے کے دن چار رکعت نماز نفل پڑھے اور ہر رکعت میں ایک بار سورہ فاتحہ اور پچاس بار قل ہو اللہ پڑھے تو رب تعالیٰ اس کے پچاس سال کے گناہ معاف فرمادے گا۔ اور اس کو جنت میں نور کے ہزار منبر عطا فرمائے جائیں گے نیز عاشورے کی رات کو جاگنا بھی بہتر ہے۔ (تفسیر روح البیان) نے اس جگہ فرمایا کہ اس رات جاگنے والے کو ملائکہ مقربین کا ثواب ملتا ہے مشائخ عظام فرماتے ہیں کہ اس دن غسل کرنے سے سال بھر تک بیماری سے محفوظ رہتا ہے شامی نے کتاب صوم میں فرمایا جو شخص عاشورے کے دن اپنے گھر میں خوب عمدہ اور اچھے کھانے پکائے تو انشاء اللہ سال بھر تک اس گھر میں برکت رہے گی اور اس دن سرمہ لگانے سے سال بھر تک آنکھیں نہیں دکھتیں اس حدیث کی بنا پر ہمارے ملک میں عاشورے کے دن حلیم (کھچڑا) پکایا جاتا ہے کیونکہ اس میں ہر قسم کے غلے اور گوشت ہوتا ہے جس سے امید ہے کہ سال بھر تک ہر غلے میں برکت رہے۔ بعض روایت میں ہے نوح علیہ السلام کی کشتی عاشورے کے دن زمین پر لگی کشتی والوں نے نیچے اتر کر ہر قسم کے دانے ملا کر پکائے۔ جس سے حلیم بن گیا اس کا پورا واقعہ انشاء اللہ بارہویں پارہ میں بیان ہو گا۔ اس دن ماتم کرنا، یا بال نوچنا سخت حرام۔ **چوتھے** یہ کہ انبیاء کرام پر جو نعمت الٰہی ہو اس کی یادگار منانا اور شکر بجالانا سنت ہے کیونکہ حضور علیہ السلام نے اسی دن موسیٰ علیہ السلام کی نجات کی خوشی منائی لہٰذا ہم کو بھی عید میلاد اور عید معراج وغیرہ منانا بہت بہتر ہے۔ خیال رہے کہ خوشی کی یادگار منانا مسنون اور غم کی یادگار منانا منع۔ پانچویں یہ کہ یادگاروں کے لئے دن

مقرر کرنا سنت ہے کیونکہ حضور علیہ السلام نے روزے کے لئے عاشورے کا دن مقرر فرمایا۔ **چھٹے** یہ کہ اگر کفار بھی انبیاء علیہ السلام کی یادگاریں مناتے ہوں تو ان کی مشابہت کے خوف سے مسلمان نہ چھوڑیں ہاں کسی صورت سے کچھ فرق کر دیں۔ کیونکہ حضور علیہ السلام نے یہود کی وجہ سے عاشورے کا روزہ نہ چھوڑا بلکہ اس میں کچھ اضافہ فرما دیا کہ نویں محرم کا بھی روزہ ملا دیا۔ بلکہ اگر عوام نے یادگاروں میں ناجائز چیزیں شامل کر دی ہوں تو اصلی یادگار نہ مٹاؤ بلکہ وہ زیادتیاں مٹادو کفار عرب نے حج میں جو حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے خاندان شریف کی یادگاروں کا مجموعہ ہے بہت سی مشرکانہ رسوم شامل کر دی تھیں حضور علیہ السلام نے ان رسوم پر حج بند نہ کیا بلکہ قدرت پاتے ہی ان رسوم کو بند کر دیا۔ اس سے وہ لوگ عبرت پکڑیں جو آج بزرگوں کی یادگاروں عرس و میلاد وغیرہ کو اس بہانے سے بند کراتے ہیں کہ اس میں مشرکوں سے مشابہت ہے یا اس میں فلاں فلاں ناجائز رسوم شامل ہو گئی ہیں اللہ سمجھ دے کتا مسجد میں گھس جائے تو کتے کو نکالو۔ مسجد کو نہ گراؤ۔ **ساتویں** یہ کہ بزرگان دین سے بعد وفات بھی فیض لینا سنت انبیاء ہے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے تابوت یوسف علیہ السلام سے راستے کی ہدایت حاصل کی اس کی پوری بحث ہماری کتاب "جاء الحق" میں دیکھو اور کچھ دوسرے سیپارے کے اخیر میں آئے گی۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے ان کی پرورش پر اجرت کیوں لی! یہ اجرت ناجائز ہونی چاہئے۔

جواب: اس کا جواب تفسیر میں گزر چکا کہ ان کی مجبوری بھی تھی اور کافر حربی کا مال جب کسی صورت سے اپنے پاس آجائے جس میں غدر یا عہد شکنی نہ ہو جائز ہے۔ **دوسرا اعتراض:** بنی اسرائیل نے قبطیوں کے سونے اور پوشاک پر قبضہ کر لیا۔ **جواب:** ان کو خبر تھی کہ یہ مال آخرکار ہمارے پاس ہی آنے والا ہے اور یا ڈوب جائے گا۔ اس لئے ابھی آجائے تو بہتر ہے۔ نیز دشمن کے مال پر قبضہ کرنا جائز ہے۔ **تیسرا اعتراض:** بنی اسرائیل نے فرعون سے جھوٹ کیوں بولا؟ کہ ہمارے ہاں عید ہے۔ جھوٹ بولنا حرام ہے۔ **جواب:** یہ جھوٹ نہ تھا بلکہ توریہ تھا۔ ان کی مراد تھی کہ ہماری نجات کی اور تمہارے غرق ہونے کی عید ہے وہ سمجھا کہ دوسری قسم کی عید ہے اور مجبوری کے وقت توریہ جائز ہے۔

تفسیر صوفیانہ

دنیا گویا بحر قلزم ہے اور دنیوی لذتیں اس بحر کا پانی اور قلب مومن گویا موسیٰ ہے اور صفات قلبیہ بنی اسرائیل نفس امارہ فرعون اور اس کے عیوب قبطی قوم جو موسیٰ قلب اور اس کی صفات کے دشمن ہیں قلب ہر وقت رب کی طرف متوجہ ہے اور نفس امارہ اس کا جانی دشمن اس کے پیچھے ہے دنیا کی فانی لذتوں اور اس کی شہوتوں کا دریا سامنے جس کا عبور کرنا از بس ضروری ہے کہ موسیٰ قلب اس دریا میں لا الہ الا اللہ کا عصا مار کر اس کو ایسا خشک کرے کہ تمام عالم کی لذتیں ہر چہار طرف کھڑی رہیں اور یہ اسکے درمیان سے نکل جائے جب موسیٰ قلب الا اللہ کے عصا سے اس دریا کو خشک کرے گا۔ تو رب تعالیٰ کی اس پر عنایت کی ہوا اور ہدایت کا سورج بھیج کر اس راستے کو قابل عبور بنا دے گا۔ جس سے قلب اور اس کے صفات ساحل تک پہنچ جائیں گے اس کا حاصل کون ہے وَاَنَّ اِلٰی رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى (نجم:۴۲) فرعون نفس اور اس کی قوم کو اس میں غرق کیا جائے گا۔ مگر ثابت قدمی

ضرور ہے۔

وَ اِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤى اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ
اور جبکہ وعدہ فرمایا ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا پھر بنالیا تم نے بچھڑا بعد
اور جب ہم نے موسیٰ سے چالیس رات کا وعدہ فرمایا پھر اس کے پیچھے تم نے بچھڑے کی
مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۵۱﴾ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ
اس کے حالانکہ تم لوگ ظالم تھے پھر معاف فرمایا ہم نے تم سے بعد
پوجا شروع کردی اور تم ظالم تھے پھر اس کے بعد ہم نے تمہیں معافی دی
بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۲﴾ وَ اِذْ اٰتَیْنَا مُوْسَى
اس کے تاکہ تم شکر کرو اور جبکہ دے دی ہم نے موسیٰ کو
کہیں تم احسان مانو اور جب ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی
الْكِتٰبَ وَ الْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۵۳﴾
کتاب اور فرق کرنے والی چیز تا کہ تم لوگ ہدایت پا جاؤ
اور کتاب اور حق باطل میں تمیز کر دینا کہ کہیں تم راہ پر آ جاؤ

تعلق

ان آیتوں کا گزری ہوئی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **ایک** یہ کہ اس سے پہلے بنی اسرائیل کی چار نعمتوں کا ذکر ہو چکا اب پانچویں نعمت کا ذکر ہو رہا ہے **دوسرے** یہ کہ اس سے پہلے بنی اسرائیل کو جسمانی نجات دینے کا ذکر تھا۔ اب روحانی نجات کا ذکر ہو رہا ہے کہ ہم نے ان کو ایسی کتاب عطا فرمائی جس پر وہ عمل کر کے اخروی مصیبتوں سے بچ جائیں۔ **تیسرے** یہ کہ اس سے پہلے فرعون اور فرعونیوں کے شرک کا ذکر ہوا۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ اے اسرائیلیو تم نے ان سے بھی بڑھ کر جرم کیا کہ انہوں نے تو فرعون بادشاہ کو خدا مانا تھا اور تم نے بے عقل بچھڑے کو۔ انہوں نے پہلے ہی سے اور تم نے ایمان کے بعد۔ انہوں نے نادانی سے تم نے جان بوجھ کر انہوں نے بے نور ہونے کی وجہ سے تم نے نور نبوت پانے اور موسیٰ علیہ السلام کے صحبت حاصل کرنے کے بعد چاہئے تھا کہ تم بھی ان کی طرح ہلاک کر دیئے جاتے۔ لیکن ہمارا فضل ہوا کہ انہیں توبہ کی توفیق عطا فرمائی۔

تفسیر

وَ اِذْ یہاں یا تو اذکروا فعل پوشیدہ ہے یا اذکر یا تو بنی اسرائیل سے خطاب ہے یا نبی کریم علیہ السلام سے۔ یعنی اے

اسرائیلو اس قصے کو بھی یاد کرواے نبی ﷺ انہیں وہ قصہ بھی یاد دلادو وٰعَدْنَا اس کے معنی ہیں آپس میں ایک دوسرے سے وعدہ کیا معنی یہ کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے توریت دینے کا وعدہ فرمایا۔ اور انہوں نے طور سینا پر حاضر ہونے کا۔ یا یہ وٰعَدْنَا (ضرب) کے معنی میں ہے۔ موسیٰ۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کا ذاتی اسم شریف ہے بعض علماء نے کہا کہ یہ لفظ عربی ہے بروزن فعلی ہے اور مَاسَ یَمِیْسُ سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں اکڑ کر چلنا چونکہ آپ کی رفتار بہت قوت سے ہوتی تھی۔ اس لئے آپ کا نام موسیٰ رکھا گیا۔ اور بعض نے کہا کہ یہ بروزن مفعل ہے یعنی باب افعال کا اسم مفعول وسی سے بنا ہے جس کے معنی ہیں درخت سے پتے جھاڑ لینا۔ مگر صحیح یہ ہے کہ یہ لفظ عبرانی ہے اور موا و شیٰ سے بنا ہے عبرانی زبان میں مو پانی کو اور شیٰ درخت کو کہتے ہیں۔ چونکہ آپ کو فرعون کی بی بی آسیہ کی لونڈیوں نے اس نہر سے پایا تھا جو ان کے باغ میں بہتی تھی اور ایک صندوقچے میں پایا تھا اس لئے حضرت آسیہ نے آپ کا نام موشیٰ رکھا۔ یعنی درخت و پانی سے پایا ہوا فرزند پھر عربی میں آ کر شین سین بن گیا اور موسیٰ رہ گیا آپ کا نسب شریف یہ ہے موسیٰ ابن عمران ابن بصیر ابن ناہت ابن لاوی ابن یعقوب ابن اسحاق ابن ابراہیم علیہم السلام اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً یہاں پوری مدت بیان فرمائی گئی ہے اولاً تیس رات طور سینا میں قیام کرنے کا حکم تھا۔ لیکن جب آپ یہ میعاد پوری کر چکے اور تین دن روزے رکھ چکے بارگاہ الٰہی میں توریت لینے کے لئے حاضر ہونے لگے تو اس خیال سے کہ میں نے بہت روز سے مسواک نہیں کی ہے شاید منہ میں بو ہو مسواک کر لی حکم الٰہی آیا کہ اے موسیٰ تم نے وہ منہ سے خوشبو دور کر دی جو ہم کو مشک سے زیادہ پیاری تھی۔ لہٰذا دس دن روزے اور رکھو تا کہ تمہارے منہ میں پھر وہی خوشبو پیدا ہو یہ دونوں مدتیں مل کر چالیس بنی اسی لئے قرآن کریم نے یہاں چالیس فرمایا اور دوسری جگہ تیس راتیں اور اس کے بعد میں دس کا ذکر ہوا یعنی یہاں اجمال ہے وہاں تفصیل، لیلۃ یہاں چالیس دن نہ فرمایا بلکہ چالیس راتیں۔ کیونکہ عربی تاریخیں چاند سے ہیں جس میں رات پہلے ہوتی ہے اور دن بعد میں نیز اس لئے کہ رات میں تاریکی اور دن میں روشنی ہے تاریکی روشنی پر مقدم یا اس لئے کہ سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے اعتکاف کرانا اور اپنا وصال عطا فرمانا مقصود تھا۔ رات وصال کا وقت ہے اور دن فراق کا اسی لئے اہل اللہ رات کا آخری حصہ جاگ کر گزارتے ہیں۔ تہجد وغیرہ پڑھتے ہیں۔ اور روزانہ رات میں رحمت الٰہی خلق کی طرف متوجہ ہوتی ہے نہ کہ دن میں جیسا کہ حدیث شریف میں ہے یا اس لئے کہ چالیس راتیں مقرر ہوئی تھیں نہ کہ چالیس دن۔ کیونکہ پہلی ذی قعد سے موسیٰ علیہ السلام کا اعتکاف شروع ہوا اور دسویں ذوالحجہ دوپہر کے وقت انہیں توریت مل گئی لہٰذا راتیں چالیس اور دن ۳۹ کیونکہ دسویں ذوالحجہ کو اعتکاف نہ فرمایا۔ ثُمَّ اتَّخَذْتُمْ یہاں ثُمَّ مہلت کے لئے نہیں بلکہ اظہار تعجب کے لئے ہے کیونکہ بنی اسرائیل نے چالیس دن کے اندر ہی سونے کا بچھڑا بنالیا تھا نہ کہ اس مدت کے بعد یعنی ہم نے تم پر اپنی نعمتیں کیں مگر تعجب ہے کہ تم نے پھر بھی گائے کا بچہ بنالیا اتَّخَذْتُمْ سے یا تو مراد ہے گائے کو معبود ماننا اس صورت میں اس کا دوسرا مفعول پوشیدہ ہے۔ یعنی تم سب نے بچھڑے کو معبود بنالیا۔ یا مراد ہے ڈھالنا اور تیاری کرنا یعنی تم سب نے بچھڑا تیار کرلیا اگرچہ صرف سامری نے ہی بچھڑا بنایا تھا۔ لیکن چونکہ سب اسرائیلیوں نے اس کی مدد کی تھی کہ اس کو سونا اور جواہرات

دبے تھے۔ نیز آگ وغیرہ دھونک کر اس کا ہاتھ بٹایا تھا۔ اس لئے فرمایا گیا کہ تم سب نے بنایا۔ یہ پورا واقعہ انشاء اللہ خلاصہ تفسیر میں آئے گا۔ الْعِجْلَ عربی میں عجل گائے کے نر بچے کو کہتے ہیں۔ یعنی بچھڑا۔ اس میں بھی ان کی حماقت کا اظہار ہے کیونکہ بیل بے وقوفی میں مشہور ہے۔ بے وقوف کو کہتے ہیں تو نرا بیل ہے۔ تو فرمایا گیا کہ تم نے بیل جیسی بے وقوف چیز کو خدا مان لیا۔ تم تو فرعونیوں سے بدتر ہو گئے اور کب مانا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ موسیٰ علیہ السلام کے بعد یا اس وعدہ کے بعد یا ان کے کوہ طور جانے کے بعد وَ اَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ یعنی تم نے یہ کام بے خبری سے نہ کیا۔ بلکہ جان بوجھ کر اور موسیٰ علیہ السلام کی صحبت کا فیض پا کر۔ لہٰذا تم بڑے ظالم ہوئے خیال رہے کہ ظلم کے معنی ہیں کسی چیز کو بے موقع استعمال کرنا یا کسی کی چیز بغیر اس کی اجازت استعمال کر لینا بت پرست غیر خالق کے لئے اپنی عبادت استعمال کرتا ہے۔ نیز رب تعالیٰ کے دیئے ہوئے اعضاء کو اس کی اجازت کے بغیر دوسرے کی عبادت میں استعمال کرتا ہے۔ لہٰذا ظالم ہے۔ بلکہ کفر و شرک بہت بڑا ظلم ہے اسی لئے ارشاد ہوا اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ (لقمان: ۱۳) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مشرک شرک کر کے اپنی روح کو ستاتا ہے کہ اسے جہنم میں لے جاتا ہے۔ لہٰذا وہ اپنے اوپر ظالم ہے۔ ثم یا تاخیر زمانی کے لئے ہے یا اظہار تعجب کے لئے یعنی کچھ دنوں بعد ہم نے تمہارا گناہ معاف کر دیا۔ یا ہمارا کرم تو دیکھو کہ تمہاری اس قدر سرکشی کے بعد ہم نے معافی دے دی عَفَوۡنَا عَنۡكُمۡ عفو کے معنی ہیں مٹانا۔ چونکہ بخش دینے سے گناہ مٹ جاتا ہے اس لئے اسے عفو کہتے ہیں۔ گویا تمہارا دامن عفت اس گناہ کے داغ سے داغدار ہو گیا تھا۔ ہم نے رحمت کے پانی سے داغ دور کر دیا۔ خیال رہے کہ عفو سے یہ مراد ہے کہ تم کو فرعونیوں کی طرح بالکل ہلاک نہ کر دیا بلکہ تمہاری توبہ قبول کر کے آخرت کے عذاب سے بچا لیا۔ یہ مطلب نہیں کہ تمہاری پکڑ نہ کی کیونکہ ستر ہزار مجرموں کو قتل کرا کر توبہ قبول ہوئی تھی مِنۡۢ بَعۡدِ ذٰلِكَ یعنی بچھڑے بنانے اور اس کی پرستش کرنے وغیرہ کے بعد بھی تمہاری معافی ہو گئی۔ کیونکہ لَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ کہ تم اس واقعہ کو یاد رکھ کر آئندہ گناہ سے بچے رہو۔ اس احسان کا شکر کرو۔ اس میں ادھر بھی اشارہ ہے کہ تم میں اور فرعونیوں میں یہ فرق تھا۔ کہ ان سے شکر کی اہلیت جاتی رہی تھی ان کے ایمان کی امید نہ رہی تھی۔ لہٰذا وہ ہلاک کر دیئے گئے تم نے اگرچہ ان سے بڑھ کر جرم کیا لیکن تم میں اہلیت موجود تھی اگر اب تم بھی اپنی اہلیت فنا کر دو گے تم کو بھی عذاب دیا جائے گا۔ پھر یہی نہ کیا بلکہ یہ بھی یاد کر لو وَ اِذۡ اٰتَيۡنَا مُوۡسَى الۡكِتٰبَ جب کہ ہم نے تمہارے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام کو کتاب عطا فرمائی کتاب سے مراد توریت شریف ہے چونکہ یہ زبرجد کی تختیوں پر لکھی ہوئی ملی تھی۔ اس لئے اس کو کتاب فرمایا گیا۔ وَ الۡفُرۡقَانَ اس کے معنی ہیں فرق کرنے والی چیز یا تو اس سے توریت ہی مراد ہے اور یہ عطف تفسیری ہے یعنی وہ کتاب دی جو حق و باطل میں فرق کرنے والی ہے یا دین کے شعائر مراد ہیں جیسے کہ ان کے لئے شنبہ (سنیچر) کی تعظیم کرنا۔ اس دن کاروبار نہ کرنا۔ اور اونٹ کا دودھ اور گھی استعمال نہ کرنا اور ختنہ اور قربانی وغیرہ (تفسیر عزیزی) لَعَلَّكُمۡ تَهۡتَدُوۡنَ یہ توریت عطا فرمانے کی حکمت ہے نہ کہ علت کیونکہ رب کے کام علت سے پاک ہیں مطلب یہ ہے کہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کو اس کتاب کی چنداں ضرورت نہ تھی کہ وہ تو پہلے ہی سے ہدایت پر تھے نبی کفر و گمراہی سے محفوظ رہتے ہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ گمنا دانے

اخلاق سے بھی انہیں پاک و صاف رکھتا ہے بلکہ اصل ضرورت تم کو تھی تا کہ تم اس کے ذریعے ہدایت پا جاؤ یا ہدایت پر قائم رہو ایمان تو لا چکے تھے اب اس سے اعمال سیکھ لو لہٰذا اگر تم اس نبی آخر الزمان پر ایمان نہ لائے تو سمجھ لو کہ تم نے توریت کا مقصد پورا نہ کیا۔

خلاصہ تفسیر

پچھلی آیتوں کی تفسیر میں آپ معلوم کر چکے ہیں کہ بنی اسرائیل نے نذر مانی تھی کہ اگر ہم کو رب تعالیٰ فرعون سے نجات دے گا تو ہم اس کی اطاعت کریں گے جب انہیں نجات مل گئی اور بنی اسرائیل فرعونیوں کی ہلاکت کے بعد مصر کی طرف لوٹے (تفسیر خزائن العرفان) تب موسیٰ علیہ السلام نے ان کی وہ نذر یاد دلائی تب انہوں نے عرض کیا کہ ہم کو دل و جان سے یہ بات منظور ہے لیکن ہمیں رب کے احکام کی خبر نہیں ہم اطاعت کیسے کریں۔ موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں عرض کی تب ان سے فرمایا گیا کہ تم کوہ طور پر آنا اور وہاں چالیس دن اعتکاف اور عبادت کرنا تا کہ جسمانی تعلقات کم ہو کر ملکیت کا ظہور ہو تب تم سے بلا واسطہ کلام بھی کیا جائے گا اور تمہیں توریت بھی دی جائے گی موسیٰ علیہ السلام توریت لینے کوہ طور پر تشریف لے گئے اور اے اسرائیلیو! تم نے ان کے پیچھے یہ غضب ڈھایا کہ سونے کا بچھڑا بنا کر اس کی پرستش شروع کر دی ہم نے اس پر بھی درگزر کر کے تمہیں ایک دم ہلاک نہ کیا بلکہ موسیٰ علیہ السلام کی واپسی تک تم کو باقی رکھا اور ان کے تشریف لانے پر تمہیں توبہ کا طریقہ بتایا تم کو اس پر عمل کی توفیق دی پھر جب تم نے توبہ کر لی تو معاف بھی کر دیا تا کہ ٹھوکر کھا کر آئندہ کے لئے ہوشیار ہو جاؤ اور ہمیشہ اس کے شکر گزار رہو اور یہ بھی یاد رکھو کہ تمہاری نذر پوری کرنے کے لئے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب بھی عطا فرما دی اور قانون شریعت بھی دیا تا کہ تم ہدایت پر رہو۔ خیال رہے کہ موسیٰ علیہ السلام کتاب اللہ کے طالب تھے اور ہمارے حضور علیہ السلام کتاب کے مطلوب اس لئے آپ کتاب لینے طور پر گئے اور ہمارے حضور علیہ السلام کے پاس آیات قرآنیہ آئیں سفر و حضر دشت و جبل بلکہ کوچہ و گھر جہاں حضور ہوتے آیات آ جاتیں حتیٰ کہ جب حضور مکی تھے تو وہاں آنے والی آیات بھی مکیہ تھیں اور جب حضور مدنی ہوئے تو آیات مدنیہ۔

موسیٰ علیہ السلام کو توریت ملنا اور بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی

اس واقعہ کے معلوم کرنے سے پیشتر چند باتیں دھیان میں رکھنی چاہیں **ایک** یہ کہ بنی اسرائیل مصر سے چلتے وقت قبطیوں سے قیمتی اور جڑاؤ زیور مانگ لائے تھے اور ان کو اس کا استعمال جائز نہ تھا کیونکہ بنی اسرائیل کے ہاں غنیمت کا مال مسلمان استعمال نہ کر سکتے تھے بلکہ آگ اس کو جلا جاتی تھی۔ **دوسرے** یہ کہ بنی اسرائیل میں ایک سنار تھا جس کا نام یحییٰ یا موسیٰ ابن ظفر تھا۔ قبیلہ بنی سامرہ کا شخص تھا۔ اس لئے اس کو سامری کہتے تھے یہ فن زرگری میں بڑا ماہر تھا۔ اور منافقت سے ایمان لایا تھا۔ اس کے پاس حضرت جبرائیل علیہ السلام کی گھوڑی کے پاؤں کے نیچے کی مٹی موجود تھی جو کہ فرعونیوں کے غرق کے وقت بحر قلزم سے اٹھا لایا تھا۔ **تیسرے** یہ کہ جب بنی اسرائیل بحر قلزم سے نجات پا کر نکلے تھے تو راستے میں آتے ہوئے انہوں

نے ایک قوم کو گائے پوجتے دیکھا تھا اور موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا تھا کہ ہمارے لئے بھی پروردگار کی صورت بنادو تاکہ اس کو سامنے رکھ کر ہم عبادت کیا کریں جس سے ہمارا دھیان نہ بٹے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو ڈانٹ دیا تھا۔ مگر سامری نے پتہ لگالیا تھا کہ بنی اسرائیل میں فرعونیوں کی محبت سے مخلوق پرستی کا مادہ موجود ہے اگر ان کو بہکایا جائے تو آسانی سے گمراہ ہو جائیں گے اب اصل واقعہ سنو۔ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل سے تیس دن کا وعدہ فرما کر جانب کوہ طور روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر یکم ذیقعدہ سے روزا عتکاف عبادت شروع کردی۔ تیس ذیقعدہ کو مسواک کر کے توریت لینے کے لئے خاص پہاڑ پر حاضر ہوئے جس کی وجہ سے ان کو دس دن اور ٹھہرنا پڑ گیا۔ ادھر تیس دن گزرتے ہی اسرائیلیوں میں کھلبلی مچ گئی اولاً تو انہوں نے حضرت ہارون سے پوچھا کہ ہم اس زیور کو کیا کریں آپ نے فرمایا کہ اس کو ایک گڑھے میں ڈال کر جلا کر راکھ کردو اور اس کی راکھ زمین میں دفن کردو۔ خیال رہے کہ ہارون علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام کے نائب ہو کر یہاں ہی موجود تھے۔ ادھر سامری نے ان لوگوں سے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام تمہاری ہی طرح بشر ہیں صرف طلسماتی عصا کی وجہ سے یہ معجزے دکھاتے ہیں اور تم سے بڑھ گئے ہیں۔ تم وہ سارا سونا ہمارے حوالے کردو۔ میں تمہارے لئے اس سے بھی عجیب تر طلسم بنادوں جس سے تم کو موسیٰ علیہ السلام کی ضرورت باقی نہ رہے یہ بھی کہا کہ موسیٰ علیہ السلام وفات پاگئے ہیں کیونکہ ان کے آنے کی میعاد گزرگئی۔ ان لوگوں نے وہ سارا سونا اس کے حوالے کردیا سامری۔ نے اس سے جواہرات و یاقوت علیحدہ نکال لئے اور سونا گلا کر نہایت خوبصورت بچھڑا بنایا اور جواہرات و یاقوت کو اس لے کان آنکھ زانوں اور قدم پر نہایت قرینے سے جڑ دیا۔ جس سے وہ بہت خوبصورت معلوم ہونے لگا۔ اور جبرائیلی خاک اس کے منہ میں ڈالی جس سے اس میں آواز جنبش پیدا ہوگئی۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس کی ناک میں کچھ سوراخ رکھے تھے جس میں ہوا گزر کر آواز پیدا کرتی تھی جیسے آج کل بانسری اور سیٹی وغیرہ لیکن صحیح یہ ہے کہ یہ آواز خاک کی تاثیر سے پیدا ہوئی تھی کیونکہ روایت میں آتا ہے کہ وہ بچھڑا حرکت بھی کرتا تھا۔ نیز قرآن فرماتا ہے کہ خود سامری بولا فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا (طٰہٰ:۹۶) یعنی میں نے حضرت جبرئیل کے آثار سے مٹھی بھر کر خاک لے لی وہ بچھڑے میں ڈال دی نیز قرآن فرماتا ہے عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ (طٰہٰ:۸۸) عربی میں خوار بچھڑے کی آواز کو کہتے ہیں۔ نہ کہ بانسری کی آواز کو۔ اسرائیلیوں سے کہا کہ دیکھو کہ خدا نے اس میں حلول کیا ہے موسیٰ اس کو وہاں ڈھونڈ رہے ہیں اور یہ ہمارے پاس آگیا اسرائیلی اس کے بہکانے میں آگئے اس لئے ایک بڑے خیمے میں یہ بچھڑا کھڑا کیا اور اسکے آس پاس پر تکلف فرش بچھائے اور خیمے کے سامنے نوبت اور چنگ بجائی گیت گانے شروع کئے اسرائیلی مرد عورتیں وہاں جمع ہوگئے کوئی اس کی عبادت کرنے لگا۔ کوئی اس کے سامنے گوشہ نشین ہوگیا۔ سوائے ہارون علیہ السلام کے اور ان کے بارہ ہزار ساتھیوں کے باقی سارے اسرائیلی اس میں مبتلا ہوگئے بنی اسرائیل کے تین گروہ بن گئے ایک وہ جنہوں نے بچھڑے کی عبادت کی دوسرے وہ جو حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ تبلیغ دین مشغول ہوئے اور اس عبادت سے لوگوں کو روکتے رہے تیسرے وہ جو خاموش رہے۔ نہ عبادت کی نہ اس سے انکار کیا۔ پہلا اور تیسرا گروہ عتاب میں آگیا اور دوسرا

گروہ سلامت رہا۔ (تفسیر عزیزی) ادھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دسویں ذوالحجہ دوپہر کے وقت توریت شریف عطا ہوئی اور رب تعالیٰ نے ان کو خبر دی کہ تمہارے پیچھے تمہاری قوم غفلت میں مبتلا ہوگئی۔ موسیٰ علیہ السلام یہ سن کر سخت غمگین ہوئے اور وہاں سے بہت جلد واپس آئے اور اپنی قوم کا یہ حال دیکھ کر بہت پریشان ہوئے اور غصے سے توریت شریف کی تختیاں آپ کے ہاتھ سے گر گئیں یا گرا دیں۔ اور اپنے بڑے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو مارنے لگے کہ تم نے بنی اسرائیل میں شرک کیوں ہونے دیا۔ حضرت ہارون نے بنی اسرائیل کی سرکشی اور اپنی معذوری و مجبوری بیان فرمائی کہ میں نے ان کو بہت کچھ روکا لیکن یہ نہ مانے۔ تب آپ سے توریت شریف کے کل سات حصے تھے اس گر جانے سے چھ حصے غائب کر دیئے گئے اور ایک حصہ جس میں صرف ضروری مسائل تھے باقی رہ گیا۔ وہی بنی اسرائیل کو ملا۔ پھر آپ نے بنی اسرائیل سے باز پرس کی کہ تم نے یہ کیا کیا۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں سامری نے بہکا دیا۔ سامری سے پوچھا اس نے کہا کہ میرے دل میں کچھ ایسا ہی آ گیا۔ لہٰذا آپ نے بنی اسرائیل کو توبہ کا حکم دیا۔ سامری کے حق میں بددعا فرمائی اور بچھڑے کو جلا کر اس کی راکھ دریا میں پھینک دی۔ بعض پجاری بنی اسرائیلیوں کو بچھڑے سے ایسی محبت ہوگئی تھی کہ انہوں نے تبرک کیلئے دریا کا پانی چھپ کر پیا۔ جس میں یہ راکھ پھینکی ہوئی تھی۔ جس سے کہ ان کے ہونٹ کالے پڑ گئے اور پیٹ پھول گئے ان کی توبہ قبول نہ ہوئی (تفسیر روح البیان)

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **ایک** یہ کہ بمقابلے ہدایت گمراہی جلد پھیلتی ہے۔ گمراہی بیماری ہے اور ہدایت تندرستی۔ بیماری خود بخود اور جلد پھیلتی ہے۔ صحت بمشکل حاصل ہوتی ہے **دوسرے** یہ کہ کسی شخص کو اپنے نفس پر اعتماد نہ چاہئے بڑے سے بڑے عابد کو یہ ایک دم بہکا دیتا ہے۔ دیکھو بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کی صحبت میں رہ کر بھی ایک ذرا سی بات میں پھسل گئے۔ **تیسرے** یہ کہ بری صحبت سے ہر شخص کو دور رہنا چاہئے بنی اسرائیل سامری کی صحبت سے بگڑ گئے۔ **چوتھے** یہ کہ شرک سے مسلمان مرتد ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ بنی اسرائیل پر گزرا۔ **پانچویں** یہ کہ الحمد للہ امت مصطفیٰ ﷺ بنی اسرائیلیوں سے کہیں افضل ہے۔ کیونکہ اسرائیلی اس قدر معجزات دیکھ کر بھی معمولی شبہ سے دھوکہ کھا گئے۔ لیکن عام مسلمان بحمدہ تعالیٰ بڑے بڑے شبہات سے بھی دھوکہ نہیں کھاتے۔ **چھٹے** یہ کہ عقائد میں تقلید حرام ہے۔ عقائد دلائل سے معلوم ہونے چاہئیں اس لئے کہ بنی اسرائیل نے فقط سامری کے کہنے پر بچھڑا پوجا۔ اگر دلیل پر غور کرتے تو ایسا کبھی نہ کرتے۔ خیال رہے کہ اماموں کی تقلید اعمال میں ہے نہ کہ عقائد میں۔ **ساتویں** یہ کہ اس میں حضور ﷺ کو تسلی دی گئی کہ آپ مشرکین عرب اور یہودیوں اور عیسائیوں کی مخالفت سے غم نہ کریں انہوں نے تو معجزات دیکھ کر اور رب کی نعمتیں پا کر بھی کفر کیا پھر جیسے موسیٰ علیہ السلام نے صبر فرمایا آپ بھی صبر فرمائیں۔ **آٹھویں** یہ کہ اس سے حضور ﷺ کا نبی ہونا ثابت ہوا کہ آپ نے کتب سیر و تواریخ نہ پڑھیں اور بغیر تاریخ جاننے والوں کی صحبت حاصل کئے ہوئے نہایت صحیح قصہ بیان فرما دیا معلوم ہوا کہ آپ صاحب وحی ہیں تو ان کو معلوم ہوا کہ نبی کی ہیبت سے امت کو توبہ و تقویٰ بلکہ کافر کو ایمان نصیب ہوتا ہے۔ دیکھو حضرت ہارون کی موجودگی میں بنی اسرائیل بچھڑا پوجتے رہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے تشریف لاتے ہی ڈر کے

مارے سب تائب ہو گئے۔ اب بھی جس کے دل میں حضور کی ہیبت ہے مومن ہے جو انہیں اپنے جیسا مان کر ان سے بے خوف ہے، کفر طغیان پر دلیر ہے۔ لوگوں کے دلوں میں حضور کی ہیبت بٹھاؤ تا کہ انہیں تقویٰ نصیب ہو۔ **نواں فائدہ:** نبی کے ادب سے ایمان مل جاتا ہے اور بے ادب مارا جاتا ہے۔ بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کی خدمت میں معذرت پیش کی انہیں توبہ نصیب ہوگئی۔ سامری اکڑا مارا گیا۔ موسیٰ علیہ السلام کے جادوگروں نے بوقت مقابلہ موسیٰ علیہ السلام کا ادب کیا کہ ان سے اجازت مانگ کر کرتب دکھائے۔ مومن، صابر، شہید سب کچھ ہو گئے۔ **دسواں فائدہ:** یہ کہ چالیس کا عدد رب کو بہت پیارا ہے، چالیس دن میں آدم کا خمیر ہوا اور چالیس دن میں موسیٰ علیہ السلام کو توریت ملی، چالیس سال کی عمر میں اکثر پیغمبروں کو نبوت عطا ہوئی، چالیس دن ماں کے پیٹ میں نطفہ اپنی شکل پر رہتا ہے پھر چالیس دن تک خون پھر چالیس دن پارۂ گوشت، بچے کی پیدائش کے بعد چالیس دن تک عورت کو نفاس آ سکتا ہے۔ چالیس سال کی عمر میں انسان کی عقل پختہ ہوتی ہے۔ تفسیر عزیزی نے اس جگہ ایک حدیث نقل فرمائی کہ جو شخص چالیس دن خلوص دل سے عبادت کرے خدا تعالیٰ اس کے دل اور زبان پر حکمت کے چشمے ظاہر فرماتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ چالیس میں حالات کا انقلاب ہوتا ہے۔ اسی لئے صوفیاء کرام چالیس دن کے چلے کرتے ہیں اور یہ بھی مشہور ہے کہ جو شخص چالیس دن نماز پڑھ لے انشاء اللہ وہ نمازی ہو جاتا ہے۔ **گیارھویں** یہ کہ اس سے معلوم ہوا کہ میت کا چالیسواں کرنا نہایت بہتر چیز ہے۔ انوار ساطعہ نے بحوالہ بیہقی سیدنا انس سے روایت کی کہ انبیاء کرام اپنی قبور میں چالیس دن سے زیادہ نہیں چھوڑے جاتے ان کو بارگاہ الٰہی میں خاص قرب عطا فرمایا جاتا ہے زرقانی شرح مواہب نے اس حدیث کے معنے یوں بیان فرمائے کہ انبیاء کرام کی ارواح کا تعلق اپنے اس جسم مدفون سے چالیس روز تک بہت زیادہ رہتا ہے اور پھر قرب الٰہی میں عبادت کرتی ہیں۔ **بارھویں** یہ کہ کچھ دن کے لئے تارک الدنیا ہو کر عبادات و مجاہدہ کرنا ایمانی ترقی کا باعث ہے جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام کے اس قصہ سے ثابت ہوا۔ صوفیائے کرام کا اسی پر عمل ہے **تیرھویں** یہ کہ گناہ سے رحمت الٰہی جاتی رہتی ہے بنی اسرائیل کی خطا سے توریت کا اکثر حصہ غائب ہو گیا۔ حضور علیہ السلام شب قدر کی خبر دینے تشریف لائے دو شخص آپس میں لڑ رہے تھے فرمایا کہ ان کی لڑائی کی خطا سے شب قدر اٹھا لی گئی اب سال بھر تلاش کرنی پڑتی ہے۔ یہ گناہ کا وبال ہے۔ **چودھویں** یہ کہ تبرکات میں تاثیر ہوتی ہے دیکھو جسم جبریل کاٹھی سے مس ہوا اور کاٹھی گھوڑے سے اور گھوڑے کے سم مٹی سے پھر مٹی بچھڑے سے اتنے دور کی نسبت کے باوجود مٹی نے بچھڑے میں زندگی پیدا کر دی۔ اگر خاک مدینہ ایمانی زندگی بخشے تو کیا بعید ہے۔ **پندرھویں** یہ کہ خبیث کو تبرکات سے الٹا فائدہ ہوتا ہے۔ اگر یہ مٹی کسی مومن کے پیٹ میں جاتی تو اس کے ذریعے ہزاروں کو ایمان مل جاتا چوں کہ مٹی فرعونی خبیث سونے میں لگ گئی تو اگرچہ زندگی پیدا کر دی مگر اس کی آواز سے لوگوں کو گمراہی ملی حدیث و قرآن اگر خبیث کے سینے میں جائے تو اس سے لوگ گمراہ ہوں گے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: موسیٰ علیہ السلام نے غصے میں توریت شریف کی تختیاں کیوں پھینکیں؟ اگر آج کوئی قرآن پاک پھینک

دے تو کافر ہو جائے۔ حالانکہ اس کا کاغذ، لکھائی چھپائی سب انسانی صنعت ہے صرف کلام رب کا ہے۔ توریت شریف کی وہ تختیاں ان کی روشنائی اور تحریری سب ربانی تھیں اس کو پھینکنا کفر کیوں نہ ہوا۔ **جواب:** قرآن پاک کے گرنے میں تین صورتیں ہیں۔ (۱) غلطی سے گر جائے۔ (۲) کسی پر غصہ آ جائے اور اتفاقاً اس وقت ہاتھ میں قرآن شریف ہو اور جھنجھلا کر بے خودی میں گرا دیا جائے (۳) خود قرآن کریم کی اہانت کے لئے پھینکا جائے۔ پہلی صورت میں گناہ بھی نہیں دوسری صورت حرام ہے مگر کفر نہیں تیسری صورت کفر ہے۔ موسیٰ سے یا تو وہ تختیاں غصے میں بلا قصد گریں یہ کوئی جرم نہیں یا قوم پر دین کی خاطر غصہ آیا اور جھنجھلاہٹ میں گرا دیں یہ خطا ہوئی جس کی انہوں نے رب سے معافی چاہ لی کہ عرض کیا رَبِّ اغْفِرْ لِيْ وَ لِاَخِيْ (اعراف: ۱۵۱) توریت شریف کی توہین مقصود نہ تھی نیز توریت کی تختیوں پر کلام اللہ تھا اور موسیٰ کلیم اللہ ہیں۔ کلیم اللہ ان تختیوں سے یقیناً افضل ہیں۔ ہمارے اور احکام ہیں ان کے دوسرے دیکھو عام مسلمان مسجد میں بحالت جنابت نہیں آ سکتے مگر حضرت صدیق کو اس کی اجازت تھی۔ **دوسرا اعتراض:** ہارون پیغمبر ہیں اور موسیٰ سے عمر میں بڑے موسیٰ نے ان کو بلا قصور مارا اس میں ان پر ظلم بھی ہوا اور نبی کی توہین بھی ظلم کرنا گناہ کبیرہ ہے اور نبی کی توہین کفر۔ **جواب:** موسیٰ کے اگر یہ افعال ناجائز ہوتے تو ان پر ضرور عتاب الٰہی آ جاتا جیسے آدم پر گندم کھانے سے آ گیا۔ موسیٰ، ہارون سے درجے میں افضل تھے ان سے خطا اجتہادی ہوئی وہ سمجھے کہ حضرت ہارون نے تبلیغ میں کوشش نہ کی اس لئے ان پر عتاب کر دیا خطا اجتہادی معاف ہے، اگر حاکم غلطی سے کسی کو سزا دے دے تو اس کے بدلے حاکم کو سزا نہیں دی جا سکتی۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ
اور جبکہ فرمایا موسیٰ نے واسطے قوم اپنی کے اے میری قوم تحقیق تم نے ظلم کیا جانوں
اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اے قوم میری تم نے بچھڑا بنا کر اپنی جانوں پر ظلم
بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ فَتُوْبُوْٓا اِلٰى بَارِئِكُمْ فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ؕ
اپنی پر بوجہ بنانے تمہارے بچھڑا پس توبہ کرو طرف پیدا کرنے والے اپنے کے پس قتل کرو جانوں
کیا تو اپنے پیدا کرنے والے کی طرف رجوع لاؤ تو آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرو
ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِنْدَ بَارِئِكُمْ ؕ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ؕ اِنَّهٗ
اپنی کو واسطے تمہارے نزدیک خالق تمہارے کے پس توبہ قبول کی اس نے اوپر تمہارے
یہ تمہارے پیدا کرنے والے کے نزدیک تمہارے لئے بہتر ہے تو اس نے تمہاری توبہ
هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۴﴾
تحقیق وہ ہے بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان

توبہ قبول کی بیشک وہ ہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان

تعلق

اس آیت کا پہلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **ایک** یہ کہ یہ آیت پچھلی آیت کی تفسیر ہے کیونکہ پہلے فرمایا گیا تھا کہ ہم نے تمہارا گناہ معاف کر دیا، اب اس معافی کی کیفیت کا ذکر فرمایا۔ **دوسرے** یہ کہ پہلے فرمایا گیا تھا کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو ''فرقان'' یعنی فرق کرنے والی چیز عطا فرمائی، اب اسرائیلیوں کی توبہ کا ذکر ہوا کیونکہ توبہ بھی باغی اور خطاکار میں فرق کر دیتی ہے، یا توبہ کی برکت سے مجرم کے حال میں فرق آ جاتا ہے کہ وہ فاسق سے صالح بن جاتا ہے۔ **تیسرے** یہ کہ اس سے پہلے اسرائیلیوں پر نعمتوں کا ذکر ہوا، اب پانچویں نعمت کا ذکر ہو رہا ہے یعنی ان کی توبہ قبول ہونا، البتہ فرق اتنا ہے کہ پہلے وہ نعمتیں ذکر کی گئیں جو ظاہر و باطن ہر طرح نعمتیں تھیں، یہاں اس نعمت کا ذکر ہے جو بظاہر زحمت اور حقیقتاً نعمت ہے۔ خیال رہے کہ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس آیت کا پہلے سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ پہلے نعمتوں کا ذکر تھا اور یہاں ان کے قتل کا، اور قتل عذاب ہے نہ کہ رحمت، مگر یہ غلط ہے کیونکہ اس قتل سے بنی اسرائیل آخرت کے وبال سے بچ گئے اور دنیا سے شہید ہو کر گئے، گناہ سے معاف ہو گئے اور جس کے یہ فائدے ہوں وہ یقیناً رحمت ہے، نہ کہ عذاب، شہادت بھی قتل سے حاصل ہوتی ہے اسے عذاب نہیں سمجھا جاتا، لہٰذا اس قتل کو نعمتوں میں شمار کرنا بالکل صحیح ہے، ڈاکٹر کا بیماری معلوم کر کے مریض کا آپریشن کرنا نعمت ہے، عذاب نہیں اگر حاکم پھانسی کے ملزم کو جرمانہ لے کر چھوڑ دے تو یہ جرمانہ اس کے حق میں ہے عذاب نہیں، قتل سے آخرت میں معافی ہو جانا گویا جرمانے کے ذریعہ پھانسی سے بچ جانا ہے۔ نیز حق تعالیٰ نے ان کو قتل کا حکم دے کر سب مجرموں کو فنا نہ کر دیا بلکہ بعض کو باقی رکھا، جو مر گئے وہ شہید ہوئے جو بچے وہ مغفور۔ لہٰذا یہ نعمت ہوئی۔

تفسیر

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی یہاں بھی ایک فعل پوشیدہ ہے یعنی اے بنی اسرائیلو یاد کرو اے محبوب ﷺ انہیں یاد دلاؤ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنے برادر معظم حضرت ہارون علیہ السلام سے واقعہ کی تحقیق فرمالی اور سامری کے حق میں بددعا کر چکے اور بچھڑے کو جلا کر اس کی راکھ دریا میں بہا چکے تب پوجنے والے اسرائیلیوں کی طرف متوجہ ہوئے اور ان سے فرمایا یٰقَوْمِ اس جگہ قوم سے مراد ساری قوم نہیں ہے، بلکہ صرف بچھڑے کے پجاری، کیونکہ ظالم صرف وہی تھے، چونکہ ساری قوم کو بھی قوم کہہ دیتے ہیں اور قوم کے بعض لوگوں کو بھی اس لئے یہاں قوم فرمایا گیا۔ یٰقَوْمِ اصل میں یا قومی تھا جس کے معنی ہوئے اے میری قوم ی گرا دی گئی، یہ اضافت شفقت و مہربانی کے اظہار کے لئے ہے تاکہ قوم آپ کی اطاعت کرے، خیال رہے کہ لفظ قوم کے معنی ہیں۔ درست ہونا اور سیدھا ہونا۔ کہا جاتا ہے اِقَامَ الصَّلٰوۃَ نماز کا درست یا سیدھا کرنا۔ قِیَامُ النَّاسِ لوگوں کا سیدھا کھڑا ہونا۔ قَوَامَ الشَّیْءِ چیز کی درستی، اب اصطلاح میں مشترک جماعت کو قوم کہا جاتا ہے، ہم پیشہ، ہم وطن، ہم مذہب اور ہم قبیلہ لوگوں کو قوم کہتے ہیں کیونکہ اس جماعت سے کسی چیز کا انتظام درست اور قائم رہتا ہے، کہتے ہیں تاجر، ہندوستانی قوم، مسلم قوم اور سید قوم وغیرہ۔ یہاں موسیٰ علیہ السلام کا ان پجاریوں کو اپنی قوم فرمانا ہم وطن یا ہم قبیلہ ہونے کی وجہ سے ہے،

یعنی اے میرے قبیلے یا وطن والو، ہم مذہب ہونے کے لحاظ سے نہیں کیونکہ یہ لوگ مرتد ہو کر دین سے نکل چکے تھے اور ابھی توبہ نہ کی تھی، اسی طرح جس پیغمبر نے بھی کفار کو اپنی قوم فرمایا وہ اسی معنی میں ہے۔ اِنَّکُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَکُمْ یعنی اے پجاری اسرائیلیو تم نے نہ تو میرا کچھ بگاڑا اور نہ میرے بھائی حضرت ہارون کا اور نہ رب تعالیٰ کو کوئی نقصان پہنچایا ہم بیان کر چکے ہیں یہاں ظَلَمْتُمْ ستانے اور نقصان پہنچانے کے معنی میں ہے اَنْفُسَ یہ جمع نفس کی ہے نفس کے بہت سے معنی ہیں نفس امارہ نفس مطمئنہ وغیرہ کو بھی نفس کہتے ہیں اور ذات، جان اور عین کو بھی نفس بولتے ہیں، یہاں آخری تین معنی مراد ہیں تم نے اپنی جانوں کو یا اپنی ذاتوں کو یا اپنے آپ کو نقصان پہنچایا۔ بِاتِّخَاذِکُمُ الْعِجْلَ اگر یہاں معبود پوشیدہ ہو تو اس کے معنی بالکل ظاہر ہیں کہ تم سب نے بچھڑے کو معبود مان کر اپنے پر ظلم کیا اور اگر اتخاذ کے معنی بنانے کے لئے کئے جائیں اور معبود پوشیدہ نہ ہو تو چونکہ یہ سارے پجاری بچھڑا بنانے میں سامری کے مددگار تھے، اس لئے یہ کام سب پجاریوں کا مانا گیا، یعنی تم سب بچھڑا بنا کر ظالم ہو چکے، تب بنی اسرائیل نے عرض کیا کہ یہ قصور تو ہم سے ہو چکا فرمایئے اس کا کفارہ کیا ہے تب آپ نے فرمایا فَتُوْبُوْا۔ ف سببیہ ہے، یعنی تم چونکہ ظالم ہو چکے، لہٰذا توبہ کرو، توبہ کے معنی اور اس کی ساری قسمیں ہم آدم علیہ السلام کے قصے میں بیان کر چکے ہیں یہاں اتنا سمجھ لو کہ توبہ دلی، زبانی، عملی ہر طرح کی ہوتی ہے وہ حضرات دلی توبہ یعنی ندامت اور زبانی توبہ یعنی اقرار جرم اور معذرت تو موسیٰ علیہ السلام کے تشریف لاتے ہی کر چکے تھے مگر آپ نے عملی توبہ یعنی جرم کی سزا کا حکم دیا، اسلام میں بھی کبھی مجرم کو کفارہ، تعزیر حدود وغیرہ کا حکم دیا جاتا ہے، مگر کفر و شرک وارتداد میں خیالی اور زبانی توبہ کافی ہوتی ہے، یہ حضور کی رحمت ہے۔ اِلٰی بَارِئِکُمْ یعنی تمہاری یہ توبہ محض مجھ کو راضی کرنے یا قوم کے دکھلاوے کے لئے نہ ہونی چاہئے بلکہ رضائے الٰہی کے لئے۔ خیال رہے کہ بَارِءٌ بوء سے بنا ہے جس کے معنی ہیں دور ہونا یا کسی سے علیحدہ ہونا، جیسے کہتے ہیں کہ بری المریض بیمار اچھا ہو گیا، یعنی بیماری سے علیحدہ ہو گیا بری المدیون یا بری الحالف یعنی مقروض اور قسم والے نے قرض اور مرض سے خلاصی پائی اب ایجاد کرنے اور پیدا کرنے کو بھی بری ء کہنے لگے، کیونکہ اس میں بھی نیستی سے علیحدہ ہو کر ہستی میں آنا ہوتا ہے، یہاں باری کے معنی خالق ہے یعنی اپنے پیدا کرنے والے کی طرف توبہ کرو، اس مقام میں ایک نہایت باریک نکتہ ہے کہ اس کی عبادت کرنا چاہئے جس نے ہم کو بنایا اور اے اسرائیلیو تم نے اس کو بچھڑے کو پوجا جس کو خود تم نے بنایا بیوقوفی کی انتہا کر دی، خیال رہے کہ خالق اور باری اگرچہ قریباً ہم معنی ہیں مگر ان میں اکثر فرق یہ کیا جاتا ہے کہ اجسام کا پیدا کرنا خلق اور روح کا پیدا فرمانا برء کسی چیز سے بنانا خلق اور بلا واسطہ صرف کن سے پیدا فرمانا۔ برء یا ظاہر کی پیدائش خلق باطنی کی برء اس لئے خلق کبھی بندے کی طرف منسوب نہیں ہوتی ہے، ہمارے اجسام مٹی، غذا نطفہ سے بنائے گئے یہ ہوا خلق اور ارواح صرف امر کن ہے، یہ ہے برء اس لئے رب کو باری النسمۃ کہا جاتا ہے، ارواح کا پیدا فرمانے والا فَاقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ یہ جملہ توبہ کی تفسیر نہیں ہے کیونکہ توبہ کی حیثیت گذشتہ جرم پر نادم ہونا اور آئندہ عہد کرنا ہے، نہ کہ اپنے کو قتل کرنا بلکہ یہ توبہ کی شرط ہے یعنی تم اپنے کو قتل کراؤ جس سے تمہاری توبہ قبول ہو جائے جیسے آج بھی قاتل کی توبہ کی شرط یہ ہے کہ وہ اپنے کو قصاص کے لئے پیش کر دے یا غاصب کی توبہ کی شرط یہ ہے کہ مغصوب چیز مالک کو دے دے، اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کے

دین میں مرتد کی توبہ بغیر قتل کی تیاری کے قبول نہ ہوتی تھی۔ قتل کے لغوی معنی ہیں کسی ہتھیار کے ذریعہ سے کسی کی جان نکالنا خواہ فوراً یا مہلت سے، چاقو، لاٹھی، تلوار پتھر وغیرہ سے سر پھاڑ کر مار ڈالنا بھی قتل ہے اور ان چیزوں سے زخمی کر دینا جس کے کچھ عرصہ بعد زخمی مر جائے یہ بھی قتل ہے موت کا سبب قائم کرنا قتل نہیں راستے میں کنواں کھود دیا جس سے کوئی گر کر مر گیا یہ قتل نہیں اور ذبح یہ ہے کہ دھار والی چیز سے گردن کاٹ دی جائے، یہاں دوسرے ہی معنی مراد ہیں، ظاہری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو خودکشی کرنے کا حکم دیا گیا، یعنی ہر مجرم خود اپنے کو ہلاک کرے لیکن یہ معنی روایت کے خلاف ہیں اس لئے مفسرین فرماتے ہیں کہ یا تو اس کا مقصود یہ ہے کہ اپنے آپ کو قتل کے لئے پیش کر دو اور یا یہ خطاب ان اسرائیلیوں سے ہے جو بچھڑے کی پوجا سے محفوظ رہے یعنی اے بے گناہ اسرائیلیو تم اپنے نفسوں یعنی اپنے اہل قرابت مجرموں کو قتل کر ڈالو چونکہ قبیلے کو قتل کرنا گویا اپنے کو قتل کرنا ہے جیسے قرآن کریم فرماتا ہے وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ (الحجرات:۱۱) یہاں بھی انفس سے مراد مسلمان بھائی ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ خطاب بھی مجرموں سے ہی ہے، یعنی اے مجرمو تم ایک دوسرے کو قتل کرو ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ یہ کلام بھی موسیٰ علیہ السلام کا ہے یعنی اے اسرائیلیو! یہ قتل ہو جانا اور توبہ کر لینا زندہ رہنے سے بہتر ہے، کیونکہ توبہ کی موت جرم کی زندگی سے اچھی ہے کیونکہ وہ موت حیات ابدی اور فرحت سرمدی کا ذریعہ ہے اور شرک کی نجاست سے طہارت، عِنْدَ بَارِئِكُمْ یعنی ظاہراً یہ بہت سخت ہے نفس پر بڑا بھاری ہے بیوقوفوں کے نزدیک بڑا برا ہے مگر رب کے نزدیک بہت بہتر۔ فَتَابَ عَلَيْكُمْ یہ رب کا کلام ہے اور اس میں مدینہ پاک کے اسرائیلیوں سے خطاب ہے۔ یعنی تمہارے باپ دادوں نے بخوشی جان دینا منظور کی اور کئی ہزار آدمی ذبح ہو گئے، لہٰذا ہم نے ان پر کرم فرمایا اور ان کی توبہ قبول کر لی، محبوب کا جان لے کر بھی راضی ہو جانا عین کرم ہے اور فانی چیز فنا کر کے نعمت باقیہ عطا فرما دینا عین اس کی مہربانی ہے۔ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ۔ تواب کے معنی ہیں، بہت توبہ قبول کرنے والا اور یا توبہ کی توفیق دینے والا، یعنی اس کے فضل سے بندہ توبہ کرنے کی ہمت کر لیتا ہے اور پھر وہی اپنے فضل سے قبول فرما لیتا ہے۔ الرَّحِيْمُ۔ بڑی رحمت والا ہے کہ اس نے قتل کو کفارہ گناہ بنا دیا اور بعضوں کو قتل کرا کر سب کے گناہ معاف کر دیئے اور مقتولین کو شہداء اور محفوظین کو مغفور اور قاتلین کو غازی بنا دیا۔ خیال رہے کہ تَوَّاب کے معنی ہیں، بہت ہی توبہ قبول فرمانے والا۔ اس طرح کہ بندہ بارہا گناہ کرتا ہے وہ بارہا بخشتا ہے بلکہ ہماری خطائیں محدود ہیں اس کی عطائیں غیر محدود، یا بڑے سے بڑا گناہ بخش دینے والا ہے وہ یہ نہیں دیکھتا کہ بندے کا گناہ کیسا ہے بلکہ یہ دیکھتا ہے کہ میری مغفرت کیسی ہے رحیم کے فرمانے کا منشا یہ ہے کہ اپنی رحمت و کرم سے گناہ بخشتا ہے نہ کہ بندے کی دھونس و استحقاق سے، اگر توبہ کرا کر بخش دے تو بھی اس کی مہربانی ہے۔

خلاصہ تفسیر

یہ پانچواں انعام یاد دلایا جا رہا ہے کہ اے بچھڑا پوجنے والے اسرائیلیو! اگر تم کو اس جرم کی سزا میں اس سرے تک ہلاک کیا جاتا تو بھی کوئی بات نہ تھی کیونکہ تم نے بغاوت کی تھی باغی کی سزا یہی ہے، جیسا کہ فرعون کی قوم کے ساتھ کیا گیا، مگر پھر بھی تم پر کرم کیا گیا کہ تم سے موسیٰ نے فرمایا تم ظالم ہو چکے، لہٰذا توبہ کرو اور اپنی جانوں کو قتل کے لئے پیش کر دو، پھر تم کو اس بھاری کام کی

ہمت بھی ہم نے دی کہ تم نے اس بوجھ کو برداشت کرلیا، پھر کچھ لوگوں کو قتل کرا کر سب کی خطا معاف کردی بلکہ مقتولین کو درجہ شہادت عطا فرما دیا، یعنی باغی تھے انہیں شہید بنا دیا، بے شک رب تعالیٰ بہت ہی توبہ قبول کرنے والا مہربان ہے۔

قتل بنی اسرائیل

جب موسیٰ علیہ السلام نے بچھڑا پوجنے والوں کو قتل کا حکم دیا تو انہوں نے کہا کہ ہم رب کے حکم پر راضی ہیں، تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ مجرمین بغیر ہتھیار اور بغیر خود اور زرہ کے باہر آ جائیں اور اپنے دروازوں پر دو زانوں بیٹھ جائیں اور اپنے زانو اپنی پیٹھ سے باندھ لیں اور اپنے سر زانوں پر رکھ لیں اور تلوار اپنی گردن پر لیں، نہ تو کوئی اپنا زانو بند کھولے نہ تڑپے اور نہ ہاتھ پاؤں مارے۔ اگر کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی قاتل کو دیکھا یا اس کی تلوار کا وار اپنے ہاتھ، یا پاؤں سے روکا تو اس کی توبہ قبول نہ ہوگی جب یہ سب لوگ اس پر تیار ہو گئے تو موسیٰ علیہ السلام نے حضرت ہارون سے فرمایا کہ ان بارہ ہزار آدمیوں کو حکم دو جو بچھڑے کی پوجا سے محفوظ رہے کہ ننگی تلواریں لے کر ان بندھے ہوئے آدمیوں کے پاس جائیں اور انہیں قتل کرنا شروع کر دیں چنانچہ اس پر فوراً عمل کیا گیا آپ نے ایک بلند جگہ کھڑے ہو کر آواز دی کہ اے مجرم اسرائیلیو تمہارے بھائی تلواریں سونتے ہوئے تمہیں قتل کرنے آ رہے ہیں، اللہ سے ڈرو اور صبر کرو۔ جب قاتلین مجرمین کے پاس پہنچے تو محبت کی وجہ سے قتل نہ کر سکے، کیونکہ یہ ان کے بھائی بھتیجے اور بیٹے پوتے تھے اور موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ ہمارے ہاتھ ان پر نہیں اٹھتے اپنے ہاتھوں سے اپنے جگر کے ٹکڑوں کو کیسے قتل کیا جائے، تب ان پر ایک نہایت سیاہ بادل بھیجا گیا جس سے سارے میدان میں اندھیرا ہو گیا اور کوئی کسی کو نہ دیکھ سکا۔ اور حکم ہوا کہ جاؤ اب انہیں قتل کرو، چنانچہ ایک دن میں اور بعض روایت میں ہے کہ تین دن میں ستر ہزار آدمی قتل ہو گئے تب بنی اسرائیل کے بچے اور عورتیں موسیٰ علیہ السلام کے پاس آکر شور فریاد کرنے لگے کہ اے موسیٰ رب سے رحم کی درخواست کرو حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام ننگے سر روتے ہوئے عاجزی کرتے ہوئے میدان میں آئے اور عرض کیا اے مولیٰ اسرائیلی ہلاک ہوئے جا رہے ہیں، اب رحم فرما، تب وہ بادل سیاہ ہٹا اور حکم آیا کہ اب قتل بند کرو، سب کی توبہ قبول ہو گئی، ہم ان سب کو جنت دیں گے۔ خیال رہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو توریت تو یکدم عطا ہو گئی اب ان کا وقتاً فوقتاً اپنی قوم کو اس قسم کے احکام دینا یہ آپ کی حدیث تھی، کتاب اللہ کی آیات نہ تھیں۔ معلوم ہوا کہ پیغمبر ڈاکیہ کی طرح صرف کتاب پہنچانے والے نہیں ہوتے اور انہیں کتاب اللہ ہی نہیں ملتی بلکہ وہ حضرات علاوہ کتاب کے اور بہت کچھ دیتے ہیں اور انہیں دوسری وحی بھی ہوتی رہتی ہے جب کلیم اللہ کی حدیث قابل عمل تھی تو احادیث رسول اللہ بھی یقیناً لازم العمل ہیں اس سے وہ منکرین حدیث عبرت پکڑیں جو کہتے ہیں کہ حضور صرف قرآن لائے نبی صرف ڈاکیے ہوتے ہیں، سوا کتاب کے اور کچھ نہیں لاتے اللہ سمجھ دے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** یہ کہ کفار کو مسلمان اپنی قوم کہہ سکتا ہے مگر ہم وطن یا ہم قبیلہ کے

معنی میں، نہ کہ بمعنی ہم مذہب کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے ان مرتدین کو اپنی قوم فرمایا۔ **دوسرا فائدہ:** یہ کہ تبلیغ نرمی اور محبت سے چاہئے کیونکہ اس کا اثر زیادہ ہوتا ہے اور سختی سے دلوں میں ضد پیدا ہوتی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے انہیں یا قوم فرمایا۔ حضرت نوح نے بے دین بچے کو یابُنَیَّ فرمایا، ہاں جب کسی کے ایمان کی امید نہ رہے تو اس پر خوب سختی کرنا سنت الٰہیہ سنت نبویہ اور سنت صحابہ ہے، قرآن کریم فرماتا ہے وَ اغْلُظْ عَلَیْهِمْ (توبہ: ۷۳) اے نبی ان بے ایمانوں پر خوب سختی فرمائیے نیز خود رب تعالیٰ نے ابولہب وغیرہ کفار کی بہت برائیاں بیان فرمائیں حتیٰ کہ ولید کے سورہ ن میں گیارہ عیوب بیان کئے اور آخر میں فرمایا زنیم وہ حرام کا جنا ہے جو شخص لاعلاج کافروں پر خوشامدانہ نرمی کرتا ہے وہ خود دین میں مداہن ہے ہم تو نماز سے پہلے بھی شیطان کو رجیم کہہ لیتے ہیں تو نماز پڑھتے ہیں حضور ﷺ نے جن کفار کے ساتھ نرم برتاؤ فرمایا وہ وہی کفار تھے جن کے ایمان کی امید تھی اگر ہر کافر سے خوش خلقی برتی گئی تھی تو جہاد کس نے ہوا، غرضکہ ہماری نرمی اور سختی دونوں اللہ کے لئے چاہئیں نہ کہ اپنی ذات کے لئے، تبلیغ نہایت نرمی سے کی جائے اور تردید خوب سختی سے۔ **تیسرا فائدہ:** یہ کہ موجودہ بنی اسرائیل کو دعوت دی گئی کہ تمہارے باپ دادوں نے توبہ کے لئے اپنے کو قتل کرادیا، اب نبی آخرالزمان بغیر قتل ہی کے نہایت نرم توبہ کی دعوت دے رہے ہیں اس کی قدر کرو، اور توبہ کرلو **چوتھا فائدہ:** یہ کہ مسلمانوں کو توبہ میں بہت جلدی کرنی چاہئے، دیکھو اسرائیلیوں پر توبہ کرنا بہت دشوار تھا اور مسلمانوں کیلئے آسان ہے اگر اب بھی توبہ نہ کریں تو ان کی سخت بدنصیبی ہے۔ **پانچواں فائدہ:** یہ کہ نبی کریم ﷺ کی تشریف آوری سارے جہان کے لئے نعمت ہے کیونکہ حضور علیہ السلام کی وجہ سے تمام وہ مصیبتیں جو بنی اسرائیل پر تھیں ٹل گئیں۔ ۱۔ ان کے ناپاک عضو کو کاٹنا پڑتا تھا۔ ۲۔ ان کی نماز سوا مسجد کے اور کہیں نہ ہوسکتی تھیں۔ ۳۔ ان کی طہارت صرف پانی سے ہی ہوسکتی تھی۔ ۴۔ ان کا روزہ دار رات کو سونے کے بعد کچھ نہ کھا پی سکتا تھا۔ ۵۔ ان پر گناہوں کی وجہ سے حلال چیزیں حرام ہوجاتی تھیں۔ ۶۔ ان پر چوتھائی مال کی زکوٰۃ واجب تھی روپے میں چار آنہ، ان کے رات کے چھپے ہوئے گناہ صبح دروازے پر لکھے جاتے تھے جس سے وہ سخت رسوا ہوجاتے تھے وغیرہ وغیرہ۔ (تفسیر روح البیان) اسلام میں ان سے کوئی بات نہیں۔ **چھٹا فائدہ:** یہ کہ توبہ حق تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، توبہ کے چار درجے ہیں،

ایک نفس امارہ کی توبہ: جو کہ عام مسلمانوں کو حاصل ہوتی ہے اس کی حقیقت بری باتوں سے بچنا اچھے کام کرنا فوت شدہ عبادتیں قضا کردینا حق والوں کے حق دے دینا۔ مظلوموں سے معافی مانگ لینا۔ گزشتہ گناہوں سے شرمندہ ہونا اور آئندہ بچنے کا عہد کرنا ہے اسے توبہ محض کہتے ہیں یا توبہ نصوح۔

دوسرا درجہ نفس لوامہ کی توبہ ہے۔ یہ اولیاء اللہ اور مومنین خاص کو حاصل ہوتی ہے اس کی حقیقت ترک دنیا اور حق سے غافل کرنے والی چیزوں سے بچنا، اخلاق کی درستی، نفس کی صفائی اور اس کی مخالفت ہے، اس کا نام انابت ہے اس سے نفس امارہ قلب منیب کے درجہ میں آجاتا ہے قرآن کریم فرماتا ہے وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِیْبٍ (ق: ۳۳)

تیسرا درجہ نفس ملهمه کی توبہ ہے یہ خاص اولیاء اللہ کو حاصل ہوتی ہے، جس کی حقیقت دنیا سے نفرت

اور آخرت کی طرف رغبت ہے اس کا نام اوبہ ہے اس کی برکت سے نفس روح کے مقام میں داخل ہو جاتا ہے اور تنہائی پسند کرتا ہے۔ خلقت سے وحشت اور خالق سے رغبت رکھتا ہے اور خالق کی طلب میں کونین سے بے تعلق ہو جاتا ہے۔

چوتھا درجہ نفس مطمئنہ کی توبہ ہے یہ خاص اولیاء اور انبیاء کرام کو حاصل ہوتی ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ خود عنایت ربانی ان نفسوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے (جیسے مقناطیس لوہے کو) اور اپنی انانیت سے نکال کر ربوبیت کی ہویت میں گم کر دیتی ہے اس درجے میں دوئی سے نفرت اور یکی طلب ہوتی ہے ادھر سے حکم ہوتا ہے کہ ارۡجِعِیۡۤ اِلٰی رَبِّکِ (الفجر:۲۸) اور اس طرف سے بزبان حال عرض ہوتی ہے کہ

تجھ میں میں ایسا سما جاؤں کہ میں ہی نہ رہوں   مجھ میں تو ایسا سما جائے تو ہی تو ہو جائے

ساتواں فائدہ: قرآن سے ثابت ہے کہ مرتد کی سزا قتل ہے، مرتدین بنی اسرائیل کو قتل کا حکم دیا گیا منکرین حدیث کہتے ہیں کہ قتل مرتد ظلم ہے اور قرآن سے ثابت نہیں صرف حدیث سے ثابت ہے لہٰذا نا قابل عمل وہ اس آیت میں غور کریں جب دنیاوی حکومتوں کے باغی قتل کر دیئے جاتے ہیں تو حکومت الٰہیہ کا باغی قتل کیوں نہ کیا جائے البتہ اسلام میں مرتد کو اولاً دوبارہ مسلمان ہو جانے کا حکم دیا جاتا ہے نہ مانے تو قتل دین موسوی میں خود قتل ہی اصل توبہ قرار دیا گیا غرضکہ حدیث میں قتل مرتد کی اصل قرآن سے ملتی ہے۔

تفسیر صوفیانہ

ہر قوم بچھڑے کی پجاری ہے جو چیز رب سے غافل کرے وہی بچھڑا ہے کوئی دولت کے بچھڑے کی پوجا کر رہا ہے اور کوئی شہوت کے اور کوئی عزت کے بچھڑے کی، کوئی خواہشات نفسانی کے بچھڑے کی، ہر مومن کا قلب جو مثل موسیٰ کے ہادی ہے بنی اسرائیلی خواہشات سے پکار کر کہہ رہا ہے کہ تم نے اس بچھڑے کی پوجا کر کے اپنے پر ظلم کر لیا ہے اب تم ماسوی اللہ کو چھوڑ کر متوجہ الی اللہ ہو جاؤ اور اپنے نفس امارہ کو قتل کر ڈالو اللہ کی مدد مانگو کافر کو لوہے کی تلوار سے قتل کیا جاتا ہے۔ مگر نفس کو صدق وصفا کی تلوار سے کافر کا قاتل غازی اور اس کا مقتول شہید ہے اور نفس کا قاتل صدیق ہے اور یقیناً صدیق کا درجہ غازی اور شہید سے زیادہ ہے۔ اسی لئے قرآن کریم نے صدیقین کو شہداء سے پہلے بیان فرمایا، نبی علیہ السلام نے جہاد کفار کو جہاد اصغر اور جہاد نفس نا ہنجار کو جہاد اکبر فرمایا۔ کیونکہ وہ مجاہد تو ایک بار قتل ہو کر مصیبتوں سے بچ جاتا ہے اور اس کے سارے اعمال بھی ختم ہو جاتے ہیں لیکن صدیق ہر دن ہزاروں بار نفس کو قتل کرتا اور ہر قتل میں نئی لذت پاتا ہے اس لئے فرمایا گیا کہ ذالکم خیر لکم یعنی نفس کو صدق کی تلوار سے قتل کرنا تمہارے واسطے بہتر ہے کیونکہ اس کے ہر قتل میں بلندی ہے اور ہر حملے میں ایک درجہ کسی شاعر نے کیا ہی خوب کہا ہے

کشتگان خنجر تسلیم را !   ہر زمان از غیب جان دیگر است

وَاِذۡ قُلۡتُمۡ یٰمُوۡسٰی لَنۡ نُّؤۡمِنَ لَکَ حَتّٰی نَرَی اللّٰهَ جَهۡرَةً

اور جبکہ کہا تم نے اے موسیٰ ہرگز نہ ایمان لائیں گے ہم واسطے آپ کے یہاں تک کہ دیکھ لیں ہم اللہ کو ظاہر ظہور
اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم ہرگز تمہارا یقین نہ لائیں گے جب تک علانیہ خدا کو نہ دیکھ لیں
فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ
پس پکڑ لیا تم کو کڑک نے اور حالانکہ تم لوگ دیکھ رہے تھے پھر زندہ کیا ہم نے تم کو
تو تمہیں کڑک نے آلیا اور تم دیکھ رہے تھے پھر مرے پیچھے
مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۵۶﴾
سے مرنے کے پیچھے تاکہ تم شکر کرو
ہم نے تمہیں زندہ کیا کہ کہیں تم احسان مانو

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **ایک** یہ کہ اس سے پہلے پانچ نعمتیں بیان کی جا چکیں جو کہ بنی اسرائیل پر کی گئیں اب چھٹی نعمت کا ذکر ہے۔ **دوسرے** یہ کہ اس سے پہلے بنی اسرائیل کے شرک کرنے کا ذکر ہوا ہے، اب مخالفت پیغمبر کا ذکر ہو رہا ہے کہ وہ ایک بار تو مشرک ہوئے تو دوسری بار موسیٰ علیہ السلام کے منکر، **تیسرے** یہ کہ اس سے پہلے بھی ان کے قتل کئے جانے کا ذکر ہوا اور اب بھی انکے مارے جانے کا یعنی جب انہوں نے بت پرستی کی تب تو ستر ہزار ذبح کرا دیئے گئے اور جب انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت کی تو ان کو کڑک کی آواز سے ہلاک کر دیا گیا۔ مگر فرق یہ ہے کہ اس بار موسیٰ علیہ السلام کے عرض کرنے پر دوبارہ ان کو زندگی دے دی گئی **چوتھے** یہ کہ پہلے توبہ و کفارہ کے ذریعہ گناہ معاف ہونے کا ذکر تھا اب شفاعت کلیم اللہ کے ذریعے معافی کا تذکرہ ہے تاکہ معلوم ہو کہ شفاعت وہاں کام آتی ہے جہاں سارے ذریعے ختم ہو جاتے ہیں جہاں تدبیر ختم ہو وہاں تقدیر کام کرتی ہے اور جہاں تقدیر بگڑ جائے وہاں شفاعت کارگر ہوتی ہے کہ شفاعت سے بگڑی تقدیریں بن جاتی ہیں اس لئے توبہ کی معافی کا ذکر پہلے اور شفاعت کی معافی کا ذکر بعد میں ہوا۔

تفسیر

وَ اِذْ قُلْتُمْ یہاں بھی وہی فعل پوشیدہ یعنی اے اسرائیلیو! تم اس وقت کو بھی یاد کرو یا اے نبی علیہ السلام انہیں وہ وقت بھی یاد دلاؤ جبکہ تم نے کہا تھا یہاں ان ستر آدمیوں کا کہا مراد ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ طور پر گئے تھے۔ خیال رہے کہ موسیٰ علیہ السلام دوبارہ اپنے ساتھ ستر اسرائیلیوں کو کوہ طور پر لے گئے تھے پہلے توریت لینے کے وقت اور دوسرے اس جرم کے بعد یہاں دوسری بار کا ذکر ہو رہا ہے اس میں اختلاف ہے کہ یہ واقعہ بنی اسرائیل کے قتل سے پہلے ہوا یا بعد میں بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ پہلے ہوا۔ یعنی جبکہ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو بچھڑا پرستی سے کفارے میں قتل کا حکم دیا تب انہوں نے کہا کہ ہمیں کیسے یقین آئے کہ آپ کو رب نے حکم دیا ہے تب آپ ان میں سے ستر نیک لوگوں کو وہ طور پر لے گئے اور وہاں یہ واقعہ پیش آیا۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ قتل کے بعد ہوا۔ یعنی جب ستر ہزار بنی اسرائیل قتل ہو چکے تو موسیٰ علیہ السلام اس بت پرستی کی معذرت کرنے کے لئے بحکم پروردگار ان ستر آدمیوں کو طور پر لے گئے اور وہاں یہ واقعہ پیش ہوا۔ یٰمُوْسٰی اس زمانے میں پیغمبروں کو نام لے کر پکارنا جائز تھا۔ ہمارے لئے حکم قرآنی ہے کہ ہم حضور علیہ السلام کو عام معمولی خطابوں سے نہ پکاریں بلکہ ادب کے ساتھ ہمارے نبی علیہ السلام کو رب نے بھی نام لے کر نہ پکارا بلکہ ان کے پیارے القاب کے ساتھ، بارگاہ مصطفوی کے ادب کا یہ عالم ہے کہ حضرت فاطمہ زہرا ابا کہہ کر۔ حضرت علی مرتضیٰ بھیا کہہ کر۔ حضرت عباس بھتیجا کہہ کر نہیں پکارتے۔ سب یہ ہی عرض کرتے ہیں یا رسول اللہ یا نبی اللہ، بلکہ حضور کو ایسے القاب سے پکارا جاتا ہے جن سے راجہ نواب بادشاہ سلامت کہہ کر نہ پکارو سلطان الانبیاء کہو لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ اس کے معنی ہیں کہ ہم آپ کی بات نہ مانیں گے، یا صرف آپ کی وجہ سے اس پر ایمان نہ لائیں گے حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً۔ نری رؤیت سے بنا ہے جس کے معنی ہیں دیکھنا، یہاں آنکھ سے دیکھنا مراد ہے نہ دلائل کے ذریعہ عقل سے پہچاننا کیونکہ یہ تو ان کو پہلے بھی حاصل تھا اس لئے وہ کہتے ہیں جَهْرَةً یعنی صاف صاف اور ظاہر ظہور۔ جھر کے لغوی معنے ہیں ظہور اور کشف بلند آواز کو صوت جہر کہتے ہیں اور خوبصورت چہرے کو وجہ جھیر نیز اہل عربی بولتے ہیں کہ جھرت الشئی یعنی اس چیز کی میں نے تحقیقات کر لی اور جھرت البیر کنوئیں کا پانی کیچڑ وغیرہ نکال کر صاف کر دیا ان اسرائیلیوں کا مقصد یہ تھا کہ ہم خدا کو صورت وشکل میں دیکھنا چاہتے ہیں نہ کہ بناوٹی خیالات سے اور نہ اس طرح جیسا کہ آخرت میں بلا کیف اس کے دیدار کا وعدہ ہے کیونکہ یہ ہماری عقل میں نہیں آتا۔ فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ یہاں صٰعِقَةُ سے مراد آسمانی آگ ہے نہ وہ بجلی جو کہ بادل سے نکل کر گرتی ہے کیونکہ اس وقت طور پر بادل نہ تھا، نیز بادل کی بجلی ایک شخص پر گرتی ہے نہ کہ جماعت پر (تفسیر عزیزی) بعض لوگوں نے کہا ہے کہ اس کے گرنے سے وہ لوگ صرف بیہوش ہو گئے تھے، مرے نہ تھے، کیونکہ موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں یہی فرمایا گیا ہے کہ وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا (اعراف: ۱۴۳) یہاں صعق سے مراد بیہوشی ہے نہ کہ موت، نیز اس جگہ فرمایا جا رہا ہے وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ یعنی تم اس کو دیکھ رہے تھے، اگر یہ لوگ مر گئے ہوتے تو دیکھنے کے کیا معنی مگر صحیح یہ ہے کہ یہ لوگ مر گئے تھے کیونکہ آگے ارشاد ہو رہا ہے ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ اور لفظ صعق قرآن کریم میں مرنے کے معنی میں بھی ارشاد ہوا ہے رب فرماتا ہے۔ ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ (الزمر: ۶۸) یعنی تم اس صعقة کا آنا اور بعض کا ہلاک ہونا اپنی آنکھ سے دیکھ رہے تھے کیونکہ یہ لوگ ترتیب وار ہلاک ہوئے تم ان کی ہلاکت دیکھ کر نہ تو بچ سکے اور نہ کہیں بھاگ کر جا سکے ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ چونکہ یہ لوگ ایک دن اور رات مردہ رہے دوسرے روز زندہ کئے گئے اس لئے یہاں ثم فرمایا گیا یعنی تم کو مار کر کچھ دیر کے بعد زندہ کیا گیا نہ کہ فوراً، بَعَثْنَا۔ بعث سے بنا ہے جس کے معنی ہیں اٹھنا بھیجنا اور زندہ کرنا، یہاں آخری معنی مراد ہیں یعنی زندہ کرنا جس طرح کہ یہ لوگ ترتیب وار مرے تھے اسی طرح ترتیب وار زندہ ہوئے تا کہ ہر ایک مرنا اور جینا آنکھوں سے دیکھ لے مِّنْۢ بَعْدِ مَوْتِكُمْ اس سے صاف معلوم ہوا کہ وہ لوگ حقیقت میں مر گئے تھے ان پر بیہوشی طاری نہ ہوئی تھی موت سے بیہوشی مراد لینا بلا دلیل ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ یہ سارے کام اس لئے ہوئے کہ تم زندگی پانے اور ایمان پانے کا شکر کرو اور آئندہ پیغمبر

سے اس قسم کے مطالبے نہ کیا کرو۔

خلاصہ تفسیر

اے اسرائیلیو تم اس نعمت کو یاد کرو جب کہ تم میں سے کچھ لوگ کوہ طور پر موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ گئے اور انہوں نے اپنے کانوں سے رب کا کلام سنا جو موسیٰ علیہ السلام سے ہو رہا تھا اس پر بھی انہوں نے کہا اے موسیٰ ہم تو جب مانیں جبکہ اپنی آنکھوں سے رب کو دیکھ لیں۔ یہ جرم اتنا سنگین تھا کہ اس پر سخت سزا تم کو ملنا چاہئے تھی کیونکہ تم نے موسیٰ علیہ السلام کا اعتبار نہ کیا تم کو آسمانی آگ سے ہلاک کر دیا گیا، پھر موسیٰ علیہ السلام کی عرض پر دوبارہ زندہ کیا گیا تم نے سرکشی پر سرکشی کی، خطا پر خطا کرتے رہے مگر ہم عطا پر عطا کرتے رہے جس طرح گزشتہ زمانے میں تمہاری خطائیں معاف ہوتی رہیں اگر اب بھی اپنی خطاؤں پر نادم ہو کر اس نبی آخر الزمان پر ایمان لے آؤ تو تمہاری خطائیں معاف فرما دی جاویں جیسا کہ ہم کرم فرماتے ہی کرتے ہیں۔ خیال رہے کہ ان اسرائیلیوں کی زندگی یا تو ختم ہو چکی تھی پھر موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے دوبارہ زندگی ملی جیسے عیسیٰ علیہ السلام کی دعا سے عرصہ کے مردے زندہ ہوتے اور پھر دوبارہ زندگی پا کر جیتے رہتے تھے نبی کی دعا سے زندگی ملتی بھی ہے اور بڑھتی بھی ہے جیسے چراغ کا روغن ہی ختم ہونے پر دوبارہ ڈال دیا جاتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ ابھی ان کی عمریں ختم نہ ہوئیں تھیں مگر موسیٰ علیہ السلام کی ناراضگی سے ایسے مر گئے جیسے چراغ میں تیل ہی ہو، مگر ہوا سے بجھ جائے اور پھر روشن کر دیا جائے، قانون یہ ہے کہ وقت سے پہلے موت نہ آئے فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ (اعراف: ۳۴) مگر قدرت یہ ہے کہ موت آگے پیچھے ہو جائے جیسے یہ واقعات وہاں قانون کا ذکر ہے یہاں قدرت کا ہم لوگ قانون کے پابند ہیں نہ کہ رب تعالیٰ، اس لئے وہاں فرمایا گیا لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ الخ۔ یعنی لوگ آگے پیچھے نہیں کر سکتے، رب چاہے تو کر دے۔

بنی اسرائیل کی موت اور ان کا پھر زندہ ہونا

جب ستر ہزار اسرائیلی کفارے میں قتل ہو چکے تب موسیٰ علیہ السلام کو حکم الٰہی ہوا کہ تم کچھ باقی ماندہ لوگوں کو لے کر اس گناہ کی معذرت کے لئے کوہ طور پر حاضر ہو اور وہاں یہ لوگ اپنی قوم کی طرف سے معافی چاہیں کیونکہ یہ وہ جنگل ہے جہاں موسیٰ علیہ السلام رب سے ہم کلام ہوتے ہیں، جنگل کی برکت سے توبہ جلد قبول ہوگی۔ جیسے مدینہ منورہ میں عبادات۔ یہاں انہوں نے شرک کیا ہے یہاں یہ توبہ نہ کریں، جیسے مندر یا گرجا میں نماز نہیں پڑھی جاتی، چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے ان میں سے ستر بہترین آدمی چنے جب یہ لوگ طور کی طرف روانہ ہوئے تب انہوں نے عرض کیا کہ اے موسیٰ ہمیں رب کا کلام سنوا دو آپ نے دعا فرمائی رب نے قبول کی، جب کوہ طور پر پہنچے تو آپ نے فرمایا کہ تم سب غسل کر لو، اپنے تمام گناہوں سے توبہ کر دو اور تین تین روزے رکھو اور تسبیح و تہلیل میں مشغول رہو جب آپ پہاڑ پر پہنچے تو ان لوگوں کو نیچے کھڑا کیا اور خود اوپر تشریف لے گئے، انہوں نے دیکھا کہ ایک نورانی ستون ابر سفید کے رنگ کا نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ پھیلتا گیا۔ یہاں تک کہ سارے پہاڑ کو اس نے گھیر لیا اور موسیٰ علیہ السلام اس میں گھر گئے پھر رب نے ان سے کلام فرمایا یہ لوگ نیچے کھڑے ہوئے کلام الٰہی

سن رہے تھے انہوں نے عرض کیا کہ یہ تمام گفتگو صرف موسیٰ سے ہو رہی ہے ہم پر بھی کرم فرمایا جاوے اور کوئی بات ہم سے بھی خطاب کر کے فرمادی جائے، کہ یکایک نور کی تجلی ان کی طرف کوندی اور پھر ان کے کان میں آواز آئی کہ اِنِّی اَنَا اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا ذُوْبَكَّةِ اَخْرَجْتُكُمْ مِنْ اَرْضِ مِصْرَ فَاعْبُدُوْنِیْ وَلَا تَعْبُدُوا غَیْرِیْ یعنی ہم اللہ ہیں ہمارے سوا کوئی معبود نہیں ہم مکہ والے ہیں ہم تم کو مصر سے نکالیں گے تم ہماری ہی عبادت کرنا کسی اور کی نہ کرنا، جب یہ ابر صاف ہو گیا اور موسیٰ علیہ السلام نیچے تشرف لائے تب آپ نے پوچھا کہ کہو تم نے رب کا کلام سنا، وہ بولے کہ سنا تو ہے مگر کیا خبر کہ کون بولا رہا تھا۔ ہم نے رب کو نہ دیکھا، یہ صرف آپ فرماتے ہیں کہ بولنے والا رب تھا۔ ہم کو یقین نہیں آتا آپ رب کو صاف صاف شکل و صورت میں دکھادیں تو ہم مان لیں گے۔ تب ان پر آسمانی آگ مع سخت آواز کے آئی جس سے وہ سب مردہ ہو گئے، ایک دن و رات مردہ رہے، موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ مولیٰ اب بنی اسرائیل کو کیا جواب دوں گا وہ کہیں گے کہ تم نے ستر ہزار آدمی تو یہاں قتل کروائے اور ستر آدمی باہر لے جا کر نہ معلوم کس طرح ہلاک کر دیئے، مولیٰ میری بدنامی ہو گی، میں تو ان کو اپنا گواہ بنا کر لایا تھا، یہ کیا ہو گیا، خدایا تو انہیں زندہ فرمادے، ان کی دعا سے یہ تمام لوگ ترتیب وار زندہ ہو گئے اور پھر موسیٰ علیہ السلام ان سب کو لے کر واپس تشریف لائے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **ایک فائدہ:** یہ کہ انبیاء کرام کی ایسی شان ہے کہ ان کی بارگاہ میں بے ادبی کرنے سے عذاب الٰہی آتا ہے، کیونکہ انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کا اعتبار نہ کیا اس لئے موت میں گرفتار ہوئے۔
دوسرا فائدہ: حق تعالیٰ اپنے مقبول بندوں کی دعا سے مردے زندہ فرمادیتا ہے۔ **تیسرا فائدہ:** یہ کہ رب تعالیٰ کو انبیاء کرام کی عزت و عظمت باقی رکھنا منظور ہے کہ صرف موسیٰ علیہ السلام کی عزت و عظمت برقرار رکھنے کے لئے یہ زندگی ان کو عطا ہوئی۔ **چوتھا فائدہ:** یہ کہ اگر موجودہ بنی اسرائیل حضور علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر ایمان نہ لائیں تو تعجب نہ کرنا چاہئے، کیونکہ یہ تو رب کا کلام سن کر بھی نہ مانتے تھے **پانچواں فائدہ:** یہ کہ اے نبی علیہ السلام آپ ان کی مخالفت پر رنجیدہ نہ ہوں یہ تو مخالفت کرنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ رب تعالیٰ ضد اور ہٹ دھرمی سے بچائے آمین۔ **چھٹا فائدہ:** متبرک مقامات پر عبادات یا دعا کرنی کرانی سنت انبیاء ہے کہ بنی اسرائیل کو کوہ طور پر بلا کر توبہ و معذرت کرائی گئی جو لوگ بزرگوں کے قرب میں مساجد بناتے ہیں یا ان کے عبادت خانوں، اعتکاف کی جگہ نمازیں یا دعائیں ادا کرتے ہیں ان کی دلیل یہ آیت ہے حضرت عبداللہ ابن عمر مکہ معظمہ کے راستے میں ہر اس جگہ نفل پڑھتے جہاں حضور نے قیام فرمایا تھا۔
ساتواں فائدہ: نبی کا انکار کر کے کوئی عبادت یا دعا یا عشق الٰہی قبول نہیں رب کے دیدار کی تمنا بہترین عبادت تھی مگر چونکہ ان اسرائیلیوں نے موسیٰ علیہ السلام کا انکار کرتے ہوئے یہ کی اس لئے عذاب میں گرفتار ہوئے **آٹھواں فائدہ:** نبی کی شفاعت وہاں کام آتی ہے جہاں کوئی حیلہ و تدبیر کام نہیں آتی یہ اسرائیلی خود تو مر چکے تھے، اب ان کی معافی اور گئی ہوئی زندگی ملنا۔ موسیٰ علیہ السلام کی شفاعت سے ہوئی۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: جب رب نے ان ستر آدمیوں سے بھی کلام فرمایا تو چاہئے کہ ان کو بھی کلیم اللہ کہا جائے صرف موسیٰ علیہ السلام کی یہ خصوصیت نہ رہی۔ **جواب:** کلیم اللہ وہ جو خود رب سے کلام کر کے جواب حاصل کرے یہاں ایسا نہ ہوا صرف کلام الٰہی ان کو سنا دیا گیا مخاطبہ نہ ہوا۔ **دوسرا اعتراض:** جب یہ لوگ دوبارہ زندہ ہوئے تو چاہئے کہ پھر شریعت کے احکام کے مکلف نہ رہتے کیونکہ مرنے کے بعد سارے احکام ختم ہو جاتے ہیں۔ **جواب:** چونکہ یہ لوگ دوبارہ زندہ ہو کر بھی اس دنیا میں رہے اس لئے ان پر احکام شرعیہ بھی باقی رہے، ہاں برزخی اور اخروی زندگی میں احکام نہ ہوں گے کیونکہ وہ عالم ہی دوسرا ہو گا۔ **تیسرا اعتراض:** جن لوگوں کو مار کر زندہ فرما دیا گیا ان کی عمر ختم ہو چکی تھی یا نہیں، اگر ہو چکی تھی تو دوبارہ زندہ کیوں رہے، اگر نہ ہوئی تھی تو موت کیوں آئی، موت تو زندگی ختم ہونے پر آتی ہے۔ **جواب:** ابھی ان کی عمر ختم نہ ہوئی تھی، یہ موت عارضی تھی پھر انہوں نے دوبارہ زندہ ہو کر اپنی بقیہ عمر پوری کی، جیسے کسی چراغ میں روغن اور بتی موجود ہو مگر ہوا سے گل ہو جائے پھر کوئی اللہ کا بندہ اس میں دیا سلائی لگا کر روشن کر دے، اسی طرح ان کی شمع حیات میں روغن عمر باقی تھا مگر نافرمانی کی تیز آندھی سے وہ گل ہو گئی حضرت موسیٰ کی دعا دیا سلائی کی مثل تھی، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی پہلی عمر ختم ہو چکی ہو حضرت موسیٰ کی دعا سے دوبارہ دوسری عمر عطا فرمائی گئی ہو سیدنا آدم علیہ السلام نے اپنی عمر میں سے چالیس سال حضرت داؤد کو دیئے۔ روایات میں ہے کہ اہل قرابت کے ساتھ اچھا سلوک کرنے سے عمر بڑھتی ہے بعض اعمال عمر بڑھا دیتے ہیں تو پیغمبر کی دعا سے نئی عمر مل سکتی ہے۔ حضرت زلیخا کو یوسف کی دعا سے دوبارہ جوانی عطا ہوئی وغیرہ۔ اس کی زیادہ تحقیق انشاء اللہ عیسیٰ کے مردے زندہ کرنے اور تقدیر کی اقسام کی بحث میں آوے گی۔ **چوتھا اعتراض:** اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ دیدار الٰہی ناممکن اگر ممکن ہوتا تو ان کو اس کے مانگنے پر سزا کیوں ملتی اور ناممکن چیز کبھی نہیں ہو سکتی، لہٰذا آخرت میں بھی دیدار نہ ہو گا۔ نیز حق تعالیٰ امکان اور جہت سے پاک اور اس کے بغیر دیکھنا محال۔ **جواب:** دیدار الٰہی ممکن ہے بلکہ ہمارے حضور کو ہوا اور انشاء اللہ تعالیٰ قیامت میں عام مسلمانوں کو حاصل ہو گا اگر ناممکن ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام اس کی دعا نہ فرماتے کیونکہ ناممکن کی دعا کرنا گناہ ہے اور نبی گناہ سے معصوم۔ نیز جب موسیٰ علیہ السلام نے دعائے دیدار کی تو رب نے فرمایا کہ اس پہاڑ پر نظر کرو اگر یہ اپنی جگہ قائم رہ جائے تو تم بھی ہم کو دیکھ لینا یعنی اپنے دیدار کو ممکن چیز پر موقوف رکھا اور ممکن پر موقوف بھی ہوتا ہے۔ یہ قاعدہ بھی غلط ہے کہ دیدار کے لئے مکان اور جہت ضروری ہے یہ اس دنیا کا حال ہے انشاء اللہ آخرت میں بغیر کیفیت اور بغیر جہت کے ہو گا ان اسرائیلیوں پر یہ عتاب طلب دیدار کی وجہ سے نہ ہوا، اگر اس لئے ہوتا تو چاہئے تھا کہ موسیٰ علیہ السلام پر بھی ہوتا کیونکہ انہوں نے بھی اس کی خواہش کی تھی۔ **پانچواں اعتراض:** موسیٰ نے تمنائے دیدار کی تو وہ محبوب رہے اور ان اسرائیلیوں نے کی تو یہ معتوب ہو گئے۔ وجہ فرق کیا ہے؟ **جواب:** موسیٰ نے اشتیاق ملاقات اور شوق دیدار میں تمنا کی تھی انہوں نے سرکشی اور عناد کی وجہ سے اور موسیٰ پر بے اعتباری کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم آپ کی بات نہ مانیں گے بلکہ خود دیکھ کر یہ کفر ہوا اس وجہ سے وہ معتوب ہوئے نیز انہوں نے کہا تھا کہ رب کی صورت اور شکل میں ہم کو

دکھاؤ جیسا کہ ہم جھرۃ کی تفسیر میں لکھ چکے اور رب شکل وصورت سے پاک ہے اگر وہ یہ دو باتیں نہ کہتے تو ہر گز خرابی میں نہ پڑتے۔ **چھٹا اعتراض:** بنی اسرائیل نے بچھڑے کی پرستش کر کے شرک کیا تب توان پر عذاب نہ آیا صرف توبہ ہی کرائی گئی اور وہ قتل توبہ بھی ان کے لئے رحمت ہوا مگر یہاں گناہ معمولی اور عذاب سخت اس کی کیا وجہ ہے۔ **جواب:** فرق یہ ہے کہ پہلی صورت میں انہوں نے پیغمبر کا مقابلہ، ان کی توہین نہ کی دوسری صورت میں توہین نبی کا جرم کیا ہے اس لئے عذاب آیا، عذاب الٰہی ہمیشہ نبی کے مقابلے پر آتا ہے، فرعون نے موسیٰ علیہ السلام سے پہلے دعویٰ خدائی کیا ہزار ہا بچے ذبح کر دیئے مگر کبھی سر میں درد بھی نہ ہوا۔ جب موسیٰ علیہ السلام کا مقابلہ کیا غرق ہوا۔

مولانا فرماتے ہیں۔

ہیچ قومے را خدا رسوا نہ کرد تا دلے صاحب دلے نہ آمد بدرد

مسئلہ: اس دنیا میں رہ کر کوئی شخص بحالت بیداری اور آنکھوں سے رب کو نہیں دیکھ سکتا، ہمارے حضور علیہ السلام نے معراج کی رات رب کو دیکھا مگر دوسری دنیا یعنی عالم امر میں پہنچ کر سارے مسلمان رب کا دیدار کریں گے مگر آخرت میں نہ کہ اس دنیا میں امام اعظم ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ نے رب کو سو بار دیکھا، مگر خواب میں نہ کہ ان آنکھوں سے، یہاں دیدار نہ ہونے کی چند حکمتیں ہیں۔ **پہلی حکمت:** یہ کہ اگر یہاں مسلمان رب کو دیکھ لیتے تو کفار کہہ سکتے تھے کہ ہم بھی دیکھ کر اس کی عبادت کریں گے اور اگر کفار کو بھی دکھایا جاتا تو مسلمانوں کو ان پر کچھ فوقیت نہ رہتی۔ **دوسری حکمت:** یہ ہے کہ رب کے نزدیک غائبانہ محبت مقبول ہے، یہاں بغیر دیکھے اس سے محبت کرو، تاکہ یہ محبت اس کے دیدار کا ذریعہ بنے کیونکہ دنیا کے سودے دیکھ کر خرید و مگر آخرت کے بغیر دیکھے، **تیسری حکمت:** یہ ہے کہ اگر یہاں دیدار الٰہی ہوتا تو دنیاوی کاروبار سب ختم ہو جاتے کیونکہ جو آنکھ اسے دیکھ لیتی وہ کسی اور کو نہ دیکھتی۔ **چوتھی حکمت:** یہ ہے کہ اس کی قدر ہو کیونکہ جو چیز مشکل سے ملتی ہے اس کی قدر ہوتی ہے۔ **پانچویں حکمت:** یہ ہے کہ دنیا غیرت کی جگہ ہے یہاں پر عاشق چاہتا ہے کہ نہ میں محبوب کے سوا کسی کو دیکھوں اور نہ محبوب کو کوئی دیکھے اور نہ خود وہ کسی کو دیکھے اس لئے سب کو تکلیف ہوتی کسی شاعر نے خوب کہا ہے

نیناں میں جو آن بسو نیناں جھانپ ہی لوں نہ میں دیکھوں اور کو نا توئے دیکھن دوں

آخرت میں چونکہ یہ حال نہ رہے گا لہٰذا وہاں دیدار ہو گا۔ **چھٹی حکمت:** یہ ہے کہ دنیوی آنکھ اتنی کمزور ہے کہ سورج کے نور کی بھی تاب نہیں لاتی تو خالق سورج کو کیا دیکھ سکے، حوران بہشتی اور فرشتے اسی لئے چھپا لئے گئے کہ کسی کی آنکھ میں ان کے دیکھنے کی طاقت نہیں، ہاں سورج پر ہلکے بادل کا غلاف آجائے۔ یا اس کا عکس پانی میں لے لیا جائے تو اس کا دیدار ہو جاتا ہے، نیز چاند تاروں کے ذریعہ سورج کا نور معلوم ہو جاتا ہے اسی طرح اس دنیا میں اگر رب کا جمال دیکھنا ہے تو مصطفیٰ کا جمال دیکھو کیونکہ یہ جمال آئینہ حق نما ہے معراج کی رات موسیٰ علیہ السلام کے لئے قبول دعا کی رات تھی کہ رَبِّ اَرِنِیْ والی دعا کا اثر آج ظاہر ہو رہا تھا کہ ان کو رب نے آئینہ مصطفائی میں اپنا دیدار دکھایا اسی لئے حضرت موسیٰ اور تجلی گاہ رحمانی کے

درمیان بار بار حضور علیہ السلام کی آمدورفت رہی۔

تفسیر صوفیانہ

اغیار کا یار کے دروازے پر آ کر دیدار کے لئے شور مچانا اس دربار کی بے ادبی ہے اور دوری اور شقاوت کا ذریعہ بھی۔ قصوران اسرائیلیوں سے ہوا تھا جس کی سزا میں ان کو موت دیدی گئی مگر چونکہ یہ اس دروازے تک خود نہ گئے تھے بلکہ یار کے بلائے ہوئے اور اس کے مقبول بارگاہ کے ذریعہ سے اور لے جانے والوں کو اپنے لانے کا پاس ہوتا ہے اور بازو پکڑنے کی لاج، اسی لئے موسیٰ نے عرض کیا کہ یا مولیٰ یہ ہیں تو بے ادب، مگر میرے لائے ہوئے ہیں اس لئے ان پر رحمت کی بارش ہوئی اور بعد موت ان کو زندگی بھی عطا ہوئی اور نبوت بھی جیسا کہ روایت میں آتا ہے کیونکہ غیرت والے کسی کو بلا کر گھر سے خالی نہیں پھیرتے۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے

لج پال پریت کو توڑت ناہیں جو بانہہ پکڑت سو چھوڑت ناہیں
گھر آئے کو خالی موڑت ناہیں

اس بارگاہ میں داخل وہ ہوتا ہے جو کسی کے ساتھ جائے اور قرب حق کی منزلیں صبر سے طے کرے، زبان سے شور نہ مچائے اور اس کے گھر کے دروازے سے جائے اور سوال و جواب میں ادب ملحوظ رکھے بنی اسرائیل کو ایک ہی بار مار کر زندہ کیا گیا لیکن طالب مولیٰ ہر آن مرتے اور زندہ ہوتے ہیں۔ خیال رہے کہ عذاب دیکھ کر توبہ کرنا یا ایمان لانا بیکار ہوتا ہے فرعون ڈوبتے وقت ایمان لایا جو قبول نہ ہوا۔ مگر ان لوگوں پر عذاب آ بھی گیا ہلاک بھی ہو گئے توبہ نہ کر سکے پھر بھی عذاب سے نجات بلکہ رب کی طرف سے اعزاز صرف اس لئے کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھی تھے، پتہ لگا کہ نبی کے ساتھیوں کی معافی ہوتی ہے تو حضور کے بعد کچھ صحابہ سے لغزشیں ہوئیں تو تمام مغفور ہیں کسی پر زبان طعن دراز کرنا جائز نہیں۔ کیا رسول اللہ کے صحابہ کلیم اللہ کے صحابہ سے بھی کم ہیں اسی طرح حضرت زلیخا اور برادران یوسف سے جو خطائیں سرزد ہوئیں سب بخشی گئیں ان پر زبان طعن کھولنا اپنے اعمال برباد کرنا ہے۔ اس آیت سے عبرت پکڑنا چاہئے۔ رب تعالیٰ سمجھ دے، یہ تمام حضرات طور سے جا کر نبی یا کم از کم ولی ہوئے کہ کلام الٰہی سن چکے تھے۔

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ط
اور سایہ کیا ہم نے اوپر تمہارے ہلکے بادل سے اور اتارا ہم نے اوپر تمہارے من اور سلویٰ کو
اور ہم نے تمہارا سائبان کیا اور تم پر من وسلویٰ اتارا
كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ ط وَمَا ظَلَمُونَا وَلٰكِنْ كَانُوْا
کھاؤ تم ستھری چیزوں میں سے وہ جو دیں ہم نے تم کو اور نہ ظلم کیا انہوں نے ہم پر اور لیکن
کھاؤ ہماری دی ہوئی ستھری چیزیں اور انہوں نے ہمارا کچھ نہ بگاڑا ہاں

اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۵۷﴾
تھے وہ جانوں اپنی پر ظلم کرتے
اپنی جانوں کو بگاڑتے تھے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے **ایک** یہ کہ اس سے پہلے بنی اسرائیل کی چھ نعمتیں بیان کی گئیں اب ساتویں نعمت کا ذکر ہے۔ **دوسرے** یہ کہ پچھلی آیتوں میں بنی اسرائیل کو قتل کر کے یا موت دے کر رحم فرمانے کا ذکر تھا اب ان کو قید فرما کر کرم فرمانے کا ذکر ہوا **تیسرے** یہ کہ پہلی آیتوں میں بنی اسرائیل کی بت پرستی اور موسیٰ علیہ السلام کے انکار اور ان پر سزا، اور پھر عفو خطا کا ذکر تھا اور اب ان کی نافرمانی اور رب کی پکڑ اور اس سے نجات کا ذکر فرمایا جا رہا ہے یعنی پہلے سخت جرم اور ان کی سخت سزا یعنی موت اور بڑی عطاؤں کا ذکر ہوا اور اب ان کے ہلکے جرم اور ہلکی سزا یعنی سزائے قید اور رحم خسروانہ کا تذکرہ ہو رہا ہے۔

تفسیر

پچھلی ساری آیتوں کو لفظ اِذْ سے شروع فرمایا گیا تھا، مگر اس نعمت کو بغیر اذ۔ اس کی دو وجہیں ہیں **ایک** یہ کہ یہ پہلی نعمت ہی کا ایک جز ہے۔ مستقل دوسری نعمت نہیں، یعنی ہم نے تم کو موت کے بعد زندہ کیا اور پھر تم پر سایہ کیا **دوسرے** یہ کہ یہ نعمتیں یعنی ابر کا سایہ کرنا اور من وسلویٰ کا اتارنا اس وقت عطا ہوئیں جبکہ ان کو مصر کی سرسبز زمین سے نکال کر بیابان جنگل میں قید کر دیا، جیسے بادشاہ کی طرف سے جیل خانہ میں قیدیوں کو کھانا پانی اور مکان دیا جاتا ہے کہ یہ چیزیں اگرچہ نعمتیں ہیں مگر بظاہر عذاب ہر شخص اس جیلخانہ کے کھانے سے پناہ مانگتا ہے لہٰذا چونکہ یہ نعمتیں ایک قسم کا عذاب بھی تھیں اس لئے یہاں اذ نہ فرمایا گیا ظَلَّلْنَا۔ ظِلّ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں سایہ، سایہ کی تین صورتیں ہیں ایک تو آفتاب کا نہ ہونا، دوسرے ہونا مگر درخت و مکان وغیرہ زمینی چیزوں کی وجہ سے دھوپ کا ہم تک نہ پہنچنا، تیسرے آسمانی چیزوں بادل وغیرہ کی وجہ سے دھوپ کا نہ آسکنا جنت کی نعمتوں میں فرمایا گیا وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ (واقعہ: ۳۰) یعنی دراز سایہ یہاں پہلی قسم کا سایہ مراد ہے کیونکہ وہاں آفتاب ہے ہی نہیں وہ جو روایت میں آتا ہے کہ درخت طوبیٰ کے سایہ میں سوار سو برس تک دوڑ سکتا ہے اس سایہ سے مراد اس کے نیچے کی زمین ہے اگر آفتاب ہوتا تو وہاں تک سایہ ہوتا اس آیت میں تیسری قسم کا سایہ مراد ہے یعنی بادل کی وجہ سے دھوپ کا میدان میں نہ آنا، آیت کے معنی یہ ہوئے کہ بذریعہ بادل کے تم پر سایہ کیا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ظُلَّةٌ سے بنا ہو جس کے معنی ہیں سائبان یا شامیانہ یعنی ہم نے تم پر بادل کو شامیانہ بنایا عَلَيْكُمُ اس سے سارے بنی اسرائیل مراد ہیں نہ کہ صرف وہ ستر جو طور پر مار کر زندہ کئے گئے کیونکہ یہ سایہ ان پر ہوا جو کہ مصر سے نکل کر شام کی طرف جہاد کے لئے بھیجے گئے اور پھر نافرمانی کی وجہ سے جنگل میں قید کر دیئے گئے، جس کا پورا قصہ انشاء اللہ خلاصہ تفسیر میں آئے گا۔ اَلْغَمَامَ یہ لفظ غَمّ سے بنا ہے جس کے

معنی ہیں ڈھانپنا، رنج کو بھی اسی لئے غم کہتے ہیں کہ وہ دل پر چھا جاتا ہے اور اس کو ڈھانپ لیتا ہے، یہاں اس سے سفید باریک اور ٹھنڈا بادل مراد ہے جس کی وجہ سے وہ آفتاب کی دھوپ سے بچ جائیں اور اندھیرے میں مبتلا نہ ہوں اس کی وجہ سے وہ میدان ان کے لئے ایک مکان سا بن گیا۔ وَاَنْزَلْنَا عَلَیْکُمُ الْمَنَّ چونکہ وہ کھانے کے حاجتمند تھے اس لئے ان پر مَنّ اتارا گیا مَنّ کے لغوی معنی ہیں احسان اور چیز بغیر مشقت کے حاصل ہو جائے وہ مَنّ کہلاتی ہے کیونکہ وہ محض اللہ کے فضل سے ملی، اسی لئے حدیث شریف میں آیا ہے کہ کَمْاَۃٌ (یعنی کھمبی جو کہ بارش میں گلی ہوئی لکڑی سے چھتری کی طرح نکلتی ہے) مَن میں سے ہے اور اس کا پانی آنکھوں کے لئے شفا اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بنی اسرائیل پر اس قسم کا من اترا تھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ بغیر مشقت ہم کو مل گئی۔ اس معنی سے جھربیری کے بیر اور تمام درختوں کے پھل من میں داخل ہیں طبیبوں کی اصطلاح میں وہ شبنم ہے جو درخت یا پتھر پر گرے اور اس میں مزہ اور مزاج ہو جیسے ترنجبین اور شیر خشت اور گزانگبین چونکہ بنی اسرائیل پر بھی شبنم گر کر جم جاتی تھی اس لئے اس کو من فرمایا۔ اس میدان میں صبح صادق سے آفتاب نکلنے تک ایک شبنم گرتی تھی جو جم کر برف کی طرح سفید اور لذت میں گھی اور شہد کی معجون کی طرح ہوتی تھی، یہ لوگ اپنی چادروں اور کپڑوں پر اس کو جمع کر لیتے اور اس پر گزارہ کرتے، سلویٰ ایک دریائی پرندہ کا نام ہے جس کا قد چھوٹے مرغ کے برابر ہوتا ہے اس کا گوشت نہایت لذیذ اور زود ہضم ہے۔ طبیبوں کی اصطلاح میں اس کو قتیل الودر کہتے ہیں کیونکہ یہ بادل کی گرج سن کر مر جاتا ہے۔ اس کا عربی میں دوسرا نام سمانے اور فارسی میں اردھی ہے اس کا پاخانہ چڑیا کے پاخانہ کے مشابہ ہوتا ہے اس کا پتہ مرگی کے واسطے مفید ہے اور اس کا خون کان کے درد کو دور کرتا ہے اس کے ہمیشہ کھانے سے دل نرم ہوتا ہے۔ یہ مصر اور حبشہ کے علاقہ میں کھاری سمندر کے پاس زیادہ پایا جاتا ہے روزانہ شام کے وقت ان پرندوں کو ہوا اڑا کر لاتی تھی اور یہ شکار کر کے ان کے کباب کھاتے تھے۔ کُلُوْا مِنْ طَیِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰکُمْ اس میدان میں ان بے محنت نعمتوں کا ان کے ذمہ صرف یہ شکر واجب کیا گیا کہ من وسلویٰ روز کا روز کھالو۔ کل کے لئے جمع نہ رکھو کیونکہ نیا روز اور نئی روزی ہوگی۔ ہاں چونکہ ہفتہ کے دن من وسلویٰ نہ آئے گا اس لئے جمعہ کے دن ایک دن کا جمع کر لو۔ اس جملہ کا یہی مقصود ہے۔ طَیِّبٰتٌ جمع طَیِّبَۃٌ کی ہے۔ طیبہ وہ حلال چیز ہے جو طبیعت کو مرغوب ہو۔ جو چیز حلال تو ہو مگر مرغوب نہ ہو وہ طیبہ نہ کہلائے گی۔ جیسے طلاق اسی لئے اس کو ابغض المباحات کہتے ہیں جو مرغوب ہو مگر حلال نہ ہو وہ بھی طیب نہیں جیسے زنا وغیرہ بلکہ خبیث ہے۔ رَزَقْنَا میں ادھر اشارہ ہے کہ ہم نے بغیر تمہارے کسب کے یہ چیزیں عطا فرمائیں لہٰذا ان کی قدر کرو۔ وَمَا ظَلَمُوْنَا ان لوگوں نے اس پر عمل نہ کیا بلکہ بے صبری کی وجہ سے جمع کر رکھا۔ نیز موسیٰ علیہ السلام سے شکایت بھی کی کہ ہم سے روزانہ ایک غذا نہیں کھائی جاتی ہمیں تو زمینی خوراکیں چاہئیں۔ جیسے گیہوں، مسور، ککڑی اور لہسن وغیرہ اس ناشکری سے انہوں نے ہمارا کچھ نہیں بگاڑا کیونکہ ہماری کسی شان میں فرق نہیں آیا۔ وَلٰکِنْ کَانُوْٓا اَنْفُسَھُمْ یَظْلِمُوْنَ اپنی جانوں ہی پر ظلم کرتے تھے اور اپنا ہی نفع کھو بیٹھے کیونکہ انہوں نے وہ روزی کھو دی۔ جس پر نہ دنیا میں محنت تھی نہ آخرت میں حساب اور اپنی قابلیت فیض بھی کھو بیٹھے اگر یہ لوگ یہ حرکتیں نہ کرتے تو ہمیشہ ان کو یہ نعمتیں ملتی رہتیں۔ اب محنت سے کمائیں گے اور آخرت میں حساب بھی دیں گے خیال رہے کہ مقام تیہ کے یہ

واقعات حضرت موسیٰ کے معجزات ہیں۔ بنی اسرائیل کو غیبی غذا، غیبی پانی، غیبی سایہ، غیبی لباس ملنا۔ حضرت موسیٰ کی برکت سے ہوا ہمارے حضور نے حضرت ابو طلحہ کی ہانڈی و آٹے میں اپنا لعاب دہن ڈال دیا تو چار سیر جو اور تین سیر گوشت سے دو ہزار آدمیوں نے کھایا اور کم نہ ہوا۔ گوشت میں بوٹیاں اور شوربے میں مرچ مصالحہ سب کچھ ہی ہوتا ہے۔ پھر اتنی بھاری جماعت کے کھانے میں لکڑیاں کتنی چاہئیں اور پکانے والی میں قوت بازو کس قدر درکار ہے۔ یہ سب حضور کی طرف سے ہوا یونہی حضور نے بارہا ایک پیالہ یا ایک مشکیزہ پانی سے لشکروں کو سیر فرما دیا حضرت علی کو دعا دے دی انہیں سردی گرمی نہ لگتی تھی۔

خلاصہ تفسیر

اے بنی اسرائیل تم اس نعمت کو بھی یاد کرو جب کہ تم مصر سے جہاد کرنے کے لئے ملک شام کی طرف روانہ کئے گئے اور ایک نافرمانی کی وجہ سے مقام تیہ میں قید کر دیئے گئے جو سخت گرمی اور آب و دانہ سے خالی تھا۔ اگر وہاں تم پر ہمارا فضل نہ ہوتا تو تم وہاں ہی بھوکے پیاسے جل بھن کر ختم ہو جاتے۔ لیکن ہم نے وہاں بھی تمہاری دستگیری فرمائی کہ تم پر ہلکے بادل کا سایہ کیا اور لذیذ مزیدار حلوا اور کباب تمہیں بغیر مشقت عطا فرمایا۔ تم سے صرف اتنا کہا گیا کہ تم توکل سے کھانا آج کا رزق کل کے لئے جمع نہ کرنا۔ مگر تم سے یہ بھی نہ ہو سکا تم نے وہاں بھی ہم پر توکل نہ کیا اور جمع کر کے اپنے رزق کو بند کر لیا۔ غور تو کرو کہ اس میں ہمارا کیا بگڑا۔ تم نے اپنا ہی بگاڑ لیا۔ مولانا فرماتے ہیں

ترک مستقبل کن و ماضی نگر ‏ ‏ سالہا خوردی و کم نامد زخور

بے صبر آئندہ کو دیکھتا ہے کہ میں کیا کھاؤں گا۔ صابر بندہ گزشتہ کو دیکھ کر کہتا ہے کہ جس نے مجھے پہلے کھلایا تھا۔ وہ آئندہ بھی کھلائے گا۔

بنی اسرائیل پر من وسلویٰ کا اترنا

جب موسیٰ علیہ السلام ان ستر اسرائیلیوں کو زندہ کرا کر مصر میں لے گئے تو سارے اسرائیلیوں کو حکم الٰہی پہنچایا کہ مصر سے روانہ ہو کر ملک شام کی طرف چلو۔ کیونکہ وہ ابراہیم علیہ السلام کا مدفن ہے اور وہاں ہی بیت المقدس بھی ہے۔ جس پر ایک ظالم اور سخت قوم عمالقہ نے قبضہ کر رکھا ہے ان سے جہاد کر کے اس ملک سے ان کو نکالو اور وہاں ہی آباد ہو جاؤ جیسے کہ تم نے مصر کو فرعونیوں سے پاک کر دیا اس حکم میں راز یہ تھا کہ بنی اسرائیل ملک مصر میں فرعون کے عیش و آرام دیکھ چکے تھے اور اب سارے مصر کے مالک ہو گئے۔ اندیشہ تھا کہ یہ بھی فرعونیوں کی طرح عیش و آرام میں پھنس کر اللہ کی عبادت بھول جائیں گے۔ نیز فرعون کہا کرتا تھا کہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام صرف یہ چاہتے ہیں کہ مجھ کو مصر سے نکال کر بنی اسرائیل کو یہاں کا مالک بنا دیں اگر اسرائیلی وہاں ہی رہتے تو دوسرے لوگ کہتے کہ فرعون کا خیال صحیح تھا۔ صرف ملک گیری کے خیال سے یہ سب کچھ کیا گیا تھا اور یہ تمام باتیں دنیا حاصل کرنے کے بہانے تھے اس لئے حکم دیا گیا کہ اس جگہ کو چھوڑ دو اور فی سبیل اللہ جہاد کر کے شام کی مقدس زمین کو دشمنان دین سے خالی کرالو۔ بنی اسرائیل مصر کی زمین سے بہت راضی تھے کیونکہ بغیر مشقت

لقمہ تر ان کے ہاتھ آ گیا تھا۔ اس لئے ان کو وہاں سے نکلنا بہت شاق گزرا۔ چار و نا چار روانہ تو ہو گئے لیکن بات بات کی موسیٰ علیہ السلام سے شکایت کرتے تھے اور زبان درازی کر کے ان کو تنگ کرتے تھے۔ جب مصر اور شام کے درمیان بے آب و دانہ اور سخت گرم میدان میں پہنچے جس کا نام تیہ ہے اور انہیں خبر لگی کہ جن عمالقہ قوم سے ہم جنگ کرنے جا رہے ہیں وہ سخت جنگ جو اور بہادر ہے۔ ان کے جسم تقریباً سات سو گز کے ہیں تو جنگ سے ہمت ہار بیٹھے اور موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ آپ اپنے رب کے ساتھ جا کر ان سے جنگ کریں۔ ہم تو یہیں رہیں گے۔ رب نے ان کو یہاں ہی چالیس سال کے لئے قید کر دیا یہ میدان تیہ صرف بارہ کوس میں تھا لیکن وہ اس میں ہی حیران و پریشان پھرے اور یہاں سے نکل نہ سکے۔ اسی لئے اس کو تیہ کہتے ہیں۔ جس کے معنی ہیں حیرانی (تفسیر روح البیان) اب ان کا انتظام یہ کیا گیا کہ دن میں سفید ہلکا بادل ان پر سایہ کر کے انہیں گرمی سے بچاتا تھا اور اندھیری رات میں ایک نوری ستون اترتا تھا جس کی روشنی میں اپنا کام کاج کرتے تھے اور آفتاب نکلنے سے پیشتر نہایت لذیذ حلوا برس جاتا تھا۔ یعنی من جو ہر شخص کو روزانہ ایک صاع یعنی تقریباً ۴ سیر ملتا تھا جو کہ ان کو دن بھر کے لئے بخوبی کافی ہوتا اور جمعہ کے دن دگنا برستا تاکہ ہفتہ کے دن بھی کام آئے۔ یہ لوگ شیرینی سے گھبرا گئے اور نمکین چیز کا موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا۔ چنانچہ روزانہ عصر کے بعد ان کے لئے نفیس کبابوں کا انتظام کیا گیا۔ یعنی سلویٰ جیسا کہ ہم تفسیر میں عرض کر چکے ہیں لیکن اس میں پابندی یہ تھی کہ روز کے روز کھا لو کل کے لئے جمع نہ کرو۔ اب بھی جس بزرگ کو دست غیب ہوتا ہے اس میں بھی یہی پابندی ہے اور جمع کرنے سے بند ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس میں توکل تام شرط ہے ان لوگوں سے صبر نہ ہوا اور انہوں نے کل کے لئے رکھ چھوڑا۔ جس کا انجام یہ ہوا کہ کباب سڑنے لگے اور اس کی بو سے لوگوں کو تکلیف ہونے لگی اور اس کا آنا بند ہو گیا (تفسیر عزیزی) خیال رہے کہ اس سے پہلے گوشت کبھی نہ سڑتا تھا۔ حدیث شریف میں ہے کہ اگر بنی اسرائیل نہ ہوتے تو کھانا نہ سڑا کرتا اور حوا کی خیانت (یعنی حضرت آدم کو گندم کھلا دینا) نہ ہوتی تو کوئی بھی عورت اپنے شوہر سے خیانت نہ کرتی اس زمانے میں اسرائیلیوں کے نہ بال بڑھتے تھے اور نہ ناخن تاکہ حجامت کی ضرورت نہ پڑے اور نہ کپڑے میلے ہوتے نہ پھٹتے تاکہ دھوبی یا درزی کی ضرورت نہ پڑے اور جو بچے پیدا ہوتے تھے ان کے جسم پر قدرتی لباس ہوتا تھا۔ جو کھال کی طرح جسم کے ساتھ بڑھتا تھا۔ اس دوران میں بنی اسرائیل کے جو اولاد ہوتی وہ بھی قدرتی کپڑے میں لپٹی ہوئی جو بقدر جسم بڑھتا جاتا تھا۔ بعض روایات میں ہے کہ حضور ﷺ ختنہ شدہ ناف بریدہ آنکھوں میں سرمہ بالوں میں شانہ کئے حریر میں لپٹے ہوئے پیدا ہوئے۔ اگر یہ روایت درست ہو تو اس کی تائید بنی اسرائیل کے اس واقعہ سے ہو جاتی ہے کہ چالیس سال کے دوران ان پر اور ان کی اولاد پر قدرتی کپڑا ہوتا تھا۔ قبروں سے اٹھیں گے ننگے بعد میں قدرتی کپڑا عطا ہوگا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** یہ کہ نافرمانی سے عذاب الٰہی آتا ہے جیسے کہ بنی اسرائیل نافرمانی کی وجہ سے قید کر دیئے گئے۔ **دوسرا فائدہ:** یہ کہ جب رب تعالیٰ جب کوئی مصیبت بھیجتا ہے تو ساتھ ہی اس

کا علاج بھی۔ جیسے بنی اسرائیل پر میدان تیہ میں بادل اور من وسلویٰ اتارا۔ **تیسرا فائدہ:** یہ کہ بے صبری سے نعمت چھن جاتی ہے جیسے کہ بنی اسرائیل سے من وسلویٰ کی نعمت چھن گئی۔ **چوتھا فائدہ:** یہ کہ سڑا ہوا کھانا حرام نیز تندرستی کے لئے مضر ہے۔ کیونکہ سلویٰ طیب یعنی حلال اور مرغوب چیز تھی۔ ان کی نافرمانی سے اسے غیر طیب بنا دیا گیا۔ مسئلہ سڑا ہوا طعام حرام ہے لیکن سڑا ہوا دودھ اور تیل گھی حلال۔ الاشباہ والنظائر روح البیان **پانچواں فائدہ:** جو چیز آرام سے ملتی ہے اس کی قدر نہیں ہوتی جیسے کہ بنی اسرائیل کو من اور سلویٰ کی قدر نہ ہوئی آج ہم کو دین کے مقابلہ میں دنیا کی قدر زیادہ ہے اور ہمارے بزرگوں کو دین کی قدر تھی۔ کیونکہ دین انہوں نے کمایا تھا اور دنیا ہم نے ایک شخص قیمتی چادر سے اپنے پھٹے جوتے جھاڑ رہا تھا لوگوں نے کہا یہ کیا۔ اس نے کہا کہ جوتے میری اپنی کمائی کے ہیں اور چادر میرے باپ کی کمائی کی جو میں نے میراث سے پائی۔ یہی حال ہمارا ہے۔ **ساتواں فائدہ:** مفت خور قوم میں اولوالعزمی غیرت جفاکشی نہیں رہتی۔ آرام طلبی آجاتی ہے۔ فسق وفجور اور کاہلی ان کا شیوہ ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہ جفاکش قوم کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور آخر وہ ان کا شکار بن جاتی ہے اس لئے رب تعالیٰ محنت سے رزق عطا فرماتا ہے۔ اسلام نے جفاکشی کا حکم دیا۔ ہمیشہ آرام طلب امیر قوم جفاکش قوم کی غلام بن جاتی ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: آسمان سے حلوے کا مینہ برسنا عقل کے خلاف ہے یہ تو ان بچوں کی سی کہانی ہے جو کہا کرتے تھے کہ کھیلوں بتاشوں کا مینہ برستا ہے (عام نیچری طبقہ قرآن کا مذاق) **جواب:** معترض دینوی موجودہ حالات سے بھی بے خبر ہے۔ اب بھی روزانہ بہت سی چیزیں شبنم اور بارش کے ذریعہ برستی ہیں برفانی علاقہ میں جو برف کی سلیں زمین پر جم جاتی ہیں یہ جمی ہوئی شبنم ہی تو ہے۔ اسی طرح ترنجبین خشک نجبین۔ شیر خشت اور گزانگبین اور بیدانگبین یہ سب جمی ہوئی شبنمیں ہیں۔ بعض پتھروں پر شبنم جم کر شیر خشت بن جاتی ہے اور بعض درختوں پر جم کر ترنجبین وغیرہ نیز قیمتی موتی بارش کا جما ہوا قطرہ ہی تو ہے جو کہ سیپ میں جم کر موتی کی شکل میں آ گیا۔ جو مولیٰ پانی اور شبنم کو جما کر اتنی چیزیں بنا دے اگر وہ تیہ کی زمین میں یہ تاثیر پیدا کر دے کہ وہاں شبنم گر کے حلوا بن جائے تو کون سی بعید بات ہے۔ **دوسرا اعتراض:** اگر تیہ کی زمین میں شبنم کو حلوا بنا دینے کی تاثیر تھی تو پھر کیوں نہ رہی۔ **جواب:** تاثیر رب قدیر کے حکم سے ہوتی ہے۔ اگر نیچری صاحب کی والدہ کے رحم میں منی کو جما کر بچہ بنانے کی تاثیر تھی تو بڑھاپے میں وہ تاثیر کیوں نہ رہی یہ اعتراض نہیں بلکہ مجنون کی بڑ ہے۔

تفسیر صوفیانہ

جب رب تعالیٰ نے ان کو غربت کے کوڑے سے ادب دیا تو عین قریب کی حالت سے ان کی دستگیری فرمائی۔ کیونکہ جس مصیبت میں رب مبتلا کرتا ہے تو مدد بھی کرتا ہے اور جس میں بندہ خود پھنستا ہے تو رب کی طرف سے اس کو امداد نہیں ہوتی۔ روح انسانی عالم ارواح میں عیش وعشرت کے مصر میں آباد تھی رب کی طرف سے ان کو دنیا کے میدان تیہ میں پھنسایا گیا تو ان پر رحمتوں کی بارش بھیجی گئی رزق کا انتظام کیا گیا اور آسمان نبوت سے ان پر تقویٰ کا من وسلویٰ برسایا گیا جن لوگوں نے اس پر

کفایت نہ کی اور حرص و ہوا کے شہر میں متاع دنیوی کی تلاش میں نافرمانی کرتے ہوئے داخل ہو گئے۔ پھر جوان پر مصیبت بھیجی گئی اس میں کوئی امداد نہ کی گئی کیونکہ یہ اس میں خود داخل ہوئے تھے۔

دوسری تفسیر صوفیانہ

دنیا گویا مقام قید ہے۔ جس میں ہم سب مختلف میعادوں کے قیدی ہیں۔ کہ ہماری عمریں قیدی کی میعاد ہے۔ یہاں نفس امارہ و شیطان وغیرہ کی تکالیف ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت سے جہاں ہم پر حضور علیہ السلام کو سایہ بان یا آپ کے دامن اقدس میں ہر طرح کا امن ہے۔ قرآن وحدیث ہمارے لئے روحانی من وسلویٰ ہے۔ جس سے ہمارے قلب وروح کو ایمانی غذائیں ملتی رہتی ہیں۔ اس کے شکریہ کا ہم کو حکم ہوا ہے۔ جو ان نعمتوں کا غلط استعمال کرے وہ اپنی ہی جان پر ظلم کرتا ہے رب کا کچھ نہیں بگڑتا۔

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ
اور جبکہ فرمایا ہم نے گھس جاؤ اس بستی میں پس کھاؤ تم اس سے جہاں کہیں
اور جب ہم نے فرمایا اس بستی میں جاؤ پھر اس میں جہاں چاہو بے روک ٹوک
شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ
چاہو تم وسیع اور داخل ہو تم دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے اور کہو تم معافی
کھاؤ اور دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو اور کہو ہمارے گناہ معاف ہوں
نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۚ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۸﴾
بخش دیں گے ہم واسطے تمہارے خطائیں تمہاری اور عنقریب زیادہ دیں گے ہم نیکو کاروں کو
ہم تمہاری خطائیں بخش دیں گے اور قریب ہے نیکی والوں کو اور زیادہ دیں

تعلق

اس آیت کا گزشتہ آیت سے چند طرح تعلق ہے **ایک** یہ کہ اس سے پہلے بنی اسرائیل کی سات نعمتوں کا ذکر ہوا۔ اب آٹھویں نعمت کا ذکر ہو رہا ہے۔ **دوسرے** یہ کہ پہلی آیت میں ان کے مقام تیہ میں قید ہونے کا ذکر تھا اب قید سے چھوٹنے کا **تیسرے** یہ کہ اس سے پہلے قدرتی غذا من وسلویٰ عطا فرمانے کا ذکر ہوا اب ان کو شہر میں پہنچا کر ہر قسم کی نعمتیں دینے کا ذکر فرمایا جا رہا ہے۔ من وسلویٰ بھی بغیر محنت ہی ملتا تھا۔ اور اس شہر کی نعمتیں بھی اسی طرح۔ قوم عمالقہ جمع کر گئے تھے اور اسرائیلیوں نے اس کو استعمال کیا **چوتھے** یہ کہ اس پہلے غذا جسمانی یعنی من وسلویٰ کا ذکر ہوا اب غذا روحانی یعنی توبہ اور مغفرت اور دیگر انعامات الٰہیہ کا۔

تفسیر

وَاِذْ قُلْنَا یہاں بھی ایک فعل پوشیدہ ہے۔ یعنی اے اسرائیلیو! اس نعمت کو بھی یاد کرلو۔ یا اے نبی ﷺ انہیں وہ نعمتیں بھی یاد دلا دو جب کہ ہم نے ان کے باپ داداؤں سے تیہ سے نکلتے وقت کہا کہ اُدْخُلُوْا ظاہر یہ ہے کہ یہ امر وجوب کے لئے ہے جس سے کہ بنی اسرائیل پر اس شہر میں جانا واجب ہو گیا یعنی اے اسرائیلیو! اس میدان سے نکل کر اس بستی میں جاؤ نہ کہ کسی اور جگہ اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ امر اباحت ہو کہ اب تک تم اس جنگل میں قید تھے اب بستی میں جا سکتے ہو۔ هٰذِهِ الْقَرْيَةَ جس بستی میں ان کو بھیجنا منظور تھا وہ ان کو دکھا دی گئی کہ وہ بستی جو تم کو نظر آ رہی ہے۔ اس میں چلے جاؤ اس لئے هٰذِهٖ فرمایا گیا۔ قریۃ قریٰ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ جمع ہونا۔ اس لئے مہمانی کے کھانے کو قری کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ مجمع میں کھایا جاتا ہے بستی کو قریہ اس لئے کہتے ہیں۔ کہ وہاں مختلف قسم کے لوگ جمع ہو کر رہتے ہیں۔ قریہ گاؤں اور شہر دونوں کو بولا جاتا ہے اس میں اختلاف ہے کہ یہ کون سی بستی تھی۔ بعض علماء نے فرمایا کہ بیت المقدس شہر تھا اس صورت میں یہ واقعہ موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد کا ہوگا۔ اور اس وقت اسرائیلیوں کی قید کا زمانہ ختم ہو چکا تھا کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے تیہ میں ہی وفات پائی ان کے بعد حضرت یوشع علیہ السلام بنی اسرائیل کے حاکم ہوئے اور آپ ہی ان کو نکال کر بیت المقدس میں لے گئے اس صورت میں اعتراض یہ پڑے گا۔ آئندہ آیت میں پھر تیہ کا ہی ذکر آ رہا ہے تو اگر یہ واقعہ تیہ سے نکلنے کا ہے تو واقعات کے بیان میں بے ترتیبی ہو گئی لیکن اس میں کوئی مضائقہ بھی نہیں اس لئے کہ ان حکایتوں میں فقط نعمتوں کا شمار کرانا منظور ہے اور بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس بستی سے اریحا مراد ہے یہ بیت المقدس کے پاس ایک گاؤں تھا جس میں قوم عمالقہ رہتی تھی اور لشکر بنی اسرائیل کے خوف سے اس گاؤں کو خالی کر کے چلے گئے تھے اور اس میں غلہ اور میوے بے شمار چھوڑ گئے تھے اس صورت میں یہ واقعہ موسیٰ علیہ السلام کی زندگی شریف کا ہی ہے اور یہ زمانہ تیہ میں قید ہونے کا ہی زمانہ ہے تو گویا بنی اسرائیل کی اس قید کے دو حصے ہیں۔ ایک جنگل میں رہنے کا اور دوسرے اس بستی میں جنگل میں رہ کر ان پر من وسلویٰ آیا اور یہاں رہ کر قسم قسم کی نعمتیں ملیں اس صورت میں ساری آیتوں کے مضمون ترتیب دار ہو جائیں گے۔ فَكُلُوْا مِنْهَا بنی اسرائیل کو اس بستی کی ساری نعمتیں استعمال کرنے کا حق تھا کہ وہاں کی غذائیں کھاؤ لباس پہنو مکانات میں رہو تمہارے واسطے سب چیزیں حلال ہیں لیکن کھانا چونکہ سب سے بڑھ کر نعمت ہے اس لئے اس کا ذکر کیا گیا۔ حَيْثُ شِئْتُمْ اس میں یہ بتایا گیا کہ وہاں تم پر مقام تیہ کی سی پابندی نہ ہوگی اور نہ وہ جگہ تمہارے واسطے سخت جیل ہوگی بلکہ تم کو اختیار ہوگا کہ وہاں ہی رہ کر نعمتیں کھاؤ یا باہر لے جا کر رَغَدًا اس کے معنی ہم آدم علیہ السلام کے قصے میں بیان کر چکے ہیں۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ یہاں تم پر من وسلویٰ کی سی پابندی نہ ہوگی بلکہ تمہارے لئے عام اجازت ہوگی۔ نیز یہ نہ سمجھنا کہ یہ غذائیں بقدر ضرورت کھانا جائز ہیں جیسے کہ مجبور آدمی کے لئے حرام غذا بلکہ خوب سیر ہو کر کھاؤ پیو اور چین کرو۔ خیال رہے کہ یہ امر اباحت کے لئے ہے۔ وَادْخُلُوا الْبَابَ اب اس شہر کے آداب کا ذکر فرمایا گیا کہ تم کو وہاں جانے کی اجازت تو ہے مگر شرط یہ ہے کہ شہر کے دروازہ میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہونا۔ بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اس سے بیت المقدس کا دروازہ مراد ہے جو آج بھی موجود ہے جس کا نام باب

حطہ یا باب القبہ ہے اب بھی جو شخص اس مسجد میں آتا ہے۔اسی دروازہ سے آتا ہے اور عام مسلمان اس کی زیارت کرتے ہیں اور اس دروازے سے داخل ہونے کو مغفرت کا ذریعہ سمجھتے ہیں جیسے مسجد نبوی شریف میں ستون ابولبابہ کے پاس کھڑے ہو کر لوگ توبہ کرتے ہیں یا ہمارے پاکستان میں پاک پٹن شریف میں بہشتی دروازے سے لوگ داخل ہوتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس دروازے سے اس بستی کا دروازہ مراد ہے کیونکہ بیت المقدس کی مسجد اور باب حطہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں بنا۔ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں نہ یہ مسجد بنی اور نہ یہ باب حطہ۔ پھر اس دروازہ سے داخل ہونے کے کیا معنی سُجَّدًا سجدے کے لغوی معنی ہیں جھکنا اور شرعی معنی ہیں سر، زمین پر رکھنا۔ اگر یہاں لغوی معنی مراد ہوں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اپنی فتح اور بہادری پر اتراتے ہوئے اکڑ کر مت جانا۔ بلکہ عاجزی کرتے ہوئے اور جھکے ہوئے داخل ہونا کیونکہ یہ پیغمبروں کا شہر ہے یہاں تو فرشتے بھی جھک کر ادب سے آتے ہیں یہ جگہ اکڑنے کی نہیں۔ بلکہ نیازمندی اور عجز کے اظہار کی ہے۔ حاجی آج مکہ مکرمہ میں احرام باندھ کر داخل ہوتے ہیں کہ وہ خلیل اللہ کا شہر ہے وہاں شکار وغیرہ نہیں کرتے نیز مسجدوں میں بحالت جنابت نہیں جاتے نسبت کا بڑا اثر ہے اور اگر شرعی معنی مراد ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ داخل ہوتے وقت شکر کے سجدے کر لینا کہ خدا تعالیٰ نے تم کو اس قید سے آزاد کیا اور تمہارے دشمنوں کو یہاں سے بھگا دیا اور تم کو اس مقدس شہر میں داخل ہونے کی توفیق عطا فرمائی کیونکہ انسان سجدہ کرتے ہوئے چل نہیں سکتا۔ وَقُولُوا حِطَّةٌ اور اے اسرائیلیو صرف بدنی عبادت کرنے پر ہی کفایت نہ کرنا بلکہ وہاں داخل ہوتے وقت اپنی زبان سے کہنا خدایا ہمارے گناہ معاف کر دے یعنی وہاں شیخی مارتے ہوئے مت جانا بلکہ بدنی عمل کے ساتھ قلبی اور زبانی شرمندگی بھی ظاہر کرنا۔ حِطَّةٌ عربی لفظ ہے۔ جس کے معنی ہیں گرا دینا یا تو بنی اسرائیل کو یہ لفظ ہی سکھایا گیا تھا کہ تم عربی زبان میں توبہ کرتے ہوئے جانا یا اس کا ہم معنی عبرانی لفظ ان کو بتایا گیا تھا جس کا عربی ترجمہ قرآن پاک میں نقل فرمایا ہے تفسیر کبیر میں ہے کہ اس کے معنی اترنے اور رہنے کے بھی ہیں۔ اب مطلب یہ ہوا کہ خداوند ہم اس گاؤں میں رہیں گے نَّغْفِرْ لَكُمْ۔ نَغْفِرُ، غَفْرٌ سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں چھپانا۔ چھلکے کو اسی لئے غفر کہتے ہیں کہ وہ مغز کو چھپائے ہوتا ہے۔ یہاں مراد ہے بخشنا اور معاف کرنا کیونکہ بخشش سے گناہ چھپ جاتا ہے۔ یعنی اے اسرائیلیو! اگر تم نے اس پر عمل کر لیا تو ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے۔ خَطٰيٰكُمْ۔ خطایا۔ خَطِيْئَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں غلطی خواہ بھول سے ہو یا جان بوجھ کر۔ یعنی ہم تمہارے سارے گناہ معاف کر دیں گے۔ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ محسنین احسان سے بنا ہے جس کے معنی ہیں اچھے کام کرنا۔ اصطلاح میں محسن وہ شخص ہے جس کے عقائد اور اعمال اچھے ہوں یا وہ جو اچھے کام کرے اور برائیوں سے بچے یا وہ جو ایسے کام کرے جو شرعاً اور عقلاً بہتر ہوں چونکہ ان بنی اسرائیل میں انبیاء کرام بھی تھے جو خطاؤں اور گناہوں سے معصوم ہیں اس لئے فرمایا کہ اس شہر میں داخل کے وقت ہر شخص حِطَّةٌ کہے اس کی برکت سے گنہگاروں کے گناہ تو معاف ہو جائیں گے اور معصوموں کے درجے بلند ہوں گے یعنی ایک ہی لفظ دو جماعتوں کے لئے علیحدہ علیحدہ فائدہ دے گا۔ جو کام گنہگاروں کے گناہ معاف کراتا ہے۔ وہ نیک کاروں کے درجے بڑھاتا ہے۔ نزید کا دوسرا مفعول چھپا ہوا ہے یعنی ہم محسنین کا ثواب اور درجے بڑھائیں گے کیونکہ اچھی زمین میں دانہ کی

پیداوار اچھی ہوتی ہے۔ تخم اچھا پھل دیتا ہے ایسے ہی مقدس اور متبرک مقامات میں عبادات و نیکیاں اچھا اور زیادہ پھل دیتی ہیں وہاں کی آب و ہوا نیک اعمال کے لئے زیادہ موافق ہے مکہ معظمہ کی ایک نیکی کا ثواب ایک لاکھ ہے۔ مدینہ پاک کی ایک نیکی کا ثواب پچاس ہزار۔

خلاصہ تفسیر

اے بنی اسرائیل ہماری اس نعمت کو بھی یاد کرو جب کہ تم مقام تیہ میں قید کر دیئے گئے اور وہاں تم ایک معین غذا کھاتے گھبرا گئے اور اس جگہ رہنے سے تم اکتا بھی گئے اور تم نے موسیٰ سے اپنی مصیبت بیان کی تو ہم نے تم پر یہ کرم فرمایا کہ تمہارے دشمن قوم عمالقہ جو بیت المقدس یا اریحا میں آباد تھی۔ اس کے دلوں میں تمہارا رعب ڈال دیا کہ وہ بہادر قوم تم کمزوروں سے ڈر کر بغیر لڑے بھڑے شہر خالی کر گئی اور پھر ہم نے تم سے کہا کہ جاؤ وہ شہر تمہارے واسطے خالی ہے تمہارے دشمن جو نعمتیں وہاں چھوڑ گئے ہیں تم جا کر اپنے استعمال میں لاؤ مگر تم پر صرف دو پابندیاں لگائیں ایک یہ کہ اس شہر کے دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے جھکے ہوئے عاجزی کرتے ہوئے داخل ہونا اور دوسرے یہ کہ اس داخلے کے وقت تمہاری زبان پر کوئی فخر یہ کلمہ نہ ہو بلکہ ہم سے معافی چاہتے ہوئے جاؤ...... جس سے ہم گناہگاروں کی خطائیں معاف کر دیں گے اور نیک کاروں کے درجے بڑھا دیں گے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** یہ کہ اگر چہ توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ انسان گزشتہ جرم پر نادم ہو اور آئندہ کے لئے بچنے کا عہد کرے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ زبان سے توبہ کے کلمے بولنا اور اس وقت کوئی نیک کام بھی کرنا چاہئے جیسے کہ بنی اسرائیل سے سجدہ بھی کرایا گیا اور حِطَّةٌ بھی کہلوایا گیا۔ اسی لئے اب بھی حکم ہے کہ توبہ کے وقت نماز توبہ اور صدقہ خیرات ادا کرے کیونکہ یہ توبہ کی قبولیت کا ذریعہ ہیں۔ **دوسرا فائدہ:** یہ کہ توبہ گناہ کے مطابق ہونی چاہئے یعنی چھپے گناہ کی چھپی توبہ اور ظاہر گناہ کی ظاہر توبہ جیسے کہ یہاں بنی اسرائیل کو علانیہ توبہ کا حکم دیا گیا تاکہ جس کو ہمارے گناہ کی خبر ہو اس کو ہماری توبہ کی بھی خبر ہو جائے بلکہ بہتر ہے کہ اپنی توبہ پر متقی اور پرہیزگاروں کو گواہ بنالے اسی طرح جو شخص بدمذہبی سے توبہ کرے اس کو چاہئے کہ اس توبہ کا اعلان کرے۔ **تیسرا فائدہ:** یہ کہ متبرک مقامات جہاں رحمت الٰہی کا نزول ہوتا ہے وہاں جا کر توبہ کرنا اور اطاعت بجالانا زیادہ قبولیت کا سبب ہے جیسے بنی اسرائیل کو توبہ کرنے اور عبادت کرنے کے لئے اس شہر متبرک میں بھیجا گیا۔ تفسیر عزیزی نے اس جگہ فرمایا کہ بعضے خاندانی اور بزرگ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ جن کے پاس بیٹھ کر توبہ کرنے اور عبادت کرنے سے جلد قبولیت ہوتی ہے چنانچہ ابن مردویہ نے ابو سعید خدری سے روایت کی ہے کہ ایک دن ہم حضور علیہ السلام کے ساتھ سفر میں تھے رات کے آخری حصے میں حضور علیہ السلام ایک پہاڑ سے گزرے جس کا نام دار الحنظل تھا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ گھاٹی بنی اسرائیل کے اس دروازے کی طرح ہے۔ جس سے ان کو سجدہ کر کے داخل ہونے کا حکم ہوا اور جہاں ان سے توبہ کرائی گئی ابن ابی شیبہ نے بروایت صحیح فرمایا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں

کہ اس امت میں ہم اہل بیت کشتی نوح اور بنی اسرائیل کے دروازہ حطۃ کی طرح ہیں یعنی جس طرح بنی اسرائیل کا اس دروازہ میں آنا گناہ کی معافی کا ذریعہ تھا ایسے ہی امت مصطفیٰ علیہ السلام کا ہمارے سلسلہ میں داخل ہونا اور بیعت اور توبہ کرنا گناہوں کی معافی کا سبب ہے۔ تفسیر عزیزی بلکہ مثنوی شریف میں فرمایا گیا ۔

گر نداری تو دم خوش در دعا	رو دعا می خواہ ز اخوان صفا
ہر کہ اول پاک شد از اعتلال	آں دعائش می رود تا ذوالجلال
ہیں بجوایں قوم را اے مبتلا	ہیں غنیمت دارشاں پیش از بلا

یعنی بہتر ہے کہ اپنے لئے کسی بزرگ سے دعا کراؤ کیونکہ ان کی زبان سے نکلی ہوئی دعا حق تعالیٰ تک پہنچتی ہے جیسے کہ کمان کا تیر اور بندوق کی گولی۔ اگر ہم گولی ہاتھ سے پھینک دیں تو وہ اثر نہ ہوگا جو بندوق سے پھینکنے کا ہوگا۔ دعا گولی ہے اور ان کی زبان بندوق۔ **چوتھا فائدہ:** انبیاء واولیاء کے مزارات پر حاضر ہو کر دعا کرنا بہت بہتر ہے امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ دعا کے لئے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے مزار شریف پر آتے تھے (شامی) ہم کو قرآن نے بھی حکم دیا کہ توبہ کے لئے ہمارے نبی پاک کی بارگاہ میں جاؤ۔ **پانچواں فائدہ:** بزرگان دین کے شہر کی تعظیم کرنا بھی نیک بختی کی علامت ہے جیسے کہ بنی اسرائیل سے اس شہر کی تعظیم کرائی گئی اس لئے کہ یہ انبیاء کرام کی آرام گاہ تھا۔ مدینہ منورہ اور بغداد شریف کی تعظیم کی یہی اصل ہے۔ بلکہ موسیٰ علیہ السلام کو وادی سینا میں داخل ہوتے وقت نعلین اتار دینے کا حکم دیا گیا فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ إِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى (طٰہٰ:۱۲) بعض حضرات اپنے شیخ کے شہر میں ننگے پاؤں رہتے ہیں جوتا نہیں پہنتے۔ حضرت امام مالک حدود مدینہ میں گھوڑے پر سوار نہ ہوتے۔ حضرت امام ابوحنیفہ نے مدینہ کے قیام کے زمانہ میں اس زمین پاک میں پیشاب پاخانہ نہ کیا کھانا ہی چھوڑ دیا ان تمام آداب کی اصل یہ آیات ہیں نیز پاک پتن کے بہشتی دروازے کے معنی یہ ہیں کہ اس دروازے میں داخل ہو کر توبہ کرو اور گناہ سے معافی مانگو جیسے ستون توبہ کے پاس کھڑے ہو کر توبہ کرنا غالباً اس جگہ بابا صاحب نے عبادت کی ہوگی۔ **چھٹا فائدہ:** جن عملوں سے ہم گنہ گاروں کے گناہ معاف ہوتے ہیں ان سے نیک کاروں کے درجے بڑھتے ہیں۔ ہماری توبہ گناہ مٹاتی ہے ان کی توبہ ان کے درجے بڑھاتی ہے ہماری مصیبتیں ہمارے گناہوں کی وجہ سے ہیں۔ ان کی مصیبتیں ترقی درجات کے لئے جیسے کہ میدان تیہ میں بنی اسرائیل بھی رہے اور موسیٰ علیہ السلام بھی مگر یہ میدان بنی اسرائیل کے لئے قید خانہ تھا موسیٰ علیہ السلام کے لئے اعلیٰ مقام جو شخص ان حضرات کی توبہ یا مصیبتوں کو دیکھ کر انہیں گنہگار یا بے دین مانے وہ خود بے دین ہے۔ گنہگار کی قبر پر پھول یا سبزہ ڈالا جائے تو اس سے عذاب میں کمی ہوتی ہے اور نیک کاروں کی قبر پر ڈالنے سے ان کے ثواب میں زیادتی۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس بستی میں داخل ہونے کے وقت کا سجدہ کس کو تھا۔ رب تعالیٰ کو یا اس شہر کو اگر رب تعالیٰ کو تھا تو کس طرف تھا اور اگر بستی کو تھا تو یہ بت پرستی ہے (آریہ) **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر گیا کہ یا تو اس سجدے سے مراد

جھک کر جانا ہے تو اس میں اس کی تعظیم منظور ہے اور یا جاتے وقت سجدہ شکر ادا کرنا تب اس بستی کا دروازہ ان کے لئے مثل کعبہ تھا۔ کہ سجدہ رب کو اور جھکنا اس کی طرف۔ بت پرستی کا جواب ہم آدم کے سجدے میں دے چکے ہیں اس کی تفسیر صوفیانہ اگلی آیت میں ہوگی۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ تم مسجد المقدس کے دروازے میں داخل ہو کر دو رکعت تحیۃ المسجد پڑھو جیسے آج مسجد میں جا کر پڑھی جاتی ہے۔ لہٰذا تعظیم شہر ثابت نہیں ہوتی۔ **جواب:** یہ غلط ہے اولاً اس لئے کہ یہاں بستی کا ذکر نہ کہ مسجد کا دروازہ بستی ہی کا ہونا چاہئے دوسرے اس لئے کہ اس آیت کے معنی یہ ہیں کہ سجدہ کرتے ہوئے جاؤ نہ کہ جا کر سجدہ کرو یہ ترجمہ ہی غلط ہے۔ تیسرے یہ کہ اس وقت مسجد بیت المقدس بنی نہ تھی کہ یہ حضرت سلیمان کی تعمیر ہے۔ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے صدہا برس بعد ہوئے مسجد بننے سے پہلے وہاں داخلہ کیسا۔

فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا
پس بدل دی انہوں نے جنہوں نے ظلم کیا وہ بات سوا اس بات کے جو کہی گئی واسطے ان کے پس اتارا ہم نے
تو ظالموں نے اور بات بدل دی جو فرمائی گئی تھی اس کے سوا
عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَآءِ بِمَا كَانُوْا
اوپر ان کے جنہوں نے ظلم کیا عذاب آسمان سے بوجہ اس کے
تو ہم نے آسمان سے ان پر عذاب اتارا
يَفْسُقُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع
کے فسق کرتے تھے
بدلہ ان کی بے حکمی کا

تعلق

یہ آیت پچھلی آیت کا تتمہ ہے کہ وہاں رب کے حکم کا ذکر تھا اور یہاں اسرائیلیوں کے عمل کا نیز پہلی آیت میں وعدہ کی شرطوں کا ذکر ہوا اور اس آیت میں ان اسرائیلیوں کے شرائط پورے نہ کرنے کا۔

تفسیر

فَبَدَّلَ یہ لفظ تبدیل سے بنا ہے جس کے معنی ہیں بدل دینا یا بدل لینا۔ بدلنے کی دو صورتیں ہیں ایک تو اپنی چیز دے کر دوسرے کی چیز لینا جیسا کہ تجارت میں ہوتا ہے دوسرے لینے کے قابل چیز کو چھوڑ کر وہ چیز اختیار کرنا جو نہ لینا چاہئے تھی۔ یہاں دوسرے معنی مراد ہیں یعنی ان کو جو کہنا چاہئے تھا وہ نہ کہا اور جو نہ کہنا چاہئے تھا وہ کہا۔ خیال رہے کہ بدلنا دو طرح کا ہے ایک تو اصل کو بدلنا۔ یہ دو طرح کا ہے۔ اس طرح کہ الفاظ بھی بدل جائیں اور مضمون بھی دوسرے وصف کو بدلنا اس طرح کہ

الفاظ بدل جائیں اور مضمون وہی رہے پہلے کو تبدیل اور دوسرے کو تغییر کہتے ہیں ان اسرائیلیوں نے پہلی قسم کی تبدیلی کی کہ نہ مضمون باقی رکھا اور نہ الفاظ اسی لئے یہاں بَدَّلَ فرمایا گیا نہ کہ غَیَّرَ اگر وہ لوگ بجائے حِطَّۃٌ کے مَغْفِرَۃٌ یا غُفْرَانَکَ وغیرہ مغفرت کے الفاظ بول لیتے تو غالباً رب کے غضب میں نہ آتے انہوں نے الفاظ و معنی تو کیا مقصود بھی بدل دیا۔ کیونکہ حِطَّۃٌ سے شرمندگی کا اظہار مقصود تھا مگر انہوں نے اس وقت تمسخر اور دل لگی کا اظہار کیا اسی لئے قرآن کریم نے بَدَّلَ باب تفعیل سے فرمایا نہ کہ ابدال باب افعال سے یعنی انہوں نے خوب بدل دیا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اس سے معلوم ہوا کہ سب نے نہ بدلا تھا بلکہ محض ظالمین نے ان میں جو انبیاء اور صالحین تھے وہ حِطَّۃٌ کہتے ہوئے ہی داخل ہوئے اس ظلم سے یا تو بچھڑے کی پوجا وغیرہ مراد ہے یا یہ بدلنا ہی یعنی جو پہلے ہی جرم کر چکے تھے انہوں نے ہی آج بھی یہ حرکت کی۔ یا یہ کہ بدلنے والے ظالمین نے بدلا باقی نے نہیں قَوْلًا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ قول سے کلام مراد ہے بنی اسرائیل کو حکم تھا کہ سجدہ کرتے ہوئے جائیں اور یہ کہتے ہوئے انہوں نے فعل تو باقی رکھا یعنی سجدہ کرتے ہوئے گئے مگر قول بدل دیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہاں قول سے مراد حکم ہے یعنی انہوں نے پورا حکم بدل دیا نہ تو سجدہ کرتے ہوئے گئے اور نہ حِطَّۃٌ کہتے ہوئے بلکہ خاموش گھس گئے اور بعضوں نے فرمایا کہ انہوں نے قول و عمل دونوں بدل دیئے کہ حِطَّۃٌ کی بجائے کچھ اور کہا اور سجدہ کی بجائے سرین کے بل چلے۔ تفسیر روح البیان نے اس جگہ لکھا کہ حق تعالیٰ نے وہ دروازہ نیچا کر دیا تھا تاکہ انہیں خود بخود جھکنا پڑ جائے لیکن یہ بیٹھ کر سرین پر گھسٹتے ہوئے داخل ہوئے تفسیر کبیر نے فرمایا کہ انہوں نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام حِطَّۃٌ کہلوا کر کھیل کرا رہے ہیں حِطَّۃٌ کیا چیز۔ یہ تیسری بات ہی زیادہ صحیح ہے کیونکہ اگلا جملہ اسی کی تائید کرتا ہے۔ اسی لئے ان کا یہ کام کفر قرار دیا گیا جس پر عذاب الٰہی آ گیا۔ پیغمبر کے کسی قول و فعل کو برا جاننا کفر ہے۔ غَیْرَ الَّذِیْ قِیْلَ لَهُمْ یہ تبدیلی کا بیان ہے کہ وہ خاموش نہ گئے کچھ کہتے ہوئے ہی گئے مگر وہ نہ کہا جو ہم نے بتایا تھا بلکہ اس کے سوا وہ بات کہی جو ہمارے حکم کے بالکل ہی خلاف تھی۔ مضمون، عبارت، مقصود سب ہی بدل دیا۔ قرآن نے یہاں سوا نہ کہا۔ غیر کہا۔ یہ بتانے کے لئے حدیث شریف میں آیا ہے کہ وہ کہتے گئے حِنْطَۃٌ فِیْ شَعِیْرَۃٍ یعنی ہم کو گیہوں اور جو دے۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ وہ کہتے ہوئے گئے۔ حِطِّیٰ سَمْهَاثَا یہ لفظ عبرانی ہے جس کے معنی ہیں سرخ یا شربتی گیہوں۔ شاید حدیث پاک میں ان کے کلام کا ترجمہ فرمایا گیا ہوگا کیونکہ ان کی زبان عبرانی تھی۔ فَاَنْزَلْنَا۔ ف سے معلوم ہوا کہ ان پر فوراً ہی بلا تاخیر عذاب آ گیا۔ عَلَی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا اس سے معلوم ہوا کہ یہ عذاب فقط مجرمین پر ہی آیا۔ نیکوکار اس سے محفوظ رہے اگر یہاں علیہم فرمایا جاتا تو غلط فہمی ہو جاتی کہ سب پر عذاب آ گیا ہو اس ظلم سے کلمہ بدلنا مراد ہے اور پہلے ظلم میں چند احتمال نیز پہلے ظلم میں گناہ کبیرہ اور صغیرہ سب ہی مراد ہو سکتے ہیں اور اس ظلم میں صرف کبیرہ ہی کیونکہ آگے ان کو فاسق فرمایا گیا۔ لہٰذا کلام میں تکرار نہیں رِجْزًا۔ رجز کے لفظی معنی سزا اور عذاب اور گندگی ہیں جیسے رجز مگر یہاں عذاب مراد ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ ان پر اچانک موت (ہارٹ فیل) کا عذاب نازل ہوا۔ بعض نے فرمایا کہ طاعون جس سے ایک ساعت میں چوبیس ہزار آدمی ہلاک ہوئے اور کئی روز تک ان میں

طاعون رہی کل ستر ہزار آدمی مرے مِّنَ السَّمَآءِ جس آسمان سے کہ ان پر من وسلوٰی کی نعمتیں آئی اسی سے اب طاعون وغیرہ آئی تفسیر عزیزی میں ہے کہ زہریلی ہوا چلی جس سے کہ ان کے خون میں زہریلا مادہ پیدا ہوا اور جس کے نرم مقامات پر گلٹیوں کی شکل میں نمودار ہوا۔ یہ عذاب اس لئے آیا کہ وہ فسق وفجور کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔

خلاصہ تفسیر

بنی اسرائیل کی سرکشی اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ بڑے سے بڑا مجرم بھی اتنی دراز قید کاٹ کر کچھ روز کے لئے سیدھا ہو جاتا ہے لیکن یہ چالیس سال قید گزارنے کے بعد جب وہاں سے چھوٹے تو ان سے کہا گیا تھا کہ تم اس شہر میں سجدہ اور توبہ کرتے ہوئے داخل ہونا انہوں نے اس فرمان عالی کو بالکل بدل ڈالا بجائے سجدہ کے اپنے سرین پر گھسٹتے ہوئے گھسے اور بغیر ندامت کے دل لگی اور مذاق کرتے ہوئے اور بجائے معافی مانگنے کے گیہوں اور جو وغیرہ مانگتے ہوئے گئے وہ سمجھے کہ نبی کی بتائی ہوئی دعا موقعہ اور وقت کے خلاف ہے ضرورت تو گندم کی ہے ہم من وسلوٰی کھاتے کھاتے اکتا گئے ہیں وہ کہتے ہیں معافی مانگو اس سے وہ لوگ عبرت پکڑیں جو آج کہتے ہیں کہ سود کی حرمت، عورتوں کا پردہ، زکوٰۃ، قربانی اس زمانہ کے مناسب تھا اب وقت دوسرا ہے اب ان احکام کی ضرورت نہیں یا ان میں ترمیم چاہئے۔ ترمیم کر کے ہی ان اسرائیلیوں کا بیڑا غرق ہوا۔ اس سرکشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ان پر آسمانی عذاب طاعون وغیرہ نازل فرمایا کیونکہ وہ عادی مجرم تھے تو اے محبوب ﷺ آپ ان کی نافرمانی سے غمگین نہ ہوں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** یہ کہ انبیاء کرام کی مخالفت سے دنیاوی عذاب بھی آجاتے ہیں اور ان کا مذاق اڑانا کفر ہے۔ **دوسرا فائدہ:** یہ کہ مومن کے لئے دنیوی تکلیفیں کفارہ گناہ ہیں جس سے کہ وہ آخرت کے عذاب سے بچ جاتا ہے کفار کے لئے نہیں جیسے کہ دنیوی نعمتیں کافروں کے لئے ان کے ظاہری نیک اعمال کا بدلہ۔ مومن کے واسطے نہیں دنیوی عذاب کافر کے لئے مثل حوالات ہے اور مومن کے دنیوی نعمت مثل بھتہ کے کہ تنخواہ اس کے علاوہ ہے۔
تیسرا فائدہ: طاعون بنی اسرائیل کے زمانہ سے شروع ہوا۔ یہ ان کے واسطے عذاب تھا اور مسلمانوں کے لئے رحمت۔ حدیث پاک میں ہے کہ جب طاعون تمہارے شہر میں واقع ہو تو وہاں سے نہ بھاگو دوسرے شہر میں ہو تو وہاں نہ جاؤ نیز حدیث صحیح میں وارد ہوا کہ جو لوگ وبا کی جگہ میں رب کی رضا پر صابر رہیں اگر وہ وبا سے محفوظ بھی رہے جب بھی شہادت کا ثواب پائیں گے۔ (تفسیر خزائن العرفان وغیرہ) مگر یہ شہادت حکماً ہوگی نہ کہ حقیقتاً اور فقہی لہٰذا ایسے شہید کو غسل وغیرہ دیا جائے گا۔ مگر انشاء اللہ قیامت میں اس کا حشر شہدا کے ساتھ ہوگا۔ **چوتھا فائدہ:** یہ کہ چند حضرات وہ ہیں جن کو شہادت کا درجہ ملتا ہے۔ ۱۔ جو پانی میں ڈوب جائے۔ ۲۔ جل کر مرے۔ ۳۔ سفر میں مرے۔ ۴۔ دب کر مرے۔ ۵۔ پیٹ کی بیماری میں مرے۔ ۶۔ طاعون سے مرے۔ ۷۔ زچہ عورت مدت نفاس میں مرے۔ ۸۔ جو جمعہ کی رات میں مرے۔ ۹۔ ذات الجنب کی بیماری میں مرے۔ ۱۰۔ طالب علمی کے زمانہ میں مرے (علم دین) ۱۱۔ جو سل یا ۱۲۔ مرگی یا ۱۳۔ بخار کی مرض

سے مرے۔ ۱۴۔ جو کسی کے عشق میں مرے بشرطیکہ پاک دامن اور عشق کو چھپانے والا ہو۔ ۱۵۔ جس کو درندہ کھا جائے۔ ۱۶۔ جس کو زہریلا جانور کاٹ لے۔ ۱۷۔ فی سبیل اللہ اذان دینے والا۔ ۱۸۔ سچا تاجر۔ ۱۹۔ حلال کی روزی کما کر بال بچوں کو پالنے والا۔ ۲۰۔ دریا کا مسافر۔ ۲۱۔ جو روزانہ پچیس بار یہ پڑھ لیا کرے۔ اَللّٰھُمَّ بَارِکْ لِیْ فِی الْمَوْتِ وَ فِیْ مَا بَعْدَ الْمَوْتِ۔ ۲۲۔ جو شخص نماز چاشت اور ہر مہینہ میں تین روزوں کا پابند ہو۔ ۲۳۔ جو وتر کا پابند ہو۔ ۲۴۔ جو روزانہ سو بار درود شریف پڑھا کرے جو شہادت کی تمنا میں رہے۔ ۲۵۔ جو تاجر ضرورت کے وقت باہر سے مسلمانوں کیلئے غلہ لائے۔ ۲۶۔ جو سنت کا پابند ہو جب کہ مسلمان سنت کو چھوڑ رہے ہوں۔ ۲۷۔ جو اپنی بیماری میں چالیس بار آیت کریمہ پڑھے۔ ۲۸۔ جو ہر رات سورۃ یٰسین پڑھنے کا پابند ہو۔ ۲۹۔ جو روزانہ صبح و شام درود شریف پڑھا کرے۔ ۳۰۔ جو روزانہ تین بار اعوذ پڑھ کر سورۃ حشر کی آخری آیتیں لَا یَسْتَوِی سے آخر تک پڑھ لیا کرے (شامی باب الشہید)

مسئلہ: جو طاعون سے مرے اس سے حساب قبر نہیں ہوتا۔ **مسئلہ:** مدینہ منورہ طاعون اور دوسرے وبائی امراض سے محفوظ ہے۔ **مسئلہ:** طاعون کی جگہ سے بھاگنا حرام ہے ہاں اگر کسی ضرورت کی وجہ سے باہر گیا تو جائز۔ **مسئلہ:** مرض اڑ کر نہیں لگتا اس کا مطلب یہ ہے کہ کفار بیماریوں میں قدرت مانتے ہیں اسی لئے ان کی پوجا کرتے ہیں چیچک اور ماتا کے بت بنا کر پوجتے ہیں یہ عقیدہ مشرکانہ ہے۔ حدیث لاعدویٰ کے یہی معنیٰ ہیں۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ کسی بیماری کی وجہ سے وہاں کی آب و ہوا بگڑ جائے جس سے دوسرے لوگ بھی بیمار ہو جائیں جیسے کہ متعفن آب و ہوا سے بچنا بہتر ہے ایسے ہی بعض بیماروں سے احتیاط کرنا بھی جائز ہے جیسے جذامی اور مدقوق وغیرہ اسی لئے بعض احادیث میں ان سے بچنے کا حکم دیا گیا۔ البتہ وبائی امراض سے بھاگنا حرام ہے۔ جس کی حکمت ہم انشاء اللہ عنقریب سوال و جواب میں بیان کریں گے۔ **پانچواں فائدہ:** موت سے کوئی تدبیر نہیں بچا سکتی۔

حکایت: جالینوس نے اپنے دوستوں کو موت کے وقت دو گولیاں دیں اور کہا کہ میرے مرنے کے بعد ایک کو لوہے پر ڈال دینا اور دوسری کو پانی کے بھرے ہوئے گھڑے میں اور پھر گھڑا توڑنا لوگوں نے ایسا ہی کیا لوہا تو اس گولی سے پگھل گیا اور پانی جم گیا اس وقت کے حکماء نے کہا ہے کہ جالینوس نے یہ دکھایا ہے کہ میں پانی کو جمانے اور لوہے کو گلانے کی قدرت رکھتا تھا مگر اپنے کو موت سے نہ بچا سکا بلکہ جو حکیم جس بیماری کے علاج میں زیادہ ماہر تھا۔ خود اس کی موت اسی بیماری سے ہوئی۔ سانپ کا منتر جاننے والا سانپ ہی سے مرتا ہے کسی نے خوب کہا ہے ؎

اَلَا یَاۤاَیُّهَا الْمَغْرُوْرُ تُبْ مِنْ غَیْرِ تَاخِیْرٍ ۔۔۔ فَاِنَّ الْمَوْتَ قَدْیَاتِیْ وَ لَوْ صُیِّرْتَ قَارُوْنَا

بِسَلٍّ مَا اَرْسَطَا لَیْسُ بُقْرَاطِ فَلَاجٍ! ۔۔۔ وَاَفْلَاطُوْنَ بِبِرْسَامٍ وَ جَالِیْنُوْسٍ مَبْطُوْنَا

یعنی ارسطو سل کی بیماری سے اور بقراط فالج سے اور افلاطون برسام اور جالینوس پیٹ کی بیماری سے مرے (تفسیر روح البیان) وبا کا علاج اہم ہے۔ شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ طاعون کا سب سے بہتر علاج تسبیح و تحلیل اور درود شریف ہے بشرطیکہ ظاہری اور باطنی شرطوں کے ساتھ ہو۔ نیز فرمایا گیا کہ وبا کے زمانہ میں سورۃ دخان شریف بلند آواز سے صبح کے وقت

پڑھنے سے جہاں تک اس کی آواز جائے وہاں تک امن رہتا ہے نیز وبا کا ایک علاج یہ بھی ہے کہ کسی نقارے یا تاشہ پر سورہ جمعہ دائرہ کی طرح لکھی جائے اور درمیان میں پندرہ کا نقش بنا دیا جائے پھر ایک خصی بکرے کو ساتھ لے کر تاشہ بجاتے ہوئے سارے شہر میں گشت لگایا جائے مگر شرط یہ ہے کہ چوب نقش پر پڑے نہ کہ حرفوں پر پھر کنارہ شہر پر پہنچ کر وہ جانور ذبح کر کے اس کا گوشت خیرات یا دفن کر دیا جائے۔ انشاء اللہ وبا سے امن ملے گی نیز اس زمانہ میں بلند آواز سے اذانیں کہنا بھی مفید ثابت ہوا ہے اس لئے کہ طاعون جنات کا اثر ہے اور غلبہ جن کے وقت اذان کہنا سنت ہے (شامی باب الاذان) **چھٹا فائدہ:** رب کا فرمان بدلنا باعث عذاب ہے جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوا مسئلہ قرآن کے الفاظ یا اس کے متواتر معنی یا مقصود کو دیدہ دانستہ بدلنا کفر ہے جو شخص عمداً ض کو ظ پڑھے وہ بھی کافر ہے (شرح فقہ اکبر) ہاں اگر قرآنی آیت تلاوت کی نیت سے نہ پڑھی جائے بلکہ دعا یا جواب کی نیت سے تو اس میں زیادتی کمی یا تبدیلی وغیرہ جائز ہے کیونکہ اس صورت میں یہ آیت ہی نہیں ہے بلکہ وہ اپنا کلام ہے جیسے کسی نے آپ کی مزاج پرسی کی آپ نے اس کو جواب میں کہ دیا۔ الحمد للہ رب العالمین الکریم الروف الرحیم یا جیسے کہ حفاظ تلاوت سے پہلے کہتے ہیں ببرکت بسم اللہ السمیع العلیم الرحمن الرحیم اسی کا نام اقتباس اور قرآن سے اقتباس جائز ہے (شامی کتاب الجہاد) کیونکہ اب یہ ہمارا کلام ہو گیا اسی واسطے اس نیت سے جنبی کو پڑھنا جائز اور نمازی کو پڑھنا منع ہے بلکہ اس کی نماز کو باطل کر دے گا دعاؤں اور وظیفوں کے الفاظ بدلنے سے ان کی تاثیر جاتی رہتی ہے صرف ثواب باقی رہ جاتا ہے۔ دلائل الخیرات میں ایک درود شریف چودہ بار پڑھا جاتا ہے کسی شاگرد نے اپنے شیخ الدلائل شاہ عبدالحق الہ آبادی سے پوچھا کہ ہم پندرہ بار کیوں نہ پڑھ لیں انہوں نے جواب میں کہا کہ جس قفل میں چار دانت والی چابی پڑتی ہے وہ پانچ دانت والی چابی سے نہیں کھلتا۔ پندرہ بار سے ثواب تو مل جائے گا مگر دروازہ نہ کھلے گا۔ حدیث شریف میں ہے کہ نبی ﷺ نے ایک صحابی کو سوتے وقت کی ایک دعا تعلیم فرمائی جس میں تھا اٰمَنْتُ بِنَبِیِّکَ الَّذِیْ اَرْسَلْتَ انہوں نے اٰمَنْتُ بِرَسُوْلِکَ الَّذِیْ اَرْسَلْتَ پڑھا دیکھو نبی اور رسول یہاں ہم معنی ہیں لیکن حضور نے فرمایا نہیں وہ ہی کہو بِنَبِیِّکَ الَّذِیْ کیونکہ دعا میں الفاظ کے ساتھ زبان کی تاثیر بھی درکار ہے۔ تلوار کی دھار کے ساتھ وار کی بھی ضرورت ہے۔ زبان کی تاثیر انہی الفاظ میں ہے جو شیخ سے منقول ہوں مگر جو دعائیں اور اذکار عبادات میں درکار ہیں ان میں اگر الفاظ بدل جائیں اور مضمون باقی رہے تو عبادت درست ہو جائے گی۔ لہٰذا اگر کوئی نماز کی تکبیروں میں بجائے اللہ اکبر کے اللہ عظیم یا الرحمٰن اکبر کہ دے تب بھی نماز جائز ہے۔ اسی طرح اگر ذبح کرتے وقت بجائے بسم اللہ اللہ اکبر کے رب کا کوئی بھی نام لے لیا تب بھی ذبح درست ہے۔ اگرچہ ثواب کم ہو جائے گا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: چاہئے کہ ذکر و دعا میں بالکل فرق نہ کیا جائے کیونکہ بنی اسرائیل نے دعا کے لفظ ہی بدلے تھے جس سے ان پر عذاب آگیا تھا۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر چکا ہے انہوں نے صرف لفظ نہ بدلے تھے بلکہ عبارت، معنیٰ، مقصود سب بدل دیا تھا اور پیغمبر کا مذاق اڑاتے ہوئے گئے تھے یہ کفر ہوا اس وجہ سے ان پر عذاب آیا الحمد للہ کوئی

مسلمان یہ نہیں کرتا۔ محض آسانی کے لئے تبدیلی الفاظ کی اجازت دی گئی ہے کہ اگر کسی کو دعا قنوت یا دعا جنازہ یاد نہ ہو اور اللہ اکبر اس سے صحیح ادا نہ ہوتا ہو تو اس لئے نماز نہ چھوڑ دے بلکہ یہ مضمون دوسرے الفاظ میں ادا کر دے۔ **دوسرا اعتراض:** جب قحط سالی اور دوسری بلاؤں سے بھاگنا جائز ہے تو طاعون سب سے سخت بلا ہے اس سے بھاگنا کیوں حرام ہے؟ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ **ایک** یہ کہ وبا میں اکثر اپنے اہل قرابت اور دوست احباب بیمار ہو جاتے ہیں جس سے وہ بھاگ نہیں سکتے اگر اس موقعہ پر تندرستوں کو بھاگنے کی اجازت دی جائے تو ان بیماروں کی تیمارداری کون کرے یہ لوگ یقیناً سخت تکلیف سے مریں گے اور ان کو گور و کفن بھی میسر نہ ہوگا۔ اس لئے یہاں ٹھہرنا بہت ثواب کا کام ہے جیسے جہاد کی صف میں ٹھہرنا۔ قحط سالی و دیگر بلاؤں میں یہ بات نہیں وہاں سب بھاگ سکتے ہیں بلکہ مفلس اور غریب ہی پہلے بھاگتے ہیں۔ (تفسیر عزیزی) میں نے خود دیکھا کہ ایک بار بدایوں میں طاعون پڑی۔ مسلمانوں کے جنازے بہت عزت و احترام سے جاتے تھے ان کے ساتھ بڑا مجمع اور آگے نعت خوانی ہوتی تھی۔ ہندوؤں کی لاشوں کو حکومت نے چھکڑوں اور بیل گاڑیوں میں لدوا کر پھنکوایا۔ یا زمین میں دبوایا۔ کیونکہ تندرست ہندو انہیں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اس واقعہ سے کئی ہندو مسلمان ہو گئے۔ **دوسرا جواب** یہ ہے کہ طاعون وباخبیث جنات کے اثر سے ہے اسی لئے اس کو طاعون کہتے ہیں۔ کیونکہ یہ طعن سے بنا ہے جس کے معنی نیزہ مارنا۔ طاعونی بیمار کو بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ میرے کوئی برچھیاں مار رہا ہے ان کے مقابلے سے بھاگنا گویا اس سے ڈر جانا جس طرح ظاہری جہاد میں کفار کے مقابلہ سے بھاگنا منع ہے ایسے ہی وباؤں کے مقابلے سے بھی۔

تفسیر صوفیانہ

نفوس کو دنیا کی بستی میں بھیجا گیا اور اس کو حکم دیا گیا کہ اعضاء جسم کو جس طرح چاہے استعمال کر اور دنیا کی نعمتیں خوب کھا اور پی لیکن دروازہ حیات میں رب کی اطاعت کرتے ہوئے اور توبہ کرتے ہوئے جانا تیری خطائیں معاف ہوں گی اور تجھے بڑا اجر دیا جائے گا۔ مگر اس ظالم نفس نے نہ کہنے کی بات کہی اور نہ کرنے کے کام کئے۔ دنیا کی طلب میں ایسا مشغول ہوا کہ آخرت کو بالکل بھول گیا۔ فکر معاش میں خیال معاد سے غافل ہو گیا۔

عمر گراں مایہ دریں صرف شد   تاچہ خورم صیف وچہ پوشم شتاء

کھانا ذکر الٰہی کے لئے تھا مگر نفس نے سمجھا کہ زندگی کھانے کے لئے ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس غافل نفس پر عذاب الٰہی موت کی شکل میں نمودار ہوا اور وہ تمام دنیاوی جمع کی ہوئی نعمتیں چھوڑ کر چل دیا۔ خیال رہے کہ موت غافل کے لئے عذاب آسمانی اور عاقل کے لئے ذریعہ شادمانی اور راحت جاودانی ہے اسی لئے اللہ والوں کے موت کے دن کو عرس یعنی شادی کا دن کہتے ہیں حق تعالیٰ غفلت کی زندگی سے بچائے۔

دوسری تفسیر صوفیانہ

عقائد، فرائض، واجبات، نوافل، مستحبات دولت ایمان کی محافظ دیواریں ہیں۔ عقائد پہلی دیوار اور مستحبات آخری جولب سڑک

ہوتی ہے۔ چور پہلے کنارہ والی دیوار کو توڑتا ہے اگر وہاں ہی حفاظت کر لی گئی تو دولت محفوظ رہے گی ورنہ چور اور دیواروں کو بھی توڑے گا۔ شیطان چور پہلے مستحبات پھر سنتیں پھر واجبات پھر فرائض چھڑواتا ہے پھر عقائد پر حملہ کرتا ہے گناہ صغیرہ وہ ہے جسے انسان چھوٹا سمجھے۔ کبیرہ وہ ہے جسے انسان معمولی جانے ان لوگوں نے حِطَّةٌ کو معمول سمجھ کر چھوڑ دیا آفت آ گئی۔

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ
اور جب پانی مانگا موسیٰ نے واسطے قوم اپنی کے پس کہا ہم نے مارو تم لاٹھی اپنی پتھر کو
اور جب موسیٰ نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا تو ہم نے فرمایا اس پتھر پر اپنا عصا مارو
الْحَجَرَ ؕ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ؕ قَدْ عَلِمَ كُلُّ
پس بہنے لگے اس سے بارہ چشمے بیشک جان لیا ہر گروہ نے گھاٹ اپنا
فوراً اس میں سے بارہ چشمے بہہ نکلے ہر گروہ نے اپنا گھاٹ پہچان لیا
اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ؕ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا
کھاؤ تم اور پیو تم لوگ رزق سے اللہ کے اور نہ
کھاؤ اور پیو خدا کا دیا اور
تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ﴿۶۰﴾
پھیلو تم زمین میں فساد کرتے ہوئے
زمین میں فساد اٹھاتے نہ پھرو

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **ایک** یہ کہ اس سے پہلے بنی اسرائیل پر آٹھ احسانات کا ذکر ہو چکا اب نویں احسان کا ذکر ہے جو کہ بہت بڑا اور عجیب قسم کا احسان ہے اس لئے کہ خشک جنگل میں جہاں پانی کی امید نہ ہو پیاسوں کو پانی مل جانا بہت بڑی نعمت ہے اور ایسی جگہ سے پانی ملنا جو کہ بالکل خلاف عادت ہو بہت ہی عجیب احسان ہے **دوسرے** یہ کہ اب تک ان نعمتوں کا ذکر ہوا جس کی بنی اسرائیل نے ناشکری کی اب اس نعمت کا ذکر ہے جس کی بظاہر ناشکری تو نہ کی لیکن اس سے ان کی فرقہ بندی اور اختلافات ظاہر ہوئے کیونکہ وہ سب ایک چشمے میں پانی نہ پی سکے **تیسرے** یہ کہ اب تک کھانا عطا فرمانے کا ذکر ہوا تھا۔ اور کھانا بغیر پانی استعمال نہیں کیا جا سکتا اس لئے اب پانی کا ذکر ہوا ہے جیسے کہ کھانا یعنی من و سلویٰ عجیب طریقے سے ان کو دیا گیا ایسے ہی پانی میں **چوتھے** یہ کہ اس سے پہلے من و سلویٰ کا ذکر ہوا جو ان کے لئے دینوی نعمت تھی جس سے کہ ان کا پیٹ بھرتا تھا اب اس پانی کا ذکر ہوا جو ان کے لئے دینوی نعمت بھی تھی اور دینی بھی اس سے

پیاس بھی بجھتی تھی اور ایمان بھی ملتا تھا کہ یہ موسیٰ کا معجزہ تھا جس سے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اور موسیٰ علیہ السلام کی نبوت ثابت ہوئی۔ **پانچویں** یہ کہ اس سے پہلے آسمانی نعمتوں کا ذکر ہوا یعنی ابر کا سایہ کرنا اور من وسلویٰ کا برسنا اب زمینی نعمتوں کا ذکر ہو رہا ہے یعنی پتھر سے پانی وغیرہ کا نکلنا۔

تفسیر

وَاِذِ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ ایک سفر میں درپیش آیا جب کہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو کہیں لئے جارہے تھے اور وہ پیاسے ہو کر ان سے پانی مانگنے لگے مگر تفسیر کبیر نے فرمایا کہ عام مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ میدان تیہ کے زمانہ قیام میں ہوا کہ رب تعالیٰ نے ان کے رہنے کے لئے بادل کا سایہ فرمایا اور کھانے کے لئے من وسلویٰ اتارا۔ لباس کا وہ انتظام کیا جو ہم پہلے بیان کر چکے تب موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ مولیٰ پانی کا بھی انتظام فرما اسْتَسْقٰى مُوْسٰى موسیٰ علیہ السلام سے اولاد بنی اسرائیل نے پانی مانگا پھر انہوں نے رب سے جیسا کہ سورہ اعراف میں ہے اِذِ اسْتَسْقٰهُ قَوْمُهٗ (اعراف: ۱۶۰) لہٰذا یہ آیت اس کے خلاف نہیں قوم نبی سے پانی مانگتی تھی نبی اللہ سے کہتے۔ دیتا وہ ہے۔ بانٹتے یہ ہیں ان سے مانگنا شرک نہیں رب کی مرضی کے، منشاء کے عین مطابق ہے۔ یہ لفظ سَقی سے بنا ہے جس کے معنی ہیں بارش سے سیرابی لہٰذا استسقے کے معنی ہیں بارش مانگی اس صورت میں رب نے طلب سے زیادہ دیا کہ بادل سے پانی مانگا تھا پتھر سے نکال کر عطا فرمایا سقی کے معنی ہیں مطلق سیرابی جیسے کہ وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا (الدھر: ۲۱) لہٰذا جو مانگا تھا وہی ملا لِقَوْمِهٖ قوم کے معنی ہم پہلے بیان کر چکے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ انہوں نے صرف اپنی قوم کے لئے پانی مانگا تھا نہ کہ سارے جہان کے لئے نیز فقط پینے کے لئے مانگا نہ کہ کھیتی باڑی کے لئے اسی لئے ان پر بارش نہ آئی بلکہ پتھر سے پانی نکلا۔ ہمارے نبی علیہ السلام نے استسقاء کے موقعہ پر سارے جہان کے لئے پانی مانگا اور فقط پینے کے لئے نہیں بلکہ کھیتی باڑی کے لئے اس لئے آپ کی دعا پر بارش آئی فَقُلْنَا اضْرِبْ یا تو بطور الہام رب نے فرمایا یا بطریق وحی بِّعَصَاكَ معلوم ہوا کہ لاٹھی سے پتھر کو مارنے کا حکم تھا نہ کہ پتھر سے لاٹھی کو یعنی زمین پر رکھے ہوئے پتھر پر لاٹھی ماریئے موسیٰ علیہ السلام کا عصا جنت کے درخت آس کی لکڑی تھی جو آدم علیہ السلام وہاں سے اپنے ساتھ لائے اور ان سے منتقل ہوتا ہوا حضرت شعیب علیہ السلام تک پہنچا تھا جب موسیٰ علیہ السلام نے ان کی بکریاں چرائیں تو یہ ان کو دیا گیا یہ موسیٰ علیہ السلام کے قد کی طرح دس ہاتھ تھا اس میں دو شاخیں تھیں جو تاریکی میں دو مشعلوں کی طرح چمکتی تھیں موسیٰ علیہ السلام اس عصا سے بکریوں کے لئے پتے بھی جھاڑتے تھے اور اس پر تکیہ بھی لگاتے تھے دیگر ضروریات بھی اس سے پوری فرماتے تھے اس میں چند خصوصیات تھیں دریائے قلزم کو اسی عصا سے خشک کیا گیا یہاں پتھر سے اس کے ذریعے پانی نکالا گیا۔ یہ عصا سانپ بن کر موسیٰ کی حفاظت کرتا تھا اور پھر پکڑ لینے پر لاٹھی ہو جاتا تھا اندھیری رات میں مشعل کا کام دیتا تھا پھر خوبی یہ کہ موسیٰ کے ہی ہاتھ میں یہ کام کرتا تھا نہ تو اس سے پہلے کسی نبی کے دست مبارک یہ معجزات اس سے ظاہر ہوئے اور نہ آپ کے زمانہ میں کسی دوسرے ہاتھ میں اسی لئے کہتے ہیں کہ کمالات عصا کے لئے ید بیضا چاہئے۔ غالباً اس کو عصا اس واسطے کہتے ہیں کہ یہ عصو یا عصی سے بنا ہے جس کے معنی ہیں نافرمانی اس ہی لفظ

سے عصیان اور معصیت بنا چونکہ یہ فرعون وغیرہ نافرمانوں کی اصلاح کے لئے عطا ہوا تھا اس لئے اس کو عصا کہا گیا پھر ہر لاٹھی کو عصا کہنے لگے اَلْحَجَرَ اس میں اختلاف ہے کہ پتھر سے کوئی خاص پتھر مراد ہے یا عام یعنی اس میں الف لام جنسی ہے یا عہدی بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ وہی پتھر ہے جو موسیٰ علیہ السلام کے کپڑے لے کر بھاگا جس کا ذکر سورہ احزاب میں ہے حضرت جبرائیل علیہ السلام نے عرض کیا تھا کہ آپ اس کو کسی تھیلے میں سنبھال کر رکھیں اس سے معجزات صادر ہوں گے بعض نے فرمایا کہ یہ طور کا پتھر تھا بعض فرماتے ہیں کہ یہ پتھر بھی عصا کی طرح جنتی تھا جس کو آدم علیہ السلام اپنے ہمراہ لائے تھے اور انبیاء کرام میں منتقل ہوتا ہوا شعیب علیہ السلام تک پہنچا اور انہوں نے عصا کے ساتھ موسیٰ کو یہ پتھر بھی عنایت فرمایا یہ پتھر سنگ مرمر تھا۔ دو دو گز مربع یعنی ایک گز لمبا اور ایک گز چوڑا تھا بعض نے فرمایا کہ اس سے عام پتھر مراد ہے یعنی جس پتھر پر آپ عصا مارتے اس سے ہی پانی جاری ہو جاتا تھا یہ حسن بصری اور وہب ابن منبہ کا قول ہے اور یہ ہی زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے (تفسیر عزیزی و روح البیان) کیونکہ اس صورت میں اعلیٰ معجزہ ظاہر ہوگا اگر کوئی خاص پتھر ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس پتھر کی تاثیر تھی فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ یہاں ایک عبارت پوشیدہ ہے یعنی موسیٰ نے عصا مارا پس پتھر سے بارہ چشمے بہ نکلے تفسیر عزیزی نے فرمایا کہ آپ نے پتھر پر بارہ چوٹیں ماریں اور ہر چوٹ سے چشمہ جاری ہوا۔ ہر جگہ عورت کا سا پستان ظاہر ہوا تھا جس سے پہلے عرق سا آتا اور پھر قطرہ قطرہ ٹپکتا پھر پانی بہنے لگتا اِنْفِجَار فجر سے بنا ہے جس کے معنی ہیں پھٹنا یا چر جانا صبح صادق کو اسی لئے فجر کہتے ہیں کہ اس وقت سیاہی پھٹ کر سفید ڈورے نمودار ہوتے ہیں بدکار آدمی کو اسی لئے فاجر کہتے ہیں کہ وہ اپنی بدکاری سے مسلمانوں کی جماعت میں شگاف پیدا کر دیتا ہے (تفسیر کبیر) تو آیت کا مطلب یہ ہوا کہ موسیٰ کے عصا مارنے سے پتھر میں شگاف پیدا ہوا اور اس سے پانی بہنے لگا پانی بہنے کو بھی انجار اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ پانی کسی جگہ شگاف کر کے نکلتا ہے یا تو قدرتی طور پر پتھر میں پانی پیدا ہو جاتا تھا یا وہ پتھر زمین سے اس طرح پانی کھینچ لیتا تھا جیسے کہ مقناطیس لوہے کو، یا آج کل نل پانی کو یا اس پتھر سے اردگرد کی ہوا مس کر کے پانی بن جاتی تھی جیسے کہ آج بھی ٹھنڈے برتن سے چھو کر ہوا پانی بن جاتی ہے۔ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا چونکہ میدان تیہ میں بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے اگر ان سب کے لئے ایک ہی گھاٹ ہوتا تو وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے اس لئے رب تعالیٰ نے بارہ چشمے جاری فرمائے تاکہ ان میں جھگڑا پیدا نہ ہو۔ اس پتھر کی ہر سطح سے تین تین چشمے پھوٹتے تھے موسیٰ نے ہر گروہ کو حکم دیا تھا کہ علیحدہ علیحدہ بارہ گہرے گڑھے کھود لیں پتھر سے پانی آ کر ان گڑھوں میں جمع ہو جاتا اور ہر گروہ اپنے کام میں لاتا قَدْ عَلِمَ كُلُّ أُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ان میں سے ہر گروہ نے اپنا گھاٹ پہچان لیا تھا اور کوئی دوسرے کے گھاٹ سے پانی نہ لیتا تھا اس میں سے اشارۃً فرمادیا گیا کہ جب موسیٰ کی زندگی پاک ہی میں ان میں آپس میں اتنا اختلاف تھا کہ ایک گھاٹ سے پانی بھی نہ پی سکتے تھے تو ان کی وفات کے بعد ان میں اتفاق و محبت کی کیا امید ہو سکتی ہے۔ یہ لوگ وہاں چھ لاکھ تھے اور بارہ میل میدان میں قیام کئے ہوئے تھے۔ علیحدہ علیحدہ بارہ محلے سے قائم تھے ہر خ۔ میں ایک نہر پہنچتی تھی اور ان کے کھودے ہوئے گڑھے میں گرتی تھی كُلُوا وَاشْرَبُوا مِن رِّزْقِ اللَّهِ یا تو رب تعالیٰ ۔ موسیٰ ۔ ذریعے ان سے کہلوایا یا خود موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا لہٰذا اس جگہ یا تو قُلْنَا پوشیدہ ہے یا قَالَ یعنی ہم نے یا موسیٰ

نے فرمایا کہ اے اسرائیلیو! تم خوب کھاؤ پیو اللہ کا وہ رزق جو کہ تم کو بلا محنت و مشقت عطا ہوا کہ بغیر کھیتی باڑی کے من وسلویٰ مل رہا ہے اور بغیر کنواں وغیرہ کھودے ہوئے پانی لیکن یہ نعمتیں کھا کر وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ زمین میں فساد برپا کرتے نہ پھرو بلکہ اس کا شکر بجالاؤ لفظ تعثوا۔ عثیٰ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں خوب فساد پھیلانا لا تعثوا میں فساد برپا کرنے سے منع فرمایا گیا آگے مفسدین فرما کر بتلایا جا رہا ہے کہ فساد ان کے دلوں میں جم چکا ہے تو خلاصہ مضمون یہ ہوا کہ تم دراصل مفسد تو ہو مگر مہربانی فرما کر اس زمین میں فساد نہ پھیلانا اور اپنی عادت فساد کو یہاں ظاہر نہ کرنا (تفسیر عزیزی)

خلاصہ تفسیر

اے بنی اسرائیل رب کی یہ نعمت بھی یاد کرو جب کہ میدان تیہ میں تمہارے سائے اور خوراک ولباس کا انتظام ہو چکا تو موسیٰ نے تمہارے لئے رب سے پانی مانگا ہم نے جیسے کہ وہاں تم کو غذا ایک عجیب وغریب طریقہ سے عطا فرمائی ایسے ہی پانی بھی کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ آپ اپنا عصا پتھر پر ماریں انہوں نے ایسا ہی کیا تب پتھر سے بارہ چشمے جاری ہو گئے تمہارے بارہ قبیلوں میں ہر قبیلے نے اپنا گھاٹ خوب پہچان لیا اور ہر طرح آرام سے پانی حاصل کیا ہم نے فرمایا کہ ہم ان نعمتوں کا شکر صرف یہ چاہتے ہیں کہ تم آئندہ زمین میں فساد انگیزی سے بچو رب کی نعمتیں خوب سیر ہو کر کھاتے پیتے رہو پتھر سے پانی نکلنے کا واقعہ کئی دفعہ اور کئی جگہ پیش آیا ایک تو یہاں مقام تیہ میں اور دوسرے جب کہ یہ لوگ ایلیم میں پہنچے وہاں بھی ان کو بارہ چشمے پانی کے اور ستر درخت کھجور کے عطا ہوئے تیسری بار جبکہ یہ لوگ مقام قادس میں پہنچے یا تو ہر جگہ اسی پتھر سے پانی نکلا یا علیحدہ علیحدہ پتھروں سے (تفسیر حقانی) خیال رہے کہ یہاں نہ تو یہ فرمایا گیا کہ بنی اسرائیل نے رب سے پانی مانگا اور نہ یہ فرمایا کہ موسیٰ نے اپنے لئے پانی مانگا تاکہ تین باتوں کی طرف اشارہ ہو ایک یہ کہ اے اسرائیلیو! تم نے ہمیشہ موسیٰ کو دکھ دیا مگر انہوں نے ہمیشہ تمہیں آرام دیئے تم بے وفا ہو اور وہ وفادار دوسرے یہ کہ اگر براہ راست تم ہم سے پانی مانگتے تو ہم نہ دیتے کہ تم مستحق عذاب تھے موسیٰ کی وساطت ان کے رحم وکرم سے ہم نے تمہیں پانی دیا اچھوں کے صدقے بروں پر رحمت ہو جاتی ہے تیسرے یہ کہ وہاں موسیٰ نے اپنے لئے پانی نہ مانگا قوم کے لئے مانگا قوت قدسیہ والے کھانے پینے کے چنداں حاجت مند نہ ہوتے ہمارے حضور روزہ وصال میں بہت روز تک کچھ نہ کھاتے پیتے تھے عیسیٰ تقریباً دو ہزار سال سے بغیر کھائے پیئے سو رہے ہیں۔ سلطان العارفین بایزید بسطامی نے تین سال تک پانی نہ پیا۔ اسی طرح موسیٰ بغیر کھائے پیے عرصہ گزار سکتے تھے تمہاری خاطر پانی مانگا تا شکرو شکریہ ادا کرو اور نبی آخر الزمان پر ایمان لے آؤ۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** یہ کہ اپنے ساتھ لاٹھی رکھنا سنت ہے دیگر انبیاء کرام کا بھی عمل رہا ہے اور خود ہمارے نبی علیہ السلام کا قول بھی مشہور ہے کہ بعض وقت بھائی ساتھ چھوڑ جاتا ہے مگر لاٹھی نہیں چھوڑتی۔ **دوسرا فائدہ:** یہ کہ پتلا بید یا چھوٹی قمچی سے سنت ادا نہ ہوگی بلکہ اپنے قد کے برابر لاٹھی ہونی چاہئے یا سینے تک موسیٰ کی لاٹھی قد کے برابر اور حضور کے سینہ تک تھی حضور کی لاٹھی کے نیچے لوہے کا گولا بھی ہوتا تھا جس سے بوقت ضرورت استنجا کے

لئے ٹہنیاں بھی توڑا جاسکتا تھا اور جنگل میں نماز پڑھتے وقت سامنے گاڑ کر سترہ کا بھی کام لیا جاتا تھا اس بنوٹ وغیرہ میں بھی وہی لاٹھی زیادہ کام دیتی ہے جو سینے تک ہو۔ **تیسرا فائدہ:** یہ کہ استسقاء یعنی رب سے پانی طلب کرنا سنت ہے حضور نے کبھی تو فقط دعا ہی فرمائی اور کبھی اس کے لئے نماز استسقاء بھی پڑھی اب بھی ہر طرح جائز ہے۔ بہتر یہ ہے کہ جب بارش کی دعا کرنی ہو تو اولاً توبہ کریں پھر صدقہ خیرات کریں اگر روزہ بھی رکھیں تو بہتر ہے پھر معمولی لباس پہن کر عاجزی کرتے ہوئے عیدگاہ وغیرہ میں جائیں جانور اور کمزور بچوں کو بھی ساتھ لے جائیں کفار مشرکین کو ہرگز ہمراہ نہ لیں پھر وہاں نماز استسقاء ادا کریں اور دعا کریں تین روز تک یہ عمل کریں بارش کے لئے یہ دعا بہت نافع ہے۔ اَللّٰهُمَّ اَغِثْنَا غَيْثًا مُغِيْثًا هَنِيْئًا مَرِيْئًا مَرِيْعًا غَدَقًا مُجَلِّلًا سَحًّا صَبًّا (درمختار و شامی) اگر یہ الفاظ بھی کہہ لئے جائیں تو بہتر ہے نَافِعًا غَيْرَ ضَارٍّ عَاجِلًا غَيْرَ اٰجِلٍ کہ احادیث سے ثابت ہے جب رب تعالیٰ بارش بھیجے تب دعا مانگنا مستحب ہے اور بہتر ہے کہ صحن میں کھڑے ہو کر وہ پانی اپنے سینے اور منہ پر لے اور اگر سنے کہ فلاں ملک میں بارش نہیں تو ان کے لئے بھی دعا کرنا مستحب ہے مگر اس صورت میں نماز نہ پڑھی جائے۔ **چوتھا فائدہ:** یہ کہ حضور کے معجزات اس سے بالاتر ہیں موسیٰ نے تو پتھر سے بارہ چشمے نکالے مگر حضور نے اپنی انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری فرمادیئے ایک بار سفر میں پانی کی تنگی ہوئی صحابہ کرام نے عرض کیا فرمایا کسی پیالے میں تھوڑا پانی لاؤ لایا گیا دست مبارک رکھ دیا اور پندرہ سو آدمیوں کو پلا بھی دیا۔ غسل وضو بھی کرایا اور پیاسے جانوروں کو سیراب بھی فرمادیا خالی برتن اور مشکیزے بھی بھروا دیئے حضرت جابر نے سوچا کہ دیکھوں یہ پانی کہاں سے آ رہا ہے نظر کی تو مبارک انگلیوں سے جاری تھا

انگلیاں ہیں فیض پر ٹوٹے ہیں پیاسے جھوم کر ندیاں پنجاب رحمت کی ہیں جاری واہ واہ

پتھر سے پانی نکلنا آسان ہے پہاڑوں وغیرہ سے نکلتا رہتا ہے مگر انگلیوں سے جاری ہونا بہت ہی عجیب ہے اور یہ تو بار بار ہوا کہ کسی بوڑھی عورت کے مشکیزے سے کسی کے برتن سے صدہا آدمیوں کو پانی پلادیا مگر اس میں سے ایک قطرہ کم نہ ہوا۔ دیکھو مشکوٰۃ شریف (باب المعجزات) میرے آقا نے تو دودھ کی نہریں بھی جاری فرمائی ہیں کہ ہجرت کے سفر میں ام معبد کی خشک بکری کے تھن کو ہاتھ مبارک لگایا جس سے تھن دودھ سے بھر گئے اور اس قدر دودھ نکلا کہ ساتھیوں نے پیا ام معبد کے گھر والوں نے پیا اور تمام گھر کے برتن بھر گئے پتھر سے پانی کے بارہ چشمے نکلنا بیشک بڑا معجزہ ہے مگر دودھ کی دو نہریں خشک بکری کے تھنوں سے جاری ہونا بہت بڑا معجزہ عیسیٰ نے دعا فرما کر آسمان سے غیبی خوان کھانے سے بھرا ہوا منگوایا مگر میرے شہنشاہ نے حضرت جابر کے گھر چار سیر جو کے آٹے اور تھوڑے سے گوشت سے سارے لشکر والوں اور مدینہ والوں کو سیر فرمادیا گوشت کی بوٹیاں شوربا اور شوربے کا مصالحہ آٹا وغیرہ تمام چیزیں جنت سے منگا کر حضرت جابر کی ہانڈی سے نکال کر سب کو کھلادیں موسیٰ نے پتھر سے پانی نکالا بیشک بڑا معجزہ ہے مگر میرے شہنشاہ نے منبر پر کھڑے ہو کر ایک بار دعا بارش فرمائی ابھی منبر سے نیچے نہ آئے تھے کہ پانی برسنے لگا اور نماز جمعہ پڑھتے پڑھتے مدینہ پاک کی گلی کوچوں میں بہنے لگا دوسرے جمعہ کو اس منبر پر کھڑے ہو کر جو انگشت پاک کا اشارہ فرمایا تو بادل پھٹ گیا اور جہاں حکم دیا وہاں جا کر برسا معلوم ہوا کہ موجودہ انبیاء

کرام کی حکومت زمین اور زمینی چیزوں پر ہے مگر سید الانبیاء کی سلطنت زمین، آسمان بلکہ دونوں جہان میں ہے اس کے لئے ہماری کتاب سلطنت مصطفیٰ کا مطالعہ کرو غرض حضور کے معجزات سب معجزات سے اعلیٰ ہیں۔ **پانچواں فائدہ:** یہ کہ رب تعالیٰ اپنی نعمتیں انبیاء کرام کے ذریعہ عطا فرماتا ہے بلاواسطہ کسی کو نہیں دیتا وہ قادر تھا کہ پتھر سے بغیر عصا مارے ہی پانی عطا فرمادے مگر نہ فرمایا بلکہ موسیٰ کا واسطہ درمیان میں رکھا کہ وہ عصا ماریں تب بنی اسرائیلوں کو پانی ملے تاکہ ان کی عظمت لوگوں کے دلوں میں قائم ہوجائے اور اس سے سمجھ جائیں کہ دنیا کی طرح آخرت کی نعمتیں بھی انہی حضرات کی نظر کرم سے ملیں گی دیکھو ایوب علیہ السلام کو جب شفا دینی ہوئی تو ان سے فرمایا اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌ (ص:۴۲) اپنا پاؤں رگڑو جس سے چشمہ پیدا ہوا فرمایا پیو اور اس سے نہاؤ جب حضرت یعقوب کی آنکھیں منور کرنا منظور ہوئیں تو حضرت یوسف کی قمیص کا واسطہ بیچ میں رکھا کہ وہ آنکھوں سے لگے آنکھیں روشن ہوں۔ فرمایا اِذْهَبُوْا بِقَمِيْصِيْ (یوسف:۹۳) غرضیکہ دیتا خود ہے مگر اپنے محبوبوں کے واسطے سے جیسے دنیا میں سب شفا، رزق، انصاف وغیرہ رب ہی دیتا ہے مگر لوگوں کی معرفت سے اس توسل سے دنیا قائم ہے اگر یہ توسل نہ ہو تو دنیا ختم ہوجائے ایسے ہی دنیا و آخرت میں سب کچھ رب ہی دیتا ہے مگر محبوبوں کی معرفت سے اگر یہ معرفت نہ ہو تو آخرت کا انتظار ختم ہوجائے۔ **چھٹا فائدہ:** یہ کہ رب سے جو مانگنا ہو وہ اگر انبیاء سے مانگا جائے تو بھی درست ہے کیونکہ بنی اسرائیل ہر موقعہ پر موسیٰ ہی سے شکایت کرتے تھے اور آپ یہ نہ فرماتے تھے کہ تم مشرک ہوگئے تم نے رب کو چھوڑ کر مجھ سے کیوں شکایت کی بلکہ ان کا حاجت روائی فرماتے تھے یہ ہی طریقہ صحابہ کرام کا تھا کہ ہر دکھ درد مصطفیٰ سے عرض کرتے دیکھو ہماری کتاب جاء الحق **ساتواں فائدہ:** یہ کہ مفت نعمتیں ملنے اور مصیبتیں نہ آنے سے لوگ فساد برپا کرتے ہیں بنی اسرائیل نے بغیر مشقت غذائیں کھائیں پانی پیا تو آپس میں ایسے جھگڑے کہ ایک جگہ سے پانی بھی نہ پی سکے **آٹھواں فائدہ:** یہ کہ فساد سے نعمتیں چھین لی جاتی ہیں جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کو فرمایا گیا کہ نعمتیں تو کھاؤ پیو مگر فساد نہ پھیلانا ورنہ سلب ہوجائیں گی۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: یہاں فرمایا گیا فَانْفَجَرَتْ یعنی پتھر سے پانی خوب بہ نکلا اور سورہ اعراف میں فرمایا گیا فَانْۢبَجَسَتْ (اعراف:۱۶۰) یعنی تھوڑا تھوڑا نکلا (یعنی صرف رسا) ان دونوں آیتوں میں تعارض ہے۔ **جواب:** اولاً تو پانی تھوڑا تھوڑا نکلتا تھا پھر خوب بہنے لگتا تھا وہاں پہلی حالت بیان ہوئی اور یہاں آخری **دوسرا اعتراض:** جب ابر کا سایہ اور من وسلویٰ کا اترنا اور پانی کا جاری ہونا ایک ہی میدان میں ہوا تو اس کو علیحدہ علیحدہ آیت میں کیوں بیان فرمایا۔ سب ایک ساتھ ہی کیوں نہ فرمادیئے گئے۔ **جواب:** وہ نعمتیں آسمانی تھیں اور یہ زمینی ان نعمتوں میں اسرائیلیوں کا اختلاف ظاہر نہ ہوا اس سے ظاہر ہوا۔ نیز اس نعمت سے موسیٰ علیہ السلام کی سلطنت وحکومت بھی علی وجہ الکمال معلوم ہوتی تھی اس وجہ سے اس کو علیحدہ علیحدہ بیان فرمایا **تیسرا اعتراض:** اِضْرِبْ بِعَصَاكَ الْحَجَرَ کے معنی یہ نہیں ہیں کہ لاٹھی سے پتھر کو مارو بلکہ یہ کہ لاٹھی کے سہارے پتھریلے میدان کو طے کرلو یا پہاڑ پر چڑھ جاؤ۔ ضرب کے معنی چلنے کے بھی آتے ہیں یہاں وہ ہی مراد

ہیں کیونکہ پتھر سے پانی نکلنا خلاف عقل ہے (علی گڑھی ٹکسال) **جواب:** جب ضرب کے معنی چلنا ہوتے ہیں تو اس کے بعد فی لایا جاتا ہے رب فرماتا ہے وَاِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْاَرْضِ (النساء:۱۰۱) اگر یہاں یہی ہوتا تو عبارت یوں ہوتی اِضْرِبْ بِعَصَاكَ فِي الْحَجَرِ اور فی یہاں نہیں جس سے معلوم ہوا کہ ضرب مارنے کے معنی میں ہے نیز یہ ہی معنی عام روایت سے ثابت ہیں اس پر امت کا اجماع اس کو غلط بتانا سخت گمراہی ہے جب پتھر سے بال اڑ جاتے ہیں لوہا کھچ آتا ہے اب بھی پہاڑوں سے دریا جاری ہو جاتے ہیں وہ پانی پتھر سے ہی نکلتا ہے کنوؤں میں مٹی سے ہی پانی کے سوت جاری ہوتے ہیں تو اگر اس وقت بھی ایسا ہوا تو کون سی بات ہے ان وھمیات کی وجہ سے معجزات کا انکار کرنا سخت جہالت ہے۔ **چوتھا اعتراض:** ایک چیز سے چند متضاد کام نہیں ہو سکتے۔ ایک عصا سے بحر قلزم خشک بھی ہو گیا اور یہاں پتھر سے پانی بھی جاری ہوا عقل میں نہیں آتا۔ **جواب:** بعض پتھروں پر لوہا رگڑنے سے آگ پیدا ہو جاتی ہے اگر پتھر پر عصا لگنے سے پانی پیدا ہو تو کیوں انکار ہے وہ قادر مطلق ہے یہ دنیا میں بہت ہوتا ہے ایک سورج سے سردی بھی پڑتی ہے گرمی بھی ایک مہینہ میں بعض سبز چیزیں جل جاتی ہیں اور بعض پیدا ہوتی ہیں ایک ہی دوا قابض بھی ہوتی ہے اور قبض کشا بھی مقوی باہ بھی ہوتی ہے اور نقصان دہ بھی ہم اپنی آنکھ سے روتے ہیں سوتے ہیں دیکھتے ہیں اشارے بھی کرتے ہیں اس سے نیک کام بھی کرتے ہیں اور بد بھی۔ جب ہمارے اعضاء اور دنیاوی چیزیں اپنے میں اتنی تاثیریں رکھتی ہیں تو اگر موسیٰ کے عصا سے عجائبات ظاہر ہوں تو کیا تعجب ہے ہمارے حضور کا لعاب دہن (تھوک) کھاری کنویں میں پڑے تو میٹھا کر دے۔ خشک کنویں کو جاری فرمادے۔ حضرت جابر کی ہانڈی میں پڑ کر گوشت اور شوربا بڑھادے آٹے میں پہنچ کر اس میں برکت دے حضرت علی کی دکھتی ہوئی آنکھ میں لگ کر شفا بخشے عبداللہ ابن عتیک کی ٹوٹی ہوئی ہڈی پر لگ کر جوڑ دے معاذ ابن عمرؓ یا بن جموع کے کٹے ہاتھ پر لگے تو اس کو صحیح کر دے۔ غرضکہ ایک چیز میں چند فائدے ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں۔

تفسیر صوفیانہ

انسانی روح اور اس کی صفات مثل موسیٰ اور بنی اسرائیل کے ہیں کہ وہ اپنے رب سے حکمت و معرفت کا پانی مانگ رہے ہیں روح کے پاس لا الہ الا اللہ کا عصا ہے جس میں نفی اور اثبات کی دو چمکتی ہوئی شاخیں ہیں اس کو روح بارگاہ الٰہی سے لے کر آئی۔ روح کو حکم ہے کہ یہ عصا اس قلب پر مارے جو کہ مثل پتھر کے یا اس سے بھی زیادہ سخت ہے اس چوٹ سے بفضلہ تعالیٰ بارہ چشمے جاری ہوتے ہیں۔ کیونکہ لا الہ الا اللہ کے بارہ حرف ہیں اور صفات انسانی کے بھی بارہ گروہ پانچ ظاہری حواس، قوت باصرہ، سامعہ شامہ لامسہ اور ذائقہ اور پانچ باطنی حسیں مشترک۔ حافظہ خیال وہم اور قوت متصرفہ اور ایک قلب اور ایک نفس ان میں سے ہر ایک اپنے گھاٹ کو پہچانتی ہے قلب کا گھاٹ تقویٰ اور اطاعت ہے روح کا گھاٹ کشف اور مشاہدہ یہ روح حقیقت سر کے چشمے کا پانی تجلی کے پیالے سے ساقی کی عطا سے پیتی رہتی ہے اور فرمان ہوتا ہے وَسَقٰهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا (الدھر:۲۱) ب ۵ اھم ہے۔ یہ حقیقی رزق کھاؤ پیو لیکن دین کو دنیا کے بدلہ میں بیچ کر اور آخری چیز کو ادنیٰ پر ترجیح دے کر اور ان دونوں کو موسیٰ پر مقدم جان کر فساد مت پھیلاؤ کسی شاعر نے کیا خوب کہا

دھن دے تن کو راکھئے اور تن دے رکھئے لاج   تن من دھن سب واریئے ایک دھرم کے کاج

وَ اِذْ قُلْتُمْ یٰمُوْسٰی لَنْ نَّصْبِرَ عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ فَادْعُ لَنَا
اور جبکہ کہا تم نے اے موسیٰ ہرگز نہیں صبر کریں گے ہم اوپر کھانے ایک کے پس دعا کیجئے
اور جب تم نے کہا اے موسیٰ ہم سے تو ایک کھانے پر ہرگز صبر نہ ہوگا تو آپ اپنے رب
رَبَّكَ یُخْرِجْ لَنَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ مِنْۢ بَقْلِهَا وَ
آپ واسطے ہمارے اپنے رب سے نکالے واسطے ہمارے اس میں سے جو اگاتی ہے زمین ساگ اس کے سے اور
سے دعا کیجئے کہ زمین کی اگائی ہوئی چیزیں ہمارے لیے نکالے کچھ ساگ اور
قِثَّآىٕهَا وَ فُوْمِهَا وَ عَدَسِهَا وَ بَصَلِهَا ؕ قَالَ اَتَسْتَبْدِلُوْنَ
ککڑی اس کی سے اور گیہوں اس کے اور مسور اس کی اور پیاز اس کی کہا بدلتے ہو تم
ککڑی اور گیہوں اور مسور اور پیاز فرمایا کیا تم
الَّذِیْ هُوَ اَدْنٰى بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ ؕ
اس کو کہ وہ گھٹیا ہے بعوض اس کے کہ وہ بہتر ہے
ادنیٰ چیز کو بہتر کے بدلے مانگتے ہو

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **ایک** یہ کہ اس سے پہلے نونعمتیں بیان ہو چکیں اب دسویں نعمت کا ذکر ہو رہا ہے لیکن فرق اس قدر ہے کہ وہ نعمتیں اعلیٰ تھیں اور یہ نعمت درحقیقت ان سے ادنیٰ لیکن بظاہر بنی اسرائیل کو یہ پیاری معلوم ہوئی کیونکہ ان چیزوں سے وہ اکتا چکے تھے **دوسرے** یہ کہ اس سے پہلے آسمانی نعمتوں کے بعد زمینی نعمت یعنی پانی عطا فرمانے کا ذکر ہو چکا تھا اب ان زمینی غذاؤں کا ذکر ہے جو نعمت معہ زحمت تھی۔ **تیسرے** یہ کہ اس سے پہلے بنی اسرائیل کی نعمتوں کا ذکر تھا اب ان کی نااہلی اور کم ہمتی اور نافرمانی کا ذکر ہو رہا ہے کہ وہ آسمانی نعمتوں کے اہل ثابت نہ ہوئے اعلیٰ ہستی کھو کر پستی کے طالب ہوئے اس صورت میں یہ واقعہ دسویں نعمت نہیں بلکہ ان کی ناقدری کی وجہ ہے ہاں اگر یوں کہا جائے کہ یہ لوگ اس قابل تھے کہ ان سے تمام نعمتیں چھین لی جائیں مگر ہمارا ہی کرم تھا کہ ہم نے نہ چھینیں تو یہ نہ چھیننا بھی ایک نعمت ہے۔

تفسیر

وَ اِذْ قُلْتُمْ یہاں بھی وہ ہی فعل پوشیدہ ہے یعنی اے اسرائیلیو! وہ واقعہ بھی یاد کرو جب تم نے کہا تھا یا اے نبی انہیں یاد دلا دو خیال رہے کہ یہ واقعہ بھی میدان تیہ کا ہی ہے جب کہ وہ من و سلوٰی کھاتے کھاتے گھبرا گئے تھے کیونکہ وہ تو مصر میں رہ کر عادی

ترکاریاں کھانے کے عادی تھے۔ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ ان کا یہ مطالبہ کرنا گناہ نہ تھا کیونکہ من وسلویٰ کھانا ان پر واجب نہ تھا بلکہ فقط مباح اور مباح کھانے کے بدلنے کی خواہش جرم نہیں البتہ چونکہ یہ بغیر محنت ملتا تھا جس سے یہ لوگ عبادت کا کافی موقعہ پالیتے تھے اسی لئے موسیٰ نے اسکو خیر فرمایا اور اس کو اَدْنٰی یٰمُوْسٰی تفسیر عزیزی نے فرمایا کہ اتنے بڑے پیغمبر کو نام لے کر پکارنا کمال بے ادبی ہے۔ انہیں چاہئے تھا کہ یا رسول اللہ یا نبی اللہ کہہ کر پکارتے دیوبندیوں کے پیشوا میاں اسمٰعیل دہلوی ان سے کئی درجہ آگے ہیں۔ کیونکہ وہ تو انبیاء کو بشر، ایلچی، چوہدری، اور نمبردار بلکہ بھائی کہتے ہیں۔ حالانکہ ہمارے حضور کو تو خود حضرت عباس بھتیجا کہہ کر حضرت علی بھائی کہہ کر ازواج پاک زوج کہہ کر نہیں پکارتی تھیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے یا محمد کہہ کر نہیں پکارا جہاں پکارا۔ یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ۔ یٰاَیُّھَا الرَّسُوْلُ۔ یٰاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ وغیرہ پیارے القاب سے پکارا جب خالق یہ احترام کرے تو ہم کمینے گندے کس شمار میں ہیں۔ اگرچہ حضور اور سارے نبی بشر ہی ہیں مگر یہ کہنا بے ادبی ہے ماں کو والدہ صاحبہ کہو باپ کی بیوی نہ کہو خیال رہے کہ کبھی سچ بولنا کفر ہوتا ہے اور جھوٹ بولنا عین عبادت شیطان نے کہا مولا تو نے مجھے گمراہ کر دیا بات سچی تھی مگر وہ ہو گیا کافر۔ بے گناہ، معصوم یا محفوظ بندے کہتے ہیں خدایا ہم بڑے گنہگار ہیں بات غلط ہے مگر یہ کہنا عبادت ہے نبی کو بشر کہنا بات سچی ہے مگر ہے بے ادبی لَنْ نَّصْبِرَ یعنی ہم صبر کر سکتے ہیں تو مگر کریں گے نہیں۔ انہوں نے اپنی ناطاقتی بیان نہ کی بلکہ بے صبری لہٰذا یہ دوسری بے ادبی تھی مانگنے کے لئے بھی ادب وتمیز چاہئے عَلٰی طَعَامٍ وَّاحِدٍ طعام طعم سے بنا ہے طعام لذت والی غذا کو کہتے ہیں اسی لئے کڑوی دواؤں کو طعام نہیں کہا جاتا۔ یہاں ایک کھانے سے مراد ہے نہ بدلنے والا کھانا وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ ہم سے ہر روز ایک سا ہی کھانا نہیں کھایا جاتا چند وجوں سے ایک یہ کہ کھاتے کھاتے عرصہ ہو چکا دوسرے یہ کہ ہم پہلے سے اس کھانے کے عادی نہ تھے۔ تیسرے یہ کہ ایک کھانے سے معدہ کمزور ہوتا ہے اور خواہش میں بھی کمی آتی ہے نفس بھی اسے قبول نہیں کرتا چوتھے یہ کہ ہم زمین کے رہنے والے ہیں زمینی ہی غذائیں چاہتے ہیں بعض لوگوں نے کہا کہ ایک کھانے سے مراد یکساں کھانا ہے جو کہ غریب و امیر سب کو برابر ملے گا گویا وہ کہہ رہے ہیں کہ ہم کو مختلف کھانے چاہئیں جس سے بڑے اور چھوٹے کا فرق ظاہر ہو اور جس میں بعض بعض کے خدمت گزار بنیں (تفسیر روح البیان) اس صورت میں یہ ان کی تیسری بے ہودگی ہوئی فَادْعُ لَنَا۔ یہ اسرائیلی بھی جانتے تھے کہ رب پیغمبر کی بہت سنتا ہے اس لئے براہ راست خود دعا نہ کرتے تھے بلکہ پیغمبر سے دعا کراتے تھے۔ نیز وہ یہ سمجھتے تھے کہ پیغمبر خلق کے حاجت روا ہوتے ہیں اسی لئے اپنے دکھ درد ان سے عرض کر دیتے تھے بزرگوں سے دعا کرانا یا ان کی خدمت کر کے دعا لینا ان سب کی اصل یہ آیت ہے۔ نیز رب فرماتا ہے وَصَلِّ عَلَیْھِمْ (توبہ:۱۰۳) خیال رہے کہ دعا کرانا اور ہے اور دعا لینا کچھ اور جو دعا لی جاتی ہے وہ تیر بہدف ہوتی ہے منافقین دعا کراتے تھے دعا لیتے نہ تھے اس لئے ان کے متعلق ارشاد ہوا تَسْتَغْفِرْ لَھُمْ سَبْعِیْنَ مَرَّةً فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰہُ لَھُمْ (التوبہ:۸۰) حضرت طلحہ نے رات کی خدمت کر کے حضرت عثمان نے غزوہ عسرت میں خیرات کر کے حضرت ربیعہ نے تہجد کا وضو کرا کر دعا لی۔ حضور نے فرمایا تم جنتی ہو گئے بلکہ حضرت عثمان کے لئے فرمایا کہ جو چاہو کرو جنت تمہارے لئے واجب ہو چکی ہے یہ ہے دعا لینا اب بھی موقعہ ہے حضور سے دعائیں لے لو ان کی خدمت کرو۔ لنا نے بتایا

کہ اے موسیٰ یہ دعا ہمارے واسطے ہے نہ کہ آپ کے واسطے کیونکہ آپ تو اسی پر صابر شاکر ہیں بے صبرے تو ہم ہیں۔ رَبَّکَ تفسیر عزیزی نے فرمایا کہ اس میں بوئے۔ غیرت آتی ہے کہ انہوں نے رَبَّکَ کہا رَبَّنَا نہ کہا یعنی اپنے رب سے عرض کرو مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے کو حقیر جانتے ہوئے رَبَّنَا نہ کہا جیسے ہم رب کو رب العرش، رب کعبہ، رب محمد کہہ دیتے ہیں یُخْرِجْ لَنَا یہ جملہ یا دعا کا بیان ہے یا اس کا جواب یعنی آپ رب سے دعا کریں کہ وہ ہمارے لئے اگا دے یا اگر آپ دعا کریں گے تو وہ ضرور اگا دے گا کیونکہ آپ مقبول الدعاء ہیں۔ یُخْرِجْ سے یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہ ساگ پات بھی من وسلویٰ کی طرح بغیر محنت ہی پیدا ہو جائیں ہم کو جوتنے بونے کی ضرورت نہ پڑے کیونکہ ہم حالت سفر میں ہیں کھیتی باڑی نہیں کر سکتے۔ مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ اس کا مفعول ہے یعنی ہم کو وہ چیزیں دے جو زمین اگاتی ہے مِنْۢ بَقْلِهَا بقل کا ترجمہ ہے سبزی ترکاری یہ دو طرح کی ہوتی ہے ایک وہ جو پکا کر کھائی جائے جیسے خرفہ پالک اور میتھی سویا وغیرہ دوسرے وہ جو کچی بھی کھائی جائے جیسے دھنیا پودینہ وغیرہ یہ لفظ دو قسم کی ترکاریوں کو شامل ہے وَقِثَّآئِهَا اس کے معنی ہیں خیار۔ یہ دو قسم کا ہے خیار دراز یعنی ککڑی اور خیار خورد یعنی کھیرا ان دونوں کو خیارین کہتے ہیں یہ کچی بھی کھائی جاتی ہے اور پکا کر بھی یعنی یہ غذا بھی ہے اور دیہاتی میوہ بھی فُوْمِهَا گیہوں کو کہتے ہیں چونکہ یہ پیس کر پکا کر کھایا جاتا ہے اس لئے اس کو ترکاریوں کے بعد بیان کیا ایک قرات ثُوْمِهَا بھی ہے جس کے معنی ہیں لہسن اور بعض علماء نے فوم کے معنی بھی لہسن کئے ہیں وہ کہتے ہیں کہ یہ ف، ث کے عوض میں آئی ہے کیونکہ آگے پیاز کا ذکر آرہا ہے اور اس کا جوڑ لہسن ہے نہ کہ گیہوں نیز وہ لوگ ادنیٰ چیزیں مانگ رہے ہیں اور گیہوں اعلیٰ ہے لیکن صحیح یہی ہے کہ یہاں فوم بمعنی گیہوں ہے کیونکہ آگے مسور ہے جو کہ گیہوں سے کھائی جاتی ہے اور پیاز کا ذکر تو اس کے بعد بھی ہے نیز گیہوں اگرچہ خود اعلیٰ ہے مگر من وسلویٰ کے مقابلہ میں ادنیٰ اور گیہوں کی روٹی عمدہ چیز ہے مگر جب ساگ اور پیاز وغیرہ معمولی ترکاریوں سے کھائی جائے تو ادنیٰ شمار کی جاتی ہے کیونکہ روٹی سالن کے ساتھ نافع ہے وَعَدَسِهَا مسور کو کہتے ہیں یہ چھیل کر اور بغیر چھیلے ہر طرح نہایت آسانی سے پک جاتی ہے اسی لئے انہوں نے یہاں طلب کی وَبَصَلِهَا بصل پیاز کو کہتے ہیں کیونکہ یہ خود بھی ترکاری بن جاتی ہے کہ سرکے سے کچی اور پکا کر روٹی سے کھائی جاتی ہے اور دیگر ترکاریوں کی بھی اصلاح کرتی ہے اس لئے مسور کے بعد اس کا ذکر ہوا۔ قَالَ یہ موسیٰ کا فرمان ہے یا رب کا اَتَسْتَبْدِلُوْنَ یہ بدل سے بنا ہے جس کے معنی ہیں معاوضہ یہاں حقوق کا بدلہ مراد ہے یعنی من وسلویٰ کا حق کیوں لیتے ہو اَلَّذِیْ هُوَ اَدْنٰی ان تمام چیزوں کو ادنیٰ فرمایا گیا کیونکہ یہ قدر و قیمت اور فائدے اور لذت سب ہی میں ادنیٰ ہیں۔ نیز یہ زمینی چیزیں ہیں اور اس میں تمہاری محنت کا دخل ہے۔ بِالَّذِیْ هُوَ خَیْرٌ من وسلویٰ چند لحاظ سے بہتر تھا وہ آسمانی نعمت تھی قدر و نعمت، لذت، فائدہ سب میں اعلیٰ تھا اور بے محنت حاصل ہوتا تھا جس سے انہیں عبادت کے لئے وقت خوب ملتا تھا دنیا میں مشغولیت نہ ہوتی تھی نیز من وسلویٰ کسی طرح صحت کے لئے مضر نہیں یہ چیزیں ہزار ہا بیماریاں پیدا کریں گی نیز من وسلویٰ قدرتی چیزیں تھیں جن کے حرام یا مکروہ ہونے کا احتمال نہیں جیسے دھوپ بارش کا پانی۔ تمہاری پیدا کردہ چیزیں مکروہ یا حرام بھی ہو سکتی ہیں خیال رہے کہ ادنیٰ کا مقابلہ اعلیٰ سے ہوتا ہے مگر اعلیٰ میں ادنیٰ شامل نہیں۔

خلاصہ تفسیر

اے اسرائیلیو تم میدان تیہ کا وہ واقعہ بھی یاد کرو جب تم پر اس دشت پر خار میں جہاں کوئی سامان نہ تھا رب کی طرف سے من و سلویٰ اترنے لگا تو تم بجائے شکر کرنے کے وہاں موسیٰ سے لڑنے جھگڑنے شروع ہو گئے کہ آپ نے ہمیں مصر جیسے سرسبز و شاداب خطہ سے نکال کر ایسے جنگلوں میں لا ڈالا جہاں من و سلویٰ کے سوا کچھ نہیں ہم تو مصر کی ہر قسم کی پیداوار کھاتے تھے یہاں عرصہ سے ایک ہی قسم کا کھانا کھا رہے ہیں۔ اب ہم اس پر صبر نہ کریں گے اپنے رب سے عرض کرو کہ وہ ہمارے لئے اس جنگل میں بھی ساگ پات اور ککڑی گیہوں مسور اور پیاز وغیرہ زمینی غذائیں ہمیں بغیر مشقت کے دے۔ موسیٰ نے فرمایا کہ ارے تم کیا غضب کر رہے ہو کیا رب تعالیٰ کی اعلیٰ نعمتیں چھوڑ کر ادنیٰ لیتے ہو اس پر اگر تم کو ہلاک کر دیا جاتا تو کچھ بعید نہ تھا مگر رب نے درگذر فرمایا اور عذاب نہ بھیجا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** یہ کہ حرص و ہوس کا نتیجہ برا ہے بنی اسرائیل نے من و سلویٰ پر صبر نہ کیا دیگر کھانوں کی ہوس کی جس کی وجہ سے خرابی میں پڑے۔ حرص و ہوس و طمع تینوں لفظ جیسے نقطہ سے خالی ہیں ویسے ہی فائدے سے بھی خالی۔ **دوسرا فائدہ:** ہر چھوٹی بڑی چیز رب سے مانگنی چاہئے یہ نہ خیال کیا جائے کہ اتنی بڑی بارگاہ میں معمولی چیزیں کیا مانگیں بنی اسرائیل نے ککڑی پیاز جیسی معمولی چیزیں بھی رب سے مانگنے کی درخواست کی موسیٰ علیہ السلام نے اس سے منع نہ فرمایا کہ معمولی چیزیں نہ مانگو اگر کسی کے جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے تو رب سے ہی مانگے حکایت مشہور ہے کہ سکندر بادشاہ سے کسی نے ایک پیسہ مانگا اس نے کہا کہ تو نے ایک پیسہ مانگ کر میری توہین کی ہے اتنے بڑے بادشاہ سے ایک پیسہ مانگا جاتا ہے سائل نے کہا اچھا ایک ملک مجھے عنایت کر دیجئے سکندر نے جواب دیا کہ یہ تو نے اپنی طاقت سے زیادہ مانگا تو ملک کے لائق نہیں سائل کہنے لگا کہ یہ رب ہی کی شان ہے کہ ایک پیسہ بھی اس سے مانگا جاتا ہے اور ملک بھی اور وہ کسی پر ناراض نہیں ہوتا بلکہ مانگنے کا حکم دیتا ہے کہ اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ (المؤمن:۶۰) تم دعا کرو ہم قبول فرمادیں گے مولانا فرماتے ہیں

اے کہ باہر دل ترا رازے دگر ہر گدا را بر درت نازے دگر

تیسرا فائدہ: یہ کہ بزرگوں کو چاہئے کہ جب کوئی ان سے دعا کرائے تو اس کو دعا کے متعلق نیک مشورہ دیں کہ یہ دعا نہ کراؤ اس میں بہتری نہیں موسیٰ نے ان کو یہی مشورہ دیا کہ تم ادنیٰ چیز اعلیٰ کے بدلے نہ لو۔ **چوتھا فائدہ:** یہ کہ اعلیٰ اور ادنیٰ چیزیں جمع نہیں ہوتیں جو شخص چاہے کہ وہ بھی حاصل ہو اور دنیا کمینی بھی ہاتھ سے نہ جائے وہ دو ضدوں کو جمع کرتا ہے دیکھو بنی اسرائیل نے یہ نہ کہا کہ من و سلویٰ بند ہو جائے بلکہ وہ چاہتے تھے کہ یہ بھی آتا رہے اور ساگ پات بھی ملے فرمایا یہ نہ ہوگا تبادلہ ہوگا اور تبادلہ اچھا نہیں۔ **پانچواں فائدہ:** یہ کہ دل کی ہر بات نہ ماننا چاہئے بسا اوقات یہ ادنیٰ چیز کو اعلیٰ دکھاتا ہے بنی اسرائیل کو ساگ پات اچھا معلوم ہوا مگر حقیقت میں یہ ادنیٰ تھا قرآن کریم فرماتا ہے۔ وَعَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّ

هُوَ شَرٌّ لَّكُمْ (البقرہ:۲۱۶) دل نادان بچہ یا بیوقوف مریض کی طرح ہے جو کہ رنگت وخوشبو پر مرتا ہے اور بسا اوقات نقصان دہ چیزوں کی خواہش کر لیتا ہے **چھٹا فائدہ:** حضرات انبیاء راضی بررضا ہوتے ہیں وہ سب کچھ ہمارے لئے مانگتے ہیں دیکھو بنی اسرائیل نے عرض کیا کہ ان چیزوں کی دعا ہمارے لئے کرو اگرچہ مقام تیہ میں موسیٰ بھی من وسلویٰ کھاتے تھے اور بعد میں آپ نے بھی یہ سبزیاں وغیرہ کھائیں مگر اس میں اصل مقصود بنی اسرائیل تھے غرضیکہ وہ حضرات دنیا ہماری خاطر استعمال کرتے ہیں اور رب تعالیٰ ہم کو آخرت کی بھلائیاں ان کی خاطر دیتا ہے یہ فوائد ان سے حاصل ہوئے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: بنی اسرائیل کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدا کا کھانا نہ چاہتے تھے بلکہ اس من وسلویٰ کے ساتھ اور بھی غذائیں مانگ رہے تھے پھر موسیٰ نے تبادلہ کو ان کی طرف کیوں منسوب کیا کہ فرمایا اَتَسْتَبْدِلُوْنَ کیا تم بدلنا چاہتے ہو یہ تو خلاف واقعہ ہے **جواب:** انہوں نے آسمانی کھانے سے ناخوشی اور بے رغبتی ظاہر کی جس کا مطلب یہ تھا کہ یا تو اس غذا کو بالکل نہ کھائیں گے یا شکم سیر ہو کر نہ کھائیں گے کیونکہ اس سے اکتا گئے ہیں۔ اس ناقدری کی بنا پر اس کا بند ہونا لازم تھا تو چونکہ انہوں نے تبادلہ غذا کا سبب قائم کر دیا تھا اس لئے ان کی طرف منسوب کیا گیا۔ **دوسرا اعتراض:** بنی اسرائیل کی یہ خواہش جائز تھی یا ناجائز اگر ناجائز تھی تو حضرت موسیٰ نے ان کو اس سے صراحۃً کیوں نہ روک دیا ناجائز چیز کی دعا کرنا بھی ناجائز ہے اور اگر جائز تھی تو کام میں پس وپیش کیوں فرمایا۔ **جواب:** یہ خواہش جائز تھی چند کھانے کھانا بھی جائز اور ان کی رغبت بھی مباح مگر ان کے لئے تکلیف کا سبب تھی لہٰذا اس خواہش سے منع تو نہ فرمایا صرف ان کے نقصان پر ان کو مطلع کر دیا جیسے کوئی شخص اپنی اچھی آمدنی پر لات مارنا چاہتا ہے تو اس کو سمجھایا جاتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ

آخرت کی نعمتیں ایمان وتقویٰ، عشق اللہ ورسول گویا من وسلویٰ ہیں دنیا اور یہاں کی لذتیں گویا ادنیٰ غذائیں جیسے من وسلویٰ ان غذاؤں کے ساتھ جمع نہ ہو سکیں ایسے ہی دنیا دین کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی دل اس بیٹھک کی طرح ہے جس کا ایک دروازہ سڑک کی طرف ہو اور ایک اندرون گھر کی طرف جب سڑک والا دروازہ کھلے گا تو باہر کی چیزیں گرد وغبار کوڑا اور اغیار آئیں گے اور جب اندرون خانہ کا دروازہ کھلے گا تو بیوی بچے اور صاحب اسرار آئیں گے۔ یہ دونوں دروازے بیک وقت نہیں کھل سکتے جب دل میں دنیا کا دروازہ کھل جاتا ہے تو حسد کینہ عداوتیں گرد وغبار آئیں گے اور اگر آخرت کا دروازہ کھل جائے تو سوز وگداز، توبہ، شوق پیدا ہوگا مگر یہ دونوں دروازے بیک وقت نہیں کھل سکتے دنیا وآخرت دو سگی بہنیں ہیں جو بیک وقت ایک کے نکاح میں نہیں آ سکتیں۔

اِهْبِطُوْا مِصْرًا فَاِنَّ لَكُمْ مَّا سَاَلْتُمْ ؕ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ

اتر جاؤ تم کسی شہر میں پس تحقیق واسطے تمہارے وہ ہے جو تم نے مانگا اور مقرر کر دی اوپر ان کے خواری

اچھا مصر یا کسی شہر میں اترو تمہیں ملے گا جو تم نے مانگا اور ان پر مقرر کردی گئی خواری
وَ الْمَسْكَنَةُ ۚ وَ بَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ
اور فقیری اور لوٹے وہ بیچ غضب اللہ کے یہ بوجہ اس کے ہے
اور ناداری اور خدا کے غضب میں لوٹے یہ بدلہ تھا اس کا
كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ يَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ
کہ وہ لوگ تھے انکار کرتے نشانیوں کا اللہ کی اور قتل کرتے تھے نبیوں کو بلا حق کے
کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور انبیاء کو ناحق شہید کرتے
الْحَقِّ ؕ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿٦١﴾
یہ بوجہ اس کے ہے کہ نافرمانی کی انہوں نے اور تھے وہ حد سے آگے بڑھتے
یہ بدلہ تھا ان کی نافرمانیوں اور حد سے بڑھنے کا

تعلق

اس جملہ کو پچھلے جملہ سے چند طرح تعلق ہے **ایک** یہ کہ اس کا تتمہ وہاں معلوم ہوا کہ اسرائیلیوں نے دعا کرانا چاہی موسیٰ نے ان کو مشورہ دیا کہ ایسا نہ کریں اب فرمایا جارہا ہے کہ انہوں نے حضرت کا مشورہ قبول نہ کیا تب آپ نے ان سے فرمایا **دوسرے** یہ کہ پہلے فرمایا گیا کہ اسرائیلیوں نے اپنی یہ عرض رب کی بارگاہ میں پیش کرانا چاہی موسیٰ نے فرمایا یہ تمہاری دعا قابل عرض نہیں ہے میں پیش نہ کروں گا اگر تم میرا مشورہ نہیں مانتے تو تم کو اس کی یہ تدبیر بتاتا ہوں (تفسیر عزیزی) **تیسرے** یہ کہ پہلے معلوم ہوا تھا کہ بنی اسرائیل چاہتے تھے کہ ہم کو یہ تمام چیزیں اسی جنگل میں من وسلویٰ کی طرح مل جاویں اس میں فرمایا گیا کہ تم کو یہ نعمتیں یہاں نہ ملیں گی بلکہ اس کے لئے تم کو شہر میں جانا ہوگا لہٰذا یہ جملہ ان کی خواہش کی تردید کرتا ہے **چوتھے** یہ کہ پہلے معلوم ہوا تھا کہ بنی اسرائیلی چاہتے تھے کہ رب یہ چیزیں بغیر محنت ہم کو عطا کرے یہاں فرمایا گیا کہ یہ محنت سے ملیں گی۔

تفسیر

اِهْبِطُوْا یہ لفظ ہبوط سے بنا ہے جس کے معنی ہیں اترنا یعنی اتر جاؤ تم یا تو یہ میدان تیہ بلندی میں واقع تھا اور جہاں ان کو بھیجا جا رہا تھا وہ ہے پستی میں اس لئے اہبطو فرمایا یا مسافر سفر میں تو کسی سواری پر رہتا ہے اور جہاں ٹھہرنا ہوتا ہے وہاں اترنا ہے اس لئے فرمایا گیا کہ تم سواریوں پر بیٹھو اور اس شہر میں سواریوں سے اتر جانا یعنی ٹھہرنا یا مطلب یہ ہے کہ پیچھے کو ہی لوٹ جاؤ کیونکہ واپس لوٹنا ناکامی کی دلیل ہے اور ناکامی میں اپنے درجے پر سے اترنا ہوتا ہے اس میں اس جانب بھی اشارہ ہے کہ تم ان

غذاؤں کے حاصل کرنے سے کم ہمت اور پست حوصلہ ہو جاؤ گے تمہاری پہلی سی شان نہ رہے گی کیونکہ دنیاوی ہوس سے یہ عیوب پیدا ہو جاتے ہیں اور تم ہوس ہی کر رہے ہو لہٰذا یہ بظاہر امر اور در پردہ غیب کی خبر ہے کہ ابھی تو تمہارے پاس سلطنت اور حکومت ہے پھر فقط کسان بن کر رہ جاؤ گے اور ہمیشہ کے لئے تخت و تاج سے محروم ہو جاؤ گے کیونکہ تمہاری طبیعت میں کسانی چیزیں اور کسانی کاموں کی طرف رغبت ہے۔ مِصْرًا، مصر کے لغوی معنی ہیں قطع۔ یعنی علیحدہ ہونا اور اب بستی یا شہر کو مصر کہتے ہیں کیونکہ یہ جنگل سے منقطع اور علیحدہ ہوتا ہے کبھی گاؤں کو بھی مصر کہہ دیتے ہیں جیسے کہ شہر کو قریہ کہا جاتا ہے مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ (زخرف:۳۱) (روح البیان) مصر خاص فرعونی شہر کا نام بھی تھا اور ہر شہر کو بھی کہا جاتا ہے جیسے کہ لفظ مدینہ ہر شہر کو بھی کہہ سکتے ہیں اور خاص مدینہ منورہ کا نام بھی ہے اگر اس سے خاص شہر مصر مراد ہو تو یہ غیر منصرف ہے۔ علیت اور عجمہ کی وجہ سے قرآن کریم نے فرمایا مِنْ مِّصْرَ (یوسف:۲۱) اور عام شہر کے لئے ہو تو منصرف بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس سے وہ فرعونی مصر ہی مراد ہے تو مطلب یہ ہے کہ آپ نے فرمایا کہ تم جہاں سے آئے ہو وہاں ہی واپس چلو یعنی مصر اور چونکہ یہ ساکن الاوسط ہے اس لئے منصرف بھی ہو سکتا ہے جیسے کہ نوح و ھند وغیرہ لیکن یہ قول ضعیف ہے کیونکہ بنی اسرائیل سے فرمایا گیا کہ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِیْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَ لَا تَرْتَدُّوْا عَلٰۤى اَدْبَارِكُمْ (مائدہ:۲۱) یعنی جب تم مقدس زمین یعنی شام میں داخل ہو تو پیچھے نہ واپس ہونا جب انہیں واپسی سے منع کر دیا گیا تھا تو اب حکم کیوں دیا جاتا ہے بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اس سے مراد وہی جگہ ہے جہاں ان کو لے جانا منظور تھا مگر یہ بھی ضعیف ہے کیونکہ رب نے فرمایا تھا فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَیْهِمْ اَرْبَعِیْنَ سَنَةً ۚ یَتِیْهُوْنَ فِی الْاَرْضِ (مائدہ:۲۶) یعنی وہ شہر ان پر چالیس سال کے لئے حرام کر دیا گیا۔ اسی میدان میں حیران و پریشان پھریں گے۔ موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت یوشع علیہ السلام کے ساتھ یہ لوگ وہاں گئے اور یہ واقعہ ان کی زندگی شریف کا ہے لہٰذا قوی یہ ہی قول ہے کہ اس سے کوئی عام شہر مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ چیزیں تم کو یہاں تو ملیں گی نہیں کسی بستی میں چلے جاؤ۔ وہاں پاؤ گے فَاِنَّ لَكُمْ اس میں بتایا گیا کہ یہ چیزیں بغیر محنت نہ ملیں گی۔ بلکہ تم کو محنت کرنا ہوگی کیونکہ یُخْرِجُ اللّٰهُ لَكُمْ نہ فرمایا صرف لَكُمْ فرمایا۔ یعنی تمہارے لئے وہاں مَّا سَاَلْتُمْ وہ چیزیں جو تم نے مانگیں مجھے یہ لائق نہیں کہ رب سے یہ چیزیں مانگوں تم نے مانگی ہیں تم ہی پاؤ گے۔ وَضُرِبَتْ عَلَیْهِمُ ضرب کے چند معنی ہیں مارنا زمین پر چلنا مثال بیان کرنا لازم کرنا۔ مقرر کرنا۔ ڈالنا۔ یہاں آخری تین مراد ہیں کیونکہ علیٰ سے متعدی ہے۔ یعنی ان پر ذلت ڈال دی گئی جیسے کہ کسی زمین پر خیمہ ڈال دیا جاتا ہے اور وہ ہر طرف سے گھیر لیتا ہے یا ذلت مقرر یا لازم قرار دی گئی جیسے کہ سکہ پر نقش اسی لئے اس کو سکہ مضروب کہتے ہیں۔ عَلَیْهِمْ کی ضمیر ان یہودیوں کی طرف پھر رہی ہے جنہوں نے اولاً اس غذا کی خواہش کی پھر بعد میں بہت کفر و معاصی کر بیٹھے جن کا ذکر پہلے سے ہو رہا ہے اور ہو سکتا ہے کہ حضور کے زمانے کے یہود کی طرف پھرتی ہو اور ممکن ہے ان یہود سے لے کر آخر زمانے تک کے یہود اس کا مرجع ہوں چونکہ قوم کے بعض افراد کا کفر و گناہ ساری قوم کی طرف منسوب ہوتا ہے جب قوم اس سے راضی ہو اس لئے یہ فرمانا درست ہے کہ یہ لوگ انبیاء کو قتل اور آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔ الذِّلَّةُ۔ ذِلَّةٌ کے معنی خواری ہیں یعنی یہود پر خواری لازم کر دی گئی کہ ان سے سلطنت چھین لی اور

ان کو مسلمان یا عیسائیوں کا غلام بنا دیا گیا۔ وَالْمَسْكَنَةُ یہ مسکن سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ٹھہر جانا اور بیٹھ رہنا غریبی کو مسکنت اس لئے کہتے ہیں اس سے بھی انسان بیٹھ کر رہ جاتا ہے۔ یعنی یہود پر ہمیشہ دوسری حکومتوں کی طرف سے ٹیکس وغیرہ اس قدر لگتے رہیں گے جس سے غریب رہیں گے یا ٹیکس کے خوف سے ہمیشہ اپنی غریبی ظاہر کریں گے کہ کوئی ہم کو مالدار ہی نہ جانے۔ اَلْغِنٰی غِنَی النَّفْسِ تونگری بہ دل است نہ بہ مال لہٰذا یہودی اگر مالدار بھی ہو جائے تب بھی اسکا دل غریب ہی رہتا ہے، یا یہ کہ ان کے چہروں پر رونق نہ ہوگی۔ چہروں سے فقر وفاقہ ظاہر ہوگا جیسا کہ آج کل بھی ظاہر ہے۔ بہر حال بہت سی وجہوں سے وہ ذلیل و مسکین رہیں گے۔ خیال رہے کہ مسکینیت تو خوبی ہے اور مسکنت عیب مسکینیت کے معنی ہیں دل میں غرور وغیرہ نہ ہونا اور مالداری کی وجہ سے غفلت نہ آنا۔ مسکنت کے وہ معنی ہیں جو ہم نے عرض کر دیئے۔ حدیث میں جو آتا ہے کہ اے اللہ مجھے مسکین بنا کر زندہ رکھ اور مسکین ہی بنا کر وفات دے۔ اس سے پہلے معنی مراد ہیں۔ قلب کا مسکین ہونا بہت کمال ہے اور مسکنت بہت بڑا عیب وَبَآءُوْ یہ لفظ بوءٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں لوٹنا۔ برابر ہونا۔ مستحق ہونا یعنی وہ لوگ غضب الٰہی میں لوٹے یا غضب کے ساتھ لوٹے یا غضب کے مستحق ہوئے یا غضب ان پر برابر ہوا (تفسیر کبیر) بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ غضب کے معنی ہیں بدلہ کا ارادہ یا قہر تنوین تعظیم کی ہے یعنی وہ رب کے بڑے ہی قہر کے مستحق ہو گئے کہ دنیاوی عزت اور آخرت کی جنت سے محروم رہے اور انبیاء کرام و اولیاء کرام کی برکت سے جو رتبے انہیں حاصل ہوئے وہ سب جاتے رہے۔
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ یعنی یہ غضب الٰہی محض چند کھانے مانگنے کی وجہ سے نہ تھا یہ تو ایک جائز کام تھا بلکہ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وہ پہلے ہی سے رب کی نشانیوں کو جھٹلاتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام کے فرمان پر دھیان نہ دیتے تھے اور توریت شریف کی جو آیات ان کی خواہشات کے خلاف ہوتیں ان کو بدل ڈالتے اور دوسرے پیغمبروں کا انکار کرتے تھے اس سے معلوم ہوا کہ ان کی ذلت و رسوائی موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں نہ ہوئی بلکہ بعد کو موسیٰ علیہ السلام نے آئندہ کی خبر دی تھی کہ اب تمہاری خیر نہیں ہے۔ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ اگرچہ پیغمبروں کا قتل بھی کفر میں ہی داخل تھا مگر چونکہ یہ تمام کفریات سے بڑھ کر ہے اس لئے اس کا علیحدہ بیان کیا۔ یہودیوں نے بہت سے پیغمبروں کو شہید کیا جیسے کہ حضرت شعیا و زکریا و شعیب و یحییٰ علیہم السلام اور بہت کو قتل کرنے کی کوشش کی جیسے کہ عیسیٰ علیہ السلام کہ ان کو سولی دینا چاہی اور ہمارے حضور علیہ السلام کو زہر بھی دیا اور دوسری بھی کوششیں کیں۔ ایک دفعہ ایک دن میں ۷۰ پیغمبروں کو شہید کیا۔ بِغَيْرِ الْحَقِّ اگرچہ پیغمبر کو شہید کرنا ناحق ہی ہوتا ہے مگر یہاں حق سے شرعی حق مراد نہیں ہے بلکہ ظاہری حق مراد ہے یعنی وہ بظاہر بھی کوئی وجہ اس قتل کی پیش نہ کر سکتے بلا وجہ ہی شہید کیا۔ عیسیٰ علیہ السلام کو صرف چند روپے کی لالچ میں شہید کرنے کی کوشش کی۔ حضرت زکریا و یحییٰ علیہم السلام کو بادشاہ نے صرف اس لئے شہید کیا کہ وہ اپنی سوتیلی لڑکی سے نکاح کرنا چاہتا تھا۔ ان حضرات نے اس کو حرام فرمایا اور اس کی مرضی کے مطابق فتویٰ نہ دیا غرضیکہ ان انبیاء کرام کا قتل خود ان کے نزدیک بھی ناحق ہوا۔ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا شاید کسی کو شبہ ہوتا کہ وہ تو اہل کتاب تھے انہوں نے اپنے ہی پیغمبروں کو شہید کیوں کیا تو فرمایا گیا کہ یہ جرات ان کو اس لئے ہوئی کہ وہ پہلے سے نافرمان تھے اولاً معمولی گناہ کئے پھر بڑے گناہ کرنے کی ہمت کی آخر کار انبیاء کرام کو شہید کرنے کی جرات کر بیٹھے وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ پہلے تو

گناہ کرنے کا ذکر فرمایا گیا اور اب حد سے بڑھنے کا یعنی وہ شرعی حدود کو توڑ کر آگے بڑھ گئے تھے کہ حرام کاموں کو حلال جاننے لگے تھے اور واعظین وعلماء کے دشمن بن گئے تھے جو آیات کہ گناہوں کی برائیاں بتاتی تھیں ان کی بے جا تاویلیں کر کے اپنے جرموں کو جائز ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے جس کی وجہ سے اعتقاد میں فتور آ گیا گناہ کرنا علیحدہ چیز ہے اور حد سے بڑھنا علیحدہ وہ بدعملی ہے اور یہ بداعتقادی اور چونکہ بدعملی کا انجام بداعتقادی ہوتا ہے اس لئے قرآن نے پہلے عصیان اور بعد میں حد سے بڑھنے کا ذکر فرمایا۔

خلاصہ تفسیر

اولاً تو موسیٰ علیہ سلام نے بنی اسرائیل کو بہت سمجھایا کہ تم اس ذلیل خیال سے باز آ جاؤ مگر جب وہ باز نہ آئے تو ان سے فرمایا کہ یہ چیزیں یہاں تو ملیں گی نہیں تم کسی آبادی میں چلو وہاں پالو گے کیونکہ مقصود یہ تھا کہ وہ کچھ آگے بڑھیں ان کی نافرمانیوں اور بداعتقادیوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اے محبوب ان پر ذلت وخواری ومسکنت لازم کر دی گئی یہ اس کا نتیجہ تھا کہ وہ ناحق انبیاء کرام کو قتل کرتے تھے اور یہ قتل کرنے کی جرات ان میں اس لئے پیدا ہوئی کہ وہ پہلے گناہ کرنے اور حد سے بڑھ جانے کے عادی ہو چکے تھے خیال رہے کہ ان بنی اسرائیل نے اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کو بہت پریشان کیا اور انہیں معافی ملتی رہی اس دعا سے موسیٰ علیہ السلام ناراض تھے اور انہیں تبدیلی رزق سے منع کرتے تھے مگر وہ نہ مانے تو ان پر ڈر، مسکینی اور غضب الٰہی آیا جس کی وجہ یہ ہوئی کہ انہیں کفر بلکہ قتل انبیاء کی ہمت ہو گئی یہ بات عذاب کا سبب بنی لہٰذا اس آیت پر نہ تو یہ اعتراض ہے کہ انہوں نے مباح کھانے کی دعا کی یہ کھانا بھی گناہ نہ تھے نہ یہ دعا گناہ پھر عتاب کیوں اور نہ یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ ابھی تو انہوں نے قتل انبیاء نہ کیا تھا بلکہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد یہ جرم کئے پھر ابھی عذاب کیوں آیا۔ یہ دعا جرم نہ تھی موسیٰ علیہ السلام اس دعا سے ناراض تھے لہٰذا جرم ہو گئی اور بہت سے جرموں کی جڑ بن گئی۔ اصل یہ ہے باقی اس کی شاخیں لہٰذا انہیں بھی قاتل انبیاء قرار دیا گیا نبی کے مقابلے کی جرات ان لوگوں میں اس واقعہ سے پیدا ہوئی جو آخر قتل تک پہنچ گئی۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** یہ کہ انبیاء کرام کو رب تعالیٰ کی طرف سے خصوصی اختیارات ملتے ہیں جن کی بنا پر وہ خلق پر حکومت کرتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے رب سے دعا نہ فرمائی بلکہ اپنے خصوصی اختیار سے فرما دیا کہ کسی شہر میں چلے جاؤ جیسا کہ ہم تفسیر عزیزی کے حوالے سے تفسیر میں عرض کر چکے ہیں۔ **دوسرا فائدہ:** یہ کہ غذا کا اثر کھانے والے پر پڑتا ہے دیکھو بنی اسرائیل نے من وسلویٰ سے گھبرا کر زمینی غذائیں طلب کیں تو فرمایا گیا کہ تم پست حوصلہ اور کم ہمت ہو جاؤ گے ایسے ہی ہوا اسی لئے شریعت پاک نے خراب غذاؤں کو منع فرما دیا فقہا فرماتے ہیں کہ گلی سڑی نقصان دہ چیزیں کھانا منع ہے **تیسرا فائدہ:** یہ کہ دنیاوی نعمتیں محنت سے ملتی ہیں بغیر محنت طلب کرنا حماقت ہے اسرائیلیوں نے یہی تو کیا کہا تھا کہ من وسلویٰ کی طرح یہ چیزیں بھی بغیر محنت ہی ہم کو مل جایا کریں۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** یہ کہ گناہ کی عادت بدعقیدگی کا ذریعہ ہے علماء فرماتے ہیں کہ جو مستحب کو ہلکا جانے گا وہ سنت سے محروم کر دیا جائے گا اور جو سنت کو

ہلکا جانے گا یا اس میں سستی کرے وہ فرائض سے محروم ہو جائے گا اور جو فرائض سے محروم ہے وہ معرفت سے دور ہو گا اور جب معرفت دل سے نکلی تب اہل معرفت سے محبت چھوٹی اور اس چھوٹنے سے بد عقیدگی پیدا ہو گی۔ اس لئے مستحبات کی عزت اور عادت کرنی چاہئے دیکھو اسرائیلی اولاً گناہ کے عادی ہوئے پھر معصیت کو ہلکا جاننے لگے اور پھر انبیاء کرام کے دشمن بن کر ان کے قتل کی ہمت کر بیٹھے اگر تمہارا بچہ سوئی کی چوری کرے تب بھی سرزنش کرو۔ اگر اس سے چشم پوشی کی تو آئندہ بڑی چیزیں چرانے کی ہمت کر کے آخر کار ڈاکو بن جائے گا۔ نفس ناسمجھ بچہ ہے احکام شرعیہ ہمارا اسباب مستحب کو ہلکا جاننا سوئی کی چوری ہے اگر ابھی سے اس کو نہ روکا گیا تو آئندہ بڑا مجرم بن جائے گا۔ تمہارے مکان کے چند دروازے ہیں اور کوٹھری میں مقفل صندوق ہے جس میں دولت محفوظ مگر آپ چور کو پہلے دروازے ہی سے روکتے ہیں کہ اگر پہلا قفل توڑ کر گھر میں آ جانے میں کامیاب ہو گیا تو اس کو دوسرے قفل توڑنے آسان ہوں گے۔ شیطان چور ہے تمہارا ایمان دولت احکام شرعی اس کی حفاظت کے قفل مستحب پہلا قفل ہے جب وہ توڑ کر چور گھر میں آ گیا تو دوسرے قفل بھی توڑے گا اس کو یہاں ہی روک دو۔ داڑھی منڈانے والے اور دیگر گنہگار اس سے عبرت پکڑیں۔ رب تعالیٰ ہم سب کے قفل محفوظ رکھے آمین۔ **پانچواں فائدہ:** یہ کہ چند حلال غذائیں کھانا جائز ہیں کیونکہ بنی اسرائیل کو اس سے نہ روکا گیا۔ حضور علیہ السلام کو شہد اور دیگر شیریں چیزیں مرغوب تھیں مسور اور زیتون صالحین کی غذا ہے مسور سے دل نرم بدن ہلکا ہوتا ہے۔ قوت شہوانی کا جوش ٹھنڈا پڑ جاتا ہے۔ (روح البیان) **چھٹا فائدہ:** یہ کہ لہسن پیاز اور دیگر بدبودار چیزیں جیسے کہ ادرک وغیرہ کھانا مباح ہے کیونکہ رب نے اسرائیلیوں کا یہ مطالبہ ذکر فرما کر اس کی تردید نہ فرمائی البتہ حدیث پاک میں وارد ہے کہ کوئی شخص کچی پیاز وغیرہ کھا کر مسجد میں نہ آوے جب تک کہ منہ سے بو آتی ہو کیونکہ اس سے رحمت کے فرشتوں کو (جو کہ مسجد میں رہتے ہیں) تکلیف ہوتی ہے اسی طرح کوئی بدبو کی چیز مٹی کا تیل، کچا گوشت مچھلی وغیرہ مسجد میں نہ لائی جائے جس کسی کے زخم یا منہ سے بدبو نکلتی ہو وہ بھی مسجد میں نہ آوے۔ خواہ وہاں کوئی ہو یا نہ ہو کیونکہ فرشتوں کو بہر حال اس سے تکلیف ہو گی حضور ﷺ نے کچی پیاز خود بھی ملاحظہ نہ فرمائی دوسروں کو اجازت دی کیونکہ آپ فرشتوں سے کلام فرماتے تھے۔ **ساتواں فائدہ:** یہ کہ اللہ والوں کی عداوت رب کی رحمت سے محروم کر دیتی ہے رب نہیں چاہتا کہ میرے محبوب کا دشمن میری جنت میں آئے جیسا کہ اسرائیلیوں کا حشر ہوا کہ پیغمبروں کی عداوت نے دونوں جہان میں ان کو ذلیل و خوار کر دیا۔ **آٹھواں فائدہ:** یہ کہ بغیر ایمان پیغمبر زادگی بیکار ہے دیکھو بنی اسرائیل اولاد انبیاء ہیں مگر بد عقیدگی کی وجہ سے غضب الٰہی میں گرفتار ہو گئے۔ آج بھی جو کوئی اپنے کو سید کہلوا کر رافضی، مرزائی، دیوبندی، وہابی وغیرہ بن جاوے وہ سید ہی نہیں جب مسلمان ہی نہیں تو سید کیسا۔ کنعان کے حال سے سبق لو۔ **نواں فائدہ:** یہ کہ رب کا عذاب فوراً نہیں آتا بہت مہلت ملتی ہے اور جب آتا ہے پھر پلٹتا نہیں۔ اسرائیلی پیغمبروں کو قتل کرتے رہے مگر مہلت میں رہے پھر ایسی سخت پکڑ ہوئی کہ قیامت تک اس میں گرفتار ہو گئے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ اسرائیلیوں نے پیغمبروں کو قتل کیا مگر دوسری جگہ رب فرما رہا ہے اِنَّا لَنَنْصُرُ

رُسُلَنَا (المومن:۵۱) اور فرماتا ہے وَ لَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿﴾ إِنَّهُمْ لَهُمُ الْمَنْصُوْرُوْنَ (الصافات:۱۷۲) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے پیغمبروں کی مدد ضرور فرماتا ہے جب ان کی مدد ہوئی تو یہود سے مغلوب کیوں ہو گئے۔ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ **ایک** یہ کہ مدد اور نصرت کے وعدے مجاہدین انبیاء کے متعلق ہیں اور غیر مجاہدین نبی شہید ہوئے یعنی اگر پیغمبر کفار سے جہاد فرمائیں تو انشاء اللہ کافروں سے مغلوب ہو کر شہید نہ ہوں گے جن پیغمبروں کو شہید کیا گیا ان پر جہاد فرض ہی نہ تھا **دوسرا** یہ کہ مدد کی آیتوں میں دلائل کی مدد مراد ہے یعنی دلائل میں کوئی پیغمبر کافر سے مغلوب نہ ہوں گے (تفسیر روح البیان) **تیسرے** یہ کہ مدد کی آیتوں میں باطنی امداد مراد ہے کہ اگرچہ بظاہر کفار غالب بھی آجاویں اور پیغمبر کو شہید بھی کر دیں مگر دراصل یہ شہادت پیغمبروں کی فتح ہے اور کفار کی شکست کیونکہ اس سے ان کے دین کا غلبہ ہی ہوتا ہے کفار کا مقصد پورا نہیں ہوتا بظاہر امام حسین کے مقابلہ میں یزیدیوں کو فتح ہوئی امام حسین شہید ہوئے مگر درحقیقت امام حسین کی فتح اور یزیدیوں کی سخت شکست ہوئی۔ کیونکہ یزید اس جنگ کا مقصد نہ پاسکا۔

دوسرا اعتراض: اس تفسیر سے معلوم ہوتا ہے کہ تا قیامت یہود کی سلطنت نہ ہوگی اور احادیث میں آتا ہے کہ دجال یہود میں سے ہوگا وہ تو تمام دنیا میں بادشاہت کرے گا۔ نیز بعض یہود غالب ہو کر کعبہ معظمہ کی عمارت کو بھی شہید کر دیں گے اور آج بھی بعض جگہ یہودی حاکم ہیں ہندوستان کا وائسرائے یہودی رہ چکا ہے۔ **جواب:** دجال وغیرہ کی مستقل سلطنت نہ ہوگی بلکہ ڈاکوؤں کا سا شور ہڑبونگ چالیس روز تک رہے گا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری پر ختم ہوگا اس ہڑبونگ کو کوئی بھی عاقل سلطنت نہیں کہتا۔ کسی جگہ کی عارضی حکومت مل جانا بھی سلطنت نہیں اگر ہندو یا کوئی مسلمان چند روز کے لئے وائسرائے بنایا جائے تو اس سے مسلمان یا ہندوؤں کی سلطنت نہ ہو جاوے گی۔ وائسرائے بھی حکومت کا غلام ہوتا ہے یہاں مستقل سلطنت کی نفی ہے اور واقعی اب تک یہود کی سلطنت ایک چپہ زمین پر بھی نہیں اور نہ انشاء اللہ ہوگی اگر کچھ دن کے لئے سلطنت بھی مل جاوے تو انہیں ذلیل کرنے اور دیگر قوموں سے پٹوانے کے لئے ہوگی جیسے کسی کمزور آدمی کو شاباش دے کر اکھاڑے میں کسی پہلوان کے مقابل کھڑا کر دیا جاوے پٹوانے کے لئے یہ تعظیم نہیں بلکہ اس کی توہین کی تمہید ہے۔ دجال کو اتنے اختیارات دئے جائیں گے۔ عیسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ ہلاک کرا کر ذلیل کرنے کے لئے عزت کے بعد ذلت سخت تر ہے۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہودیوں پر ذلت اور غریبی لازم کر دی گئی حالانکہ آج بھی یہود بڑی مالدار قوم ہے۔ **جواب:** اس کا مفصل جواب تفسیر میں گزر گیا کہ وہ مالدار ہو کر بھی غریب ہی رہیں گے۔ ان کا دل غریب اور چہرہ غریبوں کا سا ان سے برتاوا غریبوں سے بدتر ہوگا ابھی جرمنی نے یہودیوں کو اپنے ملک سے نکالا تو بہت سے قبیلوں کو زمین پر جگہ نہ ملتی تھی۔ ان کا جہاز سمندر میں پھرتا پھراتا تھا کوئی ملک اپنے یہاں اترنے نہیں دیتا تھا یہ مالداری کس مصرف کی ذلت تو بالکل ظاہر ہے اس سے بڑھ کر کیا ذلت ہوگی کہ ان ناخواندہ مہمانوں کا آنا ہی کوئی گوارا نہیں کرتا۔

چوتھا اعتراض: قرآن کہتا ہے کہ وہ ہمیشہ دوسروں کے غلام رہیں گے مگر آج فلسطین میں یہودیوں کی بادشاہت قائم ہو گئی تو قرآن کی یہ خبر غلط ہو گئی۔ **جواب:** قرآن کریم نے ان کی سلطنت ختم نہ ہونے کی خبر نہ دی بلکہ حدیث شریف

میں تو فرمایا گیا کہ آخر زمانے میں مسلمانوں کی جنگ یہود سے ہوگی جس میں یہود کو شکست ہوگی حتی کہ اگر کوئی یہودی کسی درخت یا پتھر کے پیچھے چھپے گا تو وہ پتھر آواز دے گا کہ اے مسلمان یہاں یہودی ہے اسے قتل کر۔ اس حدیث شریف میں ان کی سلطنت کی خبر دی گئی۔ نیز فرمایا گیا ہے کہ قریب قیامت ایک حبشی یہودی کعبہ معظمہ کو شہید کرے گا۔ غرضیکہ ان کی سلطنت کی خبریں احادیث میں ہیں۔

تفسیر صوفیانه

جیسے کہ بنی اسرائیل نے خباثت نفس کی وجہ سے ایک کھانے پر صبر نہ کر کے موسیٰ علیہ السلام سے ادنیٰ کھانوں کی درخواست کی ایسے نفس امارہ اس غیبی کھانے پر صبر نہیں کرتا جس کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے میرا رب مجھے کھلاتا پلاتا ہے بلکہ یہ نفس امارہ موسیٰ قلب سے عرض کرتا ہے کہ رب سے دعا کر کے ہم کو وہ کھانے دلا جو کہ بشریت کی زمین سے پیدا ہوتے ہیں حیوانیت کا ساگ پات اور لذات جسمانیہ کی ککڑیاں وغیرہ موسیٰ قلب کی طرف ارشاد ہوتا ہے کہ تم عالم ارواح کی تیہ سے عالم سفلی کے شہر میں چلے جاؤ وہاں تم کو یہ ادنیٰ مطالب حاصل ہوں گے اس نفس پر ذلت اور مسکنت ڈال دی گئی کہ فرمایا گیا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (اعراف: ۱۷۹) کیونکہ یہ نفس مکاشفات روحانیہ اور انوار غیبیہ کا جو کہ آیات الٰہیہ میں منکر تھا اور انبیاء کرام کے اسرار غیبیہ کا انکار کر کے ان کے دین کو باطل کرنا چاہتا تھا جو کہ مثل قتل نبی کے ہے اور اس کو یہ ہمت اس لئے ہوئی کہ ماسوی اللہ کا طالب بن کر پہلے سے عادی مجرم بن چکا تھا اور طلب حق میں کوتاہی کر کے حد سے آگے بڑھ گیا تھا (روح البیان) بزرگوں سے دعا کرانا بہترین چیز ہے مگر ان پر ضد کرنا ہلاکت کا باعث جو دعا ان سے جبراً کرائی جاوے گی وہ ہلاکت کا باعث ہوگی۔ دیکھو یہود نے موسیٰ علیہ السلام سے ضد کر کے دعا کرائی دعا قبول تو ہوگئی مگر اس کا انجام خراب ہوا دیکھو جمیل نے حضور سے ضد کر کے دولت کی دعا کرائی مگر اس کا انجام بد ہوا کہ وہ دولت پا کر اولاً فاسق بعد میں مرتد ہوگیا۔ جس کے بارے میں قرآن کریم میں عتاب موجود ہے دعا وہ ہی اچھی جو یار کی رضا کی حامل ہو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالنَّصٰرٰى وَالصّٰبِـِٕيْنَ
تحقیق وہ لوگ جو ایمان لائے اور وہ لوگ جو یہودی ہوئے اور عیسائی اور صابی لوگ
بے شک ایمان والے نیز یہودیوں اور نصرانیوں اور ستارہ پرستوں میں سے
مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ
جو کہ ایمان لے آئے ساتھ اللہ اور دن پچھلے کے اور نیک کام کریں پس واسطے انکے ثواب ہے
وہ جو کہ سچے دل سے اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائیں اور نیک کام کریں ان کا ثواب ان کے رب کے
عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۶۲﴾

ان کا نزدیک رب انکے کے اور نہیں ہے ڈر او پر ان کے ور نہ وہ لوگ غمگین ہوں گے
پاس ہے اور نہ انہیں کچھ اندیشہ ہو اور نہ کچھ غم

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **ایک** یہ کہ قرآن کریم کا قاعدہ ہے کہ کفر کے بعد ایمان اور غضب وقہر کے بعد لطف ومہر کا ذکر فرماتا ہے اب تک یہود کے کفر اور ان پر غضب کا ذکر تھا اب ایمان اور رحمت رب کا ذکر فرمایا کیونکہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ **دوسرے** یہ کہ پہلے ہلاک کرنے والے عیوب کا ذکر ہوا اب نجات دینے والی صفات تاکہ یہود وغیرہ ان سے توبہ کر کے یہ صفات اختیار کریں طبیب کامل دوا اور پرہیز دونوں بتاتا ہے اور وجہ مرض بھی جتاتا ہے تاکہ اس سے بیمار آئندہ دور رہے۔ **تیسرے** یہ کہ پہلے بتایا گیا کہ یہود غضب الٰہی کی آگ کے مستحق بن چکے ہیں اب فرمایا جاتا ہے کہ اس آگ کو بجھانے والا رحمت کا پانی بھی ہے اگر یہ لوگ اب بھی اس دریا میں غوطہ لگائیں تو ہم ان کے سارے گناہ معاف کردیں گے اب بھی وقت ہے **چوتھے** یہ کہ اس سے پہلے غضب کے اسباب کا ذکر ہوا۔ کہ قتل انبیاء وغیرہ وہ جرم تھے جس سے صدہا بیماریاں پیدا ہوگئیں اب رحمت کے اسباب کا ذکر ہے کہ ایمان اور نیک کام وہ تریاق ہے جس سے سخت زہریلے سانپ یعنی کفر کا بھی زہر اتر جاتا ہے۔ بعض اعمال نیکیوں کو برباد کردیتے ہیں وہ پہلے ذکر ہوگئے۔ بعض اعمال برائیوں کو مٹا دیتے ہیں وہ اب بیان ہو رہے ہیں۔

شان نزول

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ایمان کی تلاش میں بہت سرگرداں رہے اور ملک ملک پھرے، بہت سے عیسائی راہبوں اور یہودی عابدوں کے حالات دیکھے ان کی بہت بڑی عمر تھی بعض فرماتے ہیں کہ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بعض حواریوں سے بھی ملے ہیں اس لحاظ سے یہ ان کے تابعی اور حضور علیہ السلام کے صحابی ہیں۔ واللہ اعلم جب تقدیر نے ان کو بارگاہ مصطفیٰ علیہ السلام تک پہنچادیا اور یہ اسلام سے مشرف ہوگئے تو انہوں نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عیسائی عابدوں کی سخت عبادات اور ان کے استدراج (کرامات) کا ذکر کیا جو انہوں نے خود دیکھی تھیں حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ وہ کتنی بھی عبادات کریں۔ ایمان کے بغیر کچھ قبول نہیں اس مبارک فرمان کی تائید میں یہ آیت اتری۔ اس کے اترنے پر حضور علیہ السلام نے حضرت سلمان سے فرمایا کہ یہ آیت تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے بارے میں اتری جو شخص دین عیسوی پر مرے اور ہماری تشریف آوری سے بےخبر رہے وہ تو خیر پر ہے اور جو ہمارا نام سن کر پھر ایمان نہ لائے وہ ہلاک ہوگا۔ (از تفسیر خزائن العرفان وعزیزی)

تفسیر

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اس سے یا تو منافقین مراد ہیں جو کہ صرف زبان سے ایمان لائے تھے نہ کہ دل سے اور ان کو منافق اس لئے نہ کہا تاکہ معلوم ہو کہ نام کا ایمان کام نہیں دے گا یا وہ یہودی اور عیسائی مراد ہیں جو کہ حضور علیہ السلام سے پیشتر عیسیٰ علیہ

السلام وغیرہ پر ایمان لائے اور خرافات سے بچے رہے جیسے قیس ابن ساعدہ بحیرہ راہب، حبیب نجار، زید ابن عمرا بن نفیل، ورقہ ابن نوفل سلمان فارسی ابوذر غفاری۔ وفد نجاشی وغیرہ یا اس سے مخلص مومنین اہل اسلام مراد ہیں اس جگہ ان کا گذشتہ ایمان مراد ہے آئندہ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ میں مستقبل کا ایمان یعنی خاتمہ بالخیر حاصل ہونا یعنی جو فی الحال ایمان لے آئے اور ایمان پر وفات پا گئے وَالَّذِيْنَ هَادُوْا اور وہ جو یہودی ہوئے یہ لفظ یا تو ھود سے بنا ہے جس کے معنی ہیں توبہ کرنا رجوع کرنا چونکہ انہوں نے بچھڑے کی پوجا سے بے مثل اور سخت توبہ کی تھی۔ اس لئے ان کو یہودی کہا گیا کیونکہ انہوں نے عرض کیا تھا هُدْنَآ اِلَيْكَ (اعراف:۱۵۶) یا یہ لفظ یہود کی نسبت ہے۔ یہودا یعقوب علیہ السلام کے بڑے فرزند کا نام تھا۔ یعنی یہودا والے لوگ۔ یا ھود کے معنی ہیں ہلنا یعنی حرکت کرنا چونکہ یہ لوگ توریت شریف بہت جوش سے ہل کر جھوم کر پڑھتے تھے اس لئے یہودی نام ہوا۔ یا ھود کے معنی ہیں رہبری کرنا مخبری کرنا یہ بادشاہ وقت کو انبیاء کرام کی خبر دے کر انہیں قتل کراتے تھے اس لئے یہ لقب غضب ملا۔ (تفسیر کبیر وروح البیان) ان کے عقائد نہایت گندے ہو چکے تھے حق تعالیٰ کو جسم مانتے تھے انبیاء کرام پر تہمت لگاتے تھے۔ موسیٰ علیہ السلام پر ہارون علیہ السلام کے قتل کی تہمت، حضرت مریم کو زنا کی تہمت، حضرت داؤد علیہ السلام کو اوریا کے قتل کی تہمت، حضرت سلیمان علیہ السلام کو جادوگری کی تہمت لگائی۔ انہوں نے توریت کو بدلا۔ حضور علیہ السلام کی نعت کی آیتوں کو صاف بگاڑ دیا۔ یہ یہودی نبی کو محض ایلچی مانتے تھے یعنی اس کی قدر رب کے نزدیک زیادہ نہیں فقط قاصد اور چٹھی رساں سی ہے (تفسیر عزیزی) یہ ہی عقیدہ اس زمانے کے دیوبندوں کا ہے شاید یہ فرقہ بھی یہود کی ہی شاخ ہے۔ دیکھو "تقویۃ الایمان۔ وَالنَّصٰرٰى" یہ نصران کی جمع ہے۔ جیسے کہ ندمان کی جمع ندامٰی۔ یہ لفظ نصر سے بنا ہے جس کے معنی ہیں مدد کرنا عیسائیوں کو یا تو اس لئے نصاریٰ کہتے ہیں کہ جب عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ (آل عمران:۵۲) میرا مددگار کون ہے تو ان کے ساتھیوں نے عرض کیا۔ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ (آل عمران:۵۲) ہم اللہ کے دین کے مددگار ہیں جیسے صحابہ کرام کی ایک جماعت کا نام انصار ہے یا ناصرہ ایک بستی کا نام تھا جہاں عیسیٰ علیہ السلام اکثر تشریف لایا کرتے تھے۔ اس کی طرف منسوب کیا گیا ان کے نہایت واہیات عقیدے ہیں یہ عیسیٰ علیہ السلام میں خدائی کا حلول مانتے تھے۔ جیسے کہ پھول میں خوشبو ان کا عقیدہ ہے کہ نیک اعمال کی ضرورت نہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام ہم سب کی طرف سے سولی پا گئے۔ ان کی صلیب ہمارے گناہوں کا کفارہ بن گئی اور قیامت کے دن عیسیٰ علیہ السلام ہی سب کو عذاب یا نجات دیں گے خیال رہے کہ نصاریٰ اور انصار کے نام ہی وہابیت کی تردید ہیں۔ کیونکہ نصاریٰ کے معنی ہیں عیسیٰ علیہ السلام کے مددگار اور انصار کے معنی ہیں حضور ﷺ کے مددگار تو اگر خدا کے سوا کسی کی مدد لینا ہی شرک ہو تو یہ نام بھی مشرکانہ ہوں گے اور نبیوں کا مدد مانگنا بھی شرک ٹھہرے گا۔ غرضیکہ یہ نام رد وہابیت کے لئے بڑی میگزین ہے وَالصّٰبِـِٕيْنَ یہ لفظ صباء سے بنا ہے جس کے معنی ہیں نکل جانا چونکہ یہ بھی یہودیت سے نکل کر ستارہ پرست بن گئے اس لئے صابئ کہلائے گئے یا اس کے معنی ہیں انڈیلنا، کوٹ دینا، گرانا ان بدنصیبوں نے پہلے انبیاء کرام کو گرفتار کر کے ان کے سروں پر کھولتا ہوا پانی انڈیل کر شہید کیا اس لئے ان کا یہ نام ہوا۔ ان کے بھی بہت برے عقیدے ہیں ان کے مذہب کا خلاصہ یہ ہے کہ آدمی سعادت حاصل کرنے میں کسی پیغمبر یا

مرشد کا حاجتمند نہیں اس کو چاہئے کہ روحانیت سے مناسبت پیدا کرے ان میں بعض لوگ ستاروں کی پوجا کرتے ہیں اور بعضے ستاروں کے نام کے بت بنا کر انہیں سجدہ کرتے ہیں ان میں ایک فرقہ ہے جس کا نام کلدانیین ہے اسی کا ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں زور تھا اور آپ انہی کے مقابلے کے لئے بھیجے گئے۔ بعض صابئین تین وقت کی نماز بھی پڑھتے ہیں اور اونٹ کبوتر اور پیاز کو حرام جانتے ہیں اور شراب کو جائز بعض علماء فرماتے ہیں کہ صابئین عراق کے علاقہ میں ہیں کسی پیغمبر کو نہیں مانتے بعض نے فرمایا کہ ان کا مذہب عیسائیوں اور مجوسیوں کے درمیان ہے بعض نے کہا کہ اہل کتاب میں سے ہیں زبور پڑھتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ یہ ملائکہ کی پرستش کرتے ہیں۔ غرض کہ ان کے دین کی صحیح تحقیق نہ ہو سکی۔ کیونکہ یہ تقریباً مٹ چکے ہیں۔ (تفسیر عزیزی وکبیر) اسی واسطے ہمارے اماموں میں اختلاف ہے بعض نے ان کو اہل کتاب مان کر ان کی عورتوں سے نکاح اور ان کا ذبیحہ حلال مانا ہے۔ بعض نے فرمایا کہ مشرک ہیں اور ان کا ذبیحہ حرام ہے۔ مَنْ اٰمَنَ یہاں صحیح اور سچا ایمان یا خاتمہ کے وقت کا ایمان مراد ہے ورنہ ہر کافر اپنے کو مومن سمجھتا ہے۔ بِاللّٰهِ اللہ پر ایمان لانے میں اس کی ذات وصفات اور اس کے رسولوں پر ایمان لانا بھی داخل ہے۔ اگر اس کی ایک صفت کا بھی انکار کیا گیا یا اس کے لئے کوئی عیب مانا گیا یا اس کے کسی نبی کا انکار کیا گیا تو اللہ پر ایمان حاصل نہ ہوا لہٰذا یہود، عیسائی، صابئ وغیرہ کوئی بھی اللہ پر ایمان نہیں رکھتے کیونکہ یہ اس کے پیغمبروں کے منکر ہیں اور اس کے لئے بیوی بیٹا جسم وغیرہ عیوب مانتے ہیں۔ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ اس سے قیامت کا دن مراد ہے اور جنت، دوزخ حساب اور کتاب اور سارے احکام شرعیہ پر ایمان لانا اس میں داخل ہے جو شخص اس میں سے ایک کا بھی انکار کردے وہ درحقیقت قیامت کا منکر ہے۔ مثلاً جو آدمی نماز کا منکر ہے۔ وہ قیامت کے دن اس کے حساب وکتاب کا قائل نہیں لہٰذا وہ صحیح معنی میں قیامت کا قائل نہیں ان دو لفظوں میں ساری ایمانی باتیں داخل ہو گئیں۔ خیال رہے کہ منافقین یہود ونصاریٰ اور صابئین ان میں سے کوئی بھی خدا تعالیٰ اور اس کی صفات اور قیامت کا منکر نہ تھا مگر فرمایا گیا کہ ان میں جو اللہ اور قیامت پر ایمان لائے کیونکہ وہ لوگ حضور ﷺ کے منکر تھے اس لئے انہیں سب کا منکر قرار دیا گیا۔ ایک ہے اللہ اور قیامت کو ماننا اور ایک ہے ان پر ایمان لانا ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔ نجات کے لئے ماننا کافی نہیں بلکہ ایمان لانا کافی ہے۔ ایمان وہ ہے جو نبوت کی معرفت ہو دیکھو شیطان توحید وقیامت وغیرہ سب کچھ مانتا ہے مگر مومن نہیں کیونکہ نبوت کے بغیر ماننا ہے لہٰذا ناجی نہیں توحید سکہ ہے نبوت اس کی مہر بغیر مہر سکہ رائج نہیں وَعَمِلَ صَالِحًا ایمان کے بعد عمل کا ذکر فرما کر یہ بتایا گیا ہے کہ کوئی شخص ایمان پر کفایت کر کے اعمال سے بے پرواہ نہ ہو جائے ایمان سے نجات ہوتی ہے اور اعمال سے کامل نجات صالح عمل وہ ہے جو اللہ کو پسند ہو منسوخ اعمال اب صالح نہیں رہے۔ اگرچہ ایک وقت میں صالح تھے لہٰذا احمد مصطفیٰ ﷺ کی تشریف آوری کے بعد یہودیت اور عیسائیت کے اعمال گناہ بن گئے مندر کا پجاری گرجے اور کنیسہ میں بیٹھنے والے لوگ اب نیک کار نہیں خیال رہے کہ عمل صالح وہ جس سے رب راضی ہو رضا الٰہی نہ تو عقل سے معلوم ہو سکتی ہے نہ لوگوں کی رائے سے صرف پیغمبر کے بتانے سے معلوم ہوتی ہے حضور کی ذات اچھے برے اعمال، اچھے برے لوگوں کی کسوٹی ہے جس سے ہر چیز کا پتہ لگتا ہے ورنہ رضا اور ناراضی تو انسان کی بھی معلوم نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ وہ نہ بتائے کہ یہ دل کے احوال ہیں فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ

یعنی ان کو پورا اجر ملے گا۔ اس میں اشارۃً بتایا گیا کہ اگر یہودی عیسائی اب بھی ایمان لے آئیں تو ان کے پچھلے گناہ معاف کر دیئے جائیں گے اور انہیں پورا ثواب دیا جائے گا گویا کہ وہ پہلے ہی سے مومن تھے سو برس کا ایماندار اور ایک دن کا ایماندار اجر میں برابر ہیں لہٰذا یہ لوگ یہ خیال نہ کریں کہ اتنا عرصہ کفر کرنے کے بعد اب ایمان لانا بیکار ہے خیال رہے کہ ایمان کا اجر سب کے لئے یکساں ہے یعنی جنت۔ ہاں اعمال اور کیفیت ایمانی کے ثواب میں فرق ہے۔ اسی لئے جنت میں مختلف درجے ہیں۔ عِنْدَ رَبِّهِمْ ان کے رب کے پاس عِنْدَ سے نہ تو قرب مکانی مراد ہے اور نہ قرب حفاظت بلکہ قرب یقینی مراد ہے یعنی ان کا ثواب یقینی ہے جس میں کچھ زور نہیں اس جگہ رب نے عند فرما کر یہ بتایا کہ جس طرح حق تمہاری پرورش کرتا ہے ایسے ہی تمہارے اعمال اور ایمان کی بھی کہ ایک ساعت کے ایمان اور تھوڑے سے عمل کو صد سالہ ایمان اور اعمال مقبول عطا فرمائے نیز اشارہ فرمایا گیا کہ تمہیں ثواب تمہارے اعمال کے لائق نہیں، شان کے لائق نہیں بلکہ اپنی شان کے لائق دیں گے دیکھو ایک آن کے ایمان اور چند سالوں کی عبادت کا ثواب جنت کی بے حساب نعمتیں اور وہاں کا دائمی قیام ہے۔ رب کے شان کے لائق اجر۔ شاہ حجاز جب پاکستان میں لاہور اسٹیشن پر اترے تو جس قلی نے ان کا لوٹا بھی اٹھالیا اسے بھی سو روپے عطا کئے پھر رب کی عطا کا کیا کہنا وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ یا تو اس سے آخرت کا خوف مراد ہے یعنی وہاں کفار کو ڈر ہوگا نہ کہ مومنین کو اور یا دنیا اور آخرت کا عام خوف یعنی اگر یہ ایمان لے آئے تو انہیں گزشتہ کفر اور بدکاریوں کا کوئی ڈر نہیں کیونکہ وہ سارا میل کچیل ایمانی پانی اور رحمت ربانی سے دھل گیا۔ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ اس میں بھی وہی دو احتمال ہیں کہ یا تو وہ قیامت میں غمگین نہ ہوں گے اور یا دنیا میں بھی یعنی ان کو ایمان لانے کے بعد گذشتہ عمر کے برباد ہونے کا رنج وغم نہ ہوگا بلکہ آئندہ کی راحت کے خیال سے دل کو خوشی حاصل ہوگی۔

خلاصہ تفسیر

پچھلی آیتوں میں یہود کی ذلت اور ان پر وقتاً فوقتاً عذاب الٰہی کا نزول بیان کیا گیا تھا اور ان کی انتہائی بدعملیوں کا ذکر ہوا تھا جس سے ان کو ایک طرح کی مایوسی ہو سکتی تھی اس آیت میں ان کی مایوسی کو مٹایا گیا اور فرمایا گیا کہ ہمارے ہاں کسی شخص کی ذات سے عداوت نہیں صرف ایمان اور اعمال پر نجات کا دارومدار ہے مسلمان ہو۔ عیسائی یہودی ہو یا صابیٔ جو اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان لا کر اچھے کام کرے گا اس کو خدا کے پاس ضرور ثواب ملے گا نہ تو اسے خوف عذاب ہوگا اور نہ یہ رنج کہ ہم نے بہت سی عمر برباد کیوں کر دی کیونکہ نئے اور پرانے مومن ہمارے ہاں برابر ہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** یہ کہ بغیر ایمان کوئی عمل قبول نہیں ایمان جڑ ہے اور اعمال پانی جڑ کٹنے کے بعد پانی دینا بیکار ہے۔ **دوسرا فائدہ:** یہ کہ سارے ایمانات پر ایمان ضروری ہے ایک کا بھی انکار کفر ہے۔ **تیسرا فائدہ:** یہ کہ ایمان میں زیادتی کمی نہیں اور نہ اس میں نئے پرانے کا اعتبار۔ **چوتھا فائدہ:** یہ کہ کوئی اپنے بزرگوں کی عظمت پر گھمنڈ نہ کرے پیر اور فقیر زادے بادشاہ اور امیر سب ایمان وعمل کے حاجت مند ہیں۔ کیونکہ

بنی اسرائیل اپنی پیغمبر زادگی پر ناز کر کے ایمان اور اعمال سے بے نیاز ہو گئے تھے اس آیت میں ان کو یہ ہی بتایا گیا ہے مسلمانوں کو بھی اس سے سبق لینا چاہئے **پانچواں فائدہ:** یہ کہ حق تعالیٰ کو کسی سے ذاتی عناد نہیں ہر شخص ایمان و اعمال اختیار کر کے اس کی رحمت پا سکتا ہے۔ یہود نے ایک وقت ایمان اور نیکوکاری کی بدولت دنیا پر فضیلت حاصل کی پھر وہ ہی قوم بے ایمان اور بدکار بن کر ذلیل و خوار ہو گئی پچھلوں کی ترقی و تنزل سے اگلوں کو سبق لینا چاہئے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سے ایمان سمجھا گیا تھا پھر مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ کے کیا معنی۔ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ کبھی دوستوں کا ذکر کر کے دشمنوں کو سنایا جاتا ہے جیسے کوئی بادشاہ کہے کہ ہمارا کوئی موافق ہو یا مخالف جو ہماری اطاعت کرے گا وہ ہم سے انعام لے گا۔ ظاہر ہے کہ موافق تو اطاعت کر ہی رہا ہے مخالف ہی کو سنانا منظور ہے جس کا منشا یہ ہے کہ اے مخالفو ہمیں موافقین سے کوئی خصوصیت نہیں بلکہ ان کی اطاعت ہماری مہربانی کا سبب ہے اگر تم بھی اس زمرے میں آجاؤ تو تم کو بھی انعام ملے گا دوسرے یہ کہ عطف تفسیری ہے اہل کتاب اپنے کو مومن سمجھتے تھے تو فرمایا گیا کہ جو لوگ اپنے کو مومن جانتے ہیں یعنی یہود و نصاریٰ وغیرہ یہ حقیقۃً مومن نہیں اور مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ سے حقیقی ایمان مراد یعنی جو بھی ان سے حقیقی ایمان لے آئے خدا سے اس کا اجر پائے گا اور باقی وہ ہی جواب ہیں جو ہم تفسیر میں بتا چکے۔ یعنی اٰمَنُوْا سے منافقین مراد اور مَنْ اٰمَنَ سے مخلصین یا اٰمَنُوْا سے دنیوی مومن مراد اور مَنْ اٰمَنَ سے موت کے وقت کے مومن یا اٰمَنُوْا سے ایمان لانے والے مراد اور مَنْ اٰمَنَ سے ایمان پر قائم رہنے والے۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ فقط اللہ اور قیامت پر ایمان لانا کافی ہے نہ کہ قرآن وغیرہ باقی چیزوں پر **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر گیا ہے کہ ان دو باتوں میں سارے ایمانیات داخل ہیں جب مبدا اور مبدی اور معاد اور منتھا کا ذکر کر دیا تو درمیانی چیزیں خود بخود شامل ہو گئیں کوئی کہتا ہے کہ میں پشاور سے کلکتہ پہنچا تو راستہ کے تمام شہر خود بخود اس میں آ گئے۔ یا کہا جائے کہ نماز تکبیر تحریمہ سے سلام تک کا نام ہے تو بقیہ ارکان خود ہی اس میں آ گئے۔ خیال رہے کہ اللہ کے ماننے میں رسولوں کتابوں کا ماننا خود بخود آ گیا جیسے باپ کو مان کر اس کے تمام قرابت داروں کا ماننا لازم ہے کہ باپ کا بھائی چچا اور اس کا باپ دادا ہے اس کی زوجہ ماں۔ ایک باپ کا رشتہ ان تمام رشتوں کو اپنے میں لئے ہوئے ہے یوں ہی اللہ کو رب ماننے میں انبیاء اور اولیاء سے رشتہ غلامی خود بخود آ گئے جیسے باپ کا بیٹا اپنا بھائی ضرور ہے بلاتشبیہ اسی طرح اللہ کے محبوب بندے ہمارے لئے قابل احترام ضرور ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کا دعویٰ تھا کہ ہم اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں ان کے اس خیال کی تردید کر دی گئی۔ **تیسرا اعتراض:** فَلَهُمْ کی ف سے معلوم ہوتا ہے کہ ثواب ایمان اور عمل دونوں پر مرتب ہے لہٰذا بدعمل مومن اور نیک عمل کافر دونوں ہی ثواب سے محروم ہیں تو چاہئے کہ گنہگار مسلمان اور کفار برابر ہوں۔ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ یقینی ثواب بلا عذاب نیک کار مومن ہی کے لئے ہے کفار کے لئے ثواب ہی نہیں اور گنہگار مسلمان اس کے لئے ثواب تو ہے مگر پہلے کچھ عذاب کا بھی اندیشہ ہے دوسرے یہ کہ یہاں تین چیزوں کا ذکر ہے ثواب کا ملنا اور خوف و غم سے محفوظ

رہنا اور تینوں باتیں صرف نیک کار مسلمانوں کو حاصل ہوں گی گنہگار مسلمانوں کو قیامت کے دن کچھ خوف و غم بھی ہوگا۔ خیال رہے کہ بدکار سے وہ مراد ہے جو اعمال کا موقع پائے اور نہ کرے۔ جس کو موقع ہی نہ ملا اس کے لئے صرف ایمان ہی نیک عمل ہے یہاں تک کہ متقی مسلمانوں کے نابالغ بچے بھی انشاء اللہ متقین میں شمار ہوں گے غرضیکہ ایمان و اعمال بلاواسطہ بھی ہیں اور بالواسطہ بھی بچوں کا ایمان و عمل بالواسطہ ہے مگر کفر و بدعمل بلاواسطہ معتبر ہیں بالواسطہ معتبر نہیں اس لئے کفار کے ناسمجھ بچے انشاء اللہ عذاب نہ دیئے جائیں گے کہ انہوں نے نہ کفر کیا نہ بدعملی۔

تفسیر صوفیانہ

ایمان کی چند نوعیتیں ہیں۔ تقلیدی رسمی ایمان، عادی ایمان، تحقیقی ایمان۔ کسی کے دیکھا دیکھی محض باپ داداؤں کی پیروی پر بغیر تحقیق کے مسلمان بن جانا تقلیدی ایمان ہے اور اگر عقیدہ درست نہ ہو فقط لوگوں کی شرم سے نماز وغیرہ پڑھ لینا اور ایمان کے مراسم ادا کر لینا رسمی ایمان ہے اور عبادت سے مجبور ہو کر عبادت کرنا عادی ایمان یہ تینوں ایمان ناقص ہیں ہاں جس کا قلب نور معرفت سے منور ہو اور وہ اس نور قلبی سے اللہ اور یوم آخر کو پہچانے اس پر انانیت کے حجاب کا خوف نہیں اور نہ وہ دوئی کے بھنور سے غمگین ہو کیونکہ وہ توحید کے دریا میں غوطہ زن ہے اور لا الہ کی تلوار سے اپنا سب کچھ فنا کر کے الا اللہ کی برکت سے باقی باللہ ہے نیز ایک ایمان فطری ہے جو میثاق کے دن بلے کہہ کر سب کو حاصل ہوا۔ مگر اس ایمان میں سعید و شقی میں فرق نہ تھا۔ جب یہ اپنی ماؤں کے پیٹ میں آئے تب کاتب تقدیر نے عالم اقرار پر نظر نہ کی بلکہ علم اللہ القہار پر نظر کر کے ہر ایک کی سعادت و شقاوت لکھی اسی لئے ایک حدیث شریف میں آتا ہے کہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے دوسری حدیث میں ہے کہ جس بچے کو حضرت خضر نے قتل کیا تھا وہ کافر پیدا ہوا تھا۔ پہلی حدیث میں میثاق ایمان مراد ہے اور دوسری میں شکم مادر کا ایمان اس لئے صوفیاء کرام کے ہاں ایمان کے چار مقام ہیں۔ ایک بطن معنوی جسے صوفیاء کرام ام یا ام الکتاب کہتے ہیں۔ دوسرا مقام بلے جسے مولود معنوی کہا جاتا ہے۔ تیسرا بطن ام صوری اور چوتھا مولود صوری بطن ام صوری یہ اللہ کا علم ہے جس میں سعید و شقی کا فرق موجود ہے۔ اس کی طرف اس حدیث میں اشارہ ہے اَلسَّعِیْدُ سَعِیْدٌ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ وَالشَّقِیُّ شَقِیٌّ فِیْ بَطْنِ اُمِّہٖ دوسری روایات میں آیا اَلسَّعِیْدُ قَدْ یَشْقٰی وَالشَّقِیُّ قَدْ یَسْعَدُ غرضیکہ میثاقی سعادت بدل جاتی ہے اور علم اللہ کی سعادت و شقاوت نہیں بدل سکتی تو اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا میں پہلی قسم کا ایمان مراد ہے اور مَنْ اٰمَنَ میں آخیری قسم معتبر۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَکُمُ الطُّوْرَ ؕ خُذُوْا مَآ
اور جبکہ لیا ہم نے عہد تمہارا اور اٹھالیا ہم نے اوپر تمہارے طور کو تو تم لوگ وہ
اور جب ہم نے تم سے عہد لیا اور تم پر طور کو اونچا کیا تو جو کچھ ہم تم کو
اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّۃٍ وَّاذْکُرُوْا مَا فِیْہِ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۶۳﴾ ثُمَّ
چیز جو دی ہم نے تم کو ساتھ طاقت کے اور یاد کرو تم وہ جو ہے بیچ اس کے شاید کہ تم پرہیزگار بن جاؤ

دیتے ہیں زور سے اور اس کے مضمون یاد کرو اس امید پر تمہیں پرہیزگاری ملے
تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ
پھر پھر گئے تم لوگ پیچھے سے اس کے پس اگر نہ ہوتا فضل اللہ کا اوپر تمہارے اور
پھر اس کے بعد تم پھر گئے تو اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت
وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۶۴﴾
رحمت اس کی البتہ ہو جاتے تم ٹوٹا پانے والوں میں سے
تم پر نہ ہوتی تو تم ٹوٹا پانے والوں میں ہو جاتے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** یہ کہ اس سے پہلے بنی اسرائیل کی نونعمتوں کا ذکر ہو چکا اب دسویں نعمت کا ذکر ہو رہا ہے ان نعمتوں کے درمیان ایمان اور اعمال کا ذکر جملہ معترضہ کے طریقہ پر تھا تا کہ سننے والے مسلسل مضمون سے اکتا نہ جائیں خیال رہے کہ قرآن کریم کی مثال اس بازار کی سی ہے جس میں مختلف دوکانیں ایک ہی لائن میں ہوتی ہیں جہاں سے ہر حاجتمند اپنی ضروریات زندگی تھوڑے سے وقت میں حاصل کر سکتا ہے اگر مختلف دوکانیں مختلف بازاروں میں ہوں مثلاً ایک بازار میں کھانے ہی کی دوکانیں اور دوسرے میں کپڑے ہی کی تو خریدار کو بہت دشواری بھی ہوگی اور اس کا بہت وقت بھی خرچ ہوگا۔ اسی طرح قرآن کریم میں قصے مثالیں احکام وغیرہ کے مضامین نہایت عمدہ ترتیب سے ہر جگہ جمع ہوتے ہیں تا کہ خریدار عقیدت کی پونجی صرف کر کے نہایت آسانی سے ہر ضرورت پوری کرے وہی طریقہ یہاں ہے۔ **دوسرا تعلق:** اس سے پہلے بنی اسرائیل کو نبی آخر الزمان ﷺ پر ایمان لانے اور نیک اعمال کرنے کی رغبت دی گئی اب فرمایا جا رہا ہے کہ اے اسرائیلیو شروع سے ہی تمہاری طبیعت عیش پسند اور تکلیفوں سے گھبرانے والی ہے۔ دیکھو تمہارے باپ داداؤں نے خود ہی تو توریت مانگی تھی اور خود اس کے احکام دیکھ کر پھر گئے تھے تب ان کو مجبور کر کے منوایا تھا اب بھی تم نے دعائیں کر کر کے نبی آخر الزمان کو پایا اور جب وہ تشریف لے آئے تو اپنی رشوتوں اور آمدنیوں کے کم ہونے کے خوف سے تم پھر ان سے پھر گئے۔ بہت ممکن ہے کہ پہلے کی طرح اب بھی تم کو قتل قید اور جلاوطنی اور جزیئے سے ڈرا کر ایمان کی رغبت دی جائے اس لئے بہتر ہے کہ تم خوشی خوشی ہی ایمان لے آؤ۔ تا کہ تمہیں وہ دن نہ دیکھنا پڑے تو گویا پچھلی آیت میں ثواب وغیرہ کا لالچ دے کر ان کو ایمان کی رغبت دی گئی اور اب نہایت حکیمانہ انداز میں کسی قدر دھمکا کر۔ اس شان کرم پر قربان ہر طرح ہمارا بھلا کرنا منظور ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں قرآن منوانے کا ذکر تھا اس آیت میں توریت منوانے کا گزشتہ واقعہ بیان ہو رہا ہے۔ یعنی یہ رحمت والے نبی کی برکت ہے کہ تمہیں یوں لالچ دے کر منا رہے ہیں ورنہ ہم اس پر بھی قادر ہیں کہ کوئی آفت دکھا کر تمہیں قرآن ماننے پر مجبور کر دیں اور تم مجبوراً ایمان قبول کر لو۔

تفسیر

وَاِذْ اَخَذْنَا یہاں بھی وہی فعل پوشیدہ ہے یعنی اے اسرائیلیو وہ واقعہ یاد کرو، یا اے نبی ﷺ ان کو یاد دلا دو، یہ واقعہ تیہ کے واقعہ سے پیشتر کا ہے جس وقت کہ بنی اسرائیل موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ بحر قلزم سے بخیر و عافیت نکل گئے اور فرعون غرق ہو چکا یہ پورا واقعہ خلاصہ تفسیر میں عرض کیا جائے گا اگرچہ عہد و پیمان موسیٰ علیہ السلام نے لیا تھا مگر چونکہ اللہ کے محبوبوں کا کام درحقیقت رب کا کام ہے اس لئے فرمایا گیا کہ ہم نے عہد لیا اس کی مثالیں قرآن کریم میں بیشمار ہیں۔ مِیْثَاقَكُمْ یہ لفظ وثق سے بنا ہے جس کے معنی ہیں مضبوطی۔ مہر اور قرض کی تحریر کو بھی اسی لئے وثق یا وثیقہ کہتے ہیں کہ اس سے ایک چیز کی مضبوطی کی جاتی ہے اصطلاح میں نہایت مضبوط عہد کو میثاق کہا جاتا ہے ہم وعدہ اور عہد اور میثاق کا فرق پہلے بیان کر چکے ہیں۔ جب بنی اسرائیل نے کتاب الٰہی مانگی تھی تب بھی موسیٰ علیہ السلام نے ان سے بہت مضبوط عہد و پیمان لے لیا تھا کہ تم مانگ تو رہے ہو بعد میں پھر نہ جانا اگرچہ ہر شخص سے علیحدہ عہد لیا گیا تھا لیکن چونکہ وہ ایک ہی نوعیت کا تھا اس لئے میثاق واحد فرمایا گیا۔ اس کی جمع یعنی مواثیق نہ فرمائی گئی جیسا کہ قرآن کریم فرماتا ہے ثُمَّ یُخْرِجُكُمْ طِفْلًا (المؤمن: ٦٧) یہاں بھی اطفال نہ فرمایا اسی ہی وجہ سے وَرَفَعْنَا بلکہ موسیٰ نے ان کو توریت لا کر دی یہ آزاد لوگ اس کی پابندیاں اور سخت احکام دیکھ کر گھبرا گئے تب ان پر طور پہاڑ اکھیڑ کر مثل شامیانہ کے کھڑا کر دیا گیا یہاں رَفَعْنَا کے معنے جڑ سے اکھیڑ کر اوپر کو اٹھا دینا ہیں اس سے یہ سمجھنا کہ یہودی پہاڑ کی جڑ میں کھڑے تھے اور اس کے گرنے سے ڈرتے تھے محض حماقت ہے کیونکہ اس قسم کا اونچا ہونا تو پہلے ہی سے حاصل تھا پھر رَفَعْنَا کے کیا معنی یہ فعل تو حدوث چاہتا ہے یعنی غیر موجود کو موجود کرنا نیز اس صورت میں موسیٰ کا کوئی خاص معجزہ نہ ہوتا نیز اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ پورا طور اٹھا کر اوپر لایا گیا اور اس میں تاویل کی بنا پر اس کا بعض حصہ زمین کے نیچے بھی رہا۔ فَوْقَكُمُ روایت میں آتا ہے کہ حضرت جبریل حکم الٰہی سے اس پہاڑ کو اپنی جگہ سے اکھیڑ کر اور اپنے پروں پر اٹھا کر لائے اور قد آدم فاصلہ سے بنی اسرائیل کے سر پر کھڑا کر دیا بنی سرائیل چار فرسخ (کوس) میدان میں پھیلے ہوئے تھے۔ پہاڑ بھی اتنا لمبا چوڑا کر دیا گیا۔ الطُّوْرَ یہ سریانی لفظ ہے جس کے معنی ہیں ہرا بھرا پہاڑ اور اب یہ لفظ اس پہاڑ کا نام بن گیا۔ جہاں موسیٰ علیہ السلام رب سے ہم کلام ہوتے تھے بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہاں اس سے عام پہاڑ مراد ہے یعنی ایک پہاڑ کو ان کے سر پر کھڑا کر دیا گیا۔ کیونکہ اس وقت یہ اسرائیلی طور پہاڑ سے بہت دور تھے مگر صحیح یہ ہے کہ اس سے خاص موسیٰ علیہ السلام کا طور ہی مراد ہے کیونکہ اگر طور کے لغوی معنی بھی مراد لو۔ تب بھی الف لام عہدی کی وجہ سے وہ خاص ہی مراد ہوگا اور جو رب کہ پہاڑ اکھیڑنے پر قادر ہے وہ دور تک لے جانے پر بھی قادر ہے۔ (تفسیر کبیر) خُذُوْا۔ یہ لفظ اَخْذٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں پکڑنا اور لینا۔ یہاں توریت کی تختیوں کا ہاتھ سے پکڑنا مراد نہیں بلکہ ماننا اور دل میں لینا مراد ہے یعنی ہم نے ان سے کہا کہ تم قبول کر لو مَآ اٰتَیْنٰكُمْ وہ احکام یا وہ کتاب جو ہم نے تم کو عطا فرمائی بِقُوَّةٍ یعنی پوری کوشش سے لو جیسے کہ دنیوی تھوڑا نفع حاصل کرنے کے لئے بڑی مشقتیں برداشت کر لیتے ہو۔ اسی طرح دینی نفع کے لئے توریت کے سخت احکام بھی برداشت کرو۔ رنج و راحت مصیبت و آرام کسی حالت میں اس کو نہ چھوڑنا اور اس پر دائم قائم رہنا جیسے جو چیز ہاتھ میں قوت

سے پکڑی جاوے وہ نہیں چھوٹتی ایسے ہی جو چیز قوت سے پکڑی جاوے وہ رنج وخوشی کسی حال میں نہیں چھوٹتی۔ امام حسین کبھی حضور کے کندھوں پر سوار اور کبھی شمر مردود آپ کے سینہ پر سوار نہ اس وقت فخر تھا نہ اس حالت میں بیقراری۔ ہر حال میں راضی بہ رضا الٰہی رہے اللہ تعالیٰ نے قوت بخشی خیال رہے کہ کبھی انسان ایمان کی قوت سے پکڑتا ہے اور کبھی ایمان انسان کو قوت سے پکڑتا ہے۔ جیسے رسی کو انسان پکڑے یا اسے رسی سے باندھ دیا جاوے پہلی صورت میں خطرہ ہے دوسری صورت بے خطر ہے پہلی صورت ابتداء ہے دوسری انتہا وَاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ یہ لفظ ذکر سے بنا ہے یا ذکری سے یعنی اس کو لے کر طاق میں نہ رکھ دینا بلکہ اس کے احکام کو حفظ کر لینا اس کی تلاوت کیا کرنا مدرسوں میں اس کو پڑھایا کرنا اور اس سے غافل نہ ہو جانا اور یا اس کی آیات میں غور کرنا اور اس سے نصیحت حاصل کرنا اور اس پر عمل کرنا۔ بلا عمل فقط پڑھنا کافی نہیں۔ خیال رہے کہ قرآن کریم کے سوا کوئی اور کتاب حفظ نہ کی گئی ہاں گزشتہ کتابوں کے احکام و مضامین ان کے علماء ایسے یاد کر لیا کرتے تھے جیسے آج کل وکلا قوانین کی کتابوں کے احکام یاد کرتے ہیں اسی لئے یہاں اذکرو فرمایا، احفظوا نہ فرمایا لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ لعل رب کی طرف سے یقین کے لئے ہے اور بندوں کی طرف سے امید کے لئے یعنی تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ یا اس امید پر تم توریت کے حامل بنو کہ تم متقی ہو جاؤ نہ دنیوی لالچ پر۔ اتقاء سے مراد یا تو جہنم سے بچ جانا ہے یا پرہیزگار بن جانا کیونکہ توریت پر عمل کرنے سے دنیا میں پرہیزگاری اور آخرت میں جہنم سے رستگاری حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے یہاں اس کا ذکر فرمایا گیا ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ یہ لفظ ولی سے بنا ہے جس کے معنی ہیں قریب ہونا۔ اس باب میں آکر سلب کے معنی پیدا ہوئے یعنی قریب کو دور کر دینا اور پھر جانا یعنی تم یہ عہد و پیمان کر کے اور مجبوراً توریت کو مان کر اس سے پھر گئے کہ نہ تم نے توریت کے احکام پر عمل کیا اور نہ اس کا پڑھنا پڑھانا باقی رکھا نہ اس کی حفاظت کی بلکہ اس کتاب کو دنیا کمانے کا ذریعہ بنا لیا مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ۔ ذٰلِكَ کا اشارہ یا میثاق کی طرف ہے یا طور اٹھانے کی طرف یا اس پورے واقعہ کی طرف یعنی تم نے اتنے اہم واقعات کے بعد بھی اپنے وعدے کی وفا نہ کی بیوفائی عقلاً نقلاً بری ہے۔ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ یا تو فضل و رحمت ایک ہی معنی میں ہیں یا فضل سے مراد قبول توریت کی توفیق دینا اور رحمت سے مراد بعد کی بیوفائیوں پر عذاب نہ بھیجنا ہے یعنی اگر پہاڑ وغیرہ اٹھا کر تم سے توریت قبول نہ کرائی جاتی اور بعد کی بدعملیوں پر تم کو مہلت نہ دی جاتی تو لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ تم خسارے والوں میں سے ہو جاتے۔ خسارہ اصل پونجی کے ضائع ہو جانے کو کہتے ہیں اس میں لطیف اشارہ اس طرف بھی ہے کہ سختی سے احکام منوانا درحقیقت رحمت ہے اور نبی آخر الزمان کا زمانہ پالینا عین فضل الٰہی ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ اب بھی سنبھل جاؤ اور اس پیغمبر علیہ السلام پر ایمان لے آؤ۔

خلاصہ تفسیر

قانون ہدایت بیان فرمانے کے بعد ارشاد ہو رہا ہے کہ اے اسرائیلیو! ہم نے تم پر یہاں تک مہربانی فرمائی کہ جیسے احمق بیمار کو مہربان طبیب زبردستی دوا پلاتا ہے اسی طرح ہم نے تمہارے ساتھ کیا تم بخوشی اصلاح قبول نہ کرتے تھے ہم نے تم پر کوہ طور اٹھا کر اختیار کرنے پر مجبور کر دیا اور فرما دیا کہ توریت قبول کرو ورنہ پہاڑ گرتا ہے تم بھی ایسے ضدی واقع ہوئے کہ اس وقت تو

جبراً قہراً مان لیا مگر بعد میں اس کو بھی توڑ دیا اور طرح طرح کی بدکاری اور بت پرستی میں مشغول ہو گئے، توریت شریف کو بدل ڈالا۔ ہم نے اپنے فضل و کرم سے کبھی کبھی تم میں انبیاء بھیجے تا کہ تمہیں ہلاکت اور بربادی سے بچائیں مگر تم نے انہیں بھی ظلماً قتل کر ڈالا پھر بھی ہم نے درگزر کی اگر ہمارا اتنا فضل و کرم نہ ہوتا تو تم کبھی کے نیست و نابود ہو چکے تھے۔

اصل واقعہ

اس میں اختلاف ہے کہ پہاڑ اکھیڑنے کا واقعہ کن بنی اسرائیل پر پیش آیا۔ آیا ان ستر پر جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ توریت لینے گئے تھے یا ان پر جو یہاں رہ گئے تھے ہم اس اختلاف کا لحاظ کرتے ہوئے واقعہ عرض کرتے ہیں جب موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیلیوں سے توریت ماننے کا عہد و پیمان لے کر ستر آدمیوں کے ساتھ توریت لینے کوہ طور پر تشریف لے گئے اور وہاں یہ ستر آدمی کلام الٰہی سن چکے اور مر کر زندہ ہو چکے تب آپ کو توریت شریف عطا ہوئی جب آپ نے وہ کتاب ان ستر کو دکھائی تو یہ لوگ سخت احکام اور کڑی پابندیاں دیکھ کر گھبرا گئے اور کہنے لگے کہ ہم سے ان پر عمل نہ ہو سکے گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں دعا کی تب حضرت جبرئیل بحکم الٰہی کوہ طور اکھیڑ کر ان کے سروں پر لے کر کھڑے ہو گئے کہ یا توریت قبول کرو ورنہ ابھی تم پر گرتا ہے یہ پہاڑ قد آدم ان کے سروں سے اونچا تھا یہ لوگ ابھی موت دیکھ چکے تھے۔ اب گھبرا گئے فوراً سجدے میں گر گئے۔ مگر سجدہ پوری پیشانی پر نہ کیا۔ بلکہ ایک رخسار پر تا کہ پہاڑ کو بھی دیکھتے رہیں کہیں گر نہ جائے چنانچہ اب تک یہود صرف ایک رخسار پر ہی سجدہ کرتے ہیں اور مسلمان پیشانی پر اور سجدہ میں گر کر توبہ کی اور پورا پورا عہد کیا کہ ہم اس کو قبول کرتے ہیں ہمیشہ اس پر عامل رہیں گے۔ اس میثاق سے یا تو یہی سجدہ والا میثاق مراد ہے یا پہلا میثاق جو اسرائیلیوں سے طور پر آتے وقت لیا گیا تھا اس کا واقعہ یہ ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام توریت لے کر اپنی قوم کے پاس آئے اور بچھڑے وغیرہ کو ہلاک فرما چکے سب سے توبہ کرا چکے تب آپ نے ان کو توریت دکھائی۔ انہوں نے دیکھ کر قبول کرنے سے انکار کر دیا اور ان پر یہ ہی طور اٹھا کر یہاں لایا گیا اور انہوں نے سجدہ کر کے عہد و پیمان کیا مگر بعد میں اس کو توڑ دیا اور بدکاریوں میں مشغول ہو گئے۔ ان کی نافرمانی کی ابتداء تو موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں ہو چکی تھی مگر آپ کے پردہ فرمانے کے بعد اس میں زیادتی ہو گئی کہ توریت بدل ڈالی گئی۔ پیغمبروں کو قتل کرنے لگے۔ شرک و بت پرستی میں گرفتار ہو گئے۔ اس لئے یہاں ثُمَّ فرمایا گیا جس کے معنی ہیں تراخی۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** یہ کہ دنیوی تکلیفیں جو ہدایت کا ذریعہ بن جائیں وہ درحقیقت انعام الٰہی ہیں اسی لئے اس واقعہ کو انعامات کے سلسلے میں ذکر فرمایا گیا۔ **دوسرا فائدہ:** یہ کہ حق تعالیٰ امت مصطفیٰ ﷺ پر بڑا مہربان ہے کیونکہ بنی اسرائیل پر نہایت سخت احکام بھیجے اور سب ایک دم بھیجے جس سے وہ گھبرا گئے اور اس امت پر نرم احکام بھیجے گئے اور وہ بھی یکے بعد دیگرے نہایت آہستگی سے اس عمدہ طریقہ سے کہ بوجھ نہ محسوس ہو مثلاً روزہ فرض کیا گیا تو پہلے سال بھر میں ایک عاشورہ کا پھر ہر مہینہ میں تین پھر رمضان کے روزے، مگر فدیہ دینے کا اختیار۔ شراب حرام کی گئی

تو نہایت آہستگی سے۔ **تیسرا فائدہ:** یہ کہ اس امت سے دنیوی ظاہری عام عذاب اٹھادیا گیا۔ اسرائیلیوں پر پہاڑ لاد کر ان سے توریت منوائی۔ مگر مسلمانوں کے ساتھ یہ سلوک نہ ہوا۔ **چوتھا فائدہ:** یہ کہ توریت کی حفاظت بنی اسرائیل کے ذمہ کی گئی کہ فرمایا گیا خُذُوْا مَآ اٰتَیْنٰکُمْ بِقُوَّةٍ جس سے وہ عاجز ہو گئے مگر قرآن کریم کی حفاظت خود فرمائی ہمارے ذمہ نہ کی **پانچواں فائدہ:** کلام اللہ کی تلاوت کرنا بھی ضروری ہے اور اس پر غور کرنا بھی اور اس پر عمل کرنا بھی بغیر تلاوت اس کی بقا مشکل ہوگی اور بغیر عمل محض اس کا پڑھ لینا غیر مفید طبیب کا نسخہ پڑھو بھی، سمجھو بھی، عمل بھی کرو۔ اپنے حبیب کا خط بار بار پڑھ کر لطف حاصل کرو۔ اور اس کی فرمائشیں پوری کرو۔ مثنوی شریف میں ہے ؎

ہست قرآن حالہائے انبیاء ماھیان بحر پاک کبریا
در بخوانی ونہ قرآن پذیر انبیاء و اولیاء را دیدہ گیر

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ اسرائیلیوں سے مجبوراً توریت منوائی گئی اور انہیں ایمان دیا گیا مگر دوسری جگہ فرمایا گیا لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ یعنی دین میں جبر نہیں حدیث پاک میں بھی ارشاد ہوا دَعُوْاهُمْ وَمَا يَدِيْنُوْنَ یعنی کفار کو ان کے دین پر چھوڑ دو۔ نیز جبری چیز پر ثواب نہیں ملتا اس لئے جہاد میں کفار پر اسلام یا جزیہ پیش ہوتا ہے کسی کو جبراً مسلمان نہیں بنایا جاتا پھر اس آیت کا کیا مطلب۔ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں سب سے بہتر جواب تو وہ ہے جو تفسیر خزائن العرفان میں دیا گیا کہ بظاہر جبر تھا مگر درحقیقت معجزہ دکھا کر ان کو مطمئن کرنا تھا کہ بیشک یہ کتاب رب کی طرف سے ہے جیسا کہ دیگر معجزات کا مقصود ہوتا ہے۔ **دوسرا جواب:** یہ کہ بندوں کو جائز نہیں کہ کسی کو دین پر مجبور کریں اور یہ فعل رب کا تھا نہ کہ بندوں کا تو لَآ اِكْرَاهَ کی آیت بندوں کے لئے ہے اور یہ رب کا فعل **تیسرے:** یہ کہ اس واقعہ میں اسرائیلیوں کو ایمان لانے پر مجبور نہ کیا گیا وہ ایمان تو پہلے ہی لا چکے تھے اب ان کو ارتداد سے روک کر ایمان پر قائم رکھا گیا۔ اب بھی مرتد کو ایمان لانے پر مجبور کرتے ہیں ورنہ قتل کر دیتے ہیں چوتھے یہ کہ عہد شکنی کی سزا تھی اور بد عملی کی سزا دینا نقلاً عقلاً ہر طرح درست ہے اب بھی زانی کو رجم کرتے اور چور کے ہاتھ کاٹتے ہیں اس وقت بد عملی کی سزا ہلاکت تجویز ہوئی۔

دوسرا اعتراض: پہاڑ کا ہوا میں بغیر ستون کے معلق ہو جانا خلاف عقل ہے ہلکی چیز بھی معلق نہیں رہ سکتی تو اتنی بھاری پہاڑ کیسے معلق رہ گیا۔ **جواب:** یہ علی گڑھی عقل کے خلاف ہوگا مسلمان کی عقل کے بالکل موافق آسمان، سورج، چاند اور بھاری بادل برف کے پہاڑ (یعنی اولے اور برف) سب معلق ہی ہیں اگر ایک وقت میں پتھر کا پہاڑ بھی معلق ہو گیا تو کیا ہو گیا۔ آج مشین کے ذریعہ بھاری ہوائی جہاز مع سازو سامان کے ہوا میں معلق ہو جاتے ہیں بلکہ جرمنی نے اڑن بم بنا کر بغیر مشین ہی بھاری چیز کو لٹکا کر دکھا دیا تو کیا جرمنی معلق کر سکتا ہے اور رب نہیں کر سکتا۔

تفسیر صوفیانہ

طور کو سب نے معلق دیکھا مگر اتنا بڑا معجزہ دیکھ کر بھی بعض نے شوق سے عہد کیا اور بعض نے خوف سے جس سے معلوم ہوا کہ

ایک ہی خطاب اور ایک ہی معجزہ بعض کے لئے ہدایت اور بعض کے لئے گمراہی کا سبب ہوتا ہے۔ جب خوف والوں پر خذ لان یعنی رسوائی آ گئی تو برہان نے کام نہ دیا۔ دلائل کا علم عرفان نہیں بخشتا۔ وہاں تو شوق وذوق چاہیے پھر رب نے فرمایا کہ ہمارے احکام قوت سے پکڑو جس سے معلوم ہوا کہ احکام کے لئے قوت ربانی چاہیے نہ کہ طاقت جسمانی یہاں تائید الٰہی درکار ہے اپنی کمائی بیکار پھر فرمایا کہ توریت کے رموز، اشارات، حقائق ودقائق یاد کرو جو کہ اہل دل کی صحبت سے ملتے ہیں تا کہ ماسوااللہ سے بچ جاؤ۔ پھر تم لوگ خیالات نفسانی اور خواہشات شہوانی کی وجہ سے طریقہ ربانی سے ہٹ گئے۔ وفاق کا راستہ چھوڑ کر نفاق کی طرف دوڑ گئے اگر پہلے ہی سے عنایت ربانی اور توفیق یزدانی تمہاری نگرانی نہ کرتی اور انبیاء کرام تمہاری نگہبانی نہ فرماتے تو تم اصل پونجی یعنی فطری لیاقت کھو کر خسارہ میں پڑ جاتے۔

دوسری تفسیر صوفیانہ

بندہ پہلے خوف سے پھر عادت سے پھر شوق سے اللہ کی عبادت کرتا ہے بچہ اولاً خوف سے پھر عادت سے پھر شوق سے پڑھنے میں محنت کرتا ہے یہاں بھی بنی اسرائیل کو پہلے ڈرا دھمکا کر توریت قبول کرنے پر راضی کیا گیا یہ ان کا ابتدائی حال تھا۔ پھر شوق وذوق سے عبادت انتہائی کمال، اس کو یہاں تقویٰ فرمایا گیا یعنی ابھی خوف سے ہماری بندگی کر و تا کہ ممکن ہے آئندہ دل میں ذوق عبادت پیدا ہو جائے جو تقویٰ ہے اس سے معلوم ہوا کہ انسان بے ذوق عبادت چھوڑ نہ دے کبھی وقت آئے گا کہ پھر ذوق وشوق بھی پیدا ہو جائے گا۔

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ
اور البتہ تحقیق جانا تم نے ان لوگوں کو جو حد سے بڑھے تم میں سے بیچ ہفتہ کے پس کہا ہم نے واسطے
اور بیشک ضرور تمہیں معلوم ہے تم میں سے جنہوں نے ہفتہ میں سرکشی کی تو ہم نے ان سے
كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿۶۵﴾ فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا
ان کے ہو جاؤ تم بندر رحمت سے دور پس کر دیا ہم نے اس کو عبرت واسطے اس کے جو درمیان
فرمایا ہو جاؤ بندر دھتکارے ہوئے تو ہم نے اس بستی کا یہ واقعہ اس کے آگے اور پیچھے
وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ﴿۶۶﴾
دو ہاتھوں اس کے اور وہ جو پیچھے اس کے اور نصیحت واسطے پرہیز گاروں کے
والوں کے لئے عبرت کر دیا اور پرہیز گاروں کے لئے نصیحت

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** اس سے پہلے اسرائیلیوں کی دس نعمتوں کا ذکر فرمایا گیا

یہاں سے ان سختیوں کا ذکر شروع ہوتا ہے جو ایک نافرمانی کی وجہ سے ان پر کی گئیں تاکہ ڈر کر اب مخالفت سے باز آ جائیں کیونکہ انسان کو برائی سے بچانے کے دو ہی ذریعے ہیں ایک نعمت دوسرا عذاب چونکہ رحمت الٰہی غضب پر غالب ہے اس لئے رحمتوں کا ذکر پہلے ہوا اور عذاب کا بعد میں **دوسرا تعلق:** بنی اسرائیل کو پچھلی آیت سے یہ شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ ساری کتاب کے انکار کرنے سے عذاب آتا ہے جیسے کہ توریت کے انکار سے ہوا۔ اگر اس کے ایک حکم کی مخالفت کریں تو کوئی مضائقہ نہیں اور نبی آخر الزمان کی اطاعت نہ کرنا بھی توریت کے ایک ہی حکم کی مخالفت ہے اس میں کوئی حرج نہیں اس وہم کو دفع کرنے کے لئے فرمایا جا رہا ہے کہ تم کو تو معلوم ہے کہ تمہارے بزرگوں نے صرف ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار کر لیا تھا جس سے ان پر عبرت ناک عذاب آ گیا وہ بھی تو ایک ہی حکم کی مخالفت تھی اب اگر تم نے نبی آخر الزمان کی اطاعت نہ کی تو عذاب آنے کا ضرور اندیشہ ہے۔ اس واقعہ سے وہ لوگ عبرت پکڑیں جو کہتے ہیں دل صاف چاہئے نماز، روزہ، داڑھی لباس پر ایمان موقوف نہیں جب ہماری صورت و سیرت ہی کفار کی سی ہو گی تو مسلمان کس چیز کا نام ہے دیکھو بنی اسرائیل صرف ایک شکار سے عذاب الٰہی میں گرفتار ہو گئے۔

تفسیر

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ پچھلی آیتوں کے واقعات زیادہ مشہور و معروف نہ تھے بعض کو کچھ یاد تھے اس لئے وہاں اِذْ فرما کر یاد دلایا گیا لیکن یہ واقعہ یہود کے بچہ بچہ کو یاد تھا اس لئے یہاں لَقَدْ عَلِمْتُمُ فرمایا گیا۔ یعنی اے اسرائیلیو یقیناً تم سب یہ قصہ جانتے ہو مگر چونکہ تم اس سے عبرت نہیں پکڑتے اس لئے ہم بھی بیان فرمائے دیتے ہیں نیز اس بیان کرنے میں ہمارے اس نبی ﷺ کے غیب جاننے کا ثبوت ہے کہ انہوں نے نہ تو تاریخ پڑھی اور نہ تاریخ جاننے والوں کی صحبت اٹھائی اور پھر بے کم و کاست سچا سچا قصہ بیان فرما رہے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیب دان نبی ہیں الَّذِیْنَ اعْتَدَوْا یا تو اس سے پہلے لفظ حال یا لفظ عذاب وغیرہ چھپا ہوا ہے یا خود الَّذِیْنَ ہی عَلِمْتُمُ کا مفعول ہے۔ یعنی حد سے بڑھنے والوں کے قصے اور عذاب کو جانتے ہو یا خود ان لوگوں کو جانتے پہچانتے ہو کہ یہ لوگ داؤد علیہ السلام کے زمانہ میں شہر ایلہ میں رہتے تھے مدینہ منورہ اور شام کے درمیان دریا کے کنارے واقع تھا اور یہ پورا قصہ انشاء اللہ خلاصہ تفسیر میں بیان ہوگا۔ حد سے بڑھنے سے مراد شرعی حدود توڑنا اور ممانعت الٰہی کی نافرمانی ہے۔ یعنی شریعت نے جو حد مقرر کی اس پر کار بند نہ رہے اس معنی سے ہر گنہگار عملاً حد توڑتا ہے اور ہر گمراہ اعتقاداً حد سے بڑھتا ہے مِنْكُمْ یہاں لفظ اسلاف چھپا ہوا ہے یعنی یہ مجرمین تمہارے بزرگوں میں سے تھے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ تم ہی میں سے یعنی تمہارے ہم قوم اور ہم مذہب تھے۔ فِي السَّبْتِ سبت کے لغوی معنی ہیں۔ قطع کرنا سنیچر کے دن کو اس لئے یوم السبت کہتے ہیں کہ یہود پر اس دن عبادت اور دنیوی کاروبار سے الگ رہنا فرض تھا نیند کو بھی اس لئے سبات کہتے ہیں کہ اس سے انسانی کام منقطع اور بند ہو جاتے ہیں۔ نیز سبت کے معنی تعظیم کے بھی ہیں قرآن کریم فرماتا ہے کہ یَوْمَ لَا یَسْبِتُوْنَ لَا تَاْتِیْهِمْ (اعراف: ۱۶۳) چونکہ سنیچر کے دن کی یہود تعظیم کرتے تھے اس لئے اس کا نام یوم السبت ہوا۔ انشاء اللہ ہم ہفتے کے سارے دنوں کے ناموں کی وجہ اور یہ کہ ان دنوں میں کیا کیا اہم واقعات ہوئے اور اب ان میں کیا کیا

کرنا چاہئے فِیْ سِتَّةِ ایام کی تفسیر میں بیان کریں گے۔اس جگہ لفظ یوم پوشیدہ ہے یعنی جو کہ زیادتی کرتے تھے۔ ہفتہ کے دن میں فَقُلْنَا لَهُمْ یہاں قول سے مراد وحی بھیجنا یا بلا واسطہ کلام کرنا نہیں بلکہ فقط توجہ ارادہ مراد ہے یعنی ہم نے ان کی طرف ارادہ غضب متوجہ کر دیا اور چاہ لیا کہ وہ بندر بن جائیں كُوْنُوْا قِرَدَةً كُوْنُوْا كَوْنٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ہو جانا اور بن جانا۔تم بندر ہو جاؤ۔یا بن جاؤ۔یہ امر بھی شرعی نہیں ہے بلکہ تکوینی ہے (پیدا کرنا) یعنی ہم نے ان کا بندر ہو جانا چاہ لیا۔ جس سے وہ فوراً ہی بندر بن گئے۔اس چاہنے کو اس طرح بیان کیا گیا کہ ہم نے کہہ دیا۔تم بندر بن جاؤ یہی کُنْ فیکون کا بھی مطلب ہے۔قردة جمع قرد کی ہے جیسے دیکۃ جمع دیک کی (مرغ) ظاہر تو یہ ہی ہے کہ ان کے بوڑھے جوان بچے مرد عورتیں سب چھوٹے بڑے بندر ہی بنائے گئے لیکن روح البیان نے اس جگہ فرمایا کہ ان کے جوان تو بندر بنائے گئے تھے اور بوڑھے سور۔ خٰسِئِیْنَ یہ خساء سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ذلت اور دھتکارنا چونکہ بندر خوبصورت جانور ہے بعض لوگ اسے پال بھی لیتے ہیں لہذا خاسین فرما کر یہ بتایا کہ وہ خوبصورت بندر نہ بنے تھے کہ لوگ انہیں پالتے محبت کرتے بلکہ ان کے جسم سے ایسی بدبو آتی تھی کہ کوئی ان کے قریب بھی نہ آتا تھا اور وہ بندروں کی سی پیاری حرکتیں نہ کرتے تھے۔ بلکہ صرف دم ہلاتے اور آنسو بہاتے تھے اور جوان کو دیکھتا وہ لعن طعن کرتا تھا۔لہذا وہ دھتکارے ہوئے نکالے ہوئے ذلیل بندر ہوئے۔ فَجَعَلْنٰهَا جعل کے معنی کرنا بھی ہیں اور بنانا بھی ھَا کا مرجع یا وہ امت ہے یا اس کا عذاب اور یا یہ پورا واقعہ یعنی ہم نے اس قصے یا اس سزا یا اس آیت کو عبرت بنا دیا نَكَالًا یہ لفظ نکل سے بنا ہے جس کے معنی ہیں روکنا اور منع کرنا اسی لئے قسم سے باز رہنے کو نکول کہتے ہیں اور بیڑی اور سخت لگام کو نکل کہتے ہیں کیونکہ یہ چیزیں بھی قیدی اور جانور کو بھاگنے سے روکتی ہیں اور یہاں عبرت والا عذاب مراد ہے جس کو سن کر لوگ نافرمانی سے بچیں جیسے قرآن کریم فرماتا ہے اِنَّ لَدَیْنَآ اَنْكَالًا وَّ جَحِیْمًا (مزمل:۱۲) اور فرماتا ہے وَّ اَشَدُّ تَنْكِیْلًا (النساء:۸۴) یعنی ہماری یہ سزا محض بدلہ لینے کے لئے نہ تھی بلکہ عبرت کے لئے لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهَا اس کے لفظی معنی ہیں دو ہاتھوں کے درمیان اور مراد ہے سامنے کیونکہ سامنے والی چیز ہاتھوں کے درمیان ہوتی ہے اور ھَا سے مراد یا وہ امت ہے یا شہر ایلہ اور سامنے سے مراد ایلہ کے سامنے والے شہر ہیں جن کو اس واقعہ کی خبر لگی اور آ کر دیکھ گئے اور یا ان سے پہلی امتیں کیونکہ ان کو یہ خبر دی گئی تھی کہ آئندہ زمانہ میں ایسا واقعہ ہونے والا ہے۔ وَمَا خَلْفَهَا اس میں بھی وہ ہی دو احتمال ہیں یا تو اس سے دور کے شہر مراد ہیں جنہوں نے یہ واقعہ دیکھا تو نہیں مگر سن لیا یا آنے والی امتیں کیونکہ یہ واقعہ قرآن پاک میں مذکور ہوا جس سے سب کو عبرت حاصل ہوئی۔ہم نے یہ واقعہ اگلے پچھلوں کے لئے عبرت بنا دیا۔ وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِیْنَ۔ مَوْعِظَةٌ، وعظ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں نصیحت لینا یا کرنا یعنی اس واقعہ سے پرہیزگاروں نے نصیحت پکڑی یا قیامت تک اس سے واعظ نصیحت کریں گے خیال رہے کہ عبرت دل کا فعل ہے اور موعظہ زبان کا چونکہ عام لوگوں میں وعظ کہنے کی طاقت نہیں ہوتی۔ہاں وعظ سن کر ڈر جاتے ہیں اسی لئے ان کے لئے عبرت فرمایا گیا اور پرہیزگاروں کے لئے موعظہ یعنی قیامت تک علماء واعظین اس کا وعظ کیا کریں گے اور سامعین سن کر ڈرا اور رو یا کریں گے۔

خلاصہ تفسیر

حق تعالیٰ اپنے انعام یاد دلا کر کچھ بنی اسرائیل کی نافرمانیاں بیان فرمارہا ہے، فرماتا ہے کہ اے اسرائیلیو تمہیں ان ایلہ والوں کا قصہ تو یاد ہی ہے جو تمہارے ہی بزرگ تھے انہوں نے ہفتہ کے دن میں ایک بداعتدالی کرلی تھی یعنی مچھلی کا شکار کرلیا تھا تو ہم نے ان سب کو بندر بنا دیا ان کا یہ واقعہ سارے اگلے پچھلوں کے لئے عبرت اور پرہیزگار علماء واعظین کے لئے نصیحت کردیا گیا تم اس کو سوچ کر عبرت کیوں نہیں پکڑتے اور نبی آخرالزمان پر ایمان کیوں نہیں لاتے؟ جب مچھلی کے شکار سے عذاب آگیا تو کیا اتنے بڑے پیغمبر کی مخالفت سے عذاب نہ آئے گا۔ خیال رہے کہ ایک حکم ربانی کا انکار ویسا ہی کفر ہے جیسے تمام احکام کا انکار۔ کفر میں تقسیم نہیں کہ کفر آدھا یا انتہائی ہر کفر پورا کفر ہے ہاں درجات کفر اور کیفیات کفر میں فرق ہوتا ہے کہ بعض سخت کافر بعض ہلکے کافر اسی بنا پر عذابوں میں فرق ہے۔

یہودیوں کا بندر بننا

جیسے کہ اسلام میں جمعہ عزت والا ہے عیسائیوں کے لئے اتوار اور ہندوؤں کے لئے منگل اسی طرح یہودیوں کے لئے ہفتہ کا دن محترم تھا مگر فرق اتنا ہے کہ اسلام میں صرف ان لوگوں پر جن پر جمعہ کی نماز فرض ہے جمعہ کی پہلی اذان سے ختم نماز تک وہ دنیاوی کاروبار کرنا حرام ہیں جو نماز میں خلل انداز ہوں عورتیں بچے مسافر دیہاتی اور بیمار لوگ اس حکم سے علیحدہ ہیں کیونکہ ان پر جمعہ فرض نہیں لیکن یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں ان سارے دنوں میں دنیاوی کاروبار حرام تھے اور خاص کر شکار کرنا سخت جرم موسیٰ علیہ السلام سے کئی برس بعد یہ واقعہ پیش آیا کہ بنی اسرائیل کی ایک جماعت بحر قلزم کے کنارے شہر ایلہ میں رہتی تھی جو مدینہ منورہ اور شام کے درمیان ہے یہ لوگ مچھلی کے بہت شوقین تھے رب کی شان کہ ہر ہفتہ کے دن اس دریا میں بیشمار مچھلیاں نمودار ہوتی تھیں یا تو ان کے امتحان کے لئے یا اس مچھلی کی زیارت کے لئے جس کے پیٹ میں یونس علیہ السلام رہے تھے۔ (تفسیر روح البیان) باقی دنوں میں سب غائب ہو جاتی تھیں۔ ان کے منہ میں پانی بھر آیا اور سوچنے لگے کہ کسی تدبیر سے ان کا شکار کرنا چاہئے جس سے شکار بھی ہو جائے اور ہفتہ کے دن کی بے حرمتی بھی نہ ہو۔ آخر ان عقلمندوں نے یہ حیلہ سوچا کہ دریا کے اردگرد بہت سے گہرے غار کھود دیئے اور دریا سے اس غار تک نالیاں بنالیں۔ جمعہ کی شام کو ان نالیوں کا منہ کھول دیتے کہ پانی کے ساتھ مچھلیاں ان گڑھوں میں آجائیں اور اتوار کے دن ان گڑھوں سے پکڑ لیتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم ہفتہ کو شکار نہیں کرتے انہوں نے وہ مچھلیاں خوب کھائیں اور فروخت کیں۔ جس سے یہ بڑے مالدار ہو گئے۔ چالیس یا ستر سال تک ان کا یہ عمل رہا یہ لوگ کل ستر ہزار تھے ان کی تین جماعتیں بن گئیں۔ ایک تو شکار کرنے والوں کی دوسرے اس سے منع کرنے والوں کی تیسرے خاموش رہنے والوں کی یہ لوگ کل بارہ ہزار تھے۔ باقی سب شکاری، جب شکاریوں نے ان کی نصیحت نہ مانی تو انہوں نے اپنے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا کر شہر کے دو حصے کر دیئے اور کہا کہ ہم ان کے ساتھ نہ رہیں گے کہ کہیں ہم پر عذاب نہ آجائے۔ یہاں تک کہ داؤد علیہ السلام کا زمانہ آگیا آپ نے ان کو شکار کرنے سے منع کیا اور

فرمایا کہ اے بیوقوفو! قید کرنا ہی تو شکار ہے جیسے کوئی ہرن کو جال میں پھانس لے اس نے شکار کرلیا کھائے یا نہ کھائے اور کھائے تو آج ہی کھائے یا کبھی دوسرے وقت غرضیکہ ہفتہ کے دن تمہیں شکار کی ممانعت ہے نہ کہ فقط ہاتھ میں پکڑنے یا کھانے کی۔اس سے باز آجاؤ ورنہ عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے شکاریوں نے کہا کہ ہم تو بہت عرصہ سے یہ کام کررہے ہیں۔ اگر یہ برا ہوتا تو اب تک ہم کو امن کیوں ملتی تب داؤد علیہ السلام نے یہ دعا فرمائی جس سے رب کا غضب آگیا اور رات میں یہ سب کے سب بندر، یا جوان لوگ بندر اور بوڑھے لوگ سور بنا دیئے گئے ان کے عقل وحواس تو باقی رہے مگر قوت گویائی جاتی رہی جسموں سے سخت بدبو نکلنے لگی۔صبح کے وقت اس محلہ کے لوگوں نے دیکھا کہ نہ تو اس محلہ سے کوئی آدمی آتا ہے نہ کوئی آواز نہ دھواں وغیرہ نکلتا ہے تو یہ دیواروں پر چڑھ کر ان کے گھر میں داخل ہو گئے وہ بندر ان کو دیکھ کر ان کی طرف دوڑے اور ان کے قدموں سے لپٹنے لگے اور ان کے کپڑے سونگھتے اور روتے تھے ان لوگوں نے کہا کیا ہم نے تمہیں شکار سے منع نہ کیا تھا وہ بندر سر ہلاتے اور آنسو ان کے رخساروں پر بہتے تھے اس حال پر ان کو تین روز گزرے اور چوتھے روز سب ہلاک کر دیئے گئے نہ کوئی باقی بچا اور نہ ان کی نسل چلی لوگوں میں یہ مشہور ہے کہ موجودہ بندر انہیں کی اولاد میں سے ہیں۔غلط ہے ان سے پہلے بھی بندر تھے اور یہ موجودہ بندر ان پہلے بندروں کی اولاد سے ہی ہیں۔کیونکہ صحیح روایت میں ہے کہ کوئی مسخ شدہ قوم تین دن سے زیادہ نہیں جیتی نہ کھاتی ہے نہ پیتی ہے نہ اس کی نسل چلتی ہے۔(تفسیر عزیزی) اسی تفسیر عزیزی نے ایک حدیث نقل کی ہے کہ ایک دن حضرت عبداللہ ابن عباس سورہ اعراف میں یہ واقعہ پڑھ کر بہت رو رہے تھے ان کے شاگرد خاص حضرت عکرمہ نے رونے کا سبب پوچھا آپ نے فرمایا کہ قرآن کریم سے یہ تو معلوم ہوا کہ شکاریوں کو عذاب اور منع کرنے والوں کو نجات ہوئی مجھے خبر نہیں کہ خاموش رہنے والوں کا کیا حال ہوا۔ممکن ہے کہ وہ بھی منع نہ کرنے کی وجہ سے عذاب میں مبتلا ہو گئے ہوں۔آج بھی بہت لوگ بری باتوں سے روکنے میں سستی کرتے ہیں۔عکرمہ نے عرض کیا کہ نہیں بلکہ یہ بھی نجات پا گئے پوچھا کہ کیسے عکرمہ نے عرض کیا کہ تبلیغ احکام فرض کفایہ ہے (جیسے نماز جنازہ) کہ بعض کے کرنے سے کل سے ادا ہو جاتا ہے۔اگر یہ سب خاموش رہتے تو سب گنہگار ہوتے جب بعض نے تبلیغ کردی سب بری الذمہ ہو گئے۔حضرت ابن عباس سن کر بہت خوش ہوئے اور اٹھ کر عکرمہ کی پیشانی کو بوسہ دیا اور ان کو گلے سے لگالیا اور اپنے پاس بٹھایا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** گناہ صغیرہ ہمیشہ کرنے سے کبیرہ بن جاتا ہے جس پر عذاب بھی آجاتا ہے ہفتہ کے دن شکار کرنا ان کے لئے گناہ صغیرہ تھا۔مگر ہمیشہ کرنے سے عذاب میں مبتلا ہو گئے۔ **دوسرا فائدہ:** کسی گناہ پر عذاب نہ آنا اس کے جائز ہونے کی دلیل نہیں رب تعالیٰ کی پکڑ بہت مہلت سے ہوتی ہے ستر سال تک یہ یہودی شکار کرتے رہے مگر عذاب نہ آیا اور جب آیا تو تباہ کر گیا۔ **تیسرا فائدہ:** دوسروں کی مصیبت سے نصیحت حاصل کرنا چاہئے اور ان کے واقعات کی خبر رکھنا بھی ضروری ہے۔قرآن کریم نے یہ ہی بتایا کہ ہم نے اس قصہ کو عبرت بنا دیا۔شیخ سعدی فرماتے ہیں۔

مرغ سوئے دانہ افراز جو دیگر مرغ بیند اندر بند
پند گیر از مصائب دگراں تانہ گیرند دیگراں زتو پند

چوتھا فائدہ: خوشی کے وقت گلے ملنا معانقہ کرنا سنت صحابہ ہے اس کے لئے سفر سے آنا یا غائب ہونے کے بعد ملنا شرط نہیں دیکھو ابن عباس نے خوشی میں عکرمہ کو گلے لگا لیا رضی اللہ عنہما۔ لہٰذا عید کے دن گلے ملنا سنت سے ثابت ہے کہ یہ بھی خوشی کا موقعہ ہے۔ **پانچواں فائدہ:** بدکاروں سے دور رہنا چاہئے ورنہ ان کے ساتھ نیکوکاروں پر بھی عذاب آجائے گا۔ دیکھو نیک کاران شکاریوں سے علیحدہ ہو گئے۔ گیہوں کے ساتھ گھن بھی پس جاتے ہیں اور جواریوں کے ساتھ کھڑے ہونے والے تماشائی بھی گرفتار ہو جاتے ہیں۔ **چھٹا فائدہ:** تبلیغ صرف عالموں ہی پر فرض نہیں بلکہ جس کو جو بھی مسئلہ معلوم ہو، ناواقف کو ضرور بتادے ورنہ گنہگار ہوگا دیکھو یہ منع کرنے والے سب علماء نہ تھے مگر ان پر تبلیغ فرض ہوئی اور تبلیغ ہی کی برکت سے عذاب سے بچے۔ **ساتواں فائدہ:** دوسرے کے گناہ سے راضی ہونا بھی گناہ ہے اور کفر سے راضی ہونا کفر اور بلاوجہ اس کی تردید نہ کرنا جرم جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس اور عکرمہ کی تقریر سے ثابت ہوا کہ اگر کسی کو گناہ کرتے ہوئے دیکھے تو اگر طاقت ہو تو ہاتھ سے روکے ورنہ زبان سے منع کرے اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو دل سے ہی برا سمجھ کر وہاں سے علیحدہ ہو جائے۔ **آٹھواں فائدہ:** حضور کے صحابہ تمام نبیوں کے صحابہ سے اور حضور کی امت تمام امتوں سے افضل کہ اللہ تعالیٰ نے حضور کے صحابہ کا شکار سے امتحان لیا کہ ایک بار بحالت احرام شکاری جانور ان خیموں میں آئے مگر ان میں سے کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ رب فرماتا ہے لَيَبْلُوَنَّكُمُ (مائدہ: ۹۴) نیز آج بھی حضور کی امت پر بحالت احرام شکار حرام بلکہ حرم شریف کا شکار ہمیشہ حرام۔ مگر بفضلہٖ تعالیٰ یہ امت اب تک مضبوطی سے اس پر کاربند ہے حتیٰ کہ حرم کے کبوتر حاجیوں کے پاس آجاتے ہیں بلکہ ان کے سر و بازو پر بیٹھ جاتے ہیں مگر انہیں کوئی چھیڑتا بھی نہیں یہ اللہ کا کرم ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ حیلہ کرنا گناہ ہے کیونکہ ان بنی اسرائیلیوں نے شکار کا حیلہ ہی تو کیا تھا۔ جس سے عذاب میں گرفتار ہو گئے پھر علماء صدہا حیلے کیوں سکھاتے ہیں فقہ کی کتابیں حیلوں سے بھری ہوئی ہیں عالمگیری نے تو حیلہ کا علیحدہ باب باندھا۔ کتاب الحیل (عام نیچری) **جواب:** حیلہ حرام ہونا بھی بنی اسرائیل پر عذاب الٰہی تھا جیسے کہ ان پر بعض گوشت حرام تھے ایسے ہی حیلہ شرعی بھی ورنہ خود قرآن کریم اور احادیث شریف میں شرعی حیلہ کی تعلیم دی۔ ایوب علیہ السلام نے قسم کھائی تھی کہ اپنی بیوی کو سو لکڑیاں ماروں گا۔ جب قسم کو پورا کرنے کا وقت آیا تو رب نے ان کو تعلیم دی۔ خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ وَلَا تَحْنَثْ (ص: ۴۴) اپنے ہاتھ میں جھاڑو لے کر مارو قسم نہ توڑو۔ اسی طرح احادیث میں بہت سی شرعی حیلوں کی تعلیم دی گئی۔ اس کی پوری بحث ہماری کتاب "جاء الحق" میں دیکھو نیز کسی کا مال مارنے کسی کو دھوکہ دینے حرام کو حلال کرنے کے لئے حیلہ کرنا گناہ ہے مگر شرعی ضرورت پورا کرنے گناہ سے بچنے کے لئے حیلہ کرنا بہتر ان اسرائیلیوں کا یہ حیلہ حرام کو حلال کرنے کا تھا۔ لہٰذا گناہ ہوا مثلاً زکوٰۃ سے بچنے کا حیلہ کرنا گناہ ہے اور سید کو زکوٰۃ دینے یا مسجد میں لگانے

کے لئے یہ حیلہ کیا جاوے کہ کسی فقیر کو دے دی جاوے اور وہ مالک بن کر اپنی طرف سے وہاں صرف کر دے تو عین ثواب ہے غرضیکہ حیلہ کا مدار نیت پر ہے **دوسرا اعتراض:** آپ کی تقریر سے معلوم ہوا کہ مسخ کی ہوئی قوم کی نسل نہیں چلتی حالانکہ حضور نے فرمایا کہ یہ موجودہ چوہے اونٹ کا دودھ نہیں پیتے شاید کہ یہ مسخ کئے ہوئے اسرائیلی ہوں معلوم ہوتا ہے کہ مسخ شدہ قوم کی نسل چل سکتی ہے تب ہی تو شک فرمایا گیا۔ **جواب:** یہ حدیث اس وقت کی ہے جب حضور علیہ السلام پر ظاہر نہ فرمایا گیا۔ ظاہر فرمانے پر وہ فرمایا جو ہم پیش کر چکے لہٰذا یہ حدیث گویا منسوخ ہے۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کا بندر وغیرہ بن جانا ممکن ہے یہ ہی تناسخ یا آواگون یا یونی چکر ہے اہل اسلام پھر اس کی مخالفت کیوں کرتے ہیں (آریہ) **جواب:** یہاں صورتیں بدل گئیں تھیں نہ کہ روح اور نفس لہٰذا یہ مسخ ہوا نہ کہ نسخ، مسخ ممکن ہے اور نسخ ناممکن۔ اس کی تفصیل یہ ہے کہ مثلاً انسان فقط اس ظاہری شکل و صورت چہرے مہرے کا نام نہیں ورنہ مردہ اور انسانی فوٹو کو بھی انسان کہا جاتا بلکہ انسان جسم اور نفس ناطقہ کے مجموعہ کا نام ہے پھر جسم میں بھی دو طرح کے اجزاء ہیں ایک تو اصلی جو کہ کبھی نہیں بدلتے دوسرے عارضی جو بدلتے رہتے ہیں۔ روح اور نفس کا بدلنا ناممکن ہے مگر جسم کی شکل ہمیشہ بدلتی رہتی ہے بچپن، بڑھاپے، بیماری، تندرستی، رنج و خوشی میں جسم کا رنگ روپ لاغری فربہی وغیرہ بدلتی رہتی ہے مگر اصلی اجزاء برابر باقی رہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ یہ ہی وہ بچہ ہے جو کہ جوان ہو گیا اور پیدائش سے پہلے اور موت کے بعد یہ اصلی اجزا بھی دوسرے جسم میں نمودار تھے۔ مثلاً پہلے نطفہ تھے اور بعد میں مٹی ہو جائیں گے یہاں ان اسرائیلیوں کے اصلی اجزاء اور نفس و روح وہ ہی رہے حتیٰ کہ ہوش و عقل وغیرہ سب قائم رہے صرف شکل و صورت بدل گئی اور زبان میں طاقت گویائی نہ رہی جیسے کہ حضرت موسیٰ کا عصا۔ آواگون یہ ہے کہ اصلی اجزاء ظاہری شکل اور نفس و روح وغیرہ سب ہی بدل جاوے کہ انسان حقیقۃً کتا گدھا بن جاوے یہ محال ہے یوں سمجھو کہ مسخ تین قسم کا ہے۔ (۱) مسخ حقیقی جس میں حقیقت بدل جاوے (۲) مسخ صوری جس سے ظاہری شکل بدلے۔ مسخ معنوی جس سے جسم کے اصلی اجزاء اور نفس کے صفات بدل جاویں مسخ حقیقی ناممکن اسی کا نام آواگون ہے اور یہاں یہ نہ ہوا بلکہ صرف مسخ صوری ہوا۔

تفسیر صوفیانہ

جو کوئی احسان کی قدر نہیں کرتا اور منعم کی نعمت کا کفران کرتا ہے وہ اسی طرح بلاء خسران میں مبتلا ہوتا ہے اور عزت وصال سے نکال کر ذلت ہجران میں ڈال دیا جاتا ہے۔ گذشتہ امتوں کا عذاب جسمانی خسف و مسخ تھا لیکن اس امت کا عذاب روحانی اور نفسانی خسف و مسخ ہے یعنی پہلے جسم بدلتے تھے اور اب دل قرآن کریم فرماتا ہے وَنُقَلِّبُ أَفْئِدَتَهُمْ وَأَبْصَارَهُمْ (انعام: ۱۱۰) یہ اس سے زیادہ سخت ہے جو شکل میں خنزیر بن گیا وہ پلیدی کھاتا ہے۔ اور قلباً خنزیر حرام کھاتا ہے قلب کے مسخ ہونے کی تین نشانیاں ہیں اطاعت میں لذت نہ پانا۔ معصیت سے خوف نہ کرنا۔ کسی کی موت سے عبرت نہ کرنا۔ عوف بن عبداللہ فرماتے ہیں کہ تین باتیں یاد رکھو جو شخص آخرت کے لئے کام کرے گا حق تعالیٰ اس کے دنیوی کام خود بخود بنا دے گا۔ جو اپنا معاملہ اللہ کے ساتھ درست رکھے گا۔ حق تعالیٰ لوگوں کے ساتھ اس کا معاملہ درست فرما دے گا۔ جو اپنا باطن درست کرے گا

اللہ اس کا ظاہر بھی درست فرمادے گا۔ محمد ابن قاسم علی ترمذی فرماتے ہیں کہ چار شخصوں کی چار موقعوں میں اصلاح ہوتی ہے بچوں کی کتاب میں۔ بدمعاشوں کی جیل خانہ میں عورتوں کی گھر میں۔ عمر رسیدہ مردوں کی مسجد میں۔ (تفسیر روح البیان)

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖۤ اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا
اور جبکہ فرمایا موسیٰ نے واسطے اپنی قوم کے تحقیق اللہ حکم فرماتا ہے تم کو کہ ذبح کرو
اور جب موسیٰ نے اپنی قوم سے فرمایا خدا تمہیں حکم کرتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو
بَقَرَةً ؕ قَالُوْۤا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا ؕ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ
تم ایک گائے انہوں نے کہا کیا بناتے ہیں آپ ہم کو مسخرا فرمایا موسیٰ نے پناہ لیتا ہوں میں اللہ کی
بولے آپ ہمیں مسخرہ بناتے ہیں فرمایا خدا کی پناہ کہ میں
اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِیْنَ ﴿۶۷﴾
یہ کہ ہوؤں میں جاہلوں میں سے
جاہلوں سے ہوؤں

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** بنی اسرائیل کی سرکشیاں بیان ہو رہی ہیں اس سے پہلے ایک سرکشی مذکور ہو چکی اب دوسری کا ذکر ہے۔ **دوسرا تعلق:** اس سے پہلے بنی اسرائیل کی حیلہ سازیوں کا ذکر تھا جس سے کہ وہ حرام کو حلال بنانے کی کوشش کرتے تھے اب ان کی کج بحثی اور حجت بازی کا تذکرہ ہے۔ **تیسرا تعلق:** اس سے پہلے حیلہ سازی کے عذاب بیان ہوئے اب حجت بازی کا نتیجہ بتایا جا رہا ہے کہ زیادہ کج بحثی سے سختی بڑھتی ہے۔
چوتھا تعلق: اس سے بنی اسرائیل کی داؤد علیہ السلام سے مخالفت کا ذکر تھا جس کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ زمانہ موسیٰ علیہ السلام کے دور ہونے کی وجہ سے یہ ہوا۔ اب خود موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کے واقعہ کا ذکر ہو رہا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہودی اصل سے ہی سرکش ہیں۔

تفسیر

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى یہاں بھی وہی فعل پوشیدہ ہے یعنی اے اسرائیلیو! وہ واقعہ یاد کرو یا اے نبی علیہ السلام ان کو یاد دلاؤ۔ واقعہ یہ تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص عامیل نامی بڑا مالدار تھا اور لاولد تھا۔ اس کے چچازاد بھائی نے میراث کے لالچ میں اس کو قتل کر کے دوسری بستی کے دروازے پر ڈال دیا اور صبح کے وقت خود اس کے خون کا مدعی بن کر موسیٰ علیہ السلام کی بارگاہ میں آیا اور اس بستی والوں پر خون کا دعویٰ کر کے ان سے خون بہا (یعنی جان کا بدلہ لینا چاہا) موسیٰ علیہ السلام نے اس محلہ والوں سے

پوچھا۔ انہوں نے صاف انکار کیا اور وہاں کے لوگوں نے درخواست کی کہ آپ دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ حقیقت ظاہر فرمائے آپ نے دعا فرمائی تب آپ پر وحی آئی جس کا مضمون آپ نے ان لوگوں کو سنایا اسی کا یہاں ذکر ہے۔ لِقَوْمِهٖٓ قوم کے لفظی معنی اور اس کے اقسام ہم پہلے بتا چکے ہیں یہاں بعض قوم مراد ہے جنہوں نے دعا کی درخواست کی تھی نہ کہ سارے بنی اسرائیل اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ ظاہر یہ ہے کہ یہ حکم وجوبی تھا۔ کیونکہ یا تو اس وقت تک قسامت (جن کے محلہ میں مقتول پایا جائے ان سے پچاس قسمیں لینا) کے احکام نہ آئے تھے اور یا آپ نے مصلحتاً قسم نہ لی بہرحال یہ فعل قسامت کا قائم مقام تھا اور قسامت واجب الہدایہ بھی واجب کُمْ میں یا تو وارث، اس کے اہل قرابت سے خطاب ہے کیونکہ وہ مدعی تھا اور دعویٰ کا ثبوت اس کے ذمہ تھا یا محلہ والے مسلمین سے کیونکہ ان پر شبہ تھا۔ جس سے بری ہونے کا ثبوت ان کے ذمہ تھا یا دعا کرنے والوں سے یا ساری اس قوم سے اَنْ تَذْبَحُوْا یہ ذبح سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں حلقوم اور اس کے اطراف کی رگیں چوڑائی میں کاٹ کر جان نکالنا ان کو لمبائی میں چیرنے کا نام نحر ہے۔ گائے اور بکری وغیرہ کو ذبح کرنا بہتر ہے اور اونٹ کو نحر فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (الکوثر:۲) بَقَرَةً بقر کے لفظی معنی ہیں چیرنا اور پھاڑنا۔ گائے کو اس لئے بقر کہتے ہیں کہ اس کا نر کھیتی باڑی کے لئے زمین کو پھاڑتا ہے۔ اس لئے بڑے عالم کو باقر العلوم کہتے ہیں یا اس سے فقط مادہ گائے مراد ہے اور یا نر کو بھی شامل۔ خلاصہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ رب کا حکم ہے کہ کوئی سی گائے ذبح کر کے اس کا پارہ گوشت مقتول پر مارو۔ جس سے وہ زندہ ہو کر اپنے قاتل کا نام بتادے گا۔ یہ بات ان کی سمجھ میں نہ آئی وہ کہنے لگے قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا هُزُوًا یا تو ان سب نے کہا تھا یا ان میں سے بعض نے هُزُوًا مصدر ہے۔ جس کے معنی ہیں دل لگی اور مذاق کرنا۔ یہاں اسم مفعول کے معنی میں ہے یعنی مسخرہ یا نث جیسے فَاتَّخَذْتُمُوْهُمْ سِخْرِيًّا (مؤمنون:۱۱۰) وہ کہنے لگے کہ آپ ہم کو مسخرہ بنا کر مذاق کر رہے ہیں کہ ہم تو کہتے ہیں۔ قاتل کا پتہ لگایئے اور آپ کہتے ہیں کہ گائے ذبح کرو۔ اس جواب کو ہمارے سوال سے کیا تعلق اَعُوْذُ بِاللّٰهِ موسیٰ علیہ السلام کہنا یہ چاہتے تھے کہ میں مذاق نہیں کرتا لیکن اس کو اس عمدہ طریقہ سے بیان فرمایا جس سے اپنے منہ اپنی تعریف نہ ہو بلکہ رب کے کرم کا ظہور ہو۔ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ یعنی بے ربط جواب دینا یا شرعی فیصلہ کے وقت مذاق و دل لگی کرنا یا کسی کو مسخرہ بنا کر اس کو ذلیل کرنا جاہلوں کا کام ہے انبیاء کی شان اس سے بالا ہے میں رب کی پناہ مانگتا ہوں کہ اس قسم کی حرکت کر کے جہلاء کے زمرہ میں ہو جاؤں۔

خلاصہ تفسیر

یہ دوسری عدول حکمی و سرکشی اور اس کے نتیجہ کا ذکر ہو رہا ہے کہ بنی اسرائیل خود موسیٰ علیہ السلام سے سرتابیاں اور معمولی حکم میں نکتہ چینیاں کر کے خود مشقت میں پڑتے تھے اے اسرائیلیو اپنے باپ داداؤں کا وہ قصہ یاد کرو جب کہ وہ ایک قتل کا مقدمہ لے کر موسیٰ علیہ السلام کے پاس آئے تھے اور چاہتے تھے کہ قتل کا پتہ لگ جائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے خود نہ بتایا بلکہ ایک تدبیر پیش کر دی کیونکہ اگر وہ خود قاتل کا پتہ دے دیتے تو یہ بیباک قوم ان کو طرف داری کا بہتان دے دیتی۔ اس لئے آپ نے معجزہ سے مقتول کو زندہ فرمانا چاہا تاکہ وہ اپنی زبان سے قاتل کا پتہ دے نیز قصاص کے لئے وارث کا دعویٰ ضروری ہے آپ

نے چاہا کہ مقتول خود زندہ ہو کر مدعی بنے تا کہ قاتل سے قصاص لیا جاسکے چونکہ بیل اور گائے کو زمین کے آباد کرنے اور درختوں کے لئے جوتنے بونے اور پانی دینے میں بہت دخل ہے۔اس لئے یہاں گائے کا انتخاب ہوا اگر چہ یہ بھی ممکن تھا کہ زندہ گائے مقتول کے جسم سے لگا کر اس کو زندہ کر دیا جاتا۔مگر یہاں تو عجیب معجزہ دکھانا منظور تھا کہ مردہ گائے مردہ کو زندہ کرے اس لئے یہ تجویز ہوئی چاہئے تو یہ تھا کہ یہ لوگ حکم پاتے ہی کوئی سی بھی گائے ذبح کر ڈالتے اور تعمیل ارشاد میں دیر نہ لگاتے جس سے نہایت آسانی سے چھوٹ جاتے اور مقدمہ اتنا طول نہ پکڑتا۔مگر انہوں نے کج بحثی کر کے خود اپنے پر بہت سی پابندیاں لگالیں۔ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند اسمٰعیل سے کہا تھا کہ میں نے خواب میں تم کو ذبح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔انہوں نے اپنے کو ذبح کرانے میں کوئی حجت نہ کی اور یہ نہ کہا کہ یہ تو خواب ہے بلکہ اپنی قربانی فوراً پیش کر دی۔ان بے وقوفوں نے ایک گائے ذبح کرنے کے لئے اپنے پیغمبر سے اتنی حجت کی کہ کہہ دیا کہ آپ ہم کو مسخرہ بنا کر دل لگی کر رہے ہیں جس پر موسیٰ علیہ السلام نے ہمارے واسطے سے اپنی برات ظاہر کی کہ دل لگی کرنا جہلا کا کام ہے۔میں پیغمبر ہوں (تفسیر عزیزی)

گائے کا قصہ

بنی اسرائیل میں ایک نیک شخص تھا جس کا ایک چھوٹا سا بیٹا تھا اس نے ایک بچھیا بڑی محبت سے پالی تھی جب اس کی موت کا وقت قریب آیا تو بچھڑی لے کر جنگل میں پہنچا اور دعا کی کہ اے مولیٰ یہ گائے تیرے سپرد کرتا ہوں جب میرا بیٹا جوان ہو تو اس کو لے لے یہ تو مر گیا مگر اس کی گائے جنگل میں اور اس کا بیٹا ماں کے پاس پرورش پاتا رہا یہ لڑکا نہایت سعادت مند اور فرمانبردار تھا ایک روز اس کی والدہ نے کہا کہ تیرے باپ نے فلاں جنگل میں خدا کے نام پر ایک بچھڑی چھوڑی ہے جو کہ اب جوان ہو گئی ہو گی اس میں فلاں فلاں علامتیں ہیں تو جا اور اس کو پکڑ لا۔لڑکا گیا اور ماں کی بتائی ہوئی علامتوں سے اس کو پکڑ لیا۔ماں نے کہا اس کو بازار میں لے جا کر تین اشرفیوں میں فروخت کر دے مگر جب سودا ہو تو پھر مجھ سے اجازت لے لینا یہ شخص گائے کو بازار میں لایا ایک فرشتہ بشکل خریدار آیا اور اس نے قیمت پوچھی لڑکے نے کہا۔تین اشرفیاں مگر والدہ کی اجازت شرط ہے فرشتہ بولا کہ چھ اشرفیاں لے لے مگر ماں سے نہ پوچھ لڑکے نے کہا اگر تم اس کے برابر سونا بھی دو تب بھی ماں سے پوچھے بغیر نہ بیچوں گا۔غرضکہ لڑکا اپنی ماں کے پاس آیا تو اسے سارا واقعہ سنایا ماں نے کہا کہ جا چھ میں بیچ دے مگر سودا ہونے پر پھر مجھ سے پوچھ لینا۔لڑکا پھر بازار میں لایا وہی فرشتہ پھر ملا اور کہنے لگا بارہ اشرفیاں لے لے مگر ماں سے نہ پوچھ لڑکا نہ مانا پھر آ کر اپنی والدہ کو یہ ماجرا سنایا۔وہ بڑی عقلمند تھی کہنے لگی شاید یہ کوئی فرشتہ ہے جو تیری آزمائش کے لئے آتا ہے۔اگر اب ملے تو اس سے پوچھ لینا کہ ہم گائے فروخت کریں یا نہ کریں لڑکے نے یہ ہی کیا فرشتے نے جواب دیا کہ اپنی والدہ سے کہنا کہ ابھی اس کو روکے رہو عنقریب بنی اسرائیل کو اس کی ضرورت پڑے گی موسیٰ علیہ السلام اس کو خریدیں گے اور اس سے ایک بڑا معجزہ ظاہر ہو گا۔جب وہ لوگ خریدنے آئیں تو اس کی قیمت یہ مقرر کرنا کہ اس کی کھال کو سونے سے بھر دی جائے۔لڑکا گائے کو گھر لایا اور پھر وہ واقعہ درپیش آیا جس کا یہاں ذکر ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** یہ کہ بزرگوں کے فرمان پر اپنے عقلی ڈھکوسلے نہ چلائے بلکہ بلا دلیل مان لے ورنہ مشکل میں پڑ جائے گا، جیسا کہ یہاں ہوا چاہئے یہ کہ ان کے فرمان پر اپنی عقل بلکہ اپنے حواس سے بھی زیادہ اعتماد کرے۔ **دوسرا فائدہ:** اپنے حلال مقصد کے لئے جانوروں کو تکلیف دینا بلکہ ذبح کرنا بھی جائز ہے جیسا کہ اس موقع پر کیا گیا۔ **تیسرا فائدہ:** یہ کہ اصل اشیاء میں اباحت ہے اور شریعت میں جس چیز پر کوئی پابندی نہ ہو اس میں پابندی نہ لگانا چاہئے اگر یہ لوگ کوئی بھی گائے ذبح کر لیتے تو کام چل جاتا۔ **چوتھا فائدہ:** یہ کہ بزرگوں سے زیادہ سوالات کرنا بھی خرابی میں ڈال دیتا ہے۔ قرآن کریم نے فرمایا لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ (مائدہ:۱۰۱) اسی لئے صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ جب اپنا شیخ کوئی وظیفہ یا عمل بتائے تو اس میں پوچھ پوچھ کر پابندیاں مت لگاؤ بلکہ آزادی سے کر ڈالو۔ **پانچواں فائدہ:** یہ کہ احکام الٰہی میں تبدیلی بھی ہو سکتی ہے اور تغیر بھی دیکھو ان کو پہلے مطلق گائے ذبح کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ پھر ان کے سوالات سے وہ گائے خاص کر دی گئی۔ **چھٹا فائدہ:** یہ کہ جو اپنے بال بچوں کو اللہ کے سپرد کر دے تو اللہ اس کی عمدہ پرورش فرماتا ہے۔ **ساتواں فائدہ:** جو اپنا مال اللہ کے بھروسہ پر اس کی امانت میں دے اللہ اس میں برکت دیتا ہے۔ **آٹھواں فائدہ:** ماں باپ کی فرمانبرداری حق تعالیٰ کو بہت پسند ہے علماء فرماتے ہیں کہ دوسرے نیک اعمال کا بدلہ آخرت میں ملے گا لیکن والدین کی اطاعت کا بدلہ دنیا و آخرت دونوں جگہ ملتا ہے۔ **نواں فائدہ:** فیض ربانی خیرات و قربانی کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ **دسواں فائدہ:** راہ خدا میں نفیس مال دینا چاہئے۔ **گیارھواں فائدہ:** گائے کی قربانی بہت افضل ہے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام نے ان کو گائے کی قربانی کا حکم دیا نہ کہ دوسری چیز کا نیز زمین گائے کے سینگ پر ہے نیز ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں کے سامنے گائے کا گوشت ہی پیش فرمایا۔ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ (ہود:۶۹) نیز جنت کی پہلی غذا گائے کی کلیجی اور مچھلی کا گوشت ہوگا۔ نیز مشرکین گائے کی عبادت کرتے ہیں۔ اس کو ذبح کر دینے میں شرک کی حقارت ہے جیسے کہ قیامت میں چاند و سورج جہنم میں بھیجے جائیں گے۔ مشرکین کی ذلت کے لئے۔ **بارھواں فائدہ:** کسی کو مذاق سے پریشان کرنا یا مسائل شرعیہ میں دل لگی کرنا یا مقدمہ کے فیصلہ کے وقت مذاق کرنا جہالت ہے انبیاء کرام اس سے معصوم ہیں۔ **تیرھواں فائدہ:** پیغمبروں کا فرمان بہر حال ماننا چاہئے۔ سمجھ میں آئے یا نہ آئے ان کے فرمانوں کو غلطی یا دل لگی پر محمول کرنا بے ادبوں کا طریقہ ہے۔

چودھواں فائدہ: اللہ تعالیٰ اپنے پیارے بندوں کی میراث محفوظ رکھتا ہے اور وارثوں کو پہنچا دیتا ہے۔ دیکھو انطالہ کے ایک صالح شخص کا مال زیر دیوار دفن تھا دیوار گری جاتی تھی۔ رب نے اس کی مرمت کے لئے حضرت خضر کو بھیجا لہٰذا اگر باغ فدک وغیرہ حضور کی میراث اور آپ کی اولاد کا حق ہوتا تو اللہ تعالیٰ ضرور انہیں دلواتا کوئی ظلماً قبضہ نہ کرتا معلوم ہوا کہ وہ میراث تھا ہی نہیں بلکہ وقف تھا۔ جیسے حضور کی دوسری املاک آپ کے بعد وقف ہوئیں حتیٰ کہ مکان شریف بھی روضہ بن گیا جو وقف ہوتا ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس مقصد کے لئے گائے کا گوشت ہی کیوں تجویز ہوا دوسرے جانوروں سے بھی یہ کام نکل سکتا ہے۔
جواب: اس کی بہت سی حکمتیں خلاصہ تفسیر اور فوائد میں بیان ہو چکیں چند وجہ اور بھی ہیں۔ (۱) بنی اسرائیل بچھڑے کی پرستش کر چکے تھے اور ان کے دل میں اب تک کسی قدر اس کی عظمت تھی وہ توڑنے کے لئے اس کے ذبح کا حکم دیا گیا۔
(۲) اس میں ایک سعادت مند اور والدہ کی اطاعت کرنے والے بچہ کا بھلا بھی تھا کہ اس کی گائے بہت قیمت سے فروخت ہوگئی۔ **دوسرا اعتراض:** اپنے نفع کے لئے بے قصور جانور کی جان لینا ظلم ہے اور خدا تعالیٰ ظلم نہیں کر سکتا۔ (آریہ)
جواب: جانور وغیرہ انسان ہی کے نفع کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ پنڈت جی بھی چمڑے کے جوتے اور گائے بھینس کا دودھ دہی استعمال کرتے ہیں بلکہ اب تو سائنس نے بتا دیا ہے کہ ہوا اور پانی میں صدہا جانور ہیں جو ناک اور منہ کی راہ انسان کے پیٹ میں جاتے رہتے ہیں پنڈت جی کو چاہئے کہ پانی پینا اور سانس لینا چھوڑ دیں۔ نیز تمام سبزیوں میں بھی جان ہے وہ بھی نہ کھانی چاہئیں پنڈت جی دنیا کا نظام ایسے ہی قائم ہے۔ کہ بعض جان بعض جان کو کھا کر زندگی گزارتی ہیں بڑی مچھلی چھوٹی کو شکاری جانور دوسروں کو کھا کر ہی زندہ رہتے ہیں۔ دواؤں میں صدہا جانوروں کے گوشت و چربی کام آتے ہیں۔ جنہیں پنڈت صاحبان بخوبی فروخت کرتے اور استعمال کرتے ہیں اسلام فطری دین ہے اس کے سارے احکام بھی فطرت کے موافق ہیں۔ **تیسرا اعتراض:** حدیث شریف میں ہے کہ گائے کا گوشت بیماری ہے اسی لئے نبی کریم ﷺ نے کبھی نہ کھایا اور صوفیاء کرام چلوں میں اور اطباء بیمار کو اس سے سخت منع کرتے ہیں لہٰذا اس سے بچنا سخت ضروری ہے (کتاب خون کے آنسو) **جواب:** یہ حدیث روح البیان پارہ آٹھ سورہ انعام میں زیر آیت وَهُمْ بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُوْنَ (انعام: ۱۵۰) میں ہے پوری حدیث یہ ہے کہ گائے کا دودھ و گھی استعمال کرو اور اس کے گوشت سے بچو کیونکہ اس کے دودھ اور گھی میں شفا ہے اور گوشت میں بیماری ہے اس حدیث سے تو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ گائے کا گوشت گائے کے گھی کے ساتھ استعمال کرنا چاہئے کہ اس کی اصلاح اس میں ہے یعنی گائے کا گوشت خوب کھاؤ۔ مگر اس میں گائے کا گھی ڈال لیا کرو۔ اور کھا کر گائے کا دودھ بھی پی لیا کرو۔ نیز ملک عرب کی آب و ہوا خشک ہے اور یہ گوشت بھی خشک، ہو سکتا ہے وہاں کے لئے مفید نہ ہو۔ ورنہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ جنت میں یہ ہی پہلی غذا ہوگی اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مہمان فرشتوں کو یہ ہی پیش فرمایا نیز اسکی قربانی کا قرآن کریم نے بھی حکم دیا وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ (حج: ۳۶) اس کی تحقیق اسی آیت کے ماتحت انشاء اللہ ہوگی۔ حضور علیہ السلام نے حجۃ الوداع میں اپنی ازواج پاک کی طرف سے گائے کی قربانی فرمائی اور اس کا شوربا استعمال فرمایا تو کیا بیماری کی چیز سے قربانی فرمائی صوفیاء کرام چلوں میں صرف گائے کا ہی نہیں بلکہ سارے گوشتوں سے پرہیز کرا کر ترک حیوانات کا حل کراتے ہیں بلکہ دودھ گھی تیل وغیرہ سے بچاتے ہیں اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ نفس دنیاوی لذتیں چھوڑ کر مردہ ہو جاوے۔ رہا اطبا کا اس گوشت سے منع فرمانا اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ گوشت گائے کا نہایت قوی اور عمدہ غذا ہے اسے قوی معدہ والا تندرست ہی ہضم کر سکتا ہے جیسے کہ سیب و دیگر مقویات بیمار برداشت نہ کر سکے

گا۔ حکیم صاحب بیماروں کو تو اس سے بچاتے ہیں خود روزانہ سیروں کھاتے ہیں نیز اگر گائے ذبح نہ ہو تو ان کی کثرت سے آدمی کی زندگی دشوار ہو جاوے گی تمام زمین میں یہ ہی ہو جاویں گی اور تمام پیداوار بھی ہضم کر جائیں گی اب صرف ہندوستان میں پچیس ہزار روزانہ ذبح ہوتی ہیں تب بھی کثرت کا یہ حال ہے اگر ان کا ذبیحہ بند ہو گیا تو پنڈت جی کو بھی کھا جائیں گی۔ انشاء اللہ ذبیحہ گائے کی بحث سورہ حج میں بھی کی جائے گی۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ مذاق اور دل لگی کرنا جاہلوں کا کام ہے حالانکہ قرآن فرماتا ہے۔ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ (البقرہ:۱۵) رب بھی مذاق کرتا ہے۔ نیز احادیث سے ثابت ہے کہ نبی علیہ السلام بھی خوش طبعی فرماتے تھے۔ مشکوٰۃ شریف میں حضور علیہ السلام کی خوش طبعی کا ایک باب مقرر کیا باب مزاح **جواب:** اس آیت میں مشرکین کی سزا کو استہزاء فرمایا گیا جس کی تفسیر وہاں ہی ہو چکی یعنی اللہ تعالیٰ ان بدبختوں کو استہزاء کی سزا دے گا نہ یہ کہ رب تعالیٰ ان سے مذاق دل لگی کرتا ہے جیسے فرمایا گیا جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (شوریٰ:۴۰) برائی کا بدلہ برائی ہے حالانکہ بدلہ تو برائی نہیں بدلہ لینا تو اچھا ہے حضور علیہ السلام نے مزاح فرمایا ہے نہ کہ استہزا مزاح خوش طبعی اور دل خوش کرنے والی باتوں کو کہتے ہیں اور استہزا کسی کو بے وقوف بنانے اور اس کو دل لگی کر کے پریشان کرنے کا نام ہے۔ استہزاء منع ہے اور کبھی کبھی مزاح (خوش طبعی) جائز بلکہ بہتر ہے اس کی تفسیر صوفیانہ اخیر قصہ میں کی جائے گی۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا

کہا انہوں نے دعا کرو واسطے ہمارے رب اپنے سے بیان کرے واسطے ہمارے کیا ہے وہ کہا تحقیق وہ فرماتا ہے تحقیق وہ

بولے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ وہ ہمیں بتادے گائے کیسی ہے۔ کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ ایک

بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۭ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ۭ فَافْعَلُوْا

ایک گائے ہے نہ تو عمر رسیدہ اور نہ بچھیا نصف ہے درمیان اس کے پس کرلو تم وہ جو

گائے ہے نہ بوڑھی ہے اور نہ اوسر بلکہ ان دونوں کے بیچ میں ہے تو کرو جس کا

مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۭ

حکم دیے جاتے ہو تم وہ بولے دعا کرو واسطے ہمارے رب اپنے سے بیان فرمائے واسطے ہمارے

حکم ہوتا ہے بولے اپنے رب سے دعا کیجئے ہمیں بتادے اس کا رنگ کیا ہے

قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ

کیا ہے رنگ اس کا فرمایا تحقیق رب فرماتا ہے وہ ایک گائے ہے پیلی خالص ہے رنگ اس کا

کہا وہ فرماتا ہے وہ ایک پیلی گائے جس کی رنگت ڈبڈباتی ہے

النّٰظِرِيْنَ ﴿۶۹﴾
خوش کرتی ہے دیکھنے والوں کو
دیکھنے والوں کو خوشی دیتی ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پہلے موسیٰ علیہ السلام کے فرمان کا ذکر ہوا تھا اب ان اسرائیلیوں کے آمادگی عمل کا تذکرہ ہے۔ **دوسرا تعلق:** پہلی آیت کے مضمون سے شبہ ہو سکتا تھا کہ وہ اسرائیلی اطاعت حکم پر تیار نہ ہوئے بلکہ سرکشی کرتے رہے اب وہ شبہ دور کیا جا رہا ہے کہ وہ اطاعت تو کرنے پر راضی ہوئے مگر بہت حیل و حجت کے بعد۔

تفسیر

قَالُوْا چونکہ ان اسرائیلیوں کو اس سے بہت ہی حیرت تھی اس لئے وہ سمجھے کہ ہر گائے میں مردہ زندہ کرنے کی تاثیر نہیں یہ تو کوئی خاص گائے ہی ہوگی۔ اس لئے وہ اس گائے کی نشانیاں پوچھ پوچھ کر مقرر کرانے لگے یہ نہ سمجھے کہ یہ گائے کا کام نہیں بلکہ موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ہے۔ یا قاتل اور اسکے ورثا نے اپنی رسوائی کے خوف سے اس قسم کی حجت بازیاں شروع کر دیں تا کہ بحث میں پڑ کر یہ معاملہ رفع دفع ہو جاوے۔ (تفسیر کبیر) لہٰذا یا تو ان سب لوگوں نے کہا یا قاتل اور اس کے ساتھیوں نے دوسری صورت میں یہ قَالُوْا برائی کے لئے ہے کیونکہ ملزم و ظالم کو سزا سے چھوڑانے کی کوشش کرنا ایسا ہی جرم ہے جیسے بے قصور کو سزا دلوانا شرعاً و قانوناً یہ نا قابل معافی جرم ہے۔ اُدْعُ لَنَا ہمارے لئے دعا کرو لَنَا سے یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ سوال ہماری تسلی کے لئے ہے آپ کو تو پہلے ہی سے تشفی ہے رَبَّکَ اپنے رب سے موسیٰ علیہ السلام کی طرف اس لئے نسبت کیا کہ وہ ان پر مہربان ہے اور ان کی سنتا ہے۔ جس سے معلوم ہوا کہ کسی مقبول بارگاہ سے دعا کرانا بہتر ہے۔ بعض عوام بزرگ کے آستانہ پر کہتے ہیں میری تیرے آگے اور تیری رب کے آگے یعنی میری التجا تیرے آگے ہے اور تیری التجا رب سے اس گفتگو کو بعض لوگ شرک کہتے ہیں مگر غلط ہے اس گفتگو کا ماخذ یہ آیت ہے کہ اسرائیلی کہتے تھے اے موسیٰ علیہ السلام رب سے ہماری یہ التجا پیش کر و رب فرماتا ہے۔ اے کلیم اپنی قوم سے یہ فرما دو۔ نبی رب و مربوب کے درمیان وسیلہ عظمیٰ ہیں۔ ایکسچینج ٹیلی فون والے کا ایک تعلق دور والے سے ہوتا ہے اور ایک قریب والے سے کہ یہ دور والے کی گفتگو سن کر قریب والے کو سناتا ہے۔ یُبَیِّنْ لَّنَا مَاهِیَ ہمیں واضح کر کے بتا دے کہ وہ گائے کیا ہے کیسی ہے۔ خیال رہے کہ لفظ مَاهِیَ حقیقت دریافت کرنے کے لئے بولا جاتا ہے مگر یہاں صفات اور علامات پوچھنے کے لئے ہے جیسے کہتے ہیں زید کیا ہے یعنی طبیب ہے یا عالم یا شاعر۔ اسی طرح کہا گیا کہ وہ گائے کیا ہے۔ یعنی چھوٹی ہے یا بڑی۔ تفسیر عزیزی نے اس جگہ عجیب بات فرمائی وہ یہ کہ یہاں مَاهِیَ سوال حقیقت کے لئے ہے گائے بہت سی قسم کی ہیں جنگلی گائے جسے نیل گائے کہتے ہیں پہاڑی گائے جسے سور گائے کہتے ہیں۔ دریائی گائے اور

عام پالنے کی گائے وہ سمجھے کہ ان چار گائیوں میں زندہ کرنے کی تاثیر نہیں شاید علم الٰہی میں ان کے سوا اور کوئی گائے بھی ہو گی کہ جس میں یہ تاثیر ہو چونکہ لفظ بقرۃ چند قسم کی گائیوں کو شامل تھا۔ جن میں سے ہر ایک کی نوعیت علیحدہ تھی اس لئے انہوں نے ماھی کہا مگر چونکہ یہی دودھ کی گائے مقصود تھی۔ اس لئے جواب میں اس کے صفت بتائے گئے نہ کہ حقیقت اس تفسیر سے منطقی اور نحوی سارے اعتراض اٹھ گئے قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ یہاں ایک عبارت پوشیدہ ہے یعنی موسیٰ علیہ السلام نے دعا فرمائی اور رب نے وحی کی تب آپ نے قوم سے فرمایا کہ رب فرما رہا ہے گائے سے کوئی خاص قسم کی گائے مراد نہیں بلکہ اِنَّهَا بَقَرَةٌ یہی دودھ والی عرفی گائے مراد ہے حکم میں تو کوئی مقرر نہ تھی جو تم چاہتے ذبح کر دیتے مگر علم الٰہی میں معین ہے کہ وہ گائے لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ نہ تو بڈھی ہے اور نہ بالکل نوجوان یعنی بیکار نہیں کام کاج کے قابل ہے۔ فَارِضٌ فرض سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ قطع کرنا اور انتہا تک پہنچ جانا نماز پنجگانہ کو اسی لئے فرض کہتے ہیں کہ ان کا حکم قطعی اور انتہائی ہے جس میں کوئی گنجائش نہیں لفظ بکر کے معنی ہیں شروع اور نئی اس لئے کنواری عورت کو باکرہ اور پہلے پھل کو باکورہ کہتے ہیں اور صبح کے وقت کو بکرہ کہتے ہیں بُكْرَةً وَّ اَصِيْلًا (احزاب: ۴۲) بکر عورت وہ ہے جس تک مرد نہ پہنچا ہو اور بکر گائے وہ جس نے بچہ نہ دیا ہو یا فقط ایک بار دیا ہو عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ اس کے درمیان ہی یعنی ادھیڑ اگرچہ پہلے کلام سے ادھیڑ ہونا ظاہر ہو گیا تھا مگر چونکہ وہ حجت باز کہتے کہ نہ معلوم بالکل بچی مراد ہے یا قریب جوان یا قریب بڑھاپے کے اس لئے فرما دیا گیا بڑھاپے اور جوانی کے بالکل درمیانی ہونی چاہئے۔ ذٰلِكَ کا اشارہ فارض اور بکر دونوں کی طرف ہے اس لئے اس پر بَيْنَ داخل ہو گیا۔ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ یا تو رب کا کلام ہے یا موسیٰ علیہ السلام کا اس میں لطیف اشارہ اس جانب بھی ہے کہ اے اللہ کے بندو محقق نہ بنو ورنہ مشکل میں پڑ جاؤ گے بلکہ جس کا حکم ملا ہے فوراً کر ڈالو اور عجائبات قدرت سے کچھ تعجب نہ کرو جونسی گائے ذبح کر لو گے رب اس میں یہ تاثیر پیدا کر دے گا مگر اس پر بھی ان کی تشفی نہ ہوئی اور پھر سوال کرنے لگے کہ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ ہم یہ تو سمجھ گئے لیکن اپنے رب سے یہ اور پوچھ لو کہ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ہمیں بتا دے اس کا رنگ کیسا ہے شاید اس کے رنگ میں تاثیر ہو تب قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ یہاں بھی وہی عبارت پوشیدہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے رب سے دعا کی اور ادھر سے وحی آئی تب آپ نے قوم سے فرمایا رب فرماتا ہے کہ اِنَّهَا بَقَرَةٌ صَفْرَآءُ کہ وہ پیلے رنگ کی ہے حضرت وھب فرماتے ہیں کہ ایسی تیز پیلی ہے کہ گویا اس میں سے آفتاب کی شعاعیں نکل رہی ہیں اسی لئے اس گائے کا نام مذہبہ تھا۔ یعنی خوبصورت سنہری چونکہ صفراء کالی کو بھی کہہ دیا کرتے ہیں جیسے كَاَنَّهٗ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ اس وہم کو دفع کرنے کے لئے فرمایا گیا فَاقِعٌ لَّوْنُهَا اس کی زردی خالص اور تیز ہے فاقع فقع سے بنا ہے جس کے معنی ہیں تیز ہونا اور خالص ہونا یعنی وہ گائے تیز پیلی اور خالص پیلی ہے کہا گیا ہے کہ اس کے سینگ اور کھر بھی پیلے تھے۔ (تفسیر روح البیان) اس کے باوجود ڈیل ڈول وغیرہ میں بدنما نہیں بلکہ تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ دیکھنے والوں کو پسند آتی ہے اور اس کو دیکھ کر اپنے غم بھول جاتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

جب موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو اطمینان دلایا کہ یہ تمسخر کی باتیں نہیں بلکہ حکم الٰہی ہے تو وہ سمجھے کہ مردہ زندہ کرنے کی تاثیر کسی

خاص گائے کے گوشت میں ہوگی۔ اسی کے ذبح کرنے کا حکم ہوگا اس لئے انہوں نے عرض کیا کہ اے موسیٰ علیہ السلام رب سے دعا کرو اس اجمال کی تفصیل فرمائے اور اس گائے کو مقرر کرے کہ وہ کیسی ہے تب آپ نے ارشاد فرمایا کہ وہ گائے ادھیڑ عمر کی ہے نہ تو بڑھاپا ہے اور نہ بالکل چھوٹی بچھیا بلکہ اس کے درمیانی اے قوم والو جو حکم ملا ہے کر گزرو۔ زیادہ تحقیقات میں نہ پڑو۔ مگر پھر بھی وہ نہ سمجھے کیونکہ معجزے کی طرف ان کا خیال نہ گیا بلکہ یہ ہی سمجھتے رہے کہ کوئی عجیب ہی گائے ہوگی کہ جس کے گوشت میں یہ تاثیر ہے تو وہ بولے کہ اب یہ دعا کرو کہ ہمیں اس کا رنگ بتا دیا جائے تو آپ نے فرمایا کہ وہ پیلی گائے ہے اس کا رنگ تیز ہے دیکھنے والوں کو بہت بھلی معلوم ہوتی ہے غرضکہ ان کی جس قدر تفتیش بڑھتی گئی اس قدر اس طرف سے زیادہ پابندی آتی گئی۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** یہ کہ اللہ کی راہ میں بہتر چیز خرچ کرنی چاہئے اور اچھے جانور کی قربانی کرنی چاہئے کیونکہ جب انہوں نے اس گائے کے حالات دریافت کئے تو عمدہ گائے کی طرف ان کو ہدایت کی گئی۔ **دوسرا فائدہ:** خالص پیلا رنگ خوشی پیدا کرتا ہے اور غموں کو دور کرتا ہے۔ تفسیر عزیزی اور روح البیان نے اس جگہ حضرت عبداللہ ابن عباس اور علی رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کی ہے کہ جو شخص پیلے رنگ کے جوتے پہنے انشاء اللہ اس کے غم دور ہوں گے اور وہ خوش و خرم رہے گا اور بعض روایتوں میں ہے کہ جو کوئی لگاتار پیلے جوتے کے سات جوڑے پہنے وہ انشاء اللہ رنج سے نجات پائے۔ عبداللہ ابن زبیر اور دیگر بزرگوں نے سیاہ رنگ کا جوتہ منع فرمایا کیونکہ اس سے رنج و غم پیدا ہوتا ہے۔ خیال رہے۔ سرخی اور زردی سیاہی سفیدی اور سبزی ان پانچ رنگوں کے جدا جدا خاصے ہیں۔ سرخی میں جمال ہے زردی میں خوشی۔ سبزی میں بزرگی سفیدی میں خوبی افضلیت اور سیاہی میں دہشت و رنج و غم (تفسیر عزیزی) اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر سیاہ چیز بری ہے۔ بلکہ سیاہ جوتا بہتر نہیں موزہ اور پگڑی سیاہ ہی عمدہ۔ فرعون کا موزہ سرخ تھا۔ ہامان کا سفید اور نبی ﷺ کا موزہ مبارک سیاہ باقی لباس مردوں کے لئے سفید بہتر اور عورتوں کے لئے رنگین۔ **تیسرا فائدہ:** قرآن کریم میں رب تین معنوں میں پر استعمال ہوا۔ بمعنی پالنے والا۔ رب العالمین۔ مہربان ربکم یا رب الناس بندوں کی مانند ربک یہاں تیسرے معنی میں ہے اس لحاظ سے رب کی نسبت اولیاء انبیاء خصوصاً سید الانبیاء کی طرف ہوتی ہے اسی طرح عبد تین معنی میں آیا ہے یعنی مخلوق یا بندہ اس لحاظ سے ہر مخلوق عبد ہے بمعنی عابد و پرہیزگار وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ (الفرقان: ٦٣) اس لحاظ سے صرف متقی عبد ہیں بمعنی فنافی الذات سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ (الاسراء: ١) اس لحاظ سے ڈاکٹر اقبال کہتے ہیں ؎

عبد دیگر عبدہ چیزے دگر ایں سراپا انتظار او منتظر

کلب ہر کتا ہے مگر کلبہم وہ کتا ہے جو عبدہ کا کتا بن گیا۔ جسے حیات ابدی مل گئی عبدہ کا عبد بننا بھی اللہ کا فضل ہے جیسے ایک باپ کے چند بیٹے ہوں لائق و نالائق تو وہ کہتا ہے بیٹے میرے سب ہی ہیں مگر میرا بیٹا تو فلاں ہے یعنی اطاعت شعار فرمانبردار بیٹا۔ عبدہ ربانی قوت سے کام کرتا ہے۔ مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ (انفال: ١٧) اَنَا اٰتِیْكَ بِهٖ قَبْلَ اَنْ یَّرْتَدَّ اِلَیْكَ طَرْفُكَ

(نمل: ۴۰) جیسے بلب اور برقی پنکھا پاور کی طاقت پر چلتا ہے اس درجہ میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ بندے کو راضی کرنا چاہتا ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس میں کیا راز ہے کہ پہلے ہی سے پوری بات نہ بتائی گئی بلکہ صرف پہلے گائے کا حکم دیا گیا اور ان کے پوچھنے پر باقی قیدیں لگائی ہیں لیکن یہ طریقہ علم و حکمت کے خلاف معلوم ہوتا ہے۔ **جواب:** اولاً ان کو صرف گائے ذبح کرنے کا حکم تھا ان کے پوچھنے پر قیدیں لگائی گئیں اگر پہلے ہی سے خاص گائے مراد ہوتی تو یہ سوال پڑسکتا تھا۔ **دوسرا اعتراض:** تو کیا ان کے پوچھنے سے رب کا علم اور ارادہ بدل گیا۔ یہ تو ناممکن ہے۔ **جواب:** ارادہ اور علم تو نہ بدلا حکم میں فرق ہو گیا رب کے علم و ارادہ میں یہی بات تھی کہ وہ بار بار سوال کریں اور قیدیں بڑھیں تاکہ اگلوں کو نصیحت ہو اور وہ سوالات سے بچا کریں حکم کی تبدیلی دن رات ہوتی رہتی ہے امیر آدمی کو پانچ عبادتوں کا حکم ہے۔ مگر جب غریب ہو جائے تو حج و زکوٰۃ معاف ہو کر صرف تین کا حکم رہ جاتا ہے۔ درحقیقت یہ حکم کی تبدیلی نہیں بلکہ تعلق کی تبدیلی ہے۔ **تیسرا اعتراض:** اس کام کے لئے پیلی گائے کیوں منتخب ہوئی اور گایوں سے بھی یہ کام ہو سکتا تھا؟ **جواب:** اس لئے کہ سامری کا بچھڑا سونے کا تھا اور پیلا جس کی عظمت ان کے دل میں قائم ہو چکی تھی۔ مناسب تھا کہ اس رنگ کی گائے انہیں کے ہاتھوں ذبح کرا کر ان کے دل سے یہ عظمت دور کی جائے تفسیر صوفیانہ مضمون کے خاتمہ پر کی جائے گی۔

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ إِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ

وہ بولے دعا کرو واسطے ہمارے رب اپنے سے بیان کردے واسطے ہمارے کیا ہے وہ گائے تحقیق گائے مشتبہ ہو گئی

بولے اپنے رب سے دعا کیجئے کہ ہمارے لئے صاف بیان کردے وہ گائے کیسی ہے بیشک گایوں میں ہم کو

عَلَيْنَا ۭ وَإِنَّآ إِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ۝ قَالَ إِنَّهٗ يَقُوْلُ

اوپر ہمارے اور تحقیق ہم اگر چاہا اللہ نے ہدایت پانے والے ہیں فرمایا تحقیق وہ رب فرماتا ہے

شبہ پڑ گیا ہے اور اللہ چاہے تو ہم ہدایت پا جائیں گے کہا وہ فرماتا ہے کہ وہ

إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْأَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ

تحقیق وہ ایسی گائے ہے کہ نہیں ہے ذلیل کہ جوتتی ہو زمین کو اور نہ پانی دیتی ہے کھیتی کو

ایک گائے ہے جس سے خدمت نہیں لی جاتی کہ زمین جوتے اور نہ کھیتی کو پانی دے

مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ۭ قَالُوا الْئٰنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۭ فَذَبَحُوْهَا

سلامت ہے کہ نہیں ہے کوئی داغ بیچ اس کے کہا انہوں نے اب لائے آپ ٹھیک بات پس ذبح کیا

بے عیب ہے جس میں کوئی داغ نہیں بولے اب آپ ٹھیک بات لائے تو اسے ذبح کیا

وَمَا كَادُوا يَفْعَلُونَ ﴿٧١﴾

انہوں نے اس کو اور نہ قریب تھے کہ کر لیتے

اور ذبح کرتے معلوم نہ ہوتے تھے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** یہ کہ پہلے مضمون کا تتمہ ہے اور ان کے سوال و جواب کا بقیہ۔ **دوسرا تعلق:** پہلے سوالات سے شبہ ہو سکتا تھا کہ شاید وہ لوگ اس بہانہ سے حکم ٹالنا چاہتے ہیں اور ان کے یہ سوالات عناداً ہیں نہ احتیاطاً اطاعت کے لئے اب اس شبہ کو دور کیا جا رہا ہے کہ وہ اطاعت ہی کے لئے اتنی تحقیقات کر رہے تھے چونکہ وہ وہمی قوم تھی اس لئے اپنے سوالات کی بوچھاڑ کر ڈالی۔

تفسیر

قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ گائے کی عمر اور رنگت بیان کرنے کے بعد بھی ان کو تسلی نہ ہوئی اب اس کی دیگر صفات معلوم کرنے کے لئے موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ رب سے پھر دعا کرو۔ يُبَيِّن لَّنَا خوب ظاہر کر دے ہمارے لئے یعنی اس عمر اور رنگت اور جمال والی گائے بھی بہت سی ہیں ان میں سے کسے ذبح کریں۔ لہٰذا صاف صاف بتایا جائے کہ مَا هِيَ وہ کیسی یا کون سی گائے ہے۔ بعض علماء نے فرمایا کہ یہ پہلا ہی سوال ہے یعنی ہماری سمجھ میں آتو گیا ذرا اور صاف دوبارہ بیان کرو۔ بعض نے فرمایا کہ یہ مَا هِيَ بھی کیف کی طرح صفات پوچھنے کے لئے ہے یعنی اب یہ بتاؤ کہ وہ جنگل میں چرتی ہے یا مالک کا کام کاج کرتی ہے۔ بعض نے فرمایا کہ یہ حقیقت شخصیہ دریافت کرنے کے لئے ہے یعنی پہلے مَا هِيَ کا یہ مطلب تھا کہ وہ کون کون سی قسم کی گائے ہے۔ دریائی یا خشکی کی جنگلی یا پہاڑی۔ اب یہ پوچھ رہے ہیں کہ اس خاص قسم کی گائے میں سے کون سی گائے ہے اس کی حقیقت شخصیہ کیا ہے لہٰذا اس سوال میں تکرار بھی نہیں ہے اور دونوں جگہ ماطلب حقیقت ہی کے لئے ہے اس لئے وہ کہتے ہیں کہ إِنَّ الْبَقَرَ تَشَابَهَ عَلَيْنَا کہ اس قسم کی گائے بھی ہم پر مشتبہ ہی ہے کیونکہ ایسی گائے صدہا موجود ہیں اور ذبح کرنے کی تاثیر ہر ایک میں نہیں ہو سکتی اور اے موسیٰ علیہ السلام ہم ٹالنے کے لئے یہ سوالات نہیں کر رہے ہیں بلکہ وَإِنَّا إِن شَاءَ اللَّهُ لَمُهْتَدُونَ اگر اللہ نے چاہا تو اس گائے کا پتہ لگا لیں گے اور اس پر عمل کریں گے یا تو اس کا یہ مطلب ہے کہ ہم فی الحال ہدایت پائے ہوئے ہیں اور انشاء اللہ فقط برکت کے لئے کہا ہے یعنی خدا کے فضل سے ان سوالات میں ہم حق بجانب اور ہدایت پر ہیں ہمارے یہ سوالات کفر اور گمراہی کی بنا پر نہیں بلکہ اطاعت کے لئے ہیں یا یہ مطلب ہے کہ ہم ہدایت والے ہو جائیں گے یعنی اگر آپ نے ہماری تسلی کر دی تو ہم اس گائے کو ضرور حاصل کر لیں گے یا قاتل کو پا لیں گے۔ یہ سن کر موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا قَالَ إِنَّهُ يَقُولُ یہاں بھی وہی عبارت پوشیدہ ہے یعنی موسیٰ علیہ السلام نے یہ سوال رب کے سامنے پیش کیا اور جواب ملنے پر قوم سے فرمایا کہ رب فرماتا ہے کہ إِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا ذَلُولٌ وہ گائے ذلیل نہیں ہے۔ یعنی خدمت انسان کی

ذلت اس میں نہیں اور نہ وہ کام کاج کے لئے رکھی گئی ہے ذلول بروزن فعول صفت کے لئے آیا اس وزن میں ت کی ضرورت نہیں جیسے اِمْرَاءَ ۃٌ صَبُوْرٌ یہ ذلّ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ذلت اور حقارت چونکہ شوقیہ پالے ہوئے جانور کی محبت، قدر، خدمت بہت زیادہ ہوتی ہے اور کام کاج کے جانور کی اتنی قدر نہیں بلکہ معمولی غذاؤں سے فقط باقی رکھا جاتا ہے تاکہ کام بند نہ ہو ہم نے دیکھا ہے کہ شوقیہ پالے ہوئے مرغ کبوتر وغیرہ کو عمدہ عمدہ غذائیں کھلائی جاتی ہیں۔ دہلی وغیرہ میں قربانی کی گائے کو جلیبیاں اور مٹھائیاں کھلاتے ہیں۔ اسے عمدہ کپڑوں اور زیوروں سے آراستہ کرتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ کاروباری جانور ذلیل اور مشوقیہ عزیز ہے۔ اسی لئے ذلول کی تفسیر میں فرمایا تُثِیْرُ الْاَرْضَ یہ لا کے تحت میں ہے یعنی وہ ایسی ذلیل نہیں ہے کہ زمین جوتے تُثِیْرُ۔ ثَوْرٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں منقلب کرنا پلٹ دینا اس لئے جوش کو ثوران کہتے ہیں کہ اس میں نفس کی حالت پلٹ جاتی ہے جوتنے میں بھی مٹی اوپر نیچے ہو جاتی ہے اس لئے اس کو اثارت کہتے ہیں اور بیل کو بھی اس لئے ثور کہا جاتا ہے کہ وہ یہ کام کرتا ہے وَلَا تَسْقِی الْحَرْثَ یہ سَقْیٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں پلانا اسی لئے بہشتی کو سقہ اور شراب پلانے والے کو ساقی اور پانی کی جگہ کو سقایا کہتے ہیں یعنی وہ چرسہ یا رہٹ وغیرہ چلا کر کھیت کو پانی بھی نہیں دیتی چونکہ زمین کی جتائی پہلے ہوتی ہے اور پانی بعد میں اس لئے اس کا ذکر بعد میں ہوا نیز سادہ زمین جوتی جاتی ہے اور بوئی ہوئی کو پانی دیا جاتا ہے۔ اس لئے پہلے ارض فرمایا تھا۔ یہاں حرث فرمایا یعنی کھیتی بعض لوگوں نے یہ سمجھا کہ وہ بیل تھا کہ کھیتی باڑی کا کام بیل ہی کرتا ہے نہ کہ گائے مگر صحیح ہے کہ وہ گائے تھی کیونکہ ان آیات میں تمام ضمیریں مونث ہی ہیں اور روایت بھی اس کی تائید کرتی ہیں غالباً اس ملک میں گائے سے کھیتی باڑی کا کام لیتے ہوں گے جیسے پنجاب میں بھینس سے بلکہ سیالکوٹ میں تو بھینس سے بیل گاڑیاں وغیرہ بھی چلائی جاتی ہیں۔ اس لئے یہ فرمایا گیا۔ اس ذلول کو اور بھی واضح کرنے کے لئے ارشاد ہوا بعض بزرگوں نے اس آیت سے ثابت کیا ہے کہ قربانی کے جانور سے کام کاج نہ لیا جائے۔ ان کی اون اور دودھ اپنے کام میں نہ لایا جائے کیونکہ بنی اسرائیل کی اس قربانی میں قید لگائی گئی کہ ایسے گائے کی قربانی کرو جس سے دنیاوی کام نہیں لیا جاتا۔ بعض لوگ اپنی بعض اولاد کو اللہ کے لئے وقف کر دیتے ہیں کہ اس سے دنیاوی کام نہیں لیتے اسے عالم بنا کر تبلیغی کاموں میں مصروف رکھتے ہیں ان کا ماخذ بھی یہی آیت ہو سکتی ہے۔ حضرت مریم کی والدہ نے نذر مانتے وقت کہا تھا رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَكَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا (آل عمران: ۳۵) محرر کے معنی ہیں دنیوی کاموں سے آزاد۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ اپنی ہر چیز کی قربانی کرو۔ کہ کچھ سانسیں کچھ اوقات کچھ مال کی قربانی دو جسے بالکل اللہ کے لئے کرو۔ نماز کے اوقات میں دنیاوی کام نہ کرو۔ غرضیکہ یہ آیت بہت سے احکام کا ماخذ ہے۔ مُسَلَّمَةٌ یہ سلم سے بنا ہے جس کے معنی ہیں صحیح سلامت رہنا یعنی وہ گائے عیبوں سے کام کاج کے اثرات سے سلامت ہے یا باندھنے سے محفوظ ہے کہ وہ جنگل میں چھوٹی ہوئی یا وہ کانٹے سوراخ کرنے یا داغ دینے یا جوتنے کے اثر اور چابک وغیرہ کے اثرات سے محفوظ ہے کیونکہ یہ عیوب کام کاج کے جانوروں میں ہوتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے لَّا شِیَةَ فِیْهَا شِيَةَ، وَشْیٌ سے بنا ہے جیسے وَمْدٌ سے مدۃ اور وزن سے زنۃ اس کے لفظی معنی ہیں گودنا اور داغ دینا۔ یعنی وہ گائے بالکل پیلی ہے جس میں کوئی داغ دھبہ نہیں جب انہوں نے یہ سارے

صفات سن لئے تو خوش ہو کر بولے قَالُوا الْئٰنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ اب آپ ٹھیک ٹھیک بات لائے آن تھوڑے سے وقت کو کہتے ہیں جیسے کہ ایک آن میں چلا گیا اور الف لام کی وجہ سے اس کے معنی ہوتے ہیں اب۔ یہ حق باطل کا مقابل نہیں یہ مطلب نہیں ہے کہ اب تک جھوٹ کہا تھا۔ اب سچ بلکہ اس سے پوری اور ٹھیک بات مراد ہے یعنی اب آپ نے تسلی بخش بات کہی۔ تسلی ہو چکنے کے بعد انہوں نے اس گائے کو ڈھونڈ کر حاصل کیا اور فَذَبَحُوْهَا ذبح کے معنی ہم پہلے بتا چکے چونکہ گائے بکری کو ذبح کرنا ہی بہتر ہے نہ نحر اس لئے انہوں نے ذبح ہی کیا بہت حیل و حجت کے بعد ذبح تو کر لیا لیکن وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ اس بڑے کام کے کرنے کے قریب بھی نہ تھے اس لئے کہ انہوں نے سوالات کا ایسا سلسلہ قائم کیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ سلسلہ ختم نہ ہوگا نہ یہ ذبح کریں گے یا وہ گائے اس قدر قیمتی تھی کہ بظاہر ان کی برداشت سے باہر یا ان کی رسوائی کا خوف تھا کہ مقتول زندہ ہو کر قاتل کا پتہ دے گا جس سے راز کھل جائے گا مگر ہم نے ان کو شافی جواب دے کر خاموش کر دیا جس سے ذبح کرنے پر مجبور ہو گئے اس عبارت کا ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ لوگ زیادہ سوال و جواب کی وجہ سے جلد ذبح نہ کر سکے بلکہ بہت عرصہ کے بعد چنانچہ روح البیان نے فرمایا کہ اس سارے واقعہ میں چالیس سال صرف ہوئے۔

خلاصہ تفسیر

ان اسرائیلیوں کو زرد رنگ معلوم ہونے پر بھی تسکین نہ ہوئی کہنے لگے کہ اس عمر اور اس رنگت کی بہت سی گائیں ہیں ابھی ہم پر مشتبہ ہی ہے کہ کون سی گائے ذبح کریں دعا فرمایئے کہ رب تعالیٰ اور بھی وضاحت فرما دے کہ کون سی گائے ذبح کی جائے ہم انشاء اللہ اطاعت سے درگذر نہ کریں گے ضرور وہ گائے تلاش کر کے ذبح کر دیں گے۔ تب موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ رب فرماتا ہے کہ وہ نہ تو ایسی ذلیل و خوار گائے جو ہل جوتتی یا کھیتی کو پانی دیتی ہو اور نہ اس میں کسی قسم کا کوئی عیب ہے۔ سارے عیبوں سے دور اور اس کا جسم بے داغ و دھبہ ہے تب وہ بولے کہ ہاں اب آپ نے پوری اور صاف صاف بات بتائی پھر وہ تلاش کرتے ہوئے اس لڑکے کے پاس پہنچے جس کے پاس ایسی گائے تھی حالانکہ اس زمانے میں گائے کی قیمت تین دینار یعنی ساڑھے سات روپیہ تھی مگر لڑکے نے فرشتے کی ہدایت کے موافق یہ قیمت طے کی کہ اس کا چمڑا سونے سے بھر دیا جاوے اور موسیٰ علیہ السلام کی ضمانت پر گائے بنی اسرائیل کے حوالہ کی ان ظاہری علامات سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ لوگ یوں ہی وقت گزار کر معاملہ رفع دفع کر دیں گے مگر تسلی بخش جوابات کے پا جانے پر ان کو یہ کرنا ہی پڑا۔ خیال رہے کہ ان سوالات کے جوابات کے سلسلے میں بنی اسرائیل کا کافی عرصہ لگ گیا۔ پھر ایسی گائے کی تلاش میں بہت وقت گزرا اس وقت تک مقتول کی میت کو دفن نہ کیا گیا معلوم ہوا کہ مقدمہ کی تحقیقات کے لئے دفن میں تاخیر جائز ہے بلکہ بعد دفن نعش نکالنا بھی درست ہے۔ دیکھو بیت المقدس کی تعمیر کی تکمیل کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان کی نعش شریف کو چھ ماہ یا ایک سال تک بغیر دفن رکھا جیسا کہ قرآن کریم میں ہے مَا دَلَّهُمْ عَلٰى مَوْتِهٖۤ اِلَّا دَآبَّةُ الْاَرْضِ (سباء: ۱۴) لہٰذا اگر صحابہ کرام نے مسئلہ خلافت کی تکمیل کے لئے حضور علیہ السلام کے دفن میں دو دن تاخیر کر دی تو کوئی مضائقہ نہیں اب بھی شرعی حکم ہے کہ بادشاہ کو دفن جب کیا جاوے جب اس کا خلیفہ مقرر ہو جاوے تاکہ زمین خلیفہ سے خالی نہ رہے غرضیکہ یہ واقعہ بہت احکام کا ماخذ ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** یہ کہ قربانی کے لئے بہتر جانور لینا چاہئے اس کا ناک کان دم وغیرہ سب دیکھ لیں۔ عیب دار جانور ہرگز ذبح نہ کریں۔ **دوسرا فائدہ:** یہ کہ ہر امید پر ''انشاء اللہ'' ضرور کہنا چاہئے ورنہ وہ امید پوری نہ ہوگی۔ حدیث پاک میں ہے کہ اگر یہ لوگ انشاء اللہ نہ کہتے تو کبھی بھی یہ کام نہ کر سکتے۔ انشاء اللہ کہنے میں عقیدے اور عمل کی اصلاح ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والا اپنی طاقت پر بھروسہ نہیں کرتا بلکہ رب کی مدد پر۔ قرآن کریم میں حضور ﷺ سے فرمایا گیا ہے کہ آپ آئندہ بات پر انشاء اللہ ضرور فرمایا کریں مگر خیال رہے کہ جائز اور بہتر باتوں پر انشاء اللہ کہنا چاہئے۔ نہ کہ حرام چیزوں اور بلاؤں آفتوں پر۔ یہ کہو کہ انشاء اللہ نماز پڑھوں گا یوں نہ کہو کہ انشاء اللہ میں چوری یا زنا کروں گا۔ شراب پیوں گا۔ ہم بسم اللہ کی تفسیر میں بیان کر چکے کہ حرام چیزوں پر بسم اللہ پڑھنا کفر ہے۔ اسی طرح یوں کہو کہ انشاء اللہ بیمار کو آرام ہوگا۔ یوں نہ کہو کہ انشاء اللہ عنقریب بیماری پھیلے گی۔ کیونکہ بیماری بلا ہے۔ یہاں لفظ اندیشہ وغیرہ استعمال کرو اسی طرح آئندہ کی بات پر انشاء اللہ۔ گزری ہوئی بات پر کہنا بیکار ہے ہاں برکت کے لئے اگر اس پر بھی کہہ لے تو جائز ہے اس موقعہ پر انشاء اللہ بفضلہٖ تعالیٰ کے معنی میں ہوگا اور یہ لفظ ان شک کے لئے نہ ہوگا۔ مثلاً کوئی کہے کہ ان شاء اللہ میں مسلمان ہوں تو معنی یہ ہیں کہ خدا کے فضل سے میں مسلمان ہوں اگر اپنے ایمان میں شک کرتے ہوئے انشاء اللہ کہتا ہے تو کافر ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انشاء اللہ کہنا بعض جگہ سنت ہے اور بعض جگہ منع اور بعض موقع پر کفر بھی ہے۔ **تیسرا فائدہ:** رب کی اطاعت میں جلدی کرنا ضروری ہے۔ تحقیقات کر کے دیر لگانا باعث وبال۔ نوکر کا فرض ہے فرمانبرداری اور جان سپاری نہ کہ تحقیقات میں وقت گزاری۔ مولانا فرماتے ہیں۔

تا خیال دوست در اسرار ماست — چاکری و جاں سپاری کار ماست

کسی نے کیا خوب کہا ہے

عاشقاں راچہ کار با تحقیق! — ہر کجا نام اوست قربانیم

چوتھا فائدہ: اپنی چیز جس قدر بھی نفع سے فروخت کرے جائز ہے اس میں حکومت یا قوم کی طرف سے پابندی نہیں لگائی جا سکتی دیکھو تین دینار کی گائے اتنی گراں قیمت میں بکی۔ ہاں غلہ یا چارہ قحط کے زمانہ میں گرانی کے انتظار میں روکنا منع ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس گائے میں کام کاج نہ کرنے اور بے داغ دھبہ ہونے کی قید کیوں لگائی گئی ہے۔ اسلام نے قربانی کے جانور میں یہ قیدیں نہیں لگائیں۔ **جواب:** سامری کا بچھڑا بے داغ بے دھبہ تھا اور کھیتی باڑی بھی نہیں کرتا تھا۔ ان قیود سے اس بچھڑے کی مشابہت مقصود تھی۔ جب اسلام نے شراب منع فرمائی تو شروع میں شراب کے برتن استعمال کرنا بھی منع فرما دیئے کہ اس حالت سے مشابہت نہ ہو جائے اور انہیں دیکھ کر شراب یاد نہ آ جاوے اس گائے کو دیکھ کر وہ بچھڑا ان کو یاد آوے گا اور پھر اس کو اپنے ہاتھ سے ذبح کریں گے تو اس کی الفت دور ہوگی نیز ان پابندیوں سے اس سعادت مند والدہ کی اطاعت

کرنے والے جوان کا بھلا ہو گا۔ کہ ایسی گائے کسی اور جگہ نہ ملے گی وہ منہ مانگی قیمت حاصل کرے گا۔ **دوسرا اعتراض**: ایک سعادت مند جوان کی بھلائی کے لئے ساری قوم کو زیر بار کرنا خلاف عقل ہے۔ **جواب**: ایک نیک بخت کی بھلائی کے لئے مجرم قوم کو کچھ مشقت میں ڈالنا بالکل حکمت کے مطابق ہے ہمیشہ اعلیٰ پر ادنیٰ قربان کیا جاتا ہے۔ ایک بادشاہ کی راحت کے لئے صدہا فرد مشقتیں اٹھاتے ہیں نیز اگر یہ قیمت ساری قوم نے چندہ کر کے ادا کی تو ان کو محسوس بھی نہ ہوا اور اگر قاتل نے ادا کی تو یہ بھی اس کی سزا تھی اور اگر مقتول کے ہم جنس دوستوں نے دی تو اس قیمت کی وجہ سے ان کو اس کی میراث بچ رہی کیونکہ یہ سب مال قاتل کا تھا۔ جب اس کا قتل معلوم ہو گیا تو وہ ورثہ سے محروم رہا۔ بہر حال زیادہ نفع کے لئے تھوڑا نقصان مضر نہیں۔ **تیسرا اعتراض**: رب تعالیٰ نے اس گائے کے تمام صفات ایک بار ہی کیوں نہ بتا دیئے۔ تا کہ علیحدہ علیحدہ سوالات کی ضرورت نہ رہتی۔ **جواب**: دو وجہ سے ایک یہ کہ بنی اسرائیل کو موسیٰ علیہ السلام کی حاجت برابر رہے ان سے بے تعلقی نہ ہو جائے تا کہ معلوم ہو کہ امت ہر وقت نبی کی ایسی حاجت مند ہے جیسے زمین پانی کی۔ دوسرے یہ کہ اس ذریعے سے موسیٰ علیہ السلام کو رب کی ہمکلامی کا سلسلہ دراز ہو جیسے ہمارے حضور کے لئے اولاً پچاس نمازیں معراج میں فرض فرمائیں پانچ پانچ کر کے نو دفعہ میں پینتالیس کم کیں عقل کے نزدیک کلام میں کمی اچھی عشق کے لئے محبوب سے دراز کلام بہتر ہے۔ اس لئے موسیٰ علیہ السلام سے سوال ہوا کہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے تو فرمایا لاٹھی ہے جس سے بکریوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں۔ اس پر ٹیک لگاتا ہوں اور بہت کام نکالتا ہوں سوال ایک تھا مگر جواب تین تا کہ تخاطب دیر تک قائم رہے۔

تفسیر صوفیانہ

قلب کو انسان کی خواہشات نفسانی نے قتل کر دیا اب اس کے زندہ کرنے کی تدبیر یہ ہے کہ گائے یعنی نفس کو شریعت کی چھری سے ذبح کرو کہ اس کی موت میں قلب کی حیات ہے۔ اس مقاتلہ نفس کو جہاد اکبر فرمایا گیا اور ارشاد ہوا کہ **مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا** یعنی مرنے سے پہلے مر جاؤ۔ خواہشات نفس نے جب یہ حکم سنا تو موسیٰ روح سے کہا کیا تو ہم سے دل لگی کرتا ہے قتل نفس ہر کس و ناکس کا کام نہیں۔ روح نے جواب دیا کہ خدا کی پناہ میں ان جہلا میں سے نہیں جو کہ قتل نفس کو آسان سمجھتے ہیں۔ یہ کام دنیا دار نفس کے پجاری کا نہیں، تب انہوں نے عرض کیا کہ اچھا مقرر کرو کہ کون سا نفس قتل کیا جاوے جس سے قلب زندہ ہو۔ جواب دیا کہ وہ نفس نہ تو بڈھا راہ قطع کرنے سے عاجز ہو نہ بالکل جوان نشہ مست شباب ہو۔ بلکہ اس کے درمیان جب کمال عقل رکھتا ہو تب پوچھا کہ اس کا رنگ کیا ہو جواب ملا کہ پیلے رنگ کا ہو یعنی ریاضت اور مجاہدہ والوں کا نفس ہو جن کے چہرے پیلے ہوتے ہیں۔ جن کی یہ زردی بھلی معلوم ہوتی ہے نہ کہ بری جو بھی انہیں دیکھتا ہے ان کو صالح سمجھ کر خوش ہوتا ہے ان کا دلی تقویٰ چہرے کی رنگت سے ظاہر ہوتا ہے، **سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ** (فتح: ۲۹) پھر کہا گیا کہ کچھ اور صفات بتاؤ۔ کیونکہ اس لباس میں بہت سے بطال فریبی بھی ہیں۔ ایسا نشان بتاؤ جس سے باطلین طالبین سے علیحدہ ہو جائیں تب فرمایا گیا کہ وہ ایسا نفس ہے جو دنیا طلبی میں حرص و ہوس کے ہل میں نہ جوڑا گیا ہو اور دنیاوی مصنوعات پر فریفتہ نہ ہوا ہو۔ یہ ذلت اس نے برداشت نہ کی ہو اور نہ اپنی آبرو کے پانی سے دنیا کو سیراب کیا ہو۔ یعنی دنیا حاصل کرنے کے لئے ذلت حاصل نہ کی ہو اور وہ

نفس یک رنگ ہو۔ دو رنگ نہ ہو۔ یعنی اللہ اور ماسوی اللہ دونوں کا طالب نہ ہو۔ اس قسم کے عیوب سے مسلم ہو۔ تب انہوں نے خنجر صدق سے رب کی توفیق سے نفس کو ذبح کر کے قلب کو زندہ کیا (تفسیر روح البیان) خلاصہ یہ ہے کہ ظاہری گائے ذبح کر کے ظاہری مقتول زندہ کرنے کا واقعہ صرف ایک بار ہی ہوگا مگر اندرونی گائے ذبح کر کے اندرونی مقتول دل کو زندہ کرنا قیامت تک جاری رہے گا کہ اللہ والے نفس مار کر قلب جلاتے رہیں گے مگر یہ مردوں کا کام ہے نہ کہ ہر کس و نا کس کا۔

وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا ؕ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ
اور جب کہ قتل کیا تم نے ایک جان کو پس تم نے ایک دوسرے کو الزام لگایا بیچ اس کے اور اللہ ظاہر فرمانے
اور جب تم نے ایک خون کیا تو ایک دوسرے پر اس کی تہمت لگانے لگے اور اللہ کو ظاہر کرنا تھا جو
تَكْتُمُوْنَ ﴿۷۲﴾ فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ؕ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ
والا ہے وہ جو کہ تھے تم چھپاتے پس فرمایا ہم نے مارو تم اس کو ساتھ ٹکڑے اس گائے کے اس ہی طرح
تم چھپاتے تھے تو ہم نے فرمایا اس مقتول کو اس گائے کا ایک ٹکڑا مارو اور اللہ یونہی
الْمَوْتٰى ۙ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۳﴾
زندہ فرماتا ہے اللہ مردے کو اور دکھاتا ہے تم کو نشانیاں اپنی تاکہ تم عقل رکھو
مردے جلائے گا اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے کہ کہیں تمہیں عقل ہو

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں ذبح گائے کا واقعہ بیان ہوا۔ اب اس کی وجہ بیان ہو رہی ہے کہ گائے ذبح کیوں کرائی گئی۔ **دوسرا تعلق:** پہلے گائے کے ذبح کا ذکر ہوا تھا اب قتل انسان کا واقعہ بیان ہو رہا ہے جو کہ بنی اسرائیل سے سرزد ہوا اگرچہ قتل انسان پہلے ہوا تھا اور ذبح گائے پیچھے مگر چونکہ ذبح گائے کا واقعہ بتانا ہی اصل مقصود تھا۔ اس لئے پہلے وہ ارشاد فرمایا گیا اور ایک واقعہ کو دو واقعہ کی طرح بیان فرمایا گیا۔ **تیسرا تعلق:** جیسے رب فرماتا ہے وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ (آل عمران: ۴۳) دیکھو رکوع پہلے ہوتا ہے اور سجدہ بعد میں مگر چونکہ سجدہ نماز میں اعلیٰ مقصود ہے۔ اس لئے اس کا ذکر پہلے ہوا۔ ایسے ہی یہاں ہے۔ پچھلی آیت کے مضمون پر شبہ پڑ سکتا ہے کہ بنی اسرائیل کا ذبح گائے میں دیر لگانا اپنی سستی یا نافرمانی کی وجہ سے نہ تھا۔ بلکہ محض اس لئے کہ ان کو جواب شافی نہ ملا تھا۔ اور گائے کے ذبح اور مردہ ہونے میں کوئی تعلق نہ تھا اس شبہ کو دفع فرمایا جا رہا ہے کہ نہیں بلکہ یہ سب کچھ ان کی سرکشی سے تھا اصل واقعہ ہی ان کی سرکشی پر مبنی ہے جس میں انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو دھوکا دینے اور قوم میں فساد پھیلانے کی کوشش کی یعنی ایک شخص کو خلاماً قتل کیا پھر دوسروں کو الزام لگایا پھر موسیٰ علیہ السلام کو دھوکہ دیا لہٰذا یہ تاخیر بھی سرکشی کی وجہ سے ہوئی۔ موجودہ زمانے کے بعض بے

پڑھ مفسروں نے یہاں وَاِذْ دیکھ کر کہہ دیا ہے کہ گائے کے ذبح کا واقعہ دوسرا ہے اور یہ قتل جان کا واقعہ، دوسرا۔ اگر ایک واقعہ ہوتا تو یہاں وَاِذْ علیحدہ کیوں فرمایا جاتا یہ لوگ موسیٰ علیہ السلام کے اس معجزے کے منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ گائے کے گوشت سے کوئی مردہ زندہ نہیں ہوا۔ مگر یہ محض غلط اور بیہودہ بکواس ہے واقعہ آگے آرہا ہے فَقُلْنَا اضْرِبُوْهُ بِبَعْضِهَا ہم نے فرمایا کہ مردے کو گائے کا بعض حصہ مارو۔ اگر یہ واقعہ دوسرا ہے تو کسے مارا گیا اور کیا مارا گیا۔ نیز آگے آرہا ہے کہ اللہ تعالیٰ مردے زندہ فرماتا ہے مگر یہاں کوئی مردہ زندہ نہ ہوا تو اس کا مطلب کیا ہوگا رہا یہاں وَاِذْ فرمانا یہ کوئی مضر نہیں ایک واقعہ کے بیان میں کہہ دیا کرتے ہیں کہ وہ بات کرو وہ بھی یاد کرو۔ چونکہ قتل انسانی بڑا جرم ہے اس لئے علیحدہ وَاِذْ فرمایا گیا۔

تفسیر

وَاِذْ قَتَلْتُمْ یہاں بھی وہی فعل پوشیدہ ہے۔ یعنی اے اسرائیلیو وہ واقعہ یاد کرو جب کہ تم نے ایک گناہ کیا تھا یا اے نبی علیہ السلام انہیں وہ واقعہ یاد دلاؤ۔ اگرچہ ایک شخص نے ہی قتل کیا تھا مگر جماعت کی طرف اس کی نسبت کی گئی کیونکہ وہ اس سے راضی تھے یا اس سازش میں شریک یا اس کے حمایتی اور حضور علیہ السلام کے ہم زمانہ اسرائیلیوں سے یہ خطاب اس لئے کیا گیا کہ وہ ان کی اولاد ہیں اور باپ داداؤں کا فعل اولاد کی طرف منسوب ہوتا ہے ہم ہندوؤں سے کہتے ہیں کہ ہم نے تم پر آٹھ سو برس تک حکومت کی نَفْسًا نفس، سانس، دل جان اور ذات وغیرہ کو کہتے ہیں۔ یہاں جان یا ذات مراد ہے اگرچہ قتل جسم پر واقع ہوتا ہے مگر چونکہ اس کا تعلق جان سے بھی ہے کہ وہ اس سے نکل جاتی ہے۔ اس لئے جان کو اس کا مفعول بنایا گیا۔ وہ مقتول عامیل ابن شراجیل تھا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا یہ اصل میں تَدَارَءْتُمْ تھا باب تفاعل سے ت کو ف کر کے اس میں ادغام کر دیا گیا اور اول میں، ہمزہ زیادہ کی گئی اس کی اصل دَرْءٌ ہے جس کے معنی ہیں دفع کرنا یعنی تم میں سے ہر ایک نے یہ الزام اپنے پر سے دفع کیا اور کہا کہ یہ کام میں نے نہیں کیا فلاں نے کیا ہے۔ فِيْهَا کی ضمیر یا تو نفس کی طرف لوٹتی ہے یا قتل کی طرف یعنی اس قتل یا اس نفس کے بارے میں تم نے ایک دوسرے کو الزام لگایا۔ ناحق قتل ایک گناہ تھا پیغمبر کی بارگاہ میں جھوٹ بولنا دوسرا گناہ دوسرے کو تہمت لگانا تیسرا گناہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تم کو موسیٰ علیہ السلام کے دین پر یقین نہ تھا۔ ورنہ ان کے پاس آکر جھوٹ بولنے کی جرات نہ کرتے وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مخرج کے لفظی معنی ہیں نکالنے والا مگر یہاں مراد ہے ظاہر کرنے والا کیونکہ اس میں بھی پوشیدگی سے نکلنا ہوتا ہے۔ اگرچہ خود مقتول نے زندہ ہو کر قاتل کو ظاہر کیا۔ مگر چونکہ یہ سب کچھ حکم الٰہی سے ہوا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کا اس سے تعلق نہ رکھا گیا اور اس عمدہ طریقہ سے ظاہر ہوا کہ کسی کو دم مارنے کی گنجائش نہ رہی اس لئے یہ اظہار خدا کی طرف منسوب ہوا یعنی اگر کوئی بندہ بتا دیتا تو تم چون وچرا کر سکتے تھے۔ یہاں تو اللہ ظاہر فرمانے والا تھا۔ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ تمہارے اس فعل کو جو تم سب مل کر چھپاتے تھے۔ تَكْتُمُوْنَ، كَتْمٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں چھپانا چونکہ ایک جماعت نے سازش کر کے یہ واقعہ چھپایا تھا۔ اس لئے چھپانا سب کی طرف منسوب کیا گیا۔ یعنی تم سب چھپانا چاہتے تھے اور رب ظاہر فرمانا مگر تمہارا چاہا نہ ہوا۔ رب کا چاہا ہوا۔ فَقُلْنَا یہ یا تو فَادّٰرَءْتُمْ پر معطوف ہے یعنی تم نے تدافع کیا تو ہم نے یہ فرمایا۔ یا مُخْرِجٌ کی تفسیر یعنی اللہ نے اس طرح ظاہر فرمایا کہ کہا، اگرچہ بظاہر فرمانے والے موسیٰ علیہ السلام تھے مگر

چونکہ زبان موسیٰ علیہ السلام کی تھی اور کلام رب کا موسیٰ علیہ السلام قائل تھے۔اس لئے اس قول کو رب کی طرف منسوب کیا گیا۔
ہم مرزا غالب کا کوئی شعر پڑھ کر کہتے ہیں کہ یہ مرزا غالب نے کہا ہے۔اِضْرِبُوْهُ فاعل کی ضمیر ساری جماعت اور ضمیر مفعول نفس کی طرف لوٹ رہی ہے۔یعنی تم سب اس نفس کو مارو۔نفس لفظاً مونث اور معناً مذکر ہے۔اس لئے ضمیر مذکر لائی گئی کیونکہ مقتول مردتھا نیز نفس یعنی روح کو مارنا ناممکن ہے۔بدن ہی کو مارا جاسکتا ہے اور بدن مذکر ہے یعنی اس مقتول کے جسم کو مارو اور مس کرو۔خود موسیٰ علیہ السلام نے یہ کام نہ کیا بلکہ ان سے ہی کرایا تاکہ کوئی آپ کو جادو کی تہمت نہ لگادے۔دیکھو حضرت عائشہ صدیقہ کو تہمت لگی تو حضور ﷺ نے خود ان کی صفائی بیان نہ فرمائی بلکہ رب نے ان کی صفائی کے لئے اٹھارہ آیات اتاریں تاکہ حضور علیہ السلام پر طرف داری کا الزام نہ لگے نیز حضرت ام المومنین کا درجہ ورتبہ معلوم ہو کہ حضرت مریم و یوسف کو تہمت لگے تو شیر خوار بچے نے گواہی دی اور محبوب کی محبوبہ کی تہمت لگے تو رب گواہی دے تاکہ قیامت تک قرآن ان کی عصمت کا گواہ ہو اور ہر مسلمان قرآن پڑھتے وقت ان کی پاک دامنی کی گواہی دیا کرے نیز تاکہ مسلمانوں کو تہمت لگانے والے کی سزا اور اس کے احکام معلوم ہوں۔غرضکہ نہ وہاں موسیٰ بے علم تھے نہ یہاں ہمارے حضور ام المومنین کی عصمت سے بے خبر بِبَعْضِهَا ھَا ضمیر بقرہ یعنی گائے کی طرف لوٹتی ہے۔بعض آدھے سے کم کو کہتے ہیں یعنی مقتول کے بدن سے گائے کا کچھ حصہ مس کردو یا تو اس سے مطلق بعض مراد ہے کوئی سا بھی حصہ ہو یا اس کی زبان یا دم وغیرہ چنانچہ ایسا کیا گیا اس گوشت کے مس ہوتے ہی بحکم الٰہی مقتول زندہ ہو گیا۔اس کے حلق سے خون کے فوارے جاری تھے اس نے اپنے چچازاد بھائی کو بتایا کہ اس نے مجھے قتل کیا ہے یہ کہہ کر پھر مر گیا۔بعض روایات میں آیا ہے کہ پھر قاتل نے بھی اقرار کرلیا تب موسیٰ علیہ السلام نے اس پر قصاص کا حکم فرمایا اور اسے میراث سے محروم کردیا۔ كَذٰلِكَ یہاں پوری ایک عبارت پوشیدہ ہے یعنی تم نے گائے ذبح کر کے اس کا گوشت مقتول کو مارا۔جس سے اس نے زندہ ہو کر قاتل کا پتہ دیا تو ہم نے فرمایا کہ اس ہی طرح يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى اللہ قیامت میں مردے زندہ فرمائے گا اگرچہ وہ لوگ قیامت کے قائل تھے مگر اب تک سن کر قائل تھے اب دیکھ بھی لیا جس طرح انصاف کے لئے اس مردہ کو رب نے محض اپنی قدرت سے زندہ فرمادیا اسی طرح عدل وانصاف وحساب وکتاب کے لئے قیامت میں بھی سب کو زندہ فرمائے گا۔ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ آیات آیۃ کی جمع ہے۔جس کے معنی ہیں نشانی اور دلیل یعنی رب تعالیٰ تم کو اپنی قدرت کی نشانیاں اور دلائل دکھاتا اور سمجھاتا ہے چونکہ اس ایک واقعہ نے حق تعالیٰ کے علم اس کی قدرت اس کی خالقیت اور موسیٰ علیہ السلام کی حقانیت اور قاتل کی گرفتاری اور بے قصور لوگوں کے چھٹکارے کو بتادیا تھا اس لئے اس کو آیت یعنی بہت سی نشانیاں فرمایا گیا۔ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ یہ عقل سے بنا ہے جس کے لغوی معنی ہیں روکنا اور اصطلاحی معنی ہیں سمجھنا یہ واقعہ دیکھ کر تم اپنے نفسوں کو برائیوں سے روکو اور رب کی اطاعت کرو۔یا تم قیاس کر کے سمجھ لو کہ جو ایک مردے کو زندہ فرماسکتا ہے وہ تمام کو بھی اگرچہ اس سے پہلے بھی وہ اتنا سمجھتے تھے لیکن اب ان کے فہم میں ترقی ہوگئی۔

خلاصہ تفسیر

یہ اس پہلے قصے کا ایک حصہ ہے جس میں خدا تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ پر ایک معجزہ یعنی مردے کو زندہ کرنا ظاہر فرمایا

یعنی اے اسرائیلیو تم وہ واقعہ بھی یاد کرو جب کہ تم نے آپس میں ایک خون کر کے دوسروں کو تہمت لگادی تھی اور اللہ چاہتا تھا کہ اصل واقعہ کو ظاہر فرمادے جس کو تم چھپارہے تھے لہٰذا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کی معرفت تم کو حکم دیا کہ تم ایک گائے ذبح کرو۔ جب تم نے حیل وحجت کے بعد ذبح کرلی تو ہم نے حکم فرمایا کہ اس گائے کی زبان یا دم یا کوئی اور عضو اس میت پر دھرو تو یہ جی اٹھے گا۔ تم نے ایسا کیا اور اس نے زندہ ہو کر اپنا قاتل بتادیا اور وہ قاتل میراث سے بھی محروم ہوا اور قصاصاً قتل بھی ہوا۔ اس واقعہ کو دیکھ کر یا سن کر سمجھ لو کہ اسی طرح حق تعالیٰ آئندہ بھی مردے زندہ فرمائے گا۔ وہ رب تعالیٰ تم کو اپنی اس قسم کی نشانیاں اس لئے دکھاتا ہے تا کہ تم اس کو قادر مطلق سمجھو اور اس پر ایمان لاؤ یا ایمان پر قائم رہو۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** حق تعالیٰ عالم وقادر ہے کوئی چیز اس کے علم وقدرت سے باہر نہیں اگر چاہے تو خلاف عقل چیزیں ظاہر فرمادے جیسے کہ اس واقعہ میں مردہ گائے کے گوشت سے مردہ زندہ فرمادیا۔

دوسرا فائدہ: عالم غیب سے فیض لینے کے لئے قربانی نیکیاں اور خیرات کرنی چاہئے۔ تا کہ اس کی برکت سے اپنا مقصود حاصل ہو۔ (تفسیر عزیزی) اس لئے بلاؤں کے دفع کرنے اور نعمتوں کے حاصل کرنے کے لئے ختم قرآن نمازیں روزے خیرات محفل میلاد شریف اور نعت کی مجلسیں وغیرہ کرنی چاہئے جیسے اسرائیلیوں سے مصیبت پر قربانی کرائی گئی۔

تیسرا فائدہ: یہ کہ جہاں شریعت نے قید لگائی نہ ہو وہاں اپنی طرف سے قید لگانا برا ہے۔ خود اپنے پر سختی کرنے سے رب کی طرف سے بھی سختی ہوجاتی ہے۔ (تفسیر عزیزی) لہٰذا جن چیزوں کو شریعت نے حرام نہ کیا ہو انہیں اپنی رائے سے حرام نہ کہو اور نہ کسی کام میں اپنی طرف سے قید لگاؤ جیسے محفل میلاد شریف وغیرہ۔ **چوتھا فائدہ:** یتیموں پر مہربانی کرو ان کے مال کو حفاظت اور نافع تجارت کر کے بڑھاؤ کیونکہ رب تعالیٰ بھی ان پر کرم فرماتا ہے جیسے گائے والے یتیم کا واقعہ۔

پانچواں فائدہ: قاتل مقتول کی میراث سے محروم ہوگا جیسے کہ اس واقعہ میں ہوا۔ **مسئلہ:** لیکن اگر عادل نے باغی کو قتل کیا یا حملہ آور سے اپنی جان بچانے کے لئے اس کو دفع کیا۔ اس میں وہ قتل ہوگیا تو قاتل مقتول کی میراث سے محروم نہ ہوگا۔ **چھٹا فائدہ:** جب کوئی بندہ کسی کام پر ہمیشگی کرتا ہے تو خواہ وہ کتنا ہی چھپائے مگر خدا تعالیٰ اس کو ظاہر فرمادیتا ہے۔ ہاں اگر ایک دو بار کسی سے کوئی قصور ہوجائے اور وہ اس پر شرمندہ ہو کر چھپانے کی کوشش کرے تو رب تعالیٰ بھی اسے اپنی رحمت سے چھپادیتا ہے اور اس کی پردہ دری نہیں کرتا۔ ان اسرائیلیوں نے اپنے فعل بد کے چھپانے کی کوشش کی مگر رب نے ظاہر فرما ہی دی۔ تفسیر عزیزی نے اس جگہ روایت نقل فرمائی کہ اگر کوئی شخص سنسان جنگل یا بند تہ خانہ میں بیٹھ کر کوئی کام کر دے تب بھی رب اس کام کو مخلوق پر ظاہر فرمادیتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے صحابہ کرام سے دریافت فرمایا کہ مومن کون ہے انہوں نے عرض کیا کہ خدا اور رسول بہتر جانتا ہے۔ فرمایا مومن وہ ہے کہ حق تعالیٰ اس کے کان اس کی ثناوصفت سے مرنے سے پہلے بھردے (یعنی لوگوں میں اس کے تقویٰ کی خود بخود شہرت ہوجائے) اگر کوئی بندہ ستر دروازوں کو قفل لگا کر نیک یا بد کام کرے تو بھی اس کا عمل لوگوں میں مشہور ہوجاتا ہے۔ بلکہ تجربہ تو یہ ہے کہ متقی کے چہرے کی نورانیت اور بدکار کے چہرے

کی بے رونقی اس کے خفیہ اعمال اور دلی حالت کا پتہ دیتے ہیں۔ بارہا کا مشاہدہ ہے کہ قاتل اور چور بدحواسی اور چہرے کے رنگ اڑ جانے سے پکڑ لئے گئے۔ سبحان اللہ لطف یہ ہے کہ ہم کو نیکیاں چھپانے کا حکم ہے اور رب خود ظاہر فرما دیتا ہے۔

ساتواں فائدہ: قیاس حق ہے اس لئے کہ ایک مردہ زندہ کر کے دکھا کر باقی کو اس پر قیاس کرنے کا حکم فرمایا گیا۔

آٹھواں فائدہ: باغ فدک نہ تو حضور کی میراث بنا نہ فاطمہ زہرا کا حق تھا بلکہ وقف تھا ورنہ حق تعالیٰ ضرور اس کی حفاظت فرما کر حضرت فاطمہ کو دلوا دیتا جیسے اسرائیلی کی گائے جنگل میں محفوظ رکھ کر اس کے بچے کو عطا فرمائی اور پھر اسے بڑی قیمت دلوا دی۔ نیز خضر علیہ السلام کو اتنا کیہ بھیجا کہ فلاں دیوار کے نیچے ایک صالح آدمی کا مال دفن ہے اس کے بچے چھوٹے ہیں دیوار گرنے والی ہے۔ جا کر دیوار بناؤ فرماتے ہیں۔ وَكَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَكَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا (کہف: ۸۲) جب اللہ تعالیٰ ان اسرائیلی صالحین کی میراث برباد ہونے نہیں دیتا تو اس نے سید الانبیاء ﷺ کی میراث کیوں ضائع ہونے دی اور حسن و حسین کے جوان ہونے تک کیوں نہ محفوظ کیا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ میں مخرج اسم فاعل بمعنی ماضی ہے تو چاہئے کہ عمل نہ کرے حالانکہ یہاں ما میں عمل کر رہا ہے (نحوی) **جواب:** یہ اسم فاعل اس وقت تو بمعنی ماضی ہے لیکن اس واقعہ پر بمعنی مستقبل تھا۔ لہٰذا اس کا عمل درست ہوا۔ یہاں اس واقعہ کی نقل ہے۔ **دوسرا اعتراض:** اس واقعہ میں صرف مقتول کے زندہ ہو کر بتا دینے سے قاتل سے قصاص لے لیا قاتل کے اقرار کی کوئی صحیح روایت نہیں ملتی۔ حالانکہ مقدمہ میں ملزم کا اقرار یا دو گواہیاں ضروری ہیں۔

جواب: بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس واقعہ کے بعد قاتل نے اقرار بھی کر لیا تھا۔ اگر ایسا ہو تو پھر کوئی اعتراض نہیں اور اگر یہ نہ ہوا تو پھر مقتول کا قول ہی صدہا گواہیوں سے بڑھ کر ہے کیونکہ مرنے سے پہلے انسان جھوٹ بول سکتا ہے۔ اسی لئے اس کو گواہیوں کی ضرورت ہے مگر مرنے کے بعد نہیں کیونکہ وہ نزع، برزخ، آخرت دیکھ کر آیا ہے۔ اس لئے اب جھوٹ نہیں بول سکتا اب اس کی تصدیق کے لئے گواہیوں کی ضرورت بھی نہیں جو خبر یا گواہی نبی کے معجزے کی بنا پر ہو۔ وہ ایک ہی کی قبول ہے۔ دیکھو یوسف علیہ السلام کی پاک دامنی کا طریقہ صرف ایک شیر خوار بچے نے بتایا جو قبول ہوئی رب فرماتا ہے وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا (یوسف: ۲۶) یہ گواہی دراصل نبی کے معجزے کی ہے۔ جیسے حضور کی گواہی پتھروں لکڑیوں نے دی یہ بھی معجزے کی بلکہ رب کی گواہی تھی۔ **تیسرا اعتراض:** یہ جواب غلط ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے کہ کفار قیامت میں عرض کریں گے۔ وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (انعام: ۲۳) قسم رب کی ہم مشرک نہیں تھے۔ دیکھو برزخ وغیرہ سب کچھ دیکھ کر جھوٹ بول رہے ہیں نیز دوسری جگہ فرماتا ہے اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ (یٰس: ۶۵) جس سے معلوم ہوا کہ کفار اپنی بد کرداریوں کا انکار کریں گے تب ان کے منہ پر مہر لگا کر ان کے ہاتھ پیروں سے گواہی لی جائے گی اس لئے علم کلام والے فرماتے ہیں کہ اگر کسی پیغمبر کی گواہی پتھر یا جانور دیں تو معتبر ہے لیکن اگر مردہ زندہ ہو کر دے تو معتبر نہیں کیونکہ جب مردہ زندہ ہوا اس کو عقل و شعور و خیال و وہم سب دوبارہ حاصل ہو گئے اور یہی خطا اور غلطی کا محل ہیں نیز دجال مردے زندہ کر کے ان سے

اپنی ربوبیت کی گواہی دلوائے گا جیسا کہ روایت میں آیا ہے اگر چہ وہ جنات ہوں گے جو شکل انسانی میں آ کر اس کی گواہی دیں گے مگر احتمال تو پیدا ہو گیا غرضیکہ زندہ مقتول کی گواہی مقبول نہ ہونی چاہئے ممکن ہے کہ وہ اب بھی جھوٹ بول رہا ہو یا کوئی جن اس کے قالب میں داخل ہو کر غلط خبر دے گیا ہو۔ **جواب:** اس کا قوی جواب یہ ہے کہ یہاں حق تعالیٰ نے گائے ذبح کر کے مردے کو زندہ کرایا اور پہلے سے خبر دے دی تھی کہ یہ زندہ ہو کر اپنے قاتل کا پتہ بتائے گا۔ لہٰذا قاتل کی گواہی مقتول نے دی۔ اور مقتول کے سچے ہونے کی گواہی رب نے دی۔ اب رب کی گواہی سے مقتول کا کلام قبول ہوا۔ جیسا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو لوگوں نے تہمت لگائی رب نے ان کی پاکدامنی بیان فرمائی صرف رب کے فرمان پر تہمت لگانے والے کو سزا دی گئی۔ (ماخوذ از تفسیر عزیزی) **چوتھا اعتراض:** اس جگہ گائے کو درمیان میں آڑ کیوں بنایا گیا بلاواسطہ ہی کیوں زندہ نہ فرمادیا گیا۔ **جواب:** اس میں بہت سی حکمتیں ہیں جو ہم پچھلی آیتوں میں تفصیل وار بیان کر چکے۔

تفسیر صوفیانہ

جو شخص اپنے دل کی زندگی چاہتا ہے اس کو چاہئے کہ اپنے نفس کی گائے کو ذبح کر ڈالے جو شخص نفس کو ریاضت سے مارے گا اللہ اس کے قلب کو انوار مشاہدات سے زندہ فرمادے گا۔ جو نفس کو شریعت کے ذریعہ سے مردہ کرے گا اللہ اس کے دل کو حقیقت و معرفت سے زندہ فرمادے گا۔ جیسے اس مقتول نے مردہ گائے سے زندہ ہو کر اپنے قاتل کا پتہ دیا اسی طرح جو اپنے نفس کو صدق کی چھری سے ذبح کرے اور مذبوحہ نفس کی زبان اس قلب پر لگائے جو خدا کے ذکر میں مقتول ہو چکا ہے تو اللہ اس کے قلب کو اپنے نور سے زندہ فرمائے گا۔ اور پھر کسی کا قلب پکارے گا وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ (یوسف: ۵۳) اور کوئی زندہ ہو کر منصور کی طرح انا الحق اور سبحانی ما اعظم شانی کے نعرے لگائے گا کیونکہ زندہ دل رب کے مظہر و منظر ہیں حدیث میں آیا ہے کہ اللہ فقط تمہاری صورتیں نہیں دیکھتا بلکہ قلبوں اور نیتوں کو بھی دیکھتا ہے یہ قلب مظہر الٰہی ہیں اسی لئے ان کا کلام اللہ کا کلام اور ان سے تقرب اللہ سے تقرب ہے مولانا فرماتے ہیں

ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا — او نشیند در حضور اولیاء
گفتہ او گفتہ اللہ بود — گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود
چوں روا باشد انا اللہ از درخت — کے روانہ بود کہ گوید نیک بخت

سری سقطی فرماتے ہیں کہ میرا نفس تیس سال سے گھی کی روٹی اور بادام مانگ رہا ہے مگر میں نے اس کو نہ دیا۔ ایک شخص ہوا میں اڑتا جارہا ہے اس سے پوچھا گیا کہ تو نے یہ درجہ کیسے پایا اس نے جواب دیا وَتَرَكْتُ الْهَوٰى فَسُخِّرَلِيَ الْهَوَاءُ میں نے ہوا یعنی نفس کی خواہش چھوڑ دی تو یہ ہوا میرے تابع ہوگئی۔

دوسری تفسیر صوفیانہ

جسم کی زندگی جان سے ہے اور جان کی زندگی ایمان سے دل کی زندگی محبت رحمٰن ہے جیسے مردہ زندہ ہوا مگر موسیٰ علیہ السلام کے فیض اور گائے کی قربانی سے یوں ہی اللہ تعالیٰ مردہ دلوں اور مردہ جانوروں کو کسی کی نظر کرم اور کچھ قربانی سے زندہ کیا

کرے گا جو چاہے کہ بغیر وسیلہ نبی یا ولی زندہ کرے وہ نہ کر سکے گا۔ نبی کے بغیر وسیلہ قربانی بیکار ہے جیسے اس بنی اسرائیلی کے مردہ ہونے کی صورت میں جھگڑا رہا۔ اس کے زندہ ہوتے ہی تمام جھگڑے جاتے رہے یونہی مردہ دل تمام جھگڑوں کی جڑ ہے۔ دل کی زندگی پر سب جھگڑے ختم ہو جاتے ہیں۔ اللہ دل کی زندگی نصیب کرے۔ آمین۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ
پھر سخت ہو گئے دل تمہارے پیچھے سے اس کے پس وہ مثل پتھروں کے ہیں بلکہ زیادہ
پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے تو وہ پتھروں کی مثل ہیں بلکہ ان سے بھی
قَسْوَةً ؕ وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَ اِنَّ
سخت اور تحقیق پتھروں میں سے البتہ وہ ہیں کہ بہتی ہیں ان میں سے نہریں اور تحقیق
زیادہ کرے اور پتھروں میں تو کچھ وہ ہیں کہ جن سے ندیاں بہہ نکلتی ہیں اور کچھ
مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ
ان میں سے البتہ وہ ہیں جو پھٹ جاتے پس نکلتا ہے اس سے پانی اور تحقیق ان میں سے البتہ وہ ہیں
وہ ہیں جو پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی نکلتا ہے اور کچھ وہ ہیں جو
مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۴﴾
جو گر جاتے ہیں ڈر سے اللہ کے اور نہیں ہیں اللہ بے خبر اس سے جو کرتے ہو تم
اللہ کے ڈر سے گر پڑتے ہیں اور اللہ تمہارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** گزشتہ واقعات سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل پہلے کبھی گناہ کرتے تھے کبھی توبہ کبھی عہد شکنی کبھی پیغمبر کی اطاعت کرتے تھے کبھی ان کی مخالفت جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کے دلوں میں قدرے نرمی اور نصیحت قبول کرنے کی کچھ قابلیت تھی۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ ان واقعات کے بعد ان کے دلوں کی رہی سہی نرمی بھی جاتی رہی وہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہو گئے۔ **دوسرا تعلق:** اس سے پہلے اسرائیلیوں پر پے در پے مصیبتوں اور بلاؤں کے آنے کا ذکر تھا جس سے خیال تھا کہ شائد ان کے دل بہت نرم ہو گئے ہوں گے کیونکہ مصیبتیں دلوں کو نرم کر دیتی ہیں اب اس خیال کو دفع کیا جا رہا ہے کہ نہیں ان کے دل تو ان واقعات سے اور بھی زیادہ سخت ہو گئے۔

تفسیر

ثُمَّ قَسَتْ اس جگہ ثُمَّ تراخی رتبہ کے لئے ہے یعنی اس قدر واقعات کے بعد پھر بھی تمہارے دل سخت ہو گئے۔ قست

قسوۃ اور قساوۃ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں۔ درشتی اور سختی، دل کی سختی یہ ہے کہ اس میں وعظ و نصیحت اثر نہ کرے اس کو مصیبت اور تکلیفوں کی پرواہ نہ ہو۔ حق تعالیٰ کی نشانیاں دیکھ کر بھی اس کی اطاعت نہ کرے۔ قُلُوْبُكُمْ یا تو حضور کے زمانے کے اسرائیلیوں سے خطاب ہے یعنی اتنے واقعات سن کر تمہارے دل اور سخت ہو گئے اور تم نبی آخر الزمان پر ایمان نہیں لاتے یا گزشتہ لوگوں سے یا ان واقعات کو دیکھ کر تمہاری قوم کے دل اور بھی سخت ہو گئے مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ، ذٰلِکَ سے یا تو صرف گائے کے واقعہ کی طرف اشارہ ہے یا سارے واقعات کی طرف یعنی اس گائے کے واقعہ یا گائے اور طور کے اٹھانے اور بندر اور سور بنانے کے واقعات کے بعد بھی تمہارے دل سخت ہو گئے حالانکہ ان واقعات سے پتھر بھی نرم پڑ جاتا ہے۔ تفسیر کبیر نے اس جگہ فرمایا کہ مقتول کے زندہ ہو کر گواہی دینے کے بعد بھی قاتل اور اس کی قوم نے جرم کا انکار کیا اور کہا کہ یہ مقتول جھوٹا ہے اور بڑا فتنہ پھیلانا چاہا۔ خیال رہے کہ تین چیزوں سے دل میں سختی پیدا ہوتی ہے۔ زیادتی عیش۔ دنیا میں زیادہ مشغولیت اسی لئے رب نے دن و رات میں بار بار نمازیں رکھی ہیں تاکہ دنیا میں مشغولیت زیادہ نہ رہے اور اللہ والوں کی عداوت۔ مگر پہلی دو چیزیں برسوں میں سختی پیدا کرتی ہیں مگر یہ تیسری چیز منٹوں سیکنڈوں میں۔ دیکھو شیطان صدیوں کا عابد تھا مگر حضرت آدم علیہ السلام کی اہانت کر کے دو منٹ میں اس کا دل ایسا سخت ہوا کہ وہ سختی آج تک نہ گئی۔ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ یعنی یہ دل سختی میں پتھر کی مثل ہے نہ کہ لوہے اور فولاد کی طرح کیونکہ لوہا، فولاد آگ اور معجزات سے پگھل جاتا ہے جیسے داؤد علیہ السلام کے لئے ہوا اور اس سے کارآمد چیزیں بنائی جاتی ہیں لیکن پتھر نہ آگ سے پگھلے اور نہ پگھل کر کارآمد چیز بنے۔ اسی طرح تمہارے دل خوف اور ہیبت کی آگ سے بھی نرم نہیں ہوتے۔ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً۔ اَوْ یا بمعنی واؤ ہے جیسے اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اٰبَآئِهِنَّ (النور: ۳۱) میں یا بمعنی بل یا اباحت کے لئے ہے یا اختیار کے لئے یا تردید کے لئے (تفسیر کبیر) یعنی پتھر سے بھی زیادہ سخت ہے یا سننے والے تجھے اختیار ہے کہ ان کے دلوں کو پتھر کہے یا اس سے بھی زیادہ سخت اگرچہ قَسْوَةً کی تفضیل اَقْسٰی بھی آسکتی ہے لیکن اَشَدُّ قَسْوَةً کہنے میں زیادہ سختی بیان ہوئی کیونکہ اس نے صورت اور مادہ دونوں کے ساتھ زیادتی بتائی۔

نیز اقسی کہنے میں یہ نہ معلوم ہوتا کہ کیفیت میں زیادہ سخت ہیں یا مقدار میں اَشَدُّ قَسْوَةً کہنے سے زیادتی کیفیت معلوم ہو گئی کیونکہ اسم تفضیل کی زیادتی مبہم ہوتی ہے اور اَشَدُّ یا اَقْوٰی میں زیادتی کیفیت اور اکثر و ازید میں زیادتی مقدار معلوم ہوتی ہے وَ اِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ یہ گویا ان کے دلوں کے پتھر سے زیادہ سخت ہونے کا بیان ہے یعنی پتھر بھی بعض وقت خوف الٰہی سے متاثر ہو جاتے ہیں مگر تمہارے دل کبھی اثر نہیں لیتے اس لئے کہ بعضے پتھر ایسے ہیں کہ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ کہ ان سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں۔ يَتَفَجَّرُ، فَجْرٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں خوب کھل جانا اور ظاہر ہو جانا اسی لئے صبح صادق کو فجر اور علانیہ گناہ کرنے والے کو فجور کہتے ہیں کیونکہ یہ بھی خوب ظاہر ہوتے ہیں۔ انہار نہر کی جمع ہے جس کے لغوی معنی ہیں کھودنا۔ اصطلاح میں اس وسیع غار کو نہر کہتے ہیں جس میں پانی بہتا ہو یعنی بعض پتھر وہ ہیں جو خوب پھٹ جاتے ہیں اور ان کے شگافوں میں سے بہت پانی نکلتا ہے جس سے نہریں اور دریا جاری ہو جاتے ہیں اور ان سے لوگ نفع حاصل کرتے ہیں۔ خیال رہے کہ یا تو اس پتھر سے موسیٰ علیہ السلام کا وہ پتھر مراد ہے جس میں عصا کی برکت سے بارہ چشمے جاری ہوئے تھے۔ یعنی عصاء موسوی سے

پتھر سے پانی کے چشمے جاری ہو گئے۔ مگر تمہارے دلوں سے ایمان وحکمت کے چشمے جاری نہ ہوئے اور یا وہ عام پہاڑی پتھر مراد ہیں جن سے گنگا جمنا وغیرہ دریا اور نہریں جاری ہیں۔ فلاسفر کہتے ہیں کہ پہاڑ کے اجزاء دھواں بن جاتے ہیں اور اردگرد کی ہوا کو اپنی طرف کھینچ کر پانی بنا دیتے ہیں۔ جس سے دریا اور نہریں جاری ہو جاتی ہیں اور کبھی زمین کے اندر بخارات جمع ہو کر ٹھنڈک پا کر پانی بنتے ہیں اور زور مار کر پہاڑ کو جگہ جگہ سے پھاڑ کر نکل جاتے ہیں جس سے کہ بڑے جھیل و تالاب بن جاتے ہیں (تفسیر کبیر وعزیزی) وَاِنَّ مِنۡهَا لَبَعض پتھر تو وہ تھے جن سے نہریں اور دریا جاری ہوئے اور بعض وہ ہیں کہ لَمَا يَشَّقَّقُ جو کہ پانی کے زور سے پھٹ جاتے ہیں۔ فَيَخۡرُجُ مِنۡهُ الۡمَآءُ اور ان میں سے رس رس کر تھوڑا پانی نکلتا ہے۔ جس سے نہریں تو جاری نہیں ہوتیں ہاں پانی کے چشمے بن جاتے ہیں یعنی بعض پتھروں سے دریا اور نہریں نکلتی ہیں اور بعض سے چشمے ان دو صورتوں میں یہ فرق ہوا کہ پہلی صورت میں پتھر میں جگہ جگہ چوڑے شگاف پیدا ہو جاتے ہیں اور ان سے بہت پانی نکلتا ہے اور دوسری صورت میں کسی قدر ان سے کم چوڑے شگاف پیدا ہوتے ہیں جس سے پانی ٹپک ٹپک کر نکلتا ہے يَشَّقَّقُ باب تفعل سے ہے اصل میں يَتَشَقَّقُ تھا۔ ت کوش کر کے اس میں ادغام کر دیا گیا یہ شقق سے بنا ہے جس کے معنی ہیں پھٹ جانا اور چر جانا۔ اسی لئے مخالفت کو شقاق کہتے ہیں کہ اس سے ایک جماعت پھٹ کر دو جماعتیں بن جاتی ہیں۔ وَاِنَّ مِنۡهَا لَبَعض پتھر تو وہ تھے جن سے مخلوق نے کم وبیش فائدہ حاصل کیا لیکن بعض وہ پتھر بھی ہیں کہ مخلوق کو پانی سے نفع تو نہیں پہنچاتے مگر خود لَمَا يَهۡبِطُ مِنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ خدا کے خوف کی وجہ سے پہاڑ کی چوٹی سے نیچے گر جاتے ہیں۔ یعنی رب کا حکم پاتے ہی اس کی اطاعت کرتے ہیں اور حرکت میں آ جاتے ہیں مگر ان منکرین کے دل نہ تو نرم پڑتے ہیں اور نہ رب کی اطاعت کرتے ہیں باوجودیکہ پتھر بظاہر بے حس اور بے شعور ہیں۔ یہ کفار بھی شعور و عقل وفہم سب کچھ رکھتے ہیں لیکن ان کو غلط استعمال کر کے رب کی مخالفت کرتے ہیں خیال رہے وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ اللہ تمہارے ظاہری اور باطنی اعمال سے بے خبر نہیں۔ اس کے علم سے تم دھوکہ نہ کھاؤ۔ عذاب میں دیر تمہارے لئے خطرناک ہے ظاہر یہ ہے کہ مِنۡ خَشۡيَةِ اللّٰهِ کا تعلق گزشتہ تینوں مضمونوں سے ہے۔ یعنی اللہ کے خوف سے پتھروں سے پانی بہہ کر نہریں بنتا ہے۔ چشمے بنتے ہیں اور گر جاتے ہیں لہٰذا اگر کسی انسان کو اللہ کے ذکر پر روتے آنسو بہاتے یا وجد کرتے دیکھو تو ان پر اعتراض نہ کرو کہ یہ کیفیات پتھروں میں بھی آ جاتی ہیں۔ خیال رہے کہ جیسے پتھروں کے ان آنسوؤں سے زمانہ فیض پاتا ہے کہ یہ پانی پی کر دنیا گزارا کرتی ہے ایسے ہی اللہ والوں کے عشقیہ آنسوؤں اور ان کے وجدانی حالات سے زمانہ فیض پاتا ہے اور پاتا رہے گا۔ جس جنگل میں اللہ والا رب رب کرے وہ جنگل تا قیامت فیض کا چشمہ بن جاتا ہے بلکہ دردوالوں کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ کے وظیفے پڑھے جاتے ہیں اور لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک مچھلی کے منہ سے نکلتے ہوئے سانس عنبر بن جاتے ہیں تو اللہ والوں کے منہ سے نکلتے ہوئے الفاظ روحانی عنبر ہیں۔

خلاصہ تفسیر

حق تعالیٰ موجودہ یا گذشتہ بنی اسرائیل کو فرما رہا ہے کہ ان واقعات اور عجائبات قدرت دیکھنے کے بعد تمہارے دل اور بھی سخت ہو گئے اور گناہ کرتے کرتے ان میں پتھروں کی سی سختی آ گئی کہ جن میں نہ آگ اثر کرے اور نہ میخ وغیرہ گڑے اسی طرح

تمہارے دلوں میں نہ تو خوف الٰہی نرمی پیدا کرتا ہے اور نہ انبیاء کرام کی نصیحت و وعظ اثر کرتی ہے۔ بلکہ تمہارے دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہیں کیونکہ ان سے تو کچھ فائدے بھی ہیں کہ وہ بخارات وغیرہ کا اثر قبول کرتے ہیں بعض سے تو پانی کے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں جن سے ایک مخلوق فیض پاتی ہے اور بعض سے پانی رس کر اور جھر کر نکلتا ہے جس سے چشمے اور تالاب بن جاتے ہیں اور ان سے بھی لوگ کچھ نہ کچھ فائدہ حاصل کر لیتے ہیں اور بعض پتھر کی چوٹی سے زمین پر گر جاتے ہیں گویا کہ ہیبت الٰہی سے کانپ کر اس کو سجدہ کرتے ہیں مگر تمہارے دلوں کی سختی کا یہ حال ہے کہ تم نبی آخر الزماں کے وعظ پر قہقہہ اڑاتے ہو اس میں نبی کے فیض کا قصور نہیں بلکہ تمہارے دلوں کا فتور ہے سبحان اللہ پتھروں کے بیان میں کیسی نفیس ترتیب ہے کہ سب سے پہلے اعلیٰ فیض رساں پتھروں کا ذکر ہوا۔ پھر اس سے کم کا اور پھر اس پتھر کا جو با فیض تو نہیں مگر خود ہیبت سے کانپتا ہے منشا یہ ہے کہ اے اسرائیلیو تم کو نرمی قلب کے چار اسباب میسر تھے تو تم نے مصیبتیں بہت جھیلیں سخت توبہ و عبادات بھی کیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی صحبت میں رہے اور ان کی نگاہ کرم کے موقعہ پر موجود تھے پھر بھی تمہارے دل سخت رہے نرم نہیں ہوئے۔ اگر اب تمہیں اس نبی آخر الزمان سے فیض نہ ملے تو اس میں تمہارے دلوں کا قصور ہے نہ کہ صحبت کے فیض میں کمی۔

دوسری تفسیر

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان تینوں قسم کے پتھروں سے کفار کے دل مراد ہوں کیونکہ جس طرح مسلمانوں کے دلوں کی صفائی مختلف ہوتی ہے اسی طرح قلوب کفار کی سختی بھی یعنی اے علماء یہود تمہارے دل عام کفار کے دلوں کی طرح یا ان سے بھی زیادہ سخت ہیں چنانچہ تفسیر عزیزی نے اس جگہ فرمایا کہ کفار کے دل چند طرح ہیں۔ بعض وہ ہیں کہ کدورت و نفسانی خواہشیں اور نیک لذتیں چھوڑ دیتے ہیں جس سے ان پر کسی قدر روحانیت غالب آ جاتی ہے اور ان سے کچھ عجیب باتیں ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ جس کو استدراج کہا جاتا ہے جیسا کہ اکثر تارک الدنیا پنڈتوں اور پادریوں میں دیکھا گیا ہے اور بعض وہ کفار ہیں کہ جن کے دلوں پر علوم غیبیہ کا دروازہ کھل جاتا ہے اور ان کے دل بشریت کے پردہ کو پھاڑ کر عالم ارواح عالم ملکوت میں گھر جاتے ہیں جس سے کہ وہ اس عالم کی چیزیں معلوم کر لیتے ہیں جنہیں حکماء اشراقین کہا جاتا ہے اور بعض کفار وہ ہیں جن کے دلوں میں پورا خدا کا خوف ہے اور دوسری ارواح سے فیض لے لیتے ہیں اس لئے ہر مذہب کے فاسق ان صفات سے محروم رہتے ہیں اور ہر مذہب کے عابد ان صفات کو پا لیتے ہیں غرضکہ کشف اور عجیب باتوں کا ظہور مسلمانوں کے لئے ہی خاص نہیں بارہا کفار کو بھی حاصل ہو جاتا ہے البتہ مسلمانوں اور ان کفار میں فرق یہ ہے کہ مسلمان اس مرتبہ پر پہنچ کر مقبول بارگاہ ہو جاتا ہے اور ترقی کرتا ہے اور کافر کو یہ مقبولیت اور رضا حاصل نہیں ہوتی ہے کسی نے خوب کہا ہے

صفا با خبث باطن نیز گاہے جمع میگردد   برو بالوعہ راچو دود بنشیند تماشہ کن!

(تفسیر عزیزی و روح البیان) لہٰذا پہلے قسم کے کافر نہر والے پتھر کی طرح ہیں۔ دوسرے قسم کے کفار چشمہ والے پتھر کی مانند تیسری قسم کے بیدین ہیبت سے گرنے والے پتھر کی مثل اے علماء یہود تم ان کفار سے بھی گئے گذرے ہوئے ہو اس تفسیر میں مشبہ اور مشبہ بہ ایک ہی جنس کے ہوں گے۔ یعنی دلوں کو دلوں سے تشبیہ ہو گئی۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** پتھروں میں احساس اور شعور ہے اگر چہ ہم کو محسوس نہ ہو۔ اسی لئے قرآن کریم نے فرمایا کہ ہر چیز اللہ کی تسبیح کرتی ہے مگر تم نہیں سمجھتے بلکہ ایک جگہ ارشاد ہوا کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَهٗ وَ تَسْبِیْحَهٗ (النور: ۴۱) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر جانور وغیرہ اپنی نماز بھی ادا کرتے ہیں بلکہ بعض اللہ والے کا کلام سن بھی لیتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کے فراق میں لکڑی روئی۔ جس کو صحابہ کرام نے بھی سنا۔ ابو جہل کے ہاتھ میں کنکروں نے کلمہ پڑھا جو کہ اس نے بھی سنا۔ بکری کے زہر آلودہ گوشت نے حضور کو زہر کی اطلاع دی حضور کے بلانے پر دو درخت چلے آئے۔ حضور علیہ السلام کو پتھروں نے سلام کیا۔ ثَبیر پہاڑ نے ایک دفعہ حضور سے عرض کیا کہ یا حبیب اللہ آپ کو کفار ڈھونڈ رہے ہیں اس لئے آپ میری پشت سے نیچے اتر آئیں تاکہ آپ کو پکڑ نہ سکیں۔ مسلم و بخاری میں ہے کہ حضور نے احد کے بارے میں فرمایا کہ یہ ہم سے محبت کرتا ہے۔ ہم اس سے محبت کرتے ہیں بلکہ قرآن کریم فرما رہا ہے کہ قیامت کے دن کفار کی کھالیں اور ہاتھ پاؤں بولیں گے۔ حضرت شیخ شیر اسکواری فرماتے ہیں کہ میں جاری پانی سے یَادَائِمُ یَادَائِمُ کا ذکر سنتا ہوں مولانا فرماتے ہیں ؎

نطق آب و نطق خاک و نطق گل   ہست محسوس از حواس اہل دل

فلسفی گو منکر حنانہ است   از حواس اولیا بیگانہ است

دوسرا فائدہ: انسانوں کی طرح پتھر اور جانور بھی مختلف درجے رکھتے ہیں۔ اگر چہ ہر مخلوق تسبیح پڑھتی ہے مگر سبزہ کی تسبیح سے عذاب قبر میں کمی ہوتی ہے نہ کہ پتھر کی تسبیح سے جیسے کہ مسلمان کا قرآن پڑھنا باعث ثواب ہے نہ کہ کافر کا **تیسرا فائدہ:** مسلمانوں کی طرح کفار کے بھی مختلف درجے ہوتے ہیں۔ اس لئے جہنم کے درجے مختلف ہیں۔ ابولہب امیہ ابن خلف اور ابو طالب ایک درجہ کے کافر نہیں۔ **چوتھا فائدہ:** جو شخص اللہ کی اطاعت نہ کرے وہ جانور تو کیا پتھر سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ ؎

آدمی آمد برائے بندگی   زندگی بے بندگی شرمندگی

پانچواں فائدہ: انسانی دل اگر درست رہے تو فرشتوں سے افضل ہے اور اگر بگڑ جائے تو پتھروں سے بدتر۔ اسی واسطے کہتے ہیں کہ زبان اگر درست رہے تو زباں ہے اگر زیادہ چلے تو زیاں یعنی نقصان اور اگر ٹیڑھی ہو جائے تو زبون یعنی فساد۔ **چھٹا فائدہ:** دل کی نرمی اللہ کی بڑی نعمت ہے جو تمام نعمتوں کے حصول کا ذریعہ ہے زمین کو ہل سے نرم کر کے بیج بوتے ہیں پانی سے نرم کر کے برتن بناتے ہیں جس سے وہ محبوب کے پینے کے لائق ہوتا ہے ایسے ہی انسانی دل اگر نرم ہو تو اس میں ایمان و عرفان کے باغ لگیں گے۔ **ساتواں فائدہ:** جیسے مٹی لوہے وغیرہ کو نرم کرنے کی مختلف صورتیں کبھی ہل کر کبھی پانی کبھی آگ سے نرم ہوتے ہیں یوں ہی نرمی دل کبھی مصیبتوں سے کبھی بزرگوں کی صحبت سے کبھی ان کی نگاہ سے نصیب ہوتی ہے۔ بنی اسرائیل کو یہ چاروں چیزیں دی گئیں مگر نرمی دل نصیب نہ ہوئی رب کا فضل شامل حال نہ تھا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس تفسیر سے معلوم ہوا کہ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَۃً میں اَوْ اختیار کے لئے بھی ہوسکتا ہے۔ حالانکہ اختیار انشاء میں ہوتا ہے نہ کہ خبر میں اور اس آیت میں خبر ہے۔ **جواب:** ہر خبر کے ضمن میں انشاء اور ہر انشاء کے ضمن میں خبر ہوتی ہے بعض جگہ اس ضمنی چیز کا لحاظ کر لیا جاتا ہے (تفسیر عزیزی) یہ قاعدہ خوب خیال میں رکھو بہت فائدہ مند ہے بعض جگہ خبریں منسوخ ہو جاتی ہیں۔ اس ضمنی انشاء کی وجہ سے جیسے وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ (انعام:۵۰) **دوسرا اعتراض:** کفار کی سنگدلی بیان کرنے کے لئے صرف پتھر کا ذکر کافی تھا اس قدر پتھر کیوں بیان کئے گئے؟ **جواب:** اس لئے کہ اللہ والوں کے دل چار درجوں کے ہیں ایک وہ دل جو بحر توحید میں ڈوبا ہوا اور اس سے معرفت کی نہریں جاری ہوں جیسے صوفیائے کرام کے دل دوسرا وہ جو علم ظاہری کے سمندر سے سیراب ہو اور خلقت اس سے نفع اٹھائے جیسے علمائے کاملین کا دل تیسرے وہ دل جو رب کی فرمانبرداری میں مشغول رہے اور اس کے خوف سے بھرپور ہو جیسے زاہدوں اور عابدوں کا دل اور کفار کے دل سرکشی اور غرور کی وجہ سے بے خوف ہیں نہ فیض علمی قبول کریں نہ کوئی اور اثر۔

تفسیر صوفیانہ

ہر دل میں فطری طور پر خوف الٰہی اور شفقت خلق کے پانی موجود ہیں گناہ اور بے دینوں کی صحبت اس کو خشک کرنے والی دھوپ ہے جب انسان گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے تو رفتہ رفتہ یہ دونوں پانی خشک ہو جاتے ہیں جس سے کہ اس کا دل خشک کنکر یا پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے۔ سختی قلب کی تین علامتیں ہیں۔ آنکھ کا خشک ہونا یعنی آنسو نہ نکلنا دینوی امیدوں کی زیادتی اور حرص زیادہ بولنا اور زیادہ ہنسنا قلب کو سخت کر دیتا ہے۔ خوف الٰہی میں آنسو اور زیادہ ذکر اللہ دل کو نرم کرنے والی چیزیں ہیں۔ صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ اگر رحمت الٰہی امداد نہ کرے تو آیتیں اور نشانیاں دل کی سختی بڑھاتی ہیں جیسے کہ ان یہود نے انبیاء کے معجزے دیکھے مگر ان میں زیادہ سختی پیدا ہوئی۔ ہدایت فضل رحمان سے ملتی ہے نہ کہ دلائل و برہان سے سخت قلب میں قرآن اور وعظ الٹا اثر کرتا ہے جیسے کہ بیمار کو مقوی دوائیں زیادہ بیمار کرتی ہیں۔

اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ وَ قَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ
کیا پس طمع رکھتے ہو تم اس کی کہ ایمان لائیں وہ واسطے تمہارے حالانکہ تحقیق تھا ایک گروہ ان میں
تو اے مسلمانو کیا تمہیں یہ طمع ہے کہ یہ یہودی تمہارا یقین لائیں گے اور ان ہی کا ایک گروہ وہ
يَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ
سے سنتے تھے وہ کلام اللہ کا پھر بدلتے تھے وہ اس کو پیچھے سے اس کے کہ سمجھتے تھے
تھا کہ اللہ کا کلام سنتے پھر سمجھنے کے بعد اسے
وَ هُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾

وہ اس کو حالانکہ وہ جانتے تھے
دانستہ بدل دیتے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** اس سے پہلے گذشتہ یہودیوں کی سرکشی اور نافرمانی کا ذکر کیا گیا تھا۔ اب موجودہ یہودیوں کی حالت کا ذکر ہے۔ **دوسرا تعلق:** اس سے پہلے اسرائیلیوں سے خطاب تھا اور ان کو اسلام لانے کی رغبت دی گئی تھی اب مسلمانوں کو خطاب کر کے فرمایا گیا کہ یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے فقط حجت ختم کرنے کے لئے ان کو دلائل سنا دیئے گئے۔ **تیسرا تعلق:** اس سے پہلے بتایا گیا کہ اسرائیلیوں نے پیغمبروں کے اعلیٰ معجزات دیکھ کر بھی سرکشی کی اب فرمایا جارہا ہے کہ اے مسلمانو! ایسی قوم کیا صرف تمہارے دلائل سن کر ایمان لے آئے گی۔ تم ان کی مخالفت پر رنج و غم نہ کرو کیونکہ یہ ان حرکتوں کے عادی ہیں۔

تفسیر

اَفَتَطْمَعُوْنَ یہ استفہام تعجب کا ہے یا روکنے کا جیسے اپنے بچہ سے کہا جاوے کہ کیا اب تو ایسا کرے گا۔ یعنی نہ کرنا تا قیامت مسلمان کافر سے وفا کی امید نہ رکھیں ورنہ دھوکا کھائیں گے۔ اور خطاب صحابہ کرام سے ہے۔ اور ہوسکتا ہے کہ نبی ﷺ سے بھی ہو اس لئے کہ حضور تبلیغ میں بہت کوشش فرماتے تھے اور یہود کے انکار سے آپ کو رنج و غم ہوتا تھا۔ رب تعالیٰ نے ان کی گذشتہ سرکشیاں سنا کر اپنے محبوب علیہ السلام اور مسلمانوں کو تسکین دی کہ کیا تم اب بھی ان کی سرکشی پر رنج و افسوس کرو گے خیال رہے کہ دنیاوی طمع بری ہے لیکن دینی طمع مبارک اور محمود۔ اس جگہ طمع سے نہیں روکا گیا بلکہ رنج و غم سے جو طمع کی وجہ سے تھا۔ حرص وہوس طمع لالچ مختلف امیدوں کے نام ہیں اور قناعت صبر وغیرہ مختلف ناامیدیوں کے القاب۔ اللہ سے رسول سے طمع، لالچ، ہوس، حرص محمود ہے رب نے حضور کی تعریف فرمائی۔ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ (التوبہ:۱۲۸) ایک ہے طمع رحمانی ایک ہے طمع شیطانی یونہی ایک ہے حرص نفسانی ایک ہے حرص ایمانی۔ صحابہ کو یہ طمع رحمانی ایمانی تھی۔ انہیں یہ تو فرمادیا کہ کفار سے دھوکہ نہ کھانا مگر اس طمع پر عتاب نہ فرمایا۔ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ اس سے وہ یہودی مراد ہیں جن کا کافر رہنا اور ایمان قبول نہ کرنا اللہ کے علم میں آچکا تھا کیونکہ بہت سے یہودی ایمان لے بھی آئے تھے۔ ایمان کے معنی یقین کرنا ہے اور اصطلاحی معنی ہیں دینی باتوں کی تصدیق کرنا اس جگہ اگر لغوی معنی مراد ہوں تو لَكُمْ صلہ کا ہوگا یعنی جب انہوں نے انبیاء کرام کے اعلیٰ معجزات دیکھ کر ان کا یقین نہ کیا تو کیا تمہارا یقین کرلیں گے اور اگر اصطلاحی معنے مراد ہوں تو یہ لام تعلیلیہ ہے یعنی کیا تم کو طمع ہے کہ تمہاری تبلیغ تمہارے دلائل کی وجہ سے یہ ایمان لے آئیں گے۔ وَقَدْ كَانَ واؤ حالیہ ہے عاطفہ۔ كَانَ یا بمعنی تھا، ہے یا بمعنے ہے، یعنی ان میں ایک گروہ ایسا تھا یا ایسا ہے فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ فریق ربط اور جماعت کے معنی میں ہے یہ فرق سے بنا ہے جس کے معنی ہیں جدا ہونا۔ فریق علیحدہ اور جدا جماعت ہے یا تو خود ان کی یا ان کے بزرگوں کی یا تو اس جماعت سے وہ ستر آدمی مراد ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہ طور پر گئے تھے اور رب کا کلام سن کر آئے۔ اور ان میں سے بعض نے قوم سے کہہ دیا کہ

رب نے ان تمام احکام کے کرنے اور نہ کرنے کا تم کو اختیار دیا ہے اور یا دوسرے علماء یہود مراد ہیں۔ جنہوں نے توریت میں سے رجم وغیرہ کی آیتیں کاٹ ڈالیں یا حضور کے زمانہ کے وہ علماء یہود مراد ہیں جنہوں نے توریت میں نبی آخر الزمان کے صفات بدل ڈالے یَسْمَعُوْنَ كَلٰمَ اللّٰهِ اس سے یا تو طور پر کلام الٰہی بلا واسطہ سننا مراد ہے اور یا توریت کے احکام موسیٰ علیہ السلام سے بلا واسطہ یا بالواسطہ سننا ثُمَّ يُحَرِّفُوْنَهٗ یہ تحریف سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ہٹا دینا اور مائل کر دینا۔ اس کا مادہ حرف ہے جس کے معنی ہیں علیحدہ ہونا۔ کنارے اور شک اور حرف کو بھی اس لئے حرف کہتے ہیں کہ وہ اصل میں علیحدہ ہوتا ہے اسی سے انحراف اور محرف بنا۔ تحریف کی چند صورتیں ہیں لفظ کا بدل ڈالنا معنی بدل ڈالنا۔ عبارت کا وہ مطلب بنانا جو اجماع امت کے خلاف ہو کلام الٰہی کی تحریف کفر ہے جو شخص عبارت قرآن دیدہ و دانستہ بدلے وہ کافر ہے یہود توریت شریف میں ہر قسم کی تحریف کرتے تھے نبی آخر الزمان کے صفات میں لفظ ابیض تھا اسے کاٹ کر آدم بنا دیا تھا اس کی جگہ طوال لکھ دیا اور حضور کے فضائل اور معجزات بدل ڈالے احکام کی آیتیں مٹا کر اپنے خاطر خواہ عبارتیں بنا کر لکھ دیں مثلاً توریت میں تھا کہ زانی کو سنگسار کرو۔ اس جگہ لکھ دیا کہ اس کا منہ کالا کر کے اس کو گدھے پر سوار کرو۔ چونکہ قرآن کریم کی رب تعالیٰ نے حفاظت فرمائی ہے اس لئے بحمدہ تعالیٰ اس میں کسی قسم کی تحریف نہ ہو سکی۔ اگرچہ قادیانیوں اور دیو بندیوں وغیرہ نے تحریف معنوی کی کوشش کی لیکن علماء ربانی نے ان سب کو مٹا دیا۔ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ یعنی شبہ کی وجہ سے تحریف نہ کی اور یہ نہ ہوا کہ لفظ یا معنے کے سننے یا سمجھنے میں ان سے غلطی ہو گئی ہو بلکہ الفاظ خوب سن لئے اس کے معنے خوب سمجھ لئے اور پھر اس کو بدل ڈالا۔ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ اور وہ تحریف کرتے وقت جانتے بھی تھے کہ یہ لفظ توریت کے نہیں ہیں اور یہ معنی خدا تعالیٰ کے مراد نہیں ہیں خلاصہ یہ ہے کہ تحریف کے دو عذر ہو سکتے تھے ایک یہ کہ پہلے ہی سے سننے میں غلطی ہوئی ہوتی۔ دوسرے یہ کہ بعد میں بھول گئے ان کو یہ دونوں عذر نہ تھے۔ مِنْۢ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ میں نہ سمجھنے کا عذر دور کیا گیا اور وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ میں یاد نہ رہنے کا یعنی انہوں نے توریت کے سننے کے وقت صحیح سنا تھا اور تحریف کرتے وقت اصل توریت یاد تھی یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ وہ جانتے تھے کہ تحریف میں بڑا عذاب ہے۔

خلاصہ تفسیر

خدا تعالیٰ مسلمانوں کو تسلی دیتے ہوئے ارشاد فرماتا ہے کہ کیا تم یہودیوں سے امید رکھتے ہو کہ تمہاری تبلیغ سے دین اسلام قبول کریں گے۔ ان سے یہ امید نہ رکھو کیونکہ یہ سرکش قوم ہے اس میں بعض لوگ ایسے بھی تھے یا ہیں جو کلام الٰہی سن کر اور خوب سمجھ کر پھر اپنی خواہش نفسانی سے بدل ڈالتے تھے اور اے مسلمانو اب تو ان کو تم سے اور تمہارے پیغمبر سے حسد و بغض بھی ہے۔ کیونکہ انہیں تمہاری وجہ سے اپنی ریاست جانے کا اندیشہ ہے۔ جب کہ نبی آخر الزمان تشریف بھی نہ لائے تھے اور انہیں ان سے کوئی خطرہ بھی نہ تھا جب ہی یہ ان کے صفات احوال بدل چکے تھے اور یہ جانتے بھی تھے کہ یہ سخت گناہ ہے تو اب جب کہ انہیں تم سے خطرہ بھی پیدا ہو چکا یہ تمہاری بات کیسے مان لیں گے۔ جس کلام کو یہ حق سمجھتے تھے اور جس نبی پر یہ ایمان لا چکے تھے جب اس پر انہوں نے یہ کارروائی کر لی تو قرآن اور صاحب قرآن کو تو یہ مانتے بھی نہیں۔ اگر اس کی مخالفت کریں تو تم

کیوں رنج کرتے ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ ہی میں توریت کو سن کر سمجھ کر اس کے خلاف عمل کرنا موسیٰ علیہ السلام کا فرمان جان کر بچھڑے کی پرستش کرنا عملی تحریف تھی۔ غرضیکہ انہوں نے توریت کی لفظی معنوی حکمی عملی ہر قسم کی تحریف کر ڈالی۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ**: ضدی عالم منصف جاہل سے بدر جہا بدتر ہے۔ کیونکہ اس جاہل کے ایمان کی امید ہے مگر اس عالم کے ایمان کی امید نہیں۔ اسی لئے فی زمانہ مناظرے فائدے مند نہیں ہوتے کیونکہ وہاں آبرو اور ضد کا سوال ہوتا ہے۔ **دوسرا فائدہ**: کوئی شخص اپنے علم و معرفت اور یقین بلکہ رب کی ہمکلامی کے باوجود ایمان نہیں پاسکتا۔ جب تک رحمت الٰہی شامل نہ ہو۔ ابلیس نے رب سے کلام بارہا کیا تھا مگر مردود ہو گیا۔ بلکہ عالم انوار دیکھ کر ملائکہ میں رہ کر مومن نہ رہا۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں جب کہ ایمان بعد العیان جاتا رہا تو ایمان بالبرھان کا کیا اعتبار مولانا فرماتے ہیں

جز عنایت کہ کشاید چشم را — جز محبت کہ نشاید چشم را
جہد بے توفیق خود کس رامباد — در جہاں واللہ اعلم بالسداد

بے توفیق والی عبادت کھوٹے روپے کی طرح ہے۔ دیکھنے میں عمدہ مگر بازار میں بے کار

مفلساں گرخوش شونداز زرقلب — لیک آں رسوا شود در دار ضرب

تیسرا فائدہ: دین کو بدلنا اس میں بری بدعتیں ایجاد کرنا بھی اسی وعید میں داخل ہے کیونکہ یہ بھی دین کی معنوی تحریف ہے۔ **چوتھا فائدہ**: تبلیغ احکام ہمیشہ اور ہر شخص کو کرنی چاہئے اور لوگوں کے انکار پر رنج و غم نہ کرنا چاہئے۔ دیکھو رب نے یہود کے ایمان سے مسلمانوں کو مایوس تو کر دیا مگر تبلیغ سے نہ روکا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ بعض یہودیوں نے توریت کی تحریف کی پھر اس سے سب جماعت کے ایمان سے کیوں مایوس کیا گیا۔ نیز گزشتہ یہودیوں نے تحریف کی تھی اس کی بنا پر موجود یہودیوں کے ایمان سے کیوں مایوسی ہوئی۔ **جواب**: اس لئے کہ یہ بعض لوگ ان تحریف کرنے والوں کے اندھے مقلد تھے اور بے دین ضدی عالم اور اس کا اندھا مقلد بے ایمانی میں دونوں برابر ہیں کہ ان کے ایمان کی امید نہیں۔ **دوسرا اعتراض**: ان کی تبلیغ سے کیا فائدہ کیونکہ تبلیغ تو دعوت حق کے لئے ہوتی ہے۔ **جواب**: اگر تبلیغ سے کافر مسلمان ہو جائیں تو مبلغ کو دو ثواب ملتے ہیں اور اگر کوئی مسلمان نہ ہو تو صرف احکام پہنچانے کا ایک ثواب ضرور مل جاتا ہے۔ **تیسرا اعتراض**: اس آیت سے معلوم ہوا کہ جان بوجھ کر تحریف کرنا جرم ہے نہ کہ غلطی سے تو جو شخص غلطی سے بے دین ہو جائے چاہئے کہ وہ گنہگار بھی نہ ہو۔ **جواب**: بیشک اگر حافظ بھول کر آیت غلط پڑھ جائے یا عالم خطاءً معنیٰ میں غلطی کر جائے یا مجتہد اجتہاد میں خطا کرے تو یہ

گنہگار نہیں بشرطیکہ اس پر ضد نہ کریں اور کوئی عالم غلطی سے بے دین نہیں ہوتا بلکہ دیدہ دانستہ ہی بنتا ہے رہے جہلا ان کا ذکر اگلی آیت میں آ رہا ہے۔ **چوتھا اعتراض:** جب کلام الٰہی کے الفاظ کا معنے اور حکم بدلنا تحریف ہے تو چاہئے کہ قرآن کا ترجمہ بھی نہ کیا جائے اس لئے کہ اس میں کلام کے الفاظ بدل جاتے ہیں اور انہیں کو رب کی طرف نسبت دی جاتی ہے۔ مثلاً کوئی کہتا ہے کہ خدا نے فرمایا کہ نماز پڑھو حالانکہ یہ عبارت خدا کی نہیں۔ **جواب:** یہ تحریف نہیں بلکہ تعبیر ہے تاکہ عربی نہ جاننے والے قرآن کا مطلب سمجھ جائیں اس میں ضروری ہے کہ مضمون نہ بگڑے یہ کوئی بھی نہیں کہتا کہ یہ الفاظ خدا کے ہیں۔ تبدیلی الفاظ قرآن پاک میں بھی ہے۔ فرمایا ہے۔ وَاِنَّهٗ لَفِیْ زُبُرِ الْاَوَّلِیْنَ (شعراء:۱۹۶) یہ قرآن اگلوں کے صحیفوں میں تھا حالانکہ وہ صحیفے زبان عبرانی میں تھے اور قرآن عربی میں ہے۔

تفسیر صوفیانہ

روحانی ترقی کا مدار انا کو فنا کرنے پر ہے جس سے غنا نصیب ہو۔ ان بدنصیب یہودیوں کو انا کی بیماری تھی جس کی وجہ سے وہ توریت کی تبدیلی میں بھی جرات کرنے سے نہ ڈرتے تھے اور اپنی انا کے فنا کے خوف سے حضور کے اوصاف کریمہ کو توریت سے نکالنے پر تلے ہوئے تھے اس انا نے ابلیس کا بیڑا غرق کیا اسی انا نے فرعون سے دعویٰ خدائی کرایا کہ ابلیس نے کہا اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ (ص:۷۶) اور فرعون بولا اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی (النازعات:۲۴) انا وہ آگ ہے جو ایک دم میں ایمان و عرفان کے باغ کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔ اسی کو فنا کر دینے کا نام ولایت ہے۔ شعر

خود کو ایسا مٹا کہ تو نہ رہے　　تجھ میں اپنی خودی کی بو نہ رہے

وَ اِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْۤا اٰمَنَّا ۚۖ وَ اِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ اِلٰی بَعْضٍ
اور جب ملیں وہ ان سے جو ایمان لائے تو کہیں ایمان لائے ہم اور جب تنہا ہو بعض ان کا طرف
اور جب مسلمانوں سے ملیں تو کہیں ہم ایمان لائے اور جب آپس میں اکیلے ہوں تو کہیں
قَالُوْۤا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَیْكُمْ لِیُحَآجُّوْكُمْ
بعض کے تو کہیں کیا خبر دیتے ہو تم ان کو ساتھ اس کے جو کھولی اللہ نے اوپر تمہارے
وہ علم جو اللہ تعالیٰ نے تم پر کھولا مسلمانوں سے بیان کیے دیتے ہو
بِهٖ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۷۶﴾ اَوَ لَا یَعْلَمُوْنَ
تاکہ حجت کریں وہ تم سے ساتھ اس کے نزدیک رب تمہارے کے کیا پس نہیں عقل رکھتے تم کیا اور نہیں جانتے وہ
کہ اس سے تمہارے رب کے یہاں تمہیں پر حجت لائیں کیا تمہیں عقل نہیں کیا نہیں جانتے
اَنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ مَا یُسِرُّوْنَ وَ مَا یُعْلِنُوْنَ ﴿۷۷﴾

تحقیق اللہ جانتا ہے جو وہ چھپاتے ہیں اور جو ظاہر کرتے ہیں وہ
کہ اللہ جانتا ہے جو کچھ وہ چھپاتے ہیں اور جو کچھ ظاہر کرتے ہیں

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** اس سے پہلے حضور علیہ السلام کے زمانہ کے یہودیوں کا ایک عیب بیان کر دیا گیا۔ اب ان کا دوسرا عیب بیان کیا جارہا ہے۔ **دوسرا تعلق:** اس سے پہلے بتایا گیا تھا کہ علماء یہود بذریعہ قلم لوگوں کو ایمان سے روکتے ہیں۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ وہ زبانی بھی بہت روک تھام کر رہے ہیں۔ **تیسرا تعلق:** اس سے پہلے ایک دلیل سے مسلمانوں کو یہودیوں سے مایوس کیا گیا اب اسی مایوسی کی دوسری دلیل بیان ہو رہی ہے کہ اے مسلمانو یہ خود تو کیا ایمان لائیں گے ان کو تو یہ بھی گوارہ نہیں کہ ان کی جماعت کا کوئی آدمی حضور علیہ السلام کی زبانی تعریف بھی کر دے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت سے شبہ پڑتا تھا کہ تحریف وغیرہ صرف علماء یہود کا کام ہے ان کی جماعت کے عام لوگ ایسے خبیث نہیں یہ تو ہمارے نبی کی تعریفیں بھی کرتے ہیں اب اس شبہ کو دور کیا جارہا ہے کہ اے مسلمانو ان کی ظاہری تعریف کو مت دیکھو یہ تقیہ کرتے ہیں۔ نیز ان کی باگ دوڑ ان کے علماء کے ہی ہاتھ میں ہے وہ ان کو تنہائی میں خوب ڈانٹتے ہیں۔

شان نزول

حضور علیہ السلام کے زمانہ میں کچھ یہودی صحابہ کرام سے ملتے تو کہتے تھے کہ ہم بھی اس پر ایمان لائے ہیں جس پر تمہارا ایمان ہے اور تمہارے نبی سچے ہیں۔ ان کا فرمان حق ہے ان کی صفتیں توریت شریف میں موجود ہیں ان لوگوں پر علماء یہود ملامت کرتے تھے ان لوگوں کے لئے آیت کریمہ آئی (تفسیر خزائن العرفان)

تفسیر

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا اس جگہ محرفین یہود مراد نہیں بلکہ منافق جماعت یعنے جب منافق یہودی مخلص مسلمانوں سے ملتے ہیں قَالُوا آمَنَّا کہتے ہیں کہ ہم تمہاری طرح دل سے ایمان لے آئے لیکن اپنے اہل قرابت اور بزرگوں کے ڈر سے اپنے باپ داداؤں کا دین نہیں چھوڑتے بظاہر تو ہم توریت کے عامل ہیں۔ مگر درحقیقت تمہارے ساتھی (تفسیر عزیزی) وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ خلا کی تحقیق سورہ بقر کے شروع میں ہو چکی۔ پہلے بعض سے منافقین اور دوسرے بعض سے محرفین یا کھلے کافر مراد ہیں۔ یعنی جب بعضے منافقین ایسی باتیں بنا کر اپنے علماء کے ساتھ تنہائی میں جمع ہوتے ہیں جہاں کوئی مسلمان نہ ہو۔ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُم کا فاعل دوسرے بعض ہیں۔ یعنی یہ علماء یا کھلے کافر ان منافقین سے کہتے ہیں کہ کیا تم مسلمانوں کو ایسی باتیں بتا دیتے ہو تُحَدِّثُونَ تحدیث سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں بات کرنا یا خبر دینا خیال رہے کہ یہ کفار تنہائی میں ہی ملامت کرتے تھے کیونکہ اعلانیہ ملامت کرنے میں انہیں دو خطرے تھے۔ ایک یہ کہ کہیں یہ منافقین ہم سے کٹ کر مسلمانوں سے نہ جا ملیں دوسرے یہ کہ مسلمان ہمارے اس ڈر اور خوف سے خبردار نہ ہو جائیں۔ اس لئے خیرخواہانہ طریقے پر چھپ کر ان سے کہتے

تھے۔ اس چھپے راز کا اظہار حضور علیہ السلام کی نبوت کی کھلی دلیل ہے۔ بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ فتح کے لفظی معنی ہیں کھولنا یہاں ظاہر کرنا اور بیان کرنا مراد ہے یعنی اے منافقو نبی آخر الزمان کے فضائل اور ان کی امت کی بزرگیاں اور بنی اسرائیل سے ان کی اطاعت کا عہد و پیمان جو توریت میں مذکور ہے یہ توریت و زبور کے خزانوں کے قیمتی علمی موتی ہیں جن کو ہم نے اب تک بمشکل چھپایا ہے تم کیا غضب کر رہے ہو کہ مسلمانوں پر ظاہر کئے دیتے ہو۔ لِيُحَاجُّوكُمْ بِهٖ یہ لام انجام کا ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ اس نے چوری کی جیل خانہ کے لئے یعنی تمہاری اس خبر دینے کا انجام یہ ہوگا۔ يُحَاجُّوْ، مُحَاجَّةٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں مناظرہ کرنا یا غالب ہو جانا۔ یعنی مسلمان اس ذریعہ سے تم سے مناظرہ و مقابلہ کریں گے یا تم پر غالب آجائیں گے کیونکہ تمہاری یہ باتیں ان کے لئے دستاویز کا کام دیں گی۔ جس سے وہ تم کو الزام دے کر خاموش کر دیں گے۔ عِنْدَ رَبِّكُمْ اس کے معنی میں علماء نے بہت تردد کیا ہے۔ کسی نے عِنْدَ کو فِي کے معنی میں لیا کسی نے رَبِّكُمْ سے پہلے لفظ کتاب یا حکم پوشیدہ مانا کسی نے عند کو اعتقاد کے معنی میں لیا۔ مگر صحیح توجیہ یہ ہے کہ عند اپنے معنی میں ہے اور کوئی لفظ پوشیدہ نہیں یعنی قیامت کے دن رب تعالیٰ کے سامنے مسلمان تم کو رسوا کریں گے کہ کہیں گے کہ مولیٰ انہوں نے ہمارے سامنے اسلام کی حقانیت کا اقرار کیا اور پھر اس کی مخالفت کی جس سے تم اقبالی مجرم اور اقراری ملزم بنو گے جس کی سزا بھی زیادہ ہوتی ہے اور رسوائی کافی اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ظاہر یہ ہے کہ یہ ان علماء کا ہی کلام ہے اور اس میں منافقین سے خطاب ہے، یعنی اے منافقو تم یہ بات سمجھتے کیوں نہیں اور اس خطاء سے بچتے کیوں نہیں یہ بھی احتمال ہے کہ یہ کلام رب کا ہو اور مسلمانوں سے خطاب ہو کہ اے مسلمانو تم یہ واقعات سن کر سمجھتے کیوں نہیں اور ان کے ایمان سے مایوس کیوں نہیں ہوتے۔ اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ رب تعالیٰ ان کی تردید فرما رہا ہے یہ استفہام انکاری ہے یعنی کیا یہ علمائے یہود اتنا نہیں جانتے کہ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ کہ اللہ ان کی چھپی اور اعلانیہ سب باتوں کو جانتا ہے۔ یا تو اس کا یہ مطلب ہے کہ منافقین کے ظاہر کرنے اور علماء کے در پردہ منع کرنے کو رب جانتا ہے۔ قیامت میں ان پر الزام تو قائم ہو چکا یا مسلمانوں کو اس مشورہ سے آگاہ فرما دے گا جس سے وہ دنیا اور آخرت میں ان پر الزام قائم کریں گے یا حق تعالیٰ ان کی چھپائی ہوئی اور ظاہر کردہ توریت کی آیتیں جانتا ہے مسلمانوں کو اس سے مطلع فرما دے گا۔ جس سے ان کی یہ کوشش بیکار جائے گی۔ چنانچہ عبداللہ ابن سلام اور حضرت کعب احبار جیسے علماء یہود کو رب تعالیٰ نے اسلام کی توفیق دی۔ جنہوں نے توریت شریف کی چھپائی ہوئی آیتیں ظاہر فرمائیں اور حضور کی نعت شریف کے گیت گائے۔

خلاصہ تفسیر

حق تعالیٰ مسلمانوں کو یہود کی دوسری بری خصلت سے مطلع کر رہا ہے اور فرماتا ہے کہ ان کی بے دینی یہاں تک پہنچ چکی کہ ان کی ایک جماعت نے کفر و ایمان کو معمولی بات سمجھ رکھا ہے کہ جب مسلمانوں سے ملتے ہیں تو اپنے ایمان کا اظہار اور حضور علیہ السلام کے فضائل کا اقرار کرتے ہیں اور جب اکیلے میں جمع ہوتے ہیں تو ایک دوسرے پر ملامت اور انکار کرتے ہیں اور ان میں دوسری جماعت وہ ہے جو منافقین کی زبانی تعریف کو بھی گوارا نہیں کرتی وہ ان کو تنہائی میں سمجھاتی ہے کہ تم مسلمانوں کے سامنے توریت وغیرہ کی وہ باتیں کیوں کرتے ہو جن سے اسلام کی حقانیت ثابت ہو اس کا انجام یہ ہوگا کہ جس طرح وہ تم کو اور

دلائل سے الزام دیتے ہیں اسی طرح ان آیتوں اور تمہارے اقرار سے بھی تم کو الزام دیں گے۔ نیز بارگاہ الٰہی میں ابھی تم بے علمی کا بہانہ کر سکتے ہو مگر پھر نہ کر سکو گے۔ بلکہ اقبالی مجرم کی حیثیت سے سخت سزا کے مستحق ہو گے۔ حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ کیا یہ بیوقوف ہم کو بے علم جانتے ہیں۔ یہ مسلمانوں سے کچھ کہیں یا نہ کہیں ہمیں سب کچھ روشن ہے نیز ہم نے ہی توریت اتاری ہے ہم اپنے نبی ﷺ کو اور مسلمانوں کو ان کی چھپائی ہوئی آیتیں بتادیں گے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** مناظرہ کرنا۔ مقابل کی کتابوں کی خبر رکھنا۔ ان کو الزامی جواب دینا سنت انبیاء ہے اسی لئے تو علمائے یہود توریت کی آیتیں چھپاتے تھے کہ مسلمان ہم کو الزامی جواب نہ دیں۔ **دوسرا فائدہ:** دنیا کی ہوس اور یہاں کی عزت و آبرو کی طمع انسان کے دین کو برباد کر دیتی ہے۔ دیکھو علماء یہود کو خدا سے خوف بھی تھا اور آخرت کے اقبالی جرم سے ڈرتے بھی تھے مگر پھر دینوی لالچ میں اپنی ضد پر قائم تھے۔ **تیسرا فائدہ:** حق بات اور حضور ﷺ کے اوصاف چھپانا اور حضور کے کمالات کا انکار کرنا خبیث یہودیوں کا طریقہ ہے اس زمانے کے عام دیوبندی اور وہابیوں کا یہی طریقہ ہے کہ فضائل کی آیات و حدیث نہ پڑھیں نہ کسی کو بتائیں اگر ان کا بس چلے تو ان آیتوں اور حدیثوں کو مٹا ہی دیں اور جن آیتوں سے ان کے خیال میں حضور کی اہانت نکلے ان کا ہر جگہ اعلان کریں۔ یہ بالکل ان محرفین یہودیوں کے قدم بقدم ہیں۔ اسمٰعیل دہلوی نے تقویۃ الایمان میں صاف لکھ دیا کہ حضور کی بندوں کی سی تعریف کرو اور اس میں بھی کمی کرو مگر میرے رب کا حکم یہ ہے کہ وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ (فتح: ۹) اس شہنشاہ کی خوب تعظیم کرو۔ لہٰذا رب کی ہی بات مانی جائے گی نہ کہ کسی اور خبیث کی۔ **چوتھا فائدہ:** بری نیت سے کتاب اللہ پڑھنا بھی حرام بلکہ کفر ہے دیکھو علماء بنی اسرائیل حضور علیہ السلام کے اوصاف چھپانے کی نیت سے توریت پڑھتے تھے ان کا یہ فعل کفر تھا ہم سورہ عَبَس کی تفسیر میں انشاء اللہ ذکر کریں گے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس امام کو قتل کرادیا تھا جو حضور کی اہانت کی نیت سے ہر نماز میں عبس پڑھا کرتا تھا۔ آج دیوبندی وہابی اور دیگر بیدینوں کا یہی دستور ہے کہ ان کا قرآن و حدیث پڑھنا پڑھانا بری نیت سے ہے ہم نے تو دیکھا کہ یہ نماز میں بھی وہی آیتیں پڑھتے ہیں جن میں حضور کی توہین سمجھتے ہیں۔ انہیں سورہ حجرات، طٰہ اور سورہ فتح وغیرہ یاد ہی نہیں ہوتیں ایسے ہی لوگوں کے متعلق حدیث شریف میں آیا کہ وہ قرآن پڑھیں گے۔ قرآن ان پر لعنت کرے گا۔ جب قرآن لانے والے کی عظمت دل میں نہ ہو تو قرآن پڑھنا بیکار ہے۔ قرآن پڑھنا، دیکھنا، چھونا سب عبادت ہے مگر جب کہ اچھی نیت سے ہو بری نیت سے یہ تمام کام گناہ بلکہ کبھی کفر ہوتے ہیں۔ دیکھو مسجد میں آنا عبادت ہے مگر آنا، نہ کہ جوتی چرانے کی نیت سے حضور کی اہانت ثابت کرنے کو قرآن پڑھنا بے دینی ہے۔ **پانچواں فائدہ:** کوئی شخص حضور ﷺ سے اپنا راز چھپا نہیں سکتا دیکھو بنی اسرائیل نے چھپ کر جو مشورے کئے تھے وہ رب نے حضور پر ظاہر فرما دیئے۔ **چھٹا فائدہ:** مسلمانوں کو اپنے ایمان کا اعلان کرنا بلکہ اپنی صورت و سیرت سے اسلام ظاہر کرنا ضروری ہے صرف زبانی اظہار کافی نہیں جیسا کہ قَالُوْا فرمانے سے معلوم ہوا کہ یہاں قَالُوْا عتاب کے لئے ہے۔ **ساتواں فائدہ:** مسلمانوں کو کفار سے

محبت ان سے خلوتوں میں ملاقاتیں قابل راز باتیں ممنوع ہیں کہ کفار اس طرح ان کو بہکانے لگیں۔ کیونکہ خَلَا بَعْضُهُمْ کو بھی بطور عتاب فرمایا اور بَعْضُهُمْ فرما کر بتایا کہ زبانی ایمان کا اقرار کرنے والے کفار کی جماعت سے ہیں تم میں سے نہیں یعنی مجاہر کافر اور ساتر سب آپس میں ایک ہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: کیا اس جگہ وہ منافقین مراد ہیں جن کا ذکر سورۂ بقرہ کے شروع میں آچکا ہے یا دوسرے اگر وہ ہی مراد ہیں تو اس تکرار سے کیا فائدہ؟ نیز وہاں کچھ اور مشورہ بتایا گیا تھا یہاں اس کے خلاف۔ **جواب:** یہاں منافقین مراد ہیں خواہ وہ ہی ہوں یا کوئی دوسرے۔ اس جگہ منافقین کا مسلمانوں کے ساتھ برتاوا بتانا منظور تھا۔ اور یہاں ان کے ایمان سے مایوس کرنا منظور ہے لہٰذا تکرار نہ ہوئی نیز تاکید کے لئے تکرار بری نہیں اور وہاں منافقین کا کلام ارشاد ہوا تھا کہ وہ کہتے تھے إِنَّا مَعَكُمْ اور یہاں کھلے کافروں کی فہمائش کا ذکر ہے۔ خیال رہے کہ بعض یہود وہ بھی تھے جو دل سے حضور کی تعظیم کرتے تھے مگر خوف سے اقرار نہ کر سکتے تھے۔ مسلمانوں سے علیحدگی میں ڈرتے ڈرتے کچھ کہہ دیتے تھے۔ ممکن ہے کہ اس جگہ وہ مراد ہوں۔

وَ مِنْهُمْ أُمِّيُّونَ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ إِلَّآ أَمَانِيَّ وَ إِنْ هُمْ
اور ان میں سے بے پڑھے ہیں نہیں جانتے وہ کتاب کو مگر خواہشات کو اور نہیں ہیں
اور ان میں کچھ ان پڑھ ہیں کہ جو کتاب کو نہیں جانتے مگر زبانی پڑھ لینا یا کچھ اپنی
إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿۷۸﴾
وہ مگر گمان کرتے
من گھڑت اور نرے گمان میں ہیں

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے کئی طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** جن یہودیوں کے ایمان سے مایوسی تھی ان کے چار فرقے تھے ایک گمراہ کن علماء دوسرے منافقین، تیسرے منافقین کو ڈانٹنے والے یہودی چوتھے عام جہلا۔ اس سے پہلے تین فرقوں کا ذکر ہو چکا اب چوتھے فرقے کا ذکر ہے۔ **دوسرا تعلق:** اس سے پہلے ان یہود کے ایمان سے ناامید کیا گیا اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ ان کی بے ایمانی کی ایک وجہ نہیں۔ علماء تحریف سے منافقین نفاق سے اور جہلا ان کی اندھی پیروی سے کفر پر اڑے ہوئے ہیں۔ **تیسرا تعلق:** اس سے پہلے علمائے یہود کے دو عیب بیان ہو چکے اب تیسرا عیب بیان ہو رہا ہے کہ انہوں نے اپنے جہلا کو اپنے پھندے میں ایسا جکڑ رکھا ہے کہ جس سے ان کو نکلنے ہی نہیں دیتے۔

تفسیر

وَ مِنْهُمْ أُمِّيُّونَ، هُمْ کا مرجع وہ یہودی ہیں جن کے ایمان سے مایوسی ہے۔ أُمِّيُّونَ امی کی جمع ہے یہ ام سے بنا ہے جس

کے معنی ہیں، اصل۔ ماں کو ام مکہ مکرمہ کو ام القریٰ سورہ فاتحہ کو ام الکتاب حضور علیہ السلام کو امی اس لئے کہتے ہیں کہ ماں بچے کی، مکہ مکرمہ ساری زمین کی سورہ فاتحہ سارے قرآن کی حضور علیہ السلام سارے عالم کی اصل ہیں۔ حضور علیہ السلام کے امی ہونے کے اور بھی معنی ہیں جو انشاء اللہ النبی الامی کی تفسیر میں بیان کئے جائیں گے۔ اب بے پڑھے آدمی کو یا کتاب اور رسول کے منکر کو امی کہا جاتا ہے۔ یہاں پہلے معنی بے پڑھے لکھے آدمی مراد ہیں۔ یعنی جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ایسے ہی رہے یا یہ صرف ماں والے ہیں باپ کا ان پر سایہ نہ تھا جو انہیں تعلیم و تربیت دیتا یعنی ان یہودیوں میں بعض ان پڑھ جہلاء ہیں جن کا حال یہ ہے کہ لَا يَعْلَمُونَ الْكِتٰبَ اس کتاب سے توریت شریف مراد ہے اور علم سے جاننا مراد ہے۔ یا سمجھنا یعنی پڑھ تو لیتے ہیں۔ سمجھتے نہیں یا نہ پڑھ سکتے ہیں بلکہ ان کے علماء جو کچھ انہیں پڑھ کر سنا دیتے ہیں اس پر اندھا دھند ایمان لے آتے ہیں اور ان کے سوا کسی کو نہیں سنتے۔ لطف یہ ہے کہ اہل کتاب کہلاتے ہیں مگر کتاب سے بالکل ناواقف جیسے کہ آج کل کے عام اہل حدیث کہ حدیث کی کتابوں کے صحیح نام بھی نہیں لے سکتے مگر کہلاتے ہیں اہل حدیث لکھے نہ پڑھے نام محمد فاضل اسی نکتہ کے لئے اُمِّيُّونَ کی قرآن کریم نے یہ تفسیر فرما دی۔ اِلَّآ اَمَانِيَّ یہ کتاب کا مستثنیٰ متصل ہے یا منقطع اَمَانِيَّ امنیۃ کی جمع ہے اور اس کے چند معنی ہیں۔ دل خوش کن بات جھوٹے خیالات گھڑی ہوئیں باتیں پڑھی ہوئی چیز قرآن کریم فرماتا ہے۔ اِذَا تَمَنّٰۤى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْۤ اُمْنِيَّتِهٖ (حج: ۵۲) اور قرآن کریم میں یہ لفظ ہر معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اگر آخیر معنی مراد لئے جائیں تو یہ مطلب ہے کہ یہ جہلا توریت شریف کے مضامین نہیں جانتے اور نہ اسے پڑھ سکتے ہیں بلکہ جو ان کے علماء پڑھ کر سنا دیتے ہیں ان پر ایمان لے آتے ہیں حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ توریت نہیں جانتے مگر صرف بغیر معنی سمجھے زبانی پڑھ لینا (تفسیر خازن و خزائن العرفان) ان دونوں صورتوں میں یہ مستثنیٰ متصل ہے۔ بعض مفسرین نے یہ معنی کئے کہ اَمَانِيَّ سے وہ جھوٹی گھڑی ہوئی باتیں مراد ہیں جو یہودیوں نے اپنے علماء سے سن کر بے تحقیق مان لی تھیں۔ مثلاً یہ کہ ہم اللہ کے محبوب اور اس کے بیٹے ہیں جو چاہیں کریں ہماری پکڑ نہیں یا یہ کہ ہمارے باپ دادا خدا کی مرضی بدل سکتے ہیں کہ خدا ہم کو پکڑے گا تو وہ جبراً چھڑا دیں گے یا یہ کہ یہود کو سات یا چالیس دن سے زیادہ عذاب نہ ہوگا۔ یا یہ کہ یہود کی شریعت قیامت تک باقی ہے کبھی منسوخ نہیں ہو سکتی یا یہ کہ نبوت و رسالت بنی اسرائیل کے ساتھ خاص ہے غیر اسرائیلی نبی نہیں ہو سکتا وغیرہ وغیرہ اس صورت میں یہ مستثنیٰ منقطع ہے یعنی وہ کتاب سے بالکل دور ہیں صرف انہوں نے اپنے علماء کی گھڑی ہوئی باتیں یاد کر رکھی ہیں۔ پھر لطف یہ ہے کہ وَ اِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ یعنی ان کے پاس ان باتوں کی کوئی دلیل نہیں محض خوش اعتقادی سے مانے ہوئے ہیں یا انہیں خود بھی ان باتوں کا یقین نہیں محض بے بنیاد خیالات پکالئے ہیں اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ کہ اپنے دین پر اطمینان اور یقین تو مسلمان ہی کو حاصل ہے آج بھی دیکھا جا رہا ہے کہ پڑھے لکھے ہندو اور سکھ وغیرہ اولیاء اللہ کے مزارات پر حاضری دیتے ہیں اپنے بیماروں پر مسلمانوں سے قرآن پاک پڑھا کر دم کراتے ہیں۔ مسجدوں کے دروازوں کی خاک اپنے بیماروں پر ملتے ہیں۔ بلکہ اب تو آریہ اور عیسائی سوسائیٹیاں بھی عملی طور پر قرآن کریم کی طرف آ رہی ہیں اور اسکو اپنے لئے دستور العمل بنا رہی ہیں ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ بعض ہندوؤں کو جب جان

کنی کی تکلیف ہوتی ہے تو اس کے ورثا کہتے ہیں کہ اب ان کہی کہلواؤ۔ یعنی اسلامی کلمہ پڑھواؤ۔ کشتی میں سوار ہوتے وقت بعض جگہ ہندو ملاح کہتے ہیں کہ نبی جی کا کلمہ پڑھو تا کہ بیڑا پار لگے۔ بعض ہندو ہر مصیبت میں حضور غوث پاک کی گیارہویں دیتے ہیں۔ الحمدللہ مسلمان ہر مصیبت اور آرام میں اپنے اسلام پر ہی قائم رہتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی کفار کو اپنے دین پر یقین نہیں آج کل بعضے جہلا یہ آیت عوام مسلمانوں کی تلاوت قرآن پر چسپاں کرتے ہیں ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ بعض مسلمان قرآن کا ترجمہ نہیں جانتے صرف اس کے الفاظ بڑبڑا لیتے ہیں۔ یہ کلمہ بڑی بیدینی ہے ورنہ بتاؤ کہ یہ آیت حضور کے زمانے میں نازل ہوئی جب کہ سارے صحابہ عربی دان تھے۔ بتاؤ اس وقت کون بے سمجھے پڑھتا تھا۔ نیز اس سے پہلے یہود کا ذکر ہو رہا ہے بعد میں بھی انہیں کا ذکر ہے پھر بیچ میں یہ ایک آیت مسلمانوں کیلئے کیسے آ گئی نیز اس کے آخر میں ہے وَهُمْ يَظُنُّونَ یعنی وہ نرے گمان میں ہیں یعنی کتاب اللہ چھوڑ کر اپنے گمانوں کو عقیدہ بنا بیٹھے ان مسلمانوں کا یہ حال کہاں ہے۔ وہ قرآن کی تلاوت ثواب کے لئے کرتے ہیں نہ کہ قرآن کے مقابل اپنی رائے قائم کرنے کو۔ غرضیکہ یہ ترجمہ بالکل غلط ہے اس سے مسلمانوں کو ایک عبادت یعنی تلاوت سے روکنا منظور ہے۔

خلاصہ تفسیر

اہل کتاب میں بعض وہ جہلا اور بے پڑھے بھی ہیں کہ جو کتاب اللہ کو بالکل نہیں جانتے جو ان کے گمراہ کن علماء نے اپنی مرضی کے موافق میٹھی میٹھی باتیں گھڑ رکھی ہیں انہوں نے ان باتوں کو اپنی رائے کے مطابق پا کر یاد کر لیا ہے اور اپنے خیال میں ان کو توریت کے مضامین اور خلاصہ سمجھ کر خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے کتاب کا لب لباب نکال لیا یا وہ جہلا توریت کی عبارت بے سوچے سمجھے طوطے کی طرح پڑھ لیتے ہیں اس کے مضامین تک نہیں پہنچتے مگر لطف یہ ہے کہ انہیں خود بھی ان باتوں پر یقین نہیں۔ تفسیر کبیر نے اس جگہ فرمایا کہ اس قسم کے لوگ مسلمانوں میں بھی موجود ہیں ان میں بعض گمراہ کن علماء ہیں جو کہ قرآن کریم اور حدیث کی تحریف معنوی میں دن رات مشغول رہتے ہیں بعض مسلم نما کفار وہ ہیں جو غیروں کی مرضی پر اپنا دین و مذہب اور قوم قربان کرنے پر تیار ہیں۔ بعض وہ جہلا بھی ہیں جنہوں نے قرآن کریم کے اردو ترجمے دیکھ کر کچھ نوٹ لگا رکھے ہیں اور اپنے کو بڑا عالم مفسر محدث جانتے ہیں۔ اس زمانہ کی اکثر اردو تفسیروں کا یہ ہی حال ہے۔ کوئی جاہل روح قرآن کوئی دُرر قرآن کوئی ترجمان القرآن ناموں سے اسی قسم کی تفاسیر چھاپ رہے ہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ:** دینی معارف نظری ہیں نہ کہ بدیہی جن کو بہت غور و فکر سے معلوم کرنا ضروری ہے۔ **دوسرا فائدہ:** دینیات میں یقین ضروری ہے ظن اور گمان ناکافی ہے۔ **تیسرا فائدہ:** عقائد میں تقلید حرام ہے ہم مقلدین صرف فروعات میں مقلد ہیں نہ کہ عقائد میں یعنی ہم توحید و رسالت حشر و نشر وغیرہ کو صرف امام اعظم کے قیاس سے نہیں جانتے بلکہ دلائل یقینیہ سے **چوتھا فائدہ:** گمراہ کن عالم اور اس کا پیرو جاہل دونوں برابر کے گمراہ ہیں اگرچہ عالم کا عذاب دوگنا ہے کیونکہ وہ گمراہ بھی ہیں اور گمراہ کن بھی **پانچواں فائدہ:** جیسے

عالم پر فرض ہے کہ صحیح مسائل لوگوں کو بتائے اور خود بھی عمل کرے اسی طرح جاہل کا فرض ہے کہ سچے علماء کی صحبت اختیار کرے ہر چمکتی چیز کو سونا نہ سمجھے ورنہ وہ رب کے ہاں گرفتار ہوگا۔ **چھٹا فائدہ**: خود دین سے بالکل بے خبر رہنا سخت جرم ہے عقائد اور ضروری مسائل سیکھنا ہر مسلمان پر فرض عین ہے پورا عالم دین بننا فرض کفایہ ہے۔ اپنے بچوں کو اتنا علم دین سکھا دو کہ وہ مسلمان رہیں کفار کا شکار نہ بن جاویں یہ خیال رہے کہ فقہ سیکھنا بھی کتاب اللہ سیکھنا ہے۔ فقط ترجمہ کتاب سیکھنا کتاب اللہ کا علم نہیں۔ **ساتواں فائدہ**: مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ سے یہ حاصل ہوا کہ رب نے جہالت دین پر عتاب فرمایا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ ظن یعنی گمان بری چیز ہے اور قیاس بھی ظن ہی ہے لہٰذا صرف قرآن و حدیث کو ماننا چاہئے (غیر مقلد) **جواب**: بیشک اصول دین میں ظن برا ہے وہاں یقینیات چاہئیں فروعی اعمال میں ظن معتبر اگر یہاں بھی یقینیات کی ضرورت ہو تو بہت دشواری ہوگی کیونکہ اکثر حدیثیں اور قرآن پاک سے نکالے ہوئے بہت مسائل ظنی ہیں غرضیکہ اچھے ظن اچھے ہیں برے ظن برے رب فرماتا ہے۔ لَوْلَاۤ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا (النور: ۱۲) یہاں حضرت عائشہ صدیقہ پر نیک گمان نہ کرنے پر عتاب فرمایا گیا شرعی قیاسات اچھے ظن ہیں برے ظن نہیں **دوسرا اعتراض**: عوام کو علماء کی تقلید نہ چاہیے عام یہودی اپنے علماء کی تقلید سے ہی کافر ہوئے اور تم بھی اماموں کی تقلید کرتے ہو (غیر مقلد) **جواب**: اللہ رسول کے فرمان کے مقابل میں کسی کی تقلید کرنا حرام ہی نہیں بلکہ کفر ہے عام یہودی قرآن اور حضور کے مقابل اپنے علماء کی پیروی کرتے ہیں۔ ہم حضور علیہ السلام کی اطاعت کے لئے اماموں کی پیروی کرتے ہیں کہ ان کے ذریعہ ہم کو حضور کی سچی اطاعت نصیب ہو جائے اس تقلید کا قرآن و حدیث میں سخت حکم ہے دیکھو ہماری کتاب جاء الحق۔ علم صرف و نحو اور اسماء رجال اور علم تجوید وغیرہ میں اس فن کے اماموں کی تقلید کرنا ہی پڑتی ہے۔ جس حدیث کو تم ضعیف یا صحیح کہتے ہو وہ محدثین کی تقلید سے ہی کہتے ہو۔ یہ قوت اور ضعف قرآن اور حدیث سے ثابت نہیں۔ موتی نکلتے سمندر سے ہیں مگر ملتے جوہری کی دوکان سے ہیں ایسے ہی جواہر نکلیں گے قرآن سے مگر ملیں گے امام ابوحنیفہ قدس سرہ کی دوکان پر ہم قرآن و حدیث سمجھنے اس سے مسائل نکالنے کے لئے تقلید کرتے ہیں نہ کہ قرآن چھوڑنے کے لئے۔ **تیسرا اعتراض**: اَمَانِيَّ کے پہلے معنے سے معلوم ہوا کہ بغیر ترجمہ جانے قرآن نہیں پڑھنا چاہئے کیونکہ عوام یہود میں یہ ہی عیب تھا (عام نیچری) **جواب**: تلاوت عقائد درست کرنے کے لئے ہے۔ تلاوت کرنے والا توحید و رسالت کا عقیدہ رکھتا ہے اور وہ اتنا سمجھتا ہے کہ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اور آیت مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کا یہی مطلب ہے عام یہودی توریت کے ان مضامین سے بھی بے خبر ہو چکے تھے اس کی برائی کی گئی ہے ورنہ خود قرآن پاک سے ثابت ہے کہ پورا علم دین سیکھنا ہر مسلمان پر فرض نہیں بعض کا سیکھ لینا کافی ہے۔ فَلَوْ لَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِی الدِّيْنِ (التوبہ: ۱۲۲) نیز قرآن کا بغیر مطلب سمجھے ہوئے ترجمہ سیکھ لینا بیکار بلکہ گمراہی کی جڑ ہے۔ اگر بغیر ترجمہ جانے قرآن پڑھنا بیکار یا ناجائز ہو تو آیات متشابہات جن کے معنی جبریل بھی نہیں جانتے ان کی تلاوت ممنوع ہوتی حالانکہ صریح حدیث سے

ثابت ہے کہ الم پڑھنے پر تیس نیکیاں ملتی ہیں۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ جہلا کو صحیح عالم کی پیروی کرنا ضروری ہے گمراہ کن عالم کی پیروی سے وہ خود گمراہ ہو جاتے ہیں مگر صحیح عالم کا پتہ لگانا ناممکن ہے اس میں طاقت سے زیادہ تکلیف ہے۔ **جواب:** جس طرح بیمار، کامل اور ناقص طبیب میں فرق کر لیتا ہے کہ جس کی دوا سے تندرستی ملے وہ کامل ہے ورنہ ناقص اسی طرح ہر شخص کو چاہئے کہ صحیح اور جھوٹے عالم میں فرق کرلے۔ جن کی محبت سے اللہ و رسول کی محبت اور سنت کی اتباع کا جذبہ ہو وہ سچا عالم ہے ورنہ جھوٹا یہ اصلی ونقلی عالم کے لئے کسوٹی ہے۔

تفسیر صوفیانہ

بعض نام نہاد صوفی شکل وصورت میں صوفی ہیں اور لباس صوفیانہ پہن لیتے ہیں کلام بھی صوفیوں کا سا کرتے ہیں لیکن ارادہ میں پکے اور عقیدہ میں سچے نہیں۔ ہر غافل کی طرف مائل ہوتے ہیں اور ہر آواز پر کان لگا دیتے ہیں۔ ان کی ظاہری افعال کی نقل تو اتارتے ہیں لیکن ان کے اصل جذبے سے بے خبر نہ ان کی صحبت میں اخلاص اور نہ ان کو حق و باطل میں تمیز کرنے کا مادہ وہ ان بے پڑھے یہودیوں کی طرح ہیں جو اصل کتاب سے بے خبر رہ کر دوسروں کی خواہشات کی پیروی کرتے ہیں سالک پر لازم ہے کہ اس راستہ میں احتیاط سے قدم رکھے وہمیات سے دور بھاگے ظاہر حالت سے دھوکا نہ کھائے یہ راستہ نہایت باریک ہے اور یہ کنواں نہایت عمیق اس راستہ میں صدہا شکاری قسم قسم کے جال لگائے اور طرح طرح کے دانے ڈالے بیٹھے ہیں مولانا فرماتے ہیں

صد ہزاراں دام و دانہ است اے خدا!	ماچو مرغان حریص بے نوا!!
دم بدم مابستہ دام نویم!	ہر یکے گر باز و سیمرغ شویم

اسی کو صوفیاء کی اصطلاح میں بوالہوس کہتے ہیں۔

حکایت: ایک شخص نے کسی بزرگ کو دیکھا کہ وہ ہر خوبصورت چیز کو چوم لیتے ہیں۔ یہ بھی ان کے ساتھ اس نیت سے گیا کہ بہت خوبصورتوں کے بوسے ملیں گے ایک دن کسی لوہار نے بھٹی سے گرم اور سرخ لوہا نکالا ان بزرگ نے اس کو سینہ سے لگا لیا اور خوب چوما۔ یہ بوالہوس پیچھے ہٹنے لگا۔ تب ان بزرگ نے ایک چپت رسید کیا اور فرمایا کہ اس کو کیوں نہیں چومتا۔ ہم نے بعض حضرات کو دیکھا کہ بزرگوں کے نذرانہ دیکھ کر ان کے منہ میں پانی بھر آیا اور اسی کی نیت سے پیر بن گئے یہ سب لوگ اس آیت کے مصداق ہیں۔

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتٰبَ بِأَيْدِيهِمْ ۚ ثُمَّ يَقُولُونَ

پس خرابی ہے واسطے ان لوگوں کے جو لکھتے ہیں کتاب کو ساتھ ہاتھوں اپنے کے پھر کہتے ہیں

تو خرابی ہے ان کے لئے جو کتاب اپنے ہاتھ سے لکھیں پھر کہہ دیں یہ خدا

هٰذَا مِنْ عِندِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا ۖ فَوَيْلٌ لَّهُم

وہ یہ طرف سے اللہ کے ہے تا کہ خریدیں وہ ساتھ اس کے قیمت تھوڑی پس خرابی
کے پاس سے ہے کہ اس کے عوض تھوڑے دام حاصل کریں تو خرابی ہے ان کے
مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَ وَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ﴿۷۹﴾
ہے واسطے ان کے اس سے جو لکھا ہاتھوں نے ان کے اور خرابی ہے واسطے ان کے اس سے جو کماتے ہیں وہ
ہاتھوں کے لکھے سے اور خرابی ہے ان کے لئے اس کمائی سے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** اس سے پہلے یہود کی مختلف جماعتوں اور ان کی بد کرداریوں کا ذکر ہوا اب ان میں سے بدترین جماعت یعنی محرفین کی سزا کا ذکر ہو رہا ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں سے شبہ ہوتا تھا کہ شاید ان سب گروہوں کی سزا یکساں ہوگی۔ کیونکہ ان سب کے ایمان سے مایوسی ہے۔ اس آیت میں اس شبہ کو دفع فرمایا جا رہا ہے کہ نہیں بلکہ سزا بقدر جرم ہے چونکہ ان میں بڑے مجرم علماء یہود ہیں کیونکہ وہ کافر اور کافر گر ہیں۔ لہٰذا ان کی سزا بھی سخت تر ہے۔

شان نزول

جب حضور ﷺ مدینہ منورہ میں تشریف لائے تو علماء یہود کو قوی اندیشہ ہوا کہ ہماری سرداری چھن جائے گی اور روزی بند ہو جائے گی۔ کیونکہ توریت شریف میں حضور علیہ السلام کا حلیہ شریف اور ان کے اوصاف مذکور ہیں۔ جب لوگ حضور علیہ السلام کو اس کے مطابق پائیں گے فوراً ایمان لے آئیں گے اور ہم کو چھوڑ دیں گے اس اندیشہ سے انہوں نے توریت شریف میں تحریف کر ڈالی اور آپ کا حلیہ بدل دیا۔ مثلاً توریت شریف میں تھا کہ نبی آخر الزمان خوبصورت گھونگر یلے بال سرگیں آنکھ والے اور میانہ قد ہیں انہوں نے اس کو مٹا کر یوں لکھ دیا کہ بہت دراز قد ہیں ان کی آنکھیں کنجی اور نیلی اور بال الجھے ہوئے ہیں جب عوام یہودی ان سے پوچھتے کہ کیا توریت میں نبی آخر الزمان کے صفات ہیں تو وہ یہی بدلی ہوئی توریت لاکر انہیں یہی بگڑا ہوا مضمون سنا دیتے اور کہتے کہ رب نے توریت میں یہ اوصاف بیان کیے۔ حضور علیہ السلام میں ان میں سے کوئی صفت موجود نہیں اس پر یہ آیت کریمہ اتری۔

تفسیر

فَوَيْلٌ چونکہ تمام اہل کتاب کی گمراہیوں کے ذمہ دار یہی بدلنے والے پادری تھے لہٰذا اسے ف سے شروع فرمایا گیا تا کہ معلوم ہو کہ وہ سب کفر کی شاخیں تھیں اور یہ کفر کی جڑ ہے۔ ویل اور ویح اور ویس اور ویب عرب میں وہ کلمات ہیں جو مصیبت زدہ کو دیکھ کر بولے جاتے ہیں۔ لیکن ویح اور ویس کو ترس کھا کر بولتے ہیں جس کے معنی ہوتے ہیں افسوس اور ویل اور ویب بددعا کیلئے استعمال کرتے ہیں جس کے معنی ہیں خرابی اور خواری یعنی مصیبت سے کبھی نہ نکلے جیسے امیر آدمی فقیر بے نوا پر ترس

کھا کر کہے افسوس تیری غریبی پر اور حاکم مجرم سے کہے افسوس تیرے حال پر پہلا افسوس عطا کی تمہید ہے دوسرا افسوس سزا کی تمہید پہلے افسوس کا ترجمہ ویح یا ویس ہے دوسرے کا ترجمہ ویل اس لئے حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ ویح رحمت کا اور ویل عذاب کا دروازہ ہے ایک بار حضور علیہ السلام نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا وَیْحَکِ. ام المومنین اس لفظ سے پریشان ہوئیں تو حضور نے فرمایا کہ اے عائشہ یہ کلمہ رحمت کا ہے اس سے پریشان نہ ہو ہاں ویل سے پریشانی چاہئے (تفسیر عزیزی) خیال رہے قرآن کریم نے یہودی علماء اور نماز میں سستی کرنے والوں اور کم تولنے والوں کے لئے ویل فرمایا اور احادیث شریفہ میں مسائل چھپانے والے علماء اور بے علم فتویٰ دینے والے جہلا کے لئے اور رب کی قدرتوں میں غور نہ کرنے والے عوام کے لئے ویل فرمایا۔ غرضکہ قرآن وحدیث میں مختلف مجرموں کے لئے یہ لفظ بولا گیا۔ نیز ویل کی تفسیریں بھی مختلف آئی ہیں۔ چنانچہ بعض روایات میں ہے کہ ویل جہنم میں ایک آگ کا پہاڑ ہے جو مجرموں پر گر کر ان کا جسم پاش پاش کر دے گا اور بعض میں ہے کہ ویل جہنم میں ایک گہرا غار ہے جس میں مجرمین ڈالے جائیں گے۔ بعض روایات میں ہے کہ ویل جہنم میں ایک نہایت گرم پتھر ہے جس پر مجرموں کو چڑھایا جائے گا یا اتارا جائے گا بعض میں ہے کہ ویل ایک ندی ہے جس میں دوزخیوں کا خون اور پیپ بہتا ہوگا اور مجرموں کو وہی پلایا جائے گا بعض روایات میں ہے کہ ویل جہنم میں ایک کنوئیں کا نام ہے جس میں کافر ڈالے جائیں گے اور چالیس برس تک اس کی تہ تک نہ پہنچیں گے۔ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ ویل ایک دردناک عذاب کا نام ہے (تفسیر کبیر وعزیزی) ان سب روایتوں کو اس طرح کر دو کہ ویل کے معنی ہیں، خواری اور سخت عذاب لیکن قیامت میں اس کا ظہور مختلف طرح سے ہوگا۔ جیسا مجرم کا جرم ویسا اس کے لئے ویل۔ محرفین علماء کا ویل آگ کا پہاڑ متکبروں کا ویل غار ظالم چوہدریوں کا ویل گرم پتھر، شراب خوروں کا ویل خون اور پیپ کی ندی عام کافروں کا ویل جہنم کا کنواں (تفسیری عزیزی) لہٰذا قرآن وحدیث میں ویل مختلف معنی میں ہے۔ کم تولنے والوں کا علیحدہ ویل۔ نماز میں سستی کرنے والوں کا علیحدہ لِلَّذِیْنَ یَکْتُبُوْنَ الْکِتٰبَ یا تو کتاب سے، بدلی ہوئی کتاب مراد ہے اور یہی یَکْتُبُوْنَ کا مفعول ہے۔ یعنی ان علما کے لئے ویل ہے جو بدلی ہوئی کتاب لکھتے ہیں۔ صحیح نہیں لکھتے۔ یَکْتُبُوْنَ کا مفعول اور کتاب سے پہلے فی چھپا ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے کتاب منسوب ہے یعنی اپنی طرف سے گھڑے ہوئے مضامین کتاب میں لکھتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ لغت میں ہر تحریر کو کتاب کہتے ہیں۔ چنانچہ بولتے ہیں قد جاء کتاب اخی میرے بھائی کی کتاب یعنی خط آیا۔ اصطلاح میں مختلف مضامین کے مجموعہ کو کتاب کہتے ہیں اور ایک مضمون کو رسالہ شریعت میں آسمان سے نازل شدہ ایک مضمون کو صحیفہ کہتے ہیں اور بہت سے مضامین کے مجموعہ کو کتاب اگر یہاں لغوی معنی مراد ہے تو مطلب ظاہر ہے یعنی اپنے ہاتھ سے تحریریں لکھ کر رب کی طرف نسبت کر دیتے ہیں اور اگر شرعی معنی مراد ہوں تو فی پوشیدہ ہا۔ بِاَیْدِیْهِمْ اپنے ہاتھوں سے۔ یعنی نہ تو بگڑی ہوئی کتاب نقل کرتے ہیں اور نہ کسی سے کہہ کر بگڑواتے ہیں اور نہ بے خبری اور نادانی سے بگاڑتے ہیں یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ توریت بدلنے والے۔ بدلی ہوئی کو نقل کرنے والے اس کی اشاعت کرنے والے، اس کے اس عیب کو چھپانے، یوں ہی بدلنے والے سب مجرم ہیں۔ ایدی بمعنی قوت وطاقت جیسے

چوری کرنے والا چوری کرانے والا چوری کا مال گھر میں رکھنے والا۔ چور کا راز دار سب مجرم ہیں ایسے ہی یہ سب لوگ مجرم۔
پھر یہی نہیں کہ چپکے سے بگاڑ کر رکھ دیں بلکہ ثُمَّ یَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لوگوں کو وہ بدلی ہوئی عبارت دکھا کر کہتے ہیں کہ یہ رب کی طرف سے آئی ہوئی آیت ہے اس میں بگڑی عبارت کی طرف اشارہ ہے غرضیکہ وہ پے در پے تین جرم کرتے ہیں۔
ایک کتاب الٰہی کا بگاڑنا۔ دوسرے اس بگڑے ہوئے کو رب کی طرف نسبت دینا۔ تیسرے رب پر اتنا بڑا جھوٹ باندھنا جس سے کہ یہود کی موجودہ اور آئندہ نسلیں گمراہ ہوتی رہیں لطف یہ کہ انہوں نے اتنے بڑے بڑے جرم کیوں کئے محض اس لئے کہ لِیَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِیْلًا تاکہ ان بڑے گناہوں سے تھوڑے دام وصول کرلیں یا تو اس طرح کہ لوگ ایمان نہ لائیں بلکہ ہمارے پھندے میں پھنسے رہیں جس سے ہماری آمدنی برقرار رہے یا مالدار یہودیوں سے رشوت لے کر توریت کے سخت احکام نرم کردیتے تھے تھوڑے سے فنا ہونے والے نفع کے لئے ایمان جیسی دولت چھوڑ دینا بڑی بدبختی ہے۔ خیال رہے کہ بِهٖ کا مرجع یا تحریف شدہ کتاب ہے یا ان کا تحریف کرنا یعنی تحریف کردہ کتاب کے عوض یا تحریف کرنے کے عوض تھوڑی قیمت لے لیتے ہیں دنیا آخرت کی قیمت ہے اور یہ کتنی بھی زیادہ ہو آخرت کے مقابلہ میں تھوڑی ہے۔ اس لئے اس کو ثمن قلیل فرمایا گیا۔ ثمن قلیل کے بہت نکات ہم اس سے پہلے بیان کرچکے ہیں۔ خیال رہے کہ ان سب جرموں کا بدلہ ایک ہی ویل نہیں بلکہ فَوَیْلٌ لَّهُمْ ان کو چند قسم کی خواریاں اور ویل ملیں گے جن میں سے ایک قسم کی بڑی خواری اور سخت ویل تو مِّمَّا كَتَبَتْ اَیْدِیْهِمْ ان کے اس لکھنے اور کتاب الٰہی بگاڑنے کی وجہ سے ہوگا۔ وَوَیْلٌ لَّهُمْ اور دوسری قسم کا سخت ویل اور سخت رسوائی مِّمَّا یَكْسِبُوْنَ ان کی حرام کمائی اور رشوت ستانی کی وجہ سے ہوگا یَكْسِبُوْنَ كَسْبٌ سے بنا ہے کسب فاعل کو نفع دینے والے یا نقصان دور کرنے والے کام کو کہتے ہیں۔ اسی لئے خدا کے کام کو کسب نہیں کہتے اور نہ اس کو کاسب کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے ذاتی نفع اور نقصان سے پاک ہے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یَكْسِبُوْنَ سے علماء یہود کی ساری بدعمالیاں مراد ہیں **نکتہ:** اس جگہ كَتَبَتْ ماضی اور یَكْسِبُوْنَ مضارع فرمایا گیا۔ کیونکہ انہوں نے کتاب کی تحریف تو ایک بار کرلی تھی مگر اس تحریف شدہ کتاب سے روٹیاں عمر بھر کھاتے رہے۔ جیسے کوئی جعل ساز جھوٹی سرکاری مہر بنا کر رکھ لے اور اس سے ہمیشہ غلط پروانے بنا کر روپیہ کمایا کرے۔

خلاصہ تفسیر

ان علماء یہود کا یہ حال ہے کہ امیروں کو راضی کرنے اور اپنی سرداری قائم رکھنے کے لئے غلط مسائل اور جھوٹی روایتیں توریت شریف میں لکھ کر لوگوں کے سامنے پیش کردیتے ہیں اور نہایت دلیری سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے یعنی توریت کی اصل عبارت ہے اگر یہ کسی پرانی لکھی ہوئی کتاب کو اپنی خوش عقیدگی سے من اللہ کہہ دیتے تو بھی ایک بات تھی۔ غضب تو یہ ہے کہ خاص اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے کو من اللہ کہہ دیتے ہیں یہ دین فروشی بے ایمانی خدا پر جھوٹ باندھنا اس کی کتاب کو بگاڑنا ایسے ایسے سنگین جرم کس لئے ہیں صرف چند پیسے کمانے کیلئے تف ہے ان کے اس لکھنے پر اور لعنت ہے ان کی اس کمائی پر۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** گمراہ کن کتابیں اور جھوٹے مضامین گمراہ کرنے کیلئے لکھنا اور چھاپنا حرام ہے ہاں کسی کے غلط مضامین کو مع تردید شائع کردینا جائز بلکہ سنت الٰہی ہے۔ **دوسرا فائدہ:** حرام کام پر اجرت لینا حرام اور اس کا استعمال کرنا سخت گناہ لہٰذا ناچ گانے وغیرہ کی اجرت حرام ہے **تیسرا فائدہ:** جانبین کی رضامندی سے حرام مال حلال نہیں ہوتا دیکھو علماء یہود کو ان کے جہلا تحریف کے عوض رضامندی سے مال دیتے تھے مگر وہ حرام رہا۔ اسی طرح رشوت وسود وغیرہ اگرچہ رضامندی سے دیا جائے مگر وہ حرام ہے۔ **چوتھا فائدہ:** قرآن پاک کا ترجمہ اس کی تفسیر سورتوں کے نام وقف اور ربع اور نصف اور ثلث کی علامتیں اس طرح لکھنا کہ جس سے قرآن میں اور ان میں فرق نہ رہے حرام ہے کیونکہ اس سے اصل قرآن مشتبہ ہو جائے گا اور یہ تحریف ہے اسی لئے نصف اور ربع اور رکوع کی علامتیں اس کے حاشیہ پر لکھی جاتی ہیں اور سورتوں کے نام اور ترجمہ اگرچہ قرآن کے ساتھ ہی لکھے جاتے ہیں مگر خطوط کھینچ کر اور تحریر وغیرہ میں بہت طرح فرق کردیا جاتا ہے تاکہ رب کا کلام ہمارے کلام سے مل نہ جائے بلکہ فقہا فرماتے ہیں کہ کلام الٰہی کو نستعلیق (اردو خط) میں لکھنا منع ہے نسخ (یعنی عربی عبارت تحریر) میں لکھنا ضروری ہے بلکہ چاہئے کہ قرآن کی تحریر میں مصحف عثمانی کی پیروی کی جائے۔ اسی طرح پڑھنے میں بھی فرق ضروری ہے۔ **پانچواں فائدہ:** حرام روپے سے جو چیز خریدی جائے وہ بھی حرام ہے۔ رشوت یا سود کے روپے سے غلہ وغیرہ جو خریدا جائے سب حرام۔ حرام مال کو راہ خدا میں خیرات کرنا حرام ہے اور اس پر ثواب کی امید رکھنا کفر ہے۔ جیسے یَكْسِبُوْنَ کے عموم سے معلوم ہوا **چھٹا فائدہ:** الحمد للہ کہ قرآن کریم جیسا آیا ویسا ہی محفوظ ہے۔ صحابہ کرام نے نہ قرآن بدلا نہ اس کا کوئی حکم ورنہ اگر ایک آیت یا ایک حکم بدلا ہوتا تو بدلنے والے بھی مجرم ہوتے اور بدلتا دیکھ کر خاموش رہنے والے اہل بیت بھی اس میں داخل ہو کر مجرم ہوتے۔ خیال رہے کہ اعراب قرآن بھی قرآن کی طرح نازل ہوئے کہ حضرت جبرائیل نے الحمد کے دال کو پیش اور اللہ کے نام کو زیر سے پڑھا مگر ان اعراب کا لگانا بعد میں ہوا تاکہ عربی سے ناواقف، اترے ہوئے اعراب کو غلط نہ پڑھیں۔ یہ کتاب میں خلط نہیں بلکہ صحیح رہبری ہے۔ غرضیکہ قرآن کے اعراب، احکام سب محفوظ ہیں اس لئے حضرات خلفاء نے اپنی خلافت میں یہ ہی قرآن پڑھا اس پر عمل کیا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت میں تین جگہ ویل کیوں فرمایا گیا۔ ایک ہی جگہ کافی تھا۔ **جواب:** پہلے ویل میں اجمال ہے۔ اس سے شبہ ہوتا تھا کہ شاید تحریف کرنے اور جھوٹ بولنے اور حرام کمائی کرنے پر ویل ہے۔ فقط ایک کام کرنے میں کوئی خرابی نہیں اس کو دفع کرنے کے لئے آگے ہر فعل میں علیحدہ ویل فرمایا۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن لکھ کر فروخت کرنا حرام ہے جو یہ کاروبار کرتے ہیں کیونکہ اس آیت میں کتاب الٰہی لکھ کر اجرت لینے پر ویل فرمایا گیا ہے۔ نیز ابراہیم نخعی اور اعمش نے قرآن لکھنے کی اجرت سے منع فرمایا۔ اس پر یہی آیت پیش کی عبداللہ ابن یزید ختمی اور

قاضی شریح نے فرمایا کتاب اللہ کی قیمت مت لو۔ حضرت مطرف فرماتے ہیں کہ ہم ایک جنگ میں ابوموسیٰ اشعری کے ساتھ تھے۔ مال غنیمت میں دو کتابوں کے صندوق بھی آئے جن میں ایک میں توریت یا انجیل تھی لشکر میں ایک عیسائی مزدور تھا اس نے یہ کتاب خریدنا چاہی مسلمانوں نے کتاب اللہ کا بیچنا مکروہ جانا اس کو کتاب تو مفت دے دی اور صندوق دو درم میں فروخت کر دیا بہت سے بزرگان دین حتی کہ امام اعظم کے استاد حضرت حماد بھی قرآن کریم کی تجارت مکروہ جانتے تھے حضرات عبداللہ ابن عمر جب بازار میں کسی کو قرآن شریف بیچتے ہوئے دیکھتے تو فرماتے کہ کاش میری زندگی میں کوئی حاکم پیدا ہو جو قرآن بیچنے والے کے ہاتھ کٹوائے، حضرت ابن عمر، عبداللہ ابن مسعود اور دیگر صحابہ کرام بھی قرآن کی تجارت بری جانتے تھے امام زین العابدین فرماتے ہیں کہ صحابہ کرام کے زمانہ میں قرآن بیچنے کا رواج نہ تھا بلکہ لوگ سادہ کاغذ اور قلم دوات لے کر منبر کے پاس بیٹھ جاتے اور ہر پڑھے لکھے مسلمان سے ایک دو ورق لکھوا لیتے تھے۔ اس آیت اور ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی لکھائی چھپائی کی اجرت حرام ہے۔ **جواب:** اس آیت کا ترجمہ غلط سمجھا گیا۔ علماء یہود صحیح توریت لکھ کر فروخت نہ کرتے تھے بلکہ اس میں اپنی طرف سے خلط کرتے تھے اور یہ فعل بغیر اجرت بھی حرام ہے اس لئے فرمایا گیا کہ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ نیز ان کے لکھنے پر ویل علیحدہ فرمایا گیا اور کمائی پر علیحدہ بیشک چاروں خلفاء کے زمانہ میں قرآن پاک کے فروخت کرنے کا رواج نہ تھا۔ یہ بدعت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے آخیر زمانہ میں مروج ہوئی لیکن یہ بدعت حسنہ ہے سیئہ نہیں۔ شروع شروع میں علماء نے اس آیت کی وجہ سے اس کو منع کیا۔ بعد میں غور سے معلوم ہوا کہ اس کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ یہ روشنائی کاغذ کی قیمت ہے اور لکھنے کی اجرت اسی لئے عبداللہ ابن عباس محمد ابن حنیفہ امام جعفر صادق اور امام محمد باقر یہاں تک کہ حسن بصری رضی اللہ عنہم نے بھی اس کے جواز کا فتویٰ دیا اور بعد میں اس جواز پر علماء کا اجماع ہو گیا۔ (تفسیر عزیزی) **تیسرا اعتراض:** اس آیت میں پہلے علماء یہود کے تین عیب بیان کئے گئے توریت کی تحریف کرنا اس کو رب کی طرف نسبت دینا اور اس پر روپیہ لینا۔ لیکن عذاب فقط تحریف اور کمائی پر بیان کیا گیا۔ کیا جھوٹ نسبت کرنے پر ویل نہ ہوگا۔ **جواب:** لکھنے میں یہ داخل ہو گیا تھا کیونکہ لکھنا اسی لئے تھا۔ لہٰذا اس کے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

تفسیر صوفیانہ

گناہ نفس کی بیماری ہے اس کے چار درجے ہیں پہلا درجہ یہ ہے کہ گنہگار گناہ کو برا جان کر کرے اور اپنے کو اس پر ملامت بھی کرتا رہے۔ یہ حالت قابل علاج ہے۔ دوسرا یہ کہ گناہ کا احساس ہوتا رہے یہ حالت بھی قابل علاج تو ہے مگر بمشکل تیسرا درجہ یہ ہے کہ گناہ کا احساس بھی نہ رہے اور نصیحت کرنے والے کو دشمن جانے اس کا علاج بہت مشکل ہے اگر تقدیر سے کوئی قابل روحانی طبیب مل گیا تب تو خیر ورنہ اس کا انجام ہلاکت روح ہے۔ چوتھا درجہ یہ کہ گناہ کو اچھا سمجھے اور اس پر فخر کرے اس کی اشاعت کرے اور چاہے کہ لوگ اس کے گناہ کی تعریف کریں۔ اس کا علاج تقریباً غیر ممکن ہے۔ علماء یہود کی بیماری اسی درجہ کی تھی جس کے متعلق رب نے اپنے نبی ﷺ کو ان کی شفا یعنی ایمان سے مایوس کر دیا۔ جو شخص اپنے گناہ پر تعریف

کرائے اور اس تعریف سے خوش ہو۔ وہ اس بے وقوف کی طرح ہے جس سے کوئی مسخرہ کہے کہ آپ کے پاخانے کی خوشبو مشک وعنبر کی طرح ہے اور وہ اس پر خوش ہو۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ ویل ہے اس متکبر واعظ کے لئے جو لوگوں کی دست بوسی پر فخر کرے اور اپنے ہر کلام کی سامعین سے تعریف چاہے۔ حضرت جنید بغدادی نے ایک بار وعظ میں فرمایا کہ میں وعظ کہنے کی اس لئے ہمت کرتا ہوں کہ حضور نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ فاسق فاجر آدمی سے بھی اس دین کو قوت دے گا۔ میں فاجر فاسق ہوں شاید اللہ میرے وعظ سے دین کو قوت دے دے اس آیت سے ہم سب کو عبرت پکڑنی چاہئے۔ اگر انسان کی زندگی اللہ کے لئے ہو تو اس کے ہر عمل پر بے عنایت ثواب ہے اور اگر نفس کے لئے ہو تو ہر عمل برباد، بلکہ باعث عذاب حضور کے اوصاف چھپانے کے لئے توریت وانجیل بلکہ قرآن ڈھونڈنا کفر ہے۔ حضور کے اوصاف ظاہر کرنے کے لئے ان میں ہر چیز سیکھنا، دیکھنا عبادت ہے۔ اگر صفروں کی کسی عدد سے وابستگی ہو تو ہر صفر شمار بڑھائے گا۔ ایک صفر دہائی بنائے گا۔ دوسرا سینکڑا۔ تیسرا ہزار چوتھا دس ہزار حتیٰ کہ اگر زیادہ صفر ہوں تو شمار ہمارے حساب سے باہر ہوگا۔ مگر صفروں کی یہ ساری بہار اس ایک عدد سے ہے جس سے یہ وابستہ ہیں اگر یہ عدد ہٹ جائے تو سارا کھیل بگڑ جاوے دنیا کا ہر کام صفر ہے۔ حضور عدد اگر ان سے تعلق ہے تو ہر کام پر بے حد ثواب ورنہ ہر کام وبال۔ زندگی موت، سونا جاگنا سب کا یہ حال ہے (از روح البیان)

وَ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ
اور کہا انہوں نے ہرگز نہیں چھوئے گی ہم کو آگ مگر دن گنے ہوئے فرمادو کیا ہے لیا تم
اور بولے ہمیں تو آگ نہ چھوئے گی مگر گنتی کے دن تم فرمادو کیا خدا سے
عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗۤ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ
نے نزدیک اللہ کے وعدہ پس ہرگز نہ خلاف کرے گا اللہ وعدہ اپنا یا کہتے ہو تم اوپر اللہ کے
تم نے کوئی عہد لے رکھا ہے جب تو اللہ ہرگز اپنا عہد خلاف نہ کرے گا یا خدا پر
مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۸۰ بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّ اَحَاطَتْ بِهٖ
وہ جو نہیں جانتے تم ہاں وہ جو کمائے گناہ اور گھیرے اس کو
وہ بات کہتے ہو جس کا تمہیں علم نہیں ہاں کیوں نہیں جو گناہ کمائے اور اس کی خطا اسے گھیرے
خَطِيْٓئَتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۸۱
خطا اس کی پس وہ لوگ آگ والے ہیں وہ لوگ بیچ اس کے ہمیشہ رہنے والے ہیں
وہ دوزخ والوں میں ہیں انہیں ہمیشہ اس میں رہنا ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** اس سے پہلے موجودہ یہودیوں کے دو عیب بیان ہو چکے اب ان کا تیسرا عیب بیان ہو رہا ہے۔ فرق یہ ہے کہ وہ ان کے عیب فعلی تھے یہ قولی۔ یعنی پہلے فرمایا گیا تھا کہ وہ یہ کرتے ہیں اب ارشاد ہو رہا ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں۔ **دوسرا تعلق:** اس سے پہلے موجودہ یہود کی بدعملیوں کا ذکر تھا اب اس کی وجہ بتائی جا رہی ہے۔ یعنی ان کو ان بدکاریوں کی اس لئے ہمت پڑی کہ انہوں نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم جو چاہیں کریں ہم کو چند روز سے زیادہ عذاب نہ ہوگا۔ یا وہ سمجھ چکے ہیں کہ ہم کو چند روز عذاب ضرور ہوگا۔ خواہ نیکوکاری کریں یا بدکاری جب یہ ہونا ہی ہے تو ہم دنیا میں مزے کیوں نہ اڑالیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ان کی آس یا یاس نے انہیں گناہ پر دلیر کر دیا۔

شان نزول

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہود کہتے تھے کہ ہم دوزخ میں صرف اتنی مدت رہیں گے، جتنی کہ ہمارے باپ داداؤں نے بچھڑے کی پوجا کی ہے۔ یعنی چالیس دن اس کے بعد عذاب سے چھوٹ جائیں گے اس پر آیت کریمہ نازل ہوئی (تفسیر خزائن العرفان)

تفسیر

وَقَالُوْا یہ سارے یہودیوں کا قول ہے علماء تو اپنی طرف سے بنا کر کہتے تھے جاہل ان کی پیروی سے یعنی کہا کہ ان سب یہودیوں نے کہ لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ ہم کو آگ چھوئے گی بھی نہیں۔ خواہ کتنے ہی بدکاریاں اور کفریات کرلیں۔ یعنی آگ میں رہنا تو کیا ہم کو اس کے شعلے بھی نہ پہنچیں گے اِلَّآ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَةً مگر گنتی کے دن اس اِلَّا سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ہم جہنم میں کبھی نہ رہیں گے ہاں کچھ دن ہم کو آگ کے شعلے پہنچ جائیں گے اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ گنتی کے دن سے کیا مراد بعض نے فرمایا کہ تھوڑے دن، خواہ کتنے بھی ہوں جیسے کہا جاتا ہے وہاں گنتی کے آدمی تھے۔ بعض نے کہا سات دن کیونکہ ایام جمع قلت ہے جو دس تک بولی جاتی ہے اور وہ سات دن اس لئے کہتے تھے کہ بنی آدم کی زندگی کل سات ہزار سال ہے اور قیامت کا ایک دن ایک ہزار برس کے مقابلہ میں ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّكَ كَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ (حج: ۴۷) اس حساب سے ہم کو سات دن آگ پہنچے گی۔ بعض نے کہا کہ اس سے چالیس دن مراد ہیں کیونکہ اسی قدر انہوں نے بچھڑے کی پوجا کی تھی اور ایام اگرچہ جمع قلت ہے مگر مجازاً دس سے زیادہ پر بھی بولا جاتا ہے۔ جیسے قرآن کریم نے ماہ رمضان کے بارے میں فرمایا۔ اَیَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ بعض نے فرمایا۔ چالیس سال جس قدر کہ وہ میدان تیہ میں پریشان رہے۔ بعض یہودی کہتے تھے کہ جہنم کے دو کناروں میں چالیس سال کا فاصلہ ہے جب ہم جہنم میں جائیں گے تو وہاں ٹھہریں گے نہیں بلکہ اپنے باپ داداؤں کی شفاعت کے زور سے گزرتے رہیں گے اور چالیس برس میں اس فاصلہ کو طے کرلیں گے۔ ہمارے باپ دادا انبیاء کرام، رب تعالیٰ کے ہاں ایسے دخیل کار ہیں کہ رب کو ان کی ہر بات دب کر ماننی پڑتی ہے۔ رب تو چاہے گا کہ ہم دوزخ میں گر جائیں مگر ہمارے باپ دادا زور دے کر ہم کو پار لگا دیں گے۔ اس قسم کی

شفاعت اور وسیلہ ماننا کفر بلکہ شرک ہے رب تعالیٰ دھونس دو باؤ سے پاک ہے۔ لَمۡ یَکُنۡ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ (الاسراء:۱۱۱) اس پر گواہ ہے بعض یہودی کہتے تھے کہ ہر شخص کو بقدر گناہ عذاب ہوگا۔ یعنی بلوغ کے بعد جتنے دن اس نے گناہ یا کفر کیا اتنے ہی دن اسے عذاب رہے گا۔ کیونکہ گناہ سے زیادہ عذاب دینا ظلم ہے اور خدا اس سے پاک ہے بعض کہتے تھے کہ روح اصل میں پاک صاف نورانی ہے برے کاموں سے کچھ مکدر ہو جاتی ہے مرنے کے بعد کچھ روز اس پر گناہوں کا عذاب رہتا ہے۔ اسی کا نام عذاب ہے اور پھر وہ صاف ہو کر اپنی اصلی حالت پر آ جاتی ہے۔ جیسے پانی اصل میں ٹھنڈا ہے آگ پر رکھنے سے گرم ہو جاتا ہے اور اس کے بعد بھی کچھ دیر گرم رہتا ہے۔ پھر خود بخود ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ بعض کہتے تھے کہ ہم خدا کے پیارے اور اس کے بیٹے ہیں ہم کو وہ ہرگز عذاب نہ دے گا بلکہ پیارے باپ کی طرح کچھ دن بطور تنبیہ سزا دے گا۔ بعض کہتے تھے کہ گناہوں کی طرح کفر کا عذاب بھی دائمی نہیں بلکہ کافر کی بھی آخر میں نجات ہے۔ سبحان اللہ قرآن کریم نے ان کی اتنی بکواس کو ایک لفظ میں بیان فرما دیا۔ یہ تو ان کا عقیدہ تھا۔ اب ان کی کیا ہی نفیس تردید فرمائی جاتی ہے۔ قُلۡ اَتَّخَذۡتُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ عَهۡدًا اے محبوب ان سے پوچھو تو الخ۔ کیا تم نے اس کا خدا سے کوئی وعدہ یا پروانہ لے رکھا ہے۔ یعنی آخرت کی باتیں عقل وقیاس سے معلوم نہیں ہو سکتیں اس کے لئے نقل اور سننے کی ضرورت ہے جو انبیاء کرام سے حاصل ہو سکتا ہے۔ تو کیا تم نے توریت وغیرہ میں کہیں یہ ہمارا عہد پڑھا ہے؟ لاؤ کتاب دکھاؤ اور یقیناً کسی آسمانی کتاب میں تو ہے نہیں۔ خیال رہے کہ اَتَّخَذۡتُمۡ میں دو ہمزہ تھے۔ ایک استفہامیہ اور دوسرا باب افتعال کا مگر پہلے کی وجہ سے دوسرا گر گیا اور یہ استفہام انکاری ہے نیز یہاں عہد سے مراد فقط خبر ہے کیونکہ رب کی خبر بھی عہد کی طرح پختہ ہوتی ہے اور عند اللہ ثابت کا ظرف بن کر عہد کا حال ہے یعنی کیا تم نے کوئی عہد کیا ہے جو اللہ کے نزدیک ثابت ہو۔ فَلَنۡ یُّخۡلِفَ اللّٰهُ عَهۡدَهٗۤ یہ یا تو چھپی شرط کی جزا ہے۔ اور یا عہد کا نتیجہ یعنی اگر تم نے عہد لیا ہے تو خدا ہرگز اس کے خلاف نہ کرے لیکن شرط تو غلط ہے تو جزا بھی ختم یا یہ مطلب ہے کہ کیا تم نے خدا سے عہد لیا ہے کہ اس کے خلاف نہ کرے یعنی نہ وہ ہے نہ یہ اَمۡ تَقُوۡلُوۡنَ عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ یا اللہ پر تم وہ بات کہتے ہو جس کو تم جانتے نہیں اس جملہ کی دو تفسیریں ہیں ایک یہ کہ آخرت کی باتیں نبی کے فرمان سے معلوم ہوتی ہیں نہ کہ اپنی رائے سے اور تم نے یہ باتیں رائے سے کہیں ہیں۔ لہٰذا ان کا اعتبار نہیں کیونکہ ان چیزوں میں رائے علم کا ذریعہ نہیں۔

دوسری تفسیر

یہ ہے کہ ان کے ہاں یہ مشہور تھا کہ حق تعالیٰ نے یعقوب علیہ السلام سے عہد کیا ہے کہ میں تمہارے بیٹوں کو عذاب نہ کروں گا مگر قسم پوری کرنے کے لئے۔ اس بنا پر یہودی کہتے تھے چونکہ ہم بھی ان کی اولاد ہیں۔ لہٰذا ہم کو بھی ایسا ہی عارضی عذاب ہو گا۔ اول تو اس واقعہ کی معتبر سند تمہارے پاس موجود نہیں پھر تم نے اس پر یقین کیسے کر لیا دوسرے اگر یہ صحیح بھی ہو تو یعقوب علیہ السلام کے بیٹیوں سے مراد ان کے اپنے فیملی بیٹے ہیں نہ کہ سارے بنی اسرائیل۔ تیسرے ان بیٹوں کو عذاب نہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے خطا کر کے اپنے والد اور خود یوسف علیہ السلام سے معافی چاہ لی اور ان صاحبوں نے ان سب کے

لئے دعائے مغفرت بھی کر دی جس سے حق اللہ اور حق العباد دونوں معاف ہو گئے اور وہ بخش دیئے گئے۔ اے اسرائیلیو تم کفر گناہ پر قائم ہو اور اللہ اور بندوں کے حق مار رہے ہو اور پھر بھی اپنے کو اس بشارت میں داخل سمجھتے ہو۔ ہاں ان کی طرح توبہ کر لو تو تم بھی بخش دیئے جاؤ گے۔ اے اسرائیلیو کیا تم اللہ پر وہ بات کہتے ہو۔ جس کی تم نے تحقیق بھی نہیں کی اور جس کا تم نے مطلب بھی صحیح نہ سمجھا۔ بَلٰی یہ حرف نفی کے بعد آتا ہے اور نفی کا ثبوت کرتا ہے اور نعم یا تو ایجاب کے بعد آتا ہے یا نفی کو ثابت کرتا ہے یعنی ہاں تم کو عذاب دائمی ہوگا۔ جیسے رب نے ارشاد فرمایا تھا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ (اعراف:۱۷۲) کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں تو سب نے عرض کیا تھا بلٰی یعنی ہاں تو رب ہے اگر وہ جواب میں نعم کہتے تو معنی ہوتے کہ ہاں تو رب نہیں مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً قرآن کریم میں کسب دلی یا جسمانی اعمال کرنے کو کہا جاتا ہے مالی اعمال کو عموماً کسب نہیں کہتے رب فرماتا ہے لَهَا مَا كَسَبَتْ (بقرہ:۲۸۶) اور فرماتا ہے لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى (نجم:۳۹) یعنی بدنی و قلبی اعمال خود کرنے والے کے لئے ہیں دوسرے کی طرف سے نہیں ہو سکتے مالی اعمال میں نیابت کی نفی۔ سَيِّئَةً، سُوْءٌ سے بنا بمعنی برائی اس میں جسمانی روحانی جنانی برائیاں سب داخل ہوتی ہیں۔ خیال رہے کہ برائی بھلائی کا کوئی معیار یا کسوٹی چاہئے وہ حضور کی زبان پاک ہے۔ جس چیز جس شخص کو حضور برا کہیں اگرچہ دنیا بھر کی عقلیں اچھا کہیں تو وہ بری ہے۔ جیسے سود یا ابوجہل یونہی اسکے عکس جیسے زکوۃ یا حضرت بلال لہٰذا آیت کے معنی یہ ہوئے کہ جو کوئی بھی گناہ کرے یا تو سیئہ سے مراد مطلق گناہ ہے یا گناہ کبیرہ اور یا کفر (روح البیان وعزیزی) اور اس کے نکرہ ہونے سے عموم کا فائدہ ہوا یعنی جو بھی کسی قسم کا کفر کرے یا کوئی سا گناہ کبیرہ کرے مگر حال یہ ہو کہ وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓئَتُهٗ، خَطِيْٓئَتُهٗ خطا کی جمع ہے خطا کبھی عمد کے مقابل بولی جاتی ہے۔ بمعنی لغزش یا بھول چوک رب فرماتا ہے۔ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا (بقرہ:۲۸۶) اس معنی سے انبیاء کرام پر بھی بولی جاتی ہے۔ جیسے آدم علیہ السلام نے خطأ گندم کھالیا اور کبھی صواب کے مقابل یعنی سیدھے راستہ سے بھٹک جانا اس معنی سے گنہگاروں یا کفار پر بولی جاتی ہے یہاں دوسرے معنی میں ہے مطلب یہ ہے کہ اس کا گناہ اس کا گھیرے اور احاطہ کرے۔ اگر سَيِّئَةً سے مراد کفر تھا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ کفر اس کے دل و دماغ اور زبان کو گھیر لے یعنی وہ دل میں کفر کا عقیدہ رکھے اور زبان سے اس کا اظہار کرے لہٰذا جو مجبوراً منہ سے کلمہ کفر نکال دے وہ اس سے خارج ہے یا یہ کفر اس کی زندگی کو گھیر لے اور اس کا خاتمہ اس کفر پر ہو۔ جو کافر مرنے سے پہلے مسلمان ہو گیا وہ اس میں داخل نہیں کیونکہ کفر نے اس کی زندگی نہ گھیری اور اگر سیئہ سے مراد گناہ ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ گناہ اس کے دل و دماغ اور ظاہری اعضا کو گھیر لے۔ اس طرح کہ ہاتھ پاؤں سے گناہ کرے اور دل سے اسے حلال جانے۔ لہٰذا گنہگار مسلمان اس میں داخل نہیں کیونکہ اس کا دل گناہ سے بچا ہوا ہے۔ یا وہ گناہ اس کی نیکیوں کو گھیر لے اور ان کو ضائع کر دے۔ یعنی گناہ حد کفر تک پہنچ جائے۔ جس سے نیکیاں برباد ہو جائیں۔ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (حجرات:۲) بہرحال اس سے کفر مراد ہے۔ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ پس یہی لوگ آگ والے ہیں اگرچہ کچھ روز گنہگار بھی دوزخ میں رہیں گے لیکن وہ آگ والے نہیں آگ والا تو وہ ہے جس کی خاطر آگ بنی اور آگ اس کو لازم ہو جائے اگرچہ بعض کفار جہنم کے ٹھنڈے طبقے میں رہیں گے۔ مگر چونکہ وہاں کی ٹھنڈک آگ کی دوری کی

وجہ سے ہوگی اس لئے وہ بھی آگ والے ہیں هُمْ فِيهَا خٰلِدُوْنَ یہ حقیقت میں اصحاب النار کا ترجمہ ہے یعنی وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے چونکہ گناہ نے ان کو گھیر لیا تھا اس لئے عذاب ان کے سارے وقتوں کو گھیرے گا۔

خلاصہ تفسیر

ان یہود کی تمام بدعملیوں کی وجہ یہ ہے کہ وہ یہ سمجھ چکے ہیں کہ ہمیں چند روز ہی عذاب ہوگا اس کے بعد آگ ہم کو چھوئے گی بھی نہیں لہٰذا ہم جو چاہیں سو کر لیں اے نبی ﷺ آپ ان سے اتنا تو پوچھیں کہ تم نے کوئی خدا سے اس قسم کا معاہدہ کر لیا ہے جس کے وہ خلاف نہ کرے یا ویسے ہی اس کے ذمہ ایسی بات لگاتے ہو جس کی تمہارے پاس کوئی علمی سند نہیں۔ آخرت کے معاملہ میں محض قیاس کو دخل نہیں ہاں یقیناً تم جہنم میں ہمیشہ رہو گے کیونکہ ہمارا یہ قانون ہے کہ جو شخص قصداً گناہ کرے اور وہ گناہ اس کے ظاہر و باطن کو گھیرے یا جو شخص کفر کرے اور اس پر ہی اس کا خاتمہ ہو جائے وہ دوزخی ہے اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہاں عہد سے مراد کلمہ طیب ہے جو شخص صدق دل سے کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جائے اور اسی پر اس کا خاتمہ ہو۔ رب تعالیٰ کا اس سے بخشش کا وعدہ ہے۔ اب آیت کی تفسیر یہ ہوئی کہ اے یہودیو! تم جو کہتے ہو کہ ہم کو چند روز عذاب ہو کر ختم ہو جاوے گا تو کیا تم کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گئے ہو! کیونکہ عذاب کے بعد بخشش ہونا گنہگار مسلمان کے لئے ہے جب تم نے اسلام قبول نہ کیا تو غلط امید کیوں رکھتے ہو تم تو ہمیشہ ہی دوزخ میں رہو گے کیونکہ تم کافر ہو۔ خیال رہے کہ رب تعالیٰ کے بندوں سے وعدہ فرمانے کی چند صورتیں ہیں ایک براہ راست بلاواسطہ جو میثاق کے دن ہوا کہ بندوں نے رب سے اطاعت اور فرمانبرداری کا وعدہ کیا رب نے ان سے انبیاء کرام بھیجنے اور مطیعوں کو بخشنے کا وعدہ کرم فرمایا۔ دوسرے انبیاء کرام کے ذریعہ عمومی وعدہ جو مشروط طور پر کیا گیا۔ جیسے مومن و متقی سے جنت کا وعدہ اور سچے مومنوں سے سربلندی کا وعدہ تیسرے خود نبی کا کسی سے وعدہ فرمالینا جیسے حضور نے حضرت عثمان سے جنت و کوثر کا وعدہ فرمایا کہ ارشاد ہوا۔ عثمان جو چاہیں کریں وہ جنتی ہو گئے یا طلحہ نے اپنے لئے جنت واجب کر لی یہ وعدہ بھی رب کا وعدہ ہے۔ وزیر خارجہ کے دورے کرنا حکومت کے وعدے ہوتے ہیں۔ چوتھے یہ کہ رب تعالیٰ بذریعہ نبی کسی سے خاص اور غیر مشروط وعدہ فرمائے۔ جیسے قرآن کریم نے انصار و مہاجرین ابوبکر صدیق یا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے وعدے فرمائے۔ یہاں فرمایا جارہا ہے کہ تم سے براہ راست یا پیغمبر کی معرفت رب نے یہ وعدے کئے ہیں یا موسیٰ علیہ السلام تم سے جنت کا وعدہ کر گئے ہیں۔ یا محض اپنی عقل سے اپنے جنتی ہونے کا یقین کر بیٹھے ہو۔ اگر رب کا وعدہ ہے تو توریت دکھاؤ اور اگر عقل کے اندازے سے کہتے ہو تو ان غیبی خبروں میں عقل کام نہیں آتی۔ (تفسیر عزیزی)

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ:** رب سے بےخوفی ناامیدی انسان کو گناہ پر دلیر کرتی ہے۔ جیسا کہ ان یہود کی حالت سے معلوم ہوا۔ مسلمان کے لئے رب کا خوف اور اس سے امید ضروری ہے۔ **دوسرا فائدہ:** وعدہ خلافی عیب ہے اور رب تعالیٰ ہر عیب سے پاک لہٰذا وہ وعدہ خلافی اور جھوٹ سے پاک ہے علماء کرام فرماتے ہیں کہ جھوٹ

شان خدائی کے خلاف ہے۔ دیوبندی رب کا جھوٹ بولنا، وعدہ خلافی کرنا ممکن مانتے ہیں جس کے معنی یہ ہوئے کہ اس سے سلب الوہیت ممکن ہے۔ ہم اس مسئلہ کی تحقیق اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (بقرہ:۲۰) کی تفسیر میں کر چکے وہاں دیکھو۔

تیسرا فائدہ: بے دلیل بات قابل قبول نہیں۔ حق تعالیٰ نے یہود کی یہ بے دلیل بات رد فرما دی۔ **چوتھا فائدہ:** ممکن چیز کے ہونے یا نہ ہونے کی نقلی دلیل چاہئے۔ محض قیاس سے یہ ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ (تفسیر کبیر) **پانچواں فائدہ:** جو کفر پر مراوہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا۔ اس کی بخشش ناممکن ہے۔ اسی لئے اس کے لئے دعائے مغفرت کرنا اسے مرحوم وغیرہ کہنا سخت منع ہے اور مسلمان خواہ کیسا ہی مجرم ہو آخر کار اس کی بخشش ضرور ہوگی وہ دوزخ میں ہمیشہ نہ رہے گا۔

چھٹا فائدہ: قطعی گناہ کو جائز جاننا کفر ہے جیسا کہ اَحَاطَتْ بِهٖ خَطِیْٓئَتُهٗ کی تفسیر سے معلوم ہوا۔

مسئلہ: گنہگار مسلم کے متعلق بہت سے قول ہیں خارجی اس کو کافر کہتے ہیں معتزلی کہتے ہیں کہ وہ نہ مومن ہے نہ کافر بعض کے نزدیک کفار کی طرح وہ ہمیشہ دوزخ میں رہے گا اور بعض نے بہت تفریط کی وہ کہتے ہیں کہ آخر کار کافر کی بخشش ہو جائے گی فرقہ مرجیہ کہتا ہے کہ ایمان کے ہوتے گناہ مضر نہیں انسان ایمان درست کر کے جو چاہے عمل کرے یہ تمام اقوال باطل ہیں مذہب اہل سنت یہ ہے کہ گنہگار مسلمان ہے اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے اس کی تجہیز و تکفین کی جاوے اور وہ جہنم میں ہمیشہ نہ رہے گا۔ بعض بغیر سزا اور بعض کچھ سزا پا کر آخر نجات پا جائیں گے۔ نیز ایمان کے ساتھ اعمال کی بھی سخت ضرورت ہے کوئی بھی اعمال سے بے پرواہ نہیں رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِهٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ (النساء:۱۱۶) اس سے خارجی و معتزلہ مذہبوں کی تردید ہوگئی۔ نیز فرماتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا (کہف:۱۰۷) اس میں مذہب مرجیہ کا ابطال ہے یہ نہ سمجھو کہ مذہب مرجیہ ختم ہو چکا ہے۔ یہ مذہب موجود ہے مگر اب اس کا نام دوسرا ہے۔ پنجاب میں دتہ شاہی مذہب پھیل رہا ہے۔ عام ملنگ، فقیر، بھنگی چرسی اس عقیدے میں گرفتار ہیں کہ ایمان کے ساتھ اعمال کی کوئی ضرورت نہیں وہ دن رات بھنگ چرس میں مست ہیں بعض بے دین پیر لوگوں کو اس شرط پر مرید کرتے ہیں کہ وہ نمازیں چھوڑ دیں۔ یہ سب درحقیقت مرجیہ ہی ہیں۔ حدیث پاک میں ان کے متعلق ارشاد ہوا کہ میری امت کے دو گروہ ایسے ہوں گے جن کا اسلام میں کوئی حصہ نہیں ایک مرجیہ دوسرا قدریہ حق تعالیٰ ان سب فرقوں سے محفوظ رکھے اور مذہب سنت پر خاتمہ نصیب فرمائے آمین۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ قیاس کرنا سخت گناہ بلکہ کفر ہے۔ کیونکہ یہود نے قیاس سے اپنا چند روزہ عذاب مانا اور آیت نے ان کی سخت تردید کر دی اور حنفی، شافعی وغیرہ تمام مقلدین قیاس کرتے ہیں۔ لہٰذا یہ سب گمراہ ہیں۔ (غیر مقلد) **جواب:** اس کے چند جوابات ہیں ایک یہ کہ یہودیوں نے عقائد میں قیاس کیا یہ واقعی ناجائز ہے۔ مقلدین فروعی اعمال میں قیاس کرتے ہیں نہ کہ عقائد میں۔ دوسرے یہ کہ یہود نے خبر میں قیاس کیا کہ قیامت میں ہماری بخشش ہو جائے گی اور خبر میں قیاس نہیں ہو سکتا اس کے لئے نقلی دلیل ضروری ہے۔ ہم لوگ احکام شرعیہ میں قیاس کرتے ہیں۔ تیسرے

یہ کہ انہوں نے نص کے مقابل قیاس کیا۔ توریت نے کفار کی بخشش کا انکار کیا۔ انہوں نے قیاس سے اس کو ثابت کیا اور نص کے مقابل قیاس کرنا حرام ہے ان کا حال شیطان کا سا ہوا۔ ہم ایسا قیاس نہیں کرتے۔ جہاں نص نہ ہو وہاں مجبوراً قیاس ہوتا ہے۔ چوتھے یہ کہ ان کا قیاس فلسفی قیاس آرائی تھی کسی آیت سے اس کی تائید نہیں تھی۔ ہمارا قیاس شرعی ہوتا ہے جس کی آیت یا حدیث سے تائید ہوتی ہے۔ پانچویں یہ کہ ان کا قیاس بلا ضرورت تھا ہمارا قیاس شرعی ضرورت پوری کرنے کے لئے ہوتا ہے لہٰذا وہ قیاس بے دینی تھا۔ یہ قیاس دینی کوئی غیر مقلد بغیر قیاس زندہ نہیں رہ سکتا۔ فرق اتنا ہے کہ ہم مجتہدین کا قیاس لیتے ہیں اور وہ جہلا اور گمراہوں کا گویا ہم اماموں کے مقلد ہیں وہ نفس اور شیطان کے۔ **دوسرا اعتراض:** کافر کو ہمیشہ دوزخ میں رکھنا ظلم ہے۔ سزا جرم کے مطابق چاہئے نہ کہ ہمیشہ (آریہ) **جواب:** اس کے بھی چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ قانون سے زیادہ سزا دینا واقعی ظلم ہے اور قانونی سزائیں انصاف، رب کا قانون یہ ہے کہ حکومت الٰہیہ کے باغی یعنی کافر کی سزا ہمیشہ جہنم ہے لہٰذا یہ ہمیشگی ظلم نہیں چور آدھے گھنٹے میں چوری کرتا ہے اور دو چار دن میں چوری کا مال کھا پی لیتا ہے مگر اس کو سات یا دس سال کی جیل ہوتی ہے۔ ڈاکو کو عمر قید ہوتی ہے وہاں کوئی نہیں کہتا کہ اس نے ایک گھنٹہ میں جرم کیا اس کو ایک گھنٹہ ہی جیل میں رکھو بلکہ قانون نے چونکہ اس کی سزا یہی رکھ ہے لہٰذا یہ عین انصاف ہے ہاں جو حاکم قانون سے زیادہ سزا دے وہ ظالم ہے اس کی اپیل وغیرہ ہو کر کمی ہو جاتی ہے۔ دوسرے یہ کہ کافر نے رب کی بے انتہا نعمتیں کھا کر بے انتہا نافرمانی یعنی بغاوت کی چاہئے کہ اس کو بے انتہا سزا دی جائے آج بھی باغی کی سزا عمر قید یا پھانسی ہے مگر چونکہ وہاں موت نہیں اس لئے اس سزا کی انتہا نہیں اور یہاں موت اس زندگی کی انتہا ہے اس لئے یہ اس سزا کی انتہا تیسرے یہ کہ کافر اگر ہمیشہ زندہ رہتا تو ہمیشہ ہی کفر کرتا اور اگر دوبارہ بھی واپس کیا جاوے تو بھی کفر ہی کرے چونکہ اس کی سرکشی بے حد ہے لہٰذا سزا بھی بے حد قرآن کریم فرما رہا ہے وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ (انعام: ۲۸) عادی ڈاکو کی سزا پھانسی یا عمر قید ہے۔ بولو پنڈت جی تمہارے دھرم کا قانون ہے کہ جو چوری کرے وہ سات بار ہاتھی کی جون میں آوے۔ کیوں اس نے جرم تو صرف ایک گھنٹہ کیا اور اس کی سزا میں کم از کم سات سو سال تک ہاتھی بنا یہ جرم سے زیادہ سزا ہوئی یا نہیں اور یہ ظلم ہوا کہ نہیں۔ **تیسرا اعتراض:** روح ایک پاک چیز ہے۔ جس کے گناہ سے عارضی ناپاکی اس میں آ گئی تو چاہئے کہ مرنے کے بعد جب یہ ناپاکی جاتی رہے تب اس کی نجات ہو جاوے (نیچری) **جواب:** کفر و شرک ایسی گندگی ہے جس سے روح اصلاً گندی ہو کر ناقابل اصلاح ہو جاتی ہے جیسے کہ لوہا اور صاف شیشہ زنگ سے ناقابل اصلاح ہو جاتا ہے اب بھی بعض عادات و اخلاق سے انسان قابل اصلاح نہیں رہتا۔ لہٰذا ایسی گندی روح کو عذاب دائمی ہی ضروری ہے۔ کفر کی سمیت نے اس کی اصل بگاڑ دی۔ **چوتھا اعتراض:** چاہئے کہ روح کو سزا نہ ملے کیونکہ جرم جسم نے کیا ہے گناہ اعضاء سے ہوتے ہیں صرف جسم ہی کو سزا ہونی چاہئے (جہلا) **جواب:** ایک اندھا لنگڑے کو کندھے پر لے کر باغ میں چوری کرنے گیا۔ لنگڑے نے پھل توڑے اندھے نے وہاں تک پہنچایا۔ مالک نے ان دونوں کو پکڑ لیا تو دونوں ہی کی جوتہ کاری کرے گا۔ کیونکہ دونوں مجرم۔ جسم لنگڑا ہے اور روح اندھی ان دونوں نے مل کر رب کے احکام کے باغ کی چوری کی ہے لہٰذا دونوں عذاب کے مستحق ہیں۔ جسم بغیر

روح کچھ نہ کرسکتا تھا اور روح بغیر جسم مجبور تھی (اعلیٰ حضرت قدس سرہ،) نیز جسم بغیر روح عذاب نہیں پا سکتا۔ کیونکہ تکلیف کا احساس روح سے ہوتا ہے اس لئے روح کو عذاب ضروری ہے۔ ہماری گفتگو سے معلوم ہوا کہ کفار کے چھوٹے بچے جو نا سمجھی میں فوت ہو گئے وہ دوزخی نہیں کہ دوزخ صرف اپنے کسب سے ملتی ہے دنیا میں کبھی بروں کی وجہ سے اچھوں پر عذاب آ جاتا ہے مگر آخرت میں یہ نہ ہوگا۔

تفسیر صوفیانہ

روح کا تعلق جسم سے بھی ہے اور دل سے بھی مگر بمقابلہ جسم دل سے قوی تعلق ہے۔ لہٰذا جسمانی گناہ سے روح کی اصل صفائی جاتی رہتی ہے اور اس سے روحانی اخلاق علم وکرم، مروت و غیرت، شکر وصبر وغیرہ نکل کر اس میں حیوانی بلکہ شیطانی صفات پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کی صیقل صرف کلمہ طیبہ اور درستگی عقائد ہیں۔ اگر دنیا ہی میں یہ صیقل کر لی گئی تو خیر ورنہ آخرت میں اس کی اصلاح ناممکن ہے اور اس کی سزا دائمی عذاب ہے، علمائے بنی اسرائیل ان دو مرتبوں میں فرق نہ کر کے اور دونوں کو یکساں سمجھ بیٹھے دیکھو روح کا تعلق ناخن ہاتھ پاؤں اور دماغ و دل سبھی سے ہے۔ مگر مختلف کہ ناخن اور بال کاٹنے سے روح کو تکلیف بھی نہیں ہوتی اور دوسرے اعضاء کے بیکار ہو جانے سے اس کو تکلیف تو ضرور ہوتی ہے۔ مگر موت نہیں ہوتی لیکن دل و دماغ پر آفت آ جانے سے موت واقع ہو جاتی ہے۔ روح ایک ہے مگر اس کے تعلقات مختلف۔ ان یہودیوں نے دل و دماغ (عقائد) کو بال وغیرہ (اعمال) وغیرہ پر قیاس کر لیا اس کی تردید فرمائی گئی بادشاہ کا تعلق چوکیدار سے بھی ہے اور وزیراعظم سے بھی۔ لیکن وزیر کے بگڑنے سے سلطنت جائے گی نہ کہ چوکیدار کے بگڑنے سے۔

وَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ
اور وہ جو ایمان لائے اور کیا انہوں نے نیکیوں کو یہ لوگ جنت والے ہیں
اور ایمان لائے اور اچھے کام کیے وہ جنت والے ہیں انہیں
هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۸۲﴾
وہ لوگ بیچ اس کے ہمیشہ رہنے والے ہیں
ہمیشہ اس میں رہنا ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** اس سے پہلے دائمی جہنمیوں کا ذکر ہوا تھا۔ اب دائمی جنتیوں کا تذکرہ ہو رہا ہے کیونکہ ہر چیز اپنی ضد سے پہچانی جاتی ہے۔ **دوسرا تعلق:** اس سے پہلے جہنم میں پھنسانے والے عیوب بتائے گئے تھے اب جہنم سے بچانے والے صفات کا ذکر ہے۔ تاکہ لوگ ان سے بچیں اور یہ صفتیں اختیار کریں۔ **تیسرا تعلق:** اس سے پہلے علمائے یہود کی غلط بیانی بتا کر اس کی تردید کی گئی اب اس غلط بیانی کی وجہ بتائی جا رہی ہے اور

فرمایا جارہا ہے کہ توریت وغیرہ میں مومنین کے لئے وعدہ مغفرت کیا گیا تھا نہ کہ کفار کے لئے ان بیوقوفوں نے کفار کو بھی اس میں داخل سمجھ لیا۔ یہ آیت بھی بَلٰی کے تحت میں ہے **چوتھا تعلق**: اس سے پہلے رب کے قہر کا ذکر ہوا تھا۔ اب اس کی رحمت کا ذکر ہے تاکہ سننے والوں کو خوف اور امید حاصل ہو جس پر ایمان کا دارومدار ہے۔

تفسیر

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا جو لوگ علم الٰہی میں مومن ہیں یا وہ جو خاتمہ کے وقت ایمان پر رہے یا وہ جن کو ایمان معتبر نصیب ہوا اور اس کے ساتھ ہی وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ انہوں نے شائستہ اعمال بھی کئے۔ یعنی بقدر طاقت عبادات معاملات میں درست رہے بقدر طاقت کی اس لئے قید لگائی کہ بعض مومنین کو اعمال کرنے کا موقع ہی نہیں ملتا جیسے دیوانے اور نابالغ بچے اور وہ جو ایمان لاتے ہی مرجائیں اور موقعہ پانے والوں میں بھی مختلف لوگ ہیں۔ مساکین صرف نماز وروزہ کا موقعہ پاتے ہیں۔ مالدار حج اور زکوٰۃ کا بھی وغیرہ وغیرہ یہ لفظ ان سب کو شامل ہے اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یہی لوگ جن کے دل نور ایمانی سے روشن اور بدن گناہوں کی گندگی سے پاک ہیں۔ وہ جنت والے ہیں یعنی جنت ان کو لازم ہے اور وہ دوزخ میں کبھی جائیں گے ہی نہیں۔ خیال رہے کہ نیک اعمال کی قید جنت والا ہونے کے لئے ہے کیونکہ گنہگار مسلمان اگرچہ جنت میں پہنچ تو جائیں گے لیکن ان کا جنت والا ہونا یقینی نہیں جنت والا وہ ہے جو شروع سے جنت میں جائے۔ سزا بالکل نہ پائے۔ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یعنی جیسے پہلے فرقہ کی سزا دائمی ہے کیونکہ اس کے پاس نہ ایمان ہے نہ نیک عمل ایسے ہی اس فرقہ کی جزا دائمی کیونکہ اس کے پاس ایمان بھی ہے اور نیک عمل بھی۔ خیال رہے کہ دوزخ صرف اپنے کفر یا گناہ کے باعث ملے گی۔ مگر جنت ملنے کے تین طریقے ہیں اپنے اعمال سے یہ جنت کسبی ہے جیسے تمام مومنوں کا جنت میں جانا، دوسروں کے اعمال کے طفیل اسے جنت وہبی کہا جاتا ہے۔ جیسے مسلمانوں کے چھوٹے فوت شدہ بچے، بلا اعمال وبلا وسیلہ اسے جنت عطائی کہا جاتا ہے۔ جیسے وہ مخلوق جو جنت بھرنے کے لئے پیدا کی جاوے گی اس جیسی تمام آیات میں پہلی قسم یعنی کسبی کا ذکر ہے۔ لہٰذا آیات پر کوئی اعتراض نہیں اور نہ ہی یہ آیت دوسری آیتوں کے خلاف ہے۔

خلاصہ تفسیر

لوگ چار قسم کے ہیں ایک وہ جو ایمان اور اعمال دونوں سے خالی ہیں ان کا ذکر پہلی آیت میں ہوا کہ وہ ہمیشہ کے جہنمی ہیں دوسرے وہ جو ایمان اور نیک اعمال دونوں رکھتے ہیں۔ ان کا ذکر اس آیت میں ہوا کہ وہ ہمیشہ کے جنتی ہیں۔ دو فریق باقی بچے ایک وہ جن کا ایمان درست اور اعمال خراب یعنی فاسق مسلمان چونکہ یہ اگلے دونوں فریقے سے ملے ہوئے ہیں کہ عقیدے میں مسلمانوں کے اور اعمال میں کفار کے مشابہ ہیں لہٰذا ان کی جزاء بھی دونوں فریقوں کی جزاء سے ملی ہوگی۔ یعنی کچھ دن جہنم میں رہیں گے پھر جنت میں مکان ہوگا۔ جنت میں رہ کر پھر دوزخ میں نہ آئیں کیونکہ وہاں کسی کو سر بلند کر کے گرانا رب کی حکمت کے خلاف ہے ہاں گرے ہوئے کو اٹھانا عین کرم ہے۔ نیز وہ قلب سے مسلمان تھے اور یہ قالب سے کفار کے مشابہ اور قلب قالب سے اعلیٰ ہے۔ لہٰذا قالب کے جرم پر عارضی سزا پائیں گے اور قلب کی درستی کی وجہ سے بعد کو دائمی

بہشت۔ خیال رہے کہ یہ قانونی سزا ہے لیکن اگر رب کرم خسروانہ یا بزرگوں کی شفاعت سے اس کو بالکل بخش دے تو اس کی رحمت ہے۔ چوتھا وہ گروہ جو عقیدہ میں کافر مگر ان کے بعض اعمال اچھے جیسے صدقہ وخیرات کرنے والے کفار۔ ان کے متعلق خواہ یہ کہہ لو کہ جو کچھ انہوں نے دنیا میں کھاپی لیا اور آرام پالیا وہ ان کے اعمال کا بدلہ ہو گیا۔ آخرت میں ان کے لئے دائمی جہنم کیونکہ وہ قالب سے نیک تھے جو کہ عارضی چیز ہے اور قلب سے بد اور قلب اصلی چیز ہے اسی طرح دنیا میں جو کہ عارضی مقام ہے ان کو جزا دے دی گئی اور آخرت میں جو اصل مقام ہے سزا پائی یا یوں کہہ لو کہ کفار کا کوئی عمل نیک ہوتا ہی نہیں کیونکہ نیک اعمال کے لئے ایمان شرط ہے۔ لہٰذا ان کے صدقہ وخیرات کو عمل صالح نہیں کہہ سکتے اگرچہ بظاہر صالح معلوم ہوتے ہیں جیسے لکڑی کا گھوڑا اور قالین کا شیر کہ یہ اصلی گھوڑے اور شیر کے ہم شکل تو ہیں مگر حقیقتاً نہ گھوڑا ہیں نہ شیر اسی لئے قرآن کریم نے فرمایا کہ کفار کے اعمال اس سفید چمکدار ریت کی طرح ہیں جس کو پیاسا دور سے دیکھ کر پانی سمجھتا ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** یہ کہ ایمان نیک اعمال پر مقدم ہے کیونکہ یہ شرط ہے۔ **دوسرا فائدہ:** یہ کہ ایمان کے بغیر جنت نہیں مل سکتی۔ لیکن نیک اعمال کے بغیر جنت تو ملے گی مگر اس کا عذاب سے بچ جانا یقینی نہیں ممکن ہے کہ پہلے عذاب ہو جائے۔ لہٰذا اعمال سزا سے بچنے کے لئے ضروری ہیں۔ نیز ایمان سے جنت ملے گی اور اعمال سے وہاں کے درجات۔ **تیسرا فائدہ:** جنت میں پہنچ کر کوئی نہ نکلے گا مگر جہنم سے بہت خلوق نکلے گی۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: جس طرح بدکار کو کچھ روز جہنم میں رکھ کر جنت میں بھیجا جائے گا۔ اسی طرح چاہئے تھا کہ نیکوکار کافر کو کچھ روز جنت میں رکھ کر جہنم میں بھیجا جاتا۔ **جواب:** اس کا نہایت نفیس جواب خلاصہ تفسیر میں گذر چکا آپ اپنے عمدہ قالین پر گندے پاؤں والے کو نہیں آنے دیتے رب تعالیٰ بھی اپنے جنت کے قالین پر کافر کی گندی روح کو کیوں آنے دے۔ **دوسرا اعتراض:** اس کی کیا وجہ ہے کہ بعضے مسلمان تو سزا پا کر جنت میں جائیں گے مگر بعض کی ویسے ہی بخشش ہو جاوے۔ **جواب:** مقصود تو یہ ہے کہ کوئی میلی روح جنت میں نہ پہنچے پہلے ہی اس کو پاک کر دیا جائے۔ جس طرح دنیا میں ہم کسی چیز کو پانی سے پاک کرتے ہیں کسی کو آگ میں رکھ کر۔ اسی طرح پروردگار کسی گنہگار مسلمان کو رحمت کے پانی سے اور کسی کو دوزخ کی آگ سے پاک کر کے جنت میں بھیجے گا۔ یہ وہ خود جانتا ہے کہ کون کس لائق ہے۔ **تیسرا اعتراض:** پھر گندا شیطان آدم علیہ السلام کو بہکانے کے لئے جنت میں کیوں پہنچا۔ **جواب:** اس کا جنت میں پہنچنا یقینی نہیں۔ جیسا کہ ہم آدم علیہ السلام کے قصے میں بتا چکے کہ اس نے باہر رہ کر ہی اپنا کام کیا اور اگر گیا بھی ہو تو وہ خدا کا بلایا ہوا نہ گیا بلکہ خود چور کی طرح وہاں گھس پڑا۔ پھر وہاں سے نکال دیا گیا۔ بلائے جانے میں اور خود گھس جانے میں بڑا فرق ہے۔ **چوتھا اعتراض:** جب جنت ہمیشگی کی جگہ ہے تو آدم علیہ السلام وہاں سے کیوں باہر بھیجے گئے۔ **جواب:** جب اعمال کی جزا کے لئے جائیں گے تو وہاں ہمیشگی ہوگی آدم علیہ السلام کی وہ سکونت جزا کی نہ تھی۔

تفسیر صوفیانہ

جو طالبین کہ مومن ہوں اور شیخ طریقت کے اشارہ سے شریعت کے قانون کے مطابق ایسے نیک اعمال کریں جو حقیقت تک پہنچانے والے ہیں وہ ان اصول پر عمل کر کے جنت وصول کے حصول میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور دیدار یار سے فیض یاب اور پھر وہ ہمیشہ اس میں سیر کرتے رہتے ہیں کیونکہ اس راستے کی منازل اور مقاصد کی اگرچہ انتہا ہے لیکن ان کے سیر کی کوئی حد نہیں۔

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ
اور جب لیا ہم نے عہد اولاد سے یعقوب کی نہ پوجنا تم مگر اللہ کو
اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کو نہ پوجو
وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّ ذِي الْقُرْبٰى وَ الْيَتٰمٰى وَ الْمَسٰكِيْنِ
اور ساتھ ماں باپ کے احسان کا اور صاحب قرابت کے ساتھ اور یتیموں کے ساتھ اور غریبوں سے
اور ماں باپ کے ساتھ بھلائی کرو رشتہ داروں اور یتیموں اور مسکینوں سے
وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَّ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ ثُمَّ
اور کہو تم واسطے لوگوں کے اچھی بات اور قائم کرو تم نماز کو اور دو تم زکوۃ پھر
اور لوگوں سے اچھی بات کہو اور نماز قائم رکھو اور زکوۃ دو پھر تم
تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَ اَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۸۳﴾
پھر گئے تم مگر تھوڑے تم میں سے اور تم لوگ منہ پھیرنے والے ہو
پھر گئے مگر تم میں سے تھوڑے اور تم روگردان ہو

تعلق

اس آیت کا پچھلی سے چند طرح تعلق ہے **پہلا تعلق**: اس سے پہلے بنی اسرائیل کے ایمان سے مایوسی کی چند وجہیں بیان ہو چکیں۔ توریت کو بدل ڈالنا تھوڑی قیمت پر خدا کے احکام بیچ ڈالنا اور پھر بھی اپنے کو جنت کا حقدار جاننا۔ اب اس مایوسی کی ایک اور بڑی وجہ بیان فرمائی جا رہی ہے۔ **دوسرا تعلق**: پچھلی آیت میں علماء یہود سے مطالبہ تھا کہ تم اپنے جنتی ہونے کا توریت سے ثبوت دو۔ وہ نہ دے سکے اب اسی توریت سے ان کے جہنمی ہونے کا ثبوت دیا جا رہا ہے کہ تم نے توریت کے فلاں فلاں عہد توڑے اور حق تعالیٰ سے بدعہدی کرنے والا ہمیشہ کے عذاب کا مستحق ہے۔ **تیسرا تعلق**: پچھلی آیتوں میں جنتی اور جہنمی کی پہچانیں بتائی گئی تھیں۔ کہ کفار بدکار جہنمی اور مسلمان نیک کار جنتی ہے اب فرمایا جا رہا ہے کہ اے یہود تم

اپنے کو دیکھو کہ تم میں کونسی علامت ہے۔ تم میں جنیوں کی فلاں فلاں علامتیں ہیں لہٰذا تم کبھی جنتی نہیں ہو سکتے۔

تفسیر

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ بنی اسرائیل سے پوری توریت شریف پر عمل کرنے کا عہد لیا گیا تھا۔ جس میں یہ احکام بھی موجود تھے لہٰذا ان کا بھی عہد ہو گیا۔ میثاق مضبوط عہد کو کہتے ہیں یعنی ہم نے بنی اسرائیل سے حسب ذیل چیزوں کا مضبوط عہد کرایا پہلے یہ کہ **لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ** غیر اللہ کی عبادت نہ کرو۔ یہ خبر بمعنی نہی ہے۔ جس سے کہ اس میں بہت اہمیت پیدا ہو گئی جیسے ہم اپنے کسی فرمانبردار غلام سے کہیں کہ تم فلاں جگہ جاؤ گے۔ یعنی اس حکم کی مخالفت کرنی چاہئے ہی نہیں اور تم سے اس کا اندیشہ بھی نہیں۔ اس لئے بجائے حکم کے خبر دے رہا ہوں۔ خیال رہے کہ اس عبارت میں دو عہد ہیں ایک یہ کہ خدا کی عبادت کرو دوسرے یہ کہ غیر کی نہ کرو اور یہ بھی ظاہر ہے کہ رب کی عبادت درستی عقائد پر موقوف ہے کہ اس کی ذات وصفات اس کے پیغمبروں اس کی کتابوں کو مان کر عبادت کی جائے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ عبادت وہ چاہئے کہ جو اس کے ہاں مقبول ہو اور یہ انبیاء کرام کی تعلیم سے ہی معلوم ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس مختصری عبارت میں توحید، رسالت، کتاب، ملائکہ اور ساری اعتقادیات پر ایمان لانے کا ذکر بھی آ گیا۔ کیونکہ یہ چیزیں عبادت کی شرطیں ہیں یہ بھی خیال رہے کہ عبادت صرف نماز ہی کا نام نہیں بلکہ جو جائز کام رب کی رضا کے لئے کیا جائے وہ عبادت ہے۔ لہٰذا اس میں سارے عبادات بھی داخل ہو گئے۔ غرضیکہ یہ دو لفظ سارے عقائد، اور عبادات کا مجموعہ ہے بلکہ یوں کہو کہ سارے علم کلام اور علم فقہ واحکام کو شامل ہے چونکہ عقائد سارے اعمال پر مقدم ہیں اس لئے پہلے ان کا ذکر فرمایا گیا خیال رہے کہ عبادت صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہو سکتی ہے اور دینی اتباع صرف نبی ﷺ کی اور اطاعت اللہ تعالیٰ کی بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے رسول کے بھی۔ ماں باپ علماء مشائخ کی بھی کیونکہ عبادت وہ ہے کہ کسی کو اپنا خالق یا خالق کی مثل مان کر راضی کرنے کی کوشش کرنا۔ اتباع کے معنی ہیں آنکھیں بند کر کے کسی کے قدم بقدم چلنا اس کے ہر کام کی نقل کرنا یہ حضور کی ہو سکتی ہے کیونکہ رب کے سے کام ہم نہیں کر سکتے وہ مارتا جلاتا ہے خود نہیں کھاتا بلکہ کھلاتا ہے اور غیر نبی کے کام میں غلطی کا بھی احتمال ہے ان کے اچھے کاموں کی پیروی کرو مگر حضور کا ہر کام رب کی طرف سے ہے۔ وہاں نفس اور شیطان کا دخل نہیں۔ دوسرا عہد یہ ہے کہ **وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا** معاملات میں سے یہ پہلا عہد ہے۔ یہاں ایک فعل **اَحْسِنُوْا تُحْسِنُوْنَ** پوشیدہ ہے یعنی ماں باپ کے ساتھ احسان کر دیا کرو گے۔ رب تعالیٰ نے اپنی عبادت کے ساتھ والدین کی اطاعت کا ذکر فرمایا اس کی چند وجہیں ہیں ایک یہ کہ ماں باپ اولاد کی پیدائش اور اس کی پرورش کا سبب ہے اور حق تعالیٰ کے فیض کا پہلا واسطہ جو نعمت بھی کسی کو ملے گی پیدائش کے بعد ہی ملے گی۔ لہٰذا خدا کے بعد ماں باپ کا ہی احسان ہے۔ دوسرے یہ کہ ماں باپ کا انعام خدا کے انعام سے مشابہت رکھتا ہے۔ جیسے حق تعالیٰ بلا طمع بندوں کو پالتا ہے ایسے ہی ماں باپ بغیر لالچ بچے کو پالتے ہیں اور دوسرے محسن بدلے کی امید پر احسان کرتے ہیں کفار ماں باپ جو قیامت جنت ودوزخ کے منکر ہیں۔ انہیں ثواب کی بھی امید نہیں۔ مگر بچہ پالتے ہیں لڑکیوں اور بے دست وپا لڑکوں کے پالنے میں دینوی لالچ بھی نہیں ہوتا تیسرے یہ کہ حق تعالیٰ انسان کی پیدائش میں حقیقی موثر ہے اور ماں باپ ظاہری موثر۔

چوتھے یہ کہ حق تعالیٰ اپنے نافرمان بندے پر انعام کرنے سے ملول نہیں ہوتا ایسے ہی ماں باپ ناخلف اولاد کی خیر خواہی اور شفقت سے ملول نہیں ہوتے۔ پانچویں یہ کہ جس طرح مخلوق کے دو خالق نہیں ہو سکتے اسی طرح بچے کے دو ماں یا دو باپ نہیں ہو سکتے کیونکہ سوتیلے ماں باپ حقیقت میں ماں باپ ہی نہیں چھٹے یہ کہ ماں باپ کبھی بھی اولاد کی ترقی میں کمی نہیں کرتے اور کبھی ان پر حسد نہیں کرتے۔ یہ انہیں کی خصوصیت ہے۔ ساتویں یہ کہ ماں باپ کی اطاعت سارے دینوں میں ضروری ہے اس میں کسی کا اختلاف نہیں بلکہ ان سے محبت انسانوں کے علاوہ بے عقل حیوانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ آٹھویں یہ کہ ہمیشہ ماں باپ اولاد کے مال کو بڑھاتے ہیں اور نقصان سے بچاتے ہیں جیسے رب تعالیٰ اپنے بندے کے نیک اعمال کو بڑھاتا ہے۔ (تفسیر کبیر وعزیزی) خیال رہے کہ رب تعالیٰ کی عبادت شاہ وگدا نبی وامتی سب پر فرض ہے یوں ہی ماں باپ کی خدمت سب پر فرض عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا وَّ بَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ (مریم: ۳۲) نیز رب کی عبادت ہر وقت لازم۔ یونہی ماں باپ کی خدمت ہر وقت فرض ان کی زندگی تندرستی میں بھی بیماری بڑھاپے میں بھی بعد موت بھی۔ رب کی عبادت ہر طرح کی ضروری۔ جانی بدنی مالی یوں ہی ماں باپ کی خدمت ہر طرح لازم جان وجسم، مال غرضکہ ہر شے ان پر صرف کرے۔ صرف نوکروں پر انہیں نہ چھوڑ دے بادشاہ بھی ہو تو اپنے ہاتھ پاؤں سے ان کی خدمت کرے۔ نیز کوئی شخص دعویٰ نہیں کر سکتا میں نے حق عبادت ادا کر دیا۔ غرضیکہ والدین کی خدمت کو رب کی عبادت سے بہت طرح مناسبت ہے۔ ماں باپ کی اطاعت میں چند ہدایتوں کا خیال رکھو پہلی ہدایت اگرچہ ماں اور باپ دونوں کی اطاعت لازم ہے لیکن چونکہ ماں نے بچے کو اپنا خون پلا کر پالا ہے اور باپ نے زر پلا کر۔ اس لئے ماں کا حق الخدمت باپ سے سات گناہ زیادہ ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ تو اور تیرا مال تیرے باپ کا ہے دوسری روایت میں ہے کہ جنت تمہاری ماؤں کے قدموں کے نیچے ہے۔ دوسری ہدایت اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر ماں باپ کی بھی اطاعت اور تعظیم کرے۔ اس لئے کہ یہاں والدین میں ایمان کی قید نہیں لگائی گئی۔ نیز ان کی اطاعت حق پرورش کی وجہ سے ہے اور یہ حق تو کافر ماں باپ میں بھی ہے تیسری ہدایت ماں باپ کے ساتھ احسان تین قسم کا ہے ایک یہ کہ اپنے قول وفعل سے ان کو ایذا نہ پہنچائے دوسرے یہ کہ اپنے بدن ومال سے ان کی خدمت کرے۔ تیسرے یہ کہ جب وہ بلائیں تو فوراً حاضر ہو جائے پہلی اطاعت بہرحال واجب ہے کہ ماں باپ کو ایذا دینے والا عاق اور نافرمان کہلاتا ہے۔ دوسری اطاعت جب واجب ہے کہ ماں باپ حاجتمند ہوں اور اولاد میں اس خدمت کی قدرت ہو اگر انہیں حاجت نہیں۔ یا اولاد میں طاقت نہیں تو اس قسم کی اطاعت واجب بھی نہیں۔ تیسری قسم کی خدمت کی یہ شرط ہے کہ ان کی خدمت میں حاضر ہونے سے کوئی شرعی خرابی پیدا نہ ہو اگر نماز کا وقت جا رہا ہے ادھر ماں باپ بلا رہے ہیں تو ان کے پاس نہ جائے پہلے نماز پڑھے۔ چوتھی ہدایت ماں باپ کے ساتھ احسان کرنے کا جو حدیث میں بیان آیا ہے وہ یہ ہے ۱۔ ان سے دلی محبت رکھے ۲۔ بات چیت اور اٹھنے بیٹھنے میں ان کا ادب کرے کہ راستے میں ان کے آگے نہ چلے اور ان کو نام لے کر نہ پکارے بلکہ ادب سے بلائے ۳۔ جہاں تک ہو سکے اپنا مال وجان ان پر خرچ کرے ۴۔ ہر کام اور ہر بات میں ان کی رضامندی کا خیال رکھے ۵۔ ان کے مرنے کے بعد ان کی وصیت پوری کرے ۶۔ اور ان کے لئے دعائے

مغفرت کرے ۷۔ ان کے لئے کبھی کبھی صدقہ وخیرات کرتا رہے ۸۔ ہر ہفتہ میں ان کی قبر کی زیارت کرے اور اگر ہو سکے تو سورۃ یٰسین پڑھ کر ان کو بخشے ۹۔ ان کے دوستوں اور قرابت داروں سے محبت رکھے ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔ سعادت مند بچے اپنے ماں باپ کے دوستوں کو ان کے بعد ماں باپ کی جگہ سمجھتے رہیں (تفسیر عزیزی) پانچویں ہدایت اگر ماں باپ گناہ کرنے کے عادی ہوں یا کسی بدمذہبی میں گرفتار ہوں تو ان کو نرمی کے ساتھ راہ راست پر لانے کی کوشش کرے چھٹی ہدایت اگر ماں باپ کافر یا منافق بھی ہوں تب بھی ان کا حق مادری، پدری ادا کرے اور ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے چچا آذر کی جو سخت کافر تھا، سختی کو برداشت کیا اور اس سے نرم کلام بھی فرمایا۔ حضرت حنظلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا باپ ابو عامر سخت کافر تھا۔ آپ نے حضور علیہ السلام سے اس کے قتل کی اجازت چاہی تو حضور علیہ السلام نے نہ دی (تفسیر کبیر وعزیزی) ساتویں ہدایت جب ماں باپ کا اللہ اور رسول سے مقابلہ ہو جائے تو اس وقت نہ ماں باپ کا لحاظ ہوگا نہ اور قرابتدار کا۔ مثلاً ایک جنگ میں بیٹا غازی بن کر اور باپ کافروں کی طرف سے آیا ہے۔ تو اب اس کے حق پدری کا لحاظ نہیں کیونکہ اللہ اور رسول کا حق سب سے مقدم ہے اسی لئے جنگ احد میں حضرت ابو عبیدہ ابن جراح نے اپنے باپ جراح کو قتل کیا اور جنگ بدر میں حضرت ابوبکر صدیق نے اپنے بیٹے عبدالرحمٰن کو جو اس وقت کافر تھے اپنے مقابلہ کے لئے بلایا اور حضرت علی اور حضرت حمزہ اور ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے اپنے اہل قرابت عتبہ اور شیبہ اور ولید کو قتل کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جنگ بدر میں اپنے ماموں عاص ابن ہشام کو قتل کیا (تفسیر خزائن العرفان آخر سورہ مجادلہ) جنگ بدر کے قیدیوں کے بارے میں حضرت عمرؓ کی رائے یہ تھی کہ ہر مسلمان اپنے قرابتدار قیدی کو قتل کرے۔ اس کی قرآن کریم نے تائید فرمائی دیکھو سورۃ انفال لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ (انفال: ۶۸) خلاصہ یہ ہے کہ کافر ماں باپ کی بھی اطاعت ضروری ہے۔ مگر جب کہ ان کا حق اللہ ورسول کے حق کے مقابل ہو جائے تو اللہ ورسول کا حق مقدم ہوگا۔ صحابہ کرام کا اپنے کافر ماں باپ کی اطاعت کرنا اور یا انہیں قتل کرنا مختلف موقعوں کے لحاظ سے ہے۔ ذِی الْقُرْبٰى اس کا والدین پر عطف ہے اور قربیٰ بمعنی قرابت ہے جیسے حسنیٰ یعنی اپنے اہل قرابت کے ساتھ احسان کرو چونکہ اہل قرابت کا رشتہ ماں باپ کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور ان کا احسان بھی ماں باپ کے مقابلہ میں کم ہے اس لئے ان کا حق بھی ماں باپ کے بعد ہے اس جگہ بھی چند ہدائتیں ہیں۔

پہلی ہدایت: ذی القربیٰ وہ لوگ ہیں جن کا رشتہ بذریعہ ماں باپ کے ہو جسے ذی رحم بھی کہتے ہیں۔ یہ تین طرح کے ہیں۔ ایک باپ کے قرابتدار جیسے دادا، دادی، چچا، پھوپھی وغیرہ دوسرے ماں کے جیسے نانا، نانی، ماموں، خالہ، اخیافی بھائی وغیرہ۔ تیسرے دونوں کے قرابتدار جیسے۔ حقیقی بھائی، بہن ان میں سے جس کا رشتہ قوی ہوگا۔ اس کا حق مقدم۔ لہٰذا اگر بھائی اور چچا حاجتمند ہوں تو پہلے بھائی کی خدمت کرے اور اگر چچا اور ماموں حاجتمند ہوں تو پہلے چچا کی۔

دوسری ہدایت: اہل قرابت دو قسم کے ہیں ایک وہ جن سے نکاح حرام ہے۔ انہیں ذی رحم محرم کہتے ہیں جیسے چچا، پھوپھی، ماموں، خالہ وغیرہ ضرورت کے وقت ان کی خدمت کرنا فرض ہے نہ کرنے والا گنہگار رہوگا۔ دوسرے وہ جن سے

نکاح حلال جیسے خالہ ماموں چچا کی اولاد ان کے ساتھ احسان و سلوک کرنا سنت موکدہ ہے اور بہت ثواب لیکن ہر قرابتدار بلکہ سارے مسلمانوں سے اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آنا ضروری اور ان کو ایذاء پہنچانی حرام (تفسیر عزیزی)

تیسری ہدایت: سسرالی دور کے رشتہ دار ذی رحم نہیں، ہاں ان میں سے بعض محرم ہیں جیسے ساس اور دودھ کی ماں۔ بعض محرم بھی نہیں ان کے بھی حقوق ہیں۔ یہاں تک کہ پڑوسی کے بھی حق ہیں۔ مگر یہ لوگ اس آیت میں داخل نہیں۔ کیونکہ یہاں رحمی اور رشتہ والے مراد ہیں۔ وَالْيَتٰمٰى یہ جمع یتیم کی ہے۔ جیسے ندیم اور ندامی۔ انسانوں میں یتیم وہ نابالغ بچہ ہے جس کا باپ مر جائے اور جانوروں میں وہ چھوٹا بچہ جس کی ماں نہ ہو۔ اور جواہرات میں وہ یتیم ہوتا ہے جس کی مثل نہ ہو اور سیپ میں اکیلا پیدا ہو۔ یتیم کی جمع قاعدے سے یتمی نہیں چاہئے تھی۔ لیکن چونکہ یہ آفت زدہ ہے اس لئے دوسرے آفت زدوں کی طرح اس کی جمع بھی لائی گئی۔ جیسے حبط حُباطی۔ خیال رہے کہ یتیم پر احسان دو طرح کا ہے ایک یہ کہ اس کے مال کی حفاظت کریں اس کی خوراک و پوشاک کی خبر گیری رکھیں اس کو علم و ادب سکھائیں۔ یہ اس کے اہل قرابت پر واجب ہے۔ دوسرے یہ کہ اسے ایذا نہ دیں۔ اس کے ساتھ نرمی اور مہربانی کریں اس کو مجلسوں اور محفلوں میں اپنے پاس بٹھائیں اس کے سر پر ہاتھ پھیریں۔ اس کو اپنے بچوں کی طرح گود میں لیں اور محبت ظاہر کریں یہ اس پر لازم ہے کیونکہ جس بچے کا باپ مر گیا سب مسلمان اس کے باپ ہیں۔

حکایت: انجمن حمایت اسلام کے یتیم خانے کی لڑکی کا کسی سے نکاح کیا گیا۔ جس میں ڈاکٹر محمد اقبال بھی لائے گئے۔ کسی نے مذاق سے دولہا سے کہہ دیا کہ آیئے انجمن حمایت اسلام کے داماد۔ ڈاکٹر محمد اقبال نے کہا کہ نہیں بلکہ مسلم قوم کے داماد کیونکہ یہ بچی سارے مسلمانوں کی بیٹی ہے۔ وَالْمَسٰكِيْنِ یہ مسکین کی جمع ہے مسکین سکون سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ٹھہر جانا گویا کہ غریبی نے اس کو نقل و حرکت سے روک دیا۔ فقیر وہ ہے جس کے پاس نصاب سے کم مال ہو، اور مسکین وہ ہے جو بالکل مال کا مالک نہ ہو یہ ہی احناف کا قول ہے۔ خضر علیہ السلام کے کشتی والوں کو جو مسکین فرمایا گیا فَكَانَتْ لِمَسٰكِيْنَ يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ (کہف: ۷۹) یا تو وہ مسکین لغوی معنی میں ہے یعنی بیچارے لاچار یا وہ کشتی ان کی اپنی نہ تھی یہ لوگ اس پر مزدوری کرتے تھے۔ اس لئے يَعْمَلُوْنَ فِي الْبَحْرِ فرمایا گیا۔ غرضیکہ مسکین فقیر سے زیادہ حاجتمند ہے۔ کبھی فقیر محتاج کو کہتے ہیں اور مسکین اسے جس کے دل میں عجز و انکساری جو اگرچہ کتنا ہی مالدار ہو اس معنی سے حضور نے فرمایا کہ مولیٰ مجھے مسکین جلا مسکین وفات دے اور مسکینوں کے زمرے میں اٹھا۔ وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا یہ وَاِذْ اَخَذْنَا پر معطوف ہے یعنی ہم نے بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ تم لوگوں سے اچھی باتیں کہنا چونکہ ہر شخص کی بدنی اور مالی خدمت نہیں کی جا سکتی لہٰذا ماں باپ وغیرہ کی تو مالی اور بدنی لازم کی گئی اور باقی لوگوں کی صرف قولی۔ یعنی ان سے اچھا برتاؤ کرے اس عبارت کی دو تفسیریں ہیں۔ پہلی تفسیر سیدنا ابن عباس سے مروی ہے کہ یہاں لوگوں سے عام لوگ مراد ہیں اور اچھی بات سے نیکیوں کی رغبت اور بدیوں سے روکنا مطلب یہ ہے کہ اے اسرائیلیو حضور علیہ السلام کی شان میں اچھی اور سچی بات کہو۔ ان کے کمالات اور اوصاف بالکل نہ چھپاؤ بلکہ ایمانداری سے سچ سچ کہہ دو۔ (تفسیر خزائن العرفان) دوسری تفسیر یہ کہ ناس سے عام لوگ مراد ہیں اور حسنا عام بھی

باتیں۔ یہاں بھی چند ہدائتیں ہیں۔ پہلی ہدایت جیسا آدمی ویسے ہی اس کے ساتھ اچھی بات۔ متقی مسلمان کے ساتھ ادب واحترام کے ساتھ پیش آئے۔ ملاقات کے وقت سلام ومصافحہ کرے۔ نرم وشیریں گفتگو کرے۔ ناواقف مسلمان کو نرمی سے احکام شریعہ بتائے اس کے ساتھ لڑائی جھگڑا نہ کرے۔

حکایت: ایک بزرگ نے کسی کو وضو کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا بھائی میرا وضو دیکھ لے اگر کچھ غلطی ہو تو بتا دینا۔ یہ کہہ کر اپنا وضو دکھا دیا وہ سمجھ گیا۔ ۲۔ عام مسلمانوں سے ملاقات میں دوستی ظاہر کرے۔ ان کی مزاج پرسی کرے ان کے رنج وغم میں شریک رہے ان کی دعوت میں شرکت کرے۔ ان کو اچھے لقب اور اچھے نام سے پکارے انہیں پیچھے بھلائی سے یاد کرے ضرورت کے وقت اچھا مشورہ دے۔ ۳۔ مصیبت کے وقت ان کے کام آئے۔ مثلاً بھولے ہوئے کو راستہ بتائے گرتے ہوئے کو سنبھال لے۔ جو کچھ خریدنا چاہتا ہو۔ بازار سے خرید دے جو کوئی مسئلہ پوچھے تو بتا دے وغیرہ وغیرہ ۴۔ فاسق وفاجر بدکار فسادی مسلمان کو اگر ہو سکے تو ملامت کرو۔ ان کو برا بھلا کہو بلکہ حاکم وقت ان کو سزا دے۔ اسی میں ان کی اصلاح ہے اور ان کے حق میں یہی قول حُسْنًا ہے۔ حضور علیہ السلام نے مجرموں کو سزائیں دیں۔ دوسری ہدایت اس آیت میں کافر بھی داخل ہیں کفار سے بھی اچھی بات کہو جس کافر کے ایمان کی امید ہو اس سے نرم گوئی اور دلجوئی سے پیش آؤ۔ نہایت اخلاق سے دعوت اسلام دو۔ دیکھو فرعون سخت کافر تھا اور موسیٰ علیہ السلام بڑے پیغمبر مگر جب انہیں فرعون کی ہدایت کے لئے بھیجا گیا تو حکم دیا گیا فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (طٰہٰ: ۴۴) یعنی اس سے نرم بات کرنا شاید وہ نصیحت قبول کرے اور خدا سے ڈر جائے چونکہ ابھی تک اس سے ایمان کی بظاہر ناامیدی نہ ہوئی تھی اس لئے اس سے نرم کلام کا حکم دیا گیا۔ نیز قرآن کریم ہمارے حضور کی تعریف فرماتا ہے فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ (آل عمران: ۱۵۹) آپ اللہ کی رحمت سے ان کے لئے نرم ہو گئے۔ اگر سخت گو اور سخت دل ہوتے تو البتہ آپ کے پاس سے یہ لوگ بھاگ جاتے (تفسیر کبیر وعزیزی) شروع اسلام میں ایسے کفار کو زکوۃ دینا بھی جائز تھی۔ انہیں کو مؤلفۃ القلوب کہتے ہیں وہ حکم اب جاتا رہا۔ لیکن ان کے ساتھ اخلاق کا برتاؤ اور ان کی دلجوئی کرنے کا حکم اب بھی باقی ہے حضور علیہ السلام نے ایسے کفار کے ساتھ بہت پاکیزہ اخلاق سے برتاؤ فرمایا اور انہی اخلاق نے انہیں گرویدہ کرلیا اور وہ مسلمان ہو گئے۔ اس کے صدہا واقعات ہیں۔ درحقیقت اسلام اخلاق ہی سے پھیلا ہے۔ ضدی ہٹ دھرم کفار جن کے ایمان کی کوئی امید نہیں جو ہر وقت اسلام کے مٹانے کے درپے ہوں ان کے ساتھ بقدر طاقت نہایت سختی کی جائے۔ خدا نصیب فرمائے تو ان سے جہاد کیا جائے ان پر تلوار چلائی جائے ان کے حق میں یہ برتاؤ ہی قول حسن ہے اور ان کا فتنہ اس طرح رک سکتا ہے۔ تفسیر کبیر نے اس جگہ فرمایا کہ کفار کو لعنت ملامت کرنا ہی ان کے لئے قول حسن ہے۔ کیونکہ قول حسن سے نفع والی بات مراد ہے نہ کہ دل پسند بات نالائق بچے کو مارنا۔ ڈاکو کو سولی دینا۔ اس کے لئے قول حسن ہے دیکھو جب موسیٰ علیہ السلام فرعون کے ایمان سے ناامید ہوئے تب آپ نے اس کے لئے بددعا فرمائی۔ رَبَّنَا اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ (یونس: ۸۸) نرم کلام فرمانے کا اور وقت حکم تھا اور یہ بددعا اور وقت کی

گئی۔رب تعالیٰ نے اپنے محبوب علیہ السلام سے فرمایا یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَ الْمُنٰفِقِیْنَ وَ اغْلُظْ عَلَیْهِمْ (التوبہ:۷۳) مسلمانوں کے صفات یوں بیان فرمائے اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ (فتح:۲۹) وغیرہ وغیرہ غرضیکہ اخلاق اور قسم کے کفار کے لئے ہیں اور سختی وجہاد دوسرے کفار کے لئے میٹھی اور لذیذ دوائیں اور بیماروں کے لئے ہیں اور کڑوی دوائیں اور آپریشن دوسرے بیماروں کے لئے کفار مرتدین کسی نرمی اور رعایت کے مستحق نہیں بلکہ اگر ان کے لوٹ آنے کی امید ہو تو ان کی ہدایت کی جائے اسلامی بادشاہ ان کو کچھ سوچنے کی مہلت دے پھر بھی باز نہ آئیں تو قتل کرادے ان کے حق میں یہ ہی قول حسن ہے اب جب کہ اسلامی حکومت نہیں تو مسلمانوں پر لازم ہے کہ اس کی صحبت سے دور بھاگیں قرآن وحدیث نے ان سے بچنے کا سخت حکم دیا ہر کافر اور بدمذہب سے دور رہنا ضروری ہے یہی حکم اس زمانہ میں دیوبندی وہابیوں اور تمام ان فرقوں کا ہے۔تیسری ہدایت۔اخلاق،مدارت اور مداہنت اور خوشامد میں فرق ہے۔اخلاق اچھی چیز ہے اور مداہنت بری اخلاق یہ ہیں کہ اپنے نفس کے حق میں نرمی کی جائے۔ذاتی قصور کو معاف کیا جائے۔جو اپنے سے بدسلوکی کرے۔اس کا بدلہ بھلائی سے دیا جائے۔یہ نہایت پاکیزہ صفت ہے قرآن کریم نے فرمایا۔ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِیْمٍ (القلم:۴) حضور علیہ السلام کے اخلاق نہایت پاکیزہ تھے لیکن دین میں ست اور پلپلا ہونا مداہنت ہے کہ کسی سے ناجائز باتیں سنے یا اس کو حرام کام کرتے ہوئے دیکھے اور اس پر سختی نہ کرے یہ نہایت بری صفت ہے۔جو کبھی کفر تک پہنچادیتی ہے۔جو شخص اپنی بیوی کے پاس کسی غیر شخص کو دیکھے اور غصہ نہ آئے بلکہ اس کی خاطر کرے وہ خلیق نہیں بلکہ دیوث ہے ایسے ہی جو کسی کو اللہ ورسول کی توہین کرتے ہوئے دیکھے اور غصہ نہ کرے اور اسے برا معلوم نہ ہو۔وہ خلیق نہیں بلکہ بے غیرت بے دین ہے

دشمن احمد پہ شدت کیجئے ملحدوں سے کیا مروّت کیجئے

چوتھی ہدایت۔اس آیت میں حُسْنًا کہ مُسْتَحْسَن حسنا وہ بات ہے جو درحقیقت اچھی اور نافع ہو اور مستحسن وہ جس کو لوگ اچھا سمجھیں۔کفار پر سختی ان کے نزدیک مستحسن نہیں مگر حسن ہے اور ان کی خوشامد ان کے نزدیک مستحسن ہے مگر حسن نہیں۔ہم کو کلام حسن کا حکم ہے نہ کہ مستحسن کا۔یہ مضمون بہت خیال میں رہے۔یہاں اکثر لوگ دھوکہ کھا کر اخلاق اور خوشامد میں فرق نہیں کرتے۔پانچویں ہدایت۔اگرچہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ احکام بنی اسرائیل کو دیئے گئے تھے۔مگر ہم سب مسلمانوں پر بھی لازم ہیں (اصول فقہ) جب بندوں کے حقوق سے فراغت ہوئی تو فرمایا گیا وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ (البقرہ:۴۳) کہ نماز قائم رکھو اور زکوۃ دو چونکہ نماز میں فقط رب سے ہی تعلق ہے اور زکوۃ میں بندوں سے بھی اس لئے نماز کو زکوۃ پر مقدم کیا۔معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر بھی نماز اور زکوۃ فرض تھی لیکن ہماری نماز زکوۃ سے مختلف چنانچہ ان پر چوتھائی مال زکوۃ فرض تھی۔ہم پر چالیسواں حصہ اگرچہ لَا تَعْبُدُوْنَ میں یہ بھی آگئی تھی۔مگر اس کی افضلیت کی وجہ سے اس کو علیحدہ بھی بیان کردیا ثُمَّ تَوَلَّیْتُمْ یا تو یہ موجودہ بنی اسرائیل سے خطاب ہے یا گزرے ہوؤں سے یعنی پھر تم یا تمہارے بزرگ ان تمام احکام سے منہ موڑ گئے اور ان کی پابندی نہ کی۔چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ حیات شریف میں انہوں نے بچھڑا پوجنا شروع کردیا۔بعد میں اگرچہ ڈر خوف سے اس عبادت سے توبہ تو کرلی مگر بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں رچ

گئی تھی وَاشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ پھر یہود نے تو حضرت عزیر کے فوٹو کی اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ و مریم کے فوٹو کی پوجا شروع کر دی اصلی عبادت الٰہی کو چھوڑ بیٹھے نماز کی جگہ آٹھویں دن کی دعا رکھ لی۔ زکوٰۃ کا مسئلہ بالکل ختم ہی کر دیا۔ لوگوں کو بجائے ہدایت دینے کے انہیں ایمان وہدایت سے روکنے لگے۔ یتیموں غریبوں کی پرورش کا مذہبی دستور ختم کر دیا۔ اب جو غرباء کی امداد کی سوسائیٹیاں ہیں وہ مذہبی نہیں قومی ہیں اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْكُمْ سوتم میں سے تھوڑوں نے یعنی تم میں سے بہت تھوڑے ایسے لوگ ہیں جو نبی آخر الزمان پر ایمان لے آئے اور انہوں نے سارے احکام کی پابندی کی جیسے عبداللہ بن سلام اور کعب احبار وغیرہ رضی اللہ عنہما یا تمہارے بزرگوں میں سے بہت تھوڑوں نے ان کی پابندی کی پھر تم نے یہ بھی نہ کیا کہ توبہ کر کے اس عہد شکنی کا بدلہ کر دیتے بلکہ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ تم روگردان ہی رہے اور دن بدن عہد شکنی میں ترقی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ بدمزاجی بدخلقی خدا کے احکام سے منہ موڑنا تمہاری عادت بن گئی۔ پھر تم کیسے کہتے ہو کہ ہم عارضی عذاب پا کر چھوٹ جائیں گے ان عیوب سے دائمی عذاب آتا ہے۔

خلاصہ تفسیر

یہ مختصری آیت انسانی زندگی کا مکمل دستور العمل ہے۔ اس میں عقائد عبادات معاملات مکمل طور پر بیان کئے گئے اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر پوری روشنی ڈال دی گئی اس میں آٹھ احکام بیان ہوئے لیکن اگر تفصیل کی جائے تو آٹھ کروڑ سے بھی زیادہ ہیں۔ پھر ترتیب ایسی نفیس کہ سبحان اللہ، چونکہ عقائد اعمال پر مقدم اور اللہ کا حق سارے حقوق سے اعلیٰ اس لئے پہلے اس کو بیان فرمایا گیا کہ تم غیر خدا کی عبادت نہ کرو۔ پھر مخلوق میں سب سے بڑا ماں باپ کا حق ہے۔ اس لئے اس کے بعد فرمایا گیا کہ والدین کے ساتھ بھلائی کرو۔ پھر ماں باپ کے رشتہ داروں کا حق، اس لئے حکم ہوا کہ اہل قرابت سے سلوک کرو۔ پھر ان کا حق تھا۔ جن سے اسلام کا رشتہ ہے خواہ بدنی رشتہ ہو یا نہ ہو۔ یتیم بچے اور مسکین مسلمان اگر یتیم زیادہ حاجتمند تھے۔ اس لئے ان کو مسکینوں پر مقدم کر کے فرمایا گیا کہ یتیموں اور مسکینوں کے ساتھ بھی احسان کرو پھر سارے انسانوں کے تمامی حقوق کو ان دو لفظوں میں بیان فرما دیا کہ لوگوں سے اچھی بات کہو معاملات سے فراغت کے بعد ساری بدنی اور مالی عبادتوں کو ان دو لفظوں میں بیان فرمایا کہ نماز قائم کرو اور زکوۃ دو۔ کیونکہ جہاد وغیرہ بھی نماز قائم کرنے کے لئے ہی ہیں پھر ان تمام احکام کی پابندی کرانے کے لئے فرما دیا کہ ان احکام کو چھوڑ کر نجات کی امید کرنا خیال خام ہے اگر اپنا چھٹکارا چاہتے ہو تو ان عقائد اور اعمال کی پابندی کرو ان کی کچھ تفصیل ہم نے تفسیر میں عرض کر دی۔ اگر پوری تفصیل کی جائے تو اس کے لئے دفتر درکار ہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ**: نجات دائمی کے لئے عقائد، عبادت و معاملات سب ضروری ہیں۔ عقائد بنیاد ہے اور عبادت دیواریں اور معاملات چھت مکان کے لئے تینوں چیزیں ضروری ہیں ایسے ہی نجات دائمی کے لئے یہ تینوں ضروری یا یوں سمجھو کہ عقائد پرندہ اور اعمال پرندے کے دو پر ہیں۔ اگر ایک بھی ٹوٹ گیا تو اڑنا ناممکن۔ قیامت کے دن بدعمل مسلمان کو بڑی الجھنیں پیش آئیں گی۔ **دوسرا فائدہ**: یہ حق بقدر احسان ہے اسی لئے ماں باپ

کا حق ساری مخلوق سے اعلیٰ۔ **تیسرا فائدہ:** یتیموں سے بھلائی کرنا علامت ایمان ہے۔ جس دسترخوان پر یتیم ہو اس پر شیطان نہیں ہوتا۔ جو یتیم کو پال کر جوان کردے۔ اس کے سارے گناہ بخشے جاتے ہیں۔ بلکہ روایت میں یہ بھی ہے کہ جو اپنی تین بیٹیوں یا بہنوں کو بلکہ دو کو بھی پال کر جوان کرلے تو وہ اس کے لئے جہنم میں آڑ بن جائیں۔ ایک بار حضور علیہ السلام نے اپنی دو انگلیوں کو ہلا کر فرمایا کہ ہم اور یتیم کا پالنے والا جنت میں ایسے رہیں گے۔ خیال رہے کہ دونوں مبارک انگلیاں چھوٹی بڑی تھیں جن سے درجات کا فرق معلوم ہوا (روح البیان) **چوتھا فائدہ:** اچھے اخلاق اور لوگوں سے اچھا کلام کرنا بھی علامت ایمان ہے۔ امام محمد باقر رحمۃ اللہ علیہ نے اچھے اخلاق کی نہایت عمدہ تفسیر فرمائی جس کا ترجمہ یہ ہے ؎

کبھی بھول کر کسی سے نہ کر کلام ایسا کہ جو کوئی تم سے کرتا تمہیں ناگوار ہوتا

جو بات کسی سے کہو اچھی ہو بھلی ہو کڑوی نہ ہو کھٹی نہ ہو مصری کی ڈلی ہو

پانچواں فائدہ: تارک الدنیا بننا کمال نہیں بلکہ کامل وہ شخص ہے جو خالق و مخلوق کے حقوق ادا کر کے دنیا سے جائے۔ **چھٹا فائدہ:** جب ماں باپ رشتہ دار اپنے اہل قرابت ہیں اور ان کے حقوق اپنے ذمہ ہیں تو حضور علیہ السلام کے اہل قرابت بھی سب مسلمانوں کے بزرگ ہیں ان کے حقوق بھی ہم پر ہیں۔ رب فرماتا ہے قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَیْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِی الْقُرْبٰی (شوریٰ: ۲۳) تا قیامت حضور کے اہل قرابت یا اولاد کا احترام انہیں پڑھانا لکھانا علم و ہنر سکھانا مسلمانوں پر لازم ہے کہ ان کے گھر سے ہمیں ایمان، قرآن بلکہ رحمان ملا۔ یہ حضرات روحانی ذوی القربیٰ ہیں اس سے وہ لوگ عبرت پکڑیں جو اہل بیت اطہار یا صحابہ کبار کی شان میں گستاخیاں کرتے رہتے ہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت میں نبی کا ذکر نہ آیا کیا نبی کا کوئی حق نہیں ہے۔ **جواب.** تفسیر میں بتایا گیا کہ لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ میں خدا کے حق کے ساتھ پیغمبر کا حق بھی آ گیا۔ درحقیقت ان کے حق کے بغیر خدا کے حق ادا ہو سکتے ہی نہیں۔ ساری عبادت بلکہ معاملات بھی نبی کا حق ہیں کیونکہ وہ نبی کے فرمانے سے ہی واجب ہوئے اسی لئے قرآن کریم نے فرمایا کہ جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت میں عالم دین اور دینی استاد اور پیر کا ذکر نہ کیا کہ ان کا کوئی حق نہیں۔ **جواب:** یہ حضرات یا تو والدین میں داخل ہیں کیونکہ یہ روحانی ماں باپ ہیں بلکہ ان کا حق اطاعت ماں باپ پر بھی مقدم ہیں کیونکہ ماں باپ تو ہم کو اوپر سے نیچے لائے اور انہوں نے ہمیں پھر نیچے سے اوپر پہنچایا یا یوں کہو کہ ہم کو ماں باپ نے حیوان بنایا اور انہوں نے ناطق یا انہوں نے جسم و جان کی پرورش کی اور انہوں نے روح و ایمان کی اور یا یہ حضرات قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا میں داخل ہیں کیونکہ جیسے ناس ویسا ان کے ساتھ کلام **تیسرا اعتراض:** اس آیت میں بیوی اور رضاعی ماں اور پڑوس وغیرہ کا حق نہیں آیا۔ **جواب:** یہ بھی الناس میں داخل ہو کر آ گئے۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت میں پہلے عبادت کا ذکر ہے اور پھر معاملات کا اور پھر نماز، زکوٰۃ کا۔ ایسی ترتیب کیوں رکھی گئی **جواب:** یہاں معاملات کا عبادت پر مقدم رکھنا ضروری ہے کیونکہ بندے اپنے حقوق کے محتاج ہیں اور رب تعالیٰ

حقوق سے بے نیاز۔ مگر چونکہ ان سب کے لئے ایمان شرط ہے اس لئے لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰہَ فرمایا گیا۔

تفسیر صوفیانہ

رب تعالیٰ محسن حقیقی ہے اور ماں باپ وغیرہ محسن مجازی۔ لیکن محسن مجازی کا حق ادا کئے بغیر محسن حقیقی کا حق ادا نہیں ہو سکتا، اسی لئے یہ قاعدہ مقرر ہے کہ مجاز حقیقت کا پل ہے تین چیزیں بغیر تین چیزوں کے قبول نہیں ہوتیں اسی لئے قرآنی آیت سے ان کو ملا دیا ہے۔ خدا کی اطاعت بغیر رسول وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ (مائدہ: ۹۲) خدا کا شکر ماں باپ کے شکر کے بغیر اَنِ اشْکُرْ لِیْ وَلِوَالِدَیْکَ (لقمان: ۱۴) نماز بغیر زکوۃ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ جو شخص بغیر وسیلہ مجاز حقیقت کو پانا چاہے وہ ناکام رہے گا مجاز کی کشتی میں بیٹھ کر حقیقت کا دریا عبور کرو بلکہ حق تو یہ ہے کہ مجاز حقیقت کا مظہر ہے چاہئے کہ مجازی آئینہ میں محبوب حقیقی کو دیکھے مولانا فرماتے ہیں۔

اصل صد یوسف جمال ذوالجلال اے کم از زن شو فدائے آں جمال

اصل بیند دیدہ چون اکمل بود فرع بیند چونکہ مرد احول بود

سرمہ توحید از کحال حال یافتہ رستہ زعلت اعتلال

عبادت دو قسم کی ہے بلاواسطہ اور بالواسطہ جن افعال سے براہ راست رب کی رضا منظور ہو وہ بلاواسطہ عبادت ہے۔ اس کو شریعت اور عبادات کہا جاتا ہے۔ جیسے کہ روزہ، نماز، حج وزکوۃ اور جن افعال سے مخلوق کو راضی کرنا منظور ہو۔ مگر یہ مخلوق کی رضا رضائے الٰہی کے لئے ہی ہو۔ وہ بالواسطہ عبادت ہے۔ اسی کو معاملات کہا جاتا ہے۔ جیسے خدمت والدین اور ادائگی حقوق۔ یہ ہی فرق ہے صدقہ اور نذر میں جو کوئی معاملات سے رب کی رضا جوئی نہ کرے وہ اپنا وقت بیکار گزارتا ہے۔ ان تمام بندوں میں رب کا نظارہ کرو۔ اور سمجھو۔

حاصل نہ شود رضائے سلطان تا خاطر بندگان نہ جوئی

ورنہ تم زنان مصری سے بھی کم ہو۔ جنہوں نے حسن یوسف میں خالق یوسف کا جمال دیکھ کر اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور درد تک محسوس نہ کیا بلکہ بجائے ہائے وائے کے جمال یوسف کی تعریف کرتی رہیں۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَکُمْ لَا تَسْفِکُوْنَ دِمَآءَکُمْ وَ لَا تُخْرِجُوْنَ
اور جب کہ لیا ہم نے عہد تمہارا کہ نہ بہاؤ گے خون اپنوں کو اور نہ نکالو گے تم
اور جب ہم نے تم سے عہد لیا کہ اپنوں کا خون نہ کرنا اور اپنوں کو اپنی بستیوں
اَنْفُسَکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَ اَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۸۴﴾
نفسوں اپنوں کو شہروں سے اپنے پھر اقرار کیا تم نے اور تم لوگ گواہ ہو
سے نہ نکالنا پھر تم نے اقرار کیا اور تم گواہ ہو

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیت سے کئی طرح تعلق ہے **پہلا تعلق**: اس سے پہلے تہذیب اخلاق اور تدبیر منزل کے احکام کا ذکر تھا جن پر عمل کرنے سے انسان کے اخلاق درست ہو جائیں اور خانگی زندگی سنبھل جائے۔ اب سیاست بدنی کے احکام کا ذکر ہے۔ جس سے قومی اصلاح ہو اور ملک میں امن و امان کا دور دورہ ہو۔ **دوسرا تعلق**: اس سے پہلے اختیار کرنے کیلئے اچھے صفات کا ذکر کیا گیا تھا۔ اب ان عیوب کا ذکر فرمایا جا رہا ہے جن سے بچنا ضروری ہے۔ اسی لئے پہلی آیت میں امر تھا اور اس میں نہی **تیسرا تعلق**: پہلی آیت میں اسرائیلیوں کی نافرمانوں کا دعویٰ کیا گیا تھا کہ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اس آیت میں ان کے اعمال سے ثبوت دیا جا رہا ہے۔ **چوتھا تعلق**: موجودہ بنی اسرائیل پچھلی آیت کے مضمون کا انکار کر سکتے تھے کہ ہمارے بزرگوں نے یہ بدعہدیاں نہ کیں اور ہم بھی توحید الٰہی پر قائم اور ادائے حقوق میں ثابت قدم ہیں اور اگر انہوں نے یہ بدعہدیاں کی بھی ہوں تو اس سے ہم پر کیا الزام۔ اس کے جواب میں اس آیت میں دوسرا عہد یاد دلایا جا رہا ہے۔ جس کی یہ لوگ ظاہر ظہور مخالفت کر رہے ہیں۔ **پانچواں تعلق**: اس سے یہود کے ایمان کی مایوسی کی چند وجہیں بتائی گئی تھیں۔ اس آیت میں بھی اسی کی ایک وجہ بیان ہو رہی ہے کہ جب یہ لوگ توریت شریف کے نہایت ظاہر اور پختہ ایمان کو نہیں مانتے تو نبی آخر الزمان پر ان کے ایمان لانے کی کیا امید ہے یہ عہد یا تو اس طرح لیا کہ توریت میں یہ احکام بھیجے اور جو شخص موسیٰ علیہ السلام کا کلمہ پڑھ کر دین موسوی میں داخل ہوتا تو گویا توریت کے سارے احکام پر عمل کرنے کا عہد کر لیتا ہے جیسے ہم کلمہ پڑھ کر سارے احکام قرآن و حدیث پر عمل کرنے کا عہد کر لیتے ہیں یا اس طرح موسیٰ علیہ السلام نے اپنی وفات کے قریب بنی اسرائیل سے یہ عہد لیا تھا۔ جیسے ہمارے حضور نے حج الوداع میں مسلمانوں کو خصوصی وصیتیں فرمائیں کہ میرے بعد ایک دوسرے کو قتل نہ کرنا اپنی بیویوں سے اچھے سلوک کرنا وغیرہ اور چونکہ نبی کا عہد لینا گویا رب کا عہد لینا ہے اس لئے اَخَذْنَا فرمایا گیا کہ ہم نے عہد لیا۔

تفسیر

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ یہاں وہی اذکُرُوْا فعل چھپا ہوا ہے یعنی اے یہودیو اس وقت کو یاد کرو جب کہ ہم نے تم سے عہد لیا یہاں موجودہ بنی اسرائیل ہی سے خطاب ہے کیونکہ آئندہ انہی کی بدعہدی کا ذکر ہو رہا ہے اسی لئے یہاں مِيْثَاقَكُمْ فرمایا گیا اور پچھلی آیت میں مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ دراصل یہ عہد بھی ان کے باپ داداؤں سے ہی لیا گیا تھا۔ مگر چونکہ باپ داداؤں کا فعل ہوتا ہے اس لئے اس کا ان سے خطاب ہوا یہاں وعدہ کی نوعیت مراد ہے ورنہ حقیقت میں ان سے تین عہد لئے گئے تھے پہلا یہ کہ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ اپنا خون نہ بہانا یہ سَفَكَ سے بنا ہے سَفَكَ وَسَكَبَ کے معنی ہیں انڈیلنا اور بہانا اس عبارت کے چند مطلب ہو سکتے ہیں۔ ۱۔ دنیوی مصیبت سے گھبرا کر یا روحانی ترقی کی امید میں خودکشی نہ کرنا۔ ۲۔ اپنے ہم قوم یا ہم مذہب کو قتل نہ کرنا یعنی آپس میں جنگ و جدل نہ کرنا کیونکہ اپنی قوم کو مارنا درپردہ اپنے ہی کو مارنا ہے۔ ۳۔ کسی کو قتل کرنا کہ اس کے قصاص میں تم قتل کر دئے جاؤ کیونکہ دوسرے کو ہلاک کرنا اپنے کو موت کے منہ میں دینا ہے۔

۴۔ جنگجو اور مفسد قوموں کا ساتھ نہ دینا ورنہ تم تباہ ہو جاؤ گے (تفسیر کبیر) خیال رہے کہ یہاں بھی نفی میں نہی کے معنی ہیں چونکہ ایک دوسرے کا قتل و خون سخت گناہ ہے کہ شرک و کفر کے بعد اسی کا درجہ ہے اسی لئے اس عہد کو بھی توحید کے عہد کی طرح نہایت اہتمام سے خبر کی صورت میں بیان فرمایا۔ دوسرا عہد یہ تھا کہ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اپنے کو اپنے گھروں میں سے نہ نکالنا۔ یعنی اپنی قوم یا اپنے اہل قرابت یا اپنے پڑوسی کو اتنا تنگ نہ کرنا کہ وہ مجبور ہو کر اپنا گھر یا وطن چھوڑنے پر آمادہ ہو جائے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ تم ایسی بدعملیاں نہ کرنا جس سے تم کو جلا وطن کر دیا جاوے۔ یعنی حکومت تم کو ملک سے نکال دے یا یہ کہ تم خود تارک الدنیا ہو کر اپنا گھر بار چھوڑ کر جنگل میں آوارہ نہ پھرنا بہر حال یہاں بھی یا تو نفس سے اپنی جانیں مراد ہیں۔ یا اپنے ہم قوم چونکہ جلا وطن کرنا قتل کے بعد سب سے بڑا ظلم ہے۔ چنانچہ اب بھی پھانسی کا درجہ کالے پانی کی سزا ہے نیز جلا وطن قوم کبھی سلطنت نہیں کر سکتی جب اس کی اجتماعی قوت جاتی رہی اور لوگ بکھر گئے تو مخالف کو حملہ کرنے کی جرات ہو جائے گی اور وہ اس کو غلام بنالے گا۔ اس لئے خونریزی کے بعد جلا وطنی کا ذکر کیا گیا اور اے اسرائیلیو یہ ہی نہ ہوا کہ تمہیں ان احکام کی خبر دے دی جاتی بلکہ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ تم نے اس کا بھی اقرار کر لیا کہ ہم اس پر عمل کریں گے پھر یہ اقرار خفیہ طریقہ پر یا ضمنی طور پر نہ تھا اتنا صاف اور صریح تھا کہ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ تم اب بھی اس گذشتہ اقرار کی گواہی دے رہے ہو۔ خیال رہے کہ اقرار اور گواہی ایک شخص کی نہیں ہو سکتی مقر کوئی اور ہوتا ہے اور گواہ دوسرا، اس لئے اس آیت کے یا تو یہ معنی ہیں کہ تمہارے بزرگوں نے اقرار کیا تھا اور تم اس کے گواہ ہو۔ یا یہ کہ تم سب نے اقرار کیا تھا اور بعض لوگ بعض پر گواہ تھے۔ یا تم نے پہلے اقرار کیا تھا اور اب گواہ ہو کہ ہاں ہم اقرار کر چکے ہیں اس سے مقصود یہ ہے کہ تم وہ اقرار اب تک بھولے نہیں ہو۔ سب کچھ تمہیں یاد ہے اور جان بوجھ کر اس کی مخالفت کر رہے ہو۔

خلاصہ تفسیر

اے اسرائیلیو تم اس وقت کو بھی یاد کرو جب ہم نے تم سے مضبوط عہد لیا تھا کہ تم آپس میں خونریزی نہ کرنا اور اپنی قوم کو ناحق جلا وطن نہ کرنا کیونکہ اس سے تمہاری قوت ٹوٹ جائے گی اور قومی شیرازہ بکھر جائے گا جو تمہاری ہلاکت کا باعث ہو گا تم نے اس کا پورا اقرار بھی کیا تھا۔ اور تم اب تک اس پر گواہ ہو مگر تم نے کیا کیا اور اس اقرار پر کتنے قائم رہے اس کا ذکر اگلی آیت میں آرہا ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** اپنے دینی بھائی کو مارنا درحقیقت اپنے کو مارنا ہے۔ کیونکہ اس سے قوم میں کمزوری پیدا ہو گی جس کا وبال سبھی بھگتیں گے۔ **دوسرا فائدہ:** اپنے دینی بھائی کو ذلیل کرنا درحقیقت اپنے کو ذلیل کرنا ہے کیونکہ اس سے غیر قوم کی نگاہ میں اپنی قوم کا وقار جاتا رہتا ہے اور جب اپنی قوم کا وقار گیا تو خود اپنا بھی گیا کاش کہ موجودہ مسلمان بھی یہ راز سمجھ جائیں اگر ہم مسلم قوم کی عزت کریں تو کوئی قوم ہم کو ذلیل نہیں کر سکتی۔ دوسری قوموں کو مسلمانوں کے مقابلے کی اس لئے ہمت ہوئی کہ خود مسلمان ہی اپنی قوم کے دشمن بن گئے۔ **تیسرا فائدہ:** قوم کی عزت

سے دین کی عزت ہے مومن کی عزت سے ایمان کی۔ مسلم سے اسلام کی۔ عالم دین کی عزت سے قرآن کی عزت ہے۔ دین کی عزت کے لئے دینداروں کی عزت کرو۔ اللہ پاک عمل کی توفیق عطا فرمائے آج انگریزیت کے دلدادہ دین وملت سے بے قید مادر پدر آزاد لوگ اپنی ترقی علماء کو گالیاں دینے میں سمجھتے ہیں جس کو دیکھو عالم کا بدگو ہے۔ پھر لطف یہ ہے کہ عالم کو آڑ بنا کر اسلام پر وار کرتے ہیں۔ روزے، نماز، حج وزکوۃ وقربانی کو برا کہتے ہیں کہ دین کا نام لے کر ملاؤں نے اٹھک بیٹھک، بھوکے مرنا ناحق جانوروں کا خون کرنا نکالا ہے۔ یہ بدنصیب نہ دین کے نہ دنیا کے ان کے اس عمل سے خود اپنی دینی وقومی تباہی ہے۔ یہ لوگ اس آیت سے عبرت پکڑیں۔ **چوتھا فائدہ**: مسلمانوں کو لازم ہے کہ اپنے گھر نہ چھوڑیں اور اپنی زمین فروخت نہ کریں۔ بلکہ زمین خریدنا اور اپنی آبادیاں بڑھانا اور محلے قائم کرنا ضروری ہیں اگر ہندوستان سے مسلمان چلے جائیں تو یقیناً یہاں کی مسجدیں بند اور مسلمانوں کے قبرستان گئوشالے بنالئے جائیں گے اور ان کی ساری وقف زمینوں پر غیر قبضہ کرلیں گے۔ **پانچواں فائدہ**: بعض جگہ سن کر یا شہرت پر یا علامتیں دیکھ کر بھی گواہی دی جاسکتی ہے۔ ہر گواہی میں دیکھنا ضروری نہیں۔ دیکھو موجودہ یہودیوں نے اپنے بزرگوں کے عہد ومیثاق کا واقعہ خود نہ دیکھا تھا۔ محض قربت دیکھ کر یا سن کر گواہی دی وہ معتبر ہوئی۔ اسی طرح آج بھی وقف نسب، نکاح، تبرکات کی گواہی فقط سن کر یا علامتیں دیکھ کر دی جاسکتی ہے۔ لہٰذا دیوبندیوں اور وہابیوں کا تبرکات کے ثبوت کے لئے حدیث بخاری کا مطالبہ کرنا محض غلطی ہے۔

اعتراضات

اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل کو اپنے آپ کو قتل نہ کرنے کا مکلف کیا گیا۔ انسان اپنے قتل سے تو خود ہی بچتا ہے اسے مکلف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ **جواب**: اس کا جواب تفسیر میں گزر چکا کہ بعض وقت انسان خودکشی کرتا ہے۔ بعض قومیں خودکشی کو ذریعہ نجات سمجھتی ہیں۔ اس لئے اس سے ان کو روکا گیا یا یہ مراد ہے کہ اپنی قوم کو قتل نہ کریں۔

تفسیر صوفیانہ

نفس کی پرورش کرنے میں روح کی ہلاکت ہے اور دنیا میں محبت کرنے سے اپنے اصلی وطن یعنی جنت سے محرومی۔ ہر انسان سے عہد لیا گیا ہے کہ وہ شیطان کی اطاعت اور نفس کی پیروی کر کے اپنی جان یا اپنی روح کو ہلاک نہ کردے نیز اپنے کو دنیا میں پھنسا کر اپنے کو اصل وطن جنت سے نہ نکالے یا یوں سمجھو کہ ہمارا دین فطری اسلام ہے۔ ہم دنیا میں رہ کر بھی اپنے اصلی وطن یعنی اسلام میں موجود ہیں۔ ہم کو چاہئے کہ اسلامی حدود سے نکل کر بے وطن نہ بنیں۔ نیز صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ ترقی روح کا ذریعہ شریعت کی پابندی ہے۔ یہ ہرگز جائز نہیں کہ روحانی ترقی کے لئے خودکشی کی جائے یا اپنے کو دنیوی بلاؤں میں پھنسایا جائے یا آبادی چھوڑ کر اپنے کو صحرا نشین بنایا جائے۔ ان باتوں سے فقیری نہیں ملتی۔ یہ طریقہ سادھوؤں اور جوگیوں اور راہبوں کا ہے بعض صحابہ کرام نے دین کی خاطر دنیوی لذتیں چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ کسی نے کہا کہ میں نکاح نہ کروں گا۔ کسی نے کہا میں ہمیشہ روزہ رکھوں گا وغیرہ۔ حضور علیہ السلام نے ان سب کو اس ارادے سے روک دیا اور فرمایا کہ ہمارے دل میں بہت زیادہ خوف الٰہی ہے۔ لیکن ہم نماز بھی پڑھتے ہیں اور سوتے بھی ہیں اور افطار بھی کرتے ہیں نکاح بھی کرتے ہیں۔ نکاح میری

سنت ہے جس نے اس سے منہ پھیرا وہ میرے گروہ سے نہیں لطف یہ ہے کہ شرعی قیود میں عارف کی آنکھ دنیا کے ہر آئینہ میں رب کا جمال دیکھتی ہے۔ جب یہ حال ہو جائے گا تو پھر یہ لطف ہوگا کہ انسان جہاں جائے گا رب کو پائے گا۔ مسجد میں آئے گا تو اسی کو دیکھے گا اور گھر میں پہنچے گا تو اسی تک پہنچے گا اور دکان میں داخل ہوگا تو اسی کے قرب میں داخل ہوگا۔ اور پھر یہ آیت ظاہر ہو گئی۔ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (بقرہ: ۱۱۵) جہاں جاؤ رب کو پاؤ پھر قلب کی حالت یہ ہوگی کہ نہ دنیوی غم سے غمگین ہوگا اور نہ یہاں کی راحت سے خوشی۔ اسی کا ظہور کربلا کے میدان میں ہوا کہ امام حسین نے بزبان حال فرمایا ۔

میں تیرا غیر نہیں عین ہوں اے عین کرم تو ہی آتا ہے نظر مجھ کو بچشم پرنم

ثُمَّ اَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَ تُخْرِجُوْنَ فَرِیْقًا مِّنْكُمْ

پھر تم یہ ہو کہ قتل کرتے ہو جانوں اپنی کو اور نکالتے ہو تم ایک گروہ کو اپنے

پھر یہ جو تم ہو اپنوں کو قتل کرنے لگے اور اپنے میں سے ایک گروہ کو ان پر

مِّنْ دِیَارِهِمْ٘ تَظٰهَرُوْنَ عَلَیْهِمْ بِالْاِثْمِ وَ الْعُدْوَانِؕ وَ اِنْ

ان کے گھروں سے اوروں کو مدد دیتے ہو (بمقابلہ) ان کے ساتھ گناہ اور زیادتی کے اور اگر وہ آئیں

مدد دیتے ہو (یعنی ان کے مخالف کو) گناہ اور زیادتی میں اور اگر وہ

یَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَ هُوَ مُحَرَّمٌ عَلَیْكُمْ اِخْرَاجُهُمْؕ

تمہارے پاس قیدی ہو کر تو فدیہ دیتے ہو تم ان کا اور شان یہ ہے کہ حرام ہے اوپر تمہارے

قیدی ہو کر تمہارے پاس آئیں تو بدلہ دے کر چھڑا لیتے ہیں اور ان کا نکالنا تم پر حرام ہے

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَ تَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ

نکالنا ان کا کیا تم ایمان لاتے ہو تم ساتھ بعض کتاب کے اور کفر کرتے ہو ساتھ بعض کے پس کیا بدلہ ہے

تو کیا خدا کے کچھ حکموں پر ایمان لاتے ہو اور کچھ سے انکار کرتے ہو تو جو تم میں سے ایسا کرے گا

یَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَاۚ وَ یَوْمَ

اس کا جو کرے یہ تم میں سے مگر رسوائی بیچ زندگی دنیا کے اور دن قیامت

اس کا بدلہ کیا ہے مگر یہ کہ دنیا میں رسوا ہو اور قیامت میں

الْقِیٰمَةِ یُرَدُّوْنَ اِلٰۤى اَشَدِّ الْعَذَابِؕ وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا

کے لوٹائے جائیں گے وہ طرف سخت عذاب کے اور نہیں ہے اللہ بے خبر

سخت تر عذاب کی طرف پھیرے جائیں گے اور اللہ تمہارے کوتکوں
تَعۡمَلُوۡنَ ﴿۸۵﴾
اس سے جوتم کرتے ہو
سے بے خبر نہیں

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** یہ آیت پچھلی آیتوں کا تتمہ ہے **دوسرا تعلق** پچھلی آیت میں بنی اسرائیل پر احکام بھیجنے کا ذکر تھا۔ اب ان کے اعمال کا تذکرہ ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں بنی اسرائیل کے اقرار اور عہد و پیاں کا ذکر تھا۔ اب اس کے توڑنے کا تذکرہ ہے۔

شان نزول

توریت میں بنی اسرائیل سے عہد لیا گیا تھا کہ وہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل نہ کریں اور وطن سے نہ نکالیں اور جو بنی اسرائیل کسی کی قید میں ہو اس کو مال دے کر چھڑا لیں۔ اس پر انہوں نے اقرار بھی کیا اور گواہ بھی ہوئے لیکن قائم نہ رہے اور اس سے پھر گئے۔ جس کا ذکر خلاصہ میں آتا ہے۔ اب یہ آیت کریمہ اتری (تفسیر خزائن العرفان)

تفسیر

ثُمَّ اَنۡتُمۡ هٰٓؤُلَآءِ تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ۔ ثم یا تو رتبی تراخی کے لئے ہے یا زمانی یعنی باوجودیکہ یہ احکام عقلاً نقلاً نہایت اعلیٰ تھے جن پر ملکی اور قومی انتظام موقوف تھا۔ مگر تعجب ہے کہ پھر بھی تم اس کی مخالفت کرتے ہو۔ جس سے دین دنیا میں تمہاری رسوائی ہے۔ یا یہ کہ بہت عرصہ تک تم ان احکام کے پابند رہے اتنے عرصے کے بعد اب تم نے ان کی مخالفت شروع کر دی۔ یا تو اَنۡتُمۡ مبتداء اور تقتلون اس کی خبر اور هٰٓؤُلَآءِ سے اول لفظ یا تو پوشیدہ ہے یعنی اے وہ عہد کے توڑنے والو تم اپنے کو قتل کرتے ہو یا انتم مبتداء ہے اور هٰؤُلَاءِ اس کی خبر اور تَقۡتُلُوۡنَ سے آخر تک اس کا بیان یعنی یا تو هٰؤُلَآءِ الَّذِیۡنَ کے معنی میں ہے اور جملہ اس کا صلہ اور یا یہ اپنے ہی معنی میں ہے مگر انتم سے اس کی ذات مراد اور هٰؤُلَاءِ سے ان کے صفات یعنی پھر تم وہ بے عہد لوگ ہو جو اپنے کو قتل کرتے ہو (تفسیر روح البیان) اس تقریر سے انشاء اللہ سارے وہ اعتراض اٹھ جائیں گے جو اس عبارت پر پڑتے ہیں **تَقۡتُلُوۡنَ اَنۡفُسَكُمۡ** کے یا تو یہ معنی ہیں کہ تم تارک الدنیا راہب بن کر اپنے آپ کو ہلاک کر لیتے ہو یا یہ کہ تم آپس میں ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو۔ دوسرے معنی ہی زیادہ صحیح ہیں (تفسیر کبیر) **وَتُخۡرِجُوۡنَ** یعنی یا تو تم غلبہ پا کر اپنی ایک جماعت کو جلاوطن کر دیتے ہو اور یا ان کو اتنا پریشان کرتے ہو کہ وہ وطن چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ غرض کہ بالواسطہ یا بلاواسطہ تم انہیں نکال دیتے ہو۔ **فَرِیۡقًا مِّنۡكُمۡ** فریقاً فرق سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں جدا ہونا چونکہ ہر قبیلہ دوسرے قبیلوں سے ممتاز اور جدا ہوتا ہے اس لئے اس کو فریق کہتے ہیں۔ خیال رہے کہ جہاں دنیوی وجہ سے جدائی ہو وہاں فریق بولا جائے

اور جہاں دینی وجہ سے وہاں فرقہ اور کبھی اس کا عکس بھی ہوتا ہے مِّنۡ دِيَارِهِمۡ دیار جمع دار کی ہے جس کے معنی ہیں گھر، وطن ملک کو اس لئے دیار کہتے ہیں کہ وہاں بہت سے گھر ہوتے ہیں هم کا مرجع فریق ہے جو لفظاً واحد اور معناً جمع ہے یعنی تم اپنی ایک جماعت کو ان کے وطن سے نکال دیتے ہو۔ تَظٰهَرُوۡنَ عَلَيۡهِمۡ یہ قتل کرنے اور نکالنے کا بیان ہے۔ یعنی تم براہ راست خود تو یہ حرکت نہیں کرتے، مگر ان کے دشمنوں کو ان کے مقابلہ میں امداد دیتے ہو۔ تَظٰهَرُوۡنَ ظہر سے بنا ہے جس کے معنی ہیں پشت۔ مدد دینے کو اس لئے تظاہر کہتے ہیں کہ اس سے جنگ میں دوسرے کی پشت قوی ہوتی ہے۔ اسی لئے اپنے مددگار کو پشت پناہ کہتے ہیں۔ غضب تو یہ ہے کہ تمہاری یہ امداد کسی نیک کام کے لئے نہیں بلکہ بِالۡاِثۡمِ وَالۡعُدۡوَانِ اور زیادتی میں ہے یعنی دشمن ظلماً تمہاری ایک جماعت پر حملہ کرتا ہے اور تم اس دشمن کی امداد کرتے ہو۔ لہٰذا تم بھی اس گناہ میں شریک ہوئے پھر لطف یہ ہے کہ تم اس مظلوم جماعت سے پوری دشمنی بھی نہیں کرتے بلکہ اولاً تو انہیں دیس سے نکال دیتے ہیں جس سے وہ قید ہو جاتے ہیں وَاِنۡ يَّاۡتُوۡكُمۡ اُسٰرٰى جمع اسیر کی ہے۔ اسیر وہ جس کو جبراً پکڑ لیا جائے۔ خیال رہے کہ جو قیدی ہتھکڑی بیڑی میں ہو وہ اُسۡرٰی کہلاتے ہیں اور جو فقط دوسرے کے قبضے میں ہوں وہ اُساری یعنی جب یہ مظلوم لوگ تمہارے پاس قیدی ہو کر پابجولاں آتے ہیں تو تُفٰدُوۡهُمۡ تم فدیہ دے کر ان کو چھڑا لیتے ہو۔ تُفٰدُوۡا۔ فداء سے بنا ہے جس کے معنی ہیں چیز کا معاوضہ۔ خیال رہے کہ قیدی کو چھڑانا عیب نہیں بلکہ خوبی ہے یہاں اس فعل کی برائی کرنا منظور ہے کہ تم پوری کتاب پر عامل نہیں یا یہ کہ تم خود ہی قید کرا کر خود ہی چھڑاتے ہو۔ یہ تمہاری حماقت ہے تفسیر کبیر نے تُفٰدُوۡا کے ایک یہ معنی بھی کئے کہ تم ان کا فدیہ بھی لے لیتے ہو۔ یعنی اولاً اپنی قوم کو قید کرتے ہو اور جب ان کا قرابتدار چھڑانے آئے تو مال لے کر چھوڑتے ہو۔ اس صورت میں یہ بھی ایک عیب ہی ہوا مگر پہلے معنی زیادہ صحیح معلوم ہوتے ہیں جیسا کہ اگلی عبارت کا تقاضہ ہے وَهُوَ یہ ضمیر شان ہے یعنی تمہارا عمل تو یہ ہے اور تمہارا دین یہ کہ مُحَرَّمٌ عَلَيۡكُمۡ اِخۡرَاجُهُمۡ تم پر ان کا نکالنا ہی حرام تھا۔ نکال کر چھڑانا تو ایسا ہے جیسے کسی کے گھر میں آگ لگا کر پانی کے لئے دوڑنا اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ استفہام انکار کے لئے ہے یا جھڑکنے کے لئے یا تو ایمان سے ماننا مراد ہے اور یا عمل کرنا یعنی تو کیا تم عمل کرتے ہو۔ یا مانتے ہو بِبَعۡضِ الۡكِتٰبِ بعض توریت کو یعنی تم نے توریت کے حکم فدیہ پر تو عمل کیا وَتَكۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ اور بعض توریت کا انکار کرتے یا چھوڑتے ہو۔ کیونکہ اس میں تو آپس میں جنگ کرنا اور ایک دوسرے کو وطن سے نکالنا حرام کیا گیا تھا یا یہ کہ موسیٰ علیہ السلام پر تو ایمان لاتے ہو۔ یہ بعض توریت پر ایمان لانا ہوا اور نبی آخر الزمان کا انکار کرتے ہو۔ یہ بعض توریت کا انکار یا اپنی خاطر خواہ اور دل پسند مسائل کو مان لیتے ہو اور آپس میں قتال، دیس نکالا اور اپنی قوم کا فدیہ لینا اس کو چھوڑتے نہیں وہ بعض پر عمل تھا یہ بعض کا ترک اب تم خود فیصلہ کرو کہ فَمَا جَزَآءُ یہ ما استفہامیہ ہے یا نافیہ یعنی ایسے شخص کی کیا سزا ہو سکتی ہے یا کوئی بدلہ نہیں ہے مَنۡ يَّفۡعَلُ جو ایسی حرکت کرے کہ بعض کو مانے بعض کو نہ مانے یا بعض کو چھوڑے اور بعض پر عمل کرے۔ باوجودیکہ مِنۡكُمۡ ہو تم میں سے یعنی اپنے کو یہودی بھی کہتا ہو اور توریت کو ماننے کا مدعی بھی ہو۔ اِلَّا خِزۡىٌ فِى الۡحَيٰوةِ الدُّنۡيَا خزی کے لفظی معنی ذلت ناراضی یا شرمندہ کرنا ہے۔ یہاں یا تو اس سے جزیہ مراد ہے یا قتل یا جلاوطنی یعنی اے اسرائیلیو ان حرکتوں کی وجہ سے تم پر بار ہا دنیا میں ٹیکس لگے۔ تمہیں دوسری قوموں کی طرف

سے قتل اور جلاوطن کیا گیا اور آئندہ بھی ایسا ہوگا کہ مسلمان تمہارے حاکم بنیں گے جو تم میں بعض کو قتل کریں گے اور بعض کو جلا وطن اور بعض پر ٹیکس لگائیں گے۔ کیونکہ بکھری ہوئی اور بگڑی قوم کا یہی انجام ہوتا ہے۔ قرآن پاک کی اس خبر کا آج تک ظہور ہو رہا ہے کہ اب تک یہود دوسروں کے غلام ہی ہیں اور ہمیشہ نکالے جاتے ہیں اور پھر اسی پر سزا بس نہیں بلکہ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ قیامت کے لفظی معنی ہیں کھڑا ہونا چونکہ اس دن ساری مخلوق ہی کھڑی ہوگی۔ یا تمام جہان کے سارے اولین و آخرین ایک میدان میں کھڑے ہوں گے۔ ایسے دن میں يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ لوٹائے جائیں گے سخت عذاب کی طرف رد کے لفظی معنی ہیں پکڑ کر واپس کرنا یا پہلی حالت کی طرف لوٹانا۔ یعنی اولاً پکڑے جائیں گے یا جس طرح دنیا میں پہلے ذلیل و رسوا تھے پھر اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے مگر یہ رسوائی پہلے سے سخت ہوگی اور یہ عذاب یقینی ہے کیونکہ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اللہ تمہارے کسی عمل سے غافل نہیں۔ جب اس کی قدرت بھی پوری اور علم بھی کامل تمہارے جرم بھی حد سے آگے رب تعالیٰ کا انصاف بھی اعلیٰ پھر کیا وجہ ہے کہ تم کو بڑے جرم کی سزا نہ دی جائے۔

خلاصہ تفسیر

مدینہ منورہ کے آس پاس یہود کے دو فرقے رہتے تھے۔ بنی قریظہ اور بنی نضیر اور خاص مدینہ منورہ میں مشرکین کے دو فرقے تھے۔ اوس اور خزرج بنی قریظہ اوس کے حلیف تھے اور بنی نضیر خزرج کے یعنی ہر ایک قبیلہ نے اپنے ساتھی قبیلہ سے قسمیہ معاہدہ کر لیا تھا کہ اگر ہم میں سے کسی پر کوئی حملہ بھی کرے تو دوسرا اس کی مدد کرے گا یہ اوس اور خزرج تقریباً سو برس سے آپس میں جنگ کرتے رہتے تھے۔ جس میں بنی قریظہ کو اوس کی اور بنی نضیر خزرج کی مدد کے لئے آتے تھے جب جنگ ہوتی تھی کہ اوس بنی قریظہ ایک طرف اور خزرج اور بنی نضیر دوسری طرف ہو کر آپس میں خوب کشت و خون کرتے تھے۔ جس کی وجہ سے بنی قریظہ کو بنی نضیر اور بنی نضیر کو بنی قریظہ قتل کرتے تھے اور ان کے گھر ویران کرتے اور ان کو جلاوطن کر دیتے تھے لیکن جب بنی نضیر اوس کے ہاتھوں یا بنی قریظہ خزرج کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتے تو وہ ان کو مال دے کر چھڑا لیتے یعنی بنی قریظہ کو بنی نضیر اور بنی نضیر کو بنی قریظہ چھڑاتا باوجود یکہ اگر وہی شخص جنگ کے موقعہ پر آ جاتا تو اسے قتل کرنے میں ہرگز تعامل نہ کرتے۔ جب لوگ ان سے کہتے کہ تم خود ہی انہیں قتل اور جلاوطن کرتے ہو اور پھر خود ہی تم قید سے آزاد کراتے ہو۔ یہ کیا حرکت ہے تو وہ کہتے کہ ہمیں توریت میں اپنی قوم کے قیدیوں کو چھڑانے کا حکم دیا گیا ہے۔ جب ان سے سوال ہوتا کہ پھر تم ان سے جنگ کیوں کرتے ہو تو کہتے کہ اپنے حلیف کو ذلت سے بچانے کے لئے اس آیت میں ان کے اس فعل پر ملامت کی جا رہی ہے کہ اے یہودیو تم سے تو چار عہد لئے گئے تھے۔ آپس میں قتال نہ کرنا، کسی کو جلاوطن نہ کرنا اپنی قوم کے مقابل دشمن کو امداد نہ دینا اور قیدیوں کو چھڑانا، اس کے کیا معنی کہ تم نے تین حکموں کو تو نہ مانا اور ایک پر عمل کیا۔ کیا بعض کتاب ماننے کے قابل ہے اور بعض انکار کے لائق۔ جو قوم ایسی حرکتیں کرے گی وہ دنیا میں رسوا اور آخرت میں سخت عذاب کے مستحق ہوگی چنانچہ دنیا میں تو ان کی رسوائی ہوئی کہ ۳ ہجری میں بنی قریظہ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل کر دیئے گئے کہ ایک دن میں ان کے سات سو آدمی مارے گئے اور بنی نضیر مدینہ منورہ سے نکال کر خیبر میں رکھے گئے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں وہاں سے بھی نکال

دیئے گئے یہ لوگ بارگاہ مصطفوی سے ایسے نکلے کے اب تک ان کا کہیں ٹھکانا نہیں ہے۔ اب بھی جرمنی وغیرہ کے نکالے ہوئے یہود دربدر مارے مارے پھر رہے ہیں اور انشاء اللہ قیامت تک ایسے ہی پھریں گے ان کے قتل اور جلا وطنی کی وجہ آئندہ بیان ہوگی۔ حضور ﷺ نے اوس اور خزرج قبیلوں کو دولت ایمان دے کران کے آپس کی صد سالہ جنگ کو ختم فرمادیا اور انہیں آپس میں شیر وشکر بنادیا۔ اب انہیں جماعتوں کا نام انصار ہے جن کے بہت فضائل قرآن پاک میں بیان ہوئے اور جن کی جانی اور مالی قربانیوں کی قیامت تک یادگار رہے گی بلکہ یوں سمجھو کہ یہ قوم ہی اشاعت اسلام کا ذریعہ بنی واہ رے تیری بے پروائیاں جس سے چاہے اپنا کام لے لے۔ خیال رہے کہ ان یہود کی جنگیں نفسانی یا قومی تھیں جو یقیناً جرم ہے مگر صحابہ کی آپس کی جنگیں نہ نفسانی تھیں نہ قومی بلکہ ایمانی تھیں کہ ایک دوسرے فریق کو سمجھتا تھا کہ یہ شرعی غلطی کر رہا ہے اس کی اصلاح کرنی چاہئے۔ لہٰذا وہ حضرات اس آیت کی زد میں نہیں آتے۔ دیکھو قابیل نے ہابیل کو قتل کیا عورت کے لئے یہ نفسانی قتل ہوا۔ برادران یوسف نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بلکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو پریشان کیا نفس کی یا عورت کی خاطر نہیں بلکہ یعقوب علیہ السلام کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے۔ اس لئے ان میں فرق ہوا۔ حضرت علی مرتضیٰ نے عائشہ صدیقہ یا حضرت معاویہ کے گرفتار شدہ سپاہی کو غلام نہ بنایا یا قید نہ کیا بلکہ ان کی مدارات کی۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ**: ظلم اور حرام پر مدد دینا بھی حرام ہے۔ سود لینا دینا دلوانا لکھنا گواہی دینا وغیرہ وغیرہ سب حرام ہے۔ **دوسرا فائدہ**: یہ کہ حرام قطعی کو حلال جاننا کفر ہے۔ بنی اسرائیل نے قتل وغارت کو حلال جانا انہیں کافر کہا گیا۔ **تیسرا فائدہ**: کتاب الٰہی کے ایک حکم کا انکار بھی کفر ہے۔ جیسے کے ساری کتاب کا انکار اس طرح ایک پیغمبر کا انکار بھی کفر ہے جیسے کہ سب کا انکار **چوتھا فائدہ**: کفر کے ہوتے نیک کام بیکار ہے کہ یہود کا قیدیوں کو چھڑانا بیکار رہا۔ **پانچواں فائدہ**: کسی کی طرف داری میں دین کی مخالفت کرنے سے علاوہ اخروی عذاب کے کبھی دنیا میں بھی رسوائی آجاتی ہے۔ **چھٹا فائدہ**: جو دوسروں کی وجہ سے اپنی قوم کو ذلیل کرے گا وہ خود ذلیل ہوجائے گا۔ جوڑنے کے رشتوں کو جوڑو اور توڑنے کے رشتوں کو توڑو۔ تنبیہ۔ کاش کہ اس زمانے کے عام دیوبندی اور وہابی اس راز کو سمجھ جاتے انہوں نے ہمیشہ مشرکین اور کفار سے محبت رکھی اور مسلم قوم کو اس پر قربان کیا۔ نجدیوں نے حرمین شریفین کی زمین سے صحابہ کرام کی قبروں کو اکھڑوادیا لیکن اسی زمین پاک میں عیسائیوں کو پہنچایا اور جدہ شریف میں عیسائیوں کی پختہ قبریں بننے کی اجازت دی بلکہ زمین حرم امریکی کمپنی کے ہاتھ کان کنی کے ٹھیکے کے بہانے فروخت کرڈالی۔ ہندوستان کے دیوبندیوں نے جمعیت علمائے احرار، حکومت الٰہیہ وغیرہ کے ناموں سے ہمیشہ ہندوؤں کی ہمنوائی کی اور مسلم قوم کو پائمال کیا۔ یہود قتال کرکے اپنے قیدیوں کو چھڑا لیتے تھے ان سے یہ بھی نہ ہوسکا یہ یہودیوں سے بھی قومی دشمنی میں چار نمبر آگے ہیں **ساتواں فائدہ**: جائز وعدوں کو پورا کرنا اور ناجائز وعدوں کو توڑ دینا ضروری ہے۔ بنی اسرائیل نے اوس خزرج سے ناجائز وعدے کئے اور پھر ان پر قائم رہے اس پر رسوائی اور عذاب کے مستحق ہوئے کیونکہ سب سے بڑھ کر وہ وعدہ ہے جو ہم

نے رب سے کیا اس کے مقابل سارے وعدے باطل اور توڑنے کے قابل ہیں کسی نے اپنے دوست سے وعدہ کیا کہ آج شام کو ہم دونوں شراب پئیں گے۔ اس کا توڑنا ضروری ہے کیونکہ ہم نے مسلمان ہو کر رب سے وعدہ کیا ہے کہ شراب نہ پئیں گے۔ اسی لئے ناجائز کام کی قسم توڑنا اور کفارہ ادا کرنا واجب ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا ظلم پر مدد کرنا بھی ظلم ہے۔ تو حق تعالیٰ نے ظالم کو ظلم پر قدرت کیوں دی یہ بھی ظلم پر مدد ہے۔ **جواب:** رب نے ظلم پر قدرت دے کر اس سے منع بھی فرمایا اور بہت ڈرایا ہے۔ مگر انسان جب ظالم کی مدد کرتا ہے تو اسے ظلم کی رغبت دیتا اور اس سے ظلم کرواتا ہے۔ لہٰذا رب کا قدرت دینا ظلم پر امداد نہیں۔ قدرت محض اس لئے دی گئی ہے کہ بندہ اس پر قابو پا کر اس سے بچے اور ثواب کا مستحق ہو۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ ان یہود کا آپس میں جنگ کرنا دنیوی وجہ سے تھا تو زیادہ سے زیادہ یہ حرام ہونا چاہئے اسے کفر کیوں کہا گیا آج بھی مسلمان بہت سی ناجائز حرکتیں کرتے ہیں۔ انہیں کافر نہیں کہا جاتا۔ **جواب:** یا تو وہ لوگ یہ حرکتیں حلال سمجھ کر کرتے تھے لہٰذا کافر ہوئے اور یا اس لئے کہ شریعت میں بعض بڑے گناہ کو بھی کفر کہہ دیا جاتا ہے کہ وہ کافروں کا سا کام ہے۔ جس طرح ہم کسی ذلیل حرکت کرنے والے کو کہہ دیں کہ تو بھنگی ہے۔ یعنی بھنگیوں کے سے کام کرتا ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ وہ اس کام کو نفرت کر کے چھوڑ دے۔ جیسے کہ حدیث شریف میں ہے کہ جس نے قصداً نماز چھوڑی وہ کافر ہو گیا۔ خیال رہے کہ یہ دوسرا جواب مولوی اشرف علی صاحب کا ہے اور یہ سخت ضعیف ہے کیونکہ اس آیت اور اگلی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں حقیقی کفر ہی مراد ہے۔ لہٰذا جواب اول جو حضرت صدر الافاضل دام ظلہم نے اپنی تفسیر خزائن العرفان میں دیا نہایت قوی ہے۔

تیسرا اعتراض: یہاں فرمایا گیا کہ یہ یہودی سخت عذاب میں لوٹائے جائیں گے چاہئے یہ کہ سخت عذاب دہریوں کو ہو جو کہ خالق ہی کے منکر ہیں کیونکہ ان کا کفر بھی سخت ہے۔ **جواب:** اس کا مطلب یہ ہے کہ جس عذاب میں وہ جائیں گے وہ دنیا کے عذاب سے سخت ہوگا۔ اگرچہ بعض دیگر کفار کے عذاب سے نرم ہو۔ (تفسیر کبیر) **چوتھا اعتراض:** أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ میں اگر هؤلاءِ اَنتُم کی خبر ہو تو ترکیب صحیح نہیں ہوتی کیونکہ مبتداء اور خبر میں فرق چاہئے یہاں دونوں ایک ہی ہیں نیز اَنتُم حاضر ہے اور هؤلاءِ غائب۔ **جواب:** اس کے جوابات تفسیر میں گزر گئے کہ اَنتُم سے ان کی ذات مراد ہے۔ اور ھولاء سے ذات مع صفت وغیرہ۔ **پانچواں اعتراض:** اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا سے معلوم ہوا کہ یہودی دنیا میں ہمیشہ ذلیل ہی رہیں گے حالانکہ موجودہ زمانے کے یہود حکومت کر رہے ہیں **جواب:** بسا اوقات مجرم کو سزا دینے کے لئے اونچے مقام پر چڑھا کر نیچے پھینکا جاتا ہے۔ اسی طرح عنقریب ہی موجودہ یہود کی حکمرانی ان کی ذلت کا باعث بنے گی۔ **چھٹا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ آپس میں لڑنا بھڑنا کفار کا کام ہے اور ایک دوسرے پر رحیم و کریم ہونا صحابہ کی صفت ہے رب فرماتا ہے رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ (فتح:۲۹) مگر صحابہ ایک دوسرے کے جانی دشمن لہٰذا یہ آیت درست نہیں یا صحابہ مومن نہ تھے۔ **جواب:** یہ جنگیں رحم و کرم کے خلاف نہیں۔ ذاتی امور میں وہ حضرات رحیم تھے

اور دینی امور میں سخت تھے۔

تفسیر صوفیانہ

قیدی چھوڑانا بہت اچھا کام ہے اسی لئے اس آیت میں ان کے جلاوطن کرنے کو حرام فرمایا نہ کہ چھوڑانے کو۔ قیدی دو قسم کے ہیں ایک جسم کے قیدی دوسرے قلب کے جسم کے قیدی تو مال وغیرہ سے چھوٹتے ہیں اور قلب کے قیدی دیگر چیزوں سے کمند ہوا کے قیدی کی رہائی ہدیٰ (ہدایت) سے ہے اور محبت دنیا کے قیدی کی خلاصی ذکر موت ہے۔ وسواس شیاطین کے قیدی کا فدیہ دلائل و برہان اور یقین ہے تاکہ شکوک اور تخمین سے بچ جائے۔ تکبر کے قیدی کی نجات رہبری حق اکبر ہے لیکن بعض عشق کے قیدی ہیں ان کا نہ کوئی فدیہ ہے اور نہ کوئی چھٹکارے کا راستہ کیونکہ عشق کے قیدی کی دیت اس کے مقتول کا قصاص اس کے مربوط کا خلاص نہیں بلکہ اس تک ہر ایک کی رسائی بھی نہیں کیونکہ یہ مقام اولیائے کاملین کا ہے طالب صادق کو ضروری ہے کہ اپنے کو گزشتہ قیدیوں سے نکال کر محبوب کے اس جال میں پھنسائے تاکہ دنیوی رسوائی سے نجات پائے کیونکہ اس جگہ بہت جانچ پرکھ کر قبولیت ہوتی ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرَوُا الْحَيَاةَ الدُّنْيَا بِالْآخِرَةِ ۖ فَلَا
یہ لوگ وہ ہیں جنہوں نے خرید لیا زندگی دنیاوی کو بعوض آخرت کے پس نہ
یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے آخرت کے بدلے دنیا مول لی تو نہ
يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُونَ ﴿٨٦﴾
ہلکا کیا جائے گا ان سے عذاب اور نہ وہ لوگ مدد کیے جائیں گے
ان پر سے عذاب ہلکا ہو اور نہ ان کی مدد کی جائے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پہلے یہود کے بعض عیوب اور کچھ خوبیاں (قیدی چھڑانا) بیان کی گئی تھیں۔ جس سے وہم ہوتا ہے کہ شاید ان کی جزا بھی ملے گی کچھ عذاب اور کچھ انعام۔ اس آیت میں اس وہم کو دفع کیا گیا کہ چونکہ وہ اپنی آخرت دنیا کے عوض بیچ چکے یعنی اس لئے وہ صرف عذاب ہی پائیں گے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت سے شبہ ہوتا تھا کہ وہ یہودی مومن تو ہیں اسی لئے وہ قیدیوں کو چھڑاتے ہیں ہاں کبھی دنیا میں پھنس کر گناہ بھی کر بیٹھتے ہیں یہاں فرمایا گیا کہ نہیں وہ جو نیک کام کرتے ہیں وہ بھی دنیوی غرض کے لئے انہیں آخرت کا کوئی خوف نہیں۔ لہٰذا ان کی کوئی نیکی ہی نہیں۔ **تیسرا تعلق:** اس سے پہلے فرمایا گیا تھا کہ یہ یہودی دنیا میں خوار اور آخرت میں عذاب میں گرفتار ہوں گے اب اس کی وجہ بتائی جا رہی ہے کہ انہوں نے آخرت کے نفع کے لئے اپنے پاس کوئی چیز رکھی ہی نہیں یہ تو اس تاجر کی طرح ہیں جس نے اپنی اصل رقم بھی ضائع کر دی ہو۔ لہٰذا ان کی یہ ہی سزا چاہئے۔ **چوتھا تعلق:** پہلے

یہود کی حرکتوں کا ذکر تھا۔ اب ان کی نوعیت اور حیثیت کا بیان ہے۔ کہ یہ دنیا کے بندے ہیں جدھر دنیا ان کو لے جاتی ہے ادھر جاتے ہیں۔

تفسیر

اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ یہ مسلمانوں سے خطاب ہے کہ اے مسلمانو تم نے جن کے اوصاف قبیحہ سن لئے جانتے ہو کون ہیں۔ یہ وہ ہیں جنہوں نے اشْتَرَوُا الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا بِالْاٰخِرَۃِ آخرت کے عوض دنیوی زندگی خرید لی۔ یعنی آخرت کے مقابل اسے اختیار کر لیا۔ مثلاً اگر ان کے سامنے کوئی ایسی چیز آئی جو دنیا کے واسطے نافع اور آخرت کے لئے مضر ہے تو انہوں نے آخرت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اسے بے تامل لے لیا اور جب کوئی ایسی چیز پائی جو آخرت کے لئے نافع ہے اور ان کی دنیا کیلئے مضر تو اسے بے کھٹک چھوڑ دیا۔ نیز رب کو چھوڑ کر دنیا والوں کی خوشامد میں مشغول رہے تو اب یہ لوگ آخرت کے کس نفع کے امیدوار ہیں۔ ان کی سزا یہ ہے کہ فَلَا یُخَفَّفُ عَنْھُمُ الْعَذَابُ کہ رب کی طرف سے ان کا عذاب کبھی ہلکا نہ کیا جائے گا کیونکہ یہ بھی ایک قسم کا اخروی نفع ہے اور رب کا کرم جس سے وہ بالکل محروم ہیں۔ وَلَا ھُمْ یُنْصَرُوْنَ اور نہ ان کی بیرونی امداد کی جائے گی۔ یعنی جیسے کہ دنیوی مصیبت کے وقت اپنے حمائیتیوں کی مدد کی امید رکھتے ہیں وہاں ایسا نہ ہوگا نہ تو کوئی ان کی شفاعت کرے گا۔ اور نہ کوئی رب کے مقابلہ میں زور سے ان کی حمایت۔

خلاصہ تفسیر

یہ یہودی جن کے یہ کرتب ہیں کہ ہر کام دنیا کے لئے کرتے ہیں۔ آخرت کا کبھی دل میں خیال بھی نہیں لاتے اور آخرت کے عوض دنیا قبول کر چکے یہ کس منہ سے کہتے ہیں کہ ہمیں کچھ روز عارضی عذاب ہو کر چھٹکارا ہو جائے گا۔ غلط ہے بلکہ ان کے عذاب میں کسی قسم کی تخفیف نہ ہوگی۔ نہ تو موقوف کر کے اور نہ ہلکا کر کے اور نہ انہیں کوئی بیرونی امداد پہنچے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** جو شخص دنیا کی خاطر کوئی نیک کام کرے یا برائی سے بچے وہ کچھ نفع نہ پائے گا۔ مثلاً ایک شخص شراب سے اس لئے بچتا ہے کہ وہ اسے نقصان دیتی ہے، چوری اس لئے نہیں کرتا کہ اس سے بدنامی اور جیل ہوگی۔ وہ اس کا کوئی ثواب نہ پائے گا۔ کیونکہ اتباع شریعت سے نہ چھوڑا۔ جیسے کہ ان یہودیوں کا قیدی چھڑانا تھا۔ بلکہ ریاکاری کی عبادت بھی بے فائدہ ہے۔ اگرچہ اس سے شرعی فرض ادا ہو جاتا ہے۔ اس لئے وہ حضرات عبرت پکڑیں جو دکھاوے اور نام نمود کے لئے ماں باپ کی خدمت میں یا اولاد کی شادیوں میں ہزارہا روپیہ خرچ کرتے ہیں۔ لڑکیوں کو بھاری جہیز دیتے ہیں چونکہ یہ سب نام و نمود کے لئے ہے اس لئے اس پر ثواب نہیں۔ **دوسرا فائدہ:** عذاب میں کمی نہ ہونا اور بیرونی امداد کا نہ پہنچنا صرف کفار کے لئے ہے۔ الحمد للہ گنہگار مسلمان کے لئے عذاب کی قبر و حشر میں بھی کمی ہوگی اور بیرونی امداد بھی پہنچے گی۔ چنانچہ جمعہ اور ماہ رمضان میں مومن کے عذاب میں کمی ہوتی ہے۔ اور ان شاء اللہ آخرت میں بھی عذاب منقطع ہو جائے گا اور ویسے بھی کمی ہوتی رہے گی۔ اسی طرح مومن کے بچے، علماء، اولیاء اللہ، انبیائے کرام شفاعت اور

ایصال ثواب سے اس کی امداد کرتے ہیں اور کریں گے اس لئے زندوں کو حکم ہے کہ اپنے مردوں کی صدقہ وخیرات سے امداد کریں۔ آج جو کہتے ہیں کہ ہمارا کوئی مددگار نہیں وہ در پردہ اپنے کفر کا اقرار کرتے ہیں۔ اور دیکھایہ گیا ہے کہ جو صدقہ خیرات سے لوگوں کو روکتے ہیں ان کے مرنے کے بعد انہیں کوئی بھی فاتحہ وخیرات سے یاد نہیں کرتا۔ **تیسرا فائدہ:** مسلمان کیسا بھی گنہگار ہو مگر آخرت کے عوض دنیا نہیں خریدتا گناہ کرتے شرمندہ ہوتا ہے۔ اور دل میں خوف رکھتا ہے بلکہ اگر اچھی صحبت پائے تو برائیوں سے بچنے بھی لگتا ہے لہٰذا یہ آیت اس پر ہرگز چسپاں نہیں ہو سکتی۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار کے عذاب میں کبھی تخفیف نہ ہوگی حالانکہ بخاری جلد دوم کتاب النکاح کی روایت ہے کہ ابولہب کے عذاب میں اس لئے تخفیف ہو جاتی ہے کہ اس نے حضور علیہ السلام کی ولادت کی خوشی منائی تھی۔ اب اس آیت اور حدیث میں کس طرح مطابقت کی جائے۔ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ یہ حکم خاص ان کافروں کے لئے ہے جن میں مذکورہ عیوب ہوں نہ کہ ہر کافر کے لئے۔ بعض کفار پر ان کے اعمال کی وجہ سے عذاب ہلکا ہو جاتا ہے۔ جیسے حاتم طائی وغیرہ دوسرے یہ کہ ایسے کافروں کیلئے اول ہی سے ہلکا عذاب مقرر ہوتا ہے نہ یہ کہ پہلے عذاب سخت ہو اور بعد میں ہلکا کیا جائے جس کی اس آیت میں نفی ہو رہی ہے۔ مثلاً ابولہب کے لئے اول ہی سے یہ مقرر ہے کہ جب وہ جہنم میں اپنی انگلی چوسے تو اس کی پیاس بجھ جائے۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار کی امداد بھی نہ کی جائے گی۔ حالانکہ حدیث شریف میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے اپنے چچا ابوطالب کی ان کی وفات کے بعد بہت بڑی امداد فرمائی کہ انہیں جہنم میں پایا تو وہاں سے نکال کر آگ کے جھیرے میں رکھ دیا۔ لہٰذا اب وہ عین جہنم میں نہیں بلکہ اس سے علیحدہ ہیں جہاں اس کی تپش پہنچ رہی ہے یہ ہی کافر کی امداد ہے۔ **جواب:** اس کے بھی دو جواب ہیں ایک یہ کہ کفار کے لئے عذاب ختم کرنے کی امداد نہ ہوگی۔ تخفیف کی امداد ہو سکتی ہے دوسرے یہ کہ ان کی دھونس کی امداد نہ ہوگی کہ کوئی رب تعالیٰ پر جبر کر کے ان کو چھوڑا دے ہم انشاء اللہ آیت الکرسی کی تفسیر میں عرض کریں گے کہ حضور کی شفاعت سات قسم کی ہے اور بعض شفاعتوں سے کفار بھی فائدہ حاصل کریں گے۔ خلاصہ یہ کہ کفار کو ان کے بتوں کی طرف سے مدد نہ پہنچے گی اگر نبی یا ولی کی مدد پہنچے گی تو یہ ممکن ہے یا یوں کہو کہ کفار دو قسم کے ہیں ایک محبت انبیاء کی زیادتی محبت سے کافر جیسے عیسائی دوسرے عداوت انبیاء سے کافر جیسے یہودی عداوت والے کفار کا نہ عذاب ہلکا ہو نہ انہیں مدد پہنچے۔ کفار محبت کے لئے یہ دونوں چیزیں ہو سکتی ہیں لہٰذا آیت واضح ہے۔

تفسیر صوفیانہ

دنیا اور آخرت ان سوکنوں کی طرح ہیں جن کا اجتماع ناممکن ہے جو چاہے کہ میں دنیا کی لذتوں میں پھنسا رہوں اور آخرت بھی ہاتھ سے نہ جائے وہ بیوقوف ہے حق تعالیٰ نے ہر شخص کو موقع دیا ہے کہ ان میں سے جو چاہے اختیار کرلے جو شخص کہ ان میں سے ایک کے حاصل کرنے میں مشغول ہوگا تو دوسری کھو بیٹھے گا یہود کے پاس توریت اور دامن نبی تھا انہوں نے اس کو

چھوڑ کر دنیوی لذت کو اختیار کیا اور اس تجارت میں نفع نہ پایا یوں سمجھو کہ دنیا اور آخرت ترازو کے دو پلڑوں کی طرح ہیں کہ ایک کے بھاری ہونے سے دوسرا ہلکا ہو جاتا ہے خیال رہے کہ صوفیہ کے نزدیک دنیا وہ ہے جو رب سے غافل کر دے۔ بال بچوں کا پالنا، سنت سمجھ کر حلال روزی تلاش کرنا عین دین ہے۔ چاہئے تو یہ کہ دل کے پلڑے میں دین رہے اور ظاہر اعضاء دنیوی کاروبار کریں اور زبان مثل ترازو کی ڈنڈی کے استعمال ہو۔ اسی لئے اس کو بھی لسان کہتے ہیں۔ اور ترازو کی ڈنڈی کو بھی لسان۔

وَ لَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَ قَفَّیْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ٘
اور البتہ تحقیق عطا کی ہم نے موسیٰ کو کتاب اور پیچھے بھیجا ہم نے ان کے بعد رسولوں کو
اور بے شک ہم نے موسیٰ کو کتاب عطا کی اور اس کے بعد پے در پے رسول بھیجے
وَ اٰتَیْنَا عِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ وَ اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِؕ
اور عطا کیں ہم نے عیسیٰ بیٹے مریم کو کھلی نشانیاں اور قوت دی ہم نے ان کو ساتھ روح پاک کے
اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو کھلی نشانیاں عطا فرمائیں اور پاک روح سے اس کی مدد کی
اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْۚ
پس جب کبھی لائے تمہارے پاس کوئی رسول اس کو جو کہ نہیں خواہش کرتے نفس تمہارے تو غرور کیا
تو کیا جب تمہارے پاس کوئی رسول حکم لے کر آئے جو تمہارے نفسوں کی خواہش نہیں تکبر کرتے ہو تم ان
فَفَرِیْقًا كَذَّبْتُمْ٘ وَ فَرِیْقًا تَقْتُلُوْنَ۝۸۷
تم نے پس ایک گروہ کو جھٹلایا تم نے اور ایک گروہ کو قتل کرتے ہو تم
(انبیاء) میں اور ایک گروہ کو تم جھٹلاتے ہو اور ایک گروہ کو شہید کرتے ہو

تعلق

اس آیت کریمہ کا پچھلی آیتوں سے چند طرح کا تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** اس سے پہلے موجودہ بنی اسرائیل کے ایمان سے مایوسی کی چند وجہیں بیان کی گئیں اب بھی اس کی ایک بہت بڑی وجہ بیان کی جارہی ہے کہ یہ لوگ تو ایسے نفس پرست اور دنیا دار ہیں کہ انہوں نے نفسانی خواہش کے ماتحت بہت سے پیغمبروں کو شہید کر دیا ان کے ایمان کی کیا امید **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں یہود کا آپس میں قتال کرنے کا ذکر تھا۔ اب انبیاء کرام کو شہید کرنے کا تذکرہ ہے جو کہ اس سے کہیں بدتر گناہ ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت کے مضمون کا بنی اسرائیل انکار کر سکتے تھے کہ ہم ان حرکات کی وجہ سے بیشک گنہگار ہیں مگر کافر نہیں کیونکہ آپس میں جنگ فسق ہے کفر نہیں اور فاسق عارضی عذاب پا کر نجات پائے گا۔ اس آیت میں اس کا جواب دیا جا

رہا ہے کہ بعض گناہ انکار کی علامت ہیں ان کا کرنے والا کافر ہوتا ہے۔تم منکر ہو کر جنگ کرتے ہو اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ تم اس سے پہلے ہمارے پیغمبروں کو شہید کر چکے ہو کہو وہاں کیا بہانہ کرو گے۔

تفسیر

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ لفظ موسیٰ کی تحقیق وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى (بقرہ:۵۱) کی تفسیر میں ہو چکی۔ الکتاب سے خاص کتاب توریت مراد ہے۔جس میں رب تعالیٰ کے سارے عہد و پیمان موجود تھے اور سب سے بڑا عہد یہ تھا کہ ہر وقت کے پیغمبر کی اطاعت کرو۔ان پر ایمان لاؤ۔ان کی تعظیم و توقیر کرو۔حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام کو توریت کی تختیاں ملیں تو وہ اٹھا نہ سکے۔حق تعالیٰ نے ایک ایک آیت اٹھانے کے لئے ایک ایک فرشتہ مقرر کیا۔وہ بھی نہ اٹھا سکے پھر ایک ایک حرف کے لئے ایک ایک فرشتہ بھیجا اس سے بھی نہ اٹھ سکا۔جب اس کتاب کی عظمت ظاہر ہوگئی تب اس کو موسیٰ علیہ السلام کے لئے ہلکا کر دیا گیا اور وہ اٹھا کر بنی اسرائیل کے پاس لائے چونکہ پوری توریت یعنی لکھی ہوئی ایک دم عطا ہوئی تھی اور غالباً بغیر فرشتہ کے ذریعہ براہ راست رب کی طرف سے ملی تھی اس لئے یہاں اٰتَيْنَا فرمایا گیا۔یعنی ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو بڑی کتاب ایک دم عطا فرمائی اور اس کتاب کی حمایت کے لئے وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ ان کے بعد ہم نے بہت سے پیغمبر بھیجے لفظ قَفَّيْنَا۔قَفَاءٌ سے بنا ہے۔جس کے معنی ہیں پشت یا قدم کے نشان رسل۔رسول کی جمع ہے جس کے معنی ہیں بھیجے ہوئے پیغمبر، نبی اور رسول میں یا تو محض اعتباری فرق ہے یعنی چونکہ وہ غیب کی خبر دیتے ہیں اس لئے وہ نبی ہیں اور چونکہ خدا نے انہیں تبلیغ کے لئے بھیجا ہے اس لئے وہ رسول۔یا یوں کہو کہ جو تبلیغ احکام کے لئے آئے وہ نبی اور جو اس کے ساتھ ساتھ نئی یا پرانی کتاب بھی رکھتے ہوں۔وہ رسول اور جو پیغمبر کہ نئی کتاب اور نئی شریعت لے کر آئیں۔وہ مرسل اسی لئے کہا جاتا ہے کہ نبی ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم و بیش ہیں اور رسول تین سو تیرہ یا کم و بیش مرسل چار ہیں۔موسیٰ علیہ السلام، داؤد علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام اور ہمارے نبی آخر الزمان ﷺ پہلے معنی سے موسیٰ علیہ السلام سے پہلے پیغمبر بھی رسول کہلائیں گے۔دوسرے معنی سے ان حضرات کو نبی کہا جائے گا نہ کہ رسول اور رسولوں کا سلسلہ موسیٰ علیہ السلام سے شروع ہوگا کیونکہ آپ ہی صاحب کتاب پیغمبر ہیں۔اس جملہ کے معنی یہ ہوئے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کے بعد اور پیغمبروں کو بھی ان کے قدم بہ قدم چلایا یا ان کے پیچھے ہم نے اور رسول بھیجے۔مفسرین فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کے درمیان چار ہزار پیغمبر گزرے۔جن میں سے بڑے بڑے پیغمبر حضرت یوشع الیاس الیسع ،شموئیل ، داؤد، سلیمان ،شعیا ، ارمیا، یونس ، عزیر، حزقیل ، زکریا ، یحییٰ ، شمعون علیہم السلام ہیں۔یہ سب حضرات توریت شریف کے احکام کی تبلیغ فرماتے تھے اور ان کی ایک ہی شریعت تھی (تفسیر کبیر و عزیزی) اور بنی اسرائیل سے احکام الٰہی ادا کرنے میں جو سستی ہو جاتی اس کو دور کرتے تھے۔اسی طرح بے عمل عالم جو توریت کو بگاڑ دیتے تھے یہ انبیاء کرام اس کی اصلاح فرماتے تھے۔ہمارے حضور علیہ السلام پر چونکہ سلسلہ نبوت ختم ہو گیا۔لہٰذا اس دین کی حفاظت کے لئے علماء ربانی مجددین اور اولیاء پیدا فرمائے گئے۔جن کا سلسلہ قیامت تک انشاء اللہ رہے گا۔اسی لئے روایت میں آیا کہ میری امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہوں گے۔یعنی ان کی

طرح دین مصطفیٰ علیہ السلام کی حفاظت اور اشاعت کریں گے۔ ابوداؤد شریف کی روایت میں ہے کہ اللہ تعالیٰ اس امت میں ہر سو برس پر ایک مجدد بھیجے گا جو ان کے دین کی تجدید یعنی درستی اور تازگی کرے گا۔ سبحان اللہ اس پیش گوئی کا ظہور آج ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ جتنی خدمت اسلام علمائے اسلام نے کی اتنی خدمت کسی دین کے علماء نے اپنے دین کی نہ کی۔ کسی کتاب کی تفسیریں نہ لکھی گئی۔ کسی نبی کی حدیثیں جمع نہ ہوئیں۔ کسی دین میں علم فقہ نہ بنا۔ یہ چیزیں صرف اسلام میں ملیں گی اور ان کی خدمات کا سہرا علماء کے سر ہے جو اس زبان سے نکلا وہ پورا ہوا حالانکہ علماء اسلام کی نہ کوئی حکومت خدمت کرتی ہے نہ قوم اس کسمپرسی میں بھی تمام خدمات ہو رہی ہیں اور اے اسرائیلیو اگر تم یہ بہانہ کرو کہ چونکہ ان پیغمبروں کے پاس موسیٰ علیہ السلام کی طرح بڑے بڑے معجزے نہ تھے جس سے ہمارے بزرگوں کو ان کے ثبوت میں شبہ ہوا۔ اور غلطی سے انہیں شہید کر ڈالا تو بھی تم جھوٹے ہو۔ کیونکہ وَ اٰتَیْنَا عِیْسَى ابْنَ مَرْیَمَ الْبَیِّنٰتِ ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو کھلے ہوئے معجزے عطا فرمائے چونکہ عیسیٰ علیہ السلام سے پہلے پیغمبر شریعت موسوی کے پیرو تھے۔ عیسیٰ علیہ السلام نے شریعت موسوی کے اکثر احکام منسوخ فرمائے۔ اس لئے آپ کا ذکر مستقل طور پر علیحدہ کیا گیا آپ کا اسم شریف یسوع ہے جس کے معنی ہیں مبارک اسی سے لفظ عیسیٰ بنا یہ لفظ عیسیٰ بھی عبرانی ہے اور ان دونوں کے معنی ایک ہی ہیں۔ آپ نے پیدا ہوتے ہی فرمایا تھا کہ وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا (مریم: ۳۱) رب تعالیٰ نے مجھے برکت والا بنایا۔ آپ کی ذات سے پہلے بھی بہت سی برکتیں ظاہر ہو چکیں اور قیامت کے قریب نازل ہونے پر بھی ظاہر ہوں گی۔ چونکہ آپ کی پیدائش بغیر باپ کے ہے اس لئے قرآن کریم نے انہیں ان کی والدہ کی طرف نسبت کر کے ابن مریم فرمایا باقی کسی پیغمبر کا نام مع ولدیت نہ لیا۔ مریم کے لفظی معنی ہیں خادمہ اور عابدہ۔ چونکہ ان کی والدہ نے انہیں بیت المقدس کی خدمت کے لئے وقف کر دیا تھا اور بچپن ہی سے نہایت عبادت گزار تھیں اس لئے ان کا نام مریم ہوا۔ ان کی یہ خصوصیت ہے کہ قرآن کریم نے سات جگہ انبیاء کے ساتھ ان کا ذکر فرمایا ہے۔ انبیاء کرام کی طرح ہی خطاب بھی فرمایا۔ وَ اصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ (ال عمران: ۴۲)۔ اَلْبَیِّنٰتِ یہ بَیِّنَةٌ کی جمع ہے جس کے معنی ہیں روشن معجزہ۔ عیسیٰ علیہ السلام کو بہت بڑے بڑے معجزے عطا ہوئے۔ اولاً تو آپ بذات خود معجزہ تھے۔ پھر مردوں کو زندہ کرنا، مادرزاد اندھے اور کوڑھیوں کو تندرست کرنا، مٹی کا پرندہ بنا کر پھونک مار کر اصلی پرندہ بنا دینا۔ غیب کی خبریں دینا۔ توریت پاک کا خود بخود دیکھ لینا وغیرہ۔ یہ وہ معجزات ہیں جو موسیٰ علیہ السلام کے معجزوں سے کسی طرح کم نہیں۔ اس کے علاوہ ایک خاص چیز ان کو عطا فرمائی گئی جو موسیٰ کو بھی نہ ملی وہ یہ کہ وَ اَیَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ہم نے انہیں پاک روح سے قوت دی۔ اَیَّدْنَا۔ اید سے بنا ہے جس کے معنی ہیں قوت اور مضبوطی، تائید، قوی کرنا روح القدس صفت موصوف ہیں جس کے معنی ہیں پاک رُوْحٌ رِیْحٌ۔ رِیْحٌ کے معنی ہیں ہوا روح وہ ہوا کہلاتی ہے جو جاندار کے مسامات میں پھر کر اس کو زندہ رکھتی ہے (تفسیر کبیر) قدس یہاں اس سے یا تو حضرت جبریل علیہ السلام مراد ہیں۔ کیونکہ آپ خود روحانی ہیں اور آپ میں روح بخشنے کی تاثیر ہے۔ حضرت مریم کو پھونک سے فرزند دے دیا اور آپ کے گھوڑے کے سم کی خاک سے سامری کا بچھڑا زندہ ہو گیا یا اس لئے کہ آپ وحی لاتے ہیں جو کہ دلوں کی زندگی ہے عیسیٰ علیہ السلام تینتیس سال کی عمر شریف میں آسمان پر اٹھائے گئے۔ اس

عرصہ میں جبرئیل ہر وقت آپ کے ساتھ رہے بلکہ یوں سمجھو کہ مریم کو بچپن شریف میں جنت سے میوے لا کر انہیں نے کھلائے۔ عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت انہی نے ان کو شیطان سے محفوظ رکھا۔ ساری عمر یہودیوں کے فریب سے انہوں نے ان کو بچایا اور آخر کار یہی ان کو آسمان پر لے گئے غرض کہ حضرت جبریل عیسیٰ علیہ السلام کے خادم خاص ہیں یا روح القدس وہ اسم الٰہی ہے جس سے عیسیٰ علیہ السلام مردوں کو زندہ اور بیماروں کو تندرست کرتے تھے۔ یا روح القدس سے خود آپ کی ہی روح مراد ہے تفسیر عزیزی نے اس جگہ فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام کی روح ملکی تھی اور آپ بہت سے بشری عوارض سے پاک تھے۔ تفسیر روح البیان شریف نے ایک جگہ فرمایا کہ آپ نصف بشر اور نصف ملک ہیں کیونکہ آپ کی پیدائش بھی بشر اور ملک سے ہی ہے کچھ بھی ہو آپ کی بڑی خصوصیت ہے اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ یہ موجودہ یہودیوں سے خطاب ہے اگرچہ یہ حرکات ان کے اگلوں نے کی تھیں۔ لیکن چونکہ یہ ان کے حمائتی اور طرف دار پیروکار تھے اس لئے ان سے ہی فرمایا گیا کہ جب کبھی ان پیغمبروں میں سے کوئی پیغمبر تمہارے پاس وہ احکام لے کر آئے کہ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ جو تمہارے دل نہ چاہتے تھے اور تمہاری نفسانی خواہشوں کے خلاف تھے تو تم نے بجائے اطاعت کرنے کے اور توریت کے عہد کو پورا کرنے کے اسْتَكْبَرْتُمْ تکبر کیا اور اس کے قبول کرنے سے انکار کیا اور صرف اسی پر تم نے صبر نہ کیا۔ بلکہ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ ان میں سے ایک جماعت کو تم نے جھوٹا کہا۔ یعنی خود تو اطاعت سے باز رہے اور دوسروں کو بھی باز رکھا بلکہ جس پر تمہارا بس چلا وَ فَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ اس فریق کو تم قتل بھی کر دیتے تھے چونکہ جھٹلانا ایک بار ہی ہوتا ہے اور قتل کی تدبیریں اور سازشیں بار بار ہوتی ہیں۔ اور عرصہ تک رہتی ہیں اور قسم قسم کی ہوتی ہیں۔ اس لئے جھٹلانے کو ماضی کے صیغہ سے كَذَّبْتُمْ فرمایا گیا اور قتل کرنے کو مضارع کے صیغہ سے۔

خلاصہ تفسیر

اے بنی اسرائیل تمہارا یہ آپس کا کشت و خون یا نبی آخر الزمان کی مخالفت غلطی اور خطا سے نہیں بلکہ سرکشی اور عناد سے ہے۔ جس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کو توریت جیسی عظیم الشان کتاب عطا فرمائی اور اسی پر کفایت نہ کی بلکہ ان کے بعد ہزارہا پیغمبر بھیجے جو موسیٰ علیہ السلام کی حمایت اور توریت شریف کی اشاعت اور تم کو ہدایت کرتے رہے اور سب سے آخیر میں تمہارے پاس کنواری بتول مریم کا وہ پاک ستھرا بیٹا عیسیٰ ابن مریم بھی تشریف لایا علیہ السلام جو اولاً سر سے پاؤں تک خود معجزہ تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی معجزات اس کے دست شریف میں تھے۔ اس کی مبارک پھونک سے بے جان جاندار ہوتے تھے۔ کیونکہ ان کی پیدائش شریف بھی روح الامین کی پھونک سے ہوئی تھی۔ اس کے ہاتھ لگنے سے مریض لا دوا صحت پاتے تھے۔ وہ تمہاری کمائی ہوئی غذا اور گھر میں چھپائی ہوئی اشیاء کی خبر دیتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ روح الامین جبریل جیسے عظیم الشان فرشتہ ان کے خاص خدمت گار اور حاضر دربار تھے یہ باتیں تمہارے ایمان پر رہنے کے لئے بہت کافی تھیں۔ لیکن بدنصیبو! تم نے ہمیشہ یہ کیا کہ جب رسولوں نے تمہاری خواہشات کے خلاف احکام سنائے تو تم نے ان کو جھوٹا کہا ان کی مخالفت کی۔ اسی پر صبر نہ کیا بلکہ ایک جماعت انبیاء کو قتل کرنے میں مشغول رہی۔

چنانچہ حضرت شعیب، زکریا، حضرت یحیٰ علیہم السلام تمہارے ہاتھوں ہی شہید ہوئے اور عیسیٰ علیہ السلام کو بھی تم نے اپنی دانست میں دار پر کھینچ ہی دیا۔ وہ تو ہماری حمایت سے بچ گئے اور ان نبیوں کے سرتاج صاحب معراج نبی آخرالزمان ﷺ کے شہید کرنے میں تم نے کوئی کسر نہ چھوڑی کبھی تم نے ان پر جادو کیا۔ کبھی تم نے انہیں دیوار کے نیچے بٹھا کر باتوں میں لگا کر قتل کے ارادے سے دھوکہ سے ایک بھاری پتھر اوپر سے پھینکا کبھی ان کو زہر کھلایا۔ بلکہ حق تو یہ ہے کہ ان کی وفات بھی تمہارے ہاتھوں ہے کیونکہ تمہارے زہر کا اثر ہر سال ان پر لوٹتا۔ جس سے کہ ان کے گلے میں درد خناق پیدا ہوتا اور بروقت وفات اسی اثر کا ظہور ہے۔ جیسا کہ حدیث میں ہے۔ لہٰذا تمہارا قتل انبیاء کرنا ابھی جاری ہے کیا تم اپنے اسی کرتوت پر اپنے علماء کو پیارا سمجھتے ہو۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوتے۔ **پہلا فائدہ:** مومن کی مخالفت بلکہ اس کو قتل کر دینا بھی کفر نہیں جب تک کہ قاتل کا عقیدہ خراب نہ ہو کہ یا تو اس کو جائز سمجھے یا اس کو ایمان کی وجہ سے قتل کرے اسی لئے امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے یزید پلید جیسے ظالم کو بھی کافر کہنے میں تامل کیا کیونکہ اس کا یہ ظلم اپنی باطل حکومت کی خاطر تھا۔ نہ کہ دینی وجہ سے نیز حجاج وغیرہ ظالموں کو کسی نے کافر نہ کہا۔ لیکن نبی کی مخالفت یا ان کی ایذا کیسی ہی کیوں نہ ہو کفر ہے۔ کیونکہ سب مومن ہیں اور وہ ایمان۔ یہاں تک کہ پیغمبر کے کسی فعل کی حقارت کرنا بھی کفر ہے **دوسرا فائدہ:** امت مصطفیٰ ﷺ کے علماء اور مشائخ بڑے درجے والے ہیں کہ ان سے وہ کام لیا جا رہا ہے جو اگلے بعض نبیوں سے لیا گیا۔ **تیسرا فائدہ:** بعض نبی بعض نبیوں کی اطاعت کرتے ہیں جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام کی ان کے بعد والے پیغمبروں نے کی اسی طرح سارے پیغمبر اور رسول ہمارے حضور علیہ السلام کے امتی ہیں۔ اس کی تحقیق ہماری کتاب شان حبیب الرحمٰن میں دیکھو۔ **چوتھا فائدہ:** تکبر وغرور نبوت سے دور اور خدا کی رحمت سے مہجور رکھتا ہے۔ خیال رہے کہ کفار کے مقابل تکبر عبادت ہے۔ مسلمانوں کے مقابل تکبر حرام اور نبی کے مقابل تکبر کفر ہے۔ خاک میں عجز ہے۔ آگ میں تکبر باغ خاک میں لگائے جاتے ہیں آگ میں نہیں یہاں بنی اسرائیل کے تیسرے تکبر کا ذکر ہے یعنی نبی کے مقابل تکبر۔ **پانچواں فائدہ:** ہر مفید چیز سے تمام فائدے نہیں اٹھاتے۔ سورج سے چمگادڑ۔ بارش سے بہت سی سبزیاں فائدہ نہیں اٹھاتیں۔ ایسے ہی نبوت سے سب فائدہ نہیں اٹھاتے۔ **چھٹا فائدہ:** بڑی مفید چیز سے اگر نقصان ہوگا تو بڑا ہی ہوگا۔ تانگہ گر جائے تو چار پانچ سواریاں ہلاک ہوں گی۔ بس ٹوٹ جائے تو پچاس اور ریل گر جائے تو ہزار ہلاک ہوں گے۔ نبی سے بڑا فائدہ ہوتا ہے لیکن ان کی مخالفت سے آفتیں بھی بہت آتی ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی مخالفت سے ستر لاکھ آدمی ہلاک ہوئے۔ نوح علیہ السلام کی مخالفت پر سارا جہان ڈوب گیا۔ بنی اسرائیل بندر سور وغیرہ بنے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: کسی نبی کا دوسرے نبی کی اطاعت کرنا خلاف عقل ہے کہ اس صورت میں اس کا دنیا میں آنا بیکار ہے۔

جواب: ان انبیاء کرام کے بھیجنے سے اگلی شریعت کو محفوظ رکھنا اور امت کو دین پر قائم رکھنا ہے تو گویا یہ مٹے ہوئے دین کو زندہ کرنے کے لئے آتے ہیں۔ (تفسیر کبیر) **دوسرا اعتراض:** پھر ان پیغمبروں میں اور موجودہ علماء میں کیا فرق رہا۔ **جواب:** بہت فرق ہے۔ ان کا تقرر رب کی طرف سے ہوتا ہے یہ خود محنت کر کے عالم بنتے ہیں۔ ان پر وحی ہوتی ہے ان پر نہیں وہ معصوم ہوتے ہیں یہ نہیں وغیرہ وغیرہ۔ **تیسرا اعتراض:** پھر یہ امت کس کی امت کہلائے گی آیا اس صاحب شریعت پیغبر کی یا ان مبلغین کی۔ **جواب:** یہ لوگ اس صاحب شریعت کی ہی امت کہلائیں گے مگر نسبت ان انبیاء کی طرف ہوگی جیسے کہ ہندوستانی لوگ بادشاہ کی بھی رعایا کہلاتے ہیں اور وائسرائے اور گورنر کے بھی۔ **چوتھا اعتراض:** داؤد علیہ السلام خود صاحب کتاب تھے انہیں اس جگہ علیحدہ بیان کیوں نہ کیا گیا۔ **جواب:** ان کی کتاب زبور شریف اکثر احکام میں توریت شریف کے موافق تھی نہ کہ مخالف اس لئے اس پر عمل گویا توریت پر ہی عمل تھا۔ اور انجیل شریف توریت شریف کی ناسخ لہٰذا عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر علیحدہ۔ **پانچواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام حضور نبی آخر الزمان علیہ السلام سے بھی افضل ہیں کیونکہ ان کے معجزات نہایت اعلیٰ جبریل امین سے ان کو خاص امداد ان کی پیدائش بغیر باپ کے مردوں کو زندہ کرنا وغیرہ۔ اس کے علاوہ۔ **جواب:** اس کا تفصیلی جواب تو ہماری کتاب شان حبیب الرحمٰن میں دیکھو اور انشاء اللہ اس میں بھی وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ (بقرہ: ۲۵۳) کی تفسیر میں عرض کر دیا جائے گا۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لو کہ سارے انبیاء کرام کے معجزات حضور علیہ السلام میں جمع ہیں مگر ان کے ظہور کا طریقہ جداگانہ حضور کے طفیل حضور کے بعض غلاموں کو جبریل امین کی تائید ہوئی۔ حضور کے نعت خوان حضرت حسان رضی اللہ عنہ جب نعت شریف پڑھتے تو حضور علیہ السلام فرماتے اَللّٰهُمَّ اَيِّدْهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ اے اللہ تو میرے حسان کی روح القدس سے امداد فرما۔ جنگ بدر میں پانچ ہزار ملائکہ صحابہ کرام کی امداد کیلئے حاضر ہوئے۔ اب بھی طالب علم کے نیچے اپنا پر بچھاتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق کے غلام اور بعض دیگر صحابہ کرام کی نعشیں آسمان پر پہنچا دی گئیں۔ حضرت حبیب کی نعش زمین میں غائب کر دی گئی یہ تو اس سلطان کے چاکروں کی عزت افزائی ہے۔ سلطان کونین کے درجات تک کسی کا وہم وگمان بھی نہیں پہنچ سکتا۔

تفسیر صوفیانہ

جس طرح معدہ اور دل کی گرمی غذا قبول نہیں کرتی اسی طرح نفس کی محبت دنیا کی عیش پسندی سرداری کی طمع ایمان قبول نہیں کرتا۔ کیونکہ اسلام میں جھکنا ہے اور نفس کی خواہش ہے اٹھنا، بنی اسرائیل کے کفر کی اصل وجہ یہی تھی جو شخص کامل ایمان چاہتا ہے وہ ان عیوب سے نفس کو پاک کرے اپنے وجود کو خاموشی کے گوشہ میں دفن کر دو تاکہ اس سے پھل دار درخت پیدا ہو۔ شہرت کی خواہش دل سے نکال دو۔ کیونکہ شہرت نے بڑوں بڑوں کو گرا دیا۔

خود کو ایسا بنا کہ تو نہ رہے — تجھ میں اپنی خودی کی بو نہ رہے

اس کی تین صورتیں ہیں ایک یہ کہ تمہیں جب اپنے اوصاف و کمالات نظر آئیں تو فوراً اپنے گناہوں پر نظر کر لو دوسرے یہ کہ

اپنی اصل پر نظر رکھو کہ ہم ناپاک قطرے سے بنے حیض کا گندہ خون پی کر ماں کے پیٹ میں نو ماہ گزارے اب کس چیز پر فخر کرتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ دینی معاملات میں اپنے سے اعلیٰ کو دیکھو۔ خیال رہے کہ نفس میں سات عیب ہیں۔ ۱۔ خود پسندی ۲۔ غرور ۳۔ ریاکاری ۴۔ غصہ ۵۔ حسد ۶۔ مال کی محبت ۷۔ اور عزت کی چاہت اور دوزخ کے دروازے بھی سات ہیں۔ جو ان سات عیبوں کو نکالے ان پر انشاء اللہ یہ دروازے بند ہوں گے۔ حضرت ابراہیم بن ادھم نے اپنے بعض دوستوں کو وصیت فرمائی کہ تم دم بنا سر نہ بنا کیونکہ سزا کے وقت سر پر آفت آتی ہے اور دم بچ جاتی ہے۔ سردار کی بڑی مصیبت ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

تا توانی بندہ شو سلطان مباش زخم کش چو گوئے شو چوگاں مباش

یعنی بادشاہ بننے کی خواہش نہ کرو۔ بندے بن کر رہو۔ گیند بنو۔ بلا نہ بنو۔ تسبیح کے ہر دانہ میں ایک ایک ڈورا ہوتا ہے اور امام میں دو کیونکہ وہ بڑا ہے۔

بڑوں کو دکھ بہت ہے چھوٹوں سے دکھ دور تارے سب نیارے رہیں گہن چاند اور سور

وَ قَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا
اور کہا انہوں نے دل ہمارے غلافوں والے ہیں بلکہ لعنت کی ان پر اللہ نے بوجہ کفران کے
اور یہودی بولے ہمارے دلوں پر پردے ہیں بلکہ اللہ نے ان پر لعنت کی ان کے کفر کے سبب
مَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾
کے پس بہت کم ایمان لاتے ہیں یہ
تو ان میں تھوڑے ایمان لاتے ہیں

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** اس سے پہلے موجودہ بنی اسرائیل کے ایمان کی مایوسی کی چند وجہیں بیان ہو چکیں۔ یہاں بھی اسی ایک بڑی وجہ کا ذکر ہے کہ اے مسلمانوں تمہاری باتیں ان کے دل میں اترتی ہی نہیں پھر ان کے دل کا کفر کیسے نکلے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں گذشتہ انبیاء کے ساتھ یہود کی بدسلوکیوں کا ذکر تھا۔ اب خود حضور نبی اکرم ﷺ کے ساتھ برتاوے کا ذکر ہو رہا ہے۔ **تیسرا تعلق:** یہود قتل انبیاء کے عذر میں فخریہ کہتے تھے کہ ان کو قتل کرنا ہماری پختگی ایمان کی دلیل ہے۔ ہمارے جہلا ان کی عجیب باتیں دیکھ کر فریب کھا جاتے اور ان کے معتقد بن جاتے تھے۔ لیکن ہم اپنے دین میں اس قدر پختہ ہیں کہ کسی کی کرامات اور معجزات سے دھوکہ نہیں کھاتے اور جو ہمارے مذہب اور قاعدے کے خلاف ہو اسے ہرگز نہیں مانتے کیوں ہمارے دل نور کے غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں۔ اس آیت میں اس بکواس کی تردید کی جا رہی ہے۔ **چوتھا تعلق:** گذشتہ آیتوں کے مضامین سے مسلمانوں کو امید ہو سکتی تھی کہ شاید

موجودہ بنی اسرائیل اپنی ان حرکتوں کو سن کر نادم ہو جائیں۔ اس آیت میں رب تعالیٰ نے ان کی ایک بکواس نقل فرما کر مسلمانوں کی اس امید کو ختم فرمایا۔

تفسیر

وَقَالُوْا یہ ان یہودیوں کا قول ہے جنہوں نے حضور علیہ السلام کے مبارک وعظ وغیرہ اور اپنے گذشتہ عیوب سن کر یہ نامعقول بات کہی۔ **قُلُوْبُنَا غُلْفٌ** ہمارے دل پردوں میں ہیں۔ غلف۔ اغلف کی جمع ہے۔ جس کے معنی ہیں غلاف والا۔ اس عبارت کے چند مطلب ہیں ایک یہ کہ ہمارے دل ایسے غلافوں سے ڈھکے ہوئے ہیں جو آپ کی وعظ نصیحت وہاں تک نہیں پہنچنے دیتے دل یقین کا مقام ہے اور آنکھ، زبان وغیرہ یقین ہونے کے ذریعہ ہیں۔ بعض کو سن کر بعض کو چھو کر بعض کو سونگھ کر مگر جب دل میں بیماری پیدا ہو جائے تو وہاں یقین نہیں آتا۔ جیسے دیوانہ، بعض صحابہ حضور کو دیکھ کر ایمان لائے۔ بعض آپ کا کلام سن کر۔ بعض معجزات دیکھ کر ہم لوگ صرف نام سن کر مگر جن کے دل میں بغض و عناد کی بیماری تھی وہ سب کچھ دیکھ کر بھی ایمان نہ لائے اور اس پر وہ فخر کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ ہمارے دل تو خود ہی علم کے غلافوں میں ہیں اور حکومت پر قائم اب ہمیں شریعت محمدیہ کی کوئی ضرورت نہیں اپنی باتیں جہلا کو سنایئے۔ تیسرے یہ کہ آپ کے اتنے وعظ و نصیحت سن کر بھی ہمارے دل خالی غلافوں کی طرح ہی ہیں وہاں تک کوئی بات نہ پہنچی (تفسیر کبیر) ان کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے دل پیدائش سے ہی پردوں میں ہیں۔ وہاں تک کسی کے وعظ و نصیحت کی رسائی ہی نہیں ایک احتمال یہ بھی ہے کہ اس کلام میں استفہام انکاری ہو کہ کیا ہمارے دل پردوں میں ہیں؟ جو آپ کی بات مان لیں نہیں بلکہ بالکل صاف ہیں۔ ہم نے نہایت صفائی اور دیانتداری سے آپ کے دلائل میں غور کیا۔ مگر قابل قبول نہ پایا۔ رب تعالیٰ نے ان کی تردید میں فرمایا کہ وہ جھوٹے ہیں۔ **بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ** بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے ان پر خدا نے لعنت فرما دی ہے۔ لعنت کے لفظی معنی ہیں دور کرنا اللہ کی لعنت کے معنی ہیں رحمت سے دور کرنا اور بندوں کی لعنت کے معنی ہیں دوری، رحمت کی دعا کرنا۔ یعنی ان کے کفر کی وجہ یہ ہے کہ وہ گزشتہ کفریات سے رحمت سے دور کر دیئے گئے اور انہوں نے اپنی لیاقت کو بگاڑ لیا مثلاً جب انہوں نے ایک معجزے یا ایک پیغمبر یا ایک حکم الٰہی کا انکار کیا تو ان کے دلوں میں سختی اور سیاہی پیدا ہوئی جب دوسرے پیغمبر یا حکم کا انکار کیا تو وہ سختی اور بڑھ گئی۔ آخر کار انکار کرتے کرتے اب وہ سختی اس حد تک پہنچ گئی کہ اس میں کوئی وعظ وغیرہ اثر نہیں کرتا۔ خیال رہے کہ کسی بات کا دل پر اثر جب ہوتا ہے جب کہ بات کرنے والے کا وقار دل میں ہو۔ چونکہ بنی اسرائیل کے دلوں میں انبیاء کرام کی عظمت نہ تھی اس لئے وہ انبیاء خصوصاً سید الانبیاء ﷺ کی تعلیم قبول نہ کرتے تھے اس لئے حضور نے پہلے تبلیغ میں کفار کو اپنی پہچان کرائی پھر احکام شرعیہ کی تبلیغ کی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ **فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ** ان میں بہت کم لوگ ایمان لاتے ہیں یا یہ لوگ بہت تھوڑی باتوں کو مانتے ہیں۔ یا یہ لوگ بہت کم یقین کرتے ہیں یہ قلیل یا تو مومن کی صفت ہے یا ایمان کی۔ آخری دو صورتوں میں ایمان کے لغوی معنی یعنی یقین مراد ہیں کیونکہ تھوڑا یا تھوڑی چیز پر تو ایمان ہو سکتا ہی نہیں ایمان تو پورا اور پوری چیزوں پر ہوگا۔ یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے عربی میں کبھی بالکل نفی کرنے کے لئے بھی قلیلا بولتے ہیں۔ **قَلِيْلًا مَا**

تُنۡبِتُ الۡاَرۡضُ یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام پر بھی بہت کم ایمان لاتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

جب مسلمان یہود کو وعظ و نصیحت کرتے اور ان کے گذشتہ عیوب سناتے تو وہ عذر یا مذاق کے لئے کہتے تھے کہ ہمارے دل نور یا رحمت کے پردے میں لپیٹے ہوئے ہیں۔ جس طرح غلاف اپنے اندر کی چیز کو گرد و غبار سے محفوظ رکھتا ہے۔ ایسی ہی تمہاری باتیں جو گرد و غبار کی طرح ہیں۔ ہمارے دلوں کے اندر تو کیا ان کے قریب تک نہیں پہنچ سکتیں۔ تم سے پہلے بھی جن انبیاء کو ہم نے شہید کیا ان کی نصیحتیں بھی ہمارے دلوں میں نہ پہنچتی تھیں۔ کیونکہ ہم نہایت متصلب دیندار ہیں رب تعالیٰ نے فرمایا کہ ہاں تمہارے دلوں پر غلاف تو ہیں مگر نور یا رحمت کے نہیں۔ بلکہ ظلمت اور لعنت کے اور یہ غلاف پیدائشی نہیں تاکہ تم معذور ہو بلکہ تمہارے خود پیدا کئے ہوئے ہیں کہ تم کفر پر کفر کرتے رہے اور تمہارے دلوں پر لعنت کی تہہ پر تہہ جمتی رہی جیسے کہ پانی اصل میں پتلی چیز ہے مگر سردی کے موسم میں ٹھنڈک سے جمنے لگتا ہے اور جب بار بار ٹھنڈک پہنچتی رہے تو پھر وہ پانی پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے کہ اس میں کیل بھی نہیں گھستی اور جو لعنت اپنی پیدا کی ہوئی ہو۔ اس میں کوئی عذر نہیں سنا جاتا لہٰذا یہ لوگ اپنے نبی پر بھی کم ایمان لاتے ہیں۔ تفسیر عزیزی نے یہاں ایک روایت نقل کی کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ دل چار قسم کے ہیں ایک وہ جو صاف ہو اور اس میں چراغ چمکتا ہو۔ دوسرے وہ جو غلافوں میں لپٹا ہوا ہو۔ تیسرے وہ جو اندھا ہو۔ چوتھے وہ جن کا ایک حصہ سفید اور ایک حصہ سیاہ ہو۔ پہلا قلب تو مومن کا جس میں چراغ ایمان روشن ہے۔ دوسرا قلب کافر کا جو کفر کے غلافوں میں لپٹا ہوا ہے۔ اور تیسرا قلب منافق کا ہے کہ جس میں سے ایمان آ کر نکل گیا۔ دو رنگا دل اس کا ہے جس میں ایمان و نفاق جمع ہوں۔ عقیدہ میں مومن ہو اور اعمال میں منافق۔ ایمان قلب میں سبزے کی طرح ہے جو وعظ و نصیحت کے پانی سے بڑھتا ہے اور نفاق اس ناسور کی مثل ہے جس میں پڑ جائے تو پیپ و خون بن جاتا ہے اور اسے زیادہ خراب کر دیتا ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** تعصب اور تصلب میں فرق ہے تصلب نہایت عمدہ خوبی ہے اور تعصب سخت عیب تصلب کے معنی ہیں دین پر پختگی کہ دین حق پر اس طرح مضبوط ہو کہ شیطان کی دھوکہ بازیاں اور کفار کے فریب میں نہ آئے اور دنیوی مصیبتوں اور پریشانیوں میں بھی دین پر قائم رہے تعصب یہ ہے کہ اپنی جھوٹی بات پر ضد کرے اور یاروں اور دوستوں کی جھوٹی بات میں بھی حمایت کرے اور اپنے مخالف کی حقانیت ظاہر ہونے پر بھی اس کا انکار ہی کئے جائے اور اپنے کو نیک اور دوسروں کو بد سمجھے۔ خلاصہ یہ کہ حق بات پر ثابت قدم رہنے کا نام تصلب ہے اور باطل پر ضد کرنے کا نام تعصب ان یہودیوں نے اپنے تعصب کو تصلب سمجھا اور اس پر فخر کیا۔ **دوسرا فائدہ:** چھوٹا عیب بڑے عیب کا ذریعہ ہے اور معمولی کفر سخت کفر کا راستہ ہے ان یہودیوں کے عارضی کفر کا انجام لعنت ابدی ہوا۔ **تیسرا فائدہ:** نفس کے فریب سے بچنے کے لئے کسی بزرگ کی پناہ میں آنا ضروری ہے ورنہ انسان لعنت کو رحمت کفر کو ایمان اور عیب کی خوبی سمجھ کر اس پر فخر کرتا ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت میں ان کے دلوں پر پردے ہونے کا انکار کیا گیا۔ دوسری جگہ اس کا اقرار بھی کیا ہے۔ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً (کہف:۵۷) دوسری جگہ ارشاد ہے اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا (یٰس:۸) ایک جگہ ارشاد ہے خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ (بقرہ:۷) ایک جگہ فرمایا گیا وَجَعَلْنَا مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ سَدًّا (یٰس:۹) ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار کے دلوں پر پردے بھی ہیں۔ ان کی گردنوں میں طوق بھی ان کے دلوں پر مہر بھی کردی گئی ہے ان کے سامنے دیوار بھی قائم کردی گئی ہے اب ان دونوں قسم کی آیتوں میں مطابقت کیوں کر ہو۔ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ وہ لوگ پیدائشی پردوں کا دعویٰ کرتے تھے۔ یہاں اس کا انکار ہے اور ان آیتوں میں عارضی پردوں کا ثبوت یعنی کفر کی وجہ سے پردے پڑ گئے۔ مہر لگ گئی۔ سامنے دیوار قائم ہوگئی۔ دوسرے یہ کہ یہود نے کہا تھا کہ ہمارے قلوب پر رحمت کے پردے ہیں یہاں اس کا انکار ہے لعنت کے پردوں کا ثبوت **دوسرا اعتراض:** اس آیت کا مطلب یہ بنا کہ ان پر کفر کی وجہ سے لعنت ہوئی اور لعنت کی وجہ سے کفر یہ دور ہے اور دور باطل۔ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں۔ ایک یہ کہ ہلکے کفر سے لعنت ہے اور لعنت سے سخت کفر۔ دوسرے یہ کہ کفر کرنے سے لعنت ہے اور لعنت سے کفر پر جمنا۔ یعنی آئندہ ایمان کے قابل نہ رہنا۔ لہٰذا کوئی دور نہیں۔ **تیسرا اعتراض:** اگر قلیلًا ایمان کی صفت ہو اور عبارت یوں ہے فَاِیْمَانًا قَلِیْلًا مَا یُؤْمِنُوْنَ تو لازم آئے گا کہ ایمان بھی زیادہ اور کم ہو حالانکہ زیادتی کمی مقداری چیز میں ہوتی ہے **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ ایمان بمعنی یقین ہے یعنی بہت کم یقین کرتے ہیں دوسرے یہ کہ یہ کمی صفت کی ہے نہ کہ مقدار کی۔ یعنی ان کے دل میں آپ کی حقانیت کا ہلکا سا خیال آجاتا ہے اور پھر نکل جاتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ

ایمان قیمتی سامان ہے اور عقیدت اس کی قیمت علماء اور صوفیاء کی مجلس ایمان کا بازار جس طرح کہ بے زر بازار سے بیزار اور نامراد لوٹتا ہے۔ ایسے ہی بے عقیدت اس بازار ایمانی سے یعنی صحبت علماء مشائخ سے محروم واپس پھرتا ہے اور پھر اپنے کو بڑا اور ان کو برا سمجھتا ہے اور اپنی محرومی کو معصومی خیال کرتا ہے اس بازار میں عقیدت کی قیمت لاؤ اور متاع ایمانی لے جاؤ۔ اس باغ میں دامن اعتقاد لے کر آؤ اور ایمان و عرفان کے تازہ پھول بھر لے جاؤ۔ بہرحال عقیدت سے عقائد اور عقائد سے عرفان ملتا ہے۔ یہ یہودی عقیدت سے خالی تھے ایمان نہ لا سکے ہم کو بھی ان کی حالت سے عبرت پکڑنی چاہئے۔ جس ننگے کے پاس دامن نہ ہو اور پھر چمن سے محروم لوٹنے پر فخر کرے۔ تو وہ ننگا بھی ہے اندھا بھی۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا

اور جب کہ آئی ان کے پاس کتاب پاس سے اللہ کے تصدیق کرنے والی واسطے اس کے جو

اور جب ان کے پاس اللہ کی وہ کتاب (یعنی قرآن) آئی جس نے ان کے ساتھ والی کتاب (یعنی توراۃ)

مَعَهُمْ ۙ وَ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ
ان کے پاس ہے اور تھے وہ پہلے سے فتح مانگتے اوپر ان لوگوں کے جنہوں نے کفر کیا
کی تصدیق فرمائی اور اس سے پہلے وہ اسی نبی کے وسیلہ سے کافروں پر فتح مانگتے تھے
كَفَرُوْا ۚ فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ ۚ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ
پس جبکہ آیا ان کے پاس وہ جو پہچانا انہوں نے کفر کیا انہوں نے ساتھ اس کے پس
تو جب تشریف لایا ان کے پاس وہ جانا پہچانا اس سے منکر ہو بیٹھے تو اللہ نے
عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾
لعنت اللہ کی اوپر کافروں کے
لعنت کی منکروں پر

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** اس سے پہلے یہود کے مایوسی ایمان کی چند وجہیں بیان ہو چکیں اب بھی اسی کی ایک وجہ بیان ہو رہی ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں موجودہ یہودیوں کے وعظ و نصیحت نہ سننے کا ذکر تھا اب فرمایا جارہا ہے کہ وہ تو اپنی کتاب کی بھی نہیں سنتے۔ تمہاری کیا سنیں **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا یہودی متصلب اور دین ہی پر پختہ نہیں اور ان کے دلوں پر نور کے پردے نہیں بلکہ متعصب ضدی ہیں اور ان کے دلوں پر لعنت کے پردے ہیں اس آیت میں اس کی دلیل دی جارہی ہے کہ وہ اس پیغمبر کو جان پہچان کر انکار کر رہے ہیں اور اسی کا نام ضد ہے۔ **چوتھا تعلق:** پہلے فرمایا گیا کہ ان کا اپنی کتاب پر بھی ایمان کم ہے۔ اسی کا ثبوت دیا جارہا ہے۔

شان نزول

حضور ﷺ کی تشریف آوری اور قرآن کے نازل ہونے سے پہلے یہودی اپنی حاجات کے لئے حضور کے نام پاک کے وسیلہ سے دعا کرتے اور کامیاب ہوتے تھے اور جنگ کے وقت بھی یہ الفاظ کہتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ افْتَحْ عَلَيْنَا وَانْصُرْنَا بِالنَّبِيِّ الْاُمِّيِّ یارب ہمیں نبی امی کے صدقہ میں فتح و نصرت عطا فرما۔ مگر جب حضور تشریف لائے تو یہی دعا مانگنے والے صاف مکر گئے اس پر یہ آیت اتری۔

تفسیر

وَلَمَّا جَآءَهُمْ اس میں موجودہ بنی اسرائیل مراد ہیں۔ کیونکہ قرآن کریم اور نبی آخر الزمان کو انہوں نے ہی پایا۔ یعنی جب ان موجودہ یہودیوں کے پاس کتاب آئی۔ قرآن ساری خدائی کے لئے آیا۔ اس لئے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ حضور کے پاس قرآن

آیا اور یہ بھی کہ مسلمانوں کے پاس آیا۔ یہ بھی کہ کفار کے پاس اس طرح حضور کے متعلق ہر مخلوق کہہ سکتی ہے کہ حضور ہمارے پاس آئے جیسے جب سورج نکلتا ہے تو ہر ملک و شہر والا کہتا ہے کہ ہمارے ہاں سورج نکلا کیونکہ اس کا فیض عام ہے۔ ہر جگہ دن نکلتا ہے۔ خیال رہے کہ بعض نجی بلا کر دیتے ہیں اور بعض آ کر دیتے ہیں جیسے کنواں اور بارش، قرآن اور حضور ﷺ آ کر دینے والے ہیں۔ اسی لئے یہاں فرمایا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ اور دوسری جگہ فرمایا لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ (توبہ: ۱۲۸)۔ كِتٰبٌ اس کتاب سے قرآن کریم مراد ہے اس لئے کہ توریت وغیرہ کی تصدیق اس نے ہی فرمائی جس کا آگے ذکر ہے اسے کتاب اس لئے فرمایا گیا کہ وہ پہلے بھی لوح محفوظ وغیرہ میں لکھی ہوئی تھی اور آئندہ بھی قیامت تک بکثرت لکھی جائے گی اگرچہ اتری ہے پڑھی ہوئی مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ اللہ کے پاس یہ قرب تشریفی ہے نہ کہ مکانی کیونکہ رب تعالیٰ مکان اور جگہ سے پاک ہے اور اس کا خدائی کتاب ہونے پر ان کو بھی یقین تھا کیونکہ اس کے مقابلے سے ان کے سارے علماء عاجز رہ گئے تھے اور نیز وہ کتاب مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ اسی توریت کی تصدیق کرنے والی ہے جو ان کے پاس ہے حالانکہ نبی آخر الزمان نہ عبرانی خط پڑھتے تھے اور نہ عربی اور ایسے بے پڑھے نبی کا توریت کے احکام کی تصدیق فرمانا اس کی کھلی دلیل ہے کہ وہ عالم علم لدنی ہیں۔ تصدیق کرنے کی چند صورتیں ہیں یا توریت کی حقانیت کا اقرار کرنا اور اسے خدائی کتاب ماننا یا لوگوں سے اس کی حقانیات کا اقرار کرا دینا قرآن کریم نے اگرچہ توریت کے احکام منسوخ کر دیئے مگر سب سے منوا لیا کہ وہ حق ہے۔ اگر توریت اور موسیٰ علیہ السلام کا ذکر قرآن کریم میں نہ ہوتا تو دیگر انبیاء اور صحیفوں کی طرح دنیا اسے بھی بھول جاتی یا یہ قرآن توریت کو سچا کرنے والا ہے کہ اس نے آخری کتاب کے آنے کی خبر دی تھی جو کہ اس قرآن کے آنے سے پوری ہوئی۔ اگر یہ قرآن حق نہیں تو یہودی بتائیں کہ آخری نبی اور آخری کتاب کب اور کہاں آئی اور یہ لوگ پہلے بے خبر نہ تھے۔ بلکہ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ یہ یہودی اس کتاب کے اترنے سے پیشتر اس نبی کی عظمت کے قائل اور اس کتاب کی حقانیت کے ماننے والے تھے کیونکہ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کفار یعنی مشرکین عرب کے مقابلہ میں انہی کے نام پاک کے وسیلہ سے رب سے فتح مندی اور نصرت مانگتے تھے۔ تفسیر عزیزی میں اس جگہ فرمایا کہ انہیں یقین تھا کہ نبی آخر الزمان کا نام پاک تمام پیغمبروں کا مددگار ہے اور ان کا نام بھی کفر کو مٹانے اور باطل کو گھٹانے میں لشکر جرار ہے۔ (دیوبندیت فنا) مدینہ اور خیبر کے یہودی، مشرکین عرب بنی اسد اور بنی غطفان کے مقابلہ میں شکست کھاجاتے تھے آخر کار انہوں نے اپنے علماء کی طرف رجوع کیا۔ انہوں نے یہودی سپاہیوں کو یہ دعا یاد دلائی اور کہا کہ جنگ کے وقت پڑھ لیا کرو۔ انہوں نے اس پر عمل کیا اور پھر ہمیشہ فتح پائی۔ اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا اِنَّا نَسْئَلُكَ بِحَقِّ اَحْمَدِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ وَعَدْتَنَا اَنْ تُخْرِجَهُ لَنَا فِيْ اٰخِرِ الزَّمَانِ وَبِكِتَابِكَ الَّذِيْ تُنْزِلُ عَلَيْهِ اٰخِرَ مَا يُنْزِلُ اَنْ تَنْصُرَنَا عَلٰى اَعْدَاءِ نَا یعنی اے رب ہمارے ہم تجھ سے اس نبی امی احمد کے حق سے سوال کرتے ہیں جن کے بھیجنے کا تو نے وعدہ کیا اور اس کتاب کی برکت سے کہ جو تو ان پر اتارے گا۔ سب کتابوں سے پیچھے کہ تو ہم کو ہمارے دشمنوں پر فتح دے۔ اسی تفسیر عزیزی میں اس جگہ یہ بھی ہے کہ سلمہ ابن قیس فرماتے ہیں کہ ہمارے محلے میں ایک یہودی رہتا تھا میں اس زمانے میں کمسن تھا ایک دن ہمارے ہاں ایک محفل تھی وہاں وہ یہودی بھی آ گیا اور پکار کر کہا کہ اے

بت پرستو کیا نہیں جانتے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا ہم سب نے کہا کہ تو ہی بتا۔ وہ بولا پھر سب کو زندگی ملے گی۔ اعمال کا حساب ہوگا میزان ہوگی، دوزخ ظاہر ہوگی ہر ایک کو اعمال کے موافق سزا اور جزا ملے گی۔ ہم سب نے کہا کہ یہ تو بڑی بعید بات ہے یہ کبھی نہیں ہو سکتی وہ بولا خدا کی قسم ضرور ہوگی۔ سب نے پوچھا تیری دلیل کیا ہے۔ اس نے کہا میری دلیل وہ آخر الزمان پیغمبر ہے جو مکہ اور یمن سے ظاہر ہوگا۔ وہ میرے کلام کی تصدیق کرے گا ہم نے کہا کہ وہ کب ہوگا۔ اس نے مجلس کے دائیں بائیں دیکھ کر میری طرف اشارہ کر کے کہا کہ اگر اس نوجوان کی عمر بڑھی تو یہ اس پیغمبر کو پالے گا۔ سلمہ کہتے ہیں کہ ابھی چند روز گزرے تھے کہ حضور کی نبوت کی خبر مشہور ہوئی اور جب حضور علیہ السلام مدینے میں تشریف لائے تو ہم سب مسلمان ہو گئے ہم نے اس یہودی کو دیکھا وہ کافر رہا اور حسد کرتا تھا ہم نے اس سے کہا کہ تجھے کیا ہو گیا کہ ان کا منکر ہے کیا تجھے وہ اپنی بات یاد نہ رہی جو تو نے ہم سے کہی تھی وہ بولا یاد تو ہے لیکن یہ وہ نبی نہیں ہیں۔ ان روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودی صرف جنگ میں ہی نہیں بلکہ مناظرہ اور دیگر مصیبتوں میں بھی حضور کے نام پاک کو اپنا پشت پناہ بناتے تھے اور آپ کے نام پاک کی صفات، آپ کی جائے پیدائش اور وقت پیدائش سے بھی واقف تھے۔ اس قدر جان پہچان کے باوجود فَلَمَّا جَآءَهُم مَّا عَرَفُوْا جب ان کے پاس جانی پہچانی چیز آئی۔ اس مَا سے یا تو کتاب مراد ہے اور یا صاحب کتاب ﷺ مگر دوسرے معنی زیادہ قوی ہیں کیونکہ کتاب کا ذکر دور ہے اور نبی علیہ السلام کا ذکر يَسْتَفْتِحُوْنَ میں قریب ہی گزرا۔ نیز کتاب کے آنے کا ذکر تو پہلے بھی ہو چکا لہٰذا یہی بہتر ہے کہ یہاں نبی کا آنا مراد ہوتا کہ کلام میں تکرار نہ ہو۔ چونکہ اس جگہ اوصاف والی ذات مراد ہے اس لئے مَا فرمایا گیا۔ جیسے وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ (النساء: ۲۲) میں عورتوں کو جو ذی عقل ہے مَا فرمایا گیا۔ خیال رہے کہ اس سے پہلے قرآن کی آمد کا ذکر ہوا۔ نہ کہ حضور کی تشریف آوری کا مگر چونکہ قرآن کی آمد حضور کے ذریعہ ہے کہ قرآن خود نہیں آسکتا حضور کے ذریعے آیا۔ لہٰذا اس میں حضور کی آمد کا بھی ذکر ہو گیا تو یہاں حضور کی طرف ضمیر کا لوٹنا اور مَّا عَرَفُوْا سے حضور کا مراد ہونا درست ہوا۔ پچھلے اہل کتاب حضور کے نام کے توسل سے دعائیں کرتے تھے نہ کہ قرآن کے وسیلہ سے لہٰذا آیت کے یہ معنی ہوئے کہ حضور کے توسل سے دعائیں کرتے تھے یعنی جب کہ ان کے پاس وہ چیز یا وہ ذات آئی جس کو وہ پہچانتے ہیں عَرَفُوْا میں دو احتمال ہیں یا یہ کہ ان اوصاف کی وجہ سے ان کو اب دیکھ کر پہچان لیا۔ کیونکہ ان میں وہ ساری توریت کی علامتیں موجود تھیں یا جس کو وہ توریت سے پہچان چکے تھے لہٰذا چاہیے تو یہ تھا کہ وہ سب فوراً ایمان لے آتے مگر ہوا یہ کہ كَفَرُوْا بِهٖ وہ صاف انکار کر گئے اور ان کی نعت اور اوصاف کو بدل ڈالا یا تو یہ جملہ دونوں لما کا جواب ہے یعنی جب وہ جانی ہوئی کتاب اور جانا ہوا نبی ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے ان میں سے ہر ایک کا انکار کر دیا یا یہ فقط دوسرے لما کا جواب ہے اور پہلے لما کا جواب وہاں ہی پوشیدہ ہے۔ یعنی جب ان کے پاس کتاب آئی تو اس کا انکار کر دیا اور یہ کیوں نہ کرتے ان کا تو یہ حال ہے کہ جس نبی کے نام سے ان کی مشکلیں حل ہو جاتی تھیں۔ جب وہ نبی تشریف لائے تو ان کا بھی انکار کر بیٹھے اور اس انکار کا انجام یہ ہوا کہ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ جان بوجھ کر حق چھپانے والے کافروں پر اللہ کی لعنت ہے کیونکہ ان پر الزام تھا کہ یہ اس نبی کی خدمت اور مدد کرتے اگر چہ یہاں علیہم بھی کافی تھا۔ لیکن سبب لعنت بتانے کے لئے کافرین فرمایا تا کہ

کوئی یہ نہ سمجھے کہ وسیلہ پکڑنے سے ان پر لعنت ہوئی۔ اب معلوم ہوا کہ ان کا وسیلہ چھوڑنے سے ملعون ہوئے۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! تم ان کے ایمان کی کب تک امید رکھو گے یہ تو بڑے ضدی کافر ہیں ان کی ضد کی تو یہ حالت ہے کہ اس قرآن کے آنے پر ان کی توریت کی سچائی موقوف تھی ان کو چاہئے تھا کہ اس کو آنکھوں سے لگاتے اور اس کے آنے پر خوشیاں مناتے اور کفار سے کہتے کہ دیکھو ہماری توریت کا ظہور آ گیا۔ نیز قرآن نے اعلان کیا بنی اسرائیل کی آسمانی کتابیں سچی ان کے نبی سچے ان کے اولیاء واصحاب کہف وغیرہ سچے اب قرآن کو جھوٹا کہہ کر اپنی کتابوں نبیوں کو جھوٹا کہتا ہے۔ مدعی اپنے گواہ کو ہمیشہ سچا ہی کہتا ہے۔ اگر جھوٹا کہے تو اس کا مقدمہ خارج ہو جائے جو صحابہ کو جھوٹا، کافر کہتے ہیں وہ ضدی اور جھوٹے ہیں۔ کیونکہ اہل بیت کے فضائل کی آیات واحادیث انہیں سے مروی ہیں۔ اگر وہ حضرات سچے نہ ہوں تو یہ آیات واحادیث بھی سچی نہ ہوں گی۔ پھر اہل بیت کے فضائل کا انکار ہی کرنا پڑے گا گزشتہ کتب اور نبیوں کو برحق ماننے کے لئے قرآن اور حضور کو سچا مانو اور اہل بیت کی عظمت ماننے کے لئے صحابہ کو سچا مانو۔ نیز یہ نبی آخر الزمان وہ ہیں جن کے نام سے ان کے بگڑے کام بنے انہیں کے نام کے وسیلہ سے ان لوگوں نے رب سے دعائیں مانگیں اسی نام کی برکت سے انہوں نے مشرکین پر فتح پائی اسی کی برکت سے انہوں نے مناظرہ وغیرہ میں سرخروئی حاصل کی اور انہیں کے بل بوتے پر مشرکین سے کہتے تھے کہ ذرا ٹھہر جاؤ۔ نبی آخر الزمان آنے والے ہیں ہم ان کی مدد سے تم پر غالب آئیں گے۔ انہیں کا انتظار تھا انہیں کی دعائیں مانگی جا رہی تھیں چاہئے تو یہ تھا کہ ان کے قدم دھودھو کر پیتے اور اپنی خوش نصیبی پر فخر کرتے مگر انہوں نے کیا یہ کہ منکر ہو کر ان کے پیچھے پڑ گئے ایسے کافروں پر خدا کی لعنت۔ ان ضدیوں کے ایمان کی کیا امید۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** اللہ والوں کے وسیلہ سے دعا قبول ہوتی ہے کیونکہ رب نے ان یہودیوں کے وسیلہ پکڑنے کا انکار نہ کیا۔ بلکہ ان کے کفر پر لعنت کی۔ اس واسطے عَلَى الْكٰفِرِيْنَ فرمایا نہ کہ علیھم۔ تاکہ کوئی یہ نہ کہے کہ وسیلہ پکڑنے والوں پر لعنت کی گئی **دوسرا فائدہ:** حضور علیہ السلام سے پہلے آپ کی تشریف آوری کی دھوم دھام ہو چکی تھی اور اس وقت بھی حضور کے وسیلہ سے خلق کی حاجت روائی ہوئی تھی جس سے معلوم ہوا کہ دیوبندی وہابی اس وقت کے یہودیوں سے بھی بدتر ہیں کہ وہ تو حضور علیہ الصلوۃ والسلام کے نام کی مدد لیتے تھے اور یہ اسے شرک کہتے ہیں اور کلمہ گو ہو کر ان کے وسیلہ سے منکر ہیں۔ دیکھو ان کی کتاب ''تقویۃ الایمان'' **تیسرا فائدہ:** کافروں پر لعنت کرنا جائز ہے لعنت کافروں کے حق میں رحمت سے دوری ہے اور گنہگار مسلمانوں کے حق میں عزت سے دوری۔ لعنت کے اسباب تین ہیں۔ کفر، بدعت، فسق جیسے کہہ دیتے ہیں جھوٹے پر خدا کی لعنت۔ لعنت کے تین درجے ہیں ا۔ عام وصف سے لعنت کرنا جیسے کافر بدعتی یا فاسق پر لعنت ۲۔ خاص وصف سے لعنت کرنا جیسے یہودی یا عیسائی یا خارجی یا زانی یا سود خور پر لعنت یہ دو قسم کی لعنتیں بہرحال جائز ہیں ۳۔ کسی کا نام لے کر لعنت کرنا۔ یہ صرف اسی کے حق میں جائز ہے جس کے کفر کا شرعاً ثبوت ہو جیسے

کہ فرعون یا ابوجہل پر لعنت لہٰذا اب مرے بعد نام لے کر کسی کافر کو بھی لعنت جائز نہیں کیونکہ اس کا کفر پر مرنا دلیل شرعی سے معلوم نہیں ممکن ہے کہ مرتے وقت ایمان لے آیا ہو جس کی ہمیں خبر نہیں ہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ رام لعل یا مرزا غلام احمد زندگی میں کافر معلون تھے اسی لئے یہ کہنا بالاتفاق جائز ہے کہ قاتل حسین پر لعنت مگر یوں نہ کہے کہ یزید پر لعنت کیونکہ وصف پر لعنت جائز ہے اور یہ نام اور نام کی لعنت میں خدشہ ہے۔ بہر حال کسی پر بلاوجہ لعنت کوئی اچھی چیز نہیں۔ سب سے بڑا مردود شیطان ہے مگر اس پر بھی لعنت کرنا عبادت نہیں بہت سے لوگ اپنے جانور اور اپنے مال پر لعنت کرتے ہیں۔ خیال رہے کہ جو غیر مستحق کو لعنت کرتے ہیں وہ لعنت خود اپنے پر لوٹتی ہے مسلمان تبرائی اور لعنتی نہیں ہوتا یہ روافض کی خصوصیت ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ عورتیں اکثر جہنمی ہیں کیونکہ وہ لعنت زیادہ کرتی ہیں خیال رہے کہ لعنت اور چیز ہے اور کفار پر سختی دوسری چیز۔ سختی کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔ **چوتھا فائدہ:** جاہل کافر سے، عالم کافر کا عذاب سخت ہے۔ کیونکہ وہ نادانی سے کافر ہے اور یہ جان بوجھ کر اسی لئے اس آیت میں مَّا عَرَفُوْا، فرمایا۔ **پانچواں فائدہ:** ہر ایک کا نام اس کے ماں باپ رکھتے ہیں مگر حضور کا نام رب نے رکھا کہ ان کی ولادت سے صدیوں پہلے ہی عرش و فرش میں اسے چمکا دیا۔ **چھٹا فائدہ:** بعض دیوبندی وہابی مجبور ہو کر یہ کہہ دیتے ہیں کہ حضور کی زندگی میں آپ کے وسیلہ سے دعا کرنی جائز تھی۔ لیکن بعد وفات ناجائز کیونکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں حضرت عباس کے ذریعہ سے دعا مانگی نہ کہ حضور کے طفیل وہ اس آیت سے عبرت پکڑیں۔ جس سے معلوم ہو رہا ہے کہ حضور کی ولادت پاک سے پہلے ہی آپ کے وسیلہ سے دعائیں مانگی جا رہی تھیں۔ یہ حدیث تو ان کے واسطے زہر قاتل ہے۔ اس لئے کہ حضرت عباس کا اس لئے وسیلہ اختیار کیا گیا کہ وہ حضور کے چچا ہیں۔ یہ تو حضور کی نسبت کا وسیلہ ہے۔ اور پھر اس وسیلہ سے حضور کے وسیلہ کی نفی کیوں کر ہوگئی۔ پھر وہ تو اب بھی زندہ ہیں کیونکہ ہم پڑھتے ہیں۔ محمد رسول اللہ۔ محمد اللہ کے رسول ہیں۔ نہ یہ کہ تھے۔ وہ زندہ نہیں ہیں تو وصف رسالت کس کے لئے ثابت ہو رہا ہے۔ محمول کا ثبوت موضوع کا وجود ظرف اتصاف میں چاہتا ہے۔

لطیفہ: چونکہ اس آیت میں لفظ یَسْتَفْتِحُوْنَ سے حضور علیہ السلام کا وسیلہ پکڑنا حضور کے نام سے مدد حاصل کرنا ثابت ہوتا تھا۔ جو کہ دیوبند کے لئے موت ہے اور ان کی توحید کے خلاف اس لئے دیوبندیوں کے پیشوا مولوی اشرف علی صاحب نے اپنی تفسیر بیان القرآن میں اس لفظ کے معنی یہ کئے کہ یہ یہودی کفار سے بیان کیا کرتے تھے یعنی خود کفار عرب کو حضور کی آمد کی خبر دیا کرتے تھے اپنے نامعقول مذہب کی پاسداری کے لئے آیت کی تحریف معنوی کر ڈالی نہ تو یہ معنی کسی مفسر نے کئے اور نہ ہی عربی قواعد سے درست ہیں کیونکہ استفتاح فتح سے بنا اور استفعال میں آ کر اس میں طلب یا وصول کے معنی پیدا ہوئے اور علی نقصان و ضرر کے لئے آتا ہے۔ تو صاف معنی یہ ہوئے کہ کافروں کے مقابل فتح مانگتے یا فتح حاصل کرتے تھے۔ خواہ مناظرہ وغیرہ میں یا جنگ میں۔ خبر دینے اور بیان کرنے کے معنی کیسے ہو سکتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ اس معنی سے مولوی صاحب پر دوسری قیامت آ گئی کہ یہود کا علم غیب ثابت ہو گیا۔ یہود نے حضور کی ولادت پاک سے پہلے آپ کی خبر دے دی۔ مگر وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے مصطفیٰ علیہ السلام کے علم کا انکار کیا ہے نہ کہ کفار کے علم کا۔ ہم تو شیطان کا بھی علم غیب مانتے

ہیں۔ ہاں حضور کے لئے علم غیب ماننا شرک ہے۔ دیوبندیوں نے اس قسم کی بہت سی تحریفیں صرف تقویۃ الایمان کی درستی کے لئے کی ہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن، یہودیوں کے پاس جو توریت تھی، اس کی تصدیق کرتا ہے حالانکہ وہ کتاب تو بدلی ہوئی اور محرف تھی اور قرآن نے اس کی سخت تردید کی ہے۔ **جواب:** اس کے چند جوابات ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں فرمایا گیا مَعَهُمْ نہ کہ عِنْدَهُمْ یعنی ان کی ساتھ والی توریت کی تصدیق کرتا ہے نہ کہ پاس والی توریت کی بدلی ہوئی مشکل کو وہ بھی غلط سمجھتے تھے۔ صرف کھانے کمانے کے لئے اس کو رکھ چھوڑا تھا اس پر ان کا بھی ایمان نہ تھا۔ دوسرے یہ کہ قرآن اصلی توریت کی تصدیق کرتا ہے نہ کہ اس کے ہر لفظ کی اور بدلی ہوئی کتاب میں کچھ تو اصل بھی تھی اس ہی کی تصدیق کی۔ یہاں ساری کتاب کی تصدیق کا ذکر نہیں۔ تیسرے یہ کہ مصدق کے معنی ہیں صدق کو ظاہر فرمانے والا۔ یعنی قرآن سے پہلے سچی اور جھوٹی توریت میں فرق ظاہر نہ تھا۔ اس نے آ کر ان کی تحریفات کو ظاہر فرمایا اور توریت کی سچائی کو شائع کیا۔ چنانچہ رجم وغیرہ بہت سے توریت کے اصلی احکام قرآن سے کھلے اور یہودیوں کو اپنی تحریف کا اقرار کرنا پڑا۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہودی قرآن اور صاحب قرآن کی حقانیت جانتے تھے۔ پھر انہیں کفار کہا گیا وہ تو مومن ہوئے کیونکہ دل سے جاننے ہی کا نام ایمان ہے۔ **جواب:** وہ جانتے تھے مانتے نہ تھے اور ایمان ماننے کا نام ہے نہ کہ صرف جان لینے کا۔ جاننا غیر اختیاری ہوتا ہے اور ماننا اختیاری۔ ثواب اختیاری خیر پر ہی ملتا ہے اگر جاننے کا نام ایمان ہوتا تو اس کا ثواب نہ ہونا چاہئے تھا یا یوں کہو کہ ایمان جاننے اور اقرار کرنے کا نام ہے یعنی اقرار ایمان کی شرط ہے جب انہوں نے انکار کیا تو ایمان صحیح نہ ہوا۔ جیسے کہ بغیر وضو نماز۔ **تیسرا اعتراض:** قرآن نے پہلے فرمایا تھا وَ قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا لوگوں سے اچھی بات کہو اور یہاں کافروں پر لعنت فرما رہا ہے۔ کیا لعنت بھی اچھی بات ہے۔ **جواب:** اس آیت میں گزر چکا کہ کفار کو برا کہنا درحقیقت اچھا ہے اور ان پر لعنت ہی ان کے لئے قول حسن ہے۔ (تفسیر کبیر)

چوتھا اعتراض: تم ان کو کفار کہہ کر لعنت کرتے ہو اور وہ تم کو نہ معلوم اس میں سچا کون ہے اور جھوٹا کون (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** چور پولیس کو برا کہتا ہے اور پولیس چور کو پنڈت جی اللہ نے عقل اور بدی اسی لئے دی ہے کہ نقل و اصل میں فرق کرے دنیا میں نقل و اصل ملی جلی بازار میں فروخت ہوتی ہے۔ مگر آنکھ والے کو چاہئے کہ دیکھ کر چیز خریدے اچھا تاؤ کہ تم کو اپنے مذہب کی سچائی کیسے معلوم ہوئی۔ یہ اعتراض تو تم پر بھی پڑتا ہے۔ **پانچواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل قرآن کے وسیلہ سے دعائیں کرتے تھے نہ کہ حضور کے وسیلہ سے کیوں مَا عَرَفُوْا میں ما ہے جو غیر عاقل چیز کے لئے آتا ہے نیز اس سے پہلے اس آیت میں کتاب ہی کا ذکر ہے (دیوبندی) **جواب:** ان سوالوں کے جوابات تفسیر میں گزر چکے۔ بہت دفعہ عاقل کے لئے بھی ما بول دیتے ہیں۔ جیسے وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ (النساء: ۲۲) اور چونکہ کتاب کی آمد میں حضور کی آمد کا بھی ذکر ہے۔ اس لئے حضور ہی کی آمد مراد ہے نیز یہود وغیرہ حضور ہی

کو پہچانتے تھے نہ کہ قرآن کو، قرآن کو تو صحابہ بھی نہ پہچانتے تھے جب تک کہ حضور نہ بتاتے کہ یہ قرآن ہے کیونکہ ایک ہی زبان سے قرآن بھی نکلتا تھا۔ حدیث بھی۔ قرآن کریم فرماتا ہے۔ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (بقرہ:۱۴۶) وہ آیت اس آیت کی تفسیر ہے۔

تفسیر صوفیانہ

بصارت سے صورت اور بصیرت سے سیرت معلوم ہوتی ہے۔ ہم گھر میں جا کر سارے عزیزوں کی صورت تو آنکھ سے دیکھتے ہیں مگر ماں بہن بیٹی بیوی کو بصیرت سے پہچانتے ہیں ان کا ماں بہن ہونا آنکھ سے نظر نہیں آتا اور جیسے کے بعض دوائیں بصارت کو قوت دیتی ہیں اور بعض بیماریاں بصارت مٹا دیتی ہیں اسی طرح عشق وہ کحل الجواہر (عمدہ سرمہ) ہے یا وہ دوربین یا خوردبین ہے جس سے بصیرت قوی ہو جاتی ہے اور عاشق اپنے محبوب کی ہر خوبی کو معلوم کر لیتا ہے مگر کفر و بے دینی بغض وحسد بصیرت کو پھوڑنے والی بیماریاں ہیں۔ یہود کی بصیرت پر بغض وحسد کا جالا آ چکا ہے۔ انہیں عشق کا سرمہ نصیب نہ ہوا جس سے مصطفٰی ﷺ کی ظاہری صورت کو تو دیکھ سکے۔ مگر سیرت پاک تک نظر نہ گئی مسلمانوں کو چاہئے کہ حضور ﷺ سے عشق پیدا کریں تا کہ ان پر حقیقت حال ظاہر ہو۔ حضور کو صرف بصارت سے دیکھنے والا کافر ہے اور بصیرت سے دیکھنے والا صحابی۔ آدم علیہ السلام کو فرشتوں نے بصیرت سے دیکھا سجدے میں گر گئے۔ ابلیس نے بصارت سے دیکھا اکڑ گیا۔

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ

بری ہے وہ چیز کہ خریدا انہوں نے بدلے اس کے جانوں اپنی کو یہ کہ کفر کریں وہ ساتھ اس کے کہ اتاری

کسی برے مولوں انہوں نے اپنی جانوں کو خریدا کہ اللہ کے اتارے سے منکر

بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ

اللہ نے حسد سے اس کے کہ اتارے اللہ اپنے فضل سے اوپر اس کے کہ چاہے بندوں

ہوں اس کی جلن سے کہ اللہ اپنے فضل سے اپنے جس بندے پر چاہے

عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ

میں سے اپنے پس لوٹے وہ ساتھ غضب کے اوپر غضب کے اور واسطے کافروں کے

وہ اتارے تو غضب پر غضب کے سزاوار ہوئے اور کافروں کے لئے

مُّهِيْنٌ ﴿۹۰﴾

عذاب ہے اہانت والا

ذلت کا عذاب ہے۔

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیت سے کئی طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** موجودہ بنی اسرائیلیوں کے ایمان سے مایوسی کی یہ بھی ایک بڑی وجہ ہے۔ **دوسرا تعلق:** گویا یہ آیت پچھلی آیت کا تتمہ ہے۔ یعنی بنی اسرائیلیوں نے قرآن کا اس ضد سے انکار کیا کہ وحی ہمارے سوا پر کیوں ہوئی۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ان کے انکار کا ذکر تھا اب اس کی وجہ اور برائی بیان ہو رہی ہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت سے معلوم ہوا تھا کہ منکرین یہودیوں نے انکار نبوت کو اپنی خلاصی اور بقاء سرداری کا ذریعہ بنایا۔ اب فرمایا جا رہا ہے ان بیوقوفوں نے اس میں بڑی ہی غلطی کی۔

تفسیر

بِئْسَمَا۔ بِئْسَ فعل ذم (برائی بتانے والا فعل) ہے اور ما، شیئًا کے معنی میں ہے۔ یعنی وہ چیز بڑی ہی بری ہے۔ جو کہ **اشْتَرَوْا بِهٖٓ** یہ لفظ شریٰ سے بنا ہے اور شریٰ جب ضرب یضرب سے آتا ہے تو بیچنے اور فروخت کرنے کے معنی دیتا ہے۔ جیسے وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۭ بَخْسٍ (یوسف: ۲۰) یعنی انہوں نے یوسف علیہ السلام کو کھوٹی قیمت میں بیچا۔ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ اور باب افتعال میں آ کر خریدنے کے معنی دیتا ہے بعض مفسرین نے فرمایا کہ یہ اشْتَرَوْا، اَشْرَوْا کے معنی میں ہے۔ یعنی وہ چیز بری ہے جس کے عوض انہوں نے اپنی جانوں کو خریدا۔ اب اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر شخص کی جان گویا گرو (رہن) مال ہے اور اس پر اعمال کا قرض ضروری ہے کہ نیک اعمال کر کے اپنی جانوں کو گرو سے چھڑا لیں۔ گویا خرید لیں۔ ان بیوقوفوں نے بجائے چھڑانے کے اس کو سخت قیدی بنا دیا۔ رب فرماتا ہے كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ رَهِيْنَةٌ ۝ اِلَّآ اَصْحٰبَ الْيَمِيْنِ (المدثر: ۳۸) ہر نفس اپنے اعمال میں گروی ہے سوا داہنی طرف والوں کے ان کی مثال اس بیوقوف غلام کی سی ہے جو کسی کے ہاتھوں کچھ مال میں گروی ہو۔ وہ بجائے اس کے کہ مال ادا کر کے اپنے کو چھڑا لے اسی مال کا انکار کرتا پھرے کہ مجھ پر کچھ نہیں اور یہ مالک دعویٰ میں جھوٹا ہے۔ یہ غلام اپنی اس حرکت سے قید سے آزاد نہ ہوگا۔ بلکہ زیادہ گرفتار اور مستحق مار ہوگا۔ ایسے ہی یہ لوگ ہیں۔ **اَنْفُسَهُمْ** تفسیر روح البیان نے اس جگہ فرمایا کہ یہاں انفس سے مراد ایمان ہے چونکہ ایمان نفس میں رہتا ہے اس لئے محل بول کر حال مراد لیا اور آیت کے معنی یہ ہیں کہ جس کے عوض انہوں نے اپنا ایمان بیچ دیا وہ بہت بری چیز ہے اور دیگر مفسرین نے فرمایا کہ انفس سے جانیں ہی مراد ہیں اور اس کے معنی وہ کئے جو اوپر بیان ہو چکے یا یوں کہو کہ ہر انسان تاجر ہے زندگی دوکان سانسیں راس پونجی اعمال سودے جسے وہ سانسیں خرچ کر کے خریدتا ہے شریعت ترازو، اس کے احکام حرام، حلال، مکروہ، مستحب وغیرہ باٹ، ہم ہر وقت تجارت کر رہے ہیں کیونکہ ہر سانس میں کوئی عمل ضرور کرتے ہیں جو سانس نیک عمل میں گزرا وہ نفع کا سودا ہوا اور جو سانس برے عمل میں گزرا وہ نقصان کا سودا ہوا۔ خیال رہے کہ گنہگار مسلمان گھاٹے کا سوداگر ہے اور کافر دیوالیہ تاجر۔ یہاں ان کے دیوالیہ ہونے کا ذکر ہے کہ انہوں نے کفر کے عوض جان کو خریدا یا بیچا۔ **اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ** یہ جملہ بِئْسَ کا مخصوص بالذم ہے۔ جس سے ما کی مراد ظاہر ہو رہی ہے۔ یعنی وہ چیز بڑی بری ہے کہ کتاب اللہ کا انکار اور یہ انکار بھی نادانی سے نہیں بلکہ بغیًا حسد سے ہے۔ یہ يَّكْفُرُوْا کا مفعول لہ ہے اس کے لفظی معنی

بغاوت ہیں چونکہ اکثر بغاوت حسد سے ہوتی ہے اور حاسد آخر کار باغی بن جاتا ہے۔ اس لئے یہاں یہ معنی کئے گئے (تفسیر روح البیان) اور یہ حسد بھی کوئی دینی فریضہ نہ تھا بلکہ اس بات کا تھا کہ اَنْ یُّنَزِّلَ اللّٰهُ اللہ اتارتا ہے یہاں علٰی پوشیدہ ہے کیونکہ حسد علٰی کو چاہتا ہے۔ مِنْ فَضْلِهٖ اپنا فضل یہاں فضل سے مراد وحی ہے کیونکہ وحی اپنی محنت یا استحاق وغیرہ سے نہیں صرف اللہ کے فضل وکرم سے ملتی ہے عَلٰى مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہے، واقعہ یہ ہے کہ یہود سمجھتے تھے کہ پہلے کی طرح نبی آخر الزماں بھی ہم بنی اسرائیل میں سے ہی ہوں گے۔ اب جب کہ حضور ﷺ کو یہ درجہ عنایت ہوا۔ آپ بنی اسماعیل میں سے تھے۔ اس پر یہ اسرائیل جل گئے کہ یہ عہدہ ہماری قوم کو کیوں نہ ملا، اور اس جلن کا یہ انجام ہوا کہ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ خدا کا غضب پر غضب لے کر لوٹے گویا یہ لوگ بازار عمل میں خریداری کرنے لگے لیکن اپنی حماقت سے اصلی رقم بھی ہاتھ سے کھو آئے اور بجائے سامان کے غضب الٰہی لے کر آئے۔ خیال رہے کہ اس سے دو غضب مراد نہیں بلکہ قسم قسم کے بیشار غضب۔ جیسے کہا جاتا ہے نور علی نور یا اردو میں بولتے ہیں کہ فلاں کے پاس مال پر مال آرہا ہے۔ یعنی بیشار مال۔ بات یہ ہے کہ ان یہودیوں نے چار قسم کے کفر کئے۔ ۱۔ اپنی کتاب کو بدل دیا اور کیوں صرف اسی حسد سے ۲۔ قرآن کو پہچان کر انکار کیا ۳۔ اللہ کے انتخاب سے ناراض ہوئے کہ فلاں کو نبی کیوں بنایا ہمیں کیوں نہ بنایا۔ ۴۔ نااہل کو اہل اور اہل کو نااہل سمجھا۔ یعنی ہم خواہ کتنے ہی نالائق ہیں۔ مگر نبوت کے ٹھیکیدار اور بنی اسماعیل میں خواہ کتنے ہی علمی اور عملی کمالات ہوں مگر نبوت کے لائق نہیں کیونکہ وہ ہم سے نہیں اور ان میں سے ہر کفر صدہا غضبوں کا ذریعہ ہے۔ لہٰذا وہ بیشار غضب لے کر لوٹے اب جب کہ وہ غضب الٰہی کی گٹھریاں اٹھائے ہوئے ہیں پھر کس منہ سے کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے پیارے ہیں اور ہمیں چند روز عذاب ہوگا۔ حق یہ ہے وَلِلْكٰفِرِیْنَ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ عام کافروں کے لئے یا خاص ان کافروں کے لئے اہانت اور ذلت والا عذاب ہے۔ مھین ھون سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ہلکا پن۔ آسان کام کو اسی لئے ھین کہتے ہیں کہ اس کا ذکر آسان ہے۔ ذلت اور رسوائی کو اسی لئے اہانت یا توہین کہتے ہیں کہ اس سے آدمی ہلکا ہو جاتا ہے۔ یعنی کافروں کو ذلیل اور ہلکا کرنے والا عذاب ہے۔

خلاصہ تفسیر

یہود نے قرآن اور صاحب قرآن کا انکار کیا کہ کیوں خدا تعالٰی جس پر چاہے اپنے فضل سے وحی اتار دیتا ہے اور ہمارے خاندان کے لئے نبوت کو خاص کیوں نہیں فرمایا۔ ان بے وقوفوں نے وہ تجارت کی جس میں بجائے نفع کے غضب الٰہی کمایا یہ تاجر ہیں۔ ان کی جان اصل پونجی ہے اور ان کی بدعملیاں وہ مال کہ جو اپنی قیمتی عمریں خرچ کر کے حاصل کر رہے ہیں انہوں نے اپنی جانیں دے کر جو کچھ خریدا وہ یہ تھا کہ خدا کے پیغمبر کا ضد اور عناد سے انکار کیا۔ لہٰذا ان کا یہ سودا بڑا ہی برا ہے یا یوں سمجھو کہ ان کی جانیں رب تعالٰی کے یہاں رہن اور قید تھیں اور ان سے کہا گیا تھا کہ تم نے ہماری نعمتوں کے عوض اپنی جانیں گروی کردی ہیں۔ اب نیک اعمال کر کے چھڑا لینا، انہوں نے یہ تو نہ کیا بلکہ اس کے لئے اوندھی چال چلے کہ کفر پر کفر کئے۔ جس سے کہ یہ بجائے چھوٹنے کے اور زیادہ گرفتار اور مستحق غضب قہار ہو گئے اور اپنے اس معاملہ میں بڑے برے رہے یا یوں سمجھو کہ انہیں نبی

آخر الزماں کے تشریف لانے سے پیشتر ایمان حاصل تھا۔ ان کو مانتے تھے لیکن ان کے تشریف لانے پر انہوں نے الٹا بیوپار کیا کہ کفر کے عوض ایمان فروخت کر ڈالا۔ لہٰذا اس بازار سے بجائے نفع کے غضب اور قہر کے پشتارے اپنی پیٹھ پر باندھے ہوئے واپس آئے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** حسد ایسی بری بلا ہے جو خود حاسد کو کھاتی ہے۔ محسود کا کچھ نہیں بگاڑتی۔ اس سے حاسد کی تندرستی خراب ایمان برباد اور دل سیاہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ محسود تو آرام سے سوتا ہے۔ مگر یہ بیچارا حسد کی آگ میں جل کر اپنا عیش و آرام کھوتا ہے اور خون کے آنسوؤں سے منہ دھوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں ؎

چوں کنی بر بے حسد مکر و حسد زاں حسد دل را سیاہی ہا رسد
خاک شو مردان حق را زیر پا خاک بر سر کن حسد را ہم چوما

یعنی حسد پر خاک ڈالو اور اللہ والوں کی پیروی کی خاک بن جاؤ۔ ورنہ خیال رکھو کہ حسد تمہارے قلب کو بہت سیاہ کر دے گی۔ حاسد کوئی ترقی نہیں کر سکتا کیونکہ اس کو جلن سے فرصت نہیں وہ ترقی کے ذریعے کب سوچے گا۔

مسئلہ: حسد اور غبطہ میں فرق ہے دوسرے کا زوال چاہنا حسد ہے اور دوسرے کی طرح اپنے لئے بھی کمال چاہنا غبطہ ہے۔ حسد بہر حال حرام ہے اور غبطہ دینی باتوں میں جائز دنیاوی باتوں میں حرام ہے۔ ہم کسی کو نیک کام کرتے ہوئے دیکھ کر خود نیک کام کرنے لگیں۔ یا اس کی تمنا کریں یہ عین ثواب ہے صحابہ کرام نیکیوں میں ایک دوسرے پر بڑھنے کی کوشش کرتے تھے۔ **دوسرا فائدہ:** نبوت بلکہ ولایت محض اللہ کے فضل سے ملتی ہے نہ کہ اپنے کمال سے کیوں کہ یہاں وحی کو فضل فرمایا گیا۔ آدم و عیسیٰ علیہم السلام پیدا ہوتے ہی نبی تھے۔ ہمارے نبی علیہ السلام پہلے سے نبی تھے۔ معلوم ہوا کہ نبوت کمال پر موقوف نہیں۔ **تیسرا فائدہ:** اللہ کا کرم کسی قوم کے ساتھ خاص نہیں۔ وہ فاعل مختار ہے جس کو چاہے اپنے فضل سے نوازے۔ اسی قوم پرستی سے یہودی تباہ ہوئے اور اسی خاندان پرستی نے بہت سے مسلمانوں کو برباد کر دیا۔ **چوتھا فائدہ:** رافضی بھی انہیں یہودیوں کی طرح ہیں کہ انہوں نے نبوت کو بنی اسرائیل سے خاص مانا اور انہوں نے خلافت کو بارہ اماموں میں منحصر کر دیا۔ **پانچواں فائدہ:** اہانت کا عذاب صرف کفار ہی کو ہوگا۔ گنہگار مسلمانوں کے لئے درحقیقت وہ عذاب پاک کرنے کا ذریعہ ہے جیسے کہ مہربان باپ اپنے بیٹے کو سزا دے یا اس کا ختنہ حجامت اور حمام کرائے اور یہ کیوں نہ ہو رب کا فیصلہ ہے وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ (منافقون: ۸) گنہگار بھی مومن ہی ہے دوزخ میں جانا اس کے لئے عزت ہے کہ یہ پاکی کا ذریعہ **چھٹا فائدہ:** حضور ﷺ کا انکار سارے نبیوں اور ساری کتابوں کا انکار ہے۔ دیکھو ان اسرائیلیوں نے حضور کا انکار کیا تو رب نے فرمایا اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ۔ مَا اَنْزَلَ میں سارے نبی ان کی کتابیں ان کے معجزات سب داخل ہیں اس کی وجہ ظاہر ہے کیونکہ ساری کتابوں سارے نبیوں نے حضور کی خبر دی۔ انہوں نے حضور کا انکار کیا تو یقیناً ان سب نبیوں کتابوں کو جھوٹا مانا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: غضب ایک مغلوبی حالت کا نام ہے جو بری چیز دیکھ کر خون کے جوش کھا جانے سے پیدا ہوتی ہے۔ خدا کی ذات اس سے پاک ہونی چاہئے **جواب:** حق تعالیٰ کے لئے یہ معنی محال ہیں یہاں ارادہ عذاب مراد ہے۔

دوسرا اعتراض: نبوت کی خواہش عبادت ہے یہود نے یہی تو کیا تھا وہ عذاب کے مستحق کیوں ہو گئے؟ ہر شخص فضل الٰہی حاصل کرنا چاہتا ہے **جواب:** بیشک تمنا نبوت بہتر لیکن نبی سے حسد بدترین گناہ۔ مال سے محبت کرنا جائز مگر مال دار کی چوری یا اسے قتل کرنا حرام۔

تفسیر صوفیانہ

رب نے انسانوں کو تاجر فرمایا ہے۔ تاجروں کا قاعدہ ہے کہ خوردہ فروش تھوک فروشوں سے خریدتے ہیں۔ وہ بڑی منڈیوں سے اور منڈی والے بڑی ولایت سے مال منگواتے ہیں۔ بڑی ولایت والے خود بناتے ہیں۔ اچھے سودوں کی دکانیں علیحدہ ہوتی ہیں۔ بروں کی علیحدہ۔ شراب کی دکانیں اور ہیں تسبیح ومصلے کی دکانیں اور ہم لوگ خوردہ والے ہیں۔ اپنے مشائخ سے اچھے اعمال خریدتے ہیں برے یاروں سے برے عمل پھر مشائخ کا سلسلہ تجارت حضور ﷺ پر پہنچتا ہے جو ان اعمال کا ٹکسال ہے اور برے اعمال کا سلسلہ ابلیس تک جہاں پر بدعملیاں بنتی ہیں نیز ہر دوکان کے سودے خریداروں سے معلوم ہوتے ہیں مریضوں کا ہجوم دواخانہ پر ہوتا ہے۔ طلباء کا مجمع اسٹیشنری کی دوکانوں پر حضور کی دوکان پر نمازیوں غازیوں صحابیوں دردمندوں کی بھیڑ ہے۔ ابلیس کی دوکان پر بدمعاشوں کا ہجوم۔ اس آیت میں ارشاد ہوا کہ ان لوگوں نے شیطانی دکان سے کفر خریدا تجربہ سے ثابت ہے کہ کسی پر رحمت دوسرے کے واسطے زحمت بن جاتی ہے بارش بعض درختوں کے واسطے رحمت ہے اور بعض کے لئے زحمت نبوت اور ولایت کا بھی یہی حال ہے کہ یہ نبی اپنے امتیوں کے واسطے رحمت ہے اور حاسدین کے واسطے زحمت بلکہ حق یہ ہے کہ حسد بھی حاسد کے لئے زحمت اور محسود کے واسطے رحمت ہے کہ اس سے اس کے درجے بڑھتے ہیں۔ بغیر حاسد اور دشمنوں کے کوئی ترقی نہیں کرسکتا۔ رب تعالیٰ نے جمال کا جلال کے ساتھ اور نور کا ظلمت کے ساتھ اور رحمت کا زحمت کے ساتھ جوڑا بنایا ہے گلزار مصطفیٰ کے ساتھ ابوجہلی بھی ہے۔ حافظ شیرازی فرماتے ہیں ۔

دریں چمن گل بے خار کس نہ چید آرے
چراغ مصطفوی باشرار بولہبیت

مولانا روم کے استاد شیخ صلاح زرکوب فرماتے ہیں کہ مجھے رب نے آسمان گرانے کی قدرت دی ہے اگر میں چاہوں تو اللہ کے فضل سے سارے حاسدوں کو تباہ کردوں لیکن ہم فقراء کے لئے صبر بہتر ہے۔ (تفسیر روح البیان)

وَ اِذَا قِیْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَاۤ
اور جب کہا جائے واسطے ان کے ایمان لے آؤ ساتھ اس کے جو اتاری اللہ نے تو وہ کہتے ہیں کہ ایمان لاتے ہیں ہم
اور جب ان سے کہا جائے کہ اللہ کے اتارے پر ایمان لاؤ تو کہتے ہیں وہ جو ہم پر اترا اس پر ایمان لاتے ہیں

أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَ يَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۚ وَ هُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا

ساتھ اس کے جو اتاری گئی اوپر ہمارے اور انکار کرتے ہیں وہ ساتھ اس کے جو سوا اس کے ہے حالانکہ وہ حق ہے تصدیق کرنیوالا ہے

اور باقی سے منکر ہوتے ہیں حالانکہ وہ حق ہے ان کے پاس والے کی

لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ

واسطے اس کے جو ساتھ ہے ان کے فرمادو تم پس کس واسطے قتل کرتے ہو تم پیغمبروں کو اللہ کے اس سے پہلے

تصدیق فرماتا ہوا تم فرمادو کہ پہلے اللہ کے نبیوں کو کیوں شہید کیا اس سے پہلے اگر تمہیں

كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾ وَ لَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ

اگر تھے تم ایمان والے اور البتہ تحقیق لائے تمہارے پاس موسیٰ کھلی نشانیوں کو

پہلی کتاب پر ایمان تھا اور بے شک تمہارے پاس موسیٰ کھلی نشانیاں لے کر تشریف لائے

اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

پھر بنالیا تم نے بچھڑے کو پیچھے ان کے اور تم تھے ظالم

پھر تم نے اس کے بعد بچھڑے کو معبود بنالیا اور تم ظالم تھے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** یہ بھی یہودیوں کے ان عیوب کے سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو ان کی مایوسی ایمان کا باعث ہے یعنی اے مسلمانوں تم ان کے ایمان کی کیسے امید کرتے ہو وہ پہلے ہی سے فیصلہ کر چکے ہیں اپنی ہی مانیں گے اور کی نہیں۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ یہودی اپنے کو نبوت کا ٹھیکیدار سمجھ کر حضور کی نبوت کے صرف حسد سے منکر ہیں چونکہ حسد ایک اندرونی عیب ہے اس لئے اب اس کا ثبوت ان کے قول سے دیا جارہا ہے تو گویا پچھلی آیت میں دعویٰ تھا اور اس میں اس کی دلیل۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا کہ یہودی غضب پر غضب لے کر لوٹے اب ان غضبوں کے اسباب بیان ہورہے ہیں۔

تفسیر

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اس قول کے کہنے والے صحابہ کرام ہیں اور ھم کا مرجع مدینہ کے یہودی یعنی جب صحابہ کرام کی طرف سے یہود مدینہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ایمان لے آؤ۔ ان تمام کتابوں پر جو اللہ نے اتاریں۔ اس جگہ ما عموم کے لئے ہے۔ کیونکہ بعض آسمانی کتابوں پر تو ان کا ایمان تھا اگر یہاں ما سے مطلق آسمانی کتابیں مراد ہوں تو یہ کلام بیکار ہوگا کیونکہ مطلق ایک فرد سے بھی پایا جاتا ہے نیز یہودیوں نے اس کے جواب میں توریت پر ایمان کا ذکر کیا تو اگر یہ ما عموم کے واسطے نہ

ہوتا تو ان کا کلام اس کا رد نہ بنتا بلکہ اقرار۔ اس کلام کا مطلب یہ ہے کہ اے یہودیو تم میں اور خالق میں بندگی اور ربوبیت کا تعلق ہے اور بندہ پر واجب ہے کہ اپنے مالک کا ہر حکم مانے خواہ کسی ذریعے سے آئے اور کسی پر آئے چونکہ قرآن وغیرہ بھی اسی کی کتابیں ہیں۔ جس کا تم کو بھی یقین ہو چکا لہٰذا اسی قاعدہ سے سب پر ہی ایمان لے آؤ۔ تم نے توریت کو اس لئے نہ مانا تھا کہ یہ موسیٰ علیہ السلام پر آئی بلکہ اس لئے کہ وہ رب کی طرف سے آئی اور یہ بات تو تمامی کتابوں میں موجود ہے۔ تو سب کو ہی مان لو۔ ان بیوقوفوں نے اس مدلل فصیح و بلیغ کلام کے جواب میں قَالُوْا نُؤْمِنُ کہا کہ ہم تو ایمان لائے ہیں۔ صرف بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا ان کتابوں پر جو ہم پر اتاری گئی یعنی جو ہماری جماعت کے انبیاء حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہ پر کتابیں اور صحیفے اترے وہ تو ہم مانتے ہیں اور مانتے رہیں گے چونکہ نبی پر کتاب آنا گویا ساری امت پر آنا ہے۔ یا اپنے خاندانی بزرگوں کی چیز خود اپنی ہوتی ہے اس لئے انہوں نے عَلَيْنَا کہا حالانکہ توریت ان سب پر نہ اتری تھی۔ وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ یہ رب کا کلام ہے جو کہ یہودیوں کے کلام کی شرح کر رہا ہے۔ یہودیوں نے صرف یہ کہا تھا کہ ہم اپنی کتابوں پر ایمان لاتے ہیں اور دوسری کتابوں کے کفر کا ذکر نہ کیا تھا قرآن کریم نے فرمایا کہ ان کا مطلب یہ ہے کہ ان کتابوں کے سوا باقی کا انکار کرتے ہیں کیونکہ عام کے جواب میں خاص بولنے سے باقی کا انکار ہوتا ہے۔ جیسے کہ بادشاہ کہے کہ سب کو یہ چیز تقسیم کر دو۔ دوسرا جواب دے کہ میں تو پٹھانوں کو دوں گا تو اس کا مطلب یہ ہی ہوگا کہ پٹھان کے سوا اوروں کو نہ دوں گا۔ وَهُوَ الْحَقُّ یہ ان کی نہایت نفیس تردید ہے کہ وہ تو اس کا انکار کر رہے ہیں حالانکہ یہ حق ہے اور حق کا انکار باطل ہی ہوتا ہے لہٰذا وہ باطل پر ہیں۔ لطف یہ ہے کہ قرآن وغیرہ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ان کی کتاب کو سچا کرنے والا ہے کہ اگر یہ نہ آتا تو توریت غلط ثابت ہوتی کہ اس نے اس کے آنے کی خبر دی تھی لہٰذا توریت کا ماننا قرآن کے ماننے پر موقوف ہے اور اس کا انکار توریت شریف کا انکار ہے۔ یہاں تک تو نہایت لطیف طریقہ سے سمجھایا گیا کہ یہ لوگ توریت کے بھی منکر ہیں۔ اب نہایت واضح طور پر بات ثابت کی جا رہی ہے کہ قل اے نبی علیہ السلام ان کی سرزنش یا ان کے قول و فعل میں فرق دکھانے کے لئے ان سے یہ تو فرما دو کہ اگر تم واقعی توریت کے ماننے والے ہو تو فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ تم نے اس سے پہلے اللہ کے نبیوں کو قتل کیوں کیا۔ جیسے حضرت شعیا، زکریا، یحییٰ علیہم السلام توریت میں تو انبیاء کی اطاعت کا حکم دیا گیا تھا نہ کہ ان کے قتل کا خیال رہے کہ تَقْتُلُوْنَ ماضی کی حکایت ہے جو صیغہ حال سے کر دی گئی اس کی حکمت انشاء اللہ اعتراض و جواب میں بتائی جائے گی اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ اس شرط کی جزا محذوف ہے یعنی اگر تم توریت کے مومن تھے تو تم نے یہ حرکتیں کیوں کیں۔ اس الزام کے جواب میں شاید وہ کہہ دیتے کہ چونکہ موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ گزر چکا تھا اور ہم ان کی تعلیم بھول چکے تھے اس لئے ایسی خطا ہو گئی۔ لہٰذا اب دوسرا واقعہ سنا کر بتایا جا رہا ہے کہ تم نے خاص موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں کفر و عناد میں کون سی کمی کی۔ اس زمانہ میں تو تم نے اس سے بھی بڑھ چڑھ کر کفر کئے کہ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ تمہارے پاس موسیٰ علیہ السلام ایک نہیں بلکہ بہت سے کھلے ہوئے معجزات لائے عصا تم نے دیکھا ید بیضا کی تم نے زیارت کی دریا چڑھتے۔ فرعون کو ڈوبتے اپنے کو اترتے تم نے دیکھا یہ سب کچھ دیکھنے کے باوجود ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ پھر بھی تم نے اس بے عقل بچھڑے کو معبود بنایا

جو تمہارے ہاتھوں ڈھلا اور بنا حالانکہ ابھی موسیٰ علیہ السلام نے وفات نہ پائی تھی۔ بلکہ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ صرف انہوں نے تم سے پیٹھ ہی پھیری تھی کہ توریت لینے طور پر گئے تھے اور تم نے یہ غضب ڈھایا۔ خیال رہے کہ یہاں ثم صرف رتبے کی تراخی کے لئے ہے نہ کہ تراخی زمانی کے لئے۔ کیونکہ ان کی گائے پرستی اس وقت ہوئی نہ کہ کچھ دنوں بعد اور پھر اس کی یہ وجہ نہ تھی کہ شریعت موسوی منسوخ ہو چکی تھی یا موسیٰ علیہ السلام وفات پا گئے تھے بلکہ صرف اس لئے کہ وَاَنۡتُمۡ ظٰلِمُوۡنَ تم جہنم کے عادی ظالم ہو کہ تمہاری خمیر اور تخم میں ظلم اور کفر ہے۔

خلاصہ تفسیر

مسلمانوں کی طرف سے یہود مدینہ سے نہایت مدلل طریقے سے کہا گیا کہ ان کو نہایت نفیس طریقے سے دعوت ایمان دی گئی کہ اے یہودیو! جس طرح تم نے توریت کو مانا ہے۔ اسی طرح انجیل وقرآن کو بھی مانو کیونکہ وجہ ایمان ان سب میں ایک ہی ہے انہوں نے بیبا کی سے کہا کہ ہم تو اس کو مانیں گے جو ہم بنی اسرائیل پر اتری رب تعالیٰ نے ان کے کلام کی شرح فرمائی کہ اے مسلمانو ان کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ماسوا کسی کتاب کو نہ مانیں گے۔ پھر ان کی چار طریقہ سے تردید فرمائی گئی۔ اولاً یہ کہ قرآن حق ہے جس کا یہ بھی اقرار کرتے ہیں لہٰذا ان کا انکار باطل۔ دوسرے یہ کہ قرآن توریت کو سچا کرنے والا ہے۔ کیونکہ توریت میں اس کے آنے کی خبر تھی لہٰذا اس کا انکار توریت ہی کا انکار ہے۔ تیسرے یہ کہ تمہارے گذشتہ اعمال تمہارے دعوے کو توڑتے ہیں کہ توریت میں انبیاء کرام کی اطاعت کا حکم تھا تم نے انہیں قتل کیا اب بتاؤ تمہارا ایمان کیا رہا۔ نیز تم نے صاحب توریت علیہ السلام کی موجودگی میں ان کے غائب ہوتے ہی بدتر شرک کر ڈالا معلوم ہوا کہ تم ہمیشہ سے ہی ظالم ہو یہ انکار بھی اسی وجہ سے ہے ان آیات کے مضمون سے اصحاب رسول اللہ ﷺ کی عظمت کا پتہ لگا کہ یہود نے موسیٰ علیہ السلام کی حیات شریف میں ہی دین بدلنے کی کوشش کی کہ شرک میں مبتلا ہو گئے مگر اصحاب رسول اللہ ﷺ نے حضور کے بعد وفات دین کو وہ رونق دی کہ سبحان اللہ بکھرے قرآن کو جمع کیا احادیث کو لوگوں تک پہنچایا مسیلمہ کذاب اور مانعین زکوۃ کا فتنہ ختم کیا۔ تمام عالم میں اسلام پھیلایا غرضیکہ بنی اسرائیل یہودیت مٹانے والے تھے اور حضور کے اصحاب دین پھیلانے والے جیسے حضور تمام نبیوں کے سردار ہیں ویسے ہی حضور کے صحابہ تمام اصحاب انبیاء کرام کے سردار رضی اللہ عنہم۔

دوسری تفسیر

جب یہود سے کہا جاتا کہ تم ساری کتابوں پر ایمان لاؤ تو وہ کہتے کہ چونکہ ہم توریت کے ماننے والے ہیں اس لئے قرآن کے صرف اس حصہ کو مانیں گے جو اس کے موافق ہے یعنی اس کے خلاف مضمون کو ہرگز نہ مانیں گے۔ اس کی تردید میں ارشاد ہوا کہ یہ مضمون بھی حق ہے اور اس نسخ میں بھی توریت کی تصدیق ہے کہ توریت نے اس نسخ کی خبر دی تھی اور اگر تم توریت کی حمایت میں اس کے ناسخ قرآن کو نہیں مانتے اور نبی آخر الزمان میں یہ عیب نکالتے ہو کہ یہ توریت کے منسوخ کرنے والے ہیں اس لئے ہم ان کو نہیں مانتے تو بتاؤ کہ ان سے پہلے جو پیغمبر توریت کی اشاعت وحمایت کرنے کے لئے آئے انہیں تم نے کیوں قتل کیا وہ تو ناسخ نہ تھے بلکہ حامی تھے۔ نیز موسیٰ علیہ السلام تو خود توریت لانے والے ہیں۔ تم نے ان کی موجودگی میں

بت پرستی کیوں کی یہ تمہارے صرف بہانے ہیں انکار کی وجہ صرف یہ ہے کہ تم جدی اور موروثی ظالم ہو۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** کفار سے مناظرہ کرنا سنت قرآنی ہے۔ **دوسرا فائدہ:** بے دینوں سے دین میں جھگڑا کرنا اور مناظرہ میں نقض وارد کرنا، مقابل کو الزامی جواب دینا طریقہ انبیاء ہے۔ **تیسرا فائدہ:** بعض انبیاء پر ایمان اور بعض کا انکار بالکل غلط بلکہ محال ہے۔ کیونکہ ہر نبی سب کی تصدیق فرماتے ہیں۔ ایک کا بھی انکار اس تصدیق کا انکار ہے۔ مثلاً موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تھا کہ نبی آخر الزمان ﷺ سچے اور ان کا قرآن حق ہے اب جو قرآن کا انکار کرتا ہے وہ موسیٰ علیہ السلام کے اس فرمان کا منکر ہے۔

مسئلہ: یہی حال صحابہ کرام اور اہل بیت کا ہے کہ ان میں سے ایک کا انکار دوسرے کا انکار ہے۔ مثلاً صدیق اکبر کا اگر انکار کر دیا جائے تو قرآن شریف غلط ٹھہرا کیونکہ اس کے جمع کرنے والے وہی ہیں اور پھر اہل بیت کے فضائل کی حدیثیں بھی غلط ہوئیں کیونکہ یا تو وہ صدیق اکبر سے مروی ہیں یا ان کے معتقدین سے جب دونوں راستے بند ہو گئے تو اہل بیت کے ماننے کا اور پہچاننے کا کون سا ذریعہ رہا۔ نیز سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے اپنی تقریر اور تحریر میں ان کے فضائل بیان کئے دیکھو نہج البلاغہ (خطبات علی المرتضیٰ) لہٰذا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انکار سیدنا علی المرتضیٰ کے ان فرمانوں کا انکار ہے۔

سارے اصحاب نبی کا ہے جو دل سے معتقد　　ماننے والا وہ ہی ہے حیدر کرار کا

اسی لئے رافضیوں نے مولا علی میں تقیہ (منافقت) مانا کہ جو کچھ انہوں نے ابوبکر و عمر کے فضائل فرمائے یا ان کی خلافت کا اقرار کیا ان سے بیعت کی یہ دل سے نہیں محض منافقانہ چال تھی۔ معاذ اللہ امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے میدان کربلا میں سخت تکلیف کے باوجود تقیہ نہ کیا اب جو رافضی حضرات خلفاء ثلثہ میں عیب لگائے اس سے پوچھو کہ ان عیوب کی حضرت علی مرتضیٰ کو خبر نہ تھی تمہیں چودہ سو برس کے بعد خبر لگی۔ اگر تھی تو انہوں نے دست بیعت دراز کر کے ان حضرات کی خلافت کو کیوں تسلیم کر لیا اور ان کے نذرانہ وغیرہ کیوں قبول فرمائے۔

خیال رہے کہ بنی اسرائیل نفسانی طور پر یا اپنا دین مٹانے کے لئے آپس میں لڑے بھڑے مگر حضور کے اصحاب دین کی خاطر لڑے۔ دین مٹانے کو آپس میں نہیں لڑے ان کی آپس کی جنگیں کفر و اسلام یا عداوت یا نفسانیت کے لئے نہ تھیں بلکہ ان میں سے ہر ایک کا دوسرے کے متعلق یہ خیال تھا کہ وہ دینی غلطی کر رہا ہے اس لئے لڑے اس لئے رب نے قرآن کریم میں کہیں ان کی برائی نہ کی تعریف ہی کی۔ **چوتھا فائدہ:** انبیاء کرام کی مخالفت، انہیں قتل کرنا یا ایذا پہنچانا کفر ہے دیکھو بنی اسرائیل نے دعویٰ کیا تھا قرآن کریم نے ان کا یہ جرم (قتل انبیاء) دکھا کر انہیں جھٹلایا اور ان کا کفر ثابت کیا۔

پانچواں فائدہ: کفر سے راضی ہونا بھی کفر ہے۔ دیکھو موجودہ بنی اسرائیل نے انبیاء کرام کو قتل نہ کیا تھا۔ محض اس سے راضی تھے قرآن کریم نے ان سے فرمایا تَقْتُلُوْنَ تم قتل کرتے ہو۔

مسئلہ: دیوبندیوں کے چند سردار حضور علیہ السلام کی توہین کر کے کافر ہوئے۔ اب جو بھی ان نوتنوں کی حمایت کرے وہ

اسی قاعدے سے ان جیسا کافر ہے۔ **چھٹا فائدہ:** ایمانیات میں اپنی طرف سے قید لگانا خدا کا انکار اور اپنے خدا ہونے کا اقرار ہے اس کا ایمان رب پر نہیں اپنے پر ہے کہ رب کی بات صحیح نہیں۔ میری بات صحیح ہے یہودیوں کو حکم تھا کہ جو اللہ نے اتارا اس پر ایمان لاؤ۔ انہوں نے کہا نہیں بلکہ جو کچھ اللہ نے ہم پر اتارا۔ اس پر ایمان لائیں گے۔ انہوں نے (ہم پر) یہ قید اپنی طرف سے لگائی۔ جس سے وہ رب کے منکر ہو کر کافر ہے۔

مسئلہ: روافض حضور علیہ السلام یا اہل بیت کو نہیں مانتے بلکہ صرف اپنے اس فہرست بنانے والے کو مانتے ہیں جس نے انہیں بارہ اماموں کی فہرست بنا کر دے دی کہ ان کے علاوہ گالیاں دینا ورنہ کیا وجہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کی بیٹی حضرت فاطمہ کو مانیں۔ باقی بیٹیوں رقیہ، کلثوم اور زینب کو گالیاں دیں پھر حضور کے ایک داماد حضرت علی کو مانیں اور دو دامادوں حضرت عثمان اور ابوالعاص کو گالیاں دیں۔ پھر سیدنا علی کے دو بیٹوں یعنی امام حسن و حسین کو تو مانیں اور باقی بیٹوں یعنی محمد ابن حنیفہ اور ابوبکر و عمر (سیدنا علی کے بیٹے) کو گالیاں دیں۔ پھر حضرت فاطمہ کے دو بیٹوں یعنی امام حسن و حسین کو تو مانیں اور ان کی بیٹی ام کلثوم کو گالیاں دیں۔ اس لئے کہ وہ حضرت عمر کے نکاح میں تھیں۔ اگر نبی یا اہل بیت پر ایمان ہوتا تو ان کی اولاد تو کیا ان کے غلاموں بلکہ گلی کے کتوں سے بھی محبت ہوتی۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: تَقْتُلُوْنَ سے زمانہ حال معلوم ہوتا ہے اور مِنْ قَبْلُ سے ماضی یہاں چاہئے تھا۔ قتلتم کیونکہ یہ واقعہ پہلے ہو چکا تھا۔ **جواب:** لازمی صفت صیغہ حال سے بیان کر دی جاتی ہے۔ (تفسیر کبیر) نیز یہاں تَقْتُلُوْنَ سے مراد ترضون ہے یعنی تم اپنے بڑوں کے قتل سے راضی ہوتے ہو۔ چونکہ رضائے جرم اور جرم ایک ہی حکم میں ہیں۔ اس لئے رضا کو قتل فرما دیا گیا۔ **دوسرا اعتراض:** بچھڑے کی پوجا توریت ملنے سے پہلے ہوئی تھی پھر اس کو توریت کی انکار کی دلیل کیوں بنایا گیا۔ **جواب:** چونکہ یہ توحید کی ہی مخالفت ہے نیز پیغمبر اور کتاب کی مخالفت یکساں ہے۔

تفسیر صوفیانہ

صورت سے سیرت قالب سے قلب قال سے حال اور اعمال سے کمال کا پتہ چلتا ہے جن کا قلب درست ہوگا۔ انشاء اللہ اس کی ساری چیزیں درست ہوں گی۔ جس شخص کے اعمال اس کے دعویٰ کے مطابق نہ ہوں۔ وہ دعویٰ میں جھوٹا ہے اس آیت کریمہ میں یہودیوں کے قول و فعل سے ان کی بے ایمانی کا ثبوت دیا گیا۔ نیز جو شخص کہ بارگاہ مصطفیٰ علیہ السلام کا نکالا ہوا ہو کہیں سرخرو نہیں ہو سکتا جیسا کہ ان یہودیوں کا حال ہوا۔ اسی طرح جو شخص کسی ولی اللہ کے عتاب میں آ جائے وہ ہر جگہ سے دھتکارا ہی جائے گا۔ بعض بیوقوف مرید یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے سلسلہ کے مشائخ کو مانیں باقی سے کوئی تعلق نہ رکھو۔ وہ بے عقل مشرب تصوف میں ان یہودیوں کی طرح ہیں۔ جنہوں نے کہا تھا کہ ہم اپنے پر اتری ہوئی کتاب کے مومن ہیں۔ وہ تو ایمان سے محروم رہے اور جھوٹا مرید عرفان سے محروم ہے۔ معرفت حاصل کرنے کے لئے ہر ولی کے زیر سایہ رہنا ضروری ہے ہاں یہ بات ضرور ہے جہاں سے فیض ملے تو یوں سمجھے کہ میرے مرشد کا فیض ہے۔ جو اس دروازہ سے مل رہا ہے۔

وَ اِذْ اَخَذْنَا مِیْثَاقَكُمْ وَ رَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَؕ خُذُوْا مَاۤ
اور جب کہ لیا ہم نے عہد تمہارا اور اٹھالیا ہم نے اوپر تمہارے طور کو تو تم وہ جو
اور یاد کرو جب ہم نے تم سے پیمان لیا اور طور کو تمہارے سروں پر بلند کیا لو جو
اٰتَیْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّ اسْمَعُوْاؕ قَالُوْا سَمِعْنَا وَ عَصَیْنَاۗ
دیا ہم نے تم کو ساتھ طاقت کے اور سنو تم کہا انہوں نے سنا ہم نے اور نافرمانی کی ہم نے
ہم تمہیں دیتے ہیں زور سے اور سنو تم بولے ہم نے سنا اور نہ مانا
وَ اُشْرِبُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْؕ قُلْ بِئْسَمَا یَاْمُرُكُمْ
اور پلادیئے گئے وہ بیچ دلوں اپنے کے بچھڑا بوجہ کفر کے ان کے تم فرمادو بری ہے
اور ان کے دلوں میں بچھڑا رچ رہا ہے ان کے کفر کے سبب تم فرمادو کیا برا حکم
بِهٖۤ اِیْمَانُكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ(۹۳)
وہ چیز کہ حکم کرتا ہے تم کو ساتھ اس کے ایمان تمہارا اگر ہو تم ایمان والے
ہے دیتا ہے تم کو تمہارا ایمان اگر ایمان رکھتے ہو۔

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے کئی طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں بنی اسرائیل کی بدعملیوں سے ثابت کیا گیا تھا کہ وہ توریت کے منکر ہیں۔ اب اس سے ترقی کر کے خود توریت قبول کرتے وقت کی حالت سے ان کی بے ایمانی ثابت کی جارہی ہے کہ تم لوگ توریت لیتے ہی کہاں تھے خوف کی وجہ سے چار و ناچار صرف زبانی قبول کرلی تھی۔ **دوسرا تعلق:** اس سے پہلے یہودیوں کے اس دعوے کی تردید میں کہ ہم اپنے دین پر مضبوطی سے قائم ہیں اور ہمارے دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں رب تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ ان پر لعنت کے پردے ہیں۔ اس دعوے کے ترتیب وار تین ثبوت دیئے جو کہ ایک دوسرے سے اعلیٰ ہیں ایک یہ کہ تم نبی آخر الزمان ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے ان کی دعائیں مانگتے تھے اور ان سے وسیلہ کرتے تھے اور جب وہ بنی اسمٰعیل میں سے تشریف لائے تو تم حسد سے ان کے منکر ہوگئے۔ یہ تعصب ہے دوسرے یہ کہ تمہارا یہ خیال ہے کہ توریت کے سوا کسی اور سچی بات کو بھی نہ مانیں گے۔ یہ بھی تعصب ہے اس وجہ سے تم نے توریت کے حامی نبیوں کو بھی قتل کر ڈالا۔ اب اس آیت میں تیسرا ثبوت دیا جارہا ہے کہ تم نے موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں بھی اس توریت کو صحیح معنی میں نہ اختیار کیا اور یہی طریقہ مناظرہ کا ہے کہ دعویٰ کے چند ثبوت دیئے جائیں کہ ہر اگلا ثبوت پچھلے سے اعلیٰ ہو۔ **تیسرا تعلق:** اس سے پہلے فرمایا گیا تھا کہ تم اس قرآن کا انکار کر رہے ہو جو توریت کو سچا کرنے والا

ہے اس سے توریت کا انکار لازم آئے گا۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ تم توریت کے صراحۃً منکر ہو یعنی پہلے توریت کے انکار کا الزامی ثبوت دیا گیا تھا اور اب صریحی۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیات میں بتایا گیا تھا کہ تم اپنے انبیاء بلکہ خود موسیٰ علیہ السلام کے بھی متبع نہیں کہ تم نے ہمیشہ ان کی مخالفت کی اب بتایا جا رہا ہے کہ تم توریت کے بھی معتقد نہیں کہ تم نے اسے نہ دل سے مانا تھا نہ اب، چونکہ نبی کا ماننا کتاب سے ماننے پر مقدم ہے اور نبی کا انکار کتاب کا انکار ہے۔ اس لئے پہلے نبی کے انکار کا ذکر کیا پھر کتاب کے انکار کا۔

تفسیر

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ یہاں بھی وہی اذکروا فعل محذوف ہے۔ یعنی اے اسرائیلیو تم اس واقعہ کو بھی یاد کرو جب کہ ہم نے تم سے توریت پر عمل کرنے کا عہد لیا تھا اور تم نے اس سے صاف انکار کر دیا تھا کہ ہم سے ان بھاری احکام پر عمل نہ ہو سکے گا۔ اس لئے **وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ** ہم نے تم پر شامیانے کی طرح طور پہاڑ کھڑا کر دیا اگر تم بلا حیل وحجت پہلے ہی سے مان لیتے تو تم پر طور کیوں آتا۔ اس کا آنا ہی تمہارے انکار کی کھلی دلیل ہے اور طور اٹھا کر ہم نے کہا۔ **خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ** جو کچھ ہم نے تم کو دیا پورے زور سے لے لو۔ یعنی اس سخت احکام پر عمل کرو اور تکلیفیں برداشت کرو۔ **وَّاسْمَعُوْا** اور تم ساری توریت پوری توجہ سے سنو تا کہ کوئی حکم ملنے سے نہ رہ جائے۔

خیال رہے کہ یا توریت کے لینے سے اس پر عمل کرنا مراد ہے اور سننے سے قبول کرنا اور چونکہ عمل مقصود ہے اور قبول اس کی شرط اس لئے سننے کا ذکر لینے کے بعد کیا گیا یا لینے سے اس کا ماننا مراد ہے اور سننے سے اطاعت کرنا اور ماننا اطاعت سے پہلے ہے۔ لہٰذا پہلے لینے کا ذکر کیا گیا اور بعد میں سننے کا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لینے سے مراد ہو اس پر قبضہ کرنا اور پکڑنا اور سننے سے مراد ہو عمل کے لئے پڑھوا کر سننا جیسا کہ کوئی کتاب پہلے حاصل کرتے ہیں پھر پڑھوا کر سنتے ہیں یا لینے سے مراد ہو توریت میں عمل کرنا اور سننے سے موسیٰ علیہ السلام کے دوسرے فرمانوں کا ماننا چاہئے تو یہ تھا کہ اس خوف کی حالت میں دل سے اطاعت کرتے مگر قالوا انہوں نے صرف منہ سے کہہ دیا **سَمِعْنَا** ہم نے سن تو لیا یہاں **قَالُوْا** اور **سَمِعْنَا** فرمانے میں اس طرف باریک اشارہ ہے کہ ان کی یہ ساری باتیں فقط ظاہری تھیں۔ پہاڑ کے خوف سے کہہ رہے تھے کہ خیر مرتا کیا نہ کرتا سن لیا ہم نے مگر دل میں یہ تھا کہ **عَصَيْنَا** جب چھوٹیں گے تب لوٹیں گے۔ جب اس خوف سے امن ملے گا تو مولیٰ، کریں گے تیری نافرمانی ہی معلوم ہوا کہ ان کے دل نہایت سخت تھے کہ ایسی خطرناک حالت میں بھی نرم نہ ہوئے۔ اس لئے کہ **وَاُشْرِبُوْا** وہ پلا دیئے گئے تھے یا تو پلانے کے ظاہری معنی مراد ہیں یعنی جیسے کہ شراب معدہ میں پہنچ کر مست اور مخمور کر دیتی ہے ایسے ہی بچھڑے کی محبت کی شراب نے انہیں مخمور بنا دیا تھا۔ جس سے کہ وہ برے بھلے میں تمیز نہ کر سکے یا اس سے خلط کرنا مراد ہے جیسے کہ کپڑے کو رنگ میں غوطہ دے دیتے ہیں جس سے اس کا تار تار رنگین ہو جاتا ہے اور رنگت اس کے رونگٹے رونگٹے میں سرایت کر جاتی ہے ایسے ہی ان کے دلوں کو بچھڑے کی محبت، بچھڑے کے رنگ میں ڈبو دیا گیا۔ جس سے کہ ان کے دل رنگ گئے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ **وَاُشْرِبُوْا** سے رنگوں کی آپس کی آمیزش مراد ہو جیسے کہ عرب کہتے ہیں۔ **ثَوْبٌ مشربٌ بحُمْرَةٍ** کپڑا مائل بہ

سرخی ہے یعنی ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت کی جھلک تھی۔ غرض کہ اس کے تین معنی ہیں اور ہر معنی میں نیا لطف فِیْ قُلُوْبِهِمُ
یہ وَاُشْرِبُوْا کا ظرف ہے یعنی اور شرابیں تو معدہ میں پہنچ کر دل ودماغ کو خراب کرتی ہیں اور یہ شراب خاص ان کے دل میں
پہنچی جیسے کہ جب زمین پانی پیتی ہے تو اس سے قسم قسم کی سبزیاں پیدا ہوتی ہیں اسی طرح بچھڑے کی محبت کی شراب سے قسم قسم
کی خراب حرکتیں ان سے ظاہر ہوئیں الْعِجْلَ یہاں حب محذوف ہے۔ یعنی گائے کی محبت سبحان اللہ کیا لطیف عبارت ہے
بچھڑے کی محبت کو شراب قرار دیا اور یہودیوں کے دل کو اس کا جائے قیام اور ان کی ذات کو مظہر آثار یعنی یہ شراب ان کے
دلوں میں پہنچی جس سے وہ سرتاپا مخمور ہوگئے۔ یا بچھڑے کی محبت کو گہرا رنگ قرار دیا اور یہودیوں کے دلوں کو اس کا ظرف اور
ان کی ذات کو اس کا مظہر یعنی بچھڑے کی محبت کے گہرے رنگ نے ان کے دلوں میں ایسا اثر کیا کہ وہ سرتاپا اس میں رنگ گئے
اب جو کچھ ان کی حرکتیں تھیں یہ اس رنگ یا خمار کا اثر تھا۔ اصل عبارت یوں تھی وَاُشْرِبَ الْعِجْلَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مگر اس طرح
بیان کرنے میں عجیب ہی نکات پیدا ہوگئے۔ یہ رنگ کیوں چڑھا بِکُفْرِهِمْ ان کے پچھلے کفر کی وجہ سے یعنی ان کے دلوں پر اللہ
کا رنگ نہ تھا۔ صحبت نبی سے اگرچہ بہت حد تک صفائی ہوہی گئی تھی لیکن پھر بھی کفر کی ایک تہہ باقی تھی وہ تھا کفر کی طرف میلان
اسی لئے انہوں نے دریا سے نکلتے ہی موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا تھا کہ ہمارے لئے بھی ایک جسم والا خدا بنادو۔ اس میلان
کفر کا نتیجہ یہ ہوا کہ موقعہ پاتے ہیں وہ بچھڑے کے پجاری بن گئے جیسے کہ بیمار میں کمزوری باقی ہو اور معمولی سردی گرمی پا کر
پھر بیمار ہو جائے۔ تفسیر روح البیان نے یہ بھی فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس بچھڑے کی راکھ نہر میں پھنکوادی اور ان لوگوں
نے جوش محبت میں وہ پانی پی لیا۔ جس کے اثر سے ان کے دل میں محبت باقی رہ گئی۔ اس صورت میں پلانے کے معنی بالکل
ظاہر ہیں۔ قل اے نبی ﷺ موجودہ یہودیوں کو یہ قصہ سنا کر ان سے یہ فرمادو۔ بِئْسَمَا یَاْمُرُكُمْ بِهٖۤ اِیْمَانُكُمْ تمہارے دعویٰ
کا ایمان تم سے بڑے برے کام کرالیتا ہے۔ کہنا تو یہ تھا کہ تمہارا ایمان بڑا برا ہے مگر فرمایا یہ کہ تمہارے ایمان نے جو تم سے کام
کرائے وہ بڑے برے ہیں تاکہ ان کے اعمال اور عقائد دونوں کی برائی بطور کنایہ بیان ہو جائے کہ بے ایمانو کیا ایماندار کا
ایمان اس سے ناشائستہ حرکتیں کراتا ہے رب نے ان کی بے ایمانی کو ایمان فرمایا ان کو ذلیل کرنے کے لئے جیسے کہ تھانیدار
کسی چور سے کہے تو بڑا شریف ہے۔ تیری شرافت تجھ سے چوریاں کراتی ہے۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ اس شرط کی جزا محذوف
ہے یعنی اگر تم توریت کے ماننے والے تھے تو تم سے یہ حرکتیں کیوں صادر ہوئیں معلوم ہوا کہ تم پہلے ہی سے توریت کے منکر ہو
اب اپنے اس نئے کفر کے لئے توریت کو آڑ بنا رہے ہو۔

خلاصہ تفسیر

پہلے یہود کی بے دینی کے چند عملی ثبوت دیئے گئے۔ اب توریت کے قبول کرنے کا قصہ سنایا جارہا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے
کہ یہ لوگ توریت کے اول ہی سے منکر تھے فرمایا جارہا ہے کہ اے یہودیو تم توریت کے ملنے کا وقت تو یاد کرو کہ جب تم نے
توریت کے ملتے ہی انکار کردیا اور اس کے منوانے کے لئے طور پہاڑ اکھیڑ کر تمہارے سروں پر شامیانے کی طرح کھڑا کردیا
گیا اور اس حالت میں تم سے کہا گیا کہ قبول کرو۔ اور سنو ورنہ پہاڑ گرتا ہے۔ تم نے یہ خطرہ دیکھ کر منہ سے تو کہہ دیا کہ سن لیا مگر

دل تمہارے اس وقت بھی کہتے رہے کہ نافرمانی کریں گے چونکہ شریعت کا حکم ظاہر پر ہے، اس لئے تمہارے اس کہہ دینے سے ہی پہاڑ ہٹا دیا گیا اور یہ کیوں نہ ہوتا تمہارے دل تو پہلے ہی سے بچھڑے کی محبت میں رنگے ہوئے تھے اور اس شراب سے مست و سرشار تھے یہ سب حرکتیں اس نشہ کی تھیں۔ اے محبوب ﷺ آپ ان سے فرمادو کہ اگر اسی کا نام ایمان ہے جو تم سے ایسی بری حرکتیں کرا لیتا ہے تو اس ایمان کو دور سے سلام اگر تم مومن تھے تو تم سے یہ حرکتیں کیوں صادر ہوئیں اور جب تم نے توریت کو ہی اس مصیبت سے صرف زبانی مانا نہ کہ دل سے تو اگر آج قرآن کا انکار کر دو تو کیا بعید ہے تمہارا یہ کفر و انکار توریت ماننے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اصل وجہ وہی ہے کہ تمہارے دلوں میں کفر کی محبت اب بھی موجود ہے اور اس محبت نے اس لئے زیادہ اثر کیا کہ پچھلے کفر کی وجہ سے تمہارے قلب کی زمین پہلے ہی ہموار ہو چکی تھی۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** ڈر سے ایمان نہیں ملتا بلکہ فیضان الٰہی سے یہ یہودی اتنا بڑا خوف دیکھ کر بھی صحیح مومن نہ ہوئے۔ **دوسرا فائدہ:** شریعت کے احکام ظاہر پر ہیں نہ کہ فقط دل پر اسی لئے اسرائیلیوں نے جب منہ سے سمعنا کہہ دیا تو ان سے پہاڑ ہٹا لیا گیا۔ **تیسرا فائدہ:** دنیوی ڈر اور خوف کا ایمان اللہ کے نزدیک معتبر نہیں اور اخروی ڈر اور خوف کا ایمان معتبر ہے۔ جو دوزخ کے ڈر یا جنت کے لالچ سے ایمان قبول کرے۔ عنداللہ معتبر اور جو دنیوی خوف سے ایمان لائے وہ غیر معتبر۔ **چوتھا فائدہ:** کفر کی طرف میلان کفر تک پہنچا دیتا ہے۔ جیسے کہ ان یہودیوں کا حال ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** ان واقعات کو سن کر اصحاب رسول اللہ ﷺ کی شان اطاعت معلوم ہوتی ہے کہ ان حضرات نے اسلام کے احکام بخوشی قبول کئے اور اسلام کی وجہ سے مصیبتیں، ترک وطن و اولاد و جان کی قربانی خندہ پیشانی سے قبول کی۔ اولاً یہ حال تھا کہ مسلمان ہونا اپنے کو مصیبتوں اور ہلاکتوں میں ڈالنا ہوتا تھا ان بزرگوں نے سب کچھ قبول کیا مگر حضور کا ساتھ نہ چھوڑا **چھٹا فائدہ:** اب بھی جو مسلمان قرآن کریم کو صرف کچہریوں میں اس کی جھوٹی قسمیں کھانے اور میت کے لئے ختم پڑھنے پر استعمال کرتے ہیں باقی عمل امریکہ و یورپ کے قوانین پر کرتے ہیں وہ بھی اسی سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا پر عامل ہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ بنی اسرائیل سے جبراً توریت منوائی گئی حالانکہ دوسری جگہ فرمایا جارہا ہے لَآ إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ دین میں جبر نہیں۔ **جواب:** اس کا پہلے جواب دیا جا چکا ہے کہ وہ لوگ ایمان تو پہلے لا چکے تھے اب توریت کو دیکھ کر مرتد ہو رہے ہیں اور ارتداد سے جبراً روکنا جائز ہے۔ یا اب وہ عمل سے انکار کر رہے تھے ان سے جبراً عمل کرایا گیا اس میں کوئی مضائقہ نہیں جیسے کہ کسی مسلمان کو جبراً نماز پڑھائیں یا اسے گناہ سے روکیں۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے اس مصیبت میں دونوں باتیں کہیں۔ سَمِعْنَا بھی اور عَصَيْنَا بھی کیونکہ یہ دونوں قالوا کے مفعول ہیں اور یہ عقل میں نہیں آتا کہ ایسی مصیبت میں بھی وہ یہ کہنے کی ہمت کرتے اور اگر

انہوں نے کہا بھی تو چاہئے تھا کہ پہاڑ گر جاتا کیونکہ انہوں نے ایمان قبول کیا ہی نہیں۔ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ایک یہ کہ یہاں قالوا مطلق ہے یعنی انہوں نے منہ سے کہا سَمِعْنَا اور دل سے کہا عَصَيْنَا۔ جیسے کہ منافقین یہودی حضور علیہ السلام سے عرض کرتے تھے وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ یعنی آپ سنئے اور خدا کرے سننے کے قابل نہ رہیں یہ لوگ واسمع زبان سے کہتے تھے اور غیر مسمع دل سے اور یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ اب بھی بعض سرکش ڈاکو پٹتے ہیں۔ حاکموں کو گالیاں دیتے چلے جاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہاں ترتیب میں فرق ہے۔ یعنی جب ان پر پہاڑ آیا تو سمجھے یونہی ڈرانے کیلئے آیا ہے تو کہتے رہے عَصَيْنَا عَصَيْنَا مگر جب دیکھا کہ پہاڑ تو اور بھی نیچے آرہا ہے اور قریب ہے کہ گر جائے تو سمجھے کہ یہ نخرے کرنے کا وقت نہیں ہے تب کہا سَمِعْنَا۔ اس کی تفصیل دوسری آیت میں کردی گئی ہے۔ کہ وَظَنُّوْٓا اَنَّهٗ وَاقِعٌۢ بِهِمْ (اعراف:۱۷۱) تیسرے یہ کہ اسی وقت بعض نے سَمِعْنَا کہا تھا اور بعض نے عَصَيْنَا۔ چوتھے یہ کہ ان سب نے سَمِعْنَا کہا تھا۔ مگر ان کی اولاد نے عَصَيْنَا۔ پانچویں یہ کہ ان سب نے کہا تھا سَمِعْنَا اور عمل سے ثابت کیا عَصَيْنَا۔ **تیسرا اعتراض:** یہی واقعہ پہلے بیان ہو چکا ہے اب دوبارہ کیوں بیان ہوا اس تکرار سے کیا فائدہ۔ **جواب:** اولاً تو بیان میں فرق ہے کہ وہاں سَمِعْنَا اور عَصَيْنَا کا ذکر نہ تھا اور یہاں ہے۔ لہٰذا تکرار نہ ہوئی اور پھر مقصد میں فرق ہے کہ وہاں ان کے قبول کرنے کا طریقہ بتایا گیا تھا اور یہاں اس کی نوعیت کہ انہوں نے ظاہراً قبول کیا نہ کہ حقیقۃً نیز ایک بات چند جگہ بیان کرنے کا طریقہ کرنے میں تاکید کا فائدہ دیتی ہے۔ **چوتھا فائدہ:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفر کی وجہ سے ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت آئی۔ ان کا پہلا کفر کون سا تھا۔ جس سے یہ محبت پیدا ہوئی۔ **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر گیا کہ انہوں نے پہلے ایک بت پرست قوم کو دیکھ کر بت پرستی کی تمنا کی۔ پھر اگرچہ توبہ کرلی مگر اس کا اثر باقی رہا۔ **پانچواں اعتراض:** بچھڑا پوجنے والے سب قتل کردیئے گئے تھے اور توبہ کرکے شہید مرے تھے پھر ان کے دلوں میں محبت باقی کیسے رہی۔ **جواب:** یا تو اس لئے کہ سب پجاری قتل نہ ہوئے تھے اور توبہ کے چند درجے ہوتے ہیں۔ ان کی توبہ ہلکے درجے کی تھی جس کی وجہ سے قلب میں کچھ ظلمت باقی رہ گئی تھی۔ وہی کبھی کبھی اپنا رنگ دکھاتی تھی۔ اس لئے قرآن نے فرمایا وَاُشْرِبُوْا جیسے کہ ایک رنگ میں دوسرے رنگ کی آمیزش کردی جائے تو اس کی جھلک نظر آتی ہے ایسے ہی ان کی توبہ میں بچھڑے کی محبت کی جھلک تھی۔ روح البیان نے اس جگہ فرمایا کہ جب ان لوگوں نے اس نہر کا پانی پیا کہ جس میں بچھڑے کی راکھ پھینکی گئی تھی تو ان میں سے بہت کے ہونٹ نیلے پڑ گئے جو کہ اس محبت کا اثر تھا یا یہ کہ جو بچھڑے کی پوجا سے محفوظ رہے تھے وہ پجاریوں سے پورے متنفر نہ تھے جس کا اثر ان میں یہ پیدا ہو گیا۔

تفسیر صوفیانہ

وہی بیج پھل دیتا ہے جو اچھی زمین میں صحیح حالت میں بو دیا جائے۔ پھر اسے مناسب ہوا اور پانی بھی ملتا رہے اور پھر زمینی آسمانی آفات سے محفوظ رہے برسات میں چھت اور دیواروں میں بعض دانے اگ جاتے ہیں۔ مگر وہ پھل نہیں دے سکتے۔ کیونکہ ان کی زمین درست نہیں اسی طرح کلمہ توحید جب ہی پھل دے گا جب دل کی زمین میں بویا جائے۔ محبت الٰہی کا پانی

پلایا جائے۔ رحمت الٰہی کی اس کو ہوائیں لگیں، مخالفت انبیاء و اولیا کی آفات سے محفوظ رہے۔ بنی اسرائیل کا تخم ایمان صرف زبان پر اگا۔ کہ انہوں نے سَمِعْنَا کہہ دیا اور اسے بچھڑے کی محبت کا پانی ملا۔ مخالفت نبی کی آفتیں اس پر آتی رہیں۔ اس کا الٹا نتیجہ نکلا جس سے وہ اور زیادہ مردود ہو گئے۔ اگر کلمہ توحید کی صحیح کاشت ہو جائے تو ایسے پھل دیتا ہے کہ سبحان اللہ ایک آن میں مردود کو مقبول بنا دیتا ہے۔ خطاؤں کو مٹاتا ہے رب کی عطائیں دلاتا ہے رب فرماتا ہے مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ (ابراہیم: ۲۴) یعنی کلمہ طیبہ کی جڑ مومن کے دل میں ہے اور شاخیں آسمان میں۔ زندگی موت، قبر و حشر ہر جگہ پھل دیتا ہے اس درخت کے سایہ میں عالم آرام کرتا ہے مخلوق حضور غوث پاک و خواجہ اجمیری کے اس باردار درخت سے پھل کھا رہی ہے اور ان کے سایہ میں آرام کر رہی ہے اس جگہ تفسیر روح البیان میں ہے کہ جب دحیہ کلبی اسلام سے مشرف ہوئے تو رونے لگے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ تو خوشی کا وقت ہے روتے کیوں ہو انہوں نے عرض کیا کہ میں نے زمانہ کفر میں اپنے قبیلہ کی ستر لڑکیاں اپنے ہاتھ سے ذبح کی ہیں میرا یہ گناہ کیونکر معاف ہوگا حضور علیہ السلام حیران ہوئے فوراً جبرئیل امین حاضر خدمت ہوئے اور عرض کیا یا حبیب اللہ دحیہ کو رب کا پیغام پہنچا دو کہ جب میں نے اس کلمہ کی برکت سے تمہاری ساٹھ سال کی کفر کی خطائیں معاف کر دیں تو ستر لڑکیوں کا خون کیوں نہ معاف کروں گا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا مولیٰ جب تو نے ایک بار کلمہ پڑھنے سے ستر خون معاف کر دیئے جو دن رات کلمہ پڑھے۔ اس کو تو کیا کچھ نہ دے گا مگر خیال رہے کہ یہ صحیح کلمے کی برکتیں ہیں مولانا فرماتے ہیں ؎

اذکر اللہ کار ہر اوباش نیست ارجعی بر پائے ہر قلاش نیست

کلمہ ایمان اور قرآن یا تو ہمارے گواہ ہیں یا ہم پر گواہ ہمیشہ رب کا فضل مانگنا چاہئے صوفیاء فرماتے ہیں کہ دنیا بچھڑا ہے۔ نفس امارہ گویا سامری دنیا میں مشغولیت، رب سے غفلت ہی بچھڑے کی پوجا ہے۔ قلب گویا موسیٰ ہے۔ سیدھی راہ، راہ خدا گویا اسی موسیٰ کی توریت جیسے بچھڑے کی محبت اور توریت پر عمل ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتیں۔ ایسے ہی دنیا کی محبت اور اللہ رسول سے الفت ایک شخص میں جمع نہیں ہو سکتے محبت دنیاوی احکام کو مشکل بنا دیتی ہے۔ دنیاوی مشغولیت کو آسان اس لئے بنی اسرائیل نے توریت کو مشکل سمجھ کر کہہ دیا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا کہ ان کے دلوں میں بچھڑے کی محبت تھی اور اللہ و رسول کی الفت دین کے احکام کو آسان کر دیتی ہے دنیا کو مشکل شہدائے کربلا نے ہزارہا مصیبتوں کا جام پیا۔

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ

فرمادو تم اگر ہو واسطے تمہارے گھر پچھلا نزدیک اللہ کے نرا

تم فرمادو اگر پچھلا گھر اللہ کے نزدیک خالص تمہارے لیے ہو

دُوْنِ النَّاسِ فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ وَلَنْ

سوائے لوگوں کے پس تمنا کرو تم موت کی اگر ہو تم سچے اور ہرگز نہیں

نہ اوروں کے لیے تو بھلا موت کی آرزو تو کرو اگر ہو سچے اور ہرگز
یَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ ؕ وَ اللّٰهُ عَلِیْمٌۢ
تمنا کریں گے وہ اس کی کبھی بھی بوجہ اس کے آگے بھیجے ہاتھوں نے ان کے
اس کی آرزو نہ کریں گے ان بداعمالیوں کے سبب سے جو آگے کر چکے
بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۹۵﴾
اور اللہ خوب جاننے والا ہے ظالموں کو
اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** اب تک یہودیوں کی بے ایمانی ان کی گذشتہ بدعملیوں سے ثابت کی گئی۔ اب ان موجودہ حالات سے ان کی بے دینی ثابت کی جارہی ہے کہ اے یہودیو تم اب بھی توریت کو نہیں مانتے۔ **دوسرا تعلق:** اب تک مناظرانہ رنگ میں گفتگو تھی جس کو شاید جہلا نہ سمجھتے۔ اب ایک نہایت ظاہر بات سے فیصلہ کرایا جارہا ہے جس کو بچہ بھی سمجھ جائے کہ اے بے دینو اگر تم توریت کے ماننے والے ہو تو صرف زبان سے ایک بار ہی اپنی موت مانگ لو۔ اگر تم نے موت مانگ لی تو تم جیتے اور اگر تمہارے منہ سے یہ لفظ نہ نکلا تو ہم سچے اور تم جھوٹے **تیسرا تعلق:** اب تک یہود کے صرف دعوئ ایمان کی تردید تھی اور اب ایک دم ان کے چار دعوے باطل کئے جارہے ہیں۔ (۱) ہم توریت کے مومن ہیں۔ (۲) ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔ (۳) جنت ہمارے ہی لئے ہے۔ (۴) ہم کچھ بھی کریں ہمارے باپ دادا ہمیں بخشوالیں گے۔ **چوتھا تعلق:** یہود سے کہا گیا تھا کہ تم ساری آسمانی کتابوں پر ایمان لاؤ۔ اس کے جواب میں وہ کہہ سکتے تھے کہ بے شک ہم ساری کتابوں پر ہی ایمان لائے ہیں۔ انجیل اور قرآن آسمانی کتابیں ہی نہیں اور توریت قیامت تک کے لئے باقی ہے۔ اس آیت میں اس شبہ کا جواب دیا جارہا ہے کہ پھر اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ تم ہی سچے ہو اور باقی سب جھوٹے تو اچھا تم اپنے سچ کا یہ ثبوت پیش کرو۔

تفسیر

قُلْ یا تو یہ ہر مسلمان سے اس وقت خطاب تھا کہ اے قرآن پڑھنے والو تم ان سے یہ تو کہو یا خاص نبی ﷺ سے مگر یہ حکم اس وقت کے لئے خاص ہے آج ان سے یہ نہیں کہا جاسکتا کیونکہ معجزہ کا ظہور اسی وقت ہوتا اِنْ كَانَتْ لَكُمُ یہ لام خصوصیت کا ہے اور کم سے وہ سارے یہودی مراد ہیں یعنی اگر خاص تمہارے ہی واسطے ہو، کیا چیز اَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ اگرچہ جہنم اور اعراف بھی آخری گھر ہیں مگر یہاں اس سے جنت ہی مراد ہے کیونکہ وہ اسی کے دعوے دار تھے نیز اعراف تو عارضی جگہ ہے اور جہنم جیل خانہ اور آخرت سے ہمیشہ کا آرام دہ گھر مراد ہے عِنْدَ اللّٰهِ یہ ثابتۃ کا ظرف ہے۔ یعنی تمہارا جنت کا حق دار ہونا اگر اللہ

کے نزدیک ثابت ہو خالصۃ دار کا حال ہے یہ خلوص سے بنا ہے جس کے معنی ہیں غیر کی شرکت سے خالی ہونا (نرا) اس میں دو احتمال ہیں۔ یا تو عذاب سے خالص یا لوگوں سے یعنی تمہارے لئے جنت ہی ہو نہ کہ عذاب یا جنت تمہارے ہی لئے ہو۔ مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ نہ کہ اوروں کے لئے یہاں الناس سے یہود کے علاوہ دیگر لوگ مراد ہیں۔ اور یہ یا تو خَالِصَةً کی تفسیر ہے اور یا اس کی ایک نوعیت کا بیان اگر واقعی تمہارا یہ عقیدہ ہے فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ تم ایک بار ہی موت کی تمنا تو کرلو اور یوں تو کہہ دو کہ اے اللہ ہمیں موت دے دے کیونکہ اپنے خیال میں تم جنتی ہو اور خدا کے پیارے اور ان دونوں کو حاصل کرنے کا ذریعہ موت ہے۔ تمنی منی سے بنا ہے جس کے معنی ہیں خواہش باب تفعل میں آ کر اس کے معنی ہوئے اظہار خواہش یعنی خواہش کا زبان سے ظاہر کرنا۔ لہٰذا اس جگہ منہ سے موت مانگنا مراد ہے نہ کہ فقط دلی رغبت اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اگر تم دعویٰ ایمان یا ان چاروں دعوؤں میں سچے ہو جو تعلق میں بیان کئے جاچکے۔ وہ لوگ یہ سن کر آرزو نہ کر سکے رب نے آئندہ کی خبر دیتے ہوئے فرمایا کہ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا جیسے قط زمانہ ماضی کے گھیرنے کے لئے ہے ایسے ہی ابد زمانہ مستقبل گھیرنے کے لئے یعنی یہ لوگ جب تک زندہ ہیں کبھی بھی موت کی تمنا نہ کریں گے۔ کبھی کہیں گے کہ يٰلَيْتَنِیْ كُنْتُ تُرٰبًا (النبا: ۴۰) اور کبھی کہیں گے يٰلَيْتَهَا كَانَتِ الْقَاضِيَةَ (حاقہ: ۲۷) اور یہ تمنا کریں بھی کیسے انہیں تو اپنے اعمال کی خبر ہے کہ ہمیں پوری سزا ملے گی۔ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ اپنے ان اعمال کی وجہ سے جو پہلے کر چکے تھے خیال رہے کہ چونکہ اکثر کام ہاتھ سے ہی ہوتے ہیں اس لئے کبھی تو ید سے ذات اور کبھی قدرت اور رحمت مراد لے لیتے ہیں یہاں ذات مراد ہے اور يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ وغیرہ میں رحمت وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ بِالظّٰلِمِيْنَ اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے لہٰذا انہیں سزا بھی خوب دے گا۔

خلاصہ تفسیر

یہود اپنی مقبولیت اور محبوبیت کے گیت گایا کرتے تھے اور کہتے تھے کہ جنت ہمارے ہی لئے ہے یا ہمارے لئے جنت ہی ہے ہم اللہ کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں وغیرہ وغیرہ رب تعالیٰ نے ان خرافات کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ اے محبوب ﷺ ان سے فرمایئے کہ اگر تمہیں اپنے جنتی ہونے کا یقین ہے تو ذرا موت کی التجا تو کرو۔ کیونکہ دنیا تو مصیبتوں کا گھر ہے اور خاص کر ان نبی آخر الزمان کے تشریف لانے اور اسلام کی اشاعت ہونے سے تمہارا اور بھی ناک میں دم آ گیا ہے تو چاہئے کہ تم دار المحن سے چھوٹنے اور دار الامن میں جانے کی دعا مانگو۔ تفسیر عزیزی نے بیہقی کی روایت نقل کی کہ حضور ﷺ نے سارے یہودیوں کو جمع فرما کر فرمایا کہ اگر تم ان دعوؤں میں سچے ہو تو ایک بار کہہ دو اَللّٰهُمَّ اَمِتْنَا قسم رب کی جو بھی کہے گا وہ یہیں گلا گھٹ کر مر جائے گا۔ یہودی گھبرا کر انکار کر گئے۔ تب دوسری آیت اتری کہ اے محبوب ﷺ یہ اب تو کیا جیتے جی بھی دعا نہ کریں گے الحمد للہ یہ غیب کی خبر سچی ہوئی کہ انہوں نے کبھی تمنائے موت نہ کی۔ تفسیر روح البیان نے حضرت نافع سے روایت کی کہ ایک دن ایک یہودی ہم سے کہنے لگا کہ میں تو تمنائے موت کرتا ہوں، میں کیوں نہیں مرتا۔ عبداللہ ابن عمر نے سنا تو فرمایا۔ ارے جاہل یہ ان علمائے یہود کے لئے تھا جو جان بوجھ کر نبوت مصطفیٰ کا انکار کرتے تھے اور جن کو اس وقت بارگاہ نبوت میں بلا کر کہا گیا تھا انہوں نے کبھی تمنائے موت نہ کی۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** کفار کو اپنے دین کی حقانیت کا یقین نہیں۔ اسی لئے اس کے بھروسے پر کوئی بات نہیں کرتے بلکہ انہیں اپنے جھوٹے ہونے کا یقین ہے۔ اسی لئے وہ دنیا کو جنت اور آخرت کو قید سمجھتے ہیں اب بھی ہندو وغیرہ دنیوی زندگانی کے بہت حریص ہیں۔ **دوسرا فائدہ:** سب کی ملاقات اور حضور کے دیدار یا اپنے ایمان کی سلامتی کے لئے موت کی تمنا کرنا جائز ہے۔ حدیث پاک میں ہے کہ سعد ابن ابی وقاص نے خوف سے اپنی موت کی دعا کی۔ حضور نے فرمایا کہ میرے ہوتے ہوئے موت مانگتے ہو اس کے حاشیے لمعات میں ہے کہ حضور پاک کی زندگی پاک میں دعائے موت کرنا منع ہے کیونکہ اس وقت زندگی دیدار مصطفیٰ کا ذریعہ تھی لیکن حضور کے وفات شریف کے بعد دیدار کے لئے تمنائے موت جائز ہے کیونکہ اب موت ذریعہ دیدار ہے۔ دیکھو مشکوٰۃ کتاب الجنائز باب تمنی الموت۔ **تیسرا فائدہ:** مناظرہ میں دلائل کے علاوہ دیگر علامات سے بھی مقابل کو خاموش کرنا جائز ہے۔ **چوتھا فائدہ:** قل بعض جگہ قرآن شریف میں صرف حضور سے کہلوانے کے لئے آتا ہے دوسرے مسلمانوں سے کہلوانا مقصود نہیں ہوتا۔ دیکھو یہاں قل صرف حضور سے ارشاد ہو رہا ہے کہ آپ ان سے فرماؤ کہ میرے سامنے اپنے موت کی دعا کر دیں میں آمین کہوں۔ دیکھو پھر کیا بنتا ہے دعا ختم ہونے سے پہلے تم ختم ہو جاؤ گے اب کوئی مسلمان یہود سے اس دعا کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ اگر مطالبہ کرے اور وہ یہودی دعا کر کے موت کی تمنا کرے۔ پھر نہ مرے تو اس سے قرآن کی یہ آیت غلط نہ ہوگی یوں ہی سورہ کہف میں ارشاد ہوا ہے لہٰذا قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ (کہف:۱۱۰) میں حضور سے ہی خطاب ہے صرف حضور اپنے کو بشر کہہ سکتے ہیں ہم لوگ نہیں کہہ سکتے۔ **پانچواں فائدہ:** جھوٹے کا جھوٹ ظاہر کرنا ضروری ہے تاکہ لوگ اس سے بچیں۔ **چھٹا فائدہ:** قرآن کریم کی غیبی خبریں بالکل برحق ہیں جن کی حقانیت لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ رب نے اعلان فرمایا تھا کہ اے محبوب یہ لوگ آپ کے سامنے موت کی تمنا بھی نہ کریں گے انہوں نے یہ اعلان بھی سنا پھر مسلمانوں نے انہیں للکارا بھی ان کی حقانیت کا مدار اس دعا کو قرار دیا مگر ان میں سے کسی نے اس کی ہمت نہ کی اگر ایک نے بھی کی ہوتی تو یہ لوگ اسے خوب اچھالتے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: مسلمان بھی سمجھتے ہیں کہ سوائے مومن کے کوئی جنت میں نہ جائے گا۔ لہٰذا وہ یہود بھی مسلمانوں سے یہی کہہ سکتے تھے کہ ہم تمہیں قتل کر دیں تاکہ تم جنت میں جلدی پہنچ جاؤ۔ **جواب:** مسلمان یہود کی طرح اپنے جنتی ہونے کا یقین نہیں کرتے کہ ہم کچھ بھی کریں بہرحال جنتی ہیں بلکہ رب کی رحمت کے امیدوار اور اپنے گناہوں سے خوف کرتے ہیں اور زندگی کی اس لئے تمنا کرتے ہیں کہ نیک اعمال کر کے اپنی آخرت کا توشہ تیار کر لیں اور گذشتہ گناہوں سے توبہ کر لیں اور دوسروں کو تبلیغ ایمان کر کے اپنے ساتھ ملا لیں۔ **دوسرا اعتراض:** شاید وہ یہود بھی اپنے گناہوں سے ڈر کر دعا نہ کرتے ہوں۔ **جواب:** یہ غلط ہے ان کا دعویٰ یہ تھا کہ ہمیں خالص جنت ملے گی۔ یعنی بغیر عذاب اور اگر کسی کو عذاب ہوگا

بھی تو صرف چالیس دن تو ان سے فرمایا جارہا ہے کہ اگر تم زندہ رہے تو بہت دنوں میں جنت میں پہنچو گے اور مر کر یا تو فوراً یا کچھ تکلیف پا کر جنتی ہو جاؤ گے تو تم جلدی مرتے کیوں نہیں۔ **تیسرا اعتراض:** شاید وہ موت کے خوف سے اس کی تمنا نہ کرتے ہوں **جواب:** انسان بڑی راحت کے لئے تھوڑی تکلیف برداشت کر لیتا ہے جیسے کہ تندرستی کے لئے مریض کڑوی دوائیں پی لیتا ہے آپریشن کرا لیتا ہے بلکہ گلے ہوئے اعضاء کٹوا لیتا ہے۔ دیکھا تو یہ گیا ہے کہ غیرت مند آدمی طعنہ کے وقت جان دے دیتا ہے اس وقت ان کو طعنہ دے کر شرمندہ کیا جارہا ہے انہیں چاہئے تھا کہ جان دے کر آبرو بچاتے پھر انہیں یہ بھی یقین کیسے تھا کہ ہم اس وقت تمنائے موت کرتے ہی مر جائیں گے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ وہ اپنے کو جھوٹا اور جہنمی سمجھتے تھے اور حضور کو سچا۔ **چوتھا اعتراض:** شاید انہوں نے دل سے تمنا کر لی ہو اور ممکن ہے کہ زبان سے بھی کر لی ہو جس کی خبر ہمیں نہ ملی۔ **جواب:** ہم تفسیر میں بحوالہ روح البیان وعزیزی وکبیر بتا چکے ہیں کہ تمنا زبانی آرزو کو کہتے ہیں اور اگر انہوں نے ایک بار بھی تمنا کی ہوتی تو مخالفین اسلام اسے بہت اچھالتے **پانچواں اعتراض:** قرآن وحدیث نے موت کی تمنا سے منع فرمایا۔ قرآن تو فرماتا ہے يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِهَا ۚ وَالَّذِينَ آمَنُوا مُشْفِقُونَ (شوریٰ:۱۸) یعنی بے ایمان تو قیامت آنے میں جلدی کرتے ہیں اور مسلمان اس سے ڈرتے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ کوئی شخص موت کی آرزو نہ کرے اور یہاں اس آیت میں معاملہ الٹا ہو رہا ہے۔ **جواب:** یہ پیش کردہ آیت مشرکین کے حق میں آئی ہے جو قیامت کے منکر اور اس سے بے خوف تھے مسلمان قیامت کے مقرر اور اپنے اعمال سے خوف میں ہیں۔ مگر یہود قیامت کو مان کر اس کی مصیبتوں سے اپنے کو محفوظ سمجھتے ہیں لہٰذا وہ آیت اس کے خلاف نہیں حدیث پاک میں یہ ہے کہ کوئی بھی دنیوی مصیبت کی وجہ سے تمنائے موت نہ کرے بلکہ نیک اعمال کی خاطر زیادہ جینا بہتر ہے۔ لقائے حبیب کے لئے تمنائے موت جائز بلکہ صحابہ کرام سے ثابت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہر نماز کے بعد دعا کرتے تھے کہ اے اللہ مجھے اپنے محبوب کے شہر میں شہادت نصیب فرما۔ شہداء بدر واحد تمناء موت میں بیتاب تھے۔ صحابہ کرام بے دریغ اپنی جان ومال جہاد میں خرچ کرتے تھے۔ حذیفہ ابن یمان پر نزع کی حالت میں خوشی کے آثار نمودار ہوئے اور چیخ کر فرمایا کہ میری پیاری موت عین انتظار کی حالت میں آ گئی۔ حضرت عمار جنگ صفین میں خوشی کے نعرے مارتے تھے کہ اب عنقریب اپنے محبوب ﷺ اور اپنے دوستوں سے ملوں گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک دفعہ باریک کرتہ پہنے ہوئے جنگ کی صفوں میں گھوڑا کوداتے پھرتے تھے آپ کے فرزند امام حسن نے عرض کیا کہ باوا جان غازی کا یہ لباس نہیں زرہ پہن کر آنا چاہئے تھا تو فرمایا بیٹا مجھے پرواہ نہیں کہ موت مجھ پر گرے یا میں موت پر گروں۔ ایک بار حضرت سعد ابن ابی وقاص نے رستم ابن فرخ زاد کو خط لکھا کہ میرے ساتھ وہ قوم ہے جو موت کو اتنا ہی چاہتی ہے جتنا تم لوگ شراب کو (تفسیر عزیزی) ان تمام باتوں سے معلوم ہوا کہ دنیوی تکلیف سے تمنائے موت کرنا منع ہے اور دینی راحت حاصل کرنے کے لئے جائز اور یہاں یہود سے دینی راحت کے لئے ہی تمنا کرائی گئی تھی۔ **نکتہ:** بعض مفسرین نے اس آیت کا ایسا نفیس مطلب بیان کیا ہے جس سے یہ اعتراض پڑتے ہی نہیں وہ یہ کہ ان سے اپنے دعوے کے ثبوت کے لئے بطور قسم تمناء موت کرائی گئی جیسے کوئی قاضی مدعیٰ علیہ سے کہے کہ تو اپنے

بیٹے کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہہ دے کہ میں سچا ہوں۔ اگر وہ یہ نہ کرے تو جھوٹا ایسے ہی یہاں کیا گیا کہ یہودیو! اگر تم سچے ہو قسم سے کہہ دو کہ اگر ہم جھوٹے ہوں تو مر جائیں۔ اس صورت میں تمام تکلفات دور ہو گئے۔

تفسیر صوفیانہ

تین شخص موت کی تمنا کرتے ہیں۔ ۱۔ موت کی مصیبت سے ناواقف ۲۔ وہ بے صبر جو موت کو خدا کی پکڑ سے بچنے کا ذریعہ سمجھے ۳۔ تیسرے وہ عاشق جانباز جو اللہ و رسول کی ملاقات چاہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

شد ہوائے مرگ طوق صادقاں — کہ جہوداں رابداں دم امتحاں

مثنوی کے مصنف جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ کی جب موت کا وقت آیا تو ملک الموت شکل انسانی میں دروازے میں آ کر کھڑے ہوئے۔ مولانا نے کمال شوق سے فرمایا۔

پیشتر آ پیشتر آ جان من — پیک باب حضرت سلطان من

(تفسیر روح البیان)

اے میری جان اے میرے سلطان کے دربان تو کہاں تھا۔ جلدی آ وہ یہودی چونکہ ان تینوں جماعتوں سے خارج تھے۔ تمناء موت نہ کر سکے ابو حازم فرماتے ہیں کہ مطیع کا رب کے پاس جانا ایسا ہے جیسے غائب عاشق کا محبوب کے پاس حاضری دینا بدکار کی موت ایسی ہے جیسے بھاگے ہوئے مجرم کی گرفتاری کا وارنٹ۔ مولانا فرماتے ہیں۔

انبیاء رانتگ آمد ایں جہاں — چوں شہاں رفتند اندر لا مکاں

چوں مرا سوے اجل عشق و ہواست — نہی لا تلقوا بایدیکم مراست

زانکہ نہی از دانہ شیریں بود — تلخ راخود نہی حاجت کے شود

کافر موت کو کڑوا سمجھتا ہے اس لئے اس کو خواہش کا حکم ہے۔ مومن موت کو نہایت میٹھا اور لذیذ محسوس کرتا ہے اس کو خواہش موت منع ہے۔ انبیائے کرام کی موت عجیب پر لطف چیز ہے۔ ان کی تو یہ شان ہے۔

یہ دونوں گھر انہی کے ہیں جہاں جی چاہا جا بیٹھے — کبھی اس گھر میں جا بیٹھے کبھی اس گھر میں آ بیٹھے

اضطراری موت سے پہلے اختیاری موت اختیار کر لو اور مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا کے عامل بن جاؤ تا کہ موت اضطراری آسان ہو۔

وَ لَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى حَيٰوةٍ ۚ وَ مِنَ الَّذِيْنَ

اور البتہ ضرور پائیں گے آپ ان کو زیادہ حریص لوگوں سے اوپر زندگی کے اور ان لوگوں سے جنہوں نے

اور بے شک تم ضرور پاؤ گے کہ سب لوگوں سے زیادہ جینے کی ہوس رکھتے ہیں اور مشرکوں

اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَ مَا هُوَ

شرک کیا تمنا کرتا ہے ایک ان کا کاش کہ عمر دیا جائے وہ ہزار سال اور نہیں ہے وہ
سے ایک کو تمنا ہے جو کہ کہیں ہزار برس جئے اور وہ اسے
بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ؕ وَ اللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا
دور کرنے والا اس کو عذاب سے یہ کہ عمر دیا جائے اور دیکھنے والا ہے
عذاب سے دور نہ کرے گا اتنی عمر دیا جانا اور اللہ ان کے
يَعْمَلُوْنَ ﴿٩٦﴾
اس کو جو وہ کرتے ہیں
کو تک دیکھ رہا ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق**: اس سے پہلے یہود کا موت سے گھبرانے کا ذکر کیا گیا ہے۔ اب ان کا دنیوی زندگی کی محبت کا ذکر ہو رہا ہے۔ **دوسرا تعلق**: گذشتہ آیت کا مضمون بھی اسی بات کی علامت تھا کہ وہ اپنے کو گمراہ سمجھتے ہیں اور اس آیت کا مضمون بھی یہی بتا رہا ہے کہ وہ دینوی زندگی کو غنیمت جانتے ہیں تاکہ انہیں کچھ آرام کی سانسیں میسر ہو جائیں آخر کار پھر جلنا تو ہے ہی **تیسرا تعلق**: پہلی آیت کے مضمون سے شبہ پیدا ہوتا تھا کہ شاید یہودی نہ موت کی تمنا کرتے ہوں نہ زندگی کی بلکہ راضی برضائے الٰہی ہوں جو کہ انسان کی بہترین صفت ہے۔ یا اعمال کے لئے زندگی کے خواہش مند ہوں اس آیت سے اس شبہ کو دور کیا جا رہا ہے۔

تفسیر

وَلَتَجِدَنَّهُمْ بھی حضور علیہ السلام سے خطاب ہے اور یا قیامت تک کے قرآن پڑھنے والے مسلمان سے۔ تَجِدُ۔ وجدان سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں پانا یہاں عقلی اور تجربہ کا پانا مراد ہے جیسے میں نے زید کو عالم پایا۔ هُمْ سے مراد عام یہودی ہیں۔ یعنی اے محبوب ﷺ اے قرآن کے پڑھنے والے تم ان تمام یہودیوں کو پاؤ گے۔ اَحْرَصَ النَّاسِ لوگوں سے زیادہ حریص یہاں ناس سے یہود کے سوا باقی سب لوگ مراد ہیں کہ افضلیت اپنے پر لازم نہ آجائے۔ عَلٰی حَيٰوةٍ یہاں حیات سے خاص قسم کی زندگی مراد ہے لمبی اور آرام دہ عَلٰی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو خود دراز اور آرام دہ زندگی کی ہی حرص ہے۔ اعمال کے لئے زندگی نہیں مانگتے۔ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ظاہر ہے کہ واؤ عاطفہ ہے اور اس کا ناس پر عطف ہے۔ یعنی یہودیوں کو عام لوگوں اور مشرکین سے بھی زیادہ حریص پائیں گے اگرچہ مشرکین ناس میں داخل تھے مگر چونکہ یہ لوگ حرص زندگی میں مشہور اس لئے ان کا ذکر خاص کیا گیا۔ اس صورت میں يَوَدُّ اَحَدُهُمْ علیحدہ جملہ ہے جس میں اس کا بیان ہے۔ بعض لوگوں نے فرمایا ہے کہ یہ واؤ استینافیہ ہے اور یہ مبتداء ہے۔ يَوَدُّ اس کی خبر یعنی مشرکین میں سے بعض تمنا کرتے

ہیں بعض لوگوں نے فرمایا کہ اس کا ترجمہ یہ ہے کہ آپ یہود کو اور مشرکین کی ایک جماعت کو زندگی کا زیادہ حریص پائیں گے اس صورت میں مِنَ الَّذِیْنَ ھُمْ پر معطوف ہو کر تجدن کا مفعول ہوگا۔ بہر حال اس آیت کے تین معنی ہیں اور ہر معنی میں نیا لطف مشرکین سے عام مشرکین مراد ہیں یا خاص مجوسی، سیدنا عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ مجوسی آپس میں ایک دوسرے کو سلام میں کہتے تھے۔ ذی ہزار یعنی تو ہزار سال جئے، بعض کہتے تھے۔ عش الف نیروز، بعض کہتے تھے۔ عش الف مہرجان یعنی تو ہزار نیروز یا تو ہزار مہرجان جئے گویا ان کے سلام و جواب سے ہی حرص دنیا ظاہر ہوتی تھی چونکہ مجوس کا عقیدہ ہے کہ خدا دو ہیں ایک یزدان دوسرا اہرمن یزدان بھلائیوں کا خالق ہے اور اہرمن برائیوں کا۔ اس لئے ان کو مشرکین کہا گیا۔ بعض نے کہا کہ اس سے مشرکین عرب مراد ہیں۔ یَوَدُّ اَحَدُھُمْ یَوَدُّ، وُدٌّ سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں دلی خواہش احد سے ہر ایک مراد ہے نہ کہ کوئی خاص ایک ھم کا مرجع یا یہود ہیں یا مشرکین۔ یعنی ان میں سے ہر ایک خواہش رکھتا ہے کہ لَوْ یُعَمَّرُ لو شرطیہ نہیں بلکہ تمنا کا ہے یُعَمَّرُ کے واحد لانے میں یہ بتایا گیا کہ ان میں ہر شخص صرف اپنی ہی دراز زندگی چاہتا ہے کہ دوسرے مریں یا جئیں۔ مجھے عمر مل جائے۔ یعنی کاش کہ عمر دیا جاوے۔ وہ اَلْفَ سَنَةٍ ہزار سال یا تو یہ مجوسیوں کے قول ذی ہزار سال کی نقل ہے اور یا اس سے لمبی مدت مراد ہے۔ جیسے کہتے ہیں کہ میں تو ہزار سال تک تیری بات نہ مانوں گا۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

تم سلامت رہو ہزار برس ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

رب نے فرمایا ہے وَمَاھُوَ، ھُوَ کا مرجع احد ہے اور یہ ما کا اسم ہے۔ یعنی نہیں ہے، وہ شخص بِمُزَحْزِحِهٖ مزحزح زحزحۃ کا اسم فاعل ہے۔ جس کے معنی ہیں دور رکھنا۔ اس لئے کوئیں کی جگت اور آگ کے جھیرے کو زحزاح کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی پانی اور آگ سے دور ہوتا ہے۔ ہ ضمیر اس کا مفعول ہے اور اَنْ یُّعَمَّرَ اس کا فاعل یعنی کوئی بھی ایسا نہیں کہ جس کو اس کی دراز عمر عذاب سے دور کرنے والی ہو۔ یعنی لمبی عمر کے بعد بھی عذاب ہی ہوگا۔ اس کی خواہش بے کار۔ چاہئے کہ ایمان و اعمال کی کوشش کرو۔ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا یَعْمَلُوْنَ عرب میں بصیر حقیقت حال جاننے والے کو کہتے ہیں۔ یعنی اللہ ان کے اعمال کی حقیقت سے خبر دار ہے۔ یہ جتنی زیادہ عمر پائیں گے اتنے ہی زیادہ گناہ کمائیں گے۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانوں یہودیوں کا موت سے گھبرانا کسی نیک ارادہ سے نہیں بلکہ تم تجربہ اور امتحان کر کے دیکھ لو تو ان کو زندگی کا بڑا ہی حریص پاؤ گے کہ دنیا میں زندگی کے زیادہ خواہش مند مشرکین ہیں کیونکہ وہ قیامت اور سزا جزا کو مانتے نہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگانی نہیں۔ بلکہ محض فنا ہے۔ ان کے لئے یہ دنیا ہی بہشت ہے۔ اگر وہ اس زندگی پر حرص کریں تو بجا ہے لیکن یہ یہودی جو اپنے کو اہل کتاب کہیں۔ سزا جزا کا اقرار کریں جنت کو اپنی جائیداد مانیں اپنے کو خدا کا بیٹا جانیں۔ ان مشرکین سے بھی زیادہ حریص ہیں۔ جس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ انہیں آئندہ دوزخ نظر آ رہا ہے۔ اور ان کو اپنے کرتوت کی سزا کا پورا یقین ہے۔ ان کے حریص ہونے کی چند دلیلیں ہیں۔ ہر وقت زیادتی عمر کی فکر میں رہتے ہیں شفا حاصل کرنے کے لئے حرام حلال چیزیں استعمال کر لیتے ہیں۔ بیماری میں ہر طبیب ہر منتر پڑھنے والے ہر جادوگر کے پاس پہنچ

جاتے ہیں۔ دنیوی زندگی کے لئے اپنا دین وایمان برباد کردیتے ہیں۔ دنیوی عیش کے لئے حرام وحلال مال لے لیتے ہیں۔ بڈھے ہوکر دانت گرجانے، بال سفید ہوجانے پر بھی آئندہ کی فکر نہیں کرتے۔ بلکہ دنیا میں پورے مشغول رہتے ہیں اور زیادتی عمر کی تجویزیں کرتے رہتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنی زندگی کا خواہش مند ہے۔ اپنے پر دوسروں کو قربان کرنے کے لئے تیار ہزار سال تک کی عمر چاہتے ہیں حالانکہ ساٹھ ستر برس ہی میں انسان کے اعضاء بیکار ہوجاتے ہیں۔ اور اس کی زندگی وبال جان ہوتی ہے۔ مگر ان کے حرص کی یہ حالت ہے کہ خواہ وہ کتنے ہی مصیبت میں رہیں مگر جیتے رہیں۔ ان بے وقوفوں کو یہ خبر نہیں کہ لمبی عمر انہیں عذاب سے بچانہیں سکتی اور جب موت یقینی ہے تو کیا دس برس اور کیا ہزار سال۔ اللہ ان کے اعمال سے خبردار ہے اور جانتا ہے کہ یہ جی کر گناہ ہی کریں گے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** فساد پھیلانے یا عذاب سے بچے رہنے کے لئے لمبی عمر مانگنا علامت کفار ہے۔ **دوسرا فائدہ:** زندگی کے لالچ میں دین کا لحاظ نہ رکھنا بڑی بدنصیبی ہے۔ **تیسرا فائدہ:** جو چیز یقینی آنے والی ہے وہ قریب ہے۔ **چوتھا فائدہ:** مجرم کا بہت بھاگا پھرنا سخت سزا کا باعث ہے۔ ایسے ہی کافر کی دراز عمر زیادہ گرفتاری کا سبب ہے۔ **پانچواں فائدہ:** اسلامی سلام تمام دینوں کے سلام سے افضل ہے ہندو کہتے ہیں رام رام جواب دیتے ہیں جیتا رام۔ پنڈت کہتے ہیں پایں لاگن۔ جواب دیتے ہیں سکھی رہو۔ مجوسی کہتے ہیں ذی ہزار سال۔ عیسائی کہتے ہیں گڈ مارننگ۔ مسلمان جاہل عورتیں کہتی ہیں۔ سلام جواب ملتا ہے جیتی رہو۔ بڑی عمر ہو۔ دنیا میں عیش سے رہو۔ یہ سب سلام جواب بیہودہ ہیں۔ کیونکہ ان میں سے بعض میں سے تو شرک کی بو ہے اور بعض میں دنیا کی ہوس کا اظہار۔ سب سے بہتر ہے السلام علیکم جس کا مطلب ہوا تم سلامت رہو اس میں دنیوی دینی ہر معصیت سے سلامتی کا ذکر آگیا اسی لئے رب تعالیٰ نے ان کے سلام کی برائی فرمائی اور انشاء اللہ سلام کا مسئلہ سلام کی آیتوں میں آئے گا۔

نصیحت: ہمیں چاہئے کہ اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں حق یہ ہے کہ ہم لوگوں میں بھی اس قسم کی بہت بیماریاں پیدا ہوچکیں ہیں ہم میں سے بعض تو محبت دنیا میں یہود سے بھی چار نمبر آگے ہیں۔ ان کا یہ حال ہے کہ بچپن کی زندگی کالج میں گزاری۔ جوانی دنیا کمانے میں ختم کی بڑھاپے میں جب پنشن ہوگئی تو قدرت نے ان کو اللہ اللہ کرنے کا اچھا موقعہ دیا تھا مگر اب ممبری اور مجسٹریٹی کی دھن لگی۔ ممبری کے زمانہ میں لوگ تو صبح شام اللہ اللہ کرلیتے ہیں مگر یہ پنشن یافتہ قریب الموت بزرگ رائے دہندوں کے دروازے کے طواف میں مشغول نہ نماز کی فکر نہ روزے کا ذکر نہ زکوۃ کا ملال نہ حج کا خیال۔ دوستو جب یہ تینوں زمانے اس طرح گنوادیئے بتاؤ اللہ اللہ کرنے کا وقت کب آئے گا۔ یہودیوں کی طرح اس حالت سے عبرت پکڑو۔ خیال رہے کہ زندگی تین طرح کی ہے شخصی زندگی۔ قومی زندگی۔ مذہبی زندگی۔ شخصی زندگی کی مہلت بہت تھوڑی ہے۔ اس کے لئے تھوڑا انتظام کرو مگر مسلمان کی قومی ومذہبی زندگی ان شاء اللہ قیامت تک ہے۔ اس کے لئے بڑا انتظام کرو جہاں اشخاص قوم یا مذہب پر فدا ہوں گے وہاں عزت وبزرگی ہوگی اور جہاں قوم ومذہب اشخاص پر قربان ہوں گے وہاں ذلت

وخواری ہوگی۔ یزیدیوں نے اپنے شخصی نفع کے لئے اس سید کا خون کیا دیکھو سب ذلیل ہو گئے۔ حضرت حسین نے اپنے مذہب پر اپنے کو قربان کیا تا قیامت سرخرو ہو گئے صدقات جاریہ اس لئے افضل ہیں کہ ان کا تعلق قومی نفع سے ہے بنی اسرائیل دین کو اپنی ذات پر قربان کرتے تھے کہ اپنے نفع کی خاطر دین کی بربادی کتاب اللہ تبدیلی گوارا کر لیتے تھے۔ اس آیت میں اس طرف اشارہ ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ درازی عمر کی خواہش جرم ہے حالانکہ ہر مسلمان لمبی عمر چاہتا ہے حدیث شریف میں بھی ہے کہ مبارک ہے وہ شخص جس کی عمر لمبی اور اعمال اچھے ہوں۔ **جواب:** فساد کرنے یا عیش و آرام کے لئے یا زندگی کو اصل مقصود سمجھ کر اس کی تمنا کرنا بے شک برا ہے لیکن نیک اعمال کے لئے زندگی چاہنا بہتر سرکاری ملازم کی جتنی زیادہ سروس ہوگی اتنی زیادہ پنشن مسلمانوں کی زندگی نوکری کی مدت ہے **دوسرا اعتراض:** اس تفسیر سے معلوم ہوا کہ زندگی بڑھانے کے اسباب اختیار کرنا برا ہے۔ حالانکہ حدیث شریف میں ہے کہ نیک اعمال سے زندگی بڑھتی ہے تو چاہئے کہ جو کوئی اس نیت سے نیکیاں کرے وہ گنہگار ہے **جواب:** عمر بڑھانے کے جائز اسباب ضرور اختیار کرے ناجائز اسباب سے بچے **تیسرا اعتراض:** اسلام میں بھی شفا حاصل کرنے اور جان رکھنے کے لئے حرام چیزوں کا استعمال جائز ہے تو اگر یہودی بھی اپنی زندگی کے لئے حرام اسباب پر عمل کریں تو کیوں گنہگار ہوں۔ **جواب:** اسلامی حکم یہ ہے کہ جو بیماری وغیرہ کی سخت مصیبت میں پھنس جائے اس کے لئے حرام دوائیں وغیرہ حلال ہیں۔ شریعت نے مصیبت سے بچنے کے لئے اس کے حق میں حرام کو حلال ہی کر دیا یہ بالکل جائز ہے لیکن نفسانی خواہشوں کے لئے حرام چیزوں کا استعمال کرنا عقلاً بھی برا ایک شخص قوت باہ زیادہ کرنے کے لئے مینڈک کا تیل یا سانپ کا گوشت یا شراب استعمال کرتا ہے وہ مجرم ہے۔ دوسرا شخص پیاس سے مر رہا ہے جان بچانے کے لئے شراب کا گھونٹ پیتا ہے۔ وہ مجرم نہیں کیونکہ پہلے شخص کا مقصد شہوت ہے اور اس کا مقصد مصیبت سے بچنا۔

تفسیر صوفیانہ

تمام گناہوں کی اصل دو چیزیں ہیں۔ محبت عمر، محبت مال وجاہ۔ اگلی آسمانی کتابوں کی تحریف جھوٹے نبیوں کی پیداوار اب بعض علماء اور مشائخ کی گمراہی روزانہ نئے مذہبوں کا نکلنا انہیں دو وجہوں سے ہے۔ اس بیماری کے تین علاج ہیں۔ ایک تو علماء ربانی کی وعظ و نصیحتوں کی مجلسوں میں حاضری صالحین کے واقعات کا مطالعہ کرنا جس سے دل نرم پڑ جائے۔ دوسرے اکثر موت کو یاد کرنا اور یہ خیال رکھنا کہ دنیا کی ساری چیزیں فانی ہیں۔ تیسرے لوگوں کی جان نکلتے ہوئے دیکھنا۔ میت کے ساتھ قبرستان جانا۔ زیارت قبور کرنا۔ حضرت کعب احبار سے کسی نے پوچھا کہ بتائیے موت کیا چیز ہے۔ فرمایا یوں سمجھو کہ درخت خاردار کسی انسان کے پیٹ میں ہو جس کا ہر کانٹا اس کی رگ رگ میں چبھ چکا ہو پھر اسے کوئی شخص نہایت طاقت سے کھینچے جس سے کہ وہ درخت رگوں کو چیرتا ہوا گوشت کو نوچتا ہوا باہر نکلے یہ وہ چیزیں ہیں کہ جن کے خیال سے انسان دنیا سے

بے رغبت ہو جاتا ہے۔ (تفسیر روح البیان)

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ

فرمادو وہ جو کہ ہو دشمن جبریل پس تحقیق اس نے اتارا اس کو اوپر دل تمہارے کے

تم فرماؤ جو کوئی جبریل کا دشمن ہو تو اس (جبریل) نے تمہارے دل پر اللہ کے

بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَ هُدًى وَّ بُشْرٰى

ساتھ حکم اللہ کے سچا کرنے والا واسطے اس کے درمیان دو ہاتھوں اس کے اور ہدایت اور خوشخبری

حکم سے یہ قرآن اتارا اگلی کتابوں کی تصدیق فرماتا ہے اور ہدایت و بشارت

لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۹۷﴾ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَ رُسُلِهٖ

واسطے ایمان والوں کے وہ جو کہ ہو دشمن واسطے اللہ کے اور فرشتوں اس کے اور رسولوں اس کے

مسلمانوں کو جو کوئی دشمن ہو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں

وَ جِبْرِيْلَ وَ مِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۹۸﴾

اور جبریل کے اور میکائیل کے پس تحقیق اللہ دشمن ہے واسطے کافروں کے

اور جبریل اور میکائیل کا تو اللہ دشمن ہے کافروں کا

تعلق

اس آیت کا گذری ہوئی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** یہ بھی ایمان یہود سے مایوسی کی ایک وجہ ہے کہ وہ قرآن تو کیا قرآن لانے والے جبریل کے دشمن ہیں تو تمہارے دوست کیونکر بن سکتے ہیں۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ وہ زندگی اور عیش و آرام کے بڑے ہی خواہش مند ہیں۔ اب فرمایا گیا کہ ان کی خواہش مندی اس حد تک ہے کہ جو ان کے آرام کے خلاف احکام لائے جبریل اس کے بھی دشمن ہیں۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں یہود کی ایک جماعت کا ذکر تھا کہ وہ عذاب سے بچنے کے لئے دراز عمر چاہتے ہیں۔ حالانکہ درازی عمر عذاب سے نہیں بچا سکتی بلکہ ان کے لئے یہ چیز اور زیادہ باعث عذاب ہے کیونکہ وہ زیادہ عمر میں زیادہ گناہ کریں گے اب ان کی دوسری حماقت کا ذکر ہے۔ وہ یہ کہ یہ لوگ عذاب سے بچنے کے لئے عذاب لانے والے فرشتے حضرت جبریل کے دشمن ہیں۔ ان بے وقوفوں کو یہ خبر نہیں کہ اس دشمنی سے عذاب گھٹے گا نہیں اور زیادہ بڑھے گا کیونکہ اللہ والوں کی مخالفت عذاب کا باعث ہے۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیتوں میں یہود سے کہا گیا تھا کہ توراۃ کے علاوہ اور باقی آسمانی کتابوں پر بھی ایمان لاؤ۔ وہ جواب دے سکتے تھے کہ ہم توراۃ اس لئے مانتے ہیں کہ بلا واسطہ رب کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کو ملی اور یہ قرآن جبریل کے واسطہ سے نازل

ھوتا ہے۔ اور یہ جبریل ہمارے سخت دشمن ہیں ہم نہیں چاہتے کہ دشمن کا احسان اٹھائیں کہ اس کے لائے ہوئے قرآن کو مانیں۔ **پانچواں تعلق:** پچھلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ بنی اسرائیل انبیاء کے دشمن آسمانی کتابوں کے دشمن اپنی موت کے دشمن۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ یہ تو بغیر دیکھے ہوئے حضرت جبریل کے دشمن ہیں۔ کہ قرآن کریم کو اس لئے نہیں مانتے کہ حضرت جبریل کا لایا ہوا ہے تو اے مسلمانو اگر یہ تمہارے دشمن ہیں تو ان سے کیا بعید ہے۔

شان نزول

تفسیر کبیر وعزیزی وروح البیان وغیرہ نے طبرانی اور بیہقی، مسند امام احمد وغیرہ سے روایت کی ہے کہ جب حضور علیہ السلام ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لائے تو فدک کے ایک یہود کی جماعت اپنے سردار عبداللہ ابن صوریا کو لے کر امتحان کی غرض سے آپ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئی ابن صوریا بولا کہ ہماری کتابوں میں نبی آخر الزمان کی چند علامتیں لکھی ہیں ہم چاہتے ہیں کہ وہ علامات دیکھیں فرمایا تحقیق کر لو وہ بولا بتایئے آپ کے سونے کا کیا حال ہے؟ فرمایا ہماری آنکھیں سوتی ہیں دل بیدار رہتا ہے بولا آپ نے سچ کہا۔ آخری نبی کی یہ علامت ہے پھر بولا اچھا چند باتیں دریافت کرتا ہوں جن کو نبی کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ فرمایا پوچھو: پوچھا کیا وجہ ہے کہ کبھی بچہ ماں کے ہم شکل ہوتا ہے اور کبھی باپ کے فرمایا کہ بچہ ماں اور باپ دونوں کی منی سے بنتا ہے مگر ان میں سے جس کی منی اوپر رہے یا جس کی منی رحم میں پہلے داخل ہو یا جس کی منی زیادہ اور غالب ہو بچہ اسی کی شکل پر پیدا ہوتا۔ بولا بہت ٹھیک۔ اچھا بتایئے بچے کا کون سا عضو ماں کی منی سے بنتا ہے اور کون سا عضو باپ کی منی سے۔ فرمایا ہڈی اور پٹھے باپ کی منی سے اور گوشت اور خون اور بال اور ناخن ماں کی منی سے بولا بالکل سچ ہے اچھا بتایئے کہ جنتیوں کو جنت میں پہلے کون سی غذا دی جائے گی فرمایا مچھلی اور بیل کا گوشت بعض روایات میں ہے کہ اور زمین کی روٹی بولا ٹھیک ہے۔ بتایئے کہ یعقوب علیہ السلام نے اپنے پر کون سی غذا حرام کی تھی اور کیوں کی تھی فرمایا کہ ان کو عرق النساء کی بیماری تھی آپ نے نذر مانی کہ خداوندا اگر مجھے اس بیماری سے نجات ملے تو میں اپنی مرغوب غذا یعنی اونٹ کا گوشت اور دودھ اپنے پر حرام کر لوں گا۔ بولا آپ کی تمام باتیں بالکل سچی ہیں۔ بس ایک بات اور بتا دیجئے تو میں اپنی جماعت کے ساتھ آپ پر ایمان لے آؤں گا، آپ پر وحی کون لاتا ہے۔ آپ کا رفیق وغمگسار کون فرشتہ ہے، فرمایا حضرت جبریل، یہ ہی سارے پیغمبروں پر وحی لاتے تھے اور یہی ان کے بھی رفیق تھے۔ بولا بس ہم ایمان نہ لائیں گے فرمایا کیوں بولا کہ جبریل تو یہود کا پرانا دشمن ہے اگر میکائیل قرآن لائے ہوتے تو ہم ایمان لے آتے فرمایا اس نے تم سے کیا دشمنی کی۔ بولا ایک دشمنی نہیں بیسیوں رسالت ہمارے خاندان میں تھی اب انہی نے یہ عہدہ بنی اسمٰعیل کو دے دیا (۲) ہمارے بزرگوں پر قسم قسم کے عذاب لانے والے یہی حضرت ہیں۔ ہمارے پیغمبر نے خبر دی تھی کہ ایک لڑکا بخت نصر عراق میں فلاں تاریخ کو پیدا ہوگا اور فلاں جگہ پر رہے گا۔ وہ بیت المقدس کو ویران اور بنی اسرائیل کو تباہ اور غارت کرے گا۔ ہمارے بزرگوں نے چند قاتل وہاں بھیجے تا کہ کسی ترکیب سے قتل کر دیں انہوں نے اس بچہ پر قابو بھی پا لیا مگر انہی جبریل نے اسے بچایا جس پر اسی بخت نصر نے ہماری قوم کو ہلاک کر ڈالا بتایئے اس سے بڑھ کر ہمارا دشمن کون ہے۔ اس کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی، تفسیر کبیر نے فرمایا کہ

ایک روایت میں بھی ہے کہ عمر کی زمین مدینہ منورہ سے باہر تھی آپ اکثر اس کی دیکھ بھال کے لئے جاتے اور وہاں سے قریب ہی یہودیوں کا ایک مدرسہ تھا آپ جب بھی اپنی زمین میں جاتے تو اس مدرسہ میں ضرور تشریف لے جاتے اور یہودیوں کے وعظ ونصیحت سنتے اتفاقاً ایک دن اسی مدرسہ میں اس وقت پہنچے جب کہ وہاں سارے یہود علماء جمع تھے۔ سب نے کہا مرحبا۔ ہم آپ سے بہت محبت کرتے ہیں اور غالباً آپ بھی ہم سے محبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ آپ کے سوا اور کوئی صحابی ہمارے مدرسے میں نہیں آتا۔ فرمایا کہ اے یہودیوں میں اس لئے نہیں آتا ہوں کہ مجھے تم سے کوئی محبت ہے یا اپنے دین میں کوئی شک۔ یا تمہارے دین کی طرف کچھ میلان ہے میں تو صرف اس لئے آتا ہوں کہ تمہاری کتابوں سے قرآن کی حقانیت اور اپنے محبوب ﷺ کے فضائل معلوم کر کے اپنا ایمان اور قوی کروں، الحمدللہ اتنے روز کی آمدورفت میں اپنے دین پر میرا یقین اور بڑھ گیا اور تمہاری بدنصیبی پر افسوس کرتا ہوں کہ تم توراۃ میں اس نبی کے لئے ایسے فضائل دیکھ کر بھی ان پر ایمان نہیں لاتے تب ان یہود نے یہ تقریر کی کہ جبریل ہمارے دشمن ہیں کہ ہمارے راز تمہارے نبی تک پہنچا دیتے ہیں اور ہم پر ساری مصیبتیں انہیں کے ہاتھوں آئیں میکائیل ہمارے دوست ہیں کیونکہ وہ بارش اور رحمت لاتے ہیں آپ نے فرمایا کہ جبرئیل اور میکائیل کا بارگاہ الٰہی میں کیا درجہ ہے وہ بولے کہ دونوں بہت ہی مقرب بارگاہ ہیں دونوں پر تجلی الٰہی ہوتی ہے۔ جبریل داہنی طرف اور میکائیل بائیں طرف رہتے ہیں حضرت عمر نے فرمایا کہ تم جیسے گدھوں سے زیادہ بے عقل کون ہوگا۔ جب وہ دونوں مقبول بارگاہ ہیں پھر جو ایک کا دشمن ہے وہ دونوں کا دشمن اور جو دونوں کا دشمن وہ رب کا دشمن یہ کہہ کر آپ حضور کی خدمت میں روانہ ہوئے۔ ابھی راستہ ہی میں تھے کہ حضور پر اسی مضمون کی یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ جب حاضر بارگاہ ہوئے تو حضور نے فرمایا کہ اے عمر رب نے تیرے کلام کی موافقت فرمائی ہوسکتا ہے کہ یہ دونوں واقعات متصل ہوئے ہوں اور یہ دونوں ہی اس آیت کے شان نزول ہوں۔

تفسیر

قُلْ مَنْ كَانَ یہ نہایت پرلطف کلام ہے کہنا تو یہ تھا کہ اے یہودیو تم خدا کے دشمن ہو مگر اس طرح کہا کہ جو دشمن جبریل کا ہے وہ ایسا ہے کیونکہ درپردہ بات ظاہر بات سے بہتر ہے جیسے کوئی ہمیں گالی دے تو ہم جواب میں کہیں گے کہ جو مجھے گالی دے گا میں اسے ماروں گا۔ خیال رہے کہ اس آیت کو قل سے فرمایا گیا کیونکہ یہاں حضرت جبریل سے دشمنی کا ذکر ہے تو ارشاد ہوا کہ اے حبیب اس کا جواب تم دو تمہارے مخالفین کو ہم جواب دیں گے اور جبریل علیہ السلام جواب دیں گے مگر ہمارے اور فرشتوں کے دشمنوں کو تم جواب دو کیونکہ یگانگت جو ہوئی شعر

قل کہہ کے اپنی بات بھی منہ سے تیرے سنی   اتنی ہے گفتگو تیری اللہ کو پسند

یہ لفظ "عَدُوٌّ" سے بنا ہے جس کے معنے ہیں حد سے بڑھ جانا بروزن فعول لانے میں دو واؤ جمع ہوئے۔ ان میں ادغام ہوگیا چونکہ دشمن بھی حد سے بڑھ کر مخالفت کرتا ہے اس لئے اسے عدو کہتے ہیں جبریل لفظ عبرانی ہے یہ جبر اور ئیل سے بنا ہے۔ جبر کے معنے بندہ اور ئیل اللہ کا نام۔ جس کے معنے ہوئے اللہ کا بندہ بعض نے فرمایا کہ ان کا نام عبداللہ ہے اور جبریل لقب ہے

یہ لفظ چھ طرح پڑھا جاتا ہے۔ جَبْرِیْل، جَبْرَئِلُ، جِبْرِیْل، جِبْرَائِلُ، جِبْرَائِیل، جِبْرَائِلُ، جِبْرِیْن تفسیر عزیزی نے فرمایا کہ جبریل اور میکائیل کا نام تو عبداللہ ہے اور اسرافیل کا نام عبدالرحمٰن فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ بعض مفسرین نے فرمایا کہ اس شرط کی جزا پوشیدہ ہے اور ف، سے جزا کی علت ہے اور یہ ف تقلید کا ہے آیت کے معنی یہ ہوئے کہ جو جبریل سے دشمنی کرے وہ بڑا ہی بے وقوف ہے کیونکہ جبریل تو خدا کے حکم سے قرآن لاتے ہیں نہ کہ اپنی رائے سے بعض نے فرمایا کہ فَاِنَّهٗ ہی جزا ہے اور کبھی جزا شرط کی علت ہوتی ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ اگر آج اس نے تجھے مارا تو تو نے بھی کل اسے مارا تھا۔ اب آیت کے معنے یہ ہوئے کہ جو جبریل سے دشمنی کرے گا یا کرتا ہے وہ اس لئے کرتا ہے کہ انہوں نے آپ پر قرآن بحکم الٰہی اتارا ہے گویا قرآن اتارنا دشمنی کی وجہ ہے۔ عَلٰی قَلْبِكَ اگرچہ نزول قرآن آپ کی ذات پر ہوتا تھا مگر چونکہ مضمون قرآن قلب سمجھتا ہے اس لئے اس کا ذکر کیا گیا۔ اس کی زیادہ تحقیق انشاء اللہ اعتراض و جواب میں آئے گی۔ بِاِذْنِ اللّٰهِ نزول کے متعلق ہے یعنی جبریل خود نہ لائے۔ بلکہ اللہ کے حکم سے لائے ان سے عداوت دراصل رب سے عداوت ہے ان بے وقوفوں کو یہ خبر نہیں کہ قرآن تو ان کے لئے بھی باعث رحمت ہے انہیں چاہئے تھا کہ اس سے خوش ہوتے کیونکہ اس میں تین صفتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ ساری اگلی کتابوں کو سچا فرماتا ہے اگر یہ نہ فرماتا تو وہ سب غلط ہو جاتیں۔ دوسرے یہ کہ هُدًى بمقابلہ اگلی کتب کے زیادہ کامل ہدایت دینے والا ہے کیونکہ اس کے احکام قیامت تک باقی ہیں۔ تیسرے یہ کہ بُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِیْنَ مسلمانوں کو خوشخبری دینے والا اگر یہ بھی ایمان لے آئیں تو انہیں بھی بشارت دے ان کو چاہئے کہ جبریل امین کا احسان مانیں کہ وہ ان کے لئے ایسی اچھی کتاب لے آئے تفسیر خزائن العرفان نے اس جگہ فرمایا کہ اس میں اشارۃً یہ بھی فرمایا گیا کہ وہ زمانہ گیا جب جبریل عذاب لاتے تھے اب تو بشارتیں لا رہے ہیں تم پھر بھی ان کی عداوت سے باز نہیں آتے یعنی پہلے حضرت جبریل کے دو کام تھے مسلمانوں کے لئے خوشخبریاں لانا اور کفار کے لئے عذاب۔ مگر اب سلطنت مصطفٰی کا دور دورہ ہے اب ان کا کام صرف بشارت لانا ہی ہے۔ عذاب لانا بند ہو گیا خیال رہے کہ قرآن سارے عالم کے لئے ہدایت ہے کفاروں کو ایمان کی مومنوں کو اعمال کی گنہگاروں کو توبہ کی نیکوکاروں کو بلندی درجات کی ہدایت دیتا ہے مگر بشارت صرف مومنوں کے لئے ہے لیکن ہم جیسے مومنوں کو مغفرت کی بشارت دیتا ہے کہ فرماتا ہے لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (الزمر: ۵۳) صحابہ کو بلندی درجات کی بشارت دیتا ہے۔ فرماتا ہے وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى (النساء: ۹۵) اور حضور کو بشارت دیتا ہے یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا (احزاب: ۴۵) الخ۔ غرض کہ اس کی ہدائتیں بھی مختلف ہیں اور اس کی بشارتیں بھی رنگ برنگی۔ یہاں تک ان کی حماقتوں کا ذکر ہوا۔ اب اس میں عداوت کا نتیجہ بیان ہو رہا ہے کہ فرمایا جا رہا ہے مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ جو اللہ کا دشمن ہو یا تو اس طرح کہ اس کی اطاعت نہ کرے یا یوں کہ اس کی رضا سے راضی نہ رہے یا اس طور کہ اس کے کسی فرشتہ کا مخالف وَ مَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ یا اس کے سارے فرشتوں اور سارے پیغمبروں کا دشمن ہو معلوم ہوا کہ ایک جبریل کی مخالفت ان سب کی دشمنی ہے وَجِبْرِیْلَ وَمِیْكٰىلَ اور جبریل اور میکائیل کا دشمن ہو اگرچہ یہ دونوں بھی ملائکہ میں آ گئے تھے مگر چونکہ یہ دونوں سب فرشتوں میں افضل ہیں یا انہیں کا اس وقت تذکرہ تھا یا دشمنی یا دوستی انہیں سے ہی ہو سکتی ہے کیونکہ اسرافیل کا تعلق اس

وقت دنیا سے ہے ہی نہیں اور عزرائیل سے کسی کو دشمنی نہیں بلکہ ان کا ڈر اور خوف ہے اور وہ بھی وحی کی وجہ سے نہیں بلکہ جان نکالنے کی وجہ سے اس لئے ان دونوں کا علیحدہ ذکر کیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جبریل کی دشمنی کے ساتھ میکائیل سے دوستی کبھی نہیں ہو سکتی کیونکہ ان دونوں کی ذمہ داریاں مشترک ہیں۔ خیال رہے کہ میکائیل کی بھی چند قرائتیں ہیں۔ مِیْکَال۔ مِیْکَائِیل۔ مِیکَئِیل۔ مِیکَئِل۔ ان سب کے معنے ہیں عبد اللہ یعنے اللہ کا بندہ میک کا معنے بندہ اور ئیل اللہ۔ ان عداوتوں کا نتیجہ یہ ہوگا۔ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ کہ اللہ کافروں کا دشمن ہے یہ لوگ تو عداوت کر کے رب کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے، مگر خود یہ دشمنوں کے گروہ میں آکر اپنی دین و دنیا تباہ کریں گے۔

خلاصہ تفسیر

اے محبوب خدا ﷺ ان بے وقوف یہودیوں کا ایک نامعقول عذر یہ بھی ہے کہ ہم قرآن کیسے مانیں اس کو تو جبریل لے کر آتے ہیں در حقیقت یہ عذر نہیں بلکہ نہ ماننے کا ایک بہانہ، مگر ان کا منہ بند کرنے کے لئے آپ ان سے کہہ دو کہ جو جبریل کا دشمن ہے وہ در حقیقت رب کا دشمن ہے کیونکہ جبریل اپنی طرف سے نہیں بلکہ رب کے حکم سے آپ پر قرآن لاتے ہیں ان سے ناراضی رب کے حکم سے ناراضی ہے ان کو چاہئے تھا کہ جبریل کا احسان مانتے کیونکہ وہ ایسی کتاب لائے ہیں کہ جو اگلی کتابوں کو سچا کرتی اور سب کو ہر طرح کی ہدایت دیتی ہے اور مسلمانوں کو خوشخبریاں سناتی ہے ان کی مثال تو اس اندھے کی سی ہے کہ کنوئیں میں گر رہا تھا کسی آنکھ والے نے ترس کھا کر اسے وہاں سے ہٹا دیا۔ وہ اندھا بجائے شکر گزار ہونے کے الٹا گالیاں دے کہ تو نے میرا ہاتھ کیوں پکڑا اور ضد میں آکر کنوئیں میں چھلانگ لگا دے اس نے اپنا ہی نقصان کیا بچانے والے کا کچھ نہ بگاڑا، اعلان عام فرما دو کہ جو کوئی اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے پیغمبروں کا اور جبریل و میکائیل کا دشمن ہوگا تو وہ کافر ہے اور اللہ کافروں کا دشمن ہے۔ انہوں نے بہت سے کفر کر ڈالے خدا کے فعل پر اعتراض کیا۔ اس کے خاص بندوں کو دشمن جانا جبریل جو کہ فرشتوں کے سردار اور حاضر باش دربار ہیں ان سے مقابلہ کی ٹھانی تو الٹے مصیبت میں گرفتار ہوئے کہ خدا کے دشمنوں کی فہرست میں ان کا نام آگیا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** ایک اللہ سے عداوت سارے محکمہ ربانی بلکہ خود رب تعالیٰ سے عداوت ہے جس کا نتیجہ خود اپنی ہلاکت ہے **دوسرا فائدہ:** نبی کے لئے علم غیب ضروری ہے دیکھو ابن صوریہ نے علوم غیبیہ سے آپ کی نبوت آزمائی اور وہ باتیں پوچھیں جن تک ماہر طبیب اور کامل عقلمند کے ذہن کی رسائی نہیں، اس پر حضور علیہ السلام نے یہ نہ فرمایا کہ میں تو مسئلے بتانے آیا ہوں۔ مجھے غیبی خبروں سے کیا تعلق بلکہ ایسے نفیس جواب دیئے جس سے اس کا منہ بند ہو گیا۔ **تیسرا فائدہ:** دنیا میں کوئی شخص حضور کے برابر عالم نہیں ہو سکتا کیونکہ تمام لوگ تو انسانوں سے سیکھ کر عالم بنتے ہیں مگر حضور انور نے تمام علوم خصوصاً قرآن شریف اللہ تعالیٰ سے سیکھے کہ رب نے فرمایا نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ جبریل نے قرآنی علوم تمہارے دل پر اللہ کے حکم سے نازل کئے جس سے تمام علوم تمہیں بغیر محنت حاصل ہو گئے **چوتھا فائدہ:**

علمائے کاملین کو جائز ہے کہ مناظرہ کے لئے مندروں یا گرجوں یا یہودیوں کے کنیسوں میں جائیں اور اسلام کی حقانیت ثابت کرنے یا کفار کی تردید کے لئے ان کی کتابوں کا مطالعہ کریں مگر یہ انہیں علماء کے واسطے ہے جو حضرت فاروق جیسا قوی ایمان رکھتے ہوں عام لوگ بلکہ عام علماء کو بھی بدمذہبوں کی کتابیں دیکھنا جائز نہیں ایسا نہ ہو کہ خود شبہ میں پڑ جائیں خاص علماء کو بھی مذکورہ صورتوں میں ہی جائز ہوگا بلاضرورت ان کو بھی ایسی کتابیں پڑھنا حرام ہے حضور ﷺ نے ایک بار عمرؓ کو بھی تورات کے دیکھنے سے منع فرمایا تھا دیکھو کتب احادیث۔ **پانچواں فائدہ:** حضرت عمرؓ کی وہ شان ہے کہ کبھی ان کی رائے کے مطابق قرآنی آئتیں اترتی تھیں بلکہ بہت سے قرآنی احکام بھی ان کے حسب منشاء آئے جن کا مختلف موقعوں پر ذکر کیا جائے گا۔ **چھٹا فائدہ:** حضرت جبریل باقی ملائکہ سے افضل ہیں اسی لئے اس آیت میں ان کا ذکر میکائیل سے پہلے ہوا (۲) نیز یہ قرآن، وحی اور علم لائے جو کہ غذائے روح ہیں۔ حضرت میکائیل بارش وغیرہ لاتے ہیں جس سے بدن کو بقا ہے اور روح بدن سے افضل ہے۔ اسی لئے اس کی غذا بھی بدن کی غذا سے افضل اور پھر حضرت جبریل بھی حضرت میکائیل سے افضل (۳) نیز قرآن کریم نے حضرت جبریل کی صفت میں فرمایا مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ (تکویر:۲۱) جس سے معلوم ہوا کہ حضرت جبریل مطاع اور باقی سارے فرشتے ان کے مطیع اور فرمانبردار (۴) نیز حضرت جبریل کے ذمہ انبیاء کرام کی خدمت رہی اور دوسرے انتظام کرنے والے فرشتوں کے ذمہ عام مخلوق کی خدمت اور بڑے مخدوم کا خادم بھی بڑا ہوتا ہے۔ تفسیر عزیزی نے طبرانی کی ایک روایت بیان فرمائی کہ فرشتوں میں افضل حضرت جبریل اور پیغمبروں میں افضل حضرت آدم دنوں میں افضل جمعہ مہینوں میں افضل ماہ رمضان راتوں میں افضل شب قدر اور عورتوں میں افضل حضرت مریم ہیں پیغمبروں میں آدم علیہ السلام اس لئے افضل ہیں کہ وہ تمام پیغمبروں کی اصل ہیں۔ جیسے کہ روئی کپڑوں کی اصل اس لئے سب سے افضل یا جڑ پھول وپھل کی اصل اس لئے ان سے افضل اور آدم علیہ السلام اس لئے افضل ہیں کہ وہ تمام پیغمبروں کی جڑ ہیں۔ مگر درجہ اور قیمت میں پھول پھل جڑ سے اعلیٰ ہے اور قیمتی کپڑے روئی سے بڑھ کر ایسے ہی حضور علیہ السلام درجات اور تقرب میں آدم علیہ السلام سے کہیں افضل ہیں۔ **ساتواں فائدہ:** رافضی بہت سی باتوں میں یہود سے ملتے جلتے ہیں یہود نے نبوت بنی اسرائیل سے خاص سمجھی انہوں نے خلافت بارہ اماموں سے اور یہود نے پیغمبروں کو خدا کا بیٹا مان لیا اور بعض کو گالیاں دیں اور ایذائیں پہنچائیں رافضیوں نے بھی ایک خلیفہ حضرت علی کو خدا اور رسول سے بڑھ کر سمجھا اور باقی خلفاء پر تبرے کئے عام رافضی حضرت علی کو حضور سے افضل سمجھتے اور کہتے ہیں۔ مصرع مگر اپنے سے بڑھ کر ڈھونڈ کر داماد کرتے ہیں۔ نصیری فرقہ نے انہیں خدا مانا، عام رافضی یہ شعر پڑھا کرتے ہیں۔

دکھا دو یا علی جلوہ نصیری کے خدا تم ہو یہ آنکھیں طالب دیدار ہیں حاجت روا تم ہو

یہود نے کہا حضرت جبریل نے نبوت بنی اسمٰعیل کو دے دی، رافضی بھی کہتے ہیں کہ حضرت علی وحی کی اصل مقصود تھے بظاہر حضور پر آگئی یہودی بھی دعویٰ کرتے تھے کہ فرشتے آپس میں ایک دوسرے کے دشمن ہیں رافضی بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ خلفاء راشدین ایک دوسرے کے دشمن تھے اور جیسے کہ ایک جبریل علیہ السلام سے دشمنی سارے ملائکہ رب سے دشمنی ہے ایسے ہی

ایک صحابی سے عداوت رب سے عداوت ہے کہ خلفاء ثلاثہ کے مقابلہ میں خود جناب علی مرتضی دعویٰ خلافت نہ فرمائیں مگر یہ خیر خواہ سر پھوڑے مرے جاتے ہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن حضور کے قلب پاک پر آتا تھا نہ تمام ذات پر جس سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کا صرف مضمون ہی رب کی طرف سے ہے نہ کہ الفاظ یہ حضور ﷺ کے خود اپنے الفاظ ہیں کیونکہ الفاظ کان سے اور مضمون دل سے محسوس ہوتا ہے تو گویا بطور کشف قرآن کا القا ہوتا تھا (بعض موجودہ بے دین) **جواب:** قرآن کے الفاظ و مضامین سب ہی اللہ کی طرف سے ہیں رب فرماتا ہے۔ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا (یوسف: ۲) کہیں فرماتا ہے۔ وَّ هٰذَا لِسَانٌ عَرَبِیٌّ مُّبِیْنٌ (النحل: ۱۰۳) وغیرہ الفاظ ہی عربی فارسی ہوتے ہیں۔ نیز زبان سے الفاظ ہی ادا ہوتے ہیں نہ کہ مضمون اس اعتراض کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ دل معنی کی طرح الفاظ کو بھی سمجھتا ہے اور کان تو محض آلہ ہے جیسے آنکھ کے سامنے ایک عینک قرآن کے نزول کے وقت کان سنتے تھے اور دل سمجھتا تھا دوسرے یہ کہ احادیث سے ثابت ہے کہ نزول وحی کے وقت حضور علیہ السلام پر غشی کی سی حالت طاری ہو جاتی تھی، اس وقت بلا واسطہ کان الفاظ قلب پر ہی وارد ہوتے ہوں گے، تیسرے یہ کہ عام لوگ تو قرآن پاک اولاً کان سے سنتے ہیں اور بعد میں دل سے گویا کان دل کا راستہ ہیں۔ لیکن حضور علیہ السلام اولاً دل سے اور بعدہ کان سے محسوس فرماتے تھے جو کہ بڑا کمال ہے (تفسیر عزیزی) سبحان اللہ یہ عجیب فرق ہے قرآن کریم بواسطہ جبریل حضور تک پہنچا اور دو واسطوں سے (حضرت جبریل اور نبی علیہ السلام) مسلمانوں تک تو گویا قرآن نبی پر بھی اترا اور امت پر بھی فرق یہ ہی ہوا کہ امت کے دلوں نے بذریعہ کان قرآن سمجھا اور حضور علیہ السلام کے کان مبارک نے دل کے ذریعہ سنا ہم نے اپنی کتاب جاء الحق میں یہ ثابت کیا ہے کہ حضور علیہ السلام نزول قرآن سے پہلے ہی عارف باللہ بلکہ اجمالاً قرآن سے آگاہ تھے اس کی نفیس تحقیق وہاں ہی دیکھو **دوسرا اعتراض:** اس آیت میں قرآن کی تین صفتیں بیان ہوئیں۔ اگلی کتابوں کی تصدیق، ہدایت اور خوشخبری ان صفات میں یہ ترکیب کیوں رکھی گئی **جواب:** اس میں بڑا نکتہ ہے کلام سننے والے تین طریق سے اس کو سچا جانتے ہیں عام لوگ تو اس طرح کہ وہ ان کے بزرگوں کے کلام کے موافق ہو۔ محققین دلائل سے، وہی لوگ لالچ سے چونکہ یہود میں تینوں قسم کے لوگ موجود تھے اس لئے یہ تینوں صفتیں اس ترتیب میں بیان کی گئیں۔ **تیسرا اعتراض:** حضرت جبریل سے دشمنی کرنا خلاف عقل ہے، اس لئے موجودہ یہودی بھی اس کا انکار کرتے ہیں۔ **جواب:** ان بے وقوفوں سے یہ حماقت کچھ بعید نہیں انہوں نے تو موسیٰ علیہ السلام سے نیا خدا بھی مانگا تھا۔ موجودہ یہودی اپنے اس عیب کو چھپاتے ہیں جو بے وقوف قوم کہ حضرت عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مان سکتی ہے وہ حضرت جبریل سے دشمنی بھی کر سکتی ہے۔ **چوتھا اعتراض:** قرآن کریم پڑھا ہوا نازل ہوا اور پڑھی ہوئی چیز کان پر نازل ہوتی ہے نہ کہ دل پر لہٰذا قرآن دل پر نازل نہیں ہو سکتا **جواب:** اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ الفاظ کو سنتے کان ہیں مگر انہیں محفوظ دل رکھتا ہے اس نسبت سے فرمایا گیا کہ دل پر اترا یعنی دل میں جمع فرما دیا سننا کان کا کام ہے اور قبول کرنا اور ماننا

دل کا کام۔ کہا جاتا ہے تمہاری بات میرے دل میں اتر گئی دوسرے یہ کہ الفاظ قرآن کان پر نازل ہوئے مگر احکام قرآن و معنی و مسائل قرآن دل پر اترے جیسے اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کے الفاظ کان پر جب اترے تو رب کی طرف سے حضور نے یہ دل سے جان لیا کہ قائم کرنا کیا ہے اور صلوٰۃ کیا ہے اس کے مسائل کیا ہیں۔ تیسرے یہ کہ قرآن کے راز و رموز جو الفاظ سے ادا نہیں ہو سکتے وہ حضور کے دل پر نازل ہوئے دنیا میں لاکھوں چیزیں صرف سمجھ میں آتی ہیں الفاظ سے ان کی تعبیر نہیں ہو سکتی، جیسے بھوک پیاس سفیدی وغیرہ کہ انہیں جانتے سب ہیں مگر لفظوں میں بیان نہیں ہو سکتے۔

تفسیر صوفیانہ

تمام گناہوں سے بدتر گناہ اللہ والوں کی عداوت ہے اور تمام کفر میں بدترین کفر وہ جو محبوبان خدا کی عداوت کے سبب ہو اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ قلب قابل فیضان نہیں رہتا اور ایسے بے دین کا رب بھی دشمن ہے صرف دو مجرموں کو حق تعالیٰ نے اعلان جنگ دیا ہے ایک سود خوار اور دوسرے محبوبان الٰہی کا دشمن۔ اس لئے چاہئے کہ ان دونوں بیماریوں سے خاص طور پر ڈریں محب گناہگار کی بخشش ہو جائے مگر دشمن عابد کی بخشش ناممکن ہے بلکہ حق یہ ہے کہ محبت کا کافر کچھ فائدے میں رہتا ہے مگر عداوت کا کافر ہر طرح خسارے میں ہے عیسائی کافر محبت ہیں دنیا میں سلطنت کر رہے ہیں۔ یہودی عداوت کے کافر دنیا میں ہمیشہ ذلیل ہی رہیں گے۔

وَ لَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍۚ وَ مَا یَكْفُرُ بِهَاۤ
اور البتہ تحقیق اتاری ہم نے طرف تمہاری نشانیاں ظاہر اور نہیں کفر کریں گے
اور بے شک ہم نے تمہاری طرف روشن آئتیں اتاریں اور ان کے منکر نہ ہوں گے
اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ﴿۹۹﴾
ساتھ ان کے مگر فاسق لوگ
مگر فاسق لوگ

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** اس سے پہلے یہود کا قلبی اندھا ہونا بیان ہوا تھا کہ عداوت جبریل میں ایسے اندھے ہوئے کہ اس کی وجہ سے قرآن جیسی فائدہ مند کتاب کے منکر ہو گئے ان کی آنکھ کا اندھا ہونا بتایا جا رہا ہے کہ قرآنی آیتیں ایسی ظاہر ہیں کہ اندھوں کو بھی نظر آ جائیں مگر ان کو نظر نہیں آتیں۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ حضرت جبریل نے آپ پر قرآن ہمارے حکم سے اتارا اب فرمایا جاتا ہے کہ بلکہ ہم نے ہی اتارا وہ تو فقط ایک قاصد ہیں۔ یہود کو ہم سے کیا عداوت ہے جو ہماری کتاب نہیں مانتے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت سے معلوم ہوا کہ یہود عداوت جبریل کے سبب قرآن کے منکر ہیں اب فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے تو قرآن کے سوا اور صدہا آیت یعنی

معجزات بلاواسطہ جبریل آپ پر اتارے ہیں۔ یہ لوگ ان کے کیوں منکر ہیں۔ ان میں تو جبریل کا واسطہ بھی نہیں۔ **چوتھا تعلق:** یہود نے اپنے انکار کی وجہ عداوت جبریل بتائی اس آیت میں ان کی تردید ہے کہ نہیں بلکہ اس کی وجہ ان کا دائمی فسق اور بے دینی ہے۔

شان نزول

اسی ابن صوریہ نے ایک دفعہ عرض کیا تھا کہ اے محمد ﷺ آپ ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہ لائے جسے ہم پہچانتے اور نہ آپ پر کوئی ظاہری آیت اتری جسے ہم دیکھتے اس کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ ایک دفعہ معاذ ابن جبل ؓ نے فرمایا کہ اے یہود پہلے تم اہل کتاب تھے اور ہم مشرک تم نے ان نبی آخر الزمان کی تعریفیں سنا سنا کر ہمیں ان کا شیدائی بنا دیا رب کی شان کہ ہم نے اور تم نے ان کو پا بھی لیا تو تمہاری بتائی ہوئی صفتوں سے ہم ان پر ایمان لے آئے تم کیوں محروم رہ گئے اس پر یہود نے کہا یہ توراۃ کی یہ بتائی ہوئی نشانی لے کر نہ آئے جس سے ہم ان کو نبی مانیں تب یہ آیت اتری ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں واقعات ہوئے ہوں کہ ادھر تو ابن صوریا نے حضور سے عرض کیا ہو اور ادھر دوسرے یہود نے معاذ ابن جبل سے اور تب یہ آیت اتری۔

تفسیر

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَاۤ اِلَیْكَ کے معنے ہیں ایک دم اتارنا۔ سارا قرآن تو ترتیب وار اترا۔ لیکن اس کے بعض رکوع ایک دم اترے ہیں۔ اس لئے یہاں اَنْزَلْنَا فرمایا گیا۔ نیز ہر رمضان میں جبریل امین پورا قرآن سناجاتے تھے اس لحاظ سے اَنْزَلْنَا فرمایا گیا یا رب تعالیٰ نے آپ پر اتارنے کے لئے سارا قرآن ایک دم پہلے آسمان کی طرف اتار دیا پھر وہاں سے فرشتہ کے ذریعے ترتیب وار آتا رہا تو گویا بلاواسطہ تو ایک دم اترا اور بالواسطہ آہستہ یا آیت سے مراد معجزات ہیں۔ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ آیات آیت کی جمع ہے جس کے معنی ہیں نشانی یا علامت چونکہ قرآن کا ہر جملہ رب تعالیٰ کی نشانی ہے۔ اس لئے اسے آیت کہتے ہیں اور قرآن میں بہت سی آیتیں ہیں اس لئے آیات فرمایا گیا۔ یا قرآن کی ہر آیت صدہا طریق سے حضور کی نبوت ثابت کر رہی ہے۔ اس لئے آیت کو آیات کہا گیا۔ فصاحت' بلاغت' غیب کی خبر' توحید و نبوت کے دلائل' احکام' مسائل قریب قریب ہر آیت میں موجود ہیں یا آیات سے مراد معجزات ہیں۔ بنیات کے معنے ہیں ظاہر اور کھلے ہوئے کیونکہ اس کا معجزہ ہونا عام لوگ معلوم کر چکے تھے۔ اس لئے اسے بینات کہا گیا یعنی ہم نے آپ پر کھلی ہوئی نشانیاں اتاریں، وَمَا یَكْفُرُ بِهَاۤ کسی میں جرات اور ہمت نہیں کہ ان کا انکار کرے اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ جو حد انسانیت سے نکل چکے ہیں' فاسق فسق سے بنا ہے جس کے معنے ہیں نکل جانا جیسے کہ وہ مسلمان فاسق کہلائے گا جو گناہ کبیرہ کر کے تقویٰ کی حد سے نکل جائے ایسے ہی کافر کو بھی اس لئے فاسق کہا جاتا ہے کہ وہ حد ایمانی یا حد انسانی سے نکلا ہوا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ جہاں قرآن کریم فسق کو کفر کے ساتھ جمع فرماتا ہے تو اس سے بدترین کفار مراد ہوتے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

اے نبی کریم ﷺ ہم نے آپ پر وہ قرآن اتارا جو ہماری وحدانیت اور آپ کی نبوت پر کھلی ہوئی دلیل ہے ان کا کوئی بھی بے علمی اور نادانی یا کسی شبہ سے انکار نہ کرے گا۔ بلکہ محض خباثت نفس یا یوں کہو کہ اے نبی ﷺ اگر یہود جبریل کی وجہ سے قرآن کو نہیں مانتے تو ہم نے تو قرآن کے علاوہ اور بہت سے معجزات بھی اتارے ہیں آپ کے فراق میں ستون رویا آپ سے درختوں نے کلام وسلام کیا آپ سے اونٹوں نے شکایت اور ہرنوں نے اپنے دکھ کی حکایت کی آپ کے اشارۂ انگشت سے چاند پھٹا' سورج لوٹا' انگلیوں سے پانی کے چشمے پھوٹے' تھوڑے کھانے سے ساری خلقت سیر ہوئی ان باتوں کو دیکھتے ہوئے پھر یہ کیوں آپ کے منکر ہیں معلوم ہوا کہ جبریل کا فقط بہانہ ہے ان کا نفس ہی خبیث ہے۔ خیال رہے کہ نبوت نبی کی ان کے معجزات سے معلوم ہوتی ہے۔ اور نبی کی پہچان کے بعد کتاب اللہ کو پہچانا اور مانا جاتا ہے۔ نبوت کی پہچان کتاب اللہ کے ماننے پر موقف نہیں اس لئے بہت سے نبی ایسے بھی گزرے جن کے پاس کتاب اللہ تھی ہی نہیں اور بہت سے وہ ہوئے جن کے پاس پرانی کتاب تھی وہاں ان کی نبوت ان کے معجزات سے معلوم ہوئی فرمایا جارہا ہے کہ تم قرآن کو تو پیچھے ماننا پہلے اس محبوب کو ان کے معجزات کے ذریعے سے تو مان لو ان معجزات میں تو جبریل کا واسطہ نہیں تعجب ہے کہ تم قرآن کے بہانے سے نبی پر ایمان نہیں لاتے اس توجیہ پر یہ آیت بہت باریک ہوگی۔

تفسیر صوفیانہ

قرآن وکفار کی مثال ایسی ہے جیسے کہ اندھیری کوٹھڑی میں خوبصورت اور بدشکل لوگ موجود تھے بدصورت اپنے حسن کی تعریف کررہا تھا' وہ سمجھتا تھا کہ اس اندھیرے میں مجھے کون دیکھ رہا ہے جو چاہوں اپنی زور زبان سے منوالوں کہ اچانک وہاں شمع آگئی' یہ تیز زبان بدصورت اٹھ کر پھونکیں مارنے اور اس میں عیب نکالنے لگا۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ شمع بری ہے وجہ یہ ہے کہ اس عیبی کو اپنے عیب کھلنے کا اندیشہ ہے۔ اسی طرح سعید وشقی روحیں دنیا میں جمع تھیں مگر شقی اپنی تیز زبانی سے اپنی سعادت کے خطبے پڑھ رہے تھے کہ اچانک اللہ کا نور محمد ﷺ ایک روشن شمع (قرآن) لے کر دنیا میں تشریف لائے جس روشنی میں ہر چیز صاف نظر آنے لگی۔ کفار نے اپنا کفر وفسق چھپانے کے لئے اس میں صدہا قسم کے عیب نکالنے شروع کردیئے اور چاہا کہ اس شمع کو بجھادیں مگر رحمانی شمع انسانی پھونک سے کبھی نہیں بجھ سکتی۔ آج تک قرآن کے ہزاروں دشمن ہیں مگر قرآن دن بدن ترقی کررہا ہے کسی صوفی نے کیا خوب کہا۔

شمع رخشند دراں جمع نہ خواہند کہ تا — عیب شاں در شب تاریک بماند مستور
وائے آں وقت کہ روشن شود ایں راز چوں روز — پردہ برخیزد و ایں حال بیاید بظہور

چمگادڑ کی آنکھ چاہتی ہے کہ آفتاب نہ نکلے مگر آفتاب نکل کر ہی رہتا ہے۔

اَوَ كُلَّمَا عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْؕ بَلْ
کیا اور جب کبھی عہد کیا انہوں نے کوئی عہد پھینک دیا اس کو ایک گروہ نے ان میں سے بلکہ بہت سے
اور یا جب کبھی کوئی عہد کرتے ہیں ان میں سے ایک فریق اسے پھینک دیتا ہے بلکہ ان میں بہتیروں کو
اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَ لَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ
ان کے نہیں ایمان لاتے اور جب کہ آیا ان کے پاس پیغمبر پاس سے
ایمان نہیں اور جب ان کے پاس تشریف لایا اللہ کے یہاں سے ایک رسول ان کی کتابوں
عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ
اللہ کے سچا کرنے والا واسطے اس کے جو ساتھ ہے ان کے تو پھینک دیا ایک گروہ نے ان میں سے
کی تصدیق فرماتا تو کتاب والوں میں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب
اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ
جو دیئے گئے کتاب کتاب اللہ کی پیچھے پیٹھوں اپنی کے
اپنی پیٹھ کے پیچھے پھینک دی گویا وہ کچھ
لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۱﴾
گویا وہ نہیں جانتے
علم ہی نہیں رکھتے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پہلے فرمایا گیا تھا کہ یہود عداوت جبریل کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنی خباثت کی وجہ سے آیات کا انکار کرتے ہیں اب اس دعویٰ کا نہایت قوی ثبوت دیا جا رہا ہے کہ عہد شکنی ان کا عام دستور ہے۔ بتاؤ یہ عہد کا کیوں انکار کرتے ہیں ان میں تو حضرت جبریل کا واسطہ نہیں۔ معلوم ہوا کہ ان کے نفس ہی خبیث ہیں۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں یہود کا آیات الٰہی کے انکار کا ذکر ہوا تھا۔ اللہ کی آیتوں میں کفار شک بھی کرتے مگر اب ان کی عہد شکنی کا ذکر ہے۔ جو کہ ہر مذہب و ملت میں برا ہے تو گویا اس میں اعلیٰ کی طرف ترقی ہے۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت سے معلوم ہوا تھا کہ وہ یہود تورات کو اس لئے مانتے ہیں کہ بغیر واسطہ جبریل آئی۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ یہ تو خود تورات کو بھی پس پشت ڈال چکے اس کے بھی عامل نہ رہے معلوم ہوا کہ جبریل کا بہانا ہے اصل وجہ فسق و فجور ہے۔

شان نزول

ایک بار حضور ﷺ نے یہود کے بڑے عالم مالک ابن سیف اور اس کی جماعت کو حق تعالیٰ کے وہ عہد و پیمان یاد دلائے جو کہ توراۃ میں نبی آخرالزمان پر ایمان لانے کے متعلق لئے گئے تھے تو ابن سیف نے ان کا صاف انکار کر دیا کہ ہم سے اس کے متعلق کوئی عہد نہیں لیا گیا اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی (تفسیر خزائن العرفان) خیال رہے کہ بعض گناہ گذشتہ چھپے گناہوں کو ظاہر کر دیتے ہیں اور گذشتہ نیکیوں کو چھپا لیتے ہیں اور بعض نیکیاں گذشتہ چھپی نیکیوں کو ظاہر کر دیتی ہیں اور گناہوں کو چھپا لیتی ہیں۔ یزید پلید نے نماز روزے صدقات جہاد کئے تھے مگر واقعہ کربلا نے اس کے یہ سب اعمال چھپا لئے اور اس کے سارے چھپے عیب زنا شراب خوری وغیرہ دنیا میں مشہور کر دی۔ صحابہ کرام کی صحابیت نے ان کے زمانہ جاہلیت کے سارے عیب چھپا لئے اور ان کی گذشتہ ساری نیکیاں ظاہر کر دیں۔ اسی طرح ان بنی اسرائیل کی عداوت جناب مصطفیٰ نے ان کی گذشتہ نیکیاں تو چھپا لیں مگر ان کی بدعہدیاں اور دیگر قصور دنیا کے سامنے کر دیئے اگر یہ لوگ حضور پر ایمان لے آتے تو معاملہ برعکس ہوتا۔ اس لئے رب نے پہلے تو ان کی گذشتہ بدعہدیوں کا ذکر کیا پھر لَمَّا جَآءَهُمْ سے اس جرم کا جس نے ان کے سارے جرم کھلوا دیئے رب کی پناہ۔

تفسیر

اَوَكُلَّمَا یہاں ایک فعل پوشیدہ ہے یا تو اَوَ کے بعد یا ہمزہ کے بعد اور واؤ سے پہلے یعنی اَوَلَمْ يَكُنْ ذٰلِكَ كُلَّمَا اور کیا یہ نہیں ہوا کہ جب بھی انہوں نے عہد کیا تو توڑ دیا اور اگر ہمزہ اور واؤ کے درمیان فعل پوشیدہ ہو تو یا یہ واؤ حالیہ ہے یا عاطفہ یعنی يَنْكُرُوْنَ ذَالِكَ وَكُلَّمَا الخ کیا یہود اپنے فسق کا انکار کر سکتے ہیں حالانکہ ہر عہد توڑتے رہے یا اَكْفُرُوْا بِالْاٰيَاتِ وَكُلَّمَا کیا انہوں نے واضح آیتوں کا بھی انکار کیا اور ہر عہد بھی توڑا غرضکہ یہ سوال تو تعجب کا ہے یا انکاری۔ عٰهَدُوْا عَهْدًا، عَاهَدُوْا معاہدہ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں آپس میں عہد و پیمان کرنا عہداً یا تو مفعول مطلق ہے یا مفعول بہ اور اس عہد سے یا تو رب کا عہد مراد ہے کہ اس نے یہود سے توراۃ پر عمل کرنے انبیاء کی اطاعت کرنے آپس میں خونریزی نہ کرنے اور نبی آخرالزمان پر ایمان لانے کا عہد لیا تھا مگر انہوں نے وہ سارے عہد توڑ ڈالے یا نبی علیہ السلام کا عہد جو یہود مدینہ بنی قریظہ اور بنی نضیر نے حضور سے کیا تھا کہ ہم آپ کے دشمنوں کی آپ کے مقابل کبھی مدد نہ کریں گے۔ مگر خندق وغیرہ کے موقع پر عہد شکنی کر کے مشرکین مکہ کی خوب مدد کی اس کے علاوہ بھی مسلمانوں کی خفیہ خبریں کفار قریش کو بھیجتے رہے یا موسیٰ علیہ السلام کا عہد مراد ہے کہ یہود نے ان سے صدہا عہد کئے اور توڑ دیئے یا مسلمانوں کا عہد یا خود ان کے آپس کا عہد کہ یہود اپنے کسی وعدے کے پابند نہ تھے عہد شکنی ان کی عادت ہو چکی تھی حالانکہ اس کو ہر دین و ملت برا کہتا ہے۔ نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ان میں سے ایک گروہ اس عہد کو پس پشت پھینک دیتا ہے نَبَذَ سے یہ بتایا کہ یہود اپنے وعدوں کا ذرا بھی پاس اور لحاظ نہیں کرتے پیٹھ پیچھے کی چیز بالکل نظر نہیں آتی، دائیں بائیں کی کچھ نظر تو آتی ہے تو انہوں نے عہد دائیں بائیں نہ پھینکا کہ کچھ دکھائی بھی دے بلکہ پیچھے پھینکا کہ بالکل نظر ہی نہ پڑے۔ فریق سے یہ بتایا کہ عہد شکنی سارے یہود کا طریقہ نہیں ان میں سے بعض نہایت وفادار

ہیں جیسے کہ سیدنا عبداللہ ابن سلام وغیرہ، فریق چھوٹی یا بڑی جماعت کو کہتے ہیں یہ لفظ فرقۃ سے بنا ہے اس کے لفظی معنے ہم پہلے بتا چکے ہیں۔ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ لفظ فریق سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید بے عہد بہت تھوڑے یہودی ہوں گے لہٰذا بل فرما کر فرمایا اَكْثَرُهُمْ نہیں ان میں بدعہد بہت ہیں پھر بھی شبہ تھا کہ شاید یہود بدعہدی کو جرم اور اپنے کو مجرم سمجھے ہوں گے فرمایا نہیں بلکہ لَا يُؤْمِنُوْنَ وہ پابندی عہد پر ایمان نہیں لاتے یعنی اس عیب کو عیب نہیں ہنر سمجھتے ہیں یا توارات کی ان آیات کو ہی نہیں مانتے جن میں وفاء عہد کا حکم ہے یا توارات ہی پر ایمان نہیں رکھتے پھر پابندی عہد کا کیا ذکر ہے۔ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ منجملہ اور عہد خلافیوں کے ایک بڑی وعدہ خلافی یہ ہے کہ جب کہ ان کے پاس وہ بڑے رسول تشریف لائے جن میں چند خاص صفات تھیں ایک یہ کہ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وہ رب کے پاس سے آئے اور بادشاہ کے پاس سے آنے والے حاکم کا بہت ادب ولحاظ چاہئے کہ اس کی مخالفت دراصل بادشاہ کی توہین ہے مگر انہوں نے کوئی پرواہ نہ کی دوسری صفت یہ ہے مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وہ پیغمبر خود ان کی کتابوں ان کے پیغمبروں کو سچا کرتے ہیں کہ انہوں نے ان کی آمد کی پیشین گوئی کی تھی اگر یہ نہ آتے تو یہ خبر جھوٹی ہو جاتی ان کے آنے سے وہ سچے ہوئے یا یہ پیغمبران کو سچا کہتے ہیں یا ان پیغمبر کی برکت سے تمام دنیا میں اگلی کتابوں اگلے پیغمبروں کی صداقت کے قیامت تک خطبے پڑھے جائیں گے۔ خیال رہے کہ رب نے تمام مخلوقات کے لئے خلق ارشاد فرمایا مگر نبیوں اور حضور کے لئے جاء فرمایا کیونکہ ہم پہلے کچھ نہ تھے دنیا میں آ کر سب کچھ ہوئے مگر وہ حضرات پہلے ہی سب کچھ تھے رب کے عابد، مومن، عارف تھے وہاں سے سیکھ کر یہاں آئے یہاں سکھانے آئے نیز دوسری جگہ ارشاد ہوا لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ (توبہ: ۱۲۸) یہاں فرمایا وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ وہاں دوستوں کے پاس آنے کا ذکر تھا یہاں دشمنوں کے پاس آنے کا ذکر ہوا معلوم ہوا کہ وہ دوست دشمن سب کے پاس آئے بارش ہر قسم کی زمین پر برتی ہے خواہ زمین گندی ہو یا ستھری، رسول فرما کر ارشاد ہوا کہ دنیا میں رسالت کی شان لے کر آئے اور معراج میں رب کے پاس عبودیت کی ادا سے گئے اس لئے یہاں عبدہ ارشاد ہوا لہٰذا رب اسے عبد کہے اور مخلوق اپنا رسول نبی کہے وہاں کے لئے وہ لقب یہاں کے لئے یہ لقب مگر ان بدنصیبوں نے ان سے یہ سلوک کیا کہ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مشرکین کفار کی کیا شکایت خود وہ لوگ جنہیں کتاب الٰہی ملی اور جن کو اس کی خبر تھی ان میں سے ایک گروہ نے پھینک دیا۔ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ اللہ کی کتاب کو پیٹھوں کے پیچھے کہ اس پر کوئی توجہ ہی نہ کی خیال رہے کہ اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے یا تو علمائے یہود مراد ہیں جنہیں توارات کا علم تھا یا عام یہود اور کتاب اللہ سے یا تو قرآن کریم مراد ہے کیونکہ اس کے کتاب الٰہی ہونے کا ان کو بھی یقین تھا یا توارات شریف امام سدی فرماتے ہیں کہ یہود نے توارات کا قرآن سے مقابلہ کیا تو مطابق پایا قرآن کریم کی جلن میں توارات کو بھی چھوڑ دیا کہ ہم وہ کام نہ کریں گے جو قرآنی احکام کے موافق ہوں (تفسیر خزائن العرفان) پیٹھ پیچھے کی کتاب بالکل نظر نہیں آتی انہوں نے بھی توارات پر بالکل نظر نہ کی اور ایسے انجان بنے کہ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ گویا وہ قرآن اور توارات کو جانتے ہی نہیں۔ سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ یہود توارات شریف کو حریر وریشم کے غلاف میں لپیٹے اور اس کو سنہری روپہلی رنگوں سے زینت دیتے تھے مگر اس کے احکام پر عمل نہیں کرتے تھے اس لئے رب نے فرمایا کہ انہوں نے توارات کو پھینک دیا۔

خلاصہ تفسیر

یہود کے چار فرقے تھے ایک تو صحیح معنے میں توریت پر عامل تھے جو کہ حضور ﷺ پر ایمان لائے جیسے ابن سلام اور کعب احبارؓ اسی لئے قرآن نے فریق فرمایا کہ منکر سب نہیں ہیں بلکہ ایک گروہ ہے مگر یہ بہت تھوڑے اس لئے فرمایا گیا بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ دوسری وہ جماعت جنہوں نے علانیہ عہد شکنی اور سرکشی و بغاوت کی ان کے لئے فرمایا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ تیسرے وہ جہلا جنہوں نے بے علمی اور علماء کے بہکانے سے تورات سے منہ موڑ لیا ان کے لئے فرمایا بَلْ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ چوتھے وہ جو دیدہ دانستہ جاہل بن گئے اور نبی آخرالزمان کو پہچان کر بے خبری ظاہر کرنے لگے ان کے لئے فرمایا گیا كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ان میں سے پہلا فرقہ تو ناجی ہے باقی تینوں ناری۔ مگر جس کا جیسا جرم ویسی ہی سزا فرمایا جارہا ہے کہ اے محبوب ﷺ یہ حضرت جبریل کا بہانا کر رہے ہیں ان کی تو یہ حالت ہے کہ سواء چند مخلص لوگوں کے باقی سب نے اپنے عہد و پیان توڑ دیئے کسی نے کھلے بندوں کسی نے خفیہ کسی نے جہالت سے کسی نے جاہل بن کر یہ لوگ ایسے گندے عذر کہاں کہاں کریں گے آپ ان کی بکواس پر دھیان نہ دیں اللہ کے عہد انہوں نے توڑے رسولوں کے عہدوں کا انہوں نے خیال نہ کیا آپس کے عہد و پیان توڑنے میں یہ بڑے ماہر کتاب اللہ کو پس پشت انہوں نے ڈال دیا قرآن کریم کی جلن میں تورات کو انہوں نے پھینک دیا۔ پھر ایسی ہٹ دھرم قوم کا کیا ٹھکانا ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** وعدہ خلافی کرنا سخت جرم ہے اور نبی سے وعدہ خلافی کرنا اور بھی بہت سخت اور رب سے بے وفائی کرنا بڑا ہی سخت جرم ہے جس کی بات ٹھیک نہیں اس کا باپ بھی ٹھیک نہیں **دوسرا فائدہ:** عالم بے عمل اور جاہل برابر ہیں بلکہ ایسے عالم کی سزا سخت ہے کیونکہ جاہل تو کسی قدر معذور بھی ہے اسی لئے بزرگان دین فرماتے ہیں کہ زبانی وعظ صرف کان تک اور دل کا وعظ دل تک پہنچتا ہے یعنے بے عمل عالم کا وعظ اثر نہیں کرتا۔ لوگ سن کر بھول جاتے ہیں۔ **تیسرا فائدہ:** اگر کتاب اللہ پر عمل نہ ہو تو اس کا چومنا چاٹنا ظاہر طور پر اس کو پڑھنا بیکار ہے جیسا کہ ان یہودیوں کے حال سے معلوم ہوا کہ بغیر عمل توریت کی تعظیم ان کے لئے کچھ کام نہ آئی اگر طبیب کا نسخہ ستھرے غلاف میں لپیٹ کر رکھا جائے روزانہ اس کو پڑھ لیا جاوے مگر اس پر عمل نہ ہو کبھی فائدہ نہ دے گا مگر خیال رہے کہ یہ حکم ان لوگوں کے لئے ہے جو کہ کتاب اللہ کو حق نہ جانیں یا بے دھڑک اس پر عامل نہ رہیں جیسے کہ یہود کا حال ہے جو گنہگار مسلمان نادانی سے قرآن پاک پر پورا عمل نہیں کرتا پھر اپنے کو قصور مند مجرم جانتا ہے اس کے لئے قرآن پاک کی تعظیم اس کی تلاوت اس کو دیکھنا ضرور باعث ثواب ہے قرآن کریم کے ایک حرف پڑھنے میں دس نیکیاں ہیں محبوب کا نام لینے سے بیماری ہلکی پڑجاتی ہے پیارے کا دیدار شفاء بیمار ہے بعض دواؤں کے نام سے مرض دور ہو جاتا ہے۔ جس کی تحقیق ہم پہلے کر چکے ہیں۔ لہٰذا قرآن دیکھنا اس کا پڑھنا اس کی تعظیم سب فائدہ مند ہے یہ نہیں کہ جو عمل نہ کر سکے وہ تلاوت اور تعظیم بھی چھوڑ دے **چوتھا فائدہ:** حضور علیہ السلام اپنے ظہور سے پہلے رب کے حضور میں حاضر تھے کیونکہ فرمایا گیا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ یہ رسول، اللہ کے حضور سے

آئے۔ حضور الٰہی سے وہ ہی آئے گا جو پہلے وہاں حاضر ہو گا۔ تفسیر روح البیان نے لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ کی تفسیر میں ایک حدیث نقل فرمائی کہ ایک بار حضور علیہ السلام نے جبریل امین سے پوچھا کہ تمہاری عمر کتنی ہے عرض کیا یہ تو مجھے خبر نہیں ہاں اتنا جانتا ہوں کہ ایک تارا ستر ہزار سال کے بعد طلوع کرتا تھا میں نے اس کو بہتر ہزار مرتبہ نکلتے دیکھا ہے فرمایا کہ وہ تارا ہمارا ہی نور تھا **پانچواں فائدہ:** ایک شب پھول کی صحبت میں رہ کر تل بھی مہک جاتے ہیں کہ ان کا تیل جس دماغ پر پہنچے اس کو بھی معطر کر دے جو ذات کریم کہ کروڑوں سال رب کے حضور حاضر رہے اس کو کیا کچھ فیض نہ ملے ہوں گے اور پھر وہ صحابہ جنہوں نے اس ذات کریم کی صحبت پائی وہ کیونکر نہ چمکے ہوں گے رافضی صحابہ کرام کے کمالات کا انکار کر کے درحقیقت حضور علیہ السلام کی توہین کرتے ہیں اور دیوبندی حضور کے کمالات کے منکر ہو کر رب کے کمال کے منکر ہیں عالم کے پاس جاہل کچھ سال رہے تو عالم بن جائے مگر حضور علیہ السلام کی صحبت میں رہ کر صحابہ کرام بے فیض رہیں اور رب کے پاس رہ کر حضور کو فیض حاصل نہ ہو۔ **چھٹا فائدہ:** حضور علیہ السلام رب کا ہدیہ ہیں جو کہ مسلمانوں کو عطا ہوا۔ کیونکہ فرمایا گیا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ اور بادشاہ اپنی حیثیت کے موافق ہدیہ دیتا ہے تو حق تعالیٰ کا ہدیہ تمام ہدیوں کا بادشاہ ہے۔ حضور علیہ السلام تمام نعمتوں سے اعلیٰ نعمت ہیں۔ **ساتواں فائدہ:** اگرچہ سارے نبی اللہ کے پاس سے آئے اور حضور بھی مگر جتنا قرب اور جتنا زیادہ قرب رب سے حضور کو رہا اتنا کسی کو نہ ملا۔ لہٰذا جو فیض رب سے حضور نے لیا وہ کسی نے نہ لیا آپ کے گھر میں آپ کے پاس ماں باپ بیوی بچے خدام اور دوست سب رہتے ہیں مگر جتنا قرب آپ کے دوست کو آپ سے ہو گا اتنا کسی سے نہ ہو گا۔ اس لئے قیامت میں حضرت خلیل فرمائیں گے کہ میں تو باہر کا دوست تھا۔ اس کے پاس جاؤ جو اندرونی دوست ہے اس لئے رب نے حضور کی خصوصی صفت فرمائی مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: یہود توریت کو مانتے تھے پھر کیوں فرمایا گیا کہ انہوں نے توریت پھینک دی۔ **جواب:** صرف زبانی مانتے تھے عملاً مخالف تھے اور عمل کا لحاظ ہوتا ہے نہ کہ صرف زبانی شیخی کا **دوسرا اعتراض:** جاہل معذور ہے چاہئے کہ وہ قرآن کا انکار کرنے پر سزا نہ پائے **جواب:** جاہل پر لازم ہے کہ علم حاصل کرے وہ اس سے لاپرواہی حاصل کر کے گنہگار اور ملزم ہوا۔

تفسیر صوفیانہ

مشہور تو یہ ہے کہ علم ظاہری علم باطنی پر مقدم ہے اور بصارت یعنی آنکھ کی روشنی بصیرت یعنی قلبی روشنی سے پہلے مگر علم ظاہری کا فیض علم باطنی کے بعد ہے اور بصارت کا فائدہ بصیرت سے حاصل ہوتا ہے دیکھو یہود کے پاس علم ظاہری اور بصارت کی کمی نہ تھی مگر علم باطنی اور بصیرت نہ ہونے کی وجہ سے انہوں نے کتاب الٰہی کو اسی طرح پس پشت ڈال دیا جیسے کہ مجنون دیوانہ سچے موتی کو کھلونا یا لعل کو ٹھیکری سمجھ کر اور ان کا یہ علم ظاہری و بصارت ان کے لئے زیادہ وبال جان بن گیا لہٰذا انسان کو چاہئے کہ اپنے علم میں علم باطنی پیدا کرے اور اللہ والوں کی صحبت سے بصیرت حاصل کرے اور رب کی پکڑ سے ڈر کر توبہ و استغفار میں

جلدی کرے ندامت ہر قسم کی ہے ایک تو دن بھر کی ندامت جیسے کہ کوئی شخص بغیر ناشتہ کے گھر سے نکل جاوے تو دن بھر اپنے اس کئے پر نادم رہے گا۔ دوسرے سال بھر کی ندامت جیسے کہ کوئی وقت کے بعد بیج بوئے وہ سال بھر تک نادم رہے گا کہ میں نے یہ سال برباد کر دیا۔ تیسرے عمر بھر کی ندامت جیسے کہ کوئی خراب عورت سے نکاح کرے وہ عمر بھر پریشان رہے گا۔ چوتھے ہمیشہ کی ندامت۔ اللہ و رسول کا باغی آخری قسم کا نادم ہے کہ ہمیشہ ہی روئے گا جیسے کہ تریاق دیکھنا زہر کو دور نہیں کر سکتا بلکہ اس کا استعمال شرط ہے ایسے ہی کتاب اللہ و رسول کو معمولی طرح دیکھ لینا زہر کفر نہیں مٹاتا بلکہ ان کی اطاعت و فرمانبرداری اس زہر کا علاج ہے۔

حکایت: نصیر الدین طوسی جو کہ علم ریاضی کا بڑا ماہر گزرا ہے ایک ولی سے ملاقات کرنے گیا کسی نے ان بزرگ سے عرض کیا کہ یہ دنیا کا اس وقت بڑا عالم ہے انہوں نے پوچھا اس میں کیا کمال ہے کہا کہ علم نجوم میں کامل ماہر ہے فرمایا سفید گدھا اس سے زیادہ نجوم جانتا ہے طوسی کو بہت ناگوار گزرا اور وہاں سے اٹھ گیا۔ کمال اتفاق سے رات کو ایک چکی والے کے گھر پہنچا جس کے یہاں بہت سے گدھے پلے ہوئے تھے گدھے والا بولا حضرت آج سخت بارش ہوگی۔ اندر آرام کرو طوسی نے پوچھا تجھے کیا خبر اس نے کہا جب میرا گدھا اپنی دم تین بار ہلاتا ہے تو سخت بارش ہوتی ہے۔ آج اس نے دم ہلائی ہے چنانچہ کچھ دیر بعد تیز بارش آ گئی۔ تب یہ نادم ہوا کہ واقعی گدھے بھی علم نجوم والے سے زیادہ واقفیت رکھتے ہیں، ہوا میں اڑنا، دریا پر چلنا، بڑا عالم ہو جانا کوئی کمال نہیں۔ مکھی بھی اڑتی ہے۔ مچھلی بھی تیرتی ہے۔ چیل آندھی کو اور مینڈک بارش کو پہلے سے ہی معلوم کر لیتے ہیں یہ اوصاف جانوروں میں بھی ہیں بڑا علم شیطان کو بھی تھا۔ تصوف اور فقیری اطاعت مصطفیٰ علیہ السلام سے حاصل ہوتی ہے۔

ریاضت نام ہے تیری گلی میں آنے جانے کا	تصور میں ترے رہنا عبادت اس کو کہتے ہیں
تجھی کو دیکھنا تیری ہی سننا تجھ میں گم ہونا	حقیقت معرفت اہل طریقت اس کو کہتے ہیں

صوفیاء فرماتے ہیں بنی اسرائیل توریت کے منکر نہ تھے اسے مانتے بھی تھے۔ اس پر عمل کا دعویٰ بھی کرتے تھے مگر رب نے فرمایا کہ انہوں نے اسے پیٹھ کے پیچھے پھینک دیا کیونکہ حضور کا انکار کر کے توریت کا ماننا ماننا نہیں اس پر عمل عمل نہیں تمام چیزیں قالب ہیں حضور قلب۔ یوں ہی حضور سے منہ موڑ کر توحید توحید نہیں نماز وغیرہ عبادات عبادتیں نہیں قرآن پڑھنا تلاوت نہیں بلکہ ایسا شخص توحید وغیرہ کو پس پشت ڈالنے والا ہے۔ نیز جب توریت نے حضور کو برحق کہا اپنے کو حضور کی آمد پر منسوخ فرمایا۔

وَ اتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ عَلٰی مُلْكِ سُلَیْمٰنَ ۚ وَ مَا

اور پیروی کی انہوں نے اس کی جو پڑھتے ہیں شیطان اوپر سلطنت سلیمان کے اور نہیں

اور اس کے پیرو ہوئے جو شیطان پڑھا کرتے تھے سلطنت سلیمان کے زمانے میں اور

كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ
کفر کیا سلیمان نے اور لیکن شیطانوں نے کفر کیا سکھاتے ہیں
سلیمان نے کفر نہ کیا ہاں شیطان کافر ہوئے
السِّحْرَ ق
لوگوں کو جادو
لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **پہلا تعلق:** پہلے فرمایا گیا تھا کہ یہود نے اللہ کی کتاب کو پس پشت ڈال دیا۔ اب اس کی بڑی وجہ بتائی جا رہی ہے کہ یہ لوگ جادو سیکھنے سکھانے میں مشغول ہو گئے اس لئے کتاب الٰہی کو پھینک بیٹھے **دوسرا تعلق:** پہلے کہا گیا تھا کہ یہود حضرت جبریل کے مخالف ہیں اب فرمایا گیا کہ کیوں نہ ہوں یہ تو ان شیاطین کے دوست ہیں جنہوں نے علم جادو کو رواج دیا۔ رب کے دشمنوں سے دوستی کرنے والا راضی ہونے والا رب کے دین سے عداوت کرتا ہے۔ **تیسرا تعلق:** پہلے فرمایا گیا تھا کہ یہ رسول اللہ ﷺ اگلے پیغمبروں اور ان کی کتابوں کو سچا فرماتے ہیں اب اس کی زندہ مثال پیش فرمائی جا رہی ہے کہ دیکھو حضرت سلیمان کو عام یہودیوں نے جادوگر کہا ان کی نبوت کا انکار کیا حضرت سلیمان پر بھی اسی نبی کا کرم ہے کہ انہوں نے ان سے یہ الزام دور کیا اور دنیا میں ان کی نبوت کا اعلان فرمایا **چوتھا تعلق:** یہود نے کہا کہ اگر میکائیل قرآن لاتے تو ہم اس پر ایمان لے آتے اب فرمایا جا رہا ہے کہ اے یہودیو یہ نہ کہو بلکہ یوں کہو کہ اگر یہ علم جادو ہوتا اور شیاطین اس کے لانے والے ہوتے تو ہم اس پر ایمان لے آتے کیونکہ تم جادو کے متوالے ہو۔

شان نزول

تفسیر کبیر نے فرمایا کہ علماء یہود کہا کرتے تھے کہ محمد ﷺ پر تعجب ہے کہ حضرت سلیمان کو نبی کہتے ہیں وہ تو صرف جادوگر تھے ان کی تردید میں یہ آیت اتری، تفسیر خزائن العرفان میں فرمایا گیا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد سے حضور ﷺ کے زمانہ پاک تک یہ ہی مشہور رہا کہ سلیمان علیہ السلام جادوگر تھے جادو ہی کے زور سے انہوں نے اتنی بڑی سلطنت حاصل کر لی تھی۔ حق تعالیٰ نے یہود کی تردید اور حضرت سلیمان علیہ السلام کی تائید کے لئے یہ آیت اتاری ان دونوں قولوں کا نتیجہ یہ ہی نکلتا ہے ان میں کچھ اختلاف نہیں۔

تفسیر

وَاتَّبَعُوْا یہ لفظ اتباع سے بنا ہے جس کے معنی ہیں کسی کے پیچھے چلنا، یہاں پیروی کرنا مراد ہے یا اس سے وہ یہود مراد ہیں جو

حضور علیہ السلام کے زمانہ میں موجود تھے کیونکہ وہ بھی جادو کے بہت دلدادہ تھے یا ان کے پیچھے لوگ عام یا یہودی کیونکہ یہ سب ہی حضرت سلیمان کی نبوت کے منکر تھے مَاتَتْلُوا الشَّیٰطِیْنُ مَا سے مراد جادو کی کتابیں یا ان کے منتر ہیں تَتْلُوْا تلاوت سے بنا ہے جس کا مادہ تَلْوٌ ہے اس کے معنے ہیں پیچھے ہونا یا پیچھے چھوڑنا اس لئے منطق میں شرط کی جزا کو تالی کہتے ہیں کہ وہ مقدم سے پیچھے ہوتی ہے کیونکہ پڑھنے والا بھی کتاب کی عبارت کو پیچھے چھوڑتا ہے اور آگے بڑھتا رہتا ہے اسی لئے پڑھنے اور خبر دینے کو تلاوت کہا جاتا ہے اگر اس کے بعد لام آئے تو سچی خبر دینے کے معنی ہوں گے اور اگر علیٰ آوے تو جھوٹی خبر کے معنے تلوت لہ اور تلوت علیہ چونکہ یہاں علیٰ آرہا ہے لہٰذا اس کے معنی جھوٹی خبر کے ہوئے (تفسیر کبیر) شیاطین سے یا تو خبیث جن مراد ہیں جیسا کہ روایت میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی وفات کے بعد شیطان شکل انسانی میں یہود کے پاس جا کر بولا حضرت سلیمان کی سلطنت جادو کے زور سے تھی آؤ میں تمہیں جادو کی کتابیں دکھاؤں یہ کہہ کر ان کے تخت کے نیچے کی زمین کھدوائی اور وہاں سے جادو کی کتابیں نکلوائیں اس کا پورا قصہ انشاء اللہ خلاصہ تفسیر میں آئے گا اور یا خبیث انسان مراد ہیں جیسا کہ روایت میں ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے علوم کتابوں میں جمع فرما کر اپنے تخت کے نیچے داب دیئے۔ ان کی وفات کے بعد کچھ عرصہ، منافقین نے چپکے سے وہ کتب نکال کر ان میں جادو شامل کر دیا۔ اور لوگوں سے کہا کہ ان ہی علوم کی وجہ سے وہ اتنے بڑے بادشاہ بن گئے تھے (تفسیر کبیر) شیطان شطن سے بنا ہے جس کے معنی ہیں فساد اور فریب۔ ہر فسادی اور فریب کار لغۃً شیطان ہے۔ شریعت میں ابلیس کو شیطان کہتے ہیں۔ یہ تمام جنات کا باپ ہے اس کی پیدائش آگ سے ہے۔ خرپوتی شرح قصیدہ بردہ میں ہے کہ شیطان کی ایک ران میں مذکر کی علامت ہے اور دوسری میں مونث کی خود اپنے سے جماع کرتا ہے اور خود حاملہ ہوتا ہے اور خود بچہ جنتا ہے اس کے علاوہ ان کی پیدائش کے بہت سے طریقے ہیں ہر انسان کے ساتھ ہی شیطان پیدا ہوتا ہے جسے ہمزاد کہتے ہیں اسی کو لوگ بھوت وغیرہ بھی کہا کرتے ہیں حدیث شریف میں ہے کہ اگر انسان جماع کے وقت بسم اللہ نہ پڑھے تو اس جماع میں شیطان شریک ہو جاتا ہے اور بچے میں شیطانی صفات ہوتے ہیں۔ عَلٰی مُلْکِ سُلَیْمٰنَ یا تو علیٰ فی کے معنے میں ہے اور ملک سے پہلے عہد پوشیدہ ہے یعنی یہود نے اس جادو کی پیروی کی جو شیاطین سلمان علیہ السلام کی سلطنت کے زمانہ میں لوگوں کو بتاتے تھے یا معنی یہ ہیں کہ حضرت سلیمان کی سلطنت پر بہتان باندھتے تھے کہ شیاطین جادو سکھاتے تھے تفسیر کبیر نے اس کے بہت نفیس معنے یہ بھی کئے کہ شیاطین حضرت سلیمان کی سلطنت پر بہتان باندھتے تھے کہ یہ سب جادو کی وجہ سے ہوا۔ اب علیٰ اپنے ہی معنی میں رہا اور کسی لفظ کے پوشیدہ ماننے کی بھی ضرورت نہ رہی ملک سلیمان سے یا ان کی ظاہری بادشاہت مراد ہے یا باطنی یا نبوت یا ان کی وحی اور شریعت (تفسیر کبیر) رب تعالیٰ ان کی براءت فرماتا ہے کہ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ حضرت سلیمان نے کبھی کفر نہ کیا یعنی اکثر جادو میں کفر ہوتا ہے یا اس میں کفر یہ شرائط پائی جاتی ہیں یا عملاً کفر ہے یعنی جادو کرنا کفار کا کام تھا اور چونکہ سلیمان علیہ السلام پیغمبر تھے اس لئے وہ جادو کر سکتے ہی نہیں۔ جب جادو اور ایمان جمع نہیں ہو سکتے تو جادو اور نبوت میں کیونکر اجماع ہوگا بلکہ بات یہ ہے وَ لٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا کہ دراصل انسانی یا جنی شیطانوں نے کفر کیا کہ يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ کہ لوگوں کو جادو سکھاتے ہیں

سحر کے لفظی معنی ہیں چھپی چیز صبح صادق کو اس لئے سحر کہتے ہیں کہ وہ رات کی اندھیری میں کچھ چھپی ہوتی ہے سینہ کو بھی اسی لئے سحر کہا جاتا ہے کہ وہ کرتے یا قمیص سے چھپا رہتا ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور علیہ السلام کی وفات بَیْنَ سَحْرِیْ وَنَحْرِیْ یعنی میرے سینے اور گلے کے درمیان ہوئی جادو کو بھی سحر اسی لئے کہتے ہیں کہ اس کا سبب چھپا ہوتا ہے شریعت میں سحر کے معنی ہیں خفیہ طور پر کسی چیز کو خلاف اصل ظاہر کرنا یہ برا بھی ہے اور اچھا بھی کسی کو فریب دینے کے لئے یہ حرکت کرنا برا ہے اپنے زور بیان سے غلط بات کو بھی ثابت کر دینا کمال ہے۔ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں۔ اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا بعض وعظ جادو ہوتے ہیں۔ یعنی بعض وعظ اپنے زور بیان سے مشکل بات کو واضح کرتے ہیں اور ان کے کلام کا جادو کی طرح دلوں پر اثر ہوتا ہے آیت میں برا جادو ہی مراد ہے جادو کی قسمیں اور ان کے احکام انشاء اللہ فوائد میں بیان ہوں گے اس زمانے کے بعض روشن دماغ لوگ جنات اور جادو کے منکر ہیں مگر یہ انکار گمراہی ہے یہ دونوں برحق ہیں حضور پر جادو کا اثر ہو گیا تھا جس کے اتارنے کے لئے سورۂ فلق اور سورۂ ناس نازل ہوئیں۔ موسیٰ علیہ السلام کا جادوگروں سے مقابلہ قرآن کریم میں بہت تفصیل سے مذکور ہے یوں ہی جنات بھی انسانوں پر اثر کر دیتے ہیں رب فرماتا ہے اَلَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ۔ (بقرہ:۲۷۵)

خلاصہ تفسیر

حضور علیہ السلام کی تشریف آوری سے پہلے شیاطین جنات آسمان پر جاتے اور فرشتوں کے کلام سنا کرتے تھے جو آئندہ واقعات کی بابت آپس میں گفتگو کرتے ہوتے تھے یہ گفتگو سن کر کاہنوں کو سناتے تھے مگر اس میں بہت جھوٹ ملا کر پھر وہ کاہن (پنڈت نجومی) لوگوں کو یہ خبریں پہنچاتے تھے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں چونکہ جنات سے عمارات بنوانے، کنوئیں اور نہریں کھدوانے، عمدہ عمدہ حوض و قلعے بنوانے کا کام لیا جاتا تھا جس سے کہ شیاطین اور انسانوں سے خلط ملط رہتا تھا۔ چونکہ جنات کی طاقت انسان سے زیادہ ہے اس لئے وہ انسانوں کو عجیب عجیب کرتب دکھا کر انہیں حیران کر دیتے تھے۔ انسان ان سے پوچھتے کہ تم یہ عجیب کام کیسے کر لیتے ہو تو وہ کہتے کہ فلاں منتر اور فلاں ٹوٹکے کے زور سے وہ لوگ ان منتروں اور ٹوٹکوں کو جن میں صدہا کفریہ اور شرکیہ باتیں ہوتی تھیں سیکھ لیتے بلکہ لکھ لیتے اور جب انسان بھی یہ منتر پڑھتے تو در پردہ شیطان کوئی عجیب کام کر دیتے تھے جس سے انسانوں کو یقین ہو گیا کہ یہ منتر بہت تاثیر والے ہیں۔ یہاں تک کہ ان منتروں کی کتابیں تیار ہو گئیں۔ ہوتے ہوتے سلیمان علیہ السلام کو خبر لگی آپ نے اپنے وزیر آصف بن برخیا کو حکم دیا کہ شیطانوں کو جمع کر کے انہیں انسانوں سے ملاقات کرنے سے روک دو اور وہ تمام کتابیں جمع فرما کر صندوق میں بھر کر اپنے تخت کے نیچے دفن کرا دیں اور حکم دیا کہ جو کوئی منتر جادو کرے گا سخت سزا پائے گا آپ کی وفات کے بعد شیطان یہود کے پاس انسانی شکل میں آیا اور بولا کہ تمہیں خبر ہے کہ حضرت سلیمان کو اتنی بڑی بادشاہت کیونکر ملی، صرف اس جادو سے ملی۔ جس کی کتابیں ان کے تخت کے نیچے جمع ہیں اگر تم بھی ان کتابوں پر عمل کر دتو ان کی طرح بادشاہ بن جاؤ گے پھر کیا تھا یہود دوڑے اور زمین کھود کر کتابوں کا صندوق نکالا ان میں لکھے ہوئے جنتر منتروں پر عمل شروع کیا۔ چونکہ شیاطین چاہتے تھے کہ انسان

ہماری پوجا کریں۔ ان منتروں میں بت پرستی کی شرائط تھیں۔شیاطین سے مدد مانگنے کے الفاظ جب یہود یہ الفاظ پڑھتے شیطان چپکے سے ان کا کام کر دیتے رفتہ رفتہ تقریباً ساری قوم یہود نے توریت کو چھوڑ دیا اور ان واہیات میں پھنس گئے اور ان میں یہ مشہور ہو گیا کہ سلیمان علیہ السلام بادشاہ نہ تھے صرف جادوگر حضور علیہ السلام کے زمانہ پاک تک یہی مشہور رہا۔اس آیت نے اصلی بات بتائی۔اور حضرت سلیمان علیہ السلام سے یہ اتہام دور کیا فرمایا کہ اے بے دین یہودیو! حضرت سلیمان پیغمبر ہیں اور جادو یا تو خود کفر ہے یا اس میں بت پرستی جنات پر بھینٹ قربانی ان کی نذر و نیاز وغیرہ کفریات کی شرطیں ہیں یا یہ کفار کا کام ہے۔اتنا بڑا پیغمبر کفر کیسے کر سکتا ہے انہوں نے کبھی بھی کفر نہ کیا بلکہ شیاطین نے کفر کیا کہ ان کے زمانہ میں موقع پا کر لوگوں کو جادو سکھایا اور الٹا حضرت سلیمان علیہ السلام کو الزام لگایا وہ اس الزام سے بری ہیں اللہ کے مقبول پیغمبر ہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** جادو کے موجد دراصل شیاطین ہیں نہ کہ حضرت سلیمان اور نہ ہاروت ماروت، جب جادو پھیل گیا تو لوگوں کے بچانے کے لئے ہاروت ماروت آئے جیسا کہ اگلی آیت میں معلوم ہوگا اسی لئے قرآن کریم نے پہلے شیاطین کا ذکر فرمایا اور پھر ہاروت ماروت کا اور ساتھ ہی فرمادیا کہ ہاروت و ماروت اس سے لوگوں کو روکتے ہیں۔ **دوسرا فائدہ:** جادو اکثر کفر ہی ہوتا ہے یا تو خود اس میں کفریہ الفاظ ہوتے ہیں یا کفریہ شرائط یہ کفار کا کام ہے اور کفر **تیسرا فائدہ:** کفر سکھانا کفر ہے جب کہ عمل کے لئے ہو اگر بچنے کے لئے سکھایا تو کفر نہیں شیطانوں نے عمل کے لئے جادو سکھایا اور وہ کافر ہوئے ہاروت و ماروت نے بچنے کے لئے جادو سکھایا وہ کافر نہ ہوئے علماء کرام کفریہ الفاظ بچنے کے لئے بتاتے اور کتب فقہ میں لکھتے ہیں یہ بہت ثواب ہے لیکن اگر یہ ہی الفاظ عمل کے لئے سکھائے جائیں تو سیکھنے سکھانے والے دونوں کافر۔ **چوتھا فائدہ:** انبیاء کرام کفر اور گناہ کبیرہ سے معصوم ہوتے ہیں۔ دیکھو حضرت سلیمان علیہ السلام کو لوگوں نے جادوگری کی تہمت لگائی تو قرآن کریم نے ان کی سخت تردید فرمادی جو ان کو جادوگر یا ایک منٹ کے لئے کافر مانے وہ خود بے دین ہے **پانچواں فائدہ:** حضور علیہ السلام کی ذات سے گذشتہ پیغمبروں کو بھی فائدے پہنچے حضور سے ہی حضرت عیسیٰ کی والدہ حضرت مریم کی پاک دامنی کے خطبے پڑھے گئے حضور سے ہی حضرت سلیمان علیہ السلام سے جادوگری کا الزام دور ہوا اور دنیا نے ان کو پیغمبر مانا اسی لئے انبیاء کرام حضور کی بشارتیں سناتے اور خوشیاں مناتے تھے کہ ان کے دم قدم سے ہماری بگڑی بنے گی۔ رب تعالیٰ حضور کے طفیل ہمارے عیب چھپالے اور ہماری بھی بگڑی بنائے۔
چھٹا فائدہ: بعض جادو خود کفر ہیں اور بعض میں کفریہ شرطیں ہیں بعض کفر تو نہیں مگر حرام ہیں اور بعض جادو حلال، جادو خواہ کیسا ہی ہو مگر اس کا سیکھنا کفر نہیں ہر علم سیکھنا اچھا ہے (تفسیر کبیر) ہاں عمل کے لئے سیکھنا کفر ہے اگر بعض جادو سیکھنا یا سکھانا کفر ہوتا تو ہاروت و ماروت معصوم فرشتے اس کی تعلیم کے لئے رب کی طرف سے نہ آتے نیز اس آیت سے حضرت سلیمان کے جادو کرنے کی نفی ہے نہ کہ جاننے کی حضرت خود جانتے تھے مگر کبھی کیا نہیں اس کی تحقیق ہماری کتاب جاء الحق میں دیکھو **ساتواں فائدہ.** تفسیر کبیر و عزیزی نے جادو سلیمان کی آٹھ قسمیں بتائیں اور ہر ایک کے علیحدہ علیحدہ احکام بتائے

(۱) جادو کلدائیں یا جادو بابل یہ ہی ہاروت و ماروت سے نکلا ہے یہ جادو تمام جادوؤں سے مشکل ہے اور اس سے عجیب عجیب کام ہوتے ہیں اس کی حقیقت یہ ہے کہ سارے اجسام میں ایک قدرتی روح ہے۔ چاند، سورج، تارے چاروں عناصر (پانی ہوا آگ مٹی) اس جادو میں تمام روح کو اپنے تابع کر لیا جاتا ہے جن سے جو چاہے کام لیتے ہیں اسی جادو کا بابل میں بہت زور تھا اور اسی کی تردید کرنے حضرت ابراہیم علیہ السلام بھیجے گئے۔ چونکہ اس قسم کا جادوگر عالم کی تمام چیزوں پر حکومت کرتا ہے اس لئے ابراہیم علیہ السلام کو رب نے سارے عالم کی چیزیں دکھا دیں۔ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (انعام: ۷۵) تا کہ وہ ان تمام چیزوں کو ملاحظہ فرما کر معلوم فرمالیں کہ سب رب کے حکم کے تابع ہیں اور آپ نے سیر کر کے فرمایا اِنِّيْ وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (انعام: ۷۹) اے قوم تم ان چاند، سورج میں مستقل تاثیر مان بیٹھے میں تو ان کے خالق کو مانتا ہوں نمرود کے زمانہ میں اس جادو سے بہت سی عجیب چیزیں بنائی گئیں تھیں۔

حکایت: نمرود کے زمانہ میں تانبے کی ایک بط تھی، جس وقت کوئی جاسوس یا چور اس شہر میں آتا تو اس بط سے آواز نکلتی جس سے وہ پکڑا جاتا۔ ایک نقارہ تھا کہ جب کسی کی کوئی چیز گم ہو جاتی اس میں چوب مارتے نقارہ اس چیز کا پتہ دیتا ایک آئینہ تھا جس سے غائب شخص کا حال معلوم ہوتا تھا جب بھی اس آئینہ میں نظر کی وہ غائب آدمی اس کا شہر اور قیام گاہ اس میں نمودار ہو گئی۔ نمرود کے دروازے پر ایک درخت تھا جس کے سایہ میں درباری لوگ بیٹھتے تھے جوں جوں آدمی بڑھتے جاتے اس کا سایہ پھیلتا جاتا تھا۔ ایک لاکھ آدمی تک سایہ پھیلتا رہتا تھا۔ اگر لاکھ سے ایک بھی زیادہ ہو جاتا سارے دھوپ میں آجاتے ایک حوض تھا جس میں مقدمات کا فیصلہ ہوتا تھا۔ مدعی اور مدعی علیہ باری باری اس میں گھستے جو سچا ہوتا اس کے ناف کے نیچے پانی رہتا تھا اور جو جھوٹا ہوتا اس میں غوطہ کھاتا تھا۔ اگر فوراً توبہ کر لیتا تو بچ جاتا ورنہ ہلاک ہو جاتا اس قسم کی طلسمات پر اس نے دعویٰ خدائی کر دیا تھا۔ جادو خالص کفر و شرک ہے کیونکہ اس میں جادوگر تمام چیزوں کی روح کو مستقل موثر جانتا ہے اور ان کی قربانی نذر و نیاز استمداد وغیرہ کرتا ہے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ جنات شیاطین کو تابع کر لیا جائے اور ان سے حسب منشاء کام لیا جاوے۔ اس کا اب بھی بہت رواج ہے اور یہ آسانی سے حاصل ہو جاتا ہے یہ بھی صریح کفر ہے کہ اس میں بتوں کی پرستش ان کے نام کی بھینٹ و قربانی وغیرہ کرنا ہوتی ہے۔ تیسری قسم یہ ہے کہ مردہ انسانوں کی روحوں کو منتر وغیرہ سے قبضہ میں کیا جاوے اور اس سے کام لئے جائیں اور اس کو عمل ہمزاد یا عمل بیر بھی کہتے ہیں یہ بھی کفر ہے کہ اس میں شیاطین کی پرستش اور ان سے استمداد وغیرہ ہوتی ہے کہ ہمزاد کو ہمارے قابو میں کر دو۔ اس قسم کا جادو شہوت پرستی اور غصہ وغیرہ میں کام آتا ہے۔ اس لئے عیاش جوگی وغیرہ اس کے عامل ہوتے ہیں۔ چوتھی قسم یہ ہے کہ کسی ذریعہ سے انسان کے خیالات اور حواس خراب کر دیئے جاتے ہیں۔ جس سے اس کو کچھ کا کچھ نظر آنے لگتا ہے۔ اس کو نظر بندی کہتے ہیں اسی جادو کا فرعون کے زمانے میں بہت زور تھا۔ قرآن کریم فرماتا ہے يُخَيَّلُ اِلَيْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰى (طٰہٰ: ۶۶)۔ وہ رسیوں کو سانپ کی طرح چلتا پھرتا دکھائی دیتے تھے آج بھی بعض جادوگر مٹی کا روپیہ بنا کر لوگوں کو دکھاتے ہیں اور پھر پیسہ پیسہ بھیک مانگتے ہیں اگر وہ مٹی واقعہ روپیہ ہو

جاتی تو یہ بھیک کیوں مانگتے اس قسم کا جادو کفر نہیں۔ ہاں اولیاء اللہ کے مقابلہ میں کیا جاوے تو گناہ کبیرہ ہے انبیاء کے مقابلہ میں ہو تو کفر کیونکہ مقابلہ نبی کفر ہے۔ پانچویں قسم خیالی جادو ہے کہ مطلوب کی صورت کو سامنے رکھ کر اس پر نظر اور خیال خوب جمایا یہاں تک کہ مقصد حاصل ہو گیا۔ اس کو مسمریزم بھی کہتے ہیں کہ انسان کی نظر سے چیز کھینچ آتی ہے اور معلق ہو جاتی ہے وغیرہ وغیرہ یہ جادو اگر حلال کام کے لئے کیا جاوے تو حلال ہے اور حرام کے لئے ہو تو حرام ہے چھٹی قسم نیرنج ہے جس میں بعض بعض دوائیں وغیرہ کے ذریعہ عجیب عجیب کام کئے جاتے ہیں مثلاً کوئی شخص اپنی انگلی کو کابلی سرکہ میں تر کر کے سمندری جھاگ میں ملا کر مالش کرے تو انگلیاں آگ میں نہ جلیں گی وغیرہ وغیرہ بعض گھڑیوں کے حروف رات میں چمکتے ہیں ان میں بھی کوئی مصالحہ ہی ہوتا ہے۔ ساتویں قسم سحر حیل ہے۔ جس میں سائنسی آلات کے ذریعہ عجیب کام ہوتے ہیں، جیسے ریڈیو، فوٹو گراف وغیرہ۔ آٹھویں قسم شعبدہ ہے جس کو ہاتھ کی صفائی بھی کہتے ہیں اس میں اس چالاکی سے چیز بدلی جاتی ہے کہ دیکھنے والوں کو اس کا پتہ نہیں چلتا اور وہ سمجھتے ہیں کہ اس نے یہ چیز ہی بدل دی یہ تینوں قسمیں نہ کفر ہیں نہ حرام صوفیاء عظام نے آیات قرآنیہ اور اعمال جائز اور اسمائے الٰہیہ سے وہ وہ عجیب باتیں دکھائیں جن سے ساحر بھی حیران رہ گئے۔ **آٹھواں فائدہ:** بزرگوں کے کمال یا اعمال کو نہ دیکھنا اور ان کا حال دیکھنا اور اسے ناجائز طریقوں سے حاصل کرنے کی کوشش کرنا اور ان پر جھوٹے اتہام باندھنا کہ انہیں یہ مال فلاں ناجائز طریقے سے حاصل ہوا کفار کا طریقہ ہے۔ دیکھو بنی اسرائیل نے حضرت سلیمان کے اعمال و کمال نہ تو دیکھے نہ ان کی پیروی کرنے کی کوشش کی ان کا مال و دولت دیکھا اور کہا کہ آپ نے یہ سب جادو سے حاصل کیا پھر اس کی ہوس میں خود جادو سیکھا اس سے وہ لوگ عبرت پکڑیں جو آج مشائخ کے لنگروں ان کی دنیاوی مالداری کو دیکھ کر ان پر اعتراض کرتے ہیں جیسے حضور غوث پاک کی مالداری۔ انبیاء صفات الٰہی کے مظہر ہیں اس لئے ان کے رنگ مختلف ہیں حضرت سلیمان علیہ السلام بہت غنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام بالکل تارک الدنیا اولیاء اللہ انبیاء کے مظہر ہیں اس لیے ان کے رنگ بھی جداگانہ ہیں۔ حضور غوث پاک مالدار ہیں حضرت ابن ادھم مسکین۔ **نواں فائدہ:** حضرات انبیاء کرام سے کفار کے اعتراض اٹھانا سنت الٰہیہ ہے دیکھو کفار نے حضرت سلیمان کو جادو کی تہمت لگائی رب نے ان کی صفائی بیان کی۔ حمد الٰہی سنت انبیاء ہے نعت مصطفوی سنت الٰہیہ اور سنت انبیاء۔ **دسواں فائدہ:** ہمارے حضور کا سارے نبیوں پر احسان ہے کہ حضور کی برکت سے ان پر سے کفار کے الزام اٹھے۔ **مسئلہ:** تعویذ لکھ کر گلے میں ڈالنا نظر بند وغیرہ کے لئے جائز اور دعائیں پڑھنا جائز ہیں۔ خود حضور علیہ السلام نے ایسی دعاؤں کی تعلیم دی اور صحابہ کرام نے عمل کئے **مسئلہ:** کفریہ الفاظ سے منتر کرنا نجاست سے آیات قرآنیہ لکھنا (جیسے خون یا پیشاب وغیرہ) الٹی آیات پڑھنا یا لکھنا حرام ہیں اس سے بچنا ضروری ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: سحر وغیرہ خلاف عقل ہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ انسانی الفاظ یا آواز میں ایسی عجیب تاثیریں ہوں گی یہ تو اس کے وہم ہیں (نیچری) **جواب:** الفاظ اور آواز میں بہت تاثیریں ہیں گالی سے رنج، صدمہ کی خبر سے موت، خوشی کی

خبر سے فرحت حاصل ہوتی ہے یہ الفاظ ہی تو ہیں، فوجی حاکم کی سیٹی (بگل) سے فوج کا حملہ اور گارڈ کی سیٹی سے ریل کی روانگی ہو جاتی ہے۔ جس ساحر کے قبضہ میں جنات ہوں وہ اس کا اشارہ پا کر کچھ حرکت کرتے ہیں تو کیا تعجب ہے۔ سانپ کی پھونک میں زہر نیولے کی پھونک میں تریاق ہے۔ ایسے ہی قرآن خوان کی پھونک میں شفا اور جادوگر کی پھونک میں بیماری ہونا کوئی مشکل نہیں۔ **دوسرا اعتراض:** رب تعالیٰ نے ایسی نقصان دہ چیزوں کو پیدا ہی کیوں فرمایا؟ **جواب:** دنیا کا انتظام مضر اور مفید چیزوں سے ہی قائم ہے اس نے سانپ بچھو وغیرہ زہریلے جانور کیوں پیدا کیے آپ کو کیوں پیدا کیا۔ آپ کی ذات سے بجز زمین گندہ کرنے کے اور کیا حاصل ہے۔ **تیسرا اعتراض:** حضرت سلیمان علیہ السلام نے وہ جادو کی کتابیں دفن کیوں کرائیں۔ جلوا کیوں نہ دیں تا کہ وہ مٹ جائیں۔ **جواب:** وہ رب کی مرضی سے واقف تھے ان کا ہر کام ادھر کے اشارے پر ہوا یہ ایسا ہی سوال ہے کہ کہا جاوے کہ انہوں نے سانپ وغیرہ مروا کیوں نہ دیئے۔ شیاطین کو زندہ ہی کیوں چھوڑا۔ خود رب نے شیطان کو ہلاک ہی کیوں نہ کیا۔ اس کو قیامت تک مہلت کیوں دے دی؟ تفسیر صوفیانہ پوری آیت کے بعد بیان ہوگی۔

وَ مَاۤ اُنۡزِلَ عَلَی الۡمَلَکَیۡنِ بِبَابِلَ هَارُوۡتَ وَ مَارُوۡتَ ؕ
اور وہ جو اتارا گیا اوپر دو فرشتوں کے بیچ بابل کے ہاروت اور ماروت
اور وہ جادو جو بابل میں دو فرشتوں ہاروت اور ماروت پر اترا
وَ مَا یُعَلِّمٰنِ مِنۡ اَحَدٍ حَتّٰی یَقُوۡلَاۤ اِنَّمَا نَحۡنُ فِتۡنَۃٌ فَلَا
اور نہیں سکھاتے کسی کو یہاں تک کہ کہتے ہیں بجز اس کے نہیں کہ ہم آزمائش ہیں پس نہ
اور وہ دونو کسی کو کچھ نہ سکھاتے جب تک کہ یہ نہ کہہ لیتے کہ ہم تو نری آزمائش ہیں
تَکۡفُرۡ ؕ فَیَتَعَلَّمُوۡنَ مِنۡہُمَا مَا یُفَرِّقُوۡنَ بِہٖ بَیۡنَ الۡمَرۡءِ وَ
کفر کر تو پس سیکھتے ہیں وہ چیز جو جدائی ڈالیں ساتھ اس کے درمیان
تو اپنا ایمان نہ کھو تو ان سے سیکھتے وہ جس سے جدائی ڈالیں
زَوۡجِہٖ ؕ
مرد اور بیوی اس کی کے
مرد اور اس کی عورت میں

تعلق

یہ جملہ پچھلے جملہ کا تتمہ ہے۔ پہلے مطلق سحر کا ذکر ہوا اب خاص کا ذکر ہو رہا ہے پہلے بتایا گیا تھا کہ شیاطین سے سحر حاصل کیا گیا

اب بتایا جارہا ہے کہ فرشتوں سے بھی حاصل کیا گیا۔

تفسیر

وَمَآ اُنۡزِلَ یہ ما موصولہ ہے اس کا عطف یا تو سحر پر ہے یا وَاتَّبَعُوۡا کے مَا پر یعنی سکھاتے ہیں شیاطین جادو اور وہ چیز جو ہاروت وماروت پر اتاری گئی یا پیروی کی یہود نے شیطانوں کے بتائے جادو کی اور اس کی جو ہاروت وماروت پر اتاری گئی یا مُلۡكِ سُلَيۡمٰنَ پر عطف ہے یعنی شیاطین نے حضرت سلیمان پر تہمت باندھی اور ہاروت وماروت کے اتارے ہوئے پر بھی نہ تو سلیمان علیہ السلام نے جادو کیا اور نہ ہاروت ماروت نے بعض نے فرمایا کہ یہ ما نافیہ ہے اور اس کا عطف مَا كَفَرَ سُلَيۡمٰنُ کے ما پر ہے یعنی نہ تو حضرت سلیمان نے کفر کیا اور نہ ہاروت ماروت پر کچھ اترا۔ اس ما نے اس سارے جملہ کی نفی کردی ان آخر کی دو صورتوں میں ہاروت وماروت کے قصہ کی بالکل نفی ہی ہو جاوے گی۔ مگر پہلے دو معنے زیادہ صحیح ہیں۔ کیونکہ احادیث سے پتا چلتا ہے کہ ہاروت وماروت کا واقعہ بالکل صحیح اور ان ہی پہلے معنی میں آیت کی عبارت بھی بے جوڑ نہیں ہوتی۔ اُنۡزِلَ عَلَيۡهِمۡ یا عُلِّمَ کے معنے میں ہے یعنی وہ جادو جو ہاروت وماروت کو سکھایا گیا یا ان کو الہام کیا گیا کیونکہ جادو بذریعہ وحی نہیں آیا بلکہ قدرتی طور پر ان کے دل پر القا ہوا قرآن شریف میں اُنۡزِلَ خلق کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے اور القاء یعنی ڈالنے کے معنے میں بھی رب فرماتا ہے وَاَنۡزَلۡنَا الۡحَدِيۡدَ (الحدید:۲۵) ہم نے لوہا پیدا کیا یا ان کانوں میں ڈالا کیونکہ لوہا برستا نہیں یہاں بھی انہیں معنی میں ہے چونکہ ہر چیز کا خزانہ آسمان ہے۔ جہاں سے خبریں آتی ہیں رب فرماتا ہے۔ وَفِي السَّمَآءِ رِزۡقُكُمۡ وَمَا تُوۡعَدُوۡنَ (الذاریات:۲۲) اس لئے انزال فرمانا درست رہتا ہے۔ عَلَى الۡمَلَكَيۡنِ مشہور قرءت ہے۔ مَلَكَيۡنِ لام کے زبر سے یعنی دو فرشتوں پر اور ایک قرءت میں مَلِكَيۡنِ ہے لام کے کسرہ سے یعنی دو بادشاہوں پر۔ تفسیر حقانی وغیرہ نے کہا کہ ہاروت وماروت دو نیک سیرت فرشتہ صفت بادشاہ تھے۔ لہٰذا مَلِكَيۡنِ کی قرءت میں ان کی صفت مراد ہے مگر یہ صحیح ہے کے دونوں فرشتہ ہی تھے مگر چونکہ اپنی عبادت وریاضت کی وجہ سے فرشتوں کے سردار تھے۔ اس لئے بعض قرءتوں میں مَلِكَيۡنِ (یعنی فرشتوں کی جماعت کے بادشاہ) آیا جیسے بعض ملائکہ کو ملک الجبال وغیرہ کہا جاتا ہے۔ یعنی جادو اتارا گیا دو ان فرشتوں پر جو دیگر فرشتوں کے بادشاہ ہیں لہٰذا دونوں قرءتیں مطابق ہوگئیں ان دونوں کا فرشتہ ہونا صحیح احادیث سے ثابت ہے اور مَلِكَيۡنِ کی قرءت بھی متواتر ہے۔ محض عقلی دلائل سے احادیث کو رد نہیں کیا جاسکتا اور متواتر قراءت کی مخالفت نہیں ہوسکتی۔ نیز ایک شہر بابل میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے اگر یہ بادشاہ ہوتے تو دو ملکوں میں رہتے۔ بِبَابِلَ یا تو یہ اُنۡزِلَ کے متعلق ہے یا پوشیدہ لفظ موجودین کے یعنے جادو دو فرشتوں پر بابل میں اتارا گیا۔ یا ان فرشتوں پر اتارا گیا جو کہ بابل میں اب موجود ہیں۔ دوسرے معنی کی احادیث سے تائید ہوتی ہے نیز وہ دونوں جادو جانتے ہوئے آسمان سے اترے تھے بابل میں نہیں سیکھا۔ بابل کوفہ، عراق کا ایک بڑا شہر ہے غالب یہ ہے کہ یہاں کوفہ کا بابل مراد ہے۔ اس کو بابل اس لئے کہتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کشتی سے اتر کر پہلے اسی جگہ پہنچے اور یہی شہر بنایا۔ اس کا نام ثمانین رکھا رب کی شان کہ ایک دن میں یہاں اسی زبانیں جاری ہوگئیں کسی کی عربی کسی کی فارسی وغیرہ تو آپ نے فرمایا قَدۡ تَبَلۡبَلَتۡ اَلۡسِنَتُهُمۡ ان کی زبانیں مختلف ہوگئیں۔

بلبلہ کے معنے ہیں مختلف ہونا تب سے اس شہر کا نام بابل ہوا۔ یعنی اختلاف کی جگہ (تفسیر روح البیان) ہاروت و ماروت ملکین کا بیان ہے یعنے وہ دو فرشتہ ہاروت و ماروت ہیں۔ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ اس میں ان کے طریق تعلیم کا ذکر ہے کہ وہ فرشتے شیاطین کی طرح جادو کی رغبت نہیں دیتے کسی سے جادو نہیں کراتے بلکہ جو خود بخود ان سے سیکھنے جاوے تو اس کو بھی فوراً نہیں سکھا دیتے بلکہ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ ان سے کہہ دیتے ہیں کہ ہم بندوں کے لئے آزمائش ہیں تاکہ ظاہر ہو جاوے کون سحر سے بچتا ہے اور کون اس کو اختیار کرتا ہے۔ خیال رہے کہ اس جگہ اِنَّمَا حصر اضافی کے لئے ہے یعنے ہمارا سکھانا جواز کی علامت نہیں۔ ہم جائز کرنے والے نہیں بلکہ صرف ذریعہ آزمائش ہیں۔ فتنہ کے لفظی معنی ہیں جانچ یا پڑتال عرب کہتے ہیں۔ فَتَنْتُ الذَّهَبَ عَلَى النَّارِ میں نے سونے کو آگ پر آزمایا۔ یعنی گلا کر معلوم کیا کہ کھرا ہے یا کھوٹا فَلَا تَكْفُرْ لہٰذا تو اس کو سیکھ کر یا اس پر عمل کر کے کفر اختیار نہ کر ہماری ان قیدوں کا فائدہ آئندہ معلوم ہوگا اگر وہ جانے والا یہ سن کر باز رہ جائے تو فبہا ورنہ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا لوگ ان دونوں سے وہ جادو سیکھ لیتے ہیں یہ ف جزائیہ ہے۔ جس کی طرف شرط پوشیدہ ہے یعنی اگر یہ لوگ ان کی نصیحت نہیں مانتے تو ان سے سیکھ لیتے ہیں۔ مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ وہ پرتاثیر جادو کہ جس سے عورت و مرد میں جدائی ڈال دیتے ہیں یا تو ان میں دشمنی اور عداوت ڈال کر یا مرد کو عورت کے قابل نہیں رکھتے۔ جس سے وہ اپنی بیوی سے علیحدہ رہتا ہے۔ یعنی اس میں قوت مردمی تو باقی رہتی ہے مگر اس جادو کے اثر سے اپنی عورت پر قابو نہیں پاتا۔ دوسری پر قادر ہو جاتا ہے۔

جادو کے علاج: ۱۔ جو شخص جادو کے باعث عورت پر قادر نہ ہو سکے وہ بانس کی آگ میں جوڑ والا بسولا گرم کرے یہاں تک کہ وہ سرخ ہو جاوے پھر آگ سے نکال کر اس پر پیشاب کر دے (روح البیان) یہ بہت مجرب عمل ہے۔ ۲۔ شامی نے باب العین میں فرمایا کہ ایسے شخص کو چاہئے کہ بیری کے سات سبز پتے پیس کر پانی میں گھول لے وہ پانی کچھ تو پی لے اور باقی پانی سے غسل کرے۔ ۳۔ جو شخص روزانہ صبح کو سات عجوہ چھوہارے کھا لیا کرے اس پر جادو اثر نہ کرے گا۔ ۴۔ جو شخص آیت الکرسی پڑھ کر ہاتھوں پر دم کرے اور سارے جسم پر ہاتھ پھیرے وہ بھی انشاء اللہ جادو سے محفوظ رہے گا۔ ۵۔ جو شخص پندرہ شعبان کو رات یعنی شب برات کو بعد مغرب غسل کرے وہ بھی انشاء اللہ جادو سے محفوظ رہے گا۔ ۶۔ جس شخص کو جادو ہو گیا ہو وہ دریا کے بیچ دھار کے پانی سے گھڑا بھر کر لائے اور اس پر سورۂ فلق اور سورۂ ناس گیارہ گیارہ بار پڑھ کر دم کر کے اس سے غسل کرے انشاء اللہ صحت ہوگی۔ مگر یہ پانی بہنے نہ دے بلکہ کسی گڑھے میں کھڑے ہو کر غسل کرے جس سے پانی وہاں جمع ہو جاوے بعد میں دفن کر دے۔

خلاصہ تفسیر

ان یہود نے اللہ کی کتابیں چھوڑ دیں اور شیاطین کے سکھائے ہوئے جادو پر عمل کیا اور جو ہاروت و ماروت فرشتوں سے سیکھا اس کے پیچھے لگ گئے حالانکہ یہ فرشتے جادو سکھانے میں اتنی احتیاط کرتے ہیں کہ کسی کو فوراً نہیں بتا دیتے بلکہ اولاً اس کو منع کرتے ہیں کہ ہم رب کی طرف سے آزمائش ہیں۔ تو تو جادو سیکھ کر کفر نہ کر جب وہ باز نہ آتا تب کہیں تعلیم دیتے ہیں۔ ان کو

چاہئے تھا کہ اس نصیحت سے ہی سبق لے لیتے اور اس کام میں مشغول نہ ہوتے اور پھر جادو سے کرتے بھی کیا ہیں ایذا رسانی، تکلیف پہنچانی، زوجین کو آپس میں جدا کرنا مرد کو عورت کے قابل نہ رکھنا یہ باتیں محض ضرر ہیں۔

ہاروت ماروت کا قصہ

تفسیر عزیزی وغیرہ نے بحوالہ ابن جریر اور ابن ابی حاتم اور حاکم و دیگر تفاسیر نے حضرت ابن عباس و علی مرتضیٰ و عبداللہ ابن مجاہد رضی اللہ عنہم اجمعین سے بیان کیا کہ حضرت ادریس علیہ السلام کے زمانے میں انسان بہت بدعمل ہو گئے۔ فرشتوں نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ مولیٰ انسان بہت بدکار ہے۔ خیال رہے کہ فرشتوں نے پیدائش آدم علیہ السلام سے پہلے اپنا استحقاق خلافت بیان کیا وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ (بقرہ: ۳۰) الخ۔ اس موقع پر انسان کی نااہلیت کا اظہار مقصود ہے یعنی یہ خلافت کے لائق نہیں انہیں معزول کر دیا جائے یا کم از کم خلیفہ یہ رہیں اور وزیر ہم تاکہ ہم ان کے بگڑے کام سنبھال لیں کچھ بھی سہی۔ رب تعالیٰ کا ارشاد ہوا کہ اس کو غصہ اور شہوت دیا گیا ہے جس سے گناہ زیادہ کرتا ہے اگر یہ چیزیں تمہیں ملیں تو تم بھی گناہ کرنے لگو۔ فرشتے بولے کہ مولیٰ کریم ہم تو گناہ کے پاس بھی نہ جائیں گے۔ خواہ کتنا ہی غصہ اور شہوت ہو۔ حکم ربی ہوا کہ تم اپنی جماعت میں سے اعلیٰ درجے کے پرہیز گار فرشتے چھانٹ لو ان کو غصہ اور شہوت دے دیتے ہیں۔ پھر امتحان ہو جاوے گا۔ چنانچہ ہاروت و ماروت جو بڑے ہی عبادت گزار فرشتے تھے انتخاب میں آ گئے حق تعالیٰ نے ان کو یہ چیزیں یعنی غصہ اور شہوت دے کو شہر بابل میں اتار دیا۔ اور فرمایا کہ تم قاضی بن کر لوگوں کا فیصلہ کیا کرو اور روزانہ اسم اعظم کے ذریعہ شام کو آسمان پر آ جایا کرو یہ دونوں ایک مہینہ تک ایسے ہی آتے جاتے رہے اتنے عرصہ میں ان کے عدل و انصاف کا عام چرچہ ہو گیا اور بہت مقدمے ان کے پاس آنے لگے ایک روز ایک نہایت حسین و جمیل عورت نے جس کا نام زہرہ تھا یہ ملک فارس کی رہنے والی تھی۔ حضرت علی کی روایت میں ہے کے اس کا نام بیدخت تھا زہرا لقب تھا اپنے خاوند کے خلاف مقدمہ دائر کیا یہ دونوں اسے دیکھتے ہی عاشق زار ہو گئے اور اس سے برے کام کی خواہش کی۔ اس نے کہا میرا دین کچھ اور تمہارا دین کچھ ہے اور اختلاف ہوتے ہوئے یہ نہیں ہو سکتا۔ نیز میرا شوہر بہت غیرت مند ہے اسے خبر لگ گئی تو مجھے قتل کر دے گا۔ لہٰذا پہلے تو آپ میرے بت کو سجدہ کرو اور پھر میرے شوہر کو قتل کرو پھر میں تمہاری اور تم میرے انہوں نے انکار کیا وہ چلی گئی۔ مگر ان کے دل میں اس کے عشق کی آگ بھڑک گئی۔ آخر اسے پیغام بھیجا کے ہم تیرے گھر آنا چاہتے ہیں اس نے کہلا بھیجا سر اور آنکھوں پر یہ دونوں اس کے گھر پہنچے اس نے اپنے کو آراستہ کیا اور بولی کہ یا تو آپ لوگ مجھے اسم اعظم سکھا دیں یا بت کو سجدہ کریں یا اپنا شوہر کو قتل کریں یا شراب پی لیں۔ انہوں نے سوچا کہ اسم اعظم اسرار الٰہی اس کو ظاہر کرنا بہت ظلم ہے۔ بت پرستی کرنا شرک ہے، اور قتل حق العباد۔ لاؤ شراب پی لیں چنانچہ شراب پی لی۔ جب شراب پی کر مست ہو گئے تو اس نے ان سے بت کو سجدہ بھی کرا لیا۔ اپنے شوہر کو قتل بھی اور اسم اعظم بھی پوچھ لیا۔ وہ تو اسم اعظم پڑھ کر صورت بدل کر آسمان پر پہنچ گئی۔ حق تعالیٰ نے اس کی روح کو زہرہ ستارہ سے متصل کیا اور شکل اس کی زہرہ ستارے کی طرح ہو گئی۔ جب ان کا نشہ اترا تو یہ اسم اعظم بھول چکے تھے اور اپنے کئے پر نادم و شرمندہ تھے۔ حق تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ انسان تجلی سے دور رہتا ہے یہ دونوں شام کو

حاضر بارگاہ ہوتے تھے۔ پھر بھی شہوت سے مغلوب ہو کر سب کچھ کر بیٹھے اگر انسان سے گناہ سرزد ہوں تو کیا تعجب ہے تمام فرشتوں نے اپنی خطا کا اقرار کیا اور زمین والوں پر بجائے لعن طعن کرنے کے ان کے لئے دعائے مغفرت کرنے لگے قرآن فرماتا ہے۔ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِى الْاَرْضِ (شوریٰ: ۵) پھر یہ دونوں حضرت ادریس کی بارگاہ میں حاضر ہو کر شفاعت کے طالب ہوئے آپ نے ان کے حق میں دعائے مغفرت کی۔ بہت روز کے بعد حکم الٰہی آیا کہ ان کو اختیار دیجئے کہ یہ یا تو دنیاوی عذاب قبول کرلیں یا آخرت کا۔ حضرت ادریس علیہ السلام نے ان کو حکم الٰہی پہنچایا انہوں نے عرض کیا کہ یا نبی اللہ دنیا کا عذاب فانی اور آخرت کا ابدالاباد تک باقی ہے ہم کو دنیاوی عذاب منظور ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم فرمایا کہ ان دونوں کو لوہے کی زنجیروں میں جکڑ کو بابل کے کنویں میں اوندھا لٹکا دیں اس کنویں میں آگ بھڑک رہی ہے اور یہ لٹکے ہوئے ہیں اور فرشتے باری باری سے ہر وقت ان کو کوڑے مارتے ہیں۔ سخت پیاس سے ان کی زبانیں باہر لٹکی ہوئی ہیں یہ قصہ سنن بیہقی مسند امام احمد اور دیگر کتب احادیث بہ اسناد صحیح مروی ہے اور بعض لوگوں نے ہاروت وماروت کو اس حالت میں دیکھا بھی ہے۔

حکایت: حاکم نے اپنی مسند میں اور بیہقی نے اپنے سنن میں حضرت عائشہ صدیقہ سے روایت کی ہے کہ آپ فرماتی ہیں کہ حضور علیہ السلام کی وفات کے بعد میرے پاس دومۃ الجندل کی ایک عورت آئی جو کہ حضور علیہ السلام کو تلاش کرتی تھی۔ میں نے کہا کہ سرکار کی وفات ہو چکی تم مجھ سے کہو۔ کیا کہنا چاہتی ہو۔ وہ کہنے لگی کہ میں اپنے شوہر کی سختیوں سے تنگ آ گئی تو میں نے ایک عورت سے اپنی مصیبت بیان کی۔ اس نے مجھے ایک کتے پر سوار کر کے آن کی آن میں بابل پہنچا دیا۔ میں نے ہاروت وماروت کو ایک کنویں میں لٹکا دیکھا تو ان سے جادو سیکھنا چاہا انہوں نے بہت سمجھایا کہ یہ کفر ہے نہ سیکھ مگر میں نہ مانی۔ آخر کار انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ اس تنور میں پیشاب کر کے آ۔ میں نے جب اس میں پیشاب کیا تو دیکھا کہ ایک نورانی سوار میرے بدن سے نکلا اور آسمان کی طرف اڑ کر غائب ہو گیا۔ میں ان سے آ کر یہ ماجرا بیان کیا انہوں نے فرمایا کہ یہ تیرا ایمان تھا جو تجھ سے چھن چکا اب جا تو جادو میں خوب ماہر ہو گئی۔ جب سے میں فنِ جادو میں بہت استاد ہوں گیہوں کا دانہ زمین میں داب کر اس کو حکم کرتی ہوں تو وہ اگ آتا ہے اور فوراً اس میں سٹہ لگ جاتا ہے۔ پھر فوراً خشک ہو جاتا ہے اور میرے کہنے سے فوراً آٹا ہو کر روٹی بن جاتی ہے مگر میں اپنے دل میں ایمان کے جانے پر شرمندہ ہوں میں پوچھنے آئی تھی کہ کیا میری توبہ اب قبول ہو سکتی ہے میں نے کہا کہ تو حضور علیہ السلام کے صحابہ کرام سے مل تو میں ان کی خدمت میں حاضر ہوئی کسی نے اس کے ایمان کی امید نہ دلائی ہاں حضرت عبداللہ ابن عباس نے فرمایا کہ تیرے ماں یا باپ ہوں تو ان کی خدمت کر۔ ان کی دعا سے تیرا ایمان واپس ہوگا۔ (تفسیر کبیر وعزیزی) اسی طرح ابن منذر نے اوزاعی سے نقل کیا کہ ہارون ابن رباب فرماتے ہیں کہ میں عبدالملک ابن مروان کے دربار میں بیٹھا تھا کہ ان کے پاس ایک شخص آیا جو کہ کسی جادوگر کا بیٹا تھا اس نے بھی اپنا قصہ اسی طرح بیان کیا کہ میں جادو کے شوق میں ہاروت ماروت کے پاس پہنچا مگر ان کے سمجھانے بجھانے پر بغیر جادو سیکھے واپس آیا ان روایات سے معلوم ہوا کہ ہاروت وماروت ابھی تک چاہ بابل میں لٹکے ہوئے ہیں، اور جو وہاں پہنچ جائے اس کو

جادو سکھاتے ہیں۔

فائدے

اس آیت اور تفسیر سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** کوئی شخص اپنے زہد و تقویٰ عبادت و ریاضت پر بھروسہ نہ کرے رب کا فضل طلب کرتا رہے دیکھو معصوم فرشتے بھی غصہ اور شہوت سے گناہ کر بیٹھے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

ہمچو ہاروت ہمچو ماروت شہیر — از بطر خوردند زہر آلود تیر
اعتمادی بودشاں بر قدس خویش — چیست بر شیر اعتماد گاؤمیش
گرچہ او با شاخ صد چارہ کند — شاخ شاخش شیر نر پارہ کند

یعنی ہاروت و ماروت جیسے مقدس فرشتے اپنی تقدیس پر اعتماد کر کے گھائل ہو گئے۔ بیل شیر کے مقابل اپنے سینگ وغیرہ پر اعتماد نہیں کر سکتا۔ **دوسرا فائدہ:** علم سحر بھی خدائی علموں میں سے ایک ہے جس کی بقا خدا کو منظور ہے (تفسیر عزیزی) اسی لئے اس کی تعلیم بذریعہ فرشتہ کرائی کہ جادو سے فساد پھیلانا برا ہے۔ مگر جادو کا پیدا فرمانا برا نہیں شیطان برا ہے مگر شیطان کا پیدا فرمانا برا نہیں ان چیزوں کے پیدا کرنے میں ہزار حکمتیں ہیں۔ **تیسرا فائدہ:** ہاروت و ماروت کا جادو کفر ہی ہے یعنی اس میں شرکیہ الفاظ و کفریہ شرائط ہیں مگر وہ کفر کے لئے نہیں سکھاتے بلکہ اس کے ذریعے ایمان قوی کرنے کے لئے کہ لوگ یہ سیکھ کر جادو اور معجزہ میں فرق کریں اور نبی کو جادوگر سے ممتاز کریں جو اصل ایمان ہے۔ **چوتھا فائدہ:** کفر سیکھنا سکھانا کفر نہیں بلکہ اس کو ماننا یا اس پر عمل کرنا کفر ہے۔ دیکھو فرشتے سحر سکھاتے ہیں جو کہ کفر ہے مگر کافر نہیں اور سیکھنے والا بھی اگر فقط علم حاصل کرنے کے لئے سیکھے تو وہ کافر نہیں اسی لئے وہ پہلے فرما دیتے ہیں کہ فَلَا تَكْفُرْ تو اس کو سیکھ کر کفر نہ کرنا یعنی اس پر اعتقاد یا عمل نہ کرنا۔ **مسئلہ:** جو سحر کفر ہے اس کا عامل مرتد ہے اگر مرد ہے تو قتل کیا جاوے اگر عورت ہے تو قید کی جاوے گی۔ **مسئلہ:** جو سحر کفر نہیں مگر اس سے جانیں ہلاک کی جاتی ہیں اس کا عامل ڈاکو کے حکم میں ہے کہ اس کو گرفتار کر کے قتل کیا جاوے اور اگر گرفتاری سے پہلے توبہ کر کے نیک صالح بن جاوے اور جادو چھوڑ دے تو معاف کیا جائے گا۔ **مسئلہ:** جادوگر کی توبہ قبول ہے۔ **مسئلہ:** کسی کو تکلیف پہنچانے یا حرام غرض سے جادو کرنا کفر ہے یا حرام۔ مگر جادو سے بچنے یا اس کو باطل کرنے کے لئے جادو کرنا جائز ہے بشرطیکہ اس میں کلمات کفریہ نہ ہوں۔ **پانچواں فائدہ:** جب جادوگر ایک آن ہاروت و ماروت کی صحبت میں رہ کر لوگوں کے دلوں اور اندرونی قوتوں پر جادو کے ذریعہ تصرف کر سکتے ہیں کہ خاوند کو عورت سے متنفر کر دیں اور مرد کو نامرد بنا دیں تو حضور کے صحبت یافتہ صحابہ اور فیض یافتہ اولیاء اللہ بھی یقیناً ہمارے دلی رنج و غم اور دکھ درد دور کر سکتے ہیں۔ جادوگروں کے تصرفات مان کر کرامات و معجزات اور اولیاء کے تصرفات بھی مان لو۔

قصہ ہاروت و ماروت پر اعتراضات و جوابات

اس قصہ میں بہت لوگوں کو بڑے بڑے اعتراضات پیش آئے یہاں تک کہ حضرت امام فخر الدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے

قصہ زہرا وغیرہ کا انکار کیا اور فرمایا کہ یہ احادیث اصول اسلام کے خلاف ہیں لہٰذا قابل قبول نہیں۔ بعض مفسرین نے ہاروت وماروت کے فرشتہ ہونے ہی کا انکار کر دیا مگر حق یہ ہے کہ یہ تمام واقعہ بالکل صحیح ہے۔ عقلی دلائل سے احادیث کا رد نہیں کیا جا سکتا بلکہ ضروری ہے کہ شبہات دور کئے جاویں ورنہ بظاہر حضرت یوسف وحضرت داؤد کا قصہ بھی خلاف اسلام معلوم ہوتا ہے تو جیسے ان قصوں سے اعتراضات اٹھائے جاتے ہیں اسی طرح اس سے بھی اٹھائے جاویں۔ اب ہم ان مفسرین وغیرہ کے سوالات معہ جوابات عرض کرتے ہیں ان میں اکثر جوابات تفسیر عزیزی سے حاصل ہوئے ہیں اور بعض ہمارے اپنے ہیں رب تعالیٰ قبول فرمائے آمین۔

اعتراض

پہلا اعتراض: رب نے جادو کی تعلیم کیوں دلائی اس میں کیا حکمت ہے؟ خراب چیز کا روکنا ضروری ہے نہ کہ شائع کرنا **جواب:** اس وقت بابل میں پہلے ہی سے جادو کا چرچا تھا۔ جہلاء جادو اور معجزے میں فرق نہ کر سکتے تھے۔ انبیاء اور جادوگر کو یکساں سمجھتے تھے رب تعالیٰ نے دو فرشتے بھیج کر جادو دکھا کر اس میں اور معجزے میں فرق کر دکھایا جیسے کہ فقہاء کرام کفریہ الفاظ بتا کر مسلمانوں کو ان سے بچنے کی ہدایت کرتے ہیں۔ اسی طرح ہاروت وماروت نے کیا۔ **دوسرا اعتراض:** یہ کام انبیاء سے ہی کیوں نہ لیا وہ ہی جادو بھی بتا کر فرق کر دکھاتے۔ **جواب:** وجہ یہ ہے کہ خود ان انبیاء ہی کو تو جادوگروں سے جدا کرنا منظور تھا وہ گویا اس معاملہ میں ایک فریق تھے لہٰذا چاہئے تھا کہ حاکم اور پنچ کوئی اور ہوا۔ نیز اس سکھانے کے لئے الفاظ کفریہ جو جادو میں ہوتے ہیں۔ انبیاء کو بولنے پڑتے اور یہ ان کی شان نبوت کے خلاف تھا کیونکہ وہ احکام شرعیہ کی تبلیغ کے لئے آئے تھے اور یہ الفاظ شرعاً کفریہ ہیں مگر فرشتے خیر وشر ہر کام کرتے ہیں۔ ظالم کی پرورش، موذی جانور کی تربیت وغیرہ ان سے ہی کرائی جاتی ہے لہٰذا اس کے لئے بھی وہ ہی موزوں تھے۔ ۲۔ نیز تعلیم سحر اشاعت جادو کا ذریعہ بھی تھی۔ رب تعالیٰ کو منظور نہ ہوا کہ یہ اشاعت حضرات انبیاء کرام کی طرف منسوب ہو کیونکہ ان سے شرعی احکام کا کام لیا جاتا ہے۔ اسی لئے حضرات انبیاء نے فلسفہ، سائنس اور منطق وغیرہ کی تعلیم نہ دی۔ ہاں ان حضرات نے جادو کے اجمالاً احکام بتا دیئے کہ حرام ہے یہ نہ بتایا کہ جادو ایسے کرتے ہیں یہ ان فرشتوں نے بتایا۔ **تیسرا اعتراض:** شیاطین نے جادو سکھایا تو کافر ہوئے اور ہاروت ماروت فرشتوں نے سکھایا تو وہ کافر کیوں نہ ہوئے۔ **جواب:** شیطان نے عمل کرنے کے لئے رغبت دیتے ہوئے سکھایا اور انہوں نے بچنے کے لئے ہدایت کرتے ہوئے سکھایا۔ ایک شخص کسی کو کافر بنانے کے لئے الفاظ کفریہ سکھائے وہ کافر ہے عالم دین بچنے کے لئے وہ ہی الفاظ بتا دیں تو وہ مومن **چوتھا اعتراض:** اس قصہ سے معلوم ہوا کہ فرشتوں نے رب تعالیٰ کا مقابلہ کیا کہ اس نے فرمایا کہ تم بھی غصہ اور شہوت پا کر گناہ کر بیٹھو گے انہوں نے کہا کہ ہرگز نہیں اور رب کا مقابلہ کفر ہے اور ملائکہ معصوم؟ **جواب:** یہ مقابلہ نہیں بلکہ اپنی اطاعت اور نیازمندی کا اظہار ہے اور اپنے مصمم ارادہ کا تذکرہ کہ مولیٰ ہم نے تیری اطاعت اور فرمانبرداری کا پورا ارادہ کر لیا ہے کہ بڑی مصیبت میں بھی نافرمانی نہ کریں گے۔ جیسے کوئی وفادار نوکر اپنے آقا سے مضبوطی ارادہ ظاہر کرے **پانچواں اعتراض:** فرشتے معصوم ہیں رب تعالیٰ فرماتا ہے

یَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَ یَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ (التحریم:۶) پھر ہاروت و ماروت یہ تین سخت گناہ کیوں کر بیٹھے؟ یہ تو قرآن کے خلاف ہے **جواب:** جب یہ دونوں شکل انسانی میں آ گئے اور ان میں غصہ اور شہوت پیدا کر دیا گیا تو ان میں فرشتوں کے صفات نہ رہے۔ فرشتہ فرشتہ رہ کر معصوم نہ کہ انسانی خواص پا کر بھی۔ دیکھو حضرات انبیاء بشر ہیں اور بشر طبعاً معصوم نہیں۔ مگر جب رب تعالیٰ ان کے غصہ اور شہوت کی اصلاح فرما دیتا ہے تو یہ معصوم بن جاتے ہیں غرضکہ غصہ والا اصلاح سے معصوم اور معصوم غصہ پا کر غیر معصوم ہو سکتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب فرشتے انسانی شکل میں ہوں گے تو ان پر انسانی عوارض جاری ہوں گے اگرچہ ان کی حقیقت نور ہی ہو گی۔ دیکھو موسیٰ علیہ السلام کی لاٹھی جب سانپ بنتی تو کھاتی پیتی تھی۔ رب فرماتا ہے تَلْقَفُ مَا یَاْفِكُوْنَ (الاعراف:۱۱۷) حرکت بھی کرتی تھی سانس بھی لیتی تھی۔ حضرت جبریل جب شکل انسانی میں آتے تو آپ کے کپڑے سفید اور بال سیاہ ہوتے تھے اسی طرح حضرات ہاروت ماروت جب شکل انسانی میں آئے تو کھانے پینے جماع کرنے کے عادی ہو گئے اس سے ثابت ہوا کہ حضور ﷺ نور الٰہی ہیں۔ مگر شکلاً بشر ہیں لہٰذا کھاتے پیتے سوتے جاگتے ہیں ان کے کھانے پینے کو دیکھ کر ان کی نورانیت کا انکار نہ کرو پھر بھی حضرات انبیاء و اولیاء پر بھی نورانیت کا جلوہ آشکارا ہوتا ہے تو کھانے پینے سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام صدہا سال سے بغیر کھائے پیے آسمان پر جلوہ گر ہیں۔ اصحاب کہف صدہا سال سے بغیر کھائے پیے سو رہے ہیں۔ حضور روزہ وصال میں اور معراج میں کھانے پینے سے بے نیاز تھے۔ غرضیکہ یار کے رنگ مختلف ہیں۔ **چھٹا اعتراض:** اگر یہ دونوں انسان بن گئے تھے تو آواگون درست ہوا (آریہ) **جواب:** ان کی فقط شکل بدلی تھی نہ کہ روح اور گناہ کرنا شکل و صورت اور جسم سے ہوتا ہے۔ روح جسم پا کر اعمال کرتی ہے۔ آواگون میں روح کی تبدیلی ہوتی ہے **ساتواں اعتراض:** جب ہاروت و ماروت اپنی ہی مصیبت میں گرفتار ہیں تو لوگوں کو تعلیم سحر کیوں کر دیتے ہیں؟ **جواب:** کامل اور تجربہ کار ماہر آدمی بیماری اور پریشانی میں بھی عملی مسائل بے تکلف بیان کر دیتا ہے یہ حضرات چونکہ اس فن میں بہت کامل ہیں لہٰذا بہت آسانی سے سکھا دیتے ہیں۔ **آٹھواں اعتراض:** جب ان تک کوئی پہنچتا ہی نہیں تو ان سے جادو کیسے سیکھتے ہیں؟ **جواب:** اولاً تو ان تک عام مخلوق پہنچ جاتی تھی کیونکہ وہ اشاعت سحر کا وقت تھا پھر رفتہ رفتہ یہ کام بند ہوتا رہا۔ صحابہ کرام کے زمانہ میں بھی بعض لوگ وہاں پہنچے مگر اب شیاطین تو وہاں پہنچ جاتے ہیں مگر انسان نہیں پہنچتے جیسا کہ روایت میں آیا ہے کہ ہر سال بعض جن ان سے جادو سیکھتے ہیں (تفسیر عزیزی) **نواں اعتراض:** یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک عورت تارہ بن کر آسمان پر چڑھ جائے **جواب:** آدمی کا بدن مر کر مٹی بن جاتا ہے۔ انسانی روح مر کر آسمان میں جاتی ہے جب بدن مٹی بن سکتا ہے تو تارہ کی شکل بھی بن سکتا ہے۔ اس میں شکل کی تبدیلی ہے کوئی تعجب نہیں۔ **دسواں اعتراض:** زہرا تارہ تو پہلے ہی سے موجود ہے اگر یہ عورت تارہ بن کر وہاں پہنچی تو چاہئے تھا کہ ادریس علیہ السلام سے پہلے یہ تارہ نہ ہوتا؟ **جواب:** اس کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ زہرا تارا وہ عورت ہے بلکہ یہ تارہ تو پہلے سے موجود تھا۔ اس وقت اس عورت کا تعلق اس تارے سے ہو گیا۔ بعض روحیں جنت میں اور بعض روحیں دوزخ میں اور بعض چاہ زمزم میں رہتی ہیں اس عورت کی روح زہرا تارے میں رہتی ہے۔

شہداء سبز پرندے کی شکل میں جنت میں سیر کرتے ہیں یہ اس تارے کی شکل میں آسمان کی سیر کرتی ہے **گیارھواں اعتراض:** رب تعالیٰ نے ہاروت و ماروت کو دو عذابوں کا کیوں اختیار دیا۔ چاہیے تھا کہ توبہ کا حکم دیتا توبہ گناہ کا کفارہ ہے؟ **جواب:** دنیاوی عذاب ہی ان کے لئے توبہ ہے جیسے کہ بچھڑے کے پجاری یہودیوں کے لئے قتل۔ ہر جرم کی توبہ علیحدہ ہے گویا ان سے کہا گیا کہ یا تو یہ تکلیف برداشت کر کے توبہ کر لو ورنہ عذاب آخرت میں گرفتار ہو گے۔ انہوں نے توبہ اختیار کی۔ **بارھواں اعتراض:** زہرہ عورت کافرہ فاجرہ تھی اس کو تارے میں رہنے کی عزت کیوں ملی؟ کافر کی جگہ جہنم ہے نہ کہ تارا۔ **جواب:** اسم اعظم پڑھ کر مومنہ ہو گئی اور اس کے سارے گناہ معاف ہو گئے جیسے کہ سو برس کا کافر بدکار کلمہ طیبہ پڑھ کر مومن بن جاتا ہے۔ پھر اسی اسم اعظم کے طفیل یہ دعا کی جو کہ قبول ہوئی اور وہ تارے میں رہنے لگی **تیرھواں اعتراض:** ہاروت و ماروت اسم اعظم کیسے بھول گئے؟ **جواب:** گناہ یا کفر سے کبھی حافظہ کمزور ہو جاتا ہے اور علم بھول جاتا ہے۔ دماغ سے خون نکل جانے پر نسیان کی بیماری ہو جاتی ہے اگر ایمان نکل جانے پر یہ مرض ہو جائے تو کیا تعجب ہے۔

خاتمہ مضمون

زبیر ابن بکار اور ابن مردویہ اور دیلمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کی کہ میں نے حضور علیہ السلام سے پوچھا کہ انسان کتنی صورتوں میں مسخ ہوا فرمایا تیرہ میں۔ ۱۔ ہاتھی۔ ۲۔ ریچھ ۳۔ سور ۴۔ بندر ۵۔ مار ماہی ۶۔ گوہ ۷۔ چمگادڑ ۸۔ بچھو ۹۔ عموص (دریائی چھوٹا جانور) ۱۰۔ مکڑی ۱۱۔ خرگوش ۱۲۔ سہیل (تارہ) ۱۳۔ زہرہ تارا یعنی بعض قومیں ہاتھی بنا دی گئیں۔ بعض بندر بعض سور وغیرہ (تفسیر عزیزی)

تفسیر صوفیانہ

انسان میں سارا عالم ہے ہاروت و ماروت اس کی قوت نظر اور قوت عملی ہے اور اس کا نفس گویا زہرہ ہے اس نفس نے ان دونوں قوتوں سے وہ صفات سیکھے جن کی برکت سے یہ نفس عالم اجسام سے ترقی کر کے عالم ارواح سے مل سکے اور ملاء اعلیٰ میں اس کا شمار ہو۔ مگر یہ نفس ان دونوں قوتوں کو گناہوں پر رغبت دیتا رہا۔ جس سے کہ یہ عالم سفلیات میں ہی رہ جائیں۔ جب یہ دونوں قوتیں نفس کی اطاعت کر کے نادم ہوں تو شریعت پیغمبر کے حضور حاضر ہو کر اپنی شفاعت چاہیں ادھر سے حکم ملے کہ ان دونوں کو چاہ دنیا میں عمر بھر کے لئے قید کر دو۔ جہاں کہ ان کو مصائب و آلام کی تکلیف برداشت کرنا پڑے یہ قوت عملی و نظری دیگر انسانی قوتوں کو دنیاوی امور سکھاتی ہیں مگر ساتھ ہی فرما دیتی ہیں کہ یہ دنیا جال ہے۔ اس سے بچے رہنا اس پر عمل نہ کرنا یہ تمام چیزیں تم کو بچنے کے لئے بتائی گئی ہیں نہ کہ علم کے لئے جو ان کی مخالفت کر کے دنیا میں پھنس جاتا ہے وہ طریقت کا کافر ہے اور جو ان کی مان جاتا ہے وہ کامل مومن ہے۔

اہل دنیا کافران مطلق اند روز و شب در زق زق دور بک بک اند

چیست دنیا از خدا غافل بدن نے قماش و نقرہ و فرزند و زن

دوسری تفسیر صوفیانہ

ہاروت و ماروت کی ایک گھڑی صحبت میں رہ کر ان سے کچھ فیض لے کر بندہ باذن الٰہی لوگوں کو نقصان پہنچانے پر قادر ہو جاتا ہے اور لوگوں کے دلوں پر تصرف کر سکتا ہے کہ خاوند کے دل میں بیوی سے نفرت پیدا کر دے یا اسے بیوی پر قادر نہ ہونے دے اور اولیاء اللہ کا صحبت یافتہ باذن الٰہی لوگوں کو فائدہ پہنچانے پر قادر ہو جاتا ہے اور لوگوں کے دلوں پر تصرف کرنے پر قادر ہو جاتا ہے وہ بچھڑوں کو ملا سکتا ہے بلکہ اللہ سے دور رہنے والے بندوں کو رب تک پہنچا سکتا ہے ہاروت و ماروت کا یہ قصہ پڑھو اور تصرفات اولیاء میں غور کرو کہ ان کے قبضہ میں عالم کے عالم ہوتے ہیں جادو سے زیادہ کرامت کی تاثیر۔

وَ مَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ
اور نہیں ہیں وہ لوگ نقصان پہنچانے والے ساتھ اس کے کسی کو مگر ساتھ حکم اللہ کے
اور اس سے ضرر نہیں پہنچا سکتے کسی کو مگر خدا کے حکم سے
وَ يَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَ لَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَ لَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ
اور وہ سیکھتے ہیں جو انہیں نقصان دے گا اور نہ نفع دے گا ان کو اور البتہ تحقیق جانا انہوں نے
اور وہ سیکھتے ہیں جو انہیں نقصان دے گا اور نہ نفع دے گا اور بے شک ضرور انہیں معلوم ہے
اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ۫ وَ لَبِئْسَ مَا
البتہ وہ جو خریدے اس کو نہیں ہے اس کے واسطے بیچ آخرت کے کوئی حصہ اور البتہ
کہ جس نے یہ سودا لیا آخرت میں اس کا کچھ حصہ نہیں اور بے شک کیا
شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَ لَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا
برا ہے اور جو خریدا انہوں نے ساتھ اس کے جانوں کو اپنی اگر وہ ہوتے جانتے اور اگر تحقیق وہ
بری چیز ہے جس کے بدلے انہوں نے اپنی جانیں بیچیں کسی طرح انہیں علم ہوتا اور اگر وہ ایمان لاتے
وَ اتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع
لوگ ایمان لاتے اور پرہیزگاری کرتے البتہ ثواب نزدیک اللہ کے اچھا اگر ہوتے وہ جانتے
اور پرہیزگاری کرتے البتہ اللہ کے یہاں کا ثواب بہت اچھا ہے کسی طرح انہیں علم ہوتا

تعلق

یہ جملہ پچھلے جملہ کا تتمہ ہے اس میں کہا گیا تھا کہ جادوگر جادو سے زوجین میں جدائی ڈال دیتے ہیں تو شاید کسی کو وہم ہوتا کہ وہ

اس اثر میں مستقل ہیں اس وہم کو دفع کرنے کے لئے فرمادیا کہ بغیر اذن الٰہی کچھ نہیں کرسکتے۔ یہ سب رب تعالیٰ کے حکم سے ہوتا ہے نیز پچھلے جملہ سے سمجھایا گیا کہ جادوگر دوسروں کو کافی نقصان پہنچا سکتا ہے۔ اس جملہ میں بتایا گیا کہ وہ سب سے بڑا اپنا نقصان کرتا ہے۔

تفسیر

وَمَاهُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ یہ جادوگر اس جادو سے کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے ضارین جمع فرما کر ارشاد فرمایا کہ تمام دنیا کے جادوگر مل کر سارا زور جادو پر خرچ کر کے بھی معمولی شخص کو ادنیٰ نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ تو ایک دو جادوگروں کا تو ذکر کیا ہی ہے۔ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ یہاں اذن سے یا تو ارادہ مراد ہے یعنی اذن تکوینی نہ کہ اذن تشریعی تخلیہ یعنی خدا نے اس جادو میں تاثیر رکھ دی ہے جس سے وہ نقصان پہنچا دیتے ہیں جیسے چھری میں کاٹنے کی تاثیر دی جس سے زخم لگایا جاسکتا ہے وہ اس میں مستقل نہیں یا یہ مطلب ہے کہ جادو رب تعالیٰ کی اجازت سے اثر کرتا ہے اس لئے کبھی اثر کرتا ہے اور کبھی نہیں اور کسی پر کرتا ہے اور کسی پر نہیں اگر ہر جادو ہمیشہ اثر کرتا تو ماہر جادوگر تمام بادشاہوں کو فنا کر کے ان کی فوجوں کو جادو سے ہلاک کر کے دنیا پر راج کرتے مگر ایسا نہیں۔ نیز حضرت ابراہیم علیہ السلام و موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جادو بہت ترقی پر تھا۔ چاہئے کہ انہیں ہلاک کر ڈالتے مگر نہ کر سکے معلوم ہوا کہ جادو کبھی اثر کرتا ہے اور کبھی نہیں اور کسی پر اثر کرتا ہے اور کسی پر نہیں پھر اثر بھی مختلف کرتا ہے۔ حضور علیہ السلام پر سخت جادو کیا گیا مگر صرف خیال مبارک پر اثر ہوا کہ کسی قدر نسیان بڑھ گیا لہٰذا مومن کو چاہئے کہ ہمیشہ رب تعالیٰ ہی سے ڈرے کہ سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ ہاں جادوگر خود جادو سے ضرور نقصان پاجاتا ہے دوسرے کو نقصان ہو یا نہ ہو کیونکہ وہ یا تو اس پر عقیدہ رکھ کر یا الفاظ کفریہ بول کر یا شرائط کفریہ ادا کر کے کافر ہوجاتے ہیں یا ستاروں اور شیاطین میں اثر دیکھ کر ان کو مستقل مؤثر مان جاتے ہیں جو کہ کفر ہے۔ یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ جادوگر گرفتار کر کے قتل بھی کر دیئے جاتے ہیں کبھی ایک دوسرے کے مقابلہ میں ہلاک بھی ہوجاتے ہیں غرضیکہ ان کے دینی یا دنیاوی نقصان بہت وَلَا يَنْفَعُهُمْ یہ لَا يَضُرُّ کی تاکید ہے یعنی جادو خود جادوگر کو بہت نقصان دیتا ہے جس میں نفع کا شائبہ بھی نہیں ہوتا دوسروں کو اگر نقصان دیا مگر نفع کے ساتھ اس میں اشارہ ہے کہ اگر کسی کو جادو سے نقصان پہنچا تو یا تو وہ شہید ہو کر مرا یا اسے صبر کا ثواب ملا جادوگر کا دین و ایمان تباہ ہوا جس میں محض نقصان ہی ہے۔ نفع بالکل نہیں۔ پھر یہ بھی خیال رہے کہ خود جادوگر اس نقصان سے بے خبر نہیں بلکہ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ وہ یقیناً جانتے ہیں کہ جو کوئی جادو خریدے یعنی ایمان چھوڑ کر کفر یا آسمانی کتابیں چھوڑ کر شیطانی باتیں یا قرآن کو چھوڑ کر جادو وغیرہ اختیار کرے۔ تو مَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ یعنی اس سے کچھ دنیا کما لے مگر آخرت میں اسے کچھ نہ ملے گا۔ خیال رہے کہ یہود کے پاس توریت موجود تھی جس پر عمل کر کے وہ دین و دنیا کماتے یا ان کو قرآن پاک حاصل کرنے کا موقع تھا۔ مگر ان بدنصیبوں نے توریت چھوڑی۔ قرآن سے منہ موڑا اور جادو کے شیدائی ہوئے اس چھوڑنے اور اختیار کرنے کو رب نے خرید و فروخت فرمایا۔ کیونکہ خریدار قیمت دے کر مال لیتا ہے۔ مگر ان کا یہ سودا گھاٹے کا ہوا کہ نافع چیز ہاتھ سے کھو بیٹھے اور نقصان دہ چیز

لے بیٹھے وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ یہ اس تجارت کا انجام ہے کبھی تو تجارت نفع دیتی ہے اور کبھی حساب برابر رہتا ہے کہ نہ نفع نہ نقصان اور کبھی کچھ نقصان دیتی ہے اور کبھی تاجر کو بالکل تباہ کرڈالتی ہے کہ اس کی اصل پونجی برباد مکان اور جائیداد نیلام ہو جاتی ہے اور تاجر دیوالیہ ہو کر قید اور ذلیل وخوار ہوتا ہے ان جادوگر یہود کی تجارت آخری قسم کی ہے کہ جادو سے ان کے گذشتہ اعمال برباد ایمان ختم۔ جنت کا استحقاق زائل ہو گیا اور جہنم کے حقدار بن گئے۔ روح البیان نے فرمایا کہ انفس سے ایمان مراد ہے کیونکہ وہ اصل مقصود ہے اور شراء سے فروخت کرنا۔ یعنی جادو کے عوض انہوں نے ایمان فروشی کی وہ جادو نہایت برا ہے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ یہ دونوں لفظ اپنے اصلی معنی پر ہی ہیں یعنی ان کو چاہئے تھا کہ نیک اعمال کے ذریعہ رب تعالیٰ سے اپنی جانیں چھڑاتے مگر انہوں نے اس کے برعکس کیا اس کی پوری تحقیق پہلے گذر گئی لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ کاش کہ وہ یہ برائی بھی جانتے ہوتے یعنی یہ تو وہ جانتے ہیں کہ جادو میں ثواب نہیں کاش وہ یہ بھی جانتے کہ اس میں عذاب ہے اور اس سے آخرت برباد ہوتی ہے وہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ جادو ایک مباح چیز ہے کہ جس کا نہ ثواب نہ عذاب اب رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر چہ یہ یہودی بڑے بڑے جرم کر چکے لیکن اب بھی توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اگر یہ چاہیں کہ جنت میں ہمیں بھی جگہ مل جائے تو وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا اگر یہ اب بھی ایمان لے آویں اور جادو کو حرام جان لیں توریت پر پورا عمل کریں اور نبی آخر الزمان علیہ السلام کے پیروکار بن جاویں تو ان کو بڑا ہی ثواب ملے گا اور لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ تھوڑا سا ثواب بھی جو اللہ کے پاس ہے دنیا کے بڑے بھاری نفع سے بہت اچھا ہے۔ ہماری تفسیر سے معلوم ہوا کہ لو کی جزا پوشیدہ ہے اور یہ جملہ ایک پرلطف معنے دے رہا ہے خلاصہ یہ ہے کہ اگر یہ اب بھی ایمان لے آویں تو ہم ان کو بڑا ہی ثواب دیں اور اے اللہ کے بندو رب تعالیٰ کا تھوڑا ثواب بھی دنیا سے بہتر ہے تو بڑے ثواب کا کیا پوچھنا عِنْدِ اللّٰهِ سے معلوم ہوا کہ تمام مزدوروں کی اجرت دنیا والے دیتے ہیں مگر انبیاء کی اطاعت کی اجرت رب تعالیٰ دیتا ہے اور رب تعالیٰ کی اجرت تمام اجرتوں سے بڑی ہے۔ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ کاش یہ راز کو جانتے۔ انہیں تو یہ خبر ہے کہ فلاں منتر میں یہ اثر ہے فلاں جادو سے یہ تبدیلی ہو جاتی ہے۔ مگر انہیں یہ خبر نہیں کہ کلمہ پاک میں کیا اثر ہے اس کے پڑھنے سے انسان کی کیسی کایا پلٹ جاتی ہے کہ سو برس کا مجرم بدکار ایک منٹ میں صالح پرہیزگار بن جاتا ہے کہ وہ منتر اور جادو بہتر ہیں یا یہ تدبیر کارآمد اور یہ عمل مفید ہے ان کی آنکھوں پر پردے پڑے ہیں۔ وَلَوْ اَنَّهُمْ سے پہلے ان کی بدعملیوں اور بدعملیوں کے نقصان کا ذکر کرنے کے بعد اب اس کا علاج اور علاج کے فوائد بیان ہو رہے ہیں، ایمان اور تقویٰ، چونکہ ایمان اعمال پر مقدم ہے اس لئے پہلے ایمان کا ذکر کرنے کے بعد تقویٰ کا ذکر ہوا بہر حال یہ آیت گذشتہ آیات سے بے تعلق نہیں۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو بے شک جادو میں تاثیر ہے مگر یہ نہ سمجھنا کہ مستقل تاثیر ہے نہیں بلکہ جو کچھ ہے رب تعالیٰ کی اذن اور اس کے ارادے سے ہے جادوگر کے جادو سے دوسرے کو نقصان ہو یا نہ ہو اور اگر ہو تو پورا ہو یا تھوڑا مگر خود جادوگر یہ سیکھ کر اپنا نقصان کر لیتا ہے کہ اس کے اوقات بجائے ذکر اللہ کے فکر شیاطین میں گزرتے ہیں اور وہ بجائے آسمانی کتابوں کے شیطانی وسواس

میں پھنسا رہتا ہے ایمان چھوڑ کر بے ایمان ہو جاتا ہے اور اتنا تو خود جادوگر بھی جانتے ہیں کہ جادو کا آخرت میں کوئی ثواب نہیں کاش وہ یہ بھی جانتے کہ یہ بہت ہی بری چیز ہے جس کے عوض وہ اپنے جان وایمان کو فروخت کر چکے ہیں لیکن ان سے کہہ دو کہ ہم بڑے غفور رحیم ہیں جس طرح کہ انہوں نے پہلے ہمیشہ خطائیں کیں اور ہم نے عطائیں۔ اگر یہ اس قدر جرم کر کے اب بھی ایمان لے آئیں تو ہماری رحمت انہیں آغوش میں لینے کو تیار ہے ہم تو دیتے ہیں کوئی لینے والا ہی نہیں ان کے ایک کلمہ پڑھ لینے سے ہم انہیں بہت بڑا ثواب دیں گے حالانکہ ہمارا تھوڑا ثواب بھی ساری دنیا کی نعمتوں سے بڑھ کر ہے کاش کہ یہ اس ثواب کی قدر جانتے تو ایسی حرکتیں نہ کرتے اے مولیٰ تیرے کرم کے قربان کس طرح اپنے مجرم بندوں کو رحمت کی طرف بلا رہا ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** جادو میں اثر ہے جو اس کے اثر کا منکر ہے وہ اس آیت پر غور نہیں کرتا کہ یُفَرِّقُوْنَ سے صراحۃً اثر کا ثبوت ہے اور اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ میں بھی نفی ٹوٹ کر اثر کا ثبوت ہو گیا نیز اس کے اثرات کا بارہا تجربہ بھی ہوا اور ہو رہا ہے اس کا انکار بالکل ظاہر بات کا انکار ہے۔ **دوسرا فائدہ:** موثر حقیقی اللہ ہے باقی ساری چیزیں محض اسباب اسی لئے جادو سے کبھی بہت جلد فائدہ ہوتا ہے کبھی بہت دیر میں کبھی بالکل نہیں۔ کبھی ایک جماع سے ہی حمل قرار پا جاتا ہے اور کبھی بہت سے جماع سے کچھ بھی نہیں ہوتا۔ پھر کبھی جماع سے ایک بچہ ہو کبھی دو کبھی لڑکی، کبھی لڑکا، کبھی خوبصورت کبھی بدصورت غرضیکہ اثر مسبب الاسباب کے ہاتھ میں ہے۔ چاہئے کہ اسباب پر ضرور عمل کرے مگر نظر و اعتقاد خالق پر رکھے۔ **تیسرا فائدہ:** بغیر عمل علم بیکار بھی نقصان دہ ہے کہ یہود جادو کو بیکار جانتے تو تھے مگر عمل اس کے خلاف کرتے تھے۔ لہٰذا مردود ہوئے۔ **چوتھا فائدہ:** دنیاوی فائدے کے مقابلے میں آخرت کا تھوڑا فائدہ بھی زیادہ ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ جنت میں ایک کمان رکھنے کی جگہ دنیا سے بہتر ہے۔ **پانچواں فائدہ:** جادوگر کی توبہ قبول ہے کیونکہ جادوگر یہودیوں کو ایمان اور توبہ کی دعوت دی گئی ہے۔ **چھٹا فائدہ:** ایمان وتقویٰ انسان کی کایا پلٹ دیتے ہیں یہ جادو سے بڑھ کر موثر ہیں آدمی کو چاہئے کہ بجائے کیمیا، ریمیا، سیمیا جادو منتر کے ایمان کی کیمیا اور تقویٰ کا منتر سیکھے اولیاء اللہ کی نظر سے مٹی سونا بن جاتی ہے۔

کیمیا و ریمیا و سیمیا کس نداند جز بذات اولیاء

ساتواں فائدہ: کوئی علم بذات خود برا نہیں بلکہ اس کی برائی تین وجہ سے ہے ایک یہ کہ اس میں نقصان زیادہ اور نفع کم ہو جیسے کہ علم سحر و نجوم طلسمات وغیرہ۔ دوسرے یہ کہ وہ علم خود تو مضر نہ ہو لیکن سیکھنے والے میں اس کی باریکیاں سمجھنے کی قابلیت نہیں جس سے اندیشہ ہو کہ یہ غلط سمجھ کر گمراہ ہو جائے جیسے علم فلسفہ، مسئلہ تقدیر، مسئلہ وحدت الوجود۔ صحابہ کرام کے اختلافات اور جنگوں کے اسباب اولیاء اللہ کے بولے ہوئے معمے جیسے کہ انا الحق۔ طریقت کے اسرار۔ قرآن کریم کی صوفیانہ تاویلات کہ عام لوگ اس کے اہل نہیں۔ تیسرے شرعی علموں میں بیجا تاویلات اور شرعی اعمال میں افراط وتفریط جیسے کہ علم

عقائد اور توحید میں فلسفہ کو دخل دینا اور علم فقہ میں غلط حیلے اور اصل روایتیں لینا اور علم سلوک میں جوگیوں کے مشغلوں کو دخل دینا۔ **آٹھواں فائدہ:** جادو معجزے اور کرامت کے مقابلہ میں اثر نہیں کر سکتا۔ لیکن بغیر مقابلہ نبی یا ولی پر ضرور اثر کر دیتا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے عصا کے مقابل جادوگر فیل ہوئے مگر حضور علیہ السلام پر یہود کا جادو کسی قدر چل گیا کیونکہ وہاں معجزے کا مقابلہ تھا اور یہاں اثر حقیقۃً بغیر مقابلہ ہوا۔ **نواں فائدہ:** اگر جادوگر دعویٰ کر دے تو اس کا جادو باقی رہتا ہے لیکن اگر دعویٰ نبوت کر بیٹھے تو وہ ہی جادو بیکار ہو گیا کہ یا تو اثر کرے گا ہی نہیں اگر کرے گا تو الٹا۔ دیکھو دجال دعویٰ خدائی کر کے بھی عجیب باتیں دکھائے گا لیکن مسیلمہ کذاب دعویٰ نبوت کر کے اپنے جادو سے کوئی کام نہ لے سکا۔ کیونکہ خدائی میں دھوکہ نہیں پڑ سکتا کہ انسان کا کھانا پینا سونا جاگنا ہی بتا رہا ہے کہ وہ خدا نہیں۔ مگر نبوت میں شبہ پڑ سکتا ہے کیونکہ انبیائے کرام بشر ہی ہوتے ہیں اس لئے قدرت اس کا جادو بیکار کر دیتی ہے۔ یہ آخری تین فائدے اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ سے حاصل ہوئے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ جادوگر خدا کے حکم سے لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہیں تو کیا خدا بری باتوں کا حکم بھی دیتا ہے تو جادوگر برا کیوں ہے (آریہ) **جواب:** اس کے چند جواب ہیں (۱) ایک یہ کہ یہاں اذن کے معنی نہ تو اجازت ہیں اور نہ امر و حکم، بلکہ اس کے معنے ہی خلق یا ایجاد یعنے اذن شرعی مراد نہیں بلکہ اذن تخلیقی یا تکوینی مراد ہے یعنے جادو خود اثر نہیں کرتا بلکہ اصل موثر پروردگار ہے۔ (۲) دوسرے یہ کہ یہاں اذن سے مراد اجازت ہی ہے مگر جادوگر کو جادو کرنے کی نہیں بلکہ جادو کو اثر کرنے کی یعنی جادو خدا کی اجازت سے اثر کرتا ہے جیسے کہ چھری خدا کی اجازت سے کاٹتی ہے لہٰذا جادو برا نہیں ہاں جادوگر برا ہے کہ اس نے بغیر اجازت جادو کیا تلوار بری نہیں قاتل برا ہے۔ (۳) تیسرے یہ کہ اذن سے مراد موقعہ دینا ہے یعنی رب نے جادوگر کو موقعہ دے دیا جیسے کہ اس نے ساری برائیاں کرنے کا موقع دے دیا ہے۔ (۴) چوتھے یہ کہ اذن سے مراد علم اور اطلاع ہے چنانچہ نماز کی اطلاع کو اذان کہتے ہیں۔ قرآن کریم نے فرمایا وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖۤ (التوبہ: ۳) اور فرمایا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ اللّٰهِ (بقرہ: ۲۷۹) اطلاع کو اذان اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ اذان یعنے کان سے سنی جاتی ہے۔ یعنی جادوگر اللہ کے حکم کے بغیر ضرر نہیں پہنچا سکتے **دوسرا اعتراض:** اس آیت میں اول تو فرمایا گیا وَلَقَدْ عَلِمُوْا یعنے وہ یقیناً جانتے ہیں اور اخیر میں فرمایا گیا۔ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ کاش کہ وہ جانتے ہوتے یعنی نہیں جانتے تو جاننا اور نہ جاننا جمع کیسے ہو گیا۔ **جواب:** اس کے بھی چند جواب ہیں (۱) ایک یہ کہ ان میں سے بعض جادو کی برائی جانتے تھے اور بعض نہ جانتے تھے لہٰذا جاننے والے اور ہیں اور نہ جاننے والے دیگر (۲) دوسرے یہ کہ ان میں جو جانتے تھے مگر عمل نہ کرتے تھے لہٰذا پہلے علم بے عمل کا ثبوت ہے اور پھر علم باعمل کی نفی (۳) تیسرے یہ کہ وہ جانتے تھے کہ جادو پر ثواب نہیں مگر یہ نہ جانتے تھے کہ اس پر عذاب بھی ہے یعنی لَقَدْ عَلِمُوْا کا مفعول لَمَنِ اشْتَرٰىهُ ہے اور لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ کا وَلَبِئْسَ **تیسرا اعتراض:** آیت میں لَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا شرط ہے اور لَمَثُوْبَةٌ اس کی جزا اور جزا شرط پر موقوف ہوتی ہے تو مطلب یہ ہوا کہ خدا کے ثواب کا ہونا ان کے ایمان لانے پر موقوف ہے یعنی اگر وہ ایمان لے آئیں تو ثواب اچھا ہو ورنہ نہیں حالانکہ رب

کا ثواب بہت بہتر چیز ہے خواہ یہودی ایمان لائیں یا نہ لائیں۔ **جواب:** یہاں جزاء شرط پر حکم میں موقوف ہے نہ کہ واقعہ میں جیسے کہ قرآن کریم میں ہے کہ وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ (نحل: ۵۳) یعنے ان کے لئے ثواب اچھے ہونے کا حکم جب ہوگا جب کہ وہ ایمان لائیں یوں کہو کہ اس کی جزاء پوشیدہ ہے اور لَمَثُوْبَةٌ علیحدہ جملہ ہے۔

تفسیر صوفیانہ

علم درحقیقت اچھی چیز ہے لیکن اس کا اثر مختلف جس علم کے ساتھ نیک اعمال، کتاب وسنت کی پیروی، اللہ ورسول کا عشق و محبت ہو وہ علم نافع ہے اور جس کے ساتھ یہ اوصاف نہ ہوں وہ علم بیکار اور جو شخص علم سے غلط فائدہ حاصل کرے کہ اس کو دنیا کمانے اور اپنی آبرو بڑھانے کا ذریعہ بنائے وہ علم مضر ہے۔ شیخ ابوالحسن فرماتے ہیں کہ اگرچہ سارے علم حق ہیں لیکن جس علم کی طرف نفس مائل ہو اور طبیعت کو اس سے لذت حاصل ہو اسے اختیار نہ کرو انسان کے لئے وحدانیت کا علم اور اللہ رسول کی محبت کا عمل کافی ہے بعض صوفیاء فرماتے ہیں کہ برے آدمی کے لئے علم کی زیادتی ایسی ہے جیسے اندرائن اور خاردار درختوں کی جڑوں میں زیادہ پانی جیسے کہ وہاں پانی سے کانٹے اور کڑوے پھل بڑھیں گے ایسے ہی یہاں علم سے بدعملی اور بیدینی پھیلے گی جو شخص کہ دنیا کمانے اور اپنی آبرو بڑھانے کے لئے علم سیکھتا ہے وہ اس شخص کی طرح ہے جو کہ سونے کے چمچے سے گوبر کھاتا ہے اے علماء اگر تم چاہتے ہو کہ اپنا درجہ اللہ کے نزدیک معلوم کرو تو خود غور کرلو کہ تمہارے دل میں اللہ کا کیا درجہ ہے سمجھ لو کہ انسان کا نصف اسفل مثل ملک کے ہے اور نصف اعلیٰ مثل ملکوت کے۔ یوں کہو کہ طبیعت اور نفس ملک ہے اور روح ملکوت تم اپنے ملک وملکوت پر قادر ہو۔ یہود نے ملک وملکوت والے علوم چھوڑ کر علم سحر جیسے علم اختیار کئے وہ وبال میں پھنس گئے۔ خیال رہے کہ صوفیاء کے نزدیک ایمان کی حقیقت ہے اللہ اور رسول کا مل جانا ان کی عقیدت محبت اطاعت رضا میں ملا دینا ایمان ہے ان میں فرق کرنا کفر ہے رب فرماتا ہے۔ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ...... (النساء: ۱۵۰) اُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا...... (النساء: ۱۵۱) شکر و پانی ملنے سے شربت بنتا ہے گرم و سرد تار ملنے سے بجلی کا پاور بنتا ہے اللہ رسول کو ملانے سے ایمان بنتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے ایمان۔ اطاعت رضا وغیرہ میں اللہ رسول کو ملایا کہ فرمایا۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ (ال عمران: ۳۲) اور فرماتا ہے۔ وَاللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اَحَقُّ اَنْ يُّرْضُوْهُ (التوبہ: ۶۲) وغیرہ وغیرہ یہاں وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا میں اسی طرف اشارہ ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَ قُوْلُوا انْظُرْنَا
اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو نہ کہو تم لوگ راعنا اور کہو تم نظر کیجئے ہم پر
اے ایمان والو راعنا نہ کہو اور یوں عرض کرو کہ حضور ہم پر نظر رکھیں اور
وَ اسْمَعُوْا ؕ وَ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾
اور سنو تم اور واسطے کافروں کے عذاب ہے دردناک

پہلے ہی سے بغور سنو اور کافروں کیلئے دردناک عذاب ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق**: اب تک یہود کی ان بدکاریوں کا ذکر تھا جو حضور علیہ السلام کی تشریف آوری سے پہلے کر چکے تھے۔ اب ان کے وہ عیوب بیان ہو رہے ہیں جو حضور علیہ السلام کے زمانہ میں ان میں پیدا ہوئے یعنی صاحب قرآن میں عیب جوئی کرنا اور ان کے دین میں طعنے دینا۔ اس سلسلے میں پہلا عیب اس آیت میں بیان ہو رہا ہے۔ **دوسرا تعلق**: پچھلی آیت میں یہود کے جادو سیکھنے کا ذکر تھا اور جادوگر کچھ الفاظ ہی کے ذریعہ لوگوں کو ایذاء پہنچاتا ہے اب اس آیت میں ان لوگوں کی وہ تکلیف دینے والی باتیں بیان ہو رہی ہیں۔ جو جادو کی طرح حضور علیہ السلام کو ایذا پہنچاتی تھیں۔ **تیسرا تعلق**: پچھلی آیت میں یہود کا جادوگر ہونا بتایا گیا اور جادوگر اپنے کو کراماتی ولی ظاہر کرتا ہے اور اپنے جادو کو کرامت بتاتا ہے مگر درحقیقت وہ موذی ہیں اور ان کا یہ لفظ، لفظ محبت نہیں بلکہ کلمہ ایذاء ہے۔ ان کے اس لفظ سے دھوکا نہیں کھانا چاہئے۔ **چوتھا تعلق**: پچھلی آیت میں جادو کا ذکر ہوا اور جادو کا موجد اور سکھانے والا تو اس کی حقیقت سے واقف ہے مگر سیکھنے والا شاگرد اس سے بے خبر رہ کر اندھا دھند منتر پڑھتا ہے اس آیت میں لفظ راعنا سے بے ادبی کرنے والے اس لفظ کی حقیقت سے واقف تھے۔ مسلمان بے خبری میں یہی لفظ بولتے تھے۔ انہیں اس سے روک دیا گیا، جیسے جادو کا موجد اور اس کا عامل دونوں گنہگار ہیں۔ ایسے ہی راعنا سے بے ادبی کرنے والے اور بے خبری میں اس کو استعمال کرنے والے دونوں مجرم ہوں گے۔ **پانچواں تعلق**: اس سے پہلے ایمان اور تقویٰ کا ذکر ہوا اور تقویٰ یہ ہے کہ انسان شبہ کی چیز سے بھی بچے اب فرمایا جا رہا ہے کہ اے مسلمانوں متقی بنو کیونکہ لفظ رَاعِنَا میں فاسد معنی کا شبہ ہے اس سے بھی بچ جاؤ۔

شان نزول

حضور علیہ السلام جب صحابہ کرام کو کچھ تعلیم فرماتے تو حضرت کے درمیان کلام میں عرض کر دیتے تھے کہ راعنا یا رسول اللہ یعنی یا حبیب اللہ ہماری رعایت فرمائیے۔ یعنی یہ بات ہماری سمجھ میں نہ آئی دوبارہ اشارہ فرما دیجئے مگر اس لفظ رَاعِنَا کے ایک برے معنی بھی ہیں۔ جیسا کہ ہم اس تفسیر میں عرض کریں گے۔ یہود نے اس برے معنی کی نیت سے یہ لفظ عرض کرنا شروع کر دیا اور دل میں خوش ہوئے کہ ہمیں بارگاہ عالی میں نہایت چالاکی سے گستاخی کرنے کا موقعہ مل گیا ایک دن حضرت سعد ابن معاذ رضی اللہ عنہ نے ان کی زبان سے یہ لفظ سن کر فرمایا کہ اے دشمنان خدا تم پر اللہ کی لعنت ہو، اگر میں نے اب کسی کی زبان سے یہ لفظ سنا تو اس کی گردن ماروں گا۔ یہود نے کہا کہ ہم پر تو آپ ناراض ہوتے ہیں مسلمان بھی تو یہی کہتے ہیں اس پر آپ غمگین ہو کر حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آئے ہی تھے کہ یہ آیت نازل ہوئی جس میں راعنا کہنے کی ممانعت فرما دی گئی اور اس معنی کا دوسرا لفظ انظرنا کہنے کا حکم دیا گیا (خزائن العرفان وعزیزی وکبیر)

تفسیر

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا یہ خطاب قرآن کریم میں اٹھاسی جگہ ہے ان میں سے یہ پہلا موقعہ ہے پچھلی کتابوں میں صرف پیغمبروں

سے خطاب ہوتا تھا امت مصطفیٰ ﷺ کی یہ عزت ہے کہ رب تعالیٰ نے براہ راست ان سے کلام فرمایا دنیا میں تو مسلمانوں کو الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کا خطاب دیا۔ یعنے اے ایمان والو انشاء اللہ آخرت میں بھی خطاب ہوگا۔ مگر وہاں اس کے معنی ہوں گے اے امن میں رہنے والو کیونکہ ابتداء انتہا کو بتاتی ہے اور خطاب سے ثواب یا عتاب کا پتہ لگ جاتا ہے کسی کو پکارا او گدھے معلوم ہوا عتاب ہوگا۔ کسی کو پکارا او میرے بچے معلوم ہوا کہ کرم ہوگا۔ بعض روایات میں ہے کہ توریت وانجیل میں خطاب يٰاَيُّهَا الْمَسَاكِيْنَ تھا کہ جس کا انجام یہ ہوا کہ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ (البقرہ:۶۱) کہ ان پر ذلت وخواری ڈال دی گئی ہمیں خطاب ہوا۔ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا جس کا انجام ہوا کہ وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ فَضْلًا كَبِيْرًا (الاحزاب:۴۷) خیال رہے کہ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کے خطاب میں حضور داخل نہیں ہوتے کیونکہ یہ ایمان والوں سے خطاب ہے اور حضور عین ایمان ہیں حضور کا خطاب ہے۔ يٰاَيُّهَا النَّبِيُّ۔ يٰاَيُّهَا الرَّسُوْلُ۔ يٰاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ۔ وغیرہ نیز بھی اس خطاب کے بعد ایسے احکام بیان ہوتے ہیں جو حضور انور پر شامل نہیں ہو سکتے۔ جیسے یہاں راعنا کہنے سے باز رہنے کا حکم یا رب کا فرمان کہ اے مومنو نبی کی آواز پر آواز اونچی نہ کرو، اے مومنو اللہ کے رسول سے آگے نہ بڑھو وغیرہ ہے نماز روزے کے ان خطابوں میں بھی حضور داخل نہیں کہ حضور تو ظہور نبوت سے پہلے ہی ان احکام پر عامل تھے۔ اگرچہ اس خطاب میں صحابہ، اولیاء، علماء اور ہم جیسے گنہگار سب ہی داخل ہیں مگر ان کے لئے یہ خطاب اظہار کرم کے لئے ہے اور ہم جیسوں کو یہ خطاب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے۔ چیز ایک ہے مگر تعلقات علیحدہ لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا ہمارے نبی سے آئندہ راعنا نہ کہنا یہ لفظ مراعات کا امر ہے جس کے معنے ہیں رعایت کرنا صحابہ کرام عرض کرتے ہیں راع رعایت فرمایئے نا ہماری۔ مگر یہودی زبان میں یہ گالی تھی۔ یا وہ کسی قدر کھینچ کر بولتے تھے جو کہ راعینا بن جاتا تھا۔ یعنی ہمارا چرواہا (راعی چرواہے کو کہتے ہیں) یا وہ رعونت سے بناتے تھے جس کے معنے ہیں حماقت تو راعنا کے معنے ہوئے احمق اور دل میں خوش ہوتے تھے۔ نیز ویسے بھی اس لفظ میں بے ادبی کا احتمال ہے کیونکہ یہ باب مفاعلہ سے ہے جس کے معنی ہوئے آپ ہماری رعایت کریں ہم آپ کی۔ اس میں نبی علیہ السلام کے ساتھ برابری کا شائبہ پایا جاتا تھا۔ یہ خودسری کا حکم معلوم ہوتا تھا کہ یا حبیب اللہ میرے کلام کی رعایت کیجئے اس سے بے پرواہی نہ کیجئے کسی اور کے ساتھ مشغول نہ ہو جایئے ان وجہوں کی بنا پر مسلمانوں کو اس سے روک دیا گیا کہ تم اگرچہ سادگی سے کہتے ہو مگر اس لفظ کے دوسرے خلاف معنی بھی ہیں یا اوروں کو اس سے بے ادبی کرنے کا موقعہ مل جاتا ہے لہٰذا تم اچھی نیت سے بھی نہ بولو بلکہ وَقُوْلُوا انْظُرْنَا اگر یہ کہنا ہے تو یہ لفظ بولا کرو۔ یا تو انظر انتظر کے معنے میں ہے یعنی ہمیں مہلت دیجئے (نظر بمعنے مہلت) اور یا یہاں الیٰ پوشیدہ ہے۔ اُنْظُرْ اِلَيْنَا یعنی ہماری طرف نظر کرم فرمایئے (نظر بمعنے کرم) اس لفظ میں کسی فاسد معنی کا احتمال نہیں۔ بلکہ بہتر تو یہ ہے کہ وَاسْمَعُوْا پہلے سے فرمان عالی غور سے سن لیا کرو تاکہ تمہیں یہ عرض کرنے کی ضرورت ہی نہ پڑے یا یہ مطلب ہے کہ یہ حکم بگوش ہوش سن لو خبردار اب کبھی راعنا نہ کہنا یا یہ مطلب کہ اطاعت کی غرض سے سنو یہود کی طرح سَمِعْنَا وَ عَصَيْنَا نہ کہنا اس لئے کہ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ان کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے جو راعنا کہہ کر محبوب پاک کے قلب کو ایذا پہنچاتے ہیں انہوں نے زبان سے تکلیف دی ہم انہیں

تکلیف دہ عذاب میں مبتلا کریں گے۔

خلاصہ تفسیر

اے ایمان والو! تم ہمارے نبی علیہ السلام سے نیک نیتی اور صفائی دل کے ساتھ لفظ راعنا بول دیتے ہو جس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ حضور ہم نے یہ بات نہ سنی ہم پر نظر کرم فرمائیں اور دوبارہ فرمادیں۔ مگر تمہارے اس لفظ کے خراب معنی بھی ہیں اور اسے دشمنوں کو بے ادبی اور گستاخی کرنے کا موقع مل جاتا ہے لہٰذا تم یہ لفظ اچھی نیت سے بھی بولنا چھوڑ دو تاکہ گستاخی کا دروازہ بند ہو جائے اور بجائے اس کے انظرنا کہہ دیا کرو اس سے تمہارا مقصد پورا ہو جاوے گا اور بے ادبی کا بھی شائبہ نہ رہے گا اور سب سے بہتر یہ کہ نبی علیہ السلام کا کلام شریف پہلے ہی سے بغور سن لیا کرو تاکہ اس عرض و معروض کی ضرورت ہی نہ پڑے یا ہمارا یہ حکم کان کھول کر سن لو۔ اب اس کی خلاف ورزی نہ ہو۔ اب جو کوئی راعنا کہے گا وہ کافر ہو گا کافروں کے لئے دردناک عذاب ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** بارگاہ الٰہی میں حضور علیہ السلام کی بیحد عزت ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو عرض و معروض کرنے کا طریقہ بھی سکھایا اور عرضی دینے کے الفاظ بھی بتائے، قرآن کریم نے دربار مصطفائی کی حاضری کے آداب، بیٹھنے اٹھنے کے طریقے، کھانے پینے کے آداب، گفتگو کرنے کے ڈھنگ بھی سکھائے۔ اس کی تحقیق کے لئے ہماری کتاب سلطنت مصطفیٰ اور مملکت کبریا کا مطالعہ کرو۔ **دوسرا فائدہ:** تعظیم مصطفیٰ ﷺ تمام عبادات سے مقدم ہے اور سب سے بڑھ کر اہم فرض کیونکہ قرآن کریم نے نماز روزہ کے احکام میں اتنی سختی نہ فرمائی جتنی کہ یہاں فرمائی کہ حکم کے بعد اسْمَعُوْا بھی کہا۔ یعنی خوب سن لو اور خلاف ورزی کرنے والوں کو کافر فرمایا۔ **تیسرا فائدہ:** لِلْكٰفِرِيْنَ سے اشارۃً معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام کی شان میں بے ادبی کا لفظ بولنا کفر ہے اگرچہ اس قصد سے نہ ہو لہٰذا حضور علیہ السلام کی شان میں گستاخی کرنے والے دیوبندی کافر ہیں اگرچہ وہ یہ ہی کہیں کہ ہماری یہ نیت نہ تھی۔ گستاخی میں عرف کا لحاظ ہے نہ کہ نیت کا۔ نیک نیتی سے گالی دینے والا مجرم ہے۔ **چوتھا فائدہ:** برائیوں کے ذریعوں کو بند کرنا ضروری ہے لہٰذا وہ جائز کام بھی حرام ہے۔ جس سے محرمات کا دروازہ کھلے رب نے مشرکین کے بتوں کو گالیاں دینے سے منع فرمایا تھا کیونکہ اس سے مشرکین رب کو گالیاں دیتے یہود پر ہفتہ کے دن شکار کرنا منع تھا جنہوں نے حیلۃً پہلے سے تیاری کی وہ بھی عذاب الٰہی میں گرفتار ہو گئے کیونکہ یہ حرام کا ذریعہ تھا تصویر بنانا اور شوقیہ استعمال کرنا حرام کر دیا گیا کہ یہ بت پرستی کا ذریعہ ہے قبر کے سامنے نماز حرام ہے کیونکہ اس میں بت پرستی کا دروازہ کھلنے کا اندیشہ ہے کسی کے باپ کو گالی مت دو ورنہ وہ تمہارے باپ کو گالی دے گا مگر افسوس اس راز کو دیوبندی نہ سمجھے انہوں نے تقویۃ الایمان اور براہین قاطعہ جیسی گندی کتابیں شائع کیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آریوں نے رنگیلا رسول جیسی ملعون کتاب چھاپی اور اپنی اس گستاخی کے لئے تقویۃ الایمان کو آڑ بنایا۔ **پانچواں فائدہ:** اللہ تعالیٰ اور حضور علیہ السلام کی شان میں ایسے لفظ بولنا حرام ہیں۔ جن میں بے ادبی کا ادنیٰ شائبہ

بھی ہو اور جوان کی شان کے خلاف ہوں اور اسی لئے اللہ کو میاں اور حضور علیہ السلام کو بھائی اور بشر کہنا حرام ہے کہ میاں شوہر کو اور بھائی بشر برابر والے کو بھی بولا کرتے ہیں۔ **چھٹا فائدہ:** حضور علیہ السلام سے رحم و کرم کی درخواست کرنا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اُنْظُرْ حَالَنَا کہنا بالکل جائز ہے کیونکہ یہاں نظر بمعنی دیکھنا نہیں بلکہ بمعنی مہربانی کرنا ہے۔ لَا یَنْظُرُ اِلَیْہِمْ (آل عمران: ۷۷) اور سب مسلمانوں کو خواہ کہیں ہوں کسی زمانے میں ہوں انظرنا کہنے کا حکم ہے کیونکہ قرآن کریم میں مطلقاً ایمان والوں سے خطاب ہوا ہے الفاظ کے اطلاق کا اعتبار ہوتا ہے خیال رہے کہ سارے شرعی احکام ہمارے مرتے ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ مگر حضور سے نظر کرم کی درخواست وہ عبادت ہے جو قبر و حشر میں رہے گی ہر جگہ حضور کے کرم کی ہمیں ضرورت ہے قیامت میں سب سے پہلے حضور کی تلاش پھر حضور کی شفاعت ہوگی۔ پھر دوسرے کام حساب و کتاب وغیرہ تو قُوْلُوا انْظُرْنَا پر ہر جگہ عمل ہوگا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ تعریض کرنا حرام ہے (دو معنی والے لفظ کے بعید معنی مراد لینا) حالانکہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی کو ایک بار بہن کہا تھا یعنی دینی بہن نیز فقہا فرماتے ہیں کہ تعریض جائز ہے **جواب:** مجبوری میں تعریض بیشک جائز ہے بلا ضرورت نہ چاہئے نیز کفر کی تعریض کے احکام کچھ اور ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ضرورۃً بیوی کو بہن فرمایا اور اس میں کفر کے معنی بھی نہ تھے۔ **دوسرا اعتراض:** شافعی لوگ کہتے ہیں کہ منقولہ الفاظ میں تبدیلی جائز نہیں لہٰذا نماز میں بجائے اللہ اکبر کے الرحمٰن اکبر وغیرہ کہنا منع ہے جیسے کہ بجائے انظرنا کے راعنا کہنا حرام ہے۔ **جواب:** اس مسئلے کو اس آیت سے کوئی تعلق نہیں راعنا کے فاسد معنے ہیں اس لئے وہ حرام ہے الرحمٰن اکبر میں کون سی خرابی ہے۔

تفسیر صوفیانہ

اے وہ لوگو جو قَالُوْا بَلٰی کہہ کر ازل میں مومن ہو چکے ہو تم دربار یار میں اغیار کے سامنے راعنا وغیرہ ایسے لفظ محبت سے بھی نہ بولو کہ جس سے اغیار کو دشمنی کرنے کا موقع ملے تمہارے اور احکام ہیں اور دوسروں کے لئے دوسرے احکام ایسا نہ ہو کہ تمہارے مقصد سے بے خبر ہو کر لوگ یہ باتیں بولیں اور کفر میں پھنسیں۔

ہندیاں را اصطلاح ہند مدح — سندھیاں را اصطلاح سندھ مدح
موسیا آداب دانا دیگر اند — سوختہ جان و رواناں دیگر اند

ضروری ہے کہ اہل شریعت صوفیائے کرام کی اصطلاح اور ان کی باتوں سے علیحدہ رہیں دانا کو چاہیے کہ سوختہ جان روانا سے دور رہے انا الحق اور سبحانی ما اعظم شانی نہ تو ہر کوئی کہہ سکے نہ سمجھ سکے نیز دربار الٰہی مقام ناز ہے اور دربار مصطفائی مقام نیاز۔

با خدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار

وہاں انا اللہ کہنے پر بھی کچھ نہیں بگڑتا اور یہاں راعنا کہنے پر ہی ایمان جاتا ہے۔ لہٰذا اس گلی میں ہوش سنبھال کر قدم رکھو۔

دوسری صوفیانہ تفسیر

مہربانی کا استحقاق رکھنے والا رعایت مانگتا ہے مگر جس کا کوئی حق نہ ہو وہ کرم کی نظر مانگتا ہے خریدار تاجر سے رعایت مانگتا ہے مگر بھکاری داتا سے نظر مہر کی درخواست کرتا ہے فرمایا جارہا ہے کہ اے مومنو تم محبوب کے آستانہ میں تاجر یا خریدار بن کر رعایت مانگنے نہ آؤ بلکہ بھکاری بن کر ان کی عنایت مانگنے آؤ نہ تو بندوں کا رب پر کوئی حق ہے نہ ہمارا حضور پر کوئی استحقاق جو دے دیں ان کی عنایت ہے۔ خیال رہے کہ حضور کی عنایت کی ہر شخص کو ضرورت ہے گنہگار ہو یا پرہیزگار ابر رحمت کی بارش کی ہر زمین کو حاجت ہے۔ اعلیٰ زمین ہو یا معمولی اس لئے ہر مسلمان کو حکم دیا گیا۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَ لَا الْمُشْرِكِيْنَ
نہیں چاہتے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا کتاب والوں میں سے اور نہ مشرکوں میں سے
وہ جو کافر ہیں کتابی یا مشرک وہ نہیں چاہتے
اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَخْتَصُّ
یہ کہ اتاری جائے اوپر تمہارے کوئی بھلائی طرف سے رب تمہارے اور اللہ خالص
کہ تم پر کوئی بھلائی اترے تمہارے رب کے پاس سے اور اللہ اپنی رحمت سے خاص
بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَ اللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾
فرماتا ہے ساتھ رحمت اپنی کے جس کو چاہتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے
کرتا ہے جسے چاہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیت سے کئی طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں یہود کی عداوت اور بغض کا ذکر تھا کہ وہ نبی علیہ السلام کی دشمنی کرنے کے لئے موقعہ ہی تلاش کرتے رہتے ہیں اب مسلمانوں کو ان سے ڈرایا جارہا ہے کہ یہ تمہارے سخت دشمن ہیں تمہاری بھلائی انہیں گوارا نہیں۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں بتایا گیا کہ یہود نبی علیہ السلام کے ایسے دشمن ہیں کہ ان کے ساتھ کسی معاملہ میں کمی نہیں کرتے اب فرمایا جارہا ہے۔ مسلمانو وہ تمہارے کیوں کر خیر خواہ ہو سکتے ہیں۔ یعنے پہلے مخالفت نبی کا ذکر تھا اب عداوت مومنین کا تذکرہ ہے۔ **تیسرا تعلق:** پہلے بتایا گیا تھا کہ یہود برے ارادے سے راعنا کہتے ہیں اب اس کی وجہ ارشاد ہو رہی ہے کہ وہ اس لئے ایسی حرکت کرتے ہیں کہ مسلمان بھی عام طور پر یہ بولنے لگیں۔ اور فیضان نبوت سے محروم ہو جائیں اور ان پر کوئی خدا کی رحمت نازل نہ ہو، نیز ان لوگوں کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ جب مسلمان اور ان کے نبی ہماری بات نہیں سمجھتے تو رب کا فرمان کیا سمجھتے ہوں گے اور رب تعالیٰ ایسے سیدھے لوگوں پر اپنا کلام

کیوں کراتا رہتا ہوگا۔

شان نزول

یہود کی ایک جماعت مسلمانوں سے دوستی اور خیر خواہی ظاہر کرتی تھی اور میٹھی باتوں سے ان کا دل لبھانا چاہتی تھی ان کے جھٹلانے اور مسلمانوں کو بروقت خبردار کرنے کے لئے یہ آیت کریمہ اتری (جمل وخزائن العرفان)

تفسیر

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَوَدُّ۔ وُدٌّ سے بنا ہے۔ جس کے معنے ہیں دل سے چاہنا اور پسند کرنا یا تمنی کرنا اس کی نفی سے کراہت لازم آئی یعنی کفار نہیں چاہتے تھے بلکہ برا سمجھتے ہیں، كَفَرُوْا سے عام کافر مراد ہیں خواہ منافق ہوں یا ظاہری اور ظاہر کفار میں بھی اہل کتاب ہوں یا بت پرست اسی لئے فرمایا گیا کہ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ یعنی عام کفار مراد ہیں خواہ وہ یہود نصاری ہوں یا مشرکین ان میں کوئی بھی کبھی نہیں چاہتا کہ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ کہ اے مسلمانو تم پر کوئی بھلائی اترے یا تو خیر سے مراد وحی ہے اور علیکم سے مراد نَبِيُّكُمْ ہے اور یا خیر سے عام بھلائی مراد ہے اور علیکم اپنے ظاہری معنی پر یعنی کفار نہیں چاہتے کہ تم پر کوئی بھلائی یا تمہارے نبی پر وحی آئے مِّنْ رَّبِّكُمْ تمہارے رب کی طرف سے یہ من ابتدائیہ ہے یعنی وہ خود تمہارے لئے بھلائی کیا کرتے یا اور کسی ذریعہ سے تم تک بھلائی کیا پہنچنے دیتے وہ تو یہ بھی نہیں چاہتے کہ حق تعالیٰ بھی تم پر فضل فرمائے کیونکہ یہود تو اپنے کو نبوت اور وحی کا ٹھیکیدار سمجھے ہوئے ہیں اور مشرکین اپنے مال اور عزت کے گھمنڈ میں ہیں اور کہتے ہیں کہ نبوت کسی بڑے مالدار آدمی کو ملنی چاہئے تھی یا نعیم ابن مسعود طائفی کو ملتی یا ولید ابن مغیرہ مکی کو۔ مگر نہیں ان باتوں سے کچھ فائدہ نہیں کیونکہ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ رب تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت سے خاص کر لیتا ہے اور اس کی مرضی میں کسی کو دخل نہیں رحمت سے مراد نبوت، وحی، حکمت، نصرت اور فتح مندی ہے پھر یہ نہیں کہ نااہل کو اپنی رحمت دیدے بلکہ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ اللہ بڑے فضل والا ہے کہ جس پر رحمت کرنا چاہتا ہے پہلے اس میں لیاقت اور قابلیت بھی عطا فرماتا ہے تو جس ذات کریم پر اس نے وحی بھیجی اور جس قوم پر قرآن اتارا اسے پہلے ہی اس کی لیاقت اور قابلیت بھی عطا فرمادی فضل کے معنے ہیں محض کرم سے بغیر کسی کے استحقاق کے کچھ عطا فرمانا

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانوں کفار کی چکنی چپڑی باتوں پر فریفتہ نہ ہو جانا ہم تمہیں ان کا دلی حال بتاتے ہیں کہ کوئی کافر خواہ کتابی ہو یا مشرک چاہتا ہی نہیں کہ تم پر خدا کا کوئی فضل بھی ہو اہل کتاب تو اپنے کو ہر فضل کا حقدار سمجھتے ہیں اور مشرکین آخرت کی نعمتوں کو دنیوی نعمتوں پر قیاس کر کے کہتے ہیں کہ جس طرح مال اور عزت ملی ہے ایسے ہی نبوت بھی ملنی چاہئے تھی مگر ان بے وقوفوں کو یہ خبر نہیں کہ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت دیتا ہے اور جس پر چاہتا ہے اپنا فضل فرماتا ہے یہ تو ان بگڑے ہوئے خاندانی نوابوں کی طرح ہیں جو کہ نئے دولت مند اور صاحب کمال لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں اور اپنے کو خاندانی اور موروثی نواب سمجھے بیٹھے ہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ:** اللہ پر کچھ واجب نہیں اور نہ کسی کا اس پر ذاتی حق ہاں اس نے خود اپنے فضل سے جو حق جس کو دیدیا وہ درست ہے۔ **دوسرا فائدہ:** اللہ کی نعمت محض اس کے فضل سے ملتی ہے ہاں بعض نعمتوں میں بعض ظاہری اسباب کو بظاہر دخل ہوتا ہے۔ **تیسرا فائدہ:** نبوت محض وہبی ہے اس میں کسب کو دخل نہیں۔
چوتھا فائدہ: حق تعالیٰ نااہل پر فضل نہیں کرتا بلکہ پہلے اسے اہل بناتا ہے پھر رحمت دیتا ہے۔ ع

بجائے خویش بود آنچہ کردگار دھد

پانچواں فائدہ: حسد بڑی بری بیماری ہے اس میں حاسد خود اپنا ہی نقصان کر لیتا ہے محسود کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: جب اللہ جس کو چاہے رحمت سے خاص کرے تو تم نے نبوت اولاد ابراہیم کے ساتھ کیوں خاص مان لی اور حضور علیہ السلام پر اس کی انتہا کیوں مان بیٹھے ممکن ہے کہ مرزا جی پر اس نے رحمت کر دی ہو یہ ختم نبوت یہود کا عقیدہ ہے **جواب:** یہ آیت ہی اس اعتراض کا جواب ہے جب اس نے نبوت اولاد ابراہیم کے ساتھ، ختم نبوت حضور علیہ السلام کے ساتھ خاص فرمادی تو ہمیں اس اعتراض کا کیا حق ہے یہ تو رب سے کہو یا قرآن سے پوچھو **دوسرا اعتراض:** تمہاری تفسیر سے معلوم ہوا کہ نااہل کو نعمت نہیں ملتی اور احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت کے قریب نااہلوں کو سلطنت اور مال ملے گا۔ اب بھی کفار اور ظالم لوگ بادشاہ بنے بیٹھے ہیں۔ **جواب:** یہ سلطنت اور مال و دولت نعمت نہیں بلکہ لعنت ہے اس سے مجرموں کو سزا دینا منظور ہے۔

چو خواہد کہ ویراں کند عالمے نہد ملک در پنجہ ظالمے

تفسیر صوفیانہ

اللہ کا فضل بہت وسیع ہے جو اس سے محروم رہا وہ فضل کی تنگی سے نہیں بلکہ خود اپنی کوتاہی کی وجہ سے ہے اس فضل کے لینے والے دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو اہل اعمال جو کہ عبادت و زہد سے حاصل کرتے ہیں دوسرے اہل محبت جو کہ اپنے قرب اور دلی محبت کی وجہ سے فضل پاتے ہیں اور بدنصیب جب اس سے محروم رہتے ہیں تو دور بیٹھے ہوئے ان پر حسد کیا کرتے ہیں درحقیقت حاسد پانچ طرح رب کا مقابلہ کرتا ہے ایک یہ کہ اس نعمت سے بغض رکھتا ہے جو اس کے غیر کو ملی دوسرے یہ کہ وہ رب کی تقسیم پر راضی نہیں بلکہ اسے رائے دیتا ہے کہ اس طرح تقسیم فرما تیسرے یہ کہ رب کریم اپنے کرم سے دیتا ہے اور یہ بخیل اس پر بخل کرتا ہے چوتھے یہ کہ اللہ کے ولی سے دشمنی رکھتا ہے اور اس کی نعمت کا زوال چاہتا ہے پانچویں یہ کہ وہ ابلیس کی امداد کرتا ہے حاسد کی مثال اس شخص کی سی ہے جو دوسرے کو پتھر مارے مگر وہ لوٹ کر اس کی کھوپڑی پر پڑے اور اس کو زخمی کرے سب سے پہلا حاسد شیطان تھا انسانوں میں پہلا حاسد قابیل ہوا۔ ان دونوں کے انجام سے دنیا خبردار ہے۔ حسد تپ دق یا دمہ کی سی بیماری ہے جو دم کے ساتھ جاتی ہے۔ یہود حسد کے ہی مارے ہوئے تھے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ

وہ جو منسوخ کردیں ہم کوئی آیت یا بھلادیں ہم اس کو لائیں گے ہم اچھی کو اس سے یا مثل اس کی کیا نہ

جب کوئی آیت ہم منسوخ فرمائیں یا بھلادیں تو اس سے بہتر یا اس جیسی لے آئیں گے

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿١٠٦﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ

جانا تو نے تحقیق اللہ اوپر ہر چیز کے قادر ہے کیا نہ جانا تو نے تحقیق واسطے اس

کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ سب کچھ کرسکتا ہے کیا تجھے خبر نہیں کہ اللہ ہی کے لئے

اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ وَ مَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ

کے ہے ملک آسمانوں اور زمین کا اور نہیں ہے واسطے تمہارے

ہے آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اور اللہ کے سوا تمہارا

اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ﴿١٠٧﴾

سوائے اللہ کے کوئی حمائتی اور نہ مددگار

کوئی حمائتی اور نہ مددگار ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** اس سے پہلے یہود کی دشمنی حضور علیہ السلام اور مسلمانوں کے ساتھ بیان کی گئی اب ان کی کتاب اللہ سے عداوت کا ذکر ہے کہ وہ اس کتاب سے لوگوں کو ہٹانے کے لئے نسخ وغیرہ کے بیہودہ اعتراضات کرتے رہتے ہیں اور ان اعتراضوں کا منہ توڑ جواب دیا جارہا ہے **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت سے معلوم ہوا تھا کہ وحی اللہ کا فضل ہے وہ جس کو چاہتا ہے عطا فرماتا ہے اس پر شبہ ہوسکتا ہے کہ جب وحی خدا کا فضل ہے تو کبھی منسوخ کیوں ہوتی ہے اور جب قرآن کی ہر آیت خیر ہے تو اس کے منسوخ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس کے بجائے شر آجائے اسی آیت میں اس شبہ کو دور فرمایا جارہا ہے۔

شان نزول

مشرکین اور یہود مسلمانوں سے کہتے تھے کہ کیا تم تعجب نہیں کرتے کہ محمد ﷺ صحابہ کو آج ایک کام کا حکم دیتے ہیں اور کل اس سے منع کرکے دوسرا حکم دیتے ہیں دیکھو پہلے زانی کے لئے فرمایا **فَاٰذُوْهُمَا** کہ انہیں زبانی ایذا دو پھر اس کے خلاف حکم دیا کہ انہیں گھروں میں تادم مرگ قید کرو پھر اس کو بدلا اور کہا کہ انہیں سو کوڑے مارو وغیرہ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خود ان کا

کام ہے کہ کبھی بے خبری میں کچھ کہہ دیتے ہیں اور پھر نادم ہو کر اسے بدلتے ہیں اس کے جواب میں یہ آیت کریمہ آئی (تفسیر روح البیان واحمدی)

تفسیر

مَا نَنْسَخْ یہ ما شرطیہ ہے۔ جس کے معنی ہیں جو کچھ مَا نَنْسَخْ، نَسْخ سے بنا جس کے معنی ہیں زائل کرنا باطل کرنا فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ (حج: ۵۲) اللہ شیطانی وسوسے کو باطل فرماتا ہے اور نقل کرنا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (الجاثیہ: ۲۹) ہم تمہارے اعمال کو نامہ اعمال میں نقل کرتے تھے اسی لئے کتاب کی نقل کو نسخ اور ناقل کو ناسخ اور کتاب کو نسخہ کہتے ہیں اور زمانہ کی تبدیلی اور روحوں کے بدلنے کو تناسخ کہا جاتا ہے شریعت میں کسی حکم یا آیت کی انتہا بیان کرنے کو نسخ کہتے ہیں کیونکہ اس سے وہ حکم زائل یا منتقل ہو جاتا ہے۔ انشاء اللہ نسخ کی پوری تحقیق اور اقسام خلاصہ تفسیر میں بیان ہوں گے۔ مِنْ اٰيَةٍ، نسخ آیت کا بھی ہوتا ہے اور حدیث کا بھی پوری شریعت اور دین کا بھی بعض احکام کا بھی مگر چونکہ یہاں نسخ آیت پر ہی اعتراض تھا اس لئے اسی کا ذکر ہوا اور ممکن ہے کہ آیت سے مراد نشانی ہو جس میں دین حکم، شریعت سب داخل ہوں۔ خیال رہے کہ یہاں نسخ سے مراد نسخ حکم ہے نہ کہ نسخ تلاوت کیونکہ اس کا ذکر آگے آرہا ہے۔ اَوْ نُنْسِهَا ایک قرات میں نَنْسَاهَا ہے نون کے فتح اور ہمزہ سے یہ نَسَاءٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں دیر لگانا اِنَّمَا النَّسِیْٓءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ (التوبہ: ۳۷) اسی لئے ادھار کو نسیہ کہتے ہیں یعنی جس آیت کے اتارنے میں ہم دیر لگاتے ہیں لیکن مشہور قرات نُنْسِهَا ہے یہ نسیان سے بنا ہے جس کے معنے ہیں بھول جانا۔ فَنَسِيَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا (طٰہٰ: ۱۱۵) یا چھوڑ دینا جیسے فَالْيَوْمَ نَنْسٰهُمْ (الاعراف: ۵۱) یعنے جس آیت کو ہم بھلا دیتے ہیں کہ اس کی تلاوت منسوخ فرما دیتے ہیں یا جس آیت کو ہم چھوڑ دیتے ہیں یعنی قرآن میں باقی نہیں رکھتے تو نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اس سے اچھی ہم لے آتے ہیں اس سے آسان تر یا ثواب میں زیادہ یا موجودہ حالت کے مناسب مراد ہے اَوْ مِثْلِهَا یا اس منسوخ آیت کی مثل کہ یہ آیت ثواب اور مناسبت حالت میں منسوخ کی طرح ہوتی ہے اگرچہ نسخ آیت کا حدیث سے بھی ہوتا ہے جیسا کہ ہم خلاصہ تفسیر میں عرض کریں گے۔ لیکن چونکہ حدیث بھی رب کا فرمان ہے اس لئے وہاں بھی ناسخ رب تعالیٰ ہی سمجھیں اَلَمْ تَعْلَمْ یا تو کفار سے خطاب ہے اور یا مسلمانوں سے یعنی اے منکر کافر، اے قرآن پڑھنے والے مسلمان کیا تو نہیں جانتا اور ممکن ہے کہ حضور علیہ السلام سے خطاب ہو استفہام انکاری یعنی بے شک آپ جانتے ہیں اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے کہ کائنات عالم کو ہر لحظہ اور ہر آن بدلتا ہے تو کیا وہ احکام بدلنے پر قادر نہیں اور جو مالک الملک دنیوی حاکموں کو بدلتا رہتا ہے کیا وہ اس پر قادر نہیں کہ مختلف احکام سے دین و دنیا کا نظام قائم رکھے اچھا ہم پوچھتے ہیں کہ اَلَمْ تَعْلَمْ یہاں بھی یا تو ہر عقلمند سے خطاب ہے۔ یا خاص حضور ﷺ سے کہ کیا تم نہیں جانتے کہ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یہ سارے آسمان و زمین اللہ ہی کا ملک ہے اور ان میں تو دن رات میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے دن رات اور موسم وغیرہ بدلتے ہیں اور زمین میں مختلف ملک اور قومیں ہیں جن کے علیحدہ قوانین ہیں اور مختلف طریقہ زندگانی تو اگر آیتوں کے تبادلہ سے قرآن خدائی کتاب نہیں رہتا تو چاہئے کہ ان حالات کے تبادلہ سے

زمین و آسمان خدا کے ملک نہ رہیں اور یہ تو خدا کے ملک ہیں تو قرآن بھی خدا کی کتاب ہے وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ رب کے سوا تمہارا کوئی حمائتی دوست نہیں تا کہ تم نسخ فرمانے والے رب کو چھوڑ کر اس کی پناہ میں آجاؤ اور نہ کوئی مددگار ہے کہ جب تم ناسخ احکام چھوڑ کر عذاب پاؤ تو تمہیں بچا سکے یا یوں کہو کہ تمہارے حالات میں تبدیلی فرمانے والا رب ہی ہے اس کے سوا کوئی دوسرا مالک نہیں تو آیات قرآن میں تبدیلی فرمانے والا بھی رب ہی ہے نہ کوئی اور خیال رہے کہ اس آیت کریمہ میں نسخ کی ایک حکمت بیان ہوئی یعنی ہر حکم کا اپنے وقت میں بندوں کے حالات کے زیادہ موافق ہونا جیسے ایک وقت بچہ و بیمار کو ایک غذا و دوا مناسب ہوتی ہے اور دوسرے وقت دوسری غذا و دوا اس کے علاوہ کبھی نسخ حضور کی محبوبیت دکھانے کے لئے ہوا۔ جیسے تبدیلی قبلہ جو حضور کی رضا جوئی کے لئے ہوئی رب نے فرمایا فَلَنُوَلِّیَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا (البقرہ: ۱۴۴) تا کہ قیامت تک کے مسلمان سمجھیں کہ جسے جو نعمت ملی حضور کے واسطے سے ملی کہ کعبہ اگر قبلہ بنا تو حضور کی مدد سے یہ بھی بتایا گیا کہ حضور کا فیض دور دور پہنچتا ہے دیکھو مدینہ میں بیٹھے ہوئے کعبہ کو جو مکہ معظمہ میں تھا قبلہ بنا دیا یا یوں ہی سرکار مدینہ منورہ سے تمام عالم کو فیض بحکم الٰہی دے رہے ہیں۔

خلاصہ تفسیر

کفار اہل کتاب اور مشرکین جو کہ نسخ پر اعتراض کرتے ہیں ان کو جواب دو کہ ہم جو بھی آیت یا جو حکم یا جو شریعت یا جو دین منسوخ فرمادیتے ہیں یا تو اس کے صرف احکام بدل دیں مگر اس کا چرچا باقی رکھیں یا بالکل اس کو بھلا ہی دیں اور اس کا چرچا بھی ختم فرمادیں تو اس سے اچھی آیت یا اچھا حکم یا اچھا دین بھیج دیتے ہیں یا اسی کی مثل کیا تم نے نہ دیکھا کہ دین موسوی منسوخ ہو کر عیسوی آیا جو اس سے آسان تر تھا پھر اس کے بعد دین محمدی بھیجا گیا جو سب سے بہتر ہے کیا تم نے خدا کی قدرت کو محدود سمجھ رکھا ہے کہ وہ ایک حکم کے سوا دوسرے سے کام نہ چلا سکے نہیں بلکہ وہ رنگ برنگے احکام بھیج کر اپنی قدرت کا اظہار فرماتا ہے تم جانتے ہو کہ زمین و آسمان میں اللہ ہی کی بادشاہت ہے اور ایسی مستقل بادشاہت کہ اس کے سوا کوئی دوسرا بادشاہ تو کیا بندوں کا حمائتی اور مددگار بھی نہیں مگر اس کے باوجود زمین و آسمان میں ہر وقت انقلاب اور حالات کی تبدیلی ہوتی رہتی ہے ہر دن ایک نئے حال کا ظہور ہوتا ہے اور نئی شان کی جلوہ گری کون سی چیز ہے جس کو قرار ہے اے یہودیو! اگر تم آیات کی تبدیلی سے قرآن کی مخالفت میں ایسے اندھے ہوئے کہ اپنا اصل دین ایمان کھوئے دیتے ہو۔

نسخ اور اس کے اقسام اور احکام

نسخ کے لغوی اور اصطلاحی معنی تفسیر میں معلوم ہو چکے یہ ضرور خیال رہے کہ نسخ ہمارے لئے تبدیلی ہے اور رب کے علم میں انتہاء مدت کا بیان نسخ نقلاً اور عقلاً ہر طرح جائز بلکہ واقع ہے عقلاً تو اس لئے کہ احکام دو قسم کے ہیں تکوینی اور تشریعی، تکوینی احکام کا تعلق عالم کی پیدائش سے ہے اور تشریعی احکام قابل عمل قوانین کا نام ہے ہم دیکھتے ہیں کہ تکوینی احکام میں ہمیشہ انقلاب رہتا ہے نہ زمین و آسمان کو ایک حال پر قرار ہے نہ ان کی کسی چیز کو جب تکوینی احکام دن رات بدل رہے ہیں تو تشریعی احکام کے

بدلنے میں کیا مضائقہ ہے بلکہ حق یہ ہے کہ تشریعی احکام کو تکوینی احکام کے ساتھ خاص تعلق ہے۔ جیسے مخلوق کی حالت ویسے اس کے احکام بچے پر جسم ڈھانکنا فرض نہیں غریب پر زکوۃ واجب نہیں۔ مالدار کو زکوۃ کھانا جائز نہیں۔ حضرت آدم کے زمانہ میں بہن سے نکاح حلال تھا اور اس کے بعد حرام۔ یہ تبدیلی احکام کیوں ہے۔ تکوین بدلنے سے اگر انسان کی حالت بدلتی رہے مگر اس کے احکام نہ بدلیں تو زندگی دشوار ہو جائے بڑھاپے تک ماں کا دودھ ہی پینا پڑے اسی لئے اس آیت کریمہ میں تکوین کے اختلاف سے نسخ احکام ثابت کیا گیا۔ نقلاً اس واسطے کہ آدم علیہ السلام سے ہمارے حضور ﷺ تک صدہا پیغمبر تشریف لائے مگر ان کے احکام میں سخت اختلاف رہا۔ آدم علیہ السلام کے دین میں اپنی بہن سے نکاح حلال تھا جو کہ شریعت نوح علیہ السلام سے منسوخ ہوا۔ پھر نوح علیہ السلام کی شریعت میں سارے چوپائے حلال تھے دین موسوی میں بہت سے حرام کر دیئے گئے۔ خود ہمارے اسلام میں اولاً شراب حلال رہی بعد میں حرام ہوئی۔ پہلے وفات کی عدت ایک سال تھی اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ (البقرہ: ۲۴۰) پھر چار ماہ دس دن ہوئی پہلے حضور علیہ السلام سے عرض معروض کرنے کے لئے خیرات کرنا واجب تھی۔ فَقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَیْ نَجْوٰىكُمْ صَدَقَةً (مجادلہ: ۱۲) پھر یہ حکم ءَاَشْفَقْتُمْ (مجادلہ: ۱۳) کی آیت سے منسوخ ہوا پہلے پچاس نمازیں فرض تھیں۔ بعد میں پانچ رہیں پہلے بیت المقدس قبلہ تھا بعد میں کعبہ ہوا غرض کہ جیسے دن رات سے سردی گرمی سے بچپن جوانی سے تندرستی بیماری سے بہار خزاں سے منسوخ ہوتی ہے ویسے ہی آیت آیت سے۔ ایک حکم دوسرے سے ایک دین دوسرے دین سے منسوخ ہونے میں۔ افسوس ہے کہ اتنی ظاہر بات کو عیسائی، پادری اور ہندو وغیرہ نہ سمجھ سکے۔ ان کی کیا شکایت ہمارے علی گڑھی تہذیب کے مسلمان اور جاہل مفسر اس کا انکار کر رہے ہیں۔ مجھ سے ایک اچھے خاصے پڑھے لکھے نے کہا کہ قرآن شریف کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ کیا یہ آیات اب بھی قابل عمل ہیں؟ زانیہ عورت زانی یا مشرک سے نکاح کرے مسلمان پر حرام ہے یا خاوند کی وفات کے بعد عورت ایک سال تک عدت کرے یا کفار سے چشم پوشی کرو ان پر سختی نہ کرو یا زانیہ لونڈی کو گھر میں قید کر دو حتی کہ اللہ تعالیٰ ان کے احکام بیان کرے آخر کار وہ حضرت خاموش ہو گئے غرضکہ نسخ کا انکار ایسا ہی ہے جیسے روز روشن کا انکار۔

نسخ کی قسمیں

نسخ کی تین قسمیں ہیں: ۱۔ نسخ تلاوت۔ ۲۔ نسخ حکم۔ ۳۔ نسخ تلاوت وحکم۔ نسخ تلاوت یہ ہے کہ آیت کے الفاظ قرآن میں نہ رہیں اور نماز وغیرہ میں اس کی تلاوت جائز نہ ہو مگر اس کے احکام باقی ہوں جیسے کہ یہ آیت اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ اِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا نَكَالًا مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ یعنی جب بوڑھا اور بوڑھی زنا کر بیٹھیں تو ان کو سنگسار کر دو اللہ سے ڈرانے کے لئے یہ آیت تلاوت منسوخ لیکن اس کا حکم باقی۔ تفسیر عزیزی نے اس قسم کی بہت سی منسوخ آیتیں بیان فرمائی ہیں خیال رہے کہ منسوخ الحکم آیتوں کی تلاوت ہوگی اس تلاوت پر ثواب ملے گا۔ لہٰذا یہ اعتراض نہیں ہوسکتا کہ ان آیات کو پھر باقی کیوں رکھا گیا کیونکہ آیات قرآنیہ صرف احکام کے لئے نہیں اتریں جیسے متشابہات قصص۔ مثالیں۔ وغیرہ کہ صرف

تلاوت کے لئے ہیں احکام کے لئے نہیں منسوخ فی الحکم یہ کہ آیت قرآن میں موجود ہے اس کی تلاوت بھی ہوتی ہو مگر اس کا حکم باقی نہ ہو جیسے مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ (البقرہ: ۲۴۰) سے عدت وفات ایک سال معلوم ہوتی ہے اور نہ تو آیت کا حکم باقی رہے اور نہ اس کی تلاوت جیسے ایک آیت تھی عَشْرَ رَضَعَاتٍ مَعْلُوْمَاتٍ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ عورت کا دودھ دس گھونٹ پینے سے رضاعت ثابت ہوگی مگر اب نہ اس آیت کی تلاوت رہی اور نہ اس کا حکم بلکہ ایک گھونٹ سے بھی رضاعت ثابت ہو جاتی ہے ان تینوں قسموں کو مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا میں بیان فرمایا۔

نسخ کی دوسری قسمیں پھر نسخ کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ **آسان حکم سے مشکل حکم کا نسخ:** جیسے کہ وفات کی ایک سال کی عدت چار ماہ دس دن سے منسوخ ہوئی۔

۲۔ **مشکل حکم سے آسان حکم کا نسخ** مگر اس مشکل میں ثواب زیادہ جیسے کہ ترک جہاد کا حکم جہاد کی آیات سے منسوخ ہوا کہ اگرچہ جہاد ہے تو مشکل مگر اس کا ثواب بہت

۳۔ **مساوی کا مساوی سے نسخ:** یعنی منسوخ اور ناسخ آسانی اور ثواب میں برابر ہوں جیسے تبدیلی قبلہ کہ بیت المقدس کا قبلہ ہونا منسوخ ہوا اور کعبۃ اللہ قبلہ بنا مگر ان دونوں قبلوں میں ثواب اور آسانی برابر اسی تقسیم کی طرف اس عبارت میں اشارہ ہے نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا خیر سے مراد یا آسان یا زیادہ باعث ثواب ہے اور مثل سے مراد برابر ہے

محل نسخ: قیاس اور اجماع نہ تو منسوخ ہو سکتے ہیں نہ ناسخ صرف قرآنی آیات اور احادیث میں نسخ ہوتا ہے ان میں بھی صرف قابل نسخ احکام کی آیتیں اور حدیثیں منسوخ ہو سکتی ہیں یعنی مستقل واجب اور مستقل حرام کی آیتیں منسوخ نہیں ہو سکتیں۔ جیسے ایمان کے وجوب اور کفر کی حرمت کی آیتیں اس طرح حق تعالیٰ کی ذات وصفات کی آیات واحادیث نسخ کے قابل نہیں۔ نیز قرآن، حدیث کی خبریں بھی منسوخ نہیں ہو سکتیں۔ ہاں وہ قوانین جو خبری شکل میں بیان ہوئے وہ یقیناً نسخ کے قابل ہیں جیسے كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ (البقرہ: ۱۸۳) (تم پر روزے فرض کئے گئے) یا وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ (آل عمران: ۹۷) (لوگوں پر بیت اللہ کا حج فرض ہے) یہ بظاہر خبریں ہیں مگر درحقیقت شرعی قانون لہٰذا ان کا نسخ جائز ہے اس لئے آیت وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِیْۤ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ (البقرہ: ۲۸۴) (تم دل کی باتیں ظاہر کر دیا چھپاؤ رب سب کا حساب لے گا) بظاہر خبر اور درحقیقت قانون ہے اس لئے آیت لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا (البقرہ: ۲۸۶) سے منسوخ ہو گیا۔ نیز مَاۤ اَدْرِیْ مَا يُفْعَلُ بِیْ وَلَا بِكُمْ (احقاف: ۹) کی آیت لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ (فتح: ۲) سے منسوخ ہے غرضیکہ جہاں خبر کے نسخ سے جھوٹ لازم آ جائے وہ نسخ منع ہوگا۔ اس کے علاوہ جائز یہ قاعدہ خیال میں رکھنا چاہئے ہر خبر کا منسوخ تلاوت ہونا جائز ہے جس کی بہت سی مثالیں ہیں۔ دیکھو تفسیر عزیزی، اسی طرح جن احکام کو قرآن کریم نے دائمی فرمایا وہ بھی منسوخ نہیں ہو سکتے جیسے خٰلِدِيْنَ فِيْهَاۤ اَبَدًا

نسخ کی صورتیں

نسخ کی چار صورتیں ہیں۔نسخ آیت کا آیت سے جیسے لَكُمْ دِيْنُكُمْ (کافرون:٦) کی آیت قَاتِلُوْا فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ کی آیت سے منسوخ ہے یا مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ (البقرہ:۲۴۰) کی آیت اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا (البقرہ:۲۳۴) کی آیت سے منسوخ دوسرے نسخ حدیث کا حدیث سے جیسے مثلہ کرنے کی حدیث اس کی ممانعت کی حدیث سے منسوخ ہے (مثلہ مقتول کے اعضا کاٹنے کو کہتے ہیں) یا جیسے امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے یا رفع یدین کرنے کی حدیثیں دوسری احادیث سے منسوخ۔چنانچہ عینی شرح بخاری میں ہے کہ حضرت براء ابن عازب نے کسی کو نماز میں رفع یدین کرتے دیکھا تو فرمایا کہ رفع یدین شروع اسلام میں تھا۔پھر چھوڑ دیا گیا۔اس واسطے حضرت ابن مسعود نے فرمایا کہ میں نے حضور کو نماز پڑھتے دیکھا حضور نے سوائے تکبیر تحریمہ کے اور کسی وقت ہاتھ نہ اٹھائے۔یوں ہی پہلے حکم تھا کہ مقتدی الحمد شریف پڑھے پھر فرمایا وَ اذ قرا فانصتوا اور فرمایا کہ امام کی قراءت مقتدی کی قراءت ہے پہلی احادیث منسوخ ہیں یہ احادیث ناسخ تیسرے آیت کا نسخ حدیث سے جیسے غیر اللہ کو سجدہ تعظیمی کا جواز قرآن سے ثابت اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ (بقرہ:۳۴) وغیرہ۔مگر حدیث سے منسوخ یا جیسے ماں باپ اور اہل قرابت کو وصیت کرنا قرآن سے ثابت الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ (البقرہ:۱۸۰) مگر یہ حکم حدیث لَا وَصِيَّةَ لِلْوَارِثِ سے منسوخ یا اُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ (النساء:۲۴) کی آیت سے ثابت تھا کہ ماں بہن وغیرہ چند عورتوں کے سوا تمام عورتیں حلال ہیں۔مگر یہ آیت اس حدیث سے منسوخ ہے کہ لَا تُنْكَحُ الْمَرْءَةُ عَلٰى عَمَّتِهَا وَلَا عَلٰى خَالَتِهَا جس سے معلوم ہوا کہ پھوپھی، بھتیجی اور خالہ، بھانجی کو نکاح میں جمع نہیں کر سکتے ہیں۔اس قسم کی بہت سی آیتیں جو حدیث سے منسوخ ہیں۔چوتھے نسخ حدیث کا قرآن سے جیسے بیت المقدس کا قبلہ ہونا حدیث سے ثابت تھا اور وہ اس آیت سے منسوخ ہوا۔ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ (البقرہ:۱۴۴) ایسے ہی رمضان کی راتوں میں بیوی سے جماع کی حرمت حدیث سے ثابت تھی مگر وہ اس آیت سے منسوخ ہوئی اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ (البقرہ:۱۸۷) اس قسم کی بہت سی احادیث ہیں جو آیات سے منسوخ ہیں اس کی پوری تحقیق کتاب الاعتبار مصنفہ علامہ حازمی شافعی میں دیکھو خیال رہے کہ قرآن و حدیث میں جس قدر نسخ ہونا تھا حضور کی زندگی پاک میں ہو گیا اب حضور کی وفات شریف کے بعد کسی قسم کا نسخ ممکن نہیں کیونکہ نہ اب وحی آسکتی ہے اور نہ نئی حدیث لہٰذا سارا قرآن اور ساری احادیث محکم ہیں۔

نسخ کی وجوہات

نسخ کی چند وجہیں ہوتی ہیں ایک یہ کہ پہلا حکم عارضی طور پر ضرورۃً جاری کیا گیا تھا۔بعد کو ختم کر دیا گیا۔جیسے شریعت آدم علیہ السلام میں بہن سے نکاح اس لئے جائز تھا کہ دوسری عورتیں نہ ملتی تھیں بعد کو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔دوسرے یہ کہ پہلے حکم کے لوگ عادی ہو چکے تھے اس کا ایک دم چھوڑنا مشکل تھا لہٰذا آہستگی سے بند کیا گیا۔جیسے کہ اہل عرب شراب کے عادی تھے اس لئے پہلے شراب سے نفرت دلائی گئی پھر نشہ کی حالت میں نماز سے روکا گیا۔پھر بالکل حرام کر دی گئی، اسی طرح اہل عرب

روزے کی مشقت برداشت نہ کر سکتے تھے اس لئے پہلے تو سال میں صرف عاشورے کا ایک روزہ فرض کیا گیا۔ پھر ہر مہینہ میں تین روزے پھر ماہ رمضان کے روزے فرض ہوئے۔ تیسرے یہ کہ نسخ سے محبوب کی عظمت کا اظہار ہو جیسے کہ معراج میں پچاس نمازیں فرض ہوئیں۔ پھر پانچ پانچ کٹ کر آخر کار پانچ رہیں تاکہ موسیٰ علیہ السلام کو عظمت مصطفیٰ ﷺ کا پتہ لگ جائے انہیں بارگاہ الٰہی میں بہت باریابی ہے۔ اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔

قصر دنیٰ تک کس کی رسائی جاتے یہ ہیں آتے یہ ہیں

نیز اسی نسخ سے پتہ لگا کہ اللہ کے پیارے بندے وفات کے بعد بھی مدد کرتے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے شب معراج میں پچاس نمازیں کم کرا کر پانچ کرادیں حالانکہ اس وقت موسیٰ علیہ السلام کو وفات پائے قریباً تین ہزار سال ہو گئے اس طرح حضور بھی بعد وفات ہم گنہگاروں کی مدد کر سکتے ہیں غرضیکہ اس نسخ میں بہت راز ہیں۔ اسی طرح تبدیلی قبلہ کا حکم جس سے حضور علیہ السلام کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ چوتھے یہ کہ اس سے خود ناسخ کی عظمت معلوم ہو۔ جیسے کہ اسلام سے دوسرے ادیان کا نسخ ہونا اگر اول ہی سے دنیا میں اسلام آجاتا تو اس کے قوانین کی برتری ظاہر نہ ہوتی پانچواں یہ کہ ہر شے اپنے اصل پر پہنچ کر ختم اور منسوخ ہو جاتی ہے اور اس سے الگ رہ کر مضطرب رہتی ہے۔ جیسے تمام دریا سمندر کی طرف اس تیزی سے بھاگتے ہیں کہ جو درخت یا پل ان کو روکے اسے بھی اکھیڑ ڈالتے ہیں شور مچاتے ہوئے دوڑے چلے جاتے ہیں کیونکہ سمندر ان سب کی اصل ہے کہ سمندر ہی سے بادل اٹھ کر پہاڑوں پر برسا یا برف بن کر گرا اور اس سے دریا بنا اب یہ اپنے اصل کی طرف دوڑے مگر جب سمندر کے قریب پہنچے تو ان کا وہ شور بھی جاتا رہا اور زور بھی گھٹ گیا روانی میں بھی کمی آگئی اور سمندر میں پہنچ کر ایسے گم ہو گئے گویا تھے ہی نہیں اور بزبان حال یوں کہنے لگے

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی! تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

حضور علیہ السلام نبوت کا سمندر ہیں سارے انبیاء دریا تمام نبوتیں اس طرف دوڑی آرہی تھیں جو بھی فرعونی یا نمرودی طاقت ان سے ٹکرائی وہ پاش پاش ہو گئی نبوت مصطفیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں سب گم ہو گئے

یہ انبیاء و مرسلین تارے ہیں تم مہر مبین سب جگمگائے رات بھر چمکے جو تم کوئی نہیں

نسخ پر اعتراضات و جوابات

پہلا اعتراض: قرآن کریم فرماتا ہے مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ (ق:۲۹) یعنی ہمارے قول میں تبدیلی نہیں اور نسخ میں تبدیلی ہی ہوتی ہے۔ لہٰذا نسخ ناجائز ہے **جواب:** نسخ کو بندے اپنی بے علمی سے تبدیلی سمجھتے ہیں مگر در حقیقت وہ تو ایک حکم کی انتہاء کا بیان ہے نہ کہ تبدیلی مثلاً ایک سال کی عدت کچھ روز کے لئے تھی جب وہ مدت گذر گئی وہ حکم بھی ختم ہو گیا۔ لہٰذا یہ تبدیلی قول نہیں نیز تمہاری پیش کردہ آیت میں تبدیلی قول سے مراد وعدہ خلافی ہے اسی لئے وہاں ہے وَمَا أَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ (ق:۲۹) یعنی ہمارا وعدہ خلاف نہیں ہوتا اور ہم بندوں پر ظالم نہیں اور نسخ میں خبریں اور وعدے نہیں بدلتے صرف

احکام بدلتے ہیں یوں ہی آیت کریمہ لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (یونس: ۶۴) کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی آیتوں کو کوئی شخص نہیں بدل سکتا۔ جیسے پہلی کتابوں میں تحریف وتبدیلی ہوئی اس لئے یہاں کلمات اور تبدیلی فرمایا **دوسرا اعتراض:** قرآن فرماتا ہے وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (النساء: ۸۲) یعنی اگر قرآن غیر خدا کی کتاب ہوتی تو وہ اس میں اختلاف پاتے معلوم ہوا قرآن میں اختلاف نہیں اور نسخ اختلاف ہے چاہئے کہ قرآن میں نہ ہو؟ **جواب:** نسخ اختلاف نہیں بلکہ ایک حکم کی انتہاء کا بیان ہے اختلاف سے مراد یہ ہے کہ خبریں واقعات کے مخالف ہوں یا کلام فصاحت وبلاغت میں یکساں نہ ہو جیسے کہ شعراء کے قصیدوں میں بعض اشعار اعلیٰ درجے کے ہوتے ہیں اور بعض ادنیٰ درجے کے۔ قرآن از اول تا آخر یکساں فصیح وبلیغ ہے یا اختلاف سے مراد تعارض ہے کہ خبروں میں آپس میں مخالف ہو نسخ کو اس سے کوئی تعلق نہیں **تیسرا اعتراض:** نسخ قرآن کی کسی آیت سے ثابت نہیں مَا نَنْسَخْ والی آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ جو آیتیں ہم لوح محفوظ سے فرشتوں کے روزنامچوں میں نقل کرتے ہیں یا ان میں دیر لگاتے ہیں یہاں نسخ کے معنی نقل کرنا ہے نہ کہ بدلنا (مرزائی وغیرہ) **جواب:** معاذ اللہ یہ آیت کا ترجمہ نہیں بلکہ تحریف ہوئی اگر آیت کے یہ معنی ہیں تو نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا کے کیا معنی ہوں گے اس کے معنی وہی ہیں جو ہم تفسیر میں عرض کر چکے اور سنو، رب فرماتا ہے وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ (نحل: ۱۰۱) الخ جب ہم کسی آیت کو دوسری آیت کی جگہ بدلتے ہیں یہاں صاف لفظ تبدیلی موجود ہے۔ سنو، رب فرماتا ہے۔ سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسٰىٓ ۝ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ (الاعلیٰ: ۶) اس سے معلوم ہوا کہ بعض آیتیں بتا کر بھلا دی جائیں گی۔ یعنی ان کی تلاوت منسوخ ہو جائے گی۔ غرضیکہ نسخ کا انکار پوری جہالت ہے۔ **چوتھا اعتراض:** نسخ کلام والے کی جہالت یا اس کے عجز سے ہوتا ہے اگر اس کو خبر ہوتی کہ یہ حکم ہمیشہ کام نہ دے گا تو پہلے ہی سے کارآمد بھیجتا جو حکم پیچھے بھیجا ہے وہ پہلے ہی کیوں نہ بھیجا (آریہ) **جواب:** نسخ کی بہت سی وجہیں ہوتی ہیں انسانوں کے حالات کے اختلاف سے بھی احکام بدل جاتے ہیں طبیب اپنے بیمار کے لئے اس کی حالت کے موافق دوائیں اور غذائیں تجویز کرتا ہے جوں جوں مریض کی حالت بدلے گی طبیب کی تجویز بھی بدلے گی۔ یہ طبیب کی جہالت کی نہیں بلکہ کمال کی دلیل ہے رب کو معلوم تھا کہ انسان اولاً بچہ پھر جوان پھر ادھیڑ اور آخر کار بوڑھا ہو گا اس نے پہلے ہی سے کیوں نہ بوڑھا کر دیا۔ پنڈت جی اگر آپ بوڑھے پیدا ہوتے تو آپ کا تو کچھ نہ بگڑتا اور آپ کی والدہ صاحبہ دنیا سے بے ٹکٹ روانہ ہو جاتیں۔ **پانچواں اعتراض:** تو چاہئے کہ اب بھی اسلام اور قرآن میں نسخ جاری رہے کیونکہ دنیا کے حالات اب بھی بدل رہے ہیں۔ **جواب:** ہر چیز کمال پر پہنچنے سے پہلے بدلتی ہے اور کمال پر پہنچ کر ٹھہر جاتی ہے۔ بچہ پہلے گھٹی پھر ماں کا دودھ پھر چاول وغیرہ استعمال کرتا ہے پھر روٹی پر پہنچ کر رک جاتا ہے۔ پھر اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔ بیمار کی دوائیں بدلتی رہتی ہیں مگر آخر میں کوئی پیٹنٹ مقوی دوا تجویز کر دی جاتی ہے کہ اسے ہمیشہ استعمال کیا کرے بڑھاپے سے پہلے جسم انسانی میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے مگر بڑھاپے پر پہنچ کر تبدیلی بند ہو جاتی ہے کیونکہ اب آدمی کمال پر پہنچ گیا اسی طرح ادیان میں تبدیلی ہوتی رہی اور مسائل میں نسخ کا سلسلہ جاری رہا یہاں تک کہ بشارت الٰہی آگئی کہ اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ (مائدہ: ۳) اب کمال کے بعد نسخ

اور تبدیلی کیسی؟ **چھٹا اعتراض:** جب اسلام مکمل دین ہے تو عیسیٰ علیہ السلام اس کے جزیہ وغیرہ کے احکام کیوں منسوخ فرمائیں گے؟ نیز حضرت عمر نے اپنی خلافت کے زمانہ میں قرآن کی بعض آیتیں کیوں منسوخ کیں؟ کہ زکوٰۃ کے مصرف قرآن نے آٹھ بیان فرمائے مگر انہوں نے مؤلفۃ القلوب (مائل بہ اسلام کفار) کو اس سے نکال کر صرف سات مصرف رکھے۔ **جواب:** عیسیٰ علیہ السلام جزیہ وغیرہ ہرگز نہ منسوخ فرمائیں گے۔ بلکہ خود حضور ﷺ نے ہی اس کی حد بیان فرمادی کہ جزیہ وغیرہ کا حکم عیسیٰ علیہ السلام کی آمد تک ہے اس کے ناسخ حضور علیہ السلام ہی ہیں عیسیٰ علیہ السلام تو اسے جاری فرمائیں گے۔ نیز عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کوئی حکم منسوخ نہیں کیا بلکہ حکم کی علت اٹھ جانے کی وجہ سے حکم خود اٹھ گیا۔ ضعف اسلام کی وجہ سے مؤلفۃ القلوب زکوۃ کے مصرف تھے جب خلافت فاروقی میں اسلام قوی ہوگیا تو یہ نکل گئے۔ جب زید مالدار تھا اس پر زکوٰۃ فرض تھی جب غریب ہوگیا تو اس پر زکوٰۃ واجب نہ رہی درحقیقت حکم زکوٰۃ منسوخ نہیں ہوگیا بلکہ علت بدل جانے سے حکم بدل گیا۔ **ساتواں اعتراض:** قرآن کریم فرماتا ہے مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ (آل عمران: ۳) یعنی قرآن اگلی کتابوں کی تصدیق فرماتا ہے اگر یہ انہیں منسوخ کردے تو تصدیق کہاں رہی؟ **جواب:** اس کا جواب بارہا گزر گیا کہ ان کتابوں نے قرآن کے آنے کی خبر دی تھی اس کی آمد سے وہ سچی ہوگئیں نسخ تبدیلی کے خلاف نہیں حکیم اپنا نسخہ بدلتا ہے جس سے اس کا پہلا نسخہ غلط نہیں ہوجاتا بلکہ اپنے وقت پر وہ صحیح تھا اس وقت یہ صحیح ہے۔ **آٹھواں اعتراض:** حدیث میں ہے کہ كَلَامِىْ لَا يَنْسَخُ كَلَامَ اللّٰهِ میرا کلام خدا کے کلام کو منسوخ نہیں کرسکتا مگر تم کہتے ہو کہ حدیث سے قرآن منسوخ ہوتا ہے (شافعی) **جواب:** اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ جو کلام میں اپنی رائے سے فرمادوں وہ کلام الٰہی کو منسوخ نہیں کرسکتا۔ لیکن جو کلام رب کے الہام سے ہو وہ یقیناً منسوخ کرسکے گا۔ کیونکہ حدیث و قرآن ایک ہی ہیں یا یہ مطلب ہے کہ میرا کلام قرآن شریف کی تلاوت منسوخ نہیں کرسکتا یعنی آیت کا نسخ تلاوت صرف حدیث سے نہیں ہو سکتا اس لئے یہاں کلام اللہ فرمایا گیا۔ احکام اللہ نہ فرمایا گیا۔ کلام عبارت کو کہا جاتا ہے نہ کہ احکام کو۔ **نکتہ:** حکم اٹھ جانا نسخ ہے اور کسی وجہ سے حکم جاری نہ ہونا نسخ نہیں غریب آدمی پر زکوۃ واجب نہ ہونا، مجبور پر جہاد فرض نہ ہونا نسخ نہیں کہ یہ حکم تو باقی ہے ضرورۃً اس کا اجراء نہ ہوا اور رمضان کی راتوں میں جماع کی حرمت منسوخ ہے کیونکہ یہ حکم ہی اٹھ گیا۔ **نواں اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ خدا کے سوا نہ کوئی مددگار نہ دوست پھر نبیوں ولیوں کو تم مددگار کیوں مانتے ہو۔ **جواب:** یہاں دون اللہ سے مراد اللہ کا مقابل ہے یعنی ایسا دوست و مددگار تمہارا کوئی نہیں جو اللہ کے مقابل تمہاری مدد کرے کہ اس کے غضب سے تمہیں بچالے ورنہ رب فرماتا ہے۔ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ (مائدہ: ۵۵) الخ اور فرماتا ہے وَّاجْعَلْ لِّيْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِيْرًا (الاسراء: ۸۰) آج ہم بیماری اور مقدمہ میں مدد کے لئے حکیم و حاکم کے پاس جاتے ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ (صف: ۱۴) ان کے مددگاروں کو نصاریٰ اور حضور کے مددگاروں کو انصار کہا جاتا ہے۔

تفسیر صوفیانہ

جس طرح طبیب جسمانی مریض کے مزاج کے موافق نسخہ تجویز کرتا ہے اور پھر اس کے حالات کے لحاظ سے اپنے نسخہ میں تبدیلی کرتا ہے یوں ہی طبیب روحانی یعنی مرشد کامل اپنے مرید کی حالت کا خیال رکھتا ہے بعض اعمال کسی وقت اس کو مفید پھر وہ ہی اعمال دوسرے وقت مضر ہوتے ہیں اس لئے وہ اپنی تعلیم میں اس کا لحاظ رکھتا ہے اور جیسے راستہ طے کرنے والے مختلف ہوتے ہیں بعض موٹر کار سے بعض سائیکل سے بعض دوڑ کر بعض آہستہ چل کر ایک ہی راستہ مختلف مدت میں طے کرتے ہیں یہ ہی حال راہ طریقت کا ہے کہ اس کے مسافر مختلف حال رکھتے ہیں لیکن بحمدہ تعالیٰ طالب جس منزل سے گزرتا ہے قرب الٰہی میں ترقی کرتا ہے اس کی ہر اگلی حالت پچھلی حالت سے بہتر ہوتی ہے ایک وقت ذکر جہری اس کا مشغلہ تھا یہ حالت منسوخ ہو کر ذکر خفی کی حالت پیدا ہوئی پھر وہ یہ منزل بھی طے کر کے ذکر اخفی کے درجہ میں قدم رکھتا ہے۔ غرضیکہ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ کی وہاں ہر وقت جلوہ گری ہوتی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

رمز ننسخ ایة او ننسها ۔۔۔ نات خیر در عقب می داں مہا

آنکہ داند دوخت او داند درید ۔۔۔ ہر چہ را بفروخت نیکو تر خرید

لہٰذا چاہئے کہ طالب خود کو شیخ کامل کے حوالہ کر دے اس کی تعلیم میں نکتہ چینی نہ کرے ورنہ الطاف ربانی سے محروم رہے گا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام وخضر علیہ السلام کے قصہ سے سبق لے۔ آخری آیت وَمَا لَكُمْ الایۃ کی تین تفسیریں ہیں۔ جاہلانہ۔ عالمانہ۔ عاشقانہ۔ تفسیر جاہلانہ تقویۃ الایمان وغیرہ میں ہے کہ خدا کے سوا کوئی دوست و مددگار نہیں۔ لہٰذا نبی، ولی، علی، وصی مددگار نہیں۔ یہ تفسیر دوسری آیتوں کے بھی خلاف ہے نبیوں، ولیوں بلکہ خود رب تعالیٰ کے اپنے عمل کے بھی خلاف۔ رب نے بندوں سے مدد مانگی اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ (محمد: ۷) جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا بلکہ خود ان تفسیر کرنے والوں کے خلاف بھی ہے کہ وہ بھی کہتے ہیں۔

مدد کر اے کرم احمدی کہ تیرے سوا ۔۔۔ نہیں ہے قاسم بے کس کا کوئی حامی کار

تفسیر عالمانہ وہ ہے کہ یہاں دُوْنَ بمعنی مقابل ہے یعنی کوئی مخلوق رب کے مقابل ہو کر تمہاری دوست یا مددگار نہیں کہ رب تمہیں ہلاک کرنا چاہے تو وہ تمہیں بچا لے وہ ناممکن ہے بلکہ ہر ایک کی دوستی و مدد رب کی مہربانی سے ہے۔

سائیں انکھیاں پھیریاں میرا وَیری ملک تمام ۔۔۔ ذرا سی جھانکی مہر کو تو لاکھوں کریں سلام

تفسیر عاشقانہ یہ ہے کہ ہر شے میں ظاہر و باطن ہے اعضاء ظاہر روح باطن، درخت کے برگ و بار ظاہر ہیں اندرونی رس باطن بجلی کی فٹنگ ظاہر ہے پاور باطن، ان میں سے باطن اصل ہے۔ ظاہر فرع۔ ظاہر مجاز ہے باطن حقیقت یوں ہی تمام دنیا ظاہر ہے، رب کا فضل باطن عالم مجاز ہے۔ خالق عالم حقیقت یہاں حقیقت امداد کی نفی ہے کہ تمہارا حقیقی دوست و مددگار ہمارے سوا اور کوئی نہیں اور آیات ثبوت میں مجازی مدد، دوستی کا ثبوت ہے۔ اس کی تفسیر وہ آیات وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِيْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ (ال عمران: ۱۶۰) وغیرہ مگر دنیا اور آخرت میں مجاز پر بھی احکام جاری ہیں۔ چور کا ہاتھ کٹتا ہے، ماں باپ

کی اطاعت وخدمت ضروری ہے۔ اسی طرح نبی ولی کے آستانے سے مدد لینا ضروری مگر مجازی مدد۔

اَمْ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىٕلَ مُوْسٰى
کیاارادہ کرتے ہوتم یہ کہ سوال کرو پیغمبروں اپنے سے مثل اس کے کہ
کیا یہ چاہتے ہو کہ اپنے رسولوں سے ویسا سوال کرو جو موسیٰ سے پہلے
مِنْ قَبْلُؕ وَ مَنْ یَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ
سوال کیا گیا موسیٰ سے پہلے اور وہ جو کہ بدل لے کفر کو بعوض ایمان کے پس بے شک گمراہ ہو گیا
ہوا تھا اور جو ایمان کے بدلے کفر لے وہ ٹھیک راستہ
السَّبِیْلِ﴿۱۰۸﴾
وہ سیدھے راستہ سے
سے بہک گیا

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے کئی طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پہلے معلوم ہوا تھا کہ یہود غیر منسوخ کتاب چاہتے ہیں جس کی بعض آیتیں منسوخ ہوں اس کے ماننے سے انکاری ہیں۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ ان کا یہ مطالبہ ایسا ہی نامعقول ہے جیسا کہ موسیٰ علیہ السلام سے انہوں نے اپنا من بھاتا خدا مانگا تھا۔ **دوسرا تعلق:** پہلے معلوم ہوا کہ ناسخ حکم یا تو منسوخ سے بہتر ہوتا ہے یا اس کی مثل اس پر غالباً انہوں نے تفصیل کا مطالبہ کیا ہوگا کہ ہمیں ہر ناسخ کی ہر منسوخ سے افضلیت بتایئے لہٰذا فرمایا گیا کہ یہ سوال ایسا ہی لغو ہے جیسا کہ اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام سے کرتے تھے۔ **تیسرا تعلق:** پہلے معلوم ہوا کہ بعض احکام الٰہی بعض سے منسوخ ہوں گے اب پوچھا جا رہا ہے کہ کیا تم اطاعت کر کے مقبول بنو گے یا یہود کی سی کج بحثی کر کے مردود۔ **چوتھا تعلق:** پہلے معلوم ہوا تھا کہ بعض احکام بعض سے منسوخ ہوں گے اب فرمایا جا رہا ہے کہ یہ نسخ ہماری مرضی کے مطابق ہوگا۔ اے مسلمانو تم یہود کی طرح اپنی رائے کے مطابق خود ہی نسخ کا مطالبہ نہ کرنا کہ ان کا جو دل چاہتا تھا تو وہ مان لیتے تھے اور سخت احکام کے بدلنے کا پرزور مطالبہ کیا کرتے تھے بلکہ ہم موقعہ کے مطابق خود ہی نسخ فرماتے رہیں گے۔ **پانچواں تعلق:** معلوم ہوا تھا کہ احکام میں نسخ ہوگا۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ اے مسلمانو اگر تم ان احکام کو قبول نہ کرو گے تو ان ہی سرکش یہود کی طرح ہو گے جنہوں نے موسیٰ سے نہ کرنے کے سوال کئے تھے۔

شان نزول

بعض مفسرین نے فرمایا کہ ایک بار یہود نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا کہ آپ ایسی کتاب لایئے جو آسمان سے یک بارگی

نازل ہوئی ہو۔ ہم ایسی کتاب نہ مانیں گے جس میں ردوبدل ہوتا ہو۔ (تفسیر خزائن العرفان) بعض نے فرمایا کہ عبداللہ ابن امیہ مخزومی قریش کی ایک جماعت کو لے کر حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میں تو جب ایمان لاؤں گا کہ آپ زمین سے پانی کے چشمے جاری کر دیں یا آپ کے کھجور اور انار کے باغات ہوں یا آپ کے پاس سونے کا گھر ہو یا آپ آسمان پر چڑھ کر دکھا دیں یا میرے نام رب کی کوئی چٹھی آ جائے جس میں لکھا ہو کہ اے عبداللہ ابن امیہ بے شک محمد ﷺ میرے رسول ہیں تو ان کی پیروی کر جماعت قریش بولی کہ یہ تو بڑی باتیں ہیں انہیں جانے دیجئے بلکہ موسیٰ علیہ السلام کی طرح مکمل کتاب ایک دم لا دیجئے تب یہ آیت کریمہ اتری۔ مجاہد سے روایت ہے کہ قریش نے ایک بار کہا تھا کہ صفا اور مروہ پہاڑ کو سونے اور چاندی کا بنا دو تب یہ آیت اتری۔ (تفسیر کبیر)۔ بعض نے یہ بھی کہا کہ بعض نومسلموں نے حضور سے مطالبہ کیا تھا کہ مشرکین کی طرح ہمارے بھی چند معبود ہونے چاہئیں اور بعض لوگ محض امتحان کے لئے معجزات کا مطالبہ کیا کرتے تھے۔ ان کے حق میں یہ آیت کریمہ آئی لیکن یا تو پہلی روایت صحیح ہے یا آخری کیونکہ سورۂ بقر مدنی ہے۔ اور عبداللہ بن امیہ مخزومی وغیرہ مکہ کے باشندے تھے ان کے سارے مطالبے ہجرت سے پہلے ہی ہوا کرتے تھے۔ نیز بہت دور سے یہود سے گفتگو چلی آ رہی ہے۔ اور آئندہ بھی انہیں کا ذکر ہے۔ لہٰذا بہتر یہ ہے کہ اب بھی انہیں کا تذکرہ ہو۔ پچھلی روایت کی تائید خود اس آیت کی عبارت کرتی ہے اگر اس میں مسلمانوں سے خطاب ہو تو آیت میں کوئی تکلف نہیں کرنا پڑتا۔ جیسا کہ تفسیر سے معلوم ہوگا۔

تفسیر

اَمْ تُرِیْدُوْنَ یا تو اَوْ کے معنی میں ہے اور اس سے پہلے ایک عبارت پوشیدہ یعنی کیا تم ناسخ احکام کی اطاعت کرو گے یا تم اسی قسم کی کج بحثی کا ارادہ کر رہے ہو جو یہود کیا کرتے تھے اس صورت میں یہ مسلمانوں سے خطاب ہے یا اَمْ بَلْ کے معنی میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ تم نسخ وغیرہ کا بہانہ کرتے ہو بلکہ تم انہیں بیہودہ سوالوں کا ارادہ کرتے ہو جو تمہارے بزرگوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کئے تھے۔ اس صورت میں یہ یہود سے خطاب ہے۔ اَنْ تَسْئَلُوْا رَسُوْلَكُمْ کہ اپنے رسول سے وہ سوال کرو۔ اگر یہ مسلمانوں سے خطاب ہے تو مطلب یہ ہے کہ تم جس رسول کی امت ہو اس عالی شان پیغمبر سے ایسا سوال کرنا چاہتے ہو۔ اور اگر یہود سے خطاب ہے تو مطلب یہ ہوا کہ جو رسول تمہاری ہدایت کے لئے بھیجے گئے ان سے یہ سوال کرنا چاہتے ہو۔ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ جیسا کہ اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام سے سوال کیا گیا تھا کہ یہود نے ان سے رب تعالیٰ کے دیکھنے یا مشکل احکام بدلوانے یا نیا خدا بنانے کا مطالبہ کیا تھا۔ جس سے ان پر بہت مصیبتیں آ پڑیں کیا تم بھی ایسے لغو مطالبے کر کے مصیبت مانگتے ہو۔ حالانکہ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ جو ایمان کے عوض کفر لے کر رب کی اتاری آیتوں پر تو بھروسہ نہ کرے اور اپنی دل پسند باتوں کا مطالبہ کرے یا ایمان قبول کر کے شبہات میں پڑ جائے یا نبی کی اطاعت تو نہ کرے اور ان کی آزمائش میں مشغول رہے فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ یقیناً وہ سیدھے راستہ سے بہک گیا۔ سواء کے معنی ہیں متوسط اور درمیانی سڑک سیدھی اور آس پاس کی گلیاں ٹیڑھی ہوتی ہیں اس لئے سواء سے سیدھا راستہ مراد ہے۔ انبیاء کی اطاعت اور ان کی پیروی سیدھا راستہ ہے جس کو اختیار کر کے بے کھٹکے جنت تک پہنچنا ہوتا ہے ان کی مخالفت اور خواہشات نفس کی پیروی

وہ ٹیڑھا راستہ ہے اور جہنم میں جائے گا۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو کیا تم بھی نسخ وغیرہ پر اعتراض یا نبی علیہ السلام سے غلط مطالبات یا ان سے امتحاناً معجزات طلب کر کے اسی قسم کے سوالات کرنے چاہتے ہو جیسے کہ اس سے پہلے موسیٰ علیہ السلام سے کئے جاتے تھے تم ان یہود کا انجام سن چکے جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو ایسے سوالات سے پریشان کیا اور تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ جو ایمان لا کر کفر میں پھنسے وہ گویا سیدھے راستہ پر پڑ کر بہک گیا اور ایسا آدمی بہت ہی بدنصیب ہے۔ یا اے یہودیو کیا تم چاہتے ہو کہ اس نبی آخر الزمان ﷺ سے بھی ویسے ہی بیہودہ سوالات کرو جیسے کہ تمہارے باپ دادا موسیٰ علیہ السلام سے کیا کرتے تھے۔ خیال رہے کہ وہ اور وقت تھا یہ دوسرا زمانہ ہے اب سخت سزا پاؤ گے۔ تم نے ایمان اور ایمانیات کو پہچان لیا۔ قرآن آتے دیکھ لیا۔ صاحب قرآن کی زیارت کر لی، خیال رہے کہ مسلمانوں کی تبدیلی کفر تو یہ ہے کہ ایمان چھوڑ کر کفر قبول کر لیں۔ یعنی مرتد ہو جائیں اور یہود وغیرہ کفار کے لئے یہ ہے کہ ایمان اختیار نہ کریں اور کفر میں پھنسے رہیں اسی طرح سیدھے راستہ سے بھٹکنا مسلمانوں کے لئے تو یہ ہے کہ وہ یہ راستہ چھوڑ کر اور طرف چل دیں اور کفار کے لئے یہ کہ سیدھا راستہ دیکھ کر اسے اختیار نہ کریں۔ اور غلط راستوں پر ہی چلتے رہیں۔ لہٰذا یہ آیت مومنین اور کفار دونوں کے حق میں ہو سکتی ہے اور اس پر کوئی اعتراض نہیں۔ خیال رہے کہ اللہ تعالیٰ نے جیسے مسلمانوں کو دربار مصطفوی کے اور بہت سے آداب سکھائے کہ ان کی آواز پر اپنی آواز اونچی نہ کرو۔ ان سے آگے نہ بڑھو اگر ان کے ہاں دعوت ہو تو کھانا پکنے سے پہلے نہ آ جاؤ اور کھا کر بلا وجہ نہ بیٹھے رہو یونہی رب نے حضور سے پوچھنے سے بچنے کے آداب بھی سکھائے کہ ان سے اس قسم کے سوال نہ کرو، ایسے کرو چنانچہ یہاں تو یہ فرمایا اور دوسری جگہ فرمایا کہ لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ (مائدہ:۱۰۱) ہمارے نبی سے وہ باتیں نہ پوچھو کہ اگر وہ ظاہر کر دی جاویں تو تم کو پچھتانا پڑے۔ ان احکام پر اکابر صحابہ نے حضور سے سوال کرنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ کوئی باہر سے سمجھدار آدمی آئے حضور سے سوال کرے حضور جواب دیں ہم سنیں اس لئے حضرت جبریل سائل کی شکل میں حضور کی خدمت میں حاضر ہوتے اور حضور جواب دیتے صحابہ سنتے یہ عمل تھا ان آیات پر۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** بزرگوں سے ایسا سوال نہ کرنا چاہئے جس سے نافرمانی ظاہر ہوتی ہو یا جس سے فساد کا دروازہ کھلتا ہے۔ **دوسرا فائدہ:** اللہ والوں کو اپنی رائے کا پابند نہ بنانا چاہئے بلکہ ان کے فرمان کی خود پابندی کرنی چاہئے۔ **تیسرا فائدہ:** انبیاء علیہم السلام کے فرمان میں کسی قسم کا شک کرنا یا عناد کے طریقہ پر سوالات کرنا یا ان کے فرمان سے ناراض ہونا یا ان کا مذاق سے امتحان لینا کفر ہے کیونکہ اس آیت میں اس قسم کے سوالات کو کفر قرار دیا۔ **چوتھا فائدہ:** حضور ﷺ کفار کے بھی رسول ہیں۔ اور کفار حضور کے امتی کیونکہ رَسُوْلَكُمْ میں یہود سے خطاب ہے اور ان کی طرف سے رسول کی نسبت۔ خیال رہے کہ امت دو قسم کی ہے۔ امت دعوت اور امت اجابت۔

امت دعوت وہ جس کو رسول علیہ السلام تبلیغ احکام کریں اور جن پر ان پیغمبروں کی اطاعت واجب ہو۔ امت اجابت وہ جو ان کے احکام قبول کرے مومنین حضور علیہ السلام کی امت اجابت ہیں۔ اور کفار بلکہ سارا عالم امت دعوت لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (الفرقان:۱) حق تعالیٰ تو عالمین (تمام جہانوں) کا رب ہے اور حضور علیہ السلام عالمین کے نبی۔ انبیاء کرام، ملائکہ عظام تمام حیوانات، نباتات، سموٰات چاند سورج وغیرہ حضور علیہ السلام کی امت اجابت ہیں مگر ہر مخلوق کے جداگانہ احکام ہیں جن پر وہ پابند ہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ نبی سے سوال نہ کیا جائے تو ہدایت کیسے حاصل ہو۔ **جواب.** سوال کے دو معنی ہیں پوچھنا اور مطالبہ کرنا۔ نہ تو ہر طرح کا پوچھنا کفر ہے اور نہ ہر مطالبہ بلکہ عناد یا مذاق کے لئے پوچھنا کفر۔ ہدایت حاصل کرنے کے لئے پوچھنا ضروری بیکار سوالات منع، ابوجہل تمسخر سے باتیں پوچھتا تھا۔ یہ کفر ہوا۔ مسلمان عمل کے لئے احکام الٰہی پوچھتے تھے یہ ثواب بعض ضعیف الاعتقاد بلاوجہ پوچھا کرتے تھے۔ میری عورت حاملہ ہے اس کے لڑکا ہوگا یا لڑکی؟ یا کہ میرا باپ کون تھا؟ یہ منع اسی طرح معجزات کا مطالبہ کرنا۔ اگر پیغمبر کو عاجز کرنے کی نیت سے ہو تو کفر ہے جیسے کفار کہتے تھے کہ اگر آپ زمین سے چشمے نکال دیں یا باغات اگا دیں تو ہم ایمان لے آئیں اس سے ایمان لانا منظور نہ تھا بلکہ فقط عاجز کرنا یا مذاق اڑانا اور اگر ایمان لانے سے پیشتر سچائی معلوم کرنے کے لئے معجزہ طلب کیا جائے تو جائز ہے۔ جیسے کہ بعض حضرات نے ایمان لانے سے پہلے معجزہ مانگا اور دیکھ کر ایمان لے آئے جیسے کہ ابوبکر صدیق یا عبداللہ ابن سلام رضی اللہ عنہما۔ نیز اگر مسلمان کفار کو دکھانے کیلئے معجزے کی خواہش کریں تو جائز ہے اس آیت میں انہیں سوالات اور انہیں مطالبوں کا ذکر ہے جو عناداً ہوں۔ اس لئے فرمایا گیا كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ **دوسرا اعتراض:** اگر اس میں یہود سے خطاب ہو تو ان کے پاس ایمان تھا ہی کہاں جسے وہ کفر سے بدلتے اور سیدھے راستہ پر تھے ہی کب جس سے وہ بھٹکتے۔ **جواب:** اس کا تفصیلی جواب تفسیر میں گزر گیا کہ ان کا ایمان قبول نہ کرنا تبدیلی کفر ہے۔ یعنی ان کے سامنے ایمان کفر دونوں موجود تھے۔ ایمان چھوڑ کر کفر اختیار کر لیا اسی طرح راہ ہدایت دیکھ کر اس پر نہ چلنا یہی ان کا بھٹکنا ہے۔

تفسیر صوفیانہ

شریعت احکام اور طریقت ادب، بے ادب مردود ہے۔ اگرچہ بظاہر احکام کا پابند ہو۔ جیسے ابلیس وغیرہ اس آیت میں فرمایا گیا کہ اللہ و رسول ﷺ کا ادب ایمان کی روح ہے، بارگاہ نبوت میں بے دھڑک سوالات کر دینا اور بے خوف ہر قسم کی بات کر ڈالنا بے ادبی ہے۔ اور بے ادب یا تو فوراً ہی کافر ہو جاتا ہے۔ یا کبھی نہ کبھی کفر کر بیٹھتا ہے۔ ادب نفس کی قید ہے جب نفس اس قید سے نکل گیا تو اسے کفر میں جانے سے کون روکے گا۔ ایمان اس قلعہ کی طرح ہے جس کے آگے پیچھے پانچ دیواریں ہوں پہلے سونے کی، دوسری چاندی کی، تیسری لوہے کی چوتھی پتھر کی۔ پانچویں کچی اینٹ کی، ایمان کی بھی پانچ دیواریں ہیں پہلی یقین کی دوسری اخلاص کی۔ تیسرے ادائے فرض کی، چوتھی سنتوں کی پابندی کی، پانچویں ادب کی اگر قلعے

والے اپنے قلعے کی حفاظت چاہتے ہیں تو اس پانچویں دیوار کا بچاؤ کریں جو کچی اینٹ کی ہے۔ اگر چور اس کو پار کر آیا یا اسے توڑ دیا تو اب اگلی دیواروں کی بھی خیر نہیں۔ اسی طرح اگر شیطان نے نازک دیوار کو توڑ دیا اور تمہیں بے ادب بنا دیا تو سمجھ لو کہ ایمان کی اگلی دیواروں کی بھی خیر نہیں پھر وہ آگے پیچھے بھی کو توڑ دے گا۔ اس آیت میں اس پانچویں دیوار کی حفاظت ہی کی تاکید ہے کہ دیکھو بارگاہ مصطفیٰ ﷺ کے بے ادب نہ بننا ورنہ تمہارے ایمان کی خیر نہیں۔ بزرگوں کے آستانہ سے سب کو فیض نہیں ملتا کوئی وہاں سے لے کر آتا ہے کوئی خالی اور کوئی ایمان کھو کر آتا ہے جو وہاں اپنے کو خالی سمجھ کر جائے گا۔ انشاء اللہ بھر کر لوٹے گا جو اپنے کو بھرا ہوا عالم سمجھ کر جائے پوچھ گچھ کرے وہاں زیادہ بولے زیادہ سنے نہیں وہ خالی لوٹے گا۔ خالی ڈول کنویں سے پانی لاتا ہے۔ بھرا جاتا ہے تو کچھ لے کر نہیں آتا اور جو اپنے کو بھرا نہیں خالی سمجھ کر جائے تو اپنا سب کچھ کھو آئے گا۔ یہ کج بحثیاں کرنے والے تیسری قسم کے تھے وہاں جا کر زیادہ بولنے کی کوشش نہ کرو زیادہ سننے کی کوشش کرو، ادب بزرگان اصل عبادت ہے۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ
چاہا بہتوں نے کتاب والوں میں سے یہ کہ واپس کر دیں تم کو پیچھے سے ایمان تمہارے کے
بہت کتابیوں نے چاہا کاش تمہیں ایمان کے بعد کفر کی طرف پھیر دیں
كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ أَنْفُسِهِم مِّنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ
کافر حسد سے نزدیک نفسوں اپنے کے پیچھے سے اس کے کہ ظاہر ہو گا
اپنے دلوں کی جلن سے بعد اس کے کہ حق ان پر خوب ظاہر ہو چکا
لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهِ ؕ
واسطے ان کے حق پس معاف کرو اور درگزر کرو یہاں تک کہ لائے اللہ اپنا
ہے تم چھوڑ دو اور درگزر کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لائے
إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٠٩﴾
حکم تحقیق اللہ اوپر ہر چیز کے قادر ہے
بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پہلے نسخ وغیرہ پر یہود کے اعتراضات کا ذکر فرمایا گیا۔ اب ان کے اعتراضات کے مقصود کا ذکر ہو رہا ہے کہ اے مسلمانو در حقیقت انہیں خود کوئی شبہ نہیں وہ تو محض تمہارے دلوں میں

شبہات پیدا کرنے کے لئے اعتراضات کرتے ہیں تاکہ تم ایمان چھوڑ کر پہلے کی طرح کافر بن جاؤ۔ **دوسرا تعلق:** پہلے یہود کی گذشتہ فریب کاریوں کا ذکر کیا گیا کہ وہ ان طریقوں سے مسلمانوں کو راہ ایمان سے پھیرنا چاہتے ہیں اب آئندہ کا تذکرہ ہے کہ مسلمانو ہوشیار رہنا یہود آئندہ بھی تمہارے شکار کیلئے بہت سے جال پھینکیں گے کیونکہ وہ تمہارے ایمان کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ **تیسرا تعلق:** پہلے یہود کے اعتراضات بیان فرما کر ان کے جواب دیئے اور مسلمانوں کو ایسے واہیات سوالوں سے روکا گیا اب فرمایا جا رہا ہے کہ اے مسلمانو یہ تمہاری خاطر جواب دیئے جا رہے ہیں کہ تم ایمان پر قائم رہو انہیں تو ہدایت حاصل کرنا منظور ہی نہیں آئندہ ان کے ہر سوال کا جواب نہ دیا جائے گا کیونکہ وہ تمام سوالات تمہیں گمراہ کرنے کے لئے ہوں گے۔ خیال رکھنا اور ہوشیار رہنا۔

شان نزول

جنگ احد کے بعد فنحاص ابن عاذوراء اور زید بن قیس اور دیگر یہود نے حضرت حذیفہ ابن یمان اور عمار ابن یاسر سے کہا کہ اگر تم سچے ہوتے تو تمہیں جنگ میں شکست نہ ہوتی۔ لہٰذا تم ہمارے دین میں لوٹ آؤ۔ حضرت عمار نے فرمایا کہ بتاؤ عہد شکنی بے وفائی کیسی ہے انہوں نے کہا بہت بری آپ نے فرمایا کہ میں عہد کر چکا ہوں کہ اپنی آخری سانس تک حضور ﷺ سے نہ پھروں گا اور کفر اختیار نہ کروں گا۔ یہودیوں نے کہا عمار تو ہمارے ہاتھوں سے نکل ہی گئے اب ان کے لوٹنے کی کوئی امید نہیں حذیفہ تم بولو کیا ہم سے ملو گے۔ حضرت حذیفہ نے فرمایا کہ میں اللہ کے رب ہونے اور محمد ﷺ کے نبی ہونے، اسلام کے دین ہونے قرآن کے ایمان کعبہ کے قبلہ ہونے اور مسلمانوں کے بھائی ہونے سے راضی ہوں، یہود بولے قسم رب موسیٰ کی تمہارے دلوں نے محمد مصطفیٰ ﷺ کا جام پی لیا اس کے بعد یہ دونوں صحابہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس واقعہ کی خبر دی آپ نے فرمایا کہ تم نے ٹھیک کیا اور کامیابی پائی۔ خلاصہ یہ ہے کہ کوئی کسی کو مانتا ہے لالچ سے، کوئی ڈر سے، کوئی عشق سے۔ صحابہ نے حضور کو عشق سے مانا تھا۔ عشق کا رنگ ایسا پختہ ہوتا ہے جو کسی چیز سے نہیں اترتا۔ ماں بچے کو کبھی نہیں چھوڑتی، عاشق معشوق سے ہزارہا مصیبتیں جھیلنے پر بھی منہ نہیں موڑتے۔ صحابہ نے ہر طرح کا لالچ ہر قسم کی مصیبتوں پر حضور کو نہیں چھوڑا۔ اللہ تعالیٰ عشق کی اطاعت نصیب کرے آمین۔ ڈر یا لالچ کی اطاعت تو منافق بھی کرتے تھے۔ ہر چیز کو فنا ہے مگر عشق کو فنا نہیں۔ بلکہ جس کی عبادت میں عشق کی ملاوٹ ہو جائے وہ بھی فنا سے بچ جاتی ہے۔

تفسیر

وَدَّ كَثِيْرٌ۔ وَدَّ، وُدٌّ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں چاہنا محبت کرنا پسند کرنا کثیر سے معلوم ہوا کہ سارے اہل کتاب یہ نہ چاہتے تھے بلکہ ان میں سے اہل علم اور شیاطین کیونکہ عام کفار کو نہ تو کسی کو بہکانا آتا ہے۔ اور نہ ان میں اپنے دین کی تبلیغ کا جذبہ ہوتا ہے۔ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ یعنی مشرکین کو یہ خواہش نہیں یہ ارادہ تو ان کا ہے جو اپنے کو اہل کتاب کہتے ہیں اور جو پچھلی کتابوں اور پچھلے نبیوں پر ایمان لانے کے دعویدار ہیں اور نسخ وغیرہ کی حکمتوں سے خوب واقف ہیں۔ وہ جان بوجھ کر چاہتے ہیں کہ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ کہ تم کو پھیر دیں۔ تفسیر روح البیان نے فرمایا کہ لو حرف مصدریہ ہے۔ بمعنی اَنْ کیونکہ جب لَوْ ایسے

فعل کے بعد آئے جس میں تمنا کے معنے ہوں تو اَنْ کے معنی ہیں ہوتا ہے۔ جیسے وَدُّوْا لَوْتُدْهِنُ (قلم: ۹) یعنی بہت سے اہل کتاب تم کو پھیرنا چاہتے ہیں مگر کب مِّنْۢ بَعْدِ اِیْمَانِكُمْ تمہارے ایمان لانے ایمان کی لذت چکھنے اور قرآن پاک کا لطف حاصل کرنے کے بعد اور كُفَّارًا یا یَرُدُّوْنَكُمْ کی ضمیر سے حال ہے یا اس کا مفعول دوم یعنی تم کو پھیر دیں کافر کرکے یا تمہیں کافر بنادیں۔ حَسَدًا۔ وُدَّ کی علت ہے یعنی تمہاری خیر خواہی کی وجہ سے نہیں بلکہ محض حسد کی بناء پر کہ ہم تو کافر رہے اور یہ مومن کیوں ہو گئے۔ ہم تو ڈوبے ہیں مگر یار کو بھی لے ڈوبیں گے۔ مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ یا تو یہ وُدَّ کے متعلق ہے۔ یا حَسَدًا کے یعنی انہوں نے تم کو مرتد کرنا محض نفسانی خواہش سے چاہا نہ کہ اپنی دینداری سے یا اپنے نفسانی حسد سے تم کو مرتد کرنا چاہا خلاصہ یہ ہے کہ مسلمان تو دینداری اور خلق کی خیر خواہی کے لئے دوسروں کو مسلمان کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن کفار اس لئے نہیں فقط نفسانی خواہش اور عداوت سے مسلمانوں کے مرتد ہونے کی تمنا کرتے ہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ کہ ان کی ساری یہ حرکتیں حق ظاہر ہو چکنے کے بعد ہیں وہ خود سمجھتے ہیں کہ حضور علیہ السلام سچے ان کا دین برحق ان کے معجزات نہایت کامل ان کی صفات توریت شریف میں مذکور اگرچہ اس شرارت بدذاتی کا تقاضا تو یہ تھا کہ تم ان کو اس کی سزا دیتے اور ان سے اس کا بدلہ لیتے مگر تم رب کی مرضی کے تابع رہو ابھی ہم تم کو اسکی اجازت نہیں دیتے بلکہ حکم دیتے ہیں۔ فَاعْفُوْا انہیں چھوڑ دو۔ یہ لفظ عَفْوٌ سے بنا ہے جس کے لغوی معنی ہیں مٹا دینا۔ اہل عرب کہتے ہیں۔ عَفَتِ الرِّیْحُ الْمَنْزِلَ۔ ہوا نے گھر کے آثار مٹا دیئے اصطلاح میں اس کے معنے ہیں جرم کی سزا نہ دینا۔ یعنی معاف کر دینا اور چھوڑ دینا۔ وَاصْفَحُوْا اور ان سے درگزر کرو۔ یہ صَفْحٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں کروٹ یعنی ان کی طرف سے کروٹ پھیر لو۔ ادھر توجہ نہ کرو خیال رہے کہ اس معافی دینے اور درگزر کرنے سے مراد رضامندی نہیں کیونکہ کفر سے راضی ہونا بھی کفر ہے بلکہ ان سے جنگ نہ کرنا اور ان کی بدکلامی کا جواب نہ دینا مقصود ہے جیسا کہ روایت میں آیا ہے کہ بعض صحابہ کرام نے حضور علیہ السلام سے ان بہکانے والے یہود کے قتل کی اجازت چاہی اس پر یہ عبارت نازل ہوئی۔ (روح البیان)۔ اور اے مسلمانو یہ تحمل اور بردباری اور صبر کا حکم ہمیشہ نہ رہے گا، صرف اسی وقت تک برداشت کرلو کہ حَتّٰى یَاْتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ کہ اللہ جہاد کا حکم دے۔ امر سے یا تو اجازت جہاد مراد ہے یا حکم جہاد، پہلے تو مسلمانوں کو جہاد کرنا منع تھا پھر مباح کیا گیا کہ فرمایا گیا اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ ۙ (حج: ۳۹) پھر فرمایا گیا کہ قَاتِلُوا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْیَوْمِ الْاٰخِرِ (التوبہ: ۲۹) اور اے مسلمانوں یہ بھی نہ سمجھنا کہ تم کمزور ہی رہو گے۔ اور وہ قوی بلکہ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اس میں قدرت ہے کہ کمزوروں کو زورمندوں پر غالب کر دے۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانوں تمام اعتراضات سے یہود کا مقصود صرف یہ ہے کہ تمہارے دل میں اسلام کی طرف سے شبہات پڑ جائیں۔ جس سے تم مومن ہونے کے بعد، کافر اور ایماندار ہونے کے بعد بے ایمان بن جاؤ اور ان کی یہ حرکتیں صرف اس جلن سے ہیں کہ تم کو ایمان جیسی دولت کیوں مل گئی اور وہ اس سے کیوں محروم رہ گئے ورنہ وہ خود جانتے ہیں کہ اسلام سچا ہے اور وہ جھوٹے

مگر ان کی ان بیہودہ حرکتوں سے طیش میں نہ آجانا اور ان سے جنگ نہ کر بیٹھنا بلکہ اس وقت تک درگزر اور چشم پوشی کیے جانا جب تک کہ جہاد کی اجازت یا اس کا حکم رب کی طرف سے نہ آجائے اور اس تاخیر سے یہ مت سمجھ بیٹھنا کہ ہم فی الحال تمہاری مدد سے عاجز ہیں نہیں اللہ تو ہر وقت ہر چیز پر قادر ہے وہ ابابیل سے فیل مروا دیتا ہے بلکہ اس تاخیر میں یہ حکمت ہے کہ اگر تم ابھی سے جہاد شروع کر دو گے تو لوگ بدگمانی کریں گے کہ اسلام خونی دین ہے۔ اور مسلمان بداخلاق اور خونخوار کہ ہر ایک سے لڑتے رہتے ہیں محبت اور صلح سے کسی کو اپنی طرف مائل نہیں کر سکتے اس آیت سے پتہ یہ لگا کہ کفار بڑے سے بڑے مسلمان سے غافل نہیں انہیں بہکانے کی تدبیریں کرتے رہتے ہیں لہٰذا مسلمان کو کبھی ان سے بے فکر نہ ہونا چاہئے جب تک کھیت کٹ کر گھر میں نہ آجائے تب تک کسان بے فکر نہیں ہوتا یونہی جب تک ایمان پر خاتمہ نصیب نہ ہو جائے تب تک مومن بے فکر نہیں ہوتا، آدم علیہ السلام معصوم تھے جنت جگہ محفوظ مگر وہاں بھی شیطان دشمن نے داؤ مار دیا۔ خیال رہے کہ معافی اور درگزر کی ساری آیتیں آیات جہاد سے منسوخ ہیں۔ تفسیر کبیر نے اس جگہ فرمایا کہ بعض علماء فرماتے ہیں کہ یہ آیت قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (توبہ: ۲۹) سے منسوخ ہے اور امام باقر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے اس وقت تک جہاد کا حکم نہ دیا جب تک حضرت جبریل یہ آیت لے کر نہ آئے۔ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ الایۃ (حج: ۳۹) اس آیت پر حضرت جبریل نے حضور علیہ السلام کو تلوار پہنائی اور سب سے پہلے عبداللہ ابن جحش اور ان کے ساتھیوں نے بطن نخلہ میں جہاد کیا۔ پھر بخاری کی روایت پر حضور علیہ السلام نے پہلا جہاد ابوا، پھر لواط، پھر اشیرا، پھر جنگ بدر فرمائی۔ تفسیر کبیر و دیگر کتب سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور کا پہلا جہاد جنگ بدر ہے۔ یہ دونوں روایتیں صحیح ہیں یعنی باقاعدہ پہلی جنگ، جنگ بدر ہوئی اس سے پہلے ابوا لواط وغیرہ معمولی جھڑپیں تھیں۔ حضور علیہ السلام نے کل انیس غزوے فرمائے۔ خیال رہے کہ یہ آیت جہاد کی آیات سے منسوخ ہے کیونکہ ان کا نزول غزوۂ احد کے بعد ہوا ہے جبکہ جہاد کا حکم آچکا تھا بلکہ واقعہ یہ تھا کہ نبی ﷺ نے مدینہ کے یہود سے اس شرط پر صلح کر لی تھی کہ وہ غیر جانبدار رہیں، ہمارے دشمنوں کی ہمارے مقابل مدد نہ کریں۔ جب یہود نو مسلموں کو خفیہ طور پر بہکانے لگے فرمایا اس بہکانے پر ان سے جہاد نہ کرو اور اپنی شرط صلح نہ توڑ دو بلکہ ان کے یہ قصور معاف کرو، جب اللہ اپنا حکم لاوے کہ ان کی طرف سے بدعہدی ظاہر ہو تب انہیں قتل بھی کرنا اور شہر بدر بھی چنانچہ غزوۂ خندق میں یہود مدینہ نے کھلم کھلا کفار مکہ کی مدد مسلمانوں کے مقابل کی تب بنی نضیر کو تو جلاوطن کیا گیا اور بنی قریظہ کو قتل، اور مدینہ میں سارے مسلمان ہی رہ گئے اس صورت میں آیت پر یہ اعتراض نہیں کہ جہاد کا حکم تو پہلے آچکا تھا، اب معافی کا حکم کیسا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** کفار مسلمانوں سے کبھی راضی نہیں ہو سکتے ان کے اتفاق کی صرف دو ہی صورتیں ہیں یا تو وہ مومن ہو جائیں۔ یا معاذ اللہ مسلمان مرتد، کیونکہ ایمان نور ہے اور کفر تاریکی، ایمان دن ہے اور کفر رات جو مومن اور کافر میں اتفاق کی کوشش کرتا ہے وہ فطرت اور قدرت سے مقابلہ کرتا ہے اسے کبھی کامیابی حاصل نہ ہوگی اور اس کا بارہا تجربہ ہو چکا مسلمانو رواداری کا گیت نہ گاؤ اپنے میں خودداری پیدا کرو۔ **دوسرا فائدہ:** حسد، بہت

براعیب ہے۔ حدیث پاک میں ارشاد ہوا کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا ڈالتا ہے جیسے آگ خشک لکڑی کو۔ دوسری روایت میں ہے کہ حاسد درحقیقت حق تعالیٰ کی نعمتوں کے دشمن ہیں۔ (تفسیر عزیزی) اس تفسیر عزیزی میں یہ بھی ہے کہ چھ گروہ دوزخ میں بہت جائیں گے۔ ۱۔ امیر لوگ ظلم کی وجہ سے ۲۔ اہل عرب تعصب اور حمیت کے سبب۔ ۳۔ گاؤں والے تکبر اور غرور کی وجہ سے ۴۔ بیوپاری خیانت کی وجہ سے۔ ۵۔ جنگلی لوگ جہالت کی وجہ سے۔ ۶۔ عام لوگ حسد کی وجہ سے روایت ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے کسی ایک شخص کو عرش کے سایہ میں دیکھا۔ عرض کیا مولیٰ اس کو یہ درجہ کس عمل سے حاصل ہوا۔ ارشاد الٰہی ہوا کہ تین عملوں سے ایک، یہ کہ یہ کسی پر حسد نہ کرتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اپنے ماں باپ کا فرمانبردار تھا۔ تیسرے یہ کہ چغلخوری سے محفوظ تھا فضل ابن محلب فرماتے ہیں کہ تکبر سے بچو کہ شیطان اسی سے ہمیشہ کا لعنتی ہوا۔ اَبٰی وَاسۡتَکۡبَرَ حرص اور طمع سے بچو کہ اسی نے آدم علیہ السلام کو جنت سے باہر کیا۔ حسد سے دور رہو کہ حسد ہی سے قابیل نے ہابیل کو قتل کیا اور حسد ہی سے برادران یوسف نے یوسف علیہ السلام پر اتنی زیادتی کر ڈالی۔

حسد کے درجے

حسد کے چار درجے ہیں۔ پہلا یہ ہے کہ حاسد دوسروں کی نعمت کا زوال چاہے کہ خواہ مجھے نہ ملے مگر اس کے پاس سے جاتی رہے اس قسم کا حسد مسلمانوں پر گناہ کبیرہ ہے۔ اور کافر، فاسق کے حق میں جائز مثلاً کوئی مالدار اپنے مال سے کفر یا ظلم کر رہا ہے اس کے مال کی اس لئے بربادی چاہنا کہ دنیا کفر و ظلم سے بچے جائز ہے۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ حاسد دوسرے کی نعمت خود لینا چاہے کہ فلاں کا باغ یا اس کی جائیداد میرے پاس آجائے یا اس کی ریاست کا میں مالک ہوں یہ حسد بھی مسلمانوں کے حق میں حرام ہے تیسرا درجہ یہ ہے کہ حاسد اس نعمت کے حاصل کرنے سے خود تو عاجز ہے اس لئے آرزو کرتا ہے کہ دوسروں کے پاس بھی نہ رہے تاکہ وہ مجھ سے بڑھ نہ جائے یہ بھی منع ہے۔ چوتھا مرتبہ یہ ہے کہ وہ تمنا کرے کہ یہ نعمت اوروں کے پاس بھی رہے مجھے بھی مل جائے یعنی اوروں کا زوال نہ چاہتا اپنی ترقی کا خواہش مند ہے اسے غبطہ یا تنافس کہتے ہیں یہ دنیوی باتوں میں منع اور دینی باتوں میں اچھا اور کبھی واجب بھی ہے رب فرماتا ہے۔ وَفِیۡ ذٰلِکَ فَلۡیَتَنَافَسِ الۡمُتَنَافِسُوۡنَ (المطففین: ۲۶) حدیث شریف میں ہے کہ دو شخصوں پر حسد یعنی غبطہ جائز ہے۔ ایک وہ عالم دین جو اپنے علم سے لوگوں کو فائدہ پہنچاتا ہو۔ دوسرا وہ سخی مالدار جس کے مال سے فیض جاری ہو۔

حسد کے اسباب

حسد کے کل سات سبب ہیں۔ **پہلا سبب** عداوت اور بغض ہے۔ جس سے کسی کو ایذاء پہنچ جائے پہلے تو وہ بدلہ لینے کی کوشش کرتا ہے اور مجبور ہو کر چاہتا ہے کہ اس پر غیبی مار پڑے اس کی مصیبت سے خوش اور آرام سے ناخوش ہوتا ہے۔ اِنۡ تَمۡسَسۡکُمۡ حَسَنَۃٌ تَسُؤۡهُمۡ (آل عمران: ۱۲۰) **دوسرا سبب** تکبر کہ حاسد اپنی بڑائی کا خواہش مند ہے۔ لَوۡلَا نُزِّلَ هٰذَا الۡقُرۡاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الۡقَرۡیَتَیۡنِ عَظِیۡمٍ (زخرف: ۳۱) یہ اسی قسم کا حسد تھا۔ **تیسرا سبب** سرداری کی خواہش ہے کہ

حاسد چاہتا ہے کہ سب میرے حاجت مند ہوں اور میں سب کا آقا کہلاؤں اس لئے وہ سب کو غریب دیکھنا چاہتا ہے۔ **چوتھا سبب** عجب اور بڑائی ہے حاسد دوسرے کو نعمت کا نااہل سمجھتا ہے اس لئے چاہتا ہے کہ اس کے پاس نہ رہے رب فرماتا ہے۔ اَوَعَجِبۡتُمۡ اَنۡ جَآءَكُمۡ ذِكۡرٌ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ عَلٰى رَجُلٍ مِّنۡكُمۡ (اعراف: ۶۳) (الخ) **پانچواں سبب** یہ ہے کہ حاسد دوسروں کے کمال میں اپنا زوال سمجھے کہ اگر وہ کامیاب ہو گئے تو میں ناکام ہو جاؤں گا۔ جیسے کہ پیشہ ور اپنے ہم پیشہ سے اسی قسم کا حسد رکھتے ہیں۔ تاجر طبیب واعظ اپنے ہم جنس کی ترقی سے ناراض ہوتے ہیں۔ **چھٹا سبب** حکومت ہے کہ حاسد چاہتے ہیں کہ میں اپنے کمال میں بے نظیر رہوں کہ میرے برابر کوئی دوسرا نہ نکلے۔ **ساتواں سبب** حاسد کی کم ظرفی اور کمینہ پن ہے کہ اس سے کسی کا عیش دیکھا نہیں جاتا یہ حسد سب حسدوں سے بدتر ہے۔ اللہ پاک ہر قسم کے حسد سے محفوظ رکھے یہود کو مسلمانوں سے کئی قسم کے حسد تھے۔

حسد کا علاج

خیال رہے کہ حسد ایک عالمگیر مرض ہے جس سے بہت کم لوگ خالی ہیں اس لئے اس کا علاج بہت ضروری ہے اس کے صرف دو ہی علاج ہیں ایک علمی علاج دوسرا عملی علاج۔ ۱۔ علمی علاج یہ ہے کہ یہ حاسد یہ عقیدہ رکھے کہ ہر ایک چیز تقدیر سے ہی ہوتی ہے اور میں حسد کر کے اپنی بدنصیبی اور دوسروں کی نیک بختی کو بدل نہیں سکتا اور یہ بھی جانے کہ حسد ایمان کی آنکھ کا تنکا اور خاک ہے جیسے کہ دماغ کی آنکھ ان چیزوں سے گدلی ہو جاتی ہے۔ ایسے ہی حاسد کا ایمان بلکہ اس کے دین و دنیا حسد سے مکدر ہو جاتے ہیں کہ دنیا میں رنج اور آخرت میں عذاب کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ ۲۔ عملی علاج یہ ہے کہ حاسد محسود کے ساتھ طبیعت کے خلاف برتاؤ کرے مثلاً اگر دل چاہتا ہے کہ محسود کی غیبت کرو تو فوراً اس کی تعریف کرنے لگ جائے یا اگر نفس کہتا ہے کہ محسود کے سامنے اکڑ کر بیٹھوں تو فوراً اس کے سامنے عاجزی و نرمی کرے اگر دل یہ کہتا ہے کہ اس سے نفرت کروں تو بے تکلف اس سے محبت کرے انشاء اللہ ان علاجوں سے بہت فائدہ ہوگا۔ اور یہ بھی خیال رہے کہ بے اختیاری نفرت یا محبت کی اللہ کے یہاں پکڑ نہیں (تفسیر کبیر و عزیزی)۔ نیز حسد کے علاج کے لئے کتب تصوف خصوصاً امام غزالی کی کتابیں جیسے احیاء العلوم وغیرہ کا مطالعہ کرو۔ **تیسرا فائدہ:** رب کے کام نہایت آہستگی سے ہوتے ہیں ہم کو بھی چاہئے کہ ہر کام میں جلدی نہ کریں۔ خود ہم میں حاسد و محسود موجود ہے۔ نفس امارہ حاسد اور دل محسود۔ نفس کی ہمیشہ یہ کوشش ہے کہ دل کو نیک راہ سے ہٹا کر بری راہ پر لگا دے کیونکہ قیامت میں ثواب دل کو ملے گا اور امارہ نفس تو وہاں فنا کر دیا جائے گا۔ نفس تو صرف اسی دنیا میں آرام یا تکلیف اٹھا رہا ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت کو منسوخ کہنا غلط ہے کیونکہ یہاں خود معافی اور درگذر کی حد بتا دی گئی ہے۔ کہ حَتّٰى يَاۡتِىَ اللّٰهُ بِاَمۡرِهٖ جیسے روزے کی حد ہے اِلَى الَّيۡلِ نہ روزہ رات سے منسوخ ہے اور نہ یہ احکام آیت جہاد سے۔ **جواب:** تفسیر معین

ناسخ ہوتی ہے اور معین حد ناسخ نہیں بلکہ انتہا روزے کی رات ہے جو سب کو معلوم ہے۔ مگر معافی اور درگزر کی حد حکم جہاد ہے۔ جس کی خبر نہیں کہ کب آئے گی۔ (تفسیر کبیر)۔ لہٰذا روزہ غیر منسوخ اور یہ احکام منسوخ یہ فرق خیال میں رکھو۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت کے نزول کے وقت مسلمان کمزور اور کفار طاقتور تھے اور کمزور کا بدلہ نہ لے سکنا معافی نہیں کہلاتا معافی تو یہ ہے کہ انسان بدلہ لینے پر قادر ہو پھر چھوڑ دے لہٰذا یہاں فَاعْفُوْا کیوں فرمایا گیا **جواب:** اگرچہ اس وقت مسلمان اجتماعی حملہ یعنی لشکر کشی پر قادر نہ تھے مگر انفرادی حملہ کا بہت موقعہ تھا کہ گلی کوچوں میں جہاں کافر کو پاتے ٹھکانے لگا دیتے اس آیت میں اس سے بھی روکا گیا۔

تفسیر صوفیانہ

مشہور یہ ہے کہ دنیا میں گوشت کے بہت سے دشمن ہیں پرندے درندے چرندے دریائی جانور سب ہی اس کے تاک میں رہتے ہیں گوشت کی بوٹی پر ہوا سے چیل، کوے، گدھ وغیرہ گرتے ہیں اور زمین کے کتے، بلی، شیر، چیتا حملہ کرتے ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس کی بہت حفاظت کی جائے ورنہ بعد میں کف افسوس ملنا ہوگا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایمان کے بیرونی اور اندرونی بہت دشمن ہیں۔ شیطان، ہمزاد شیطان، انسان نما شیطان یعنی کفار اور حاسدین نفس امارہ دنیا کی دلکش چیزیں سبھی ایمان کی تاک میں ہیں مگر ایمان کی حفاظت کی بیمہ کمپنی بھی ہے جو اللہ کے فضل سے اس دولت کو منزل مقصود تک پہنچانے کا ٹھیکہ لیتی ہے اس کمپنی کا ہیڈ کوارٹر مدینہ منورہ میں ہے اور اس کی شاخیں بغداد اور اجمیر اور پیران کلیر وغیرہ میں کھلی ہوئی ہیں اور اس کی برانچ شاخیں تقریباً ہر جگہ ہیں اور اس کے دلال ہر جگہ پھر رہے ہیں۔ حدیث شریف میں ہے کہ ہر چالیس متقی مسلمانوں میں ایک ولی اللہ ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ نقد عقیدت دے کر اپنے ایمانوں کا بیمہ کرالیں قلب کا پتہ ہر وقت ہواؤں کے خطرے میں ہے۔ چاہئے کہ کسی پتھر کے نیچے آجائے۔ شعر

دل پہ کندہ ہو تیرا نام کہ وہ دزد رجیم ۔۔۔ الٹے ہی پاؤں پھرے دیکھ کے طغرا تیرا

وَ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتُوا الزَّكٰوةَ ؕ وَ مَا تُقَدِّمُوْا

اور قائم رکھو تم نماز کو اور دو تم زکوٰۃ اور جو کچھ آگے بھیجو گے

اور نماز قائم رکھو اور زکوٰۃ دو اور اپنی جانوں کے لئے

لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا

واسطے جانوں اپنی کے کوئی بھلائی پاؤ گے تم اس کو نزدیک اللہ کے تحقیق

جو بھلائی آگے بھیجو گے اسے اللہ کے یہاں پاؤ گے بے شک اللہ

تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾

اللہ اس کو جو تم کرتے ہو دیکھنے والا ہے
تمہارے کام دیکھ رہا ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح کا تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں کو بتایا گیا کہ تمہارے ایمان کے چھیننے والے بہت سے دشمن ہیں۔ اب ان کو حفاظت ایمان کا طریقہ بتایا جارہا ہے تم نماز زکوٰۃ وغیرہ نیک اعمال سے ان کی حفاظت کرو۔ **دوسرا تعلق:** پہلے مسلمانوں کو ضبط اور تحمل کا حکم دیا گیا جو کہ ان پر بہت شاق تھا۔ اب نماز روزہ کا حکم دیا جارہا ہے جس سے ان کے دلوں کو برداشت کی طاقت پیدا ہو۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں کو جہاد کفار سے روکا گیا۔ اب انہیں جہاد نفس کا حکم دیا گیا کہ ابھی اس جہاد کا تو حکم نہیں اپنے نفس سے نماز روزے کے ہتھیار سے جہاد کرو۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں کو کفار کی اصلاح کا طریقہ بتایا گیا کہ معافی اور درگزر سے ان کی اصلاح کرو۔ اب اپنے نفس کی اصلاح کا طریقہ سکھایا کہ نماز روزے سے اس کو درست کرو۔ **پانچواں تعلق:** پہلے کفار کی سختیاں جھیلنے کا حکم تھا اب نماز، زکوٰۃ کی پابندیاں برداشت کرنے کا فرمان ہے۔

تفسیر

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ یہ **فَاعْفُوْا** پر معطوف ہے یعنی ان بے دینوں سے منہ پھیر لو اور نماز کی طرف متوجہ ہو کر اسے ہمیشہ قائم رکھو قائم رکھنے کے معنے بارہا بیان کئے جا چکے ہیں کہ اچھی طرح پڑھو یا ہمیشہ پڑھو یا اس کے مستحبات وغیرہ کا لحاظ کر کے پڑھو اور صلوٰۃ سے مراد غالباً فرض، واجب نمازیں ہیں کہ انہیں کے قائم رکھنے کا حکم ہوتا ہے۔ **وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ** چونکہ نماز عبادت بدنی ہے اور زکوٰۃ عبادت مالی اور مالی عبادت بدنی کے بعد ہے۔ اس لئے زکوٰۃ کا ذکر نماز کے بعد ہوا اور اے مسلمانوں صرف فرائض و واجبات پر ہی قناعت نہ کرنا بلکہ نوافل اور مستحبات بھی ادا کرتے رہنا۔ کیونکہ **وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ** اپنے لئے جو بھلائی آگے بھیج لوگے بہتر۔ خیر ہر بھلائی کو شامل ہے یعنی نماز روزہ زکوٰۃ اچھے معاملات تلاوت قرآن درود پاک اور کلمہ طیبہ وغیرہ۔ مگر چونکہ نماز زکوٰۃ سب میں بہتر تھیں۔ اس لئے ان کو علیحدہ ذکر کیا ہے۔ یعنے اے مسلمانو! تم اپنے نفع کے لئے جو بھلائی کرو گے **تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ** اللہ کے نزدیک محفوظ پاؤ گے یا تو اس کا ثواب پانا مراد ہے یا خود ان اعمال کا ہی پانا جیسے کہ روایت میں ہے کہ قیامت میں اچھے اعمال اچھی شکل میں سامنے آئیں گے عند اللہ فرما کر بتا دیا دنیا میں جزا پانے کی طمع نہ رکھو اگر دنیوی مصیبت آجائے تو اس سے بددل نہ ہو جاؤ کیونکہ جزا کی جگہ تو آخرت ہے نیز جو یہاں کچھ آرام اور عیش پائے اس کی اخروی جزا میں کوئی کمی نہ ہوگی۔ یہ تو اللہ کے فضل سے تنخواہ کے علاوہ راستہ کا بھتہ ہے۔ یہ بھی خیال رہے کہ **تَجِدُوْهُ** سے یہ مراد نہیں ہے کہ جتنا کرو گے اتنا ہی پاؤ گے روایت میں تو یہ آتا ہے کہ معمولی صدقات پہاڑ کے برابر ہو کر ملیں گے۔ جب دنیوی بادشاہ اپنے نوکروں کے فنڈ کا روپیہ بڑھا کر دیتے ہیں تو وہ احکم الحاکمین نہ معلوم کتنا بڑھا کر دے گا اور یہ مت سمجھنا کہ معمولی نیکیاں حقیری چیز ہیں نہ معلوم وہ اتنے بڑے دربار میں شمار آئیں یا نہ آئیں۔ نہیں وہاں تو ذرہ ذرہ کی

جزاء ملے گی کیونکہ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ حق تعالیٰ تمہارے چھوٹے بڑے ادنیٰ اعلیٰ اعمال کو دیکھ رہا ہے اور ان سے خبردار ہے یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ مسلمانو یہ نہ سمجھنا کہ نیکیاں تو وہاں ملیں گی اور بدیاں ضائع ہو جائیں گی نہیں حق تعالیٰ تمہارے ہر قسم کے نیک و بد اعمال دیکھ رہا ہے۔ ہر ایک کی جزاء سزا دے گا۔ اس صورت میں یہ آیت ترغیب کی بھی ہے اور ترہیب یعنی ڈرانے کی بھی۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! تم بہکانے والوں کی طرف توجہ نہ کرو اور فی الحال ان سے بدلہ لینے کی کوشش نہ کرو۔ کسی کے بہکانے میں نہ آؤ۔ بلکہ ابھی خود ایمان پر ثابت قدم رہ کر عالم آخرت کے لئے جہاں تم کو ہمیشہ رہنا ہے۔ تیاری کرو بدنی عبادتوں میں سب سے اعلیٰ نماز ہے اس کو پابندی سے ادا کرتے رہو اور مالی عبادت یعنی زکوٰۃ وغیرہ سے بھی غافل نہ رہو۔ نماز زکوٰۃ کے علاوہ بھی جو ہو سکے نیکی کرلو۔ خلق سے بھلائی اپنے اور بیگانے کے ساتھ نیک سلوک سے پیش آؤ۔ یقین رکھو کہ تمہارا کوئی کام ضائع نہ جائے گا۔ تم اپنے سارے اعمال کا بدلہ مع نفع کے رب تعالیٰ کے پاس پاؤ گے یا خود اعمال ہی کو وہاں دیکھو گے۔ کیونکہ سارے اعمال عالم امثال میں موجود رہتے ہیں جن کو مرنے کے بعد ہر شخص ضرور پائے گا اور یہ بھی یقین رکھو کہ خدا تعالیٰ سب کچھ دیکھ رہا ہے وہ کسی کے عمل اور اس کی سزا و جزا سے غافل نہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ**: نماز زکوٰۃ سے افضل ہے اسی لئے نماز کو اس سے پہلے بیان فرمایا اور نماز کے لئے اَقِیْمُوْا یعنی ہمیشہ قائم رکھو اور زکوٰۃ کے لئے اٰتُوْا یعنی دے دو کہا۔ ا۔ نماز بدنی عبادت ہے اور زکوٰۃ مالی اور بدن مال سے افضل ہے تو اس کی عبادت بھی افضل۔ ۲۔ نماز امیر غریب سب پر فرض اور زکوٰۃ صرف امیروں پر لہٰذا اس کا نفع عام۔ ۳۔ نماز میں ہر عضو کام کرتا ہے۔ زکوٰۃ دینے میں صرف ہاتھ۔ ۴۔ نماز روزانہ پانچ بار ادا ہوتی ہے اور زکوٰۃ سال بھر میں ایک بار۔ ۵۔ نماز براہ راست حق تعالیٰ سے تعلق رکھتی ہے اور زکوٰۃ بذریعہ فقیر۔ ۶۔ نماز معراج میں حضور علیہ السلام کو عرش پر بلا کر دی گئی، زکوٰۃ کے احکام یہاں ہی بھیج دیئے گئے۔ ۷۔ نماز میں رب تعالیٰ سے ہم کلامی ہے اور زکوٰۃ میں فقیر سے وغیرہ وغیرہ۔ **دوسرا فائدہ**: انسان صرف نماز، زکوٰۃ پر ہی قناعت نہ کرے بلکہ جس بھلائی کا موقعہ مل جائے اسے کر گزرے معمولی نیکی اس ایک گھونٹ پانی کی طرح ہے جو کبھی پیاسے کی جان بچا لیتا ہے اور معمولی گناہ اس چنگاری کی طرح ہے جو کبھی گھر جلا دیتی ہے۔ **تیسرا فائدہ**: اس عالم کے سوا ایک دوسرا عالم بھی ہے جسے عالم المثال کہتے ہیں یہاں تو اعمال اور اعراض کی کوئی شکل نہیں۔ لیکن وہاں ہر چیز کی شکل اور اس کا وزن ہے وہاں بخیل کا مال گنجے سانپ کی شکل میں اور قرآن و رمضان وغیرہ اچھی شکل میں سامنے آئیں گے۔ **چوتھا فائدہ**: دنیا میں حکام اور بادشاہ بڑے لوگوں سے باخبر اور چھوٹوں سے بے خبر رہتے ہیں۔ نیز اپنی رعایا کے بڑے اعمال کی طرف متوجہ رہتے ہیں اور چھوٹے اعمال سے بے پرواہ مگر رب تعالیٰ کی نظر کرم ہر چھوٹی بڑی مخلوق پر اور ان کے ہر اعلیٰ و ادنیٰ اعمال پر ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان اپنی ہر نیکی کو وہاں پائے گا اور دوسری آیت میں معلوم ہوتا ہے کہ بعض گناہوں سے نیکیاں، برباد بھی ہو جاتی ہیں۔ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ (الحجرات: ۲) ان آیتوں میں مطابقت کیونکر ہو۔
جواب: اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ یہاں فرمایا گیا وَمَا تُقَدِّمُوْا تم جو بھلائی آگے بھیج دو گے اسے پاؤ گے اور وہی بھلائی آگے جاتی ہے جو شرائط ادا اور شرائط قبول کے ساتھ ہو اور پھر اس پر کوئی برباد کرنے والی آفت بھی نہ پہنچ جائے۔ لہٰذا جو نیکیاں خلاف قاعدہ کی گئی یا جو یہاں ہی برباد ہو گئیں وہ آگے گئی ہی نہیں انہیں پائیں گے کیسے۔ دوسرے یہ کہ انسان اپنی ہر بھلائی کو وہاں دیکھ تو لے گا مگر ثواب اس کا ہی پائے گا جو بربادی سے بچ رہی۔ کافر مردہ بھی قبر میں جنت دیکھتا ہے مگر اس سے محروم یہاں فرمایا گیا۔ تَجِدُوْهُ جو سب کو شامل ہے۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ خدا تعالیٰ ہمارے انہیں کاموں کو دیکھتا ہے جو ہم کرتے ہیں۔ یعنی ہمارے کرنے سے پہلے وہ بے خبر ہوتا ہے۔ کیونکہ فرمایا گیا بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ اور یہ عیب ہے۔ ادھر صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ اللہ والے تو لوگوں کی پیدائش سے صدہا سال پہلے ان کو اور ان کے اعمال کو دیکھتے ہیں۔

بلکہ قبل از زادن تو سال ہا مر ترا بیند بچندیں حال را

تو کیا اولیاء اللہ کا علم خدا کے علم سے زائد ہے۔ **جواب** حق تعالیٰ ہمیشہ سے سننے اور دیکھنے والا ہے مگر دنیا کی ہستی سے پہلے اس کا دیکھنا اور قسم کا تھا اور اس کی ہستی کے بعد دوسری قسم کا بلا تشبیہ۔ یوں سمجھو کہ ہم عمارت بنانے سے پہلے اس کا سارا نقشہ اپنے ذہن میں لے لیتے ہیں اور پھر اسے کاغذ پر مکمل طور پر کھینچ کر معمار کو بتا دیتے ہیں جس کے مطابق عمارت بنتی ہے تو ہم کو اس عمارت کا تین طرح علم حاصل ہوا۔ ایک خیالی خاکہ کا دوسرا کاغذ پر نقشہ کا۔ تیسرے بن چکنے کے بعد خود اس عمارت کا علم ظہور تو بن چکنے کے بعد ہوا۔ مگر دوسری قسم کا علم اس سے پہلے بھی تھا۔ رب تعالیٰ ہر چیز کو ہمیشہ سے جانتا اور دیکھتا ہے پھر اس نے علم کے مطابق لوح محفوظ میں عالم اور اس کے واقعات کا نقشہ کھینچا۔ فرشتوں نے اسی کے مطابق دنیاوی انتظامات کئے اور پھر اسی عالم بن جانے کے بعد بھی اس کو جانا اور دیکھا مگر یہ علم ظہور ہے اور وہ قبل ظہور یہاں کا جاننا دیکھنا مراد ہے۔ **تیسرا اعتراض:** جب حق تعالیٰ ہمارے اعمال کو خود ہی دیکھتا اور جانتا ہے تو فرشتوں سے کیوں لکھواتا ہے۔ (آریہ)
جواب: فیصلے کے لئے کیونکہ فیصلہ حاکم کے ذاتی علم پر نہیں بلکہ قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ قانون قدرت یہ ہے کہ بندوں کا فیصلہ خفیہ پولیس کی رپورٹ اور خود ملزم کے اعضاء کی گواہی پر ہو۔ یہ سب کچھ اسی لئے ہے۔

تفسیر صوفیانہ

دنیا انسان کے لئے کمانے کی جگہ ہے جو کچھ یہاں کما کر اپنے وطن بھیج دے گا وہ وہاں پہنچ کر اس کے کام آئے گا۔ البتہ یہاں تو بھیجا ہوا روپیہ کبھی مارا بھی جاتا ہے اور کبھی وطن پر پہنچ کر برباد ہو جاتا ہے لیکن وہاں کے متعلق فیصلہ ربانی ہے کہ نہ مارا جائے اور نہ برباد اور جب انسان مرتا ہے لوگ کہتے ہیں فلاں نے کیا چھوڑا اور ملائکہ پوچھتے ہیں کہ وہاں سے کیا لایا۔ ایک

دن عمر رضی اللہ عنہ بقیع یعنی مدینہ پاک کے قبرستان میں تشریف لے گئے اور فرمایا کہ اے قبروں والو ہماری خبریں سن لو۔ تمہاری بیویوں نے دوسروں سے نکاح کر لیا اور تمہارے گھر اوروں سے آباد ہو گئے اور تمہارے مال تقسیم ہو چکے ایک غیبی آواز آئی کہ اے ابن خطاب ہماری خبریں بھی سن لو جو ہم نے آگے بھیجا تھا وہ پالیا اور جو کچھ راہ مولیٰ میں خرچ کر آئے تھے مع نفع کے وصول کر لیا جو کچھ چھوڑ آئے اس پر ندامت ہے۔ (روح البیان)۔ اے اللہ کے بندو جب یہ بات طے کہ جو کماؤ گے سو پاؤ گے اور جو کچھ بھیجو گے اس میں سے کچھ نہ مارا جائے گا۔ لہٰذا اپنا یہ موقعہ کیوں کھوتے ہو اس آیت کے معنی یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جو کچھ اپنے لئے اگلی بھلائی کر جاؤ گے یعنی ایسا عمل کر جاؤ گے کہ تمہارے بعد صدقہ جاریہ ہو کر باقی رہے تو اس کا اجر مرنے کے بعد بھی اللہ کے ہاں پاتے رہو گے۔ صوفیائے کرام حدیث کے مطابق فرماتے ہیں کہ انسان کے مرتے ہی اس کے سارے عمل بند ہو جاتے ہیں سوا اس کی چار اولادوں کے ایک تو مالی اولاد جیسے مسجدیں اور پل، دوسرے اس کی علمی اولاد جیسے دینی کتاب اور شاگرد تیسرے اس کی بدنی اولاد جیسے وہ نیک بچہ جو اس کے لئے دعائے خیر کرتا رہے اور چوتھے اس کی روحانی اولاد جیسے نیک مریدین۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ بوستان میں فرماتے ہیں ۔

ازاں کس کہ خیرے بماند رواں ۔۔۔ دما دم رسد رحمتش برروان

نمرد آنکہ ماند پس از وے بجائے ۔۔۔ پل و مسجد و خوان و مہمان سرائے

وگر رفت و آثار خیرش نماند ۔۔۔ نہ شائد پس مرگ الحمد خواند

بندہ گنہگار احمد یار بارگاہ کردگار میں عرض گزار ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے بھی اس تفسیر میں اخلاص نصیب فرمائے اور اپنے فضل و کرم سے قبول فرمائے اور مصنفین مقبولین کے صدقہ میں اس کو میرے واسطے صدقہ جاریہ بنائے اور جو حضرات میرے الفاظ سے فائدہ اٹھائیں وہ میرے واسطے مغفرت و رحمت کی دعائیں مانگیں کہ میں نے اس لالچ میں یہ مشقت اٹھائی ہے اور کبھی مجھ کو اپنی دعاؤں میں یاد کر لیا کریں ۔

اے کہ بر ما میروی دامن کشاں ۔۔۔ از سرے اخلاص الحمدے بخواں

وَقَالُوْا لَنْ یَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ
اور کہا انہوں نے ہرگز نہیں داخل ہوگا جنت میں مگر وہ جو ہو یہودی یا
اور اہل کتاب بولے ہرگز جنت میں نہ جائے گا مگر وہ جو یہودی یا
نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِیُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
عیسائی یہ خواہشات ہیں ان کو فرما دو لاؤ تم دلیل اپنی اگر ہو تم
نصرانی ہو یہ ان کی خیال بندیاں ہیں تم فرماؤ لاؤ تم دلیل اپنی اگر

صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ
سچے ہاں جو جھکا دے چہرہ اپنا واسطے اللہ کے اور وہ بھلائی
سچے ہو ہاں کیوں نہیں جس نے اپنا منہ جھکایا اللہ کے لئے اور وہ
فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۠ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ
کرنے والا ہو پس واسطے اس کے ثواب ہے اس کا پاس رب اس کے اور نہیں ہے ڈر
نیکوکار ہے تو اس کا نیگ اس کے رب کے پاس ہے اور انہیں نہ کچھ اندیشہ
يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ ع
اوپر ان کے اور نہ وہ غمگین ہوں گے
ہو اور نہ کچھ غم

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پہلے بتایا گیا تھا کہ یہود مسلمانوں کو شبہات میں ڈال کر اسلام سے علیحدہ کرنا چاہتے ہیں۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ وہ جنت کا لالچ دے کر ہی مسلمانوں کو اسلام سے پھیرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ وہ کہتے ہیں کہ تم کتنے بھی اعمال کرو بغیر یہودی بنے ہوئے جنت کی بو نہیں پاسکتے۔ **دوسرا تعلق:** پہلے مسلمانوں کو نیک اعمال کی رغبت دی گئی تھی۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ تم عیسائیوں اور یہودیوں کی طرح نہ ہو جانا جو کہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ ہمیں اعمال کی ضرورت نہیں۔ **تیسرا تعلق:** پہلے فرمایا گیا تھا کہ جو کرو گے وہ رب کے نزدیک پاؤ گے۔ اب یہود کی بیہودگی کا ذکر ہے کہ وہ بغیر کئے بھی پانے کے امیدوار بنے بیٹھے ہیں۔

شان نزول

ایک بار نجران کے عیسائی اور مدینہ کے یہودی حضور علیہ السلام کی خدمت میں جمع ہو کر آپس میں مناظرہ کرنے لگے ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کو جھوٹا کہا۔ یہودی بولے کہ جنت میں یہود کے سوا کسی کا داخلہ نہیں ہو سکتا، عیسائیوں نے جواب دیا کہ عیسائیوں کے سوا کسی کو بھی جنت نہیں مل سکتی۔ تب یہ آیت کریمہ اتری۔ (تفسیر روح البیان)۔

تفسیر

وَقَالُوْا اس کے فاعل یہودی اور عیسائی دونوں ہیں۔ اگرچہ پہلے سے یہود کا ہی ذکر آ رہا ہے لیکن یہاں ضمیر میں عیسائیوں کو بھی شامل کر لیا گیا۔ کیونکہ وہ دونوں کفر اور شیخی اور مسلمانوں کو بہکانے میں یکساں تھے۔ لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ کہ جنت میں رہنا تو بہت بڑی بات ہے، کوئی وہاں داخل بھی نہ ہو گا بلکہ وہاں تک پہنچے گا بھی نہیں اگرچہ سارے پیغمبروں پر ایمان لائے اور

اپنی ساری عمر عبادت الٰہی میں خرچ دے۔ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا سوائے اس کے جو یہودی ہو یہ یہود کا قول ہے اس لئے کہ عیسائی یہ نہ کہہ سکتے تھے یہود کا عقیدہ یہ تھا کہ ہم نیک اعمال کریں یا نہ کریں۔ بہر حال جنتی ہیں کیونکہ ہم بذریعہ اسحاق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں اور ہمارے متعلق رب نے ابراہیم علیہ السلام سے جنت دینے کا وعدہ کرلیا۔ رب تعالیٰ پر اپنے وعدہ کا پورا کرنا لازم ہے۔ ھود جمع ھائد کی ہے جس کے معنے ہیں توبہ کرنے والا۔ قرآن فرماتا ہے اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ (اعراف: ۱۵۶) چونکہ انہوں نے بہت سخت توبہ کی تھی اس لئے ان کا یہ نام ہوا اَوْ نَصٰرٰى یہ عیسائیوں کا قول ہے کیونکہ یہودی یہ نہ کہہ سکتے تھے عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ہم بہر حال جنتی ہیں کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سولی ہمارے گناہوں کا کفارہ ہو چکی، نصاریٰ جمع نصران کی ہے جیسے سکاریٰ جمع سکران۔ اس کے معنے ہیں مددگار، چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں یعنے ساتھیوں نے ان سے مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا اس لئے ان کا نام نصارے ہوا۔ یہود و نصاریٰ دونوں بڑے اچھے نام تھے لیکن اب ان کا علم بن کر رہ گئے جیسے کالے آدمی کو کہہ دیتے ہیں بھورے خاں، یہ آیت در حقیقت دو جملوں کا مختصر ہے۔ یعنے یہود تو کہتے تھے کہ یہود کے سوا جنت میں کوئی نہیں جائے گا اور عیسائی کہتے تھے کہ عیسائیوں کے سوا جنت میں کوئی داخل نہ ہوگا ان کی تردید میں ارشاد ہوتا ہے کہ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ یہ ان کی فقط خیالی باتیں ہیں، اَمَانِىُّ، اُمْنِيَةٌ کی جمع ہے اور امنیہ اصل میں اموینۃ تھا اس کا مادہ ہے مُنًى جس کے معنی ہیں خواہش جیسے اَعْجُوْبَةٌ کی جمع اعاجیب، اہل عرب ہر بے دلیل بات کو تمنّی، امنیۃ غرور اور ضلال اور احلام کہہ دیتے ہیں۔ (تفسیر روح البیان)۔ چونکہ اس کی قائل دو جماعتیں تھیں اس لئے امانی جمع بولا گیا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تِلْكَ سے ان کی تمام بکواس اور برے ارادے مراد ہوں یعنی مسلمانوں کو مرتد بنانا اور ان پر کسی بھلائی کا نہ اترنا اور ان کا جنت سے محروم رہنا یہود و نصاریٰ کے غلط خیالات اور جھوٹی خواہشات ہیں ان کی تردید کے لئے فرمایا جاتا ہے کہ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اے نبی ﷺ یا اے مسلمانو ان دونوں قوموں سے فرمادو کہ اپنے اس دعوے پر دلیل لاؤ، هَاتُوْا اور اصل اِئْتُوْا تھا۔ اِيْتَاءٌ کا امر جس کے معنی ہیں لانا ہمزہ ھ سے بدلی اور یہ امر یا تعجب کا ہے یا عاجز کرنے کا۔ کیونکہ ان کے پاس کوئی دلیل تھی ہی نہیں بُرْهَان۔ بَرَهٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں روشن ہونا یا بُرْهَةٌ سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں مضبوطی، اصلاح میں بچی اور قوی دلیل کو برہان کہتے ہیں کیونکہ اس سے دعوے مضبوط یا روشن ہوتا ہے یہاں برہان سے مراد صرف عقلی دلائل نہیں کہ یہ مسئلہ یعنی دوزخی ہونا وہاں کا مسئلہ ہے جہاں عقل کام نہیں کرتی بلکہ توارت کی صریح آیت یا حضرت موسیٰ کلیم اللہ کا صریحی فرمان مراد ہے جو ان تک بہ طریقہ تواتر پہنچا ہو۔ یعنی ان صحابہ کا جنتی ہونا قرآنی آیات اور نبی آخر الزمان کے قول سے ثابت ہے تم ان کا جنتی نہ ہونا توارت کی صریحی آیت سے ثابت کرو مگر اس تحریف شدہ تورات میں بھی کوئی ایسی آیت تم کو نہیں ملے گی۔ جس سے یہ اہم مسئلہ ثابت ہو۔ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ اگر تم سچے ہو، کیونکہ کوئی دعویٰ بغیر دلیل قابل قبول نہیں۔ اس مختصر سے جملے میں ان دونوں قوموں کا اجمالی اور تفصیلی رد کر دیا گیا اور جب وہ دونوں قوی تو کیا ضعیف سی دلیل بھی نہ پیش کر سکے تو فرمایا گیا بَلٰى یہ حرف ایجاب ہے جس سے منفی کا ثبوت ہوتا ہے بلکہ اس جگہ تو اس میں ثبوت اور نفی دونوں ہیں، انہوں نے کہا تھا کہ ہم جنت میں جائیں گے اور ہمارے سوا کوئی نہیں جائے گا، ان کا جواب دیا گیا کہ ہاں تم نہ جاؤ گے،

بلکہ تمہارے سوا وہ لوگ جائیں مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ جنہوں نے اپنا منہ رب کے سامنے جھکا دیا اَسْلَمَ اسلام سے بنا ہے جس کا مادہ ہے سَلْمٌ اس کے معنی ہیں ظاہری اور باطنی آفات سے بچ جانا، اسلام، سلامتی میں داخل ہونا یا کوئی چیز بلا شرکت دوسرے کو سونپ دینا، شریعت میں اسلام کی دو صورتیں ہیں، ایک تو زبان سے دینی باتوں کا اقرار کرنا، دوسرے دل سے اعتقاد اور زبان سے اقرار کرنا چونکہ ایسا شخص اپنے کو عذاب سے بچا لیتا ہے اور اپنی ذات اور اپنی عبادات اور اعمال کو خالص رب کے لئے قرار دیتا ہے اس لئے ان کو مسلم اور اس کے عقیدے کو اسلام کہتے ہیں یہاں اسلام کے دوسرے ہی معنی مراد ہیں یعنی عقائد اور اقرار میں درست وَجْهَهٗ کے لفظی معنی ہیں سامنے والی چیز اور چہرہ بھی سامنے ہی ہوتا ہے اس لئے اسے وجہ کہتے ہیں اور کبھی ذات کو یہاں تینوں معنی بن سکتے ہیں یعنی جس نے اپنی ذات یا اپنے چہرے یا اپنی توجہ کو اللہ تعالیٰ کے لئے خاص کر دیا یا جھکا دیا اور اپنے کو آفات سے بچا لیا، پھر فقط اسی پر قناعت نہ کی بلکہ هُوَ مُحْسِنٌ اور نیکوکار بھی رہا یعنی درستی عقائد اور اقرار کے ساتھ اپنے اعمال بھی سنبھالے وہ حکمت نظری تھی اور یہ حکمت عملی کیونکہ اسلام ایک بار ہی قبول کیا جاتا ہے اور اعمال بار بار اس لئے وہاں ماضی فرمایا اور یہاں جملہ اسمیہ جس نے یہ سب کچھ کر لیا۔ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ اس کو اس کا ثواب ملے گا، اجر عمل کے اس معاوضہ کو کہتے ہیں جس کا پہلے سے وعدہ کر لیا جائے جیسے اجرت اور مزدوری یہاں اس سے جنت کا داخلہ مراد ہے اور اسے اجر اس لئے فرمایا کہ اس کا عمل سے قوی تعلق ہے اس کے بغیر جنت کی امید کرنا باطل خیال ہے۔ عِنْدَ رَبِّهٖ اس اجر کے ضائع ہونے کا انشاء اللہ اندیشہ نہیں بلکہ وہ رب کے نزدیک ثابت ہو چکا ہے اور عادل بادشاہ مزدور کی اجرت نہیں روکتے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ قیامت کے دن یا جنت میں جاتے وقت نہ تو انہیں آئندہ کا ڈر ہوگا اور نہ پچھلی باتوں پر غم یا دنیا میں بھی انہیں، غیر خدا کا وہ خوف اور غم نہیں ہوتا جو انہیں ایمان و عمل سے روک دے اور انہیں مضر ہو۔ رب کا خوف جہنم کا ڈر، خرابی خاتمہ کا اندیشہ جو ان کے لئے مفید ہے۔ وہ ضرور رہوگا۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! اہل کتاب تمہیں بہکانے کی بہت تدبیر کرتے ہیں، اسلام پر اعتراض کرنے اور تمہارے دلوں میں شکوک ڈالنے کے علاوہ تمہیں غلط لالچ بھی دیتے ہیں کہ یہود تو کہتے ہیں کہ ہمارے سوا جنت میں کوئی نہ جائے گا کیونکہ ہم پیغمبروں کی اولاد ہیں۔ اور عیسائی کہتے ہیں کہ ہم اکیلے ہی جنت کے ٹھیکیدار ہیں کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہم سب کی طرف سے سولی پا کر ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا کر گئے، ہم کچھ بھی نہ کریں تو جنتی ہیں اور تم سب کچھ کرو تو بھی جنتی نہیں۔ مگر مسلمانو یہ ان کے فاسد خیالات اور محض نفسانی خواہشات ہیں جن کا ان کے پاس ثبوت نہیں تم ان کی یوں آزمائش کرو کہ ان سے کوئی قوی دلیل مانگو اور کہو اگر سچے ہو تو اپنی کتابوں سے ہی دلیل لاؤ نہ وہ دلیل دے سکتے ہیں نہ دے سکیں گے، نہ توراۃ میں یہ ہے، نہ انجیل میں نیز یہ عقیدہ عقل کے بھی خلاف ہے کہ خداوند تعالیٰ تمام انسانوں کا رب ہے ہر قوم ہر ملک سے اس کی یکساں نسبت ہے، کوئی خاص قوم یا ملک اس کی رحمت کے حق دار نہیں بلکہ جو بھی عربی، عجمی، حبشی، چینی وغیرہ اس کے آگے اپنا سر جھکا دے اور اس کے ہر حکم کو بے چون و چرا مان لے اور نیکوکار بھی ہو اس کا بدلہ ضرور ملے گا خدا کے پاس، جہاں اسے ہمیشہ رہنا ہے اور

وہاں پہنچ کر نہ تو انہیں اپنے مرنے اور قرابت داروں سے چھوٹنے، بڑھاپا آنے، یا بیماریوں کے ستانے، یا تنگ دستی کے غالب آنے، یا جنت سے باہر نکالے جانے، یا دشمن، یا کسی بادشاہ کے ایذاء دینے، یا خدا کے ناراض ہونے کا ڈر ہوگا اور نہ اپنی گزشتہ عمر برباد کرنے کا غم کہ ہائے میں دن رات دولت جمع کرنے، عمدہ مکان و باغ بنانے، دنیوی عزت حاصل کرنے میں سرگرداں رہا اور غلط مذہب کی پابندی سے بڑی بڑی محنت اٹھاتا رہا، رب کی نعمتیں چھوڑیں، گنگا جمنا میں غوطے لگائے، گرجوں میں صلیب کو پوجا اور ان میں سے کوئی چیز ہمارے کام نہ آئی بلکہ انہیں دائمی آرام خوشی میسر ہوگی۔ **فائدے** خیال رہے کہ بعض باتیں بالکل ظاہر و بدیہی ہوتی ہیں جن پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہوتی، جیسے دن کے وقت سورج کی ہستی و طلوع بعض چیزیں صیغہ راز میں ہوتی ہیں۔ جنہیں نظری کہا جاتا ہے پھر یہ نظری چیزیں بعض بہت اہم ہیں۔ بعض معمولی اہم۔ دعوے کے لئے قوی دلیل چاہئے جیسے زنا، قتل کا ثبوت، معمولی دعوے کے لئے معمولی دلیل جیسے رمضان کا چاند جس میں صرف ایک کی خبر کافی ہے۔ چونکہ یہود کا دعوے تھا کہ حضرت صدیق و فاروق رضی اللہ عنہ جیسی ہستیاں جنتی نہیں بلکہ دوزخی (معاذ اللہ) ہیں تو فرمایا گیا کہ اس مسئلہ پر معمولی دلیل کافی نہیں بلکہ برہان یعنی قوی دلیل لاؤ، قرآن مبین کا فرمان تو یہ ہے کہ یہ حضرات جنتی ہیں تم کہتے ہو کہ دوزخی ہیں۔ تم قرآن سے زیادہ قوی دلیل لاؤ جس سے ان کا غیر جنتی ہونا ثابت ہو۔ اس آیت سے روافض کو عبرت پکڑنی چاہئے کہ رب نے ان یہود سے برہان مانگی جو صحابہ کے جنتی ہونے کے انکاری تھے ان کے جنتی ہونے کے براہین موجود ہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** عقائد اور اعمال سے کوئی بھی مستغنی نہیں نبی زادہ، پیرزادہ، سید زادہ، شاہزادہ، مولوی زادہ جو بھی بے ایمان ہو جہنمی ہے اسی طرح ان میں کسی کے لئے نماز، روزہ معاف نہیں۔ ایسے عقیدے تو یہود اور نصاریٰ کے تھے جن کی یہاں تردید کردی گئی۔ **دوسرا فائدہ:** اسلام کے عقائد اور احکام پر قوی دلائل قائم ہیں۔ دیگر مذاہب ویسے ہیں اگر ہمیں اپنی کسی دلیل کی خبر نہ ہو تو ہمارا قصور ہے۔ **تیسرا فائدہ:** عقائد میں دلیل ضروری ہے کسی کو کشف والہام یا تقلید کا اختیار نہیں یہاں صرف دلیل مانگی گئی، ہاں انبیاء کرام کے دیگر احکام، کہ ان کا فرمان ہی قوی دلیل ہے۔ **چوتھا فائدہ:** ہر مدعی کو دلیل دینا ضروری ہے۔ خواہ وہ نفی کا دعویٰ کرے یا ثبوت کا، یہود و نصاریٰ نے یہاں نفی ہی کا دعویٰ کیا تھا جس پر دلیل کا مطالبہ ہوا۔ **پانچواں فائدہ:** اعمال پر ایمان مقدم ہے کہ بعض صورتوں میں بغیر عمل نجات ہو سکتی ہے لیکن بغیر ایمان نجات ناممکن اور بغیر ایمان عمل بے کار لیکن عمل بغیر ایمان نہیں اس لئے یہاں اسلام کا ذکر ہوا اور احسان کا بعد میں۔ **چھٹا فائدہ:** تمام اعضاء میں چہرہ اشرف اور افضل ہے اور ساری عبادات میں سجدہ اعلیٰ (تفسیر کبیر)۔ **ساتواں فائدہ:** نیک اعمال جب ہی مفید ہوں گے جب شریعت کے مطابق ہوں گے۔ اس واسطے فرمایا گیا وَهُوَ مُحْسِنٌ **آٹھواں فائدہ:** صحابہ کا جنتی ہونا قطعی یقینی، برہانی ہے۔ رب فرماتا ہے۔ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى (النساء: ۹۵) اب جو انہیں جنتی نہ مانے وہ قرآن کی صریحی آیت ان کے کفر کی پیش کرے۔ ان کے جنتی

ہونے کا انکار فعل یہود ہے اور انہیں دوزخی ماننے والا یہودی ہے۔ اس سے روافض عبرت پکڑیں۔ **نواں فائدہ:** جواز استحباب ثابت کرنے کے لئے بہت معمولی دلیل کافی کہ یہ مسئلہ معمولی ہے مگر کسی چیز کو حرام یا کسی کو کافر ثابت کرنے کے لئے بہت قوی دلیل درکار ہے۔ دیکھو یہود سے برہان مانگی گئی۔ اس سے وہابی لوگ عبرت پکڑیں جو ہم سے جواز استحباب کے لئے قرآن یا حدیث مانگتے ہیں اور خود بلا دلیل ہر بات کو حرام کہہ دیتے ہیں اور بزرگان دین کو جو عرس میلاد وغیرہ کے قائل ہیں انہیں مشرک قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ شرک و کفر ثابت کرنے کو بڑی برہان کی ضرورت ہے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: مسلمان یہ کہتے ہیں کہ ہمارے سوا کوئی جنتی نہیں، پھر یہود و نصاریٰ میں اور ان میں کیا فرق ہوا؟ **جواب:** اس کے تین جواب ہیں۔ ایک یہ کہ یہود و نصاریٰ اپنے کو اعمال اور صحیح عقائد سے بے نیاز مانتے تھے۔ مسلمانوں کا یہ عقیدہ نہیں، دوسرے یہ کہ ان کا یہ قول بلا دلیل ہے۔ جس کا ان کی کتابوں میں بھی ثبوت نہ تھا بلکہ ان کی کتابوں سے نبی آخر الزمان کی تشریف آوری اور ان کی امت کی نجات ثابت تھی اور مسلمانوں کے دعویٰ کا قرآن پاک سے ثبوت ہے ایک تو یہی آیت مَنْ اَسْلَمَ پکار رہی ہے۔ دوسری آیت وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ الایۃ (آل عمران: ۸۵) صاف بتا رہی ہے۔ تیسرے یہ کہ یہود و نصاریٰ نے اپنے اصلی عقائد بدل دیئے اور گھڑے ہوئے مشرکانہ عقائد کو مدار نجات سمجھ بیٹھے، مسلمان اصل قرآنی عقائد کو مدار نجات سمجھتا ہے۔ اب بھی اگر کوئی مدعی اسلام جیسے قادیانی، دیوبندی وغیرہ غلط عقائد پر نجات مانے جھوٹا ہے۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ اجر کے لئے ایمان و عمل دونوں ضروری ہیں، تو چاہئے کہ گنہگار مسلمان کبھی نجات نہ پائے۔ **جواب:** خالص اور یقینی اجر کے لئے بے شک اعمال بھی ضروری ہیں، گنہگار مسلمان کا اجر خالص ہونا یقینی نہیں۔ ممکن ہے کہ شفاعت وغیرہ سے معافی ہو جائے اور ممکن ہے کہ عذاب پا کر اجر ملے۔ نیز قیامت کے خوف و غم سے آزاد ہونے کے لئے بھی اعمال ضروری ہیں۔ گنہگاروں کو وہاں خوف بھی ہوگا اور غم بھی۔

تفسیر صوفیانہ

یہود کہتے ہیں کہ ان کی جنت یعنی جنت افعال اور جنت نفس اور عالم ملک میں وہی جائے گا جو یہودی ہو۔ اور عیسائی کہتے ہیں کہ جنت باطن یعنی جنت صفات اور جنت قلب اور عالم ملکوت میں وہی جائے گا جو عیسائی ہو۔ یہ سب ان کی خواہشات اور ان کی حدود ہیں کہ ملک و ملکوت اور نفس و قلب میں پھنس کر رب سے محجوب رہ گئے اور اس پر بھی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں اگر سچے ہیں تو پیش کریں حق یہ ہے کہ جو اپنی ذات و صفات اور عارضات کو بالکل محو کر کے ذات خالق میں فنا کر دے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ بقاء بعد فنا میں صحیح رہے کہ اپنے اعمال میں اپنے رب کا مشاہدہ کرے اور اپنے وجود حقانی سے اس کو ہر غیب شہود ہو جائے تو اس کو ملک ملکوت بلکہ اس سے بھی اعلیٰ اجر جس سے کہ یہود و نصاریٰ محروم رہ گئے ملے گا۔ اور اس کے سوا نہ تو انہیں ذات کے حجاب اور نفس کے بقاء کا خوف ہوگا اور نہ انہیں جمال یار کے غائب ہونے کا اندیشہ۔ احسان کے تین درجے

ہیں ایک احسان شرعی کہ ایسے اعمال کرنا جس پر شرعاً کوئی الزام نہ آئے۔ دوسرے احسان وصفی جس کی تفسیر یہ حدیث کرتی ہے کہ تو اللہ تعالٰی کی ایسی عبادت کر گویا کہ تو اسے دیکھتا ہے، اگر اس پر قادر نہ ہو تو ایسی کہ وہ تجھے دیکھتا ہے، تیسرے احسان ذاتی یا احسان باطنی جس کی حقیقت اس حدیث قدسی میں بیان ہوئی کہ میں اپنے ذاکر شاغل بندے کا کان، نگاہ، ہاتھ، پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا، دیکھتا، چھوتا، چلتا ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اس بندے کا جسم صفات الٰہی کا آئینہ بن جاتا ہے اب ان کے لئے خوف ہو تو کس سے اور غم ہو تو کس کا۔ وہ تو غم خوف کی چیزوں کو پہلے ہی سے اس آگ میں جلا چکے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

ہر کہ ترسد مرورا ایمن کنند ‏ ‏ ‏ مردلے ترسندہ را ساکن کنند

آنکہ خوفش نیست چوں گوئی مترس ‏ ‏ ‏ درس چہ دہی نیست او محتاج درس

(تفسیر روح البیان وابن عربی) خدایا ہم کو ان حضرات کے غلاموں میں سے بنا دے، جو مشاہدہ ذات میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو چکے)۔

وَ قَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۠ وَّ قَالَتِ
اور کہا یہود نے نہیں ہیں عیسائی اوپر کسی چیز کے اور کہا
اور یہود بولے نصرانی کچھ نہیں اور
النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّ هُمْ يَتْلُوْنَ
عیسائیوں نے نہیں ہیں یہود اوپر کسی چیز کے حالانکہ وہ تو تلاوت کرتے
نصرانی بولے کہ یہود کچھ نہیں حالانکہ وہ کتاب پڑھتے
الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ
کتاب اسی طرح انہوں نے جو کہ نہیں جانتے مثل قول ان کے
ہیں اسی طرح جاہلوں نے ان کی سی بات کہی تو
فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ
کے پس اللہ فیصلہ کرے گا درمیان ان کے دن قیامت کے بیچ اس کے
تو اللہ قیامت کے دن ان میں فیصلہ کر دے گا
يَخْتَلِفُوْنَ ﴿١١٣﴾

کہ تھے وہ بیچ اس کے اختلاف کرتے
جس بات میں جھگڑ رہے ہیں

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پہلے عیسائیوں اور یہودیوں کا متفقہ دعویٰ بیان کیا گیا ہے کہ ہر ایک صرف اپنے ہی جنتی ہونے کا دعویدار ہے۔ اب ان کے آپس کا اختلاف بیان ہو رہا ہے۔ کہ ان میں سے ہر ایک بھی دوسرے کو جہنمی سمجھتے ہیں۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں یہود و نصاریٰ کے جھوٹے ہونے کی چند وجہیں بیان کی گئیں کہ ان کے یہ دعوے بلا دلیل ہیں وغیرہ اب ان پر الزامی دلیل قائم کی جارہی ہے کہ وہ خود ایک دوسرے کو بے دین سمجھتے ہیں کس منہ سے مسلمانوں کے سامنے آتے ہیں۔ چونکہ جواب الزامی جواب تحقیقی کے بعد ہوتا ہے اس لئے اس مضمون کو پیچھے بیان کیا گیا۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ اہل کتاب قرآن و اسلام کو جھٹلاتے تھے۔ جس سے مسلمانوں کو دلی صدمہ اور روحانی رنج ہوتا تھا۔ اب رب تعالیٰ نے مسلمانوں کی تسلی کے لئے فرمایا کہ تم ان کی بکواس سے غم نہ کرو ان کی تو عادت ہی ہے۔ اگر یہ تمہیں جھٹلاتے ہیں تو آپس میں ایک دوسرے کی کب رعایت کرتے ہیں۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں رب تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ جو مسلمان اور نیکوکار ہو وہ جنتی ہے یعنے اے اہل کتاب چونکہ تم میں یہ دونوں وصف نہیں لہٰذا تم جنتی نہیں۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ وہ تم نے کہا تھا! دیکھو یہ خود اپنے منہ سے ایک دوسرے کے جہنمی ہونے کا اقرار کر کے ہماری تائید کر رہے ہیں۔

شان نزول

تفسیر عزیزی و خزائن العرفان وغیرہ نے اس جگہ وہ مناظرہ بیان کیا جس کا تذکرہ ہم پہلی آیت میں کر چکے ہیں کہ نجران کے عیسائی حضور علیہ السلام کی ملاقات کے لئے حاضر ہوئے مدینہ منورہ کے یہودی بھی انہیں دیکھنے آگئے۔ رافع ابن حرملہ یہودی عالم۔ نے عیسائیوں سے کہا کہ تم بے دین ہو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر اور انجیل کو کلام الٰہی سمجھے بیٹھے ہو حالانکہ نہ حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) پیغمبر اور نہ انجیل کتاب اللہ، تمہارا دین اصل سے ہی غلط ہے۔ نجرانیوں میں سے ایک نصرانی بولا کہ تم بے دین ہو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر اور توریت کو کتاب الٰہی مانے ہوئے ہو۔ حالانکہ نہ صرف موسیٰ علیہ السلام پیغمبر تھے اور نہ توریت آسمانی کتاب اسی پر خوب شور مچا انہوں نے ایک دوسرے کو کافر اور بیدین بتایا حضور علیہ السلام ناخوش ہوئے اور فرمایا کہ تعجب ہے کہ توریت و انجیل ایک دوسرے کی تصدیق کریں اور تم تکذیب حضور علیہ السلام کی تائید میں یہ آیت کریمہ اتری۔ ممکن ہے کہ اس واقعہ پر یہ دونوں ہی آیتیں آئی ہوں اور پہلی آیت میں تو ان کے دعوے کا اجمالی ذکر کیا گیا ہو۔ اور اس آیت میں تفصیلی، خیال رہے کہ یہود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت اور انجیل کی حقانیت کو نہ مانتے تھے مگر عیسائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبی اور توریت کو سچی کتاب مانتے تھے اس لئے یہود کا انکار تو اپنے عقیدے کی وجہ سے تھا۔ لیکن عیسائیوں کا انکار محض ضد اور ہٹ دھرمی سے ہے کہ اگر تم ہمارے نبی کو نہیں مانتے تو ہم بھی تمہارے نبی کو نہیں مانتے جیسے بعض سنی

شیعوں سے مناظرہ کرتے وقت کہہ دیں کہ اگر تم صحابہ کو نہیں مانتے تو ہم بھی اہل بیت کو نہیں مانتے، یا بعض جاہل مسلمان عیسائیوں کے مناظرہ میں کہہ دیں کہ اگر تم ہمارے نبی کو نہیں مانتے تو ہم بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نہیں مانتے۔

تفسیر

وَقَالَتِ الْيَهُودُ اس سے یا تو وہ علمائے یہود مراد ہیں جو اس مجلس میں موجود تھے۔ اور قول سے زبانی قول اور یا یہود سے عوام یہودی اور قول سے اعتقاد مراد، یعنی ان علمائے یہود نے دعویٰ کیا یا عام یہود نے یہ اعتقاد رکھا کہ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ کہ عیسائی کسی چیز پر نہیں، یا تو شیء سے مراد سچا دین مراد ہے یا عام چیز یعنی عیسائی سچے دین پر نہیں یا ان کی کوئی بات صحیح نہیں۔ اس کے جواب میں وَقَالَتِ النَّصٰرٰى عیسائی بولے یہاں بھی وہی دو احتمال ہیں کہ ان نصرانی عالموں نے یہ دعویٰ کیا یا عام عیسائیوں نے یہ عقیدہ رکھا کہ لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ یہود سچے دین پر نہیں یا یہود کی کوئی بات سچی نہیں، خیال رہے کہ یہودی نہ عیسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر مانتے ہیں اور نہ انجیل کو آسمانی کتاب اور عیسائی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ کو صحیح تو مانتے ہیں مگر کہتے ہیں ان کی نبوت اور توراۃ دونوں منسوخ ہو چکیں۔ لہٰذا یہود کا تو یہ مطلب تھا کہ عیسائیوں کی اصل بنیاد کہ انجیل ہی غلط ہے اور عیسائی یہ دعوے کرتے تھے کہ یہودیوں کی کتاب قابل عمل تھی۔ لیکن اب اس کو ماننا حماقت ہے۔ ان دونوں کا کلام تو یکساں ہے مگر مطلب جداگانہ۔ خیال رہے کہ آسمانی کتاب کا ماننا اور ہے اس پر عمل کرنا کچھ اور عیسائیوں نے کہا تھا کہ اب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کی کتاب توراۃ کا ماننا ہی غلط ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور توراۃ کوئی چیز ہی نہیں۔ اس وجہ سے ان پر یہ عذاب ہو رہا ہے، ہم مسلمان توراۃ و انجیل کو قابل عمل تو نہیں سمجھتے مگر ان کو مانتے ہیں ان پر ایمان رکھتے ہیں ان کے انکار کو کفر سمجھتے ہیں لہٰذا ہمارے عقیدے اور ان کے اس قول میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ وہ سب ہی آسمانی کتاب پڑھتے ہیں یا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں اپنی اپنی کتابوں کے ماہر ہیں کسے غلط کہا جائے یا یہ کہ وہ دونوں اس وقت اپنی اپنی کتاب پڑھ کر ایک دوسرے کو کافر کر رہے ہیں اور ہر ایک اپنی کتاب سے دلیل دے رہا ہے۔ لہٰذا چاہئے کہ ان دونوں کو سچا مان کر سب سے جدا جاؤ۔ سیدنا عبداللہ ابن عباسؓ اس آیت کو پڑھ کر فرماتے تھے کہ صَدَقُوْا وَاللّٰهِ خدا کی قسم یہ سب اس بات میں سچے ہیں کہ ان میں سے کوئی بھی ہدایت پر نہیں۔ ہدایت تو تیسرے دین یعنی اسلام میں ہے۔ یہ بدنصیب پڑھ لکھ کر بھی جاہل بن گئے کیونکہ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ایسے ہی تو ان جاہلوں نے بھی کہا تھا جو کتاب الٰہی کے جاننے والے نہیں۔ یعنی مشرکین و دیگر کفار تو ان علماء اور ان جہلاء میں کیا فرق رہا۔ مِثْلَ قَوْلِهِمْ یا تو كَذٰلِكَ کا بدل ہے اور یا قَالَ کا مفعول یعنی ان جہلاء نے انہیں کی طرح اور انہیں کی سی بات کہی، ان بے وقوف عالموں نے اپنی شان گنوا دی اور اپنے کو ان جہلاء میں داخل کر دیا بلکہ حق تو یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک خود اپنے ہی قول سے جھوٹا ہے کیونکہ یہود بھی عیسائیوں کی بعض باتوں کو سچا جانتے ہیں۔ اور عیسائی یہود کی مگر ایک دوسرے کو یہ کہتے ہیں کہ اس کی کوئی بات سچی نہیں۔ اس صورت میں ان دونوں کے درمیان تیسرا حاکم چاہئے۔ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ان کا قطعی فیصلہ قیامت میں رب تعالیٰ فرمائے گا۔ یعنی اگرچہ حضور علیہ السلام نے دنیا میں ہی صحیح فیصلہ فرما دیا۔ مگر انہوں نے وہ قبول نہ کیا۔ اب پروردگار آخرت میں ان کا ایسا فیصلہ فرمائے گا۔ جو انہیں ماننا پڑے گا فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ان ساری

باتوں کا فیصلہ ہوگا جس کے اندر یہ دنیا میں جھگڑتے تھے کہ ہر ایک کو بقدر کفر اور بحد گناہ سزا دی جائے۔

خلاصہ تفسیر

اس سے پہلے یہود و نصاریٰ کے اقوال بہت قوی دلائل سے باطل کئے گئے تھے۔ اب ایک عجیب دلیل سے اور باطل کیا جا رہا ہے کہ اے مسلمانو! تم اس کو روتے ہو کہ اہل کتاب ہمیں برا کہتے ہیں ذرا ان کی آپس کی جوتے بازی تو دیکھو کہ اہل کتاب کے بڑے بھائی تو کہتے ہیں کہ عیسائیوں کا کوئی دین مذہب ہی نہیں ان کے چند ڈھکوسلے ہیں جو ان کے پیشواؤں نے گھڑ لئے ہیں بھلا اندھیر تو دیکھو کہ توراۃ میں خدا کو ایک کہا گیا اور انہوں نے اس کے تین حصے کر ڈالے۔ باپ بیٹا اور روح القدس نہ اس سے پہلے کسی پیغمبر نے یہ کہا تھا اور نہ کسی کے وہم و گمان میں یہ بات آئی تھی اور پھر اس کو خدا کا بیٹا مانا جو بقول ان کے ہمارے ہاتھوں صلیب پر چڑھا دیا گیا۔ ستم تو دیکھو کہ گناہ یہ کریں اور ان کے عوض خدا کا بیٹا صلیب کی تکلیف برداشت کرے اور انہیں جرم و گناہ کرنے کی عام اجازت دی جائے کہ آئندہ ان کے گناہ پوپ صاحب معاف کر دیا کریں، بھلا یہ بھی کوئی مذہب ہے، عیسائی یہ کہتے ہیں کہ یہود نے پچھلے نبی کو نہ مانا اور توراۃ میں دس احکام اور کچھ رسمی قاعدوں کے سوا دھرا ہی کیا ہے۔ پولوس مقدس فرماتے ہیں کہ توراۃ ظلمت کا پردہ ہے۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام (معاذ اللہ) جلادوں کے استاد تھے ہم کو ان سے کوئی تعلق نہیں وہ رسمی مذہب بھی مسیح کے آنے سے بیکار ہو گیا (تفسیر حقانی) رب فرماتا ہے کہ بے باکیاں اور گستاخیاں انہیں پر کیا موقوف ہیں۔ ہر جاہل مذہب والے کیا کرتے ہیں۔ ہندو بھی اپنے سوا سب کو ملیچھ اور ناپاک کہتے ہیں۔ آریہ وغیرہ بھی ایسے ہی بے سری باتیں ہانکتے ہیں۔ جب یہ بھی تعصب میں اسی طرح ڈھول ڈھپا کرنے لگے تو ان علماء اور جہلاء میں کیا فرق ہے۔ اچھا ٹھہر جاؤ اب ان جھگڑوں کو ہم ہی چکائیں گے اور ان کا فیصلہ جہنم کی آگ ہی کرے گی، مگر مسلمانو! یہ باتیں سن کر اب تم کو ان کی بکواس سے برا نہ ماننا چاہئے۔ کیونکہ ان میں نفسانیت ہے حقانیت سے ان کو کوئی واسطہ نہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** کفار سے صحیح نیت سے مناظرہ کرنا باعث ثواب ہے اور جھگڑے کے ارادے اور ایک دوسرے کو ہرانے کے لئے مناظرہ برا اور طریقہ یہود و نصاریٰ کا ہے۔ پچھلی آیت میں تو مسلمانوں کو کفار سے مناظرہ کرنے کا حکم دیا گیا اور اس آیت میں ان کے آپس کے مناظرہ کی برائی بیان ہوئی بلکہ اس مناظرہ کو مسلمانوں کے لئے جواب الزامی بتایا گیا۔ لہٰذا اس زمانہ کے عام مناظروں سے پرہیز چاہئے کہ ان میں ضد اور ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ **دوسرا فائدہ:** بدنیت مناظر کبھی ایسی بات کہہ جاتا ہے کہ جو خود اس کے بھی خلاف ہوتی ہے جیسے یہاں عیسائیوں اور یہودیوں نے ایک دوسرے سے کہہ ڈالا، کہ تمہاری کوئی بات سچی نہیں۔ حالانکہ ان کے عقیدے کے بھی خلاف ہے۔ مناظرہ میں بہت سوچ سمجھ کر منہ سے بات نکالو، اگر رافضی مناظر حضرات شیخین کا انکار کر دے تو تم اس کے مقابلہ میں اہل بیت اطہار کا انکار نہ کر بیٹھو۔ **تیسرا فائدہ:** مناظرہ کے لئے حکم ہونا چاہئے کہ یہاں رب تعالیٰ نے اہل کتاب کا

مناظرہ بیان فرما کر اپنی حکومت کا ذکر فرمایا۔ **چوتھا فائدہ:** مناظر کو چاہئے کہ مقابل کی کتابوں پر نظر رکھے اور ان کے دین وغیرہ سے واقف ہو۔ دیکھو رب تعالیٰ نے مسلمانوں کو کفار کی بکواس سنا کر یاد کرائی تاکہ انہیں مناظرہ میں کام آئے۔
پانچواں فائدہ: متعصب عالم جاہل کی مثل بلکہ اس سے بدتر ہے کہ اس کے کسی قول کا اعتبار نہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: مسلمانوں کے فرقے بھی ایک دوسرے کو گمراہ اور کافر کہتے ہیں تو چاہئے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کی طرح یہ سب گمراہ ہوں اور ان میں سے کسی کا اعتبار نہ رہے یا ان سب کو سچا مان کر سب کو بے دین مانا جائے۔ (عام مرتدین)۔ **جواب:** یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کی کتاب کے منکر اور ان کے انبیاء علیہ السلام کے انکاری تھے کہ یہود تو عیسائیوں کو انجیل اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے کی وجہ سے بے دین کہتے تھے۔ ایسی باتیں کرنے والے سب بے دین ہیں لیکن ہم جو دیوبندیوں، مرزائیوں، رافضیوں وغیرہ کو گمراہ اور کافر کہتے ہیں۔ اس لئے نہیں کہ وہ قرآن کو مانتے ہیں یا ان کے پاس جو قرآن ہے وہ کتاب اللہ نہیں بلکہ اس لئے کہ انہوں نے کماحقہ، مانا نہیں اور اس کی بعض آیتوں کا در پردہ انکار کیا۔ یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کو تورات انجیل ماننے پر کافر کہتے تھے۔ اور ہم نہ ماننے پر لہٰذا فرق ہو گیا اگر ہر مناظر گمراہ ہو تو ان آیتوں میں بلکہ سارے قرآن میں مناظرہ ہی ہے۔ ہم تو یہود و نصاریٰ کو بھی اسی لئے کافر نہیں کہتے کہ وہ تورات انجیل مانتے ہیں بلکہ اس لئے کہ قرآن کو نہیں مانتے اور ہمارے نبی پر ایمان نہیں لاتے۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ دنیا کے سارے مذہب سچے ہیں۔ دیکھو یہود و نصاریٰ نے ایک دوسرے کو کافر کہا۔ تو رب تعالیٰ نے ان دونوں پر ناراضگی فرمائی۔ معلوم ہوا کسی کو کافر نہیں کہنا چاہئے۔ (عام نیچری، اور بعض مرزائی)۔ **جواب:** یہاں ناراضگی کی وجہ یہ ہے کہ ہر ایک نے جوش میں آ کر دوسرے دین کے سچے پیغمبر کا انکار کر دیا اور ان کی اصل کتاب کا انکار کر ڈالا۔ یا ان کی ہر بات کو (علی شیء) کہہ کے غلط کہہ دیا۔ حالانکہ ان میں کوئی نہ کوئی بات تو اب بھی اچھی ہے اسی لئے ہم کو حکم ہے کہ موجودہ تورات و انجیل کا بے دھڑک انکار نہ کریں بلکہ یوں کہیں کہ جو اللہ نے اتاری اسی پر ہمارا ایمان اگر سارے دین سچے ہی ہیں تو ان آیتوں کے کیا معنی ہوں اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ۔ (ال عمران:۱۹) اَلْیَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِیْنَكُمْ (مائدہ:۳) وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا۔ (ال عمران:۸۵) قُلْ یٰۤاَیُّهَا الْكٰفِرُوْنَ وغیرہ بلکہ قرآن مجید کی تعلیم ہی غلط ہو جائے گی کیونکہ اس نے اول سے آخر تک کفار کی برائی اور مسلمانوں کی تعریف فرمائی بلکہ پھر تو خنزیر حلال بھی ہو گا حرام بھی۔ ماں بہن سے نکاح کرنا جائز بھی ہو گا اور ناجائز بھی۔ کیونکہ ان چیزوں کو بعض دین حلال کہتے ہیں اور بعضے حرام اور تمام دین سچے، ابوالکلام آزاد صاحب نے بھی، ہندوؤں کو خوش کرنے کے لئے اپنی تفسیر سورۂ فاتحہ میں لکھا کہ ہر مذہب سچا ہے۔ جس میں رہ کر نیک اعمال کئے جائیں تو نجات ہو گی۔ انہوں نے ان جیسی آیات سے دھوکا کھایا اور لکھا کہ ہر اصلی مذہب اسلام ہے اور اس کا پیروکار مسلم ہے۔ جہاں کہیں فرمایا گیا اللہ کا پسندیدہ دین اسلام ہے۔ وہاں مراد ہر دین ہے۔ (نعوذ باللہ) ہر دین اسلام ہوتا تو رب کا یہ فرمان غلط ہو جاتا کہ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِیْنَ (حج:۷۸) رب نے صرف تمہارا نام مسلمان رکھا پھر حضور

ﷺ نے جہاد کن پر کیا۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ ہی فیصلہ فرمائے گا۔ دوسری جگہ فرمایا حَتّٰی یُحَکِّمُوْكَ (النساء: ۶۵) وہ آپ کو اپنا حاکم مانیں، یہاں معلوم ہوا کہ قیامت کے دن فیصلہ ہوگا۔ دوسری جگہ فرمایا لِتَحْکُمَ بَیْنَ النَّاسِ (النساء: ۱۰۵) کہ آپ ان کا دنیا میں ہی فیصلہ فرما دیں۔ ان آیتوں میں مطابقت کیونکر ہو۔ **جواب:** زبانی فیصلہ تو قرآن اور نبی ﷺ نے دنیا میں فرما دیا لیکن سزا اور جزا دے کر عملی فیصلہ قیامت میں رب تعالیٰ فرمائے گا۔ **چوتھا اعتراض:** كَذٰلِكَ اور مِثْلَ قَوْلِهِمْ کے ایک معنی ہیں۔ پھر اس آیت میں دونوں لفظ کیوں لائے گئے، ایک ہی تشبیہ کافی تھی۔ **جواب:** كَذٰلِكَ سے طریقہ گفتگو اور مِثْلَ قَوْلِهِمْ سے کلام میں تشبیہ دی گئی۔ یعنی ایسی ضد اور ہٹ دھرمی سے اسی قسم کی بیہودہ باتیں ان جہلاء نے بھی کہی تھیں۔

تفسیر صوفیانہ

ظاہر باطن کا حجاب ہے۔ ظاہر میں پھنسا ہوا آدمی باطن تک نہیں پہنچ سکتا۔ یہ عیسائی اور یہودی دوئی کی جھنجھٹ میں پڑ کر ایک دوسرے کا انکار کر بیٹھے حالانکہ ان کے پاس حجاب پھاڑنے اور اصل دکھانے والی کتاب موجود تھی۔ لہٰذا ان کتاب کے الفاظ دیکھنے والوں اور عقلی ڈھکوسلوں کے ماننے والے مشرکین میں کوئی فرق نہ رہا۔ حق تعالیٰ قیامت کبریٰ کے وقت وحدت فیصلہ فرمائے گا۔ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اپنے بندوں پر ان کے عقائد کے موافق صورت میں تجلی فرمائے گا جس سے وہ اسے پہچان لیں گے پھر دوسری صورت میں تجلی ذات ہوگی جس کے وہ منکر ہو کر گمراہ اور محجوب ہو جائیں گے قیامت میں وہی موحد کامیاب رہے گا جس نے رب کی ذات کو اپنے کسی عقیدے کی صورت میں مقید نہ مانا ہو۔ (تفسیر ابن عربی)۔ روح البیان نے فرمایا کہ ایک دوسرے کی مخالفت کرنا گمراہوں میں ہی خاص نہیں بلکہ علماء، صوفیاء، اور مشائخ میں بھی جاری ہے۔ بعض مشائخ فرماتے ہیں کہ جو بغیر نفس کو صاف کئے ہوئے مرشد بننے کا دعویٰ کرے اور اس خرقہ کو دنیا کمانے کا ذریعہ بنائے اس کا عذاب زانیہ عورت سے سخت تر ہوگا۔ کیونکہ زانیہ ناجائز بچہ پیدا کر کے اس کی زندگی برباد کرتی ہے۔ مگر یہ مدعی غلط مرید بنا کر اس کی آخرت تباہ کرتے ہیں، اسی قسم کے حجاب والے لوگوں ہی میں اختلاف ہوتا ہے، یہ سارے جھگڑے اس حجاب کے ہیں اگر یہ حجاب اٹھ جائے تو نہ اختلاف رہے۔ نہ اختلاف والے۔

کفر و اسلام کے جھگڑے تیرے چھپنے سے بڑھے ❊ تو اگر پردہ اٹھا دے تو تو ہی تو ہو جائے

مولانا فرماتے ہیں کہ ایسے لوگ اصل چھوڑ کر سایہ کے شکار میں اپنی قیمتی عمر خرچ کرتے ہیں فرماتے ہیں ۔

مرغ بر بالا پراں و سایہ اش ❊ می دود بر خاک پراں مرغ وش

ابلہے صیاد آں سایہ شود ❊ ے دود چنداں کہ بے مایہ شود

تیرا اندازد بسوئے سایہ او ❊ ترکشش خالی شود از جستجو

ترکش عمرش تہی شد عمر رفت ❊ از دویدن در شکار سایہ تفت

سایۂ یزداں چو باشد دایہ اش ❊ وارہاند از خیال و سایہ اش

طالب دنیا اپنے ترکش عمر کے سارے تیر زندگی کے دن جسم اور جسمانیات کے شکار میں صرف کر دیتا ہے اگر یہی محنت روح کے شکار پر کرتا تو بہت کامیاب رہتا۔

وَ مَنۡ اَظۡلَمُ مِمَّنۡ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنۡ یُّذۡکَرَ فِیۡهَا اسۡمُهٗ
اور کون ہے بڑا ظالم اس سے جو روکے مسجدوں اللہ کی یہ کہ ذکر کیا جائے بیچ
اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جو اللہ کی مسجدوں کو روکے ان میں نام خدا لیے جانے سے
وَ سَعٰی فِیۡ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِکَ مَا کَانَ لَهُمۡ اَنۡ یَّدۡخُلُوۡهَاۤ
اس کے نام اس کا اور کوشش کرے بیچ ویرانی اس کی کے یہ لوگ ہیں نہیں تھا واسطے ان کے
اور اس کی ویرانی میں کوشش کرے ان کو نہ پہنچتا تھا کہ مسجدوں میں جائیں
اِلَّا خَآئِفِیۡنَ ۬ؕ لَهُمۡ فِی الدُّنۡیَا خِزۡیٌ وَّ لَهُمۡ فِی الۡاٰخِرَةِ
یہ کہ داخل ہوں ان میں مگر خوف کرتے واسطے ان کے بیچ دنیا کے رسوائی ہے بیچ آخرت کے
مگر ڈرتے ہوئے ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہے اور ان کے لئے آخرت میں
عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿۱۱۴﴾
عذاب بڑا
بڑا عذاب ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ یہود اور عیسائیوں نے اللہ کی کتابوں اور اس کے نبیوں سے دشمنی کی اب فرمایا جاتا ہے کہ انہوں نے تو اللہ سے بھی دشمنی کی کہ اس کے ذکر کی مسجدوں کو ویران کرنے کی کوشش کی تو اے مسلمانو! تم کس شمار میں ہو۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں فرمایا گیا تھا کہ اے اہل کتاب جنتی وہ جس کے عقائد اور اعمال درست ہوں۔ تمہارے تو اعمال بھی خراب ہیں اور عقائد بھی پھر تم اس کے دعویدار کیسے اس کے بعد ان کے عقائد کی خرابی بتائی گئی کہ تم انبیاء کے منکر ہو اور اب ان کے اعمال کی خرابی بتائی جارہی ہے کہ تم مسجدیں گرانے والے ہو۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ اہل کتاب کے یہ اقوال مشرکین سے ملتے جلتے تھے، اب فرمایا جارہا ہے کہ ان کے اعمال بھی انہیں جیسے ہیں کہ وہ مشرکین بھی مسجدوں کے دشمن اور یہ بھی۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ ان اہل کتاب نے جوش عداوت میں ایک دوسرے کے دین کی حقانیت کا بالکل انکار کر دیا۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ ان کی عداوت اس حد تک پہنچی کہ ایک دوسرے کے عبادت خانے گرانے کے بھی در پے ہو

گئے۔ **پانچواں تعلق:** پہلے فرمایا گیا تھا کہ بے دینوں کا فیصلہ قیامت میں ہوگا۔ اب بتایا جارہا ہے کہ جن کی شرارت حد سے بڑھ جاتی ہے ان کو آخرت کے علاوہ دنیا میں بھی کچھ سزا دی جاتی ہے۔

شان نزول

اس کے شان نزول میں بہت سے قول ہیں۔ روح البیان نے فرمایا کہ عیسائیوں کے بادشاہ طیطوس نے ایک بار بنی اسرائیل (یہود) سے جنگ کی اور ان کے جوانوں کو قتل اور ان کے بچوں کو قید کیا توراۃ شریف کو جلا دیا۔ بیت المقدس کو ویران کیا، اس میں مردار ڈالے اور سور ذبح کئے، خلافت فاروقی تک بیت المقدس اسی حال میں رہا۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فتح کسریٰ کے بعد اس کو آباد کیا اور وہاں اذان و نمازیں شروع کرائیں اس کے بارے میں یہ آیت کریمہ اتری پھر بیت المقدس انگریزوں نے فتح کر لیا اور تقریباً سوا سو (۱۲۵) برس ان کے قبضہ میں رہا۔ یہاں تک کہ سلطان صلاح الدین ایوبی نے ۵۸۵ھ میں فتح فرمایا۔ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ یہ آیت بخت نصر کے بارے میں اتری، جس نے یہود کو تباہ کر کے بیت المقدس میں یہ حرکتیں کیں۔ بعض نے فرمایا کہ یہ آیت مشرکین مکہ کے بارے میں اتری جبکہ انہوں نے نبی ﷺ اور مسلمانوں کو مسجد حرام میں نماز سے روکا۔ اور حدیبیہ میں مسلمانوں کو عمرہ سے روکا یہاں تک کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے دروازے پر سے نماز پڑھنے سے بھی منع کر دیا، آخر کار ان کو وہاں سے ہجرت کرنی پڑی۔ مگر ابوبکر رازی علیہ الرحمۃ نے اپنی کتاب ''احکام القرآن'' میں اول دو واقعات کا انکار کیا کیونکہ بخت نصر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے گزرا ہے۔ اس وقت عیسائی تھے ہی کہاں؟ نیز یہ کیونکر ممکن ہے کہ بیت المقدس کو تباہ کریں جبکہ وہ خود بھی اس کی تعظیم کرتے ہیں۔ تیسرے قول پر امام رازیؒ نے اعتراض کیا کہ اس صورت میں آیتوں کا ربط ٹوٹتا ہے کہ اب تک تو یہود کی برائیاں ہو رہی تھیں اور اب مشرکین کا ذکر شروع ہو گیا اور خود انہوں نے شان نزول یہ بتائی کہ تحویل قبلہ کے بعد یہود مدینہ کعبہ معظمہ کے دشمن ہو گئے اور مسلمانوں کو ادھر منہ کر کے نماز پڑھنے سے روکنے لگے۔ اور ممکن ہے کہ انہوں نے کعبۃ اللہ یا مسجد نبوی کو ویران کرنے کی در پردہ کوشش کی ہو۔ مگر شان نزول کے لئے نقل کی ضرورت ہے اس میں شاید کافی نہیں۔ امام رازی نے اس پر کوئی روایت پیش نہ فرمائی۔ اگر یہ آیت مشرکین مکہ کے بارے میں آئی ہو تو بھی اس کا ربط نہایت درست ہے جیسا کہ ہم بیان تعلق میں بتا چکے کہ پچھلی آیت میں مشرکین کا ذکر ہو چکا ہے۔ اور اگر یہود و نصاریٰ کے بارے میں ہو تو بھی درست ہے۔ نیز ابوبکر رازی علیہ الرحمۃ کا یہ فرمانا کہ عیسائی تو خود بیت المقدس کی تعظیم کرتے ہیں وہ اسے ویران کیوں کریں گے۔ یہ بھی قوی نہیں اہل دنیا دشمن کو مغلوب کرنے میں ہر جائز ناجائز کوشش کرتے ہیں۔ ابھی جرمنی نے لندن پر حملے کئے تو صدہا گرجے گرا دیئے حالانکہ وہ خود عیسائی ہے۔ اسی طرح ممکن ہے کہ عیسائیوں نے یہودیوں کی مخالفت میں بیت المقدس کو ویران کیا ہو۔ بہر حال یہ آیت کریمہ یا تو یہود کے بارے میں آئی یا مشرکین کے۔

تفسیر

وَمَنْ اَظْلَمُ، من سوال کے لئے آتا ہے۔ لیکن یہاں استفہام انکاری نفی کے لئے ہے یعنی ان سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں۔

اظلمہ، ظلمٌ سے بنا بمعنی کسی کا حق مارنا حق دنیاوی بھی ہوتا ہے اور دینی بھی۔ پھر لوگوں کا بھی اپنے پر حق ہے اللہ رسول کا بھی کعبہ معظمہ کا مسجد وقرآن شریف کا بھی، مسجد کا ویران کرنے والا اللہ رسول کا حق مارتا ہے۔ مسلمانوں کا بھی مسجد کا بھی اور خود اپنے نفس کا بھی کیونکہ اسے چاہیے تھا کہ خود مسجد میں حاضر ہو کر نمازیں پڑھتا تا کہ اس کا نفس عذاب دوزخ سے بچتا اس لئے رب نے اسے بڑا ظالم فرمایا چور مالی ظلم کرتا ہے۔ قاتل جانی ظلم مگر یہ ایمانی ظلم کر رہا ہے۔ نیز چور قاتل شخصی ظلم کرتا ہے مگر یہ شخصی قومی ملکی اور دینی ظلم کرتا ہے۔ لہٰذا بڑا ظالم ہے مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ جو اللہ کی مسجدوں کو روکے مساجد جمع مسجد کی ہے۔ جس کے معنی ہیں سجدہ گاہ لیکن اصطلاح میں اسلامی عبادت خانے کو مسجد کہتے ہیں جیسے قرآن کریم فرماتا ہے لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ (حج: ۴۰) اگرچہ عیسائیوں کے گرجوں اور یہودیوں کے کنیسوں میں بھی سجدے ہوتے ہیں مگر انہیں قرآن نے مسجد نہ فرمایا اتنا فرق ہے کہ خاص سجدہ گاہ کو بھی مسجد جیم کی فتح سے اور پورے عبادت خانہ کو مسجد جیم کے کسرے سے کہتے ہیں اگرچہ عیسائیوں نے صرف ایک مسجد یعنی بیت المقدس کو اور مشرکین نے صرف بیت الحرام ہی کو ویران کیا مگر چونکہ ایک مسجد کو ویران کرنا گویا کہ کل کو ویران کرنا ہے۔ اس لئے یہاں مساجد اللہ کہا گیا ہے۔ جیسے ایک پیغمبر کا انکار کل کا انکار اور ایک فرشتہ کی دشمنی کل کی دشمنی یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے تو بیت المقدس اور اب بیت الحرام تمام مسجدوں کی اصل ہے۔ کیونکہ سب مسجدوں کا رخ اسی طرف ہوتا ہے لہٰذا انہیں مساجد فرمایا گیا۔ مساجد کو اللہ کی طرف نسبت کیا تا کہ مسجد ضرار وغیرہ نکل جائیں کیونکہ مسجد اللہ وہ جس پر رسول کی رجسٹری ہو جائے اسی طرح جو مسجد خلاف شرع ہو اس کے یہ احکام نہیں وہ مسجد اللہ ہی نہیں اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ یا تو یہ مساجد کا بدل ہے اور یہاں من پوشیدہ ہے۔ اور یا منع کا دوسرا مفعول جیسے وَمَا مَنَعَنَآ اَنْ نُّرْسِلَ بِالْاٰيٰتِ (الاسراء: ۵۹) اور وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا (الاسراء: ۹۴) یعنی جو اللہ کی مسجدوں کو وہاں خدا کا نام لینے سے روکے یا مسجدوں کو اس سے روکے کہ خدا کا ذکر کیا جائے۔ خیال رہے کہ یہاں بجائے نماز کے ذکر فرمایا کیونکہ ذکر اللہ میں بہت چیزیں داخل ہیں نماز اور درود شریف، تلاوت قرآن مجید، مجلس وعظ، محفل میلاد شریف، نعت خوانی، دینی تعلیم وغیرہ۔ جو شخص ان میں سے کسی چیز کو بند کرتا ہے وہ اس میں داخل ہے۔ خیال رہے کہ ذکر اللہ دو طرح کا ہے ایک بلا واسطہ اور ایک بالواسطہ اللہ کے پیاروں کا ذکر بالواسطہ خدا ہی کا ذکر ہے۔ بلکہ اس کے دشمنوں کا ذکر بھی بعض دفعہ ذکر اللہ بن جاتا ہے۔ سورہ تبت یدا میں ایک کافر ہی کا ذکر ہے مگر اس کا پڑھنے والا ذاکر کہلاتا ہے۔ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا خراب، خَرْبٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ویرانی اس کا مقابل ہے۔ (عمارۃ) آبادی یعنی جو مسجدوں کے ویران کرنے کی کوشش کرے یا تو زبان سے ہو یا قلم سے یا غلط فتوؤں سے۔ ایسے ہی ویرانی عام ہے مسجد کو گرا دینا، اذان یا جماعت کو روکنا نماز کے وقت اس میں قفل لگا دینا۔ مسلمانوں کو وہاں سے روکنا مسجد کے برابر دوسری مسجد بنا دینا تا کہ پہلی مسجد ویران ہو جائے وہاں کی زیب و زینت دور کر دینا یہ سب اس میں داخل ہیں۔ اُولٰٓئِكَ یہ دونوں قسم کے لوگ جو ذکر اللہ سے روکیں یا مسجد کی کسی قسم کی بھی ویرانی کوشش کریں۔ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ یا تو کان ماضی کے معنی میں ہے یعنے ان اہل کتاب کو خود اپنے دین کے اعتبار سے وہاں آنا جائز نہ تھا مگر اللہ سے خوف اور عاجزی کرتے ہوئے کیونکہ یہ ان کے بھی دینی مقامات ہیں یا

مستقبل کے معنی میں اور آئندہ کی خبر دی جارہی ہے کہ اے مسلمانو غم نہ کرو عنقریب وہ وقت آرہا ہے جبکہ ان مشرکین کو مسجد حرام میں آنے کی اجازت بھی نہ ہوگی مگر ڈر کر چھپ کر پس رب تعالیٰ نے اپنا وعدہ فرمایا کہ ۹ ھ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور علیہ السلام کے حکم سے اعلان فرمایا کہ آئندہ کوئی مشرک اس مسجد پاک میں داخل نہ ہو اور فاروق اعظم اور عثمان غنی رضی اللہ عنہما کے زمانہ میں ملک شام بھی عیسائیوں کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ اور بنی امیہ، بنی عباس کے زمانے میں قسطنطنیہ، رومیہ وغیرہ بھی ان کے ہاتھ سے جاتے رہے اور جزائر فرنج میں آوارہ اور پریشان رہے، یا یہ مطلب ہے کہ انہیں مناسب نہیں کہ مسجدوں میں آئیں مگر رب سے ڈرتے ہوئے یہاں کسی بری غرض سے نہ آئیں مسجدوں کو سیاسی اڈہ نہ بنائیں غرضیکہ کان یا بمعنی ماضی ہے یا بمعنی حال یعنی مستقبل اور خوف سے مراد یا اللہ کا خوف ہے، یا مسلمانوں کا خوف۔ خیال رہے کہ مومن کو ہر جگہ ہی خوف خدا چاہئے مگر بعض جگہ بعض وقتوں میں اور بعض بندوں کے سامنے زیادہ خوف خدا چاہئے ماہ رمضان شب قدر میں یونہی مسجدوں، خانہ کعبہ، مسجد نبوی میں یونہی ماں باپ کے سامنے، شیخ و دینی استاد اور نبی کے سامنے زیادہ خوف خدا چاہئے۔ ہر جگہ گناہ کر کے تو یہاں بخشوائے جاتے ہیں یہاں گناہ کر کے کہاں بخشوائیں گے۔ غرضیکہ اس آیت میں کفار کا حال سنایا جارہا ہے مگر مسلمانوں کو مساجد کا ادب سکھایا جارہا ہے۔ باادب مسجد سے لے کر آتا ہے۔ بے ادب مسجد سے کچھ دے کر اور کھو کر آتا ہے۔ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ مسجدیں ویران کرنے کا وبال یہ پڑے گا۔ کہ ان کے لئے دنیا میں رسوائی ہوگی خِزْیٌ کے لفظی معنی ہیں شکست کا پہنچنا خواہ اپنی طرف سے یا کسی اور کی طرف سے اہل کتاب اور مشرکین کو چند طریقوں سے رسوائی ہوئی۔ جنگوں میں انہوں نے شکست پائی۔ جزیئے ان پر قائم ہوئے، حجاز سے یہ نکالے گئے، اپنی زمینوں سے بے دخل ہوئے اور اس پر بس نہیں بلکہ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ان کے لئے آخرت میں بھی بڑا عذاب ہے۔ چونکہ دنیوی مصیبت آخرت کے مقابلہ میں ہیچ ہے۔ اسی لئے اسے خزی کہا اور اسے عذاب۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو تم ان کی کہاں تک شکائتیں کرو گے ان کی گمراہی کا تو یہ حال ہے کہ باوجودیکہ ان کے دین میں بھی مسجدوں کی عزت ہے۔ مگر انہوں نے جوش تعصب میں اس کا بھی لحاظ نہ کیا اور انہیں ویران کیا بتاؤ تو اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جو خدا کی مسجدوں کو خدا کے ذکر سے روکے اور ان کے ویران کرنے کی کوشش کرے جیسا کہ عیسائیوں نے بیت المقدس میں کیا اور مشرکین نے بیت الحرام میں۔ واقعی یہ بہت بڑا ظلم ہے کیونکہ بعض تو مالی ظلم کرتے ہیں اور بعضے جانی بعضے آبرو کا مگر اس میں بڑا ظالم وہ ہے جو کسی کا گھر چھین لے انہوں نے گھر پر قبضہ کیا۔ دوسرا یہ کہ کوئی تو چیز کا غاصب ہوتا ہے اور کوئی اس کے نفع کا مگر بدتر وہ شخص ہے جو مالک کا ذکر ہی نہ ہونے دے۔ تیسرے یہ کہ بعض غاصب مغصوب پر اصل ملکیت کا دعویٰ کرتے ہیں اور بعض اس کے خریدنے کا۔ مگر خبیث غاصب وہ ہے جو اصل چیز ہی کو تباہ کر دے اور مالک کا نام بھی نہ لینے دے ان کم بختوں کو چاہئے تھا کہ خود بھی ان مسجدوں میں ڈرتے جھجکتے آتے اب اس کا انجام یہ ہوگا کہ ان کے واسطے دنیا میں بھی رسوائی ہوگی اور آخرت میں بھی سخت عذاب ملے گا یا یہ کہ اس جرم کا انجام یہ ہوگا کہ مسجدیں تو پھر آباد ہو جائیں گی لیکن وہ خود وہاں سے ایسے

نکلیں گے کہ پھر ان کا داخلہ بھی دشوار ہوگا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** جو شخص مسجد کو کسی طرح ویران کرے وہ بڑا ظالم ہے اور جو اسے آباد کرے وہ بڑا ہی ثواب کا مستحق ہے۔ آبادی کی چند صورتیں ہیں۔ مسجد بنانا اس میں چٹائیوں اور تیل بتی کا انتظام کرنا، وہاں عمدہ امام مقرر کرنا جس سے جماعت ہو جائے۔ وہاں اللہ کا ذکر کرنا اس کی اعلیٰ سے اعلیٰ زینت کرنا اس کی پوری تحقیق انشاء اللہ اِنَّمَا یَعۡمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰہِ (التوبہ: ۱۸) کی بحث میں آئے گی۔ حدیث شریف میں جو مسجدوں کے زینت کی ممانعت آئی ہے اس سے یا تو فخریہ زینت مراد ہے یا ناجائز زینت جان دار کی تصویروں اور فوٹوؤں سے مسجد کو آراستہ کرنا یا محض دوسری مسجدوں کے مقابلہ کی غرض سے نہ کہ اللہ کو راضی کرنے کے لئے سجانا منع ہے اس کی تحقیق ہماری کتاب جاء الحق میں دیکھو وہ دیوبندی، وہابی جو وہاں نعت خانی اور چراغاں وغیرہ کو منع کریں اس میں داخل ہیں۔ **دوسرا فائدہ:** مسجد میں ہر طرح کا ذکر الٰہی جائز ہے۔ خواہ بلند آواز سے ہو یا آہستہ، نعت خوانی ہو یا درود خوانی، ذکر کے حلقہ کیونکہ اس آیت میں اَنۡ یُّذۡکَرَ مطلق ہے۔ جماعت اول کے وقت بلند آواز سے ذکر کرنا صرف نمازیوں کی نماز میں خلل کے اندیشہ سے منع ہے۔ جماعت اولیٰ کے بعد ہر طرح کا ذکر جائز، صحابہ کرام نے مسجدوں میں نعت خوانی کی ہے اور حضور علیہ السلام نے ہر نماز کے بعد ذکر بالجہر فرمایا اس کی بھی پوری بحث ہماری کتاب جاء الحق میں دیکھو۔ **تیسرا فائدہ:** جس چیز سے مسجد کی جماعت گھٹے وہ منع ہے کیونکہ یہ ویرانی کی کوشش ہے۔ لہٰذا وہاں بد مذہب یا سخت مزاج نرا جاہل امام رکھنا منع بد بودار چیزیں لے جانا حرام کچا لہسن پیاز کھا کر حقہ پی کر بد بودار زخم لے کر وہاں جانا ناجائز کیونکہ اس سے مسلمانوں کو ایذاء ہوگی اور وہ آنا چھوڑ دیں گے۔ **چوتھا فائدہ:** کوشش کی جائے کہ مسجد کی عمارت ہمارے اپنے مکانوں سے اعلیٰ اور بلند و بالا ہو۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ میں مسجد نبوی شریف نہایت اعلیٰ اور نفیس بنوائی۔ **پانچواں فائدہ:** مسجد کو ویران کرنے والا انشاء اللہ دنیا میں خوار و خستہ ہوگا اور اس پر غم اور خوف طاری رہے گا۔ اور آخرت کا عذاب اس کے علاوہ ہے۔ اس کا تجربہ بھی ہو چکا ہے بلکہ جن لوگوں نے مسجد کی چیزیں غصب کر کے گھر میں استعمال کیں وہ بھی آخر تباہ و برباد ہوئے۔ **مسئلہ:** سب مسجدیں اللہ ہی کی ہیں لیکن ان کے درجے مختلف، سب سے افضل مسجد بیت اللہ پھر مسجد نبوی، پھر بیت المقدس، پھر ہر شہر کی جامع مسجدیں، پھر محلہ کی مسجد، پھر گھروں کی مسجدیں، یعنی گھر میں جو جگہ نماز کے لئے صاف کر لی جاتی ہے۔ (تفسیر روح البیان)۔ درمختار وغیرہ نے ترتیب یوں بیان کی کہ سب سے افضل مسجد مکہ **معظمہ** پھر مسجد مدینہ، پھر بیت المقدس، پھر قباء، پھر ہر شہر کی پرانی مسجدیں، پھر وہاں کی بڑی مسجد، پھر اپنے گھر سے قریبی مسجد، پھر اپنے استاد کی مسجد، شامی نے اس کے علاوہ اور بھی مسجدوں کا ذکر کیا۔ **مسئلہ:** تفسیر عزیزی نے فرمایا کہ مسجدوں میں جھاڑو دینا، انہیں تھوک وغیرہ سے صاف کرنا، انہیں معطر کرنا بہت بہتر ہے بلکہ مسجد کی جھاڑو حوران بہشتی کا مہر ہے اور باقی مسائل کے لئے کتاب بہار شریعت کا مطالعہ کرو۔ **مسئلہ:** اگرچہ ہر مسجد کا ادب و احترام اور احکام شرعیہ یکساں ہیں مگر جو مسجدیں بزرگوں کے قریب میں واقع ہوں۔ ان کا

ادب واحترام بہت زیادہ ایک تو مسجد کا ادب دوسرے اس بزرگ کا ادب جو مسجد کے قریب سو رہا ہے اس لئے مسجد نبوی، مسجد قدس، مسجد کعبہ معظمہ میں عبادت کا ثواب بھی زیادہ ہے۔ اور وہاں کا احترام بھی بہت، مسجد نبوی میں نبی ﷺ آرام فرما ہیں خود کعبہ شریف ہے اور وہاں طواف کی جگہ چار سو انبیاء سو رہے ہیں۔ مسجد قدس یعنی بیت المقدس میں بہت سے نبی سو رہے ہیں بزرگوں کے شہر کی بھی تعظیم، رب نے بنی اسرائیل کو حکم دیا تھا۔ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا (البقرہ:۵۸) اس شہر کے دروازے میں سربسجود جاؤ۔ کیونکہ وہاں یعنی بیت المقدس میں انبیاء کے مزارات تھے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسجد کو ویران کرنے والا بڑا ظالم ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ (لقمان:۱۳) جس سے معلوم ہوا مشرک اور کافر بڑا ظالم ہے ان دونوں آیتوں میں مطابقت کیونکر ہو۔
جواب: ایک لحاظ سے مشرک بڑا ظالم ہے۔ دوسرے لحاظ سے مسجد کو ویران کرنے والا۔ مشرک تو اپنے نفس پر بڑا ظلم کرتا ہے کہ اسے آخرت کی نعمتوں سے محروم کرتا ہے اور مسجد کو ویران کرنے والا دوسروں کے لئے ظالم کہ انہیں ذکر اللہ سے محروم کرتا ہے لہٰذا دونوں آیتیں مطابق ہیں۔ **دوسرا اعتراض:** اسلام کا قانون ہے کہ دنیا تو عمل کی جگہ ہے اور آخرت جزاء کی تو مسجد کے ویران کرنے والے کو دنیا میں رسوائی کی سزا کیوں ملی۔ **جواب:** دنیا کی رسوائی اس کی حقیقی سزا نہیں۔ یہ تو صرف لوگوں کی عبرت کے لئے ہے۔ سزائے حقیقی تو آخرت ہی میں ہوگی۔ جیسے کہ چور کی سزا جیل خانہ ہے۔ حوالات تو اس کی ابتداء ہے۔ **تیسرا اعتراض:** مسجدوں کو اللہ کی طرف نسبت کیوں کیا گیا؟ کیا اور ساری چیزیں اللہ کی نہیں ہیں، نیز اسے اللہ کے گھر کیوں کہتے ہیں کہ وہ اس میں رہتا ہے۔ (آریہ) **جواب:** اس لئے کہ مسجدوں پر کسی بندے کی ظاہری ملکیت بھی نہیں۔ دیگر گھروں پر بندوں کی ظاہری ملکیت ہے جنہیں وہ فروخت کر سکتے ہیں۔ نیز اور گھروں میں تو دنیوی کام بھی ہوتے ہیں۔ مگر مسجدوں میں صرف اللہ ہی کے کام نماز، تلاوت قرآنی، نعت خوانی وغیرہ۔ دیکھو سارا ملک بادشاہ کا ہے۔ لیکن صرف کچہریوں، ڈاک خانوں، شفا خانوں ہی کو سرکاری عمارتیں کہا جاتا ہے۔ کیونکہ وہاں صرف سرکاری ہی کام ہوتے ہیں۔ اور ان پر کسی رعایا کا ظاہری دخل و قبضہ نہیں۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ مشرکین کو مسجد میں آنے کی اجازت نہیں۔ کیونکہ فرمایا گیا کہ یہ لوگ نہ آئیں مگر ڈرتے چھپتے۔ پھر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے کفار کا مسجد میں آنا کیوں جائز رکھا۔ **جواب:** اس کی پوری بحث تو انشاء اللہ اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ الخ (التوبہ:۲۸) کی تفسیر میں آئے گی۔ یہاں سرسری طور پر چند جواب دیئے جاتے ہیں ایک یہ کہ مَا كَانَ لَهُمْ ممانعت نہیں بلکہ خبر ہے۔ یعنی آئندہ مشرکین کو مسجد حرام میں داخلہ تو کیا آنا بھی مشکل ہوگا۔ دوسرے یہ کہ خائفین کے معنی یہ ہیں اللہ سے خوف کرتے ہوئے یعنی چاہئے تو یہ تھا کہ یہ کفار بھی مسجد میں ڈرتے ہوئے آتے لیکن یہ شرک کرتے ہوئے آئے۔ تیسرے یہ کہ خائفین میں مخلوق سے ڈر مراد ہے۔ یعنی یہ کفار مسجد میں نہ آئیں گے مگر مقدور لے کر کیونکہ مسلمان قاضی مسجدوں میں ہی فیصلے کیا کریں گے جہاں یہ مظلوم بن کر آیا کریں گے چوتھے یہ کہ جب مشرک مسلمان کی اجازت سے مسجد میں آیا تو مسلمان جب

چاہے نکال دے تو یہ بھی خوف سے ہی آنا ہوا۔ حضور ﷺ اپنے کفار مہمانوں اور دیگر سلطنت کے کافر ایلچیوں کو مسجد نبوی شریف میں ہی ٹھہراتے تھے۔ یہاں تک کہ ثمامہ بن اثال کو حالت کفر ہی میں مسجد کے ستون سے باندھا تھا۔ لہٰذا اس آیت کی یہ توجیہ کرنا ضروری ہے۔ **پانچواں اعتراض:** پھر اہلسنت اپنی مسجدوں سے قادیانی، وہابی، شیعہ وغیرہم کو کیوں روکتے ہیں۔ حالانکہ حضور انور ﷺ نے نجران کے عیسائیوں کو مسجد نبوی میں اپنی عبادت کر لینے کی اجازت دی، کسی کو مسجد میں نماز سے روکنا مسجد کو ذکر اللہ سے روکنا ہے۔ **جواب:** اس لئے روکتے ہیں کہ ان لوگوں کا ہماری مسجدوں میں آنے سے خصوصاً اپنی جماعتیں کرنے سے مسلمانوں میں فساد پھیلتا ہے۔ اور اہل مسجد کو ایذاء ہوتی ہے یہاں عبادت سے نہیں روکا جاتا بلکہ فساد سے روکا جاتا ہے۔ گندہ ذہن بدبودار منہ ولباس والے کو مسجد سے روکا جاتا ہے۔ تاکہ نمازیوں کو ایذاء نہ ہو۔ ایسے ہی گندے عقیدے اور بدمذہبوں کو روکنا بھی جائز ہے۔ کہ نمازیوں کو ایذاء نہ ہو یہ محض غلط ہے۔ کہ حضور انور ﷺ نے عیسائیوں کو مسجد نبوی میں اپنی مذہبی عبادت کی اجازت دی بلکہ ہوا یہ تھا کہ مسلمان نماز پڑھنے لگے تو انہوں نے اپنی مذہبی عبادت شروع کر دی۔ حضور ﷺ نے صحابہ کو ان کی عبادت بند کرنے کا حکم نہ دیا۔ بلکہ انہیں اپنی عبادت پوری کر لینے دی جیسے ایک بدوی مسجد میں پیشاب کرنے لگا تو صحابہ سے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اسے نہ روکو جب پیشاب کر چکا تو مسجد دھلوادی اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسجدوں میں پیشاب کرنا جائز ہے، ایسے ہی یہ ہے کیا تم مسجد میں ہندوؤں کو اجازت دو گے کہ وہ وہاں مورتیاں رکھیں اور گھنٹیاں بجایا کریں۔ (نعوذ باللہ)۔

تفسیر صوفیانہ

مسلمانوں کے دل اللہ کی مسجدیں ہیں بڑا مبارک وہ شخص ہے جو ان مسجدوں کو اس کے ذکر سے آباد رکھے اور بڑا ظالم وہ ہے جو ان میں دنیوی وسوسے پیدا کر کے انہیں اللہ کے ذکر سے خالی کر دے اور مختلف قسم کی تمناؤں سے ان کے ویران کرنے کی کوشش کرے۔ لہٰذا نفس اور شیطان بڑے ظالم ہیں کہ یہ تجلی گاہ رحمان یعنی قلوب انسان کو اس مسجد کے نمازیوں یعنی رب کے ذکر وفکر وغیرہ کو وہاں سے روکتے ہیں مگر یاد رہے کہ ایک وقت وہ بھی آئے گا جب رب تعالیٰ ان دلوں پر کسی شیخ کی برکت سے تجلی ڈالے گا تو ان چیزوں کا وہاں داخلہ بھی مشکل ہو جائے گا کہ وہاں نہ جائیں گے مگر ڈرتے ہوئے ان کے لئے دنیا میں رسوائی اور مغضوبیت ہے اور آخرت میں حق سے محجوب رہنے کا بڑا عذاب۔ (تفسیر ابن عربی)۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تین باتیں تو وطن میں ضروری ہیں اور تین چیزیں سفر میں لازم۔ وطن میں تو تلاوت قرآن، آبادی مسجد، اور مسلمانوں سے محبت کرے، سفر میں خروج فراخی میں اخلاق کی درستی اور ساتھیوں سے جائز خوش طبعی کرے مسجدیں وطن ارواح ہیں وہ بڑا ظالم ہے جو روحانی وطن کو برباد کرے۔

وَ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَ الْمَغْرِبُ ۚ فَاَیْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ
اور واسطے اللہ کے ہے پورب اور پچھم پس جہاں کہیں پھر و تم پس وہاں ہے وجہ اللہ کا
اور پورب پچھم سب اللہ ہی کا ہے تو تم جدھر منہ کرو ادھر وجہ اللہ (خدا کی رحمت تمہاری طرف

اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾
تحقیق اللہ وسعت والا علم والا ہے
متوجہ ہے) بے شک اللہ وسعت والا علم والا ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پہلے فرمایا گیا تھا کہ مسجدوں کو ویران کرنے والا اور وہاں عبادت کو روکنے والا بڑا ظالم ہے۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ وہ ظالم خیال رکھے کہ مسجدیں ویران کرنے سے خدا کا ذکر بند نہ ہو جائے گا۔ اللہ کی سلطنت تو مشرق و مغرب میں ہے۔ جدھر نظر اٹھا کر دیکھو وہاں اس کی عبادت ہو رہی ہے یہ بے دین کہاں کہاں سے اس کا ذکر روکیں گے۔ **دوسرا تعلق:** پہلے فرمایا گیا تھا کہ کفار مسلمانوں کو مسجدوں میں اللہ اللہ کرنے سے روکتے ہیں۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ اے مسلمانوں اگر تم مسجدوں میں نہ جا سکو تو خدا کا ذکر نہ چھوڑو۔ پورب پچھم اللہ کا ہے جہاں بھی بیٹھ کر اللہ اللہ کرو گے وہاں اس کو پالو گے مسجد پر ہی عبادت موقوف نہیں۔ **تیسرا تعلق:** پہلے فرمایا گیا تھا کہ کفار آئندہ مسجدوں میں ڈرتے ہوئے آئیں گے۔ یعنی مسلمانوں کا غلبہ ہوگا۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ اے مسلمانوں صرف مسجدوں پر ہی تمہارا قبضہ نہ ہوگا بلکہ سارا مشرق و مغرب اللہ کا ہے۔ تم جدھر بھی جہاد کرتے ہوئے پہنچ جاؤ گے ادھر ہی رب کی نصرت پاؤ گے اور مشرق و مغرب کے بادشاہ کہلاؤ گے گویا پہلے کفار کی مغلوبیت کا ذکر تھا اور اب مسلمانوں کے غلبہ کا۔ **چوتھا تعلق:** پہلے تو کفار کے جرم کا ذکر ہوا اب ان کی سزاء کا تذکرہ ہو رہا ہے کہ اے کافرو ابھی ہم نے تم کو مہلت دے رکھی ہے۔ جب ہماری پکڑ میں آؤ گے تو کہیں پناہ نہ پاؤ گے، کیونکہ مشرق و مغرب اللہ کا ہے جدھر جاؤ گے اللہ کا عذاب پاؤ گے۔

شان نزول

اس آیت کے شان نزول میں بہت سے قول ہیں ایک یہ ہے کہ ایک بار صحابہ کرام رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اندھیری رات میں سفر کر رہے تھے۔ قبلہ کا رخ معلوم نہ ہو سکا۔ جس کا جدھر دل جما اس نے ادھر ہی نماز پڑھ لی۔ صبح کو یہ واقعہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا گیا۔ تب یہ آیت کریمہ اتری جس نے بتایا کہ سب کی نمازیں ہوگئیں۔ دوسرا یہ کہ یہ آیت مسافر کے بارے میں اتری کہ وہ بحالت سفر سواری پر نفل ادا کر سکتا ہے۔ خواہ اس کی سواری کا رخ کدھر ہی ہو جائے اس کے نفل درست ہیں تیسرا قول یہ ہے کہ ایک بار حضور علیہ السلام سے عرض کیا گیا کہ دعا کدھر منہ کر کے مانگیں کیا نماز کی طرح اس کا بھی کوئی قبلہ ہے۔ تب یہ آیت اتری جس میں بتایا گیا کہ دعا کے لئے کوئی جہت لازم نہیں اللہ کی رحمت ہر طرف ہے۔ چوتھا قول یہ ہے کہ یہ آیت نماز خوف کے بارے میں آئی کہ جنگ کی حالت میں سخت خوف کے وقت جس طرف بھی نماز پڑھ لیں ہو جائے گی۔ پانچواں قول یہ ہے کہ قبلہ بدلنے پر یہود نے مسلمانوں پر طعنہ کیا کہ تمہارا عجیب دین ہے جس کا کوئی قبلہ ہی مقرر

نہیں کبھی بیت المقدس اور کبھی کعبہ معظمہ اس پر یہ اتری جس میں فرمایا گیا کہ اہل کتاب تو سمت کے تابع ہیں اور اے مسلمانوں تم اللہ کے حکم کے۔ چھٹا قول یہ ہے کہ ایک زمانہ میں مسلمانوں کو اختیار تھا کہ کدھر چاہیں ادھر ہی منہ کر کے نماز پڑھیں بیت المقدس یا خانہ کعبہ اس وقت کی یہ آیت ہے۔ (تفسیر کبیر و احکام القرآن و خزائن العرفان لہٰذا یہ آیت یا منسوخ ہے یا ناسخ اور یا اپنے حال پر باقی۔

تفسیر

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ۔ لِلّٰهِ میں لام ملکیت کا ہے یعنی اللہ کی ملک ہیں۔ مشرق شرق کا ظرف ہے۔ جس کے معنی ہیں چمکنا وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا (الزمر: ۶۹) پورب کو اس لئے مشرق کہتے ہیں کہ اس طرف سے سورج اور تمام تارے چمکتے اور طلوع کرتے ہیں۔ مغرب غوبٌ کا ظرف ہے۔ جس کے معنی ہیں ڈوب جانا اس لئے بڑے ڈول کو غرب کہتے ہیں کہ اسے پانی میں ڈبویا جاتا ہے اور بہت ممکن ہے کہ مسافر اور انوکھی چیز کو بھی اس لئے غریب کہا جاتا ہے کہ وہ ڈوبے ہوئے کی طرح لوگوں کی نظر وغیرہ سے چھپے رہتے ہیں۔ خیال رہے کہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ صرف پورب پچھم اللہ کا ہے۔ اور جنوب شمال کسی اور کا بلکہ اس سے سارا عالم اجساد مراد ہے۔ کیونکہ مشرق و مغرب کے دو کنارے بول کر پوری چیز مراد لی جاتی ہے۔ جیسے کہ فلاں کو سر سے پاؤں تک پسینہ آ گیا یعنی سارے جسم پر مطلب یہ ہوا کہ پورب پچھم یعنی سارا عالم اللہ کا ہے۔ لہٰذا اگر کفار تم کو مسجدوں میں اللہ کا ذکر نہ کرنے دیں۔ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا جدھر بھی تم رخ کر لو اَيْنَمَا این ظرفیہ اور ما تنکیریہ سے بنا ہے اَيْنَ کے معنیٰ ہیں جگہ اور مَا کے معنی ہیں جونسی یا جس تُوَلُّوْا وَلْیٌ سے بنا ہے۔ جس کے معنی قرب کے ہیں تَوَلِّی کے معنی منہ کرنا بھی ہے اور پیٹھ پھیرنا بھی ہے۔ یعنی قرب اور سلب۔ یہاں دونوں معنی بن سکتے ہیں۔ یعنی جدھر منہ کر لو یا مسجد سے پیٹھ پھیر کر جدھر جا کر نماز پڑھو۔ یعنی تم دعا یا نماز میں جدھر منہ کر لو۔ فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ادھر ہی اللہ کی توجہ ہے، ثم اور ھناک دونوں ظرف مکان ہیں۔ ھنا قریب جگہ کو بولتے ہیں اور ثم دور کو کہتے ہیں جیسے اردو میں یہاں اور وہاں مگر اس جگہ ثم ھنا کے معنی میں ہے (روح البیان)۔ وجہ کے چند معنی ہیں چہرہ ذات جیسے اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ (انعام: ۷۹) اور مرضی جسے اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ (الدھر: ۹) اور كُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ (القصص: ۸۸) ان دونوں آیتوں میں وجہ رضا کے معنی میں ہے اور جہت، سمت یہاں چاروں معنی بن سکتے ہیں۔ اگر چہرہ مراد ہو تو اس کی اضافت اللہ کی طرف تشریفی ہوگی۔ جیسی ناقۃ اللہ و بیت اللہ یعنی ادھر ادھر اللہ کا پیدا کیا ہوا چہرہ ہے۔ (تفسیر کبیر)۔ تو گویا کہ اللہ کے مقبول بندوں کے چہروں کو وجہ اللہ کہا گیا۔ یعنی جدھر بھی منہ کر لو گے ادھر ہی مقبولان خدا خصوصاً نبی کریم ﷺ کا چہرہ پاک پھرا ہے۔ تم ہر طرف ان کی سنت کو پاؤ گے کیونکہ انہوں نے سفر اور خوف کی حالت میں ہر طرف ہی نماز پڑھی ہے اور اگر ذات مراد ہو تو اس سے رب کا علم اور رحمت مقصود ہوگی یعنی جدھر بھی منہ کر لو گے ادھر ہی اس کی رحمت پاؤ گے اور اگر رضاء ہو تو معنی ظاہر ہیں کہ ہر طرف اللہ کی رضا ہے اور اگر جہت اور سمت مراد ہو تو یہ معنی ہوں گے کہ تم جدھر بھی منہ کر لو گے۔ وہی اللہ کی پسندیدہ جہت ہے۔ تفسیر کبیر نے فرمایا کہ وجہ کے معنی قصد اور نیت کے بھی ہیں۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے۔

اَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ ذَنْباً لَسْتُ اُحْصِيْهِ　　　رَبَّ الْعِبَادِ اِلَيْهِ الْوَجْهُ وَالْعَمَلُ

بمعنی قصد اب معنی یہ ہوئے کہ تم جدھر منہ کرو گے ادھر ہی اللہ کا ارادہ ہے۔ غرضیکہ ہر طرف اللہ ہی اللہ ہے اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ لفظ واسع یا سَعَةٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں لامحدود و فراخی۔ خواہ مکان کے لحاظ سے ہو یا حالت کے یا فعل کے لحاظ سے حق تعالیٰ کا نام واسع بھی ہے۔ جس کے معنی ہیں کہ اس کا علم اس کی ملکیت، اس کی قدرت اس کا خلق، تمام عالم کو گھیرے ہوئے مگر خود لامحدود جیسے فرمایا وَرَحْمَتِىْ وَسِعَتْ كُلَّ شَىْءٍ (الاعراف:۱۵۶) اور فرمایا وَسِعَ رَبِّىْ كُلَّ شَىْءٍ عِلْمًا (الانعام:۸۰) عَلِيْمٌ یہ گویا واسع ہی کا بیان ہے۔ یعنی اس کی سلطنت سب کو گھیرے ہوئے ہے اور پھر وہ کسی سے بے خبر نہیں بلکہ سب کو جانتا ہے۔ علیم میں بشارت بھی ہے اور ڈرانا بھی کہ مسلمانوں کو چاہئے کہ بقدر طاقت نیکیاں کئے جائیں۔

خلاصہ تفسیر

اس آیت کی تفسیریں شان نزول اور تعلقات کے لحاظ سے بہت ہیں یا یہ کہ اے مسلمانو اگر مشرکین تم کو مسجدوں میں اللہ کا ذکر سے منع کرتے ہیں تو تم اس کی پرواہ نہ کرو نہ تو اس سے اللہ کا ذکر رک سکتا ہے اور نہ تمہاری نمازیں کیونکہ اس کی عبادت صرف مسجدوں کی چار دیواری میں ہی محدود نہیں بلکہ سارا مشرق و مغرب اسی کا ہے اور سارے عالم میں اسی کی سلطنت ہے تم جہاں کہیں بھی موقعہ پا کر نماز پڑھ لو گے ادھر ہی اللہ کی رحمت اور اس کی قبولیت ہوگی کیونکہ اللہ بڑی وسیع مملکت والا بڑے علم والا ہے۔ یا اے مسلمانو! تم بحالت خوف جب جہاد میں ڈرتے ہوئے نماز پڑھو تو جدھر بھی منہ کر لو گے ادھر ہی اللہ کی رحمت ہے اس آخری صورت میں یہ آیت فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ (بقرہ:۱۴۴) سے منسوخ ہے یا اے لوگو تم جدھر منہ اٹھا کر دیکھو وہاں اللہ کی معبودیت ہے ہر جگہ اس کی عبادت ہو رہی ہے۔ لہٰذا تم بھی اس کی عبادت کرو یا اے صحابہ کرام تم جدھر بھی جہاد کے لئے جاؤ گے ادھر ہی اللہ کی رحمت اس کی فتح و نصرت پاؤ گے۔ یا اے کافرو تم جدھر بھی بھاگ کر جاؤ گے ادھر ہی اللہ کی ذات ہے۔ یعنی اس کے غضب و عذاب سے کہیں امان نہ پاؤ گے۔ خیال رہے کہ وسعتیں بہت سی ہیں۔ ۱۔ وسعت علمی۔ ۲۔ وسعت احسانی کہ اس کا علم اور اس کی نعمتیں ہر چیز پر حاوی ہیں۔ بعض مخلوقات کو کچھ وسعتیں خاص ملی ہیں لیکن مطلق وسعت والا رب ہی ہے۔ اگر اس کے علم کو دیکھو تو وہ ایک دریا ناپیدا کنار ہے۔ اگر اس کے احسانات پر نظر کرو تو وہ بے حد و بے شمار ہے۔ اگر اس کی قدرتوں میں غور کرو تو وہ اندازے سے باہر لہٰذا کہنا پڑے گا کہ وہی حقیقی واسع ہے اور وہی حقیقی علم والا ہے۔ یا واسع بمعنی وسعت و گنجائش والا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے امت مصطفوی کو بہت وسعتیں اور گنجائش دینے والا ہے۔ چنانچہ اسلام میں رب نے بہت سی وسعتیں دی ہیں ہر جگہ نماز درست ہے۔ پانی نہ ملے تو مٹی سے تیمم جائز ہے ناپاک چیزوں کو پاک کرنے کے لئے بہت آسان طریقے مقرر ہیں۔ [illegible] پاک ہو سکتا ہے جنب کے لئے بہت سہولتیں دے دیں۔ زکوٰۃ صرف چالیسواں حصہ ہے۔ صوفیائے کرام کے نزدیک واسع کا مطلب یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے انسان کو عقل دی جو محدود ہے۔ عشق بخشا جو لامحدود ہے۔ پھر دنیا کو محدود بنایا آخرت کو غیر محدود۔ عقل محدود سے دنیا محدود کو جانو اور عشق غیر محدود سے غیر محدود آخرت کو پہچانو۔ رب نے اپنے محبوب کو غیر فانی لامحدود صفات بخشے۔ حضور ﷺ کو عقل سے نہ پرکھو عشق

سے معلوم کرو۔ سمندر کا پانی، ہوا اور سورج کی روشنی کسی ترازو سے نہیں تل سکتی یونہی حضور ﷺ کے فضائل عقل کی ترازو سے مت تولو۔ عقلی، اطاعتوں کا بدلہ جنت اور وہاں کی نعمتیں ہیں مگر عشق کا عوض دیدار الٰہی ہے۔ رب تعالیٰ اپنے محبوب کو وسعتیں دینے والا ہے۔ عاشقوں کے عشق میں وسعتیں بخشنے والا اور جانتا ہے کون کس وسعت کے لائق ہے۔

فائدے

اس آیت اور اس کی تفاسیر سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** پہلی امتوں کی نمازیں عبادت خانوں کے سوا کہیں نہ ہو سکتی تھیں۔ اسلام میں مسلمانوں کے لئے ساری زمین مسجد ہے اگر کسی جگہ نماز کی ممانعت ہو گی تو کسی عارضے کی وجہ سے جیسے کہ قبرستان مذبح خانہ اور حمام وغیرہ۔ **دوسرا فائدہ:** اگر کسی کو سمت قبلہ نہ معلوم ہو سکے تو جدھر دل گواہی دے ادھر ہی نماز پڑھ لے۔ **تیسرا فائدہ:** سفر میں نوافل اور خوف میں ہر نماز اور خانہ کعبہ اور مکہ معظمہ کے نظر والے ملک میں جس طرف رخ کر کے پڑھ لی جائے جائز ہے۔ **چوتھا فائدہ:** دعا کے واسطے کوئی سمت لازم نہیں امام کو بھی چاہئے کہ اکثر داہنی طرف رخ کر کے دعا مانگے کیونکہ سنت ہے مگر کبھی کبھی اور سمت رخ کر کے بھی دعا مانگا کرے۔ **پانچواں فائدہ:** نیکی سے روکنا سخت گناہ ہے۔ کسی کے روکنے سے نیک کام تو نہ رکے گا مگر خود روکنے والے پر وبال پڑے گا۔ **چھٹا فائدہ:** اگر مسلمان ایمان کا ہتھیار لے کر جہاد کریں تو ہر جگہ فتح و نصرت ان کے ساتھ ہوں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اگر ہر طرف اللہ کی رحمت ہے تو مسلمان نماز میں کعبہ کی طرف کیوں منہ کرتے ہیں؟ چاہئے کہ ہر طرف نماز پڑھ لیا کریں۔ (ستیارتھ پرکاش)۔ **جواب:** تاکہ مسلم قوم میں اجتماعی شان پیدا ہو اسی لئے نماز، روزے، حج وغیرہ کے لے وقت مقرر کر دیئے گئے اور مسجدوں میں حاضری کا حکم دیا گیا۔ نیز سمت مقرر ہونے سے دل میں سکون رہتا ہے۔ اسی لئے نمازی کی نظر بھی ایک جگہ رہنی چاہئے۔ ہر طرف دیکھنے سے دل بٹتا ہے نیز اس میں رب کی شان قہاری نظر آتی ہے کہ اس نے کروڑوں انسانوں کو ایک رخ پر جمع فرما دیا اور چونکہ خود کعبہ کو سجدہ کرنا مقصود نہیں لہٰذا بعض صورتوں میں ہر طرح نماز جائز کر دی گئی۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ نماز میں کعبہ کو منہ کرنا فرض نہیں زیادہ سے زیادہ مستحب ہوگا۔ **جواب:** شان نزول اور تعلق میں اس کے جوابات تفصیل وار گزر گئے کہ یا تو یہ آیت دعا کے لئے ہے۔ اور یا مسافر اور خائف کے لئے اور یا کفار کو ڈرانے یا مسلمانوں کو خوش کرنے کے لئے ہے اور اگر اختیار دینے کے لئے ہے تو اس آیت سے منسوخ ہے۔ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهٗ (بقرہ: ۱۴۴) وغیرہ۔ **تیسرا فائدہ:** جب دعا کے لئے کوئی سمت مقرر نہیں تو مسلمان آسمان کی طرف ہاتھ کیوں اٹھاتے ہیں کیا وہاں خدا رہتا ہے؟ **جواب:** چند وجہ سے ایک یہ کہ سنت انبیاء ہے ان کی اطاعت سے دعا زیادہ قبول ہو گی دوسرے یہ کہ آسمان تمام نعمتوں کا خزانہ ہے وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ (الذاریات: ۲۲) تو اس طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ مولیٰ تو ہمیں یہاں سے نعمتیں جیسے شاہی نوکر خزانہ پر جمع ہوتے ہیں اور وہاں سے ہاتھ پھیلا کر تنخواہیں لیتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ ہم کو بڑی بری نعمتیں آسمان ہی سے ملتی ہیں۔ بارش، دھوپ موسموں

کا تبادلہ، تندرستی اور بیماری آسمانی اثرات سے ہوتی ہے۔ تو چونکہ اس طرف سے نعمتیں لینے کی عادت پڑ چکی اس لئے ادھر ہی سے مانگتے ہیں۔ **نکتہ:** کعبہ قبلہ نماز ہے اور آسمان قبلہ دعاء اور بیت المعمور قبلہ ملائکہ اور کرسی قبلہ کروبین اور عرش قبلہ حاملین۔ عرش اور ذات رسول اللہ ﷺ قبلہ قلب اور کعبہ روح ہے۔ جس کے طفیل یہ سارے قبیلے پیدا ہوئے۔ اسی لئے صدیق اکبرؓ نے عین نماز پڑھانے کی حالت میں جب سرکار ﷺ کو تشریف لاتے ہوئے دیکھا تو خود مقتدی بن گئے اور اسی وقت سے حضور علیہ السلام امام کیونکہ قبلہ کو پیٹھ کر کے نماز نہیں ہوتی اور اسی لئے مسجد نبوی شریف میں صف کی بائیں جانب دائیں طرف سے افضل ہے کیونکہ ادھر روضہ مطہرہ ہے جیسے کہ دل سے جسم کی بقاء ہے اور دل بائیں پہلو میں ہے۔ ایسے ہی حضور سے نماز کی بقاء ہے اسی لئے وہ مسجد کے بائیں طرف آرام فرما ہیں ۔

اے جوش دل گر ان کو یہ سجدہ روا نہیں اچھا وہ سجدہ کیجئے کہ سر کو خبر نہ ہو

وہ نماز قبول ہے جس میں سر کعبہ کی طرف ہو اور دل مصطفیٰ ﷺ کی طرف۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا بھی جسم ہے کیونکہ اس کے لئے چہرہ بھی ثابت کیا گیا اور وسعت بھی۔ **جواب:** اس کا جواب ان دو لفظوں کی تفسیر میں گزر گیا ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ خدا کے جسم سے پاک ہونے کی یہ دلیل ہے کہ حضور ﷺ نے عرش پر پہنچ کر بھی فرمایا اَنۡتَ اور یونس علیہ السلام نے مچھلی کے پیٹ میں رہ کر فرمایا لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنۡتَ نیز ہر مخلوق دریا، خشکی ہوا وغیرہ ہر جگہ سے اسے انت ہی سے خطاب کرتے ہیں اگر جسم ہوتا تو کسی جگہ سے ہوتا اور ہر جگہ سے اس کو خطاب نہ ہوتا۔ (روح البیان)۔

تفسیر صوفیانہ

شریعت مشرق ہے اور طریقت مغرب ظاہر مشرق ہے اور باطن مغرب، نور مشرق ہے اور ظہور مغرب۔ شریعت میں رہ کر ظاہری عبادت کرو، سر سے سجدے کرو یا طریقت میں آکر قلبی سجدے گزارو غرض کسی طرف جاؤ رب کو پاؤ گے۔ شریعت اور ظاہر بھی اس لئے ہیں اور طریقت اور ظلمت اور ظہور بھی اس لئے نیز زاہدین حرم کے میدان میں کعبہ کی دیوار کے سایہ میں نماز شریعت پڑھتے ہیں مگر عاشقین کربلا کے میدان میں تلواروں کے سائے کے نیچے نماز عشق ادا کرتے ہیں مگر جہاں جاؤ رب کو پاؤ گے لیکن خیال رہے کہ جب عشق کی وادی سینا میں قدم رکھو تو طبیعت اور نفس کے جوتے اتار دو تا کہ اَنَا اخۡتَرۡتُكَ کا خطاب پاؤ۔

دوسری تفسیر صوفیانہ

اے جماعت صحابہ تمہاری مشرق و مغرب یعنی پیدائش و ذات اللہ کے لئے ہے تو اے صحابہ جدھر تم منہ کرو گے ادھر ہی اللہ کی رحمت ہے اس آیت کی تفسیر وہ آیت ہے فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ مَاۤ اٰمَنۡتُمۡ بِهٖ فَقَدِ اهۡتَدَوۡا (بقرہ: ۱۳۷) اور وہ حدیث ہے کہ میری امت کے ۷۳ فرقے ہوں گے ایک جنتی باقی دوزخی۔ جنتی فرقہ وہ ہے جو میرے صحابہ کے طریقے پر ہو جو صحابہ کو چھوڑ کر کلمہ، قرآن نماز پڑھے، حج کرے وہ مردود ہے کیونکہ مقبولیت تو صحابہ کے ساتھ ہے دیکھو جب حضور انور اور صحابہ مکہ معظمہ سے ہجرت کر گئے تو مسلمانوں کو بلا عذر مکہ میں رہنا حرام ہو گیا حالانکہ مکہ میں بیت اللہ وغیرہ سب کچھ تھا اور صلح

حدیبیہ کے موقع پر جب عثمان غنی صلح کا پیغام لے کر مکہ معظمہ گئے تو کفار نے آپ سے کہا کہ آپ کے لئے کعبہ حاضر ہے۔ طواف وسعی وعمرہ کرلیں حضرت عثمان نے فرمایا کہ بغیر حضور ﷺ کے کعبہ ویران ہے میں عمرہ نہیں کر سکتا جبکہ حضور ﷺ موجود نہ ہوں کعبہ جسم طواف، کعبہ دل یعنی حضور مصطفیٰ ﷺ کے ساتھ کروں گا۔ لہٰذا جس مذہب میں صحابہ رضی اللہ عنہم ہوں۔ وہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے جہاں صحابہ کی قبریں ہوں وہاں اللہ کی رحمتیں ہیں۔

وَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ
اور کہا انہوں نے بنایا اللہ نے بچہ پاکی ہے اس کو بلکہ واسطے اس کے ہے جو بیچ آسمانوں
اور بولے خدا نے اپنی اولاد رکھی پاکی ہے اسے بلکہ اس کی ملک ہے جو کچھ آسمانوں اور
وَ الْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۝۱۱۶ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ؕ
اور زمین کے ہے سب واسطے اس کے اطاعت کرنیوالے ہیں ایجاد کرنے والا آسمانوں اور زمین کا
زمین میں ہے سب اس کے حضور گردن ڈالے ہیں نیا پیدا کرنے والا آسمانوں اور زمین کا
وَ اِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝۱۱۷
اور جب فیصلہ کردے کسی بات کا پس اس کے سوا نہیں کہتا ہے واسطے اس کے ہوجا پس وہ ہوجاتی ہے
اور جب کسی بات کا حکم فرمادے تو اس سے یہی فرماتا ہے کہ ہوجا وہ فوراً ہوجاتی ہے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں بتایا گیا کہ کفار مسلمانوں کو مسجدوں میں اللہ کا ذکر کرنے سے روکتے تھے۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ خود بھی اس کا ذکر نہیں کرتے بلکہ اسے گالیاں دیتے ہیں۔ یعنی ان مسلمانوں کو روکنا اپنی عبادت کے لئے نہیں ہے بلکہ خباثت نفس سے ہے۔ **دوسرا تعلق:** پہلے فرمایا گیا تھا کہ کفار مسجدوں کے دشمن ہیں۔ اب بتایا جارہا ہے کہ وہ خود خدا کے بھی دشمن ہیں کہ اس میں عیب نکالتے ہیں۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں فرمایا گیا تھا کہ سارے جہان کا اللہ ہی مالک ہے۔ اور یہ ایسی کھلی ہوئی بات تھی جس کا بے وقوف بھی انکار نہیں کرسکتا اب فرمایا جارہا ہے ان بے وقوفوں نے اس قدر صاف مسئلہ کا بھی انکار کردیا کہ رب کے لئے اولاد مانی اور ظاہر ہے کہ اولاد والا ساری چیزوں کا مالک نہیں ہوسکتا جیسا کہ انشاء اللہ تفسیر میں معلوم ہوگا۔

شان نزول

یہود نے حضرت عزیر علیہ السلام کو اور عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا مانا اور مشرکین عرب نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں بتایا کیونکہ یہ سب خدائی کام کرتے ہیں اور کسی کو نظر نہیں آتے لہٰذا وہ اس کی بیٹیاں ہیں ان سب کی تردید میں یہ

آیت کریمہ اتری۔

تفسیر

وَقَالُوا اس کا فاعل یہود، نصاریٰ، مشرکین سب ہیں۔ چونکہ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ (بقرہ:۱۱۴) میں ان سب کی طرف اشارہ ہو چکا ہے لہٰذا ان سب کی طرف ضمیر کا لوٹنا صحیح ہو گیا۔ اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا اتخاذ کے دو معنی ہیں ایک مشقت یعنی اختیار کرنا دوسرے تصویر یعنی بنانا پہلے معنی میں اس کا ایک ہی مفعول ہوتا ہے، اور دوسرے معنی میں دو اگر یہاں پہلے معنی مراد ہوں تو مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے اپنے لئے کچھ اختیار کیا اور اگر دوسرے معنی مراد ہوں تو اس کا پہلا مفعول پوشیدہ ہوگا یعنی اللہ نے اپنی بعض مخلوقات کو اپنا (متبنی) منہ بولا بیٹا بنایا اور یہ دونوں باتیں رب کے حق میں گالی ہیں۔ اگرچہ ہمارے واسطے درست جیسا کہ مفعول ہونا عورتوں کے لئے عیب نہیں مگر مردوں کے حق میں گالی ہے۔ اہل کتاب نے تو اس کے لئے بیٹا مانا تھا اور مشرکین نے بیٹی۔ اس لئے ولداً فرمایا جو کہ دونوں کو شامل ہے یعنی بچہ۔ ولد مصدر ہے جس کے معنی ہیں جننا۔ مگر یہاں مولود کے معنی میں ہے۔ اپنے متبنی کو بھی مجازاً ولد کہہ دیتے ہیں جیسے اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا (یوسف:۲۱) مجازاً پیداوار کو بھی کہہ دیا جاتا ہے جیسے اَلْاَرْضُ تَلِدُ الزَّعفرانَ زمین زعفران جنتی ہے نیز تربیت دینے اور پرورش کرنے کو بھی تولید کہہ دیتے ہیں۔ اس معنی سے رب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو فرمایا تھا کہ اَنَا وَلَدْتُکَ میں نے تمہاری پرورش کی بے وقوف عیسائیوں نے انہیں ولد یعنی خدا کا بیٹا سمجھ لیا نیز اس زمانہ میں رب کو باپ اور پیاری مخلوق کو اولاد کہا کرتے تھے۔ یہودیوں نے ان لفظوں کو غلط معنی میں استعمال کرنا شروع کر دیا اور کہا نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ یہاں قالوا سے مراد تو قائل ہونا اور معتقد ہونا ہے یا زبان سے کہنا ہے۔ قالوا فرما کر اشارۃً کہا گیا ہے کہ اس عقیدے اور قول کے وہ لوگ خود ذمہ دار ہیں۔ انہوں نے یہ اپنی طرف سے کہا ہے نہ تو ان سے ہم نے فرمایا نہ ہی ہمارے نبیوں نے نہ ہماری کتابوں نہ ان سچے دینوں کے سچے مومنین نے رب تعالیٰ نے ان سب کی چند طرح تردید فرمائی اول یہ کہ سُبْحٰنَهٗ اس کے لئے پاکی ہے سبحان سَبْحٌ سے بنا ہے جس کے لغوی معنی ہیں تیرنا اور دور ہونا كُلٌّ فِىْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (یٰس:۴۰) اصطلاح میں ہر عیب سے پاک ہونے کو بولتے ہیں کیونکہ پاک ذات ہم جیسوں کے وہم و گمان سے دور ہے اسی سے تسبیح بنا جس کے معنی ہیں رب کو پاک جاننا۔ خیال رہے کہ چونکہ سبحان میں ہر عیب سے کامل پاکی مراد ہے۔ اس لئے کسی مخلوق کے واسطے یہ لفظ نہیں بولا جا سکتا بخلاف حمد و تکبیر کے کہ اسے مخلوقات بھی آپس میں استعمال کر لیتی ہیں۔ (تفسیر عزیزی)۔ سبحان میں یہ فرمایا کہ الوہیت باپ ہونے کے خلاف ہے اور رب اب نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ بیٹا باپ کی جنس سے ہوتا ہے۔ رب جنسیت سے پاک ہے نیز بیٹا مجبوراً اختیار کیا جاتا ہے اور رب مجبوری سے بھی پاک ہے۔ نیز بیٹا باپ کا جز ہوتا ہے رب اس سے بھی پاک ہے۔ نیز بیٹے کے لئے رب کی بیوی ماننا پڑے گا اور رب بیوی سے پاک ہے۔ نیز ضروری ہے کہ بیوی شوہر کا کفو یعنی مثل ہو۔ رب مثلیت سے پاک اسی لئے فرمایا گیا۔ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ غرضیکہ الوہیت اور باپ ہونا کبھی جمع ہو ہی نہیں سکتے یہ سب دلائل سبحان میں بتائے گئے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تعجب کے لئے سبحان کہا گیا ہو ہم لوگ بھی ایسے موقعہ پر سبحان اللہ معاذ اللہ وغیرہ بولتے ہیں۔

دوسری دلیل: بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یہ درحقیقت دو دلیلیں ہیں۔ اس آیت کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ کفار کا رب کے لئے ولد ماننا غلط ہے۔ بلکہ آسمان وزمین کی تمام چیزیں اس کی ملکیت ہیں اور ظاہر ہے کہ باپ بیٹے کا مالک نہیں ہوسکتا تو اگر اس کے لئے اولاد ہوتی تو رب تعالیٰ بعض کا تو مالک ہوتا اور بعض کا باپ یا یہ کہ ہر چیز رب کی مخلوق ہے اور بیٹا مخلوق نہیں بلکہ مولود ہوتا ہے۔ لہٰذا لازم آئے گا کہ بعض چیزیں رب کی مخلوق ہوں اور بعض مولود دوسرے یہ کہ اولاد باپ کے مال کی ایک طرح مالک وقابض ہوتی ہے فرمایا گیا اللہ ہی کی ہیں آسمان وزمین کی چیزیں۔ اگر اس کی اولاد ہوتی تو یہ چیزیں رب کی بھی ہوتیں اور اولاد کی بھی۔ **تیسری دلیل:** یہ ہے کہ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ہر چیز اصل کی مطیع ہے۔ قانتون قنوت سے بنا۔ جس کے چار معنی ہیں۔ اطاعت وفرمانبرداری جیسے اُقْنُتِيْ لِرَبِّكِ (ال عمران: ۴۳) کھڑا ہونا جیسے طول القنوت چپ رہنا جیسے وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ (البقرہ: ۲۳۸) ہمیشہ رہنا یہاں چاروں معنی بن سکتے ہیں۔ یعنی ہر چیز رب کی فرمانبردار ہے اس کے سامنے کھڑے ہوکر عبادت گزار ہے اس کے احکام پر خاموش ہے اور ہمیشہ اس کی محتاج ہے یہ نہیں کہ صرف پیدا ہوتے وقت اس کی محتاج تھی بعد میں غنی ہوگئی۔ اولاد اولاً ماں باپ کی محتاج ہوتی ہے پھر ان سے بے پرواہ بلکہ اخیر میں خود ماں باپ ان کے محتاج، اگر رب کی بھی اولاد ہوتی تو معاذ اللہ یا تو وہ اس کا محتاج ہوتا یا کم از کم وہ اولاد اس سے غنی ہوتی۔ نیز خدا کی اولاد بھی خدا ہی ہونی چاہئے تھی اور، خدا دوسرے کی عبادت نہیں کر سکتا۔ لہٰذا عالم کی بعض چیزیں تو اس کی مطیع ہوتیں۔ بعض نہ ہوتیں۔ **چوتھی دلیل:** یہ ہے کہ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وہ آسمان وزمین کو ایجاد فرمانے والا ہے۔ بَدِيْعُ، بِدْعٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں بغیر نمونہ کے بنانا اور جب رب کے لئے اس کا استعمال ہو تو اس کے معنی ہوتے ہیں بغیر آلہ اور مادہ اور زمانہ اور مکان کے کسی چیز کو وجود دینا اسی سے بنا ہے بدعت یعنی دین میں نیا عقیدہ داخل کرنا۔ یہ بھی درحقیقت اولاد نہ ہونے کی دو دلیلیں ہیں اور اس کے بھی دو مطلب ہیں ایک یہ کہ بدیع بمعنی مبدع ہو اور السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس کا مفعول یعنی رب تعالیٰ آسمان وزمین جیسی بڑی چیزوں کو بغیر نمونہ بغیر مثال بغیر مادہ اور بغیر آلہ کے پیدا فرمانے والا ہے تو انسان اور فرشتے بھی ایسے ہی پیدا فرمائے اور باپ وہ جس سے اس کی مثل اس کے مادہ سے اور آلہ سے بچہ بنے لہٰذا رب کسی کا باپ نہیں۔ دوسرے یہ کہ بدیع اپنے معنی میں ہو اور السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اس کا فاعل ہو۔ یعنی رب تعالیٰ انوکھے آسمان وزمین والا ہے۔ (روح البیان) اور لائق بیٹا وہ ہوتا ہے جو باپ سے بڑھ چڑھ کر کام کرے یا کم از کم اس کے برابر ہے اور اگر اس کی کوئی اولاد ہے تو بتاؤ اس کے آسمان وزمین کہاں ہیں۔ **پانچویں دلیل:** یہ ہے کہ وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا۔ قَضٰى، قَضَاءٌ سے بنا ہے۔ اور قضاء قرآن کریم میں چند معنوں میں استعمال ہوا۔ ۱۔ پیدا کرنا فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ (حم سجدہ: ۱۲) ۲۔ حکم دینا وَقَضٰى رَبُّكَ (الاسرا: ۲۳)۔ ۳۔ فیصلہ کرنا ہے۔ اسی لئے حاکم کو قاضی کہتے ہیں۔ ۴۔ خبر دینا وَقَضَيْنَآ اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ (الاسراء: ۴) اس معنی کے لئے الی ضروری ہے۔ ۵۔ فارغ ہونا فَلَمَّا قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ (احقاف: ۲۹) اور فرمایا گیا وَقُضِيَ الْاَمْرُ (بقرہ: ۲۱۰)۔ ۶۔ پورا کر لینا جیسے فَلَمَّا قَضٰى زَيْدٌ (احزاب: ۳۷)۔ ۷۔ ارادہ کرنا۔ یہاں یا تو فیصلہ کرنے کے معنی ہیں یا ارادہ کرنے کے یا حکم دینے کے خیال رہے کہ قضاء

قدر میں یہ فرق ہے کہ قدر کے معنی ہیں اندازہ کرنا اور قضاء کے معنی ہیں حکم یا فیصلہ دینا (ع) لہٰذا قدر اندازہ ہے اور قضاء اس سے نافذ کرنا۔ پس قدر قضا سے پہلے ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ نَفِرُّ مِنْ قَضَاءِ اللّٰهِ اِلٰى قَدَرِ اللّٰهِ یعنی ہم اللہ کے حکم سے اس کی قدر کی طرف بھاگتے ہیں قدر سے ہی تقدیر بنی۔ فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ یعنی وہ اپنے پیدا فرمانے میں کسی مادہ وغیرہ کا حاجتمند نہیں بلکہ صرف کن فرمانا اور ارادہ کا تعلق کافی ہوتا ہے اور بیٹے میں یہ بات نہیں لہٰذا وہ اولاد وغیرہ سے پاک ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانو! یہ مسجدوں سے تم کو اس لئے نہیں روکتے کہ خود وہاں رب کی عبادت کریں گے یہ بدنصیب اس کی عبادت تو کیا کرتے اسے گالیاں دیتے ہیں اس کے لئے نہ ہونی بات مانتے ہیں خیال تو کرو کہ کیسی گندی بات اس کے لئے مان بیٹھے۔ کہ کہتے ہیں کہ رب نے بھی ہماری طرح اپنے لئے اولاد اختیار فرمائی یا اُس نے بعض مخلوق کو اپنا منہ بولا بچہ بنایا سبحان اللہ یہ کیونکر ممکن ہے رب تو پاک ہے آسمانی اور زمینی چیزوں کا واحد مالک ہے آسمان اور زمین جیسی زبردست مخلوقات کو بغیر نمونہ، بغیر مادہ، بغیر آلات واسباب ایجاد فرمانے والا ہے اس کی شان تو یہ ہے کہ جب کسی بات کا فیصلہ فرمائے تو اس سے کن فرما دیتا ہے اور اس کا ارادہ اس چیز کے متعلق ہو جاتا ہے جس سے وہ چیز فوراً پیدا ہو جاتی ہے جس کی ایسی اعلیٰ صفتیں ہوں وہ اولاد ہونے سے بلند وبالا ہے۔ خیال رہے کہ یہود ونصاریٰ نے حضرت عزیر ومسیح علیہما السلام کا ایک ایک معجزہ دیکھ کر انہیں اللہ کا بیٹا کہہ دیا۔ کیونکہ ان قوموں میں اپنے انبیاء علیہ السلام کا میلاد شریف پڑھنے کا رواج نہ تھا۔ ورنہ انہیں معلوم ہوتا رہتا کہ وہ حضرات ماں سے پیدا ہوئے ماں کا دودھ پیتے رہے۔ فلاں کی پرورش میں رہے اور جو پیدا ہو کر دودھ پئے پرورش کیا جائے وہ اللہ یا اللہ کا بیٹا نہیں ہوسکتا اس لئے رب تعالیٰ نے حضرت مسیح وموسیٰ وغیرہم انبیائے کرام علیہم السلام کا میلاد شریف قرآن پاک میں بہت تفصیل سے بیان کیا۔ مسلمان دن رات حضور کا میلاد شریف پڑھتے رہتے ہیں ہمیشہ ان میں یہ دستور ہے اسی لئے حضور کے ہزار ہا معجزات دیکھ کر سن کر بھی کسی مسلمان نے حضور کو نہ خدا کہا نہ خدا کا بیٹا۔ یہ میلاد شریف کا ذکر شرک توڑ ہے۔ محض میلاد کی برکت سے ہی لوگ شرک سے بچے۔

رب کے اولاد سے پاک ہونے کے دلائل

حق تعالیٰ کے اولاد سے پاک ہونے کی بہت سی دلیلیں ہیں جن میں سے کچھ تو یہاں بیان ہوئیں اور کچھ سورہ اخلاص شریف میں کچھ دیگر آیتوں میں آئیں گی ہم قدرے تفصیل سے بطور اختصار کچھ بیان کرتے ہیں۔ **دلیل اول:** اولاد کی ضرورت مغلوب کو ہوتی ہے کبھی تو شہوت سے مغلوب ہو کر جماع کرتا ہے۔ جس سے اولاد ہو جاتی ہے کبھی دشمنوں کی قوت سے مجبور ہو کر اولاد کی خواہش کرتا ہے جو اپنا قوت بازو ہو اور اس کے ذریعہ رشتے داریاں بڑھیں اور یہ مجبور ہو کر نہ رہے۔ رب تعالیٰ ہر قسم کی مغلوبی سے پاک ہے۔ لہٰذا اولاد سے پاک۔ **دوسری دلیل:** بدلنے والی چیز اولاد کی خواہش مند

ہو سکتی ہے غیر متبدل کی اولاد نہیں انسان سمجھتا ہے کہ مجھ کو بڑھاپا بھی آنے والا ہے اس وقت عصاء پیری یعنی فرزند چاہئے، چاند تارے سورج وغیرہ چونکہ بدلتے نہیں اسی لئے ان کی اولاد بھی نہیں۔ رب تعالیٰ بھی تبدیلی سے پاک اس لئے اولاد سے بھی پاک۔ **تیسری دلیل:** فانی کو اولاد درکار تاکہ اس کی نسل باقی رہے۔ انسان اپنی نسل کی بقاء اپنے بعد اپنے گھر کی آبادی اور اپنے نام کو زندہ رکھنے کے لئے اولاد چاہتا ہے جانوروں کی نسل کی بقاء اولاد ہی سے ہے بعض علم طبیعات والے فرماتے ہیں کہ درختوں بلکہ پتھروں میں بھی توالد وتناسل ہے۔ بعض درخت نر اور بعض مادہ ہیں نر کی ہوا مادہ کو لگتی ہے جس سے وہ پھلوں سے حاملہ ہو جاتی ہے۔ بعض درختوں میں تو اس کا مشاہدہ بھی ہوتا ہے جیسے ارنڈ کھجور وغیرہ یہی حدیث تابیر نخل کا مطلب ہے جس کو ہم نے اپنی کتاب جاء الحق میں بیان کیا چونکہ آسمانی چیزیں قیامت تک فانی نہیں اس لئے ان کی اولاد بھی نہیں اور رب تو واجب الوجود ہے۔ اس لئے اولاد سے پاک۔ **چوتھی دلیل:** اولاد باپ کی ہم جنس چاہئے۔ آپ کے جسم کے کیڑے جوئیں وغیرہ آپ کی اولاد نہیں اگر رب کی اولاد ہوتی تو اس کے ہم جنس ہوتی اور جنس کے لئے فصل ضروری اور جنس فصل کے لئے مادہ ضروری اسی لئے رب کا مادی ہونا لازم آتا ہے۔ اور وہ تو مادہ سے پاک لہٰذا اولاد سے بھی پاک۔ **پانچویں دلیل:** اولاد میں ماں باپ کے سے ذاتی صفات چاہئے۔ انسان کا بچہ انسان کی طرح ضاحک، متعجب وغیرہ ہونا چاہئے اگر رب کی اولاد ہوتی تو وہ اس کی طرح واجب، قدیم، خالق وغیرہ ہوتی اور پھر اولاد ہونے کی وجہ سے اس سے پیچھے ہوتی۔ واجب قدیم ہونا پیچھے ہونے کے خلاف ہے۔ لہٰذا رب اولاد سے پاک ہے۔ **چھٹی دلیل:** اولاد جو اپنی جز یعنی نطفے سے پیدا ہو۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت جبرئیل علیہ السلام کے بیٹے نہیں۔ سیدنا آدم مٹی کے بیٹے نہیں آپ کے سر کی جوں وغیرہ آپ کی اولاد نہیں کیونکہ وہ آپ کے نطفے سے نہیں اور رب تعالیٰ نطفے سے پاک لہٰذا وہ اولاد سے پاک۔ **ساتویں دلیل:** اولاد میں ماں کی شرکت ہوتی ہے کہ اس کے کچھ اعضاء باپ کے نطفے سے بنتے ہیں کچھ ماں کے۔ اگر رب کی اولاد ہوتی تو اس میں ماں کی شرکت ہو جاتی اور وہ اس کا مستقل خالق نہ ہوتا اور یہ تو بڑا عیب ہے لہٰذا وہ اولاد سے پاک ہے۔ **آٹھویں دلیل:** اولاد ایک وقت تک ماں باپ کی محتاج پھر ان سے بے پرواہ اور پھر معاملہ برعکس کہ ماں باپ بعض کاموں میں اولاد کے محتاج اور رب تعالیٰ محتاجی سے پاک۔ لہٰذا وہ اولاد سے پاک۔ **نویں دلیل:** اکثر اولاد والا خود بھی کسی سے نکلتا ہے جب رب کسی سے بنا نہیں تو اس کی بھی کوئی اولاد نہیں اس لئے فرمایا۔ لَمْ یَلِدْ ۙ وَلَمْ یُوْلَدْ آدم علیہ السلام مٹی سے بنائے گئے۔ (تفسیر عزیزی)۔ **دسویں دلیل:** باپ کی تربیت ناقص ہوتی ہے کہ وہ بچے کو پال کر استاد اور شیخ کے حوالہ کرتا ہے اور اگر خود ہی علم و معرفت کا اسے درس دے تو بھی باپ ہونے کی حیثیت سے نہیں شیخ اور استاد ہونے کی حیثیت سے دے گا۔ اور رب کی پرورش کامل ہے کہ بندوں کے جسم اور روح وقلب اور قالب کو پالتا ہے لہٰذا وہ کسی کا باپ نہیں۔ **گیارھویں دلیل:** بیٹا باپ کا خادم ہوتا ہے نہ کہ عابد اسی طرح اس کا شریک ہوتا ہے نہ کہ اس کی مخلوق تو اگر رب کی کوئی اولاد ہوتی تو خادم ہوتی اس کی عابد نہ ہوتی لہٰذا رب کی معبودیت ناقص رہ جاتی۔ **بارھویں دلیل:** بیٹا اپنے باپ کا شریک ہوتا ہے نہ کہ بندہ اور مملوک شہزادہ اپنے باپ کی رعایا نہیں کہلاتا بلکہ اس کی سلطنت کا حصہ

دار اگر باپ اپنے بیٹے کو خریدے تو وہ فوراً آزاد ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اگر رب کا بیٹا ہوتا تو وہ اس کا بندہ نہ ہوتا۔ بلکہ اس کا برابر کا حصہ دار۔ **تیرھویں دلیل:** باپ بہت آہستگی سے بیٹا حاصل کر سکتا ہے نہ کہ ایک دم کہ اس کا نطفہ عورت کے پیٹ میں نو ماہ تک پرورش پاتا ہے۔ رب اپنے پیدا فرمانے میں آہستہ پر مجبور نہیں لہٰذا وہ اولاد سے پاک۔ **چودھویں دلیل:** بیٹا اپنے باپ کا نمونہ اور ہم شکل ہوتا ہے۔ رب تعالیٰ ہم شکل اور کسی کا نمونہ بننے سے پاک ہے لہٰذا وہ اولاد سے بھی پاک۔ **پندرھویں دلیل:** بیٹے تین قسم کے ہیں۔ پوت، سپوت اور کپوت۔ پوت وہ ہے جو باپ کے برابر کمال دکھائے، سپوت وہ جو باپ سے بڑھ جائے، کپوت وہ جو باپ سے گھٹا ہوا رہے بلکہ اس کے نام کو ڈبو دے اگر رب کے بیٹا ہوتا تو سوال ہوتا کہ وہ کس قسم کا ہے۔ اگر سپوت ہے تو چاہئے اس کی مخلوق رب کی مخلوق سے بڑھی ہوئی ہو کہ رب کے سات آسمان ہیں تو اس کے کم از کم آٹھ تو ہوں اور اگر پوت ہے تو خالقیت اور مالکیت وغیرہ میں برابر ہونا چاہئے تھا اور کپوت ہوتا تو یہ بیٹے کے عیب اور باپ کی مجبوری پر دلالت کرتا ہے کہ بیٹا تو نالائق رہا اور باپ اسے درست نہ کر سکا۔ یہ پندرہ دلیلیں ہوئیں یہ تمام اور ان کے علاوہ اور بہت سے دلائل اسی آیت سے نکل سکتے ہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: مسلمان بھی کہتے ہیں کہ رب کے بعض بندے محبوب، بعض خلیل اور بعض اس کے حبیب ہیں جیسے کہ رب بیٹے سے پاک ہے چاہئے کہ دوست بنانے سے بھی پاک ہو۔ **جواب:** محبوبیت، خلت اصطفائی، عبدیت کے خلاف نہیں ہو سکتا ہے کہ بادشاہ اپنے غلاموں اور کنیزوں کو اپنا مقبول بارگاہ کرے اسی سے وہ غلام ہی رہیں گے مگر بیٹا ہونا بندے کے خلاف ہے جیسا کہ ہم دلائل میں بیان کر چکے ہیں۔ لہٰذا رب اولاد سے پاک ہے ہاں! اس کے بعض بندے اس کے پیارے محبوب ہیں کہ اس کا حق بندگی خوب ادا کرتے ہیں۔ **دوسرا اعتراض:** قٰنِتُوْنَ سے معلوم ہوتا ہے رب کے سارے بندے اس کے مطیع اور فرمانبردار ہیں حالانکہ بہت بندے کافر اور نافرمان بھی ہیں۔ **جواب:** یہاں فرمایا ہے کہ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ یہ نہ کہا گیا لِاَحْكَامِهٖ قٰنِتُوْن کفار اور شیاطین رب کے شرعی احکام سے منکر ہیں نہ کہ اس کے ارادے کے کہ جب چاہے جس کو چاہے فنا کر دے بیمار بنا دے غنی یا فقیر کر دے ان احکام سے کوئی باہر نہیں۔ نیز ساری مخلوق تسبیح اضطراری کر رہی ہے کہ اس کی ہستی اپنے بنانے والے کی قدوسیت اور قادریت پر گواہی دے رہی ہے۔ تسبیح اختیاری کرے یا نہ کرے۔ **تیسرا اعتراض:** یہاں فرمایا گیا لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ مَا بے عقل چیزوں کے لئے آتا ہے تو کیا بے عقل چیزیں رب کی ہیں اور عقل والی کسی اور کی۔ **جواب:** ہر بے عقل اور عقل والی اللہ کی مخلوق ہونے میں مثل بے عقل کے ہیں کیونکہ بمقابلہ عاقل کے بے عقل پر مالک کا زیادہ قبضہ ہوتا ہے غلام کے مقابل جانور وغیرہ بے عذر خدام ہیں۔ تو یہاں فرمایا گیا کہ ساری مخلوق بے عقل چیز کی طرح اس کی بے عقل بے عذر مملوک ہے۔ **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ رب تعالیٰ ہر چیز کن (ہو جا تو) کہہ کر پیدا فرماتا ہے۔ بتاؤ یہ حکم کس نے سنا کس کو سنایا گیا۔ (ستیارتھ پرکاش)۔ نیز کن بھی تو ایک چیز ہے بتاؤ یہ کس کن سے پیدا ہوئی۔ نیز کن خود حادث چیز ہے کہ کاف اور نون سے بنا اور یہ

عربی زبان کا ایک لفظ ہے جس کے لئے مضارع اور مادہ ضروری تو کیا رب تعالیٰ اپنے خالق ہونے میں حادث چیز کا محتاج ہے۔ نیز اگر کن میں موجود کرنے کی تاثیر ہے تو ہمارے ہزار ہا کن سے کچھ نہیں بنتا۔ **جواب:** تفسیر عزیزی میں اس کا نہایت نفیس جواب دیا گیا کہ کن سے مراد ہے پیدا کرنا اور ارادہ کا متعلق کرنا اور فیکون سے مراد ہے فوراً چیز کا پیدا ہو جانا نہ تو کن مقصود ہے۔ اور نہ کسی کو سنانا مراد تو مطلب یہ ہوا کہ باپ بیٹے کے حاصل کرنے میں بہت محنت کرتا ہے اور کاریگر چیز کے بنانے میں بہت سامان جمع کرتا ہے رب تعالیٰ کو مخلوق کے پیدا کرنے میں نہ صورت مادہ وغیرہ سامان کی ضرورت نہ محنت کی حاجت بلکہ اس کی شان یہ ہے کہ جس چیز کے کرنے کا فیصلہ کیا تو وہ فوراً پیدا ہو گئی۔ **پانچواں اعتراض:** عقلاء اور علماء کی اتنی بڑی جماعت نے ایسی غلط بات کیسے کہہ دی یہ تو کوئی بے وقوف بچہ بھی نہیں کہہ سکتا۔ **جواب:** اس کی وجہ ہم تفسیر میں بتا چکے کہ پہلے رب کو باپ کہہ کر پکارتے تھے اور اپنے کو اس کا بیٹا کہتے تھے نیز رب نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ وَلَّدْتُکَ وَاَنْتَ نَبِیٌّ جس کے معنی تھے کہ ہم نے تم کو نبی پیدا فرمایا عیسائیوں نے نَبِی کو اِبْنِیْ بنایا اور وَلَّدْتُ کو جننے کے معنی میں لیا اور ترجمہ یہ کیا کہ میں نے تم کو جنا ہے۔ اور تم میرے بیٹے ہو۔ نیز رب نے بنی اسرائیل کو خطاب کر کے فرمایا تھا یَا اَحْبَارِیْ وَیَا اَبْنَاءُ رُسُلِیْ یعنی اے میرے دین کے عالمو اور اے میرے پیغمبروں کی اولاد جس کو یہود نے یوں بنایا کہ یَا اَحْبَارِیْ وَیَا اَبْنَائِیْ یعنی اے میرے پیارے بیٹو (تفسیر روح البیان)۔ اور حق تو یہ ہے کہ خدا جب دین لیتا ہے تو سمجھ بھی چھین لیتا ہے۔ جب بے دین پیپل اور گائے کہ خدا مان سکتے ہیں تو ان کے لئے خدا کا بیٹا ماننا کیا مشکل ہے۔

تفسیر صوفیانہ

ایک ہی پھول کا رس بھڑ کے پیٹ میں پہنچ کر زہر اور شہد کی مکھی کے پیٹ میں پہنچ کر شہد بن جاتا ہے ایسے ہی رب کا کلام اور اس کے احکام مومنین کے دماغ میں پہنچ کر باعث شفا بنتا ہے اور کفار کی بیماری بڑھا دیتا ہے اسی تورات اور انجیل سے بعض حضرات مومن کامل بنے تھے اور انہیں کتابوں سے بے نورے لوگ بے دین بنے کہ خدا کے لئے اولاد وغیرہ مان بیٹھے اور جیسا کہ خدا کے لئے اولاد ماننا کفر ہے ایسے ہی کسی مخلوق کو موجود مستقل ماننا بے دینی ہے مَا سِوَا اللّٰہِ بِذَاتِہٖ تو معدوم ہے۔ رب کے ارادے سے موجود اور اس کی ذات سے قائم وہی وجود مطلق ہے۔ باقی تمام اس کے تعینات جب تک کہ انسان اپنے کو دوئی کے بھنور سے نکال کر بحر توحید میں غرق نہ کرے اور اپنا دامن قلب شرک جلی و خفی سے پاک نہ کرے اس کی کوئی عبادت قبول نہیں مسلمان کے لئے تین قلعے ہیں ایک ذکر اللہ، دوسرے تلاوت قرآن، تیسرے اس کی ظاہری اور باطنی مسجد ظاہر مسجد تو مصلے ہے۔ اور باطنی مسجد صدق اور اخلاص خیال رہے کہ تسبیح گویا گولی ہے۔ اور اخلاص بارود اور الفاظ کارتوس اور زبان بندوق۔ بے شک گولی ہی شکار کرتی ہے مگر بارود اور رائفل کی مدد سے قلب میں اخلاص نہ ہو۔ عقیدہ درست نہ ہو، زبان جھوٹ وغیرہ سے پاک نہ ہو تو فقط الفاظ کیا کام کریں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

ہست تسبیحت بخار آب وگل مرغ جنت شدز نفخ صدق دل

(ماخوذ از تفسیر ابن عربی و روح البیان)

وَ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ لَوْ لَا یُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِیْنَاۤ اٰیَةٌ
اور کہا انہوں نے جو نہیں جانتے ہیں کیوں نہیں کلام کرتا ہم سے اللہ یا آئی مارے پاس نشانی
اور جاہل بولے اللہ ہم سے کیوں نہیں کلام کرتا یا ہمیں کوئی نشانی ملے
كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تَشَابَهَتْ
مثل اس کے کہا انہوں نے جو ان کے پہلے سے تھے مثل کلام ان کے مشابہ ہو گئے
اس سے اگلوں نے بھی ایسی ہی کہی ان کی سی بات ان کے دل
قُلُوْبُهُمْ قَدْ بَیَّنَّا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾
دل ان کے بے شک ظاہر فرما دیں ہم نے نشانیاں واسطے اس قوم کے جو یقین رکھتی ہیں
ایک سے ہیں بے شک ہم نے نشانیاں کھول دیں یقین والوں کے لیے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** اب تک اہل کتاب کی بکواس کا ذکر تھا اب خالص مشرکین کے بیہودہ گفتار کا تذکرہ ہے۔ یا اس سے پہلے اہل کتاب اور خالص مشرکین کی مشترکہ باتیں بیان کی گئیں اب خالص جہلاء مشرکین کے اقوال کا ذکر ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں کفار کی ان باتوں کا ذکر کیا گیا جو توحید کے خلاف ہیں اب ان کی اس گفتار کا سلسلہ ہے جو نبوت کے مخالف۔ **تیسرا تعلق:** پہلے فرمایا تھا کہ کفار نے رب کی بعض مخلوق کو اتنا بڑھایا کہ اسے خدا کا بیٹا مان لیا اب فرمایا جا رہا ہے کہ انہوں نے خود اپنے کو اتنا اونچا سمجھا کہ ہم رب سے کلام کرنے کے لائق ہیں۔

شان نزول

ایک دفعہ رفیع ابن خزیمہ نے حضور ﷺ سے عرض کیا کہ اگر آپ واقعی اللہ کے رسول ہیں تو اللہ سے فرما دیجئے کہ وہ ہم سے کلام کرے اور ہم سنیں کہ آپ اللہ کے نبی ہیں۔ ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ اس کے جواب میں یہ آیت کریمہ اتری۔ (تفسیر خزائن العرفان)۔

تفسیر

وَ قَالَ الَّذِیْنَ، جاہلوں نے کہا ظاہر یہ ہے کہ اس سے مشرکین عرب مراد ہیں۔ جو حقیقۃً آسمانی کتابوں سے جاہل تھے اور

ممکن ہے کہ اہل کتاب بھی مراد ہوں جو دیدہ دانستہ جاہل بنتے تھے اور رب نے بھی ان کو جاہل اس واسطے فرمایا کہ یہ لوگ عالم بے عمل تھے جو کہ مثل جاہل کے ہوتا ہے یا بعض احکام کو غلط جانے بیٹھے تھے اور غلط جاننا نہ جاننے سے بدتر ہے۔ (روح وکبیر) لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ لفظ لولا جب ماضی پر آتا ہے تو نہ کروانے پر ملامت کے معنے دیتا ہے جیسے تو کل کیوں نہ آیا اور مضارع پر آ کر فاعل کو راغب کرتا ہے جیسے کہ تو میرے پاس کیوں نہ آئے گا یعنی ضرور آنا یہاں کفار بظاہر رغبت کا کلمہ بول رہے تھے۔ لیکن حقیقتاً مذاق اڑاتے تھے یا تو یہ کہتے تھے کہ جب رب تعالیٰ بعض پیغمبروں سے بلاواسطہ کلام کرتا ہے۔ اور یا یہ کہ جب رب تعالیٰ فرشتوں کے ذریعہ کلام فرماتا ہے تو ہم پر فرشتے کیوں نہیں آتے غرضیکہ وہ اپنے کو یا تو فرشتوں کی مثل سمجھتے ہیں یا پیغمبروں کی۔ علماء فرماتے ہیں کہ اس کفر کی وجہ یہ تھی کہ کفار اپنے میں اور نبی میں فرق نہ کرتے تھے نبی سے خبردار نہ تھے یوں بھی کہتے تھے کہ ہم اور نبی کھانے پینے، سونے جاگنے میں یکساں ہیں تو مرتبوں میں بھی برابر ہم کو ان کے واسطے وسیلے کی ضرورت نہیں جب مسجد کی اینٹ پاخانہ کی اینٹ کے برابر نہیں اور قرآن کا کاغذ ناول کے کاغذ کے برابر نہیں اگرچہ ایک ہی کارخانہ میں بنے تو نبی اور گندے لوگ کیسے یکساں ہو سکتے ہیں۔ جب تم ابوجہل کے برابر نہیں نبی تمہارے برابر کس طرح ہو سکتے ہیں تم نے حضور علیہ السلام کا کھانا پینا دیکھا ان کا معراج پر جانا اور پتھروں کا کلمہ پڑھنا نہ دیکھا۔ اَوْ تَاْتِيْنَاۤ اٰيَةٌ یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آئی؟ یعنی قرآن کریم و دیگر معجزات ان کے نزدیک نشانیاں ہی نہیں اپنی خاطر خواہ نشانی چاہتے تھے اور کہتے تھے کہ قریب کا راستہ اختیار کرنا چاہیے رب تعالیٰ نے ہماری ہدایت کے لئے اتنا بعید راستہ کیوں اختیار کیا کہ وہ فرشتے سے اور فرشتہ آپ سے اور آپ ہم سے یا معمولی معجزات ہم کو دکھائے آسان طریقہ یہ تھا کہ یا تو براہ راست ہم سے کلام فرما لیتا اور کوئی ایسی نشانی بھیجتا کہ جس سے ہم مجبوراً آپ کو مان لیتے مثلاً یہ کہ مکہ مکرمہ کی بے آب ودانہ زمین میں چشمے جاری ہو جاتے یا آسمان پھٹ کر ہم پر گرتا یا فرشتے صف باندھ کر ہمارے سامنے آ جاتے یا آپ کا گھر سونے چاندی کا ہو جاتا یا آپ ہمارے سامنے جا کر ساری کتاب ایک دم لے آتے ان بے وقوفوں کو اب تک ایمان تو میسر نہیں اور ملائکہ اور انبیا کی ہمسری کا دعویٰ کر رہے ہیں ان کا یہ مطالبہ کرنا گویا اپنے لئے نبوت یا ملکیت کا مانگنا ہے رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے نبی ﷺ آپ ان کی بکواس سے غمگین نہ ہوں کیونکہ یہ آپ پر ہی پہلا سوال نہیں ہوا بلکہ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ اسی طرح ان کے اگلے کفار نے بھی اپنے پیغمبروں سے مطالبے کئے یعنی جیسے کہ محض ضد سے نہ کہ طلب حق کے لئے یہ لوگ مطالبے کر رہے ہیں۔ ایسے ہی ان سے پہلوں نے بھی کئے تھے۔ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ اور جو مطالبے انہوں نے کئے تھے وہی یہ کر رہے ہیں۔ خیال رہے کہ كَذٰلِكَ تشبیہ کام کے لئے اور مِّثْلَ قَوْلِهِمْ تشبیہ کلام کے لئے یعنی یہ لوگ اگلے کفار کی طرح بدنیتی سے اسی قسم کے سوالات کرتے ہیں جو انہوں نے کئے چنانچہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ رب دکھا دو۔ مشرکین کی طرح ہمارے لئے بھی چند خدا بنا دو۔ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ کیا آپ کا رب آسمان سے دسترخوان اتار سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ اے نبی ﷺ اگرچہ یہ اور وہ زمانہ، جگہ، زبان، جسم، قوت، عمر وغیرہ میں مختلف ہیں۔ مگر تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ دل ان سب کے ایک رنگ کے ہیں۔ یعنی عناد، سختی، ضد اور اندھے پن میں یہ اور وہ یکساں ہیں کیونکہ زبان ترجمان قلب ہے جب ان کے کلام یکساں تو یقیناً دل بھی یکساں خیال رہے کہ تشابہ اور تشبیہ میں فرق یہ ہے کہ تشبیہ میں

مشبہ بہ مشبہ سے اکثر اعلیٰ ہوتا ہے مگر تشابہ میں دونوں بالکل یکساں۔ اسی لئے یہاں تشابہت فرمایا گیا۔ جس سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ کفر میں اپنے اگلوں سے کم نہیں بالکل برابر ہیں اور یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں محض عناد سے نہ کہ ایمان لانے کی نیت سے۔ رہا ان کا یہ اعتراض کہ ہم پر پریشانی کیوں نہیں آتی اس کا جواب یہ ہے کہ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ ہم نے ایک نہیں دو نہیں بلکہ صدہا نشانیاں ظاہر فرمادیں اول تو سر سے پاؤں تک خود آپ ہی رب کی کھلی نشانی ہیں۔ پھر آپ کے حالات قرآن پاک کی آیات اور صاحب قرآن کے معجزات اسلام کی حقانیت پر گواہی دے رہے ہیں کیا انہوں نے نہ دیکھا کہ آپ کے اشارے سے چاند پھٹ گیا آپ کو پتھروں نے سلام کیا آپ کے حکم سے کنکروں نے کلمہ پڑھا، آپ کے اشارے پر درخت چلے، آپ کے فراق میں لکڑی کا ستون رویا۔ آپ کی انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری ہوئے، آپ سے قیدی ہرنی نے شکایت اور بے زبان اونٹنی نے درددل کی حکایت کی، آپ کے صدق کی بھیڑوں نے گواہی دے دی۔ آپ کی برکت سے تھوڑے سے کھانے پر لشکر سیر ہوا، آپ کے ہاتھ لگنے سے سخت بیماریاں دور ہوئیں اور باوجودیکہ آپ نے کسی انسان سے علم نہ سیکھا مگر عرب کے فصحا اور بلغاء نے زانوئے ادب تہ کیے کیا یہ معجزات ناکافی ہیں ان کے ہوتے ہوئے اور کیا چاہتے ہیں لیکن بات یہ ہے کہ یہ تمام علامتیں لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ اس قوم کے لئے ہے جس میں یقین کرنے کا مادہ ہو یا جو یقین حاصل کرنے کے لئے ان پر نظر کرے یا جن کا ایمان اور یقین ازل میں مقدر ہو چکا ہو ضدی اور جھگڑالو جو کہ اپنے کو غالب اور دوسرے کے عاجز کرنے کی نیت سے مطالبہ کرتے ہیں وہ کسی چیز سے بھی فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔

خلاصہ تفسیر

اے نبی ﷺ کفار کے عالم و جاہل حماقت اور بے دینی میں ایک دوسرے سے بڑھ کر ہیں ان کے علماء نے تو رب کے لئے اولاد مانی اور ان کے جہلاء نے تو حد ہی کر دی کہنے لگے کہ اگر آپ سچے رسول ہیں تو خدا تعالیٰ ہم سے منہ در منہ کیوں نہیں کہہ دیتا کہ آپ نبی ہیں۔ اتنے واسطے درمیان میں کیوں رکھے اگر یہ نہیں تو ہمارے پاس ایسی نشانی کیوں نہیں آجاتی جس سے ہم آپ کو مجبوراً مان لیں۔ اے نبی ﷺ یہ نیا سوال نہیں ہے بلکہ گذشتہ انبیاء سے بھی کفار نے ایسی ہی خرافات بکی تھیں اگر ہر شخص میں رب سے کلام کرنے کی قابلیت ہوتی تو دنیا میں انبیاء کے بھیجنے کی ضرورت ہی کیا تھی ہر شخص رب سے پوچھ کر حلال و حرام عبادت و ریاضت کے مسائل حاصل کرلیا کرتا رب نور ہے اور مادہ ظلمت کیونکر ممکن ہے کہ ظلمت نور تک پہنچ سکے رب جس کو چاہتا ہے اسے ظلمت مادہ سے نکال کر عالم انوار میں لاتا ہے اور اس کے سر پر نبوت کا تاج رکھتا ہے پھر اس سے بلا واسطہ یا بالواسطہ ملائکہ کلام فرماتا ہے۔ بے وقوف ظلمت مادہ تو کیا تاریکی کفر سے تو نکلتے نہیں اور رب سے کلام کرنے کا حوصلہ کر رہے ہیں کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ مجھے حکیم کی کیا ضرورت یا حاکم و بادشاہ کی کیا حاجت ہر شخص حکیم اور حاکم کیوں نہیں بن جاتا یہ نادانی اور جہالت ہے۔ ایک ملحد کسی بزرگ سے بولا کہ مجھ کو خدا دکھا دو انہوں نے کہا یہ کیا مشکل ہے اور اسے دھوپ میں کھڑا کر کے اس کا منہ سورج کی طرف کر دیا۔ وہ آنکھیں بند کرنے لگا تو ان بزرگ نے چپت لگا کر فرمایا کہ آنکھ کھول وہ بولا کیسے کھولوں کھلتی نہیں تو فرمایا آفتاب کو رب کے نور سے کوئی نسبت ہی نہیں وہ تو نور السموت والارض ہے سورج تو اس کا پرتو بھی نہیں۔ جب تیری آنکھ میں اس کی تاب نہیں تو اس کی تاب کیسے لائے گا۔ رب کو دیکھنے والی آنکھ تو بنواؤ، دکھا میں دوں گا

اے نبی ﷺ اگرچہ ان کفار کی زبانیں اور زمانہ مختلف ہے مگر دل سب کے یکساں ہیں کہ سب پر کفر کا یکساں غلاف چڑھا ہوا ہے۔ رہا ان کا دوسرا اعتراض اس کا جواب یہ ہے کہ ہم نے آپ کے سچا ہونے کی صدہا نشانیاں بھیج دیں مگر کس کے لئے یقین والوں کے لئے جن میں یقین کا مادہ ہی نہیں ان کے لئے سب بیکار، بہرے کے سامنے دلکش نغمے واندھے کے سامنے حسن وجمال بیکار اور ان کے من مانے معجزات اور مجبور کرنے والے نشانات نہ بھیجے جائیں گے کیونکہ ایمان اختیاری پر ثواب ملتا ہے نہ کہ اضطراری پر اور نبوت ایمان لانے کے لئے ہے نہ کہ تماشے دکھانے کے لئے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** اپنے کو بڑا سمجھنا جہالت ہے عقل مند وہ ہے جو سب سے پہلے اپنا درجہ پہچانے دیکھو رب تعالیٰ نے ہم کلامی رب کے مطالبہ کہ جہالت فرمایا۔ **دوسرا فائدہ:** بیداروں کے لئے معمولی اشارہ کافی ہے اور قلب غافل کے لئے کھلے ہوئے معجزات بھی ناکافی چونکہ ان کفار کے قلب غافل تھے انہوں نے اتنی نشانیوں کو نشانی ہی نہ مانا لیکن قسمت والوں نے صرف سن کر ایمان قبول کر لیا۔ **تیسرا فائدہ:** یقین اور ایمان محض اپنی کوششوں سے نہیں ملتا یہ عطائے الٰہی ہے۔ **چوتھا فائدہ:** وسیلہ انبیاء کا انکار کفر ہے بلاواسطہ اچھی چیز مانگنا بھی بے دینی۔ ان کفار نے رب سے بلاواسطہ ہی ہم کلامی چاہی تھی۔ جس پر عتاب فرمایا گیا اتنے بڑھ گئے کہ آپ سے مستغنی ہوگئے۔ **پانچواں فائدہ:** جو وسیلہ انبیاء کا منکر ہے وہ نہ اپنے کو پہچانتا ہے نہ رب کو انسان اگر اپنی مجبوری اور رب کی قہاری کو جانتا ہے تو ایسی غلط خواہش کر سکتا ہی نہیں۔ اس لئے قرآن کریم نے فرمایا لَا یَعْلَمُوْنَ۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآنی آیتیں یقین والوں کے لئے ہیں جن کو پہلے ہی سے یقین ہے ان کو آیتوں کی ضرورت کیا؟ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں۔ ایک یہ کہ اہل یقین سے مراد وہ لوگ ہیں جن میں یقین کی لیاقت اور استعداد ہے نہ وہ کہ جنہیں یقین بالفعل حاصل ہے دوسرے یہ کہ اہل یقین سے وہ مراد ہیں جو یقین حاصل کرنے کی کوشش کریں ضدی اور ہٹ دھرم نہ ہوں۔ تیسرے یہ کہ اہل یقین سے ایسے یقین والے مراد ہیں جن کا یقین علم الٰہی میں آچکا ہے چوتھے یہ کہ اس یقین سے فطری یقین مراد ہے یعنی یہ جو یوم میثاق کے یقین پر قائم رہے دنیا کی بری صحبتوں نے اس کو وہم وشک کی ظلمتوں میں پھنسا نہ دیا ہو، **دوسرا اعتراض:** رب نے کفار کو جواب دیتے ہوئے اگلے کافروں کا ذکر کیوں کیا۔ **جواب:** تاکہ نبی ﷺ کے قلب پاک کو ان اعتراضات سے تکلیف نہ پہنچے اور وہ خیال فرمالیں اور انبیاء کرام سے بھی ایسی کج بحثیاں کی گئی تھیں۔

تفسیر صوفیانہ

علم توحید تمام علوم کی اصل ہے جو توحید سے جاہل رہا وہ رب کی آیات اور اس کے کلام سے بھی واقف ہے چونکہ اگلے پچھلے کفار اس علم سے محروم رہنے میں یکساں تھے۔ اس لئے ان کی کج بحثیاں بھی یکساں۔ خیال رہے کہ علم اور ایمان ہر قوم کو

یکساں فائدہ پہنچاتے ہیں۔ ایسے ہی جہالت و بے دینی ہر ایک کے لئے یکساں مضر دیکھو اگلے پچھلے کفار اگرچہ زمانہ اور زبان وغیرہ میں مختلف تھے۔ مگر چونکہ کفر میں شریک تو ان سے کلام بھی یکساں صادر ہوئے۔ اسی طرح حضرت صدیق اکبر اور حسن بصری وغیرہ بعد والے حضرات زمانہ وغیرہ میں مختلف تھے مگر چونکہ سلسلہ ایمانی میں سب جکڑے ہوئے تھے اور ہر قریب بعد پر ایک ہی آفتاب نے تجلی فرمائی تھی۔ لہٰذا وہ چمکنے میں یکساں رہے۔ اگرچہ درجات میں فرق ہوا اسی لئے آخرت میں جہنم سب اگلے پچھلے کفار کو اپنے میں جمع کرے گی اور جنت سارے مومنین کو کیونکہ یہ دونوں قومیں دنیا میں بھی کفر یا ایمان میں جمع تھیں۔ نیز ایمان ہر چیز کو صحیح دکھاتا ہے اور کفر غلط کفار خود حقیر تھے مگر ان کے کفر نے انہیں عظیم دکھایا اور اللہ تبارک تعالیٰ جل شانہ کی آیتیں عظیم تھیں۔ مگر انہیں حقیر معلوم ہوئیں۔ حق تعالیٰ ہمیں حق کو حق اور باطل کو باطل دکھائے۔ (آمین)

اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا ۙ وَّ لَا تُسْئَلُ عَنْ
تحقیق ہم نے بھیجا آپ کو ساتھ حق کے خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا اور نہ سوال کیے جائیں گے
بے شک ہم نے تمہیں حق کے ساتھ بھیجا خوشخبری اور ڈر سناتا اور تم سے دوزخ والوں کا
اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ ﴿۱۱۹﴾
آپ بابت میں دوزخ والوں کے
سوال نہ ہوگا

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں سے معلوم ہوا تھا کہ کفار نے عناداً معجزات مانگے اور رب نے ان کے جوابات بھی دیئے تھے اب فرمایا جارہا ہے کہ اے نبی ﷺ ہم نے آپ کو ان سے مناظرہ کرنے کے لئے بھیجا ہی نہیں آپ ان کے بکواس سے تنگ دل نہ ہوں۔ آپ نے اپنا مقصد رسالت پورا فرمادیا گویا پہلے کلام کا رخ کفار کے جواب کی طرف تھا اور اب اپنے محبوب ﷺ کے تسکین خاطر کی طرف۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ ہم نے بہت سی آیتیں ظاہر فرمائی ہیں اب ان آیات کی تفصیل فرمائی جارہی ہیں کہ مجموعہ آیات آپ کی ذات اور صفات ہیں۔ **تیسرا تعلق:** پہلے فرمایا گیا تھا کہ کفار رب سے ہم کلامی کا مطالبہ کرتے ہیں اب فرمایا جارہا ہے کہ یہ لوگ اگر ایمان لے آئیں تو ان کو یہ ہم کلامی کا درجہ حاصل ہے کیونکہ ہم نے آپ سے کلام کیا اور یہ لوگ بھی آپ ﷺ سے کلام کریں۔ تو گویا یہ ہم سے ہی کلام کریں گے۔ جیسے عید کے ہلال میں تمام دنیا کے مسلمانوں کی نگاہیں جمع ہو جاتی ہیں سب طالب ہوتے ہیں وہ مطلوب ایسے ہی حضور ﷺ کی ذات بابرکات میں تمام نگاہیں جمع ہیں۔ تمام مخلوق بھی آپ کو دیکھتی ہے اور خالق عالم کی بھی نظر آپ پر ہے جو رب سے ملنا چاہے وہ حضور سے ملے۔

ہر کہ خواہد ہم نشینی باخدا او نشیند در حضور مصطفیٰ

اسی طرح جو رب کو دیکھنا چاہے وہ حضور ﷺ کی آنکھوں کی زیارت کرے۔ جن آنکھوں نے رب ذوالجلال کو دیکھا۔

جہاں اکھیاں نے دلبر ڈٹھا اوہ اکھیں تک لیاں ۔ تو ملیوں تو ساجن ملیا ہن آساں لگ گیاں

شان نزول

تفسیر روح البیان وعزیزی نے صراحۃً اور تفسیر مدارک نے اشارۃً فرمایا کہ ایک بار حضور ﷺ فرماتے تھے کہ کاش میں اپنے والدین کا انجام معلوم کرلوں تب یہ آیت کریمہ اتری اس کے بعد حضور ﷺ نے کبھی اپنے والدین کا ذکر نہیں فرمایا۔ لیکن شیخ جلال الدین سیوطی نے اس روایت کو ضعیف فرمایا اور کہا کہ اس صورت میں یہ آیت گذشتہ سے بے ربط بھی ہو جائے گی۔

تفسیر

اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ اے نبی ﷺ ہم نے آپ کو بھیجا ہے یعنی آپ مخلوق کی طرف ہمارا عزیز ہدیہ ہیں اور جو شخص کہ شاہی ہدیہ کی قدر نہ کرے وہ یقیناً بادشاہ کے عتاب میں آتا ہے۔ نیز آپ پہلے ہی سے ہماری بارگاہ میں حاضر تھے آپ کی تکمیل کر کے اور نبوت کا تاج آپ کے سر پر رکھ کر آپ کو بھیجا اب جو آپ میں عیب نکالے وہ درحقیقت ہم میں عیب نکالتا ہے کیونکہ سند یافتہ شاگرد میں عیب نکالنا درحقیقت سند دینے والے کا انکار ہے۔ نیز ہم نے اور تمام مخلوق کو تو پیدا کیا ہے تم کو بھیجا ہے یعنی دیگر لوگ اپنا کام کرنے، اپنی ذمہ داری پر دنیا میں گئے اور تم ہمارا کام کرنے ہماری ذمہ داری پر گئے۔ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا بحق سے یا تقاضاء حکمت مراد ہے یا صداقت وحقانیت یا معجزات وآیات یا دلائل قدرت یا سچا دین اور یا قرآن کریم اور بِالْحَقِّ کا تعلق یا تو اَرْسَلْنَا سے ہے یا مُؤَيِّدًا یا مُلْتَبِسًا پوشیدہ سے یا بشیر، نذیر سے یعنی ہم نے آپ کو بہ تقاضائے حکمت یا صداقت وحقانیت دے کر یا دلائل ومعجزات سے مضبوط کر کے یا دین قدیم اور قرآن عطا فرما کے بھیجا۔ یا آپ کو سچا بشیر، نذیر بنا کر بھیجا۔ مبشر تو تبشیر سے بنا ہے۔ جس کے معنی ڈرانا غالباً منت کو بھی اس لئے نذر کہا جاتا ہے کہ اس کے پورا نہ کرنے میں عذاب کا ڈر ہے۔ اگرچہ نبی ﷺ بشیر بھی ہیں اور نذیر بھی مگر اطاعت کرنے والوں کے لئے بشیر اور نافرمانوں کے لئے نذیر اور انبیاء بھی بشیر نذیر تھے لیکن وہ سن کر اور حضور دیکھ کر کیونکہ حضور نے معراج میں بچشم سر رب کو دیکھا اور جنت کی وہ نعمتیں بھی ملاحظہ فرمائیں جو کسی آنکھ نے نہ دیکھیں کسی کان نے نہ سنیں۔ اور نہ کسی کے وہم وگمان میں آئیں۔ جہنم کی ساری چیزوں کو بھی دیکھا لہٰذا دیگر انبیاء کرام کی بشارت کامل ہے اور آپ کی کامل تر وَّلَا تُسْئَلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ اس کے دو قرائتیں ہیں ایک وَّلَا تُسْئَلُ نفی مجہول اور ایک لَا تَسْئَلْ نہی معروف جحیم جَحْمَةٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں شعلہ نار کی تیزی۔ پہلی قرائت پر اس کی عبارت کے تین معنی ہیں ایک یہ کہ جہنمی کفار کے متعلق آپ سے باز پرس نہ ہوگی کہ یہ ایمان کیوں نہ لائے۔ کیونکہ آپ نے اپنا فرض تبلیغ پورا انجام دے دیا نیز تبلیغ آپ کا کام تھا ہدایت ہمارا کام ہم اپنے کام کا آپ سے سوال نہ کریں گے کہ انہیں ہدایت کیوں نہ دی دوسرے یہ کہ حدیث میں آتا ہے کہ اگلی امتوں کے کفار اپنے انبیاء کی تبلیغ کا انکار کریں گے کہ امت رسول ﷺ ان انبیاء کے حق میں گواہی دے گی۔ اس گواہی پر وہ جرح کریں گے کہ تم نے وہ زمانہ نہ پایا بغیر دیکھے گواہی کیوں داغ رہے ہو۔ جس کی توثیق کے لئے حضور ﷺ تشریف لائیں گے اور آپ کی گواہی

پر انبیاء کرام کے حق میں ڈگری ہوگی ۔ اور کفار کو بھی اب جرح کرنے کی جرات نہ ہوگی ۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے ۔ لِتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (بقرہ : ۱۴۳) یہی واقعہ اس آیت میں بتایا جارہا ہے کہ اے محبوب تم کلیم اللہ یا روح اللہ تو نہیں کہ قیامت کے میدان میں آپ کا کفار سے مقدمہ ہو بلکہ آپ حبیب اللہ ہیں کسی کافر کو آپ کی تبلیغ کے انکار کی جرات نہ ہوگی اور کسی کو آپ کی گواہی پر جرح کرنے کی جرات نہ ہوگی ۔ تیسرے یہ کہ حضور کو اپنے والدین ماجدین کے متعلق فکر تھی کہ ان کا انجام کیا ہوا اور اگر وہ جہنمی ہوئے تو لوگ سوال کر سکیں گے کہ آپ کے والدین کو آپ سے فائدہ کیوں نہ ہوا تو تسکین دی گئی کہ اے محبوب کوئی شخص آپ سے یہ سوال نہ کر سکتا کیونکہ وہ جہنمی ہیں ہی نہیں ، سوال تو جب ہو کہ جہنمی ہوں خیال رہے کہ قضیہ سالبہ موضوع کے وہ نہ ہونے پر بھی صادق آجاتا ہے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں سوال تو جب ہو کہ اوروں سے تو اپنی ذات اور اپنی اولاد وغیرہ کے متعلق سوال ہوگا کہ تمہارے اہل وعیال گمراہ یا گنہگار کیوں ہوئے مگر اے محبوب ﷺ آپ سے اس قسم کا نہ حساب کتاب ہوگا نہ سوال و جواب کیونکہ آپ تو خود معصوم ہیں اور آپ کے سارے اہل وعیال مومن اور گناہوں سے محفوظ اور کیوں نہ ہوں آسمان کا سورج ہزار ہا میل سے گندی زمین کو سکھا کر پاک کر سکتا ہے تو دونوں جہان کا سچا سورج ﷺ اپنے ساتھیوں کو کیونکر نہ پاک فرمادے ۔ آپ کے اہل قرابت میں سے جو لوگ ایمان نہ لائے ان کا اپنا قصور ہے آپ نے تبلیغ میں پوری کوشش فرمادی ۔ چمگادڑ بے نور رہتے ہیں آفتاب بے قصور ہے لہٰذا آپ سے اس قصور کا کوئی سوال نہ ہوگا ۔ دوسری قرات یعنی لَا تَسْئَلْ بصیغہ نہی کے یہ معنی ہیں کہ اے محبوب علیہ السلام برزخیوں یعنی آپ اپنے ماں باپ کا حال کچھ نہ پوچھو کیونکہ یہ آیت انہیں کے بارے میں آئی ہے ۔ انشاء اللہ یہ بحث خلاصہ تفسیر میں آئے گی ۔

خلاصہ تفسیر

کفار سے جوابات ارشاد فرما کر اپنے محبوب ﷺ کو تسکین دی جاتی ہے کہ آپ ان اوندھے سوالات سے ناخوش نہ ہوں خود ہم نے نہ کہ کسی اور نے آپ کو دین حق یا قرآن کریم یا معجزات دے کر بھیجا ہے تاکہ آپ ماننے والوں کو بشارت دیں ۔ اور منکروں کو آنے والی مصیبت سے ڈرائیں جو اس بشارت اور خوف سے ایمان لائے گا وہ سچا مومن ہے کسی کو جبراً ایمان دینا ہمارا کام نہیں کیونکہ جبری ایمان پر کوئی ثواب نہیں ملتا جو آپ پر اعتبار نہ کرے اپنے دلائل پیش کرے کہ ثواب کس چیز کا ملنا ہے اے محبوب ﷺ اگر کوئی بدنصیب آپ کی بات نہ مانے تو آپ سے کوئی پرسش نہ ہوگی کیونکہ آپ نے تبلیغ میں کوئی کوتاہی نہیں فرمائی جو آپ بات نہ مانے وہ جہنمی ہے اور انکی ذلت وخواری ورسوائی اور سختی عذاب کا حال کچھ مت پوچھو وہ بیان کے قابل نہیں ۔ خیال رہے محبوب پاک جناب مصطفیٰ ﷺ کو حجاز کی سرزمین میں تریسٹھ سال کے لئے بھیجا گیا ۔ مگر رسالت شریف کو ہمیشہ کے لئے سارے عالم میں بھیجا گیا ۔ جیسے سورج خود تو چوتھے آسمان پر ہے مگر اس کی چمک دمک سارے جہاں میں ۔ اس آیت میں حضور کی رسالت کا ذکر ہے وَاَنْتَ حِلٌّ بِهٰذَا الْبَلَدِ (البلد : ۲) آپ کے جسم پاک کے مکہ معظمہ میں رہنے کا تذکرہ ہے اسی لئے یہاں یہ نہ فرمایا کہ آپ کو کہاں بھیجا اور کب تک کے لئے بھیجا سرکار فرماتے ہیں ۔ خَيْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِيْ اس میں اپنی حیات جسمانی کا ذکر ہے اور فرماتے ہیں اَنَا وَالسَّاعَةَ كَهَاتَيْنِ اس میں حیات رسالت کا

ذکر ہے غرضیکہ زمانہ نبی اور ہے اور زمانہ نبوت کچھ اور حضور کا زمانہ نبوت ابدالاباد تک ہے اور جہاں رب کی خدائی وہاں حضور کی مصطفائی ہے۔

حضور کے والدین کریمین کے ایمان کی بحث

حضرت آمنہ خاتون اور حضرت عبداللہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے ایمان میں بہت گفتگو کی گئی۔ بعض ظاہرین علماء نے اس آیت کریمہ سے ان کا جہنمی ہونا سمجھا العیاذ باللہ۔ ہم اس بارے میں نہایت منصفانہ تحقیقات کرتے ہیں۔ قارئین سے امید انصاف ہے اور حضور سید المرسلین علیہ السلام اور ان کے پروردگار رب العالمین تبارک وتعالیٰ سے امید قبول۔ خیال رہے کہ اس مسئلہ میں چار قول ہیں۔ ایک یہ کہ یہ دونوں حضرات نہ زندگی میں مومن تھے نہ موت کے وقت اور نہ اب۔ یہ قول ملا علی قاری وغیرہ کا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس میں خاموشی چاہئے ان کا حال رب جانے۔ تیسرے یہ کہ دونوں حضرات بروقت موت تو ایمان پر نہ تھے لیکن اب مومن ہیں۔ چوتھے یہ کہ وہ زندگی میں موحد مومن تھے بروقت وفات بھی توحید پر قائم رہے اور اب وہ دین اسلام پر ہیں یہ اخیر قول ہی صحیح ہے۔ جمہور علماء کا یہی عقیدہ ہے سکوت کرنے والے کہتے ہیں کہ ان کے ایمان و کفر دونوں کے دلائل ملتے ہیں لہٰذا اس مسئلہ میں زبان نہ کھولنی چاہئے اور ان کے متعلق نیک گمان ہی لازم ہے جو لوگ کہ انہیں زندگی میں کافر اور اب مومن مانتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ بعض روایتوں سے ان کا مشرک ہونا معلوم ہوتا ہے اور حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے انہیں حج وداع کے موقع پر زندہ کر کے کلمہ پڑھایا جیسے کہ شامی نے امام قرطبی اور امام ناصر الدین وغیرہم سے روایت کی جو لوگ کہتے ہیں کہ وہ پہلے بھی ایمان پر نہ تھے اور اب بھی نہیں۔ وہ کچھ آیتیں، کچھ احادیث، کچھ بزرگان دین کے اقوال اور دلائل عقلی پیش کرتے ہیں۔ **پہلی دلیل:** یہی آیت ہے کہ حضور علیہ السلام نے اپنے والدین کا حال دریافت کرنا چاہا تو فرمایا گیا کہ آپ جہنمیوں کا حال نہ پوچھئے۔ معلوم ہوا کہ وہ حضرات اس وقت بھی جہنمی ہیں۔ نعوذ باللہ من ذالک، ان کی **دوسری دلیل:** ایک بار حضور علیہ السلام نے اپنی والدہ کے لئے دعائے مغفرت کی اجازت چاہی تب یہ آیت اتری۔ مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَن يَسْتَغْفِرُوا لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ (التوبہ: ۱۱۳) جس میں فرمایا گیا کہ آپ مشرکین کے لئے دعائے مغفرت نہ کریں جس سے معلوم ہوا کہ معاذ اللہ وہ اب بھی مشرک ہیں ان کی **تیسری دلیل:** مشکوٰۃ باب زیارت القبور میں مسلم کی روایت ہے کہ حضور علیہ السلام نے اپنی والدہ کی قبر کی زیارت کی خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رلایا۔ اور فرمایا کہ میں نے ان کی مغفرت کے لیے رب سے اجازت چاہی تھی نہ ملی۔ اور ان کی زیارت قبر کی اجازت چاہی مل گئی اس حدیث سے معلوم ہوا کہ آمنہ خاتون مومنہ نہیں ہیں معاذ اللہ ان کی **چوتھی دلیل:** حضور علیہ السلام نے ایک بدوی سے فرمایا کہ میرے اور تمہارے والد دوزخ میں ہے نیز دوسری روایت میں آتا ہے کہ دو صاحبوں نے پوچھا ہماری مائیں کہاں ہیں تو فرمایا دوزخ میں۔ انہوں نے پوچھا آپ کی والدہ کہاں ہیں تو فرمایا کہ میری والدہ بھی تمہاری ماں کے ساتھ ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ دوزخ

میں ہیں۔ان کی **پانچویں دلیل:** امام اعظم ابوحنیفہ رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ فقہ اکبر میں فرماتے ہیں کہ حضور کے والدین ماجدین نے کفر پر وفات پائی۔امام کے قول کے ہوتے ہوئے حنفیوں کو حق نہیں کہ ان کو مومن مانیں۔ان کی **چھٹی دلیل:** والدین کریمین کو زندہ کر کے ایمان دینا عقل ونقل کے خلاف ہے۔نقلاً تو اس لئے کہ یہ حدیث ضعیف ہے عقلاً اس واسطے کے نزع سے پہلے کا ایمان معتبر ہے۔وقت موت اور بعد موت کا ایمان نا قابل قبول بلکہ عذاب الٰہی دیکھ کر زندگی میں بھی معتبر نہیں ہوتا دیکھو فرعون ڈوبتے وقت ایمان لایا تو فرمایا گیا آٰلْـٰٔنَ وَقَدْ عَصَيْتَ قَبْلُ (یونس:۹۱) پہلے نافرمانی کر کے اب ایمان لاتا ہے تو ان دونوں حضرات کا وفات کے بعد والا ایمان کیسے معتبر ہوگا رب فرماتا ہے۔ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ (البقرہ:۲۱۷) نیز فرماتا ہے وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ (النساء:۱۸) نیز قیامت سے پہلے مردوں کا اٹھنا بھی خلاف عقل ہے۔محققین علماء یہ کہتے ہیں کہ دونوں حضرات اپنی زندگی اور وفات میں موحد مومن تھے اور اب مسلمان بلکہ مسلمانوں کے سردار اور صحابی ہیں وہ جہنم کے قریب بھی نہیں ہمارے دلائل حسب ذیل ہیں۔ **ہماری پہلی دلیل:** یہی آیت کریمہ ان کے متعلق جو شان نزول بیان کی جاتی ہے وہ ضعیف ہے۔دیکھو کتاب التعظیم والمنہ مصنفہ شیخ جلال الدین سیوطی رحمتہ اللہ علیہ بلکہ اس کے معنی تو وہ ہیں جو کہ ہم تفسیر میں عرض کر چکے کہ آپ سے جہنمیوں کے بارے میں سوال ہی نہ ہوگا کیونکہ آپ کے والدین جنتی ہیں۔سوال کیسا؟ **دوسری دلیل:** رب فرماتا ہے لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ (التوبہ:۱۲۸) ایک قرات میں ف کے فتحہ سے ہے یعنی تمہارے پاس یہ عظمت والے رسول نفیس ترین جماعت میں سے تشریف لائے اور کافر نفیس نہیں بلکہ خبیث ہے معلوم ہوا کہ حضور کے والدین بلکہ سارے آباؤ اجداد اعلیٰ مومن ہیں۔ ہماری **تیسری دلیل:** رب فرماتا ہے تَقَلُّبَكَ فِي السّٰجِدِيْنَ (شعراء:۲۱۹) اے نبی علیہ السلام ہم آپ کے مومنین کی پشتوں اور شکموں میں دورے کو دیکھ رہے ہیں یعنی از آدم تا عبداللہ آپ کے سارے آباء واجداد مومن اور عابد رہے دیکھو تفسیر مدارک وجمل وغیرہ ہماری **چوتھی دلیل:** مشکوۃ باب فضائل سید المرسلین میں بروایت بخاری ہے کہ حضور فرماتے ہیں بُعِثْتُ مِنْ خَيْرِ قُرُوْنِ بَنِيْ اٰدَمَ قَرْنًا فَقَرْنًا حَتّٰى كُنْتُ مِنَ الْقَرْنِ الَّذِيْنَ كُنْتُ مِنْهُ جس سے معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام ہمیشہ انسانوں کی بہتر جماعت میں منتقل ہوتے رہے یعنی آپ کے نور کی گردش بھی پاک پیٹھوں اور پیٹوں میں رہی اور پیدائش شریف بھی بہترین پشت وشکم سے ہوئی اور مشرک خیر نہیں بلکہ شر ہے۔ہماری **پانچویں دلیل:** مشکوۃ زیارت القبور کی وہ حدیث کہ حضور علیہ السلام کو آمنہ خاتون کی قبر کی زیارت کی اجازت ملی نہ کہ استغفار کی اگر وہ کافر ہوتیں تو زیارت قبر کی اجازت نہ ملتی قرآن کریم فرماتا ہے۔ وَلَا تَقُمْ عَلٰى قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ (التوبہ:۸۴) جس سے معلوم ہوا کہ کفار کی قبر کی زیارت منع ہے۔رہا استغفار کی اجازت نہ ملی وہ اس لئے نہیں کہ وہ کافرہ تھیں بلکہ اس لئے کہ وہ بے گناہ ہیں۔گنہگار تو وہ جس کو شرعی احکام پہنچیں اور وہ ان کی مخالفت کرے ان کی شریعت کے احکام پہنچے ہی نہیں اسی لئے بچے کی نماز جنازہ میں دعائے مغفرت نہیں ہوتی۔رہا حضور کا گریہ فرمانا وہ محبت فرزندی کے جوش سے ہے کہ آج وہ زندہ ہوتیں تو ہماری اس شان کو دیکھ کر آنکھیں ٹھنڈی فرماتیں۔ہماری **چھٹی دلیل:** آج تک

دلیل قوی تو کیا کسی ضعیف دلیل سے بھی ان دونوں صاحبوں کی بت پرستی یا عقیدہ کفر ثابت نہیں ہوا بلکہ ان کے اقوال سے ان کے ایمان کا پتہ لگتا ہے۔ چنانچہ علامہ سیوطی نے اپنی کتاب التعظیم والنہ میں بروایت دلائل النبوت مصنفہ ابونعیم بیان کیا کہ آمنہ خاتون نے اپنی وفات کے وقت حضور ﷺ کے چہرۂ پاک پر حسرت سے نظر کی اور ان کی یتیمی پر خیال کر کے یہ اشعار پڑھے۔

بَارَکَ اللّٰهُ فِیْکَ مِنْ غُلَامِیْ — یَا اِبْنِی الَّذِیْ مِنْ حُرْمَةِ الْحَمَام

فَاَنْتَ مَبْعُوْثٌ اِلَی الْاَنَامِ — مِنْ عِنْدِ ذِی الْجَلَالِ وَالْاِکْرَام

تُبْعَثُ فِی الْحِلِّ وَ الْحَرَام — تُبْعَثُ بِالتَّحْقِیْقِ وَالْاِسْلَام

دِیْن اَبِیْکَ الْبَرِّ اِبْرَاهَام — فَاللّٰهُ اَنْهَاکَ عَنِ الْاَصْنَام

یعنی اے بیٹے اللہ تجھے برکت دے۔ مجھے یقین ہے کہ تم رب کی طرف سے ساری مخلوق کے نبی ہو گے۔ اور حل و حرم، عرب و عجم میں اسلام پھیلاؤ گے۔ اللہ تمہیں بت پرستی سے بچائے گا۔ اور دین ابراہیمی تم سے پھیلائے گا اور پھر فرمایا:

و کل کثیر یفنی وانامیتۃ و ذکری باق و قد ترکت خیراً و ولدت طھراً

یعنی میں تو مر جاؤں گی مگر میرا ذکر قیامت تک رہے گا کیونکہ میں نے بہترین چیز پاک فرزند چھوڑا ہے۔ اس سے ان کے دین ابراہیمی پر قائم ہونے کا پتہ لگتا ہے۔ ہماری **ساتویں دلیل:** حضور کی پیدائش سے پہلے آپ کی تشریف آوری کی دھوم مچ گئی تھی۔ لوگ آپ کی نبوت، آپ کی بت شکنی اور دیگر صفات کے خطبے پڑھ رہے تھے حضرت عبداللہ نے بہت سے عجائب خود دیکھے تھے۔ آمنہ خاتون نے حمل شریف اور ولادت پاک میں بہت معجزات مشاہدہ کئے حتیٰ کہ اصحاب فیل کا عجیب و غریب واقعہ دیکھا کہ اس حمل پاک کی برکت سے جماعت فیل کو ابابیل نے مار دیا زمانہ حمل میں ہر ماہ ایک پیغمبر خواب میں حضرت آمنہ کو حضور ﷺ کی بشارت، ان کے اوصاف کی خبر دیتے رہے۔ ایک دفعہ حلیمہ دائی نے آپ سے عرض کیا کہ تمہارے فرزند کا سینہ چاک کیا گیا ہے میں ڈرتی ہوں تو آپ نے فرمایا مت ڈر یہ سچے نبی ہیں انہیں شیطان وغیرہ نقصان نہیں پہنچا سکتے وغیرہ وغیرہ تو کیونکر ممکن ہے کہ یہ باتیں دیکھ کر بھی وہ بت پرست ہی رہیں۔ ہماری **آٹھویں دلیل:** ابو لہب نے حضور ﷺ کی پیدائش کی تھوڑی سی خوشی کی تو اسے عذاب میں تخفیف ہو گئی۔ آپ کی قبر انور عرش اعظم سے افضل جس مچھلی کے پیٹ میں یونس علیہ السلام رہے وہ عرش سے اعلیٰ جس سیپ میں موتی رہے وہ قیمتی تو جو والدہ پاک نو مہینہ اس در یتیم کو اپنے صدف شکم میں رکھے اور ان کے پیدا ہونے کی خوشیاں منائے کیونکر ممکن ہے کہ وہ جہنمی ہو۔ ہماری **نویں دلیل:** رب فرماتا ہے وَمَا كُنَّا مُعَذِّبِيْنَ حَتّٰى نَبْعَثَ رَسُوْلًا (الاسراء: ۱۵) یعنی ہم کسی قوم کو بغیر ان میں رسول بھیجے ہوئے عذاب نہیں دیتے تو ان دونوں صاحبوں کی طرف دعوت تبلیغ پہنچی ہی نہیں تو عذاب کیسا۔ **دسویں دلیل:** شیخ فرماتے ہیں کہ کسی پیغمبر کی ماں کافرہ نہ ہوئیں تو حضور کی والدہ کا کافرہ ہونا کیونکر ممکن ہے۔ ہماری **گیارھویں دلیل:** اصحاب فترت یعنی عیسیٰ علیہ السلام اور حضور ﷺ کے درمیانی لوگوں کے لئے فقط عقیدہ توحید کافی ہے اور اسی سے ان کی

نجات ہے یہ دونوں صاحب عین جوانی میں وفات پا گئے، چنانچہ حضرت عبداللہ کی عمر پچیس سال ہوئی اور آمنہ خاتون کی اس سے بھی کم لہٰذا انہیں صحبت کفار کم ملی۔ ہماری **بارھویں دلیل**: ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ بنا کر دعا کی تھی۔ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ مولیٰ! ہماری اولاد میں ایک مسلمان جماعت رکھنا پھر فرمایا تھا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ (بقرہ:۱۲۹) اور اسی مسلمان جماعت میں آخری نبی بھیجنا وہ دعا حضور ﷺ سے پوری ہوئی اس سے معلوم ہوا کہ حضور ﷺ مسلم جماعت سے پیدا ہوئے اس کی تفسیر ان آیات کی تفسیر میں دیکھو۔ قائلین کفر کے دلائل حسب ذیل ہیں اور ان کے جواب یہ ہیں۔ اول اس لئے کہ اس آیت کا نزول حضور ﷺ کے والدین کے بارے میں ہے ہی نہیں۔ دیکھو شامی اور کتاب التعظیم والسنہ اور تفسیر کبیر و عزیزی وغیرہ۔ لیکن دوسری دلیل اس لئے کہ یہ آیت مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ (توبہ:۱۱۳) حق یہ ہے کہ ابو طالب کے بارے میں آئی یا ان مسلمانوں کے بارے میں جنہوں نے اپنے مشرک ماں باپوں کے لئے دعائے مغفرت کا ارادہ کیا تھا۔ بخاری نے بھی اس کا نزول ابو طالب کے حق میں مانا۔ جو روایت تم نے پیش کی ہے اس کو ناقدین حدیث نے سخت ضعیف کہا اور ضعیف حدیث سے کفر جیسا اہم مسئلہ ثابت نہیں ہوتا۔ دیکھو تفسیر خزائن العرفان یہی آیت۔ ان کی تیسری دلیل زیارت قبر والی اس کا جواب ہم اپنے دلائل میں دے چکے۔ رہی چوتھی دلیل وہ اس لئے کہ محدثین نے فرمایا ہے کہ یہ حدیث منسوخ ہے۔ حضور علیہ السلام نے ان کی نجات کے علم سے قبل فرمایا تھا دیکھو شامی باب المرتدین یا یہ حدیث سخت ضعیف ہے اگرچہ مسلم نے روایت کی دیکھو کتاب التعظیم یا یہاں ابی سے مراد چچا ابو طالب ہیں اہل عرب چچا کو باپ کہہ دیا کرتے ہیں۔ قرآن فرماتا ہے لِأَبِيهِ آزَرَ اور چچا کو باپ فرمایا گیا نیز فرماتا ہے۔ اٰبَآئِكَ إِبْرٰهِمَ وَإِسْمٰعِيلَ وَإِسْحٰقَ (البقرہ:۱۳۳) **پانچویں دلیل**: اس کا جواب یہ ہے کہ فقہ اکبر کے نسخوں میں بہت اختلاف ہے۔ بعض میں ہے کہ مَاتَا عَلَى الْكُفْرِ اور بعض میں ہے مَا مَاتَا عَلَى الْكُفْرِ یعنی ان کا انتقال کفر پر نہ ہوا اور بعض نسخوں میں یہ مسئلہ بالکل ہے ہی نہیں۔ چنانچہ مولوی وکیل احمد صاحب سکندر پوری نے فقہ اکبر کا نہایت صحیح نسخہ حیدر آباد سے حاصل کر کے چھپوایا اور ثابت کیا کہ یہ صحیح ہے اور باقی نسخے غلط ہیں اس میں اس مسئلہ کا پتہ بھی نہیں بعض نسخوں میں ہے کہ مَاتَا عَلَى الْفِطْرَةِ یعنی وہ حضرات دین فطرت یعنی توحید پر دنیا سے گئے۔ بعض نسخوں میں ہے مَا مَاتَا عَلَى الْكُفْرِ یعنی وہ دونوں کفر پر فوت نہ ہوئے اتنے اختلاف کے ہوتے ہوئے ایک نسخہ پر کیسے یقین کیا جائے اور اگر صحیح مان بھی لو تو یہ مسئلہ اجتہادی یا تقلیدی نہیں تا کہ اس میں امام کی پیروی واجب ہو بلکہ یہ تاریخی واقعہ ہے اگر اس کے خلاف ثبوت ہو جائے تو اسی کو مانا جائے جیسے مسئلہ لعن یزید اور اطفال مشرکین وغیرہ۔ **دلیل چھٹی**: اس کا جواب یہ ہے کہ والدین کریمین کو زندہ کرنے کی حدیث بالکل صحیح شامی نے باب المرتدین میں فرمایا کہ امام قرطبی اور حافظ ہشام ابن ناصر الدین وغیرہ نے اسے صحیح بتایا شیخ جلال الدین نے کتاب الفضل میں انہی حافظ شمس الدین کے یہ اشعار نقل فرمائے۔

حَبَا اللّٰهُ النَّبِيَّ مَزِيْدَ فَضْلٍ عَلٰى فَضْلٍ وَكَانَ بِهٖ رَءُوْفًا
فَاَحْيَا اُمَّهٗ وَكَذَا اَبَاهُ لِاِيْمَانٍ بِهٖ فَضْلًا لَطِيْفًا

اور قاعدہ ہے کہ جرح پر تعدیل مقدم اور فضائل اعمال میں حدیث ضعیف بھی معتبر اور یہ بھی والدین کریمین کے فضائل ہی کی حدیث ہے نیز مردوں کو زندہ کرنا ممکن ہی نہیں بلکہ واقع ہے حضرت عیسیٰ و موسیٰ و حزقیل علیہم السلام وغیرہم انبیاء نے مردے زندہ کئے حتیٰ کہ قریب قیامت دجال کافر بھی لوگوں کو مار کر زندہ کرے گا حضور علیہ السلام نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے بچوں اور ایک جماعت کو زندہ فرمایا دیکھو شرح قصیدہ بردہ، خرپوتی، مدارج النبوۃ شامی باب المرتدین وکتاب الفضل وغیرہ۔ اگر آپ ﷺ نے والدین کریمین کو بھی زندہ فرمایا ہو تو کون سی قباحت ہے اسی طرح بعد موت یا عذاب الٰہی دیکھ کر ایمان قبول ہونا بھی تعجب کی بات نہیں اصحاب کہف زندہ ہو کر حضرت امام مہدی کے ساتھ رہیں گے اور امت مصطفیٰ ﷺ میں داخل ہو کر حج بھی کریں گے۔ (روح البیان یہی آیت وکتاب التعظیم) حضرت یونس علیہ السلام کی قوم عذاب دیکھ کر ایمان لائی جو کہ قبول ہو گیا۔ قرآن کریم فرماتا ہے فَلَوْلَا كَانَتْ قَرْيَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَآ اِيْمَانُهَآ اِلَّا قَوْمَ يُوْنُسَ (یونس: ۹۸) جس سے معلوم ہوا کہ حضرت یونس علیہ السلام کی یہ خصوصیت تھی کہ ان کی قوم کا ایمان یاس بھی قبول کر لیا گیا اسی طرح یہ بھی حضور ﷺ کی خصوصیت ہے کہ آپ کے والدین ماجدین کا ایمان بعد وفات قبول کر لیا گیا۔ خصوصیات قوانین کو خاص کر دیتی ہیں۔ دیکھو حضور نے ڈوبا ہوا سورج واپس فرما کر حضرت علیؓ کو گئی ہوئی نماز تو پڑھا دی جو شہنشاہ کہ قضا نماز کو سورج لوٹا کر ادا کرا دیں وہ اپنے والدین کو زندہ فرما کر کلمہ بھی پڑھا سکتے ہیں۔ رہا قرآن پاک کا یہ فرمانا وَلَا الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ (النساء :۱۸) یا یہ فرمانا فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ (البقرہ: ۲۱۷) ان کے بارے میں ہے جو مشرک و کافر ہو کر مرے ہوں۔ جب وہ دونوں حضرات موحد ہو کر وفات پائیں تو اس آیت میں کیونکر داخل ہوں گے اگر یہ حضرات مشرک ہوتے تو ان کا اسم شریف عبد اللہ اور آمنہ نہ ہوتا بلکہ کفار کا سا نام ہوتا۔ عبد اللہ کے معنی ہیں اللہ کا بندہ اور آمنہ کے معنی ہیں اللہ کی امانت رکھنے والی۔ یا دنیا کو امن دینے والی بی بی یا ایمان والی جوان کو آمنہ کہہ کر کافر کہتا ہے وہ ایسا ہے جیسے کہ حضور کو محمد کہہ کر ان کی گستاخی کرے اور اگر معاذ اللہ وہ دونوں کفر میں وفات پاتے جب بھی حضور کی خصوصیات ان کے ایمان کو درست کرا کر انہیں جہنم سے بچا لیتی اور کیوں نہ ہو رب تعالیٰ فرماتا ہے وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى (الضحیٰ: ۵) رب آپ کو اتنا دے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔ وہ کون سعادت مند بیٹا ہے جو کہ اپنے والدین کے جہنمی ہونے پر راضی ہو جائے حضور علیہ السلام نے حضرت انسؓ کے دسترخوان سے ہاتھ پونچھ لئے تھے تو وہ تنور کی آگ میں نہیں جلتا تھا تو کیا جن پستانوں کو حضور نے چوسا وہ جہنم میں جل سکتے ہیں۔ کیا آمنہ خاتون حضرت مریم اور موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ سے بھی کم رہیں گی کیا یہ رب کو پسند ہوگا کہ حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی والداؤں کو جنت میں دیکھیں اور اس محبوب کی والدہ ماجدہ وہاں نظر نہ آئے بلکہ جہنم میں جائے۔ قسم ان کے رب کی یہ کبھی نہ ہوگا۔ لہٰذا حق یہ ہے کہ وہ دونوں حضرات اپنی زندگی پاک میں موحد مومن تھے۔ اور انہیں حجۃ الوداع میں حضور نے زندہ فرما کر کلمہ پڑھا کر مسلمان کیا۔ اور اب وہ امت مصطفیٰ ﷺ کے اولیاء کاملین میں سے ہیں۔ صحابہ ہیں۔

حکایت: ضلع سیالکوٹ میں ایک دیوبندی مولوی نے وعظ میں کہا کہ تم لوگ حضور کی شفاعت کی آس لگائے بیٹھے ہو وہ تو

اپنے ماں باپ کی بھی شفاعت نہ کر سکیں گے کہ وہ دونوں جہنم میں جائیں گے۔ وعظ ختم ہونے پر ایک جاہل کسان نے پوچھا کہ مولوی صاحب مولوی اور حافظ کا کیا درجہ ہے۔ دیو بندی بولا کہ عالم اپنی سات پشت کو اور حافظ اپنی تین پشت کو بخشوائے گا۔ کہ کسان بولا کہ مولوی تو سات پشت کو بخشوا لے اور معراج میں جانے والے قرآن لانے والے سرکار ﷺ اپنی ماں کو بھی نہ بخشوا سکے اس کے بعد دیو بندی مولوی ذلیل کر کے نکالا گیا۔ یہاں تک تو دلائل تھے لیکن مقام عقیدت میں ان دلائل سے میری آنکھیں اندھی اور میرے کان بہرے اور میری زبان گونگی ہے۔ جو حضور کے والدین کریمین کا کفر ثابت کریں وہ احادیث ضعیف ہیں اور وہ دلائل باطل ہیں در حقیقت انہیں کے گھر کا یہ سارا باغ ہے وہی اس کے مالی اور خود اس سے محروم رہیں یہ کیونکر ممکن ہو سکتا ہے مسلم کی حدیث ضعیف مان لینا آسان ہے۔ راوی حدیث کی غلطی تسلیم کرنا سہل ہے۔ لیکن شہنشاہ کونین کے والدین کو کافر ماننا سخت مشکل ہے۔ غضب ہے کہ مسلم کی روایت یا راوی حدیث کی حمایت میں حضور کے والدین کو کافر مان لیا جائے وصلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہ سیدنا و مولانا محمد وآلہ وبارک وسلم اس مسئلہ کی زیادہ تحقیق کے لئے شمول الاسلام مصنفہ اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خان بریلوی قدس سرہ، اور ہماری کتاب شان حبیب الرحمن کا مطالعہ کرو۔

وَ لَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَ لَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ
اور ہر گز نہیں راضی ہوں گے تم سے یہودی اور نہ عیسائی یہاں تک کہ پیروی کرو
اور ہر گز تم سے یہود اور نصاریٰ راضی نہ ہوں گے جب تک تم ان کے دین کی
مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَ لَئِنِ
تم دین ان کے کی۔ تم فرما دو تحقیق ہدایت اللہ کی وہی ہدایت ہے اور البتہ اگر
پیروی نہ کرو۔ تم فرما دو اللہ ہی کی ہدایت ہدایت ہے اور اے سننے والے (کسے باشد)
اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ
پیروی کرے تو نفسانی خواہشات کی ان کے پیچھے اس کی کہ آ گیا تیرے پاس علم
اگر تو ان کی خواہشوں کا پیرو ہوا بعد اس کہ تجھے آ چکا علم
مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّ لَا نَصِیْرٍ ﴿۱۲۰﴾
نہیں ہے واسطے تیرے اللہ سے کوئی دوست بچانے والا اور نہ مددگار
تو اللہ سے تیرا کوئی بچانے والا نہ ہوگا نہ مددگار

تعلق

اس آیت کا گذشتہ آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں کفار کی کج روی کا ذکر تھا اور نبی ﷺ کو

ان کے ایمان سے مایوس کیا گیا تھا۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ وہ اتنے سخت ہیں کہ اس پر بھی راضی نہیں کہ تم علیحدہ رہو اور وہ علیحدہ بلکہ وہ تو اس پر راضی ہیں کہ تم ان کے جھوٹے دین میں چلے جاؤ۔ اس صورت میں ان کے ایمان کی کیا امید ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں سے شبہ ہوسکتا تھا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ ان یہود و انصاریٰ نے گزشتہ پیغمبروں کے معجزات پسند کر کے ان کا دین قبول کرلیا اور نبی آخر الزمان ﷺ کے معجزات سے منہ پھیر گئے۔ اب جواب دیا جارہا ہے کہ اس کی وجہ محض حسد اور خود پسندی ہے کہ وہ اپنا پیشوا رہنما اور دوسروں کا اپنے تابع ہونا پسند کرتے ہیں۔ چونکہ پہلے نبی تو ان کی قوم کے تھے اس لئے انہیں مان لیا۔ اور یہ پیغمبر ان کی قوم کے نہیں اس لئے انکار کر دیا۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ رب نے آپ کو بشیر و نذیر بنا کر بھیجا اب فرمایا جارہا ہے کہ اس بشارت اور ڈرانے میں کفار کی رضامندی کا لحاظ نہ کریں کیونکہ وہ تو تمہیں اپنے میں ملائے بغیر راضی نہیں ہو سکتے۔

تفسیر

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى یہ غیب کی خبر ہے اور سارے کفار کا یہی حال ہے کہ وہ مسلمانوں سے مسلمان رہتے ہوئے بھی راضی نہیں ہو سکتے۔ مگر چونکہ وہاں یہودیوں عیسائیوں سے ہی سابقہ تھا نیز عرب میں یہی لوگ اہل علم مشہور تھے اور وہ چاہتے تھے کہ سارا جہان ہمارا تابعدار رہے اور ہم سب کے سردار اس لئے یہاں انہی دو قوموں کا ذکر فرمایا گیا۔ **حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ** یہ حضور علیہ السلام سے خطاب ہے اور اشارۃً بتایا جارہا ہے کہ ان کا آپ سے راضی ہونا محال ہے کیونکہ محال پر موقوف بھی محال ہے حضور علیہ السلام پیغمبر ہیں پیغمبر سے گناہ بھی ناممکن ہے چہ جائیکہ کفر تو فرمایا گیا ہے کہ ان کی رضا اس پر موقوف ہے کہ آپ ان کا دین اختیار کریں اور یہ تو قطعاً محال لہٰذا وہ بھی محال خیال رہے کہ اطاعت کے معنی ہیں فرمانبرداری اور اتباع کے معنی ہیں کسی کے قدم بقدم چلنا یعنی ان کی نقل کرنا اسی لئے اطاعت تو اللہ تعالیٰ کی رسول کی علماء و سلاطین اسلامیہ کی ہوسکتی ہے مگر اتباع صرف حضور کی ہوگی رب فرماتا ہے۔ **اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ** (النساء:۵۹) اور فرماتا ہے **فَاتَّبِعُوْنِيْ** یعنی اطاعت میں اللہ رسول اولی الامر کا ذکر فرمایا گیا اتباع میں صرف حضور کا۔ کیونکہ مطلقاً پیروی صرف حضور کی ہوسکتی ہے لہٰذا آیت کا مطلب یہ ہوا کہ یہود و نصاریٰ اسی وقت ہی آپ سے راضی ہو سکتے ہیں جبکہ آپ ان کی ملت کی اندھا دھند پیروی کریں کہ وہ کہیں رب صاحب اولاد ہے تم کہو بالکل ٹھیک وہ کہیں گائے، سور سب حلال تم کہو بالکل درست نعوذ باللہ۔ خیال رہے کہ ملت کے لفظی معنی ہیں لکھوانا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے **وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ** (البقرہ:۲۸۲) چونکہ انبیائے کرام بھی شرعی قوانین اپنی امت کو لکھوا دیتے ہیں اس لئے انہیں ملت کہا جاتا ہے۔ اور چونکہ امت ان قوانین کی اطاعت کرتی ہے اس لئے وہ دین بھی کہلاتے ہیں۔ (دین بمعنی اطاعت) اور چونکہ وہی قوانین رب کے پانے کا راستہ بھی ہیں اس لئے شریعت بھی کہتے ہیں شریعت، بمعنی کھلا راستہ رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ **شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا** (مائدہ:۴۸)، ملت اور دین میں یہ فرق ہے کہ دین تو رب، نبی اور مجموعہ امت اور ہر امتی کی طرف مضاف ہوسکتا ہے مگر ملت کی نسبت ہر امتی کی طرف نہیں ہوتی صرف رب تعالیٰ پیغمبر اور ساری امت کی طرف ہوسکتی ہے۔ خیال رہے کہ یہاں یہودی اور عیسائی دو قوموں

کے لئے ایک ملت فرمایا کیونکہ ساری ملتیں کفر میں ایک ہی ہیں اَلْکُفْرُ مِلَّةٌ وَّاحِدَةٌ نیز اس جگہ پر لطف اشارہ یہ بھی ہے کہ ان دونوں کا راضی ہونا اجتماع ضدین پر موقوف ہے۔ لہٰذا محال کیونکہ دین عیسوی وموسوی ضدین ہی تھے اور ایک شخص ایک وقت میں عیسائی یہودی نہیں بن سکتا قُلْ اِنَّ ھُدَی اللّٰہِ ھُوَ الْھُدٰی اس میں ان دونوں کو کامیابی سے مایوس فرمایا گیا ہے۔ یعنی آپ اعلان فرمادو کہ اللہ کی ہدایت یعنی اسلام ہی سچی ہدایت ہے۔ پیغمبر سے یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ حق کو چھوڑ کر باطل اختیار کرے اگر چہ وہ دونوں دین بھی اللہ تعالیٰ کی ہدایت تھے لیکن ان کے منسوخ ہو چکنے کے بعد ان کی پیروی کرنا گمراہی ہے نیز تم نے ان میں بہت ملاوٹ کر دی جس سے وہ اللہ کے دین نہ رہے بلکہ وہ تمہاری خود ساختہ خواہشات بن گئے۔ خیال رہے کہ اس جگہ یا تو پہلی ہدایت سے اسلام اور دوسری ہدایت سے ہدایت حقیقی مراد ہے یا اس کے برعکس یعنی اسلام ہی ہدایت حقیقی ہے یا ہدایت حقیقی اسلام ہی ہے اور تمہارے ادیان ہدیٰ نہیں بلکہ ہویٰ ہیں۔ (خواہشات نفسانی) بلکہ اگر یہاں قُلْ میں نبی ﷺ سے خطاب ہے تو ہدی اللہ سے مراد وہ الہامی ہدایت ہے جو حضور کو اول ہی سے دی گئی جس کی وجہ سے آپ ظہور نبوت سے پہلے بھی تمام برائیوں سے محفوظ رہے۔ ہر نیکی نماز وغیرہ ادا کرتے ہیں یعنی اللہ کی وہ ہدایت جس پر میں پیدا کیا گیا ہوں وہ سچی ہدایت ہے اور اگر قُلْ میں مسلمانوں سے خطاب ہے تو ہدیٰ اللہ سے مراد یا اسلام ہے یا قرآن یا حضور ﷺ کے فرمان یا خود حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذات ہے۔ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَھْوَآءَھُمْ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ یہ حضور علیہ السلام ہی سے خطاب ہے یعنی اگر بفرض محال آپ ان کی خواہشات کی پیروی کریں قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ (زخرف:۸۱) نہ خدا کا بیٹا ہونا ممکن ہے اور نہ حضور علیہ السلام کا ان بے دینوں کی طرف مائل ہونا قضیہ شرطیہ محض تعلیق بتاتا ہے۔ اسے مقدموں کے امکان سے کوئی تعلق نہیں مگر تفسیر خازن اور تفسیر خزائن العرفان میں فرمایا کہ یہ امت سے خطاب ہے یعنی اے مسلمان اگر تو نے یہ حرکت کی اس صورت میں کوئی اعتراض ہی نہیں پڑتا۔ خیال رہے کہ اھواء، ھوا کی جمع ہے جس کے لغوی معنی ہیں اوپر سے نیچے گرنا یا اڑتا پھرنا رب فرماتا ہے۔ اَوْ تَهْوِيْ بِهِ الرِّيْحُ (حج:۳۱) اصطلاح میں نفسانی خواہش کو ھویٰ کہتے ہیں کیونکہ وہ بھی انسان کو نیچے گراتی ہے۔ شریعت میں گمراہ کن خیالات کو ھویٰ کہتے ہیں اسی لئے گمراہوں کو اہل ھویٰ بھی کہا جاتا ہے چونکہ ان دونوں دینوں سے حقانیت نکل کر ان میں نفسانیت شامل ہو گئی تھی اس لئے انہیں اھواء فرمایا گیا ان کے اس خیال کو کہ حضور علیہ السلام ان کی پیروی کریں اھواء کہا اور چونکہ۔ ان میں سے ہر ایک شخص کی یہ خواہش تھی اس لئے جمع بولا گیا بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ علم کے معنی ہیں کسی چیز کا صحیح جاننا یہاں یا تو اس سے قرآن مراد ہے یا اسلامی قوانین یا ان دنیوی قوانین کا منسوخ ہو جانا۔ یعنی اے مسلمان اگر تو نے قرآن یا احکام اسلام یا یہودیت، نصرانیت کا بطلان جان کر پھر اس کی پیروی کی تو مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ تمہارے لئے خدا کی طرف سے نہ سفارشی دوست مقرر ہے نہ کوئی مددگار جو کہ تمہیں عذاب الٰہی سے بچا سکے۔ خیال رہے کہ ولی اور نصیر میں یہ فرق ہے کہ ولی جو دوستی اور آشنائی کی وجہ سے مدد کرے مگر اس کی کامیابی یقینی نہ ہو نصیر وہ جس کی کامیابی یقینی ہو اگر چہ وہ اجنبی ہو۔ لہٰذا ان دونوں میں عموم خصوص من وجہ ہے (روح البیان)۔ اس آیت کی بناء پر علماء فرماتے ہیں کہ کفار سے اچھی باتیں بھی یہ سمجھ کر لو کہ ہمارے اسلام کی تعلیم ہے یہ

ہمارے کھیت کا دانہ اور ہمارے باغ کا پھل۔ بلکہ جھولی کا گرا ہوا موتی ہے جو غیروں نے اٹھالیا ہے آج ہم امریکہ و برطانیہ کے سچے معاملات و دیانتداری کی تعریفیں کرتے ہیں کیونکہ یہ اسلامی تعلیم ہے۔

خلاصہ تفسیر

اگرچہ اس دین حق کی اندرونی اور بیرونی خوبیاں اس کی حقانیت کی کھلی ہوئی دلیل ہیں جن سے دل میں تو مخالفین بھی قائل ہیں مگر یہود و نصاریٰ کی ضد اور تعصب کا یہ حال ہے کہ جب تک آپ خود ان کی جہالت اور گمراہی کے جس کو انہوں نے اپنا دین وملت بنا رکھا ہے تابع نہ ہو جائیں وہ آپ سے خوش بھی نہ ہوں گے آپ ان ازلی بدنصیبوں کے ہدایت پر آنے کی امید نہ رکھیں بلکہ انہیں علانیہ فرمادیں کہ حقیقی ہدایت تو وہی ہے جو اللہ کی طرف سے ہے یعنی دین اسلام پیغمبر تو لوگوں کو ہدایت دینے کے لئے آتے ہیں یہ کیونکر ممکن ہے کہ وہ خود کسی کے خیالات کی پیروی کریں اور اے قرآن کے پڑھنے والے مسلمان تو بھی خیال رکھنا کہ اگر تو نے حقانیت سے معلوم کر کے اور ہدایت تک پہنچ کر پھر ان کی خواہشات نفسانیہ کی پیروی کی تو تجھ سے سایہ فضل خداوندی اٹھ جائے اور تجھ میں بھی وہی زہر سرایت کر جائے گا اور پھر تیری غیبی رحمت باقی نہ رہے گی اور نہ کوئی تیرا دوست و مددگار ہوگا جو تجھے اللہ کے عذاب سے بچالے۔ تفسیر حقانی نے کہا کہ اہل کتاب حضور علیہ السلام سے درخواست کرتے تھے کہ اگر آپ اپنا قبلہ بدل دیں اور جانوروں کے حلال و حرام ہونے میں ہم سے اتفاق کرلیں تو باقی تمام باتوں میں ہم آپ کی باتیں مان لیں گے۔ اس آیت میں حضور علیہ السلام سے ارشاد فرمایا گیا کہ آپ کسی مصلحت وقت سے بھی کسی کی نفسانی خواہش پوری نہ فرمائیں اور ان کے مسلمان ہو جانے کی امید پر فروعی مسائل میں بھی ان کا کہنا نہ مانیں۔ کیونکہ آپ پر ہر حقیقت حال ظاہر ہو چکی ہے اور ان پر آپ کی اطاعت ضروری ہے نہ کہ آپ پر ان کی خیال رہے کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے یہودیت یا نصرانیت کو اہواء یعنی نفسانی خواہشات کا مجموعہ بتایا تین وجہ سے ایک یہ کہ ان دینوں میں اہواء شامل کر دیئے گئے تو جیسے مفید دواء میں زہر ملا دینے سے وہ دوا قابل استعمال نہیں رہتی ایسے ہی توراۃ وانجیل وغیرہ ملاوٹوں کی وجہ سے قابل عمل نہ رہیں۔ دوسرے یہ کہ توراۃ وانجیل نسخ سے پہلے ہدیٰ تھیں منسوخ ہو کر ہوئی بن گئیں کہ ان پر عمل حرام ہو گیا جیسے ماں کا دودھ جوان بچہ پر حرام ہے یا دن میں بجلی یا قمقمہ بلا وجہ روشن کرنا فضول خرچی اور حرام ہے حالانکہ یہ کبھی جائز تھے تیسرے یہ کہ توراۃ وانجیل کے نسخ سے پہلے ان پر عمل کرنے کا حکم ربانی تھا۔ بعد نسخ رب نے ان پر عمل کرنے سے منع فرمادیا تو اب اسے ماننا شیطانی یا نفسانی عمل ہو گیا۔ جیسے طبیب جب اپنے پچھلے نسخہ کا استعمال مریض کو منع کر دے تو اب اسے استعمال کرنا مریض کا ناجائز عمل ہے جس کا وہ خود ذمہ دار ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** کافر مسلمان سے کبھی راضی نہیں ہو سکتے کیونکہ انہیں تو اسلام سے چڑ ہے نہ کہ مسلمان کی ذات سے، ہندوستان کے مسلمانوں نے اس کا تجربہ بھی کرلیا۔ نئی روشنی کے مسلمان ہندوؤں کو راضی کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا چکے انہوں نے اپنی مسلمان قوم ہی کو کچلا۔ کبھی خلافت کے بہانے سے صدہا نہ

کرنے والے کام کرلئے۔ گاندھی جی کی جے انہوں نے لگائی قربانی کی گائے کو انہوں نے روکا۔ اپنی پیشانیوں پر قشقے انہوں نے لگائے مسلمانوں سے سرکاری نوکریاں چھوڑا کر ہندوؤں کو دلوائیں۔ ہجرت کرا کر بے گھر انہیں بنایا اب بھی احرار، جمعیت علماء ہند اور دیو بند کا مدرسہ ہندوؤں کے اشارہ ابرو پر چل رہے ہیں مگر کفار اب تک ان سے راضی نہ ہوئے کاش کہ وہ لوگ اس آیت کریمہ پر غور کریں اور اس کفار پرستی اور گاندھی کی پوجا چھوڑ کر بجائے رواداری کے اپنے میں خودداری پیدا کریں اور سمجھ لیں کہ مسلمان اپنی ہی قوم سے عزت پاسکتے ہیں نہ کہ دوسری قوموں سے کفار کو راضی کرنے کے بجائے اللہ ستار غفار کو راضی کرنے کی کوشش کریں۔ **دوسرا فائدہ**: مسلمانوں کے لئے باذن اللہ تعالیٰ رب کی طرف سے ولی بھی ہیں اور مددگار بھی کیونکہ یہاں بتایا گیا ہے کہ کافروں کے لئے کوئی ولی یا مددگار نہیں جو لوگ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مددگار نہیں وہ اپنے آپ کو کافر سمجھتے ہوں گے۔ ہمارے لئے تو انبیاء اولیاء قرآن رمضان بلکہ چھوٹے بچے بھی باذن الٰہی مددگار ہیں۔ **تیسرا فائدہ**: دلائل ظاہر ہونے کے بعد تقلید حرام ہے اسی لئے کہا جاتا ہے کہ عالم مجتہد کو غیر کی تقلید ناجائز (تفسیر کبیر و عزیزی)۔ اس کی زیادہ تحقیق کے لئے ہماری کتاب جاء الحق کا مطالعہ کرو۔ **چوتھا فائدہ**: دوسری تفسیر سے معلوم ہوا کہ احکام محال پر بھی معلق ہو جاتے ہیں کافر قطعی کو ایمان کی رغبت دینا اور مومن قطعی کو بے ایمانی سے ڈرانا جائز ہے تاکہ دوسرے لوگ سن کر عبرت پکڑیں۔ (عزیزی) **پانچواں فائدہ**: علم الٰہی سے اسباب باطل نہیں ہوتے رب کو خبر ہے کہ زید قتل ہوگا مگر اس کے قاتل کو پھر بھی پھانسی دی جائے گی۔ اور قانون یہ بنایا جائے گا کہ قتل کا بدلہ قتل ہے۔ دیکھو نبی علیہ السلام بلکہ صدیق اکبر و فاروق اعظم وغیرہم کا کفار کی پیروی کرنا قریباً ناممکن تھا لیکن پھر بھی اس پر عذاب کو معلق کر دیا۔ (تفسیر عزیزی)۔ **چھٹا فائدہ**: مجذوب لوگ علم الٰہی پر نظر کرتے ہوئے اسباب چھوڑ دیتے ہیں مگر سالکین اس آیت کو دیکھ کر اسباب پر عمل کرتے ہیں یعنی مجذوب رب کی قدرت کو دیکھتے ہیں اور سالکین اس کی حکمت کو اسی لئے سالک مجذوب سے افضل ہے انبیاء کرام اور اولیاء اللہ جانتے ہیں کہ فلاں بیمار کو شفا نہ ہوگی۔ مگر پھر بھی اسے دوا پلاتے ہیں مگر مجذوب دواء اور حکیم کے احسان سے سبکدوش رہتے ہیں۔ **ساتواں فائدہ**: رب تعالیٰ بے خبر پر عذاب نہیں بھیجتا ہاں جو عمداً بے خبر رہے اس کو عذاب ہوسکتا ہے۔ رب نے حق کے دلائل قائم فرمادیئے اب جو باطل پر رہے وہ مجرم ہے اسی لئے اس آیت میں علم آچکنے کی قید لگائی گئی۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: جن مفسرین نے وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ میں حضور سے خطاب مانا ہے ان کے قول پر یہاں اِنْ نہ آنا چاہئے تھا بلکہ لَوْ آنا ضروری تھا کیونکہ ناممکنات کے نہ ہونے کا یقین ہے اور اِن شک کے لئے ہے قرآن کریم نے فرمایا۔ لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ (انبیاء:۲۲) **جواب**: اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ ان مفسرین کے نزدیک بھی بظاہر نبی علیہ السلام سے خطاب ہے مگر درحقیقت دوسروں کو سنانا منظور۔ اس لئے اِن لایا گیا دوسرے یہ کہ جہاں ناممکن واقع فرض کیا جائے تو وہاں اِن بولا جاتا ہے۔ جیسے اِنْ كَانَ زَيْدٌ حِمَارًا فَهُوَ نَاهِقٌ یعنی اگر زید کو گدھا فرض کرلو وہ تو رینگنے والا ہے اس آیت میں فرض

محال ہے اور لَوْ کَانَ میں یہ فرض نہیں اس لئے یہاں اِنْ لایا گیا دوسری جگہ لَوْ۔ **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ کفار مسلمانوں سے دوستی کرتے ہیں۔ حضور غوث پاک کی گیارہویں کرتے ہیں۔ نبی علیہ السلام کی نعتیں لکھتے ہیں ابوطالب ایمان پر نہ تھے مگر حضور سے راضی تھے۔ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ یہ آیت فقط خاص متعصب یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں ہے۔ اسی لئے انہیں کا نام بھی لیا گیا۔ مگر یہ جواب ضعیف ہے کیونکہ یہاں یہود و نصاریٰ میں کوئی قید نہیں نیز اور دوسری آیت میں مشرکین کو بمقابلہ عیسائیوں کے مسلمانوں کا زیادہ سخت دشمن بتایا گیا چنانچہ ارشاد ہوا لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوا الْیَهُوْدَ وَالَّذِیْنَ اَشْرَكُوْا (مائدہ: ۸۲) دوسرے یہ کہ اس قسم کے کفار صرف نام کے کافر رہ جاتے ہیں حقیقتاً دل میں خود اپنے دین سے بیزار ہوتے ہیں چنانچہ ابوطالب صرف نام ہی کے کافر رہ گئے تھے ابوطالب کے متعلق کچھ گفتگو ہم کر بھی چکے ہیں اور مکمل بحث ان آیتوں کی تفسیر میں کریں گے جہاں ان کا ذکر آئے گا۔ امام احمد ابن دحلان مکی رحمۃ اللہ علیہ اپنی کتاب اسنی المطالب فی ایمان ابی طالب میں فرماتے ہیں کہ ابوطالب نے اپنے نعتیہ اشعار میں ساری ایمانیات کا اقرار کر لیا صرف حضور کے آرام کی خاطر صراحۃً ایمان ظاہر نہ کیا کہ میرے بظاہر کافر رہنے پر میری زندگی میں اور بعد موت کفار حضور علیہ السلام کا لحاظ کریں گے اور انہیں ایذا نہ پہنچائیں گے۔ یعنی انہوں نے نار بھی اختیار کی تو حضور کے آرام کی خاطر اسی لئے حضور علیہ السلام نے ان کو جہنم سے نکال کر اس کے جھیرے میں رکھ دیا دیکھو مشکوٰۃ باب صفت النار بحوالہ بخاری۔ تیسرا جواب یہ ہے کہ اس قسم کے عام کفار درحقیقت اسلام اور مسلمانوں سے راضی نہیں۔ بلکہ بعض کفار تو محض دنیوی نفع کی خاطر گیارہویں کرتے ہیں اور عام شعراء داد لینے کے لئے نعت لکھتے ہیں۔ اگر دل سے راضی ہوتے تو مسلمان ہو جاتے۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ مسائل میں کفار کی بالکل رعایت نہ کی جائے حالانکہ خود نبی کریم ﷺ نے تالیف قلوب کے لئے بہت موقعوں پر ان کی رعایت فرمائی۔ شروع اسلام میں ان کو زکوٰۃ دینا جائز رہا۔ انہیں کی خاطر سترہ مہینے تک بیت المقدس مسلمانوں کا قبلہ رہا وغیرہ لہٰذا اگر ہم بھی ہندوؤں کو راضی کرنے کے لئے قربانی گائے چھوڑ دیں تو کیا حرج ہے جائز باتوں میں ان کو راضی کر لیا کریں **جواب:** کفار کے راضی کرنے کے لئے دین کے جائز کام بھی چھوڑنا گناہ ہے عبداللہ ابن سلام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہودیت کی خاطر اونٹ کے گوشت سے پرہیز کیا تھا تو آیت آئی اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۪ وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ (البقرہ: ۲۰۸) اسلام میں پورے آجاؤ شیطان کے قدم بقدم نہ چلو حضور علیہ السلام نے زکوٰۃ اور قبلہ وغیرہ میں کسی کافر کی خواہش پر عمل نہ کیا بلکہ رب کے حکم پر رب نے خواہ اسی لئے فرمایا ہو لیکن ہم تو اسکے فرمان پر عمل کریں گے ایسی کوئی مثال نہ ملے گی کہ جہاں کفار کی خواہش پر آپ نے احکام اسلامیہ میں فرق کیا ہو اسلام کا ہر قانون اپنی جگہ قائم رہے گا۔ ہندوؤں کی خاطر اذان و قربانی گائے وغیرہ نہیں بند کی جا سکتی۔

تفسیر صوفیانہ

نفس امارہ کافر ہے اور روح مومن۔ شیطان نفس کا مددگار اور فرشتہ روح کا وزیر۔ ضروری ہے کہ نفس کو مغلوب رکھنے کیلئے اس

کی ہر خواہش پامال کی جائے اور اس کی پوری پوری مخالفت کی جائے اگر کوئی چاہے کہ نفس و روح میں اس طرح صلح کرا دے کہ روح تو نفس کی بعض خواہشات پورے کرے اور نفس بعض چیزوں میں روح کی اطاعت کرے یہ ناممکن ہے نفس امارہ روح سے اس وقت تک راضی نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسے بالکل اپنے ہم رنگ نہ کرلے نفس اس شیر خوار بچہ کی طرح ہے کہ اگر اس کی بعض ضدیں پوری کی جائیں تو اور زیادہ ضدی بنتا ہے اور اگر مہربان دایہ جبراً اس کا دودھ نہ چھڑا دے تو وہ کبھی اس پر راضی نہ ہو لہٰذا اے روح اگر تو نے علم حاصل ہونے کے بعد نفس کی تھوڑی بھی پیروی کی تو رب کی خاطر سے جو تیرا معاون اور مددگار فرشتہ مقرر ہے وہ تجھ سے جاتا رہے گا اور پھر تو اس پردیس میں بے یار و مددگار ٹھوکریں کھاتی پھرے گی پس چاہئے کہ۔

بائیں رستے نہ جا مسافر سن راہ ہے راہ مار پھرتے ہیں

خیال رہے کہ ولایت یعنی دوستی اور مدد تین قسم کی ہے۔ جسمانی، طغیانی، ایمانی، پہلی دو قسم کی دوستیاں رکھنے والے ولی من دون اللہ ہیں اور تیسری دوستی اور ولایت والے ولی من اللہ جسمانی محبت مرتے ہی مٹ جائے گی رب فرماتا ہے يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ ۝ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ (عبس: ۳۴) دوسری محبت بعد موت دشمنی میں بدل جائے گی مگر تیسری محبت و مدد ابد الاباد تک قائم رہے گی۔ رب فرماتا ہے اَلْاَخِلَّاۗءُ يَوْمَىِٕذٍۢ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ (زخرف: ۶۷) قیامت میں ولی من دون اللہ ہرگز کام نہ آئیں گے بلکہ نقصان پہنچائیں گے۔ رب فرماتا ہے وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (البقرہ: ۱۰۷) اور وَلِیٌّ مِنَ اللّٰهِ مومنوں کو ہر جگہ کام آئیں گے قبر و حشر و دنیا میں ان کی مدد برحق ہے رب فرماتا ہے اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوا (مائدہ: ۵۵) اور فرماتا ہے وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (النساء: ۷۵) اور فرماتا ہے فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ مَوْلٰىهُ وَجِبْرِيْلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ بَعْدَ ذٰلِكَ ظَهِيْرٌ (التحریم: ۴) یہاں اس آیت کا منشا ہے کہ اگر تم نے یہود و نصاریٰ کی پیروی کی تو تمہارا ولی من اللہ کوئی نہ ہوگا رہے ولی من دون اللہ وہ اگرچہ بہت بن جائیں گے مگر ان کی ولایت تمہیں مضر ہوگی جیسے شیطان اور کفار کہ اگرچہ یہ تمہارے اس وقت ظاہری دوست بن جائیں مگر بعد موت دشمن ہوں گے اور اگر تم مومن رہے تو تمہارے ولی من اللہ بہت ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ حضور ﷺ صالح مسلمان فرشتے یہ سب دنیا و آخرت میں تمہارے ولی بھی نصیر بھی۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ

جو کہ دی ہم نے انہیں یہ کتاب تلاوت کرتے ہیں وہ اس کی حق تلاوت اس کی کا یہ لوگ

جنہیں ہم نے کتاب دی ہو وہ جیسے چاہئے اس کی تلاوت کرتے ہیں وہ ہی

يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۱۲۱

ایمان لاتے ہیں ساتھ اس کے اور جو انکار کرے اس کا پس یہ لوگ وہ ٹوٹا پانے والے ہیں

اس پر ایمان رکھتے ہیں اور جو اس کے منکر ہوں پس یہ لوگ تو وہی لوگ زیاں کار ہیں

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں یہود و نصاریٰ کی ہٹ دھرمی اور ان کے سخت عناد کا ذکر کیا گیا ہے۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ سارے اہل کتاب کا یہ حال نہیں ان میں سے بعض حق پرست بھی ہیں۔
دوسرا تعلق: پچھلی آیت میں یہود و نصاریٰ کے دین کو اہواء یعنی نفسانی خواہشات فرمایا گیا ہے اب اس کی وجہ بتائی جا رہی ہے کہ انہوں نے درحقیقت اس کتاب کو پڑھا نہیں جنہوں نے صحیح پڑھا ہے وہ مسلمان ہو گئے۔ **تیسرا تعلق:** پہلے فرمایا گیا تھا کہ اسلام حقیقی ہدایت ہے اب اس کی دلیل دی جارہی ہے کہ توراۃ وانجیل کو صحیح پڑھنے والوں نے بھی اسے قبول کرلیا۔

شان نزول

بعض صحابہ کرام نے حضور علیہ السلام کی ہجرت سے پیشتر حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی اور حبشہ کے بادشاہ نجاشی وغیرہ کو قرآن سنا کر اسلام کا دلدادہ کرلیا تھا۔ جب حضور علیہ السلام نے مدینہ پاک کی ہجرت کی تو یہ لوگ بھی بذریعہ کشتی وہاں آگئے کیونکہ انہوں نے مجبوراً اتنے روز تک حضور علیہ السلام کا فراق گوارا کیا ان کے ہمراہ چالیس اہل کتاب تھے جن میں سے بتیس اہل حبشہ اور آٹھ شامی راہب تھے۔ انہیں میں بحیرہ راہب بھی شامل تھے ان سب کے سردار حضرت جعفر بن ابی طالب تھے۔ (از تفسیر خزائن العرفان) خیال رہے کہ چالیس تو حبشہ اور شام کے عیسائیوں اور یہودیوں کی تعداد تھی مکہ کے مہاجرین کی تعداد ان کے علاوہ ہے ان حبشی اور شامی اہل کتاب کے بارے میں یہ آیت کریمہ اتری جو قرآن پاک سن کر اور اپنی کتابوں میں حضور علیہ السلام کی نعت دیکھ کر ایمان لا کر حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

تفسیر

اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ پہلی آیت میں فرمایا تھا مِلَّتَهُمْ اور یہاں اٰتَیْنٰهُمُ جس سے معلوم ہوا کہ مفسدین اہل کتاب کا دین اپنا خود ساختہ اور مومنین اہل کتاب کا علم و عرفان رب کا عطا فرمایا ہوا ہے اس لئے وہ کافر رہے اور یہ نور ایمانی سے چمک گئے۔
اَلْكِتٰبَ یا تو اس سے قرآن کریم مراد ہے کیونکہ آئندہ تلاوت کی رغبت اور ایمان کا ذکر ہو رہا ہے اور یہ صفات قرآن کے ہیں توراۃ وانجیل کی نہ تو کوئی باقاعدہ تلاوت ہوئی اور نہ وہ سب ذریعہ ہدایت ہے یا اس سے توراۃ ہی مراد ہے اس لئے کہ اس آیت کے آگے پیچھے بنی اسرائیل ہی کا ذکر ہے اور یہ کشتی والے لوگ توراۃ وغیرہ پڑھ کر اسی کی رہبری سے حضور علیہ السلام پر ایمان لائے تھے یَتْلُوْنَهٗ اگر کتاب سے قرآن مراد ہو تو تلاوت کے معنی ہیں پڑھنا اور اگر اس سے توراۃ وانجیل مراد ہے تو تلاوت کے معنی ہیں پیروی کرنا رب تعالیٰ فرماتا ہے وَالْقَمَرِ اِذَا تَلٰىهَا (شمس: ۲) یہاں تلاوت بمعنی اتباع ہے نہ کہ پڑھنا بلکہ پڑھنے کو بھی تلاوت اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں لکھے ہوئے کی اتباع ہوتی ہے۔ (تفسیر کبیر)۔ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ یہ مصدر محذوف کی صفت ہے یعنی وہ تلاوت ایسی کرتے ہیں جیسی وہ چاہتے ہیں اور جیسے اس کا حق اگر یہاں اہل کتاب مراد ہیں تو حق تلاوت سے مقصود ہے صحیح پڑھنا ان کتابوں میں تحریف و تبدیل نہ کرنا ان کے احکام پر عمل کر کے نبی آخر الزمان ﷺ پر ایمان

لے آنا اور یا کتاب سے قرآن اور لوگوں سے مسلمان مراد ہیں تو حق تلاوت سے اس کا صحیح پڑھنا اس کے معانی میں غور کرنا خشوع وخضوع سے پڑھنا مراد ہے۔ یَتْلُوْنَ مضارع فرما کر اشارۃً فرمایا گیا کہ مومن صرف ایک بار تلاوت کر کے قرآن کریم چھوڑ نہیں دیتے بلکہ وہ ہمیشہ تلاوت کرتے رہتے ہیں مومن کی شان یہ ہے کہ وہ مرتے دم تک تلاوت قرآن کرتا ہے بلکہ اس کے مرتے وقت سورۂ یٰسین کی تلاوت اس کے پاس کی جاتی ہے اس کے مرنے کے بعد اس کے ورثاء وقتاً فوقتاً اسے تلاوت قرآن کا ثواب پہنچاتے رہتے ہیں بلکہ مومن میت قبر میں تلاوت کرتا رہتا ہے اور انشاء اللہ محشر و جنت میں بھی تلاوت کرے گا جیسا کہ روایات میں ہے لہٰذا یَتْلُوْنَ میں بہت وسعت ہے۔ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ یہی لوگ جن کی یہ صفتیں ہیں۔ وہ درحقیقت اس کتاب کے مومن ہیں نہ کہ بدلنے والے اور اس کو عملاً چھوڑنے والے۔ خیال رہے کہ فعل کو جب مبتداء پر مسند کیا جائے تو حصر کا فائدہ دیتا ہے جیسے کہ اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ (البقرہ: ۱۵) (روح البیان)۔ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ اور جو کوئی اہل کتاب اس کا انکار کرے یا تو اس طرح کہ اسے بدل دے یا اس طرح کہ اس قرآن یا نبی آخر الزمان ﷺ کا انکار کر دے جس کی اس کتاب میں بشارت ہے۔ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ پس وہ لوگ بہت ٹوٹا پانے والے ہیں کہ قرآن پر ایمان بھی ان کو حاصل نہ ہوا اور اپنی کتاب سے بھی بے بہرہ ہو گئے اور دنیا میں مقتول، قیدی، جلاوطن ہوئے اور آخرت میں دوزخی رہے اگر اس قسم کے لوگ آپ کی نبوت کا انکار کریں تو آپ اس سے رنجیدہ نہ ہوں کیونکہ یہ درحقیقت اہل کتاب ہی نہیں اگرچہ بظاہر گدھے کی طرح کتاب اٹھائے ہوئے ہیں۔ خیال رہے کہ یہ آیت اگر قرآن اور مسلمانوں کے حق میں ہو تو اس اخیر جملہ کا مطلب یہ ہوگا کہ جو قرآن کریم میں معنوی تحریف کر کے منکر ہو جائے وہ بہت نقصان میں ہے کہ اس کے قریب آ کر نکل گیا اور اس کے ماننے کا کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکا۔

خلاصہ تفسیر

اے نبی ﷺ اگرچہ سب ہی بنی اسرائیل اپنے کو اہل کتاب کہتے ہیں اور بظاہر سب ہی کتاب پڑھتے ہیں مگر درحقیقت کتاب انہیں کو ملی جنہیں ہم نے دی اور جنہوں نے اس کو صحیح طور پر پڑھا اس کی تلاوت کا حق ادا کیا اس کے احکام پر عمل کیا اور جو اس کے بتائے ہوئے راستے پر چلا جن میں یہ صفتیں ہیں وہی اس کے سچے ماننے والے ہیں اور انہیں کا اس پر صحیح ایمان ہے اور جو کہ زبان سے تو کتاب پڑھتا رہا اور عملاً اس کا منکر رہا وہ خسارا والا تاجر ہے کہ اس نے بجائے نفع حاصل کرنے کے اپنی اصل پونجی بھی کھو دی۔

دوسری تفسیر

جنہیں ہم نے قرآن کریم عطا فرمایا وہ اس کی ایسی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کا حق ہے اور یہی حق تلاوت ادا کرنے والے ہیں صحیح معنی میں اس کے ماننے والے ہیں اور جو قرآن کریم کے ماننے کا دعویٰ کرے اور اپنے کو قرآنی یا اہل قرآن کہتا رہے اور درپردہ اس کے احکام کا منکر وہ سخت نقصان میں ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ**: قرآن کریم کا صحیح پڑھنا بھی باعث ثواب ہے جو لوگ کہتے ہیں کہ اس کے پڑھنے کی کیا ضرورت ہے عمل چاہئے وہ سخت غلطی پر ہیں اگر قرآن شریف صرف عمل کے لئے ہوتا اور اس کا دوسرا فائدہ نہ ہوتا تو اس میں منسوخ اور متشابہ آیات نہ ہوتیں جن پر عمل نہیں ہو سکتا قرآن کریم کی محکم آیات عمل کے لئے ہیں۔ اور سارا قرآن کریم تلاوت، شفاء تازگی ایمان کے لئے ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ بغیر ترجمہ جانے قرآن شریف بلکہ نماز بھی نہ پڑھنا چاہئے کیونکہ تلاوت و نماز بارگاہ خداوندی میں درخواست ہے اور جب درخواست دینے والے کو یہی خبر نہ ہو کہ درخواست میں کیا لکھا گیا ہے تو درخواست بے کار ہے مگر یہ خیال غلط ہے اگر قرآن شریف محض درخواست ہوتا تو اردو زبان میں بھی تلاوت کر لیا جاتا صرف عربی کی قید نہ ہوتی۔ اس کی تلاوت کا مقصد یہ ہے کہ جو الفاظ حضرت جبریل نبی کریم ﷺ اور صحابہ نے اپنے منہ سے پڑھے وہ ہماری زبان پر بھی جاری ہو جائیں۔ جن سے باطنی طہارت نصیب ہو، برکت حاصل ہو، مرکب دواء مریض کو مفید ہے خواہ ہمیں اس کے اجزاء کی خبر ہو یا نہ ہو۔ ولایتی پیٹنٹ دوائیں بلا تحقیق اجزاء ہر بیمار استعمال کرتا ہے قرآن طب ایمانی کی دوا ہے جو کارخانہ قدرت میں تیار ہوئی نیز یہ قرآن حضور کی بولی ہے رب کو اپنے محبوب کی بولی پیاری ہے تم کو طوطے مینا کی بولی پیاری اگرچہ وہ یہ نہ سمجھیں۔ رب کو جناب مصطفیٰ کی بولی پیاری بولنے والا اسے سمجھے نہ سمجھے۔ **دوسرا فائدہ**: قرآن پاک کا صحیح طور پر باادب خشوع و خضوع سے پڑھنا ایمان کی علامت ہے۔ **تیسرا فائدہ**: اس تلاوت سے فائدہ ہوگا جو نیک نیتی سے ایمان کے ساتھ ہو ایمان چھوڑ کر صرف تلاوت کرنا قرآن کریم کو اپنے خلاف گواہ بناتا ہے۔ **چوتھا فائدہ**: حق تلاوت میں بہت گفتگو ہے عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حق تلاوت یہ ہے کہ قرآن کریم کے حلال کو حلال جانے اور اس کے محرمات کو حرام سمجھے اور اس کے حروف کو صحیح ادا کرے غفلت سے غلط پڑھنا حرام ہے اور عمداً غلط پڑھنا کفر ہے۔ کیونکہ یہ بھی قرآن کریم کی تحریف ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ حق تلاوت یہ ہے کہ جب جنت کا ذکر آئے تو رب سے مانگے اور جہنم کے ذکر میں اس سے پناہ مانگے۔ عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ حق تلاوت یہ ہے کہ اس کے حلال کو حلال جانے اور اس کے حرام کئے ہوئے کو حرام مانے اور جس طرح اترا ہے ویسے ہی پڑھے اس کے کلمات میں تحریف نہ کرے اور اس کے معنی کی غلط تادیل نہ کرے دنیاداروں کی خاطر اس کے احکام نہ چھپائے۔ حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حق تلاوت یہ ہے کہ قرآن کی ظاہر آیتوں پر عمل کرے متشابہات پر ایمان لائے اور جو آیت سمجھ میں نہ آئے وہ علماء سے پوچھ لے اپنی عقل کو اس میں دخل نہ دے۔ (تفسیر عزیزی) **مسئلہ**: تلاوت قرآن کے آداب یہ ہیں کہ پڑھنے والا باوضو قبلہ رو ہو کر پڑھے۔ سننے والا ادب اور تعظیم سے خاموش ہو کر سنے۔ جہاں لوگ کام کاج میں مشغول ہوں وہاں بلند آواز سے تلاوت نہ کی جائے پڑھنے والا یکسو ہو کر اطمینان قلب سے پڑھے، پڑھتے وقت حضور قلب اور خشوع خضوع ضروری ہے اگر معانی جانتا ہو تو ان پر غور کرتا جائے۔ ورنہ فقط عبارت قرآن پر ہی دھیان رکھے کہ اس کی عبارت بھی بہت لذیذ اور پر لطف ہے۔ **مسئلہ**: چند آدمی مل

کر قرآن کریم بلند آواز سے نہ پڑھیں یا تو سب آہستہ پڑھیں یا ایک بلند آواز سے پڑھے اور باقی سب سنیں **مسئلہ:** قرآن یاد کرنے والے بچوں پر یہ پابندیاں نہیں وہ سب مل کر بلند آواز سے پڑھ سکتے ہیں کیونکہ وہ تلاوت قرآن نہیں بلکہ تعلیم قرآن ہے۔اسی لئے شامی نے فرمایا کہ تلاوت کرتے وقت اعوذ پڑھے مگر استاد کو سناتے وقت نہ پڑھے کیونکہ اعوذ باللہ سنت تلاوت ہے نہ کہ سنت تعلیم۔(شامی باب صفت الصلوٰۃ)

اعتراضات

پہلا اعتراض: اگر اس آیت میں کتاب سے قرآن شریف مراد ہے تو یہ آیت شان نزول کے مطابق نہ رہے گی کیونکہ یہ حبشہ کے یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں آئی **جواب:** چونکہ یہود اور عیسائی قرآن کریم پر ایمان لا کر ایمان لانے کے لئے حاضر دربار ہوئے تھے۔اس لئے انہیں قرآن کریم مل چکا ہے اور یہ اس کے صحیح معنی میں تلاوت کرنے والے تھے۔ لہٰذا شان نزول سے اس کی کوئی مخالفت نہیں روایات میں تو یہ آیا ہے کہ حضرت جعفر طیار نے جب نجاشی کے دربار میں سورۂ مریم اور سورہ طٰہٰ کی تلاوت فرمائی تو خود بادشاہ اور اس کے درباری زار وقطار رونے لگے اسی طرح نجاشی کی قوم کے سترہ (۱۷) آدمی حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضور سے سورۂ یٰسین سن کر بہت روئے جس کا ذکر اس آیت میں ہے۔ وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ (مائدہ: ۸۳) نیز یہ لوگ ادب اور تعظیم سے تلاوت قرآن کرنے لگے تھے **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ جو قرآن کریم کو بحق تلاوت پڑھے وہی مسلمان ہے تو کیا قرآن پاک کو نہ پڑھنے والا کافر ہے۔ **جواب:** اس کے چند جواب یہ ہیں۔ایک یہ کہ تلاوت قرآن اہل کتاب کی علامت ہے اور شئی کے لئے علامت لازم نہیں دوسرے یہ کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تلاوت قرآن کرنے والا کامل مومن اور یقیناً جو اس نعمت سے محروم ہے وہ ایمان کے کمال سے محروم۔تیسرے یہ کہ بے شک بغیر قرآن مجید پڑھے کوئی مومن ہو سکتا ہی نہیں کیونکہ ایمان کے لئے کم از کم کلمہ پڑھنا ضروری ہے اور کلمہ طیبہ قرآن ہی کی آیتیں ہیں۔ **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ قرآن کا جو منکر ہے وہی کافر ہے حالانکہ تم کہتے ہو کہ حدیث متواتر اور اجماع کا منکر بھی کافر ہے جیسے کہ تعداد رکعات اور نصاب زکوٰۃ۔ **جواب:** حدیث یقینی کا انکار بھی قرآن کریم ہی کا انکار ہے بلکہ اجماع مسلمین کا انکار بھی ایسا ہی ہے کیونکہ قرآن کریم میں اطاعت نبی ﷺ اور اطاعت اجماع مسلمین کا حکم دیا ہے ان میں سے ایک کا انکار ان آیتوں کا انکار ہے قرآن نے فرمایا وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ (النساء: ۱۱۵) الخ

تفسیر صوفیانہ

فرق ہے کتاب الٰہی کے خود حاصل کرنے میں اور رب کے عطا فرمانے میں اس آیت میں ان قسمت والوں کا ذکر ہے۔ جنہیں کتاب خود رب تعالیٰ نے عطا فرمائی یعنی اولیاء کرام ان کی صفت یہ ہے کہ حق تلاوت وہی ادا کر سکتے ہیں قرآن کا حق تلاوت یہ ہے کہ اس کے پڑھتے وقت دل دنیا سے سرد ہو کر آواز میں درد ہو، آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگی ہو، دنیا اور دنیاوی چیزوں سے ایک دم غافل ہو جائے فنا فی اللہ اور بقاء باللہ کے مزے سے ایسا مرد میدان اپنی تلاوت ہی سے اوروں پر

بھی رنگ جمادیتا ہے اور اس تلاوت کی برکت سے اوروں کو ایمان بخش دیتا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہجرت سے پہلے اپنے دروازے پر قرآن کریم کی تلاوت کرتے تو مشرکین عورتیں اور بچے آپ کے گرد جمع ہو جاتے، آپ روتے بھی تھے اور ان سب کو رلاتے بھی تھے۔ بہت لوگ ان درد والی آوازوں سے قرآن پاک سن کر ایمان لے آتے تھے انہی کی یہ صفت ہے کہ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ کہ وہ اس تلاوت کے ذریعہ لوگوں کو ایمان بخش دیتے ہیں اور سب کو ایمان میں لے لیتے ہیں لیکن وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ جو ایسے پاک بازوں سے قرآن پاک سن کر بھی کافر رہے یا ان کے درد کا انکار کرے وہ بہت نقصان والا ہے۔ ان لوگوں نے تو اس تلاوت ہی کے ذریعہ روحانی بیماریوں کے سوا جسمانی بیماروں کو بھی شفا بخشی وہی قرآن کریم صحابہ کرام بھی پڑھتے تھے کہ ان کی ایک آیت سے سانپ کاٹے ہوئے کو بھی شفا مل جاتی تھی اور وہی قرآن کریم ہم بھی پڑھتے ہیں مگر اس میں یہ تاثیر نہیں کیونکہ وہ تلاوت کا حق ادا کرتے تھے اور ہم یہ نہیں کرتے رب تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہم کو وہ دل و زبان عطا فرمائے جس سے حق تلاوت ادا ہو صوفیاء فرماتے ہیں کہ نقش قرآن کی جگہ کاغذ ہے الفاظ قرآن کی جگہ سننے والے کے کان اور تلاوت کرنے والے کی زبان مضامین قرآن کی جگہ مومن کا دماغ انوار و تجلیات قرآن کی جگہ مومن کا دل ہے۔ نقوش و مضامین و معنی استادوں کے ذریعہ مل جاتے ہیں۔ مگر انوار قرآن صرف عطیہ ربانی ہے جسے فرمایا گیا اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ جو کسی کو بلا واسطہ اور کسی کو کسی صاحب نظر کی نظر عنایت سے نصیب ہوتا ہے صاحب نظر تو پتھروں پر نقش جمادیتے ہیں چہ جائیکہ مومن کے دل حضرت خواجہ بہاؤالدین نقشبند نے ایک کمہار کے پکے ہوئے آوے کو نگاہ بھر کر دیکھا تو نار کو نور بنا دیا اور ہر ہر برتن پر اسم ذات کندہ کر دیا اس دن سے ان کا لقب نقش بند ہوا، اسی طرح حضور کے جسم کا مقام اور، اور دل کا مقام اور، اور روح کا مقام اور، اور حضور کی نورانی تجلیات کی جگہ اور ہے، جسم پاک عرب میں رہا دل رب کے قرب خصوص میں کہ فرماتے ہیں اَبِيْتُ عِنْدَ رَبِّىْ يُطْعِمُنِىْ وَ يَسْقِيْنِىْ اور روح پاک کا مقام وہاں ہے جہاں فرشتوں کا گمان نہ پہنچے فرماتے ہیں۔ لِىْ مَعَ اللّٰهِ وَقْتٌ لَا يَسَعُنِىْ فِيْهِ مَلَكٌ مُقَرَّبٌ وَّلَا نَبِىٌّ مُّرْسَلٌ اور حضور کی تجلیات کا مقام ہر مومن کا دل ہے۔ سورج آسمان پر ہے مگر شعاعیں ہر گھر ہیں۔

يٰبَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ
اے اولاد یعقوب کی یاد کرو تم نعمت میری جو کہ کی میں نے اوپر تمہارے
اے اولاد یعقوب یاد کرو میرا احسان جو میں تم پر کیا اور وہ جو میں نے اس
وَ اَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ
اور تحقیق میں نے بزرگی دی تم کو اوپر جہانوں کا اور تم ڈرو اس دن سے نہ بدلے گی
زمانہ کے سب لوگوں پر تمہیں بڑائی دی اور ڈرو تم اس دن سے کوئی جان

نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّ لَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّ لَا تَنْفَعُهَا
کوئی جان کسی جان سے کسی چیز کا اور نہ قبول کیا جائے گا اس جان سے فدیہ اور نہ نفع دے گی
دوسرے کا بدلہ نہ ہوگی اور نہ اس کو کچھ لے کر چھوڑیں اور نہ کافر کو کوئی سفارش
شَفَاعَةٌ وَّ لَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾
اس کو سفارش اور نہ وہ لوگ مدد کیے جائیں گے
نفع دے گی اور نہ ان کی مدد ہو

تعلق

اس آیت کے پچھلی آیتوں سے چند تعلق ہیں۔ **پہلا تعلق**. شروع سیپارہ میں بنی اسرائیل کو ندا دے کر ان سے خطاب شروع فرمایا گیا۔ اب بہت کچھ کلام فرما کر قریباً ان سے خطاب ختم ہو رہا ہے لہٰذا پھر وہی خطاب ہوا۔ جیسے کہ ایک حساب دان پہلے اجمالی حساب بتا کر اس کی تفصیل بیان کرتا ہے اور پھر تفصیل کے آخر میں دوبارہ اجمالی حساب کا ذکر کر دیتا ہے یا منطقی دعویٰ قائم کر کے دلائل قائم کرتا ہے۔ اور پھر بطور نتیجہ اس دعویٰ کو دہراتا ہے تاکہ یاد رہے یہاں بھی پہلے فرمایا کہ اے اسرائیلیو میری نعمت کو یاد کرو پھر اپنی نعمتیں اور ان کی نافرمانیوں کی تفصیل وغیرہ بتا کر فرمایا کہ ان نعمتوں کو یاد رکھنا۔ **دوسرا تعلق**: پہلے کی آیتوں میں فرمایا گیا تھا کہ بنی اسرائیل نبی علیہ السلام کو اپنا تابع کرنا چاہتے ہیں۔ اور وہ سب سرداری کرنے کے عادی ہیں اب ان سے خطاب کر کے فرمایا جا رہا ہے کہ تم کو جو کچھ نعمتیں اور بزرگیاں گذشتہ زمانہ میں ملی تھیں وہ انبیاء کرام کی غلامی کی برکت سے تھیں۔ اگر تم ان نعمتوں کی بقاء چاہتے ہو تو اس نبی آخر الزماں ﷺ کی اطاعت کرو۔ **تیسرا تعلق**: پچھلی آیت سے معلوم ہوا تھا کہ یہود و نصاریٰ نے کتاب اللہ کو نخوت اور غرور اور نفسانیت و تعصب کا ذریعہ بنالیا جس سے وہ کتاب ان کے لئے حجاب بن گئی اب فرمایا جا رہا ہے کہ اے اسرائیلیو! تم انہیں انعامات کو یاد کر کے پھر اختیار کر لو جس کی وجہ سے تمہیں پہلے بزرگی ملی تھی۔

تفسیر

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ کبھی خطاب عتاب کے لئے آتا ہے اور کبھی رحمت کے لئے آتا ہے یہاں بظاہر عتاب کا خطاب ہے لیکن ممکن ہے کہ رحمت کا خطاب ہو اسی لئے ان کو برگزیدہ نبی یعقوب علیہ السلام کی نسبت کر کے پکارا گیا۔ یعنی اے اسرائیلیو! اگرچہ تم بڑے مجرم اور خطاکار ہو مگر چونکہ ہم ستار و غفار ہیں اور تم ہمارے ایک بندۂ خاص کی اولاد ہو اگر اب بھی ہماری طرف رجوع کرو تو ہماری رحمت تمہیں لینے کو تیار ہے۔ خیال رہے کہ رب نے قرآن کریم میں دیگر انبیائے کرام کو نام لے کر پکارا مگر حضور ﷺ کو القاب کریمہ سے ایسے ہی دیگر امتوں کو ان کے نسبی ناموں سے پکارا اور امت مصطفیٰ کو **اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** کے پیارے خطاب سے پکارا یہ اس امت کا احترام ہے **اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ** میری نعمت کو یاد کرو۔ ذکر سے یا تو ان نعمتوں پر

غور کرنا مراد ہے۔ یا ان کا شکر یہ ادا کرنا اُذْكُرُوْا کے معنی ہیں یاد کرو، یاد دلاؤ یعنی اے بنی اسرائیل میری ان نعمتوں کو یاد کرو، یاد رکھو یا اے علماء بنی اسرائیل میری وہ نعمتیں اپنی قوم کو یاد دلاؤ۔ یاد سے زبانی، دلی اور علمی یاد مراد ہے زبانی یاد میں تحریری یاد تقریری یاد سب داخل ہیں رب کی عبادات اس کی نعمتوں کی عملی یاد ہے جیسے عاشورہ کا روزہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نجات کی عملی یاد اور شکر یہ ہے نعمت سے جنس نعمت مراد ہے جو ساری نعمتوں کو شامل ہے۔ الَّتِیْۤ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ جو خاص تم پر ہم نے کیں بنی اسرائیل کو کچھ تو عام نعمتیں ملی تھیں جن میں سارے انسان شریک ہیں جیسے ہوا، پانی، روشنی وغیرہ اور کچھ خاص نعمتیں جیسے تورات اور اولاد انبیاء ہونا، من وسلویٰ کا اترنا، بحیرہ قلزم کا ان کے لئے پھٹنا وغیرہ وغیرہ۔ اور ان سب سے اعلیٰ نعمت یہ تھی کہ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ کہ میں نے تم کو تمام جہانوں پر بزرگی عطا فرمائی تھی۔ اور بزرگوں کو چاہئے کہ اپنی بزرگی قائم رکھنے کے لئے رب کی اطاعت زیادہ کریں۔ کیونکہ فرمانبرداری بقدر تنخواہ ہونی چاہئے اولاً تو اس احسان کے شکریہ میں تمہیں انسان بن کر رہنا چاہئے اور اگر تم میں اتنی انسانیت باقی نہ رہی کہ منعم کا احسان مانو کم از کم وَاتَّقُوْا یَوْمًا قیامت کے دن سے ہی خوف کر کے ایمان لے آؤ ایسا نہ ہو کہ تم دنیا میں عالمین کے سردار رہے اور وہاں سب کے سامنے ذلیل وخوار ہو اور تمہاری رسوائی برسر بازار ہو اور یہ نہ خیال کرنا کہ دنیا کی طرح کوئی کسی کو بچالے وہاں کے حالات ہی اور ہیں اس دن میں چار خصوصیتیں ہیں ایک یہ کہ لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْــٴًـا۔ لَا تَجْزِیْ میں دو احتمال ہیں لازم ہو یا متعدی یعنی کوئی جان کسی کا بالکل بدلہ نہ ہوگی کہ اس کے عوض سزا بھگت لے یا کوئی کسی کی طرف سے کچھ بدلہ نہ دے گا کہ اس کے حقوق اپنے اعمال وغیرہ سے ادا کر دے کیونکہ اپنی اپنی پڑی ہوگی وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ اور نہ یہ ہو سکے گا کہ مجرم سے کچھ فدیہ قبول کر لیا جائے عدل کے لغوی معنی ہیں برابری اس لئے انصاف کو عدل کہتے ہیں کہ اس میں ظالم مظلوم کو برابر کر دیا جاتا ہے۔ دو طرفہ برابر وزن کو عدل کہتے ہیں فدیہ کو اس لئے عدل کہتے ہیں کہ مال جرم کے برابر قرار دیا جاتا ہے فدیہ نہ قبول کرنے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ مجرم مال پیش کرے مگر حاکم قبول نہ کرے۔ دوسرے یہ کہ مجرم کے پاس مال ہی نہ ہو جو قبول کیا جائے یہاں دوسری صورت مراد ہے کیونکہ وہاں کسی کے پاس مال نہ ہوگا۔ خیال رہے کہ جزاء اور عدل میں اس جگہ فرق یہ ہے کہ جزاء تو وہ جو دوسرا کسی کی طرف سے دے عدل یہ کہ خود مجرم اپنا بدلہ ادا کرے۔ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ اور نہ یہ ہی ممکن ہے کہ کوئی کسی کافر کی سفارش کر کے چھڑا لے ہم شفاعت کے معنی اور اس کے اقسام اس سے پہلے شفاعت کی آیت میں بتا چکے شفاعت اور جزاء میں یہ فرق ہے کہ جزاء کچھ دے کر چھڑانے کو کہتے یں اور شفاعت صرف سفارش کر کے چھوڑائے کہ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ اور نہ کفار کی مدد کی جائے کہ کوئی شخص بزور انہیں عذاب سے بچالے غرضیکہ دنیا میں کسی کو چھوڑانے کے جو اسباب ہیں کفار کے واسطے وہاں کام نہ آئیں گے لہٰذا صرف اپنے اولاد نبی ہونے پر بھروسہ کر کے ایمان اور اعمال سے بے نیاز ہو جانا بڑی ہی بے وقوفی ہے۔ خیال رہے کہ قیامت میں مومنوں کے لئے انشاء اللہ یہ چاروں چیزیں ہوں گی کہ نیکوں کے طفیل برے بخشے جائیں گے اور صالحین کے صدقہ بے عمل درجات پائیں گے جیسے مسلمانوں کے فوت شدہ بچے وغیرہ اور کفار مومنوں کا فدیہ ہوں گے مومنوں کی شفاعت بھی ہوگی اور مختلف اطراف سے ان کی مدد بھی ہوگی کہ انبیاء اولیاء چھوٹے

بچے رمضان شریف، کعبہ شریف وغیرہ ان کی مدد کریں گے یہ آیۃ صرف کفار کے لئے ہے کہ ان کا ہی پہلے ذکر ہو چکا ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے ہمارے بندۂ خاص حضرت یعقوب علیہ السلام کی ناسمجھ اولاد یعنی اسرائیل ان گذشتہ نعمتوں کو یاد رکھو اور ان کا شکریہ ادا کرو جو ہم نے تم پر پہلے کی تھیں کہ مصر سے فرعون کو نکال کر تمہیں وہاں کا بادشاہ بنایا، اسے ڈبویا، تمہیں بچایا، تم پر من سلویٰ برسایا، تم میں انبیاء اور اولیاء پیدا فرمائے وغیرہ وغیرہ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک زمانہ میں تم کو تمام جہانوں پر بزرگی دے دی کہ تمہارے پائے کا دنیا میں کوئی نہ پایا گیا ذرا عقل سے کام لو تو تم نبی زادے ہو تم پر اطاعت الٰہی زیادہ لازم ہے تاکہ تم دوسروں کے واسطے نمونہ بنو اور تم سے تمہارے باپ دادوں کے نام روشن ہوں گے کہ لوگ تمہیں دیکھ کر کہیں کہ جن کی اولاد ایسی نیک ہے ان کے باپ دادا کیسے نیک ہوں گے تم اپنے ان فضائل سے غلط فائدے حاصل کرنے کی کوشش نہ کرو بلکہ اس نبی پر ایمان لا کر سچے مسلمان بن جاؤ، کافر کا شکریہ ہے کہ مومن ہو جائے اور مومن کا شکریہ ہے کہ نیک اعمال کرے۔ حضور کی غلامی رب کی تمام نعمتوں کا شکریہ ہے جو بادشاہ کو راضی کرنا چاہے وہ اس کے شہزادے کو راضی کرے یہ نہ سمجھو کہ نبی زادے ہونے سے ایمان و اعمال کی ضرورت نہیں رہتی۔ خیال رکھو کہ تمہارے سامنے قیامت کا دن ہے جس دن نہ تو کوئی نفس کسی کافر نفس کا فدیہ ہے نہ اس کی طرف سے کوئی فدیہ ادا کرے اور نہ خود اس کافر سے کوئی فدیہ وغیرہ لے کر چھوڑا جائے نہ اس کافر کو کسی کی سفارش نفع دے اور نہ ان کی کسی اور قسم کی امداد کی جائے لہٰذا اپنی پیغمبر زادگی کے دھوکے میں نہ رہنا بلکہ ہماری بارگاہ میں ایمان و اعمال لے کر آنا دنیا میں نالائق بیٹے کو ماں باپ منہ نہیں لگاتے اسی طرح آخرت میں انبیاء اور اولیاء بے ایمان اولاد کو نہ پوچھیں گے۔ خیال رہے کہ دنیا میں مجرم چار صورتوں سے ہی حاکم کے عذاب سے چھوٹ سکتے ہیں ایک یہ کہ اس کے والی وارث ضمانت دے کر چھڑالیں یا اس کی طرف سے جرمانہ وغیرہ بھگت دیں اس کی نفی لَا تَجْزِیْ کہہ کر فرمادی دوسرے یہ کہ خود مجرم اپنے مال سے جرمانہ یا فدیہ یا دیت دے کر چھوٹ جائے لَا یُقْبَلُ الایۃ کہہ کر اس کی بھی نفی کر دی گئی۔ تیسرے یہ کہ مجرم کے قرابت دار عزت و وقار والے ہوں وہ سفارش کر کے چھڑالیں لَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ فرما کر اس سے بھی مایوس کر دیا کہ اللہ کے پیارے کفار کی شفاعت کریں گے ہی نہیں چوتھے یہ کہ مجرم کے جرگے اور قبیلے والے بڑے بہادر لوگ ہوں وہ حکومت کی بغاوت کر کے اس پر غالب آجائیں اور مجرم کو بزور چھڑالیں وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ فرما کر یہ امید بھی باقی نہ رکھی اب چھٹکارے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ بندہ وفادار بن کر رب کی بارگاہ میں حاضری دے اور اس سے رحم کی درخواست کرے وہ بڑا غفور رحیم ہے مومن کے بڑے بڑے گناہ معاف فرمادیتا ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** اولاد نبی ہونا خدا کی بڑی نعمت ہے سادات کرام دوسروں سے افضل ہیں بشرطیکہ مومن ہوں کیونکہ رب نے بنی اسرائیل کو اسی نسبت سے یاد فرمایا کہ اے یعقوب علیہ السلام کی اولاد نیز ان بنی اسرائیل کو جو تمام جہان پر افضلیت ملی تھی وہ محض اپنے اعمال سے نہ تھی نیک اعمال تو بعض قبطیوں اور دوسری قوموں نے

بھی کئے تھے بلکہ ان کی فضیلت اولاد انبیاء ہونے کی وجہ سے تھی دنیا میں حاکم کی اولاد کو دوسروں پر عزت حاصل ہوتی ہے تو کیا انبیاء کی اولاد کو اوروں پر بزرگی حاصل نہ ہوگی مگر خیال رہے: کہ اس عظمت کے لئے ایمان ضروری ہے۔ **دوسرا فائدہ:** اللہ کی نعمت کو یاد کرنا اس کا چرچا کرنا بہت بہتر کام ہے بنی اسرائیل سے فرمایا گیا کہ ہماری گذشتہ نعمتیں یاد کرو اور ان پر غور کرو لہٰذا محفل میلاد شریف بہت بہتر کام ہے کہ اس میں حضور علیہ السلام کی آمد کا ذکر ہوتا ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے۔ **تیسرا فائدہ** بطور شکر یہ اپنے اوصاف بتانا جائز ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا اَنَا سَيِّدُ وُلْدِ آدَمَ وغیرہ میں سارے انسانوں کا سردار ہوں یوسف علیہ السلام نے بادشاہ مصر سے کہا تھا کہ اِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ (یوسف:۵۵) میں بڑا محافظ اور علم والا ہوں یہاں بھی بنی اسرائیل کو اپنے ان فضائل اور بزرگیوں کے ذکر کرنے کا حکم دیا گیا جو رب نے انہیں عطا فرمائی تھیں ہاں فخر یہ طور پر شیخی مارنے کیلئے بیان کرنا منع **چوتھا فائدہ:** بڑوں کی اولاد کو چاہئے کہ بڑوں کے سے کام کرے علماء مشائخ، سادات کو نیک اعمال نہایت ضروری ہیں نیز قانون دان اور سلطنت کے ارکین اگر قانون توڑیں تو بڑے مجرم ہیں کیونکہ دوسرے ان کی پیروی کریں گے۔ **پانچواں فائدہ:** بغیر ایمان پیغمبر زادگی اور کوئی نیکی کام نہیں آسکتی مردے کو مقوی دوائیں بیکار ہیں۔ ایمان جان ہے اور یہ چیزیں دوائیں اور غذائیں دیکھو۔ نوح علیہ السلام کی کشتی میں کتوں گدھوں کی جگہ تھی مگر کافر انسان کے لئے نہ تھی جن میں خود کنعان بھی تھا رب کفار کے لئے فرماتا ہے۔ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ (اَلْبَيِّنَة:۶) لہٰذا کافر و مشرک اگرچہ اولاد علی مرتضی ہو مگر سید سردار کو کہتے ہیں اور رب انہیں شر البریہ تمام مخلوق سے بدتر کہہ رہا ہے اشرار لوگ سردار نہیں ہو سکتے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: احسان جتانا عیب ہے پھر رب نے احسان کیوں جتائے۔ **جواب:** طعنہ دینے اور دوسروں کو شرمندہ کرنے کے لئے احسان جتانا واقعی ہی عیب ہے مگر اپنا حق احسانی ثابت کرنے اور دوسروں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے احسان جتانا بڑا وصف ہے جس سے دوسروں کی اصلاح ہو باپ نالائق بیٹے کو اپنی گزشتہ مہربانیاں یاد دلائے تاکہ وہ لائق ہو جائے، عیب نہیں بلکہ کرم ہے یہاں بھی ایسا ہی ہے نیز خالق و مخلوق کے احکام یکساں نہیں بندے کے لئے احسان بتانا اس لئے منع ہے کہ وہ حقیقی محسن نہیں چونکہ حق تعالیٰ محسن ہے اس لئے اپنے احسانات جتانا اس کا حق ہے۔ **دوسرا اعتراض:** کیا بنی اسرائیل پہلے زمانہ میں انبیاء کرام اور فرشتوں سے بھی افضل تھے کیونکہ یہاں فرمایا گیا ہے کہ تم کو عالمین پر بزرگی دی اور عالمین میں یہ سب حضرات داخل ہیں۔ **جواب:** بعض بنی اسرائیل یعنی ان کے انبیاء اور خاص اولیاء بے شک فرشتوں سے افضل تھے آیت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ سارے بنی اسرائیل سب سے افضل تھے اور عالمین سے انبیاء کرام باستثناء عقلی علیحدہ ہیں قوم بنی اسرائیل کو اسی لئے تو بزرگی ملی کہ وہ انبیاء کی اولاد ہیں پھر وہ انبیاء سے کیونکر افضل ہوں گے کہا جاتا ہے کہ کام بسم اللہ سے شروع کرو اس کا مطلب یہ نہیں کہ خود بسم اللہ کو بھی بسم اللہ سے شروع کر دیا کہتے ہیں کہ حضور کے نام پر درود شریف پڑھو اس کا یہ مطلب نہیں کہ خود درود شریف میں جو نام پاک آجائے اس پر بھی درود شریف

پڑھو یا حضور علیہ السلام سارے انسانوں کے سردار ہیں اس کا یہ مطلب نہیں کہ اپنے بھی سردار ہیں ایسے ہی یہاں بھی ہے۔
تیسرا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ کوئی نفس کسی کا فدیہ نہ بنے گا۔ حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کفار مسلمانوں کے فدیہ بنیں گے کہ مسلمانوں کے جہنم کی جگہ کافر سنبھال لیں گے اور کافر کے جنتی مقام پر مسلمان قابض ہوگا کیونکہ ہر انسان کے لئے دو مقام تیار کیے گئے ہیں۔ **جواب:** یہ چاروں حالتیں کفار کی ہیں مسلمان کا فدیہ بھی ہے شفاعت بھی اور باذن الٰہی بعض کی بعض کو مدد بھی ہے۔ **چوتھا اعتراض:** لَا تَجْزِیْ نَفْسٌ الخ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا کہ کوئی نفس دوسرے کی طرف سے کچھ فدیہ ادا نہ کرے گا۔ حالانکہ حدیث شریف میں ہے کہ مقروض کی نیکیاں قرضخواہ کو دی جائیں گی اور اگر اس کے پاس نیکیاں نہ ہوں تو قرضخواہ کے گناہ اسے دے دیئے جائیں گے۔ **جواب:** اس آیت سے کے معنی یہ ہیں کہ کوئی کسی کی طرف سے بخوشی فدیہ نہ دے گا۔ قرضخواہ اور مقروض کا معاملہ رب کے قانون سے ہوگا نہ کہ اس کی اپنی خوشی سے۔ (روح البیان)۔ **پانچواں اعتراض:** اگر کافر کا مسلمان پر قرض رہ گیا تو کیا اس کی نیکیاں بھی کافر کو دی جائیں گی۔ **جواب** نہیں بلکہ بقدر قرض کافر کے عذاب میں کچھ تخفیف کر دی جائے گی اور اگر مسلمانوں کا کافر پر قرض رہ گیا تو کافر کا عذاب اور مسلمان کا ثواب بڑھا دیا جائے گا۔ **چھٹا اعتراض:** یہاں فرمایا گیا وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ اور کہیں فرمایا گیا وَّ لَا شَفَاعَةٌ (بقرہ: ۲۵۴) اگلی دو آیتوں سے معلوم ہوا کہ کافر کے لئے شفاعت ہو گی ہی نہیں ان میں مطابقت کیونکر ہو اور اگر تینوں آیتوں کے یہ معنی ہیں کہ شفاعت ہوگی ہی نہیں تو مختلف عبارتوں سے اس کا کیوں ذکر کیا گیا؟
جواب: انبیاء کرام کی شفاعت دو قسم کی ہے۔ ایک شفاعت عامہ، دوسری خاصہ، شفاعت عامہ میں بظاہر کفار بھی داخل ہوں گے۔ مگر ان کے حق میں قبول نہ ہوگی۔ اور نہ ان کے لئے نافع۔ مثلاً وہ عرض کریں گے کہ اے اللہ مومنوں کو یا میری اطاعت کرنے والوں کو بخش دے بعض کفار جو اپنے کو مومن اور انبیاء کرام کا مطیع سمجھے ہوئے تھے وہ سمجھیں گے کہ ہم بھی اس شفاعت میں داخل ہیں لیکن اس کا اثر یہ ہوگا کہ مومن بخشے جائیں گے اور یہ لوگ محروم یہ شفاعت تو ہوئی مگر ان کے حق میں غیر نافع اس کے لئے فرمایا گیا ہے۔ لَا یُقْبَلُ مِنْهَا یا لَا تَنْفَعُهَا رہی شفاعت خاصہ یعنی کسی خاص شخص کی شفاعت وہ کفار کے لئے ہوگی ہی نہیں۔ اس کے لئے فرمایا گیا وَّ لَا شَفَاعَةٌ (بقرہ: ۲۵۴) بعض روایات میں آیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اپنے چچا آذر کی شفاعت کریں گے لیکن ان کو نہایت بہترین طریقے سے سمجھا کر آذر کو جہنم میں پہنچا دیا جائے گا اس سمجھانے میں ابراہیم علیہ السلام کی اظہار شان ہوگی نہ کہ توہین اس روایت کی بناء پر لَا یُقْبَلُ مِنْهَا اور لَا تَنْفَعُهَا بھی شفاعت خاصہ کے متعلق ہیں۔ غرضیکہ شفاعت کا نہ ہونا اور حیثیت سے ہے اور قبول نہ ہونا دوسری حیثیت سے ہوگا اس جواب پر بہت غور کیا جائے بہت دقیق ہے۔

تفسیر صوفیانہ

انسان کو دو چیزیں حاصل ہیں ایک نفس اور دوسری روح۔ روح اور اس کی صفات گویا بنی اسرائیل ہیں کیونکہ ان پر انبیاء کرام کی توجہ ہے اور نفس امارہ اور اس کے صفات گویا کفار اور مشرکین ہیں روح سے خطاب کر کے فرمایا گیا ہے کہ اے روح و

صفات روح تو ہماری گذشتہ نعمتوں کو یاد کر کہ تجھ کو عالم ارواح میں طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا گیا اور تجھ کو عالم مادیات، عالم ظلمات وغیرہ بہت سے جہانوں پر بزرگی دی اب تو صحبت اغیار میں اپنے کو خراب نہ کر لینا یہ نفس جو تجھے سبز باغ دکھا کر بہکانا چاہتا ہے اس کے دھوکے میں نہ آنا اگر تو اس کی اطاعت کر کے گمراہ ہو گئی تو نہ تو قیامت میں یہ تیری فدیہ بنے گی نہ تیری سفارش کر سکے اور نہ اس سے تجھے کسی قسم کی مدد پہنچے اے پردیسی مسافر تیرے پاس دولت ایمانی ہے کہیں لٹ نہ جائے۔

سونا پاس ہے سونا بن ہے سونا زہر ہے اٹھ پیارے تو کہتا ہے میٹھی نیند ہے مت ہی تیری نرالی ہے

صوفیاء فرماتے ہیں کہ اتقوا تقویٰ سے بنا۔ تقویٰ وہ خوف ہے کہ جس کے ساتھ اطاعت ہو خوف وخشیت میں یہ قید نہیں شیطان کو رب کا خوف تو ہے وہ کہتا ہے اِنِّیۡۤ اَخَافُ اللّٰہَ رَبَّ الۡعٰلَمِیۡنَ (حشر:١٦) مگر تقویٰ نصیب نہیں۔ تقویٰ کے تین درجے ہیں۔ دوزخ سے قیامت سے آگ کے ڈر سے یہ تقویٰ کی ابتدائی منزل ہے چونکہ یہاں کفار کو خطاب ہے لہٰذا انہیں فرمایا گیا قیامت سے ڈر کر ایمان و پرہیز گاری اختیار کرو پھر دوسرا درجہ رب سے خوف و ہیبت کہ گناہ نہ کرے مگر رب سے ہیبت رکھے یہ خوف انبیاء کرام اور خاص اولیاء اللہ کو میسر ہوتا ہے اس خوف کی بناء حضرات انبیاء قیامت میں رب سے کسی کی شفاعت کی ہمت نہ کریں گے تیسرا درجہ یہ ہے کہ انسان کو خدا سے خوف نہ ہو کہ وہ تو غفور و رحیم ہے بلکہ اپنی خودی سی خوف ہو کہ ہم تو لیئم ہیں یہ خوف بعض حالات میں مجذوبین پر طاری ہوتا ہے جب ان پر رب سے امید غلبہ کرتی ہے اس بناء پر حضرت شیخ عطار منطق الطیر میں فرماتے ہیں۔

خلق ترسد از تو من ترسم ز خود کز تو نیکی دیدہ ام و از خویش بد

وَ اِذِ ابۡتَلٰۤی اِبۡرٰہٖمَ رَبُّہٗ بِکَلِمٰتٍ فَاَتَمَّہُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیۡ جَاعِلُکَ
اور جب آزمایا ابراہیم کو رب ان کے نے ساتھ چند باتوں کے پس پورا کر دیا انہیں فرمایا تحقیق
اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے کچھ باتوں میں آزمایا تو اس نے پوری کر دکھائیں فرمایا میں تمہیں
لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَ مِنۡ ذُرِّیَّتِیۡ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَہۡدِی
میں بنانے والا ہوں تم کو واسطے لوگوں کے پیشوا عرض کیا اور میری اولاد سے فرمایا میرا عہد
لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں عرض کی اور میری اولاد سے فرمایا میرا عہد
الظّٰلِمِیۡنَ ﴿۱۲۴﴾
ظالموں کو نہیں پہنچتا
ظالموں کو نہیں پہنچتا

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پہلے بنی اسرائیل کو رب سے ڈرنے اور نیک اعمال کرنے کی رغبت دی گئی اور بتایا گیا کہ نجات کیلئے فقط پیغمبر زادگی کافی نہیں اب فرمایا جارہا ہے کہ تم سب کے جد امجد ابراہیم علیہ السلام جن کی اولاد ہونے پر تم فخر کرتے ہو ان کو بھی رب نے اتنی بزرگیاں اس لئے دیں کہ وہ اس کے مطیع وفرمانبردار تھے تم اطاعت الٰہی سے کیونکر بے نیاز ہوسکتے ہو۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں بنی اسرائیل کو تقویٰ اور طہارت کا حکم دیا گیا اب بتایا جارہا ہے کہ تم کو یہ صفات اسلام لانے پر حاصل ہوں گے۔ کیونکہ اسلام میں وہ چیزیں موجود ہیں جو دین ابراہیم میں تھیں جیسے حج، ختنہ اور خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا وغیرہ **تیسرا تعلق:** بنی اسرائیل اپنے اولاد ابراہیمی ہونے کو نجات کے لئے کافی سمجھتے تھے اس آیت میں بتایا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے ہی کہہ دیا گیا تھا کہ آپ کی بعض اولاد ظالم بھی ہوگی۔ اور وہ دینی پیشوا نہ بن سکے گی لہٰذا چونکہ تم ظالم ہو تم لوگوں کے سردار تو کیا عذاب سے نجات بھی نہیں پاسکتے لہٰذا تمہیں چاہئے کہ نبی آخر الزماں پر ایمان لاؤ تا کہ تمہاری عظمت برقرار رہے۔

تفسیر

وَ اِذِ ابْتَلٰٓی یہ لفظ بَلْوٌ یا بَلَاءٌ سے بنا ہے اس کے لفظی معنی ہیں آفت یا جانچ، اِبْتَلٰی کے معنی ہیں مشقت میں ڈالا یا جانچا اور امتحان لیا کبھی تو خود اپنی واقفیت کیلئے کسی چیز کو جانچا جاتا ہے اور کبھی دوسروں پر اسی کی بڑائی بھلائی ظاہر کرنے کے لئے حق تعالیٰ کا امتحان یا جانچ دوسرے فائدے کے لئے ہے کیونکہ وہ خود تو ہر ایک کے سارے حال کا جاننے والا ہے یہ جانچ صرف اسی لئے ہوتی ہے کہ جب ان کو بزرگیاں دی جائیں تو دوسرا اعتراض نہ کرسکے لہٰذا پہلے جانچتے ہیں پھر انعامات سے نوازتے ہیں۔ اِبْرٰهٖمَ یہ لفظ سریانی ہے اس کے معنی ہیں اب رحیم یعنی "مہربان باپ" چونکہ آپ بچوں پر بہت مہربان تھے۔ نیز مہمان نوازی اور رحم وکرم میں آپ مشہور ہیں اسی لئے آپ کو ابراہیم کہا جاتا ہے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ مسلمانوں کے جو چھوٹے بچے مرجاتے ہیں ان کی پرورش آپ اور آپ کی بیوی حضرت سارہ فرماتی ہیں۔ (تفسیر روح البیان)۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ ابراہیم اصل میں ابرم تھا جس کے معنی ہیں بزرگ چونکہ آپ بہت سے انبیاء کرام کے والد ہیں اور سارے دینوں میں آپ کی عزت۔ حتیٰ کہ مشرکین عرب بھی آپ کی عظمت کرتے تھے اس لئے آپ کا نام نامی ابراہیم ہوا رَبُّهٗ عام قرات میں رب کا ضمہ اور ابراہیم کا فتح ہے یعنی ابراہیم علیہ السلام کی ان کے رب نے آزمائش کی یا تو امامت عطا فرمانے سے پیشتر جیسا کہ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ سے معلوم ہوتا ہے اور یا اس کے بعد جیسا کہ بِكَلِمٰتٍ سے ظاہر ہے مگر حضرت ابن عباس اور ابو ہریرہ رضی اللہ عنہما کی قرات میں ابراہیم کا رفع اور رب کا نصب ہے یعنی ابراہیم علیہ السلام نے چند دعائیں مانگ کر اپنے رب کی رحمت کا اندازہ کیا کہ وہ مجھ پر کتنا مہربان ہے رب نے اس کی ساری دعائیں پوری فرمالیں۔ (تفسیر کبیر)۔ خیال رہے کہ یہاں سخت امتحان کے موقع پر رَبُّهٗ فرمایا گیا جس میں بتایا گیا کہ بندوں کا امتحان لینا انہیں بلاؤں آفتوں میں گھیر دینا بھی رب کی ربوبیت مطلقہ کا تقاضا ہے جس میں صدہا رحمتیں ہیں وہ آرام دے تو اس کی مہربانی اور تکلیف بھیجے تو اس کا کرم

ہے اگر باپ تربیت کے لئے بچے کو مارے پیٹے تو بھی اس کی مہربانی ہے ۔

ناخوش او خوش بود درجان من　　جان فدائے یار دل رنجان من

گندہ لوہا بھٹی کی تپش اور ہتھوڑے کی چوٹیں کھا کر صاف ہوتا ہے سونا سنار کی آگ میں تپ کر مار کھا کر محبوب کے پہننے کے قابل بنتا ہے۔ بِكَلِمٰتٍ یہ جمع كلمة کی ہے جس کے لفظی معنی ہیں ایک بات اور کلمات بہت سی باتیں۔ لیکن یہاں مضمون و احکام وغیرہ مراد ہیں۔ جیسے وَتَمَّتْ كَلِمٰتُ رَبِّكَ (انعام:۱۱۵) مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ (کہف:۱۰۹) نیز اس سے یا تو دعائیں مراد ہیں یا چند مصیبتیں، یا چند احکام یعنی ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کی رحمت کو چند دعاؤں سے آزمایا۔ رب نے ابراہیم علیہ السلام کو چند مصیبتوں سے آزمایا، یا ان کو سخت احکام سے آزمایا، ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں تو یہ تھیں کہ مولیٰ جنگل حرم کو شہر بنادے وہاں کے باشندوں کو قسم قسم کے پھل دے یا نبی آخر الزماں ﷺ کو ان میں پیدا فرما وغیرہ وغیرہ۔ آپ پر بڑی مصیبتیں سات آئیں۔ ۱۔ آفتاب اور چاند سے آزمائش۔ ۲۔ سلطنت نمرودی کا مقابلہ۔ ۳۔ بڑی عمر میں ختنہ۔ ۴۔ آگ میں ڈالا جانا۔ ۵۔ لاڈلے فرزند کا ذبح کرنا۔ ۶۔ اللہ کی راہ میں ترک وطن کرنا۔ ۷۔ اپنی پیاری بیوی اور اکلوتے فرزند کو بحکم الٰہی جنگل میں چھوڑ آنا جن میں سے اکثر عطاء امامت سے پہلے ہوئیں احکام میں اختلاف ہے بعض نے فرمایا کہ وہ ارکان حج تھے بعض نے کہا دس اور بعض نے کہا تیس دس کی تفصیل یہ ہے کہ ان میں سے پانچ سر کے متعلق تھے کلی کرنا۔ ناک میں پانی ڈالنا۔ سر کی مانگ نکالنا۔ مونچھیں کٹوانا اور مسواک کرنا۔ پانچ باقی بدن میں ختنہ، زیر ناف کے بال اکھیڑنا، ناخن کٹوانا اور ڈھیلوں کے بعد پانی سے استنجا کرنا تیس کی تفصیل یہ ہے کہ دس تو وہ جن کا ذکر سورۂ برات میں ہوا۔ ۱۔ توبہ۔ ۲۔ عبادت۔ ۳۔ حمد الٰہی۔ ۴۔ سیاحت۔ ۵۔ رکوع۔ ۶۔ سجدہ۔ ۷۔ اچھی باتوں کا حکم کرنا۔ ۸۔ بری باتوں سے روکنا۔ ۹۔ حدود الٰہی کی نگہبانی کرنا۔ ۱۰۔ خدا کو ہر وقت حاضر و ناظر جاننا اور دس سورہ احزاب میں مذکور ہیں۔ ۱۔ اسلام۔ ۲۔ ایمان۔ ۳۔ اطاعت۔ ۴۔ صبر۔ ۵۔ عاجزی۔ ۶۔ صدقہ۔ ۷۔ روزہ۔ ۸۔ شرمگاہ کی حفاظت۔ ۹۔ نظر کی حفاظت۔ ۱۰۔ ہر وقت زبان سے ذکر الٰہی اور دس سورہ مومنون اور سَاَلَ سائل میں مذکور ہیں۔ ۱۔ قیامت کی تصدیق۔ ۲۔ نماز میں حضور قلبی۔ ۳۔ مستحبات کی پابندی۔ ۴۔ بیکار باتوں سے پرہیز۔ ۵۔ زکوٰۃ بخوشی ادا کرنا۔ ۶۔ بیوی اور لونڈی کے سوا اوروں سے شرمگاہ کی حفاظت کرنا۔ ۷۔ وعدہ پورا کرنا۔ ۸۔ امانت کا پورا کرنا۔ ۹۔ مذاق اور دل لگی سے پرہیز کرنا۔ ۱۰۔ سچی گواہی نہ چھپانا۔ فَاَتَمَّهُنَّ یعنی ابراہیم علیہ السلام نے ان سب مصیبتوں پر صبر کیا یا سارے احکام بخوشی ادا کئے اس لئے رب نے فرمایا وَاِبْرٰهِيْمَ الَّذِيْ وَفّٰۤى (نجم:۳۷) یا رب نے ان کی ساری دعائیں پوری فرمائیں قَالَ اِنِّيْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا رب نے فرمایا کہ ہم تمہیں لوگوں کا پیشوا بنانے والے ہیں یا امامت سے نبوت مراد ہے یا تمام لوگوں کا دینی پیشوا ہونا کہ تمام ادیان میں آپ کی عزت و عظمت ہو اور آپ کے بعد تمام شریعتوں میں آپ کے قوانین پر عمل رہے اور ہزارہا انبیاء کے آپ والد ماجد ہوں۔ خیال رہے کہ امام اَمٌّ سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں قصد کرنا۔ لغت میں ہر پیشوا کو امام کہتے ہیں۔ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ (قصص:۴۱) مگر اصطلاح میں دینی پیشوا کو کہتے ہیں قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ

ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ یہ کرم میری بعض اولاد پر بھی فرما ذریت یا ذرٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں پیدا کرنا یا ذرٌ سے جس کے معنی ہیں پھیلانا چھوٹی چیونٹی اور ریت کے ذروں کو بھی ذرہ اس لئے کہتے ہیں کہ وہ زمین میں پھیلے ہوتے ہیں اصطلاح میں چھوٹی اولاد کو ذریت کہا جاتا ہے اور کبھی چھوٹوں بڑوں سب پر بھی بولا جاتا ہے۔ رب تعالیٰ نے ان کی دعا قبول کرتے ہوئے قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ فرمایا کہ ہمارا یہ وعدہ ظالموں کو نہیں پہنچتا۔ عَهْدِی سے وعدہ امانت مراد ہے اگر امانت سے نبوت مقصود ہو تو معنی یہ ہیں کہ ہماری نبوت فاسقوں کو نہ ملے گی اور دینی پیشوائی مراد ہو تو معنی یہ ہیں کہ کفار دینی پیشوائی کے مستحق نہیں یعنی اے خلیل آپ کی یہ دعا کچھ ترمیم کے ساتھ قبول ہے کہ تمہاری اولاد کو بھی امامت دی جائے گی لیکن تمہاری اولاد میں بعض کافر بعض مومن اور فاسق بھی ہوں گے۔ دینی پیشوائی کفار کو نہ ملے گی اور نبوت سے فساق محروم رہیں گے۔ متقی اولاد ہماری امامت سے سرفراز فرمائی جائے گی اس سے معلوم ہوا کہ جو حضرت علی کی اولاد سے ہو مگر مرزائی، شیعہ، وہابی، دیوبندی وغیرہ بن جائے تو وہ امامت و پیشوائی کے لائق نہیں۔

خلاصہ تفسیر

اے نبی ﷺ آپ ان یہود و نصاریٰ بلکہ سارے ان کفار کو جو ابراہیم علیہ السلام کو اپنا آقا و پیشوا سمجھتے ہیں فرما دو کہ تم طریقہ ابراہیمی پر نہیں وہ ہمارے نہایت فرمانبردار بندے تھے ہم نے انہیں کئی باتوں میں آزمایا وہ سچے نکلے بیٹے کی قربانی کا حکم دیا وہ تیار ہو گئے۔ ستارہ پرستوں کی محبت توڑنے بلکہ وطن چھوڑنے کو فرمایا انہوں نے ویسا ہی کر دکھایا کہ سب کو چھوڑ کر ملک شام میں آ بسے ریگستان عرب کو بسانے اور خانہ کعبہ بنانے کا حکم دیا فوراً اپنی بیوی ہاجرہ اور بیٹے اسمٰعیل کو وہاں بسا دیا اور خانہ کعبہ بنایا۔ ایمان پر رہ کر نمرود کی آگ میں پڑنا منظور کیا اسکے علاوہ بہت سے ہمارے احکام نماز زکوٰۃ، ظاہری باطنی طہارت ختنہ وغیرہ بجا لائے اس کے صلہ میں ہم نے ان سے کہا کہ ہم تم کو تمام لوگوں کا پیشوا بنانا چاہتے ہیں کہ تمام دینوں میں تمہارا چرچا رہے انبیاء تمہاری اولاد میں ہوں قیامت تک تمہارے کعبہ کا حج ہوتا رہے دور و قریب سے اس کی طرف گردنیں جھکتی رہیں لوگ تمہاری اور تمہارے بیٹے اسمٰعیل کی اور حضرت ہاجرہ کی نقل کر کے حاجی بنا کریں نبی آخر الزماں کی امت اپنی نمازوں اور خطبوں میں اس محبوب کے ساتھ تم پر بھی درود بھیجا کرے قیامت میں بھی تمہاری پیشوائی ظاہر ہو تو انہوں نے عرض کیا کہ مولا میری اولاد میں بھی بابرکت لوگ پیدا کرنا تاکہ تیری فرمانبرداری ہمیشہ میرے خاندان میں رہے ہم نے ان کی دعا قبول فرماتے ہوئے کہا کہ اچھا ہم تم سے اس کا وعدہ کرتے ہیں لیکن اس اقرار وعدہ میں تمہاری وہ اولاد شامل نہیں جو بدکار ہوان کو یہ برکت نصیب نہ ہوگی لہٰذا اے اسرائیلیو تم کو لازم ہے کہ اپنے جد امجد کی پیروی کرو اور ان نبی آخر الزماں پر ایمان لاؤ جن کے لئے انہوں نے دعائیں مانگیں اور یہ مت سمجھو کہ نبوت بنی اسحاق کے لئے خاص ہے بنی اسمٰعیل بھی انہیں کی اولاد ہیں اور وہ بھی اس وعدہ میں داخل ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حالات

ابراہیم علیہ السلام تارخ ابن ناخور کے فرزند ہیں۔ آپ کا نام ابراہیم اور آپ کا لقب ابو الضیفان ہے آپ کا نسب یہ ہے

ابراہیم ابن تارخ ابن ناخور ابن ساروع ابن رعوا بن تالغ ابن عابر ابن شالخ ابن ارفخشد ابن شام ابن نوح ابن مالک ابن متوشالح بن ادریس علیہ السلام ابن یارد ابن ملہلیل ابن قینان ابن انوش ابن شیث ابن آدم علیہ السلام۔ (تفسیر حقانی)۔
آپ کی پیدائش طوفان نوح سے سترہ سو نو سال بعد اور عیسیٰ علیہ السلام سے تقریباً دو ہزار تین سو سال پیشتر شہر بابل کے قریب قصبہ کوثی میں ہوئی۔ (تفسیر عزیزی) خزائن العرفان میں فرمایا کہ آپ کی پیدائش امواز کے علاقہ مقام سوس میں ہوئی آپ بچپن ہی سے بہت عقل مند اور ہونہار تھے اپنی قوم سے توحید الٰہی پر مناظرہ کرتے تھے یہاں تک کہ ایک بار آپ نے بتوں کو بھی توڑ دیا نمرود نے آپ کو آگ میں ڈالا مگر رب نے آپ کو صحیح سلامت رکھا تب آپ بحکم الٰہی اپنا وطن ترک کر کے حراں وہاں سے شام اور فلسطین میں ہجرت کر گئے اور فلسطین ہی کو اپنا قیام بنایا آپ نے جانی اور مالی بہت سی قربانیاں کیں چار ہی چیزوں سے امتحان ہوسکتا ہے۔ جان، مال، فرزند اور وطن آپ نے جان کو آگ میں ڈالا۔ مال اور وطن کو خیر باد کہا پیارے بچے اور بیوی کو ایک دفعہ جنگل میں چھوڑا اور ایک بار بیٹے کی قربانی کرنے کو تیار ہو گئے اسی برس کی عمر میں ختنہ کا حکم ملا۔ اسی وقت گھر سے تیشہ لے کر خود اپنا ختنہ کر لیا وحی آئی کہ اے ابراہیم تم نے اس کام میں جلدی کی عرض کیا مولیٰ تیری اطاعت میں شتابی منظور تھی۔

ابراہیم کے اوّلیات

سب سے پہلے ا۔ آپ ہی نے اپنا اور اپنی اولاد کا ختنہ کیا آپ سے پہلے پیغمبر ختنہ شدہ پیدا ہوتے تھے۔ ہمارے حضور علیہ السلام بھی ختنہ شدہ پیدا ہوئے۔ ۲۔ سب سے پہلے آپ ہی کے بال سفید ہوئے۔ ۳۔ پہلے آپ نے ناخن اور مونچھ کٹوائے اور زیر ناف کے بال دور کرنے کو رواج دیا کہ آپ کے دین میں یہ باتیں فرض تھیں اور ہمارے ہاں سنت۔ ۴۔ پہلے آپ ہی نے سلا ہوا پاجامہ پہنا۔ ۵۔ پہلے آپ ہی نے بالوں میں خضاب لگایا۔ ۶۔ پہلے آپ ہی نے منبر بنایا اور اس پر خطبہ پڑھا۔ ۷۔ پہلے آپ ہی نے ہاتھوں میں عصا لیا۔ ۸۔ پہلے آپ ہی نے راہ خدا میں جہاد کیا جبکہ رومی کافر آپ کے بھتیجے لوط علیہ السلام کو قید کر کے لے گئے آپ نے ان سے جہاد کر کے انہیں چھڑایا۔ ۹۔ پہلے آپ ہی نے مہمان نوازی کی کہ بغیر مہمان کبھی ناشتہ بھی نہ کیا اور مہمان کی تلاش میں چار چار کوس نکل جاتے تھے۔ ۱۰۔ پہلے آپ ہی نے شیر مال یا پراٹھے پکوا کر مہمانوں کو کھلائے۔ ۱۱۔ پہلے آپ ہی نے معانقہ کیا (گلے ملنا)۔ آپ سے پہلے سجدہ تحیت کا رواج تھا۔ ۱۲۔ آپ ہی کو بہت مال اور خدام دیئے گئے۔ ۱۳۔ پہلے آپ ہی نے ثرید پکایا (شوربے میں پکی ہوئی روٹی)۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فضائل

ا۔ آپ ہی اپنے مابعد سارے پیغمبروں کے والد ہیں۔ ۲۔ ہر آسمانی دین میں آپ ہی کی پیروی اور اطاعت ہے۔ ۳۔ ہر دین والے آپ ہی کی تعظیم کرتے ہیں۔ ۴۔ آپ ہی کی یاد قربانی ہے۔ ۵۔ آپ ہی کی یادگار حج کے ارکان ہیں۔ ۶۔ آپ ہی خانہ کعبہ کی پہلی تعمیر کرنے والے ہیں یعنی اسے گھر کی شکل بنانے والے جس کا ذکر اگلی آیت میں آنے والا ہے۔ ۷۔ جس

پتھر پر کھڑے ہو کر آپ نے خانہ کعبہ بنایا اس کی طرف قیام اور سجدے ہونے لگے یعنی مقام ابراہیم جس کا ذکر اگلی آیت میں آرہا ہے۔ ۸۔ قیامت میں سب سے پہلے آپ ہی کو لباس فاخرہ عطا ہوگا اس کے فوراً بعد ہمارے حضور علیہ السلام کو۔ ۹۔ ایک دفعہ آپ کے زمانہ میں قحط سالی ہوئی غلہ کہیں میسر نہ ہوتا تھا۔ آپ نے بوریوں میں سرخ ریت بھروا کر منگوالیا جب کھولا گیا تو شربتی گیہوں تھے جب اسے بویا گیا تو اس کے درختوں میں جڑ سے اوپر تک بالیاں لگیں۔ ۱۰۔ ایک دفعہ کفار نے آپ پر شیر چھوڑے شیروں نے آپ کو سجدہ کیا اور آپ کے قدم چاٹنے لگے۔ ۱۱۔ امام احمد نے اپنی مسند میں اور حاکم اور بیہقی وغیرہ محدثین نے نقل کیا کہ مسلمانوں کے مردہ بچوں کی آپ اور سارہ عالم برزخ میں پرورش کرتے ہیں۔ (تفسیر عزیزی)۔

ابراہیمی سنتوں کے فائدے اور احکام

ہم تفسیر میں عرض کر چکے ہیں کہ بعض مفسرین نے فرمایا کہ کلمات سے دس چیزیں مراد ہیں جو ان پر واجب تھیں اور ہمارے لئے سنت۔ ۱۔ کلی کرنا۔ ۲۔ ناک میں پانی ڈالنا۔ ۳۔ سر میں مانگ نکالنا۔ ۴۔ مونچھیں کٹوانا۔ ۵۔ مسواک کرنا۔ ۶۔ ختنہ کرنا۔ ۷۔ ناف کے نیچے کے بال صاف کرنا۔ ۸۔ بغل کے بال اکھیڑنا۔ ۹۔ ناخن کٹوانا۔ ۱۰۔ پانی سے استنجا کرنا۔ ان کے فائدوں کی پوری تفصیل ہماری کتاب اسلامی زندگی میں دیکھو یہاں اجمالاً کچھ عرض کئے دیتے ہیں اولاً تو سمجھنا چاہئے کہ سرکاری چیز پر سرکاری نشان ہوتے ہیں فوجیوں پر سرکاری، وردی اور سرکاری گھوڑوں پر شاہی مہر ہوتی ہے۔ مومن سلطنت الٰہیہ کا نوکر ہے چاہئے کہ اس کی پیٹی وردی علیحدہ ہو یہ دس باتیں شاہی پیٹی وردی ہیں ان کے فوائد حسب ذیل ہیں۔ ۱۔ کلی کھانے سے پہلے اور اس کے بعد اور اس کے علاوہ بھی کلی کرنا نہایت مفید ثابت ہوا ہے اگر کھانے میں دانت کا میل شامل ہو جائے تو تندرستی کو مضر ہے نیز اس میل سے منہ میں بدبو آتی ہے جس سے لوگ نفرت کرتے ہیں ان سب کا علاج کلی ہے۔ ۲۔ مسواک سے دانتوں کی ریخوں میں میل جمع ہو کر زہریلا مادہ بن جاتا ہے اگر وہ دور نہ کیا جائے تو مسوڑھوں سے خون یا پیپ بہنے لگتا ہے۔ اس لئے مسواک بڑی مفید ہے مسواک بہت سی بیماریوں کو مفید ہے اس سے ہاضمہ درست رہتا ہے آنکھیں خراب نہیں ہوتیں گندہ دہنی اور منہ کے امراض کو دور کرتی ہے۔ جان کنی میں آسانی ہوتی ہے وغیرہ مگر چاہئے کہ مسواک پیلو یا کسی کڑوے درخت کی ہو پھل پھول والے درخت کی نہ ہو ایک بالش سے زیادہ نہ ہو۔ ۳۔ ناک میں پانی لینا دماغ کو صاف کرتا ہے اسی لئے وضو کرنے والے دیوانے کم ہوتے ہیں مگر چاہئے کہ اگر روزہ نہ ہو تو بانسہ تک پانی چڑھائے۔ ۴۔ مونچھ کٹوانا اس قدر مونچھ کٹوانا سنت ہے جس سے ہونٹ کا پورا کنارہ کھل جائے کہ کھانے اور پینے میں اس کے بال نہ ڈوبیں ان بالوں میں زہریلا اثر ہوتا ہے اگر کھانا یا پانی اس سے لگ کر جائے تو بیماری پیدا ہوگی۔ مونچھ منڈوانا منع ہے کیونکہ اس سے ضعف باہ پیدا ہوتا ہے مونچھوں کے کنارے کاٹنے کی ضرورت نہیں کیونکہ نہ تو اس سے منہ ڈھکتا ہے اور نہ کھانے میں ڈوبتی ہیں لبی مونچھوں والوں کو سگریٹ پینا۔ ناک صاف کرنا کچھ کھانا پینا وبال ہوتا ہے۔ ۵۔ داڑھی ایک مشت رکھنا سنت ہے اور مشت سے زیادہ کاٹنا بہتر ہے۔ مرد کی داڑھی عورت کے سر کے بالوں کی طرح چہرے کی زینت ہے، داڑھی مقوی باہ بھی ہے چھوٹے بچوں اور عورتوں اور خصی انسانوں کی داڑھی نہیں ہوتی، اچھے بھلے آدمی کے خصیے نکال لئے جائیں تو داڑھی

جھڑ جاتی ہے۔ داڑھی والوں کی اولاد بمقابلہ داڑھی منڈوں کے زیادہ ہوتی ہے اور قوی بھی۔ ۶۔ ناخن کٹوانا بھی سنت ہے کیونکہ ناخن کا میل بھی زہریلا اثر رکھتا ہے اگر کھانے میں مل کر جائے گا بیمار کر دے گا جو شخص جمعرات کے دن عصر کے بعد ناخن اس طرح کاٹے کہ داہنے ہاتھ کی شہادت انگلی سے شروع کرکے چھنگلیا پر ختم کرے پھر بائیں ہاتھ کی چھنگلیا سے شروع کرکے انگوٹھے پر ختم کرے پھر داہنے انگوٹھے کا ناخن بھی کاٹ لے اس کے بعد داہنے پاؤں کی چھنگلیاں سے شروع کرکے ترتیب وار بائیں پاؤں کی چھنگلیا پر ختم کر دے تو انشاء اللہ تنگ دستی دینوی پریشانی اور آنکھ کی خرابی سے محفوظ رہے گا۔ (از روح البیان وشامی) ۷۔ ختنہ یہ بھی پیشاب وغیرہ کی بہت سی بیماریوں کا علاج ہے قوت باہ کے لئے مفید ہے، مختون کی اولاد قوی اور اس کی بیوی پاک دامن رہے گی روح البیان وغیرہ میں ہے کہ بہتر یہ ہے کہ پیدائش سے ساتویں روز عقیقہ کے ساتھ ختنہ بھی کرا دیا جائے اور سات اور دس سال کی درمیانی عمر میں تو ضروری کروایا جائے۔ امام حسین فرماتے ہیں کہ بڈھے نومسلم کا ختنہ ضروری نہیں دیگر علماء نے فرمایا کہ بہتر یہ ہے کہ اس کا نکاح کسی ایسی عورت سے کروایا جائے جو ختنہ کر سکے اور بعد نکاح وہ اس کا ختنہ کر دے۔ تفسیر عزیزی نے فرمایا ہے کہ بیہقی میں ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے اسحاق علیہ السلام کا ختنہ پیدائش سے ساتویں دن اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا ختنہ تیرہویں سال کرایا اور حضور علیہ السلام نے امام حسن وحسین کا ختنہ ساتویں روز کرایا۔ ۸۔ موئے زیر ناف کا صاف کرنا آٹھویں روز یا پندرہویں دن یا زیادہ سے زیادہ چالیسویں دن ضروری ہے یہ بال رہنے سے خارش پیدا ہوتی ہے اور باہ کمزور پڑتی ہے۔ ۹۔ مانگ نکالنا یا تو مرد سر کے کل بال رکھے یا کل کٹوائے بعض کا کٹانا اور بعض کا رکھنا منع ہے جیسے انگریزی بال اور پان چھجے حضور علیہ السلام کے بال شریف اکثر تا گوش اور کبھی تا بدوش ہوتے تھے جس کے بال ہوں وہ انہیں پراگندہ نہ رکھے کہ اس سے نیستی آتی ہے بلکہ ان کو درست رکھے اور بیچ سر کے مانگ نکالنا سنت ہے بعض عورتیں جو دائیں بائیں مانگ نکالتی ہیں وہ سنت کے خلاف ہے۔ ۱۰۔ بغل کے بال مونڈھنا بھی جائز مگر اکھیڑنا سنت ہے اور ناک کے بالوں کا کٹوانا بہتر اور اکھیڑنا منع ہے کیونکہ اس سے بیماری پیدا ہوتی ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے ہیں۔ **پہلا فائدہ:** انبیاء کرام نبوت سے پہلے اور اس کے بعد گناہ کبیرہ اور حقیر حرکات سے معصوم ہیں کیونکہ فاسق ظالم کو نبوت نہیں مل سکتی۔ **دوسرا فائدہ:** کافر مسلمانوں کا دینی پیشوا نہیں بن سکتا کیونکہ کافر ظالم ہے اور ظالم امامت کا حقدار نہیں۔ خیال رہے کہ چونکہ نبوت کا بڑا درجہ ہے اس لئے وہاں فسق سے معصوم ہونا بھی ضروری ہے دیگر اماموں میں یہ پابندی نہیں۔ **تیسرا فائدہ:** رب تعالیٰ کی اکثر نعمتیں محنتوں کے بعد ملتی ہیں۔ **چوتھا فائدہ:** ابراہیم علیہ السلام امتوں بلکہ پیغمبروں کے بھی امام ہیں کہ سارے پیغمبر اپنے ابراہیمی ہونے پر فخر کرتے ہیں۔ **پانچواں فائدہ:** اپنی اولاد یا اہل قرابت کو پیشوا بنانے کی دعا یا کوشش حرام نہیں سنت خلیل ہے موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر عرض کیا تھا کہ مولا میرے بھائی ہارون کو نبی بنا دے۔ وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿۲۹﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿۳۰﴾ اشْدُدْ بِهٖۤ اَزْرِيْ (طٰہٰ: ۳۱) لہٰذا حضرت امیر معاویہ کا اپنے بیٹے یزید کو اپنا جانشین بنانے کی کوشش کرنا حرام یا جرم نہیں اور

اس بناء پر اس صحابی رسول کو طعن نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ یزید پلید کا فسق بعد میں ہوا اس وقت تک وہ بظاہر نیک تھا۔ دیکھو ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے لئے امامت کی دعا کی جو کچھ ترمیم سے شروع ہوئی اس دعا کی برکت سے سارے نبی آپ کی اولاد میں ہوئے اور تا قیامت قطب سید ہی ہوگا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اگر ظالم نبی نہیں ہو سکتا ہے تو خود انبیاء نے اپنے کو ظالم کیوں کہا؟ حضرت یونس علیہ السلام نے عرض کیا اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (انبیاء: ۸۷) آدم علیہ السلام نے عرض کیا رَبَّنَا ظَلَمْنَاۤ اَنْفُسَنَا (اعراف: ۲۳) اگر انہوں نے صحیح کہا تو ان کا گناہ ثابت ہوا اور اگر غلط کہا تو جھوٹ ہوا اور یہ بھی گناہ۔ **جواب:** یہاں ظلم سے مراد لغزشیں اور خطائیں ہیں بڑے لوگ عاجزی اور استغفار کے موقعہ پر اپنی بھول چوک کو بھی ظلم کہہ دیتے ہیں اس کی پوری بحث ہم آدم علیہ السلام کے واقعہ میں عصمت انبیاء کے موقعہ پر کر چکے۔ **دوسرا اعتراض:** اگر ابراہیم علیہ السلام سارے جہان کے امام ہیں تو وہ حضور علیہ السلام کے برابر بلکہ ان سے بڑھ گئے کیونکہ ان کی دعوت بھی عام ہوگئی پھر تم حضور علیہ السلام کو سید المرسلین کیوں کہتے ہو۔ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ ابراہیم علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا۔ لِلنَّاسِ اِمَامًا حضور علیہ السلام کے متعلق فرمایا گیا لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا (الفرقان: ۱) جس سے معلوم ہوا کہ وہ تو لوگوں کے اور حضور علیہ السلام ملائکہ اور جنات وغیرہ ساری خلق کے امام یعنی پیشوا ہیں اور حضور علیہ السلام نذیر یعنی نبی ہیں لہٰذا حضور علیہ السلام کی دعوت عام ہے دوسرے یہ کہ ابراہیم علیہ السلام سارے لوگوں کے امام ہیں نہ کہ نبی اور حضور علیہ السلام تمام جہانوں کے نبی یعنی سارے جہان پر حضور کا کلمہ پڑھنا لازم ہے اور تمام دینوں کا دین ابراہیمی کے موافق ہونا اس کی حقانیت کی دلیل ہے اسی لئے بعد کے تمام پیغمبروں کا دین، دین ابراہیمی کے موافق ہوا بلا تشبیہ یوں سمجھو کہ ہم جس کو نماز کا امام بنائیں اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ ہم اس کی سی اور اس کے ساتھ نماز پڑھیں گے نہ یہ کہ اس کے امتی بن جائیں۔ **تیسرا اعتراض:** جب سارے آسمانی دین ملت ابراہیمی کے موافق ہیں تو ان میں اختلاف کیوں ہے۔ **جواب:** کلی قوانین میں اس کے موافق ہیں جزئیات میں اختلاف جیسے صاحبین حنفی ہیں مگر کبھی مسائل میں امام ابو حنیفہ کی مخالفت بھی کرتے ہیں یا جیسے سارے یونانی طبیب بوعلی سینا کے پیرو ہیں مگر ان کے آپس کے طریقہ علاج مختلف اس کے یہی معنی ہیں کہ قواعد اور قوانین میں سب ان کے تابع اور جزئیات میں اختلاف اور پھر ان کے جزئیات بھی قوانین کے موافق رہتے ہیں۔ **چوتھا اعتراض:** اگر ابراہیم علیہ السلام نبیوں کے بھی امام ہیں تو سب نبی ان کے امتی بن گئے حالانکہ تم کہتے ہو کہ حضور علیہ السلام نبی الانبیاء ہیں نیز قرآن کریم فرماتا ہے کہ قُلْ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا (البقرہ: ۱۳۵) یعنی اے نبی فرما دو کہ ہم ملت ابراہیمی کی پیروی کرتے ہیں۔ **جواب:** اس کا جواب دوسرے اعتراض کے جواب میں گزر گیا یہاں اتباع کے صرف یہ معنی ہیں کہ ہمارے احکام ان کے موافق ہوں خلاف نہ ہوں جیسے کہ آخری بادشاہ اگلے بادشاہوں کے قوانین سلطنت باقی رکھتا ہے اس سے یہ بادشاہ اگلوں کا رعایا نہ بن گیا بلکہ اس نے طریقہ حکومت میں ان کی موافقت کی **پانچواں اعتراض:** اس

آیت سے معلوم ہوا کہ ابوبکر صدیق اور عمر فاروق کی خلافت صحیح نہیں کیونکہ یہ حضرات اولاً شرک میں مبتلا تھے بعد میں مومن ہوئے اور شرک بڑا ظلم ہے اور مشرک بڑا ظالم جو کبھی ظالم رہ چکا ہو امام نہ بننا چاہئے۔ **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک الزامی اور دوسرا تحقیقی الزامی یہ ہے کہ پھر خلافت مرتضوی کی بھی خیر نہیں کیونکہ وہ بھی پیدائشی مسلم نہ تھے خود فرماتے ہیں۔

مصرع سَبَقْتُكُمُوْا اِلَى الْاِسْلَامِ طُرًّا

یعنی میں تم سب سے پہلے اسلام لایا اور اسلام وہ لاتا ہے جو پہلے سے مسلمان نہ ہو جواب تحقیقی یہ ہے کہ نبوت کے لئے معصوم ہونا ضروری ہے کہ کبھی بھی نبی سے شرک و کفر اور گناہ وغیرہ صادر نہیں ہو سکتا کیونکہ نبی کی اطاعت اور اس کی تعظیم بہر حال لازم ہے مگر خلافت و امامت وغیرہ کیلئے فی الحال فاسق نہ ہونا کافی۔ لہٰذا جو شخص پہلے فاسق یا کافر ہو اور پھر مسلمان متقی پرہیز گار بن جائے تو خلیفہ بن سکتا ہے کیونکہ خلیفہ کی اطاعت بہر حال لازم نہیں بلکہ اگر خلاف شرع حکم دے اس کی مخالفت ضروری۔ روافض کی معتبر کتاب نہج البلاغہ میں سیدنا مولا علی کا فرمان موجود ہے۔ لَا بُدَّ لِلنَّاسِ مِنْ اَمِيْرٍ بَرًّا وَّ فَاجِرٍ لوگوں کے لئے ایک امیر ضروری ہے چاہے نیک ہو یا فاجر، فاسق اس قول کے مطابق تو فاجر فاسق بھی امیر بن سکتا ہے۔ افسوس ہے کہ شیعہ مخالفت شیخین میں قرآن کریم سے بھی آنکھیں بند کر لیتے ہیں کہ یہ تو توبہ کرنے والے کو فاجر اور فاسق کہتے ہیں مگر قرآن کریم فرماتا ہے فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ (الفرقان: ۷۰) یعنی رب تعالیٰ توبہ کرنے والوں کے گناہوں کو نیکیاں بنا دیتا ہے بلکہ حق یہ ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق نے اسلام سے پہلے بھی کبھی شرکیہ عقیدہ نہ رکھا کبھی بت پرستی نہ کی، کبھی شراب نہ پی، کبھی زنا کے قریب نہ گئے۔ آپ خود تو بت پرستی کیا کرتے جب اپنی والدہ کے شکم میں تھے تو اپنی ماں کو بت کے آگے جھکنے نہ دیتے تھے پیٹ میں اس طرح سکڑ جاتے کہ وہ جھک نہ سکتیں ایک بار آپ کے والد ابوقحافہ آپ کو بت کے سامنے جھکنے کے لئے لے گئے آپ نے فرمایا کہ اے بت میں بھوکا ہوں مجھے روٹی دے، میں پیاسا ہوں مجھے پانی پلا، بیمار ہوں مجھے شفا دے۔ جب وہ کچھ نہ بولا تو آپ نے اس کو جوتے مارے اور فرمایا کہ تو سجدے کے لائق کیسے ہو سکتا جب تجھ میں طاقت ہی کوئی نہیں۔ سبحان اللہ۔

تفسیر صوفیانہ

رب تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کا روحانی درجات طے کرنے کا امتحان لیا کہ انہیں فرمایا کہ تم صبر، تسلیم، توکل اور رضا وغیرہ پر سوار ہو کر قلب سر، روح خفا وحدت احوال اور مقامات کے درجات طے کر کے وہ الی اللہ اور فی اللہ کے راستے کو طے کر کے منزل فنا تک پہنچے۔ تب الطاف ربانی نے ان پر توجہ فرمائی اور فرمایا کہ ہم تم کو فنا کے بعد بقاء اور حق سے خلق کی طرف رجوع عطا فرمائیں گے تا کہ آپ خلق کے امام بنیں اور ان کو اسی راستہ پر چلنا سکھائیں اور وہ سب آپ کی پیروی کر کے ہم تک پہنچیں تب آپ نے عرض کیا کہ مولا میری اولاد سے بھی بعض کو درجہ امامت عطا فرمانا فرمان الٰہی ہوا کہ ان میں سے بعض تمہاری اقتداء چھوڑ کر ظالم ہو جائیں گے اور ہماری خلافت اور امامت ظالموں کو نہیں ملتی۔ (ابن عربی) راہ تصوف میں ابراہیم علیہ السلام امام الائمہ ہیں اور یہ راستہ بغیر امام طے ہونا محال۔ مولانا فرماتے ہیں

چوں گرفتی پیر ہیں تسلیم شو ہم چو موسیٰ زیر حکم خضر رو

وَ اِذْ جَعَلْنَا الْبَیْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَ اَمْنًا ؕ وَ اتَّخِذُوْا مِنْ
اور جب بنایا ہم اس گھر کو جائے رجوع واسطے لوگوں کے اور امن اور بناؤ تم جائے قیام
اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کیلئے مرجع اور امان بنایا اور ابراہیم کے
مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَ عَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ
سے ابراہیم کی جائے نماز اور عہد لیا ہم نے طرف ابراہیم اور اسماعیل
کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کا مقام بناؤ اور ہم نے تاکید فرمائی ابراہیم واسماعیل کو
اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ لِلطَّآىٕفِیْنَ وَ الْعٰكِفِیْنَ وَ الرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾
کی اس کا کہ پاک رکھو تم میرا گھر واسطے طواف والوں کے اور اعتکاف والوں اور رکوع والوں اور سجدہ والوں کے
کہ میرا گھر خوب ستھرا کرو طواف والوں اور اعتکاف والوں اور رکوع والوں اور سجود والوں کے لئے

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں فرمایا گیا تھا کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو بہت سے احکام کا مکلف کیا جن پر انہوں نے بخوشی عمل کیا اور اب فرمایا جا رہا ہے کہ ان کو بیت اللہ شریف کے خدمت جیسے اہم کام کی بھی تکلیف دی گئی جو انہوں نے برداشت کر لی **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ابراہیم علیہ السلام کی امامت کا ذکر تھا اب اس کا ثبوت دیا جا رہا ہے کہ ان کی امامت عامہ کا ظہور اس طرح ہو رہا ہے کہ ان کے بنائے ہوئے گھر کی طرف سب کا رجوع ہے اور جس پتھر پر انہوں نے قدم رکھ دیا ہے یعنی مقام ابراہیم وہ بھی قیامت تک کے لئے معظم ہے۔ **تیسرا تعلق:** پہلے فرمایا گیا تھا کہ ہم نے ابراہیم کو کئی باتوں میں آزمایا تو انہیں پورا پایا دیگر باتوں کو تو اہل کتاب بھی مانتے تھے مگر تعمیر کعبہ اور اس کا حج ہونا، اس کے وہ منکر تھے اور کہتے تھے کہ نہ تو حج طریقہ ابراہیمی ہے اور نہ کعبہ ان کی تعمیر۔ حج مشرکانہ رسم ہے جس کو محمد ﷺ نے اپنے ملک وقوم کی محبت میں باقی رکھا ہے۔ اس آیت میں ان کے اس خیال باطل کی تردید ہے کہ ہم ہی نے ابراہیم سے کعبہ بنوایا اور ہم ہی نے حج کے احکام مقرر فرمائے۔

شان نزول

اس آیت کا ایک جملہ یعنی وَاتَّخِذُوْا سے مُصَلًّى تک کا شان نزول یہ ہے کہ ایک بار حضور علیہ السلام نے عمر رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر وہ پتھر دکھایا جس کا نام مقام ابراہیم ہے حضرت عمر نے عرض کیا کہ جب یہ اتنا معظم پتھر ہے تو ہم اسے مصلی کیوں نہ بنا لیں یعنی اس کے سامنے کھڑے ہو کر کعبہ کو رخ کر کے نماز کیوں نہ پڑھیں حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے اس کا حکم نہیں دیا

گیا تب آفتاب ڈوبنے سے پیشتر ہی آیت کریمہ آ گئی۔ (تفسیر مدارک واحمدی) لہٰذا یہ آیت ان آیتوں میں سے ہے جو کہ حضرت عمر کی رائے کے موافق اتریں۔

تفسیر

وَاِذْ جَعَلْنَا یہاں ایک فعل پوشیدہ ہے یعنی اے نبی علیہ السلام یہ واقعہ یاد کرو یا ان لوگوں کو بتاؤ یا اے لوگو! یہ واقعہ یاد کرو ہم نے بنایا خیال رہے کہ بیت اللہ کا زیارت گاہ ہونا آدم علیہ السلام کے وقت سے ہے جیسے کہ خلاصہ تفسیر میں ان شاء اللہ معلوم ہو گا چونکہ اس مقام پر گھر کی شکل میں عمارت بنانے والے ابراہیم علیہ السلام ہی ہیں اس لئے اس کا بیت کی شکل میں مرجع خلائق ہونا ان کے وقت سے ہوا۔ لہٰذا قصہ ابراہیمی میں یہ واقعہ بیان کیا گیا۔ اَلْبَیْتَ یہ بَیْتُوْتَۃٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں رات گزارنا۔ بیت وہ کوٹھری یا عمارت جس میں رات گزاری جائے اب بیت ہر کوٹھری یا عمارت کو کہنے لگے اس معنی میں کعبہ کو بیت کہا جاتا ہے بلکہ مطلق البیت سے خانہ کعبہ ہی مراد ہوتا ہے کیونکہ وہ سب سے پرانا گھر ہے نیز اس کو گھر بنانے والی بڑی معظم ہستیاں ہیں لہٰذا اس وصف میں یہ کامل ہے مَثَابَۃً یہ ثَوْبٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں رکوع کرنا جزاء خیر کو بھی اسی لئے ثواب کہتے ہیں کہ وہ کرنے والے کی طرف لوٹتی ہے غالباً کپڑے کو بھی ثوب اس لئے کہتے ہیں کہ وہ انسان کے جسم سے لوٹ لوٹ کر آتا ہے مَثَابَۃً اسم ظرف ہے جس کے معنی ہیں لوٹ کر آنے یا متفرق ہو کر ملنے کی جگہ چونکہ اس مقام پر سارے جہان کے لوگ جمع ہوتے ہیں یا جو ایک بار وہاں آتا وہ بار بار آنا چاہتا ہے راستہ کی مصیبتوں کی پرواہ نہیں کرتا یا جو دنیاوی مشاغل سے فارغ ہو جاتا ہے اور اپنی اخیر عمر میں قدم رکھتا ہے تو اللہ اللہ کرنے کے لئے کعبہ معظمہ جانے کی کوشش کرتا ہے یا جن انبیاء کی امتیں ہلاک ہوئیں عموماً یہاں آ کر رہے جیسے صالح علیہ السلام وغیرہ اس لئے اسے مثابۃ کہا یوں سمجھو کعبہ معظمہ وہ آشیانہ ہے جس کی طرف پرندے شام کے وقت لوٹتے ہیں یا ہر جگہ سے مسلمان اسی طرف منہ کر کے نماز وغیرہ عبادات کرتے ہیں یا ہر جگہ سے مرنے والے مسلمان کو موت کے وقت اور قبر میں ادھر منہ کر کے لٹایا جاتا ہے۔ (تفسیر عزیزی)

لِلنَّاسِ اس میں الف لام عہدی ہے یعنی حاجیوں یا عمرہ کرنے والوں یا سارے مومنوں کا ملجاء ماوی مومن جنات کی بھی جائے رجوع کعبہ معظمہ ہی ہے کہ وہ بھی اسی طرف منہ کر کے نماز وغیرہ عبادات کرتے ہیں مگر چونکہ اصل مقصود انسان ہیں وہ جنات وغیرہ ان کے تابع اس لئے خصوصیت سے انسانوں کا ذکر ہوا نیز حج کعبہ صرف انسانوں پر فرض ہے رب فرماتا ہے وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ (ال عمران: ۹۷) اس لئے انسانوں کے لئے یہ کئی طرح مرجع ہے و امنا یہ مصدر بمعنی اسم فاعل یا اسم ظرف ہے یعنی امن پانے کی جگہ یا امن دینے والا یہاں جنون جذام اور برص سے لوگوں کو امن ہے یا حاجی کو عذاب آخرت سے امن ہے یا اس مجرم کو جو وہاں داخل ہو جائے قانون سزا سے امن ہے یا خود یہ مقام ظالموں کے قبضے سے محفوظ ہے کہ جو بیدین اسے ویران کرنا چاہے وہ تباہ ہو جائے جیسے اصحاب فیل وغیرہ یا یہ جگہ شکار کو شکاری جانوروں اور انسانوں سے امن دینے والی ہے کہ اس مقام میں بھیڑیا اور شیر بھی حملہ نہیں کرتا۔ خیال رہے کہ یہاں بیت سے سارا حرم مراد ہے یعنی مکہ مکرمہ کی وہ حدود جہاں شکار کرنا حرام ہے مگر چونکہ اس رقبہ کی یہ حرمت بیت کی وجہ سے ہے اس لئے اس کا ذکر ہوا۔ دوسری جگہ فرمایا گیا

اَنَّا جَعَلْنَا حَرَمًا اٰمِنًا (عنکبوت: ۶۷) وَاتَّخِذُوْا اس کی دو قرآ یتیں ہیں۔ خ کی فتح سے یعنی لوگوں نے ہمارے الہام سے مقام ابراہیم کو مصلیٰ بنالیا اس صورت میں جعلنا پر عطف بلا تکلف صحیح ہے دوسرے خ کے کسرہ سے تو یہاں قُلْنَا پوشیدہ ہے یعنی ہم نے کہا کہ تم اسے مصلی بنالو کیونکہ انشاء کا عطف خبر پر جائز نہیں مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مقام قیام کا ظرف ہے یعنی کھڑے ہونے کی جگہ اس کے شان نزول اور دیگر احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ مقام ابراہیم وہ پتھر ہے جس پر آپ نے کھڑے ہو کر عمارت کعبہ بنائی اور پھر اسی پر کھڑے ہو کر سارے جہان کو حج کے لئے پکارا ایک بار اس پر قدم رکھ کر اپنی بہو یعنی اسمٰعیل علیہ السلام کی بیوی سے اپنا سر دھلوایا جیسا کہ خلاصہ تفسیر میں معلوم ہوگا مُصَلًّى اس کے لفظی معنی ہیں جائے نماز مگر یہاں مجازاً قبلہ مراد ہے جیسا کہ ایک روایت میں ہے کہ میری مسجد آخر مساجد ہے مسجد بمعنی قبلہ کیونکہ کوئی بھی اس پر کھڑے ہو کر نماز نہیں پڑھتا بلکہ امام کی طرح اس کو سامنے رکھ کر نماز پڑھتے ہیں یا مقام ابراہیم کے مصلی بنانے کے یہ معنی ہیں کہ اس کی متصل زمین کو جاء نماز بناؤ اس لئے یہاں من فرمایا گیا وَعَهِدْنَاۤ اِلٰۤى اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِیْلَ عہد کے لفظی معنی وعدے کے ہیں مگر یہاں تاکیدی حکم مراد ہے یعنی ہم نے ابراہیم اور اسمٰعیل علیہما السلام دونوں کو تاکیدی حکم دیا اسمٰعیل حضرت ابراہیم کے بڑے فرزند کا نام ہے جو حضرت ہاجرہ کے شکم سے پیدا ہوئے حضرت ہاجرہ کسی شاہی خاندان سے تھیں اور شاہ مصر کے یہاں قید تھیں جن روایتوں میں ان کو لونڈی یا خادمہ بتایا گیا وہ اس لحاظ سے ہے کہ اس کو شاہ مصر نے ظلماً لونڈی بنا کر رکھا تھا کیونکہ پہلے قیدیوں کو لونڈی ہی بنالیا کرتے تھے۔ (تاریخ ابن خلدون) ابراہیم علیہ السلام اخیر عمر تک لاولد تھے بیٹے کی دعائیں مانگ کر کہتے تھے اِسْمَعْ اِیْلَ اسمع لفظ عربی ہے اور ایل عبرانی میں خدا کا نام جس کے معنی ہوئے اے خدا میری سن لے جب آپ پیدا ہوئے تو اس دعا کی یادگار میں آپ کا نام اسمٰعیل رکھا گیا (روح البیان وغیرہ) اَنْ طَهِّرَا بَیْتِیَ یہ لفظ تطہیر سے بنا ہے جس کے معنی ہیں پاک کرنا اور پاک رکھنا یہاں دوسرے معنی مراد ہیں یعنی میرے اس گھر کو نجاستوں اور گھناؤنی چیزوں سے پاک و صاف رکھو یہ نہیں کہ اب تک ناپاک تھا اور اب پاک کرو چونکہ کعبہ اللہ ہی کی عبادت کے لئے ہے اور اسی کے حکم سے بنایا گیا اور کسی انسان کا اس پر قبضہ اور ملکیت نہیں اس لئے رب نے اسے اپنی طرف منسوب فرمایا کہ بیتی یعنی میرا گھر یہ مطلب نہیں کہ رب تعالیٰ وہاں رہتا ہے جیسے ناقۃ اللہ و روح اللہ لِلطَّآىٕفِیْنَ یہ طواف سے بنا جس کے معنی ہیں کسی کے آس پاس گھومنا شہر طائف کو بھی اسی لئے طائف کہتے ہیں کہ اس کا راستہ حرم کے گرد گھومتا ہوا گیا ہے اس سے مراد یا تو وہ پردیسی لوگ ہیں جو خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے یہاں پھیرا مار جاتے ہیں یہ عام طواف کرنے والے خواہ دیسی ہو یا پردیسی وَالْعٰكِفِیْنَ یہ عکوف سے بنا ہے جس کے معنی ہی متوجہ ہونا یا کسی کے ساتھ تعظیماً تعلق پیدا کرنا یا ٹھہرنا اسی سے اعتکاف بنا جو رمضان کے آخری عشرہ میں ہوتا ہے یہ سنت مؤکدہ علی الکفایہ ہے اس عاکفین سے یا تو مکہ کے باشندے مراد ہیں یا وہاں اعتکاف کرنے والے وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ رکع راکع کی اور سجود ساجد کی جمع ہے۔ اس سے مراد ہیں نمازی لوگ یعنی ہمارے گھر طواف کرنے والوں اور اعتکاف کرنے والوں اور نمازیوں کے لئے پاک صاف رکھو جس سے معلوم ہوا کہ وہاں عبادت کے سوا کوئی دنیوی کام جائز نہیں۔

خلاصہ تفسیر

اے نبی ﷺ ان کو یہ بھی یاد دلا دو کہ ہم نے اس مبارک گھر کو ہمیشہ سے لوگوں کی زیارت گاہ اور مقام ثواب بنایا کہ ہمیشہ سے لوگ یہاں جمع ہوتے ہیں اور بھکاری ثواب سے اپنا دامن مراد بھرلے جاتے ہیں اور ہر مصیبت میں اسی کی طرف رجوع کرتے ہیں چونکہ یہ لوگوں کے اجتماع کی جگہ تھی اس لئے ہم نے یہاں امن رکھی کہ نہ تو کوئی مسافر یہاں لوٹا جائے یا مارا جائے اور نہ یہاں عام وبائی امراض پھیلیں اور نہ جانوروں کو تکلیف وایذا پہنچے اور نہ اسے کوئی ویران و برباد کر سکے کیونکہ یہ چیزیں اجتماع کو توڑنے والی ہیں اور چونکہ یہاں وہ پتھر بھی ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت خلیل نے کعبہ جلیل بنایا اور اس پتھر کو حضرت خلیل کی پاپوشی کا شرف حاصل ہوالہذا ہم نے اس کی اتنی عظمت بڑھائی کہ اس کو لوگوں کا قبلہ گاہ قرار دے دیا اور حکم دیا کہ اس گھر کا طواف کر کے گھر بنانے والے کی قیام گاہ کے سامنے سر جھکا کر نفلیں پڑھنا۔ اور یہ آج کی بات نہیں بلکہ ابراہیم علیہ السلام کو بھی حکم دیا کہ میرے اس گھر کو گندگیوں یعنی پیشاب پاخانے وغیرہ اور گھناؤنی چیزوں تھوک وخون کوڑا وغیرہ سے پاک صاف رکھنا تاکہ اس میں طواف کرنے والے اور اعتکاف کرنے اور نماز پڑھنے والے آسانی سے بے تکلف یہ عبادت ادا کر سکیں۔ کیونکہ یہ جگہ ان ہی لوگوں کے واسطے ہے۔

خانہ کعبہ کی تاریخ

تاریخ ابن عساکر اور تاریخ ارزقی سے تفسیر عزیزی وغیرہ نے نقل کیا کہ جب حضرت آدم علیہ السلام بہشت سے زمین پر تشریف لائے تو بارگاہ الٰہی میں عرض کیا کہ خدایا میں یہاں نہ تو ملائکہ کی تسبیح وتکبیر سنتا ہوں اور نہ کوئی عبادت گاہ دیکھتا ہوں جیسے کہ آسمان میں بیت المعمور دیکھتا تھا جس کے اردگرد ملائکہ طواف کرتے تھے جواب الٰہی آیا کہ جاؤ جہاں ہم نشان بتائیں وہاں کعبہ بنا کر اسکے اردگرد طواف بھی کرلو۔ اور اس کی طرف نماز بھی ادا کرو حضرت جبریل علیہ السلام آدم علیہ السلام کی رہبری کے لئے ان کے ساتھ چلے اور انہیں وہاں لائے جہاں سے زمین بنی تھی یعنی جس جگہ پانی پر جھاگ پیدا ہوا تھا اور پھر وہی جھاگ پھیل کر زمین بنی اس کا پورا واقعہ ان شاء اللہ اِنَّ اَوَّلَ بَیۡتٍ (ال عمران: ۹۶) کی تفسیر میں آئے گا حضرت جبریل نے وہاں اپنا پر مار کر ساتوں زمین تک بنیاد ڈال دی جس کو ملائکہ نے پانچ پہاڑوں کے پتھروں سے بھرا کوہ لبنان۔ کوہ طور کوہ جودی اور حرا اور طور زیتا بنیاد بھر کر نشان کے لئے چاروں طرف کی دیواریں اٹھادیں اس طرف آدم علیہ السلام نماز پڑھتے رہے اور اس کا طواف بھی کرتے رہے بعض روایات میں آیا ہے کہ خود بیت المعمور اتار کر اس بنیاد پر رکھ دیا گیا تو گویا بنیاد دنیوی پتھروں کی رہی اور عمارت بیت المعمور کی طوفان نوحی تک کعبہ اسی حال میں رہا اس طوفان کے وقت وہ عمارت تو آسمان پر اٹھائی گئی اور یہ کعبہ کی جگہ اونچے ٹیلے کی طرح رہ گئی مگر لوگ برابر برکت کے لئے یہاں آتے تھے اور آ کر دعائیں مانگتے تھے پھر ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ تک کعبہ اسی حال میں رہا جب حضرت اسمٰعیل وہاجرہ اس میدان میں آ کر ٹھہرے اور ان کی وجہ سے یہاں کچھ آبادی ہو گئی جس کا ذکر اگلی آیت میں آئے گا ان شاء اللہ تب حضرت ہاجرہ کے انتقال کے بعد حضرت ابراہیم کو

حکم ہوا کہ آپ اسمٰعیل کو ساتھ لے کر یہاں عمارت کعبہ بنائیں اس کی نشانی اسی طرح قائم فرمائی کہ ایک بادل کا ٹکڑا بھیجا گیا تا کہ اس کے سایہ سے کعبہ کی حد مقرر کر لی جائے حضرت جبریل نے اس سایہ کی مقدار خط کھینچا اور ابراہیم علیہ السلام نے اس خط پر یہاں تک زمین کھودی کہ بنیاد حضرت آدم نمودار ہوئی اور اس بنیاد پر عمارت بنائی اس کی مقدار یہ ہے کہ اس کی بلندی نو ہاتھ اور رکن اسود سے رکن شامی تک کی دیوار ۳۳ ہاتھ اور رکن شامی سے رکن غربی تک کی دیوار ۲۲ ہاتھ اور رکن غربی سے رکن یمانی تک ۳۱ ہاتھ اور رکن یمانی سے پھر رکن اسود تک ۳۰ ہاتھ لہٰذا اس وقت یہ کعبہ مستطیل کی شکل تھا جس کا طول عرض سے زیادہ اور خود طول کی شرقی غربی دیواروں میں ایک غیر محسوس سا فرق، اس کا دروازہ زمین سے ملا ہوا جس میں کواڑ وغیرہ نہ تھا جس کی شکل یہ ہے۔
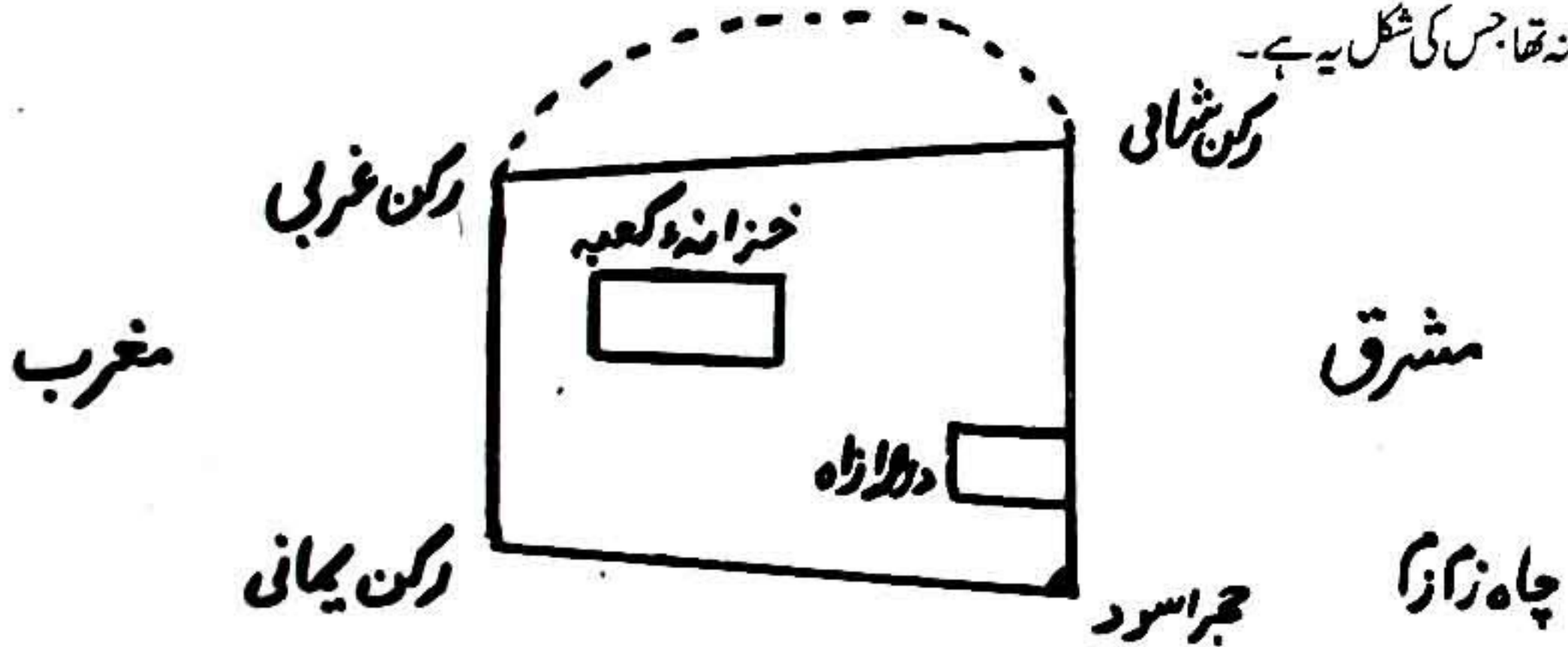
کہ کچھ دنوں بعد طبع حمیری نے اس دروازہ میں کواڑ زنجیر اور قفل لگائے یہ بھی خیال رہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کے اندر داہنی جانب ایک تغار سا بنایا تھا جو مثل خزانہ کے تھا کعبہ کے لئے جو کچھ نذر تحفے آئیں اس میں رکھے جائیں اس کے دروازے دو تھے ایک داخل ہونے کا دوسرا نکلنے کا اور کعبہ بنانے والے خلیل تھے اور ان کو گارا اور پتھر اٹھا کر دینے والے اسمٰعیل علیہ السلام اور اس عمارت میں تین پہاڑوں کے پتھر لگائے گئے کوہ ابوقبیس کوہ حرا اور کوہ ورقان ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کسی نے یہاں عمارت نہ بنائی تھی مگر آپ کے بعد کئی دفعہ اس کی تعمیر و مرمت ہوئی چنانچہ ایک دفعہ قبیلہ عمالقہ اور جرہم نے اسے بنایا پھر دوبارہ قصی ابن کلاب نے اسکی تعمیر کی جس میں چھت درخت مقل کی لکڑی کی بنائی جس پر بجائے تختوں کے خرمے کی لکڑی ڈالی جب حضور علیہ السلام کی عمر شریف ۲۵ سال کی تھی۔ تو پھر قریش کو اس کی تعمیر کرنا پڑی وجہ اس کی یہ ہوئی کہ ایک عورت وہاں خوشبو سلگاتی تھی ایک بار اچانک اس سے شعلہ اٹھا اور چھت جل گئی اس سے پہلے سیلابوں وغیرہ سے کعبہ کی دیواریں بھی پھٹ چکی تھیں لہٰذا سرداران قریش نے جمع ہو کر ولید ابن مغیرہ کو میر عمارت مقرر کیا اور کعبہ کو منہدم کر کے دوبارہ بنایا مگر آپس میں یہ طے کیا کہ اس میں مال حلال ہی خرچ ہو چونکہ اس وقت اکثر مالدار سود خور تھے اس لئے مال حلال بہت کم جمع ہوا اس کمی مال کی وجہ سے انہوں نے عمارت چھوٹی کر دی اور چند فرق بھی کر دیئے **اول**: یہ کہ تعمیر ابراہیمی سے چند گز زمین چھوڑ کر اسے حطیم قرار دیا (جس میں اب بھی کعبہ کا پرنالہ گرتا ہے) **دوسرے**: یہ کہ بجائے دو کہ ایک ہی دروازہ رکھا اور وہ بھی زمین سے خوب اونچا تا کہ جسے چاہیں جانے دیں اور جسے چاہیں نہ جانے دیں تیسرے یہ کہ خانہ کعبہ

کے اندر لکڑی کے ستونوں کی صفیں بنائیں ہر صف میں تین تین ستون **چوتھے**: یہ کہ اس کی بلندی دگنی کردی گئی یعنی پہلے نو ہاتھ تھی اب ۱۸ ہاتھ **پانچویں**: یہ کہ خانہ کعبہ کے اندر رکن شامی کے قریب ایک زینہ بنایا جس سے چھت پر چڑھ سکیں اور اب کعبہ کی شکل یہ ہوگئی۔
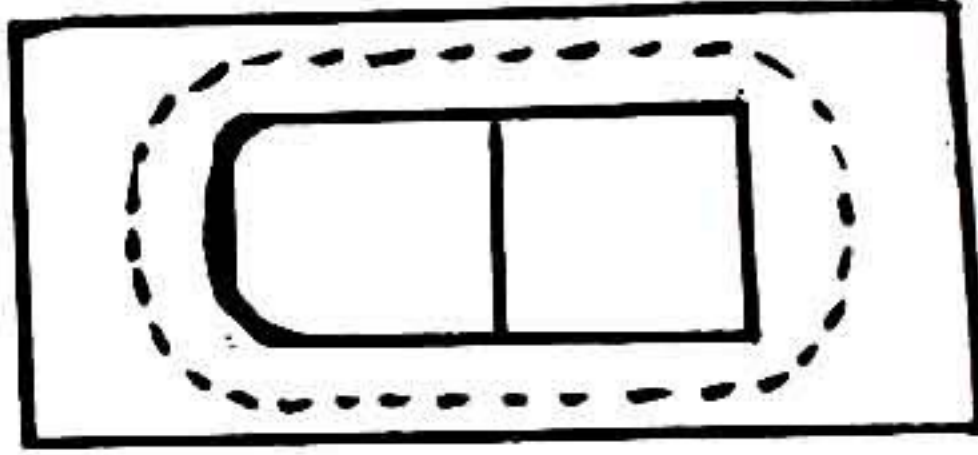
حضرت عائشہ صدیقہ فرماتی ہیں کہ ایک بار مجھے خود حضور علیہ السلام نے کعبہ کے متصل زمین میں بنیاد ابراہیمی کھول کر دکھائی جس میں اونٹ کی کوہان کی شکل کے پتھر لگائے ہوئے تھے اور فرمایا کہ اے عائشہ قریش نے روپیہ کی کمی کی وجہ سے بنیاد ابراہیمی کا کچھ حصہ چھوڑ دیا۔ ابھی لوگ نو مسلم ہیں اگر ان کے بھڑک جانے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم موجودہ کعبہ کو منہدم کر کے بنیاد ابراہیمی پر مکمل بناتے پھر اسلام میں عائشہ صدیقہ کی روایت کی وجہ سے حضرت عبداللہ ابن زبیر نے کعبہ معظمہ دوبارہ بنایا جس کو بنیاد ابراہیمی پر مکمل کیا قریش کے فرقوں کو دور کیا حطیم کو خانہ کعبہ میں داخل کیا اور اس میں زمین سے متصل شرقاً غرباً دروازے رکھے یمن سے خوشبودار مٹی منگوا کر جس کو ارس کہتے ہیں چونہ میں مخلوط کر کے بجائے گارے کے استعمال کی اور اس کی دروازوں پر اندر باہر مشک وعنبر سے کہگل کی دیواروں پر نہایت قیمتی ریشمی غلاف چڑھایا جسے غلاف کعبہ کہتے ہیں اور جس کا اب بھی رواج ہے غلاف کعبہ سب سے پہلے پہنانے والے کا نام اسعد ہے جو شاہ یمن تھا جسے تبع کہتے ہیں یہ ہی مدینہ منورہ کو آباد کرنے والا ہے حضور انور کے شوق ملاقات میں اس نے یہاں ہی سکونت اختیار کرلی اس کی کچھ قوم والے حیرہ بھی یہاں رہ گئے یہ ہی مدینہ پاک کی پہلی آبادی ہے جیسے قوم جرہم نے مکہ معظمہ کو پہلے آباد کیا اس کا پورا واقعہ روح البیان پارہ ۲۶۔۲۵ قوم تبع کی تفسیر میں ملاحظہ فرمائیں۔ ۲۷ رجب ۶۴ ہجری کو اس کام سے فراغت حاصل ہوئی پھر ۷۴ھ میں حجاج ابن یوسف نے جو کہ عبدالملک ابن مروان کا نائب تھا یہ عمارت گرا کر قریش کی طرح ہی بنادیا۔ پھر ہارون الرشید نے چاہا کہ عبداللہ بن زبیر کے طریقہ پر بنائے مگر علماء نے منع کیا بار بار بنانا اور گرانا کھیل ہو جائے گا پھر اسلامی بادشاہ اس کی مرمت تو کرتے رہے مگر کسی نے دوبارہ نہ بنایا پھر ۱۰۴۰ھ میں سلطان مراد ابن احمد خان شاہ قسطنطنیہ نے جب دیکھا کہ اس کی عمارت بہت کہنہ ہوگئی ہے تو سوائے اس رکن کے (گوشہ یا کونہ) جس میں سنگ اسود لگا ہوا ہے سب کو گرا کر پھر نئے سرے سے بنیاد حجاج کے موافق کعبہ بنایا جس کے اندر سنگ مرمر کا فرش بچھایا اور اندر چھت پر نہایت نفیس مخملی چھت گیری لگائی اور باہر کی دیواریں سنگ خارا سے چونہ میں چنیں نہایت نفیس ریشمی سیاہ پردہ تمام خانہ کعبہ پر ڈالا جس پر کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ بنا اور طول دیوار میں کئی بالشت سہرا چمکا لگایا جس میں کار چوبی حروف سے سلطان کا نام لکھا گیا اب موجودہ کعبہ سلطان مراد کا بنایا ہوا ہے اور مصر سے ہر سال غلاف کعبہ تیار ہو کر بڑے جشن اور دھوم دھام سے آتا رہا اور ۱۳۸۲ھ میں غلاف کعبہ لاہور سے تیار ہو کر گیا اور دستور یہ رہا کہ ہمیشہ حج کے موقعہ پر پرانا غلاف اتار کر خدام کعبہ کو دے دیا

جاتا جس کو حاجی لوگ تبرک ٹکڑے ٹکڑے خرید لیتے نیا غلاف چڑھا دیا جاتا میں نے ۱۳۵۰ھ میں وہاں دیکھا کہ نجدیوں کی حکومت ہے ملک عبدالعزیز ابن سعود وہاں کا بادشاہ ہے اس کے ظلم و ستم کی وجہ سے مصر سے غلاف آنا بند ہو گیا اب خود نجد میں ہی تیار ہوتا ہے جس کے اوپری حصہ میں ابن سعود کا نام لکھا جاتا ہے ہماری اس تحقیق سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ کعبہ معظمہ کو عمارتی شکل میں سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام نے بنایا اور پھر پانچ بار کعبہ بنتا رہا اور کعبہ کی موجودہ عمارت ۳۳۹ سال کی ہے کیونکہ ۱۰۴۰ھ میں بنی اور اب ۱۳۷۹ھ ہے۔

مقام ابراہیم و سنگ اسود

اس لفظ کی تحقیق ہم ابھی تفسیر میں کر چکے ہیں حدیث شریف میں ہے کہ رکن اور مقام دو جنتی یاقوت ہیں پہلے بہت نورانی تھے اللہ نے ان کا نور محو کر دیا اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ مشرق و مغرب کو چمکاتے مقام ایک پتھر ہے جس پر تین بار حضرت خلیل کھڑے ہوئے اولاً تو جب کہ ان کی بہو حضرت اسمٰعیل کی بیوی نے ان سے عرض کیا کہ میں آپ کا سر دھلا دوں تب آپ نے گھوڑے سے اتر کر اس پتھر پر قدم رکھا اور ان سے یہ خدمت لی جس کا پورا قصہ ان شاء اللہ اگلی آیت میں آئے گا دوسرے جب کہ کعبہ کی دیواریں اونچی ہوئیں تب آپ نے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے کہا کہ ہمارے واسطے کوئی پتھر لاؤ جس پر ہم کھڑے ہو کر دیوار بنائیں حضرت اسمٰعیل علیہ السلام پتھر کی تلاش میں ابوقبیس پہاڑ پر تشریف لے گئے راہ میں حضرت جبریل ملے اور کہا کہ آیئے میں آپ کو ایک پتھر بتاؤں جو آدم علیہ السلام کے ساتھ دنیا میں آیا اور اسے ادریس علیہ السلام نے طوفان نوحی کے خوف سے اس پہاڑ میں دفن کر دیا ہے اس جگہ چھوٹے بڑے دو پتھر مدفون ہیں چھوٹے کو تو کعبہ کی دیوار میں دروازے کے قریب لگا دو کہ ہر طواف کرنے والا اس کو چوما کرے یعنی سنگ اسود اور بڑے پر ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہو کر عمارت بنائیں چنانچہ آپ وہ دونوں پتھر لے آئے اور یہ پیغام الٰہی بھی پہنچایا ابراہیم علیہ السلام نے حکم الٰہی کے مطابق سنگ اسود کو تو ایک گوشہ میں لگا دیا اور بڑے پر کھڑے ہو کر تعمیر کا کام جاری کیا جس قدر عمارت بلند ہوتی جاتی یہ پتھر بھی اونچا ہوتا جاتا تھا یہاں تک کہ آپ تعمیر سے فارغ ہوئے اور پتھر کی ضرورت نہ پڑی روایت میں ہے کہ جب سنگ اسود دیوار کعبہ میں قائم کیا گیا تو اس کی روشنی چاروں طرف دور تک جاتی تھیں جہاں تک اس کی روشنی پہنچی وہاں تک حرم کے حدود مقرر ہوئے جس میں شکار کرنا منع ہے اور سنگ اسود کا رنگ بالکل سفید تھا گنہگاروں کے ہاتھوں سے سیاہ ہو گیا۔ تیسرے جب کہ آپ تعمیر سے فارغ ہوئے تب بحکم الٰہی کوہ ابوقبیس پر بھی مقام ابراہیم رکھا اور اس پر چڑھ کر چوطرفہ آواز دی کہ اے اللہ کے بندو حج کے لئے آؤ جس کا ذکر خود قرآن کریم نے فرمایا وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّعَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ (حج: ۲۷) یہ آواز قیامت تک پیدا ہونے والی روحوں نے سنی جو خاموش رہی اسے حج نصیب نہ ہو گا اور جس نے جتنی بار لبیک کہا اتنے ہی حج کرے گا (حدیث و عام تفاسیر) اس وقت اسی پتھر میں حضرت خلیل کی انگلیوں کا نشان نمودار ہو گیا بہت عرصہ تک لوگوں نے یہ نشان دیکھا مگر چومنے والوں کی کثرت سے کچھ محو ہو گیا اب کچھ خفیف سا نشان باقی ہے پہلے یہ پتھر خانہ

کعبہ کے متصل رکھا ہوا تھا حضرت عمر کے زمانہ میں ایک عظیم سیلاب آیا جس کا نام ہے سیل "ام نہشل" اس سیلاب سے یہ پتھر اپنی جگہ سے ہٹ کر دور جا گرا حضرت عمر خود تشریف لائے اور مطاف کے کنارے چاہ زمزم کے پاس اس کو رکھا اور اس پر ایک پتھر کی عمارت بنادی اب تک وہی عمارت ہے اور اسی جگہ یہ پتھر موجود ہے اس کے سامنے کچھ تھوڑی جگہ اور پاٹ دی گئی جس میں آگے پیچھے کل بارہ آدمی نماز پڑھ سکتے ہیں اس کی پوری تفصیل تفسیر عزیزی وغیرہ بڑی اور معتبر تفاسیر میں دیکھیں۔

تنبیہ: مکہ مکرمہ میں پندرہ جگہ دعا بہت قبول ہوتی ہے۔ ملتزم یعنی سنگ اسود اور دروازہ کعبہ کے درمیان میزاب یعنی کعبہ معظمہ کے پرنالے کے نیچے رکن یمانی کے پاس صفا مروہ کے درمیان سنگ اسود اور مقام ابراہیم کے پاس خانہ کعبہ کے اندر منیٰ شریف میں اور مزدلفہ میں عرفات میں تین جمروں کے پاس اور چاہ زمزم پر اور زمزم پیتے وقت (عزیزی) جس کو وہاں کی حاضری نصیب ہو دعائیں مانگیں اور فقیر کے لئے بھی دعا کرے **دوسری تنبیہ:** کعبہ کو کعبہ کہنے کی دو وجہیں ہیں ایک یہ کہ کعب کے لفظی معنی ہیں اٹھا ہوا ہونا یا اونچا ہونا ٹخنہ کو کعب اور کنواری لڑکی کو کاعبہ اسی لئے کہتے ہیں وَّكَوَاعِبَ اَتْرَابًا (النباء: ۳۳)) چونکہ کعبہ کی سطح سمندر سے بہت اونچی ہے اس لئے اسے کعبہ کہا جاتا ہے یا کعب بقاعدہ اقلیدس وہ ہے جس کو چھ برابر کی سطح گھیریں اگرچہ بناء ابراہیمی میں کعبہ بشکل مستطیل تھا لیکن نزول قرآن کے وقت بشکل مکعب تھا یعنی اس کی لمبائی چوڑائی اور بلندی برابر اس لئے اسے کعبہ کہا گیا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے ہوئے **پہلا فائدہ:** بزرگوں کی چیزوں کی تعظیم کرنا اور اس سے برکت لینا قرآن کریم سے ثابت ہے اور ساری امت کا اس پر عمل مقام ابراہیم ایک پتھر ہے اس کی یہ تعظیم صرف اسی لئے نہیں ہے کہ وہ جنتی ہے بلکہ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ اس پر قدم خلیل علیہ السلام پڑے ہیں اس لئے زمانہ ابراہیمی سے پہلے اس کی وہ تعظیم نہ ہوتی تھی جواب ہے کہ تمام لوگوں کے سر اس کی طرف جھکتے ہیں اس لئے قرآن کریم نے اس پتھر کو مقام ابراہیم کہا نہ کہ جنت کا پتھر تا کہ معلوم ہو کہ اس پتھر کی تعظیم وتوقیر اس لئے ہے کہ وہ ابراہیم علیہ السلام کا جائے قیام ہے تبرکات کی تعظیم بہت سی آیتوں اور احادیث سے ثابت ہے اس کے لئے ہماری کتاب جاء الحق کا مطالعہ کریں بلکہ بزرگوں کے تبرکات سے بیماریاں جاتی رہیں رب کی رحمتیں آتی ہیں دیکھو یوسف علیہ السلام کی قمیص سے یعقوب علیہ السلام کی آنکھیں روشن ہوئیں اور ایوب علیہ السلام کے پاؤں کی دھون سے آپ کو شفا ہوئی اور آج تک آب زمزم شفاء کہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ایڑی سے پیدا ہوا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تبرکات سے طالوت کو جنگ میں فتح ہوئی **دوسرا فائدہ:** مسجدوں کو گندگی اور کوڑے سے پاک رکھنا بہت ضروری ہے کیونکہ مسجد کی تعظیم کعبہ معظمہ کی طرح ہے اسی لئے کعبہ کی طرح مسجد کی چھت پر بھی بلاضرورت چڑھنا منع ہے اور کعبہ کی صفائی کا تو اس آیت میں حکم دیا گیا لہٰذا تمام مسجدوں کے لئے بھی یہی حکم ثابت ہوگا **تیسرا فائدہ:** مسجد اور کعبہ معظمہ کا کوئی متولی بھی چاہئے جس کے ذمے وہاں کی ساری خدمات ہوں کیونکہ رب نے کعبہ کو پاک رکھنے کا حکم ابراہیم اور اسمٰعیل علیہ السلام کو دیا کہ وہ اپنے اہتمام سے کریں **چوتھا فائدہ:** مسجدوں میں اعتکاف نماز وغیرہ دینی کام ہی

کریں گے کیونکہ اس آیت میں بتایا گیا کہ یہ صفائی اعتکاف کرنے والوں اور نمازیوں کے لئے ہے **پانچواں فائدہ:** مسافروں کو ہر مسجد اور مسجد حرام میں ٹھہرنا اور سونا وغیرہ جائز ہے کیونکہ عاکفین کے معنی مسافرین بھی کئے گئے ہیں **چھٹا فائدہ:** تمام مسجدیں بلکہ سارے سجدے کعبہ معظمہ کی طرف ہونے چاہئیں کیونکہ اس آیت میں بتایا گیا کہ ہم نے کعبہ کو لوگوں کا جائے رجوع بنایا لوگوں کے رجوع کرنے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ وہاں جا کر حج کریں دوسرے یہ کہ ہر جگہ سے ادھر رخ کر کے سجدہ کریں **ساتواں فائدہ:** جو مجرم حرم شریف میں جا کر امن لے لے اسے نہ تو وہاں گرفتار کر سکتے ہیں اور نہ وہاں سزا دے سکتے ہیں بلکہ اس تک رزق وغیرہ نہ پہنچنے دیں تا کہ وہ خود مجبور ہو کر نکلے کیونکہ اسے مقام امن فرمایا گیا **آٹھواں فائدہ:** اس آیت کے شان نزول سے معلوم ہوا کہ حضرت عمر فاروق نہ تو تبرکات بزرگان کے خلاف تھے نہ انہیں مٹانا چاہتے تھے دیکھو مقام ابراہیم جو ابراہیم کی یادگار اور ان کا تبرک ہے حضرت عمر فاروق کی رائے سے عظمت والا اور مصلی بنا بیعتہ الرضوان کا درخت حضرت عمر نے ہرگز نہیں کٹوایا بلکہ اصل درخت گم ہو گیا لوگوں نے دوسرے درخت کی زیارت شروع کر دی تھی آپ نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے وہ دوسر درخت کٹوایا۔ دیکھو بخاری شریف **نواں فائدہ:** عین نماز کی حالت میں بزرگوں کے تبرکات کی تعظیم جائز ہے۔ دیکھو جو نماز مقام ابراہیم کی طرف ہوگی اس میں نماز کی حالت میں اس پتھر کا احترام بھی ہوگا حضرت صدیق اکبر نے بحالت نماز حضور کا ادب کیا خود مصلی سے پیچھے آگئے حضور درمیان نماز میں امام ہوئے اس سے وہ لوگ عبرت پکڑیں جو کہتے ہیں کہ نماز میں حضور کا خیال کرنا گدھے بیل کے خیال سے بدتر ہے وہ مقام ابراہیم کے متعلق کیا کریں گے بلکہ صفا و مروہ کی سعی و تعظیم پر حج و عمرہ موقوف ہے صفاء و مروہ حضرت ہاجرہ کی گزر گاہ **دسواں فائدہ:** جب مقام ابراہیم اس لئے قابل عزت ہوا کہ حضرت ابراہیم کا قدم اسے لگ گیا تو حضور کی ازواج و صحابہ کرام و اہل بیت عظام کی عزت کا کیا پوچھنا کہ انہیں حضور انور سے بہت قرب رہا۔ (مدارک و خزائن العرفان)

اعتراضات

پہلا اعتراض: حج کی کیا ضرورت ہے اور دنیا بھر کو وہاں جمع کرنے سے کیا فائدہ کہ لوگ اپنے کام کا نقصان کر کے اور پیسہ برباد کر کے وہاں کا چکر لگائیں **جواب:** اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ قدرت نے انسان میں دو قوتیں رکھی ہیں ایک عقل دوسرا عشق جو اس کے لئے دو پاؤں کی طرح ہیں نہ تو فقط عقل کافی ہے نہ صرف عشق سے کامیابی اسی لئے عبادات دو قسم کی ہیں بعض میں اطاعت غالب اور بعض میں عشق کامل لیکن ہر عبادت میں یہ دونوں موجود ضرور ہیں نماز زکوۃ وغیرہ میں اطاعت کا غلبہ ہے اور روزہ اور حج وغیرہ میں عشق کا اظہار چنانچہ حج میں دعا اور استغفار کا تعلق عقل سے ہے مگر احرام باندھ کر عاشقانہ حالت پیدا کرنا، بیت اللہ کے آس پاس گھومنا عرفات وغیرہ میں لبیک پکارنا وغیرہ یہ سب حضرت عشق کی جلوہ گری ہے دوسرے یہ کہ انسان کے علوم و کمالات آپس کے اجتماع سے بڑھتے ہیں اس لئے جنگلی لوگ اکثر جاہل اور بے تہذیب اور شہری لوگ عام طور پر مہذب ہوتے ہیں کیونکہ شہر میں ہر قسم کے لوگوں کا اجتماع ہوتا ہے ضرورت تھی کہ دنیا بھر کے مسلمان بھی ایک جگہ جمع ہو کر ایک دوسرے کے حالات سے خبردار ہوں جس سے ہر ایک کی عقل اور علم ترقی کرے اور عالم کے مسلمانوں

میں اجتماعی شان پیدا ہو اس کے لئے دنیا کے آباد حصہ کا مکان یعنی مکہ معظمہ منتخب کیا گیا کہ وہاں ہر سال اسلامی کانفرنس ہوا کرے آج دوسری قومیں اپنی کانفرنس کرنے میں بہت دشواریاں برداشت کرتی ہیں مسلمانوں کی یہ کانفرنس بہت آسانی سے ہو جاتی ہے تیسرے یہ کہ انسانی روح شیشے کی طرح صاف ہے۔ جس میں ایک دوسرے کا عکس پڑتا ہے جب بہت سی روحیں ایک جگہ جمع ہوں گی تو ان سے قوی نورانیت پیدا ہوگی جیسا کہ چراغوں کے اجتماع سے ہوتی ہے اسی لئے اسلام میں جمعہ اور جماعتیں ہیں **دوسرا اعتراض:** تو اس اجتماع کے لئے عرب کا خشک ریگستان ہی کیوں منتخب کیا گیا کوئی اور جگہ ہونی چاہئے تھی **جواب:** چند وجہ سے ایک یہ کہ یہ جگہ آبادی عالم کے تقریباً بیچ میں واقع ہوئی ہے تو گویا یہ حکومت الٰہیہ کا دارالخلافہ ہے دوسرے یہ کہ عبادت میں اپنی اصل کی طرف رجوع کرنا بہتر ہے نماز میں زمین پر سر رکھا جاتا ہے کیونکہ زمین ہی ہماری اصل ہے ایسے ہی کعبہ معظمہ زمین کی اصل ہے ضروری تھا کہ مسلمان اپنی اصل پر پہنچ کر حج کے ارکان ادا کریں اسی لئے نماز میں ادھر منہ کر لیتے ہیں اور حج میں وہاں پہنچ جاتے ہیں تیسرے یہ کہ عرب کے اس مقام پر جو بھی آئے گا خاص اس عبادت ہی کی نیت سے آئے گا دنیاوی اغراض کا بالکل دخل نہ ہوگا کیونکہ وہاں دنیاوی کاروبار ہوتے ہی نہیں پہاڑی علاقہ یا تفریحی مقامات پر زرخیز خطہ میں لوگ سیر و تفریح کی نیت سے بھی جاسکتے ہیں مگر اس خشک بیابان میں سوائے عبادت دوسرا مقصد ہو سکتا ہی نہیں **تیسرا اعتراض:** حج میں بت پرستی سے مشابہت ہے کہ بزرگوں کے تبرکات کی تعظیم کرنا پتھریلی عمارت کے آس پاس گھومنا کہیں پتھر پھینکنا کہیں دوڑنا ان باتوں سے فائدہ کیا ہے (آریہ) **جواب:** اس میں چند حکمتیں ہیں ایک یہ کہ ان کاموں سے گزشتہ مقبول بندوں کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ جس سے ان کی اتباع کا جذبہ پیدا ہوتا ہے مثلاً صفا مروہ کے درمیان دوڑنے میں حضرت ہاجرہ کی بے بسی یاد آتی ہے جمروں پر کنکر مارنے میں اسماعیل علیہ السلام کی شیطان سے نفرت اور قربانی کا جذبہ یاد آتا ہے قربانی کرنے میں حضرت خلیل کا راہ مولیٰ میں اکلوتے بیٹے کو ذبح کرنا یاد آتا ہے۔ جس سے ہر شخص میں شوق عبادت کی آگ بھڑکتی ہے کہ ہم بھی انہیں کی طرح نفس کشی اور اطاعت الٰہی کریں۔ دوسرے یہ کہ ہر زمین کی علیحدہ تاثیر ہے جہاں نافرمان رہتے ہوں وہاں مدتوں تک قہر کے آثار نمودار ہوتے ہیں اور فرمانبرداروں کی جگہ میں آثار رحمت نمایاں رہتے ہیں۔ حکومتیں باغیوں کے شہروں کو بم برسا کر تباہ کرتی ہیں۔ اور اس تباہ شدہ بستی سے عرصہ تک لوگ عبرت پکڑتے ہیں وفادار سلطنت کے مکانات کو اچھی حالت میں رکھا جاتا ہے ملک عرب میں حکومت الٰہیہ کی وفادار جماعت گزری ہے جہاں جگہ جگہ ان کے نشانات موجود ہیں ہم بھی وہاں پہنچ کر ان کے سے کام کر کے اپنی وفاداری کا اظہار کرتے ہیں **چوتھا اعتراض:** کعبہ سے پہلے رب نے کوئی پاک مکان بنایا تھا یا نہیں اگر بنایا تھا تو کعبہ کی کیا ضرورت تھی اور اگر نہیں تو اگلے لوگ اس پاکی سے محروم رہے (ستیارتھ پرکاش) **جواب:** کعبہ انسانوں کی پیدائش کے وقت سے نہیں بلکہ زمین کے بننے کے وقت سے پاک اور مقدس جگہ ہے کہ ہمیشہ انسانوں نے وہاں سے برکت حاصل کی ابراہیم علیہ السلام نے تو اس پر عمارت بنائی تاکہ اس کی پہچان رہے لہٰذا یہ سوال ہی حماقت ہے اور نیز اگر کعبہ بعد میں بھی بنتا تو بھی اس میں کوئی خرابی نہ تھی ہو سکتا تھا کہ اگلوں کے لئے پاک جگہ دوسری ہو اور پچھلوں کے لئے یہ کعبہ **پانچواں اعتراض:** کسی

خاص جگہ کو عزت دینے میں خدا بعضوں کا طرفدار ٹھہرتا ہے کہ وہاں کے رہنے والے تو بے تکلف فائدہ اٹھائیں گے مگر دور کے رہنے والے لوگ بہت دشواری سے، رب کو تو سب بندوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنا چاہئے (ہندو) **جواب:** پنڈت جی! تمہارا خدا بھی غیر جانبدار نہیں اس نے بھی متھرا، جودھیا، بندرابن وغیرہ تیرتھ کے مقام بنا کر اپنی طرف داری کا ثبوت دے دیا کہ گنگا باشی تو بے تکلف روز وہاں غوطے لگایا کریں مگر دور والوں کو دشوار ہو پنڈت جی! دنیا کا نظام ایسے ہی قائم ہے کوئی امیر کوئی فقیر کوئی جنگل بیابان اور کہیں کھیتی باڑی سے آبادان **چھٹا اعتراض:** اگر مقام ابراہیم پتھر کی اس لئے یہ تعظیم ہے کہ اسے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم لگے ہیں تو چاہیے کہ جس جس پتھر و ذرے کو آپ کے قدم لگے ہوں وہ سب مسجود اللہ ہوں آپ تو زندگی بھر ہزار ہا پتھروں ذروں پر چلے پھرے تھے۔ (وہابی) **جواب:** بے شک اس سرزمین کے تمام ذرات عظمت والے ہیں جہاں جناب خلیل کے قدم لگے تھے جیسے مدینہ پاک کی ساری مٹی خاک شفا ہے مگر خاص یہ حرمت و تعظیم آپ کے خاص قیام سے۔ ان کی جو بھی ادا رب کو پسند آ گئی اس ادا کی یادگاریوں قائم کر دی جیسے حج کے طواف قدوم میں اکڑ کر چلنا حضور کی خاص ادا تھی جو رب کو پسند آئی اب اس کی یادگار قائم ہے التحیات میں کلمہ شہادت پر انگلی اٹھائی جاتی ہے۔ ہر جگہ پر نہیں اٹھائی جاتی کہ یہ محبوب کی کسی ادا کی نقل ہے۔

تفسیر صوفیانہ

قلب کعبہ ہے جس کو ماسوی اللہ کی گندگی سے پاک رکھنے کا حکم ہے اس کے آباد کرنے والے کو حکم ہے کہ اس کعبہ کو تمام غیروں سے پاک کرو تا کہ یہاں انوار الٰہی اعتکاف کریں اور اسرار رحمانی یہاں تک پہنچیں جو بندہ اس درجہ کو پہنچ گیا وہی حقیقت رب کا ساجد ہے کسی نے خوب کہا ہے ۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است — از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است
کعبہ تعمیر خلیل اطہر است — دل نظر گاہ جلیل اکبر است

صوفیائے کے ہاں کعبہ میں جانے کا وہی حقدار ہے جس کا دل سلامت زبان سچی ہاتھ صاف اور فرج پاک ہو، گندے دل جھوٹی زبانیں گناہوں میں لتھڑے ہوئے ہاتھ زانی شرمگاہیں پلیدی اور گندگیاں ہیں جس سے کعبہ کو پاک و صاف رکھو۔ (روح البیان) دوسری تفسیر، ہم نے بیت اللہ یعنی قلب کو لوگ کا جائے رجوع اور مقام امن بنایا کہ جہاں پہنچ کر نفس کے دھوکوں شیطان کے وسوسوں کے خیال اور وہم کے فریبوں سے امن ملتی ہے اسی کعبہ کے پاس ایک مقام ابراہیم یعنی روح کی تجلی گاہ بھی ہے۔ اے طالبان حق تم اس پر مشاہدہ انوار الٰہیہ اور ذوق وشوق کی حقیقی نماز ادا کرو اور ہم نے حکم دیا ہے کہ اس کعبہ قلب کو شیطانی وسوسوں اور شہوانی خیالات سے پاک صاف رکھو تا کہ سالکین اپنی سیر میں اس قلب کا طواف کریں اور واصلین یہاں توکل کے ساتھ اعتکاف کریں اور خاشعین یہاں رکوع اور رضا اور سجود فنا ادا کریں۔ (ابن عربی)

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ

اور جب عرض کیا ابراہیم نے اے رب میرے بنا دے تو اس کو شہر امن والا اور

اور جب عرض کی ابراہیم نے اے میرے رب اس شہر کو امن والا بنا دے اور اس
ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ
روزی دے رہنے والوں کو اس سے بعض پھل اور جو ایمان لائے اور میں سے ساتھ اللہ
شہر کے رہنے والوں کو طرح طرح کے پھلوں سے روزی دے اور جو ان میں سے
الْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَ مَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ
کے اور دن پچھلے کے فرمایا اور جو کفر کرے گا پس سامان دوں گا اس کو تھوڑا پھر مجبور
اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لائیں فرمایا اور جو کافر ہوا تھوڑا برتنے اسے بھی دوں گا
اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾
کروں گا اس کو طرف عذاب آگ کے اور برا ہے جائے رجوع
پھر اسے عذاب دوزخ کی طرف مجبور کروں گا اور وہ بہت بری جگہ ہے پلٹنے کی

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں ابراہیم علیہ السلام کے دو حال بیان ہو چکے ہیں انہیں امامت کا ملنا اور بیت اللہ کی تولیت کا سپرد ہونا اب ان کا تیسرا حال یعنی مکہ مکرمہ کو بسانا بیان ہو رہا ہے اگرچہ آبادی مکہ ان دونوں واقعات سے پہلے ہوئی چونکہ وہ دونوں اس سے افضل واعلیٰ تھے نیز وہ اصل مقصود تھے اور یہ ان کا ذریعہ لہٰذا خلاف ترتیب پہلے انہیں بیان کیا اور بعد میں اسے یوں سمجھو کہ ان واقعات کے ذکر میں ترتیب رتبی کا لحاظ ہے نہ کہ ترتیب وقوعی کا **دوسرا تعلق:** اہل کتاب کے مسلمانوں پر دو اعتراض تھے ایک بیت اللہ کی تعظیم کرنا دوسرے شہر مکہ کو معظم جاننا اگلی آیتوں میں پہلے اعتراض کا جواب دیا گیا اب دوسرے کا جواب دیا جا رہا ہے کہ یہ دونوں کام ابراہیم علیہ السلام نے کئے انہیں باقی رکھا تم کیسے اہل کتاب ہو جو ابراہیمی سنتوں کا انکار کر رہے ہو۔

تفسیر

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ یہاں بھی ایک فعل پوشیدہ ہے یعنی اے نبی علیہ السلام انہیں یہ واقعہ بھی یاد دلاؤ کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی کہ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا یہاں ہذا سے اس بے آب ودانہ جنگل کی طرف اشارہ ہے جہاں حضرت خلیل علیہ السلام اپنی بیوی ہاجرہ اور اپنے فرزند اسمٰعیل علیہ السلام کو چھوڑ چلے ہیں یعنی اے مولیٰ بنا دے تو اس جنگل کو، بَلَدًا اٰمِنًا امن والا شہر اس میں دو باتیں عرض کیں ایک یہ کہ یہاں بڑا شہر آباد ہو جائے دوسرے یہ کہ وہ شہر قحط خشک سالی، دھنسنے، زلزلوں، جنون جذام، برص وغیرہ دنیوی مصیبتوں اور دجال عالم سلاطین وغیرہ دینی مصیبتوں سے اٰمِنَ رہے خیال رہے کہ یہاں امن

کے معنی ہیں امن والا جیسے لابن، کے معنی دودھ والا اور تامر، تمر والا اور بلد وہ محدود جگہ ہے جس کے رہنے والوں میں اجتماعی شان اور انس ہو اور جیسے کہ فقط بیت سے خانہ کعبہ مراد ہوتا ہے ایسے ہی بلد سے مکہ مکرمہ۔ وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ یہ آپ کی تیسری عرض ہے پہلی دونوں دعائیں اس خطہ کے لئے تھیں اور یہ وہاں کے رہنے والوں کے لئے مختلف قسم کے پھل اور میوے دے اگر غور کیا جائے تو یہ تینوں معروضات درحقیقت ایک ہی ہیں یعنی اس جگہ کو معظم بنا اور عظیم کے لئے اس کا شہر ہونا بھی ضروری ہے ورنہ اس کی حفاظت کون کرے گا پھر یہاں امن بھی چاہئے ورنہ لوگ آباد کیسے رہیں گے اور پھر یہاں غلے اور دانے بھی چاہئیں کہ اس کے بغیر زندگی ناممکن اور یہاں ہر ملک کے پھل بھی چاہئیں تاکہ یہاں کے باشندے میوے کھانے کے شوق میں میوہ دار ملکوں میں نہ جائیں بلکہ میوے خود ان کے پاس آئیں خیال رہے کہ زندگی کی بقاء کے لئے غلے اور دانے کھائے جاتے ہیں اور لذت کے لئے میوے یعنی غلہ غذا ہے اور میوے مزہ میوے غذا کے بعد کھائے جاتے ہیں لہٰذا میوے کی دعا میں دانہ غلہ خود بخود ہی آ گیا لہٰذا یہ دعا بہت جامع ہے اگر آپ من نہ فرماتے تو تمام میوے وہاں نہ پہنچتے۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے لئے امامت مانگی تھی تو اس میں رب کی طرف سے ایمان کی قید لگائی گئی تھی۔ آپ نے خیال فرمایا کہ شاید رب کی روزی کے بھی مومنین ہی مستحق ہوں اس لئے عرض کیا مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ خدایا یہاں روزی انہیں دینا جو تجھ پر اور قیامت پر ایمان لائیں اس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خداوند یہاں مومنین ہی آباد ہوں کفار نہ رہیں تاکہ تیرے گھر کی پوری پوری عظمت ہو۔ اس مطلب کو اس طرح ادا کیا کیونکہ بغیر روزی انسان کا رہنا محال ہے یا کفار سے اپنی بیزاری کا اظہار مقصود ہے کہ مولیٰ جو کافر ہو اگرچہ مکہ معظمہ کا رہنے والا ہو۔ اگرچہ میری اولاد ہو مگر میں ان کے لئے روزی کی بھی دعائیں نہیں کرتا رب تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرماتے ہوئے وسعت دیکر فرمایا قَالَ وَمَنْ كَفَرَ یا تو یہاں ایک فعل پوشیدہ ہے یعنی میں کفار کو بھی کچھ رزق دوں گا اور یہ مبتداء ہے جس کی خبر آگے آ رہی ہے یعنی اے ابراہیم علیہ السلام تمہاری دعا بالکل قبول لیکن یہ امامت نہیں بلکہ رزق ہے امامت میں ہماری نیابت ہے جسے پاک صاف لوگ ہی پا سکتے ہیں۔ اور رزق میں ہماری پرورش ہم رب العالمین ہیں خار و گلزار، بدکار و ایماندار دونوں کو رزق دیتے ہیں لہٰذا جو کفر بھی کرے گا اس کو بھی فَاُمَتِّعُهٗ قَلِیْلًا کچھ تھوڑا دنیوی سامان ہم دیں گے اس کلام کے دو معنی بن سکتے ہیں ایک یہ کہ مومن کو جسمانی باقی اور فانی رزق کے مقابلہ میں نفع بہت کم ہے یا یہ کہ کچھ روز تو اس مکہ میں بت پرست بھی رہیں گے۔ اور خانہ کعبہ میں بت پرستی بھی ہوگی مگر تمہاری دعا کا ظہور اس طرح ہوگا کہ وہاں محمدی نور چمکے گا جو قیامت تک کے لئے اس جگہ کو بت پرستی اور شرک سے پاک کر دے گا تاکہ اس سے اس نبی کی عظمت و شوکت کا پتہ چلے اگر رات نہ ہو تو سورج دور کسے کرے گا اگر پیاس نہ ہو تو پانی بجھائے کسے وہ نبی ان ہی میں سے صدیق و فاروق بنائے گا۔ لہٰذا یہ ان کی دعا کی قبولیت ہے نہ کہ تردید (تفسیر کبیر) ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ثم فاصلے کے لئے آتا ہے چونکہ کافر کو سزا پانے اور جہنم میں جانے کے درمیان کچھ مدت کا فاصلہ ہے اس لئے ثم فرمایا گیا اضطرار سے یا تو مجبور کرنا مراد ہے اور یا ادھر ادھر جبراً کھینچنا چنانچہ قرآن کریم نے ایک جگہ فرمایا یَوْمَ یُدَعُّوْنَ اِلٰى نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا (طور: ۱۳) دوسری جگہ فرمایا یَوْمَ یُسْحَبُوْنَ فِی النَّارِ عَلٰی

وُجُوۡهِهِمۡ (القمر: ۴۸) یہ دونوں آیتیں اس جملہ کی تفسیر ہیں یعنی اسے جہنم میں جانے پر مجبور کروں گا یا کھینچ کر پھینکوں گا یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یہ لفظ ضر سے بنا ہو جس کے معنی ہیں مصیبت کا قریب کرنا اسی لئے عورت کی سوکن کو ضرہ کہتے ہیں کہ وہ اس کے لئے مصیبت بن کر قریب رہتی ہے۔ (تفسیر کبیر) یعنی میں اسے عذاب نار کے قریب کردوں گا دوزخ میں اگرچہ ٹھنڈا عذاب بھی ہوگا مگر چونکہ وہ ٹھنڈک بھی آگ کی وجہ سے ہوگی یعنی آگ سے قریب طبقے گرم ہوں گے اور اس سے دور طبقہ ٹھنڈا لہٰذا وہ بھی آگ کا ہی عذاب ہوگا وَبِئۡسَ الۡمَصِيۡرُ۔ مصیر، صیرٌ سے بنا ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں پھاڑنا اور اصطلاح میں اس کے معنی ہیں ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہوجانا مصیر وہ حالت یا وہ جگہ جس کی طرف آخر کار انسان پہنچے۔ بِئۡسَ فرما کر یہ بتایا کہ دنیا میں بدتر سے بدتر جگہ میں بھی کچھ نہ کچھ خوبی ہوتی ہے مگر دوزخ وہ جگہ ہے کہ جہاں مصیبت ہی مصیبت اور برائی ہی برائی ہے یعنی وہ حالت اور وہ جگہ ہر طرح بری ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے نبی ﷺ انہیں وہ واقعہ بھی یاد دلا دو جبکہ ابراہیم علیہ السلام نے اس جنگل میں جہاں آج کعبہ ہے اپنے باپ بچوں کو چھوڑ کر دعا کی تھی کہ اے مولا اس جنگل کو امن والا شہر بنا اور یہاں کے رہنے والوں کو جو مومن ہوں قسم قسم کے دانے میوے عطا فرما۔ یا اس جگہ کو مومنین سے آباد کر حق تعالیٰ نے ان کی دعا قبول فرماتے ہوئے فرمایا کہ اے ابراہیم کافروں کو بھی ان کی زندگی میں کچھ رزق دوں گا پھر بعد موت عذاب جہنم کی طرف مجبور کروں گا اور وہ بہت بری جگہ ہے۔ رہے مسلمان انہیں مرنے سے پہلے دنیوی سامان ملے گا اور مرنے کے بعد لازوال نعمتیں عطا ہوں گی یعنی کافر کی موت تو اس کی نعمتوں کو ختم کر دے گی۔ مگر مسلمان کی موت اسے بڑھائے گی یا یہ کہ اس شہر میں کچھ روز تو کافر رہیں گے مگر آخر کار یہاں اسلام کا آفتاب چمکے گا جس سے شرک و کفر کی تاریکی ہمیشہ کے لئے دور ہوجائے گی۔ اس دعا کی قبولیت کا اثر اس طرح ظاہر ہوا کہ کچھ دنوں بعد ہی یہاں شہر بن گیا اور ہمیشہ یہاں کا ادب اور احترام ہوتا رہا۔ انسان تو کیا یہاں کے جانور بھی محفوظ ہوگئے جس طرح بیت المقدس پر بادشاہوں کے ہاتھ سے مصیبتیں پیش آئیں اور صلیبی جنگ اور چنگیز خانیوں کے حملوں کی آگ ہر جگہ پھیلی۔ الحمدللہ کہ یہاں نہ پھیلی اور حضرت جبریل کو حکم ہوا وہ اپنے پروں پر شام یا فلسطین سے کچھ زمین اٹھا کر لائے۔ اولاً تو اس کو خانہ کعبہ کے گرد سات بار طواف کرایا۔ اور پھر اسے مکہ معظمہ سے چند میل دور دو پہاڑوں پر رکھ دیا اسی لئے اس کا نام طائف ہوا۔ (تفسیر عزیزی) قدرت کا تماشا دیکھو کہ عرب جیسے گرم و خشک ملک میں مکہ معظمہ سے بالکل قریب ہی وہ جگہ بھی رکھ دی جہاں کی ہوا خوب سرد رہتی ہے اور قسم قسم کے نفیس میوے بکثرت پیدا ہوتے ہیں۔ جس سے مکہ مکرمہ کی منڈی میووں سے بھری رہتی ہے نیز قریباً ہر ملک کے غلے اور میوے خلاف موسم بھی وہاں پہنچ جاتے ہیں میں نے وہاں بے موسے میٹھے انار اور خشک پان کھائے مکہ مکرمہ کی آبادی اور تعمیر خانہ کعبہ کا قصہ اگلی آیت میں آرہا ہے انشاء اللہ تعالیٰ۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ:** مکان کی عزت مکین سے ہے۔ مکہ مکرمہ چونکہ بزرگوں کی دعا سے

آباد ہوا اور وہاں نبیوں نے قیام فرمایا اس لئے سارے شہروں سے افضل ہوا سیدنا امام مالک کے نزدیک شہر مدینہ شہر مکہ سے افضل ہے کیونکہ مکہ مکرمہ کے لئے خلیل نے دعائیں فرمائیں اور مدینہ منورہ کے لئے حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے مکہ مکرمہ میں اجسام کا کعبہ ہے اور مدینہ منورہ میں عرفان کا کعبہ اس کی نہایت نفیس اور مکمل بحث ہماری کتاب شان حبیب الرحمان میں دیکھیں نیز ان شاء اللہ اس تفسیر میں بھی لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ (البلد:۱) کی آیت میں آئے گی **دوسرا فائدہ:** اللہ والوں کی جگہ کو متبرک سمجھنا جائز ہے مکہ مکرمہ کے متبرک ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ بزرگوں کا جائے قیام رہا۔ **تیسرا فائدہ:** اپنے بال بچوں اور وطن والوں کے لئے رب سے عمدہ رزق اور اچھے پھل مانگنا جائز بلکہ سنت انبیاء ہے۔ دیکھو ابراہیم علیہ السلام نے سارے مکے والوں کے لئے ہی چیزیں طلب کیں۔ **چوتھا فائدہ:** دعا کا اثر کبھی دیر میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا کہ مکہ مکرمہ میں ایمان و مومن ہی رہیں ہمارے حضور کے زمانہ میں ظاہر ہوئی۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ مکہ مکرمہ مقام امن ہے اور کوئی ظالم بادشاہ اس پر قابو نہ پائے گا۔ اور جو ظالم یہاں آنا چاہے گا تباہ ہوگا تو حجاج ابن یوسف یہاں کا حاکم کیوں بن گیا جس نے کہ اسی شہر میں عبداللہ بن زبیر سے جنگ کی وہاں کے باشندوں کو تکلیفیں پہنچائیں اور خانہ کعبہ کو ویران کیا یزید پلید نے بھی یہاں بڑے ظلم ڈھائے یہاں تک کہ اس کے حملے سے غلاف کعبہ بھی جل گیا۔ یہ لوگ اصحاب فیل کی طرح تباہ کیوں نہ ہو گئے **جواب:** اس شہر کے امن والا ہونے کے دو معنی ہیں ایک یہ کہ یہاں جنگ وغیرہ کرنا حرام ہے نیز قدرتی طور پر عام دلوں میں اس کا ادب اور احترام ہے دوسرے یہ کہ جو ظالم خانہ کعبہ کی ہلاکت کا قصد کرے وہ برباد ہو جائے گا اصحاب فیل نے خود کعبہ گرانے کا قصد کیا تھا برباد ہو گئے حجاج اور یزید کا مقصود خود کعبہ کی ویرانی نہ تھی بلکہ اپنے مخالفوں کو مغلوب کرنا ان کی جنگ تو مخالفوں سے تھی اتفاقاً کعبہ معظمہ کی بے حرمتی بھی ہوگئی یزید کو تو اس کی اصلاح کا موقعہ ہی نہ ملا وہ جلد مر گیا مگر حجاج نے اس پر افسوس بھی کیا اور دوبارہ پہلے سے بڑھ کر اسے آراستہ کر دیا۔ **دوسرا اعتراض:** ابراہیم علیہ السلام نے مکہ والوں کے لئے امن رزق اور پھلوں کی دعا کی یہ تمام چیزیں دنیوی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ طالب دنیا تھے۔ (بعض بے دین) **جواب:** دین کے لیے دنیا حاصل کرنا دین ہے نماز کے لئے روٹی کھانا۔ جہاد کے لئے اپنے جسم کو فربہ کرنا علم دین کے لئے مقوی دماغ غذائیں اور دوائیں کھانا دین ہی ہے حضرت خلیل نے یہ چیزیں اس لئے طلب کیں تاکہ یہاں آبادی اور رونق رہے جس سے کعبہ معظمہ کی حرمت قائم ہو۔ **تیسرا اعتراض:** قرآن نے یہاں دعاء خلیل ان الفاظ میں نقل کی کہ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت یہ جنگل تھا اور سورہ ابراہیم میں اس طرح فرمایا کہ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا یعنی اس شہر کو امن والا بنا دے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت یہاں شہر تھا یہ اختلاف کیوں ہے **جواب:** آپ نے دوبارہ دعا فرمائی ہے ایک حضرت ہاجرہ و اسمٰعیل علیہ السلام کو یہاں چھوڑتے وقت جب کہ یہ جنگل تھا اس کا ذکر اس آیت میں ہے دوسرے خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد جب کہ وہاں شہر بن چکا تھا اس کا ذکر سورۃ ابراہیم میں ہے لہٰذا آیتوں میں کوئی اختلاف نہیں **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے

معلوم ہوتا ہے کہ یہ جگہ دعا ابراہیم سے امن والی ہوئی۔ اس سے پہلے نہ تھی۔ نیز حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضور علیہ السلام نے دعا فرمائی کہ اے اللہ میں مدینہ کو حرم بناتا ہوں جیسے ابراہیم نے مکے کو حرم بنایا۔ (تفسیر کبیر و مشکوٰۃ بروایت مسلم) نیز دوسری روایت میں آیا ہے کہ حضور نے فتح مکہ کے دن فرمایا کہ اس شہر کو اللہ نے اسی دن سے حرم بنایا ہے جب زمین آسمان پیدا فرمائے (مشکوٰۃ) اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جگہ ہمیشہ ہی سے حرم ہے ان میں مطابقت کیسے ہو۔ اور یہ جگہ حرم کب سے ہے **جواب:** یہ جگہ ابراہیم علیہ السلام سے پہلے اور معنی سے حرم تھی۔ کہ یہاں قدرتی طور پر ظلم و جبر نہ ہوتے تھے اور حضرت خلیل سے شرعی طور پر حرم بنی کہ یہاں ظلم وغیرہ شرعاً حرام کیے گئے۔ یعنی اس کی پہلی قدرتی حرمت تھی اور آپ کے دعا سے شرعی حرمت ہوئی کہ اس کا قانون بن گیا۔ لہٰذا دونوں روایتیں مطابق ہیں **پانچواں اعتراض:** ابراہیم علیہ السلام نے ایمان میں صرف اللہ اور قیامت کے دن کا ذکر کیوں کیا ایمان تو انبیاء و کتب آسمانی وغیرہ سب پر چاہئے **جواب:** آپ نے ایمانی حدود کے دو کناروں کا ذکر فرمایا توحید مبداء قیامت منتہی باقی چیزیں درمیان میں آ گئیں۔ جیسے کہا جائے کہ آسمان و زمین اللہ کا ہے درمیانی چیزیں خود بخود آ گئیں یہاں اللہ اور قیامت کے جاننے اور ماننے کا ذکر نہ فرمایا بلکہ ان پر ایمان لانے کا ذکر ہے ایمان وہ ہی ہو گا جو کہ نبی اور آسمانی کتاب کے بتانے پر جانا مانا جاوے تو نبی کا ذکر اس میں آ گیا۔ دیکھو شیطان سب کچھ مانتا ہے مگر مومن نہیں کہ بغیر تعلیم نبی مانتا ہے یا اللہ پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے سارے نبیوں پر ایمان لایا جائے کسی کو اپنا والد ماننے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے سارے عزیزوں کو اپنا عزیز مانے کہ والد کا باپ دادا اس کا بھائی چچا اس کی اولاد بھائی بہن وغیرہ۔

تفسیر صوفیانہ

قلب کعبہ ہے اور سینہ اس کا حرم اور باقی بدنی قوتیں وہاں کے باشندے اور نفسانی صفات اور شیطانی وسواس چور و دشمن دعا یہ کی گئی کہ مولا کعبہ قلب کو حرم یعنی سینہ کو امن والا مدینہ بنا دے جہاں کی رہنے والی قوتیں شیطان اور نفس سے محفوظ رہیں اور ان میں سے جو اللہ کی توحید اور معاش و معاد کا قائل ہو کر مومن بن جائے اسے روحانی معارف اور حکمت پھل عطا فرما۔ جواب میں ارشاد ہوا کہ اس مدینہ سینہ کے رہنے والے جو ایک حد میں محدود رہ کر محبوب کے دیدار سے محجوب ہوں گے اور شریعت عشق کے کافر ہوں گے انہیں بھی کچھ علوم عقلیہ کا سامان دیا جائے گا مگر آخر کار محرومی اور حجاب کی آگ کی طرف دھکیلے جائیں گے اور بہت برا ٹھکانہ ہے کیونکہ اس میں ہمیشہ نار فراق میں جلنا ہے۔ (ابن عربی) نیز صورت جسمانی گویا کہ مکہ ہے اور قلب اس کا ظاہری کعبہ مگر حقیقی کعبہ بارگاہ الٰہی ہے جس کا قلب مومن طواف حقیقی کرتا ہے جو شخص اس کعبہ حقیقی کا حقیقی طواف کر سکے تو یہ کعبہ اس کی زیارت کرتا ہے بیت کا طالب بیت اللہ جاتا ہے اور رب البیت کے طالب کے پاس بیت اللہ آتا ہے حق اس کا قبلہ ہے اور وہ تمام کا قبلہ جیسے آدم علیہ السلام قبلہ ملائکہ قرار پائے تھے اس میں یہی راز تھا۔ حضرت شیخ عطار منطق الطیر میں فرماتے ہیں۔

حق تعالٰی گفت آدم غیر نیست کور چشمی و ترا ایں سیر نیست

شد نفخت فیہ من روح آشکار سر جاناں گشت بر خاک استوار

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

از دم حق آمدی آدم توئی! اصل کرّمنا بنی آدم توئی

قبلہ کل آفرینش آمدی! پائے تاسر عین بنیش آمدی

نگاہ ابلیس نے سیدنا آدم کا خاکی بدن دیکھا لہٰذا ادھر جھکنے سے انکار کر دیا۔ نگاہ ملائکہ نے اس خاک پر یار کے آشکار دیکھے اور فوراً جھک گئے۔ اعلیٰ حضرت نے فرمایا۔

شمع ایک تو ہے کہ پروانہ ہے کعبہ تیرا اور پروانے ہیں ہوتے ہیں جو کعبہ پر نثار

آنکھ والے کہتے ہیں کہ یہ کعبہ تمام عالم کا کعبہ ہے اور حضور علیہ السلام اس کے بھی کعبہ اسی لئے ولادت سرکار کے وقت خانہ کعبہ نے آمنہ خاتون کے گھر کی طرف سجدہ کیا۔ (مدارج وغیرہ)

وَ اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَ اِسْمٰعِیْلُ
اور جب اٹھاتے ہیں ابراہیم بنیادیں اس گھر کی اور اسمٰعیل
اور جب اٹھاتا تھا ابراہیم اس گھر کی نیویں اور اسمٰعیل
رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ﴿۱۲۷﴾
اے رب ہمارے قبول فرما ہم سے تحقیق تو ہی سننے والا اور جاننے والا
اے رب ہمارے ہم سے قبول فرما بے شک تو ہی سنتا جانتا

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں ابراہیم علیہ السلام کے تین واقعات بیان ہو چکے ہیں اب چوتھا بیان ہو رہا ہے۔ مگر یہاں ترتیب وقوعی نہیں رہتی **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں شہر مکہ بسانے کا واقعہ بیان ہوا اب بیت اللہ بنانے کا واقعہ بیان ہو رہا ہے جو اس شہر کا اصل مقصود ہے گویا پہلے درخت کا ذکر ہوا اب اس کے پھل کا **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں ابراہیم علیہ السلام کی چند دعاؤں کا ذکر تھا۔ اب اس کا ذریعہ قبولیت اور ظہور اثر کا ذکر ہو رہا ہے یعنی ابراہیم علیہ السلام نے وہ گھر بنا دیا جس کی برکت سے اس شہر میں امن رہے اور رزق و پھل کی بہتات بھی ہو۔

تفسیر

وَ اِذْ یَرْفَعُ یہاں بھی ایک فعل پوشیدہ ہے یعنی اے نبی علیہ السلام انہیں وہ واقعہ بھی یاد دلا دو جب کہ ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام تعمیر کعبہ کر رہے ہیں اس میں گزشتہ واقعہ حال سے بیان کیا جا رہا ہے گویا کہ اب ایسا ہو رہا ہے جیسے خواب دیکھنے والا بیان کرتے وقت کہتا ہے کہ میں نے دیکھا کہ وہاں جا رہا ہوں وغیرہ خیال رہے کہ رفع کے معنی اٹھا لینا بھی ہیں اور بلند کرنا

بھی یہاں دوسرے معنی مراد ہیں یعنی بلند کرتے ہیں۔ اِبْرٰھٖمُ ابراہیم علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے تعمیر کیا کسی دوسرے معمار اور مستری کو اس میں شامل نہ کیا تا کہ یہ ثواب صرف مجھے ہی حاصل ہو اور کعبہ بیت المقدس سے افضل رہے کیونکہ اسے حضرت سلیمان جنات سے بنوائیں گے گویا اس کو تو نبی نے بنوایا اور اسے پیغمبر نے اپنے ہاتھ سے بنایا۔ اَلْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ قواعد جمع قاعدہ کی ہے جس کے لفظی معنی ہیں ثابت رہنے والی چیز۔ اسی لئے بیٹھنے والوں کو قاعدہ کہتے ہیں کہ وہ اپنے حال پر ثابت رہتے ہیں۔ یہاں بنیادیں یا دیواریں ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ بنیاد پہلے ہی سے موجود ہے۔ حضرت خلیل نے اس پر عمارت چن دی جیسا کہ ہم خانہ کعبہ کے قصے میں بیان کر چکے ہیں اور ممکن ہے کہ قواعد سے وہ پتھر مراد ہوں جن سے دیواریں چنیں۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام بیت اللہ کے پتھر چنتے تھے وَ اِسْمٰعِیْلُ یا تو یہ ابراہیم پر معطوف ہے یعنی ابراہیم اور اسمٰعیل دونوں چن رہے تھے چونکہ حضرت اسمٰعیل چننے میں حقیقتاً شریک نہ تھے بلکہ پتھر وگارا دے کر امداد کر رہے تھے اسی لئے کچھ فاصلہ سے ان کا ذکر کیا گیا اور امداد کی وجہ سے انہیں بھی چننے والا مانا گیا اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ پوشیدہ فعل کا فاعل ہے یعنی امداد کرتے تھے ان کی اسمٰعیل اور یہ بھی احتمال ہے کہ یہ مبتداء ہو اور اگلی عبارت اس کی خبر یعنی حضرت ابراہیم تو دیواریں چن رہے تھے اور اسمٰعیل علیہ السلام یہ دعا کر رہے تھے (تفسیر کبیر) مگر پہلی توجیہ قوی ہے کیونکہ حدیث سے ثابت ہے روح البیان نے یہاں فرمایا کہ اس وقت حضرت ابراہیم کے چار بیٹے تھے اسمٰعیل، اسحاق، مدین اور مدائن مگر یہ شرف صرف اسمٰعیل علیہ السلام کو حاصل ہوا۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا یہاں ایک فعل پوشیدہ ہے یعنی وہ دونوں عرض کرتے تھے کہ اے ہمارے پروردگار ہماری اس خدمت کو قبول فرما یا تو بنانے کی حالت میں یہ کہتے جاتے تھے یا اس سے فارغ ہو کر خیال رہے کہ قبول اور تقبل میں یہ فرق ہے کہ قبول اعلیٰ چیز کے منظور کرنے کو کہتے ہیں اور تقبل حقیر ہدیہ کو محض اپنے کرم و مہربانی سے منظور فرما لینے کو یعنی یہ کام اپنے کرم سے قبول فرما لینا (تفسیر کبیر و عزیزی و روح) مطلب یہ ہوا کہ اے مولا ہماری یہ حقیر محنت تیری بارگاہ میں گو قابل قبول نہ ہو مگر مولیٰ ہماری کوتاہیوں پر نظر نہ فرما۔ محض اپنے کرم سے قبول فرما لے نیز یہ بھی معنی ہو سکتے ہیں کہ ہم اس کا ثواب نہیں مانگتے صرف تیری منظوری مانگتے ہیں کہ ثواب تو تیرے کرم سے ملے گا عقلمند خادم کو مولیٰ کی خوشنودی ثواب سے زیادہ پیاری ہے (کبیر) اس میں انتہائی انکسار ہے اس لئے دعاؤں میں تقبل ہی کہا جاتا ہے رب تعالیٰ ان محبوبوں کے صدقے سے اس تفسیر اور فقیر کے ٹوٹے پھوٹے الفاظ کو بھی اپنے کرم سے قبول فرما لے اور اسے میرے لئے صدقہ جاریہ اور گناہوں کا کفارہ بنائے خیال رہے کہ نہ ہم قیمتی اور نہ ہمارا کوئی کام قیمتی ہم تو گندگی کا ڈھیر اور بداعمالیوں کا مجموعہ ہیں اگر رب تعالیٰ قبول فرمائے تو اس کے فضل کی کوئی انتہا ہی نہیں وہ قیمتوں سے وراء ہے کرم کرے تو ہم کھوٹے کھرے بن جاویں۔

بہائے خویش می دانم بہ نیم جو نمے ارزد — وگر تو فضل فرمائی بہائم بے بہا گردد

تم کو پا کر تو سالک برا بھلا بن جائے — کھوٹا کھرا نہ دیکھے پارس کندن سبھی بنائے

اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ اے مولا تو ہی ہماری دعا سننے والا اور ہماری نیت کا جاننے والا ہے تمام کی سننا اور سب کی جاننا خدا ہی کی صفت ہے اسی لئے حصر کے طریقے پر فرمایا گیا۔ حضور علیہ السلام روزہ افطار کے وقت یہی دعا پڑھتے تھے۔ (عزیزی)

خلاصہ تفسیر

اے نبی علیہ السلام انہیں یہ واقعہ بھی سنادو کہ جب حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کعبہ کی دیواریں بناتے تھے اس طرح کہ ابراہیم علیہ السلام تو بہ نفس نفیس چن رہے تھے اور حضرت اسمٰعیل گارا اور پتھر دے رہے تھے اور نہایت عجز و انکسار سے یہ دعا کرتے جاتے تھے کہ الٰہی ہماری اس کوشش کو قبول فرما ہم جو کچھ زبان سے دعا کرتے ہیں تو خوب سنتا ہے اور ہمارے دل کی حالت سے تو خوب واقف ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ بنیاد کعبہ پہلے ہی سے موجود تھی یہاں روح البیان اور عزیزی نے فرمایا کہ زمین سے پہلے پانی ہی پانی تھا۔ قدرتی طور پر دو ہزار سال پہلے کعبہ کی جگہ اس پر سفید جھاگ پیدا ہوا کچھ روز میں اسی کو پھیلا کر زمین کر دیا گیا پھر جب فرشتوں کو رب نے آدم علیہ السلام کی پیدائش کی خبر دی تو انہوں نے اپنا خلافت کا استحقاق پیش کیا اور آدم علیہ السلام کی پیدائش کی حکمت پوچھی۔ مگر اس جرات کی معذرت میں توبہ کی نیت سے سات برس عرش اعظم کا طواف کیا حکم الٰہی ہوا کہ زمین میں بھی اسی جھاگ کی جگہ نشان لگا دو۔ جہاں میرے بندے خطا کر کے اس کے طواف سے مجھے راضی کیا کریں پھر آدم علیہ السلام کا خمیر اس کعبہ کی جگہ ہوا اور چالیس سال تک ان کا جسم پاک یہاں ہی رہ کر خشک ہوا اور آپ یہاں سے ہی جنت میں گئے۔ اور جنت سے ہندوستان میں اترے اور آپ نے پاپیادہ چالیس حج کئے کعبہ کے باقی حالات ہم اس سے پہلے بیان کر چکے ہیں۔

آبادی مکہ مکرمہ

تفسیر عزیزی میں ہے کہ جب ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے ہاتھ سے نجات پائی اور بابل والوں کے ایمان سے مایوس ہوئے تو وہاں سے ہجرت کر کے اپنے چچا ہاران کے گھر مقام حران میں آگئے ہاران کی ایک نہایت خوبصورت بیٹی تھی سارا۔ انہوں نے حضرت ابراہیم کی سعادت مندی دیکھ کر حضرت سارا کا ان سے نکاح کر دیا ابراہیم علیہ السلام کچھ روز وہاں تبلیغ فرماتے رہے مگر سوائے حضرت سارا اور لوط علیہ السلام کے کوئی ایمان نہ لایا بلکہ ہاران نے غصے ہو کر اپنی بیٹی اور داماد کو اپنے گھر سے نکال دیا۔ آپ نے حضرت سارا سے معاہدہ کیا کہ تم ہمیشہ میری فرمانبرداری کرنا اور میں تمہاری بات مانوں گا اور یہ تینوں حضرات حران سے مصر روانہ ہو گئے مصر کا بادشاہ بڑا ظالم اور سرکش تھا جب کسی خوبصورت عورت کو دیکھتا تو اس کے شوہر کو قتل کرا کر عورت پر قبضہ کر لیتا تھا جب یہ چھوٹا سا قافلہ مصر پہنچا تو شاہی پولیس نے بادشاہ کو خبر دی کہ مصر میں بے مثل حسینہ جمیلہ عورت آئی ہے۔ خیال رہے کہ مردوں میں حضرت یوسف اور عورتوں میں حضرت سارا بے مثل حسین ہوئے بلکہ حضرت یوسف کا حسن حضرت سارا کی میراث تھا ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارا کو سمجھا دیا کہ اگر تمہیں پولیس گرفتار کر کے بادشاہ کے پاس لے جائے تو تم یہ نہ کہنا کہ ابراہیم میرے شوہر ہیں بلکہ یہ کہنا کہ وہ میرے بھائی ہیں کیونکہ میں تمہارا دینی بھائی ہوں۔ حق تعالیٰ تمہیں اس ظالم سے محفوظ رکھے گا یہ گفتگو ہو ہی رہی تھی کہ ان دونوں کو پولیس نے گھیر لیا اور حضرت سارا کو بادشاہ کے پاس لے گئے۔ ابراہیم نے یہ حالت دیکھ کر نماز شروع کر دی اور دعا میں مشغول ہو گئے۔ بادشاہ حضرت سارا کو

دیکھتے ہی ان پر عاشق ہو گیا چاہا کہ کچھ بے ادبی کرے۔ حضرت سارا نے فرمایا کہ مجھے اتنی مہلت دے کہ میں غسل کر کے کچھ عبادت کرلوں ظالم نے فوراً غسل کا انتظام کر دیا آپ نے وضو کر کے نماز کی نیت باندھی اور بارگاہ قاضی الحاجات دعا میں مشغول ہوئیں جب ظالم نے دیکھا کہ دیر لگی وہ آپ کے حجرہ میں داخل ہوا اور چاہا کہ عین نماز کی حالت میں آپ پر دست درازی کرے اچانک اس کے دونوں ہاتھ خشک ہو گئے اور بے ہوش ہو کر گر پڑا سانس پھول گیا اور منہ سے جھاگ ڈالنے لگا۔ حضرت سارا نے دعا کی اے مولا اگر یہ مر گیا تو مجھ پر اس کے قتل کا الزام آئے گا۔ تو پھر میری خیر نہیں یہ دعا کرنی تھی کہ اسے ہوش آ گیا پھر وہی ارادہ کیا پھر ویسا ہی حال ہوا غرضیکہ تین بار یہ معاملہ پیش آیا تب وہ بولا کہ یہ انسان نہیں یا جن ہے یا جادوگرنی میرے پاس ایک عورت اور بھی ہے جس کو میں نے قبطیوں سے حاصل کیا تھا۔ اور میں اس پر بھی قابو نہ پا سکا (حضرت ہاجرہ) اسے بھی اس کے حوالے کرو اور ان دونوں عورتوں کو مصر سے نکال دو غرض حضرت سارا ہاجرہ کو لے کر حضرت ابراہیم کے پاس آئیں آپ اس وقت نماز میں ہی مشغول تھے۔ حضرت سارا سے پوچھا مھیم یعنی کیا حال ہے سارا خاتون نے عرض کیا کہ خیر سے رب نے ظالم کو ذلیل کیا اور مجھے خادمہ دی جس کا نام ہاجرہ ہے ابراہیم علیہ السلام بہت خوش ہوئے اور یہاں سے چاروں اصحاب روانہ ہو کر فلسطین پہنچے وہاں کے لوگوں نے ان بزرگوں کو غنیمت جانا اور بہت زمین نذر کی رب نے اس زمین میں اتنی برکت دی کہ کچھ دنوں میں آپ کے پاس کھیتی باڑی جانور غلام وغیرہ بے شمار ہو گئے آپ نے مسافر خانے اور لنگر جاری کئے اور لوط علیہ السلام کو تبلیغ دین کے لئے روم کی طرف روانہ کیا ایک دن حضرت سارا عرض کرنے لگیں کہ ہمارے گھر میں اللہ کا دیا بہت کچھ ہے مگر فرزند نہیں تم ہاجرہ سے نکاح کرلو شاید ان سے ہی کوئی بچہ پیدا ہو آپ نے نکاح کر لیا حضرت ہاجرہ کے شکم سے اسمٰعیل علیہ السلام پیدا ہوئے حضرت سارا نہایت محبت سے انہیں پالتی تھیں اور حضرت ہاجرہ صرف دودھ پلاتی تھیں مگر ابراہیم علیہ السلام حضرت سارا کی تکلیف کے خیال سے فرزند کو گود بھی نہ لیتے تھے اللہ کی شان کہ ایک دن اسمٰعیل علیہ السلام کو تنہا حجرے میں لیٹا ہوا دیکھ کر محبت پدری سے گود میں لے لیا ان کے رخسار اور پیشانی کو بوسہ دے رہے تھے کہ حضرت سارا آ گئیں اور ان پر غیرت نے اتنا غلبہ کیا کہ فرمایا اسی وقت اس کو اور اس کی ماں کو میرے گھر سے نکال کے بے آب ودانہ جنگل میں چھوڑ آؤ آپ نے بہت کچھ سمجھایا مگر کچھ پیش نہ گئی۔ ادھر تو آپ حران والے معاہدے کے پابند تھے ادھر وحی آئی کہ سارا کی ہر بات مانو اس میں ایک راز ہے۔ سچ ہے، بڑوں کی لڑائی میں بھی راز ہوتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

ہر چہ گیرد علتی علت شود کفر گیرد کاملے ملت شود

ان دو مقبول بیویوں کی لڑائی کی برکت سے عرب کا ملک بنا مکہ شہر ہوا بیت اللہ آباد ہوا۔ برادران یوسف علیہ السلام کے غصے کی برکت سے یوسف علیہ السلام مصر کی سلطنت پر جاگزین ہوئے اور بنی اسرائیل کنعان گاؤں سے نکل کر مصر اور دیگر شہروں میں پھیلے صحابہ کرام کی آپس کی جنگوں کی برکت سے بہت سی قرآنی آیات کی تفسیر ہوئی۔ جن میں باغی گروہ سے جنگ کے احکام مذکور ہیں اور اہل بیت اطہار حجاز سے نکل کر عراق میں پہنچے جس سے سارا عراق متبرک ومعظم ہو گیا ان جنگوں میں اللہ کے راز ہیں لہٰذا ہم کسی صحابی کو ظالم نہیں کہہ سکتے جیسے کہ بی بی سارا کو ظالم نہیں کہہ سکتے۔ برادران یوسف علیہ السلام کی اہانت نہیں کر

سکتے کہ وہ حضرات آسمانی ہدایت کے تارے ہیں یوسف علیہ السلام نے انہیں تاروں کی شکل میں خواب میں دیکھا۔ صحابہ کرام کو برا کہنے والے بی بی سارا اور برادران یوسف علیہ السلام کو کیا کہیں گے۔ ابراہیم علیہ السلام ان دونوں کو سواریوں پر لے کر روانہ ہوئے وہ منزل بمنزل وہاں پہنچے جہاں آج خانہ کعبہ ہے حکم الٰہی پہنچا کہ ان دونوں کو یہاں ہی چھوڑ دو اور ہمارے سپرد کر جاؤ۔ زمزم کے مقام پر ایک درخت تھا اور باقی سب جنگل بیابان تھا۔ نہ وہاں سایہ نہ دانہ پانی، نہ آدمی آپ ایک ٹوکری خرما اور کچھ روٹی کے ٹکڑے ایک مشکیزہ میں پانی حضرت ہاجرہ کے حوالے کر کے لوٹ آئے حضرت ہاجرہ پیچھے دوڑیں اور کہنے لگیں کہ مجھ کو اس بے آب و دانہ جنگل میں کہاں چھوڑے جاتے ہو۔ جہاں نہ کوئی غم خوار ہے نہ کوئی مکان سایہ دار آپ نے کوئی جواب نہ دیا۔ آخر کار حضرت ہاجرہ بولیں کہ کیا تمہیں خدا نے حکم دیا ہے سر کے اشارے سے فرمایا کہ ہاں تب آپ نے فرمایا کہ پھر مجھے کچھ پرواہ نہیں۔ میرا رب مجھے ضائع نہ کرے گا۔ واپس لوٹیں اور اپنے بچے کو گود میں لے کر اکیلی بیٹھ گئیں اور دودھ پلانے لگیں ابراہیم علیہ السلام پہاڑ کی آڑ میں آکر رکے اور کعبہ کی طرف منہ کر کے دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے اور عرض کیا رَبَّنَآ اِنِّیۤ اَسْكَنْتُ (ابراہیم: ۳۷) الخ مولیٰ میں نے اپنے بال بچے بے آب و دانہ جنگل میں چھوڑ دیئے۔ جب تک خرما اور پانی رہا حضرت ہاجرہ اطمینان سے گزر کرتی اور فرزند کو دودھ پلاتی رہیں مگر پانی ختم ہونے پر پیاس نے ستایا۔ لخت جگر نے بے اختیار رونا شروع کر دیا تو اپنی تو اتنی فکر نہ ہوئی مگر نور نظر کی بے قراری دیکھی نہ گئی۔ اٹھیں اور صفا پر چڑھیں کہ شاید کہیں پانی کا نشان ملے مگر نہ ملا مایوس ہو کر نیچے اتریں۔ مروہ پہاڑ کی طرف روانہ ہوئیں مگر نظر فرزند پر تھی راہ کے کچھ حصہ میں فرزند سے آڑ ہو گئی تو آپ اسے جلد طے کرنے کے لئے دوڑ کر چلیں اس آڑ سے نکل جانے پر پھر آہستہ چلیں یہاں تک کہ مروہ پر پہنچ گئیں وہاں چڑھ کر بھی پانی کہیں نہ دیکھا پھر صفا کی طرف روانہ ہوئی۔ اسی طرح سات چکر کیے ہر دفعہ درمیان میں دوڑتی تھیں۔ (صفا و مروہ کی سعی اسی کی یادگار ہے) اخیر بار مروہ پر چڑھیں تو ایک ہیبت ناک آواز کان میں پڑی۔ ڈر کر فرزند کے پاس آئیں دیکھا کہ وہ روتے ہوئے اپنی ایڑیاں زمین پر رگڑ رہے ہیں جس سے شیریں پانی کا چشمہ جاری ہے بہت خوش ہوئیں اور اس کے گرد مٹی جمع کر کے فرمانے لگیں یاماء زم زم اے پانی ٹھہر ٹھہر اس لئے اس کا نام آب زم زم ہوا بعض علماء نے فرمایا کہ آپ فرماتی تھیں ماء زَمْ زَمْ پانی میٹھا ہے میٹھا ہے بعض نے فرمایا ماء زَمْ زَمْ پانی بہت کافی ہے بعض نے فرمایا کہ زَمْزَمَۃ اور صہمۃ گن گنا کر گانے کو کہتے ہیں چونکہ آپ خوش ہو کر کچھ گن گناتی جاتی تھیں۔ اس لئے اس کا نام زمزم ہوا واللہ اعلم بالصواب (من بعض اساتذتنا) حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر حضرت ہاجرہ اس پانی کو گھیر نہ دیتیں تو یہ چشمہ بن جاتا اور آخر کار آپ وہ پانی خود پیتیں اور اپنے پسر کو بھی پلاتی تھیں اسی لئے بہت روز تو گزر اوقات کرتی رہیں کیونکہ اس پانی میں غذائیت بھی ہے اتفاقاً یمن کی ایک قوم جرہم کسی طرح اس طرف آ پہنچی اور مقام کدا میں اتری اس نے دیکھا کہ کچھ فاصلہ پر پرندے بہت اڑ رہے ہیں۔ کہنے لگے کہ یہاں پانی ضرور ہے۔ کیونکہ ہم یہاں بارہا آئے کبھی پرندے نہ دیکھے انہوں نے تحقیق کے لئے اپنے میں سے ایک شخص بھیجا اس نے آکر خبر دی کہ یہاں پانی کا غیبی چشمہ ہے جس کے پاس ایک بی بی اپنے فرزند کو لئے بیٹھی ہے یہ سن کر وہ سارے لوگ حضرت ہاجرہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بولے کہ اگر آپ کی

اجازت ہو تو ہم یہاں ہی رہنے سہنے لگیں۔ چونکہ حضرت ہاجرہ بھی تنہائی میں گھبرا گئی تھیں۔ اس شرط پر اجازت دے دی کہ اس پانی پر کسی کا حق نہ ہو یعنی سب استعمال تو کریں مگر حق میرا ہو ان سب نے یہ شرط قبول کر کے وہاں خود بھی رہائش اختیار کرلی اور اپنے دوسرے اہالی موالی کو بھی بلا لیا جس سے کہ یہاں ایک اچھی خاصی بستی بس گئی۔ کچھ دنوں میں اسمٰعیل علیہ السلام بھی سمجھ دار بن گئے۔ آپ نے اس قوم جرہم سے زبان عربی سیکھی۔ نہایت ذکی قابل اور ہونہار جوان ہوئے اور جماعت جرہم کے سردار نے آپ سے اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا۔ ادھر حضرت ہاجرہ نے وفات پائی۔ جب حضرت اسمٰعیل کی عمر ۱۴ سال کی ہوئی تو حضرت سارا کے شکم سے بھی ایک فرزند ہوئے جن کا نام اسحاق رکھا گیا۔ حضرت سارا ان کی پرورش میں مشغول ہوئیں اور اتنے عرصے میں کچھ جوش غیرت بھی کم ہو گیا تب ابراہیم علیہ السلام نے ان سے کہا کہ اگر تم اجازت دو تو میں اسمٰعیل کو دیکھ آؤں انہوں نے اس شرط پر اجازت دی کہ وہاں زمین پر قدم نہ رکھیں اور بہت نہ ٹھہریں آپ روانہ ہوئے یہاں آ کر معلوم ہوا کہ فرزند جوان اور خانہ دار ہے اور ان کے والدہ وفات پا چکی تلاش کرتے کرتے حضرت اسمٰعیل کے دروازہ پر آئے آپ اس وقت شکار کے لئے جنگل گئے تھے کیونکہ آپ کی گزر اوقات شکار کے گوشت اور زمزم کے پانی پر تھی۔ ابراہیم علیہ السلام نے ان کی بیوی کو دروازہ پر بلا کر ان کی زندگی کے حالات دریافت کئے۔ بیوی نے کہا کہ ہم بہت غریب مسکین ہیں۔ بہت تنگی اور مشقت سے گزران کرتے ہیں اور کچھ تواضع خاطر نہ کی۔ آپ نے فرمایا کہ تم اپنے شوہر سے ہمارا سلام کہنا اور کہنا کہ اپنے دروازے کی چوکھٹ بدل دو کہ ایسی چوکھٹ اس گھر کے لائق نہیں شام کے وقت جب حضرت اسمٰعیل شکار سے لوٹے تو مکہ کی گلی کوچوں میں نبوت کے برکات و انوار دیکھے سمجھ گئے کہ میرے والد ماجد تشریف لائے ہوں گے۔ اپنی بیوی سے پوچھا کہ کیا کوئی آج آیا ہے اس نے سارا واقعہ عرض کیا آپ نے فرمایا کہ وہ بزرگ میرے والد تھے اور تو میرے گھر کی چوکھٹ ہے مجھے تجھ کو طلاق دینے کا حکم دے گئے ہیں اسے طلاق دیکر اس کے میکے پہنچا دیا اور قبیلہ جرہم کی دوسری لڑکی سے نکاح کر لیا پھر ایک مدت بعد ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارا سے کہا کہ میں نے پہلی بار اسمٰعیل کو نہ دیکھا تھا میری تسلی نہیں ہوئی تھی۔ آپ نے پچھلی شرط پر دوبارہ جانے کی اجازت دی جب حضرت اسمٰعیل کے دروازہ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہ شکار کے لئے گئے ہیں۔ ان کی نئی بیوی نے آپ کو دیکھ کر کہا کہ حضرت تشریف لائیے۔ ہمارے غریب خانہ میں کچھ قیام کیجئے۔ آپ کے سر مبارک میں گرد و غبار ہے۔ مجھے اجازت دیں کہ میں دھو دوں۔ حضرت نے فرمایا کہ مجھے اترنے کا حکم نہیں وہ نیک بی بی ایک بڑا اونچا پتھر اٹھا کر لائیں (یہ وہی مقام ابراہیم تھا) اور ان کی رکاب کے پاس رکھ کر عرض کیا کہ اس پتھر پر قدم پاک رکھ کر اپنا سر شریف کچھ جھکا دیجئے۔ جس سے کہ آپ اپنے معاہدہ پر بھی قائم رہیں اور مجھے خدمت کا موقعہ بھی مل جائے حضرت اس ذکاوت سے بہت خوش ہوئے اور ایسا ہی کیا۔ ان بی بی نے آپ کا سر خوب دھو کر کنگھی کر دی اس درمیان میں آپ نے اپنی بہو سے گھر کے سارے حالات پوچھے اس نیک بی بی نے آپ سے عرض کیا کہ الحمد للہ ہم بہت آرام سے ہیں حق تعالیٰ نے ہمیں کسی مخلوق کا محتاج نہیں کیا۔ ہمارے شوہر جنگل سے شکار لاتے ہیں۔ اور آب زمزم ہمارے پاس ہے اس گوشت اور اس پانی سے ہماری بخوبی گزر ہوتی ہے آپ نے ان کی حق میں دعائے خیر کی اور فرمایا۔ حق تعالیٰ

تمہارے گوشت اور پانی میں برکت دے اس دعا کا یہ اثر ہے کہ اب بھی وہاں گوشت بکثرت ہے میں نے خود قربانی کے لئے ڈیڑھ روپیہ کی بکری خریدی اور دیکھا کہ پانچ روپے میں گائے چھ روپے میں دنبہ اور پچیس روپے میں قربانی کا اونٹ فروخت ہوتا تھا جب کہ ہندوستان میں چھ روپے کی بکری آتی تھی۔ القصہ آپ نے فرمایا کہ اپنے شوہر کو ہمارا اسلام کہنا اور کہہ دینا کہ تمہارے دروازے کی چوکھٹ بہت اچھی ہے اسے غنیمت جانو اور بخوبی محفوظ رکھو شام کو جب حضرت اسمٰعیل آئے تو انہوں نے پھر وہی تجلیات دانوار دیکھے۔ بیوی سے پوچھا کیا آج کوئی بزرگ تشریف لائے تھے۔ اس نے کہا ہاں اور سارا واقعہ بیان کیا آپ نے فرمایا کہ وہ میرے والد حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے تمہارے متعلق سفارش فرما گئے کہ تمہیں اپنے ساتھ رکھوں اور تمہارے ساتھ اچھا برتاؤ کروں۔ پھر کچھ مدت بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارا سے فرمایا کہ میں دوبارہ فرزند کو دیکھنے گیا مگر نہ دیکھ سکا اب تم اجازت دو کہ میں اسے دیکھوں اور اس کے پاس چند روز رہوں۔ حضرت سارا نے بخوشی بلا شرط اجازت دی حضرت ابراہیم علیہ السلام وہاں پہنچے اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو دیکھا کہ زمزم کے پاس ایک درخت کے نیچے تیروں کو درست کر رہے ہیں باپ بیٹے نے ایک دوسرے کو پہچانا فرزند بے اختیار اٹھے پدر نے گلے سے لگایا۔ پیشانی پر بوسے دیئے اور اس قدر روئے کہ پرندے ہوا میں رونے لگے اور وہاں کچھ قیام فرمایا ایک دن فرمایا کہ اے اسمٰعیل رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اس جگہ خانہ کعبہ کی تعمیر کروں چاہتا ہوں کہ کام صرف اپنے ہاتھ سے کروں اور تم اس میں میری مدد کرو آپ نے فرمایا بسر و چشم ابراہیم علیہ السلام نے پہلی ذیقعدہ کو تعمیر کعبہ شروع فرمائی اور اسی مہینہ کی پچیسویں تاریخ کو ختم فرمادی پھر آٹھویں ذی الحجہ کو آپ کو خواب میں فرزند کے ذبح کا حکم ہوا اور دسویں کو ذبح اسمٰعیل علیہ السلام کا واقعہ پیش آیا یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس سال یا اس کے بعد، روح البیان نے ۲۳ ویں سیپارے میں فرمایا کہ ذبح کے وقت اسمٰعیل علیہ السلام کی عمر تیرہ سال کی تھی مگر تفسیر عزیزی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت عمر کہیں زیادہ تھی کیونکہ ان کی چودہ سال کی عمر میں اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے اور اس کے بعد کچھ فاصلے سے ابراہیم علیہ السلام تین بار مکہ معظمہ تشریف لائے تیسری بار حضرت اسمٰعیل سے آپ کی پہلی ملاقات ہوئی نیز یہ مشہور ہے کہ حضرت ہاجرہ کی موجودگی میں ذبح کا واقعہ در پیش آیا اس روایت کے رو سے غلط ہے کیونکہ اس سے معلوم ہوا کہ آپ حضرت ہاجرہ کی زندگی میں مکہ شریف تشریف لائے ہی نہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ذبح کا واقعہ تعمیر کعبہ کے بعد ہوا کیونکہ پہلی ملاقات میں ۲۵ ذیقعدہ تک تعمیر ہوئی اور دس ذی الحجہ کو واقعہ ذبح ہوا واللہ اعلم بالصواب۔

فائدے

اس آیت اور تفسیر سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ:** بیت اللہ قبول دعا کی جگہ ہے اس لئے حضرت خلیل نے اسی جگہ یہ دعا قبولیت اور اگلی دعائیں مانگیں **دوسرا فائدہ:** عمل خواہ کتنا ہی نیک ہو اور کیسے ہی اخلاص سے ہو اس کی قبولیت کی دعا کرنی چاہئے اس سے ہرگز غفلت نہ کی جائے تعمیر کعبہ بہت اچھا کام ہے اور رب کے حکم سے ہوا تھا۔ مگر آپ نے پھر بھی اس کی قبولیت کی دعا کی **تیسرا فائدہ:** اپنے معاہدہ کی پابندی کرنا لازم ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارا کے سارے عہدوں کو بہت پابندی سے نبھایا کہ ان کے بغیر اجازت اپنے بیوی بچوں کو دیکھنے بھی نہ آئے۔ **چوتھا**

فائدہ: کعبہ معظمہ بیت المقدس سے اس لئے بھی افضل ہے کہ اسے حضرت ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام نے بنایا اور بیت المقدس کو حضرت سلیمان علیہ السلام نے جنات سے بنوایا جیسے تعمیر کرنے والوں میں فرق ویسے ہی تعمیروں میں فرق جیسے آب زمزم کا متبرک ہونا اسی لئے ہے کہ یہ ایک نبی کی ایڑی سے جاری ہوا اب اس میں دوسری بزرگی یہ ہے کہ حضور سید الانبیاء کا لعاب دہن بھی اس میں مل گیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ تمام دنیا کے پانیوں میں زمزم افضل ہے مگر زمزم سے بھی وہ پانی افضل ہے جو ایک موقع پر حضور علیہ السلام کی انگلیوں سے جاری ہوا کیونکہ یہ تو ایک نبی کی تلووں سے جاری ہوا اور وہ سید الانبیاء کی انگلیوں سے ﷺ **پانچواں فائدہ:** بزرگوں کی مانگی ہوئی دعائیں اور ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ مقبول بارگاہ الٰہی ہیں اسی لئے رب تعالیٰ نے ان کی دعائیں قرآن شریف میں بیان فرمائیں تاکہ مسلمان یہ دعائیں مانگا کریں کہ ان میں الفاظ کی تاثیر کے ساتھ ان زبانوں کی بھی تاثیر ہے **چھٹا فائدہ:** نیک عمل کرتے وقت اور کر چکنے کے بعد اس کے توسل سے دعا کرنا افضل ہے دیکھو ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ بناتے وقت دعا مانگی اس لئے نماز کی حالت میں اور اس کے بعد دعائیں کی جاتی ہیں **ساتواں فائدہ:** قبولیت عمل رب کی بڑی نعمت ہے کہ انبیاء کرام نے اس کی دعائیں مانگی ہیں آج حکومت جو کتاب منظور کرے اسے یونیورسٹی کے نصاب میں جگہ دے جاتی ہے جسے پڑھ کر لوگ سند پاتے ہیں اور پاس ہوتے ہیں۔ جسے رب قبول کرے وہ عمل تا قیامت لوگوں کی نجات کا مدار بن جاتا ہے صحابہ کرام اس قبولیت کے لئے حضور کے ذریعہ خیرات کرتے تھے اب ہم لوگ حضور اور حضور کی آل پاک کے طفیل دعائیں کرتے ہیں۔ شعر

الٰہی بحق بنی فاطمہ! کہ بر قول ایمان کنی خاتمہ

اعتراضات

پہلا اعتراض: ابراہیم علیہ السلام نے حضرت سارا کے کہنے پر اپنی بیوی اور بچے پر ظلم کیوں کیا کہ ان کو ہلاکت کی جگہ چھوڑ دیا اور ان سے اتنے عرصہ تک تعلق نہ رکھا اور حقوق زوجیت ادا نہ کئے ناجائز معاہدے کی پابندی نہ کرنی چاہئے

جواب: گناہ وہ ہے جو مرضی رب کے خلاف ہو یہ سارے کام جب رب کی مرضی سے اور اس کے حکم سے ہو رہے تھے تو گناہ کیسے حضرت ابراہیم تو رب کی مرضی پا کر بے قصور فرزند کو ذبح کرنے کے لئے تیار ہو گئے یہ معاملات تو اس سے کہیں ہلکے ہیں جناب ہاجرہ کا سخت امتحان اور مکہ مکرمہ کی آبادی کا انتظام اور خانہ کعبہ کی تعمیر کا اہتمام، سید الانبیاء علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تشریف آوری کی دھوم دھام تھی پھول کے لئے درخت لگاتے وقت باغ والے کو بلکہ خود زمین والے اور زمین اور بیج کو تکلیف ہی ہوتی ہے یہ چمن خلیلی کے آخری بیج کے کاشت کرنے کا وقت تھا ان سب کو تکلیف ہونی ہی چاہئے۔ **دوسرا اعتراض:** حضرت سارا جیسی پاک ہستی نے ایسے ظلم کا کیوں حکم دیا۔ **جواب:** اس کا جواب پہلے سوال کے جواب میں گزر گیا کہ یہ بھی الہام ربانی سے ہوا اور اس میں بھی وہی راز تھے جو ہم بیان کر چکے موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے ایک بار تو موسیٰ علیہ السلام کو جلتے ہوئے تنور میں ڈال دیا اور دوبارہ دریا میں بہا دیا یہ بھی الہام الٰہی تھا اس میں کوئی گناہ نہیں۔ **تیسرا اعتراض:** ابراہیم علیہ السلام نے قبولیت کی دعا میں اپنے عمل کا ذکر کیوں نہ فرمایا کہ خدایا ہماری تعمیر قبول فرما **جواب:**

یا تو اس لئے آپ نے اس دعا میں تا قیامت حجاج کو داخل فرما لیا۔ یعنی اے مولا میری تعمیر اور حجاج کے سارے اعمال حج بلکہ یہاں آ کر نیکیاں کرنے والوں کی ساری نیکیاں قبول فرمالے اسی دعا کا اثر ہے کہ وہاں ایک نیکی کا ثواب ایک لاکھ ہے یا اس لئے کہ جب رب تعالیٰ ایک نیکی قبول فرماتا ہے تو اس ایک کے صدہا اجزاء کر کے ہر ایک کا علیحدہ ثواب دیتا ہے ایک نماز پڑھو۔ وضو، مسجد میں آنے کے لئے ہر قدم پر پھر مسجد میں بیٹھے نماز کا انتظار کرنے پر مختلف ثواب دے گا۔ چونکہ اس تعمیر پر بہت سے اجر ملنے والے تھے اس لئے آپ نے کسی چیز کا ذکر نہ کیا۔

تفسیر صوفیانہ

قلبی اور روحانی بنیادیں ہر انسان میں فطرتاً موجود ہیں یہ قلب بیت اللہ ہے اس کو بنانے والا شیخ طریقت اور تعلیم میں مدد دینے والا عالم شریعت ہے عالم تو شریعت کے پتھر شیخ کے حوالے کرتا ہے۔ جس کو شیخ طریقت کے چونے سے جوڑ کر اس پر تصوف کی عمارت قائم کرتے ہیں جس میں تجلی ربانی پڑتی ہے اور یہی قلب نفس اور سارے اعضاء کا قبلہ اور سجدہ گاہ قرار پاتا ہے یہ حضرات اس محنت کے وقت رب سے دعائے قبولیت کرتے ہیں کہ مولیٰ تیرے بندوں کو تیری بارگاہ تک لانا ہمارا کام تھا اور انہیں قبول فرمانا تیرا کام جیسے کہ بغیر معمار ظاہری گھر کی تعمیر نہیں ہو سکتی ویسے ہی بغیر شیخ اور عالم دین کے روحانی گھر بننا ناممکن ہے۔

رَبَّنَا وَ اجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَ مِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً
اے رب ہمارے اور بنا ہم کو مطیع واسطے اپنے اور اولاد سے ہماری جماعت
اے رب ہمارے اور کر ہمیں تیرے حضور گردن رکھنے والا اور ہماری اولاد میں سے
لَّكَ ۠ وَ اَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَ تُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ
مطیعہ واسطے اپنے اور دکھا ہمیں ارکان حج ہمارے اور توبہ ڈال اوپر ہمارے
ایک امت تیری فرمانبردار ہمیں ہماری عبادت کے قاعدے بتادے اور ہم پر اپنی رحمت کے ساتھ
الرَّحِيْمُ ﴿۱۲۸﴾
بے شک تو ہی توبہ قبول فرمانے والا مہربان ہے
رجوع فرما بے شک تو ہی ہے بہت توبہ قبول کرنے والا مہربان

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں تعمیر کعبہ کا ذکر فرمایا گیا اب عظمت کعبہ کا ذکر ہے کہ بیت اللہ نگاہ خلیل میں کوئی معمولی چیز نہ تھی بلکہ نہایت عظیم الشان جس کی وجہ سے انہوں نے اس کے مقبول ہونے

اور ہمیشہ باقی رہنے کی دعا فرمائی **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں کعبہ کا ذکر کیا گیا اور اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ مقبول الٰہی وہی ہے جو اس گھر کا خدمت گار ہے اور حج کا پابند کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں تعظیم بیت اللہ اور طریقہ حج سکھانے کی دعا فرمائی۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں کعبہ کے حق ہونے کا ذکر تھا اور اب دین اسلام کے سچا ہونے کا تذکرہ ہے کہ حضرت ابراہیم نے زمین حرم میں ایک جماعت مسلمہ رہنے کی دعا کی اور وہ جماعت سوا مسلمانوں کے کوئی نہیں۔

تفسیر

رَبَّنَا یہاں یا پوشیدہ ہے یعنی اے ہمارے پالنے والے اور اللہ سے جب کچھ مانگنا ہو ویسے ہی نام سے پکارا جائے رزق کے لئے یارزاق شفا کے لئے یا شافی الامراض دشمن کو مغلوب کرنے کے لئے یا قہار وغیرہ وَ اجْعَلْنَا یہ جعل سے بنا جس کے چند معنی ہیں کرنا، بنانا، دینا، بیان کرنا، تعلیم دینا، رہبری کرنا۔ (کبیر) مُسْلِمَیْنِ لَکَ یہ لفظ مسلم کا تثنیہ ہے جو اسلام سے بنا جس کے معنی ہیں سپرد کرنا فرمانبرداری کرنا محفوظ ہو جانا مومن کو مسلم اس لئے کہتے ہیں کہ وہ اپنے کو رب کے سپرد کرتا ہے۔ اور اس کا فرمانبردار ہو جاتا ہے اور شیطان اور جہنم وغیرہ سے بچ جاتا ہے اصطلاح میں جب اسلام مطلق آتا ہے تو ایمان اور درستی اعتقاد کے معنی دیتا ہے اور لام کے ساتھ اطاعت شعاری اور فرمانبرداری کے معنی رکھتا ہے (کبیر وروح البیان) لہٰذا یہاں دوسرے معنی مراد ہیں یعنی اے اللہ ہمیں اپنا فرماں بردار رکھ یا بنا۔ پہلی صورت میں یہ دعا تعلیم کے لئے ہے دوسری صورت میں اپنے اور تمام لوگوں کے لئے طلب استقامت کے لئے اس میں بتایا گیا کہ رب کی اطاعت بڑی نعمت ہے اور اطاعت پر استقامت خاص رب کی عطا ہے اپنی بہادری نہیں صوفیاء فرماتے ہیں کہ ایک استقامت ہزار کرامت سے بہتر ہے وَمِنْ ذُرِّیَّتِنَا ذریت کے معنی ہم پہلے عرض کر چکے مِنْ سے معلوم ہو رہا ہے کہ آپ نے اپنی بعض اولاد کے لئے ہدایت کی دعا فرمائی کیونکہ آپ کو معلوم ہو چکا تھا کہ ان میں بعض کفار بھی ہوں گے اور ارادہ الٰہی کے خلاف دعا کرنا منع ہے لفظ نا سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں وہ لوگ مراد ہیں جو حضرت ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام دونوں کی اولاد میں ہوں یعنی بنی اسمٰعیل لہٰذا یہ دعا بنی اسرائیل کے لئے نہیں اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّکَ، اُمَّةً ام سے بنا بمعنی اصل، ماں کو بھی اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بچے کی اصل ہے اور اصطلاح میں امت وہ جماعت ہے جو کسی ایک چیز میں بااختیار یا بلا اختیار جمع ہو شریعت میں وہ جماعت امت کہلاتی ہے جو کسی ایک دین میں متفق ہو۔ لہٰذا ایک باپ کی اولاد ایک پیر کے مریدین ایک گھر کے لوگ لغتہً امت ہیں شرعاً نہیں کیونکہ یہاں دین میں جمع ہونا ملحوظ نہیں وَاَرِنَا یہ اَرَاءَۃٌ سے بنا جس کے معنی آنکھ سے دکھانا بھی ہے اور عقل وخیال سے ادراک کرانا بھی اور یہاں مناسک کے معنی کے لحاظ سے دونوں ہی بن سکتے ہیں یعنی دکھا اور بتا ہم کو مَنَاسِکَنَا یہ منسک بفتح سین کی جمع ہے یا منسِک بکسر سین کی۔ یہ نسک سے بنا ہے جس کے معنی ہیں عبادت کرنا اسی لئے عابد کو ناسک اور قربانی کو نسیکہ کہتے ہیں منسک بفتح سین عبادت کی جگہ اور بکسر سین عبادت کے اعمال عرف میں زیادہ ترحج کے افعال ومقامات کو مناسک کہتے ہیں یعنی خدایا ہمیں حج کے مقامات یعنی عرفات، منیٰ، مزدلفہ وغیرہ دکھا دے یا حج میں

کرنے کے احکام احرام تلبیہ، رمی وغیرہ بتادے خیال رہے کہ جس کام سے رب کو راضی کیا جائے وہ عبادت ہے عبادت تین طرح کی ہے عبادت نفسانی عبادت شیطانی عبادت رحمانی عبادت نفسانی یہ ہے کہ انسان اپنی عقل ورائے سے نیکیاں کرے انبیاء کی تعلیم سے منہ موڑے رہے جیسے کفار مشرکین کا صدقہ وخیرات وغیرہ کرنا۔ عبادت شیطانی یہ ہے کہ شیطان کی تعلیم سے عبادت کی جائے جیسے مشرکین کا بت پرستی کرنا جس سے وہ خدا کو راضی کرنا چاہتے ہیں پہلی عبادت بیکار ہے۔ دوسری شرک۔ عبادت رحمانی وہ ہے جو رب تعالیٰ کے بتانے سے کی جائے اَرِنَا میں عرض کیا گیا مولا ہمیں عبادت تو سکھا نفس وشیطان سے بچا خیال رہے انبیاء کرام کو رب تعالیٰ تین طرح عبادت سکھاتا ہے فطری طور پر جیسے عیسیٰ علیہ السلام کا پیدا ہوتے ہی فرمانا اَوۡصٰنِیۡ بِالصَّلٰوۃِ (مریم:۳۱) الہامی طور پر خواہ خواب میں الہام ہو یا بیداری میں جیسے حضرت خلیل نے خواب کے ذریعہ قربانی معلوم فرمائی وحی ظاہر کے طور پر حضرت خلیل نے ارنا فرما کر ان تینوں طریقوں کی طرف اشارہ فرمادیا کہ ہمیں دکھایئے خواہ الہام سے خواہ وحی وغیرہ سے اور میرے مولیٰ چونکہ حج بڑی مشکل چیز ہے لہٰذا اگر آئندہ ہم حاجیوں سے کوئی خطا ہو جایا کرے تو وَتُبۡ عَلَيۡنَا تو ہماری توبہ قبول فرما ہمیں توبہ کی توفیق دینا۔ یا ہم پر کرم سے رجوع فرما خیال رہے کہ عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قرات یہ ہے وَاَرِهِمۡ مَنَاسِكَهُمۡ وَ تُبۡ عَلَيۡهِمۡ (تفسیر کبیر) یہ قرات مشہور قرات کی گویا تفسیر ہے لہٰذا اس پر کوئی اعتراض نہیں اِنَّكَ اَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ تو ہی بار بار اور بہت توبہ قبول فرمانے والا ہے خیال رہے کہ توبہ کے معنی ہیں رجوع کرنا۔ بندے کی توبہ گناہوں سے اور رب کی توبہ غضب سے رجوع کرنا ہے اس لئے تواب رب کی بھی صفت ہے اور بندے کی بھی۔

خلاصہ تفسیر

ابراہیم علیہ السلام نے فراست سے معلوم کرلیا کہ اس تقریب اور تعمیر کعبہ کے رنگ میں کوئی دوسری دنیا ظاہر ہوگی اور عشق اپنے نئے کرشمے دکھائے گا۔ اس بیت اللہ کے ذریعہ باطن ظاہر کا لباس پہنے گا اور آدمی ملائکہ کی طرح خلاف عقل اطاعت الٰہی کریں گے اور اس میدان میں لبیک کا شور مچا کرے گا چونکہ تعمیر کعبہ ہم سے کرائی گئی ہے لہٰذا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سہرا ہمارے سر رہے گا پس آپ نے خوش ہو کر سب سے پہلے اپنے لئے اور پھر اپنی مسلم اولاد کے لئے چند دعائیں کیں۔ عرض کیا مولیٰ ہم دونوں کو ہمیشہ اپنا مطیع اور فرماں بردار رکھنا کہ تیرے احکام کے قبول کرنے میں کبھی حیل وحجت نہ کیا کریں اور میری مسلمان اولاد کو بھی اسی طرح اپنا مطیع اور فرماں بردار بنانا تاکہ حج کے ارکان ادا کرنے میں عقلی اعتراضات نہ کیا کریں۔ اس لئے کہ حج میں عقل کی مخالفت اور عشق کی پیروی ہے مجنونوں کی سی وضع قطع بنانا کہ ننگے سر کفنی پہنے بال بکھیرے شور مچاتے پھرنا۔ اس گھر کے گرد پروانہ کی طرح گھومنا۔ کہیں پتھروں کو چومنا، کہیں دشمن کو بغیر دیکھے محض خیال پر پتھر مارنا کہیں جانوروں کا خون بہانا ہے مولیٰ انہیں ایسی توفیق دینا کہ بلا حیل وحجت ہر سال یہ کام کیا کریں اور چونکہ یہ ارکان حج عقل سے سمجھ میں نہیں آسکتے۔ اس لئے تو خود ہمیں یہ کام بھی سکھا اور ہر کام کی جگہ بتا کہ کون سا کام کہاں ہوگا۔ احرام کہاں بندھے گا قربانی کہاں ہوگی اور پتھر کہاں پھینکے جائیں گے اور چونکہ یہ سارے کام بہت دشوار بھی ہیں اور اکثر لوگوں کو عمر میں ایک بار ہی نصیب ہوا کریں گے اس لئے جو کوتاہیاں ہو جایا کریں انہیں معاف فرمادیا کرنا رب نے ان کی یہ ساری دعائیں حرف

بحرف قبول فرمائیں کہ وہ دونوں حضرات زبردست احکام پر بلا تکلف عمل کر گزرے حضرت اسمٰعیل علیہ السلام نے اپنے کو ذبح کے لئے پیش کر دیا اور خلیل اللہ بلا تامل بیٹے پر چھری لے کر کھڑے ہو گئے اور ان کی ذریت میں ہمیشہ مومن رہے اور خانہ کعبہ کا ہمیشہ حج بھی ہوتا رہے گا سیدنا علی وابن عباس سے روایت ہے کہ اس دعا کے بعد حضرت جبریل علیہ السلام کو حکم ہوا کہ ہمارے خلیل کو حج دکھا دو۔ بلکہ کرا دو چنانچہ آپ حاضر ہوئے اور آٹھویں ذی الحجہ سے تیرھویں تک سارے اعمال حج کرائے اسی حالت میں تین دن دسویں، گیارہویں، بارہویں تین جگہ شیطان ملا آپ نے اسے دفع کرنے کے لئے سات سات کنکر مارے حضرت جبریل نے عرض کیا۔ کہ آئندہ آپ کی اولاد بھی اسی جگہ کنکر مارا کرے گی (عزیزی) اللہ کی شان کہ آپ کی ایک جماعت کا نام مسلمان ہی رکھا گیا۔ لفظ مسلمۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دعا خاص امت مصطفیٰ ﷺ کے لئے تھی کیونکہ ہم سے پہلے کسی امت کا نام مسلمان نہ ہوا رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ؕ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ۙ مِنْ قَبْلُ (حج: ۷۸)

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ:** دعا کے وقت رب کو پکارنا طریقہ انبیاء ہے **دوسرا فائدہ:** پہلے اپنے لئے پھر اپنی اولاد اور سب مسلمانوں کے لئے دعا کرنی چاہئے **تیسرا فائدہ:** عقائد اور دین کی دعا اعمال اور دنیوی حاجات سے پہلے کی جائے جیسا کہ اس آیت میں ہے **چوتھا فائدہ:** اسمٰعیل علیہ السلام کی اولاد میں ہمیشہ موحدین صالحین رہے کوئی وقت ایسا نہ آیا کہ سارے مشرک ہو جاتے چنانچہ زمانہ جاہلیت میں بھی زید ابن عمر اور قیس ابن ساعد اور عبد المطلب ابن ہاشم حضور علیہ السلام کے جد امجد اور عامر ابن ضرب وغیرہ اسلام پر تھے کہ خدا کو ایک جانتے تھے ثواب وعذاب حشر ونشر کے قائل تھے نہ مردار کھاتے تھے اور نہ بت پرستی کرتے تھے۔ (تفسیر کبیر وعزیزی) **نوٹ:** حضور علیہ السلام کے والدین ماجدین کو کافر کہنے والے اس آیت اور تفسیر کبیر کی اس عبارت پر غور کریں اگر حضور علیہ السلام سے پہلے سارے بنی اسمٰعیل مشرک ہو گئے تھے تو لازم آتا ہے کہ حضرت خلیل کی یہ دعا قبول نہ ہوئی یقیناً ایک جماعت ایمان پر ہی رہی اور اسی جماعت میں حضور کے آباء واجداد تھے نیز قیامت تک سارے سید وقریش کبھی گمراہ نہ ہوں گے کیونکہ یہ لوگ ابراہیمی ہیں کہ ان میں مومن رہنا ضروری ہے۔ **پانچواں فائدہ:** بیت اللہ کے پاس دعا مانگنا سنت ابراہیمی ہے **چھٹا فائدہ:** عبادت الٰہیہ محض اپنی رائے سے معلوم نہیں کر سکتے اس کے لئے تعلیم الٰہی ضروری ہے جیسا کہ اَرِنَا سے معلوم ہوا یہ تعلیم خاص بندوں کو الہام یا وحی سے ہوتی ہے اور عام بندوں کو ان خاص کے ذریعہ سے اصول عبادت میں خصوصی تعلیم ضروری ہے اور فروعی عبادات میں عمومی تعلیم کافی ہے جیسا کہ مَنَاسِكَنَا سے معلوم ہوا۔ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا میں بہت گنجائش ہے کیونکہ دکھانے میں الہام، وحی، اجتہاد سب داخل ہیں۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم واسمٰعیل علیہما السلام ہمیشہ سے مسلمان نہ تھے۔ ورنہ آپ اپنے

ایمان کی دعا نہ کرتے۔ **جواب:** اس کے چند جواب ہیں ایک تو وہ جو تفسیر میں معلوم ہو چکا ہے کہ مسلمین سے مطیع، فرماں بردار مراد ہے۔ اجْعَلْنَا کے معنی ہیں رکھ ہمیں یعنی اپنا مطیع رکھ تو یہ دعاء استقامت ہے نہ کہ دعائے ایمان دوسرے یہ کہ یہاں زیادتی کی درخواست ہے یعنی ہمیں اطاعت کی زائد توفیق عطا فرما۔ انبیاء کرام اگرچہ معصوم مگر رب سے مستغنی نہیں۔ تیسرے یہ کہ یہ دعاء تعلیم کے لئے ہے تاکہ مسلمان بھی ایسے ہی دعا کیا کریں جیسے رب تعالیٰ فرماتا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ رب تعالیٰ اپنے لئے کسی سے ہدایت نہیں مانگ رہا ہے بلکہ بندوں کو سکھا رہا ہے کہ ایسے دعا مانگو غرض کہ اس آیت سے ابراہیم علیہ السلام کو گنہگار یا گمراہ ماننا بے دینی ہے **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ یہ دونوں حضرات معصوم نہ تھے ورنہ توبہ نہ کرتے توبہ گنہگار کرتے ہیں **جواب:** اس کے بھی چند جواب ہیں ایک وہ جو تفسیر میں معلوم ہوا کہ اس کے معنی ہیں کہ ہم حاجیوں کی توبہ قبول کر اور ہماری اولاد سے جو حج کی ادائیگی میں کچھ کوتاہی ہو جائے اس کو درگزر فرما دوسرے یہ کہ یہاں بھول چوک سے توبہ مراد ہے انبیاء کرام سے بغیر قصد کے خطائیں ہو جاتی ہیں۔ جس سے توبہ کرتے رہتے ہیں تیسرے یہ کہ یہ بھی تعلیم امت کے لئے ہے کہ کعبہ معظمہ میں آ کر توبہ کر لیا کریں یہ قبولیت کی جگہ ہے **تیسرا اعتراض:** ابراہیم علیہ السلام نے صرف اپنی اولاد کے لئے کیوں دعا کی چاہئے تھا کہ سارے بندوں کے لئے دعا کرتے **جواب:** اس کے بھی چند جواب ہیں ایک یہ کہ اولاد ماں باپ کی دعا کی زیادہ حق دار ہے رب تعالیٰ فرماتا ہے قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (التحریم: ٦) دوسرے یہ کہ جب پیغمبروں کی اولاد درست ہو جائے تو ان کی وجہ سے دیگر لوگ بھی درست ہو جائیں گے بڑوں کی اصلاح سے چھوٹوں کی اصلاح خود بخود ہو جاتی ہے **چوتھا اعتراض:** ابراہیم علیہ السلام پہلے اپنی اولاد کے لئے امامت مانگ چکے اب ان کے لئے ہدایت کیوں مانگی امامت میں ہدایت آ گئی تھی **جواب:** امامت تو ایک وقت میں ایک ہی کو ملتی ہے مگر ہدایت جماعت کو ہو گی وہ دعا افراد کے لئے تھی اور یہ جماعتوں کے لئے۔

تفسیر صوفیانہ

ابراہیم علیہ السلام کی اس دعا میں دو لطیف اشارے ہیں۔ ایک یہ کہ اپنی طرف سے قبول کیا ہوا ایمان معتبر نہیں بلکہ رب کا دیا ہوا چاہئے اس لئے عرض کیا کہ مولیٰ ہمیں اپنی نفوس کے حوالے نہ کر کہ ہم خود ایمان لائیں بلکہ توفیق دے کہ تجھ ہی سے تیرے بتانے سے تجھ پر ایمان لائیں بلکہ یوں کہو کہ تیری ہی دی ہوئی توفیق سے تیری ہی بات مانیں اپنا ایمان شیطان کا تھا جو مفید نہ ہوا دوسرے یہ کہ دینداروں سے آخرت قائم ہے اور دنیا داروں سے یہ جہاں آباد ہے دنیا کی آبادی تین چیزوں سے ہے ایک کھیتی و باغ، دوسرے جنگ و جدال، تیسرے تجارتی سامان کی نقل و حرکت یہ تینوں ہی چیزیں موت و حساب کو بھلانے والی ہیں۔ صوفیائے کرام فرماتے ہیں کہ اگر بیوقوف نہ رہیں تو دنیا برباد ہو جائے۔ لہٰذا حکمت یہ ہے کہ نہ یہاں سب بدکار ہوں اور نہ سب نیک کار اس لئے حضرت خلیل نے بعض کے لئے دعا کی مشائخ عظام کو بھی چاہئے کہ اپنے سارے مریدین کی ہدایت کا یقین نہ کریں۔ مولانا فرماتے ہیں۔

استن ایں عالم اے جان غفلت است   ہوشیاری ایں جہاں را آفت است

ہوشیاری زاں جہاں است وچوں آں — غالب آید پست گردد ایں جہاں

ہوشیاری آفتاب و حرص یخ — ہوشیاری آب و ایں عالم وسخ

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَ

اے رب ہمارے اور بھیج بیچ ان کے ایک رسول ان میں سے جو تلاوت کرے اوپر ان کے

اے رب ہمارے بھیج ان میں ایک رسول انہی میں سے کہ ان پر تیری آئتیں تلاوت کرے

يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ وَ يُزَكِّيهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيزُ

آئتیں تیری اور سکھائے انہیں کتاب اور حکمت اور پاک فرمائے

اور انہیں پختہ علم سکھائے تیری کتاب کا اور انہیں خوب ستھرا فرمادے

الْحَكِيمُ ﴿۱۲۹﴾ ع

انہیں تحقیق تو ہی غالب حکمت والا ہے

بیشک تو ہی ہے غالب حکمت والا

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ان دعاؤں کا ذکر تھا کہ جو خاص جماعتوں کو مفید ہوں کہ مکہ مکرمہ کے امن وہاں کے پھلوں سے وہ فائدہ اٹھائیں جو وہاں ہوں ایسے ہی خانہ کعبہ کی تعمیر سے خصوصی فائدہ حجاج اٹھاویں۔ اب اس عالمگیر دعا کا ذکر ہے جس سے عربی عجمی، شرقی، غربی، فرشی، عرشی مخلوق ہمیشہ فائدہ اٹھائے۔ یعنی حضور کی بعثت شریفہ یعنی خاص دعاؤں کے بعد عام **دوسرا تعلق:** اہل کتاب بیت اللہ کی عزت اور مکہ معظمہ کی حرمت اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت کے منکر تھے گزشتہ آیتوں میں پچھلی دو باتیں ثابت فرمائیں گئیں کہ کعبہ معظمہ اور مکہ مکرمہ وہ مقامات ہیں جنہیں حضرت خلیل نے بڑی محنت اور جانفشانی سے بنایا اور بسایا اور اب حضور علیہ السلام کی نبوت کا ثبوت دیا جارہا ہے کہ یہ وہ نازنین پیغمبر ہیں۔ جس کی حضرت نے دعائیں مانگیں اور نبیوں نے ان کے گن گائے۔

گن گائیں جن کے انبیاء مانگیں رسل جن کی دعا — وہ دو جہاں کے مدعا صل علیٰ یہی تو ہیں

بے وقوفو تم کیسے بدنصیب ہو کہ ان تینوں کی برکتوں سے محروم ہو **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں ابراہیم علیہ السلام کی پانچ چھ دعاؤں کا ذکر ہوا۔ جن میں سے بعض دنیاوی نقطہ نگاہ سے تھیں اور بعض دینی نقطہ نگاہ سے۔ اب ان کی اس جامع دعا کا ذکر ہے جس میں دین اور دنیا دونوں ہیں۔ یعنی حضور علیہ السلام کا بھیجنا **چوتھا تعلق:** پچھلی آیتوں میں بتایا گیا کہ ابراہیم

علیہ السلام نے ارکان حج بتانے کی دعا کی۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ انہوں نے اس معلم کی بھی دعا مانگی جو تمام عالم کو یہ باتیں سکھائے یعنی پہلے علم کا ذکر تھا۔ اور اب معلم کا **پانچواں تعلق:** پچھلی آیت میں بتایا گیا کہ خلیل اللہ نے امت مسلمہ کی دعا کی اب بتایا جا رہا ہے کہ انہوں نے اس کی بھی دعا فرمائی جس سے یہ جماعت قائم رہے یعنی پہلے مقتدیوں کا ذکر ہوا اب مقتدیٰ کا۔

تفسیر

رَبَّنَا اگر یہ دعائیں علیحدہ وقتوں میں مانگی گئیں ہیں تب تو ہر دعا کے اول میں رَبَّنَا عرض کیا گیا اور اگر ایک ہی وقت میں کی گئیں تو ایک ہی دعا میں ربنا بار بار عرض کیا گیا تا کہ معلوم ہو کہ دعاء میں بار بار رب کو پکارنا بہتر ہے۔ وَابْعَثْ فِیْهِمْ یہ بعث سے بنا جس کے معنی ہیں اٹھانا، یا بھیجنا یہاں دونوں ہی بن سکتے ہیں۔ فِیْهِمْ کی ضمیر یا تو مکہ والوں کی طرف لوٹتی ہے یا امت مسلمہ کی طرف مگر روح البیان اور تفسیر مدارک نے دوسری بات اختیار کی یعنی اے مولا میری اولاد میں جو مسلمان جماعت ہو اس میں بھیجنا خیال رہے کہ ارسال اور بعثت قریباً ہم معنی ہیں مگر کبھی اس میں یوں فرق کرتے ہیں کہ عارضی بھیجنے کو ارسال اور وہاں رہنے کو بعثت کہتے ہیں حضور انور کو بھیجا جسم اطہر کے لحاظ سے ارسال ہے اور فیضان کے لحاظ سے بھیجنا بعثت ہے حضور انور کی حیات ظاہری کا زمانہ تریسٹھ سال ہے مگر حضور کی رسالت کا زمانہ ابدالاباد تک، پہلے لحاظ سے فرماتے ہیں خَیْرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِی ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ اور دوسرے لحاظ سے فرماتے ہیں اَنَا وَالْقِیَامَةُ کَهَاتَیْنِ اور تریسٹھ سال میں لوگ صحابی بنتے تھے اور اب ہمیشہ تک لوگ حضور کے فیض سے مومن بنتے رہیں گے یعنی مولا اس رسول کو ان میں مبعوث فرما جو آ کر نہ جائیں یہ بھی خیال رہے کہ ارسال کے بعد الیٰ آتا ہے اور بعثت کے بعد فی یعنی شان رسالت سے حضور سب سے کنارہ پر ہیں اور شان بعثت میں حضور ہم سب میں ہیں حضور شرف کے لحاظ سے وہاں ہیں جہاں جبریل کا خیال تک نہ پہنچ سکے اور کرم اور فیض سے ہر ٹوٹے دل میں ہیں ہر دیر اور دہر اجڑے دیار میں رونق افروز ہیں۔

وہ شرف کہ قطع ہیں نسبتیں وہ کرم کہ سب سے قریب ہیں
کوئی کہہ دو آس و امید سے وہ کہیں نہیں وہ کہاں نہیں

قیامت سے پہلے حضور کے شرف کا اظہار ہوگا یہاں تک کہ تمام دنیا صدہا سال ڈھونڈتی پھرے گی نہ ملیں گے پھر کرم جلوہ گری کہ مجرموں کے میزان پر ہوں گے پل صراط پر گرتوں کو سنبھالتے ہوں گے جیسے سورج چوتھے آسمان پر رہتا ہے مگر اس کی تجلی ہر جگہ رہتی ہے اس لئے نماز میں پڑھا جاتا ہے اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّهَا النَّبِیُّ اس لئے یہاں فِیْهِمْ فرمایا رَسُوْلًا ایک رسول نبی اور رسول میں بعض علماء اعتباری فرق کرتے ہیں یعنی ایک ہی ذات کو رسول تو اس لئے کہتے ہیں کہ رب کا بھیجا ہوا ہے۔ اور نبی اس لئے کہ مخلوق کو خالق کی خبر دیتا ہے بعض فرماتے ہیں کہ رسول کتاب والا پیغمبر اور نبی اس سے عام بعض کہتے ہیں کہ رسول نئی کتاب والا پیغمبر اور نبی اس سے عام اور بعض نے نئی کتاب والے کو مرسل اور مطلق کتاب والے کو رسول اور مطلق پیغمبر کو نبی کہا اس لئے کہا جاتا ہے کہ نبی تو ایک لاکھ چوبیس ہزار اور رسول ۳۱۳ اور مرسل ۴ یہاں رسول سے صرف حضور

ﷺ ہی مراد ہیں اور یہ دعا خاص انہیں کے لئے ہے۔ چند وجہ سے ایک یہ کہ اس سے بنی اسمٰعیل یا مکہ کا پیغمبر مراد ہے اور وہ صرف حضور ﷺ ہی ہیں کیونکہ بنی اسمٰعیل اور مکہ میں صرف آپ ہی نبی آئے اور دوسرے اس لئے کہ یہاں رسول واحد فرمایا۔ یعنی صرف ایک رسول بھیج اور بنی اسرائیل میں صد ہا رسول تشریف لائے۔
مگر بنی اسمٰعیل میں صرف حضور ہی۔ تیسرے اس لئے کہ اس رسول کی یہ صفت بیان کی کہ جو لوگوں کو آیتیں پڑھ کر سنائے اور ان کا تزکیہ نفس کرے۔ جس سے معلوم ہوا کہ جس نبی کی کتاب با قاعدہ پڑھی جائے اور اس کے بعد سلسلہ نبوت ختم ہو کر ولایت باقی رہ جائے اور یہ دونوں صفتیں حضور ہی کی ہیں کہ تلاوت اور قرات دھوم دھام سے انہیں کی کتاب کی ہوئی اور آپ ہی خاتم النبیین ہوئے۔ چوتھے اس لئے کہ رب تعالیٰ نے دوسری آیت میں حضور کی یہ ہی صفت بیان فرمائی کہ فرمایا هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَ یُزَكِّیْهِمْ الخ (جمعہ:۲) معلوم ہوا کہ جو حضرت ابراہیم نے عرض کیا وہی رب نے کہا۔
پانچویں اس لئے کہ مشکوۃ باب فضائل سید المرسلین میں ہے کہ حضور فرماتے ہیں کہ میں دعاء ابراہیم اور بشارت عیسیٰ ہوں اور اپنی والدہ کا وہ خواب ہوں جو انہوں نے میری پیدائش پاک کے وقت دیکھا کہ ان کے لئے ایک نور ظاہر ہوا جس سے شام کے محل نظر آگئے۔ چھٹے اس لئے کہ اسی پر تمام امت کا اجماع ہے کہ آپ ہی دعاء خلیل ہیں کیونکہ آپ ہی سے خلیل اللہ علیہ السلام کا دین اور نام پھیلا۔ پھر عرض کیا مِّنْهُمْ یعنی اے مولا وہ شاندار رسول اس ذریت ہی میں سے ہو۔ فِیْهِمْ اور مِّنْهُمْ کہہ کر یہ بتایا کہ یہاں یہ پیدا ہوں اور میری ہی اولاد میں ہوں تا کہ ان کی طفیل اس مکان اور مجھ کو اور میرے سارے خاندان کو شرف حاصل ہو اور میری ذریت ان سے فیض لینے میں عار نہ کرے کیونکہ اعلیٰ خاندان والوں کو غیر کی سرداری برداشت نہیں ہوتی اپنے کی سرداری بخوشی قبول کر لیتے ہیں آج بھی سادات کرام سید عالم کی بات جلد مان لیتے ہیں۔ نیز وہ لوگ اس صورت میں اس پیغمبر کے حسب و نسب صدق و امانت سے بخوبی واقف ہوں گے۔ نیز ہر شخص اپنی اولاد کی خیریت کا حریص ہوتا ہے۔ ابراہیم علیہ السلام نے بھی تمنا کی کہ نبی آخر الزمان کا فخر مجھ کو اور میری اولاد کو حاصل ہو۔ اور یہ پھول میرے ہی چمن میں کھلے۔ پھر عرض کیا کہ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ ظاہر یہ ہے کہ آیات سے مراد قرآنی آیتیں ہیں کیونکہ تلاوت انہیں کی ہوتی ہے مگر روح البیان میں فرمایا کہ اس سے توحید و رسالت کے دلائل مراد ہو سکتے ہیں یعنی وہ رسول پہلا کام تو یہ کرے کہ تیرے بندوں کو خاص کر میری ذریت کو قرآنی آیتیں اور ان کا پڑھنا سکھائے اور صرف پڑھا کر ہی نہ چھوڑ دے بلکہ وَ یُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ انہیں اس کتاب کے معنی اور علم ظاہر یعنی شریعت بھی سکھائے کیونکہ بغیر مضامین کے صرف الفاظ یاد کرنا کافی نہیں خیال رہے کہ یعلم تعلیم سے بنا ہے جس کے معنی ہیں آہستہ آہستہ اور اچھی طرح سکھانا اور الکتاب میں الف لام عہدی ہے۔
یعنی وہ خاص کتاب، قرآن آہستگی سے ان کے خوب ذہن نشین کرائے اور حضرت موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کی طرح ساری کتاب ایک دم نہ لے آئے اور اس کے بعد وَ الْحِكْمَةَ انہیں علم باطن اور قرآن کریم کے اسرار بھی سکھائے کیونکہ علم ظاہر بغیر علم باطن بے دینی ہے اور علم باطن کے بغیر علم ظاہر جعل سازی (تفسیر عزیزی) خیال رہے کہ حکمة حکم سے بنا۔ جس کے لغوی معنی ہیں پھیر دینا۔ روک لینا۔ پالینا، علم کو اس لئے حکمت کہا جاتا ہے کہ اس سے نفس جہالت سے پھر جاتا ہے۔ بری

باتوں سے رک جاتا ہے اور حق کو پالیتا ہے بعض نے فرمایا کہ یہاں حکمت سے مراد فقہ ہے بعض نے کہا کہ حدیث وسنت بعض کہتے ہیں قرآن پاک کے اسرار بعض نے کہا کہ حق و باطل میں فیصلے کرنے والی چیز بعض نے کہا کہ کتاب سے مراد صحیح قول و عمل اسی لئے عالم باعمل کو حکیم کہتے ہیں۔(تفسیر کبیر) اور ممکن ہے کہ ساری ہی چیزیں مراد ہوں۔ کیونکہ حضور علیہ السلام نے سب ہی کچھ سکھایا۔ اور اے مولیٰ انہیں فقط علم ہی نہ سکھائے بلکہ وَ یُزَکِّیۡهِمۡ ان سے اچھے اعمال کرا کر ان کے جسموں اور دلوں اور سینوں اور خیالات کو وہم وغیرہ سے بھی پاک فرما دے خیال رہے کہ یزکی زکوٰۃ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں صاف کرنا اور بڑھانا اسی لئے فرضی صدقہ کو زکوٰۃ کہتے ہیں کہ اس سے باقی مال صاف بھی ہو جاتا ہے اور بڑھتا بھی ہے یہاں اس کے چند معنی ہیں ایک یہ کہ اعمال صالح کرا کر اور اچھے عقیدے بتا کر کفر اور گناہوں کے میل سے پاک کرے۔(روح البیان) دوسرے یہ کہ ان کے دل کو کدورت سے ایسا صاف کرے جس سے سارے حجاب اٹھ جائیں پھر اس آئینۂ قلبی میں غیبی چیزیں نقش ہوں اور بغیر سیکھے سکھائے انہیں علم حاصل ہو۔ اور حقائق خود بخود ان میں جلوہ گر ہو جائیں۔(عزیزی) تیسرے یہ کہ قیامت کے دن وہ رسول تیری بارگاہ میں ان کے گواہ صفائی ہوں وَ یَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡکُمۡ شَهِیۡدًا (البقرہ: ۱۴۳) ابراہیم علیہ السلام کی اس ترتیب سے اس طرف اشارہ ہے کہ بندے آیات قرآنیہ تلاوت کر کے علم و حکمت سیکھ کر بھی پاک نہیں ہو سکتے جب تک حضور کی نگاہ انہیں پاک نہ کرے اسی لئے تلاوت وغیرہ کے بعد تزکیہ کا ذکر فرمایا اس تزکیہ کو حضور پاک ﷺ کی طرف منسوب کیا خیال رہے کہ ظاہری پاکی کو طہارت اور قلبی پاکی کو طیب کہا جاتا ہے مگر جسمانی، قلبی، روحانی خیالات وغیرہ کی مکمل پاکی کو تزکیہ کہتے ہیں مردار جانور کا گوشت کھال سوکھ کر پاک ہو جاتی ہے مگر مزکی نہیں۔ مزکی فرما کر بتایا گیا کہ وہ محبوب مسلمانوں کو ہر طرح پاک وصاف کریں اور یُزَکِّیۡهِمۡ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا حضور انور ہر مسلمان کے ایمان تقویٰ اور سارے اعمال سے خبردار ہیں کیونکہ گواہ کی صفائی وہ بتا سکتا ہے جو گواہ کے سارے حالات سے خبردار ہو خیال رہے کہ ساری امت رسول اللہ انبیاء کی گواہی کے لئے پیش ہوگی مگر گواہی سب کی نہ ہوگی وہ تو بیشمار ہیں مخصوص کی گواہی ہوگی ان کی صفائی صراحۃً حضور دیں گے۔ ہم جیسے گنہگار ان مخصوصین کے ساتھ جمع ہوں گے لہٰذا اس آیت پر اعتراض نہیں کہ حضور انور قیامت میں سب کی صفائی فرما دیں گے اور ان میں بعض فساق اور نا قابل گواہی ہوں گے (عزیزی) تیسرے یہ کہ قیامت کے دن وہ رسول تیری بارگاہ میں ان کے گواہ صفائی ہوں گے وَ یَکُوۡنَ الرَّسُوۡلُ عَلَیۡکُمۡ شَهِیۡدًا (البقرہ: ۱۴۳) (تفسیر کبیر) خیال رہے کہ سارے پیغمبر اپنی نافرمان امتوں کے خلاف گواہی دیں گے مگر حضور ﷺ خطا پوش ہیں کہ اپنی امت کی نیکیاں ظاہر فرمائیں گے اور گناہوں پر پردہ ڈالیں گے اور اے مولا ہم یہ دعا اسی لئے مانگتے ہیں کہ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡحَكِیۡمُ تو ہی عزت وحکمت والا ہے۔ تیری عزت کا یہ تقاضا نہیں کہ کسی کو بغیر علم کے چھوڑ دے لہٰذا عزت وحکمت کا یہ تقاضا ہوا کہ وہ نبی آخر الزمان ﷺ دنیا میں ضرور بھیجے جائیں۔ خیال رہے کہ عزیز عزت سے بنا جس کے معنی ہیں غلبہ اور انوکھا اور بے مثل ہونا۔ عزیز یعنی غالب اور بے مثل۔

خلاصہ تفسیر

ابراہیم علیہ السلام جب یہ سارے کام کر چکے اور کعبہ اور مکہ بنا اور بسا چکے تو اخیر میں ان کا ذکر کیا جن کے طفیل دعائیں قبول ہوتی ہیں اور جن کے دم سے یہ ساری بہار ہے جن کے طفیل خلیل اور کعبہ، مقام و منی دنیا میں جلوہ گر ہوئے عرض کیا کہ اے مولیٰ ان لوگوں میں ایک ایسا جلیل القدر پیغمبر بھیج دے جن میں یہ سات صفتیں ہوں۔ ۱۔ انہیں مکہ والوں میں سے ہو فِیۡهِمۡ ۲۔ ابراہیمی ہو مِّنۡهُمۡ یعنی کی مدنی ہو ابراہیمی ہاشمی مطلبی ہو۔ ۳۔ اپنی شان رسالت میں اکیلا ہو یعنی خاتم النبیین اور امام المرسلین ہو (رسولا)۔ ۴۔ سب کو اور خصوصا میری اولاد کو آیتیں سنائے بتائے اور پڑھنا سکھائے یعنی انہیں حفظ بھی کرائے اور علم قرات بھی سکھائے (یَتۡلُوۡا الایہ)۔ ۵۔ انہیں تیری کتاب کے مضامین سکھا کر عالم فقیہ اور مجتہد بنادے (وَ یُعَلِّمُهُمُ الایہ) ۶۔ اور انہیں قرآنی اسرار سکھائے اور تیرا راز دار بنادے اور طریقت کے مدارج انہیں طے کرادے (والحکمۃ) یعنی انہیں صاحب حال وقال کردے۔ ۷۔ ان کے دل اور روح پاک وصاف کر کے غیوب سے خبردار کردے اور بے پڑھوں کو اپنے فیض سے غوث وقطب کا سردار بنادے کہ ان کے دروازوں سے ولایت تقسیم ہوا کرے میرے مولیٰ اس نبی کو اپنی ساری صفات کا مظہر بنا کر بھیج کہ اسے دیکھ کر تو یاد آجایا کرے (اِنَّكَ اَنۡتَ الایۃ) خلاصہ دعا یہ ہوا کہ لوگ حافظ سے قرآن مجید پڑھتے ہیں اور قاری سے اس کے الفاظ سیکھتے ہیں۔ اور مولوی سے اس کے معنی معلوم کرتے ہیں پیر کامل سے اس کے اسرار تک پہنچتے ہیں۔ غرض صرف قرآن کریم کے سیکھنے کے لئے چند آستانوں پر حاضری دینا پڑتی ہے ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی اے مولا وہ نبی آخر الزمان ﷺ تنہا یہ سارے فیوض دے اس کی بارگاہ کا بیٹھنے والا کسی کے دروازے پر نہ جائے بلکہ سارا جہاں اس کے غلاموں کے پاس آئے وہ اپنے غلاموں کو حافظ قاری، مجتہد، صوفی، فقیر، بادشاہ، قاضی سب کچھ بنا دے بلکہ خرپوتی شرح قصیدہ بردہ میں ہے کہ بعض صحابہ وہ بھی ہیں جو اسلام لاتے ہی آن کی آن میں قاضی عالم حافظ اور قاری بنا کر بھیج دیئے گئے۔

جو فلسفیوں سے حل نہ ہوا اور نکتہ دروں سے کھل نہ سکا ۔۔۔ وہ راز ایک رحمت والے نے سمجھا دیا چند اشاروں میں

خیال رہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی گزشتہ دعاؤں کا قرآن میں نقل فرمانا تعلیم اولاد کے لئے تھا کہ آپ نے لوگوں کی تعلیم کے لئے وہ دعائیں کی ہوں گی مگر اس دعا میں تعلیم کا استعمال نہیں۔ کیونکہ حضور تشریف لا چکے پھر نبی کی بعثت کیسی اس دعا کو رب نے قرآن وتوریت وانجیل وغیرہ آسمانی کتب میں حضور ﷺ کی شان ظاہر کرنے کے لئے نقل فرمایا کہ تا قیامت لوگوں کو پتہ لگے کہ حضور وہ شان والے رسول ہیں کہ حضرت خلیل ان کے دعا گوؤں میں ہیں۔ جیسے قرآن کریم کی وہ آیات جن پر صرف صحابہ عمل کر گئے ان پر عمل ناممکن ہے مگر قرآن میں اس لئے رکھی گئی ہیں کہ شان مصطفوی معلوم ہو۔

فائدے

پہلا فائدہ: اپنی قوم اور اہل قرابت کی خیر خواہی کرنا سنت انبیاء ہے حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ہم پہلے اپنے اہل بیت کی پھر بنی ہاشم کی پھر اہل قرابت قریش کی پھر ساری امت کی شفاعت کریں گے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

کہ خدا کی قسم اگر بہشت کی کنجی میرے ہاتھ میں ہو تو میں کسی بنی امیہ کو جنت سے باہر نہ چھوڑوں۔ (تفسیر عزیزی) **دوسرا فائدہ:** حضور علیہ السلام کا میلاد شریف کرنا سنت الٰہیہ اور سنت انبیاء ہے کہ اس آیت میں حضور علیہ السلام کی تشریف آوری ہی کی تو دعا ہے اور تشریف آوری کا ذکر ہی میلاد ہے۔ بلکہ نماز و کلمہ میں بھی میلاد شریف ہے اس کے لئے ہماری کتاب جاء الحق کا مطالعہ کریں **تیسرا فائدہ:** حضور ﷺ تمام نبیوں کے سردار ہیں کیونکہ آپ خلیل اللہ علیہ السلام کی دعا اور ان کے سارے اعمال کا اصل مقصود ہیں **چوتھا فائدہ:** قرآن کے ساتھ حدیث کی بھی ضرورت ہے اور قرآن کے ظاہری معنی کے ساتھ کچھ باطنی معنی بھی ہیں کیونکہ کتاب کے ساتھ حکمت کا بھی ذکر ہے اور صفائی قلبی کا بھی **پانچواں فائدہ:** کوئی شخص قرآن پاک فقط اپنے علم سے نہیں سمجھ سکتا۔ اس لئے کہ اس دعا سے معلوم ہوا کہ وہ نبی اس قرآن کو سکھائیں گے۔ فلسفہ منطق اور ریاضی آسان ہے کہ وہ انسان کے بنائے ہوئے علوم ہیں اور دینوی ماسٹروں سے پڑھے جاتے ہیں مگر قرآن مشکل کیونکہ وہ خدا کا کلام ہے اور اس کے لئے رب نے خود معلم بھیجا **چھٹا فائدہ:** یہ کہنا جائز ہے کہ حضور علیہ السلام تمام عالم کو پاک فرماتے ہیں انہیں علم و حکمت اور خدا کی ساری رحمتیں دیتے ہیں جیسے کہ اس آیت سے معلوم ہوا **ساتواں فائدہ:** دعا کے اخیر میں رب کی حمد اور حضور پر درود بھیجنا چاہئے جیسا کہ ابراہیم علیہ السلام نے یہاں کیا۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اگر حضور علیہ السلام سید الانبیاء ہیں تو درود ابراہیمی میں ابراہیم علیہ السلام کا نام حضور علیہ السلام کے نام کے ساتھ کیوں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ درجہ میں وہ حضور کے برابر ہیں **جواب:** چند وجہ سے ایک یہ کہ انہوں نے اللہ کے حبیب کے لئے دعا کی۔ رب نے فرمایا کہ اے مسلمانوں چونکہ انہوں نے میرے حبیب کے لئے دعا کی ہے۔ تم ان کے لئے قیامت تک دعا کرتے رہو۔ ان کا درجہ اسی لئے ہے کے وہ حضور کے دعا گو ہیں اور دوسرے یہ کہ ابراہیم علیہ السلام دینی والد ہیں۔ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ (حج: ۷۸) اور حضور علیہ السلام رحم والے والد ہیں جیسے کہ ابن مسعود کی قرآت میں اَلنَّبِيُّ اَوْلٰى بِالْمُؤْمِنِيْنَ (احزاب: ۶) کے ساتھ ہے وَهُوَ اَبُوْهُمْ یعنی حضور علیہ السلام مسلمانوں کے والد ہیں۔ لہٰذا والد ہی کا ذکر والد کے ساتھ چاہئے۔ تیسرے یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام حج کی ندا دینے والے ہیں وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ (حج: ۲۷) اور حضور علیہ السلام دین کے منادی مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ (ال عمران: ۱۹۳) رب نے دونوں منادیوں کو درود میں جمع فرمایا **چوتھے:** یہ کہ حضرت ابراہیم نے عرض کیا تھا وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ (شعراء: ۸۴) یعنی اے رب میرا اچھا ذکر آئندہ لوگوں میں باقی رکھ رب تعالیٰ نے ان کی یہ دعا اس طرح قبول فرمائی کہ ان کا نام اپنے حبیب کے ساتھ درود میں ملا دیا کہ اس کی برکت سے ان کا ذکر خیر باقی رہے ان وجوہ سے حضور علیہ السلام کی افضلیت کا صاف پتہ لگتا ہے **دوسرا اعتراض:** درود ابراہیمی کو مشبہ بہ بنایا گیا كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ اور مشبہ بہ مشبہ سے بڑھ کر ہوتا ہے جیسے زید شیر کی طرح ہے یقیناً شیر زید سے زیادہ بہادر ہے **جواب:** بے شک ایک چیز میں ابراہیم علیہ السلام واقعی بہت بڑھ چڑھ کر ہیں کہ محمد ﷺ جیسا فرزند ملا جس سے ان کی شہرت اور عزت، حرمت کو چار چاند

لگ گئے اور درود میں یہی رحمت مراد ہے کہ اب ابراہیم علیہ السلام بڑھ کر ہیں یا نہیں بے شک افضل ہے مگر حضور ہی کے طفیل اور بھی اس کے بہت سے جواب ہو سکتے ہیں عام علماء یہ فرماتے ہیں کہ یہاں صرف شہرت کی وجہ سے تشبیہ دی گئی واللہ اعلم بالصواب **تیسرا اعتراض:** اس آیت سے تمام ضمیریں ذریت کی طرف لوٹ رہی ہیں کہ اس ذریت میں نبی آخری بھیجے جو انہیں علم وحکمت سکھائے اور انہیں پاک کرے تو کیا حضور انور صرف ذریت ابراہیمی کے معلم ہیں اور صرف انہیں کو پاک کرتے ہیں **جواب:** حضور تمام خدائی کے معلم ومزکی ہیں مگر اس ذریت پاک وصحابہ کرام کو بلا واسطہ اور دوسرے لوگوں کو ان کے واسطے سے انجن ساری ریل کو کھینچتا ہے مگر پہلے ڈبے کو بلا واسطہ اور دوسرے ڈبوں کو اس کے واسطے سے **چوتھا اعتراض:** اگر حضور ساری خدائی کو پاک کرتے ہیں تو سب لوگ پاک کیوں نہ ہوئے کافر کیوں رہے **جواب:** حضور سب کو پاک کرتے ہیں مگر سب آپ سے پاکی لیتے نہیں سورج سب کو چمکاتا ہے مگر چمگادڑ چمکتا نہیں لہذا سورج میں کمی نہیں۔

تفسیر صوفیانہ

اگر گھر میں سب کچھ ہو مگر روشنی نہ ہو۔ تو کوئی بھی اس گھر سے نفع حاصل نہیں کر سکتا ساری متاع ابراہیمی ان کے بھرے گھر کا سامان ہے۔ اور حضور علیہ السلام اس گھر کا نور اسی لئے کعبہ کو بیت اللہ اور حضور علیہ السلام کو نور اللہ کہتے ہیں حضرت خلیل نے سب کچھ بنا کر اس نور کی دعا کی جس سے ظاہر وباطن چمکے اور عالم میں شریعت، طریقت کا نظام قائم رہے۔ اب بھی وہی نور بذریعہ کاملین ہر دل تک پہنچ رہا ہے۔ اگر انسان عبادت اور ریاضت کا سارا سامان جمع کرے اور شیخ کا ہاتھ نہ پکڑے تو وہ اس سے فائدہ نہیں پا سکتا اس بیابان دنیا میں ایسے محافظ رہبر کی ضرورت ہے جو ہماری دولت ایمانی کو شیطان ڈاکو سے بچا کر اصل مقصود تک پہنچا دے۔ شیخ کامل ہی سالک کے نفس کو التفات ماسوی اللہ کے میل سے پاک صاف کرتا ہے اور اس پر اندرونی اور بیرونی آیات قدرت تلاوت کرتا ہے جس سے کہ وہ زمرۂ صدیقین میں داخل ہو جاتا ہے حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔

بکوئے عشق منہ بے دلیل راہ قدم   کہ من بخویش نمودم صد اہتمام نشد

بارگاہ الٰہی عزیز ہے اس تک ہر بے تمیز نہیں پہنچ سکتا چاہئے کہ کسی صاحب تمیز کا دامن پکڑ لیا جائے صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ روشنی ظاہری بہت قسم کی ہوتی ہے چراغ کی بھی روشنی ہے بجلی وگیس کی بھی روشنی ہے چاند تاروں کی بھی روشنی ہے مگر ان میں سے کوئی روشنی رات کو دفع نہیں کر سکتی ان میں دوسری روشنیوں کی گنجائش رہتی ہے۔ مگر سورج کی روشنی وہ ہے جو رات کو دفع کر دیتی ہے۔ دن بنا دیتی ہے اور اس کے ہوتے ہوئے کسی روشنی کی ضرورت نہیں اس لئے سورج نکلتے ہی آسمانی تارے چاند زمینی چراغ وغیرہ سب بجھ جاتے ہیں ایسے ہی سب انبیاء نور تھے ہمارے حضور سورج ہیں جن کے آنے پر سارے چراغ گل ہو گئے دن چڑھ گیا اس لئے ابراہیم علیہ السلام نے رسول واحد فرمایا یعنی ایک ایسا رسول بھیج جو اکیلا تمام دنیا کو کافی ہو۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ
اور کون بے رغبتی کرے گا دین ابراہیم سے سوا اس کے جو جاہل کرے جان اپنی کو

اور ابراہیم کے دین سے کون منہ پھیرے سوا اس کے جو دل کا احمق ہے
وَلَقَدِ اصۡطَفَیۡنٰهُ فِی الدُّنۡیَا ۚ وَ اِنَّهٗ فِی الۡاٰخِرَةِ لَمِنَ
اور البتہ تحقیق چن لیا ہم نے ان کو بیچ دنیا کے اور تحقیق وہ بیچ آخرت کے البتہ
اور بے شک ضرور ہم نے دنیا میں اسے چن لیا اور بے شک وہ آخرت میں ہمارے خاص
الصّٰلِحِیۡنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذۡ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسۡلِمۡ ۙ قَالَ اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ
نیکوں میں سے ہیں جب کہا واسطے ان کے رب ان کے نے اسلام لا کہا انہوں نے اسلام لایا
قرب کی قابلیت والوں میں ہے جب اس سے اس کے رب نے فرمایا گردن رکھ عرض کیا میں نے
الۡعٰلَمِیۡنَ ﴿۱۳۱﴾
میں واسطے پالنے والے جہانوں کے
گردن رکھی اس کے لئے جو رب ہے سارے جہان کا

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پہلے کعبہ معظمہ مکہ مکرمہ کی عظمت اور حضور علیہ السلام کی نبوت، جن کے اہل کتاب منکر تھے ان کو ملت ابراہیمی کی اصل ثابت کیا گیا اب اس کا نتیجہ بتایا جارہا ہے کہ یہ تینوں چیزیں دین ابراہیمی میں اصل الاصول ہیں۔ جو ان کا منکر ہے وہ دین ابراہیمی سے علیحدہ ہے اہل کتاب ان تینوں چیزوں کا انکار کر کے کس منہ سے اپنے ملت ابراہیمی پر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں **دوسرا تعلق:** اس سے پہلے دین ابراہیمی کا نمونہ دکھا دیا گیا۔ اب فیصلہ فرمایا جارہا ہے کہ جو اس نمونہ کے مطابق ہو وہ دین ابراہیمی پر ہے اور اس کا مخالف اس ملت سے کوسوں دور اور اے اہل کتاب تم تو ہر بات میں ابراہیم علیہ اسلام کے خلاف ہو اور مسلمان ساری باتوں میں ان کے مطابق حج، طواف، قربانی نبی علیہ السلام کی پیروی وہ ہی کرتے ہیں نہ کہ تم لہٰذا وہ ہی ابراہیم علیہ السلام کے سچے متبع ہیں تم دعویٰ اتباع میں جھوٹے ہو **تیسرا تعلق** پچھلی آیت سے معلوم ہوا کہ ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد میں ایسے نبی کی تشریف آوری کی درخواست کی کہ جو لوگوں کو قرآن کی آیتیں پڑھائے اور ان کے دلوں کو پاک وصاف کرے۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ اس نبی میں ہی وہ ساری صفتیں موجود ہیں۔ اے اسرائیلیوں نہ تمہارے پاس روحانی صفائی ہے اور نہ تلاوت لہٰذا دین ابراہیمی پر وہ ہیں نہ کہ تم۔

شان نزول

حضرت عبداللہ بن سلام نے جو کہ یہود کے بہت بڑے عالم تھے مسلمان ہو کر اپنے دو بھتیجوں مہاجر اور سلمہ کو دعوت اسلام دی

اوران سے فرمایا کہ تمہیں معلوم ہے کہ حق تعالیٰ نے توریت میں فرمایا ہے کہ میں اولاد اسمٰعیل سے ایک نبی پیدا کروں گا جن کا نام احمد ہوگا۔ جوان پر ایمان لائے گا ہدایت پائے گا اور جو ان پر ایمان نہ لائے گا وہ ملعون ہوگا یہ سن کر سلمہ تو ایمان لے آئے مگر مہاجر نے اسلام سے انکار کردیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی (خزائن العرفان وروح البیان)

تفسیر

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ، مَنْ استفہامیہ ہے۔ جس سے اس دعویٰ کا بہت ظاہر ہونا بتایا جارہا ہے یَرْغَبُ رغب سے بنا ہے۔ جس کے لغوی معنی ہیں وسعت وگنجائش چونکہ خواہش اور آرزو میں ارادہ کو وسعت ہوتی ہے۔ اس لئے اصطلاح میں اسے رغبت کہا جاتا ہے۔ جب اس کے بعد عن آئے تو اس کے معنی ہوتے ہیں۔ نفرت وکراہت اور جب اس کے بعد فی یا الی آتا ہے تو اس کے معنی ارادہ یا خواہش ہوتے ہیں اِلٰى رَبِّنَا رٰغِبُوْنَ (القلم: ۳۲) چونکہ یہاں، عن آرہا ہے اس لئے اس سے خواہش اور ارادہ کا پھر جانا مراد ہے یعنی دین ابراہیمی سے کون بے رغبتی کرسکتا ہے تفسیر عزیزی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی یرغب کے بعد فی والی عبارت اور عَنْ مِّلَّةِ سے پہلے ایک اور عبارت پوشیدہ ہے۔ یعنی وہ ابراہیم علیہ السلام جن پر سارے بنی اسرائیل وبنی اسمٰعیل فخر کرتے ہیں۔ ان سے کون منہ پھیرے گا اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ سوا اس کے جو دلی احمق ہو سَفِهَ، سَفْهٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں ہلکا پن بیوقوف اور جاہل کو اس لئے سفیہ کہتے ہیں کہ وہ عقل کا ہلکا ہوتا ہے یہ لازم بھی آتا ہے متعدی بھی یعنی ہلکا کرنا نَفْسَهٗ کے زبر میں چند احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ یہاں سفہ متعدی ہے اور یہ اس کا مفعول بہ دوسرے یہ کہ سفہ کے معنی جہل اور خسر ہیں تیسرے یہ کہ اس کے معنی اھلک ہیں چوتھے یہ کہ اس کے معنی اَضَلَّ ہیں یعنی جو اپنے کو ہلکا کردے یا اپنے کو نقصان میں ڈال دے یا ہلاک کردے گمراہ کردے بعض نے فرمایا کہ یہ سَفُهَ لازم ہے اور نفسہ کا زبر فی کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے ہے۔ ایک آیت قرآت میں سَفَّهَ کی تشدید سے ہے تب تو بالکل ظاہر ہے چونکہ ملت ابراہیمی کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے خلیل اللہ کی عظمت کا اظہار ضروری تھا کہ طبیب کی عظمت سے نسخہ کی عزت ہے بانی کے احترام سے بنا کی توقیر ہے اس لئے رب نے ان کے فضائل بیان کئے۔ (تفسیر کبیر) وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا، اِصْطَفَيْنَا، صَفْوٌ سے بنا ہے جس کے معنی ہیں کسی چیز کا ملاوٹ سے پاک ہونا اور کسی کو اپنے لئے خاص کر کے چن لینا ہمارے حضور علیہ السلام کا نام پاک مصطفیٰ ﷺ، کیونکہ آپ عیبوں سے پاک ہیں اور رب نے آپ ہی کو اپنے لئے چن لیا یعنی حضرت ابراہیم کی شان اور ان کا حال تو یہ ہے کہ رب تعالیٰ نے ان کو دنیا ہی میں بہت سی صفات میں چن لیا ہے آپ ہی نبوت، رسالت، امامت، ولایت، ابوت انبیاء کے جامع ہیں آپ کے متبعین قیامت تک رہیں گے خلیل آپ ہی کا لقب ہے افعال حج آپ ہی پر ظاہر ہوئے آپ ہی کا بنایا ہوا کعبہ ہمیشہ کے لئے باقی رکھا گیا آپ ہی کا بسایا ہوا مکہ مکرمہ جائے امن بنا آپ ہی کی تمام آسمانی دین والے تعریف کرتے ہیں خیال رہے کہ چناؤ دو قسم کا ہوتا ہے عمومی وخصوصی جس عہدہ پر چند آدمی رہ سکیں ان کا چناؤ عمومی ہوگا جیسے حکومت کے اہل کار جس عہدے پر صرف ایک شخص ہی رہ سکے اس کے لیے چناؤ بھی خصوصی ہوگا جیسے وزارت عظمیٰ کے لئے چناؤ رب تعالیٰ نے بندوں کا چناؤ ایمان تقویٰ، ولایت نبوت، کے لئے فرمایا یہ تمام عمومی چناؤ

تھے اگر چہ بعض بہت عام تھے بعض بہت کم مگر محبوبیت کے لئے جناب مصطفیٰ کا خصوصی چناؤ ہوا اس محبوبیت عظمیٰ میں دوسرے کی گنجائش نہیں اس لئے صرف حضور کو مصطفیٰ کہا جاتا ہے یا یوں کہو کہ ایک زمانہ میں خلت وغیرہ خصوصی اوصاف کے لئے صرف حضرت ابراہیم کا خصوصی انتخاب وچناؤ ہوا تھا اب صرف حضور کا خصوصی چناؤ ہوا جیسے یہود سے فرمایا گیا وَ اَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِیْنَ (البقرہ:۴۷) یا بی بی مریم سے فرمایا گیا وَ اصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ (ال عمران:۴۲) لہٰذا اب ابراہیم علیہ السلام کو مصطفیٰ نہیں کہہ سکتے یا یوں کہو کہ جیسے عوام میں سے ممبروں کا انتخاب پھر ممبروں میں وزراء کا پھر وزراء سے وزیر اعظم کا انتخاب یوں ہی مقبولوں میں سے انبیاء کا انتخاب پھر انبیاء میں سے رسولوں کا پھر رسولوں میں مرسلین کا پھر مرسلین میں حضور مصطفیٰ کا۔ لہٰذا آیت واضح وبے غبار ہے اور پھر یہ ہی نہیں کہ فقط دنیا میں آپ کا چناؤ ہوا بلکہ وَ اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ وہ آخرت میں بھی خاص صالحین میں سے ہوں گے یعنی اگر چہ اس دن ان کی نبوت اور رسالت اور امامت ظاہر نہ ہوگی کیونکہ سید الکونین ﷺ کی عظمت وجلالت سامنے ہوگی مگر پھر بھی خاص ولایت کا تاج ان کے سر پر ہوگا۔ (تفسیر عزیزی) کہ تمام قبروں سے ننگے اٹھیں گے اور سب سے پہلے آپ ہی کو خلعت ربانی ملے گی سب بے داڑھی والے ہوں گے آپ کے چہرۂ انور پر داڑھی پاک ہوگی وغیرہ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ ، یہ اِذْ یا تو ظرفیہ ہے اور یا پوشیدہ فعل کا مفعول یا اصطفینا کا ظرف یا تعلیلہ اور اصطفینا کی علت یعنی وہ وقت بھی یاد کرو جب ان سے رب نے یہ کہا، یا رب نے انہیں جبھی چن لیا تھا جب ان سے یہ فرمایا گیا تھا یا انہیں رب نے اس لئے چنا کہ ان سے یہ فرمایا گیا کہ خیال رہے کہ یہاں قال سے وحی خفی یعنی الہام مراد ہے کیونکہ اس واقعہ کے وقت آپ کی نبوت ظاہر نہ تھی۔ (تفسیر عزیزی) یعنی آپ کے رب نے ان کے قلب میں اشارۃً اَسْلِمْ فرمایا، اسلام لاؤ یہاں اسلام کے عرفی معنی مراد نہیں کیونکہ انبیاء کرام ہمیشہ ہی سے مومن ہوتے ہیں بلکہ لغوی معنی مراد ہیں یعنی اپنے کو رب کے سپرد کرو اور اس کے حضور سر جھکا دو تفسیر عزیزی نے فرمایا کہ رب نے یہ فرمایا کر انہیں اپنے میں ایسا جذب کر لیا کہ وہ فنا فی اللہ ہو گئے اور بے اختیار پکار اٹھے کہ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ میں نے اپنے کو رب کے سپرد کر دیا عزیزی نے فرمایا کہ رب نے ان میں سارے کمالات کی قابلیت دیکھ کر کمالات عطا فرمائے اور انہوں نے اپنی جان واولاد اہل قرابت اور زن وفرزند سب کچھ راہ مولیٰ میں قربان کر کے جذب کا عملی ثبوت دے دیا روح البیان نے فرمایا کہ یہاں اسلام سے عرفی اسلام ہی مراد ہے اور اس کے معنی ہیں اسلام پر ثابت قدم رہو آپ نے اس کا اقرار کیا اور ثابت کر دکھایا اور یہ واقعہ جب ہوا جب کہ آپ ایک غار میں پرورش پا رہے تھے اور سات سال کی عمر شریف میں ہی چاند تاروں اور سورج کی ربوبیت کا انکار اور حق کا اقرار کیا۔ جس کا ذکر انشاء اللہ ساتویں پارہ میں اس آیت کی تفسیر میں آئے گا۔ فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً (انعام:۷۸) چونکہ وہ زمانہ نمرود کی سلطنت کا تھا اس وقت ایمان پر قائم رہنا اور اپنے اسلام کا اعلان کرنا آسان نہ تھا مگر آپ نے تمام کفار اور نمرود کا مقابلہ کر کے اپنے اسلام کا اعلان فرمایا اور اس پر جس قدر مصیبتیں پڑیں جھیلیں اس لئے رب نے آپ کے اس عمل شریف پر آپ کو عظمت بخشی اس سے معلوم ہوا کہ مصیبت کے زمانہ میں اسلام کا اعلان اور اس پر قائم رہنا بڑے درجہ کا باعث ہے۔ لہٰذا صحابیوں کی طرح نہیں ہو سکتے کہ ہم آرام کے وقت مومن ہیں وہ مصیبتوں کے زمانہ

کے مومن اور حضور پر قربان یہ بھی معلوم ہوا کہ تقیہ اسلام کے خلاف ہے۔

خلاصہ تفسیر

اے اہل کتاب تم جو کعبہ کی عظمت مکہ مکرمہ کی عظمت نبی آخر الزمان کی نبوت کا انکار کرتے ہو۔ تو درحقیقت ملت ابراہیمی کے منکر ہو کیونکہ یہ چیزیں جو اسلام کے اصول ہیں ملۃ ابراہیمی کی بھی اصل ہیں اور دین ابراہیمی کا اس کے سوا کون انکار کرے گا۔ جو خود نادان اور نرا احمق ہو کیونکہ ابراہیم علیہ السلام وہ ہیں کہ جنہیں خدا تعالیٰ نے دنیا میں بھی برگزیدہ کیا کہ سارے موحد ان کو اپنا پیشوا جانتے ہیں اور ہر جگہ ان کا ذکر خیر جاری ہے اور عرب وعجم میں ان کے نام کے ڈنکے بج رہے ہیں اور آخرت میں بھی ان کے مرتبے بلند ہیں اور وہ خاص درجہ والوں سے ہیں اور یہ بزرگیاں انہیں کیوں نہ ملتیں جب ان کی فرماں برداری اور اطاعت شعاری کا یہ عالم ہے کہ جب ہم نے ان سے فرمایا کہ تم ہر طرح ہمارے مطیع ہو جاؤ اور ہمارے حضور اپنا سر نیاز جھکا دو تو اگرچہ انہیں بہت سی دنیوی رکاوٹیں درپیش تھیں اور بڑی مصیبتوں کا سامنا تھا مگر بلا تامل فرمایا کہ میں دل وجان سے اپنے رب کا تابعدار ہوں اور اس پر ایسا عمل کیا کہ باید وشاید جب انہیں آگ میں ڈالا گیا تو جبریل نے عرض کیا کہ کیا آپ کو کچھ حاجت ہے؟ فرمایا تم سے کچھ نہیں عرض کیا رب سے ہے فرمایا وہ خود جانتا ہے۔ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ (روح البیان یہ ہی مقام) ہمارا اشارہ پا کر فرزند کی قربانی کے لئے تیار ہو گئے ہماری رضا کے لئے گھر بار چھوڑ دیا غرض کہ جو کچھ کہا تھا وہ کر کے دکھایا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ:** صحیح مذہب کی پہچان یہ ہے کہ وہ سلف صالحین کے مطابق ہو کیونکہ وہ ہدایت کا نمونہ ہیں دیکھو رب نے اسلام کی حقانیت کا یہاں یہ ثبوت دیا کہ دین ابراہیمی کا ذکر فرما کر اسلام کی اس سے مطابقت فرما دی آج بے قیدی کا حال یہ ہے کہ ہر کس وناکس نیا دین نکال لیتے ہیں اور بے دھڑک گزشتہ بزرگوں کو کافر کہہ دیتے ہیں۔ جیسے دیوبندی، نیچری وغیرہ کہ ان بے دینوں کے ہاں وہ کام شرک ہیں جنہیں بزرگان دین متبرک سمجھ کر کرتے ہیں۔ **دوسرا فائدہ:** ہم کو چاہئے کہ اگرچہ خود اچھے نہ ہوں مگر کسی اچھے کے پیچھے لگ جائیں دیکھو اس آیت میں یہی تو بتایا کہ اس ہستی ابراہیم کی پیروی کا تو بے وقوف ہی انکار کرے گا کیونکہ عقلمند تو سمجھتا ہے کہ انجن اپنے پیچھے والے ہر قسم کے ڈبوں کو کھینچ لے جاتا ہے خواہ وہ سیکنڈ، فسٹ ہو یا تھرڈ مال گاڑی کا ڈبہ مگر چاہئے کہ اس سے کڑی مضبوط ملی ہو **تیسرا فائدہ:** کبھی بالواسطہ بھی کسی کی پیروی کی جاتی ہے دیکھو اس آیت نے حضور کی پیروی کو ابراہیم علیہ السلام کی پیروی قرار دیا ہم کو بھی چاہئے کہ حضور کی پیروی کے لئے موجودہ علماء ربانی اور کامل مشائخ کی غلامی کریں۔ **چوتھا فائدہ:** حضرات انبیاء کرام ظہور نبوت سے پہلے بھی رب کے پاس سچے مطیع فرمانبردار ہوتے ہیں کیونکہ یہاں اَسْلِمْ اور اَسْلَمْتُ کی گفتگو ابراہیم علیہ السلام کی نبوت سے پہلے کی ہے جو ان کو کسی وقت بے دین مانے وہ خود بے دین ہے۔ **پانچواں فائدہ:** جو شخص اپنے آپ کو ابراہیمی کہے مگر ان کے ایک فرزند حضرت اسحاق کو مانے حضرت اسماعیل کا انکار کرے اور ان

کے لگائے ہوئے باغ مکہ معظمہ، کعبہ شریف اور حضور کی ذات شریف کا منکر ہو وہ ملت ابراہیمی پر ہی نہیں بلکہ ان کا دشمن ہے لہٰذا وہ روافض جو حضور کی اولاد میں صرف فاطمہ زہرا کو مانیں باقی سے دشمنی رکھیں حضرت علی کی اولاد میں صرف حسن حسین کو مانیں باقی کو گالیاں دیں حضور کے دامادوں میں صرف حضرت علی کو مانیں باقی دامادوں کو گالیاں دیں وہ حضور کے دین کے منکر ہیں وہ اپنی فہرست کو مانتے ہیں نہ کہ حضور ﷺ کو **چھٹا فائدہ**: بارگاہ الٰہی میں وہ عاقل ہے جو اللہ رسول کا مطیع ہو ان سے پھر جانے والا احمق و بے عقل ہے اگرچہ دنیاوی کاموں میں بڑا چالاک ہو۔ دیکھو رب نے چالاک اہل کتاب کو سفیہ و احمق فرمایا **ساتواں فائدہ**: دین و ملت کی عظمت ظاہر کرنے کے لئے نبی کی تعریف کرنی ضروری ہے۔ دیکھو رب نے پہلے ملت ابراہیمی کی عظمت بیان کی پھر اس کی دلیل میں جناب خلیل اللہ کی تعریفیں کیں اس سے وہ لوگ عبرت پکڑیں جو حضور کی تعریف کو رب کی یا اسلام کی توہین سمجھتے ہیں۔ **آٹھواں فائدہ**: گناہ گار کو چاہئے کہ اپنی بخشش کے لئے کسی مقبول کا دامن پکڑے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اگر اِذْقَالَ، اِصْطَفَیْنَا کا ظرف ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ابراہیم علیہ السلام کو رب نے خاص اس وقت چنا نہ کہ اس سے پہلے تو کیا پہلے وہ برگزیدہ نہ تھے۔ **جواب**: آپ کی برگزیدگی ہمیشہ سے ہے مگر بعض وقت اس کے آثار لوگوں پر بھی ظاہر ہوتے رہے یہ وقتوں کی قید آثار کے ظہور کے لحاظ سے ہے جیسے کہا جاتا ہے کہ زید میدان جنگ میں بہادر ہے یا بکر مدرسہ میں پہنچ کر علم کا دریا ہے۔ ظاہر ہے کہ زید میں شجاعت تو ہر وقت ہے مگر اس کا ظہور میدان جنگ میں **دوسرا اعتراض**: اس آیت میں کہا گیا کہ ابراہیم علیہ السلام کو رب نے چنا تو چاہئے کہ انہیں بھی مصطفیٰ کہا جائے حالانکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سوا کسی کا یہ لقب نہیں **جواب**: بے شک رب نے انہیں برگزیدہ فرمایا مگر یہ لقب حضور ہی کا ہے۔ وصف ہونا اور بات ہے لقب ملنا دوسری بات حق تعالیٰ سارے مسلمانوں سے فرماتا ہے هُوَ الَّذِیْ یُصَلِّیْ عَلَیْكُمْ وَمَلٰٓىِٕكَتُهٗ (احزاب: ۴۳) مگر انبیاء کرام کے سوا کسی بھی مسلمان کو ﷺ نہیں کہا جاتا **تیسرا اعتراض**: یہاں اسلم فرمانے سے معلوم ہوا کہ کبھی ابراہیم علیہ السلام اسلام سے خالی بھی تھے۔ حالانکہ انبیاء کفر سے ہمیشہ پاک ہوتے ہیں۔ **جواب**: اس کا جواب تفسیر سے گزر گیا اس سے یا تو اطاعت کرنا مراد ہے یا اسلام پر قائم رہنا اپنے کو رب کے سپرد کر دینا یا خلائق سے منہ موڑ کر رب کی طرف جذب ہو جانا اور اگر ظاہری معنی اسلام ہی مراد ہوں تو یہ واقعہ عالم ارواح کا ہے نہ کہ اس دنیا کا اس عالم میں تمام روحیں صفات سے خالی پیدا ہوئیں پھر نوری چھینٹے سے ان کے مختلف حالات ہوئے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے **چوتھا اعتراض**: کیا وجہ ہے کہ خدا نے ابراہیم ہی کو پسند کیا اگر پارسا ہونے سے کیا تو پارسا تو اور بھی ہو سکتے ہیں اور اس کی کیا وجہ؟ کہ جو دین ابراہیمی کو نہ مانے وہ بے عقل ہے۔ (ستیارتھ پرکاش) **جواب**: شاید پنڈت جی کی آنکھیں دکھتی ہیں جس سے وہ پوری آیت دیکھ نہ سکے رب تعالیٰ سارے پارساؤں کو پسند فرماتا ہے۔ چونکہ ابراہیم علیہ السلام اعلیٰ درجے کے پارسا ہیں۔ اس لئے وہ اعلیٰ درجہ کے مقبول اور ان کا دین رب کا سیدھا راستہ ہے۔ جو سیدھا راستہ چھوڑ

کر ٹیڑھا راستہ اختیار کرے اس سے بڑھ کر بے وقوف کون ہے۔

تفسیر صوفیانہ

اس آیت میں نہایت نفیس دو اشارے ہیں ایک یہ کہ جو اپنے نفس کو پہچان لے گا۔ وہ رب کو ضرور پہچانے گا بت پرست اور دنیا پرست دراصل اپنے سے ناواقف ہے اگر اپنے کو جانتا تو رب سے کبھی بے خبر نہ رہتا اپنے ضعف سے رب کی قوت کا اپنے عجز سے رب کی قدرت کا اپنے فنا سے رب کی بقا کا پتہ لگتا ہے نفس پردہ ہے جس کے وراء جلوۂ محبوب ہے۔ مولانا اس کو خوب حل فرماتے ہیں ؎

جملہ معشوق است عاشق پردہ — زندہ معشوق است و عاشق مردہٴ

چیست توحید خدا آموختن — خویشتن را پیش واحد سوختن

ہستیت درہست آں ہستی نواز — ہمچو مس درکیمیا اندر گداز

رب نے بھی اپنا پتہ اس طرح دیا وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ (الذاریات: ۲۱) ہمارے جلوے تمہارے نفسوں میں ہیں تم دیکھتے کیوں نہیں۔ دوسرا اشارہ یہ ہے کہ رب کے راستہ میں ایک عظیم الشان دریا ہے جس کا نام ہے شریعت اس کی کشتی ہے طریقت یوں سمجھو کہ شریعت اسلام ہے اور طریقت استسلام جو بہادر اس کشتی کے ذریعہ دریا پار کر گیا تو پھر وہ رب کا ہے اور رب اس کا دیکھو رب نے ابراہیم علیہ السلام کو اصطفٰی کا تمغہ کب دیا۔ جب ان سے اسلم فرما کر یہ دریا عبور کرا لیا۔ محبوب بننے کے لئے ضروری ہے۔ کہ محبوبیت کے پردے پھاڑ دیئے جائیں اور رب جانے کے اسلم فرما کر ان کے کتنے حجاب اٹھا دیئے اور انہوں نے اسلمت کہہ کہ کتنے پردے پھاڑ ڈالے معراج میں اپنے حبیب کو اُدْنُ کہہ کر قریب کیا یہاں خلیل کو اسلم فرما کر صحیح سلامت اپنے سے واصل کر لیا اللہ ہمیں واصلین میں سے فرمائے صوفیاء فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے انبیاء کرام خصوصاً ابراہیم علیہ السلام کی دعائیں اور کلام قرآن ہی نے نقل کیلئے حضور نے ان کے وظیفے کئے تاکہ لوگوں میں ان بزرگوں کا چرچا رہے۔ اور لوگوں کو ان کی طرح عبادات کا شوق ہو اور ان کلمات کی برکت سے رب تعالیٰ لوگوں کو نیکیوں کی توفیق دے ان کلمات میں بھی تاثیر ہے۔ چنانچہ ہم نماز پڑھتے وقت اِنِّیْ وَجَّھْتُ الخ مصیبت کے وقت لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنْتَ پڑھتے ہیں۔

وَ وَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَ يَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ
اور وصیت کی ساتھ اس کے ابراہیم نے بیٹوں اپنے کو اور یعقوب نے کہ اے بچو میرے تحقیق
اور اسی دین کی وصیت کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں کو اور یعقوب نے کہ اے میرے بیٹو بیشک
اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ
اللہ نے چن لیا واسطے تمہارے یہ دین پس ہرگز نہ مرو تم مگر اس حال میں کہ
اللہ نے یہ دین تمہارے لیے چن لیا تو نہ مرنا مگر

مُّسۡلِمُوۡنَ ؕ﴿۱۳۲﴾
تم مسلمان ہو
مسلمان

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں ابراہیم علیہ السلام کے ذاتی کمال کا ذکر فرمایا گیا کہ وہ خود کامل تر ہیں۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ وہ کامل گر بھی ہیں یعنی اوروں کو بھی اپنے فیض سے کامل فرماتے ہیں۔ گویا پہلے ان کے کمال کا ذکر تھا اور اب ان کے اکمال کا **دوسرا تعلق:** کمالات ابراہیمی کو سن کر کوئی کہہ سکتا تھا کہ ان کی ملت انہیں کے ساتھ تھی کہ اس پر یا تو وہ خود عامل ہوں یا بڑے بڑے پیغمبر۔ ہم عوام کو یہ حق نہیں کہ ان کے دین کی پیروی کریں کیونکہ یہ ہماری استعداد سے بڑھ کر ہے۔ اب اس وہم کی تردید فرمائی جارہی ہے کہ ان کا دین بہت آسان اور واضح ہے۔ جس کی انہوں نے اپنی ساری اولاد کو وصیت فرمائی اگر وہ ان کی خصوصیات سے ہوتا۔ تو اس کا دوسروں کو حکم نہ فرماتے **تیسرا تعلق:** پہلے فرمایا گیا تھا کہ دین ابراہیم سے بے وقوف ہی علیحدہ رہے گا۔ اس کی ایک وجہ تو اسی آیت میں بیان کردی گئی کہ وہ نہایت کامل دین ہے۔ دوسری وجہ اب بتائی جارہی ہے کہ اس پر قائم رہنے کی انہوں نے وصیت بھی کی تھی اور جو اپنے بزرگوں کی وصیت نہ مانے وہ بڑا بے وقوف ہے **چوتھا تعلق:** پچھلی آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کی عملی تبلیغ کا ذکر فرمایا کہ آپ نے دنیا والوں کو اس طرح عبادات کر کے دکھائیں اس آیت میں آپ کی قومی تبلیغ کا ذکر کیا ہے کہ اپنی اولاد کو عبادات کی یوں وصیت فرمائی۔ بزرگوں کے اعمال بھی تبلیغ ہوتے ہیں رب تعالیٰ نے ان کے اعمال واقوال قرآن کریم میں اس لئے نقل کئے کہ لوگوں کو تبلیغ ہو۔

تفسیر

وَوَصّٰى، یہ **وَصِیَّۃٌ** سے بنا جس کے لغوی معنی ہیں کسی پر کوئی نیک بات پیش کرنا۔ اصطلاح میں تاکیدی حکم کو وصیت کہا جاتا ہے۔ اسی لئے مرنے والے کے آخری پیغاموں کو وصیت کہتے ہیں کہ ان کے پورا کرنے کی بہت تاکید ہے۔ نیز رب فرماتا ہے **یُوۡصِیۡکُمُ اللّٰہُ فِیۡۤ اَوۡلَادِکُمۡ** (النساء:۱۱) لہٰذا **وَصّٰی** کا یہ مطلب نہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی پاک میں تو اپنے فرزندوں کو تبلیغ اسلام نہ فرمائی صرف وصال کے وقت فرمائی۔ بلکہ یہ مطلب ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے بتاکید حکم دیا یا وفات کے وقت بھی حکم فرما گئے **بِهَا،** اس اسلام کا یا اس ملت کا چونکہ اسلمت میں تو اسلام کا ذکر آگیا تھا اور **عَنۡ مِّلَّةِ** میں ملت کا لہٰذا دونوں طرف ضمیر لوٹ سکتی ہے اگرچہ ضمیر مونث ہے۔ **اِبۡرٰهٖمُ بَنِيۡهِ** بنی ابن کی جمع ہے یعنی بیٹے اگرچہ آپ کی وصیت سب کے لئے ہی تھی مگر بیٹوں کا ذکر خصوصیت سے اس لئے کیا کہ وہ آپ کا نمونہ بنیں اور دنیا میں تبلیغ کریں۔ خیال رہے کہ ابراہیم علیہ السلام کی تین بیویوں سے آٹھ بیٹے تھے حضرت ہاجرہ کے شکم سے اسمٰعیل علیہ السلام جو سب سے بڑے تھے اور حضرت

سارا کے شکم سے اسحاق علیہ السلام جو حضرت اسمٰعیل سے چودہ سال عمر میں چھوٹے تھے۔ اور قنطورا بنت یقطن کنعانیہ کے شکم سے چھ بیٹے مدین، مدائن، زمران، بقشان، یشبق اور نوخ (تفسیر روح البیان، عزیزی، حقانی قدرے اختلاف) خیال رہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے سب سے پہلے اپنے چچا ہاران کی بیٹی سارا سے نکاح کیا۔ پھر حضرت ہاجرہ سے حضرت سارا کی وفات کے بعد قنطورا سے آپ کے دو بیٹے یعنی اسمٰعیل اور اسحاق علیہم السلام تو پیغمبر ہوئے باقی چھ متقی مسلمان۔ اسمٰعیل علیہ السلام کو مکہ معظمہ میں بسایا۔ اور اسحاق علیہ السلام کو اپنے ساتھ کنعان رکھا۔ اور مدین کو وہاں رکھا جہاں انہیں کے نام سے شہر مدین بسا شعیب علیہ السلام انہیں کی اولاد سے تھے۔ مدائن وغیرہ کو شام وروم وغیرہ میں بحکم الٰہی آباد کیا پھر اسمٰعیل کے بارہ بیٹے ہوئے جن میں سے منجھلے بیٹے (چھوٹے سے بڑے) قیدار تھے۔ جس کی نسل سے ہمارے نبی ہیں (از عزیزی وحقانی) وَ یَعْقُوْبُ ہماری قرات میں یعقوب کے پیش سے یعنی یعقوب نے بھی اپنی اولاد کو یہ ہی وصیت کی تھی اور ایک قراءت میں یعقوب کا نصب بھی ہے یعنی ابراہیم نے سارے بیٹوں اور اپنے پوتے یعقوب علیہ السلام کو وصیت کی (تفسیر کبیر) یعقوب عقب سے بنا جس کے معنی ہیں پاؤں کی ایڑی چونکہ آپ اپنے بھائی عیصو کے ساتھ ہی اس طرح پیدا ہوئے کہ آپ کے ہاتھ ان کی ایڑی سے لگے ہوئے تھے اس لئے آپ کا نام یعقوب ہوا خیال رہے کہ اسحاق علیہ السلام کا نکاح لوط علیہ السلام کی دختر سے ہوا۔ ان کے شکم سے یعقوب علیہ السلام پیدا ہوئے لہٰذا آپ ابراہیم علیہ السلام کے پوتے اور حضرت لوط کے نواسے آپ کے دو بیبیوں اور چند لونڈیوں کے بطن سے بارہ بیٹے تھے۔ آپ نے اپنے ماموں لایاں کی بیٹی لَیّا سے نکاح کیا۔ جن سے روحیل۔ شمعون اور لاوا یہودا ہوئے لَیّا کے انتقال کے بعد ان کی ہمشیرہ یعنی اپنی چھوٹی سالی رائیل سے نکاح کیا جن سے یوسف علیہ السلام اور بنیامین ہوئے باقی چھ بیٹے زیتون، یشاخر، دان، نفتالی اور کاد اور انترا کہ یہ سب بلہ، زلفہ وغیرہا لونڈیوں سے پیدا ہوئے۔ (عزیزی وحقانی) یعقوب علیہ السلام کی عمر ۱۴۷ سال کی ہوئی اور اب روایت میں ہے کہ آپ نے مصر میں وفات پائی اور آپ کی وصیت کے مطابق بیت المقدس میں اسحاق علیہ السلام کی قبر کے پاس دفن کیا گیا۔ یٰبَنِیَّ اے میرے بچو یہاں بنین کو، متکلم کی طرف مضاف کیا گیا اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ اللہ نے تمہارے واسطے یہ دین یعنی اسلام جو کہ تمام دینوں سے چھٹا ہوا دین ہے پسند کیا اور چن لیا اَلدِّیْنَ میں یا تو الف لام عہدی ہے یا جنسی یعنی اس خاص دین کو یا مطلق دین کو چن لیا۔ گویا اسلام ہی دین ہے اس کے سوا اور ادیان دین ہی نہیں اور جو بھی اعتقاد وعمل اس کے خلاف ہو رب کے ہاں مقبول نہیں۔ لہٰذا خبردار فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ تم اسلام کے سوا کسی اور دین پر نہ مرنا۔ یہاں مرنے سے ممانعت نہیں اور نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ تم زندگی میں تو کفر کرتے رہنا اور موت کے وقت ایمان لے آنا بلکہ یہ مطلب ہے کہ ہر وقت اسلام پر قائم رہنا۔ کیونکہ موت کا ہر وقت ہی اندیشہ ہے لہٰذا کوشش کرنا کہ موت تمہیں اسلام پر آئے ایک روایت میں ہے کہ یعقوب علیہ السلام جب مصر تشریف لائے تو وہاں بعض لوگوں کو بت پرستی کرتے دیکھا۔ تو آپ نے اپنے سب فرزندوں کو جمع فرما کہ یہ وصیت فرمائی۔

خلاصہ تفسیر

اے لوگو ابراہیم علیہ السلام خود تو کامل اور کامل تر تھے۔ مگر انہوں نے چاہا کہ میرے جانشین بھی میرے ہی قدم بقدم چل کر میرا نمونہ بنیں۔ تاکہ لوگ انہیں دیکھ کر میرے راستہ پر چل سکیں اس لئے ابراہیم علیہ السلام نے تو اپنے بیٹوں کو اور یعقوب علیہ السلام نے اپنے فرزندوں کو بتاکید حکم دیا کہ اے بچو! جھوٹے دین تو لوگوں کے اپنے بنائے ہوئے ہیں۔ مگر اپنے بندوں کے لئے جو رب نے دین بھیجا ہے۔ وہ یہ دین اسلام ہے لہٰذا تم ہمیشہ اسی دین پر قائم رہنا اور کوشش کرنا کہ دنیا سے اسی دین پر جاؤ۔ اور چونکہ موت کا ہر وقت اندیشہ ہے لہٰذا ہر وقت ہی اسلام پر جمے رہنا خیال رہے کہ انبیاء کے مال میں چونکہ میراث نہیں لہٰذا ان کی وصیت بھی نہیں ان کے مال کی میراث یا وصیت نہیں بلکہ ان کے اعمال یا کمال یا حال کی میراث یا وصیت ہے قرآن کریم نے حضرت داؤد و زکریا علیہما السلام کی وراثت کا ذکر کیا ہے مگر وراثت مال نہیں بلکہ وراثت علم و وراثت دینی ہے اور ابراہیم و یعقوب علیہما السلام کی وصیتوں کا ذکر ہے۔ مگر وصیت مال نہیں بلکہ وصیت دینی اس سے روافض عبرت پکڑیں جو حضور کی مالی میراث بھی مانتے ہیں اور مالی وصیت بھی انہوں نے حضور کی شان پہچانی ہی نہیں یہاں وصی فرمان میں چند خوبیاں ہیں۔ ۱۔ ایک یہ کہ وصیت عام طور پر خوف یا موت کے وقت ہوتی ہے اور ان وقتوں میں انسان بہت احتیاط سے کام لیتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ان حضرات نے بہت احتیاط فرماتے ہوئے تاکیداً یہ حکم فرمایا ۲۔ دوسرے یہ کہ اپنے بچوں کو خاص طور پر یہ وصیت فرمائی اور ظاہر ہے کہ ماں باپ اولاد پر زیادہ مہربان ہوتے ہیں تو اگر اسلام سے زیادہ ان کی نگاہ میں کوئی اور چیز پیاری ہوتی تو اس کی وصیت فرماتے لہٰذا اسلام ہی بڑی لذیذ اور افضل چیز ہے۔ ۳۔ تیسرے یہ کہ ان حضرات نے یہ وصیت عام طور پر اپنے فرزندوں کو کی۔ ۴۔ چوتھے یہ کہ اس وصیت میں کسی جگہ اور وقت کی قید نہ لگائی۔ ۵۔ پانچویں یہ کہ اس کے سوا اور کوئی وصیت نہ کی ان تمام وجوہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کی نگاہ میں دین بڑی ضروری چیز تھی۔ جو بدنصیب کہ ان کی وصیت پوری نہ کرے وہ ان کی روح کو تکلیف دیتا ہے اور وہ اپنے کو ابراہیمی کہنے کا حق دار نہیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ**: بزرگوں کو چاہئے کہ سب سے پہلے اپنی اولاد کو سنبھالیں پھر دیگر لوگوں کو جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوا اور حضور علیہ السلام کو بھی یہی حکم دیا گیا وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ (الشعراء: ۲۱۴) جس پر عمل کرتے ہوئے آپ نے اپنے اہل قرابت کو ہی تبلیغ فرمائی یہاں تک کہ اپنی لخت جگر فاطمہ زہرا سے فرمایا کہ اگر تم نے اسلام قبول نہ کیا اور غضب الٰہی جوش میں آ گیا تو میں دور نہ کروں گا۔ **دوسرا فائدہ**: اپنی اولاد اور اہل قرابت کو آہستگی سے بار بار سمجھانا چاہئے جیسا کہ وصی کی تشدید سے معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات نے عمدہ طریقہ سے ہمیشہ تبلیغ فرمائی **تیسرا فائدہ**: اسلام اور ایمان کا فائدہ جب ہی ہے کہ جب اس پر موت ہو اسی لئے ان حضرات نے موت تک اسلام پر قائم رہنے کا حکم دیا **چوتھا فائدہ**: انبیاء کرام کی نگاہ میں اہم چیز دین ہے نہ کہ دنیوی مال۔ اسی لئے وہ حضرات وصیت بھی دین ہی کی فرماتے ہیں نہ کہ دنیا کی حضور علیہ السلام نے بھی فرمایا کہ ہماری میراث علم ہے ہم جو کچھ مال

چھوڑیں وہ صدقہ ہے روافض کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کو اپنے آخر وقت میں بھی فدک وغیرہ مال کی فکر تھی اور آپ اس ہی کی حضرت علی اور فاطمہ زہرا کو وصیت فرما گئے اس سے لازم آتا ہے کہ ابراہیم و یعقوب علیہما السلام حضور سے بڑھ جائیں کہ وہ تو دین کی وصیت کریں اور آپ چند درخت کھجوروں کی **پانچواں فائدہ**: بغیر ایمان پیغمبر زادگی بیکار ہے بلکہ بڑوں کی اولاد کو زیادہ کامل الایمان ہونا چاہئے تاکہ ان سے ان کے بزرگوں کا نام روشن ہو اور لوگ راہ ہدایت پائیں۔ **چھٹا فائدہ** ماں باپ کو چاہئے کہ کبھی اپنی اولاد سے بے خبر نہ رہیں۔ ہمیشہ اس کو نصیحت کرتے رہیں اور ان کے اعمال کی کڑی نگرانی کریں۔ دیکھو ابراہیم علیہ السلام وفات کے وقت بھی اس طیب و طاہر اولاد سے بے فکر نہ ہوئے اپنے بعد کے لئے انہیں وصیت فرما گئے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: موت غیر اختیاری چیز ہے تو فَلَا تَمُوْتُنَّ فرما کہ اس سے منع کرنے کے کیا معنی؟ حکم اور ممانعت اختیاری چیز میں ہوتی ہے **جواب**: اس کا جواب تفسیر میں گزر گیا۔ کہ یہاں موت سے ممانعت نہیں بلکہ غیر مسلم ہو کر مرنے سے ہے اور درحقیقت یہ اسلام پر رہنے کا حکم ہے جیسے کہ کوئی کہے کہ نماز مت پڑھو، بغیر حضور قلب اس میں نماز سے روکنا نہیں بلکہ دل حاضر رکھنے کا حکم ہے **دوسرا اعتراض**: ابراہیم اور یعقوب علیہما السلام کے دین کا نام اسلام نہ تھا تو انہوں نے اسلام پر قائم رہنے کی کیوں وصیت کی؟ **جواب**: یہاں اسلام کے لغوی معنی مراد ہیں نہ کہ اصطلاحی۔ ہر پیغمبر کی امت لغۃً مسلمان یعنی رب کی فرمانبردار تھی اس وصیت میں لطیف اشارہ یہ بھی ہے کہ میری اولاد میں جو بھی جس پیغمبر کا زمانہ پائے اس کی اطاعت کرے کیونکہ یہ ہی رب کی اطاعت اور یہ ہی اسلام ہے یہ ضد نہ کرے کہ ہم تو دین یعقوبی ہی مانیں گے یہ دین نسخ سے پہلے اسلام ہے نہ کہ اس کے بعد **تیسرا اعتراض**: ابراہیم اور یعقوب کا زمانہ ایک نہیں تو ان کو اس آیت میں جمع کیوں کیا گیا۔ **جواب**: اہل کتاب ان دونوں حضرات کو بڑا بزرگ مانتے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنے دین کو ابراہیمی دین اور اپنے کو یعقوب علیہ السلام کی اولاد کہتے ہیں اس لئے ان دونوں کا ذکر فرما کر یہ بتایا گیا کہ تم عملاً نہ ابراہیمی ہو اور نہ اسرائیلی فرق زمانہ کے لحاظ سے ایسی عبارت فرمائی گئی ورنہ عبارت یوں ہوتی۔ وَصّٰى بِهَا اِبْرٰهِيْمُ وَ يَعْقُوْبُ بَنِيْهِمَا

تفسیر صوفیانہ

ہوا و نفس ہاویہ کا راستہ ہے اور نفس کی شرارت کی اصل یہ ہے کہ وہ اپنی بڑائی دیکھتی ہے برائیوں پر نظر نہیں کرتی اہل کتاب کی نظر اس پر تھی کہ ہم پیغمبروں کی اولاد ہیں اس پر نہ تھی کہ ہم عملاً ان سے دور ہیں اس بیماری سے بچانے کے لئے ان دونوں پیغمبروں نے اپنی اولاد کو حکم دیا کہ تم مرتے دم تک اپنی ایمانی اور عملی حالت پر نظر کرنا یہ خیال نہ کرنا کہ ہم ابراہیمی اور اسرائیلی ہیں ٹھنڈے لوہے کو کوٹنا بیکار ہے۔ اس کا گرم کرنا ضروری ہے اسی طرح نفس کو اعمال کی بھٹی میں گرم کرو پھر تصوف کے ہتھوڑے سے کوٹو تاکہ وہ کچھ کام کا بن جائے۔ صوفیاء فرماتے ہیں کہ بعض بدعمل یہ سمجھتے ہیں کہ رب غفور رحیم ہے ہمیں اس کی بخشش کی امید ہے مگر وہ جھوٹے ہیں اگر انہیں امید ہوتی تو اس کی اطاعت بھی کرتے رب سے امید عین ایمان ہے اور اس پر

امن کفر (روح)۔

دوسری تفسیر

ابراہیم و یعقوب علیہما السلام نے اپنی اولاد کو کلمہ توحید کی وصیت کی اور فرمایا کہ یہی دین وہ ہے جسے موحد اختیار کرے اس کے سوا نہ کوئی دین ہے اور نہ کوئی ذات دین اللہ کا دین ہے اور ذات اس کی ذات لہذا تم جہالت کی موت نہ مرنا بلکہ اپنے کو رب میں فنا کر کے ایسا مرنا کہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہو جاؤ۔ بدن کی موت اس حال میں آئے کہ تمہارا قلب قابل موت نہ رہا ہو لوگ تمہیں مردہ کہیں اور رب بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ (ال عمران:۱۶۹) فرما کر تمہاری زندگی کا اعلان فرمائے یہی اسلام و استسلام، توحید اور تصوف کی حقیقت ہے۔

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ
کیا تھے تم موجود جبکہ حاضر ہوئی یعقوب کو موت جب کہا
بلکہ تم خود موجود تھے جب یعقوب کو موت آئی جبکہ
لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ
انہوں نے واسطے بیٹوں اپنے کے کیا پوجو گے تم پیچھے میرے بولے وہ پوجیں گے
اس نے اپنے بیٹوں سے فرمایا میرے بعد کس کی پوجا کرو گے بولے ہم پوجیں گے
اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ
ہم معبود تمہارا اور معبود باپ دادوں تمہارے ابراہیم اور اسماعیل اور اسحاق کا
اسے جو خدا ہے آپ کا اور آپ کے آباء ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق کا
وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۳﴾
معبود ایک اور ہم اسی کے لئے اسلام لانے والے ہیں
ایک خدا اور ہم اس کے حضور گردن رکھے ہیں

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق**: اب تک ابراہیم و یعقوب علیہم السلام کی عظمت، اطاعت الٰہی کا ذکر فرمایا اب ان پر سے وہ تہمت دور کی جا رہی ہے جو بنی اسرائیل نے انہیں لگائی یعنی پہلے ان کے فضائل کا اثبات تھا اب ان کی تہمت کا دفعیہ **دوسرا تعلق**: اب تک ان حضرات کی دینی استقامت کا رب نے ذکر فرمایا۔ اب خود مخالفین کی گواہی سے اس کا ثبوت دیا جا رہا ہے۔ **تیسرا تعلق**: پچھلی آیت میں یعقوب علیہ السلام کی اس وصیت کا ایک حصہ

بیان کیا گیا۔اب اس کا دوسرا حصہ بیان ہو رہا ہے۔یعنی پہلے بتایا گیا کہ انہوں نے اپنی اولاد کو دینی استقامت کا حکم دیا اور اب فرمایا جا رہا ہے کہ اس کا ان سے اقرار بھی لیا۔

شان نزول

یہود کہتے تھے کہ ہم کو وصیت ابراہیمی کی تو خبر نہیں یہ ہم جانتے ہیں کہ یعقوب علیہ السلام نے اپنی وفات کے دن اپنی اولاد کو وصیت کی تھی کہ تم ہمیشہ دین یہودیت پر قائم رہنا۔ان کے اس بہتان کی رد میں یہ آیت نازل ہوئی۔(خازن وخزائن العرفان) خیال رہے کہ اہل کتاب نے جیسے توریت وانجیل میں مسخ وتبدیلی کر دی یوں ہی رب کی ذات وصفات انبیاء کرام کی تعلیم اور ان کے حالات میں بہت کتر بیونت کر دیتے تھے چنانچہ تمام اہل کتاب نے حضرت سلیمان کو نبوت کی فہرست سے نکال کر جادوگروں کے زمرے میں داخل کر دیا تھا۔عیسائیوں نے حضرت مسیح کو صف انبیاء سے نکال کر خدا مان لیا یہود نے اس کنواری پاک کو بہتان لگائے اور حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا کہہ دیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہودی یا عیسائی بنایا یعقوب علیہ السلام کے متعلق مشہور کیا کہ وہ ہمیں یہودی رہنے کی وصیت کر گئے ہیں وغیرہ وغیرہ قرآن نے ان کی اس بکواس کی جگہ جگہ تردید کی اور انبیاء کرام کی شان، ان کی تعلیم صحیح طور پر دنیا پر ظاہر کی۔ان تمام نبیوں پر حضور کا احسان ہے یہ آیت کریمہ بھی اس سلسلہ کی ایک کڑی ہے جس میں حضرت یعقوب علیہ السلام کی وصیت کو صحیح طور پر شائع کیا تاکہ مسلمان بھی اسی وصیت پر عمل کریں۔

تفسیر

اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ بعض نے ام متصلہ مانا ہے، بعض نے منقطع بمعنی استفہام انکاری یعنی آیا تم اس وصیت کے وقت موجود تھے یعنی نہ تھے اور تم بغیر دیکھے غلط گواہی دے رہے ہو۔لہٰذا اس کا کوئی اعتبار نہیں۔(روح البیان) یا یہ مطلب ہے کہ بلکہ تم اس وصیت کے وقت موجود تھے۔یعنی تمہارے بڑے یعقوب علیہ السلام کی وفات کے وقت ان کے پاس تھے ان کو علم ہے کہ انہوں نے وہی وصیت کی جو ہم نے بیان کی پھر تم دیدہ دانستہ ان پر کیوں اتہام باندھتے ہو (تفسیر کبیر) بہر حال اس میں یا تو ان کے موجود ہونے کا انکار ہے۔یا اثبات دوسری تفسیر زیادہ قوی ہے کیونکہ اس پر الزام زیادہ سخت ہے۔شہداء جمع شہید کی ہے۔جیسے رحماء جمع رحیم کی۔جس کے معنی حاضر بھی ہیں اور گواہ بھی بلکہ گواہ کو بھی اس لئے شہید کہتے ہیں کہ وہ موقعہ واردات پر حاضر ہوتا ہے اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ یہ اذ یا كُنْتُمْ کا ظرف ہونے سے اسباب وعلامات موت کا موجود ہونا مراد ہے کیونکہ وصیت موت آنے پر نہیں کی جاتی بلکہ موت کے قریب یعنی اے اسرائیلیو تمہارے بڑے تو سب موجود تھے۔حضرت یعقوب علیہ السلام پر موت کے آثار نمودار ہوئے۔اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ یہ پہلے اذ کا بدل ہے اور اسی کنتم یا شہداء کا ظرف یعنی جب کہ انہوں نے اپنے سارے بیٹوں کو جمع فرما کر ایک عجیب طریقہ سے استقامت دین کی وصیت فرمائی کہ خود حکم نہ دیا بلکہ ان سے پوچھا کہ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ اب تک تو تم رب کی عبادت کرتے رہے مگر یہ بتاؤ کہ میری وفات کے بعد کس کی عبادت کرو گے لفظ ما اگرچہ بے عقل چیزوں کے لئے آتا ہے مگر ابہام کے موقعہ پر سب کو شامل ہوتا ہے (روح) اور بعدی سے مراد بعد موت ہے یعنی تم اس خدا ہی کی عبادت کرو گے جس کی اب تک کرتے رہے یا ان بتوں وغیرہ کی جن کی

مصروالے کرتے ہیں قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وہ بولے کہ ہم اس رب کی اطاعت کریں گے جو آپ کا اور آپ کے باپ داداوں کا رب ہے اس کے دو معنی ہیں۔ ایک یہ کہ جس کی آپ نے اور آپ کے باپ داداؤں نے عبادت کی ہے یا جسے ہم نے آپ کے اور آپ کے باپ داداؤں کے ذریعے پہچانا ہے یعنی ان بتوں کو تو کفار نے بتایا۔ اور سچے رب کو آپ نے پہچنوایا ہم آپ کے بتائے ہوئے رب کے عابد ہوں گے نہ کہ ان کے بتائے ہوئے کے۔ آباء اب کی جمع ہے جس کے حقیقی معنی ہیں باپ مگر مجازاً دادا، چچا بلکہ استاد وغیرہ کو بھی اب کہہ دیتے ہیں اور یہاں اس سے باپ دادے مراد ہیں۔ اسمٰعیل علیہ السلام یعقوب علیہ السلام کے چچا ہیں۔ چونکہ چچا بھی باپ ہی کی طرح ہوتا ہے۔ اس لئے آپ کا ذکر بھی آباء کے سلسلہ میں کیا گیا اور چونکہ آپ اسحاق علیہ السلام سے عمر میں چودہ سال بڑے بھی ہیں اور حضور علیہ السلام کے جد امجد۔ اس لئے اسحاق علیہ السلام سے پہلے آپ کا ذکر کیا۔ اس جملہ میں دو جگہ الٰه سے شاید کوئی وہم کرتا کہ اس سے دو معبود مراد ہیں۔ آپ کا اور معبود اور باپ داداوں کا دوسرا۔ اس وہم کو دور کرنے کے لئے عرض کیا کہ اِلٰهًا وَّاحِدًا ایک ہی معبود کی جو کہ ذات وصفات میں اکیلا ہے اور پھر یہ بھی نہیں عبادت ایک ہی طریقہ کی کریں اور اسی پر ڈٹے رہیں بلکہ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ہم تو اس کے حکم کے تابع ہیں۔ جس زمانہ میں جس پیغمبر کے ذریعہ جو بھی احکام آئیں گے اور ہمیں جو بھی طریقہ عبادت بتایا جائے گا۔ اس پر کاربند رہیں گے۔ (تفسیر عزیزی) غرضیکہ گزشتہ جملوں میں توحید کا ذکر تھا اور اس میں نبوت کا تذکرہ۔

خلاصہ تفسیر

اے بنی اسرائیل تم ہماری بیان کی ہوئی وصیت کا انکار کیسے کرتے ہو۔ یعقوب علیہ السلام نے تو یہ وصیت تنہائی میں نہ کی تھی۔ بلکہ اعلانیہ اور سب کے سامنے تا کہ ان کی اولاد اپنی اطاعت شعاری کا اقرار کرے اور دوسرے لوگ سن کر عبرت پکڑیں چنانچہ خود تمہارے بڑے بھی اس مجلس میں موجود تھے جب کہ یعقوب علیہ السلام پر آثار موت نمودار تھے اس موت کی کشمکش میں بھی انہوں نے اپنی اولاد کو جمع کر کے یہی پوچھا تھا کہ میرے بچو! تم میری وفات کے بعد عبادت کس کی کرو گے ان سب نے عرض کیا تھا کہ والد مہربان آپ مطمئن رہیں۔ ہم اس ایک واحد قہار کے عابد رہیں گے۔ جسے آپ کے اور آپ کے باپ دادا اور دیگر انبیاء کے ذریعہ پہچانا۔ اور جس کی آپ نے اور انہوں نے عبادت کی ہے اور ہم بھی اس کے فرمانبردار ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے کہ جس پیغمبر کے ذریعہ جو حکم ملے ہمیں اس کے ماننے میں عذر نہ ہوگا جب تمہارے بڑے یہ وصیت اپنے کانوں سے سن چکے اور آنکھوں سے دیکھ چکے اور وہاں ان کی موجودگی تھی تو تم جان بوجھ کر یعقوب علیہ السلام کو تہمت کیوں لگاتے ہو کہ انہوں نے یہودیت پر رہنے کی وصیت کی تھی۔ خیال رہے کہ یعقوب علیہ السلام کی وفات، صحیح یہ ہے کہ مصر میں ہوئی وہاں ہی آپ کے تمام بیٹے اور بیٹیاں موجود تھے کہ یوسف علیہ السلام نے ان سب حضرات کو مصر بلا لیا تھا۔ پھر بعد وفات حسب وصیت آپ کا تابوت شریف شام میں بھیجا گیا۔ اور اسحاق علیہ السلام کے پہلو میں دفن کیا گیا اگرچہ آپ نے یہ وصیت اپنے بیٹے بیٹیوں سب ہی کو کی تھی مگر چونکہ لڑکے تبلیغ کرتے ہیں۔ نیز ان کی زندگی بیرونی ہوتی ہے جسے سب دیکھتے

ہیں۔ اور لڑکی کی زندگی خانگی ہوتی ہے جسے سب نہیں دیکھتے نیز مقابلہ مردوں کے عورتوں کا ایمان خطرے میں کم ہوتا ہے اس لئے یا تو اپنے بیٹوں کو زیادہ تاکید فرمائی یا قرآن کریم نے صرف بیٹوں کا ذکر فرمایا۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** یہ کہ یعقوب علیہ السلام کے سارے بیٹے متقی و مومن ہیں۔ جن سے یوسف علیہ السلام کو جدا کرنے کا قصور ہوا تھا ان کی معافی ہو چکی قرآن کریم نے ان کی اطاعت شعاری اور ایمان کی گواہی دی بلکہ بعض علماء نے ان سب کو نبی مانا ہے اور انہیں ولی اور صحابی نبی تو سب مانتے ہیں اس کی نہایت نفیس اور لذیذ تحقیق کتاب قہر کبریا بر منکرین عصمت انبیاء میں دیکھو جس میں برادران یوسف علیہ السلام اور قابیل میں عمدہ فرق کر کے دکھایا ہے کہ ان کی اس خطا میں بھی صدہا راز تھے جو انہیں اب بے دین یا گنہگار کہے وہ خود بے دین ہے **دوسرا فائدہ:** قرآن کریم چچا کو باپ فرما دیتا ہے جیسے کہ یہاں ہوا لہٰذا جن علماء نے آزر کو ابراہیم کا چچا مانا اور لابیہ میں اور حدیث اِنَّ اَبِیْ وَاَبَاکَ فِی النَّارِ میں اب کے معنی چچا کئے ان کی دلیل یہ ہی آیت ہے کہ اسمٰعیل علیہ السلام کو جو کہ یعقوب علیہ السلام کے چچا تھے اباء میں داخل کیا گیا **تیسرا فائدہ:** امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک دادا کو باپ کہنا حقیقتاً ہے نہ کہ مجازاً اس لئے ان کے نزدیک حقیقی بہن بھائیوں کو باپ کی طرح دادا بھی میراث سے محروم کر دیتا ہے۔ بعض نے یہ مسئلہ اس آیت سے نکالا مگر یہ دلیل ضعیف ہے۔ (تفسیر عزیزی) بلکہ اس کی اصل حضرت ابوبکر صدیق و حضرت عائشہ اور حضرت عباس ؓ کا قول ہے۔ **چوتھا فائدہ:** رب کی حقیقی پہچان پیغمبروں کی ذریعہ ہوتی ہے کیونکہ فرزندان یعقوب علیہ السلام نے یہ نہ کہا کہ ہم عقل سے پہچانے ہوئے رب کی عبادت کریں گے بلکہ یہ کہا کہ تمہارے باپ داداؤں کے رب کی عبادت کریں گے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: ایک لفظ سے حقیقی اور مجازی معنی مراد لینا منع ہے۔ پھر یہاں لفظ آباء سے چچا اور والد دونوں کیوں مراد ہو گئے **جواب:** یا تو یہاں عموم مجاز کے طریقے پر آباء سے بزرگ مراد ہیں۔ جن میں باپ اور چچا دونوں داخل ہیں اور یہاں تغلیب ہے جیسے کہ تغلیباً ماں باپ کو ابوین اور چاند سورج کو قمرین اور حضرت ابوبکر اور عمر فاروق کو عمرین کہتے ہیں۔

دوسرا اعتراض: آبَآئِکَ کے بعد تین پیغمبروں کے نام کیوں لئے گئے وہ تو اس میں آ گئے تھے **جواب** تاکہ اس میں سارے باپ دادے شامل نہ ہو جائیں صرف انبیاء کرام ہی داخل رہیں کیونکہ ان کے آباء میں تو آزر بھی تھا **تیسرا اعتراض:** یہاں جواب میں اتنی دراز عبارت کیوں بولی صرف یہ کہہ دیتے کہ ہم اللہ کی یا اپنے خالق و مالک کی عبادت کریں گے **جواب:** اس لئے کہ مصر کے لوگ ستاروں اور بتوں کو خالق، مالک اور الٰہ جانتے تھے یہ الفاظ بولنے پر پتہ نہ چلتا کہ کون مراد ہے **چوتھا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ معرفت الٰہی میں تقلید جائز ہے کیونکہ ان صاحبوں نے اللہ کو نبیوں کے کہنے سے جانا حالانکہ عقائد کا مسئلہ ہے کہ معرفت الٰہی دلائل سے چاہئے نہ کہ کسی کے بتانے سے اسی لئے جو نور نبوت سے دور ہوا سے بھی یہ لازم ہے **جواب:** اس کے دو جواب ہیں ایک یہ کہ انبیاء کرام کی ذات و معجزات رب کی

دلیل ہیں بلکہ سارے عالم کی ہستی اسے بتا رہی ہے۔اسی لئے قرآن کریم نے حضور علیہ السلام کو رب کی دلیل بتایا قَدْ جَآءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ (النساء: ۱۷۴) انہوں نے ان پیغمبروں کے کمالات سے رب کو پہچانا نہ کہ محض ان کے فرمانے سے دوسرے یہ کہ عقل سے صرف اتنا معلوم ہوسکتا ہے کہ عالم کا کوئی خالق ہے اور وہ اکیلا ہے باقی اس کی ذات وصفات کی پوری تحقیق انبیاء کے بتانے سے ہی ہوگی اور یہاں یہ ہی ہے (از عزیزی وتفسیر کبیر) **پانچواں اعتراض:** بنی اسرائیل کو حضرت یعقوب علیہ السلام کی وصیت یاد دلانا بیکار ہے۔ کیونکہ موجودہ یہودی بت پرست نہ تھے خدا کو ایک مانتے تھے۔ اس کا انہوں نے یعقوب علیہ السلام سے اقرار کیا تھا۔ **جواب:** یہود تو عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہنے لگے تھے اور عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کو لہٰذا وہ اپنے اقرار سے پھر گئے۔ کیونکہ یعقوب علیہ السلام نے حضرت عزیر وعیسیٰ علیہما السلام کو نہ خدا مانا تھا نہ خدا کا بیٹا پھر ان یہود نے حضرت یعقوب کے رب کو خدا کہاں مانا۔ نیز نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ کا وعدہ وفا نہ کیا۔ نیز یعقوب علیہ السلام تو اس خدا کو ماننے والے تھے جو بیوی بچوں سے پاک ہے ان بدنصیبوں نے وہ خدا مانا، جو بیوی بچوں والا تھا۔ غرض کہ یہ لوگ اقرار کے دونوں جزوں سے ہٹ گئے۔

تفسیر صوفیانہ

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِیْ میں فقط شرعی عبادت ہی مراد نہیں بلکہ ہر قسم کی اطاعت مراد ہے جو جھوٹے معبودوں کو پوجے وہ شرعاً مومن نہیں اور جو نفسانی خواہشات میں پھنس کر رب کو بھولے وہ صوفیاء کے نزدیک مومن موقن نہیں نفس بھی ایک بت ہے جس کے اہل دنیا پجاری اور جس کام میں رب کی رضا ملحوظ نہ ہو وہ بت پرستی ہے جو اللہ سے دور کرے وہ طاغوت ہے کوئی درم کا بندہ ہے۔ کوئی دینار کا جیسا کہ حدیث میں ہے یعقوب علیہ السلام نے دنیا اور یہاں کی دل فریب چیزوں کو دیکھ کر اپنے بچوں پر غفلت کا اندیشہ کیا۔ تب ان سے اقرار کرالیا کہ تم ہوا کی پرستش نہ کرنا اور ان پر بت پرستی کا اندیشہ تھا۔ (روح البیان)

مولانا فرماتے ہیں۔

اہل دنیا کافران مطلق اند — روز وشب در زق زق ودر بک بک اند

چیست دنیا از خدا غافل بودن — نے قماش و نقرہ فرزند وزن

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ

یہ گروہ ہے کہ بے شک گزر گیا واسطے اس کے ہے جو وہ کمائے اور واسطے تمہارے

یہ ایک امت ہے کہ گزر چکی ان کے لئے ہے جو انہوں نے کمایا اور تمہارے

وَلَا تُسْــَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۴﴾

وہ جو کماؤ تم اور نہ سوال کیے جاؤ گے تم اس سے کہ تھے وہ کرتے

لئے ہے جو تم کماؤ اور ان کے کاموں کی تم سے پرسش نہ ہوگی

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **پہلا تعلق** پچھلی آیت سے معلوم ہوا تھا کہ یعقوب علیہ السلام نے اپنی اولاد کو ایمان اور اعمال کی وصیت کی جس سے سمجھا گیا کہ کوئی اپنے باپ دادوں کی بزرگی پر نہ بھولے بلکہ خود بھی پرہیز گار بنے اب اس وصیت کو موجودہ بنی اسرائیل پر چسپاں کیا جارہا ہے کہ جب ان کی خاص اولاد کو پرہیزگاری کی ضرورت تھی تو تم تو کہیں دور ہو تو تم پر یہ وصیت جاری کیوں نہ ہو **دوسرا تعلق** پچھلی آیت سے معلوم ہوا تھا کہ فرزندان یعقوب علیہ السلام نے وعدہ کیا کہ ہم ہر پیغمبر کی اطاعت کریں گے۔ شریعت یعقوبی پر رہنے کی ضد نہ کریں گے۔ جیسا کہ ہم، مسلمون کی تفسیر میں بتا چکے۔ اب فرمایا جارہا ہے کہ جب انہوں نے ہی اقرار کرلیا تھا تو تم پر بھی لازم ہے کہ موجودہ پیغمبر کی اطاعت کرو اسی شریعت کی غلط پابندی کی ضد نہ کرو **تیسرا تعلق**: بنی اسرائیل جب دلائل سے ہار جاتے تھے تو آخرکار یہ کہہ دیتے تھے کہ یعقوب علیہ السلام ہمارے دادا ہیں۔ اگر ہمارے یہ اعمال غلط بھی ہوئے تو ہم ان کے اعمال پیش کر کے آخرت میں نجات پالیں گے اس آیت میں ان کے اس وہم کی تردید کردی گئی۔ (تفسیر روح البیان)

تفسیر

تِلْكَ اُمَّةٌ، تِلْكَ سے ان انبیاء کرام اور ان کی اولاد کی طرف اشارہ ہے جن کا پچھلی آیت میں ذکر تھا۔ تلک اشارہ بعید فرما کر بتایا گیا کہ وہ بزرگوں کی جماعت تم سے بہت دور ہے وہ عظمت کی بنا پر اعلیٰ علیین میں ہے اور تم بدکرداریوں کی وجہ سے اسفل السافلین میں پھر تم کس منہ سے ان کی اولاد ہونے کا دعویٰ کرتے ہو اگر ان کی بارگاہ تک پہنچنا چاہتے ہو تو ان کے سے کام کرو۔ امت یا تو امّ سے بنا ہے بمعنی اصل یا امٌّ سے بمعنی قصد چونکہ جماعت بھی ایک اصل کی طرف رجوع کرتی ہے اور اس کا ایک مشترک مقصد ہوتا ہے۔ اس لئے اسے امت کہا جاتا ہے (روح) خیال رہے کہ یہاں امت سے صرف لغوی جماعت مراد ہے نہ کہ کسی پیغمبر کی امت کیونکہ ان مذکورہ حضرات میں ابراہیم و یعقوب علیہما السلام امت والے نبی ہیں۔ کسی اور نبی کی امت نہیں چونکہ یہ سارے حضرات توحید اور اطاعت الٰہی اور نسب میں شریک تھے اس لئے ان سب کو ایک امت کہا گیا **قَدْ خَلَتْ** یہ خلوٌ سے بنا جس کے معنی ہیں خالی یا اکیلا ہونا اسی لئے تنہائی کو خلوت و تنہائی کی جگہ کو بیت الخلاء اور فضائے آسمانی کو خلا کہا جاتا ہے اور جب یہ زمانہ کے لحاظ سے بولا جاتے تو اس کے معنی ہوتے ہیں گزر جانا یہاں یہ ہی مراد ہے گویا دنیا سے ان کا تعلق جاتا رہا۔ اور وہ خدا سے جا ملے یعنی تمہارے بزرگوں کی یہ جماعت تو گزر چکی۔ گزشتہ انبیاء کرام میں بعض وہ حضرات بھی ہیں جن کی وفات ابھی تک نہیں ہوئی وہ زندہ ہیں جیسے زمین پر الیاس و خضر علیہما السلام اور آسمان پر حضرت عیسیٰ و ادریس علیہما السلام اس لئے رب نے خلت فرمایا یعنی ان کا زمانہ گزر گیا مَاتَتْ نہ فرمایا یعنی وہ فوت ہوچکے لہٰذا اس آیت پر مرزائی دلیل نہیں پکڑ سکتے **لَهَا مَا كَسَبَتْ** لہا کے مقدم کرنے سے حصر کا فائدہ ہوا اور لام نفع کے لئے آتا ہے لہٰذا اس سے نیک اعمال مراد ہیں۔ یعنی اس گزشتہ جماعت کے نیک اعمال خود اس کو ملیں گے تم اس سے فائدہ حاصل نہیں کرسکتے۔ **وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ** یہاں بھی وہ ہی نفع کا لام ہے اور ما سے نیکیاں مراد اور لَكُمْ کی تقلید سے حصر کا فائدہ ہے یعنی

تمہاری نیکیاں صرف تمہاری ذات کے لئے ہوں گی اس سے وہ فائدہ حاصل نہ کریں گے خلاصہ یہ کہ باپ دادوں کے اعمال اولاد کے کام نہیں آتے اور اولاد کی نیکیاں باپ دادوں کو مل جاتیں اور تم اس خیال میں نہ رہو کہ ہم ان کے اعمال پیش کر کے نجات حاصل کر لیں گے کیونکہ وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ تم سے ان کے اعمال کا سوال ہی نہ ہوگا تم پیش تو جب کرو جب تم سے ان کی پرسش ہو بغیر پرسش پیشی کیسی۔

خلاصہ تفسیر

اے نافرمان اسرائیلیو! تم اس بات پر ناحق مغرور نہ ہو کہ ہم ان بزرگوں کی اولاد ہیں۔ اگر ہمارے اعمال سے باز پرس ہوئی تو ان کے اعمال پیش کر دیں گے تم کو ان سے کیا تعلق۔ وہ پاکباز لوگ تھے جو گزر گئے ان کے اعمال سے ان ہی کو فائدہ ہوگا تم کو اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہوگی تم کو چاہئے کہ ان کی وصیت سنو اور نیک اعمال میں جلدی کرو۔ جب وہ اپنی خاص اولاد کو آخری دم تک ایمان و اعمال کی وصیت کرتے رہے تو تم ان سے کیونکر بے نیاز ہو گئے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ:** آخر میں اپنا کسب کام آئے گا نہ کہ نسب اسی لئے روایت میں آتا ہے کہ جس کو عمل نے پیچھے کر دیا اسے نسب آگے نہ بڑھا سکے گا۔ دوسری روایت میں ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اے بنی ہاشم ایسا نہ ہو کہ لوگ تو نیکیاں لائیں اور تم صرف نسب (روح) **دوسرا فائدہ:** باپ دادوں کے اعمال اولاد کے کام نہیں آتے۔ ایسے ہی اولاد کے اعمال باپ دادوں کے لئے بے کار **تیسرا فائدہ:** باپ دادوں کے کفر سے اولاد کو عذاب نہ ہوگا جب تک کہ وہ اس سے راضی نہ ہوں۔ یہ یہود کا عقیدہ تھا کہ ہمیں اتنے روز جہنم میں رہنا ہوگا۔ جتنے روز ہمارے بزرگوں نے بچھڑا پوجا (کبیر) **چوتھا فائدہ:** بندہ اپنے اعمال کا خالق نہیں کاسب ضرور ہے۔ اسی پر اس کو ثواب و عذاب ہے کسب کے معنی ہیں وجود کے اسباب کو ارادۃً جمع کر دینا اور خالق کے معنی ہیں غیر موجود کو وجود بخش دینا مثلاً چھری کا کسی کے گلے پر چلا دینا کسب ہے اور جان نکالنا خلق موت۔ پہلا کام بندے کا تھا اور یہ رب کا۔ بندے کے غیر اختیاری کام کسب نہیں کہلاتے اور نہ ان پر ثواب و عذاب (از تفسیر کبیر) اسی لئے اس آیت میں کسبت فرمایا گیا نہ کہ صدرت، کام کرنا اور ہے اور صادر ہونا کچھ اور

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی کی نیکیاں دوسرے کو کار آمد نہیں حالانکہ احادیث سے ثابت ہے کہ اولاد کی نیکیوں سے ماں باپ کی رہائی ہوتی ہے۔ حافظ کی تین پشت اور عالم کی سات پشت کی بخشش ہوگی عام مسلمان ایصال ثواب بھی کرتے ہیں کہ نیک کام کر کے اس کا ثواب مردوں کو بخش دیتے ہیں۔ یہ ساری باتیں اس آیت کے خلاف ہیں نیز روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے اپنے غریب امتیوں کی طرف سے قربانی فرما دی دیکھو یہاں بزرگوں کے عمل غلاموں کے کام آرہے ہیں **جواب:** اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ یہ آیت کفار کے حق میں ہے کیونکہ یہاں

اسرائیلیوں سے خطاب ہے جو اپنی اولاد پیغمبر ہونے کی وجہ سے ایمان کی پرواہ نہ کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ اس سے بدنی اعمال مراد ہیں۔ اسی لئے یہاں کسب فرمایا گیا نہ کہ ثواب یعنی کوئی شخص دوسرے کی طرف سے بدنی اعمال نہیں کرسکتا کہ باپ کی طرف سے بیٹا نمازیں پڑھ کردے یا روزے رکھ دے زکوۃ مالی عبادت ہے اور حج مشترکہ عبادت لہٰذا وہ ایک دوسرے کی طرف سے ادا ہوسکتے ہیں ثواب بخشنے میں میت کو محض ثواب ملتا ہے اس کے ذمہ سے فرائض ادا نہیں ہوجاتے تیسرے یہ کہ اس کی مراد یہ ہے کہ عمل کرنے والا اپنے اعمال سے کبھی محروم نہ ہوگا یعنی اس کا ثواب بخشنے کے بعد بھی ثواب پائے گا ایصال ثواب کی متعدد آیتیں ہیں اور بہت احادیث رب فرماتا ہے اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ (طور:۲۱) اور فرماتا ہے فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ (النساء:۶۹) حضور علیہ السلام اپنی امت کی طرف سے قربانی فرما کر ایصال ثواب کرتے تھے حضرت سعد نے اپنی ماں کی طرف کنواں کھدوا کر فرمایا هٰذِهٖ لِاُمِّ سَعْدٍ حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا کہ کوئی شخص عشاء میں دو رکعت پڑھ کر کہہ دے هٰذَا لِاَبِیْ هُرَيْرَةَ لہٰذا یہ آیت ان آیات کے خلاف نہیں **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوا کہ کوئی کسی کی بد عملی سے نہ پکڑا جائے گا۔ حالانکہ روایت میں آتا ہے کہ ہر شخص سے سوال اپنے متعلق بھی ہوگا اور اپنی بیوی اور اولاد کے متعلق بھی کہ وہ گمراہ یا بے دین کیوں ہوئے تو اس آیت اور حدیث میں مطابقت کیونکر ہو؟ **جواب:** بیشک اولاد کی بد عملی کا حساب ماں باپ سے ہوگا مگر کب جب انہوں نے ان کی تعلیم میں کوئی کوتاہی کی ہو اور یہ حقیقت میں اس کی کوتاہی کی پکڑ ہے جو کہ خود اس کا فعل ہے۔ قرآن کریم فرماتا ہے قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا (تحریم:۶) **تیسرا اعتراض:** قَدْ خَلَتْ سے معلوم ہوتا ہے کہ وفات یافتہ حضرات کو دنیا سے تعلق نہیں رہتا۔ پھر تم ان سے استمداد وغیرہ کیوں کرتے ہو **جواب:** یہاں تعلق ظاہری ٹوٹ جانا مراد ہے۔ یعنی اب وہ تم سے بات چیت نہیں کرتے رہا تعلق باطنی وہ کبھی ختم نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے ہم اپنے بزرگوں کی میراث پاتے ہیں۔ ان کی اولاد کہلاتے ہیں۔

تفسیر صوفیانہ

نفس اور ظاہری اعضاء کو چاہئے کہ خود عمل کریں روح کی طہارت اور صفائی پر پھولے نہ رہیں۔ نیز میثاق کے دن جو ایمان لا چکے ہیں اس پر مغرور نہ ہوں۔ سزا اور جزا کے لئے یہاں کے اپنے عمل معتبر ہیں اسی طرح ہر عضو اپنے کام میں مشغول رہے۔ دوسرے اعضاء کے عمل سے دھوکہ کھا کر خود معطل نہ ہوجائے قلب کا عمل ہے ایمان، پاؤں کا عمل ہے نیک مجلسوں کی طرف چلنا۔ آنکھ کا عمل آیات الٰہی کو دیکھنا اور خوف وشوق میں رونا زبان کا عمل حق بولنا ہاتھ کا عمل قرآن کریم چھونا اور نماز میں رب کے سامنے بندھا رہنا وغیرہ۔ چاہئے کہ ہر عضو سے اس کا عمل کرائے جاؤ فقط ایمان لا کر نماز سے غافل نہ ہو اور فقط نماز پڑھ کر ایمان سے بے پرواہ مت ہو جاؤ اور یہ نہ سمجھو کہ اچھے اصل کی شاخیں بھی اچھی ہوتی ہیں۔ بسا اوقات اچھے سے برے اور بروں سے اچھے ظاہر ہوجاتے ہیں انگور سے شراب اور گنے سے شکر شہد کی مکھی کی قے سے شہد ختنی ہرن کے خون سے مشک بنتا ہے اسی طرح آدم علیہ السلام کی پشت سے قابیل اور ابو جہل کی پشت سے عکرمہ پیدا ہوئے۔ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ

وَ یُخْرِجُ الْمَیِّتَ مِنَ الْحَیِّ (روم:۱۹) رب کی بے نیازی سے ڈرتے رہو۔

وَ قَالُوْا كُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوْا ؕ قُلْ بَلْ مِلَّةَ
اور کہا انہوں نے ہو جاؤ تم یہودی یا عیسائی ہدایت پا جاؤ گے فرمادو بلکہ پیروی کریں گے
اور کتابی بولے یہودی یا نصرانی ہو جاؤ راہ پاؤ گے تم فرمادو بلکہ ہم تو
اِبْرٰهٖمَ حَنِیْفًا ؕ وَ مَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۳۵﴾
ہم دین کی ابراہیم کے مائل اور نہ تھے وہ مشرکین سے
ابراہیم کا دین لیتے ہیں جو ہر باطل سے جدا تھے مشرکوں سے نہ تھے۔

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیت سے چند طرح تعلق ہے **پہلا تعلق** پچھلی آیت میں بتایا گیا کہ کسی کو دوسرے کے اعمال کافی نہیں اس سے وہم ہو سکتا تھا کہ ہر شخص کو اپنا مذہب بھی علیحدہ اختیار کرنا چاہئے کہ ہر ایک کے اعمال بھی علیحدہ ہوں اور مذہب بھی علیحدہ اس وہم کو رفع فرمانے کے لئے اب بتایا گیا کہ دین میں ابراہیم علیہ السلام کی اطاعت اور اعمال میں ان کی موافقت چاہئے۔ اعمال نہ کرنا اور چیز ہے اور موافقت کرنا اور چیز **دوسرا تعلق:** اب تک اہل کتاب کی غلطی پر نہایت قوی دلائل کئے گئے اب خود ان ہی کے قول سے انہیں الزام دیا جا رہا ہے کہ یہ لوگ ابراہیم علیہ السلام کے قائل ہیں مگر یہودیت یا نصرانیت میں ہدایت کو محدود مانتے ہیں اگر ہدایت خاص ان دو دینوں میں ہوتی تو خود ابراہیم علیہ السلام ہدایت پر نہ ہوتے کیونکہ یہ دونوں دین ان کے وقت میں تھے ہی نہیں **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں اہل کتاب کے شبہات کے تحقیقی جوابات دیئے گئے تھے اور دلائل سے اسلام کی حقانیت ثابت کی گئی تھی اب انہیں الزامی جواب دیا جا رہا ہے کہ اگر تم دین کے قبول کرنے میں اپنے بڑوں کی پیروی کرتے ہو اور دلائل سے کام نہیں لیتے تو تمہیں چاہئے کہ ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کرتے کیونکہ وہ سب کے مانے ہوئے بزرگ ہیں۔ ان کے دین کی حقانیت میں کسی کو اختلاف نہیں اور یہودیت اور نصرانیت میں تم آپس میں بھی متفق نہیں لہٰذا اس کا ماننا بہتر۔ (کبیر)

شان نزول

حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ ایک بار یہود کے سرداروں نے مسلمانوں سے کہا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام سب سے افضل ہیں اور ان کی کتابوں توریت تمام کتاب سے اعلیٰ اور یہودی دین تمام دینوں سے بڑھ کر اور قرآن شریف وانجیل کا انکار کرتے ہوئے انہیں یہودی بننے کی رغبت دی اسی طرح نجران کے عیسائیوں نے اپنے دین اپنی کتاب کی افضلیت جانتے ہوئے مسلمانوں کو عیسائیت کی دعوت دی ان دونوں کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔ (خزائن العرفان)

تفسیر

وَقَالُوْا ۔اس کا فاعل یہودی اور عیسائی دونوں ہی ہیں کیونکہ ایک جماعت دو دین کی دعوت نہیں دے سکتی اور ہو سکتا ہے کہ بعض خبثاء نے یوں کہا ہو کہ اسلام چھوڑ دو خواہ یہودی بن جاؤ یا عیسائی ان دینوں میں تو ہدایت ہے اسلام میں بالکل ہدایت نہیں کیونکہ اہل کتاب اسلام کے مقابل ایک ہو جاتے تھے۔ یہود تو مکہ معظمہ جا کر اسلام کے خلاف مشرکین کو لڑانے کے لئے کعبہ کے بتوں کو سجدہ کر آتے تھے اور کہا تھا مسلمانوں کے مقابل تم حق پر ہو ممکن ہے کہ یہ قول بعض منافقوں کا ہو جو مسلمانوں میں رہ کر اسلام کے خلاف سازشیں کرتے تھے ان صورتوں میں آیت کریمہ اپنے ظاہر معنی پر ہے کُوْنُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی پہلا قول یہود کا ہے اور دوسرا قول عیسائیوں کا یعنی یہود نے تو کہا کہ تم یہودی بن جاؤ کیونکہ موسیٰ علیہ السلام پہلے صاحب کتاب نبی ہیں اور ان کی بڑی شان ہے ان سے رب نے کلام فرمایا اور عیسائیوں نے کہا کہ عیسائی ہو جاؤ کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے آخری پیغمبر ہیں اور بغیر والد کے پیدا ہوئے اور چونکہ انہوں نے مردوں کو زندہ کیا۔ اس لئے وہ مردہ دلوں کو بھی زندگی بخش سکتے ہیں۔ اگر تم یہ دین اختیار کر لو گے تو تَهْتَدُوْا ہدایت پا جاؤ گے۔ کیونکہ ہدایت ہمارے ہی دین میں ہے قُلْ یا تو یہ ہر مسلمان سے خطاب ہے۔ اور یا خاص نبی ﷺ سے اور یہ ہی ظاہر ہے کیونکہ مسلمانوں سے خطاب آئندہ آیتوں میں ہو رہا ہے یعنی اے نبی علیہ السلام آپ ان اہل کتاب سے فرما دو یا مسلمانوں کو یہ جواب سکھا دو کہ بَلْ مِلَّةَ اِبْرٰهٖمَ حَنِيْفًا ایک لفظ تو بَلْ سے پہلے پوشیدہ ہے اور ایک عبارت ملت سے پہلے یعنی ہم تمہاری بات نہ مانیں گے بلکہ ملت ابراہیمی پر رہیں گے۔ اور اس کی اتباع کریں گے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ اے اہل کتاب ہم تو اس دین پر نہ آئیں گے بلکہ تم کو چاہئے کہ ملت ابراہیمی کو قبول کر لو۔ (تفسیر کبیر) اور اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں آ جاؤ کیونکہ یہ دین ملت ابراہیمی کے موافق ہے۔ حنیفا یہ لفظ حنف سے بنا حنف اور جنف دونوں کے معنی ہیں پھرنا اور مائل ہونا مگر حنف میں گمراہی سے ہدایت کی طرف پھرنا ہے اور جنف میں ہدایت سے گمراہی کی طرف لوٹنا۔ حنیف کے معنی ہیں افراط و تفریط سے علیحدہ اور تمام باطل دینوں سے دور اور حق پر قائم اور یہ یا تو ملتہ کا حال ہے بتاویل حال اور یا ابراہیم کا یعنی ہم اس دین ابراہیمی کی یا ان ابراہیم علیہ السلام کی پیروی کرتے ہیں جو خدا کی اور تمام باطل چیزوں سے علیحدہ ہیں تم لوگ رب کو چھوڑ کر غیروں کی طرف جھک گئے کہ عیسائیوں نے مسیح علیہ السلام کو اور یہودیوں نے عزیر علیہ السلام کو خدا کا بیٹا یا خدا مان لیا جس سے وہ مشرک ہو گئے اور ابراہیم علیہ السلام کا یہ حال ہے کہ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ کہ وہ خود تو مشرک کیا ہوتے مشرکین میں سے تھے بھی نہیں کہ ہر قسم کے شرک اور مشرک سے سخت بیزار تھے۔

خلاصہ تفسیر

یہود و نصاریٰ نے اپنے دینوں میں کانٹ چھانٹ کر کے ایک نیا دین بنا رکھا تھا جس پر ان کو بڑا ناز تھا اسی کو ذریعہ نجات سمجھ کر یہود تو کہتے تھے کہ ہمارا دین پرانا ہے اس کے بغیر ہدایت ناممکن تم سب یہودی بن جاؤ اور عیسائی کہتے تھے کہ ہمارا دین بنی اسرائیل میں آخری ہے اور اس کا تاریخ نجات اسی میں ہے کہ عیسائی بن جاؤ اس سب کے جواب میں فرمایا جا رہا ہے کہ تم کہہ دو

کہ تمہارے مذہبوں میں شرک کی آمیزش ہے اور ابراہیم علیہ السلام کا دین اس سے بالکل پاک صاف کہ نہ تو وہ مشرک تھے اور نہ اب تک ان کے دین میں شرک ملا اور ان بزرگ کا طریقہ طریقہ اسلام تھا ہم اس ملت کے پیرو ہیں اور اس لحاظ سے یہ ہی دین اسلام پرانا دین ہے تمہاری یہ کیفیت ہے کہ عبادت میں حرام حلال کے احکام میں عالم کی خلقت میں اپنے بزرگوں کو خدا کا شریک جانتے کہ خدا کے حرام کئے ہوئے کو ان کی طرف نسبت کر کے حلال جانتے اور رب کے ساتھ اپنے پیغمبروں کی عبادت کرتے ہو۔ اور تمہارا یہ بھی عقیدہ ہے کہ ہمارے پیغمبر اپنے رب کی مرضی کے خلاف ہم کو فتح ونصرت دیتے ہیں ہمیں روزی پہنچاتے ہیں ہمیں اولاد دیتے ہیں اور ہمیں آخرت میں بجز خدا کے عذاب سے بچالیں گے۔ لہٰذا تم درحقیقت مشرک ہو۔ (تفسیر عزیزی)

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ:** ہر شخص اپنے دین کو اچھا کہتا ہے مگر اچھائی کی بہت سی پہچانیں ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ بزرگوں کے مطابق ہو۔ اس آیت میں اہل کتاب کی اس طرح تردید کی گئی کہ تمہارا دین ملت ابراہیمی کے خلاف ہے آج جس مذہب کی طرف ہمیں دیوبندی یا قادیانی بلاتے ہیں وہ اسی قاعدے سے جھوٹے ہیں کہ ان کے عقائد بزرگان دین کے خلاف ہیں **دوسرا فائدہ:** اختلاف مٹانے کے لئے مسلمہ بزرگوں کی طرف رجوع کرنا چاہئے دیکھو یہاں تین مذہبوں یعنی یہودیت، نصرانیت اور اسلام کے اختلاف پر ابراہیم علیہ السلام کی طرف رجوع کیا گیا اسی لئے فقہاء کے اختلاف کے وقت صحابہ کرام کی طرف اور احادیث کے ظاہری تعارض کے وقت قرآن پاک کی طرف رجوع کیا جاتا ہے **تیسرا فائدہ:** دین کی عظمت دکھانے کے لئے بانیان دین کی تعریف کرنا ضروری ہے دیکھو یہاں ملت ابراہیمی کی عزت کا اظہار ابراہیم علیہ السلام کے مناقب بتا کر کیا گیا یہ ہی محفل میلاد شریف وغیرہ کا مقصود ہے اور یہی اہل سنت کا دین وایمان ہے کہ اسلام کی عظمت دکھانے کے لئے مصطفیٰ ﷺ کے گیت گاتے ہیں دیوبندی وغیرہ حضور علیہ السلام کی توہین کر کے در پردہ اسلام کی بیخ کنی کرتے ہیں طبیب کی عزت سے اس کے نسخہ کی قدر ہوتی ہے اور بولنے والے کے دبدبہ سے کلام کا وقار۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ اسلام ملت ابراہیمی کے بالکل مطابق ہے نہ کہ یہودیت اور عیسائیت اگر اسلام سارے عقائد واعمال میں اس کے موافق ہے تو نبی آخر الزمان کی تشریف آوری بیکار رہی اور اسلام کا آنا بے فائدہ کیوں کہ ان کا مقصد ابراہیم علیہ السلام سے پورا ہو چکا اور اگر اسلام عقائد میں اس کے موافق اور اعمال میں اس کے خلاف ہے تو یہ بات تو یہودیت اور عیسائیت میں بھی تھی بلکہ سارے آسمانی دین عقائد میں متفق ہیں رب فرماتا ہے شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى (شوریٰ: ۱۳) پھر اسلام کو اس ملت کے موافق کہنا اور دیگر دینوں کو خلاف کیونکر صحیح ہوا خیال رہے کہ الوہیت مسیح یا سیدنا عزیر کے ابن اللہ ہونے کا عقیدہ ان

لوگوں کی اپنی ایجاد ہے ہمارا سوال اصلی یہودیت اور عیسائیت سے ہے **پہلا جواب:** اسلام اور ملت ابراہیمی سارے عقائد اور اعمال کے اصول میں متفق ہیں اسی لئے اسلام ملت ابراہیمی کے موافق ہے نہ کہ شریعت ابراہیمی کے کیونکہ ملت میں صرف اصول کا لحاظ ہوتا ہے اور شریعت میں جزئیات کا بھی لہٰذا اسلام ملت ابراہیمی اور شریعت محمدی ہے۔ باقی دیگر دین صرف عقائد میں دین ابراہیمی کے موافق تھے اور قوانین اعمال میں خلاف لہٰذا وہ ادیان ملت ابراہیمی نہ کہلائے جیسے کہ صاحبین فروعات میں امام ابوحنیفہ رحمتہ اللہ علیہم اجمعین کی مخالفت کر کے بھی حنفی کہلاتے ہیں نہ کہ شافعی۔ کیونکہ یہ حضرات امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ کے اصول میں بھی مخالف ہیں لہٰذا تمام دینوں کا عقائد میں ایسا اتفاق ہے جیسے مجتہدین کا قرآن حدیث کے ماننے میں یا تمام طبیبوں کا اصل علاج میں اور پھر ان کا آپس میں اختلاف ہے جیسے کہ مجتہدین کا آپس میں اصولی اختلاف یا یونانی اور ڈاکٹری طبیبوں کی اصل علاج میں مخالفت پھر اسلام کی ملت ابراہیمی سے ایسی موافقت ہے جیسے صاحبین کی ابوحنیفہ سے اس لئے قرآن کریم نے فرمایا اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ (ال عمران: ۶۸)

دوسرا جواب: یہ ہے کہ شریعت محمدیہ اپنے میں شریعت ابراہیمی کو پورا پورا لئے ہوئے ہے۔ یعنی عقائد اصول اعمال اور سارے جزئیات میں اس سے متفق ہے۔ ہاں تکمیل کے لئے ہزارہا جزئیات اس پر زائد ہیں۔ لہٰذا ملت ابراہیمی گویا متن ہے اور شریعت مصطفوی اس کی شرح کہ شرح کرنے والا اگرچہ ہزار ہا باتیں زیادہ بتا جاتا ہے مگر پھر بھی متن کے ساتھ ہوتا ہے اسی لئے قرآن کریم فرماتا ہے مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ (حج: ۷۸) نیز فرماتا ہے ثُمَّ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا (نحل: ۱۲۳) چنانچہ کفار سے جہاد، بتوں کو توڑنا، ختنہ، عقیقہ مہمانوں کی دعوت، اچھا لباس پہننا نماز میں ہاتھ اٹھانا، نماز چاشت پڑھنا، نکاح میں گواہ، مہر کا ہونا، نماز میں سجدہ سے پہلے رکوع کرنا، مال کی زکوۃ دینا، ستر ڈھانپنا، کعبہ کو قبلہ بنانا، حج اور قربانی کرنا، مجرم کا متفقہ نہ ہونا، کاہنوں سے دور بھاگنا، کسی تاریخ یا دن کو منحوس نہ ماننا، مصیبت میں صبر کرنا کھیل کود سے بچنا، تصویر و فوٹو سے دور رہنا۔ تارک الدنیا ہونے اور جوگی بننے سے بچنا گھر بار اور بال بچے رکھنا اور روزی کمانا وغیرہ سب ملت ابراہیمی کے مسائل ہیں جو ہمارے ہاں ویسے ہی محفوظ دیگر دینوں میں یہ بات نہیں لہٰذا اسلام ملت ابراہیمی ہے نہ کہ دیگر ادیان (تفسیر عزیزی) اگر کوئی کہے کہ پھر تمہارے پیغمبر ابراہیم علیہ السلام کے امتی ہوئے نہ کہ افضل نبی اس کا جواب ہم پہلے دے چکے ہیں کہ یہ اتباع ایسے ہی ہے۔ جیسے کہ پچھلا بادشاہ اگلے سلاطین کے قانون باقی رکھتا ہے۔ گویا ملت ابراہیمی تخم ہے اور دین محمدیہ سایہ دار پھل والا درخت کہ تخم اجمال ہے درخت اس کی تفصیل **دوسرا اعتراض:** ابراہیم علیہ السلام کو حنیف کہہ کر پھر یہ کیوں کہا گیا کہ وہ مشرکین میں سے نہ تھے یہ بات تو حنیف میں آ چکی تھی۔ **جواب:** اس میں موجودہ یہودیوں اور عیسائیوں پر چوٹ ہے کہ تم تو اپنے اصلی دین پر بھی قائم نہ رہے بلکہ مشرک ہو گئے پھر کس منہ سے اپنے کو ابراہیمی کہتے ہو وہ تو شرک سے بہت دور ہے اور تم اس میں مخمور **تیسرا اعتراض:** دین ابراہیمی بھی خدائی دین ہے اور دین موسوی و عیسوی بھی پھر کیا وجہ ہے کہ اسلام نے دین موسوی و عیسوی کو تو منسوخ کیا کہ اب ان کی اتباع گمراہی ہے اور دین ابراہیمی کی اتباع کو لازم قرار دیا **جواب:** دین ابراہیمی دین فطرت ہے جسے رب نے حضور کے ذریعہ تا قیامت باقی رکھا

ہے دین موسوی وعیسوی ہنگامی حالات کے ماتحت عارضی احکام کے حامل کہ حالات بدل جانے پر وہ سب ختم ہو گئے جیسے ایک شخص پر بیماری طاری ہو جانے پر غذائیں و دوائیں مخصوص طور پر لازم ہو جاتی ہیں اس بیماری کے جاتے ہی سب غذائیں اصل حالت پر آ آتی ہیں بیماری کی غذائیں بند کر دی جاتی ہیں۔ چنانچہ دین موسوی کے احکام اسرائیلیوں کی سرکشی کی وجہ سے بہت سخت تھے کہ توبہ میں مجرم کو قتل کیا جاتا ناپاک کپڑے یا جسم کو کاٹا جاتا تھا۔ جانوروں کی چربی حرام تھی، رب فرماتا ہے فَبِظُلۡمٍ مِّنَ الَّذِیۡنَ هَادُوۡا حَرَّمۡنَا (النساء:١٦٠) دین عیسوی میں نہایت نرمی تھی کہ شراب بھی حلال کسی پر جہاد نہیں وغیرہ۔

تفسیر صوفیانہ

دنیا ایک خطرناک جنگل ہے اور ہم لوگ یہاں کے نووارد مسافر ہمارا ایمان اصل پونجی اس جنگل میں قزاقی ڈکیتی، راہ ماری بہت ہوتی ہے ہر ڈاکو مسافروں کو اپنے گھات کی طرف بلاتا ہے مگر قدرت نے اصل مقصود پر ایک شمع روشن کر دی ہے جو ہر شخص کو دور سے نظر آ رہی ہے اور اس راستہ میں بھی جگہ جگہ پولیس کی چوکیاں اور راہبر موجود ہیں اور کامیاب مسافروں کے نشان قدم بھی نظر آ رہے ہیں مسافر کو چاہئے کہ اس شمع مقصود کی سیدھ پر جائے اور ان رہبروں کی حفاظت میں رہے ان کے قدموں کے نشانوں کو اپنا راہنما بنائے ادھر ادھر دھیان نہ کرے ورنہ مارا جائے گا اور یہ مجوبوں کی آوازیں محبوب سے روک دیں گی۔ بارگاہ الٰہی سب کی اصل مقصود شمع نبوت اس کا نشان اور شیخ طریقت اس راستہ کے رہبر اہل اللہ کے مزارات وغیرہ اس راستہ کی حفاظت کی چوکیاں گزشتہ نیک بندوں کے حالات یہاں کے آثار قدم اگر مقصود پر پہنچنا ہو تو شیخ کامل کے پیچھے جاؤ۔ جماعت مومنین کے ساتھ رہو اور شمع نبوت پر نظر رکھو قُلۡ بَلۡ مِلَّةَ اِبۡرٰهٖمَ حَنِیۡفًا پر غور کرتے رہو ہر مذہب کی آواز پر نہ چل پڑو۔

یہ جو تجھ کو بلاتا ہے یہ ٹھگ ہے مار ہی رکھے گا
ہائے مسافر دم میں نہ آنا مت کیسی متوالی ہے

قُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡنَا وَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلٰۤی اِبۡرٰهٖمَ
کہو تم ایمان لائے ساتھ اللہ کے اور اس کے جو اتارا گیا طرف تمہارے اور اس کے جو اتارا
یوں کہو کہ ہم ایمان لائے اللہ پر اور اس پر جو ہماری طرف اترا اور جو اتارا گیا
وَ اِسۡمٰعِیۡلَ وَ اِسۡحٰقَ وَ یَعۡقُوۡبَ وَ الۡاَسۡبَاطِ وَ مَاۤ اُوۡتِیَ مُوۡسٰی
گیا طرف ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور اولاد کے اور جو دیا گیا موسیٰ
ابراہیم اور اسماعیل اور اسحٰق اور یعقوب اور ان کی اولاد پر اور جو عطا کیے گئے
وَ عِیۡسٰی وَ مَاۤ اُوۡتِیَ النَّبِیُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَیۡنَ اَحَدٍ

اور عیسیٰ کو اور جو دیئے گئے تمام نبی رب ان کے سے نہیں فرق کرتے ہم درمیان کسی
موسیٰ اور عیسیٰ اور جو عطا کیے گئے باقی انبیاء اپنے رب کے پاس سے ہم ان میں سے
مِّنۡهُمۡ ۚ وَ نَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۳۶﴾
کے ان میں سے اور ہم واسطے اسی کے اسلام والے ہیں
کسی پر ایمان میں فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے حضور گردن رکھتے ہیں

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں حضور علیہ السلام سے جواب دلوایا گیا۔ اب کسی قدر تفصیل کے ساتھ مسلمانوں سے جواب دلوایا جا رہا ہے اسی لئے وہاں قُلْ تھا اور یہاں قُوْلُوْٓا **دوسرا تعلق:** یہ آیت پچھلی آیت کی گویا تفسیر ہے کہ وہاں فرمایا گیا تھا۔ کہ ہم دین ابراہیمی کی پیروی کرتے ہیں۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ اس پیروی کے معنی یہ ہیں کہ سب پیغمبروں کو مانتے ہیں **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت پر اہل کتاب اعتراض کر سکتے تھے کہ تم نے یہودیت اور عیسائیت کو دائرہ ہدایت سے خارج کیا اور ان دونوں کو اشارۃً مشرک کہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ تم شریعت موسوی اور عیسوی کے منکر ہو۔ لہٰذا تم کافر۔ اس آیت میں جواب دیا گیا کہ ہم ان کے اصلی دین کے منکر نہیں اس کو حق مانتے ہیں تمہاری ایجادات کے منکر ہیں اور اسی کو شرک کہتے ہیں۔ **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ یہود یہودیت کی طرف دعوت دیتے ہیں اب فرمایا جا رہا ہے کہ کہہ دو ہم سارے پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یعنی تم تو اپنے پیغمبروں کو قومیت کے لحاظ سے مانتے ہو کہ وہ اسرائیلی تھے اور غیر اسرائیلی پیغمبروں کا انکار کرتے ہو۔ لہٰذا تمہارے ایمان میں نفسانیت کو دخل ہے ہم جس پیغمبر کو بھی مانتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ اللہ کے بھیجے ہوئے اور صاحب معجزات ہیں خواہ اسرائیلی ہوں یا اسمٰعیلی یا کوئی اور لہٰذا یہ ماننا اللہ کے لئے ہے۔

تفسیر

قُوْلُوْٓا یہ تمام مسلمانوں سے خطاب ہے اس کا مفعول یا تو اگلی عبارت ہے اور یا پوشیدہ عبارت یعنی کہہ دو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے الخ یا کہہ دو کہ ہم کفر نہیں کر سکتے اور تمہاری باتوں میں نہیں آ سکتے کیونکہ ہم تقیہ باز نہیں اپنے ایمان کا اعلان کرتے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ یہ خطاب صحابہ سے ہو۔ یعنی اے صحابہ تم دیوار اسلام کی پہلی اینٹ ہو تم اپنے ایمان کا ان الفاظ میں اعلان کرو تا کہ تا قیامت مسلمان تمہاری طرح ایمان لائیں۔ تم تمام مسلمانوں کے معلم ہو سب تمہارے شاگرد۔ اس لئے آگے ارشاد ہے فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا (بقرہ: ۱۳۷) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ یہود و نصاریٰ سے خطاب ہو۔ یعنی اے یہودیو، عیسائیو تم لوگوں کو یہودی، عیسائی بنانے کی کوشش نہ کرو بلکہ یوں عرض کر کے مسلمان ہو جاؤ یہ خیال نہ کرو کہ عمر بھر تو کفر کیا اب آخر میں کیا ایمان لائیں سورج پانچ منٹ میں رات بھر کی برف، شبنم کو ختم کر دیتا ہے ہم ایک آن میں عمر بھر کے کافر کو

بخش سکتے ہیں۔ دیکھو موسیٰ علیہ السلام کے جادوگروں کا حال اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ہم تو اللہ پر ایمان لائے نہ کہ اپنے نفس اور خواہشات پر لہٰذا اس کی ساری کتابوں اور سارے پیغمبروں کو مانیں گے۔ مگر ہاں ان میں بعض بعض سے افضل ہیں اور ہماری کتاب ساروں کی جامع لہٰذا پہلے وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا اس پر ایمان لائے جو ہم پر اتارا گیا اگرچہ قرآن کا نزول آہستگی سے ہوا مگر چونکہ رمضان یا شب قدر میں ایک دم بھی اترا ہے اس لئے یہاں اُنْزِلَ فرمایا گیا ہے یعنی ایک دم اتارا گیا اگرچہ قرآن حضور علیہ السلام پر آیا مگر چونکہ وہ ہمارے مولیٰ ہیں اور ہم ان کے غلام اور محض ہماری ہی ہدایت کے لئے آیا نہ کہ ان کی وہ تو پہلے ہی سے ہدایت پر تھے اس لئے فرمایا گیا اِلَيْنَا کہ ہم سب کی طرف پھر وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ اس پر بھی ایمان لائے جو کہ ابراہیم علیہ السلام پر اتارا گیا کیونکہ ان کا دین ہمارے دین کے بہت مشابہ ہے خیال رہے کہ ابراہیم علیہ السلام پر کتاب نہ اتری بلکہ دس صحیفے آئے (روح البیان) اسی لئے دوبارہ انزل فرمایا گیا کہ منزل میں فرق ہے۔ یعنی اتارنے والا۔ مگر اس نے نبی آخر الزمان پر کتاب اتاری اور ان پر صحیفے واسمٰعیل واسحٰق ویعقوب ان حضرات پر علیحدہ کتاب یا صحیفے نہ آئے بلکہ یہ ابراہیمی صحیفوں کے تابع تھے اور ان پر جو وحی آتی تھی وہ شریعت ابراہیمی کو کامل کرنے والی تھی۔ اس لئے یہاں علیحدہ اُنْزِلَ نہ فرمایا گیا اور اس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اس پر بھی ایمان لائے جو ابراہیم واسمٰعیل وغیرہم علیہم السلام پر نازل ہوئے (تفسیر عزیزی) ان کے ناموں پر ترتیب زمانی بھی ہے اور رتبی بھی۔ وَالْاَسْبَاطِ یہ سبط کی جمع ہے جس کے لغوی معنی ہیں شاخوں والا درخت اصطلاح میں خاندان اور قبیلہ کی سبط اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ بھی ایک شخص سے پھیلتا ہے پھر اس کو سبط کہنے لگے جو قبیلہ کا اصل اور قبیلہ اس کی نسل سے اسی لئے امام حسن وحسین رضی اللہ عنہما کو سبطین کہتے ہیں کہ وہ حسنی اور حسینی سیدوں کے اصل ہیں۔ (کبیر وحقانی) قرآن کریم میں اسباط یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں کو کہا جاتا ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک، ایک قبیلہ کا جد امجد بنا۔ وہ ہی یہاں بھی مراد ہے ان بارہ میں سے یوسف علیہ السلام کی نبوت قطعی اور یقینی ہے دوسروں کی نبوت میں اختلاف اور صحیح یہ ہے کہ وہ پیغمبر نہ تھے (عزیزی) اور اس کی زیادہ تحقیق ہماری کتاب قہر کبریا میں دیکھو ان شاء اللہ سورہ یوسف کی تفسیر میں بھی کی جائے گی۔ لہٰذا ان پر صحیفوں کا اترنا ایسا ہے۔ جیسا ہم مسلمانوں پر قرآن کا اترنا اگرچہ ان میں سارے اسرائیلی پیغمبر آگئے تھے مگر چونکہ کلام یہود ونصاریٰ سے ہو رہا ہے نیز موسیٰ وعیسیٰ علیہما السلام ان میں عظیم الشان پیغمبر ہیں۔ اس لئے فرمایا گیا وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى کہ ہم اس پر بھی ایمان لائے جو ان پیغمبروں کو دیا گیا۔ چونکہ انہیں توریت و انجیل کتاب کی شکل دی گئی تھی۔ اس کے علاوہ بہت سے بڑے بڑے معجزات بھی عطا ہوئے تھے۔ اس لئے یہاں بجائے اُنْزِلَ کے اُوْتِيَ فرمایا گیا وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ہمارا ایمان فقط ان مذکورہ پیغمبروں ہی میں محدود نہیں اور نہ صرف ان کی کتابوں پر بلکہ از آدم تا این دم مذکور اور شرح مذکور جس قدر بھی پیغمبر آئے انہیں کتاب صحیفے، وحی معجزات جو کچھ ملے۔ ان سب پر ایمان ہم لائے یعنی ہمارا ایمان ان پر کچھ تفصیلی بھی ہے اور آسانی بھی اے اسرائیلو تم تو ایمان لانے میں اسرائیلی اور غیر اسرائیلی پیغمبروں میں فرق کرتے ہو لیکن ہمارا یہ حال ہے کہ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ہم ایمان میں کسی میں فرق نہیں کرتے کہ تمہاری طرح بعض پر ایمان لائیں اور بعض پر نہ لائیں بلکہ سب پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور یہاں احد کے معنی ہیں

کسی، نہ کہ ایک کیونکہ لفظ بین کثرت کو چاہتا ہے یعنی ان میں سے کسی کے درمیان اور یہ کیوں نہ ہو کہ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ہم تو رب کے فرماں بردار ہیں نہ کہ اپنے نفس کے اس کا جو حکم جس وقت بھی جس پیغمبر پر جس زبان میں آوے۔ ہمارے سر آنکھوں پر۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانوں تمہیں یہود و نصاریٰ نفسانیت سے اپنے اپنے دینوں کی طرف بلاتے ہیں جن دینوں میں ان کے نفس کو دخل ہے۔ تم انہیں جواب دے دو کہ ہمارا ایمان تو اللہ پر ہے اور قرآن کریم پر جو تمام شریعتوں کا جامع اور تمام کی اصل ہے کہ جس کا ماننا سب کا ماننا ہے ہم اللہ پر اور اپنی کتاب پر بھی ایمان لائے اور جو نبیوں کے جد امجد ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزند ارشد اسمٰعیل علیہ السلام اور اسرائیلی پیغمبروں کے والد ماجد اسحاق علیہ السلام اور ان کے فرزند یعقوب علیہ السلام کے سارے فرزندوں پر اترا اور ان کتب، معجزات وغیرہ کو بھی دل سے مانتے ہیں جو موسیٰ و عیسیٰ علیہما السلام کو دی گئیں۔ اور انہیں میں کیا منحصر ہے ہم تو ان ساری کتابوں اور نعمتوں کو حق جانتے ہیں جو سارے پیغمبروں کو ان کے رب سے ملیں ہم تمہاری طرح اپنی طرف سے پیغمبروں میں فرق نہیں کرتے کہ جس کو چاہا مان لیا۔ اور جس کو چاہا نہ مانا کیونکہ ہم تو رب کے مطیع ہیں نہ کہ اپنے نفسوں کے جسے وہ بڑا بنادے ہم اسی کے ماننے کو تیار ہیں خیال رہے کہ انبیاء میں تفریق کی تین صورتیں ہیں نبیوں میں فرق کہ بعض کو مانیں، بعض کو نہیں۔ جیسے یہود کا طریقہ تھا ان کی نبوتوں میں فرق کہ بعض کو اصلی نبی مانیں بعض کو عارضی یہ دونوں تفریقیں کفر ہیں۔ ہاں ان کے مراتب میں فرق کرتے ہیں۔ یہ تفریق رکن ایمان ہے رب فرماتا ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (آل عمران: ۲۵۳) جیسے سارے قرآن پر ایمان ہے مگر بعض آیتیں بعض سے افضل ہیں۔ سارا کعبہ قبلہ ہے مگر رکن اسود رکن ایمانی افضل سارے ماہ رمضان پر ہمارا اعتقاد ہے۔ مگر شب قدر باقی اوقات سے افضل ہے پھر جیسے ہم سب انبیاء کو مانتے ہیں فرق نہیں کرتے ایسے ہی ہم اولیاء اللہ صحابہ کرام اور اہل بیت کو مانتے ہیں۔ فرق نہیں کرتے اگرچہ ان کے فرق مراتب کے قائل ہیں غرضیکہ لا نفرق میں بہت وسعت ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے رب کا ماننا آسمانی کتاب کے ماننے سے موقوف نہیں بلکہ ایمان باللہ سارے پیغمبروں اور کتابوں کے ماننے کی اصل ہے دیکھو یہاں ایمان باللہ کو ساری کتابوں کے ماننے سے پہلے بیان کیا گیا۔ (تفسیر کبیر) یعنی ہم نے پیغمبروں اور کتابوں کو خدا کے لئے مانا اور اس لئے کہ وہ خدا کے بھیجے ہوئے ہیں خدا کو اس لئے نہ مانا کہ نبی نے فرمایا اسی لئے نبوت سے بے خبر رہنے والے پر بھی خدا کا ماننا ضروری ہے۔ یہ درست ہے کہ نبی خدا کی ذات و صفات کو ظاہر کرتے ہیں تو پیغمبروں سے خدا کا پہچاننا ایسا ہے جیسا کہ دھوپ سے آفتاب کا۔ یہ بہت باریک فرق ہے خیال رہے جیسے حضور علیہ السلام سے اور ان کے بتائے ہوئے قاعدوں سے مشائخ کو پہچانا پھر بذریعہ مشائخ بارگاہ نبوت تک پہنچے جن صوفیاء نے فرمایا کہ میں خدا کو بھی اسی لئے مانتا ہوں کہ وہ رب محمد ہے ﷺ یا جنہوں نے کہا کہ اگر پروردگار بشکل مصطفیٰ تجلی

فرمائے تب میں اسے پہچانوں۔ ان سب کا یہ ہی مطلب ہے اسی طرح جو قرآن پاک میں فرمایا گیا وَ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِیْۤ اٰدَمَ (اعراف: ۱۷۲) پھر فرمایا گیا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ (اعراف: ۱۷۲) اس میں بھی یہ ہی اشارہ ہے کہ رب نے بندوں کو اپنی پہچان یوں کرائی کہ ہم رب محمد ہیں اور پھر ان سے اپنی ربوبیت کا عہد لیا تو اس عہد میں رب کی ربوبیت کے ساتھ حضور علیہ السلام کی نبوت کا بھی ذکر ہے **دوسرا فائدہ:** جیسے سو کے عدد میں ساری اکائیاں اور دہائیاں داخل ہیں ایسے ہی حضور کی پہچان میں سارے انبیاء کی پہچان اور قرآنی عرفان میں ساری کتابوں کا عرفان شامل ہے دیکھو اس آیت میں پہلے مَاۤ اُنْزِلَ اِلَیْنَا فرمایا گیا اور پھر کچھ تفصیل اسی لئے صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کی زیارت سارے پیغمبروں اور سارے اولیاء کی زیارت ہے مدینہ منورہ کی حاضری سارے آستانوں کی حاضری ہے **تیسرا فائدہ:** ضروری ہے کہ ایمان میں پیغمبروں کی تعداد کا لحاظ نہ کرے بلکہ اجمالاً سارے پیغمبروں کو مانے کیونکہ ان کی صحیح تعداد ہم کو یقین سے معلوم نہیں اسی لئے یہاں اخیر میں سارے پیغمبروں کا اجمالی ذکر بھی کیا گیا۔ **چوتھا فائدہ:** جس طرح ایمان لانے میں پیغمبروں میں فرق نہیں۔ ایسے ہی ان کی نبوتوں میں بھی فرق نہیں۔ یعنی یہ نہیں کہ بعض کی نبوت اصلی ہو اور بعض کی عارضی جیسے کہ اصلی حاکم کی غیر موجودگی میں دوسرا عارضی حاکم چندروز کے لئے کام کرتا ہے اس لحاظ سے سارے پیغمبر اصلی ہی نبی ہیں۔ ہاں یہ صحیح ہے کہ سب کی نبوت حضور علیہ السلام کے طفیل ہے مگر ہے اصلی جیسے کہ چاند تاروں کا نور آفتاب کے طفیل قصیدہ بردہ شریف میں ہے

فَاِنَّکَ شَمْسُ فَضْلٍ هُمْ کَوَاکِبُهَا   یُظْهِرْنَ اَنْوَارَ هَا لِلنَّاسِ فِی الظُّلَمِ

لہٰذا مولوی قاسم صاحب کا دیگر پیغمبروں کو عارضی نبی ماننا غلط ہے اور آیت لَا نُفَرِّقُ کے خلاف۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: اس آیت سے معلوم ہوا کہ ساری کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے۔ پھر تم انہیں منسوخ کیوں مانتے ہو **جواب:** اس کا جواب ہم نسخ کی بحث میں دے چکے۔ ایمان اسی پر ہے کہ وہ ساری کتابیں رب کی ہیں نسخ کے یہ معنی کہ وہ اپنے زمانے میں قابل عمل تھیں اب نہیں جیسے طبیب کے سارے نسخے سچے ہیں مگر پچھلے اب استعمال نہ ہوں گے **دوسرا اعتراض:** اس جگہ فرمایا گیا کہ لا نفرق دوسری آیت میں ہے تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ (ال عمران: ۲۵۳) اور مسلمان انبیاء کے درجات میں فرق بھی کرتے ہیں اور اپنے پیغمبر کو سید الانبیاء بھی کہتے ہیں ان آیتوں میں مطابقت کیونکر ہو **جواب:** اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ ایمان میں فرق نہیں کہ بعض کو مانیں اور بعض کو نہ مانیں درجات میں فرق ہے دوسرے یہ کہ نبوت میں فرق نہیں بعض کی اصلی اور بعض کی عارضی ہو دیگر درجات میں فرق ہے تیسرے یہ کہ ہم اپنی طرف سے فرق نہیں کرتے جو خود رب نے فرق بتا دیا ہے۔ اسے مانتے ہیں اسی لئے یہاں فرمایا گیا کہ لا نفرق کہ ہم بندے فرق نہیں کرتے وہاں ہے کہ فَضَّلْنَا، رب نے بزرگی دی۔ چوتھے یہ کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم ایسا فرق نہیں کرتے جس سے دیگر انبیاء کی توہین ہو جائے جیسے مولوی قاسم صاحب دیو بندی نے تحذیر الناس میں لکھا کہ دوسرے پیغمبر ہمارے

حضور علیہ السلام کے دریوزہ گر یعنی بھکاری ہیں یہ حرام ہے ہاں ادب کا لحاظ رکھتے ہوئے فرق کرتے ہیں اسی لئے ایک حدیث میں آتا ہے کہ ہم سارے انسانوں کے سردار ہیں دوسری روایت میں ہے کہ ہم کو یونس علیہ السلام پر بھی بزرگی مت دو اس کا یہی مطلب ہے کہ ایسی بزرگی نہ دو کہ جس میں ان کی توہین ہو۔

لطیفہ: ایک نعت خواں نے اعلیٰ حضرت کے سامنے یہ پڑھا۔

شان یوسف جو دبی وہ بھی یہیں آ کے دبی

آپ نے فرمایا یوں نہ کہو بلکہ کہو شان یوسف جو بڑھی وہ بھی اسی گھر سے بڑھی حضور علیہ السلام سب کو بڑھانے والے ہیں کسی کو گھٹاتے نہیں۔ انہوں نے سارے پیغمبروں کو چمکایا اور سب کی شانیں دوبالا کر دیں۔ **تیسرا اعتراض:** جو ارکان ایمان اس آیت میں مذکور ہیں وہ آج سارے کلمہ گو مرزائی وغیرہ مانتے ہیں پھر تم ان سب کو مسلمان کیوں نہیں مانتے اور پھر حضور نے یہ کیوں فرمایا کہ میری امت کے ۷۳ فرقوں میں ایک ناجی ہے۔ باقی ۷۲ ناری جواب علامات ایمان وقت اور موقع کے لحاظ سے مختلف ہوتے رہتے ہیں۔ اول اسلام میں حکم تھا کہ لا الہ الا اللہ پڑھنے والا جنتی ہے۔ پھر بعد ہجرت فرمایا گیا کہ جو لا الہ الا اللہ پڑھے ہمارے قبلہ کی طرف منہ کرے ہمارا ذبیحہ کھائے وہ جنتی ہے اس قاعدے سے یہاں اہل کتاب کے مقابلہ میں گفتگو ہے جو بعض انبیاء کے انکاری تھے لیکن جو تمام نبیوں کو مانتے ہوئے کسی اور رکن اسلامی کے انکاری ہوں ان کے متعلق اور گفتگو ہوئی۔

تفسیر صوفیانہ

ایمان گویا کہ جال ہے اور اعمال شکار اسی جال سے شکار ہو سکتا ہے۔ جس کے سارے پھندے مضبوط ہوں اگر ایک پھندا بھی کھل گیا تو جال شکار کے قابل نہ رہا اور پھر دوسرے پھندے بھی کھل جائیں گے۔ سارے انبیاء کرام کو ماننا۔ ساری کتابوں کو حق جاننا اس جال کے پھندے ہیں ایک پیغمبر کے بھی انکار سے ایمان بیکار ہے اور اس سے دوسرے پیغمبروں کا بھی انکار یہ ہی حال اولیاء اور علماء کا ہے تم خواہ کسی سلسلہ میں ہو اور کوئی مذہب رکھتے ہو۔ سارے اولیا اور سارے آئمہ مجتہدین کو حق جانو اور ان کی عظمت کرو ایک ولی کا نکالا ہوا سارے اولیاء اللہ کے ہاں سے پھٹکارا جاتا ہے۔ بھیک اپنے ہی شیخ سے لو مگر تعظیم سب کی کرو جیسے ایمان کے لئے یہ ضروری ہے کہ ایمان میں انبیاء کرام کے درمیان فرق نہ کرے سب پر ایمان لائے۔ ایسے ہی مومن ہونے کے لئے یہ عین شرط ہے کہ ایمان میں اللہ و رسول کے ملانے کا نام ایمان ہے انہیں علیحدہ سمجھنے کا نام کفر۔ قرآن کریم فرماتا ہے یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا ۙ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا (النساء: ۱۵۰) دیکھو یہاں اللہ رسول میں فرق کرنے والوں کو پکا کافر فرمایا گیا۔

فَاِنْ اٰمَنُوْا بِمِثْلِ مَاۤ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَ اِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا

پس اگر وہ ایمان لائیں وہ ساتھ مثل اس کے کہ ایمان لائے تم ساتھ اس کے تو بے شک ہدایت پا گئے اور اگر

پھر اگر وہ بھی یوں ہی ایمان لائے جیسا تم لائے جب تو وہ ہدایت پا گئے اور اگر منہ پھیریں تو وہ
هُمْ فِیْ شِقَاقٍ ۚ فَسَیَكْفِیْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (۱۳۷)
منہ پھیریں پس اس کے سوا نہیں وہ بیچ مخالفت کے ہیں پس عنقریب کفایت کرے گا تمہیں ان کے مقابلہ میں اللہ
نری ضد میں ہیں تو اے محبوب عنقریب ان کی طرف سے تمہیں کفایت کرے گا اور وہی سنتا
صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَ مَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّ نَحْنُ لَهٗ
اور وہ سننے والا جاننے والا ہے رنگ اللہ کا اور کون ہے زیادہ اچھا اللہ کے رنگ سے اور ہم
جانتا ہے ہم نے اللہ کی رینی لی اور اللہ سے بہتر کس کی رینی ہے اور ہم
عٰبِدُوْنَ (۱۳۸)
اس کے لیے عبادت کرنے والے ہیں
اس کو پوجتے ہیں

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے۔ **پہلا تعلق:** پچھلی آیت میں یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو اسباط فرما کہ ان کی بہت عزت افزائی کی گئی تھی۔ شاید موجودہ بنی اسرائیل اس پر فخر کرتے اس لئے اب بتایا جارہا ہے۔ کہ اگر تم صحیح ایمان لے آؤ تو تم اس بزرگی میں داخل ہو ورنہ نہیں **دوسرا تعلق:** پچھلی آیتوں سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں اور اہل کتاب میں یہ فرق ہے کہ مسلمان تو سارے پیغمبروں پر ایمان لاتے ہیں اور وہ بعض پر جس سے شاید مسلمان دھوکہ کھاتے کہ اہل کتاب میں اور ہم میں بہت تھوڑا فرق ہے اور وہ بھی قریباً ہدایت پر ہی ہیں ہمارے بھائی ہیں کیونکہ صرف ایک دو پیغمبروں کے ماننے ہی میں تو اختلاف ہے اس وہم کو دفع کرنے کے لئے اب فرمایا جارہا ہے کہ جب تک کہ وہ بالکل تمہاری طرح ایمان نہ لے آئیں تب تک ہدایت پر نہیں اور نہ تم سے قریب بلکہ بالکل بے دین اور تمہارے دشمن ہیں۔ **تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں مسلمانوں کو تبلیغ کا حکم تھا کہ تم اہل کتاب کے سامنے اپنا ایمان پیش کرو اب اس کا نتیجہ بیان فرمایا جارہا ہے کہ اگر وہ تمہاری بات سن کر تم جیسے بن جائیں تو فبہا ورنہ وہ گمراہ ہیں **چوتھا تعلق:** پچھلی آیت میں ارکان اسلام میں سے صرف توحید و رسالت کا ذکر تھا باقی ارکان کا ذکر نہ ہوا تھا۔ اب بقیہ تمام ارکان کا ذکر اس آیت میں ہے کہ اے صحابہ وہ لوگ صرف ان دو باتوں کو ماننے پر کفایت نہ کریں بلکہ تمہاری طرح تمام ایمانیات حشر نشر، دوزخ جنت ملائکہ سب پر ایمان لائیں اور توحید و رسالت کو بھی تمہاری طرح مانیں۔

تفسیر

فَاِنْ اٰمَنُوْا اس کا فاعل وہ ہی یہود و نصاریٰ ہیں جو ہدایت کو اپنے میں محدود سمجھے ہوئے تھے اور جن پر ایمانی باتیں پیش کی گئی

تھیں۔ یعنی اگر یہ لوگ ایمان لے آئیں بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ یا تو ما سے ایمان مراد ہے یا دین یعنی اگر یہ تمہارے ایمان کی طرح ایمان قبول کر لیں یا ان چیزوں پر ایمان لے آئیں جن پر تم لے آئے ہو اس کی زیادہ تحقیق ان شاء اللہ اعتراض و جواب میں آئے گی۔ ہوسکتا ہے کہ اٰمَنُوْا میں تمام جن وانس مراد ہوں اور اٰمَنْتُمْ میں صحابہ کرام سے تخاطب ہو۔ یعنی تا قیامت جو جن وانس اے صحابہ تمہاری طرح کا ایمان لائے وہ ہدایت پر ہوگا یعنی مجھے میرے رسولوں کو میری کتابوں کو اس طرح ماننے جیسا تم نے مانا ہے۔ تب وہ ہدایت پر ہے اور اگر سب کچھ مانے مگر تمہاری طرح نہ مانے تو گمراہ کا گمراہ ہے تم تمام جن وانس کے ایمان کی کسوٹی ہو۔ فَقَدِ اهْتَدَوْا تو یہ بھی تمہاری طرح ہدایت پا جائیں گے۔ اِهْتَدَوْا افتعال میں آکر یا تو شرکت کے معنی دے رہا ہے یا کمال کے یعنی تمہارے ساتھ ہدایت میں شریک ہو جائیں گے یا کامل ہدایت پالیں گے۔ اس میں ادھر اشارہ ہے کہ ہدایت ان میں محدود تو کیا ہوتی سرے سے ہے ہی نہیں اگر ایمان قبول کر لیں تو وہ بھی تمہارے ساتھ ہدایت میں شریک ہوں گے نیز یہ نہ ہوگا کہ تم پرانے مومن ہونے کی وجہ سے ان سے افضل رہو۔ اور یہ نو مسلم ہونے کی وجہ سے تم سے گھٹیا بلکہ کلمہ پڑھتے ہی تمہاری طرح کامل ہوں گے۔ وَاِنْ تَوَلَّوْا یہ ولیٌ سے بنا جس کے معنی ہیں قریب ہونا باب تفعل میں آکر سلب قرب یعنی دور ہونے کے معنی بنے چونکہ پیٹھ پھر کر جانے والا دور ہو جاتا ہے اس لئے تولی کے معنی منہ پھیرنا یا پیٹھ پھیرنا کئے جاتے ہیں۔ پھر نہ ماننے کو بھی تولی اس لئے کہا جاتا ہے کہ وہ ہماری رائے سے دور ہو گیا یعنی اگر تمہاری ساری باتیں مان لیں مگر ایک عقیدے سے بھی منہ موڑ لیں یا سب کچھ مان کر تمہاری مشابہت سے منہ موڑ لیں۔ تو وہ ہدایت پر نہیں اور نہ وہ تمہارے دوست۔ تَوَلَّوْا کی پانچ صورتیں ہیں۔ مسلمانوں کے عقائد سے علیحدہ ہو جائیں مسلمانوں کے اعمال سے ہٹ جائیں۔ جس کام کو مسلمان اچھا اور کار ثواب جانتے ہیں اسے یہ حرام یا شرک کہنے لگے یا صحابہ کرام کے عقائد سے علیحدگی اختیار کریں یا سنت صحابہ کو برا جانیں اور خود صحابہ کرام سے بغض رکھیں یہ سب شیطانی دھڑے میں چلے جائیں گے۔ سنن صحابہ سنن رسول بلکہ سنن الہیہ کے ساتھ ایسی ملی ہوئی ہیں۔ جیسے چوکی کے تختوں کے ساتھ کیلیں۔ دیکھو نماز جمعہ فرض، اذان ثانی، سنت رسول اللہ اور اذان اول سنت عثمانیہ یوں ہی روزہ رمضان فرض تراویح سنت، تراویح کی ہمیشہ جماعت، ختم قرآن سنت فاروقی۔ بلکہ قرآن کلام اللہ اس کا ورد سنت رسول اللہ اس کا جمع سنت صدیقی مسجد نبوی کی زمین صدیقی عمارت نبوی بلکہ فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ وہ تمہاری کھلی ہوئی مخالفت میں ہیں۔ شقاق شقٌ سے بنا جس کے لفظی معنی ہیں شگاف اور علیحدگی شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا (عبس:۲۶) ٹکڑے کو بھی شقہ اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ کٹ کر علیحدہ ہو جاتا ہے۔ مخالفت کو بھی شقاق اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس نے ضد کر کے شق مخالفت اختیار کر لی اور شق کے معنی مشقت کے بھی آتے ہیں اِلَّا بِشِقِّ الْاَنْفُسِ (نحل:۷) دشمنی کو اس لئے شقاق کہتے ہیں کہ ہر دشمن دوسرے کو مشقت میں ڈالنے کی فکر کرتا ہے (تفسیر کبیر) یعنی وہ ضد میں تمہاری جناب مخالفت میں ہیں اور تم کو مشقت میں ڈالنے کی فکر میں یہاں یہ نہ کہا گیا کہ ان میں ضد ہے بلکہ وہ ضد میں ہیں کہ ضد اور دشمنی ان پر چھا گئی اور غالب آ گئی لامحالہ تمہاری ان کی جنگ ہوگی مگر تم یقین رکھو کہ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ اے نبی علیہ السلام اللہ تمہیں ان کی شرارت سے کافی ہوگا۔ اس پر بھروسہ کرو خیال رہے کہ اس سے پہلی عبارت میں خطاب مسلمانوں سے

تھا اور اب صرف حضور علیہ السلام سے ہوا تاکہ معلوم ہو جائے کہ رب کی فتح اور نصرت اپنے حبیب کے لئے ہو گی جو ان کے دامن میں آجائے گا وہ بھی اس سے نفع پالے گا اور یہ کیونکر ممکن ہے کہ رب تمہاری امداد نہ کرے وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ وہ تو تمہاری اور ان کی باتوں کو سننے والا اور نیتوں کو جاننے والا ہے تمہاری باتوں میں حقانیت اور نیتوں میں اخلاص ہے ان کے کلام میں شرارت ہے اور دل میں فساد، اور مفسد مغلوب اور مخلص غالب ہوتا ہے۔ یہاں تک ایمان کے ارکان اور اعتقادی مسائل بیان فرما کر ترقی کرتے ہوئے فرمایا جارہا ہے کہ اے مسلمانوں تم ان سے بھی کہہ دو کہ صِبْغَةَ اللّٰهِ یہ صبغ سے بنا جس کے معنی ہیں رنگ بروزن فعلة کے آکر نوعیت اور حالت کے معنی دے رہا ہے کیونکہ جیسے نماز کے لئے شرط جواز اور ہیں جو علماء بتاتے ہیں اور شرائط قبول کچھ اور جو مشائخ بتاتے ہیں اسی طرح ایمان کے ارکان شرعی اور ہیں جو پہلے بیان ہوئے۔ توحید و رسالت پر ایمان۔ صحابہ جیسا مومن بظاہر بن جانا اور ارکان عشق کچھ اور ہیں یعنی دل میں اللہ کا رنگ چھا جانا تم پہلے ارکان بتانے کے بعد اب دوسرے ارکان بتادو کہ صِبْغَةَ اللّٰهِ صِبْغَةً یعنی ہم کو اللہ نے خاص رنگ میں رنگ دیا ہے جس سے ہمارا ظاہر و باطن ایسا رنگین ہو گیا کہ کسی پانی سے چھوٹ سکتا ہی نہیں یا تو اس رنگ سے مراد فطرت سلیمہ ہے یا دین اسلام یا تقویٰ اور پرہیز گاری یا وہ نور کے چھینٹے جو ارواح کی پیدائش کے وقت مومنوں پر پڑے تھے یا صوفیائے کرام کے کشف کے رنگ کچھ بھی مراد ہو مطلب یہ ہی ہے کہ ہم اللہ کے خاص رنگ میں رنگے ہوئے خیال رہے کہ جیسے عالم اجسام میں بعض رنگوں سے کپڑے رنگے جاتے ہیں۔ بعض سے لکڑی لوہا وغیرہ ایسے ہی عالم ارواح میں بعض رنگوں سے دماغ و خیالات رنگے ہوئے ہیں۔ بعض سے عقل بعض سے دل ایمان تقویٰ، عشق الٰہی دل کے رنگ ہیں۔ انہیں کو صبغۃ اللہ کہا جاتا ہے چونکہ دل اللہ کا گھر ہے۔ اس لئے اس دل کے رنگ کو اللہ کا رنگ کہا گیا اس کی پالش نیک اعمال ہیں اور اس رنگ کا کاٹ تکبر اور بے صبری ہے وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً یہ تو بتاؤ کہ اللہ کے رنگ سے بڑھ کر کس کا رنگ ہے کہ دنیوی رنگ پرانے ہو کر پھیکے پڑ جاتے ہیں اور دھل کر یا دوسرے رنگ کے غلبہ سے چھوٹ جاتے ہیں اس کا رنگ ایسا ہو کہ نہ پھیکا پڑے اور نہ چھوٹے دیکھ لو کہ چہرہ اور پتھروں کے رنگ کیسے پختہ ہوتے ہیں اور پھر ہم اس رنگ پر ہی نہیں پھولتے بلکہ اس کی جلا کے لئے وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ہم اس اللہ کے لئے یا اس رنگ کے لئے بغیر کسی دوسری لالچ کے رب کی عبادت کرتے رہتے ہیں تاکہ عبادت کے صیقل سے باطنی زنگ دور ہوتی رہے۔

خلاصہ تفسیر

اے مسلمانوں تم یہ نہ سمجھنا کہ اہل کتاب کچھ ہدایت پر ہیں اور تم سے قریب کیونکہ بجز بعض پیغمبروں اور بعض کتابوں کے ساری باتیں مانتے ہیں نہیں بلکہ اگر وہ بالکل تمہاری طرح اسلام کو پورے طور پر قبول کرلیں تو تمہارے ساتھ ہدایت میں شریک ہیں اور تمہارے بھائی اور اگر ایک عقیدے سے بھی الگ رہیں تو یقین کرلو کہ وہ ضدی تمہارے پورے دشمن ہیں اور تم سے ان کے مقابلے، مجادلے، مقاتلے ضرور ہوں گے مگر اے نبی ﷺ آپ مسلمانوں کی کمی اور غریبی پر نظر نہ فرمائیں اللہ تعالیٰ آپ کے لئے ان کے مقابلے میں کافی اور وافی ہے آپ اور آپ کی چھوٹی سے مخلص جماعت ان سب پر غالب آئے

گی اور یہ اللہ کی رسی سے بندھی ہوئی مٹھی بھر جماعت کفر کے سارے بکھرے ہوئے کوڑے کو جھاڑ کر پھینک دے گی رب نے یہ وعدہ پورا فرمایا کہ چند سال کے اندر یہود میں سے بنی قریظہ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل ہوئے اور بنی نضیر، جلا وطن اور اہل خیبر مسلمانوں کی رعایا بنے چونکہ عیسائیوں نے اس وقت کوئی خاص شرارت نہ کی بلکہ ان کے بادشاہ نجاشی نے اسلام قبول کیا۔ نجران کے عیسائیوں نے صلح کر لی ہرقل قیصر روم نے تکبر و عناد نہ کیا بلکہ عقیدت مندی ظاہر کی اس لیے عیسائی اس قہر میں گرفتار نہ ہوئے یا اے محبوب کے صحابہ قیامت تک کے جن وانس اگر تم جیسا ایمان اختیار کریں تب تو وہ ہدایت یافتہ ہوں گے اور اگر تمہاری رہنمائی سے منہ پھیریں تو اگرچہ تمام ایمانیات کے ماننے کا دعویٰ کریں مگر وہ دنیا میں مرتے وقت اور قیامت میں مومنوں میں نہ ہوں گے بلکہ مومنوں کے مقابل جانب کفار کی صفوں میں ہوں گے کیونکہ تم صحبت یافتہ جناب مصطفیٰ ہو۔ تمام دنیا کے ایمان کے کسوٹی ہو۔ خیال رہے کہ مومن و کافر دنیا میں اگرچہ ایک گھر میں ہی رہتے ہیں مگر الگ ہیں۔ اور دو مومن اگر مشرق و مغرب میں ہوں مگر ساتھ ہیں اس طرح اگر مومن و کافر ایک ہی قبر میں دفن ہوں گے مگر الگ ہیں دو مومن اگرچہ مشرق و مغرب میں دفن ہوں مگر ساتھ ہیں۔ قیامت کے دن پہلے سارے مومن و کافر ایک جگہ جمع ہوں گے۔ وَامْتَازُوا الْيَوْمَ اَيُّهَا الْمُجْرِمُوْنَ (یٰس: ۵۹) فرما کر چھانٹ کر دی جائے گی مومن عرش کے داہنے طرف اور کافر بائیں طرف فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ کی جلوہ گری ہر جگہ ہوگی۔ حاکم نے مستدرک میں روایت کی کہ عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ ایک روز عثمان غنی حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوئے آپ نے فرمایا کہ اے عثمان تم سورت بقر پڑھتے ہوئے شہید ہو گے اور تمہارا خون اسی آیت پر پڑے گا فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ محدثین و مورخین فرماتے ہیں کہ جب مصری لوگ قتل کے ارادہ سے حضور عثمان کے گھر میں گھسے تو وہ قرآن شریف کھولے ہوئے یہ ہی رکوع پڑھ رہے تھے ایک شقی نے آپ کے ہاتھ پر تلوار ماری جس سے خون نکل کر اسی لفظ پر پڑا آپ قرآن پاک کو صاف کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ خدا کی قسم سب سے پہلے اسی ہاتھ سے قرآن لکھا ہے۔ بہت عرصہ کے بعد لوگوں نے اس قرآن پاک کی زیارت کی اور اس پر خون کا اثر دیکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان مصریوں میں سے سب برے حال پر مرے۔ (عزیزی) بلکہ خون عثمانی ہی کا یہ اثر ہوا کہ مسلمانوں کا شیرازہ بکھر گیا۔ اور قیامت تک کے لئے ان میں کشت و خون جاری ہو گیا۔ اب ہم پھر تفسیر کی طرف آتے ہیں۔ عیسائی اپنے بچوں کی پیدائش کے ساتویں سال اور دوسروں کو عیسائی بناتے وقت زرد پانی کے حوض میں غوطہ دیتے تھے۔ جس کا بپتسمہ رکھتے اور کہتے کہ یہ اب عیسائی بنا اور عیسائیت کے رنگ میں رنگا گیا۔ اور وہ سمجھتے تھے کہ اس پانی میں عیسیٰ علیہ السلام کے غسل کا پانی ملا ہوا ہے جگہ جگہ حوضوں میں وہ پانی ملا دیا گیا تھا اس پانی کا نام ماء معمودیہ تھا۔ اور سنا گیا ہے کہ اب بھی عیسائی بناتے وقت اس پر پانی چھڑکتے ہیں یا پادری کے بدن کا دھوون ڈالتے ہیں رب تعالیٰ ان کی تردید میں فرماتا ہے کہ اس رنگ سے کیا ہوا جس سے فقط دو چار دن کے لئے جسم رنگین ہو گیا اور بعد میں کچھ نہ رہا مسلمانو تم کہہ دو ہمیں اللہ نے دین کے رنگ میں ایسا رنگا ہے کہ ہمارا ظاہر و باطن ہمیشہ کے لئے رنگ گیا کہ دل و دماغ رب کے متوالے بن گئے ہاتھ اس کے آگے بندھ گئے سر سے پاؤں تک وضع قطع، شکل و صورت لباس سب مسلمانوں کی طرح ہو گیا اخلاق و آداب، چال چلن۔ رنگ ڈھنگ ان

سب میں کسی اور ہی محبوب کا جلوہ نظر آنے لگا۔ اور پھر شریعت نے اس رنگ پر عبادت کی پالش کر دی اور ہمیں عابد بنا دیا۔ خیال رہے کہ دنیا کے سارے رنگ کچے اور نا کافی ہیں ظاہری رنگ فقط کھال پر فلسفہ کا رنگ فقط عقل پر بدعات اور ناجائز رسموں کا رنگ فقط وہم پر منسوخ دینوں کا رنگ فقط عادت پر دنیوی محبت کا رنگ فقط شہوت پر حکومت کا رنگ مال پر یا غضب پر اور پھر یہ سارے رنگ جلد مٹنے والے، اللہ کا رنگ وہ رنگ ہے۔ جو ظاہر و باطن سب پر چڑھ جائے اور کبھی نہ چھوٹے اللہ ان رنگے ہوئے محبوبوں کے طفیل ہمیں بھی رنگ دے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے۔ **پہلا فائدہ:** مومن بننے کے لئے سارے عقائد کا ماننا ضروری ہے ایک عقیدے کا منکر بھی ویسے ہی پورا کافر ہے جیسے سارے عقائد کا منکر لہٰذا جو لوگ قادیانیوں یا دیوبندیوں یا دیگر مرتدین کو اپنا بھائی سمجھیں اور انہیں اسلام سے قریب جانیں وہ سخت غلطی پر ہیں **دوسرا فائدہ:** ہر کافر مسلمانوں کا پورا دشمن ہے۔ ان سے دوستی کی امید غلطی ہے۔ قرآن مجید کی ساری خبریں سچی ہیں اس نے فرمایا فَاِنَّمَا هُمْ فِیْ شِقَاقٍ **تیسرا فائدہ:** فتح و نصرت اور غلبہ رب تعالیٰ سے ملے گا نہ کہ سب سے سب کو راضی کرنے کے لئے رب تعالیٰ کو ناراض نہ کر۔ بلکہ خود صحیح مسلمان بنو اور اللہ اور رسول کے مخلص فرمانبردار بندے اپنی جماعت بڑھانے کے لئے بے دینوں کو اپنے میں نہ ملاؤ عطر بڑھانے کے لئے اس میں پیشاب مت بڑھاؤ کیونکہ اس سے عطر فنا ہو جائے گا **چوتھا فائدہ:** یقیناً مسلمانوں کو اللہ کافی مگر حضور علیہ السلام کی طفیل اسی لئے فرمایا گیا فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ **پانچواں فائدہ:** بغیر صفائی باطن ظاہری زینت بیکار ہے اور بغیر صفائی ظاہر کے باطنی صفائی ناقص کامل وہ ہی ہے جس کی سیرت و صورت دونوں اسلامی رنگ میں رنگے ہوں جو کہتے ہیں داڑھی میں کیا رکھا ہے کہ دل پاک چاہئے وہ اس آیت کو غور سے پڑھیں **چھٹا فائدہ:** جسے اللہ رنگ دے وہ کبھی بفضلہٖ تعالیٰ بے رنگ نہیں ہو سکتا جو مسلمان مرتد ہو جائے سمجھو وہ اللہ کا رنگ ہوا نہ تھا **ساتواں فائدہ:** دین رنگ ہے اور عبادت اس کی پالش یا دافع زنگ۔ فاسق مسلمان کا رنگ گناہوں کے غبار سے پھیکا ہے۔ **آٹھواں فائدہ:** صحابہ کرام درستی ایمان کی کسوٹی ہیں کہ تاقیامت جس کا ایمان صحابہ سا ہو گا وہ مومن صادق ہے جس کا ایمان ان کے خالف ہو گا وہ بے ایمان ہے۔ اس آیت کی تفسیر وہ حدیث ہے کہ فرمایا میری امت کے ۷۳ فرقے ہوں گے ایک کے سوا سارے دوزخی ہوں گے عرض کیا گیا حضور وہ فرقہ کون سا فرمایا مَآ اَنَا عَلَيْهِ وَ اَصْحَابِیْ دیکھو یہاں رب نے فرمایا اے صحابہ اگر وہ تمہارا سا ایمان لائیں تو ہدایت پائیں گے۔ نیز حضور نے فرمایا میرے صحابہ تارے ہیں تم جس کی پیروی کرلو ہدایت پاؤ گے۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ سے سمجھا گیا کہ اہل کتاب کو چاہئے کہ ہمارے دین کی مثل پر ایمان لائیں حالانکہ اسلام بے مثل ہے کیونکہ ہمارا رب بے مثل ہے ہمارے پیغمبر ہمارا قرآن ہمارا کعبہ وغیرہ سب ہی بے مثل ہیں پھر اس آیت کا مطلب کیا **جواب:** اس کے چند جواب ہیں ایک یہ کہ ما مصدر یہ ہے اور ب، استعانت کی تو مطلب یہ ہوا کہ تمہاری طرح

خالص اور نفاق سے پاک وصاف ایمان قبول کریں لہٰذا یہاں ایمان کی ایمان سے تشبیہ ہے نہ کہ دین کی دین سے کہ ان کا ایمان تمہارے ایمان جیسا ہو۔ دوسرے یہ کہ یہاں مثل زائد ہے تو معنی یہ ہوئے کہ اس پر ایمان لائیں جس پر تم لائے ہو یعنی تمہاری طرح قرآن شریف اور نبی آخر الزمان کو مانیں۔ تیسرے یہ کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی کتابوں پر ایسا ایمان لائیں جیسا کہ تم قرآن پر لائے یعنی انہیں بغیر تحریف تبدیل کے مانیں اور ظاہر ہے کہ اس صورت میں وہ ضرور مسلمان ہو جائیں گے کیونکہ ان کی کتابوں میں اسلام لانے کا حکم ہے۔ چوتھے یہ کہ بِہٖ، ب استعانت کی ہے اور ما سے مراد دلائل ہیں یعنی اہل کتاب تمہاری طرح دلائل سے ایمان لائیں نہ کہ نفسانی خواہش سے **دوسرا اعتراض:** فَقَدِ اهْتَدَوْا سے معلوم ہوتا ہے اہل کتاب ہدایت پر تو ہیں مگر اسلام لانے سے اس میں ترقی ہو جائے گی کیونکہ اِهْتَدَوْا کے معنی ہیں کہ ہدایت میں کامل ہو جائیں گے حالانکہ وہ تو بالکل کافر ہیں **جواب:** اس کا جواب تفسیر میں گزر گیا یا تو اس سے مراد ہے ہدایت میں مسلمان کے ساتھ شریک ہو جانا یہ کہ اسلام لاتے ہی کامل ہدایت پر ہوں گے نہ کہ ناقص پر **تیسرا اعتراض:** یہاں دین کو رنگ کہا گیا **جواب:** اس لئے کہ جیسے رنگ کپڑے کے تار تار میں سرایت کر جاتا ہے ایسے ہی ایمان مسلمان کے رگ و ریشہ میں اثر کرتا ہے کہ دل و دماغ کو برے خیالات اور ظاہری اعضاء کو گناہ سے بچاتا ہے **چوتھا اعتراض:** بِمِثْلِ مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ سے معلوم ہوا کہ ہدایت اسلام میں محدود ہے دوسری آیتوں میں اس کی تصریح بھی ہے اور اہل کتاب بھی اپنے دین میں ہدایت محدود مانتے تھے ان کی تردید کی گئی تو اسلام کے اور اہل کتاب کے عقیدہ میں فرق کیا **جواب:** چند فرق ہیں ایک یہ کہ اہل کتاب میں نفسانیت ہے اور اسلام میں للّٰہیت دوسرے یہ کہ اہل کتاب بعض انبیاء کا انکار کرتے ہیں مسلمان سب کا اقرار تیسرے یہ کہ اہل کتاب کو کتابوں نے قرآن اور نبی آخر الزمان ﷺ کی آمد کی خبر دی تھی اور بتایا تھا کہ ان کی آمد پر ہم سب منسوخ ہو جائیں گے اسلام کی کتاب یعنی قرآن نے ان کی تصدیق کرتے ہوئے اب دروازہ نبوت کے بند ہونے کی خبر دی لہٰذا اہل کتاب کا اپنے میں ہدایت کو محدود ماننا غلط ہے اور اسلام کا یہ دعویٰ کہ صرف قرآن ہی میں ہدایت ہے صحیح ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ نفسانیت میں ہدایت نہیں للّٰہیت میں ہے۔ انبیاء کرام کے انکار میں ہدایت نہیں ان کے ماننے میں ہے رب تعالیٰ کی مخالفت میں ہدایت نہیں اس کی اطاعت میں ہے۔ کوئی اندھا ہی اس کا انکار کرے گا۔

تفسیر صوفیانہ

زندگی ایک دراز سفر ہے دنیا خطرناک جانوروں، چور ڈاکوؤں سے بھرا ہوا جنگل ایسے سفر میں مسافر کو تین چیزیں درکار ہوتی ہیں اچھی سواری کافی توشہ زاد راہ اور اچھے قافلے کی ہمراہی ورنہ مسافر راستہ میں ہلاک ہو جائے گا۔ منزل مقصود تک نہ پہنچے گا۔ ایمان اس راستہ کی سواری ہے نیک اعمال توشہ اور صحابہ کی جماعت اچھا قافلہ ہے جس کے ساتھ رہنا ہر مسافر کو لازم ہے۔ خیال رہے کہ جسمانی ہمراہی کے لئے جگہ اور وقت کا ایک ہونا ضروری ہے مگر ایمانی روحانی ہمراہی کے لئے یہ کچھ بھی ضروری نہیں بلکہ رشتہ ایمانی میں بندھا ہوا ہونا کافی ہے تا قیامت ہر جگہ کے مسلمان بفضلہ تعالیٰ صحابہ کرام کے ساتھ ہیں اس لئے ارشاد ہوا کہ جو صحابہ کی طرح ایمان لائے گا وہ منزل مقصود کی ہدایت پائے گا۔ جو ان سے منہ پھیرے گا۔ وہ دوسرے

کنارہ یعنی ہلاکت میں پڑے گا۔ صوفیاء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ تا قیامت حضور کے لئے کافی ہے اور آپ کا مافوق الاسباب اور اسباب کے ساتھ مددگار ہے۔ ہر مسلمان کو حضور کی تائید غیبی پہنچتی رہتی ہے اور فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ کے جلوے نظر آتے رہیں گے۔

دوسری تفسیر

رنگ کے لئے چند چیزیں چاہئیں۔ رنگ بنانے والا۔ رنگ جمانے والا۔ رنگ قبول کرنے والا۔ دین اسلام رنگ ہے جو کہ کارخانہ قدرت میں تیار ہوا۔ رب نے تیار کیا حضور علیہ السلام نے وہ رنگ جمایا۔ مسلمانوں کے دل و دماغ اور ظاہر و باطن نے قبول کیا اور عبادت اور ریاضت نے اس میں جلادی اور پالش کی اللہ کا رنگ اولاً بندوں کے دل پر چڑھتا ہے۔ اور پھر اس کا اثر ہر ادا پر ظاہر ہوتا ہے اور یہ میخانہ طیبہ سے بٹتا ہے اسی رنگ نے نہ معلوم کسے کسے کیا کیا کر دیا۔ مولانا فرماتے ہیں۔

رنگ ہائے نیک از خم صفا است　　رنگ زشتاں از سیاہ آب جفاست

صبغۃ اللہ نام آن رنگ لطیف　　لعنۃ اللہ بوئے ایں رنگ کثیف

بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور کی صحبت پاک سے بعض حضرات کے ظاہری رنگ بھی بدل گئے کالے تھے گورے ہو گئے۔ حبشی تھے رومی ہو گئے۔

حکایت: مثنوی شریف میں ہے کہ ایک جنگل میں لشکر اسلام پیاسا تھا۔ کسی کافر کا غلام پانی کے مشکیزے اونٹ پر لادے ہوئے اپنے مولیٰ کے پاس جا رہا تھا سرکار کے حکم سے اسے روک کر اس کے مشکیزوں سے سارے لشکر کو پانی پلا دیا گیا اور لشکر کے مشکیزے بھر دیئے گئے لیکن غلام کا پانی اتنا ہی رہا حضور علیہ السلام نے اس کالے غلام کو سینہ سے لگا کر فرمایا کہ جا۔ اللہ جانے ایک آن میں اسے کیا دے دیا کہ وہ نہایت حسین و جمیل خوبصورت جوان ہو گیا۔ جب وہ اپنے مولیٰ کے پاس پہنچا تو وہ اسے پہچان نہ سکا اور کہنے لگا کہ تو کون ہے اور میرا غلام کہاں گیا؟ وہ بولا کہ میں ہی تیرا غلام ہوں۔ مولیٰ نے کہا وہ کالا تو گورا وہ حبشی تو رومی اس نے جواب دیا۔

صدر را دیدم و بدرے گشتہ ام　　صاحب فضلے و قدرے گشتہ ام

صبغۃ اللہ ہست رنگ خم او　　ہستھا یک رنگ گردد اندر او

یعنی میں تھا تو حبشی ہی مگر کچھ دیر صدر نبوت کے پاس بیٹھ کر بدر بن گیا اور میری عزت و قدر بڑھ گئی اس کے پاس اللہ کے رنگ کی ایک کاٹ تھی۔ جس میں غوطہ دے کر رنگ برنگوں کو یک رنگ بناتا تھا اور بے رنگوں کو رنگ برنگا۔ اس کاٹ کے رنگ سے کوئی صدیق بن گیا کوئی فاروق۔ اس غلام کے طفیل اللہ وہ رنگ ہم پر بھی چڑھاوے و نحن لہ عبدون سے معلوم ہوا کہ عارفین تو رضائے الٰہی کے لئے عبادت کرتے ہیں نہ کہ جنت کے شوق اور دوزخ کے خوف سے اگر رب تعالیٰ جنت و دوزخ نہ بناتا تو کیا عبادت کا مستحق نہ ہوتا؟ خیال رہے کہ عبادت اور ہے اور عبودیت کچھ اور۔ اور عبودیت کا کچھ اور ہی طور عبادت جسم سے ہوتی ہے۔ عبودیت نفس اور روح سے صوفیاء فرماتے ہیں کہ عابد وہ ہے جو چاروں چیزوں سے نہ گھبرائے۔ بھوک،

ننگا ہونا، فقیری اور ذلت بعض نے فرمایا کہ بندہ پر چار وقت آتے ہیں ہر وقت کی علیحدہ عبادت نعمت اور بلا۔ معصیت اور اطاعت نعمت میں شکر۔ بلا میں توبہ اور اطاعت میں استقامت عبادت ہے اور یہ وہ ہی کرسکتا ہے کہ جس کا نفس مردہ ہو نفس کی موت روح کی زندگی ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

تازہ کن ایمان نہ از گفت زبان　　اے ہوا را تازہ کردہ در نہاں

تا ہوا تازہ است ایمان تازہ نیست　　کیں ہوا جز قفل آں دروازہ نیست

ایمان ہرا بھرا باغ ہے، شیطان چور، خواہش نفسانی پالا۔ اس باغ کو ان دونوں سے بچاؤ۔

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَ هُوَ رَبُّنَا وَ رَبُّكُمْ ۚ وَ لَنَاۤ اَعْمَالُنَا
کہہ دو کیا جھگڑا کرتے ہو تم ہم سے بیچ اللہ کے حالانکہ وہ رب ہے ہمارا اور رب ہے تمہارا اور
تم فرماؤ کیا اللہ کے بارے میں ہم سے جھگڑتے ہو حالانکہ وہ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی اور ہماری کرنی ہمارے
وَ لَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَ نَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾
واسطے ہمارے اعمال ہیں ہمارے اور واسطے تمہارے اعمال ہیں تمہارے اور ہم واسطے اس کے اخلاص والے
ساتھ اور تمہاری کرنی تمہارے ساتھ اور ہم نرے اس کے ہیں

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **پہلا تعلق:** پچھلی آیتوں میں کہا گیا تھا کہ اے مسلمانو اہل کتاب سے کہہ دو کہ ہم خدا کے رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ جس پر وہ کہہ سکتے تھے کہ تم تو آج نئے مومن اور عابد ہوئے اب تک مشرک تھے ہم صدیوں سے ان خدائی رنگ میں رنگین اور اس کی عبادت میں مشغول ہیں لہٰذا ہم اس رنگ میں ہیں نہ کہ تم اس کے جواب میں بتایا جا رہا ہے کہ رب تعالیٰ کے ہاں نئے پرانے کا لحاظ نہیں اعمال کا لحاظ ہے۔ **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت کے مضمون پر اہل کتاب اعتراض کرسکتے تھے کہ اسلام اللہ کا رنگ نہیں اور نہ حضور علیہ السلام اس کے نبی نہ تم خدا کے پیارے کیونکہ ہمارا دین پرانا سارے پیغمبر ہمارے ہی نسب میں ہم ہی رب کے محبوب تمہیں اطاعت پر وہ ثواب نہیں مل سکتا۔ جو ہم گناہ کر کے پالیتے ہیں کیونکہ ہم اس کے پیارے ہیں اور پیارے کی نافرمانی غیروں کی فرمانبرداری سے بڑھ کر ہے۔ اس وہم کو دفع کرنے کے لئے اب فرمایا جا رہا ہے کہ رب کی محبوبیت اعمال سے حاصل ہوتی ہے نہ کہ نسب سے **تیسرا تعلق:** پچھلی آیتوں میں رنگ اور رنگنے والے دونوں کا ذکر ہوا۔ چونکہ اے یہودیو، تمہارے دلوں پر نفسانی، شیطانی، رنگ چڑھے ہوئے ہیں تو ان پر رحمانی رنگ کیسے چڑھے ہم اپنے دل ان رنگوں سے دھو کر خالص مخلص بندے ہوگئے۔ لہٰذا ہم رنگین ہیں۔ جیسے صاف کردہ تختی پر لکھا جاتا ہے نہ کہ پہلے نقش والی پر۔

شان نزول

یہود نے مسلمانوں سے کہا کہ ہماری کتاب سب سے پہلی، ہمارا قبلہ پرانا۔ ہمارا دین قدیم سارے انبیاء ہم ہی میں لہٰذا ہم ہی سچے اگر محمد مصطفیٰ ﷺ نبی ہوتے تو ہم میں سے ہوتے نہ کہ عرب کے بت پرستوں میں سے ان کی تردید میں یہ آیت کریمہ اتری۔

تفسیر

قُلْ شان نزول اور اگلی ضمیروں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسلمانوں سے خطاب ہے کہ اے مسلمانو تم اہل کتاب سے کہہ دو اور ہو سکتا ہے کہ حضور علیہ السلام سے خطاب ہو یعنی اے محبوب علیہ السلام آپ مسلمانوں سے فرمادیں کہ وہ اہل کتاب سے کہیں کہ اَتُحَآجُّوْنَنَا کیا تم ہم سے حجت بازی کرتے ہو یہ لفظ محاجۃ سے بنا جس کا مادہ حجت ہے اس کے معنی ہیں ایک دوسرے کے مقابلے میں اپنے دعویٰ پر دلیلیں قائم کرنا یعنی آپس میں جھگڑا فی اللہ یہاں یا تو دین وغیرہ پوشیدہ ہے یا نہیں یعنی تم ہم سے اللہ کے دین کے بارے میں جھگڑتے ہو کہ ہم تو کہیں کہ ہمارا دین سچا اور تم کہو کہ ہمارا یا خدا کے بارے میں جھگڑتے ہو کہ تم کہو کہ خدا ہمارا ہی ہے مسلمانوں کا نہیں تمہارا یہ دعویٰ غلط ہے خیال رہے کہ اللہ کے بارے میں جھگڑے کی پانچ صورتیں ہیں اللہ کی ہستی کا جھگڑا کہ رب کی ذات ہی کا انکار کیا جاوے۔ اس کی صفات میں جھگڑا اس کے احکام میں جھگڑا یا اس کے کسی سچے نبی میں جھگڑا یا اس کے اولیاء میں جھگڑا یہاں آخری تین جھگڑے مراد ہیں۔ رب پر الزام لگانا کہ ہم گناہ بھی کریں تو اس نے ہمیں رنگ دیا ہے یا حضور کی نبوت کا انکار یا صحابہ کی حقانیت کا انکار کیونکہ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ہمارا بھی مالک ہے اور تمہارا بھی یعنی اس کی ربوبیت سب کو شامل ہے اور بندہ ہونے میں ہم تم برابر پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ تمہارے تو گناہ بھی بھلے ہوں اور ہماری نیکیاں بھی بری اس کی بارگاہ میں یہ ناممکن ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے ربوبیت جسمانی کے لئے کچھ قوانین مقرر کئے ہیں جن میں نبی زادے، بادشاہ زادے، فقیر زادے، سب وابستہ ہیں کہ ہر شخص انسانی غذا کھا کر ہی جی سکتا ہے کوئی بادشاہ بھی سونا چاندی ہیرے جواہرات یا مٹی کھا کر نہیں جیتا۔ یوں ہی روحانی ربوبیت کیلئے قواعد مقرر ہیں جن میں سارے انسان وابستہ ہیں۔ نبی زادے کفر کر کے محبوب رحمانی نہیں بن سکتے سب کو ایمان و اعمال کی ضرورت ہے۔ خیال رہے کہ رب تعالیٰ کفار کا رب ہے قہر کے ساتھ اور مسلمانوں کا رحم کے ساتھ جیسے حکومت پھانسی کے ملزم کو بھی کھانا دیتی ہے اور اپنے خاص ملازم کو بھی اب رہی عبادت اس کے لئے یہ قاعدہ ہے کہ جو اس کے فرمان کے مطابق ہوگی وہ قبول ورنہ مردود لہٰذا وَلَنَآ اَعْمَالُنَا ہمارے اعمال ہمارے واسطے مفید کیونکہ اس کے قوانین کے مطابق ہیں اور پھر یہ بھی ہم نہیں کہتے کہ تمہاری ساری نیکیاں برباد بلکہ وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ تمہاری بھی وہ نیکیاں کارآمد تھیں جو تم نے پہلے اپنے دین کے مطابق کی تھیں جب کہ تمہارا دین منسوخ نہ ہوا تھا۔ (تفسیر عزیزی) اس صورت میں اعمال سے ان کی گزشتہ نیکیاں مراد ہیں جو ان کے بزرگوں نے ان کے نسخ دین سے پہلے کیں۔ جن کی نسبت ان کی طرف مجازاً ہے یا لکم کا لام علیٰ کے معنی میں ہیں یعنی اب جو تم بدعملیاں اور منسوخ احکام پر عمل کئے جا رہے ہو وہ تمہارے لئے سخت نقصان دہ ہیں کیونکہ رب کے قوانین کے خلاف ہیں۔ (روح البیان) خلاصہ یہ کہ تمہارے اعمال میں نفسانیت اور رسوم و رواج کی پابندی کو دخل ہے لہٰذا

برباد اور ہمارے اعمال کار آمد کیونکہ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ہم خالص اس اللہ کے بندے ہیں اور اسی کے رضا کے لئے سب کچھ کرتے ہیں رسم ورواج کو دخل نہیں دیتے۔

خلاصہ تفسیر

اے یہودیو! تم اللہ کے بارے میں ہم سے کج بحثی نہ کرو اور اپنے کو رب کا پیارا بلاوجہ نہ جانو یہ کبھی نہیں ہوسکتا کہ تم بدعملی کرکے بھی پیارے ہی بنے رہو اور ہم نیکیاں کرکے بھی اس سے دور رہیں جب ہم بھی اس کے بندے اور تم بھی اور وہ ہمارا بھی رب ہے اور تمہارا بھی تو وہ ناحق طرف داری کیوں کرے گا اس کی بارگاہ میں قبولیت بذریعہ اعمال ہے آؤ ہم تم اپنے اپنے اعمال کو اخلاص کی کسوٹی پر کسیں ہمارے اعمال تو رب کے لئے ہیں اور اس کے قانون کے مطابق اور تمہارے اعمال اپنی قوم کے لئے ہیں اور برادری کے قانون کے مطابق لہٰذا یہ مقبول اور وہ مردود خیال رہے کہ جیسے تختی صاف ہونے میں پانی، کھریا پھر دھوپ کی ضرورت ہے ایسے ہی دل کی تختی صاف ہونے میں آنکھوں کے پانی عبادت کی کھریا اور عشق کی تپش کی ضرورت ہے۔ نَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ میں ان تمام کی طرف اشارہ ہے پہلے روئی کو بنولوں سے خالص کرو پھر اسے صدہا چکر دو پھر کپڑا تیار ہوگا۔

دوسری تفسیر

اے اہل کتاب! ہم تمہاری طرح صرف اپنی ذات کو جنت کا ٹھیکیدار نہیں سمجھتے۔ اللہ ہمارا تمہارا دونوں کا رب ہے لہٰذا ہمارے موجودہ عمل جو اس دین کے موافق ہیں وہ قبول اور تمہارے بزرگوں کے گزشتہ اعمال جو اس دین کے موافق تھے۔ وہ قبول اور ہم یہ انصاف کیوں نہ کریں ہم تو رب کے خالص بندے ہیں اس کے فرمان پر سر جھکانا نفسانیت سے دور رہنا ہمارا پہلا فرض ہے۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ:** دنیا میں ہر برا بھلا بندہ رب کی ربوبیت سے فائدہ حاصل کرتا ہے یہاں کی امیری غریبی سے کسی کی مقبولیت یا مردودیت کا پتہ نہیں چل سکتا۔ ہاں اس کا ظہور تو ان شاء اللہ قیامت میں ہوگا **دوسرا فائدہ:** آسمانی دین اپنے اپنے وقتوں میں بندوں کے لئے ذریعہ نجات تھے۔ لہٰذا ہمیں گزشتہ یہودی اور عیسائیوں کو کافر، فاسق نہیں کہنا چاہئے اس زمانے میں ان میں بڑے بڑے اولیاء اللہ گزرے ہیں **تیسرا فائدہ:** منسوخ دین اختیار کرنا گمراہی ہے اور ان کے اعمال جو پہلے نیکیاں تھیں اب گناہ جوان آدمی ماں کا دودھ پیئے تو گنہگار بچے کے لئے اس کا پینا ضروری کیونکہ یہ بچپن کی غذا ہے نہ کہ جوانی کی **چوتھا فائدہ:** نفسانیت سے کسی کی برائی نہ کرو ہاں للّٰہیت سے بروں کو برا کہنا ثواب کہ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ سے معلوم ہوا سب کو برا کہنا بھی برا اور سب کو اچھا کہنا بھی برا بروں کو اچھا اور اچھوں کو برا کہنا کفر ہے صلح کل اور نیچری اس آیت سے عبرت پکڑیں شریعت کے فرمان کے مطابق نرم و گرم ہونا چاہئے **پانچواں فائدہ:** اپنے کمال ایمان، اخلاص، وغیرہ نعمتوں کو بیان کرنا لوگوں میں اس کا اعلان عبادت ہے

جس کا قرآن نے حکم دیا بشرطیکہ اپنی شیخی کے لئے نہ ہو رب کے شکر کے لئے ہو۔ **چھٹا فائدہ:** تمام صحابہ کرام مخلصین کاملین تھے کہ رب نے انہیں اپنے اخلاص کے اعلان کا حکم دیا جو ان کے اخلاص کا انکار کرے وہ اس آیت پاک کا منکر ہے افسوس ہے کہ جن بزرگوں کے ایمان واخلاص کا رب گواہ اس کا تو انکار ہے اور اپنے ایمان کا دعویٰ جس پر نہ تو قرآن کی گواہی ہے نہ حدیث کی قرآن صحابہ کرام کے ایمان، اخلاص، تقویٰ کی گواہیاں جگہ جگہ دے رہا ہے ان آیتوں کو ہماری کتاب امیر معاویہ میں دیکھو۔

اعتراضات

پہلا اعتراض: جب دنیا میں رب کی ربوبیت کی جلوہ گری ہے اور وہ سب کا ہی رب ہے تو سب کو آرام میں کیوں نہ رکھتا بعضوں کو تکلیف کیوں دیتا ہے؟ **جواب:** یہ بھی ربوبیت ہی کا تقاضا ہے اگر سب ایک حال میں ہو جائیں تو دنیا برباد ہو جائے جو جس کے لائق ہے اسے وہ ہی دیا گیا ہے چیونٹی کو کن ہاتھی کو من دیتا ہے باپ کے پاس شہد بہت ہے مگر بیٹے کا مزاج بہت گرم ہے کیسے دے (گلستان) **دوسرا اعتراض:** اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان ہر مذہب میں رہ کر مقبول خدا بن سکتا ہے اور ہر دین کی نیکیاں کارآمد ہیں (بعض بے دین) کیونکہ کفار سے فرمایا گیا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ تمہاری نیکیاں تمہارے واسطے مفید، لام نفع کا ہے **جواب:** اس کے نہایت نفیس جواب تفسیر میں گزر گئے کہ یہاں اعمال سے ان کے گزشتہ اعمال مراد ہیں جو انہوں نے نسخ دین سے پہلے کئے تھے یا لَكُمْ کا لام علی کے معنی میں ہے جیسے کہ کبھی علی لام کے معنی میں آتا ہے وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرہ: ۱۴۳) یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں ان کے اعمال کا دنیوی نفع مراد ہو جیسا کہ روایت میں آیا ہے کہ مشرکین اور کفار کی نیکیوں کا بدلہ انہیں دنیا ہی میں دے دیا جاتا ہے کہ وہ اس کے عوض یہاں آرام پالیتا ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں آخرت ہی کا نفع مراد ہو کہ بعض کفار اپنے صدقہ اور خیرات کی وجہ سے عذاب میں تخفیف پائیں گے جیسے کہ حاتم طائی، ابولہب، نوشیرواں وغیرہ یعنی ان کے اعمال کا نفع تخفیف عذاب ہے جیسا کہ روایات میں ہے اور ممکن ہے کہ اس آیت کے معنی یہ ہوں کہ اگر تم ایمان لاکر ہماری طرح اعمال کرو تو ہمیں تمہیں یکساں ثواب ملے گا نومسلم اور پرانے مسلم ہونے کا اعتبار نہ ہوگا جیسا کہ تم کرتے ہو یہ بھی ممکن ہے کہ اس کلام سے اظہار بیزاری مراد ہے یعنی تمہیں اپنے اور ہم کو اپنے اعمال کافی ہیں جیسے اردو میں کہتے ہیں کہ اپنی اپنی کرنی اپنی اپنی بھرنی یہ چھ جواب یاد رکھو کیونکہ گزشتہ آیت سے بھی معلوم ہو چکا اور دوسری آیتوں میں بھی صاف فرمایا گیا کہ اسلام کے سوا سارے دین باطل ہی ہیں کہ جن میں رہ کر کوئی نیکی قبول نہیں اور یہ تو کوئی اندھا بھی نہ کہے گا ہر دین سچا ہے اور اس کے قاعدے صحیح۔ آریہ، عیسائی حتیٰ کہ بھنگی چمار بھی لوگوں کو اپنے دین کی دعوت دیتے ہیں اگر ان کے نزدیک سب دین تھے تو وہ اپنے دین کی طرف کیوں بلاتے ہیں اگر سب دین سچے ہیں تو اسلام کی تبلیغ بیکار بلکہ پھر تو یوں کہنا چاہئے کہ اے ہندوؤ، سکھو اپنے اپنے مذہب پر جمے رہو نجات پا جاؤ گے قرآن پاک فرماتا ہے اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ (حجرات: ۲) دوسری جگہ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (آل عمران: ۱۹) تیسری جگہ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (ال عمران: ۸۵)

فرمایا جس سے معلوم ہوتا کہ بغیر اسلام قبول کئے کوئی نیکی قبول نہیں لہٰذا اس آیت کے وہ ہی مطالب ہیں جو ہم نے عرض کئے۔

تفسیر صوفیانہ

مخلوق طالب ہے اور خالق کل کا مطلوب، ساری خدائی اس کی شیدائی ہے اور وہ سب کا محبوب ہر ایک کو اس کی طلب اور اس کی جستجو، کافر ہو یا مومن مخلص ہو یا منافق سب اسی کے جویاں ہیں ہاں یہاں بعض کا جذبہ بھڑکا ہوا ہے اور بعض کا دبا ہوا کل قیامت میں وہ جذبہ بھڑک اٹھے گا۔ اسی لئے کفار کا سب سے بڑا عذاب محبوب کی مجوبی ہوگی وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۪ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (ال عمران: ۷۷) اس پر گواہ ہے کافر کی بت پرستی اور مومن کی حق پرستی اپنی اپنی سمجھ میں اس کی رضا کے لئے ہے۔ یعنی ہندو مندر میں اسی کو ڈھونڈ رہا ہے اور مسلمان مسجد میں اور پس پردہ ہر عاشق سمجھ رہا ہے کہ رب میرا ہے اس کی رضا ہی کا جھگڑا ہے جس کا اس آیت میں ذکر ہے قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ مگر یہ سارے جھگڑے پردے کے ہیں۔

کفر و اسلام کے جھگڑے تیرے چھپنے سے بڑھے
تو اگر پردہ اٹھا دے تو تو ہی تو ہو جائے!

پردہ اٹھتے ہی کوئی کافر نہ رہے گا۔ رب تعالیٰ فرماتا ہے فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ (ق: ۲۲) اس مقام پر ضرورت تھی کہ کوئی اندرون راز والا محبوب آئے اور رب کا راز بتائے محبوبوں کے جھگڑے چکائے اور انہیں بتائے کہ رب کس کا ہے اسی راز دان محبوب یزادان کا نام پاک محمد مصطفیٰ ﷺ جس نے ان پردے والوں کا فیصلہ فرمایا اور جس کی ذات پاک حق کی کسوٹی ہے کہ جس کی زندگی اس شہنشاہ کے نقش قدم پر ہے وہ اللہ کا ہے اور اللہ اس کا اور جو ان کا نہیں رب اس کا نہیں اس لئے ارشاد ہوا وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ کہ ہم تو نرے اسی کے ہیں کیونکہ اس کے حبیب ہیں ﷺ

وہ رب کے ہیں رب ان کا ہے جو ان کا ہے وہ رب کا ہے
بے ان کے جو حق سے ملا چاہے دیوانہ ہے سودائی ہے

صوفیاء فرماتے ہیں کہ اخلاص اللہ کی نعمت ہے اور اخلاط رب کا عذاب۔ مخلوط، سونا، دودھ گھی گھٹیا ہے خالص سونا وغیرہ بڑھیا۔ یوں ہی بازار قیامت میں اخلاط والے ایمان وعبادت کی کوئی قیمت نہیں۔ اخلاص کی قیمت ہے اخلاص تین طرح ہے۔ اخلاص فی الایمان، اخلاص فی العبادت، اخلاص فی العبودیت۔ اخلاص عبودیت انبیاء کرام اور خاص اولیاء کو عطا ہوتا ہے اس لئے رب تعالیٰ نے مخصوص نبیوں کے لئے فرمایا اِنَّهٗ كَانَ عَبْدًا شَكُوْرًا (الاسراء: ۳) معراج کے ذکر میں فرمایا اَسْرٰى بِعَبْدِهٖ اخلاص فی عبودیت وہ ہے جو فَنَا فِي الْمَوْلٰى ہو کہ اس کا کھانا پینا، جینا اللہ کے لئے ہی ہو۔ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (الانعام: ۱۶۲) اخلاص ہم کو فنا فی الشیخ پھر فنا فی الرسول کے بعد میسر ہوتا ہے صحابہ کرام فناء فی الرسول ہو کر فنا فی اللہ ہوئے ان سے کہلایا گیا۔ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ۔

اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ
یا کہتے ہو تم تحقیق ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحاق و یعقوب
بلکہ تم یوں کہتے ہو ابراہیم اور اسمٰعیل اور اسحٰق و یعقوب
وَ الْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ
اور ان کی اولاد تھے یہودی یا نصرانی تھے فرمادو کیا تم زیادہ جاننے والے ہو
اور ان کے بیٹے یہودی یا نصرانی تھے تم فرماؤ کیا تمہیں علم زیادہ ہے
اللّٰهُ ؕ وَ مَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ
یا اللہ اور کون ہے بڑا ظالم اس سے جو چھپائے گواہی کہ جو پاس ہے اس کے اللہ کی طرف سے
یا اللہ کو اور اس سے بڑھ کر ظالم کون جس کے پاس اللہ کی طرف سے گواہی ہو اور وہ اسے
وَ مَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾
اور نہیں ہے اللہ بے خبر اس سے جو کرتے ہو تم
چھپائے اور خدا تمہارے کرتوتوں سے بے خبر نہیں

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے چند طرح تعلق ہے **پہلا تعلق:** اہل کتاب نے دو دعوے کئے تھے۔ایک یہ کہ ہم کچھ بھی کریں بہرحال اللہ کے پیارے ہیں۔دوسرے یہ کہ ہم بڑے پیغمبر یعنی ابراہیم علیہ السلام کے ہم مذہب ہیں وہ بھی ہمارے ہی دین پر تھے۔پچھلی آیت میں ان کی ایک بکواس کی تردید کی گئی اب دوسری بات کا رد ہو رہا ہے **دوسرا تعلق:** پچھلی آیت میں اہل کتاب کے رب تعالیٰ پر اتہام لگانے کی تردید تھی کہ ہمارے عیبوں سے بھی راضی ہے اب ان کے اس اتہام کی تردید ہے جو انہوں نے پیغمبروں پر باندھا کہ وہ یہودی تھے۔**تیسرا تعلق:** پچھلی آیت میں کہا گیا تھا کہ مسلمان ہی اللہ کے مخلص بندے ہیں اور اس پر وہ کہہ سکتے تھے کہ نہیں ہم مخلص ہیں کیونکہ ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے ہم مذہب ہیں اس وہم کی اب تردید کی جارہی ہے۔

تفسیر

اَمْ تَقُوْلُوْنَ یا تو ام متصلہ ہے یعنی اے اہل کتاب کیا تم خدا کو اتہام لگاتے ہو کہ وہ ہمارا ہے یا ان پیغمبروں کو کہ وہ ہمارے دین پر تھے یا منفصلہ یعنی تم خدا پر ہی اتہام نہیں باندھتے بلکہ پیغمبروں پر بھی کہ تم ان کے متعلق کہتے ہو کہ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ وَ الْاَسْبَاطَ یہ سارا خاندان نبوت۔خیال رہے کہ اسحاق علیہ السلام کی اولاد کو اسباط اور اسمٰعیل علیہ السلام

کی اولاد کو قبائل کہا جاتا ہے۔ (قبیلے) (روح البیان) كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی یہودی تھا یا عیسائی اور ہم ان کے پیرو کار لہٰذا ہم بہر حال محبوب کردگار یہ ایک جماعت کا کلام نہیں بلکہ یہود تو ان سب حضرات کے یہودی ہونے کا اور عیسائی ان سب کے عیسائی ہونے کا دعویٰ کرتے تھے اور ان دونوں کا یہ دعویٰ نہایت ہی باطل ہے کیونکہ یہودیت تو موسیٰ علیہ السلام اور عیسائیت عیسیٰ علیہ السلام سے دنیا میں آئی اور وہ سب حضرات ان سے پیشتر گزرے کہ ان کے زمانہ پاک میں نہ توریت تھی نہ توریت والے نہ انجیل نہ انجیل والے۔ شاید اس پردہ کہیں، ان حضرات کا دین ہمارے دین کے موافق اور ان کی شریعت، شریعت موسوی یا عیسوی کے مطابق تھی۔ اس لئے ہم انہیں یہودی یا عیسائی کہتے ہیں تو اس کا جواب میں قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ اے محبوب آپ فرمادو کہ اس کے متعلق تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ۔ ظاہر ہے کہ اللہ کو زیادہ علم ہے کیونکہ وہ دانائے کل ہے اور وہ تو خبر دے رہا ہے کہ مَا كَانَ اِبْرٰهِیْمُ یَهُوْدِیًّا وَّلَا نَصْرَانِیًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِیْفًا مُّسْلِمًا (ال عمران: ۶۷) کہ ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے نہ عیسائی۔ وہ تو ان سب سے علیحدہ رب تعالیٰ کے مطیع تھے رہی شریعت اس پر بھی غور کرلو کہ ان کا قبلہ کعبہ تھا۔ تمہارا بیت المقدس ان کے ہاں ختنہ تھا۔ تمہارے ہاں نہیں ان کی نماز میں رکوع وسجدہ تھا تمہارے ہاں یہ غائب ان کی شریعت میں حج کعبہ تھا تمہارے ہاں ندارد تمہارے ہاں ہفتہ کے دن کی تعظیم ہے ان کے ہاں نہ تھی پھر تمہاری ان کی شریعت میں شرکت کیسی۔ لہٰذا نہ تمہارا دین ان کا سا اور نہ تمہاری شریعت اور سب سے بڑا غضب تو یہ ہے کہ توریت وانجیل نے بھی خبر دی کہ ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد دین حنیفی پر تھی اور ان پر یہودیت کے احکام نہ تھے۔ (عزیزی) اب فیصلہ کرلو کہ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ کہ اس بدبخت سے بڑھ کر ظالم کون ہے کہ جس کے پاس اللہ کی گواہی موجود ہو اور وہ اسے چھپائے یعنی تمہاری کتابوں میں رب کی گواہی موجود ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہودی، عیسائی نہ تھے اور پھر تم اسے چھپائے ہی نہیں بلکہ بدل کر پیش کرتے ہو کہ رب تعالیٰ کہتا ہے کہ وہ یہودی نہ تھے اور تم کہتے ہو کہ تھے۔ جب شہادت الٰہیہ کو چھپانے والا بڑا ظالم، تو تم بدلنے والوں کا کیا درجہ خیال رہے کہ مِنَ اللّٰهِ میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ یہ شہادۃ کا صلہ ہے یعنی اللہ کی گواہی کو چھپالے۔ دوسرے یہ کہ كَتَمَ کا متعلق یعنی جو اللہ سے گواہی چھپائے یعنی اے یہودیو! تمہاری کتابوں اور پیغمبروں نے ابراہیم علیہ السلام کے حنیفی ہونے کی گواہی دی اور وہ گواہی تم نے رسول اللہ سے چھپائی تو گویا اللہ سے چھپائی اور رب سے چھپانے والا بڑا ظالم تو تم بڑے ظالم خیال رکھو کہ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ اللہ تمہارے ظاہری، باطنی اعمال اور کتاب الٰہی میں کانٹ چھانٹ کرنے اور رب کی گواہیوں کے چھپانے سے بے خبر نہیں تم دنیا پر مغرور نہ ہو جاؤ۔ اور اپنے گناہوں سے توبہ کرو اور نبی آخر الزمان کی مخالفت میں اپنے بزرگوں بلکہ رب تعالیٰ پر اتہام پر نہ لگاؤ خیال رہے کہ قرآن کریم کا یہ قاعدہ تا قیامت ہمارے ایمان کی حفاظت کا ذریعہ ہے آج وہابی وغیرہ کہتے ہیں کہ حضور غوث پاک و صحابہ کرام ہمارے ہم عقیدہ تھے ان سے پوچھ لو کہ کیا ان کے عقائد واعمال تمہارے جیسے تھے ہرگز نہ تھے حضور غوث پاک فرماتے ہیں کہ اللہ کے سارے ملکوں پر میری حکومت ہے یا رب کے سارے ملکوں کو میں رائی کے دانہ کی طرح دیکھ رہا ہوں صحابہ کرام حضور سے جنت مانگتے تھے۔ ہر مصیبت میں آپ سے فریادیں کرتے تھے بولو کیا تمہارے عقائد یہ ہیں ہرگز نہیں تو

پھر تو وہ حضرات تمہارے خلاف تھے جنہیں تم شرک کہتے ہو وہ ان کا ایمان ہیں۔

خلاصہ تفسیر

جب یہودیت اور نصرانیت کے عقائد اور خانہ ساز مسائل پر جرح ہوتی جس کا جواب ان سے نہ بنتا تو عاجز ہو کر بڑے انبیاء کرام کی آڑ لیتے اور کہتے تھے کہ ہمارا ہی مذہب مدار نجات ہے کیونکہ یہ ہی عقائد حضرات ابراہیم و اسمٰعیل و اسحاق علیہم السلام کا دین ہے۔ مسلمانوں کو اس کا جواب بھی سکھایا جارہا ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا یہ دعویٰ بھی سراسر غلط ہے بھلا یہ تو سمجھو کہ عیسائیت اور یہودیت ہزار ہا سال کے بعد دنیا میں آئی تو وہ یہودی، عیسائی کیسے ہو گئے اور اگر کہہ دیں کہ ان کے اور ہمارے اصول دین یکساں ہیں تو بھی غلط ہزاروں برس پہلے کی بات تمہیں معلوم ہے یا خدا کو رب تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ نہ یہودیوں کے موافق تھے نہ عیسائیوں کے بھلا ان حضرات کے زمانہ میں ہفتہ کی تعظیم عزیر علیہ السلام کے خدا کا بیٹا ہونے کا عقیدہ رب تعالیٰ کی شکل ہونے کا خیال کہاں تھا۔ اسی طرح ان کے زمانہ میں الوہیت مسیح تثلیث کا گندہ عقیدہ اور یہ خیال کہ عیسیٰ علیہ السلام کی سولی سب کے گناہوں کا کفارہ ہے اور پوپ صاحب کا سب بدکاریوں کو معاف کرنا اور بپتسمہ وغیرہ جو کہ عیسائی مذہب کے اصول ہیں کب تھے اور ان میں سے کسی نے ایسے گندے عقیدے کب رکھے تھے لہٰذا ان کے عقیدے اور ان کے اعمال سب ان کے خلاف ہیں پھر لطف یہ ہے کہ خود ان کی کتابیں بھی گواہ ہیں کہ وہ حضرات عیسائی، یہودی نہ تھے یہ اپنی بات پالنے کے لئے غلط بیانی کر رہے ہیں اور ان سے بڑھ کر ظالم کون؟ انہیں خدا کا خوف بھی نہیں کہ وہ ان کے اعمال سے خبردار ہے۔ اگر سرکاری خفیہ پولیس کسی کے پیچھے لگ جائے تو وہ ڈر کے مارے حکومت کی مخالفت نہیں کرتا یہ کیسے نڈر اور بے خوف ہیں کہ رب ان کی ہر بات پر نگہبان اور انہیں بالکل اطمینان۔

لطیفہ: ایک مسلمان نے کسی پادری سے پوچھا کہ ایمان کے جزو کتنے ہیں۔ اس نے کہا تین ایک رب کی ربوبیت جاننا دوسرے روح القدس عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کو ماننا تیسرے کفارے کا عقیدہ رکھنا کہ مسیح کی سولی سب کے گناہوں کا کفارہ ہے۔ مسلمان بولا تمہارا ایمان بڑھ کر ہے یا ابراہیم علیہ السلام کا وہ بولا کہ ابراہیم علیہ السلام کا مسلمان نے کہا کہ یہ ناممکن ہے ان کا ایمان تہائی اور تمہارا ان سے تگنا کہ انہیں فقط خدا پر ایمان لانا میسر ہوا کہ وہ مسیح علیہ السلام سے پہلے تھے اور تمہارے ہاتھ تینوں لگے۔ عیسائی شرمندہ تو ہوا مگر جھینپ اتارنے کے لئے کہنے لگا کہ تمہارے ہاں بھی ایمان کے دو جز ہیں ایک لا الہ الا اللہ دوسرے محمد رسول اللہ اور ابراہیم علیہ السلام جب محمد علیہ السلام سے پہلے ہوئے تو انہیں محمد صاحب کی نبوت ماننے کا موقعہ نہ ملا مسلمان نے کہا ذرا پادری صاحب ہوش میں آؤ اسلام میں ایمان کے لئے توحید اور نبوت کا عقیدہ کافی ہے جس نبی کا زمانہ پائے اس پر صراحتہً ایمان لائے اور اگلے پچھلے پیغمبروں پر اجمالاً اور تمہارے ہاں الوہیت مسیح کا جھگڑا ہے۔ آخرکار عیسائی شرمندہ ہو گیا یعنی جیسے ہم تمام گزشتہ پیغمبروں پر اجمالاً یوں ایمان لاتے ہیں کہ سارے پیغمبر برحق ہیں خواہ ہمیں ان کے نام و حالات معلوم ہوں یا نہ ہوں اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی امت آئندہ ہونے والے رسولوں پر بھی اجمالاً ایمان لائے کہ جتنے نبی آئندہ ہوں گے ان سب پر ہمارا ایمان ہے اور حضرت ابراہیم حضور محمد ﷺ تو واقف تھے کہ

آپ کے لئے رب سے دعائیں مانگیں۔

فائدے

اس آیت سے چند فائدے حاصل ہوئے **پہلا فائدہ:** انبیاء کرام سے مخالفین کے اتہامات اٹھانا سنت الٰہیہ ہے دیکھو اہل کتاب نے ان پیغمبروں پر یہودیت اور عیسائیت کا الزام لگایا اور رب نے اسے دفع فرمایا اسی طرح زمانہ موجودہ میں کفار و مرتدین نے جو حضور علیہ السلام پر الزامات لگائے ان کو دفع کرنا عبادت ہے اور سنت الٰہیہ پر عمل **دوسرا فائدہ:** گواہی چھپانا ظلم ہے اور بدلنا بڑا ظلم گواہ پر لازم ہے کہ ضرورت کے وقت گواہی دے **تیسرا فائدہ:** گواہی دینے والوں کے مختلف ثواب ہیں اور چھپانے والوں کے مختلف عذاب جیسی گواہی ویسا ہی اس پر ثواب وعذاب سب سے بڑی گواہی عقائد کی ہے کہ اس کا چھپانا کفر اور اس کو ظاہر کرنا ایمان پھر گواہی آپس کے معاملات کی ہے اگر گواہی کے چھپانے سے کسی کا حق مارا جائے تو چھپانے والا گنہگار اسی طرح چاند وغیرہ کی گواہی ضروری ہے کہ اس پر مسلمانوں کی عبادات موقوف ہیں۔ بعض گواہیاں وہ ہیں جن کا چھپانا ثواب اگر تمہیں کسی مسلمان کے خفیہ عیب کی خبر ہے اس کا پردہ ڈھک لو اللہ تمہارے عیب چھپائے گا ہاں شریر اور مفسد کا عیب ضرور ظاہر کر دو تا کہ لوگ اس کے فتنہ سے بچیں اسی لئے یہاں شہادت میں مِنَ اللّٰهِ کی قید لگائی۔ یعنی اللہ کی گواہی چھپانے والا بڑا ظالم ہے نہ کہ ہر گواہی کا چھپانے والا **چوتھا فائدہ:** بارگاہ مصطفیٰ علیہ السلام بارگاہ خدا تعالیٰ ہے کہ ان کا مجرم رب کا مجرم ہے جیسا کہ مِنَ اللّٰهِ کی دوسری تفسیر سے معلوم ہوا یعنی حضور سے گواہی چھپانا گویا خدا سے چھپانا ہے۔ **پانچواں فائدہ:** انبیاء کرام خصوصاً سید الانبیاء کے فضائل چھپانا اور آپ کی نعت کی آیتیں ظاہر نہ کرنا ہمیشہ ان میں نقص ثابت کرنے کی کوشش کرنا طریقہ یہود ہے اس سے وہ لوگ عبرت پکڑیں جو ہمیشہ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ سناتے ہیں کبھی حضور کے فضائل کی آیات کا ذکر نہیں کرتے کیونکہ وہ اس عمل میں وراثۃً یہود کے مستحق ہیں۔

تفسیر صوفیانہ

تمام گناہوں کی اصل اپنی بڑائی اور ریاکاری ہے یہودیوں کی یہ ساری حرکتیں، خدا کو الزام لگانا، پیغمبروں پر اتہام باندھنا صرف اپنی بات پانے کے لئے تھا کہ ہماری بات کسی طرح رہ جائے اس کا علاج اخلاص ہے جنید بغدادی فرماتے ہیں کہ اخلاص بندے اور رب کے درمیان ایک راز ہے جسے نہ فرشتہ جانتا ہے تا کہ لکھ سکے نہ شیطان پہچانتا ہے کہ اسے بگاڑ سکے اور نہ نفس کو اس کی خبر ہے کہ ڈکیتی کرے قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ لوگوں کے لئے نیکی کرنا بھی ریا ہے اور لوگوں کی وجہ سے عمل چھوڑنا بھی ریا (روح البیان) یعنی اس لئے عمل چھوڑ دینا کہ کہیں لوگ مجھے عابد نہ کہیں بیوقوفی ہے ریاکار اس شخص کی طرح ہے جو کھوٹے پیسے تھیلے میں بھر کر بازار پہنچے کہ دیکھنے والے اسے مالدار جانیں مگر دوکاندار دھتکارے ایسے ہی دنیادار تو ریاکار کو عابد شمار کرتے ہیں مگر پروردگار کے ہاں پھٹکار کا انعام پاتا ہے اور یہ سارے فساد "میں" کے ہیں جوان میں ہے وہاں "تو" نہیں یار کے لئے اغیار سے خانہ قلب خالی کرو۔ ان یہودیوں میں اگر میں نہ ہوتی تو مسلمان ہو جاتے یہ بھی خیال رہے کہ بڑوں پر طعنہ کرنا اپنے کو رسوا کرنا ہے اہل کتاب نے پیغمبروں پر طعنہ کر کے اپنے کو تا قیامت رسوا کر لیا مولانا فرماتے ہیں۔

چوں خدا خواہد کہ راز کس درد میلش اندر طعنہ پاکاں دہد

صوفیاء فرماتے ہیں کسی کا حق مارنا ظلم ہے جسمانی حقوق ہزارہا ہیں ماں باپ، بھائی برادر پڑوسی کے مختلف حقوق ہیں ایسے ہی روحانی حقوق صدہا ہیں شیخ، نبی، ولی، اللہ تعالیٰ، کعبہ معظمہ، رمضان، قرآن کے مختلف حقوق ہیں لہٰذا ظلم کی ہزارہا قسمیں پس جتنا بڑا حق مارے گا اتنا ہی بڑا ظالم ہوگا ماں کا نافرمان بڑا ظالم ہے ایسے ہی سب سے بڑا حق اللہ کا پھر رسول کا۔ لہٰذا ان کا حق مارنے والا بڑا ہی ظالم ہے آیات نعت چھپانے میں کا بھی حق مارنا ہے اور رسول کا بھی اس لئے قرآن کریم نے اسے بڑا ظالم فرمایا نیز اس گواہی کو چھپانے سے ہزاروں لوگ ایمان سے محروم ہو جاتے ہیں۔

تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ
یہ ایسی جماعت ہے بیشک گزر گئی واسطے اس کے وہ ہے جو کمایا اس نے اور واسطے تمہارے وہ جو کمایا تم نے
وہ ایک گروہ ہے جو گزر گیا ان کے لیے ان کی کمائی اور تمہارے لیے تمہاری کمائی
وَلَا تُسْئَلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾
اور نہ سوال کیے جاؤ گے تم اس سے جو کرتے تھے وہ
اور ان کے کاموں کی تم سے پرسش نہ ہوگی

تعلق

اس آیت کا پچھلی آیتوں سے کئی طرح تعلق ہے **پہلا تعلق:** اہل کتاب نے ابراہیم و اسمٰعیل علیہما السلام کے یہودی یا عیسائی ہونے کا دعویٰ کیا اس کی نہایت نفیس عقلی اور نقلی تردید کر دی گئی اس پر وہ کہہ سکتے تھے کہ اچھا اگر ہم ان کے دین پر نہیں تو ان کے نسب میں تو ہیں، ہمارے واسطے اتنی ہی نسبت کافی ہے اب اس کی بھی تردید کی جا رہی ہے کہ اللہ کے نزدیک بغیر ایمان نسبی رشتہ کارآمد نہیں وہ بزرگ اپنی بزرگی اور نیکیاں اپنے ساتھ ہی لے گئے تمہارے لئے چھوڑ نہ گئے بے دین بیٹا اپنے مسلمان باپ کی مالی میراث بھی نہیں پاتا تم ان کی عملی میراث کیسے پاؤ گے اس خیال خام کو دماغ سے نکال دو **دوسرا تعلق:** گزشتہ آیتوں میں اہل کتاب کی باتوں کا نہایت محققانہ جواب دیا گیا اب ان کا دعویٰ مان کر جواب دیا جا رہا ہے کہ اچھا بفرض محال مان لو کہ وہ حضرات یہودی یا عیسائی مذہب رکھتے تھے مگر تمہیں کیا وہ اور وقت تھا اور اب نیا تخت ہے نیا تاج، نیا راج اب وہ دین ختم ہو چکا اور وہ اعمال بھی گئے اگر آج وہ بھی زندہ ہوتے تو اس سلطان کونین کی اطاعت ہی کرتے جیسا کہ حدیث شریف میں ہے اب جب تم نے ان کا زمانہ پایا تم ان کی غلامی کرو رات میں بہت تارے اپنی اپنی جگہ چمک لئے اور دنیا والوں نے چراغ گیس اور بجلی وغیرہ سے روشنی لے لی اب آفتاب نبوت چمک چکا۔ دن نکل آیا سورج کو چھوڑ کر چراغ کی طرف بھاگنا نادانی ہے۔

تفسیر

اس آیت کی پوری تفسیر ہم قریب ہی میں کر چکے ہیں یہاں اتنا اور سمجھ لو کہ یہ آیت بلا وجہ نہیں دہرائی گئی بلکہ وہاں اور لطف دے رہی تھی اور یہاں کچھ اور رنگ دکھا رہی ہے یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ اے اہل کتاب اپنے باپ دادوں کے دین پر نہ اڑے رہو جیسے کہ انہوں نے اپنے سے پہلی شریعتوں کو منسوخ کیا تھا کہ نوح علیہ السلام سے آدم علیہ السلام کی شریعت منسوخ اور ابراہیم علیہ السلام سے پچھلی شریعتیں ختم ایسے ہی نبی آخر الزمان سے شریعت موسوی اور عیسوی منسوخ ہوگئی تو کیوں چیختے ہو یہ تو پہلے سے چلا آ رہا ہے اگر آج کوئی شریعت آدم علیہ السلام کی آڑ لے کر اپنی بہن سے نکاح کرنا چاہے تو دیوانہ ہے ایسے ہی دین مصطفائی کی موجودگی میں جو توریت پر عمل کرے گا وہ پاگل ہے (از تفسیر کبیر) خیال رہے کہ گروہ انبیاء کو تلک اشارہ بعید سے ذکر فرمانا ان اہل کتاب کے لحاظ سے ہے کہ یہ لوگ زمان ومکان کے لحاظ سے ان بزرگوں سے بہت دور ہیں نہ کہ ان حضرات کے لحاظ سے ان مقبولوں کے لئے زندگی اور بعد وفات زمان ومکان کا قرب یکساں ہے حضور انور ﷺ نے بہت عرصہ بعد ہونے والے واقعات کو ھذا فرمایا جیسے ارشاد فرمایا ھٰذَا اَوَ انُ یُّخْتَلَسُ فِیْہِ الْعِلْم وہ وقت ہے جب کہ علم اٹھ جاوے گا حالانکہ علم دین اٹھ جانا بالکل قیامت کے قریب ہوگا رب فرماتا ہے ذٰلِکُمُ اللّٰہُ ذٰلِکَ اشارہ بعید ہے حالانکہ رب تعالیٰ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

یار نزدیک تراز من بمن است　　　دین عجب بین کہ من ازوے دورم

فائدے

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اپنے بزرگوں کے عمل اولاد کو کام نہیں آتے مگر یہ اس صورت میں ہے کہ اولاد کو عمل کرنے کا وقت ملے اور نہ کرے جو بچپن میں مر جائیں وہ یقیناً اپنے ماں باپ کے تابع ہو کر ان سے درجات پائیں گے متقی مسلمانوں کے فوت شدہ بچے جنت میں اعلیٰ مقام پائیں گے اور فاسق مسلمانوں کے چھوٹے بچے وہ مراتب حاصل نہ کر سکیں گے حضور انور علیہ السلام کے چاروں فرزند طیب، طاہر، قاسم اور ابراہیم جو کہ بچپن میں وفات پا گئے ہمارے چھوٹوں سے کہیں اعلیٰ اور افضل ہیں یہاں تک کہ بعض روایتوں میں آیا کہ مشرکین کی چھوٹی اولاد اپنے باپ کے تابع ہو کر جہنم میں ہی جائے گی امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے ان کے بارے میں سکوت فرمایا اور یہ تو تم دن رات دیکھتے ہو کہ کفار کے بچوں پر نماز جنازہ پڑھی جائے نہ اس کا باقاعدہ کفن دفن ہو آخر یہ کیوں؟ ان بچوں نے کون سا کفر کیا ہے مگر بات یہ کہ وہ اپنے عاقل بالغ ہونے سے پہلے اپنے ماں باپ کے حکم میں ہیں ان کی مثال یوں سمجھو کہ زبان کسی کو گالی دے تو سر پٹتا ہے اور زبان اچھا وعظ کہے تو ہاتھ پاؤں چومے جاتے ہیں دیکھو یہ بدی تو زبان نے کی مگر اس کا نتیجہ دوسرے اعضاء نے بھی بھگتا کیونکہ اس کے تابع تھے ایسے ہی یہاں سمجھ لو اسی لئے فرمایا گیا وَلَکُمْ مَّا کَسَبْتُمْ جس سے معلوم ہوا کہ یہ خطاب اس وقت ہے کہ اولاد سمجھ دار ہو کہ کسب کے قابل ہو جائے اس کے باقی قاعدے اور اس کے متعلق اعتراضات و جوابات ہم کچھ پہلے اسی آیت کی تفسیر میں بیان کر چکے ہیں۔

مولوی وصوفی

چونکہ اس تفسیر میں عالمانہ وصوفیانہ تفسیریں بیان ہوئی ہیں لہٰذا ہم مولوی وصوفی کا فرق بتاتے ہیں مولوی مولی کی طرف سے نسبت ہے یعنی مولا والا یائے نسبتی سے مولا کا الف واؤ بن گیا جیسے کہ عیسیٰ سے عیسوی اور موسیٰ سے موسوی ایسے ہی مولا سے مولوی۔ صوفی صوف سے بنا جس کے معنی ہیں پشمینہ یا اون چونکہ پچھلے صوفیائے کرام کمبل وغیرہ اونی سادے کپڑے استعمال کرتے تھے۔ اس لئے ان کا لقب صوفی ہوا یعنی کمبل پوش یا اونی لباس والے یہ تو ان لفظوں کی تحقیق تھی اب ان حضرات میں کیا فرق ہے ملاحظہ ہو۔

ا۔ قرآن کریم کے کچھ ظاہری معنی ہیں اور کچھ باطنی راز دیکھو مشکوٰۃ کتاب فضائل القرآن وغیرہ اس کے ظاہری معنی پر بحث کرنے والا مولوی اور باطن یا سرار سے گفتگو کرنے والا صوفی۔

۲۔ دینی علم دو ہیں علم ظاہر یعنی شریعت علم باطن یعنی طریقت۔ شریعت کا عالم مولوی طریقت کا عالم صوفی۔

۳۔ انسان کے اعضاء دو قسم کے ہیں ظاہری ہاتھ پاؤں زبان وغیرہ اور باطنی دل ودماغ وغیرہ، ظاہر کی اصلاح کرنے والا مولوی اور باطن کو سنبھالنے والا صوفی۔

مثال: ایک بادشاہ نے چینی اور رومی کاریگروں کو بلا کر کہا کہ تم اپنا اپنا کمال دکھاؤ ان دونوں نے عرض کیا کہ ہمیں ایک بند کمرہ دے دیا جائے جس کی دو دیواروں پر علیحدہ علیحدہ ہم کام کریں گے مگر بیچ میں پردہ رہے چنانچہ ایسا ہی کیا گیا چینیوں نے تو اپنی دیوار پر نقش ونگاہ کر کے اسے چمن بنا دیا رومیوں نے اپنی دیوار کی گھٹائی کر کے اسے آئینہ کر دیا ان کی فراغت کے بعد بادشاہ ان کا امتحان لینے پہنچا اور حکم دیا پردہ ہی کا جھگڑا ہے اسے پھاڑ و اور پھر مقابلہ کر کے دکھاؤ۔ پردہ اٹھتے ہی جب دیواریں مقابل ہوئیں تو چینیوں کے نقش ونگار رومیوں کی دیوار میں نظر آنے لگے کیونکہ وہ مثل آئینہ کے تھی حق تعالیٰ بادشاہ ہے انسان بند کمرہ ہیں مولوی چینی کاریگر جو کہ شریعت کی اتباع کرا کر انسان کے ظاہری اعضاء پر نقش ونگار کرتا ہے صوفی رومی کاریگر جو کہ الا اللہ کی ضربوں اور مراقبوں کے ذریعہ دل میں جلا دیتا ہے سانس کا ہی پردہ ہے جب یہ زندگی کا پردہ اٹھا اور انسان کی موت آئی تو مولوی کے سارے نقش اس صاف آئینہ میں جگمانے لگے اسی کا قبر میں امتحان ہے وہاں نماز روزہ کا سوال نہیں یار کے پہچاننے کا امتحان ہے کہ اس ہرے گنبد والے کو پہچانو کہ وہ کون ہے دیکھنا یہ ہے کہ تمہارا آئینہ دل کاشانہ یار ہے یا خانہ اغیار۔

۴۔ مولوی وہ جو کلام کا منشاء سمجھے صوفی وہ جو کلام کا جذبہ پہچانے۔ دیکھو موسیٰ علیہ السلام سے رب نے فرمایا کہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے کیا رب کو خبر نہ تھی کہ ان کے ہاتھ میں لاٹھی ہے۔ منشاء کچھ اور بھی تھا مولوی کہتا ہے کہ یہ سوال آئندہ گفتگو کی تمہید تھی کہ وہ جواب میں عرض کریں کہ لاٹھی ہے اور پھر رب فرمائے کہ اچھا اسے پھینک دو تو کلیم اللہ پھینکیں وہ سانپ بن جائے تاکہ اس لاٹھی کی تاثیر موسیٰ علیہ السلام یہاں ہی دیکھ لیں ایسا نہ ہو کہ فرعون کے یہاں پہنچ کر یہ تاثیر ظاہر ہو اور خود ڈر جائیں صوفی کہتا ہے کہ اس کلام کا جذبہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اس وادی محبت میں نیا قدم رکھا ہے ابھی اگر ان سے کوئی اجنبی

بات فرمائی گئی تو شاید انہیں اضطراب ہو پہلے ان کی لاٹھی کا ذکر کیا گیا جو ان کی عرصے کی ساتھی تھی تاکہ کلام سے وحشت سے نہ ہو موسیٰ علیہ السلام نے اس موقع کو غنیمت جانا آج مجھ پر یہ کرم ہے کہ خالق اپنی ہم کلامی سے مجھے نواز رہا ہے تو کلام کو طول دینے کے لئے عرض کیا کہ مولیٰ یہ میری لاٹھی ہے میں اس پر ٹیک لگاتا ہوں اپنی بکریوں کے لئے پتے جھاڑتا ہوں اور بہت سے کام کرتا ہوں وہ چاہتے یہ تھے کہ رب یہ پوچھ لے کہ تم اور کیا کام کرتے ہو تاکہ اس بہانہ سے ساری زندگی اس کلام میں گزار دوں جب اس نے مجھ سے ایک بات پوچھی ہے تو جواب سنناہی پڑے گا وہ کلام کا منشاء تھا اور یہ ہوا جذبہ۔

۵۔ مولوی وہ جو بتا کر سمجھائے اور صوفی وہ جو دکھا کر مسئلہ حل کر دے۔

حکایت: حج میں میرے ساتھ ایک پنجابی بزرگ تھے جن کا نام تھا صوفی محمد حسین وہ مجھ سے فرمانے لگے کہ ایک بار میں شاہ عبدالحق مہاجر الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ حدیث شریف میں تو آتا ہے کہ ہمارا مدینہ بھٹی ہے جیسے کہ بھٹی لوہے کی میل کو نکال دیتی ہے ایسے ہی زمین مدینہ نااہل کو اپنے سے نکال دیتی ہے حالانکہ مرتد اور منافق بھی مدینہ پاک میں مر کر یہاں ہی دفن ہو جاتے ہیں پھر اس حدیث کا مطلب کیا شاہ صاحب نے مجھے کان پکڑ کر نکلوا دیا میں حیران تھا کہ مجھے کس قصور میں نکالا گیا رات کو خواب میں دیکھا کہ مدینہ منورہ کے قبرستان یعنی جنت البقیع میں کھدائی ہو رہی ہے اور اونٹوں پر باہر سے لاشیں آ رہی ہیں اور یہاں سے باہر جا رہی ہیں میں ان لوگوں کے پاس گیا اور پوچھا کہ کیا کر رہے ہو وہ بولے کہ جو نااہل یہاں دفن ہو گئے ہیں ان کو باہر پہنچا رہے ہے اور عشاق مدینہ کی ان لاشوں کو جو اور جگہ دفن ہو گئی ہیں یہاں لا رہے ہیں اور دوسرے دن پھر شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا آپ نے مجھے دیکھتے ہی فرمایا کہ اب سمجھے حدیث کا مطلب یہ ہے اور کل تم نے مجھ سے اغیار میں اسرار پوچھے تھے جس کی تمہیں سزا دی گئی تھی۔

۶۔ مولوی جس کی گفتار سے مسائل حل ہوں صوفی وہ کہ جس کے دیدار سے منازل طے ہوں گے مگر خیال رہے کہ ولی را ولی می شناسد مولانا فرماتے ہیں۔

لوح محفوظ است پیشانی یار راز پنہاں می شود زآں آشکار

ایک جگہ فرماتے ہیں۔ ع

اے لقائے تو جواب ہر سوال

۷۔ مولوی جو دلائل سنا کر سائل کے مسائل میں تسلی کرے صوفی وہ جو مطلوب تک پہنچا کر بذریعہ کشف تشفی کر دے کہ جہاں دلائل کی ضرورت ہی نہ رہے مولانا فرماتے ہیں۔

پائے استدلالیاں چوبیں بود پائے چوبیں سخت و بے تمکیں بود

۸۔ مولوی وہ جو صاحب قال ہو اور صوفی وہ جو صاحب حال ہو۔ مولانا فرماتے ہیں۔

قال را بگذار مرد حال شو زیر پائے کاملے پامال شو

۹۔ مولوی وہ جس پر اطاعت غالب ہو صوفی وہ جس پر عشق غالب ہو۔

نہ مسجد میں نہ کعبہ میں نہ بیت اللہ کے سائے میں　　　نماز عشق ادا ہوتی ہے تلواروں کے سائے میں

۱۰۔ مولوی وہ جو شریعت کا کھلا ہوا راستہ طے کرے صوفی وہ جو طریقت کا نہایت تنگ و دشوار اور پیچیدہ راستہ کو قطع کرے اور وہاں پہنچے جہاں سے نہ لوٹے۔

یہ حکم ہوا ہے کہ کوئی آنے نہ پائے　　　اور جو کوئی آ جائے تو پھر جانے نہ پائے

۱۱۔ مولوی وہ جو اپنے کو سب پر ظاہر کرے اور شور مچاتا سب کو بلاتا منزل مقصود کو جائے۔ صوفی وہ جو اپنے کو چھپائے اور سواء ارواح کے کسی کو نہ بلائے گویا مولوی شاہی نشان ہے اور صوفی پردہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ مجھے حضور علیہ السلام سے دو علم ملے ایک کو تو سب میں پھیلا دیا دوسرے کو میں ظاہر کروں تو مارا جاؤں (بخاری و مشکوٰۃ کتاب العلم)۔

۱۲۔ مولوی وہ جو عبادات کا قالب تیار کرے صوفی وہ جو عبادات کا قلب بنائے اور ان میں روح پھونکے نماز کی شرائط ادا مولوی بتائے گا اور شرائط قبول صوفی سے معلوم ہوں گے۔

۱۳۔ حضرت خواجہ فرید الدین شکر گنج رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا کہ صوفی وہ ہے جو میلے کچیلوں کو صاف کرے اور خود ان سے گدلا یا میلا نہ ہو۔ (از اخبار الاخیار شریف) خیال رہے کہ تھوڑا پانی گندے کو پاک نہیں کرتا بلکہ اس کی گندگی سے خود گندا ہو جاتا ہے اور دریا تمام میلوں کو اجلا گندوں کو پاک بنا دیتا ہے مگر خود نہ گدلا ہو نہ میلا نہ نجس ان صوفیا کرام میں کوئی تالاب ہے کوئی دریا حضور انور علیہ السلام سمندر جہاں سے سارے دریا بنتے ہیں اور پھر سارے دریا وہاں ہی گرتے ہیں خیال رہے کہ بعض حضرات شریعت طریقت کے جامع گزرے جیسے مولانا جامی اور شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور بعض حضرات وہ ہیں جو علم ظاہری میں مشہور تھے جیسے ملا علی قاری اور امام فخر الدین رازی مولانا فرماتے ہیں۔

گر بہ استدلال کار دیں بودے　　　فخر رازی راز دار دیں بودے

بعض وہ حضرات ہیں جو صرف تصوف میں مشہور ہوئے اور ان سے فیوض باطنی جاری ہوئے جیسے حضرت امام العارفین محی الدین ابن عربی یہ بھی خیال رہے کہ ہم کو شریعت طریقت دونوں کی ضرورت ہے یہ دونوں چیزیں زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں کہ اگر ایک پہیہ بھی نہ ہو تو گاڑی بیکار ہم عالم دین کے بھی محتاج اور شیخ طریقت کے بھی کسی نے اعلیٰ حضرات قبلہ قدس سرہ سے پوچھا کہ امام ابو حنیفہ اور حضور غوث پاک میں سے افضل کون ہے فرمایا کہ وہ شریعت کے امام اعظم ہیں اور یہ طریقت کے امام اعظم تجھے اس فرق کی کیا ضرورت تو دونوں ہی آنکھوں کا حاجتمند ہے وہ بولا اچھا یہ بتا دیجئے کہ ان میں داہنی آنکھ کون ہیں اور بائیں کون؟ آپ نے فرمایا اور اس سلسلہ میں سارے داہنی ہی ہیں بائیں کوئی نہیں سبحان اللہ کیا حکیمانہ جواب ہے فضیلت ایک محکمہ کے حکام میں نہیں دیکھی جاتی وائسرائے یا کمانڈر انچیف یا کپتان پولیس اور سول سرجن میں اعلیٰ ادنیٰ کیسا ہی سارے اپنے اپنے محکمے میں چوٹی کے حکام ہیں اور ہر ایک کو دوسرے سے تعلق کپتان صاحب سول سرجن سے علاج کراتے ہیں اور سول سرجن کپتان سے چوری کی تحقیقات اسی طرح علماء صوفیاء سے بیعت ہوتے ہیں اور صوفیاء علماء کے شاگرد ہم غلاموں کو کیا حق ہے اس بحث میں پڑیں خیال رہے کہ صوفیاء اور اولیاء علمائے حق تا قیامت اسلام کی حقانیت اور

مذہب اہل سنت کے برحق ہونے کی زندہ جاوید دلیلیں ہیں کیونکہ یہ حضرات درخت اسلام کے پھل پھول ہیں اسی درخت میں پھل پھول ہوتے ہیں جس کی جڑ زندہ ہو دیکھو بنی اسرائیل میں صدہا اولیاء وعلمائے حق ہوئے مگر جب سے ان کا دین منسوخ ہوا تب سے ان میں کوئی ولی نہیں چونکہ حضور کا دین تا قیامت ہے لہٰذا قیامت تک یہ جماعتیں رہیں گی نیز اسلام کے تہتر فرقوں میں سوا مذہب اہل سنت کے اولیاء صوفیاء کسی مذہب میں نہیں معلوم ہوا کہ اسلام کی اصل اصول یعنی حضور ﷺ سے اس کا تعلق ہے باقی مذاہب سوکھی ہوئی شاخیں ہیں چولہے میں جلانے کے قابل رب تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَكُونُوا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ (توبہ:۱۱۹) اور فرماتا ہے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۙ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ اسی جماعت میں رہو جس میں یہ سچے لوگ یعنی علماء حقانی اولیاء، صوفیاء ہوں۔

وَصَلَّى اللّٰهُ تَعَالٰى عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمَ

ناچیز:۔ احمد یار خان نعیمی قادری
مہتمم مدرسہ غوثیہ نعیمیہ گجرات پاکستان
۲۷ ذیقعدۃ الحرام ۱۳۶۳ھ یوم چہارشنبہ